ساقی

قیمت ایک روپیہ

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ چھ آنے

جرعات

چندہ سالانہ ممالک غیر سے
۱۲ شلنگ۔ نمونے کا پرچہ
مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۱۹ | ساقی دہلی بابت ماہ فروری ۱۹۳۹ء | نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

۱۹۳۸ء کے آخیر اور ۱۹۳۹ء کے شروع میں اُردو کے مشہور رسائل نے اپنے اپنے سالنامے شائع کئے۔ یہ سالنامے نہایت شاندار اور علم و ادب کے جواہر پاروں سے لبریز ہیں۔ اِسے صحافتِ اُردو کی خوش نصیبی اور ترقی کی دلیل سمجھنا چاہیئے۔ "ادبی دنیا" "عالمگیر" "ادبِ لطیف" "ہمایوں" اور "نگار" کے سالنامے انگریزی جرائد کے سالناموں کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ مضامین کے اعتبار سے ہماری زبان کے سالنامے دُنیا کی کسی اور زبان کے خاص نمبروں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ اِن سالناموں کی لائق رشک کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی بہترین توقعات اُردو کے مستقبل سے وابستہ کر سکتے ہیں۔ قلتِ گنجائش کی وجہ سے ان خاص نمبروں پر ہم علیحدہ علیحدہ تبصرہ نہیں کر سکے۔ ان میں سے ہر خاص نمبر اِس لائق ہے ہر صاحبِ ذوق کے پاس اسکی ایک کاپی ہو ع۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

پچھلے دو مہینے میں متعدد کتب لغرض تبصرہ موصول ہوئی ہیں۔ افسوس ہے کہ اِن سب پر بھی اظہارِ خیال نہیں کیا جا سکا۔ اُمید ہے کہ آئندہ مہینے میں یہ کسر پوری ہو جائیگی۔ کیونکہ چند اہل ذوق حضرات نے تبصرہ نگاری کا فرض اپنے ذمہ لیکر ادارہ ساقی کو بڑی حد تک سُبکدوش کر دیا ہے۔ ناشرین سے درخواست ہے کہ اِس تاخیر کو معاف فرمائیں

اِس پرچے میں کرسٹوفر مارلو کی شہرۂ آفاق تمثیل "ڈاکٹر فاؤسٹس" کا اندوہناک فسانۂ زندگی" تمام و کمال شائع ہو رہا ہے۔ فرخندہ اختر بیگم صاحبہ نے نہایت محنت اور کاوش سے یہ ترجمہ کیا ہے اور اُردو زبان کے اچھے تراجم میں ایک اور کا اضافہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ سالنامہ کے لئے موصول ہوا تھا مگر کثرتِ مضامین کی وجہ سے شریک نہیں کیا جا سکا۔ اسی طرح چند اور مضامین شائع ہونے سے رہ گئے جو فروری کے ساقی میں بھی شامل نہ ہو سکے۔ مضمون نگار حضرات سے ہم معذرت خواہ ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ ہماری مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کرینگے۔

میاں بشیر احمد صاحب کا مضمون جس کی پہلی قسط اِس پرچے میں شریک ہے مسلمانوں کے لئے خاص طور پر لائقِ مطالعہ ہے۔ حضرت ایم۔اسلم نے "شبِ تنہائی" بہت مؤثر افسانہ لکھا ہے۔ اِسے آپ آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔

سید رفیق حسین صاحب کا افسانہ "کفارہ" اپنی طرز کا پہلا افسانہ ہے۔ افسانہ نگار حضرات اگر اسی طرح نئی نئی باتیں پیدا کریں تو ہمارا افسانوی ادب مالامال ہو سکتا ہے۔

آخیر میں "نہ رزق نہ موت" بھی ہماری توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے۔

خریدارانِ ساقی سے التماس ہے کہ وہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ "مینیجر"

مُسلمانوں کا ماضی حال اور مُستقبل

انجمن حمایت الاسلام لاہور کی طلائی جوبلی کی تقریب پر میاں بشیر احمد صاحب اڈیٹر ہمایوں نے اس عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا جو بعد میں بہت اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ موصوف کا یہ مضمون بیش قیمت معلومات کا حامل ہے اور اس لائق ہے کہ اسکی اشاعت زیادہ سے زیادہ کی جائے۔ اُمید ہے کہ خوش مذاق ناظرینِ ساقی میں یہ مضمون مقبول ہوگا۔ شاہد

ہندوستان بھر میں اس وقت کونسا ایسا مسلمان ہوگا جسے موجودہ حالات کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو اور جس کا دل اپنی قوم کے مستقبل کے لئے تڑپ رہا ہو؟ ہماری نازک حالت ہمسایہ قوم کی تنظیم اور اقتدار، ساری دُنیا میں آزادی اور مساوات کے لئے جدوجہد! ہندوستان کے مسلمان نیم جاہل بھی بہت غافل بھی لیکن اب اتنے جاہل اور اتنے غافل بھی نہیں رہے کہ اس صریح حقیقت کے معنی بالکل نہ سمجھ سکیں۔ خدا بھلا کرے زمانے کا جس نے اپنی سختی سے اور ہمسایہ قوم کا جس نے اپنی بے اعتنائیوں سے ہماری اس جہالت اور غفلت کو بیچینی اور تھوڑی بہت علم و عمل کی خواہش میں تبدیل کر دیا ہے۔

لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ صرف کچھ نہ کچھ سمجھ لینا اور کچھ نہ کچھ کرلینا ہرگز کافی نہیں۔ آج صدیوں کے کام مہینوں میں اور برسوں کا پروگرام ہفتوں میں انجام پاتا ہے۔ سو اگر ہم ایک خوددار قوم کی باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ پچھلے چند برس میں جو کچھ ہوا اور ہمارے اردگرد جو کچھ اب ہو رہا ہے اُسے غور سے دیکھیں اور پھر سمجھیں کہ ہم کس حال میں ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

دُنیا کہاں سے کہاں نکل گئی! جنگ عظیم کے بعد کیا کیا تبدیلیاں ہوگئیں، اس پر ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی ہولناک جنگ کا جو فیصلہ فتح اور شکست نے سنہ ۱۹۱۸ء میں کیا وہ محض عارضی تھا۔ یہ درست ہے کہ چند سال صرف ہمارے محسن اتحادیوں کے نام کا ڈنکا بجا اور اب بھی انگلستان کی سلطنت پر سورج نہیں ڈوبتا، فرانس کا جھنڈا اب بھی اُدھر مراکش پر لہراتا ہے، اِدھر مشرقی ایشیا میں جاپان اپنی دن رات کی بمباری سے ایک نئی سلطنت کی بُنیاد ڈالتا معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھو کہ گزشتہ بیس سال میں اور کتنی پُرانی اور نئی قوموں نے طاقت پکڑی اور مہذب دُنیا میں کیا کیا معاشری اور معاشی اور تمدنی انقلاب برپا ہوئے جن سے دُنیا گویا ایک قطعاً نئی دُنیا بن گئی!

پہلے سنہ ۱۹۱۷ء میں روس میں ایک نئی طاقت بلکہ ایک نئے اشتراکی تمدن کا آغاز ہوا۔ جنگ کے خاتمے پر یورپ میں کئی پُرانی مظلوم قوموں کو نئی جمہوری حکومتیں عنایت ہوئیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان نام نہاد "قومی" حکومتوں میں بسا اوقات کسی نہ کسی سیاسی غرض کے ماتحت طرح طرح کے اختلاف رکھنے والی قوموں کو یکجا کیا گیا جس سے ان اکثریتوں اور اقلیتوں کے درمیان مناقشات کا ایک خطرناک سلسلہ چھڑ گیا۔ جیسے زیکوسلوویکیا میں ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء کے آخیر میں جو عجیب و غریب بین الاقوامی ڈرامہ کیا گیا اس کی کہانی ہم سب کو خوب یاد ہے۔ اتحادی جمہوریت پرستوں کی مہربانی سے جرمنوں کی ایک اقلیت کو زبردستی چیکوں اور سلوویکوں کی یک اکثریت کے ساتھ چپک دیا گیا۔ ان خوددار جرمنوں کو یہ قوم پرستی پسند نہ آئی، چنانچہ بیس برس تک اقلیت اور اکثریت کے جھگڑے جاری رہے مگر مظلوموں کی شنوائی نہ ہوئی۔ یہاں تک جناب ہٹلر کی تیغ جگر دار نے عالمگیر جنگ کی دھمکی دے کر اتحادیوں سے پنالو یا منوالیا اور آخر یہ اقلیت اکثریت کے پنجے سے چھوٹ گئی۔ ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر سلوویک لوگوں نے بھی چیک اکثریت پر دباؤ ڈالا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب چیکوسلوویکیا ایک فیڈرل یا وفاقی ملک بن گیا ہے جس میں چیکوں کی قومی مجلس الگ ہے اور سلوویکوں کی الگ۔ ہندوستان کے قوم پرست اگر ان تازہ حالات سے عبرت پکڑیں تو اس بدنصیب ملک کی قسمت کے دن پھر جائیں۔

ان آدھا تیتر آدھا بٹیر قومیتوں کی بُنیاد دو رسائی کے عہدنامے میں (سنہ ۱۹۱۹ء) رکھی گئی تھی۔ اس کے اگلے سال لیگ اقوام کی بنا پڑی جو فی الحقیقت صرف بعض جیتنے والی طاقت ور قوموں کی انجمن تھی۔ جن قوموں کی آواز یہاں نہ سُنی جاتی تھی انہوں نے مجبور ہو کر اپنی قومی تنظیم شرُوع کی تاکہ اپنے زورِ بازو سے دُنیا کی محفل میں اپنا سکہ بٹھائیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے اطالیہ میں اور سنہ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے جرمنی میں مطلق العنان آمر بن کر اپنی اپنی قوم میں ایسی رُوح پھونکی اور اُن کی ایسی تنظیم کی کہ دُور اندیش انگلستان نے اُن کی طرف پہلے نظرِ عنایت کی اور دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں ان سب قوموں کے درمیان لوکارنو سمجھوتا اور سنہ ۱۹۲۸ء میں برِیاں کیلگ میثاق ہوا۔ جن کا مقصد جنگ سے پرہیز

کرتا تھا۔ مگر غیر اتحادی قومیں طاقت کے مفہوم کو خوب سمجھ چکی تھیں، چنانچہ ۱۹۳۱ء میں جاپان نے منچوریا پر حملہ کرکے "مانچوکواو" کو اپنے سانچے میں ڈھالا۔ ۱۹۳۵ء میں اطالیہ نے ابی سینیا پر دھاوا بول دیا، اور ۱۹۳۶ء میں جرمنی نے رائین کے علاقہ میں اپنی فوجیں اُتار دیں۔ اسی سال اُدھر سپین میں اِدھر چین میں خانہ جنگی کا بازار گرم ہوا اور موقع پاکر جاپان نے ۱۹۳۷ء میں چین پر حملہ کردیا۔ اور جرمنی نے سوڈیٹنوں کو شہ دے کر اکتوبر ۱۹۳۹ء میں سوڈیٹن لینڈ کو جرمنی میں شامل کرلیا۔ اتحادی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ وہ فقط اپنے اتحاد کو مضبوط پکڑے بیٹھے رہے بلکہ اب تو وہ اِن "غاصبوں" کو دعوتِ خاص دے رہے ہیں کہ آؤ اِس اتحاد میں تم بھی شامل ہوجاؤ تاکہ دُنیا میں امن وامان قائم رہے۔ لیکن امن وامان کیسا؟ جہاں طاقت کے احساس پر ہر ایک کی نیت لحظہ بہ لحظہ بدل جانے پر آمادہ ہو وہاں جس کے ہاتھ جب لاٹھی آئیگی وہ تمدن کی بھینس کو اپنے ہی گھر کی طرف ہانکے جائیگا۔

اِس تاریک زمانے کا سب سے روشن اور سب سے حیرت انگیز واقعہ مصطفٰے کمال کا کارنامہ ہے جس نے اپنی جانبازی اور دُور اندیشی سے ایک گئی گزری قوم اور ایک مُردہ مُلک کو قومی تنظیم کے ذریعے سے ازسرِنو زندہ کردیا۔ دُنیا کی تاریخ میں کتنی مثالیں ہیں جہاں ایک ایسے کمزور گروہ نے بڑی بڑی منظم قوموں کا میدانِ جنگ میں اُتر کر یوں علانیہ مقابلہ کیا ہو۔ یونانیوں پر تُرکوں کی فتح دراصل جنگ کے بعد انگلستان اور فرانس کی پہلی شکستِ فاش تھی۔ اور یہ سب کرشمہ صحیح قومی احساس اور مکمل قومی تنظیم کا تھا۔ اس کے بعد کمال نے جو کچھ کیا اُس سے دُنیا واقف ہے۔ اُس نے وہ کام کیا جس نے ترکوں کو اندرونی اور بیرونی حیثیت سے ایک مضبوط قوم بنا دیا۔ مُلک کے اندر معاشرتی اصلاح اور معاشی ترقی اور مُلک سے باہر دوسری قوموں سے اور بالخصوص اسلامی ممالک سے اُس نے وہ معاہدے کئے جن کے باعث تُرکی کو مشرق ومغرب کے عین وسط میں ایک باوقار حیثیت حاصل ہوگئی۔

یہ ہے قومی تنظیم اور اس کا نتیجہ! اس کے برعکس جو قوم اپنے ربط و ضبط سے اپنے آپ کو اس قابل نہیں بناتی کہ وہ اپنے تمام قومی معاملات میں صاحبِ اختیار ہوسکے۔ اُس کے اختیارات چھین لئے جاتے ہیں، اُس کی ہیت مٹا دی جاتی ہے، یہ کسی دوسری قوم کا قصور نہیں، یہ مٹنے والی قوم کا اپنا قصور ہے کہ وہ یوں مٹ جائے۔ قدرت کا قانون اور خدا کا فرمان سب کے لئے یکساں ہے خواہ وہ مُسلم ہوں یا غیر مُسلم۔ جو شخص اُوپر سے کُودیگا ہلاک ہوجائیگا۔ جو قوم اپنی سُستی میں پڑی کراہے گی اُسے برباد کردیا جائے گا۔ ساری تاریخ اِن واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے کے واقعات بھی ہمیں یہی بتارہے ہیں۔ دُنیا مقابلے کا میدان ہے۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ جو قومیں جان کی بازی لگاتی ہیں وہ بازی لیجاتی ہیں یا پھر جان کھو دیتی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج فلسطین میں کیا ہورہا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ بالفور کا اعلان عملی طور پر منسوخ ہوجائیگا اور عرب اپنی من مانی مُراد پالیں گے، لیکن یہ کیسے ہوگا؟ اتحاد اور قربانی سے جن کے بغیر دُنیا میں نہ کبھی کچھ ہوا ہے نہ ہوگا!

ساری اسلامی دُنیا بیدار ہورہی ہے، چالیس کروڑ مسلمانوں کے اندر ایک نئی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ترکی، ایران، عرب، افغانستان آزاد ہوگئے۔ عراق اور مصر اور شام آزادی کے راستے پر ہیں۔ باقی اکثر اسلامی ممالک غیر مُلکی حکمرانوں کے قبضے میں ہیں۔ گو حریت کی رُوح اب یہاں بھی روز وشب اپنا کام کررہی ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اِن سب سے جُداگانہ ہے، اُنہیں نہ صرف اپنے غیر مُلکی حکمرانوں سے بلکہ اپنے مُلکی بھائیوں سے بھی معاملہ طے کرنا ہے۔ یک نہ شد دو شد۔

یہاں ہمارے سامنے سب سے پہلے ایک عجیب وغریب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تم ہندوستان کے مسلمان کوئی قوم ہو ہی نہیں۔ اگر اس بیان کا اور آج کل اس پر عمل کرنے کا نتیجہ دردانگیز نہ ہوتا تو واقعی یہ بات محض مضحکہ خیز تھی، لیکن بدقسمتی سے مُلک میں ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں اور روز بروز پیدا کئے جارہے ہیں جو بہ حیثیت قوم ہمارے لئے غایت درجہ خطرناک ہیں اور ہمارے تمام قومی اداروں کا خواہ وہ سیاسی ہوں یا تعلیمی، مذہبی ہوں یا معاشی، یہ قومی فرض ہے کہ وہ مسلمانوں میں قومی رُوح پیدا کریں اور قومی تنظیم کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کردیں۔ اسے اچھی بات سمجھئے یا بُری۔ اب سیاست معاشرت اور تعلیم اور معیشت سے الگ نہ رہ سکتی ہے اور اس لئے ایک تعلیمی ادارے کے پلیٹ فارم پر ایک غیر سیاسی آدمی کو بھی مجبوراً وہ باتیں کہنی پڑتی ہیں جو کل تک صرف ماہر سیاستدان سیاسی پلیٹ فارم پر کہا کرتے تھے۔

قوم اور قومی تہذیب پر آج کل جگہ جگہ خوب گرما گرم بحث ہوتی ہے۔ ایک فریق کا خیال ہے کہ ہندوستانی ایک "قوم" ہیں، یہ "نیشن" کا ترجمہ ہے۔ نیشن کا نہ صرف لفظ یورپ سے آیا ہے بلکہ اس کی موجودہ عملی صورت بھی یورپ ہی کی ایجاد ہے۔ یورپ نے چونکہ دُنیا کے اکثر حصّوں پر قبضہ کرلیا ہے اس لئے اُس کا طرزِ خیال دُنیا بھر پر چھا گیا ہے۔ اب یورپ کی سب چیزیں اور یورپ کے سب خیالات ہمیں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ فیشن ہے۔ لیکن ساتھ ہی یورپ کی ایک صدی کی حکومت نے غیر یورپین لوگوں کو اس سے منحرف کردیا ہے۔ اُدھر خود یورپ میں اپنی سیاسیات میں بےچینی

اور اپنے فلسفۂ زندگی سے بے اطمینانی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ باوجود طاقتور اور مالدار ہونے کے یورپ خوش نہیں مطمئن نہیں۔ اشینوں کے زور سے اُس نے اٹھکر قدرت پر ضرور ایک حد تک قابو پالیا لیکن اُس کا اپنا دل خدا جانے کیوں اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے ؎

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

یورپ نے مشین بنا تو لی لیکن وہ اُس کا صحیح استعمال نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم دماغ کی پیداوار ہے لیکن زندگی جو عمل سے جنت بھی اور جہنم بھی بنتی ہے اپنے عمل کے لئے ایک سچے دل کی محتاج ہے۔ اور دل سچائی کو نہیں پا سکتا جب تک اُس کے سامنے ایک بلند نصب العین نہ ہو۔ ایسا نصب العین جو ایک فرد کو بہتر اور قوی تر فرد بنانے کے ساتھ کُل نوعِ انسان اور ساری کائنات سے اس طرح وابستہ کر دے کہ وہ سب کی بہتری میں اپنی بہتری دیکھے اور سب کی قوت سے اپنے لئے مزید قوت حاصل کرلے!

لیکن نیشنلسٹ اور سوشلسٹ اِن خیالوں کو وہم و گمان پکارتے ہیں یا پھر فرقہ داری اور سرمایہ داری سے جا ملتے ہیں۔ نیشنلسٹوں کے نزدیک جو کچھ ہے "نیشن" ہے جو خاص جغرافی حدود کے اندر محبوس رہتی ہے اور بس چلے تو دوسروں پر ہاتھ صاف کیا کرتی ہے۔ سوشلسٹوں کی کائنات میں صرف مزدور کا ہر جگہ جلوہ ہے اُن کی تاریخ تاریخی مادیت کی کارگاہ ہے اور جہاں کوئی بھولے سے بھی خدا کا نام لے لے وہ بھوک اور روٹی کا نعرہ لگا کر اُس کا مُنہ نوچ لیتے ہیں۔

یہی نیشنلسٹ اور سوشلسٹ ہیں جو ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم اور قومی تہذیب کے وجود سے انکار کرتے ہیں، مگر اپنے دل کے اندر وہ ان کی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے، اپنے کٹر ہم مذہب فرقہ پرستوں کے ساتھ مل کر، دن رات اِن کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ شکر ہے کہ جب اِن کی زمیں دوز حرکات سطح پر آ گئی ہیں اور یہ علانیہ ہماری قومیت اور قومی تہذیب پر جو یقیناً ہماری محبوب ترین متاع ہو گم باری کرنے لگے ہیں ہمارے کانوں پر بھی ذرا جوں رینگنے لگی ہے!

اس بارے میں ہم میں سے اکثر موجودہ ہندوستان کے محترم لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"مسلم قوم کے وجود کا خیال چند لوگوں کی قوت واہمہ کا
کرشمہ ہے اگر اخبارات اس خیال کو اسقدر شہرت نہ دیتے تو یہ
نام بھی بہت کم لوگوں نے سُنا ہوتا"!

ہماری تہذیب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب
کیا ہے، لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب
نہ ہوا"

لیکن وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ناکامی کے اِس پُر انکسار اعتراف کے ساتھ ہی انہوں نے ہماری تہذیب کی "نمایاں ترین علامتیں" عوام الناس میں دیکھ پائی ہیں یعنی "ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا، ایک خاص طریقے سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر داڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دینا اور ایک خاص قسم کی ٹونٹی والا لوٹا"! الحمد للہ کہ اس جسمانی تثلیث میں پنڈت جی نے مسلمانوں کے "ناقوم" گروہ کی وحدت کو ڈھونڈ پایا۔

اِس عظیم الشان دریافت کے بعد پنڈت جی نے ایک اور کامیاب سائنٹفک تجربہ کیا ہے۔ مسلمانوں کے قومی مطالبات کے متعلق فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے اس نام نہاد فرقہ وارمسئلے کا ایک دُوربین
کے ذریعے سے معائنہ کیا ہے لیکن اگر کسی چیز کا وجود
ہی نہ ہو تو نظر خاک آئے!"

مسلمانوں کی قومیت کے بارے میں ہمارے مُلکی بھائیوں کے رویّے پر ایک انگریزی مثل یاد آتی ہے کہ آدمی کا خیال اُس کی خواہش کے تابع ہوتا ہے۔ یہ بھلے مانس چونکہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومیت قائم نہ رہے اس لئے وہ بلا دقت سمجھ لیتے ہیں کہ یہ قومیت موجود ہی نہیں۔

وطنیت و قومیت کے متعلق اُس عظیم الشان شخص کے ارشادات ہم مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں جو بیسویں صدی میں ہندوستان کا سب سے بڑا مسلمان گزرا ہے۔ اگر ہم مسلمان علامہ اقبالؒ کی دکھائی ہوئی راہ پر سلامتی سے چلنا سیکھ لیں تو حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے کھوئے ہوئے مذہب کو پھر پالیں، اور دین و دُنیا دونوں میں سُرخرو ہو جائیں۔

اُس بصیرت افروز بیان میں جو مرحوم نے اپنی وفات سے ڈیڑھ مہینہ پہلے شائع کیا، اس قول پر کہ "اقوام اوطان سے بنتی ہیں" تبصرہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ "ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں"۔ پھر لکھتے ہیں کہ "وطن کا لفظ جو اِس قول میں مستعمل ہوا ہے محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اِس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ اسکے حدود آج کچھ ہیں اور کل کچھ، اِن معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی

کرنے کو تیار رہتا ہے، بعض نادان لوگ اس کی تائید میں حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔ مگر زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اُصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظِ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جاتے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔

اور اسلام کیا ہے؟ اسلام ایک مکمل "اجتماعی نظام" ہے جو بقول اقبالؒ "عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔" یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے، نہ انفرادی اور پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔" "ایسا دستور العمل صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔" پھر اس خطرناک نظریے کی کہ "مسلمان بحیثیت قوم اور" سکتے ہیں اور بہ حیثیتِ ملت اور" اور" مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہیئے" یعنی یہ کہ "مذہب اور سیاست جُدا جُدا چیزیں ہیں" اس بات کی تردید کرکے لکھتے ہیں کہ "قرآن کی رُو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔" اور "نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے، کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اُس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔" بالفاظِ دیگر بنی نوعِ انسان کو "اُن تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جائے جو زمان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اِس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیّل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملّتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں مگر اِس میں بھی شک نہیں کہ جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔"

غرض ہماری زندگی کے لئے ہمارا وطن نہیں بلکہ اسلام ہماری بنیاد ہے۔ وہی ہے ہمارا ماضی اور حال اور مستقبل۔ لہٰذا اگر ہم اپنے مستقبل کو شاندار بنانا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم دیکھیں کہ اسلام کیا ہے، اُس نے دنیا میں کیا کیا اور اب ہمیں کس طرح اُس کی پیروی کرنی چاہیئے کہ ہماری زندگیاں اُس کی شان کے شایاں اور اپنے اور دُنیا کیلئے موجبِ راحت و برکت ہو جائیں۔

پیغمبرِ اسلام جس وقت اپنا رُوحانی پیغام لیکر اُٹھے دُنیا کے مذاہب توہمات کا مجموعہ اور قوموں کے تمدن عیش و عشرت اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکے تھے۔ ایم۔ این رائے کہتے ہیں کہ "اسلام مذاہب میں سب سے آخری مذہب ہے اور سب سے بڑا مذہب" "اسلام کا عروج سب معجزوں سے بڑا معجزہ ہے۔" اور "اسلام کی حیرت انگیز کامیابی زیادہ تر اُسکے انقلابی مفہوم کی وجہ سے تھی نیز اس وجہ سے کہ اُس نے عوام الناس کو اُس ناگفتہ بہ حالت سے رہائی دلائی جو نہ صرف یونان اور روما بلکہ ایران اور چین اور ہندوستان کی قدیم تہذیبوں کے زوال و تخریب سے پیدا ہو گئی تھی۔" "اسلام کے انقلاب نے نوعِ انسان کو بچا لیا۔" ڈریپر اپنی مشہور تصنیف "یورپ کی عقلی ترقی کی تاریخ" میں لکھتا ہے کہ "دُنیا کی تاریخ میں کسی شخص نے نوعِ انسان پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا جتنا بانیٔ اسلام نے۔" آریاؤں کا دلدادہ، مسلمانوں کا مخالف ہیول کہتا ہے کہ "یہ اسلام کے فلسفے کی وجہ نہیں تھی بلکہ اُس کے اجتماعی اُصولوں کے باعث تھا کہ ہندوستان میں اتنے لوگوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔" اس کی تردید میں مسٹر رائے کا خیال ہے کہ "ہندوستان کے عوام میں اسلام کے اجتماعی پروگرام کی مقبولیت کی اصلی وجہ یہی تھی کہ اس پروگرام کی بنیاد ایک ایسے فلسفے پر تھی جو ہندو فلسفے سے بہتر تھا۔ ہندو فلسفے نے معاشرت میں جو ابتری ڈال دی تھی اسلام نے آکر عوام کو اس مُصیبت سے نکلنے کی راہ دکھائی۔"

اسلام کا فلسفہ نہایت سادہ تھا، اس قدر سادہ کہ اُسے فلسفہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ اُس نے مذاہب کے سب توہمات اور انسانی افکار کی سب اُلجھنوں کو چند سیدھے سادے اُصولوں کے ذریعے سُلجھا کے رکھ دیا۔ اسلام کو ایک جاہل سے جاہل شخص بھی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ اسلام نے دکھا دیا کہ کائنات کی حقیقت کس قدر سادہ اور عام فہم اور انسان کیلئے کس قدر دلکش اور جانفزا ہے۔

یہ زمین و آسمان، یہ ساری دیکھی اور اَن دیکھی کائنات صرف ایک رشتے میں پروئی ہوئی ہے اور وہ رشتہ خُدا ہے۔ خدا کا کائنات سے وہی تعلق ہے جو انسان کی رُوح کا اُس کے جسم سے ہے۔ خدا کائنات کے ذرّے ذرّے میں، روشنی کی کرن کرن میں، بڑے سے بڑے وجود اور

چھوٹی سے چھوٹی ہستی کی رگ رگ میں جاری و ساری ہے۔ ہر شے جو کچھ ہے اُس سے ہے کیونکہ وہ ہر شے کی رُوح اور ہر رُوح کی زندگی ہے۔ مادہ اور رُوح دو چیزیں نہیں، یہ لاکھوں کروڑوں، یہ بے حد و بے حساب چیزیں یہ ساری کثرت فقط ایک وحدت سے ظہور میں آئیں اور فی الحقیقت اب بھی اُسی کے اندر موجود ہے۔ جو کچھ ہے وہی ہے۔ اُسی نے اِس سب کچھ کو وہ شکل دی جو اس کی ہے۔ اُس مادے میں جو بظاہر مردہ تھا اُس نے جان ڈال دی۔ اور ایک رُوحانی ہستی پیدا کر دی وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ (اور تم تو مُردہ تھے۔ پھر اُس نے تم میں جان ڈالی) یہ انفرادی رُوح خدا یعنی رُوحِ کائنات کا ایک جزو ہے۔ یہ نامکمل ہے، اپنے ارتقاء کے لئے یہ مادے کا لباس پہنتی ہے اور زندگی کے درجے طے کرتی ہوئی رُوحِ کل کی طرف رجوع کرتی ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، یہ فقرہ جو عموماً کسی کی دُنیاوی موت پر بولا جاتا ہے دراصل ابدی زندگی کی کیفیت بیان کرتا ہے، یہ اُس کا مختصر سفرنامہ ہے! ابدی زندگی کا پہلا خود شعوری کا مرحلہ اس دُنیا کی زندگی ہے۔ خدا نے انسان کو اپنا نائب بنا کر اس زمین میں بھیجا، اُسے فرشتوں پر ترجیح دی، اُسے وہ چیزیں بتائیں جو اُنہیں معلوم نہ تھیں گویا علم و عمل میں اُسے اپنا شریک کار بنایا۔ اُسے طاقت دی کہ زمین اور پہاڑوں نے جس بارِ امانت کو اُٹھانے سے انکار کیا حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ، اُسے انسان نے اُٹھالیا۔ دُنیا میں سینکڑوں ہزاروں نعمتیں اُس کے لئے پھیلا دیں کہ وہ ان سے لطف اُٹھائے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ خدا نے انسان کو نیک پیدا کیا اور اُسے نیک و بد کی پہچان دی لیکن نیکی یا بدی اختیار کرنے میں اُسے پوری آزادی دے دی کہ جو چاہے کرے اور اُس کا پھل پائے۔ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ (جو شخص ذرہ برابر بھی بھلائی کریگا وہ اُسے پالے گا اور جو شخص ذرہ برابر بھی بُرائی کریگا وہ اُسے بُھگت لے گا۔) اور نیکی بدی سب اپنے لئے ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ (جس کسی نے نیک کام کیا سو اپنے لئے) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اس دشوار مرحلے میں اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (خدا تمہارے لئے آسانی کرنا چاہتا ہے، سختی نہیں کرنا چاہتا) اور پھر جہاں زندگی کی آزمائشیں آزمائیں فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (تو میں تمہارے پاس ہی ہوں) خدا اُس کے ایک ہمدرد، اُس کے اِک ہمراز اُس کے اِک دلی دوست کی طرح ہر وقت اُس کے ساتھ ہے مگر انسان بھی تو ذرا توجہ کرے۔ فَاذْكُرُوْنِیْ اَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو میں بھی تمہیں یاد کروں گا) وہ اُس کے قریب اُس کے دل میں رہ کر اُسے، اگر وہ سُنے چُپکے ہی چُپکے، دُنیا و کائنات کا بھید بتاتا ہے۔ کائنات کا ایک مقصد ہے۔ یہ فضول نہیں بنا دی گئی مَا خَلَقْنٰهَا اِلَّا بِالْحَقِّ اس مقصد کی تکمیل میں اِس کائنات کے بڑھانے اور بلند کرنے میں خدا ہر لحظہ میں منہمک ہے۔ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (وہ ہر روز کسی نہ کسی کام میں لگا رہتا ہے) یہ نہیں کہ کائنات کو چند روز میں بنا دیا اور پھر عرش پہ جا بیٹھے۔ اسلام ارتقا کا قائل ہے، یہ زمین و آسمان، یہ مہر و مہ، یہ ستارے اور یہ اور سب کچھ، یہ بدلتے رہتے ہیں بڑھتے رہتے ہیں، آفرینش کا عمل جاری ہے اور جاری رہیگا۔ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ۔ (پھر خدا ایک اور پیدائش پیدا کرے گا) ترجمانِ حقیقت نے کیا خوب کہا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُنْ فَیَکُوْن

یہ زندگی موت پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مختلف حالتوں مختلف درجوں سے ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (اور قسم چاند کی جب وہ کامل ہو جائے کہ تم لوگ درجہ بدرجہ (رتبۂ اعلیٰ پر) چڑھوگے) یعنی جس طرح پہلی رات کو ہلال ایک سا ہوتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے بدرالدجیٰ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی اس دُنیا میں ابھی گویا زندگی کے پہلے دن میں ہے اور اس کے بعد وہ زندگی کے خدا جانے کتنے مرحلے طے کریگا اور کیا سے کیا ہو جائے گا!۔

خدا نے انسان کو زمین و آسمان میں محصور کر کے بظاہر عاجز کر دیا لیکن ساتھ ہی عقل بھی دی کہ اِن پر قوت حاصل کر کے ان کو مطیع کر سکے اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا۔ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔ علامہ اقبال اس کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر تم زمین و آسمان کی حدود سے آگے بڑھ سکتے ہو تو بڑھ نکلو، لیکن ہاں تم ان سے آگے بڑھ سکوگے تو صرف قوت سے!

دیکھو اسلام انسان کو خدا کے کتنا قریب لے گیا ہے۔ انسان کو کتنی آزادی دی گئی ہے۔ اُس کے لئے کہاں تک ارتقا کی راہیں کھول دی گئی ہیں۔ وہ محض خدا کا مجبور غلام نہیں بلکہ خدا ہی کے حکم سے اُسے صاحبِ اختیار بنایا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ (تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے) کیونکہ ساری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے لیکن خدا کی قدرتِ کاملہ کے ساتھ ساتھ خدا ہی کے حکم سے انسان کی آزادی اور اُس کی طاقت برابر قائم ہے۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ (اور خدا نے تو اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنے اوپر آپ ہی ظلم کرتے ہیں) لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (انسان کوشش کے بغیر کچھ نہیں پاتا) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا

بِاَنْفُسِهِمْ (خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت کو نہ بدلے۔) فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پھر جب ارادہ کر چکو تو خدا پر توکل کرو) یعنی پہلے خود ارادہ کرو پھر خدا پر چھوڑو۔ یہ نہیں کہ ارادہ کے بغیر ہر بات خدا پر چھوڑ رکھو۔ اس کے بعد بھی جو اپنی قسمت کا رونا روئے اُس سے خدا سمجھے۔ ہمارے قومی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے!

لیکن یہ مرتبہ کمل ایمان اور مسلسل توجہ اور مستقل ریاضت سے نصیب ہوتا ہے۔ جب سے ہم نے جسمانی کاہلی اور نفسی خودغرضی اور غلط قسم کے توکل پر تکیہ کیا اُس دن سے ہم انسانیت کے درجے سے گر گئے اُس دن سے ہم اور ہماری قوم دین و دُنیا دونوں میں اپنی جگہ کھو بیٹھے۔ حضرت عمرؓ اس تقدیر کے قائل نہ تھے جس کے آگے ہندوستان کے مسلمان کچھ عرصے سے سرنگوں ہو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے سنہ ۱۸ھ میں جب شام میں وبا پھیل جانے پر مسلمانوں کے لشکر کو کوچ کا حکم دینا چاہا اور حضرت ابوعبیدہؓ نے طیش میں آکر کہا، اے عمر! تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا نَعَمْ اَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ اِلٰى قَضَاءِ اللّٰهِ (ہاں تقدیرِ الٰہی سے بھاگتا ہوں۔ مگر بھاگتا بھی تقدیرِ الٰہی کی طرف ہوں) یہ ہے آزادی اور تدبیر کا وہ رستہ جو آج کل کے زیاں کار مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ ہے اسلام کا نصب العین جس نے عرب کے بدوؤں میں علم و عمل کی وہ رُوح پھونک دی جس کے فیض سے مشرق و مغرب کو اک نئی زندگی ملی۔ ہم بھول گئے ہیں کہ ہمارے پیغمبر نے ہمیں تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (اپنے آپ کو خدا کی صفات سے متصف کرو) کا حکم دیا تھا۔ کس قدر بلند مرتبہ تھا جو اسلام نے انسان کو بخشا اور کس قدر ادنیٰ درجہ ہے جس پر آج اُس کے اکثر پیرو پہونچ چکے ہیں۔ اُن کے دل بجھ گئے ہیں، اُن کی ہمتیں پست ہو گئی ہیں، وہ کہتے ہیں جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے، ہماری قسمت ہی ایسی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کو وہ یہ معنی پہنانا چاہتے ہیں کہ خدا چاہے تو بغیر ہمارے ہاتھ ہلائے ہمیں مالا مال اور طاقتور بنا دے۔ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ اور اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ایسے لوگوں کے لئے ارشاد نہ ہوا تھا!

اُس مذہب میں تقدیر پرستی کیسے ہو سکتی تھی جو بات بات میں عقل کی سند دے، اور طلب کرے هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو) اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (میں جاہلوں کے زمرے میں داخل ہونے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں) هُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ هُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ هُمْ لَا يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ هُمْ لَا يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ هُمْ لَا يَتَدَبَّرُوْنَ ۝ (وہ نہیں جانتے وہ عقل نہیں رکھتے، وہ نہیں سوچتے، وہ فکر نہیں کرتے۔ وہ غور نہیں کرتے)

علامہ اقبال جنہوں نے اپنے غیر فانی کلام میں مسلمانوں کی قوم کیلئے قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی واضح اور مکمل تشریح چھوڑی ہے اپنے سات انگریزی لیکچروں (مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ اور ۱۹۳۴ء) میں، حالاتِ حاضرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے، عقلی نقطۂ نظر سے اسلام کے اُصولوں کی "تشکیلِ جدید" پیش کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو زمانۂ حال کے ترقی یافتہ ناخوش بیزار انسان کو قلبی اطمینان بخش سکتا ہے۔ علامہ مرحوم فرماتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک حصولِ علم کے تین بڑے ذریعے ہیں وجدان، فطرت اور تاریخ۔ وجدان کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اس کے ذریعے ہر شخص اپنے دل میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے اور اُس کی آواز سنتا ہے۔ خدا اور انسان کے اِس رشتے کے لیے ثبوت کی ضرورت نہیں، خدا ہر بلانے والے کو جواب دیتا ہے، جو چاہے خود اس کا تجربہ کر لے، وہ کبھی ناکام نہ رہیگا۔ تصوف اِسی زبردست بنیاد پر قائم ہے۔ صدیوں سے دُنیا کے کونے کونے میں تنہا انسانوں نے اسی راہ میں خُدا کو اپنا ہم سفر پایا ہے۔ شبلی رح کا قول ہے کہ "صوفی دونوں جہاں میں بجز خدا کے اور کسی کو نہیں دیکھتا" ایک اور صوفی (ابوالنصر سراج) کہتا ہے "عشق اُس آگ کا نام ہے جو عاشقوں کے دل اور سینے میں جلتی رہتی ہے اور خدا کے سوا جو کچھ ہے اُسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے"

لیکن اسلام اِسی قلبی اندرونی ثبوت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ساتھ ہی عقلی بیرونی ثبوت بھی مہیا کرتا ہے۔ قرآن میں جا بجا عقل و علم کا ذکر ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ (خدا کو علم ہے) وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّا اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (اور بعض ان میں اَن پڑھ ہیں جو بڑ بڑا لینے کے سوا کتاب الٰہی کو کچھ نہیں سمجھتے اور وہ فقط خیال تکے چلایا کرتے ہیں اور بس) قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (کہتے ہیں، نہیں ہم تو اُسی طریقے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے پایا، بھلا اگر اُن کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ راہِ راست پر چلتے رہے ہوں تو بھی وہ انہیں کی پیروی کئے چلے جائیں گے؟) خود قرآن کے معنی ہیں ایسی چیز جو پڑھی جائے، کتاب! سب سے پہلی آیت جو رسولِ کریمؐ پر اُتری، سب سے پہلا لفظ جو روح کائنات نے عرب کے صحراؤں سے دُنیا بھر کے لئے نشر کیا علم سے متعلق تھا۔ اِقْرَاْ (پڑھ!) اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (پڑھ خدا کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ آدمی کو گوشت کے

لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا خدا تو بڑا مہربان ہے جس نے انسان کو علم سکھایا قلم کے ذریعے سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو اُسے معلوم نہ تھا) مَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (جسے حکمت دی گئی بیشک اُسے بڑی دولت دی گئی۔) فطرت کا جابجا ذکر ہے، تاریخ کی طرف جابجا اشارے ہیں۔ یہ نہیں کہ انسان فقط اپنے آپ میں ڈوبا رہے اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر و بے تعلق رہے۔ اسلام راہبوں کا مذہب نہیں۔ اسلام پہلا دین ہے جس نے دُنیا سے صحیح ربط پیدا کیا۔ اسلام میں دین اور دُنیا دونوں ملتے ہیں۔ اسلام کے اہلِ دین اہلِ دُنیا ہیں اور اہلِ دُنیا اہلِ دین۔ یہاں دین و دُنیا کی تفریق مٹا دی گئی۔ دونوں ایک ہو گئے کہ اسلام میں دوئی ناممکن تھی۔

فطرت میں مشاہدے کی عادت یورپ نے مسلمانوں سے سیکھی اور مسلمانوں نے قرآن سے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (بیشک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کی ادل بدل میں اور جہازوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور مینہ میں جس کو خدا آسمان سے برساتا اور پھر اُس کے ذریعے سے زمین کو اُس کے مرے پیچھے پھر زندہ کرتا ہے اور ہر قسم کے جانوروں میں جو خدا نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کے پھرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں، قدرتِ خدا کی نشانیاں ہیں۔)

تاریخ کے ایک مسلسل تحریک اور ایک ارتقائی عمل ہونے کا نظریہ دُنیائے حاضرہ نے ابن خلدون سے سیکھا۔ اس کا منبع بھی قرآن ہے۔ سینکڑوں جگہ ماضی کے واقعات کو بیان کیا ہے کہ اُن کے آئینے میں انسان اپنے حال اور مستقبل کو سنوارے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ (تم سے پہلے بھی واقعات ہو گزرے ہیں تو دُنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ حق کے جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا! یہ لوگوں کے لئے ایک صریح بیان اور نیکوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے۔) وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (یہ اتفاقاتِ وقت ہیں جنہیں ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں۔)

طبیعیات، و تاریخ سے یورپ نے دُنیا میں جو انقلاب پیدا کیا اُس کا سرچشمہ مسلمانوں کا ہسپانیہ تھا۔ بریفالٹ اپنی کتاب "تشکیلِ انسانیت" میں لکھتا ہے کہ سائنس سب سے بڑی نعمت ہے جو عربی تہذیب کے ہاتھوں دُنیائے حاضرہ کو ملی۔ تجربہ کرنے کا طریقہ جس نے یورپ کو دُنیا بھر کا اُستاد اور مالک بنا دیا انہوں نے اوّل اوّل عربوں ہی سے سیکھا۔ اس طبیعیات اور طبعی طریقے کی بُنیاد عرب کے صحراؤں میں قرآن کی تعلیم نے رکھی تھی۔

علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ "اسلامی کلچر کے متعلق پہلا ضروری نکتہ جو قابلِ غور ہے یہ ہے کہ وہ اپنی نظر ٹھوس محدود چیزوں پر جماتی ہے۔" "میں اس غلط فہمی کو قطعاً مٹانا چاہتا ہوں کہ یونانیوں کے طرزِ فکر کا مسلمانوں کے کلچر کی نوعیت پر کچھ اثر پڑا۔" اس کے برعکس یونانی زیادہ تر افکار و نظریات میں دلچسپی لیتے رہے چنانچہ یونانیوں ہی کے فلسفے کا اثر تھا کہ عربوں کی عملی رُوح تقریباً دو صدیوں تک بروئے کار نہ آئی۔ پھر جب حکمائے اسلام سمجھے کہ "قرآن کے نزدیک کائنات کی بُنیاد حرکت پر ہے، وہ محدود ہے اور اُس میں ترقی کی قابلیت ہے" تو اپنے یونانی اُستادوں سے باغی ہو کر انہوں نے اسلامی حُریتِ فکر کا جھنڈا بلند کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دُنیائے حاضرہ کے قدامت شکن طرزِ فکر کی بُنیاد دراصل اس بغاوت سے پڑی جو اسلام نے یونانی طرزِ خیال کے خلاف شروع کی۔" ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام ایک انقلابی تحریک تھی۔ جس نے دُنیا کی کایا پلٹ دی۔ جس نے بقولِ اقبال رح مذہب اور روحانی تعلیم کی تکمیل کر کے علی الاعلان وحی اور پیغمبری کا خاتمہ کر دیا۔ اور نوعِ انسان کی باگ ڈور انسانی عقل کے ہاتھ میں دے دی۔ پھر تعجب ہے کہ آج کل کے کئی مسلمان اس قدر قدامت پسند ہیں کہ مخالفینِ اسلام کے معنی ہی قدامت پسندی سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے ہر قسم کی قدامت پرستی کو مٹایا۔ اُس نے صرف پتھروں کے بُتوں کو نہیں توڑا، اُس نے پُرانے خیالات، پُرانے رسم و رواج غرض ہر پُرانی چیز کی بزرگی کو بُت سمجھ کر پاش پاش کر دیا کیونکہ یہ سب نام نہاد بزرگیاں انسانی نفس کی ترقی کے راستے میں پتھر بن کر حائل تھیں، انہوں نے انسانی رُوح کو پتھرا دیا تھا۔ اسلام نے اپنے بُت شکن قدامت شکن طرزِ عمل سے انسانی آزادی کے لئے رستہ صاف کر دیا۔ سو سچا مسلمان وہی ہے جو قرآن کے لفظوں میں محض اندھا دھند اپنے باپ دادا کے طریقے پر نہ چلتا رہے بلکہ جو ربانی ہدایت کی روشنی میں خود اپنی عقل سے کام لے۔

غرض اپنا وجدان، قدرت کا مشاہدہ، تاریخ کا مطالعہ، ٹھوس چیزوں پر نظر، عقل کی کسوٹی اسلام کے اُصول ان سادہ بُنیادی چیزوں پر مبنی تھے۔ اس سے انسان نے جو سمجھا وہ یہ تھا کہ کائنات جس کی رُوح خُدا ہے ایک بڑھنے والی حرکت کرنے والی نشوونما پاتی ہوئی آزاد برادری ہے، اور خدا کی

باندھی ہوئی حدوں کے سوا جو فطرت میں مضمر ہیں سب رکاوٹیں اور بندشیں
شیطان کے چرخے ہیں جن کا مٹا دینا ہر مسلمان کا منصبی فرض ہے۔ حرکت کا وہ
اصول جس سے یہ بندشیں ہر زمانے میں توڑی جاتی ہیں اسلام میں "اجتہاد"
کہلاتا ہے جس کا یہ مدعا ہے کہ اسلام نے جو عام اصول انسانی معاشرت کی
نشوونما کے لئے وضع کئے ہیں اُن کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے
مطابق معاشری و تمدنی تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں بلکہ ایسی تبدیلیوں کا عمل
میں لانا ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر اسلام کی روح کبھی پیکر انسانی میں ایک
زندہ روح کی طرح اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتی۔

بقول اقبال اسلام کے نزدیک زندگی کی روحانی بنیاد ابدی
ہے اور تنوع اور تغیر میں ظہور پذیر ہوتی ہے، لہٰذا انسانی معاشرت کو ابدی
قدروں "ثبات اور تغیر کے دو متضاد مقولوں" کو تطابق دینا چاہیئے۔ اسلام
نے اُدھر بعض مستقل قوانین نافذ کئے لیکن اِدھر تغیر کو قرآن کے لفظوں
میں خدا کی ایک نشانی قرار دے کر حرکت کا وہ اصول وضع کیا جسے اجتہاد
کہتے ہیں۔

اسلام کے سارے اندرونی و بیرونی نظام کی بنیاد وحدانیت پر ہے
مذاہب کے سارے توہمات معاشرت کے سارے امتیازات کو اسلام نے
اپنی وحدت کے طوفان میں غرق کر دیا۔ خدا ایک ہے۔ یہ کائنات بھی اپنی
بوقلمونیوں کے ساتھ ایک ہے سو نوع انسان بھی سب کی سب ایک اور
متحد ہے۔ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ مذہب کا مقصد یہی ہے کہ انسان کا رشتہ
براہِ راست خدا اور ساری کائنات سے پیدا کرے جس سے اس کے
تن من کے اندر ایک ہمہ گیر روح دوڑ جائے۔ اس وحدت میں اُسے کوئی غیر
نظر نہ آئے، پھر جب غیریت کے پردے اٹھ جائیں اور دل خود بخود محبت کے
باہم رنگین رشتوں سے بندھ جائیں تو زندگی کی پیچیدگیاں آپ سے آپ
سلجھتی جائیں گی۔ اسلام میں وحدت ہی کے سرچشمے سے اخوت اور حریت
اور مساوات کی ندیاں لہریں لیتی ہوئی بہتی ہیں۔ توحید الٰہی کا لازمی نتیجہ
وحدت انسانی ہوتا ہے۔ اس انسانی حریت اور اخوت و اتحاد کو ہر وقت
زندہ و تابندہ رکھنے کے لئے اسلام نے فرائض کا ایک نظام قائم کیا
جس سے بیک وقت فرد اور جماعت کی بہتری مقصود تھی۔ نماز سے مدعا اگر
کورنش عبادت ہوتا تو فرشتوں کے بعد انسان کی تخلیق غیر ضروری تھی۔ نماز،
روزہ، زکوٰۃ، حج ان سب کا مقصد اگر ایک طرف فرد کا تزکیۂ نفس تھا تو
دوسری طرف انسانوں کی جماعت کو منظم و متحد اور مربوط و مضبوط کرنا تھا
ان سے وہ اتحاد پیدا ہوا جس نے امیر و فقیر کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے
مسلمانوں کی جماعت کو تن واحد بنا دیا۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ الْجَمَاعَۃِ (جماعت کے
اُوپر خدا کا ہاتھ ہے) لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ (اسلام جماعت ہی سے ہے۔)
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ
اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔ عام
مسلمانوں کو ہدایت تھی کہ خدا اور رسول کا کہا مانو لیکن ساتھ ہی رسول کو
بھی یہ ہدایت تھی شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (سب معاملات میں ان سے مشورہ
کیا کرو۔)

آنحضرت کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اسلام کی اس آزاد
روح کو قائم رکھا۔ حضرت عمرؓ جو اپنے ایثار و اجتہاد اور اپنے عزم و استقلال
کے کارناموں کے باعث اسلام کی تاریخ میں ایک امتیازی مرتبہ رکھتے ہیں
اسلامی روح کا ایک نہایت درجہ پاکیزہ نمونہ تھے۔ وہ ہر بات میں دوسروں
سے مشورہ لیتے تھے۔ ان کا قول تھا لَا خِلَافَۃَ اِلَّا عَنْ مَشْوَرَۃٍ۔ فَاِنِّیْ وَاحِدٌ
کَاَحَدِکُمْ (میں بھی ایسا ہی ہوں جیسے تم سے کوئی ایک) ایک دفعہ وہ آستینیں
چڑھائے بیت المال کے ایک اونٹ کے پیچھے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔
کسی نے کہا آپ تکلیف نہ کیجئے کسی غلام کو حکم دے دیجئے۔ فرمایا اَیُّ عَبْدٍ
اَعْبَدُ مِنِّیْ۔ (مجھ سے بڑھکر خدا کا غلام کون ہوگا) مساوات کا نمونہ، محنت کا
جذبہ، امانت داری کا نظارہ اس سے بڑھکر دنیا کی آنکھوں نے کم
دیکھا ہوگا۔

تاریخ میں اگر کبھی جمہوریت صحیح طور پر عمل میں آئی تو وہ اسلام کی پہلی
صدی میں۔ انقلاب فرانس کا نعرہ "حریت و مساوات و اخوت" ایک نعرہ
ضرور تھا مگر اس پر عمل اوّل تو ہوا ہی تھوڑا اور جو ہوا وہ دس سال بھی قائم
نہ رہ سکا اور اس مدت میں بھی اخوت محض نام کو باقی تھی اور حقیقت یہ ہے
کہ بغیر اس مخصوص اسلامی صفت کے حریت و مساوات کا صحیح معنوں میں
قیام ناممکن ہے۔ ہر زمانے میں بہت سے غیر مسلم نکتہ چینوں نے اعتراف
کیا ہے کہ رنگ و نسل کا مسئلہ اگر کسی مذہب و ملت نے حل کیا ہے تو
اسلام اور اہل اسلام ہی نے۔ ایک دفعہ سرداران قریش حضرت عمرؓ سے
ملنے آئے۔ اتفاق سے حضرت بلالؓ بھی، جو ایک حبشی غلام تھے، موجود
تھے۔ حضرت عمرؓ نے قریش کے سرداروں کو چھوڑ کر پہلے بلالؓ سے
ملاقات کی۔ اس پر ابوسفیان برہم ہو گیا تو ایک دوسرے حق شناس قریشی
سردار نے کہا کہ بھائی یہ ہم کو عمرؓ کی نہیں بلکہ اپنی شکایت کرنی چاہیئے۔
اسلام نے سب کو ایک آواز سے بلایا لیکن جو اپنی شامت سے پیچھے پہونچے
آج بھی وہ پیچھے رہنے کے سزاوار ہیں۔ آجکل اس انحطاط کے عہد میں
بھی غالباً مسلمان ہی وہ قوم ہیں جنکو حبشیوں کے خلاف انکے سیاہ رنگ کی
بنا پر کوئی تعصب نہیں۔ یہ سب اسلام کا اثر ہے۔

چند برس سے روس میں ایک قسم کی اشتراکیت کا دَور دورہ ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ روس نے بعض باتوں میں خاصی ترقی کی ہے کیونکہ اُس نے فاقہ مست مزدوروں کو سرمایہ داروں کی غلامی سے چھڑایا ہے۔ لیکن کیا اُس نے بہت سی انفرادی خصوصیتوں کو اور فرد کی آزادی کو کچل کے نہیں رکھ دیا۔ اسلام نے جماعتی آزادی اور مساوات بھی قائم کیں لیکن ساتھ ہی فرد کی آزادی بھی قائم رکھی، اُس پر جبر نہ کیا۔ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ روحانیت نے خود بخود سب کے دل موم کر دئے تھے اور ساتھ ہی عمل کی رُوح بھی پھونک دی تھی۔ وراثت کے احکام سے سرمایہ داری ناممکن ہو گئی، جائداد بہت سے حصّوں میں بٹ گئی اور پھر زکوٰۃ و خیرات سے اس میں اور کمی آگئی۔ سُود پہلے سے جائز ہی نہ تھا۔ جُوا بازیوں کو سختی سے روکا گیا۔ اجارے اور احتکار کو آنحضرتؐ نے حرام قرار دیا۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ اسلام نے زبردستی اور علی الاعلان امیری اور غریبی اور چھوٹے بڑے کے فرق کو قانوناً نہیں مٹایا۔ اسلام انسانی فطرت سے خوب آگاہ تھا وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ۔ اُس نے مختلف طبقوں کے معاشری امتیازات کو جہاں تک ہو سکا کم کیا۔ اِس طرح فرد کی آزادی بھی قائم رہی اور طبقوں کے فرق بھی کم ہوتے گئے۔ اس غرض سے مختلف باتوں کی ترغیب دی گئی۔ اپنی جائداد کو رفاہِ عام اور مفید کاموں میں خرچ کرنے کی ترغیب وقف کے طریقے سے دی۔ پیغمبرِ اسلام نے یہ کہکر امارت کی قدر کم کی: اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ (مجھے اپنی غریبی پر ناز ہے۔) کام اور مزدوری کو یہ کہہ کر بلند مرتبہ دیا کہ "جو ہر حال سے لائق اور دُرست ہیں مگر نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کیلئے کام کرتے ہیں اللہ اُن پر مہربان نہیں۔" "اللہ انہیں پر مہربان ہے جو اپنی روزی مزدوری کر کے حاصل کرتے ہیں۔" چنانچہ خود اپنے ہاتھوں سے معمولی مزدور کی طرح کام کرتے تھے۔ مدینے میں مسجدِ نبوی کی تعمیر کے وقت خود اپنے ہاتھوں اینٹیں اُٹھا کر لاتے، صحابہ عرض کرتے، ہم آپ پر قربان آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔ غزوۂ احزاب میں جب تمام صحابہ مدینے کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ خدا اُس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام اور خلفائے راشدین نے پچاس سال تک اِن اُصولوں پر عمل کر کے دکھا دیا۔ یہ ہی عملی اشتراکیت۔ یہ مرتبہ کبھی لینن اور سٹالن کو نصیب نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا محرّک صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، سچا ایمان جس سے صحیح قسم کی بے لاگ اخوت پیدا ہوتی ہے اور سچا ایمان مادّی دُنیا کی پیداوار نہیں، وہ صرف ایک روحانی کائنات کے احساس سے وجود میں آسکتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کے اِس اوّلین عہد میں ہر فرد ریاست کا رُکن تھا۔ حاکموں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ چھوٹے سے چھوٹا آدمی امیر المومنین پر علانیہ نکتہ چینی کرتا تھا، ہر شخص ریاست کا خادم تھا اور اپنی روزی کیلئے کچھ نہ کچھ کام کرتا تھا اور ریاست اُن لوگوں کی پرورش کرتی تھی جو کام کرنے سے معذور تھے۔ غیر مسلموں کا بھی ہر بات میں دھیان رکھا جاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ ایک غیر مسلم کے خنجر سے شہید ہوئے تو مرنے سے پہلے یہ وصیت کر گئے کہ ذمیوں سے جو اقرار ہے وہ پورا کیا جائے، اُن کے دُشمنوں سے لڑا جائے اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔

ہر شخص کو خود غرضی مٹانے کی تعلیم دی گئی اور ایک دوسرے کی بے لوث مدد کی ہدایت کی گئی۔ اس طرح لوگوں کے لطیف جذبات اُبھرے، اور بغیر کسی جماعتی جنگ کے مساوات مناسب حد تک خود بخود قائم ہو گئی۔ اسلام نے ایمان کی روشنی میں انفرادیت و اجتماعیت کے ملاپ سے صحیح قسم کی اشتراکیت وضع کی اور یہ اشتراکیت پچاس سال تک عملاً قائم رہی۔

یہ تھا صحیح اعتدال کا رستہ۔ اسلام اعتدال کا مذہب تھا۔ وہ انسانی فطرت کے مطابق تھا۔ اُس کی یہ تعریف کی گئی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (خدا کی فطرت جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا) یہ ایک خیالی مذہب نہ تھا بلکہ تمام انسانوں کے لئے ایک عملی نظام تھا جس پر کاربند ہونا اُن کے لئے آسان تھا کیونکہ یہ انسانی فطرت کے عین مطابق تھا۔ ارسطو نے میانہ روی کو اخلاق کی تکمیل سمجھا ہے۔ ذرا دیکھو اسلام نے میانہ روی اختیار کرتے ہوئے اسلامی معاشرت کی بہتری کے لئے کیسے اخلاق پیش کئے۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ کسی مذہب نے اخلاق پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے۔ قرآن کا ایک ایک صفحہ اخلاقی ہدایات سے بھرا پڑا ہے! انسانی نفس کا گہرا مطالعہ ہے اور اُس کے لئے قابلِ عمل نصیحتیں ہیں۔ جا بجا باطن کی ہدایت ہے کہ بغیر سخت کوشش کے اور بغیر مصائب کی زد کے روحانی ترقی ناممکن ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلا دیا ہے کہ خدا انسان کے لئے آسانی چاہتا ہے اُسے خواہ مخواہ مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

"ہمیشہ سچ بولو اور جانتے بوجھتے سچ بات کو نہ چھپاؤ، اچھی بات نکالو اور سیدھی سیدھی بات کہہ دیا کرو لیکن بحث جب کرو عمدہ پیرائے میں اور اپنی آواز کو نرم رکھو۔ نیکی کی تعلیم دو لیکن یہ نہ ہو کہ لوگوں کو توبہ کرنے کو کہو اور اپنے نفس کو بھولے رہو اور نیکی یہ نہیں کہ نماز میں اپنا مُنہ

مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا، بلکہ اصل نیکی ہے ایمان میں اور اپنوں اور غیروں کی مدد کرنے میں اور نماز اور زکوٰۃ میں اور ایفائے عہد میں اور مصیبت اور ہلاچلی کے وقت ثابت قدم رہنے میں کہ یہی ہے سچائی اور یہی ہے پرہیزگاری اور مصیبت آنے پر ڈر مت جاؤ اور خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہو بلکہ ہمیشہ صبر و صلوٰۃ کا سہارا پکڑو اور یقین کئے رہو کہ اگر تمہارا ایمان صحیح ہے تو آخرکار تم ہی غالب رہو گے۔"

غرض اسی طرح زندگی کے ایک ایک مرحلے کے لئے ہدایتیں ہیں، نصیحتیں ہیں، تسلیاں ہیں، ہر طرح انسان کا دل بڑھایا ہے، اُسے ہمت دلائی ہے، اُسے برائیوں سے روکا ہے، لیکن بالعموم زندگی کا اچھا پہلو پیش نظر ہے اور انسان کو دنیا و آخرت دونوں سے فیضیاب ہونے کی ترغیب دی ہے۔ مسلمان دونوں جہان سے، مادّی اور روحانی دونوں زندگیوں سے لطف اٹھانے کا آرزومند ہے، رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اعتدال کا رستہ دکھاتا ہے۔ مثال کے طور پر غور کرو کہ زمین کو خدا کی ملک ٹھہرایا لیکن موروثی جائداد کو ناجائز قرار نہیں دیا بلکہ اس طرح اس کی تقسیم کر دی کہ سرمایہ داری ناممکن ہو گئی۔ مرد کو عورت پر کہنے کو فوقیت دی، لیکن ساتھ ہی ایک دوسرے پر دونوں کے حقوق برابر کر دئے۔ تاکید کی کہ بدی کا جواب نیکی سے دو (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ) لیکن ساتھ ہی اجازت بھی دی کہ ضرورت کے وقت سختی کا جواب سختی سے دیا جائے اور اس میں بھی ہر حال میں زیادتی سے روکا۔ ایک طرف یہ کہا کہ اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ اور دوسری طرف یہ سمجھا دیا کہ وَالصُّلْحُ خَیْرٌ (صلح بہتر ہے) فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی ٹھہرایا اور بخیلوں کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا اور ہدایت کی کہ اپنا ہاتھ نہ تو اتنا کھینچو کہ گویا گردن سے بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو کہ بس تہی دست بیٹھے رہ جاؤ اور پھر لوگ تم کو لگیں ملامت کرنے۔ اپنے ماں باپ سے نیک سلوک کرو اور نرمی سے بات کرو لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو کچھ تمہارے باپ دادا کرتے چلے آئے اندھا دھند اسی راہ پر چلے چلو۔ اسی طرح فرد اور جماعت کے معاملے میں انفرادیت اور اجتماعیت کی خوبیوں کو اعتدال کی راہ پر جمع کر دیا ہے تاکہ ادھر نوعِ انسان کی تنظیم ہوتی جائے اور اُدھر فرد کیلئے ارتقا کا رستہ صاف کھلا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر ایک بات میں افراط و تفریط کے اندر جہاں میانہ روی لازم قرار دی ہے وہاں انسان کو گویا اپنی عقل و تمیز سے کام لینے کی راہ دکھائی ہے اور یہی مذہب اسلام کی خوبی ہے کہ باوجود ان ہدایتوں کے اس نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی قوتِ تمیز کو خود کام لے اور ہر بات میں دیکھے کہ اُسے کس حد تک کیا کرنا چاہیئے۔ بعض لوگوں کو قرآن میں تضاد نظر آتا ہے، یہ قوتِ تمیز کی کمی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کی آزادی کو ہر طرح سے برقرار رکھا ہے۔ یہاں تک کہ جبر و اختیار کے معاملے میں بھی اختیار کے اختیار کر لینے کا اختیار اسی پر چھوڑ دیا ہے!

اس کے بعد کون اس دعوے کو باطل قرار دے سکتا ہے کہ،

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۰ (دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہی)

اسلام نے اپنا پیغام دنیا تک پیغمبرِ اسلام کے ذریعے سے پہنچایا مولانا شبلی اپنی مشہور تصنیف "سیرۃ النبی" کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ "عالمِ کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے" پھر لکھتے ہیں کہ "اس مقصد کے حصول کا سب سے زیادہ کامل طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ جبر و زور سے کام لیا جائے بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آ جائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے" پیغمبرِ اسلام ایک ایسی ہستی تھے۔ بقول اقبالؔ پیغمبرِ اسلام قدیم اور جدید دنیا کے عین درمیان کھڑے معلوم ہوتے ہیں" تاریخِ انسانی میں جہاں وہ قدم دھرتے ہیں پرانا زمانہ ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ کیا آئے کہ دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ بقولِ شبلیؔ "صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا" کارلائل کہتا ہے: "یہ عرب لوگ، یہ آدمی محمدؐ اور وہ ایک صدی! کیا ایسا معلوم نہیں ہوتا گویا ایک چنگاری تھی کہ گری، صرف ایک چنگاری اس دنیا پر جو سیاہ فضول سی ریت کی دنیا معلوم ہوتی تھی لیکن نہیں دیکھو کہ وہی ریت بھک سے اڑنے والی بارود ثابت ہوئی جو دہلی سے لیکر غرناطہ تک شعلہ بن کر آسمان تک جا پہنچی!"

ہمارے نبیؐ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ دنیا کو یاد ہے، اس کہانی کے لئے ایک جداگانہ صحبت درکار ہے۔ عرب اور دنیا بھر کی وہ ذلیل حالت، آپکے دل میں ربانی آواز، وہ غارِ حرا کا تحنّث، وہ دعوتِ اسلام ابطالِ

کو وہ جواب کہ خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دے دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا"۔ وہ آپکو اور آپکے پیرووں کو اذیتیں اور عذاب، وہ شعبِ ابوطالب کے کٹھن دن، وہ غارِ ثور کی تین تنہا راتیں، وہ دشمن کی آہٹ پر اپنے غم زدہ دوست کو تسلی لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا، وہ مدینے کا قیام، مہاجرین و انصار کی مواخات وہ بدر اور احد اور خندق کی صعوبتیں اور آزمائشیں اور کامرانیاں، وہ سلاطین کو دعوتِ اسلام، وہ فتحِ مکہ، وہ کعبے میں داخلہ اور اذان، وہ نعرۂ حق

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

(حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی)

اور پھر وہ آخری خطبے کی ہدایتیں اور وہ قول کہ "میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ خدا کی کتاب!"

(باقی. باقی)

پیغمبرِ اسلام کے متعلق ایک بات غیر معمولی اور قابل ذکر ہے کہ باوجودیکہ آپ کا ایک ایک کام معجزے کا مرتبہ رکھتا تھا، باوجودیکہ آپ کے کارنامے نے دنیا کی تاریخ کا رخ پھیر دیا اور آپ اپنے پیرووں کو جان و دل سے زیادہ عزیز تھے لیکن آپ نے خود کئی بار فرمایا کہ میں تو فقط تم جیسا ایک آدمی ہوں اور صرف یہی نہیں بلکہ اُن کی اس طرح تربیت کی کہ آج تمام بڑے بڑے مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیرو نہ اپنے پیغمبر کی پرستش کرتے ہیں، نہ اسے خدا کا اوتار مانتے ہیں بلکہ اُسے ایک اپنی طرح کا انسان جانتے ہیں جس نے نوعِ انسان کو خدا کی وحدت کا پیغام دیا۔ قرآن اور اسوۂ رسولؐ اور ان کے تتبع میں خلفائے راشدین کا طرزِ عمل اور مسلمانوں کے صدیوں کے عروج و زوال کے اندر قرآنی تہذیب کی اجتہادی شان! یہ ہے اسلام اور اس کا کارنامہ! ہمیشہ قائم ہمیشہ رواں!!

بشیر احمد

نغمۂ نور

حسن نے یا کہ عشق نے کس نے یہ گل کھلا دیا ۔۔۔ تجھ کو خدا بنا دیا بندہ مجھے بنا دیا

چہرہ زرد زرد دیکھ دامن چاک چاک دیکھ ۔۔۔ میں نے تو بے کہے ہوئے راز تجھے بتا دیا

دل کی خلش کو کیا کہوں دل بھی عجیب چیز ہے ۔۔۔ اسکو میں کر رہا ہوں یاد جسنے مجھے بھلا دیا

ہاں مجھے آج تک تو تھا رنگِ جہاں پہ اعتبار ۔۔۔ تو نے نگاہ پھیر کے رنگِ جہاں بتا دیا

اب یہ کمال کفر ہو یا کہ کمالِ دین ہو ۔۔۔ آپ کے پائے ناز پر میں نے تو سر جھکا دیا

اب ترے آستاں پہ ہے سب کی نگاہِ بندگی ۔۔۔ میرے سجودِ شوق نے کفر کو دیں بنا دیا

اس نے نگاہ کر کے چار اس نے نگاہ پھیر کے
غم کو خوشی بنا دیا کیف کو غم بنا دیا

بہزاد لکھنوی

گل و خار

"گل"

غنچے نے کہا وقتِ سحر خار سے ہنسکر ۔۔۔ دامن نہ پھٹے میرا تیری نوک میں پھنسکر
تذلیل نہ کرنا مری شاہانہ قبا کی ۔۔۔ دیتا ہوں قسم تجھکو میں بلبل کے خدا کی
یہ میری جھلک حسنِ حقیقی کی ادا ہے ۔۔۔ اس رنگ کے پردہ میں جو یوں جلوہ نما ہے
مقصود مری ذات کا زینت ہی زمیں ہے ۔۔۔ وہ جذب و کشش میری رگِ جاں میں مکیں ہے
ہے دعوتِ نظارہ جو ہر اہلِ نظر کو ۔۔۔ جکڑے ہوئے جو مجھ سے ہے بلبل کے جگر کو
وابستہ مرا سوز ہے سورج کی کرن سے ۔۔۔ ہوں بڑھ کے جبھی نافۂ آہوئے ختن سے

میں شاہِ گلستاں ہوں نہ چھو میری قبا کو
بوسے کی اجازت ہے فقط بادِ صبا کو

"خار"

تو نازِ چمن زخمۂ بن سازِ چمن ہے ۔۔۔ گویا تو ہی پیداکنِ آوازِ چمن ہے
شاہی ہے تری کسکو ہے انکار چمن میں؟ ۔۔۔ میں بھی تو مگر ہوں تری تلوار چمن میں
میں تیری حفاظت پہ کمربستہ ہوں دن رات ۔۔۔ محبوب ہے اسدرجہ مجھے خود ہی تری ذات
میں مثلِ سناں تیرے ہی دشمن کیلئے ہوں ۔۔۔ پتوں میں نہاں تیرے ہی دشمن کیلئے ہوں
ہاں مست اگر ہو کے تو الجھا کبھی مجھ سے ۔۔۔ بے طرح الجھنا مجھے پڑ جائیگا تجھ سے
ذلت یہ "خودی" میری گوارہ نہ کرے گی ۔۔۔ اس وقت کوئی پاس تمہارا نہ کرے گی

ہے مجھ سے بچانا ہی اگر اپنی قبا کو
کر دیجئے تنبیہہ ذرا بادِ صبا کو

رہینِ حسین بیکودی

شبِ تنہائی

(ایک خط ساقی ماہِ دسمبر میں شائع ہو چکا ہے۔)

شاہد بھائی!

بس خدا ہی تم سے سمجھے! تم بھی تو ایک پرخرافات ہی نکلے۔

واہ سبحان اللہ! کیا کہنے ہیں تمہارے استدلال کے!

"بھئی اب یہ قصہ شروع کیا ہے تو لکھے ہی جاؤ۔ اور کچھ نہیں تو شاید کسی کو کچھ کام کی بات مل جائے"

میرے یار! کیا اچھا ہوتا جو تم نے لگے ہاتھوں اس "کام کی بات" کی تشریح بھی تو کر دی ہوتی۔ میں تو کچھ اپنا رونا رو رہا تھا اور تم اس میں کام کی باتیں ڈھونڈ رہے ہو۔ ہاں صاحب! یہ تم نے "بیسا تا" کب سے سیکھا۔

"لکھے جا رہے ہو یا نوکِ قلم سے دل و جگر کو نشتگان رہے جا رہے ہو۔ واللہ بڑے مزے کا قصہ رہیگا"

جی ہاں! کیوں نہ ہے ؎

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوزِ تب و تابِ اوّل سوزِ تب و تابِ آخر

اور پھر جب سننے والے تم ایسے درد مند ہوں! ایک مدت کے بعد جب ان باتوں کا خیال آتا ہے تو ایک تصویر سی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بس کل ہی کی تو بات ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ جس طرح ؏

نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

اسی طرح اگر درد و غم کی داستان میں تاثیر نہ ہو تو وہ داستان ہی کیا۔ درد وہی ہے جو سننے والے کو بھی تڑپا دے۔ مجھے یہ واقعات بیان کرنے سے تو گریز نہیں۔ لیکن ڈر ہے تو اتنا کہ ؎

نہ کر دیں مجھکو مجبورِ نوا فرودسی حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

تم خوش ہو کہ اس روز چودھری کی خوب گت بنی۔ آخر چودھری سے یہ کاوش کیوں؟ اس بیچارے نے تمہارا کیا بگاڑا۔ مگر بھلا آدمی تو اپنی عادت سے مجبور ہے ؎

خود ہوئے رسوا مجھے رسوا کیا
جس جگہ بیٹھے مرا چرچا کیا

تماشہ تو یہ ہے کہ آخر انہی دو ایک ملاقاتوں میں ہی میری نظر سے ایک پردہ سا اٹھا دیا تھا۔ یہ نئے نئے انکشافات مجھے پہروں دریائے حیرت میں غرق رکھتے۔ اکثر لوگ میرے اور چودھری کے تعلقات کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اب یعنی پردہ اٹھ جانے کے بعد؟ توبہ ہی بھلی!!

اب تم ایک واقعہ سنو۔ ایک روز اس کا نوکر ایک خط لایا۔

"بندہ نواز!

اپنی خطاؤں کی معافی چاہتی ہوں۔ اور اس جسارت پر بھی آپکے عفو کی امیدوار ہوں کہ یہ خط آپ کو لکھ رہی ہوں۔ بس اور کیا لکھوں۔ بہر کیف آپ کو اتنا تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ بندی اتنی گنہگار نہیں جتنی آپ غالباً مجھے سمجھتے ہوں گے۔ یہ تو میں بھی مانتی ہوں کہ جو کچھ ہوا بیہودہ تھا۔ اور شاید طبعِ نازک پر گراں بھی گذرا ہو۔ لیکن مجھے تو یہ افسوس تھا کہ ایک شریف آدمی کا کیوں مذاق اڑایا جائے۔ ہائے توبہ! دل بھی دھڑک رہا ہے اور ہاتھ جس میں قلم ہے وہ بھی کانپ رہا ہے۔ قلم تو اب چھوڑتی ہوں لیکن دل کو اسکے سوا اور کیا کہوں کہ ؏

وہ جب تشریف لادیں فرشِ پا انداز ہو جانا! گنہگار اختر"

دیکھا تم نے! کس سادگی سے وہ دل کی بات کہہ گئی. لیکن سوال یہ تھا کہ اس کھیل کا نتیجہ کیا ہوگا. اگر میرا آنا جانا چودھری کو پسند نہ ہوا تو پھر مفت کی بدمزگی پیدا ہو جائے گی. اور ممکن ہے کہ وہ اسی بدمزگی کی ہی راہ نکال رہی ہو. لیکن کیوں؟ اس کا تو جواب میرے پاس نہیں. اب رہا میرا جانا تو سچی بات تو یہ ہے کہ ملنے کو تو میرا دل بھی چاہتا تھا. لیکن بن بلائے جانے کو تو شاید میں حشر تک بھی آمادہ نہ ہوتا. لیکن قدرت بہت کارساز ہے. ہم گنہگاروں کے شوق اور آرزو پورا کرنے کے خود بخود انتظام کر دیتی ہے.

خیر! شام کے قریب میں اس کے مکان پر پہونچا. نوکر نے مجھے اوپر کی منزل پر لے جاکر بٹھلا دیا. کوئی پانچ سات منٹ بعد اختر سروِ چمن کی طرح جھومتی اور شاخِ سنبل کی طرح لچکتی ہوئی آگئی. ہونٹوں پر مِسّی کی دھڑی تھی اور رخسار پر غازے کی جھلک. اور آہوانی آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی تحریر بھی نظر آرہی تھی. ذرا سانس پھولا ہوا تھا اور شاید اسی لئے سینے کا ابھار بڑھ بڑھ کر جلوے دکھا رہا تھا. وہ سامنے آتے ہی جھکی اور بولی: "تسلیم!"

پھر مجھ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی: "میں بہت نادم ہوں"

"کیوں؟"

"آپ تشریف لائے اور میں موجود نہ تھی"

"معمولی بات ہے"

"مزاج تو اچھے ہیں" اس نے مسکرا کر پوچھا.

"دیکھ لیجئے"

"امید تو نہ تھی" اس نے پھر مسکرا کر کہا.

"کس بات کی؟"

"تشریف آوری کی" اس نے ذرا لچک کر کہا

"آپ نے یاد فرمایا" میں نے کہا "حاضر ہو گیا!"

"اور جو میں تکلیف نہ دیتی" اس نے پوچھا.

"تو شاید میں بھی جرأت نہ کرتا" میں نے جواب دیا.

"اس روز بھی آپ نے یہی جواب دیا تھا" اس نے ذرا آنکھیں مٹکا کر کہا "ہاں! اس روز آپ چلے کیوں گئے؟"

"یہ کہیے!" میں نے کہا "کہ بھاگ کیوں گیا.؟"

"میری مجال ہے" وہ بولی "جو آپ کی شان میں ایسا لفظ کہوں"

"میری شان کیسی؟" میں نے کہا "ذرا اپنی شان دیکھئے

غمزہ و ناز و ادا ترچھی نگاہیں کیا کیا

آج پیدا تو کوئی تجھ سی ذرا شان کرے"

"تسلیم!" وہ ہنس کر کہنے لگی "یہی تو میرے ہتیار ہیں. خیر اس روز آپ نے اپنے دوست کی باتیں تو سن لیں"

"آپ نے بہت غلطی کی" میں نے کہا.

"غلطی؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیسی غلطی؟"

"آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ چودھری صاحب میرے دوست ہیں" میں نے کہا.

"اور یہی تو میں آپ کو بتلانا چاہتی تھی کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں" اس نے ذرا سنجیدگی سے جواب دیا "آپ کے اخلاق نے مجبور کر دیا کہ آپ کو اصل حقیقت سے واضح کر دوں"

"میرا اخلاق!" میں نے ایسے ہی مسکرا کر کہا "آپ سہیلیوں کو چھوڑ کر میرے پاس تشریف لائیں اور میری بے رخی سے آپکو رنج ہوا. آپ نے چائے اور پھل سے تواضع کرنی چاہی اور میں نے انکار سے آپ کا دل دکھایا. یہی ہے نا میرا اخلاق؟"

"جی نہیں!" اس نے سر ہلا کر کہا.

"خیر!" میں نے کہا "اخلاق پر تو پھر کسی وقت بحث کر لی جائیگی. لیکن یہ تو بتلائیے کہ جب چودھری صاحب آپکے بندۂ بے دام بنے بیٹھے ہیں تو پھر آپ نے مجھے کیوں ایسا موقع دیا کہ میں ان کی کمزوریاں دیکھ لوں. اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں بھی اسی مکان میں موجود

ہوں، اور باتیں سن رہا ہوں تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟"

"مجھے نتیجہ سے سروکار نہیں" وہ بولی "میں نے جو کچھ کیا محض اپنا فرض سمجھکر کیا۔ اور اگر واقعی آپ ناراض ہیں تو لیجئے میں ہاتھ جوڑتی ہوں، معاف کر دیجئے!"

"معافی ایک شرط پر مل سکتی ہے" میں نے ہنسکر کہا "پہلے یہ بتلایئے کہ آپ کو یہ سوجھی کیا؟"

"فی الحال اس بات کو رہنے دیجئے!" اس نے جواب دیا۔

"گویا کوئی سازش ہو رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سازش نہیں" اس نے کہا "بلکہ ایک کھیل ختم ہو رہا ہے"

"کیسا کھیل؟"

"کہہ تو دوں" وہ بولی "لیکن ممکن ہے کہ آپ اسے بھی رنڈی کی ایک چال ہی سمجھیں"

"مجھے اس لفظ سے گھن آتی ہے" میں نے کہا "خدا کیلئے یہ لفظ میرے سامنے استعمال نہ کیا کیجئے"

"بہت اچھا" وہ کہنے لگی "بات یہ ہے کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے اور یہاں آنے والوں میں سے ننانوے فیصدی صرف جھوٹ ہی میں کرامت سمجھتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں تو اس ذلیل پیشے پر آج لعنت بھیجوں، لیکن گھر والوں کے سامنے پیش نہیں جاتی"

"گویا آپ کو ناچنے گانے سے نفرت ہے!" میں نے پوچھا۔

"ناچنے گانے سے نہیں" وہ بولی "بلکہ سیاہ کاری سے"

"آپ گاتی تو خوب ہیں" میں نے کہا۔

"آپ سنیں گے؟"

"اس وقت نہیں!"

"آپ کے چودھری صاحب کو تو جھوٹ بولنے کا مرض ہے" اس نے ہنسکر کہا۔

"میرے یا آپکے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کیوں؟"

"آپ کو ان سے محبت جو ہے"

"ان سے نہیں بلکہ ان کے پیسے سے کہئے!" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں نے یہ سن کر سر جھکا لیا۔

وہ ہنسکر بولی "چپ کیوں ہو گئے آپ؟ کچھ تو میری بیحیائی کی داد دیجئے"

"تو گویا آپ کو جھوٹ سے نفرت ہے" میں نے کہا "آپ تو کبھی جھوٹ نہ بولتی ہونگی"

"جناب!" اس نے ایک دلفریب انداز سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "جھوٹ نہ بولوں تو ٹکے کون دے"

"تو پھر دوسروں پر لتاڑ کیسی؟" میں نے کہا۔

"میں رنڈی ہوں" وہ کہنے لگی "میری دکان اسکے بغیر نہیں چل سکتی"

"اب اجازت دیجئے" میں نے کہا۔

"کہیں جانا ہے آپ کو؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے تو کہیں جانا نہیں" میں نے کہا "لیکن آپ کا تو وقت ضائع ہو رہا ہے"

"میرے وقت کی فکر مت کیجئے" اس نے جواب دیا۔

"فکر کیسے نہ ہو" میں نے کہا "دروازے تو بند پڑے ہیں"

"شکریہ!" وہ بولی "بند بھی پڑے رہیں تو قسمت میں جو لکھا ہے مل جائے گا"

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں پھر میں چلا آیا۔

کیوں میاں شاید! اب ذرا سچ کہنا، ان بے کیف باتوں میں کیا خاک لطف آیا ہوگا تمہیں۔ لیکن یہ تو تم بھی مانو گے کہ اس کی ہر بات اس قماش کی عورتوں سے کچھ الگ ہی تھی۔ یا ممکن ہے میرا ہی

خیال غلط ہو کیونکہ مجھے اِن باتوں کا تجربہ نہیں۔

لیجئے! اب دس بجے ہیں۔ میرے کمرے میں ایک سناٹا سا ہے۔ جانے یہ کمبخت چمگادڑ کہاں سے گھس آئی۔ ظالم کس طرح فراٹے بھر رہی ہے۔ شاید میری طرح اسے بھی کسی کی تلاش ہو۔ بجلی کے لیمپ پر ایک پروانہ قربان ہو رہا ہے۔ کوئی اس وقت اس کی بیتابی کو دیکھے۔ جانے اسے جل مرنے میں ہی حیات سرمدی نظر آرہی ہے۔ عشق بھی تو اسی بیتابی کا نام ہے۔ جلانے والے کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جلنے والا سو طرح سے بیتاب ہو رہا ہے۔

نہ جانے یہ پہاڑ سی رات کیسے کٹے گی۔ لیکن تم قدرت کی ستم ظریفی تو دیکھو! میری پریشانیوں کے سامان کس کس طرح ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ذرا ریڈیو سے دل بہلاؤں گا۔ ایریل لگایا تو آج پھر لاہور اسٹیشن سے فیروزہ کی دلکش آواز سنائی دی۔

بیدردا اس کو کیا بہچانے جس پر بیتی ہو وہ جانے
دیکھ لے گیانی دُنیا ہے فانی ہائے محبت ہائے جوانی
آگ لگی ہے حسن میں
دل ہے پرائے بس میں

گا توں رہی ہے اور جو کے میرے دل پر یہاں لگ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گانے والی کے دل کو بھی لگی ہے۔ ورنہ یہ سوز کیسا؟

گانے تو ہر روز ریڈیو پر سنتا ہوں۔ لیکن جو لطف فیروزہ کے گانے میں آتا ہے وہ کسی اور سے وہ کیف پیدا نہیں کرتے۔ لیکن تم اِن ریڈیو والوں کی بد ذوقی بھی تو دیکھو، پنجابی گانوں کی وہ بھرمار کہ بس توبہ ہی بھلی۔ اِن اللہ کے بندوں کو شاید کسی حکیم نے بتلایا ہوگا کہ پنجاب والے پنجابی کے سوا اور کچھ پسند نہیں کرتے۔ لیکن اِن ریڈیو والوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں گدھے بھی بے سُری تانیں اُڑا رہے ہیں اور غچے بھی دھرپت الاپ رہے ہیں۔

شاہد بھائی! سچ پوچھو تو ؎

مرا تجربہ ہے کہ اِس زندگی میں
پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں

خدا تمہیں اِن بلاؤں سے محفوظ رکھے۔

عارف

ایم۔ اسلم

مرزا کیمیاگر

ایک جزو

(سونا بنانے کے لئے سینکڑوں روپے خرچ کرکے اس نوبت پر پہونچے ہیں کہ چھچوندر کے خون میں کیمیائی گولی ڈالی جائے۔ اس کے بعد صحرائی مینڈک کے منہ میں سی جائے گی۔ بہر دست چھچوندریں آئی ہیں۔

ایک پنجرے میں تین چھچوندریں ہیں۔ مرزا جی چھچوندروں کا پنجرہ لاتے ہیں۔)

مرزا۔ لیجئے حضرت دیکھئے۔ واللہ کیا بتاؤں تیلے جزو ہیں۔

کلن خاں۔ شاید نسخہ میں تو دو چھچوندریں لکھی ہیں۔

مرزا جی۔ اجی حضت لکھی تو دو ہیں مگر جزو ضائع گیا تو۔ استاد کا قول ہے کہ جزو کے معاملے میں کفایت نہ ہو۔ لہذا میں نے تین منگوائی ہیں۔

کلن خاں۔ ٹھیک، ٹھیک۔ ادھر لاؤ۔ اجی مرزا صاحب، اور جزو اعظم..... مینڈک..... تیار اُسے بھی رکھنا چاہیئے۔

مرزا جی۔ دیکھا نہیں آپنے۔ ناند میں ہے۔

فتو۔ رات تو ٹرا رہا تھا۔

مرزا جی۔ ٹرا رہا تھا کہ جیسے گرج رہا ہو کوئی۔ اجی حضت شیر کی طرح ڈکراتا تھا۔ س... س... خت زہریلا ہے حضت۔

میر صاحب۔ ماشاءاللہ، کیا جزو ہے!

کلن خاں۔ کیا کہنے ہیں اس جزو کے۔ ماشاءاللہ جزو تو مرزا صاحب خوب لائے ہیں۔

مرزا صاحب۔ آداب عرض۔ آداب عرض۔

میر صاحب۔ خدا نظر بد سے بچائے مرزا صاحب یہ جزو تگڑا بھی ہے۔

مرزا صاحب۔ تگڑا! حضت دو سیر پختہ سمجھئے۔ مگر حضت اب ادھر دان کو دیکھئے۔ واللہ کیا پُھر تیلے جزو ہیں۔

کلن خاں۔ توبہ! بُو کتنی ہے کمبخت میں۔ چھچوندر سے خدا بچائے۔

مرزا جی۔ اجی حضت۔ اِس جزو میں اصل شے تو بدبو ہی ہے۔ اچھا بھئی فتو، ذری دستپناہ تو لانا۔

فتو۔ یہ لیجئے۔

میر صاحب۔ کیا کیجئے گا۔ دستپنے کا کیا ہوگا۔

مرزا جی۔ کرونگا کیا۔ حضت جزو کی ٹانگ پکڑ کر قابو میں کرتا ہوں ادھر آپ کاغذ روشن کرکے گولی سینکیں۔

(مرزا چھچوندر کی ٹانگ پکڑ رہے ہیں۔ چمٹا پنجرے پر مارکر۔ مگر چھچوندر ادھر سے اُدھر ہو جاتی ہے)

مرزا جی۔ اونہوں ہا... ہش... ارے تیرے کی۔ بڑا پھرتیلا جزو ہے! اری جاتی کہاں ہے... دیکھئے۔ پھرتی دیکھئے جزو کی۔ ارے رے رے ٹھہر تو جا.....!

کلن خاں۔ اجی حضت جزو ضائع ہو جائے گا، جزو ضائع ہو جائیگا جزو کی ٹانگ زخمی ہوئی نہیں کہ خون نکل جائے گا۔ احتیاط سے ذری.... قبلہ....!

مرزا جی۔ آماں تم نے بھی کوئی اناڑی سمجھا ہے ہمیں۔ کوئی اناڑی ہیں ہم جو ہمارے ہاتھ سے جزو ضائع ہو جائیگا۔

میر صاحب۔ بہتر ہو مرزا صاحب۔ بجائے ٹانگ کے مسلّم جزو کو پکڑیں آپ۔

مرزا جی۔ اجی مسلّم ہی جُزدتو لے رہا ہوں۔ وہ ہاتھ بھی آدے۔ سب کے سب جُزو پُھرتیلے ہیں۔ سلاخوں سے جُزو قابو میں نہیں آئیگا۔ میں کھڑکی کی طرف سے چِمٹا ڈالتا ہوں آپ چوہے دان کو اُدھر سے کھڑکھڑائیے۔

میر صاحب۔ آنچ تیار ہے جناب۔ جلدی کیجئے تاکہ میں گوٹی ڈالوں۔

(اب کلّن خاں نے ہاہا۔ کھڑ کھڑ کر کے پنجرا پٹخنا شروع کیا)

ہاں لیجئے مرزا صاحب دیکھئے۔ کھڑکی زیادہ نہ کُھلے.....

وہ لیجئے... اوہو... گئے۔

مرزا جی۔ ہُھونہہ.... لے لیا ہے.... ذرا اُدھر سے بھگائیے۔ بڑا پُھرتیلا جُزو ہے۔

(یہاں چوہے دان کی کھڑکی کو زور سے کھٹکھٹ تے ہیں۔ دستپناہ زور سے مارتے ہیں۔)

کلّن خاں۔ لیجئے، لیجئے.... دیکھئے کھڑکی نہ کُھلے... کھڑ کھڑ، کھڑ، کھڑ۔ ارے..... ارے... کھڑ... کھڑکی.... واللہ..

...ارے.....،

مرزا۔ اُونہوں۔ ارے۔ یا علی... لینا۔

میر صاحب۔ (چیخ کر) جُزو جاتا ہے۔ جُزو، جُزو.... کندھے پر ہے قبلہ۔ کندھے پر کندھے پر۔ واللہ۔

مرزا صاحب۔ قیں، چیں....

(خوب کودتے ہیں، پیر پھٹپھٹاتے ہیں۔)

حضت۔ قبلہ... جُزو۔ جُزو۔

(شور ہے ہنگام۔ خوب دھما چوکڑی ہوتی ہے)

کلّن خاں۔ (حلق پھاڑ کر) اجی لیجئے قبلہ جُزو۔ جُزو آستین کے قریب جُزو جُزو۔ ارے رے رے۔ واللہ۔ قبلہ۔

میر صاحب۔ ارے رے۔ کمبل ڈالو۔ کمبل کمبل کمبل... ارے! قبلہ۔ واللہ۔ رے... دوڑو۔

کلّن خاں۔ گیو.... ارے فتّو... لینا... جُزو۔

فتّو۔ ارے میاں وہ رہی لینا... ارے! رے نکل گئی... واللہ! لینا، لینا گئی۔ نکل گئی۔

میر صاحب۔ دیکھا نا۔ جُزو ضائع ہو گیا۔ واللہ!

کلّن۔ کدھر گیا؟۔

میر صاحب۔ وہ سامنے پل میں گُھس گئی۔

مرزا جی۔ اماں جاؤ بھی۔ مچا رہے ہیں کھڑاے غل۔ جُزو ضائع کر دیا۔ بڑے کیمیاگر بنتے ہیں۔

کلّن خاں۔ میں نے کیا کہ آپنے۔ خود تو چھوڑ دی۔

مرزا جی۔ اماں کہیں ایسے بے تحاشہ پنجرا پٹختے ہیں کہ دھڑکے پوری کھڑکی کھولدی

کلّن خاں۔ کھڑکی میں نے کھولدی؟۔

مرزا جی۔ اور کیا۔

کلّن خاں۔ اماں خدا سے ڈرو۔ میں تو چوہے دان کھٹکھٹاتا تھا، کھڑکی تو تم کھولے تھے۔

مرزا جی۔ خیر کھڑکی ہم کھولے تھے مگر مرد خدا کوئی ایسے بھی ہلڑ مچاتا ہے کہ سب کھڑکی کھل جائے۔ آئے ہوش جاتے رہے۔ آخر کیمیاگر ہیں۔ کوئی کنجڑے تو ہیں نہیں۔ اور پھر یہ فتّو الو کا پٹھا بیٹھا دیکھتا رہا اور نکل جانے دیا اپنی نانی کو۔

فتّو۔ میں کیا لٹھ مار دیتا۔

مرزا۔ ابے لٹھ کے بچے، جُزو ضائع ہو رہا ہے اور تو دیکھ رہا ہے بیٹھا بت کی طرح، اور پھر اب ٹرّاتا ہے۔ نامعقول۔

فتّو۔ اب گئی چیز کا غم کیا صاحب جانے بھی دیجئے۔ وہ تو جانے والی ہی تھی۔

مرزا۔ بے جانے کیسے دیں۔ یہاں تو جُزو ضائع ہو گیا....... ارے یہ کیا؟۔

کلّن خاں۔ کیوں، خیر تو ہے؟

مرزا۔ خیر ہی تو نہیں حضت۔ ایک اور جُزو غائب ہے۔ ابے فتّو کے بچے اس میں تو تین چھچھوندریں تھیں۔ یہ دوسری تُو نے کیا کی۔

فتو۔ میں نے کیا کی۔ ارے صاحب تین تھیں جس میں سے دو آپنے چھوڑ دیں۔

مرزا۔ ابے میں نے چھوڑ دیں، اَبکے تو کہہ بدمعاش۔ اور پھر دو کب چھوڑیں، ایک ہی تو چھوٹی۔

فتو۔ ارے صاحب ایک تو آپکے ہاتھ پر آئی اور آپنے اُچھال دی تو آپکے کندھے پر پہونچی جب آپ چیخے۔

مرزا جی۔ ابے تو کون؟ کوئی خدائی فوجدار ہے۔ ہماری چیز تھی ہم نے اُچھال دی خوب کیا۔ اور خوب چیخے بھی۔ تو کون ہوتا ہے، مگر وہ تیری نانی دوسری کہاں گئی۔

فتو۔ دوسری آپکی ٹانگوں میں ہو کر نکل گئی۔

میر صاحب۔ اور تو دیکھتا رہا۔ تجھے دیکھنے کیلئے بٹھایا تھا۔

فتو۔ اب دیکھنے کو تو سب ہی دیکھتے رہے۔

کلن خاں۔ ہم نے تو نہیں دیکھی۔ گئی کہاں۔

فتو۔ وہ گئی سامنے کے بلوخے میں۔

مرزا جی۔ ابے بلوخے کے بچے، تو ہاتھ میں لکڑی لئے کیا کرتا رہا۔

فتو۔ لکڑی ماری تو وہ آپکے کولھے میں لگی اور چھچھوندر کی چھچھوندر نکل گئی۔

مرزا صاحب۔ ابے جبھی تو ہم کہیں کہ یہ درد کیسا۔ ابے نمک حرام یوں کیوں نہیں کہتا کہ تو نے لٹھ مارا ہے۔ نمک حرام کہیں کا۔ اجی میر صاحب، ہم تو تقدیر سے ہارے ہیں۔ اس فتو نے وہ وہ جزو ضائع کئے ہیں کہ نہ پوچھئے۔ اور پھر اب گستاخی تو دیکھئے۔

فتو۔ سرکار معاف کیجئے، میں نے جان کر تھوڑی ایسا کیا۔

میر صاحب۔ اب صبر کیجئے حضت، پھر دیکھا جائیگا۔ معافی مانگتا ہے۔

مرزا صاحب۔ معافی مانگنے سے حضت نہ تو میرے کولھے کا درد جائے اور نہ جزو ہاتھ آئے اور اب اندیشہ ہے مجھے جزوِ اعظم کا۔

کلن خاں۔ کیوں کیا مینڈک مر جائیگا۔

مرزا جی۔ اجی حضرت اُس کے دشمن مر تو خیر نہیں جائیں گے لیکن وہ باسی تو ہو جائے گا۔ جزو کی تاثیر بدل جائیگی۔

میر صاحب۔ یہ کیسے معلوم کہ تاثیر بدل جائیگی۔ نسخہ میں تو لکھا نہیں ہے۔

مرزا صاحب۔ مگر ہم تو جانتے ہیں۔ کوئی اناڑی تھوڑی ہیں۔

میر صاحب۔ خیر اب کل دیکھا جائیگا۔ ابھی سے فکر کیجئے میں بھی جاتا ہوں۔ اور خانصاحب آپ بھی جائیے۔

مرزا صاحب۔ فتو خیریت اسی میں ہے ابھی جاؤ بھنگی کے پاس اور اُس سے کہدو کہ اگر کل تک چھچھوندریں نہ آگئیں تو خیریت نہیں۔

فتو۔ بہت اچھا۔

(سب چلے جاتے ہیں)

* * *

مرزا عظیم بیگ چغتائی

"چمکی"

مرزا عظیم بیگ چغتائی کا رنگین شاہکار "چمکی" پڑھکر آپ کو کہنا پڑیگا کہ "اے عورت تیرا نام خودداری ہے!"

قیمت قسم اول ایک روپیہ بارہ آنے (عہ۱۲؎) قسم دوم ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ۸؎) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:۔ ساقی بکڈپو۔ دہلی

تمہاری یاد

سکونِ قلب جب ملتا ہے بلبل کو نشیمن میں
شرارے سے نظر آتے ہیں ہر سو صحنِ گلشن میں
گھٹائیں جھومتی ہیں جب پہاڑوں کی بلندی کو
بہاریں لوٹتی پھرتی ہیں جب صحرا کے دامن کو

مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

سہانے جنگلوں میں آبشاروں کی روانی میں
حجابِ حسن کی مخمورکن، رنگیں کہانی میں
گھٹائیں جھومتی ہیں جب فضائے ابرباراں میں
بہاریں رنگ بھرتی ہیں شبیہِ نوجوانی میں

مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

فضائے باغ جب محوری سی معلوم ہوتی ہے
تمہارے ہجر میں ہر کیف سے محروم ہوتی ہے
سرورِ شوق جب درجہ بدرجہ گھٹنے لگتا ہے
حیاتِ عشق جب باضابطہ معدوم ہوتی ہے

تم اُس وقت اپنے فرحت کو بہت ہی یاد آتے ہو

زمانہ محو ہوتا ہے سرودِ جشنِ ساماں میں
گل و بلبل میں پیمانِ وفا بندھتا ہے بستاں میں
جہانِ رنگ و بو میں زلزلہ سا جب مچلتا ہے
حیاتِ نو جھلک اٹھتی ہے خوابیدہ ارماں میں

مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

خمار انگیز دورِ بادۂ سرجوش ہوتا ہے
چمن زاروں میں رنگِ محشرِ ناموش ہوتا ہے
فضاؤں میں جمالِ روئے انور جب مچلتا ہے
گھٹاؤں کی ردا میں چاند جب روپوش ہوتا ہے

تم اُس وقت اپنے فرحت کو بہت ہی یاد آتے ہو

کلس مندر کے، گنبد مسجدوں کے جب چمکتے ہیں
لبِ دریا پہ ذرّے ریت کے پیہم دمکتے ہیں
فضائے ابر کی جھولی سے جب کندن برستا ہے
ردائے ابر سے جب چاند کے ٹکڑے جھلکتے ہیں

مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

ہوا مستانہ وار آتی ہے مستِ رنگ و بو ہو کر
نسیم اٹھلا کے چلتی ہے شریکِ ہاؤ ہو ہو کر
مچل اٹھتے ہیں جب رندانِ خوش اوقات ساقی سے
چھلک پڑتے ہیں گلہائے چمن، جام و سبو ہو کر

تم اُس وقت اپنے فرحت کو بہت ہی یاد آتے ہو

گلے ملتا ہے جب روزِ وفا خورشب کی دلہن سے
رُوپہلی چاندنی چھنتی ہے جب گردوں کی چلمن سے
شعاعِ مہرِ تاباں چومتی ہے جب رُخِ شبنم
سحر کی آمد آمد کی صدا اٹھتی ہے گلشن سے

مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

فلک پر ناچتے ہیں جب رُوپہلی گوٹ کے بادل
منوّر ہو کے دھندلے پڑنے لگ جاتے ہیں جب جنگل
جزیرے سے بگولے بننے لگتے ہیں فلک پر جب
بس اشجارِ افق پر لب بہ لب ملتے ہیں جب جل تھل

مجھے تم یاد آتے ہو، مجھے تم یاد آتے ہو

کنول کے برگ پر برسی ہوئی بوندیں چمکتی ہیں
زمرد کے طبق پر مثلِ ہیروں کے دمکتی ہیں
کنول کے پھول جب تالاب بھر میں سر اٹھاتے ہیں
چمن کی نزہتیں جب کونے کونے میں جھلکتی ہیں

تم اُس وقت اپنے فرحت کو بہت ہی یاد آتے ہو

فرحت کانپوری

میری یاد

مری فرقت میں تم ڈھونڈو گے مجھکو صحنِ گلشن میں — نہ میں شبنم رہونگا اور نہ اِن پھولوں کے دامن میں
نہ پروانوں میں پاؤ گے، نہ حُسنِ شمع روشن میں — نہ رنگ رلیوں میں عالم کی، نہ خاموشیِ مدفن میں
بہت ڈھونڈو گے لیکن کچھ پتہ میرا نہ پاؤ گے

فلک کی وسعتِ بے انتہا میں مجھکو ڈھونڈو گے — عدم کے کوچۂ ناآشنا میں مجھکو ڈھونڈو گے
محبّت کی ہر اک رنگیں ادا میں مجھکو ڈھونڈو گے — بالآخر عشق کے جذبِ وفا میں مجھکو ڈھونڈو گے
بہت ڈھونڈو گے لیکن کچھ پتہ میرا نہ پاؤ گے

پتہ پوچھو گے موجِ بحرِ بے پایاں سے گھبرا کر — کلی کو چھیڑ بیٹھو گے ادائے غم سے اٹھلا کر
صبا سے محوِ استفہام ہو گے دل کو سمجھا کر — اِسی میں کھو کے رہ جاؤ گے کُل عالم کو ٹھکرا کر
مگر مجھکو نہ پاؤ گے، مگر مجھکو نہ پاؤ گے

نگاہیں اپنی دوڑاؤ گے اِن اُونچے پہاڑوں پر — پلٹ کر دوڑ جاؤ گے زمرد پوش ٹیلوں پر
کوئی دھبا سا دیکھو گے تلاطم خیز موجوں پر — تو سمجھو گے مرا عکس ہے پانی کے تھپیڑوں پر
بہت ڈھونڈو گے لیکن کچھ پتہ میرا نہ پاؤ گے

سنہری رات کے نکھرے ہوئے جوبن میں ڈھونڈو گے — مہِ پُرنور سے چھنتے ہوئے کُندن میں ڈھونڈو گے
فضائے دشت میں ڈھونڈو گے یا گلشن میں ڈھونڈو گے — زمانے بھر میں تھک کر قلب کی دھڑکن میں ڈھونڈو گے
مگر مجھکو نہ پاؤ گے، مگر مجھکو نہ پاؤ گے

شعاعِ مہر جب چھپنے لگے گی شب کی چلمن میں — ملیں گے روز و شب جی کھول کر جب صحنِ گلشن میں
سمیٹے گی محبّت شب کی دن کو اپنے دامن میں — تڑپ کر ایک بجلی سی گرے گی دل کے خرمن میں
میں تم کو یاد آؤں گا، مگر مجھکو نہ پاؤ گے

کبھی جوشِ مسرت میں تم اپنا ہار گوندھو گے — مگر میں یاد آؤں گا تو پھر کیا اُس کو پہنو گے
اُٹھا کر چھوڑ دو گے چھوڑ کر پھر تم اُٹھاؤ گے — کبھی اک ہار میں نے بھی پنہایا تھا یہ سوچو گے
میں تمکو یاد آؤں گا مگر مجھکو نہ پاؤ گے

اندھیری رات میں طوفانِ برق و باد و باراں میں — چمک اُٹھیں گے نیزے برق کے جب دستِ شیطاں میں
شبِ تاریک ہیبت خیز منظر ہو گی طوفاں میں — قیامت ہل اُٹھیگی خود بخود قلبِ پریشاں میں
میں تم کو یاد آؤں گا، مگر مجھکو نہ پاؤ گے

صدائے بربط و چنگ و رباب آئیگی کانوں میں — مرا ماتم بپا ہو گا چمن کے نغمہ خوانوں میں
قیامت سی تڑپ اُٹھے گی خود آشفتہ جانوں میں — نہاں اِک محشرِ خاموش ہو گا سب کی تانوں میں
میں تمکو یاد آؤں گا مگر مجھکو نہ پاؤ گے

مری یاد آئے گی، آ کر تمہیں بیحد ستائے گی — تمہیں بے حد ستائے گی، تمہیں بیحد رُلائیگی
محبت فتنۂ خاموش ہے، کچھ رنگ لائے گی — صلہ ایثارِ پیہم کا پسِ مُردن بھی پائے گی
میں تم کو یاد آؤں گا مگر مجھکو نہ پاؤ گے

فرحت کانپوری

نشرِ اُردو

وہ نظم جو بہ تقریبِ یومِ اُردو لکھی اور پڑھی گئی۔

سب کو رامِ زبانِ اُردو کر — صیدِ دامِ زبانِ اُردو کر
مست جامِ زبانِ اُردو کر — شاد کامِ زبانِ اُردو کر
جا، پیامِ زبانِ اُردو لا — آ، کلامِ زبانِ اُردو کر
مادرِ ہند کی سمجھ کے زباں — احترامِ زبانِ اُردو کر
ہر کتابت میں، ہر خطابت میں — التزامِ زبانِ اُردو کر
کل مکاتب میں، کل مدارس میں — انتظامِ زبانِ اُردو کر
ملک کے عام کاروباروں میں — اہتمامِ زبانِ اُردو کر
ملک کے تمام اداروں میں — انصرامِ زبانِ اُردو کر
ہر ذریعے سے، ہر وسیلے سے — نشرِ تامِ زبانِ اُردو کر
اور اُردو زباں کی قدر بڑھا — اور نامِ زبانِ اُردو کر

شستہ کامِ زبانِ اُردو کو — تیز گامِ زبانِ اُردو کر
بد کلامانِ ہند کو اُٹھ کر — خوش کلامِ زبانِ اُردو کر
بے لگامانِ ملک کو بڑھ کر — با لگامِ زبانِ اُردو کر
جن کو اُردو زبان سے رم ہے — اُن کو رامِ زبانِ اُردو کر
قتل کر ڈال قتل، جو یہ کہے — قتلِ عامِ زبانِ اُردو کر
ختم کر ڈال ختم، جو یہ کہے — اختتامِ زبانِ اُردو کر

اُٹھ اور آزاد، بے مراموں کو — با مرامِ زبانِ اُردو کر
تیغِ اُردو زباں عطا کر کے
ذی حسامِ زبانِ اُردو کر

حکیم آزاد انصاری

ڈاکٹر فاؤسٹس کا اندوہناک فسانۂ زندگی

افرادِ تمثیل

پوپ (پاپا)

ریم کا قسیسِ اعظم۔

اساقفہ اور پادری

برونو۔ ۔ ۔ ناہ سیکسنی۔

شہنشاہِ جرمنیہ

نواب فان ہولٹ۔

فاؤسٹس۔

فالدیز | فاؤسٹ کے دوست۔
کورنیلیوس |

فریڈرک۔

بنوالیو۔

مارٹینو۔

وگنر۔ فاؤسٹ کا ملازم۔

مسخرا۔ رابن۔ رالف۔

ڈک۔

ونٹر۔ گھوڑوں کا سوداگر۔ سورما۔ بوڑھا۔

علما۔ ساقن۔ پادری اور ملازم۔

فان ہولٹ کی بیگم۔

لوسیفر۔

بیلزی بب۔

میفسٹوفلیس۔

نیکی کا فرشتہ۔

بدی کا فرشتہ۔

ہفت مہلک گناہ۔

شیاطین۔

سکندر اعظم۔ اس کی محبوبہ اور زوجہ کی

ہیلن کی متشکل روحیں۔

طائفہ۔

ڈاکٹر فاؤسٹس کا اندوہناک فسانۂ زندگی

مطربوں کا طائفہ آتا ہے۔

طائفہ گاتا ہے۔

اس وقت شاعری کی دیبی نہ تو اپنے ربانی اشعار میں صولت و حشمت کی پُر غرور رزم آرائیوں کو بیان کرنیکا ارادہ رکھتی ہے ورنہ وہ تراسمین کے میدانِ جنگ میں خدائے جنگ مریخ نے قرطاجنیوں پر جو لطف وکرم کیا تھا اس کا تذکرہ کرنا چاہتی ہے اور نہ چمنستانِ عشق و محبت میں راز و نیاز کی اٹکھیلیاں دکھانا اُس کا مقصود ہے اور نہ ایسے درباروں کا حال سُنانا اُس کی غرض ہے جہاں حکومتوں کے تختے الٹ چکے ہیں۔ اسوقت صرف ایک شخص کے واقعاتِ زندگی خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے بیان کرنا اس کا موضوعِ کلام ہوگا۔ اس شخص کا نام فاؤسٹس تھا اور ہم اپنے صبر آزما ناظرین کے فہم و ذکا سے تحسین و آفرین کے متوقع ہوکر فاؤسٹس کی پیدائش اور لڑکپن کے حالات سُناتے ہیں۔ یہ شخص ملک جرمانیہ کے شہر رودس میں ادنیٰ ماں باپ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ جب سیانا ہوا تو درسگاہِ وٹن برگ میں پرورش اور تعلیم کی غرض سے گیا۔ یہاں اسکے اعزا اور اقارب اس کی تعلیم و تربیت کے زیادہ تر کفیل رہے۔ درسگاہ میں پہونچتے ہی اُس نے مسیحی دینیات میں ترقی کے آثار دکھائے اور جلد باغِ علم کی رونق بن گیا۔ اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں اُس نے دینیات میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی اور اپنے ہم زمانہ طلبہ میں سب پر فوقیت لے گیا۔ جن کے مباحثے اور جنکی تقریریں نہایت شیریں اور دلکش ہوتی تھیں اور جو علم الٰہیات کے دقائق اور رموزِ علوی میں نہایت درجے دلچسپی رکھتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ فاؤسٹس میں عیاری اور خودستائی کا مادہ پیدا ہوگیا۔ اس کے موم کے پر اُس کے بوتے سے زیادہ بلندی پر اُسے اُڑانے لگے۔ مگر پھر اُنہوں نے پگھلنا شروع کیا اور اب مشیت کو منظور ہوا کہ اُسے قعرِ مذلت میں گرا دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ وہ علم کے زریں انعامات سے مالامال ہوکر شیطانی افعال کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ طلسم و سحر جیسے پلید اور مردود علم سے اُسے دلچسپی ہوئی۔ جادو کے سوا اب کوئی دوسرا مضمون اُس کے لئے قابلِ ترجیح و پسند نہ رہا۔ اور نہ کسی اور علم میں اُسے لطف و لذت حاصل ہوتی تھی۔ اور اب ہم اسے اپنے مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا دیکھتے ہیں۔

پہلا منظر

فاؤسٹس کے مطالعہ کا کمرہ

فاؤسٹس نمودار ہوتا ہے۔

فاؤسٹس۔ اے فاؤسٹس تو اپنی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہونچا۔ اور جس چیز کو تو اپنا پیشہ بنانا چاہتا ہے اُس کی گہرائیوں سے پوری پوری واقفیت حاصل کر۔ تُو نے مذہبی رنگ شروع ہی سے اختیار کیا ہے۔ ظاہر میں تو خدا پرست پادری بنا رہ۔ ہر علم و فن کی تحصیل کو اُس کی انتہا تک پہونچا دے۔ بالخصوص فلسفۂ ارسطاطالیس کی پیروی میں زندہ رہ اور اسی میں مر بھی۔ اے میرے محبوب علم قیاس و تحلیل تم ہو جنہوں نے مجھے فرطِ مسرت سے مست و بیخود بنا رکھا ہے بہترین تقریر اور طرزِ استدلال منطق کی انتہا ہے کیا واقعی بہترین مباحثہ منطق کا معراج کمال ہے؟ کیا اس سے زیادہ یہ فن عجائبات دکھانے سے عاری ہے۔ اب تُو نے زیادہ حاصل کرنا عبث ہوگا تو تو اسکی انتہا کو پہلے ہی پہونچ چکا ہے۔ اب کوئی دوسرا مضمون جو اس سے بھی زیادہ وسیع اور ارفع ہو فاؤسٹ کی عقل کے شایاں ہوگا۔ بس منطق کو اب خدا حافظ کہہ۔ حکیم جالینوس اب آپ کی باری ہے۔ آئیے۔ فاؤسٹ اب اس مقولے پر غور کرکے کہ "فلسفے کی ابتدا طب کی انتہا ہے" تم طبیب بن جاؤ۔ سونے کی ڈھیریاں لگا لو۔ اور کوئی مجرب دوا بناکر شہرتِ دوام حاصل کرو۔ دوا کی انتہائے خوبی صحتِ جسمانی کا حاصل ہو جانا ہے اور علاج کا کمال یہ ہے کہ تندرستی ملے فاؤسٹ تم نے اس فن کو کیوں حاصل نہیں کیا۔ کیا تمہاری روزمرہ کی باتوں کو زمانے میں ضرب الامثال کا درجہ نہیں ملا ہے، کیا تمہاری تحریریں بطور یادگار کے آویزاں نہیں کی گئی ہیں۔ تم نے وبا کی غارتگری سے شہر کو کیسا محفوظ رکھا۔ تم نے ہزارہا خوفناک بیماریوں کا سدباب کیا۔ پھر بھی تم فاؤسٹ ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے قدم آگے نہ بڑھا سکے۔ کیا تمہاری قدرت میں نہیں کہ انسان کو زندگی جاوید بخشو۔ کیا تم مُردے کو زندہ نہیں کرسکتے۔ اگر کسی فن کے زور سے ایسا کرسکے تو وہ فن نہایت قابلِ قدر ہوگا۔ بس اب ذوقِ طب تجھ سے بھی رخصت ہوتا ہوں۔ اچھا اب جسٹینین واضع قوانین کو بھی اُٹھاکر دیکھ لوں۔ (پڑھتا ہے)

"اگر وصیت کے ذریعے صرف ایک ہی شئے دو آدمیوں کیلئے چھوڑی

جائے تو ایک آدمی اُس شے کو حاصل کریگا اور دوسرا اسکی قیمت"..... یہ تو ایک خفیف سا مقدمہ حقیر قانونِ وراثت کا ہوا۔ (پھر پڑھتا ہے) "باپ بیٹے کو محروم الارث نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ" یہ ہے جسٹی نین کے مجموعے قوانین کا مضمون اور یہی قوانینِ عام کا مجموعہ ہے۔ یہ فن تو وہ سیکھے جسے پیشہ کمانے کی محنت و مشقت میں پڑنا گوارا ہو جس کا مقصد سوائے دنیا کی گندی دولت کمانے کے دوسرا نہ ہو۔ میرے لئے تو وہ ایک ذلیل اور آزادی کا مٹانے والا کام ہوگا۔ یہ کل مضامین برطرف کرنے کے قابل ہیں۔ اور ان سب کے مقابلے میں پھر دینیات ہی بہتر مضمون معلوم ہوتا ہے۔ فاؤسٹ ذرا جیروم کی انجیل کو اُٹھا کر پڑھ۔ (پڑھتا ہے) "گناہ کا صلہ ابدی موت ہے" ہاں گناہوں کی پاداش ہمیشہ کی موت ہے۔ یہ بات تو بہت سخت ہے۔ (پھر پڑھتا ہے) "اگر ہم یہ کہیں کہ ہم گناہ نہیں رکھتے وغیرہ وغیرہ یعنی یہ کہیں کہ ہم نے گناہ کبھی نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے کو دھوکے میں ڈالتے ہیں اور ہم صدق و صفا سے عاری ہیں اگر ایسا ہے تو پھر گناہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہوا اور اس کی سزا میں ہمیشہ کی موت کا مستوجب ہونا لازمی۔ ہاں۔ کیا اس میں ابدی موت مرنا لازمی ہے۔ اچھا اِس اُصول کو تم کیا کہتے ہو۔ کہ جو کچھ ہوگا وہ ہوگا" بس دینیات تجھے بھی الوداع کہتا ہوں۔ اس کے مقابلے میں تو ساحروں کی الٰہیات اور جادو کی یہ تصانیف جنت کے نمونے ہیں۔ یہ خطوط۔ یہ دائرے، یہ مناظر، حروف و نقوش اب یہی چیزیں مجھے بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ علم تو لامحدود فوائد اور مسرتوں کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ اور بے قیاس قوت و اختیار اعزاز و اقتدار کے دعدے جفاکش ہنرمندوں کیلئے اس میں موجود ہیں۔ جملہ اشیاء عالم جو قطبین کے درمیان حرکت کرتی ہیں میرے قبضہ و اختیار میں ہونگی۔ بادشاہ اور شہنشاہ تو فقط تلف اور معدودے چند ملکوں اور سلطنتوں پر حکمران ہوتے ہیں، اور وہیں اُن کے حکموں کی بجاآوری ہوتی ہے۔ مگر نہ تو ہواؤں کا چلانا اور نہ بادلوں کا چاک کرنا اُن کی قدرت میں ہوتا ہے۔ مگر جو شخص اس علم (سحر) کا ماہر بنکر دوسروں پر سبقت لیجائے تو پھر اسکی حکومت و سلطنت طبیعت بشری کی طرح وسیع اور لاانتہا ہے اور اسکی حدود اختیارات انسانی تخیل کی طرح لامحدود ہونگے۔ ایک ساحر کامل ہر طرح کی قدرت رکھنے والے معبود کی طرح ہوتا ہے ہاں تو اے فاؤسٹ اگر تمہیں ریاضت ہی کرنی ہے تو پھر خدا بننے کی کوشش کیوں نہ کرو۔

(فاؤسٹ کا ملازم ویگنر آتا ہے)

ویگنر خدا جاؤ اور میرے عزیز ترین جرمن احباب فالیڈیز اور کورنیلیوس سے میرا سلام کہکر کہو کہ وہ جلد آکر مجھ سے ملیں۔

ویگنر بہت خوب جناب والا۔

فاؤسٹ۔ اپنی دماغ سوزی اور فکر سے زیادہ انکی ملاقات اور گفتگو سے مجھے مدد ملیگی۔ زیادہ مشقت اور کاہش مجھ سے نہ ہو سکے گی۔

(نیکی کا فرشتہ اور بدی کا فرشتہ نمودار ہوتا ہے)

نیکی کا فرشتہ۔ فاؤسٹ ان نجس اور مردود کتابوں کو دور کرو۔ ان پر نظر تک نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہاری روح کو گمراہ کر کے اپنی طرف راغب کریں اور پھر قہر خدا کا سنگ گراں تمہارے سر پر لا دھریں۔ پاک و مقدس کتابیں پڑھو۔ یہ کتابیں جو تمہارے سامنے ہیں یہ سب کلماتِ کفر سے بھری ہیں۔

بدی کا فرشتہ۔ فاؤسٹ نہیں۔ اس مشہور اور مفید علم میں قدم بڑھائے چلے جاؤ۔ یہ علم وہ ہے جو قدرت کے تمام غیبی خزانوں پر حاوی ہے۔ تم روئے زمین پر ایسے تابندہ اور درخشاں ہو جاؤ گے جیسے کہ فلک پر مشتری ہے۔ اور عناصر عالم پر بھی قادر ہو کر ان پر فرمانروائی کروگے۔

(نیکی کا فرشتہ اور بدی کا فرشتہ دونوں چلے جاتے ہیں)

فاؤسٹ۔ ان باتوں نے مجھ میں کتنا کبر و غرور بھر دیا کیا اب میں بھی روحوں کو حکم دوں کہ جو کچھ میں چاہوں میرے لئے حاضر کریں۔ اور میرے تمام شکوک و مغالطے کو دور کر دیں۔ اور جس سخت سے سخت مہم کا حکم دوں اُسے سر کریں۔ اچھا میں یہی کرتا ہوں۔ میں انہیں حکم دیتا ہوں کہ فوراً اُڑکر ہندوستان سے سونا لائیں۔ اور مشرق کے موتیوں کیلئے تمام سمندر کو چھان ماریں اور نئی دنیا کے ہر گوشہ میں خوش ذائقہ پھلوں اور بادشاہ پسند لذیذ چیزوں کو تلاش کریں اور میں ان سے کہونگا کہ وہ مجھے عجیب عجیب مسائل فلسفہ اور حکمت پڑھکر سنایا کریں اور حکم دونگا کہ شاہان دول غیر کے راز ہائے سربستہ سے مجھے آگاہ کریں اور میں کل ملک جرمنیہ کے گرد اُن سے پیتل کی فصیل تیار کراؤنگا اور ان سے کہونگا کہ تیز رفتار دریائے رہن کو خوشنما شہر وٹن برگ کے گرد حلقے کی شکل میں بہاؤ۔ اور مدارس عامہ میں دیبا اور حریر کے انبار لگوا دونگا کہ طلبا خوب اچھے اچھے لباس پہنیں۔ میں دنیا کے لشکروں کو معہ انکے مال و متاع کے جمع کرونگا اور ان سے کہونگا کہ پرما کے شہزادے کو ہمارے ملک سے نکال باہر کریں۔ پھر میں اپنے ملک کے تمام حصوں اور صوبوں پر تنہا بادشاہ بنکر حکمرانی کرونگا اور اپنی ماتحت اور تابع روحوں سے ایسے آلات حرب عجیب و غریب تیار کرواؤنگا جو لڑائی میں شدت سے مہلک ثابت ہوں۔ اور یہ آلے اس آتش فگن سفینے سے بھی زیادہ جو انٹ ورپ کے پل کے نیچے پڑا رہتا تھا۔ زیادہ غارتگر ہونگے۔

(فالڈیز اور کورنیلیوس آتے ہیں)

آؤ ہماری جرمنی کے فالڈیز اور کورنیلیوس آؤ اور اپنی دانشمندانہ تقریر سے مجھے محظوظ و مسرور کرو۔ فالڈیز پیارے فالڈیز تمہاری باتوں نے آخر مجھے اپنا بنا ہی لیا اور مجھے آمادہ کر دیا کہ میں سحر اور علوم باطن کو سیکھ کر انہیں عمل میں لاؤں۔ یہ

نہ صرف تمہاری فرمائش سے بلکہ اپنے دلی شوق سے ہی۔ فلسفہ مجمل اور مبہم علم ہے۔ قانون دُ
طلب ادنیٰ ذہانت رکھنے کیلئے ہیں۔ دینیات ان تینوں میں سب سے ادنیٰ اور حقیر ہے۔
بس اب یہ تنہا علم سحر ہی ہے جس نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ میرے عزیز دوستو
اب تم میری اس کوشش میں مدد کرو تاکہ میں جس نے منطق کے مختصر قضیوں سے
کلیسائے جرمن کے بڑے بڑے راہبوں اور قسیسوں کو بند کر دیا اور درسگاہ
وٹن برگ کے مایہ ناز نوجوانوں کو اپنے مسائل کے حل کرنے میں اس طرح سر جوڑ کر
بٹھا دیا ہے جیسے جہنم کی روحیں یونانِ قدیم کے شاعر میوسیوس کے گرد جب وہ جہنم
میں آیا تھا جمع ہو گئی تھیں۔ میں چاہتا ہوں کہ مشہور ساحر اگریپا کی طرح اس علم کا
ماہر ہو جاؤں جس کی روحِ عدم رفتہ نے تمام یورپ کو اسکی عزت کرنے پر مجبور کیا تھا۔

فالدیز۔ فاؤسٹ یہ تمہاری سحر کی کتابیں، تمہاری ذہانت اور ہمارا تجربہ ہمارے
مرنے کے بعد ہماری تقدیس کرائیگا جس طرح ہندی قوم اپنے ہسپانوی آقاؤں کی
اطاعت گزار ہے اسی طرح تمام عناصر کی روحیں ہم تینوں کی خدمت کیا کرینگے
اور جب ہمیں ضرورت ہوگی تو وہ شیروں کی طرح ہمارے سینہ پر رہینگے اور
المانیہ کے شہسواروں کی طرح گھوڑوں پر سوار برچھے ہاتھ میں لئے لاپستان کے
جنات کی طرح کبھی [illegible] کبھی جوان لڑکیوں کی صورت
میں ہمارے پہلو میں چلتے ہونگے وہ ایسی حسین پیشانیوں سے [illegible] عشق کے گورے
گورے سینہ [illegible] ظاہر [illegible] اور اگر فاؤسٹ نے ہمت کر کے
حکم دیا تو وہ بندرگاہ وینس سے بڑے بڑے تجارتی جہازوں کو گھسیٹ لائینگے اور
امریکہ کی سنہری اون جو فلپ [illegible] ان کے خزانوں کو زر و دولت سے ہر سال لا
مال کرتی ہے پہنچ جائیگی۔ صرف ہمت درکار ہے۔

فاؤسٹ۔ فالدیز میں اس ارادے میں اتنی ہی ہمت رکھتا ہوں جیسی کہ تم زندہ
رہنے کیلئے ہمت رکھتے ہو لہٰذا اس میں ذرا شبہ نہ کرو۔

کورنیلیوس۔ سحر جب کرامات اور عجائبات دکھائیگا تو [illegible] آپ [illegible] بات
کا عہد کر لیں گی کہ آپ بجز اس علم کے دوسرا علم نہ پڑھیں۔ جو شخص علم نجوم کا ماہر
اور دنیا کی مختلف زبانوں کا عالم ہوتا ہے اور معدنیات سے بھی واقف ہوتا ہے تو وہ
سحر کے ضروری اصول پر بھی حاوی ہوتا ہے پس فاؤسٹ آپ یقین کریں کہ اس پوشیدہ
علم کی وجہ سے اب ولفائی کے آریکل (فال گھر) سے بھی زیادہ دنیا میں شہرت
حاصل کرینگے اور آپ کے پاس اتنے لوگ آنے لگیں گے کہ اتنے لوگ ولفائی میں
بھی نہ جاتے ہونگے۔ روحیں مجھے خبر دیتی ہیں کہ وہ سمندر کو خشک کر کے غیر ملکوں
کے تباہ شدہ جہازوں کا جس قدر مال و متاع سمندر کی تہ میں پڑا ہے اور جس قدر
دولت ہمارے بزرگوں نے بطنِ زمین میں دفن کی تھی وہ کل ہمارے پاس لا سکتی
ہیں۔ اس حالت میں بتاؤ فاؤسٹ ہم تینوں کو کیا چیز درکار رہ جاتی ہے۔

فاؤسٹ۔ کچھ نہیں کورنیلیوس پھر ہم کسی بات کے محتاج نہ رہیں گے۔ واہ
واہ اس خیال سے کیسا دل خوش ہوتا ہے۔ کورنیلیوس آؤ سحر کی باتیں دکھاؤ تاکہ
میں بھی کسی گوشے میں بیٹھ کر جادو کا عمل کروں اور اس کی مسرتوں کو پورے
طور پر حاصل کروں۔

فالدیز۔ آؤ کہیں درختوں کے جھرمٹ میں چل بیٹھیں۔ وہ عاقل و فرزانہ بیکن اور
البانوس کی تصانیف ساتھ لیتے چلیں عبرانی میں دعاؤں کی کتاب اور انجیل کا عہد
جدید یا اور کتابیں جو ضروری ہوں ساتھ ہوں۔ ان کتابوں کے ناموں سے ہم آپکو
اپنی اس ملاقات کے ختم ہونے سے پہلے اطلاع دینگے۔

کورنیلیوس۔ فالدیز پہلے فاؤسٹ کو اس علم کی اصطلاحات سکھا دو۔ پھر جو
کچھ رسمیں کرنی پڑتی ہیں ان سے آگاہ کرو۔ پھر فاؤسٹ اپنی ذہانت سے خود سب
باتیں نکال لیگا۔

فالدیز۔ پہلے تو میں آپکو اس علم کے ابتدائی قاعدے سکھاتا ہوں۔ پھر آپ اس
فن میں مجھ سے بھی زیادہ ماہر ہو جائیں گے۔

فاؤسٹ۔ تو پھر آپ آج میرے ساتھ ماحضر تناول کریں۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم
اس علم کے نکات پر غور کرینگے کیونکہ آج میں خوابگاہ میں جانے سے پہلے کوشش کرونگا
اور دیکھونگا کہ اس علم کی طفیل میں کیا کر سکتا ہوں آج شب کو میں جادو کرونگا
چاہے مجھے موت ہی کیوں نہ آ جائے۔

دوسرا منظر

فاؤسٹ کے گھر کے سامنے

(دو طلبا آتے ہیں)

پہلا طالب علم۔ میں حیران ہوں کہ فاؤسٹ کو کیا ہو گیا۔

دوسرا طالب علم۔ یہ بات ہم ابھی معلوم کئے لیتے ہیں۔ دیکھو وہ اسکا
نوکر آ رہا ہے۔

(وگنر آتا ہے)

پہلا طالب علم۔ کہیئے آپکے آقا کہاں ہیں۔

وگنر۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں ہیں۔

دوسرا طالب علم۔ کیوں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں۔

وگنر۔ ہاں معلوم تو ہے لیکن یہ کوئی منطقی قضیہ تو ہے نہیں جس کا نتیجہ بھی
بتانا ضروری ہو۔

پہلا طالب علم۔ اجی جانے بھی دو۔ یہ مذاق کی باتیں ہیں انہیں چھوڑو۔
یہ بتلائیے کہ فاؤسٹ ہیں کہاں؟

وگنر۔ اگر فاؤسٹ سے آپکے مراسم ہیں تو اس سے یہ تو نہیں نکلتا کہ اسکی نسبت
ہر بات کے دریافت کرنیکا حق بھی حاصل ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپکو حق ہے تو یہ

یہ خیال صحیح ہے کہ مجھ میں اب ایک زبردست سے زبردست بادشاہ سے بھی زیادہ قوت موجود ہے۔

(میفسٹو فرانسسکن قسیس کی صورت میں آتا ہے)

میفسٹو۔ فاؤسٹ فرمایئے کیا حکم ہے؟

فاؤسٹ۔ میرا حکم یہ ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تم میری خدمت میں حاضر رہو اور جو کچھ میں حکم دوں بلا عذر بجا لاؤ۔ اگر میں چاہوں کہ مہتاب کو فلک سے نیچے گرا دیا جائے یا زمین کے تختے کو سمندر میں غرقاب کر دیا جائے تو اس سے تمہیں انکار نہ ہو سکے گا۔

میفسٹو۔ میں ملک الملکوت یعنی ابلیس کا خادم ہوں اور اسکی اجازت کے بغیر آپکے حکم کی تعمیل میں قاصر ہوں۔ میری بڑی خدمت یہی ہے کہ میں ابلیس کے حکموں کو بجا لاتا رہوں۔

فاؤسٹ۔ کیا ابلیس نے تمہیں میرے سامنے حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی؟

میفسٹو۔ نہیں، میں خود ہی حاضر ہوا ہوں۔

فاؤسٹ۔ کیا میرے کلمات سحر نے تمہیں یہاں حاضر ہونے پر مجبور نہیں کیا؟ بولو، جواب دو۔

میفسٹو۔ بات یہ ہے کہ شروع میں جب ہم سنتے ہیں کہ کوئی شخص خدا سے منحرف ہوا ہے اور خدا کی مقدس کتابوں کو نہیں مانتا ہے اور نجات دینے والے یسوع مسیح پر بھی اعتقاد نہیں رکھتا ہے تو پھر ہم اسکی روح پر قبضہ کرنے کے لئے فوراً دوڑ پڑتے ہیں، مگر ہم اسوقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہلتے جب تک کہ ہمارا بلانے والا ان ذرائع کو کام میں نہ لاتا جو ہمیشہ کیلئے اُسے ملعون و مردود کر دیں۔ اس لئے سحر و افسوں کا چھوٹے سے چھوٹا فقرہ زبان پر لانا تالوث مقدس سے انکار کرنا ہے اور جہنم کے بادشاہ یعنی ابلیس سے التماس کرنے کے برابر ہے۔

فاؤسٹ۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ اور اسی بات کو اپنا اصول قرار دیا ہے، اس لئے بیلزبب کے سوا کسی کو اپنا ایسا حاکم نہیں سمجھتا جس کے حوالے میں اپنی روح کر دوں۔ اب "لعنت" کا لفظ فاؤسٹ کو خوف زدہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس نے جنت کی ابدی راحتوں اور مسرتوں کو جہنم پر قربان کر دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسکی روح پرانے سن رسیدہ فلسفیوں کے ساتھ رہے۔ خیر تم اس فضول اور ناکارہ گفتگو کو جو روح کے متعلق ہے چھوڑو، اور بتاؤ کہ تمہارا آقا ابلیس کیا درجہ رکھتا ہے۔

میفسٹو۔ وہ جہنم کے نائب اعلیٰ اور جملہ ارواح پر حکومت کرنیوالے ہیں۔

فاؤسٹ۔ کیا یہ ابلیس وہی تو نہیں ہیں جو کبھی ملک الملکوت تھے؟

میفسٹو۔ ہاں یہ وہی ہیں جو کسی زمانے میں خدا پرستی میں شہرۂ آفاق تھے۔

فاؤسٹ۔ تو پھر وہ ملک الشیاطین کیونکر ہو گئے۔

میفسٹو۔ تکبر اور نافرمانی کی سزا میں خدا نے انہیں جنت سے نکال باہر کیا۔

فاؤسٹ۔ اور تم کیا ہو جو ابلیس کے ساتھ رہتے ہو۔

میفسٹو۔ میں اُن روحوں میں سے ایک ناشاد اور بد قسمت روح ہوں جو ابلیس کے ساتھ ساتھ قعر مذلت میں گرائی گئی تھیں۔ جنہوں نے ابلیس کا ساتھ دیکر اپنے خدائے برتر اور بزرگ کے خلاف سازش کی تھی اور پھر وہ ابلیس کے ساتھ ہمیشہ کیلئے مردود اور راندۂ درگاہ ہو گئیں۔

فاؤسٹ۔ اور جب لعنت تم پر اتری ہے تو تم کہاں تھے؟

میفسٹو۔ جہنم میں۔

فاؤسٹ۔ تو پھر جہنم سے نکلکر تم باہر کیونکر آئے!

میفسٹو۔ جہنم سے باہر ہوں یا اندر میرے لئے ہر جگہ جہنم ہے۔ مجھے جہنم سے باہر نہ سمجھئے۔ ذرا میری حالت پر غور فرمائیں میں وہ ہوں جسے خدا کا دیدار نصیب ہوا تھا۔ جنت کی دائمی نعمتوں سے لذت اندوز ہوا مگر پھر ابدالآباد کیلئے ان تمام مسرتوں اور راحتوں سے یک قلم محروم کر دیا۔ کیا یہ محرومی میرے لئے لاکھوں کروڑوں جہنموں کے عذاب سے بڑھکر نہیں ہے! فاؤسٹ ان باتوں کا استفسار چھوڑو یہ میری شکستہ روح کو سنان خونچکاں کی نوک سے گھائل کئے ڈالتے ہیں۔

فاؤسٹ۔ میفسٹو فلیس معظم کیا آپ واقعی حقیقت سے محروم ہو کر آتش غم میں سوختہ ہو رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو آپ فاؤسٹ سے ہمت مردانہ سیکھئے۔ اور ان مسرتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھئے جو آپکو دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتیں، جا کر ابلیس کو خبر دیجئے کہ خدا سے منحرف ہونے کی پاداش میں فاؤسٹ پر ابدی موت طاری کر دی گئی ہے۔ اس لئے اب فاؤسٹ اپنی روح کو آپکے سپرد کرتا ہے اور اسکے معاوضے میں چاہتا ہے کہ اُسے چوبیس برس تک اس عالم فنا میں زندہ رہنے دیا جائے اور اس دوران میں ابلیس اسکی پوری پوری محافظت اور اعانت کرے تاکہ وہ اپنے نفس کی تشنگی کو خاطر خواہ بجھا سکے اور دنیا کی لذتوں، راحتوں اور مسرتوں سے پورا پورا لطف اندوز ہو سکے اور میفسٹو کو میری خدمت میں حاضر رہنے کی اجازت دی جائے تاکہ جس چیز کی ضرورت ہو اس سے مہیا کرا سکوں، اور جو راز سربستہ میں اس سے دریافت کروں اس سے مجھے آگاہ کرے، دشمنوں کو تباہ کرے دوستوں کی اعانت کرے، غرض کہ میری جتنی خواہشیں ہوں انہیں پورا کرے اور میرا بے عذر غلام بنا رہے میفسٹو، اب تم ابلیس کے پاس واپس جاؤ اور پھر آدھی رات کو میرے دارالمطالعہ میں آکر مجھے اپنے آقا کے ارادے سے مطلع کرو۔

میفسٹو۔ بہت اچھا۔ (چلا جاتا ہے)

فاؤسٹ۔ اگر میرے پاس اتنی روحیں ہوتیں جتنے کہ فلک پر ستارے ہیں، تب بھی میں ان سب کو میفسٹو کے حوالے کر دیتا۔ اب میں اسکی مدد سے دنیا کا

سب سے بڑا بادشاہ بن جاؤنگا اور بس سر سراتے کرۂ ہوا میں ایک پل باندھونگا جس پر سے اپنا لشکر لئے سمندر کو عبور کرونگا اور میں افریقہ کے ساحل کے پہاڑی سلسلہ کو ہسپانیہ سے ملا کر اُسے بھی ہسپانیہ کا ایک حصہ بنا دونگا اور پھر یہ دونوں ملک میرے زیر نگیں رہینگے۔ اور میرے تخت و تاج کے معین و مددگار ہونگے۔ میں نے اپنا دلی مدعا حاصل کر لیا ہے۔ جرمانیہ کا طاقتور فرمانروا تو کیا دنیا کا کوئی شہنشاہ بھی میرے منشا کے بغیر زندہ نہ رہیگا۔ اب میں میفستو کی واپسی تک اسی علم سحر پر غور و خوض کرتا ہوں۔

چوتھا منظر

ایک گلی

ویگنر اور ایک مسخرا آتا ہے۔

ویگنر۔ ارے چھوکرے ادھر آ۔

مسخرا۔ چھوکرے کی بھی خوب کہی۔ بسوگند سچ یہ آپنے مجھے چھوکرا کیسے کہا۔ شاید آپ ہی نے ایسے چھوکرے بہت سے دیکھے ہونگے جنکے منہ پر میری طرح گھنی داڑھیاں ہوں گی۔

ویگنر۔ اچھا تو یہ بتاؤ تمہارا وہاں جانا ہوتا ہے۔

مسخرا۔ جی ہاں جانا بھی ہوتا ہے اور آنا بھی۔ یہ تو آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔

ویگنر۔ افسوس یہ غریب مصیبت کا مارا ہے تنگدستی اسکی عریانی کی ہنسی اڑاتی ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ ننگا بھوکا اور بے روزگار بھی ہے اور بھوکا بھی اتنا کہ اگر شیطان بھیڑ کے شانے کا گوشت کچا کیا خون میں لتھڑا اس کے سامنے رکھدے تو یہ اسکی قیمت میں اپنی روح اس کے حوالے کر دے۔

مسخرا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھیڑ کے کچے گوشت کے بدلے میں اپنی روح شیطان کے حوالے کر دوں اے یار عزیز یہ کسی طرح ممکن نہیں، سیدہ مریم کی قسم اگر سودا اتنا گراں ہوا تو میں اس گوشت کو خوب بھنوا کر اور اس پر سرکہ چھڑک کر نوش جان کرونگا۔

ویگنر۔ اچھا اگر تم ہماری خدمت کروگے تو ہم تمہیں اپنا معقول شاگرد بنا لینگے۔

مسخرا۔ کیا شعر و شاعری میں شاگرد بنائیے گا۔

ویگنر۔ نہیں ریشم کوٹنے اور لکڑ بازار میں لکڑی کا کام سکھائیں گے۔

مسخرا۔ کیا فرمایا؟ کیا مرغی بازار میں کام سکھائیے گا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ یہی زمین کا ایک ٹکڑا ایسا ہے جو آپ کے والد آپ کے لئے چھوڑ مرے تھے۔ جناب والا سمجھ لیں کہ مجھ سے کبھی ایسا نہ ہوگا کہ جس چیز پر آپ کا گذر ہو وہی آپ سے چھین لوں۔

ویگنر۔ ارے میاں میرا مطلب یہ ہے کہ لکڑ بازار میں تمہیں لکڑی کا کام سکھا دونگا

مسخرا۔ آہا اگر اس کام میں میں آپکے ہاتھ کے نیچے رہا تو پھر میرے تن بدن پر نہ پھر کے کیڑے مکوڑے رینگنے لگیں گے۔

ویگنر۔ یہ درجہ تو تمہارا ہر حال میں ہونے والا ہے چاہے میرے شاگرد بنو یا نہ بنو۔ بھلے مانس اب یہ ہنسی مذاق کی باتیں چھوڑو۔ اصل مطلب یہ ہے کہ کیا تم سات برس کے لئے اپنے آپ کو میرے حوالے کر سکتے ہو، اگر تم نے نہ مانا تو میں دنیا بھر کی جوئیں تمہارے پاس بھیجدوں گا اور وہ تمہیں اتنا کاٹیں گی کہ تمہارا سارا خون پی جائینگی۔

مسخرا۔ آپ کیوں اتنی تکلیف کریں۔ جوئیں تو پہلے ہی مجھ سے خوب شناسا ہیں مسیح مصلوب کی قسم یہ چیزیں تو میرا خون پینے پر ایسی دلیر اور بیباک ہیں گویا میرے نان نفقہ کی وہی ذمہ دار ہیں۔

ویگنر۔ خیر اب یہ اشرفیاں موجود ہیں۔ (اشرفیاں دیتا ہے)

مسخرا۔ یہ اشرفیاں کیسی؟

ویگنر۔ یہ تو فرانسیسی اشرفیاں ہیں۔

مسخرا۔ کیا فرانسیسی ہیں۔ ان اشرفیوں سے تو جوا کھیلنے کے انگریزی پانسے اچھے۔ میں انہیں لیکر کیا کرونگا۔

ویگنر۔ انکے لینے میں کیا ہرج ہے اچھا نہیں لیتے تو سمجھ لو کہ ایک گھنٹہ پہلے تمہیں اطلاع کر دیجاتی ہے کہ جہاں کہیں بھی تم ہوگے شیطان تمہیں پکڑ کر لے جائیگا۔

مسخرا۔ نہیں نہیں، پھر تو آپ اپنی اشرفیاں اپنے پاس ہی رکھیے۔

ویگنر۔ نہیں واللہ میں انہیں واپس نہیں لونگا ایک اشرفی بھی واپس نہیں لونگا

مسخرا۔ نہیں جناب یہ تو آپ کو واپس لینی ہی پڑینگی۔

ویگنر۔ گواہ رہو کہ اشرفیاں میں نے تمہیں دیدی ہیں۔

مسخرا۔ گواہ رہیے کہ اشرفیاں میں نے آپکو واپس کر دی ہیں۔

ویگنر۔ یہی بات ہے تو میں دو شیطانوں کو بلاتا ہوں کہ وہ تمہیں پکڑ کر لیجائیں بیلی ایل اور بلشر تم کہاں ہو ادھر آؤ۔

مسخرا۔ میں آپکے بیلی ایل اور بلشر کو سمجھتا ہی کیا ہوں، ذرا آئیں تو پھر دیکھیے۔ انہیں ایسا ٹھوکونگا کہ جب سے وہ شیطان بنے ہیں کبھی اتنا نہ پٹے ہونگے۔ لوگ کہ کر ذرا کچھ دور اس لمبے تڑنگے آدمی کو دیکھیے اس نے شیطان کو مار گرایا تھا۔ اب میں شیطانوں کو مارنیوالا سارے علاقہ میں مشہور ہو جاؤنگا

(دو شیطان آتے ہیں مسخرا روتا ہوا اِدھر اُدھر بھاگتا ہے۔)

ویگنر۔ بیلی ایل، بلشر بس چلے جاؤ۔

(دونوں شیطان غائب ہو جاتے ہیں۔)

مسخرا۔ کیا وہ چلے گئے میں اُن سے بدلہ نکالونگا۔ اُنکے پنجوں میں لمبے۔ تیز اور گندے ناخن تھے ان دونوں میں سے ایک بھتنا تھا اور دوسری

یہ بھتنے اور بھتنیوں کی پہچان میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بھتنوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں اور بھتنیوں کے پاؤں کی جگہ چرے ہوئے سم ہوتے ہیں۔

ویگنر۔ جو کچھ بھی ہو۔ بہرکیف تمہیں اب میری تابعداری کرنی پڑیگی۔

مسخرا۔ تابعداری کروں گا مگر اس شرط پر کہ آپ مجھے بیلی ایل بلشر کو بلانا سکھا دیں۔

ویگنر۔ ہاں جو کچھ کہو گے وہی سکھا دونگا جیسی جی چاہے اپنی شکل بنا سکو گے اگر کتا بلی بننا چاہو تو کتا بلی بن جاؤ گے اگر جوں بننا چاہو گے تو جوں بن جاؤ گے غرض جو چاہو گے جو کچھ بننا چاہو بن سکو گے

مسخرا۔ واہ میں تو عیسائی ہوں۔ کتا بلی کیسے بن سکتا ہوں۔ اگر آپ کو میری صورت بدلنی ہی منظور ہے تو پھر آپ مجھے ایک خوبصورت پچھر بنا دیں کہ میں ادھر اُدھر اڑتا پھروں پھر تو میں ان حسین بازاری عورتوں کے کپڑوں میں گھس کر انہیں ایسا کاٹوں اور گدگداؤں گا کہ وہ بھی مجھے یاد ہی کریں گی۔ واللہ آپ مجھے پچھر بنا کر تو دیکھیں۔

ویگنر۔ اچھا آپ ادھر آئیں تو سہی

مسخرا۔ لیکن ویگنر آپ، تو سُن لیں . . .

ویگنر۔ کیا کہتے ہو۔ ارے بیلی ایل بلشر۔

مسخرا۔ خدا کیلئے ان شیطانوں کو نہ بلایئے ویگنر انہیں تو سوتا ہی رہنے دو۔

ویگنر۔ نالائق نابکار تجھے آقا ویگنر کہکر پکار اور بائیں آنکھ میری داہنی پتلی پر جمائے رکھ۔ (چلا جاتا ہے)

مسخرہ۔ خدایا مجھے معاف کر۔ یہ تو عجیب اناپ شناپ گڑبڑ بولی بولتا ہے اب تو مجھے اسی کی تابعداری کرنی پڑیگی اور اسی کی خدمت میں رہنا ہوگا اور یہی اچھا ہے۔ (چلا جاتا ہے)

پانچواں منظر

فاؤسٹ کا دارالمطالعہ

فاؤسٹ بیٹھا نظر آتا ہے۔

فاؤسٹ۔ کیا اب ضروری ہو کہ تو خدا سے مردود ہو جائے۔ کیا اب تیری بخشش ممکن نہیں ہوسکتی۔ اگر یہی ہے تو پھر خدا اور جنت کے خیال سے کیا حاصل۔ ان خیالات باطل کو دل سے دور کر اور مایوس ہو جا۔ خدا سے منحرف ہو جا اور ابلیس پر اعتقاد رکھ۔ دیکھ اب اپنے کئے سے پھر نہیں۔ فاؤسٹ ثابت قدم رہ۔ دل میں شکوک کیوں جاتا ہے۔ کوئی چیز میرے کان میں کچھ کہہ رہی ہے اور یہ ہے کہ اس جادو کو ترک کر اور خدا سے پھر رجوع کر۔ تو کیا فاؤسٹ پھر خدا سے لو لگائے۔ خدا تو اب تجھ پر مہربان نہیں رہا۔ جب خدا کو تو اس وقت مان رہا ہے وہ تو خود سری اور ایک اشتہائے نفس ہے اور اس میں ابلیس کی محبت سمائی ہے۔ میں تو ابلیس کے لئے ایک قربان گاہ اور کلیسہ تیار کراؤنگا اور نوزائیدہ بچوں کا نیم گرم خون اس پر چڑھاؤنگا۔

(بھلائی کا فرشتہ اور برائی کا فرشتہ آتا ہے۔)

بھلائی کا فرشتہ۔ پیارے فاؤسٹ اس ناپاک فن کو چھوڑ دے۔

فاؤسٹ۔ (عاجزی) انکسار تخشع توبہ اور استغفار سے کیا ہوتا ہے۔

بھلائی کا فرشتہ۔ یہ سب تمہارے لئے حصول بخشش کا باعث ہوسکتی ہیں۔

برائی کا فرشتہ۔ نہیں۔ یہ کل باتیں دھوکے اور دیوانگی کا ثمرہ ہیں اور جو ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں انہیں احمق اور بیوقوف بناتے ہیں

بھلائی کا فرشتہ۔ پیارے فاؤسٹ جنت اور اسکی لازوال نعمتوں کا خیال کرو۔

برائی کا فرشتہ۔ نہیں فاؤسٹ عزت اور دولت پر نظر رکھو۔

(فرشتے چلے جاتے ہیں)

فاؤسٹ۔ اوہ دولت کا خیال! میفسٹو میری کمک پر رہا تو کیا امدن پر میری حکومت نہ ہو جائے گی۔ خدا تجھے کیا نقصان پہونچا سکتا ہے فاؤسٹ تم تو ہر طرح پر محفوظ و مصئون ہو۔ بس اب شبہ کی گنجائش نہیں او میفسٹو میرے پاس آ اور ابلیس کا کوئی مژدہ سنا۔ کیا ابھی آدھی رات نہیں ہوئی میفسٹو آ۔ آ۔ میرے پاس آ۔ (میفسٹو آتا ہے) اچھا بتا اب تیرے سردار ابلیس کا کیا حکم ہے۔

میفسٹو۔ حکم یہ ہے کہ جب تک فاؤسٹ زندہ ہے میں اس کی خدمت میں رہوں اور اس کا مطیع و محافظ رہوں۔ اس طرح فاؤسٹ اپنی روح کی قیمت میں میری خدمات مول لیگا۔

فاؤسٹ۔ میں نے تو پہلے ہی سے اس کے لئے اپنی روح کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

میفسٹو۔ لیکن فاؤسٹ آپ کو یہ بات وصیت کے طور باضابطہ تحریر کرنی ہوگی اور ہبہ نامہ اپنے خون سے لکھنا ہوگا اور یہی ضمانت ہے جو ابلیس چاہتا ہے۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہوا تو پھر میں جہنم کو جہاں سے میں آتا ہوں اپس جاتا ہوں۔

فاؤسٹ۔ نہیں میفسٹو ــــ صبر کرو اور یہ بتاؤ کہ میری روح پر قابض ہونے سے تمہارے سردار ابلیس کو کیا حاصل ہوگا؟

میفسٹو۔ اس کی سلطنت میں توسیع ہوگی۔

فاؤسٹ۔ کیا یہی سبب ہے کہ تم پر اتنا اصرار کرتا ہے!

میفسٹو :۔ مغضوبین کیلئے یہ موجب راحت ہوتا ہے کہ جس غضب میں وہ مبتلا ہیں اس میں ان کے شریک حال اور بھی ہوں۔

فاؤسٹ :۔ کیا تمھیں کوئی تکلیف ایسی ہے جو دوسروں کو بھی اذیت پہنچاتی ہے؟

میفسٹو :۔ وہ تکلیف ایسی ہی ہے جیسی اور ارواح بشری کو ہوتی رہتی ہے۔ لیکن فاؤسٹ آپ یہ بتائیں کیا اس روح پر میرا قبضہ ہو جائیگا۔ اگر ایسا ہو تو پھر میں آپ کا خادم ہوں اور خدمت میں ہر وقت حاضر رہوں گا۔ اور ہماری عطیات ان سے زیادہ ہوں گے جن کے مانگنے کا آپ کو وہم و خیال بھی نہ گذریگا۔

فاؤسٹ :۔ اچھا میفسٹو میں اپنی روح تمھارے حوالے کرتا ہوں۔

میفسٹو :۔ تو پھر فاؤسٹ آپ ہمت کرکے اپنے بازو پر شگاف دیں، اور اس امر کے پابند ہوں کہ ایک خاص دن ابلیس آپ کی روح کا دعویدار ہو۔ پھر آپکا درجہ ابلیس کے برابر اعلیٰ اور ارفع ہو جائیگا۔

فاؤسٹ :۔ (جلدی سے اپنے بازو پر شگاف دیکر) لو میفسٹو تمھاری محبت میں یہ بھی گوارا ہے۔ میں اپنے بازو کے خون سے اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ میری روح ابلیس کے سپرد ہوتی ہے جو ابدی ظلمت کا سب سے بڑا سردار اور بادشاہ ہے۔ دیکھو میرے بازو سے خون کی بوندیں بہنے لگی ہیں۔ اور یہ خون میری آرزو کیلئے نیک فال ہو۔

میفسٹو :۔ مگر فاؤسٹ آپ کو جو کچھ لکھنا ہوگا وہ ایک ہبہ نامہ کی شکل میں ہونا چاہئے۔

فاؤسٹ :۔ ہاں میں یہی کرتا ہوں۔ (لکھتا ہے) لیکن میفسٹو ذرا دیکھو تو یہ خون جم چلا۔ اور اب اس سے آگے کچھ لکھا نہیں جاتا۔

میفسٹو :۔ میں آگ لاتا ہوں گرم کرنے سے خون ذرا سیال ہو جائیگا۔ (چلا جاتا ہے)

فاؤسٹ :۔ خون کے جم جانے سے کیا خبر نکلتی ہے۔ کیا میرا خون نہیں چاہتا کہیں یہ دستاویز لکھوں۔ یہ رقیق کیوں نہیں ہوتا تاکہ میں پھر لکھنا شروع کروں۔ یہاں تک لکھنے کے بعد کہ "فاؤسٹ اپنی روح تمھیں دیتا ہے"۔ خون جم گیا۔ خون تو نے کیوں نہیں دیتا۔ کیا تیری روح میری نہیں ہے۔ اچھا پھر لکھتا ہوں۔ فاؤسٹ اپنی روح دیتا ہے۔ (میفسٹو جلتے کوئلوں کی ایک انگیٹھی لاتا ہے)

میفسٹو :۔ فاؤسٹ آؤ اور خون گرم کرکے پھر لکھنا شروع کرو۔

فاؤسٹ :۔ ہاں اب خون رقیق ہو چلا۔ اب میں جلدی سے اس دستاویز کو ختم کرکے دیتا ہوں۔

میفسٹو :۔ کون جتن ہے جو میں اس کی روح حاصل کرنیکو نہ کروں گا (علیحدہ کہتا ہے)

فاؤسٹ :۔ لیجئے۔ ختم شد۔ یہ تحریر ختم ہوگئی۔ اور فاؤسٹ نے اپنی روح ابلیس کے حوالے کردی۔ مگر یہ میرے بازو پر کیا نظر آرہا ہے؟ "ارے انسان بھاگ" بھاگ کر کہاں جاؤں۔ اگر خدا کے پاس جاتا ہوں تو وہ فوراً مجھے وصل جہنم کردیگا مگر میرے تو اس کو دھوکہ ہوا۔ بازو پر کچھ لکھا نہیں ہے۔ لیکن صاف دیکھ رہا ہوں کہ بازو پر اس جگہ لکھا ہے کہ "انسان بھاگ"۔ لیکن فاؤسٹ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔

میفسٹو :۔ میں تماشا ایسا کرتا ہوں کہ فاؤسٹ کا دل خوش رہے (علیحدہ کہکر چلا جاتا ہے)

(میفسٹو پھر آتا ہے۔ بہت سے شیاطین ساتھ ہیں۔ وہ
بڑے بڑے خلعت اور تاج فاؤسٹ کو پیش کرتے ہیں۔
اور ناچ دکھا کر چلے جاتے ہیں)

فاؤسٹ :۔ میفسٹو کچھ بتاؤ اس تماشہ سے کیا مطلب تھا؟

میفسٹو :۔ سوائے تمھارا دل خوش کرنے کے اور کچھ غرض نہ تھی۔ اور یہ دکھانا منظور تھا کہ سحر کیا کیا کام کرسکتا ہے۔

فاؤسٹ :۔ تو کیا میں ان شیاطین کو جب چاہوں بلا سکتا ہوں؟

میفسٹو :۔ ہاں بلا سکتے ہو۔ اور ان سے بھی بڑھکر کام کرسکوگے۔

فاؤسٹ :۔ تو پھر تو ایسی ایسی ہزاروں روحیں اس پر قربان کی جاسکتی ہیں۔ اچھا میفسٹو یہ دستاویز موجود ہے جس میں جسم اور روح دونوں کے سپرد کرنیکا اقرار ہے مگر شرط یہ ہے کہ جو جو باتیں فریقین میں طے پائی ہیں ان سب پر تمھارا عمل رہیگا۔

میفسٹو :۔ فاؤسٹ میں ابلیس اور جہنم دونوں کی قسم کھاتا ہوں کہ جتنے قول اور اقرار اس عہدنامہ میں ہیں ان سب پر کاربند رہوں گا۔

فاؤسٹ :۔ تو اچھا میں یہ عہدنامہ پڑھتا ہوں تم سن لو (پڑھتا ہے) شرائط ذیل۔ پہلی بات یہ ہے کہ فاؤسٹ ایک ایسی ہستی ہے جو روح اور جسم دونوں رکھتی ہے دوسری شرط یہ ہے کہ میفسٹو اس کا خادم اور تابعدار رہیگا۔ اور اس کے ہر حکم کو بجا لائیگا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ فاؤسٹ جو کچھ منگوائیگا میفسٹو وہ حاضر کریگا۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ میفسٹو فاؤسٹ کے کمرہ میں اس طرح رہیگا کہ کسی کو نظر نہ آئے۔ اخیر شرط یہ ہے کہ فاؤسٹ پر وہ ہر وقت جس شکل و صورت میں چاہے حاضر ہوگا۔ میں مسمی جان فاؤسٹ وٹن برگ کا ڈاکٹر اس دستاویز کے ذریعہ اپنا جسم اور اپنی روح ابلیس شہزادہ مشرق اور اس کے ندیم خاص میفسٹو کے حوالے کرتا ہوں۔ اور منظور کرتا ہوں کہ آج سے چوبیس برس ختم ہونے تک جس قدر شرائط اس دستاویز میں تحریر ہیں ان میں فرق نہ آئیگا اس کے بعد فریق ثانی کو اختیار ہوگا کہ جون فاؤسٹ کا جسم و روح گوشت اور خون اور مال و متاع اپنے مسکن میں لیجائے جہاں کہیں وہ واقع ہو۔

میری قلم سے جان فاؤسٹ

میفسٹو: فاؤسٹ آپ کہیں کہ میں یہ دستاویز تمھیں دیتا ہوں۔

فاؤسٹ: ہاں لے لو اور شیطان تمھارا بھلا کرے۔

میفسٹو: اچھے دوست اب آپ کو جو کچھ درکار ہو وہ فرمائیں۔

فاؤسٹ: سب سے پہلا سوال تو میرا جہنم کے بارے میں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ جس جگہ کو جہنم کہتے ہیں وہ کہاں ہے؟

میفسٹو: آسمان کے نیچے ہے۔

فاؤسٹ: لیکن ٹھیک جگہ بتاؤ کہ کہاں ہے؟

میفسٹو: ان عناصر کے جگر میں ہے جہاں ہمیں عذاب دیا جاتا ہے اور ہمیشہ رہنا پڑتا ہے۔ دوزخ کی حدود نہیں ہیں اور نہ کوئی خاص جگہ ہے کہ اس کے گرد احاطہ کھنچا ہو۔ جہاں کہیں ہم ہیں وہیں دوزخ ہے اور جہاں کہیں دوزخ ہے وہاں ہمارا موجود ہونا لازمی ہے۔

فاؤسٹ: جانے بھی دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوزخ محض ایک داستان ہے۔

میفسٹو: ہاں آپ ایسا ہی خیال کرتے رہیں تاوقتیکہ تجربہ آپ کی رائے نہ بدلے۔

فاؤسٹ: تو کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ فاؤسٹ پر عذاب نازل ہوگا۔

میفسٹو: یہ بات ضروری ہے کیونکہ یہ دستاویز موجود ہے جس میں تم نے اپنی روح ابلیس کے حوالے کی ہے۔

فاؤسٹ: ہاں اور جسم بھی۔ مگر اس سے ہوتا کیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ فاؤسٹ اتنا بیوقوف ہے کہ حیات بعد الممات میں کسی عذاب کا متوقع ہو۔ دور کرو۔ یہ سب نامعقول باتیں ہیں اور بڑھیا بیویوں کی کہانیاں ہیں۔

میفسٹو: مگر فاؤسٹ میں آپ کے اس خیال کے خلاف ثبوت میں ایک مثال پیش کرسکتا ہوں۔ میں اس وقت عذاب میں ہوں اور جہنم میں ہوں۔

فاؤسٹ: دوزخ میں کیسے ہو۔ اگر یہی دوزخ ہے تو اس دوزخ میں عذاب کیلئے میں تیار ہوں۔ ہر حال میں چلتا پھرتا ہوں یا بات کرتا ہوں مگر باوجود اس کے میں ایک بیوی چاہتا ہوں جو ملک جرمانیہ میں بہت حسین و جمیل ہو کیونکہ اس وقت میں حالت مستی میں ہوں اور عورت کی خواہش غالب ہے۔ بغیر عورت کے زندگی مشکل ہے۔

میفسٹو: بیوی کیسی۔ مہربانی فرما کر یہاں بیوی کا ذکر نہ کریں۔

فاؤسٹ: نہیں پیارے میفسٹو ایک بیوی ضرور لا دے۔ کیونکہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔

میفسٹو: اچھا تو میں شیطان کا نام لیکر تجھے ایک بیوی لائے دیتا ہوں (چلا جاتا ہے)۔

(میفسٹو پھر آتا ہے اور ایک شیطان کو عورت کے بھیس میں حاضر کرتا ہے)

میفسٹو: کیوں فاؤسٹ تمھیں اپنی بیوی پسند ہے یا نہیں؟

فاؤسٹ: خدا اسے غارت کرے وہ تو آگ کو انگارہ ہے۔

میفسٹو: جاؤ بھی فاؤسٹ شادی تو ایک رسم و رواج کا کھلونا ہوتی ہے۔ اگر آپ کو میرا کچھ لحاظ اور مروت ہے تو اس خیال کو دل سے دور کردیں اور میں شہر کی بہترین حسین سے حسین شاہدان بازاری میں سے میں کسی حسینہ کو آپ کیلئے منتخب کرسکتا ہوں اور ہر صبح آپ کے بستر پر حاضر کرسکتا ہوں۔ اور یہ وہ ہوں گی جن کو آپ کی نظر اور آپ کا دل پسند کریگا۔ وہ ایسی ہی پاکدامن ہوں گی جیسی کہ پینی لوپ اور ایسی ہی عاقل و فرزانہ جیسی کہ ملکہ سبا تھی۔ اور اتنی ہی حسین ہونگی جیسے کہ خود ابلیس راندۂ درگاہ ہونے سے پیشتر تھا۔ اس کتاب کو پکڑو اور اچھی طرح اس کا مطالعہ کرو۔ (کتاب دیتا ہے) ان سطروں کے بار بار پڑھنے سے زر و دولت ملیگا۔ اور اگر اس دائرہ کو زمین پر کھینچو گے تو تجھ سے طوفان گرج بجلی زمین پر پیدا ہوں گے۔ اس عبارت کو تین مرتبہ پورے اعتقاد سے پڑھو گے تو مسلح آدمی آپ کے سامنے آئیں گے اور جو کچھ آپ انھیں حکم دیں گے بجا لائیں گے۔

فاؤسٹ: شکریہ۔ لیکن میں ایسی کتاب دیکھنا چاہتا ہوں جس میں تمام جنتر منتر اور برزخ کی خبریں ہوں تاکہ جس وقت چاہوں روحوں کو بلا سکوں۔

میفسٹو: لیجئے یہ سب چیزیں بھی یہیں موجود ہیں (ورق الٹ کر بتاتا ہے)

فاؤسٹ: اچھا مجھے ایک ایسی کتاب چاہئے جس میں ہر قسم کی علامات سحر اور اجرام فلکی اور ستارے موجود ہوں تاکہ میں ان کی گردش اور اعمال میں واقفیت پیدا کر دوں۔

میفسٹو: لیجئے یہ بھی اسی کتاب میں یہاں موجود ہیں (ورق الٹ کر مقام بتاتا ہے)

فاؤسٹ: بس ایک کتاب مجھے اور چاہیئے جس میں ان کل پودوں نباتات اور جڑی بوٹیوں اور درختوں کا حال موجود ہو جو زمین پر اگتے ہیں۔

میفسٹو: وہ بھی اسی میں موجود ہیں۔

فاؤسٹ: شاید تمھیں دھوکا ہوا ہے۔

میفسٹو: نہیں جناب۔ لیجئے یہ موجود ہیں (ورق الٹ کر مقام بتاتا ہے)

چھٹا منظر

فاؤسٹ کا گھر

فاؤسٹ اور میفسٹو اندر آتے ہیں۔

فاؤسٹ: جب میں آسمان کو دیکھتا ہوں تو دل پشیمان ہوتا ہے اور اسے شریر میفسٹو تجھ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اس وجہ سے کہ تو نے مجھے ان خوشیوں سے محروم کردیا ہے۔

میفسٹو: فاؤسٹ یہ کیسے؟ کیا تمھارا خیال ہے کہ عرش آسمان اور جنت کچھ بہت

بی عظیم الشوکت چیزیں ہیں۔ فاؤسٹ آپ سمجھ لیں کہ وہ آپ سے یا کسی انسان سے جو زمین پر رہتا ہے آدمی بھی حسین و جمیل نہیں ہیں۔

فاؤسٹ:۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟

میفسٹو:۔ یہ کل چیزیں انسان کیلئے بنائی گئی تھیں۔ اس سے سمجھنا چاہیے کہ انسان ان سے زیادہ حسین و باوقعت ہے۔

فاؤسٹ:۔ اگر وہ انسان کیلئے بنائی گئی تھیں تو پھر گویا میرے لئے بنائی گئی تھیں۔ میں تمھارے اس سحر و جادو کو ترک کر کے توبہ اور استغفار میں مصروف ہوتا ہوں۔

(بھلائی کا فرشتہ اور بُرائی کا فرشتہ دونوں آتے ہیں)

بھلائی کا فرشتہ:۔ فاؤسٹ توبہ کر اور نادم ہو خدا تجھ پر رحم کریگا۔

بُرائی کا فرشتہ:۔ فاؤسٹ تو ایک روح ہے خدا کو تجھ پر کبھی رحم نہیں آسکتا۔

فاؤسٹ:۔ یہ میرے کانوں میں کوئی کیا کہہ رہا ہے کہ تو ایک روح ہے اور خدا کو تجھ پر رحم نہیں آسکتا۔ میں اگر شیطان بھی ہوں تو خدا مجھ پر رحم کریگا۔ ہاں خدا مجھ پر رحم کریگا اگر میں توبہ واستغفار کروں۔

برائی کا فرشتہ:۔ مگر فاؤسٹ کبھی توبہ نہ کریگا۔ اور کبھی نادم و پشیمان نہ ہوگا۔ (فرشتے چلے جاتے ہیں)

فاؤسٹ:۔ کیا میرا دل ایسا سخت ہوگیا ہے کہ میں توبہ نہیں کرسکتا۔ نجات ایمان اور عرش کا نام میری زبان سے نہیں نکل سکتا۔ میرے کانوں میں تو خوفناک آوازیں گونج رہی ہیں "فاؤسٹ تو ہمیشہ کو ملعون و مردود ہوا"۔ اب تو تلوار، زہر، خنجر، تفنگ اور پھانسیوں کی رسیوں اور زہر میں بجھی ہوئی شمشیروں کے اور کچھ نہ رہا۔ اب یہ سب چیزیں میرے سامنے رہتی ہیں کہ اپنی جان دوں۔ میں تو اس سے پہلے کبھی کا ہلاک ہوچکا ہوتا اگر مسرت و شادمانی ناامیدی پر نہ غالب ہوگئی ہوتیں۔ میں نے پرانے نابینا شاعر باکمال ہومر کو سکندر کے عشق اور پارس کی معشوقہ رودی نون کی موت کے حالات گنگناتے ہوئے سنا ہے۔ اور میں نے ان مغنیوں کے راگ بھی سنے ہیں جنھوں نے اپنے شیریں ساز بجا کر تھیبز کی فصیلیں تعمیر کرادی تھیں۔ اور جو میفسٹو کے ساتھ گاتا بجاتا تھا۔ پھر میں ابھی کیوں مروں یا ناامید ہوں۔ اچھا میں نے کیا ارادہ کرلیا ہے کہ فاؤسٹ کبھی توبہ نہ کریگا میفسٹو آتا کہ پھر اس مسئلہ پر باہمی گفتگو ہوجائے۔ اور اس اعلیٰ اور ارفع علم نجوم پر بحث و مباحثہ ہو۔ اچھا بتاؤ کہ کیا مہتاب کے اوپر بہت سے افلاک ہیں۔ کیا تمام اجرام فلکی ایک کرہ کی شکل میں واقع ہوئے ہیں۔ اور ان کا مادہ بھی وہی ہے جو اس کرۂ ارض کا ہے؟

میفسٹو:۔ جو عناصر کا حال ہے وہی ان کُروں کی کیفیت ہے۔ یہ کرے ایک دوسرے میں بند ہوکر کل ایک ہی کرہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور فاؤسٹ غور کرو کہ یہ مجموعہ ایک ہی محور پر گردش کرتا ہے۔ اور اس محور کے سروں کو دنیا کے قطبین کہتے ہیں۔ اور زحل مریخ اور مشتری خیالی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ سب سیارے ہیں۔

فاؤسٹ:۔ میفسٹو یہ تو بتاؤ کہ کیا بلحاظ سمت اور اوقات گردش ان کی گردش ایک ہی ہے؟

میفسٹو:۔ ہاں یہ سب مل کر چوبیس گھنٹے میں دنیا کے محور کے گرد مشرق سے مغرب کی سمت میں گردش کرتے ہیں لیکن منطقۃ البروج کے دور پر ان کے وقت اختلاف ہوتا ہے۔

فاؤسٹ:۔ بالکل لغو بات ہے۔ یہ حقیر مسائل تو وہ ہیں جنھیں ویگنر حل کر سکتا ہے۔ کیا میفسٹو تم میں اس سے زیادہ قابلیت نہیں ہے۔ کون شخص ہے جو سیاروں کی دوہری حرکت سے واقف نہیں۔ پہلی حرکت ایک دن میں تمام ہوجاتی ہے جسے یوم طبعی کہنا درست ہوگا۔ دوسری حرکت کی کیفیت یہ ہے کہ زحل تیس برس میں مریخ چار برس میں مشتری بارہ برس میں شمس زہرہ اور عطارد ایک سال میں اور قمر اٹھائیس دن میں پوری کرلیتے ہیں۔ یہ کل باتیں آجکل کے مبتدیوں کے مفروضات ہیں۔ مگر تم یہ بتاؤ کہ کیا ہر کُرہ بذاتہ ایک دنیا ہے جس پر صاحب عقل و شعور مخلوق آباد ہے۔

میفسٹو:۔ ہاں ایسا ہی ہے۔

فاؤسٹ:۔ عالم میں کتنے کُرے اور افلاک ہیں؟

میفسٹو:۔ نو ہیں سبع سیارہ، فلک الافلاک اور عرش بریں۔

فاؤسٹ:۔ اچھا میرے اس سوال کا جواب دو کہ اقتران، مقابلات اوضاع کسوف و خسوف یہ سب ایک ہی وقت میں کیوں نہیں ہوتے۔ اور کیا وجہ ہے کہ کسی سال میں یہی چیزیں زیادہ ہوتی ہیں اور کسی سال میں کم؟

میفسٹو:۔ حرکت کا یہ تفاوت مطابق اپنی اپنی مذہب کے ہوتا ہے۔

فاؤسٹ:۔ میرے سوال کا جواب ہوگیا۔ اچھا یہ بتاؤ اس عالم کا بنانیوالا کون ہے؟

میفسٹو:۔ یہ بات میں نہ بتاؤں گا۔

فاؤسٹ:۔ نہیں پیارے میفسٹو ضرور بتانا ہوگا۔

میفسٹو:۔ یہ بات مجھ سے نہ پوچھو۔ یقیں میں یہ نہ بتاؤں گا۔

فاؤسٹ:۔ نالائق کیا تجھ میں اور مجھ میں یہ شرط نہیں ہوگئی ہے کہ میں جو کچھ پوچھوں گا تجھے بتانا ہوگا؟

میفسٹو:۔ ایسی شرط کرنی ہماری رسموں کیخلاف نہیں لیکن بانئ عالم کا بتانا خلاف ہے۔ فاؤسٹ اب جہنم کا خیال کریں کیونکہ تم مردود ہوچکے ہو (بھلائی کا فرشتہ اور برائی کا فرشتہ آتا ہے)

بھلائی کا فرشتہ:۔ فاؤسٹ خدا کا خیال کر جس نے دنیا بنائی ہے۔

میفسٹو:۔ جو کچھ میں نے کہا اسے یاد رکھنا۔

فاؤسٹ :۔ ارے ملعون۔ روح جیا جلتے دوزخ میں چلی جا۔ تو ہی ہے جس نے فاؤسٹ کی روح لیکر جب کہ وہ تکلیف میں تھا مردود کیا۔ اب بھی کچھ دیر نہیں ہوئی ہے

برائی کا فرشتہ :۔ نہیں وقت گذر چکا ہے۔

بھلائی کا فرشتہ :۔ نہیں ابھی وقت ہے۔ فاؤسٹ توبہ کرسکتا ہے۔

برائی کا فرشتہ :۔ اگر تو نے توبہ کی تو شیاطین آکر تیرے ٹکڑے اڑادینگے۔

بھلائی کا فرشتہ :۔ توبہ کرلے اور کوئی شیطان تیری کھال ادھیڑ نہیں سکتا

(فرشتے چلے جاتے ہیں)

فاؤسٹ :۔ اے مسیح نجات کے دینے والے۔ بدنصیب مصیبت زدہ فاؤسٹ کی روح کو بچالے۔

(ابلیس، بلیزی باب اور میفسٹو آتے ہیں)

ابلیس :۔ مسیح اس روح کو نہیں بچا سکتا۔ اگر وہ انصاف کرنیوالا ہے اور سوائے میرے کوئی دوسرا نہیں جسے اس معاملہ میں دلچسپی ہو۔

فاؤسٹ :۔ تو کون ہے جو ایسا خوفناک معلوم ہو رہا ہے؟

ابلیس :۔ میں ابلیس ہوں اور یہ بلیزی باب ہیں جو دوزخ میں میرے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں۔

فاؤسٹ :۔ ارے کیا یہ بدبخت میری روح کو لینے آئے ہیں؟

ابلیس :۔ نہیں ہم اس لئے آئے ہیں کہ تو نے ہمیں نقصان پہونچایا ہے۔ تو مسیح کا نام لیتا ہے اور اس میں تو اپنے وعدے کے خلاف کرتا ہے۔ تجھے خدا کا خیال دل میں نہ لانا چاہیئے۔ شیطان کا خیال دل میں رکھ۔

بیلیزی باب :۔ اور اس کے ساتھی کا۔

فاؤسٹ :۔ اچھا اب ایسا نہ ہوگا۔ معاف کرو۔ خطا ہوئی۔ اور اب فاؤسٹ اقرار کرتا ہے کہ کبھی آسمان کی طرف نہ دیکھے گا۔ کبھی خدا کا نام نہ لیگا اور نہ اس سے التجا کریگا۔ انجیل کو جلادے گا اور قسیسوں کو قتل کریگا۔ اور اپنی تابع روحوں کے ذریعہ خدا کے کلیساؤں کو مسمار کریگا۔

ابلیس :۔ ہاں ایسا ہی کرتا رہ ہم تجھے بہت خوش کریں گے۔

بیلیزی باب :۔ فاؤسٹ ہم اس وقت جہنم سے آرہے ہیں تاکہ تجھے ایک تماشا دکھلائیں۔ بیٹھ جا اور ساتوں مہلک گناہ اپنی اصلی شکل میں تیرے سامنے آتے ہیں۔

ابلیس :۔ بہشت اور آفرینش کا تذکرہ مت کر اور اس تماشے کو بغور دیکھ، بجز شیطان کے کسی کا ذکر زبان پر نہ لا۔ آ۔ ادھر چلا آ۔ سات مہلک گناہ یکے بعد دیگرے داخل ہوتے ہیں۔

بلیزی باب :۔ اچھا فاؤسٹ اب ان سب کے نام اور خواص کا علم حاصل کرو۔

فاؤسٹ :۔ (پہلے گناہ سے) تم کون ہو؟

تکبّر :۔ میں تکبّر ہوں۔ میرے والدین نہیں ہیں۔ والدین رکھنے سے مجھے نفرت ہے۔ میں اوڈ کے پسّو کی طرح ہوں۔ جو عورت کے جسم کے ہر گوشہ میں پہنچ جاتا ہوں۔ کبھی مصنوعی بالوں کی ٹوپی کی طرح اس کے سر پر جا بیٹھتا ہوں۔ اور کبھی گردن میں ہار بن کر لٹک رہتا ہوں۔ اور کبھی پروں کی پنکھیا بنکر اس کے لبوں کا بوسہ لیتا ہوں۔ اور کبھی میں بے آستینوں والی قمیص میں جا گھستا ہوں اور جو چاہتا ہوں سو کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کیا کچھ نہیں کرتا۔ لیکن شرم۔ یہ کیسی کوٹھیلی ہے۔ اب میں کچھ نہ کہوں گا جب تک کہ فرش پر عطر نہ چھڑکا ہو گا۔ اور دیبا و حریر کا فرش نہ ہوگا۔

فاؤسٹ :۔ اچھا اور یہ دوسرا گناہ کیا ہے؟

طمع :۔ میں طمع ہوں۔ میں ایک گنوار کے صُلب سے ایک چرمی کیسہ میں پیدا ہوا تھا۔ اور اگر میری آرزوئیں پوری ہوسکیں تو میں چاہوں گا کہ یہ سارا گھر اور اس کے سب آدمی سونا ہوجائیں تاکہ میں اسے اپنے صندوق میں مقفل کردوں۔ اے پیارے سونے۔

فاؤسٹ :۔ اچھا تم تیسرے گناہ تم کیا ہو؟

غصّہ و غضب :۔ میں غصہ و غضب ہوں۔ میرا کوئی باپ ہے نہ ماں۔ میری پیدائش کو آدھا گھنٹہ بھی نہیں گذرا تھا کہ میں ایک شیر کے منہ سے نکل پڑا۔ اور اس وقت سے آجتک میں دنیا میں دوڑا دوڑ ہاتھ میں یہ تلواریں لئے پھرتا ہوں۔ اور جب کوئی لڑنے کو نہیں ملتا تو اپنے ہی تئیں زخمی کرتا ہوں۔ میری جائے ولادت جہنم ہے اور اسی کی عزت لازمی رکھو۔ کیونکہ تم میں سے بعض جہنم میں ہمارے باپ بنیں گے۔

فاؤسٹ :۔ اچھا تم چوتھے گناہ کیا ہو؟

حسد :۔ میں حسد ہوں۔ میرا باپ چمنیاں صاف کرنیوالا اور ماں مچھیرن تھی۔ میں پڑھ لکھ نہیں سکتا اس لئے چاہتا ہوں کہ جتنی کتابیں دنیا میں ہیں سب جلا ڈالی جائیں۔ جب میں دوسروں کو کھاتے دیکھتا ہوں تو دُبلا ہو جاتا ہوں۔ اے کاش اس دنیا میں قحط پڑجاتا اور سب بھوکے مرجاتے اور صرف میں زندہ رہتا تو پھر آپ دیکھتے کہ میں کیسا موٹا تازہ ہوجاتا۔ ہائیں تم بیٹھے ہو اور میں کھڑا ہوں اس کا سخت بدلا لوں گا۔

فاؤسٹ :۔ اے حاسد نابکار دُور ہو۔ اچھا تم پانچویں گناہ کیا ہو؟

پُرخوری :۔ میں پُرخوری ہوں میرے ماں باپ مرچکے ہیں۔ اور انھوں نے ایک پیسہ تک میرے لئے نہ چھوڑا۔ صرف آذوقہ اور نبیذ مل جاتا ہے۔ یعنی دن میں تیس وقت کا کھانا کھانے کو اور دس وقت شراب پینے کو مل جاتی

ہے۔ یہ غذا انسان کیلئے بہت کم ہے۔ میرے بزرگ شاہی خاندان سے تھے۔ میرا دادا سور کی نمک لگی خشک ران تھا۔ اور میری دادی شراب کا پیپا تھی۔ میرے رشتہ داروں میں آپ پیٹر پیچار مازی اور مارٹن لحم اسفر تھے۔ لیکن میری روحانی ماں تو کیا بات ہے۔ وہ تو بڑی ہی شریف عورت تھی اور ہر شہر اور قصبہ میں لوگ اس سے بہت ہی محبت کرتے تھے ان کا نام بیگم مارجوری مارچ بیر شراب تھا۔ اچھا فاؤسٹ اب آپ نے میری کل نسل کی باتیں سن لیں۔ آپ ہمیں کھانا کھلائیں۔

فاؤسٹ:۔ کھانا کیسا؟ میں تو تجھے پھانسی پر چڑھتا دیکھتا ہوں تو بھلا۔ تو تو میرا سارا کھانا ختم کردیگا۔

پُرخوری:۔ شیطان تیرے گلے میں پھندا ڈالے۔

فاؤسٹ:۔ پُرخوری تو اپنا گلا خود کیوں نہیں گھونٹ لیتی۔ اچھا چھٹا گناہ آپ کون ہیں

کاہلی:۔ میں کاہلی ہوں۔ میں پانی کے کنارے دھوپ میں پیدا ہوئی تھی۔ اور وہیں پر اب تک آرام سے پڑی رہی۔ آپ نے وہاں سے یہاں بلانے میں مجھے بڑی تکلیف دی ہے اچھا اب پُرخوری اور عیش پرستی کو بلائیے کہ مجھے وہیں اپنی آرام کی جگہ پہونچا دیں۔ اب میں ایک حرف زبان سے نہ نکالوں گی۔ چاہے میرے بولنے سے کسی بادشاہ کی رہائی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔

فاؤسٹ:۔ اچھا آپ اُرت بلائی۔ ساتویں معصیت آپ کون ہیں؟

عیّاشی:۔ کیا مجھ سے پوچھتے ہیں۔ میں تو وہ ہوں جو ایک انچ جیتے گوشت کو ایک بیمانہ مانی بریاں سے بہتر سمجھتی ہوں۔ میرے نام کا پہلا حرف ع ہے۔

ابلیس:۔ اچھا جاؤ سب جہنم کو چلے جاؤ۔ (گناہ سب چلے جاتے ہیں) فرمائیے فاؤسٹ آپ ان ساتوں کو کیسا پسند کرتے ہیں؟

فاؤسٹ:۔ یہ تو میری روح کھائے جاتے ہیں۔

ابلیس:۔ نہیں فاؤسٹ۔ جہنم میں بڑے بڑے عیش و آرام ہیں۔

فاؤسٹ:۔ کیا میں جہنم کو دیکھ سکتا ہوں؟ اور دیکھ کر پھر وہاں سے اگر صحیح و سلامت واپس آ گیا تو پھر مجھے کیسی خوشی ہوگی۔

ابلیس:۔ ہاں ہاں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آدھی رات کو میں آپ کو بلوا لوں گا۔ اس اثنا میں یہ کتاب آپ اپنے پاس رکھیں۔ اور اسے غور سے از اوّل تا آخر پڑھ جائیے پھر آپ جو شکل چاہیں گے وہی اختیار کر سکتے ہیں۔

فاؤسٹ:۔ بہت بہت شکریہ۔ اے زور و طاقت والے ابلیس اس کتاب کو میں جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔

ابلیس:۔ اچھا رخصت۔ شیطان کا خیال ہر وقت دل میں رکھیو۔

فاؤسٹ:۔ رخصت اے ابلیس بزرگ میفسٹو ادھر آؤ۔ (سب چلے جاتے ہیں)

ساتواں منظر

روبن ایک کتاب لئے آتا ہے۔

روبن:۔ ارے ڈک ذرا گھوڑوں کو جب تک میں آؤں ذرا دیکھنا رہ۔ مجھے اس وقت ڈاکٹر فاؤسٹ کی جادو کی کتابوں میں سے ایک کتاب لے چلنی ہے اور اب دیکھنا آگے چل کر ہمیں کیسے کیسے شیطان دیکھنے پڑیں گے۔ (ڈک آتا ہے)

ڈک:۔ روبن تمہیں ادھر آنا چاہیئے۔ گھوڑوں کو ٹہلاؤ۔

روبن:۔ میں گھوڑے ٹہلاؤں۔ مجھے تو اس کام سے نفرت ہے۔ علاوہ اس کے اور کام ہاتھ تلے ہیں۔ گھوڑے اگر چاہیں تو خود ٹہل سکتے ہیں۔ کتاب میں سے پڑھتا ہے الف بجائے خود۔ پھر دہ میں وہ بجائے خود۔ ارگن گورگن سے انکار کر۔ ابے جاہل ان پڑھ سرائے کے سائیس مجھ سے دور کھڑا رہ۔

ڈک:۔ یہ تمہارے پاس کیا چیز ہے۔ کیا کوئی کتاب ہے۔ تم تو اس کا ایک حرف بھی نہیں پڑھ سکتے۔ کیوں سچ کہتا ہوں نا؟

روبن:۔ یہ تو ابھی دیکھ لے گا۔ کنڈل سے باہر رہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے حسن میں پھنسنا پڑے۔

ڈک:۔ واللہ کچھ عجب نہیں۔ ارے یار اس حماقت کو چھوڑ۔ اگر مالک آ گیا۔ تو واللہ وہ تجھ پر جادو کریگا۔

روبن:۔ میرا مالک مجھ پر جادو کرے۔ سن لے اگر مالک آیا تو میں فوراً اس کے سر پہ دو سینگ ایسے لگا دوں گا کہ تو نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھے ہونگے۔

ڈک:۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مالک کی جورو پہلے ہی اپنے خاوند کے سر پر دو سینگ لگا چکی ہے۔

روبن:۔ ہاں ہم ہی نہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی باتوں کا کھوج لگاتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کہنے پر تیار ہوں تو پھر۔

ڈک:۔ تجھے موت سمجھانے۔ میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ تو اس عورت کے پیچھے یوں ہی نہیں پڑا پھرتا۔ مگر روبن یہ تو بتا کہ کیا واقعی یہ جادو کی کتاب ہے؟

روبن:۔ مجھ سے جو کام تجھے لینا ہے وہ بتا۔ میں وہ کام کردوں گا۔ اگر ننگا ناچنا ہے تو کپڑے اتار ڈال۔ اور پھر میں تجھ پر ابھی جادو کئے دیتا ہوں۔ اگر تو شراب خانہ میں میرے ساتھ چلے گا تو تجھے سفید شراب۔ سرخ شراب۔ کلارٹ شراب۔ اور طرح طرح کی شرابیں پلاؤں گا اور تم ایک پیسہ بھی اس کی قیمت کا نہ دوگے۔

ڈک:۔ ارے بہادر واہ تیرے کیا کہنے۔ میں تو اس وقت ایسا پیاسا ہوں جیسے کتا ہو۔

روبن:۔ اچھا آؤ تو پھر چلیں۔ (چلے جاتے ہیں)

(طائفہ آتا ہے)

طائفہ:۔ صاحب علم و فضل فاؤسٹ علم ہیئت کے رازہائے سربستہ کو جاننے کیلئے جو خدائے یہود کے صحیفہ فلک الافلاک میں درج ہیں کوہ المپس کی چوٹی پر پہنچا۔ یہاں وہ ایک آگ کی طرح چمکتے رتھ میں رونق افروز ہے جو اژدہوں کے شانوں کی قوت سے حرکت کرتا ہے۔ اس نے بادلوں، سیاروں اور ستاروں، طبقات معقول اور فلک کے ہر سمت اور گوشے کا ذرے کے دامن درخشاں سے لیکر فلک اور ثوابت و سیارہ تک معائنہ کرتا ہے۔ اور اس کی تیز گردش کے ساتھ خود بھی قطبین کے درمیان مشارق سے مغرب کی طرف گردش کرتا ہے۔ رتھ کے اژدہے تیز رفتاری سے چل کر آٹھ دن کے اندر پھر فاؤسٹ کو اپنے مسکن پر لے آتے ہیں۔ وہ اپنے خاموش اور ساکن مسکن میں زیادہ دن قیام نہیں کرتا۔ کہ اس محنت و جفاکشی کے بعد کچھ دیر آرام کرے۔ لیکن نئے نئے مہام کا شوق پھر اسے اپنے مسکن سے باہر نکالتا ہے اور پھر وہ ایک اژدہے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جو اپنے مضبوط پروں سے ہوا چیرتا ہوا اڑتا ہے اس مقام پر آتا ہے جہاں وہ فن نگارش نظام عالم کا ثبوت دیتا اور اس فن میں سواحل بحر اور دنیا کی حدود سلطنت کی پیمائش کی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے وہ اس کام کیلئے شہر روما میں وارد ہوگا کہ پاپائے روما سے ملاقات کرکے اس کے دربار کے طریقے معائنہ کرے اور مقدس پطرس کی ضیافت میں شرکت کرے جو آجتک بہت مذہبی تزک و احتشام سے ہوتی رہتی ہے۔

آٹھواں منظر

پاپائے مقدس کا خلوت کدہ

فاؤسٹ اور میفسٹو آتے ہیں۔

فاؤسٹ:۔ میرے اچھے میفسٹو اب ہم عالی شان شہر ترے سے گذر چکے ہیں جس کے گرد پہاڑوں کی ہوادار اور پرفضا چوٹیاں حلقہ کئے ہیں۔ جس کی شہر پناہ سنگ چقماق سے بنی ہے۔ جس کے گرد بڑی گہری خندقیں اور فصیلیں ہیں تاکہ دشمن شہر پر غلبہ نہ پاسکے۔ یہاں ہم نے دریائے سین کو دریائے رون میں گرتے دیکھا۔ جس کے کنارے کنارے دور تک تاکستان کھڑے ہیں اور بیلوں میں انگوروں کے خوشے لٹک رہے ہیں۔ روما سے نیپلز اور پھر سادہ الداراور پرفضا شہر کمپانیہ جس کے مکان نظر کیلئے حسین اور شاندار ہیں۔ بازار سیدھے چلے گئے ہیں اور بہترین اینٹوں کا فرش لگا ہوا ہے۔ یہ بازار شہر کو چار برابر کے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہاں ہم نے مارو کا سنہری مقبرہ دیکھا اور وہ راستہ دیکھا جو ایک میل تک اس نے چٹانوں کو تراش کر ایک رات میں تیار کرایا تھا۔ پھر وہاں سے وینس اور پیدوا اور دوسرے شہروں کو جانا ہوا۔ ایک شہر ایسا دیکھا جس میں ایک عالی شان ہیکل کھڑا تھا۔ اس کی بلندی اتنی تھی کہ ستاروں کے دل میں بھی خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اس تعمیر کے در و دیوار رنگ برنگ کے پتھروں کے ہیں۔ اور اونچی چھت پر عجیب و غریب زرکاری ہوئی ہے۔

سو اس طرح فاؤسٹ نے اپنا وقت صرف کیا۔ لیکن میفسٹو بتاؤ کہ اس منزل کا نام کیا ہے۔ کیا تم نے جیسا کہ میں نے پہلے حکم دیا تھا مجھے شہر روما کی شہر پناہ کے اندر پہونچا دیا ہے؟

میفسٹو:۔ ہاں میں نے آپ کو شہر روما کے اندر پہونچا دیا ہے۔ اور اس خیال سے کہ سامان بھی ساتھ رہے میں نے قیام کیلئے پاپائے مقدس کا خلوت کدہ مخصوص کر لیا ہے۔

فاؤسٹ:۔ مجھے امید ہے کہ مقدس باپ ہمارے آنے سے خوش ہونگے۔

میفسٹو:۔ خوش ہوں یا ناخوش ہم نے یہی کیا ہے۔ ہم ان سے نڈر اور بیباک ہو کر تنگ کر سکتے ہیں۔ اچھا فاؤسٹ اب آپ کو یہ بات بتانے کیلئے ہے کہ روما میں کیا چیزیں دیکھنے اور دیکھکر خوش ہونے کی ہیں۔ سنئے کہ روما کا شہر سات پہاڑوں پر واقع ہے۔ اور شہر کی تعمیروں کی بنیاد انھیں پہاڑوں پر قائم ہے۔ شہر کے بیچ میں سے دریائے ٹائبر پیچ و خم کھاتا ہوا گذرتا ہے اور اس کے رہگذر نے شہر کے دو حصے کر دئے ہیں۔ اور ایک حصے سے دوسرے حصے میں آسانی سے جانے کیلئے دریا پر چار عالی شان پل بنے ہیں۔ ان میں سے ایک پل جسے انجیلو کا پل کہتے ہیں اس پر ایک مضبوط قلعہ بنا ہے۔ اس قلعہ کی چار دیواری میں سامان حرب کا بکثرت ذخیرہ ہے۔ اور دوہری دوہری توپیں پیتل کی ڈھلی ہوئی تھیں۔ اور ان کی فہرست شمار میں اتنی ہے جتنے کہ سال میں دن ہوتے ہیں رکھی ہیں اور بڑے بڑے سنگین اہرام رکھے ہیں جو سیزر افریقہ سے لایا تھا۔

فاؤسٹ:۔ اب میں ان سلطنتوں کی قسم کھاکر جن پر جہنم کی حکومت ہے یعنی سٹکس اور ایکیرون اور آگ بھری جھیلوں اور ہمیشہ جلنے والی فلی گی تھون کی قسم کھاکر کہتا ہوں کہ میں شہر روما کا درخشاں موقع اور اس کی مشہور و معروف یادگاروں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ بس آؤ چلو سیر کریں۔

میفسٹو:۔ نہیں فاؤسٹ ابھی ٹھہرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھیں پاپا سے ملاقات کرنی ہے۔ اور مقدس پطرس کی ضیافت میں شرکت کرنی ہے۔ جو آج روما اور اٹلی میں پاپا کی فتحیابی کی خوشی میں بڑی دھوم سے ہونیوالی ہے۔

فاؤسٹ:۔ پیارے میفسٹو یہ خبر تم نے ایسی سنائی ہے کہ میرا دل خوش ہو گیا۔ جب تک میں اس دنیا میں ہوں تو مجھے وہ سب چیزیں جن سے انسان کا دل خوش ہوتا ہے انھیں دکھا کر میرا جی بھر دے۔ میں یہ چوبیس برس کی آزادی کا زمانہ ہر طرح کے عیش و نشاط میں بسر کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ فاؤسٹ کا نام جب تک یہ رونق دنیا قائم ہے دور دور کے ملکوں میں تعریف کے ساتھ روشن رہے۔

میفسٹو:۔ یہ بات خوب کہی۔ فاؤسٹ آئیے آپ میرے قریب کھڑے ہو جائیں اور پھر وہ سب ایک ایک کرکے آپ کی نظر کے سامنے سے گذرنے لگیں گے۔

فاؤسٹ:۔ نہیں شریف میفسٹو ذرا ٹھہرو اور میری درخواست منظور کرو۔

اور پھر میں چلوں گا۔ تم جانتے ہو کہ آٹھ دن کے اندر اندر ہم نے آسمان زمین اور جہنم کی شکلیں دیکھ لیں۔ ہماری سواری کے اژدہے اتنے اونچے اڑے کہ جب میں بلندی سے نیچے دیکھنے لگا تو یہ زمین ذرا سی ہتھیلی سے زیادہ بڑی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہاں سے ہم نے دنیا کی بادشاہتوں کو دیکھا اور جن چیزوں کو میں آنکھ سے دیکھ کر خوش ہوتا وہ سب وہاں سے دیکھی ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اسی تماشے میں مجھے تم ایسا تماشا کرنا بتاؤ کہ یہ مغرور پاپا فاؤسٹ کی عقل بھی معلوم کرے کہ وہ کیسی ہے۔

میفسٹو: ایسا ہی ہونا چاہئے۔ لیکن فاؤسٹ ابھی یہاں قیام کرو۔ اور پاپا کی فتوحات کا معائنہ کرو جس کے جلوس سامنے سے گذر رہے ہیں۔ اور پھر جیسا تمہارا دل چاہتا ہے کوئی ترکیب ایسی نکالو اور اپنے فن میں ہوشیاری کے ساتھ کوئی کارروائی ایسی ہو کہ اس کا یہ سب غرور ڈھے جائے۔ اور اس کے تمام راہبوں کی شکل بندر کی سی ہو جائے۔ اور وہ پاپا کے سہ گوشہ تاج کے گرد جست وخیز کریں۔ اور پادری جو ساتھ ہیں ان کے گلے کی تسبیحوں کے دانے اچھل اچھل کر ان کی جبینوں پر لگیں۔ پاپا پر کچھ نائبوں کے سر پر سینگ لگا دو یا کوئی اور ایسی ہی شرارت جو تمہیں سوجھے کرو۔ میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔ سنو وہ جلوس آرہا ہے۔ آج کا دن روما میں تمہارا اندراج رہے گا۔

(پاپا کے نائبین۔ اساقفہ بعض کے ہاتھوں میں صلیبیں ہیں اور بعض کے پاس سنول ہیں۔ راہب اور قسیس جلوس میں گاتے جاتے ہیں۔ پھر پاپا کی سواری آتی ہے۔ اس کے بعد ہنگاریہ کا بادشاہ ریمنڈ مع برونو کے جو زنجیروں میں جکڑا ہوا ساتھ آتا ہے)

پوپ: سواری اترنے کیلئے پائیدان رکھو۔

ریمنڈ: برونو تم پائیدان بن کے سامنے جھک جاؤ۔ تاکہ تقدس مآب تمہاری پشت پر پاؤں رکھکر سواری سے اتریں۔ پاپا سنٹ پطرس کی کرسی اور آسمانی ریاست ہیں۔

برونو: ارے موذی آسمانی ریاست تو میری ہے اور اس طرح میں پطرس کے سامنے جھکتا ہوں۔ تیرے لئے اے پاپا میں نہیں جھکتا۔

پاپا: اس طرح تو میرے اور پطرس کیلئے زمین پر جھک ورنہ پاپائے عظمت و بزرگی کے سامنے خفیف اور ذلیل ہو گا۔ دیکھو اس طرح سینٹ پطرس کا وارث برونو کی کمر پر پاؤں رکھکر اپنی سواری سے اترتا ہے۔ نفیر بجاؤ۔

(جب پاپا سواری سے اتر کر سینٹ پطرس کی کرسی پر بیٹھتا ہے تو نفیر بجتے ہیں)

جس طرح سے کہ انسان کے خداوند کے پاپوش میں چپکے چپکے آہستہ

ہیں اور پہلے اس سے کہ وہ اپنے فولادی ہاتھوں سے انسان کو سزا دیں۔ اسی طرح ہمارا خفتہ انتقام اب بیدار ہو جائیگا۔ اور بیدار ہو کر تمہارے قابل نفرت کام کو موت سے پامال کریگا۔ فرانس اور پدوا کے نائبو ہماری روحانی عدالت کے دفتر میں جاؤ اور وہاں فرامین میں سے وہ فرمان نکالو جو ٹرنت کی مقدس مجلس نے اس شخص کے حق میں نافذ کیا تھا جو پاپائے حکومت پر بغیر انتخاب اور اجتہاد کے قابض ہونا چاہے۔ جاؤ ابھی جاؤ اور ہمیں اس کے مضمون سے اطلاع دو۔

پہلا نائب: حضور ہم ابھی جاتے ہیں (نائب چلے جاتے ہیں)

پوپ: نواب ریمنڈ۔

فاؤسٹ: میفسٹو جلدی کر۔ نائبوں کے پیچھے عدالت میں جا اور جب فرامین الٹ پلٹ کرکے سوچنے لگیں تو ان پر ایسی سستی اور کاہلی بلکہ ایسی نیند طاری کر کہ وہ غافل سو جائیں۔ اور پھر ان کا بھیس بدل کریں اور تو پاپا سے جاکر گفتگو کریں۔ یہ پاپا شہنشاہ کا مغرور فاتح ہے اور باوجود پاپا کے تقدس کے ہم برونو کو قید سے رہا کریں گے۔ اور اس کو جرمانیہ کی ریاستوں میں سے لے جائیں گے۔

میفسٹو: فاؤسٹ میں جاتا ہوں۔

فاؤسٹ: اس کام کو جلد کردو۔ پاپا فاؤسٹ کے روما آنے پر لعنت کریگا۔ (میفسٹو اور فاؤسٹ چلے جاتے ہیں)

برونو: پاپا ایدرین آپ کچھ تو مجھے قانون کے حقوق دیں۔ میرا انتخاب شہنشاہ نے کیا تھا۔

پاپا: اس قصور میں ہم شہنشاہ کو معزول کریں گے۔ اور اس قوم پر لعن کرینگے جو شہنشاہ کی اطاعت کرتی ہے۔ اور تم اور شہنشاہ دونوں کلیسا سے خارج کر دیئے جاؤ گے۔ اور کلیسا کی تمام مراعات سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ اور اس طرح تمام پاک اور مقدس لوگوں کی صحبت نصیب نہ ہو سکے گی شہنشاہ اپنی حکومت پر بہت غرور کرنے لگا ہے۔ وہ اپنا سر اتنا اونچا کرتا ہے کہ بادلوں سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اور ایک مینار کی طرح کلیسا کی چوٹی سے بھی اونچا ہوتا جاتا ہے۔ لیکن ہم اس کے اس غرور کو نیچا دکھائیں گے۔ اور جس طرح پاپا اسکندر نے جو ہمارا ارث اعلیٰ تھا۔ شہنشاہ فریڈرک کی گردن پر پاؤں رکھا تھا اور جس نے ہماری تعریف میں یہ بات کہی تھی کہ ولی پطرس کی اولاد جرمانیہ کو شہنشاہوں کو اور بار خوفناک کی پشت پر سوار ہو کر شیر اور اژدہے کو پامال کریگی اور بلاخوف وخطر اس مار قاتل کو ہلاک کریگی جن کی نظریں موت ہے۔ پس اسی طرح ہم اس مغرور متکبر بدعتی کو غارت کریں گے اور اپنے پاپائی اختیارات سے اس کو بادشاہی سے معزول کریں گے۔

برونو: پاپا جولیوس نے بادشاہ سگمند کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ خود

اور اس کے بعد جسقدر پاپا رومامیں ہوں گے وہ سب شہنشاہوں کو اپنا سردار اور آقا مانیں گے۔

پاپا:۔ پاپا جولیوس نے کلیسا کی مقدس رسوم کو بدترین طریقے پر ادا کیا تھا اس لئے اس کا کوئی حکم جائز نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیا دنیا کے جملہ اختیارات ہمارے حوالے نہیں کیے گئے ہیں۔ اور اگرچہ ہم غلطی کر سکتے ہیں مگر ہر حال میں ہم معصوم ہیں۔ اس چاندی کے کمربند کو دیکھو جس پر سونے کی سات مہریں لگی ہیں۔ ان سات عددوں سے عبارت ہے کہ ہمیں آسمان سے ہفت گونہ اختیارات حاصل ہیں۔ ہم جس کو چاہیں پابند اور جس کو چاہیں آزاد کر سکتے ہیں۔ جس کو چاہیں قید کریں جس کو چاہیں ملزم بنائیں جس کے ساتھ چاہیں انصاف کریں جس کو چاہیں رہا کریں جس کو چاہیں ماخوذ کریں جیسی کچھ ہماری مرضی اور خوشی ہو۔ بس شہنشاہ کو اور تجھے اور باقی تمام دنیا کو ہمارے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔ ورنہ پھر ہمارے قہر و غضب میں مبتلا ہو کر ہماری زبان سے اپنے حق میں لعنت سنو گے اور ہماری لعنت اس طرح تم پر نازل ہوگی جیسے جہنم کے عذاب ہوتے ہیں۔ (فاؤسٹ اور میفسٹو پاپا کے نائبوں کے لباس میں آتے ہیں)۔

میفسٹو:۔ فاؤسٹ بتاؤ کیا یہ ہمارا بھیس درست نہیں ہے؟

فاؤسٹ:۔ ہاں میفسٹو اور ساتھ یہ بھی ہے کہ ایسے دو نائبوں نے کبھی کسی پاپا کی ایسی خدمت نہ کی ہوگی جیسی کہ ہم کریں گے۔ وہ نائب تو مقدس عدالت میں سو رہے ہیں۔ آؤ پاپا کو سلام تو کر لیں۔

ریمنڈ:۔ حضور دیکھیں وہ دونوں نائب آتے ہیں۔

پاپا:۔ آبائے کلیسا آپ کا آنا مبارک ہے۔ فوراً بتاؤ کہ ہماری مقدس مجلس نے برونو اور شہنشاہ کے مقدمہ میں کیا فیصلہ دیا تھا۔ اور حال میں جو سازش انھوں نے سلطنت اور پاپائی اقتدار کی مخالفت میں کی ہے اس کے بارے میں کیا حکم دیا۔

فاؤسٹ:۔ کلیسائے روما کے نہایت مقدس مربی اور سرپرست مجلس مقدسہ اور حضور جتنے اور اسافقہ حاضر تھے ان کا یہ حکم تھا کہ برونو اور جرمانیہ کا شہنشاہ مناقب بدعتی اور نہایت مغرور و مفسد اور کلیسا کے امن و امان میں نقص پیدا کرنے والے سمجھے جائیں۔ اور اگر برونو اپنی مرضی سے بغیر سرداران جرمانیہ کی پشت گرمی کے پاپائی تاج سہ گوشہ اپنے سر پر رکھنا چاہے اور آپ کی موت سے ولی بطرس کی کرسی پر بیٹھنا چاہے تو فوراً بدعت کے جرم میں اسے ماخوذ کیا جائے۔ جو احکام اور فرامین نافذ ہو چکے ہیں ان کا یہی مضمون ہے۔ اور فوراً اسے لکڑیوں کا انبار لگا کر زندہ جلا دیا جائے۔

پاپا:۔ اچھا بس یہی کافی ہے۔ اسے اپنی حراست میں لیلو اور فوراً باب انجیلو پر لیجا کر وہاں کے قلعہ میں اسے مقید کر دو۔ کل ہم روحانی عدالت میں اجلاس کریں گے اور ہمارے نائبین کی پوری جماعت وہاں حاضر ہوگی۔ اس وقت ہم اس کی موت یا زندگی کا تصفیہ کریں گے۔ اور یہ تاج سہ گوشہ ہم اتار کر دیتے ہیں کہ کلیسا کے خزانہ میں اسے رکھ دیا جائے۔ میرے مہربان نائبو جلدی کرو اور ہم بہ حیثیت پاپا تمہارے حق میں دعا کرتے ہیں۔

میفسٹو:۔ ہاں ہاں کبھی شیطان کے حق میں پاپا نے دعا نہ کی ہوگی جیسے کہ اس وقت کر رہے ہیں۔

فاؤسٹ:۔ پیارے میفسٹو جلد جاؤ۔ نائب جو پڑے سوتے ہیں جاگے ہونگے تو بہت مصیبت میں ہونگے۔

(فاؤسٹ میفسٹو اور برونو چلے جاتے ہیں)

میفسٹو جا اور جلدی سے ضیافت کا سامان کر تاکہ ہم ولی بطرس کی ضیافت میں شریک ہوں۔ اور نواب ریمنڈ بادشاہ ہنگاریہ کے ساتھ اس خوشی میں دیر تک مے نوشی کریں۔ (چلے جاتے ہیں)

ضیافت شروع ہوتے ہی اندر سے باجے بجتے ہیں اور پھر
فاؤسٹ اور میفسٹو اپنی اصلی شکل میں آتے ہیں۔

میفسٹو:۔ فاؤسٹ آؤ اب ایک تماشا دکھائیں۔ وہ اونگھتے نائب پاپا کے پاس آ رہے ہیں تاکہ برونو کو ملزم قرار دیں۔ لیکن برونو کو تو ہم نے پہلے ہی سے گھوڑوں پر سوار کر کے جن کی رفتار سرعت میں خیال سے بھی زیادہ تیز ہے کوہسار البا کے راستہ سے شاداب اور ثمر خیز ملک جرمانیہ کی طرف روانہ کر دیا ہے تاکہ وہ غمزدہ شہنشاہ کو جا کر سلام کرے۔

فاؤسٹ:۔ پاپا اپنے نائبوں کی غفلت پر ان سے سخت ناراض ہوگا۔ ان نائبوں نے اپنی نیند میں برونو اور اس کے تاج دونوں کو غائب کر دیا۔ اب ان کی غلطی کا مذاق اڑا کر پیارے میفسٹو مجھ پر ایسا جادو کر دو کہ میں سب کے پاس جاؤں اور کسی کو نظر نہ آؤں۔ اور جو کام چاہے کر لوں مگر کوئی نہ دیکھے کہ کس نے کیا ہے۔

میفسٹو:۔ فاؤسٹ آپ جھک جائیں۔

جب میں تیرے سر پر ہاتھ رکھوں۔
اور اس عصائے سحر سے تجھ پر جادو کروں
تو پھر یہ پیٹی کمر میں باندھ اور سب کی
نظروں سے غائب ہو جا
ساتوں سیارے اور تاریک ہوا
دوزخ اور قہر و غضب کے دھوئیں کے سرکی لٹیں۔
خدائے جہنم پلوٹو کی نیلی آگ اور خدا کی ملکہ ہیکیٹی کا جادو کا درخت
جادو کے منتروں کے ساتھ اس طرح آ جائیں کہ کوئی آنکھ تیرے جسم کو نہ دیکھ سکے
بس فاؤسٹ باوجود ان سب کے تقدس کے اب جو تیرا جی چاہے وہ کر
کوئی تجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

فاؤسٹ:۔ شکریہ میفسٹو۔ اچھا اب پادریو ذرا ہوشیار رہنا اور اپنی منڈی ہوئی

چندیوں کو بچائے رہنا کہیں ان سے خون نہ جاری ہو جائے۔

فاؤسٹ:۔ ابھی بیانے دیئے دیکھو وہ پاپا کے نائب آ رہے ہیں۔

(پوپ اور کلیسا کے تمام بزرگ ساتھ آتے ہیں اور
ایک کتاب ساتھ ہے۔)

پاپا:۔ سردار نائبو آپ کے تشریف لانے سے خوشی ہوئی۔ آؤ بیٹھو۔ سردار ریمنڈ آپ بھی بیٹھ جائیں تیبیو متوجہ رہو۔ دیکھو سب چیزیں جو اس بڑے موقع کیلئے درکار ہوں تیار رہیں۔

پہلا نائب:۔ پاپائے مقدس کو خدا سلامت رکھے۔ حضور پہلے جو حکم مجلس مقدس نے برونو اور شہنشاہ کے بارے میں دیا تھا اسے ملاحظہ کریں۔

پاپا:۔ یہ سوال کیوں پیدا ہوا۔ کیا میں یہ حکم نہیں دے چکا ہوں کہ کل ہم عدالت میں اجلاس کریں گے۔ اور وہاں اس کیلئے سزا تجویز کریں گے۔ تم ابھی تو ہمارے پاس یہ کہنے کیلئے آئے تھے کہ مجلس کا حکم یہ ہے کہ برونو اور وہ ملعون شہنشاہ دونوں کو مجلس نے مجرم قرار دیا ہے اور انھیں بدعتی قرار دیا ہے۔ پھر اس حکم کو دیکھنے کیلئے یہ کتاب کیسی اپنے ساتھ لائے ہو!

فرانس کا نائب:۔ حضور کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمیں کوئی حکم حضور نے ایسا نہیں دیا تھا۔

ریمنڈ:۔ انکار نہ کرو۔ ہم گواہی دینے کو موجود ہیں کہ برونو جس وقت یہاں موجود تھا پاپا نے اپنا سگوشہ تاج تمھیں دیا تھا کہ اسے کلیسہ کے خزانہ میں رکھ دو۔

دونوں نائب:۔ تقدیس پاپوس کی قسم نہ ہم نے برونو کو دیکھا نہ تاج کو۔

پاپا:۔ پطرس کی قسم تم دونوں قتل کئے جاؤ گے۔ جب تک دونوں کو حاضر نہ کرو گے یہ حکم تم پر نافذ رہیگا۔ ان دونوں کو قید خانہ میں بھیج دو۔ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ دو۔ جھوٹے اور مکار نائب ہیں۔ انھوں نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ لعنت ہو تمھاری ارواح پر اور عذاب جہنم میں گرفتار رہو۔

(ملازمین دونوں نائبوں کو حراست میں لئے باہر جاتے ہیں)

فاؤسٹ:۔ اچھا یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ یہ دونوں تو محفوظ ہو گئے۔ اب ضیافت میں چلو۔ پاپا کو کبھی ایسا چنچل مہمان نہ ملا ہوگا۔

پاپا:۔ ریم کے اسقف اعظم آپ ہمارے قریب بیٹھیں۔

اسقف اعظم:۔ حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

فاؤسٹ:۔ غارت ہو جاؤ۔ اگر کسی کو چھوڑ دو تو شیطان تمھارا گلا گھونٹ دیں۔

پاپا:۔ ارے یہ کون ہے جو بولتا ہے قیبیو جاؤ تجسس کرو۔ یہ کس کی آواز ہے؟ سردار ریمنڈ آپ بھی اس طرف متوجہ ہوں۔ میں اس عجیب تحفے کیلئے اسقف میلان کا ممنون ہوں۔

فاؤسٹ:۔ شکریہ جناب کا۔ (پاپا کے سامنے سے رکابی ہٹا دیتا ہے)

پاپا:۔ ارے یہ کون ہے جو میرے سامنے سے رکابی اٹھا کے گیا۔ بدمعاشو تم بتاتے کیوں نہیں۔ جناب اسقف اعظم صاحب یہ کھانا تناول فرمائیں۔ یہ میرے معتمد فلورنس نے مجھے خاص طور پر بھیجا تھا۔

فاؤسٹ:۔ میں بھی یہی کھاؤں گا۔ (رکابی سامنے سے اٹھا لیتا ہے)

پاپا:۔ یہ کیسے نامعقول لوگ ہمارے گرد جمع ہیں۔ ہماری کیسی توہین ہو رہی ہے اور انھیں خبر تک نہیں۔ تھوڑی سی شراب ہمارے لئے لاؤ۔

فاؤسٹ:۔ ہاں ضرور فاؤسٹ بھی تشنہ دہاں ہے۔

پاپا:۔ سردار ریمنڈ میں آپ کا جام صحت پیتا ہوں۔

فاؤسٹ:۔ میں بھی حضور کا جام صحت پیتا ہوں۔ (پیالہ ہاتھ سے چھین لیتا ہے)

پاپا:۔ شراب بھی کسی نے مجھ سے چھین لی۔ ارے نابکارو دیکھو تو یہ کون ہے۔ اور ایسے آدمی کو تجسس کر کے جو ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔ ورنہ قسم ہے اپنے تقدس کی ہم سب کے قتل کا حکم دے دیں گے۔ میرے معزز مہمانوں اس پریشان کرنے والی ضیافت میں آپ صبر سے کام لیجئے گا۔

اسقف:۔ تقدس مآب میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی روح ہے جو اعراف سے بھاگ کر ادھر آ گئی ہے۔ اور وہ اس وقت حضور کی خدمت میں عفو تقصیر کیلئے حاضر ہوئی ہے۔

پاپا:۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو۔ جاؤ قسیسوں سے کہو وہ دفع بلیّات کی دعا مانگیں۔ تاکہ اس روح کا غیظ و غضب کم ہو۔ (نوکر چلے جاتے ہیں۔ پاپا صلیب کا نشان بناتا ہے۔)

فاؤسٹ:۔ کیوں یہ بات کیسی ہوئی۔ کیا شیطان کو صلیب کے اثر سے دور کیا جائیگا۔ تو پھر جسم کے ہر حصہ پر نشان صلیب بناؤ۔ نہیں تو پھر یہ لو۔ (پاپا کو.... صلیب سے مارتا ہے)

پاپا:۔ سردارو! میری مدد کرو کوئی مجھے مارے ڈالتا ہے۔ ارے آؤ اور کوئی مجھے اٹھا کر یہاں سے لے چلے۔ جس نے ایسا کیا ہو خدا اس کی روح پر دائمی عذاب نازل کرے۔

(پاپا کے متعلقین چلے جاتے ہیں)

میفسٹو:۔ فاؤسٹ! اب تم کیا ارادہ رکھتے ہو۔ اب تو تم پر ہر ہر طرح سے کلیسا کی لعنت پڑیگی۔ گھنٹہ بھی ہے انجیل بھی ہے اور شمع بھی ہے کوئی چیز بھی تمھاری لعنت کیلئے چھوڑی نہ جائیگی۔

فاؤسٹ:۔ یہ کیا کہا؟ گھنٹہ ہے انجیل اور شمع ہے۔ شمع انجیل اور گھنٹہ ہی مجھ پر لعنت بھیجی جائیگی آگے اور پیچھے سے۔ غرض ہر طرف سے یہی پکاریگی کہ فاؤسٹ کو جہنم واصل کیا جائے۔ مگر دیکھو تم دیکھو گے کہ ایک سور بولے گا۔ ایک بچھڑا ڈکاریگا

اور ایک گدھا رینکے گا کیونکہ آج ولی بطرس کا دن ہے۔

(تمام قسیس رد بلا کی دعا گاتے آتے ہیں)

پہلا قسیس:۔ اے بھائیو آؤ اپنا کام سچے دل اور جوش ایمان سے شروع کریں۔ (قسیس گاتے ہیں)

ملعون ہے وہ جس نے تقدس مآب پاپا کے سامنے سے کھانے کی رکابی اٹھالی۔ اے خدا اس پر لعنت ہو۔

ملعون ہے وہ جس نے تقدس مآب کے چہرہ پر طمانچہ مارا اے خدا اس پر اپنی لعنت بھیج۔

ملعون ہے وہ جو تقدس مآب کی شراب لے گیا۔ اے خدا اس پر لعنت بھیج۔

ملعون ہے وہ جس نے برادر سند بلا کے سر پر ضرب لگائی۔ اے خدا اس پر لعنت بھیج۔

ملعون ہے وہ جو ہماری اس دافع بلا کی دعا میں مخل ہوا۔ اے خدا اس پر لعنت بھیج۔

اے خدا تو پاک اور مقدس ہے۔ آمین۔

(میفسٹو اور فاؤسٹ قسیسوں کو مارتے ہیں اور ان پر آگ کے انگارے اور جلتے فدنگ پھینکتے ہیں اور اس طرح یہ چیزیں پھینکتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔)

(طائفہ آتا ہے)

طائفہ:۔ جب فاؤسٹ نے بہت سی نادر و نفیس چیزوں کو دیکھا اور بادشاہوں کے درباروں کی سیاحت کی تو پھر چلتے چلتے ٹھیر گیا اور کچھ عرصہ کے بعد اپنے گھر واپس آیا۔ یہاں جو اس کے دوست اور عزیز تھے اس کے چلے جانے کا غم کرتے تھے اس کو واپس آتے دیکھکر خوش ہوئے اور اس کے صحیح سلامت آنے پر خدا کا شکر کرنے لگے اور اور جب سفر کے حالات دریافت کرنے کا موقع آیا تو انھوں نے اس کا بیان اور فضائے عالم میں سفر کے متعلق اور کواکب کے نظام کے متعلق سوالات کئے۔ ان سوالوں کا جواب فاؤسٹ نے بڑی ہوش مندی اور ذہانت کیساتھ دیا۔ سامعین اس کے علم و فضل اور سیاحت پر حیرت کرنے لگے۔ اب تمام ملکوں میں اس کی شہرت ہوگئی حتیٰ کہ شہنشاہ کے کانوں تک اس کے فضل و کمال کی شہرت پہونچی۔ اس شہنشاہ کا نام چارلس پنجم تھا۔ اب اس کے محل میں دیگر امرا کیساتھ فاؤسٹ ضیافت میں شریک ہوتا ہے۔ اپنے فن کا کمال دکھانے میں یہاں جو کچھ اس نے کیا اگر کہ بیان سے اجتناب کرتا ہوں تم خود دیکھو گے کہ اس نے کیا کیا کیا۔

(چلا جاتا ہے)

نواں منظر

ایک سرائے کے قریب۔

(روبن سرائے والا ایک کتاب ہاتھ میں لئے آتا ہے)

روبن:۔ واہ میری بھی کیا بات ہے۔ ڈاکٹر فاؤسٹ کی ایک جادو کی کتاب چرا لایا ہوں۔ اس میں سے میں سحر کے وہ نقوش اور علامتیں نکالوں گا جنھیں میں اپنے کام میں لاسکوں۔ اب تو میں اپنے محلہ کی تمام لڑکیوں کو اپنے سامنے ننگا نچواؤں گا اور اب تک جو کچھ دیکھا یا معلوم کیا اس سے کہیں زیادہ جادو کے زور سے آئندہ دیکھوں اور معلوم کروں گا۔ (رالف روبن کو پکارتا ہوا آتا ہے)

رالف:۔ مہربان ادھر آئیے کسی بھلے مانس کو گھوڑا درکار ہے۔ اور وہ آپ کے انتظار میں کھڑا ہے۔ اور اپنی چیزیں بھی آپ صاف کرا کر انھیں چمکا رکھوانا چاہتا ہو اس وقت وہ میری عورت کے ساتھ جھگڑا کر رہا ہے۔ اور اس نے مجھے آپ کے بلانے کیلئے بھیجا ہے۔

روبن:۔ دور رہو دور۔ کہیں تو پ دم نہ کردوں اور تمھارے پرخچے اڑ جائیں۔ رالف میرے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ اس وقت میں ایک بڑے زبردست کام میں مصروف ہوں۔

رالف:۔ ذرا ادھر تو دیکھو۔ تم اس کتاب کو کیا کروگے۔ پڑھنا تو تمھیں آتا نہیں۔

روبن:۔ میرے مالک اور میری بیگم کو معلوم ہو جائیگا کہ میں پڑھ سکتا ہوں۔ مالک کے ذہن پر تحت بیکو اور مالکہ دل بہلانیکو پڑھا کرتے ہیں۔ بس اب تو ان کی خوب گذریگی۔ ورنہ چھ میرا یہ پڑھنا بالکل بیکار ہوگا۔

رالف:۔ بتاؤ تو یہ کیا کتاب ہے؟

روبن:۔ کیا پوچھتے ہو یہ تو علم سحر میں بڑے غضب کی کتاب ہے۔ ایسی کتاب میرے استاد شیطان نے خداوند ملک کی طرح جتنا بنے کبھی پہلے نہ لکھی تھی۔

رالف:۔ کیا اس کتاب کو پڑھنے سے تمھیں جادو آجائیگا۔

روبن:۔ ہاں جادو کے زور سے جو چاہوں گا کرسکوں گا۔ اور کوئی کام ایسا نہ ہوگا جسے نہ کرسکوں گا۔ اگر تم چاہوگے تو یورپ کے کسی شراب خانہ سے لال لال شرابیں منگوادوں گا اور جادو کے کھیلوں میں یہ میرا ایک کھیل ہوگا۔

روبن:۔ ہمارے پادری صاحب فرماتے ہیں کہ جادو کوئی چیز نہیں۔

رالف:۔ نہیں جادو واقعی برحق ہے۔ اگر کچھ اور دیکھنا چاہتے ہو اور اس جوان باورچن نین سپیت کی طرف تمھاری . . . . طبیعت مائل ہو تو میں اسے ابھی تم پر فریفتہ کردوں۔ پھر تم اسے اپنا ہی سمجھنا۔ آدھی رات بھی ہوگی تو جتنی مرتبہ کہوگے حاضر ہو جایا کریگی۔

رالف:۔ ارے واہ بہادر تیرے کیا کہنے۔ اگر وہ باورچن میری ہو جائے تو پھر مجھے اور کیا چاہئے۔ اگر ایسا ہوگیا تو پھر میں تمھارے شیطان کو گھوڑوں کو کھلانے والی روٹیاں عمر بھر مفت کھلاتا رہوں گا۔

روبن:۔ پیارے رالف آؤ۔ بوٹ میلے پڑے ہیں۔ انھیں صاف کرنا ہے۔ انھیں صاف کریں تو پھر شیطان کا نام لیکر جادو شروع کریں۔ (چلے جاتے ہیں)

دسواں منظر

مقام وہی ہے۔

روبن اور رالف سونے چاندی کا ایک جام لیے آتے ہیں۔

روبن:۔ رالف سنتے ہو۔ کیا میں یہ کہنا بھول گئے کہ ڈاکٹر فاؤسٹ کی یہ کتاب ہماری تقدیر جگادیگی۔ ذرا اس نشان کو دیکھو۔ گھوڑے رکھنے والوں کیلئے یہ بڑا آسان نسخہ ہوا ہے۔ جب تک یہ نشان قائم ہے گھوڑے گھاس پھوس منہ نہ ڈالیں گے۔

(ایک شراب بیچنے والا آتا ہے)

رالف:۔ دیکھو وہ مے فروش ادھر آرہا ہے۔

روبن:۔ چپکے رہو۔ دیکھو میں اسے جادو کے زور سے کیا اُلو بناتا ہوں۔ کیوں کیا دام چاہئیں ہم سب کچھ دے چکے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔ رالف آؤ چلو۔

میفروش:۔ تیز نہ ہو جئے۔ آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ ذرا جانے سے پہلے چاندی کے جام کی قیمت دیتے جائیں۔

روبن:۔ چاندی کا جام۔ چاندی کا پیالہ۔ بکتے کیا ہو۔ بس تم تو تھے ایسے کے ایسے ہی نکلے۔ کیسا پیالہ کیسا جام۔ ڈھونڈھ لو جو میرے پاس نکلے۔

میفروش:۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ اگر اجازت ہو۔ (روبن کی جامہ تلاشی لیتا ہے)

روبن:۔ فرمائیے اب کیا کہنا ہے؟

میفروش:۔ آپ کے ان ساتھی سے بھی کچھ کہنا ہے۔ ہاں جناب ذرا آپ بھی نہیں۔

رالف:۔ کیا مجھ سے کچھ فرماتے ہیں۔ کیا ہے۔ آئیے دل کھول کر تلاشی لے لیجئے۔

(میفروش رالف کی جامہ تلاشی لیتا ہے) اچھا جناب اب آپ کو شرم آنی چاہیے کہ آپ ایماندار آدمیوں کو چوری لگاتے ہیں۔

میفروش:۔ جو کچھ ہو۔ آپ دونوں میں سے کسی کے پاس چاندی کا جام ضرور ہے۔

روبن:۔ تم جھوٹے ہو۔ کیا تم مجھے چور سمجھتے ہو۔ (علیحدہ کہتا ہے)۔ اچھا جناب میں بتاؤں گا کہ ایماندار آدمیوں پر بہتان لگانا کیسا ہوتا ہے۔ ذرا کھڑے رہئے۔ اس چاندی کے جام کے بدلے میں بھی آپ کو کیسا دُھنتا ہوں۔ ابلیس کا نام لیکر میں آپ کو ماخوذ کرتا ہوں۔ (رالف سے علیحدہ کہتا ہے) ذرا چاندی کے جام سے خبردار رہنا۔

روبن:۔ ٹھیرئیے میں مطلب بتائے دیتا ہوں۔ (ایک کتاب میں سے کچھ عبارت پڑھتا ہے) اب مجھے آپ کی گت بنانا ہے۔ (رالف سے علیحدہ کہتا ہے ذرا چاندی کے جام سے ہوشیار رہنا) پھر جادو کے چند الفاظ پڑھکر میفسٹو کو پکارتا ہے۔

میفسٹو آتا ہے۔ سب کی پیٹھ پر آگ کے کوڑے مارتا ہے۔ اور پھر چلا جاتا ہے۔ روبن، رالف اور میفروش گھبرائے ہوئے ادھر ادھر بھاگے پھرتے ہیں۔)

میفروش:۔ روبن خدا کیلئے بتا تو کیا چاہتا ہے۔ کیا واقعی تیرے پاس میرا جام نہیں ہے؟

رالف:۔ گناہوں میں یہی سب سے بڑا گناہ ہوا۔ لے یہ تیرا جام ہے۔ اچھے میفروش۔ (جام میفروش کو دیدیتا ہے جو لیکر چلا جاتا ہے)

روبن:۔ بس رحم کرو۔ میں کیا کروں۔ اچھے میرے نیک شیطان۔ اب تو مجھے معاف کر دے۔ پھر میں کبھی تیرے کتب خانہ سے کوئی کتاب نہ چراؤں گا۔ (میفسٹو پھر آتا ہے)

میفسٹو:۔ اے جہنم کے طاقتور بادشاہ جس کے سیاہ کار حکومت میں بڑے بڑے تاجدار خوف زدہ ہو کر سر جھکاتے ہیں۔ جس کی قربان گاہوں پر ہزاروں روحیں پڑی رہتی ہیں۔ اس حال میں بھی یہ کمینے جادو کے زور سے مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ اس وقت میں ان نالائقوں کی طلبی پر قسطنطنیہ سے آرہا ہوں۔

روبن:۔ ہائیں کیا حضور قسطنطنیہ سے تشریف لارہے ہیں۔ یہ تو واقعی بڑا لمبا سفر ہوگا۔ لیجئے میری طرف سے یہ چھدام اپنی جیب میں ڈال لیجئے۔ اگر واپسی پر کہیں بھوک لگے تو کچھ لیکر کھا لیجئے گا۔ مگر یہاں سے تشریف لیجائیے۔

میفسٹو:۔ اچھا تیری اس گستاخی کی سزا میں تجھے بندر اور تجھے (رالف سے مخاطب ہو کر کہتا ہے) کتا بنائے دیتا ہوں۔ اور بس یہاں سے دور ہو (میفسٹو چلا جاتا ہے)۔

روبن:۔ واہ واہ بندر بھی خوب بنایا۔ یہ بہت ٹھیک ہوا۔ اب لڑکوں میں میرا خوب تماشا بنا کریگا۔ سیب اخروٹ خوب کھانے میں آیا کریں گے۔

رالف:۔ اور مجھے کتا بن کر جینا پڑیگا۔

روبن:۔ ہاں یار تیرا سر تو کبھی دلیہ کی ہنڈیا سے باہر نکلے گا نہیں۔ (دونوں چلے جاتے ہیں)۔

میفسٹو:۔ اور میں بھی ان رذیلوں کے شعلے اٹھاتا غصے میں اڑتا ہوا اپنے فاؤسٹ کے پاس بڑے بادشاہ کے دربار میں جاتا ہوں۔ (چلا جاتا ہے)

گیارھواں منظر

انسبرگ میں شہنشاہ کا دربار۔

علیحدہ دروازوں سے مرتینو اور فریڈرک آتے ہیں۔

مرتینو:۔ ارے ملازمو شریفو شہنشاہ کی حضوری کیلئے جلد حاضر ہو۔ اچھے فریڈرک دیکھو کمرے سب صاف اور درست ہو جائیں۔ بادشاہ سلامت اجلاس کے کمرے کی طرف تشریف لارہے ہیں۔ واپس جاؤ اور دیکھو کہ دربار کرنے کیلئے سب چیزیں درست ہیں۔

فریڈرک:۔ مگر برونو کہاں ہے جو ہمارا منتخب پاپا ہے۔ وہ بڑے غیظ و غضب میں اڑتا ہوا یہاں آیا ہے۔ کیا پاپا ہمارے شہنشاہ کے ساتھ حکومت میں شریک ہوگا؟

مرتینو:۔ ہاں ضرور اور جرمانیہ کا مشہور ساحر یعنی فاؤسٹ وٹن برگ کا مشہور طرۂ امتیاز

علامہ بھی بابا کے ساتھ آیا ہے۔ یہ عالم سحر و طلسم میں دنیا کے عجائبات میں سے ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ شہنشاہ کو ان کے بزرگوں کا پورا سلسلہ دکھائے۔ اور اعلیٰ حضرت کے سامنے شاہی صورتیں اور جنگ آور شبیہیں اسکندر اعظم اور اس کی حسین معشوقہ کی نظر کے سامنے سے گذارے۔

فریڈرک: بنوالیو کہاں ہے؟

مرتینو: یقین مانئے کہ وہ غافل سوتا ہوگا کیونکہ شب کو اس نے بردنو کے جام صحت پینے میں اتنی شراب چڑھالی ہے کہ آج یہ سست آدمی اپنے بستر سے نہیں اٹھ سکتا ہے۔

فریڈرک: دیکھو تو اس کے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے۔ آؤ اسے پکاریں۔ ارے بنوالیو بنوالیو۔

(بنوالیو اوپر کی کھڑکی سے شب خوابی کی ٹوپی پہنے سر نکالتا ہے۔
کوٹ کے بٹن لگاتا ہوا آتا ہے)۔

بنوالیو: آج شیطان تم دونوں کے پیچھے کیوں پڑا ہے؟

مرتینو: ذرا آہستہ آہستہ بات کرو۔ کہیں شیطان نہ سن لے۔ فاؤسٹ رات گئے آیا ہے۔ اور ہزار ہا شیاطین اس کے ساتھ ہیں۔ تاکہ فاؤسٹ جو کچھ حکم دے اس کی تعمیل کریں۔

بنوالیو: اچھا تو پھر اس سے کیا مطلب؟

مرتینو: پہلے کمرے سے تو باہر نکلو پھر دیکھنا یہ ساحر بابا اور بادشاہ سلامت کے سامنے کیسے کیسے عجیب و غریب کرتب دکھاتا ہے جو آج تک کبھی کسی نے جرمانیہ میں نہ دیکھے ہونگے

بنوالیو: کیا بابا کا ابھی سحر و جادو سے جی نہیں بھرا شیطان کی چڑھی پر چڑھا چڑھا ابھی تک تو گشت لگاتا رہا ہے۔ اگر ابھی تک شیطان کے عشق میں مبتلا ہے تو بہتر ہوگا کہ وہ شیطان کو اپنے ساتھ روانہ لے جائے۔

فریڈرک: اچھا تو یہ کہو کہ تم تماشا دیکھنے ہمارے ساتھ چلتے ہو یا نہیں؟

بنوالیو: نہیں جناب بندہ کو ضرورت نہیں۔

فریڈرک: تو پھر کیا کھڑکی میں کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھو گے؟

بنوالیو: ہاں اگر بیچ میں سو نہ گیا۔

مرتینو: قریب ہے کہ شہنشاہ جو تشریف لا چکے ہیں ان عجائبات کا ملاحظہ کریں گے جو طلسم جادو کے زور سے دکھائے جا سکتے ہیں۔

فریڈرک: اچھا جاؤ تم شہنشاہ کی خدمت میں حاضر رہو۔ میں تو صرف ایک مرتبہ اس کھڑکی سے سر نکال کر جو کچھ دیکھنا ہوگا اسے دیکھ لوں گا۔ اور یہی میرے لئے کافی ہوگا کیونکہ مشہور ہے کہ اگر رات کو کسی نے شراب زیادہ پی لی تو صبح سویرے شیطان اسکو کچھ نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ اگر یہ سچ ہے تو میرے سر میں اس وقت وہ جادو بھرا ہے جو نہ صرف شیطان کو بلکہ اس ساحر کو بھی اپنے شکنجے سے باہر نہ ہونے دیگا۔ بس میری بات کا یقین کیجئے (فریڈرک اور مرتینو چلے جاتے ہیں)

بارھواں منظر

نقارے بجتے ہیں۔ چارلس شاہ جرمانیہ۔ بردنو۔ نواب سیکسن
فاؤسٹ میفسٹو، فریڈرک، مرتینو اور ملازمین آتے ہیں۔

شہنشاہ: انسانوں میں عجیب انسان، ساحروں میں مشہور ساحر، فضل و کمال میں سرگونہ شہرت رکھنے والے ڈاکٹر فاؤسٹ اپنے دربار میں ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ آپ کے اس کام سے کہ آپ نے بردنو کو اس کے اور ہمارے جانی دشمن کے پنجے سے آزاد کیا۔ آپ کو اپنے فن میں وہ کمال حاصل ہوگا کہ اگر آپ اپنے سحر و فسوں کے زور سے ساری دنیا کو تسخیر کر لیتے تو وہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔ اب تم ہمیشہ کیلئے ہمارے محبوب ہو۔ اگر بردنو جسے تم نے آزاد کرایا ہے امن و سلامتی سے گوشہ تاج اپنے سر پر رکھکر مقدس پطرس کے تخت پر جلوہ فرما ہو تو یہ محض اتفاق ہوگا۔ مگر تمام اٹلی میں تمہاری شہرت ہو جائیگی اور جرمانیہ کا شہنشاہ تمہاری عزت کریگا۔

فاؤسٹ: شہنشاہ عالی جاہ حضور کے کرم گسترانہ الفاظ سے فاؤسٹ حتی المقدور شہنشاہ جرمانیہ کے ساتھ الفت اور اس کی خدمت کیلئے ہمہ وقت دل و جان سے حاضر رہیگا اور اپنی جان مقدس بردنو کے قدموں پر رکھدیگا۔ اور اس بات کے ثبوت میں اگر جہاں پناہ کی اجازت اور مرضی ہو تو فاؤسٹ اپنے علم سحر کی قوت سے ایسا جادو کرنے کو تیار ہے جو ہمیشہ دوزخ کے سیاہ آہنی دروازوں کو توڑ تاڑ کر نکل جائے اور قہر و غضب کی دیویوں کو جن کے سر کی لٹیں لپٹے ہوئے سانپ معلوم ہوتے ہیں ان کے غاروں سے باہر نکال دے تاکہ وہ حضور کا حکم بجا لائیں۔

بنوالیو: سبحان مسیح! اس کی تقریر میں تو بلا کا قہر بھرا ہوا ہے (علیحدہ کہتا ہے) یہ تو مجھے ایسا ہی جادوگر معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کنجڑے کی نظر میں خود بابا معلوم ہوتا ہے۔

شہنشاہ: تو پھر ڈاکٹر فاؤسٹ جو کچھ ہم کہیں اس پر آپ غور کریں۔ جب کبھی میں اپنی خلوت گاہ میں اکیلا بیٹھا ہوتا ہوں تو اکثر مجھے اپنے آبا و اجداد کے جاہ و حشم اور ان کی عزت کا خیال آیا کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے زور بازو سے کیسے کیسے بڑے کام کئے۔ کیسی کیسی دولت پیدا کی۔ کتنی عظیم الشان سلطنتوں کو مسخر کیا۔ ہم جو ان کے جانشین ہیں یا وہ جو ہمارے جانشین ہوں گے کبھی اختیار اور صولت میں وہ شہرت حاصل نہیں کر سکتے جو ہمارے ان بزرگوں کو نصیب ہوئی تھی۔ ہمارے ان اسلاف میں ایک سکندر اعظم تھا جو دنیاوی بزرگی میں سب سے بلند مقام پر پہونچا تھا جس کی عظیم الشان کارناموں نے عالم دنیا کو منور کر دیا۔ اور جب کبھی میں اس کا تذکرہ سنتا ہوں تو میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس بزرگ ہستی کو کبھی بچشم خود نہیں دیکھا۔ پس اگر تم اپنے جادو کے علم کے زور سے اس دنیا کے مشہور فاتح کو اس کی سنگین قبر سے جہاں یہ عظیم الشان ہستی دفن ہے اٹھا کر مع اس کی حسین معشوقہ ان کی اصلی شکل و صورت لباس اور انداز و ادا میں جو وہ اپنی زندگی میں رکھتے تھے مجھے دکھا دو تو پھر تم میری

تعین آرزو کو پورا ہی نہ کرو گے بلکہ مجھے اس بات پر بھی مجبور کرو گے کہ میں جب تک دنیا میں زندہ رہوں ہمیشہ تمہارا ثناخواں رہوں۔

فاؤسٹ:۔ جہاں پناہ جن لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ ابھی حاضر کئے جاتے ہیں میفیسٹو اٹھو، دروازہ اور بوق و قرنا کی آوازوں میں سکندر اعظم اور اس کی حسین معشوقہ کو شہنشاہ جرمانیہ کی نظروں کے سامنے لاؤ۔

میفسٹو:۔ فاؤسٹ میں حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔

بنوالیو:۔ اجی ڈاکٹر صاحب اگر آپ کے یہ شیاطین جلد واپس نہ آئے تو کہیں میں سو نہ جاؤں۔ مسیح کے زخموں کی قسم کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس بات پر غصہ سے اپنے تئیں پھاڑ کھاؤں کہ واللہ میں بھی کتنا بڑا گدھا ہوں کہ شیاطین کے سردار کے سامنے منہ کھولے کھڑا ہوں اور کچھ نہیں دیکھ سکتا۔

فاؤسٹ:۔ اگر میں اپنے فن میں تاکام رہا تو میں ابھی سب کچھ تجھے دکھائے دیتا ہوں۔

شہنشاہ عالی جاہ مجھے حضور سے ایک ضروری بات عرض کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور جب میری ذریات سکندر اور اس کی معشوقہ کی صورتیں پیش کریں تو حضور سکندر اعظم سے کوئی سوال نہ کریں۔ بلکہ بالکل عالم خاموشی میں انہیں آنے اور سامنے سے گذرنے دیں۔

شہنشاہ:۔ جیسا فاؤسٹ نے کہا ہے وہی کیا جائیگا۔ ہم اسی کو کافی سمجھتے ہیں۔

بنوالیو:۔ ہاں ہاں میں بھی جب تم سکندر اور اس کی معشوقہ کو سامنے لاؤ گے تو اسی کو کافی سمجھوں گا۔ میں تو زمانہ کا مشہور شکاری اکتیون بن کر اسٹیج پر آؤنگا۔

فاؤسٹ:۔ اور میں بھی دائنا دیبی بن کر ظاہر ہوں گا۔ اور فوراً تمہیں سینگوں کی جوڑی پیش کروں گا۔

نقارہ بجتا ہے ایک دروازہ سے بادشاہ سکندر اور دوسرے دروازہ سے شاہ عجم دارا آتے ہیں۔ دونوں لڑنے لگتے ہیں۔ دارا زمین پر گرا دیا جاتا ہے۔ اور پھر سکندر اسے قتل کر دیتا ہے اور دارا کے سر کا تاج اتار کر جانیکو ہوتا ہے کہ سکندر کی معشوقہ اس سے ملتی ہے سکندر اسے گلے لگاتا ہے اور دارا کا تاج اس کے سر پر رکھدیتا ہے اور پھر دونوں واپس آکر شہنشاہ جرمانیہ کو تعظیم دیتے ہیں۔ شہنشاہ اپنا تخت چھوڑ کر ان دونوں سے معانقہ چاہتا ہے۔ فاؤسٹ یہ دیکھتے ہی شہنشاہ کو روکتا ہے۔ اب نقارے بجنے موقوف ہوتے ہیں اور موسیقی شروع ہو جاتی ہے۔

میرے محترم تاجدار حضور اپنے کو بھول چلے تھے۔ یہ صورتیں محض پرچھائیاں تھیں کوئی اصلیت نہ رکھتی۔

شہنشاہ:۔ فاؤسٹ مجھے معاف کرو۔ اس مشہور شاہنشاہ اسکندر کو دیکھکر میری طبیعت میں ایسا ولولہ پیدا ہوا کہ میں نے اس سے بغل گیر ہونا چاہا۔ لیکن چونکہ فاؤسٹ تمہارا حکم تھا کہ ان صورتوں سے بات نہ کروں اس لئے منہ سے کچھ نہ بولا اور جن باتوں کو دریافت کرنا چاہتا تھا دریافت نہ کر سکا۔ مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ حسین عورت جب زندہ تھی تو اس کی گردن پر ایک خال تھا اس قول کی تصدیق کیسے ہو؟

فاؤسٹ:۔ حضور بے کھٹکے قریب جائیں اور دیکھیں کہ خال ہے یا نہیں۔

شہنشاہ:۔ فاؤسٹ میں اس خال کو بخوبی دیکھ رہا ہوں۔ اور اس خال کو دیکھکر میں اتنا خوش ہوا ہوں کہ اگر ایک سلطنت بھی مجھے ملتی تو اتنا خوش نہ ہوتا۔

فاؤسٹ:۔ (ان صورتوں سے کہتا ہے) بس اب چلی جاؤ۔ (صورتیں غائب ہو جاتی ہیں) شہنشاہ اعظم ذرا اس جانور کو بھی دیکھئے جو کھڑکی سے منہ باہر نکالے ہے۔ ارے حیوان تو کون ہے جو کھڑکی سے منہ باہر نکالے ہے؟

شہنشاہ:۔ واہ یہ بھی عجیب حیرت انگیز نظارہ ہے۔ امیر سیکسن آپ دیکھتے ہیں کہ اس نوجوان بنوالیو کے سر پر دو سینگ کیسے لگے ہیں۔

سیکسن:۔ کیا وہ سوتا ہے یا مر گیا؟

فاؤسٹ:۔ حضور والا وہ سوتا ہے۔ مگر سر کے سینگ خواب میں نظر نہیں آتے۔

شہنشاہ:۔ یہ تو عجیب تماشا ہے۔ اسے آواز دیکر جگانا چاہیئے۔ ارے بنوالیو! سوتا ہے جاگ اٹھ۔

بنوالیو:۔ ارے تم سب کو موت لیجائے۔ مجھے ذرا سونے دو۔

شہنشاہ:۔ میں تجھے زیادہ سونے پر برا نہیں کہتا۔ تیرے سر میں ویسے ہی گوڑا بھرا ہے۔

سیکسن:۔ تو اٹھتا کیوں نہیں۔ شہنشاہ سلامت آواز دے رہے ہیں۔

بنوالیو:۔ شہنشاہ! وہ کہاں ہیں؟ ارے اللہ میرے اس سر کو کیا ہو گیا۔

شہنشاہ:۔ نہیں۔ جب سر پہ سینگ قائم ہیں تو پھر سر کی کیا فکر کیونکہ اس کی پاس تو حفاظت کا پورا سامان ہے۔

فاؤسٹ:۔ کیوں جناب والا۔ یہ سینگ کس نے لگا دیئے؟ یہ تو بڑی بری بات ہوئی شرم شرم یہ شرم سے سر نیچا نہیں کر لیتے۔ اور تمام دنیا کو اپنے اوپر حیرت کرنے دیتے ہو۔

بنوالیو:۔ ارے بدبخت ناپاک کتے معلوم ہوتا ہے کہ تو کسی پادری کے گندے غار میں پلا تھا۔ یہ تیری ہمت کیونکر ہوئی کہ تو ایک شریف کو بے عزت کرے۔ ارے شیطان میرے سر پر سے ان سینگوں کو اتار دے۔ اور فوراً میرا کہنا مان لے۔

فاؤسٹ:۔ آپ ایسا نہ کہیں۔ فاؤسٹ میں نہ تو اتنی مہارت ہے اور نہ لیاقت نہ ہوشیاری کہ وہ سرداروں کے اور شہنشاہ عالی جاہ کے سامنے اس زبردست جنگ آور شہنشاہ یعنی اسکندر کو پیش کر دے۔ اگر فاؤسٹ ایسا کر سکا تو پھر جلد تم

لنگڑی اُن کی صورت سے بارہ سنگے کی صورت میں بدل دیئے جاؤگے۔ اور میرے آقا۔ شہنشاہِ ذی جاہ مجھے اجازت دیں گے تو میں کتّوں کا ایک غول پیدا کرکے اس بارہ سنگے کا ان سے اس طرح شکار کرواؤں کہ اس کی تیز رفتاری کچھ کام نہ دے سکے اور وہ ان کتّوں کے خونی پنجوں اور دانتوں سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ ارے بلی موتی ارگی، ران، اسپتورتی تم سنتے ہو!

بنوالیو:۔ صبر کرو صبر کرو۔ واللہ یہ شخص ضرور شیطانوں کا ایک غول فوراً یہیں پیدا کردے گا۔ سرکار حضور میری سفارش کریں۔ میں کبھی ایسی اذیتیں برداشت نہیں کرسکوں گا۔

شہنشاہ:۔ اچھا استاد ڈاکٹر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ بنوالیو کے سر سے سینگ اڑوا دیں۔ اس کو کافی سزا مل چکی ہے اور وہ توبہ کرتا ہے۔

فاؤسٹ:۔ اے شہنشاہ معظم مجھے نقصان پہنچانے کیلئے نہیں بلکہ آپ کو خوش کرنے کیلئے میں نے اس سردار سے بدلا لیا ہے۔ اور بس اتنا ہی چاہتا تھا۔ میں خوشی سے اس کے سر سے سینگ اڑائے دیتا ہوں میفسٹوفیلیس آؤ۔ اور بنوالیو کے سر سے سینگ اُڑا دو۔ اور جیسا وہ تھا پھر اسے ویسا ہی کردو۔ (میفسٹو سینگ اڑا دیتا ہے) اور بنوالیو میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آئندہ جب تم عالموں کا تذکرہ کرو تو انھیں اچھا کہنا۔

بنوالیو:۔ تمھارا ذکر اور اچھی طرح سے اور جتنے عالم بھی ہوں گے وہ بھی تمھاری طرح شریفوں کے سروں پر سینگ لگا کر ان کی بیویوں کو حرام کار ثابت کرنے ہوں گے میں ان بھولی بھالی صورتوں اور تالیاں بجا کر تعریف کرنیوالوں پر کبھی بھروسہ نہ کروں گا۔ مگر خدا کیلئے میری باتوں سے برا مان کر پھر درپئے انتقام نہ ہو جائیں اور کہیں مجھے کیکڑا نہ بنا دیں کہ ہر وقت پانی کیلئے مُنہ پھاڑے رہوں اور سوائے کھاری پانی کے اور کچھ پینے کو نہ ملے (بنوالیو یہ باتیں علیحدہ کہتا ہے اور چلا جاتا ہے)

شہنشاہ:۔ آؤ فاؤسٹ آؤ۔ جب تک جرمانیہ کا شہنشاہ زندہ ہے تم اپنی اعلیٰ قابلیت سے اس کی سلطنت میں صاحب اقتدار رہوگے اور شہنشاہ معظم چارلس کے ہمیشہ محبوب رہوگے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

بارھواں منظر

(بنوالیو، مرتینو فریڈرک اور بہت سے سپاہی آتے ہیں)

مرتینو:۔ نہیں پیارے بنوالیو اس جادوگر کے خلاف سازش کرنے سے درگذر کرو۔

بنوالیو:۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ ورنہ پھر تم مجھے درگذر کرنیکو کبھی نہ کہتے۔ میں اپنی اتنی بڑی ذلت کو کیونکر گوارا کرلوں۔ میرے ساتھ جو بُرا سلوک کیا گیا ہے اس پر میرے سب نوکر چاکر ہنستے ہیں۔ اور اپنے دیہاتی کھیلوں میں خوب خوش ہو ہو کر کہتے ہیں کہ آج بنوالیو کے سر پر سینگ سجائے گئے تھے۔ اے کاش جب تک میں اپنی تلوار سے اس جادوگر کا سر نہ اُڑا دوں کبھی نیند میں پلک سے پلک نہ ملے۔ اگر اس کام میں تمھیں میری مدد کرنا ہے تو پھر تلواریں کھینچ لو۔ تیار ہو جاؤ اور ہمت سے کام لو۔ اگر ایسا نہیں تو سب رخصت ہو جاؤ بنوالیو کو تو یہیں مرنا ہے اور فاؤسٹ کی موت میری بے عزتی کی تلافی کردیگی۔

فریڈرک:۔ نہیں جو کچھ بھی ہو ہم تمھارا ساتھ ضرور دیں گے۔ اور اس ڈاکٹر کو اگر وہ ادھر سے نکلا تو قتل بھی کردیں گے۔

بنوالیو:۔ تو پھر شریف فریڈرک درختوں کے اس جھنڈ میں چلے جاؤ اور اپنے کل نوکروں چاکروں کو درختوں کے پیچھے کہیں چھپا کر بٹھا دو۔ اب تک تو سمجھتا ہوں کہ فاؤسٹ قریب آگیا ہوگا۔ کیونکہ میں نے اسے شہنشاہ کے سامنے جھکتے ہوئے اور ان کا ہاتھ چومتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس طرح بڑا انعام پاکر وہ شہنشاہ سے رخصت ہو رہا تھا۔ سپاہیو! تم سب بڑی ہمت اور جوانمردی سے لڑنا۔ اگر فاؤسٹ مارا گیا تو اس کی کل دولت تمھاری ہوگی اور فتح کامل ہماری ہوگی۔

فریڈرک:۔ سپاہیو آؤ میرے ساتھ درختوں کے اس جھنڈ میں چلو اگر فاؤسٹ کو تو جان سے مارے گا اسے دولت اور محبت کرنیوالوں کی کمی نہ ہوگی۔ (فریڈرک سپاہیوں کو لئے چلا جاتا ہے)

بنوالیو:۔ گو سر سے سینگ جانے سے سر ہلکا ہوگیا مگر دل سر سے زیادہ بھاری ہو رہا ہے۔ اور جب تک اس جادوگر کا سر تن سے جُدا نہ کردیگا برابر دھڑکتا رہیگا۔

مرتینو:۔ بنوالیو ہم کہاں چھپ کر بیٹھیں۔

بنوالیو:۔ پہلے حملے کو برداشت کرنے کیلئے ہمیں یہیں رہنا چاہیئے۔ کاش یہ جہنم کا کتا جاہ و اقتدار نہ رکھتا ہوتا تو پھر دیکھتے کہ میں اپنی بے عزتی کا انتقام کس قدر جلد لیتا ہوں۔ (فریڈرک آتا ہے)

فریڈرک:۔ پاس پاس ہو جاؤ۔ جادوگر قریب آرہا ہے اکیلا ہے اپنی عبا پہنے جلد جلد قدم مارتا آرہا ہے۔ تیار ہو جاؤ اور اس موذی گنوار کا کام تمام کردو۔

بنوالیو:۔ اسے جان سے مارنیکی عزت مجھے حاصل ہونا چاہیئے۔ اچھا۔ اب اے تلوار سیدھا وار کر۔ اب سینگوں کے بجائے میں اس کا سر لیتا ہوں (فاؤسٹ ایک نقلی سر کندھوں پر لگائے آتا ہے)

مرتینو:۔ دیکھو، دیکھو وہ آرہا ہے۔

بنوالیو:۔ خاموش۔ اس ضرب میں اس کا کام تمام ہوا چاہتا ہے۔ اے جہنم تو اس کی روح کو تو اپنے پاس رکھ اور اس کا جسم یہیں چھوڑ جا۔ (فاؤسٹ پر تلوار چلاتا ہے)

(فاؤسٹ ہائے کرکے زمین پر گرتا ہے)

فریڈرک :۔ لائق ڈاکٹر کیا آپ ہائے ہائے کرتے ہیں؟

بنوالیو :۔ پیارے فریڈرک اس کو تو اس وقت تک ہائے ہائے کرنے دو جب تک کہ اس کا دل شق ہو جائے۔ اور فریڈرک دیکھ میں اس کی کل تکلیف کا کس طرح خاتمہ کئے دیتا ہوں۔

مرتینو :۔ ہاں ذرا ہاتھ کس کر لگانا (بنوالیو فاؤسٹ کا سر تن سے جدا کر دیتا ہے) اچھا سر تو کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔

بنوالیو :۔ اچھا یہ خبیث شیطان تو مارا گیا۔ اب دوزخ کی دیبیاں جتنا چاہے ہنسیں۔

فریڈرک :۔ کیا یہی وہ چہرہ تھا جو اس قدر خوفناک اور قہر و عتاب سے بھرا نظر آیا کرتا تھا۔ جسے دیکھ کر ارواح جہنم کا خوفی چشم بادشاہ بھی لرزا اٹھتا تھا اور اس کے احکام سحر کو سنکر کانپ جاتا تھا!

مرتینو :۔ کیا یہ وہی ملعون سر ہے جس کے دل و دماغ نے بنوالیو کی ذلت و خواری شہنشاہ کے حضور میں کی!

بنوالیو :۔ جی ہاں یہ وہی سر ہے اور یہ اس کا دھڑ پڑا ہے جسے اپنی بد معاشیوں کی پوری سزا ملی ہے۔

فریڈرک :۔ آؤ کوئی ایسی تدبیر کریں کہ جس سے اس کے قابل نفرین نام کو ذلیل سے ذلیل تر کیا جائے۔

بنوالیو :۔ پہلے تو اس کے سر پر جو بڑا انیار اس نے میرے ساتھ کی ہیں اس کی یاداشت میں بڑی بڑی نوکیں نکلے ہوئے سینگ اس کی پیشانی کے دونوں طرف کیلوں سے جڑ دیں اور اس شکل میں اس سر کو اس کھڑکی میں لٹکا دیں جہاں پہلے پہل اس نے مجھے ذلیل و خوار کیا تھا۔ تاکہ ساری دنیا میرے اس انتقام کو دیکھ لے۔

مرتینو :۔ اس کی ڈاڑھی سے کیا کام لیا جائے؟

بنوالیو :۔ اسے کسی چمنی صاف کرنیوالے کے ہاتھ بیچ ڈالا جائے۔ اس ڈاڑھی سے کوئی دس جھاڑو تیار ہو جائیں گی۔

فریڈرک :۔ اور اس کی آنکھوں کو کیا کریں؟

بنوالیو :۔ آنکھیں سر سے نکالیں گے اور اس کے ہونٹوں پر بٹنوں کی طرح لگا کر ہونٹوں کو بند کر دیں گے تاکہ زبان کو ٹھنڈ نہ پہنچے۔

مرتینو :۔ خوب تدبیر سوچی۔ صاحبو سر کے ٹکڑوں کا خاصا بندوبست ہو گیا مگر باقی جسم کے لئے کیا کیا جائے۔

(فاؤسٹ اٹھ بیٹھتا ہے)

بنوالیو :۔ بہ سوگند مسیح۔ یہ شیطان تو پھر جی اٹھا۔

فریڈرک :۔ خدا کیلئے اس کا سر اسے دیدو۔

فاؤسٹ :۔ نہیں اسے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ تمھارے اس فعل کا بدلہ لینے کو فاؤسٹ کے پاس بہتیرے ہاتھ ہو جائیں گے۔ ارے بے ایمانو تمھیں یہ معلوم کہ میں اس دنیا میں چوبیس برس زندہ رہنے کی شرط سے آیا ہوں۔ اگر تم میرے جسم کو اپنی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کا باریک قیمہ بھی کر دیتے تب بھی ایک منٹ میں میری روح آکر ان سب کو جوڑ کر مجھے صحیح و سالم کر دیتی اور میں ایسا زندہ آدمی ہو جاتا جسے کوئی کسی طرح کا ضرر نہ پہنچا سکتا تھا۔ لیکن اب میں اپنا انتقام لینے میں کیوں دیر کر رہا ہوں۔ البروتھ۔ بلی موتھ میفسٹو ادھر آؤ۔ (میفسٹو مع دیگر شیاطین کے آتا ہے) شیطانو اپنی آگ کی طرح جلتی پیٹھوں پر ان سب کو سوار کر دو۔ اور آسمان تک اڑتے چلے جاؤ۔ اور پھر وہاں سے دوزخ کے قعر اسفلین میں انھیں گرا دو۔ لیکن نہیں صبر کرو۔ اس صورت میں دنیا تو ان کی مصیبت و خواری کو نہ دیکھ سکے گی۔ اس کے بعد کہیں دوزخ ان کو ان کے مکر و فریب کی سزا دیگا۔ بلی موتھ تم جاؤ اور اس بدمعاش کو یہاں سے لے جاؤ۔ اور اسے کسی کیچڑ اور غلاظت کے گڑھے میں گرا دو۔ اس دوسرے آدمی کو لیجا کر جنگلوں میں اسے گھسیٹے پھرو۔ جہاں کانٹے اور کانٹوں دار جھاڑیاں ہوں اور میرے شریف میفسٹو تم اس بدمعاش کو اٹھا کر پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر پہنچا دو۔ وہاں سے اسے نیچے گرا دو۔ تاکہ نیچے تک آنے میں اس کی سب ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں۔ اس طرح جیسے کہ اس نے میرے جسم کے ٹکڑے کرنے چاہے تھے۔ بس سب فوراً اڑو اور میرے احکام کو بجالاؤ۔

فریڈرک :۔ شریف فاؤسٹ ہم پر رحم فرمائیے۔ ہماری جانیں بچا دیجئے۔

فاؤسٹ :۔ فوراً جاؤ جس طرح حکم دیا ہے وہی کرو۔

فریڈرک :۔ جسے شیطان ہانکے اسے تو چلنا ہی پڑتا ہے (شیاطین لوز تینوں سردار آتے ہیں)

(سپاہی چوکیں گاہ میں چھپے بیٹھے تھے آتے ہیں۔)

پہلا سپاہی :۔ جوانو آؤ اور تیار ہو جاؤ اور جلد ان شریف آدمیوں کی مدد کرو جنھیں میں نے ساحر سے باتیں کرتے سنا ہے۔

دوسرا سپاہی :۔ دیکھو وہ ساحر آرہا ہے۔ تلوار کا ہاتھ لگاؤ اور فوراً اسے قتل کر دو۔

فاؤسٹ :۔ ارے یہ کیا ہے؟ اچھا میری تاک میں سپاہیوں کو بٹھا کر میری جان لینی چاہی تھی۔ اب فاؤسٹ تو بھی اپنی چال چل۔ ارے کمینے گنوارو دم لو ذرا ٹھیرے رہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے حکم سے یہ درخت اپنی جگہ سے ہٹنے لگے ہیں۔ اور مجھ میں اور تم میں ایک سنگین دیوار کی طرح حائل ہو گئے ہیں تاکہ تمھاری دغا اور فریب سے مجھے محفوظ رکھیں۔ تمھاری اس بیہودہ کوشش کو بیکار کرنے کیلئے ایک فوج چلی آرہی ہے (فاؤسٹ دروازہ پر ہاتھ مارتا ہے اور ایک شیطان ڈھول بجاتا ہوا آتا ہے اور ایک دوسرا شیطان ہاتھ میں علم لئے حاضر

ہوجاتا ہے اور بہت سے ہتھیار بھی اس کے پاس ہیں۔ میفسٹو آتش فگن آلات لئے ہوئے آتا ہے اور یہ سب سپاہیوں پر حملہ کرتے ہیں اور انھیں باہر نکال دیتے ہیں۔)

تیرھواں منظر

مختلف دروازوں سے بنوالیو، فریڈرک اور مرتینو آتے ہیں ان کے چہرے اور سر سے خون جاری ہے اور کیچڑ اور غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ اور ان کے سروں پر سینگ لگے ہیں

مرتینو:۔ ارے بنوالیو کیا تم یہاں ہو!

بنوالیو:۔ ہاں۔ ارے کیا فریڈرک بھی یہاں ہے!

فریڈرک:۔ اے شریف دوست میری مدد کر۔ مرتینو کہاں ہے؟

مرتینو:۔ پیارے فریڈرک میں بھی یہیں موجود ہوں۔ کیچڑ اور گندگی کے گڑھے میں مجھے ان شیطانی ذریات نے پاؤں پکڑ کر اتنا گھسیٹا ہے کہ دم آدھا کردیا۔

فریڈرک:۔ مرتینو دیکھتے ہو کہ بنوالیو کے سر پر پھر سینگ نکل آئے ہیں۔

مرتینو:۔ ارے مصیبت۔ بنوالیو کیوں اب کیا حال ہے؟

بنوالیو:۔ خدایا میری مدد کر۔ اب تک یہ شیطان مجھ پر قابو پائے ہے۔ کیا میرا یہی حال رہیگا!

مرتینو:۔ ڈرو نہیں۔ ہم میں کسی کو جان سے مار ڈالنے کی طاقت نہیں ہے۔

بنوالیو:۔ میرے دوستوں کی صورتیں کیسی بدل گئیں۔ ارے جہنمی عداوت! تم سب کے سروں پر سینگ دیکھ رہا ہوں۔

فریڈرک:۔ ٹھیک کہتے ہو۔ کیا تمھاری مراد اپنے سینگوں سے ہے جو تمھارے سر پر لگے ہیں؟

بنوالیو:۔ ارے کیا پھر سینگ میرے سر پر لگ گئے ہیں؟

مرتینو:۔ گھبراؤ نہیں سب کا یہی حال ہے۔

بنوالیو:۔ ارے اس ملعون ساحر کے تحت میں کون بڑا شیطان ہے جس نے اپنے بغض اور کینے سے ہماری تکلیفوں کو دوگنا کردیا!

فریڈرک:۔ یارو بتاؤ کہ اس ذلت و خواری سے بچنے کی کیا تدبیر ہے؟

بنوالیو:۔ اگر ہم انتقام کی غرض سے اس کا پیچھا کرتے ہیں تو پھر وہ ان سینگوں کے پاس گدھے کے دو لمبے کان بھی لگادیگا اور پھر تمام دُنیا ہم پر ہنسے گی۔

مرتینو:۔ تو پھر پیارے بنوالیو ہم کیا کریں!

بنوالیو:۔ میرا ایک قصر اس جنگل کے قریب ہے بس وہاں چلنا چاہئے۔ اور وہیں گمنامی کی حالت میں زندگی اس وقت تک بسر کریں کہ زمانہ ہماری اس بُری شکل کو بدل دے۔ کیونکہ اس ذلت نے ہماری شہرت کو ایسا تباہ کیا ہے کہ ذلیل ہوکر جینے سے تو مرجانا بہتر ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

چودھواں منظر

(ایک سبزہ زار جہاں بعد کو فاؤسٹ کا مکان بنا)

فاؤسٹ:۔ زمانہ زندگی کے پُرشور منازل کو اپنے خاموش قدموں سے چپ چاپ طے کر رہا ہے۔ اور میرے رشتۂ حیات اور زندگی کے دنوں کو کم کر رہا ہے اور جو سال ابھی گذرے ہیں ان کا معاوضہ مجھ سے لیا چاہتا ہے۔ بس پیارے میفسٹو آؤ وٹن برگ جلد چلیں۔

میفسٹو:۔ کیا آپ گھوڑے پر سوار ہوکر جانا چاہتے ہیں یا پیدل؟

فاؤسٹ:۔ نہیں جب تک میں اس پُرفضا سبزہ زار سے نہ گزرلوں اس وقت تک پیدل ہی چلنا چاہتا ہوں۔

(ایک گھوڑے بیچنے والا آتا ہے)

گھوڑے کا سوداگر:۔ میں آج سارا دن آقائے تبیان (فاؤسٹ) کو تلاش کرتا ہوں۔ لیجئے وہ یہاں مل گئے۔ سرکار کو خدا سلامت رکھے۔

فاؤسٹ:۔ اچھا تم گھوڑوں کے سوداگر ہو۔ خوب ملے۔

گھوڑی کا سوداگر:۔ آپ نے سُنا۔ میں آپ کے گھوڑے کی قیمت چالیس ڈالر لیکر آیا ہوں لیجئے یہ قیمت حاضر ہے۔

فاؤسٹ:۔ میں تو اتنے کم میں نہیں بیچتا۔ اگر پچاس ڈالر منظور ہوں تو گھوڑا لے سکتے ہو۔

گھوڑی کا سوداگر:۔ افسوس جناب اس سے زیادہ میرے پاس نہیں ہے۔ آپ سے التجا ہے کہ خریدار کا بھی آپ خیال رکھیں۔

میفسٹو:۔ حضور سے درخواست ہے کہ اس کو گھوڑا لے لینے دیجئے۔ یہ ایماندار آدمی ہے بیوی بچے نہیں رکھتا پھر بھی اس کے مصارف زیادہ ہیں۔

فاؤسٹ:۔ اچھا آؤ۔ روپیہ جو لائے ہو مجھے دیدو۔ (گھوڑوں کا سوداگر روپیہ دیتا ہے) ہمارا سائیس گھوڑا تمھارے حوالے کردیگا لیکن گھوڑا لینے سے پہلے ایک بات تمھیں بتادینی ضرور ہے کہ کبھی اس پر سوار ہوکر پانی میں نہ جانا۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ یہ کیوں۔ کیا اندیشہ ہے کہ وہ ہر قسم کا پانی نہیں پی سکتا

فاؤسٹ:۔ پانی وہ ہر قسم کا پی سکتا ہے مگر اس پر سوار ہوکر پانی میں نہ جانا۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ بہت بہتر ہے۔ مجھے تو حضور نے اس وقت آدمی بنا دیا۔ اب تو میں چالیس ڈالر میں اس گھوڑے کو کسی کے ہاتھ نہ بیچوں گا۔ اگر چال کا تیز دار نکلا تو پھر میں اس سے بہت کچھ کماؤں گا اس کے پٹھے تو ایسے چکنے ہیں جیسے

مچھلی پھنسی ہوتی ہے (علیحدہ کہتا ہے) اچھا خدا آپ پر ہمیشہ مہربانی کرے۔ آپ کا سائیس وہ گھوڑا میرے حوالے کر دیگا۔ لیکن اتنا سمجھ لیجئے کہ اگر میرا گھوڑا بیمار پڑا۔ یا کسی طرح کی تکلیف اسے ہوئی تو پھر میں اس کا قارورہ حاضر کروں گا اور آپ اس کا علاج بتائیں گے۔

فاؤسٹ:۔ ارے بدمعاش دور ہو۔ کیا تو مجھے سلوتری سمجھے ہوئے ہے۔

(گھوڑوں کا سوداگر چلا جاتا ہے)۔ ہائے فاؤسٹ تو ایسے انسانوں میں ہے جن پر موت کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ اور تیرا آخری وقت اب قریب آتا جاتا ہے۔ مایوسی میرے خیالات میں بدگمانی پیدا کر رہی ہے۔ ان جذبات کو میٹھی نیند لیکر دور کرو۔ مسیح نے صلیب پر چور کو آواز دی تھی۔ پس فاؤسٹ اس پریشان حال میں تسکین سے رہو اور آرام کرو۔۔

(فاؤسٹ اپنی کرسی پر سو جاتا ہے)

(گھوڑوں کا سوداگر سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا روتا ہوا آتا ہے)

گھوڑوں کا سوداگر:۔ ہائے ہائے ڈاکٹر فستیان غرض یہ ہے کہ واللہ ڈاکٹر لوپسر ہرگز ایسا ڈاکٹر نہ تھا آپ نے تو ایسا جلاب دیا کہ چالیس ڈالر ہی نکل گئے۔ اب ان کی صورت پھر دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔ لیکن میرا گدھا پن یہ تھا کہ میں نے ان کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ کیونکہ آپ کا حکم یہ تھا کہ میں اس پر سوار ہو کر پانی میں نہ جاؤں۔ لیکن میں یہ سمجھا کہ اس گھوڑے میں کوئی وصف ایسا ہے جس کی مجھے اطلاع نہیں کی گئی میں ایک دل چلے نوجوان کی طرح اس پر سوار ہو کر ایک گہرے پانی کے تالاب میں چلا۔ یہ تالاب شہر کے ایک سرے پر تھا۔ جوں ہی میں تالاب کے بیچ میں پہنچا گھوڑا غائب ہو گیا۔ اور میں گھاس کے ایک بوجھ پر بیٹھا نظر آیا۔ کبھی ڈوب کر مرنے کی ایسی نوبت پہلے نہ آئی تھی۔ لیکن میں اس ڈاکٹر کو تلاش کروں گا جس نے میرے ہاتھ یہ گھوڑا بیچا تھا۔ اور اپنے چالیس ڈالر ضرور وصول کروں گا۔ ورنہ سمجھوں گا کہ اس گھوڑے کے برابر دوسرا قیمتی گھوڑا نہیں۔ لو ان کی لمبی چونچ والے لق لق تو یہاں موجود ہیں۔ سنتے ہو میاں مداری آپ کے آقائے نامدار کہاں ہیں؟

میفسٹو:۔ کیوں جناب آپ کو ان سے کیا کام ہے۔ آپ ان سے بات نہیں کر سکتے۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ میں تو ضرور بات کروں گا۔

میفسٹو:۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو اس وقت بے خبر سو رہے ہیں۔ پھر کسی وقت آنا۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ میں تو ابھی ان سے بات کروں گا۔ ورنہ اس کی خواب گاہ کی کھڑکیوں کے شیشے اس طرح توڑوں گا کہ ان کے ٹکڑے آپ کے آقا کے کان پر گریں۔

میفسٹو:۔ سنو تو فاؤسٹ آٹھ راتیں گذری ہیں کہ سویا نہیں۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ آٹھ راتیں کیسی اگر آٹھ اٹھوارے بھی جاگتے گذرے ہوں تو بھی میں ان سے بغیر بات کئے یہاں سے نہ ٹلوں گا۔

میفسٹو:۔ آپ کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیجئے کہ فاؤسٹ وہ سو رہے ہیں۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ یہی ہیں نا۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ ماسٹر ڈاکٹر۔ ماسٹر ڈاکٹر۔ ماسٹر ڈاکٹر فستیان چالیس ڈالر۔ چالیس ڈالر کیا فقط گھاس کے بوجھ کیلئے ہیں۔

میفسٹو:۔ دیکھتے نہیں کہ وہ تمھاری بات بالکل نہیں سنتے۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ (فاؤسٹ کے کان کے پاس منہ لاکر پکارتا ہے) اجی سنتے ہو۔ میں تو تمہیں اپنے جانے سے پہلے جگا کر چھوڑوں گا۔ (فاؤسٹ کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہے ٹانگ علیحدہ ہو جاتی ہے) ارے کیا کروں میں تو نٹ گیا۔

فاؤسٹ:۔ ارے میری ٹانگ میری ٹانگ میفسٹو مدد کرو۔ پولیس کو بلاؤ۔ ہائے میری ٹانگ ٹانگ۔

میفسٹو:۔ ارے بدمعاش ادھر آ۔ میں تجھے پولیس کے حوالے کروں۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ اجی مہربان مجھے جانے دیجئے۔ میں چالیس ڈالر اور آپکی نذر کروں گا۔

میفسٹو:۔ وہ ڈالر کہاں ہیں؟

گھوڑوں کا سوداگر:۔ یہاں تو نہیں ہیں۔ آپ میرے مکان پر آئیں پھر میں یہ رقم آپ کو دیدوں گا۔

میفسٹو:۔ جلدی روپیہ لیکر آؤ۔ (سوداگر بھاگ جاتا ہے)

فاؤسٹ:۔ کیا وہ چلا گیا۔ فاؤسٹ کی ٹانگ پھر اس کے پاس آگئی۔ اچھا میاں سوداگر خدا حافظ۔ اس کی ساری محنت کی اجرت گھاس کا ایک بوجھا ہوا۔ اس ترکیب سے چالیس ڈالر اسے اور دینا پڑے۔

(ویگنر آتا ہے)

اچھا ویگنر کہو کیسے ہو؟

ویگنر:۔ حضور فان ہولٹ کے نواب صاحب بڑے اشتیاق سے آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

فاؤسٹ:۔ فان ہولٹ کے نواب صاحب تو بڑے معزز شریف ہیں۔ ان کیساتھ چالاکی کرنے میں مجھے کمی نہ کرنا چاہیئے۔ آؤ میفسٹو اس نواب سے ملنے چلیں۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

پندرھواں منظر

روبن، ڈک، گھوڑوں کا سوداگر اور ایک چھکڑے والا آتا ہے۔

چھکڑے والا:۔ آئیے میں یورپ کی بنی ہوئی بہترین بیئر شراب آپ کو پلواتا ہوں۔ اے پی بھٹی والی ساقن سنتی ہو۔ کہو وہ طوائفیں کہاں ہیں؟

(ساقن آتی ہے)

ساقن:۔ فرمائیے کس چیز کی ضرورت ہے۔ آہا آپ تو ہمارے پرانے گاہک ہیں آئیے۔ کرم فرمائیے۔

روبن:۔ سمجھے بھی میں اتنا چپ کیوں ہوں؟

ڈک:۔ نہیں روبن میں کچھ نہیں سمجھا کہ تم چپ کیوں ہو۔

روبن:۔ مجھے تو اشارہ مل رہے ہیں اس ساقن کے دیئے ہیں۔ مگر کچھ کہو نہیں۔ دیکھنا ہے کہ وہ دیکھوں تو نہیں گئی۔

ساقن:۔ ایک یہ کون صاحب ہیں جو بالکل خاموش دور کھڑے ہیں! یہ تو میری پرانے گاہک معلوم ہوتے ہیں۔

روبن:۔ ساقن آپ کیسی ہیں۔ وہ آپ کا قرضہ اب تک مجھ پر چلا آتا ہے۔

ساقن:۔ اس میں کیا شبہ ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ اسے ابھی ادا کرنا ضروری نہیں جانتے۔

ڈک:۔ پی ساقن سنتی ہو۔ تھوڑی سی بیئر شراب ہمارے لئے منگوا لیجئے۔

ساقن:۔ ابھی لیجئے۔ اندر کمرے میں تشریف لے جائیے (یہ کہکر ساقن چلی جاتی ہے)

ڈک:۔ یارو ساقن تو چلی گئی۔ اب جب تک وہ آئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

چھکڑے والا:۔ جناب عالی میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں کہ حال ہی میں ایک جادوگر نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا آپ ڈاکٹر فاؤسٹ کو تو جانتے ہوں گے!

گھوڑوں کا سوداگر:۔ وہ تو طاعون سے مرا بھلا۔ میں تو اس کو خوب جانتا ہوں کیا تم پر بھی اس نے کوئی جادو مارا!

چھکڑے والا:۔ سنئے تو اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔ تھوڑے دن گذرے کہ میں گھاس لئے وٹن برگ جا رہا تھا کہ وہ رستے میں ملا۔ اور کہنے لگا جتنی گھاس میں کھاؤں گا اس کے کیا دام ہوں گے۔ میں سمجھا کہ یہ گھاس کتنی کھائیگا میں نے کہا اچھا تین فاردنگ دو اور جتنی کھائی جائے کھالو۔ اس نے دام میرے حوالے کئے اور گھاس کھانا شروع کی۔ یقین جانو کہ اس نے گھاس پر سے منہ نہ اٹھایا جب تک پورا گٹھڑ میری گھاس کا کھا نہ لیا۔

سب:۔ ارے غضب پورا بوجھا گھاس کا کھا گیا!

روبن:۔ ہاں ہاں اس میں تعجب کیا ہے۔ میں نے ایک آدمی کا ذکر سنا جو لکڑیوں کا پورا گٹھڑ کھا گیا تھا۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ اچھا دوستو سنو کہ وہ میرے ساتھ کیسی بدمعاشی سے پیش آیا۔ میں کل اس کے پاس ایک گھوڑا خریدنے گیا مگر گھوڑے کی قیمت چالیس ڈالر سے ایک پیسہ کم نہ کی۔ چونکہ میں گھوڑے کو سمجھتا تھا کہ جانور اچھا ہے جھاڑی پر سے کودتا پھاندتا نکل جائیگا اور کبھی نہ تھکے گا۔ میں نے روپیہ اس کے حوالے کیا۔ غرض جب گھوڑا میرے حوالے کر دیا گیا تو ڈاکٹر فاؤسٹ نے مجھ سے کہا کہ اس گھوڑے پر رات دن سواری لینا اور اسے چین سے نہ بیٹھنے دینا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس پر سوار ہو کر کبھی پانی میں نہ جانا۔ اب جناب میں یہ سمجھا کہ گھوڑے میں کوئی خاص وصف ایسا ہے کہ جس سے یہ مجھے واقف کرنا نہیں چاہتا۔ میں تب سوار ہو کر ایک دریا کے اندر چلا۔ اب جوں ہی دریا کے بیچ پہونچا گھوڑا غائب ہو گیا اور میں ایک گھاس کے گٹھڑ پر بیٹھا رہ گیا۔

سب:۔ ارے واہ رے ڈاکٹر۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ اب سنئے۔ میں بھی چپکا نہ بیٹھا۔ فوراً اس ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہاں وہ بے خود پڑا سو رہا تھا۔ اس کے کان کے پاس بڑی دیر تک چیختا چلاتا رہا مگر وہ کسی طرح نہ جاگا۔ جب دیکھا کہ کسی طرح بھی جاگتا ہی نہیں تو میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اس زور سے گھسیٹی کہ ٹانگ جسم سے جدا ہو گئی جناب وہ ٹانگ اب تک میرے مکان میں موجود ہے۔

روبن:۔ تو کیا ڈاکٹر اب ایک ٹانگ کا ہو گیا؟ یہ تو بہت خوب ہوا۔ کیونکہ اس کے شیطانوں میں سے ایک شیطان نے اپنا چہرہ لنگور کا سا بنا لیا ہے۔

چھکڑے والا:۔ ساقن تھوڑی سی شراب اور دیجئے۔

روبن:۔ سنتے ہو۔ ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ تم یہاں پیتے جب پی چکو تو سب مل کر ڈاکٹر فاؤسٹ کے پاس چلیں۔

(سب چلے جاتے ہیں)

سولھواں منظر

نواب فان ہولٹ کا دربار۔

نواب، اس کی بیگم اور فاؤسٹ اندر آتے ہیں۔

نواب:۔ ڈاکٹر فاؤسٹ یقین جانیئے کہ اس وقت کے مذاق اور دل لگی سے میں بہت ہی محظوظ ہوا ہوں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے کمال کا جو جادو کا محل تیار کرنے میں آپ نے دکھایا ہے کس طرح معاوضہ ادا کر سکتا ہوں۔ اس جادو کے محل کو جو ہوا میں معلق دیکھ کر میں اس قدر خوش ہوا ہوں کہ اس سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی۔

فاؤسٹ:۔ جناب والا اس سے بڑھکر میرے لئے اور کیا معاوضہ ہو سکتا ہے کہ حضور فاؤسٹ کے کام سے خوش ہوئے۔ لیکن جنابہ بیگم صاحبہ غالباً اس کام کو دیکھکر خوش نہیں ہوئی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ حاملہ عورتیں کوئی خاص چیز زمانہ حمل میں کھانا پسند کرتی ہیں۔ بتائیں کہ حضور کو کون سی چیز سے رغبت ہے وہی چیز حاضر کروں گا۔

بیگم:۔ ڈاکٹر صاحب میرا شکریہ قبول ہو۔ مجھے خوش کرنے کیلئے آپ کے اس اخلاق کی میں قدر کرتی ہوں اور جس چیز کو دل چاہتا ہے وہ میں آپ سے مخفی نہ رکھوں گی۔ آج کل جنوری کا مہینہ ہے سخت جاڑا پڑ رہا ہے۔ اگر گرمی کا موسم

ہوتا تو میں آپ سے درخواست کرتی کہ کچے انگوروں کی ایک طشتری مجھ درکار ہے

فاؤسٹ:- یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے میفسٹو فوراً جاؤ اور انگور حاضر کرو (میفسٹو چلا جاتا ہے) اگر حضور اس سے بھی بڑھکر کوئی چیز طلب فرمائیں۔ تو وہ بھی آپکی خوشی کیلئے فوراً حاضر کر دی جائیگی۔

(میفسٹو انگور لئے حاضر ہوتا ہے)

لیجئے بیگم صاحبہ انگور حاضر ہیں آپ انھیں نوش فرمائیں۔

نواب:- فاؤسٹ آپ یقین کریں کہ مجھے اس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ جاڑا آج کل زوروں پہ ہے اور جنوری کا مہینہ ہے یہ انگور آپکو کیسے دستیاب ہوگئے؟

فاؤسٹ:- جناب والا بات یہ ہے کہ کل دنیا میں سال کے دو حصے ہوتے ہیں جس زمانہ میں ہمارے ہاں جاڑا ہوتا ہے اس کے مقابل کے منطقے میں جیسے ہند اور سبا اور دیگر ممالک مشرق میں ان دنوں وہاں گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ اور ایک نہایت تیز رو قاصد کے ذریعے جیسا کہ میرے پاس ہے آپ ملاحظہ کرتے ہیں کہ میں نے یہ انگور منگوائے۔ حضور بیگم صاحبہ انگور مزے کے ہیں کیسے ہیں آپ انھیں پسند کرتی ہیں؟

بیگم:- ڈاکٹر فاؤسٹ یقین جانئے کہ اس سے زیادہ لذیذ اور شیریں انگور میں نے اپنی تمام عمر میں آج سے پہلے نہیں کھائے تھے۔

فاؤسٹ:- مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے انھیں پسند فرمایا۔ (اچید اوباش مسخرے دروازے کے باہر دُند مچاتے ہیں)

نواب:- یہ دروازے کے باہر کون گستاخ شور و غل مچاتا ہے۔ ان کے غل غصے کو رفع کرنے کیلئے کمرے کے دروازے کھول دو اور پھر ان سے دریافت کرو کہ یہ کیا حرکت ہے۔ (باہر کے لوگ پھر غوغا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ڈاکٹر فاؤسٹ سے بات کرنی چاہتے ہیں)

ایک ملازم:- ارے صاحبو یہ تم کیسی غول بندی کر کے آئے ہو۔ کیا وجہ ہے کہ تم نواب صاحب کے آرام میں خلل ڈالتے ہو؟

ڈک:- ہم کوئی وجہ نہیں رکھتے اس لئے نواب کی ہمیں پروا نہیں ہے۔

ملازم:- ارے بیہودہ آدمیوں کیا تمھاری اتنی ہمت ہوگئی۔

گھوڑوں کا سوداگر:- جی ہاں بیباکی کی ہمت ہم میں ہے گو ہمارا خیر مقدم کیا جائے۔

ملازم:- معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ بیباکی اور ہمت تم کہیں اور دکھاؤ۔ نواب صاحب کو تکلیف نہ دو۔

نواب:- آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں؟

ملازم:- بس یہی چیخ رہے ہیں کہ ہم ڈاکٹر فاؤسٹ سے بات کرنی چاہتے ہیں۔

گاڑی بان:- ہاں اور ہم ضرور اس ڈاکٹر سے گفتگو کریں گے۔

نواب:- کیا ایسا ارادہ ہے۔ ان بدمعاشوں کو گرفتار کر لو۔

ڈک:- ہمیں گرفتار کرتے ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ اس کے باپ کو گرفتار کر لو۔

فاؤسٹ:- میں حضور سے درخواست کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو اندر آنے دیا جائے۔ یہ ہنسی دل لگی کیلئے اچھا مضمون ہیں

نواب:- ڈاکٹر فاؤسٹ آپ جو چاہیں کریں میں آپ کو اختیار دیتا ہوں۔

فاؤسٹ:- میں حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(روبن، ڈک، گاڑی بان اور گھوڑوں کا سوداگر اندر آتا ہے)

کہو دوستو کیا حال ہے اب تو سب بڑے ہوائی ہوگئے ہو فکر نہ کرو میں نے نواب صاحب سے تمھاری خطا معاف کرا دی ہے۔ آؤ تم سب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

مسخرا:- نہیں جناب ہمارا خیر مقدم تو ہمارا روپیہ ہے۔ ایک درجن بیئر شراب کی بوتلیں نذر کیجئے اور پھر چاہے آپ پھانسی پہ چڑھ جائیں۔ ہمیں اس سے کیا۔

فاؤسٹ:- ارے سُنتا بھی ہے۔ تجھے خبر بھی ہے کہ اس وقت کہاں ہے؟

گاڑی بان:- ہاں واللہ خوب معلوم ہے۔ ہم سب آسمان کے نیچے ہیں۔

گھوڑوں کا سوداگر:- ہاں ہاں جس مکان میں ہیں وہ شراب پینے کیلئے اچھا مقام ہے۔ ہاں واللہ تھوڑی سی شراب پلاؤ۔ ورنہ سمجھ لو کہ جس قدر شراب کے پیپے اس مکان میں ہونگے ہم انھیں توڑ دیں گے اور تم سب کے سر بوتلوں سے پھوڑ دیں گے۔

فاؤسٹ:- اس قدر کیوں غصہ کرتے ہو۔ آؤ تمھیں بیئر شراب دی جائیگی۔ حضور نواب صاحب مجھے تھوڑی دیر کو اجازت دیں میرا اعتبار کریں حضور اخیر میں خوش ہو جائیں گے۔

نواب:- ہاں نہایت خوشی سے مہربان ڈاکٹر۔ جو خوشی آپ کی وہی میری ہے۔ جو آپ کی خوشی ہو وہ کیجئے۔ میرا گھر میرے ملازم سب آپکی خدمت کیلئے حاضر ہیں۔

فاؤسٹ:- میں جناب والا کا بیحد ممنون ہوا ہوں۔ اچھا کچھ بیئر شراب لائی جائے۔

گھوڑوں کا سوداگر:- واللہ یہ بات ڈاکٹر نے کہی ہے۔ اور خدا جانتا ہے کہ میں آپکی لکڑی کی ٹانگ کا جام صحت ضرور پیوں گا۔

فاؤسٹ:- میری لکڑی کی ٹانگ اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟

گاڑی بان:- ہاں ڈک سنتے ہو ڈاکٹر کیا کہتے ہیں وہ اپنی ٹانگ ہی کو بھول گئے ہیں۔

گھوڑوں کا سوداگر:- بھول کیوں گئے۔ کیا آپ اس کے سہارے کھڑے تو ہوتے نہیں؟

فاؤسٹ:- ہاں یہ مجھ سے کہتے ہو کہ لکڑی کی ٹانگ پہ میں نہیں کھڑا ہوتا۔

گاڑی بان:- خدایا یہ بھی حیرت کا مقام ہے کہ گوشت اور خون آپ کے نزدیک اتنی کمزور شے ہے۔ آپ کو وہ سوداگر گھوڑوں کا یاد ہے جس کے ہاتھ ایک گھوڑا

آپ نے فروخت کیا تھا!

فاؤسٹ:۔ ہاں خوب یاد ہے کہ ایک گھوڑا میں نے اس کے ہاتھ بیچا تھا۔

گاڑی بان:۔ اور کیا آپ کو یہ بھی یاد ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر پانی میں نہ جانا؟

فاؤسٹ:۔ ہاں خوب یاد ہے۔

گاڑی بان:۔ پھر کیا آپ کو اپنی ٹانگ کی بابت کچھ یاد نہیں؟

فاؤسٹ:۔ نہیں واللہ کچھ یاد نہیں۔

گاڑی بان:۔ پھر مہربانی فرما کر اپنا اخلاق یاد فرمائیں۔

فاؤسٹ:۔ میں آپ کا شکر گزار ہوا۔

گاڑی بان:۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔ وہ بات ہی کونسی ہے۔ مگر ایک بات ضرور بتائیے۔

فاؤسٹ:۔ وہ کیا؟

گاڑی بان:۔ کیا رات کو آپ کی دونوں ٹانگیں ساتھ ہوتی ہیں؟

فاؤسٹ:۔ کیا تم مجھے کوئی عفریت سمجھتے ہو جو ایسے سوال مجھ سے کرتے ہو!

گاڑی بان:۔ نہیں میں آپ کو کچھ نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر میرے سوالوں کا جواب آپ مجھے دیدیں گے تو مجھے مسرت ہوگی۔

(ساقن شراب لئے آتی ہے)

فاؤسٹ:۔ اگر آپ پوچھتے ہی ہیں تو بتاتا ہوں کہ میری دونوں ٹانگیں ساتھ ہوتی ہیں۔

گاڑی بان:۔ شکریہ۔ اب مجھے بالکل اطمینان ہو گیا۔

فاؤسٹ:۔ مگر یہ سوال آپ نے کیوں کیا تھا؟

گاڑی بان:۔ وجہ کچھ نہ تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان دو ٹانگوں میں سے جو آپ کے ساتھ بستر میں ایک لکڑی کی تھی۔

گھوڑوں کا سوداگر:۔ ذرا میری سنئے۔ جب آپ سو رہے تھے تو کیا میں نے آپ کی ایک ٹانگ نہیں گھسیٹی تھی؟

فاؤسٹ:۔ نہیں وہ ٹانگ تیری میرے پاس موجود تو ہے۔ اس وقت تو میں جاگ رہا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیں یہ موجود ہے۔

سب۔:۔ ارے کیا اس ڈاکٹر کے تین ٹانگیں ہیں!

گاڑی بان:۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ میرا سارا گٹھڑ کھا کر آپ نے مجھے کیسا دھوکا دیا تھا۔ (فاؤسٹ جادو کے زور سے اسے چپ کر دیتا ہے۔)

ڈک:۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ میرا چہرہ آپ نے بندر کا سا بنا دیا تھا؟

گھوڑوں کا سوداگر:۔ ارے بے ایمان جادوگر تجھے یاد ہے کہ تو نے میرے ہاتھ گھوڑا بیچ کر کیسا ٹھگا تھا!

مسخرا:۔ اور کیا مجھے تم بالکل ہی بھول گئے اور اپنی شعبدہ بازیوں سے مجھے بالکل ہی ٹالنا چاہتے ہو۔ کیا کتے کا منہ بھول گئے۔ (سب مسخرے چلے جاتے ہیں)

ساقن:۔ میری شراب کے دام کون دیگا؟ فاؤسٹ صاحب آپ نے میرے سب گاہکوں کو چمپت کر دیا۔ فرمائیے اب میں شراب کے دام کس سے وصول کروں گی

(ساقن چلی جاتی ہے)

بیگم:۔ میرے مالک ہم اس لائق اور قابل شخص کے نہایت ممنون احسان ہیں۔

نواب:۔ اور یہی حال ہمارا ہے بیگم۔ ہم اس کی عنایات کا معاوضہ نہیں کر سکتے خواہ کیسی ہی محبت اور مہربانی کا اظہار کریں اس کے احسانات کی تلافی نہیں ہو سکتی اس کے جتنے کام ہیں سب پُر لطف ہوتے ہیں۔ اور غمگین خیالات کو دل سے دور کر دیتے ہیں۔

(چلے جاتے ہیں)

سترھواں منظر

فاؤسٹ کے مکان کا ایک کمرہ۔

ویگنر آتا ہے۔

ویگنر:۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا آقا مرنیکو ہے۔ اس نے اپنا کل سامان مجھے دیدیا ہے لیکن پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ اگر موت قریب ہوتی تو پھر یہ دعوتیں ضیافتیں اور مے نوشی کے جلسے نہ کرتا اور اس طرح اپنے شاگردوں میں بیٹھ کر شراب نہ پیتا جیسا کہ آج کل حال کر رکھا ہے۔ شاگرد سب پیٹ کے مزے میں ایسے خوش ہو کر شریک ضیافت ہیں کہ ویگنر نے تو اپنی عمر میں انہیں اتنا خوش کبھی نہ دیکھا تھا۔ دیکھو وہ سب کے سب آ رہے ہیں۔ شاید ضیافت ختم ہو گئی۔

(فاؤسٹ دو یا تین شاگردوں اور میفسٹو کے ہمراہ آتا ہے)

پہلا شاگرد:۔ جب سے حسین عورتوں کے متعلق ہماری بحث یہ تھی کہ دنیا میں کونسی عورت حسین تر ہے۔ سو اس وقت یہی فیصلہ ہوا تھا کہ یونان کی مشہور حسینہ ہیلن سب سے خوبصورت عورت ہے۔ بس استاد اگر آپ اتنی مہربانی ہمارے حال پر کریں کہ یونان کی اس بے مثل حسینہ کے دیدار سے جس کے حسن و جمال کی دنیا تعریف کرتی ہے ہمیں عزت بخشیں تو ہم آپ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں۔

فاؤسٹ:۔ شاگردو میں جانتا ہوں کہ تمہاری محبت میرے ساتھ سچی ہے۔ اور فاؤسٹ کی یہ عادت نہیں کہ وہ ایسے لوگوں کی درخواست کو ٹال دے جو اس سے مہربانی سے ملتے ہیں۔ اچھا آپ اس عدیم المثال حسینہ یعنی ہیلن کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور اسی شان و تجمل میں وہ آپ کو نظر آئیگی جب کہ شہزادہ پارس نے اس کے ساتھ سمندر کو عبور کیا تھا۔ اور کل مال غنیمت دردانیا کے دولت مند شہر میں لایا تھا۔ بس خاموش رہو۔ الفاظ میں بھی خطرہ ہے (موسیقی کی صدائیں سنی جاتی ہیں اور ہیلن اسٹیج پر سے

گذرتی ہے)

دوسرا شاگرد:۔ کیا یہی وہ ہیلن تھی جس کے حسن کی قدر دانی میں یونان نے دس برس کی لڑائیوں میں ٹروئے کے ملک کو غارت اور تباہ کیا تھا!

تیسرا شاگرد:۔ جس عورت کے حسن و جمال کی تعریف ساری دُنیا کرتی رہی ہو اس کی تعریف کرنے میں میرا فہم قاصر ہے۔

دوسرا شاگرد:۔ اس حسین ملکہ کو ملک سے بھگا لے جانے پر اگر یونانیوں نے غصہ اور رنج میں دس برس لڑائیاں جاری رکھیں تو اس میں ہرگز کوئی حیرت کی بات نہیں اس ملکہ کا جلوئی حسن تو ایسا تھا کہ کوئی حسن اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

پہلا شاگرد:۔ چونکہ اب ہم نے اسے دیکھ لیا ہے۔ جو فطرت کے کاموں میں فطرت کیلئے موجب فخر و ناز ہے اور جو لطافت اور پاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس لئے اب ہمیں یہاں سے رخصت ہونا چاہئے۔ اور اس احسان و کرم کیلئے ہمیں فاؤسٹ کے ہمیشہ خوش رہنے کی دُعا کرنی چاہئے۔

فاؤسٹ:۔ شاگرد و خدا حافظ۔ میں بھی تمھاری خوشی و مسرت کا خواہاں ہوں

(شاگرد اور ویگنر چلے جاتے ہیں)

(ایک بڈھا آدمی آتا ہے)

بڈھا آدمی:۔ اے شریف فاؤسٹ آپ اس ناپاک فن سے توبہ کریں۔ یہ سحر و جادو وہ ہے جو آپکی روح کو مسحور کر کے آخر کار جہنم واصل کر دیگا۔ اور آپ کو نجات اخروی سے محروم کر دیگا۔ اس وقت تک تو نے مثل ایک انسان کے خطا کی ہے۔ اب شیطان کی طرح اس خطا پر مُصر نہ ہو۔ ابھی تک تیری روح اصلاح پذیر ہے۔ گناہ کرتے کرتے وہ تیری طبیعت نہ ہوگئی ہو۔ اگر ایسا ہوا تو فاؤسٹ توبہ بھی کی تو دیر میں ہوگی پھر تو جنت کے دیدار سے دُور کر دیا جائیگا۔ اور کوئی فانی انسان دوزخ کی درد و عذاب سے واقف نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسے بیان کر سکتا ہے۔ ممکن ہو اس وقت یہ میری نصیحت تمھیں ناگوار اور شاق گذرے مگر ایسا نہ ہونا چاہئے۔ اے شریف فرزند میں یہ نصیحت غصہ کی حالت میں نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں کوئی حسد شامل ہے۔ بلکہ سچے خلوص اور محبت سے کہتا ہوں اور اس بات پر رحم کھا کر کہتا ہوں کہ تو آئندہ مصیبتوں سے محفوظ ہو جائے۔ اور اس طرح امید ہو سکتی ہے کہ میری اس وقت کی زجر و توبیخ تیرے جسم کو گناہ سے پاک رکھکر تیری روح کی اصلاح کرے۔

فاؤسٹ:۔ ارے بدبخت فاؤسٹ تو کہاں ہے۔ ارے مصیبت کے مارے تو نے کیا کیا۔ فاؤسٹ تو جہنمی ہوگیا جہنمی۔ مایوس ہو اور مرجا۔ دوزخ اپنا حق طلب کرتا ہے اور بڑی دہشت ناک آواز میں کہتا ہے فاؤسٹ آ۔ اب تیرا وقت ہونے کو ہے سو اب فاؤسٹ آئیگا کہ تیرا حق تجھے پہنچائے۔ (میفسٹو ایک خنجر فاؤسٹ کو دیتا ہے)

بڈھا آدمی:۔ اچھے فاؤسٹ ہاتھ کو روک یہ تو کیا کرتا ہے۔ ایسی بے جا جسارت نہ کر میں تو ایک فرشتے کو تیرے سر پر اڑتا دیکھتا ہوں۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک شیشہ ہے جس میں خدا کی برکتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس شیشہ سے وہ میری روح کو تر کرنا چاہتا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ خدا سے رحمت کی التجا کر اور ناامید نہ ہو۔

فاؤسٹ:۔ آہ۔ میرے سچے دوست تیری فاضلانہ باتیں میری مضطرب روح کو چین دیتی ہیں۔ کچھ دیر کو مجھے تنہا چھوڑ دے تاکہ میں اپنے گناہوں پر غور کروں۔

بڈھا آدمی:۔ اچھا فاؤسٹ میں جاتا ہوں مگر دل پر ایک بوجھ ہے۔ مجھ خوف ہے کہ تیری ناامید روح کہیں غارت نہ ہو جائے۔ (چلا جاتا ہے)

فاؤسٹ:۔ ارے ملعون فاؤسٹ اب خدا کی رحمت کہاں نصیب ہے۔ میں اس وقت توبہ بھی کرتا ہوں اور مایوس بھی ہوں۔ دوزخ قلب کی نیکیوں سے اس کشمکش میں ہے کہ میرے دل پر غلبہ حاصل کرے۔ میں موت کے پنجے کیونکر بچ سکتا ہوں۔

میفسٹو:۔ دھوکے باز اور دغا باز فاؤسٹ میں تیری روح کو گرفتار کرتا ہوں کیونکہ تو نے ہمارے شاہ محتشم کی نافرمانی کی ہے۔ اگر تو نے بغاوت و سرکشی کی تو تیری بوٹیاں کر دوں گا۔

فاؤسٹ:۔ پیارے میفسٹو اپنے مالک سے میری سفارش کر کہ وہ میرے بیجا قول اقرار سے درگذر کرے۔ میں اپنے خون سے اپنے پہلے اقرار کی تصدیق جو میں نے ابلیس سے کیا تھا کئے دیتا ہوں۔

میفسٹو:۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو اور دل صاف رکھو۔ ورنہ خوف ہے کہ اس تبدیلی سے بڑے بڑے خطرے درپیش ہو جائیں (فاؤسٹ اپنے بازو میں خنجر بھونکتا ہے اور اپنے خون سے لکھتا ہے)

فاؤسٹ:۔ پیارے میفسٹو اس بڈھے کو عذاب دو جو مجھے ابلیس سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ عذاب ایسا ہو جو تمھارے جہنم کے تمام عذابوں سے بڑھ کر ہو۔

میفسٹو:۔ اس بڈھے کا ایمان بہت مضبوط ہے میں اس کی روح کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ لیکن اس کے جسم کو اذیت پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر وہ اذیت زیادہ نہیں۔

فاؤسٹ:۔ اے پیارے ملازم میفسٹو دل کی ایک حسرت مٹا دے اور وہ یہ ہے کہ جس حسین ہیلن کو میں نے ابھی دیکھا ہے اس کا وصل نصیب ہو جائے اس سے ہمکنار ہو کر میرے وہ خیالات رفع ہو جائینگے جو میرے اقرار سے انحراف چاہتے ہیں۔ اور میں اس قول پر قائم رہوں جو میں نے ابلیس سے کیا ہے۔

میفسٹو:۔ یہ جو کچھ تو چاہتا ہے یا اور جو کچھ تو چاہیگا ایک چشم زدن میں عمل میں آ جائیگا

(ہیلن پھر اسٹیج پر ظاہر ہوتی ہے اس مرتبہ دو کیوپڈ اس کے ساتھ ہیں)

فاؤسٹ:۔ کیا یہ اسی صورت نے جس نے ایک ہزار جنگی جہاز سمندر میں ڈبوا دیئے تھے۔ اور الیم کے اوپر سے نوک ہوئے میناروں کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔ پیاری ہیلن ایک بوسہ دیکر مجھے غیر فانی بنا دے۔ (فاؤسٹ ہیلن کا بوسہ لیتا ہے) اس کے لبوں نے میری روح کو چوس لیا۔ اور دیکھو میری روح اڑ کر کہاں جاتی ہے۔ ہیلن آ۔ میری روح مجھے پھر واپس دے۔ ان لبوں میں جنت ہے۔ اور میں اسی جنت میں رہوں گا۔ ہیلن کے سوا ہر چیز [illegible] ہیچ ہے۔ میں تیرے عشق میں شہر [illegible] پیارس بنوں گا [illegible] تروے کے اس [illegible] برگ [illegible] میں کمزور مینا سے لڑوں گا اور [illegible] میں تیرے ہی نشان بناؤں گا۔ میں کیلز کے پاؤں کو زخمی کروں گا۔ (ہیلن کے پاس) ایک بوسہ کیلئے واپس آؤں گا۔ پیاری ہیلن تو نسیم شام سے بھی زیادہ لطیف و حسین ہے جس نے آسمان کے بے شمار کواکب میں اپنا حسن چھپا رکھا ہے۔ تو نورانی جو پیٹر سے بھی زیادہ روشن ہے۔ جس وقت کہ وہ بدقسمت سیمیلی کے سامنے نمودار ہوا تھا۔ تو تاجدار فلک سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ جبکہ وہ آرتھوسا کے نیلی فام بازوؤں میں لپٹا نظر آتا تھا بس سوائے تیرے اب کوئی میری محبوبہ و معشوقہ نہ ہوگی

(چلا جاتا ہے)

(بڈھا آدمی پھر آتا ہے)

بڈھا آدمی:۔ اے ملعون و نابکار فاؤسٹ اے بدبخت آدمی تیری روح رحمت باری سے محروم و مستثنیٰ ہوئی کہ تو خدا کے تخت عدل و انصاف سے بھاگتا ہے

(شیاطین آتے ہیں) شیطان اپنے تکبر و غرور سے میری چھان بین کر رہا ہے۔ تاکہ خدا کی جلتی بھٹی میں میرے ایمان کی آزمائش کرے۔ میرا ایمان اے بدکار جہنمی تجھ پر فتح پائیگا۔ اے گستاخ و بدکار شیطانو دیکھو آسمان کس طرح تمہاری شکست پر متبسم ہے۔ اور تمہاری اس حالت پر ہنسکر تم سے نفرت ظاہر کرتا ہے۔ ارے دوزخ کی ذریات یہاں سے دور ہو۔ میں اڑ کر اپنے خدا سے جا ملتا ہوں

(ایک طرف سے شیاطین اور دوسری طرف سے بڈھا چلا جاتا ہے)۔

اٹھارھواں منظر

(آسمان پر بادل گرجتا ہے۔ ابلیس، شیطان اور میفسٹو آتے ہیں)

ابلیس:۔ اب دوزخ سے ہم اوپر اٹھتے ہیں تاکہ اپنی اقلیم کی رعایا کو ملاحظہ کریں۔ وہ روحیں جن کو گناہ نے اپنی مہر ثبت کرکے انھیں اپنا سیہ کار فرزند بنایا ہے اور جن میں ان کا سردار فاؤسٹ شامل ہے۔ اے فاؤسٹ ہم تیرے پاس ہمیشہ کا عذاب لیکر آئے ہیں اور تیری روح پر قبضہ کرنیکے منتظر ہیں کیونکہ اب اس کی ضبطی کا وقت قریب ہے۔

میفسٹو:۔ اور اس نحوست کی رات میں اور اس سیاہ مقام پر مصیبت زدہ فاؤسٹ موجود ہوگا۔

شیطان:۔ اور یہیں ہم قیام کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ اس کا مجبور طریق کیا ہے (وہ اپنے آپ کو کیونکر ذلیل کرتا ہے)

انیسواں منظر

مقام وہی ہے جو پہلے تھا۔

فاؤسٹ اور ویگنر اندر آتے ہیں۔

فاؤسٹ:۔ ویگنر [illegible] میرا وصیت نامہ غور سے پڑھا تم اسے کیا کہتے ہو؟

ویگنر:۔ جناب والا وصیت نامہ تو بہت ہی خوبی سے تحریر ہوا ہے اور میں ایک وفادار خادم کی طرح اپنی جان اور ہمیشہ کی خدمت گذاری پیش کرتا ہوں۔ (فاؤسٹ کے شاگرد آتے ہیں)

فاؤسٹ:۔ ویگنر تمہارا بہت بہت شکریہ۔ دوستو آؤ [illegible] بیمار ہے۔ (ویگنر چلا جاتا ہے)

پہلا شاگرد:۔ فاؤسٹ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی صورت بدل گئی ہے۔

فاؤسٹ:۔ شریف دوستو ہاں میرا کچھ ایسا ہی حال ہو رہا ہے۔

پہلا شاگرد:۔ خدانخواستہ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔

فاؤسٹ:۔ آہ پیارے فیلو کاش میں تمہارے ساتھ ہی زندگی بسر کرتا ہوتا تو واقعی زندہ ہوتا لیکن اب تو مجھ پر ہمیشہ کی موت وارد ہے۔ دیکھو وہ آ رہے ہیں وہ آ رہے ہیں۔

دوسرا شاگرد:۔ اس سے استاد کا کیا مطلب ہے؟

تیسرا شاگرد:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ تنہائی میں بسر کرنیکی وجہ سے دماغ مختل ہو گیا ہے۔

پہلا شاگرد:۔ اگر ایسا ہے تو پھر کسی طبیب سے رجوع کرنا چاہیئے۔ حد اعتدال سے متجاوز ہونیکا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

فاؤسٹ:۔ ہاں قابل معافی گناہوں کے حد سے بڑھ جانیکی سزا ہی جس نے جسم اور روح دونوں کو مردود کر دیا۔

دوسرا شاگرد:۔ خیر استاد آپ خدا پر بھروسہ رکھیں اس کے فضل و کرم کی انتہا نہیں ہے۔

فاؤسٹ:۔ میرے گناہ ایسے سنگین ہیں جو کبھی معاف نہیں کئے جاسکتے وہ مار عدن جس نے حوا کو بہکایا تھا شاید نجات حاصل کرلے مگر فاؤسٹ کو نصیب نہ ہوگی۔ شریفو میری داستان ذرا صبر سے سنو مگر اسے سن کر کانپ

گو اس کے خیال سے میرے دل پر لرزہ طاری ہے تنفس تیز ہوتا جاتا ہے سنو کہیں اس درس گاہ میں تیس برس تک تحصیل علم کرتا رہا۔ کاش میں وٹن برگ میں نہ آیا ہوتا۔ اور ان کتابوں کو میں نے نہ پڑھا ہوتا۔ اور وہ عجائبات جو مجھ سے ظاہر ہوتے جن پر نہ صرف جرمانیہ بلکہ کل دنیا گواہی دے رہی ہے۔ اور یہ عجائبات وہی تھی جنکی وجہ سے فاؤسٹ کے ہاتھ سے نہ صرف جرمانیہ اور ساری دنیا نکل گئی بلکہ وہ جنت سے بھی ہمیشہ کیلئے محروم کر دیا گیا۔ وہ جنت جو خدا کی قلمرو میں شامل ہے جہاں نیک بندے حکومت کرتے ہیں اور غیر فانی مسرتوں کا دور دورہ ہے۔ اب مجھے ہمیشہ نار جہنم میں جلنا ہوگا۔ دوزخ اور ہائے ہمیشہ کی دوزخ۔ پیارے رفیقو اس وقت فاؤسٹ پر کیا گذریگی جبکہ اسے ہمیشہ دوزخ کے شعلوں میں جلنا ہوگا۔

تیسرا شاگرد:۔ فاؤسٹ خدا کو یاد کرو۔

فاؤسٹ:۔ جس خدا کو بھلا چکا ہوں اسے کیا یاد کروں۔ جس خدا کا منکر ہو چکا کیا اسے اب پکاروں؟ ہائے میرے معبود میں صدق دل سے تیری بارگاہ میں آہ و زاری کرتا لیکن شیاطین میرے آنسوؤں کو آنکھوں میں خشک کئے ڈالتے ہیں۔ لے میرے خون تو آنسوؤں کی جگہ کیوں آنکھوں سے پھوٹ نہیں پڑتا۔ ہائے جان اور روح دیکھو یہ شیطان میری زبان بند کئے دیتا ہے۔ میں دعا میں اپنے ہاتھ اٹھاتا مگر دیکھو یہ شیاطین ہاتھ پکڑے لیتے ہیں کہ وہ دعا میں نہ اٹھیں۔

سب:۔ فاؤسٹ وہ کون ہے جو تمھاری زبان بند کرتا ہے اور ہاتھ پکڑے لیتا ہے

فاؤسٹ:۔ یہ ابلیس اور میفسٹو ہیں۔ شریفو میں نے اپنی عقل و دانائی ان شعبدہ بازیوں کے بدلے میں ان کے حوالے کر دی تھی۔

سب:۔ خدا ایسا نہ کرے۔

فاؤسٹ:۔ خدا نے ایسا نہیں کیا بلکہ فاؤسٹ نے خود ایسا کیا۔ چوبیس برس کی باطل خوشیوں کیلئے فاؤسٹ نے ابدی مسرت ہاتھ سے دیدی۔ میں نے ایک اقرار نامہ اپنے خون سے لکھکر ان کو دیا۔ اب اس کی تاریخ نکل چکی ہے۔ اب وقت آنے والا ہے کہ شیطان آئیگا اور مجھے لے جائیگا۔

پہلا شاگرد:۔ فاؤسٹ نے ہم سے پہلے یہ بات کیوں نہ کہی تاکہ عابد اور زاہد مل کر اس کے حق میں دعا کرتے۔

فاؤسٹ:۔ مجھے اس بات کا اکثر خیال آیا لیکن شیطان نے مجھے ڈرایا کہ اگر ایسا کروں گا تو وہ میرے ٹکڑے اڑا دے گا۔ اگر میں نے خدا کا نام لیا تو شیطان میرے جسم اور روح دونوں کو جہنم واصل کر دیگا۔ اور اب اس کا وقت نکل چکا ہے۔ شریفو یہاں سے چلے جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی میرے ساتھ غارت ہو جاؤ۔

دوسرا شاگرد:۔ ارے کوئی بتائے کہ استاد کو ہم اس عذاب سے کیونکر بچائیں؟

فاؤسٹ:۔ میرا نام زبان پر نہ لاؤ۔ صرف اپنے تئیں بچاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔

تیسرا شاگرد:۔ خدا مجھے قوت بخشے گا اور میں استاد کے ساتھ آخر وقت تک رہوں گا۔

پہلا شاگرد:۔ خدا کو کسی بات پر آمادہ نہ کرو۔ پیارے دوست آؤ دوسرے کمرے میں چلیں اور وہاں فاؤسٹ کے حق میں خدا سے دعا کریں۔

فاؤسٹ:۔ ہاں ہاں میرے لئے دعا کرو۔ اور جب تم غل سنو تو میرے پاس نہ آنا کیونکہ مجھے اب عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

دوسرا شاگرد:۔ آپ بھی دعا مانگیں اور ہم بھی خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ پر رحم کرے۔

فاؤسٹ:۔ شریفو خدا حافظ۔ اگر میں کل صبح تک زندہ رہا تو تم سے ملوں گا ورنہ سمجھ لینا کہ فاؤسٹ واصل جہنم ہوا۔

سب:۔ فاؤسٹ خدا حافظ۔ (شاگرد چلے جاتے ہیں گھنٹے میں گیارہ بجتے ہیں)

میفسٹو:۔ فاؤسٹ اب چونکہ تمھیں جنت کی امید نہیں رہی اس لئے نا امید ہو جاؤ۔ اور دوزخ کا خیال کرو۔ کیونکہ اب دوزخ ہی تمھارا ٹھکانا اور رہنے کا گھر ہوگا۔

فاؤسٹ:۔ ارے او دغاباز۔ حرشیطان! یہ تیرا ہی اغوا تھا جس نے مجھے ابدی مسرت سے بے بہرہ کر دیا۔

میفسٹو:۔ میں بھی اس بات کا اقرار کرتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں بیشک یہ میں ہی تھا جس نے اس وقت جبکہ تو نے جنت کی راہ اختیار کر لی تھی تیرا راستہ کاٹا۔ اور تجھ پر ابدی عذاب نازل کر دیا۔ جب تو نے کتاب مقدس پڑھنے کو اٹھائی تو یہ میں ہی تھا جس نے اس کے ورق الٹ دیئے اور تجھے کتاب کے پاک مضامین پڑھنے نہ دیئے۔ اب تو رو تا کیا ہے وقت نکل چکا ہے۔ مایوس ہو جا۔ اچھا رخصت وہ بیوقوف جو دنیا میں ہنستے ہیں۔ وہ دوزخ میں رویا کرتے ہیں۔ (چلا جاتا ہے)

(بھلائی اور برائی کا فرشتہ مختلف دروازوں سے آتے ہیں۔)

بھلائی کا فرشتہ:۔ اے فاؤسٹ اگر تو میری بات سنتا تو بے انتہا مسرتیں تجھے حاصل ہوتیں مگر تو نے دنیا سے محبت کی۔

برائی کا فرشتہ:۔ تو نے میری بات سنی۔ اب لازم ہوا کہ دوزخ کی اذیتیں ہمیشہ کو برداشت کرے۔

بھلائی کا فرشتہ:۔ اب تو اپنی دولت جاہ وحشم عیش ونشاط سے کیا نفع اٹھا سکتا ہے۔ اور وہ تجھے کیا فائدہ دے سکتے ہیں؟

بُرائی کا فرشتہ:۔ کچھ نہیں بلکہ ان کا خیال بھی تیرے لئے سوہانِ روح ہوگا کہ دُنیا میں تجھے سب کچھ نصیب تھا اب دوزخ میں ہر چیز کا حسرت مند رہیگا۔ اور اس طرح تیری تکلیفیں بڑھتی رہیں گی۔

(موسیقی کی صدائیں آتی ہیں۔ تخت نیچا ہوتا جاتا ہے)

بھلائی کا فرشتہ:۔ افسوس تو نے آسمانی مسرتوں سے اپنے کو محروم کردیا۔ یہ مسرتیں لازوال تھیں اور کبھی ختم نہ ہوتیں اگر تو خدا کے سچے کلام کو سمجھتا۔ تو پھر نہ شیطان اور نہ دوزخ تیرا کچھ کر سکتے تھے۔ تجھ پر انھیں کسی قسم کا اختیار نہ ہوتا۔ اگر تو اس راہِ نیک پر ہوتا تو یہ سب چیزیں ہیچ تھیں۔ فاؤسٹ دیکھ ساتو کے تخت پر تو کس نورانی شان میں جلوہ افروز ہوتا۔ تیری شکل ایسی ہی نورانی ہوتی جیسے کہ ان پاکباز روحوں کی ہے جنھوں نے دوزخ پر فتح پائی ہے۔ یہ نور کا تخت اب تجھ سے چھین گیا۔ اور اے روح اب تیری بھلائی کا فرشتہ تجھ سے رخصت ہوتا ہے۔ دوزخ کے جبڑے تیرے نگلنے کو کھل گئے ہیں۔ (چلا جاتا ہے)

(دوزخ جلتی دکھائی دیتی ہے)

بُرائی کا فرشتہ:۔ اچھا فاؤسٹ اب تو اس بیت العذاب کو دیکھ جہاں ہمیشہ کی اذیتیں ہیں۔ یہاں دوزخ کے کارکن مردود روحوں کو لوہے کے کانٹوں سے آگ میں الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں۔ جلتے سیسے میں ان کی لاشیں بھونی جاتی ہیں۔ رہنے کے مکان ایسے ہیں جن کو جلتے کوئلوں سے گرم کیا جاتا ہے اور یہ آگ وہ ہوگی جو کبھی نہ بجھے گی۔ یہ جلتی کرسی آرام کرنیکو ہے جنھیں عذاب حد سے زیادہ ہو چکا ہے۔ وہ روحیں جنھیں انگارے کھلائے جا رہے ہیں وہ ہیں جو زندگی میں خوب لذیذ کھانوں سے رغبت رکھتی تھیں اور اپنے دروازہ پر مسکینوں کو فاقوں سے مرتے دیکھنے میں خوش ہوتی تھیں۔ مگر یہ چیزیں تو کچھ بھی نہیں تم کو تو دس ہزار اذیتیں ان سے بھی زیادہ ہولناک دیکھ کر خوف کھانا پڑیگا۔

فاؤسٹ:۔ اپنے درد و عذاب کیلئے تو میں سب کچھ دیکھ چکا۔ کیا یہ میری اذیت کیلئے کافی نہیں؟

بُرائی کا فرشتہ:۔ نہیں اب تم ان اذیتوں کو محسوس کروگے اور ان کے درد میں مبتلا ہوگے جو شخص دُنیا کی لذتوں پر فدا ہے وہ انھیں لذتوں کی وجہ سے عذاب اٹھائیگا۔ اور اے فاؤسٹ میں تجھے اس حال میں چھوڑتا ہوں کہ تو عذاب و اذیت کے دریا میں غوطے لگاتا رہ۔ (چلا جاتا ہے)

فاؤسٹ:۔ ہائے فاؤسٹ اب تجھے ایک گھنٹہ اور زندہ رہنا ہے اور پھر تیری لئے ہمیشہ کا عذاب ہے۔ اے آسمانوں کے ہمیشہ کے حرکت میں رہنے والے کرہ کچھ دیر کو قائم ہو جا۔ تاکہ وقت کی رفتار بند ہو جائے۔ اور کبھی آدھی رات نہ آئے۔ اے حسین فطرت کی چشم پُر نور پھر باز ہو اور ہمیشہ کا دن کردے۔ اور اس ساعت کو ایک سال ایک ماہ ایک ہفتہ یا ایک دن کردے تاکہ فاؤسٹ اپنی روح کی سلامتی کے لئے توبہ اور استغفار کرے۔ آسمان پر ستارے گردش میں ہیں وقت گذر رہا ہے گھنٹہ بجنے والا ہے اب شیطان آئیگا اور فاؤسٹ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہو جائیگا۔ کاش میں اچھل کر خدا تک پہونچتا۔ کون ہے جو مجھے اس قعرِ سفل سے اُبھرنے نہیں دیتا۔ دیکھو دیکھو مسیح کے خون کے دریا آسمان پر بہتے نظر آرہے ہیں۔ اس خون کا ایک قطرہ بلکہ آدھا قطرہ میری روح کو عذاب سے بچالے گا۔ آہ میرے مسیح! میرے مسیح کا نام لیکر میرے دل کے ٹکڑے مت کر۔ تو بیا پھر میں اسی کو پکاروں۔ ارے ابلیس آ او۔ مجھے بچا ہے۔ ابلیس اب کہاں ہے وہ تو چلا گیا۔ دیکھو خدا اپنا ہاتھ کس طرح پھیلائے ہے اور اس کی جبین مشتعم کے شکن کس طرح بل کھا رہے ہیں۔ پہاڑو اور پہاڑیو آؤ اور مجھ پر گر پڑو۔ اور مجھے خدا کے عتاب سے چھپا دو۔ نہیں نہیں! تو پھر میں سر کے بل زمین میں دھنس جاؤں گا۔ اے زمین شق ہو جا۔ نہیں زمین مجھے اپنے آغوش میں جگہ نہ دیگی۔ اے آسمان کے ستارو جو میری پیدائش کے وقت فلک پر طلوع تھے جن کے اثر نے پہلے ہی سے موت اور دوزخ بنادی تھی۔ تم فاؤسٹ کو ایک غبار کی طرح اٹھا کر بادلوں میں چھپا دو تاکہ جب وہ بادل برسیں تو میرے ایک ایک عضو کو زمین پر اُگل دیں۔ اور تمھارے دُخانی دہن سے میرے اعضا نکلیں تاکہ اس طرح میری روح آسمان پر نہ پہنچنے پائے (گھنٹہ میں آدھا بجتا ہے) ہائے نصف ساعت گذر چکی باقی وقت بھی اسی طرح گذر جائیگا۔ ارے میرے خدا اگر تجھکو میری روح پر رحم نہیں آتا تو میں مسیح کا واسطہ دیکر کہتا ہوں جس کا خون میرا کفارہ بنا ہے کہ اس ہمیشہ کے درد و عذاب کو کبھی تو بند کردے۔ فاؤسٹ کو دوزخ میں ایک ہزار برس نہیں بلکہ ایک لاکھ برس تک مقید رکھ مگر پھر اس کی نجات کردے مغضوب روحوں کیلئے عذاب کبھی ختم نہ ہوگا۔ کاش میں ایسی مخلوق ہوتا جس میں روح نہ ہوتی۔ یا پھر تو نے میری اس روح کو غیر فانی نہ بنایا ہوتا۔ آہ فیثا غورث کاش تیرا علم الہیت صحیح ہوتا۔ یہ روح میرے جسم سے نکل جاتی اور میں کوئی بدصورت درندہ ہو جاتا۔ درندے سب خوش رہتے ہیں کیونکہ جب وہ مرتے ہیں تو ان کی روحیں عناصر میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن میری روح دوزخ میں عذاب اٹھانے کیلئے سلامت رہیگی۔ لعنت ہو ان ماں باپ پر جو مجھے دُنیا میں لائے نہیں فاؤسٹ انھیں کیا لعنت بھیجتا ہے اپنے اوپر لعنت بھیج۔ ابلیس پر لعنت کر جس نے تجھے جنت کے ہمیشہ کے آرام سے محروم کردیا۔ (گھنٹہ میں بارہ بجتے ہیں) ارے گھنٹے بجا۔ ارے گھنٹے بجا۔ اے جسم تو ہوا ہو جا۔ ورنہ ابلیس تجھے جلد دوزخ میں لیجائیگا۔ (کڑک اور بجلیاں آسمان پر پیدا ہوتی ہیں) اے میری روح پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں میں اپنے تئیں بدل لے۔ اور سمندر میں گر جا تاکہ تیرا پتہ نہ چلے کہ کہاں ہے۔ (شیاطین آتے ہیں) میرے خدا میرے خدا مجھ پر اتنا قہر و عتاب نہ کر۔ سانپو بچھوؤ تھوڑی دیر مجھے دم لینے دو۔ اری ہیبت ناک دوزخ مجھ پر اتنا منہ نہ پھاڑ۔ ابلیس تو میرے پاس نہ آ۔ میں اپنی کتابیں جلا ڈالوں گا۔ ارے میفسٹو۔

(شیاطین مع فاؤسٹ کے چلے جاتے ہیں)

بیسواں منظر

فاؤسٹ کے شاگرد آتے ہیں

پہلا شاگرد:- آؤ شریفو چلو فاؤسٹ سے ملاقات کریں۔ کیونکہ ایسی بھیانک رات جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے پہلے نہ دیکھی تھی۔ ایسی چیخیں آہ و فغاں کبھی پہلے سننے میں نہ آئی تھی۔ خدا سے دعا کرو کہ ہمارا استاد فاؤسٹ اس خطرے سے بچ جائے۔

دوسرا شاگرد:- اے خدا ہماری مدد کر۔ دیکھو یہ فاؤسٹ کے ہاتھ پاؤں ہیں جنھیں موت کے ہاتھوں نے چیر پھاڑ کر پھینک دیا ہے۔

تیسرا شاگرد:- جس شیطان کی فاؤسٹ خدمت کرتا تھا اسی نے فاؤسٹ کو چیر پھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ کیونکہ بارہ اور ایک کے درمیان میں نے فاؤسٹ کو چیختا اور زور زور سے مدد کیلئے دُہائی دیتا سُنا۔ اور یہی وہ وقت تھا کہ سارے گھر کو آگ لگی معلوم ہوتی تھی اور ملعون شیاطین کا ہر طرف خوف طاری تھا۔

دوسرا شاگرد:- اچھا شریفو گو فاؤسٹ کا انجام ایسا ہوا ہے کہ ہر عیسائی اگر خیال سے روتا ہے لیکن چونکہ وہ ایک عالم تھا جس کی تعریف ایک زمانہ میں جرمنیہ کے تمام مدارس میں اس کے فضل وکمال کی وجہ سے ہوا کرتی تھی۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے ان کٹے ہاتھ پاؤں کو جمع کرکے انھیں ادب وتعظیم کے ساتھ دفن کریں اور کُل طلبا سیاہ ماتمی لباس پہنیں اور اس کے جنازہ میں شرکت کریں۔

(چلے جاتے ہیں)

(طائفہ آتا ہے)

طائفہ:- وہ شاخ کاٹ دی گئی جو سیدھی بڑھتی۔ اور اپولو کی وہ شاخ جو اس عالم میں سرسبز تھی جل گئی۔ افسوس فاؤسٹ دُنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے دوزخ میں گرنے کو دیکھو۔ عاقل اس کی اس بُری تقدیر سے نصیحت پکڑتے ہیں۔ اور ناجائز باتوں کو صرف نگاہ مسرت سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ ناجائز باتیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ بعض منچلے لوگ ان پر اتنا عمل کرتے ہیں کہ جس کی خدائی طاقت وقدرت نے اجازت نہ دی تھی۔

(چلا جاتا ہے)

(کرسٹوفر مارلو)

مترجمہ:- فرخندہ اختر بیگم

نغمۂ نور

آنکھوں میں مری پنہاں الفت کا خزانہ ہے
ہر اشک کہانی ہے ہر اشک فسانہ ہے

دامن میں لئے ہیں ہم دُنیا کی تباہی کو
ہم درد نصیبوں کے قدموں میں زمانہ ہے

روداد محبّت کے ٹکڑے ہیں فقط دو ہی
اک تم کو سُنانا ہے اک دل کو سنانا ہے

دُنیا سے الگ رہکر جینے سے بھی کیا حاصل
ہم اس کے ہی بندے ہیں جس کا کہ زمانہ ہے

روداد الم سُن کر ہم درد کے ماروں کی
ہنسنے کا ارادہ ہے رونے کا بہانہ ہے

کس طرح جئیں گے ہم یہ آپ بتا دیجئے
اک دل کا سہارا ہے دل غم کا نشانہ ہے

ہاں چھیڑ کوئی نغمہ اے قلب حزیں اس دم
روتوں کو ہنسانا ہے ہنستوں کو رُلانا ہے

القصّہ تم ہی تم ہو میرے لئے دُنیا میں
تم ہو تو مرا دل ہے دل ہے تو زمانہ ہے

آنکھیں تو مری دیکھو ہونٹوں کو مرے دیکھو
جو دل پہ گذرتی ہے تم سے بھی چھپانا ہے

اے دیدۂ گریاں ہاں گرم اشک رہیں جاری
اس خشک سے دامن پر شعلہ سا گرانا ہے

اے چشم الم اب کر کچھ اشک میں تبدیلی
جب آگ بجھانا تھا اب آگ لگانا ہے

بہزاد حزیں ہم کو معلوم نہیں کچھ بھی
اس عشق ومحبّت میں کھونا ہے کہ پانا ہے

بہزاد لکھنوی

پروفیسر صاحب

اُن کا طرزِ زندگی مشرقی اور مغربی معاشرت کا ایک دلچسپ
[بم]بہ تھا۔

مَیں کوٹھی میں داخل ہوا اور برآمدے میں پہونچکر گھنٹی بجائی۔
[ا]بھی گھنٹی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی کہ ایک نوجوان مُلازم جو اپنی گھنی
[د]اڑھی اور پیشانی کے گٹے سے کسی مسجد کا موذن یا مدرسہ کا طالبعلم
[معلو]م ہوتا تھا، آن موجود ہوا۔

"پروفیسر صاحب ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہیں"

"اطلاع کر دو"

"آپ کا ——— آپ کا کارڈ؟"

میرے پاس کارڈ نہیں ہے۔ کہنا ایک صاحب ملنا چاہتے ہیں"
میں نے یہ الفاظ کچھ اس طرح کہے کہ اُسکو نام پوچھنے یا کچھ
[پو]چھنے کی جُرأت نہ ہوئی۔ اور وہ چُپ چاپ اندر چلا گیا۔

پروفیسر صاحب کو مَیں عرصے سے جانتا تھا، لیکن ملاقات
[ش]اذ ہوتی تھی۔ اور کوٹھی پر تو دو ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں گیا تھا۔
[ا]ن کوٹھی مغربی وضع پر آراستہ تھی۔ برآمدے میں اُن کے نام کی
[تخ]تی لگی تھی۔ آمد کی اطلاع کرنے کے لئے گھنٹی تھی اور ٹوپیاں لٹکانے
[کو] ایک نہایت عمدہ شیشے دار ہیٹ ریک تھا۔ اندر ڈرائنگ روم،
[ڈائنگ] روم، آفس، سبھی کچھ تھا۔ ڈرائنگ روم میں نرم نرم گدّوں
[والے] صوفے تھے اور قیمتی دبیز قالین بچھے ہوتے تھے۔ لیکن دیواروں
[پر] عورتوں کی تصویروں اور آرٹ کے عریاں مرقعوں کی بجائے
[مدینہ م]نورہ، مسجد اقصیٰ، جامع مسجد دہلی اور دوسرے مقامات مقدسہ
[کی تص]اویر آویزاں تھے۔ یا بڑے بڑے چوکٹوں میں جڑی ہوئی قرآن مجید
[کی آ]یتیں تھیں۔ پروفیسر صاحب بذاتِ خود ایک زندہ دل اور صاحب
ذوق انسان تھے۔ یوں تو وہ چوڑی دار پاجامے کے ساتھ شیروانی بھی
پہنتے تھے اور کبھی کبھی اپنے وطنِ مالوف، پنجاب کا مخصوص لباس یعنی کوٹ
اور بڑے گھیر کی شلوار بھی زیبِ تن فرماتے تھے۔ لیکن میں نے اکثر و بیشتر
اُن کو انگریزی سُوٹ میں دیکھا۔ دُبلا پتلا جسم، لانبا قد، گورا رنگ، سلیقے
کے ساتھ کُتری ہوئی داڑھی، بیش قیمت کپڑے کا سوٹ، اور سیاہ
فیلٹ ہیٹ ——— حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب بہت وجیہہ،
نہایت خوش مذاق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے ایک فرد معلوم
ہوتے تھے۔

وہ دہلی کے ایک مشہور کالج میں پروفیسر تھے۔ اُن کی تنخواہ
کم و بیش دو سو روپے تھی۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہ تھے۔ وہ دیکھتے
تھے کہ انہیں کی طرح اور بہت سے ایم۔ اے۔ ہیں ——— خود
اُنہیں کے کالج میں! ——— لیکن اُن کو چار چار سو اور پانچ پانچ سو
روپے ملتے ہیں۔ یہ بے انصافی اُن کو پسند نہ تھی اور وہ اکثر اپنی
بیزاری کا اظہار کیا کرتے تھے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ
کوئی خود پرست انسان تھے۔ ہرگز نہیں۔ اُن کے دل میں قوم و مُلک
کا بڑا درد تھا۔ وہ شدید قسم کے سامراج دشمن واقع ہوئے تھے۔
غیرملکی حکومت نے ہندوستان میں جو کچھ کیا ہے اور کر رہی ہے اُس کو
دیکھکر وہ بہت کُڑھتے تھے۔ اکثر حکومت کی اقتصادی پالیسی پر نکتہ
چینی کرتے اور یہ بتانے کی کوشش کرتے کہ برطانیہ نے کس کس طرح
اِس مُلک کی دولت سمیٹی ہے اور کیونکر یہاں کے باشندوں کا خُون
چُوسا ہے۔ انہیں سیاسی عقائد کی بِنا پر اُنہوں نے ایک گورنمنٹ
کالج میں مُلازمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایک سچے قوم پرست
تھے ———!

اور آج مَیں اُن کی کوٹھی پر اُن سے ملنے آیا تھا۔

مجھے برآمدے میں کچھ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ملازم بہت جلد واپس آیا اور مجھے اندر لے گیا۔

پروفیسر صاحب اپنے آفس میں ایک دوست کے ساتھ بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی آداب عرض کرکے بیٹھ گیا۔ ایک مختصر سی رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے نہایت جوش کے ساتھ سامنے پڑا ہوا اخبار (اسٹیٹسمین) اُٹھایا اور لپک کر بولے: "آپ نے آج کا اخبار دیکھا؟"

میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا اور ماحول سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُن کے اِس فوری سوال اور جوشیلے انداز سے چونک پڑا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" میں نے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ارے صاحب مَیں تو آج بہت خوش ہوں۔ جو شخص آتا ہے اُس سے یہی ذکر کرتا ہوں" پروفیسر صاحب خوشی سے چھلکتے ہوئے لہجے میں بولے۔

میں حیران ہوا کہ ایسا کون سا حادثہ وقوع پذیر ہوا ہے جس کی وجہ سے پروفیسر صاحب اس قدر مسرور ہیں۔ آج تو یکم جنوری یا بادشاہ کی پیدائش کا دن بھی نہیں ہے کہ اِن کو کوئی ایسا خطاب ملا ہو جو ان کیلئے خوشی کا باعث ہو۔

"مجھے بھی بتائیے صاحب، کیا بات ہے؟" میں نے نہایت اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

"جناب آسٹریا پر ہٹلر کا قبضہ ہوگیا!" انہوں نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ اُن کی آنکھیں مسرت کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔

میں دم بخود رہ گیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ آخر اس پر خوش ہونے کی کون سی بات ہے۔ کہیں یہ شخص اپنے عقیدے کے لحاظ سے فاشسٹ تو نہیں کہ ہٹلر کی اس کامیابی پر خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا۔ لیکن پھر یاد آیا کہ پروفیسر صاحب تو ایک قوم پرست ہیں اور ہر اپنی سامراج دشمنی کا بڑے شدّ و مد کے ساتھ اظہار کیا کرتے ہیں۔ اُ ہٹلر کے ساتھ کیا ہمدردی ہوسکتی ہے!

ایک لمحے کے اندر یہ سب خیالات میرے ذہن میں گزر گئے لیکن مَیں اس چیز پر زیادہ دیر تک غور نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میں نے دیکھا کہ پروفیسر صاحب کا خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ میری طرف مُڑا ہے اور وہ متوقع ہیں کہ مَیں اُن کی خوشی میں شرکت کروں اور زبان اس خوشی کا اظہار کروں۔ موقع نہایت نازک تھا اور میں نہیں سمجھ تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیئے۔

"لیکن یہ تو ایک افسوسناک بات ہے" بالآخر الفاظ میری زبان پر آہی گئے۔

پروفیسر صاحب کی آنکھوں کی چمک زائل ہوگئی۔ چہرے پر خ کی بجائے مایوسی، سنجیدگی اور شکست کا ایک فوری احساس ظاہر ہوگی (پروفیسر صاحب بہت حساس آدمی تھے)

"کیوں؟" اُنہوں نے پریشان ہوکر پوچھا۔

اب مَیں اِس کیوں کا کیا جواب دیتا! میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی: "ارے صاحب ہٹلر کی فتح و کامیابی تو ہمارے لئے خوشی کا باعث ہو ہی نہیں سکتی" میں نے کہا۔

"جناب اب دیکھئے گا ہٹلر اِن انگریزوں کا سر توڑے گا مَیں تو بہت خوش ہوں" اُنہوں نے نہایت گھبراہٹ کے ساتھ اپنی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کیلئے کہا۔

میری حیرت انتہا کو پہونچ گئی۔ یہ کیسا پروفیسر ہے! سیاسیا کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ بالکل ہی کورا ہے۔ "یہ آپ کیا فرما رہے ہیں پروفیسر صاحب؟" میں نے کہا "ہم ہندوستانی تو ہٹلر کے ساتھ ہمدردی کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو برطانوی حکومت سے بھی گیا گزرا ہے۔ آسٹریا پر جرمنی نے قبضہ کرلیا، اس کے یہ معنی ہیں کہ دُنیا میں ایک غلام مُلک کا اضافہ ہوگیا ــــ ہم تو مظلوموں کے ساتھ ہیں نہ کہ کے ساتھ ــــ برطانیہ اور جرمنی دو بھیڑیئے ہیں جن کے مقاص

ایک ہیں ——"

اب پروفیسر صاحب سنبھل چکے تھے اور اُن کی گھبراہٹ دُور ہو چکی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص نہ صرف میری مسرت میں شریک نہیں ہوا بلکہ مجھے بیوقوف سمجھتا ہے اور تعلیم دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بھلا اس کو برداشت کر سکتے تھے —— وہ! جو پروفیسر تھے اور کالج کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے فوراً اس گفتگو کو جس سے اُن کا علمی افلاس اور دماغی کھوکھلا پن بُری طرح بے نقاب ہو رہا تھا، ختم کر دینا چاہا۔ ملازم کو آواز دی اور کہا "آپ کے لئے پان لاؤ۔"

"شکریہ! میں پان نہیں کھاتا۔" میں نے کہا۔

پھر پروفیسر صاحب سے اجازت چاہی اور "سخن فہمی عالم بالا معلوم شد" کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

اُس روز رات کو میں نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"آج پروفیسر —— سے اُن کی کوٹھی پر ملاقات ہوئی۔ اور اس امر کا اندازہ ہوا کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کتنا جاہل ہے!..."

* * *

اختر انصاری

کل کی سُہاگن

رات کی تنہائیوں میں سو رہی تھی کائنات
چشمِ شاعر تھی مگر معمارِ نقشِ حسیات

کہکشاں کے دوش پر بکھرے ہوئے تاروں کے ہار
صبحدم جیسے گیاہِ سبز پر شبنم کے تار

کرمکِ انجم کی ہلکی ٹمٹماتی روشنی
ایک مریضِ بے نوا ہو جیسے صرفِ جاں کنی

ذرہ ذرہ مائلِ درسِ سکوتِ شام تھا
خامشی کا تذکرہ محفل میں شب کی عام تھا

گوشۂ ظلمات میں پیدا تھے آثارِ سحر
صورتِ کافور اُڑنے ہی کو تھا شب کا اثر

اِس دُھندلکے میں فضا کے دُور اک جنبش ہوئی
تھرتھراتی کانپتی، سہمی ہوئی جنبش ہوئی

ایک جانب جم گئیں نظریں۔ گئی کچھ سانس تھم
دھیمے دھیمے اک طرف اُٹھنے لگے میرے قدم

دیکھتا کیا ہوں کہ اک دوشیزۂ رنگیں جمال
سوچ میں ڈوبی ہوئی ناآشنائے حال و قال

ترجمانِ نوحۂ دل بھولی بھولی انکھڑیاں
ڈوبی ڈوبی آنسوؤں میں کالی کالی پُتلیاں

بوکھلایا رُخ، دھڑکتا دل، تنفس تیز تیز
شیشۂ اُمید دستِ آرزو میں ریز ریز

سرد سرد آہوں میں سرگرمِ فغاں بیٹھی ہوئی
انتہائے درد میں زلفِ دوتا اینٹھی ہوئی

جذبۂ وحشت میں ہونٹوں کو چباتی ہے کبھی
ماتمیٔ حال بنکر گنگناتی ہے کبھی

پتھروں سے بے خودی میں چشم و لب ملتی ہوئی
اُنگلیاں حسرت سے قبرِ دوست پر چلتی ہوئی

سسکیاں لیتی ہجومِ یاس میں بہکی ہوئی
ہچکیوں میں توڑ کر اک شعر یوں کہتی ہوئی

"سونے والے! دیوتا تو ہے برہمن میں بھی ہوں
دل کے مندر سے نہ جا کل کی سہاگن میں بھی ہوں"

(حبیب نجیب آبادی)

ہماری عید

ہماری عید کا لطف اُٹھانا ہو تو رمضان سے پہلے، شہر کے ایک مشہور سینما گھر میں کسی فلم کا سترھواں شاندار ہفتہ کھل رہا تھا، بے فکرے شوقینوں کی وہ ریل پیل کہ ماں بہن سے اٹھیں تو کشتم کشتا پر دم لیکر ڈیوڑھے دونے پر ٹکٹ خریدیں اور تماشے پہ تماشہ دیکھیں، کلمہ درود اللہ کا نام، مگر ڈرامے کا مکالمہ از بر، کیا مجال کہ از الف تا والسلام ایک متشابہ لگ جائے، کوئی کاما، فل اسٹاپ چھوٹ جائے۔ اپنا شجرہ پوچھئے تو شمشیر ابن شمشیر" مگر ہیرو ئن کی سنئے تو ولدیت، قومیت، سکونت زبان کی نوک پر۔

شامت جو آئی تو آج ہم بھی ایک سیٹ کیلئے ریزرو ہو گئے، اور چراغ بتی سے پہلے بنے سنورے، اور سگرٹ سلگا گھر سے نکلنے ہی کو تھے کہ گھن گرج سے آواز آئی "دناناتا! اور ایک اور دناناتا! ہم نے کہا "سنتی ہیں آپ، جیسی توپیں چل رہی ہوں؟" کہنے لگیں "حضور کی سلامتی میں رمضان کا چاند مبارک ہو" بیگم کا بیان، اُس پر توپخانہ کی شہادت، ہم نے بھی ادھر اُدھر دیکھکر ایک ہوائی فیر سر کیا" امی جان آداب" نہ جانے کدھر سے، شاید باورچی خانے سے بڈھی ساس کے پوپلے منہ سے جواب آیا" جیو اپنی کے لال، دُودوں نہاؤ پوتوں پھلو، رمضان کا چاند ہے تر دار کا منہ ضرور دیکھ لینا"

"ہاں تو" ہم نے کہا "آج کے چاند کا منشا یہ ہے کہ ابکے پورے تیس روزوں پر عید ہے گی۔ مناسب! مگر یہ تو کہیئے سحری کا کیا انتظام ہے؟ بس انتیس کے چاند میں یہی علت ہے کہ نہ وقت پر تراویح کا پروگرام بن سکے، نہ سحری کا اہتمام ہو سکے، خیر تراویح کا تو یہ ہے کہ اگر وقت ٹل جائے تو قضا سے فرصت ہے مگر سحری کے بغیر روزہ خلاف سنت ہے، بالفعل آپ اور کچھ نہ کریں، بس ایک چوزے کا قورمہ دم کو، بھنا بھنا شوربا کم، دو تین شامی، مگا ہوں چٹ پٹے اور وقت پر گرم گرم ملیں، شیر برنج تو ہو دے ہی گی، کیوڑے میں بسائیے، ہوائیاں چھڑکئے اور قلفیوں میں جما دیجئے، اللہ اللہ خیر سلا"

سینما سے آئے اور گدگدے بستر پر کروٹیں اور نئے بدلے مشکل سے پل بھر آنکھ لگی ہوگی کہ محلے بھر میں ایک حشر ایک اودھم! معلوم ہوا کہ "سحری برداروں" کا روزے داروں پہ یورش ہے، اصطلاح نئی ہے اور تماش کا حق واضع کیلئے محفوظ، ہاں تو پہلی روند میں ایک بزرگوار ہم پر بھی نازل ہوتے، اور کان پر ہاتھ رکھ لگایا کڑکا "جاگو جاگنے میں بھلا ہوگا اس جاگنے میں خدا ملا ہوگا" [1] سبحان اللہ! سنا کہ جس مکتب موسیقی کے پیرو یہ موسیقار ہیں اُن کے سُر ققنس کی روایتی منقار کے بجائے صورِ اسرافیل سے لئے گئے ہیں، غالباً یہ مطلع تھا اور ہم سمجھے تھے کہ اس بحرِ ناپیدا کنار کی پوری غزل سے بہرہ اندوز ہونا پڑے گا، بارے ڈفلی کی چھ مسلسل ضربوں نے اِس نعمت سے محروم یا محفوظ رکھا۔

شعر کی معنویت تو ہم دُنیا دار کیا سمجھتے، البتہ صوری حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب کے دُور شہر میں پھر کوئی بے طرح یا طرحدار، مخلوط [2] یا مخبوط مشاعرہ برپا ہو تو بانیین یا بانیات مشاعرہ سے سفارش کی جاتی ہے کہ اس شعر کے کسی مصرعے پر ضرور متفکر ہوں۔

ڈفلی نواز کی چھ ضربی گونج مغز پاشی کر ہی رہی تھی کہ اسی اسٹیشن پر ایک اور سحری بردار کا کراس ہوا، کڑک اور گرج میں یہ اپنے ڈفالی پیش رو سے کم نہ زیادہ مگر نرے تحت اللفظ تھے یعنی۔ رمضان کے روزے دارو سحری کرو اٹھو" اور اس مارشل لا کی شدت کو ذری نرمانے کے لئے۔ روزے نماز، عبادت سخاوت قبول، بارگاہِ رسول، چاندی کا چھلا ذری کا پھلکا"

---

[1] شہر کا مشہور مشاعرہ جو شعر سے شروع ہو کر ٹھیوں پر ختم ہوا۔

ان بلیات کے نزول اور مع الخیر رفع ہوجانے پر ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ اگلے پچھلے سب معاف ہو گئے، کہ ساقی دیا جیسے مینڈک کے گلے میں کسی نے کمرچ سپتک اتار دی ہو، اور وہ ٹریمولو میں "اٹھو سونے والو سحر ہو گئی" الاپ رہا ہو۔

شہر آدھیا کے ان پوقلمون مظاہروں کے بعد خیال ہوتا ہے کہ آنے والی شبرات کے پھلجھڑی پٹاخوں سے جی بچیں تو اپنی سرکردگی میں ہم چھٹے ہوئے عاقل بالغ شہریوں کا ایک وفد "پدران شہر" کی خدمت میں باریاب کرائیں اور شہری برادری کے کمزور اعصاب کا واسطہ دیکر قانون بنوا دیں کہ "کوئی سحری بردار جو موزوں طبع نہ ہو، جو خوش گلو نہو، جو کم از کم غزل ٹھمری نہ گا سکتا ہو، بالذات یا بالواسطہ، یا بہر دو، یا ذریعہ کسی، یا جملہ آلات موسیقی روزہ داروں کو، سحری کے لئے بالارادہ یا بلاارادہ نہ اٹھائے گا، یا نہ اٹھوائیگا یا نہ اٹھاسکے گا۔ بہ صورت خلاف ورزی مرتکب، ایسے روزہ رکھنے یا روزہ دار کی صورت بنانیکا مستوجب ہوگا جو تحت قواعد اُسکے لئے مناسب سمجھی یا تصور کی جائے۔"

خیر یہ تو جب نو من تیل ہوگا تب رادھا ناچیگی، ہوا یہ کہ دسترخوان کی صفائی اور کلی غرارے سے نچنت ہو کر ہم نے بطور حفظ ماتقدم بیگم کو مخاطب کیا "سنیئے صاحب، پھر نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی، نیت تو اِس وقت ہم تیسوں ہی روزوں کی باندھے لیتے ہیں، مگر ایک اُصولی مسئلہ سن بلکہ سمجھ رکھئے، وہ یہ کہ اگر علی الصباح باورچی خانہ کے اندر نعمت خانہ کے قریب، آپ ہم سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتے یا وقوع میں آتے دیکھ پائیں جسے عرف عام میں کھانے پینے سے تعبیر کرتے، یا کر سکتے ہیں، تو آپ بھول کر نہ یاد دلائیں اور ہم بھی یاد کر کے بھول جائیں کہ روزہ دار ہیں۔"

چنانچہ بھول ہی بھول میں دن سرکنے لگے، اور ہم بھی عادی ہوگئے کہ پابندی کے ساتھ سحری سے شروع ہوں تو صبح کے ناشتے کو دیکھتے ہوئے دوپہر کے کھانے پر دم لیں، اور شام کے افطار کے بعد دوسری سحری کا انتظار ہو۔

رمضان شریف تو خیر ایک "خانگی حادثہ" تھے، اور ان سے مع الخیر والعافیت عہدہ برآ ہونے کے لئے "بقدر وسعت نفس" ہماری مساعی اگر کامیاب نہیں تو کچھ ایسی ناکام بھی نہیں ہوئیں۔ مگر عید کا پبلک اعلان

ع:- پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

ہمارے لئے نہایت صبر آزما تھا۔ یعنی ادھر، خدا سے قطع نظر، خودی کی سالانہ نمائش اور بیگم کے جوڑے کی فرمائش، اُدھر افلاس کی فراوانی اور جیب کی عُریانی۔ ڈر تھا کہ عید کے خلاف ہم کہیں ستیہ گرہ، بھوک ہڑتال یا سول نافرمانی قسم کی کوئی چیز نہ کر ڈالیں اور بیرا ئیوٹ روزے بھی نہ رکھنے لگیں، جو کبھی کا لیا دیا کام آیا اور بیگم کی رونمائی کے "سم سم" کی کنجی تک رسائی ہو گئی۔

تانگہ رکا، . . . . . اینڈ کو کی دوکان اس وقت لین دین کا محشرستان بنی ہوئی تھی۔ دکاندار نے پہلے تو ہمیں اُس چڑی مار کی نظر سے دیکھا جو جال بچھا چکا ہو، دانہ ڈال چکا ہو، پھر اس طرح تیور بدل لئے کہ ع:- اِن تلوں تیل ہی نہ تھا گویا،

یہ شاید اس لئے کہ ہم اُن خوش دہند گاہکوں میں سے تھے جو دیوالی دیوالی نقد سے زیادہ اُدھار کھاتے میں جمع ہوتے رہتے ہیں، جانبین کا سکوت ٹوٹا، فرمائشات کی فہرست سُنائی گئی، اور بقایا کے تقاضے ادائی کے حلفی وعدے پر تکمیل پا گئی، حلوائی کی دُکان سے دادا جی کی فاتحہ کے بعد سامان سے لدے پھندے ہم اُٹھے ہیں تو بیگم کی مشکل کشائی پر ایمان لا چکے تھے۔

آج رمضان کی تیرھویں تھی، اور کوئی رکھے تو کل منجھلا روزہ دوپہر ڈھلتے ہی سحری کی بچت کے آڈر نکلے اور تیسرے پہر تک چولہوں پر چڑھ گئے، اُدھر ہم نکلے تو شہر کا طواف کر کے رات گئے گھر میں داخل اور

سحری کے فراق میں خالی پیٹ ہی سو گئے۔

آنکھ کھلی، آنتیں مچل رہی تھیں، دیکھا تو اندھیرا گھپ! "بیگم بیگم! امی جان امی جان! فخرو فخرو!" توبہ کیا گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں، برقی مشعل سے دیکھا، سارا گھر ظلمات، گویا آسمان سے کاجل برس رہا تھا، یہ کمرہ، وہ دالان، ہائیں چراغ گل، بیگم غائب، امی جان ندارد، ماما اُڑنچھو! چاہا کہ منہ پر پانی کے دو چلو مار کر حواس ہی ٹھیک کرلیں، تو لوٹے، صراحیاں، مٹکے سب خالی پیٹ! یاد آیا کہ مودی خانہ باقی ہے، کھولا، دیکھا تو ایک طرفہ تماشا! یعنی بچھونا بچھا ہے، بیگم چاروں خانے چت پڑی ہیں، نہ منہ سے بولتی ہیں نہ سر سے کھیلتی ہیں، آنکھیں بیشک کھلی ہیں اور ستم ظریفی یہ کہ مسکرا رہی ہیں، ایک طرف پہلو میں مسالا کوٹنے کا موسل رکھا ہے تو دوسری طرف امی جان مراقب ہیں،

"استغفراللہ یہ کیا سوانگ ہے، اُٹھیے وقت جا رہا ہے، پیٹ میں آنچ لگی ہے۔" ساس نے سر کی ڈگڈگی ہلا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا پھر بیگم کو دکھایا۔ اب ہمیں یاد آیا کہ آج چاند گرہن ہے اور بیگم صاحب کو جورو سے اماں بننے کے ابتدائی مراحل طے کراتے جاتے ہیں۔

"یہ سب لال کتاب کے مسئلے ہیں، اُٹھیے دسترخوان چنوائیے، کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ منجھلا روزہ بھی ہڑپ کرلیں اور پورے کافر ہو جائیں؟"

لال کتاب کا نام آنا تھا کہ بڑی بی کا رواں رواں غصے کے مارے لال ہو گیا، تڑپ کر بولیں: "تم تو کول کے مدرسے میں جا کے نیچری ہو گئے ہو نیچری، لال کتاب نہ ہوتی اور ماں کے پیٹ سے لنگڑا لولا بچہ نکلتا تو چھٹی چلا، شادی بیاہ، کرنی کرتوت کر کے کوئی تمہیں پروان چڑھا کر دیکھتے بیٹا! سات قرآن درمیان، اس حالت میں گہن کی چھاؤں پڑتے تو پیٹ کے معصوم کی کیا گت بنے؟"

ہم نے کہا: "بیت المعذورین کے دروازے کھلے ہیں اور وقت! اب سحری . . . . ."

جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ توپ گرجی دناتا نا!!

صبح کو سنا کہ کھانا مسجد کو گیا، ہمارے اصیل مرغ کا جوڑا سحری بردار نے مارا، بیگم کا نیا بنارسی دوپٹہ خود ماما کے پسند آیا، تیلی راجہ البتہ گھاٹے میں رہے یعنی اُن کی قسمت کا ایک انڈا، سوا سیر ماش اور کپی بھر تیل ہی نکلا!!

آپ نے دیکھا کہ جاڑوں کے سستے روزے کس اطمینان سے ہم نے رکھے: اور کل مطلع پر کس شان سے گئے ہیں کہ دوربین بھی ہے، بھری ہوئی قرابیں بھی ہیں، ابر کے ٹکڑے ٹکڑے پر نظر ہے، کیوں نہ ہو تیسویں افطار کی فکر ہے ناگہاں۔ ع۔

ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد — مبارک!

آج عید ہے! اور ہماری عید ہے، منہ اندھیرے عارضِ تقاضی کو مصدرِ استردن پر گردان کر نہائے ہوئے، تولیے اور روغنیات کے زور سے چہرے کے زنگِ فطرت کو دور کیا، اور مونچھوں کو کاسمیٹک کی چپٹ دیکر اتنا تاؤ دیا کہ نیک نیتی ثابت ہونے پر بھی بعض انسانی کمزوریوں کے سلسلہ میں فریقِ مخالف آلۂ جارحہ سے ضررِ شدید پہونچانے کا الزام ہم پر لگ سکے، کنگھی چوٹی سے فراغت کر کے کپڑے پہنے، چست مہری کا پیجامہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندوق پر غلاف چڑھا دیا گیا ہے، خوش وضع جامہ وار کی شروانی کا دامن بار بار محض اس لئے اُٹھا دیا جاتا ہے کہ چکن کے بیل دار کرتے میں سے سرخ ریشم کا کمربند جھلکتا رہے، پاؤں میں وصلی کی نازک بدن جوتی ہے جس کی وجہ سے چال ایسی کہ بتاشہ نہ ٹوٹے۔ المختصر آج ہماری عید ہے۔ اور سر سے پاؤں تک عطر حنا میں بسا کر جب ہم اِتراتے ہوئے عیدگاہ کو چلے ہیں تو بجائے تکبیر پڑھنے کے ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
رہینِ منت قرضم ز لطفِ ساہوکار

وردِ زبان تھا۔

آوارہ

گیت

گھر گھر آئے بادر کارے

آکر برسے اُن کے دوارے

بادر نے آنسو برسائے

بھید محبت کے سمجھائے

اُن سے کئے خاموش اشارے

گھر گھر آئے بادر کارے

پانی کی ہر بوند اک دل تھی

ان کے جلووں کی محفل تھی

اُن تک آئی اُن کے مارے

گھر گھر آئے بادر کارے

بادل گرجا بجلی چمکی

بن گئی صورت اس جیون کی

جو جیتا ہے اُن کے سہارے

گھر گھر آئے بادر کارے

بادل لیکر ساون آیا

اُن کی خبر لیکن کب لایا

ہم تو ہیں اُن ہی کے مارے

گھر گھر آئے بادر کارے

ہم بھی اے بہزادِ مضطر

روئے دیکھ کے کارے بادر

عاجز ہیں ہم دل کے مارے

گھر گھر آئے بادر کارے

(بہزاد لکھنوی)

گہرائیاں

ویسے تو شیخ صاحب محلّے بھر میں نہایت شریف آدمی سمجھے جاتے تھے مگر بیویوں کے حق میں لوگ دل ہی دل میں اُنہیں مُہلک سمجھتے تھے۔ اسکا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ اُن کی تینوں بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہو چکی تھیں۔ اُنہیں بیویاں اور لینے بدلنے کا شوق نہیں تھا۔ بلکہ اسی بات پر وہ اکثر مغموم رہا کرتے تھے۔ اور جب کبھی وہ شہزادہ سے بات چیت کرتے تو خواہ مخواہ اُن کی گردن جُھک جاتی۔ اُن کے مُنہ سے بیساختہ "جی ہاں جی ہاں" نکل جاتا اور اُن کے انداز سے ایسا ظاہر ہوتا جیسے وہ اُس سے بیاہ کر لانے کی تلافی کر رہے ہوں۔

شہزادہ اُن کی چوتھی بیوی تھی۔ اور اُن کے دوست مولوی محمد عثمان کی بیٹی تھی۔ مولوی صاحب نہایت پاکباز آدمی تھے اُن کا بیان تھا کہ جسم نجات کے راستہ میں ایک زبردست رُکاوٹ ہے۔ اُنہوں نے اپنی اکلوتی بیٹی کو اسی اصول کے ماتحت رُوحانی تربیت دی تھی۔ مگر وہ رُوحانی تربیت شہزادہ کے بھرے ہوئے جسم کے متناسب پیچ و خم کو روک نہ سکی۔ اور شہزادہ اس اصول سے اُبھر کر ایک حسین مجسمہ بن گئی۔ جیسے وہ جسم اس اصول پر مُسکرا رہا ہو۔ شہزادہ کی طرف دیکھا یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی مخملیں گلابی جسم اُبھر اُبھر سمٹ سمٹ کر آپ سے کچھ کہہ رہا ہو۔ حتیٰ کہ آپ کا جی چاہتا کہ اُٹھ کر کچھ پھوڑ دیں یا کسی سے لڑ پڑیں۔ اور اگر شہزادہ کی گہری عنابی آنکھیں مُسکرا کر دیکھ لیں تو .... مگر شہزادہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ اور وہ تسلیم کی کالی کالی موٹی موٹی آنکھوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتی تھی۔

تسلیم شیخ صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی اور اُن کی پہلی بیوی جہاں آرا سے تھی۔ تسلیم کو دیکھکر شہزادہ خواہ مخواہ غصہ سا محسوس کرتی۔ شاید اس لئے کہ تسلیم کی آنکھیں اُسے بہت پسند تھیں یا اس لئے کہ وہ آنکھیں اسکے چہرے پر تھیں یا شاید اس لئے کہ شیخ صاحب تسلیم کے متعلق شہزادہ کی کوئی بات نہ سُنتے تھے۔ بہرصورت اس کی کوئی بھی وجہ ہو۔ شہزادہ بات بات پر تسلیم کو "اندھی ہے کیا ــــــ دکھائی نہیں دیتا" کہنے کی عادی تھی۔ تسلیم سُن کر پی جاتی اور اُس کی آنکھیں ان نہ بہے ہوئے آنسوؤں سے اور بھی جاذبِ نظر ہو جاتیں۔ تسلیم کی عُمر کوئی سولہ برس کی ہوگی۔ مگر اُس کا شباب ان خاموش نمناک آنکھوں نے جذب کر لیا تھا۔ اور اُس کے اعضا اُن لطیف حرکات سے ناواقف ہی رہ گئے جن سے شباب اپنا اظہار کرتا ہے۔

البتہ جب کبھی تسلیم کا خالہ زاد بھائی کرامت اُن کے گھر آ جاتا تو خُدا جانے کہاں سے ایک ہلکی سی سُرخی آ کر اُس کے چہرے پر جھلکی دکھا جاتی اور کرامت کی کسی نہ کسی بات پر اُس کے ہونٹ تبسّم سے کھل جاتے اور وہ تبسّم اُس کی آنکھوں میں جا جھلکتا۔ شہزادہ کرامت سے باتیں کرتے ہوئے تسلیم کی وہ حرکات بن دیکھے محسوس کرتی۔ حتیٰ کہ اُسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ کیا کہنے والی تھی۔ اُدھر کرامت کی نگاہیں بھی اُن کی گفتگو سے بیگانہ رہتیں۔ اور کرامت کی نگاہوں کو دیکھکر اور تسلیم کی متبسّم آنکھوں کو محسوس کر کے اُس کے دل میں غصہ اُٹھتا۔

پھر جب کرامت چلا جاتا تو شہزادہ یوں محسوس کرتی جیسے وہ دیواریں بہت اُونچی ہوں جہاں لوگ یوں چل پھر رہے ہوں جیسے کسی ویرانے میں بھوت اور وہ خود ایک پریشان، نہ ختم ہونے والا خواب۔ اس وقت تسلیم کی نمناک آنکھوں کو دیکھکر اُسے اُن کا گذشتہ تبسّم یاد آ جاتا۔ اور وہ کسی نہ کسی بات پر کہتی "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اُبا کا کوٹ جھاڑ دینا مگر تم سُنتی ہی نہیں ــــــــــــ اور یہ دیکھ میز پوش پر دھبہ لگا کر ناس کر دیا ہے۔ لکھتے وقت تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

اُس روز کرامت کے جانے کے بعد شہزادہ بہت ہی پریشان سی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ لمبی لمبی دیواریں آپس میں مل جا رہی ہوں۔ وہ دو ایک مرتبہ اندر گئی باہر آئی اور پھر اندر چلی گئی۔ ..... آئینہ دیکھکر اُس نے یوں محسوس کیا جیسے اس خوبصورت سی تصویر سے اُسے کوئی واسطہ نہ ہو۔ جیسے وہ چہرہ اُس کا مُنہ چڑا رہا ہو پھر وہ باہر صحن میں آئی اُس کے سر پر ایک پھیکا سا اُداس آسمان پھیلا ہوا تھا ... بالو کو آتے ہوئے دیکھکر اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔

"میں کہتی ہوں بالو، دو روز سے پڑوس میں زبیدہ کے متعلق کیا جھگڑا ہو رہا ہے" اُس نے بات شروع کرنے کیلئے کہا۔

"لو بی بی وہ ویسے ہی باتیں بنائی ہے۔ محلے میں کون نہیں جا قریب تر ہو کر "میں نے تو اِن آنکھوں سے اُنہیں ملتے دیکھا ہے"

"سچ کہتی ہو" اُس نے ایک جھرجھری لیکر کہا۔
"اور تو کیا بی بی مجھے اُس سے کوئی لاگ ہے کہ اُسے بُرا بناؤں"
"مگر بانو۔ لوگوں کو یوں ملنے ملانے کی جرأت کیسے ہوتی ہے۔ توبہ۔ میں تو اس خیال سے ہی کانپ اُٹھتی ہوں"
"سچ پوچھو بی بی مجھے تو اُس بیچاری پر ترس آتا ہے۔ جوان لڑکی پر ... بھلا اپنی جوانی برباد کیوں کرے۔ بیاہ کے وقت ماں باپ کہاں تھے جو سارے اُس بڈھے کے سر تھوپ دیا۔ اب لوگ خواہ مخواہ اُس بیچاری کے سر ہوتے ہیں"
"چلو جانے دو ہمیں کیا پڑی ہے کہ کسی کو بُرا بھلا کہیں ــــــ میں کہتی ہوں اس مقابل والے مکان میں کون آئے ہیں"
"یہی بات تو میں کہنے آئی تھی۔ مگر جو تم بُرا مانو بی بی تو میں کہونگی ہی نہیں۔"
متفکر ہوکر "آخر بات کیا ہے"
"بات کیا ہونی تھی۔ یہی جو سامنے والے گھر میں آئے ہیں نا۔ ایک بڑھیا ہے اور ایک جوان مشٹنڈا سا لڑکا۔ ابھی کل ہی تو آئے ہیں مگر وہ لڑکا کسی وقت بھی تو کھڑکی سے اِدھر اُدھر نہیں سرکا۔ ہر آتے جاتے کو یوں ہی چمکا چمکا کر دیکھنا۔ چاہے تم کچھ بھی کہو۔ مگر مجھے تو یہ بات پسند نہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ رکھے جوان لڑکی ہے۔ اور پھر اُس کے کمرے کی کھڑکیاں بھی تو اُن کی کھڑکیوں کے مقابل کھلتی ہیں۔ اس میں بڑی بے پردگی ہے بی بی"
"اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے۔ یہ تو اُلٹی ہمارے ہی بھلے کی ہے۔ میں کہتی ہوں اگر تمہیں ہمارے بُرے بھلے کا خیال نہ ہو تو پھر ہوگا کسے۔ تسلیم کے ابا کو تو اِن باتوں کا خیال ہی نہیں۔ کئی دفعہ اُن سے کہہ چکی ہوں کہ لڑکی اب جوان ہے اس کی کوئی فکر کیجئے۔ مگر لڑکی کے متعلق تو وہ میری بات سُننے کے روادار نہیں"
"یہ بھی کوئی بات ہے بی بی۔ لو تمہیں لڑکی کا فکر نہ ہو تو کسے ہو۔ ایک روز شادی کرنی ہی ہے"
"تم نہیں جانتی بانو" شہزادہ نے بڑھکر رازدارانہ انداز میں کہا "دیکھ لو ہر بات میں میں جو چاہوں کروں۔ مگر لڑکی کے متعلق وہ سُنتے ہی نہیں۔ وہ حمید کا جھگڑا ہوا تھا نا۔ تم تو جانتی ہی ہو۔ توبہ۔ لڑکی پر بگڑ گئے۔ اور کتنا پاکھنڈ مچایا۔ اُس کے ابا تو صاف کہنے لگے کہ میں نے ناحق پر جھوٹا بُہتان لگایا ہے"
"مگر بی بی، سچ پوچھو تو تم نے بھی بن سوچے سمجھے بات چھوڑ دی"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ بات میرے ہی سر چڑھے گی۔ میں نے تو اُنہیں کے بھلے کی بات کی تھی۔ ورنہ ایک روز جگ ہنسائی ہوتی"
"تم بھی بڑی سیدھی سادی ہو۔ یہ کوئی شرافت کا زمانہ تھوڑا ہی ہے۔ تمہیں تو چاہئے تھا کہ کوئی خط پکڑ کر اُن کے سامنے جا رکھتیں"
"یہی تو مجھے افسوس ہے۔ مگر بانو اب تو وہ بات ہاتھ سے گئی۔ (آبدیدہ ہوکر) بانو ایمان سے میری کوئی بُری نیت نہیں۔ تمہارے سر کی قسم میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ لڑکی اب اپنا گھر بسائے۔ جوان لڑکی کو گھر میں رکھنا......"
"لو بی بی یہ بھی کوئی بات ہے" بانو نے بات کاٹ کر کہا "تم چاہو تو دو ہی دن میں اُن کے سامنے سرخرو ہو جاؤ۔ خط جا رکھنا"
"خط!! وہ کیسے؟"
"واہ بی بی تم بھی بھولی ہو۔ یہ تو کمبخت رشتہ ہی ایسا ہے۔ یہاں لاگ لپیٹ کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اور تم کوئی بُری نیت سے تھوڑا ہی کرو گی اس میں تو اُسی کا بھلا ہے"
"ایمان سے بانو مجھے کوئی اِس لڑکی سے بَیر نہیں۔ میں تو ــــ"
بات کاٹ کر "لو بی بی میں بھلا سمجھتی نہیں"
"اچھا تو بانو یہ کیسے ممکن ہے۔ بس اُنہیں میری بات کا ثبوت مل جائے اور لڑکی اپنا گھر جا بسائے۔ بس میں تو یہی چاہتی ہوں"
"یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ دو دن کا کام ہے"
"مگر کرو گی کیسے"
کچھ سوچ کر "یہ جو سامنے مکان میں لڑکا ہے بس اسے ہی لپیٹ لو۔ اپنی بہن سے خط لکھوا کر اسے پہونچا دوں گی۔ وہ سمجھے گا کہ تسلیم نے بھیجا ہے۔ اِن لونڈوں کا کیا ہے۔ ان کو تو ایسی بات اللہ دے۔ فوراً جواب لکھے گا۔ بس وہ خط سنبھال کر رکھ لینا"
متفکر ہوکر "مگر بانو بات نکل گئی تو"
"میرا ذمہ بی بی۔ تم بے فکر رہو۔ تم پر آنچ نہ آنے دونگی"
"مگر بانو۔ خط کا جواب کون لائے گا۔ اس بات میں کسی اور کو نہ ڈالنا چاہئے۔"
"میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ تم بے فکر رہو۔ بی بی (کچھ سوچکر) پہلا خط تو میں کسی لڑکے کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ لکھ تم دینا اور میں اپنی بہن سے نقل کروا لوں گی۔ وہ اچھی خاصی اُردو لکھ لیتی ہے۔ تین جماعتیں پاس ہے۔ تم خط اس طرح لکھنا جیسے تسلیم کا ہو۔ اور اُس میں یہ لکھ دینا کہ جواب

اِس بیٹھک کی کھڑکی میں رکھ جائے اور پھر اگلے روز وہیں سے اُس کا جواب لے جائے۔ کھڑکی میں سلاخیں تو ہیں ہی۔ رات کو کھڑکی کھلی رکھا کرنا۔ نو دس بجے اگر وہ خط پھینک جایا کریگا۔ اور اُٹھا کر بھی لے جایا کریگا۔ بس دو ایک خطوں کی تو ضرورت ہے"۔

سوچ کر "ترکیب تو خوب ہے۔ مگر تسلیم اُس کے سامنے تو ہو گی نہیں۔ وہ بھی دل میں کیا کہے گا کہ خط تو آ رہے ہیں مگر لکھنے والی کا پتہ ہی نہیں چلتا"۔

"کیوں نہیں۔ اُسے بھلا کیا پتہ کہ تسلیم ہے کون۔ تمہارے کمرے کی کھڑکی بھی تو گلی ہی میں کھلتی ہے۔ وہاں گھڑی دو گھڑی کھڑے ہو کر بال بنا لیا کرنا۔ اُسے کیا خاک پتہ چلے گا کہ تم کون ہو۔ وہ تو یہی سمجھے گا کہ تسلیم کھڑی ہے"۔

حیران ہو کر "میں!!!"۔

"لو بی بی اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تمہیں کیا اُس سے آنکھیں ملانی ہیں۔ اور پھر دو ایک دن کی تو بات ہے۔ اور اس بات کا بیت بھی تو کسی کو نہ چلے گا۔ آخر ایسی باتوں میں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے ——"

گھبرا کر "نہ بانو۔ مجھ سے تو ایسا ......"

بات کاٹ کر "اللہ نہ کرے تمہاری کوئی بُری نیت ہو بی بی۔ اور ڈر کس بات کا ہے، تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو وہ تمہیں کھا جائیگا"۔

بانو چلی گئی تو کچھ دیر شہزادہ چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر وہ بیساختہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا "توبہ ہے! خدا جانے لوگ ایسی باتیں کیسے کر لیتے ہیں"۔ اُس نے اپنے آپ کہا —— وہ کوٹھے پر چلی گئی۔ سامنے بیڈھب سے مکانوں کا تسلسل دیکھ کر اُس نے محسوس کیا جیسے زندگی ایک بے معنی سا پھیلاؤ ہے۔ گُل عباسی کا پودا دیکھ کر اُسنے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ پودا گرد آلود ہو رہا تھا —— اُس نے وہ گلدان اُٹھا لیا اور نیچے اتر گئی۔

"تسلیم دیکھو خدا جانے کتنے دنوں سے تم نے اسے پانی نہیں دیا۔ بیچارہ سوکھ گیا ہے"۔ تسلیم کی آنکھیں جھک گئیں...... مگر شہزادہ کو یوں چُپ دیکھ کر وہ حیران سی ہو رہی تھی۔ شہزادہ نے اُس پیڑ پر پانی چھڑکا۔ پھر غسل خانہ میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اُس نے تسلیم کو آواز دی: "مجھے ذرا اپنا دوپٹہ تو دینا۔ تم جب تک اُس کھونٹی سے میرا ہوا ئی دوپٹہ لے لو"۔ تسلیم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آتا تھا۔

"میرا دوپٹہ تو میلا ہے"۔ اُس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں"۔ اور وہ مُسکرا دی۔

شہزادہ نے کمرے میں جا کر اپنے بال سنوارے اور پھر پلنگ پر یوں جا بیٹھی جیسے اُسے کوئی کام ہی نہ ہو —— اُس نے کمرے میں اندھیرا اندھیرا سا محسوس کیا۔ اُس کی نگاہیں پھر پھر کر کھڑکی پر جا ٹھہریں، کھڑکی بند پڑی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھی —— کھڑکی کھولتے ہوئے اُسے وہ مقابل والا مکان یاد آ گیا اور وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی "اُفوہ میں تو بھول ہی گئی" —— "مجھ سے تو ایسی بات نہ ہو سکے گی" ——

"مگر دیکھنے میں کیا ہرج ہے" کوئی اُس کے دل میں کہہ رہا تھا "تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو؟"

اُس نے کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھولے

سامنے کھڑکی میں ایک جوان سا لڑکا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اُس کا سینہ اُبھرا ہوا تھا اور ایک فراخ ماتھے پر دو گھنے ابرو پیوستہ تنے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک رکھی تھیں اور دونوں ہاتھوں اپنی ٹھوڑی پکڑ رکھی تھی وہ اپنے دھیان میں بیٹھا تھا۔

"میں بھی کیسی پاگل ہوں" شہزادہ نے کہا اور پھر کھڑکی کے پٹ کھول دئے۔ سامنے گوالن دودھ دوہ رہی تھی۔ خدا جانے کتنی دیر وہ سے اُس گوالن کو دیکھتی رہی۔

"عباس"۔ کسی نے گلی سے آواز دی۔ شہزادہ کی نگاہ کھڑکی کی طرف اُٹھ گئی۔

وہ لڑکا اُٹھ بیٹھا۔ "کون ہے"۔ اُس نے ایک بھاری سی آواز پوچھا —— شہزادہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تبسم جھلک گیا —— شہزادہ کی آنکھیں جھک گئیں۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش میں اُس کا سر کُ گیا۔

"کیسا ہرا بھرا پودہ ہے"۔ شہزادہ نے گُل عباسی کے پیڑ کو کہا "اب اس میں پھول لگیں گے"۔ اُس نے پیار سے ایک سُرخ پھول چُھوا "گُل عباسی —— عباس"۔ اُس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ اُسکی اُنگلیوں کو دبا رہا ہو۔ اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں بھی کیسی پاگل ہوں"۔ وہ مُسکرا دی "اتنا کام پڑا ہے میں سب کچھ بھول جا رہی ہوں"۔

شہزادہ بیٹھک میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے بال پریشان، آنکھیں نیند سے مخمور سی تھیں اور وہ بیٹھی عباس کا خط پڑھ رہی

وہ عباس کا تیسرا خط تھا اُس کے بے تکلف الفاظ شہزادہ کے رونئیں رونئیں میں ناچ رہے تھے، دل میں جاکر دھڑک رہے تھے۔ مُنہ پر سُرخی بن کر جھلکتے اور آنکھوں میں تبسّم ہوکر لہراتے تھے۔ اُس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ وہ خط "میری تسلیم" سے مخاطب تھا۔ "میری" اُس کے دل میں میری کا ایک عجب و غریب مفہوم پیدا ہو رہا تھا "میری ـــ"

اُسکے سامنے گُل عباس کے پھول لہرا رہے تھے۔ سُرخ سُرخ پھول۔

باہر آسمان پر صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی۔ گلی دُور تک دوڑ دوڑ کر کہیں جانے کا راستہ دکھا رہی تھی۔ اور مکانوں کی قطاریں یوں خاموش تھی جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں وہ آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ کوئی اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا "تمہاری آنکھیں کس قدر شوخ ہیں" کسی کاغذ کے حروف نکل کر اُس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اور وہ مسکرا دی۔ ایک ساعت کیلئے اُس کے سامنے تسلیم کی آنکھیں آ گئیں۔ بڑی بڑی بے نیاز سی آنکھیں۔ آئینے میں کوئی مسکرا مسکرا کر اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

دوپہر کے وقت شہزادہ نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ ٹرنک کھولا اور زیور کی ڈبیا میں سے تین کاغذ نکالے انکو ایک بار پڑھا۔ پھر ڈھونڈ لیا اور کچھ لکھا۔ اور بانو کے انتظار میں بیٹھ گئی

"یہ لو" اس نے بانو کو وہ رقعہ دیتے ہوئے کہا "اسے اپنی بہن کو جا کر مجھے شام تک پہونچا دینا"

بانو نے وہ رقعہ لیکر پلے میں باندھ لیا۔

"میں کہتی ہوں بی بی۔ اُس کے خطوں میں کیا لکھا ہوتا ہے" اُس نے ہنس کر کہا اور اُس کی آنکھ میں نقرئی سی چمک جھلکنے لگی۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ ابھی تک تو اُس نے ہمارے مطلب کی کوئی بات بھی نہیں لکھی ـــــــ میرا تو یہ خیال ہے کہ ابکے بار اس کا جواب آئے تو یہ قصہ ختم ہی کر دیں۔"

"مگر بی بی اتنی جلدی بھی کیا پڑی ہے۔ دو ایک خط اور لکھ دیکھو میں تو حیران ہوں بی بی۔ ایسے جوان لڑکے تو جھٹ بات کا بتنگڑ بنا لیا کرتے ہیں۔ خدا جانے اس کو کیا ہوا ـــ میں کہتی ہوں بی بی تم وہ خط مجھے تو دو کچھ پتہ تو چلے"

"اچھا" شہزادہ نے جھجک کر کہا "تم سے کیا پردہ ہے" پھر کچھ سوچ کر کہا "اسوقت تو لڑکے آنے کا وقت ہے کل سہی"

رات کو نو بجے جب شیخ صاحب نماز پڑھنے مسجد میں گئے۔ شہزادہ نے ٹرنک سے وہ رقعہ نکالا۔ اُسے ایک بار پڑھا۔ اور بیٹھک میں اُسے لے گئی۔ کھڑکی میں اُس نے ایک لکڑی کی خالی صندوقچی رکھ چھوڑی تھی۔ جس میں وہ رقعہ رکھ دیا کرتی اور عباس اُٹھا کر لے جایا کرتا تھا اور جواب ڈال دیا کرتا تھا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صندوقچی کھولی۔ اُسکے اندر ایک رقعہ پڑا ہوا دیکھکر وہ گھبرا گئی۔ آج تو مجھے جواب دینا تھا۔ یہ کاغذ کیسا ہے۔ اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے وہ رقعہ اُٹھا لیا ـــ اُس کے منہ پر برقی روشنی پڑی اور وہ گھبرا گئی سامنے عباس کی کھڑکی سے کوئی اُس پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اُس کے دل میں کئی ایک شبہات پیدا ہو گئے۔

"شہزادہ میں ابھی آیا" اُس نے عباس کو کہتے ہوئے سُنا۔

"کہیں وہ یہاں تو نہیں آ رہے ـــ اگر کسی نے دیکھ لیا تو ـــ"

اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دوڑ کر زنانے میں چلی جائے۔ مگر وہ مبہوت کھڑی تھی اور اُس کے بدن میں سکت تک نہ تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا اور بدن میں کوئی آوارہ دھڑکن لہرا رہی تھی

ایک گرم سے ہاتھ نے سیخوں سے نکلکر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خدا کیلئے تسلیم انکار نہ کرنا۔ مجھے یوں پاگل نہ بناؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے"

اُس ہاتھ کی گرمی سے اُس کا تمام جسم پگھل کر منجمد ہو گیا۔ اُس کی زبان شل ہو چکی تھی۔

"کچھ تو کہو خدا کیلئے ایک بار ہاں کہدو"

شہزادہ کے منہ پر برقی روشنی پڑ رہی تھی۔ دور گلی میں پاؤں کی چاپ سُنائی دی۔

"چھوڑئیے چھوڑئیے کوئی دیکھ لے گا" اُس کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ عباس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شہزادہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اندر بھاگ آئی ـــ

وہ رقعہ اُس کی مٹھی میں تھا اور وہ بھینچ بھینچ کر اُسے محسوس کر رہی تھی۔ خدا جانے وہ اُسے بھینچ بھینچ کر معدوم کر دینا چاہتی تھی یا اُسے محسوس کر کے اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ وہ رقعہ اُس کے پاس موجود ہے۔ بہرصورت وہ اُسے پڑھنے سے ڈرتی تھی۔ مگر وہ رقعہ دہکتے ہوئے کوئلے کی طرح اُس کے بدن کو جلا رہا تھا۔

وہ اٹھ بیٹھی اور کتنی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ پھر اندر جاکر اُس نے بتی جلائی اور جلدی جلدی اُسے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے وہ ان الفاظ کا مفہوم سمجھنا نہ چاہتی ہو۔ مگر وہ الفاظ اُس کی نس نس میں کھُب کر اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ اُس نے وہ رقعہ ٹرنک میں پھینک دیا اور خود چارپائی پر لیٹ گئی۔

اُس نے اپنا دھیان اِدھر اُدھر لگانے کی کوشش کی مگر اُس رقعے کے الفاظ ٹرنک سے نکل نکل کر اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے "اچھا تو دو ماہ کے لئے گوجرانوالہ جانا ہے ــــ دو ماہ ــــ مجھے ایک نظر دیکھنے کا شوق ہے ــــ رات کو دو بجے بیٹھک کے دروازے پر میرا انتظار کریں گے یعنی میں وہاں جا کر اُن سے ملوں ــ محبت ہے۔ عشق۔ سودائی ہو رہے ہیں!!"

"لاحول ولاقوۃ" اُس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا "یہ کیا حماقت ہے۔ جانے دو مجھے کیا ہے۔ میرے پاس اُس کے تین خط ہیں۔ کل ہی تسلیم کے ابا کے سامنے رکھدوں گی۔ کرامت، کرامت سے منہ دھو رکھے۔ اپنے گھر چلی جائیگی تو یہ روز کا قصہ ختم ہوگا"

"غیر آدمیوں سے ملنا۔ توبہ، کیسی بے حیائی کی بات ہے" اُسنے ایک جھرجھری لی۔

"میری تسلیم" "میری" "میری ــــ" اُس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا "میں بھی کیسی احمق ہوں۔ خواہ مخواہ یہ قصہ بنا بیٹھی۔ آجکل کے لڑکے بھی کیسے نڈر ہوتے ہیں ــــ زبردستی ہاتھ پکڑا۔ کیسی منہ پھٹ باتیں کیں۔ ــ اُس کے ہاتھ پر کوئی گزشتہ دیا ہوا تازہ ہو رہا تھا "تو یہ کیسا گرم ہاتھ تھا" اُس نے اپنے ہاتھ کو دیکھکر کہا "ان لڑکوں کا کیا اعتبار ہے۔ آج کسی کے کل کسی کے اور بعد میں خواہ مخواہ بدنام کرتے پھرتے ہیں"

اُس نے ٹرنک کھولا اُس کا ہاتھ زیور کی ڈبیا کی طرف بڑھا۔ "لاحول ولا" کہکر اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "تو یہ قمیص عرصے سے ادھوری ہی پڑی ہے۔ اسے سی لوں۔ یونہی نکمے بیٹھنے سے فائدہ۔ نکما انسان بھی کس کام کا۔ وہ کچھ نہ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ شاید وہ "نہ سوچنے" سے ڈرتی تھی۔ اُس کی نگاہ گل عباسی کے گلدان پر جا پڑی۔ وہ کُملائے ہوئے پھول لٹک رہے تھے۔ "شگفتہ رہیں وہ صبح و شام ان پودوں کی دیکھ بھال کون کرے۔ اب تو ان کی بہار ہی ختم ہونے کو ہے۔ اس میں گلاب لگا لینگے۔

وہ قمیص لیکر سینے بیٹھ گئی۔ دالان میں تسلیم سو رہی تھی۔ منہ کُھلا ہوا تھا، بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں تھی ہی نہیں۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"یہ رہی آپ کی تسلیم، آ کر دل بھر کر دیکھ لیجئے" اور وہ ہنس پڑی۔

گھڑی کی ٹک ٹک اُسے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی چکی چل رہی ہو۔ ساڑھے دس بج گئے "توبہ وقت کیسے گزرتا ہے۔ دو بجے دو بجے آپ بیٹھک کے دروازے پر کھڑے سوکھیں گے۔ اور آپکی تسلیم یہاں خراٹے لے رہی ہوگی ــــ خدا جانے کس کس دروازے پر انتظار کیا ہوگا۔ ان لڑکوں کا کیا اعتبار ــــ توبہ ہے۔ خدا جانے میں اُس بانو کی بات میں کیسے آگئی۔ شکر ہے بات یہیں ختم ہو گئی۔ ورنہ نکل جاتی تو خدا جانے کیا ہوتا اور ابا کو پتہ چل جاتا تو بس کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اللہ نے بچایا"

"اب سو جاؤں" اُس نے ایک انگڑائی لیکر کہا۔

ٹرنک کھول کر اُس نے قمیص رکھی۔ زیور کی ڈبیا کو دیکھکر اُسنے اپنے جسم میں ایک سرسراہٹ محسوس کی "کیسی بے حیائی کی باتیں لکھتے ہیں۔ وہ تو میں پڑھکر ابھی ان کو دکھلا دوں اور جھگڑا ختم ہو۔ مگر وہ اپنی پیاری بیٹی کے خلاف ایسی بات کب ماننے لگے۔ اور مان بھی گئے تو مجھے تو سچا کہنا ناممکن ہوگا۔ یہ قصہ شروع سے ہی فضول تھا۔ اور اس تسلیم کے لئے اتنا کچھ کرنا۔ آخر بہتری تو اسی کی ہے نا۔ اپنا گھر جا بسائیگی۔ یہ خط اُن کو دکھانے فضول ہیں ان تلوں میں تیل نہیں اُن کے دل ہی تم ہو رہے ہیں نہیں آتے۔ بیٹی ہے اُن کی۔ بیاہیں یا نہ بیاہیں۔ مجھکو کیا۔ میری بلا سے۔ میں بھی کیسی پگلی ہوں کہ اس چھوکری کی بہتری کے لئے خود کو خوار کر رہی ہوں"

اُس نے زیور کی ڈبیا سے وہ کاغذ نکال لئے۔ دیا سلائی لی اور اُن کو آگ لگا دی "بھاڑ میں جائے تسلیم اور اُسے چاہنے والے" اور وہ چارپائی پر جا لیٹی۔ دو ایک کروٹیں لیں پھر تین مرتبہ درود شریف پڑھکر سینے پر پھونک ماری اور سو گئی۔

"شہزادہ، شہزادہ"

اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ شیخ صاحب اُس کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ مگر اُسے ایسا دکھائی دیا جیسے کوئی ڈراؤنی شکل اُسے دبا رہی ہو۔ وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔

"آج تمہیں کیا ہو گیا شہزادہ" شیخ صاحب نے کہا "تم ڈر گئی ہو۔ تم بیمار تو نہیں ــ"

"کچھ بھی نہیں" اُس نے شیخ صاحب کو پہچان کر کہا۔

"تمہیں کیا فکر ہے جو تم 'میری تسلیم، میری تسلیم' بڑبڑا رہی تھیں"

"میں! ــــ"

"تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ تم مجھے معاف کر دو شہزادہ۔ میں یہ سمجھا تھا کہ تمہیں تسلیم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میری بھول تھی"

"نہیں آپ ــــ میں ــــ"

"نہیں شہزادہ، میں تم سے شرمندہ ہوں۔ اب تم جانو اور تمہاری بیٹی تسلیم۔ آئندہ سے میں کسی بات میں دخل نہ دوں گا۔ جو جی چاہے کرو۔"

شیخ صاحب کے دل میں کئی ایک وہم پیدا ہو رہے تھے اور وہ بار بار شہزادہ کی نبض دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ اسے تھپک رہے تھے۔ خدا جانے اسے شل رہے تھے یا اپنی دنیا قائم رکھنے کے لے مضطرب تھے۔

شہزادہ پھر جاگ اٹھی۔ جیسے اسے کسی نے جگا دیا ہو۔ وہ کمرے میں اکیلی پڑی ہوئی تھی۔ گھڑی کی آواز دنیا بھر میں گونج رہی تھی۔ ڈیڑھ بجا تھا۔ گھڑی کو دیکھکر اس کے دل میں خیال اٹھنے لگا۔ "ہاں دو بجے وہ آئیں گے۔ میری تسلیم۔" اس نے تسلیم کی طرف دیکھکر کہا۔ اور مسکرا دی۔ اس نے باہر نگاہ دوڑائی۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ "اس اندھیرے میں کون گھر سے نکلتا ہے۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ محبت۔" وہ طنزاً مسکرا دی۔ "لوگ بھی کس قدر جلد آپے سے باہر ہو جاتے ہیں مجھے کیا پڑی ہے۔" اس نے کروٹ لیکر کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے اپنے ہاتھ پر ایک گرم سا دباؤ محسوس کیا۔ ٹھٹک گئی۔ ہاتھ جھٹک دیا۔ "توبہ میں بھی کیسی پاگل ہوں۔ یہاں کون آسکتا ہے۔"

گھڑی نے دو بجا دے۔ "لو دو بج گئے۔ وہ تو اپنے بستر میں سو رہا ہوگا، اور یہ رہی انکی تسلیم۔ میں تو خواہ مخواہ ڈر رہی ہوں۔"

"اس اندھیرے میں بھلا دو بجے کون نکلتا ہو۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ "تو یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔" بالکل اسکے دل میں کسی نے کہا "چاہے جاکر دیکھ لو۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ "سچ تو ہے۔ لیکن اگر دروازہ کھلا رہ گیا ہوا اور وہ بیٹھک میں آئے ہوں تو۔" "تم کوئی کھانڈ کا کھلونا ہو جو وہ تمہیں کھا جائیگا۔" کسی نے اسکے دل میں کہا۔

اس نے باہر دیکھا۔ برآمدے میں تسلیم اور اس کے ابا سو رہے تھے۔ مکان میں بالکل خاموشی تھی وہ اٹھ بیٹھی۔ باہر گئی۔ باورچی خانہ میں گئی۔ پھر واپس آئی۔ برآمدے سے گزری۔ مگر تسلیم اور اس کے ابا گہری نیند سو رہے تھے۔ "ایک نظر دیکھوں تو سہی۔" اس نے کہا۔ سامنے بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ دبے پاؤں بیٹھک میں چلی گئی۔

"تسلیم۔" اس نے قریب ہی اندھیرے میں سنا۔

وہ چیخ مارکر بھاگ اٹھی۔ مگر اس کا گلا آواز سے خالی تھا اور اسکے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اس کا تمام جسم کسی ہاتھ کی گرمی سے پگھل گیا۔ وہ شرم سے لال ہو رہی تھی۔ مگر وہ شرم اور پریشانی کسی نقارخانہ میں طوطی کی آواز تھے۔

"ممتاز مفتی"

رنگِ تغزل

گم انہیں میں ہوں ان کا دھیان کب نہیں آتا ... یاد انہیں بھلانے کا کوئی ڈھب نہیں آتا

ضبطِ گریہ کی تلقین ختم کر بس اے ہمدم ... بات بات پر رونا بے سبب نہیں آتا

کس پہ جان دیتا ہوں، راز ہی میں رہنے دے ... نام اس دل آرا کا تا بہ لب نہیں آتا

کیا کہوں اسے پہلے دیکھتا تھا کس ڈھب سے ... جو حسیں نظر مجھکو آہ اب نہیں آتا

جتنے بادہ خوار آئے طالبِ نشاط آئے ... ساقیا کوئی مجھ سا حق طلب نہیں آتا

اتنے غمگساروں سے شاد کیا ہو غمگیں ... غم بھی جس کے حصہ میں سب کا سب نہیں آتا

تیری کم نگاہی کا لطف کھینچ لاتا ہے ... سامنے ترے میں خود بے سبب نہیں آتا

رشکِ غیر اے منظور ایسے وقت آتا ہے
دوست کے تصور میں دوست جب نہیں آتا

علی منظور

انوکھی انجمن کی سرگرمیاں

انجمن انسداد بیرحمی برشوہراں وزوجگاں کے پچھلے جلسہ میں یہ طے پایا تھا کہ جس طرح بیویوں کیلئے "احکام عشرہ" نافذ کئے گئے ہیں اور انکو اِن احکام پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کی تاکید کی گئی ہے اسی طرح شوہروں کے لئے بھی احکام مُرتّب کئے جائیں اور اُن پر بھی ویسی ہی پابندیاں عائد کی جائیں۔ اس قرارداد کی تعمیل میں انجمن کی "مجلس عاملہ" نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ "دس احکام" شوہروں کے لئے تجویز کئے ہیں۔ انکو جلسہ عام میں پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ فکر حضرات و خواتین کی رائے کے لئے ملک کے طول و عرض میں گشت کرایا جائے، اس غرض سے ان احکام کے مسودے کو مشہور کثیر اشاعت رکھنے والے ہر زبان کے روزناموں، ہفتہ وار اور ماہناموں میں شائع کیا جا رہا ہے، اُمید کہ ہمارے بھائی اور بہنیں اپنی قیمتی رائے اور مُفید مشوروں سے انجمن کے سکریٹری کو مطلع فرمائینگے تاکہ جو جلسہ عام ہونے والا ہے اُس میں اِس مسودے کو پیش کر کے منظور کرایا جائے۔ اس جلسہ کے دعوت نامے پہلی دسمبر سے اراکین کی خدمت میں ارسال ہونا شروع ہوں گے۔

مجلس عاملہ کے مجوّزہ "احکام عشرہ" درج ذیل ہیں،۔

(۱) تیری بیوی اپنے والدین، اپنے متعلقین اور اپنی سہیلیوں سے جُدا ہو کر تجھ سے وابستہ ہو گئی ہے، اس کی دلجوئی اور دلداری کرنا تو اپنی شان شوہری کے منافی خیال نہ کر، اُس کی جائز خواہشات کو حتی الامکان پورا کر، تیرے سوا اب اس کا دُنیا میں کوئی نہیں ہے، تو اسکے لئے سب کچھ بن جا، اُس کو یہ محسوس نہ ہونے دے کہ وہ ایک اجنبی کے پالے پڑی ہے، اُس کے ساتھ اس طرح برتاؤ کر کہ وہ تیری "خادمہ" بنکر تیری خدمت کرنا اپنا فرض سمجھے، اسکو اپنی زندگی کا جزو بنالے اور اُس کے دل میں اس طرح سما جا کہ وہ پکار اُٹھے،۔

جدھر دیکھتی ہوں اُدھر تو ہی تو ہے!!

(۲) تیری بیوی کے کچھ عزیز و اقارب بھی ہیں اور کچھ سہیلیاں بھی، اُن سب کے ساتھ اس طرح برتاؤ کر کہ وہ تجھ کو اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھیں، اُس کے بزرگوں کا ادب و احترام اس طرح کر کہ گویا وہ تیرے بھی بزرگ ہیں اور کبھی موقع آئے تو اُن کی اسی طرح خدمت بھی کر، دُنیا میں ایک دوسرے کے کام آنا بڑی انسانیت ہے، یہ جوہر جس میں نہیں وہ "انسان" کہلانے کا مستحق نہیں، بغیر کسی ناطے رشتے کے جب یہ فرض انسان پر عائد کیا گیا ہے تو تیری بیوی کے عزیزوں اور سہیلیوں کا تجھ پر بڑا حق ہے۔

(۳) یہ واقعہ ہے کہ دُنیا میں انسان کی ہر توقع پوری نہیں ہوتی. اگر تیری بیوی تیری توقعات سے کچھ کم ہے تو کیا مضائقہ ہے، خدا کا شکر کر کہ دوسری سینکڑوں بیویوں سے تو بہتر ہے۔ انسان عیب سے خالی نہیں ہوتا، تیری بیوی بھی ایک انسان ہی ہے، فرشتہ نہیں، تو اس کو اگر "فرشتہ" دیکھنا چاہتا ہے تو تیری یہ اُمید کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اُسکی اچھائیوں اور بُرائیوں کو تول اور دیکھ کہ پلہ کس طرف جُھکتا ہے، اگر تو ٹھیک ٹھیک موازنہ کرے تو ممکن ہے اُس کی اچھائیاں بُرائیوں سے زیادہ ہوں۔

(۴) جس طرح تیری محبت بڑھتی گھٹتی رہتی ہے اسی طرح تیری بیوی کی محبت میں بھی تغیر ہو سکتا ہے، "محبت" محبت کو پیدا کرتی ہے، اگر تیرے دل میں محبت نہیں ہے تو تجھکو کیا حق ہے کہ بیوی سے محبت کی توقع رکھے، اس کے علاوہ بیاہ کے وقت کی "جذباتی" محبت اور اولاد ہونے کے بعد کی محبت میں بھی بہت کچھ فرق ہوتا ہے، عورت کو دُنیا میں سب سے زیادہ اولاد پیاری ہوتی ہے، اگر وہ تیری ہی اولاد پر اپنی محبت کا بڑا حصّہ اور تجھ پر کچھ کم صرف کرتی ہے تو تجھکو اُس سے گلہ نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ عورت کی فطرت کا تقاضہ ہے۔

(۵) تیری بیوی تیری شریک زندگی ہے، تیری ہر چیز اُس کی اور اُس کی ہر چیز تیری ہے، اگر وہ تیری آمدنی کا حساب دیکھنا چاہے تو کوئی ہرج نہیں، کبھی شوہر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ روپیہ خرچ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اگر وہ اپنی پوری آمدنی بیوی کے حوالے کر دیں تو اُن کے لئے نازیبا نہیں ہے۔ بیوی کو خوش کرنے اور اپنی دولت کی فوقیت جتانے کے لئے کبھی ناجائز طریقوں سے آمدنی پیدا کرنے کی کوشش نہ کر، حرام کا مال کبھی ہضم نہیں ہوتا، جیسے آتا ہے ویسے ہی نکل جاتا ہے اور اُس کا پاپ اگر تیرے آگے نہ آئے تو تیری اولاد کے آگے آئیگا۔ اگر تیری بیوی تجھکو شراب پینے، عیاشی کرنے اور جوا کھیلنے سے منع کرتی ہے تو اُس سے لڑنے جھگڑنے کے عوض اسکو اپنے لئے ایک فرشتہ رحمت سمجھ، اور

ٹھنڈے دل سے جب تو نشے میں ہو تب غور کر کہ وہ کہاں تک تیری زندگی کو دنیا میں سنوارنے کا سامان پیدا کر رہی ہے اور کس حد تک تیرے لئے ہی تباہ کن ہے ——!

(۶) اگر تیری بیوی اپنی اندھی محبّت کی وجہ سے بچوں کو بگاڑ رہی ہو اور اُن کو فضول خرچی سکھا رہی ہے تو اُس کو اس طرح صلاحیت سے سمجھا کہ اس کو اپنی غلطیاں صاف دکھائی دیں، بچّوں کے سامنے کبھی اسکو ڈانٹ ڈپٹ نہ کر ورنہ اُن کی نظروں میں اُس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہے گی، مثل مشہور ہے "ماں کے قدموں تلے جنّت ہے" اگر تیرے برتاؤ کی وجہ تیرے بچے ماں کو ذلیل سمجھنے لگیں تو اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی کہ تُو نے اپنے بچوں کو ماں کے قدموں سے ہٹا کر جہنّم کا راستہ دکھا دیا اور اُن کی عاقبت بگاڑ دی، جو بچے آج ماں کی عزت نہیں کرتے وہ کل تیری بھی عزت نہیں کرینگے اور ایک دن گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے۔

(۷) تُو کبھی اپنی بیوی سے بدگمان نہ ہو، جب تک شوہر کا بیوی پر اور بیوی کا شوہر پر بھروسہ نہ ہو دونوں کی زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی، بدگمانیاں اقسام کے جھگڑے کھڑے کرنے کے علاوہ دلوں میں کدورتیں پیدا کر دیتی ہیں، اچھے دلوں میں بُرائی آجاتی ہے، میاں بیوی کا آرام و چین غارت ہو جاتا ہے، بات بات پر خانہ جنگیاں ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اگر تیری بیوی تیرے کسی احمق یا بدباطن دوست سے ملنا نہیں چاہتی ہے تو اس کو مجبور نہ کر کہ اُس سے ملے اس قسم کے دوستوں سے بیوی کو بے تکلف کرنا بعض دفعہ اقسام کی غلط فہمیوں کا سبب ہو۔

(۸) کسی کو دولت کی خاطر اپنی بیوی نہ بنا۔ جو لوگ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے بیاہ کرتے ہیں وہ کبھی خوش نہیں رہتے، اُنہیں اکثر بیویوں کے طعنے سننے پڑتے ہیں، دولت سے زیادہ ذاتی جوہر اور فطری خوبیوں کو تلاش کر، دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے اگر تو آج کسی سے محض روپیہ کی خاطر بیاہ کرے اور اُس کی بُرائیوں پر نظر نہ کرے تو کل تیرے لئے وہ وبال ہو جائے گی، اپنی زبان کے نشتروں اور طعنہ کی برچھیوں سے تیرے دل و جگر کو ایسا چھلنی کر ڈالے گی کہ تیرے لئے جینا دوبھر ہو جائے گا، چونکہ تو نے اُس کا بہت سارا روپیہ اپنے پر صرف کیا ہے اس لئے اگر تجھ میں کچھ غیرت ہے، تو تجھ کو اپنی بیوی کی بُری بھلی سُننی پڑیگی اور اس کا غلام بنا رہنا ہوگا۔

(۹) یہ ضروری نہیں کہ ہر معاملے میں تیری بیوی تیری ہم خیال ہو، اسی طرح مذہبی اور دُنیوی معاملات میں بھی تجھ میں اور تیری بیوی میں اختلاف ہو سکتا ہے، تجھ کو چاہیئے کہ نہایت صلاحیت اور سنجیدگی سے ایسے اختلاف کو بتدریج مٹانے کی کوشش کرے، تو اگر یہ چاہے کہ ایک دم میں تیری بیوی تیری ہی ہم خیال ہو جائے تو یہ بالکل ناممکن ہے۔ عورت عقل ناقص ہوتی ہے، اس لئے کوئی اچھی بات اُس کی سمجھ میں فوراً نہیں آسکتی، عورت کی تربیت بڑا مشکل کام ہے، اگر یہ ہنر تجھ میں آجائے تو بیڑا پار ہے۔ تیرا گھر جنّت کا نمونہ ہو سکتا ہے، جہاں چین ہی چین اور آرام ہی آرام کا دور دورہ ہوگا، اگر کبھی مصیبت کے بادل بھی چھا جائیں تو دونوں کی محبّت اور ایک دلی لگاؤ کی سُنہری چین کی کرنوں سے روشن کر سکتی ہیں۔

(۱۰) جہاں تُو اپنی بیوی سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ تیرے جذبات کو ٹھیس نہ لگائے وہاں تیرا بھی فرض ہے کہ بیوی کے احساسات کو مجروح نہ ہونے دے، عورت کا دل بہت نازک ہوتا ہے، اُس کے آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے دے، اگر یہ کبھی ٹوٹ جائے تو اُس کے جوڑنے میں بڑی دشواری ہوگی۔ ٹوٹے ہوئے دل بڑی مشکل سے جڑتے ہیں اور جڑنے کے بعد بھی بال باقی رہ جاتا ہے۔ اگر تو اپنی بیوی کے احساسات کو سمجھکر تھوڑی بہت رواداری سے عمل کرے تو بڑی خانہ جنگیوں سے تجھ کو نجات حاصل ہو سکے۔ اگر تیری بیوی پاگل ہے تو دوسری سمجھدار بیویوں کو دیکھکر رشک نہ کر، کوشش کر کہ تیری بیوی بھی ویسی ہی ہو جائے اور اُس میں بھی وہی خوبیاں پیدا ہوں، مثل مشہور ہے:۔

ع۔ "کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا"

انجمن کے پچھلے جلسہ میں یہ طے ہوا تھا کہ مظلوم شوہروں کی طرح مظلوم بیویوں کو بھی انجمن میں شرکت کی اجازت دی جائے اور وہ بھی اپنی مظلومیت کے واقعات لکھکر خواہش کر سکتی ہیں کہ اُنہیں منظر عام پر لایا جائے جب سے مظلوم بیویوں کو یہ اجازت دی گئی ہے دفتر میں سینکڑوں شرکت کی درخواستیں اور بیسیوں بے رحم شوہروں کے ظلم و ستم کی داستانیں وصول ہو چکی ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے مظلوم بیویوں کے چند خط اُن کی اجازت کے بعد ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، یہ جملہ خطوط عدالت ثالثی میں پیش کر دئے گئے ہیں جہاں سے بے رحم شوہروں کے نام نوٹس جاری ہوں گے۔

ایک بدمزاج شوہر کی قابل رحم بیوی لکھتی ہیں:۔ میرے شوہر کا مزاج اس قدر تیز ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو کر مجھے طلاق دینے آمادہ ہو جاتے ہیں، طلاق دینا تو اُن کے پاس بچوں کا

کھیل ہے اور مجھکو تو وہ ایک گڑیا سمجھتے ہیں، جب جی چاہا اپنا جی بہلایا اور جب طبیعت اُکتا گئی نکال باہر کیا۔ جب غصّہ آتا ہے (اور آتا کب نہیں ہے) اس قدر چیختے اور چلاتے ہیں کہ محلے والے سمجھتے ہیں ہمارے گھر میں کوئی غیر معمولی حادثہ ہوگیا ہے۔ ایک دفعہ کسی نوکر پر بگڑکر ایسا شور وغل مچایا کہ ہماری پڑوسن کے میاں نے آگ بجھانے کے انجن کو ٹیلیفون کر دیا تھا۔ اِس محلہ میں ہمارے رہنے سے محلہ والوں کا ناک میں دَم آگیا ہے، آدھی رات تک ہمارے مکان میں بوم مچی رہتی ہے، کیونکہ نصیب دشمناں انہیں آدھی رات سے پہلے نیند نہیں آتی، کبھی نوکروں پر گالیوں کی بوچھاڑ ہورہی ہے، کبھی کسی بچّے کی مرمّت ہورہی ہے اور کبھی یہ ناچیز ہدفِ ملامت بن رہی ہے، کیا بتاؤں کس عذاب میں جان زار ہے! یہ بھی کوئی زندگی ہے؟۔ کوئی زندگی ہے یہ زندگی نہ ہنسی رہی نہ خوشی رہی!

تعطیل کے دن تو صبح سے شام تک یہی ہنگامہ برپا رہتا ہے، چھٹّی کے روز ہمارے اکثر پڑوسی بیوی بچوں کو لئے "پکنک" کرنے باغوں کو جاتے ہیں، مگر یہ بدنصیب، جسے موت بھی اس گھر سے باہر نہیں لے جاتی' کنجِ قفس میں پر تول کر رہ جاتی ہے!۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیّاد کی ہے

ایک سینما کے شوقین میاں کی بیوی لکھتی ہیں — میرے صاحب کو سینما دیکھنے کا مرض ہے، ہفتہ میں سات دن سینما جاتے ہیں۔ کبھی یہ جنون اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی دن دو دو دفعہ یعنی پہلے اور دوسرے شو میں بھی آپ رونق افروز رہتے ہیں، تعطیل کے دن تو "میٹینی" اور پہلے شو میں جانا لازمی ہے، جو فلم زیادہ پسند آتی ہے اُس کو آپ ایک ہی شام میں دو مرتبہ ملاحظہ فرماتے ہیں، یعنی پہلے اور دوسرے شو میں، جس دن ایسا ہوتا ہے رات کا کھانا آپ کسی ہوٹل میں نوش فرماتے ہیں اور یہاں میری اور بچوں کی آنتیں "قُل ہو اللہ" پڑھا کرتی ہیں، کیونکہ آپ کا "حکم" ہے کہ جب تک آپ نہ آئیں ہم سب بھوکے رہیں مگر آپکے اِس حکم کی دس بجے تک میں تعمیل کرتی ہوں، اس وقت تک بھی بچوں کو بھوکا رکھنا ان پر کس قدر ظلم کرنا ہے۔ مہینہ کے پہلے ہفتہ میں جبکہ آپکی جیب گرم رہتی ہے ایک دوستوں کو بھی سینما دیکھنے اور ہوٹل میں کھانیکی دعوت دی جاتی ہے غرضکہ مہینہ سو سو اسو روپے سینما کی بھینٹ ہوجاتے ہیں۔

ہمارے صاحب کا روزانہ پروگرام یہ ہے۔ صبح ساڑھے نو بجے بیدار ہوتے ہیں، ضروریات سے فارغ ہوکر ساڑھے دس بجے ناشتہ کرتے ہیں اور کوئی بارہ بجے دفتر تشریف لے جاتے ہیں، چونکہ آپ لباس بڑی نفاست اور نزاکت سے پہنتے ہیں اس لئے کم ازکم ڈیڑھ گھنٹہ لباس کی نذر ہوجاتا ہے چار بجے گھر آتے ہیں، مُنہ ہاتھ دھوکر چائے نوش کرنے کے بعد ٹینس کا بلّا لئے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، پھر آپ کا دیدار کبھی دس بجے اور کبھی آدھی رات کے بعد ہوتا ہے۔ تعطیل کے دن محفل مشاعرہ گرم ہوتی ہے۔ آپ نیز کچھ تھوڑے شاعر بھی ہیں۔ آپکے کلام میں خوبی یہ ہے کہ پوری غزل کی ایک ہی "بحر" نہیں ہوتی، کئی بحریں آپ کی غزل میں داخل ہوجاتی ہیں، یہ آپکے شاعر دوستوں کی رائے ہے، مجھکو نہ شاعری سے تعلق نہ بحر سے واسطہ ہر مشاعرہ میں آپکے کلام کے اس "حسن" پر بڑی ردّ و قدح ہوتی ہے، اسئے اس وقت یہ بات یاد آگئی۔ مشاعرہ کے دن عجیب آفت آتی ہے۔ آٹھ دس ناکارے جمع ہوجاتے ہیں، دوپہر کا کھانا مجھ کو تیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہمارے باورچی کا پکایا ہوا شاعروں کو پسند نہیں آتا۔ بابر سے آرڈر پہ آرڈر آتا ہے کہ مچھلی تلی جائے، دم کے کباب لگائے جائیں، مُرغ پلاؤ تیار ہو، مٹن چاپ پکائے جائیں، مُرغ مسلم دم دیا جائے، بادام کی جالیاں بنیں، گاجر کا حلوہ پکے، غرضکہ فرمائشوں کی ڈاک لگ جاتی ہے اور صبح سے شام تک ایک دھما چوکڑی رہتی ہے، شام کے چھ بجتے ہی شاعروں کا یہ قافلہ سینما گھر کی طرف کوچ کرتا ہے، اس طرح دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے ہوجاتے ہیں مگر مجھ کو اُن سے جی بھر کر باتیں تک کرنیکا موقع نہیں ملتا۔ بس یہی زندگی ہماری ہے!

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے!!"

ایک "جُواری" کی بیوی اپنی کہانی یوں سُناتی ہیں — سُنتی ہوں کہ "ان" کو بچپن سے جُوا کھیلنے کی عادت ہے، انٹرنس پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے انہیں کلکتہ بھیجا گیا تھا۔ کلکتہ نے تو انہیں پکا جواری بنادیا گھوڑ دوڑ میں دوسروں کو جیتتے دیکھکر انہیں بھی قسمت آزمانے کا شوق ہوا۔ کھاتے پیتے گھر کے تھے، سو روپے ماہانہ جیب خرچ کے لئے ملا کرتے تھے۔ گھوڑ دوڑ کے موسم میں یہ سو روپے منگوا کر واسے نیارے ہوجاتے تھے، اس منحوس شوق نے صرف روپیہ ہی تباہ نہیں کیا، ایمان اور اخلاق بھی اس کے ہاتھوں برباد ہوگئے۔ جھوٹ بولنا، دھوکا دینا، دغا کرنا، اقسام کی چالبازیوں سے روپیہ وصول کرنا! یہ ہیں وہ ہنر جن پر اُنہوں نے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں!! اِن ڈگریوں کے ساتھ گرتے پڑتے بی۔ اے۔ کی ڈگری بھی مل گئی۔ خدا خدا کرکے اُدھر آپنے بی۔ اے۔ کا امتحان

پاس کیا اور ادھر مجھ نصیبوں جلی کا ناس ہوا!! بڑی آرزوؤں کے ساتھ اباجان نے اس بی۔ اے۔ پاس جواری سے میرا بیاہ کیا، بیاہ کے بعد دو تین مہینے بھی خیر سے گزرے نہ تھے کہ ایک دن آپ یکایک رفوچکر ہوگئے، دوچار دن کے بعد آپکے ایک دوست سے معلوم ہوا کہ آپ پر گھوڑ دوڑ کا جن سوار ہوگیا تھا، وہ کشاں کشاں کلکتہ لے گیا ہے، تیسرے روز کلکتہ سے تار آیا کہ پانچسو روپے کی شدید ضرورت ہے فوراً تار کے ذریعے بھیجے جائیں اگر یہ روپے نہ ملیں تو خدانخواستہ آپ خودکشی کرلیں گے، یہ تار پڑھکر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، ایک جواری کے گھر میں اتنی رقم کہاں! اپنے زیور پر قرض لیکر بھیجدی۔ پندرھویں دن کلکتہ سے خالی ہاتھ شاندار مراجعت ہوئی!! وہ بھی بڑی منحوس گھڑی تھی کہ میں نے پہلی دفعہ اپنے زیور پر قرض لیا تھا! اس کے بعد آہستہ آہستہ میرے کل زیور کا صفایا ہوگیا، زیور کے بعد برتن اور فرنیچر کی باری آئی، جب یہ بھی سب ختم ہوگیا تو میری بنارسی ساریاں اور بلوز بھی جوئے کی نذر ہوگئے، قیمتی کپڑوں کے بعد معمولی گھر میں استعمال کرنے کا لباس بھی جوئے کی زد سے نہ بچ سکا، یہ ساری خانہ بربادی کے بعد بھی میرے جواری کو عقل نہیں آئی، اپنی تھوڑی بہت جو کچھ بھی آمدنی ہے سب کی سب جوئے کی بھینٹ ہوجاتی ہے، جوئے بھی بہ فضلِ شیطان آپ کو اقسام کے آتے ہیں۔ کبھی پانی اور روئی کے سٹہ پر ہار جیت ہورہی ہے، کبھی گھوڑ دوڑ میں دیوالہ نکل رہا ہے، کبھی پربل، پوکر، برج اور بلیرڈ پر بازی لگ رہی ہے، کبھی شطرنج پر شرط ہو رہی ہے اور گھر میں کڑے فاقے گزر رہے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ کسی دن مجھ کو بھی کسی جوئے میں ہار جائیں۔ میری یہ خانہ بربادی ابا جان سے دیکھی نہ گئی مجھکو اپنے گھر لے آئے ہیں، میرے ساتھ برخوردار داماد بھی تشریف لائے ہیں، داماد کے ہمراہ قرض خواہوں کی ڈگریاں بھی دوڑے تیسرے روز آرہی ہیں اور اباجان بدنامی سے ڈرکر ان ڈگریوں کی ذمہ داری اپنے سر لے رہے ہیں۔ کیا بتاؤں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ اباجان نے سینکڑوں دفعہ داماد صاحب کو نصیحت کی کہ "بیٹا جوئے میں کبھی کسی نے نہیں کمایا کیوں اس کے پیچھے دیوانے ہورہے ہو" مگر داماد صاحب کا ایک ہی جواب ہے، فرماتے ہیں کہ "کسی دن تو قسمت مہربان ہوگی، اب تک جو گیا ہے ایک دن سب مل جائیگا" جس کی یہ سمجھ ہو اور جس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہوں اس کو کس طرح سمجھایا جائے! قسمت پھوٹ گئی تھی جو ایسے جواری کے پلے پڑی، اباجان بھی آخر کب تک ساتھ دیں گے اور کب تک ہمارے قرضے چکاتے رہیں گے!! موت بہتر ہے ایسے جینے سے!!! خودکشی کرنا حرام نہ ہوتا تو اب تک میری ہڈیاں بھی قبر میں باقی نہ رہتیں ــــــ!

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہوا!

جہاں نور

غزل

لے تو اکہ شرارت سے نہیں پاؤں زمین پر
تھوڑی سی عنایت بھی کسی خاک نشیں پر

ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر
مجبور نہ کر مجھکو محبت کے یقیں پر

حالاتِ محبت سے کوئی بحث نہیں ہے
لکھا ہے ترا نام مری لوحِ جبیں پر

ہاں ہم نے بھی کھائے ہیں دلِ زار پہ چرکے
ہم قتل بھی ہوجائیں تو الزام ہمیں پر

یہ بھیگی ہوئی رات یہ ہیجانِ تصور
چاہوں تو ستارے بھی اتر آئیں زمیں پر

حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ
پڑجائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر

لہجہ کی درشتی لب نازک پہ گراں ہے
ادراکِ سخن صرف نہ کر لفظِ "نہیں" پر

میں اس کو سنانے کے لئے لکھتا ہوں غزلیں
حاوی ہے تغزل مرا جذباتِ حسیں پر

"وہ میرے لئے موردِ الزامِ محبت"
آتا ہے ترس شاد مجھے حسنِ حزیں پر

شاد عارفی

کفّارہ

ریل سے اُتر کر اگر شاہ گڈھ اسٹیشن سے ٹھیک شمال کی طرف روانہ ہو تو پانچ گاؤں چھوڑ کر آخر گاؤں سکھ داس پور آتا ہے۔ اس کے بعد دو میل سے بھی زیادہ چوڑے میدان کو پار کر کے نگاہیں ایک سبزی مائل سیاہ دیوار پر رکتی ہیں۔ جو کہ دائیں ہاتھ پر سارہ دہ نہر کی اونچی پٹری سے شروع ہو کر بائیں طرف دھندلی پڑتے پڑتے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ دراصل یہ دیوار نہیں ہے بلکہ ترائی کے جنگل کا وہ حصہ ہے جسے مصطفےٰ آباد رینج کہتے ہیں۔ چونکہ اس جنگل میں چوپاؤں کی کثرت ہے، اس لئے اس میدان میں سوائے گیہوں کی ایک فصل کے اور کوئی کاشت نہیں ہوتی۔ وہ بھی اس طرح پر کہ کنارے کے تمام گاؤوں کے لوگ متفق ہو کر جنگل کے کنارے کنارے میلوں میل تک کانٹے اور درختوں کی شاخوں سے ایک باڑھ کھڑی کر دیتے ہیں، جس سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ورنہ دراصل یہ دس بارہ میل کا لمبا اور ڈھائی میل کا چوڑا گیہوں کا ایک تختہ خود بچاؤ ہے۔ اتنی بڑی کھیتی میں نقصان ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔ رات کے آٹھ بجتے ہی جگہ جگہ پر سانبھر[1] اور چیتل[2] منہ اونچا کر کے اپنے پھیلے ہوئے شاندار سینگ پیٹھ پر ملا کر تھوتنے بھر راستہ ڈھونڈ لینے کے بعد بے تکلف اندر آ جاتے ہیں۔ ان کے پھیلے ہوئے سینگ کانٹے دار لکڑیوں کی دیوار کو چیر کر اُن کے جسم سے زیادہ چوڑا راستہ بنا دیتے ہیں، رات بھر چرنے کے بعد دن پھوٹنے کی ہلکی روشنی میں یہ جانور پھر اسی طرح واپس نکل کر جنگل میں گھس جاتے ہیں۔

ہولی کو جلے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ رات کے دو بجے ہیں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ کانٹوں کی باڑھ سے کچھ دور گھٹنوں تک اونچے کھیت میں چیتلیں[3] کھڑی ہوئی اطمینان سے آدھے سوکھے گیہوں کے پتے ایک ایک چُن کے بین رہی ہیں۔ کھیت کے کنارے پر ایک جگہ فٹ دو فٹ کا گیہوں کا ایک ٹکڑا، جیسے کہ اکثر رہ جاتے ہیں اب بھی سبز ہے۔ اس پر تین اور چیتلیں جھپٹی ہوئی ہیں۔ ان کے برابر ہی کھیت سے باہر شاندار چھاتک[4] موٹی گردن اٹھائے ہوئے بارہ سینگ تاج کی طرح لگائے خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا ہے، ہاتھ پیر، سر یا آنکھیں کسی کو بھی جنبش نہیں ہے۔ صرف کان وقتاً فوقتاً اِدھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر پھر جاتے ہیں۔ آنکھیں اس قدر تیز نہیں ہیں کہ برابر گھنے جنگل کی تاریکیوں میں پتہ چلا سکے۔ ہوا بھی مخالف ہے۔ کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے۔ اِس لئے بو بھی نہیں لے سکتا ہے۔ کانوں ہی سے کام لے رہا ہے۔ دور گھنے میں تھوڑی دیر بعد ہلکی کھس کھس ہوتی ہے۔ دائیں ہاتھ پر کسی جگہ سے بہت خفیف کھٹکھٹانے کی آواز آ رہی ہے۔ اِن دونوں آوازوں کی اُسے مطلق پروا نہیں ہے۔ یہ صاف پہچان گیا ہے کہ یہ آواز نیولی کے بچوں کے کھیلنے کی ہے اور دوسری جنگل کی نیلی کُٹ کُٹ بڑھئی کے درخت کی چھال میں سے کیڑے چُننے کی ہے۔ چھاتک اس فکر میں ہے کہ ابھی تھوڑی دیر ہوئی، سال کے درختوں میں وہ جو زمین سے ملی لمبی سی چیز کے ہلنے کا شبہ سا ہوا تھا، دراصل وہ شیر ہی تھا یا کچھ اور؟ صرف ایک خفیف سی سوکھے پتے کی پیر کے نیچے چرچراہٹ کی آواز اسکو سارا ماجرا بتا دینے کیلئے کافی ہے۔

لیکن کیا مجال کہ شیر یا شیرنی کا پیر بے جا پڑ جائے۔ حالانکہ سال بنی کی تمام زمین پت جھڑ کے سوکھے پتوں سے بچھی پڑی ہے۔ لیکن یہ دونوں بغیر ایک پتے کو بھی چرچرائے یا کھس کھسائے یہاں آ کر دیمک کی بنائی ہوئی چھوٹی سی دیوار کی آڑ میں اطمینان سے چھاتک کی واپسی کے انتظار میں بیٹھ گئے ہیں۔ چیتلوں اور ان کے درمیان ہٹھ[5] کے چوڑے پتوں اور مرور پھلی کی لمبی شاخوں سے اس قدر آڑ ہو گئی کہ نظر ان دونوں کو بھی کچھ نہیں آ رہا ہے۔ پھر بھی دونوں اطمینان سے دبکے بیٹھے ہیں۔ تیز ہوا میں جو کھیت سے جنگل کی طرف چل رہی ہے چیتلوں کی بو اور اُن کے ہلنے جلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

دفعتاً شیرنی کو ہوا میں ایک نئی بو معلوم ہوتی ہے اگھبرا کر شیر کی طرف سر گھماتی ہے۔ شیر نے کوئی نئی بو محسوس نہیں کی۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہتا ہے۔ کہ اتنے میں پھر تیز ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ اب شیر کو بھی یہ نئی بو

---

[1] سانبھر سب سے بڑے قسم کا بارہ سنگہ ہوتا ہے۔ مگر سینگ آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ چار شاخیں ایک طرف اور چار دوسری طرف جسم کا رنگ مٹیالہ ہوتا ہے۔ [2] سانبھر سے چھوٹا ہوتا ہے مگر کے بارہ شاخیں ہوتی ہیں۔ کھتھی بدن پر سیاہ حاشیہ سے گھرے ہوئے سفید گل ہوتے ہیں۔ [3] مادیں چیتلیں کہلاتی ہیں اور اُنکا نر چھاتک۔ [4] جنگلی پودا، پتے بڑے بڑے ہیں۔ پودا فٹ ڈیڑھ فٹ اونچا ہوتا ہے۔ [5] جنگلی سَن۔ یہ جھاڑیوں کی طرح اگا ہوتا ہے۔ چار سے پانچ فٹ تک اونچا ہوتا ہے۔

معلوم ہوتی ہے۔ شیر جھنجھلا کر دونوں کان آگے جھکاتا ہے۔ لیکن شیرنی پریشان ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہوا کا ایک جھونکا پھر آتا ہے۔ اب شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، دونوں اُٹھکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر آہستہ سے گھوم کر شمال مشرق کی طرف چل دیتے ہیں۔

باہر کھیت میں جھانک اب بھی اسی طرح کھڑا ہے۔ سبز گچھے پر اب بجائے تین کے پانچ چیتلیں پھدک رہی ہیں باقی چار ان ہی سوکھے گیہوؤں میں سے پتے کھا رہی ہیں۔ چرتے چرتے ان چاروں کو بھی بو معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے چاروں سر اونچا کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک جھانک کی طرف دیکھتی ہے۔ جھانک جنگل کی طرف کان لگائے اسی طرح بے خبر کھڑا تھا۔ ایک چیتل کو دور سے کوئی اس پور کی سمت دھندلی سی ہلتی ہوئی کوئی چیز معلوم ہوتی ہے چیتل فوراً "کو" کی لمبی آواز لگاتی ہے سنسان رات میں جنگل کے کنارے سے آواز گونجتی ہے۔ باقی تمام چیتلیں بھی چونک کر سر اونچے کر کے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ جھانک بھی گھوم پڑتا ہے۔ یہ تمام جانور پانچ منٹ تک پتھر کی مورتیوں کی طرح بے حس کھڑے رہتے ہیں۔ بو برابر آ رہی ہے۔ لیکن دور ہلنے والی چیز رک گئی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد وہ چیز پھر ہلتی ہے۔ سب چیتل ایک ساتھ جنگل کی طرف جھپٹتے ہیں۔ کانٹوں کی باڑھ جا بجا ٹوٹی ہوئی ہے۔ چیتل ان ہی میں سے ایک راستہ سے یکے بعد دیگرے ایک قلانچیں بھرتے نکلتے ہیں۔ سب سے آخر میں جھانک بھی اس قطار میں شامل ہو جاتا ہے، جو کہ چیتلوں نے بنالی ہے۔ جنگل میں گھستے ہی چیتل پھر دو دفعہ "کو۔ کو" کی آواز لگاتی ہے اور سب چیتلیں جنگل میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سامنے کچھ دور سوکھے گیہوؤں میں ایک پریشان انسان کھڑا ہے۔

پھانسی کے تختہ پر بے بسی اور بیکسی کی موت سے بچنے کے واسطے بہاری گاؤوں سے بچتا ہوا شاہ گڈھ اسٹیشن سے دیوانہ وار اس جنگل کی طرف آیا تھا۔ اس کے خیال میں گھنے سرسبز جنگل پھولوں پھلوں سے لدے، چھوٹے چھوٹے چشموں سے آراستہ دامن پھیلائے اس کو اپنی گود میں چھپا لینے کے واسطے تیار کھڑے تھے۔ لیکن جنگل کے کنارے آتے ہی اس پر اس سمت سے بھی خوف طاری ہو گیا۔ اس کی پشت پر گاؤں کی ٹمٹماتی روشنیاں ملک الموت کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سامنے وہ جنگل جس کو کہ یہ زندگی کا گہوارہ سمجھ کر جو بیا ہوا تھا قبر کی طرح تاریک اور بھیانک معلوم ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے اس نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ نہ ناک سے کوئی بو محسوس کی تھی۔ صرف چیتل کی کوکیں سنی تھیں اور

ان ہی تین آوازوں نے اس کی خیالی جنت کو ہیبت ناک گھنا بن بنا دیا تھا۔ بہاری دیہات کا رہنے والا ضرور تھا۔ بھوت پریت سے ڈرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لیکن جنگل سے ناواقف تھا اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کو پھر آگے پیچھے چاروں طرف موت نظر آنے لگی اس کا سر چکرانے لگا! وہ سر پکڑ کر وہیں کھیت میں بیٹھ گیا اپنی بے کسی پر اس کی آنکھوں سے خود بخود آنسو بہنے لگے۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک ایسا ہیجان تھا کہ وہ کسی ایک بات کو لگاتار سوچ بھی نہ سکتا تھا کبھی وہ اپنی بدقسمتی کا خیال کرتا تھا۔ کبھی بیکس بڈھے باپ اور ماں کی حالت سوچتا تھا۔ کبھی اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا اور کبھی آئندہ زندگی بسر کرنے کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر پھر کے ہر خیال میں کسی نہ کسی طرح ایک تصویر آجاتی تھی۔ "چاندنی رات میں ایک کھیت کی مینڈ ہے اس پر ایک آدمی خون میں نہایا اوندھا پڑا ہے۔ اس کے پیروں کی طرف وہ خود گنڈاسہ لئے کھڑا ہے۔" اس تصویر سے بہاری لرز جاتا تھا کانپ اُٹھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نہ سوچے مگر بار بار یہی خیال آجاتا تھا وہ بار بار کہتا تھا۔ "بلدیو سنگھ کا قاتل میں ہوں تو سہی لیکن ہے رام یہ کیسے ہوا؟ ... کیسے ہوا؟ .... ہاں میں نے مارا .... دو گنڈاسے سر پر ہلکے سے مارے تھے۔ اور تیسرا اتنی زور سے مارا جو بیچ میں گھس گیا۔ اس ہی سے تو گر پڑا۔ بیچ کا زخم؟ .... نہیں بیچ والے سے کیا ہوا ..... وہ تو پہلا ہی گنڈاسہ سر میں گھس گیا۔ ..... میں نے مارا؟ ..... یہ کیا ہو گیا تھا؟ ..... ہے رام یہ کیا ہو گیا ..... رے رام کیا ہو گیا؟ .... اب کچھ ہو سکتا ہے؟ ... اے بھگوان اب وہ زندہ ہو سکتا ہے؟ .... ناہیں! ناہیں! ۔۔۔ اے بھگوان معافی مل سکتی ہے؟ ... ناہیں! ناہیں! ....."

اسی طرح سوچتے سوچتے ٹھنڈی ہوا نے تھکے ہوئے دماغ میں نیند کے ہلکے ہلکے پردوں میں ملا کر ایک عجیب تصویر پیش کر دیا۔ کیا دیکھتا ہے، بلدیو سنگھ کا باپ اس کے سامنے لڑکے کو لئے کھڑا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے "کنور بھیا یہ ہے بہاری تمرے سامنے! اب پھر کر دیو۔ اچھے ہوئی جائی ہو" بلدیو سنگھ کے منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ وہ آنکھیں بند کئے سامنے کھڑا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی آنکھیں کھولکر اسے دیکھ لیتا ہے۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ باپ دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑے کھڑا ہے۔ اور برابر کہہ رہا ہے "بس کنور اب جان دیو تا پھ کر دیو اچھے ہوئی جاؤ" پھر بڈھا اس کی طرف دیکھکر غصہ سے کہتا ہے۔ "بہاری تم بھی ماپھی مانگ لیو بیٹے کا دیکھ رہے ہو۔ مانگو ماپھی" بہاری ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہے۔ بلدیو سنگھ سر ہلا کر باپ سے کہتا ہے "معاف نہیں

کروںگا۔" اب بہاری اس کے پیروں پر گر پڑتا ہے۔ اس پر وہ کہتا ہے "میں نا معاف کروںگا۔ بلاؤ سپاہیوں کو۔ پکڑو! پکڑو! دوڑو! اسے پکڑ لو" بہاری کی آنکھ کُھل جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیسیوں آدمی دوڑے چلے آتے ہیں۔ وہ چونک کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ صبح کی سُہانی روشنی ایسے بھیانک معلوم ہوئی۔ سُنہرا زرد گیہوں کا کھیت موت کے ہاتھوں مٹایا ہوا نظارہ معلوم ہوا۔ کالا ہرا جنگل کا کنارہ۔ ایک قلعہ معلوم ہوا۔ جس میں اس کو موت سے پناہ مل سکتی تھی۔ یہ فوراً اُس کی طرف لپکا۔ لیکن چار قدم چلنے کے بعد اُس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ کوئی تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ درختوں میں سے جھانکتے ہوئے سکھ داس پور کے مکانوں پر اس کی نگاہ پڑی۔ ہر مکان اسکو مشتبہ نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ بہاری جنگل کی طرف بھاگا۔ کانٹوں دار باڑھ کو پھاندتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا

جس وقت دوبارہ مُرغے نے اذان دی تو بہاری نے آنکھیں کھولدیں۔ صبح کا ہلکا نور پھیل رہا تھا۔ قریب ہی کسی درخت پر کوئی مور رات بھر کے سمٹے ہوئے پر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے سر کی طرف اوپر کی کسی ڈالی پر ایک چھوٹی چڑیا "چیں چوں۔ چیں چوں" چہک رہی تھی۔ لحہ بہ لحہ روشنی کے ساتھ چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں بڑھ رہی تھیں۔ بہاری نے رات بھر کے سکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو جنبش دی اور محسوس کیا کہ جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہے، وہ "اے بھگوان کرپا کر بھگوان" کہکر بیٹھ گیا۔ اور اطمینان سے وہ رسّی کھولی جس سے کہ اس نے اپنا سینہ اور کمر برگد کے دوشاخے سے باندھ رکھا تھا۔ تاکہ وہ سوتے میں درخت سے نیچے نہ گر پڑے۔ بہاری کو آج جنگل میں آئے آٹھ دن ہو چکے ہیں، یہیں اُس نے مزور کھلی کی چھال سے یہ رسّی بٹ لی ہے۔ رات کو کھیت میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر ہولوں کی طرح بھون کر کھا لیتا ہے۔ اور پھر جنگل کے کنارے ہی کسی موٹے درخت پر چڑھ کر اُس کی ڈالیوں میں اپنے کو باندھ کر سو رہتا ہے۔

دن نکلتے ہی پھر اندر گھنے میں گھُس کر جنگل سے گھری ہوئی چاندر میں چُھپ جاتا ہے۔ جنگل کا جو تصور اُس نے باندھا تھا یہاں آکر اس میں سے کچھ نہ پایا۔ سال کا جنگل دراصل ایک میدان کی طرح تھا۔ جس میں فٹ سوا فٹ اونچے بھٹار اور کرمایری کے چھوٹے پودوں میں لاکھوں سال کے درختوں کے سیدھے اور ننگے بلا شاخوں کے تنے کھڑے ہوئے پچاس ساٹھ فٹ کے اوپر چھتری نما چند ڈالیوں سے ایک سبز چھت تھامے ہوئے تھے رات کو ان درختوں پر چڑھ رہنا اور دن میں ان کے نیچے زمین پر پھرنا ناگز تھا۔ آٹھ نو بجتے ہی جنگل میں گائے اور بھینسوں کے گلّے اور چرواہے آجاتے تھے۔ مزروعہ زمین کی طرف جنگل کے کنارے البتہ نیچے اور پھیلی ہوئی ڈالیوں کے درخت بھی تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے مجموعے سے بنی ہوئی چھوٹی بڑی بھجیاں بھی تھوڑی تھوڑی دور پر تھیں لیکن دن میں ان میں چھپنا کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ سال بنی شمال کی طرف میلوں اسی طرح چلی گئی تھی۔ اس کے مشرق میں ساردہ نہر کی شاخ ہر دوئی برانچ بہہ رہی تھی۔ اور مغرب کی طرف ناقابل گذر کھیر کے جنگل سے ملا ایک چاندر تھا۔ اسی چاندر کے بیچ میں ایک چھوٹا سا تالاب یا گڑھا تھا۔ جسکے کنارے دلدل یا کیچڑ میں بیٹھ کے اور کھڑے رہ کر بہاری دن گذارتا تھا۔ نیچے کیچڑ میں جونکیں ہاتھ پیر اور پیٹھ ڈانس اور آنکھ کے آگے صد ہا بھنگے اسے ستاتے تھے۔ جنگل کا چاندر صد ہا جنگلی سینٹوں پتاوروں اور گھاسوں کا ایک اُبلا اونچا اور گھنا کھڈا ہوتا ہے جس میں کہ انسان کو پورا پیر رکھنے کی جگہ ملنا محال ہوتا ہے۔ اونچائی میں ہاتھی مع ہودہ اس میں چھُپ جاتے ہیں۔ چاندر میں کبھی کوئی ایسا قد آور درخت نہیں ہوتا جس پر کہ انسان چھ سات فٹ بھی اوپر چڑھ سکے اگر کوئی یہ چاہے کہ چاندر کی "ٹھیرے نما گھاسوں کو کچل کر دو فٹ جگہ بنالے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قدر سخت ہوتی ہیں کہ بغیر کسی مضبوط ہتھیار کے نہیں کٹ سکتیں۔ پھر اب موسم بھی اور ہی ہو چلا ہے۔ سبز لہلہاتے چاندر کو چار مہینے پیشتر کی سخت سردی نے مار کر سُکھا دیا ہے۔ یہاں اب نہ چڑیاں چہچہاتی ہیں نہ کالا تیتر بولتا ہے۔ کھڑکھڑاتا ہوا بھورا چاندر ایک چنگاری کا منتظر ہے۔ جو کسی نہ کسی طرح ہر چاندر میں پہونچکر ان مُردہ گھاسوں کو فنا کی آخری منزل میں پہونچا دیتی ہے۔ اور جب چاندر جلکر بھوری اور سیاہ راکھ سے ڈھکا ہوا نکل آتا ہے تو اس اَرتھی کی خاک میں سے آنے والی نسل کے بے خبر نونہال پودے ہنستے ہوئے سر نکالتے ہیں ——— ظالم —— ظالم ——— قدرت کے قوانین ظالم ہیں۔

چاند اُگتا ہے ——— وہ ہستیاں جو کبھی حیات کی طالب نہیں ہوئی تھیں، حالتِ بے خبری میں وجود میں لاکر اس دُنیا میں گرم و سرد جھونکے برداشت کرنے کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ عرصۂ حیات کم ہے۔ مصائب عالم بھی ہیں، موسم کی سختیاں بھی ہیں۔ وجود کا جدوجہد بھی جاری ہے کہ بیڑا پار لگ جاتا ہے۔ اور پھر وہی ہوتا ہے — ظلم — ظلم —— قدرت کے قوانین کیسے ظالم ہیں۔ قد آور درخت، چھوٹے پودے۔ لاکھوں قسم کی گھانسیں۔ بڑے بڑے جانور اور درندے، چوپائے اور پرندے۔ چھوٹے چھوٹے جانور، کروڑہا قسم کے کیڑے اور انسان سب اسی قانون کے تابع پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چکّی چل رہی ہے۔ دانے ڈالے جارہے

ہیں۔ اُبلا نکل رہا ہے۔ شاید یہ عالمِ ہستی خود کسی گناہِ عظیم کا کفارہ ہے۔

بہاری بڑی دیر تک ہاتھ میں رسی لئے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے برگد کی چھال کو کُریدتا ہوا اسی ڈگالے پر بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ جنگل کی اِس زندگی سے اتنا عاجز آچکا تھا کہ اب اس بات پر بالکل آمادہ تھا کہ پاس کے کسی گاؤں میں جاکر فقیر یا سادھو کے بھیس میں قسمت آزمائے۔ اگر پکڑا بھی گیا اور پھانسی پر بھی لٹکنا پڑا تب بھی گوارہ تھا۔ لیکن وہ تکلیفیں جو اَب وہ اُٹھا رہا تھا، اس کو اس وقت ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھیں۔ اسکے پاس سوائے ماچس کے ایک بکس کے اور چند بیکار ردیوں کے اور کوئی چیز نہ تھی، کاش کہ ایک چاقو ہی ہوتا۔ دیاسلائیاں بھی ختم ہونے کے قریب آچلی تھیں۔ دیاسلائی کا خیال آتے ہی اُس نے پھٹے ہوئے کوٹ کی جیب میں سے ماچس کا بکس نکال کر اُس کی تیلیاں گنیں کے بعد نہایت احتیاط سے پھر اُس کو جیب میں رکھکر "بھگوان دیا کر بھگوان" کہتے ہوئے درخت سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ جب آخری ٹہنے پر آگیا تو دونوں ہاتھوں سے پکڑکر اُس میں لٹک گیا۔ اس کے پیر اب بھی زمین سے چار فٹ اُونچے ہونگے کہ اُس نے دونوں ہاتھ چھوڑ دئے اور دھم سے زمین پر آگیا سنبھل سکا پر ہاتھ زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ ساتھ ہی اُس کے دائیں ہاتھ کی طرف ساٹھ فٹ کے فاصلہ پر ایک عورت کی "ارے دَیّا" چلانے کی آواز آئی۔ سر گھماکر دیکھا تو ایک عورت رفع حاجت کرتے سے لُٹیا وٹیا چھوڑکر بھاگی چلی جارہی ہے۔ بہاری بھی گھبرا کر اُٹھا کہ جنگل کے اندر کی طرف بھاگے مگر فوراً ہی لٹیا کا خیال آیا۔ بھاگتا ہوا اُس تک گیا اُسے اُٹھا رہا تھا کہ کپڑے کی بڑی سی ایک پوٹلی اور نظر آئی۔ اس نے اُسے بھی اُٹھالیا اور لٹیا کا پانی گراتا ہوا عورت سے دوسری سمت کو بھاگا۔ فاقوں اور مصیبتوں سے جسم لاغر ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دُور میں سانس پھول گیا۔ بھاگنا بند کر دیا، تیز قدم اُٹھاتا اسی چاندر میں گھُس گیا۔

چاندر میں پہونچکر بہاری نے اُس پوٹلی کو کھولا تو اُس میں سے ایک کھُرپی۔ ایک ہنسیا۔ چھٹانک بھر کے قریب تماکو، چلم، ایک دیاسلائی کی ڈبیہ اور کوئی سوا سیر آٹے کی روٹی اور بیگن کی بھاجی نکلی۔ بہاری نے فوراً کھُرپی اور ہنسیا کی مدد سے چاندر میں ایک خشک جگہ تھوڑی سی زمین صاف کی اس کے بعد لٹیا میں پانی بھر کر لایا آٹھ دن ہو چکے تھے، سیر ہوکر روٹی کھائی پھر آگ جلا کر چلم بھری اور اطمینان سے پیتا رہا۔ عرصے کے یہ نعمتیں ملی تھیں روٹی اور تماکو دونوں کا نشہ چڑھا وہیں پڑکر سو گیا دن کے دس بجے کا سویا شام کے چار بجے اُٹھا۔ درخت پر نیند کہاں تھی۔ اب جو سوکر اُٹھا تو خواہ مخواہ طبیعت پر ایک طرح کی بشاشی تھی۔ ... کو وہ ہراساں ہوکر گاؤں میں جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا تھا لیکن اب اس کے خیالات بدل گئے۔ زندگی کا چسکا پھر زندہ ہو گیا ... کو دیکھکر وہ فوراً سمجھ گیا کہ گیہوں کی کٹائی شروع ہو گئی ہے۔ اس وقت ... لئے یہ فکر تھی کہ جلد سے جلد جس قدر گیہوں کھیتوں سے کاٹ سکتا کاٹ کر جنگل ہی میں کہیں چھپا دے ورنہ جب گیہوں نہ رہیں گے تو کیا کھائیگا۔ آبادی میں واپس جانے کو اب اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس یقین تھا کہ وہ انسانوں میں گیا نہیں کہ پکڑا گیا۔ اُس نے تصفیہ کر لیا کہ جہاں تک ہو سکے فی الحال تو جنگل ہی میں چھپا رہے۔ دنوں کے بعد پیٹ بھر روٹی نے اس میں ایک نئی روح ڈال دی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ آئندہ کے منصوبے گانٹھتا ہوا چاندر سے نکل کر جنگل کی سوفٹی سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ آرہا تھا کہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف سڑک کے دوسرے کنارے پر اُس کی نگاہ پڑی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سے شیر چلا آرہا ہے۔ سر سے پیر تک پسینہ آگیا۔ بُت بن کر جہاں کا تہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ بہاری کو یقین سا ہو چکا تھا کہ اس جنگل میں شیر یا بھیڑیا کوئی نہیں ہے آج اُس نے پہلی دفعہ شیر کو دیکھا تھا۔ لیکن شیر اس کو دو دفعہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اور آج تیسری دفعہ آمنا سامنا ہی ہو گیا۔ شیر نے اس کو دیکھکر اپنا بھاری شاہانہ چہرہ تمکنت سے پیچھے پھیر کر ایک لمحہ کے واسطے کچھ دیکھا اور پھر نہایت شان اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوا بالکل آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ بہاری سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا کہ شیر کے پیچھے ایک اور شیر تیز قدم چلا آرہا ہے۔ یہ شیرنی تھی۔ پورے دن پیٹ سے ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ جونہی شیر کے قریب آئی اس کی بھی نگاہ بہاری پر پڑی۔ ہلکی سی غراہٹ اُسکے منہ سے نکلی۔ شیر اور آہستہ ہو گیا۔ جونہی شیرنی اس کے بائیں ہاتھ کی طرف برابر میں آئی، شیر پاس کے جنگل کی طرف گھوم پڑا اور اس طرح ناراض شیرنی کو اپنے پہلو سے دھکیلتا ہوا ہٹا لے گیا۔ بہاری کے اس قدر اوسان خطا ہوگئے تھے کہ شیر اور شیرنی کے جنگل میں غائب ہو جانے کے بعد بھی وہ

---

* اودھ کے تمام جنگلوں میں محکمہ جنگلات کے انتظام سے سڑکیں کٹی ہوئی ہیں ان میں بعض ایسی ہیں جن پر موٹر چل سکتی ہے، ورنہ زیادہ تر جھاڑیاں اُگی ہوتی ہیں۔ ان سڑکوں سے آگ کا بچاؤ اور جنگل کے ٹکڑوں کی تقسیم وغیرہ کا فائدہ ہے۔

وہیں کھڑا تھا عقل کام نہ کرتی تھی کہ کدھر جائے کیا کرے۔ آخر پھر روانہ ہوا۔ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اس کی پشت پر مور چلایا۔ مڑ کر دیکھا تو بہت دور پیچھے وہ دونوں شیر اس سے کترا کر کچھ دور جنگل کے اندر اندر چلکر پھر سڑک پر نکل آئے تھے، اور اس طرح اسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔ بہاری کی متواتر جنگل میں موجودگی سے غصّہ دونوں ہی کو آ رہا تھا۔ مگر شیر سمجھدار مطمئن طبیعت کا تھا اس نے دیکھا کہ معاملات نازک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی ملکہ پیٹ سے ہے تنہائی کی سخت ضرورت ہے یہاں یہ انسان ہر وقت موجود رہتا ہے، دوسرے اس کی موجودگی سے دس بیس کانکر اور پاڑے جو اس ٹکڑے میں مستقل طور سے رہتے تھے کوچ کر گئے ہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ چیتل اور سانبھروں کی ٹولیوں نے بھی ادھر کا آنا بند کر دیا ہے۔ غذا کی کمی ہوتی جاتی ہے بہتر ہے کہ اس ٹکڑے کو چھوڑ کر چوکا ڈھایا کے نرکلوں میں رہا جائے۔ چنانچہ وہ شیرنی کو لئے نکلا چلا گیا۔ چار میل کی معمولی چہل قدمی کے بعد دونوں سارہ کی (اصلی نہر) کینال پر پہونچ گئے۔ سامنے چوکا ڈھایا کا پل تھا مگر ان کو اسکی ضرورت نہ تھی۔ اس سے دوسو قدم اِدھر ہی انہوں نے نہر میں پانی پیا اور پھر تیرتے ہوئے پار نکل گئے۔

رات گئے تک بہاری گیہوں میں لگا رہا تھا۔ صبح دھوپ نکل آئی تھی اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا دور کھیت میں تیز چار لال سافہ دیکھکر اس کی روح خشک ہو گئی۔ جلدی سے رسّی کھول کر درخت سے نیچے اترا۔ درخت کی جڑ میں چاروں طرف بن کروندوں کی گھنی جھاڑیوں نے اور اس پر پھیلی ہوئی بیلوں نے پوری آڑ کر رکھی تھی۔ یہ وہیں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ مارے ڈر کے سانس بھی پوری نہ لیتا تھا۔ دل کی دھڑکن سے مجبور تھا جس کی آواز اس کو نقارے کی چوٹوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اور جب سپاہیوں اور آدمیوں کے پیروں کی آہٹ اسی کی طرف بڑھتی ہوئی سنائی دینے لگی تو اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ اس نے کہا "ہے رام ایک میں اور سارا جگ میرا دشمن میری کیا دُردشا ہو گئی ہے؟ میں نے کس جنم میں کونسے پاپ کئے تھے" اس کے تصور نے چاندنی رات کا وہ نقشہ پھر اس کے سامنے کر دیا جبکہ اس کا اسہ پہلی دفعہ بلدیو سنگھ کے سر میں گھسکتا ہوا گھستا چلا گیا تھا۔ ایک سیدھے ہاتھ کو تیز دھار کے زندہ ہڈی میں گھسنے کا احساس ہونے سے بہاری نے پھریری لیکر اس خیال کو مٹا دیا۔ ورنہ معلوم کیوں اور کر وہ اپنے ہی سے آپ بحث کرنے لگا: میں مجرم ضرور ہوں۔ لیکن جرم سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہ کرتا اگر میرے دوستوں نے مجھے شراب نہ پلا دی ہوتی اور اگر بلدیو سنگھ کے باپ نے میرے اوپر اس قدر ظلم نہ کئے ہوتے۔ بے دخل کیا! زمین چھینی، باغ چھینا...... لیکن اس کا بدلہ...... لڑکے کو مار ڈالنا؟...... قتل؟ قتل؟...... قتل؟...... ہاں قتل...... میں نشہ میں تھا۔ پھر اسی حالت میں رمضانی نے آکر جوش دلایا... جمنا میری ہے.... میری منگیتر ہے.... اس کے گھر میں بھی تو بلدیو تھا... جمنا! ...جمنا؟.... اب کس کی ہے؟.... ہے رام کرپا کر۔"

بالکل قریب آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ اسی طرف آ رہے تھے، بڑے داروغہ.... خاں کی آواز آئی: "پاگل ہوئے ہو کہیں ڈاکو کھیت کاٹتے ہیں؟ گیہوں چراتے ہیں؟ ڈاکو ہوتا تو کہیں نہ کہیں واردات ضرور کرتا۔"

ایک آواز: "سرکار اکل لاہے۔ ساتھ ماں کوؤ نا ہر۔"

بڑے داروغہ: "ہاں بے ہاں اکیلے ہی واردات بھی کیا کرتے ہیں۔ بچہ دُکا راہگیروں کو لوٹتے ہیں۔ سوتوں کے گھروں میں گھستے ہیں۔ کہیں گیہوں چراتے ہیں؟ اور ایسا ڈاکو کہ سالے کے پاس چاقو تک نہیں۔ کیوں جی پہلے تو ہاتھ ہی کی توڑی بالیاں تھیں نا؟ ٹھیک سے دیکھا تھا؟ پہچان لیتے ہو ہاتھ کی ٹوٹی ؟ ـــ"

ایک آواز: "اے حجور ہم دیکھ کے بتائی دیں کو تو جنا ورنہ کھائی۔ کوؤن ہنسیا کاٹی۔ ل سرکار یہ ہیئی کووَن بڑا۔"

بڑے داروغہ: "کوئی بالکل نیا مجرم ہے۔ ضرور خون کرکے بھاگا ہے۔ ہو نہ ہو وہی مفرور قاتل ہے۔ کیا نام تھا جی؟ گشتی چٹھی پڑھی تھی؟ یاد ہے.... ؟"

ایک کانسٹبل کی بھاری آواز: "بہاری، ولد بھابیہ، ساکن مکروان مقتول بلدیو سنگھ۔"

ایک آواز: "داروغہ جی اِتے تا ملنے ہئیے، چاندر مان! نا ہیں تو کھیرے مان ہوئی ہیے اُتے چلو۔"

داروغہ جی: "ابے الو کی دُم یہ ہم بھی جانتے ہیں۔ یہاں تو پیروں کے نشان دیکھنا چاہتے ہیں اور چاندر میں جاکر کیا چھ آدمی ڈھونڈ لیں گے؟ پانچ سو آدمی بھی ہوں تو نہیں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یہ تو گاؤں میں ہی پکڑا جائیگا۔ تھوڑے دن میں گھبرا کر ضرور کسی نہ کسی گاؤں میں جائیگا۔ تم لوگ خیال رکھنا جو پکڑ لائیگا یا اطلاع دیگا اسے بہت انعام ملیگا۔"

جان۔ جان۔ دنیا بھر سے زیادہ پیاری جان۔ تیری حفاظت ہر طرح کی جاتی ہے۔ سڑک کے کنارے اندھی، لنگڑی، بڑھیا، سسک سسک کر بھیک مانگتی ہے۔ جوانی کے وہ دن! عشاق کے ہجوم، عیش و عشرت، روپیہ

پیسہ، ہاں پیچھے، گھر بار سب رخصت ہوگئے۔ کچھ نہ رہا اب کیوں جی رہی ہو؟ کس کا انتظار ہے؟ گئے دن واپس آنے کی اُمید ہی نہیں پھر کیوں جی رہی ہے؟ جان۔ سب سے پیاری جان باقی ہے۔ اس ہی کو گھیرے دامول رہتی ہے ——!

الوداع اے انسانوں کی بستیوں! الوداع! ہماری اب کبھی تمہاری طرف رخ نہ کریگا۔

انسانی رہگذر سے کوسوں دور گھنی سبز اور شاداب جھاڑیوں در طرح طرح کی فرنون سے ڈھکا ہوا کا ڈھایہ، ڈھلوان اترتا ہوا پانی میں ٹھنڈی۔ سبز بیت کی جھاڑیاں شامل کرتا ہے تو پھر وہاں انتہائی گھنا پندرہ فٹ اونچا نرکل کا تختہ اس سے آملتا ہے۔ جب تمام جنگل سوکھ جاتا ہے اور ہر طرف آگیں لگی ہوتی ہیں تو یہاں ٹپکتے ہوئے پھولوں میں صد ہا چڑیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرت کے راگ گاتی ہیں۔ اسی نرکل میں ایک جگہ سے چھپاندی کی بو آتی ہے۔ تر زمین پر نازک نرکل کچل کر شیر اور شیرنی نے تھوڑی سی جگہ بنائی ہے۔ اور اس ٹھنڈے اور روشنی سے محفوظ گھر میں شیرنی نے بچے دیئے ہیں۔ جن کو وہ لیٹی ہوئی بڑے غرور سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی پشت پر شیر پڑا غافل سو رہا ہے۔ بچوں کی آنکھیں کھل چکی ہیں۔ وہ آپس میں کھیل رہے ہیں سنہرے بدن پر ہلکی دھاریاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ شام ہوگئی ہے۔ شیرنی کو سخت انتظار ہے کہ کب اس کا سرتاج شیر اٹھے اور کب وہ ڈھائے سے اوپر سانپ لائن[1] سے کچھ دور روہنی[2] کی جھاڑیوں میں جائے جہاں کل کا بچا ہوا آدھا سانبھر اب بھی پڑا ہے۔ شیر انگڑائی لیکر لیٹے سے سر اٹھا کر اس کو اور بچوں کو دیکھتا ہے۔ شیرنی فوراً بدن کو جھکولا دیکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ گول مٹول بھولے بھولے دونوں بچے جو اس کے اوپر سوار ایک دوسرے پر داؤں لگا رہے تھے، کدکد زمین پر گر کر لڑھک جاتے ہیں۔ جیسے ہی شیر اٹھ کر بیٹھتا ہے شیرنی نرکلوں میں آمد و رفت سے بنی ہوئی گلی کا رخ کرتی ہے شیرنی چونکہ دودھ پلا رہی ہے اس کی اشتہا بڑھی ہوئی ہے۔ وہ بھوکی ہو رہی ہے آخر شیر بھی روانہ ہوگیا۔ جب نرکلوں سے باہر آگیا تو اس نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی پھر لی۔ اور شیرنی کے پیچھے پیچھے اطمینان سے چلدیا۔ بسید کی جھاڑیوں سے نکل کر جونہی یہ دونوں سانپ لائن پر آئے ایک سانبھر کی ساٹھ فٹ کی بلندی سے موربنے "می اوں۔ می اوں" کے نعرے لگائے ہلدو کے درخت پر بیسیوں بندروں کی گھگھی بندھ گئی۔ ان دونوں کو تو شکار تو مارنا نہ تھا۔ چھپ کر پھرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے نکلنے کی اگر جنگل کو اطلاع ہوگئی تو ہوجائے۔ اطمینان سے کھلم کھلا سانپ لائن پر چلتے رہے۔ اور جب روہنی کے جنگل کے نیچے پہونچ گئے تو باری باری ایک ایک جست لگا کر ڈھائے پر چڑھ گئے اور روہنی میں تھوڑی دور چلکر سانبھر کی بچی کچی ٹھٹھری پر پہونچے۔ لیکن یہاں آتے ہی دونوں کے شاہانہ سکوت اور اطمینان میں قہر اور غصہ کا تغیر پیدا ہوگیا۔ شیر غضبناک ہوئے لگا اس کی نرم و نازک بچکتی ہوئی ملکہ خونخوار جھنجلائی ہوئی شیرنی ہوگئی —— گوشت چرایا گیا ہے —— انسان کی بو آرہی ہے —— شیر کی سیدھی دُم کی نوک دائیں اور بائیں لہرا لہرا کر طبیعت کے انتشار کو ظاہر کرنے لگی۔ شیرنی کو غصہ زیادہ تھا۔ ناگن کی سی دو پھنکاریوں کی سی آوازیں اس کے منہ سے نکلیں۔ وہ سانبھر کی بچی ہوئی کھال اور ہڈیوں کو سونگھتی ہوئی اس کے چاروں طرف گھومی پھر ایک طرف روانہ ہوگئی۔ آج وہ ضرور اس موذی چور سے بدلہ لیگی۔ یہ تیسری بار ہے کہ اس کا شکار چوری ہوا ہے۔ شیر بھی اس کے ساتھ ساتھ روانہ ہوگیا۔ لیکن اب اس پر پھر وہی فطری متانت آگئی تھی۔ وہ بڑھکر شیرنی کے آگے ہولیا۔ جاتے جاتے تین فرلانگ کے بعد جیسے ہی کنارے کی گھنی بیتا ورے کھلی ہوئی فائر لائن پر شیر نے باہر سر نکالا۔ دو سو قدم پر سامنے بھاگتا ہوا انسان نظر آیا۔ شیر آہستہ سے ایک قدم پیچھے[3] ہٹکر اپنے سیدھے ہاتھ کی طرف گھوم پڑا اور اسی طرف کتا ہوا شیرنی کو نہر کی پٹڑی پر نکال لے گیا۔

اگر کوئی چیز انسانی دماغ پر ایک ہی وقت میں دو متضاد اثرات پیدا کرسکتی ہے تو ترائی کے جنگلوں ہی میں۔ جنہوں نے خود ان جنگلوں کی سیر نہیں کی ہے وہ مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ شام کے وقت چوکانڈی کے ڈھائے کے کنارے کسی فائر لائن پر کھڑے ہو تو دونوں طرف کے اونچے سال کے جنگلوں میں لاکھوں قدآور درختوں کے تنے ہی تنے اوپر کے سبز پتوں سے بنی ہوئی چھت کے اندھیرے میں نگاہ سے اوجھل پڑتے

---

[1] سانپ لائن وہ سڑک ہے جو ڈھائے کی آدھی اونچائی پر کاٹی گئی ہے چونکہ ڈھایا ٹیڑھا بیڑا ہے۔ اس لئے یہ سڑک بھی سانپ کی طرح لہرائی ہوئی ہے۔ سڑک سے کہیں بھی اصلی سڑک کی مراد نہیں ہے بلکہ صرف ایک راستہ ہے جس پر سے درخت کاٹ دئیے گئے ہیں۔ [2] ایک جھاڑی جسکے پھولوں میں سے سرخ رنگ کی ایک دوا نکلتی ہے۔ نہ معلوم یہ دوا کس کام آتی ہے، پہاڑی اسے جمع کرتے ہیں۔ [3] جنگل کے تمام جانور انسان سے اسقدر ڈرتے ہیں گویا انسان کا مارنا انکو حرام ہے۔

چھُپتے غائب ہوجاتے ہیں۔ ڈھائے کی طرف صدہا جھاڑیاں اُن پر بیلیں اور دھانی رنگ کے نازک پودوں کے بعد ہری کچی بیت کی بیلوں سے بنی ہوئی جھاڑیوں پر سے ہوتی ہوئی نگاہ نرکل کے لہلہاتے تختہ پر میلوں جاکر دھندلی پڑتے پڑتے کسی دُور دراز کے جنگل میں مل جاتی ہے جو کہ فاصلہ کی وجہ سے دھندلا غبار کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ جنگل میں ہرطرف خاموشی ہی خاموشی ہوتی ہے۔ دفعتاً ایک مُرغی کُڑکُڑاتی ہے اور اسکے بعد ہی مور چلاتا "می اُوں۔ می اُوں" اور پھر خاموشی چھاجاتی ہے۔ سین ایک ہی وقت میں انتہائی دلفریب بھی معلوم ہوتا ہے اور انتہائی بھیانک بھی انسان خوفزدہ ہوکر یہاں سے بھاگنا بھی چاہتا ہے اور ہٹنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت تک ہے جب تک دن کی روشنی پوری طرح موجود ہے۔ جُوں جُوں اندھیرا بڑھتا ہے اُس کی دلفریبی بھیانک پن میں بدلتی جاتی ہے۔ جُوں جُوں شام ہوتی ہے دل کی حرکت تیز ہوتی ہے۔ اور جھٹپٹے کے وقت دیکھنے والے کو یہ جنگل موت کا بھیانک سمندر معلوم ہوتا ہے۔ درخت اور جھاڑیاں سیاہ کمبل اوڑھ کر منحوس شکلیں اختیار کرلیتی ہیں۔ اس وقت سیر کرنے والے کا دل روشنی اور انسانی صحبت کے واسطے تڑپتا ہے وہ جلد جنگل سے نکل کر گھر کو روانہ ہوتا ہے اور جب ایکدفعہ پھر وہ لیمپ کی روشنی میں اپنے ہمجنسوں میں جابیٹھتا ہے تو اسکا دل بخود بخود خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔

لیکن صرف چار مہینے کے قلیل عرصے میں بیاری جان کی حفاظت کا جذبہ بہاری کے دماغ کو اِن احساسات سے معطل کرچکا ہے انسانی خیالات اور محسوسات ساکت ہوچلے ہیں، ان کے بجائے خالص حیوانیت ترقی کررہی ہے۔ سر اور ڈاڑھی کے خودرو پریشان بالوں سے گھرا ہوا چہرہ انسان کے چہرے سے بہت کچھ جُدا معلوم ہوتا۔ کمر سے گھٹنوں تک اب بھی کپڑے کی چند لیریں لٹکی ہوئی ہیں۔ حرکات میں وحشت اچال میں چیتے کی سی جھپک! اور آنکھوں میں ہرن کا سا چوکنا پن ہے۔ اب وہ بیٹھکر بجائے اپنی بدقسمتی کے واقعات سوچنے کے جنگل کی آوازوں پر کان لگاکر اُن کے مطلب اخذ کرتا ہے۔ جنگل کی جڑوں اور پتوں سے بڑھکر پرندوں کے انڈے! بسیرا لیتے پرندے! مرے گرے جانور! اور شیروں کا مارا شکار کھاتا ہے۔

ایک دن حسب دستور جب مور نے کوک کر امیناؤں نے شور مچا کر! اور بید کی جھاڑیوں میں رہنے والی مُرغیوں نے کُڑکُڑا کر اطلاع کردی تھی کہ جنگل کا بادشاہ اور اُس کی ملکہ رات کے کاروبار سے فراغت کرکے دن بھر سونے کے واسطے نرکلوں میں گھس گئے ہیں۔ اور جب بندروں نے بھی درختوں سے اُترنا شروع کیا تو بہاری بھی درخت سے نیچے اترا۔ رات کو سانبھروں کے بے تحاشہ بھاگنے، چیتلوں کے "پوق۔ پوق" چلانے کے بعد چوکا کی طرف شیر کے فتحمندانہ گرجنے کی آواز سُن چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ آج پھر تازہ شکار مارا گیا ہے۔

اب اس کے واسطے یہی تھا کہ شام ہونے سے پہلے اس شکار کو ڈھونڈے جس کو کہ شیر اور شیرنی نے انتہائی کمال سے کہیں چھپادیا ہوگا۔ بہاری اس کی تلاش میں روانہ ہوا لیکن ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن ڈھل گیا۔ یہ نااُمید ہوکر اس جستجو کو دوسرے دن کے واسطے ملتوی کرنے ہی کو تھا کہ شکار کی گھسیٹنی پر اُس کی نگاہ پڑگئی۔ فوراً بہاری نشان پر روانہ ہوا۔ نرکلوں سے آدھ میل جنوب کی طرف سانپ لائن پر سے ہوکر جہاں نرکل ختم ہوکر پانی اور کیچڑ میں گھنا بیڑا اگا ہوا تھا یہ جا پہونچا۔ اب گوشت کچھ دور نہ تھا ضرور اسی بیڑے میں ہوگا ایک کوا بھی وہاں بیٹھا تھا۔ لیکن شام ہوچلی تھی، وہاں جانا [illegible] تھا شیر کے نکلنے کا وقت آگیا تھا مگر بہاری کو تین دن کا فاقہ ہوچکا تھا اُس نے ہمت کی کہ جلدی سے تھوڑا گوشت کاٹ لائے۔ [illegible] چھپ چھپاتا بیڑے کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتا تیزی سے بڑھا۔ [illegible] سے ڈھکے سانبھر تک پہونچا تھا کہ دور مور چلایا، مرغیاں کُڑکڑائیں۔ بہاری سانبھر پر جھکا ہوا تھا، تین سکنڈ کے واسطے ٹھٹک گیا۔ لیکن فوراً ہی اُس نے ارادہ کیا کہ ایک ہی ٹکڑا کاٹ لے۔ کھائی اور چری ہوئی سانبھر کی لاش پر ایک ہی وقت میں ایک جگہ دونوں ہاتھ ہنسیا سے گوشت کاٹنے میں لگ گئے۔ اور دوسری جگہ اس کے دانت کچے گوشت میں مصروف ہوگئے۔ دو لقمے پیٹ میں اور سیر بھر کا ٹکڑا ہاتھ میں لیکر بہاری بھاگا۔ بیڑے سے نکل جھاڑیوں میں سے ہوکر جس وقت وہ سانپ لائن پر آیا تو وہیں شیرنی گھومتی تھی۔ [illegible] بجلی سی کوندی۔ چار من کا شیرنی کا جسم ایک ہی چھلانگ میں [illegible] بہاری پر گرا، کمر اور پسلیاں سیٹوں کی طرح چٹ چٹ ٹوٹ گئیں۔ بہاری شیرنی کے اگلے پیروں کے نیچے اس طرح پڑا تھا جیسے کھونٹی سے گری ہوئی اچکن پڑی ہو۔

شیر پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ اِن واقعات سے بے خبر ٹہلتا ہوا آیا۔ ہی قریب آیا ٹھٹک کر رُک گیا۔ شیرنی نے لاش کو اس طرح منہ میں ٹھالیا جیسے بلی نیم مُردہ چوہے کو اور جھٹکے دینے لگی شیر کے منہ سے گھٹی ہوئی غراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ بہاری کے زمین پر گھسٹتے ہوئے پیر اور لٹکے

ہوئے ہاتھ ہلتے دیکھکر خوف سے شیر کی گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ شیر انسان سے نہ ڈرتا تھا لیکن جنگل کے قوانین[1] اس طرح شکن ہوتے ہوئے دیکھکر تھرا گیا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور "خوں۔ خوں۔ خوں" غراتا ہوا شیرنی کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ڈھائے سے اتر کر پیڑے اور اس کے بعد کلک کے جنگل میں سے نکلتا ہوا چوکا کو تیر کر نیپال کی طرف نکل گیا۔

انسان کے گوشت اور خون میں ایک عجیب صفت ہوتی ہے۔ جس طرح کتے کے کاٹنے سے انسان بورایا ہو جاتا ہے، اسی طرح درندے انسان کے گوشت سے بورا جاتے ہیں۔ پھر ان کو ہر وقت انسان ہی کی جستجو رہتی ہے۔ شیرنی کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک بَن رکھے اور دو گاڑی والوں کو مارنے کے بعد جب اُس کو اور آدمی چوکا ڈھایا کی طرف نہ ملے تو اپنے بچوں سمیت وہ نہر پار کر کے گھومتی گھومتی مزروعہ زمین اور گاؤں سے ملے بیناکوٹ کے زمینداری جنگل میں آگئی۔ یہاں آکر اس نے متواتر کئی خون کئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ہاکا کر کے طرح طرح کی آوازوں سے ڈرا کر اسے تنے اُسکے چاندر سے نکالا دونوں چھوٹے بچے ساتھ تھے جن کی وجہ سے یہ بھاگ بھی نہیں سکتی تھی۔ جوں ہی یہ بچوں کو لئے چاندر سے نکل سامنے کے درختوں پہ بندھے ہوئے مچانوں سے تڑاتڑ بندوقوں کے فیر ہوئے۔ گولیاں اس کے لگیں اور ایک اس کے ایک بچے کے، دونوں وہیں ڈھیر ہو گئے۔ محمود کی گولی گردن پر اور احمد میاں کی پاک پر کبھی خطا ہی نہیں ہوتی۔ دوسرا بچہ پھر چاندر میں گھس گیا جو کہ کمل اور رکیٹ[2] کا زندہ ہی پکڑ لیا گیا۔ آج اس واقعہ کو برسوں گذر گئے ہیں۔ اب بھی کہیں ایک سفید بڈھا لکڑی ٹیکے ٹیکے پھر کر زندگی کے کاروبار بھی کرتا ہے۔ اور دن میں کئی دفعہ لکڑی کے سہارے بیٹھکر اپنے اکلوتے بیٹے بلدیو سنگھ کو یاد کر کے آنسو بہاتا ہے اور کہتا ہے: "اے بھگوان میں نے کونوں پاپ کئے تھے جو موہے یہ سزا ملی"! اور اب بھی کہیں ایک گیارہ فٹ لمبا شاندار شیر اپنے لاغر جسم کو لچکاتا ہوا گھنٹوں کٹہرے کی سلاخوں کے آگے گھومتا ہے۔ اور جب سلاخوں میں سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو بیٹھکر کسی دور دراز خیال میں غرق ہو جاتا ہے۔ تماشائی تالیاں بھی بجاتے ہیں کنکریاں بھی پھینکتے ہیں مگر اس کو خبر نہیں ہوتی۔ وہ کسی گہرے خیال میں ہوتا ہے۔

شیر کیا سوچتا ہوگا! ....

یارب یہ دنیا کن گناہوں کا کفارہ ہے؟

سید رفیق حسین

---

[1] جو لوگ جنگلوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس کس طرح شیر اور ہاتھی تک انسان کو چھوڑ چھوڑ کر کترا جاتے ہیں۔

ایک دفعہ مجھے ایک چاندر میں تازہ مرا ہوا سانبھر ملا سینگ بہت اچھے تھے، میں اور میرا ملازم سر کاٹنے کے واسطے اس پر جھکے۔ آٹھ نو فٹ کے فاصلہ سے شیر نے غرا کر ڈانٹا۔ اور حملہ تب بھی نہ کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ دہلی یا بمبئی کی سڑکوں سے کہیں زیادہ محفوظ جنگل میں پھرنا ہوتا ہے۔

کیفیات

بربادِ لطف ہوں میں خراب جفا نہیں ... ہمدرد کون ہو؟ کوئی درد آشنا نہیں
کیوں چھیڑتے ہو زخمِ دلِ "خودنگار" کو ... بیزار آپ سے ہوں! کسی سے خفا نہیں
اُس غم نصیب سے تمہیں یہ بدگمانیاں ... تم سے بھی حالِ دل کبھی جس نے کہا نہیں
رنج و خوشی سے ہو گئے آزاد اہلِ دل ... کہتا ہے کون۔ حاصلِ مہر و وفا نہیں
ہر ناز دلربا ہے۔ ہر انداز دل فریب ... دیوانہ فرقِ لطف و ستم جانتا نہیں
تمکینِ احتراز ہو یا لطفِ التفات ... وہ کون سی ادا ہے جو صبر آزما نہیں
حسرت نصیب دل کی ہے یہ شانِ زندگی ... گویا سوائے مرگ کوئی مدعا نہیں

کوکب عجیب رنگ ہے کچھ اپنی زیست کا
ہر سانس نیشتر ہے مگر دل کشا نہیں

کوکب شاہجہانپوری

بالموائی یاد میں

باغ، بغیچہ، ڈالی، ڈالی
جوبن دینے برکھا آئی
جھومتا سبزہ، مست ہریالی
بہتا دریا، رستی نالی
سب پر پریم کی مستی چھائی
ہر جا سکھ، اور ہر دل شادی
گھر سے خوش خوش نکلی گنواری
ساتھ میں بالم، گود میں بالی
سُندر صورت، باتیں پیاری
دل کی شہنشاہ، نام گنواری
کتنی مغرور، اور کیا سادی
کچھ بھی نہیں، اور دنیا ساری
اُونچے محل، یہ کوٹھی عالی
چھوٹی شان، اور ہر دے خالی
برہا کی رتیاں کالی کالی
میں پاپن، یہ ننھی بالی
بس، دن، بھور، اندھیرا کیوں کر، اشور، آسرا تیرا!
بالموا کی یاد میں
بالموا کی یاد میں
اُور سے ہر اک شو بھا ظاہر
سامنے، پیچھے، اندر، باہر
پی کی پوجن، من کا مندر
اس کے سوا ہر ایک مغائر
اُڑتی مَے، اور چلتا ساغر

شاہد مست، اور بے خود ناظر
رنگ چڑھا کچھ ایسا آخر
ناظر شاہد، شاہد ناظر
رو میں تخیّل، حالت نادر
جیسے ترنگ میں جھُومے شاعر
جھرنا نکلے جھر جھر، جھر جھر
چھائی بدریا گھر گھر، گھر گھر
راکھ بجھے دل چر چر، چر چر
برہا اگن سے چر مر، چر مر
آنسو آئیں پھر پھر، پھر پھر
بَہ نکلے خوں "زر زر، زر زر"
دل ہو، من ہو، سینہ، چھتیاں تڑپت، دھڑکت، برست انکھیاں
بالموا کی یاد میں
بالموا کی یاد میں

بولے پپیہا، پیہو پیہو
کوئل کوکے، کوکو، کوکو
قمری، سرو، اور جنگل، جگنو
بُلبُل گُل، اور گل اور گلبو
سب میں بسی ہے تمری خوشبو
تم پر بھو میں تم میں پربھو
ہاتھ میں ہاتھ وہ پھرنا ہر سُو
گاہ بہ خانہ، گاہ لب جو
"میں ہوں تیرا پیاری" گُمتوا"
تُو ہے مجھ میں، یا ہوں میں توا"

پیت کا دعوا ہے، قسمیں سوسو
چھیڑ سے اِک، سو آنکھ میں آنسو
اب وہ کہاں "حُسن" اور وہ "جادو"
"جس کا تھا سکّہ ہر دم چالو"
مرد، اور دل، اور پیت کی خوشبو
تو بھی ہے کیسی کملا بدھوا!
غیر کے کارن ہارا کیوں جیو؟
دل جو دیا اب رہ یا مَر تو!
یہ بھی سمجھ اک سودا نیارا کھویا پایا، پایا کھویا
بالموا کی یاد میں
بالموا کی یاد میں
گھٹنا ایسی، اور مَیں نربل
آس تمہاری، آؤ رین مل
کڑکے بجلی، گرجے بادل
گھور اندھیرا، مینہ مسلسل
دل میں دھڑکا، اور جی بیکل
کیسے مناؤں یہ من چنچل
نگری نگری، جنگل جنگل،
پھرتے پھرتے پاؤں ہوئے شل
ہے ہے مَیں تو ہو گئی پاگل
رات کی سُدھ، نے دن کی اٹکل
پھر بھی جو تمری پاؤں سنبھل
راہ میں تمرے جاؤں بَل بَل
کس کے سہارے ہو یہ کٹھن چل
تم ہو، تو ہو، جنگل منگل

آؤ آؤ جیون کے ہیکل
کب سے کھڑی ہوں ہلاتے آنچل
یا یہ بتا دو کس جا آؤں ڈھونڈوں، ڈُھونڈوں، کھوجوں بادل
بالموا کی یاد میں
بالموا کی یاد میں
کس کے کارن سب کو چھوڑا
اپنا، پرایا، ادنیٰ، اعلےٰ
دھیان میں کس کے خود کو کھویا
آگ میں جیسے ضم ہو لوہا
نام کی جپتے جپتے مالا
آگیا ہائے زباں میں کانٹا
تن ہوا جھک جھک سمرن گویا
ٹوٹا گھِس گھِس ہاتھ کا منکا
کان کھڑا ہر بات پہ اتنا
بیٹھا آخر کان کا تالا
راہ کو تکتے تکتے سکھیا
آنکھیں گئیں خود آخر پتھرا
نوچے بال اور سینہ پیٹا
سنگ سے دے دے سر کو مارا
دنیا پوچھے دیکھ یہ گھٹنا
کس کے لئے یہ سانگ رچایا؟
کوئی کرے کیا سُنکر آخر، سُندر، منہر، چندر، شاکر
بالموا کی یاد میں
بالموا کی یاد میں

❊ ❊ ❊

شاکر

ماں اور بچہ

ماں اور بچہ کا عنوان دیکھکر یہ خیال ضرور پیدا ہوگا کہ میں کچھ حفظانِ صحت کے متعلق لکھنے والا ہوں یا شاید میرا تعلق بے بی ویک (Baby Week) کے انتظام سے ہے اور میں یہ درخواست کرنے والا ہوں کہ فلاں تاریخ آپ موٹے موٹے، دُبلے دُبلے، گورے کالے، ہنسنے اور رونے والے بچے لیکر نمائش میں شرکت کیجئے اور یقین رکھیئے کہ دُبلے سے دُبلے اور روتیا سے روتیا بچے کو بھی انعام ملیگا۔

جی نہیں، میرا موضوع تو ماں کی ایک عادت اور اُس کا بچے پر اثر ہے۔ آپ کا بچہ کوئی دو سال کی جان ہے وہ چاہتا ہے کہ ککڑی کھائے، آیا اُسے ککڑی نہیں دیتی وہ رو رہا ہے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ آیا کہہ رہی ہے کہ چُپ ہو جاؤ ورنہ امی تمہیں ماریگی "امی ہو بچی": کیوں روتے ہو مُنّے! چُپ ہو جاؤ، ورنہ مائی بیچا آجائے گی۔ لے ہے وہ آئی زینے سے" بچہ چُپ ہو گیا۔ پڑھی لکھی تعلیم یافتہ ماں اس کامیابی پر خوش خوش فاتحانہ انداز سے پھر کام کاج میں مشغول ہو گئیں اور بھول گئیں کہ بچے کو انہوں نے کس طرح چُپ کرا دیا ہے۔

کیا ماں کی یہ حکمتِ عملی قابلِ تقلید ہے؟ ننھی سی جان کچی ترکاری کھالیتی پیٹ میں درد ہوتا۔ شاید کچھ حرارت بھی ہو جاتی۔ مائی بیچا کے طفیل بچہ پیٹ کے درد اور بخار سے بچ گیا۔ اور چُپ ہو گیا نفع میں۔ ماں کی محبت اور عقل نے آنے والی تکلیف سے بچا لیا۔ لیکن اگر میں ماں ہوتا تو شاید بچے کو ککڑی کھا لینے دیتا۔ بلا سے پیٹ میں درد ہوتا، بخار ہوتا مجھے پریشانی ہوتی۔ وہ سب کچھ قابلِ برداشت لیکن مائی بیچا کا گھر میں نظر آنا بُرا۔

ذرا غور کیجئے، بچہ چُپ کیوں ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ مائی بیچا سے ڈرتا ہے، مائی بیچا آخر ہے کون؟ آپنے بھی کبھی نہیں دیکھی اور میں نے بھی کبھی نہیں دیکھی۔ بچے نے بھی اس مائی بیچا کو اچھی طرح نہیں دیکھا۔ اس کے ذہن میں البتہ یہ کوئی چیز ہے۔ بڑی ڈراؤنی اور بڑی بھیانک۔ اس ننھے سے دماغ میں غالباً یہ کوئی عورت ہے۔ کوئی چھت کے برابر اونچی۔ لمبی تڑنگی۔ کالی سیاہ۔ لال لال دیدے۔ پیلے پیلے بالشت بھر کے دانت۔ پنکھے جیسے کان۔ ناک کے بدلے دو بڑے بڑے چھید نظر آرہے ہیں۔ کچھ کچھ اپنی ماں سے غصہ کی حالت میں ملتی جلتی۔ اور وہ خن خنا بھی رہی ہے۔ اب بچے کو کیا ہوش کہ اور دیکھ لے وہ سہم گیا وہ عاجز ہو گیا، اندھیری رات میں یہ ہیولائیں اور آپ بھی دیکھ پاتے تو اپنی جوتیاں چھوڑ، پاؤں سر پر رکھ وہ بھاگتے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھتے۔ بچہ ڈر گیا اور چُپ ہو گیا۔ جس کا نسان مطلب یہ ہے کہ بچے کے چُپ ہو جانے اور ضد نہ کرنے کا باعث خوف تھا جو اُس کی پیاری ماں نے پیش نظر کیا۔

اور پیاری ماں نے تو بہلانے کے لئے یہ بات کہی تھی۔ کہیں گھروں میں مائی بیچا تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ یونہی جھوٹ موٹ کو بات کہہ دی تھی۔ ورنہ بچہ ککڑی کھا لیتا اور اس کے پیٹ میں درد ہوتا۔ ماں یہ نہیں چاہتی کہ اس بھولی سی جان اور جان سے زیادہ عزیز بچے کا بال بھی بیکا ہو۔ اس لئے اس نیک بخت ماں نے جھوٹ بولا۔ سیدھے سادے الفاظ میں ہم یوں کہیں گے کہ محبت کرنے والی تعلیم یافتہ ماں نے نمبر ایک جھوٹ بولا۔ نمبر دو بچے کو ڈرایا اور اُس کے دل میں ڈر جانے کی صلاحیت پیدا کر دی توبہ توبہ کیسی بُری بات ہے۔ کہیں محبت کرنے والی تعلیم یافتہ ماں جھوٹ بولا کرتی ہیں۔ اور کیا واقعی بچے کے دل پر ڈر بیٹھ جائے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ جھوٹ، جھوٹ نہیں۔ اور جب بچہ بڑا ہو جائے گا تو یہ خوف و خطر اُس کے دل سے نکل جائے گا۔ وہ مائی بیچا تو کیا بابا بیچا سے بھی نہیں ڈریگا۔ یہ تو آپ کا خیال ہے، اب مجھ سے سُنیئے!

دُنیا کے بڑے بڑے عالم جو نفسیات کی چھان بین میں سالہا سال گذار چکے ہیں اُن کا خیال ہے کہ بچہ بہت ہی صاحبِ فہم ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اُس کی بڑھتی ہوئی عقل، تجربہ اور مشاہدہ کی قوت انتہائی ذی حس ہوتی ہے۔ وہ کسی بات کو جب سمجھ جاتا ہے تو وہ اُس کے ننھے سے دل پر نقش ہو جاتی ہے اور اُس کے مختلف قسم کے اثرات بچے کے دل و دماغ اور نشو و نما پر اپنا بُرا اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے بچے کی نشو و نما کو لیجئے۔ تجربے اور مشاہدے کی بنا پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ بچے جو سہمے ہوئے اور خوفزدہ رہتے ہیں، اُن کی قوتِ ہاضمہ خراب ہو جاتی ہے۔ اور اکثر اُن کی تندرستی دوسرے بچوں کے مقابلے میں بُری ہوتی ہے۔ آپنے دیکھا ہوگا کہ جب بچہ یا بڑا کوئی ڈر جاتا ہے تو اُس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگتا ہے۔ دل کے زور زور سے دھڑکنے

کے معنی یہ ہیں کہ معمولی مقدار سے زیادہ خون دل کے اندر دورانِ خون کے لئے پہونچتا ہے۔ اس تیزی میں پھیپھڑے بھی شامل ہوجاتے ہیں اور مجبوراً اپنا فعل پوری طرح انجام دئے بغیر یعنی خون کی عمدہ صفائی کئے بغیر اس کو جلدی سے پھر واپس کر دیتے ہیں۔ یعنی ایک تو خون کی اچھی صفائی نہیں ہوتی، اور اس میں زہریلے اجزا ملے جلے رہ جاتے ہیں۔ اور دوسرے جسم کے اور اعضا کو اپنے حصّے سے کم خون میسر آتا ہے۔ بچارے معدے کو بھی اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جب ضرورت سے کم خون اور معمول سے زیادہ غلیظ خون اُسے ملیگا تو ظاہر ہے کہ معدہ کا فعل اتنا اچھا نہیں ہوگا کہ جتنا ہونا چاہیے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ بچے کو اپنی غذا سے اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا کہ معمولی حالت میں ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب روز اور ہر گھڑی یہی حالت رہے اور بچہ ماں کے خون سے باپ کے خوف سے یا مائی بیجا کے ڈر سے سہما رہے تو اُس کی نشو ونما پر کیا اثر پڑیگا۔ ایسے سہے ہوئے بچے مزاج کے چڑچڑے، جسم کے دبلے اور کمزور اور دماغ میں ادنےٰ ہوجاتے ہیں۔ اور یہ "روگ" روز بروز بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اور آخر کار ایسا نقصان پہونچا دیتا ہے کہ جس کا علاج اور ازالہ ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسے بچوں میں اکثر اچھے خون کی پیداوار اس درجہ کم ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے ہو کر بھی بچپن کی اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے اور ہمیشہ کے روگی بن جاتے ہیں۔

اسی نقصان کے برابر کا ایک اور نقصان بھی ہوتا ہے جس کا اثر بچے پر تو پڑتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ ماں، باپ، بہن، بھائی، مدرسے میں اُستاد، ملازمت اور کاروبار میں افسر اور ماتحت اور عام زندگی میں ہر ملنے جلنے والے پر پڑتا ہے۔ آپنے دیکھا ہوگا کہ بن ماں باپ کے بچے اکثر دبے دبے ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اپنے قبضے میں کر لیتے یا یوں کہئے کہ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ انہیں وہ محبت جو ماں باپ ہی سے مل سکتی ہے میسر نہیں آتی۔ اور اس لئے قدرتاً ان میں یہ جذبہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی دیکھ بھال خود کریں۔ اور اس درجے تک کہ ان کی زندگی خود غرضانہ رنگ ہوجاتی ہے۔ اور اسی طرح وہ بچہ جو ہمیشہ ڈرایا جائے، اور اس کے گرد وپیش میں خوف دلانے والے اسباب جمع ہوں قدرتاً اس بات کا عادی ہوجاتا ہے کہ خوف دلانے والی اور ڈرانے والی چیزوں کے خلاف لڑائی کے لئے تیار رہے۔ اس ہر وقت برسرپیکار رہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈرانے والے افراد سے ایک قسم کی نفرت کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی مجھے بیت مارے تو تکلیف ہوگی۔ اور اس لئے بیت کی چوٹ کی تکلیف ہمیشہ بیت مارنے والے کے خلاف میرے دل میں نفرت پیدا کر دیگی۔ اسی طرح ایک بچہ مائی بیجا سے ڈرتا ہے لیکن اُسے مائی بیجا سے ڈرانے والی ماں سے بھی ایک خاص قسم کی نفرت ہوجاتی ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ ماں سے نفرت کیا معنی۔ اور یہ ممکن نہیں۔ لیکن آپ یقین مان لیجئے کہ اپنے مالک کو بیحد پیار کرنے والا کتا دُم ہلاتے وقت بھی اُس ہاتھ سے ڈرتا رہتا ہے جس میں لکڑی ہے۔ اور جو اُسے تکلیف پہونچا چکی ہے۔ ڈرپوک بچے بھی اسی جذبہ خود احتیاطی کے ماتحت ایک قسم کی نفرت اپنے دل میں لئے پھرتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی سے نفرت کرنا یا نقصان پہونچانا نہیں، بلکہ ان کا مقصد تو خود ہر وقت تیار رہنا ہے اور اس لئے یہ جذبۂ خود احتیاطی جذبۂ نفرت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس جذبے کی ابتدا باپ اور ماں سے ہوتی ہے۔ آپنے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچے باپ کے مقابلے میں ماں سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ماں اکثر تادیب سے درگزر کرجاتی ہے اور باپ نہیں کرتا۔ اس لئے اس جذبۂ نفرت کا اوّل نشانہ باپ ہوتا ہے۔ بہن، بھائی، ماں اور عزیز وقریب بھی اس جذبۂ نفرت کے شکار ہونے سے محفوظ نہیں رہتے۔ اب ایسا بچہ مدرسے میں داخل ہوا، آپ ہی بتائیے کہ اُستاد کے متعلق اس کے جذبات کیا ہوں گے۔ اور جب اُستاد اور شاگرد کے تعلقات میں ابتدا ہی سے یہ کھینچ تان موجود ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اسکول کی تدریس اور تعلیم سے اس بچے کو فائدہ پہونچے۔ اُستاد کہتا ہے کہ بچہ غبی ہے کند ذہن ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مدرسے کی پڑھائی اچھی نہیں، اُستاد دلچسپی نہیں لیتے۔ ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ لیکن مجرم کوئی اور ہی ہے اور اُس نے جرم بھی ناسمجھ محبت میں کیا تھا۔ اب ایسے مجرم کو کیا سزا دے۔

سمجھ لیجئے کہ بچہ سکول سے کالج اور کالج سے زندگی کے میدان میں پہونچ گیا۔ یہ میدان نرالا ہے۔ یہاں دو چار حاکم ہیں اور دو چار محکوم۔ کسی کو حکم دینا پڑتا ہے اور کوئی حکم بجا لاتا ہے۔ یہاں ہمت اور استقلال کی ضرورت پڑتی ہے۔ تعلقات کی شگفتگی اور خوش مزاجی محنت اور جانفشانی کے ساتھ ساتھ زندگی میں آرام اور عزت کی ضامن ہوتی ہیں۔ اب اگر اس دنیا میں وہ سہما ہوا بچہ جو بڑا ہوگیا ہے داخل ہو اور ہر چیز سے خائف۔ ہر شخص سے برسرپیکار کمزور ہونے کی وجہ سے محنت کرنے کے ناقابل ہو تو اس کی زندگی کا کیا طور ہوگا۔ اس کے لئے آج، گذشتہ کل کی طرح بے رنگ اور آنیوالی کل۔ آج کی طرح افسردہ ہوگی اُسکی

زندگی کی پیمائش صرف صبح اور شام سے ہو سکے گی اور اُس قیمتی انسان کی تباہی کا باعث وہ خوف اور سہما ہوا ہونا ہوگا جس کی ابتدا لکڑی کھانے سے باز رکھنے کے لئے مائی بیچا کے خوف کے دل نشین ہونے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اب غالباً اُن کے ماں باپ زندہ نہیں۔ لیکن تمام دُنیا اس کی نظروں میں مائی بیچا ہے اور زندگی کا ہر لحہ ایک اندھیرا زینہ جس پر وہ چڑھنے سے معذور ہے۔

انسانی زندگی کا تقاضا ہے کہ دل میں جوش ہو۔ اُمنگیں ہوں چیزوں کی تلاش ہو۔ اُن کے حصول کے لئے کوشش ہو دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک پہونچنے اور موتی نکالنے کی آرزو ہو۔ خطروں سے دو چار ہونے کی ہمت ہو۔ اب دیکھئے مائی بیچا سے سہمے ہوئے بچے میں یہ کہاں تک پائی جائیں گی۔

ایک قصہ سُنیئے۔ میرے ایک دوست ہیں بڑے تیس مار خاں خوب تندرست و توانا۔ بندوق رکھتے ہیں۔ شکار کا شوق ہے۔ گولی اچھی چلاتے ہیں۔ ایک مرتبہ شکار کے لئے گئے ہوئے تھے، جنگل میں ڈیرے میں قیام تھا۔ پاس کے گاؤں والے جرائم پیشہ تھے۔ رات کو ڈیرے میں ایک آدمی گھسا۔ اتفاق سے سب ڈیروں میں جاگ ہوگئی۔ وہ آدمی بھاگ گیا۔ لیکن میرے دوست کے دماغ میں لمبا قد، اس کا پگڑ، اسکا ڈنڈا ذہن نشین ہوگیا۔ ایک عرصہ گزر گیا۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد یہ صاحب میرے مہمان تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ باغ میں رات کو سو رہے تھے ان کی آنکھ کوئی ایک دو بجے کھلی۔ اندھیری رات تھی۔ اپنے سرہانے کے قریب ایک آدمی کھڑا دیکھا۔ جو خفیف سی حرکت کر رہا تھا۔ بس میرے شکاری دوست لگے ہاہا ہی کرنے اور گھگی بندھ گئی۔ میں بھی تھوڑے فاصلہ پر سو رہا تھا، اُٹھ کھڑا ہوا اور اس شور و غل کی وجہ دریافت کی۔ بہت دیر تک وہ دیدے پھاڑے لیمپ اسٹینڈ کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے کہ یہاں ایک آدمی کھڑا تھا۔ بڑی دیر میں اس بندہ خدا کو یقین آیا کہ وہ لیمپ تھا۔ اس کا شیڈ انہیں پگڑباز آدمی معلوم ہوا۔ اس کے نچلے حصے پر پڑا ہوا تولیہ اس آدمی کی چادر اور اسٹینڈ کی ٹانگ آدمی کا ڈنڈا۔

میں نے اُن سے دریافت نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بچپن میں مائی بیچا سے انہیں بھی خوب واسطہ پڑتا رہا ہے۔ اب آپ بتلائیے کہ ایسا شخص زندگی کے خطرات سے کیونکر دو چار ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ہاشمی

وداعِ دوست

بسائی تھی محبت نے بڑے آرام کی دُنیا
اُمیدِ صبح کی دُنیا، نویدِ شام کی دُنیا
ہمارے باغ میں بادِ صبا اٹھلا کے چلتی تھی
جسے اہلِ نظر کہتے تھے لطفِ عام کی دُنیا
یہاں بادِ بہاری کے تھپیڑے رنگ بھرتے تھے
یہاں حاصل تھی رندوں کو شراب و جام کی دُنیا
یہاں قدرت بچھاتی تھی مناظر دلفریبی کے
یہاں تھی نت نئے جوبن پر حسیں ایام کی دُنیا
نسیمِ تازہ اِن پھولوں سے عنبر بار ہوتی تھی
یہاں رنگیں نظر آتی تھی صبح و شام کی دُنیا
یہاں بلبل کی آنکھوں کو نئی تنویر ملتی تھی
یہاں انساں بھلا دیتا تھا ننگ و نام کی دُنیا

یہاں پھولوں کی دُنیا تھی حسینوں مہ جمالوں کی
یہاں تخلیق ہوتی تھی محبت کے خیالوں کی

بہارِ زندگانی پر جوانی کا زمانا تھا
شبابِ جانفزا کا ہر طرف عالم برستا تھا
ہمارے عشق کی بستی تھی رنگ و نور کی بستی
فضائے خلد کو اِس کی فضا سے رشک پیدا تھا
تغیّر سا بپا کرتا تھا میرے دل کی دُنیا میں
لبِ ناز آفریں سے آکے جو نغمہ نکلتا تھا
اگرچہ لغزشیں تھیں مست کیف آور ہواؤں کی
مجھے میرا سہارا تھا مجھے اُس کا سہارا تھا
نظر آتا تھا ہر دم خوشنما چہرہ اُمیدوں کا
الم سب بھول جاتے تھے سرورِ دل فزا تھا
مری دُنیا کا ہر ذرہ تجلی زار تھا گویا
کوئی موسیٰ نہیں تھا ہر طرف جلوہ ہی جلوا تھا

مقابل ہو گئے تھے دو تبسم آفریں چہرے
کہ تھے بکھرے ہوئے حسنِ ازل کے ہر طرف سہرے

مصوّر کھینچتا ہے اک مرقّع شادمانی کا
مٹا دیتا ہے اُسکو رنگ کلکِ آسمانی کا
بہارِ رُوح پرور یک قلم پامال ہوتی ہے
بدل جاتا ہے نقشہ موجِ عشرت کی روانی کا
عنادل سر پٹک کر پھول کی ہر خشک پتی پر
زبانِ حال سے کرتے ہیں ماتم شادمانی کا
چمن کے جانفزا نغمے ہوئے گم یاس و حسرت میں
بھلایا اہلِ گلشن نے سلیقہ خوش بیانی کا
چمن سے رنگ و بو کا دَور آخر ہو گیا رخصت
محبت کو ملا پیغام مرگِ ناگہانی کا
فغاں ہے، آہ ہے، فریاد ہے، شیون ہے، نالہ ہے
چمن پر ایک بادل چھا گیا ہے نوحہ خوانی کا

الٰہی اس طرح برباد ہو جانا قیامت ہے
مری جاگی ہوئی قسمت کا سو جانا قیامت ہے

بچھی ہے یاس و حسرت کی صفِ ماتم مرے دل میں
مری تنہائیاں سر پیٹتی ہیں میری محفل میں!!
تمنا جس نے دل کو اور آنکھوں کو بسایا تھا
وہ لیلیٰ منہ چھپا کر جا چھپی آغوشِ محمل میں
وہ رخصت کیا ہوا محفل کی محفل ہو گئی رخصت
خیالوں کا وہ ہنگامہ نظر آتا نہیں دل میں
سراغِ کاروانِ عیشِ رفتہ ڈھونڈنے والو
سماں شامِ غریباں کا نظر آتا ہے منزل میں
درختوں کے لئے بارش ہے جیسے موجبِ رحمت
یونہی اُس مہ لقا کی چاندنی تھی میری محفل میں
نظر آتی نہ اُلفت میں کسی طوفان کی صورت
مقدّر نے مری کشتی ڈبو دی ریگِ ساحل میں

شرابِ زندگی کیا ہے لہو کے گھونٹ پینا ہے
مرا اب جینا مرنا کیا۔ نہ مرنا ہے نہ جینا ہے

—— عطاء الرحمٰن ممتاز

کی ٹوٹ سے اڑا کر اپنی اعلیٰ درجے کی شرافت وانسانیت کا ثبوت دیں۔ اسی لئے میں اپنی قضا کا خود منتظر ہوں۔ (یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر یہ باتیں تحقیق و تصدیق طلب ہوں تو واثق ثبوت بہم پہونچایا جاسکتا ہے) بہرکیف میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی اس پُرمعنی تقریر پر صاف دلی سے لب کشائی کرنا محولہ بالا واقعہ کی روشنی میں گویا وقت سے پہلے قضا کو دعوت دینا ہے تاہم جو شبہات میرے دل میں ہیں بلکہ ہر سلیم المذاق سننے والے کے دل میں اس معرکۃ الآرا تقریر سے پیدا ہوئے اُن کا اظہار بغرض ازالۂ غلط فہمی دُور از کار نہیں۔

سب میں پہلی بات جو غور طلب ہے یہ کہ ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی تقریر کو مکرر سہ کرر پڑھ جایئے اور سوچئے کہ پندرہ منٹ کی تقریر میں جو مشتمل ہے کئی سو الفاظ پر، ڈپٹی کنٹرولر صاحب نے موضوع سے متعلق کتنی باتیں کہیں ـــــ یعنی موضوع کے پڑھنے سے جو اشتیاق اور "معلوم کرنے کی خواہش" آپ کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس تقریر کے مطالعے سے کہاں تک اس کی تسکین ہوتی ہے۔ ایمانداری سے پوچھئے تو حضرت قبلہ ڈپٹی کنٹرولر صاحب نے ایک بھی بات کام کی نہیں کہی۔ کوری لفاظی اور مسخرگی۔۔ حد یہ کہ سننے والا یا پڑھنے والا محال ہے جو اس راز سربستہ کی رمق بھی پاسکے کہ "براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے"

جب یہ طے پا گیا کہ تقریر قطعی طور پر موضوع سے خارج ہے یعنی تقریر میں وہ وہ باتیں ہیں جو کوئی بھی عنوان قائم کرکے کہی جاسکتی تھیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر اس تقریر میں ہے کیا ـــــ سنئے اِس تقریر میں اعلیٰ درجے کی خوش مذاقی کی باتیں ہیں۔ دلچسپ لفاظی ہے۔ چٹ پٹا چٹپٹا لہجہ ہے۔ لفظوں پر فقروں کی دھاریں تیز کرکے سننے والوں کو خوب خوب گدگدایا گیا ہے۔ تاکہ وہ ہنستے ہنستے پاگل ہوجائیں۔ ہی ہی ہی۔ ہا ہا ہا۔ ہو ہو ہو۔۔۔۔۔

یقیناً ایسی تقریریں کب کب سننے میں آتی ہیں جو اس قدر دلچسپ ہوں۔ لیکن میری گزارش یہ ہے کہ یہ تقریر ڈپٹی کنٹرولر آف براڈکاسٹنگ کی تھی نہ کہ پطرس کی۔ سرکاری طور پر ڈپٹی کنٹرولر صاحب نے درجہ چہارم جیسی شہ نشیں سے اتر کر یہ خدمت اپنے ذمہ لی تھی کہ وہ سننے والوں کو ایک ایکسپرٹ کی حیثیت سے یہ بتائیں کہ "براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے" اس فرض کی ادائیگی میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں سننے والوں سے پوچھئے جن کی گاڑھی کمائی ریڈیو اور اسکے نیل پروگراموں پر پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ڈپٹی کنٹرولر حادثۃً خوش مذاق واقع ہوا ہو تو یہ کوئی ایسا بڑا جرم تو نہیں ہے۔ بجا و درست۔ لیکن یہ امر بھی تنقیح طلب ہے کہ اُن کی تقریر، ریڈیو کی عام پالیسی اور تقریروں کے جو رسمی عوائد ہیں اُن کے حساب سے معیاری ہے یا نہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اس تقریر میں جملہ رسمی عوائد و ضوابط توڑے گئے ہیں اور یہ رعایت محض اس لئے روا رکھی گئی ہے کہ مقرر صاحب ڈپٹی کنٹرولر ہیں نہ کہ پطرس۔ جو جو باتیں مقرر صاحب نے اب کہیں، ڈپٹی کنٹرولر کی حیثیت سے، اگر وہ پطرس کی حیثیت سے کہہ سکتے تو جو چور کی سزا وہ میری۔

سنئے۔ حضرت قبلہ ڈپٹی کنٹرولر صاحب نے "براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے" کے زیر عنوان ذاتیات کا ذکر کیا ہے جو ریڈیو کی کسی تقریر میں ممکن نہیں، اور پھر کن الفاظ میں۔ ایک دو جگہ نہیں بلکہ پندرہ منٹ کی تقریر میں بار بار انہوں نے دلی ریڈیو اسٹیشن کے سابق ڈائریکٹر مسٹر لکھشانن کی موچھوں کا مذاق اڑایا ہے:۔

"میرے کمرے میں دلی کے اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب مسٹر لکھشانن مع اپنی موچھوں کے داخل ہوئے"
"میں مسٹر لکھشانن سے تو بہت زیادہ خوف کھاتا ہوں کیونکہ ہر وقت بغل میں ایک چھوٹی سی چھڑی دبائے پھرتے ہیں جو مختصر مگر بر لحاظ سی کار آمد ہے"
"اس کے بعد وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوگئے اور پھر دانت پیس کر بولے: اگر آپ یہ تقریر اپنے ذمہ نہ لیں گے تو میں اپنی موچھیں منڈا ڈالونگا"
"دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ مسٹر لکھشانن کی موچھیں سچ مچ ندارد ہیں۔ وہ موچھیں جن پر بڑے اسمر کے کھمبوں کا دھوکا ہوتا ہے، وہ موچھیں جو دہلی کے مشہور اور قابل دید مقامات میں شمار ہوتی تھیں"
"مثل ہے کہ گئی موچھ پھر ہاتھ آتی نہیں، اور ایک اور مثل ہے کہ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں موچھ"
"چند دن بعد معلوم ہوا کہ موچھ منڈوانے کا میری تقریر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مسٹر لکھشانن کی بیگم صاحبہ نے پہلے ہی سے حکم دے رکھا تھا کہ موچھیں صاف کردی جائیں"

وقس علیٰ ہذا۔

ملاحظہ کیجئے یہ اور ایسی بے شمار بیہودہ اور نامعقول باتیں ہیں جنہیں جناب ڈپٹی کنٹرولر صاحب نے سرکاری طور پر "براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا

[illegible]و کے عنوان سے لاتعداد سُننے والوں کے کانوں میں ٹھوکا ہے۔ تسلیم [illegible] کہ ڈپٹی کنٹرولر صاحب مسٹر لکھشانن سے اس درجہ بے تکلف ہیں کہ [illegible]ں میں ہر قسم کا مذاق روا ہے، لیکن یہ باتیں تخلیہ کی مجالس میں، یا [illegible]پس کی صحبتوں میں زیبا ہیں۔ سُننے والوں کو ان سے کیا دلچسپی۔ ہزاروں [illegible] سُننے والوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ لکھشانن کی مونچھیں کیسی ہیں یا تھیں۔ [illegible]یک کے روپے سے اپنے ماتحتوں سے اس قسم کا مذاق کرنا کہ اُن کے [illegible]تعلق فضول اور ناشائستہ کلمات ہندوستان کے لاکھوں سُننے والوں [illegible]و فخریہ سُنانا ڈپٹی کنٹرولر صاحب کا قانونی حق ہے، باز پرس کی کسے مجال [illegible]۔ اندھیر نگری چوپٹ راجہ۔

روزمرہ کے واقعات ہیں کہ اچھے اچھے لکھنے والوں کی بیش قیمت تقریروں کے فقرے کے فقرے کاٹ ڈالے گئے محض اس بنا پر کہ اُن سے ذاتیات کا گمان ہو سکتا ہے۔ حد یہ کہ صابن کا ذکر کرتے وقت "لکس" یا "پیرز" کا لفظ استعمال کرنا بھی پروپگنڈہ کے تحت میں آتا ہے جو ریڈیو کی عام پالیسی کی رُو سے ناجائز ہے۔ لیکن ڈپٹی کنٹرولر صاحب کو حق حاصل ہے کہ وہ چاہے جو کچھ اول فول بکیں۔ اگر اس اصول میں کچھ بھی صداقت ہے کہ قانون سب کے لئے یکساں ہیں۔ تو کیوں نہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں آپ (ایڈیٹر ساقی) کی شان میں کل ایک قصیدہ پڑھ آؤں یا پھر اپنے ایک اور عزیز دوست کے گنج پر دو ایک ہاتھ مار آؤں۔

آج تک دلی ریڈیو اسٹیشن سے جتنی تقریریں ہوئیں میرا دعویٰ ہے کہ یہ تقریر ہر لحاظ سے معیار سے گری ہوئی اور ذلیل ہے۔ اور پھر کس کی تقریر؟ ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی۔ براڈکاسٹروں کے بادشاہ کی۔ ع۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

ایمانداری سے سوچئے آپ نے اپنی تقریر سے لوگوں کے دماغوں پر کیا اثر چھوڑا۔ یہی نا کہ افسر ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنی پوزیشن کا ارذل ترین فائدہ اُٹھایا۔ آپ کو کیا معلوم کہ غریب مسٹر لکھشانن ملازمت کے خوف سے خاموش ہو گئے۔ کیا قانونی حیثیت سے آپ نے اُن کی شہرتِ عام اور حیثیتِ عرفی کو شدید صدمہ نہیں پہونچایا۔ وہ اگر چاہیں تو آپ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہیں اور ہندوستان کے لاکھوں سُننے والے شہادت دیں گے کہ آپ نے اُن کی مونچھوں کا مذاق اڑا کر لوگوں کی نظروں میں اُن کو موجبِ تمسخر ٹھہرایا ——— یہ ہے ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی تقریر۔

بے شمار ہونہار براڈکاسٹروں کے لئے آپ کی تقریر مشعلِ ہدایت ہے بلکہ ترغیب ہے اس بات کی کہ وہ جیسی چاہے، موضوع سے جُدا اور خارج از بحث باتیں کہنے کے علاوہ اپنے دوستوں کے ساتھ مائیکروفون پر مذاق کریں۔ صد حیف! ع۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی تقریر سے سننے والوں کو اس کا پتہ چلے یا نہ چلے کہ "براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے" یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں ہو گئی کہ "ڈپٹی کنٹرولر ہونا کیا معنی رکھتا ہے"

آخر میں معذرت خواہ ہوں کہ اتمامِ حجت کے بعد دوبارہ آپ کو اِس ذلیل محکمہ اور اس کے ناکارہ افسروں کی نالائقی اور نافہم شناسی کی دردناک اُلجھن میں گرفتار کر رہا ہوں، لیکن کیا عرض کروں کہ سمجھ ہی کچھ ایسی موٹی ہے کہ آج تک باوجود عرق ریزی کوشش اس [illegible] محکمہ کی سیدھی کل کو نہ پا سکا۔

ع
ما طفلِ کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بارمی تواں دگر از سر گرفتہ ایم

راقم، ہم سخن فہم ہیں ساقی کے طرفدار نہیں

نقد و تبصرہ

کمال اتاترک۔ مترجمہ: ملیح آبادی

بیسویں صدی کے اس حیرت انگیز انسان ایشیا کے ہیرو اور ترکی کے مسیحا غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی یہ نہایت مفصل سوانح حیات ہے جو مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے "محمد محمد فیق" کی عربی تالیف سے اردو میں ترجمہ کر کے ہندوستانیوں کی بصیرت کیلئے ملک کے آگے پیش کیا ہے۔

"کمال اتاترک" کی لائف ان کی زندگی ہی میں دنیا کی ساری مہذب زبانوں میں لکھی جا چکی ہے لیکن اردو کی بدنصیبی دیکھئے کہ اس زبان میں اب تک ان کی کوئی مبسوط اور مستند سوانح عمری شائع نہ ہو سکی! البتہ اتاترک کے دو غیر ملکی سوانح نگار "ڈگوبرٹ" اور "آرم اسٹرانگ" ہندوستان کے انگریزی داں طبقہ میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں نے اتاترک کے کارنامے حیات جمع کرنے میں محنت بھی بہت کی ہے لیکن نہیں یہ دونوں بہرحال غیر ملکی، اور ان کا نقطۂ خیال بھی یوروپین تعصب سے بری نہیں کہا جا سکتا۔ ڈگوبرٹ سے تو بیشک ہمیں کوئی خاص شکایت نہیں لیکن آرم اسٹرانگ کی "گرے وولف" ان غیر ثقہ ریمارکس کی وجہ سے جو اس میں جگہ جگہ اتاترک کی ذات اور ان کی سیرت پر کئے گئے ہیں بہت بدنام کتاب ہے اور اسلامی دنیا میں اس کے خلاف بہت کچھ غم و غصہ کا اظہار بھی ہو چکا ہے۔ اس اعتبار سے مولانا ملیح آبادی نے ترجمہ کے لئے ایک ایسی عربی کتاب پسند کی ہے جس کا مؤلف ترک ہے! بادی النظر میں، ایک ترک سے بڑھکر جس نے ترکی کا انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور کون اتاترک کو دنیا سے متعارف کر سکتا ہے! لیکن ہمیں یہ دیکھکر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ ترک مؤلف صاحب جنہوں نے اس قدر قریب سے اتاترک کی شخصیت اور ترکی انقلاب کا مطالعہ کیا ہے اپنے علم اور مشاہدے کی بنا پر آرم اسٹرانگ کی تحقیق پر کچھ بھی اضافہ نہ کر سکے! بلکہ بعض ابواب تو انہوں نے جوں کے توں "گرے وولف" سے لیکر اپنی کتاب میں شامل کر لئے ہیں۔ اور انتہا یہ ہے کہ انہوں نے "بھیڑیے، بھورے بھیڑیے، صدر بھیڑیے اور افسر بھیڑیے" کے استعارے بھی بلا تامل قبول کر لئے جو آرم اسٹرانگ نے اپنی کتاب "گرے وولف" میں اتاترک کے لئے تضحیکاً استعمال کئے تھے!! انداز بیان بیشک خطیبانہ بلکہ بعض جگہ ڈرامائی، اور شاعرانہ ہے۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے مولانا ملیح آبادی مستحق مبارکباد ہیں۔ زبان نہایت صاف شستہ اور سلیس استعمال کی ہے اور انداز بیان بھی وہی قائم رکھا ہے جو مؤلف کا ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ جیبی۔ صفحات (۵۰۰) قیمت ۲؎

میری جدوجہد۔ مترجمہ: شانتی نارائن صاحب،

جرمنی میں اپنے مسلک (نازی ازم) کی تدریجی کامیابی کے متعلق اڈولف ہٹلر کی یہ خود نوشت داستان ہے۔ جسقدر حیرت انگیز اس کا سیاسی عروج ہے اس سے زیادہ دلچسپ اس جدوجہد کی روداد ہے جس سے یہ عجیب و غریب نتیجہ مترتب ہو سکا!

"میری جدوجہد" کو اصل میں نازی ازم کا پہلا صحیفہ کہنا چاہیے۔ اس لئے کہ سب سے پہلے اسی کتاب کے ذریعے اڈولف ہٹلر نے جرمنی میں باقاعدہ اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کی اور رفتہ رفتہ ساری جرمنی قوم کا زاویہ نگاہ بدل کر رکھ دیا۔

اس خود نوشت داستان جدوجہد میں ہٹلر نے نہ صرف ان حالات اور واقعات کا ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا ہے جو بالواسطہ نازی تحریک کے خالق کہے جا سکتے ہیں بلکہ اس نے جگہ جگہ اپنے ذاتی تاثرات بھی پوری صفائی اور بے تکلفی سے حوالۂ قلم کر دئے ہیں جن کے ماتحت وہ اس مسلک کی تبلیغ چاہتا تھا۔

اس میں نازی عقیدے کی تشریح بھی ہے اور وہ پروگرام بھی تمام و کمال موجود ہے جو ہٹلر نے آج سے پندرہ برس پہلے اپنی پارٹی کے لئے وضع کیا تھا اور جس پر آج بھی نازی پارٹی کاربند ہے۔

غرض نازی اصول اور عقیدے پر یہ کتاب نہایت عمدگی سے روشنی ڈالتی ہے اور اس سے خود ہٹلر کی شخصیت صحیح طور پر سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

شانتی نارائن صاحب نے اس کا اردو ترجمہ بھی بہت اچھا کیا ہے۔ عبارت صاف اور سلیس ہے اور انداز بیان بھی دلکش ہے۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ جیبی۔ صفحات ۳۶۵۔ مجلد جس پر خوبصورت کور بھی چڑھا ہوا ہے۔ قیمت ۴؎۔ میسرز نرائن دت سہگل تاجران کتب لاہور۔

غانِ حجاز — کسی قوم کے زوال کی انتہا اُس قوم میں احساسِ پستی کے فقدان کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں [م]تدراتے ترقی احساسِ پستی کا دوسرا نام ہے۔ اس احساس کی چنگاری [سلگا]نے والا، مردہ قالب میں رُوح پھونکنے والا، قومیت کے شیرازے [کو ی]کجا کرنے والا۔ اپنی قومیت کیلئے درخشاں ستارے سے کسی طرح کم [نہیں]۔ اقبال مرحوم کی ہستی تعارف کی شرمندہ احسان نہیں۔ اگر اہل [...]ہ ہٹلر اہلِ اٹلی مسولینی کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں تو اقبال عالم [اس]لام کے لئے اور خاص طور پر مسلمانانِ ہند کے لئے مشعلِ ہدایت [...]ر ہے۔ ممکن ہے کہ جرمن اور اطالویوں کی روز افزوں ترقی دیکھکر [...]میں مظالم کی تصویر دکھا دکھا کر بین الاقوامی نفرت پیدا کرنے میں [کام]یاب ہوں۔ مگر اقبال مرحوم تو اس کا بھی مجرم نہیں۔ ان لوگوں نے [تلوا]ر کے زور پر قوم کو بچایا، اور اقبال نے قلم کے زور پر۔ اسلام نہ کبھی [تلوا]ر کے زور پر پھیلایا گیا اور نہ اقبال نے اس کی کوشش کی۔ اسکی [ق]لم گذشتہ ایام کی یاد دلا کر خون کے آنسو ضرور رُلاتی ہے۔ مگر دوسر[وں کا خ]ون بہا کر اپنا فائدہ نہیں سکھاتی۔ 'ارمغانِ حجاز' مرحوم کی آخری [اد]بیاوی وراثت ہے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس پر تبصرہ اس کے تمام [کل]ام پر ایک بسیط مضمون ہونا چاہیے تھا۔

اقبال ایک شاعر کی حیثیت سے بین الاقوامی کیوں تھا؟۔ [ا]س کے کلام میں کیا ندرت اور پاکیزگی ہے؟ کیا اُردو اس کی مرہونِ [م]نت ہے؟ اس کے تخیل کی بادہ پیمائی کی انتہا کیا ہے؟ کیوں وہ گُل [و بلب]ل، شکوہ و شکایات کی حد سے بڑھ گیا؟ یہ سب سوالات ایک طویل [بح]ث کے باب ہیں۔ لیکن کیا اقبال ایک شہید کی طرح اپنی قوم اور مذہب [پر ف]دا ہو گیا۔ اس کا جواب 'ارمغانِ حجاز' ہے۔ ایک مسلمان کے لئے [زند]گی کی ابتدا لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ سے ہوتی ہے اور یہی اس کی [انتہ]ا ہے۔

اقبال اپنے معبود سے رازدارانہ ہمکلامی کرتا ہے۔ اسے اپنے [...]ہ پر ناز ہے۔ اگر وہ شوخ ہے اور بعض لوگوں کے خیال سے بیباک [تو ا]س عبدیت اُس کے ذرّہ ذرّہ میں پنہاں ہے۔ وہ تو سراسر سوز و [ج]ذب وعشق، میں ڈوبا ہوا ہے۔ دوسرے جز میں حضور رسول اللہ [صلی ا]للہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ یہ حصہ خود آپ اپنی تفسیر ہے۔ پھر [ملتِ ا]سلامیہ کیلئے پیغامِ زندگی دیتا ہے، قومی اور ملی مسائل کو حل کرتا [ہے ا]ور دورِ حاضر کی ساحر گری کا طلسم توڑتا ہے۔ رہا یہ کہ ضربِ کلیم میں بہت [کچھ ک]ہہ چکا تھا، پھر بھی ارمغانِ حجاز میں ان موضوعات پر لکھا۔ یہی اُستاد[ی] ہے، وہ اپنے شاگرد کو بار بار سمجھاتا ہے۔ یہ اوجِ خیال اور کمالِ بیان ہے کہ مؤثر سے مؤثر پیرائے میں پھر لکھتا ہے۔ ورنہ اقبال کو نام و شہرت اور تن کی دنیا "سود و سودا مکر و فن" سے کیا غرض۔ وہ تو "فقیری میں امیر" تھا۔ یومِ اقبال، پر ایک ہزار کا چیک بطور تواضع موصول ہونے پر سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد کو مخاطب کرتا ہے۔

میں تو اس بارِ امانت کو اُٹھاتا سرِ دوش
کارِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اُس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

ہم سمجھتے ہیں یہی کچھ ہے متاعِ فقیر، اگر اہلِ اسلام کا قافلہ اس دولت کو اقبال کی آرزو کے مطابق وُٹا دے ٹھکانے لگا دے لے، لُوٹ لے اور اپنے دل میں جگہ دے تو وہ چیز جس نے اسلام کا چار دانگ ڈنکا بجوا دیا تھا پھر ادبار کے مارے مسلمانوں کو حاصل ہو جائے۔

ارمغانِ حجاز کا حجم ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ بیشتر حصہ فارسی کلام کا ہے۔ کتابت عبدالمجید پروین رقم نے کی ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔ قیمت مجلد ۳ ہے۔ بلا جلد ۲۔ ملنے کا پتہ:۔
شیخ مبارک علی تاجر کتب۔ اندرون لاہوری دروازہ۔ لاہور۔ اور
شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور۔ "ع"

مضامینِ فراق — سید ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم کی بے مثل انشاپردازی سے ساقی کے ابتدائی دور کے پڑھنے والے واقف ہیں۔ افسوس کہ اُن کے اسٹائیل میں دو سطریں لکھنے والا بھی اب کوئی نظر نہیں آتا۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی نے "مضامینِ فراق" کے نام سے مرحوم کے ۱۹ مضمون شائع کئے ہیں۔ جو حضرات دلّی کی ستھری ستھری زبان کے نمونے دیکھنا چاہیں اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ نمونہ کے طور پر دو سطریں دیکھئے:۔

"جب صبح کے وقت شبنم آفتاب کے سلام کے لئے حاضر ہوئی تو آفتاب نے کہا: کیوں ری ہرجائی، ہری چُگ، تو رات بھر عالمِ سفلی کی سیر کرتی ہے اور نت نئے تماشے دیکھتی ہے مگر کبھی اپنے بھولے مُنہ سے ہمیں کوئی قصہ نہیں سُناتی!"
اس کے بعد شبنم کا جواب ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتابت، طباعت اچھی، کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔
چمنِ اُردو بکڈپو۔ اُردو بازار۔ دہلی
اور کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار۔ دہلی "ش"

فلکش — سید ابوطاہر داؤد صاحب کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بیشتر مضامین رسالہ ساقی میں وقتاً فوقتاً شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ سید ابوطاہر داؤد صاحب مخصوص طرزِ نگارش کے مالک ہیں جن میں دقتِ نظری کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور پاکیزہ ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ پیشِ نظر مجموعہ کے جملہ مضامین اُن کے اسٹائل کی تمام تر کمال خوبیوں کے حامل ہیں۔ صفحات ۲۵۶ مضبوط جلد۔ قیمت عہ؎ ملنے کا پتہ جامعہ بک ڈپو۔ دہلی۔

قصرِ منزل — جناب عبدالشکور خاں صاحب۔ بی۔ اے، بی ٹی (علیگ) کی سیاحتِ کشمیر، شمالی ہند، بنگلور اور دکن سے متعلق ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔ اداے بیان سلیس اور دلنشیں ہے۔ مشہور مقامات کی متعدد عکسی تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ۔ قصر الادب۔ نائی کی منڈی۔ آگرہ

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ — مصنفہ عبدالوحید خانصاحب بی۔ اے۔ نہایت مفید اور بکار آمد کتاب ہے جس میں فاضل مصنف نے مؤثر طریقے پر مسلمان حکمرانوں کی تباہی سے لیکر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی آمد اور اس کے بعد تک کے حالات و کوائف قلمبند کئے ہیں۔ اور کمال صفائی اور بے لوثی سے ثابت کر دکھایا ہے کہ کانگریس ہندوستان کی صحیح نمائندہ جماعت نہیں بلکہ اوائل سے لیکر اب تک در پردہ اور اکثر علی الاعلان مسلمانوں کا گلا کاٹنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں نے اپنے ملک کی آزادی میں جو بیش بہا قربانیاں کی ہیں اُن کا مفصل و ولولہ انگیز بیان اس مختصر لیکن نہایت ہی مفید کتاب میں موجود ہے۔ فی الحقیقت یہ کتاب [illegible] کے سیاسی لٹریچر میں ایک بیش قدر اضافہ ہے۔ مصنف کی کاوشیں [illegible] سے زیادہ اُن کا وہ صحیح جذبۂ قومیت پرستی جس کے تحت یہ کارنامہ [illegible] ایالائقِ ستائش ہے۔ ہر سمجھدار مسلمان کا اس کتاب کے مطالعہ سے [illegible] ہونا از بس ضروری ہے۔ قیمت ۸؎

ملنے کا پتہ۔ عبدالوحید خانصاحب بی اے۔ سٹھلہ ضلع میرٹھ ۔۔ ۱۔ن۔

[illegible] اس نام کی ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی جو مصری ادیب خلیل [illegible] کی تصنیف ہے۔ اور سید بشیر ہندی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے [illegible] ہوتے ہیں اور طرزِ نگارش کے اندازِ خاص کے اعتبار سے بہت [illegible] جبران کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب میں پاگل کی کہانیاں [illegible] لیکن خلیل جبران کا پاگل فلسفی کا دماغ اور شاعر کی زبان رکھتا ہے۔ [illegible] مجموعہ میں [illegible] چھوٹے چھوٹے ادب پارے [illegible] لائق ہیں کہ انہیں [illegible]

ساقی کے چند خاص نمبر

رعایتی قیمت پر

نمبر	قیمت
سالنامہ ۱۹۳۴ء	۱۲ر
״ ״ ۱۹۳۵ء	۱۲ر
״ ״ ۱۹۳۶ء	۱۲ر
״ ״ ۱۹۳۷ء	۱۲ر
״ ״ ۱۹۳۸ء	عمہ
افسانہ نمبر ۱۹۳۵ء	۸ر
״ ״ ۱۹۳۶ء	۱۲ر
״ ״ ۱۹۳۹ء	۱۲ر
״ ״ ۱۹۳۰ء	۸ر
ظریف نمبر ۱۹۳۳ء	۶ر
״ ״ ۳۴ء	۶ر
״ ״ ۳۵ء	۶ر
״ ״ ۳۶ء	۶ر
چغتائی نمبر	۸ر
دانتے کا جہنم	۶ر
مکمل فائل ۱۹۳۵ء	للعمہ
״ ״ ۱۹۳۶ء	للعمہ

فاؤسٹ — مترجمہ شاہ احمد۔ بی۔ اے (آنرز) دہلوی۔ فاؤسٹ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم و سحر کن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ شہرۂ آفاق شاعرِ المانیہ گوئٹے نے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفۂ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں [illegible] کا وہ خواب دیکھئے جو ایک وقت سہانا بھی ہے اور بھیانک بھی [illegible] کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ [illegible] عشق [illegible] اور موت کی یہ داستان رنگین کہانی کی صورت میں شائع [illegible]

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ چھ آنے

چندہ سالانہ ممالک غیر سے
۱۲ شلنگ۔ نمونے کا پرچہ
مفت بھیجا جاتا ہے

جُرعات

جلد ۱۹ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء | نمبر ۳

خریداران ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر اور اپنا پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمایا کریں۔ تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

ساقی کی زیرِ نظر اشاعت میں ترقی پسند ادب کا حصہ زیادہ شامل ہے۔ جس میں افسانے ایسے ہیں جن میں زندگی کی اینٹ زندگی کی گئی ہے۔ حسن و عشق کی کہانیاں بہت رنگین خواب تو دکھا سکتی ہیں لیکن زندگی کا دکھ درد دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں نہیں کھول سکتیں۔ رومانی لٹریچر ہمیں بادلوں کی سیر کرا سکتا ہے۔ ادبِ جدید کا تقاضا ہے کہ کانٹوں کو بھی دیکھا جائے۔ صرف محبت ہی ایک ایسا جذبہ نہیں ہے جو ہمارے شعر و ادب کا موضوع بنا ہے۔ بھوک، افلاس، نفرت، ظلم، عیاری، مکاری، غرور، چوری، بغاوت وغیرہ بھی افسانوں کے موضوع بن سکتے ہیں۔ ترقی پسند ادیب ان ہی کی تلاش کرتا ہے اور زندگی کے وہ رخ پیش کرتا ہے جو ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ ہمارے سیاسی اور سماجی خیالات بدل گئے ہیں۔ اگر ہمارے ادیب کو زندہ رہنا ہے تو اسے بھی ان کے ساتھ ساتھ بدلنا پڑے گا۔ قدامت پسند حضرات کو یہ تبدیلی شاق گزرتی ہے اور وہ مخالفت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کسی لائق ادیب نے میر و غالب وغیرہ کے خلاف مضامین لکھے تو ہمارے شعرا ناراض ہو گئے۔ کسی ترقی پسند ادیب نے ذرا آزادی سے کچھ لکھا تو بعض حضرات کو جلال آ گیا۔ کسی نے کانگریس کے کارناموں سے اختلاف کیا تو ورکر صاحبان نے ساقی کے بائیکاٹ کی ٹھہرا دی۔ کسی نے اپنی نظم میں خدا سے شکوہ کیا تو بعض مسلمانوں نے اُس کو کافر گردانا بلکہ اس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ غرض ذرا رواداری نہیں۔ ذرا انصاف نہیں۔ معترض ہر بات پر اعتراض کرنے کے لئے مستعد ہے۔ ع

نیشِ عقرب نہ پئے کین است مقتضائے طبیعتش این است

ظاہر ہے کہ ساقی سب کو خوش نہیں کر سکتا تاہم ناظرینِ ساقی مطمئن رہیں کہ ہم صرف وہی لٹریچر پیش کرتے ہیں جس کی ضرورت ہے۔ اور جسے ہم مفید سمجھتے ہیں۔ ناظرینِ ساقی ہم پر بھروسہ کرتے ہیں اور ہم اُن کی توقعات زیادہ سے زیادہ پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاہد

سانحۂ ارتحال

ناظرینِ ساقی میں یہ خبر رنج و غم سے سنی جائے گی کہ ساقی کے مہتمم جناب اشتیاق احمد صاحب چشتی دہلوی کی والدہ نے ۱۴ فروری کو رحلت فرمائی۔ مرحومہ خدا بخشے بہت سی خوبیوں والی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔ جناب اثر کاظمی نے تاریخِ وفات کہی ہے جو ذیل ہے:

اُمِّ شفیق چشتیِ غمگین و سوگوار — تھیں جن کے دم سے رونقیں گلزارِ چشت میں
مدت سے تھی بھری ہوئی سر میں ہوائے قدس — مشکل تھا سانس لینا بھی دنیائے زشت میں
اللہ رے کرم کہ عزیزوں نے ہاتھوں ہاتھ — پہونچا دیا ہے روضۂ عنبر سرشت میں
لکھا یہ سالِ فوت اثرِ دردمند نے — یا رکھ کے نیند آ گئی ہے جا کر بہشت میں

۱۳۵۰

مداد کی آبادی بیس لاکھ تھی۔ وہ چالیس شہروں کا مجموعہ تھا۔ اس کا پھیلاؤ ایک
رف بیس میل اور دوسری طرف چھ میل سے کم نہ تھا۔ یہاں ۶۵۰۰۰ حمام تھے۔
رعام سرگرمی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ آدمی ہر روز
شتیوں میں دریا کو عبور کرتے تھے خلیفہ منصور کے بیت المال میں اٹھتر
روڑ درہم جمع تھے۔ ہارون کی وفات پر خزانے میں نوّے کروڑ درہم تھے
یک درہم تقریباً ۵ ر کے برابر ہوتا تھا) مقام سراف میں ایک شخص کا سرمایہ
کروڑ درہم تھا۔ وہ دریائی تجارت کرتا تھا۔ ایک تاجر نے ایک وقف کیلئے
لاکھ دینار وقف کئے۔ (ایک دینار تقریباً پونے آٹھ روپے کے برابر ہوتا
تھا۔)

چارلز اومین اپنی کتاب "انگلستان نارمن فتح سے پہلے" میں لکھتا
ہے کہ اکسفورڈ کے عجائب خانے میں ایک عجیب و غریب سکہ ہے جس کے
ایک طرف Offa Rex کندہ ہے اور دوسری طرف بغداد کے دو
ر گروں کا نام عربی حروف میں لکھا ہے۔ یہ بادشاہ آوفا انگلستان میں آٹھویں
صدی عیسوی میں مرشیا کا حکمران تھا۔ یعنی انگلستان کے سکے ڈھلنے کیلئے
باہر بھیجے جاتے تھے

اُدھر ہسپانیہ میں قرطبہ بھی ایک بے نظیر شہر تھا اس کی آبادی
لاکھ سے زائد تھی۔ اس شہر میں ۳۰۰۰ مسجدیں ۔۔۔۔۔ محل اور عالیشان
ن، دو لاکھ متوسط لوگوں اور غریبوں کے گھر اور سات سو حمام تھے۔
اکی شہرت جرمنی کے پرلے سرے تک پہونچ گئی تھی۔ سیکسن نن روس
ما اسے "زینتِ عالم" کا لقب دیتی ہے۔ مغربی سیاح بیان کرتے ہیں
ات کو انسان دس میل تک اس کے چراغوں کی روشنی میں چل سکتا
اس کے سات سو برس بعد تک لندن کے کوچوں میں ایک لیمپ بھی
۔ قسم قسم کی دکانیں اور نمائش گاہیں گویا حال کے یورپی شہروں کا نمونہ
گھروں میں گرمی میں زمین دوز راستوں سے ٹھنڈی اور خوشبودار
میں آتیں۔ کمروں کی آرائش کے لئے ہاتھی دانت کی میزیں، مرصّع
نپائیاں ایرانی قالین اور بلور کے کام کئے ہوئے پھولدان اور بیسیوں
یسی چیزیں تھیں۔

عبدالرحمٰن الناصر کی آمدنی یورپ کی ساری حکومتوں کی مجموعی
ں سے بڑھکر تھی جس سے مسلمانوں کی وسیع تجارت کا بھی اندازہ ہو
ہے۔ ہسپانیہ کے مسلمانوں کے پاس ایک ہزار تجارتی جہاز تھے اشبیلیہ
ں کی آبادی تین لاکھ تھی چھ ہزار ریشم کے کام کرنے والے تھے، اور
یہ کے آس پاس زیتون نکالنے کی ایک لاکھ چکیاں تھیں۔
علوم و فنون کی ترقی اور علم کی قدردانی جیسی مسلمانوں کے
عہد میں ہوئی دنیا کی کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔

الحاکم ثانی کے کتب خانہ میں چھ لاکھ جلدیں تھیں اور ان کی فہرستیں
ہی ۴۴ جلدوں میں تھیں۔ قاہرہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ قلمی نسخے تھے۔
جن کی جلدیں نہایت دیدہ ریزی اور کمال عرق ریزی سے تیار کی گئی تھیں
طلباء کو قاہرہ میں عاریتاً کتابیں لینے کی عام اجازت تھی۔ یورپ کی اس وقت
کی علم پسندی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ زمی مینز رمیل لاسقف
نے غرناطہ کی اسی ہزار کتابوں کو شہر کے چوک میں ایک جاہل تر گروہ کے سامنے
جلوا دیا اور اہل یورپ نے اسے سراہا کہ اس نے کفر کی بیخ کنی کرنے میں مسیحیت
پر بڑا بھاری احسان کیا ہے۔ کتابوں کو جمع کرنے اور علوم کو ترقی دینے کا
عربوں کو اس قدر خیال تھا کہ جب کوئی امیر خودمختار ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے
کتب خانے عوام کے لئے کھول دیتا اور عالموں اور حکیموں کی محفلیں جما کر
اپنے رقیبوں اور مدعیوں کے مقابلے میں علماء سے داد چاہتا۔ گبن کہتا ہے
کہ ایک وزیر کی نسبت مذکور ہے کہ اس نے دو لاکھ دینار ایک کالج کے قائم
کرنے کے لئے دیئے اور بعد میں اس کے انتظام کے لئے وہ پندرہ ہزار
دینار یعنی ایک لاکھ سے زیادہ روپیہ سالانہ دیتا رہا اس درسگاہ میں ۶۰۰۰
طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ ڈریپر نے لکھا ہے کہ ایک عالم نے اس وجہ سے
سلطان بخارا کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا کہ اس کی کتابیں لادنے
اور لے چلنے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی۔ اس زمانے کے
علما محض گوشہ نشیں نہ ہوتے تھے۔ مشہور عرب مؤرخ ابن خلدون پہلے طونس
سے فیض گیا۔ پھر غرناطہ، پھر پیڈرو ظالم کی طرف سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ پھر قاہرہ گیا پھر
مشرق کی طرف چل دیا یہاں تک کہ ہم اسے تیمور کی لشکرگاہ میں دیکھتے ہیں۔
سنہ ۱۴۰۶ء میں وہ قاہرہ میں ۷۴ برس کی عمر میں مر گیا۔ ہسپانیہ میں اُن دنوں
ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا اور یورپ کے جو لوگ پُرانے یا نئے علوم میں دسترس
حاصل کرنا چاہتے تھے وہ بلا تکلف ہسپانیہ کے دارالعلوموں میں آتے اور تحصیل
علم کرتے راجر بیکن عربوں کا شاگرد تھا، جربرٹ جس کے علم و فضل کا یورپ
میں اس قدر رعب تھا کہ وہ شیطان کا شاگرد سمجھا جاتا تھا اور جس نے
عربی ہندسوں کو رواج دیا اور پہلے پہل گھڑیاں بنائیں، وامزبری کہتا ہے
کہ اس کا سارا علم "عربوں سے چرایا ہوا تھا" مورخوں کی "تاریخ دنیا" میں
لکھا ہے کہ اطالوی لینارود، ہسپانوی ریاں، انگریز راجر بیکن، فرانسیسی آرنلد
بلکہ پندرھویں صدی سے پہلے کے سارے کے سارے یورپین مصنفین نے
سائنس کے جملہ علوم میں جو کچھ بھی لکھا وہ تمام یا عربوں کی کتابوں کی حرف
بہ حرف نقل تھی یا کچھ حاشیہ آرائی کرکے انہیں پیش کیا گیا تھا۔ قرطبہ کا
دارالعلوم قاہرہ کے ازہریہ اور بغداد کے نظامیہ سے کچھ کم نہ تھا۔ ہر شعبہ

م کے مدرس اپنے اپنے شعبے کی خلعتیں پہنے بحث میں شریک ہوتے۔ ن لےلین پول کہتا ہے کہ انگریزی دارالعلوموں کے جبّے اور قبائیں (robes & gowns) انہیں عربی دارالعلوموں سے لئے گئے۔ ن درس گاہوں کے دروازوں پر یہ حروف کندہ ہوتے تھے: "دنیا ر چیزوں سے قائم ہے: حکیموں کا علم، بادشاہوں کا عدل، پاکبازوں کی ادت اور بہادروں کی شجاعت۔"

یونان کا علم و حکمت عربوں ہی کے ذریعہ سے یورپ میں پہونچا۔ بری کہتا ہے کہ عربوں کا نام تاریخ میں سے مٹا دو اور پھر دیکھو کہ کس طرح لم ادب کی نشاۃ الثانیہ کئی صدیاں پیچھے جا پڑتی ہے۔ موسیو سدیو کہتے یں کہ "عربوں کے وہ علم و ادب کے بھرے ہوئے خزانے، اُن کی ذکاوت و لیت کی لاتعداد تصنیفات، اُن کے طبعی اکتشافات و ایجادات یہ سب اتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اُن کے دماغ اِن عقلی مساعی میں روز و شب منہمک ہتے تھے۔ اُن کے ان کارناموں کو دیکھ کر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ علم و فن میں ہمارے استاد تھے۔ ایک طرف اُنکی قرونِ وسطیٰ تواریخ، اُنکے بحری و بری سفر، اُنکی سوانح عمریاں اور دوسری طرف اُنکی بے مثال صنعت و حرفت اور ایک ایسی طرز تعمیر جو نئے تصورات سے معمور ہے، یہ باتیں ہیں جو اُنہوں نے ہمارے لئے ترکے میں چھوڑیں اور ہم ان سے مدتوں متمتع ہوتے رہے۔"

عربی تمدن اور عربی زبان کے اثر کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ tournament (دوران) squadron (عسکر) arsenal (دارالصناعۃ) tariff (تعریف) admiral (امیرالماء) اور سینکڑوں اور ایسے الفاظ یورپ والوں نے عربوں ہی سے سیکھے۔ ایک فرانسیسی مصنف کہتا ہے کہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ردیف اور قافیہ یورپ میں عربوں ہی سے آیا۔

عربوں نے یورپی تمدن کے ایک ایک شعبے پر اپنا اثر چھوڑا ہے، قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں یورپ کی جو حالت تھی اُس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ یورپ کے تمدن کی صرف ایک مثال کافی ہے۔ جادو پر عام اعتقاد تھا اور جنیوا میں تین ماہ میں پانچ سو "جادوگر" اور "جادوگرنیاں" جلادی گئیں۔ اُدھر ہسپانیہ میں ایک باقاعدہ سلطنت قائم ہونے سے اور اِدھر صلیبی لڑائیوں کی وجہ سے عرب تمدن اور عرب نظمِ حکومت کا گہرا اثر یورپ پر پڑا۔ اموی خلفا کے زمانے میں اور اُن کے بعد ہسپانیہ کی حکومت متعدد شعبوں میں تقسیم کی گئی اور اس میں شک نہیں کہ یورپین قوموں نے تقسیمِ حکومت کے بعض اصول انہیں سے اخذ کئے۔ بلکہ سید امیر علی کا خیال ہے کہ یہ تقسیم بعض حیثیتوں سے آج کل کی حکومتوں کی ترتیب سے بڑھ چڑھ کر تھی۔

عرب تمدن کے معاشرتی و اخلاقی اثرات کا یہ حال ہے کہ غریب لوگوں بالخصوص مزدوروں اور صناعوں کے حقوق، عورتوں کی مناسب آزادی، بہادرانہ برتاؤ، سپاہگری کا قانون (knight-hood)، نرمی، انکسار، صاف گوئی، راست بازی، رواداری، پھر گھروں کی آرائش میز کرسیاں کانٹے چمچے نیپکن رومال، رات کو سوتے وقت کپڑے بدلنا (قماش النوم)، اکثر غسل کرنا، چوگان، ٹینس (لعب الکرہ)، کرکٹ، شطرنج، گھڑ دوڑ، پھر حفظانِ صحت، کوچوں کی صفائی اور تمدن کی اور بیسیوں باتیں یورپ نے عربوں ہی سے سیکھیں

مذہبی اثرات کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ لوتھر اور دوسرے مصلحین کی پراٹسٹنٹ اور دوسری اصلاحی اور مذہبی تحریکات جنہوں نے یورپ کی کایا پلٹ دی اور اس میں آزادی کی روح دوڑا دی اسلام ہی کے اثر سے ظہور میں آئیں، چنانچہ ڈریپر اسلام کو "جنوب کی اصلاحی تحریک" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اگر مسلمان یورپ میں نہ آتے تو یورپ آج تک انتہائی رومن کیتھلک بت پرستوں کا شکار رہتا۔

عقلی اثرات میں کس کس علم کا ذکر کیا جائے۔ کیمیا، طب، جراحی، ہیئت، جرِّ ثقیل، طبقات الارض، جغرافیہ، تاریخ، اعداد و شمار، حکایات و امثال، کتب رجال، فنِ سوانح نگاری، دائرۃ المعارف یعنی انسائکلوپیڈیا، لغات، ریاضی، موسیقی کونسا علم ہے جو یورپ نے ان سے اخذ نہیں کیا۔ خود یورپین مؤرخین کے بیان کے مطابق کاغذ، قطب نما اور بارود جن سے تمدن میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا، دراصل عربوں کی ایجادیں تھیں۔ چاول، نیشکر، روئی کا استعمال بھی انہیں سے یورپ نے سیکھا۔ یورپ کے پہلے طبی کالج کی بنا عربوں کے ہاتھوں صقلیہ کے شہر سلرنو میں پڑی یہ صدیوں تک یورپ والوں کا مرکزی طبی مدرسہ بنا رہا۔ بے ہوشی کی دوا دینا، ریشمی ٹانکوں کا استعمال، جاری خون کو ٹھنڈے پانی سے بند کرنا یہ سب انہیں کی ایجادیں ہیں مشہور طبیعیات داں ابنِ ہیثم نے انعکاس، انعطاف، رویت قریب نظر وغیرہ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ فضا کی گہرائی ۵۱ ۱/۲ میل تک ہے۔ اسی حکیم کے متعلق ڈریپر کہتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یورپ میں حیوانات کی تدریجی ترقی یعنی مسئلہ ارتقا کی تلقین کی۔ بحری سفروں کا اُن کو اسقدر شوق تھا کہ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ امریکہ تک پہونچ چکے تھے۔ فاطمی خلفا نے اطالوی بحری قزاقوں کے جواب میں ایک طاقتور بیڑا تیار کیا تھا جس سے اُنہوں نے پہلے اطالیہ کے تھوڑے سے حصے کو زیر نگیں کیا اور پھر ۹۶۶ء میں صقلیہ پر قبضہ جما لیا۔ ہیئت سے ان کو اتنی دلچسپی تھی کہ بقول ڈریپر

"عربوں نے اپنا نام آسمان کے ستاروں پر لکھ رکھا تھا" عربوں کی موسیقی کے متعلق دو ایک باتیں دلچسپ ہیں۔ عربوں ہی سے یورپ نے موسیقی کو بند سولی تیا قلم بند کرنا سیکھا۔ کئی ساز ان کی ایجاد ہیں۔ لفظ "ہے تج بہ گ عربی" "العود" سے ماخوذ ہے۔ یورپ کی موسیقی پر عربوں نے خاصہ اثر ڈالا۔ دیارو کہتا ہے کہ میں نے ماسکو میں کریملن کے میناروں کے نیچے انہیں راگنیوں کو سنا جو میں اُس سے پہلے الحمرا کے باغوں میں سن چکا تھا۔ دونوں جگہوں میں ان لوگوں کی زبان سے میں نے عربی موسیقی کی زندہ گونج سنی۔ تعمیرات میں مسلمانوں کا کارنامہ آج تک دُنیا کے سامنے ہے۔ یورپ میں بڑی بڑی تعمیروں کے موقع پر عموماً عربوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ چنانچہ پیرس کے مشہور گرجا نوتر دام کی تعمیر کے وقت عرب میر عمارت بلائے گئے تھے

ایسی تھی اسلامی تہذیب اور ایسے تھے اُس کے اثرات۔ یہ محض چند اشارے ہیں۔ اس کے پورے بیان کے لئے اُن ہزاروں لاکھوں کتابوں کو دیکھو جو مسلمانوں نے اپنی یادگار چھوڑیں، اُن سینکڑوں تصنیفات کو پڑھو جو خود انصاف پسند یوروپین مصنفین نے لکھی ہیں اور جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا نعرہ بلند نہ ہوتا، اگر اس کی تہذیب یوں اپنا کام نہ کرتی تو نہ یورپ کا تمدن اپنے موجودہ کمال پر پہونچتا اور نہ دُنیا اس طرح آزادی اور جمہوریت اور اشتراکیت کے اصولوں سے واقف ہوتی۔

جوں جوں اسلام کے دورِ اوّل کا روحانی جذبہ کمزور پڑتا گیا دُنیاوی جاہ و جلال کی خواہش بڑھتی گئی۔ جمہوری اصول بالائے طاق رکھے گئے، جماعتوں کا فرق نمایاں ہوتا گیا، ایثار کی جگہ خود غرضی نے لے لی۔ عیش و عشرت نے اکثر بہادر سپاہیوں کو آرام طلب امیر بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلمان روز بروز اپنے اسلامی مرتبے سے گرتے گئے اور قدرت کے قانون کے مطابق اُن کے زوال کی صورتیں پیدا ہوتی گئیں۔

نواب محسن الملک نے مسلمانوں کے تمدن کے یہ اسبابِ تنزل بیان کئے ہیں۔

اوّل، خلافت کا جمہوری سے شخصی سلطنت ہوجانا اور خلفا اور سلاطین کا خود مختار ہوکر شریعت کے احکام کا پابند نہ رہنا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک خلیفہ تھے حضرت علیؓ کہ اپنے بھائی عقیل کو ایک درم حصۂ معینہ سے زیادہ نہ دیا اور ایک خلیفہ وہ تھے کہ رکاب سے پاؤں نکالنے کے اوّل ایک صوبے کی آمدنی خوشامد کرنے والوں کو بخش دی۔ ایک خلیفہ تھے حضرت عمرؓ جب اُن کے پاس روم کا سفیر آیا تو زمین پر فرش تک نہ تھا اور ایک تھے خلیفہ مقتدر باللہ جن کی جلو میں سات ہزار خواجہ سرا اور جن کی ڈیوڑھی پر سات ہزار دربان اور جن کے محل میں ۳۸ ہزار مشجر زربفت کے پردے پڑے تھے۔ ان بعد کے حکمرانوں کی رعایا کا مزاج بھی ویسا ہی ہوگیا۔ مذہبی جوش اور دلی ولولہ دولت کی افراط سے سرد پڑ گیا اور وہ محنت کے بجائے دولت کے خواہاں ہوگئے۔

مسلمانوں کے زوال کا دوسرا سبب اسلام میں اختلاف کا پیدا ہونا اور مسلمانوں کے متفرق فرقے ہوجانا تھا۔ اکثر آفتیں جو مسلمانوں پر نازل ہوئیں اُس کا سبب یہی تھا۔

تیسرا سبب مسلمانوں میں قومی آزادی کا نہ ہونا تھا جس سے وہ خود مختار بادشاہوں کے غیر محدود اختیارات کی روک تھام کرتے۔

چوتھا سبب تھا تعلیم و تہذیب کی ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہنا۔ ایک بادشاہ کے عہد میں روم اسکندریہ اور ایران سے صدہا اونٹ کتابوں سے بھرے ہوئے چلے آرہے ہیں، ترجمہ ہورہا ہے، فلسفہ و حکمت کا بازار گرم ہے۔ تعلیم کی راہیں کھلی ہیں۔ دوسرے کے زمانے میں سارا دفتر ہی الٹا نظر آتا ہے۔ تحصیلِ حکمت پر کفر و الحاد کے فتوے جاری ہیں، کتابیں جل رہی ہیں، حکیموں پر کوڑے پڑ رہے ہیں۔ غرض اتنی آزادی نہ ملی کہ دماغی ترقیوں کا سلسلہ مسلسل طور پر جاری رہ سکتا۔ اُدھر تقلید کی عادت نے عوام کو تحقیق کا شوق نہ دلایا۔

پانچواں سبب غلط مذہبی خیالات تھے۔ یہ سب سے بڑا سبب تھا مسلمانوں کے دین و دُنیا کا اور علم و تہذیب کے زوال کا۔ پاک مذہب کی پاک تعلیم کو جھوٹے توہمات اور رسموں نے آکر مکدر کر دیا۔ سچا اسلام ایک فطری مذہب تھا جس کے معنی تھے کہ انسان اُس استعداد کو کام میں لائے جو خدا نے انسان میں رکھی ہے۔ یہی استعداد ہے عقل، یہی ہے ایمان۔ امام غزالیؒ نے ایمان کی یوں تعریف کی ہے اَلْاِیْمَانُ مَعْرِفَةُ الْاَشْیَاءِ عَلٰی مَاھِیَ عَلَیْہِ (ایمان ہے چیزوں کی ماہیت کو پہچاننا) اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَۃِ الْاِسْلَامِ (ہر شخص فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے) یعنی "کوئی چیز جو خلافِ فطرت ہو اور انسان کی دماغی قوتوں اور روحانی خوشیوں اور دُنیاوی ترقیوں کو روکے اسلام اس کا کبھی حامی نہ ہوگا"۔ مسلمان فقط اپنی بہادری اور شجاعت پر نازاں رہے اور زمانے کی تبدیلی کا اندازہ نہ کرسکے۔ سو دنیا میں وہ ہر جگہ ہر طرح نیچے ہی نیچے گرتے گئے۔ اپنی کوتاہیوں کو انہوں نے قسمت کے سر تھوپا اور آپ غفلت کی نیند سو رہے، وہ اپنی کاہلی کے باعث اسلامی اصولوں پر جدید حالات کی روشنی ڈالنے سے قاصر رہے۔

اسلامی شرع و قوانین کے جامد ہوجانے کی یہ وجوہ بیان

لئی ہیں۔ اوّل یہ کہ عباسیہ سلطنت کے شروع میں جب یونان کے فلسفے کے اثر سے عقلیت کی تحریک پھیلی اور مسائلِ دین میں اختلاف پیدا ہوا تو قدامت پسندوں نے شریعت کی قیود کو اور سخت کر دیا دوسرے راہبانہ تصوف کے اثر سے جو زیادہ تر غیر اسلامی فضا میں پھولا پھلا بعض نہایت قابل مسلمان عملی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے اور نظامِ شریعت معمولی لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا جن کی عوام اندھا دھند تقلید کرنے لگے۔ تیسرے تیرھویں صدی کے وسط میں بغداد کی تباہی نے اصلی اسلامی تمدن کے ساتھ اسلامی فکر اور اسلامی اجتہاد کا بھی خاتمہ کر دیا۔

۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کے بعد اسلامی تمدن کا مشرق میں اور ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کی تسخیر کے بعد مغرب میں خاتمہ ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ ہسپانیہ سے مسلمانوں کے اخراج سے پہلے ہی ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے مسیحیت کے ہاتھ سے قسطنطنیہ کا شہر چھین لیا اور اس کے بعد انہوں نے ۱۵۲۹ء میں وی آینا کا محاصرہ کر لیا۔ اور بحر روم میں لیپانٹو کی بحری جنگ ۱۵۷۱ء تک انکی بحری سطوت کا ڈنکا بھی بجتا رہا لیکن حق یہ ہے کہ ترک محض حملہ آور فاتح تھے۔ وہ اسلام کے نام لیوا ضرور تھے لیکن وہ حقیقی اسلامی تہذیب کے علم بردار نہ تھے مغرب میں قرطبہ کی عظمت کے مٹ جانے کے بعد بقول شخصے "ترک اور قرطبہ نہ بن سکے"۔ اس کے بعد مسلمانوں کی شان شوکت کے جو نظارے دنیا نے دیکھے اُن کو ہم اسلام کے نام میں فخر سے پیش نہیں کر سکتے۔ وہ ایسے ہی کام تھے جیسے تاریخ کی آنکھوں نے اور ملکوں میں اور قوموں کو کرتے دیکھا لیکن اسے قاعدہ کلیہ نہ سمجھنا چاہیئے مثلاً ہندوستان کو ذلت سے نکالنے میں مسلمان حکمرانوں نے نوعِ انسان کی بڑی بھاری خدمت انجام دی، جیسا کہ بعض ہندوؤں نے اعتراف کیا ہے۔

تیرھویں صدی کے شروع سے مسلمانوں کی اخلاقی پستی کے باعث اسلام کی اصلی قوت روز بروز کمزور پڑتی گئی اور پانچ صدیوں تک یہی انحطاط کی حالت برقرار رہی۔ گو اسی زمانے میں اُدھر مغرب میں ترکوں نے اور اِدھر مشرق میں پٹھانوں اور ایرانیوں اور مغلوں نے اپنی فوجی طاقت کی بنا پر اسلامی جھنڈا دنیا کے سامنے بلند کئے رکھا۔

پھر جب اٹھارھویں صدی کے شروع میں اُدھر ترکوں کی اور اِدھر مغلوں کی طاقت سرنگوں ہونے لگی اور ایسا معلوم ہوا کہ اب اسلام ہر حیثیت سے زوال پر آمادہ ہونے کو ہے تو عرب کے صحرا میں یعنی عین قلبِ اسلام کے اندر زندگی کی اِک برقی رَو دوڑ گئی یعنی وہابی تحریک اٹھی جس سے بعد میں طرابلس کی سنوسی تحریک، ایران کی بابی تحریک اور ترکی و مصر و ہند کی (پان اسلامک یعنی) اتحادِ اسلامی کی عالمگیر تحریک پیدا ہوئی۔

یہ امر غور کے قابل ہے کہ اگرچہ وہابی تحریک نے ماضی کو تنقیدی نظر سے نہ دیکھا لیکن وہ خالصتہً آزادی کی رُوح کا ایک زبردست اظہار تھی جس نے دُنیائے اسلام کے مُردہ جسم میں از سرِ نو اک جان سی ڈال دی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو ابھی یہ منظور نہ تھا کہ اسلام گئی گزری قوموں کے زمرے میں شامل ہو کر مٹی میں مٹی ہو جائے بلکہ اُسے اسلام کو دوبارہ زندہ کر کے دُنیا میں اُس سے کچھ کام لینے تھے جن کی نوعیت ابھی زمانے کی آنکھوں سے پوشیدہ تھی۔

مسلمان ملکوں پر آفت پر آفت آئی۔ ترکی کے یورپی علاقے ایک ایک کر کے اُس کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی انیسویں صدی کے شروع میں خود ہماری آنکھوں نے اسلامی ممالک پر بجلیاں گرتی دیکھیں۔ طونس اور الجیریا پہلے چھن چکے تھے، مصر کی آزادی بمشکل نام کو باقی تھی۔ افغانستان ایک محروسہ علاقہ بن چکا تھا۔ عرب کے اطراف و جوانب پر انگریزوں کی گرفت تھی۔ اب مراکش اور طرابلس لُٹ گئے۔ ایران کے دو ٹکڑے کر دیے گئے۔ بلقانی ریاستیں مل کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔ اسکے بعد جنگِ عظیم آئی۔ اسلامی ملکوں نے ایک کروٹ لی تو غنیم نے ایسا چھاپہ مارا کہ ساری رہی سہی قوت گویا اِک آن کی آن میں ختم ہو گئی۔

لیکن نہیں یہاں کچھ اور ہونے والا تھا ؎

عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دَوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اور شاعرِ قوم نے یہ بھی دیکھا ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

جنگِ عظیم میں مر جانے کے بعد ترکی کا دوبارہ جی اٹھنا دنیائے حاضرہ کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ مصطفٰے کمال کی فتوحات نے اسلامی دُنیا میں اک نئی سی دَوڑا دی۔ یورپ کی تمام کامران طاقتیں ایک طرف تھیں، مردِ بیمار دوسری طرف۔ یہ غیر متوقع فتح لاکھوں اُمیدوں کا عنوان بن گئی۔ عالمِ اسلام سے اللہ اکبر کی صدا اٹھی۔ ایران نے رہائی پائی، عرب آزاد ہوا۔ افغانستان، مصر، عراق اپنی باگ ڈور آپ سنبھالنے لگے، شام نے آزادی کا وعدہ لیا، فلسطین نے جان و مال کی بازی لگا دی۔ ۱۹۳۷ء میں شاید صدیوں کے بعد چند اسلامی طاقتوں نے ایک اسلامی اتحاد قائم کیا یعنی ترکی، عراق، ایران اور افغانستان کے درمیان سعد آباد کا معاہدہ ہو گیا۔ اُمید کی جاتی ہے

عنقریب اور اسلامی ممالک بھی اِس معاہدے میں شریک ہوں گے۔ اس بیسویں صدی میں جس میں مذہب کا مضحکہ اُڑانا بعض حلقوں میں ترقی کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے ایک اسلامی اتحاد کا قیام اور اُس کی توسیع کی قوی اُمید فی الواقع ایک معجزے سے کم نہیں۔ اور تو اور ہندوستان کے مسلمان بھی باوجود اپنی جبلی کمزوریوں اور تفرقوں کے اپنے تئیں ایک اسلامی قومی جمعیت میں مجتمع و منظم کرنے کے آرزومند نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں اسلام کی کہانی قدرتی طور پر ہمارے لئے ایک خاص دلچسپی اور اہمیت رکھتی ہے کیونکہ گو ہمیں اپنے روحانی سرچشمے سے دلی لگاؤ ہے لیکن اس سرچشمے سے جس ندی کو ہمارے روحانی بزرگ کاٹ کر یہاں لائے تھے اب اُسی کے کنارے ہماری زندگیاں اُمید و بیم کی حالت میں گزر رہی ہیں۔

مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں لیکن یہیں وہ تقریباً سات صدیاں حکومت کر چکے ہیں اور اس ملک کی اکثریت پر، یہاں کے سارے ماحول پر اُنہوں نے ایک خاص اثر چھوڑا ہے جس کو برقرار رکھنے کیلئے آج اُنکی قومی رُوح تڑپ رہی ہے۔

مسلمانوں کی آمد پر ہندوستان کی معاشرتی، تمدنی اور مذہبی حالت بہت خراب تھی، گو ایک زمانے میں ہندوؤں کے تمدن نے اس مُلک کو بامِ ترقی پر پہونچا دیا تھا اور زندگی کے مختلف شعبوں میں کمال حاصل کیا تھا۔

مسلمان جب یہاں آئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کے اور ہندوؤں کے مذہب و معاشرت میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن باوجود اس کے اُنہوں نے پوری رواداری سے کام لیا اور عام طور پر نہ صرف ہندوؤں کے مذہب میں مداخلت نہ کی بلکہ خود اورنگ زیب تک نے اُن کے مندروں کے لئے جاگیریں عطا کیں۔ یہ دُرست ہے کہ بعض حملہ آوروں نے لوٹ مار کی لیکن کس قوم کی تاریخ ایسے واقعات سے خالی ہے خود آریاؤں نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کے ساتھ جو سلوک کیا اُس کے مقابلے میں بیچارے محمود غزنوی کے حملے بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتے، گو اب یہ بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ جب تک پنجاب کے راجہ جے پال نے غزنی پر متعدد حملے نہ کئے محمود نے ہندوستان کا رُخ نہ کیا۔ اسلام ہر مسلمان حملہ آور اور حکمران کے طرزِ عمل کا ذمہ دار نہیں بننا چاہتا لیکن ہندوستان کے مسلمان حملہ آوروں اور حکمرانوں پر الزامات بہت کچھ انگریز اور بعض ہندو مؤرخین کی زیادتی اور تعصب کی تخلیق ہیں۔ پروفیسر پی ایم سین لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ کو دوسرے لکھنے اور اس میں سے دل آزار باتوں کے نکال دینے کی اشد ضرورت ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی بہتری کے لئے جو کچھ کیا اُسکا اعتراف پروفیسر رام پرشاد کھوسلہ، مسٹر ایم این رائے اور دوسرے ہندو مصنفین اب صاف لفظوں میں کر رہے ہیں۔ مسٹر کھوسلہ مغل حکومت کے بڑے مداح ہیں۔ حکومت نرم دل تھی، رعایا خوش تھی اور خوش حال تھی۔ مغلوں کا عدل و انصاف دُنیا کے لئے ایک نمونہ تھا۔ مغل کہنے کو مطلق العنان تھے لیکن اُن کے پیشِ نظر ہمیشہ رعایا کی بہبود تھی۔ مسٹر کھوسلہ کی رائے ہے کہ اگر مغلوں کی حکومت ہند میں قائم رہتی تو ہندو مسلمانوں کا مسئلہ کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔ مسٹر رائے کہتے ہیں کہ ہندو مت میں اسلام کے آنے سے بیداری پیدا ہوئی اور کبیر، نانک، تکارام اور چیتنیہ وغیرہ جیسے مصلحین پیدا ہوئے جنہوں نے ہندو مذہب کو ایک سانچے میں ڈھال دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ہندوستان میں جس میں ذات پات نے پڑوسی کو پڑوسی کا غلام بنا دیا تھا، جس میں سیاسی اتحاد نام کو باقی نہ تھا، زیادہ سے زیادہ چند نیک دل علماء میں غور و فکر کا زبردست مادہ موجود تھا لیکن اکثر لوگ مذہبی رسوم و توہمات میں دھنس کر عمل کی سرگرمیوں کے ناقابل ہو گئے تھے۔ اس ہندوستان میں جب مسلمان فاتحین کا قدم آیا تو یہ سویا ہوا ملک بیدار ہو گیا، ڈرا، گھبرایا، کانپا لیکن جاگ اُٹھا اور ایک نئی زندگی سے دوچار ہوا۔ برابری، بھائی بندی، آزادی، کوئی پروہت نہیں، کوئی شودر نہیں، کوئی اونچا نہیں، کوئی نیچ نہیں، نہ مورتیوں کو پوجنا نہ بھینٹ چڑھانا، نہ آواگون کی مسلسل زنجیریں۔ صرف آسمان پر ایک خدا اور زمین پر اُس کے بندے سب آپس میں اور خدا کے سامنے سب برابر۔ اِن خیالات نے بہت سے لوگوں اور بالخصوص بعض کچلے مذہبی آدمیوں اور نیچ ذاتوں پر بیحد اثر ڈالا۔ اور وہ خود بخود اس سادہ آزادی بخشنے والے مذہب کی طرف کھچے چلے آئے۔ وحدانیت کی تلوار نے کثرت کی گتھیوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان کا پہلی بار بیرونی دُنیا سے ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ مسلمانوں میں جوش اور ولولہ اور جہانگیری اور جہانبانی کے جو جذبات تھے ہندوستان کے باشندوں کی غم پسندی اور عزلت گزینی میں اُن سے ایک حرکت پیدا ہوئی۔ غرض ہندوستان وہ ہندوستان نہ رہا۔ موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کا خاصا حصہ ہے، ہندوستان کا نام بھی مسلمانوں کا ہی دیا ہوا ہے۔

مسلمانوں کا عہد شروع ہوتے ہی تاریخ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ ایک دلیر فاتح زندہ قوم کا سیلاب آتا ہے جو صدی ڈیڑھ صدی میں سینکڑوں ہزاروں میل کی مسافت طے کر جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ نرے فاتح نہ تھے۔

فتوحات کے بعد انہوں نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک باقاعدہ حکومت قائم کرکے ملکی نظم و نسق اور رفاہِ عام کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ مثال کے طور پر صرف اک فیروز تغلق کے عہد میں ایک سو نہریں، دو سو سرائیں، پانچسو شفاخانے، ایک سو پل اور بیسیوں قسم کے اور مفید ادارے قائم ہوئے۔ محمد تغلق کے عہد میں صرف دلی کے شہر میں ایک ہزار چھوٹے بڑے مدرسے اور ستتر شفاخانے تھے جن میں غربا کا مفت علاج ہوتا تھا۔ شیر شاہ نے صرف پانچ سال حکومت کی لیکن اُس کی انتظامی اصلاحات سے فی الحقیقت مغلیہ عظمت کی بُنیاد پڑی۔ مغلوں کی سلطنت نے تاریخ ہند کا ایک نیا ورق پلٹا۔ یکے بعد دیگرے چھ زبردست فرماں روا تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوئے جن کے عہد میں دو سو سال تک ہندوستان میں ایسا امن و امان قائم رہا اور ملک نے ایسی ترقی کی کہ صدیوں تک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب ان کا شہرہ مشرق سے مغرب تک جا پہونچا۔ دُنیا بھر میں مغلِ اعظم کا چرچا تھا۔ حکومت کا نظم و نسق ایسی مضبوط بنیادوں پر رکھا گیا کہ آج تک اُسکی کئی خصوصیات حکومت کا جُزو ہیں۔

عہدِ مغلیہ کے مادّی اور علمی کارنامے اب تک ہندوستان کی معاشری زندگی کا جُزو بنے ہوئے ہیں، ہندوستانی خوراک، لباس، طرزِ بود و باش، گفتگو، آدابِ مجلس یہ جو کچھ آج ہیں خاصی حد تک مغلیہ وقتوں کی ایجادات ہیں۔ پھر فنونِ لطیفہ میں مغلیہ نقاشی، مغلیہ فنِ تعمیر اور علم ادب اور شاعری اور مصوّری اور موسیقی کا مذاق یہ سب مغلوں ہی کے زمانے کی تخلیق ہے۔ صرف اک تاج محل اِس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مغلیہ تہذیب دُنیا کی عظیم ترین تہذیبوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اُن کی شائستگی اور علم پروری داد کے لائق تھی۔ اورنگ زیب کے عہد میں صرف ٹھٹھہ (سندھ) میں بقول ہملٹن ۴۰۰ مدرسے تھے۔ اور میکس مولر کہتا ہے کہ بنگال میں انگریزوں کی آمد کے وقت اسّی ہزار مدرسے تھے۔ میجر باسو نے لکھا ہے کہ دولتمندی اور آرام اور چین کا جو نقشہ شاہجہاں کے عہد میں دیکھنے میں آتا تھا، بلا شبہ بے مثل و بے نظیر تھا۔ ایک انگریز سیاح کہتا ہے کہ اُس زمانے میں شہر آگرہ شہر لندن سے زیادہ بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔ مُلک میں قسم قسم کی صنعتیں پھولیں پھلیں جن سے ہندوستان ساری دُنیا میں مشہور ہوگیا۔ ہندوستان میں جہاز تک بنتے تھے یہاں تک کہ انگریز اور ڈچ لوگوں نے اپنے کچھ جہاز یہاں بنوائے۔ سورت کا ایک تاجر عبدالصمد کئی سو تجارتی جہازوں کا مالک تھا۔ ملک کا سکّہ اس وقت تمام یورپی سکوں پر فوقیت رکھتا تھا۔ پروفیسر برج نرائن اپنی کتاب "ہندوستان کی معاشی زندگی" میں لکھتے ہیں کہ اُس زمانے کا مزدور اوسطاً آج کل کے مزدور سے زیادہ خوش حال تھا۔ رواداری کی انتہائی مثال اکبر کی حکمت عملی ہے جس نے ہندوؤں کا دل موہ لینے کے لئے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے مسلمانوں کے دلوں میں بعض جائز شکایات پیدا ہو گئیں اور آگے چل کر اورنگ زیب کے عہد میں اُن کا تدارک ضروری سمجھا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر اور خصوصاً جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں اِن بادشاہوں کی نرمی اور رعایا پروری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر بعض مفسدہ پرواز ہندوؤں نے مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرنا شروع کر دیا تھا جیسا کہ شاہجہاں نامہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ ہندو مسلمان عورتوں سے بجبر شادی کرتے تھے اور انکو گھروں میں ڈال لیتے تھے۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ مسجدوں کو توڑ کر اپنی عمارتوں میں داخل کرتے تھے یا اُن کی جگہ مندر بنا لیتے تھے۔ مسلمان اِن باتوں سے بہت آزردہ تھے۔ اورنگ زیب نے صرف ان زیادتیوں کی روک تھام کی۔ اُس میں بعض اور نقائص تھے لیکن اُس نے کبھی کسی قسم کا کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ بقول پروفیسر کھوسلا عدل میں اورنگ زیب اپنے سب بزرگوں سے سبقت لے گیا۔ مُلک کا ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بادشاہ تک رسائی پا سکتا تھا۔ مشہور بنگالی عالم سرپی پی رائے لکھتے ہیں "اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔ اورنگ زیب نے ہندوؤں کو گورنر بنایا، گورنر جنرل بنایا، وائسرائے بنایا یہاں تک کہ اُس نے خالص اسلامی صوبے افغانستان پر بھی جو نائب دارالسلطنت مقرر کیا وہ ہندو راجپوت ہی تھا۔"

پروفیسر کھوسلا اپنی کتاب "مغل بادشاہت اور اُمرا" میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مغلیہ شاہنشاہوں کے حق میں ہمیں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ وہ عام طور پر اُس زبردست طاقت کا جو اُنہیں حاصل تھی غلط استعمال نہ کرتے تھے۔ اُن کی استبدادی بادشاہت دراصل عوام کی دلی حمایت پر مبنی تھی اور سیاسی طور پر اُنہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ برادری کا درجہ عطا کیا۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو مقامی حالات کے سانچے میں ڈھال لیا اور یہی اُن کی طاقت کا راز تھا۔" یہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا کارنامہ۔ اس بیان کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ ہندوستان کے مسلمان یہاں اجنبی بنے رہے، یا اب اجنبی اور غیر ملکی ہیں خود ہندوستان پر ظلم کرنا ہے۔

مغلیہ سلطنت اور نظم و نسق کی شاندار تعمیر اس قدر مضبوط تھی اور مغلیہ حکومت لوگوں کے دل میں اتنا گھر کر چکی تھی کہ باوجودیکہ اورنگ زیب کے بعد ایک صدی تک ایک بھی قابل بادشاہ اور کوئی ہمدرد اور دُور اندیش وزیر پیدا نہ ہوا تاہم اس سلطنت کے زوال اور تباہی میں کم از کم ایک سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ لیکن زمانہ دُنیا کا "سلطانِ عادل" دیر گیر ہو لیکن بڑا سخت گیر فرماں روا ہے۔ جب کوئی قوم گر جاتی ہے، جب کسی تہذیب میں گھن لگ جاتی ہے تو زمانہ جسم

نوع انسان کی بہبود مدِنظر ہے اور محض کسی ایک فرد یا جماعت کی بہتری مقصود نہیں انسان کی ترقی کے نئے اسباب پیدا کرتا ہے، وہ ایک نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے خواہ اس انقلاب کی تبدیلیاں کس قدر دل شکن بلکہ زلزلہ خیز ہی کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اپنا کام کر چکی تھی۔ اب مسلمان خوابِ غفلت میں سو رہے تھے اور ہندو ابھی بیدار نہ ہوئے تھے۔ یہ حال تھا کہ قدرت انگریزوں کی زمانہ شناس قوم کو ہندوستان کے ساحل کی طرف کشاں کشاں لے آئی۔

۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی بنی۔ ڈیڑھ سو سال تک انگریز زیادہ تر اپنی تجارت میں مصروف رہے۔ جس کے سلسلے میں اُن کا مقصد محض نفع طلبی اور زر کشی تھا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ہندوستان کے اندرونی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی اور ۱۷۵۷ء میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھ کر اپنی سلطنت کو بڑھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا جو ناکام رہا۔

۱۸۵۹ء میں سر سید نے بغاوت ہند کے اسباب پر ایک رسالہ لکھ کر نہایت جرأت کے ساتھ برطانوی حکومت ... بتایا کہ اس بغاوت کا اصلی سبب ہندوستانیوں کا حکومت کی کونسلوں میں شریک نہ کیا جانا تھا۔ یہ برطانوی ہند کا پہلا سیاسی اعلان تھا۔

جدید ہندوستان کے سیاسی مد و جزر کا قصہ یوں ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد باوجود ملکہ معظمہ کے خسروانہ اعلان کے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں کشیدگی بجائے گھٹنے کے بڑھتی گئی۔ ۱۸۸۱ء میں لارڈ رپن کے زمانے میں جو ایک مہربان دل وائسرائے تھا لوکل سلف گورنمنٹ کا قانون منظور ہو کر خود اختیاری حکومت کی بنیاد کے لئے زمین صاف کی گئی۔ البرٹ بل کی ناکامی کے بعد ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ کانگریس کی کوشش سے ۱۸۹۲ء میں ۱۸۶۱ء کے انڈین کونسلز ایکٹ کی حاصل شدہ مراعات میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں جنگ روس و جاپان میں جاپان کی کامیابی نے مشرق کے مُردہ جسم میں حرکت پیدا کی۔ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کی تقسیم بنگال کے بعد برطانوی ہند میں پہلی منظم سیاسی شورش برپا ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے ماتحت پہلی باقاعدہ قانون ساز مجالس بنیں۔ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم برپا ہوئی جو چار سال تک جاری رہی۔ اس کے دوران میں ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ میں باہمی سمجھوتا ہو گیا جس کا یہ اثر ہوا کہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مانٹیگو نے برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینے کے متعلق اعلان کیا اور اس کے مطابق ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات دی گئیں۔ مگر

اسی دوران میں رولٹ کے ظالمانہ قانون کے خلاف گاندھی جی نے ایک زبردست تحریک شروع کی جو ترکِ موالات پر مبنی تھی۔ مسلمان بھی چونکہ اُن شرائطِ صلح سے بیزار تھے جو اتحادیوں نے شکست خوردہ ترکوں پر زبردستی عائد کیں اس لئے اُن کا ایک طبقہ گاندھی جی کا پیرو بن گیا اور انہوں نے اس قومی جنگ میں اپنی بساط سے بڑھ کر قربانیاں کیں۔ ۱۹۲۱ء میں نئی کونسلوں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں چوری چورہ کے واقعہ کے بعد گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ اُن کے سوراجی کونسلوں میں داخل ہوئے لیکن محض حکومت کو تنگ کرنے کے لئے۔ اسی زمانے میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات شروع ہونے سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات سخت بگڑ گئے اور ملک میں نئے دن فساد ہونے لگے۔ ۱۹۲۸ء میں سائمن کمیشن کے آنے پر کانگریس کی طرف سے نہرو رپورٹ مرتب کی گئی جس کے متعلق مولانا محمد علی مرحوم نے کہا کہ اس کے معنی ہیں ملک انگریز کا اور حکم ہندو مہاسبھا بہادر کا۔ مسلمانوں نے اس رپورٹ سے اختلاف کیا اور ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس میں اپنے مطالبات پیش کئے جنہوں نے بعد میں جناح کے مشہور چودہ نکات کی صورت اختیار کی اور یہی آج تک ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست کا سنگِ بنیاد ہے۔ ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ اور کانگریس میں سمجھوتہ نہ ہو سکنے پر گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ پہلی کانفرنس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے سر تیج بہادر سپرو اور سر محمد شفیع نے متفق ہو کر ذمہ دار حکومت کا مطالبہ پیش کیا جو تسلیم کیا گیا لیکن باوجود گاندھی جی کی مساعی کے بھی اخیر تک فرقہ وار سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ گو اسی زمانے میں ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے اقلیتوں کو مطمئن کرنے کے لئے بنیادی حقوق کی قرارداد منظور کر کے اُن کی زبان مذہب اور کلچر کے تحفظ کا اعلان کیا۔ ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ اور کانگریس میں صلح ہو گئی اور کانگریس اور لیگ بھی مل کر کام کرنے لگیں۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا اور اس کے مطابق ۱۹۳۷ء میں صوبوں میں مکمل خود اختیاری حکومت کا دَور دَورہ ہو گیا۔ کانگریس سات صوبوں میں حکومت کرنے لگی اور اس نے اپنا ایک مخصوص پروگرام بنا کر مسلم لیگ سے منہ پھیر لیا۔ اور مسلم لیگ اور کانگریس میں ناچاقی ہو گئی جس پر لیگ نے مسٹر جناح کی قیادت میں مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کا پروگرام بڑے شد و مد سے شروع کر دیا۔ اس وقت ۱۹۳۹ء میں ادھر بعض ریاستوں میں شورش برپا ہو رہی ہے اور اُدھر کانگریس اور گورنمنٹ کے درمیان فیڈریشن کے قیام کے متعلق اختلاف ہے جو شاید عنقریب رفع ہو جائے۔

یہ ہے ہندوستان میں گزشتہ اسّی سال کی سیاسی جدوجہد کی مختصر کہانی۔ غدر کے بعد پہلے مسلمانوں پر حکومت کی نظرِ عتاب رہی۔ مسلمان بھی

رہتے رہے۔ پھر ۱۸۵۷ء میں حکومت کی پالیسی پر تبدیلی کی گئی۔ ۱۸۷۵ء میں سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کالج کی بنا ڈالی اور اس کے گیارہ سال بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا آغاز ہوا۔ سر سید کی پالیسی یہ تھی کہ جوشیلے مسلمانوں کے مشتعل جذبات کو قابو میں لانے اور انہیں مغربی تمدن سے روشناس کرنے کے لئے سیاست اور کانگرس سے کنارہ کشی اور مغربی تعلیم سے استفادہ کرنے کا ایک آل انڈیا پروگرام بنایا جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال ہے کہ حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے یہی پالیسی اُس وقت کے لئے موزوں تھی۔

لیکن بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ دنیا کے حالات اس قدر بدل گئے تھے کہ اب سیاست سے روگردانی قومی خودکشی کے مترادف ہوتی۔ مسلم لیگ کے قیام کے دس سال بعد لیگ اور کانگرس میں تعاون ہونے لگا۔ جس سے ہندوستان نے سیاسی حیثیت سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلما بھی قائم ہو کر کانگرس اور لیگ کے ساتھ مل کر کام کرنے لگیں۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات نے سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ ہندو مسلمانوں میں مغائرت اور منافرت کی خلیج روز بروز بڑھتی گئی۔ ۱۹۲۴ء میں مہاتما جی نے ۲۱ دن کا برت رکھا پھر بھی بلوے جاری رہے۔ ۱۹۲۶ء میں کم از کم ۴۰ ہندو مسلم بلوے ہوئے۔ گول میز کانفرنسیں رائگاں گئیں۔ جناح راجندر گفتگو کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کانگرس کے برسر اقتدار ہونے پر کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس وقت ملک میں صرف دو جماعتیں ہیں، برٹش گورنمنٹ اور کانگرس، اور مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ نہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ مسلم قوم کی کوئی حقیقت نہیں اور مسلم تہذیب محض ایک وہم ہے۔

عین اُس وقت جب کہ ہندوستان کو خود اختیاری کی پہلی قسط عملی طور پر مل گئی اس کی بدنصیبی دیکھو کہ اس کی دو بڑی قوموں میں سخت پھوٹ پڑ گئی اور طرفین کی طرف سے بندے ماترم اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے۔ لیگ اور کانگرس میں ۱۹۳۸ء میں سمجھوتے کی کوششیں ہوتی رہیں، کون بدبخت ہوگا جسے ایک باعزت مصالحت سے گریز ہو؟

ہندو مسلمانوں کا سوال نہایت پیچیدہ لیکن ان دونوں قوموں کے لئے، بلکہ ساری نوع انسان کے لئے غایت درجہ اہم ہے۔ مسٹر راسے کہتے ہیں کہ دنیا میں کہیں اور ایسی مثال نہیں ملتی کہ دو قومیں صدیوں تک ایک ہی ملک میں پہلو بہ پہلو رہتی آئی ہوں اور باوجود اس کے وہ ایک دوسرے کی تہذیب سے اس قدر ناآشنا ہوں اور ایک دوسرے کی عظمت کے اعتراف کرنے سے اس طرح انکار کریں۔

اگست ۱۹۳۸ء کے ماڈرن ریویو میں ڈاکٹر کرشنایا نے ہندو مسلمانوں کی ماضی کی روایات پر روشنی ڈالنے کے بعد مشہور اطالوی قوم پرست میزینی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہر جماعت کا ایک مخصوص مشن ہوتا ہے اور یہی مشن اُس کی قومیت ہے" پھر لکھا ہے کہ "ہندوستان سے ملک میں قومیت بین الاقوامیت سے کم نہیں ہو سکتی یہاں ہمیں ایک تنگ نظر قومیت کی بنیاد نہیں ڈالنی چاہیئے بلکہ ایک وسیع الخیال بین الاقوامیت کو فروغ دینا چاہیئے۔" اور اخیر میں کہا ہے کہ "یہ کام دشوار ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ دشوار کام ہے اور اسی لئے عظیم الشان ہے اور کرنے کے قابل ہے"

ڈاکٹر محمود اللہ (یو پی کے کانگرسی وزیر اعظم کے پارلیمنٹری سکریٹری) نے مسلم لیگ کے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے سالانہ اجلاس کی کارروائی دیکھ کر کانگرس والوں کو متنبہ کیا کہ "اس وقت دو بڑی ایشیائی تہذیبوں کے تصادم کا فوری اور ہولناک امکان ہے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دی ہے اور مسلمان کسی چیز سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا کسی نصب العین کے لئے جنگ کرنے سے" اور اخیر میں سمجھایا کہ "تاریخ بہت سی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ جہاں بعض معمولی چھوٹے چھوٹے واقعات نے بعد میں زبردست اور خطرناک مناقشات کی صورت اختیار کر لی"

ہندو مسلمانوں کا جھگڑا کوئی معمولی باجے اور گائے اور اذان کا جھگڑا نہیں، نہ یہ فقط دھوتی پاجامے یا لوٹے لٹیا کا مناظرہ ہے۔ یہ فی الحقیقت دو تہذیبوں کی ٹکر ہے۔ لیکن ٹکر کیوں ہو میل کیوں نہ ہو؟ اگر ہم ہندوستان کی تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیں تو ہم پر ظاہر ہو جائے گا کہ صلح و آشتی کا راستہ ہی دونوں قوموں کے لئے صحیح ترقی کا راستہ ہے۔ ایک دوسرے پر زبردستی اثر ڈالنے کا طریقہ، ایک دوسرے کو خاموشی سے اپنے میں جذب کرنے کی ناپاک سازش محض ایک دوسرے کو بھڑکانے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ ایسا کرنے سے خطرہ ہے کہ شاید ان میں سے کوئی ایک گروہ برداشتہ خاطر ہو کر ملک کو دو یا زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر دینے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

جمہوریت اشتراکیت قومیت ہندوستانیت ان کی بحثیں اور پروپگنڈا تو جاری ہے اور برابر جاری رہے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ بغیر اپنا وقت یا توانائی ضائع کئے چند اہل دماغ کو تو اس شغل میں لگے رہنے دیں لیکن خود اپنے نصب العین کی طرف رخ کئے وہ راہ عمل اختیار کریں جس سے ان کی موجودہ ضروریات پوری ہوں۔ یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ ایک جماعت ہیں، الگ ایک قوم ہیں، گو اپنی اس قومیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ اپنے ملکی بھائیوں سے مناسب تعاون کرنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔

لیکن فقط یہ کہہ دینا کہ ہم ایک قوم ہیں کافی نہیں۔ لازم ہے کہ ہم اِس حقیقت کا احساس کریں اور ساتھ ہی اس احساس پر اس طرح عمل کر دکھائیں کہ پھر دُنیا کو اِس میں شک شُبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

یہ کیسے ہو؟ کچھ عرصے سے ہم مسلمانوں میں انحطاط کی وجہ سے اسقدر انتشار رہا ہے کہ قوم کا بیشتر حصّہ تو یہ سمجھ کر غفلت اور مایوسی میں گُم سُم پڑا رہا کہ اب قوم کا دوبارہ سنبھلنا ناممکن ہے اور اُدھر سوچنے والوں کی یہ حالت رہی کہ کسی نے ایک نسخہ تجویز کیا کسی نے دوسرا کسی نے تیسرا۔ کسی نے کہا سیاسی حقوق حاصل کرو، کونسلوں میں قابل نمائندے بھیجو بس پھر ملک میں ہماری پوزیشن مضبوط ہو جائے گی۔ کسی نے کہا معاشی ترقی کرو، کارخانے کھولو، بنک قائم کرو پھر نہیں کسی بات کی پروا نہ رہے گی۔ کسی نے کہا ٹولیاں بناکر گلی کوچوں میں گشت کرو نماز پڑھواور پڑھواؤ، روزے رکھو اور رکھواؤ پھر دیکھو کس طرح قوم مضبوط ہو جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے تعلیم سب کمزوریوں کا علاج ہے سکولوں کالجوں اور مدرسوں کو اپنے طلباء سے بھر دو، قوم آپ سے آپ ابھر آئے گی۔ کسی کا قول ہے کہ ہماری قوم پس ماندہ ہے ہر بات میں ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو جاؤ وہ ترقی یافتہ لوگ ہیں اُن کی صحبت میں ہم بھی ہر میدان میں بڑھکر قدم مارنے لگیں گے۔ غرض جتنے حکیم اتنے ہی جُدا جُدا نسخے۔ اب بیچارا مریض کس کا کہا مانے اور کیا کرے کیا نہ کرے؟

حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت قوم ہمارے سامنے اک عرصے سے کوئی مخصوص نصب العین نہیں رہا۔ جو تھا اُسے ہم نے کھو دیا۔ مغلیہ عہد میں امارت کے معنی حکمرانی کے تھے۔ سو حکومت چھن جانیکے بعد بھی ہمیں صرف نوکریوں کی تلاش رہی اور چیزوں سے ہم نے مُنہ پھیر لیا اور اس طرح ہم روز بروز گرتے گئے۔ ہماری مدوجزر کھوکھلی ہو چکی تھی، فقط ہماری زبان پر رہ گئی تھی سو وہ بھی اب کام نہیں دیتی، کچھ مُدت ہمیں اپنی جسمانی طاقت پر ناز رہا۔ اب اُسکی قلعی بھی کھلتی جاتی ہے، ہمارا دل اُچاٹ ہوا جاتا ہے دُنیا ہمیں فانی نظر آتی ہے اور زندگی بے مصرف۔ ہم اپنے گزرے ہوئے عروج کو یاد کرتے ہیں اور اپنے شاعروں کی زبانی اُس کا مرثیہ سُن کر سر دُھنتے ہیں اور آنسو بہاتے ہیں پھر گرم گرم کر دُعا مانگتے ہیں کہ الٰہی تو چاہے تو اب بھی بغیر ہمارے ہاتھ ہلائے ہمیں دُنیا جہاں کی بادشاہی دلا دے۔ غربت اور اُس کے لوازمات، جہالت اور اُس کے لوازمات، مایوسی، غم پسندی، توہمات، دین و دُنیا سے بیخبری، بے موقع جوش، للّٰہی بغض، للّٰہی حسد، کہاں تک اس فہرست کو طول دیا جائے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس ساری بُری چیزوں کو جمع کر دو مجموعے کا نام ہندوستان کی مسلمان قوم ہوگا۔ لیکن ہمارے اِس انحطاط و زوال میں کوئی بھید چھپا ہوا نہیں، یہ کوئی آسمانی معمّا نہیں۔ بات فقط اتنی سی ہے کہ انسانوں کی جماعتیں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم جہاں اُن کے سامنے کوئی نصب العین کوئی مُنتہائے کمال نہ رہا جن سے اُن کا دِل گرمائے جن سے اُنکے خُون میں حرارت اور اُن کی طبیعت میں اُمنگ پیدا ہو وہ بے دل ہوکر باطل چیزوں کی طرف رُجوع کرنے لگیں وہ جیتے جی مر گئیں اور پھر جہاں اُن کا کوئی نصب العین ٹھہرا اُنہوں نے اُس کے حصول کے لئے تنظیم کی تو وہ اُبھریں وہ دوبارہ زندہ ہو گئیں اُن کے دل مضبوط ہوئے پھر جس کام کو اُنہوں نے ہاتھ لگایا وہ خوش اسلوبی سے ہو گیا، اور عزت نے بڑھ کر خود ایسے انسانوں کا ہاتھ چوما۔

یہ ہے مسلمانوں کا مرض اور یہ ہے اس کا علاج ؎

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

ہرچند ہماری حالت خطرناک ہے ہماری ترقی کی رفتار کچھوے کی سی ہے اور دُنیا کی رفتار تیز سے تیز تر ہوئی جاتی ہے خود ہمارے ملک میں ہمسایہ قوم نے چند سالوں میں صدیوں کی مسافت طے کرلی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہمیں فوری عمل کی ضرورت ہے اور ضرورت ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ہم مسلسل اور متواتر کوششوں سے اپنی کمیوں کو بھی پورا کریں اور ساتھ ہی وہ علمی و معاشری و معاشی و تمدنی سرمایہ بھی جمع کریں جن سے قومیں اور اُن کے تمدن دُنیا کی نظروں میں عزت پاتے ہیں۔ ہرچند کہ ہم ان تمام باتوں میں پیچھے رہ گئے ہیں مگر کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ ہماری قوم کے افراد میں بلکہ ایک خاصی جماعت کے اندر اب اپنے نقائص کا گہرا احساس اور اپنی قومیت کیلئے اک ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ اسی طرح چند دن جوش میں آجاتے ہیں اور پھر کر توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں مگر یہ بات اظہر من الشمس ہو چکی ہے کہ دُنیا بھر میں اور ہمارے ملک میں بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ اب وہ ہمارے جوش کو ٹھنڈا نہ ہونے دیں گے اب وہ یا ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے پیس ڈالیں گے اور یا ہمیں زندہ کر کے چھوڑیں گے ناموافق حالات ہی اب ہماری مدد کریں گے۔

خدا شرّے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد

اس وقت مغربی وضع کی جمہوری قومیت کا ایک طوفان ہندوستان میں برپا ہے ہر خیال، ہر اُصول، شاید ہر اینٹ پتھر بھی قومیا یا جا رہا ہے، کانگرس میں ہر چیز کو صریحاً یا عملاً حکم مل رہا ہے کہ تم بھی نمک بن جاؤ، تاکہ ہندوستان واحد قومیت کی شکل میں اپنے سیاسی و تمدنی سوراج کو حاصل کرلے۔ مگر مسلمان قوم کی اکثریت نے اس حکم پر ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا ہے۔ مسلمان قوم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھے گی۔

یوں تو غدر کے کچھ عرصہ بعد ہی سر سید علیہ الرحمۃ نے قوم کو بیداری کا

بق دیا۔ ہماری ملکی غلامی کے دور میں سر سید یقیناً سب سے بڑے عملی مسلمان ہنما ہو گزرے ہیں۔ مگر اُن کے رفقا کا پیغام کچھ مرثیہ خوانی کے رنگ میں تھا شاید وقت کا تقاضا ہی ایسا تھا۔ لیکن اَب اس تیز رَو زمانے میں جس میں ہماری ندگیاں گزر رہی ہیں مسلمانوں کو ایک ایسا فکری رہنما ملا جس نے اُن کو جدو جہد کا پیغام دے کر اُمید و کامرانی کی بشارت دی۔ سر سید کے بعد علامہ قبال اسلامی ہند کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔ قوم کے متعلق کوئی مسلمان بہت متفکر نظر آتا تو مسکرا کر کہا کرتے کہ بھئی! غم نہ کھاؤ، تمہاری قوم ڈوبتی نہیں۔ ہرچند کہ ابھی قوم کی حالت سدھری نہیں لیکن اس کا غفلت کے ساتھ ہی مایوسی کے اندر سے نکل آنا مستقبل کیلئے ایک نیک فال ہے۔

اقبال کے اثر سے اور حالاتِ زمانہ کے تقاضے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک گروہ فکر و عمل کے میدان میں اُتر آیا ہے اور اپنی قوم کے متعلق نئے نئے منصوبے باندھنے میں مصروف ہے۔ کانگرس کی قومی تحریک اور ہندویت کی اَوروں کو اپنے میں جذب کرنے کی کوشش نے مسلمانوں کو چونکا دیا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں سر اقبال نے مسلمانوں کی طرف سے شمالی ہندوستان کی علیحدگی کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے پاکستان کی تحریک شروع کی جس کا مقصد پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ، اور بلوچستان کو ایک جداگانہ ریاست کی شکل میں متحد کرنا ہے۔ اس نئے ملک کی ۴½ کروڑ آبادی میں سے ۳½ کروڑ مسلمان ہوں گے۔ پاکستانیوں کے نزدیک پاکستان جغرافی و نسلی حیثیت سے ہندوستان سے علیحدہ ایک مستقل ہستی رکھتا ہے۔ اس کے برعکس جامعہ ملّیہ کے اکثر ارکان نے اپنی اسلامی شخصیت کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوؤں اور کانگرس کے ساتھ تعاون کرنا مسلمانوں کے لئے سُود مند اور قرینِ مصلحت تصور کیا ہے۔ کئی قوم پرست مسلمان اس سے بھی آگے نکل گئے ہیں، وہ ہندوستانی قومیت میں جذب ہونے کو منتہائے زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور سر سید اور اقبال اور علیگڑھ یونیورسٹی اور مسلم لیگ کے ذکر سے چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ نوجوان ایسے ہیں جو ان قوم پرستوں کو بھی گرد کی طرح پیچھے چھوڑ گئے ہیں، یہ ہیں وہ اشتراکی اور اشتمالی دہریے جو مذہب کا نام سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور بیچاری انجمن حمایت اسلام اور غریب اُردو پر بھی اپنے زہریلے طعنوں کی بوچھاڑ کرنے سے باز نہیں رہتے۔

مسلم قوم کی اکثریت یقیناً اس قومیت پرستی اور دہریت کی مخالف ہے۔ ہمیں ان سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں مگر سخت کوتاہی ہوگی اگر ہم ان کا عملاً سدِباب نہ کریں اور اپنی معصوم قوم کو اُن کی دست بُرد سے بچائے نہ رکھیں۔

(باقی۔ باقی)

بشیر احمد

کیفیات

اے شوق کی دُعا والے! اے دل کے مدعا والے! — لے! در دبن کے آئے ہیں درد کی دوا والے

دلگیریاں اداؤں میں، دلچسپیاں جفاؤں میں — حیراں ہیں کدھر جائیں اب تیرے اسرا والے

سو رنگِ جلوہ سامانی، اک نکتۂ پریشانی — وا بابِ بتکدہ ہوگا، خاموش ہیں خدا والے

ہر ناز بندگی ان کی، ہر حکم زندگی میری — اب سر کو خود جھکاتے ہیں تسلیم پر رضا والے

خود سوختگی کا ساماں ہے، لرزاں دلِ نیستاں ہے — اب نئے کو روک لے ظالم بیداد گر نوا والے

یہ زیست کا قرینہ ہے، ہر سانس آبگینہ ہے — مجبور ہیں وفا والے، مختار ہیں جفا والے

ہر سانس تارِ گیسو ہے، ہر سجدہ پیشِ ابرو ہے — کیا کیجئے جفاؤں کو حیراں ہیں ادا والے

مجبور بیقراری ہیں، معذور اشک باری ہیں — ہاں یہ بھی کچھ سنا تُو نے؟ مایوس ہیں دُعا والے

یہ حُسن کی خودی کیفی! یہ طرزِ عاشقی کیفی!
وہ شانِ بے نیازی میں، ہم ہیں التجا والے

کیفی چریا کوٹی

فریبِ راحت

راحت کا فریب کھا رہا ہے
کیوں موت کے منہ میں جا رہا ہے
دنیا میں نہیں نشانِ راحت
تو مفت میں تلملا رہا ہے

جو کچھ بھی جناب دیکھتے ہیں
سب خواب ہی خواب دیکھتے ہیں
پیاسوں سے مذاق ہو رہا ہے
راحت کے سراب دیکھتے ہیں

راحت کا سوال ہی غلط ہے
یعنی یہ خیال ہی غلط ہے
کھائیں گے جنابِ من نہ کیوں مات؟
جب آپ کی چال ہی غلط ہے

فطرت کا فریب ہے خبردار!
اے صاحبِ عقل و فکر ہشیار!
راحت کا تخیل اک مرض ہے
تم اس میں آپ ہو کیوں گرفتار!

امینِ حزیں (سیالکوٹی)

جرائم پیشہ لوگ

یہ شمالی ہندوستان کا وہ حصہ ہے جو صدیوں سے تہذیب و تمدّن کا گہوارہ بنا رہا ہے!

آریوں کے زمانے سے لیکر اب تک گنگا کی اِس سرسبز و شاداب وادی نے کیسے کیسے انقلابات دیکھے ــــ سلطنتوں اور بادشاہتوں کا عروج و زوال! بیرونی حملہ آوروں کی یورشیں! خونریز لڑائیاں! بغاوتیں! خانہ جنگیاں! لیکن ان تمام صدموں کے باوجود یہاں کی تہذیبی اور تمدّنی زندگی برقرار رہی۔ اُس کی بنیادیں متزلزل نہ ہوئیں۔ گویا یہ زندگی ایک خوش خرام اور بے نیازی کے ساتھ بہنے والی ندی ہے جس کے پانی میں کنکر ڈالے جاتے ہیں، تھوڑی دیر کیلئے سطح پر موجوں کے دائرے بنتے ہیں اور پھر وہی ازلی سکون طاری ہو جاتا ہے۔ گزشتہ تین ہزار برس میں کتنے تمدّنی، مذہبی اور معاشری نظام یہاں پیدا ہوئے، پروان چڑھے، اور ــــ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاک میں مل گئے؟ کیا یہ کہنا زیادہ صحیح نہ ہوگا کہ وہ یہاں کی فضا میں پیوست ہو گئے؟ کیا یہاں کے جاہل لیکن ذہین باشندے تمام گزشتہ تہذیب اور کلچر کے امانت دار نہیں ہیں؟

لیکن ــــ اور یہی میرے افسانے کا موضوع ہے ــــ اِس تہذیب و تمدّن کے گہوارے" میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے انسانوں کی ہے جنہیں تہذیب و تمدّن کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ یہاں کی مہذّب فضا کے مہذّب اثرات سے (معلوم نہیں کیونکر؟) اب تک محفوظ ہیں۔ اُن کی زندگی یکسر غیر متمدّن اور وحشیانہ ہے۔ وہ اُس قدیم انسان کی یاد دلاتے ہیں جو غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا اور ذہنی ترقی کے لحاظ سے جانوروں سے کچھ ہی آگے تھا۔ اِس دَور کے مہذّب لوگوں نے اُن کیلئے "جرائم پیشہ" کا لفظ وضع کیا ہے۔ گویا آپ انہیں کتنی ہی تعلیم دیجئے، کتنا ہی مہذّب بنائیے، وہ جرائم کے ارتکاب سے باز نہیں آئیں گے اور قتل و خونریزی کے علاوہ کوئی دوسرا مہذّب پیشہ اختیار نہیں کریں گے۔ وہ پیدائشی مجرم ہیں!

میں صبح کو اپنے کام پر جاتے ہوئے قصبے سے باہر جانے والی سڑک پر سے گزرتا ہوں تو روزانہ ان جرائم پیشہ لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ (مجھ اُن میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ ناقابلِ اصلاح مجرم ہیں) ننگے سر، ننگے پاؤں، سیاہ چہرہ اور سیاہ تر جسم، کپڑے کا نام نہیں۔ بعض کا جسم بیشک ڈھکا ہوتا ہے لیکن جس چیز سے ڈھکا ہوتا ہے اُسے وہی لوگ کپڑا کہہ سکتے ہیں جو الفاظ کے غلط استعمال کے عادی ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں پستی و ذلّت کے احساس کے علاوہ ایک ایسا خوف جھلکتا ہے جو صرف ایک ٹھکرائے ہوئے کتّے یا شکاری کے ڈرے سہمے ہوئے جانور کی آنکھوں میں نظر آسکتا ہے۔

جب میں انسانیت کے اِن رحم انگیز نمونوں کو اپنے سامنے سے آتا ہوا دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی نوعمری کا ایک دلچسپ واقعہ یاد آجاتا ہے۔

میرے والد کے ایک دہلوی دوست تھے۔ اُن کی لڑکی کی شادی ہوئی والد اپنی بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے مجھے اُن کی نمائندگی کی خدمت انجام دینی پڑی۔ برات شہر سے ہی آئی تھی اور دستور کے مطابق ایک پُرتکلّف دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ چار کھانے پکّے تھے ــ زردہ، بریانی، قورمہ کلیجی، اور فیرنی! باورچی رات کو ہی آگئے تھے اور پچھلے پہر سے دیگیں کھڑکنی شروع ہو گئی تھیں۔ دن کے دس بجے تک سارا کھانا پک کر تیار ہو گیا۔ تقریباً گیارہ بجے دسترخوان بچھا اور براتیوں نے کھانا کھانا شروع کیا۔ میں نے یہ دیکھا کہ کھانے والوں کا ایک سلسلہ تھا جو ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے شہر کو دعوت دیدی گئی ہے، یا یہ کہ عام اجازت ہے جس کا جی چاہے آئے اور

ستفید ہو۔صورت یہ تھی کہ لوگ آتے، کسی سے دُعا سلام یا بات چیت کئے بغیر دسترخوان پہ بیٹھ جاتے، کھانا اُن کے سامنے چُن دیا جاتا، وہ اِس یکسوئی کے ساتھ کھاتے گویا اُن کے آس پاس کوئی دوسرا شخص نہیں ہے اور وہ تنہا کھانا کھا رہے ہیں، کھا چکتے تو اُٹھ کر نل پہ ہاتھ دھوتے اور دانتوں میں خلال کرتے ہوئے اپنے گھر کا راستہ لیتے۔ میں نے بہت سوچا لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ اس قسم کی دعوت کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ خیر، یہ سلسلہ گیارہ بجے سے تقریباً ڈھائی بجے تک جاری رہا۔

اِس دَوران میں بیاہ والی برات کے علاوہ ایک دوسری برات بھی دیکھنے میں آئی۔ شہر کے فقیر اور بھکاری بیسیوں کی تعداد میں جمع ہوئے تھے۔ اِن میں اندھے، لنگڑے، کوڑھی، مفلوج، سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ جب براتیوں کی ایک "کھیپ" کھانا کھا کر اُٹھتی تو طشتریوں کا بچا ہُوا کھانا اور دسترخوان کی ہڈیاں ایک سینی میں جمع کر لی جاتیں۔ اور کلیجے کے ٹکڑوں، چاولوں اور چچوڑی ہوئی ہڈیوں کا یہ مجموعہ ان فقیروں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اس وقت لُوٹ کھسوٹ اور چیخ پکار کا ایک شرم انگیز ہنگامہ برپا ہوتا۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے، گالیاں دیتے اور مارتے۔ کوئی اندھا ہے تو فریاد کر رہا ہے کہ مجھے کچھ نہیں ملا۔ کوئی مفلوج ہے تو وہ زمین پر پڑا ہُوا دوسروں کا مُنہ تک رہا ہے۔ کوئی عورت ایک بِلکتے ہوئے بچے کو گود میں لئے ہوئے ہے اور چیخ چیخ کر رو رہی ہے۔ سب سے خوش نصیب وہ ہیں جو زمین پر بیٹھے، اپنی جھولیوں میں مُنہ ڈالے ہوئے بھوکے کُتوں کی طرح کھا رہے ہیں —!

ڈھائی تین بجے تک کھانا کھلانے کا یہ سلسلہ رہا۔ پھر برات کو رخصت کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دُلہن اور دُلہن کے ساتھ بہت سا سامان دولہا میاں کے حوالے کیا گیا۔ اور مغرب کے وقت یہ لوگ ایک جلوس بنا کر ڈھول بجاتے ہوئے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم لوگ دن بھر کے تھکے ہارے تھے، شام ہوتے ہی سونے کی فکر دامنگیر ہوئی مکان کے آگے ایک چبوترہ سا تھا۔ یہاں دن کو کھانا پکا تھا اور دیگیں اب تک پڑی بِھنک رہی تھیں۔ اینٹوں اور پتھروں کے بنے ہوئے عارضی چولھے بھی ابھی موجود تھے۔ جلی ہوئی لکڑیاں، کوئلوں کے ڈھیر، پیاز کے چھلکے، اور زمانے بھر کا کوڑا کرکٹ وہاں جمع تھا۔ میں نے اور باہر سے آئے ہوئے چند اور مہمانوں نے وہیں چارپائیاں ڈال لیں اور اپنے اپنے بستر بچھا کر سو گئے۔

رات کو بارہ ایک بجے کے قریب میری آنکھ کُھلی۔ میں نے کروٹ بدلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے دیوار سے لگا ہُوا ایک شخص کھڑا ہے۔ خیال ہُوا کہ ممکن ہے مجھے دھوکا ہو رہا ہو۔ اس لئے آنکھوں کو بند کیا اور پھر کھول کر دیکھا۔ وہ اب بھی کھڑا ہُوا تھا۔ خوف میری رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کنپٹیاں جلنے لگیں اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

رات نہایت اندھیری تھی اور یہ شخص جو کالے کالے کپڑے پہنے، ننگے سر، اس طرح بےحس و حرکت کھڑا تھا بہت ہی بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر چور اکثر آتے ہیں کیونکہ گھر والے، کیا مرد اور کیا عورتیں، سب دن بھر کی مصروفیت کے بعد اتنے تھک جاتے ہیں کہ جب سونے کا وقت آتا ہے تو گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ چور ہے اور وہ جو دن میں فقیر اور بھکاری آئے تھے اُنہیں میں سے کوئی ہے۔ اُن ننگے دھڑنگے سیاہ فام بھکاریوں کی جو تصویر میرے ذہن میں تھی یہ شخص بالکل اُس کے مطابق تھا۔

میری چادر ٹانگوں پر پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اُس کو گھسیٹا اور سر تک اوڑھ لیا۔ لیکن خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ ایک ہی لمحے کے بعد چادر سرکائی اور جھانک کر دیکھا۔ وہ بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا، نہایت تیزی سے اُٹھا اور برابر میں جو مولانا سو رہے تھے اُن کو جھنجوڑنا شروع کیا۔

"ارے میاں اُٹھو! دیکھو یہ کون کھڑا ہے۔ جلدی اُٹھو۔ چور ہے"۔ میری آواز اتنی بھیانک تھی، بیان سے باہر ہے۔

مولانا گھبراتے ہوئے اُٹھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے "کہاں ہے؟ کون ہے؟"

میں نے کہا "وہ دیکھو سامنے کون کھڑا ہے"

انہوں نے دیوار کی طرف نظر دوڑائی "کہاں بھئی مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آتا"

"وہ دیکھو ــــ سامنے ــــ وہ رہا!!"

"اماں کہاں؟"

اتنے میں دو چار اور بھی جو چبوترے پر سو رہے تھے جاگ اُٹھے۔ سب گھبرا گھبرا کر اور حیران ہو ہو کر پوچھنے لگے "کیا قصہ ہے؟ ــــ کیا ہوا؟ ــــ خیریت تو ہے؟"

اندر گھر والے بھی بیدار ہو گئے اور لالٹینیں ہاتھوں میں لٹکائے باہر نکل آئے۔ اب جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ نہ چور ہے نہ ڈاکو، ایک لمبی سی لکڑی ہے جو دیوار کے سہارے سے کھڑی تھی۔ یہ لکڑی دن کو چولھے میں رکھی گئی تھی لیکن چونکہ بہت بھاری تھی جلی نہیں، اور نکال کر علیحدہ کھڑی کر دی گئی۔ اس کے اُوپر کا سرا جلا ہوا تھا اور اسی پر مجھکو رات کے اندھیرے میں چور کے سر کا دھوکا ہوا۔

اُس رات دلّی والوں نے میرا خوب مذاق اُڑایا۔ اور پھر جتنے دن میں وہاں رہا یہ واقعہ ایک دلچسپ موضوعِ گفتگو بنا رہا۔

میرے دہلی سے چلے آنے کے بعد ظاہر ہے کہ اُن لوگوں نے اس قصّے کو بالکل بھلا دیا ہوگا اور اُس وقت سے اب تک یقیناً کسی کو اس کا خیال بھی نہ آیا ہوگا۔

لیکن میں ابھی تک نہیں بھولا ہوں۔ جب میں صبح کے وقت اپنے قصبے سے باہر جانے والی سڑک پر یہاں کے "جرائم پیشہ" لوگوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ لکڑی جس کا اُوپر کا سرا جلا ہوا تھا یاد آجاتی ہے۔ میں اپنے دل میں سوچتا ہوں کہ واقعی یہ لوگ انسان نہیں ہیں، درختوں کی سُوکھی ہوئی لکڑیاں ہیں جن کے اُوپر کے سرے جلے ہوئے ہیں!

یہ "جرائم پیشہ" لوگ!

اختر انصاری دہلوی

زمانہ ۔ موسم سرما [illegible]

وقت ۔ صبح جس وقت کالج شروع ہوتے ہیں اور گھر کی مالکہ نوکروں سے سرمارکر چین سے سینے پرونے میں مشغول ہو جاتی ہے۔

افرادِ ڈرامہ

بنّے ۔ ایک تندرست خوش وضع، خودسر، خود رائے اور مُنہ پھٹ۔ پھوہڑ اور لڑاکا۔ بلا کا ذہین اور پڑھنے کا شوقین۔ "بزرگوں کی باتوں میں پٹا پٹ بولنے والا۔ مگر اللہ بی کی نظروں میں "گھی کا لڈو"۔

زہرہ ۔ دُبلی پتلی ڈرپوک سی لڑکی۔ چڑ کر جلدی سے ٹسوے دینے کی عادی اور اللہ بی کے رُعب کی قائل۔ بنّے سے ایک منٹ نہیں بنتی۔ اللہ بی کے بتاتے ہوئے فیشن کے مطابق سادگی پسند۔ سلیقہ مند سُگھڑ۔ بنّے کی خالہ زاد بہن۔

اللہ بی ۔ ۵۰ سالہ کنواری خاتون عمر سے زیادہ "عمر بننے" کا شوق۔ بھانجی اور بھانجے کی پرورش اپنی پیدائشی حق سمجھتی ہیں۔ زہرہ کو ہر وقت "دوتی" بناتی ہیں اور بنّے کو سر چڑھا رکھا ہے۔

ڈپٹی صاحب ۔ خوش حال وضع کے ۴۰ سالہ مرد۔ بہت تندرست۔ سر کے بال اُڑے۔ توند بڑھی ہوئی۔ بہت سُرخ رنگ۔ بڑی بڑی آنسو بھری آنکھیں پُھولی ہوئی مونچھیں۔ ٹھگنا سا قد۔ بیوی اور دو بچے موجود ہیں لیکن زہرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔

آلنو ۔ بڑی بڑی آنکھوں والا معصوم نوکر نما رشتہ دار، جو خوب پٹتا بھی ہے۔ سینما اور گلی ڈنڈے کا عاشق۔

بچے ۔ مختلف ناپ اور تول کے۔ سب پڑوسیوں کے

اسٹیج ۔ ایک دروازہ پشت پر اور دو دائیں بائیں۔

لباس ۔ معمولی۔ مگر نہ ایسے کہ اسٹیج سونی سونی معلوم ہو۔

پہلا سین

درمیانہ درجہ کا ہندوستانی وضع پر آراستہ کمرہ۔ چاندنی اور قالین کے علاوہ دو تین آرام کرسیاں، ایک آدھ چوکی اور اسٹول۔ ایک دروازہ پشت پر، دو دونوں اطراف میں۔ بیچوں بیچ فرش پر اللہ بی سینے پرونے کا سامان رکھے کچھ سینے میں مشغول ہیں۔ زہرہ داہنے دروازے سے ایک سویٹر بنتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ اگرچہ بدمزگی سے آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔

زہرہ ۔ اللہ بی آپ اس کی ... بنّے کی حرکتیں دیکھتی ہیں اس نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ جب دیکھو جب کوئی نہ کوئی آفت مچائے رکھتا ہے۔ میرے کمرے میں جاتا ہے تو ساری چیزیں اُلٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ کبھی میری چیزوں سے اُسے کیا واسطہ۔ مگر نہیں وہ تو میرا ہی البم بیٹھ کر دیکھے گا۔ میری ہی کاپیوں میں سے ورق پھاڑ پھاڑ پرچے لکھے جائیں گے۔ میرے ہی صابن سے دھوتی دھوتی جائیگی۔ میری ہی صراحی میں سے پانی پیئے گا۔

اللہ بی ۔ اُوئی! ذرا تمہاری صراحی میں سے پانی پی لیتا ہے تو بس مر گئیں؟

زہرہ ۔ (تنک کر) مر گئیں! اور جو میری کاپیوں کا ستیاناس لگاتے تو؟ میری چپل میں اپنا پھاوڑے جیسا پیر ڈال ڈال کر توڑ ڈالے تو؟ میری کیاریوں میں جان کر پیر رکھ دے تو؟ اور میری دری پر مٹی بھرے جوتے رکھے تو؟ ایک بات ہو تو کہوں! اللہ اماں تم تو اس کی ہی طرفداری کرتی ہو۔ تم سے کچھ کہنا تو اُلٹی ڈانٹ سُننا ہے۔

اللہ بی ۔ ہاں بیٹی وہ ذرا لاپرواہ ہے۔ کیا ہوا۔ وہ ذرا تجھے چھیڑتا ہے۔ تم ہو کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ بات بات پر ناچی جاتی ہو۔

زہرہ ۔ وہ لاپرواہ ہے تو میں کیا کروں۔ وہ "ذرا" چھیڑتا ہے کہ مجھے کھائے

ہتا ہے۔ میرا تو بات کرنا دوبھر ہے۔

لہ بی۔ تو بھی اُسے ایسی باتیں سُناتی ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔

زہرہ۔ اور دیکھو ہڑا اتنا کہ بس۔ سارے کمرے میں جوتے ٹوپیاں پھیلی پڑی رہتی ہیں۔ بنیصیں ہیں تو وہ چارپائی کے نیچے۔ اچکن ہے تو وہ چارپائی کے نیچے۔ کتابیں ہیں تو فرش پر ماری پھکتی ہیں اور میز پر خدا جانے کہاں کا کباڑ لدا رہتا ہے۔ مجھ سے تو صاف نہیں ہوتا اس کا کمرہ۔

(قریب کے کمرے سے پیروں کی چاپ اور سیٹی کی آواز آتی ہے۔ زہرہ غور سے کان لگا کر سنتی ہے۔ چھن سے کسی برتن کے ٹوٹنے کی آواز آتی ہے۔ زہرہ چونک کر ہزاروں شکنیں چہرے پر ڈال لیتی ہے۔

دروازے میں ببّنے ایک ٹوٹے ہوئے گلدان کے ٹکڑے لئے ہوئے آتا ہے۔ چہرے پر مصنوعی خوف اور دبی ہوئی ہنسی کے جذبات۔ آنکھیں چڑھا کر کندھوں کو جنبش دیتا ہے اور گلدان کے ٹکڑے آہستہ سے زہرہ کی کرسی کے پاس رکھ دیتا ہے۔ اور ہاتھ پشت پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے گویا کوئی بڑا اچھا کام کر کے لایا ہے اور داد کا طالب ہے)

زہرہ۔ اب دیکھ لو الہ بی۔ اب بھی مجھی کو الزام دوگی ببّنے یہ میرا گلدان کیسے ٹوٹا؟

ببّنے۔ (قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے) عجب جاہلانہ سوال ہے کیسے ٹوٹا؟ ہُونہہ! ارے کیسے ٹوٹتا ہے؟ ایسے میں ذرا اُدھر ہٹا اور یہ آپ ہی آپ آن پڑا۔

زہرہ۔ آپ ہی آپ آن پڑا! اب گلدان کے بھی پیر ہوگئے۔ آخر تم میرے کمرے میں گئے ہی کیوں تھے۔

ببّنے۔ ہم تمہارے کمرے میں یوںہیں گئے تھے... ذرا تمہارا قلم لینا تھا۔

زہرہ۔ میرا قلم؟ تمہیں میرا قلم لینے کا کیا حق؟

ببّنے۔ (نہایت سکون سے کرسی پر پھیلتے ہوئے) حق وق تو ہم جانتے نہیں۔ ہمیں ضرورت ہوگی تو ہم تمہاری ہی چیز لیں گے۔ ہمارا قلم کھو جو گیا۔

زہرہ۔ تمہارا قلم کھو گیا تو کیا میں نے کھو دیا۔

ببّنے۔ پھر وہی کوڑھ مغزی! ارے تم نے کھویا، یا میں نے کھویا، یا کتے بلیوں نے کھویا، قلم تو کھو گیا۔

زہرہ۔ یہ خوب زبردستی ہے۔

ببّنے۔ کیا کیا جائے مجبوری۔

زہرہ۔ (بھنا کر) اب الہ بی چپکی بیٹھی ہو۔ ہاں کہدو کہ میرا ہی قصور ہے۔ (رونی صورت بنا کر سوئٹر بُننے لگتی ہے) صبر ہی پڑیگا۔

الہ بی۔ نہیں مانے گا ببّنے۔ سچ تو ہے تُو بہت دق کرتا ہے۔

ببّنے۔ ارے الہ بی آپ اسے نہیں جانتیں۔ یہ کیا کم مجھے دق کرتی ہے گُھنّی گُھنّی۔ ورنہ یہ تو دعا من ہے جس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

الہ بی۔ بس ذرا سی بات میں رو دیتا ہے۔

زہرہ۔ (واقعی رو کر) لو دیکھ، لو الہ بی تو مجھے ہی الزام دینگی۔ (سوئٹر اور سلائیاں پٹخ دیتی ہے اور ساری کے آنچل سے آنکھیں ملنے لگتی ہے ببّنے چپکے سے سوئٹر میں سے سلائیاں گھسیٹ لیتا ہے اور آہستہ آہستہ اُدھیڑتا ہے۔)

ببّنے۔ (بڑے پیار سے) لے زہرہ! دیکھو تو تم نے کیسا خراب بُنا ہے سارا اُدھڑا جا رہا ہے۔

زہرہ۔ (سوئٹر چھین کر) ہائے اللہ۔ ارے کمبخت یہ سلائیاں آخر کیوں نکالدیں اتنی مشکل سے تو بُنا اور.....

ببّنے۔ کیا۔ آ۔ اتنی مشکل سے تو بُنا! لاؤ اس سے اچھا تو میں بُن دوں۔ تمہیم ایسا اچھا بُنتی ہے کہ تم تو مر کے بھی نہ بُن سکو۔

زہرہ۔ بی الہ اماں میری زندگی تو اس گھر میں ہو چکی۔ یا تو ببّنے ہی رہیں یا میں!

ببّنے۔ (مُنہ چڑا کر) ببّنے ہی رہیں یا میں۔ ارے ہمیں خود ہر وقت فکر رہتی ہے کہ کسی طرح تمہارا مُنہ کالا کریں۔ مگر کوئی آنکھ کا اندھا قبولے جب تو۔ ایسی پھوہڑ لڑاکو لڑکی سے کون بیاہ کریگا۔ موئی ہاتھ بھر کی زبان۔ (الہ بی کی آواز کی نقل کر کے) جس گھر میں جائے گی آگ لگا دے گی۔ ذرا ذرا سی بات پر تن تن۔ تن تن۔

(زہرہ بڑبڑاتی، جھلاتی جلدی سے اُٹھکر چلی جاتی اور دھڑ سے دروازے بند کر لیتی ہے)

ببّنے۔ توڑ ڈالو نہ۔ اب دروازوں کی چولیں بھی اُتار لو۔

الہ بی۔ (محبت کی خفگی سے) لے ببّنے کیوں اُسے کھائے لیتا ہے۔

دوسرا سین

ببّنے کا کمرہ۔

(کاہلی اور پھوہڑ پنے کا بہترین نمونہ۔ کمرہ کیا ہے عجائب خانہ ہے۔ ایک پلنگ دو تین کرسیاں، دو تین میزیں بے ترتیبی سے اڑی ہوئی ہیں۔ پلنگ پر معلوم ہوتا ہے کتے لوٹ کر گئے ہیں۔ علاوہ اُلٹے سیدھے تکیوں کے اور بہت سی غیر ضروری چیزیں از قسم ہتوڑی، کیلیں، میلا موزہ، اچکن، کاغذ، چائے کی پیالی، گلاس، دیا سلائی، حتیٰ کہ پالش کی ڈبیا اور دانتوں

کو برش بھی بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے ہیں کتابیں میز
پر اس طرح ایک دوسرے پر رکھی ہیں گویا
ابھی ابھی ان میں جان تھی اور یہ سرپٹکا رہی تھیں بہت
سی کتابیں اور کتابیں آدھی کھلی پڑی ہیں۔ سارے
فرش پر جوتوں اور چپلیوں کا انبار پڑا ہے۔ ایک کونے
میں انگیٹھی اور چائے بنانے کا سامان رکھا ہے۔ آثار
سے معلوم ہوتا ہے کہ شب کے آخری حصے میں چائے
بنائی گئی ہے۔ کچھ جلے ہوئے کاغذ کمرے میں پریشان
ہیں۔ آدھا جلا ہوا کاغذ انگیٹھی میں اب تک ٹھنسا ہوا ہے
پاس ہی ایک مگ میں کانٹا، چھری کھڑے ہیں۔ زہرہ
کمرے میں ذرا ہچکچاتی داخل ہوتی ہے حقارت اور
پریشانی کے جذبات چہرے سے ظاہر ہیں۔ سب چیزوں
پر ایک پریشان نظر ڈالتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کدھر
سے کمرہ صاف کرنا شروع کرے۔ کرسی پر لحاف اس
طرح رکھا ہوا ہے جیسے کوئی سردی سے بچنے کے لئے
اس کا گھونسلا سا بنا کر بیٹھا تھا اور ابھی اٹھ کر گیا ہے
اسے اٹھاتی ہے مگر پھر کچھ نہ سمجھ کر رکھ دیتی ہے۔)

زہرہ۔ اونہہ (پریشان اور تھکی ہوئی نظروں سے پلنگ کو دیکھتی ہے) بھلا کوئی کیسے صفائی کرے جب انسان کی روح ہی گندی ہو۔

(کتابوں کی میز پر سے دو ایک چیزیں اٹھاتی ہے پھر رکھ دیتی ہے۔ پلنگ پر سے بھاری چسٹر اٹھاتی ہے اس میں لپٹی ہوئی چادر کھنچی چلی آتی ہے اور بہت سی پنسلیں ڈبیاں دیا سلائیاں جھڑنے لگتی ہیں۔ ایک چھپکلی پھدک کر دیوار پر جا بیٹھتی ہے۔ زہرہ ڈر کے ہلکے سے "اُئی" کر کے پیچھے ہٹتی ہے سبتے آتا ہے۔)

سبتے۔ (چنگھارتا ہے) اچھا... آ... پکڑی گئیں نہ آج؟ ارے جبھی میں کہوں یہ میری چیزیں کون اڑا لے جاتا ہے... کل میری ساری شکر کوئی کھا گیا۔ میں سمجھا چوہے ہیں۔ آج پتہ چلا کہ جناب ہیں... دو ٹانگوں کی چوہیا...

زہرہ۔ ہوش میں رہنا۔ ایک تو میں کمرہ صاف کرنے آئی اور...

سبتے۔ یہ ایک تو، دو تو مجھ سے نہ چلے گی۔ اونہک۔ سیدھی طرح میری چیزیں لائیے۔

زہرہ۔ بھاڑ میں جائیں تمہاری چیزیں، میں کیا جانوں!

سبتے۔ بھاڑ میں جاؤ تم خود اور صاحب ایک تو چیزیں غائب اوپر سے غراتا۔ مگر یہ تو بتاؤ جب میں نے تمہیں منع کر دیا ہے کہ خبردار میرے کمرے میں قدم نہ رکھنا ورنہ ٹانگیں توڑ دی جائیں گی تو ....

زہرہ۔ چپ بدتمیز۔ بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آئے وہاں سے ٹانگیں توڑنے والے۔ میں کیوں آتی۔ اماں بی نے بھیجا کہ ذرا کمرہ صاف کر لو۔ مہمان آ رہے ہیں۔ کمرہ تمہارا سیوڑوں[1] سے بدتر تمہاری چیزوں کی جیسے میں بڑی بھوکی ہوں نا ہیں بھی بڑی بہت سی چیزیں؟

سبتے۔ اب تمہاری بلا سے ہمارا کمرہ جیسا بھی ہے اور چیزوں کا کیا کہوں لوگوں نے کمرہ صاف کرنے کے بہانے جھاڑو ہی پھیر دی۔

زہرہ۔ مجھے غرض پڑی ہے جو میں صاف کروں (جانے لگتی ہے)

سبتے۔ چلیں کہاں ... جناب عالی پہلے میری چیزیں ... اور یہ کمرہ کی جو ریڑھ لگائی ہے وہ تو پہلے ٹھیک کیجئے۔ ورنہ ...

زہرہ۔ ورنہ؟ ورنہ؟ تم کیا کر لوگے۔ بیہودہ کہیں کے۔

سبتے۔ جانتی ہو میرا غصہ برا ہے۔

زہرہ۔ (ہنس کر) بڑا جناب کا غصہ۔ ہوش میں ذرا۔

سبتے۔ اچھا اب دانت مت نکالو جھاڑو سنبھالو اور کام شروع کرو۔ چوہیا!

زہرہ۔ بدتمیز (تھپڑ اٹھاتی ہے۔ سبتے ڈر کر پیچھے ہٹتا ہے۔ میز پر سے گلاس لڑھک کر ٹوٹ جاتا ہے۔)

سبتے۔ توڑ ڈالا نا۔

زہرہ۔ میں نے توڑا ہے؟

سبتے۔ نہیں بیگم صاحبہ۔ تم نے کاہے کو توڑا۔ آخر تم میرے کمرے میں آئی ہی کیوں؟

زہرہ۔ تو میں دام دیدوں گی۔ کتنے کا تھا؟

سبتے۔ کتنے کا تھا۔ بڑی دام دیں گی۔ لیکے ایک تو سارے کمرے کو کھوند کر ڈال دیا اور اوپر سے ساری چیزیں توڑ ڈالیں۔

زہرہ۔ میں نے بگاڑا ہے تمہارا کمرہ؟

سبتے۔ اور نہیں تو کیا ایسا تھا؟ ایسا؟ (کمرے کی چیزوں کو اشارہ کر کے) ایسا سامان پھیلا تھا؟ بھلا کوئی آدمی ایسے کمرے میں رہ سکتا ہے۔

زہرہ۔ (ہنس کر) تم آدمی ہو کب؟ جانوروں سے بدتر ہو۔

سبتے۔ اچھا کمرہ تو صاف کرو۔

زہرہ۔ نہیں کرتے۔

سبتے۔ (بڑی نرمی سے) پھر مہمان جو آئیں گے تو۔ اماں بی کیا کہیں گی۔

[1] ایک خانہ بدوش قوم جو چور بھی ہوتی ہے۔ علیگڑھ میں بہت آباد ہیں۔

زہرہ:۔ کہنے دو۔ میں کہہ دوں گی تم لڑتے ہو۔

بنے:۔ اچھا اب نہیں لڑیں گے۔ بس وہ پلنگ صاف کر دو، باقی میں کر دونگا۔

زہرہ:۔ اور پھر چوریاں لگانا

بنے:۔ نہیں۔ بس وہ پلنگ اور یہ میز اب کچھ نہیں کہیں گے۔

زہرہ:۔ پلنگ میں نہیں چھوؤں گی، اس میں چھپکلی ہے۔

بنے:۔ کیا چھپکلی تمہیں نگل جائیگی۔ یہ تم سب چھپکلی سے کیوں ڈرتی ہو۔

زہرہ:۔ (میز پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے) ہمیں گندی لگتی ہے۔

بنے:۔ گندی لگتی ہے۔ تم سے تو صاف ہی ہے۔ سب لڑکیوں کو گندی لگتی ہے؟

زہرہ:۔ ہمیں ڈر بھی لگتا ہے۔

بنے:۔ آئے ہائے رہنے دو۔ کچھ فیشن ہی ہے۔ ساری لڑکیاں چھپکلی سے ڈرنا فرض سمجھتی ہیں۔ بہنیں بھی ڈرتی ہیں۔ سلطانہ کا بھی چھپکلی سے دم نکلتا ہے، رضیہ بھی مری جاتی ہے

زہرہ:۔ واہ وا۔ فیشن کیوں ہوتا۔ وہ ہوتی ہی گندی ہے۔

بنے:۔ (ایک کالا کاغذ کا ٹکڑا زہرہ پہ ڈال کر) لے۔

زہرہ:۔ (ڈر کر پیچھے ہٹتی ہے) واہ کیا میں ڈرتی ہوں۔

(دونوں خاموشی سے کمرہ صاف کرتے ہیں۔ بنے صرف چیزیں الٹ پلٹ کرتا ہے۔ کبھی کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ کوڑا اس طرح جھاڑتا ہے کہ سب زہرہ پر پڑے۔ پھر مسکرا کر اسے معاف کرنا کہہ دیتا ہے۔ زہرہ کچھ نہیں سمجھتی۔ بوجھل بوجھل کوٹ اور لحاف طے کر رہی ہے۔)

بنے:۔ یہ کون مہمان آرہے ہیں... زہرہ!

زہرہ:۔ معلوم نہیں کوئی میرٹھ سے آرہا ہے۔

بنے:۔ (تھوڑی دیر سوچتا ہے) کیا عورتیں بھی ہیں؟ (پھٹ پھٹ کرکے کتابیں زہرہ کی طرف جھاڑتا ہے)

زہرہ:۔ اونہوں... بھی... ہاں عورتیں بھی ہیں۔

بنے:۔ ارے یہ کون لوگ آرہے ہیں۔

(زہرہ خاموشی سے چٹکی سے گندے موزے اٹھا کر ٹوکری میں ڈالتی ہے۔)

بنے:۔ کیا مرد بھی ہیں

زہرہ:۔ ہاں۔ بھئی دماغ چاٹ گئے۔

بنے:۔ (خاموش کچھ سوچتا ہے) اچھا۔ آ... آ... اب سمجھے۔ جناب کے بر دکھوانے کو آرہے ہیں! اسی لئے بھی دوڑ دوڑ کر کمرے صاف ہو رہے ہیں۔

زہرہ:۔ بھئی میں چلی جاؤں گی اگر تم نے بدتمیزی کی تو۔

بنے:۔ بلا سے چلی جاؤ کوئی میری سسرال سے آدمی تھوڑی آرہے ہیں جو اترا اترا کر اپنا سگھڑاپا دکھاؤں۔

زہرہ:۔ اونہہ خاک پڑے۔ مجھے کیا پڑی ہے جو... (کتابیں پٹخ کر چلدیتی ہے۔)

بنے:۔ ہوں تو یہ کچھ مہمان آرہے ہیں..... (تھوڑی دیر کمرہ کے چاروں طرف نظر ڈالتا ہے) سچ کہتی ہے زہرہ بھوڑے ہی ایسے کمرے میں رہ سکتے ہیں۔ اچھا۔ (جلدی جلدی صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دروازے میں آٹھ دس چھوٹے بڑے بچوں کا گروہ دکھائی دیتا ہے۔)

بچے:۔ بنے بھیا۔ آ... ہا...

(بنے زور سے ہنستا ہے)

(بچے اندر آکر اس سے لپٹ کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب کو تکئے سے بے طرح دھنتا ہے۔ بچے خوش خوش ہنستے رہتے ہیں۔)

تیسرا سین

(زہرہ کا کمرہ۔ نہایت سلیقے سے صاف ستھرا آراستہ۔ کمرے میں زمین کے فرش کے علاوہ میز کرسیاں وغیرہ سلیقے سے رکھی ہیں۔ ایک جھولے دار کرسی پر زہرہ آگے پیچھے جھول رہی ہے۔ اخبار کو بے توجہی سے دیکھتی جاتی ہے۔ دروازے میں بنے لباس شب خوابی پر چھوٹا سا اوڈھنگا سا کوٹ پہنے مع بچوں کی فوج کے جھانک رہا ہے۔ بنے ہونٹ پر انگلی رکھے خاموشی کا اشارہ کرکے آہستہ آہستہ جھانکتا ہے۔ بچے ہنسی روکنے کے لئے دونوں ہاتھوں سے ناک اور منہ بند کئے ہوئے ہیں۔ دو تین بچے کھوں کھوں ہنستے ہیں۔ زہرہ مڑ کر دیکھتی ہے تو سب بھاگ جاتے ہیں۔ صرف بنے چھت کو اس انداز سے دیکھنے لگتا ہے گویا خاص طور پر چھت دیکھنے آیا ہے۔ زہرہ ایک دفعہ بڑے وقار سے چھت کی طرف دیکھتی ہے اور پھر اخبار پڑھنے لگتی ہے۔ بچے واپس آجاتے ہیں۔ بنے ایک بچے کو آگے جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا کر انکار کرتا ہے۔ بنے ہاتھ جھٹک کر گئے بزدل بتاتا ہے۔ ایک پتلی سی لمبی سی لڑکی اونچی اونچی فراک پہنے اپنی خدمات پیش کرتی ہے.......

سبتے شاباشی دیکر آگے کھینچتا ہے۔ لڑکی ڈری ڈری دو قدم
بڑھتی ہے پھر لوٹ جاتی ہے۔)
...ا۔ (چپکے سے) ماریں گی!
...ے۔ (اشارہ سے) نہیں، ہم جو ہیں۔
...ی۔ (دلیری سے آگے آکر) پیٹوخاں کی دلہن سلام۔ (تیزی سے بھاگ کر
...ے بچوں سے ٹکرا جاتی ہے۔)
(زہرہ اپنی جگہ تلملا کر رہ جاتی ہے۔ ذرا گردن کو تیز جنبش
ہوتی ہے۔ دقارت آمیز ہے۔ سب بچے اور سبتے اندر
داخل ہوتے ہیں اور ایک بے تکی قطار میں کھڑے ہو کر)
سب بچے۔ پیٹوخاں کی دلہن سلام۔
زہرہ۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔
(ذرا سی ہنسی آتی ہے جسے وہ دبانے کی کوشش کرتی
ہے۔ سب بچے ایک گھیرا بنا کر اس کے چاروں طرف
گھومتے ہیں۔ بچے چیں چیں کرکے چلاتے ہیں صرف
"پیٹوخاں ۔ ۔ ۔ اور "دلہن" سنائی دیتا ہے۔)
زہرہ۔ (نہایت سنبھلتے ہوئے قدم سے آگے بڑھتی ہے۔ ساری بھیڑ چھٹ جاتی
ہے۔ سبتے ایک کونے میں بنکر سہم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ زہرہ دیوار پر سے ریکٹ
اتارتی ہے اور اسے ذرا مضبوطی سے تولتی ہے۔) ہوں اب کہئے۔ کیا کہہ
رہے تھے تم لوگ۔
(سبتے بنکر اور کونے میں دبک جاتا ہے اور ڈری ہوئی
نظروں سے بچوں کو اور کبھی زہرہ کو اور بلّے کو دیکھتا ہے۔
بچوں کے منہ جھک۔)
زہرہ۔ (زور سے) بولو، کیا کہہ رہے تھے۔
بچے۔ (سہمی سہمی ہوئی آواز میں) ہم تو ۔ ۔ ۔ ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں ۔ ۔ ۔ رہے
تھے۔ سبتے بھیا ہمیں لاتے ہیں۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔
زہرہ۔ اور وور کچھ نہیں۔ یہ تم کہہ کیا رہے تھے۔ (کھٹا کھٹ بلّے بچوں کے
سر اور پیٹھ پر جاتی ہے۔ سب خوشامد کرتے ہیں۔) نہیں اور کہو۔ (اور سبتے
مارتی ہے۔)
بچے۔ توبہ (ایک کونے میں گھر جاتے ہیں) اب کبھی نہیں
زہرہ۔ کہو۔ سب کہو۔ سبتے بھیا اُلّو۔ گدھے۔ باجی۔
بچے۔ (ڈر کر کبھی سبتے کو کبھی بلّے کو دیکھتے ہیں) سبتے ۔ ۔ ۔ بھیا ۔ ۔ ۔ اُم ۔ ۔ ۔
اُم ۔ ۔ ۔ اُں ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
زہرہ۔ (پھر بلّے گھماتی ہے) کہو۔
بچے۔ باجی
سبتے۔ بچاری کو باجی کہہ رہے ہیں۔
زہرہ۔ (پھر بلّے گھماتی ہے) کہو سبتے بھیا اُلّو ۔ ۔ ۔ گدھے۔ باجی
بچے۔ (ڈرتے ڈرتے) سبتے بھیا ۔ ۔ ۔ اُلّو ۔ ۔ ۔ گدھے ۔ ۔ ۔ اُم ۔ ۔ ۔ آں۔ باجی۔
زہرہ۔ چلو نکلو۔ (بچے بھاگ گئے ہیں) نکلو سبتے تم بھی نکلو ورنہ خدا کی قسم بڑے زور
سے ماروں گی۔ چلو۔
سبتے۔ اے باپ رے۔ مگر سنو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
زہرہ۔ کچھ سنو ونو نہیں۔ بس چلئے۔ ورنہ لگ جائے گا۔
(سبتے سنکرتا رہتا۔ فوفو آواز منہ سے نکالتا باہر چلا جاتا ہے۔
مگر دروازے کے پاس کھڑا رہتا ہے۔ ایک سگرٹ نکال
کر سلگاتا ہے۔ دبے پاؤں پیچھے سے آکر زہرہ کے منہ
پر دھواں چھوڑ دیتا ہے۔)
زہرہ۔ (کھانستی ہے) اونہوں۔ پھر آ نکلو ۔ ۔ ۔ بھئی سبتے نکلو میرے کمرے
سے۔ اوہوں۔ سارا کمرہ بدبو سے سڑ گیا
سبتے۔ افوہ رے دماغ۔ اور یہ جو گال پھلا کر بڑی سی توند ہاتھ پھیلا کر
اشارہ کرتا ہے) یہ جو دن بھر اے۔ آئی۔ آر کا انجن بنے رہتے ہیں ——
(اسٹول کھینچ کر زہرہ کے پاس بیٹھ جاتا ہے) سچ کہتا ہوں زہری۔ ایسا
بد وضع انسان تیرے پلّے پڑنے والا ہے کہ حد نہیں۔ یہ توند۔ سپاٹ چندیا۔
یہ پھیلی پھیلی مونچھیں جیسے کسی نے بوتل دھونے کا برش دانتوں میں دبا لیا
ہوا۔ یہ گلا اور گردن تو بالکل ہاتھی کی سی ہے۔ اور پیر یہ بڑے بڑے۔
(کہنی تک لمبان بنا کر) بس یہ سمجھ لو کہ کوئی پہلوان بیٹھا ہوا ہے
(زہرہ بھویں سکیڑ کر ہنستی ہے۔)
سبتے۔ سچ کہتا ہوں اور ایک بیوی دو بچوں کا پہلے ہی سے مالک۔ اچھا ہے۔
بچے تو خوب ٹھوکنے کو ملیں گے۔ مگر روپیہ بہت ہے۔ گہرے رہیں گے
تمہارے تو۔
(زہرہ کچھ جواب نہیں دیتی)
سبتے۔ اس کی موجودہ بیوی جاہل ہے۔ تعلیم یافتہ چاہتے ہیں۔ سب بات تو
خیر ہو گئی۔ یہ بچے تو بس تھکا دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ آخر
الربی خود اس سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتیں۔
زہرہ۔ ہیں ہیں۔ سبتے ہوش میں ذرا۔ دماغ خراب ہوا ہے۔
سبتے۔ اے تو تم خود اس پیٹو سے شادی کرنے پر تلی ہوئی ہو۔
زہرہ۔ میں کیوں ہوتی۔
سبتے۔ اور پھر کون ہے؟

زہرہ۔ میں کروں گی ہی کب۔

بنّے۔ آلہ اماں جو......

زہرہ۔ کہنے دو آلہ اماں کو۔ مگر......

بنّے۔ اگر مگر تمہاری کیا چلے گی تم بزدل لڑکیوں کو اور آتا ہی کیا ہے۔ یا تو سنکھیا کھا کر چوہے کی طرح مر گئیں یا اب نئی روشنی کی دلدادہ بے تعلیمیافتہ چھوکریوں کی طرح اِدھر اُدھر نکل کھڑی ہوئیں۔ بات تو جب ہے کہ لڑ بِڑ اور صاف کہدو کہ آلہ بی اِس بڈھے سے تو آپ ہی کیجئے۔

زہرہ۔ چُپ رہو بنّے۔ کیا غضب ہے۔ جوتے کھانے کی دل میں ہے؟

الہ بی۔ (دروازے سے) لے یہ کب سے کھانے کیلئے بلا رہی ہوں۔ بنّے باہر جاؤ ڈپٹی صاحب کے ساتھ کھانا کھا لینا۔ میں نے قادری صاحب کے یہاں سے کھانے کا سیٹ منگوا لیا ہے اور تمہاری میز وہاں بچھوا دی ہے۔ ذرا سلیقہ سے کھانا۔

بنّے۔ بھلا یہ قادری صاحب کے یہاں سے برتن منگوانے کی کونسی مار تھی۔ اپنے یہاں جو غریبانہ برتن تھے کافی نہ تھے۔

الہ بی۔ وہ بڑے فیشن ایبل ہیں۔ اُنکے یہاں سڑے ہوئے جاپانی سٹ ہیں ——!

بنّے۔ تو کیا ہوا۔ ہمارے تو سٹ جاپانی ہیں اور وہ خود جاپانی دولہا ہیں۔ سوچنے کا مقام ہے کہ نہیں؟ چالیس برس کے ڈھونگ بیوی موجود بچے موجود صاحب دوسری شادی کر رہے ہیں۔

الہ بی۔ بنّے وہ بوڑھے تو نہیں لوگ کہتے ہیں تیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ دوسری شادی وہ اس لئے کر رہے ہیں کہ بیوی جاہل ہے۔

بنّے۔ خوب۔ تو پھر پہلے اُس بدنصیب سے کی ہی کیوں تھی۔

الہ بی۔ لے ہے۔ وہ کب کرتے تھے۔ اباّ نے زبردستی کر دی عین شادی کے وقت بلا کر نکاح کرنے کو کہا۔ انہوں نے انکار کیا تو بولے عاق کر دوں گا۔ بچارے چُپ ہو رہے۔ سنا ہے بیوی اُن سے عمر میں بڑی ہیں۔

بنّے۔ یہ سب جعل ہے۔ اور وہ جو زہرہ کے باپ سے بھی بڑا ہے تو آج کہتا ہے باپ نے زبردستی شادی کی تھی اسلئے دوسری کر رہا ہوں۔ کل کو کہیگا اماں نے زبردستی شادی کی تو زہرہ کے اُوپر سوت لا رہا ہوں۔

الہ بی۔ واہ ہم حقِ طلاق اور پچھتر ہزار مہر جو لکھوا لیں گے۔ میاں کو خبر پڑ جائے گی۔

بنّے۔ خبر کیا پڑ جائے گی۔ قادری صاحب کی لڑکیوں کے یہاں بھی تو یہی ڈھونگ رچا تھا۔ پھر مل نہ گیا انہیں مہر اور طلاق؟ لاکھ دعوے کر ڈالو اور سارے میں مشہور ہو گئے۔

الہ بی۔ نہ جانے کیا بک رہا ہے۔ اچھا خاصہ لڑکا مل گیا ہے۔ بھئی ہم لوگ ایسے تو رئیس ہیں نہیں جو کوئی آسانی سے ہماری لڑکی سے شادی کر لے۔ کوئی ڈھنگ کا پیغام نہیں آتا۔ روپیہ نہیں تو شہر بھر میں کسی کو پتہ بھی نہیں کہ ہماری لڑکی بھی شادی کے قابل ہے۔ ابھی جو امیر ہوتے تو مکھیوں کی طرح اچھے سے اچھا لڑکا آن گرتا۔ روپیہ ہوگا تو پھر سب کچھ ملے گا۔

بنّے۔ کچھ بھی ہو میں ذرا آج ڈپٹی صاحب سے دو دو باتیں کرونگا۔ انہیں یہ شرائط بھی معلوم ہیں۔

الہ بی۔ لے سب معلوم ہیں۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ تاریخ ٹھہرانے آئے ہیں۔ اُن کی بہن سب انتظام کر رہی ہیں۔ پہلی بیوی سوتیلی ماں کی بہن ہیں۔ اُنہوں نے زبردستی کر دی تھی۔

بنّے۔ بیٹا کیٔ پہلوان اور زبردستی شادی کر والی۔ سب مکاری ہے۔

الہ بی۔ ہوگی! تم تو دیوانے ہو۔ اٹھو جاؤ کھانے کے لئے۔ میں ابھی بھیجتی ہوں۔

بنّے۔ (اُٹھتا ہے) ذرا ہاتھ ڈالوں۔ (جاتا ہے)

چوتھا سین

(صاف ستھرا لمبا کمرہ۔ بیچوں بیچ میں ایک میز لگی ہے جس پر بہت لمبا سا میز پوش پڑا ہے جس نے میز کے کھُرچے ہوئے پایوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ آمنے سامنے دو دفتر کی کرسیاں رکھی ہیں۔ بہت قیمتی ڈنر سٹ کی چار پلیٹیں رکھی ہیں۔ بیچ میں ایک شیشے کا بیچرنگا گلدان رکھا ہے۔ ایک اُونچا اُونچا پاجامہ اور نیچا سا کُرتا پہنے نوکر سینے پر ہاتھ لپیٹے لاپروائی سے ایک پیر پر زور ڈالے کھڑا ہے۔ ایک اسٹول پر صراحی اور گلاس رکھے ہیں بنّے اور اُسکے پیچھے ڈپٹی صاحب تولیہ سے ہاتھ پوچھتے داخل ہوتے ہیں بنّے نوکر کی اُس ٹانگ پر جس پر وہ زور ڈالے ہے ایک چپراس لگاتا ہے۔ نوکر ہاتھ پھیلا کر توازن قائم کرتا ہے۔ اور "ارے" کہکر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ ڈپٹی صاحب مسکراتے ہیں۔ دونوں بیٹھ جاتے ہیں کھانا شروع ہوتا ہے)

بنّے۔ بات یہ ہے ڈپٹی صاحب یہ اُلّو ہمارا نوکر نہیں بلکہ رشتہ دار ہے۔ ذرا پھوہڑ واقع ہوا ہے۔ بدتمیز!

ڈپٹی صاحب۔ (رہنوالے رشتہ دار کو غور سے دیکھکر) ہوں۔

بنّے۔ جاؤ اُلّو ذرا اچار اس رکابی میں لے آؤ۔ سنبھال کر ٹوٹے نہیں قادری

صاحب کے برتن ہیں۔ مہمانوں کی وجہ سے منگا لئے ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں تو سڑے ہوئے جاپانی ہیں۔

(انو سر کھجاتا ہوا رکابی لیجاتا ہے)

ڈپٹی صاحب۔ (غریبی کے ثبوت کو نظر انداز کرتے ہوئے) یہ مکان جناب کا ذاتی ہے

بنّے۔ ذاتی کہاں، ہماری خالہ کا ہے انہیں کے نام ہے۔

ڈپٹی صاحب۔ ہوں۔

بنّے۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ جلد کی شادی انجام پا جائے نا؟ پھر آپ کو ذرا رخصت مشکل سے ملے گی۔

ڈپٹی صاحب۔ جی ہاں قطعی آپ کا خیال درست ہے۔ میں تو بہت جلد چاہتا ہوں۔

بنّے۔ (ایکدم سے) کیوں؟

ڈپٹی صاحب۔ (ذرا چونک کر) ار... یوں کہ پھر مجھے چھٹیاں نہ ملیں گی۔

بنّے۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کی تو بیوی موجود ہیں۔ یہ دوسری شادی کیوں کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

ڈپٹی صاحب۔ (ذرا سٹپٹا کر) بات یہ ہے کہ وہ ذرا میرے مذاق کے مطابق نہیں۔ جاہل ہیں۔ بالکل ان پڑھ۔ میری ہمخیال نہیں۔

بنّے۔ مگر آپکو یہ کیسے معلوم کہ میری بہن آپکی ہم خیال ہوگی۔

ڈپٹی صاحب۔ وہ۔ وہ تعلیم یافتہ ہیں سمجھدار ہیں۔

بنّے۔ مگر وہ آپ سے تقریباً پچیس سال چھوٹی ہے بالکل بچہ۔ بھلا وہ آپ کی ہم خیال کیا ہوگی؟

ڈپٹی صاحب۔ (گھبرا کر) میرا مطلب ہے وہ عالمہ ہیں۔ سمجھدار ہیں۔ میری بیوی بالکل جاہل ہے اسکے ساتھ میری گزر ناممکن ہے۔

بنّے۔ میری بہن بہت بد مزاج اور لڑاکا ہے۔ اُسے ذرا سی بات کی برداشت نہیں ہوتی۔ آپ سے اب کیوں چھپایا جائے۔ ذرا ذرا سی بات پر رُند رہتی ہے۔

ڈپٹی صاحب۔ (ذرا مسکرا کر) مجھے اُن کے خلاف کبھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوگی۔ دوسرے وہ اگر دو باتیں بے جا کہیں گی تو بھی میں برداشت کرلونگا۔

بنّے۔ معاف کرئیے گا ڈپٹی صاحب آپ اس وقت ذرا رومانٹک ہو رہے ہیں۔ ذرا غور کرئیے۔ اپنی اچھی خاصی زندگی میں کیوں کانٹے بو رہے ہیں۔ گھر کا دن عنقا ہو جائیگا۔ چھوڑئیے اس بیہودہ خیال کو۔ آپکو شرائط بھی معلوم ہیں؟ حق طلاق اور پچھتر ہزار مہر؟

ڈپٹی صاحب۔ جی مجھے سب منظور ہے۔

(مہر لے کے آتی ہے) کہو۔

بنّے۔ کیا آپ کو کبھی یہ بھی خیال آیا ہے کہ کہاں سے آپ اتنا مہر لائینگے۔ اور جب طلاق ہی دینا ہے تو شادی ہی کیوں کر رہے ہیں

ڈپٹی صاحب۔ (تو الجھتے ہوئے) میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بنّے۔ یوں لیجئے۔ آپ فرض کیجئے شادی کے چوتھے روز زہرہ آپکو طلاق دیدے اور مہر کا دعویٰ کردے تو؟

ڈپٹی صاحب۔ (سٹپٹا کر) جی۔ آخر بے وجہ یہ کیوں۔

بنّے۔ بے وجہ کیوں اُس کی شادی اُس کی مرضی سے کی نہیں جا رہی لہذا وہ یہی وجہ بتا سکتی ہے کہ چونکہ بزرگوں نے زبردستی کی تھی لہذا اب میں دوسری کرنا چاہتی ہوں۔

ڈپٹی صاحب۔ لاحول ولا قوۃ یہ کہیں شریف گھرانوں میں ہوا کرتا ہے؟

بنّے۔ اس میں کیا برائی ہے۔ آجکل بہتیرے ایسے واقعات سننے میں آئے ہیں۔ زہرہ کو رہنے دیجئے۔ میں چاہوں تو زہرہ کو زبردستی آپ کے یہاں جانے سے روک لوں اور طلاق دلوا دوں۔

ڈپٹی صاحب۔ زبردستی؟ یہ کیسے؟

بنّے۔ ویسے ہی جیسے کہ آپ اب کر رہے ہیں۔ کہ زبردستی اُسکی شادی آپ کر رہے ہیں۔

ڈپٹی صاحب۔ مجھے آپ لوگوں پر قطعی بھروسہ ہے اور کبھی کوئی برے برتاؤ کی اُمید نہیں۔

بنّے۔ معاف کیجئے گا ڈپٹی صاحب آپ بڑے بھولے ہیں۔ ہم لوگ اتنے بیوقوف نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ دیکھئے نا یہ میز ہم نے آپ کے اوپر رُعب ڈالنے کے لئے قادری صاحب سے منگوایا ہے۔ اور یہ میز میرے پڑھنے کی ہے۔ ہم لوگ تو عموماً تخت یا چارپائی پر بیٹھکر کھا لیتے ہیں۔ چیز یا پھانسنے کے لئے پھنکی لگانی پڑتی ہے۔ ارے آپ تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ ارے صاحب کھائیے نا۔

ڈپٹی صاحب۔ (جو حد درجہ کھسیانے اور پریشان ہو رہے ہیں) میں تو آپ لوگوں کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔

بنّے۔ کہا نا میں نے آپ سیدھے سادے بھولے آدمی ہمارے ہتکنڈے کیا سمجھیں۔ کھائیے نا۔

ڈپٹی صاحب۔ (نیچی نظروں سے) میں چار بجے کی گاڑی سے چلا جاؤنگا۔

بنّے۔ ارے آپ تو باتوں ہی باتوں میں بگڑ بیٹھے۔ ابھی حضرت کل اتوار ہے ہرن کے شکار کو چلئے گا۔ قادری صاحب سے بندوق مانگ لیں گے۔

(قہقہہ لگاتا ہے)

ڈپٹی صاحب۔ (کھسیانی ہنسی سے) جی نہیں۔ ہاں... وہ ذرا مجھے بھی کام ہے۔

پانچواں سین

(دو سال بعد ببّنے کا کمرہ۔ ویسا ہی گندہ اور اُجڑا، فرق صرف اتنا ہے کہ ذرا قیمتی اور بہتر سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا ہے۔ اور چائے کا سامان نہیں۔ نہ ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔ ببّنے سفید پینٹ اور سُرخ کوٹ پہنے ٹینس کا بلّا ہاتھ میں لئے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔)

ببّنے۔ پی۔ سی۔ ایس (زور زور سے دیگر الفاظ دہراتا ہے) ان الفاظ میں بھی کیا جادو ہے۔ ایک بندر کو بھی یہ تین ننھے مُنّے الفاظ انسان بنا دیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے۔ ببّنے خاں کو لوگ کھلنڈرا اور پھکڑ سمجھتے تھے۔ مگر آج تو گویا جو ببّنے خاں کے ہے وہ راجہ کے نہیں۔ (کمرے کی بے ترتیبی پر نظر ڈال کر) سچ کہتی ہے زہرہ واقعی میں ہوڑوں کی طرح رہتا ہوں۔ مگر اوہ... کیا پروا ہے۔ ایک پی۔ سی۔ ایس گندہ رہ سکتا ہے۔ کون اُسے روک سکتا ہے۔ خواہ وہ اس سے بھی گندہ رہے۔ رشید کہتا ہے میرے گھرے ہیں۔

الہ بی۔ (دروازے سے داخل ہو کر) ببّنے کیا کر رہے ہو۔ اوئی ذرا کمرے کی صورت تو دیکھو۔ خیر سے اب بڑے آدمی ہو گئے۔ بیرا رکھو۔

ببّنے۔ الہ بی ہم تو اس گندے کمرے میں مگن ہیں۔ آپ کا جی چاہے جسے رکھیے۔

الہ بی۔ (سنجیدگی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اب گھر والی خود ہی سب جائیگی رکھے گی۔ ہاں ببّنے وہ تم نے اُس بات کا جواب نہیں دیا۔ میں جج صاحب سے کیا کہوں۔

ببّنے۔ کون سے جج صاحب؟

الہ بی۔ وہی! کیا ننھے بنے جاتے ہو۔ اے وہی انہوں نے اپنی لڑکی کیلئے کہلوایا تھا۔ انہیں ایک اچھے لڑکے کی عرصہ سے تلاش ہے۔

ببّنے۔ نیا نیا کام۔ مجھے اتنی فرصت کہاں ہے کہ جج صاحب کے لئے لڑکا ڈھونڈتا پھروں۔

الہ بی۔ اے کچھ تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ دیوانے وہ تو تمہاری طرف اشارہ ہے۔

ببّنے۔ (سینے پر انگلی رکھ کر) خاکسار کی طرف۔ (مصنوعی ہنسی ہنس کر) ہیں ہیں ہیں۔ اوہو بڑی عنایت...... مگر مجھ سے تو وہ بار ہا ملے کبھی ذکر تک نہ کیا۔

الہ بی۔ اے تو کیا خود آن کر تم سے کہتے کہ میری لڑکی قبول لو۔

ببّنے۔ تو اس میں کیا برائی ہے۔ ہمارے ڈپٹی صاحب ہی کو لو۔ زہرہ کیلئے خود ہی سب کچھ طے کر کے بر دکھانے کو آئے تھے۔

الہ بی۔ اے تو وہ اور بات تھی۔ لڑکی کا پیغام تو لیکر کوئی نہیں دوڑتا۔

ببّنے۔ کیوں نہیں۔ اپنے لئے تو اور بات ہوا ہی کرتی ہے۔ لڑکی کے لئے پیغام لیکر جاتے لاج نہیں آتی ہے۔ بڑھاپے میں خود اپنے لئے دلہن ڈھونڈتے نہیں شرماتے۔

الہ بی۔ تم تو جھکی ہو۔

ببّنے۔ جھکی سہی۔ انہیں غرض پڑی ہو آئیں اور پیغام دیں۔

الہ بی۔ اور تم انکار کر دو۔

ببّنے۔ اس میں کیا برائی ہے۔ بچارے ڈپٹی صاحب کیا اپنا سا منہ لیکر گئے تھے۔

الہ بی۔ اے چل بیٹھ۔ اُن کی جوتی کو بھی غرض نہیں پڑی ہے جو....

ببّنے۔ جی ہاں کیوں پڑنے لگی تھی۔ کوئی اپنا نکاح تھوڑی ہے کہ دوڑ دوڑ کے سسرال جائیں اور جوتیاں چاٹیں۔

الہ بی۔ ببّنے نہ جانے تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ اچھا نسیم صاحب کی لڑکی۔ وہ تو تعلیم یافتہ ہے خود نسیم صاحب نے مجھ سے کہلوایا ہے۔

ببّنے۔ کیسی لڑکی ہے؟

الہ بی۔ اے اچھی ہے۔ روپیہ بہت ہے۔ ایک لڑکی ہے۔

ببّنے۔ صورت شکل۔

الہ بی۔ آدمی کا بچہ ہے۔

ببّنے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ بلی کا بچہ نہیں پھر بھی۔

الہ بی۔ صورت تو ذرا ویسی ہے۔ مگر بڑی سلیقہ مند ہے۔ دولت بہت ہے۔

ببّنے۔ یہ "ذرا ویسی" سے کیا مطلب۔ صاف کہئے بدصورت ہے۔ دوسرے میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُسکے مزاج سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔

الہ بی۔ اے مزاج سے تو تم کیا واقف ہو گے۔ تمہارے مزاج کی تو دنیا میں نہ ہو کوئی لڑکی ہو۔ فکر کیا کرو گے۔

ببّنے۔ اگر میرے مزاج کی لڑکی ملنا دشوار ہے تو پھر ضرورت ہی کیا ہے کہ شادی کر لوں ہی کروں۔

الہ بی۔ تم جانو۔ بھیا۔ میں تو زہرہ کو لیکر دہلی جا رہی ہوں۔ کرو بیاہ اور چلاؤ گھر۔

ببّنے۔ "کرو بیاہ اور چلاؤ گھر" گویا بیوی کوئی ڈنڈا ہے جس سے گھر ہانکا جائیگا۔ خوب اِتنگ کر مارا۔ اِدھر نوکر ہوئے اُدھر لوگوں نے ہماری شادی کی فکر میں گھلنا شروع کیا۔ جسے دیکھو چلا آتا ہے کہ کرو شادی۔ گویا ان لوگوں کو ہماری بڑی ہی فکر ہے۔ اور بھی تو ہیں اللہ کے بندے جن کو صرف اس لئے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ وہ نوکر نہیں۔

الہ بی۔ تم جاؤ۔ (اٹھکر جانے لگتی ہے)

بنے۔ (ٹہلتے ہوئے) لوگوں نے شادی کر کے میری چڑ مقرر کردی ہے۔ دراصل میری تھوڑی ہی میری لڑکی کی شادی کی فکر ہے۔

الہ بی۔ اونہہ۔ (جاتی ہے)

بنے۔ (کچھ بے تُکے انداز سے گنگناتا ہے۔ اور کھونٹی پر سے مفلر اتار کر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر لپیٹتا ہے۔ زہرہ پشت سے دروازے میں نظر آتی ہے واپس جانا چاہتی ہے لیکن بنے روکتا ہے) ٹھہرو۔ زہرہ ذرا ٹھہرو۔ (آگے بڑھتا ہے) اندر آجاؤ۔ تم تو میرے کمرے میں آتی ڈرتی ہو۔ گویا میں کاٹ ہی کھاؤں گا۔

زہرہ۔ (اندر آکر) اور کیا، کون آئے۔ چیزیں جو لگ جاتی ہیں۔

بنے۔ (زور سے ہنستا ہے) اب تھوڑی چڑاتی ہو۔ اب تو توبہ کرو۔ لو کرسی پر بیٹھو۔ کیا خاطر کریں تمہاری؟

زہرہ۔ (آرام کرسی پر بیٹھکر) بس شکریہ!

بنے۔ زہرہ تم ڈپٹی کیوں نہ بن گئیں؟

زہرہ۔ (مسکرا کر) کچھ سٹھیا گئے؟

بنے۔ (مفلر لپیٹتے ہوئے) مذاق سے نہیں سچ کہتا ہوں۔ زہرہ جب سے نوکر ہوا ہوں لوگوں نے جان کھا کر رکھ دی۔ اسے میری چڑ مقرر کرلی ہے۔ گویا میں بوڑھا ہوا جا رہا ہوں (عاجز ہو کر ہاتھ جھٹکتا ہے)

زہرہ۔ تو پھر کر کیوں نہیں لیتے۔

بنے۔ لو وہ بھی جیسی نصیحت کرنے۔ زہرہ تمہیں تو سچ مچ ٹھونک دونگا۔

زہرہ۔ (ہنسکر) لو اس میں چلنے کی کونسی بات ہے۔ سارے وقت لڑکیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے ہو کر کیوں نہیں لیتے۔

بنے۔ (کچھ دیر ادھر اُدھر دیکھتا ہے) کس سے کر لوں کوئی ہو بھی۔

زہرہ۔ کیوں حمیدہ میں کیا برائی ہے!

بنے۔ بڑے آدمی کی لڑکی ہے۔ بڑی دماغدار ہے۔

زہرہ۔ آئرس؟

بنے۔ اسے وہ کلوٹی۔ توبہ کرو۔ تم نہ کرلو اس کے بھائی سے۔

زہرہ۔ دیکھو بدتمیزی کی نہیں ہے۔ ورنہ میں جاتی ہوں۔

بنے۔ اچھا۔ اچھا۔ اب نہیں۔ اور بتاؤ۔

زہرہ۔ دیکھو رک کر گلشن؟

بنے۔ گلشن! کیا تمکی ہوئی تمہاری پسند ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔

زہرہ۔ مس منیر!

بنے۔ ہٹو۔ وہ تو بالکل چپٹی ہے۔

زہرہ۔ (بگڑ کر) کوئی نہیں خاصی ہے۔ تم تو دیوانے ہو، کیا آسمان سے حور لاؤ گے۔

بنے۔ ہاں زہرہ چاہتا تو یہی ہوں (ذرا غور سے زہرہ کو دیکھکر رکتے ہوئے) ہیں تو یہی چاہتا ہوں کہ بڑی اچھی ہو۔ (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے) کیسے بتاؤں۔ ۔ ۔ بس بہت ہی اچھی ہو۔ بڑی سلیقہ والی۔ میرے کمرے کو صاف کردے اور ہنستی رہے (زہرہ کو اور غور سے دیکھکر) تم ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ تم اچھی نہیں۔ (مسکرا کر) پھوہڑ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ لڑاکا اور پھوہڑ اور ذرا سی چڑچڑی بھی۔

زہرہ۔ (بگڑ کر) چپ بدتمیز میرا نام نہ لینا۔

(بگڑ کر مڑ کی ہو جاتی ہے۔)

بنے۔ (نرم آواز میں) میں تمہارا نام کب لیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو ۔ ۔ ۔ کہتا ہوں کہ تم اچھی نہیں۔ (جلدی سے) بالکل اچھی نہیں۔ لڑتی ہو۔ بات بات پر کاٹنے دوڑتی ہو۔

(زہرہ بڑبڑاتی ہوئی جلدی جلدی لمبے لمبے قدم رکھتی چلی جاتی ہے۔)

بنے۔ (زور سے ایک آزردہ ہنسی ہنستا ہے) بس بنے خاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو دیکھ لیا ۔ ۔ ۔ مگر یہ بھی کوئی بات ہے۔ (غصہ سے) میں آج الہ بی سے کہدونگا کہ اب کے جو انہوں نے میری شادی کا ذکر کیا تو سچ مچ لڑ پڑوں گا۔ یہ نہیں دیکھتیں ۔ ۔ ۔ ۔ کہ میرا کیا قصور ہے۔ (سر کھجاتا ہے) زہرہ شاید کمرہ صاف کرنے آئی تھیں۔ (چھت کی طرف دیکھکر) پھوہڑ لڑاکا ۔ ۔ ۔ ۔ (ہنستا ہے)

چھٹا سین

(زہرہ کا کمرہ۔ حسب معمول صاف۔ چوکی پر پیر لٹکائے بیٹھی ہے۔ نہ معلوم کیا سوچ رہی ہے۔ اٹھکر میز کے پاس جاتی ہے پھر لوٹ آتی ہے۔ بیٹھ جاتی ہے۔)

زہرہ۔ (پکارتی ہے) الو۔ الو۔

الو۔ کیا ہے۔ (دروازے میں آتا ہے)

زہرہ۔ (کچھ سوچ کر) کچھ نہیں۔ ٹھہر۔ یہاں آ ۔ ۔ ۔ تجھے معلوم ہے بنے میاں کہاں گئے ہیں۔

الو۔ کلب۔ (جانے لگتا ہے)

زہرہ۔ ٹھہر۔ سور سنتا نہیں بھاگا جاتا ہے۔

الو۔ تو کہئے نا۔ کیا ہے؟

زہرہ۔ تو جانتا ہے کلب؟

الو۔ ہاں آں۔

زہرہ۔ تو جا اور چپکے سے ان کے کان میں کہہ کہ الہ بی... نہیں نہیں میری طبیعت خراب ہے جلدی چلئے۔

الو۔ اچھا۔

زہرہ۔ کہہ کے بھاگ آنا اور جو سُور تو نے کہا کہ میں نے بھیجا تھا تو بہت پیٹوں گی۔

الو۔ لے لیجئے صاحب! بھیا ئیں نہیں بُلاتا۔ ویسے ہی مارتے رہتے ہیں۔

(جانے لگتا ہے)

زہرہ۔ ٹھہر میں کہہ رہی ہوں نہیں ماریں گے۔ تو جا۔ پھر سینما کے پیسے دونگی۔

الو۔ آہا "جنگل کا جوان" آ رہا ہے۔ مگر بھیا جوتے جو پڑیں گے۔

زہرہ۔ میرا نام مت لیجو۔

الو۔ نہیں۔ (جاتا ہے)

زہرہ۔ (تھوڑی دیر پریشان بیٹھی رہتی ہے) لے ناحق بھیجا.... نہ جانے بنّے کیا سوچے گا۔ میں نے ناحق ہی بھیجا.... جنے کیا سوچے گا۔ اونہہ....

(ذرا فکر مند ہو کر بیٹھ جاتی ہے)

الہ بی۔ (قینچی اور ایک کپڑا لئے آتی ہیں) لے زہرہ ذرا دیکھنا۔ اس میں اچوکور گلا ٹھیک رہیگا۔

زہرہ۔ (بے توجہی سے) ہوں۔

الہ بی۔ لے بی کیا اونگھ رہی ہو۔ ہوں کر دیا۔ (غور سے کپڑے کو دیکھکر) لو بھلا کھڑی دھاریوں میں چوکور گلا کیا خاک ٹھیک ہوگا۔

زہرہ۔ ہوں دیکھوں۔

الہ بی۔ بیٹھو کیا خاک دیکھوگی۔ (کرسی پر بیٹھکر کپڑا ہو نتنے لگتی ہیں)

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

زہرہ۔ لے الہ بی، بنّے کو دیکھتی ہو کیسے اٹرے اٹرے پھرتے ہیں۔ گھر میں بیٹھنا تو قسم ہے۔ جب دیکھو جب پارٹیاں۔

الہ بی۔ اور کیا گھر میں بیٹھا رہے۔ تیری تو اُس سے گھڑی بھر کو نہیں بنتی۔ آج کیا دو تین روز سے نہ جانے کیا بات ہوئی ہو جو چُپ ہے۔

زہرہ۔ الہ بی میں لڑتی ہوں؟

الہ بی۔ تو تو نہیں لڑتی۔ پر بیچ بیچ تو ہوا کرتی ہے۔

زہرہ۔ میں نہ بولوں تب بھی وہ لڑتے ہیں۔ خیر پہلے بھی تو لڑتے تھے۔ یہ بات نہ تھی۔ اب تو دراصل دوستوں میں گھوما کرتے ہیں۔ گھر میں آنے کی فرصت کہاں۔

الہ بی۔ گھر میں رہے تو بُرائی باہر جائے تو بُرائی۔ تجھے کسی کل چین نہیں۔ میں کہتی ہوں تجھے کیا فکر پڑ گئی۔

زہرہ۔ (جل کر) مجھے کیوں فکر ہوتی۔ (تھوڑی دیر بعد) الہ بی اب آخر دہلی کب چلوگی؟

الہ بی۔ لے بنّے کا گھر اکیلا ہو جائیگا۔ سی مارے نہیں جاتی۔ ذرا اس کا گھر بس جائے تو چلونگی۔ تمہارا دل آج کیوں گھبرانے لگا۔

زہرہ۔ (چڑ کر) آپ بسایئے گھر میں اکیلی چلی جاؤنگی۔ بنّے کی شادی سے مجھے کیوں ٹھہرنا لازمی ہو۔ میں الو کو لیکر چلی جاؤنگی۔

الہ بی۔ اے یہ بنّے کی شادی سے تیرے کیوں مرچیں لگ گئیں۔

زہرہ۔ (بگڑ کر) میرے کیوں مرچیں لگتیں۔ خاک پڑے مجھے کیا؟

الہ بی۔ خاک تیرے منہ میں۔ لڑکی خواہ مخواہ جلی مرتی ہے۔

زہرہ۔ (اور جلکر روئی آواز میں) بھئی اونہہ مجھے دہلی بھیجدیجے

الہ بی۔ لے تم تو پاگل ہو گئی ہو۔

(اٹھکر چلی جاتی ہیں)

آواز۔ (بنّے کی) زہرہ۔ زہرہ آ۔ ارے کہاں ہو۔ (ذرا پریشان انداز سے آتا ہے) ارے کیا سچ مچ رو رہی ہو۔ ارے! یا صرف دھوکا.....

زہرہ۔ روتے ہوئے الہ بی خواہ مخواہ ہی ڈانٹ دیتی ہیں۔

بنّے۔ تو ہوا کیا..... کچھ بولو بھی یا ناک پونچھ پونچھ کر توڑ ڈالوگی۔

زہرہ۔ اونہہ جاؤ یہاں سے۔

بنّے۔ چہ خوش آپ ہی نے تو بلایا تھا۔ اور آپ فرماتی ہیں جاؤ۔ خوب!

زہرہ۔ میں نے یہ سُور الو نے کہا ہوگا۔ میں نے.....

بنّے۔ ہاں، ہاں تم نے منع تو کیا تھا مگر میں نے جو چپت لگایا تو کہہ دیا کہ...

زہرہ۔ جھوٹا ہے۔

بنّے۔ ہوگا۔ مگر کیا تمہاری طبیعت خراب ہے۔

زہرہ۔ ہونے دو تمہیں کیا۔ ایک پھوہڑ اور بدتمیز لڑکی مر بھی جائے تو.....

بنّے۔ کون؟ تم پھوہڑ اور بدتمیز؟ کون بیوقوف کہتا ہے؟

زہرہ۔ تم۔

بنّے۔ (زور سے ہنستا ہے) بیوقوف وہ تو صرف چڑانے کو کہتا ہوں۔ مذاق میں!

زہرہ۔ اور وہ جو روز الہ بی سے میری شکایتیں ہوتی ہیں تو؟

بنّے۔ ارے عقلمند! مذاق میں تمہیں رلانے کیلئے۔ بخدا مذاق میں رنجیدہ ہو گئیں مگر نہ معلوم زہرہ تمہیں کیوں مجھ سے ہمیشہ سے نفرت ہے۔

زہرہ۔ نفرت! مجھے تو نفرت نہیں۔ تم ہی مجھ سے جلتے ہو۔

بنّے۔ تو پھر کیا یہ میرا وہم تھا!

زہرہ۔ ہاں۔

...ے ۔ اور میں تم سے جلوں گا؟ زہرہ مجھے کبھی یہ کہنے کا موقع نہ ملا کہ صرف ...ی ایسی لڑکی ہو جو میری زندگی سُدھار سکتی ہے۔ تم سے زیادہ مجھے کوئی ...ا سمجھتا۔ زہرہ مجھے کبھی یہ امید نہ تھی کہ تم میری بات کبھی سُن سکو گی۔ مجھے ...تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ تم سے لڑنا اور تمہیں بُرا کہنا آسان ...لیکن اگر میں تم سے کہتا تو یقیناً تم میرے منہ پر چپل رسید کرتیں اور ...بی سے الگ جوتیاں لگواتیں۔ اب مجھے کوئی نہ چھیڑے گا کہ "کر شادی"

زہرہ اب ہم کبھی نہیں لڑیں گے۔

(زہرہ مسکراتی ہے)

بنّے :۔ مگر زہرہ میں کمرے میں جوتے موزے پھیلایا کروں گا تو۔

زہرہ :۔ وہ میں سمیٹ دوں گی لیکن اگر تم نے کمرے میں سگرٹ پیا تو کان پکڑ کر نکال دئے جاؤ گے۔

بنّے :۔ (مٹھی پر ہتھیلی مار کر) منظور۔

(آپا جی پُشت کے دروازے کے کمرے سے جھپاک سے بھاگتی ہیں۔ چہرے پر ایک مسکراہٹ ہے۔ شاید چھپی ہوئی دیر سے کھڑی تھیں۔)

(ختم شُد)

عصمت چغتائی

عشق

...عشق آبادیِ شہر و بیاباں عشق ہے
...جب شادابیِ صحنِ گلستاں عشق ہے
...فرترکِ عشق ہے مقصودِ ایماں عشق ہے
...مل کالی راتے صبحِ درخشاں عشق ہے
عشق ہی سے ہے نمودِ جلوہ ہائے کائنات
عشق کیا ہے ابتدا و انتہائے کائنات
...الَمِ فانی میں رُوحِ زندگانی عشق ہے
...یمِ خاکی میں نویدِ آسمانی عشق ہے
...سربلندی، بختیاری، کامرانی عشق ہے
...سوائے عشق پیری ہے جوانی عشق ہے
ہے عبارت زندگی ہنگامہ ہائے عشق سے
جلوۂ ہستی کی رونق ہے بقائے عشق سے
سوا سے کچھ تعلق ہی نہیں رکھتا ہے دل
...ے ہی صورت ہے جس کو دلنشیں رکھتا ہے دل
...ق ہی کی کارسازی پر یقیں رکھتا ہے دل
بس یہی سرمایۂ دنیا و دیں رکھتا ہے دل
ڈھونڈتا ہے عشق ہی کو صورتِ آہنگ میں
ڈھالتا ہے عشق ہی کو حسنِ زنگارنگ میں
پا گئے اہلِ نظر دل میں سراغِ عاشقی
بس اسی محفل میں روشن ہے چراغِ عاشقی
کوئی دیکھے تو بہارستانِ داغِ عاشقی
بعدِ مُردن بھی کھلا رہتا ہے باغِ عاشقی
مرکزِ نورِ ازل یہ پارۂ گِل ہی تو ہے
جنت الفردوس کہتے ہیں جسے دل ہی تو ہے
حسنِ ظاہر دل سے لاکھ اظہارِ بیزاری کرے
عشق سے نفرت کرے یا ترکِ دلداری کرے
یار ہے وقفِ تغافل یا دل آزاری کرے
عشق سب کچھ دیکھتا جائیگا ہنستا جائے گا
ابرِ رحمت کی طرح ہر سو برستا جائے گا

عطاء الرحمٰن ممتاز

زہرہ :۔ (پھر بے تکان سے) ہو:

ریورس گیئر

کس کو پڑی ہے کہ کوئی میری سُنے۔ ہائے ظالم سمجھتے ہیں کہ بُڈھا سٹھیا لیا ہے۔ افسوس یہ دار المحن یونہی چلتا رہے گا۔ یہ دُنیا رنج وغم و الم کا شکار ہی بنی رہے گی۔ انسانوں کی بستی وقفِ جور وستم ہی رہے گی۔ مسکینوں پر ظلم ٹوٹتے ہی رہیں گے۔ گناہوں اور بدکاریوں کا دَور دورہ یونہی رہیگا۔ افسوس کہ میری کوئی نہیں سُنتا! بہتوں کو سمجھایا مگر کسی نے فکر نہ کی۔ یا جاتے ہی بھول گئے! عیش وعشرت کا شکار ہوگئے ـــ ہاں اب ان کو کیا پڑی ہے، جن پر گذرتی ہے گذرتی ہے ان کی جانے بلا۔ افسوس! مجھے کوئی ہمدرد نسل انسان نہ ملا۔ ناظرین آپ ہی کوشش کریں کوئی من چلا ہمدرد قوم راہیِ ملکِ عدم اگر بن جائے (مگر شرط یہ ہے کہ وضع قطع فردوس بریں کلاس کی سی ہو) تو اُس سے میرا پیغام کہدیں۔ وہاں جاکر تھوڑا سا کام وہ کردے، تمام دُنیا پر احسان ہوگا۔ کام کچھ بھی نہیں! بالکل آسان ہے۔ وہاں پہونچکر کسی دن ٹہلتا ٹہلتا پاور ہاؤس (Power-house) چلا جائے، وہیں کہیں اس ہنڈولے کا گیئر بکس (Gear-box) ہے جو کہ ٹاپ اسپیڈ (Top speed) میں پڑا ہوا ہے! ارے کون سی مشکل بات ہے! کوئی آہستہ سے اُسے ریورس (reverse) میں ڈالدے۔

خدا کی قسم سب جھگڑے مٹ جائیں۔ چین ہی چین ہو جائے دُنیا اُلٹی چلنے لگ جائے۔ قدم بقدم جیسے آگے بڑھی تھی پیچھے ہٹنے لگ جائے سب جھگڑے چک جائیں، گناہ پاپ مٹ جائیں۔ رنج ومحن، جور وستم نابود ہو جائیں ـــ دُنیا وہی رہے۔ دُنیا کے گرم وسرد وہی رہیں مگر خوشیاں ہی خوشیاں ہوں، کھٹا اور میٹھا وہی رہے مگر تلخ کامی مٹ جائے۔ رنج رہیں مگر کڑھنا نہ رہے۔ موت رہے مگر مرنا نہ رہے۔ ہائے کیا ہی لطف ہو۔ جنت کیا ہے بے بھوک کا کھانا، بے دھوپ کا سایہ، بے خزاں کی بہار، مجنوں تمہاری جان کی قسم دُنیا جنت سے بڑھ جائے۔ ذرا دیکھو تو سہی ہم ایسے بڈھے مجبوراً یہ شعر پڑھتے ہیں:-

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اور اگر دُنیا اُلٹی چلنے لگ جائے تو یہ شعر نہ پڑھا کریں:-

چشم مے گوں چال مستانہ شباب آنیکو ہے
اور کچھ دن ہیں کہ اس خم میں شراب آنیکو ہے

چند دن میں ادھیڑ ہوں پھر جوان ہو جائیں اور آخر پھر ایک دفعہ شباب آجائے۔ کسی دن مَیں کوڑے کے ڈھیر پر جاکر کھڑا ہوں جونہی دُور سے چٹکی اس پر کروں ایک دانت اُس پر سے اُٹھکر چٹکی میں آجائے۔ مَیں اُسے لئے ہوئے کمرے میں آؤں اور مزے سے لگا لوں۔ رفتہ رفتہ اُس کا ہلنا بند ہو جائے۔ باقی اور دانت بھی وقتاً فوقتاً اسی طرح واپس آجائیں۔ سفید بال کم ہوتے ہوتے تمام سر کالا ہو جائے۔ آپ لوگوں کے واسطے بھی دیکھئے کتنے فائدے ہوں۔ اب یوں ہی سمجھئے کہ اتوار کے دن بارہ بجے سے خدا نہ کرے آپکے بچے صاحب طبیعت خراب کرکے آپ کو دھمکاتے ہیں۔ شام تک آپ کی بیوی صاحبہ پریشان ہوکر آپ کو ڈاکٹر کو لانے کے واسطے گھر سے دھکیلتی ہیں۔ آپ روانہ ہوتے ہیں۔ راستہ میں ایک دوست کا مکان ملتا ہے۔ وہاں آپ برج پر پکڑے جاتے ہیں، آپ بھی دل میں کہتے ہیں کہ اناپ شناپ کھاتا رہتا ہے دست ہی تو آرہے ہیں صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ اب آپ تاشوں میں لگ جاتے ہیں۔ چار آنے پوائنٹ کا کھیل ہو رہا ہے۔ ایک بجے رات کو جب آپ کی سب جیبیں خالی ہو جاتی ہیں تو آپ چونکتے ہیں گھڑی دیکھتے ہیں، گھبرا کر گھر واپس آتے ہیں۔ یہاں معاملات برج سے بھی زیادہ بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بچہ اب تک غذا کی پچکاریاں چھوڑ رہا ہے۔ گھر بھر جاگ رہا ہے۔ اب آپسے کوئی بات تک نہیں کرتا۔ صبح ہوتے ہوتے، خدانخواستہ خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے بچہ گڑی مڑی ہو جاتا ہے اور دن کے بارہ بجے تک آپ اُسے تُوپ کر واپس آتے ہیں۔ اچھا اب یہیں تک رہنے دیجئے۔ یہ ٹوپ گیئر کا معاملہ ہے۔ اگر یہی حادثات ریورس گیئر میں وقوع پذیر ہوں تو کس قدر خوشگوار ہوں گے۔ پھر تصوّر کی دُوربین کا فوکس کیجئے، دن کے بارہ بجے آپ مع احباب اور پڑوسیوں کے تھوتنی لٹکائے شہر کے سُونے محلّے میں تشریف لے جاتے ہیں وہاں سے کھود کر بچے کو واپس لاتے ہیں، گھر میں رونا پیٹنا رہتا ہے، یہاں تک کہ شام ہونے لگتی ہے، آفتاب جس وقت مشرق کی طرف غروب ہونے لگتا ہے رونا پیٹنا اس شدت سے ہوتا ہے کہ بچہ تھوڑی سی جنبش کرتا ہے پھر کچھ اور ہلتا ہے پھر روتا ہے، اب وہی دستوں کی پچکاریاں چلنے لگتی ہیں۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے پریشانی کم ہوتی جاتی ہے ایک بجے کے قریب آپ کپڑے پہن کر گھر سے نکل جاتے ہیں اپنے دوستوں میں جاکر تاش کھیلنے میں لگ جاتے ہیں۔ صبح سویرے جبکہ

رت مغرب سے نکلتے ہوتا ہے آپ جیبیں کھنکھناتے واپس آتے ہیں۔ آپ کی
مہ صاحبہ آپ سے بالکل راضی و خوش ہیں بچے سب کی گندے کھیل میں مصروف
ن کے بار بچے بچے اُس کا دل اس کھیل سے بھر جاتا ہے۔ کھوٹے سے
ھا۔ اور کھیلوں میں لگ جاتا ہے۔ ہنسی خوشی گھر میں کھانا کھاتے ہیں۔ جیسے
موڑی دیر میں شام ہونے لگتی ہے۔ دن چھپتے کی چائے اور ناشتہ آپ
ن ذرا کر منہ دھوتے ہیں سگرٹ پیتے ہوئے چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں اور
ی دھوپ ہی ہوتی ہے کہ سو جاتے ہیں۔

کہئے کیسے رہے، بچہ آپ کا مُردہ سے زندہ ہوا، بیماری سے اچھا
ا۔ خالی ہاتھ جوتے میں گئے جیبیں کھنکھناتے واپس آئے۔ بیوی کا سب رنج
رغصہ کس مزے سے ختم ہوا ۔۔۔۔ اجی اس الٹی چال میں تو روز بروز آپکی
رآن کی محبت بڑھتی ہی جائیگی۔ رب ملنے کا کیا کام کیسے ہوں گے دھاڑ دن
ل میرے لئے زیب نہیں دیتا اس اتنا کہا جاتا ہوں کہ بس من ان کی چائے گی
اللہ رکھے آپ دولھا ہوں گے اور وہ دلہن کہئے الٹی بیر میں کیا لطف
۔ اب آپ کہتے ہوں گے کہ قبر میں اس کے بعد ایک اور بھی عصب سے
پھر نہ جدا ہو جائیں گی لوگ بیج ہوں گے پلاؤ قورمہ نکال اُگل کر دیگے یہ
ریھر دیں گے۔ قاضی آکر نکاح کی گتھی سلجھا دیگا اور بات وہ ہمیشہ کے
لئے اپنے میکے چلی جائیں گی۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میاں صاحبزادے بالکل
مست ہے مگر منچلا شباب جواب ہر دم لڑکپن ہی کی طرف رجوع ہوگا
واس جُدائی کا قطعی غم نہ ہونے دیگا تم اپنے لڑکپن کے عنوان میں شامل
ی کو ہنسکر بھول جاؤ گے۔

میاں یہ تو میری اور تمہاری زندگی کے معمولی واقعات ہیں۔ ذرا نگاہ
ر چاروں طرف دیکھو تو کیا کیا تب میاں کھیلی ہوئی ہیں، کیسے کیسے ظلم ہو رہے
کہیں بیوائیں گھُٹ گھُٹ کر روتی ہیں کہیں مائیں رو رو کر نابینا ہوتی
کہیں بچے یتیم ہوتے ہیں، بے دودھ کے تڑپتے ہیں۔ بڈھوں کا سہارا
جاتا ہے، ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور بے کسی تو دیکھئے ہمیشہ ہمیشہ
واسطے ان مظلوموں پر ظلم ٹوٹتے ہیں اور پھر انہیں ہمیشہ کے لئے امید
خیرباد کہہ دینا پڑتا ہے ۔۔۔۔ نہیں میاں دنیا الٹی چلنا چاہیئے، یہ سب
تیں خوشیوں میں بدل جائیں گی دنیا سے ہر برائی اُٹھ جائے گی۔ جوا جوا
لگا، چوری چوری نہ رہیگی۔ جواری رات رات بھر جوا کھیلیں گے، بے لیے
الگائیں گے لیکن جب اٹھیں گے مال جیب ہی لیکر باہر نکلیں گے۔

چوری ۔۔۔۔ چوری ایسے ہوگی، کہ دن میں معمار آکر ساہوکار
رمیں نقب لگائیں گے۔ بلکہ ساہوکار صاحب خود کھڑے ہوکر معماروں سے
لوائیں گے۔ رات کے سناٹے میں چور آکر روپے اور زیور مناسب
مقام پر رکھکر سوکھی اینٹوں اور سوکھے گارے سے نقب کو اس خوش اسلوبی
سے بند کر دیں گے کہ در اصل صحیح دیوار ہو جائے گی۔ واہ وا ہاتھ چوم لیجئے
ایسے چوروں کے اجی اور تو اور یہ ظالم دندان والے پوچھنے کے قابل
ہو جائیں گے۔ یہ قصائی دن بھر اپنی دکان پر بیٹھے بیٹھے گاہکوں سے بوٹیاں
لے لیکر ان کو جوڑ جوڑ کر بکروں کے ڈھانچے تیار کریں گے اور شام کی
سہانی روشنی میں مذبح میں ان لاشوں کو بیٹھا کر اپنے خنجر مسیحائی سے چھینے کو
بکرے کھڑے کرکے زندہ جانور بنایا کریگا۔

بھیا اس الٹی چال کو جس پہلو سے دیکھو خوشنما ہی خوشنما ہے
میں کہاں تک بیان کروں تم خود ماشاءاللہ سے سمجھدار ہو دیکھو بھائی آج
رات کو جب اپنے پلنگ پر لیٹنا تو میرے کہنے سے ان مسئلوں پر بھی ہم
بہت غور کرنا ۔۔۔۔ اوّل مرغی اور انڈے کا مسئلہ دوم گیہوں اور
... کا مسئلہ سوم پیڑھی در پیڑھی کا مسئلہ اور چہارم یہ کہ کیوں نہ اس
عاجز کو ... فلسفی عالم کی یادگار میں ایک میموریل یا اسٹیچو دہلی کے چاوڑی بازار
میں کھڑا کیا جائے۔ خیر یہ تو یونہی کہہ دیا میں جانتا نہیں آپ لوگ خود
قدر دان ہیں یہ جو دماغ کے کیڑے نکال نکال کر کاغذ پر بچھاتا ہوں تو آپ
ہی قدر دانوں کے واسطے ۔۔۔۔ ہاں تو اب دیکھئے جب دنیا بگڑے ہوئے
ٹٹو کی طرح قدم بہ قدم پیچھے ہی ہٹنے لگ جائے گی تو عجب عجب لطف
آئیں گے بندے کا مشغلہ بھی پُرلطف ہوگا یعنی عینک لگائے سر جھکائے
سوچ سوچ کر ڈاڑھی کھجا کھجا کر صفحۂ قرطاس سے اپنی تمام سیاہ کاریوں کو
زبان قلم سے چاٹ کر صاف کریگا اور جیسٹر کے رجسٹر کو درست کرکے دکاندار کو واپس
کیا کرے گا اجی صاحب یعنی ہر کیا منحصر ہے وکیل موکلوں کی اصلی خدمت
کیا کریں گے۔ ڈاکٹر حکیم اور خاص کر نیم حکیم تو خالص مسیحائی کیا کریں گے اقرق
امین حاتم زادے بن جائیں گے اور تو اور اسکول کے لونڈوں کی بھی
مصیبت جائے گی ۔۔۔۔ روز روز نئے نئے مشکل سے مشکل سبق یاد کرنے
کے بجائے سب پڑھا لکھا بھلاتے جانا کس قدر آسان ہوگا۔ برخوردار میں
کہاں تک اس کے فائدے بیان کروں بس تم بھی میری طرح کوشاں رہو۔
کسی لیڈر منش رفیق القلب احتشام الطبع، زاہد وضع کو تیار کرو کہ وہ جاکر
یہ کام کر دے۔ جب ہزاروں سے کہو گے تو ایک تو کر ہی دے گا۔ اور میاں
جو میری کہو تو بیشک بڈھا تو میں بھی ہو گیا ہوں مگر بھیا اوّل تو یہاں سے جانیکو
میرا جی ہی نہیں چاہتا ہے اور اگر وہ لے جاتے ہیں۔ یا بدست دگرے دست
بدست دگرے۔ مجھے جانا ہی پڑے تو ساری عمر تو لوہار کی بھٹیوں، ڈھلائی
کی بھٹیوں۔ نانبائیوں کی بھٹیوں کی دیکھ بھال میں کٹی ہے وہاں بھی بھٹیوں
ہی کی دیکھ بھال کا کام سپرد ہوگا اور بھئی اگر بفرض محال کسی غلطی سے بندے کو

رہ ۔ (پھر بھے ملاں ہے) ہم

رو دس برس میں سمجھ دیا گیا تو پھر . . . . . پھر . . . . پھر دیکھا جائیگا۔ وعدہ نہیں کرتا . . . . . وہ . . . . . . یہ . . . . . اچھا کہو تو کہدوں ۔ مگر دیکھو یہ بات کسی اور کو نہ معلوم ہو۔ تم ہی تک رہے۔ کان میں سنو ۔ ارے بھیا نہ کون ہوگا جو ایک دفعہ وہاں پہونچکر پھر گیبر کو ریورٹ میں بھی ڈالدے اور نتیجہ میں ایک دن خود بھی حضرت آدم کی طرح واپس دھکیلا جائے۔ یارو اگر کہیں فرشتوں کی بھول چوک سے ۔ وہاں پہونچ گیا تو پھر تو میری بلا سے ایسی ایسی ہزاروں دنیائیں ٹھوکریں کھاتی پھریں تو بھی میں ایسا کام نہ کرونگا کہ پھر وہ جگہ مجھ سے چھوٹے ۔۔۔ لو میاں تم جانو تمہارا کام۔

سید رفیق حسین

سازو سامانِ بہار

پھر بہار آئی چمن میں پھر ہے جوشِ رنگ و بو ۔ ساقیِ فطرت نے سیاہ ہے کر دئے جام و سبو
ہے چمن میں زرد پھولوں سے ہجومِ رنگ و بو ۔ ہر رگِ گل سے ٹپکتی ہے بہارِ آرزو
جامِ گل سے پھر چھلک اٹھی شرابِ تند خو ۔ پھر اٹھا میخانۂ گلشن سے شورِ ہاؤ ہو
ذرہ ذرہ ہے چمن کا اک جہانِ رنگ و بو ۔ پھر سے دلہن بن کے آئی ہے بہارِ آرزو
پتی پتی سے پھٹا پڑتا ہے پھر جوشِ نمو ۔ ہر رگِ گل ہے رگِ ابرِ بہاراں مو بمو
پھر سے دیتی ہے ہر اک شے روح کو درسِ نمو ۔ ہے مگر جوشِ جنوں وجہ بہارِ آرزو
پھر زمیں پر آسمانوں کے فرشتے آئے ہیں ۔ گلشنِ فردوس کے تحفے سجا کر لائے ہیں

خاک کے ذروں میں پنہاں تھا جو امکانِ بہار ۔ چھا گیا عالم پہ بنکر ابرِ نیسانِ بہار
ایک اک نقشِ چمن ہے ایک عنوانِ بہار ۔ ایک اک برگِ گلِ گلشن، گلستانِ بہار
گل سے ہے اذنِ وداعِ ہوش و ایمانِ بہار ۔ اہتمامِ رنگ و بو ہے شان شایانِ بہار
روئے تاباں پر نظر، ہاتھوں میں امانِ بہار ۔ پھر بہار آئی مرے گھر بھی بعنوانِ بہار
پھول گیندے کے کھلے سرسوں ہوئی عالم فروز ۔ زرد پوش آئے جہاں میں پھر حسینانِ بہار
پھر بسنتی ساریاں پہنے ہوئے ہیں کھیتیاں ۔ ہوگیا پھر غیرتِ فردوس، دامانِ بہار
حُسن کا سیلاب ہے یا ہے طلسمِ رنگ و بو ۔ آج بڑھتا ہی چلا آتا ہے طوفانِ بہار
ہر بنِ خارِ چمن سے ہے نظامِ رنگ و بو ۔ ہر گلِ لالہ ہے اک نقشِ فروزانِ بہار
پھر تلاطم خیز ہے ہنگامۂ حسن و جمال ۔ پھر نظر میں کھب چلا حسنِ درخشانِ بہار
پھر دھڑک کر رہ گیا سینہ زمینِ باغ کا ۔ بلبل و گل میں ہوا پھر عہد و پیمانِ بہار
ہر کہاں کی جاذبیت نالۂ بلبل میں آج ۔ دل دھڑکتا ہو مرا نبضِ رگِ ہر گل میں آج
گنجِ فطرت کھل گیا ہے لٹ رہے ہیں پھول پھل ۔ دیدۂ بینا کو ہے جوشِ نمو درسِ عمل
غنچہ و گل باغ میں جام و سبو سے کم نہیں ۔ بادۂ صافی ہے ان میں قطرۂ شبنم نہیں
بڑھ چلی پھر سبزۂ بیگانہ کی بیگانگی ۔ پھر دلِ وحشی نے پایا مژدۂ دیوانگی
پھر لبِ غنچہ کو یارائے سخن حاصل ہوا ۔ پھر جمالِ حسنِ جاناں زینتِ محفل ہوا
چاند کی تابانیوں میں پھر بہار آنے لگی ۔ پھر مجھے ہر رنگ سے بوئے نگار آنے لگی

تم نہیں تو کچھ نہیں یہ سازو سامانِ بہار
اے قرارِ قلبِ فرحت، اے گلستانِ بہار

فرحت کانپوری

میراث

کیا یاد مجھے آئے وہ گنجینۂ پرویز تھا اہلِ بصیرت کی نگاہوں میں جو ناچیز
آتے ہیں نظر گوہرِ انجم مجھے گلریز لیکن نہیں وہ لعل و جواہر طرب انگیز

گنجینۂ پرویز کا حقدار نہیں میں
اُس کے خُمِ دولت سے تو سرشار نہیں میں

گو "مرکزِ دولت" اُسے کہتے ہیں ہوس کار گردش پہ نہیں صورتِ پرکار میں تیار
قاروں بھی ہے میرے لئے منجملۂ اغیار قاروں کی بھی دولت کا نہیں ہوں میں طلبگار

میرے لئے قاروں کا خزانہ ہے فسانہ
تاریخ ہے تاریخ ـــــ فسانہ ہے فسانہ

جو بات بھی کرتا ہوں میں کرتا ہوں سند کی لی ہی نہیں خواہش کبھی غیروں سے مدد کی
کیوں اُن کے خزانوں پہ نظر ڈالوں حسد کی میرے لئے میراث ہے اپنے اب و جد کی

میراث میں جو کچھ مجھے والد سے ملا ہے
اوروں کے خزانوں سے مرے حق میں سوا ہے

والد نے بنایا ہے مجھے اپنے ہی ڈھب کا میں نے سبق اُن سے ہی پڑھا حُسنِ ادب کا
راز اُن کا شرف ہے مرے اعزازِ نسب کا محتاجِ کرم ان کا نہ تھا میری طلب کا

خوں اُن کا مرا خون ہے میں اُن کا ہوں مظہر
مال اُن کا مرا مال ہے گھر اُن کا مرا گھر

منہ حضرتِ مرحوم نے دُنیا سے جو موڑا ہر قسم کا سامان مرے واسطے چھوڑا

بگی یہ اُنہیں کی ہے اُنہیں کا ہی یہ گھوڑا اور ان کے سوا اشرفیوں کا بھی ہے توڑا
تھا حضرت مرحوم کو جو فکرِ "پس انداز"
میرا بھی سمجھ لیجئے ویسا ہی بس، انداز
سرمایۂ والد میں کروں گا میں اضافہ پورا کرے اللہ تعالیٰ یہ ارمان
میرے لئے والد نے جو چھوڑا ہے اثاثہ دے جاؤں گا اولاد کو اُس سے بھی زیادہ
میراث سے یادِ اب وجد رہتی ہے تازہ
اُٹھتا ہے بڑی دُھوم سے مورث کا جنازہ
میراث کے اسرار سے واقف ہیں خردمند میراث سے خیرات کا کوئی نہیں پیوند
میراث سے محروم نہ دختر ہو نہ فرزند ہیں باپ کی نظروں میں جو دونوں ہی جگر بند
ہے مُورث و وارث کیلئے رابطہ میراث
بے واسطہ خیرات ہے بالواسطہ میراث
میراث میں جاگیر ملے یا فقط اک گھر حساس مزا لیں گے بہرحال برابر
میراث پہ لڑتا ہے برادر سے برادر ناحق نہیں یہ جنگ کرو غور جو اس پر
حق اپنا جتانے کے لئے ہے یہ لڑائی
ظاہر میں لڑائی ہے تو باطن میں صفائی
مخفی نہیں شورش کدۂ دہر کی حالت طے کرتے ہیں حاکم جو خصومات بکثرت
میراث کے جھگڑوں کی نہیں اُنہیں حلاوت ان میرے بیانات کی شاہد ہے عدالت
کیا فیصلہ میں لُطف ہے سرکار سے پوچھو
ذوق ان کا کسی ایک زمیندار سے پوچھو

عالی منظور

گھر پھونک تماشا

چنخکر بولیں: کیا خوب! اماں باوا کے گھر سے مجھے یونہی ننگی بُچی لائے تھے جواب میری لڈن کے لئے جھومر اور گلوبند کے نام پر ایک نہیں کی ہزار نہیں ہو رہی ہے، بلا سے بالی پتے نہ سہی، کرن پھول جھمکے لانا ہونگے۔ اور کبھی چاہے کچھ ہو جڑاؤ کنگن کی جوڑی تو لونڈیا کے ہاتھ میں ڈالوں گی۔ ضرور ڈالوں گی۔ پہنچیاں، چوہے دتیاں، میں نے اپنی اُجلوا کے علاقہ بندی کے لئے دے ہی دی ہیں، رہ گئی پازیب، وہ ایسی کیا سونے کے سوا لاکھ ٹکے کی ہوگی، لانا ہی پڑیگی۔ نتھ، میں نے سوچا تھا نانی اماں نے سہاگ کی رکھی ہے، چڑھا دونگی، کیا کیجئے اُس کے موتی چھوٹے ہیں، پھر کا کا باسی، نوج میں اپنی ناک کٹاؤں، دو موتیوں میں لنکا شوقی نہ ہو جائیگی، برابر کا جوڑا ہو، خوش بیاض، غلطاں، بے ڈول کا داک نہ ہو،...........

تیوری کیوں چڑھ گئی؟ تانبے کے باسنوں کی فکر آپکے سر نہ ڈالوں گی، جی اور کیا۔ میں نے سب جگو رکھے ہیں، قلعی بھی ہو چکی۔ چاندی کا لوازمہ بے شک کرکے آنا ہے، بس ایک سادہ سا وہ مخمل کا پاندان اسی کے لائق کا اگالدان، نقشی لوٹا، خدا کیلئے اتنا سی نہ اٹھا لائیے گا، مجھے زہر لگتا ہے، انگوری بیل کا ہو، اور سجل ہو، منی سی سلفچی، بیسن دانی، ورد یکھئے....... تھالی جوڑ، عطردان، کنگھا، آئینہ اور پان کی تاب کے لئے رحل "...... پھر ماتھا کوٹ کر فرمایا "بھئی اللہ کی بڑے اس نگوڑی یاد پر، کچھ رہ گیا ہو تو آپ سُجو دیجئے گا...... رخاتونِ جنت کی قسم جتائے دیتی ہوں، ایک عدد بھی ان میں سے م ہوا تو کُنبے برادری کے اُلہنے سہنے کو سلامتی سے آپ جئیں، بندی بھیرا چاٹ کے سو رہیگی"۔

ملاحظہ ہوا سے کہتے ہیں تریا ہٹ، اور یہی ہے "گھر پھونک تماشے" کا پہلا پردہ۔

ایک دو منزلے مکان کا صدر ہال، در و دیوار کا لال بھبھاتا رنگ، دیواروں پر جابجا گلدستے، گئو ماتا اور گنیش جی کی دھار نگ چترپٹ، دری پر میلی چاندنی، اُس پر پرانا زردہ قالین، چھوٹے بڑے تکئے، تجوریاں، صندوق، بہی کھاتے، قلم، پیتل کی داواتیں، ریت کی ڈبیاں، کسوٹی، دھرم کانٹا اور ان کے بیچوں بیچ میں۔ ؎

خیال کس کا الٰہی دماغ میں آیا

کہ چلتے چلتے مری نبض بار بار رکی

گاڑھے کی مرزئی، موٹی دھوتی پہنے، پگیا جمائے، تلک لگائے، عینک چڑھائے، توند بڑھائے "اشل کے سَو، سُو، دو سَو، دو سَو، دو سَو، اُوپر کے سَوا سَو"...... ایک لمبی گہری ڈکار لے اصل اور سود کی میزان لگادی "سَوا تین سَو، برابر سَوا تین سَو" لالہ پارس رام جی اگروال، دیکھنے میں ساہوکار، پرکھنے میں کیمیاگر، چٹکی ڈالیں مٹی بھر نکالیں، کوڑی بوئیں، اشرفی کاٹیں اور کہنے کو کوٹھی کا یہ بڑا ہال، مگر برتنے میں مکڑی کا جال۔

"آئو میاں جی، بندگی، آج کدھر بر اجے؟ جہاں آؤ گلیا پے کو، تمہارے چرن چھونے ہے کو تو ترس گئے ساپ منکہ، برکھا کی گھام تو بڑی تیج ہے رئی ہے آج، رچھنا او رچھنا، ارے جے دیکھ میاں جی آئے ہیں، کچھو بورا ہوئے تو سربت پھر بت بنائے لا، میں نائیں پیونگو، سُنی، انہیں کے لئے لا،...... اور بورو نیں ہے تو جان دے، تیں ٹھنڈو جلے کھبائے دے، کانچ کو بلاتی اُمکھورا ہے، سو باہیں لیتو، بھلا"

"لالہ شربت دربت رہنے دیجئے، ایک شدید ضرورت سے حاضر ہوا ہوں وہ سُن لیجئے"

"سو بولو ساب منکہ جرور کرکے بولو، جے ساری شوبھا تو تم میاں بھین کے چرنن کی ہے، ہم پہ کا دھروہے۔ لُٹیا تھر یالے کے آتے تُمن نے آبرو دئی تو دُوئی پیشا کے چنا چباتے بے کو ہمن کو بھی مل جات ہیں ساب منکہ"

"لالہ یہ ہے کہ آپ کی بچّی کا کارج آن لگا ہے، سب بندوبست تو ہو گیا رقم کی کسر ہے، ان بھی کوئی لاکھ دو لاکھ نہیں، تین ایک ہزار روپے ہو گئے تو جیسے بینگا تنگی ترشی سے کتر بیونت کرکے چار برادری والوں کے ہاتھ دُھلا دونگا"

روپے کے نام پر معلوم ہوا کہ جیسے لالہ کے بچھو نے ڈنک مار دیا، عینک ڈھلک کر ناک کی نوک پر آگئی۔

"کا کہی تین ہجّار؟ ساب منکہ ہمن نے تو اب لوں باتیوں تین ہجّار نائیں کریں! تین ہجّار!"

"ارے یہ تو میں خرچ ہلکا کرکے بتا رہا ہوں، ہیگم ہوتیں تو پنچے سے کم نہ اُٹھتیں"

"روپیّا پانچ پچیس چھیں تولے جاؤ، ہم تم سے ایسی کا متی کھا بنگے، کل آبو رُکا پرچا ہوتے جاتے"

"پانچ پچیس کی بھی آپ نے ایک کہی، پانچ پچیس کا تو لالہ گرم مسالا اُٹھ جائے گا، مجھے تو سر دست تین ہزار سے کوڑی کم کی ضرورت نہیں ہے"

"ہے رام رام، ہجّاروں کا تو ناتوں نالیتو، ایسا گھر اب ہمّت آن لگو ہے کہ روپیّا تو جیں مور کی بوٹی ہے گیو ہے جیں مور کی بوٹی، اب کلئے عنبر سرے بہاری لال بارن کی پانچ ہجّار کی درسنی ہنڈی ان ٹیکی، ہمن کے تو ہات پائیں پھول گئے، کچھو آپائے نہ بن پڑی، تب جے منیم جی ہیں نا، سو انن نے کہی کہ ساب منکہ بڑی نلی کو گھنو آڑ کے کے دتے دیو، تب جائے کے کہیں ہنڈی سکھری، چوں منیم جی ہے کہ نہیں؟"

منیم جی آنس کا مسٹر، لالہ کے لوڈ اسپیکر، تنے اب اس ہیا کہا جھونٹ ہے، ہم نے سوچی کہ پران گئی تو گئی کوٹھی کی مرجاد بنی رہے، گھڑی بھر گہنو لئے لئے ہات پراتے گئے، ساجھ ہونے گئی، نہ جل نہ پانی، تب کام ہو، ایں لالہ جی؟"

"سو تو ہئی، اور ساب منکہ جے چینا جیان کی جھجے تو آورو لُٹیا ڈبوئے دئی لے، روئی کا بجار الگ منداتے بیائے، دُوئی روپیّا گٹھا تو کلکتہ بائے چھوتنے نائیں، تو ساب منکہ جے ماملو تو ابیلر ہوئے ناسکت، آگے جو حکم ہوئے سو کرنے کو تیار ہیں"

"لالہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کل رت جگا ہے اور پرسوں شادی کی بسم اللہ، میں تو آپکے بھروسے پر رقعے بھی بٹوا چکا، ایسا ہی ہے تو رہنے کا جھونپڑا باپ دادا کے وقت کا ہے اور نہیں نہیں کرکے بھی ہیں بائیس ہزار کی آبرو ہے وہ آڑ کر لیجئے"

لالہ کے چہرے کا جغرافیہ بدل گیا، ڈھلکی ہوئی عینک پھر سر جائی، پیشانی پر بل ڈالے اور کھولے، اور دل ہی دل میں مستقبل کا نقشہ جما کر بولے "لے اب کا بتائیں، تُمن نے تو ساب منکہ بڑے سوچ میں ڈار دؤ، اس بکھت تو بنائے کے بڑے میانجی کی یاد آئے گئی، چوں منیم جی؟"

"لے اب اس میں کہا جھونٹ ہے، بنکو تمہیں دیکھے بنا چین نائیں پرتی، اور تم بن کو دیکھے بنا سکھی نائیں ہوتے، ہے کہ نیں لالہ؟"

"تو اب جے میاں بن کے ای پوت ہیں، تو ساب منکہ جے سودا تو کرتے ای بنے گی...... سو میانجی اب تم جاؤ، چار چھ دناں پیچھے آئیو کچھو تجبیز کرنگے...... بندگی"

پشتینی تعلقات، کچھ پڑوس کے حقوق، خود لالہ بڑے بیالو، جھکنا ہی پڑا۔ دستاویز لکھ گئی، لالہ نے اتنے سے گھر کے تین کے بدلے چار ہزار چہرے شاہی گن دئے، سُود بالکل جزدی، جیسے دال میں نمک، یعنی مہینے پیچھے صرف سات روپے بارہ آنے وہ بھی سیکڑے پر!......

شادی رچ گئی، اور وہ دیکھئے نوبت خانے سے کیا میٹھی ٹکور بج رہی ہے۔

شادی رچ گئی، مانجھا، سانچق، اس کے بعد مہندی اور پھر بارات کا جلوس اس ٹھسے سے نکالا کہ سارے شہر میں دھوم مچ گئی، لوگ عش عش کرنے لگے، جوڑے تولے دیے گئے، تورے بندی کا کھانا ہوا۔ قاضی صاحب آئے، نکاح بندھا، چراغ جلے ڈومنیوں نے بابل گائے، اور باجے گاجے اور آتشبازی کی فٹ فوں میں بدا ہو کر لڈن بی پرایا دھن ہوگئیں۔

مہمانوں میں سب سے ممتاز تکلفی کپڑے پہنے۔ بنارسی دوشالا اوڑھے کوئی تھا جو پھنگیائی آنکھوں سے یہ "گھر پھونک تماشا" دیکھ رہا تھا، اور ہتھیلیاں کھجا کھجا کر کہہ رہا تھا "اشل کے چار ہجار چار ہجار" کہ پردہ گر گیا۔

دن بیت گئے۔

آج اُسی اسٹیج پر "گھر پھونک تماشے" کا ڈراپ سین ہو رہا تھا۔

نوٹس، سمن، دعویٰ، ڈگری، قرق امین۔

"اس مکان کی سرکاری بولی ایک ہزار ــــ ایکہزار ایک، ایک ہزار دو ــــ"

لالہ پارس رام جی اگروال انگلیوں پر چپکے چپکے حساب لگا رہے تھے۔

"اشل کے چار ہجار... چار ہجار... آو پر کے تین ہجار اور سات سے بیس، سو جے ملا کے ہتے سات ہجار اور سات سے بیس۔ بیا تبر:

اور ساب منک محنتانے کے دو شو،

اور طلبانے کے دو شو،

اور ہرجانے کے دو شو،

میجان بیٹھی آٹھ ہجار اور تین سے بیس،

"ہماری بولی آٹھ ہجار تین سے بیس"

"آٹھ ہزار تین سو بیس، آٹھ ہزار تین سو بیس... ایک آٹھ ہزار تین سو بیس... دو، آٹھ ہزار... تین سو... بیس... تین!!"

منیم جی نے بڑھ کے گھر کو اپنا تالا لگایا اور پردہ گر گیا۔

"آوارہ"

پروگرام

وہ واقفِ اسرارِ جہاں وجدِ خوش اوقات	ہنگامِ سحر صحن گلستاں میں ملے گا
ماحول میں ڈوبا ہوا فطرت کا ثنا خواں	خلوتکدۂ سنبل و ریحاں میں ملے گا
دن بھر تو وہ سرگرمِ عمل ظلم کا دشمن	انصاف گُناں عدل کے ایواں میں ملے گا
اور شام کو دلباز بُتاں حسن کا رسیا	آئنہ صفت بزم حسیناں میں ملے گا
پھر رات کو وہ صد گرفتارِ محبت	گویا سا ہوا، کوچۂ جاناں میں ملیگا

سکندر علی وجد

تاریخِ فرانس کا ایک نامعلوم صفحہ

ایمی لارا کی خوش قسمتی ہی اُس کی بدقسمتی تھی۔ وہ حسین تھی اس لئے بدقسمت تھی۔ وہ باوفا تھی اس لئے بدقسمت۔ وہ رحم دل تھی اس لئے بدقسمت۔ اُس کی زندگی صفحہ تاریخ پر ایک طوفان برپا نہ کر سکی لیکن وہ یہ چاہتی ہی نہ تھی۔ ورنہ کاؤنٹس۔ لارا آف قصرِ روبیل چاہتی تو سترھویں صدی کے فرانس کی اینٹ سے اینٹ بجوا دیتی۔ شادی کے بعد کئی دفعہ شاہی فرمان آئے۔ لیکن قصرِ روبیل کا کاؤنٹ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ وہ جانتا تھا کہ ایمی کا حسن دوسروں کو جلا دینے والا ہے۔ اور اُس کی وفا اپنی ذات کو جلا دینے والی۔ وہ قصرِ روبیل میں خوش تھا۔ شاہِ فرانس کو خراج دے رہا تھا۔ اور شاہِ فرانس کیا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کو سمجھاتا تھا۔ بہلاتا تھا۔ اور بار بار کہتا تھا کہ شاہ کا مدعا رتبہ بڑھانا ہے لیکن ڈراؤنے خواب کی طرح اُس کی بیوی کا حُسن مانی بیچا کا اندھیرا بنکر لپٹ جاتا۔ اُس کے نزدیک سترھویں صدی کا شاہی دربار ایسا نہ تھا کہ ایک باعصمت و عفت ملکۂ حُسن وہاں پر رہ سکے۔ دوسرے خود ملکہ میری اینٹوائینٹ کسی دوسری حسین عورت کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اور پھر حال یہ تھا کہ فرانس کے شاہی خزانے کا دیوالہ ہو رہا تھا۔ کیا یہ کم جرم تھا کہ کاؤنٹ قصرِ روبیل مالدار تھا اور کاؤنٹس ایمی حسین تھی۔ کاؤنٹ آف آرٹوائے، ڈیوک آف بوربون اور شہزادے جلاوطن کئے جا چکے تھے۔ جہاں وہ تھے، کاؤنٹ آف روبیل بھی جلاوطن کیا جا سکتا تھا۔ اس کی جائداد شاہی خزانے میں جذب ہو سکتی تھی۔ اور اُس کی حسین باوفا کاؤنٹس ایمی شکنجہ میں توڑی جا سکتی تھی۔ یہی وجوہات تھیں جن سے گھبرا کر کاؤنٹ ایک دن اپنی جوڑی گاڑی کھچوا کر اپنی کاؤنٹی کے فرانسیسی سرحدی حصّہ کی طرف چلا گیا۔ یہ ۱۷۷۵ء کی بات ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کاؤنٹ کے یہ خیالات کہاں تک ٹھیک تھے، یا صرف یہ جذبہ رقابت تھا۔ تاریخ صرف ہم کو اتنا بتاتی ہے کہ کاؤنٹس سولھواں، ایک کُند، کم علم بادشاہ تھا۔ جس کی بدقسمتی تھی کہ وہ فضول خرچ عورت کے ساتھ بیاہا گیا۔ یعنی ملکہ میری اینٹوانٹ شاہ آسٹریا کی ہمشیرہ۔

میری موٹے نقش رکھتی تھی۔ مگر وہ اتنی حسین ضرور تھی کہ وہ ایک مغرور، سراپا حُسن، ذی حس ملکہ کا پارٹ ادا کر سکے اور اسکی فضولخرچی شاہانہ تزک و احتشام کا شوق۔ وزیروں کی کوششیں ناکام۔ اِدھر امریکہ میں لڑائی۔ امیروں اور نوابوں کا رعایا پر ظلم۔ ان سب نے فرانسیسی باشندوں کے دل میں ایک آگ سُلگانی شروع کر دی۔ آخر کار ۱۷۸۷ء میں وزیر کیلون کا خاتمہ ہوا۔ اور ۱۷۸۹ء میں پیرس کے باشندوں نے جیل خانہ بیسٹل توڑ دیا۔ اور ۱۷۹۳ء کی آگ سلگتی ہوئی فرانس میں پھیل گئی۔ اور تمام امیر، نواب، سرمایہ دار، شہزادے اس آگ میں بھسم ہو کر گلوٹین کی نذر ہوتے۔ جس نے نازک سے نازک اور مغرور سے مغرور گردن ایک لمحہ میں بُھٹّا سی اُڑا کر خاک و خون کر دی۔ یہ زمانہ تھا جس میں کاؤنٹس ایمی قصرِ روبیل کی مالکہ نے اپنی زندگی گزار دی۔

۱۷۹۳ء۔ مارچ کا مہینہ۔ اور ایمی بند گاڑی میں فرّاٹے بھرتی ہوئی اپنے خاوند کا قلعہ چھوڑ کر ایک غیر آباد حصّہ میں چلی جا رہی تھی۔ کھلتی بہار کا زمانہ تھا۔ جب ایمی کی گاڑی لہلہاتے سرسبز میدانوں میں سے گزری۔ وہ کھڑکی کھول لیتی اور خود اس بہار میں محو ہو کر رہ جاتی۔ لیکن گاؤں اور قصبوں میں گزرتے ہوئے اُسے ہدایت کے مطابق کھڑکی بند کرنی پڑی۔ ایک جگہ وہ اسی طرح کھڑکی بند کئے ہوئے بیٹھی تھی کہ یکایک گاڑی کو جھٹکا لگا۔ ایک چیخ کی آواز آئی۔ پھر چاروں طرف مجمع کا غوغا ہوا۔ پھر چابکوں کی سن سناہٹ کی آواز کان پھٹنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے ایمی نے کھڑکی سے جھانکا تو بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔ کوئی چھ سال کا بچہ گھوڑوں کے ٹاپوں سے کچلا ہوا گاڑی کے پاس خون ناخون پڑا تھا۔ اُسکی

ذکر اور سپاہی چابکوں سے گاؤں والوں کو مار کر نکل جانا چاہتے تھے۔ بچّے کی ماں بلک بلک کر آگے بڑھتی مگر سپاہی نہ بڑھنے دیتے۔ یہ تو اتفاق تھا کہ گاڑی کے گھوڑے بگڑ اُٹھتے تھے۔ کبھی الف ہوتے کبھی پُشتنگ مارتے مگر آگے نہ بڑھتے۔ ورنہ آمی کو یہ دیکھنا بھی نہ پڑتا۔ اور سواری گاؤں سے گزر جاتی۔ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ آمی کی نیکی اُس کی بدقسمتی تھی۔ کوئی اور امیرزادی ہوتی تو ناک بھوں چڑھا کر چلی جاتی کہ کمبخت نے میری گاڑی کے پہیوں پر خون لگا دیا۔ لیکن آمی رحم دل تھی۔ بے اختیار دروازہ کھولکر گاڑی سے نیچے اُتری۔ تڑپتے ہوئے بلبلاتے ہوئے بچے کو ماں کی طرح گود میں لے لیا۔ سپاہی پریشان اور حیرت زدہ ہوگئے۔ آہستہ آہستہ آمی اُس کی ماں کے پاس پہونچی اور رو رو کر التجا کی کہ مجھے آج اپنے بچّے کے پاس اپنے گھر رہنے دو کہ میں اس کی دیکھ بھال کرسکوں۔ غریب امیروں سے نفرت کرتے تھے۔ مگر ڈرتے بھی تھے۔ گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اتنی حسین، اتنی مالدار، ایسے اچھے کپڑے پہنے ایک سڑے سے مکان میں گودڑ پر بیٹھکر ایک گندے بچے کی دیکھ بھال، مرہم پٹی میں لگ رہے۔ بچے کی زندگی تو بچ گئی لیکن اُس کے جسم کا عجیب حال ہوگیا۔ آمی تو چلی گئی لیکن یہ بچہ جس کا نام آلیور تھا روز اپنی ماں سے پوچھتا کہ اماں اماں وہ پری جو آسمان سے اتر کر آئی تھی، جب میں انسان کی گاڑی کے نیچے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل گیا تھا، وہ کہاں گئی؟ تو ماں کہتی کہ بیٹا، وہ پری تمہارے جیسے اور تکلیف زدہ بچوں کی دیکھ بھال کر رہی ہوگی؛ ایک دن ایک سوار گاؤں میں آیا اور اُس نے آلیور کے لئے ایک تحفہ بنڈل دیا۔ ۸ سال کا بدشکل آلیور بنڈل اُٹھائے اماں کے پاس پہونچا اور خود کہنے لگا۔ اماں دیکھو اُسی پری نے مجھے تحفہ بھیجا۔ اور واقعی آمی ہی نے بھیجا تھا۔ عجیب بات ہے کہ سالہا سال گزرتے گئے اور نہ آلیور نے آمی کو پھر دیکھا اور نہ آمی نے آلیور کو۔ لیکن ہر سال آمی آلیور — کو تحفہ بھیجتی اور آلیور اپنی پری کو شکریہ کا لفظ۔ یہ تھا ایک عجیب رشتہ جو ایک بدشکل غریب اور حسین کاؤنٹس کے درمیان قائم ہوچکا تھا۔ ہرچند کہ آلیور کو علم تھا کہ اسی کاؤنٹس کی گاڑی نے اُس کے بازو اور پیروں کو توڑ دیا تھا، اُس کی ناک اور چہرے کو خوفناک کر دیا تھا، اُسکے جسم کو چکنا چور کر دیا تھا، اور اُس حادثہ کی وجہ سے وہ دُور دُور اپنی بدصورتی کیلئے مشہور تھا لیکن وہ اس پر بھی ہمیشہ کاؤنٹس کو آسمان کی پری کہتا تھا۔

زمانہ بدلتا گیا۔ دن سے مہینے، مہینے سے سال گزرتے گئے اور ۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۹ء آگیا۔ غریبوں اور مزدوروں کے دلوں میں آگ کا شعلہ بلند ہو رہا تھا۔ آگ سُلگ رہی تھی۔ صرف چنگاری کی ضرورت تھی۔ امرا، وزرا، اپنی فضول خرچی، ظلم، جفا کی آخری منزلیں گزار رہے تھے۔ کہ کسی کو کاؤنٹ آف روبیل اور اس کی مدمغ بیوی جو کہ آج ۱۲ سال سے دربار کو ٹھکراتی رہی تھی، بدلہ لینے کی سوجھی۔ دعوتی رقعہ بھیجا گیا۔ کاؤنٹ تو آیا لیکن آمی نہ گئی۔ وہ جانتے تھے کہ آمی وفا کا حق ادا کرنے کی آرزو میں خود پھنس جائے گی۔ کاؤنٹ پیرس آیا تو ضرور لیکن اُس کی واپسی کا پتہ نہ چلا۔ آمی سرحد پر پریشان تھی کہ کاؤنٹ کے ہاتھ کا خط ملا۔ میں بیمار ہوں، میرے پاس چلی آؤ۔ محبت کی ماری، وفا کی پتلی، اندھی ہوتی ہے۔ اتنا بھی نہ دیکھا کہ یہ خط میرے کاؤنٹ کے ہاتھ کا نہیں۔ جعلی خط بھی نہ پہچان سکی۔ راتوں رات چلدی۔ اتفاق دیکھئے کہ صبح کا تڑکا ہوا تو آج ۱۲ سال بعد پھر اُسی گاؤں میں جہاں کہ آلیور رہتا تھا۔ کاؤنٹس آمی نے کوچوان کو اشارہ کیا کہ گاڑی ہلکی کی جائے لیکن گاڑی ہلکی نہ ہوئی۔ اُس نے گاڑی سے سر نکال کر حکم دیا۔ اور اس کا حکم ادھ بیچ میں ایک چیخ میں تبدیل ہوگیا۔ کیونکہ اُس کے اپنے کوچوان اور سپاہی کے بجائے یہ اور کسی کے سپاہی تھے۔ اغلباً شاہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک سوار نے آگے بڑھ کاؤنٹس سے کہا "مہربانی سے کھڑکی بند کر دیجیے اور چیخیے نہیں۔ ہم تو آپکے ساتھ نہایت عزّت کا سلوک کر رہے ہیں۔"

آمی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن بے سُود۔ وہ بھی بند نکلا۔ اب آمی کا ماتھا ٹھنکا۔ اور اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت دنیا سے

بوڑھا ہوا اور دنیا کا ٹھکرایا ہوا، دربدر پھرنے والا آلیور جوکہ اب بے مکان تھا، اور اس لئے اپنے آپ کو لامکان سمجھتا تھا، وہاں سے گذرا۔ اُس نے کھڑکی میں ایک چہرہ دیکھا۔ آلیور کے سامنے اپنے بچپن کا قصہ۔ گھوڑوں کا آنا، اس کا دوڑنا، اس کا لڑکھڑا کر گرنا۔ گھوڑوں کے ٹاپوں میں روندا جانا، اسکا ہوش میں آنا، آسمان سے پری کا اُترنا۔ لیکن اس پری کے چہرے پر گھبراہٹ۔ پریشانی اور رنج تھا وہ اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ سواری آناً فاناً میں نکل گئی۔ لیکن آلیور اس چہرے کو نہ بھول سکا۔ گاؤں والے اُسے پاگل تو سمجھتے ہی تھے۔ لیکن اب وہ قطعی پاگل معلوم ہوتا تھا۔ ہر ایک سے کہتا میری آسمان کی پری آئی تھی۔ کدھر گئی۔ پوچھتا پاچھتا، ٹکریں مارتا، پیرس کی سڑک پر پڑ لیا۔ ایک عرصہ چلتا رہا۔ جہاں گیا وہیں آسمان کی پری کا غلام کے نام مشہور ہو جاتا۔ اسی تگ و دو میں تقریباً پندرہ دن گذر گئے۔ آخر کار پیرس پہونچ گیا۔ لیکن وہاں کیا کوئی سمجھتا۔ وہاں بھی پاگل پاگل کے آوازے کسے جاتے۔ یہ تو آپ کو یاد ہی ہے کہ پیرس کا ۱۷۹۹ء میں کیا حال تھا۔ حکومت کے وزیروں اور امیروں کو باشندے کس طرح نفرت کرتے تھے۔ لیکن ظلم و جور سے مجبور تھے۔ کیا تعجب ہے کہ اس پاگل بدشکل آلیور کے کچھ ہمدرد بن گئے۔ اور اب آلیور کو کھوج کا موقع مل گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ ایک پولیس کے آدمی نے اس کو پہچانا۔ اُس نے دوسرے سے ذکر کیا۔ مشتبہ چال چلن کا سمجھا گیا اور جیل میں ڈال دیا۔ وہ اتنا بدصورت تھا کہ جس کمرے میں بند کیا جاتے دوسرے قیدی لڑائی جھگڑے کرتے۔ یہاں تک نوبت آئی کہ اس کو ایک اندھیر غار میں ڈال دیا گیا۔ آلیور تو آسمان کی پری کا گیت گا رہے تھے انہیں کیا خبر تھی کہ قسمت اُن کو یہاں لائی ہے۔ یہاں پر اُسی آسمان کی پری کا فرشتہ بھی مقید ہے۔ کسی نہ کسی طرح کاؤنٹ روبیل نے آلیور سے باتیں شروع کیں۔ دونوں نے اپنی داستان رو رو کر سنائی۔ اور دونوں میں عہد پیمان ہوئے۔ لیکن دونوں مجبور تھے۔ قسمت نے یاری دیا۔ داروغہ نے حکم دیا کہ کاؤنٹ کی اندھیری کوٹھری میں سے آلیور کو نکال دیا جائے اور آزاد کر دیا جائے۔ آلیور کے لئے یہ نادر موقع تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں یہ پہلا گناہ کیا اور وہ بھی آسمان کی پری کا نام لیکر۔ جب پہرہ دار پروانہ لیکر کوٹھڑی میں گھسا، یہ لوٹا بھوٹا انسانی پتلا جس کو ہم آلیور کہتے ہیں اُس کے اوپر شیطان کی طرح جھپٹا اور چشم زدن میں دبوچ کر گلا گھونٹ دیا۔ لطف یہ ہے کہ یہ فیصلہ اور تدبیر اسے صرف وقت پر سوجھی تھی۔ اُس نے فوراً کاؤنٹ سے کہا کہ وقت مت ضائع کرو۔ اس مردہ کا لباس جلد پہنو۔ میرے ہاتھ کی ہتکڑی پکڑ کر مجھے آزاد کرنے کے بہانے بھاگ نکلو۔ پروانہ موجود ہے۔ کاوانٹ کو سوچنے کی بھی مہلت نہ تھی۔ اس بدنما بدشکل کا دماغ آڑے آیا۔ یہ دونوں پیرس کی سڑک پر آزاد پھرنے لگے۔ شام تک ڈھنڈورا پٹ گیا۔ گلی گلی کوچے کوچے فوجی، آلیور اور کاؤنٹ کو ڈھونڈنے لگے۔ کاؤنٹ تو لباس بدل کر چھپ سکتا تھا۔ مگر آلیور بچارا پکڑا گیا۔ اس سے کاؤنٹ کا پتہ پوچھا گیا۔ تو اُس نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ میں کیا جانوں میں تو لامکان ہوں۔ لیکن اس سازش میں بڑے بڑے اُمرا شامل تھے۔ دوسرے دن صبح صبح میدان میں چبوترا قائم کیا۔ عام باشندے سمجھتے تھے کہ کسی کو سزا ملے گی۔ جوق در جوق جمع ہو گئے۔ پہرہ، فوج سب موجود تھا۔ چاروں طرف زرق برق پوشاک نیزے بھالے سے مسلح فوج کے لوگ پرے جمائے کھڑے تھے۔ آخر کار ملزم لایا گیا اور چکر سے جو چبوترے پر موجود تھا باندھ دیا گیا۔ چکر گھومنا شروع ہوا۔ اور بدشکل آلیور کرب سے اور بھی بدشکل ہو گیا۔ لیکن اُس کے چہرے پر خوشی تھی۔ اس کے کپڑے پھاڑ دئے گئے اور چمڑے کی رسیاں لیکر دو ہیکل جوان اُس پر پل پڑے۔ تمام بدن سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ لیکن آلیور نہ رویا نہ چیخا۔ بلکہ آنکھیں تک نہ جھپکائیں۔ اس سے کاوانٹ کا پتہ پوچھا گیا۔ لیکن اس کے جواب میں اُس نے ایک فاتحانہ قہقہہ مارا اور بیہوش ہو گیا۔

پھر جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے ایک لفظ منہ سے نکالا "پانی"۔ ایک فوجی نے کیچڑ کا چھینٹا اُس کے منہ پر مارا۔ ایک اور پانی کا پیالہ اور اُس کے منہ کے سامنے ہونٹوں سے ملا کر زمین پر گرا دیا۔ یکایک ایک معمولی لباس میں عورت فوج کی صف چیر کر اُس چبوترے پر

چڑھ گئی۔ آناً فاناً میں اُس نے بت کاٹ دیے۔ ہر طرف سے غریبوں، فقیروں، مزدوروں کا ریلا آیا۔ فوج نیزے بھالے چلانے لگی۔ آلیور نے ایک نعرہ مارا۔ آسمان کی پہنائیاں گونج اُٹھیں۔ مجمع میں بھاگڑ مچ گئی لیکن اس قسم کی کہ فوج بے دست و پا ہو گئی۔ جب مجمع صاف ہوا تو آلیور کا پتہ نہ ملا۔

ابھی نے فقیروں اور غریبوں کی مدد سے اس کو ڈھونڈا۔ یہاں تک کہ سنا گیا کہ ایک جماعت نئے گھوڑوں پر سوار سرحد کی طرف جاتی دکھائی دی جس میں ایک خوبصورت عورت، ایک حسین جوان اور بدشکل مریض تھا۔

ایس۔ اے۔ ہاشمی

نغمۂ روح

مدہوشیوں میں روح جو کچھ چل گئی ۔۔۔ یعنی جب رموزِ بہار سے جل گئی

کیا پایا کرکے عشرتِ دنیا کو ۔۔۔ اک نعمتی جو ہاتھ لگی تو نکل گئی

وہ ایک لمحہ جس میں ہوئی تھی نثار دنیا ۔۔۔ اس ایک لمحے میں یہ تری دنیا بدل گئی

تھی نکہتوں میں لپٹی ہوئی یاد آہ ۔۔۔ موجِ نسیم آج کلیجہ مسل گئی

چھیڑا جو تو نے ساز کے پردوں کو ۔۔۔ محسوس یہ ہوا کہ مری جان نکل گئی

یادش بخیر عہدِ محبت کی شاعری ۔۔۔ اک آہ تھی جو گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

اختر گھٹا میں جھوم کے برسا کچھ اس طرح
ایمان جاگ اٹھا، تمنا مچل گئی

اختر انصاری

مشاہدات

کتنا محشر خیز تھا اُن پر شباب آیا ہوا ۔۔۔ آسماں پر شام کو جیسے شہاب آیا ہوا

آہ وہ زلفِ پریشاں اُس رخِ پرنور پر ۔۔۔ جیسے کالی بدلیوں میں ماہتاب آیا ہوا

نیم وا آنکھوں پہ وہ نازک مژہ چھائے ہوئے ۔۔۔ جیسے میخانے پہ ہلکا سا سحاب آیا ہوا

نرگسی آنکھوں نے ایسا کر دیا بیخود مجھے ۔۔۔ جیسے بے بادہ پیئے کیفِ شراب آیا ہوا

میرے عرضِ مدعا پر وہ کسی کا جھینپنا ۔۔۔ قرمزی رخسار پر رنگِ گلاب آیا ہوا

دل تڑپ جاتا ہے عارف جب کبھی آتا ہے یاد
اُن خمار آلودہ آنکھوں میں حجاب آیا ہوا

عبد الصبور خاں عارف

فلسفی

پروفیسر۔ (آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہے) حکومت کے بنائے ہوئے قانون کی اگر خلاف ورزی کی جاتی ہے تو مجرم سزا پاتا ہے مگر خیالات کی دنیا میں روزانہ قانون شکنی ہوتی ہے اور کوئی شخص سزا نہیں پاتا۔ اگر کوئی شخص قتل کرتا ہے تو قاتل کا پھانسی پانا یقینی ہے مگر بلاوجہ مبالغہ کرنے والے کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ اے سقراط اور ارسطو کی روحو! انسانی فطرت بھی کس قدر غیر مستقل ہے۔

(شاگرد داخل ہوتا ہے)

شاگرد۔ (پروفیسر کی بڑبڑاہٹ میں مداخلت کرتا ہے) جناب میری شادی ایک گھنٹے کے اندر ہوگی۔ مہمان مکان پر جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں ــــ

پروفیسر۔ (شاگرد کی آواز نہیں سنتا ہے) انسانی فطرت بھی کسقدر مذبذب ہے۔

شاگرد۔ کیا جناب مہربانی فرما کر میری شادی میں شرکت کرینگے۔

پروفیسر۔ خیالات کی دنیا میں روزانہ قانون شکنی ہوتی ہے۔

شاگرد۔ لیکن میری شادی ہو رہی ہے۔

پروفیسر۔ اگر کوئی شخص قتل کرتا ہے۔

شاگرد۔ لیکن میں شادی کرتا ہوں۔

پروفیسر۔ تو اس کو پھانسی دی جاتی ہے۔

شاگرد۔ مگر میری شادی ہو رہی ہے۔

پروفیسر۔ مجرم سزا پاتا ہے۔

شاگرد۔ کیا جناب مہربانی فرما کر میری شادی میں شرکت کرینگے۔

پروفیسر۔ انسانی فطرت بھی کس قدر غیر مستقل ہے۔

شاگرد۔ لیکن میں بے انتہا مسرور ہوں۔

پروفیسر۔ اے سقراط و ارسطو کی روحو!

شاگرد۔ اے محبت و شادی کے دیوتا۔

پروفیسر۔ (شاگرد کی جانب پہلی بار دیکھتا ہے) اے میرے شاگرد! تم یہاں کیوں آئے ہو۔

شاگرد۔ جناب میری شادی ایک گھنٹے کے اندر ہونے والی ہے۔ کیا مہربانی فرما کر آپ شرکت کرینگے۔

پروفیسر۔ (کچھ سوچکر) "شادی" کے کیا معنی ہیں۔ لفظ "شادی" کی تعریف کرو۔

شاگرد۔ شادی کے معنی ہیں نکاح ہوجانا۔

پروفیسر۔ بیوقوف۔ تم نے منطق کی دفعہ تین کو نظرانداز کر دیا جس چیز کی تعریف کی جاتی ہے وہ "لفظ" تعریف کرنے میں نہیں آنا چاہئے اچھا پھر کوشش کرو۔

شاگرد۔ جناب مجھے بہت کام کرنا ہے اس لئے میں رخصت ہونیکی اجازت چاہتا ہوں۔

پروفیسر۔ (خفگی سے) جب تک شادی کی صحیح تعریف نہیں کروگے تم نہیں جا سکتے ہو۔

شاگرد۔ اس کے معنی ہیں وہ حالت جس میں کسی کے بیوی ہو۔

پروفیسر۔ ہاں۔ یا شوہر ہو۔

شاگرد۔ جی ہاں۔

پروفیسر۔ اگر شادی کے معنی یہ ہیں کہ بیوی یا شوہر ہو تو بتاؤ کہ تمہارے کیا ہوگا بیوی یا . . . .

شاگرد۔ جناب یقیناً میرے بیوی ہوگی۔ مردوں کے بیویاں ہوتی ہیں اور عورتوں کے شوہر۔

پروفیسر۔ اچھا میں سمجھا۔ تم مرد ہو۔

شاگرد۔ اور میری بیوی عورت ہے۔

پروفیسر:۔ عورت و مرد، بیوی اور شوہر لازم و ملزوم ہیں۔

شاگرد:۔ جی ہاں لیکن اب مجھے جانا چاہیئے کیونکہ میرے یہاں مہمان اکٹھا ہو چکے ہوں گے۔

پروفیسر:۔ میرے شاگرد! میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ شادی سے بڑی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جس طرح کوئی اندھیرے میں کود پڑے۔ کیا تم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم نے لڑکی کی شکل و صورت اور اخلاق و عادات کے متعلق کافی چھان بین کر لی ہے۔

شاگرد:۔ شمسی بہت ہی خوبصورت لڑکی ہے۔ میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ حُسن اور اخلاق کا ایک مکمل مجموعہ ہے شمسی......

پروفیسر:۔ اگر تمہاری ہونے والی بیوی کا نام شمسی ہے تو میرے نوجوان دوست میں تمہیں بتاؤنگا کہ شمسی اسم خاص ہے اور صرف نام سے تم اسکے حُسن و اخلاق کا پتہ نہیں چلا سکتے ہو، مجھے خوف ہے کہ تمہیں شاید مایوسی کا مُنہ نہ دیکھنا پڑے۔

شاگرد:۔ جناب اس سے آپ کا کیا مطلب؟

پروفیسر:۔ میرا مفہوم یہ ہے کہ شمسی اسم خاص ہے اور اسم خاص سے اچھائی بُرائی کا پتہ نہیں چل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میرا نام لے لو اس سے تم میرے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے ہو۔ یہ صرف اتفاق ہے کہ میرا نام نشاط ہے اس ہی طرح یہ بھی بالکل اتفاق ہے کہ تمہاری ہونے والی بیوی کا نام شمسی ہے ورنہ اسمائے خاص جن کے متعلق ہوتے ہیں اُنکی خصوصیت نہیں بتاتے۔

شاگرد:۔ جناب مجھے آپ کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ آپ کا نام نشاط ہے کیونکہ آپ دُنیا کے کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے رائے قائم نہیں کر سکتے ہیں اور میری شمسی اس لئے شمسی ہے کیونکہ وہ ایسی ہی خوبصورت ہے جیسے سورج۔ جملہ معترضہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے ہیں۔ عورت سے محبت کرنا ایک تخیلی جنت ہے اور اگر عورت محبت کرے تو دُنیا کی نعمتوں میں اس سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ہے۔

پروفیسر:۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ وہ تو دہ لکھی جس کو بیوی کہتے ہیں دُنیا میں موجود بھی ہے۔ بیوی اسم عام ہے۔ اور اسم عام بحیثیت شخصیت تو ضرور موجود ہے ورنہ اس کا کہیں پتہ نہیں۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ فلاں شخص کی بیوی ہے اور وہ اُس کی بیوی ہے مگر قطع نظر اس کے صرف بیوی کو تلاش کروگے تو کہیں نہیں ملے گی۔

شاگرد:۔ جناب آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ شمسی کی ہستی دُنیا میں ہے اور آپ اُس کی شخصیت سے انکار نہیں کر سکتے ہیں اور جناب کیا مَیں عرض کر سکتا ہوں کہ آپ بہت جلد اپنے دماغ کا تنقیہ کرا لیجئے۔ ورنہ بعد کو پچھتانا پڑیگا۔

پروفیسر:۔ ہر وہ تحریک جو جذبات کے ہیجان پر قائم کی جاتی ہے حباب آسا زندگی رکھتی ہے۔

شاگرد:۔ ارسطو اور سقراط کی رُوحوں کے لئے آپ ایک مجسّم لعنت ہیں۔

پروفیسر:۔ رائے عامہ ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔

(شاگرد پروفیسر کے قریب جاتا ہے پروفیسر سمجھتا ہے کہ وہ اُسے مارنے کے لئے آرہا ہے—— اس لئے وہ کمرے سے یہ کہتا ہوا باہر نکل جاتا ہے "جس کی لاٹھی اُسکی بھینس"!)

\+ \+ \+

انیس مجتبیٰ زبیری

صدر انجمن اتحادِ گداگراں

حضرات و خواتین، عرصہ کی مدت کے بعد دنیا پر یہ روشن ہو گیا ہے کہ قوموں کی ترقی کا راز انجمنوں میں ہے، اور افسوس ہے کہ ہم اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ اگر ہم کو صحیح معنی میں عروج حاصل کرنا ہے تو فوراً کسی انجمن کو سنبھال لینا چاہیئے۔

انجمن کا لفظ بحث کرنے والوں میں ہمیشہ معرکۃ الآرا رہا ہے۔ بعض حاسدوں اور نامعقولوں کا خیال ہے کہ انجمن کا لفظ دراصل "ہندی الاصل" ہے، جو مرکب ہے "آنجو" اور "مَن" سے، جس کی توجیہہ سے صاحب "غلاط اللغات" نے کئی تشریحیں کی ہیں۔ مثلاً انجمن ایک ایسی چیز جس کا دل خود آنسوؤں سے بنا ہو، ایک ایسی شے جس سے تعلق ہونے کے بعد ہر شخص روتا رہتا ہے، یا خود جو شخص انجمن پیدا کرتا ہے اُس کی قسمت میں شامت اور آنسو ہوتے ہیں۔ وغیرہ۔ اور یہی وجہ ہے کہ شمع جب تک انجمن میں رہتی ہے روتی رہتی ہے، جس کی گواہی کئی شاعر بھی دے چکے ہیں، اس پر بھی اگر کسی کو یقین نہ آئے تو کسی انجمن میں شریک ہو کر دیکھ لے۔

لیکن یہ نہایت ذلیل اور ادنیٰ توجیہہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ــ ہمارے خیال میں تو ــ سمجھا جا سکتا ہے کہ انجمن ایک نہایت اچھی چیز ہے، اور انجمن کا لفظ دراصل ماخوذ ہے "انجمان" کا، جو ہے تو عربی مگر فارسی جمع کے قاعدے کے تحت الف، نون لگانے سے فارسی بن گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہایت پاکیزہ خیال شاعر کی نظر اتفاقاً آسمان پر پڑ گئی، جس پر مختلف تارے بکھرے رہتے ہیں۔ اور تارے جس قدر روشن اور بامِ عُروج پر ہوتے ہیں، اس سے کون واقف نہیں؟ پس ہیں سے اُس نے یہ تخیل اُڑایا، اور جب دیکھا کہ بہت سے "شریف لوگ" یا شاعر وغیرہ ایک جگہ جمع ہو کر اس طرح "خوش گپیاں" کرنے لگے ہیں تو ایسے "مجمع خلاف قانون" کا نام اُس نے انجمن رکھ دیا تاکہ پولیس اس کو خلافِ قانون نہ سمجھے اور کوئی اس کی کارگزاری اور ترقی سے متاثر نہ ہو۔

اور اس سے بھی شاید آپ ناواقف نہیں کہ ہر چیز کی شکل ابتدا میں کچھ ہوتی ہے، وسط میں کچھ اور آخر میں کچھ۔ مثال کے لئے بیج ہی کو لے لیجئے، کہ ابتدا میں تو وہ صرف بیج ہوتا ہے، پھر جڑ، پھر پودا، پھر جھاڑ، پھر پھل، پھر بیج ــــ اسی طرح انجمن بھی پہلے صرف انجمن ہوتی ہے، پھر چند آدمی، پھر چند "ریزولوشن" پھر جلسے، پھر تقریریں، پھر شاید کچھ کام۔ پھر انجمن!

کہا جاتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک انجمن کے تخیلات اور مقاصد میں مختلف تغیرات واقع ہوئے۔ ابتداءً تو اس کی صورت، جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا، یہ تھی کہ دو چار آدمی صرف "اضاعتِ وقت" کے لئے کسی دوست وغیرہ کے مکان پر جمع ہو جایا کرتے تھے جن میں بعض شاعر ہوتے، بعض ناثر، بعض گپ باز اور بعض چلم باز۔ ان سب کے اتحاد سے، مل ملا کر، وقت جیسی نازک چیز بھی کٹ کے رہ جاتی ہے۔

لیکن رفتہ رفتہ انجمن کا حال بھی کچھ غزل کا سا ہوتا گیا، کہ ابتداءً تو اس میں صرف عاشقانہ اور معشوقانہ مضامین ہوا کرتے تھے، مگر بعد کو تصوف، فلسفہ، رزم، بزم، اخلاق وغیرہ سب ہی اس میں داخل ہو گئے ــــ اسی طرح انجمن کی ساخت اور نوعیتوں میں بھی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں، اور آج ہم یہ دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں کہ ہر مقصد کے لئے انجمنیں قائم کی جاتی ہیں ــ خواہ وہ سیاسی مقصد ہو، علمی مقصد ہو، فسادی مقصد ہو، موٹرنیکی مقصد ہو، ادبی مقصد ہو، یا کوئی بلیک مطلب مقصد ہو۔ حتیٰ کہ آج کل تو انجمنوں کے بغیر کوئی آدمیوں کی کمپنی ترقی نہیں کر سکتی، کیونکہ انجمن میں ہی سرپرست، صدر، اور معتمد وغیرہ ہوا کرتے ہیں، جو دائرۂ اجتماعی کے مرکز، نصف قطر، اور محیط سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کے بغیر نہ کوئی دائرہ مکمل ہو سکتا ہے، نہ ترقی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اور قوم کی ترقی کے لئے انجمن ایسی ہی ضروری شے ہے جیسے زندگی کے لئے آگ، پانی، ہوا وغیرہ۔ لیکن سخت تعجب ہے کہ اس کے باوجود سنا ہے اکثر شرفا انجمن کے نام سے بھاگتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں، حالانکہ انجمن میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جس سے انسان اس قدر متاثر ہو، بلکہ انجمن تو نام ہے سرپرست، صدر، معتمد، اور چند اراکین کے ایک خوشگوار مجموعے کا۔ پھر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس کی تیاری میں نہ کوئی عقل اور "ہاتھ لگاتے جاتے ہیں، نہ کسی قسم کی چربی وغیرہ استعمال کی جاتی ہے"!

چنانچہ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک انجمن پیدا ہو گئی ہے۔ اور انہیں انجمنوں کی بدولت گلی گلی، کوچے کوچے میں صبح سے شام تک روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے، اور آزادی کی ایک لہر ہے کہ

[illegible] کی گئی ہے [illegible] ہے۔ عورتوں سے لیکر مردوں تک، بچوں سے لیکر بڈھوں تک، ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک، ہر فرد [illegible] [illegible] نظر آتی ہیں۔ اور جنہیں نظر آتی ہیں تو صرف ہماری [illegible] [illegible] زمانہ سے سمجھنے میں اپنی [illegible] [illegible] روشنی میں [illegible] [illegible] جنہوں نے [illegible] [illegible] آرام طلب، عالم [illegible] اور وہ آزاد لوگوں کو بام عروج پر پہونچا دیتے۔

حق ہے کہ [illegible] سماج میں رہ کر سماج کے نیم کو توڑ کر، نقد فائدوں کو کھونا، اور دنیا میں رہ کر دینی خوبیوں اور اُدھار منفعتوں کی خاطر ذلتیں اٹھانا اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی مارنا ہے لیکن شکر ہے کہ ہماری قوم بھی اب اس جمود و غفلت، بے نیازی و بے سُود صلح صفائی سے جاگ اٹھی ہے، اور ارادہ کر لیا ہے کہ دنیا کو دکھا دے کہ اب ہم بھی ہیں — اور کچھ نہیں تو کم سے کم — انجمنیں تو رکھتی ہیں، جو اجتماعیت کے لئے سخت ناگزیر ہیں اور اجتماعیت کے بغیر تو شاید کسی قسم کی ترقی ناممکن ہے۔

اور کیوں نہ ہو؟ — دنیا میں سیاسی انقلاب، بے تابی و بے چینی، دن زاری و شب بیداری، چشم تر و آہ سرد سے گذر رہی ہے اس نے اس قدر بیداری پیدا کر دی ہے کہ جھیلے والے موٹر والے، اور بیکار سے بیکار مرد، حتیٰ کہ عورتیں تک انجمنیں قائم کرنے لگی ہیں، تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارا گروہ اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہے۔ چنانچہ شکر ہے کہ سنا گیا ہے، ہمارے ہاں بھی کئی ذیلی طفیلی انجمنیں قائم ہو گئی ہیں اور یہ انجمن ان سب کی صدر ہے، جس کی پہلی سالانہ کانفرنس کا افتتاح پیوستہ جمعرات کو نکہت مآب حضرت مولانا شاہ صاحب، چمن شاہ صاحب نے اپنے پُرزور خطبہ صدارت کے ساتھ فرمایا۔

خطبہ صدارت نہایت پُرمغز، پُر غذا، اور مختصر مگر وسیع بطرز کشکول تھا۔ حاضرین سخت متاثر ہوئے جس میں فقیروں کی موجودہ اقتصادی پستی، پھوٹ، اور معاشی ابتری پر نہایت "شگفتہ انگیز" طریقہ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

خطبہ صدارت کے بعد عہدہ داروں کا انتخاب، مقاصد انجمن، اور رزولوشن پاس ہوئے، جس کے رو سے سال حال کے لئے حسب ذیل عہدہ دار عمل میں آئے:۔

(۱) سرپرست: دنیا کے تمام دل والے۔

(۲) صدر: حضرت صدر کانفرنس نکہت مآب شاہ چمن شاہ

(۳) نائب صدر: حضرت قنبر شاہ۔

(۴) معتمد: حضرت پیر دگی۔

(۵) نائب معتمد: مس جھنگن، آپ ایک نہایت روشن خیال خاتون ہیں، اور خاص ترقی کا جذبہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ آپ کا اصلی نام "صابقاں بی" تھا، مگر آپ نے ترقی کے خیال میں اپنا نام بھی بدل ڈالا۔ یہ ترقی کی پہلی منزل ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ اب آپ کا ارادہ ہے کہ اپنی [illegible] کے نام بھی اسی طرز پر رکھدئے جائیں۔

آپ پہلی خاتون ہیں جو ہماری انجمن کی نائب معتمد ہوئی ہیں، اور ہماری مدد کر رہی ہیں۔ امید ہے کہ اسی طرح اور بھی خواتین ہم پر نظر عنایت فرمائیں گی

اگرچہ یہاں یہ تعارف غیر ضروری تھا مگر عام ایٹی کیٹ کے تحت خاتون ہونے کے سبب ایسا کرنا پڑا۔ لہذا آپ اسکو تعارف نہیں تو تعریف سمجھئے گا۔ بس اور کیا عرض کریں!۔

(۶) خازن: مٹھو خاں، چوران والا۔

(۷) ارکان: مختلف طیلسائین جامعہ فقرا۔

اس کے بعد حسب ذیل اہم مقاصد پڑھکر سنائے گئے:۔

(۱) انجمن ہذا کا انعقاد باعث خیر و برکت ہے، اور یہ انجمن خاص طور پر، بہ کفایت، اس لئے تیار کرائی گئی ہے کہ اس سے ہماری پوری قوم کو فائدہ پہونچے۔ اور اجتماعی ترقی کے ساتھ ساتھ انفرادی ترقی میں بھی آسانیاں پیدا ہوں، اور آج تک ہمارے فقیر بھائیوں کو کسی مرکزیت کے نہ ہونے کے سبب حصول معاش میں جو دشواریاں حائل ہیں ان کا "مرافعہ" کرکے "معاش کوشی" کے لئے راہیں صاف کی جائیں۔

(۲) انجمن کا اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے یا بعض ناسمجھ عوام کی طرف سے ہمارے خلاف جو تحریکیں پیش کی جاتی ہیں، ان کا سختی کے ساتھ سدباب کیا جائے۔

(۳) انجمن کا اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ تمام برادران ملک کو، خواہ وہ کسی رتبہ یا حیثیت کے ہوں، بے صرفے، بے محنت کے کمانا سکھایا جائے۔

(۴) تمام انسانوں میں حرص و ہوا، مردم آزاری، نفس پرستی

اور عیاشی وغیرہ کی بجائے، اپنی نظیر سے قناعت پسندی، صلح جوئی، سلامت روی، صبر و رضا اور انکسار سکھایا جائے کہ انسان خواہ مادّی ترقیوں کا کتنا ہی بلند بانگ دعوے کرے، تکاملِ انسانی کی آخری حدیں یہی ہیں ــــ!

(۵) ملک میں جس طرح سیاسی بیداری، علمی بیداری، معاشی بیداری، قومی بیداری، وطنی بیداری پیدا ہو گئی ہے، اسی طرح فقیری بیداری کی تحریک کو بھی عام کیا جائے تاکہ وہ بھی اپنی غفلتوں پر نظر ڈالیں، اور جلد سے جلد اپنے عمل کی طرف راغب ہوں۔

(۶) برادرانِ قوم کو ایسے نعرے اور اشعار سکھائے جائیں جو ہر جگہ پر ایک ہنگامہ برپا کر دیں، اور صاحبِ مکان کو بدتمیزی کے ساتھ انکار کرنے نہ دیں۔ وغیرہ۔

اس کے بعد حسب ذیل رزولوشن پاس ہوئے، اور بہ اتفاق آرا منظور بھی ہوئے۔

(۱) یہ انجمن بھی اپنا سب سے پہلا خوشگوار اخلاقی فریضہ سمجھتی ہے کہ حال میں وقتہ وقتہ سے جو دو۔ تین۔ چار، مسلمان قوم کی زبردست ہستیاں یکے بعد دیگرے سدھاری ہیں ان کی موت پر انجمن نہایت صمیم قلب کے ساتھ اپنا پُرخلوص ہدیۂ تعزیت پیش کرے۔ اگرچہ سچ پوچھئے تو ہم زندوں کا غم ان مُردوں سے بڑھکر ہے پھر ہمیں دوسروں کے غم کا حوصلہ کہاں، لیکن اب جو یہ انجمن لگائی ہے تو خواہ مخواہ اس کی اہمیت کو محسوس کرنا پڑا کیونکہ انجمنوں کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ سب سے پہلے بڑی بڑی اموات پر تبصرہ کرے، اس کے بعد جو تجویزیں عام ہو گئی ہیں انہیں فوراً منظرِ عام پر لانے کی کوشش کرے۔ اس سے کہیں خدانخواستہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ انجمنیں اور ادارے وغیرہ مُردوں کو تاکتے بیٹھتے ہیں ــــ اگرچہ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے ــــ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی بڑا آدمی مرجائے تو انجمن کا سب سے پہلا کام اس کا تعزیتی جلسہ اور قرارداد منظور کرنا ہوتا ہے۔ شروع میں انجمن کے متعلق جو لغوی تحقیق دی گئی ہے اس سے اس ذمہ داری پر کافی روشنی پڑجائے گی۔ مزید تشریح کو ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

(۲) انجمن ہذا کسی قوم یا مذہب کی نمائندہ نہیں۔۔ اور وہ حالیہ فرقہ وارانہ فسادوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتی اور تمام فرقوں کو اپنی مثال سے غیرت دلانا چاہتی ہے کہ کس طرح ایک ایسا گروہ جو علم و عقل غیرت و حمیت سے مبرا سمجھا گیا ہے، نہایت خاموشی و سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہا ہے۔ اور قرن کے قرن گزر چکے ہیں کہ اس میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگ رہے ہیں۔ لیکن اس قسم کے مکروہ اور بہیمانہ ہنگامے کبھی دیکھنے میں تو کیا سننے میں بھی نہیں آئے۔ کچھ یہ تہذیب و ترقی کے دعویدار اپنے اصول اور حدود میں رہ کر کام نہیں کر سکتے تو بہتر ہے کہ آکر ہم میں مل جائیں اور ہم سے تعاون و سبق حاصل کر کے پُرامن زندگی گزارنا سیکھیں۔

(۳) سُنا جاتا ہے کہ اکثر ہمارے نمائندے جس گھر پر بھی جاکر سوال کرتے ہیں، صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ "معاف کرو"! یہ فقیروں کی سخت توہین ہے کہ وہ اتنا وقت اور دماغ خراب کر کے کسی کے مکان پر جائیں اور یونہی بغیر خاطر تواضع کے واپس ہو جائیں۔ ہم وقت کی قیمت جاننے والوں کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ وہ جس طرح اپنے وقت کی قیمت سمجھتے ہیں، اسی طرح ہمارے وقت کی بھی قدر کریں، ورنہ سخت تدارک کیا جائیگا۔ اور احتجاجاً ہمارا سوال ملتوی کر دیا جائیگا"!

بعض دفعہ تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ لونڈے جھڑکتے اور گالیاں دیدیتے ہیں، لہذا جملہ ماں باپ اور مالکوں کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس کا بھی خیال رکھیں، اور جو گالیاں لونڈے دیتے ہیں ماں باپ فوراً "واپس لے لیں"

(۴) انجمن ہذا کی سب سے بڑی خصوصیت "خودداری" ہے۔ اس لئے وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے اراکین کو فقیر، بھکاری، یا گداگر کے ہلکے ناموں سے پکارا جائے بلکہ ان کو "شاہ صاحب" یا "سائیں" وغیرہ کے مہذب نام سے یاد کیا جائے۔ اُمید ہے کہ عوام ہماری خواہشات اور جذبات کا احترام کرینگے۔

(۵) ہوتی آئی ہے کہ ہر ہنستے پہ لوگ روتے ہیں۔ یہی حال کچھ ہماری قوم کا بھی ہے کہ ہماری طمانیت اور غیر زوال پذیری کو دیکھکر بعض حاسد جلتے اور غلط مشورے دیتے یا ہمارے خلاف مضامین لکھا کرتے ہیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسے غلط اور گھٹیا سے پروپگنڈے سے کبھی ہماری قوم متاثر ہو سکتی ہے۔ نہ اپنی قدیم خاندانی روایات اور پیشہ کو ترک کر سکتی، کہ "ساری جدید ترقیوں کی اساس تو شاید قدیم روایات ہی پر مبنی ہے"!

(۶) اس لئے یہ انجمن حکومت کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے کہ ایسے ناسمجھ عوام جو "انسدادِ گداگری" کی تدبیریں سوچتے اور مضامین لکھا کرتے ہیں فوری بازپرس اور تدارک کے قابل ہیں، کیونکہ انجمن ہذا ایسی تجویزوں کو اپنی توہین سمجھتی اور نہایت حقارت کی نظروں سے

دیکھی ہے، ورنہ ہم ایسی آہیں کریں گے کہ ان کو عمر بھر پچھتانا پڑے گا، اور آہوں کا اثر تو دنیا جانتی ہے،

بترس از تیرِ بارانِ ضعیفاں کز کمین شب
اجابت بہر استقبال از درگاہ می آید

اور یہ تو وقت ہے کہ خود تعلیمیافتہ اور اکڑنے والے اپنی بے روزگاری سے پریشان ہو کر ہم میں آن ملیں اور ہم سے تعاون کریں، نہ کہ مقابلہ۔

(۷) انجمن کے عہدہ دار وہ حضرات ہو سکیں گے جو خاندانی فقیر ہوں، یعنی جن کا خاندان کم سے کم سات پشتوں سے نہایت حسن و خوبی سے یہ خدمات انجام دیتا آ رہا ہو۔ البتہ رکن ہر شخص بلا امتیاز مذہب ملت عمر و صنف ہو سکتا ہے۔

(۸) انجمن کا چندہ بہ صورت جنس بھی لیا جائے گا، اور بہ صورت رقم بھی۔ اور ہر ماہ میں ان کے اجتماع سے ایک شاندار ڈنر ترتیب دیا جائیگا جس میں ہر شخص بہ ادائی قیمت شریک ہو سکے گا۔ ٹکٹ مختلف شاپوں اور دکانوں پر برائے فروخت رکھا دئے جائیں گے، اور تاریخ کا اعلان بھی متعاقب کر دیا جائیگا۔"

(۹) افسوس ہے کہ بعض گوناگوں مجبوریوں کے سبب یہ انجمن بہت دیر میں جاگی ہے، اور اس کو دوسروں کی برابری کرنے کے لئے بہت تھوڑے وقفہ میں بہت زیادہ کام کرنا ہے، اس لئے ہر ہفتہ میں ایک سالانہ کانفرنس ہوا کرے گی جس میں اسی طرح ترمیمات اور رزولوشن پاس ہوتے رہیں گے۔

(۱۰) مقام عبرت ہے کہ جن خیالات اور مقاصد کو ترقی کے علمبرداروں اور روشن خیالوں نے صدیوں کی جدوجہد کے بعد سمجھا ہے انہیں ہماری قوم نے ابتدا ہی سے سمجھ لیا تھا۔ مثال کے لئے پردے ہی کو لے لیجئے کہ سارے ہندوستان اور اسلامی دنیا میں ایک دھوم مچی ہوئی ہے کہ اسی مذموم پردے کے سبب عورتوں کی ترقی میں قسم قسم کی رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ابتدا ہی سے ہم اس نکتہ کو سمجھے ہوئے ہیں، چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ ہماری عورتیں پردہ کی جکڑبندیوں سے آزاد ہیں اور ہر جگہ آزادانہ پھر سکتی ہیں اور خود کما لاتی ہیں۔۔ لیکن پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کی عورتوں نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان میں کوئی مرکزیت، اجتماعیت، یا روشن خیالی نہیں، لہٰذا ہم ایسی ساری روشن خیال بہنوں سے، جو سب کچھ کر سکتی ہیں لیکن پردے کے سبب مجبور ہیں، درخواست کرتے ہیں کہ جلد سے جلد ہماری انجمن میں شریک ہو کر اپنی ترقی کا ثبوت دیں اور ہمارے لئے بھی مثال قائم کریں۔

(۱۱) یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قوموں کی ترقی اور یادگار کا آئینہ دار اس کا شعر و ادب ہے۔ اس لئے انجمن اس امر پر زور دیتی ہے کہ شعر و ادب کو قائم رکھنے کے لئے ہر ہفتہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا جائے، اور تمام شعرا کے کلام کو ایک گلدستہ کی شکل میں جمع کیا جائے، تاکہ وقت واحد میں عوام کی دلچسپی کا باعث بھی ہو اور یہ بھی ریکارڈ رہے کہ کس مقام کے فقرا کیا فرمایا کرتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات لگے گی لیکن غور کرنے پر کھلے گا کہ یہ بھی ادبیات اور خصوصاً ہر ملک کی تاریخ تمدن کا ایک اہم باب ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اب تک جتنی خبریں ہم تک پہونچی ہیں ان پر اعتبار کر کے اور یہاں تک ہمارا خیال ہے اسے بھی غلط نہ سمجھیں تو ملک میں جا بجا شعر و ادب کا ذوق عام ہو گیا ہے، اور جگہ جگہ مشاعرے منعقد ہوتے نظر آتے ہیں۔ مردوں میں تو خیر ہوں گے ہی، لیکن مقام مسرت تو عورتوں کا ہے کہ اب ان میں بھی یہ ذوق مردوں سے کسی طرح کم نظر نہیں آتا، چنانچہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ گذشتہ ہفتے میں عورتوں کے سات مشاعرے اور مجلسیں ہوئیں۔ کئی خواتین نے حصہ لیا اور ہر مشاعرہ نہایت شاندار طریقے پر منایا گیا اور نہایت کامیاب رہا اور مردوں کے لئے بھی پردے کا معقول انتظام تھا۔

انجمن نے اس کامیابی پر بھی نہایت مسرت کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا اور صدر محترم کے شکریہ پر جلسہ کو برخاست کرتے ہوئے دعا کی کہ ہر دینے والا شاد و آباد، اور نہیں دینے والا بھی دعا کرے درویش، رحم کرے اللہ!

معزز حضرات و خواتین،

یاد ہو گا کہ گذشتہ ہفتہ ہم نے ایک نہایت شاندار سالانہ کانفرنس قائم کی تھی، اور انجمنوں کی وجہ تسمیہ پر روشنی ڈال کر، انجمنوں کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے، ہماری انجمن کے مقاصد کو گنا کر کئی رزولوشن پاس کرائے تھے، جو ملک کے تمام سنجیدہ طبقہ میں نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھے گئے، اور سارے ملک میں ایک لہر دوڑ گئی کہ کیا انجمن بھی ایسی چیز ہوتی ہے!۔ اس میں ہم ناچیزوں کا تو کیا ہاتھ ہو گا، البتہ قدردانوں کی قدردانی کا نتیجہ یہ سب کیا دھرا ہے، اور توقع ہے کہ اسی طرح آئندہ بھی ان کی عنایتیں شامل حال

فدویاں رہیں گی۔ کانفرنس کی شہرت اور رزولوشن کی اس قدر دانی کو دیکھکر ہم نے سوچاکہ ان کاایک دوسرا ایڈیشن بھی نکالا جائے۔ چنانچہ انجمن کی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہم نے گذشتہ جمعرات کو بھی ایک سالانہ کانفرنس قائم کی۔ دُور دُور سے مہمان بُلائے گئے اور اسی طرح کئی رزولوشن پاس کئے گئے۔ اس سال کی کانفرنس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کانفرنس کی نشست وبرخاست کے ساتھ ساتھ ایک "مخلوط مشاعرہ" بھی رکھاگیا تھا۔ جو عام طور پر عموماً، اور نوجوانوں میں خصوصاً نہایت پسندیدہ نظروں سے دیکھاگیا۔ کئی شاعر اور شاعرنیوں نے اس میں حصّہ لیا۔

اب ہم ذیل میں پہلے چند رزولوشن پاس کر دیتے ہیں، پھر مشاعرہ پر پل پڑیں گے تو بتائیں گے کہ اس کاکیا رنگ رہا۔ ساتھ ہی ساتھ چند مشہور شعرا کا کلام اور خصوصیات کلام کابھی ذکر کر دینگے۔

اَعوذُ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) یہ واضح کر دینے کے بعد کہ پیوستہ جمعرات کو جو ہماری سالانہ کانفرنس ہوئی کتنی شاندار پیش خیمہ لئے ہوئے تھی۔ اس اُمید میں کہ ساری دُنیانے بھی اس مبارک اقدام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہوگا ہم نہایت صمیم قلب سے ساری دُنیاکا بھی شکریہ اداکرتے ہیں، اور ان سب عظیم ہستیوں کابھی جو اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے سبب آتو نہیں سکے مگر جہاں بھی تھے وہاں سے پیامات روانہ فرما دئے، جن سے انکی گہری دلچسپی اور پاک نیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ آج "عید" کے سبب کانفرنس کے لئے وقت بہت تھوڑا ہی ہم معافی چاہتے ہیں کہ پیامات سنائیں، اس لئے پھر کسی کانفرنس میں اطمینان سے یہ کام کرلیں گے۔

(۲) ہم اور ہماری انجمن نہایت صمیم قلب سے عالی جناب حضرت اورنگ شاہ خلد اللہ کا سۂ دسوالہٗ کابھی شکریہ اداکرتے ہیں کہ آپنے بہ کمالِ عنایت ہماری اس دوسری سالانہ کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی۔ آپ کی ہستی بھی محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ اپنی ہر دلعزیزی، انکساری، وضعداری وغیرہ کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ پھر خاندانی وقار اس پر مستزاد ہے، چنانچہ سترپشت سے آپ کا یہ خاندان برابر یہ خدمات انجام دیتا آرہاہے، اور آپ کی فرض شناسی کا یہ عالم ہے کہ باوجود اس قدر مخالف تحریکوں اور ناموافق اسباب کے آپ اپنے پیشہ کو نہایت حُسن وخوبی کے ساتھ انجام دئے جارہے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک نامعقول "جنٹلمین" سے آپ کی مُڈبھیڑ ہوگئی، جس نے آپ کو سخت سُست کہنا شروع کر دیا۔ انتخاب کلام یہ ہے: "ابے مُسٹنڈے، تجھے اتنا ہٹاکٹا ہوکر بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" وغیرہ۔ بیباکی اور دیدہ دلیری آپ کی مشہور خواص ہیں، لیکن آپ نے اس ناملائم گفتگو کا نہایت سنجیدگی سے جواب دیاکہ "شرم تو اس کو آنی چاہیئے جو اپنی پاسِ وضع کو چھوڑکر دوسرا کا طرز اختیار کرے، نہ کہ ہم کو۔ یہ تو ہمارا خاندانی پیشہ ہے، بھلاہم اسے کیونکر چھوڑ سکتے ہیں!" اس کے بعد "سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے" آپ نے فرمایاکہ "جناب بھی تو مجھ سے زیادہ ہٹے کٹے ہیں! مَیں معلوم کرسکتا ہوں کہ اس آن وشان کے ساتھ آپنے ہی کون ایسا شیر مارا؟"

"جنٹلمین" کو اپنا سامنہ لیکر رہ جانا پڑا، مگر پھر بھی انگلش اصول کے آدمی تھے، اس لئے چوٹ کھاکر بھی ہنس پڑے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دوسرے حضرات بھی ان سے سبق حاصل کرینگے۔

(۳) انجمنوں اور رسالوں وغیرہ کے اُصول وروایات کے تحت اب ہمارا یہ اخلاقی فریضہ تھاکہ کوئی تعزیتی قرارداد منظور کریں، مگر افسوس ہے کہ کامل ایک ہفتہ کے انتظار اور کوشش کے باوجود ہمارے پاس کسی بڑے آدمی کی موت کی خبر نہیں آئی۔ اس لئے مجبوراً ہم اس حق تعزیت کو کسی اور موقعہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور دوسری قراردادوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۴) یہ کانفرنس پھر اس امر پر زور دیتی ہے کہ انجمنوں کا مقصد صرف رزولوشن پاس کرنا اور زبانی جمع خرچ کرنا نہیں، بلکہ عملی قدم بڑھانا ہے۔ افسوس ہی کہ دُنیا کی ساری قومیں جاگ اُٹھیں، اور جہالت، بغض وحسد اور تنگ نظری سے ہٹکر اپنے مقاصد اور ترقی میں بلند سے بلند مقام پر پہنچ رہی ہیں، اور ہم دن بدن اَدبیتی، منافرت، جمود، سُستی، جھوٹی شیخی، کھوٹی طمانیت، نااتفاقی، عیش پسندی، اکھڑپن اور ایک دوسرے کی بدخواہی کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے ہیں!

گر "فقیری" ہمہ این است کہ ایں ہا دارند

وائے گر از پئے امروز بود فردا ئے

بھائیو، اب بھی کچھ نہیں گیا، وقت ہے کہ غفلت سے چونکو۔ نیک دلی، عزم درست اور اتحاد سے کام لو تو دن دونی رات چوگنی ترقی کرو، اور اپنی تحریکوں اور مقاصد کو اس طرح عام کر دو کہ ملک کابچہ بچہ بیدار ہو جائے، اور فقیری کو اس قدر فروغ ہو کہ کہیں امتیاز ایں وآں باقی نہ رہے۔ اور سارے ملک میں فقیری بیداری پھیل جائے، پھر نہ کوئی ہم پر انگلی اُٹھانے والا ہے، نہ ہماری راہوں میں روڑے اٹکانے والا۔ سب

سب ایک سطح پر آجائیں، پھر یہ پیٹ بھرے اور محلوں میں براج کر ڈینگیں مارنے والے جانیں کہ "انساد گداگراں" کیا چیز ہے۔ یعنی اگر ان امیروں کے لئے فقیر ہوجانا اتنا مشکل ہے، تو ہم بیکس فقیروں کا امیر ہوجانا کب آسان ہی؟ عمارت ڈھاتے تو دن بھی نہیں لگتے اور بناتے مہینے لگ جاتے ہیں، خصوصًا جبکہ علل و اسباب بھی مخالف ہوں۔

(۵) اور جو یہ شیخی بازسمجھتے ہیں کہ صرف مشوروں اور وعظ و نصیحت ہی سے ہمارے خلاف کچھ کر سکتے ہیں تو ابتک انہوں نے کیا کیا؟۔

(۶) یہ کانفرنس تمام پیٹ بھروں اور مصلحوں کو توجہ دلانا چاہتی ہے کہ اگر فقیری و سوال ایسی ہی بُری چیز ہے تو وہ خود کیوں در بدر کھٹکھٹاتے اور دفتر بدفتر درخواستیں دیتے پھرتے ہیں؟ کیا یہ بھی ایک قسم کی فقیری نہیں؟ سے "حلوان" مردار، اور بکرا حلال؟۔

انتہا یہ کہ اگر فقیری سے انہیں نفرت ہے تو یہ روشن خیال اور ترقی یافتہ آئے دن عرس اور جاترا کیوں رچاتے ہیں؟ درگاہوں پہ جا جاکے کیوں بچے مانگتے ہیں، شوہر مانگتے ہیں، بیوی مانگتے ہیں امرادیں مانگتے ہیں؟ کیا یہ بھی ایک قسم کی بھیک نہیں؟ ہم تو پھر بھی زندوں سے مانگتے ہیں، لیکن یہ عقل کے دعویدار تو مُردوں تک سے مانگنے سے نہیں چوکتے فرق صرف یہ ہے کہ مُردے شاید دیدیتے ہیں اور زندے نہیں دیتے۔ تو ثابت ہوا کہ یہ زندے مُردوں سے بدتر ہیں پس جو لوگ خود اس قدر مردہ اور بےحس ہوں وہ کسی اور کو کیا اٹھا بٹھا سکتے ہیں؟ لہذا یہ کانفرنس نہایت مسرت کے ساتھ اپنے بھائیوں کو یقین دلاتی ہے کہ دشمن چاہیں ہزار ڈینگیں مارلیں، ان کی حالت، مقاصد میں کوئی فرق نہ آسکیگا۔ الا ماشاء اللہ۔

(۷) کانفرنس "وطنیت" اور "قومیت" کے تخیلات و جذبات کو انتہائی نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے، کیونکہ یہی تخیلات ساری ابتری، تباہی، فساد، تعصب اور تنگ نظری کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن ان سطحی مصلحوں کی دلفریبی اور نظر بندی کے لئے انہوں نے ایک ایسا دلکش نقاب اوڑھ لیا ہے کہ یہ عقل کے اندھے سمجھتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی یوسف چھپا ہے، حالانکہ وہاں شیطان جلوہ فرما ہے۔ ہماری نظروں میں سب سے بہتر تخیل اور نصب العین "انسانیت" ہے، اور یہ اتنا وسیع تخیل ہے کہ خدا کے سوا شاید ہی کوئی اس سے بڑھ سکے۔

(۸) کانفرنس کی نظروں میں عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں، اس لئے دونوں کے حقوق برابر ملنے چاہئیں۔ مختلف انفرادی عورتوں اور ذیلی انجمنوں کی طرف سے جو مردوں کے خلاف احتجاجی خطوط اور تجاویز نسواں کی حفاظت کے لئے تجویزیں آتی رہتی ہیں اُن کی بنا پر انجمن ہذا یہ رزولوشن پاس کرنے پر مجبور ہے کہ اب تک جو کچھ غلط کاری ہوتی ہوئی، اب سے مرد و عورت دونوں آزاد ہیں اور دونوں کے حقوق بھی مساوی۔ کوئی وجہ نہیں کہ عورتیں ہاتھ جلا جلا کر پکائیں اور مرد مونچھوں پر تاؤ دیتے، یا آج کل کے لحاظ سے ہونٹوں پر انگلیاں پھیراتے، یا بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے ایک انداز سے آکر بیٹھیں اور ایک ہی منٹ میں ان بیچاریوں کی ساری محنت کا صفایا کردیں۔ لہذا اعلان کیا جاتا ہی کہ ہماری انجمن میں شریک ہونے والی کو نہ پکانے کی ضرورت ہوگی نہ مرد کی تابعدار رہنے کی، وہ بھی آزادی کے ساتھ کما سکتی ہے اور مردوں کے دوش بدوش چل سکتی ہے۔ البتہ فطری ساخت کے تحت بعض کام اور معاملے ایسے ہیں کہ ان میں اور مردوں میں برابری نہ ہوسکے گی یا عورتوں کو دبنا پڑے گا۔ تو مجبوری ہے۔ اس کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں! البتہ کانفرنس کو اُن کے ساتھ ہمدردی ہے۔

(۹) کانفرنس ریلوے والوں کو اس امر کی طرف متوجہ کرانا چاہتی ہے کہ اکثر ریلوے گارڈ بدتمیزی سے ہمارے نمائندوں کو جہاں جی چاہتا ہی ریل سے اتار دیتے ہیں جس سے انہیں سخت تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں حیلہ یہ کہ ان کے پاس ٹکٹ نہیں ہوتے ٹکٹ نہ ہوں تو مسافروں کو تکلیف دینا کونسی انسانیت ہے۔ اس لئے آئندہ سے اگر کوئی ایسی صورت پیش آئے تو اربابِ ریل کو چاہیئے کہ مسافر کا نام وغیرہ نوٹ کرکے معتمد انجمن کو اطلاع دیدیں، وہ چندہ جمع کرکے ٹکٹ کے پیسے بھیجدیں گے۔

(۱۰) یہ کانفرنس پولیس والوں اور صفائی والوں کو بھی توجہ دلاتی ہے کہ وہ ہمارے نمائندوں کو سڑک پر بیٹھنے سے منع نہ کریں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ سڑک کے کنارے بڑے بڑے درخت اور دکانیں مسلسل لگی رہتی ہے تو کوئی ہرج یا بدنمائی نہیں معلوم ہوتی اور کہیں کہیں صرف بعض فقیر بھائیوں کے بیٹھنے سے ان کے داغ لگ جاتا ہی؟

(۱۱) انجمن ملک کے تمام لیڈروں، ہمدردوں، اور فیاضوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی بے جا عیاشیوں اور دولت کے نشہ سے باز آئیں اور ہماری انجمن کے رکن بنکر اس کی ترقی و بہبودی میں اضافہ کریں۔ اور اگر اور کچھ نہیں تو یہ جتنی رقم فیشن، سینما، ٹھاٹ باٹ، عید، تہوار، عرس جاترا وغیرہ پر صرف کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی ہماری انجمن کے لئے وقف کردیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

(۱۲) مُلک کی اس بڑھتی ہوئی ناسازگار فضا کو دیکھکر یہ کانفرنس اس امر کی وضاحت پر پھر زور دینا ضروری سمجھتی ہے کہ انجمن ہذا کو کسی فرقہ

یا مذہب کی خصوصیت نہیں بلکہ اس کا صرف واحد مقصد و مسلک اتحاد ہے، اور یہ بالکل لیگ اور کانگریس کے توڑ پر نکالی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کا ظاہر اور باطن دونوں ایک ہیں۔

لیگ اور کانگریس کو دعویٰ تو اس بات کا ہے کہ انگریزوں کی مخالفت کرنے کے لئے یہ قائم کی گئی ہیں اور لطف یہ ہے کہ انجمنوں کا نام خود انگریزی رکھا گیا ہے۔ اور اکثر تقریریں بھی انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اور یہ ایک حد تک بہتر بھی ہے کیونکہ جہاں اردو انگریزی کا اتنا جھگڑا اچل رہا ہو وہاں اس سے بہتر اور کون صورت ہو سکتی ہے کہ دونوں کو چھوڑ کر انگریزی زبان اختیار کر لی جائے اس لئے کہ نہ اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کی کثرت ہے، نہ سنسکرت اور برج بھاشا کی بھرمار۔ لیکن ہمارا مسلک سب سے اچھوتا ہے، اس لئے ہم نے اس کا نام ایک چالو زبان میں رکھ دیا ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ ہندی پرست حضرات کو ناگوار گزرے کہ اس کے نام میں خود عربی فارسی کی بو بھری ہوئی ہے اس لئے یہ امر بھی انجمن کے زیر غور ہے کہ اس کا نام بجائے "صدر انجمن اتحادِ گداگراں" کے "بھکاری اتحاد مہاسبھا" رکھ دیا جائے۔ چونکہ ہندوستان کی آبادی کا تناسب بھی ایک اور تین کا ہے، ہم نے انجمن کے نام میں بھی اسی تناسب کو ملحوظ رکھا ہے۔ یعنی صرف ایک لفظ اردو کا اور باقی تین ہندی وغیرہ کے۔ کیونکہ حقوق میں تناسب کا لحاظ ضروری ہے۔ اس لئے کیا ہم تمنا کر سکتے ہیں کہ انجمن کے ارکان بھی اسی تناسب سے ہوں؟ خیر، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ انجمن میں یہ مسئلہ طے ہوتے ہی ہم ایک اور رزولیشن پاس کر دینگے۔ اور جہاں اتنے رزولیشن پاس ہوتے رہتے ہیں وہاں ایک اور رزولیشن کا کیا ہے!۔

حسب بالا رزولیشن پاس ہونے کے بعد کانفرنس کی آخری نشست برخاست ہوئی اور ترانۂ سلامتیِ عمر و اقبال پر جلسہ ختم ہوا۔

اسی سلسلہ میں ڈنر اور مشاعرہ بھی ترتیب دیا گیا تھا جو نہایت پُرلطف رہا۔ ہم نے اوپر کہیں وعدہ بھی کیا تھا کہ کانفرنس کی رُوداد بر سانے کے بعد مشاعرہ کا بھی کچھ حال سنائیں گے، لہٰذا "اس سلسلہ میں حسب ذیل اخباری بیان جاری کیا جاتا ہے"۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ "عید" کے مبارک دن ہی ہماری کانفرنس کو زور ہوا۔ لہٰذا گذشتہ جمعرات ہی کو ایک مشاعرہ "حیدرآبادی فقیروں کا مشاعرہ" کے نام سے "بزمِ محلہ" میں منعقد کیا گیا تھا۔ یہ مشاعرہ بھی شاندار طریقے پر کامیاب رہا۔ سامعین اور شعرا کی کثرت سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا" اور ساری بزم "آلۂ مکبر الصوت معلوم ہوتی تھی، اور سب سے بڑی خصوصیت یہ کہ مشاعرہ "مخلوط" تھا، لیکن پھر بھی کوئی بدعوانی یا بدتمیزی نہیں ہونے پائی۔ اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہماری اخلاقی حالت بھی کس معیار پر ہے۔ اس کے برعکس ہم نے سنا ہے کہ حال میں ہمارے مخالفین نے بھی، غالباً ہماری ہی تقلید میں، ایک "مخلوط مشاعرہ" قائم کیا تھا، لیکن جیسے ناخوشگوار واقعات پیش آئے اس سے ہماری زبانِ قلم آلودہ ہونا تو بڑی بات ہے، سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، اس سے سبق لیا جا سکتا ہے کہ ایسے روشن خیال تعلیم یافتوں سے ہم جاہل بھکاری ہی بھلے رہے کہ نہیں؟۔

لیکن ہم نے سنا ہے کہ ہماری اس کامیابی پر جل کر ہمارے مخالفین نے شاید اپنی کسر اور کلنک کو چھپانے کے لئے یہ افواہیں اڑائی ہیں کہ ہمارے مخلوط مشاعرہ میں بھی "ایسی سفلہ حرکات ہوئیں اور تو تو، میں میں، جوتی، پیزار تک نوبت آئی"۔ دنیا جانتی ہے کہ یہ سراسر غلط پروپگنڈا ہے۔ بات دراصل یہ ہے:۔

ایک معزز شاعرنی جناب "پستاماں" نے ایک ٹھمری نہایت شاندار طریقے پر سنائی، جس کی سامعین نے جی کھول کر داد دی، اور ایک صاحب کو اس قدر پسند آئی کہ خوش ہو کر، داد کے طور پر انہوں نے ایک روٹی پھینک دی۔ اتفاقاً روٹی ایک شاعر اور ان شاعرنی کے درمیان گری، شاعرنی نے سمجھا میرے لئے ہے اور شاعر نے خیال کیا میرے لئے۔ لہٰذا دونوں میں کچھ جھڑپ سی ہو گئی۔ پھر دونوں طرف کے لوگوں میں بھی کچھ یوں ہی چل گئی۔ اگرچہ حالت نازک تھی لیکن منتظمین نے خوش انتظامی سے فوراً صورتِ حال پر قابو پالیا اور مجمع کو منتشر کر دیا، بعد کو فضا صاف اور صورتِ حال اطمینان بخش ہو گئی۔

وقت کی تنگی اور مضمون کی طوالت کے خوف سے سارے مشاعرہ کی روداد پیش کرنا تو بے محل اور مشکل ہو گا، اس لئے چند خاص شعراء کے حالات اور انکا نمونۂ کلام مختصراً پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) بہادر شاہ:۔ نام بہادر شاہ لیکن ہر کسی سے نہایت دب کے ملتے ہیں۔ اگرچہ فقیر ہیں مگر نام اور حلیہ کے اعتبار سے دہلی کے آخری تاجدار ہونے کا گمان ہوتا ہے اور جہاں سے یہ تصور آیا کہ نظر کو دھکا لگا اور دل پر چوٹ پڑی، اور انقلاباتِ زمانہ کا وہ سماں نظروں میں پھر گیا جس نے مسلمانوں کی ایسی شان و مطلق العنانی کو چھینا، اور اسی قسم کے جمود و غفلت و انکسار بے جا نے خاندانِ مغلیہ کے آخری جگر گوشے کو شاہی سے فقیری کے رتبہ پر پہونچا دیا — غرض، آپ شاعر ہونے کے علاوہ دیکھنے والوں کے لئے مذاق اور سمجھنے والوں کے لئے زندہ درسِ عبرت کا بھی کام دے سکتے ہیں۔

اونچات۔ لانبی ڈاڑھی، سفید شملہ، سفید تہ بند، اور سفید قمیص، علی عمر، کبھی ہاتھ میں لٹھ اور ہتھیار رکھتے تھے اور اب ڈنکا وڈفلی رکھتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں عودان اور مورچھل ہے پیسے دینے کے بعد یک بے نیازی کے ساتھ دُعا دیتے ہوئے کشتی سے کچھ نکال کر قشقہ لگا دیتے ہیں۔

پڑھنے کا انداز بھی خاص ہے۔ شعر کے بول جگر کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں، گو شاعری کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

وہ ڈنکا مولا علی کا　　وہ ڈنکا پیران پیر کا
وہ ڈنکا غوث اعظم کا　　وہ ڈنکا پیر سبحان کا
وہ ڈنکا پیر و مرشد کا　　وہ ڈنکا تاج اور تخت کا
وہ ڈنکا دل اور من کا　　وہ ڈنکا پیٹ اور تن کا

گئے سب خاک میں ملکر
وہ تاج و تخت اور قیصر

جانا سب کو ہے اک دن دیار سے لے
چار دن اس سرا میں گزار کے رہے

(۲) رمضانی فقیر۔ نام رمضان علی شاہ عرف رمضانی فقیر، رمضان میں سحری کو اٹھاتے ہیں، شاید اسی رعایت سے نام رکھا ہے۔ اور مشہور بھی ہو گئے ہیں۔ دُور دُور تک دم ڈالتے ہیں، معمولی قد، دُبلا پتلا جسم، عمر ۵۰ سال، قوم مسلمان، پیشہ فقیری، ولد نامعلوم، ساکن بھوئی گوڑہ چھ مہینے میں ایک بار خواجہ کا عرس کرتے ہیں، خود بھی صاحب "تکیہ" ہیں اور کئی دفعہ بغیر ٹکٹ کے اجمیر بھی ہو آئے ہیں ایک ہاتھ میں بارہ سینگی سی لکڑی اور دوسرے ہاتھ میں گھنگرو دار دف رکھتے ہیں۔

گیروا کرتا، ہرا شملہ، ہرا تہ بند، ان کا ایک قطعہ بہت مشہور ہے۔ پڑھتے بھی ہیں زور سے، اور پھر ہر مصرع کے بعد دف بھی بجا دیتے ہیں۔ غرض آواز میں خوب بیداری ہے قطعہ یہ ہے:-

دو بجے شب کے قادرِ قدرت　　نازل کرتا ہے اپنی رحمت
پانا ہے تو تو بھی پالے　　ہشیار ہو جاؤ سونے والے
اللہ محمد اُٹھے بھی ہونگے　　"وُضو"[1] کو پانی لے بھی ہونگے

تم بھی اُٹھو اے سونیوالو
حق کے حکم پر سر کو جھکا دو

اے روزہ دارو، "سیری"[2] کرو اُٹھو!

(۳) میرن ماں۔ آپ بھی ایک اچھی شاعرنی ہیں، روزانہ ہی اپنا خاص کلام سناتی ہیں اور کسی دن کی خصوصیت نہیں رکھتیں۔ جمعرات کے دن کہتی ہیں کہ "آج جمعرات ہے بی بی، خیرات ڈالو"۔ جمعہ کے دن کہتی ہیں "آج جمعہ ہے بی بی . . . . ." اسی طرح ہفتے کے سات دن۔ نوجوان ہیں ناک نقشہ اچھا ہے۔ صورت میں اہل نظر کیلئے جاذبیت بھی ہے، گود میں ایک بچہ بھی ہے۔ اکثر لوگ آپ کو بہت جلد خوش کر دیتے ہیں، آواز میں بھی ترنم ہے، آپ کا پیٹنٹ قطعہ یہ ہے:-

پاؤ سیر چانول تن کا کپڑا　　دے خدا کی راہ میں
بی بی تیرے چراغ روشن　　〃　〃　〃
مائی تیرے بچے جیو　　〃　〃　〃
نیک مائی، نیک بابا　　〃　〃　〃
"شفقی"[3] تیرے چراغ روشن　　〃　〃　〃

پھر آواز کے ترنم کو گھٹاتی ہوئی کلام کو اس دُعائیہ پر ختم کرتی ہیں:- "آش[4] کے در قائم رکھے اللہ، ہم کو دے تانبے کا پیسہ اللہ تمہارے کو دے سونے روپیہ کا پیسہ"۔

(۴) آغوں بی۔ نام تو آپ کا بہت شیر خواری پر مبنی ہے، مگر آپ کافی عمر رسیدہ و بوسیدہ ہیں۔ حالت سقیم ہے، چیتھڑے لگے ہوتے۔ ساتھ میں شاید ایک بیٹی اور دو نواسے ہیں۔ اسی لئے "آغوں بی اینڈ کمپنی" کو سب دھتکارتے ہیں۔ شاید ہی کسی گھر سے کچھ ملتا ہو۔ حالانکہ سب سے زیادہ قابلِ اعتنا آپ ہی کی حالت ہے۔ پھر بھی زبان پر شکوہ شکایت نہیں۔ دیں بھی دُعا نہ دیں بھی دُعا۔ کوئی بچہ سختی سے جھڑک دیتا ہے تب بھی نہایت ٹھنڈے دل سے دُعا دے کے چلی جاتی ہیں کہ خوش رہو بیٹا!۔

تلخی زمانہ نے غالباً دل میں درد اور مذہبیت زیادہ بھر دی ہے، اس لئے اکثر مذہبی اشعار گاتی ہیں۔ خصوصاً شہدا کے اشعار وردِ زبان ہیں۔ اور اکثر آپ نکلتی بھی محرم کے زمانے میں ہی ہیں۔ آواز میں بلا کا سوز اور کلام میں کربلا کا درد ہے:-

بانو روتے ہوئے آتے "رن میں　　تم اُٹھو جی مرے بھائی اصغر
لاش بے گور و کفن کے پڑی ہے　　منہ پو دُو[5] فیر کی دھوپ چڑھی ہے

تم اُٹھو جی مرے بھائی اصغر

رو رو کہتے تھے" بی بی سکینہ　　میرے بچے کا لاشہ دکھا دو
ہائے تجھ بن یہ دوبھر ہے جینا　　میرے بچے کا لاشہ دکھا دو

تم اُٹھو جی مرے بھائی اصغر

تین دن سے نہ پانی پیا ہے　　وار تلوار کھا کر مُوا ہے

[1] وضو۔ [2] سحری۔ [3] تخی۔ [4] آس۔ [5] منہ پہ دوپہر کی دھوپ۔

تم اُٹھو جی مرے بھائی اصغر،

اللہ نام کی خیر، بیگم صاب!

(۵) بھولے سائیں۔ نہایت اسم با مسمیٰ، صورت بھولی، عقل بھولی، گُن بھولے، اور خود بھولے "بھولے" کو خواہ واؤ معروف سے پڑھیئے یا واؤ مجہول سے دونوں طرح کی خصوصیات آپ پر پھبتی ہیں۔

کلام نعتیہ ہے۔ پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ ہر مصرع کے ٹکڑے کرکے کچھ وقفہ دیدیتے ہیں تاکہ سننے والے کے لطف اور تشنگی میں اور اضافہ ہو۔

میرا دل — مصطفیٰ پر نثار ہے — اللہ

میرا مالک — جو پرور — دگار ہے — اللہ

ہے یہ انصاف — ہر ہر — جستجو میں دو؟

تیری آبرو نہیں — یہ — ذوالفقار ہے — اللہ

میرا دل — مصطفیٰ — پر — نثار ہے — اللہ

میں دُنیا — میں آکر — کچھ نہ — کیا

کیا سو کیا — ہوئے — گناہ ہی — کیا

میرے سر پر گُناہ کی بہار ہے اللہ

میرا دل — مصطفیٰ پر — نثار ہے — اللہ

شبِ فرقت — خدا بھی — اُٹھا نا سکا!

شبِ معراز — آکر — ملا نا سکا!

مجھ سے کتنا — محمد سے — پیار ہے اللہ

میرا دل — مصطفیٰ — پر نثار ہے — اللہ

(۶) ہنچا ماں۔ آپ بھی اچھی ہیں، اور آپ کا کلام بھی اچھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مثنویوں کا ذوق زیادہ ہے۔ دکنی زبان کا خاص طور پر خیال رکھتی ہیں۔ سُنتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب کہ دہلی و لکھنؤ کے شُعرا جو انہیں آپ کو بڑے اُستاد مانتے تھے، اپنے اُمیدوار شاگردوں سے کہا کرتے تھے "میاں پہلے جاکر ذرا رنڈیوں سے زبان سیکھ آؤ!"۔

اس میں ایک تو اپنی بڑائی اور دوسرے کی تحقیر تھی۔ دوسرا یہ کہ واقعی عورتوں کی زبان منجھی ہوئی اور خارجی اثرات سے بہت کم آلودہ ہوتی ہے۔ پس اگر کوئی اب دکن کا اصلی روزمرہ سیکھنا چاہتا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ایسی ہی اُستانیوں سے سیکھا جائے۔

غالباً ایک مثنوی سنائی تھی جس کے چند اشعار یہ یاد رہ گئے ہیں۔

کبوتر نی! — کبوتر نی! نکو جاؤ گئے تو جاتیوں گی

جاتیوں گی

بادشاہ کا بیٹا بڑا حرامزادہ چھڑیاں ماریں گا، تری ٹانگ توڑیں گا

بولے تو بی — سُنتی نہیں، سُنتی نہیں

جاکو آخر ٹانگ تڑائی۔ ٹانگ تڑائی

اللہ کی راہ کچھ ڈالو بی بی۔

(۷) مٹھو خاں چورن والا۔ آپ چورن کی تجارت کرتے ہیں۔ اور ہماری انجمن کے خازن بھی ہیں۔ نہایت متین و سنجیدہ۔ آواز میں گونج ہے اور بہت زور زور سے پڑھتے ہیں۔ ہر دلعزیز بھی بہت ہیں۔ خصوصاً بچوں کو آپ سے بڑی دلچسپی ہے۔ جہاں آپ کھڑے ہوئے کہ بچوں نے آپ کو گھیر لیا۔ اور آپ نے بچوں کو "چیینہ" تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ بچوں کو "چیینہ" مفت دیدیتے ہیں اور ماں باپ کے پیسے مفت لے لیتے ہیں

کلام بھی خوب ہے، جو کچھ کہتے ہیں نہایت رَو میں کہتے ہیں، زبان میں روانی، کلام میں سلاست، جزالت وغیرہ۔ غرض سب کچھ موجود ہے اور اس لحاظ سے کہ دہلی سے آنے کا دعویٰ ہے، اہلِ زبان بھی کہلانے کے مستحق ہیں، پھر تو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوسکتا۔ اشعار میں ذائقہ اور آواز میں ہاضمہ پایا جاتا ہے۔ یہ ہے نمونۂ کلام۔

مَیں ہوں دہلی سے آیا	اچھے اچھے چورن لایا
جو کوئی چُورن میرا کھائے	اُس کا دُکھ بیماری جائے
چُورن میرا جالینوس	جسکو کھلائے ترکی، روس
چورن والا ہے کنجوس	اس کا باوا مکھی چوس
واوا بالکل ہے منگوس	ڈالا چورن میں ہے کھونس
جو کوئی چُورن میرا کھائے	سیدھا قبرستان کو جائے

اب ہم دو اور حضرات کا مختصر سا تذکرہ کرکے اپنے اس بیان کو ختم کرتے ہیں۔ ان سے ہماری مُراد حضرت مُلنگ شاہ اور حیدر شاہ سے ہے، جو اپنے فن اور شاعری کے اُستاد مانے جاسکتے ہیں۔ آپ کو خاندانی فقیر ہونے کا دعویٰ ہے، اس لئے معلومات کافی وسیع ہیں۔ مختلف خاندانوں سے واقفیت رکھتے ہیں، جن میں آپ کا بیان ہے، کہ "ڈنڈے کے فقیر" "عرس کے شہزادے" "قنبر شاہی فقیر" "تانا شاہی" "سبز گنبدی" "مَسنڈ فقیر" اور "رفعی فقیر" خاندانوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ کا تعلق "ڈنڈے کے فقیر" خاندان سے ہے، جو ان سب میں بھی زبردست کہلاتا ہے، اور یہ تو نام سے بھی ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے ہاتھوں میں چھوٹا سا آبنوسی ڈنڈا بھی ہوتا ہے۔ دونوں حضرات ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور اکثر خصوصیات بھی مشترک ہیں۔ اور آپ کو کلام میں بھی خاص مراتب حاصل ہیں۔

---

۱ چیز؟ ۲ آپ؟ ۳ اور۔ ۴ معراج۔ ۵ مت۔ ۶ کہے۔ ۷ جاتی ہوں کہی۔ ۸ مارے گا۔ ۹ توڑیگا۔ ۱۰ بھی۔ ۱۱ جاکر۔

(۱) پڑھتے اس انداز سے ہیں گویا لڑتے ہیں، یا بڑی بڑی چٹانیں ہیں جو بلندی سے لڑھکائی جارہی ہیں، روانی اور تیزی اس غضب کی کہ معلوم ہوتا ہے نیاگرا کا آبشار آپ ہی کے مُنہ میں سے گرتا ہے۔ الفاظ میں بھی خاص شکوہ پایا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ آپ اُردو کے انوری وقاآنی کہلا سکتے ہیں۔

(۲) شکسپیر اور ملٹن کے متعلق مشہور ہے کہ اُنہوں نے پندرہ ہزار اور آٹھ ہزار الفاظ ایجاد کئے۔ خواہ وہ زبان کے اعتبار سے کتنے ہی بھونڈے اور مہمل کیوں نہ ہوں شکسپیر اور ملٹن کے ہونے کے لحاظ سے مستند ہو گئے ہیں۔ یہی حال کچھ ان دونوں شاعروں کا ہے۔ نیچے کی طرف دو تین غزلیں دیکھنے سے پتہ چل جائے گا کہ یہ اس خصوص میں بھی کتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ شکسپیر اور ملٹن نے اگر ساری عمر میں اور سینتیس ۳۷ ڈرامے اور کئی ہزار صفحے لکھ کر ایک پندرہ ہزار الفاظ ایجاد کئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں رہتی خصوصاً جب وقتِ واحد میں ایک شاعر ایک ہی دو غزلوں میں اتنے الفاظ پیدا کرسکتا ہے۔ پھر عمر بھر میں ایسے کتنے الفاظ ہوں گے انکا تناسب کرنے کے بعد تو شکسپیر اور ملٹن انکی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے۔ مگر افسوس ہے کہ جدت اور فیشن بھی تو بڑے آدمیوں سے شروع ہوتے ہیں، چھوٹوں کی جدتوں یا خوبیوں کو پوچھتا کون ہے۔

(۳) صرف الفاظ پر کیا موقوف، آپ حضرات تو اشعار کے اشعار اس قسم کے کہہ جاتے ہیں جن کو خاص ذوق و دماغ والے یا مستشرق سمجھیں تو سمجھیں ہمارے بس کی تو بات نہیں۔

(۴) پڑھنے کا بھی خاص انداز ہے، جہاں وزن گرتا ہے راگ سے اُٹھا لیتے ہیں، اور جہاں بڑھتا ہے جلدی سے گھٹا دیتے ہیں، یہ گویا خاص ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا کمال ہے۔

(۵) کلام زیادہ تر اہل بیت اور شہدا سے متعلق ہوتا ہے، اور پڑھنے میں مرثیہ کی بو آتی ہے۔ گویا صحیح معنی میں انیس و دبیر بھی کہلانے کے مستحق ہیں۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ! وقت واحد میں ایک ہی شخص کا انوری اور قاآنی۔ شکسپیر اور ملٹن، ایکٹر اور ایکٹریس، انیس اور دبیر، اور ان سب کمالات کے باوجود فقیر ہونا معجزہ سے کم نہیں۔ خیر، زمانہ کی ہنر نوازی سے اہل کمال کا حال تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔

آپ بھی دکن کے روزمرہ کا خاص لحاظ رکھتے ہیں، اور جس طرح ہم نے عرض کر دیا چونکہ فطری شاعر ہیں، کسی قسم کی قیود شاعری کی پروا نہیں کرتے۔ جوش میں آئے اور کہدیا۔ اب بندھ گیا سو موتی، رہ گیا سو پتھر۔

دونوں ہی حضرات سیدھے ہاتھ میں جست کی بہت سی چوڑیاں اور ایک چھوٹا سا مخروطی ڈنڈا رکھتے ہیں، اور انگشت شہادت میں ایک موٹی سی انگوٹھی۔

اب ہم ذیل میں ہر ایک کی چند انفرادی خصوصیات اور نمونۂ کلام پیش کرتے ہیں:-

(۱) **ملنگ شاہ** ۔ سیاہ قمیص، سیاہ تہ بند، گلے میں سیاہ ہار، سانولا رنگ، گول چہرہ، عمر ۵۰ سال، صورت میں کشش، ایران میں ہوتے تو بہت قدر ہوتی، آواز میں شیرینی، گا کے پڑھتے ہیں، اور پڑھتے وقت دونوں حضرات ہی ڈنڈے کو کچھ اس طرح نچاتے ہیں کہ ہاتھ کی انگوٹھی سے ٹکرا کر طبلہ کا کام دیتا ہے، اور ہاتھ کی چوڑیاں جو ہلتی ہیں تو ایک قسم کی انگریزی موسیقی پیدا ہو جاتی ہے، گویا اس طرح ہارمونی اور طبلہ کا کام لیکے وہ اپنے ریڈیو کیلئے آرکسٹرا تیار کر لیتے ہیں۔

جب لا الٰہ کہہ کے قلم کو اُٹھالیا — نام علی کو جب دیا سر کو جھکا دیا!
یہ وہ علی تا[1] شہر[2] سے سلنی چھڑالیا! — چودہ طبق جہین[3] سے جس نے اٹھالیا

حیدر کا نام لے لے علی جن کا نام ہے
مشکل کشائی کرنا علی کا ہی کام ہے

اوصافِ علی کس سے لکھا جائے سراسر — طاقت تو نہیں کون کرے وصل پاکر؟
خود آن؟ لکھے شاہی[4] سے کل دریا بناکر — ہے تار ارج[5] دشما[6] کا بن جائیگا دفتر؟

توفیدؔ وصفت حیدر کرار کی کم ہے!
محتاد؟ آآ کے کہا حیدر شفدر[7]!

بھوکا ہوں دلا دیجے کچھ اپنا فضل کر — ہم دیاز؟ دنغا لگے؟ کے تئیں مار قتل کر!
تس مین؟ شقاوت[8] کا توئیں حق کا مَین ہے؟ — مولا کے محتاد ہو، اس وقت ہولا کر!

حاضر ہوں بزار میں تو بیچ لے سو بار
بربر بھی ایک شہر، وہاں رہتا ہے کفار
لیتا ہے مجھے مول تو جا بیچ لے سو بار
گر[9] نام مرا پوچھے تو بتائیے قمشو میں
وہ بولا کہ اے شاہ میں کس طرح سے بیچوں
فرمائے کہ معاف سے کے لئے جا مجھ کو؟
بازار میں میں لے کے چلا بربر علی کو
بزار میں میں لے کے کھڑا ایسے علی کو

صورت ہوئی یہ شہر میں برزان! عذب! ہے؟
سو لاکھ ٹکے سونے کا نو لاکھ درم ہے

[1] تھا۔ [2] زمین [3] سیاہی [4] ارض و سما [5] توصیف؟ [6] صفدر؟ [7] سخاوت [8] گر

(۹) حیدر شاہ۔ لال شملہ، لال قمیص، لال تہمد، عمر کوئی تیس[1] سال، بالکل قصبہ کے دولہا معلوم ہوتے ہیں۔ پڑھنے میں اُتار چڑھاؤ، کبھی تحت اللفظ، کبھی رواں، کبھی بہت تیز۔ آپ کیا بولتے ہیں گویا ریڈیو بولتا ہے:-

صلوٰۃ بر محمد وصلِّ علی علی　　حاجت[1] روا محمد و یا مرتجا[2] علی
کیا مرتجا علی کہ تو ہے صاحب عزم[3]　　صدقہ حسین کا رکھ لیجو شرم

کیا شان ہے مدینہ کا چمن میں ظہور ہے
ہر گل میں ہر شجر[4] میں محمد کا نور ہے

نورِ نبی بنائے خدا کے ظہور سے　　سب کل کے ہوگئے پیدا ہوا ہے کہ نور سے!
ذاری[5] رہے گی نام نبی کی زبان پر　　واللہ کبھی نہ آئے[6] گی آفت[7] جان پر

مسلم کے پسر کہتے ہیں مت مار ستمگر
بن باپ کے ہم دونوں ہیں لاچار ستمگر

صیاد ہے مسافر، یارا وطن ہے؟　　بچے ہیں ترے ہم ہیں گرفتار ستمگر
آئے تھے فقط تیرے گھر میں جان بچانے　　بس اتنی بات کہہ کے ہیں گنہگار ستمگر

ان دو شمس و ما[8] کو لائے فرات[9] پر
تلوار کھینچ کے بولا کہ نیوڑا[10] دو اپنا سر

بولا کہ ہم یتیم ہیں مسلم کے پسر　　مت مار اپنی جات؟ کو لیجل ہمیں تو گر؟
وہ گھر کہے کہ قتل ہوئے کیجو دہیں؟　　حارث نے یہ ذباب[11] دیا کہ نہیں نہیں

ماروں گا آج[12] تم کو پاؤں گا مال و زر
میں کیا کروں گا جا کے یونہیں[13] اپنے گھر

غرمال کی طمع ہے تو زنے[14] مرد بیخبر　　اک سو درام[15] کمر میں ہیں سو لیجے کھول کر
اور ہی[16] طمع ہے ستمگار کو نئے میں　　کا کل مُنڈا کے بیچ لے با جار[17] کو نئے میں

وہاں زوپو! ہمارا کوئی خریدار ہوویگا
ہم جو جان سے بچے گا زب دار! ہوویگا
حاصل[18] ہمارے قتل سے کیا یار ہوویگا
تجھ سے خدا رسول بھی بے جار[19] ہوویگا

فیض اللہ، سکھی، مائی باپو کی آل اولاد،
دُعا کرے درویش رحم کرے اللہ،
قدم درویش، ردِ بلا!

مشاعرے کی بھی دو نشستیں ہوئیں، ایک ازصبح تا تقریباً نصف النہار، دوسری بعد نمازِ مغرب تا عشا۔ اس کے بعد مشاعرہ بھی برخاست ہوا۔

آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ انجمن ہذا کس خوبی اور تیز رفتاری سے کام کر رہی ہے۔ اس کے باوجود ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ سب لوگ ہمارے خلاف پروپاگنڈا کر کے؛ ہماری مخالف راہیں اختیار کر چکے اور کہیں سے کہیں بھٹک کر پہونچ گئے ہیں؛ اور یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اتنی انجمنیں کھولنے، اور اس قدر تیزی سے کانفرنس اور رزولوشن پاس کرنے کے باوجود اس انجمن کے ارکان صرف مسلمان ہیں۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ بہت جلد دوسری قومیں بھی اس بے لوث ادارے کی طرف توجہ فرمائیں گی اور ہماری کارکردگی اور ترقی میں اضافہ کریں گی۔

'پیرو بھی'
معتمد انجمن
شاکر

---

[1] حاجت روا۔ [2] مرتضیٰ۔ [3] عزم؟ [4] شجر۔ [5] جاری۔ [6] آئے گی۔ [7] آفت۔ [8] شمس و ماہ۔ [9] فرات۔ [10] جھکاؤ۔ [11] جواب۔ [12] آج۔ [13] یوں ہی۔ [14] گر۔ [15] تجھے۔ [16] درہم۔ [17] بھی؟ [18] بازار۔ [19] حاصل۔ [20] بیزار۔

زندگی شاید اسی کا نام ہے!

"اُف! کتنی زور سے بجلی چمک رہی ہے"

"ڈر لگتا ہے ——؟"

"ہوں ——!"

"مجھے تو یہ بہت پیاری ہے"

"کیوں ——؟"

"میرے دل سے پوچھو ——!"

"یہ کچھ نہیں کہتا"

"کتنا گداز ہے تمہارا جسم ——!"

"اب میں سمجھ گئی"

"کیا ——؟"

"مجھے شرم آتی ہے"

"نہیں بتلاؤ ——!"

"پھر میں اُس چارپائی پر چلی جاؤں گی"

"میں نہیں جانے دونگا"

"چھوڑ دو ——!"

"نہیں —— !"

"پھر چمکی"

"پھر چمکا"

"کیا ——؟"

"میرا نصیبا"

"وہ میرا انگیہ ——!"

"کیوں ——؟"

"تم مجھے بناتے ہو"

"اچھا سُنو! تمہیں کون موسم بہت پیارا ہے؟"

"برسات"

"کیوں ——؟"

"نہیں بتاؤں گی"

"پھر میں نہ بولوں گا"

"بتاؤ گے تو نہیں ——؟"

"نہیں"

"نہیں، بتاؤ گے"

"نہیں بھئی"

"جو بتایا تو رُوٹھ جاؤں گی"

"منظور"

"تم جو میرے پاس ہو ——!"

"بہت سخت سردی ہے"

"اور کھسک آؤ"

"بس ——؟"

"اور ——"

"بس ——؟"

"اور ——"

"اب کہاں ——؟"

"مجھ میں سما جاؤ"

"بڑے وہ ہو تم"

"اور تم ——؟"

"بہت سیدھی"

"اور بھولی بھی ——؟"

"ہوں ——"

"اچھا تمہیں کون موسم بہت پیارا ہے ——؟"

"جاڑا"

"کیوں ——؟"

"بتاؤ گے تم"

"کبھی نہیں"

"تم جو میرے پاس ہو"

"کتنی سڑی گرمی ہے"

"پنکھا جھل دوں؟"

"نہیں"

"پھر ——؟"

"مجھ سے چمٹ جاؤ"

"اور گرمی ——؟"

"وہ بھاگ جائے گی"

"کیسے؟"

"ایسے ——"

"چھوڑ دو مجھے"

"چھوڑ دوں ——؟"

"........."

"بولو ——؟"

"نہیں"

"کیوں ——؟"

"اب گرمی نہیں لگتی"

"اچھا تمہیں کون موسم بہت پیارا ہے ۔۔۔!"
"گرمی"
"کیوں ۔۔۔؟"
"دل سے پوچھو"
"وہ تو دھڑک رہا ہے"
"ہوں ۔۔۔"
"کیوں ۔۔۔؟"
"مَیں چلا جاؤں"
"کیوں ۔۔۔؟"
"........."
"تمہاری دھڑکن بند ہو جائے"
"اس دھڑکن میں ایک لذّت ہے"
"کیوں ۔۔۔؟"
"نہ جانے"
"آخر ۔۔۔؟"
"..... تم جو میرے پاس ہو"

"اُف! کتنی بھیانک رات ہے"
"برسات جو ہوئی"
"نگوڑی جیسے ڈسنے کو کھڑی ہو"
"برسات کی راتیں ایسی ہی ہوتی ہیں"
"بہت بُرا موسم ہے یہ"
"کیا ۔۔۔"
"یہی برسات"
"بھوجی! کوئی خط آیا ۔۔۔؟"
"نہیں ۔۔۔"
"یہ دیری کیوں ہوئی ۔۔۔؟"

"اب جانے دے، سوجا"
"بھو! کل تو مَیں ضرور جھولا ڈالوں گی"
"نا ۔۔۔"
"مَیں تو ڈالوں گی"
"مَیں نہیں جھولوں گی"
"کیوں ۔۔۔؟"
"مجھے برسات سے چڑ ہے"
"ہمیشہ سے ۔۔۔؟"
"نہیں ۔۔۔"
"پھر ۔۔۔؟"
"اُس سال سے"
"سمجھ گئی ۔۔۔"
"اچھا، اب سو جا!"

"ایک سال ہو گیا"
"ہاں ایک سال ہو گیا"
"کوئی چٹھی بھی نہیں آئی ۔۔۔؟"
"آئی ہے"
"کیا لکھا ہے ۔۔۔؟"
"چھٹی نہیں ملتی"
"بہت بُرا ہے سرکار ۔۔۔!"
"قسمت بُری ہے"
"گرمی اور سردی گلے مل رہی ہے"
"جانے دے، سوجا"
"مجھے تو یہ رُت بہت پیاری ہے"
"بس اب سو جا!"
"اور آپ کو بھو ۔۔۔؟"

نفرت ہے اِس سے"
"کیوں ۔۔۔؟"
"تو نہ سوئے گی"
"پھر تم بھی سو جاؤ"
"اچھا، اب سو جا ۔۔۔!"

"اب گذر کیسے ہوگی ۔۔۔؟"
"تم اس کی پروا نہ کرو؟"
"کیا یہ دن سدا یونہی رہیں گے"
"سب دن کٹ جاتے ہیں"
"لیکن یہ دن کٹتے نہیں دِکھتے"
"کٹ ہی جائیں گے"
"تم بہت اچھی ہو"
"پھر بنانے لگے"
"تم سستی ہو"
"جاؤ، اب نہ بولوں گی"
"بچہ رو رہا ہے"
"چُپ کراؤ"
"بھوکا ہے"
"انگوٹھا مُنہ میں دیدو"
"اس طرح کب تک بہلے گا ۔۔۔؟"
"جب تک بہل سکے"
"اب مَیں پھر روزگار تلاش کرنے نکلوں گا"
"کب تک مارے مارے پھرو گے ۔۔۔؟"
"جب تک پیروں میں طاقت ہے"
"اب مَیں نہ جانے دوں گی"
"پھر گذر کیسے ہوگی ۔۔۔!"

"بہلائی ہے۔۔"

"کب تک ۔۔؟"

"جب تک ہاتھوں میں دم ہے"

"تم کو بہت تکلیف پہونچتی ہے"

"بالکل نہیں ۔۔!"

"کیوں ۔۔؟"

"تم جو میرے پاس موجود ہو"

"اب میں نہ اچھا ہونگا"

"ایسا نہ کہو"

"کیوں ۔۔؟"

"مجھے دُکھ ہوتا ہے"

"نہ کہوں گا"

"اب سو جاؤ"

"نیند نہیں آتی"

"آنکھ بند کرلو"

"اب تو میں بالکل بیکار ہوگیا"

"ایسا نہ کہو"

"کیوں ۔۔؟"

"میں تو موجود ہوں"

"تم میری سہارا ہو"

"لونڈی ہوں"

"لیکن یہ ۔۔ فالج"

"سب ٹھیک ہوجائے گا"

"جھوٹی تسلی ۔۔!"

"سو جاؤ"

"بچہ سو گیا ۔۔؟"

"سوتے میں ہنس رہا ہے"

"کچھ دیکھتا ہوگا ۔۔؟"

"تم کو ۔۔"

"نہیں تم کو ۔۔"

"ایسا جینا کس کام کا"

"ہر حال میں بھلے ہو"

"کس کے لئے ؟"

"میرے لئے !"

"ہوں ۔۔۔"

"روتے کیوں ہو ؟"

"سوچتا ہوں ...."

"سو جاؤ ۔۔!"

"اب گھر کون سنبھالے گا"

"اب سو جاؤ"

"تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی"

"نہیں"

"کیوں ؟"

"تم جو میرے پاس ہو"

"کب تک روتی رہو گی بہو ۔۔؟"

"جب تک آنکھوں میں آنسو ہیں"

"ننھا کہتا تھا ۔۔"

"کیا ۔۔؟"

"بابو اب نہ آئیں گے"

"جھوٹ ۔۔!"

"........."

"وہ تو روز آتے ہیں"

"کہاں ۔۔؟"

"سپنے میں ... باہوں میں جھولا جھلایا کرتے ہیں"

"پھر روتی کیوں ہو ۔۔؟"

"وہ میرے پاس نہیں رہتے"

"لیکن ...."

"چُپ، وہ آرہے ہیں ۔۔!"

محمد ابراہیم

ہیں کون موسم بہت پیارا ہے ؟" | اور بھولی بی ۔۔!

محسن

وہ ایک دروازے میں کھڑا ہوا ٹھٹھر رہا تھا۔ اسکے کپڑے بارش سے بالکل شرابور ہو چکے تھے اور اُس کے نحیف و مختصر جسم کیساتھ چسپاں ہوئے جاتے تھے۔ اس کی موٹی موٹی، سہمی ہوئی آنکھوں نے کسی بہتر جگہ کو تلاش کرنا چاہا مگر نیم تاریکی کے پردے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی اور گلی میں جہاں کہ صرف چند ساعت پہلے لوگ آجا رہے تھے، ایسا سناٹا تھا گویا کہ نصف شب گذر چکی ہو۔ ذرا فاصلے پر ــــ مگر اُس کی نظروں میں بہت ہی دُور ــــ گلی کے سرے پر ایک بجلی کا قمقمہ چمک رہا تھا۔ اُسی مقام سے بازار گذرتا تھا۔

بار بار اُس کی نگاہیں بجلی کے قمقے کی طرف جاتیں اور مایوس ہو کر لوٹ آتیں۔ وہ انتظار میں تھا۔ خدا جانے وہ کس کے انتظار میں تھا! ایسی رات میں جوتوں کے تسمے بیچنے کی تو اُسے کیا اُمید ہو سکتی تھی۔ لوگ لمبے لمبے کوٹ پہنے ہوئے اور چھاتے لگائے ہوئے بازار میں سے گذرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اس کی جانب کوئی آنکھ اٹھاتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے جا رہے تھے۔ انگیٹھیوں سے گرم کمروں، منتظر بیویوں اور لذیذ کھانوں کے خیالات میں مگن تھے۔ اُن کے پاس ایک معصوم، لاوارث بچے کی طرف متوجہ ہونے کے لئے وقت نہ تھا۔

یکایک اُس کی موٹر کار اُسی گلی میں سے گذری۔ بجلی کی تیز روشنی سے بچے کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ اور اُس نے اپنے بازو سے انہیں ڈھانپ لیا۔ اچانک اُس کی نظریں تن تنہا بچے پر جا پڑیں۔ اُس نے شوفر کو موٹر ٹھہرانے کا حکم دیا۔ موٹر رُک گئی۔ وہ اتری اپنے دوشالے کو سنبھالتی، تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی اسکے قریب آگئی۔ اُس کے معطر جسم کی تیز خوشبو بچے کے دماغ میں سرایت کر گئی۔ وہ کچھ ڈر کر کچھ حیران ہو کر اُسے تکنے لگا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" عورت نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا

"بارش سے ڈر کر یہاں بھاگ آیا" بچے نے رُک رُک کر جواب دیا۔ وہ اب بھی ڈر رہا تھا۔

عورت نے ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ لیا۔ اُس کی بوسیدہ جا بجا پھٹی ہوئی قمیص، جس میں سے اس کا جسم صاف نظر آرہا تھا۔ اُس کا میلا کچیلا پاجامہ، ننگا سر، جس پر پانی کے بے شمار قطرے پڑے ہوئے تھے۔ اور ننگے پاؤں، جن پر کیچڑ جمی ہوئی تھی۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"جوتوں کے تسمے۔ خریدو گی؟"

عورت کے لبوں پر ایک غمگین مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بچہ اسکا مطلب نہ سمجھ سکا۔ البتہ وہ اُمید جو ایک لمحہ پیشتر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی مایوسی سے بدل گئی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟ چلو میں تمہیں وہاں پہونچا دوں"

"گھر! مگر میرا تو گھر کوئی نہیں"

عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اُس نے اپنا چہرہ ایک لمحہ کیلئے دوسری طرف پھیر لیا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟"

"کہاں؟"

"میرے گھر"

وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔

"دیکھو، تمہارے کپڑے بالکل بھیگ چکے ہیں۔ اور اگر میں بھی کچھ دیر اور یہیں کھڑی رہی تو میرے کپڑوں کا بھی یہی حال ہوگا۔

میرے ساتھ چلو، میں تمہیں نئے کپڑے پہناؤں گی۔ اور تمہیں بھوک بھی لگ رہی ہے نا؟ میں تمہیں نہایت عمدہ کھانا کھلاؤں گی اور بہت میٹھی میٹھی مٹھائیاں بھی دونگی۔"

"اور جوتوں کے تسمے؟" معصوم بچے نے پوچھا۔

"یہ میں سب خرید لونگی!" عورت نے مسکرا کر اسے یقین دلایا۔

چند منٹ بعد وہ ایک اجنبی عورت کی گود میں بے خبر سو رہا تھا۔ موٹر تیزی سے راستہ کاٹتی چلی جا رہی تھی۔ اسے قطعاً معلوم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور اس کی منزل مقصود کہاں ہے۔ اور نہ ہی وہ یہ جانتا تھا کہ یہ موٹر شہر کے اسی متمول اور معزز سوداگر کی تھی جس کے پہلو میں لیٹی ہوئی اس کی محسن چند گھنٹے پیشتر اس کی نفسانی خواہشات کو اپنے عنبریں جسم کی قیمت کے عوض پورا کر رہی تھی۔

عزیز الرحمٰن

سُباکی کا تیل

چند مہینے ہوئے میرا ایک مقالہ بعنوان "اینوشیمہ" شائع ہوا تھا جس میں جاپانی عورت کے لمبے بالوں کی تعریف تھی۔ اور اینوشیمہ کی عورت کے ایڑی تک لمبے بالوں کی تصویر تھی۔ اس جزیرے کی ایک پیداوار کا بھی تذکرہ تھا جس سے تیل نکالا جاتا ہے۔ یہ تیل جاپانی عورت کو بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے بال بڑھتے ہیں۔

میرے پاس ہندوستان سے بہت سے حضرات اور خواتین کے خطوط آتے ہیں۔ بعض نے تیل کی فرمائش کی ہے۔ بعض نے تیل کی دکانوں کے پتے دریافت کئے ہیں اور بعض نے اس کے خواص دریافت کئے ہیں۔ کیا ہندوستان میں بھی وہی فائدہ دیگا۔ ان خطوط کا فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے۔ لہذا ساقی کے ذریعے جواب پیش ہے۔

افسوس ہے کہ میں فرمائش کی تعمیل سے معذور ہوں۔ جنگ کی وجہ سے درآمد برآمد پر کچھ ایسی پابندیاں عائد ہو گئی ہیں کہ جو لوگ یہ کاروبار کرتے ہیں وہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ دوسروں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو صاحبان تیل منگوانا چاہتے ہیں ان کیلئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جاپانی قونصل جنرل مقیم کلکتہ یا قونصل مقیم بمبئی سے خط و کتابت کریں وہیں سے سوداگروں کے پتے معلوم ہو جائینگے۔

یہ بتانا بڑا مشکل ہے کہ سُباکی کا تیل ہندوستان میں بھی مفید ہوگا۔ نباتی پیداوار پر آب و ہوا کا اثر ضرور پڑتا ہے مگر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں یہ تیل مفید نہ ہو۔ تجربہ کرنے پر ہی صحیح نتیجہ نکل سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس تیل سے یہ توقع کرنا کہ شانوں تک کے بال ایڑی تک بڑھ جائیں گے بیجا ہے۔ جاپانی عورت کے بالوں کی لمبائی قومی خصوصیت ہے جو کسی تیل کے استعمال سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ نہ اُسے سُباکی کے تیل سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ دیگر اقوام کی عورتیں جاپانی عورت کے بالوں میں ایک بڑا نقص بتاتی ہیں کہ موٹے ہیں، جھاڑو بنانے کے کام کے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہندوستانی عورت کے ریشم کے لچھوں کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ سُباکی کے تیل سے اس قوم کے بال موٹے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی ایک قومی خصوصیت ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ جاپانی عورت بہت کم تیل لگاتی ہے۔

برلاس

مایا

(ایک خواب)

سندر کمہار کی لڑکی روپا سوئی تو کمہاری اور جاگی تو راجکماری۔

یہ دُنیا بھی کس قدر عجیب ہے!

"راجو آپ نہیں اُٹھیں گی۔۔۔ اچھا تو لیجئے" کسی کی شوخ آواز اُس کے کان میں آئی۔ اور ایک لمحہ بعد اُسکے گدگدی شروع ہوگئی۔

"اب بھی نہیں اُٹھو گی۔ اب بھی نہیں اُٹھو گی"

آخر کار روپا اُٹھ بیٹھی۔ چار خوبصورت اور اسکی ہم عمر لڑکیاں اُس کے پاس کھڑی تھیں۔

"بیچاری کو رات بھر تو نیند آتی نہیں۔ صبح کو نہ سوئیں تو کام کیسے چلے" شوخ کملانے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ اور وہ سب ہنس پڑیں۔

"تو کیا رات کو یہ موتی پروتی رہتی ہیں" رامی کتنی بھولی بنکر بولی۔

"ہاں اور کیا نہیں۔ موتی بھی پروتی ہیں۔ مالا بھی بناتی ہیں اور کسی کو پہناتی بھی ہیں" پھر کملا بولی۔

"کون کملا۔ کون کس کو مالا پہناتا ہے" رامی نے پھر بھولی صورت بنا کر پوچھا۔

"تم نہیں جانتیں۔ رامی۔ تم بڑی جھوٹی ہو۔ اسے ہماری راجکماری۔ اور کیا تم؟"

"اور کسے؟"

"تمہیں نہیں اپنے سوامی کو"

"اسے سوامی کو!"

"گھبراؤ نہیں، اپنے سوامی کو۔۔۔"

"اور وہ ہیں کہاں؟ کملا"

"یہ بھی پوچھو گی۔ ہماری راجکماری کے دل میں"

سب نے ایک قہقہہ لگایا۔

اونگھتی ہوئی روپا کو کملانے پلنگ سے نیچے کھینچ لیا

"راجو آج تم اتنی سست کیوں ہو رہی ہو۔ طبیعت تو اچھی ہے"

رانی سروپ رانی نے روپا سے پوچھا۔

"نہیں تو میں تو اچھی ہوں" روپا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اور کیا کہے۔

"تو پھر چپ کیوں ہو؟"

روپا خاموش رہی

"دیکھو آج تمہارا جنم دن ہے۔ سارے شہر میں خوشی ہے۔ پھر تم ناخوش کیوں ہو، راجو"

روپا پھر بھی نہ بولی۔

"اچھا میں کملا اور رامی کو بھیجتی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری نیند نہیں بھری۔ کیا اور سوؤ گی؟"

"نہیں میں ابھی تو اُٹھی ہوں" روپا کو کہنا ہی پڑا۔

"اچھا تو میں کملا کو بھیجتی ہوں" رانی سروپ رانی کہتی ہوئی چلی گئیں۔

"اچھا ابھی تک نیند نہیں بھری تمہاری راجو" شوخ کملانے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

روپا اُٹھکر بیٹھ گئی "میں سو تھوڑی رہی ہوں"

"نہیں یہ تو میں بھی نہیں کہہ رہی۔ سپنا دیکھ رہی تھیں"

"تمہیں ہر وقت یہی رہتا ہے۔"

"اور تمہیں ہر وقت وہی رہتا ہے۔"

روپا خاموش ہو گئی۔

"اچھا اٹھو گی بھی یا نہیں ـــــ ماں جی کہہ رہی تھیں کہ راجو کہیں بیمار تو نہیں۔"

"ہاں ابھی ابھی یہاں سے گئی ہیں۔"

"تو پھر انہیں پریشان کیوں کرتی ہو۔ آج تو انہیں خوش ہو لینے دو۔ تمہارا جنم دن ہے۔ پھر تو رلاؤ گی ہی۔ اب نہیں چھ مہینے بعد میں کہتی ہوں جب ہی پریشان کرنا۔ ہاں جب ہم تمہیں کیوں یاد آئیں گے ـــ تمہارے سوامی نے تو ابھی تمہیں ہم سے چھین لیا۔ اور ہاں راجو تمہیں ایک خوشخبری سناؤں، کچھ انعام دو گی۔ آج تمہارے سوامی بھی تو آئیں گے۔ آج سارے شہر کی دعوت ہے۔ اندر تو انہیں ابھی ہم آنے نہ دیں گے۔ پھر تم کیسے دیکھو گی۔ ہماری خوشامد سے کام چلے گا۔"

"کیا ہو رہا ہے بملا" اتنا کہکر روپا خاموش ہو گئی۔

"اوہو، بملا تم یہاں ہو" رامی نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور کہاں ہوتی۔ ہماری راجکماری تو بُرے چکر میں آئی ہیں، نہ بولتی ہیں، نہ بات کرتی ہیں۔ جب دیکھو بیٹھی سوچ رہی ہیں۔ ارے میں کہتی ہوں اتنی بھی بیوفائی کیا کہ شادی سے پہلے ہی میکے والوں کو بھول جاؤ۔ ابھی تو بی بی جی بہت دن ہیں۔ ابھی تو تم ہماری ہو جو کچھ ہم کہیں گے تمہیں کرنا ہوگا۔ جب سوامی کی ہو جاؤ گی سوامی کی سہی۔ وہی بڑے راجکمار بنے ہیں جو ابھی سے چھین کے لیجائیں گے۔"

روپا اٹھ بیٹھی۔ بملا اور رامی ساتھ ہو لیں۔

"بہن راجو آج تو تمہیں ہماری پسند کے کپڑے پہننے ہونگے۔ وہی نیلی ساڑھی" بملا نے صندوق کھولتے ہوئے کہا۔

"نہیں راجو نیلی نہیں۔ چاچی جی بگڑیں گی۔ آج خوشی کا دن ہے" رامی بولی۔

"واہ اچھا خوشی کا دن ہے۔ کوئی اچھے کپڑے بھی نہ پہنے۔ نیلے کالے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو وہی پہنائیں گے۔ اور آج ہی نہیں شادی کے دن بھی۔ جو ایک دفعہ تو راجکمار جی بھی دُنیا بھول جائیں۔"

"توبہ۔ بملا تمہیں تو یہی رہتا ہے" روپا نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو بیوی جی جو پسند ہو وہ پہن لو۔ میں تو کہتی ہوں اب تمہیں ہم سے مطلب ہی کیا ہے؟"

روپا خود حیران تھی کہ کسے پسند کرے۔ سینکڑوں ساڑھیاں اور ایک سے ایک عمدہ۔ ان میں سے بہت سی پہنی بھی نہیں گئی تھیں۔ وہ پسند نہ کر سکی۔

"تمہیں بتاؤ بملا تم تو خفا ہو گئیں" اسکو مجبوراً کہنا پڑا۔

"میں خفا ہو گئی، میں تو بڑے شوق سے ساڑھی نکال رہی تھی آپ ہی آج صبح سے خفا ہیں" بملا نے مُنہ بنا کر کہا۔

"نہیں بملا نہیں" روپا نے اُس کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میرا کہنا مانو"

"اور پھر رامی جو خفا ہو جائیں گی"

"تو پھر رامی جو کہے کرو"

"نہیں یہ نہیں۔ تم دونوں پسند کر لو" روپا نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک گلابی ساڑھی پسند ہوئی۔

"اچھا راجو پہلے بول دو۔ کبھی گہنے پر بھی یونہی لڑائی ہو" بملا نے کہا۔

"نہیں بملا جو تم کہو گی وہی پہنوں گی"

زیور بھی بڑی مشکل سے پسند ہوئے۔ روپا کا جی چاہتا تھا کہ وہ تمام زیور ایک دم پہن لے۔ بملا اور رامی نے ایک ہار، ایک جھومر، کرن پھول، اور ہاتھوں میں چوڑیاں اور کڑے پسند کئے۔

"ابھی تک تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ کھانا سب خراب ہو رہا ہے۔ پراونٹھے ٹھنڈے کس کام کے رہیں گے۔ تمہیں بھوک بھی نہیں لگی" رانی سروپ رانی نے اندر آتے ہوتے راجو سے کہا۔

"نہیں ماں جی انہیں آج کل بھوک نہیں لگتی" چنچل کملا خاموش نہ رہ سکی۔

راجو نے اُس کے چٹکی لی۔ رانی جی نے سر نیچا کر لیا اور مسکرا دیں۔

"اچھا دیکھو پندرہ منٹ سے زیادہ نہ لگیں" یہ کہتی ہوئی مہارانی جی چلدیں۔

"دیکھو راجو لڑائی ہو جائیگی۔ ابھی تم نے کھایا ہی کیا ہے۔ تمہارے ساتھ تو کھانے والا بھی بھوکا رہ جائے۔ مہاراجن (کھانا پکانے والی سے) انہیں ایک گرم پراونٹھا اور دو" کملا بولی۔

"نہیں مَیں کھا چکی کملا۔ یوں کہو تمہیں بھوک باقی ہو تو کھاؤ مَیں بیٹھی ہوں" روپا بولی۔

"نہیں راجکماری جی آپنے ابھی کھایا ہی کیا ہے۔ یہ لیجئے گرم پراونٹھا۔ اور آپنے میٹھا تو کھایا ہی نہیں۔ یہ لیجئے حلوا تھوڑا اور کھا لیجئے" مہاراجن بولی۔

کھانا کتنا ہی اچھا سہی روپا کتنا کھا سکتی تھی۔

دن بھر اُدھم مچا رہا، سارے شہر کی دعوت تھی۔ رات کو بھی گانے بجانے کی وجہ سے کون سو سکتا تھا۔ شہر کی راجکماری کا جنم دن تھا۔ اور وہ بھی آخری اس وجہ سے کہ چھ مہینے بعد اُنکی شادی تھی۔ پھر وہ دوسرے گھر کی ہو جائیں گی۔ راجکماری کے سسرال والے بھی آئے تھے۔ اُن کی وجہ سے اور زیادہ تیاریاں کی گئی تھیں۔ آتشبازی، ناچ گانا سب ہی کچھ تھا۔ کہیں رات کے دو بجے فراغت حاصل ہوئی۔

خواب میں چھ مہینے منٹوں میں گذر جاتے ہیں۔

آج راجکماری کی شادی کا دن ہے۔ چاروں طرف اُدھم مچا ہوا ہے۔ شہر کا شہر دُلہن بنا ہوا ہے۔ دوسرے شہر سے بارات آ رہی ہے۔ شہر کی عزت کا سوال ہے۔ اِدھر صبح ہی سے کملا اور راجو نے راجکماری کو پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ کملا نے سال بھر سے آج کے ہی دن کا اُدھم بچا رکھا تھا۔ راجکماری بھی خاموش ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ اب دوسرے گھر کو جانا ہے۔ جتنی دیر خوش ہو لیں اچھا ہے پھر یہ سہیلیاں کہاں۔

بارات آئی۔ خوب خاطر مدارات ہوئی۔ آخر کار رخصت کا دن بھی آیا۔ آج چنچل کملا ساری شوخی بھولی ہوئی ہے۔ راجو بھی خاموش ہے۔ مہارانی نے رو رو کر صبح کی ہے۔ مہاراج منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن وہ بھی چپ ہیں۔ بیٹی کو انسان کتنا ہی دیدے لیکن جی نہیں بھرتا۔ روپیہ، زیور، کپڑے اور برتن وغیرہ اتنے دئے ہیں کہ سو گاڑیوں پر لدے ہوتے ہیں۔ آدھا خزانہ خالی کر دیا لیکن طبیعت خوش نہیں ہوتی۔ اور کیا دیں۔ کس چیز کی کمی ہے۔

راجو رو رو کر بیہوش ہو گئی۔ لیکن ماں باپ سے علیحدہ ہونا ہی پڑتا۔ راجہ کی بیٹی بھی ہمیشہ اپنے گھر نہیں رہ سکتی۔

آج نئے گھر میں راجکماری کی آمد ہے۔ یہ گھر بھی دُلہن بنا ہوا ہے۔ گھر سے جس چیز کی کمی تھی وہ یہاں پوری ہو گئی۔ سسر نے ہزاروں روپے ڈولے پر سے لٹا دئے۔ جتنا زیور گھر سے لیکر آئی تھیں اُس سے زیادہ ہی یہاں ملا۔ ساس ہیں کہ خوشی کے مارے جامے سے باہر ہیں۔ ماں سے زیادہ مہربان۔ نندیں بہنوں سے زیادہ محبت کر رہی ہیں۔ سسر ہیں کہ بہو کو دیکھ کے پھولے نہیں سماتے۔ معلوم نہیں کیا دل میں ہے۔ ساری دولت لٹا کر ہی چین

لیں گے اور سب سے بڑھکر وہی بھلا والے سوامی: آج راجو کو معلوم ہوا ہے کہ بوا جو کچھ کہتی تھی سچ کہتی تھی ایک سوامی کی وجہ سے اسے اپنا گھر ماں باپ اور سہیلیاں چھوڑنی پڑیں۔ وہ اب نہ اپنے ماں باپ کی ہے اور نہ سہیلیوں کی ۔۔ اب وہ صرف ایک کی ہے ۔۔ وہی اُس کے سوامی کی۔

"راجو:" اس کے سوامی نے محبت بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوامی:" راجو نے آنکھیں نیچی کرلیں۔

"سوامی کی بچی اُٹھے گی یا نہیں۔ یا بلاؤں تیرے باوا کو"

روپا کی سوتیلی ماں نے اُسے جھنجوڑتے ہوئے کہا

وہی روپا پھر راجکماری سے کمہاری بن گئی تھی۔

یہ ایک خواب تھا۔ کتنا اچھا، کتنا سندر، مگر آنکھ کھلتے ہی آہ! کچھ بھی نہیں۔

خواب کی وجہ کہتے ہیں کہ وہی خیال ہوتا ہے جو دن بھر آدمی کو رہتا ہے۔ اس کمہار کی لڑکی کو شاہی محل کا خواب کن خیالات کی وجہ سے ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے یہ خیالات ان کہانیوں کے ہوں جو وہ اپنے پڑوس میں ایک بڑھیا سے سنا کرتی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو، لیکن غریب ایسا خواب کیوں دیکھیں؟ کیا یہ قدرت کا انتہائی ستم نہیں!۔

(ترجمہ بنگالی) ایم وائی کرمانی۔ بی۔ اے؛

گرمی کی چھٹیاں

مَیں جب چھٹیوں میں گھر گیا تو سب لوگ گھر کے اُسی حالت میں تھے جس طرح میں نے اُن کو آخری دفعہ دیکھا تھا۔ مکان کا فرنیچر، میز کرسیاں پردے، پھولدان، اُگالدان، غرض کہ پلنگ تک اپنی پُرانی جگہ پر جمے پڑے تھے۔ کچھ دیر تک تو مجھے ذرا بھی تبدیلی نظر نہ آئی۔ مگر نہا دھو کر۔ ناشتہ کرکے جب مَیں باغ کی طرف چلا تو ایک نئی چیز نظر آئی۔ ایک عورت جو شاید ابھی عورت کی منزل پر نہ پہونچی ہو۔ وہ لڑکی تھی۔ عمر مشکل سے سولہ یا سترہ سال، قد لمبا اور جسم پتلا۔ مگر ایک ہی نظر میں سینے کا اُبھار، کمر کی موزونیت اور سیاہ بالوں کا باریک پن بھا گیا۔ مَیں حیران تھا کہ گھر میں یہ نئی صورت کہاں سے پیدا ہو گئی۔ وہ مالن ہرگز نہیں تھی، کیونکہ اُس کو تو مَیں صبح ہی اُس کے بھدّے جسم اور وحشتناک صورت کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ اُس کی لڑکی؟ مگر ہماری مالن کا تو صرف ایک ہی لڑکا ہے اور اُس کی ماں ان تمام مرحلوں کو طے کر چکی ہے جن میں بچے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ خیر مَیں دیکھکر مسکرایا مگر اُس نے ایک نظر میری طرف ایسے دیکھا جیسے مَیں چڑیا گھر کا کوئی مضحکہ انگیز جانور یا ایسا بیوقوف دیہاتی ہوں جو بلا وجہ ہنسا کرتے ہیں۔ وہ تو باغ کے دوسری طرف سے ہوتے ہوتے گھر کے رسوئی خانے کی طرف غائب ہو گئی اور مجھ کو پھولوں کی کیاریوں میں یہ سوچتے چھوڑ گئی کہ پھولوں کے رنگ کس قدر خوشنما ہوتے ہیں۔ مگر بخدا ان پھولوں کی کیاریوں میں وہ ایک خوبصورت تیتری سے کچھ کم نہ تھی۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہاتھ دھونے لگا تو وہی تیتری آفتابہ اور سلفچی لئے کونے میں کھڑی تھی ـــ تو وہ گھر کی ایک نئی نوکرانی تھی ـــ معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ بدلنے کے ساتھ ہمارے گھر والوں کی ذہنیت بھی بدلتی جارہی تھی۔ اس سے پہلے آج تک گھر میں جتنی نوکرانیاں رکھی گئی تھیں وہ عام طور پر دادیاں تھیں۔ نوکرانی رکھتے وقت یہ خیال کبھی نظرانداز نہیں کیا جاتا تھا کہ اُن کی عمر کم از کم چالیس سال سے اُوپر ہو، اور آنکھ ناک اگر ٹھیک ہو تو چیچک کے داغ ضرور ہوں۔ اور اگر نوکری کرنے والی کے چیچک کے داغ نہ ہوں تو کم از کم جسامت ہی ایسی ہو کہ بغل گیر کرنے کا ارادہ رکھنے والے مرد کو اپنے چھوٹے چھوٹے بازو دیکھکر اپنی بیوقوفی کا احساس ہونے لگے۔ آخر یہ لڑکی ہمارے گھر والوں نے کس طرح پسند کرلی۔ یا شاید یہ ممکن ہو کہ وہ میرا گھر واپس آنا بھول گئے ہوں یا یہ سمجھ بیٹھے ہوں کہ اب مجھ سے کسی قسم کی ناشائستہ حرکت ہونی ممکن نہ ہو۔

خیر ہاتھ دھوتے ہوتے میں نے مجبوراً ایک نظر اُس کے جسم اور چہرے پر پھر دوڑائی۔ یہ لڑکی اُن پُرانی بے ڈھنگی، کاہل الوجود ہتھنیوں سے کس قدر مختلف تھی۔

ابھی میں نے اُس کی آواز نہ سُنی تھی۔ مگر مجھے دو مہینے کی چھٹی تھی اور ساٹھ دنوں میں نہ صرف مَیں اُس کی آواز ہی سُن سکتا تھا بلکہ شاید دل کی دھڑکن بھی۔

میں روز صبح اُٹھکر حجامت کیا کرتا تھا اور اُسترے کو خود صاف کیا کرتا تھا کہ ایک تو اُسترا حسب منشا صاف ہو جائے اور دوسرے اسلئے کہ گرم پانی اُسترے پر ڈالنے والی وہی نئی صورت تھی۔

تیسرے دن میں نے اُسترا دھوتے ہوتے اُس سے کہا "تم بہت اچھی ہو"

بڑے الہڑپن سے جواب ملا "اچھی ہوں تو کیا کروں"

میں کوئی شاعرانہ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ بڑے بھائی صاحب ایک ہنگامہ مچاتے ہوتے نکلے کہ نو بج چکے تھے اور ابھی تک ناشتہ کا نام و نشان بھی میز پر نظر نہ آرہا تھا۔ اُن کی آواز سُنکر وہ تو میرے اُسترے والے ہاتھ پر گرم پانی کا ایک سیلاب اُنڈیلتے ہوئے الگ چلی گئی اور مَیں نہانے کی فکر کرنے لگا۔

لچھمی مجھے دن بدن سڈول سے سڈول تر نظر آنے لگی۔ ممکن ہے مجھے دھوکا ہو مگر چند دن سے میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بالوں کو احتیاط سے بناتی اور جسم کی ساڑھی اور چولی بھی ہر تیسرے دن بدل ڈالتی۔ گھر کی پُرانی وزن دار و عمر رسیدہ نوکرانیاں بھی یہ تبدیلی تاڑ گئی تھیں وہ اکثر موقع پاکر اُس کے بناؤ سنگار پر ایک آدھ پھبتی چپکا دیتیں۔ اور نہ جانے کیوں مَیں اُن کے مذاق کو بھونڈا اور بے وجہ سمجھتا۔ اور اکثر اپنے کمرے میں اُن کی بیہودہ باتوں پر اُن کو ہوا میں مُکّے مارا کرتا ـــ!

ایک دن موقع پاکر میں نے لچھمی کے سینے پر آہستہ سے تھپڑ مارا۔

نے اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ شاید ڈر گئی یا محض مجھے اُسانے کے لئے تاکہ میں اس کو پکڑ کر اپنے آہنی بازوؤں کی گرفت میں جکڑ لوں۔ اُس نے کہا: "آپ ایسا نہ کریں، لوگ دیکھ لیں گے۔"

میں نے کہا: "لوگوں کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ اگر دیکھ لیں گے تو بُرا ہوگا۔"

کہنے کو تو میں نے یہ کہہ دیا مگر ہر ایک بُرائی اور بدنامی اُٹھانے پر تیار تھا اگر میں اُسے اپنے بازوؤں میں لیکر اُس کے جوان ہونٹوں میں اپنا مُنہ گاڑ سکتا۔

میں نے لچھمی سے کہا: "اگر موقع ملے تو کسی وقت میرے کمرے میں آنا تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے۔"

جواب میں اُس نے سراسیمگی کا اظہار کیا اور رسوئی میں جاکر کچھ کام کرنے لگی۔

میں اُس دن انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے دن اتفاقاً وہ مجھے ایک دروازے سے گزرتی ہوئی ملی۔ میں قصداً اُس سے بھڑتا ہوا گزرا اور آہستہ سے کل کے انتظار کا بھی حال سُنادیا۔ اُسی شام میں نے اُس کو پھر جتلایا کہ وہ رات کو اُٹھکر کم از کم میری ضروری بات تو سُن جائے۔

مگر وہ نہ آئی اور میں بیچین ہوا جاتا تھا۔

ایک رات میں بے خبر سویا پڑا تھا کہ میرے بازو کو کسی نے آہستہ سے ہلایا۔ مجھے اُس کے آنے کی اُمید بالکل باقی نہ تھی مگر چونک کر اُٹھا تو لچھمی نے اندھیرے میں آہستہ سے کہا۔

"میں آگئی ہوں، ضروری بات کہہ ڈالو۔"

دس بیس سکنڈ تک تو میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ کچھ نیند کا اثر اور پھر جوانی کی نیند، دوسرے لچھمی کی نا اُمید آمد۔ آخر جب ذرا ہوش آیا تو میں نے لچھمی کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر بٹھانا چاہا۔ مگر اُس نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ وہ تو ضروری بات سُننا چاہتی تھی۔

میں نے ایکی مرتبہ اُسے اِس زور سے اپنی طرف کھینچا کہ نہ صرف وہ پلنگ پر بیٹھ گئی بلکہ تقریباً میری گود میں آگری۔ اس سے جو دھماکہ پیدا ہوا اُس نے ہم دونوں پر کچھ دیر کے لئے سکتہ طاری کر دیا۔ بہت جلد ہی میرے کانپتے ہوئے بازو اُس کے گرد تھے۔ میں نے کہا: "لچھمی ضروری بات یہ ہے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

لچھمی نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا "تو میں کیا کروں؟"

میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سردی سے نہیں، جوش سے۔ جوانی کے جوش سے۔ میں نے بولنا بند کر دیا۔ ہونٹ اُس کے ہونٹوں سے پیوست کر دئے اور ہاتھ بھٹکنے لگے۔

لچھمی نے مجھے روکا۔ میرے ہاتھوں کو روکا۔ مگر بہت جلد اُس کی "ناں ناں" کی مدھم آواز لمبے لمبے سانسوں میں مل گئی.....

لچھمی اُٹھی۔ میں نے نیم خوابی کی حالت میں اس کو اپنے کپڑے دُرست کرتے دیکھا اُس نے کچھ نہیں کہا بلکہ جس خاموشی سے آئی تھی اُسی طرح جاکر اپنی جگہ پر سو گئی۔

دوسرے دن اُسترا صاف کراتے وقت لچھمی مُسکرا رہی تھی میں بھی شاید مُسکرایا ہونگا۔ میں نہیں جانتا۔ مگر اب وہ تقریباً ہر رات میرے کمرے میں آتی ہے۔

آہستہ آہستہ میری چھٹیاں ہر اچھی چیز کی طرح ختم ہوگئیں جب میں اسٹیشن جانے کے لئے موٹر میں بیٹھا تو لچھمی آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر لچھمی بچے کی ماں بننے والی ہو تو کیا ہوگا؟

بھارت چند کھنہ۔ ایم۔ اے (کیمبرج)

بھوکوں کا خُدا

سڑک کولتار کی بنائی جا رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف کولتار پگھلانے کی مشین اور اس کے نزدیک سڑک بنانے کا سیاہ انجن آنے والے انقلاب کی طرح اس انتظار میں کھڑا تھا کہ موقع پاتے ہی اُن تمام چیزوں کو جو اُس کی زد میں آئیں کچل کر نشیب و فراز کو ہموار کر دے۔ دُھول کا غبار فضا میں غریبوں کی آہوں کی طرح پھیل رہا تھا ـــ عورتوں کی ایک جماعت ہاتھوں میں بڑے بڑے برش لئے سڑک صاف کرنے میں مصروف تھی۔ اُنکے پیچھے کچھ مزدور تسلوں کے ذریعے دُھول اُڑا رہے تھے۔ دُھول اُن کے چہروں پر غازہ کا کام کر رہی تھی۔ وہ ان چھوٹے درجے کے عیسائیوں کی طرح حسین معلوم ہوتے تھے جن کی خوبصورتی غازہ و کریم کی مرہونِ منت ہے۔ اوورسیئر اور مقدم انجن کے نزدیک کھڑے حُسنِ آوارہ کی غیر ارادی حرکتوں اور شرم و حیا سے بے نیاز جسم کے بعض حصوں کی برق پاش عریانیوں کو جو اُن کے شعلۂ معصیت کو ہوا دے رہی تھیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

شنکر دوڑا ہوا آیا اور ایک تسلا اُٹھا کر مزدوروں میں شامل ہونے ہی والا تھا کہ اوورسیئر چلّایا "کیوں بے ابے ایمان!! اتنی دیر سے آتا ہے۔ اِس طرح کہیں مزدوری کی جاتی ہے!"

"بابو جی! آج آنکھ نہ کھلی۔ معاف کرو۔ اب ایسا نہ ہوگا" شنکر نے کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس طرح مزدوری نہیں کی جاتی۔ آج تم کو صرف آدھے دن کی مزدوری دی جائے گی" اوورسیئر نے گرجتے ہوئے کہا "یہ سرکاری کام ہے یہاں دھاندلی نہیں چلے گی۔ جاؤ مزہ کرو اب جو بیچے آتا!"

"بابو جی غریب آدمی ہوں" شنکر نے رحم کی بھیک مانگی "تھوڑا سا سویرا ساڑھے سات بجے ہیں ـــ صرف آدھے گھنٹے کی دیر ہوئی [illegible]"

مقدم نے اوورسیئر کے کان میں آہستہ آہستہ کچھ کہا۔ جس کو سُنتے [illegible] معاف کرتے ہوئے کہا "اچھا جاؤ آج معاف [illegible]"

شنکر تسلا لے کر مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ وہ زور زور سے ہاتھوں کو نصف دائرے کی شکل میں گردش دیکر دُھول اُڑانے لگا۔ موہن نے جو اُس کے قریب ہی کھڑا تھا آہستہ سے دریافت کیا "بچ گئے بیٹا"

"ہاں! بال بال بچ گیا" اُس نے مسکراتے ہوئے ایک نظر اوورسیئر اور مقدم پر ڈال کر اطمینان کر لیا کہ وہ اپنی باتوں میں مشغول ہیں "کل رات موتی مجھے زبردستی 'رام لیلا' لے گیا۔ وہ بجے رات کو میں گھر آ کر سویا تھا۔ بھلا صبح جلدی آنکھ کیسے کھلتی ـــ اور اس سردی میں تو بچھونا گودڑی چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی ـــ آج بابو جی کچھ خوش معلوم ہوتے ہیں، مجھ پر بڑی کرپا کی"

مقدم نے انہیں باتیں کرتے دیکھ لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے ڈانٹ بتائی "کیوں بے! باتیں کر رہا ہے؟ ایک تو دیر سے آتا ہے اور پھر دوسروں کو بھی باتوں میں لگاتا ہے۔ ابھی کان پکڑ کے نکال دونگا"

وہ پھر مستعدی سے کام کرنے لگا۔ لگاتار محنت سے اس کے جسم میں گرمی آ گئی۔ اس نے پیشانی کے پسینے کے قطرات اُنگلیوں سے اُتار کر میلی دھوتی سے پونچھ لئے۔ اب وہ سستانے کے لئے ذرا ٹھہرا۔ [illegible] پیش کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی ـــ عورتوں کی جماعت میں شانتی کو [illegible] چونک پڑا۔

"کیا بات ہے؟" موہن نے اپنا کام کرتے ہوئے [illegible] اُٹھائے پوچھا۔

"شانتو یہاں کیسے؟" شنکر نے حیرت سے دریافت کیا۔

"اُس کی ماں بیمار ہے وہ اُسکی جگہ کام کرنے آئی ہے"

"بڑھیا مرتی بھی تو نہیں" شنکر نے نفرت سے مُنہ بناتے ہوئے کہا "شانتو کا باپ زندہ ہوتا تو کب کا میرا بیاہ ہو چکا ہوتا ـــ بڑھیا سے کہتا ہوں میرا بیاہ کر دے۔ میری بچپن کی بات ہے۔ تو بھی میرے ہی یہاں آ رہے مگر وہ ٹال دیتی ہے ـــ جوان لڑکی کو ان بے ایمانوں میں [illegible] اوورسیئر و مقدم کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "کام کرنے بھیجتی [illegible]"

اوورسیئر و مقدم سڑک کے کنارے دھوپ میں کھڑے آہستہ [illegible] باتیں کر رہے تھے۔ مقدم کہہ رہا تھا "اس کے باپ اور شنکر کے [illegible]"

بڑی دوستی تھی شنکر اور اُس کی بچپن میں بات بھی ہو گئی تھی۔ لیکن شنکر کی ماں کے مرنے کے بعد شنکر کے باپ نے ایک نیچ ذات عورت کو گھر میں ڈال لیا اسی وجہ سے گاؤں والوں نے اسے برادری سے نکال دیا۔ دونوں کے باپ مر چکے ہیں۔ دونوں میں اب بھی بڑا پریم ہے۔ اب تک دونوں چھپ چھپ کر ملتے ہیں ــــ شنکر لاکھ خوشامدیں کرتا ہے مگر بڑھیا راضی نہیں ہوتی۔"

"بس اب اس کہانی کو ختم کرو اور کوئی مطلب کی بات کرو۔" اوورسیر نے بات کاٹ کر کہا۔

"بڑھیا ہے تو بڑی لالچی" مکدم نے جواب دیا "چاندی کے دو چار سکّے اُسے موم کر سکتے ہیں مگر شنکر کی طرف سے بڑا خطرہ ہے۔"

"سنو سنو!" اوورسیر کہنے لگا "بڑھیا کو اس بات پر راضی کرو کہ وہ شانتی کو میرے ہاں گھر جھاڑنے پر نوکر رکھا دے۔"

"بات تو ٹھیک ہے مگر شنکر بڑھیا کو نہ بہکا دے۔" مکدم نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"ارے یار! تم بھی بچّوں کی سی باتیں کرتے ہو۔" اوورسیر نے مکدم کے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کہا "میں نے ایسے سینکڑوں کھیل کھیلے ہیں۔ بڑھیا کیا اور بڑھیا کی لڑکی کیا ــــ شنکر کا گاؤں میں رہنا مشکل کر دونگا۔ کھانے کھانے کے لالے پڑ جائیں گے۔ بھیک بھی نہ ملے گی!"

"کہو بھابی کیسی ہو؟" مکدم نے بڑھیا کی جھونپڑی میں داخل ہو کر پوچھا۔

"اچھی ہوں بھیّا" بڑھیا نے جواب دیا "اپنے دن گن رہی ہوں دیکھیں کب سانس ٹوٹ جائے ــــ کہو کیسے آنا ہوا۔ کیا آج کام پر نہیں گئے؟"

"بابو جی نے تمہاری خبر لانے بھیجا ہے!"

"بڑی کرپا کی بابو جی نے۔"

"ہاں انہیں تمہارا بڑا خیال ہے۔ وہ تو شانتی سے تمہارا حال سُنکر ملنے آتے لیکن پھر کام کی وجہ سے نہ آ سکے۔"

"بابو جی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ غریبوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ [illegible] کل ملنا بڑا مشکل ہے ــــ شانتی تو کام کر رہی ہے نا؟"

"[illegible] یہ کام کا پہلا دن ہے۔ تم ذرا اُس کا خیال رکھنا کہیں [illegible]"

"[illegible] کی کیا بات ہے بھیّا۔ وہ تو اچھی لڑکی ہے۔ مگر بابو جی کا [illegible]"

[illegible]

گھر جھاڑنے پر نوکر رکھنے کو تیار ہیں ــــ پانچ روپے مہینہ دینگے ــــ میرا خیال ہے تم ضرور اسکو نوکر رکھا دو۔ پانچ روپے آجکل کہاں ملتے ہیں۔ اور کام بھی کچھ زیادہ نہیں۔"

بڑھیا کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا ہرج ہے بھابی" مکدم نے جال پھیلاتے ہوئے کہا "بابو جی بڑے اچھے آدمی ہیں ہم لوگوں پر بڑے مہربان ہیں۔"

"یہ سب ٹھیک ہے بھیّا مگر ......"

"مگر کیا؟"

"میں ...... تو ...... جوان لڑکیوں کو بڑے گھروں میں نوکر رکھنا پسند نہیں کرتی ــــ بابو جی کو تو کچھ نہیں کہتی۔ مگر بڑے لوگ ہوتے بڑے خراب ہیں۔ وہ ہماری محنت کی طرح عزّت و آبرو کو بھی اپنا زرخرید غلام سمجھتے ہیں۔ میں تم کو گاؤں کی بہت سی لڑکیاں بتا سکتی ہوں جو بڑے گھروں میں خراب ہو گئیں۔"

"نہیں! نہیں!! ایسا نہ کہو بھابی" مکدم نے تیزی سے جواب دیا "بابو جی بڑے اچھے آدمی ہیں۔ وہ لوگ حیوان ہیں جو دوسروں کی بہو بیٹیوں پر بُری نظر ڈالتے ہیں۔"

مکدم نے بڑھیا کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ بڑھیا راضی ہو گئی۔

رات شنکر روٹی کھا کر بیٹھا چلم پی رہا تھا کہ موہن آیا "شنکر کچھ سنا! کل صبح سے شانتی بابو جی کے گھر کام کرنے جائے گی۔ برتن مانجھنے اور گھر جھاڑنے کے پانچ روپے مہینہ ملیں گے۔"

"سچ کہو" شنکر نے تعجب سے پوچھا۔

"میں ابھی روٹی کھا کر یہاں آ رہا تھا۔ راستہ میں شانتی کے گھر میں شور سنکر ٹھہر گیا۔ بڑھیا شانتی پر برس رہی تھی۔ شاید اُس نے منع کیا ہو گا۔"

"تو کیا وہ راضی ہو گئی؟"

"یہ میں کچھ نہیں جانتا۔ لیکن بڑھیا اس سے کہہ رہی تھی "مجھے دن بھر کی محنت کے بعد بازار کے بانس صرف پندرہ آنے ملتے ہیں اور تجھے تو پانچ روپے مہینہ ملے گا۔ آئی دولت کو لات نہیں مارتے کب تک میرے سہارے بیٹھی رہے گی، میرے تو اب ہاتھ [illegible] مجھے ذرا بھی میرا خیال ہے تو یہ نوکری ضرور کر لے۔ [illegible]"

شنکر نے چلم کا دھواں آسمان کی طرف چھوڑ کر [illegible] کہا "چاندی کے چند چمکدار ٹکڑے [illegible]"

میری خدمت

رشید سے میری گہری دوستی تھی لیکن دل ہی دل میں میں اُس سے نفرت کرتا۔ نفرت تو کیا بلکہ یوں کہیے کہ اُس کی بہت سی باتیں مجھے ناپسند تھیں اور بہت سی باتوں کے متعلق مجھے اُس سے حسد تھا۔ ہم دونوں کی طبائع اور خصائل میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور یہ محض حادثہ تھا کہ ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں ساتھ رہنے کی وجہ سے آپس میں بے تکلفی ہو گئی جو رفتہ رفتہ دوستی کیا بلکہ گہری دوستی کہی جا سکتی تھی۔

میری سرشت کے بالکل برعکس رشید نہایت لاابالی اور شوریدہ سر تھا۔ نصاب کی کتابیں جو میری زندگی کا سہارا تھیں اُن سے اس کا دم گھٹتا لیکن ان مضامین پر جن کو میں لغو اور مہمل سمجھتا، اُس نے نہ معلوم کتنی پڑھ ڈالی تھیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مطالعہ کتاب زندگی کا مطالعہ تھا۔ وہ کہتا "میں اپنی زندگی کے جام کا ایک ایک قطرہ مزا لے لیکر پیتا ہوں" اور یہ واقعہ بھی تھا۔ اُس کی زندگی عجب طور سے والہانہ دلچسپ اور رومانی تھی جس کا ہر ہر لمحہ ایک نئی جدوجہد اور کشمکش کا پیش خیمہ تھا۔ میری طرح وہ زندگی کے تیز طوفانی دھارے میں مثل تنکے کے بہا نہیں چلا جا رہا تھا بلکہ معلوم ہوتا کہ وہ اس دھارے کی خود قیادت کر رہا ہے اور اپنے ساتھ نہ معلوم کیا کچھ بہائے لئے چلا جا رہا ہے۔

یونیورسٹی اور ہوسٹل کی شاید ہی کوئی تحریک ہو جس کا کہ وہ موجِ رواں نہ ہو۔ بہت سے طالب علم تھے جو اُس کے اُصول اور اعتقادات سے متنفر تھے لیکن کون تھا جو اُس کی نڈر اور بیباک خود اعتمادی کا معترف نہ ہوتا اور اُس کی قیادت تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو مانے نہیں جاتے ہیں بلکہ خود اپنے کو منوا لیتے ہیں۔ سوسائٹی میں اُس کی قدر و منزلت کا سب سے بڑا راز یہی تھا کہ وہ جس چیز کو بہتر اور اچھا سمجھتا [illegible] کرتا اور علی الاعلان کرتا اور ہرگز پروا نہ کرتا کہ دوسرے کیا کہتے [illegible] اس عارضی سی زندگی کو بھی اگر ہم دوسروں کی [illegible] پر قربان کردیں تو ہم سے زیادہ کوئی بیوقوف نہیں۔"

ایک دن [illegible] سے شراب کی ایک بوتل لے آیا تو میں [illegible]

مولوی نے پند و نصائح کا ایک بہت بڑا لکچر دے ڈالا شاید خود اُن کا پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے تجربہ کی خاطر ان ہی مولوی کے سامنے یہ بوتل خرید لی۔"

میں نے کہا "تو کیا تم پیو گے؟"

"اور کیا تم نہ پیو گے؟"

"میں؟" اس خیال ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کہنے لگا "اگر تم سچ سچ بتا دو کہ تمہارا یہ انکار کتنے فی صدی شراب کی نفرت کی وجہ سے ہے اور کتنے فی صدی اس خوف سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے تو میں ابھی یہ بوتل اُٹھا کر باہر پھینک دوں۔"

میں نے سچ سچ بتا دیا "پانچ فی صدی اس وجہ سے کہ شراب مضر صحت ہے اور پچانوے فی صدی اس وجہ سے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے سُن نہ لے۔"

اُس نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور کہنے لگا "جس قدر شراب جسمانی صحت کے لئے مضر ہے اُس سے زیادہ ہر وقت کا یہ خوف کہ شراب پینا گناہ ہے روحانی صحت کے لئے مضر ہے۔ خیر اب تو آپ کھل گئے اب پینے میں کیا عذر ہے؟"

جب فراغت ہوئی تو میں نے کہا "بس اب آئندہ [illegible]"

کہنے لگا "تمہاری باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ واقعی [illegible] مولوی اگر اپنے پند و نصائح سے دھمکیاں نکال دیتا تو سچ کہتا تھا لیکن ان [illegible] نے تو اپنی ایسی ہیئت کذائی بنالی ہے کہ اگر سچ بات بھی کہتے ہیں تو بھی اس طرح کہ جھوٹ معلوم ہوتی ہے۔

میرے معیار سے رشید کی زندگی کا تاریک ترین پہلو [illegible] اخلاق تھا اور اس معاملہ میں وہ بدترین قسم کی آوارگی اور عیاشی [illegible] کہا جا سکتا۔ اور اس کی یہ آوارگی اور عیاشی تھی اس وجہ سے [illegible] ہلک اور خطرناک سمجھتا کیونکہ وہ یہ سب ڈنکے کی چوٹ [illegible] کر یہ اعمال پر شامت ہوتا اور کر گذرتا وہ ایک [illegible] بار ہا [illegible] لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا [illegible]

اُس کا آرٹ تھا اُس کے افسانے اور نظمیں، اور یہ واقعہ تھا کہ وہ اپنے آرٹ میں بہت زیادہ کامیاب تھا۔ اُس کے افسانے اور نظمیں اُسکے کردار کی تمام خصوصیات لئے ہوئے نہایت بیباک اور تُند خو ہوتیں۔ اس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا اور اُس کی انفرادیت کی پوری شان سے اُس کے ہر ہر جملہ میں گرم خون کے تیز دھارے بہتے ہوئے معلوم ہوتے۔ اس کے مطالب میں بجلیاں سی چمکتیں اور اُسکی تھوڑی سی عبارت بھی پڑھنے کے بعد شعوری یا غیر شعوری طور سے اس کی بڑائی اور عظمت کا قائل ہونا پڑتا۔

ایک روز اُس سے مَیں اُسکے ایک افسانے کی تعریف کرنے لگا۔

"کیا زورِ قلم ہے اور کیا پلاٹ ہے!"

کہنے لگا: "جس شخص کی زندگی کے قدم قدم پر نتئے نئے رومانی حادثے اور افسانے بکھرے ہوں اس کیلئے یہ کیا بڑی بات ہے"

میں نے کہا: "لیکن یہ زورِ قلم تم نے کہاں سے سیکھا!"

ایک قہقہہ کے ساتھ کہنے لگا: "جرأتِ رندانہ سے۔ اگر تم اپنی زندگی میں نڈر اور بیباک نہیں ہو تو تم اپنے ادب میں بھی نڈر اور بیباک نہیں ہو سکتے"

میں نے ایک مہمل سا سوال کیا: "اور اگر ہم ہونا چاہیں؟"

اُس نے مُنہ چڑا کر کہا: "اور اگر ایک گدھا شیر ہونا چاہے؟"

مَیں چپ رہا۔

کہنے لگا: "تمہارے افسانے اور مضامین مُردہ اور بے رُوح ہوتے ہیں۔۔۔"

میں نے کہا: "کیا میرے افسانوں میں زندگی نہیں ہوتی؟"

"اسی قدر جس قدر اس مولوی کے وعظ میں جو اپنے میں جرأت زندگی و گناہ نہ پا کر اونچے اونچے منبروں اور محرابوں پر چڑھ چڑھ کر دوسروں کو نصیحت اور فضیحت کیا کرتا ہے"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم دنیا سے بھاگ کر اور زندگی سے مُنہ چھپا کر اپنے خیالات میں پناہ لیتے ہو۔ تمہارے افسانے تمہاری زندگی نہیں ہوتے بلکہ صرف تمہاری سسکتی اور بلکتی خواہشات کا ایک ہلکا سا عکس ہوتا ہے۔ کیا تم اسی کو زندگی کہتے ہو!"

ایک روز رات کو وہ دیر تک نہ آیا۔ مَیں سمجھ گیا کہ وہ کہاں مشغول ہے۔ سویرے میں جاگا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے پوچھا: "رات کہاں تھے؟"

کہنے لگا: "آرٹ کیلئے عیاشی ضروری ہے"

میں نے کہا: "خوب!"

"آج مَیں جس ڈھنگ سے ایک عورت کا کردار لکھ رہا ہوں اگر تم چار دفعہ مر مر کر بھی زندہ ہو تو نہیں لکھ سکتے"

"کیوں؟"

"کیونکہ رات بھر وہ میری آغوش میں رہی اب مَیں اُسکو اپنی ماں سے زیادہ جانتا ہوں"

تھوڑی دیر تک وہ لکھتا رہا پھر کہنے لگا: "میں کوئی کردار نہیں لکھتا جسکو کہ مَیں خود بسر نہ کر چکا ہوں اور اسی لئے تو میرا ادب اتنا زیادہ نڈر اور بیباک ہے۔ مَیں جو کچھ لکھتا ہوں محسوس کرتا ہوں"

"ہر شخص وہی لکھتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے"

اُس نے جھلا کر کہا: "کاش کہ تم وہی لکھتے جو تم محسوس کرتے! مَیں ابھی تک تم کو اتنا احمق اور گدھا نہیں سمجھتا کہ تم کچھ محسوس ہی نہیں کر سکتے لیکن تمہاری کمزوری اور بزدلی سے اس کا تو یقین ہے کہ تم وہ لکھ نہیں سکتے"

"آپ کا بحث کرنے کا طریقہ بڑا نرالا ہے"

"کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ جاڑے کی ایک ٹھنڈی رات میں کوئی تمہارے آغوش میں ہو اور مذہب اور اخلاق تمہارے دروازے ہی پر ٹھٹھرا کریں، لیکن کیا یہ تم لکھ سکتے ہو؟"

"مَیں یہ محسوس ہی نہیں کرتا"

"تمہاری کمزوری اور بزدلی نے تمہارا احساس تک مٹا دیا" اُسنے دانت پیس کر کہا۔

"تم کمزوری اور بزدلی کس کو کہتے ہو" مجھے غصہ آگیا۔

"سماج کا خوف، ناموس کا خیال، جگ ہنسائی کا دھڑکا۔ ہاتھ پیر اور گلے میں اتنی زنجیریں پہن کر اگر کوئی شخص کہے کہ وہ آزاد ہے تو بتاؤ تمہیں اس پر غصہ آئیگا یا رحم"

"تو تمہاری آزادی کے معنی ہیں عیاشی"

"آزادی کے معنی ہیں بغاوت خواہ کوئی ایسی ہی چیز کیوں نہ ہو جسے تمہاری سماج عیاشی کہتی ہے۔ میں تو بہت سی عیاشیوں کو محض اس آزمائش کیلئے کرتا ہوں کہ کہیں سماج کی اخلاقی زنجیروں نے میرے ہاتھ پیر کو جکڑ تو نہیں دیا"

"مَیں تمہاری باتیں نہیں سمجھتا"

"تم اتنا تو سمجھتے ہو کہ تمہارے افسانے اُونگھتے اور سسکتے ہوتے اور میرے افسانے مچلتے اور تڑپتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف

یہی ہے کہ چونکہ تم اپنے کردار میں آزاد نہیں ہو معمولی سے معمولی جنبش پر بھی تمہاری نظریں سماج کے ماتھے پر رہتی ہیں کہ کہیں اس پر تو کوئی شکن نہیں، اسی لئے تم اپنی گفتار میں بھی مضمحل اور مجہول ہو برخلاف اسکے ——"

"میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنے کردار میں کچھ بھی نہیں ہوتے لیکن وہ اپنی گفتار میں طوفان اور زلزلہ اُٹھا دیتے ہیں۔"

ایک قہقہے کے ساتھ اُس نے کہا "جب کوئی کمزور آدمی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ اپنی کمزوری کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے —— !"

اُس کی اُلٹی پلٹی بحث سے میں مرعوب تو ہو جاتا لیکن میرا عقیدہ تھا کہ رشید ایک آوارہ اور عیاش انسان ہے اور وہ سوائے چند گرم گرم افسانوں اور نظموں کے لکھنے کے دُنیا کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔

چند مہینے بعد مزدوروں کے ایک جلوس پر پولس نے گولی چلائی۔ یہ حادثہ ہماری یونیورسٹی کے سامنے ہی ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس جلوس کی قیادت رشید ہی کر رہا تھا، لیکن میں اس کی کوئی خبر لئے بغیر جلدی سے اپنے کمرے میں بھاگا۔ میں فوراً دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر لیٹ گیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سوچنے لگا کہ اگر کل رشید کے کسی معاملے کے متعلق وارڈن نے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں کہہ دونگا کہ جس وقت یہ حادثہ ہوا میں سو رہا تھا —— میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وجاہت سندیلوی

سر اقبال کا پیام

اور

حضرت رسا ہمدانی کا ترانہ

نوٹ :- میں نے دوشنبہ کی شب کو خواب میں دیکھا کہ سر اقبال آئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ "میرا پیغام رسا ہمدانی کے ترانے میں جو میرے قومی ترانے کے ردیف و قافیوں میں لکھا گیا ہے، دیکھو اور عمل کرو" آنکھ جو کھلی تو ایک لفافہ میرے سرہانے رکھا تھا اور اُس میں حضرت رسا ہمدانی کا مندرجہ ذیل ترانہ جسے میں ناظرین ساقی کی ضیافتِ طبع کے لئے ارسال کرتی ہوں ملفوف تھا۔ اسے میری بہن راشدہ خاتون نے مجھے ڈاک سے بھیجا تھا۔ میں نے اِس ترانے کو بارہا پڑھا اور اس سے ایک خاص قسم کا سرور میرے دل کو حاصل ہوا۔

"بلقیس زمانی"

ہاں ہم یہ کہہ رہے ہیں ہندوستاں ہمارا ہندوستان کیا ہے سارا جہاں ہمارا
سب جانتے ہیں جو کچھ گزرا تھا کربلا میں مٹنے سے اور اُبھرا نام و نشاں ہمارا
کی ہے پیمبروں نے کعبہ کی پاسبانی محبوب ہے خُدا کا اب پاسباں ہمارا
ہر ماہ پہلی شب کو آنکھیں اُٹھا کے دیکھو سینے پہ آسماں کے قومی نشاں ہمارا
سارے جہاں میں بجتیں ہیں نوبتیں ہماری پہونچا کہاں نہیں ہے تختِ رواں ہمارا
توران و شام و یثرب بغداد و کربلا میں اعدا تو کر چکے ہیں خُوب امتحاں ہمارا
صیاد فکر میں ہے لیکن ڈرینگے کیوں ہم حدِ نظر سے اُونچا ہے آشیاں ہمارا
تاریخ دہر کو تم اعدا سے لے کے دیکھو ہر اک ورق ہے اُن کا افسانہ خواں ہمارا
رفتارِ برق اس کی رفتار سے تو کم ہے جاتا ہے تیز کتنا یہ کارواں ہمارا
دونوں جہاں میں کیونکر ہوگا نہ اپنا قبضہ محبوب ہے خدا کا آرام جاں ہمارا
منکر رسا تھا نہ ہر اک یہ کہہ رہا ہے پہونچیگا تا بہ منزل اب کارواں ہمارا

ریڈیو پر ہندوستانی دل کی دھڑکن

ساقی کی گذشتہ اشاعت میں شاہد صاحب نے ریڈیو کے پروگراموں پر ہر ہر عنوان سے بہت دلچسپ بحث کی تھی۔ جسے ریڈیو سننے والوں میں سے معقول پسند طبقہ نے بے حد پسند کیا۔ ریڈیو مفادِ عامّہ کے لئے بنایا گیا ہے اور اسے ہر روز ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بوڑھے، بچّوں، مرد اور عورتوں کو سننے کا اتفاق ہوتا ہے۔ گویا جس طرح کسی عام شاہراہ کی صفائی اور عمدگی کے لئے ہر شہری اربابِ بلدیہ کے کانوں تک اپنی شکائتیں پہونچاکر جائز طور پر اُن کے انسداد کی توقع رکھ سکتا ہے، بالکل اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ شدّ و مد کے ساتھ ہر ریڈیو سننے والے کو حق ہے کہ پروگراموں کی اصلاح اور بہتری کی طرف محکمہ کو توجہ دلائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آجکل ہر چیز کو یا تو فرقہ وارانہ رنگ دیکر ہندو مسلم سوال بنالیا جاتا ہے یا پھر ذاتیات کو بیچ میں لاکر اصلاح پسند طبقہ کی آواز کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ریڈیو کے محکمہ اور اُس کے لائحہ عمل پر بحث کرتے ہوئے شخصیتوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ کیونکہ ریڈیو کا محکمہ صرف چند بجلی کے آلات یا خاص قسم کے کمروں پر مشتمل نہیں ہے۔ بلکہ ریڈیو عبارت ہے چند اصحاب کی جماعت سے جو اُس کے نگہبان اور محافظ سمجھے جاتے ہیں۔ اب اگر اس محکمہ میں کسی خاص قسم کی خرابی یا کوئی اور لغزش پائی جائے تو لاکھوں ریڈیو سننے والے بصرف بجلی کی مشینوں یا خالی کمروں سے دست و گریباں نہیں ہو سکتے۔ بلکہ بجا طور پر اس بات کے متوقع ہیں کہ کوئی ذمّہ دار شخصیت اُن کی شکایتوں کو سُنے اور دُور کرنے کی کوشش کرے۔ اور اگر بار بار کہنے سُننے پر بھی وہ شکایتیں دُور نہ ہوں تو پھر سننے والے اس نتیجہ پر پہونچنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ ریڈیو کے کارکن بھی اُس کی مشینوں کی طرح گُم سُم اور بے جان ہیں۔

چنانچہ ہندوستان کے اکثر مؤقر رسالوں اور ذمہ دار حضرات نے بیشک متعدد بار اس محکمہ میں اصلاح کی غرض سے کوشش کی ہے لیکن اس کا اثر بالکل نہیں ہوا۔ بلکہ ہر شکایت کو صرف یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اسکی تہہ میں ذاتی مقاصد پنہاں ہیں" اور لوگ صرف اتنی سی بات پر چراغ پا ہیں کہ اس محکمہ میں بمبئی سے لیکر کلکتہ تک اور مدراس سے لیکر پشاور تک ایک ہی خاندان کے افراد یا احباب جمع نظر آتے ہیں۔

اپنے احباب یا عزیزوں کو فائدہ پہونچانا کوئی ایسا مذموم فعل نہیں ہے۔ کیونکہ دُنیا میں چراغ سے چراغ جلتا ہی آیا ہے۔ اور چشمہ سے سب سے پہلے اُس کے آس پاس کی زمین ہی سیراب ہوتی ہے۔ لیکن پبلک کے روپے سے کوئی خاندان عیاشی نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں مجھے الزام کی نوعیت یا اعداد و شمار بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے دہلی کے ہفتہ وار اخبار ریاست نے کھلے لفظوں میں چیلنج کے طور پر اُن جرائم اور الزامات کی ایک طویل فہرست شائع کی ہے۔ جو ریڈیو سننے والوں اور لائسنس کی رقم ادا کرنے والوں میں کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ اگر ریڈیو کے محکمہ میں صداقت اور سچائی کا ذرا سا شائبہ بھی ہوتا تو اب تک کئی بار ایسے موقع مل چکے ہیں کہ پبلک کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کر دیتا۔ لیکن [illegible] خاموشی کے بعد جب اخباروں اور ریڈیو کے پروگرام کے رسالوں میں بہت نمایاں طور پر یہ اعلان ہوا کہ ریڈیو کے ڈپٹی کنٹرولر سید احمد شاہ بخاری "براڈکاسٹر ہونا کیا معنی رکھتا ہے" کے عنوان پر ایک تقریر براڈکاسٹ کریں گے تو بجا طور پر سب سُننے والے اِس تقریر کے لئے ہمہ تن گوش بن گئے۔ کیونکہ پطرس کے قلمی نام سے ڈپٹی کنٹرولر صاحب تقریباً دو سو صفحوں کی ایک دلچسپ کتاب کے مصنّف اور پنجاب کے مشہور نقاد اور ایکٹر کی حیثیت سے کافی شہرت پیدا کر چکے ہیں۔ رہی سہی کسر بخاری صاحب کے اُس ہٹلرانہ اقتدار نے پوری کر دی جس کی دھوم مدراس سے لیکر پشاور وغیرہ وغیرہ۔

ریڈیو کی بے ہنگام موسیقی سے تنگ آکر صرف تقریروں کے ہی پندرہ منٹ ایسے ہیں کہ جن میں کوئی معقول اور شریف انسان پناہ لے سکتا ہے۔ اور پھر تقریر بھی کس کی جو ریڈیو کی کشتی کا ناخدا اور خداوندِ مجازی ہے۔ اس تقریر کی "سخن فہم" نے جو لطیف داد دی ہے وہ بجائے خود بہت دلچسپ ہے۔ لیکن ساقی پڑھنے والوں کی معرفت مَیں ریڈیو سننے والوں کی خدمت میں ریڈیو کی عام تقریروں کے متعلق چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ بخاری صاحب نے اپنی تقریر کے آخر میں یہ لفظ کہے تھے۔

"وہ کیا ترکیب ہے جس سے اس مشین میں جو سمندر پار سے یہاں آئی ہے اور جو ریڈیو کہلاتی ہے ہندوستانی دل کی سی دھڑکن پیدا ہو جائے"

اگر اس دھڑکن کا مطلب اختلاجِ قلب نہیں ہے، جو عموماً ریڈیو

ن الشیاطین، سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ

کے کانوں سے سننے والوں کو پیدا ہوتا رہتا ہے۔ تو پھر ہم یہ ماننے ہیں بالکل حق بجانب ہیں کہ اب تک سوائے اپنے احباب اور اقربا کو ملازمتیں دلواتے کے اس محکمہ نے ہندوستانی دل کی نئی دھڑکن پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ بلکہ عموماً غلط ملط، کورذوق مزاحیہ تقریریں اور بے معنی بات چیت سے سننے والوں کو عاجز کیا ہے۔ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ ریڈیو کے اولین دور میں ڈاکٹر انصاری مرحوم۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ خواجہ غلام السیدین۔ مسٹر آصف علی۔ پروفیسر محمد مجیب۔ منشی پریم چند۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ پنڈت لکشمی دھر شاستری، مسٹر سری پرکاش ایم۔ ایل۔ اے، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور خواجہ حسن نظامی کی دلچسپ تقریریں اکثر سننے میں آتی تھیں۔ کہ جنہیں سننے کے بعد بھی کانوں کو تا دیر مزا ملتا رہتا تھا۔ لیکن اب وہ لکیر اسقدر پرانی ہوگئی ہے کہ اس میں کوئی ندرت اور دلچسپی باقی ہی نہیں رہی اِن حضرات میں یا تو بہت سے بولنے والے محکمہ کی بے راہ روی سے تنگ آکر کنارہ کش ہوگئے ہیں، یا بار ہا بلواتے بلواتے انہیں فرسودگی کی حد تک پہونچا دیا ہے۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ملک میں اس قدر ادبی رسالے اور مجلے شائع ہوتے ہیں۔ ان میں نئی نئی قسم کے مضامین اور دلچسپ تحریریں تو بآسانی مل جاتی ہیں اور ریڈیو میں اس قدر روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی اچھی تقریریں مشکل سے میسر آتی ہیں۔ اس کی وجہ ڈھونڈتے تو بآسانی مل سکتی ہے۔ ایک تو اس محکمہ کا یہ نرالا رنگ ہے کہ خواہ کوئی شخص تقریروں کے ڈھب کا ہو یا گانے کے مطلب کا، ہر پروگرام اسسٹنٹ کو جہاں جی چاہے لگا دیا جاتا ہے۔ ساقی ہی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایک صاحب جنہیں گانے سے دور کا بھی واسطہ نہیں صرف اس لئے موسیقی کے پروگرام اسسٹنٹ ہیں کہ اُن کے عزیزوں اور برادری والوں میں سے بہت سی لڑکیاں شوقیہ طور پر گانے کے لئے اکثر آتی رہتی ہیں۔ اور انکے بڑے بھائی جو اس محکمہ سے بالکل غیر متعلق ہیں، اکثر آ آ کر ان کی امداد کرتے ہیں۔ پھر تعلیمی براڈکاسٹ کے نگراں وہ صاحب ہیں جو انگلستان میں شکر سازی کی صنعت سیکھنے گئے تھے۔ غالباً بی۔ بی۔ سی کے اسٹوڈیو بھی دیکھنے گئے ہوں گے۔ نہ انہیں تعلیم کے موجودہ رجحانات سے واسطہ ہے اور نہ فی زمانہ دُنیا کے دوسرے ملکوں میں تعلیم کے سلسلہ میں کیا کیا ترقی ہو رہی ہے نہ انہیں ہندوستان کی زبانوں سے کچھ دلچسپی ہے کہ آئندہ چلکر ہندوستان کی تعلیم کا ذریعہ ملکی زبانیں ہونے والی ہیں۔ ان کا کام تو صرف پروگرام تیار کرنا اور ایک پمفلٹ چھاپ دینا ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ ملک میں کس کس مضمون پر کون کون بول سکتا ہے اور انہیں کس طرح ڈھونڈنا چاہیئے۔ تقریباً یہی حال ہندوستانی تقریروں کے انچارج کا ہے۔ اسکول اور کالج کی زندگی میں غالباً انہیں کبھی ہندوستانی زبانوں سے تعلق کی تکلیف گوارا نہیں کرنی پڑی۔ اور بعد میں بھی شاید ہی ایسا اتفاق ہوا ہو کہ ہندوستان کے ادب کے متعلق انہوں نے کبھی اپنے لمحاتِ فرصت میں سوچا ہو۔ ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ ان کا اپنا تلفظ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ لاہور سے ابھی چند دن ہوئے ایک بہت بڑے ادیب غالباً اپنے ڈرامہ میں خود پارٹ کرتے ہوئے یہ فرما رہے تھے۔ "آگ دھڑ دھڑ (بحر کے وزن پر) چل رہی ہے!" تو پھر ان غریب کا تو کہنا ہی کیا۔ لیکن حیرت تو جب ہوتی ہے کہ اِن کے ہاتھوں اچھے خاصے ادیبوں کی زبان بگڑ جاتی ہے۔ میں محکمہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ دہلی خاص ہندوستانی زبان کا اسٹیشن ہے۔ اس کے ڈائرکٹر مسٹر اڈوانی سندھی ہیں۔ جو بمشکل اُردو بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے نئے اسسٹنٹ ڈائرکٹر سردر نیازی صاحب ہیں۔ جو ایک صفحہ صحیح اُردو کا لکھ نہیں سکتے اور نہ بول سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف گانے والے ہیں۔ اور ادب سے انہیں دُور کا بھی لگاؤ نہیں۔ پروگرام ڈائرکٹر مسٹر افتخار اللہ نے خود کبھی اپنی علمیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ کیونکہ ان کی دلچسپی زیادہ تر ڈرامہ براڈکاسٹ کرنے سے ہے۔ رہے تقریروں کے پروگرام اسسٹنٹ ان کے مبلغ علم کا حال بیان ہی کیا جا چکا ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ دہلی جیسے مرکزی مقام پر یہ قحط الرجال ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ اگر کوئی ماہرِ فن اور اہلِ درد جا کر اس کی مرثیہ خوانی ڈپٹی کنٹرولر صاحب کی بارگاہ میں کرتا ہے تو فرماتے ہیں اچھا آپ ہی کوئی قابل آدمی لا دیجئے۔ اب تک ایک آدھ نہیں متعدد قابل نوجوان ریڈیو میں کام کر چکے ہیں کہ جو اپنے کام سے خوب واقف تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ اور دُور کیوں جائیے مارچ کے پہلے ہفتے میں سُنا جاتا ہے کہ پھر امیدواروں کو طلب کیا گیا ہے۔ دیکھئے اب اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے ہندوستان کے ہزاروں نوجوانوں میں سے بھی کوئی اس کام کے قابل نکلتا ہے یا پھر قرعہ صرف اُسی خاندان کے نام پر پڑتا ہے جو قابلیت اور حسن عمل کے سوا صرف ریڈیو ہی کے لئے تخلیق ہوا ہے۔ اور غالباً ایسے ہی لوگ بقول بخاری (پطرس) صاحب ریڈیو کو اس قابل بنا سکتے ہیں۔

"کہ جب ساٹھ ہزار یا لاکھ دس لاکھ یا دس کروڑ گھروں کے اندر ریڈیو کے لاؤڈ اسپیکر یک آواز ہوکر بولیں تو آپکا کان پہچانے اور دل گواہی دے کہ یہ ہندوستان کی آواز ہے۔ جو تہذیب فن اس مشین کے ذریعہ سے کانوں کے رستے دلوں میں سرایت کرے وہ ہندوستان کی بہترین تہذیب اور ہندوستان کا بہترین فن ہو۔ جس سے دلوں میں اُمنگیں پیدا ہوں اور دماغ

ساقی بک ڈپو دہلی کی دلکش کتابیں

کتاب	تفصیل	قیمت
جانم	ویوراتی جھانی کی پُرلطف نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلد سنہری ٹھپہ	[illegible]
کولتار	تھی تو بچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام "کولتار صاحب" رکھدیا۔ پھر کیسے کیسے واقعات پیش آئے ہیں کہ	[illegible]
ڈیمپائر	زانی مرد خونخوار درندے کی طرح ایک بیکس عصمت مآب خاتون پر جھپٹتا ہے۔ اُس کی زندگی برباد کرتا ہے مگر۔۔۔	[illegible]
شریر بیوی	اس قدر شریر عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی۔ کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہے اِس شریر بیوی نے!	[illegible]
روحِ ظرافت	"انگوٹھی کی مصیبت" اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے۔ جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔	[illegible]
کمزوری	عورت کی کمزور فطرت سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اُس کی زندگی خراب کر دی	[illegible]
روحِ لطافت	"مہارانی کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا حیرتناک افسانہ آپ نے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیانک مگر دلکش	[illegible]
جنت کا بھوت	بی جنت شرارت کی پُتلی تھیں۔ بھوت صاحب کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ۔۔۔	۱۲ر
دیکھا جائیگا	ایک لڑکی پر تین مرد عاشق ہوگئے تو "دیکھا جائیگا صاحب" کچھ فیصلہ ہی نہ کر سکے بالآخر یہ طے پایا کہ۔۔۔	[illegible]
ملفوظاتِ شامی	کتے، مرغے، مُرغیاں اور گھریلو جانور انسانی زبان بولنے لگے۔ کیسی عجیب عجیب باتیں کی ہیں انہوں نے!	۱۲ر
تفویض	بی ملے پاس لڑکی کی شادی مسجد کے ملا سے ہوگئی۔ بس یہ سمجھئے کہ زمین آسمان ایک ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ	۵ر
قرض	محبت کو کاٹنے والی قینچی کا نام قرض ہے۔ آپنے بہت کہانیاں پڑھی ہونگی مگر ذرا اس کو بھی پڑھکر دیکھئے۔	۵ر
فرزندِ سرحد	سرحد کے باشندے عزت کی خاطر موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ انہی غیرتمند لوگوں میں سے چند کا ذکر ہے کہ۔۔۔	۵ر
قدروان	سرزمین ریف کے ایک بہوتی اور اُس کے خطرناک سالوں نے وہ وہ حرکتیں کی ہیں کہ بس حیرت ہے۔	۵ر
خطوط کی ستم ظریفی	یہ خط بھی کیسا ستم ڈھاتے ہیں خصوصاً خط و کتابت ایک شریر لڑکی اور جوان مرد کی ہو۔	۱۲ر
مرزا جی	لکھنؤ کے بانکے مرزا جی بھی واللہ عجیب چیز تھے۔ بٹیریں لیکر انگریزوں سے لڑنے چلے واللہ	۶ر
چپکی	عورت کی فطرت! جان جائے پر آن نہ جائے۔ غیرت اور شرافت کی منہ بولتی تصویر "چپکی" میں دیکھئے۔	[illegible]
تائیس	سرزمینِ مصر کی عروس بازاری نظر بھر کے دیکھنے سے جس کا حسن میلا ہوتا تھا اس کی عبرتناک داستان	[illegible]
ہیرودیاس	سلومی کا ناچ موت کا ناچ تھا۔ اُس نے پیغمبر یوحنا کا سر انعام میں مانگا اور اُس کے مُردہ لبوں کو چوما	۱۲ر
چنگیز خاں کے سوانح حیات	خدا کا قہر چنگیز خاں کی صورت میں نازل ہوا۔ اِس قہر اللہ کے حالاتِ زندگی	۱۲ر
فاؤسٹ	شاعر کی مصوری اور مصور کی شاعری کی شہرۂ آفاق کہانی۔ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرایہ میں پیش کی گئی ہے	[illegible]
عروسِ ادب	دل میں کھُب جانے والے افسانوں کا مجموعہ۔ تین سو صفحے کا مجموعہ۔ زبان نہایت صاف۔	[illegible]
جوشِ فکر	سلطان حیدر جوش کے نادر ترین افسانوں کا مجموعہ۔ زبان کی چاشنی اور خیالات کی بلندی۔	[illegible]
گناہ کی راتیں	عورت گناہ کرنے پر کس طرح مجبور ہو جاتی ہے؟ فطرتِ انسانی کے چند عبرتناک مرقعے۔ مجلد	[illegible]
پردۂ [illegible]	ہمشیرہ مشرف حسین کے لکھے ہوئے چند مؤثر اور دلکش مضامین۔ تخیلاتِ لطیف کا مجموعہ	۲ر
ادبِ لطیف	حجاب امتیاز علی کے مختصر مضامین جن میں نفسیاتی تحلیل کے بیشمار نمونے پیش کئے گئے ہیں	۸ر
[illegible] کا دوسرا رخ	غدر میں ہندوستان پر جو جو ظلم ہوئے ہیں اُن کی تفصیل آپکو صرف اسی کتاب میں ملے گی۔	[illegible]

ساقی بکڈپو۔ کھاری باولی۔ دہلی۔

الشہ اطلس۔ سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ۔ [illegible] افسانے اردو [illegible]

ساقی
دہلی

قیمت ایک روپیہ

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ ۸/

جرعات

ممالکِ غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت
بھیجا جاتا ہے

جلد ۲۰ — ساقی دہلی۔ بابت اگست ۱۹۳۹ء — نمبر ۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ناظرین ساقی میں یہ خبر بہت خوشی سے سُنی جائیگی کہ پروفیسر نورالحسن برلاس اور اُنکی اہلیہ سات سال بعد جاپان سے اپنے وطن دلّی اگست کے پہلے ہفتے میں آ رہے ہیں۔ برلاس صاحب ٹوکیو کے مدرسۃ السنۂ غیر میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ موصوف نے نہ صرف تعلیمی خدمات بدرجۂ احسن انجام دیں بلکہ ہندوستانیوں کا وقار جاپانیوں کی نظروں میں بڑھانے میں ہمیشہ ساعی رہے۔ مبلغ اسلام کی حیثیت سے بھی اُن کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ غرض اُن کے کارہائے نمایاں کی وجہ سے حکومت جاپان نے بھی انہیں انتہائی نوازشات سے سرفراز فرمایا۔ پروفیسر برلاس پہلے ہندوستانی ہیں جنہیں دعوتِ شاہی میں مدعو کیا گیا اور اس طرح حکومت جاپان نے انتہائی عزت و تکریم کا ثبوت دیا۔ پروفیسر برلاس کی بدولت سینکڑوں جاپانی اُردو پڑھ لکھ رہے ہیں۔ ان کے شاگرد اور اسسٹنٹ پروفیسر آر۔ گامو۔ کے مضامین ساقی اور ادبی دُنیا میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو کے کئی ڈرامے پروفیسر اور مسز برلاس کے اہتمام سے جاپانی طلباء نے اسٹیج کئے اور بہت پسند کئے گئے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق جو غلط خیالات جاپانیوں کے ذہن نشیں تھے انہیں دُور کرنے کیلئے برلاس صاحب نے دامے، درمے، قدمے کوشش کی اور کامیاب بھی ہوئے۔ جاپانی معاشرت کے متعلق نہایت بصیرت افروز مضامین ساقی میں لکھتے رہے اور ایک ۲۶۰ صفحے کا "جاپان نمبر" بھی مرتب کیا جو اُردو صحافت میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔

مسز برلاس صحیح معنوں میں پروفیسر برلاس کی شریک حیات ثابت ہوئیں۔ ان کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی رہیں اور تمام سماجی کارگزاریوں میں شریک رہیں۔ مضمون نگاری کا شوق انہیں جاپان جانے سے پہلے بھی تھا مگر جاپان پہونچکر انہوں نے جاپان کے متعلق بہت اچھے اچھے مضمون لکھے جن میں سے چند ساقی میں اور بیشتر "عصمت" اور "تہذیبِ نسواں" میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ سات سال کی طویل جدائی کے بعد پروفیسر اور مسز برلاس واپس آ رہے ہیں، اور وہ بھی صرف چھ مہینے کیلئے۔ اِس مختصر عرصے میں اُمید ہے کہ جاپان کے متعلق تحریر اور تقریر دونوں کے ذریعے جدید ترین معلومات پیش کر سکیں گے۔

پروفیسر برلاس نے آرائشِ گل کا فن بطورِ خاص جاپان میں سیکھا ہے اور ایکنوبو کے ایک مستند ادارے سے ماہرِ فن کی سند بھی حاصل کی ہے۔ دورانِ قیام دہلی میں اِس فن سے ہندوستانیوں کو آگاہ کرنے کا ارادہ ہے۔ اسکے علاوہ جاپان کی اور صنعتوں کے متعلق بھی وافر معلومات برلاس صاحب سے حاصل کی جا سکے گی۔ جو حضرات خط و کتابت کرنا چاہیں ساقی کے پتہ سے خط بھیج سکتے ہیں۔

شاہد

شاہ واجد علی شاہ بہادرؔ اختر آخری تاجدارِ اودھ کی

علمی خدمات

آج سے بہت پہلے جس طرح شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی کے چند شاگردوں اور عقیدت مندوں نے بہادر شاہ ظفرؔ کے کمالِ فن پہ پردہ ڈالکر مشہور کیا کہ ظفرؔ کے تمام دیوان اُستاد ذوقؔ کی دماغی کُلفتوں اور ذہنی کاوشوں کے ثمرات ہیں، مگر نکتہ رس طبائع اور اصحابِ ذوق نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ ہرچند شاگرد اُستاد کے رنگِ شعری سے متاثر ہے لیکن طرزِ شعر گوئی اور اندازِ بیان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ اور دو مختلف راستوں کے چلنے والے اپنی اپنی منزل کی سمت رواں و دواں ہیں۔ اسی طرح اب حضرت سلطانِ عالم واجد علی شاہ بہادر کے علمی اور ادبی کارناموں پر چند ذمہ دار ہستیوں کی طرف سے خاک ڈالنے کی بے سود سعی کی جارہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت موصوف میں عالمانہ لیاقت اور ادبی صلاحیت ہی نہ تھی اور اُن کی تمام تصنیفات و تالیفات چند دیگر ہستیوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اسی خیال سے متاثر ہوکر میں نے یہ مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

شاہ واجد علی شاہ بہادر کی ولادت ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۲۲ء میں بمقام لکھنؤ ہوئی، ظاہری حُسن و جمال، شان و شوکت کے ساتھ ساتھ خدا نے باطنی اوصاف سے بھی آپ کو سنوارا تھا۔ بارگاہِ صمدیت سے دل و دماغ کی خاص قوتیں عطا ہوئی تھیں۔ طبیعت کی روانی اور ذہن کی رسائی دیکھکر اُستادانِ فاضل و اتالیقانِ کامل انگشت بدنداں رہ گئے۔ سالوں کے درس مہینوں میں اور مہینوں کے سبق دنوں میں ختم ہونے لگے۔ تھوڑی ہی مدت میں تمام علوم مروجہ سے فارغ التحصیل ہوکر جہانبانی اور کشورکشائی کے فنون سیکھنے میں مصروف ہوے اور اس میدان میں بھی گوے سبقت لے گئے۔ صورت و سیرت سے آراستہ و مجلیٰ ہوکر اول بخطاب ناظم الدولہ محمد واجد علی خاں بہادر بعد ازاں بہ لقب خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی بہادر مفتخر و سرفراز ہوے۔ علیا جناب نواب بادشاہ محل صاحبہ بنت نواب علی خاں بہادر شریکِ زندگی ہوئیں۔ ابھی شباب کی پہلی ہی منزل میں قدم رکھا تھا کہ سلطنتِ اودھ کی مسندِ ولیعہدی پر جلوہ فرما ہوکر ابو المنصور سکندر جاہ سلیمان حشم صاحبِ عالم ولیعہد مرزا واجد علی شاہ بہادر کہلائے۔ ہر دلعزیزی کا یہ عالم بخت و اقبال کی یاوری اور لطف و کرم کی مدد سے تمام رعایا برایا اور اعیان و ارکینِ سلطنت کے دلوں کو دیکھتے دیکھتے مسخر کرلیا جاہ و مرتبہ کے دعا گویوں کا وہ ہجوم ہوا کہ گردوپیش کے گوشِ سماعت گرپڑ گئے۔ آخر مہرِ حشمت و جلال طلوع ہوکر اوجِ کمال پر پہونچا اور ۲۶ صفر المظفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو پچیس سال کی عمر میں رونق افروزِ تخت جہانبانی ہوے۔

ع

شہِ عدل پرور سلیماں حشم	فزوں رتبہ تخت شاہی نمود
زملک و ملک ایں صدا شد بلند	ملک رونق تاج شاہی فزود

قطعہ تاریخ جلوس ہے مرزا محمد عسکری صاحب مترجم ہسٹری آف اردو لٹریچر مصنفہ جناب رام بابو صاحب سکسینہ ایم اے نے مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج، کے اعداد ۱۲۶۳ھ کو سن جلوس قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ مصرع کے تحت میں آپ بھی ۱۲۶۳ھ ہی تحریر فرماتے ہیں۔ شاہی تخت و تاج سنبھالنے پر ابو المنصور ناصر الدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ کے لقب سے ملقب

ہوئے اور اپنے نام کے سکے جاری کئے ؎

سکہ زد بر سیم و زر از فضل و تائید الہ ظلِ حق واجد علی سلطانِ عالم بادشاہ

مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہوئیں، اطاعت و خلوص کی نذریں گزریں اور داد و دہش کی خوب خوب بارشیں ہوئیں۔ ہر خاص و عام اور اعلیٰ و ادنیٰ اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ بمشغلۂ سلطانی، سے عدل نوشیرواں کا نقشہ کھینچکر مظلوموں کی فریاد رسی کی گئی۔ بانکوں ترچھوں کے رسالوں اور حیدری، واختری، پلٹنوں سے رستم و اسفندیار کا دبدبہ دکھا کر ملک میں مزید امن و امان قائم کیا گیا اور ہر طرف کامرانی و خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔

کارگزارانِ دولت اور مشیرانِ سلطنت پر بادشاہ کا اعتماد بڑھا تو اُمورِ شاہی سے طبیعت سیر ہونے لگی۔ بدخواہانِ ملک و ملت اور ناحق شناسانِ جاہ و ثروت نے رہا سہا بادشاہ کے مزاج میں اور تغیر پیدا کر دیا۔ عنانِ سلطنت اپنے خسر اور سمدھی نواب علی خاں وزیر اعظم کے ہاتھوں میں دیکر حضور عالم کے خطاب سے سرفراز کیا اور خود کو بجائے سلطانِ عالم کے جانِ عالم کہلوانے لگے۔ قیصر باغ کی بنیاد پڑی۔ محل اور بارہ دری کی تعمیر شروع ہوئی۔ دو کروڑ کی لاگت سے راجہ اندر کا اکھاڑہ تیار ہوا، چاروں طرف جنت کی حوریں اور پرستان کی پریاں ہوا میں اڑتی نظر آئیں۔ ہر سمت عیش و نشاط کی ایک لہر دوڑ گئی اور جا بجا رقص و سرود کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ادنیٰ اہلکار سے لیکر اعلیٰ افسر تک سبھی ان رنگ رلیوں میں پڑے ہوئے تھے اور دادِ عیش پرستی دے رہے تھے۔ ملک میں فتنہ و فساد کا غلبہ اور بدنظمیوں کا زور ہوا، انجام کار انگریزی حکومت کی طرف سے ۱۳ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاعِ سلطنت کا حکم سنایا گیا اور ریاست دہ سالہ سے دستبردار ہو کر حضرت سلطانِ عالم مع چند اعزا و رفقا بصد حسرت و یاس یہ شعر کہتے ہوئے کلکتہ کو سدھارے ؎

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

صاحبِ وزیر نامہ اپنے درد نہانی کا یوں اظہار فرماتے ہیں ؎

دوراں کہ بصد طلسم سازیست در پردۂ او ہزار بازیست

از پردۂ ایں طلسم خانہ صد رنگ برآورد زمانہ

ایں بادۂ روزگار دارد یک مستی و صد خمار دارد

حضرت سلطانِ عالم کانپور، الہ آباد اور بنارس ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے تو شاہی مہمان کے اعزاز میں قلعہ فورٹ ولیم سے اکیس توپیں سر کی گئیں اور شاہانہ استقبال کیا گیا مگر مصالح ملکی کی بنا پر دو سال قلعہ میں نظر بند رکھا گیا۔ بعد ازاں مٹیا برج کے محلہ میں قیام ہوا اور دو کرور سالانہ آمدنی کے ملک سے پندرہ لاکھ روپے سالانہ گزارے کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ بادشاہ کے آئینۂ شوق نے سواد مٹیا برج کی جلا کرکے چند دنوں میں خطۂ گلزار ارم بنا دیا اور قیصر باغ کی بارہ دری کا سماں آنکھوں کو نظر آنے لگا۔ آخر بمصداق کل نفسٍ ذائقۃ الموت، ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء مطابق ۳ محرم الحرام ۱۳۰۵ھ کو اس جہان فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر کیا اور اندرون حلقۂ مٹیا برج مدفون ہوئے جو آپ ہی کا ساختہ اور تعمیر کردہ ہے۔

سیاستِ مدن

حضرت سلطانِ عالم سیاستِ مدن میں کامل دستگاہ اور قابلیت رکھتے تھے۔ چونکہ طبیعت فطرتاً جدت پسند واقع ہوئی تھی اس لئے

آپ کی خداداد قوتِ اختراع و ایجادات طریقِ حکمرانی میں بھی دخیل رہتی تھی اور ایسے ایسے پسندیدہ قانون وضع کیا کرتی تھی جو رعایا کی ناموس اور جان و مال کے ہر طرح ضامن ہوتے تھے اور دستورات کے نام سے مشہور تھے۔ یہاں تمثیلاً چند دستورات کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے آپ کی سیاستدانی اور ملک گیری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اوّل یہ کہ رشوت کا لینا دینا دونوں جرم ہیں اور شریعت کی رو سے مرتشی و راشی موردِ قہرِ ربانی اور مستوجب عذاب سلطانی ہیں۔ دوم یہ کہ خودکشی کرکے حرام موت مرنے والے اشخاص، نوزائیدہ لڑکیوں کو ہلاک کرنے والے راجپوت اور ستی ہونے والی ہندو عورتیں سخت سے سخت سزا کی مجرم ہیں اور جو لوگ عورتوں کے ستی ہونے میں بجائے مزاحمت کے معاونت کرینگے وہ حکومت کی نظر میں قاتل ٹھہریں گے۔ سوم یہ کہ جو بخارے قرب و جوار سے غلہ لاکر ارزاں فروشی کی کوشش کریں گے وہ شاہانہ انعام و اکرام کے سزاوار ہوں گے۔ چہارم یہ کہ باغات و مکانات کے مالکوں کو چاہیئے کہ اپنی ملکیت کو آباد رکھیں تاکہ ان میں بدمعاش و بدقماش پناہ گزیں ہو کر رات میں رہزنی و نقب زنی کی واردات نہ کرسکیں اور بغیر سمجھے بوجھے او ضمانت لئے ہوئے کسی کو باغ یا مکان کرایہ پر نہ دیں اگر ان میں چور اور ڈاکوؤں کا مسکن پایا جائیگا تو ان کے ساتھ مالکانِ مکان سے بھی سخت بازپرس ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ وزیر السلطان نواب سید امیر علی خاں امیرؔ صاحب "وزیر نامہ" فرماتے ہیں ؎

بنامی زد چہ آئین بہین است　　کزیں منشور حکم عقل و دین است
دماغ افروز ہر شاہ و وزیر است　　ادب آموز ہر برنا و پیر است
کمال خوبیش مستور نہ بود　　وزیں بہ در جہاں دستور نہ بود
کسے کز شرح یک لفظش خبر یافت　　ہزاراں معنیِ باریک دریافت

عدل وانصاف

خسروانہ عدل و انصاف کی ہمہ گیری اور شاہانہ ذہانت و طباعی کی کارگزاری ملاحظہ فرمایئے۔ "مشغلۂ سلطانی" کے نام سے چند نقرئی اور طلائی صندوقچے تیار کرائے جاتے تھے جو مقفل ہو کر بادشاہ کی سواری کے ساتھ ساتھ گشت کرتے تھے، مستغیث اور امیدوار اپنی اپنی عرضیاں بے دھڑک اُن میں ڈالتے تھے، جن کو جلوس کی واپسی پر خود بادشاہ سلامت اپنے ہاتھوں سے کھول کر ہر مستحق کی کاربرآری اور دادخواہوں کی فریادرسی فرماتے تھے چنانچہ صاحبِ وزیرنامہ کہتے ہیں ؎

صندوقچۂ خوشنما و نو ایجاد　　چوں سینۂ عادلاں پر از دولت داد
صندوقچہ بود یا دلِ جملہ جہاں　　بنہفتہ درو ہزار طومار مراد

آئین رزم

فوجی قواعد کی تنظیم اور آئینِ رزم کی تعلیم بسا اوقات خود فارسی زبان میں فرماتے تھے اور ایسا دلکش پیرایۂ بیان اختیار کرتے تھے کہ ہر سر بازمست شجاعت، و مردانگی ہو کر طلبگار رنبہ و نظر آتا تھا تین تین چار چار گھنٹے مسلسل میدانِ جنگ میں کھڑے رہتے گرد و غبار کی شدت اور آفتاب کی تمازت برداشت کرتے ہر سوار و پیادہ کی تفنگ آزمائی، نیزہ بازی، شمشیرزنی اور گولہ اندازی کا بہ نفسِ نفیس امتحان لیتے اور ضروری فہمائش کے بعد شاہانہ انعام اکرام اور القاب و خطابات سے علیٰ قدرِ مراتب سرفراز کرتے اور بہادروں اور جوانمردوں کے دل بڑھاتے۔

بقولے ؎
ہر سو کہ شبرنگ را تاختے　　یلاں را بہ تعلیم بنواختے

دلیرانِ لشکر بہ کار آگہی — کمر بستہ بر رسم و راہِ شہی

شہِ کار فرما ز طبعِ رسا — بہ تعلیمِ شاں کرد ایجادہا

باندازِ نو باخت ایں مرد را — فروغِ دگر داد نادر درا

بیاموخت رزمیکہ نو ساز بود — ظفر را گزیں مایۂ ناز بود

سپہ شد ازاں آنچناں چیرہ دست — کہ ہر لشکری لشکری می شکست

عادات واطوار

عیش کوشی اور شاہانہ اقتدار کے باوجود کبھی دامنِ شرم وحیا پر نفس پرستی کا داغ نہ آنے دیا۔ کسی حُسن فروش کے غلبۂ عشق میں بھی شریعت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اور نکاح یا متعہ سے حرام کو حلال کرکے محلسرا کی زیب وزینت بڑھاتی۔ بدنگاہی کی بجلی گرا کر کبھی کسی کے خرمنِ ناموس کو جلا کر خاک نہیں کیا اور یہی وہ صفاتِ بشریہ ہیں جو انسان کو حدودِ بشریت سے نکال کر عالمِ ملکوت میں پہونچا دیتی ہیں ورنہ اس کیف و مستی اور جنون و دیوانگی کی راہ میں بڑے بڑے پاکبازوں کو قدم قدم پر لغزشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں سہ

ہر کجا سلطانِ عشق آمد نماند — قوتِ بازوے تقویٰ را محل

پاکدامن چوں زید بیچارہ — اوفتادہ تا گریباں در وحل

تاریخ وسیر

طبعِ اقدس کی نکتہ رسی اور نظرِ حق شناس کی معجز نمائی نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاہانِ عقل وتدبیر کے لئے تاریخ وسیر کا مطالعہ ازبس ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ بہت تھوڑی مدت میں تحقیق وتدقیق کی روشنی میں ایسی استعداد بہم پہونچائی کہ نور وظلمت اور صواب و ناصواب کو پہلی ہی نظر میں معلوم کرلیتے اور بہ یک اشارۂ چشم وابرو خیر و شر اور نفع و ضرر دانش و بینش کی کسوٹی پر کس کے بمصداق "خذ ما صفا و دع ما کدر" اصلاح کار و رفاہِ عام کی خاطر قدم اُٹھاتے۔ چنانچہ مؤلف وزیرنامہ کہتے ہیں سہ

بچکاندے از رگِ اندیشہ گر خوں — بہ تحقیقش نبردے پے فلاطوں

نیاید از لبِ شیوہ زبانے — کہ سنجد نکتہ از وا استانے

ساخت وتعمیر

عماراتِ عالیہ اور ابنیہ خیر کی ساخت وتعمیر سے کئی فائدے مقصود ہیں۔ شان وشکوہ اور نشانی و یادگار کے علاوہ ہزاروں محتاجوں اور لاکھوں فاقہ مستوں کی روزی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ چنانچہ دُنیا کے بڑے بڑے شاہانہ اولوالعزم اور خسروانِ نامدار کو ہمیشہ فنِ تعمیر سے خاص دلچسپی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس ہوتے کہ وہ ہنگاموں اور شور وشغب سے دور ہو کر شہرِ خموشاں کے مختلف گوشوں میں پڑے ہوتے تنہائیوں کے مزے لے رہے ہیں مگر باغات وقصور، مساجد وجسور، مدارس اور کاروان سراؤں سے ان کا نام آج بھی روئے زمین پر زندہ ہے اور جابجا فیوض وبرکات کے چشمے ابل رہے ہیں۔ حضرت سلطانِ عالم کو بھی اس فن میں خاص اشتیاق اور ملکہ حاصل تھا آپ کی تعمیر کردہ عمارتوں اور باغوں کی سیر وتفریح سے ہندسان روزگار اور معمارانِ تجربہ کار آج بھی غریق لجۂ حیرت ہیں سہ

تا قلم بر صنع کاری یافت دست صد ہزاراں نقش خود پرکار بست

فنِ موسیقی

فنِ موسیقی کو علومِ ریاضیہ کی ایک شاخ کہا جاتا ہے اس کی قدامت و لطافت کا اندازہ اشعارِ ذیل سے بخوبی ہو سکتا ہے ؎

آں روز کہ روحِ پاک آدم بہ بدن گفتند در آمی در آمد در تن
خوانند فرشتگاں بہ لحنِ داؤد در تن در تن در آمی در تن در تن

مولانا نظامی گنجوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مثنوی مخزن اسرار میں اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالتے ہیں ؎

تا سخن آوازۂ دل در نہ داد جاں تنِ آزادہ بگِل در نہ داد

غرضکہ سازِ الست میں چھڑے ہوئے اس نغمۂ سرمدی میں کچھ ایسی کشش و انجذاب کی قوتیں پنہاں کی گئیں جس کی ہر ہر صدائے جاں نواز روح پرور نے انبیاء و اولیائے زماں اور شاہان و خسروانِ جہاں کے دلوں کو مسخر کر کے مست و بیخود دُنیا و مافیہا بنا دیا۔ آج بھی اس فنِ لطیف کی قدر و منزلت کا یہ عالم ہے کہ اہل اللہ کے اکثر حلقوں میں وسیلۂ قربِ الٰہی اور ذریعۂ معرفتِ ربانی سمجھا جاتا ہے۔ حضرت سلطانِ عالم کو علم موسیقی سے کمال اُنس تھا۔ استادانِ فن سے اصولِ نادرہ اور نکاتِ غریبہ معلوم کرتے اور اُنہیں ہر طرح کے اعزاز و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ چنانچہ اس فن میں آپ کی اکثر کتب مدون مقبول و مشہور ہیں جن کا ہر صفحہ بجائے خود ایک عالمِ موسیقیت ہے۔

شعر و شاعری

مختلف ملک و دَور کے بادشاہوں نے اپنی اپنی زبان میں طبع سخن پرور کے خُوب خُوب جوہر دکھائے ہیں۔ حضرت سلطانِ عالم کو بھی دیگر علوم و فنون کی طرح ذوقِ شعری ورثتاً ملا تھا۔ فارسی و اُردو میں اختر اور ہندی میں جانِ عالم پیا تخلص فرماتے تھے۔ میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ دربار کملاء و فضلاء کا ملجاء و ماویٰ تھا۔ شفق، علیش، ہنر، قلق، امانت، تجر، ہلال و سرور، بڑے بڑے نامور شعراء و ادیب جمع ہو کر دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے تھے اور اکثر رفاقت و جاں نثاری کا دم بھرتے تھے۔ چنانچہ انتزاعِ سلطنت کے بعد مٹیا برج کلکتہ میں بھی یہ عالمانہ اور شاعرانہ صحبتیں گرم ہوتی رہیں۔ قلت مداخل اور کثرت مخارج میں تصنیف و تالیف کا شوق برابر ترقی کرتا رہا۔ سیر و تفریح کے وقت بھی ضروری حوالوں کیلئے سواری میں اساتذہ کی تصنیفات کے صندوق ساتھ رہتے۔ صاحبِ بوستانِ اودھ فرماتے ہیں "سخنوری اور معنی آفرینی میں حضرت سلطانِ عالم ابلغ البلغاء اور افصح الفصحاء خیال کئے جاتے تھے۔ مملکتِ ہندوستان میں اس فضل و کمال اور جامعیتِ علم و فن کا کوئی دوسرا بادشاہ نہیں گزرا ہے" ممکن ہے یہ فقرے بربنائے خلوص و عقیدت زبان سے نکلے ہوں، اور دعوے کی نوعیت میں کچھ فرق ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ دیگر بادشاہوں کے مقابلے میں حضرت سلطانِ عالم کی علمی خدمات کا دائرہ کچھ کم وسیع نہیں۔ چھ دیوانوں اور مرثیوں کی تین جلدوں کے علاوہ حزنِ اختری و خطابات و محلات دو مثنویاں، قصائد المبارک فارسی و اُردو کے قصیدے، مباحثہ بین النفس و العقل، صحیفۂ سلطانی، نصائح اختری، عشق نامہ، رسالۂ ایمان، دفتر پریشاں، دستورِ واجدی، صوت المبارک، ارشادِ خاقانی، جوہرِ عروض وغیرہ وغیرہ وہ قابل قدر تصنیفات ہیں جو شاہراہ علم و ادب میں شمع ہدایت بن کے روشن ہیں اور ناواقفانِ منازلِ شاہی کو راہِ راست پر آنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ وزیر السلطان نواب سید امیر علی خاں امیر حضرت کی مدح میں اس طرح رطب اللسان ہوتے ہیں ؎

از تیرہ خاکِ ہندکم آید چو من دگر　　با ایں زباں سحر بیاں ناظم وری
لیکن بہ بندہ حاجتِ اصلاح کلکِ تست　　زانرو کہ خسروی بدیارِ سخن وری
پوچیست نزدِ مردِ سخن سنجِ بے سخن　　باحضرتش کسیکہ زند لاف شاعری
دائم کرہ بملکِ معانی برم امیر　　خسروا اگر بہ تربیتم کرد رہبری

بخیال طوالت حضرت سلطانِ عالم کے فارسی و ہندی کلام سے قطع نظر کر کے میں یہاں مختلف رنگ اور صنف میں صرف اُردو کے چند اشعار تمثیلاً پیش کرتا ہوں۔ ردوقبول حسبِ استعداد و ذوقِ سخن ہے۔ طرزِ کلام اور اندازِ شعرگوئی سے مشاقی ظاہر ہوتی ہے۔ بندش و ترکیبِ نظم کی پختگی اور سلیقگی نمایاں ہے تشبیہ و استعارے میں کسی حد تک ندرت بھی ہے۔ محاورے اور روزمرہ کا خاص لطف ہے، رعایت لفظی اور ہنوٹ بھی پائی جاتی ہے مگر یہ ماحول کا اثر ہے اور اس وقت کا یہی رنگ تھا۔ ملاحظہ ہو۔

ؔ
کمر دھوکا، دہن عقدہ، غزال آنکھیں، پری چہرہ　　شکم ہیرا، بدن خوشبو، جبیں دریا، زباں عیسیٰ
برائے سیر مجھ سا رند میخانے میں گر آئے　　گرے ساغر، لنڈھے شیشہ، ہنسے ساقی، بہے دریا
جب کبھی برسات کی فصل آ گئی　　یاں گھٹا الفت کی دل پر چھا گئی
خضرِ دل تو چھوڑ دے الفت کی راہ　　اب طبیعت عشق سے گھبرا گئی
جمالِ شمع رویاں دیکھ کر محفل میں جلتے ہیں　　مثالِ موم دل عشاق کے غم سے پگھلتے ہیں
لگا دیتا ہے گھُن عاشق کے دل میں عشق کا سودا　　نمک زارِ جہاں میں ہم نمک کی طرح گھلتے ہیں
شرابِ عشق سے ہو دل کے جام کی رونق　　کہ جیسے شعر و سخن سے کلام کی رونق
اسی طرح صفِ عشاق کی نمائش ہو　　نمازِ جمعہ میں جیسے امام کی رونق

سوز و گداز اور درد و اثر سے کلام یکسر خالی نظر نہیں آتا۔ ملاحظہ ہو۔

ؔ
اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا　　آہ دلِ ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا
بنا دے نور کا پتلا خدایا میری مٹی کو　　بتوں کے واسطے پتھر کا کر دے قلب کو جی کو
اے پریزادہ تمہارے آگے پھونکا یہ گھر　　قاف سے تا قاف شہرہ اور فسانہ ہو گیا

دیکھئے یاس و حسرت کا نقشہ کن مؤثر لفظوں سے کھینچتے ہیں۔

ؔ
یہی تشویش شب و روز ہے بنگال میں　　لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا!
یوں تو شاہانِ جہاں پر بھی پڑا وقت مگر　　ختم ہے اختر پہ کس پہ جفائے غربت
سخاوت کیا کروں گا داغہائے جسمِ عریاں سے　　خزانے میں وہ مُہریں جمع ہیں جو بٹ نہیں سکتیں
توقع صبح ہونے کی کسے ہوتی ہے فرقت میں　　وہ راہیں ہجر کی ہیں لے خدا جو کٹ نہیں سکتیں

سُنیئے عشق کی مدح فرماتے ہیں گویا خیالات کی رَو میں خود بہے چلے جاتے ہیں۔

ؔ
کبھی مردمکِ چشمِ مطلوب میں　　کبھی آئینۂ بزمِ محبوب میں

جو آنکھوں میں پہونچا تو جادو ہوا　　بیاباں میں آیا تو آہو ہوا
کبھی گیسوئے موجۂ آب ہے　　کبھی گردشِ چشمِ گرداب ہے
کبھی تیرِ غم کا نشانہ ہوا　　کبھی زلفِ شاہد میں شانہ ہوا
غرض رونقِ ہر مکاں عشق ہو　　زمیں عشق ہے آسماں عشق ہو

ایک مثنوی میں ساقی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ زبان کی صفائی اور بیان کی شوخی قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں ؎

نیا ساقیا آج ساماں ہو　　وہ مے دے شرابوں کی جو جان ہو
بہار آئی کافر کدھر دھیان ہو　　عجب تو بھی سیدھا مسلمان ہو
مئے ناب خم میں کمر تک نہیں　　بہار آئی سر پر خبر تک نہیں
سبو ہوں نئے اور ساغر نئے　　کہ آتے ہیں یاں ماہ پیکر نئے
قدح نوش سرمست شیریں بیاں　　ہوا چاہتے ہیں ترے میہماں

اب ذرا آخر میں عتابِ شاہی کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ روانی کلام اور جوشِ طبع کی داد دیجئے۔ حضرت سلطانِ عالم قلعہ فورٹ ولیم کلکتہ کی تشریف بری کے وقت حکیم شفاء الدولہ بہادر کو اشعارِ ذیل جواباً تحریر فرماتے ہیں، جو ترکِ رفاقت کر کے فیض آباد چلے گئے تھے اور وہاں سے عذر خواہی کی درخواست کی تھی۔

شقۂ عتاب آلودِ شاہی

بحث کے قابل نہیں میرا دماغ　　دردِ زنداں سے نہیں مجھ کو فراغ
رمز اک سوجھی ہے موقع پر مجھے　　بلبلِ غم نے دئے ہیں پر مجھے
گوش دل سے سُن اسے تو اے طبیب　　پھر سمجھنا شاہ کو اپنا حبیب
مذہب اشاعشر کے شاہ کو　　تو نے چھوڑا قید میں اس ماہ کو
کب سکندر سے فلاطوں چھٹ گیا　　کونسی لیلےٰ سے مجنوں چھٹ گیا
کون سے مالک کا بھاگا ہے غلام　　بھاگ کر پایا ہے کس نے نیک نام
جاں کو پیارا جان کر اے قدرداں　　لکھنؤ تم ہو گئے دم میں رواں
ہم کو چھوڑا قید خانے کے لئے　　آپ جا پہونچے زمانے کے لئے
گر یہی طرزِ رفاقت ہے تو واہ　　آپ کا مالک نہیں ہے بادشاہ
سلطنت کی تھی محبت ہو چکی　　مال و زر کی تھی رفاقت ہو چکی
اب نہ میں مالک نہ تم مملوک ہو　　اب مرے نزدیک تم مشکوک ہو
اصل چھوڑی بت پرستی کیلئے　　جام توڑا فرطِ مستی کے لئے

سلیم ناطقی کانپوری

لاٹری

کیا دادھوم مچی ہوئی ہے یورپ کی ساحری کی ۔۔۔ دُھومیں مچی ہوئی ہیں دُنیا میں لاٹری کی

لیلائے لاٹری کا دیوانہ ہر کوئی ہے ۔۔۔ اس "شمعِ زرگری" کا پروانہ ہر کوئی ہے

ڈربی کی لاٹری کا میں نے ٹکٹ خریدا ۔۔۔ بے رنج گنج پانے کا ہے یہی طریقہ

۔۔۔ پانچ کے عوض میں ہوتے ہیں وارے نیارے ۔۔۔ بنتے ہیں بے مشقت ہم لکشمی کے پیارے

ہزار زور سے دل تھی دن کو ۔۔۔ رنگیں ۔۔۔ اور رات کے سمے میں دولت کے خواب شیریں

تخئیل کا مصور نقشے بنا رہا تھا ۔۔۔ اور ایک ایک کر کے مجھکو دکھا رہا تھا

رنگینیِ تصور اس درجہ دلکشا تھی ۔۔۔ جنت کی چلتی پھرتی تصویر گو نیا تھی

گرما گذارنا تھا کشمیر کے بنوں میں ۔۔۔ اور موسم زمستاں دکن کے ہوٹلوں میں

اک ولولہ تھا دل میں حج کا بھی سیر کا بھی ۔۔۔ یعنی طواف کرنا کعبے کا دَیر کا بھی

تینوں میں کیا کہ تیرہ* میں بھی نہ نام نکلا! ۔۔۔ اور نوکری کے بیروں میں بھی نہ نام نکلا!

تخئیل ہنس رہی ہے میری حماقتوں پر ۔۔۔ اور ناز کر رہی ہے اپنی طلاقتوں پر

تخئیل اور تصور گویا بنا رہے تھے ۔۔۔ میری ہنسی یہ دونوں مل کر اڑا رہے تھے

کمبخت میں نہ سمجھا رازِ درونِ پردہ ۔۔۔ اُمید بن کے ہمدم دل سے رہی تھی دھوکا

ہے اتفاقِ نادر بے رنج گنج پانا ۔۔۔ غیرت کے ہے منافی محنت سے جی چرانا

خارا شگاف ہو جا لعل و گہر کے طالب! ۔۔۔ دن رات ایک کر دے اے سیم و زر کے طالب!

مَردوں کا دین و ایماں ہیں سخت کوشیاں ہی
شایانِ شانِ انساں ہیں سخت کوشیاں ہی

امینِ حزیں

---

* تینوں میں نہ تیروں میں اور نہ نوکری کے بیروں والی ضرب المثل کو شعر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

غمِ ایّام

جمیلہ!

پے در پے تمہارے چار پانچ محبت نامے ملے۔ میں بہت نادم ہوں کہ جواب لکھنے میں مجھ سے اتنی کوتاہی ہوئی۔ اور جو برا نہ مانو تو پھر تمہیں یہ بھی بتلائے دیتی ہوں کہ ممکن تھا کہ میں جواب دینے سے یونہی گریز کئے جاتی۔ لیکن جمیلہ! تم نے آخری خط میں یہ لکھکر "شاید بیاہ کی مسرتیں خط کا جواب لکھنے میں حائل ہو رہی ہیں" جو چرکا میرے دل پر لگایا ہے، مجھ میں تاب نہیں کہ اب خاموش رہوں۔ لیکن بہتر یہی تھا کہ میں یونہی خاموشی سادھے رکھتی۔ ؎

سمجھ میں خاک نہ آئینگے معنی و مطلب
مجھے نہ سن کہ بڑی دور کی صداہوں میں

تمہیں تو مجھ سے یہ شکوہ کہ بیاہ کی مسرتوں میں کچھ ایسی کھوئی گئی کہ تمہارے خطوں کی رسید دینے کی بھی فرصت نہ رہی اور میرا یہ حال کہ ؏

سینے کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا

— جمیلہ! تم جانو اس وقت تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ میرا خط تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ تمہاری بھویں تنی سی ہیں اور تمہارا چہرہ تمہارے دل کی بیتابی اور الجھنوں کو عریاں کر رہا ہے۔ تمہاری آنکھیں خط پر جمی ہوئی ہیں لیکن جو کچھ تمہاری نگاہ کے سامنے ہے تمہارا دل اُسے باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ سچ کہیو جمیلہ! ٹھیک ہے نا؟

لیکن میرے ساتھ کھیلی ہوئی اور منہ بولی بہن! تم جو کچھ پڑھ رہی ہو تمہیں باور کرنا ہی پڑے گا۔ دنیا میں دکھ درد بھی تو انسان کے لئے ہی بنا ہے۔ پھر اگر میں دکھیاری ہوں تو کوئی اچنبھے کی بات تو نہیں۔ لیکن بہن! میں زبان پر لاؤں تو زبان جلتی ہے اور جو چپ رہوں، دل میں چھپا کر رکھوں تو مغز استخواں تک جل اٹھتا ہے۔ اس دنیا میں مجھ کمبخت کے دکھ کا درماں نہیں۔

دلہن بنکر پینس میں سوار ہونے سے پیشتر تم نے جو میرے چٹکیاں لیں اگر وہ سوفار بنکر میرے جسم کو چھید ڈالتیں اور یہ زخم مرتے دم تک اندمال نہ ہوتے تو خدا کی قسم مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جو دلہن بن کر ہو رہا ہے۔ مجھے رخصت کرتے وقت تم سب تو رو رہی تھیں اور میں ارمانوں اور تمناؤں کی دنیا آباد کر رہی تھی۔ میں رخصت ہوئی تو تم لوگوں کا رونا دھونا بھی رخصت ہوا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ سسرال پہنچکر عمر بھر کا رونا میرے نصیب میں ہوگا۔

جمیلہ! خدا تمہیں سلامت رکھے بہن۔ تمہیں چٹکیاں لینا اور مذاق کرنا خوب آتا ہے۔ "بی سہاگن" نام تو تم نے بہت مزے لے کر پسند کیا۔ لیکن افسوس! مجھے تو یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سہاگن ہونا کیا ہے۔ اور سہاگن کہتے کسے ہیں! اور شاید اب مرتے دم تک بھی اس کیف آور لفظ کے دلکش تاثرات سے محروم ہی رہونگی۔

سہاگن کون؟ میں؟ پھوٹے نصیب میرے! میری قسمت میں سہاگن ہونا کب لکھا تھا۔ سہاگن! خدا کی قسم! یہ لفظ سنکر میرے دل پر ایک چرکا سا لگتا ہے۔ لیکن اب دل کہاں؟ [illegible] کی لذت سے محروم نہیں ہوں۔ اور تم جانو! یہ زندگی جو اب میرے لئے وبالِ جان ہے اسی ایک لذت کی منت پذیر ہے۔

جمیلہ! تم کہو گی تو سہی کہ یہ کیا بکے جا رہی ہے تم کو تعجب ہوگا کہ ان تین چار مہینوں میں ہی اس پر کونسا کوہِ غم ٹوٹا جو یہ کمبخت یوں بلبلانے لگی۔ ہائے توبہ! کس زبان سے تمہیں اپنی مصیبت کی داستان سناؤں۔ وہ دن اب کہاں سے لاؤں جب ہم دونوں شادی بیاہ کے مسئلہ پر دوسروں سے چھپ چھپ کر

ہوئے ہولے باتیں کیا کرتے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا وہ راج کماری کی شادی؟ کمبخت نے مجھے تو بالکل ہی بھلا دیا۔ اور پھر جو اس کے ڈولے ہوئے تھے۔ اور پھر اس کے سسرال سے واپس آنے پر جو مزے مزے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور پھر اس کا ہمارے چٹکی لے کر کہنا کہ گھبراؤ نہیں جب سسرال جاؤ گی، تو شادی کی کیفیتوں سے خود بخود آگاہ ہو جاؤ گی۔

بیاہ کی مسرتیں؟ اُف توبہ! کتنے کیف آور الفاظ ہیں! اور پھر اس خیال سے مچل مچل جانا کہ خواب زندگی کی تعبیر کس قدر دلپذیر ہوگی۔ لیکن افسوس! ۔ع۔

جب آنکھ کھُلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا

اری جمیلہ! دل چاہتا ہے کہ دل نکال کر تمہیں دکھاؤں اب جو اس راج کماری کی باتیں یاد آتی ہیں تو بس یہی کہنا پڑتا ہے، کہ ع۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا!

توبہ ہے! اب وہ دن کہاں جب ؎

کس طرح ہیں پُر کیف جوانی کے ترانے

سُنتا ہوں مَیں تاروں میں محبت کے فسانے

ہیں چاند کے کس درجہ دلآویز اشارے

گویا کہ ہیں مخور یہ دریا کے کنارے

اور مجھکو خبر کچھ نہیں آلامِ جہاں کی!

لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ وہ دن بھی دور نہیں جب یہی جوانی کے ترانے اور یہی محبت کے فسانے فریاد و شیون بنکر میری زبان سے نکلا کرینگے۔ اب یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ آلامِ جہاں کسے کہتے ہیں اور کس طرح غمِ ایام سینہ کاوی کرتا ہے۔

بہن جمیلہ! مجھے معاف کرنا۔ مَیں جس رَو میں بہہ رہی ہوں مجھے بہے جانے دے۔ مَیں جو کچھ کہہ رہی ہوں مجھے کہہ لینے دے۔ آندھی چل جاتے تو مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ بارش ہو جائے تو گرد و غبار بھی ہٹ جاتا ہے۔ طوفان کے بعد جو سکوت پیدا ہوتا ہے اس سے کائنات کو آرام اور راحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح رو لینے سے دل کی بھڑاس بھی نکل جاتی ہے۔ دکھ درد کے اظہار سے دل کا بار ہلکا ہو جاتا ہے۔ مجھے تمہارے ہی سر کی قسم! میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ اپنا دکھڑا تم سے کہکر تم کو بھی پریشان کروں۔ پریشان تو تم ہو ہی گی لیکن جمیلہ! ؎

مرے دکھ پہ اب سخ اٹھانے سے حاصل

مصیبت پہ اب تلملانے سے حاصل؟

مرے حال پر دل دکھانے سے حاصل؟

کچھ بھی نہیں۔ خاک بھی حاصل نہ ہوگا۔

لو اب میری داستان سنو!

سسرال پہونچی تو ایک دنیا مجھے دیکھنے کو ٹوٹ پڑی۔ تم جانو! پانچ سات ہزار کے زیورات۔ دو ڈیڑھ ہزار کے ملبوسات اور اس کے علاوہ اور بہت سا سامان اور پھر اس پر یہ میری مخمور صورت۔ ساس کو ہر طرف سے مبارکباد مل رہی تھی۔

"چاند سی دلہن بیاہ لائی ہے"

"اس گھر تو لچھمی آئی ہے"

"کیا رنگ روپ ہے"

"تصویر ہے تصویر"

"گہنا پاتا تو دیکھو سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہے"

"خدا بنا بنی میں بناتے رکھے"

اسی قسم کی آوازیں ہر سمت سے آرہی تھیں۔ رات کھانے کے بعد وہ چار جوان لڑکیاں جو رشتے ہی کی تھیں میرے پاس بیٹھی تھیں۔ مَیں چُپ تھی اور وہ کچھ کھُس پھُس کر رہی تھیں۔ کبھی خود بخود ہنسنے لگتیں۔ ان میں سے ایک میرا ہاتھ پکڑ کر بولی "دلہن آؤ تمہیں سونے کا کمرہ تو دکھا دوں"

لیکن مَیں جو ذرا سمٹ کر بیٹھنے لگی تو ایک دو میرے گدگدیاں کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے کھینچ تان کر مجھے اٹھا ہی لیا۔ اور حجلہ عروسی

میں لے چلیں۔ دوسری منزل پر میرے سونے کا کمرہ تھا کمرہ پھولوں سے آراستہ تھا۔ پلنگ پر بھی رنگ رنگ کے پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ موم بتیاں جل رہی تھیں۔ دو کرسیاں ایک صوفہ ایک دیوار کے ساتھ رکھا تھا۔ ایک کرسی پر میرے شب باشی کے کپڑے تھے۔ انہوں نے مجھے پلنگ پر بٹھا دیا۔ ایک لڑکی وہ شب باشی کے کپڑے اٹھا لائی اور بولی: "لو دلہن یہ پہن لو۔"

"واہ!" ساتھ ہی آواز آئی "یہ کپڑے کیوں پہنیں؟"

یہ میرے شوہر تھے۔ ان کے اندر آتے ہی لڑکیاں اٹھ کر چلی گئیں۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر پلنگ کے پاس آ بیٹھے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بولے "رشیدہ! مزاج تو اچھے ہیں؟"

میں خاموش رہی وہ ہنسکر کہنے لگے "سمجھ گیا! اس خاموشی سے یہی مطلب ہے نا کہ نہ جانت نہ پہچان میں تیرا مہمان۔"

"جو کچھ آپ سمجھ لیں" میں نے ہولے سے کہا۔

"شکر ہے!" انہوں نے میرا ہاتھ ہونٹوں سے لگا کر کہا "کہ ٹوٹا خدا خدا کر کے۔"

"کفر؟" میں نے ذرا انکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رشیدہ!" وہ ہنسکر کہنے لگے "مجھے تو خوف تھا کہ تم شاید بات بھی نہ کرو۔"

"میں گونگی تو نہیں" میں نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن لڑکیاں سسرال آکر گونگی بن ہی جایا کرتی ہیں" وہ بولے "لیکن تم ایسی تعلیم یافتہ بیوی کے متعلق اس قسم کا خیال کرنا بھی شاید کفرانِ نعمت ہی ہوگا۔ معاف کردو رشیدہ؟"

"کیا؟"

"میری غلطی" وہ میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولے۔

"پھر تو کبھی نہ کیجئے گا؟" میں نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"دیکھو جی" وہ کہنے لگے "میں غلطی کروں تو تم روک دیا کرو۔"

میں چپکی ہو رہی۔

وہ بولے "رشیدہ نیند آرہی ہے تمہیں؟"

"جی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"سیر کو چلوگی" وہ کہنے لگے "چاندنی ہے دریا کی سیر کا لطف خوب رہے گی۔"

"آپ کی مرضی" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو جی!" وہ بولے "ہماری مرضی کے دن تو ہو لئے۔ اب تو گھر والی کی مرضی پر سب کام ہوا کرینگے۔"

قصہ مختصر ہم موٹر میں سوار ہوکر دریا پر پہونچے۔ اور کشتی میں بیٹھکر دریا کی سیر کرنے لگے۔ پانی سیال چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور کائنات چاندنی کی ردا اوڑھے خاموش فضا کی گود میں سو رہی تھی۔ جمیلہ! اس وقت جو جذبات میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے، زبانِ قلم سے بیان نہیں ہو سکتے۔ ایک جوان عورت اور محبوب مرد کا قرب پھر تنہائی اور سکوت! تم ان باتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ خدا کی قسم! دن بھر کی کوفت، ماں باپ کے گہوارے سے چھوٹنے کا رنج، سہیلیوں سے بچھڑنے کا صدمہ صرف ایک شخص کے قرب بے حجاب پر دریا ثابت ہو رہا تھا۔

وہ کشتی کھیتے ہوئے بہت دور چڑھاؤ کی طرف لے گئے۔ پھر چپو چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ کشتی خود بخود بہاؤ کی طرف ہولے ہولے آنے لگی۔

وہ بولے "رشیدہ کبھی تم نے بھی کشتی چلائی؟"

"نہیں!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا" انہوں نے ہنسکر کہا "اگر ہم سکھلا دیں تو کیا انعام ملے گا؟"

"اس میں سیکھنے کی بات ہی کیا ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"تو آؤ نا ذرا!" وہ بولے "دیکھیں تو بھلا تمہاری کرامت۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرا ہاتھ تھام کر

مجھے اپنی جگہ بٹھا دیا۔ لیکن مجھ سے تو چپّو ہی نہ پکڑے گئے وہ خوب ہنسے اور بولے "اجی جناب! جائے استاد خالی است۔"

اور میں نے ہنسکر کہا "یہ چپّو ہی کچھ بھاری ہیں۔"

"بالکل ٹھیک۔" انہوں نے پھر ہنسکر کہا "نازک ہاتھوں کے لئے چپّو بھی نازک ہی ہوں تو کام بنے۔"

میں نے ہر چند کوشش کی لیکن ہاتھ چپّو پر ٹھیک بیٹھتا ہی نہ تھا۔ آخر وہ مجھے آغوش میں لیکر بیٹھ گئے اور چپّو چلانا سکھانے لگے۔ کچھ دیر یہی شغل رہا۔ پھر کہنے لگے "رشیدہ! محبت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کبھی خریدنے کا اتفاق نہیں ہوا!" میں نے ہنسکر کہا۔

"اجی جناب!" وہ بھی ہنسکر بولے "میرا یہ مطلب نہیں۔"

"اور پہیلیاں میں بھی نہیں بوجھ سکتی" میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے" وہ بولے "کہ مرد اور عورت میں محبت کیسے ہوتی ہے؟"

"مجھے ابھی اس کا تجربہ نہیں ہوا!" میں نے جواب دیا۔

"ایک ہندوستانی عورت میں یہی سب سے بڑا نقص ہے کہ وہ شوہر کے گھر آکر اس سے محبت کرنا سیکھتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ روز اوّل سے ہی دونوں میں بن نہیں آتی" وہ کہنے لگے۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں تو کہہ چکی" میں نے کہا "مجھے ابھی اس کا تجربہ نہیں ہوا"

"تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں جس چیز سے ناواقف ہوں اس کے متعلق کیا کہہ سکتی ہوں" میں نے کہا۔

"میں تمہارا شوہر ہوں" وہ بولے۔

"جی!" میں نے ہولے سے کہا۔

"اور تم میری بیوی ہو" انہوں نے کہا۔

"جی" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں مجھ سے محبت بھی ہونی چاہئے" وہ بولے۔

اور میں نے ہنسکر کہا "آپ نے بری میں بھیجی ہوتی تو میں ساتھ لے آتی"

"اجی جناب!" وہ کہنے لگے "ہم تو بن دیکھے ہی ایمان لے آئے تھے"

"شکریہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"رشیدہ!" وہ کہنے لگے "واقعی تم بہت عقلمند ہو۔ اور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسی بیوی ملی۔ اب پہلی ہی ملاقات میں میرا تم سے محبت کا تقاضا حماقت ہی تو ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"درست ہے" میں نے ہولے سے کہا۔

اس پر وہ ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگے "خوب صاحب خوب! گویا تم بھی ہمیں احمق ہی سمجھ رہی ہو۔ لو جی! یہ اچھی رہی!"

"خدا نہ کرے مجھ سے ایسا گناہ سرزد ہو" میں نے کہا۔

"رشیدہ!" وہ بولے "مرد عورت میں جب تک محبت نہ ہو اُن کے تعلقات کبھی استوار نہیں ہو سکتے۔ خاوند کو چاہیئے کہ بیوی کو محبت کرنے کا موقع دے۔ بلکہ اُسے محبت کرنا سکھلائے۔ یہ نہیں کہ بس ڈھور ڈنگروں کی طرح رہنے سہنے لگیں"

جمیلہ! مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس موضوع پر انہوں نے کوئی لیکچر ازبر کر رکھا ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ تو کہیں ختم ہوتا نظر ہی نہ آتا تھا۔ جب کشتی بہاؤ پر بہت نیچے آجاتی تو وہ پھر چپّو سنبھال کر بیٹھ جاتے اور اُسے چڑھاؤ کی جانب لے جاتے۔ اب مجھے کچھ نیند سی بھی آنے لگی تھی اور یہ گفتگو بہت بے کیف سی معلوم ہونے لگی تھی۔ اب اس قصّے کو کہاں تک طول دوں۔ لوٹے اُس وقت جب مرغ سحر پیغامِ عمل دے رہا تھا۔ گھر والے ابھی سوتے ہی تھے وہ مجھے خوابگاہ

حجلۂ عروسی میں لے گئے اور یہ کہکر کہ "رشیدہ! مجھے تو سیر کا لطف کچھ آج ہی آیا۔ لو! اب تم بھی آرام کرو۔" دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

جمیلہ! یہ ہے اس شب اوّل کی داستان جو ہر نوکتخدا کیلئے باعثِ اضطراب ہوا کرتی ہے۔ اب اگر میں اس سرگذشت کو مسلسل لکھنے بیٹھوں تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ لیکن میری کتابِ زندگی کا یہ ایک ورق۔ نہیں! نہیں! یہ پہلا ورق جس طرح بے کیف اور بے ربط ہے اسی طرح میری آج تک کی زندگی سمجھ لو۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کی داستان، حسرتوں اور ارمانوں کی تباہی کا قصہ، تمنا اور شوق کی بربادیوں کا افسانہ۔ جذبات اور خواہشات کے خون کا مرقع۔ سننے والوں کیلئے دلکش اور دلچسپ ہو تو ہو لیکن کہنے والے کیلئے جسقدر تکلیف دہ ہو سکتا ہے، میرے سوا دوسرا اندازہ نہیں کر سکتا۔

شوہر کے گھر میں میرے لئے سب کچھ موجود ہے۔ دُنیوی نقطۂ نگاہ سے لوگ مجھے ایک خوش نصیب عورت سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میری زندگی کیا ہے؟ زندہ درگور ہوں۔ نہ کسی کے سامنے رو سکتی ہوں نہ کسی سے اپنی حرماں نصیبی کی داستان کہہ سکتی ہوں۔ اور پھر کائنات کا ذرہ ذرہ جس طرح میرے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ میرے سینے پر چرکے لگاتا ہے۔ میں کس سے کہوں؟

ایک روز منڈیر پر دو کبوتر آ بیٹھے۔ میں برآمدے میں بیٹھی کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ دونوں کو محوِ اختلاط دیکھکر سینے پر بس سانپ ہی تو لوٹ گیا۔ وہ نر کا سینہ اُبھار اُبھار کر اور پر پھلا پھلا کر مادہ کے گرد گھومنا اور ادھر مادہ کا کبھی محبت سے سر جھکا دینا کبھی خفگی سے ایک آدھ ٹھونگا مار دینا۔ پھر دونوں کا چونچ میں چونچ ڈالکر دانہ بدلنا۔ جمیلہ! قیاس تو کرو، مجھ پر کیا گذر رہی ہوگی۔

برآمدے کی چھت میں چڑیا کا گھونسلا ہے۔ کچھ روز ہوئے چڑیا نے انڈے دیئے۔ نر اور مادہ باری باری انڈے سیتے رہے۔ پھر انڈوں سے بچے نکلے۔ جس طرح دونوں بچوں پر نثار ہوتے ہیں بس میرا ہی دل جانتا ہے۔ گھر میں پھولوں کے گملے رکھے ہیں۔ کبھی کبھی خوبصورت پروں والی تیتریاں اُن سے بوس و کنار کرنے لگتی ہیں۔ جب تیتری کسی پھول پر بیٹھتی ہے تو وہ خوشی سے جھومنے لگتا ہے لیکن جب وہ اُٹھتی ہے تو فرطِ الم سے گُل کی ٹہنی جھک جاتی ہے۔ لیکن افسوس! میری خوشیوں کا چمن ہمیشہ اجڑا ہی رہیگا۔

جمیلہ! میں ان مسرتوں سے محروم تو ہوں لیکن ان بیزبانوں کو ایک دوسرے سے محبت کرتے دیکھ دیکھکر میں بھی دل سے پوچھا کرتی ہوں کہ آخر میں نے کونسا ایسا گناہ کیا جس کی پاداش میں قسامِ ازل نے میرے لئے تڑپنا ترسنا اور آہیں بھرنا لکھدیا۔ ادھر تمہارے دولھا بھائی ہیں، جو بظاہر میری مصیبت سے بالکل بے پروا نظر آتے ہیں۔ میرے شوہر تو وہ بیشک ہیں لیکن خدا کی قسم! میری نگاہ میں اس شخص سے زیادہ ظالم، سفاک اور گنہگار اور کوئی نہ ہوگا۔ تم سوچو تو سہی کہ جس شخص کو قدرت نے شوہر بننے کے قابل ہی نہیں بنایا۔ اُسے کیا حق تھا کہ وہ ایک بیگناہ عورت کی زندگی تباہ کرتا۔ تم مجھے اتنا تو بتلاؤ کہ میں اپنے والدین کو کوسوں یا اس سوسائٹی پر لعنت بھیجوں یا اپنے ملک کے رسم و رواج کا ماتم کروں۔

شوہر میاں کے التفات میں تو کوئی فرق نہیں۔ لیکن تمہارے ہی سر کی قسم جمیلہ! میں اس زندگی سے بیزار ہو چکی ہوں۔ اب میرے دل میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ سوسائٹی کے پاس میرے درد کا کوئی علاج نہیں۔ اور رسم و رواج نے مجھے کچھ اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ لبِ فریاد وا کرنا بھی میرے لئے حرام ہے۔ والدین نے جس جہنم میں مجھے جھونکنا تھا وہ جھونک چکے۔ ملک کا تمدن اور شاید قانون بھی میری دستگیری نہیں کر سکتا۔ رہا مذہب! تو اسے تو ہم لوگوں نے پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ اور جو میں کہیں انصاف کیلئے آواز اُٹھاؤں بھی تو خاندان کے ننگ و ناموس پر حرف آتا ہے۔ اری جمیلہ! کتنا ظلم ہے کہ ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لیکن تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ میں اِس ظلم کے خلاف آواز اُٹھاؤں۔ اور اس شخص سے اپنی مسرّتوں، ارمانوں، امیدوں، تمنّاؤں اور جذبات کی بربادی کا انتقام لوں جو ان تمام مصائب کا ذمہ دار ہے۔ موت! ایک بہت ڈراؤنی چیز ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو انسان کے درد کا درماں صرف موت ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی موت کا کیوں سامان کروں۔ اور اس ظالم کو موت کے گھاٹ کیوں نہ اتاروں جس نے محض دنیا کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے یا ہم چشموں میں آبرو رکھنے کے لئے مجھے حرص و ہوس کا شکار بنایا۔ میرے پاس زہر بھی ہے۔ اور ان کی میز میں پستول بھی رکھا رہتا ہے۔ نہ زہر پینا مشکل اور نہ پستول کی لبلبی دبانا کٹھن۔ رہی یہ بات کہ میں زہر کا پیالہ پی کر زندگی کے اس جانگسل عذاب سے نجات حاصل کروں گی یا میری زندگی تباہ کرنے والا گولی کا نشانہ بنے گا اسکے لئے مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے صبر و تحمّل کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے۔ بس ذرا سی ٹھیس یہ چھلکا دیگی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن اس اندھی دنیا کی آنکھیں تو شاید کھل جائیں۔

پیاری جمیلہ! اب تم سے رخصت چاہتی ہوں۔ اگر میں اس دنیا سے نامراد گئی تو اپنی دعاؤں میں مجھے بھی شامل کر لیا کرنا۔

تمہاری بدنصیب

رشیدہ۔

ایم۔ اسلم

کیوں جگاتی ہو مجھے بہرِ نماز؟

آہ نکہت کیوں جگاتی ہو مجھے بہرِ نماز؟
آہ نکہت کیوں بلاتی ہو مجھے بہرِ نماز؟
مجھ سے کیوں کہتی ہو اب اُٹھو سحر ہونے کو ہے
چہرۂ خورشید منظورِ نظر ہونے کو ہے
کروٹیں لیتی ہے خوشبو پھول کی آغوش میں
نیند سے بیہوش کلیاں آ رہی ہیں ہوش میں
دھو رہی ہے صبح اپنے منہ کو آبِ نور سے
اُٹھ کے دیکھو وہ حسیں بے آسماں کی حور سے
کر رہی ہیں رقص گلشن میں خوشی سے ڈالیاں
لے رہے ہیں داد نہریں پتے بجا کر تالیاں
بارگاہِ ایزدی میں اٹھ کے سر اپنا جھکاؤ
بھول جاؤ ہاں خیالِ ماسوا کو بھول جاؤ!

آشنائے حاصلِ ذوقِ عبادت میں بھی ہوں
اِس اسیرِ لذّتِ شوقِ عبادت میں بھی ہوں
لیکن اپنے سر کو جب سجدے میں جھکاتا ہوں پھر
سامنے صورت تمہاری جلوہ گر پاتا ہوں میں
اِس جہاں میں جلوہ فرما ہو تمہیں تم سو بسو
ہر گھڑی ہر آن ہر ساعت ہو میرے روبرو
خالقِ مطلق کے آگے سر جھکاؤں کس طرح
تم کو اپنے من کے مندر سے اُٹھاؤں کس طرح

خوف ہے مجھکو کہ حاصل بندگی کا کھو نہ جائے
گر لئے سجدہ کروں سجدہ تمہیں کو ہو نہ جائے

مہدی علیخاں

چمکتی ہوئی

(۱)

میں اور رحمت ڈرائنگ روم کے کونے میں بیٹھے چاء پیتے تھے کہ برابر کا پردہ ہلا۔ رحمت نے کہا "کون ہے.... موتی.... آؤ...." موتی آتے آتے رُک گئی۔ رحمت نے چاء کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔ "ہیں... ارے! ان سے پردہ! اندھی کہیں کی.... آؤ.... بھائی سے پردہ!" اور ایک پھول سا مسکراتا ہوا چہرہ کھل کر رہ گیا۔ مجھے سلام کیا۔ میں نے کہا "اچھی ہو؟ پانچ سال بعد ملیں.... رحمت! جب تو یہ چھوٹی سی تھی...." اور میں نے دیکھا کہ موتی کے خوبصورت چہرے پر پھول سے برسنے لگے۔ اور ہم اس پیاری صورت کو دیکھتے رہے۔ دل میں سوچے کہ جلدی سے بی۔ اے۔ پاس کر کے نوکر ہو جائیں پھر دیکھا جائیگا! جی ہاں۔ دیکھا جائیگا۔

(۲)

ہم دونوں بورڈنگ کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔

ڈاکیہ نے لاکر رحمت کو خط دیا۔ رحمت نے خط پڑھکر کہا "ارے یار غضب ہو گیا! ڈھینڈس کے ساتھ موتی کی شادی ہو رہی ہے" اور میرے اوپر بجلی سی گری! یہ ڈھینڈس رحمت کا بہت دور کا رشتہ دار تھا۔ ایف۔ اے میں تین دفعہ فیل ہو گیا پھر آوارہ گھومنے لگا۔ کوئی پوچھے تو کہدیتا ولایت جاؤنگا کسی سے کہہ دیا پرائیویٹ امتحان دونگا۔ صورت ایسی گھناؤنی کہ جیسے سور۔ موٹا، بھدا، کالا، مگر روپے والا۔

رحمت نے کہا "یہ شادی ہم ہرگز نہ ہونے دینگے...."

میں دل میں بہت خوش ہوا۔ ہم ڈھینڈس کی صورت سے جلتے تھے۔ ہمیشہ ہم سے لڑتا۔ ہم نے اُس کی گھناؤنی صورت کی وجہ سے اس کا نام ڈھینڈس رکھدیا تھا۔

(۳)

رحمت نے کہا "اب کیا ہو؟"

میں نے کہا "صبر!"

کہنے لگا "ہرگز نہیں"

میں نے پوچھا "پھر کیا کروگے؟"

بولے "زنانے میں گھُس کر خود موتی سے ملیں گے"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

بولے "اُس سے کہدیں گے کہ جب نکاح کے وقت لوگ پوچھیں تو انکار کر دینا۔ "ہاں" کے بدلے "نہیں" کہدے اور جان چھوٹتی ہے"

میں نے کہا "زنانہ میں کیسے گھُس چلوگے؟ پہرہ ہے۔ سینکڑوں مہمان......"

رحمت نے کہا "تم میرے ساتھ چلو ہم گھُس جائیں گے"

(۴)

ہم دونوں نے کواڑوں کو زور دیتے ہوئے کہا "ہم توڑ ڈالیں گے" جواب میں اندر سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ چھ سات تھیں سب نے زور لگایا۔ ہم ہار گئے اور انہوں نے چٹخنی لگادی۔ رحمت نے دیوار کے پاس کُرسی رکھی اور چڑھ گئے اور میں بھی چڑھ گیا۔ جھٹ سے اندر دونوں کُود پڑے اور لپکے جو کمرے کی طرف تو ایک عورت نے بڑھکر کہا "ارے اُدھر پردہ ہے!" مگر ہم کمرے میں گھُس گئے اور دوسرے دروازے سے پردے والی لڑکیاں اور عورتیں بھاگ گئیں۔ لپک کر ہم سامنے والے کمرے میں گھُسنا چاہتے تھے کہ ایک کشیدہ قامت سرو قد، نو عمر لڑکی نے دروازہ روک لیا۔ ایک بجلی سی چمک گئی۔ بجلی کی روشنی میں دمکتی

موتی تصویر! جب کہ یہ ذرا خفگی مگر جیسے چاندنی کھلی ہو! اس نقش و نگار کو ہم دیکھتے رہ گئے۔ چونکے۔

رحمت نے کہا: "آپ کون ہیں؟"

وہ بولی: "آپ کہاں جاتے ہیں؟"

رحمت نے کہا: "موتی کے پاس۔"

"نہیں جا سکتے۔"

"کیوں؟"

"میں آپ کو روکنے آئی ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ موتی آپ سے [illegible]"

"بالکل غلط۔"

"بالکل [illegible] یہ اپنے والدین کا کہنا نہیں مانیں گے؟"

رحمت نے کہا: "انہوں نے کہہ دیا کہ تم جانو [illegible]"

وہ بولی: "اور اگر یہ شادی خود اسے پسند نہ ہو؟"

"کیسے؟"

"ہونی کو ..." مسکرا کر وہ بولی۔ آنکھوں میں کیسی چمک!! چہرے پر کیسا نور! میں تو اس دلکش تصویر کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"ضرور۔" رحمت نے کہا: "کیوں نہ ہو ..... یہ ہیں کون؟"

"آپ کی ایک بہن ... آپ مجھے خوب جانتے ہیں مگر کبھی دیکھا نہیں تھا۔"

"پھر بھی۔"

"آپ کی بہن کی بہن .... آپ کی بہن ..."

"تو راستہ چھوڑ دیجیے۔" رحمت نے تنگ آ کر کہا۔

"ہرگز نہیں۔"

رحمت نے میری طرف دیکھ کر کہا: "یہ یوں نہیں مانیں گی۔"

میں نے کہا: "پھر؟"

"یہ بہن ہیں نا ......"

وہ بولیں: "جی ہاں۔" مسکراہٹ میں بجلیاں۔

رحمت نے ان سے میری طرف انگلی اٹھا کر پوچھا: "آپ انکو جانتی ہیں؟"

مسکرا کر بولی: "خوب اچھی طرح۔"

"دیکھو جی۔" رحمت نے مجھ سے کہا: "یہ بہن ہی تو ہیں جیسے موتی ویسے یہ ....."

بات کاٹ کر وہ چمک کر بولی: "اور کیا ....؟"

"تو ان کو گلے لگا لو۔" رحمت نے کہا۔

میں تو منتظر ہی تھا۔ اور شاید کہنے سے پہلے ہی جھپٹ پڑا۔ اور پکڑا ہی تھا کہ انہوں نے تڑپ کر وہ گئیں! ہاتھوں میں سے نکل گئیں۔ اور میرے منہ سے نکلا "چمکتی ہوئی!"

راستہ صاف اور ہم دونوں جھٹ سے موتی کے کمرے میں گھس گئے۔ دلہن کا کمرہ! وہاں یہ دوسری طرف سے آکر موجود تھیں۔ بہت خفا مگر بے حد خوبصورت۔ پہلے مجھے معافی مانگنی پڑی کہ "چمکتی ہوئی" کیوں کہا۔ میں نے اپنی غلطی مان لی اور کہا کہ "اچھا جناب بے چمکتی ہوئی سہی۔ منہ سے نکل گیا۔ معاف کیجئے۔ مگر میں نے آپ کو نہیں کہا تھا۔"

وہ خاموشی کے ساتھ نیچے دیکھنے لگیں۔

(۵)

موتی نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا اور روئے چلی جاتی تھی۔ ہماری بات کو سنا تو جواب ندارد۔ کوئی جواب ہی نہیں۔ ہر طرح سمجھایا: "اندھی ہو گئی ہے۔ ایسے گدھے سے شادی ہوئی جاتی ہے۔" رحمت نے کہا۔ مگر وہ اسی طرح رو رہی تھی کہ انہوں نے کہا: "ایسے گدھے ہی پسند ہیں۔"

رحمت نے کہا: "ناممکن۔"

انہوں نے موتی سے ڈانٹ کر کہا: "کہہ کیوں نہیں دیتی صاف صاف کہ میری مرضی کی شادی ہو۔"

وہ چُپ رہی۔

اُنہوں نے پھر جھڑک کر کہا "کمبخت کہدے صاف کہ جاؤ"

اور موتی نے اسی طرح منہ چھُپاتے کہا "آپ بیٹھے بیٹھیے"

"تیری مرضی کی ہے نا؟" وہ بولیں۔

رحمت نے کہا "موتی بولو..."

"جی..." موتی نے آہستہ سے کہا۔

ہم دونوں پر ایک بجلی سی گری اور انہوں نے مسکرا کر کہا

"کہیئے!... اب آپ دونوں حضور یہاں سے جائیے..."

میں نے پوچھا "آپ کا نام؟"

مسکرا کر بولی "آپ کو معلوم ہے۔ خوب جانتے ہیں"

"تو بتاؤ تو"

"بتاؤں کیسے؟" انہوں نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا "میرا آپکا پردہ ہے"

(۶)

دو سال بعد

کپڑوں کی چمک! خوشبو! پھولوں کی مہک! کمرے میں کوئی اور نہیں تھا بجلی کی تیز روشنی میں... میں نے خوشی کے لہجہ پر پرانا جملہ دہرایا... "چمکتی ہوئی!"

پہلے تو میں نے زور سے گدگدایا۔ پھر منہ کھولتے ہوئے کہا "میرا آپ کا پردہ نہیں ہے"

(۷)

چار مہینے بعد کا ذکر ہے

سیتے کی جوان اور سہاگن کی لاش پر بنارسی دوشالہ ڈالو!

قبرستان کا منظر!... ٹوٹی ہوئی قبریں! جھکے اور ٹوٹے ہوئے پتھر! اور میں نے خاموشی سے آنسو بہاتے ہوئے بائیں طرف دیکھا۔ ایک قبر میں سوراخ تھا اس میں سے کوئی جانور جھانک رہا تھا کہ غائب ہو گیا۔ میں لرز گیا میں نے بنارسی دوشالے کو دیکھا۔ چپکے سے دل نے کہا "چمکتی ہوئی!"

جنازہ قبر میں رکھا گیا اور قبر کو ڈھکنے سے پہلے رشتہ دار آگے بڑھے کہ آخری دیدار کر لیں۔ میں بھی آگے بڑھا ایک بڈھے رشتہ دار نے محبت سے مجھے روکا اور بولے "مرنے کے بعد تمہارا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ تمہاری کوئی نہیں۔ تمہارا اور اس کا پردہ ہے!!!"

(۸)

ایک دوست کچھ عرصے بعد ملے کہنے لگے "سنا تھا تمہاری شادی ہوئی۔ بیوی کہاں ہیں"

میں نے کہا "پردے میں" اور دو آنسو چپکے سے میری آنکھوں سے نکلے تھے جیسے چور کہ میں نے ان کو... ایک ٹھنڈی سانس لی میں نے اور میرے ہونٹوں کو جنبش سی ہوئی... "چمکتی ہوئی"

عظیم بیگ چغتائی

ایک ایکٹ کا ڈرامہ۔

طوطا

منظر۔ ایک غریب کا گھر۔ گھروالی پنجرے کے سامنے کھڑی طوطے سے باتیں کر رہی ہے۔

عورت۔ کیسا بچارا چپ چپ بیٹھا ہے! انہوں نے ایک روپے میں تجھے بازار سے خریدا ہے۔ ایک روپے میں! اور اُس ذرا سے چاندی کے گول ٹکڑے نے تیری آزادی چھین لی! آسمان پر اُڑنے اور پَروں کی جُنبش کا مفہوم تجھ سے چھن گیا۔ سناٹے اور بہتے ہوئے چشموں کا شفاف نیلا پانی اور پھلوں سے لدے ہوئے درخت سب تجھ سے چھن گئے! اے ہے۔ بچارا کیسا پھڑپھڑا رہا ہے! کیسی بے بسی میں سر ٹکرا رہا ہے! تیری روح کی زبان بند کر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی تو اپنے جوڑے سے الگ کر کے قید کر دیا گیا ہے! تیری آنکھیں کس قدر غمناک ہیں! اے خوبصورت ہرے پرندے! تو کس مایوسی سے پھڑپھڑا رہا ہے! تو آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے؟ لیکن یہ سب بے سُود ہے۔ کسی نے تجھے ایک روپے میں خریدا ہے.... کیا؟ کیا؟ کیا میں بھی تجھ جیسی ہوں —— تیری طرح پنجرے میں بند!

(بیٹا داخل ہوتا ہے)

بیٹا۔ ماں! ماں!

عورت۔ میرے موتی! میری جان! میرے من کے بھید!

بیٹا۔ ماں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں بادل ہوتا اور ہواؤں میں اُڑتا اُڑتا اُن کالے پہاڑوں کے پیچھے پہونچ جاتا۔

عورت۔ (پیار کرکے) ہاں، ہاں۔ ٹھیک ہے۔

بیٹا۔ جی چاہتا ہے میں مینہہ ہوتا۔ درختوں کے پتّوں کو دھوتا۔ میں نیلی کہر ہوتا۔ پیلے رنگ کی چڑیا ہوتا اور لال لال پھول ہوتا۔ جی چاہتا ہے بجلی ہوتا۔ بس بجلی کی ایک لکیر.... ماں —— ہرا ہرا کھیت ہوتا۔

عورت۔ ہاں ہاں میرے چاند۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ بن جائیں جو ہم نہیں بن سکتے۔

بیٹا۔ اچھی ماں۔ میرا جی کیوں چاہتا ہے کہ میں دھنک بن جاؤں اور جگنو بن جاؤں اور سمندر پر چاند بنکر چمکنے لگوں؟۔

عورت۔ میری ننھی سی جان، کبھی ایسا ہوگا کہ یہ سارے خوبصورت روپ تمہارے ہو جائیں گے۔

بیٹا۔ اچھا ماں تو پھر میں ڈر دبھری خوبصورت آنکھوں والا کتّے کا پِلّا ہی ہوتا جیسا پتاجی نے آج صبح اپنی بندوق سے مارا تھا، اور پھر لال لال آنکھیں کئے گھر آئے تھے۔ ماں، کیا پتاجی کی آنکھیں تم جیسی نہیں ہیں؟ تمہاری آنکھیں تو ٹھنڈی ہیں جیسے شام کو تالاب کا پانی۔ پتاجی کی آنکھیں لال اور دہکتی ہوئی ہیں جیسے چتا۔ پتاجی نے میرے چھوٹے سے پلّے کو بندوق سے کیوں مار دیا!

عورت۔ میرے بچّے اُسے بھول جا۔ آ میں تجھے پیار کرلوں۔

بیٹا۔ ماں۔ دیکھنا جب پتاجی تمہیں پیار کرتے ہیں تو تمہارے دُکھ ہونے لگتا ہے؟۔

عورت۔ شی۔شی.... اچھا سُنو.... کل دیوالی کا تہوار ہے۔ ہم ایک چھوٹا سا مٹّی کا قلعہ بنائیں گے... اور پھر ہم...

بیٹا۔ ماں، میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔

عورت۔ میرے تارے۔

بیٹا۔ مگر مجھے پتاجی سے نفرت ہے۔

عورت۔ میری جان کل ہم دیوالی میں سَو دیوے جلائیں گے۔

(مرد داخل ہوتا ہے۔ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا)

مرد۔ کیا تُو نے کہا تھا کہ کل دیوالی ہے؟ ہا ہا ہا۔ پاگل کہیں کی۔ تو

نشے میں ہے۔ دیوالی آج ہے۔ گھر میں جتنے چراغ ہیں سب جلا دے۔ اور دیکھ اگر میری آنکھوں کو ان سے تکلیف پہونچے تو سب کو غارت کر دے۔

عورت۔ تم ہمیشہ اس قدر پی کر گھر کیوں آیا کرتے ہو!۔

مرد۔ میں اپنے ہوش میں صرف اس وقت ہوتا ہوں جب میں پیا ہوا ہوتا ہوں۔ جبھی مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کیوں پیدا ہوا تھا۔ عورت کیوں ایجاد کی گئی تھی۔ میرے ہاتھ کیوں مضبوط ہیں اور تیرا منہ کیوں ملائم ہے!

بیٹا۔ ماں ماں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔

مرد۔ (بچے کے پاس جا کر اس کا منہ سونگھتا ہے) خدا تجھے غارت کر دے۔ تیرے منہ میں سے کیسی بو آ رہی ہے! اچھا تو تو چھپ چھپ کر پیتا ہے؟ کیوں بے کتے کے پلے! جبھی تو چاہتا ہے کہ ٹھنڈا ہوتا۔ یہ ہوتا، وہ ہوتا۔ چھوٹے شرابی! تیری ماں اسے شاعری کہتی ہے! تیری ماں کہتی ہے کہ تو شاعر ہے۔ ابے دھاڑی شراب خور۔ تیرا منہ سڑ رہا ہے۔

عورت۔ اسکے نہیں تمہارے منہ میں سے بو آ رہی ہے۔

مرد۔ تو نہیں جانتی کہ کیا بک رہی ہے۔ کیا کوئی بھی عورت جانتی ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے؟ آؤ بیٹے میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہارا منہ نمک کے پانی سے دھو دوں۔

عورت۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

مرد۔ تو نے اسے خوب برداشت کر لیا تھا۔

عورت۔ جا سو جا۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ کل رات بھر تیری پلک تک نہ جھپکی۔

مرد۔ کیوں نہیں سویا شیطان؟ رات تو سونے ہی کے لئے بنی ہے۔ یہ بدمعاش اندھیرے کو برا کہتا رہتا ہے.... اندھیرے سے ضد کرتا ہے... رات بھر جاگ کر اس کی توہین کرتا ہے... گدھا کہیں کا.... کیوں نہیں سویا رات کو؟

عورت۔ تم جو..... رات بھر ہم تمہارے انتظار میں جاگتے رہے۔ آدھی رات کو ہمارے دروازے کے سامنے سے ایک مردہ گیا جس کے ساتھ لوگ بھیانک آوازیں لگاتے جا رہے تھے۔ یہ ابھی ڈر کے مارے سہم گیا۔ اور تم اب صبح ہوتے چلے آئے ہو۔

لڑکا۔ ماں۔ اب میں سوتا ہوں۔

مرد۔ ابے او کاہل لڑکے۔ میرے ساتھ چل سمندر میں نہانے۔ آ جا۔ بیٹا ہم خوب گہرے پانی میں غوطے لگائیں گے۔ تیرے گرم گرم بدن کو موجیں پیار کریں گی۔ بیٹا وہ جن کالا کالا لگ... پانی تیری سیاہ آنکھوں کو چومے گا۔ (بچے کو زور سے پیار کرتا ہے) آ۔ ہم آج شام کو نہائیں گے جب سورج ڈوب جائیگا۔ جب سورج ڈوب جائیگا۔

عورت۔ آج شام کو نہیں۔ آج شام کو نہیں۔ کل سہی کل۔

مرد۔ "کل" تو کوئی چیز ہی نہیں۔ "کل" ایک احمقانہ جھوٹ ہے۔ "آج" حقیقی چیز ہے۔ وہ اب ہے۔ یہاں ہے۔ یہاں کیا آج کو تو نہیں دیکھ رہی۔ محسوس نہیں کر رہی؟ آہ! شام کی روشنی شراب جیسی ہے۔ شراب۔ تھوڑی سی شراب اور۔

(اپنی جیب میں سے بوتل نکال کر پیتا ہے)

عورت۔ ہے۔ ہے پرماتما! یہ کیوں پیتے ہیں؟

مرد۔ ہر چیز نشے میں ہے۔ میز نشے میں ہے، دیوار، فرش، چھت.... سب نشے میں ہیں۔ کیوں، تمہارے سیاہ بال نشے میں ہیں۔ اور ایشور خود نشے میں ہے! اس کے نشے میں ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مینڈک، بچھو، سانپ، دریائی بچھڑے، گینڈے، سیلاب، کال، مندر، مہنت، مہاجن اور بڑھتے ہوئے قرضے کا وجود ہے۔ اس کا ذمہ دار نشے میں ڈوبا ہوا ایشور ہے۔ ہاں ایشور نشے میں ہے۔ بالکل بیہوش۔ انسانی خون پی کر وہ بیہوش ہو گیا ہے۔

(چیخیں مار مار کر روتا ہے۔ پھر زور سے قہقہے لگاتا ہے)

عورت۔ نہیں۔ آج شام کو اسے اپنے ساتھ مت لیجاؤ۔ ایشور کے لئے میں تم سے بنتی کرتی ہوں کہ اسے اپنے ساتھ مت لیجاؤ۔

سمندر بڑا ہتیا کاری ہے۔

مرد۔ بیٹا تیرا جی چاہتا ہے کہ سمندر بن جائے؟ ہا ہا ہا! کیسا ٹھنڈا اور نیلا اور پُر اسرار۔

بیٹا۔ ہاں۔ ہاں۔

عورت۔ بچّے کو نیند آرہی ہے۔

مرد۔ موجیں جاگ رہی ہیں۔

(بچّے کو لیکر باہر چلا جاتا ہے)

عورت۔ (طوطے سے) پنجرے میں بند بے بس پرندے! تیرے لئے پنجرا ہے اور میرے لئے قسمت۔ دونوں کس قدر تنگ و تاریک اور اجیرن ہیں۔ (دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز) کون ہے؟

جہاں گرد۔ دروازہ کھولو۔

عورت۔ تم کون ہو؟

جہاں گرد۔ میں ایک جہاں گرد ہوں۔

عورت۔ گھر کا مالک باہر گیا ہوا ہے۔ پھر آنا۔

جہاں گرد۔ ہم سب گھر کے مالک ہیں.... جسے دنیا کہتے ہیں۔ دروازہ کھولو۔

عورت۔ (چراغ جلانے اٹھتی ہے) ٹھہرو، میں چراغ جلا لوں (چراغ جلاتی ہے) یہ کس کی آواز تھی؟ کیا چراغ بجھ گیا؟ نہیں۔ ایک خواب سا تھا۔ (دروازہ کھولتی ہے) اندر آجاؤ لے بے۔ تم تو بڈھے تھکے ہوئے اور بھوکے نظر آتے ہو۔

جہاں گرد۔ میں بڈھا ہوں۔ تھک کر چُورا ہو رہا ہوں۔

عورت۔ بچارا غریب۔

جہاں گرد۔ تمہیں مجھ پر اب بھی ترس آتا ہے؟

عورت۔ اب بھی ترس آتا ہے؟... تم کون ہو؟

جہاں گرد۔ تم نے مجھے نہیں پہچانا!

عورت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے بہت دن بیت گئے.... تمہاری آواز جانی پہچانی ہے۔ مگر میں تمہیں نہیں جانتی۔

جہاں گرد۔ نہیں پہچانا تم نے؟

عورت۔ نہیں۔

جہاں گرد۔ تمہاری بھول پر میں تمہیں دوش نہیں دے سکتا، کیونکہ میرے بال برف جیسے سفید ہو گئے اور تمہارے ابھی تک شبِ تار کی طرح ہیں جو اپنے جلو میں سپیدۂ سحر لئے ہو۔ میری آنکھیں زرد اور مُردہ اور سرد ہیں.... اور تمہاری ابھی تک جوان اور موسمِ بہار کی آرزو سے لبریز۔

عورت۔ تم کون ہو۔

جہاں گرد۔ میں وہ پہلا شوریدہ سر ہوں جس نے تمہارے آستانہ نسوانیت کو سجدہ گاہ بنایا۔ کچھ عرصے کے لئے میں تمہارا پوشیدہ مہمان تھا۔ اور پھر ہم جدا ہو گئے۔ میں اب تمہارے پنجرے کی سلاخیں توڑنے کے ارادے سے آیا ہوں۔

عورت۔ میرے پنجرے کی سلاخیں؟

جہاں گرد۔ کئی راتیں ہو گئیں، میں روزانہ تمہاری چیخیں سنتا ہوں۔ وہ بزدل جسے قانون تمہارا شوہر کہتا ہے، اُس نے ایک دفعہ تمہارے ایک چھُری پھینک کر ماری۔ مگر تم بال بال بچ گئیں تاکہ کچھ عرصے تک اور اُس کے کھیل کا نشانہ بنتی رہو۔ مجھے معلوم ہے کہ اُسنے تمہاری چوڑیاں توڑ کر تمہاری کلائی میں سے خون بہایا۔ او خدا! او خدا! اِس کل عرصے میں میں تم سے محبت کرتا رہا۔ اور اب میں آیا ہوں آیا ہوں کیونکہ وہ وقت آگیا ہے کہ میں تمہارے پنجرے کی سلاخیں توڑ دوں اور تمہیں صاف کھُلے آسمان میں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ جہاں میرے ساتھ تم روشنی اور آزادی کے گیت گا سکوگی۔

عورت۔ میں نہیں آسکتی۔۔۔ ابھی اِسی وقت۔۔۔ میں نہیں آسکتی، نہیں آسکتی۔

جہاں گرد۔ مجھے اب جانا چاہیئے۔ مگر دیکھو جب کبھی تمہیں ضرورت

ہو تو مجھے بلانا نہ بھول جانا۔ مَیں سڑک کے اُس پار رہتا ہوں۔ سامنے وہ جو ایک چھوٹی سی کٹیا ہے، اُس میں۔

عورت۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔ مجھے تم سے ایک راز کہنا ہے۔

جہاں گرد۔ مجھے فوراً چلا جانا چاہیئے۔

عورت۔ ٹھہر جاؤ۔ بچے کو دیکھ کر جانا۔ وہ بڑا خوبصورت، اور بڑا شاندار بچہ ہے۔ بڑی بڑی آرزوئیں اُس کے دل میں بھری ہوئی ہیں۔ جیسے بادل بن کر تیرتا پھرے، چڑیا کی طرح اُڑتا پھرے۔۔۔ گھومتا رہے، گھومتا رہے اور گھومتا گھومتا کہیں سے کہیں نکل جائے اور جہاں گرد بن جائے۔

جہاں گرد۔ ایشور اُس پر اپنی دیا کرے۔

(باہر چلا جاتا ہے)

عورت۔ (دروازے میں کھڑی رہتی ہے۔ مرد داخل ہوتا ہے۔۔۔ زور کا قہقہہ لگاتا ہے) بچہ کہاں ہے؟

مرد۔ سمندر سے پوچھو۔

عورت۔ کیا!

مرد۔ بچے کیلئے سمندر کی محبت تیری محبت سے زیادہ تھی۔ اے عورت! کیسا عجیب وغریب نظارہ تھا وہ!

عورت۔ بچہ کہاں ہے؟

مرد۔ موجیں اُس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں، تالیاں بجا رہی تھیں، اور ہوائیں پرندوں کی طرح سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ اور موتی آنکھوں کی طرح تہ میں سے اُچھل اُچھل کر اوپر آرہے تھے۔ ہے ایشور! کیسا نظارہ تھا وہ! عورت! ٹھنڈا پانی جب اس کے جسم کو اپنی گود میں لے رہا تھا تو بچہ خوش ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "پتاجی تم گھر جاؤ۔ میں جل پریوں سے کھیلوں گا" جل پریوں کا بادشاہ اُچھل کر اوپر آیا اور غوطہ مار کر اُسے اپنے ساتھ سمندر کے اندر لے گیا۔ اے عورت! کیسا عجیب وغریب نظارہ تھا وہ!

عورت۔ کیا! تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ سچ مچ ڈوب گیا؟ میرا بچہ۔ میرا بچہ! کہاں ہے میرا بچہ؟

مرد۔ وہ کل واپس آجائیگا دیوالی کے تہوار کیلئے۔ ہا ہا ہا!

عورت۔ کیا وہ ڈوب گیا؟

مرد۔ دیکھ عورت، سُن۔ مَیں تجھے سچ سچ بتاتا ہوں۔ سفید سچ۔ دنوں میں نے اُس بیوقوف کو آپ ہی آپ باتیں کرتے سنا ہے۔ کبھی کچھ بننا چاہتا تھا کبھی کچھ۔ شرابی کی طرح بڑبڑایا کرتا تھا۔ ہاں، وہ تو خُون میں ہے۔ میرا پردادا شرابی تھا۔ میرا دادا شرابی تھا۔ میرا باپ شرابی تھا۔ مَیں شرابی ہوں۔ پانچ پیڑھیوں سے یہ خُون میں ہے۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا بھی شرابی بنے۔ اس لئے مَیں اسے پکڑ کر سیدھا سمندر کی طرف لے گیا اور اُسے ڈبو دیا۔

عورت۔ احمق۔ وہ تیرا بیٹا نہیں تھا!

(جہاں گرد خاموشی سے داخل ہوتا ہے اور شرابی کو گھورتا ہے۔)

(پردہ)

(ہرندرناتھ چٹوپادھیا) مترجمہ۔ شاہد احمد

اُف یہ بچّے

میں نے سجے سجائے کمرے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ذرا پرے ہٹ کر اس چوکی پر بیٹھ گئی جسے میں نے چادر منڈھ کر نہایت فیشن ایبل "دیوان" میں تبدیل کر دیا تھا۔ دو ایک کشن ادھر اُدھر کئے اور پردوں کی چنٹ کو پھر سنوارا۔ آرام کرسیوں کو ذرا پوربی کھڑکی کی طرف سرکایا اور میز پوش کے کونے ذرا اور نیچے کھینچ دئے۔ اب مس قلب نہیں ان کے فرشتے بھی بے کہے سُنے آن دھمکتے تو مجھے خوف نہ تھا۔

دوپٹہ اتار کر کرسی کے ہتے پر ڈال دیا اور رسالوں کے انبار میں سے کرید کر ایک موٹا سا باتصویر رسالہ نکال لیا اور احتیاط سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ مادھوری کی دلکش آنکھیں... دیوکا رانی کا چھلّوں دار جوڑا — مسز سروجنی نائیڈو کا شاندار بازو — ہر ہٹلر کی دلفریب موچھیں — غنودگی کی وجہ سے ذرا دُھندلی دُھندلی نظر آنے لگیں — خاؤ! میں نے جمائی کو روک کر اُن پانچ توام بچوں کے چو کھونٹے چہروں کو دیکھا جو ڈبّوں کی طرح ایک قطار میں آراستہ تھے۔

"پانچ!" میں نے چپٹی ناکوں کو چھنگلیا سے گنتے ہوئے سوچا۔ "ایکدم!" دوسرا خیال آیا۔ "شاباش ہے بچّی تیرے جیوڑے پر! تیرا ہی بوتا تھا۔ کوئی اور وال کی ہوتی تو سانس بھی نہ لیتی۔" پانچ۔ پورے پانچ۔ معجزہ ہے۔

قدرت سے بھول ہو گئی۔ کچھ ہاتھ بہک گیا — سُنتے ہیں ایک بھینس کے کبوتر کے بچّے پیدا ہوئے! کیا خبر ہن سنتے ہیں۔ آج کل یہ آنکھوں کے نور دل کے سرور کچھ اسی شان سے نزول فرما رہے ہیں۔ بھئی بچوں کے دم سے ہی گھر کی رونق ہے — برداشت پر ہلکی سی کھسر پھسر ہوئی اور مجھے چونکنا پڑا۔ جب سے چنو کی کتیا نے بچے دئے تھے، ہمیں ذرا ہوشیار ہی رہنا پڑتا تھا۔ گھر کے ہر کونے میں موٹے موٹے پلے "کوں کوں" کرتے پھرتے تھے۔ ناک میں دم تھا۔ کبھی برتنوں کی ڈلیا میں سو رہے ہیں۔ تو کبھی سل پر چھچھلیاں کھیلی جا رہی ہیں... تو کبھی میلے کپڑوں پر کشتی ہو رہی ہے — تو کبھی کچھ! میں نے آہستہ سے دلائی میں منہ چھپا لیا اور ہلکے ہلکے جھک کر جوتا اٹھانے لگی کہ بس آتے ہی دوں ایک کس کے — دروازہ کھلا — پردہ ہلا — میں نے جوتے کو ذرا زور سے دابا — ارے مینو! خیر ہو گئی۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے جوتا چھوڑ کر میں واپس لیٹ گئی۔ مینو جسے میں نے صبح ہی بمشکل کمرے میں سے نکالا تھا — پھر آ گئی — لیکن خیر کیا ہرج ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔ جاگ تو رہی ہوں — کچھ بگاڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ وہ آگے بڑھکر کرسی کی آڑ میں آ گئی۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ نیند نے پھر آنا شروع کیا۔ ایک بچے کی موجودگی میں گو نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بھلا کوئی کیسے سو سکتا ہے۔ وہ بھی ہیں اللہ کی پیاری بندیاں جو کلیجے سے بچوں کو چمٹا کر غافل سو سکتی ہیں — نیند تو سولی پر بھی سنتے ہیں آ ہی جاتی ہے۔ خاموشی برابر طاری رہی۔ غنودگی بڑھکر غفلت میں ڈوب گئی۔

عجب طلسمی آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ "ارے!" یقین مانئے میری گھگی بندھ گئی۔ ایک غیر انسانی ہیولا۔ جو کسی طرح بھی ایک بڑی لومڑی سے اونچا نہ ہوگا، میرے سرہانے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ایک حیرت انگیز قلابازی کھانے کو تیار تھا۔ میرے تعجب سے اُچھلنے پر وہ شے ایک دم کچھ ایسے پلٹی کہ اس کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ٹانگیں مع دو تر بتر جوتوں کے میرے منہ اور تکیہ پر پڑیں۔

"ای ہی ہی تی۔ وہ شے ہنسی۔

"لاحول ولا قوۃ مینو" میں بھی کس قدر ڈرپوک ہوں، میں نے سوچا۔

"اونہوں، اتر نیچے!" میں نے کیچڑ پانی اور صابن میں لتھڑی ہوئی بچی کو نیچے دھکیل کر اتارا۔ ذرا حواس درست ہونے پر کچھ عجیب قسم کی پاؤڈر صابن منجن اور دیگر لوازمات کی بو کیچڑ کی سوندھی خوشبو میں ملکر کمرے کو معطر کرنے لگی۔

اور یہ واقعہ تھا کہ سنگھار میز پانی پت کا میدان بنی ہوئی تھی۔ کریموزون! وہ حیرت انگیز کریم جسے اگر حبشی بھی استعمال کرے تو تین دن میں خاصہ گورا پڑجائے ۔۔۔ جو میں نے ڈھائی روپے خرچ کر کے سپلا کمپنی بمبئی سے دو روز ہوئے منگوائی تھی۔ جسے میں مارے کنجوسی کے صرف گالوں اور ناک پر چپڑا کرتی تھی نہایت دریا دلی سے آئینہ میز اور خود مینو کی تھوتنی پر لپٹی ہوئی تھی۔ دانتوں کے چودہ آنے والے برش سے لوٹ پالش کی شیشی کی زیریں تہ نکال کر کنگھے اور برش پر پوتی گئی تھی۔ "کوٹی" کا بہترین رنگ والا پاؤڈر میز کے اوپر اور چاروں طرف چھڑکا گیا تھا۔ کیوٹکس کی دونوں شیشیاں کہنیوں تک مینو پر روغن کرنے میں خالی کی جاچکی تھیں۔ لیکن جس چیز نے میرا خون خشک کر دیا وہ میرا خوبصورت "ڈچیز سیٹ" تھا۔ جسے میں نے لاہور کی نمائش میں ساڑھے پانچ روپے میں خریدا تھا اور آج ہی مس فلپ کی عزت افزائی کیلئے بچھا دیا تھا۔ صابن منجن اور اُبٹنے میں لتھڑا ہوا نہانے کی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔

سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ مینو میری نظریں بھانپ گئی اور چلی کتراتی ہوئی۔

"ٹھہر تو سوّر یا ۔۔ چلی کہاں؟" میں نے دانت بھینچکر اُسی ہاتھ پکڑکر گھما ڈالا اور ایک میز پر بٹھا دیا جس کا میز پوش وہ پہلے ہی بالٹی میں بھگو آئی تھی۔

"آں ۔۔ چھوڑیے" وہ اترا کر تتلائی۔

"ہوں!" میں نے میز پر سے یہ موٹا سا رول اٹھا کر اُسے دھمکایا "بول اب؟"

"آں ۔۔ ہم دوامی سے کہدینگے" وہ مچلنے لگی۔

"دیکھوں تو تیری دوامی کو" میں نے اُسے گال پکڑ کر پچھاڑا۔

"دوامی دیکھیے ۔۔ آں ہٹ" اُس نے گھونسا دیا۔

"دوامی ۔۔ ی ۔۔ ی ۔۔ دیکھو مار رئیں ہیں!" وہ کچھ اور وصول کرنے سے پہلے ہی چلائی۔

"بھئی کیا آفت ہے ۔۔ کیوں کھائے لیتے ہو میری بچی کو" دوامی کہیں سے چلائیں۔

لے ہے بس آگ ہی تو لگ گئی۔ آ بکے جو وہ ڈکرائی تو ننگے پیر صرف پیٹی کوٹ پہنے دوامی صاحبہ سوتے سے بھاگی آئیں

"سب ہی میری بچی کو مارتے ہیں۔ ہٹو بھی" وہ بھنبھنائیں۔

"ہوں اور یہ تمہاری منحوس بچی چاہے کسی کو قتل کر ڈالے کچھ نہیں" میں نے کہا۔

"واہ میری بچی کیوں ہوتی منحوس۔ آخر بات بھی ہو کچھ"

"یہ ۔۔ یہ کچھ بات ہی نہیں ۔۔ بات ہی نہ ہوئی ۔۔ یہ دیکھو ۔۔ یہ دیکھو" میں نے اشارے سے انہیں وہ دردناک منظر دکھایا۔

"اوئی" وہ مسرت کو دبا کر بولیں "لے ہے" وقت کی نزاکت دیکھکر وہ بے تحاشہ ہنسنے سے باز رہیں۔ جب کوئی کسی کا نقصان کردے۔ بڑے ابا پھسل کر گر پڑیں۔ کسی کے بھڑیں لپٹ جائیں۔ یا اُن کا بچہ کچھ بگاڑ دے تو دوامی کو ہنسی کا دورہ پڑجاتا ہے۔ وہ اپنی ناک پر انگلی رکھکر لوٹ لوٹ جاتی ہیں۔ یہی ہوا کہ وہ کھلکھلائیں اور نہیں سنگی۔

میں آگے بڑھی۔

"اے ہے تو کیا اس ڈنڈے سے مارو گی؟" وہ سیاہ رول

کو دیکھکر کانپیں۔

"ہاں! اور جب یہ ٹوٹ جائے گا تو مسہری کا بانس لیلیں گے"

میں نے اطلاع دی۔

"اے چلو۔ دیوانی ہوئی ہو۔ لاؤ میری بچی کو میں نہلاؤں"

وہ آگے بڑھکر فرمانے لگیں۔

"اب ایکدم ہی آخری دفعہ نہلا لینا" میں نے رول ہلایا۔

"اُس کے دشمن نہائیں آخری دفعہ۔ چلو چھوڑو" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچا۔

"جی نہیں آج اُس پر ٹھیک طرح مار پڑے گی"

"بھلا مارنے سے کیا ہوگا" وہ اتنی پہرے پہ بھولپن لاکر بولیں۔

"ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا"

"خاک پڑے تمہارے کلیجے پر کہ بچی کہ مارنے سے ٹھنڈا ہوگا" وہ بگڑیں۔

اور ہم دونوں مینو کو ہوا میں معلق کر کے اپنی اپنی طرف تاننے لگے۔ وہ بولی "چیں"

"اے چھوڑو میری لونڈیا کا ہاتھ اُتر جائیگا واہ" وہ غرائیں۔

"میری بلا سے ہاتھ ٹوٹ جائے۔ پھر تو یہ میرے کمرے میں نہ آئے گی" میں نے جھنجوڑا۔

"اے بنو تم دام لے لینا۔ کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں"

"کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں" میں نے جلکر منہ چڑایا "کتنے کی بھی تھیں۔ ہم دام نہیں لیتے ہم تو آج اِسے جی بھر کے دھنیں گے یہ آتی ہی کیوں ہے یہاں"

"اللہ اب چھوڑو گی بھی۔ چلو اب وہ تمہارے کمرے میں تھوکے گی بھی نہیں۔ اور بھی کہہ تو دیا دام لے لو اور کیا کروں"۔ دلہن بھابی لاچاری پر اترائیں۔

"دام لے لو۔ دام سے لو بکے جا رہی ہو۔ یہ نہیں دیکھتیں اِسنے کیسا ستیاناس کیا ہے میرے کمرے کا" میں نے نرم ہوکر۔

"اچھا بھئی اب نہیں کریگی۔ ابکے سے جو آجائے تو جی چاہے جتنا مار لینا۔ بس؟"

"اچھا ابکے تو ملزمہ تمہاری ضمانت پر چھوڑی جاتی ہے۔ اگر اس کا چال چلن . . . . "

"ذرا ہوش میں! واہ بڑی آئیں میری بچی کے چال چلن کو کہنے والی ـــ اوئی ٹوٹا میری بچی کا کلا" انہوں نے اُس کا گال میری گرفت سے گھسیٹ کر چھڑا لیا "اب کبھی نہیں آئیگی وہ" انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔

"ہم کبھی نہیں آئیں گے" مینو شیر ہوگئی۔

"ٹھہر تو جا" میں نے رول لیکر دھمکایا اور بھاگیں دونوں بے حیائی سے ہنستی ہوئی۔

اُف یہ بچے! بھلا کوئی کاہے کو سگڑاپا دکھائے! اور کیسے؟ جس اُجڑے گھر میں کچھ نہیں تو ڈیڑھ درجن بچے موجود ہوں کیسے کچھ کرے۔ لوگ کہنے کو تو ہو جائیں گے کہ "اوئی ذرا پڑھی لکھی لڑکیوں کی حالت تو دیکھو"

کہو بھلا نصیبوں جلی پڑھی لکھی لڑکی کیا کرے؟ بچے سے بچے ہیں گھر میں! خدا جھوٹ نہ بلائے ڈیڑھ درجن سے تو کیا کم ہونگے ہر قوم اور قبیلے کی شکل کے۔ کالے، پیلے، کتھئی، دُبلے، پتلے، بھینگے اور چپٹے۔ ہر سال دو کا اضافہ، ایک سے ایک نت نئے فرموں میں ڈھل ڈھل کر آرہا ہے۔ ابھی تو خیر سے دو بھائی کنوارے ہیں۔ ورنہ وہ والد بزرگوار کا نام چلتا کہ کیا کہنے ـــ ایکدم میری نظر اُن پانچ توام انسانی کیڑوں پر پڑی۔ اگر ایسی ہی ـــ کچھ اس سے ملتی جلتی بھول قدرت سے یہاں ہو جائے ـــ خود میرے خاندان میں؟ مجھے پیٹھ پر کھنکھجورے سے رینگتے معلوم

ہوئے۔ ویسے ہی میں نے قلم تکیہ کے نیچے سے نکالا کہ لاؤ ان کے
یونہیں سیاہی سے ڈاڑھیاں لگا دوں۔۔۔ یونہیں جل کر میں نے چاہا۔
ارے ا۔۔۔ جیسے کسی نے دھم سے میرے کلیجے پر موسل دے مارا!
میرا قلم!۔۔۔ سبز اور کاہی ایورشارپ ا۔۔۔ آن بریک ایبل!
اس کا نب پیچھے کی جانب ایسے جھکا ہوا تھا جیسے قلا لگانے سے
پہلے نٹ اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھکر ایڑیوں سے سر لگا دیتا ہے۔
جی چاہا۔۔۔ بس کیا کروں؟ گذشتہ زمانے کی ایک ہی یادگار۔
بھولے ہوئے خوابوں کی مٹتی ہوئی تعبیر کسی کا اکلوتا تحفہ! پلنگ
کی پٹی پر بیدردی سے ٹھونکا گیا تھا۔

"یا اللہ! کوئی راستہ نجات کا ہے!" میں اندھوں کی
طرح اس مظلوم قلم کو ٹٹولتی رہی۔۔۔ گھر کیا ہے چوراہا ہے۔ جو
چیز دیکھو تباہ ہوئی جاتی ہے۔ جدھر دیکھو دو دو چار چار بزن بول رہے
ہیں۔ چار پلنگوں پر اچھل رہے ہیں۔ دو کواڑوں میں جھول رہے
ہیں۔ تین پنکھے میں لٹک رہے ہیں۔ دو نے نل کھول کر نہانا
شروع کر دیا۔ دو چار بانس کے گھوڑے بنائے کیٹروں کی طرح
سارے صحن میں کھڑکھڑاتے پھر رہے ہیں۔ وہ گھڑا الٹا۔ یہ
سینی پلٹی۔۔۔ وہ دوپٹہ الجھ کے چلا کیچڑ میں لتھڑتا ہوا۔ دو تیز
بالکل آپ کی پیٹھ کے پیچھے گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور موسل جیسی
ٹانگیں گدا گد کمر اور سر پر پڑ رہی ہیں۔۔۔ یا اللہ۔۔۔ مجھے جیسے چکر
سا آنے لگا۔ ایک دو ہوں تو بھگتے، کوئی اس خوگیر کی بھرتی کو کہاں
تک نہائے۔ جو مارو تو فرمایا جاتا ہے: "اے ہے کیسی بیدردی سے
مارتی ہے۔ اے اپنا خون ہے"!

اپنا خون! خوب! دس بچوں کی ماں کی اولاد ہونے کی
بھی سزا ہے۔ گھر کیا ہے محلہ کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے
دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے
مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ سے گھر ہسپتال بن جاتا ہے۔
کھیلیوں صابودانہ پک رہا ہے۔ سیروں کونین آرہی ہے۔ پھوڑے
پھنسی کے زمانے میں مرہم کا خرچ دال روٹی سے زیادہ جس کونے میں
دیکھو پڑے بہاتے اور مرہم کی ڈبیاں چپچپا رہی ہیں۔ ٹانگیں سڑ رہی
ہیں۔ بخار چڑھ رہے ہیں۔ لینے کے دینے پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ
لیجئے! بیماری گئی اور وہ چچڑیوں کی طرح پھریری لیکر کھڑے ہوگئے۔
پھر ایسا پیچ پیچ کر کھایا کہ چار دن میں پھر ہمارے سینے پر کودو دل
دَلنے کے لئے وہی کسی ہوئی توندیں اور مگدر جیسی ٹانگیں موجود!
سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں! مرتے ہونگے کیا خبر!

بس اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ دنیا سے
منہ موڑ کر الگ تھلگ پڑ رہوں۔ اور یہاں نہیں تو آج ہی سے لو۔
منیو تو خیر وعدہ ہی کر گئی ہے کہ اب کبھی نہ آئے گی۔ رہے مکھن
تو انہیں بھی آج ہی دھتکار دیا جائے گا۔ بس ہو چکی دل لگی۔ تجو
بھی ٹرکا دئے جائیں گے۔۔۔ اور چنو؟ چنو مردی کو تو بس ڈھیل
ہی نہیں دونگی۔ نہ منہ لگاؤں گی نہ یہ سر پر چڑھ کر ناچیں گے۔ آخر
کوئی صبر کی حد بھی ہوتی ہے؟

"دیکھو۔ دیکھو۔۔۔ اب میں کہتی ہوں چنی سے!" پاس کے
کمرے سے آواز آئی۔

"کیا کہتی ہو چنی سے!" میں نے پھر خیالات کے سلسلہ کو
جوڑا "جب سر بکار بھی ہو اسے"!

"ہائیں۔۔۔ چنی! یہ کرتا نہیں پہنتی اسے آگے مار تو"
پھر کسی نے کہا۔

"وہ آئی دیکھو آگئی چنی۔۔۔۔ لے اسے مار۔ کرتا پہنو پھر"
وہی آواز بڑھی آگے۔

"بھاڑ میں جائے کرتا اور چولھے میں جائے چنی۔ ہاں نہیں
تو۔ چنی نہ ہوگئی انکی زر خرید لونڈی ہوگئی کہ اس سے "بی شادی"
اور "ہوئے" کی خدمات بھی لی جانے لگیں۔ خدا کی شان!"
میں بڑبڑاتی رہی۔

"لو بس! اب جاؤ دکھاؤ پھوپی جان کو" پھر بولیں۔

پڑی تھی مجھے غرض! میں نے عہد بھی ٹھیک وقت پر کیا۔ ... مگر ہمت تو دیکھو! ابھی ابھی اماں بیٹیاں کان پکڑ کر کبھی نہ آنے کا وعدہ کر گئی ہیں اور دس منٹ بھی نہ گزرے اِس بے تکلفی سے آنے کو تیار۔ خیر!

میں بے رُخی سے پیٹھ موڑ کر آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ اور اُن پانچوں توام بچوں کے بے رونق مکار چہرے گھورنے لگی۔

"پٹر پٹر!" چھوٹے چھوٹے پیر کمرے کی طرف آتے سُنائی دیے۔ پانچوں موٹے بنئے جیسے چہروں نے شرارت سے آنکھ ماری۔ اونہہ!

"دیکھیے پھوپی جان!" مینو نے اپنی چمکیلی آنکھوں کے وہ تمام تیر برسا کر کہا جن کا جادو وہ خُوب جانتی ہے۔

دوسرے لمحے وہ مع جوتوں کے میری گردن پر سوار تھی۔

"ہماری فراک!" اُس نے میری گردن میں گھٹنا اڑا کر ناک پر رال ٹپکاتے ہوئے کہا: "دیکھیے!"

اُف یہ بچے!!!

میں نے چاکولیٹ کا تازہ بنڈل کھولتے ہوئے سوچا۔

عصمت چغتائی

کلامِ فرحت

سُن او لذّت کشِ غم! شکوۂ بیداد رہنے دے
نہ کر بدنام ضبطِ عشق کو فریاد رہنے دے

نہ باندھ اس طرح میرے پر کو اے صیّاد رہنے دے
ارے ظالم! قفس میں تو مجھے آزاد رہنے دے

نہ چھیڑ اے ضبط! دلکو مائلِ فریاد رہنے دے
جو خود آتش بجاں ہو اُس پہ یہ بیداد رہنے دے

بنے کیوں میری بربادی کا قصّہ رونقِ محفل
نہ کر یوں بزمِ دشمن میں مجھے برباد رہنے دے

تقاضائے جنوں ہے، دردِ دل کا راز افشا ہو
کمالِ ضبط کی تاکید ہے، فریاد رہنے دے

قفس کی تیلیاں کچھ کم ہیں میرا دل دُکھانے کو
نہ کر ذکرِ نشیمن مجھ سے اے صیّاد رہنے دے

ابھی تک تجھ کو آہِ بے اثر سے کچھ توقّع ہے
دلِ درد آشنا بس ضبط کر فریاد رہنے دے

نہ چھیڑ اے ہمنفس مجھکو کہ میں اس حال میں خوش ہوں
مجھے برباد رہنے دے، مجھے ناشاد رہنے دے

پرستارِ نشیمن ہوں، قفس سے مجھکو کیا نسبت
مگر جب ذوقِ پابندی مجھے آزاد رہنے دے

وفا کی آرزو اور اس تغافل دوست سے فرحت
غنیمت ہے کہ وہ منّت کشِ فریاد رہنے دے

فرحت کانپوری

ہمسفر

وہ پھولوں کا گلدستہ لئے پلیٹ فارم کے دوسرے سرے کی طرف جا رہی تھی۔ اگر میں نوجوان ہوتا، میرا مطلب ہے اتنا عمر رسیدہ نہ ہوتا جتنا کہ دراصل ہوں، تو اُسے کچھ اور ہی نظروں سے دیکھتا۔ کشیدہ قامت، بیباک، اور خوبصورت ــــ اسٹیشن پر سارے آدمی اسی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے اور آپس میں خاموشی سے اشارے کنائے بھی کرتے جاتے تھے ــــ جیوں جیوں ہم عمر میں بڑھتے جاتے ہیں عورتیں ہمارے احساسات پر کم اور تخیلہ پر زیادہ اثر انداز ہوتی جاتی ہیں ــــ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُسے اچھی طرح جان سکوں، سمجھ سکوں ــــ میں اپنی جگہ تلاش کرنے چل پڑا ــــ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے ہی ڈبے میں بیٹھی ہے ایک ایسے مبہم شکل والے مرد کیساتھ جو شوہر سے لیکر بھائی یا چچا تک سب کچھ ہو سکتا تھا ــــ ایسے نیرنگ نظر کے ساتھ ہمسفری کے خیال نے میری کافی ہمت افزائی کی۔ اگرچہ میں پرے کو بیٹھا ہوا باہر کے لوگوں کی طرف بے پروائی سے دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی تیز نظروں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یعنی مجھے اُس کی طرف دیکھنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ ہم دونوں نے دیکھا کہ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں ــــ ہاں بالکل یہی ــــ اُس نے پھر میری طرف غیر دلچسپ نظروں سے دیکھا اور اپنے "جاں نثار" کے ساتھ گفتگو کا ایسا لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیا جو صرف اُسکے قہقہوں سے ٹوٹتا تھا ــــ ہنسی اُسے کتنا خوبصورت بنائے دے رہی تھی۔ جیسے مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ علیگڈھ تک جا رہے ہیں جو صرف چار گھنٹے کا سفر ہے، میری ساری دلچسپی ختم ہو گئی، لیکن میں اُنکی گفتگو سن سکتا تھا۔ ایک کتاب کی طرف دیکھتے رہنا اور نہ پڑھنا اُس کا آسان طریقہ تھا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا ــــ وہ شادی شدہ تھی اور وہ "جاں نثار" صاحب اُسکے شوہر نامدار تھے جو شکل سے کافی حساس اور آپ ہی آپ شرما جانے والے معلوم ہوتے تھے ــــ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ اسکا پیارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن متوسط درجے کی معاشرت اس قسم کی عادتوں کی حمایت نہیں کرتی، سوائے چند مقامات کے، اور ریل کا ڈبہ فی الواقع ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ایک مرد اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ سکے!! بہرحال۔ میرا جی چاہا کہ خود میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں، لیکن تقاضائے عمر اس لذت کے حصول میں مانع آیا۔

"میرا خیال ہے کار تو آئی ہوگی۔ ہمیں لینے" اُس نے کہا۔

"اوہ۔ ہاں۔ ہم تانگہ لے لیں گے" انہوں نے جواب دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ جب تک ہم پہونچیں گے کافی اندھیرا ہو جائیگا اور پھر ہمیں کون دیکھے گا" اُس کے ذی عزت اور شریف ہونے میں کوئی کلام نہ تھا۔

"کل میں مندر گئی تھی ــــ دیکھو یہ چوڑیاں کیسی ہیں؟"

اُنہوں نے ایک مسکراہٹ سے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

میں نے چوڑیاں دیکھیں۔ واقعی بہت خوبصورت تھیں، لیکن اُس کے بازو ــــ گداز، بھرے بھرے اور سڈول۔ کاش میں انہیں چوم سکتا ــــ توبہ!! ــــ مالرے ([illegible]) کی دو سو صفحے کی کتاب میں ہفتوں لگ گئے اور میں اب تک اُسے ختم نہیں کر سکا ــــ کتنی شرمناک بات ہے!! ــــ لیکن وہ قریب ہی بیٹھی تھی اور اُس کی طرف دیکھنا کس قدر آسان تھا! میں نے دوبارہ اُس کی چوڑیاں دیکھیں ــــ اگر میں امیر ہوتا تو

اُسے سیکرٹری کے دست بند بنوا دیتا اور اُس کے ہاتھوں پر روغن بادام کی مالش کر کے اُن داغ دھبوں کو دُور کرتا جو زندگی کی تلخیوں نے ڈال دئے تھے۔

"وہ دیکھو، وہ عینک لگائے ہوئے جو لمبا سا صاحب کھڑا ہے نا پلیٹ فارم پر" اُنہوں نے کہا "یہی ہمارا بڑا صاحب ہے۔ مسٹر نیسٹ" اُنہوں نے احترام بھرے لہجے میں کہا اور اُس انگریز کی طرف بغور دیکھتے رہے۔

"اچھا یہ ہیں مسٹر نیسٹ" اُس نے دبی آواز سے کہا "اُنہوں نے تمہیں دیکھا تو نہیں؟"

"کیا معلوم" اُنہوں نے جواب دیا "اُسے پانچ ہزار روپے ماہوار ملتے ہیں" اُنہوں نے پانچ ہزار کو لمبا کر کے کہا۔

"پانچ ہزار روپے۔ !!" اُس نے ایک آہ کھینچی "کیا بہت امیر آدمی ہے"

"ہاں، اور بڑا سخت ہے۔ سیلون میں سفر کرتا ہے۔ جو بالکل گھر کی طرح ہوتا ہے۔ تین چار کمرے ہوتے ہیں نوکر، بہرے، خانساماں اور بہت سے آدمی اسکے ساتھ چلتے ہیں"

وہ اس امارت کے وزنی تصور سے پسپا ہوگئی۔ پھر حواس مجتمع ہونے پر بولی "بہت خرچ ہوتا ہوگا؟"

"ہاں ہزاروں"

"کیا یہ بھی ایم۔ اے ہے؟" اس کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔

"معلوم نہیں"

"اتنے سارے روپوں کا کیا کرتا ہے۔ کبھی تمہیں بھی مل سکینگے پانچ ہزار روپے ماہوار"

"ارے نہیں۔ میری تنخواہ کا حساب تو یہ ہے کہ ساٹھ روپے ماہوار پہ پانچ روپے سالانہ ترقی اور انتہا ڈیڑھ سو تک ہاں، اگر سپرانٹنڈنٹ بن گیا تو پھر ڈھائی سو ملنے لگیں گے"

"تو اسے پانچ ہزار کیوں ملتے ہیں۔ کیا بہت محنت کرتا ہے؟"

"نہیں نہیں، کام تو سب ہم لوگ کرتے ہیں، لیکن یہ بڑا صاحب ہے۔ اس کے بیرے کو ۷۰ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے"

یہ باتیں اُسکی سمجھ سے باہر ہوتی جا رہی تھیں، لیکن اُس کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔

***

گاڑی چل دی اور ہوا کی آواز اُکتانے لگی۔ لیکن میں ماآرٹ کی کتاب کسی طرح نہ پڑھ سکا۔ پانچ ہزار کا خیال اُس کے ذہن میں چکر لگا رہا تھا۔ وہ گن رہی تھی۔ اُس کے نازک ہونٹ ہل رہے تھے اُس کی انگلیاں حساب کر رہی تھیں۔ وہ چپ نہ رہ سکی۔

"جتنا تم کو دو مہینے میں بھی نہیں ملتا اتنا اسے ایک دن میں مل جاتا ہے"

اُنہوں نے سر ہلایا اور غالباً دل میں سوچا کہ ایسی باتیں یاد نہیں رکھنی چاہئیں۔

"سترہ دن تک تم برابر کام کئے جاتے ہو۔ اتوار کو بھی کام کرتے ہو اور پھر بھی اسے ایک دن میں تم سے زیادہ ملتا ہے"

"یہ ہے بھی تو بڑا صاحب" اُنہوں نے کہا۔

"ہاں ہے، پھر بھی تم کو کم از کم ایک مہینے میں تو اتنا ملنا چاہئے جتنا اسے ایک دن میں ملتا ہے"

مَیں سوچنے لگا کہ ذہانت عورتوں کے لئے بلا ہے یا نہیں ــــ

"مگر تم جو میٹرک پاس ہو۔ ہے نا؟" اُنہوں نے مسکرا کر کہا۔

اُسکی نگاہیں ایکدم سے نرم ہوگئیں اور وہ بھی مسکرادی۔

مَیں بھی خواہ مخواہ مسکرایا۔ ہاں، شاید، پانچ ہزار روپے ماہوار سے یہ بہتر ہے۔ لیکن ساٹھ روپے ماہوار کے ساتھ جوڑ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتا معلوم ہوتا تھا۔

وہ خاموش بیٹھے کھڑکی میں سے دیکھتے رہے اور مَیں اس کی پیاری باتوں سے محروم ہوگیا۔ پھر اُس کی شکل سے بھی

محروم ہوگیا کیونکہ وہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھ رہی تھی۔ میں
صرف اُس کی پیشانی کا خم اور ہوا میں تیرتی ہوئیں زلفیں دیکھ سکا۔
عالم یاس میں پھر مالرے کی طرف متوجہ ہوا۔ اسپین کے حالات
حقائق سے پُر تھے۔ لیکن اسپین بہت دُور تھا اور وہ اس قدر
نزدیک۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے چھو سکوں، اسے بتا سکوں کہ اسپین
میں لوگ اسی بات کیلئے لڑ رہے ہیں۔ میں نے ارجنٹینا کے شاندار
ماحول کے درمیان اس کا تصور کیا۔ کنگھی اور تھرکتی ہوئی
آنکھیں، کاسٹینٹس اور ہوشربا نغمے۔ میری کنپٹیاں اِس نغمہ
سے، اس ریل کی آواز سے اور اس جنگ کے خیال سے
پھٹنے لگیں۔

"فرسٹ کلاس میں سفر کرو تو پورا بنچ اپنا ہوتا ہے۔"
اُس نے پھر کہا۔

"ہاں، اگر پورا بنچ ریزرو کرالو تو پھر کوئی نہیں بیٹھ سکتا۔"

"پورا بنچ اپنا ہوتا ہے چاہے بچھونا بچھاکر آرام سے سو جاؤ۔"
اُس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں، چاہے بجلیاں گل کر کے پنکھا چلاؤ، چاہے جو کرو۔
ایک چھوٹا سا گھر ہوتا ہے۔ نہ جگہ کیلئے لڑنا پڑتا ہے نہ رات
بھر جاگنا۔"

"کبھی تم نے فرسٹ کلاس میں سفر کیا ہے؟"

"نہیں۔ مگر بہت دن ہوتے جب میں ایک دفعہ سیکنڈ
کلاس میں بیٹھا تھا۔ وہ بھی بہت آرام دہ ہوتا ہے۔ اور پھر
ریسٹورنٹ کار میں بھی جاسکتے ہیں۔ وہ جو سفید لمبی گاڑی ہوتی
ہے نا انجن کے پاس۔"

"جو جی چاہے کھا بھی سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ مگر چار روپے میں پورا انگلش ڈنر ملتا ہے۔"

"اوہو۔" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا ہم کبھی
سیکنڈ کلاس میں سفر نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں۔ لیکن خرچ بہت ہوتا ہے اور اتنی گنجائش نہیں۔"
بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں ان سے کھانے کو کہوں لیکن
خود میں بھی اس قدر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلتی رہی۔ خوبصورت، گلابی اور
سبز چوڑیاں، وہ یقیناً اُس کے حُسن کو دوبالا کر رہی تھیں۔ کھانے
کا وقت ہوگیا اور ریل ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔
تاکہ اُونچے درجے کے مسافر ریسٹورنٹ کار میں جاسکیں۔ بڑا
صاحب بھی سگرٹ پیتا ہوا گزرا۔

"کیا ہم کسی ایسی جگہ نہیں جاسکتے جہاں سب کو پانچ ہزار
ماہوار ملتے ہوں۔" وہ خاموش نہیں رہ سکی۔ "پھر تو ہم بھی سکینڈ
کلاس میں سفر کرسکیں گے اور تم خوب سگار پی سکو گے۔"

انہوں نے ایک بیڑی جلائی اور ایسی ہی جگہ کا خیال
کرنے لگے۔ وہ باز نہیں آئی۔ اس نے انہیں ٹھوکا دیا اور کہا۔

"کیا کوئی ایسا ملک نہیں ہے؟ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے؟"

"کیسا ملک؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم سُن نہیں رہے۔" اُس نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

میرا جی چاہا کہ میں چیخ پڑوں اور کہوں کہ میں سُن رہا ہوں۔
اس پر لعنت بھیجو۔ میں تیرے لئے ایسا ملک ڈھونڈ نکالوں گا۔
میں تجھے اس ذلیل ملک میں فرسٹ کلاس میں لئے پھروں گا۔
کیپ کمورین سے کمبوڈیا تک، کس چٹکانگ، کہیں بھی....

"میں سُن رہا ہوں۔" اُس نے یقین دلایا۔ "لیکن ایسا
کوئی ملک نہیں ہے۔"

اُسے ایسا صدمہ ہوا جیسے کوئی اُوپر سے نیچے گرادے۔

"لیکن کوئی نہ کوئی تو ایسا ملک ضرور ہوگا جہاں ہم سب
فرسٹ کلاس میں سفر کرسکتے ہوں اور پوری بنچ اپنی ہو۔"

"ایسا ہو تو فرسٹ بھی تھرڈ بن جاتے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں بھی کیسی بیوقوف ہوں۔"

وہ ہنسی: "لیکن اگر ہمارے پاس پانچ ہزار ہوتے تو ہم جو جی چاہتا کرتے ---- میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ میری بہن کو پانچ ہزار ملنے لگیں۔ تین لڑکے کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ لڑکی سیانی ہوگئی ہے۔ اُس غریب پر بُرا وقت پڑا ہوا ہے ---- اُفوہ کیسی اُس نے تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اور اب بھی کیسی بُری حالت ہے ---- کبھی کبھی تو اُن کے پاس سوائے چاول کے کچھ بھی کھانے کو نہیں ہوتا۔ اور جب سے بابا کی پنشن ہوئی وہ بھی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ معلوم ہے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے؟" اُنہوں نے عقلمندی سے کہا۔

"لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟" اُس نے ضدی لہجے میں کہا: "جی چاہتا ہے پرماتما ہم سب کو پانچ ہزار روپے ماہوار دے۔ ہم کو اور انسو نیا کو اور بھلا موسی کو اور تمہارے دوست ماتھر کو، اس کی بیوی کتنی اچھی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔" اُسنے ایک دلپذیر تبسم کے ساتھ کہا۔

"اگر ہم سب کو پانچ ہزار ملنے لگیں تو کیسا مزا ہو۔" وہ اس اُمید افزا خیال پر زور سے ہنسی، اُس کا چہرہ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی دھوئیں سے بھری ہوئی مدھم روشنی میں چمک اُٹھا، اُس کی آنکھیں منور ہوگئیں۔

"...... یا ساٹھ روپے ماہوار۔" ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُس کے گدگدیاں کر رہا ہے ---- "اگر سب کو ساٹھ روپے ماہوار ملنے لگیں، کیسا لُطف رہے۔ پھر تو کوئی بڑا صاحب ہی نہو ہم سب ایک سے ہی ہوں اور ہماری پڑوسن جو مارواڑن ہے نا وہ بھی موٹے موٹے ہیسے نہ پہن سکے۔" وہ ہنستی رہی ---- زور زور سے ہنستی رہی ---- "سوچو تو کسی کو بھی ساٹھ روپے سے زیادہ نہ ملیں۔ کیسی مزیدار بات ہے ---- کتنی عمدہ ---- کتنی اچھی......"

***

مَیں بھی ہنسا۔ کسی خاص وجہ سے نہیں۔ یونہی ---- یہ بھی بھول گیا کہ دُنیا میں کروڑوں آدمی کروڑوں آدمیوں سے لڑ رہے ہیں اسی "عجیب اور مزیدار بات" کی خاطر۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بعد جو لوگ پیدا ہوں وہ ایسی دُنیا دیکھیں جس میں کوئی بھی پانچ ہزار روپے والا بڑا صاحب نہ ہو، بلکہ سب ساٹھ روپے والے بابو ہوں اور اُن کے پاس ایسے ہی دلکش ساتھی ہوں ---- اب مجھے اِن دونوں کا جوڑا ٹھیک معلوم ہونے لگا۔

جب وہ دونوں علیگڑھ اسٹیشن پر اُترے تو رات کافی ہو چکی تھی اور اسٹیشن کے بڑے بڑے لیمپ اپنی آسیبی روشنی سے درو دیوار پر عجیب اور ڈراؤنی پرچھائیاں ڈال رہے تھے ---- میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کوئی پریوں کی کہانی تو نہیں ہے۔ لیکن ہماری دنیا کس قدر غیر طلسماتی ہے۔

* * * *

از "نیرا" ---- مترجمہ: انصار ناصری

***

(بسلسلۂ جون ۱۹۳۶ء)

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

جنابِ جگر مراد آبادی۔ اِس عشق کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا — اتنی ہی بڑھی حسرت جتنا بھی اُدھر دیکھا
چین اسیرانِ قفس کو یادِ گلشن میں نہیں — دوڑتی ہیں بجلیاں سیلابِ خوں تن میں نہیں

پروفیسر عندلیب شادانی۔ (ا) "جتنا" کے بعد "ہی" بے تک ہے اور زائد۔ (ب) جسم میں خون کی گردش کو سیلان کہتے ہیں۔ سیلاب نہیں۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ "ہی" اور "بھی" "یا" "سیلان" اور "سیلاب" متحد الصورت ہیں۔ لہٰذا قرینہ کتابت کی غلطی کا ہے۔

حضرت اثر لکھنوی۔ "شعلۂ طور" (دیوانِ جگر) میں پہلے شعر کا پہلا مصرع "بھی" نہیں، بلکہ "ہی" کے ساتھ تحریر ہے، اس لئے پہلا اعتراض خود بخود رد ہو گیا۔ کیونکہ "بھی" کی جگہ "ہی" وہ (معترض) بھی تجویز کرتے ہیں، اور مطبوعہ دیوان میں بھی یہی صورت ہے۔ دوسرے شعر میں "سیلابِ خوں" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن "سیلان" نہ صرف قبیح اور مشتمل بر ذم ہے بلکہ غلط بھی ہے۔ غالباً دوران یا ہیجان بہتر ہوتا۔

مجیب صاحب پہلے اعتراض کا مفہوم نہیں سمجھے — حضرتِ اثر نے بھی توجہ نہ فرمائی — اعتراض "بھی" پر نہیں "ہی" پر ہے۔ یعنی "جتنا" کے بعد "ہی" یا "بھی" کسی لفظ کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ معترض نے جو شعر نقل کیا ہے اس میں لفظ "ہی" نہیں "بھی" ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ شعر میں "بھی" سہوِ کاتب ہے، جس کی تصدیق "شعلۂ طور" اور عبارتِ اعتراض، دونوں سے ہوتی ہے۔ خود حضرتِ اثر کی عبارت میں بھی کتابت کی غلطی موجود ہے یعنی "پہلے شعر کا دوسرا مصرع" کی جگہ "پہلے شعر کا پہلا مصرع" لکھا گیا ہے — بہرحال پہلا اعتراض بحالہ قائم ہے، رد نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض بھی درست ہے۔ یعنی "سیلاب" غلط ہے، اور اس کی جگہ پر "سیلان" بھی غلط ہے، "تو ہیجان" بھی برمحل نہیں۔ ہاں "دوران" بمعنی گردش مناسب ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ یہ جنوں بھی کیا جنوں یہ حال بھی کیا حال ہو — ہم کہے جاتے ہیں کوئی سُن رہا ہو یا نہ ہو

پروفیسر عندلیب شادانی۔ دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہئے تھا، کہ "ہم کہے جاتے ہیں کوئی سُن رہا ہو یا نہ سُن رہا ہو"

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ اس کا شمار نہ عیب میں ہے نہ غلطی میں، غالب کا مصرع ہے۔ "قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت" یہاں "ہونا" ایک ضروری جزوِ مصرع تھا، مگر غائب ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ شادانی صاحب کا اعتراض غالباً "جنوں" کے بعد "ہے" کے حذف پر ہے۔ ایسا حذف نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔

اعتراض درست ہے، اور مجیب صاحب کا استدلال بے بنیاد۔ مرزا غالب کے مصرع میں "ہونا" حذف نہیں — حضرتِ اثر نے عبارتِ اعتراض پر توجہ فرمائی، اور نہ شعر پر۔ اعتراض پہلے مصرع سے متعلق نہیں، بلکہ دوسرے مصرع سے ہے کہ لفظ "نہ" اور "ہو" کے درمیان "سُن رہا" محذوف ہونے کی وجہ سے مصرع مہمل ہو گیا ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ عالم جب ایک حال پہ قائم نہیں رہے — کیا خاک اعتبارِ نگاہ و یقیں رہے

پروفیسر عندلیب شادانی۔ "نہ" کی جگہ "نہیں" استعمال ہوا ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ چونکہ "نہیں" قافیہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس لئے قابلِ اعتراض نہیں۔

جنابِ نیاز مدیر "نگار"۔ شادانی صاحب کا اعتراض صحیح ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ میری رائے میں ہر سہ حضرات غلطی پر ہیں، اور شعر جس طرح موزوں ہوا بالکل درست ہے۔ "نہ رہے" محض بیانِ واقعہ ہی چشم دید ہو یا سنا سنایا۔ "نہیں رہے" میں اعتماد اور وثوق کے ساتھ ساتھ ان انقلابات کی طرف بھی اشارہ ہے جو تغیرات کا باعث ہوئے، اور گویا قائل کے پیشِ چشم ہیں۔ اگر "عالم" کو بصیغۂ جمع سمجھئے، اور "رہے" سے کُلّیہ قائم کرنے کے بجائے صرف فعلِ ماضی بصیغۂ جمع مُراد لیجئے، تو "نہیں" کا جواز اور بھی مستحکم، اور شعر کا حاصل بلند تر ہو جاتا ہے۔

اعتراض دُرست ہے ــــ اور حضرتِ اثر کی دونوں توجیہیں دور از کار ــــ اس لئے کہ جب "نہ رہے" کا "بیانِ واقعہ" ہونا تسلیم ہے تو پھر "روزمرہ" کے خلاف "نہیں" استعمال کرنے کو جائز بتانا کیا معنی؟

رہی دوسری توجیہ، کہ شعر زیرِ بحث میں "عالم" کو بصیغۂ جمع سمجھ لیں تو اس صورت میں "نہیں" کا جواز اور بھی مستحکم اور شعر کا حاصل بلند تر ہو جاتا ہے"۔ تو بادب عرض کرنا پڑتا ہے، کہ اس موقع پر "عالم" بصیغۂ جمع استعمال ہی نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ اس کا شعر کے حاصل کو بلند تر بنانا ــــ کیونکہ یہاں عالم سے مقصود صرف ایک عالم، یعنی "عالمِ اجسام یا عالمِ ناسوت یا عالمِ اسباب یا دُنیا" ہے جس میں ہر لحہ انقلاب ہوتا رہتا ہے، اور جو خود بقول حضرتِ اثر قائل کے پیشِ چشم ہے۔ اِس عالم کے علاوہ، دوسرے عالم مثلاً "عالمِ معنی" "عالمِ امر" "عالمِ ملکوت" "عالمِ جبروت" اور عالمِ لاہوت" سے شعر کو کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے کہ نہ ان میں کسی تغیر و انقلاب کا امکان ہے اور نہ وہ قائل کے پیشِ چشم ہیں۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ میں جگر لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر　　دل ہر اک حال میں ہے حضرتِ احساں کے قریب

پروفیسر عندلیب شادانی۔ "ہر" کے بعد "اک" زائد محض اور مخلِ فصاحت ہے۔ جگر کی تائید میں کوئی صاحب غالب کا یہ مصرع پیش نہ کریں ــ ع۔
"ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے"۔ کیونکہ وہی اعتراض اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ میں شادانی صاحب کے حکم کے مطابق اُن کا پیش کردہ مصرع نظر انداز کئے دیتا ہوں، مگر اس کا کیا جواب کہ غالب نے ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ "ہر اک" لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (۱) چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہ رو کے ساتھ۔ (۲) ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں۔ (۳) ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشان اور۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ اعتراض غلط ہے ــ "ہر اک" اور "ہر" میں وہی فرق ہے جو انگریزی میں each اور every میں ہے: "ہر" کا اطلاق کسی نوع کے افراد پر من حیث المجموع ہوتا ہے۔ اور "ہر ایک" کا مجموعہ کے ہر فرد پر۔ جگر صاحب کو دکھانا تھا کہ میں کسی حال میں بھی ہوں، دل حضرتِ احسان کے پاس رہتا ہے، لہٰذا "اک" زائد کیسا ضروری ہے۔

اعتراض دُرست ہے ــــ محترم تبصرہ نگار کی طرح میں انگریزی کا عالم نہیں، لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ انگریزی لغات کی عام کتابوں میں لفظ "each" کے معنی "either of two" اور "Every one of any number taken separately" یعنی "دو میں سے ایک" اور کسی "مجموعہ کا ہر فرد، جدا جدا" اور لفظ "every" کے معنی "each one of a whole" یعنی کسی "کل کا ہر جزو" بتائے گئے ہیں۔ ان معانی میں ایسا کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا کہ ایک لفظ کے معنی "ہر" اور دوسرے کے "ہر ایک" سمجھے جائیں۔

آں جناب نے "ہر اک" اور "ہر" کا فرق سمجھانے کے لئے خود ہی ایک قاعدہ وضع کیا اور خود ہی توڑ دیا۔ اور کیوں نہ توڑ دیتے، ہر ایک فرد

کوئی نہیں ہوتا سب ہر فرد ہوتے ہیں، چنانچہ آں محترم کے قلم سے بیساختہ ہر فرد ہی نکلا۔ اور نکلنا ہی چاہیئے تھا۔

ہاں: "ہر" کے بعد "اک" یا "ایک" کے جواز کی کسی قدر گنجائش اگر نکل سکتی ہے تو اُس جگہ، جہاں "اک" یا "ایک" بطور ضمیر استعمال ہوا ہو۔ جیسے عطاء اللہ صاحب کے پیش کردہ مرزا غالب کے مصرعوں میں سے دوسرا مصرع: "ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں" یا فصیح الملک حضرت داغ کا یہ شعر ؎

"مے خانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں"

جنابِ جگر مراد آبادی۔ دیکھی تری آنکھوں کی کیفیتِ رعنائی اب کس سے سنبھلتا ہے جامِ مئے مینائی

پروفیسر عندلیب شادانی: "مینائی" محض بہ ضرورتِ قافیہ لایا گیا ہے۔ ورنہ شعر کا مطلب اس کے بغیر پورا ہو سکتا تھا۔

عطاء اللہ صاحب پالوی: جب غزل میں پورا پورا شعر محض جگہ بھرنے کیلئے لکھا جاتا ہو تو پھر ایک لفظ کے بے ضرورت استعمال کو غلط کیوں مانا جائے۔

جنابِ نیاز مدیر "نگار": یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ غزل میں پورا پورا شعر جگہ بھرنے کیلئے کہا جاتا ہے، لیکن جگر کے شعر میں اگر لفظ "مینائی" زائد ہے، تو "مے" بھی زائد ہے، کیونکہ مفہوم صرف "جام" سے پورا ہو جاتا ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی: شادانی صاحب کا اعتراض غلط ہے۔ "مینائی" نہ صرف منسوب بہ مینا کے معنی میں مستعمل ہے۔ بلکہ اس سے پرِ طاؤس کی طرح مخلوط الوان بھی مراد لیتے ہیں۔ غالباً اسی سے "میناکاری" نکلا ہے، یعنی سونے چاندی کے ظروف یا زیوروں پر رنگین نقوش بنانا۔ مختلف رنگوں کے شیشے جو روشندانوں میں لگائے جاتے تھے، انہیں بھی "ریزۂ مینا" کہتے تھے۔

جگر صاحب کے شعر میں لفظ "مینائی" نہایت خوبی اور سلیقے سے آیا، جس نے "رعنائی" کے تقابل کو اور اجاگر کر دیا۔ مگر مجھے معاف فرمائیں تو عرض کروں، کہ ایک پامال لفظ "کیفیت" کے ایہامِ معنوی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے، اگر لفظ "محجوبی" لاتے، اور پہلا مصرع یوں موزوں کرتے: "دیکھی تری آنکھوں کی محجوبی و رعنائی" تو جام نہ سنبھلنے کی ایک نادر توجیہ پیدا ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں ان کا یہ شعر سودا کے مشہور مقطع کا آفریدہ بن کر رہ گیا ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

اسی باعث میں نے سامنے کا لفظ "مخموری" نہیں تجویز کیا، گو "کیفیت" سے وہ بھی بہتر ہوتا۔

پروفیسر صاحب کا اعتراض بھی درست ہے، اور جنابِ نیاز کا بھی۔ "جامِ مئے مینائی" کے معنی ہوئے، "مینا کی مے کا جام" اور اس کے مہمل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ گو حضرتِ اثر نے اپنے مفید مطلب کوئی مثال پیش نہیں کی تاہم اگر ان کے بتائے ہوئے معنی فرض کر لئے جائیں تو مطلب ہوگا: "مختلف الالوان مے کا جام" نہ یہ حالے کہ "مختلف الالوان مے" آج تک نہیں سنی گئی۔ ہاں "جام" کو "میناکاری" کی نسبت سے "مختلف الالوان" کہہ سکتے ہیں، سو اس کا یہاں امکان نہیں، کیونکہ بہ لحاظ ترکیب "مینائی" جام کی نہیں، مے کی صفت واقع ہوئی ہے۔

رہی حضرتِ اثر کی ترمیمِ مصرع، سو اس سے بھی مجھے اتفاق نہیں، جنابِ جگر نے "کیفیت" کے ایہامِ معنوی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ انہوں نے لفظ "کیفیت" اس کے اصلی معنی (حالت) میں استعمال کیا ہے۔ یعنی "تیری آنکھوں کی رعنائی (کی حالت) دیکھی" "نشہ" نہیں دیکھا۔ نہ وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ ہاں حضرتِ اثر نے ضرور "محجوبی" کے ایہامِ معنوی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ "محجوبی" کے اصلی معنی ہیں "مستوری یا پوشیدگی"۔ ثقات اس لفظ کو شرم و حیا کے معنوں میں استعمال کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ بحالے کہ "کیفیت"، لفظ

بقول آں محترم "پامالیت" کی حد تک (بمعنی نشہ) استعمال ہو چکا ہے۔

جنابِ جگر مرادآبادی ۔ سن کے افسانۂ غم باغ میں کملا گئے پھول ۔ شاق گزرا مجھے بلبل کا غزل خواں ہونا

پروفیسر عندلیب شادانی ۔ "غزلخوانی" میں "سرور و شادمانی" کا مفہوم شامل ہے۔ اسے "افسانۂ غم" سے تعبیر کرنا مقتضائے حال کے مطابق نہیں۔

عطاء اللہ صاحب پالوی ۔ اگر غزل اُس کلام کو بھی کہتے ہیں، جس میں درد، کرب، نالہ، تپش، سب کچھ ہو، تو "غزلخوانی" کو "افسانۂ غم" سے تعبیر کرنا درست ہے۔ (اسکے بعد مرزا غالب مرحوم اور جناب سیماب اکبرآبادی کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے۔)

حضرتِ اثر لکھنوی ۔ شادانی صاحب کا اعتراض غلط ہے، اور عطاء اللہ صاحب کا جواب صحیح۔

اعتراض دُرست ہے، اور جواب ناقابلِ تسلیم ۔۔۔ اگر "غزل" کو "افسانۂ غم" سے محض اس لئے تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس میں "مضامینِ غمناک" بھی شامل ہیں ۔۔۔ تو پھر ایسا کونسا نام بچے گا جو "غزل" کے لئے ناموزوں ہو۔ کیونکہ دُنیائے عمل و عالمِ خیال کا کوئی جذبہ نہیں جو (شاعرانہ یا غیر شاعرانہ انداز سے) غزل میں نظم نہ کیا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ باوجود نیرنگی و صد رنگیٔ مضامینِ "غزل" پر "مسرت و نشاط" کا مفہوم اتنا حاوی ہو چکا ہے، کہ لفظ "غزل" کانوں میں پڑتے ہی، دل و دماغ "سرور و شادمانی" کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ۔۔۔ اور "واہ" کے سوا "آہ" کا خیال کجا، گمان تک نہیں ہوتا۔

ایرانی ہوں یا ہندی: معتمد و ثقہ شعرا کے کلام میں "غزل خوانی" کا لفظ "شادمانی" ہی کے مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی اس کے خلاف بھی لکھے، تو معتبر نہیں۔ فاضل مجیب نے میرزا غالب اور جناب سیماب کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے، مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جنابِ سیماب کا تو ذکر ہی کیا، میرزا غالب کی زبان بھی مستند تسلیم نہیں کی جاتی

آخر میں خواجہ میر درد کا ایک مشہور شعر بھی سن لیجئے، اور خود فیصلہ کیجئے، کہ یہاں "غزل" کا لفظ کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے ؎

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل ۔ کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

اگر "غزل" اور "افسانۂ غم" میں کوئی تضاد نہیں، تو پھر ایک "غمزدہ انسان" اسے اپنے حال کے مناسب کیوں نہیں سمجھتا؟

جنابِ جگر مرادآبادی ۔ سحر تک شمعِ محفل میں نے جل بجھنے کی ٹھانی ہے
ہمیں یہ دیکھنا ہے خاک ہو جاتے ہیں ہم کبتک

پروفیسر عندلیب شادانی ۔ پہلے مصرع میں "میں" اور دوسرے مصرع میں "ہم" شترگربہ ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی ۔ اساتذہ نے اسے جائز رکھا ہے۔

جنابِ نیاز مدیر "نگار" ۔ پہلے شترگربہ معیوب نہ تھا۔ لیکن اساتذہ اس سے احتراز کرتے ہیں۔

حضرتِ اثر لکھنوی ۔ فی الحقیقت ان حضرات کا وہم ہی وہم ہے، کہ شعر میں شترگربہ ہے۔ "میں" سے شاعر نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ اور "ہم" میں وہ اور شمع شریک ہیں۔ شاعر شمع کو مخاطب کر کے کہتا ہے، کہ "میں نے بھی تیری طرح جل بجھنے کی ٹھانی ہے" اب ہمیں (یعنی مجھے اور تجھے) یہ دیکھنا ہے کہ ہم میں سے (مجھ میں اور تجھ میں) کون سحر تک۔ یا اس سے پہلے جلکر خاک ہو جاتا ہے۔

محترم تبصرہ نگار نے پہلے مصرع میں اپنی طرف سے لفظ "بھی" کا اضافہ کر کے "ہم" میں شاعر و شمع دونوں کو شریک کر لیا۔ اور دوسرے مصرع کا یہ مفہوم بتایا ہے کہ "مجھ کو اور شمع کو یہ دیکھنا ہے کہ دونوں میں کون سحر تک یا اس سے پہلے جل کر خاک ہو جاتا ہے۔" بحالیکہ یہ امر مسلّم

ہو کہ شمع عموماً سحر ہی کو خاموش ہوا کرتی ہے۔ شاعر کو صرف اپنے متعلق شک ہو سکتا ہے، اور اسی لئے صرف اُسے یہ دیکھنا ہو کہ وہ کب تک خاک ہوتا ہو ــــ میری دانست میں اعتراض دُرست ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ خود اپنے نشہ میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں
خراب مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

پروفیسر عندلیب شادانی۔ انسان کی یہ قدرت نہیں، کہ اپنا منہ آپ چوم لے۔ (الا آئینہ میں، مگر وہ عکس ہی، اصل نہیں۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ گمنام شاعر و افسانہ نویس "پریم پجاری" کا ایک شعر ہے ؎

تم آئینے میں اپنے لب چوم لینا یہی دُور اُفتادہ کا پیار ہوگا

جنابِ نیاز مدیر "نگار"۔ مجیب کا استدلال میں یہ شعر پیش کرنا دُرست نہیں، کیونکہ آئینے میں اپنے لب چومے جا سکتے ہیں۔ لیکن اعتراض بھی صحیح نہیں، کیونکہ جگر کا مقصود یہ کہنا نہیں کہ "وہ واقعی اپنا مُنہ آپ چوم رہے ہیں"؛ بلکہ "نشہ کی حالت میں جھومنے" کو اُس نے اِس بات سے تعبیر کیا ہے، کہ "گویا وہ آپ اپنا منہ چوم رہے ہیں":

حضرتِ اثر لکھنوی۔ آئینے کے سامنے جب امکان ہے، تو اعتراض باطل ہو گیا، یہ ضرور نہیں کہ شاعر آئینہ کی تخصیص کرے۔

فاضل مجیب کی طرح محترم تبصرہ نگار کا بھی خیال ہے، کہ "آئینے کے سامنے ممکن ہے تو اعتراض باطل ہو گیا"۔ لیکن اس صورت میں تخصیصِ آئینہ ضروری ہو کیونکہ محض "اپنے نشہ" یا "جھومنے" سے یہ لازم نہیں آتا کہ "وہ آئینے (ہی) کے سامنے جھوم رہے ہیں":

رہی جنابِ نیاز کی یہ توجیہہ، کہ "شاعر کا یہ مقصود نہیں کہ واقعی وہ آپ اپنا منہ چوم رہے ہیں۔ بلکہ نشہ کی حالت میں جھومنے کو آپ اپنا مُنہ چومنے سے تعبیر کیا گیا ہو" سو اس تعبیر و توجیہہ کے جواز کی بھی کوئی دلیل نہیں نظر آتی۔

میری رائے میں اعتراض دُرست ہے ــــ "اپنے لب" تو ایک حد تک بغیر آئینہ بھی چومے جا سکتے ہیں، لیکن "مُنہ" (سوائے عکس اور وہ بھی بصورتِ تخصیص آئینہ وغیرہ) نہیں چوما جا سکتا۔ علاوہ ازیں پہلے مصرع میں لفظ "نشہ" کا اشباع بھی ناگوار ہے ــــ اور دوسرے مصرع میں "خراب .... بنے ہوئے ہیں" اور "ہلاک .... بنا رہے ہیں" بھی محلِ نظر ہے۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ قسم ہے تیری پشیمان نگاہیوں کی قسم مجھی کو خود مری شرمِ وفا نے لوٹ لیا

پروفیسر عندلیب شادانی۔ قسم کی تکرار بالکل بے محل ہو، اور "قسم ہے" کا ٹکڑا محض بیکار۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ اساتذہ نے تکرارِ الفاظ سے بہت کام لیا ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ تکرار حُسن بھی ہے اور عیب بھی۔ لیکن یہ تکرار بہت پُرلطف ہے، جس نے قسم کھانے کی وجہ بتا کر قسم کی اہمیت بڑھا دی۔ "قسم ہو" مصرع سے نکال کر پڑھئے.... تاثیر فنا ہو جائے گی۔

میرے نزدیک "قسم ہے" کا ٹکڑا بیکار نہیں، بلکہ آخری لفظ "قسم" بیکار ہے ــــ یہ بات سمجھ میں آنی بہت مشکل ہے کہ "قسم کی تکرار نے (کیونکر) قسم کھانے کی وجہ بتا کر قسم کی اہمیت بڑھا دی":

جنابِ جگر مراد آبادی۔ عطا کرلے جمالِ حسن وہ داغِ محبت بھی زبانِ عشق میں جس کو گلِ شاداب کہتے ہیں
جمالِ حسن کی بجلی سی لہر دوڑا کر نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

پروفیسر عندلیب شادانی: "جمالِ حسن" کی ترکیب کیسر مہمل ہے کیونکہ دونوں لفظ فارسی میں مترادف المعنی ہوگئے ہیں۔

عطاء اللہ صاحب بالوی: (ا) "حسن" اور "جمال" میں ایک نازک فرق ہے "حسن" میں چہرے کے رنگ روپ اور "جمال" میں اعضا کے رنگ ڈھنگ دیکھے جاتے ہیں۔ (ب) فارسی شعرانے "جمال" بہ معنی دیدار بھی استعمال کیا ہے ـــ مگر افسوس کہ مجھے کوئی شعر یاد نہیں ـــ اُردو میں سیماب کہتے ہیں ؎

جامِ شراب اور شبابِ جمالِ دوست ... یہ دَور تا اَبد نہ سہی عمر بھر تو ہو

جگر نے بھی دونوں شعروں میں "جمال" بہ معنی دیدار استعمال کیا ہے، اس لئے ترکیب دُرست ہے۔

جنابِ نیاز مدیرِ "نگار": "حسن وجمال" کا جو فرق مجھ نے بیان کیا درست نہیں۔ دونوں کے ایک معنی ہیں ـــ سیماب کے شعر میں "جمال" بہ معنی جلوہ استعمال نہیں کیا گیا۔

حضرت اثر لکھنوی: "حسن وجمال" میں دراصل یہ فرق ہے کہ "حسن" خوبصورتی ہے۔ اور "جمال" میں حسنِ سیرت بھی شامل ہے "جمال" کے معنی فارسی میں مجازاً "دیدار" کے بھی ہیں، مگر اس طرح "دادن" کے ساتھ آتا ہے ـــ فارسی نیز اُردو میں "جمال اور حسن" بلا کسی امتیاز کے مترادف سمجھے جاتے ہیں ـــ مگر بعض دیگر مرادفات کی طرح ایک ساتھ نہیں آتے ـــ "جمال" اُردو میں بمعنی "دیدار" کبھی استعمال نہیں ہوا...... لہٰذا "حسن وجمال" عطف کے ساتھ لانا حشو ہے ـــ اور "جمالِ حسن" یا "حسنِ جمال" بالکل بے معنی بات ہے ـــ سیماب صاحب کے شعر میں "جمال" کے معنی دیدار لینا غلط ہے...... اگر پہلے شعر میں "جمالِ حسن" کے بدلے "فروغِ حسن" ـــ اور دوسرے میں تجلیات ہو ـــ تو دیکھئے یہ شعر کہاں سے کہاں پہونچتے ہیں ؎

عطا کر اے فروغِ حسن وہ داغِ محبت بھی ... زبانِ عشق میں جس کو گلِ شاداب کہتے ہیں

تجلیات کی ہلکی سی لہر دَوڑا کر ... نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تو نے

"جمال" اور "حسن" میں درحقیقت اگر کوئی فرق ہے، تو یہ کہ "جمال" محدود ہے ـــ اور "حسن" غیر محدود ـــ یعنی "جمال" (بہ معنی خوبصورتی) صرف انسانی چہرے سے متعلق ہے، اور "حسن" پوری شکل انسانی یا غیر انسانی، ذی رُوح یا بیجان، مادّی یا غیر مادّی، غرضکہ ہر شے اور ہر جذبہ و خیال میں پایا جاتا ہے ـــ اس لئے "جمالِ حسن" یا "حسنِ جمال" (اضافت کے ساتھ) واقعی مہمل ہے۔

"جمال" بہ معنی دیدار، نہ تو زیر بحث اشعار میں استعمال ہوا ہے اور نہ سیماب صاحب کے شعر میں۔

"حسن وجمال" کی ترکیب، اگر "جمال" کے معنی "دیدار" لئے جائیں تو بیشک غلط ہے۔ لیکن محدود و غیر محدود معنویت کے لحاظ سے صحیح۔ اس لئے کہ "حسن وجمال" کے معنی ہیں "زیبائی ظاہر وخوبیِ باطن"۔ اگرچہ "حسن" ظاہر و باطن دونوں کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن بیک وقت دونوں معنی نہیں دے سکتا۔ یعنی ایک بار میں صرف ایک ہی معنی ہوسکتے ہیں۔

رہی اصلاح، سو پہلے شعر کا مطلب اب یہ ہوا کہ "اے فروغِ حسن وہ داغِ محبت بھی عطا کر، جسے زبانِ عشق میں گلِ شاداب کہتے ہیں"۔ اس میں اوّل تو لفظ "بھی" زائد معلوم ہوتا ہے جس سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ اب تک جو داغ ملے ہیں، وہ "گلِ فسردہ" کی حیثیت رکھتے ہیں ـــ اور یہ "فروغِ حسن" کی تنقیص ہے ـــ دوسرے یہ کہ "فروغِ حسن" کسی کو داغ عطا نہیں کرتی، بلکہ محبت محب کو داغ عطا کرتی ہے ـــ ورنہ "فروغِ حسن" پر جس کی نظر پڑ جاتے اُسے داغ مل جاتے، محبت کی قید نہیں۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں "تجلیات" بصیغۂ جمع بے محل ہے ـــ "تجلی کی ہلکی سی لہر" تو خیر! لیکن "تجلیات کی ہلکی سی لہر" کیا معنی؟

مصرع دوم میں "نفس نفس" بھی محلِ نظر ہے، اس لئے کہ "جگمگاہٹ" کیلئے ظرفیت لازم، اور "نفس" کی ظرفیت معلوم۔

جنابِ جگر مرادآبادی۔ شمع چپ، پروانے ششدر، اہلِ دل سب دم بخود　　ہائے کیا تصویر کا عالم تری محفل میں ہے

پروفیسر عندلیب شادانی۔ شمع کبھی بولتی بھی تھی؟ جواب "چپ" ہے! اگر "چپ" "خاموش" کا ترجمہ ہے، تو شمع محفل میں بجھی ہوئی نہیں رکھی ہے۔

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ "چپ" سے مطلب، شمع کی لَو کا غیر متحرک جلنا ہے۔

جنابِ نیاز مدیر "نگار"۔ اعتراض درست ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ "خاموشی کا اشارہ یوں بھی کرتے ہیں، کہ "ہونٹوں پر کلمہ کی انگلی رکھ لی۔" شمعِ فروزاں اس اشارے کی مجسم تصویر ہے — اور میں اس دانستہ یا نادانستہ مصوری پر جگر صاحب کو داد دیتا ہوں۔

دل نہیں چاہتا، کہ اِس تعریف کے بعد شعر میں جھول نکالا جائے، مگر طبیعت (آپ "عیب جو" کا اضافہ کرسکتے ہیں، مگر کبھی یاد کیجئے گا۔) سے مجبور ہوں — اگر "سب" کی جگہ "سو" پڑھئے — شعر کی تاثیر دوبالا ہوگئی — غور کیجئے اور سمجھیے۔"

حضرتِ اثر کی توجیہہ کام آسکتی تھی، اگر شاعر یوں کہتا، کہ "پروانے شور کر رہے ہیں، اہلِ دل نعرہ زن ہیں، اور شمع انہیں خاموشی کا اشارہ کر رہی ہے۔" لیکن آں محترم تسلیم کرتے ہیں، کہ "پروانے ششدر رہیں، اور اہلِ دل سو دم بخود" تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ شمع خاموشی کا اشارہ کسے کر رہی ہے؟ اور اُس کے "اشارہ خموشی کی مجسم تصویر" ہونے کا حاصل؟

"سب" نے اگر مصرع میں "جھول" پیدا کر دیا ہے، تو "سو" بھی اِس "جھول" کو مٹا نہیں سکتا۔ "سب" تو خیر بے ضرورت ہے ہی، لیکن "سو" بھی برمحل نہیں، تینوں ٹکڑوں کا ایک ہی انداز ہونا چاہئے۔

جنابِ جگر مرادآبادی۔ چیخی ہے کس انداز سے کس کرب وبلا سے　　دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

پروفیسر عندلیب شادانی۔ "کرب سے چیخنا" تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن بلا سے چیخنا کیا معنی؟

عطاء اللہ صاحب پالوی۔ "کرب" اور "بلا" مترادف المعنی الفاظ ہیں۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ اعتراض صحیح ہے۔

اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے — عطاء اللہ صاحب کا جواب درست ہے — صرف مثالوں کی کمی ہے — وہ ملاحظہ ہوں۔ خرم شیرازی کہتا ہے ؎

حکایت کنم از زمینِ بلا　　زکرب وبلا ہائے کرب وبلا

یک قطرۂ خوں بیش نہ باشد دلِ غمگیں　　ازکرب وبلا یاد کند چوں زشبہ دیں

جنابِ جگر مرادآبادی۔ نہ جانے محبت ہے کیا چیز لیکن　　بڑی ہی محبت سے ہم دیکھتے ہیں

پروفیسر عندلیب شادانی۔ جب آپکو معلوم ہی نہیں، کہ محبت کیا چیز ہے، تو پھر جس انداز سے آپ دیکھتے ہیں اُسے محبت سے تعبیر کرنا کیا معنی؟

حضرتِ اثر لکھنوی۔ اعتراض معقول ہے کہ جب معلوم ہی نہیں کہ محبت کیا چیز ہے تو اُسے محبت سے دیکھنا کیا معنی؟ — جگر صاحب کا شعر اس طرح درست ہوسکتا ہے ؎

تری طرح تری محبت ہے پیارے　　اُسے بھی محبت سے ہم دیکھتے ہیں

حضرتِ اثر نے پروفیسر صاحب کی عبارت غور سے ملاحظہ نہیں فرمائی — اعتراض یہ ہے، کہ "جب جگر صاحب جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا چیز ہے، تو پھر وہ جس انداز سے (محبت کو نہیں، محبوب کو) دیکھتے ہیں، اُس (محبت کو نہیں) انداز کو محبت سے کیونکر تعبیر کرسکتے ہیں؟"

کوئی معنی نہیں رکھتا۔

حضرت اثر کی عبارت، اور اصلاح بھی (اصل شعر کی طرح) قابلِ اعتراض ہے۔ اس لئے کہ "محبت کو محبت سے دیکھنا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔

جنابِ جگر مرادآبادی۔ کسی کے سامنے مشکل سے عرضِ حال ہوئی ۔۔۔ سنبھل سنبھل کے طبیعت مری نڈھال ہوئی

پروفیسر عندلیب شادانی۔ اردو میں "عرض" جب درخواست کے معنی میں آئے تو مؤنث ہے۔ مثلاً "میری یہ عرض ہے"۔ لیکن "عرضِ حال" کے معنی ہیں "اظہارِ حال"..... اِسے مؤنث سمجھنا غلط ہے۔

حضرتِ اثر لکھنوی۔ اعتراض بے بنیاد ہے۔ عرض کے معنی درخواست کے علاوہ گزارش یا کہنے کے بھی ہیں۔ مثلاً "میں نے عرض کی کہ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر"۔

اعتراض درست ہے ۔۔۔ شعر میں محض "عرض" نہیں، بلکہ "عرضِ حال" ہے ۔۔۔ اور "عرضِ حال" یا "گزارشِ حال" کے معنی ہیں "اظہارِ حال" یا "حال کہنا"۔ اور یہ بے شبہ مذکر ہے ۔۔۔ اِسے مؤنث سمجھنا غلط ہے۔

جنابِ جگر مرادآبادی۔ بیانِ اہلِ دل ہو کہ اسیرِ قیل و قال ہیں ۔۔۔ نظر ملی کہ ہو گیا تبادلہ خیال میں

پروفیسر عندلیب شادانی۔ "تبادلہ" بہ معنی تبادل (exchange) نہ عربی ہے نہ فارسی نہ اُردو...... اُردو میں "تبادلہ" کے معنی ہیں ٹرانسفر (transfer) یعنی بدلی سو اس کا یہاں کوئی محل نہیں۔

حضرت اثر لکھنوی۔ "تبادلہ" عربی یا فارسی نہ ہو مگر بہت اچھی اُردو ہے۔ تبادلۂ خیالات بھی جائز ہے، ہماری زبان میں رائج ہے، عوام نہیں ثقہ بھی بولتے ہیں۔ اور مبادلۂ خیالات سے ہر حال میں بہتر ہے...... اس کے جواز میں کوئی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی۔ خیال کو تبادلہ کسی ملازم کی بدلی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا اور اُن پر غور کرنا ہے۔ اور یہی معنی شعر میں بھی دیتا ہے۔ البتہ دونوں مصرعوں کی ردیف غلط ہے۔ "خیال کا تبادلہ" "خیال میں تبادلہ" سے بالکل مختلف ہے۔ "خیال میں تبادلہ" تو خیال میں تغیر و تبدل ہوا، نہ کہ خیال کا لین دین۔ اسی طرح "قیل و قال میں اسیر ہونا" تو اُلجھ کر رہ جانا ہے، نہ کہ قیل و قال کا پابند یا محتاج ہونا ۔۔۔ لہذا ردیف "میں" کے بجائے "کا" ہونا چاہیے۔

پروفیسر صاحب کا اعتراض معقول ہے ۔۔۔

حضرت اثر فرماتے ہیں۔ (۱) "تبادلہ عربی یا فارسی نہ ہو مگر بہت اچھی اُردو ہے"۔ "تبادلہ" کے اُردو ہونے سے تو پروفیسر صاحب کو بھی انکار نہیں، اعتراض صرف یہ ہے کہ "تبادلہ" بہ معنی "تبادل" غلط ہے۔

(ب) "تبادلۂ خیالات بھی جائز ہے، ہماری زبان میں رائج ہے، عوام نہیں ثقہ بھی بولتے ہیں، اور مبادلۂ خیالات سے ہر حال میں بہتر ہے"۔ ۔۔۔ "تبادلہ" اُردو، اور "خیالات" عربی، دونوں کی ترکیب کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟ یہ ترکیب "مبادلۂ خیالات سے ہر حال میں بہتر" شاید اس لئے ہوگی کہ "مبادلہ" اور "خیالات" دونوں عربی ہیں، ان کی ترکیب میں کوئی تنوع نہیں، اور "تبادلۂ خیالات" میں ایک لفظ اُردو ایک عربی، خاصہ تنوع ہے ۔۔۔ اگرچہ آں محترم نے کوئی مثال پیش نہیں کی، لیکن مان بھی لیا جائے کہ "تبادلۂ خیالات" آپ کی زبان میں رائج ہے، اور ثقہ بولتے ہیں۔ تو پھر بطورِ نتیجہ آں جناب کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ "لبِ سڑک" "قریب المرگ" اور اِسی قبیل کی دوسری "بہت اچھی" اور "رائج الوقت" ترکیبیں بھی درست ہیں۔

(ج) "تبادلۂ خیالات کے عدم جواز میں کوئی دلیل کارگر نہیں ہو سکتی"۔ ۔۔۔ اوّل تو ابھی ایک نہایت "کارگر" دلیل پیش کی جا چکی ہے،

اگر آں جناب اُسے تسلیم نہ کریں، تو "عدم جواز کی دلیل" کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔ ضرورت تو "دلیلِ جواز" کی ہے، کہ بارِ ثبوت مدّعی کے ذِمّہ ہوتا ہے، نہ "منکر کے۔

(د) "خیال کا تبادلہ، کسی ملازم کی بدلی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنا، اور اُن پر غور کرنا ہی اور یہی معنی شعر بھی دیتا ہے"۔ اور یہی اعتراض بھی ہی کہ "تبادلہ" جو معنی شعر میں دے رہا ہے وہ درحقیقت اس کے معنی نہیں، اس کے معنی وہ ہیں جس سے آپ انکار کر رہے ہیں۔ یعنی کسی ملازم کی بدلی ایک جگہ سے دوسری جگہ کو۔

ہمارے یہاں شفقہ ایک دوسرے کے خیالات معلوم کرنے، اور اُن پر غور کرنے کا مفہوم ادا کرنے کے لئے "مبادلۂ خیالات" بولتے ہیں۔ وجہ دفعہ (ب) میں عرض کی جا چکی۔

(ہ) "خیال میں تبادلہ، تو خیال میں تغیر و تبدّل ہوا، نہ کہ خیال کا لین دین"۔ گویا آں محترم کی رائے میں شاعر کا مقصود "خیال کا لین دین یعنی ٹرانسفر یا بدلی (اپنا خیال دینا اور دوسرے کا لینا) ہی۔ بہ حالیکہ ابھی آپ اس مفہوم سے انکار کر چکے ہیں۔

(و) "قیل وقال میں اسیر ہونا، تو اُلجھ کر رہ جانا ہی نہ کہ قیل وقال کا پابند یا محتاج ہونا"۔ اور یہ مفہوم ردیف بدلنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اُلجھ کر رہ جانا اس وقت تک باقی رہیگا جب تک "اسیر" کو پابند یا محتاج سے نہ بدلا جائے گا۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ ہر وقت اک خُمار تھا، ہر دم سرور تھا بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

پروفیسر عندلیب شادانی۔ بہ یک وقت خُمار اور سرور دونوں کا پیدا ہونا کیا معنی؟

حضرت اثر لکھنوی۔ پیاپے خُمار اور سرور کا دَور دکھانے کی وہی صورت تھی، جو شعر میں ہے۔

اعتراض دُرست ہے ـــــ پیاپے خُمار اور سُرور کا دَور دکھانے کی وہ صورت نہیں، جو شعر میں ہے، بلکہ یہ ہے کہ "ابھی خُمار تھا، ابھی سُرور تھا" یا "خمار تھا سرور تھا، سرور تھا خمار تھا" جگر صاحب کے پہلے مصرع میں یا تو "خمار" سے پہلے "اک" زائد ہے، یا "سرور" سے پہلے "اک" کم۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ جگر بتائیے کچھ حالِ زارِ خستہ تو ہے یہ کیوں برستی ہیں مایوسیاں نگاہوں سے

پروفیسر عندلیب شادانی۔ منادی اگر واحد ہو، تو اس کے لئے فعل بصیغۂ جمع اس وقت استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ اس کے ساتھ کوئی کلمۂ تعظیم بھی موجود ہو۔ ورنہ فعل بھی واحد ہی ہونا چاہیئے۔ لہذا "جگر بتا" یا "جگر صاحب بتائیے" کہنا چاہیئے۔

حضرت اثر لکھنوی۔ شادانی صاحب کو بربنائے قواعدِ اردو جو کچھ معلوم ہوا ہو۔ مگر "زبان کا ماہر" "بتائیے" میں جو ہلکا سا طنز چھپا ہوا ہی، اس کی داد دیگا، اور قواعدِ صرف و نحو کو چولھے میں جھونکے گا۔

اعتراض دُرست ہے ـــــ حضرت اثر کا جواب اُن کے شایانِ شاں نہیں ـــــ اس "ہلکے سے پوشیدہ طنز" کے لئے، جو ایک اتنکا سا خامی سے پیدا ہوا ہو، کوئی "ماہر زبان" قواعدِ صرف و نحو کو چولھے میں جھونکنا پسند نہیں کر سکتا۔

اور پھر یہ کون کہتا ہے کہ "آپ "بتائیے" (جس میں ہلکا سا طنز چھپا ہوا ہے) کسی صورت میں نہ کہیئے۔ صرف "بتا" کہیئے"ـــــ اگر آپ "بتائیے" کہنا چاہتے ہیں، تو "جگر صاحب" یا "جنابِ جگر" (جس میں اور زیادہ طنز پایا جاتا ہی) کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔

جنابِ جگر مراد آبادی۔ چاہیئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر اک ہلال سا

پروفیسر عندلیب شادانی:۔ "آپ ہی کا جمال سا" مہمل ہے۔ "آپ ہی کا سا جمال" چاہیئے۔
حضرت آثرؔ لکھنوی:۔ اعتراض درست ہے۔ مصرع اس طرح درست ہوسکتا تھا:۔ "چاہیئے عشق کو جمال آپ ہی کے جمال سا"
اصلاح کے بعد بھی مصرع مکمل نہ ہوسکا۔ "عشق" بہ معنی "عاشق" اس صورت میں مناسب ہوتا، جب "جمال" بھی بہ معنی "جمیل" ہوتا۔ دوسرے مصرع میں "ایک اور اک" غیر متوازن ہونے کے علاوہ بے ضرورت بھی ہیں۔ "ہر داغ بدر سا، ہر زخم ہلال سا" کافی ہے۔
جناب جگرؔ مرادآبادی:۔ زمانہ آج ہی غرقِ شراب تھا زاہد کچھ اور دیر جو وہ چشمِ نیم باز رہے
پروفیسر عندلیب شادانی:۔ "کچھ اور دیر" نامطبوع ہے، "کچھ دیر اور" چاہیئے۔
حضرتِ آثرؔ لکھنوی:۔ ایسی خفیف تعقیدات پر اعتراض تضیعِ اوقات ہے۔
اعتراض درست ہے۔ خفیف سے خفیف تعقید بھی جو محاورہ یا روزمرہ کی ترتیب کو ابتر کرے، معیوب ہے۔ ہاں، ہر جگہ ترتیب لفظی، نظم اور نثر میں ایک سی نہیں ہوسکتی۔
دوسرے مصرع میں "چشم" (بے اضافت) غیر فصیح ہے۔ فارسی کے ایسے الفاظ جن کا بدل فصیح موجود ہے بے ترکیب اضافی اُردو میں لانا معیوب ہے۔ یہاں "چشم" کی جگہ "آنکھ" چاہیئے، یا "چشمِ مست":

پروفیسر عندلیب شادانی نے جناب جگرؔ کے تقریباً سو اشعار پر صرف اغلاطِ زبان کے لحاظ سے اعتراضات کئے تھے۔ ان میں سے عطاء اللہ صاحب نے نصف اور حضرت آثرؔ نے تین چوتھائی اعتراضات سے بحث کی۔
جن اعتراضات کے متعلق میں نے اظہارِ خیال کیا ہے، اُن میں سے صرف چند ایسے ہیں جن میں فاضل مُعترض سے میں متفق نہ ہوسکا، باقی سب میں حضرتِ آثرؔ سے مجھے کچھ نہ کچھ اختلاف ہے۔
اور یہ اختلاف صرف اشعار مندرجِ بالا ہی میں نہیں، بلکہ اِس قسم کے اور بھی شعر ہیں، جن سے فی الحال بر بنائے قلت وقت صرفِ نظر کرنا پڑا۔

کوکب شاہجہان پوری

وہ کیا ہے! میں کیا ہوں!

وہ سرچشمہ ہے اور میں آبِ بقا ہوں | وہ ہے خضر، لیکن میں راہِ ہُدا ہوں
شفق وہ، میں رنگِ ردائے شفق ہوں | وہ مہرِ افق ہے، میں اُس کی ضیا ہوں
وہ حق ہے، میں ہوں کُشتۂ حق پرستی | وہ ہے سازِ فطرت، میں اُس کی صدا ہوں
وہ ہے سوز! میں کیفِ سوز و تپش ہوں | وہ ہے نغمۂ غم، میں نغمہ سرا ہوں
وہ میخانہ، اور میں، شرابِ محبت! | وہ سرمست، میں مستیِ مُدّعا ہوں
وہ گُل ہے، میں نکہت! وہ دل، آرزو میں | وہ ہے شعر، میں معنیِ شعر زا ہوں
وہ میرے تاثر پہ ہے سایہ افگن! | میں اُس کے تفکر میں جلوہ نما ہوں

"دلفگار"

افشائے حقیقت

بھلا کب تک لے شاہِ گردوں وقار ۔ بھٹکتا رہے گا غریب الدیار
نکلتی نہیں روح سے غم کی پھانس ہوائے چمن لاکھ ہو خوشگوار
مجھے پھر بھی تسکیں نہ ہوگی اگر مرے پاؤں دھو کر پئیں شہریار
مسرت کا احساس کیا ہو مجھے کہ بنیادِ اُلفت نہیں استوار
کہاں سے اٹھی اور کدھر جائیگی نہیں پوچھتے خاک سے شاہسوار
کسی کو کسی کی بھلا فکر کیا وہ مزدور ہو یا کہ سرمایہ دار
حریر اور اطلس کے انبار اُدھر گریباں اِدھر ہو گیا تار تار

سُناؤں تجھے اک حسیں سرگذشت فضائے نشیمن تھی جب سازگار
وہ اِک کھویا کھویا سا گنجان نیم وہ پھیلے ہوئے دُور تک مرغزار
وہ اُن کی نظر میں مرے خشک لب مِرے ہاتھ میں کاکلِ مشکبار
وہ پھول انکی زلفوں میں اُلجھے ہوئے میرے چیتھڑوں پر وہ گرد و غبار
وہ دھڑکن دلوں کی وہ مدہوشیاں وہ بُلبُل کے نغمے سرِ شاخسار
وہ بھلوں کے وہ خم وہ جھرنوں کے راگ بہت دُور اُودے سے وہ کوہسار
شعاعیں وہ موجوں پہ ہنستی ہوئی زمیں پر بہاریں فلک پر نکھار

ذرا آنکھ جھپکی تو حیرت ہوئی کہ تھا ذرّے ذرّے میں اک انتشار
نہ وہ دل رہا اور نہ وہ زندگی بس اک رُوح ہے دیکھے! وہ بھی فگار
نہ بھولا وہ خوابِ حقیقت نما بہت دیر تک مَیں رہا اشکبار
مزے سی کٹے چار سانسوں کا کھیل اگر لوٹ آئیں وہ لیل و نہار
وہ کیوں سامنے میرے آتا نہیں اگر دل میں مستور ہے روتے یار
ہر اک چیز ہے رونے دھونے میں گم فلک ہے پریشاں زمیں بیقرار

مگر اب مجھے ان سے شکوہ نہیں "شب زار نالید ابرِ بہار
کہ ایں زندگی گریۂ پیہم است"[1]

احمد ندیم قاسمی

---

[1] اقبالؒ (پیامِ مشرق)

مُعمّا

لغو

Bogus

وہ بہت ہی حسین ہے!

بلا کی شوخ، لیکن نہیں، اُس میں سنجیدگی بھی تو ہے،

آپ سمجھے وہ کیسی ہے؟ لیکن آپ کو کیا معلوم!؟

اچھا ذرا ٹھیریے، مَیں ابھی بتاتا ہوں کہ وہ کیسی ہے۔

وہ چھریرے بدن کی گوری چٹّی لڑکی ہے، اُس کا قد نہ تو کچھ ایسا زیادہ ہے نہ کم۔ بس یوں سمجھیے کہ وہ میانہ قد ہے۔ بھرے بھرے بازو تھلا تھلا ابھرا ہوا سینہ۔ سر کے بیچوں بیچ ایک لمبی سی سفید دھاری بنی رہتی ہے اور اُس کے دونوں طرف لانبے لانبے سیاہ بال جو اکثر پریشان رہتے ہیں۔ اُس کی بھویں، آپ نے پہلی تاریخ کا چاند تو دیکھا ہی ہوگا، بس کچھ اسی طرح کی ہیں۔ باریک باریک، کمان کی طرح، اُس کی آنکھیں، وہ دو جھیلوں کی مانند ہیں۔ ابھی پُرسکون، ابھی متلاطم۔ اُس کے لب مجھے تو بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے اوس میں ڈوبی ہوئی نوشگفتہ کلیوں کی پتیاں۔ مَیں آپکو کیا کیا بتاؤں، بس سمجھ لیجیے کہ وہ بہت ہی خوب ہے! جی ہاں، وہ بہت ہی خوب ہے!!

خدا معلوم اب بھی آپ سمجھے یا نہیں کہ وہ کیسی ہے، شاید نہیں سمجھے، خیر کچھ مضائقہ نہیں، مَیں ایک بار پھر کوشش کرتا ہوں۔ لیکن آپ پوری توجہ سے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ کاش آپ تصوّر کر سکیں وہ کیسی ہے، عجیب قسم کی لذّت محسوس کیجیے گا آپ!

تو آپ پوری توجہ سے سُن رہے ہیں نا؟

وہ میری ہم جماعت ہے اور ابھی کوئی بیس بائیس دن ہوتے ہونگے کہ ہم نے بی۔ اے پاس کیا ہے۔ اُس کے والد یونیورسٹی میں ادبیات کے پروفیسر ہیں اور میرے والد فلسفہ کے، ہم لوگ ایک ہی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ کئی سال سے، ماں سے وہ بھی محروم ہے اور مَیں بھی، اُس کی ماں تو بچپن ہی میں مر گئی تھی، لیکن میری والدہ کو مرے ہوئے ابھی کچھ ایسا زیادہ زمانہ نہیں ہوا۔ میری اُس کی دوستی اب تو بہت پُرانی ہو گئی ہے۔ لیکن اتنی پُرانی بھی نہیں جتنی ہمارے والدین کی۔ وہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہونے کے دس سال پہلے سے ایک دوسرے کے دوست ہیں اور انگلستان میں ایک ہی کالج میں تعلیم پائی ہے، لیکن ہم بھی ایک دوسرے کو اتنا ہی عزیز رکھتے ہیں، جتنا وہ دونوں۔ کبھی کبھی ہم لڑ بھی لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ کشیدگی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ زیادہ سے زیادہ بس آدھا گھنٹہ!

کل رات مَیں پڑھتے پڑھتے کتاب سینہ پر رکھے ہوئے سو گیا۔ اُس نے میری فاختہ اُڑا دی۔ خدا معلوم وہ مٹی کا تیل کہاں سے لے آئی، ہمارے یہاں تو اس کا استعمال بھی نہیں، اس لیے کہ ہمارے بنگلہ میں تو بجلی ہے ایسے زور سے انگوٹھا اور انگلی جلی ہے کہ ابھی تک جلن باقی ہے، مَیں بوکھلا کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور پاؤں کو زور زور سے پٹخنے لگا۔ اس بوکھلاہٹ میں سُلگتی ہوئی تھوڑی سی روئی میرے بستر پر جا پڑی۔ اور میری شال کئی جگہ سے جل گئی۔ یہ میری بہت ہی قیمتی شال تھی اور مَیں اُسے کشمیر سے لایا تھا۔ شور و غل سُن کر برابر والے کمرے سے اُس کے ابا میاں آ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی ہمدردی کریں، لگے زور زور سے قہقہے لگانے اور مَیں اس قہقہستان میں گُم سُم ایک ٹانگ پر کھڑا کھڑا اُن لوگوں کا مُنہ دیکھا کیا۔ تھوڑی دیر میں سنگار میز کے سامنے سے گذرتا ہوں تو مُنہ کالا، اچھا تو اس لئے قہقہے لگائے جا رہے تھے۔

"اچھا اب بہت کود پھاند چکے اور بہت شور مچا لیا۔ اب سو جاؤ۔ ہمیں بھی نیند معلوم ہو رہی ہے" اور یہ کہکر اُس نے بجلی کا بٹن دبا دیا۔ اندھیرے گھُپ میں میری آنکھوں کے سامنے دیر تک تارے

ناپا۔ گئے اور کنپٹیوں کی رگیں زور زور سے پھڑکا کیں۔ میری تو نیند اُچاٹ ہو گئی اور تکلیف علیحدہ دے دی اور آپ پڑی آرام کر رہی ہیں۔ میں دیر تک سوچتا رہا۔ کیا کروں، اور پھر بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کی چارپائی لَوٹ دی اور بال پکڑ کر اتنے چکر دئے، اتنے چکر دئے کہ چھٹی کا دودھ ہی تو یاد آگیا ہوگا۔ لیکن وہ برابر ہنستی رہی اور مدافعت کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ اِدھر میرا سانس پھول گیا۔ ہاں، آپ خود ہی سوچئے ایک جوان لڑکی کو چکر دینا کوئی آسان بات ہے۔ میں ہانپتا کانپتا اپنے بستر پر آکر پھر لیٹ رہا اور وہ وہیں فرش پر پڑی رہی۔ بہت دیر تک۔ پھر اٹھی اور ساتھ والے کمرے کی الماری میں نہ معلوم کیا کھکوڑتی رہی۔ تھوڑی دیر میں واپس آئی۔ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی: "لاؤ، تمہارے پاؤں میں دوا لگا دیں۔" اور وہ میرے پاؤں پر دوا لگا کر دیر تک اُسے سہلاتی رہی اور میری آنکھ لگ گئی۔ صبح کو جب آنکھ کھلی تو وہ میرے پلنگ کی پائنتی پر پڑی بیہوش سو رہی تھی، اس طرح کہ آدھا دھڑ پلنگ پر تھا اور ٹانگیں فرش پر اور شیشی کی دوا گدّے میں جذب ہو چکی تھی۔

اور پھر پرسوں صبح ——

"آؤ چوری کریں۔"

"چوری!"

"ہاں، ہاں، چلو چوری کرنے چلیں۔"

"کیا معنی؟"

"کسی شخص کی ملکیت کو اُس کی غیبت میں اُسکی بغیر اجازت لے لینا یا استعمال کرنا چوری ہے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"میں ابھی سمجھائے دیتی ہوں۔" اور یہ کہتی ہوئی مجھے دھکے دیتی بنگلے سے باہر ملازموں کی کوٹھڑیوں کی طرف لیجانے لگی۔

اُس نے آہستہ سے انّا کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا، اور پنجوں پر چلتے ہوئے لبوں پر انگلی رکھکر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دبے پاؤں کوٹھڑی میں داخل ہوئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی گویا یقین کرنا چاہتی ہے کہ اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اور پھر وہ انّا کے بکس کے تالے کو کھولنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن وہ نہ کھُلا، تو میری منّت سماجت کرنے لگی۔ میں حیرانی کے عالم میں یہ طے نہ کر سکا کہ تالا توڑوں یا نہ توڑوں کہ میری نظر اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ سراپا التجا بنی ہوئی تھی۔ مجھے اُس کی حالت پر ہنسی بھی آئی اور رحم بھی۔ اور تین چار ہی جھٹکوں میں لیور کا وہ چھوٹا سا تالا کُنڈے سے الگ کر دیا۔ اُس نے جلدی جلدی بکس کے کپڑے اُلٹنا شروع کئے، وہ پسینہ پسینہ ہوتی جا رہی تھی۔ گویا سچ مچ ہی تو چوری کر رہی ہے۔ جلدی کر اُس نے ایک جوڑا کپڑا نکالا، اور باقی کپڑے بکس میں ٹھونس کر میری انگلی پکڑ کر آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگی۔ چُپکے سے کوٹھڑی کی کنڈی لگائی اور اپنے کمرے میں جا چھپی۔ میں اپنے کمرے میں آکر سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ اتنے دیرینہ تعلقات پر بھی میں آج تک اُس کو نہ سمجھ سکا۔ ابھی میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھے ملازم نے آکر شکایت کی۔

"میاں صاحب ہم لوگوں پر ناراض ہونگے اور بٹیا انّا ہی بنی کچن میں بیٹھی ہوئی برتن صاف کر رہی ہیں۔"

میں جلدی سے اُٹھا اور باورچی خانہ میں جا کر دیکھا تو وہ انّا کے کپڑے پہنے واقعی پتیلیاں مانجھ رہی تھی اور سامنے ایک ٹوکری میں میلے برتنوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ انّا "ہائیں، ہائیں" کرتی رہی، لیکن وہ اسی طرح دُنیا زمانے سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھی، گویا اگر وہ یہ کام دل لگا کر نہ کرے تو آج دوپہر کو اُس کو کھانے کو نہ دیا جائیگا۔ میں کھڑا کھڑا یہ سب کچھ دیکھا کیا۔ آپ ہی بتائیے میں کیا کہتا؟۔

کام ختم کرنے کے بعد جب وہ کپڑے تبدیل کر کے میرے کمرے میں آئی تو میں نے پوچھا: "کبھی کبھی تم پر یہ دَورے کس قسم

کے پڑنے لگتے ہیں؟"

"دَورے!"

"یہی کہ کبھی کبھی تم پاگلوں کی سی باتیں کیوں کرنے لگتی ہو۔"

"اس میں پاگل پن کی تو کوئی بات تھی نہیں، مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ہر وقت گُڑیا ہی بنی بیٹھی رہوں۔ جی چاہا کہ آج میں بھی انّا کی طرح برتن صاف کروں، ویسے کسی سے کہتی تو بھلا مجھے ایسا کرنے دیتا۔ اس لئے سب کچھ چوری چوری کرنا پڑا۔"

اور میں اُسکے چہرے کی سنجیدگی دیکھتا رہ گیا۔

"ایک بات کہیں؟"

"کہو۔"

"تم مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہو، بہت ہی حسین!"

"اچھا تو پھر؟"

"کچھ نہیں، مجھے تمہاری صورت دیکھکر بڑی مسرّت ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ دیکھے ہی جاوں۔"

"تو دیکھتے کیوں نہیں، منع کس نے کیا ہے۔ میں تو تمہارے سامنے ہی بیٹھی ہوں۔" اُس نے اُسی سنجیدگی سے میرا پلو درُست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں منع تو کسی نے نہیں کیا۔ لیکن۔ لیکن . . . .

- - - - - - - - - - - -

"سُنتے ہو؟"

"کیا؟"

"ایک بات کہیں؟"

"ضرور!" میں نے کتاب کو بدستور پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم جب پڑھتے ہو تو تمہارے لبوں کی جنبش بہت ہی دلکش معلوم ہوتی ہے۔"

"معلوم ہوتی ہوگی، لیکن مجھے اس سے کیا!"

وہ خاموشی سے اُٹھی اور میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ اور میری صورت کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اپنے جلتے ہوئے لب میرے لبوں سے پیوست کردئے۔

میں جنبش تک نہ کرسکا اور وہ دیر تک مجھے پیار کرتی رہی۔

اور اس واقعہ کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر تھی۔ ہم لوگ لان پر سے ٹینس کھیل کر آئے۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر اپنا ریکٹ پریس میں رکھا اور ساتھ والے غسلخانہ میں غسل کرنے چلا گیا۔ غسل سے جب فارغ ہوا تو وہ ابھی تک وہیں میرے پلنگ پر بیٹھی تھی۔

"تم نہائی نہیں ابھی تک، یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

"نہاؤں کیسے، پسینہ تو خشک ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ دیکھو تو میرا دل کتنے زور زور سے دھڑک رہا ہے۔" اور یہ کہکر اُس نے میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھدیا۔ - میں نے ایکدم سے ایسا محسوس کیا کہ کوئی برقی رو میرے سارے جسم میں دوڑ گئی ہو چنانچہ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"تم اب بچی نہیں ہو، جوان ہوگئی ہو۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، پھر؟"

"پھر ـ تمہیں کیسے سمجھاؤں، ایسے، جوان لڑکیاں مردوں کے ہاتھ اپنے سینوں پر نہیں رکھتی ہیں۔"

"یہ بھی ایک ہی رہی۔ اگر ہمارا دل زور زور سے دھڑکنے لگے تو ہم کسی کو دکھائیں بھی نہیں!!"

"اب یہ اندھیرے میں بیٹھی کیا پڑھ رہی ہو، آج ٹہلنے نہیں چلوگی؟"

"تمہیں ٹہلنے کی پڑی ہے اور یہاں امتحان کی فکر کھائے جاتی ہے۔"

"لیکن یہ تو پڑھنے کا کوئی وقت نہیں"

"جی ہاں، ہم سے راتوں کو تو آنکھیں پھوڑی نہیں جاتیں، خود تو
و دو تین تین بجے رات گئے تک پڑھ پڑھ کر سب کچھ ختم کر ڈالا۔ اب جو
ں پڑھ رہی ہوں تو دیکھا نہیں جاتا۔ تم تو خدا سے چاہتے ہو گے کہ میں فیل
ہو جاؤں اور تم آگے نکل جاؤ اور پھر مجھے خوب طعنے دو اور لوگوں کے سامنے
لیل کرو، لیکن تم سے پیچھے رہنے والی نہیں"

. . . .

"تمہیں معلوم ہے، مجھے سب سے زیادہ کن لوگوں سے نفرت ہے ؟"

"میں کیا جانوں"

"مجھے اُن لوگوں سے سب سے زیادہ نفرت ہے جو ہر وقت پڑھتے
ا رہتے ہیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد موٹے موٹے شیشوں کی عینک
لگا کر اس بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کتاب کا ایک آدھ ہی
رف سجھائی دے جائے" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ سے چھین کر
تاب پھینک دی۔

"لیکن میرا امتحان ....!!!"

"یہ امتحان کی تیاری کا نہیں، ٹہلنے کا وقت ہے!"

"میں اتنی دیر سے آوازیں دے رہی ہوں اور تم جواب ہی نہیں
دیتے"

"آخر ایسا کونسا ضروری کام تھا جو چیخے ہی جا رہی تھیں"

"میں ایک بڑے مزے کی بات سوچ رہی تھی — اچھا پہلے
تم بتاؤ کہ میں ابھی ابھی کیا سوچ رہی تھی، پھر جانئے تم کتنے قابل ہو"

"میں نے غیب دانی کا کبھی دعویٰ بھی تو نہیں کیا، پھر تمہارے
دل کی باتیں! میرے بس کی بات نہیں"

"تو ہار گئے"

"اس میں ہارنے کی کیا بات ہے۔ میں نے کوشش ہی کب کی"

"میں سوچ رہی تھی، اگر میں خودکشی کر لوں تو کیا ہو — سب
لوگ خوب روئیں اور بڑا مزا آئے"

"ہاں، ہاں، ضرور! خیال تو بُرا نہیں، تم آج چپکے سے کسی
وقت خودکشی کر ڈالو"

"کیا واقعی؟"

"اور نہیں تو ....؟"

"اچھا، یہ تو بتاؤ، تم بھی روؤ گے یا نہیں؟"

"مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ روؤں اور وہ بھی تمہارے لئے"

"تو پھر ہم خودکشی بھی نہیں کرتے"

"اچھا جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو ہمیں یاد کیا کرو گی"

"بہت"

"اور ہمیں اپنے گھر بلایا کرو گی؟"

"ہاں"

"روز؟"

"روز تو شاید نہیں لیکن تیسرے چوتھے دن ضرور"

"اور اگر تمہارے میاں نے کچھ کہا تو؟"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں کہ اس وقت میں کیا کروں گی"

"تم شادی کر لو، پھر دیکھا جائیگا"

"اوں ہوں، ہم شادی نہیں کرینگے"

"کیوں؟"

"تم تو اکیلے رہ جاؤ گے"

"پگلی کہیں کی، میں بھی اپنی شادی کر لونگا"

"پھر بڑا مزا آئیگا"

"جبھی تو تم سے کہہ رہا ہوں کہ جلدی سے شادی کر ڈالو"

"نا بھائی، ہم شادی نہیں کریں گے۔ بیکار کی مصیبت سر
مول لیں۔ خدا معلوم کیسا میاں ملے، نہ معلوم اُس کی کیسی عادت ہو،
اور اُس نے اگر تمہارے بلانے کو انکار کر دیا تو۔ شادی نہیں

کریں گے ہم۔ شین الف زبر شا' دال یے زیر دی، شادی، ہم نہیں کریں گے۔ ہم نہیں کریں گے ـــــ اچھا ہم ایسا کیوں نہ کریں، ہم میں سے کوئی بھی شادی نہ کرے اور یونہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں ـــ"

"عمر بھر یونہی ایک دوسرے کے ساتھ رہیں ـــ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن کیوں نہیں ہے، یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ جیسے اب رہتے ہیں"

"تم بالکل ہی ناسمجھ ہو، بالکل بھولی"

"لیکن تم تو ہمیشہ کہتے رہتے ہو کہ میں بہت شریر ہوں"

"ہاں، ہاں، بھولی بھی ہو اور شریر بھی"

"تو بتاؤ، پھر کیا کریں؟"

"میں کیا بتاؤں، بھلا تمہارے ابا میاں یہ کس طرح گوارا کریں گے کہ تم میرے ساتھ ہمیشہ یونہی رہو۔ بغیر شادی بیاہ کے"

"تو پھر تم مجھ سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"لیکن یہ میرے اختیار میں تو نہیں"

"تم ابا میاں سے کہتے کیوں نہیں؟"

"ہش۔ یہ باتیں اس طرح تھوڑا ہی کہی جاتی ہیں"

"تو پھر کیسے کہی جاتی ہیں؟"

"یہ باتیں کہی نہیں جاتیں بلکہ بلکہ ...."

"اچھا اگر تم نہیں کہتے تو میں کہونگی"

"تم کہوگی؟"

"ہاں، ہاں، اس میں ہرج ہی کیا ہے"

"کہہ سکوگی؟"

"کیوں نہیں!"

"اچھا، کیا کہوگی؟"

"کہوں گی کیا، یہی کہ تم مجھے بہت پسند کرتے ہو اور میں تمہیں، اور تم چاہتے ہو کہ مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا بنالو، بس کوئی اچھا سا موقع ہاتھ آیا اور میں نے کہا"

اور میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں وہ سچ مچ ہی نہ کہدے۔ وہ اپنے دل میں کیا خیال کریگی۔

شاہد لطیف

تجلیات

وہ تو کہئیے نگاہِ یار میں تھا ورنہ دل بھی کسی شمار میں تھا

ہم ہیں مجبور شکر ہے، ورنہ جبر کب اپنے اختیار میں تھا

تیرا وعدہ فریبِ شوق سہی میں مگر تیرے انتظار میں تھا

وہ بھی تر دامنی کا باعث ہے جو لہو چشمِ اشکبار میں تھا

نہ رہا تجھکو فیضِ عام میں یاد اک گدا تیری رہ گذار میں تھا

آشیانہ کا اب نشان کہاں وہ بھی گذری ہوئی بہار میں تھا

جبر کی ایک شکل تھی یہ بھی میرا دل میرے اختیار میں تھا

شکر ہے اُس نے لے لیا تابشؔ ورنہ دل میرا خلفشار میں تھا

تابش دہلوی

قطعات

تصوّر

ایک صبر آزما جُدائی ہے ملنے جُلنے کی بند ہیں راہیں
میں نے اُس ماہرو کی گردن میں ڈال دی ہیں خیال کی باہیں

پیکرِ حُسن

باتیں کرنے میں پُھول جھڑتے ہیں برق گرتی ہے مُسکرانے میں
نظریں! جیسے فراخ دل ساقی خُم لنڈھائے شراب خانے میں

نظارۂ پریشاں

روبرو ہے وہ چاند سی صورت جس کا ہر دم خیال آتا ہے
مَیں ہوں بیتاب دیکھنے کیلئے اور دل ہے کہ دھڑکے جاتا ہے

لُطفِ ماہتاب

ہر طرف ایک بے حجابی ہے بے نقابی ہی ۔ بے نقابی ہے
تم بھی آجاؤ چاندنی بن کر آج کی رات ماہتابی ہے

عالمِ نشاط

ایک کافر ادا کو دیکھا ہے پُرشکن زُلف، پُرفسوں آنکھیں
آج پھر لُطف آرہا ہے مجھے داغؔ کے شعر گنگنانے میں

نگاہِ محبّت

رُخِ رنگیں پہ پڑ گئیں نظریں اور نظروں سے لڑ گئیں نظریں
مِل کے پلٹیں تو یہ ہوا معلوم عُمر بھر کو اُجڑ گئیں نظریں

اختر انصاری

چائے بازی

اِس مضمون کی سُرخی چائے بازی غالباً ناموزوں ہے کیونکہ مَیں دراصل چائے کے بارے میں کچھ نہیں لکھ رہا ہوں۔ اوّل تو لکھنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ اگرچہ کہیں بِلّی تو بلّی ہی سہی۔ اور پھر اب تو نُجھوں نے (چائے کمیٹی یا Tea Cess Committee نے) چائے کے شعر یعنی اشعار گھر گھر دیواروں پر لکھا کر بچّے بچّے کی زبان پر رواں کر دیا ہے۔

چائے پیَو جگ جگ جیو

نہ معلوم یہ شعر بھی ہے کہ نہیں۔ خیر مَیں تو شعر ہی سمجھتا ہوں۔ اگر کسی بحر میں نہیں ہے تو بے بحر ہی سہی، لیکن ہے شعر۔ دوسرے بھائی چائے کی مزمّت اور مَیں کروں (حالانکہ دل بہت چاہتا ہے) کیسے ممکن ہے۔ ویسے ہی بلاناغہ روزانہ سالہا سال سے دن میں تین چار دفعہ بیگم سے اسی کمبخت چائے پر پخ پخ ہوتی ہے۔ فجر اور عصر کی چائے تو خاموشی سے مل جاتی ہے لیکن عشراق، ظہر، مغرب، اور عشا کی چائے بغیر بدمزگی طرفین مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہیں۔ میری عادت تو چھُوٹ ہی نہیں سکتی۔ کاش وہی اپنی عادت چھوڑ دیں اور ہنسی خوشی روزانہ چائے پلوا دیا کریں، مگر وہ بھی عادت سے مجبور ہیں۔ خیر ہم دونوں عادی ہو گئے ہیں۔ وہ بگڑنے کی عادی ہو گئی ہیں مَیں برداشت کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ چائے کی میز سامنے آتے ہی میں چائے پینے لگتا ہوں اور وہ ہم ہنسی خوشی باتیں کرنے لگتی ہیں۔

البتہ اگر کبھی برسوں میں تہجّد کی چائے کا چسکہ مجھے بیدار کر دیتا ہے تو اوّل تو مَیں برداشت کرتا ہوں، دل کو بہلاتا ہوں - اسے ذرا صبر کرو تھوڑی دیر میں صبح ہو گی، صبح کی چائے پی لینا۔ ماما ہے نہیں، بیگم کو خود اُٹھنا پڑیگا۔ بڑی ہائے ویلا مچائیں گی۔ اب ایسے ہی پڑے رہو"۔ لیکن پھر جب دل کسی طرح مانتا ہی نہیں، اور چائے کے بارے میں ماننے بھی کیسے تو بیگم کو جگاتا ہوں۔ خیر چائے مل بھی جاتی ہے۔ میں پی بھی لیتا ہوں۔ لیکن صاحب پھر وہ دن بڑی بُری طرح کٹتا ہے اور مہینوں تہجد کی چائے کے خیال سے طبیعت بدمزہ ہو جایا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اب تو عرصہ دراز ہو گیا ہے کہ اس وقت کی چا، نہیں پی ہے۔ یہ حال ہے کہ اگر سوتے سے آنکھ کھُل بھی جاتے تو پڑا جمائیاں لیتا رہتا ہوں اور یہ جو کہیئے کہ مرد آدمی فوراً اُٹھکر بنا لیا کرتو نا صاحب اس سے تو بندہ عرصہ ہوا توبہ کر چکا ہے۔ اب ایسی حرکت ہرگز نہیں کر سکتا۔ خُدا کی پناہ۔ اور نا نا مرزا تو مرتے مرتے ہی بچے۔ اجی صاحب قصّہ یہ ہُوا کہ میں نے سوچا کہ لاؤ آج ان کو نہ جگاؤں، خود ہی باورچی خانے میں جا کر چائے بنا لوں اور پی پا کر لیٹ رہوں۔ دبے پاؤں باورچی خانے میں گیا۔ لالٹین روشن کی، انگیٹھی میں کوئلے سُلگائے۔ جب تک پانی کھولے اطمینان سے بیٹھا سگرٹ پیا کیا۔ جب چا، تیار ہو گئی، مزے سے پی۔ خود محنت کی تھی پھر پچھلے پہر رات کی چا، ویسے ہی بہت لُطف کی چیز ہے۔ چار پیالیاں پیں۔ طبیعت میں ایک قسم کی خوشی تھی۔ اپنے پر کچھ ناز سا ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں چستی تھی۔ اس خیال سے کہ جلدی سے جا کر چپکے سے لیٹ رہیں اور کبھی پھرتی کی۔ لالٹین گل کر اندازے کونے میں رکھ جلدی سے نکل ہی پایا تھا کہ اندھیرے میں مراد آبادی کا سینی سے پیر ٹکرایا۔ اسی اندھیرے اور خاموشی میں برتن کھڑ کھڑائے۔ کھڑ کھڑائے تو کہنا غلط ہے یوں کہیئے کہ بڑے زور سے چلّائے۔ اس کے ساتھ ہی صدر کے برآمدے میں کسی کے بعد بعد چار چھ قدم بھاگنے کی آواز آئی اور پھر بیگم کی دل دہلانے والی چیخیں تھیں۔ چور۔ چور۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اے صاحب نہتا آدمی کیا کرتا اس لئے میں

بھی گلا پھاڑ کر چلّایا۔ چور، چور۔ بچّوں کی گھگیاں بندھ گئیں۔ چیخ پکار سے محلہ گونج گیا۔ محلے والے دوڑے۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر خاں صاحب رہتے ہیں۔ وہ اپنے کوٹھے سے ہمارے کوٹھے پر لٹھ لئے پھاندے تو میری بھی ہمت بڑھی۔ میں نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ انگنائی میں چار چھ اور لوگ لکڑیاں لیکر کھڑے ہو گئے۔ اب یہ ہوا "کدھر تھا چور، کدھر گیا چور" میں نے کہا "پتہ نہیں، صدر کی طرف بھاگتے ہوئے میں نے بھی دیکھا تھا" بیگم رضائی کی آڑ میں سے بولیں "نہیں، پہلے تو باورچی خانے ہی میں تھا۔ پھر جب یہ (یعنی میں) باورچی خانے میں گئے تو بھاگ گیا" انگنائی میں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر تھا سب نے متفق ہو کر کہا "ہو نہ ہو اسی پر سے چڑھ کر کوٹھوں کوٹھوں بھاگ گیا" اب سب نے میری بہادری کی تعریفیں شروع کر دیں۔ بڑے بوڑھوں نے نصیحت شروع کی "میاں چور کا پیچھا ہرگز نہ کرنا چاہیئے" کوئی صاحب بولے "بھائی بڑی نادانی کی جو نہتے باورچی خانے میں چور کے پیچھے لپکے۔ اگر قرولی مار دیتا تو سب بہادری رہ جاتی" رضائی کی آڑ سے بیگم کے بڑبڑانے کی آواز آئی "اِن کو کبھی عقل ہی نہ آئے گی، اللہ نے جان رکھ لی، مولیٰ تو نے مجھ پر بڑا رحم کیا" کسی نے کہا "بھابی صبح ہوتے ہی صدقہ اتار دیجیے" کوئی بولا "نہیں بہن مٹھائی بانٹیے" یہی باتیں ہو رہی تھیں اور میرے دل کی دھڑکن بھی کم ہو چلی تھی کہ برابر کے مکان سے نانا مرزا محمد کی آواز آئی "اماں کیاں ہواں، کیاں ہواں"

"نانا چور تھا چور"

"ٹھیروں مَیں آنیا۔ اریں میریں لکڑی ــــ"

"نانا چور بھاگ گیا ہے"

"اماں میں آں رہاں ہوں۔ کوٹھریں کا درواراں کھولو"

نانا مرزا محمد کا مکان ہمارے مکان سے ملا ہے اور ہماری کوٹھری میں سے ایک کھڑکی اُن کے مکان کے دالان میں نکلی ہوئی ہے، نانا کی عمر پینسٹھ برس کے قریب ہے۔ پُرانی وضع کے آدمی ہیں۔ افیون سے حسب دستور کافی شوق رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے محلہ بھر کو ایک دلچسپی رہتی ہے۔ کسی نے کہا "بلالو بھائی، بلالو کوٹھڑی کھولدو" میں نے جاکر کوٹھڑی کی زنجیر کھول دی اور آواز دی "آیئے نانا" کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ مَیں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ نانا چھوٹی سی کھڑکی سے اندر داخل ہوئے۔ کوٹھڑی میں کچھ کھڑبڑ ہوئی۔ اور پھر نانا کی بھرّائی ہوئی چیخیں

"اریں۔ دوڑوں! اریں دوڑوں۔ چوں رنے میریں گردن پکڑلی۔ اریں مراں دوڑوں"

اب کیا تھا مَیں اکیلا ہی تھوڑی بھاگا۔ صحن میں چار چھ اور آدمی تھے، وہ بھی بھاگے مَیں بھی بھاگا۔ بیگم اور بچے بھی گرتے پڑتے بھاگے۔ صحن سے پار ڈیوڑھی۔ ڈیوڑھی سے پار باہر سڑک پر جاکر سب نے دَم لیا۔ نانا مرزا محمد ہیں کہ چیخ چیخ کر جان دئے دیتے ہیں "اریں دوڑوں چوں رنے گردن پکڑ لیں۔ چوں رماں ریں ڈالتاں ہے"

خدا معلوم کیا ہوتا۔ وہ تو خانصاحب اپنے گھر سے پھر نکلے۔ اب جو اُن کو معلوم ہوا اور وہ چلے تو ہم لوگوں کی بھی ہمت بڑھی۔ آگے آگے وہ پیچھے پیچھے ہم لوگ دُور ہی سے چور کو ڈانٹتے، ڈپٹتے، ڈرتے ڈرتے کوٹھڑی تک گئے۔ خانصاحب نے بڑے زور سے چور کو ڈانٹ کر لالٹین کوٹھڑی میں ڈال کر جھانکا۔

کیا دیکھتے ہیں کہ زمین سے ملی چھوٹی سی کھڑکی کے برابر کچھ دُور جو گھڑونچی رکھی رہتی تھی، اس کے ایک خانے میں سر ڈالے گردن پھنسائے نانا اکڑوں بیٹھے ہیں۔ گھڑونچی کے ایک سرے پر بہت سا سامان رکھا تھا۔ اس لئے وہ اُن سے اُٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ بیچارے

اپنی پوری طاقت چلّانے میں لگا رہے تھے۔ سب نے جا کر اُن کو نکالا۔ ہنستے ہنستے لوگوں کا بُرا حال ہوگیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی میری ہنسی سب رفوچکر ہوگئی۔

اب جو صبح سے چار پر چار میرے آگے آنا شروع ہوئی تو اب نہیں رکتی۔ پہلے تو مَیں سمجھا نہیں۔ یہی سمجھتا رہا کہ میری رات کی بہادری سے بیگم بہت خوش ہیں۔ اور قرولی کی زد سے بچ رہنے کا ان کے دل پر اثر ہے۔ مگر جب ایک ہی گھنٹے میں چوتھی مرتبہ میرے آگے چار آئی اور میں نے ان کی صورت پر غور کیا تو مُنہ پُھولا ہوًا۔ خیر صاحب اب کیا کرتا چار پیتا رہا۔ لیکن صبح دس بجے کے قریب آخر ہاتھ ہی جوڑنا پڑے۔ مگر وہاں مُنہ سُرخ۔ آنکھوں میں آنسو۔ "تمہیں ہماری جان کی قسم۔ اب تم چار پیتے جاؤ، اگر انکار کرو تو ہمارا ہی مُردہ دیکھو۔ اب پیتے جاؤ"

اُس دن کی مُصیبت اب کیا بیان کروں۔

سیّد رفیق حسین

عورت

یہ مہ پارہ، یہ رنگ و نکہت کی پُتلی　　حقیقت میں ہے اک دلیلِ خُدائی

یہ ہے رازِ خلقت، یہ ہے جانِ ہستی　　یہ ہے حُسنِ عالم، یہ ہے نورِ گیتی

یہ اِک منعقدِ شعرِ دُنیائے خوبی　　یہ اِک منجمد نغمۂ آسمانی

یہ تسنیم و کوثر کی نازک گلابی　　یہ حُسنِ ازل کی مکمّل تجلّی

یہ گلزارِ ہستی کی پُرجوش تِتلی　　محبّت کی ندّی، محبّت کی پیاسی

یہ ماں ہو کہ بیٹی، بہن ہو کہ بیوی　　بہر رنگ ہے مہر و شفقت کی دیبی

یہ گہوارۂ لُطف، یہ مہدِ رافت　　یہ آغوشِ اُلفت، یہ فردوسِ ہستی

یہ گھر کا اُجالا، یہ دُنیا کا حاصل　　یہ آنکھوں کی ٹھنڈک یہ دل کی تسلّی

یہ شمعِ مودّت، یہ ماہِ رفافت　　یہ مہرِ تعطّف، یہ ہمدردِ طفلی

یہ تعبیرِ خوابِ تمنّا و ارماں　　یہ سرمایۂ عشرت و شادمانی

جوانی میں دلدار، دم ساز، مونس　　بُڑھاپے میں غم خوار، ہم راز ساتھی

محبّت میں گنگا، وفا میں ہمالہ　　نزاکت میں پُھول، استقامت میں دھرتی

سُندرتا کا سنسار، شکتی کا ساگر　　پتی کی پُجارن، ستی، لاج ونتی

صفا میں یہ ہیرا، ضیا میں یہ تارا　　ادا میں یہ بجلی، بہا میں یہ موتی

شبابِ آفریں اس کا ایک ایک انداز　　جو بولی رسیلی، تو منظر میں نشیلی

تبسّم سراپا..... تعطّر مجسّم　　چمن زار... اِس سے.. رہِ زندگانی

یہ غربت میں راحت، یہ دُنیا میں جنّت　　یہ انعامِ قدرت، یہ احسانِ ہستی

کوکب شاہجہانپوری

(۱)

گاؤں کے اکثر کھیتوں سے ربیع کی فصل کٹ چکنے کے بعد تال کی سیاہ کوال مٹی بہت ہی نمایاں معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن ابھی تک یہاں وہاں گیہوں اور بونٹ کے سنہرے کھیت شام کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچھوائی چل رہی تھی جس کی لہروں میں گیہوں کے خوشے اور بونٹ کی چھوٹی اور گداز ڈھیریاں جھول رہی تھیں۔ ہوا میں ہنوز گرمی تھی۔ گاؤں کے قریب بھیٹھ کی قسم کے کھیتوں میں ترکاریوں کی بیتن اور پودے اپنی ہریاول سے دل و نظر کو فرحت و تسکین بخش رہے تھے۔ ان سبز و شاداب کھیتوں کے درمیان کنوؤں پر لاٹھے لگے ہوئے تھے جو اکثر چل رہے تھے اور ان کے چلنے سے مسلسل "چوں چوں" کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ دہقان کھیتوں کو پٹا رہے تھے۔ پنگھٹ اور پگڈنڈیوں پر عورتیں اور البیلی لڑکیاں پانی بھرتے یا گھڑوں اور کلسیوں کو سنبھالتے نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی سُرخ اور زرد ساریاں، جن پر گذشتہ ہولی کے رنگوں کی گلکاریاں جیت کے شباب کی رنگ رلیوں کی خوشگوار یاد دلا رہی تھیں، بہت ہی دلفریب تھیں۔ اِن کی چہلیں اور شرمیلی ہنسی اِس سارے منظر کی رُوحِ رواں تھی۔ میدانوں میں لڑکے اور نوجوان کبڈی اور گلّی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور گلیوں میں بھی گولیاں کھیلی جا رہی تھیں۔ گاؤں کی فضا پر مسرّت اور طمانیت چھائی ہوئی تھی

چودہ سال کا چھوکرا شبرتیا گاؤں کے زمیندار کے چھوٹے بچّے کو گود میں لئے بنگلے کے چبوترے پر خیالات میں گُم ٹہل رہا تھا۔ وہ لڑکا کھلانے اور اوپر کا کام کرنے پر ملازم تھا۔ وہ سوچنے لگا "بلا سے، ہم ہی تو ایک نہیں۔ رحموا اور دھوا کو بھی تو رحمت بابو اور فرید بابو کے یہاں کے کام سے چھٹی نہیں ملتی ـــ اور عیدوا" عیدوا کا نام ذہن میں آتے ہی شبرتیا آپ ہی آپ مسکرایا "منجھلی دلہن سے کیسی جوتیاں کھاتا ہے وہ" اُسے تسکین سی ہوئی۔ جیسے اُن جوتیوں کی مار سے وہ خود بچ نکلا ہو "مگر للو ساؤ بنیا کا لڑکا اور دمودر سونار کا چھوکرا۔ شرفو بابو، بھولا بابو، غنیا ...." اپنے ہم عمر بہت سے لڑکوں کے نام اس کے خیال میں آئے۔ یہ لڑکے زمینداروں تاجروں اور فارغ البال کسانوں کے تھے۔ شبرتیا کے چہرے پر مایوسی اور حسرت کے آثار پیدا ہو گئے۔ زمیندار کا لڑکا اُس کی گود سے پھسلا جا رہا تھا۔ اُس نے لڑکے کو سنبھالا اور ٹہلنے لگا۔

"کلکتہ سے صغیروا کل ہی آیا ہے۔ اُس کا باپ بوٹ پر کماتا ہے اور صغیروا بھی بیڑی بنا کر خوب پیسے کما لیتا ہے" شبرتیا کی آنکھیں یک بیک چمک اُٹھیں اور پھر بجھ سی گئیں۔ اُس کی چشمِ تصوّر نے صغیروا کی رنگ برنگی لنگی دیکھی اور جاپانی ربڑ کا پمپ شو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس خوبصورت لنگی کو خود پہنے ہوئے ہے اور وہی ربڑ کا جوتا اُسکے پاؤں کو گدگدا رہا ہے۔ لیکن یہ فریب رنگیں بہت جلد حقیقت کی بے رنگی کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

"ہم بھی کلکتہ کیوں نہ بھاگ جائیں اور پھر رنگ برنگی لنگیاں، پمپ شو اور سب سے بڑھکر آزادی۔ ہر کام سے آزادی" اُس نے اپنے طور پر کلکتہ کے وسیع شہر کا تصوّر کیا۔ پھر اُسے وہ قصّے یاد آنے لگے جو صغیروا اور دوسرے کلکتے سے آنے والے بیان کرتے ہیں۔ اس کا جی چاہا کہ لڑکے کو پٹک کر بھاگ نکلے اور جبّار میاں کی دکان پر جا کر کلکتے کے قصّے سُنے۔ اس ایک لمحے میں شبرتیا کے لئے زندگی کا

مقصد صرف کلکتہ کے قصّے سننا تھا۔ ٹریم گاڑی، جادو گھر، چڑیا خانہ، ہوٹل، بائیسکوپ ... بیڑی کی دُکان، پیسے، رنگین لنگیاں اور بمپ شوٹ ان کے متعلق اُس نے جانے کیا کیا تصوّر قائم کیا۔

زمیندار کا بنگلہ گاؤں کے کنارے ایک اونچی جگہ پر واقع تھا۔ شبرتیا نے پہلو کے میدان میں گاؤں کے لڑکوں کو کبڈی کھیلتے دیکھا اور دُور چند لڑکے پہاڑی کے کنارے والے آم کے باغ کی سمت میں جارہے تھے۔ اُس نے حسرت بھری نظر سے اُن لڑکوں کو دیکھا اور گود سے پھسلتے ہوئے بچّے کو غصّے سے جھٹک کر کمر کے اوپر سنبھال لیا۔ سامنے کھیت میں کھیرے پھلے ہوتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ رات کو کھیروں پر شبخون مارے۔ اُسے پھر آم کے ٹکولوں[1] کا خیال آیا اور اُسکے مُنہ میں پانی بھر آیا۔

"شبرتیا رے، شبرتیا رے! "۔ شبرتیا چونکنا ہو کر بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے سمجھا کہ کسی اور سخت اور بد مزہ کام کے لئے اُسے بلایا جارہا ہے۔ پھر آواز آئی "شبرتیا! اے شبرتیا! کبڈی نہیں کھیلے گا؟ آ رے شبرتیا!" رمضنیا اور رفنیا میدان سے شبرتیا کو آواز دے رہے تھے۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ذرا آگے بڑھکر وہ چوا ہا چلایا "کیسے آویں ہم رے۔ ہم کو لالٹین صاف کرنا اور پانی بھرنا ہے"۔ اسکی آواز گلوگیر تھی۔ لڑکے کبڈی کھیلنے لگے۔

"کبڈی کبڈی .... کبڈی! کبڈیہہ! کبڈیہہ! .... چل کبڈی تارا۔ سلطان گنج مارا۔ سلطان گنج مارا ...."۔ کیسی دلفریب آواز تھی۔ بول کا ترنم شبرتیا کو بیقرار کئے دیتا تھا۔ وہ کچھ دیر چُپ چاپ بصد حسرت تماشہ دیکھتا رہا اور پھر ایک خشمگیں مایوسی کے ساتھ حویلی کی طرف چلدیا۔

(۲)

"ابے او شبرتیا! مر گیا کمبخت! ہر وقت کھیل، ہر وقت تماشہ! بس بچّے کو گود میں لے لیا۔ سارے کام دھندے سے فراغت، نظارہ بازی کو نکل کھڑے ہوئے۔ کام چور، نمک حرام ... غارتی! مُردار! ... سارے کام پڑے ہوئے ہیں اور حضور سیر سپاٹے کر رہے ہونگے ......"

یہ الفاظ بڑی بیگم کے تھے جو شبرتیا نے حویلی میں داخل ہوتے ہوئے سُنے۔ اس کا جی جل گیا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا غریب۔ قہر درویش بر جانِ درویش۔ اس کے دل میں بغاوت کی کمزور سی لہر اُٹھی اور بے بسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جاکر غائب ہوگئی۔ بڑی بیگم اُسے دیکھکر بیحد چراغ پا ہوئیں اور انہوں نے اسے مسلسل نہایت ہی شگفتہ صلواتیں سنائیں۔ جھڑکیاں سہتا ہوا شبرتیا اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ کنوئیں سے پانی لانا، جھاڑو دینا، لالٹین صاف کرنا وغیرہ وغیرہ "اوپر کے کام" کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جو آدھی رات گئے تک قائم رہا۔

(۳)

"کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی، کبڈی ...."

"ابے پاگل تو نہیں ہوگیا، مونڈی کاٹے۔ دن چڑھے تک سویا ہوا ہے"۔ گھر کی بوڑھی ماما نے سوتے ہوئے شبرتیا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"... چل کبڈی تارا۔ سلطان گنج مارا۔ سلطان گنج ......"

بوڑھی ماما نے شبرتیا کے ایک دو ہتڑ دیا۔ وہ چونک کر گھبرایا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہی "اوپر کے کام" کا غیر فانی سلسلہ۔

[1] کیریوں کو بہار میں "ٹکولے" کہتے ہیں۔

بوڑھی ماما بڑبڑاتی، کوستی باورچی خانے کو چلدی۔ وہ دو روٹیوں کی آس لگائے ہوئے تھی۔ بوڑھوں کی زندگی کا اہم ترین مقصد صرف کھانا ہوتا ہے۔

شبرتیا ایک ہاتھ میں جھاڑو لئے اور دوسرے سے آنکھیں ملتا، جھکا ہوا ایک کمرے میں جھاڑو دے رہا تھا۔ اُسے بوڑھی ماما کا دوہتڑ اور بڑی بیگم کی صلواتیں یاد آرہی تھیں۔ اُس کی گرد آلود پیشانی پر شکنیں پڑگئیں۔ وہ سوچ رہا تھا "یہ بڑھیا ہم کو مارنے والی کون ہوتی ہے۔ اِس کٹنیا کا چڑا چڑا کر ناک میں دَم نہ کردیا تو میرا نام شبرتیا نہیں۔ اسے یہ بڑی بیگم کے برتے پر ہم کو آنکھیں دکھاتی ہے نا" بڑی بیگم کا خیال آتے ہی شبرتیا کو بڑی بیگم کے سارے مظالم اور اپنی ساری حسرتیں یاد آگئیں۔ اُس کے چہرے پر خون کی پچکاری سی پڑگئی "نمکحرام اور کام چور۔ اور اوپر سے جوتیاں۔ ہم اب کبھی نہیں رہیں گے ان کے یہاں۔ میری عمر کے لڑکے تو طرح طرح کے کھیل کھیلیں، کبڈی، لٹو، گلی ڈنڈا، تیرنا۔ اور ہم ان کے گھر سڑا کریں۔ آدمی نہ ہوئے بیل ہوئے۔ جیسے ہم بے جان سے ہیں، بیل سے بھی بدتر"

شبرتیا کا جی چاہتا تھا کہ ابھی فوراً بھاگ نکلے لیکن یک بیک اُسے اپنے ماں باپ کی غربت یاد آگئی۔ وہ بھاگ کر کہاں جائے۔ کلکتہ؟ اتنی دور پیدل جانا ناممکن اور پاس کوڑی بھی نہیں کہ ریل پر بیٹھ کر جائے۔ ریل پر بیٹھنے کے خیال سے اس کا دل ایک مبہم سے سرور کے احساس سے رُک رُک کر دھڑکنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کہ اُس کے ماں باپ غریب کیوں ہیں۔ پھر اُسے دوسرے غریب لوگ یاد آئے اور اس کے بعد امیر لوگ اور آخر میں بڑی بیگم۔ بڑی بیگم سے اُسے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ شبرتیا جھاڑو دیتے دیتے بیٹھ گیا۔ خیالات و تصورات کی شدت مانع حرکت و عمل ہوتی ہے۔ اُسکے دل میں اُلجھاوا سا تھا۔ وہ کچھ سمجھنا چاہتا تھا، صاف اور واضح طور پر۔

"۔۔۔ آخر ہم، رحموا، دھوا، اور رعیدوا کیوں آزادی سے کھیل کود نہیں سکتے۔ کیا اس لئے کہ ہمارے ماں باپ غریب ہیں۔ ہاں شاید اسی لئے۔ ٹھیک! تب ہی تو بھولا بابو، شرفو بابو، شنکر جی۔ کرن ساد، منے جی، خوب آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ مگر حلیموا اور سلطتا، یہ تو ہم جیسے غریب ماں باپ کے بیٹے ہیں یہ کیوں آزاد ہیں؟" شبرتیا کو گذشتہ دوپہر کا وہ منظر یاد آگیا جب حلیموا اور سلطتا لالہ کاشی لعل کی گھوڑی پکڑ کر نواری کی رسّی کا لگام لگانے اس کی ننگی پیٹھ پر سوار کھیتوں اور باغوں میں دندناتے پھرتے تھے۔ حویلی سے ملی ہوئی گلی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کسان اور مزدور زمیندار کے تالاب میں مچھلی مارنے جارہے تھے۔ شبرتیا لوگوں کی آواز سنکر چونکا تھا "اوہ او۔ آج مچھلی کی سالانہ پٹائی کا دن ہے۔ تالاب پر میلہ سا لگا ہوا ہوگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لوگوں کے جمع ہونگے" جال، چلون[1]، ٹاپے، ڈنڈے، مختلف ناپ تول کے جھوکرے، طرح طرح کے بوڑھے، قسم قسم کے گپاڑے، بھانت بھانت کے بے فکرے، زمیندار لوگ، لالہ، پٹواری، براہل، مجمع کا مجمع شبرتیا کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اُسے ناقابلِ برداشت طور پر اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے اس دُکھ کا علاج پھر خیالات کی دُنیا میں تلاش کیا۔ "آخر حلیموا اور سلطتا کو کوئی کچھ نہیں کہتا؟" وہ شبرتیا کے حافظہ نے اس خیال کی فوراً تردید کی "یہ نہیں، یہ دونوں تو کئی بار اپنے ماں باپ سے پٹے ہیں اور اُس دفعہ جب عماد بابو کے یہاں سے سلطتا بھاگا تھا تو پکڑے جانے پر عماد بابو نے اُسے کیسا اَدھ مُوا کر دیا تھا۔ مگر اُس کی بلا مانے۔ وہ پھر ایسا بھاگا کہ جنم جنم کا آزاد ہوگیا۔ اور حلیموا نے تو کبھی پیٹھ پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیا" شبرتیا کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ شاید اُسے اپنے درد کا درماں حاصل ہوگیا تھا۔ اُسکے دل میں بغاوت

---

[1] چلون، مچھلی پھنسانے کے جال کی ایک قسم۔

کی ایک تیز لہر اٹھی اور اُس گھڑی وہ اپنے آپ کو آزاد اور سربلند محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں! امیر لوگوں کے، زمینداروں کے، مہاجنوں کے لڑکے آزادی سے کھیلتے ہیں اور غریبوں کے وہ لڑکے بھی جو کسی کی غلامی نہیں کرتے اور شیروں کی طرح آزاد رہتے ہیں۔ وہ ظلم سہتے ہیں مگر مَن کے ہٹیلے ہیں اور وہی کر گزرتے ہیں جو اُن کا جی چاہتا ہے۔ اور ڈرپو، بزدل غریب لڑکے جنم بھر کولھو کے بیل ہی بنے رہتے ہیں۔ ہم اب جلیموا اور سلتا کی طرح آزاد رہیں گے اور کسی کی نہیں سُنینگے، چاہے جو کچھ ہو۔"

"شبرتیا! ابے حرامزادے! ابھی تک جھاڑو ہی دے رہا ہے۔ ایک تو دوپہر کو سو کر اُٹھتا ہے اور اُس پہ ایک کام میں سو پہر لگا دیتا ہے۔ کمبخت! کام چور! کوڑھی!"

بڑی بیگم کی قاہرانہ آواز دالان میں گونجی۔ شبرتیا سہم کر رہ گیا۔ اُس کے سارے باغیانہ ارادے، حکم برداری کی عادت کے اثر سے کافور ہوگئے۔ وہ جلد جلد جھاڑو دینے لگا اور جھٹ پٹ یہ کام ختم کر، غسل خانے سے گھڑا اُٹھا، کنوئیں پر سے پانی لانے نکل کھڑا ہوا۔

پنگھٹ اور تالاب نزدیک ہی نزدیک تھے۔ راہ میں اور پنگھٹ پر شبرتیا مچھلی کے شکاریوں اور تماشہ بینوں سے ملا۔ فصل کی کٹائی ختم ہونے والی تھی۔ کسانوں کے گھروں میں اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اپنی تھوڑی سی اور لُٹ جانے والی پونجی کے وقتی قبضہ کے احساس سے بھولے بھالے کسان پھُولے نہیں سماتے تھے۔ لگن کا زمانہ بھی اب آہی چلا تھا۔ سب کے چہروں پر آنی جانی مسرّت کے عبیر و گلال لگے ہوئے تھے۔ جہاں شادمانی اور فارغ البالی کا قحط ہو وہاں حقیر سی خوشی کا سامان بھی بہت بڑا سرمایۂ بہجت و نشاط ہوتا ہے۔ ع:-

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

کھیت کے مزدوروں کی بے مائگی تو کسانوں سے بھی بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔ یہ لنگوٹی پر پھاگ کھیلنے والے سب سے زیادہ سرمست تھے۔ بیساکھ کا موسم اور گرہ میں تھوڑی مزدوری، پھر انہیں تاڑی کی لبنیاں لُنڈھانے سے کون روک سکتا ہے، کوئی گاتا چلاتا ہے، کسی کا چہرہ بیر بہوٹی بنا ہوا ہے، کوئی ترنگ میں مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ بدن پر لنگوٹی مگر مَن میں موج۔ غرض ساری فضا میں کیف و انبساط کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ شبرتیا اس سے بلا متاثر ہوئے نہ رہ سکا۔ اُس نے بھی لہک کر ایک الاپ لگائی:-

ایلئی رے بھنواں دوار پر　　سندیسہ لیکے یار کے....!

پیچھے سے سلتا نے اسے ایک چپت رسید کی۔ شبرتیا نے اُسے مڑ کر دیکھا اور آپ خوب کھلکھلا کر ہنسا۔

سلتا بولا: "دور! غلام کا بچہ، آج بھی گھڑے ہی ڈھوتا رہیگا!"

شبرتیا کے دل میں ایک تیر سا لگا۔ شرمندگی مٹانے کیلئے سلتا کے گلے میں باہیں ڈال کر اُس نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ کنوئیں پر گھڑا رکھکر دونوں دوست تالاب کے کنارے چلے گئے۔ وہاں اُنکے ہجولیوں کی قوم کی قوم مختلف ہیئت میں کھڑی ہوئی تھی۔

شبرتیا خود فراموشی و خود فریبی کے عالم میں دوسرے چھوکروں سے زیادہ خوش و خرم نظر آرہا تھا اور سب سے بڑھ چڑھ کر کھیلوں اور شرارتوں میں حصہ لے رہا تھا۔ لیکن یہ غم غلط کرنے کی گھڑی بہت ہی گریز پا ثابت ہوئی۔

"شبرتیا! ابے شبرتیا! - بی بی تیرے کھوج رہی ہیں رے! جلدی جا نہ رے سالا..." رام ٹہل سنگھ براہل کی گرجدار آواز نے سرمستی کے رنگین بلبلوں کو توڑ کر رکھدیا۔

شبراتیا ایک برق زدہ کی طرح کنوئیں پر واپس آیا اور پانی بھر کر منہ لٹکائے حویلی کی طرف گویا کشاں کشاں چلا۔ حویلی میں بڑی بیگم نے شبراتیا کی آج غیر معمولی طور پر خبر لی۔

(۴)

زمیندار کے دو منزلے کے رُخ پر ایک کھنڈر تھا جس میں دو بیر کے درخت اور چند بانس کی جھاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے لڑکے اکثر آکر یہاں جمع ہوتے تھے، کھیلوں اور شرارتوں کے پروگرام بناتے اور کبھی کبھار یہیں کچھ کھیلنے بھی لگتے تھے۔ بیر کے موسم میں پاس کے نیچے مکانات بیر توڑنے والے لڑکوں کے ڈھیلوں کی زد میں ہوتے تھے۔

مچھلی کے شکار کے ایک ہفتہ بعد، ایک روز شبراتیا دو منزلے کے سائبان کے جنگلے سے لگا کھڑا تھا۔ اُس روز بھی زمیندار کا بچہ اُس کی گود میں تھا۔ سامنے کھنڈر میں بہت سے لڑکے جمع تھے۔ ایک جماعت لٹو کھیل رہی تھی، ایک ٹولی بیر کے درخت کے سایہ میں تاش سے شغل کر رہی تھی، اور ایک تیسرا گروہ پچیسی کے کھیل میں مشغول تھا۔ غریب شبراتیا سکتہ کے عالم میں حسرت سے سب کو دُور سے تک رہا تھا، خاموش، اُداس، مضمحل، تھوڑی دیر میں لڑکے سب کھیل سے اُکتا کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور آپس میں کسی تازہ مہم کی کھچڑی پکنے لگی۔ کچھ ردو کد کے بعد بہ اتفاق رائے یہ طے پایا کہ بابو مظہر کے آم کے باغ کی طرف رُخ کیا جائے۔ اسی کے قریب بابو جاگو سنگھ کا باغ بھی تھا۔ جیٹھ کے مہینے میں آم پک کر گرنے لگ جاتے ہیں اور نیم خام پھلوں کی تو کثرت ہوتی ہے۔ چلتے چلاتے عیدوا، بقرعیدوا اور رحموا نے شبراتیا کو دو منزلے پر دیکھ پایا۔ سب لڑکے اُسے پکارنے لگے۔ شبراتیا نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور کہا۔

"ایک دن ہم بھی آدیںگے رے۔ ایک دن ضرور۔ آدیںگے اور خُوب خُوب کھیلیں گے، خوب خوب خوب"

وہ اس تخیل سے لذت لے رہا تھا۔ لڑکے سب چلے گئے اور اب اُنکے قہقہوں کی صرف گونج باقی رہ گئی۔ شبراتیا دُور کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے دل کی ساری حسرتیں اس کی بے آس مگر آرزومند نگاہوں میں آکر مرتکز ہو گئی تھیں۔ اس کے تصوّر میں تصویریں بن اور مٹ رہی تھیں اور اُس کی بیتاب رُوح اتھاہ بے کیفی کے سرد غار میں ڈوبتی جاتی تھی۔ اس کے جذبات دَم توڑ رہے تھے اور اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انتہائی پسپائی اور شکستگی کے بطن سے انقلاب جنم لیتا ہے، کس مپرسی اور مظلومی کی خاکستر سے بغاوت کے شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ دوسرے روز بےبس اور بے زبان شبراتیا سب کی آنکھوں کے سامنے زمیندار کے گھر سے دوڑتا ہوا نکل کھڑا ہوا وہ جاکر اپنے ہجولیوں سے مل گیا۔ اُس نے ہر کھیل میں شرکت کی اور بے باکانہ شرکت کی۔ اُس نے خوب کبڈی کھیلی، خوب لٹو نچائے، خُوب خُوب آم کے باغوں کو غارت کیا، چُھٹے ہوئے گھوڑوں پر چڑھا، تالابوں میں مچھلیاں مارتا رہا اور نہ جانے کس کس طرح اُس نے اپنی حسرت نکالی۔ اُسے نہ کھانے کی فکر تھی نہ پینے کا غم۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر بھی نہیں آتا تھا، اور دن رات ہَوا کی طرح آزاد رہتا تھا۔ راتیں پہاڑی پر اور باغوں میں کاٹ دیتا اور دن قسم قسم کے کھیل کُود میں۔ شبراتیا کی طبیعت میں ایک زبردست اُبال آیا ہوا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اس دباؤ کا ازالہ کر رہا تھا جو اُس کی خواہشوں پر عرصہ تک ڈالا گیا تھا۔ اس پر ایک ہیجان کی کیفیت طاری تھی، ایک بُحران کا عالم۔

بڑی بیگم نے براہلوں کی وساطت سے شبراتیا کو گرفتار کروانا چاہا مگر وہ ہتّے نہ چڑھا۔ کامل ایک ہفتے شبراتیا اسی بُحرانی حالت

روپ متی: کنیز کورنش بجالاتی ہے۔

کریم خاں: بیٹھ جاؤ، روپ متی۔ ہمارے آقائے نامدار کی طبیعت آجکل ناساز ہے۔ محض اس واسطے تمہیں باریابی دی گئی ہے کہ تمہارے قلب کو صدمہ نہ پہونچے۔ کچھ سناؤ۔

(روپ متی گاتی ہے)

باز بہادر: آہ کریم، تو سچ کہتا تھا۔ یہ عورت حسن اور غنا دونوں میں کامل ہے۔

کریم خاں: (آہستہ سے) عالیجاہ۔ دل کا کیا حال ہے۔

باز بہادر: دل کا حال پوچھتا ہے۔ نادان۔ روح تک نے شرابِ محبت پی لی ہے۔

کریم خاں: پھر۔

باز بہادر: پھر کیا؟ سن۔ اب تک تو نغمۂ مضطرب سنا تھا۔ آج میں تجھے نغمۂ محبت سناتا ہوں۔

(باز بہادر گاتا ہے)

روپ متی: عالیجاہ، چھوٹا منہ اور بڑی بات ضرور ہے لیکن میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ایسا گانا کنیز نے زندگی میں پہلی بار سنا ہے۔

باز بہادر: روپ متی، تم حسین ہو۔ خوبصورت ہو۔ لیکن تمہارے الفاظ بتا رہے ہیں کہ تم اب تک محبت سے بیگانہ رہی ہو۔ یہ نغمہ جو میں نے سنایا، مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ اسی وقت کی واردات ہے۔ دل اور روح کی کیفیت نے ایک صدا میری زبان سے نکلوا دی۔

روپ متی: عالیجاہ تقصیر معاف، میں ایک بار یہ نغمہ اور سننا چاہتی ہوں۔

باز بہادر: ایک بار، بس، حسین کافرہ۔ اب میری زبان پر صرف یہی نغمہ رہے گا اور اس کے سوز میں دن دونی ترقی ہوگی۔

روپ متی: لیکن عالیجاہ۔ یہ لونڈی کیونکر اس نغمہ کو ہمیشہ سنے گی۔

باز بہادر: اس طرح کہ آج سے مالوہ کی سلطنت پر بجائے باز بہادر کے روپ متی حکمرانی کرے گی۔ اور باز بہادر فقیرِ محبت بنکر جنگلوں کی خاک چھانے گا یا حسین روپ متی کے قدموں میں بیٹھا اُسے محبت کا نغمہ سنایا کرے گا۔

دوسرا سین

(دربار میں شاہی بجرا پڑا ہوا ہے۔ باز بہادر اور روپ متی بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے سازندے اپنے سازوں کو لئے ہوئے مؤدب بیٹھے ہیں۔)

باز بہادر: ملکۂ حسن۔ گو باز بہادر کو تیرے قدموں میں دو سال مدہوشانہ زندگی بسر کرتے ہوئے گذر چکے ہیں۔ لیکن بخدا ابتک ہوش نہیں آیا اور نہ خدا کرے تمام زندگی آئے۔

روپ متی: میرے مالک، میری روح کے مالک۔ میری کائنات کے مالک۔ آپ کو دو برس یاد بھی ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ سارنگپور کی ادنیٰ مغنیہ مالوہ کے بادشاہ باز بہادر کے حضور میں آدھی رات کو کانپتی ہوئی لرزتی ہوئی داخل ہوئی تھی اور — اور — اس عالیجاہ نے اسے ایک نظر میں اپنا کر لیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اُسے ایسی زندگی عطا کر دی جس کا نام بہشت ہے۔

باز بہادر: میری روح۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کر، جن میں میری اور تیری تفریق نمایاں ہو۔ بادشاہ مالوہ کو اس کا فخر ہے کہ حسن کی ملکہ نے اُس کے دل کی نذر کو قبول کر لیا۔ (سازندوں سے مخاطب ہوکر) کمبختو خاموش بیٹھے ہوئے ہو۔ کیوں کوئی ایسا راگ نہیں چھیڑتے کہ تمام کائنات گم ہو جائے۔ صرف باز بہادر اور روپ متی رہ جائیں۔

(آرکسٹرا بجتا ہے)

استاد فہرو: عالی قدر، حضور کریم خاں بہادر ساحل پر سفید جھنڈی ہلا رہے ہیں۔ اُن کا مقصد غالباً یہ ہے کہ بجرا کنارے پر پہونچا دیا جائے۔

کوئی ضروری امرِ سلطنت ہوگا۔

باز بہادر۔ استاد ٹھہرو، پہلا ظلم تو تم نے یہ کیا کہ نغمے کو ناتمام چھوڑ دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کائنات میں بجز روپ متی کے اور کچھ نہیں ہے۔ دوسرا ظلم یہ ہے کہ تم مجھے پھر دنیاوی آفات میں پھنسانا چاہتے ہو۔ آہ دُنیا کو میرا یہ سکونِ محبت بھی گوارا نہیں۔ اچھا بجرا ساحل پر لے چلو۔

(دریا میں بجرے کی روانی۔ ساحل پر لنگر کی آواز)

باز بہادر۔ کہو۔ کریم خاں۔ جلد کہو۔ تم آخر مجھے میرے خواب سے کیوں چونکانا چاہتے ہو۔

کریم خاں۔ عالیجاہ، غلام معافی کا خواستگار ہے۔ لیکن ایک ضروری امرِ سلطنت نے مجھے مجبور کر دیا۔

باز بہادر۔ ضروری امرِ سلطنت۔ کریم خاں۔ ایک محبت کے دیوانے کو خدارا آزاد رہنے دو۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم لوگ سلطنت کا بار ایک ایسے شخص کے کاندھوں پر ڈال دو جس کی دُنیا بجز روپ متی کے اور کچھ نہ ہو۔ خدا کے لئے جاؤ۔ میری انگوٹھی لیتے جاؤ۔ جو جی چاہے حکم نافذ کرلو، اور مجھے اپنی روپ متی میں گُم رہنے دو۔

کریم خاں۔ حضور، معاملہ نازک ہے۔ شہنشاہ اکبر کی طرف سے ادھم خاں چالیس ہزار سپاہ لیکر مالوہ کی طرف کوچ کر رہا ہے۔

باز بہادر۔ تو کیا ڈر ہے۔ آج تک مالوہ کی سپاہ نے شاہی روٹیاں مُفت کھائی ہیں۔ کیا اب وہ لوگ مغل فوجوں کے مقابلہ میں پُشت دکھائیں گے۔

کریم خاں۔ نہیں عالی جاہ۔ مالوہ کا بچّہ بچّہ اپنے آقا باز بہادر کے نام پر اپنے خُون کا آخری قطرہ تک بہا دیگا۔

باز بہادر۔ تو جاؤ، مجھے اپنی روپ متی میں گُم رہنے دو۔ بالفرض اگر مغل فوجیں مجھ سے مالوہ لے بھی لیں تو یقین ماننا کریم خاں، وہ مجھ سے میری روپ متی نہیں لے سکتے۔

تیسرا سین

ادھم خاں اور باز بہادر کی فوجوں میں مقابلہ ہو چکا۔ باز بہادر نے شکست فاش کھائی اور وہ جنگلوں میں جان بچا کر بھاگ گیا۔ مالوہ پر اب ادھم خاں کا قبضہ ہے۔ مالوہ کی بے انتہا دولت پر قابض ہو کر ادھم خاں کے دل میں بادشاہت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ چند ہاتھی شہنشاہ اکبر کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجتا ہے۔ اس وقت ادھم خاں محل میں بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے پاس اُس کے مصاحبین ہیں۔

ادھم خاں۔ شہباز، میں تیری ترکیب کا قائل ہوں۔ محض چند ہاتھیوں ہی کے ماتھے گئی (قہقہہ)

شہباز۔ عالی قدر سردار، اگر آپ کُل مالِ غنیمت کا حال شہنشاہ کو لکھ بھیجتے تو حضور کو حساب دینا پڑتا۔

ادھم خاں۔ بات یہ ہے کہ میری عقل ذرا آجکل چوندھیا سی گئی ہے۔ کمبخت روپ متی کسی طرح راضی نہیں ہوتی۔ اس پر باز بہادر کا بھوت ایسا چڑھا ہوا ہے کہ خُدا کی پناہ۔

شہباز۔ حضور ان دونوں کی محبّت تو مشہورِ زمانہ تھی۔ باز بہادر کا واقعہ ابھی تازہ ہے، کچھ دنوں صبر فرمائیے۔ بھُول جائیگی۔

ادھم۔ صبر اچھا کہا تم نے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ روپ متی کے لئے میری رُوح بیقرار ہے، صبر کیونکر کروں۔ میں نے روپ متی کی اناّ کو دس ہزار روپے کل ہی دئے ہیں اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آج کی رات میری ہو جائیگی۔

شہباز۔ تو کیا پروا ہے۔ لے لیجئے وہ اناّ جی خود آرہی ہیں۔

(پیروں کی چاپ)

ادھم خاں۔ آئیے آئیے اناّ جی۔ خوف کیا ہے۔ یہاں سب میرے جاں نثار بیٹھے ہیں۔

اتّا۔ حضور بات ذرا خفیہ ہے۔

ادھم۔ کہیئے بھی۔ ان لوگوں سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔

اتّا۔ حضور۔ بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ تو باز بہادر کو کسی طرح بھولتی ہی نہیں۔ میں نے کہا چھوکری ہوش کی دوا کر۔ ادھم خاں کی جوتی کے برابر بھی باز بہادر خوبصورت اور سجیلا نہیں تھا۔ اری کیوں بھری تھالی میں لات مار رہی ہے۔ بڑی مصیبتوں سے منتوں سے راضی ہوئی ہے۔

ادھم۔ کارے کردی۔ اتّا جی آپ نے مجھے مول لے لیا۔ فرمایئے پھر کب؟

اتّا۔ کب؟ اوئی بھیّا۔ کیا میں کچی گولیاں کھیلے ہوں۔ لے ابھی۔ اسی وقت۔ میں ڈری کہ کہیں کچھ سوچ ساچ بات سے نہ پلٹ جائے۔

ادھم خاں۔ شہباز، وہ موتیوں کا ہار اتّا جی کو دو۔

اتّا۔ حضور میں اپنے ہاتھ سے نہلا دھلا کر۔ پوشاک پہنا کر۔ دلہن بنا کر، روپ متی کو مسہری میں لٹا آئی ہوں۔ اب آگے حضور جانیں اور حضور کا کام۔

ادھم خاں۔ بس، بس تو چلوں۔

اتّا۔ بسم اللہ۔

(چلنے کی آواز۔ سارنگی کی صدا)

ادھم خاں۔ یہ سارنگی کی آواز کیسی آرہی ہے۔

اتّا۔ روپ متی کو گانے سے عشق ہے۔ اُس کے محل میں ہر وقت ساز بجا کرتے ہیں۔

ادھم خاں۔ اتّا جی اب کدھر جاؤں۔

اتّا۔ داہنے ہاتھ کو جو کمرہ ہے اس میں روپ متی کی مسہری ہے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

ادھم خاں۔ اللہ ری زیبائش۔ کمرہ خود ہی دلہن معلوم ہو رہا ہے۔ مسہری میں کوئی لیٹا تو ہے اور منہ پر چادر پڑی ہوئی ہے۔ ذرا سا چادر تو کھسکاؤں۔

(چادر کھسکانے کی آواز)

ادھم خاں۔ ہائیں۔ چہرے پر موت کی زردی ــ ارے ــ نبض بھی سرد۔ ہائیں کیا اس نے زہر کھا لیا۔ آہ محبت۔ تو عجیب عجیب کھیل دکھاتی ہے۔

بہزاد لکھنوی

چار دِن

پہلا دن:

آج چار سال کی قید بامشقت کے بعد مجھے رہا کیا جا رہا ہے۔ ایک سپاہی مجھے آفس کی طرف لے چلا۔ آفس کے کیلنڈر پر میری نظر پڑی۔ ۲ فروری ۔۔۔ میرے منہ سے ایک آہ نکلی ۔۔۔ شاید آج پھر میرے آرام و سکون کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ ایک شکستہ کشتی کو اس وسیع سمندر میں قیامت خیز طوفان کا مقابلہ کرنے چھوڑا جا رہا ہے ۔۔۔ میرے دماغ سے سینکڑوں خیالات اس طرح گذر گئے جس طرح پانی پر بلبلے بنتے اور بگڑ جاتے ہیں۔ میرے سینے کی انتہائی گہرائیوں میں آزادی کی خواہش جگنو کی طرح کبھی کبھی چمک جایا کرتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے دوستوں کے ساتھ آرام و چین سے دن گذار دوں۔ میں اس آرام و سکون کیلئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار تھا۔ مگر ۔۔۔ کاش وہ کہیں میسر آتا! ۔۔۔ میں اسے قیدخانہ کہتا تھا کیونکہ لوگ اُسے قیدخانہ کہتے تھے ۔۔۔ اور اس کے باہر آزادی ۔۔۔ لیکن آزادی کے صحیح مفہوم سے میں اب تک واقف نہیں ہوں ۔۔۔ اگر آزادی عبارت ہے اطمینان و سکون سے تو قید میرے لئے آزادی تھی اور آزادی قید ۔۔۔ یہاں مجھ سے محنت لی جاتی تھی اور اس کے معاوضہ میں آرام و سکون نہ سہی زندگی تو دی جاتی تھی۔ اور وہاں ۔۔۔ جسے لوگ آزادی کہتے ہیں۔ محنت کے بدلے ۔۔۔ فاقہ مستی ۔۔۔ میرے خیالات کا شیرازہ جمعدار کی بھاری آواز ۔۔۔ "کیا نمبر ہے؟" نے توڑ دیا۔ جمعدار چشمے کو ناک پر گرا کر لال لال دیدوں سے میری طرف گھور رہا تھا۔

"۱۸۴۳" میں نے سینہ تان کر جواب دیا۔

اُس نے الماری میں سے ایک پُرانی گٹھری نکالی اور اُسے میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے تمہارے کپڑے"

آج سے چار سال قبل جس وقت میں یہاں داخل کیا گیا تھا تو یہ کپڑے اُتار کر رکھ لئے گئے تھے۔ اور مجھے جیل کا لباس پہنایا گیا تھا۔

"جیل کا لباس اُتار کر اپنے کپڑے پہن لو" جمعدار نے اسی گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

* * * * * * *

میں کپڑے بدل کر صدر دروازے پر آیا۔ بوڑھا داروغہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ سپاہیوں کو دروازہ کھولنے کا حکم دیتے ہوئے میری طرف رجوع ہوا۔ میرے کانپتے ہوئے کاندھوں پر ہاتھ رکھکر مربیانہ انداز میں کہنے لگا۔ "دیکھو! تم ایک جوان آدمی ہو۔ محنت و مشقت سے گذر اوقات کرو۔ چوری کرنا ۔۔۔ ڈاکے ڈالنا ۔۔۔ اور نقب لگانے سے انسان اپنی رُوح کو شیطان کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ اسکے ضمیر سے نیکی کی قوت سلب ہو جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم جائز طریقے سے اپنی روزی حاصل کرنیکی کوشش کرو گے"

"میں نہیں جانتا کہ جائز و ناجائز کِسے کہتے ہیں" میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ "میرے سامنے صرف دو راہیں ہیں اگر میں ہاتھ پیر نہ ہلاؤں تو بھوکا مر جاؤں گا۔ دُنیا اسے حرام موت کہتی ہے ۔۔۔ اور میں خود بھی تو مرنا نہیں چاہتا۔ آخر میں کیوں مروں ۔۔۔ اس لئے ہاتھ پیر ہلاتا ہوں تو زمانہ مجھے ایک خاص راہ پر ڈال دیتا ہے ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ یہ گناہ ہے، بدترین حرکت ہے لیکن میں وہی کرتا ہوں کیونکہ میں اس کے سوا کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔ میں بدی سے نفرت کرتا ہوں اور اس کے باوجود میں گناہ کا مرتکب ہوتا ہوں۔

میں مجبور ہوں۔ قطعی مجبور۔ میں مرنا پسند نہیں کرتا۔ زندگی میرے لئے ایک شکستہ گاڑی ہے جسے میں ایک ناہموار راستے پر مجبوراً گھسیٹ رہا ہوں۔۔۔"

داروغہ کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔۔۔۔ چھوٹا دروازہ آہستہ آہستہ کھُلا۔ دُنیاوی ہوا کا ایک جھونکا میرے زرد رُخساروں کو چھوتا ہوا نکل گیا۔۔۔ میرے جذبات میں انقلاب پیدا ہوا۔ ایک عجیب سی مسرت آمیز خواہش نے میرے سارے جسم کو کپکپا دیا۔۔۔ کیا میں آزاد ہو رہا ہوں؟۔۔۔ اس کا جواب میں خود نہ دے سکا۔ لیکن میں مسرور ضرور تھا۔ مسرور بہت مسرور۔۔۔۔ میں نے اس وسیع رنگین دُنیا کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ایک خوابیدہ انسان مدت کے بعد ہوشیار ہو رہا تھا۔ انسانی ہوسناکیوں نے مُردہ خواہشوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ جوانمردی نے ایک مست انگڑائی لی۔۔۔۔ دروازے کے باہر میری کلائی پکڑ کر ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے داروغہ نے کہا۔ "تو کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ دوبارہ یہاں نہ آؤ گے اور ایک شریف۔۔۔۔"

"ہاں! اگر زندہ رہنے کے لئے کہیں اور جگہ مل جائے" میں نے بات کاٹ کر جواب دیا۔

داروغہ بڑا ہی شریف آدمی تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند، زاہد و پرہیزگار۔ قیدیوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتا۔ اسی وجہ سے اسکے افسر اس سے ناراض تھے۔ اس کے ماتحت بھی اس سے ناخوش تھے کیونکہ اس کی پرہیزگاری ان کے جیب گرم ہونے میں آڑے آتی تھی

"لو یہ سرکاری عطیہ" اُس نے دو روپے میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا "کوئی عمدہ وسیلہ پیدا کرو، شرافت کی زندگی بسر کرو" داروغہ کے الفاظ میرے لئے کوئی وقعت نہ رکھتے تھے۔ میں شاید تیسری مرتبہ یہ الفاظ سُن رہا تھا۔۔۔ "اچھا خدا حافظ" اُس نے آہستہ سے کہا۔ میں نے پیٹھ موڑی اور آہستہ آہستہ سڑک پر چلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ دو نم آلود، ہمدرد نگاہیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔

***

جیل کے احاطہ سے باہر نکل کر میں نے ایک لمبی سانس لی۔ دُنیاوی ہواؤں کو پھیپڑوں سے ٹکراتے ہی خیال گزرا کہ انسان صرف ہوا کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے پیٹ کی آگ کیلئے ایندھن کی ضرورت ہے۔ میں نے مٹھی کھولی، دو چمکتے ہوئے سکوں کو دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے آنکھیں چُندھیا گئیں۔ اس وقت قریب قریب دس بجے تھے لیکن پھر بھی میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ آخر کار سامنے کے پُل پر دھوپ کا لُطف اُٹھانے بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں مستقبل کے خیالات گھوم رہے تھے۔ میں نے روپوں کو انگوٹھے پر رکھکر ترتیب وار ہوا میں اُچھالا۔ دونوں کھرے تھے۔ مگر سوال یہ تھا انہیں کس طرح استعمال کیا جائے۔ میرے سامنے قید خانہ کی چار دیواری تھی اور پیچھے شہر آباد تھا۔ میری نظریں بار بار جیل کی نیلی دیواروں سے ٹکرا کر رہ جاتی تھیں۔ اگرچہ اس وقت میں آزاد تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں ڈال دیا گیا ہوں۔ مجھے اپنے دوستوں کا خیال آیا۔ جو قید خانے میں میرے ہم مشرب تھے۔ ہم اس حرص و ہوس کی دُنیا سے کتنے دُور تھے۔ کس قدر بے فکر۔۔۔ قریب آدھ گھنٹے تک میں اُسی جگہ بیٹھا رہا۔۔۔۔ آخر کار اپنی جوانمردی کا مکر و فریب سے مقابلہ کرنے نکلا۔ شہر نے اپنا آغوشِ عصیاں میرے لئے وا کر دیا۔

***

شہر کی ایک چھوٹی سی سرائے میں نے اپنے قیام کے لئے منتخب کر لی۔ محض دو آنے میں ایک حجام نے میری زندگی کے دس دس

سال مجھے واپس دیدتے۔ ایک پیسے کے صابن اور ٹھیکری نے مُردہ جسم میں شباب کی سُرخ لہریں دوڑادیں۔

مَیں نے صبح سے ابتک کچھ نہ کھایا تھا۔ غسل آزادی کے بعد دُھلا ہوا اُجلا لباس پہن کر شریف صورت بنائے سامنے کے ہوٹل میں پہونچا ـــــ ایک پردے کی آڑ میں کچھ لوگ کباب روٹی اور طرح طرح کے مزیدار کھانے اُڑا رہے تھے۔ اِن خوشبودار کھانوں کو دیکھکر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ مَیں ایک کونے میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔

جب مَیں لال چونچ ڈر کے سگرٹ کا دُھواں اُڑاتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلا تو میری جیب میں صرف ایک روپیہ سوا پانچ آنے پڑے تھے ـــــ

مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ آرام کی غرض سے سرائے کے وسیع دالان کے ایک کونے میں لیٹ گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایسا غافل ہوا کہ پھر تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ جب میں بیدار ہوا شام ہو رہی تھی۔ غریب مزدور دن بھر کی محنت کے بعد تھکے ماندے گھر واپس ہو رہے تھے۔ شام کی دلفریب فضا نے سینکڑوں کاہل، ناکارہ انسانوں کو تفریح کے لئے باہر کھینچ لیا تھا۔ بہت سے نوجوان عیش پسند رو ساجن کی نگاہیں بلندیوں پر پرواز کرنے کی عادی تھیں، اِدھر اُدھر تاک جھانک میں لگے ہوئے تھے۔ دُنیا دی مشین کا ہر پرزہ مصروفِ عمل تھا ـــــ اچانک مجھے اپنے پیسوں کا خیال آیا ـــــ مگر کیا دُنیا میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو دوسروں کی غفلت سے فائدہ نہ اُٹھاتے ہوں۔

اَب مَیں پھر وہی چند سکوں کی تلاش میں گھوم رہا تھا جن کے بغیر میں اپنا جہنم کی آگ کو سرد نہ کرسکتا تھا۔ رات کے قریب نو بجے مجھے ایک بوجھ اُٹھانے کا کام ملا۔ ایک شخص کا صندوق اسٹیشن پہونچانا تھا۔ وہ صندوق اس قدر وزنی تھا کہ گردن اکڑ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ قدم لڑکھڑائے لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ جوں توں کر کے اسٹیشن پہونچ ہی گیا۔ اس شخص نے اپنی دریادلی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک آنہ میری ہتھیلی پر رکھدیا۔ میں نے اس آنے سے اپنی شکم پُری کی اور سرائے میں آکر سو رہا۔

دوسرا دن ـــــ

مَیں تلاشِ معاش میں گھومتا ہوا ایک ایسی جگہ پہونچا جہاں ایک مکان زیرِ تعمیر تھا۔ ٹھیکیدار نے مجھے تین آنے روز پر نوکر رکھ لیا۔ میں اینٹیں ڈھوتا جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ انسان تین آنے روز میں کیونکر اپنا گذارہ کر سکتا ہے۔ یہ لوگ کیا کھاتے ہونگے۔ گھر کا کیا کرایہ دیتے ہونگے۔ بال بچوں کی کیسے پرورش کرتے ہونگے اور اگر کوئی بیمار پڑ گیا تو .... ؟ آف! اس دُنیا میں زندگی کس قدر مہنگی ہے۔ کیا ہم محنت کے لئے تخلیق کئے گئے؟ کیا ہم مشقت کیلئے زندہ ہیں؟ ـــــ زندہ رہنے کے لئے محنت کرنا چاہیئے؟ یا محنت کرنے کیلئے زندہ رہنا چاہیئے ـــــ محنت انعام ہے زندگی کا؟ یا زندگی انعام ہے محنت کا؟ ـــــ ہماری محنت کے بدلے ہمیں کتنوں کی سی زندگی دی جاتی ہے ـــــ اور جو محنت نہیں کرتے عیاشی کرتے ہیں کاہل، آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور محنتی ہما انسانی ضروریات بھی پوری نہیں کرسکتے ـــــ یہ کیسی دُنیا ہے؟ یہاں کیسے لوگ رہتے ہیں؟ یہاں کیسے رہنا چاہیئے؟

اینٹیں ڈھوتے ڈھوتے میرے کاندھوں اور گردن میں درد ہونے لگا بھلا ایسا کام میں نے کب کیا تھا۔ اس کے لئے وقت کی ضرورت تھی۔ مگر ٹھیکیدار دم نہ لینے دیتا تھا۔ وہ تو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام چاہتا تھا ـــــ آخر کار میں نے

کمزوری اور مجبوری کا یہ صلہ ملا کہ ٹھیکیدار نے ایک بجے چھ پیسے دیتے ہوئے کہا: "مجھے تم جیسے کاہلوں کی ضرورت نہیں کوئی اور دھندا تلاش کرو۔"

چھ پیسے کھا پی کر میں بازار میں گھوم رہا تھا۔ شام کو میری حالت بہت اَبتر ہو گئی۔ کچھ سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ اچانک ایک آواز کان میں آئی "کیا شرافت کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ہے؟" یہ میرے دوست کی آواز تھی جسے میں عرصے سے بھول چکا تھا۔ وہ مجھے اُسی خاردار راستے پر پھر گزرنے کی ترغیب دے رہا تھا جس کے لوازمات و طور طریق کو قید کی محدود و مقید فضا نے ایک حد تک بھلا دیا تھا۔ میری شر انگیز، ولولہ خیز روح انگڑائی لیکر بیدار ہوئی ــــــ ایک خوش پوش کے بٹوے کے ساتھ ساتھ میری للچائی نظریں اُس کے جیب میں پہونچیں۔ ایامِ قید نے مجھ سے میرے "ہاتھ کی صفائی" چھین لی تھی۔ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میری کمزوری نے مجھے سخت شرمندہ کیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے شکار کی تلاش میں گشت کرنے لگا۔

ایک جگہ کوئی دقیانوسی حکیم اپنی بلند آواز، لچھے دار، ظرافت آمیز تقریر کے ساتھ اپنی جھوٹی دواؤں کی تعریف کر رہا تھا۔ لوگ اُس کی باتوں میں محو تھے۔ میں نے ایک رنگین بٹوے والی جیب کو اپنی مشقِ ستم کا نشانہ بنانے کے لئے تاکا۔ مجھے صرف ایک لمحہ غفلت درکار تھا ــــــ اچانک حکیم اپنی دورانِ تقریر میں کہنے لگا "دیکھئے! ذرا اپنی جیبوں سے ہوشیار رہیئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ آپکی غفلت سے کوئی پورا پورا فائدہ اُٹھائے......" لوگوں میں بیداری پھیل گئی۔ متجسس نگاہیں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ میری حالت اُس شخص کی سی تھی جو چوری کرتا ہوا پکڑا جائے۔ میں اِس خوف سے کہ مبادا کوئی میری آنکھوں سے میرا راز نہ پڑھ لے، نظریں نہ اُٹھا سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت سی متلاشی نظریں مجھ پر پڑ رہی ہیں ــــ حکیم نے پھر تقریر شروع کی ــــ میں وہاں سے کھسک گیا۔ ــــ قریب ساڑھے گیارہ بجے رات، میں تھکا ماندہ، ناکام و نامراد سرائے واپس آیا۔

تیسرا دن ــــــ

رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ مارے بھوک کے بُرا حال تھا۔ تین چار سوتے ہوئے انسانوں پر میں نے خاموش حملہ کیا لیکن اُنہیں بھی اپنا سا پایا۔ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام، لیکن میں اِس بھوکے اژدہے کیلئے ایک ٹکڑا بھی فراہم نہ کر سکا۔

شہر کا بڑا بازار اس وقت پوری رونق پر تھا۔ دن بھر کی محنت کے بعد لوگ اپنی ضروریات خریدنے چلے آئے تھے۔ میں ایک بجلی کے کھمبے سے لگا کھڑا لوگوں کے چہروں کے اطمینان و مسرت کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے کی چاندی سونے کی دُکان کو بجلی کی روشنی نے کہکشاں بنا دیا تھا ــــــ ایک سیٹھ جی مع ایک عدد وسیع توند اور ایک عدد میلی دھوتی پہنے بغیر شکن کے سفید فرش پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے ــــــ مستقل فاقے نے مجھ میں جسارت و دلیری پیدا کر دی تھی ــــ میں سیٹھ جی کے قریب پہونچا "کیوں سیٹھ جی! کیا نوکری بھی کہیں ملے گی؟" میں نے "بھولے پن" سے دریافت کیا۔

"نوکری" سیٹھ جی کی نظریں میرے قد کی لمبائی کے درمیان گشت کر رہی تھیں ــــ "پہلے کبھی نوکری کی ہے؟" سیٹھ جی نے میرا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد لاپرواہی سے پوچھا۔

"ہاں! ہاں!! ابھی جیل سے چھوٹ کر آ رہا ہوں" میں نے دلیری سے جواب دیا۔ "اور سیٹھ جی!" میں نے سادگی سے کہنا شروع

کیا۔" ہم نے جیل میں سخت محنت و مشقت کے کام انجام دئے ہیں۔ اور ہم لکھے پڑھے آدمی ہیں سیٹھ جی! مڈل تک تعلیم پائی ہے۔ آپ اگر ہمیں نوکر رکھ لیں تو آپ کو بڑا فائدہ ہوگا۔"

اب سیٹھ جی کچھ گھبرائے۔ آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ میری حالت کا جائزہ لیا اور ہمدردی سے کہنے لگے۔ "بھئی آجکل نوکری کہاں ــــ اچھے اچھے پڑھے لکھے مارے مارے گھوم رہے ہیں۔ محنت و مزدوری بھی نہیں ملتی۔" ایک وقفے کے بعد کہنے لگے "ابھی تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے ــــ پھر کبھی آنا ــــ دوستوں سے پوچھ کر جواب دونگا۔"

جب میں دکان سے نکل رہا تھا تو گلی والے چھوٹے دروازے سے ایک شخص کو اندر آتے دیکھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ فضلو تھا جو دوسری دفعہ کی جیل میں میرا ساتھی رہ چکا تھا۔ سیٹھ جی اس کو دیکھتے ہی گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔ میں گلی کے موڑ پر چھپ کر کھڑا ہوگیا ــــ سیٹھ جی نے جب اطمینان کر لیا کہ کوئی انہیں نہیں دیکھ رہا ہے، تو فضلو کو دکان کے ایک تاریک کونے میں بلا کر کہنے لگے۔ "کہو کیا ہے؟" سیٹھ جی نے کسی قدر آہستہ سے پوچھا۔

فضلو نے ایک پیلا چمکدار کڑا اُن کے سامنے کر دیا ــــ سیٹھ جی نے ہتھیلی پر اُس کے وزن کا اندازہ کیا۔ "سب نقلی سونا ہے۔ پچیس روپے کا ہوگا۔"

"کیا کہتے ہو سیٹھ جی!" فضلو نے حیرت سے کہا۔ "ڈیڑھ سو کا مال ہے ڈیڑھ سو کا۔"

"ہش! سب جھوٹا ہے نقلی ــــ چالیس سے زیادہ کا مال نکل ہی نہیں سکتا ــــ ایک بات کہتا ہوں پینتیس میں دے دو۔ اس سے زیادہ ایک پیسہ نہ ہوگا۔"

"غضب کر رہے ہو سیٹھ جی!" فضلو نے روتی آواز میں کہا۔

"بس کہہ چکا" سیٹھ جی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"خیر جو حضور کی مرضی۔" لوگوں کو دکان میں آتا دیکھ کر فضلو نے معاملہ طے کر لیا ــــ وہ جیب گرم کرتے ہوئے گنگناتا ہوا گلی کے موڑ پر آیا۔ میں نے پیچھے سے جا کر آہستہ سے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھبرا کر کانپنے لگا۔ پھر مجھے پہچان کر اُس نے کہا، "تم ہو راجو! تم نے مجھے ڈرا دیا۔ آجکل کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"

"پہلے تم مجھے کہیں کھانا کھلا دو۔ دو روز سے فاقہ ہے۔"

وہ میری کلائی پکڑ کر ایک تاریک گلی میں لے چلا۔

ہم شہر کے غیر آباد حصے کے ایک چھوٹے سے قہوہ خانہ میں پہونچے۔ اس نے بتایا کہ یہ ہوٹل اُن کا ناص اڈا ہے ــــ ہم یہاں بالکل آزادی سے بات کر سکتے تھے۔ ہم دونوں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا ــــ اس کے بعد اس کے اصرار پر میں نے اُسے دوسری قید کے بعد سے اب تک کے تمام حالات سنائے۔ جسے سنکر وہ کہنے لگا۔ "اچھا تو آپ نے شرافت و ایمانداری کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔" اُس نے قہقہہ لگایا۔ ایک لڑکے کو دو پیالی چاء لانے کا حکم دیتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "تم تین دفعہ جیل ہو آنے کے بعد بھی بچے ہی رہے راجو! ــــ ارے نادان! کہیں شرافت اور محنت و مزدوری سے بھی آرام و سکون حاصل ہو سکتا ہے؟ ــــ

اور سیٹھ ــــ اس دُنیا میں ــــ جہاں زندگی عبارت ہے مکر، فریب، دھوکا، جھوٹ اور دغا سے ــــ تم کسانوں کو نہیں دیکھتے جنہیں اُنکی شرافت، سادگی و سادہ لوحی نے زندہ درگور کر دیا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس شرافت و سادگی کو آج کل دُنیا حماقت و بیوقوفی سے تعبیر کرتی ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو۔ سیٹھ جی کی مثال لو، ابھی سب تمہاری سمجھ میں آجائیگا ــــ معلوم ہے! سیٹھ جی آج کل شہر کے سب سے بڑے رئیس ہیں۔ انسانی خواہشات اُن کی زر خرید لونڈیاں ہیں ــــ لیکن ابھی چند سال پہلے وہ ایک معمولی آدمی تھے۔ چھوٹی سی دُکان تھی۔ ہم لوگوں سے چوری کا مال خرید کر گلا کر بیچنے لگے، سُود میں لوگوں کو خُوب مونڈا۔ بہت سوں کے گھر چھینے۔ سینکڑوں کی جاگیریں ضبط کیں۔ پولیس والوں کو رشوتیں دیں۔ صاحب لوگوں کی خوشامدیں کیں۔ افسروں کو پارٹیاں دیں۔ ڈالیاں دیں۔ رائے بہادر ہوتے۔ شہر کمیٹی کے صدر ہوئے۔ آج ہر طرف عزت ہے، لوگ جُھک جُھک کر سلام کرتے ہیں۔ جلسوں کی صدارت کے لئے بُلوائے جاتے ہیں ــــ سمجھے! یہ ہے دُنیا ــــ یہاں شرافتُ عزت کا دارومدار انسانی پونجی پر ہے۔ اگر میرے پاس دولت ہے تو مَیں شہر کا سب سے زیادہ شریف و باعزت انسان ہوں! اگر اتفاقاً زمانہ سے مَیں آج غریب ہو جاؤں تو کوئی میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا ــــ دولت کی چمک انسانی نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ دولت مند کے عیوب بھی لوگوں کو اس کے محاسن نظر آتے ہیں۔ دولت کا چمکیلا جال اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ تم اپنے دُشمنوں کو اس میں پھانس سکتے ہو۔ مخالفوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہو ــــ جب تک دولت نہیں ہوتی لوگ دولت حاصل کرنے کے طریقے کے جائز و ناجائز ہونے پر تنقید کرتے ہیں اور جب دولت آجاتی ہے تو تمام جائز و ناجائز کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

فضلو ٹھنڈی چاء کا آخری گھونٹ لے کر پھر کہنے لگا ــــ "اس دُنیا میں کسی فعل کی اچھائی اور بُرائی کا دارومدار اس کے کرنے والے کی قابلیت، لیاقت اور چالاکی پر ہے۔ اگر بُرے کام کو بھی خُوشنما رنگ سے پیش کیا جائے تو وہ ایک نیک کام ہو سکتا ہے ــــ کسی جُرم کا کرنا گناہ نہیں بلکہ اس کا پوشیدہ نہ رکھ سکنا گناہ ہے۔" اُس نے ایک سگرٹ خود جلایا ایک مجھے دیا۔ دھوئیں کے چھلّے چھت کی طرف پھینکتے ہوئے کہنے لگا "سنو! میاں راجو! کامیاب زندگی کا راز چاندی کے ٹکڑوں میں پنہاں ہے۔ انسانی عمل چمکدار ہیٹوں سے تو ازن کیا جا رہا ہے۔ انسان کا مفلس ہونا اس کی سب سے بڑی بدبختی ہے تم چند سکّوں سے اپنی لوحِ قسمت کے دُھندلے الفاظ کو سنہرا کر سکتے ہو۔" وہ گھڑی دیکھکر کہنے لگا "معاف کرنا مجھے ایک خاص کام پر جانا ہے۔ تم یہاں اطمینان سے رات بسر کر سکتے ہو۔"

مَیں بیدار ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں کُھل چکی تھیں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔

"مَیں تمہارا ممنون ہوں" میں نے آہستہ سے جواب دیا "لیکن کیا تم میری کچھ اور مدد کر سکتے ہو؟"

"وہ کیا؟" اُس نے پوچھا۔

"مجھے چند نقب لگانے کے اوزار دیدو۔"

چوتھا دن ــــ

آج ــــ جبکہ میری صحیفۂ حیات کے خوشنما و رنگین اوراق کو حوادثِ زمانہ کے کرم نے چاٹ کر بوسیدہ کر دیا ہے ــــ بارہ [12] سال بعد مجھے قید سے رہا کیا جا رہا ہے . . . . صدر دروازے پر داروغہ کہنے لگا ــــ "محنت مزدوری سے گذر اوقات کرو ــــ شرافت کی زندگی بسر کرو . . . . . ."

ریاض رؤفی

مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل

ایک دن جنگل کے مغنّی نئے نواز سے میں نے پوچھا "تم شعر کیوں کہتے ہو؟ تمہارے نغمے فضا میں کس لئے آوارہ رہتے ہیں؟ ــــ" کہنے لگا "یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں شاعر نہیں دیوانہ ہوں ــــ اُس کی حنائی انگلیوں نے بربطِ حیات کے نیم شکستہ تاروں کو کچھ اس طرح چھیڑا کہ تخیل کی تمام رُومانی قوتیں مرکزِ یاس سے ہم آہنگ نظر آنے لگیں ــــ اَب میں ان نغموں سے اُس کی پُوجا کرتا ہوں ــــــ وہ اِنہیں ٹھکرا دیتی ہے اور میں کرتا ہوں جمع پھر لختِ جگر کو!" یہ کہتے کہتے اُس کی لانبی اور سیاہ پلکیں آہستہ آہستہ بلند ہوئیں اور میں نے اُسکی قسمت کے ستارے کو سرِ مژگاں ڈبڈباتے ہوئے دیکھا، میں خاموش ہو گیا!۔

اِنتساب:۔ میرس روڈ کے مُطوّفین کے نام! (راحت)

تجھے قسم ہے مرے اضطرابِ پیہم کی
تجھے قسم ہے اُنہیں کے شبابِ برہم کی
تجھے قسم ہے ستاروں کی آسمانوں کی
تجھے قسم ہے مرے دُکھ بھرے فسانوں کی

جہاں پہاڑ ہیں، بادل ہیں، سرد آہیں ہیں
جہاں خمیدہ خمیدہ سی چند راہیں ہیں
"مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل!"

جہاں پہاڑ پہ ہوتی ہے روشنی ہر سو
جہاں جنون کو ملتی ہے زندگی ہر سو
جہاں کی سُرمگیں راتیں ہیں منتظر میری
جہاں حواس کو رہتی نہیں خبر میری
جہاں حیات کے نغموں سے گونجتی ہے فضا
جہاں پیامِ نگاہی نہیں رہینِ صدا
"مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل!"

جہاں نگاہیں ملیں، مل کے مُسکرائیں تھیں
جہاں وہ پہلے پہل مجھ سے ملنے آئیں تھیں
جہاں کہ پایا تھا اُس گوہرِ نہ سُفتہ کو
جہاں جگایا تھا اُنکے شبابِ خُفتہ کو
جہاں شراب سے رنگینیاں چُرائیں تھیں
جہاں شباب سے نیرنگیاں اُڑائیں تھیں
مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل!"

جہاں "حجابِ مقدّس" ہے بے سر و ساماں
جہاں "شبابِ مجسّم" ہے مظہرِ ارماں
"——————
"——————

فریب خوردۂ اُلفت جہاں مچلتے ہیں
جہاں وہ گیسوئے مشکیں بہار بنتے ہیں
"مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل!"

جہاں فضا پہ تھا ہر سمت اختیار اُن کا
جہاں سپہر کو رہتا تھا انتظار اُن کا
جہاں ہنساتے ہنساتے تھکا دیا تھا اُنہیں
جہاں جلاتے جلاتے رُلا دیا تھا اُنہیں
جہاں ترانے محبّت کے گائے جاتے تھے
جہاں بجھے ہوئے دل پھر ہنسائے جاتے تھے
"مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل!"

اُس اُونچی چوٹی پہ وہ زرد زرد کاشانہ
جہاں بُلا کے مجھے کر دیا تھا دیوانہ
جہاں سکون کی دُنیا کو کھو دیا میں نے
جہاں خُدا کو فراموش کر دیا میں نے
جہاں خیال کی وسعت میں کھو گیا تھا میں
جہاں جمال کے پہلو میں سو گیا تھا میں
"مرے حسین تصوّر مجھے وہیں لے چل!"

راحت

برکھا رُت

گھٹا اُٹھی پھر اوّل اوّل فضا کی گود میں بکھرا ہے کاجل
کلیجہ سرد ہے پیاسی زمیں کا ہوا جاتا ہے اب میدان جل تھل
اُفق پر دھاریاں سی پڑگئی ہیں کسی نے چُن لیا ہو جیسے آنچل
لچکتی آرہی ہے تیز بجلی برستا آرہا ہے مست بادل
بھری ہیں راگنی سے سرد بوندیں ہوا کے ساز پر بجتی ہو چھاگل
یہ کوکو کا ترانہ کس نے چھیڑا گھنیرے کنج میں آنکھوں سوا دھجل
یہ کیسی مے کی خوشبو آرہی ہے یہ کس نے کھول کر رکھدی ہو بوتل

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

حسینوں کا ہے پھر باغوں میں جمگھٹ ٹپکتی ہے نگاہوں سے لگاوٹ
مچل اُٹھیں جوانی کی اُمنگیں نہ پروا ہے نہ آنچل ہے نہ گھونگٹ
یہ پھولوں سے لدی ریشم کی ڈوری گھٹاؤں میں یہ جھولوں کی سجاوٹ
ہوا میں راگنی سی گارہی ہے ملائم آنچلوں کی سرسراہٹ
یہ بوندوں کے ٹپکنے کا ترنم، سہانی پتّیوں پر نرم آہٹ
موے کی یہ بیراگی صدائیں بھنبھیری کی یہ میٹھی گنگناہٹ
گھٹائیں گود پھیلائے ہوئے ہیں کھلی ہو جیسے میخانے کی چوکھٹ

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

ہوئے جلوے حسینوں کے نرالے انوکھے رنگ باغوں میں اچھالے
یہ دھانی چوڑیاں بکھرا ہوا رنگ حسیں گردن میں یہ پھولوں کے مالے
ہوا میں اس طرف شبرنگ زلفیں فضا میں اُس طرف بادل وہ کالے
جوانی کی اُمنگوں کا تقاضا، کھلے جوڑے پہ آنچل کون ڈالے
چمن میں آبسے ہیں مالنوں کی صدائیں دے رہے ہیں پھول والے
بندھی جاتی ہیں اب ساون کی جھڑیاں گرینگے کوئی دم میں مینہ کے جھالے
گھٹاؤں سے وہ برسی نوجوانی وہ لوٹے دیکھ میخانے کے تالے

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

کہاں پانی کی آب ہلکی پھواریں ۔۔۔ فضا میں جھومتی ہیں تیز دھاریں
یہ گرتی موریاں، بجتا ہوا ٹیں ۔۔۔ یہ ہمسائے میں بچوں کی پکاریں
ہواؤں میں اُڑا جاتا ہے سبزہ ۔۔۔ بچھی جاتی ہیں آموں کی قطاریں
گھنیرے باغ میں موروں کا جھگھٹ ۔۔۔ کھلے میدان میں ہرنوں کی ڈاریں
یہ کشتی میں صدائیں مانجھیوں کی ۔۔۔ بھرے دریا کے سینے پر ملاریں
سنبھالے گاگریں جمنا کے تٹ پر ۔۔۔ نہانے آئیں بندرابن کی ناریں
اُبلتی ہے گھٹاؤں کی جوانی ۔۔۔ پھٹی پڑتی ہیں ساون کی بہاریں

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

بھرے ساون کی یہ چڑھتی جوانی ۔۔۔ گھٹا ہے یا بلائے آسمانی
یہ شور انگیز دریا کا تلاطم ۔۔۔ یہ طوفاں خیز موجوں کی روانی
گلی کوچوں میں ندی بہہ رہی ہے ۔۔۔ سڑک پر آگیا نالے کا پانی
جواریں لہلہائیں، دھان لہکا ۔۔۔ کسانوں کی ہٹی اب سرگرانی
زمیں پر جم گئی اُڑتی ہوئی خاک ۔۔۔ اُٹھی مٹی سے بو سوندھی سہانی
گھٹاؤں میں چمک یہ جگنوؤں کی ۔۔۔ سیہ آنچل پہ جیسے کامدانی
یہ موسم ہے تو بے مانگے بھی ساقی ۔۔۔ پلائے گا شرابِ ارغوانی

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

کھلا ہے پھر سے میخانے کا آغوش ۔۔۔ گھٹاؤں سے برستا ہے نیا جوش
سجی ہے پھر بساطِ بادہ نوشی ۔۔۔ ہوئے ہیں جمع اصحابِ بلانوش
شریکِ بزم زرّیں مسندوں پر ۔۔۔ حسینانِ گل آویز و گہر پوش
کھنکتے جام کی شیریں صدائیں ۔۔۔ ہوئی ہیں آج پھر سے جنتِ گوش
چلی ہے ساقیہ پھر رقص کرتی ۔۔۔ صراحی بر کمر پیمانہ بر دوش
خیالِ کفر و ایماں دور ہو دور ۔۔۔ خدا کے واسطے اے عقل خاموش!
جوانی عشرتِ امروز خواہد ۔۔۔ بکن افسانۂ فردا فراموش

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہونچی ہے برسات

جاں نثار اختر ایم۔ اے

ادب پارے

اجنبی مُسافر آدھی رات سے مُسافر جھونپڑی کے پاس سر جھکائے ہوئے بیٹھا تھا......

اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے، بال گرد آلود اور چہرہ اُداس تھا۔

ہر طرف اندھیرا اور سُنسان خاموشی تھی۔ جھونپڑی کے اندر سے سونے والے کی کروٹوں سے چارپائی کے بانس چرچرانے کی آواز آئی۔ مُسافر کا دل ڈوبتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

وہ آدھی رات سے یونہی سر جھکائے بیٹھا تھا

آم کے درختوں کے اُس پار دُھندلکے میں ایک دو کسان اپنے بیل لے جاتے نظر آنے لگے۔

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جھونپڑی کا دروازہ کُھلا اور جوان عورت اپنی لچکتی کمر پر گگری رکھکر کنوئیں پر جاتے ہوئے اسکے پاس سے گزری۔

مُسافر کو خبر نہیں ہوئی۔ وہ یونہی اُداس سر جھکائے بیٹھا رہا ـــــ!

عورت اَب لوٹ رہی تھی۔ مُسافر نے آہستہ سے سر اُٹھاکر اپنی تھکی ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا... اُسکے لبوں پر سرد آہ تھی۔

عورت ٹھٹک گئی اور تعجب سے پوچھنے لگی "تو کیوں اُداس ہے۔؟"

مُسافر کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ہونٹ ہلائے۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔

آدھی رات سے جھونپڑی کے پاس بیٹھے ہوئے مُسافر کی آنکھوں میں آنسو آگئے لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

فلاسفر صبح سے شام تک تو کتب خانہ کی بھاری بھاری الماریوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے اور ... سوچتے ... زندگی کے طویل دن گزار دیا کرتا ہی۔

آخر تو دُنیا سے اتنا بیگانہ کیوں ہے؟

... زمانۂ قدیم کی موٹی موٹی ضخیم کتابیں جن کے ... گرد ڈالنے میں ڈھیر ہیں، اور تو بیکار

سُلگا سُلگا کر اُن پر جھکا ہوا اتنا مصروف ہے کہ سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ مجھے بتا اِن میں کن دلفریب کہساروں کی دُنیا چھپی ہوئی ہے جو تیرے کانوں میں اپنے آبشاروں کے سریلے گیت گنگنا کر تجھے ایک افریقہ کی صحرائی جادوگرنی کی طرح کھینچے لئے چلی جا رہی ہے!

یا اس علم کے ذخیرے میں تجھے ایشیائی شاعروں کا محبوب جانور، کوئی خوبصورت آنکھوں والا سُنہری ہرن نظر آ گیا ہے، جس کے پیچھے تو سارے شکاریوں کو چھوڑ کر تنہا دیوانہ وار گھوڑا دوڑائے چلا جاتا ہے اور پھر کسی طلسمی محل کے اندر جا کر غائب ہو جاتا ہے؟

سوچتے سوچتے تیرے سر کے بال بھی سفید ہو چلے ہیں۔

اَب بھی تو دُنیا کی طرف سر اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور ویسے ہی بیگانہ بنا ہوا ہے!

اللہ اس راز کا انکشاف کب ہوگا؟

انکشاف جب میں بچہ تھی چاند کو پہروں ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی کہ شاید اس کے اس پار کے دُور کے ممالک سے کوئی دھیمی سی آواز میرے کانوں میں آجائے اور اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

پھر میں اَور بڑی ہوئی تو درختوں کی بھوری قطاروں کے پرے نظریں جما جما کر دیکھتی کہ شاید وہ نظر آجائے۔

آخر اس کا انکشاف کب ہوگا؟

پہلے میں حکمائے یونان کی طرح اپنے کو دُنیا میں تنہا متلاشی خیال کرتی تھی۔

اب میں کتب خانہ کی ان موٹی موٹی کتابوں میں دیکھتی ہوں کہ دُنیا کے بڑے بڑے عالموں اور فلاسفروں نے اس کی تلاش میں عمریں صرف کر دیں پھر بھی نہ پا سکے۔

وہ رستہ سے بھٹک گئے تھے۔

شاید میں ہی پا جاؤں۔

آئی اے

چندہ سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے، فی پرچہ چھ آنے

ممالکِ غیر سے ۱۲ شلنگ، نمونہ کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۲۱ | ساقی دھلی - بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۲

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

جنوری میں اُردو کے اکثر رسالے سالنامے شائع کرتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء کے اختتام اور ۱۹۴۰ء کے شروع میں چند بہت اچھے سالنامے شائع ہوئے۔ عالمگیر۔ ادبِ لطیف۔ ادبی دُنیا اور ہمایوں کے سالنامے سب اپنی اپنی جگہ اِس لائق ہیں کہ اُن سے اپنے کتب خانے کی زینت بڑھائی جائے۔ اُردو رسائل آپ کی اعانت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ اِنہیں کے ذریعے جدید سے جدید ادب کی اشاعت کم سے کم قیمت پر ہو رہی ہے۔ موجودہ گرانی اُردو رسائل کیلئے زندگی و موت کا سوال بن گئی ہے۔ اگر آپ تھوڑے سے ایثار سے کام لیں گے تو یہ کٹھن گھڑیاں بھی کسی نہ کسی طرح کٹ جائیں گی۔

سالنامۂ ساقی کے متعلق ہمارے ناظرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ بہت اچھا شائع ہوا ہے۔ اِس اظہارِ خیال کیلئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں۔ مضمون نگار حضرات کے لُطفِ خاص نے سالنامے کو خاصہ کی چیز بنا دیا۔ افسانے سب سے زیادہ پسندِ خاطر ہوئے۔ غالباً اِس وجہ سے کہ ساقی کے جتنے مخصوص افسانہ نگار ہیں سب جدّت طراز ادیب بھی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں دو صاحبِ طرز افسانہ نگار پیش کرنے کا فخر ساقی کو حاصل ہوا۔ ایک سید رفیق حسین صاحب اور دوسری عصمت چغتائی صاحبہ جو ہمارے قدیم معاونِ خاص جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن ہیں۔ سید صاحب کو جانوروں کی فطرت نگاری میں کمال حاصل ہے۔ سالنامہ میں آپ کا جو افسانہ "آئینۂ حیرت" شائع ہوا ہے اِس لائق ہے کہ اُسے بار بار پڑھا جائے۔ عصمت صاحبہ ہماری سوسائٹی اور عورت کی موجودہ حیثیت پُر لطف طنزیہ پیرائے میں اس طرح پیش کرتی ہیں کہ پڑھنے والا پھڑک جاتا ہے۔ "دائن" ان کے طرزِ تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔

نقد و تبصرہ کیلئے ساقی کے چند صفحات وقف ہیں۔ گزشتہ چند ماہ میں اُردو مطبوعات ماشاء اللہ اس کثرت سے موصول ہوئی ہیں کہ ہم اُن سب پر ایک یا دو اشاعتوں میں تبصرہ نہیں کر سکیں گے۔ تاہم ہماری کوشش یہی ہوگی کہ جلد سے جلد ان کتابوں کا تعارف کرا دیا جائے۔ پیشِ نظر اشاعت میں اکثر کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے لیکن ایک کثیر تعداد ابھی باقی ہے۔ ناشرین سے درخواست ہے کہ ہماری مجبوریوں کو نظر انداز نہ فرمائیں۔

لیڈر۔ اُردو ہندی کے ناگوار نزاع پر یہ ایک دل خراش اور بیحد مؤثر المیہ ڈرامہ ہے جس میں ہندوستانی سیاست کے اصل خط و خال نظر آتے ہیں۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ خود غرض فرقہ پرور لیڈروں کی ابن الوقتی اور اُن کی گھناؤنی زندگی کے عکس، نوجوانوں کے بیدار حس و جذبات سے لیڈر کس طرح کھیلتے ہیں اور شرو فتنہ سے ملک کی تباہی کے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ مسٹر فضل حق قریشی دہلوی نے یہ ڈرامہ بزمِ تہذیبِ ادب دہلی کی فرمائش پر لکھا ہے۔ اراکینِ بزم ۵۔ ۶۔ ۷ فروری کو دو اور ڈراموں کے ساتھ "لیڈر" بھی عربک کالج دہلی میں اسٹیج کر رہے ہیں۔

آمدنی عربک کالج فنڈ میں دیدی جائیگی۔

"لیڈر" کتابی صورت میں بھی شائع ہوا ہے اور تین آنے کے ٹکٹ بھیجکر ساقی بُک ڈپو سے منگایا جا سکتا ہے۔ یہ ڈرامہ اس لائق ہے کہ بہی خواہانِ اُردو اِسے ہر شہر میں اسٹیج کریں۔

"گلبانگ حیات" زیر تدوین کا ایک ورق۔

معلّم سے خطاب

نژادِ نو کو معلّم سکندری نہ سکھا! | بُتوں کے توڑنے والوں کو بُت گری نہ سکھا!
پڑی ہے گھُٹّی میں جن کی مئے ہُوالقادر | بٹھا کے زانو پہ اُن کو "ہری" "ہری" نہ سکھا!
بنا ہے جن کے لئے خنجرِ ہلالِ فلک | اُنہیں خدا کے لئے جنگِ زرگری نہ سکھا!
ہے جن کے ذوقِ اخوّت میں شانِ "لاتثریب" | کر اُن پہ رحم اُنہیں کینہ پروری نہ سکھا!
بنی ہے جن کے لئے کائنات کی ہر شے | اُن "آمرانِ الٰہی" کو چاکری نہ سکھا!
نہ لاد دفترِ بے معنئِ علوم ان پر | براق جن کی ہے فطرت اُنہیں خری نہ سکھا!

بھٹک نہ جائیں رہِ راست پر چلا اِن کو
خُدا کا خوف کر "انسانیت" سکھا اِن کو

بتا انہیں کہ تمنائے سروری کیا ہے | سکھا اِنہیں کہ تقاضائے داوری کیا ہے
سکھا انہیں کہ ہیں کیا چیز ذوق و فکر و نظر | بتا انہیں کہ خودی کیا ہے خودگری کیا ہے
لکھ اُن کی لوحِ تخیّل پہ بعدِ بسم اللہ | کہ فقر کہتے ہیں کس کو قلندری کیا ہے
جب اُن کے سامنے کرنی ہو شرح ظلمت و نُور | سُجھا کہ بولہبی کیا ہے حیدری کیا ہے
بتا انہیں کہ ہیں اسرارِ "کن فکانی" کیا | دکھا انہیں کہ کمالِ سخنوری کیا ہے
کبھی تھا شرق ہی سرچشمۂ علوم و فنون | بتا خُدا کے لئے ان کو "خاوری" کیا ہے

خلیلؑ ہو کے اَئیں کیوں یہ بُت گری سیکھیں؟
کلیمؑ ہو کے یہ کیوں سحرِ سامری سیکھیں؟

امینِ حزیں (سیالکوٹی)

بسلسلۂ گذشتہ۔

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی پچھر

لکھت پڑھت کا دن۔ کچھ دن ہوئے جو اَن پڑھ دیسیوں کو پڑھنے لکھنے کی چونپ دلانے اور اس کا رسیا بنانے کے لئے دیس کے ایک ٹکڑے میں پڑھنے لکھنے کا دن منایا گیا۔ اس دن منانے پر جگہ جگہ سے بہت سے لوگوں نے اپنے سندیسے (پیامات) بھیجے۔ ان میں پنڈت مدن موہن مالوی کا سندیسا (پیام) یہ تھا۔

"مجھے اانیت کھد ہے کہ سواستھ کی دربتا تھا اور کاموں کے کارن میں نرا کشرتا نوارک دن کے سمبندھ میں ابھی تک کوئی سندیش نہ بھیج سکا۔ سکشرتا سب اونتی کی مول ہے۔ دیش میں سے نرا کشرتا کو دُور کرنا دیش کی اانیت اُونچی اور ہتکاری سیوا کرنا ہے۔ بھارت ورش کی جنتا میں کسی سمے سکشار، ویاکتیوں سا کھیا بہت اُونچی تھی اور یہ اانیت دُکھ کا وشے ہے کہ آج وہ بہت کم ہوگئی ہے میں مانیا شری شمپورتا نند تتھا سنیوکت پرانت کی ورتمان گورنمنٹ کو ہردے سے بدھائی دیتا ہوں کہ انہوں نے نرا کشرتا کو دُور کرنے کا پوتر سنکلپ کیا ہے۔ لیے میں ایشور کی کرپا مانتا ہوں اور ہردے سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ اس پونیا مایوگ میں ان کا تتھا اور سب کاریا کرتاؤں کو سپھلتا پراپت ہو۔

پرانت کے ہر ایک پڑھے لکھے پردش اتری اور ودیارتھی سے میرا انرودھ ہے کہ وہ پراتیک بالغ پردش اور استری کو سکشا بنانے کے کاریا میں انشا پردک سہیوگ دیں اور اس طرح دیش کی اتم سیوا کا پونگ پراپت کریں۔ اس سے دیش کی شکتی اور سمپتی بڑھے گی اور سب طرح کی دیش کی اونتی بھی ہوگی۔"

یہ لکھت ایسی ہی دکھائی دیتی ہے جیسے سیکڑوں برس پہلے کسی بڑی پرانی راجدھانی میں راج پنڈت کی کتھا۔ یہ بولی ان پنڈت جی کی ہے جو کبھی "راشٹرپتی" رہ چکے ہیں اور جن کی باتوں کو جاننے والے ہی جانتے ہیں یہی جب ستھری اور سلجھی ہوئی اُردو بولنے پر آتے ہیں تو اچھے اچھے اُردو جاننے والوں کی گھگھی بندھ جاتی ہے۔ پنڈت جی نے بڑی روک تھام کی۔ اس پر بھی بدیسی بولیوں کے کچھ بول ان کی لکھت میں گھس ہی پڑے۔ پڑھنے لکھنے کے اسی دن منانے پر مسز وجے لکشمی پنڈت، جواہر لال جی کی چھوٹی بہن کا سندیسا (پیام) بھی پڑھئے۔

"ہندوستان میں سوتنترتا کی لڑائی چل رہی ہے۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہر پرکار سے ہم اپنے کو اس دن کے لئے تیار کرلیں۔ یاد رکھنا ہے کہ ہندوستان کے ہر ایک پرش اور استری اگیان ہوں۔ آج اس پرانت میں ساکشرتا کا کام شروع ہوا ہے۔ ہر ایک پڑھے لکھے استری اور پرش سے میرا یہ نویدن ہے کہ وہ آج کے دن سے یہ پرن کرے کہ وہ کم سے کم ایک آدمی ساکشر کر دے۔ یدی ہم سب لوگ مل کر اس کام کو اُٹھائیں تو بہت تھوڑے سمے میں ہندوستان میں ساکشرتا پھیل جائے گی اور ہماری اونتی کی بنیاد پڑ جائے گی۔"

یہ سندیسا (پیغام) بھیجنے والی دیس کے اس گھرانے سے ہیں، جس کی بول چال، بات چیت مانی ہوئی ہے۔ ان کے بڑے بھائی پنڈت جواہر لال نہرو اُردو کو اپنی اور اپنے کنبے کی بولی مان چکے ہیں۔ مسز پنڈت کا جان بوجھ کر پرانی ڈگر کو چھوڑ کے نئی پگڈنڈی پر چلنا اسی ہلڑ میں ملنے کے لئے ہے جو دیس میں جگہ جگہ مچایا جا رہا ہے۔ یہ ابھی پنڈت نہیں ہوئی ہیں اور مسز پنڈت ہی ہیں۔ اس لئے مالوی جی کے سندیسے (پیام) سے ان کے سندیسے کے کچھ بول سمجھ میں آتے تو ہیں۔ پر پتا نہیں چلتا یہ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ اس دھاچوکڑی اور ادھم سے پہلے جو لوگ ان کی منجھی ہوئی بولی سن چکے ہیں وہ جانتے

ہیں مسز پنڈت کیسی اچھی اُردو بول سکتی ہیں۔ پر بھیڑ کا ساتھ دینے کیلئے انہوں نے اسے بگاڑ کے کچھ سے کچھ کر دیا۔ اسے الٹی سمجھ نہیں تو پھر اور کیا کہا جائے جو بیٹھے بٹھائے سیدھی سادی اچھی بولی چھوڑ چھاڑ کے ایک کٹھن اور کڈھب بھاشا کے پرچار پر لوگ آڑ جائیں۔

بولی جو آپس میں میل ملاپ کا سہارا اور ایکے کا بندھن ہے اسے توڑنے کی بھاگ دوڑ کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے ہاتھ سے اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مارنا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑوں نے مل ملا کے جو "ایکا گھر" بنائے تھے۔ ہندوؤں کے سپوت اپنے بڑے بوڑھوں کے بنائے ہوئے اسی گھر کو ڈھا دینے کے جتن کر رہے ہیں۔ یہ وہ گھر تھا اور ہے جس میں ہندو اور مسلمان اپنے الگ الگ دھرم ہونے پر بھی بے جھجک ایک دوسرے سے ملتے اور مل ملا کے ایک جگہ بیٹھ کر اپنے من کی کہتے اور دوسرے کی سنتے تھے۔ آج بھی یہ دونوں جتنے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ پر اس میل جول میں وہ پہلی سی بات کہاں۔ ہندوستان کے سپوتوں کو تو یہ چاہیئے جو وہ اپنے بڑے بوڑھوں کے کئے دھرے کی لاج رکھ لیں اور اس ایکے کے بندھن کی توڑ تاڑ چھوڑ کے سپوت سے کپوت نہ بنیں۔

اُردو دِن۔ ۸ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو بڑی دھوم دھام سے "اُردو دن" منایا گیا۔ چھوٹی چھوٹی جگہوں کو چھوڑ کے دلّی، لکھنؤ، آگرہ، علی گڈھ، الٰہ آباد، پٹنہ، کلکتہ، بمبئی، لاہور، سری نگر، پشاور، راولپنڈی میں بڑی چہل پہل رہی۔ بڑی بڑی سبھائیں جمیں۔ دھواں دھار اسپیچیں ہوئیں۔ بڑی بات یہ ہے ان سبھاؤں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بہت سے ہندو بھائی بھی مل جل کر ایک جگہ بیٹھے اور کہیں کہیں یہی پنچ بھی بنے۔ جیسے، دلّی سبھا کے منشی بشیشور پرشاد منوّر، لکھنؤ کے پنڈت کشن پرشاد کول، علی گڈھ کے آنند سروپ لبیل، آگرے کے پنڈت راج ناتھ کنزرو، لاہور کے ڈاکٹر ایس آئی بھٹناگر، الٰہ آباد کے سرتیج بہادر سپرو اور اسی جگہ کی ایک دوسری سبھا کے پنچ رائے بہادر آر۔ بی۔ جینی بنائے گئے۔

سرتیج بہادر سپرو نے اپنی اسپیچ میں یہ کہا۔

"اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبے میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مجھے یہ دیکھکر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کرلیں جو فطری طور پر ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوتی ہے اور ان کی آپس کی رواداریوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے....

... اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے مٹائی نہیں جاسکتی۔ اگرچہ مٹھی بھر آدمی فرقہ وارانہ سوال پیدا کر کے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ سودائے خام ہے...... اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی...... بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو دیہاتوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جبکہ ہر گاؤں، ہر قصبے کی مقامی بولی اور لب و لہجہ میں فرق ہے اور اس طرح دیہاتی اور شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہے تو آپ کہاں تک کس کی تقلید کریںگے۔"

لکھنؤ میں پنڈت کشن پرشاد کول نے کہا۔

"میری مادری زبان اُردو ہے اور میری تمام جماعت کی پیدائشی زبان بھی یہی ہے۔ ہمارے گھروں میں مستورات بھی یہی زبان بولتی ہیں جو اس وقت میں بول رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ ہندو ایسے بھی ہوں جن کے ہاں یہ زبان نہ بولی جاتی ہو۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں کی عورتیں جب دوسری برادری کی ہندو خواتین سے ملتی جلتی ہیں تو اپنے مفہوم و مطلب کو اسی زبان میں ادا کرتی ہیں اور تمام ہندو عورتیں اسے بخوبی سمجھ لیتی ہیں۔"

لاہور میں ڈاکٹر بھٹناگر نے یہ کہا۔

"اُردو ملک کے تمام قوموں کی مشترکہ زبان ہے اور جو لوگ تعصب کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ قوم اور ملک کے دشمن ہیں۔"

ہندو مہاسبھا کے ممبر راجا نریندر ناتھ نے بھی اسی سبھا میں سب کے سامنے کہا۔

"اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور اسے مٹانے کی کوشش کرنا پرلے درجے کی ہٹ دھرمی ہے... میری مادری

زبان اُردو ہے اور ہمارے تمام خاندان میں اُردو بولی جاتی ہے؟"
پنڈت راج ناتھ کنزرو جو کچھ باتوں میں ہندو مہاسبھا کے ساتھ ہیں۔ آگرے کی اسی سبھا میں اُنہوں نے یہ کہا۔
"کوئی زبان کسی کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتی۔ موجودہ مخالفت سے اُردو کو بجائے نقصان کے فائدہ ہوگا۔"
دیکھئے یہ سب کے سب ہندو ہی ہیں جو اپنی اُردو کو اپنے بڑے بوڑھوں کی دیا سمجھکر اپنی چھاتی سے الگ کرنا نہیں چاہتے اور ان لوگوں کو جو نہیں جانتے جو اُردو کی جڑ کھوکھلی کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ تو جن لوگوں کی سوجھ بوجھ کا دیا جل رہا ہے وہ اسکے اُجالے میں نیچ اُونچ دیکھتے ہوئے بے جھجک چلے جارہے ہیں۔ اور جن کی سمجھ کا دیا بجھ چکا وہ اندھیرے میں ٹٹولتے اور ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

پبلک سے ریڈیو پروگرام کیلئے بمبئی لاسلکی کی پوچھ گچھ

ابھی کچھ دن اُدھر آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر مسٹر فیلڈن نے بمبئی والوں سے ان کی بولیوں اور ریڈیو پروگرام کو وہ کس بولی میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی ہی کئی باتیں پوچھی تھیں۔ ان کے اس پوچھنے پر بمبئی والوں نے الگ الگ جو کچھ کہا ان سب کو ایک جگہ دیکھ لیجے۔

"اگر ریل تار اور موٹر نے ہندوستان کے مختلف حصّوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے تو ان کو قریب تر کرنے کا سہرا ریڈیو کے سر ہے۔ ریڈیو کے ذریعے۔ سے خبریں، کہانیاں، گانے، تقریریں اور اسی قسم کی دوسری دلچسپ چیزیں جو مشتہر ہوتی ہیں۔ ان کو ملک کے مختلف حصّوں کے لوگ سنتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تقریروں، کہانیوں اور گانوں کی کون سی زبان ہو جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور لطف اُٹھاسکیں۔ ہندوستان بلحاظ اپنی آبادی اور اپنی وسعت کے مختلف قسم کی تہذیبوں کا ایک زندہ عجائب گھر رہا ہے اور جوں جوں وسائل آمد و رفت بڑھتے گئے یہ تہذیبی دیواریں ٹوٹتی رہیں۔ لیکن آج اس زمانے میں بھی جب مادّی ترقیاں اپنے عروج کی طرف جارہی ہیں اور وسائل آمد و رفت بڑی تیزی سے دُنیا کے چپّے چپّے پر اپنا جال بچھا رہے ہیں۔ ہندوستان کی اندرونی یکجہتی کے راستے میں اب بھی بہت سے سنگ گراں باقی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا پتھر زبان کا ہے۔

آج ہندوستان میں طرح طرح کی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ ٹامل، تلنگی، ملیالم، مرہٹی، گجراتی، سندھی، پشتو، پنجابی، اُردو، ہندی، بنگالی وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت ہندوستان میں ریڈیو کے سات اسٹیشن ہیں۔ جہاں سے مقامی ضروریات کے مطابق ان زبانوں میں تقریریں، خبریں اور گانے مشتہر ہوتے ہیں۔ جس اسٹیشن کے قریب کئی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں سے بعض وقت کئی زبانوں میں گانے اور تقریروں کا پروگرام نشر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ریڈیو کے اخراجات میں بجائے کمی کے اضافے کا زیادہ امکان ہے۔ کچھ شاید بڑھتے ہوئے اخراجات سے متاثر ہوکر اور کچھ شاید دریافت کرنے کے لئے کہ ہندوستان میں کون سی زبان سب سے زیادہ مقبول ہے۔ مسٹر فیلڈن کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو نے حال میں صوبہ بمبئی کے سترہ ہزار سُننے والوں سے کچھ سوالات کئے تھے۔ ان سُننے والوں میں صرف سات ہزار حضرات نے جوابات دئے۔ مسٹر فیلڈن نے بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن سے ان جوابات پر ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اپنے تبصرے کے شروع میں اُنہوں نے کہا کہ ہندوستان کی موجودہ فضا میں کوئی بھی ریڈیو اسٹیشن جبکہ اُسے دو سے زیادہ زبانوں کا پروگرام مرتب کرنا ہو اچھی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اور یہ دقت بمبئی میں بہت ہے۔ جہاں دو سے زائد زبانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

مسٹر فیلڈن کا پہلا سوال یہ تھا کہ آپ لوگ کس زبان کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ اسکے حسب ذیل جوابات ملے۔ ۲۵۰۰ حضرات نے گجراتی کو، ۱۵۰۰ حضرات نے مرہٹی کو، ۱۲۰۰ حضرات نے ہندوستانی کو، ۸۵۰ حضرات نے انگریزی کو، ۹۳ حضرات نے کوکنی کو، اور ۰ ، حضرات نے کنڑی کو اپنی مادری زبان قرار دیا۔ اس سے بمبئی میں گجراتی کی فوقیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن مسٹر فیلڈن نے اس سوال کا رُخ پھیر کر جو جواب حاصل کیا ہے وہ صوبہ بمبئی کے لئے خاصکر اس صورت میں عجیب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ جب اُردو کے مخالفین یہ کہتے ہیں کہ بمبئی تو گجراتی اور مرہٹی کا مرکز ہے اور وہاں اُردو کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔
مسٹر فیلڈن کا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ لوگ کس زبان میں تقریریں سننا پسند کرینگے۔ مسٹر فیلڈن نے جوابات کی تشریح یوں

کی ہے۔ ۲۵۰۰ حضرات ہندوستانی، ۲۵۰۰ حضرات انگریزی، ۱۷۰۰ حضرات گجراتی اور صرف ۱۵۰۰ حضرات مرہٹی کے حق میں تھے۔ کوکنی زبان کو پسند کرنے والے صرف ۲۱ آدمی تھے۔ مسٹر فیلڈن نے ان اعداد و شمار کو عجیب بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ بہت سے سننے والے جن کی مادری زبان گجراتی یا مرہٹی ہے انگریزی یا ہندوستانی میں تقریریں پسند کرتے ہیں اور آگے چل کر انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ابھی تک ہم نے یہ غور نہیں کیا تھا کہ بمبئی میں بھی ہندوستانی زبان میں تقریروں اور ڈراموں کی اس قدر مانگ ہے۔

مسٹر فیلڈن کا تیسرا سوال یہ تھا کہ آپ لوگ ڈرامے اور گانے کس زبان میں پسند کرینگے۔ اس کا جواب یہ ملا کہ تین ہزار حضرات نے ہندوستانی زبان کے اور ۱۲۵۰ حضرات نے مرہٹی زبان کے حق میں رائے دی۔ اس کے بعد گجراتی اور انگریزی کا نمبر تھا۔ یہ اعداد و شمار اس بات کی کھلی شہادت ہیں کہ صوبہ بمبئی میں گجراتی اور مرہٹی کے مقابلے میں ہندوستانی زبان کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔ تقریروں کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ صوبہ بمبئی کے لوگ ہندوستانی تقریریں اس لئے پسند کرتے ہیں کہ ہندوستانی، بازاروں میں سڑکوں پر ہوٹلوں میں رائج ہے اور اس قسم کی ہندوستانی تقریریں وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی گانوں اور ڈراموں کا شوق تو صاف اس بات کی پردہ دری کر رہا ہے کہ ہندوستانی زبان صرف بازاروں ہی میں نہیں مقبول ہے بلکہ یہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور شعر و موسیقی سے اُنکی ر[illegible] گی ہو چکی ہے۔

ہم مسٹر فیلڈن سے درخواست کریں گے کہ وہ اس قسم کے [illegible] کلکتہ اسٹیشن کے اُن سننے والوں سے بھی کریں جو بنگال، بہار، آسام میں آباد ہیں۔ ان جوابات سے کم سے کم یہ تو اندازہ ہو جا[illegible] گا جیسا کہ بمبئی میں ہوا ہے کہ کون سی زبان مشرقی ہندوستان میں زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہ ہندوستان[illegible] کون سی زبان ہے۔ کیا یہ گاندھی جی کی ہندی اتھوا ہندوستانی ہے۔ یا شری سمپورنانند جی وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کی ہندی اتھوا ادیو[illegible] ہے۔ جس میں کچھ بنارس کے مہا پنڈتوں کی روح حلول کر گئی ہے۔

اگر آپ بمبئی کا پروگرام سنتے رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ تو سیدھی [illegible] بے تکلف اُردو ہے جو ہندوستان کے بیشتر حصّوں میں بولی اور تمام حصّوں میں سمجھی جاتی ہے اور جو ہندو، مسلمانوں، سکھو[illegible] عیسائیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ البتہ پروگرام میں کہیں کہیں نامانوس الفاظ ضرور آجاتے ہیں ان کو کم کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی جگہ آسان عام فہم الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

اُردو پھیلنے کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ یہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں سب سے آسان ہے۔ ہر قسم کے مطالب کو ادا کرسکتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں اثر ہے۔

سر تیج بہادر سپرو نے رسالہ "اُردو" کے اقبال نمبر کے سلسلہ میں مولانا عبدالحق صاحب کو حال ہی میں ایک خط لکھا تھا اس میں اُنہوں نے اقبال کے حسب ذیل تین شعر نقل کئے ہیں:۔

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی — باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں
دیکھا بھی، کہا یا بھی سُنایا بھی سُنا بھی — ہے دل کی تسلّی نہ نظر میں نہ خبر میں

اور فرمایا "شاعری اور تخیل ایک طرف ان اشعار کی زبان دوسری طرف آج کل جو مسئلہ زبان پر بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اس پر اکثر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جس زبان میں یہ درد، یہ قدرت اور یہ وسعت ہو جو ان اشعار سے پائی جاتی ہے اُس کو ہم کیوں چھوڑیں؟" ("ہماری زبان" اپریل ۱۹۳۹ء)

مسٹر جمناداس مہتا کی نئی اپج۔ بہت سے بمبئی والے ریڈیو پروگرام جس بولی میں سننا چاہتے ہیں۔ مسٹر فیلڈن نے گنتی گِنا کے اُسے بتادیا۔ پر، بمبئی اسمبلی کے ممبر مسٹر جمناداس مہتا کو مرہٹی اور گجراتی ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے اور دوسرے لوگ

چاہیں نہ چاہیں پر یہ ریڈیو پروگرام انہی دو بولیوں میں انہیں سنوانا چاہتے ہیں ان کی اکھاڑ پچھاڑ کچھ نہ کچھ چل ہی جاتی ہے۔ ابتک نئے نئے بھیس میں انہیں آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔ ایک ڈگر اور ایک ڈھچر کا ہو رہنا اُن کے دھیان میں ایسا ہی سیٹھا پھیکا ہے جیسے دن رات ایک ہی سا کھانا کھاتے چلے جانا۔ نہ وہ کسی سے کھایا جا سکتا ہے اور نہ یہ کسی جگہ نچلے بیٹھ سکتے ہیں۔ کبھی یہ مہاتما جی کے بڑے ماننے والوں میں تھے۔ پھر جو کچھ دھیان میں گھمٹ بڑھ ہوتی تو سوراجی ہوگئے اور سوراجیوں سے بھی جب نہ بنی تو انڈپی پنڈنٹ، پھر انڈیپنڈنٹ ڈیماکریٹ ہوگئے اور ہندو مہاسبھا سے ڈانڈے ملا دتے۔

یہ سب کھیل کھیل چکنے پر اب بمبئی میں ریڈیو سننے والوں کی ایک سبھا بنا کر آپ ہی اس کے پنچ بن بیٹھے۔ اپنی اس سبھا میں لوگوں سے کہہ سُن کے ایک یہ بات منوالی۔ بمبئی کے ریڈیو رکھنے والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی بولی مرہٹی اور گجراتی ہے۔ اس لئے بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے اُردو میں کوئی بات چیت نہ ہونا چاہیئے۔ مسٹر فیلڈن جس ڈھنگ سے اس گتھی کو سلجھا چکے ہیں وہ ابھی آپ دیکھ چکے۔ بمبئی میں تو مرہٹی اور گجراتی بولنے والے اُردو میں گانے اور اسپیچیں سُننا چاہتے ہیں اور مسٹر مہتا اپنی ایک چھوٹی سی سبھا کے بل پر گجراتی اور مرہٹی ہی کا راگ الاپ رہے ہیں۔ اسے سوچ بچار کی آنکھ سے دیکھئے تو دکھائی دیگا۔ گجراتی اور مرہٹی کی آڑ پکڑ کے مہا سبھائی جتھا اُردو کو نیچا دکھانے کی گھات میں لگا ہوا ہے۔

اُردو کے سامنے مرہٹی اور گجراتی ہے کس گنتی میں۔ اُردو کا سا پھیلاؤ دیس کی کسی بولی میں نہیں۔ یہ تو پورے بمبئی کی بولی ہے۔ اسے یوں دیکھئے۔ جب کوئی گجراتی کسی مرہٹے سے ملتا ہے تو انگریزی بول چکنے پر اسی اُردو ہی میں تو بات چیت کرتا ہے۔ ایسے ہی وہاں کے اور اور جتھے ملنے جلنے میں پہلے انگریزی اور پھر بھی اُردو بولتے ہیں۔ بمبئی کے باہر گجرات، احمد آباد، بڑودہ، سورت، خاندیش، شولا پور اور ایسی اور چھوٹی بڑی جگہوں میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

دلّی لاسلکی اور ہندوستانی کی گتھی

یہ تو بمبئی لاسلکی کی بات چیت تھی۔ دلّی لاسلکی بھی اسی بولی ٹھولی کے لئے اپنے پروگرام میں جگہ نکال چکی ہے۔ شبد ساگر میں ڈبکی لگانے والے کانگریسی ہندی پرچار کی دھن میں جب گنگا جمنی بولی بولنے پر آتے ہیں تو یہ دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی پوجا پاٹ میں منتر پڑھ رہا ہے۔ سننے والے ہکا بکا ہو کر پوچھنے لگتے ہیں یہ کس دیس کی بولی ہے اس کو پرست بتاکے "ہندوستانی" کی آڑ پکڑی جاتی ہے تو ہندوستانی کیا ہوئی گورکھ دھندا ہوگئی۔

"ہندوستانی" کیا ہے؟ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مسٹر آصف علی یہ تین مسلمان اور ڈاکٹر تاراچند، بابو راجندر پرشاد، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی یہ تین ہندو، دلّی لاسلکی نے ان سب کو بلاوا بھیج کے اپنے یہاں اکٹھا کیا۔ لاسلکی کے پروگرام میں ان میں سے ایک ایک نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اسپیچ پڑھی۔ جب یہ سب پڑھ پڑھا چکے تو یہ چھے اسپیچیں ایک جگہ کر کے "جامعہ ملیہ" نے دیکھنے والوں کے جی بہلانے کیلئے چھوٹے سے سائز پر چھاپ دی ہیں۔ اس میں اسپیچ دینے والے کا پہلے فوٹو دیا گیا ہے اور پھر اسکی پوری اسپیچ۔ ایک کو چھوڑ کر پانچ اسپیچوں کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے یہ پانچوں بہت سوچ سوچ کے اور بڑی کاٹ چھانٹ کر کے لکھی گئی ہیں۔

ڈاکٹر تاراچند اور بابو راجندر پرشاد کے یہاں ہندی کے ٹھوسے ٹھسرے بول بہت ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے تو عربی، فارسی کے ان گھلے ملے بولوں کو بھی نکال پھینکا جنہیں تاراچند اور بابو راجندر پرشاد نے جگہ جگہ لکھا ہے۔ مسٹر آصف علی کو بھی انہیں کے لگ بھگ سمجھنا چاہیئے۔ پنڈت برجموہن کیفی بھی اپنی پرانی ڈگر سے کچھ ہٹے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں۔ اب ایک مولوی عبدالحق صاحب ہی رہ گئے۔ جن کی اسپیچ سمویا ہوا پانی ہے۔ اس میں عربی، فارسی، ہندی کا ایک آدھ بول بھی کوئی ایسا نہیں جسے بھولا بسرا کہا جا سکے۔ ان کے لکھنے کا وہی ڈھنگ ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے۔ انہیں چھوڑ کر اسی چھوٹی سی سبھا میں دیکھئے گا تو کئی لوگ آپکو ایسے ملیں گے جو اپنے لکھنے کے پرانے ڈھرے سے الگ ہو چکے ہیں۔ تو ڈاکٹر عبدالحق صاحب ہی کی اسپیچ ان سب میں "ہندوستانی" کی کسوٹی پر ٹھیک دکھائی دیتی ہے۔ نہ جانے ان چھؤں اسپیچوں میں نئی ہندی والوں نے کسے "ہندوستانی" ٹھیرایا۔

آج ہندوستان اس اندھیرے گھپ میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور اس ڈراؤنی گھاٹی پر دوڑ لگا رہا ہے، جس کی بھیانک گہرائی سب کچھ نگلنے پر بھی اُگلنے کا نام نہیں لیتی۔ یونہی سی چوک ہونے اور پیر پھسلنے پر یہ اس میں دھڑام سے گر پڑے تو پھر اس کا نکالنے والا کوئی نہیں۔ آئے دن ایک جگہ کے رہنے والوں کے الگ الگ جتھے دھرم اور ریما ہی اور اور آڑیں پکڑ کے آپس ہی میں اپنے لڑتے مرتے ہیں جس سے بھارت میں "مہا بھارت" کا سا سماں آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ بھلا اس اندھیاؤ میں اُردو کیسے بچ سکتی تھی۔ یہ بھی ہٹ دھرمی کی دھول میں اٹی اور چوٹ پھچوٹ کھاتی چلی جا رہی ہے۔ کہیں اسے ایک ہی جتھے کی بول ٹھہرا کے اسے مٹانے اور وہ ایکا جو اسی کے سہارے یہاں والوں میں برسوں سے چلا آ رہا ہے

اس بندھن کو توڑ تاڑ کے پھینک دینے کے جتن کرنے میں لوگ اپنے آپے سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ اسی اندھیرے میں کہیں نہ کہیں سے سوجھ بوجھ کا کچھ اُجالا بھی دکھائی دے جاتا ہے جسے دیکھ کر ڈھارس بندھتی ہے اور آگے بڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "عثمانیہ یونیورسٹی" کے اگلے برس کے کانووکیشن میں سر تیج بہادر سپرو نے جو اسپیچ پڑھی وہ بھلائی نہیں جا سکتی۔ کوئی دیکھنے والا ہو تو اس میں بہت سی چھپی ہوئی انمول باتیں دیکھ سکتا ہے۔

"اردو زبان کو میں جو اہمیت دیتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ گذشتہ زمانہ میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی تعلق اور میل جول کا ایک زبردست رشتۂ اتحاد رہ چکی ہے اور یہ کام وہ آج بھی کر سکتی ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں کر رہی ہے۔"

کچھ پرانی باتیں! پہلے پہل جب مسلمان یہاں آئے تو ایک ہی دیس کی الگ الگ جگہوں اور الگ الگ دھرموں کی چھاؤں میں ان گنت بولیاں دیکھیں۔ یہ دھ آنے والے گونگے تو نہ تھے، اپنی بولیاں رکھتے تھے اور انہی کو ساتھ لئے ہندوستان آئے تھے۔ عربوں کی عربی، ایرانیوں کی فارسی، ترکوں اور مغلوں کی ترکی بولی تھی۔ پر ان سب بولیوں پر فارسی چھائی رہی۔ سندھ کے راج والے عرب تھے پر ایران کے پاس ہونے اور وہاں کے بیوپاریوں کے لگاتار آنے جانے سے عربی ملی ہوئی فارسی ہی جگہ جگہ بولی جاتی تھی۔

خیبر کی گھاٹی میں سے جو جتھے آئے اُن کی بولی کچھ ہی کیوں نہ ہو پر ان کے راج پاٹ اور کچہریوں کی بولی فارسی ہی تھی۔ اس لئے ہندوستان کی کچہریوں کی لکھت پڑھت فارسی ہی میں ہوتی رہی۔ پر یہ تو نہیں ہو سکتا تھا جو پورے دیس کی بول چال اور بات چیت کے لئے دیس کی بولی فارسی ہی کو ٹھہرا دیا جائے اور نہ یہ ہو سکتا تھا جو یہیں کی بولیوں میں سے کسی بولی کو چھانٹ کے دیس بھاشا بنا دیا جائے۔ جب یہ دونوں باتیں نہیں ہو سکتی تھیں تو تیسری بات یہی ہو سکتی تھی اور ہوئی جو مسلمان اس دیس میں جس جگہ بھی پہونچے وہیں کی بولی بولنے کا انہوں نے لگا لگا دیا۔ ساتھ ہی اپنے بڑھتے ہوئے راج کی نت نئی باتوں کیلئے سیکڑوں، ہزاروں اپنی بولی کے بول اُس جگہ کی بولی میں بڑھانا پڑے۔

کھوج لگانے پر جگہ جگہ اس کا پتا ملتا ہے۔ دیکھئے۔ مرہٹی بولنے والے مرہٹے اپنے راج منتریوں (وزیروں) کو "پیشوا" اور ہندو راجدھانیاں انہیں آج بھی "دیوان" ہی کہہ کے پکارتی ہیں۔ پیشوا اور دیوان یہ دونوں کے دونوں ٹھیٹ فارسی بول ہیں جنہیں یہاں کی کسی بولی سے یونہی سا بھی کوئی لگاؤ نہیں۔ مہاراشٹر میں گاؤں کے چودھری کو "مقدم" اور کلرک کو "کارکن" کہا جاتا ہے۔ ان بولوں میں سے پہلا عربی ہے اور دوسرا فارسی۔ گاؤں کی چوکسی اور اُن کی دیکھ بھال، جانچ پڑتال کرنیوالوں کی جگھوں کے نام عربی، فارسی ملے ہوئے ہی آپ دیکھیں گے۔ جیسے:-

"ضلعدار، کارندہ، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، گماشتہ، سیاہہ نویس، واصل باقی نویس، خزانچی، تحویلدار، پیشکار، محرّر۔"

ڈھونڈنے پر ایسے اور بہت سے بول مل سکتے ہیں۔

کھیتی باڑی ہندوستان کا بڑا پرانا دھندا ہے۔ مسلمانوں نے آگے اسے اتنا بڑھایا اور اس میں وہ وہ باتیں نکالیں جن کا پھیلاؤ یہاں نہیں سما سکتا۔ انہیں کے راج میں کابل، ترکستان، ایران کے وہ وہ اچھے میوے اور رسیلے، میٹھے پھل دیس میں آ گئے جنہیں سونگھنا، چکھنا تو بڑی بات ہے۔ یہاں کبھی کسی نے دیکھا بھی نہ تھا۔ جیسے:-

"انجیر، ناشپاتی، خربوزہ، تربوز، سردہ، انگور، انار، سیب، بہی، شفتالو، پستہ، چلغوزہ، کشمش، بادام۔"

دیسیوں کو یہ سب ایسے بھاتے اور اچھے لگے جن کے بدیسی نام بے رٹے آپ ہی آپ دھیانوں پر چڑھ گئے اور اب انہیں بھلانا چاہیں پر بھی نہیں بھلا سکتے۔ تغلقوں کے راج میں دلّی اور اس کے آس پاس بارہ سو بڑی بڑی پھلواریاں تھیں جن میں ایک چھوڑ کئی کئی ڈھنگ کے انگور تھے۔ فیروز شاہی کا یہ لکھنا مانیں مانیں نہ مانیں آپ جانیں۔ مسلمانوں سے پہلے اندھیرے گھپ سے بچنے کیلئے یہاں کیا تھا؟ ایک ٹمٹماتا ہوا دیا جس کا اُجالا سمٹ سمٹا کے اسی کے نیچے رہ جاتا تھا۔ رات آئی اور یہی دیئے گھر گھر ٹمٹمانے لگے۔

"چراغ، مشعل، شمع کافوری، فانوس، مردنگ، دیوارگیر، فتیل سوز، قندیل۔"

یہ سب ٹھاٹ مسلمانوں کا راج ساتھ لایا اور یہاں کے اندھیرے میں ایسا اُجالا پھیلایا جس سے پورا دیس جگمگا اٹھا۔ انہیں کے راج میں باہر کے نئے نئے رنگ کے مہکتے ہوئے پھولوں سے دیس پٹ گیا اور کونا کونا مہکنے لگا۔

گلاب، سوسن، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، نسرین، نسترن، گل شببو۔

اور ایسے بہت سے نئے نئے ڈھنگ کے بول جنہیں ہندوستان نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا ایک ایک کرکے یہاں سب کھنچ آئے۔

کھانا پکانا اور کھانا کھانا کس دیس میں نہیں۔ سانس کے لسر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے۔ مسلمانوں سے پہلے کھانا پکانے کیلئے یہاں مٹی کی ہانڈیاں تھیں اور کھانا کھانے کیلئے کیلے کے چوڑے چوڑے پتے۔

دیگ، دیگچہ، دیگچی، کفگیر، چمچے، رکابیاں، پیالے، قاب، دسترخوان، آفتابہ، سیلابچی، بادرچی، بکاول، رکابدار

یہ سب مسلمان ہی اپنے ساتھ لائے۔ جب میووں، پھولوں، پھلوں کی یہاں بہت بہتات تھی تو نئے نئے کھانوں کے کیا کچھ ٹھاٹ نہ ہونگے۔

"پلاؤ، مزعفر، مطنجن، بریانی، کباب، قیمہ، کوفتہ، قلیہ، قورمہ، شب دیگ، شیرمال، باقرخانی"

اور ایسے بہت سے اچھے اچھے رنگ نے انہیں کے راج نے ہندوستان کو کھلائے اور یہ کھانے کھلا کر۔

"شکرپارے، برفی، گلاب جامن، بالوشاہی، لوزبادام، حلوا مغزی"

اور نئے نئے حلووں سے دنیا کا منہ میٹھا کیا۔ پیٹ بھر چکا تو اس کے پہننے کے لئے اچھے سے اچھے کپڑوں کا ڈھیر سامنے لگا دیا۔ جیسے۔

"کمخواب، اطلس، مشجر، زربفت، کمخواب، بادلہ، تمامی، تن زیب، جامدانی، کامدانی، شال، دوشالہ"

ٹیپ ٹاپ کے لئے۔

"سرپیچ، طرہ، گوشوارے، بازو بند، نورتن، جوشن، ہیکل، طوق، گلوبند، زنجیر، کمرزیب، پازیب"

یہ سب باتیں انہی کی نکالی ہوئی ہیں۔

"یاقوت رمانی، لعل بدخشانی، عقیق یمنی، یشب، فیروزہ، زمرد، زبرجد"

یہاں کون لایا؟ یہی مسلمانی راج تھا۔

پتھروں میں۔ "سنگ مرمر، سنگ سرخ، سنگ ساق، سنگ موسیٰ، سنگ لرزاں، سنگ خارا"

یہ سب اسی راج نے نکالے۔

گھوڑوں کیلئے۔ "زین، تنگ، لگام، رکاب، نعل، جل، نمدہ، سوار، شہسوار، تازیانہ"

یہ ٹھاٹ انہی کے ساتھ یہاں آیا۔ بساط اور چھکا دینے والے وہ کتنے ان کے ایجاد کئے ہوئے، جن کے نئے نئے نام رکھے اور دیس کی بولیوں میں سارے ہی پھیل گئے۔

ان پرانی باتوں کے دہرانے سے سوجھ بوجھ والوں کو یہی دکھانا ہے۔ مسلمان اپنے راج پاٹ اور اس کی ایک ایک بات ساتھ لئے ادھر لئے اور جو پھیلا تو یہ اپنے ساتھ سارے دہ پورے کا پورا یہاں کے لئے نیا۔ جب باہر سے آیا ہوا پھیلا تو ہندوستان میں تھا ہی نہیں تو دیس کی بولیوں میں اس کے لئے بول کہاں سے آتے۔ اسی لئے ان کے ساتھ لائے ہوئے بہت سے بدیسی بول یہاں کی بولیوں میں جوں کے توں سما گئے۔

سندھ میں اُردو کا ڈھانچا۔ پورے دیس میں سندھ ہی وہ جگہ ہے جہاں پہلے پہل مسلمان پہونچے اور یہیں کی وہ مٹی ہے جس سے اردو کے پتلا بننے کا لگا لگا۔ مسلمان جب یہاں آنے جانے لگے تو ہوتے ہوتے وہ گھڑی بھی آ گئی جس میں دھاوا کرکے انہوں نے سے لے چھین چھان کر اپنی راجدھانی بنا لیا۔ یہ دھاوا کرنے والے عراق اور شیراز کے جیوٹ، سورما اور منجھے عربی، فارسی بولتے ہوئے سندھ آئے۔ پھر وہ بیوپار والے مسلمان جو آ کے یہیں رہ پڑے ان کی بولی بھی یہی عربی، فارسی تھی۔ سندھ والے بھی عراق آتے جاتے تھے۔ یہاں والوں کا وہاں اور وہاں کے لوگوں کا یہاں آنا جانا رہنے اور ایک ایک کا منہ تکنے کے نئے تو نہ تھا۔ یہ آنا جانا اور ملنا جلنا تھا ہی اسی لئے جو اپنے جی کی باتیں جس ڈھنگ سے بھی ہو سکے دوسرے تک پہونچا دی جائیں اور دوسرے کی باتیں جیسے بھی بن پڑے آپ سن کر سمجھ سکیں۔ تو آئے دن کی اس مڈبھیڑ سے ایک بھاشا کے بگڑے بگڑائے، آدھے کٹے بول دوسری بولی بولنے والے کی بات چیت میں آنے لگے ہونگے۔

۱۳۳ھ میں شام کو چھوڑ کر خلافت نے جب عراق میں اپنا اجالا پھیلایا تو سندھ کے بہت سے پنڈت عراق میں ڈھل آئے اور اپنی بھاشا کی پکھتوں کو عربی میں لانے والوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ساتھ ہی انہیں اچھی اچھی جگہیں مل گئیں۔ عربی سے ہندی کے ملنے کی یہی پہلی گھڑی تھی جس میں بہت سے ہندی بول پہلے پہل عربی سے ملے اور ان نئے آنے والے بدیسی بولوں کو عربی نے اپنے پاس جگہ دی۔ سندھ اور ملتان یہ دونوں جگہیں تین

برس تک مسلمانوں کا راج گڑھ بنی رہیں جن کا ناتا بغداد اور مصر سے جڑا ہوا تھا۔ خراسان، عراق، یمن، ایران اور مصر سے آنے والے بیوپاریوں، لوگوں کا یہاں تانتا لگا رہتا تھا۔ الگ الگ بولیوں والوں کے ایک جگہ اکھٹے ہونے سے سندھ اور ملتان میں، دیسی بولیوں سے عربی، فارسی کا میل جول بڑھنے اور ایک نئی بولی کا ڈھانچا دھڑلے سے بننے لگا۔

بزرگ بن شہریار ملاح ۳۰۰ھ میں ادھر کا چکر لگا چکا ہے۔ اس کی ڈائری "عجائب الہند" میں کئی ہندی بولوں کا پایا جانا یہ بتاتا ہے۔ ہند بول دھیانوں پر ایسے چڑھ چکے تھے جو بات چیت تو بات چیت لکھنے میں بھی آنے لگے۔ اس سے چالیس برس پیچھے اصطخری سندھ اور ملتان آیا، منصورہ (بھکر) ملتان اور ان کے آس پاس کی بولی کو عربی اور سندھی بتاتا ہے اور مکران والوں کی بولی کو فارسی اور مکرانی۔ ابن حوقل جو اصطخری کے برس پیچھے پھرتا پھراتا ادھر آیا وہ بھی یہی کہتا ہے "منصورہ (بھکر) ملتان اور اس کے آس پاس عربی اور سندھی بولی جاتی ہے" لیکن ریو مقدسی ابن حوقل بھی سترہ برس پیچھے ملتان آیا اور یہ دیکھا "یہاں فارسی بولی سمجھی جاتی ہے"

ان سب کڑیوں کو ملا کر دیکھنے سے یہی پتا چلتا ہے۔ سب سے پہلے دیس کے جس ٹکڑے میں عربی، فارسی میل ملاپ کا لگا لگا وہ سندھ ہے اور مسلمانوں کی بولیاں پہلے پہل جن دیسی بولیوں سے ملیں وہ یہی سندھی اور ملتانی ہیں۔ پھر پنجابی اور اس کے پیچھے دہلوی کا نمبر ہے۔ بدیسی بولوں جیسی "اردو" میں ریل پیل دکھائی دے رہی ہے، عربی، فارسی بولوں سے سندھی بھی ایسی ہی لدی پھندی ہوئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر چھبے کی بات سندھ لکھنے کا ڈھب ہے جو آج تک عربی ہی چلا جاتا ہے۔

سندھی، پنجابی، ملتانی کے یونہی سے اُن بل اور گھٹ بڑھ چھوڑ کے دیکھئے تو یہ تینوں ایک ہی سی دکھائی دیں گی۔ عربی، فارسی بولوں کی بہتات جیسا میں ویسی ہی دوسری اور تیسری میں۔ آپ کی اُردو انہی کا نچوڑ، انہی کی اچھی مورت اور نکھرا ہوا رنگ ہے۔ انہی بولیوں میں عربی، فارسی بولوں کی ملاوٹ اُردو بننے کا ڈول پڑا۔ آگے بڑھ کر دہلوی بولی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور اسی سے مل ملا کے یہ کھوئی کی بولی بن بنا گئی۔ پھر راجدھانی کی یہی بولی پھیلا کے دیس کے کونے کونے میں پہونچ گئی۔

سلطان محمود غزنوی کا دھاوا ہوا تو گجرات تک۔ پر اس کی راجدھانی پنجاب اور سندھ ہی میں سمٹ سمٹا کے رہ گئی۔ دو سو برس کے لگ بھگ یہ گھرانا راج پاٹ سنبھال سکا۔ غزنویوں کی چھاؤنیوں میں مسلمان سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ہتیار لگائے اپنی اپنی جگہوں پر ڈٹے رہتے، بہت سے ہندو بڑی بڑی جگہوں پر انہی کی دیکھ بھال کے لئے رکھے گئے تھے۔ جیسے عرب اور عجم کے بڑے بھاری بھرکم لوگوں کو چھانٹ چھانٹ راج کی سبھا میں اکھٹا کیا گیا تھا ایسے ہی دیس کے چوٹی کے ہندوؤں کو بھی انہی کے ساتھ جگہ دی گئی تھی۔ دیسیوں کا بدیسیوں کے ساتھ میل جول بڑھنے سے ترک، ایران، کابل کے سیکڑوں، ہزاروں ہندوستان آ کے یہیں رہ پڑے اور یہاں والے انکی جگہوں میں جا کے بس بسا گئے۔ اس سے دیسیوں کے دھیانوں پر بد اور بدیسیوں کے دھیانوں پر دیسی بول چڑھ چڑھا گئے۔

غوریوں کا راج آیا تو انہوں نے لاہور اور ملتان سے اسے اتنا آگے بڑھایا جو دلی کو اپنا راج گڑھ بنا کے چھوڑا۔ پشاور سے گجرات اور بنگال تک جگہ جگہ انہی کی دھاک تھی۔ اب اس ملی جلی نئی بولی کی دوڑ اور بڑھی۔ پورے دیس کی بول چال اور بات چیت کی جہاں کبھی کوئی ایک بولی تک نہ تھی، وہاں اب ملی جلی بولی کا ایک بڑا پورا پتلا بن بنا گیا۔ ۶۲۵ھ میں شمس الدین التمش نے ناصر الدین قباچہ سے چھین کر ملتان اور سندھ کو بھی دلی سے ملا لیا تو ادھر اُدھر سے سیکڑوں دھندے والے اور ہزاروں بیوپاری دلی ڈھل آنے اور اب ملتان، لاہور، دلی یہ تینوں جگہیں اس کے آگے بڑھانے اور اس کے سدھارنے میں لگ گئیں۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا اس میں بہت کچھ کرنے والا پرماتما کے پریم میں ڈوبا ہوا مسلمانوں گیانی جتھا تھا جسے "صوفیہ" کہتے ہیں۔

ہندوستان میں کوئی ایک ملی جلی بولی جیسے راج چاہتا تھا اس سے بڑھ کر دیس کا ایک ایک چھوٹا بڑا اور ان سب سے چھوٹے دیس تک پہونچے اس کے سنسان من کے مندر میں بھگوان کے پریم کا دیا جلانے اٹھا تھا اس نے اچھائی پھیلانے اور برائی کو مٹانے کے لئے دیس کی بہت سی بولیوں سے وہی ملی جلی ایک بولی چھانٹ لی جسے سب سمجھ سکتے تھے۔ اب تک اُردو کے پُرانے سے پُرانے ٹکڑے اور اس کی پُرانی سی پُرانی جتنی لکھتیں آسکی ہیں یہ سب کی سب اسی بھاگوان گیانی جتھے کی ہیں۔ اس بولی کی پُرانی باتوں کی جہاں سے جہاں تک چھان بین ہو سکی اس سے یہی پتا چلتا ہے۔ پہل خواجہ فرید گنج شکر کے منہ سے اس نئی پھلواری کے پھول جھڑے۔ یہاں جگہ نہیں، نہیں تو اُن کی ایک ایک بات پھیلا کے لکھی جاتی۔ سیر الاولیا، فوا

تاریخ فرشتہ، لطائف اشرفی اور ایسی اور دوسری لکھتوں میں بیچ کڑیاں بکھری ہوئی ملتی ہیں جنہیں ایک جگہ کیا جا سکتا ہے۔
فارسی کہنے والوں کے چھندوں میں ہندی بولوں کی کھپت اسی لکھت میں آپ کہیں پہلے دیکھ چکے ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی ضیائے برنی اور تاریخ فیروز شاہی سراج عفیف خلجی اور تغلق راج کی ان دونوں لکھتوں میں بھی ہندی کی پوری جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے:-

کہار، ٹھگ، لونڈی، ٹیکہ ہنداں، منڈل، گھٹی، بہی بنوریاں، ڈھولک، چبوترہ، مٹھ، بسوہ، چرائی، منڈی غلہ، ماش، رلوڑی، دھاوگاں، تھانہ، بھٹی، چودھری۔ (فیروز شاہی ضیائے برنی)

سراج عفیف کے یہاں بھی ہندی کے ایسے ہی بول ملتے ہیں۔ جیسے:-

راج، چونہ، چھتر، جھیڑ، چودھریاں، گھڑیال، گھڑیال خانہ، درخت سینبھل، بھرکر، کنگرہ، سوندھار۔

اب بیچ کی چھوٹی بڑی کڑیوں کو یونہی چھوڑتے ہوئے اتنا آگے بڑھئے جو دکھن کے وہ بہنی راج پاٹ والے دکھائی دینے لگیں جنہوں نے دلی سے الگ ہو کر گلبرگہ کو اپنا راج گڑھ بنا لیا اور اپنی کچہریوں سے فارسی کو نکال کے دیسی بولی کو اس کی جگہ دیدی۔ یہ گھرانا جب مٹ مٹا گیا تو عادل شاہی اور قطب شاہی راج آیا اور اس نے بھی اسی دیسی بولی کی پیٹھ ٹھونکی، اسی کا ساتھ دیا اور اسی کو اپنی بھاشا سمجھا۔ راج بھاشا بن چکنے پر یہ بڑی پھرتی کی آگے بڑھی اور پھیلنے لگی۔

جب دلیس کے اتر میں یہ بولی پیٹی اور اس میں لکھت پڑھت بری بات سمجھی جا رہی تھی، اسی گھڑی میں دکھن اور گجرات نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کے لئے اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ یہ بات بھی بھولنے کی نہیں۔ پیر ادریم کی من گھڑت کہانیاں کہتے سے پہلے ادا نے جو پہلے پہل باتیں کیں وہ سب کی سب دھرم پرچار میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے گیان جتھے نے اسی میں اپنے ڈھچر کی بہت سی لکھتوں پر لکھتیں لکھ ڈالیں۔

۹۱۸ھ میں قطب شاہی راج کی نیو پڑی۔ بیجاپور، احمد نگر، گولکنڈے میں "شیعہ" ہی "شیعہ" تھے۔ سلطان قلی اور اس کے بھتیجے محمد قلی قطب شاہ اور دوسرے اور اور کوی (شاعر) جیسے شجاع الدین نوری، نصرتی اور ہاشم علی نے کربلا والوں کی دکھ بھری بپتا پر رونے رلانے کے لئے بہت کچھ لکھ لکھا کے ڈھیر لگا دیا۔ ہوتے ہوتے اس نئی بولی میں اور دوسرے دھیانوں کی کھپت کے لئے بھی جگہ نکلنے لگی۔ دکھن کی اس پھلواری کی دہک جب اتر میں پھیلنے لگی تو وہاں والے چونکے اور جھٹ سے اس کا پودا اپنے یہاں لگا کے اسکی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ جب یہ جڑ پکڑ چکا اور بڑھ بڑھا کے بڑا اونچا پیڑ بن چکا تو اسکی اٹھان اور اسکے بڑھتے ہوئے روپ کو دیکھکر دکھنی بولی پہ قائم نے یہ چوٹ کی:-

"قائم! میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی"

نئی دیسی بولی کی ندی کہاں سے نکلی اور آگے بڑھتی، پھیلتی پھیلاتی، بل کھاتی ہوئی کہاں سے کہاں جا پہونچی۔ اس کا دھندلا سا سماں ابھی آپ دیکھ چکے۔ اب یہ اندھیر دیکھئے وہ بدیسی بولیاں جیسے سنسکرت اور پرانی ہندی جن کا ناتا کئی ہزار برس کی جڑ ان چکلان دیس سے جوڑ چکی ہے اور اس سے آگے کچھ نہیں۔ یہ تو ٹھیٹ دیسی بھی جائیں اور جس بولی کا یہی جگہ جنم بھوم ہو، جسے اسی دیس نے پال پوس کے بڑا کیا ہو وہ ان سب باتوں پر بھی بدیسی بنا رہے اور دیسی نہ بن سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے کیا کہتے ہیں۔

دڑاوڑی دیسی اور آریا پردیسی، بہت دنوں تک چھوٹے بڑے سب کے سب یہی مانتے اور اسی کو ٹھیک جانتے رہے۔ جب دوڑ دھوپ آگے بڑھی تو دڑاوڑی دیسی بھی پردیسی بن گئے اور دیس کے ٹھیٹ دیسی رہی بھیل، گونڈ اور لمبا ڑے ہی ٹھیرے جنہیں آج تک اپنے ہی دیس میں نہ کبھی پیٹ بھر کھانا ملا اور نہ پہننے کو پھٹا پرانا کوئی کپڑا۔ کیسے اچنبے کی بات ہے۔ بھاگوان پردیسی تو یہاں آکے راج کریں اور بھاگ پھوٹے دیسی پھل پھلاری کھاتے ہوتے ادھر ادھر چھپتے چھپاتے پڑے پھریں۔ کہتے ہیں۔ بارہ برس میں گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ یہ کہاوت ٹھیک ہے تو ان ابھاگی دیسیوں کے کب دن پھرینگے۔ کیا ان کے لئے بارہ برس کی گنتی کروڑوں برس ہو چکنے پر پوری ہوگی؟

ہندوستان میں کب سے بدیسیوں کا تانتا بندھا؟ اسے ہزاروں برس ہو چکے۔ پھر ایک ہو تو کہا جائے۔ دڑاوڑی، آریا، یونانی، تاتاری، سیتھین، عرب، ترک، مغل، پٹھان، ایک کے پیچھے ایک آتے ہی رہے۔ آریا جو بولی بولتے ہوئے دیس میں گھسے نہ جانے وہ کب تک اسے ویسی ہی بولتے رہے جیسے بولتے یہاں آئے تھے۔ آگے بڑھکر اس میں گھال میل ہوا اور گھٹ بڑھ ہوتے ہوتے یہاں تک پہونچی جس سے ایک دوسری

بولی کا ڈھانچا بن بنا گیا۔ ایسے ہی عرب، ترک، مغل اور پٹھان اپنی اپنی بولیاں بولتے ہوئے ہندوستان آئے اور یہیں رہ پڑنے سے اپنی اپنی بولیوں کے بول ملا جُلا کے ٹھیٹ دیسی بولی بولنے لگے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس کے میل جول کے لئے یہی ایک سہارا نکالا اور سچ پوچھئے تو یہ آپ ہی آپ ایسے ہی نکل آیا جیسے ہنسنے میں دانت نکل آتے ہیں۔ دیس دیس کے لوگ جب ایک جگہ اکٹھے ہونگے تو کب تک گونگے بنے ایک دوسرے کے مُنہ کو تکتے رہیں گے کیسی ہی الگ الگ بولیاں کیوں نہ ہوں گئے دن کی مڈبھیڑ ان رکاوٹوں کو الگ کرتی ہوئی اس ڈگر تک پہونچا دیتی ہے جہاں آمنے سامنے والے اپنی اپنی بولیوں میں توڑ مڑوڑ کر کے اپنی بات دوسرے کو سمجھانے لگتے ہیں۔ پہلے تو سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے۔ بات چیت کرنیوالے اپنی اپنی ہانکتے رہتے ہیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہی ہانک کانوں میں جگہ کرتی چلی جاتی ہے اور اس ہانک کے ساتھ مُنہ کا اتار چڑھاؤ، ہاتھ نچانا، بھویں مٹکانا، یہ باتیں مل ملا کے بات پوری نہیں تو ادھوری ہی سمجھا دیتی ہیں۔ جب ادھوری باتیں سمجھی جانے لگیں تو آگے بڑھکر سمجھ کے سامنے یہی ادھوری پوری بن جاتی ہیں۔

تو ہندو، مسلمانوں نے اس سہارے کو آگے بڑھانے کے لئے نت نئے جتن کئے۔ عربوں نے عربی، ترکوں نے ترکی، ایرانیوں نے فارسی، پٹھانوں نے پشتو اور آریوں نے اپنی سنسکرت میں کتر بیونت اور گھٹ بڑھ کر کے ایک ایسی نئی بھاشا بنائی جس کی بناوٹ میں دیس دیس کی بولیوں اور لٹریچر کا کچھ نہ کچھ روپ ملا ہوا ہے اور یہی ایسی بولی ہے جس سے پورب کا سرا پچھم سے اور اُتر کا دکھن سے مل ملا کے اپنے جی کی چھپی ہوئی بات ایک دوسرے سے کہہ سکتا ہے۔

جو لوگ اُردو کو اکیلے مسلمانوں ہی کی بولی کہنے پر اڑے ہوئے ہیں۔ اُنہیں سوچنا چاہیئے اُردو تو انہی جگہوں کی بھاشا ہو سکتی ہے جہاں ہندوؤں کی بہتات اور ریل پیل ہے۔ مسلمانوں کی جہاں جہاں بہتات ہے وہ سندھ، سرحد، پنجاب، کشمیر، بنگال، یہی جگہیں ہیں جو الگ الگ اپنی بولیاں رکھتی ہیں جیسے بنگال کی بنگالی، کشمیر کی کشمیری، سندھ کی سندھی، پنجاب کی پنجابی اور سرحد کی پشتو۔ ان سب بولیوں کے ہوتے ساتے وہاں لے جو اُردو بول رہے ہیں اور اُسے چھوڑنا نہیں چاہتے وہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ اُردو کو وہ دیس کے ایکے کا بندھن سمجھ کے تھامے ہوئے ہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ اپنی اپنی جگہوں کی بولیاں ہوتے ساتے اسے کبھی مُنہ بھی نہ لگاتے۔

کہنے والے دکھاوے کے لئے یوں چاہے کچھ ہی کیوں نہ کہیں پر جی ہی جی میں وہ بھی یہی مانتے ہیں۔ اب یہ دیس کسی ایک کی گتھی نہیں۔ باہر والے جن جہاں کے جتھے بھی یہاں آ آکے رہ پڑے اور ایسے بس بسا گئے جنہیں اب یہاں سے نکلنے اور کہیں اور جاکر رہنے بسنے کا بھولے سے بھی کبھی دھیان تک نہیں آتا۔ وہ اس سے پہلے چاہے کہیں کے بھی کیوں نہوں۔ اب سب کے سب یہیں کے ہیں اور ہندوستان ہی ان سب کا جنم بھوم ہے۔ جیسے سبھوں کا ایک ہی جنم بھوم ہے۔ ایسے ہی ان سب کی بولی بھی ایک ہی ہو جو پورے دیس میں پھیلی ہوئی ہے۔

مدراس اور بمبئی میں ہندی پرچار کیلئے سنسکرت بولوں کی بھرمار کرنے کا راگ الاپنے والوں نے کبھی ٹھنڈے جی سے یہ بھی سوچا۔ یہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ مدراس اور دکھن کی بولیوں کا سنسکرت سے بھلا کیا لگاؤ۔ جو سرگم بھری جا رہی ہے وہ کبھی اس راگنی کی نہیں ہو سکتی۔ مدراس کے وہ ہندو جو برہمن نہیں، ہندی کے پرچھاواں پڑنے سے ڈرے جاتے ہیں اور اسے سیکھنا نہیں چاہتے۔ یہ کیوں؟ انہیں اس بولی کی آڑ میں اپنی بھاشا، اپنے کلچر اور اپنے لٹریچر کا ستیاناس ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور وہ اپنا بنا بنایا گھر اپنے سامنے گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اچھا بہار، راشٹر، گجرات، مدراس میں سمجھے جانے کے لئے ہندوستانی میں سنسکرت بولوں کی ریل پیل جتنی جی چاہے کیجے، پر اسی کے ساتھ ساتھ سندھ، سرحد، کشمیر، پنجاب میں بھی سمجھے جانے کے لئے سندھی، پشتو، کشمیری، فارسی، عربی بولوں کی بھرمار سے نہ چوکئے۔ تول کے باٹ اِدھر اُدھر دونوں جگہ ایک ہی سے ہونے چاہئیں۔ کہیں کی تول جھکتی ہوئی اور کہیں ڈنڈی مارنا ایسی تول تو ٹھیک نہیں۔

نئی ہندی کے پریمی اپنی بات کی پچ کرنے کی دُھن میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے نئی نئی باتیں تو نکالتے رہتے ہیں۔ پر وہ ہوتی ہیں ایسی انمل بے جوڑ جن میں کوئی تُک ہی نہیں۔ کہا جا رہا ہے دیس کی بڑی جگہوں کی بھاشا اُردو ہے اور گاؤں کی ہندی۔ گاؤں میں رہنے والوں کی بہتات نگروں میں بسنے والوں سے بہت آگے ہے۔ اس لئے دیس کے پورے نگروں میں بھی ہندی ہی کو بڑھانا اور پھیلانا چاہیئے۔ نہ سوچا نہ سمجھا جو مُنہ میں آیا کہہ دیا یہ کون سی سمجھ کی بات ہے۔ سنسار میں ایسا کونسا دیس ہے جس کے نگروں اور گاؤں کی بولیاں ایک سی ہوں۔ بڑی جگہوں میں رہنے والوں کی باتیں اُن کے رہنے سہنے اُٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ، ان کے میل جول کا ڈھچر، ان کی بہت سی اور اور باتیں گاؤں والوں سے الگ ہوا کرتی ہیں اور ان ہی سے

ایک نگر ایک گاؤں سے بات بات میں کھلم کھلا الگ دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے ان دونوں جگہوں کی بولیوں میں جیسے پہلے بڑا پورا الٹ پل رہا ایسے ہی اب بھی ہے اور آگے بھی یونہی رہے گا۔

اور جو کسی دباؤ دباؤ سے گاؤں کی بولی کو کسی نگر کے گلے منڈھ بھی دیا جائے تو جب بھی یہ اُبال آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ڈھائی دن میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ دکھائی دینے لگے گا۔ پھر دیس کے پورے گاؤں کی کوئی ایک ہندی بولی نہیں۔ ایک جگہ کچھ ہے اور دوسری جگہ کچھ۔ جگہ جگہ تھوڑے تھوڑے الٹ پل سے بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ یہ نہ کھل سکا ان سب میں سے کس جگہ بولی کو دیس بھاشا کی کسوٹی بنانا ٹھیک ہوگا۔ بھاشا کو مٹی کا کھوا سمجھ لینا بھی ٹھیک نہیں جو ایک ہی جگہ پڑا رہے اور وہاں سے ہل نہ سکے۔ بڑھنے والی بولی کہیں ایک جگہ ٹک سکتی ہے۔ اس کے لئے رکنا اور ٹکنا مرنا، اور چلنا جینا ہے۔ دیکھ لیجے سنسکرت کا ٹکاؤ اور ٹھیراؤ اس کا گلا گھونٹ کے رہا۔ پھوٹنے پھلنے والی بولی کی چلت پھرت آپ ہی آپ ہوا کرتی ہے۔ جو کسی بھاشا بھی ہو وہ سنسار کے ہاتھ کی الٹ پلٹ سے بچ نہیں سکتی اور جو کوئی بچ بچا گئی تو سمجھ لیجے وہ اپنے جینے کے دن پورے کر چکی، آج نہیں تو کل مٹ مٹا کے رہ جائے گی۔ سنسار ادھر سے تبھی ہاتھ کھینچتا ہے جب دیکھتا ہے اب اس میں دوڑ کی سکت نہیں اور ستانے کیسے ٹھیرنا چاہتی ہے۔ تو بھاشا اور بولی چلتی پھرتی چھاؤں اور بہتا ہوا پانی ہے۔ چھاؤں تو کسی کے روکے رک ہی نہیں سکتی۔ پانی رک سکتا ہے۔ پر ادھر رکا اور باس آنے لگی۔

دودھ پیتے لڑکے بالوں کے فوٹو انہی کے پندرہ، پچیس، پینتیس برس کے فوٹوؤں سے ملا کے دیکھئے تو بڑا الٹ پل پائیے گا۔ اس سے بڑھ کر بولیوں میں آپ دیکھیں گے جب ان کے پہلے پہل کے ڈھچر کو انہی کے رسان رسان آگے بڑھنے اور بڑھ بڑھا کے پھیلتے چلے جانے کی راہ ت گھٹ بڑھ اور الٹ پل سے ملایا جائے۔ رامائن کی ہندی، پدماوت والے ملک محمد جائسی کی ہندی، کبیر کی ہندی اور آج کل کی ہندی۔ ان سب کی ہندی کی جنم دیکھنا ہو تو سبھوں کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھئے۔ گھڑی بھر میں یہ پورا اُتار چڑھاؤ آگے آجائے گا۔ ایسے ہی بیجاپور، رگوکنڈے کی اردو، ولی اور ہاشم علی کی اردو، میر اور سودا کی اردو، آتش اور ناسخ کی اردو، امیر اور داغ کی اردو اور آج کل کی اردو ان چھوں کڑیوں کا الٹ پل جانچ پڑتال کرنے سے چھپ نہیں سکتا۔ پہلے پہل کا انگھڑ پن، آگے بڑھ کر بھی لیسلے پن میں یونہی سا گھٹاؤ، ہوتے ہوتے اس گھٹاؤ کا بڑھاؤ اور پھر رسان رسان انگھڑ پن گھٹ کر بولی کا کچھ کچھ ابھار، سدھار اور نکھار ایک ایک کرکے یہ سب باتیں سامنے آجائیں گی۔

کسی بھاشا اور بولی کی جانچ "چلن" سے کی جاتی ہے۔ بولی اس کسوٹی پر پوری اُترے تو ٹھیک۔ نہیں تو اس کا کوئی ٹھیک ٹھور نہیں۔ چلن کیا ہے؟ جس ڈھنگ سے کوئی بھاشا بولی اور لکھی جا رہی ہو جہاں کی وہ ہے وہاں کے چھوٹے بڑے اسے جیسے بولتے چالتے ہوں، یہی بول چال اور لکھنے کا ڈھچر "چلن" کہلاتا ہے۔ اسے ڈکشنریوں میں نہ ڈھونڈئے یہ گھروں، گلیوں، سڑکوں پر ملتا ہے۔ اس کسوٹی پر اردو کو کسئے اور دیکھئے اس کے جتنے بدیسی بول رات دن ہندو مسلمان بے جھجک بولتے اور سمجھتے ہیں وہ سب کے سب چلن کے بندھن سے بندھے ہوتے ہیں اور ان میں کا ایک بول بھی ٹکسال باہر کا نہیں۔ تو ان کی چھوٹی سی چھوٹی لکیر بھی مٹائی اور نکالی نہیں جا سکتی اس سے ہٹ کر دوسری بولیوں کی لکھتیں جب اردو کے سانچے میں ڈھالنی ہوں اور اس ڈھالنے میں نئے نئے بول ڈھونڈنا پڑیں تو اس کے لئے بولیوں کے پرکھنے والے اور بولوں کی ناپ تول کے رسیا سوچ بچار کرکے اس گتھی کو سلجھا سکتے ہیں۔ بنی بنائی بولی میں سے گھلے ملے بول نکال نکال کے بھولے بسرے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کی دھن میں لگے رہنا سمجھ کا پھیرا اور اسی پھیر کا یہ اندھیر ہے جو گنتی کے لوگوں کو چھوڑ کر اور جسے دیکھئے وہ ایسی ہی سب بے ٹھکانے کی بے سُری سرگم بھرنے کو بڑی بات سمجھ رہا ہے۔

جیسے پانی کے بہاؤ میں گھاس پھوس کے ساتھ بڑے بڑے پیڑ بھی اکھڑ کر بہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی دیس کی بھیڑ چال میں ملنے کے لئے اچھے اچھے سمجھ والے بھی آٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بھلا مسز سروجنی نائڈو جو بہت اچھی اردو جانتی ہیں اور ہندی نہیں جانتیں اور ہندی کا نہ جاننا یہ آپ مانتی ہیں۔ ان کی لکھت کا یہ ٹکڑا کہیں دُہرایا جا چکا ہے:-

"اُن احسانات کو یاد کریں جو اسلام نے ہماری زبان اور لٹریچر کے ساتھ کیا ہے۔ ہمیں ایک ایسی پیاری زبان (اردو) بخشی ہے جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک غیر فانی یادگار ہے۔ ہندوستان کے جس حصے میں چلے جاؤ تم قومی اتحاد کی یہ یادگار کسی نہ کسی حالت میں ضرور پاؤ گے۔"
(اخبار وکیل ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

یہ پھر دیکھئے "دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا" کے آٹھویں کانووکیشن میں انہوں نے جو اسپیچ دی اسے پڑھئے تو آپ بھونچکا ہو کے رہ جائیں گے۔

آج دیس کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں بھی جس بولی کا پتا تک نہیں یہ اسی پر ریجھی ہوتی ہیں اور اسی کے پرچار کی دھن میں یہ کہتی ہیں:۔

"میں نے نشچے کیا کہ آج میں اس زبان میں بولوں گی جس میں کبیر، تلسی، میرا نے گایا ہے"۔

ان کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بڑا بوڑھا دودھ پیتے بالکوں کی سی غوں غاں کرے اور انہی کے سے ہاتھ پیر مارنے لگے۔ کبیر کو پیچھے چھوڑ کر سنسار کتنا آگے بڑھ چکا۔ اس کی بولی پر آج بھی رال ٹپکی پڑتی ہے تو لسے منہ لگانے کے لئے بڑھتے ہوئے سنسار کو اتنا پیچھے دھکیل دیجئے جو کبیر کی سانس لینے کی گھڑیاں سامنے آجائیں۔ جو بات بھی ہو اس کے لئے کوئی نہ کوئی الگ جگہ ہوا کرتی ہے اور اسی جگہ میں اس کا اچھا پن بھلا لگتا ہے۔ پرانی بولی بولنے سے پہلے پرانا سماں بھی پلٹا کے لے آنا چاہئے۔ نہیں تو بات بے تکی اور بے جوڑ سی ہو کر رہ جائیگی۔ ہے یہ۔ بات کی پچ سمجھ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے اور پٹی بندھ چکنے پر پھر دیکھنا بھالنا کیسا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔

یہی دھارا بڑوں بڑوں کو بہاتے لئے جا رہا ہے اور جو الگ تھلگ تھے وہ بھی انہی کی دیکھا دیکھی کو د پھاند رہے ہیں۔ پر سب کے سب ایسے نہیں۔ انہی ہندوؤں میں سے جو سوجھ بوجھ کے پتلے اور بھاری بھرکم لوگ ہیں، وہ اودھم مچانے والوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور ان کی چیخم چاخ کو کان دھر کے بھی نہیں سنتے۔ وہ پہلے ہی جو سچی بات تھی اُسے جانچ پرتال کے دیکھ بھال چکے اور سمجھ گئے یہ جو کچھ ہو رہا ہے سُدھارنے کیلئے نہیں سب بگاڑنے کے لئے ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے بڑے بوڑھوں کی بنائی ہوئی بولی کا ستیاناس کرنا یہ نہیں چاہتے۔ یہ اپنی بنی بنائی بولی کو چھاتی سے لگا کے رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے چپ چاپ سب سے الگ تھلگ رہنے کو اچھا سمجھتے اور جب کوئی ایسی گھڑی ہاتھ آجاتی ہے جس میں جی کی بھڑاس نکل سکے تو پھر یہ نہیں چوکتے اور بے جھجک فرّاٹے بھرتے ہوئے سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔

مسز سروجنی نائڈو کا دیس کی بھیڑ چال میں مل کے الٹی گنگا بہانا ابھی آپ دیکھ چکے۔ اس کے ساتھ ہی سر تیج بہادر سپرو کا بھاری بھرکم پن اور انکی سوجھ بوجھ بھی دیکھ لیجئے۔ ۵ر اگست ۱۹۳۵ء کو سری نگر کے ایس۔ پی کالج میں "چھند سبھا" جمی۔ اس کے پنچ یہی بنائے گئے۔ اس سبھا میں سر سپرو نے جو کچھ کہا اور جس ڈھب سے کہا اس کا ایک ایک بول انمول ہے:۔

"میں ایک ہندو کی حیثیت سے بلا تامل کہتا ہوں کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور صرف اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو سکتی ہے۔ آج زبانوں کے بارے میں سخت انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی زبان پشاور سے لیکر سی۔ پی تک اور جنوبی ہند کے حصّوں میں بھی سمجھی جا سکتی ہے تو وہ صرف اردو ہے۔ میں اس نظریئے کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر خود مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اردو ہماری زبان ہے تو میں ان کے اس دعوے کی تردید کرتا ہوں۔ کیونکہ زبان اردو بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے حصّہ لیا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہندو اس زبان سے نفرت کریں۔ ہندوستانی کی اصطلاح نے اس مسئلے کو حل کرنے میں اور مشکل پیدا کر دی ہے۔ درحقیقت ہندوستانی ہندوستان کی کوئی زبان نہیں ہے۔ تامل اور تلگو بھی ہندوستانی زبانیں کہلا سکتی ہیں۔ اگر ہندوستانی سے مُراد وہ زبان ہے جو آج سے پچاس سال پہلے دہلی میں بولی جاتی تھی یا آج کل دہلی میں مروّج ہے تو میں اسے تسلیم کر سکتا ہوں۔

اردو زبان میں بے شمار ایسے الفاظ شامل ہیں جو فارسی، عربی یا سنسکرت سے لئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے الفاظ کو جو اردو کا جزو بن چکے ہیں محض اس لئے زبان سے خارج کر دینا معقولیت نہیں ہے کہ ان کا ماخذ عربی، فارسی یا سنسکرت ہے۔ اسی طرح اردو میں مزید عربی، فارسی الفاظ ٹھونس کر اُسے مشکل بنانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس بات پر کامل یقین ہے کہ اردو ایک ایسا مشترکہ ورثہ ہے جو ہمیں اپنے آبا و اجداد سے ملا ہے اور جسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مسلمان یہ دعوےٰ کریں کہ یہ صرف ہماری زبان ہے تو ہندو یہ دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ میں ایک ہندو ہونے کی حیثیت سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کرتا کہ ہماری مادری زبان اردو ہے۔ وہ رشتہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو جوڑ سکتا ہے صرف اردو زبان کا رشتہ ہو سکتا ہے اور اسے توڑنا گناہ کے مترادف ہے"۔

(باقی۔ باقی)

سیّد ابوالقاسم سرور

باقیاتِ فانی

ضبط اپنا شعار تھا نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا نہ رہا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غمگسار تھا نہ رہا

آ، کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوشگوار تھا نہ رہا

اُنکی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی اُمّیدوار تھا نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کبتک
آہ کا اعتبار تھا نہ رہا

کچھ زمانہ کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا نہ رہا

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا نہ رہا

مہرباں یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا نہ رہا

فانی بدایونی

حُسن کی قیمت

کہسار پر سکوت مسلط تھا۔ روح فرسا سکوت! بن کے سبزہ پوش بھی خاموش اور وادیوں کے لوافروش بھی خاموش۔ نالے میں برف آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ اور میں اسی برف کے کنارے بیٹھا قدرت کی کرشمہ سازیوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ برف پوش چوٹیوں پر شفق کی لالی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ساقی کہسار نے شام کی مینائیں مے گلرنگ سے بھر رکھی ہے ڈھلوانوں اور گھاٹیوں پر رنگ رنگ کے پھول اور بن کے درختوں کی ہریاول دیکھ کر زبان پر بے ساختہ یہ شعر آتا تھا کہ ؎

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

میرا راہبر احمد جو، جو اسی دیار کا رہنے والا ایک بوڑھا زمیندار تھا ایک طرف بیٹھا چائے کا پانی گرم کر رہا تھا۔ ٹفن باسکٹ میں کچھ آم تھے میں نے اپنے شکاری چاقو سے برف میں ایک گڑھا کھودا اور آم اس میں ڈال کر برف سے ڈھانپ دئے۔ مجھے آج پہلی بار برف قدرتی حالت میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ بوڑھا احمد جو تو اپنے کام میں مشغول تھا میں کوٹ اتار کر برف پر چلنے لگا دو قدم چلتا تھا کہ پاؤں پھسل جاتا۔ میں نے بوٹ اتار کر کنارے کی طرف پھینک دئے۔ اور برف پر چلنے لگا لیکن دس پانچ قدم چلتے ہی پاؤں سُن ہونے لگے۔ اب جرابیں بھی جو بیگ پی کی تھیں میں نے اتار پھینکیں۔ بڑھے احمد جو نے وہیں سے آواز دی "پاؤں سُن ہو جائینگے حضرت!"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ جواب دوں میرا پاؤں ایسا پھسلا کہ چت گرا۔ ساتھ ہی ایک قہقہے کی آواز آئی۔ ایک نوجوان عورت کنارے پر کھڑی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ میں کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ اور سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا کنارے پر آ بیٹھا۔

بوڑھے نے بیٹھے بیٹھے آواز دی "چوٹ تو نہیں آئی حضرت؟"

"نہیں!" میں نے کہا "چائے تیار ہو تو لے آؤ"

وہ عورت میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور ہاتھ بڑھا کر بولی۔

"یہ لو دو روپے! میرا بچہ مجھے دیدو"

لیکن ہاتھ خالی تھا۔ اب میں نے اس کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پیکر حُسن سامنے کھڑا ہے۔ لباس تو پھٹا پرانا تھا اور جوبن اور حُسن کی بہار بھی لٹی لٹی نظر آتی تھی۔ ہونٹوں کی نزاکت گل کی پتی کی لطافت کو شرماتی تھی۔ سیاہ اور خوبصورت بال جو شاخ سنبل کی طرح کمر تک لٹکتے تھے۔ کچھ اُلجھے اُلجھے سے تھے لیکن اب بھی کسی اجڑی بہار کا پتہ دیتے تھے۔ اس کی سیاہ اور مست آنکھوں پر چشم آہو کا دھوکا ہوتا تھا۔ پاؤں اگرچہ خاک آلودہ تھے لیکن ساق تیمیں کی نزاکت نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ صورت حال صاف کہہ رہی تھی کہ ؎

حُسن کی صبح دل افروز کی اک شام ہوں میں

"لیتے نہیں!" اُس نے پھر ہاتھ بڑھا کر کہا "اللہ قسم! دو روپے ہیں"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نادرہ!" وہ بولی "بھول گئے کیا۔ میرے حُسن کی قیمت ہے۔ اللہ قسم دو روپے ہی ملے، وہ نے ہی تو دئے تھے"

بوڑھے احمد جو نے آواز دی "دیوانی ہے حضرت!"

"جھوٹا ہے حضرت!" نادرہ نے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بس دو روپے ہے اللہ قسم دو روپے"

پھر میری طرف دیکھ کر "میرا بچہ بیمار تھا۔ تم نے دو روپے حُسن کے دام دئے میں نے بچے کی خاطر اپنا حُسن بیچ ڈالا۔ اللہ قسم! بس ایک بار"

"کون لے گیا تمہارا بچہ؟" میں نے پوچھا۔

"تم!" وہ ذرا گھور کر بولی "تم نے کہا چاندی کا سکہ دوں گا۔ یہ لو دو روپے، میرا بچہ مجھے دیدو"

میں خاموش بیٹھا اس پگلی کی طرف دیکھ رہا تھا اور قدرت کی نیرنگیوں پر حیران تھا۔ یہ حسن اور یہ بے چارگی! تیرے بھید تو ہی جانے میرے مولا۔

احمد جو چائے بنا لایا۔

"نادرہ!" میں نے کہا "بیٹھ جاؤ، چائے پی لو"

"تم میرا بچہ دو" وہ تیوری چڑھا کر بولی "اپنے نکالو میرا بچہ دو!"

"میرے پاس تمہارا بچہ نہیں" میں نے جواب دیا۔

"ہے کیوں نہیں" وہ بولی "ابھی تمہارے ساتھ برف پر کھیل رہا تھا"

بوڑھے احمد جُو نے اب کشمیری زبان میں اس سے کچھ سختی کے لہجہ میں کہا اور وہ بڑبڑاتی ہوتی جنگل کی طرف چلی گئی۔

"یہ کون ہے؟" میں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

"پگلی حضرت!" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کب سے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑی بپتا پڑی اس پر" بوڑھا بولا "دیوانی ہوگئی بے چاری"

"تم جانتے ہو اسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں حضرت!" احمد جُو نے ایک آہ بھر کر کہا "سب جانتے ہیں اسے"

"کوئی ولی وارث نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اللہ حضرت!" احمد جو نے جواب دیا۔

میں چائے پی کر وہیں لیٹ گیا۔ اور اس بدنصیب نادرہ کی حالت پر غور کرنے لگا جو اپنی زبان سے وہ الفاظ کہہ رہی تھی جو اُسے ایک دنیا میں ذلیل اور رُسوا کرنے والے تھے، گناہ کا اقبال اور بیباکی سے۔ لیکن وہ غریب تو اس وقت معذور تھی۔ بالکل معذور۔ اُسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کہہ کیا رہی ہے۔ بچے کی خاطر عصمت بھینٹ چڑھا دی۔ استغفراللہ! ہائے ری ممتا۔ کس قدر خوفناک الفاظ تھے۔ میرا خیال تھا کہ بوڑھا احمد جُو خود ہی مجھ سے یہ قصہ کہے گا۔ لیکن وہ کچھ زیادہ خاموشی پسند تھا۔ الگ بیٹھا پیالیاں صاف کر رہا تھا۔

"یہ کام کا کاغذ حضرت!" اُس نے کاغذ بیٹھے بیٹھے مجھے دکھا کر پوچھا۔

"دکھاؤ تو!" میں نے کہا۔

وہ کاغذ میرے پاس لے آیا۔ یہ نیلے رنگ کا ایک نوٹ پیپر تھا اور اس پر یہ شعر لکھا تھا ؎

چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من
کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

اور لکھا ہوا بھی میرے قلم کا۔ اس وقت اور اس فضا میں جب اس بدنصیب نادرہ کی مظلوم صورت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ علامہ مرحوم کے اس شعر نے میرے دل کے سکون و قرار کو درہم برہم کر دیا۔ لیکن یہ حالت کچھ زیادہ دیر نہیں رہی۔ کیونکہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے خیالات کی دُنیا یکلخت بدل دی۔

احمد جو جب سب سامان ٹوکری میں ڈال چُکا تو میرے پاس آکر بولا "وہ اُگے گا حضرت!"

"کیا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہی" بوڑھا بولا "جو آپ نے برف میں دبایا۔ جاڑے کے بعد کونپل پھوٹے گا"

"اوہو!" میں نے مسکرا کر کہا "آم!"

"کیا مالم" (معلوم) اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جاؤ!" میں نے کہا "نکال لاؤ"

احمد جو سب آم نکال لایا۔

میں نے پوچھا "تم نے کبھی آم کھایا؟"

"نہیں!" اُس نے سر ہلا کر کہا "آپ کے ملک کا پھل حضرت؟"

"ہاں!" میں نے ایک آم اُسے دیکر کہا "کھاؤ"

آم تو اُس نے مجھ سے لے لیا لیکن کھانے کی بجائے جیب میں ڈال لیا۔

"کھا لو!" میں نے کہا "بہت میٹھا ہے"

"گھر چھوٹی بچی حضرت!" بوڑھے نے ذرا مُسکرا کر کہا "اسکو دیگا"

اولاد کی بھی کیا محبت ہوتی ہے۔ اس شخص نے عمر بھر آم کھایا نہیں اور جب اُسے ملا ہے تو بچی کی محبت کھانے نہیں دیتی۔

میں نے دو تین آم اور اُسے دئے اور کہا "ایک تم بھی کھاؤ"

چونکہ میں نے ابھی تک اس کے سامنے آم نہیں کھایا تھا اس لئے وہ آم کو بھی بالکل ایک سیب یا ناسپاتی کی طرح دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ یہ دیکھکر مجھے ہنسی آگئی۔ اور وادیٔ کشمیر کی اس سیاہ چشم حسینہ کی بیکسی کے خیال نے جو اثر دل پر پیدا کر رکھا تھا، زائل ہوگیا۔

مغرب کی نماز میں نے وہیں برف کے کنارے ادا کی۔ بوڑھے احمد جو نے ٹفن باسکٹ پیٹھ پر باندھی اور میں نے بندوق سنبھالی اور منزل کی طرف چلدئے۔ میرا قیام ڈاک بنگلہ میں تھا۔ ڈاک بنگلہ لب سڑک تھا۔ اب چونکہ اترائی تھی اسلئے قدم جلدی اُٹھتا۔ فارسٹ روڈ یوں بھی ہموار تھی۔ کچھ خوف تھا تو کسی بگڑے دل ریچھ کا تھا۔ جو جنگل سے نکلکر ذرا تفریح کے لئے سڑک پر آبیٹھا ہو۔ اس لئے بوڑھا راہبر گاہے گاہے اپنے وطن کا کوئی گیت اونچی آواز سے گانے لگتا۔

بہرکیف سفر خیریت سے ختم ہوا۔ میں نے آتے ہی گرم پانی سے غسل کیا۔ پھر کھانا کھایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد برآمدے میں آبیٹھا۔ چاند قلۂ کوہ پر پوری آب و تاب سے جلوہ افروز تھا۔ گرد و پیش کی ہر چیز چاندی کا لباس پہنے تھی —

ڈاک بنگلے سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر بازار تھا سڑک کے دونوں کناروں پر چار پانچ دکانیں تھیں۔ اس وقت وہاں کوئی مطرب سارنگی کے ساتھ گا رہا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز تھی اور بے سُری تانیں لیکن آواز میں سوز تھا۔ اور مجھے گانا سننے کا شوق۔ میں نے چوکیدار کو بھیجکر اُسے بُلوایا۔ بوڑھا آدمی تھا اور کہیں پنجاب کا رہنے والا تھا۔

"حضور کیا حکم ہے؟" اُس نے مجھے سلام کر کے پوچھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گویا ہوں جناب!" بوڑھے نے جواب دیا۔

"گانا وانا جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"روٹی مل جاتی ہے" بوڑھے مطرب نے جواب دیا۔

"وہی جو بازار میں کھڑے گا رہے تھے وہی سُنا دو" میں نے کہا۔

وہ گانے لگا ؎

مناظرِ غم گذر رہے ہیں حجابِ عالم اُٹھا رہا ہوں
سکوت ہے شامِ بیکسی کا کھڑا ہوا مُسکرا رہا ہوں

تلفظ نہایت غلط تھا۔ دُور سے آواز میں جو ایک دلکشی سی معلوم ہوتی تھی وہ بھی اب کرختگی میں بدل گئی تھی۔ لیکن شعر کا ایک ایک حرف سوز سے معمور تھا ؎

اُمیدِ غم سے بدل چکی ہو نصیب پر مسکرا رہا ہوں
سُنا چکا ہوں انہیں فسانہ اب اپنے دلکو سُنا رہا ہوں

بس یہی دو شعر یاد تھے، دو چار بار جب وہ الاپ چکا تو میں نے پوچھا "کہاں کے رہنے والے ہو تم"

"پنجابی ہوں جناب!"

"ادھر کیسے آ نکلے؟"

"بھیک مانگتا آ گیا!"

"کب سے آئے ہوئے ہو؟"

"کتنے روز ہو گئے"

"کبھی بھلے دن بھی دیکھے" میں نے پوچھا۔

"بھیک مانگتے عمر گذر گئی" بوڑھے مطرب نے جواب دیا۔

"بیوی بچے بھی تھے؟"

"ہاں!" وہ بولا "بیاہ تو کیا تھا!"

"پھر بیوی کیا ہوئی؟"

"مر گئی!"

"کتنا عرصہ ہوا؟"

"کوئی پانچ سات سال!"

"یاد تو آتی ہو گی؟"

"جناب!" وہ ذرا فلسفیانہ انداز سے بولا "مفلسی سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے بھیک مانگ رہا ہوں اور بھیک مانگتے مانگتے مر جاؤں گا!"

کتنے دلخراش الفاظ تھے۔ تو یہ ہے! کیا زندگی ہے۔ ساری عمر بھیک گذر گئی میں نے کچھ دے کر اُسے رخصت کیا دس بیس قدم جا کر اُس نے پھر وہی آواز نکالی؎

"مناظرِ غم گذر گئے ہیں... اور... کھڑا ہوا مُسکرا رہا ہوں"

غالباً اس غریب کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہی دو شعر اُس کی زندگی کے ترجمان ہیں۔

کہسار کی ہوا نے جو غالباً برف سے دامن بھگو کر آتی تھی فضا میں خُنکی پیدا کر دی تھی۔ میں کمبل اوڑھکر پلنگ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد احمد جو آیا اور بولا "پاؤں داب دوں۔ آج تھک گیا آپ!"

"بیٹھ جاؤ" میں نے کہا۔

وہ پلنگ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ نادرہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پگلی ہے بے چاری!" احمد جو نے جواب دیا "بڑی بپتا پڑی اس پر"

"کیسی بپتا؟" میں نے پوچھا۔

"سُنئے حضرت!" احمد جو نے اپنی لوئی (کمبل) زانو کے نیچے دبا کر کہا۔

"اس جنگل کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا گاؤں ہے یہاں صمدو بٹ ایک زمیندار رہتا تھا۔ اپنی تو زمین تھی نہیں۔ گاؤں میں ایک شخص کے یہاں کھیتی باڑی کا کام کرتا۔ لیکن جاڑے پڑتے ہی محنت مزدوری کے لئے پنجاب کی طرف نکل جاتا۔ صمدو اور اُس کی بیوی دونوں بڑے نیک دل تھے شادی کے بہت سال بعد اللہ نے انہیں ایک بیٹی عطا کی۔ بیٹی کا نام انہوں نے نادرہ رکھا اور قدرت نے نادرہ کو وہ حُسن و نزاکت عطا کی کہ بایدو شاید۔ کوئی اُسے حُسن کی تصویر کہتا، کوئی پربت کی دیوی سمجھتا، کوئی بن کی رانی اور کوئی چاند کی بیٹی۔ صمدو کے پڑوس میں ایک غریب لکڑ ہارا بھی رہتا تھا۔ جس روز صمدو کے گھر لڑکی ہوئی اُس کے گھر ایک لڑکا ہوا۔ لکڑ ہارے نے بیٹے کا نام جبار رکھا۔ قضائے الٰہی سے کچھ روز بعد لکڑ ہارا اور اُس کی بیوی مر گئے۔ جبار تن تنہا رہ گیا۔ صمدو بٹ ترس کھا کر اُسے اپنے پاس لے آیا۔ وقت گذرتا گیا اور بچے پروان چڑھتے گئے۔ جس طرح نادرہ کو قدرت نے

دولت حسن ملی تھی اسی طرح جبّار کو قوت اور حوصلہ عطا ہوا تھا۔ جبّار بڑا منچلا اور نڈر تھا۔ دونوں ابھی سن شعور کو پہونچے ہی تھے کہ گاؤں میں ہیضہ پھوٹا۔ محمد اور اس کی بیوی دو ایک روز کے وقفے کے بعد آگے پیچھے عدم کو سدھارے۔ دونوں یتیم اکیلے رہ گئے۔ ذات باری کے سوا اب کوئی پرسان حال نہ تھا لیکن جبّار ایسا حوصلہ مند لڑکا ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ وہ ہر روز جنگل سے لکڑی کاٹ کر اور بازار میں جو لب سڑک تھا ایک نانبائی کے پاس روٹی کے عوض فروخت کر دیتا۔ نادرہ اور جبّار دونوں کی اسی پر گذران تھی۔

نادرہ کے پاس لے دے کر صرف ایک گائے تھی۔ جب گائے نے بچھڑا دیا اور دودھ دینے لگی تو نادرہ کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی۔ اب وہ بھی جبّار کے ہمراہ بازار دودھ بیچنے آتی۔ بازار والے بڑی شوق بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا کرتے۔ جب لکڑیاں اور دودھ فروخت ہو جاتا تو دونوں مزے مزے کے گیت گاتے گاؤں کو واپس چلے جاتے۔

کشمیر کا حُسن تو خیر ضرب المثل ہے لیکن نادرہ جوان ہو کر تو قیامت کا فتنہ ہی نکلی۔ نانبائی کی اس پر نظر تھی، قصاب کا جوان بیٹا دل میں اس کی تمنا لئے بیٹھا تھا۔ سرائے کا چوکیدار گو بال بچے والا تھا لیکن نادرہ کو جورو بنانے کا وہ بھی ارمان رکھتا تھا۔ اور جو کسی راہگذر کی نگاہ پڑ جاتی تو وہ سو سو بہانے سے اس سے باتیں کرتا۔ یہ باتیں جبّار کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ایک دو بار قصاب کے بیٹے سے ہاتھا پائی تک نوبت پہونچ چکی تھی اور سرائے والے کو بھی اس نے سر بازار دو چار مرتبہ برا بھلا کہا۔ آخر کچھ روز بعد اُن کے پیر نے دونوں کا نکاح کر دیا۔ اور وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

کوئی ایک سال کے بعد نادرہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ بچہ بھی ماں کی طرح خوبصورت تھا۔ بچہ دو سال کا تھا کہ ملک میں قحط پڑا۔ قحط کیا تھا ایک عذاب تھا۔ ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں۔ گاؤں کی تو ساری ہی کیا تھی۔ وہ تباہی آئی کہ بس توبہ ہی بھلی۔ لوگ درختوں کے پتے اُبال اُبال کر کھا گئے۔ جبّار سے گاؤں والوں کی بیچارگی دیکھی نہ گئی۔ اس وقت اس کے پاس تین گائیں تھیں۔ اس نے یکے بعد دیگرے تینوں ذبح کر کے گاؤں والوں کو کھلا دیں۔ آپ جانتے ! راج کے قانون کے مطابق گائے ذبح کرنا ایک سنگین جرم ہے۔ کچھ روز تک تو یہ راز چھپا رہا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح قصاب کے بیٹے کو جو اب باپ کی جگہ دکان پر کام کرتا تھا، پتہ لگ گیا۔ محبت کے میدان میں جو اُس نے زک اٹھائی تھی، اب اس کا انتقام لینے کا اُسے موقع ملا۔ اس کور باطن نے ڈاک بنگلے کے چوکیدار سے جو برہمن تھا، غمازی کر دی۔ جرم ثابت تھا حاکم نے تین سنگین جرموں کی پاداش میں جبّار کو سات سال کیلئے جیل بھیجدیا۔ اور نادرہ غریب پھر بے یار و مددگار رہ گئی۔

کسی زمانے میں احمد جو گاؤں کا چوکیدار تھا۔ محمد مرحوم سے اُس کی خوب بنتی تھی۔ محمد کی زندگی میں ہی احمد جو سرکار کا ملازم ہو کر گلگت چلا گیا۔ ایک مدت کے بعد وطن اُس وقت لوٹا جب اس کے گاؤں والوں میں سے اکثر مر کھپ گئے تھے۔ کچھ قحط کی مصیبت سے گاؤں چھوڑ کر دیار اغیار میں سرگرداں تھے۔

نادرہ اپنا بچہ گود میں لئے سڑک پر بیٹھی آنے جانے والوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔ احمد جو نے اُسے پہچان لیا اور اس کا حال سُنکر اُسے بہت افسوس ہوا۔ آخر احمد اور نادرہ دونوں سرکاری علاقے میں چلے آئے۔ لیکن گردش کی آب و ہوا احمد جو کو راس نہ آئی اور وہ بیمار ہو گیا۔ اب بھی نادرہ تو پردیس میں کون تھا جو اُس کی دستگیری کرتا۔ فاقوں کی ماری نادرہ اگرچہ ایک شاخ خزاں رسیدہ کی مانند مرجھائی ہوئی تھی تاہم گذشتہ رعنائی و زیبائی کی ایک ہلکی سی جھلک اب تک باقی تھی۔ وہ دن بھر کوچہ و بازار میں اپنے اور اپنے بچے کے لئے بھیک مانگتی تھی۔ کوئی دھتکار دیتا۔ کہیں روٹی سوکھی مل جاتی کوئی اللہ واسطے بچے کے لئے کٹوری بھر دودھ بھی دے دیتا۔ بری بھلی زندگی تو کٹ رہی تھی لیکن اب ایک نئی مصیبت یہ آئی کہ بچہ بھی بیمار ہو گیا اور مامتا کی ماری اس ننھی سی جان کی خاطر اس خوفناک کام کیلئے بھی آمادہ ہو گئی جو ایک عورت کو جیتے جی جہنم میں جھونک دیتا ہے۔

شہروں میں جس طرح کھلم کھلا بدچلنی اور بداخلاقی کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں دیہات تقریباً اس سے پاک ہوتے ہیں۔ مان لیا کہ دیہات کے رہنے والے تعلیم اور تہذیب سے کورے ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اخلاق اور چلن کا تعلق ہے وہ شہر والوں سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ ایک دنیا نادرہ کے حسن کی گاہک تھی لیکن آج تک اُس کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہونے پائی تھی۔ جن دنوں وہ دودھ بیچنے بازار آیا کرتی تھی اکثر بداخلاق لوگ اُسے طرح طرح کے للچاوے دیتے تھے لیکن اُسے ان سیاہ باطنوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ اور جو کہیں کسی سے آنکھیں چار ہو بھی جاتیں تو وہ نفرت سے تھوک دیا کرتی۔

جبّار قید ہو گیا، اور وہ فاقے کرتے کرتے تنگ آ گئی لیکن طبیعت پھر بھی گناہ کی طرف راغب نہ ہوئی۔ تنگی، مفلسی، بے چارگی، سبھی کچھ اس نے برداشت کیا لیکن آن اور عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ اور ہمیشہ گناہ کو گناہ ہی سمجھکر اُس سے بچتی رہی۔ لیکن جب بچے کی جان پر بنی تو دنیا نادرہ کی آنکھوں میں اندھیر ہونے لگی۔ بہت روز اُس نے خیراتی ہسپتال

میں علاج معالجہ کروایا۔ لیکن بچے کی حالت روز بروز خراب ہی ہوتی گئی۔ شہر میں کوئی وید تھا۔ بچے کے علاج کے لئے دو روپے مانگتا تھا۔ نادرہ جو صبح سے شام تک دو چار پیسے جمع کرتی وہ بچے کی خوراک پر اٹھ جاتے۔

شہر سے باہر ایک ٹوٹی پھوٹی بازلی تھی، نادرہ اور احمد اسی جگہ رہتے تھے۔ نادرہ جو ٹکڑے مانگ کر لاتی دونوں کی اسی پر گذران تھی۔ ایک اوباش عموماً ادھر سے گذرا کرتا تھا۔ ایک روز نادرہ اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی رو رہی تھی۔ احمد جو کہیں مانگنے تانگنے گیا ہوا تھا۔ وہ بدمعاش جو ادھر سے گذرا تو پاس آکر پوچھا" روتی کیوں ہو؟ روٹی نہیں ملی کیا؟" پھر جیب سے دو پیسے نکال کر" یہ لو!"

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں!" نادرہ نے روتے ہوئے کہا" مجھے رب کے لئے دو روپے دو۔ رب بھلا کریگا۔"

"دو روپے" اس نے ہنسکر کہا" کیا کرو گی؟"

"میرا بچہ بیمار ہے۔ اس کی دوا دو روپے میں آئیگی" نادرہ نے بڑی منت سے کہا" رحم کرو۔"

اس کمبخت نے جیب سے دو چمکتے ہوئے روپے نکالے اور آنکھ سے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ہائے ری مامتا! دونوں کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ لیکن جب نادرہ واپس آئی تو بچہ موت کی آغوش میں تھا۔

نادرہ بچے کو گود میں لئے اسے پیارے پیارے ناموں سے بلاتی تھی۔ کبھی گدگدیاں کرتی۔ کبھی سینے سے لگاتی۔ کبھی دو روپے اچھال اچھال کر خود بخود ہنسنے لگتی۔ اتنے میں احمد جو بھی آگیا۔ اور پاس بیٹھ کر بولا" نادرہ! ہوش کرو۔ بچہ تو مر گیا۔"

نادرہ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا اور قہقہہ مار کر کہا" نہیں! میرا بچہ اب نہیں مر سکتا۔ یہ دیکھو! یہ دو روپے میرے پاس ہیں۔ اب اس کی دوا لاؤں گی!"

"یہ روپے کہاں سے ملے؟" احمد جو نے پوچھا۔

"یہ میرے حسن کے دام ہیں!" نادرہ نے ایک قہقہہ مار کر کہا۔

"نادرہ!" احمد جو خوفزدہ ہو کر بولا" کیا کہہ رہی ہو ہوش کرو!"

نادرہ نے ذرا غضبناک نگاہوں سے احمد جو کی طرف دیکھا اور کہا" پھر یہ روپے آتے کہاں سے۔ خدا قسم! میں نے اپنے لال کی خاطر حسن بیچا۔ اب اس کی دوا لاؤں گی۔ سن لیا!"

"بچہ مر گیا!" احمد جو نے کہا" اب صبر کرو نادرہ! توبہ کرو!"

"مر کیسے گیا؟" نادرہ بولی" کس نے کہا تم سے؟!"

"دیکھو!" احمد بولا" بولتا تو ہے نہیں!"

"بولے کیسے؟" نادرہ بولی" دوا ملے گی تو بولے گا ـــــ وہ شخص جس نے مجھے روپے دیتے تھے کہتا تھا بچے کو دوا ملے گی تو اٹھکر کھیلے گا!"

"وہ جھوٹا تھا پاجی!" احمد جو نے جواب دیا" نادرہ! تم نے بہت ظلم کیا۔ توبہ کرو توبہ!"

"تم جھوٹے ہو!" نادرہ نے غصے سے کہا" پھر اس نے مجھے روپے کیوں دئے؟"

"وہ پاجی تھا بدذات" احمد جو نے تھوکتے ہوئے کہا۔

"نہیں! نہیں!" نادرہ بولی" اسے گالی مت دو۔ اس نے مجھے روپے دئے۔ تم نے تو نہیں دئے!"

احمد جو بار بار" توبہ کرو نادرہ توبہ کرو" کہتا تھا۔ لیکن نادرہ اب ہوش میں نہ تھی۔

احمد جو نے کسی زمیندار سے کسی لیکر وہیں ایک گڑھا کھودا اور نادرہ کے لال کو جس کی خاطر اس نے اپنی عصمت بھینٹ چڑھائی تھی دفن کر دیا۔ جب بچہ آنکھوں سے اوجھل ہوا تو نادرہ کی حالت بہت یاس انگیز ہو گئی۔ وہ سارا سارا دن گلی کوچوں میں گھومتی اور ہر کسی سے یہی کہتی" یہ لو! یہ دو روپے تم واپس لے لو۔ یہ میرے حسن کے دام ہیں۔ میرا بچہ مجھے دیدو!"

احمد جو خود بیمار اور بیکار تھا۔ جب ملک کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور لوگ واپس جانے لگے تو وہ بھی نادرہ کو ساتھ لیکر اپنے گاؤں میں واپس آگیا۔

لیکن نادرہ تو اب پاگل ہو چکی تھی۔ وہ گاؤں چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں دن بھر گھومتی اور جو کوئی ملتا اس سے یہی دو لفظ کہتی۔" یہ لو۔ اپنے روپے لے لو۔ میرا بچہ مجھے دیدو۔ یہ میرے حسن کے دام ہیں!"

ایم اسلم

گدھا

ایک تاجر دوست کا بیان ہے کہ ایک کاروبار میں مجھے پانچ ہزار روپے نقد وصول ہونے تھے یا جیت میں آئے تھے۔ میں خوش اور مطمئن اپنے برآمدے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا کہ یک بیک ایک نوجوان جوتشی یوں نازل ہوگیا جیسے آسمان سے ٹپک پڑا یا زمین نے اگل دیا۔ دیکھتے ہی میں نے روکھے پن سے کہا "جوتشی جی معاف فرمایئے مجھے اس وقت نہ اپنا ماضی و مستقبل سننے کی خواہش ہے نہ ایک پیسہ آپ کی نذر کرنا پسند ہے۔ آپ حضرات نے مجھ سے کافی رقمیں جیتی ہیں۔ ریس اور لاٹری میں منحوس اور مبارک نمبروں اور گھڑیوں کی قیمتیں کافی ادا کی ہیں مگر ایک میں بھی مجھے کبھی کامیابی نہ ہوئی۔"

جوتشی:۔ بابا آپ تو یہ غلط فرمارہے ہیں۔ آج ہی غیبی ہاتھ نے آپ پر بھاری کرپا کی ہے۔

میں:۔ اچھا تو آپ نے میری تازہ کامیابی کا پتہ لگالیا ہے تو واضح رہے کہ اس معاملے میں میں نے کسی جوتشی سے مدد نہیں لی تھی۔

اتنے میں ایک اور بوڑھے جوتشی مہاراج نازل ہوگئے اور پہلے جوتشی کی طرف تیکھی نگاہ کرکے بولے "صاحب اس فریبی کے جال میں نہ پھنس جایئے گا۔ آج کل کسی کو آتا جاتا تو خاک نہیں جسے دیکھئے چندن لگائے گیروا روپ دھارے، کاشی کا رام رام کا چھاپا گھچا اوڑھے اور کھڑاؤں پہنے جوتشی کا بچہ بنا پھرتا ہے۔ بابو جی بھلا ہوا کہ میں سمے پر آگیا۔"

پہلا جوتشی:۔ مہاراج ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔ بدھیمانوں کا یہ سبھاؤ نہیں ہوتا۔ آپ نے کیسے جان لیا کہ میں مورکھ ہوں، اور آپ کے بدیا کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

میں:۔ سچ تو ہے یہ جاہل سہی آپ اپنے علم کا ثبوت دیجئے۔

دوسرا جوتشی:۔ بابو جی میں اصل بھرگو سمہیتا کے قانون پہ کام کرتا ہوں اور میرا حکم کبھی غلط نہیں ہوتا۔ جانچ کیلئے ایک کاغذ پر کوئی سا عدد لکھ رکھئے میں بتادونگا۔

میں کاغذ پنسل ڈھونڈنے لگا۔ جھٹ پہلے جوتشی نے جو میری کرسی کے پیچھے کھڑا تھا اپنے تھیلے میں سے ایک سادہ نوٹ بک اور پنسل نکال کر سامنے رکھدی۔ میں نے ایک سات۔ عددوں کا نمبر لکھا جس میں دو صفر شامل تھے۔ وہ ورق پھاڑ لیا اور مٹھی میں دبالیا۔ نوٹ بک پہلے جوتشی کو واپس کردی۔ دوسرے جوتشی نے چند منٹ خاموشی سے کچھ منتر پڑھے ایک نقش نکال کر حساب کیا اور صحیح نمبر بتادیا۔ میں دل میں حیران ہوا مگر زبان سے کہا "یہ اتفاق ہے۔ اچھا پھر سہی"

پہلے جوتشی نے پھر وہی نوٹ بک اور پنسل دی اور اب کے میں نے بجائے عددوں کے لکھدیا "گدھا"۔ ورق پھر پھاڑ کر رکھ لیا اور نوٹ بک اور پنسل پہلے جوتشی کو واپس دی۔ دوسرے جوتشی نے پھر منتر پڑھکر اور نقش بچار کر کہدیا "ابکے آپنے کوئی عدد نہیں لکھا"

"تو کیا لکھا؟"

"بتاتا ہوں" ایک منٹ سوچکر کہا "گدھا"

پہلا جوتشی دوسرے کے پاؤں پر گر گیا "مہاراج میں مان گیا۔ میں پیٹ کا نربل داس ہوں آپ بدیاوان گرو ہیں" اور جھولی اٹھا چلتا بنا۔ میں ایسا مرعوب ہوا کہ دس روپے کا نوٹ جوتشی جی کی نذر کیا۔ کہنے لگا۔ "میں کسی سے اپنے لئے کچھ مانگتا نہیں۔ آپ دیتے ہیں تو لے لیتا ہوں۔ ایک مندر کی تعمیر کے لئے کچھ روپے اکٹھا کر رہا ہوں یہ اس میں کام آئیگا"

میں نے کہا "تو پانچ اور قبول کرلیجئے" وہ ایک ہفتے کے اندر ایک بڑی مالی منفعت کی بشارت دیکر رخصت ہوگیا۔

دوسرے روز میرے کارپرداز کا کلکتہ سے تار آیا کہ "چمڑے کا نرخ بالکل گرگیا ہے۔ دیوالہ کی خبر ہے"

جوتشی کی پیشینگوئی میرے دماغ پر مسلط تھی۔ مجھے اچنبھے کے ساتھ غصہ آیا۔ سیدھا دھرمشالہ گیا۔ وہاں جوتشی کا پتہ نہ تھا۔ میں ہر طرف متجسس نظر دوڑا رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک پرزہ پڑا تھا اس پر کچھ عدد کے نشان میری تحریر سے معلوم ہوئے۔ اٹھا کر دیکھا تو وہی نمبر تھا۔ کاربن سے منقش اور کاغذ بھی اسی نوٹ بک کا تھا۔ اب سب کچھ صاف تھا۔ دونوں جوتشی ملے ہوئے تھے۔ پہلے نے میرے نمبر کو کاربن کے مٹنے سے پڑھکر کسی اشارے سے یا میری بیٹھک کے پیچھے سے دکھا کر دوسرے جوتشی کو آگاہ کردیا تھا۔ میں سچ مچ گدھا بن گیا تھا۔

محمد مسلم

انکارِ غم و تہیۂ نشاط

دل خوش رکھیں گے غم کو نہ اب منہ لگائیں گے
جو غم پڑے گا اُس کو خوشی سے اُٹھائیں گے

پیدا ہوئے تھے روتے ہوئے روتے ہی کٹی
باقی جو اب رہی ہے ہنسی میں اُڑائیں گے

طغیانیوں میں گریہ کی ایک سیل آب ہے
بہجائیں گے جو آپ یہ آنسو بہائیں گے

مارے غموں کے سوکھ کے اچور ہو گئے
مارے خوشی کے دیکھنا پھر پھول جائیں گے

غم سے زیاں دشمنِ جاں اور کون ہے
غم سے لڑیں گے دوست خوشی کو بنائیں گے

دیوارِ غم کی حسرتِ فانی پہ نیو ہے
ہم مار قہقہے اسے نیچا دکھائیں گے

کوہِ الم پہ برق زنِ خندہ ہے نشاط
ہنس ہنس کے اِس پہاڑ پہ بجلی گرائیں گے

تارے زیادہ کھِلتے ہیں شب ہائے تار میں
شبہائے تارِ غم میں سوا کھِل کھِلائیں گے

موزوں کریں گے نالہ ہی گر ہو گا ناگزیر
ٹانکے دہانِ زخم کے خنداں دکھائیں گے

ہر تلخ و ناگوار کو شربت سمجھ کے ہم
تفریحِ طبع کے لئے پی ہی تو جائیں گے

پڑ جاتی ہے جو ڈالئے عادت مزاج کو
بر رغمِ غم خوشی کو ہی عادت بنائیں گے

کر لیں گے مشق خوابِ پرستان دیکھنا
خلد و ارم کے ذہن میں نقشے جمائیں گے

سامانِ ظاہری سے تصور میں کیا نہیں
تارے بھی گر ضرور ہوتے توڑ لائیں گے

لعنت اُس عیش پر جو ملے بعد صد محن
دل بجھ کے رہ گیا تو مزہ خاک پائیں گے

صدقہ سمجھ کے جان کا نقصان مال کو
سرمایہ اپنے سودِ بقا کو بڑھائیں گے

اُجڑا کبھی جو بادِ حوادث سے خانماں
اور آشیانہ کنجِ چمن میں بنائیں گے

پت جھڑ ہوا چمن تو اُمیدِ بہار میں
سوکھی ہی ٹہنیوں میں نہ پھولے سمائیں گے

مرگِ محب و اہل و عزیز و قریب پر
دل سخت کر کے صبر کا مرہم لگائیں گے

کہہ دیں گے ہر سوارِ عدم سے پکار کر
جاتے ہو تم جدھر کو چلو ہم بھی آئیں گے

افسوس کے عوض خبرِ انتقال پر
"غم سے چھٹا بھلا ہوا" یہ گیت گائیں گے

وردِ زباں رکھیں گے ترانوں کو عیش کے
غم کے فسانے ہیچ ہیں سب بھول جائیں گے

ہست آج سے نہیں ہیں ازل کی زل سی ہست
ہے نیستی غلط، غمِ ہستی نہ کھائیں گے

ہوتا قلق سوا ہے دلاسا ہے اک بلا
ہنس ہنس کے زار زار کو ہم مسکرائیں گے

صفرائے معتدل سے رہیں گے سرور میں
سودائے اصل غم اسے منضج پلائیں گے

نغمہ غذائے رُوح ہے بادل دوائے دل
درمانِ غم کو مطرب و ساقی بلائیں گے

گلزار ہونگے دشت و بیابان نگاہ میں
جب خوشدلی کی عینکِ رنگیں چڑھائیں گے

زندہ دلی و حسنِ طبیعت کے سحر کار
ہر رنگ میں بہار کا عالم دکھائیں گے

دل غیر کا دُکھانا کہ اپنا روا نہیں
فریاد دلخراش سے پہلو بچائیں گے

اک پردہ پر نظارہ ہے ہر انقلابِ دہر
محظوظ ہو کے نعرۂ تحسیں لگائیں گے

منہ مانگے دام دیں گے حسیں ہیں گے ٹوٹکے
اک پُھول سا کھلا ہوا جب دل دکھائیں گے

روتے ہیں میرؔ و غالبؔ بحالی بسورتے
یہ سب امام ہاڑوں کو اچھا سجائیں گے

اکبرؔ، نظیرؔ، داغؔ، امانتؔ ہیں زندہ دل
محفل میں ان کے واسطے آنکھیں بچھائیں گے

کیا خوب کہہ گیا ہے سُر گباش ہو جیو!
بیت الصنم کو چھوڑ کے کعبہ نہ جائیں گے

نقشِ قدم پہ اپنے رنگیلے رسول کے
جمنا کنارے برج میں بنسی بجائیں گے

ہولی دوالی اور سلونوں بسنت ہیں
کیا جل کے لکھنؤ میں محرم منائیں گے

اک زمزمی الٹ کے سبو لیں بزمزمہ
عاصی یہ عین کعبہ میں گنگا نہائیں گے

لاحول سے نہ بھاگیں تو لاتقنطو کو پڑھ
اندیشے معصیت کے پھٹکنے نہ پائیں گے

جوڑا نیا بدل کے نہا دھو کے مل کے عطر
ہنستے ہوئے جنازے میں جنت کو جائیں گے

یوں حُسن خاتمہ ہو تو بعدِ وصال بھی
خاکِ لحد پہ لالہ و گُل لہلہائیں گے

ہم اس تماشہ گہ میں شہیدانِ عشق ہیں
پھر مر کے زندہ ہونگے نیا سانگ لائیں گے

خوش رہ وگرنہ خیال کے ہیں نقش خواب بھی
خوابِ عدم میں بھی غمِ دُنیا ستائیں گے

محمد احتشام الدین دہلوی

سماجی انقلاب کی تیسری مجلس۔

شیر و شکر

پہلا منظر

ایک قصبہ۔ احمد کا بنگلہ۔ کھانے کی میز پر احباب
خاص۔ ہندو مسلمان۔

قریشی:۔ احمد دُلہن مبارک، مگر اس میز پر ہماری بھاوج کیوں نہیں؟ کیا تم نے اُن کو پردے میں بٹھا دیا؟

احمد:۔ مجلس نکاح میں تم سب نے اُن کو دیکھا، پھر یہ کیا سوال ہے؟ رہا اس میز سے اُن کی غیر حاضری سو پردے سے آزادی کے معنی جو ہم نے قرار دیئے ہیں صرف یہ ہیں کہ عورت چار دیواری میں بند اور بیرونی کاروبار یا تازہ ہوا اور سیر و تفریح سے محروم نہ رکھی جائے۔ یہ نہیں کہ وہ شمع بزم، نقل محفل اور سوسائٹی کی تفریح کا آلہ بنائی جائے۔ جب تک فطرتِ انسانی میں جنسی کشش موجود ہے اور قانونِ ازدواج جاری ہے، دونوں جنسوں کا آزادانہ اتصال آگ اور بارود سے کھیلنا یا خرمن ناموس پر بجلی کو دعوت دینا ہے۔ تدبیر منزل کے نقطۂ نظر سے دیکھو تو دونوں کی جسمانی اور دماغی صلاحیتیں جُدا جُدا ہیں۔ اگر بیوی بزم آرائیوں میں زیادہ وقت صرف کرے تو گھر کی نگرانی اور بچوں کی پرداخت کون کرے؟

انصاری:۔ تو خیر سے نکاح کے ساتھ ہی آپ کے ہاں بچے بھی پیدا ہو گئے؟

چچا:۔ آج نہیں تو کل ہوں گے۔ مگر تیاری آج ہی سے ہونا چاہئے: بچہ پروری کا فرض بھی تعلیم و تربیت چاہتا ہے۔ یہ باہر مجلسوں میں نہیں حاصل کی جاتی۔ جس طرح تم کسب معاش کی قابلیت کے لئے اپنی زندگی کے پندرہ سولہ سال مکتبوں مدرسوں اور کالجوں میں صرف کرتے ہو۔ بالکل اسی طرح لائق بیوی اور ماں بننے کی قابلیت کے لئے تعلیم گاہیں، تربیت گاہیں اور نصاب ہیں اور وہ مدرسوں سے ماورا، ماں بہنوں اور ساس نندوں کی تربیت اور صحبت ہے۔

انصاری:۔ تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ عورت کی زندگی چولہے چکی، سلائی پروئی اور بچوں کی دیکھ بھال تک محدود رہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ اُنکے فرائض میں داخل ہیں۔ لیکن انسان کی زندگی صرف فرائض کی مصروفیت میں تمام نہیں ہوتی، ایک معتد بہ حصہ تفریح اور شوق کے مشغلوں پر بھی صرف ہوتا ہے۔ ہم دن رات صرف پڑھنے یا کمائی کے دھندوں میں نہیں گذارتے۔ اپنے ذوق کی تسکین یا تفریح کیلئے بھی کافی گھنٹے نکال لیتے ہیں۔ کیا عورتیں اس کی حقدار نہیں؟

چچا:۔ میں نہیں کہتا کہ نہیں۔ مگر تفریح عام مردوں کی صحبت میں منحصر نہیں۔ تفریح پیچھے ہے فرض پہلے۔ ہماری پسماندہ، پست اور فلاکت زدہ قوم کے سامنے فرائض کا یہ ہجوم ہے کہ تفریح کا زیادہ وقت نہیں۔ جدید میلان کے مطابق ہم لڑکیوں کے وقت کا زیادہ حصہ دماغی تعلیم کی نذر کر دیتے اور اُن کے خانگی فرائض کی نیازی سے غفلت برتتے ہیں۔ کنوارپنے میں اُن کی تعلیم کے اس نقص کے باوجود شادی کے بعد بھی ان کا وقت بیرونی صحبتوں، گپ بازیوں، عشوہ سازیوں یا تقریر و تحریر پر صرف ہو تو یہ خانگی کاموں سے رہیں۔ کیا آزادی اسی کا نام ہے کہ کوئی فرد یا جماعت اپنے فرضِ منصب سے سبکدوش ہو کر جو چاہے کرے؟

انصاری:۔ تو آپ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے مخالف ہیں؟

چچا:۔ اعلیٰ تعلیم کا مخالف کون ہو سکتا ہے؟ مگر اعلیٰ تعلیم کے معنی تم لوگوں نے جو صرف ریاضیات، طبیعیات، منطق، فلسفہ، شاعری وغیرہ سمجھ رکھے ہیں وہ ہمارے لئے اعلیٰ ہو سکتے ہیں، لڑکیوں کیلئے کسی مرض کی دوا نہیں۔ اُن کی اعلیٰ تعلیم وہ ہے جو اُن کو فرض شناس بیوی اور ماں بنائے۔ وہ ہماری اعلیٰ تعلیم سے مختلف ہے، جزو مشترک اخلاق و ادب۔ اس کے ماسوا ان کا نصاب قطعی جُدا ہونا چاہئے۔ اقتصادیات، خانگی ہنر، اصول حفظ صحت، تیمارداری، دایہ گری، پرورش اطفال وغیرہ بجائے خود فنون اور ہنر ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے اجزا ہیں۔ اہلِ ثروت ان میں سے بعض تعلیمات مدرسوں میں دے سکتے ہیں مگر ان کے اکثر حصوں اور غریبوں کی تمامتر تعلیمات کے لئے اور مدرسے ہیں جہاں ناقص یا کامل تعلیم و تربیت ہوتی ہے اور وہ میکا یا سسرال ہے۔ ماں کے نرم اور ساس کے گرم اُصول تربیت کے ماتحت۔ اب تم سمجھے میں مدرسوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کا کیوں مخالف ہوں؟ پردہ شکنی کی حمایت کے باوجود میں عورت مرد کا اختلاط سخت مضر سمجھتا ہوں۔ آئے دن جو طالبات کے اسقاطِ حمل، ہلاکت، خودکشی، فرار، عاشق کی غداری، معشوق کی بے پناہی اور اضطراری حرکات کی وارداتیں دیکھتے اور سنتے کیا قیدِ پردہ اِن سے بہتر نہیں؟

انصاری۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں کیا حق ہے کہ عورتوں سے روٹیاں تھپواؤ، چولھے پھنکواؤ، کپڑے سلواؤ، جھاڑو دلواؤ، خدمتیں لو۔ جب یہ کام نوکر چاکر کر سکتے ہیں۔ تم خود بھی تو سارے کام آپ نہیں کرتے!

احمد۔ ہم جو مردانہ کام آپ نہیں کرتے وہ دوسرے مرد ہی تو کرتے ہیں عورتیں نہیں۔ اسی طرح عورتوں کا اپنے کام آپ کرنا یا دوسری عورتوں سے لینا ایک ہی بات ہے۔ اول تو نوکروں سے اہل ثروت کام لے سکتے ہیں اور وہ اقلیت کی بنا پر مستثنےٰ طبقہ ہے۔ قوموں کے پروگرام اور دستور العمل بنا کرتے ہیں نادار طبقہ کی زندگی کو پیش نظر رکھ کر، جو سماج کا جزو اعظم ہے، نہ کہ اہل ثروت کی زندگی پر، جو غیر معمولی اور غیر فطرتی ہے۔ دوسرے اہل ثروت بیبیوں کے لئے بھی جو آوروں سے اہلیت میں اپنے خاص اہنر اور فن کا علم عام نگرانی کے لئے بھی ضروری ہے۔ جس طرح بچہ اپنے عوض دوسرے سے جنوانا ناممکن ہے، بچے کو دودھ بھی دوسروں کا پلوانا قانون فطرت کے خلاف ہے۔ قدرت نے فرائض جس کے لئے مخصوص کئے ہیں اُن میں رد و بدل یا کوتاہی نظام خانگی کو درہم برہم کرنے کا باعث ہو رہا ہے۔ یورپ ہو یا ایشیا معاشی گتھیاں بڑھتی جاتی ہیں، تکلفات اور اسراف سے زندگی بے مزہ ہوتی جاتی ہے۔ تجرد پسندی اور گرستی بھی شاکی ہے۔ کسی کو سو پچاس پورے نہیں پڑتے، کسی کو ہزار پانسو کافی نہیں۔

صغیر۔ اچھا جانے دو اس بے مزہ بحث کو۔ ہم اقتصادیات پر تمہارا لیکچر سننے نہیں بیٹھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ بھائی صاحب مسلمان ہیں؟ کس کے ہاتھ پر مشرف با سلام ہوئے ہیں؟

احمد۔ ہاں۔ وہ برہمو مسلمان ہیں اور کسی کے ہاتھ پر توبہ یا سر پر اسلام لانے کی ضرورت نہ تھی۔

صغیر۔ یہ برہمو مسلمان اسلام کا کون سا فرقہ ہے؟

احمد۔ میں فرقہ ورقہ تو جانتا نہیں۔ شرط اسلام میں تو وہی جانتا ہوں جو قرآن مجید نے بتائی ہے، کہ اللہ کو اکیلا مالک و معبود سمجھے، تمام معلمین سب کو سچا پیغمبر اور ان کی تعلیمات کو حق جانے، اللہ کی کل طاقتوں یا فرشتوں کو موجود سمجھے۔ اپنے آپ کو اپنے اعمال کا جوابدہ یقین کرے یا دوسرے لفظوں میں قیامت پر ایمان رکھے اور نیک چلن بھی ہو، بس وہ مسلمان ہے۔ میری برہمو کی حیثیت سے یہ سب پہلے ہی سے مانتی ہے اور نیک چلن ہے۔ اس کے مسلمان ہونے میں کیا شک ہے۔ بلکہ وہ تو بہت سے جاہل خاندانی مسلمانوں سے زیادہ مسلمان ہے جو زبان سے اللہ کو مانتے اور مُردوں کی ہڈیاں اور تبرکات پوجتے، غیر اللہ سے مرادیں مانگتے اور صرف سماد ہی سے ڈرتے ہیں۔

صغیر۔ تو تمہارے خیال سے برہمو مسلمان ہیں، اور محمد رسول اللہ کے ختم نبوت پر ایمان؟

احمد۔ ہاں، صرف برہمو نہیں، ہر وہ فرد یا جماعت جو ان عقائد کا قائل ہو مسلمان ہے۔ ختم نبوت پر اعتقاد کی شرط قرآن شریف نے نہیں منوائی۔ حدیث صحیح ہو بتاتی ہے کہ جو اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ سمجھے وہ جنت میں جائے گا۔ رسول اللہ نے قیامت میں اس کی شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔

پرسوتم۔ میں تو اس بنا پر اُن کو آخری نبی مانتا ہوں کہ آدمیوں کی ہدایت کا وہ طریقہ جو شخصی وحی و الہام، دھیان گیان، اور ریاضت تپسیا سے جاری تھا حضرت محمد پر ختم ہو گیا۔ وحی اور دھیان کے بدلے عقلی دور شروع ہو گیا۔ جاتیوں، نسلوں اور دیسیوں کے سدھار کے بدلے نوع انسان کا سدھار اور سنسار کی آزادی مذہب کا مقصد قرار پائی۔ اس سے آگے انسانیت کہاں جا سکتی ہے اور کس الہامی تعلیم کی ضرورت باقی ہے جو اگر اسلام میں حالات زمانہ کے مطابق اڈپٹیبلٹی اور لچک موجود ہے تو ہمیں ختم نبوت سے بھی انکار نہیں۔ کسی معقول ہندو کو بت پرستی، مورتی پوجا یا قدرت کی پرستش، سوائے ہندو دھرم کی شرط نہیں۔ ویدوں کے عالم اس کے قائل نہیں۔ بھلا ایسے ہندو کو تم مسلمان کہو گے؟ اپنی سوسائٹی میں لو گے۔ بیاہ بیٹا کرو گے؟

احمد: نہیں۔

موہن:۔ کیوں؟

احمد۔ ابھی نہیں بتاتا۔ بحث زیادہ سنجیدہ ہوتی جاتی ہے اور کھانے پر محل۔ سوپر کو پہاڑی پر پک نک پارٹی ہوگی۔ باقی گفتگو وہاں ہوگی۔

دوسرا منظر

ایک پہاڑی جھرنا۔ وقت نو بجے صبح۔ وہی احباب۔

قریشی۔ پرسوتم۔ تم آج کچھ سست نظر آتے ہو۔ ہو تو اچھے؟

پرسوتم۔ ہوں تو اچھا خاصہ، صرف رات نیند نہیں آئی۔

قریشی۔ کیوں؟

پرسوتم۔ خبر نہیں۔ اچھا احمد، رات کی ناتمام بحث تمام کی جائے۔ تم کہتے تھے کہ ایسے ہندو کو جو تمہارے خیال کے مطابق اسلام کی ضروری شرطیں پوری کرتا ہو اپنی سوسائٹی میں نہیں لے سکتے۔ کیوں؟

قریشی۔ ابے پاپی تیرے نیند نہ آنے کا سبب اب میں سمجھ گیا۔

پرسوتم۔ بتاؤ کیا سمجھے؟
قریشی:۔ ایک لفظ میں جواب دوں؟
پرسوتم:۔ ایک یا دس مگر سچ ہو ورنہ تہمت کی سزا ہوگی۔
قریشی:۔ رقیبہ!۔

سب پرسوتم کی طرف دیکھنے لگتے ہیں وہ جھینپ جاتا ہے۔ سب ہنستے ہیں۔

پرسوتم:۔ اچھا یہی سہی۔ پھر اس میں پاپ کیا ہے؟ اگر پاپ ہے تو وہی ہے جو احمد نے پہلے کیا۔ چچا آپ ہی انصاف کیجئے قریشی قابل سزا ہے یا نہیں اور سزا کیا ہو؟

چچا:۔ بیشک۔ اور سزا سندر گری پر لوٹے کالج کو پک نک پارٹی جہاں سماری سبھا کا جلسہ ہو۔

قریشی:۔ تم نے میری غیب دانی کی خوب داد دی۔ مجھے تو انعام ملنا تھا۔ خیر یہ سزا منظور ہے بشرطیکہ طالبات کی مدارات کا نظم بھاوج صاحبہ شانتا دیوی اپنے ہاتھ میں لیں۔

احمد۔ وہ خوشی سے قبول کریں گی۔

ہاں پرسوتم اب رہا تمہارے سوال کا جواب۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہندو دھرم سب رسولوں پیغمبروں رشیوں، منیوں کو مانتا ہے۔ مگر ماننے پر بس نہیں کرتا، پوجنے لگتا ہے۔ ہندوؤں کی غیر معتدل عقیدت انسانوں سے گذر کر حیوانات نباتات اور جمادات کی پرستش تک پہونچ جاتی ہے۔

پرسوتم:۔ اگر کوئی ہندو خدا کے سوا کسی شخص یا شے کی پرستش نہ کرتا ہو تو؟ تم لوگ ایک غلط فہمی رفع کر لو۔ ہماری تعظیم و تکریم کے طریقے ایسے ہیں جو تم کو پرستش معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری پوجا اور تعظیم کا فرق تم نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ ہمارے لفظوں کا صحیح مفہوم نہیں جانتے۔ مثلاً دیوتا ہمارے ہاں پرماتما، پیشور اور خدا کا مرادف نہیں۔ دیوتا مقدس ہستی ہے، جیسے رسول، فرشتے، اولیا۔ ان کی تعظیم بجالانے کے طریقوں میں بھی ہمارے تمہارے درمیان اختلاف ہے اور یہ محض ملکی نسلی، مقامی کلچرل (تہذیبی) فرق ہیں۔ ہم بزرگوں اور متبرک چیزوں کے آگے ڈنڈوت کرتے ہیں تم بوسہ دیتے ہو۔ ہم ماں باپ اور گرو کے پاؤں چھوتے ہیں، تم سر پر ہاتھ رکھکر سلام کرتے ہو۔ ہمارے طریقے تم کو مشرکانہ نظر آتے ہیں۔

احمد:۔ ذرا صبر کرو۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہندو دھرم دراصل کوئی مذہب ہی نہیں۔ یہ تو درویشی اور تصوف کی قسم کا ایک مشرب ہے۔ ہر مخلوق کو حق (اس کا مظہر سمجھنے والا) ہر کے آگے سر جھکانے والا، ہر نصیحت، تعلیم، فلسفہ، سفسطہ پر ایمان رکھنے والا۔ موجودہ ہندو دھرم نام ہے صرف ایک سماجی بندش کا جو برہمنوں نے پیدا کر رکھی ہے۔ یہ صرف جاتیوں اور چھوت کی پابندی ہے۔

پرسوتم:۔ تو ہندو مت میں اسلام کا تصادم مذہب سے ہوتا ہی نہیں۔ پھر یہ ہندو مسلم کے آپس کا بیر کیسا؟ یہ بچار اور جھگڑے کس بات کے۔

احمد:۔ احمق ہیں جو ہمارے اس تصادم کو مذہبی تصادم کہتے ہیں۔ یہ جھگڑا لڑائی دین و مذہب کیلئے نہیں۔ ہندو خدا کو ایک بھی کہتا ہے، سب رسولوں اور بزرگوں کو مانتا ہے۔ وہ جس طرح رام چندر جی، سری کرشن جی کو مانتا ہے اسی طرح گوتم بدھ، عیسیٰ مسیح، محمد عربی، آپکے شہید نواسوں، گرو نانک اور خواجہ چشتی کے آگے سر عقیدت جھکاتا ہے۔ کوئی ہندو گرجا میں شریک عبادت ہو یا مسجد میں نمازیں پڑھے، روزے رکھے، قرآن پڑھے، ہندو برادری کوئی تعرض نہیں کرتی جب تک وہ اپنی جاتی اور چھوت کا پابند ہے۔ تو بھائی جاتی اور چھوت تو دھرم نہیں، پھر یہ ہندو مسلم کی لڑائی دھرم کی کیونکر ہوئی؟

پرسوتم:۔ پھر یہ لڑائیاں کیوں ہیں؟ جب ہندو دھرم ایک گنگاجی ہے جسکے پیٹ پر سب بہے چلے جاتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، جینی، بودھ، پارسی، گنگاجی کو کوئی چنتا ہی نہیں۔

احمد:۔ یہی تو ہمارا بھی کہنا ہے۔ جھگڑا دھرم کا تمہارے لئے نہیں ہمارے لئے ہے۔ اسلام دھرم صرف عقائد اور عبادات کو قرار نہیں دیتا۔ اس کا مقصد اس سے بلند تر ہے۔ نوع انسان کی تمام اصلاحات، روحانی، جسمانی، سماجی، سیاسی، اقتصادی۔ صرف نمازیں پڑھکر کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔ اسے ہر اصلاح میں حصّہ لینا ہے۔ ہندو سماج کا ظلم اور بے انصافی اسے گوارا نہیں۔ نوع انسان کی مساوات اور آزادی کی بنیادوں پر اس کی عمارت ہے۔ مسلمان لئے کھوکھلا ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ چھوت اور جاتیوں کا بچار اس کی جڑ پر کلہاڑے ہیں۔ ان کو وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ سبب ہے کہ ہندو اگر موحد بھی ہو تو ہم اُسے اپنے میں نہیں لے سکتے۔ چھوت انسان کی انسان سے منافرت کا سبب ہے یا نتیجہ۔ جو کچھ ہو، منافرت کے ساتھ ازدواجی رشتہ کیا معنی، سماجی رشتہ بھی مضبوط نہیں ہو سکتا۔

پرسوتم:۔ ہمارے بدھیمان جاتیوں اور چھوت کا بچار اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہزاروں برس کی رسم و عادت دلوں اور ذہنوں سے مٹ نہیں سکتی۔ مگر ہم میں سے جو افراد کامیاب ہو کر موجودہ سطح سے بلند ہو چکے ہیں اور ان امتیازات کو اٹھا چکے ہیں اُن کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟

احمد۔ بیشک جو موحد ہیں اور جاتی اور چھوت کے روگ سے آزاد ہیں وہ مسلمان ہیں۔ اور اسلام میں رکھا کیا ہے؟

پرسوتم۔ ایسوں کا بیاہ شادی بھی مسلمانوں میں ہو سکتا ہے؟

احمد۔ عام مسلمان کیا کریں گے میں نہیں کہہ سکتا۔ تمہارے برہمنوں کی طرح ہمارے علما نے بھی مذہب کو کم مسخ نہیں کیا ہے۔ میں بذات خود ایسے لوگوں کو اسلامی برادری میں داخل سمجھتا ہوں۔ رہا بیاہ تو اس کا تعلق صرف میاں بیوی تک محدود نہیں ہوتا۔ دونوں کی برادریاں جب تک قبول نہ کریں ایسا رشتہ چین اور امن کا باعث کہاں تک ہو سکتا ہے ادھر دولہا کی برادری دولہا سے مقاطعہ کرے گی اور دولہن کی دلہن اور اسکے گھر سے۔

قریشی۔ ارے یار چبا چبا کر باتیں کرنے کی ہی نہیں۔ صاف کیوں نہیں کہتا کہ رقیہ سے شادی کرنے کی تدبیر بتاؤ۔ تو سنو دل لگی برطرف سماج کا مقابلہ سماج ہی کر سکتا ہے، فرداً فرداً ناممکن ہے۔ صرف بین الاقوامی ازدواج ہی نہیں اور بھی سماجی اصلاحات کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ ہمارے ہم خیال کچھ ترقی پسند جوان اکٹھے ہو کر قربانیوں کے لئے تیار ہو جائیں، برادری کے مظالم کا مقابلہ کریں۔ جیسے رسول اللہ اور گذشتہ صدی میں راجہ رام موہن رائے اور دوسرے مصلحوں نے کیا اور آخر کامیاب ہوئے۔ ہمارے لئے اتنی دشواریاں نہیں، زمانہ ہمارے ساتھ ہے۔ جاہل سماج ہمارے اس زبردست سماج کا مقابلہ دیر تک نہیں کر سکتا پرسوتم پر تو رقیہ سوار ہے۔ موہن تم کیا کہتے ہو؟ کتنے ہندو جوان اس سماج میں شریک ہو سکتے ہیں؟

موہن۔ ہندو تم سے زیادہ سماج کے ستائے ہوئے ہیں۔ زمین تیار ہے فضا موافق ہے۔ کالجوں کے زیادہ تر نوجوان جو بندے ماترم اور گائے باجے، اردو ہندی کے جھگڑوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں، سچائی کی اس کرن کے پھوٹتے ہی سب بھول کر اس نئے سماج میں آ کودیں گے اور تم سے زیادہ حصہ لیں گے۔

تیسرا منظر

وقت شب۔ احمد کی کوٹھی۔ کھانے کی میز۔

صغیر۔ آج کی گفتگو میں مجھے ایک بات کھٹک رہی ہے۔ تم نے مسلمانی کیلئے صرف توحید اور مساوات کی شرط قرار دی ہے۔ مگر یہ نمازیں، روزے، حج، زکوٰۃ سب ہوا ہو گئے؟

احمد۔ تم مولوی آدمی ہو، شاید مجھے نیچری کہدو۔ اس لئے میں چچا سے تصدیق چاہتا ہوں۔ کیوں چچا قرآن میں مومن اور مسلم دو اصطلاحیں علیحدہ علیحدہ استعمال کی گئی ہیں یا نہیں؟ میں نے ان میں جو فرق سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم تو ہر وہ شخص ہے جو توحید، رسالت، ملائکہ، حشر و نشر کا قائل اور نیکو کار ہو ایسے لوگوں کو صرف یہی نہیں کہ کوئی اندیشۂ عذاب نہ ہوگا بلکہ ہر لا الٰہ الا اللہ یعنی قائل توحید کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ قرآن مجید نے کل اہل کتاب کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا۔ ارشاد ہے کہ "یہ سب یکساں نہیں۔ اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو راتوں کو نماز میں کھڑے آیاتِ الٰہی پڑھا کرتے، اللہ کے آگے سجدوں میں گرتے، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے، اچھے کاموں کو کہا کرتے، برائیوں سے منع کرتے اور نیک کاموں میں دوڑ پڑتے ہیں۔ یہ نیک بندے ہیں"۔ (آل عمران۔ ع ۱۲) ظاہر ہے کہ یہ لوگ نہ مومن کی طرح نمازیں پڑھتے نہ روزے رکھتے تھے۔ قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو تبلیغ کی اور سرور کائنات نے مسیحی فرمانرواؤں کے سامنے جو الٹی میٹم پیش کیا وہ بس اتنا ہی قول و قرار تو تھا کہ "آؤ ان باتوں پر ہم تم متفق ہو جائیں جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہیں۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور انسان انسان کو مالک نہ سمجھے"، یعنی امرا اور پادریوں کی غلامانہ تابعداری اُٹھ جائے اور سوسائٹی کے سب طبقے مساوی اور ایک ہو جائیں۔ (آل عمران ع ۷) مسیحی بادشاہ حبشہ اسی معنی میں مسلمان تھا جس کی وفات کی خبر معلوم کر کے حضور انور نے نماز جنازہ غائب پڑھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اہل کتاب سے معاشرت و مناکحت جائز سمجھی گئی اور جاری رہی۔ بلا قید صوم و صلوٰۃ یہ مسلمان تھے اور مقررہ شرطوں کے ساتھ آج بھی ہیں۔

رہے مومن۔ مومن اور ایمان والوں سے اُن خواص کو خطاب کیا گیا ہے جن سے اعلیٰ اخلاقی معیار اور قربانیوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ انکو صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی دعوت نہیں دی گئی۔ بلکہ حیا، وفا، ایثار، حلم، سخاوت، جہاد اور بے نفسی کی بھی فرمائش نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی سخت شرطیں عوام کے لئے لازم نہ ہو سکتی تھیں۔ یوں سمجھو کہ اسلام کی عالمگیر کانگریس میں دو طرح کے ممبر قرار دئے گئے ہیں۔ ایک چار آنے والے۔ ان میں موحد، نیک چلن، اہل کتاب اور کل نیکوکار موحدین داخل ہیں۔ دوسرے وہ خاص صالح، عبادتوں، ریاضتوں اور قربانیوں سے نفس کو پاک کر کے قابو میں رکھنے والے ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ یا انتظامیہ) کے ممبر ہیں۔ جو خود امن سے رہنے والے، دنیا میں امن و صلح پھیلانے والے، امن و صلح سے انکار کرنے والوں سے (اور کافر کے یہی معنی ہیں) جانی اور مالی جہاد کرنے والے ہیں۔ یہ ہیں مومن۔

ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ہمارے جیسے لاکھوں مسلمانوں کو یہ درجہ نصیب نہیں۔

چچا:۔ واقعی یہ نکتہ تم نے خوب سمجھا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید اور خلافت راشدہ کی تاریخ اسکی مؤید ہے۔

صغیر:۔ بھئی میری کھٹک جاتی رہی۔

پرسوتم:۔ اگر یہی اسلام ہے تو دُنیا میں لاکھوں ایسے مسلمان ملیں گے جو اور دھرموں سے نامزد ہیں۔

چچا:۔ نامزد کسی دھرم یا دین سے ہوں پھر بھی مسلمان رہ سکتے ہیں۔ اسلام اس معنی میں دین نہیں جو اور اقوام میں مفہوم ہے۔ ان میں دین محدود ہے نفس اور رُوح کے تزکیہ تک، یہ تزکیہ اسلام کا صرف ایک جزو ہے۔ اسلام دین و مذہب سے ماورا، سوشلزم کی طرح ایک نظامِ اجتماعی ہے۔ صرف روحانیت مستزاد ہے۔ نظام اجتماعی کی حیثیت سے دُنیا کی کوئی کمزور قوم یا جماعت اس سے جدا نہیں رہ سکتی۔ یہ وہ سوشلزم ہے جو اخلاقی بے لگامی اور رُوحانی افلاس سے پاک ہے۔ صلح و امن کی بھوکی دُنیا کو اصولِ اسلام کے بغیر چین نہیں آ سکتا خواہ اس اصول کا نام جو کچھ رکھ لیا جائے۔

موہن:۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم اسلام کو صلح و امن کا پیغام کہا کرتے ہو۔ پھر جہاد کے کیا معنی ہیں؟

احمد:۔ میں مجملاً بتا چکا ہوں، جب طبعیت بشری میں نفسانیت، شر، خود غرضی موجود ہے اور رہے گی، تشدد کی ضرورت بھی برقرار رہیگی۔ سب لوگ محض نصیحت اور نرمی سے راہِ راست پر آنے والے نہیں، یہ ممکن ہوتا تو شائستہ سے شائستہ اور مہذب قوموں میں قانون تعزیرات مدون نہ ہوتا اور قید خانے تعمیر نہ ہوتے۔ شریروں کو سزا دینے کی ضرورت نہ کبھی دفع ہوئی ہے نہ ہوگی۔ ان کو صلح و آشتی سے سمجھانے کے بعد بدرجۂ آخر زور اور طاقت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے بعض دفعہ زخمی کے بعض عضو کاٹ کر باقی جسم کو محفوظ کر لیتے ہیں اور جان بچا لیتے ہیں۔ یہی ہے جہاد۔ لیگ اقوام نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی مگر کاربند نہ ہو سکی۔ کیوں؟ اس قانون کو مذہبی تقدس حاصل نہ تھا۔ رب العالمین کا جزو اعظم غائب تھا۔ جس کے بغیر کوئی قومی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اہنسا اور ستیاگرہ صرف ہندوستان کے مجبور اور بے دست و پا غلاموں کے لئے ایسا ہی ہتھیار ثابت ہو سکا جیسے عورتوں اور بچوں کے لئے مردوں کے مقابلے میں دانت اور ناخن۔ پھر بھی حبشیوں کا ستیہ گرہ مسولینی کے مقابلے میں یا یہود کا ہٹلر کے مقابلے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔ غرض دُنیا میں کوئی ایماندار مظلوم شخص مسلمان ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ع۔

کافر نتوانی شُد ناچار مسلماں شو

یوں نام جو چاہے رکھے۔

موہن:۔ پھر اسلام اور ہندومت میں کوئی بَیر نہیں۔ آج ہندو دھرم میں پوجا پاٹ، دھیان گیان کوئی حصہ بھی ضروری نہیں۔ کچھ زیادہ سنسکرت آمیز بھاکا، گائے، باجہ، دھوتی، پتوں میں رسوئیں، لوٹا، جنیو جن پر ہندوؤں کا اصرار ہے اور ہندو کی پہچان، ان میں سے ایک کا تعلق مذہب سے نہیں۔ اصل میں ہندومت بھی ایک مقامی سماجی نظام ہے، مذہب نہیں۔ اور اسلام ایک عالمگیر سماجی نظام ہے۔ تو فرق جزو کل کا ہے، زمانے کا ہے، مقام کا ہے۔ صرف آخری نظام کی حیثیت سے اسلام کا مطمح نظر زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ ہم تو ہندو رہ کر مسلمان رہ سکتے ہیں۔

احمد:۔ بیشک ملکی لحاظ سے ہمیں بھی ہندو ہونے سے چارہ نہیں۔ ہندوستانی کی حیثیت سے ہم ہندو، انسانی برادری کے ممبر کی حیثیت سے مُسلم۔ اور اگر ایثار و تزکیہ نفس حاصل کر کے نوع انسان کے سچے خادم بنیں تو مومن بھی ہیں۔

موہن:۔ قرآن کہتا ہے خدا ایک ہے۔ سب مخلوق برابر ہیں۔ وید کہتے ہیں خُدا کے سوا کوئی موجود ہی نہیں، ہر چیز جو ہم دیکھتے ہیں خُدا کا ظہور ہے، جزو ہے، یعنی سب جیو مقدس ہیں، اس لئے برابر ہیں۔ خُدا کی اصل عبادت مخلوق کی سیوا۔ اور مخلوق کی سیوا پرماتما کی سیوا اور عبادت ہے کہ ہر میں ہر (خدا) ہے۔ یہ بھی تو توحید ہے، ٹھیک توحید، توحیدِ الٰہی ہی نہیں، توحید ہستی۔ فرق صرف تعبیرات اور اصطلاحات کا ہے مقصد صرف ایک ہی ہے اور اس کے حصول کا اُصول اور ذریعہ بھی ایک ہی۔ طریق کار میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ زمانہ کے لحاظ سے ضرورت ہے صرف مطابقت ماحول (اڈیپٹیبلٹی) کی۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ، پارسی سب دھرموں کو اسی مطابقت ماحول (اڈیپٹیبلٹی) کے بغیر سوشلسٹوں، نازیوں اور فیسسٹوں نے مذہب سے بدگمان اور عاجز ہو کر سرے سے اُسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔ مگر مذہب سے بدتر بندشیں قائم کر کے دُنیا سے امن اور شانتی چھین لی ہے اور ایسا اُپدرو مچا رکھا ہے کہ بدنام مذہب نے بھی کبھی اس سے زیادہ نہ کیا ہوگا، جو مظالم مذہب کے نام پر ہوتے تھے اُن سے زیادہ اب نسل کے نام پر ہو رہے ہیں۔

چچا:۔ قرآن بتاتا ہے کہ تمام اقوامِ عالم ایک ہی اُمت تھیں۔ بعد میں

اصل میں دین یعنی توحید سے کٹ کٹ کر بٹ بٹ گئیں۔ خدا کہتا ہے ہم نے روئے زمین کی ہر قوم کے لئے عبادت کی خاص خاص نشانیاں بنادی ہیں۔ وہ محض نشانیاں ہیں۔ اصل قانون یا اصول ایک ہی ہے۔ اس میں اختلاف جائز نہیں۔ وہ قانون کیا ہے؟ توحید کامل۔ جس میں توحید باری، وحدت خلائق وطبقات وجماعات، آزادی ومساوات داخل ہے۔ جو ایثار، قربانی اور تہذیب اخلاق سے حاصل ہوتی ہے۔ خیام عبادت کی نشانیوں کی یوں شرح کرتا ہے:۔

بتخانہ وکعبہ خانۂ بندگی است
ناقوس واذاں ترانۂ بندگی است

محراب وکلیسا وتسبیح وصلیب
حقا کہ ہمہ نشانۂ بندگی است

محمد مسلمؔ

کلامِ فرحت

محفلِ حسنِ یار میں، پھولوں کی جلوہ زار میں
لٹ گئی آبروئے دید، آج بھری بہار میں

آگ سی ہے لگی ہوئی، دامنِ قلبِ زار میں
کوندرہی ہیں بجلیاں، جلوۂ حسنِ یار میں

عشق کا راز ہے نہاں دیدۂ اشکبار میں
گوہرِ اشک بھر دئے، دامنِ حسنِ یار میں

ایک نگاہِ ناز سے چھیڑ دیے پھر حیات کو
میرا سکونِ زیست ہے، آپ کے اختیار میں

جذبۂ عشق، مستقل، برقِ جمال، بیقرار
ہے کوئی فتنہ گر ضرور، پردۂ روزگار میں

بیٹھا ہوں محوِ بیخودی، سامنے ہے دھری ہوئی
دولتِ خوابِ زندگی، دامنِ تار تار میں

رحمتِ کارساز کا، دل کو یقین ہوگیا
ذوقِ گناہ بڑھ گیا، قلبِ گناہگار میں

جام وسبو کا ڈھیر ہے، اہلِ نظر کے سامنے
شانِ شکستِ توبہ ہے، توبۂ بادہ خوار میں

واہ رے رعبِ حسنِ یار! اشک سمٹ کے رہ گئے
حالتِ دل نہ کہہ سکا، کوششِ اختصار میں

موجِ تلاطم آفریں، تہ میں لئے ہے اک سکوت
روحِ سکوں پذیر ہے، قلب کے انتشار میں

اہلِ نظر نے دیکھ لیں، ذوقِ نظر کی شوخیاں
تم ہو تبسم آفریں، جلوہ گہِ بہار میں

پوچھ لیا جو حالِ دل اشک امڈ کے بہ چلے
جانے کہاں کا سحر تھا، پرسشِ غمگسار میں

روح تری ہے، دل ترا، جان تری ہے، میں ترا
کس کی بنا پہ ہو غرور، ہستیِ مستعار میں

واہ رے آبِ ضوفگن، موج پہ موج موجزن
کھیل رہی ہیں بجلیاں، دامنِ آبشار میں

فرحتِ خستہ وخراب آہی گیا کشاں کشاں
عشق کی بارگاہ سے، بزمِ جمالِ یار میں

فرحتؔ کانپوری

ظالم محبت:-

رُوبہ صحت

آہ! آج بھی جب کبھی میں گذشتہ واقعات کو یاد کرتی ہوں تو قلب پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مارچ کا مہینہ ختم ہو چکا تھا ایشیائی اپریل کا آتشیں مہینہ شروع ہو رہا تھا۔ شہتوت کی ٹہنیاں نیلے نیلے شہتوتوں سے لدنے لگی تھیں۔ تالاب میں کنول کھلے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دریچوں سے ہار سنگھار اور چنبیلی کی لپٹیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سنہری دھوپ اب شعلوں کی طرح تپنے لگی تھی۔ ہری ہری گھاس دھوپ کی تپش سے سنہری ہو رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں عریاں تھیں۔ اور باغ میں گرم ہواؤں کے سبب دن بھر ویرانی طاری رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سال ریاست کیپاش میں سخت گرمی پڑیگی۔

اب بھیا منیر کی صحت میں نمایاں تبدیلی معلوم ہوتی تھی۔ سب کو اطمینان سا ہو چلا تھا۔ مگر جہاں ان کی تندرستی پر سارا خاندان خوش ہو رہا تھا وہاں چند اندیشوں نے بعض لوگوں کو نہایت ہراساں کر رکھا تھا۔ میں نے زندگی کو اس متانت سے کبھی نہ دیکھا تھا جیسا اس زمانے میں کیپاش میں دیکھ رہی تھی۔

اس دوپہر گرمی اور دلی الجھنوں کے سبب میں نڈھال ہو رہی تھی۔ پورا دن میں نے خوابگاہ میں بسر کیا۔ کوئی تین بجے ایک ہلکا پھلکا سا سفید ریشمیں لباس پہن کر نیچے اتری۔ دل بے حد اداس ہو رہا تھا۔ رات کی باتیں ذہن میں تازہ تھیں۔ یہ سوچ کر میں نیچے جا رہی تھی کہ تھوڑی دیر بھیا منیر کے کمرے میں بیٹھ کر دل بہلاؤں گی کہ اتنے میں بالاخانے کے زینے پر موتیا کنیز ملی۔ "خاتون روحی" اس نے کہا۔ "آپ اس سفید لباس میں بالکل چنبیلی کی کلی معلوم ہو رہی ہیں۔ مگر مرجھائی ہوئی سی۔"

میں نے دھیمے سے کہا۔ "کیا میں اداس معلوم ہوتی ہوں موتیا؟"

"بہت" اس نے کہا۔ "شاید گرمی کی وجہ ہو۔ بیگم زبیدہ آپکو پوچھ رہی ہیں۔"

"سب لوگ کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"حرم سرا کے ایوان میں سب کے سب موجود ہیں۔ سر جعفر (چچا لوٹ کے سکریٹری) بھی آتے ہوئے ہیں۔ صاحبزادے منیر کی صحتیابی پر ایک جشن منایا جانے والا تھا نا ـــ اسی سلسلے میں بات چیت اور تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

اتنا سنکر میں نے ایک آہ بھری۔ "اچھا میں بھی وہاں جا رہی ہوں ـــ !"

موتیا دو لمحے کھڑی رہی پھر مسکرا کر کہا۔ "ہاں میں تو بھول ہی گئی۔ سر لوٹ آپ کو ڈھونڈ رہے تھے، شاید سر ہارکی کا کوئی پیام دینا چاہتے تھے۔"

اتنا سنکر میں شدت مسرت سے گلابی ہو گئی۔ جھک کر موتیا کو زور سے پیار کیا، پھر زینے پر سے دوڑتی ہوئی حرم سرا میں چلی گئی۔

جب میں ایوانِ نشست میں داخل ہوئی تو دادی زبیدہ سکریٹری سے کہہ رہی تھیں "جلسۂ رقص قصرِ لنسرین کے مہمان خانے کے بڑے ایوان میں منعقد ہوگا۔"

بوڑھے سر جعفر ایک چھوٹی سی تپائی کے پاس کاغذات کے بنڈل لئے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر گار اور بھیا منیر دریچے کے پاس شطرنج کھیل رہے تھے۔ کنیزیں ادھر ادھر مصروف تھیں۔

مجھے دیکھکر سر جعفر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "آداب خاتون روحی۔ نواب لوٹ آپکو ڈھونڈ رہے تھے۔"

"میں آئی بھی انہیں کی تلاش میں ہوں سر جعفر!" یہ کہتے ہوئے میں دادی زبیدہ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر حبشی خانہ زاد دادی زبیدہ کے حکم کے مطابق عطر گلاب اور عطر خس پانی میں ملا ملا کر چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ پنکھے تیزی سے چل رہے تھے۔ صنوبر کنیز دادی جان کے بائیں ہاتھ کے قریب انکے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔

اس دوپہر دادی زبیدہ نے اپنے بال اس انداز سے سنوارے تھے جیسے کبھی نورجہانی عہد میں سنوارے جاتے تھے۔ اپنی طرف سے وہ انہیں بہت سٹائلش سمجھے بیٹھی تھیں اور بار بار فخر سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔

"میں گنہگار کس منہ سے اللہ کا شکریہ ادا کروں سر جعفر؟" دادی زبیدہ نے اپنی زری پنکھیا ہلاتے ہوئے کہا۔ "اسنے میرے دل کو کھا لیا"

میری بیچاری مادام" سر جعفر نے کہا۔

بڑھا ڈاکٹر گار شطرنج کھیلتے کھیلتے مڑکر بولا: "اس تمام موسم میں بیگم زبیدہ نے ایک جشن بھی نہیں منایا؟"

"میں نے مادام کو اپنی عمر میں اتنا پریشان کبھی نہ دیکھا تھا!" سر جعفر نے جواب دیا۔

"اور کیا ــ" دادی زبیدہ اپنی ریشمیں دستی کو ناک کے پاس لیجاتے ہوئے گویا ہوئیں: "جب سے کیبہاس آئی ہوں نہ مجھے اپنے کپڑوں کا ہوش ہے نہ زیوروں کا۔ منیر کی علالت نے حواس باختہ کر رکھا تھا۔ تم جانتے ہو ڈاکٹر، مجھے اپنے قدیم ہیروں سے کس قدر عشق ہے۔ مگر میں نے انہیں یہاں اس موسم میں ایک بار بھی نہیں پہنا! اب انشاء اللہ منیر کے غسلِ صحت پر پہنوں گی۔"

"اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟" سر جعفر نے اپنی خشخشی داڑھی کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں اُکتا سی گئی۔ "نہ جانے چچا لوٹ مجھے کیوں بُلا رہے تھے...."

دادی زبیدہ متوجہ ہوئیں: "مجھے نہیں معلوم.... شاید تمہیں کوئی پیام دیتا.... صنوبر! یہ دریچی بند کر دو۔ گرم ہوا اندر آرہی ہے۔"

"آپ نے کیا فرمایا دادی جان؟" میں نے مچل کر پوچھا۔

"شاید کوئی پیام.... جی ہاں جی ہاں سر جعفر۔ میں نے سلطان حمید کو اور اُن کے لڑکوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا ہے۔ تم کیا پوچھ رہی تھیں بیٹی؟"

میں چڑ سی گئی۔ اُٹھنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا، اور چچا لوٹ ایک خط ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"روحی۔ تم کہاں تھیں؟" اُنہوں نے آتے ہی کہا: "سر ہارلی کا خط آیا ہے۔ وہ اس ہفتہ کے اختتام پر دریائے ناٹ پاس کے کناروں پر تفریحاً آرہے ہیں۔ اُنہوں نے ہم سب کو وہاں پکنک کی غرض سے مدعو کیا ہے۔"

"کیا واقعی؟" دادی زبیدہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں ــ" چچا لوٹ نے کہا، پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا: "اور خصوصیت سے روحی کو مدعو کیا ہے اور سلام شوق لکھا ہے۔"

"پھر تو ضرور چلئے چچا لوٹ" میں نے مچل کر کہا۔

چچا لوٹ ابتک مسکرا رہے تھے بولے: "کم از کم میں تو انکی دعوت ٹال نہیں سکتا۔ ضرور جاؤنگا۔"

"اور میں بھی ــ کیوں دادی جان پیاری؟ کیونکہ میں نے سر ہارلی کے کئی خطوں کا جواب نہیں دیا۔ جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔" میں نے دادی جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے تم لوگ کس طرح برداشت کر لیتے ہو!" دادی زبیدہ نے حسب عادت دخل در معقولات شروع کر دی: "میرا تو یہ حال ہے کہ جب تک خط کا جواب نہ لکھ لوں چین نہیں آتا۔ رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میں خطوط کے جواب لکھوانے میں مصروف رہتی ہوں۔"

"میرا جی بھی بہت چاہتا ہے کہ سر ہارلی کی دعوت قبول کر لوں۔" بھیا منیر نے کہا۔

چچا لوٹ بولے: "اُنہوں نے یہی لکھا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کا تم پر مفید اثر پڑے گا۔ مزید براں جسنی بھی شادی سے پہلے تفریحاً کہیں جانا چاہتی تھی۔ اور ہاں ڈاکٹر گار ــ تمہیں ساتھ لانے کی اُنہوں نے بہت تاکید کی ہے۔ لکھا ہے کہ گار کی بذلہ سنجی کے بغیر وہاں کا لطف ادھورا رہے گا۔"

"شکریہ" ڈاکٹر گار نے کہا۔ پھر بولا: "بڑا لمبا چوڑا خط معلوم ہوتا ہے جس میں اتنی ساری باتیں لکھی ہیں۔"

میں نے کچھ سوچ کر اچانک کہا: "آپ نے سر ہارلی کو دعوتی رقعہ بھیجدیا دادی جان؟"

"لو، اور سُنو! بھیجا کیوں نہیں!" دادی زبیدہ کہنے لگیں۔ "میں تو کسی کو نہیں بھولتی۔ چہ جائیکہ سر ہارلی! میرا حافظہ تو تم لڑکیوں سے زیادہ تیز ہے۔ انہیں کیونکر مدعو نہ کرتی؟"

"تو زبیدہ" چچا لوٹ نے فرمایا: "کہو کب تک چلتی ہو؟"

"میں تو شاید نہ جا سکوں" دادی زبیدہ نے کہا: "اس جشن کا انتظام میں اپنی خاص نگرانی میں کرانا چاہتی ہوں۔ مزید برآں اس ہفتہ سلطان حمید کی والدہ ــ وہی ملکہ ثمرہ ــ کو مدعو کر رکھا ہے، کس طرح جا سکتی ہوں؟ تم لڑکیوں لڑکوں اور ڈاکٹر گار کو ساتھ لیجاؤ۔ اور جب لوٹو تو سر ہارلی کو جشن کیلئے ساتھ لیکر لوٹو۔"

مجھے اس پروگرام سے دلی خوشی ہوئی کہ دادی جان یہیں رہینگی۔

یہ سُنکر چچا لوٹ بولے: "تم نے بڑا اچھا کیا زبیدہ، جشن کی تاریخ مقرر کر لی۔ ورنہ گرمی بڑھ جاتی تو بے لطفی ہوتی اور مہمانوں کو تکلیف جُدا ہوتی۔"

"اور کیا لوٹ ــ" دادی فخریہ کہنے لگیں: "میں ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ یہ تو میری ہمیشہ کی عادت

ٹھہری، سر جعفر! بعض لوگ کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ مارے سستی کے ایک دن کا کام دو مہینوں میں ۔۔۔"

چچا لوتش بات کاٹ کر بولے "شادی مئی کے آخری ہفتے میں ہو جائے تو کیسا ہو زبیدہ؟"

"بڑا اچھا ہو" ڈاکٹر گار شطرنج کھیلتے کھیلتے بولا۔

"مگر ڈاکٹر" دادی زبیدہ نے کہا "ایسی عظیم الشان شادی کا اہتمام بھی تو اعلیٰ پیمانے پر ہونا ہے۔ جو میری اپنی شادی پورے تین سال کی تیاری کے بعد ہوئی تھی اور پھر بھی شہزادی عائشہ کہتی رہیں کہ کسر رہ گئی۔ تمہیں تو یاد ہوگا؟"

"مگر اس شادی میں دیر نہ ہونی چاہیے بیگم" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ میں جانتی ہوں" دادی زبیدہ نے کہا اور سگریٹ جلایا۔

"تمہارا شکریہ پیارے ڈاکٹر۔ بھائی منیر نے جھک کر ڈاکٹر گار سے سرگوشی کی۔

دادی نے سگریٹ کا ایک کش کھینچ کر فرمایا "یہ تو جشن والے دن سے پتہ لگے گا کہ کونسی تاریخ شادی کے لئے مبارک ہوگی۔ نجومیوں سے رائے لونگی۔ فال کھلواؤں گی، مزید براں ۔۔۔۔۔"

"جیسی تمہاری مرضی بہن" چچا لوتش نے کہا۔

اصل میں دادی زبیدہ کی اپنی دلی تمنا یہی تھی کہ شادی کل کی ہوتی آج ہو جاتے۔ مگر عادتاً عذر کئے جا رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد خود ہی مسکرائیں اور بولیں "جب آپ سب لوگ مصر ہیں تو میں بھی رضامند ہوں۔ اور منیر! تم کہو۔ اب کیسے ہو؟"

"اپنے آپ کو بیحد تندرست پاتا ہوں دادی جان پیاری" انہوں نے ہنس کر کہا۔

"پھر تو ٹھیک ہے" بوڑھے ڈاکٹر گار نے دستی وحسب معمول ناک رگڑتے ہوئے کہا "شادی جلد سے جلد ہو جانی چاہیئے"

اُسی وقت میں اُٹھ کھڑی ہوئی کہ اوپر جا کر جسوتی کو تمام حالات سے آگاہ کر دوں۔

دادی جان بولیں "بیٹی روحی، جسوتی سے کہدو کہ اس کے ساتھ ناشپاس کے سفر میں شعلہ، سوسن، کاسنی اور موتیا جائیں گی۔ تم اپنے ساتھ بوڑھی جشن زوناش کو لیجاؤ۔ چمپا اور غنچہ تمہیں تبدیل لباس میں مدد دیںگی اور سرپلی تمہارے لئے زیور۔۔۔۔۔"

میں نے آخری فقرہ نہیں سنا، دوڑتی ہوئی بالاخانے کے زینے پر پہونچ گئی۔ شدت مسرت سے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

اوپر جسوتی موسم گرما کے سفید ہین مزلین کے لباس میں پنکھے کے آگے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے بلورین کٹورے میں اُس کی رنگین مچھلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اور وہ انہیں مشغلے کے طور پر غذا کھلا رہی تھی۔

جاتے ہی میں بولی "تم نیچے کیوں نہیں آئیں پیاری؟ یہاں اداس بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ نیچے تو بہت سے مراحل طے ہو رہے ہیں ۔۔۔"

"مبارک ہو!" جسوتی نے سر اُٹھا کر طنز سے کہا "کہو تمہاری شادی کا مرحلہ بھی طے ہو گیا؟"

میں حیران ہو کر اس خلاف توقع جملے پر اُسے دیکھنے لگی۔ عام حالات میں اُس کا یہ تلخ جملہ شاید مجھے ناگوار گذرتا۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس دوپہر میں کچھ اس قدر خوش ہو رہی تھی کہ میں نے جسوتی کے اِس فقرے کی کوئی پروا نہ کی، صرف اتنا بولی "میری شادی! نہیں تو۔ ایسی اُلٹی پلٹی باتیں نہ کیا کرو جسوتی۔ کس نے تم سے کہا؟"

"کیا میں آنکھیں نہیں رکھتی روحی؟ مگر خیر ۔۔۔ مجھے تم سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پیاری میں خوب جانتی ہوں کہ ایسے موقعے پر انسان دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ مگر روحی ایک بات میری مانو گی ؎

بُری ہے اے داغ راہ اُلفت

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کیا فضول بکتی ہو جسوتی" میں نے نہایت غصہ سے کہا "تم نے زوناش کی افیون تو نہیں کھائی؟ شادی تمہاری ہو رہی ہے کہ میری؟ کچھ عقل و ہوش کی باتیں کیا کرو"

جسوتی بولی "میں تو اپنے عقل و ہوش میں ہمیشوں سے نہیں تھی اب تم بھی اسے کھو بیٹھیں"

"کیا کہتی ہو جسوتی" میں نے بے ضبط ہو کر کہا "کس نے تم سے کچھ کہا ہے؟ تم سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار کر لیتی ہو؟"

"میں سُنی سُنائی باتوں پر اعتبار نہیں کرتی روحی۔ دل لگی بھی رکھتی ہوں۔ صاف صاف کہتی ہوں کہ تمہارے چاہنے والے نے مجھ سے کہا" یہ کہکر جسوتی نے کتاب کھول لی۔

میں دو لمحے سوچتی رہی پھر بولی "میرے چاہنے والے نے!! یعنی؟ اس شخص کا نام تو جسوتی"

"میرا منہ نہ کھلواؤ روحی۔ منصور نے کہا ہے کہ عنقریب ۔۔۔"

میں زیادہ نہ سُن سکی غصّے سے بولی: "آہ ــــ منصور صاحب کس قدر نامعقول ہیں"

اتنا کہکر میں اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ اُس شام جب میں نے ایک زرد ریشمی لباس زیبِ تن کیا تو بوڑھی حبشن زوناش نے حیران ہو کر کہا تھا: "ایں خاتون روحی! آپکا چہرہ آپ کے لباس کی طرح زرد ہو رہا ہے! خیر تو ہے؟"

"خیر کہاں کی بوڑھی لومڑی!" یہ کہتے کہتے میں رو پڑی۔

حجاب امتیاز علی

بزمِ انجم

موقر سالنامہ ساقی میں اپنے گرامی قدر اور ہر دلعزیز ادیبوں اور شعرائے کرام کی تصاویر دیکھکر طبیعت بیحد مسرور ہوئی۔ اس سے جو لطیف اثرات مرتب ہوئے اُن کا خلاصہ ذیل میں عرض ہے:۔

(۱) جوئیندہ یابندہ۔

(۲) طفلِ ادب پر "بزرگی" کا دست شفقت۔

(۳) "چستا" "جوار بھاٹا" اور گنگھا برُش کر یونی!

(۴) بیسویں صدی میں قیس عامری کے لئے بھی صرف "جنون" بے معنی ہی ثابت ہوتا!

(۵) آنکھوں کی معنی آفرینی قابل غور! تبحّرِ علمی کے ساتھ ہی پریم رس کی لہریا خُدا ہی جانے یہ کس چیز کی پُجاری ہیں؟

(۶) کبھی آپنے تاریکی میں کوئی "اسٹیچو" ملاحظہ فرمایا ہے؟

(۷) تخیل کی "بلند پروازیوں" کی حقیقت!

(۸) ذکاوت اور صحافت کا امتزاج!

(۹) کوہسار آبشار، نغمہ زار سوز و ساز! اور حُسن و عشق!!

(۱۰) کون کہتا ہے کہ "پیامِ" خلوص رنگینی سے خالی ہے؟

(۱۱) سحر نگار مترجم! جرّاح ادیب!!

(۱۲) زحمتِ سفر سے بھرپور! نگانِ سفر غالب!

(۱۳) جبّہ و دستار، ریش و بروت لازمہ "فتوے" کیوں ہو؟

(۱۴) "تخئیل و تشکیل" کا تضاد! "تعمیل" خدا ہی جانے!

(۱۵) ؟

(۱۶) خُدا بھی عجیب کارساز ہے!

"دلفگار"

ایک ایکٹ کا ڈرامہ:-

جوشِ عمل

فنجی ——— ایک انقلابی خاتون
وولفنگ ——— کسانوں کا رہنما
ایڈرتھ ——— میڈرڈ کا شاعرِ اعظم
اور دوسرے لوگ

پہلا منظر

اسپین کا دارالسلطنت میڈرڈ، فرانکو کے حملے سے ایک مہینہ پیشتر۔ وقت ۸ بجے شام۔

ایک متوسط طبقہ کے رستوران میں جشن ہو رہا ہے۔ رستوران خوب روشن ہے۔ جگہ جگہ پر قمقمے اور کاغذ کے پھول پتیاں لگائی گئی ہیں۔

بہت سے مرد اور عورتیں جمع ہیں۔ زیادہ تر لوگ مزدور پیشہ ہیں اور کچھ طالب علم اور کلرک بھی۔ کچھ لوگ کرسیوں پر بیٹھے شراب یا قہوہ پی رہے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ ادھر اُدھر ٹہل کر ہنس بول رہے ہیں۔

کہیں کہیں چار چار پانچ پانچ آدمیوں کی ٹولیاں جمع ہیں اور خانہ جنگی کے متعلق زور زور سے گفتگو ہو رہی ہے، قہقہے بھی لگ رہے ہیں۔

وولفنگ اور فنجی ایک میز پر بیٹھے کچھ ناشتہ کر رہے ہیں اور شراب پی رہے ہیں۔

فنجی:- آج مہینوں کے بعد یہ اطمینان نصیب ہوا ہے۔

وولفنگ:- باغی کتے آج اپنے سروں پر پٹیاں باندھ رہے ہونگے۔

فنجی:- ہمارے مزدور بڑی جوانمردی سے لڑے۔

وولفنگ:- میڈرڈ کے حملے کی پسپائی فرانکو کے مُنہ پر بڑا زبردست تھپیڑ پڑا۔

فنجی:- اسپین کے مزدوروں نے دُنیا کے مزدوروں کا سر بلند کر دیا۔

وولفنگ:- آج ایڈرتھ کہاں ہے؟

فنجی:- لو وہ آگیا۔

(ایڈرتھ داخل ہوتا ہے اُس کی وضع قطع لاابالی پن برستا ہے۔ وہ کچھ گنگنا رہا ہے۔ کئی لوگ اس کی طرف دوڑ پڑتے اور اُس کا پُرجوش استقبال کرتے ہیں)

چند آوازیں بلند ہوتی ہیں:- خوش آمدید

مزاج بخیر

شاعر! مبارک ہو۔

ایک شخص نعرہ لگاتا ہے:- میڈرڈ کا شاعرِ اعظم۔

دوسرے لوگ:- زندہ باد!

ایڈرتھ:- آج بعد مدت کے جشن ہو رہا ہے۔

ایک شخص:- ہمارے نہتے مزدوروں نے کس بہادری سے دریا کے قریب فرانکو کی فوج کو پیچھے دھکیل دیا۔

ایڈرتھ:- اسی لئے آج شہر میں جلوس بھی نکل رہے ہیں۔

(رستوران کے سامنے سے ایک جلوس نکلتا ہے جلوس میں بہت جوش و خروش ہے۔ آگے آگے بینڈ ہے اُسکے بعد مزدوروں کی فوج اور اُسکے پیچھے ایک جم غفیر نعرے لگا رہا ہے۔ رستوران کے لوگ پہلے تو بہت زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ پھر رومال ہلاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔)

جمہور اسپین!
زندہ باد!
دُنیا کے مزدورو!
ایک ہو جاؤ!
مادرِ وطن!
زندہ باد!

(نعرے بار بار لگتے ہیں۔)

(مجمع گانے لگتا ہے۔ کچھ عورتیں ناچنے کی بھی کوشش

کرتی ہیں، جلوس نکل جاتا ہے۔ ایڈرتھ بالکل خاموش رہتا ہے۔ رستوران میں پہلے ایک لڑکی شروع کرتی ہے پھر تمام لوگ سوائے ایڈرتھ کے گانے لگتے ہیں۔)

مزدور رہیں ہم!

مزدور رہیں ہم!

جھکتے جھکتے پستے پستے

اب بہت ہم نے کھایا ہے

اب بہت ہم نے کھایا ہے

آکاش پہ دھاوا بولینگے

آکاش کے تارے توڑینگے

آکاش کے تارے توڑینگے

مزدور رہیں ہم!

مزدور رہیں ہم!

(گانا بند ہو جاتا ہے)

فنجی۔ (پکارتی ہے) ایڈرتھ! ایڈرتھ!

ایڈرتھ۔ میری جان تم وہاں ہو۔

(فنجی کی طرف بڑھتا ہے۔)

ایک لڑکی۔ (راستہ روک کر) شاعر اعظم! ہم نے بہت دنوں سے تمہاری کوئی نظم نہیں سنی۔

ایڈرتھ۔ آج تم لوگ اس کے سننے کے لئے موزوں نہیں۔

(وولفگ اور فنجی بڑھکر ہاتھ ملاتے ہیں۔)

فنجی۔ کئی دن سے کہاں تھے؟

ایڈرتھ۔ مجھے خود نہیں معلوم۔

وولفگ۔ میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کسی معرکتہ الآرا نظم کی تیاری میں مصروف ہیں۔

ایڈرتھ۔ میری مصروفیتیں اور تمہاری مصروفیتیں اور۔ میرا خدا اور ہے اور تمہارا خدا اور۔

وولفگ۔ میرا خدا کوئی نہیں۔

ایڈرتھ۔ میرا خدا حسن و شباب ہے۔

فنجی۔ لیکن اسپین کو اس وقت ایسے خدا کی ضرورت نہیں بلکہ اس وقت عمل و جہد کے خدا کی ضرورت ہے۔

ایڈرتھ۔ تم وقت اور ماحول کے تقاضے سے اپنا خدا بدلتے رہتے ہو۔ میں حسن و شباب کیلئے پیدا ہوا اور حسن و شباب ہی کیلئے مرونگا۔

وولفگ۔ لیکن ہر شخص کو تو حسن و شباب نہیں میسر آسکتا؟

ایڈرتھ۔ فنجی تم میرے یہاں آؤ تو میں تمہیں اپنی نئی نظم سناؤں۔

فنجی۔ ضرور! لیکن نظم کا موضوع کیا ہے؟

ایڈرتھ۔ زندگی حسن و شباب کیلئے ہے۔

وولفگ۔ میں تمہاری بصیرت اور مشاہدہ کی تعریف کرتا ہوں شاعر اعظم کہ اس وقت بھی جبکہ اسپین خاک و خون میں لتھڑا ہوا ہے تم ہر جگہ حسن و شباب دیکھ رہے ہو۔

ایڈرتھ۔ (فنجی کی طرف اشارہ کر کے) کیا تم کو حسن و شباب نہیں نظر آتا۔

وولفگ۔ لیکن اس حسن و شباب سے بہتر اپنے مزدور بھائیوں کا عمل جد و جہد۔ کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ اس حسن و شباب کی پرستش تو کروں لیکن اس کو قائم و دائم رکھنے کی کوئی فکر نہ کروں۔

ایڈرتھ۔ ہشت۔ بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تمہاری تلوار فانی ہے اور میرا قلم غیر فانی۔ میں فنجی کے حسن و شباب کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھ سکتا ہوں۔

فنجی۔ لیکن فنجی کو نہیں۔

(ایڈرتھ ایک سگرٹ سلگاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ایڈرتھ۔ اچھا شب بخیر۔ فنجی کل شام کو چار بجے ملو۔

فنجی۔ اچھا خدا حافظ۔

(ایڈرتھ چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

(دوسرے روز ساڑھے چار بجے شام کو۔ ایڈرتھ کا کمرہ۔ بہت سی کتابیں ادھر اُدھر پڑی ہیں۔ دیواروں پر حسن و شباب کی تصویروں کے بہت نادر اور عجیب غریب نمونے آویزاں ہیں۔ فنجی اور ایڈرتھ باتیں کر رہے ہیں۔)

فنجی۔ تمہاری نظم بہت خوب ہے۔

ایڈرتھ۔ تمہاری تعریف کی میں سب تعریفوں سے زیادہ قدر کرتا ہوں۔

فنجی۔ تمہیں وولفگ کو بھی بلانا چاہیئے تھا۔

ایڈرتھ۔ مجھے تم سے چند خاص باتیں بھی کہنا تھیں۔

فنجی۔ کیا؟

ایڈرتھ۔ مجھے تم سے محبت ہے۔

فنجی۔ میری خاطر نہیں اپنے آرٹ کی خاطر۔

ایڈورتھ:۔ (مسکراکر) محبت تو ہمیشہ ہی کی خودغرض ہوتی ہے۔

فنجی:۔ اچھا تو پھر۔

ایڈورتھ:۔ میری محبت اور دوسرے کی محبت میں بہت بڑا فرق ہے۔ میری نظر منتخب ہے اور بڑے انتخاب کے بعد میں نے تم کو پسند کیا ہے۔

فنجی:۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

ایڈورتھ:۔ میں تم پر اپنا دل و جان فدا کرتا ہوں اور تم کو اپنا اور بالکل اپنا بنانا چاہتا ہوں۔

(فنجی کچھ بولنا چاہتی ہے لیکن خاموش رہتی ہے)

ایڈورتھ:۔ میں اپنی نوجوانی کا آدھا حصہ اپنی جرأتِ رندانہ اور لذتِ گناہ میں صرف کر چکا، اب چاہتا ہوں کہ زندگی کا بقیہ حصہ تمہارے قدموں پر گذار دوں۔

فنجی:۔ لیکن . . . .

ایڈورتھ:۔ (بات کاٹ کر) پیاری فنجی پہلے مجھے اپنے دل کی بھڑاس نکال ڈالنے دو۔

فنجی:۔ لیکن پیارے ایڈورتھ جو کچھ تم کہہ رہے ہو میری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ میں نے تو شادی کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا۔ میں اپنی ساری زندگی اپنے ملک و قوم کی خدمت میں صرف کرنا چاہتی ہوں۔

ایڈورتھ:۔ تم شادی کے بعد بھی ملک و قوم کی خدمت کر سکتی ہو۔

فنجی:۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو ایڈورتھ؟ آج ہمارا پیارا اسپین انگاروں پر لوٹ رہا ہے اس کے بچے ایک دوسرے کو فنا کرنے کے درپے ہیں۔ مقتولین کی نعشیں سڑکوں پر تڑپ رہی ہیں، اور بیواؤں اور یتیموں کی آہ و بکا سے آسمان تھرا رہا ہے۔ کیا اس وقت شادی بھی کوئی ضروری چیز ہے؟

ایڈورتھ:۔ ہاں بہت ضروری! جب ہر طرف سے موت اور تباہی کی تاریکی ہماری طرف دوڑتی چلی آرہی ہے تو اگر ایک آدھ لمحہ بھی ہم مسرت و عیش میں گذار دیں تو بہت ہے۔

فنجی:۔ مجھے اس وقت میدانِ جنگ میں ہونا چاہیئے نہ کہ حجلۂ عروسی میں۔

ایڈورتھ:۔ پیاری فنجی۔ (فنجی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے) ہوش و ہوش اور جذبہ میں نہ آؤ۔ اسپین پریشان ہے لیکن اسکی پریشانی عارضی ہے اور میری شاعری دائمی۔

فنجی:۔ ایڈورتھ اپنا مقابلہ اسپین سے نہ کرو! جہاں تمہارا حسن و شباب کا فلسفہ باطل ہے وہاں تمہارا یہ خیال بھی باطل ہے کہ تمہاری شاعری دائمی ہے۔ آج مجروح اور مقید مادرِ وطن تم سے آزادی اور زندگی مانگتی ہے اور تم ایک خود غرض شاعر اپنی ابدی زندگی کے فاسد خیال کے بھروسہ پر اس سے غیر متعلق حسن و شباب کے نغمے گانا چاہتے ہو؟ ابدی زندگی سستی نہیں بکتی؟ ابدی زندگی وہی شاعر حاصل کریگا جس کے نغمے محاذِ جنگ پر گا گا کر اسپین کے مظلوم اور بھوکے کسان دشمنوں پر یلغار کرینگے۔ ابدی زندگی وہ شاعر نہیں حاصل کر سکتا جو گھروں میں چھپ چھپکر . . . . . .

(ایڈورتھ پہلو بدلتا ہے فنجی کہتے کہتے رک جاتی ہے)

ایڈورتھ:۔ کہے جاؤ فنجی مجھے ایک نئی روشنی نظر آرہی ہے۔

فنجی:۔ مجھے معاف کرو ایڈورتھ۔

ایڈورتھ:۔ نہیں پیاری فنجی! تم مجھے ایک فرشتہ معلوم ہوتی ہو۔

فنجی:۔ شاعرِ اعظم! میں تمہیں شاعرِ انقلاب دیکھنا چاہتی ہوں۔

ایڈورتھ:۔ میں اپنے میں ایک نئی طاقت محسوس کرتا ہوں، میں کوشش کروں گا۔

فنجی:۔ اب اجازت دو۔ (اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

ایڈورتھ:۔ اچھا پیاری! . . . . ہاں تم سے مجھے ایک اور بات بھی کہنا ہے۔

فنجی:۔ کیا۔ (بیٹھ جاتی ہے)

ایڈورتھ:۔ حکومت کے حکم سے کل یا پرسوں میڈرڈ خالی ہو جائیگا۔ ریل کے سفر کیلئے میں تمہیں ایک پاس دینا چاہتا ہوں۔

فنجی:۔ شکریہ۔ لیکن حکومت خود مجھے کریمان بھیجنا چاہتی ہے۔

ایڈورتھ:۔ تو تم یہ پاس ڈولنگ کو دے سکتی ہو۔ (جیب سے ایک پاس نکال کر دیتا ہے)

فنجی:۔ ہاں اس کے لئے یہ پاس مفید ہوگا۔ وہ محاذ سے پیچھے کسانوں کی تنظیم کرنا چاہتا ہے۔ اچھا تو میں چلی!

ایڈورتھ:۔ خدا حافظ، اب کب ملیں گے؟

فنجی:۔ شاید اسپین کی جمہوریت کی فتح کے بعد۔

ایڈورتھ:۔ (فنجی کو چمٹا لیتا ہے) میری جان یقین مانو آج میں تم سے بہت متاثر ہوا۔

فنجی:۔ (جلدی سے اپنے آپکو علیحدہ کر کے) شاعرِ اعظم!

ایڈورتھ:۔ میں تمہارے اشاروں اشاروں ہی میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ میری فنجی تم بہت پیاری ہو!

فنجی:۔ آپ کا شکریہ۔

(رخصت ہوتی ہے۔)

ایڈورتھ:۔ بس ایک بات فنجی! تمہیں میری زندگی کا مقصد یاد ہے۔

فنجی:۔ کیا؟

ایڈورتھ:۔ آہ! تم بھول گئیں؟ زندگی حسن و شباب کے لئے ہے!

فنجی:- (جاتے ہوئے) ہاں اچھی طرح!

(ایڈرڈ - جھکا کر بیٹھ جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(ولفگ ایک کمرے میں تنہا ٹہلتا ہے۔ نیچے سڑک بالکل تاریک اور خاموش ہو ایک راہگیر بھی نظر نہیں آتا۔ دور سے توپیں سر ہوتے اور بینڈ بجنے کی آواز آتی ہے۔)

ولفگ:- بھیڑیوں اور کتوں نے ہمارے مزدوروں کو پھاڑ کھایا! (غصہ میں میز پر ہاتھ پٹختا ہے) بازی ختم ہو گئی! ایک مرتبہ پھر سرمایہ جیتا اور محنت ہاری لیکن! (سینہ تان کر) مزدور جیتے گا جیتے گا (چیخ کر) جیتے گا! آہ مظلوم اسپین! پیارے ملک! تیرے ہی بچوں نے تیری عصمت لوٹ لی......
فرانکو! غدار فرانکو! ہمارا عزم تیری مکاری اور بزدلی پر قہقہے لگا رہا ہے۔ کیا تو اپنے کو محفوظ سمجھتا ہے (تلخ ہنسی ہنستا ہے) انتقام! انتقام! مزدور کی عزت کا انتقام! ملک کی عصمت کا انتقام! (آہٹ ہوتی ہے) کون؟ فنجی --!

فنجی:- (داخل ہوتی ہے) ولفگ! ابھی سب نہیں ختم ہوا ہے۔

ولفگ:- سب تو کبھی نہیں ختم ہوگا۔

فنجی:- فرانکو آج گیارہ بجے رات کو فاتحانہ کر و فر سے شہر میں داخل ہوگا۔ نینٹ کے جنگلوں میں ہمارے آدمی جمع ہو رہے ہیں۔ وہ اچانک اس پر ٹوٹ پڑیں گے اور ایک آخری قسمت آزمائی کریں گے۔

ولفگ:- لیکن پیاری اب یہ کوشش بے سود ہے۔

فنجی:- ولفگ تم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بے سود ہے۔

ولفگ:- ہمارے نہتے مزدور ککڑی اور مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیے جائیں گے۔

فنجی:- لیکن اگر ہم فرانکو کی گاڑی تک پہونچ گئے؟

ولفگ:- چلو یہی سہی۔ میں چلتا ہوں۔ اسوقت کیا بجا ہے؟

فنجی:- نو بج چکے ہمیں دس بجے تک ضرور پہونچ جانا چاہیئے۔

(ولفگ اپنا کوٹ پہنتا ہے اور میز کی دراز سے ایک ریوالور نکال کر جیب میں ڈال لیتا ہے۔)

ولفگ:- مزدور زندہ باد!

فنجی:- انقلاب زندہ باد! (دونوں جاتے ہیں)

چوتھا منظر

(ایک ویران گلی)

فنجی:- آج ہماری آخری رات ہے۔

ولفگ:- (ٹھنڈا سانس لیکر) پیاری فنجی!

(دونوں مضبوطی سے ایکدوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں)

(ایک قبرستان آجاتا ہے)

فنجی:- ایڈرتھ کو کیا ہوا؟

ولفگ:- آہ بہادر شاعر! ہم اسے کبھی نہیں سمجھے! اس نے اپنا پاس مجھ دیدیا تھا اور خود ہمارے ساتھیوں کے ساتھ میڈرڈ کے خوفناک مورچہ پر بڑی جانفروشی سے لڑا۔

فنجی:- (اچھل پڑتی ہے) کیا سچ!

ولفگ:- ہاں! ہاں! جب ہماری فوج میڈرڈ سے پسپا ہو کر یہاں کریان پہونچی تو وہ بھی اس میں شامل تھا۔

فنجی:- پھر! پھر! پھر کیا ہوا؟ (ولفگ کے کوٹ کا دامن کھینچتی ہے)

ولفگ:- وہ پہلے ہی سے زخمی تھا اور یہاں اسپتال میں مر گیا۔ جانکنی کی حالت میں جب پادری نے اس سے خدا کا نام لینے کو کہا تو اس نے تمہارا نام لیا۔

(فنجی دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے اور ایک قبر کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

فنجی:- آہ شاعر اعظم!

(ایکدم سے بہت زور سے بینڈ بجنے کی آواز آتی ہے اور توپیں سر ہوتی ہیں)

ولفگ:- فرانکو قبل از وقت آپہونچا اب؟

فنجی:- پیارے ولفگ سب کچھ ختم ہو چکا۔

ولفگ:- ہمت کرو فنجی! جب تک ہمارا سرخ پرچم دنیا کی ہر بلندی پر لہرا نہ لے گا ہم دم نہ لیں گے۔

فنجی:- اور وہ یقیناً لہرائیگا۔ انقلاب کی لغت میں مایوسی کا لفظ نہیں۔

ولفگ:- آخری وقت شاعر اعظم نے بھی یہی الفاظ کہے تھے۔

فنجی:- ایڈرتھ! ایڈرتھ! شاعر اعظم! میرا شاعرِ انقلاب! (رونے لگتی ہے)

ولفگ:- (اس پر جھکتا ہے اور اسکی پیشانی چوم لیتا ہے) ہیں ہیں فنجی!

فنجی:- ولفگ یہ خوشی کے آنسو ہیں!

ولفگ:- شاعر اعظم نے اپنے کتبہ قبر کے لئے یہ مصرع منتخب کیا تھا ــــ
ــــ زندگی عمل وجد و جہد کے لئے ہے۔

فنجی:- اس نے یہ مصرع اپنے خون سے لکھ دکھایا اور صرف اس ایک مصرع کی بدولت اسے ابدی زندگی مل گئی۔

(بینڈ قریب آجاتا ہے اور زور زور سے بجنے لگتا ہے۔)

ــــ (پردہ) ــــ وجاہت سندیلوی

توبہ میری!

"کھتوں کھتوں ــــ اے کھتوں۔ توبہ میری! کھتوں۔ ذری باہر آنا بڑھیا ــ ب ــ بڑھیا! وہ لٹھیا ادھر سرکا دے ری۔ توبہ میری! کھتوں کھتوں۔ کریم تو اب اچھا ہے، تو کدھر جا کر مرگئی؟ توبہ میری!"

چونے کی سی سفید ڈاڑھی، گنجا سر، لٹکی ہوئی ناک، اندر گھسے ہوئے ہونٹ، سلوٹیں پڑا چہرہ! جیسے کوئی لاش بیٹھی کھانس رہی ہے! دہلیز کے باہر ایک کھٹولے پر بیٹھا پھیپھڑوں کے سمٹنے پھیلنے کے جھٹکوں سے گھٹنوں میں سر دیتے جھک جھک جاتا تھا۔ ساتھ کی دیوار بلغم سے پٹی پڑی تھی۔ دور دو بیل کھڑے خشک تنکوں پر منہ مار رہے تھے۔ اس پار پنہاریاں پانی بھری گاگروں سے لدی سینہ تانے ایک گلی میں گھسی جارہی تھیں۔

کبڑی بڑھیا اندر سے ہانپتی ہوئی نکلی: "اے کیا شور مچا رکھا ہے تو نے؟ گھڑی بھر کیلئے اندر جاتی ہوں کہ تیرے گولی لگ جاتی ہے۔ ہاتھ بڑھا کر لٹھیا کھسکا نی ہوتی۔"

بوڑھا کھانستے ہوئے بولا: "اے اتنا غصہ نہ دکھا۔ گھونٹ بھر پانی پلا دے میرا حلق جل رہا ہے۔"

"تجھے کیا معلوم اندر تیرے لال پر کیا بیت رہی ہے، سانس لینا بھی دوبھر ہے اسے۔ اب پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا ہے، ہاتھ پیر جھٹکاتا ہے اور بے مطلب باتیں کرتا ہے، ایک بار تو پتھرا گئی تھیں اس کی آنکھیں۔"

بوڑھے نے لٹھیا لیکر وہیں دھر دی اور کھٹولے پر سے اپنی سوکھی لکڑی ایسی ٹانگیں لٹکا کر بولا: "لے ذری مجھے تھام کے لے چل میں سمجھا موسمی تاپ ہے، اتر جائیگا۔ تو نے تو بڑی ہیک بات کردی۔ کلیجہ دہلا دیا میرا۔ لے ذری تھام میرا ہاتھ۔ کھینچ مجھے۔ توبہ میری!"

کھسکتے ہوتے دونوں اندر گئے۔ پھٹے پرانے بستر پر ایک نوجوان پڑا کراہ رہا تھا۔ گردن کو اس بیزاری سے جنبش دیتا تھا جیسے اس کے سر میں شعلے اٹھ رہے ہیں۔ پاؤں یوں جھٹکتا تھا جیسے تپتے لوہے پر چل پھر رہا ہے، ہونٹ اوپر چڑھ گئے تھے۔ بتیس کے بتیس خوبصورت زرد دانت مسوڑوں سمیت نظر آرہے تھے!

بوڑھا اس کی کھاٹ کے قریب جا کر تقریباً گر پڑا۔ "اے کریم! اے کریم بیٹا۔ بیٹا کریم۔ اے کریمو۔ لے بات تو سن میری۔ سن رہا ہے کیا؟ کھتوں ــ کھتوں کھتوں ــ کھتوں ــ اے ــ اے سنتا ہے کچھ؟ تیرا بوڑھا باپ تیرے سامنے بیٹھا ہے۔ کیا کھائے گا؟ پانی پئے گا؟ پیاس ہے؛ نہیں ہے؟ ــ اری دیکھ سر ہلا رہا ہے تیرا لال ــ پیاس نہیں ہے اسے۔ کیا کھائیگا؟ صبح والی کھچڑی گرم کر لا بڑھیا ــ اے سنتی ہو؟ ــ کریم بیٹا تم بولتے کیوں نہیں؟"

بے قرار سرخ آنکھیں بوڑھے کے زرد چہرے پر جم گئیں اور پپڑیاں جمے ہونٹوں میں ناتواں سی جنبش ہوئی: "میرے دل پر بہت بوجھ ہے ابا۔ میں بہت پریشان ہوں!"

"یہ بخار کمبخت اسی طرح شدت سے چڑھتا ہے، اور اترتا بھی پل میں ہے، بس چٹکی بجاتے میں۔" بوڑھے نے اپنی بوڑھی بے رونق انگلیوں سے چٹکی بجانا چاہی مگر ناکام رہا!

نوجوان پھر اسی دھیمی دردناک آواز میں بولا: "کل مولبی جی کہہ رہے تھے۔ میں نے بوڑھے نیم کے نیچے پیشاب کر دیا اس لئے نیم کی پرانی ڈائن میرا کلیجہ نکال کر کھا گئی۔ کلیجے والی جگہ مجھے خالی جان پڑتی ہے۔" اس نے چھاتی پر ہاتھ پھیرا۔

بوڑھا بھی ہول گیا۔ مگر تسلی دیتے ہوئے بولا: "آج اسی نے تو بہت سی گھنگنیاں بانٹی تھیں تمہاری اماں نے۔ مٹھی مٹھی بھر معصوم بچوں کو دیتی گئی اور وہ تمہاری صحت کے لئے دعائیں مانگتے رہے۔ شکر رھو ڑکر مولبی جی کے ہاں بھی بھجوا دی تھیں۔ کورے برتن میں ڈال کر بڑھیا نیم تلے بھی بکھیر آئی تھی۔ اب تو اچھا ہو جائے گا۔ لے آئی کھچڑی؟" بوڑھے نے ہاتھ ٹیک کر پلٹتے ہوئے کہا: "رکھ دے ادھر۔ اٹھا اپنے لال کو۔ کھالے میرے بچے۔ دو چار دانے نگل لے۔ طاقت آجائے گی۔ پریشانی مٹ جائے گی۔ نہیں کھائے گا تو میں ہنڈیا میں ڈال آری۔ بابہ ربنے سے بو پڑ جائے گی اس میں۔ شام کو کام آئے گی۔ بچے، کچھ سونے کی کوشش۔۔۔ کھتوں ــ کھتوں کھتوں ــ کھتوں ــ اخ ــ اخاہ ــ تھوہ!" بوڑھا زمین پر جھک گیا۔ اور پھر دونوں آنکھیں کپڑے سے رگڑتے ہوئے بولا: "توبہ میری!"

کبڑی بڑھیا ہانپتی ہوئی آئی اور بچے کے سرہانے بیٹھ کر اس کے

ماتھے کو دھیرے دھیرے سہلانے لگی۔ بوڑھا کھاٹ کے ایک بازو پر کہنیاں دھرے کریم کے ابھرتے اور بیٹھتے سینے کو ٹکٹکی باندھے گھورنے لگا۔ کریم اب اتنا بیقرار نظر نہ آتا تھا۔ بڑھیا ہولے ہولے پھٹی پھٹی آواز میں گنگنانے لگی۔ "الحمد للہ رب العالمین۔ الرحمن الرحیم ......"

بوڑھے کے ہونٹ بھی ہلنے لگے اور آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

اور پھر ایک ساتھ دونوں نے کریم کے ماتھے پر "چھو" کی۔ کریم کی آنکھیں پھیل گئیں اور بوڑھا جوڑا خوشی سے لرزنے لگا۔ جیسے انہوں نے اپنے لال کو آبِ حیات کا ایک مٹکا پلا دیا ہے!

کریم کی آنکھ لگ گئی۔ بڑھیا آہستہ سے اٹھکر دہلیز پہ آ بیٹھی۔

اور بوڑھا پیچھے کھسکتا ہوا دیوار سے لگ کر اونگھنے لگا!

دو سال سے بوڑھا کوئی کام نہ کر سکتا تھا اور دو سال سے اُن کا نوجوان خوبصورت بیٹا کریم چھکڑا چلاتا تھا۔ گاؤں سے قصبے تک اُسے چونی مل جاتی تھی۔ اور پھر ہفتے میں دو تین بار تو قصبے کے سیٹھ اُسے ضرور بلا لیتے تھے۔ مہینہ بھر سے بوڑھے والدین کو کریم کی شادی کی فکر پڑ گئی تھی۔ اس نئے کھانے کے بجائے بچانے میں انہیں مزا آنے لگا۔ ماں باپ کا یہ نیا شوق دیکھکر کریم بھی لمبے لمبے سفروں پر جانے کے لئے تیار ہو جاتا۔ بڑھیا نے ہوں گرتی پڑتی گاؤں میں ایک لڑکی کے متعلق بات بھی کر آئی تھی۔ اور اُسے لڑکی کے والدین کی باتوں میں اُمید کی جھلکیاں بھی نظر آ گئی تھیں۔ کیونکہ جب وہ واپس آئی اور بوڑھے نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا "اے اب بتا بھی منہ اٹھائے کدھر بھاگی جا رہی ہے؟" تو وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی "میں دو نفل شکرانے کے پڑھ لوں پھر کہتی ہوں سارا حال!" بوڑھے کو وفورِ مسرت میں کھانسی چھوٹ گئی۔ اور وہ زمین پر زور زور سے تھوکتے ہوئے بولا "توبہ میری اے توبہ۔ شکر ہے تیرا میرے مالک۔ اخ تھو! شکر ہے۔ توبہ میری!!"

کل شام سے کریم کو بخار آ رہا تھا۔ سارے گاؤں میں یہ وبا پھیلی ہوئی تھی۔ ہر گھر سے منفشے کے کاڑھے کی بُو آتی تھی۔ اور لوگوں کو چائے کی چسکیاں دے دیکر ذیلدار تنگ آ گیا تھا۔ دکانداروں نے سونف اور گلقند کا بھاؤ چڑھا دیا تھا۔ بوڑھے نے بھی پُرانے میلے چیتھڑوں میں بندھی ہوئی جڑی بوٹیوں کو کھول کر "پھکی" بنائی اور کریم کو کھلا دی۔ مگر اُسے ایسا بخار چڑھا کہ اُس کے جسم سے گز گز بھر کے فاصلے سے تپش محسوس ہوتی تھی۔ پہلے تو دیوانے ہو گئے دونوں۔ بے مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ گرتے پڑتے رینگنے لگتے، اور بڑبڑاتے جاتے "اب کیا کیا جائے۔ اب کیا ہو گا! نبض کیسے چل رہی ہے؟ سانس کیسے آ رہی ہے؟ ماتھے پر پسینہ آ گیا کیا؟ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے؟ طبیعت متلا رہی ہے اسکی؟ اب کیا ہو گا!"

آدھی رات کو کریم کا بخار ہلکا ہوا تو جان میں جان آئی۔ مگر نیند نہ آئی۔ بوڑھا کھانستے کھانستے بے حال ہو گیا۔ کسی نے اچانک زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کریم کی آنکھ لگ رہی تھی، بھڑک کر اٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے گھورنے لگا۔ بوڑھا چلا کر بولا "اے کون ہو اسوقت؟ کیا کام ہے؟ ڈرا دیا میرے بچے کو!"

باہر سے ایک کرخت آواز آئی "اے بوڑھے۔ ملک جی کہہ رہے ہیں آج سوؤ گے بھی یا یونہیں کھانستے اور کھنکارتے رہو گے۔ تیری کھانسی نے مجھے بھر کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ ملک جی کروٹیں بدل رہے ہیں شام سے۔ کہتے ہیں بوڑھے کو کہو اتنا زور سے نہ کھانسے۔"

"مجال ہے حضور۔ مجال ہے میری۔ کھ کھ کھوں... (منہ میں کپڑا ٹھونس کر) مجال ہے مجھ غلام کی!"

کریم نے پوچھا "کیا بات ہے؟ کون تھا؟"

"ملک جی نے تمہارے متعلق پوچھ بھیجا ہے!"

کریم نے دو ایک بار آنکھیں جھپکائیں اور پھر کروٹ لے لی۔

ملک جی انکے پڑوس میں رہتے تھے۔ قصبے میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ذرا بددماغ واقع ہوئے تھے۔ ایک بار صاحب بہادر دورے پر تھے۔ ملک صاحب نے آگے بوڑھے نے ہاتھ جوڑے کہ بالشت بھر زمین پر اُگتا تو خاک نہیں لگان کہاں سے ادا کروں۔ لیکن انہوں نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ "صاحب بہادر کے سامنے پیش کر دونگا۔ وہ حوالات میں بند کر کے نکال لیں گے پیسے تیری گڑی ہوئی تجوری سے۔ سرکار اپنی ایک کوڑی بھی نہیں چھوڑتی۔ سمجھے؟ تو تو سٹھیا گیا ہے!"

اور واقعی ملک صاحب نے صاحب بہادر کے سامنے بوڑھے بڑھیا کو پیش کر دیا۔ صاحب بہادر کو بھی بوڑھے نے وہی جواب دیا تو انہوں نے اپنی پتلی چھڑی سے بڑھیا کی بالیاں چھوتے ہوئے کہا۔ "وَل انہیں بیچ ڈالو۔ سرکار پیسہ نہیں چھوڑیگا۔ سرکار کا پیسہ تم نہیں رکھو! سرکار جیل بھیجدیگا۔ سرکار سزا دیگا۔ سمجھا تم لوگ؟ ایں؟"

صاحب بہادر نے بڑھیا کی بالیاں کیا چھوئیں بوڑھے کے کلیجے پر انگارہ دھر دیا۔ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ بڑھیا کو اشارہ کیا۔ اس نے بالیاں نوچ کر صاحب بہادر کے قدموں میں ڈال دیں اور دونوں گھر چلدیئے۔ "بڑا واہیات ہے یہ اولڈمین!" صاحب بہادر سگار کو انگلیوں

میں گھماتے ہوئے بولے۔ لیکن بوڑھے کے دل میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا تھا! بل کھاتا جا رہا تھا اور بڑبڑا رہا تھا: "بڑا آیا صاحب بہادر بن کر وہاں سے! گاؤں بھر کے سامنے بالیوں پر چھڑی پھیرنے لگا۔ حاکم تھا ورنہ کمبخت کی یوں گردن اینٹھتا کہ صاحب بہادری ہوا ہو جاتی۔ پیسے کی خاطر میری عزت پر ہاتھ پھیرتا ہے، اونہہ!"

اور بڑھیا بے چاری نے بھی وہ رات روتے بسورتے گزاری۔

ملک جی نے اُس دن سے اُس گھر سے مکمل قطع تعلق کر لیا تھا۔ مگر اب اتنا کرم کرتے تھے کہ کبھی کبھار کریم کو بلانے آنکلتے تھے۔ اور وہ دن بھر سر پیٹ کر چونی کما لاتا تھا۔

آج پو پھٹے کریم پر بخار نے پھر حملہ کیا۔ ایک بار درد کی بھی شکایت کی۔ مگر بوڑھے کی پھکی آڑے آ گئی۔ دوپہر کو بخار کچھ ہلکا ہوا تو بوڑھا باہر آن بیٹھا تھا کہ بڑھیا کے کہنے پر پھر اندر جانا پڑا۔

اب کریم سو رہا تھا۔ بوڑھا دیوار کا سہارا لیتا بڑھیا کے پاس جا بیٹھا اور بولا "کتنی رقم ہو گئی؟ ہنسلی بن جائے گی؟ کڑے بھی تو بنوانے ہیں! اور سُنا ہے ہماری بہو سلوار پہنتی ہے، گھیرے دار، کوئی اچھا سا بھڑکیلا کپڑا خرید لو سلوار کے لئے، یہ جو نئے نئے کپڑے نکلے ہیں۔ اِن ہی میں سے چھانٹنا دیکھو۔ حرف نہ آئے میرے لال کی جوانی پر۔ اسی کی کمائی ہے، اسی پر خرچ ہو تو ہمیں دریغ کیا۔ ہمیں تو خوشی ہے، ہمیں دو وقت کے کھانے سے غرض ہے، سو کچھ کمی نہیں، اللہ کا فضل ہے!"

بڑھیا بولی "ساڑھے بارہ روپے ہو گئے تھے۔ ڈیڑھ روپیہ دوا دارو اور گھنگنیوں پر خرچ آئے۔ پانچ آنے کی شکر بھی لائی"۔ "اچھا ہو کر اور کما لائیگا میرا لال۔ اِدھر ملک جی سے کچھ مانگا ہوتا!"

"الٹا جوتا دکھاتے ہیں ملک جی۔ لگان والی بات یاد ہے؟"

بوڑھی کے کانوں کی لویں لرز گئیں۔ جن میں ایک کھلا سوراخ جیسے پرانی یاد کو تازہ کر رہا تھا!

کچھ دیر کے بعد بڑھیا اندر گئی اور پھر ہاتھ نچاتی باہر آکر بولی:-

"اُتر گیا بخار۔ چہرے پر رونق آ رہی ہے، اب اچھا ہو جائیگا"

بوڑھا اکڑوں بیٹھ کر تھوکتے ہوئے بولا "پھکی کی کرامات کا یقین تھا مجھے۔ تین روز ہوتے لورے کے اونٹ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔ گڑ میں ملا کر یہ پھکی کھلائی تو اٹھ کر اسی وقت بھاگنے اور ڈکرانے لگا۔ بڑے بوڑھوں کی چٹکیاں اکسیر ہوتی ہیں!"

دونوں اندر کریم کے پاس چلے گئے۔ کریم اب چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس کی ماں بہت دیر تک اس کے شانے اور پیٹھ سہلاتی رہی۔

چراغ جلے ملک جی آ دھمکے۔ تینوں کے دل دھک سے رہ گئے۔ بوڑھے نے منہ میں کپڑا ٹھونس لیا کہ کھانس نہ سکے۔ بڑھیا پریشانی میں ہاتھ ملنے لگی اور کریم چارپائی پر سے اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ملک جی بولے "کیوں! کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"بخار ہو گیا ہے اِسے!" بڑھیا بولی۔

"اب کیسا ہے؟"

"جی اچھا ہوں اب تو"

"اب اچھا ہے جی" بوڑھا منہ سے کپڑا نکالتے ہوئے بولا۔ "اب اچھا ہے ورنہ ہم تو نا اُمید ہو بیٹھے تھے۔ قرآن شریف کے ختم کے ارادے کر رہے تھے ہم تو"

ملک جی بولے "جنگ کی وجہ سے گیہوں کا نرخ چڑھ گیا ہے نا۔ اس لئے میں آج سو بوریاں قصبے میں بھجوانا چاہتا ہوں۔ صبح صبح وہاں ضرور پہونچ جانی چاہئیں۔ کریم اگر آ سکے تو آج رات چھ آنے ملینگے"

"توبہ" بوڑھا بولا "یہ کیسے آ سکتا ہے جی۔ یہ تو کھاٹ پر سے مشکل سے اُٹھا ہے"

بڑھیا بلبلا اُٹھی "سانس لینا بھی دوبھر ہے اِسے، بہت کمزور ہے جی"

"میں اچھا ہوں" کریم بولا "میں چلوں گا قصبے میں کس وقت چلنا ہو گا؟"

ملک جی بولے "ابھی۔ دوسرے چھکڑوں والے تو لاد بھی چکے ہوں گے"

"تو میں آیا!"

ملک جی چل دئے۔ بوڑھے اور بڑھیا نے کریم کی منتیں کیں کہ اس حالت میں چھ آنے کے لئے سہر رات میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن کریم بولا "کمبل اوڑھ لوں گا۔ آخر ہم لوگ ذرا ذرا سی باتوں پر یوں آرام کرنے لگے تو پیٹ کیسے بھرے گا اور ہنسلیاں، کڑے اور سلواریں کیسے بنیں گی؟ میں صبح سویرے پلٹ آؤں گا گھر کو۔ جاتے بھی نے آؤنگا قصبے سے۔ اور کچھ ضرورت ہوگی؟"

کریم اُٹھا۔ بوڑھا جوڑا پریشان اور حیران اُسے دیکھتا رہا۔ کریم نے کمبل اوڑھا، چہرے پر پگڑی کا ایک پلو پھیلا دیا اور باہر آکر چھکڑے کے آگے بیل لگا دئے،

بوڑھا بولا "دیکھ رہی ہے بڑی؟ شادی کی خوشی میں جان کی پروا نہیں کرتا"

"ہاں۔ کل کہہ رہا تھا، مَیں کوڑی کوڑی اکٹھی کرونگا مگر تمہیں دم بھر کے لئے بھی کسی کا محتاج نہ ہونے دوں گا۔ اُسے اپنی شادی کی اتنی فکر نہیں جتنی ہماری فکر ہے۔"

"اے تو کیا جانے؟" بوڑھا بولا "تو نہیں جانتی۔ دیکھو وہ چلدیا۔ یاالٰہی خیر"

"فی امان اللہ۔ اُف کتنی سردی ہو"

"توبہ میری!"

چھکڑوں کی قطار کچی سڑک پر چرچراتی ہوئی چلی تو کچے لب۔ دیگرے سب چھکڑے والے کریم کو کوسنے لگے "اے باگ ہلا ورنہ پیچھے ہٹ آ۔ ہمیں تو راستہ دے۔ کیا ٹخ ٹخ لگائے جا رہا ہے؟ سو رہے ہیں تیرے بیل؟ پیچھے ہٹ آ۔"

اور اس طرح پیچھے ہٹتے ہٹتے کریم قطار کے آخری سرے پر پہونچ گیا۔ تمام چھکڑوں والے کریم سمیت بوریوں پر لیٹے جا رہے تھے اور اندھیری رات پہیوں کی بھیانک چیخوں سے گونج رہی تھی!

صبح کو دن چڑھے ملک جی غصے میں لال پیلے ہوتے بوڑھے کے پاس آئے اور چلا اٹھے "کدھر گیا وہ تمہارا لاڈلا۔ کہاں پھینک آیا میری بوریاں۔ اُسکے ساتھی قصبے سے ہو کر آ بھی گئے کب کے۔ اور وہ ابھی تک وہاں نہیں پہونچا۔ گھر میں تو سب کچھ نہیں ڈال گیا؟"—— اور ملک جی اندر آکر چارپائیوں کے نیچے جھانکنے لگے "کدھر مر رہا وہ بدمعاش" بوڑھا کانپتے ہوئے بولا "وہ جی بس رات کو نکلا تھا سب کے ساتھ پھر واپس نہیں آیا اب تک۔"

بڑھیا بولی "اُسے سودا خریدنا تھا قصبے میں! ابھی واپس آ جائیگا"

"مگر میری بوریاں کیا ہوئیں؟" ملک جی زور سے فرش کو ٹھکراتے ہوئے گرجے!

اچانک بوڑھا چلا اٹھا "وہ رہا ہمارا چھکڑا"

"بوریوں سمیت" بڑھیا بولی۔

"اور بادشاہ سلامت سو رہے ہیں اوپر۔ خدا جانے کہاں کے چکر کاٹ کر آ رہے ہیں بیل" ملک جی بولے۔

لوگ چھکڑے کی طرف جھپٹے۔ بوڑھا جوڑا ابھی انکے عقب میں رینگتے ہوئے جانے لگا۔

"اے حضورِ عالی۔ اے ملک کریم خاں۔ اٹھو جی" ملک جی کرارہ لٹکا ہوا بازو ہلا ہلا کر بولے۔

اُن کا ایک ملازم آگے بڑھا۔ اور کریم کے چہرے سے کمبل کھینچ کر پکارا "اے کریمو۔ اٹھو بھی۔ ایسی بھی کیا نیند ہوئی کہ....."

"اے ذرا دیکھنا اوپر چڑھ کر" ملک جی بولے "کیا ہو گیا ہے اِسے"

ایک شخص چھکڑے پر چڑھ گیا۔ کریم کی پتلیاں اوپر چڑھ گئی تھیں اور تھکی ہوئی آنکھیں ہڈی کے پرانے بٹنوں کی طرح بے نور تھیں!

ملک جی ناک پر رومال پھیلاتے ایک طرف ہو کر بولے۔

"مر گیا ہے"

دُور بوڑھا بڑھیا کا ہاتھ تھامے آ رہا تھا اور پکار رہا تھا "اب ذرا تیز چل۔ تیری آواز سے جاگ اٹھے گا۔ قدم تک نہیں اٹھا سکتی۔ توبہ میری!"

احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر صاحب کوئی پچاس کے لگ بھگ ہونگے۔ گذشتہ سال ڈیڑھ
سے وہ اپنے وطن رائے بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے اور
اپنا مطب کھول لیا تھا۔ ویسے تو وہ دانتوں کے ڈاکٹر تھے لیکن علاج
ہا کا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انہیں طب کی ہر شاخ میں تھوڑا بہت
ضرور تھا۔ ڈاکٹر صاحب کثیر العیال اور اسی نسبت سے غریب۔ آئے دن
پریشانیوں کی ہی وجہ سے انہوں نے ترکِ وطن کرکے لکھنؤ میں دکان
تھی۔ لیکن جس چیز سے بھاگ کر وہ آئے تھے اُس نے یہاں بھی انکا
چھوڑا۔ انتہائی کوشش اور غیر معمولی صبر کے باوجود اُن کا مطب یہاں
چلا۔ صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک وہ اپنی دکان پر بیٹھے
لیکن کبھی انہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اور وہ روز بروز قرض کے
نیچے دبتے گئے۔

میری اُن کی ملاقات بھی عجیب طرح ہوئی۔ میرے اخبار کا دفتر بازار
ہی ایک گلی میں ہے۔ ایک روز صبح کو میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا
رہا تھا کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ ایک ڈاکٹر صاحب اپنی دکان کے
ار کے سلسلہ میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی اُن کو بلوا لیا
پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھئے، کہیئے جناب نے کیسے زحمت کی۔ آپ کا مزاج
ہے؟"

"جی ہاں، شکر ہے خدا کا — میں اس وقت اس لئے حاضر ہوا
اپنی دکان کے اشتہار کے متعلق کچھ گفتگو کروں۔"

"شوق سے، شوق سے، فرمائیے میرے لائق کوئی خدمت؟"

"جی ہاں آپ کو تکلیف ہی تو دینے آیا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں دانتوں
ایک دکان ہے، یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے یہی آپ کی گلی
کے قریب بازار میں۔ حضرت ایک سال سے نہایت محنت اور دیانتداری
کام کر رہا ہوں۔ لیکن کاروبار کسی طرح نہیں بڑھتا۔ میں چاہتا ہوں
کے روزنامے میں اپنی دکان کا اشتہار دوں۔ کہئے آپ کی کیا
ہے؟"

"ضرور، ضرور، یہ نرخنامہ اشتہارات ہے۔ آپ اسکو ایک نظر دیکھ
اسکے علاوہ ہم نے اشتہاروں کے مضمون بنانے کیلئے ایک آدمی
ملازم رکھا ہے جس نے خاص طور پر اس فن میں مہارت حاصل کی ہے۔ آپکی
منشا کے مطابق اشتہار تیار کر دیا جائیگا۔"

"بہت خوب، جی میں نے آپ کے اشتہار کی بہت تعریف سنی ہے۔
اسی وجہ سے میں نے سوچا کہ آپ کو تکلیف دوں۔"

"آپ کے انچ کا اور اخبار کے کونسے صفحے پر اشتہار چاہتے ہیں۔"

"یہی بس ایک چھوٹا سا مضمون ہو۔ لیکن کسی ایسی جگہ شائع کیجئے کہ
اخبار پر نظر پڑتے ہی اشتہار صاف دکھائی دے جائے۔"

"تو آپ پہلے صفحے پر چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں، جہاں آپ مناسب سمجھیں، بڑی عنایت ہے آپکی۔"

"ارے صاحب، عنایت ہی کیا۔ ہم لوگ تو آپ حضرات کے خادم ہیں،
خادم! لیکن جیسا کہ آپ کو نرخنامہ سے پتہ چلا ہو گا ہم لوگ پہلے صفحے کیلئے
زیادہ روپے لیتے ہیں۔"

"درست ہے، درست ہے — تو پہلے صفحے پر اشتہار شائع کرانے
کیلئے زیادہ اُجرت دینی ہوتی ہے، بہت زیادہ!"

"آپ فرمائیے تو کس قدر خرچ کر سکتے ہیں اور کتنے دن تک اشتہار
شائع کرانے کا ارادہ ہے؟"

"میں بہت مجبور ہوں، جی ہاں بہت زیادہ، میری مالی حالت
اس درجہ سقیم ہو گئی ہے کہ اس وقت تو میں کچھ بھی خرچ نہیں کر سکتا۔ آپ
اشتہار شائع کرینگے۔ اللہ نے چاہا تو میرا روزگار بڑھے گا۔ اسوقت میں حسب
استطاعت آپکی کوئی خدمت کر دونگا۔"

"تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ مفت ہی اشتہار شائع ہو جائے۔
لیکن آپ خود ہی سوچئے یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم لوگ بھی تو آپ کی طرح
تاجر ہیں۔"

"جی یہ تو درست ہے۔ لیکن آپ کا کاروبار خدا کے فضل سے
خوب چل رہا ہے۔ آپ کا اخبار ہزاروں کی تعداد میں بکتا ہے۔ بھلا میرا اور آپکا
مقابلہ کیا ہو سکتا ہے۔"

"بہر حال مجھے سخت افسوس ہے کہ ان حالات میں تو میں آپکی
کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب ایک آدھ منٹ خاموشی سے میرا منہ دیکھا کئے،

اسکے بعد آہستہ سے کھڑے ہوتے، نرخنامۂ اشتہارات پر ایک نظر ڈالی اور سلام کر کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

چپراسی جو شاید باہر سے ہم لوگوں کی گفتگو سن چکا تھا ڈاک لیکر بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "نہ معلوم کہاں سے دُنیا زمانے کے مفت خورے آجاتے ہیں"۔

میری اور ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کو کئی دن ہو چکے تھے اور میں اس واقعے کو تقریباً بھول چکا تھا۔ ایک دن رات کو دفتر سے کام ختم کر کے کوئی دس بجے جب میں گھر جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی تک اپنی دُکان پر بیٹھے ہیں۔ ایک میلی کچیلی چمنی کا لیمپ جل رہا تھا۔ میں نے دُکان کے پاس سے گذرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا، لیکن وہ نہ معلوم کن خیالات میں غرق تھے کہ جواب تک نہ دیا۔

دوسرے دن صبح کو جب میں دفتر گیا تو میں نے چپراسی کو ایک پرچہ دے کر ڈاکٹر صاحب کو بُلوایا۔ ڈاکٹر صاحب بہت اُداس معلوم ہو رہے تھے۔

"کہئیے مزاج تو اچھا ہے جناب کا۔ کچھ سُست سُست سے نظر آرہے ہیں آپ"

"جی ہاں، کئی دن سے سخت پریشان ہوں۔ منجھلی بچی کو میعادی بخار ہو گیا ہے، بہت تکلیف ہے اُسے"

"اوہو، ہو! نہایت افسوس ہے ـــــ اُس روز آپ اشتہار کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ میں نے اُس کے متعلق سوچا، مجھے آپ کے مزید حالات بھی اپنے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوئے۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ میں جو کچھ بھی آپ کے لئے کر سکتا ہوں، کرتا رہونگا۔ بہرحال کل سے آپ کی دُکان کا اشتہار کسی اچھی جگہ شائع کر دیا جائیگا"

"واقعی ـــــ؟ میں آپ کا بیحد شکر گزار ہونگا۔ مجھے جناب سے ایسی ہی اُمید تھی۔ اسی لئے تو میرا دل رہ رہ کے کہتا تھا کہ مایوس ہونیکی کوئی وجہ نہیں ......"

"خیر، اس کی مطلق ضرورت نہیں۔ میری ذات سے اگر آپ کو تھوڑا سا فائدہ پہونچ جائے تو ہرج ہی کیا ہے۔ بہتر ہے۔ بس اسی لئے میں نے آپ کو اس وقت تکلیف دی تھی"

رفتہ رفتہ میرے اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات بڑھتے گئے۔ اب اُن کا زیادہ وقت میرے اخبار کے دفتر میں ہی گذرتا۔ دکان پر وہ اپنے کسی بچے کو بٹھا آتے اور اگر کبھی کبھار کوئی مریض آجاتا تو تھوڑی دیر کیلئے چلے جاتے لیکن ایسا کم ہی ہوتا۔ نہ معلوم کیوں، انتہائی کوشش کے باوجود لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی دُکان کی طرف توجہ نہ کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں میں ڈاکٹر صاحب کے کم و بیش تمام خانگی حالات سے واقف ہو گیا اور مجھے ہر وقت یہ خیال رہنے لگا کہ ایسے نیک نفس کی کسی نہ کسی طرح مدد کی جائے، چنانچہ میں نے ذاتی طور پر اپنے تمام دوستوں سے ڈاکٹر صاحب کا تذکرہ کر دیا تھا۔ اور سب نے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی کسی کو کوئی شکایت ہوئی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے ضرور رجوع کرینگے۔

اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کی رفیق زندگی کا ایک بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب بیچارے اس قدر تنگدست ہو رہے تھے کہ تجہیز و تکفین کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا پڑا۔

بیوی کی موت کا ڈاکٹر صاحب پر بہت بُرا اثر پڑا۔ انکی پریشانیاں پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس نئی زندگی کے بھی عادی ہو گئے۔

اسکے بعد سے ڈاکٹر صاحب کا بیکاری میں سوائے اسکے کچھ کام نہ تھا کہ وہ ہر کس و ناکس سے میری تعریف کرتے رہیں یا میری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ اُنکی اس تبدیلی پر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ افلاس نے انکی ذہنیت حد درجہ خوشامدانہ کر دی تھی۔

میری والدہ عرصے سے دانت لگوانے کا ارادہ کر رہی تھیں۔ چنانچہ میں اپنی جگہ طے کر چکا تھا کہ جونہی وہ چھوٹے بھائی کے یہاں سے ناگپور سے آئیں، میں اُنکے دانت ڈاکٹر صاحب سے ضرور لگوا دونگا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کی تھوڑی بہت آمدنی بھی ہو جائیگی۔

دن گذرے گئے لیکن والدہ صاحبہ نہ آئیں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ نوبت یہاں تک پہونچ گئی تھی کہ وہ کئی مہینے سے دُکان کا کرایہ تک ادا نہ کر سکے تھے۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ آخر ایسی کونسی تدبیر نکالی جائے جس سے ڈاکٹر صاحب کا کام کسی طرح چلے جائے۔

ایک دن صبح کو جب میں دانت صاف کر رہا تھا تو میرے مسوڑھوں سے تھوڑی سی رطوبت اور خون نکلا۔ جب کھانا کھانے کے بعد میں دفتر جانے لگا تو اُس وقت بھی میرے دانتوں میں ٹیس تھی۔ میں نے سوچا کہ دفتر جاتے جاتے ڈاکٹر صاحب سے دوا لگوا لونگا۔ لیکن جب میں اُن کی دُکان پہونچا تو وہ وہاں موجود نہ تھے۔ اُنکے بچے نے بتایا کہ وہ دفتر میں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تازہ پرچہ لئے پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میرے اُس مقالۂ افتتاحیہ کی تعریف کرنے لگے جو میں نے آج کے اخبار کیلئے لکھا تھا اور جس میں اپنے اہلِ وطن سے سامراجی جنگ میں شریک نہ ہونے کی پُرزور تلقین کی تھی۔

میں نے اُن کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، آج صبح سے میرے مسوڑھوں میں سخت تکلیف ہے، کوئی ایسی دوا لگا دیجئے کہ یہ درد جاتا رہے"

ڈاکٹر صاحب کچھ پریشان سے ہوگئے۔ دیر تک میرے مُنہ اور دانتوں کا معائنہ کرتے رہے۔ پھر اپنی دُکان لے گئے اور وہاں بھی یہ سلسلہ کم و بیش آدھا گھنٹہ تک جاری رہا۔

"آپ کے مسوڑھوں میں پیپ ہوگئی ہے اور شدید قسم کا پائیریا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کو اپنے دانتوں سے ہاتھ نہ دھونا پڑے ــــــ"

"لیکن ڈاکٹر صاحب میرے مُنہ سے بدبو تو آتی نہیں اور نہ ہی کبھی اور نہ ہی کبھی پیپ وغیرہ نکلی ہے۔ آج نہ معلوم کیوں تھوڑی سی رطوبت اور خون نکل آیا!"

"جی ہاں، یہ تو دُرست ہے۔ ابھی پیپ اوپر نمودار نہیں ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے تو مجھے اُمید ہے کہ اگر پوری توجہ سے علاج کیا گیا تو آپ کے دانت بچ جائیں گے، بہرصورت حالت تشویشناک ضرور ہے اور آپ کو فوراً پوری توجہ سے اس کا علاج شروع کر دینا چاہیئے ــــــ"

چُنانچہ ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا کہ فی الحال ایک سفوف جو انہوں نے خود تیار کیا تھا استعمال کرنا شروع کر دوں اور اسی دوران میں وہ ایک اور دوا تیار کر دیں گے جس کے اجزاء انہیں کلکتے کی کسی بڑی دُکان سے منگانا پڑیں گے۔

شام کو جب میں گھر گیا تو بیوی کو سارا قصّہ سُنایا۔ وہ بیچاری سخت پریشان ہوئی۔ صبح ہوتے ہی اُس نے ڈاکٹر صاحب کے گھر کی راہ لی اور مجھے آکر بتایا کہ بیس پچیس روپے لگا کر وہ ایک ایسی دوا تیار کر دیں گے جس سے یہ مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں اُنہیں زیربار کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لئے میں نے شام کو دفتر سے واپسی پر پچیس روپے کے نوٹ ڈاکٹر صاحب کو دیدئے تاکہ وہ جلد از جلد میرے لئے دوا تیار کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب نے رسماً اور اخلاقاً روپیہ لینے سے انکار کیا۔ لیکن میرے لئے یہ کیسے ممکن تھا۔

دوسرے دن اخبار کے ایک کام کے سلسلہ میں مجھے لکھنؤ سے باہر جانا پڑا اور پانچ چھ دن کے بعد واپسی ہوئی۔ دفتر جاتے ہوئے جب میں ڈاکٹر صاحب کی دُکان کے پاس سے گذرا تو اُسے بند پایا۔ دفتر پہونچنے پر جب میں نے چپراسی سے ڈاکٹر صاحب کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ مالکِ دُکان نے کرایہ کی غیر ادائیگی کی وجہ سے دُکان خالی کرائی ہے۔

تیسرے پہر کو جب مجھے ذرا فرصت ہوئی تو میں نے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب سے اُن کے گھر جا کر مل لوں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب گھر خالی کر کے کہیں باہر جاچکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اس طرح غائب ہوجانا میرے لئے یقیناً حیرت انگیز امر تھا۔ بیوی کو جب شام کو سارا حال معلوم ہوا تو وہ بہت جزبز ہوئی اور بگڑی۔ بہرحال یہ میں بھی نہ سمجھ سکا کہ اُن کی ناراضگی آیا اس وجہ سے تھی کہ ڈاکٹر صاحب میری دوا تیار کرنے سے پہلے ہی چلے گئے یا اُن پچیس روپوں کی وجہ سے جو ڈاکٹر صاحب کو دئے جاچکے تھے۔ لیکن اُنہیں کیا معلوم کہ میں ان پچیس روپوں کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کو وقتاً فوقتاً اور کتنے روپے دے چکا تھا۔

دوسرے دن بیوی کی ہدایت کے مطابق مجھے کسی اور ڈاکٹر سے اپنے دانتوں کا معائنہ کرانا تھا کیونکہ اب اُنہوں نے بھی میرے مُنہ سے کچھ عجیب سی بُو سُونگھی تھی۔ چُنانچہ میں ڈاکٹر راج کے یہاں پہونچا جو یورپ کے سند یافتہ ہیں اور دانتوں کی بیماریوں کے بہت بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مجھے سخت تعجّب ہوا جب اُنہوں نے معائنہ کے بعد بتایا کہ میرے دانتوں میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہے اور ہمارے ڈاکٹر صاحب کسی شدید غلط فہمی میں مُبتلا تھے۔

لیکن میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایسا کیوں کیا۔

بیچارے ڈاکٹر صاحب!!!

* * * *

شاہد لطیف

عُمر

(شخصی و قومی)

نفس نفس، رواں دواں ہے عمر، مست و بیخبر
نہ سمت ہے نہ رہ گزر، مگر ہے بر سرِ سفر
خرام اک خیال ہے، قیام ایک انتظار

وہ برق جو تلاطمِ اثیر میں ہے موجزن
نسیم ہے کہ خود بخود رواں ہے سوئے خویشتن
خود اپنی آپ راہبر خود اپنے آپ پر سوار

تصورات چند کی وہ مختصر سی اک لڑی
جو دلرُبائے زندگی کے ہاتھ میں سے گر پڑی
بکھر گئی تو گم ہوئی دکھا کے خندۂ شرار

یہی ہے عمر قوم بھی ذرا سا امتیاز ہے
وہ اک جھپک ہے چشم کی یہ عشوۂ دراز ہے
مگر یہ طولِ عُمر بھی ہے لغزشوں سے تار تار

اگرچہ عُمر، زندگیِ سرمدی کی ہے کڑی
چڑھی بڑھی تو مہر ہے، نہیں تو صرف پھلجھڑی
کہ اک زمانِ مختصر، سو وہ بھی موت میں شُمار

مُسافرانِ اجنبی کو چشم و دل ہیں راہبر
جہاں نظر ہی راہ ہو تو کیجئے نظر کدھر
کہ رہ نوردِ خویشتن ہے زندگیِ روزگار

قیام ہے کہ ہے سفر، مگر عیاں ہیں حرکتیں
حقیقتیں بدل رہی ہیں صورتوں پہ صورتیں
کہ رُوح و تن کے عالموں پہ چھا رہی ہے نوبہار

مرزا نظام شاہ لبیب

فرشتہ یا عورت

زیبا ـــــ کیا معلوم یہ اُس کا اصلی نام ہے یا تخلّص؟

ـــــ ہاں تو زیبا نے مجھے ایک نامۂ استفسار بھیجا ہے اور مجھ سے دریافت کیا ہے کہ فرشتے مذکر ہیں یا مؤنث۔ اور ساتھ ہی ساتھ خوشامد بھی کی ہے کہ میں چونکہ ہر فن مولا ہوں، اس لئے اس سوال کا جواب بھی ضرور جانتا ہونگا۔

بہت اچھا... میں ہی یہ "حجابِ راز" اُٹھاتا ہوں۔ زیبا لکھتی ہے: "تقریباً ہر مُلک اور ہر زبان میں فرشتہ مذکر ہے اور ہند کے شاعر تو اسے مذکر ہی باندھنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ لیکن کیا آپ ایک فرشتہ کا نظارہ ایک مردانہ تنومند اور کرخت جسم میں کر سکتے ہیں؟۔ (یاد رہے، کہ ناصح اور واعظ جیسی ستی کش ہستیاں بھی شعرا کے نزدیک فرشتے ہیں۔) نہیں۔ بلکہ فرشتہ کا تصوّر ایک لطیف مرمریں پیکرِ رعنائی میں ہی مجسم ہو سکتا ہے!

واقعی فرشتے صنفِ نازک میں سے ہیں"۔

زیبا کے اِن الفاظ میں نسائیت مُتکلّم ہے۔ اس کی یہ آواز اور اس کے یہ احساسات دُنیا کی ہر عورت کے دل و دماغ میں موجود اور لرزاں ہیں۔ جہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ہر وہ ہستی کہ جسے 'خوابِ طفلی' اور 'آرزوئے شباب' کہا جا سکے، اپنے آپ کو سو فی صدی فرشتہ تصوّر کرتی ہے، وہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہمارے مردانہ دلوں میں اپنے متعلق ایسے احساسات کا گُزر تک بھی نہیں۔ مثال کے طور پر مجھے کبھی اپنے پر فرشتہ ہونے کا گُمان نہیں گزرا، اور نہ ہی مجھے توقع ہوئی کہ کوئی ارضی حور مجھے بھی فرشتہ کے لقب سے موسوم کرے، اِس کے برعکس بارہا کسی دوشیزہ کے جلوۂ بے محابا نے میری آہوں میں یہ صدا بھی ممتزج کر دی ہے کہ "خاصہ کی چیز ہے، فرشتہ ہے!"

اور یقیناً ایسے واقعات دوسرے مردوں پر بھی بیتتے ہیں، مگر اسکے مستثنیات بھی موجود ہیں کہ کئی مرد اپنے کو ملک کہتے نہیں شرماتے، مثال کے طور پر لاہور کے ایک مشہور پروفیسر، امرتسر کے ایک مشہور حکیم اور لکھنؤ کے ایک مشہور حجام ـــــ! لیکن اس کے باوجود بھی اِن حضرات کے فرشتہ ہونے کا اتنا ہی یقین ہے، جتنا انہیں خود ـــــ،

یہ امرِ واقعہ ہے کہ کسی حسینہ کے پیشِ نظر ہوتے ہی ہم بے اختیار فرشتوں کے متعلق سوچنے لگتے ہیں، اور تو اور اُجڈ دہقانی بھی اپنے گاؤں میں عورتوں کو فرشتہ کہہ جاتے ہیں۔ کسی مدرسے کی تفریح کے وقت اسکول کے نکڑ پر کھڑے ہو جائیے، جب کوئی لڑکا زنانے سے نکلتا آپ کہتے ہیں کیا خوش و توانا ہے اور جب کوئی بچی اُچھلتی کودتی باہر تو آپ بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں "تیری ہی فرشتہ ہے!"

کیا ہم میں سے ہر ایک نے کبھی نہ کبھی کسی مجسمۂ ناز و نزاکت کے سامنے سرِ نیاز خم نہیں کیا؟ اور اِس طور اُس کے پاؤں نہیں پکڑے وہ کوئی فرشتہ ہے۔ کہ ابھی اُڑا چاہتا ہے۔ ہمیں اس وقت غیر شعوری طور پر ان تصویروں کا خیال آتا ہے جن میں فرشتوں کی لطافت اور ان کے پروں سے عیاں ہوتی ہے۔ اور یا یہ جتانے کے لئے کہ فرشتے عورتوں کی طرح زیب و زینت کے دلدادہ ہیں ان کو پر طاؤس سے مزیّن کیا جاتا ہے ـــ!

ایک مشہور شاعر کا خیال ہے کہ ہر حسین عورت ایک فرشتہ ہے۔ اور ایک صہبائے شباب سے مست نازنین کا خمار سے ہم میں انگڑائی لینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پھر اپنے اصلی مسکنِ فلکی کی طرف اُڑ جانے کو بازو پھیلاتی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھُولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا (عزیز لکھنوی)

اِسی دُنیا میں ایسے آدمی بھی موجود ہیں جو عورت کو فرشتہ ماننے سے قطعی منکر ہیں۔ ہمیں تو ان کی کم عقلی پر ہنسی چھوڑ رونا آتا ہے۔ فرماتے ہیں:- "عورتیں شکل میں مردوں سے مشابہ اور رتبے میں کم ہیں۔" ہم مانتے ہیں کہ عورتیں قدرے مردوں سے ہم شبیہ ہیں۔ ان کا جسم و چہرہ انسانی ہے۔ لیکن یہ بات تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ فرشتے انسانی اُمور میں دخل اندازی کرتے وقت ہمیشہ انسانی شباہت اختیار کر لیتے ہیں!

ایک اور ثبوت ملاحظہ ہو۔ ایک مشہور شاعر اپنی ایک نظم میں گویا ہے:-

• گاؤں کی الھڑ کنواری لڑکیاں چاندنی کے فرش پر محو

تھیں، اگرچہ حُسن کو فضا کی خُنکی میں سمونے کے لئے اور اس خیال سے کہ اِس وقت بھلا کون ادھر آئے گا اُنہوں نے وہ لباس پہن رکھا ہے جو حوا نے کیلے کے پتوں کے فیشن سے پہلے استعمال کیا تھا اور جس کے متعلق کسی شاعر نے لکھا ہے کہ "اس کا نہیں اُلٹا سیدھا، رقص زوروں پر ہے۔" کہ ایک طرف سے گرجے کا بوڑھا پادری سر جھکائے آتا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ لڑکیاں اپنے کپڑوں کی طرف لپکتی ہیں۔ چند دانا لڑکیاں اپنے برگِ گل جیسے نازک لبوں سے یوں پھول بکھیرتی ہیں کہ "کپڑوں میں تو پادری ہمیں پہچان لیگا۔ بہتر ہے کہ ناچتی جاؤ اور اس کا خیال تک بھی نہ کرو!" پادری یہ منظر دیکھکر ٹھٹکتا ہے اور وہیں سے واپس لوٹتا ہے اور خدا کا شکر بجالاتا ہے کہ اُسے فرشتے نظر آئے۔ کیونکہ فرشتے دیکھنا فصل کی زرخیزی کی علامت ہے!"

اگر اور نمونہ مطلوب ہو تو ملاحظہ ہو اناطولِ فرانس کی رائے، فرماتے ہیں:۔

"کنواری سینٹ آر بریسیا کا حسین و جمیل پیکر ایک ہی وقت میں بہت سی محفلوں کی "شمع انجمن" بننا پسند کرتا تھا وہ دن تو ایک عاشق کے بازوؤں میں گزار دیتی لیکن ہر رات اپنے چاند سے چہرے کو لیلیِ شب کی زُلفوں میں چُھپائے ایک جوان گڈریئے کی جھونپڑی میں پہونچتی۔ اور وہاں "نوردِ بستر و بہارِ آغوش" نہ بنتی ــــ لیلیٰ شب تو اِس کے اِس معاشقہ کی بدرجۂ اتم پردہ پوشی کرتی۔ لیکن صبح صبح واپس آتے وقت اِسے افشائے راز کا دھڑکا لگا رہتا۔ کیونکہ سحر گریباں دریدہ تو ہمیشہ سے شبِ وصل کے قتل اور عشاق کی پردہ دری پر آمادہ رہی ہے۔ اِن خطرات سے بچنے کی خاطر اُس نے یہ ترکیب نکالی کہ اگر آتی دفعہ راستہ میں کوئی دہقان مل جاتا تو وہ اپنا سفید برّاق لبادہ اپنے بازوؤں پر پھیلا کر بیباکانہ انداز سے کہتی: "اے اجنبی اپنی آنکھیں نیچی کرلے تاکہ تو خداوند یسوع مسیح کا پاک فرشتہ نہ دیکھ سکے۔" یہ سُنکر سادہ دل کسان دو زانو ہو کر سر جُھکا آنکھیں بند کرلیتے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خداوند یسوع کا فرشتہ دیکھنا بہت سی تکلیفوں کا پیش خیمہ ہے!"

یہ ہے ایک نباضِ فطرت اور مردم شناس مفکر اور ادیب کے تجربہ کا نچوڑ ــــ!

اب اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ شیطان جو فرشتوں کا سردار تھا۔ گو راندۂ درگاہِ ایزدی ہی سہی، صنفِ نازک میں سے ہے۔ تو کیا یہ مکمل ثبوت نہ ہوگا کہ فرشتے مؤنث ہیں؟ مَیں یہاں ثبوت دینا نہیں چاہتا صرف ضمناً ذکر آپڑا ہے۔

کیا کبھی مَردوں کے متعلق بھی سُنا گیا ہے کہ یہ "جنّت سو نکالے ہوئے فرشتے" ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ شیطان جب چاہے نوری فرشتے کا رُوپ دھار لیتا ہے؟۔ اور کیا یہ امرِ واقعہ نہیں کہ جب کبھی شیطان نے کسی رِشی یا کسی ولی کو بہکانا چاہا تو وہی اپنا اصلی زنانہ رنگ نکھارا؟ یوں بھی دُنیا میں عورت کے سوا کیا اور بھی کسی کے دامِ شیطنت میں کوئی مرد اسیر ہوا ہے؟۔ کیا پری، آسیب، سایہ کے الفاظ ہمیں عورت کا خیال نہیں دلاتے؟ ــــ معرکۂ آدم و شیطان میں فتح شیطان کی ہوئی تھی، زن و مرد کے معاملہ میں بھی میدان عورت کے ہاتھ رہتا ہے۔

اِس دلیل کو زیادہ ٹھوس اور پُختہ بنانے کے لئے مندرجہ ذیل محاورات ملاحظہ ہوں:۔

"خوبصورت شخص شیطان کا منظورِ نظر ہوتا ہے!"

"شیطان گناہ کو قند آمیز بنا دیتا ہے!"

"شیطان بہت ضدّی ہے!"

ــــ نیز ان دو محاورات کا تقابل بھی بصیرت افروز ہے۔

"خدا کو پوجو اور شیطان سے کوئی تعلق نہ رکھو"

"خدا کی عبادت کرو ــ اور عورت کا خیال نہ کرو"

شیطان نے جب کبھی کسی مَرد کے لئے دام پھیلایا ہے تو دانہ کا کام عورت ہی سے لیا ہے، کیا ہم آدم و حوا کے قصّہ کو بھول سکتے ہیں؟ ــــ کہتے ہیں شیطان بندے کے خیالات خُدا سے ہٹا دیتا ہے۔ لیکن کیا حسین عورتیں بھی گرجے کے بیچوں بیچ بے نقاب جلووں سے یہی مقصد حاصل نہیں کرلیتیں؟!

پولینڈ میں شیطان کا لباس نیلا ہے۔ ہمارے ہاں اِس کا لباس سیاہ ہے، اٹلی میں سُرخ رنگ ہے اور گورا اقوام میں سفید ــ بعینہٖ یہی حالت عورتوں کے ملبوساتِ رنگا رنگ کی ہے!

شیطان یا جن عموماً کسی بوڑھی عورت کے سر پر اترتا ہے۔ اگر وہ مرد ہوتا تو کیا کسی ضعیفہ صد سالہ اور از کار رفتہ عورت پر ہی نظرِ انتخاب ڈالتا؟!

سب جانتے ہیں کہ محافظ فرشتے بچّوں کی حفاظت پر متعین ہیں۔ مَیں پوچھتا ہوں کہ بچّوں کی خبر گیری کیلئے آیا عورت ہوتی ہے یا مَرد؟!

انور مختار صدیقی بی۔ اے، ایل ایل بی

پھانسی

چوتھا باب

ہم اوریول سے آئے ہیں

یانسن کو جس فوجی عدالت سے سزائے موت ملی تھی اسی عدالت نے ایک اور دیہاتی کو بھی پھانسی کا حکم دیا تھا۔ یہ دیہاتی حکومتِ اوریول، علاقہ یلیٹزک کا رہنے والا تھا۔ نام میکائیل گولیوبٹس اور عرف سگانوک تھا، پیا کا نام تاتارن بھی تھا۔ تازہ واردات، جس کے متعلق اب کسی شبہ کی گنجائش نہیں تھی، اس نے یہ کی تھی کہ ایک جگہ مسلح ڈاکہ ڈالا اور تین آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس سے پہلے کے سارے واقعات ماضی کے اندھیرے اور راز کی گہرائیوں میں غائب ہو گئے تھے۔ افواہیں تھیں کہ کئی اور قتل کئے ہیں، وہ اکثر جگہ ڈاکے ڈالنے میں بھی یہ شریک تھا۔ کہا جاتا تھا کہ خون، آگ، شراب اور حرامکاری سے اس کی گزشتہ زندگی مترتب ہوتی تھی۔ یہ شخص اپنے آپ کو بڑی بے تکلفی اور خلوص دل سے قاتل کہتا تھا۔ اور ان لوگوں کو بڑی نفرت حقارت سے دیکھتا تھا جو فیشن کے مطابق خود کو قاتل کہنے کے بجائے بیگناہ کہتے تھے۔ چونکہ انکار کی اب کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے تازہ واردات کے سلسلہ میں وہ ایک ایک بات کو تفصیل سے بیان کرتا تھا اور ذرا نہیں جھجکتا تھا۔ لیکن جب اور پچھلی باتوں کے بارے میں اس سے دریافت کیا جاتا تو وہ اپنے دانت بھینچ لیتا یا سیٹی بجانے لگتا اور کہتا: "ہوا کھا تو ہوا!"

جب اس سے جرح کی گئی تو وہ چڑ گیا اور بہت سنجیدہ بن کر بولا: "ہم سب اوریول کے رہنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ اوریول اور کروما کے ڈاکو بہترین ہوتے ہیں۔

کراچیو اور لیونا میں ڈاکو پروان چڑھتے ہیں۔ اور یلیٹز سارے ڈاکوؤں کا باپ ہے۔ اب اور کیا کہنا باقی رہ گیا!"

اس کا عرف سگانوک (خانہ بدوش) تھا کیونکہ اس کی شکل صورت اور حرکات اٹھائی گیروں کی سی تھیں۔ بال سیاہ رنگ کے تھے۔ دبلا پتلا چھریرا بدن اور تاتاریوں جیسی ابھری ہوئی رخساروں کی ہڈیوں پر زرد زرد دھبے پڑے ہوتے تھے۔ اس کی نظریں تیز اور بھانپنے والی تھیں۔ ذرا کسی چیز پر نظر جماتی اور گویا اس کی تلاشی لے لیتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دیکھتے ہی اس چیز میں کچھ کمی ہو گئی ہے اور اب وہ چیز پہلی جیسی رہی ہی نہیں۔ اگر سگانوک نے کسی سگریٹ کو نظر بھر کے دیکھ لیا ہے تو اسے لیتے ہوئے اتنی کراہیت محسوس ہوگی گویا اس کے منہ کا نکلا ہوا سگریٹ ہے۔ اس میں ایک طرح کی بےچینی سی تھی۔ ابھی رسی کی طرح بل کھا رہا ہے، ابھی ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا تار کا گچھا ہے کہ لپٹا جا رہا ہے۔ پانی پینے پر آتا تو بالٹی کی بالٹی چڑھا جاتا۔

مقدمہ کے دوران میں سوالوں کے جواب مختصر اور جما جما کر دیتا۔ اور بعض دفعہ اچھل اچھل پڑتا جیسے خوشی کی انتہا ہی نہیں رہی اور کہتا۔

"بالکل ٹھیک!"

کبھی زور دیکر کہتا: "بل کُل ٹھیک!"

ایک دفعہ بالکل اچانک کسی معمولی سوال کے جواب میں وہ اچھلکر کھڑا ہو گیا اور صدر منصف سے کہنے لگا: "کیا آپ مجھے سیٹی بجانے کی اجازت دیں گے؟"

منصف نے تعجب سے پوچھا "کیوں؟"

"ابھی انہوں نے کہا تھا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ دیا تھا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اشارہ کس طرح دیا جاتا ہے۔ بہت دلچسپ طریقہ ہوتا ہے۔"

منصف نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے اجازت دیدی۔ سگانوک نے جلدی سے چار انگلیاں، دو ایک ہاتھ کی اور دو دوسرے ہاتھ کی، منہ میں رکھ کر اپنے دیدوں کو خونخواری سے گھمایا ——— اور پھر عدالت کی خاموش فضا قاتل کی تیز سیٹی سے گونج گئی ——— وہ سیٹی جسے سنکر گھوڑے اچھل کر الف ہو جاتے ہیں اور انسانی چہروں کا خون سُت جاتا ہے۔ قتل ہونے والے کی ہراسانی، قاتل کی وحشیانہ مسرت، خطرناک آگاہی، ڈاکوؤں کے جمع ہونے کا اشارہ، طوفانی رات کا اندھیرا اور سناٹا ——— اس سیٹی میں یہ سب چیزیں یکجا تھیں۔

صدر منصف نے جھنجھلا کر سگانوک کو منع کیا اور وہ بڑی اطاعت شعاری سے خاموش بیٹھ گیا۔ کسی بڑے فن کار کی طرح جس نے اپنا فن بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہو، سگانوک مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور اپنی گیلی انگلیاں کوٹ سے پونچھتے ہوئے چاروں طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

مُنصفوں میں سے ایک نے اپنا کان سہلاتے ہوئے کہا: "کیا ڈاکو ہے!"

ایک اور مُنصف جس کی چھدری روسی ڈاڑھی اور سگانوک کی طرح تاتاری آنکھیں تھیں، کسی گہرے خیال میں غرق اُسکی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مُسکراکر بولا: "واقعی ہے دلچسپ"

مُنصفوں نے بغیر کسی رحم کے شائبے کے سگانوک کو پھانسی کا حُکم سُنا دیا۔

حُکم سُنتے ہی سگانوک نے کہا: "بالکل ٹھیک۔ کُھلے میدان میں پھانسی کا پھندا۔ بالکل ٹھیک"

پھر محافظ کی طرف دیکھکر بولا: "اچھا تو کیا اب ہمیں یہاں سے چلنا نہیں ہے؟ چل نا پوستی! اور ذرا اپنی بندوق سنبھالے رہنا — کہیں مَیں چھین نہ لوں"

سپاہی نے اُس کی طرف گھُور کر دیکھا اور خوفزدہ نظروں سے دوسرے سپاہی کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بندوق ٹٹولنے لگا۔ اَوروں نے بھی اپنی اپنی بندوق سنبھالی۔ اور سارے راستے اُنہیں ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ وہ چل نہیں رہے بلکہ اُڑ رہے ہیں۔ گویا قیدی نے اُنہیں مسحور کر دیا تھا اور اپنے قدموں تلے نہ تو زمین محسوس کر رہے تھے نہ وقت گُزرتا معلوم ہو رہا تھا اور نہ اپنے آپے ہی کا کچھ ہوش تھا۔

سگانوک کو بھی یانسن کی طرح پھانسی پانے سے پہلے سترہ دن جیل میں گُزارنے پڑے۔ اور یہ سارے سترہ دن اس طرح گُزر گئے گویا ایک ہی دن تھا اور اسی ایک دُھن میں کہ کس طرح جان بچائی جائے، کیسے آزادی حاصل کی جائے، کیسے زندہ رہا جائے۔ سگانوک کی بےچینی کو جیل کی دیواروں، سلاخوں اور اندھی کھڑکی نے کُچل دیا تھا اور اب یہی بےچینی طیش کی صورت میں خود اُس کی رُوح پر پلٹ پڑی تھی، اور اُسے اس طرح جلا رہی تھی جیسے دہکتے انگارے لکڑی کے تختے پر پھیل جائیں۔ جیسے شراب دماغ کو چڑھ گئی ہو اُسے چمکدار لیکن ناتمام پرچھائیاں دکھائی دے رہی تھیں جو مدغم پڑتے پڑتے ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتیں اور پھر ایکدم سے اُن کی ایک آندھی سی اُٹھتی جو اُس کے دماغ کو اُڑائے لئے جاتی۔ اور اِن سب کا رُخ بس ایک ہی جانب تھا —

— جان بچانے، زندہ رہنے اور آزادی کی طرف۔ گھوڑے کی طرح نتھنے پھُلائے سگانوک گھنٹوں ہوا کو سُونگھتا رہتا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بان کی بُو سُونگھ سکتا ہے، آگ کے دھوئیں کی بُو، جلنے کی بےرنگ بُو سُونگھ سکتا ہے۔ کبھی کوٹھری میں لٹو کی طرح گھومتا اور دیواروں کو جلدی جلدی ٹٹولتا۔ کبھی اُنگلیوں سے اُنہیں بجا کر دیکھتا۔ نشانہ لیتا، چھت کو اپنی نظروں سے برماتا، اور سلاخوں کو خیال ہی خیال میں ریتی سے کاٹتا۔ اپنی بےچینی سے اُس نے محافظ سپاہیوں کو تھکا دیا۔ وہ اندھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتے اور بعض دفعہ تو تنگ آکر گولی مار دینے کی دھمکی بھی دیتے۔ سگانوک بھدے پن سے جواب دیتا اور بُرا بھلا کہنے پر تُل جاتا۔ یہاں تک کہ گالیوں اور گندہ دہنی پر اُتر آتا تو محافظ چُپکے ہو جاتے کہ ایسے پراگندہ حواس انسان پر گولی کیا چلائی جائے۔

سگانوک رات کو گہری نیند سوتا۔ کروٹ تک نہ بدلتا لیکن اِس بےحرکتی میں بھی جان تھی۔ جیسے بل کھایا ہوا تار عارضی طور پر بیکار رہے۔ لیکن آنکھ کُھلتے ہی وہ فوراً گھومنا شرُوع کر دیتا۔ منصوبے گانٹھتا اور دیواریں ٹٹولنے لگتا — اُس کے ہاتھ ہمیشہ خشک اور گرم رہتے تھے لیکن اُس کا دل کبھی کبھی ایکدم سے سرد پڑ جاتا۔ جیسے نہ پگھلنے والی برف کا ایک ڈلا اُسکے سینے پر رکھ دیا گیا ہو اور اِس سے اُس کے سارے جسم میں ایک ہلکی سی خشک کپکپاہٹ دوڑ رہی ہو۔ ایسے مواقع پر سگانوک کے چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا اور ڈھلے ہوئے لوہے کی طرح ہلکی سی نیلاہٹ اُس پر جھلکنے لگتی تھی اور ایک عجیب عادت اُس میں پیدا ہو گئی تھی۔ جیسے اُس نے بےتحاشہ مٹھاس کھالی ہو وہ اپنے ہونٹ چاٹتا رہتا چٹخارے لیتا رہتا۔ اور دانت بھینچکر فرش پر تھوک کی پچکاریاں مارتا رہتا۔ جب بات کرتا تو اپنے الفاظ ختم نہ کرتا۔ اسکے خیالات اتنی تیزی سے ذہن میں گُذرتے تھے کہ الفاظ اُن کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔

ایک دن داروغہ جیل ایک سپاہی کے ساتھ اُس کی کوٹھڑی میں آیا۔ فرش کی طرف نظر ڈال کر سگانوک سے بولا: "دیکھو۔ کتنا گندا کر رکھا ہے!"

سگانوک نے فوراً اتر کر جواب دیا: "تم نے ساری دُنیا کو گندا کر رکھا ہے موٹل! مگر میں نے تو تمہیں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ تم یہاں آئے کیوں ہو؟"

داروغہ نے اکھڑپن سے کہا: "کیا تم جلاّد کا کام کر سکتے ہو؟"

سگانوک نے قہقہہ لگایا اور دانت چمکا کر بولا: "تمہیں اور کوئی نہیں ملا؟ چلو اچھا ہوا۔ ہاہاہا! گردنیں موجود ہیں۔ رسّی موجود ہے لیکن پھندا ڈالنے والا کوئی نہیں تو۔ واللہ۔ یہ خُوب ہوا!"

داروغہ نے کہا: "اگر تم جلاّد بن جاؤ تو تمہارا گلا بچ جائیگا!"

سگانوک بولا: "یہ تو ہے ہی۔ اگر مَیں مر گیا تو اُنہیں پھانسی کیسے دُونگا واہ بے احمق، یہ بھی خوب کہی!"

داروغہ نے کہا: "اچھا تو تم کیا کہتے ہو؟ تمہیں یہ کام کرنا ہی یا نہیں؟"

"بھلا تم انہیں پھانسی کس طرح دیتے ہو؟ شاید دھوکے سے؟"

داروغہ نے تڑخ کر کہا "نہیں تو! باجے گاجے سے۔"

"دیکھا کیسا بیوقوف ہے! ہاں باجے گاجے کے ساتھ بھی پھانسی دی جا سکتی ہے۔ دیکھو ایسے۔" اتنا کہا اور سگانوک نے تذرہو کر بے تحاشہ گانا شروع کر دیا۔

داروغہ بولا: "دوست، تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ کیا کہتے ہو پھر؟ ذرا سمجھ کر بات کرو۔"

سگانوک نے دانت نکوس کر کہا: "کس قدر مشتاق ہو تم۔ اچھا پھر کسی وقت آنا تو بتائیں گے۔"

اس کے بعد سگانوک کے ذہنی چمکدار سائیوں میں ایک اور سایہ نمودار ہوا — جلاد کی سرخ قمیص اس کے جسم پر کیسی بھلی معلوم ہوگی! اس نے اپنے خیال میں ایک بڑی واضح تصویر بنائی۔ اِس تصویر میں ایک چوک لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ بیچ میں ایک اونچی سی پھانسی گڑی تھی۔ اور پھانسی کے چبوترے پر کلہاڑا لئے خود وہ ٹہلتا پھر رہا تھا۔ سورج سر پر تھا اور کلہاڑا چمک رہا تھا۔ ہر چیز اتنی خوش نظر آتی تھی کہ وہ شخص بھی جس کا سر اڑایا جانے والا تھا مسکرا رہا تھا۔ تماشائیوں کے ہجوم کے پیچھے گاڑیبان اور گھوڑوں کے سر دکھائی دے رہے تھے — دیہات سے دہقان تماشہ دیکھنے آئے تھے، اور ان سے بھی پیچھے کچھ فاصلے پر دیہات بھی دکھائی دے رہا تھا۔

"آخ تھو!"

سگانوک نے اپنے ہونٹ چاٹ کر چٹخارہ لیا اور کھنکار کر تھوکا۔ اور ایکدم سے اُسے ایسا معلوم ہوا کہ ایک بڑی سی ٹوپی اُسے پہنا دی گئی جس نے اُس کا منہ تک ڈھک دیا — چاروں طرف اندھیرا ہو گیا اور اُس کا دم گھٹنے لگا۔ اور اُسکا دل پھر نہ پگھلنے والی برف کا ڈلا بن گیا جس سے خشک کپکپی اُسکے سارے بدن میں دوڑنے لگی۔

داروغہ دو مرتبہ اور اسکی کوٹھری میں آیا اور سگانوک نے دانت نکوس کر پھر وہی کہا: "کسقدر مشتاق ہو تم۔ پھر آنا!"

آخرکار ایک دن داروغہ نے اندھی کھڑکی میں سے آواز دیکر کہا "احمق! تو نے اپنا موقع کھو دیا۔ ہمیں ایک اور آدمی مل گیا۔"

سگانوک نے دانت پیس کر جواب دیا: "لعنت ہو تجھ پر۔ خود پھانسی لگا لے۔" اسکے بعد سگانوک نے جلاد اور مقتل کا خواب دیکھنا چھوڑ دیا۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور موت قریب آتی گئی مبہم سایوں کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا گیا۔ سگانوک اب محسوس کرتا تھا کہ وہ ساکت کھڑا ہے۔ جیسے ٹانگیں پھیلائے کھڑا ہے — لیکن خیالات کا ایک طوفان آیا ہے اور اُسے بہاتے لئے چلا جا رہا ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے پکڑ کر سہارا لیلے۔ ہر چیز بہی چلی جا رہی ہے۔ اور اُسکی نیند بھی بے چین ہونے لگی۔ اُس کے خیالات سے بھی زیادہ شدید خواب اُسے دکھائی دینے لگے — نئے نئے خواب۔ ٹھوس، بھاری، جیسے لکڑی کے رنگین ٹکڑے۔ اب اُن کی شکل رَو کی سی نہیں تھی بلکہ ایک لامتناہی آبشار کی سی تھی۔ جو ایک لامتناہی گہرائی میں گر رہا ہو۔ بیشمار رنگوں سے بھری ہوئی دنیا میں ایک چکراتی اڑان سے مشابہ۔

جب سگانوک آزاد تھا تو اُس کی صرف بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ لیکن جیل میں اُس کی گھنی ڈاڑھی بھی نکل آئی تھی جس سے اُس کا چہرہ وحشتناک بن گیا تھا۔ جیسے پاگلوں کا چہرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات سگانوک کے ہوش و حواس واقعی زائل ہو جاتے تھے اور وہ کوٹھری میں دیوانہ وار گھومتا اور دیواروں کو بجا بجا کر دیکھتا۔ پانی پیتا تو گھوڑے کی طرح پئے چلا جاتا۔

بعض دفعہ شام کے وقت جب چراغ جلائے جاتے سگانوک چاروں ہاتھ پاؤں پر کھڑا ہو جاتا اور بھیڑیئے کی سی آوازیں نکالتا۔ بڑی سنجیدگی سے یہ حرکت کرتا۔ اور اس طرح بھیڑیئے کی آواز نکالتا گویا کوئی بڑا ضروری اور اہم کام کر رہا ہے۔

پہلے ہوا سے خوب اپنا سینہ پھلا لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک لمبی کپکپاتی آواز نکالتا اور آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے اِس آواز کو سنتا رہتا۔ کپکپاہٹ وہ دانستہ پیدا کرتا تھا۔ ایک دم سے چیخ نہیں مارتا تھا۔ بلکہ ہر سُر بڑی احتیاط سے ادا کر کے ایک غمناک آواز نکالتا جو ناقابلِ بیان رنج و خوف سے بھری ہوئی ہوتی۔

پھر یکدم سے اس آواز کو بند کر دیتا اور کئی منٹ تک اُسی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر خاموش کھڑا رہتا۔ پھر یکایک زمین کی طرف گھورتے ہوئے بڑبڑانا شروع کرتا۔

"میری پیاریو، میری دلبرو!... میری پیاریو، میری دلبرو! رحم کرو... میری پیاریو... میری دلبرو!!"

اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی آواز کو بڑے غور سے سُن رہا ہے۔ جو لفظ کہتا اُسے سُنتا جاتا۔

پھر وہ اچھل کر کھڑا ہو جاتا اور پورے ایک گھنٹے تک اول فول بکتا رہتا۔ چلاتا رہتا اور اپنے لال لال دیدے گھماتا رہتا۔

"اگر تم مجھے پھانسی دو تو مجھے پھانسی دیدو!" اور پھر بکنا شروع کر دیتا۔ پہرہ دار اُس کی چیخ پکار سُنکر خوف سے سفید پڑ جاتا۔ دروازے پر بندوق کا کندہ مارتا اور بے سُود چیختا رہتا۔ "خبردار، گولی مار دونگا۔ اپنی جان کی قسم پھر تجھے مار ڈالونگا۔ سُنتا ہے یا نہیں؟"

لیکن گولی وہ نہیں مار سکتا تھا۔ جنہیں پھانسی کا حکم مل چکا ہو اُن پر اُس وقت تک گولی چلانے کی اجازت نہیں تھی جب تک کہ وہ بغاوت نہ کر دیں۔ اس کے جواب میں سنگا نوک دانت پیستا، گالیاں دیتا اور تھوکتا۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک تیز تلوار رکھی تھی اور اس پر سنگا نوک کا دماغ کٹ کٹ کر مٹی کے خشک ڈھیلے کی طرح کھیل کھیل ہوا جا رہا تھا۔

جب آدھی رات کو چند آدمی اُسے پھانسی دینے لے چلے تو سنگا نوک بالکل ٹھیک ہو گیا گویا اس کی پہلی فطرت عود کر آئی۔ اب پھر اُس کے مُنہ کا ذائقہ میٹھا ہو گیا اور مُنہ میں تھوک بھرنے لگا۔ لیکن اس کے رُخسار گلابی ہو گئے اور آنکھوں میں وہی پہلی سی شاطرانہ چمک نمایاں ہو گئی۔ کپڑے پہنتے ہوئے اُس نے افسر سے پوچھا۔

"پھانسی کون دے گا؟ کوئی نیا آدمی ہے؟ شاید اس نے ابھی کام بھی سیکھا بھی نہیں ہو گا۔"

افسر نے سرد مہری سے جواب دیا "تمہیں پریشان ہونیکی ضرورت نہیں ہے۔"

"پریشانی کا تو میں کوئی علاج نہیں کر سکتا حضور۔ پھانسی مجھے ملنے والی ہے نہ کہ آپ کو۔ سرکاری صابن جو رسی پر ملا جائیگا کم سے کم اُس میں تو کنجوسی نہ کرنا۔"

"اچھا اچھا۔ خاموش رہو۔"

سنگا نوک نے داروغہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "اِس شخص نے تمہارا سارا صابن کھا لیا ہے۔ دیکھو اس کا چہرہ کیسا چمک رہا ہے!"

"خاموش!"

"کنجوسی مت کرو" یہ کہکر سنگا نوک نے قہقہہ لگایا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کا مُنہ میٹھا ہوتا چلا جا رہا ہے اور ایکدم سے اسکی ٹانگیں کچھ عجیب طرح سے سُن ہونے لگیں۔ پھر بھی جب نکل کر صحن میں آیا تو بولا۔

"اچھا! نواب بنگال کی گاڑی!"

پانچواں باب

پیار کرو ——— اور کچھ نہ کہو

پانچوں دہشت پسندوں کا آخری فیصلہ سنا دیا گیا اور اُسی دن اُس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مجرموں کو یہ نہیں بتایا گیا کہ انہیں پھانسی کب دی جائیگی۔ لیکن وہ اتنا جانتے تھے کہ عام دستور کے مطابق انہیں اسی رات کو یا زیادہ سے زیادہ اگلی رات کو پھانسی دیدی جائے گی۔ اور جب اُن کو کہا گیا کہ آئندہ جمعرات کو وہ اپنے عزیزوں سے ملیں گے تو وہ سمجھ گئے کہ جمعہ کی صبح کو انہیں پھانسی دیدی جائیگی۔

تانیا کا کوئی قریبی عزیز نہیں تھا۔ اور اگر کوئی تھا بھی تو بہت دُور دراز مقام پر اتنی دُور کہ مقدمے اور سزائے موت کی اطلاع بھی وہاں نہیں پہونچی ہوگی۔ مسیح درنر نے اپنا اتہ پتہ ہی نہیں دیا تھا اس لئے سمجھا گیا کہ اُن کے عزیز رشتہ دار ہیں ہی نہیں۔ صرف دو سرجے گول ون اور وسیلی کیشرن ایسے تھے جنہیں اپنے والدین سے ملنا تھا۔ یہ دونوں اس ملاقات کے خیال سے خوفزدہ اور پریشان تھے۔ پھر بھی وہ بوڑھے ماں باپ سے آخری بات چیت اور آخری پیار کرنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

سرجے گول ون اس ملاقات سے بیحد متوحش تھا۔ ماں باپ سے اُسے بے انتہا محبت تھی۔ حال ہی میں وہ اُن سے ملا تھا اور اب اُسے یہ خوف کھائے جاتا تھا کہ اب جو وہ ملنے آئیں گے تو کیا ہو گا۔ پھانسی اور پھانسی کے تمام وحشتناک لوازم اور ان کا دماغ اُڑا دینے والے خوف کا اندازہ وہ کر سکتا تھا لیکن ملاقات کے اُن چند لمحات پر غور کرنے کی اُس میں ہمت نہیں تھی۔ یہ چند لمحات اُسے وقت کی قیود اور زندگی کی حدود سے بھی باہر نظر آتے تھے۔ کس طرح دیکھے، کیا سوچے اور کیا کہے؟ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ باپ سے مصافحہ کر کے اُسے پیار کرنا اور مزاج پُرسی کرنا ——— ایسی عام بات بھی ناقابل بیان حد تک بھیانک، وحشتناک اور مہمل معلوم ہوتی تھی۔

سزائے موت سُنانے کے بعد مجرموں کو ایک جگہ نہیں رکھا گیا سب کو الگ الگ تنہا قید کیا گیا۔ صبح سے گیارہ بجے تک گول ون اپنی کوٹھری میں دیوانہ وار ٹہلتا رہا اور اپنی ڈاڑھی نوچتا رہا۔ اس طرح بھویں چڑھاتا گویا ترس آ رہا ہے اور خود بخود بڑبڑانے لگتا۔ کبھی کبھی ایکدم سے رُک جاتا اور لمبے لمبے سانس لیتا جیسے پانی میں غوطہ لگا کر بڑی دیر میں اُبھرا ہو۔ لیکن اُس کی صحت اتنی اچھی تھی اور اُس کی جوان رُوح جسم میں اتنی مضبوط تھی کہ اتنی شدید ذہنی تکلیف کے باوجود خون برابر جلد کے نیچے دوڑ رہا تھا۔ اُس کے رُخسار سُرخ ہو رہے تھے اور نیلی آنکھوں میں معصومیت کی چمک تھی۔

لیکن اُس نے جو کچھ بھی اندازہ لگایا تھا وہ بالکل غلط نکلا۔

سرجے کا باپ نکلوے گولن جو فوج میں کرنل رہ چکا تھا پہلے اُس کمرے میں داخل ہوا جہاں یہ ملاقات ہوتی. وہ سر سے پاؤں تک سفید تھا چہرہ سفید، ڈاڑھی سفید، بال سفید، ہاتھ سفید — گویا برف کا ایک مجسمہ تھا انسانی لباس میں. وہ اپنا پرانا فوجی کوٹ پہنے ہوا تھا لیکن یہ کوٹ صاف ستھرا تھا. کندھے پر کی آڑی پٹیاں نئی تھیں. اُس کی یہی وضع تھی. کمرے میں دل سخت کرکے قدم جما کر رکھتا ہوا. اپنا سفید دُبلا ہاتھ بڑھا کر بولا "کیسے ہو سرجے؟"

اس کے پیچھے پیچھے سرجے کی ماں چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی آئی اور اُس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی. اِس نے بھی سرجے کے ہاتھ زور سے دبائے اور باآواز بلند پوچھا "کیسے ہو سرپوژینکا؟"

پیار کرکے وہ خاموش بیٹھ گئی. اُس پر جھپیٹی نہیں. پھوٹ پھوٹ کر روئی نہیں. چیخیں نہیں ماریں. اُس نے کوئی حرکت وہ نہیں کی جس سے سرجے ڈر رہا تھا. اُس نے بس پیار کیا اور چپکی بیٹھ گئی. بلکہ اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا سیاہ لباس ٹھیک بھی کیا.

سرجے کو علم نہیں تھا کہ کرنل نے ساری رات ایک کمرے میں بند ہو کر اِس ملاقات کے نشیب و فراز پر غور کیا تھا. کرنل نے بالآخر یہ طے کیا تھا کہ ہمیں اپنے بچے کے آخری وقت کو اجیرن نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے. اُس نے بڑی احتیاط سے ہر عنوان گفتگو پر غور کیا. ہر حرکت اور ہر بات کو اچھی طرح سوچا لیکن نہ جانے کس طرح وہ سب کچھ بھول گیا اور کوچ کے کونے میں منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگا. صبح کو اُس نے اپنی بیوی کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ جب ملاقات ہو تو اُسے کیا کرنا چاہیے.

ماں نے رو کر کہا "میں سمجھ رہی ہوں نکلولے!"

"تمہیں رونا نہیں چاہیے. خدا کیلئے روؤ نہیں. تم رو کر اُسے مار ڈالو گی —"

"اور تم کیوں رو رہے ہو؟"

"عورتوں کے ساتھ رونا ضبط نہیں کیا جا سکتا. لیکن تمہیں رونا نہیں چاہیے!"

"اچھا نکلولے!"

گاڑی میں سوار ہو کر اُس کا ارادہ تھا کہ پھر اُسے سب باتیں سمجھا دے. لیکن وہ بھول گیا. اِس لئے وہ خاموش بیٹھے اپنے اپنے خیالات میں محو شہر کے قلب غبارے میں سے گزرتے رہے. ایک تہوار قریب تھا اور شہر میں خوب چہل پہل تھی.

وہ بیٹھ گئے. پھر کرنل اٹھا. مشق کے مطابق تن کر کھڑا ہوا اور دایاں ہاتھ سینہ پر کوٹ میں رکھا. سرجے ایک لمحہ کیلئے بیٹھی. پھر ماں کے جھریاں پڑے چہرے کو بغور دیکھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا.

ماں نے کہا "بیٹھ جاؤ سرجے!"

باپ نے بھی کہا "بیٹھ جاؤ سرجے!"

سب خاموش ہو گئے. ماں مسکرائی.

"ہم نے تمہارے لئے بڑی کوشش کی سرپوژینکا. تمہارے ابا —"

"آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا اماں —"

پھر کرنل نے جما جما کر کہا "ہمیں یہ کرنا پڑا سرجے. تاکہ تمہیں یہ خیال نہ ہو کہ ماں باپ نے تمہیں بھلا دیا۔"

پھر سب خاموش ہو گئے. ایک لفظ بھی ادا کرنا انہیں مصیبت نظر آتا تھا. گویا زبان کا ہر لفظ اپنے اصلی معنی کھو چکا تھا. ہر لفظ کے صرف ایک ہی معنی رہ گئے تھے — موت. سرجے نے اپنے باپ کے کوٹ کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا "اب ان کے پاس کوئی نوکر نہیں ہے. انہوں نے خود ہی کوٹ صاف کیا ہوگا. عجیب بات ہے کہ پہلے میں نے یہ بات کبھی سوچی ہی نہیں کہ یہ اپنا کوٹ خود صاف کرتے ہیں. شاید صبح ہی صبح صاف کر لیتے ہوں گے۔"

یکایک اُس نے پوچھا "بہن کیسی ہیں؟ اب تو اچھی ہیں؟"

ماں نے جلدی سے جواب دیا "نتوشا کو کچھ بھی خبر نہیں!"

کرنل نے سختی سے ٹوک کر کہا "جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ بچی نے اخبار میں پڑھ لیا تھا. سرجے سے کیوں چھپاؤ کہ سب — وہ سب جنہیں یہ چاہتا ہے — اس وقت سرجے ہی کو یاد کر رہے ہیں. اور —"

آگے وہ بول نہ سکا اور چپکا ہو گیا. یکایک ماں کا چہرہ سکڑا اور پھر پھیل گیا. ہوائیاں اُڑنے لگیں اور وحشت برسنے لگی. اس کی بے رنگ آنکھیں اندھوں کی طرح گھورنے لگیں اور اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا.

"سے — سے — سے. سر — سر —"

ماں کے منہ سے اتنا ہی نکلا. منہ کھلا ہوا اور لب ساکت تھے.

"پیاری اماں!"

کرنل آگے بڑھ کر آیا. کوٹ کی ہر شکن، چہرے کی ہر جھری کانپ رہی تھی. یہ نہ جانتے ہوئے کہ موت کی سی زردی خود اس کے چہرے پر چھا رہی ہے اور کتنا بھیانک ہو گیا ہے، اُس نے بڑا جبر کر کے بیوی —

کہا: "خاموش رہو۔ اُسے تکلیف مت پہونچاؤ۔ اُسے مرنا ہے۔ اُسے تکلیف مت پہونچاؤ۔"

خوف کے مارے وہ خاموش ہو چکی تھی۔ لیکن کرنل اپنی مٹھیاں بھینچے اب بھی کہہ رہا تھا: "اُسے تکلیف مت پہونچاؤ۔"

یہ کہکر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ کپکپاتے ہاتھ اپنے پیچھے کر لئے اور بہ آواز بلند زبردستی کے سکون کے ساتھ زرد لبوں سے پوچھا: "کب؟"

سرجے نے جواب دیا: "کل صبح" اُسکے ہونٹ بھی زرد تھے۔

اُس کی ماں زمین کی طرف نظریں جھکائے ہونٹ چبا رہی تھی۔ گویا اُس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ ہونٹ چباتے ہوئے اُس نے یہ سیدھے سادے الفاظ کہے مگر کچھ اس طرح کہ ہر لفظ سیسے کے ڈلے کی طرح گر رہا تھا۔

"نُوشا نے کہا تھا میری طرف سے پیار کر لینا۔"

سرجے نے کہا: "میری طرف سے بھی اُسے پیار کر لینا۔"

"اچھا۔ خوستو نے کہا تھا ہماری طرف سے پوچھ لینا۔"

"کونسے خوستو؟ اچھا وہ۔ ہاں ہاں۔"

کرنل نے بات کاٹ کر کہا: "بس اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ اُٹھو سرجے کی ماں۔ چلنا چاہیئے۔" باپ بیٹے نے مل کر مضمحل بوڑھی عورت کو اُٹھایا۔

کرنل نے حکم دیا: "سرجے سے رُخصت ہو لو۔ صلیب کا نشان بناؤ۔"

ماں سے جو جو کہا کرتی رہی لیکن جب صلیب کا نشان بنایا اور اپنے بچے کو پیار کیا تو اُس نے اپنا سر ہلایا اور آہستہ سے کہا: "نہیں۔ یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ میں کیا کہوں! میں کیسے کہوں؟ نہیں یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے۔"

باپ نے کہا: "خدا حافظ سرجے" یہ کہکر ہاتھ ملایا اور دونوں نے ایک دوسرے کو جلدی سے گرم دلی سے پیار کیا۔

"آپ ——"

سرجے نے کچھ کہنا چاہا۔

باپ نے ایکدم سے قطع کلام کیا: "کیا؟"

"نہیں نہیں! یہ ٹھیک طریقہ نہیں ہے! کیسے کہوں؟"

یہ الفاظ ماں نے سر ہلا کر بڑی نحیف آواز میں کہے اور پھر بیٹھ گئی۔

سرجے نے پھر کہا: "آپ ——"

ایکدم سے اُس کے چہرے پر غمناک شکنیں پڑ گئیں اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چمکدار آنسوؤں میں سے اُس نے باپ کے سفید چہرے کو قریب سے دیکھا۔ اُسکی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے۔

"آپ، ابا، آپ بہت اعلیٰ و ارفع ہیں۔"

"کیا ہے؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

کرنل نے تعجب سے کہا۔ اور پھر جیسے اُس کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں وہ اپنے بچے کے کندھے پر سر رکھکر سب کچھ بھول گیا۔ کرنل قد میں اُونچا تھا لیکن اب وہ پست ہو گیا تھا۔ اُس کا خشک سفید سر برف کے ڈلے کی طرح بیٹے کے کندھے پر رکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو چپ چپکے گرمجوشی سے پیار کر رہے تھے۔ سرجے اُسکے روپہلے بالوں کو اور بڈھا کرنل قیدی کے کپڑوں کو چوم رہا تھا۔

ایکدم سے چیخ سُنائی دی:- "اور میں؟"

انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سرجے کی ماں کھڑی تھی۔ سر پیچھے کی طرف کھنچا ہوا وہ غصّے سے بلکہ ایک حد تک نفرت و حقارت سے اُن کی طرف گھور رہی تھی۔

کرنل نے کہا: "سرجے کی ماں، کیا ہے؟"

ماں نے دیوانہ وار شدت سے سر ہلاتے ہوئے کہا: "اور میں! تم تو پیار کرو —— اور میں؟ تم مرد! میں؟ اور میں؟ اور میں؟"

"اماں!" کہکر سرجے اُسکی طرف لپکا۔

اِس کے بعد کیا ہوا نہ تو بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ بیان کرنے کی ضرورت.......

کرنل کے آخری الفاظ یہ تھے:-

"سریوزا اس موت میں میری دُعائیں اور برکتیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمت سے جان دینا، افسروں کی طرح۔"

اس کے بعد وہ چلے گئے۔ کسی نہ کسی طرح چلے گئے۔ وہ وہاں گئے تھے، وہاں موجود تھے، وہاں کھڑے تھے، باتیں کی تھیں —— اور یکایک چلے گئے۔ یہاں اُس کی ماں بیٹھی تھی۔ وہاں اُس کا باپ کھڑا تھا —— اور یکایک وہ چلے گئے تھے۔ اپنی کوٹھری میں واپس آکر سرجے کھٹیا پر پڑ گیا۔ مُنہ دیوار کی طرف کر لیا تاکہ سپاہی نہ دیکھ سکیں اور دیر تک روتا رہا۔ روتے روتے تھک کر وہ گہری نیند سو گیا۔

وسیلی کیشرن کے پاس صرف اس کی ماں آئی۔ اُس کا باپ ایک مالدار تاجر تھا۔ اُس نے آنا پسند نہیں کیا۔ جب بوڑھی ماں ملنے آئی تو وسیلی کمرے میں بےچینی سے ٹہل رہا تھا۔ موسم خاصہ گرم تھا لیکن وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ بات چیت مختصر اور دردناک تھی۔

"اماں تم ناحق آئیں۔ تم خود بھی پریشان ہو گی اور مجھے بھی پریشان

کروگی۔"

"تم نے یہ کیوں کیا وسیا؟ کیوں کیا؟ یا اللہ!" اتنا کہکر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور سیاہ رنگ کی اوڑھنی کے کنارے سے آنسو پونچھنے لگی۔ وسیلی کو معلوم تھا کہ ماں جب بکھر جاتی تھی تو پھر کوئی بات نہیں سُنتی تھی۔ وسیلی سردی سے کپکپانے لگا اور غصّے سے بولا: "دیکھا، میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا، تم ذرا نہیں سمجھتیں اماں۔ ذرا بھی!"

"اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے۔ کیا تمہیں ۔۔۔ سردی لگ رہی ہے؟"

وسیلی نے طنز سے کہا: "سردی!" اور پھر کمرے میں گھومنے لگا۔ کبھی کبھی ماں کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ لیتا تھا، گویا ماں کی باتوں سے چڑ گیا تھا۔

"شاید تمہیں سردی لگ گئی ہے؟"

وسیلی نے بےبسی سے ہاتھ جھٹک کر کہا: "اماں سردی کیا چیز ہے جب ۔۔۔"

اور اُس کی ماں کہنے ہی کو تھی کہ "تمہارے ابا نے گیہوں کی روٹی ملنے کا انتظام کر دیا ہے۔ بس اگلے پیر سے" مگر وہ ڈر گئی اور بولی: "میں نے اُن سے کہا وہ تمہارا بیٹا ہے۔ تمہیں اُسکے پاس جانا چاہیئے اور دُعا دینی چاہیئے۔ مگر وہ بڈھا جانور اپنی ضد پر اَڑا رہا۔"

"لعنت ہو اُس پر! باپ ہو کر اُس نے میرے ساتھ کیسا سُلوک کیا؟ ساری عُمر تو اُس نے بدمعاشی میں گزاری اور اب بھی پکا بدمعاش ہے۔"

بڑھیا نے پینترا بدلا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

"وسینکا! تم اپنے باپ کے متعلق ایسے الفاظ کہہ رہے ہو؟"

"باپ کے متعلق!"

"خود اپنے باپ کے متعلق!"

"میرا باپ نہیں ہے وہ۔"

یہ کچھ عجیب اور مہمل باتیں تھیں۔ اس کے سامنے تو موت کا خیال تھا یہاں چھوٹی چھوٹی اور دُور از کار باتیں نکل آئیں۔ اور اُس کے الفاظ اس طرح چٹخ گئے جیسے سخت چھلکے جوتے کے نیچے چٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ وسیلی اور اُسکے سب سے قریبی عزیزوں میں ہمیشہ سے ایک غلط فہمی کی دیوار حائل رہی تھی جو اس وقت بھی، مرنے سے چند گھنٹے پہلے بھی، بدستور قائم تھی۔ وسیلی نے شدّتِ غم سے روتی آواز میں کہا: "کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ جلدی ہی پھانسی ملنے والی ہے؟ پھانسی! سمجھتی ہو؟ پھانسی!"

بڑھیا نے چیخ کر کہا: "تم اگر کسی کو نقصان نہ پہونچاتے تو کوئی تمہیں ۔۔۔"

"یا اللہ! یہ کیا ہے! جانور بھی ایسا سُلوک نہیں کرتے! کیا میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں؟"

وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا اور رونے لگا۔ بڑھیا بھی اپنے کونے میں بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ محبت کے جذبے کو بروئے کار لانے کی اس میں قدرت نہیں تھی۔ آنے والی موت کے ہراس کو دُور کرنے کیلئے وہ تنہائی کے سرد آنسو بہاتے رہے جن سے اُن کے دل گرم نہیں ہوتے۔

ماں نے کہا: "تم پوچھتے ہو میں تمہاری ماں ہوں یا نہیں؟ تم مجھے طعنہ دیتے ہو! اور اِن دنوں میں میرے سارے بال سفید ہو گئے۔ میں بالکل بڑھیا ہو گئی۔ اور پھر بھی تم کہتے ہو، تم مجھے طعنے دیتے ہو!"

"خیر، اماں یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ اب تمہارے جانے کا وقت ہو گیا۔ میرے بھائیوں کو میری طرف سے پیار کر لینا!"

"کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ کیا مجھے تمہارا غم نہیں ہے؟"

وہ وہاں سے چلی گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی جاتی اور اوڑھنی سے آنسو پونچھتی جاتی۔ سڑک اُس نے دیکھی نہیں۔ جیسے جیسے قید خانے سے دُور ہوتی جاتی رونا بڑھتا جاتا۔ وہ پھر اُلٹے قدم لوٹی اور راستہ بھول گئی۔ عجیب بات ہے کہ جس شہر میں پیدا ہوئی، ساری عُمر گزار کر بڑھیا ہوئی، اُسی شہر میں بھٹکتی پھری ۔۔۔ چلتے چلتے وہ ایک ویران باغیچے میں پہونچ گئی۔ یہاں چند جلے ہوئے مُڑے تُڑے درخت تھے۔ ایک بنچ جو برف کے پگھل جانے سے گیلی ہو رہی تھی اُس پر بیٹھ گئی۔

ایکدم سے اُس کی سمجھ میں آگیا۔ اُس کے بچے کو کل پھانسی ملنے والی ہے!

بڑھیا ایک دم سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور بھاگنے کو تھی کہ یکایک اُس کا سر زور سے چکرایا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ برف آلود پگڈنڈی گیلی اور پھسلواں تھی۔ بڑھیا اُٹھنا چاہتی تھی مگر اُٹھ نہ سکی۔ وہ لڑھکتی رہی کہنیوں کا سہارا لیکر اُٹھتی مگر کروٹ کے بل گر جاتی۔ اوڑھنی پھسل کر نیچے آرہی۔ میلے سفید بالوں میں ایک جگہ سے چندیا کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ پھر جانے کس طرح اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک برات کی ضیافت میں شریک ہے۔ اُس کے بیٹے کی برات ہے اور زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اُسے نشہ ہو رہا ہے۔

اُس نے چیخ کر کہا: "اور نہیں۔ میرے بس کی نہیں۔ یا اللہ۔ بس"
گویا کسی چیز کے لینے سے وہ انکار کر رہی تھی۔ (بقیہ بر صفحہ ۷۳)

(۲۳) آخری تیر	دیوانہ بریلوی
(۲۴) بگلا بھگت	ڈاکٹر اعظم کریوی
(۲۵) اکیلی قبر	پروفیسر عبدالقادر سروری
(۲۶) بچوں کی تعلیم	رفیق اجمیری
(۲۷) ساتھ ایسا تو ہو	قیسی رامپوری
(۲۸) مصنف کا وارث	پروفیسر محمد مسلم
(۲۹) بیوی آخر بیوی ہے	ناکارہ حیدرآبادی
(۳۰) مہانداری	حجاب امتیاز علی
(۳۱) فرحت کا انجام	انصار ناصری دھلوی
(۳۲) بنات البحر	فضل حق قریشی دھلوی
(۳۳) شاہی خاندان دہلی کی بپتا	ظفر قریشی دھلوی
(۳۴) پال کی آگ	صادق الخیری دھلوی
(۳۵) شکنتلا	پروفیسر احمد علی
(۳۶) بچہ	مرزا عظیم بیگ چغتائی
(۳۷) سچی کہانی	"پریم پجاری"
(۳۸) دیوانہ شاعر	سعادت حسن منٹو
(۳۹) عورت	اختر حسین رائے پوری
(۴۰) گوالیار کے بانکے	مرزا فہیم بیگ چغتائی
(۴۱) قلعہ معلی کی ایک جھلک	اشرف صبوحی دھلوی
(۴۲) انوکھی مسکراہٹ	محمد محسن
(۴۳) گواہ	رشید احمد صدیقی
(۴۴) بیگانگی	ممتاز مفتی
(۴۵) بھوک	شاہد لطیف
(۴۶) نیرا	عصمت چغتائی
(۴۷) کفارہ	سید رفیق حسین
(۴۸) داستانِ خزانِ خزانی	اسعد الاشرفی دھلوی
(۴۹) عینک اتر جانیکے بعد	علامہ مضحک دھلوی
(۵۰) مچھندر خاں	ڈاکٹر ہاشمی

کتاب شائع ہو گئی ہے۔ اِس نایاب مجموعے کی قیمت نسبتاً بہت کم تجویز کی گئی ہے۔

ساقی کے مستقل خریداروں کیلئے دو ۲ روپے علاوہ محصولڈاک

لوٹ:- خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ رعایتی قیمت نہیں لی جائے گی۔

جو حضرات ساقی کے مستقل خریدار نہیں ہیں اُن کیلئے تین ۳ روپے علاوہ محصولڈاک

محصولڈاک مع رجسٹری آٹھ آنے (۸/)

مہتمم ساقی بک ڈپو۔ دھلی

زندانی

"لڑکی! لڑکی!! ارے او لڑکی!!!" ــــــ شنکر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دروازہ کی طرف دیکھکر ایک دم چلّایا۔
"ابے راجو! دیکھتا ہے! ــ وہ ۔ وہ!! وہ رہی ــ"
"کہاں! کہاں؟" راجو نے چونک کر پوچھا ــــ
"ہائے رام بھرپور جوانی ہو ــ"
"یہ کہاں سے ٹپک پڑی؟" بوڑھے رمیش نے گھاس کا ٹکڑا، جس سے وہ اب تک اپنے شکستہ دانت کرید رہا تھا، پھینک کر کہا۔
"ارے وہ! ــ نئے داروغہ کی بٹیا ہوگی" رامو نے لاپروائی سے گھٹنوں کے سہارے اوپر اٹھتے ہوئے کہا۔
"وہ دیکھ! ــ وہ بھی تو چھوٹے لڑکے کی انگلی پکڑے آ رہا ہے"
"جوانی ہے رنگین ــ" کمار نے اپنا پچلا ہونٹ دانت سے دبا کر ایک مست سانس لیتے ہوئے حسرت سے کہا ــــ
"چھلکے پڑتی ہے! ــ کاش اس کی زندگی کی چند رنگین ساعتیں میری جوانی کی نذر ہوتیں ــــ کاش! میری تاریک راتوں میں وہ ایک بھٹکی ہوئی کرن ثابت ہوتی ــ"

ہم سب دن بھر کام کرنے کے بعد ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے تھے ۔ میں ان کا نگراں تھا۔ مجھے اس جیل میں آئے ہوئے ابھی صرف چند ماہ گذرے تھے۔ مجھے مزدور سبھا کے سالانہ اجلاس میں ایک تقریر کرنے کے سلسلے میں تین سال کی سزا ہوئی تھی میرے تمام ساتھی بڑے پرانے پاپی تھے۔ وہ سب قتل، خون اور ڈاکے کے الزام میں لمبی لمبی سزائیں کاٹ رہے تھے ــ شنکر اور کمار دونوں جوان آدمی تھے۔ ان کی عمر کوئی تیس تینتیس برس کی ہوگی ــــ راجو ادھیڑ عمر کا تھا۔ رمیش اور رامو بوڑھے ہو چکے تھے ــ عمریں ڈھل چکی تھیں ــ زندگی کی آخری منزل کی طرف تیزی سے گام زن تھے ــ وہ سب انسان تھے ــ زندہ انسان ــ لیکن زندگی کی شعریت اور اس کی لطافتوں سے وہ ایک عرصہ سے بیگانہ تھے ــ وہ اس پیڑ کے مانند تھے جس کی جڑ کو پانی نہ ملنے سے گھن لگ جاتا ہے ۔ وہ زندگی کی ایک بڑی نعمت سے محروم کر دیئے گئے تھے ــ یوں تو انھیں کھانے، رہنے اور سونے کو مل جاتا تھا۔ لیکن صنفی تعلقات سے جو انسانی زندگی کا جزوِ لاینفک ہیں وہ قطعی ناآشنا رکھے جاتے تھے ۔ انھوں نے ایک عرصہ سے عورت کی شکل بھی نہ دیکھی تھی ۔ یہ تشنگی جو رنگ لاتی کم تھا۔ وہ بہت سی بیماریوں کا شکار ہو چکے تھے ــ بہت سی اخلاق سوز حرکات ان میں پائی جاتی تھیں ــ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا ایک جوان لڑکا قیدیوں کے زمرے میں شامل کر دیا گیا تھا ــ چند دن بعد ان میں ایک اچھی خاصی لڑائی ہوئی ۔ سرکاری کمیشن کا چاہے کچھ ہی بیان ہو لیکن جاننے والے اصلی لڑائی کا سبب خوب جانتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے جو ہمارے جیسے انسان ہیں ــ جنھوں نے ایک جوان لڑکی کو دیکھکر ایسا محسوس کیا کہ ان کی روح ایک خوابِ گراں کے بعد انگڑائی لیکر بیدار ہوئی ۔ ان کی کشتیٔ حیات نے دریائے زندگی کی ہلکی ہلکی موجوں کے جھکولے محسوس کئے۔

مجھے سرکاری طور پر چند اخبار اور رسالے پڑھنے کو مل جایا کرتے تھے ۔ اکثر نوجوان قیدی جو میرا کمرہ جھاڑنے آتے ان پرچوں میں سے عورتوں کی تصاویر پھاڑ کر لے جاتے۔ انھیں لپیٹ کر اپنی چڈیوں کے نیفوں میں چھپا لیتے ۔ تنہائی میں ان کو سامنے رکھ کر عجیب عجیب حرکتیں کرتے ــــ میں نے شنکر اور راجو کو ان تصاویر کی پرستش کرتے اور ان کے سامنے آنسو بہاتے پایا۔

"اجی! کمار جی!" لڑکی کے جانے کے بعد شنکر نے کہا ــ
"تم تو ویسے بہت گنگناتے ہو ــ کوئی بسیر دیر کہو نا؟"
کمار نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وقت کہیں اور تھا ــ بوڑھا رامو ہنستے ہنستے کہنے لگا ــ "بڑا عاشق کی دُم بنا پھرتا ہے ــ لڑکیوں کی تصویریں تھوک لگا لگا کر سینے پر چپکاتا ہے ــ مجنوں ہے مجنوں ــ ایک لڑکی کیا دیکھ لی سینے سے ہاتھ ہی نہیں ہٹتا ــ جیسے کوئی چیز نکل بھاگے گی نا؟"
"بس بس! چپ رہ بڈھے!!" شنکر نے غصّہ سے کہا۔

"ذرا بوڑھے کا خیال ہے ۔ کوئی اور ہوتا تو ۔ اور تو جانے کیا۔ ساری عمر تو چوری کرتے گذری ۔ ارے میں نے ایک لڑکی کے لئے خون کیا ہے خون ۔ اسی کی سزا بھگت رہا ہوں "

"ٹھیک بات ہے " کمار مسکرایا ۔ "ہمیشہ اوروں کے ہاں چوری کی، اگر کبھی تمھارے متاعِ دل پر ڈاکہ پڑتا تو معلوم ہوتا۔ کیوں بابو جی! سچ کہتا ہوں نا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ کمار لکھا پڑھا آدمی ہے ۔ لیکن ان کے حالات سے میں ناواقف تھا۔ آج ان کے گذشتہ واقعات معلوم کرنے کی ایک زبردست خواہش پیدا ہوئی ۔ میں اکثر ان کا نگراں رہتا تھا۔ ان کے ساتھ محبّت اور ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے سگار سے ان کی تواضع بھی کرتا تھا ۔ وہ سب مجھ سے خوش تھے ۔ آج میں نے ان کے حالات معلوم کرنیکی خواہش ظاہر کی ۔ میری تحریک سے ہر شخص میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ۔ فضا ہی کچھ ایسی تھی ——— گذرے ہوئے واقعات ہر شخص کو یاد آرہے تھے ——— میرے اشارے پر راموکہنے لگا :۔

"بابو جی! ۔ میری ساری عمر چوری کرنے، ڈاکہ ڈالنے میں گذری ۔ بس یہ سمجھ لو کہ دو تین سال جیل کے اندر رہا، دو تین سال باہر ——— لوگ دن بھر محنت کرنے کے بعد رات کو آرام کرتے ہیں ——— بس یہی میری حالت ہے ۔ جب چوری، ڈاکے، عیّاشی سے تھک جاتا ہوں تو چند دن آرام کرنے چلا آتا ہوں ———

ہاں! تو میں آپ کو سناتا ہوں کہ یہ زندگی میں نے کیوں اختیار کی۔ بڑی پرانی بات ہے ۔ میری عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی ۔ ایک رئیس کے ہاں نوکر تھا ——— ان کے رکھ رکھاؤ ۔ ان کے ٹھاٹ دیکھکر میرے منہ میں پانی آجاتا ——— جی چاہتا کہ میں بھی ایسی ہی مست زندگی گزاروں ——— مگر میں تو صرف تین روپئے کا نوکر تھا ——— ہولی کے دن تھے ۔ ہر شخص نشے میں جھول رہا تھا میں نے بھی نشے کیلئے صاحب کی جیب سے دو روپئے مار دیئے ——— انھوں نے مجھے پولس کے حوالے کردیا ——— خیر، ہم تو سزا کاٹ آئے مگر اب ہم پکّے ہو چکے تھے ——— ہر دولت مند سے مجھے نفرت ہو چلی تھی ——— اب بھی کسی بڑے آدمی کو دیکھتا ہوں تو غصّہ سے جسم پر تھرتھری آجاتی ہے ۔ ایک آگ سی تو لگ جاتی ہے۔ مجھے ان کے یہ ٹھاٹ ایک آنکھ نہیں بھاتے ——— بس انھیں لوٹتا ہوں اور اپنی زندگی گذارتا ہوں "

اس کے بعد میں شنکر کی طرف رجوع ہوا ۔

"کیا پوچھتے ہو بابو جی!" شنکر کہنے لگا ——— میں ایک اچھوت کے گھر پیدا ہوا ۔ باپ دادا چمار کا پیشہ کرتے تھے ۔ ایسا مضبوط ٹانکا لگاتے کہ گاؤں میں کیا کوئی لگائے گا ——— میں روزانہ ندی نہانے جاتا تھا ۔ وہاں ایک دھوبی کی لڑکی رانی سے پریم ہو گیا۔ بڑی ہی سندر تھی وہ ——— مجھ پر جان دینے کو تیار تھی ۔ وہ میرے لئے دیس کو ٹھکرانے پر تیار تھی ——— رانی کا باپ اس کی شادی اپنی ہی برادری کے ایک جوان موہن سے کرنا چاہتا تھا مگر رانی شادی سے دریا میں ڈوب مرنا زیادہ پسند کرتی تھی ——— میری اور موہن کی دشمنی بڑھتی گئی ——— ایک دن ندی کے کنارے ہماری خوب لڑائی ہوئی ۔ وہ مجھے ڈھکیلتا کنارے تک لے گیا۔ شاید ایک اور دھکے میں میں کئی سو فٹ نیچے پہونچتا ——— مگر میں فوراً لیٹ گیا ۔ اور موہن کو ٹانگوں پر اٹھا کر پیچھے پھینکا ۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر سنبھل نہ سکا اور گیند کی طرح لڑھکتا دریا میں جا گرا ——— تین دن بعد اس کی لاش پاس کے ایک گاؤں میں ملی ——— اور اس جرم میں پانچ سال سے یہاں پڑا ہوں۔ ——— کون جانے میرے بعد رانی کا کیا ہوا ——— مگر جب اس کی یاد آتی ہے تو ۔"

شنکر آگے کچھ نہ کہہ سکا ——— شام ہو چکی تھی ——— شنکر کی آنکھوں میں بھی ستارے جھلملا رہے تھے ——— سات بجنے کی آواز سن کر ہم سب اپنی کوٹھریوں کی طرف چل دیئے ۔

دوسرے دن شام ہم لوگ پھر اسی درخت کے نیچے جمع ہوئے۔ میری فرمائش پر راجو نے اس طرح اپنی داستان شروع کی :۔

"میں اپنی اکلوتی لڑکی کے ساتھ خاموشی سے ایک شہر میں اپنی زندگی گذارتا تھا ۔ میں ایک مل میں نوکر تھا ۔ اتنا کما لیتا تھا جو ہم دونوں کیلئے کافی ہوتا ——— ہمارے گھر کے قریب ایک "بڑے صاحب" کا چپراسی رہتا تھا ۔ وہ اپنے کو صاحب بہادر سے کسی طرح کم نہ سمجھتا تھا ۔ تمام محلّے والوں کو خواہ مخواہ ڈانٹتا دھمکاتا رہتا تھا۔ بیچارے غریب اس سے بہت ڈرتے تھے ——— اسے جمعدار کہہ کر پکارتے تھے ۔ اس کے خلاف کوئی شخص زبان نہ ہلا سکتا تھا ۔ اس نے پہلے تو میری بہن کو پھانسنے کی کوشش کی جب کچھ دال نہ گلی تو

تو ایک روز گھر میں گھس کر زبردستی اس کی عزت لے لی ——— بڑی نیک تھی بچاری ——— یہ داغدار چہرہ دُنیا کو کیا دکھاتی۔ فوراً پڑوس کے کنوئیں میں ڈوب مری ——— شام کو جب میں گھر واپس آیا تو بہن کی لاش سامنے رکھی تھی۔ سچ کہنے کا کسے حوصلہ تھا۔ سب خاموش تھے۔ مگر اتنی بڑی بات کیونکر چھپتی ——— جیسے ہی مجھے معلوم ہوا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا۔۔ اور پھر ——— میری کلہاڑی جمعدار صاحب کے سر میں چار انچ اندر گھس گئی۔"

اس دردناک قصے سے ہر شخص متاثر تھا۔ سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ بوڑھے رامو نے مونچھوں پر تاؤ دیکر کہا "بہت اچھا کیا تو نے" ——— کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ میرا اشارہ پاکر بوڑھے رتنیش نے کہنا شروع کیا:۔

"آپ لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ میں نے اپنے سگے چھوٹے بھائی کا خون کیا ہے" کچھ ٹھیر کر وہ پھر کہنے لگا ——— "میں اس کے لئے مجبور تھا۔ واقعات کچھ اس قدر اُلجھ گئے تھے کہ ہم دونوں میں سے ایک کو مرنا ضرور تھا ——— اسے میری خوش قسمتی کہو یا بدقسمتی کہ میں بچ رہا اور میرا بھائی۔ ہاں میرا بھائی میرے ہاتھوں قتل ہوا۔ باپ نے مرتے وقت کافی کھیتی باڑی چھوڑی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے اُسے آپس میں تقسیم کرلیا اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ کچھ دن بعد اس کے چند خودغرض دوستوں نے اس کے کان بھرے کہ میں نے اچھی اچھی زمین اپنی طرف کرلی ہے اور اس طرح ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنادیا ——— کشیدگی بڑھتی گئی۔ ایک مرتبہ کھیت میں ہماری لڑائی ہوگئی۔ اس نے مجھ پر لکڑی سے متواتر وار کئے اور اس کے جواب میں میں نے بھی وار کئے ——— آخرکار۔ میری لکڑی کی ایک ضرب سے اس کا بھیجہ پاش پاش ہوگیا" ——— اتنا کہہ کر بوڑھا رتنیش خاموش ہوگیا۔

کمار گھٹنوں پر سر رکھے خاموش بیٹھا تھا۔ ہم سب کی نظریں اسکی طرف اٹھ گئیں۔ کیونکہ اب اس کی باری تھی۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا اور پھر اس طرح اپنے حالات بیان کئے:۔

"میں یہاں ایک قاتل کی حیثیت سے موجود ہوں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے اس جذبے سے جس کے تحت میں نے خون کیا اور اس سزا سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے سزا تو فعل قتل کی دی گئی ہے۔ اس لئے میں اکثر اپنے فعل کے متعلق سوچا کرتا ہوں ——— کیا میں حق بجانب تھا یا میں نے زیادتی کی؟ میرا فعل جائز تھا یا ناجائز ——— چار سال سے میں اسی مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ لیکن اب تک کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ ہاں! لیجئے میں اپنے حالات سناتا ہوں ——— میں ایک یونیورسٹی کا گریجویٹ ہوں۔ میرے والد ایک بیوپاری آدمی تھے۔ ان کے انتقال کے بعد سارا بار مجھ پر آپڑا۔ اس سلسلے میں مجھے اکثر گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ یہ بات میری بیوی کو سخت ناگوار تھی۔ میری شادی معاشقہ کا نتیجہ تھی۔ ہمیں ایک دوسرے سے بیحد محبت تھی۔ اس کی محبت میری مجبوریوں کو نظر انداز نہ کرسکی۔ وہ کچھ رنجیدہ سی رہنے لگی۔ اس کی صحت گرنے لگی۔ میں نے اپنے ایک عزیز دوست سے جو ڈاکٹر تھے اس کی ملاقات کرادی کہ صحت کے متعلق وہ ان سے رائے لیتی رہے۔ اس کے بعد میں اپنے کاروبار میں محو ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے دیکھا اس کی حالت روبہ صحت تھی۔ وہ ہشاش بشاش رہنے لگی۔ اب وہ اکثر ڈاکٹر کے ساتھ گھومنے اور سینما بھی جانے لگی۔ لیکن چند دن بعد عجیب عجیب خبریں مجھ تک پہونچیں ——— میں نے حتیٰ الامکان درگذر کرنے کی کوشش کی مگر سماج کی انگلیاں مجھے تیر ونشتر کی طرح چبھنے لگیں۔ آخر ایک روز میں نے اپنی بیوی کی خوب خبر لی۔ اس نے وعدہ کیا کہ نہ وہ ڈاکٹر کو گھر آنے دیگی نہ اس سے کوئی تعلق رکھے گی۔ یہ قصہ یہاں ختم ہوگیا۔ ہم پھر ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ایک مرتبہ مجھے چند روز کیلئے باہر جانا پڑا۔ لیکن میرا کام جلد ختم ہوگیا۔ میں ایک روز قبل ہی مکان پہونچا۔ میں اچانک پہونچ کر بیوی کو حیرت میں ڈالنا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ مکان میں داخل ہوا۔ اندر میں نے کیا دیکھا۔ اُف! میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سر چکرانے لگا۔ لڑکھڑاتا ہوا آفس روم میں پہونچا۔ الماری میں سے ریوالور نکال لیا۔ میرے دل میں صرف ایک خیال تھا اس کے سوا میں کچھ نہ سوچ سکا۔ بیوی اور ڈاکٹر کے سامنے پہونچکر ان پر گولیوں کی بارش کردی جب میں ٹھیرا تو سینکڑوں خیالات میرے دماغ میں گذر گئے۔ اچانک ایک خیال آتے ہی میں نے ریوالور کی نال اپنے سینہ پر رکھ لی لیکن افسوس۔ وہ پہلے ہی خالی ہوچکا تھا!"

صدر دروازے سے بگل اور گھنٹوں کی آواز آرہی تھی۔ ہم سب اپنی اپنی کوٹھریوں کی طرف چلنے لگے۔

رات کو سوتے وقت میں نے سوچا کہ تمام فتنہ وفساد، لڑائی جھگڑے صرف زر۔ زن۔ زمین کیلئے ہوتے ہیں۔ ساری دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ بہت سے انسان اسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ انسانوں کا ایک بڑا حصہ ان تکالیف سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں؟ آخر یہ سب کیوں؟ ——— مجھے نیند آگئی۔

ریاض رؤفی

میرا مالی

کچھ عرصہ گذرا کہ مجھ کو اپنے مکان کے سامنے باغیچہ لگوانے کا سودا سر میں سمایا۔ چنانچہ میں نے یار دوستوں سے مشورہ کیا کہ باغیچہ لگانے کیلئے کن کن چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ سب نے یہی کہا کہ بھئی ایک مالی رکھ لو۔ گھر کے سامنے زمین تو ہے ہی۔ اس طرح جب "زمین" اور "مالی" یک جا ہوں گے تو باغ اور باغیچہ دونوں پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب مجھ مالی کی تلاش ہوئی۔ مگر اس معاملہ میں کچھ دقت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ جن دنوں مجھے باغیچہ لگوانے کی خواہش پیدا ہوئی تھی ان ایّام میں میری استفسارات اس زور شور سے ہو رہے تھے کہ آس پاس کے مہتر، چمار، دھوبی، نائی۔ غرضیکہ گھر گھر میں جب میاں بیوی دن بھر کی محنت کے بعد چار گھڑی آرام کرنے سے پہلے بیٹھ کر باتیں کرتے تو گھر بار کے دیگر معاملات کے علاوہ میرے باغیچہ لگوانے کا تذکرہ بھی ضرور ہوتا۔

قصہ مختصر ایک دن صبح میں نہا دھو کر اخبار پڑھنے بیٹھا تھا کہ کسی نے دروازہ کو نہایت آہستگی سے کھٹکھٹایا۔ میں نے کہا "اندر تشریف لے آئیے!" اس پر ایک پتلی سی صورت اندر داخل ہوئی۔ عجیب حُلیہ تھا۔ ننگے پاؤں جن پر پتلی پتلی ٹانگیں میلی سی دھوتی سے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک ڈھکی ہوئی تھیں۔ دھوتی پر ایک قمیص ڈھیلی ڈھالی اور اس پر کسی سپاہی کا خاکی سرج کا پُرانا کوٹ۔ کوٹ کے موٹا ہونے پر بھی اس انسان کے جسم کی لاغری عریاں تھی۔ پتلے پتلے شانوں کے اوپر پنڈلیوں سے ذرا ہی موٹی گردن پر ایک نہایت پتلا چہرہ لگا ہوا تھا۔ چہرہ کی رنگت بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس کا رنگ گہرے سبزی مائل سے لیکر گہرے چاکلیٹ تک کسی قسم کا ہوگا۔ مونچھیں بھی اس کی پتلی پتلی مگر لمبی اور مڑی تڑی ہوئی تھیں۔ ایک گھٹیا قسم کی ترکی ٹوپی جس کو سر کے بال بھی گول نہ بنا سکے تھے دھری ہوئی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ جواب میں کہنے لگے کہ وہ خود خدمت کرنے آئے تھے۔ انھوں نے پاس کے کسی چمار سے سُنا تھا کہ مجھ کو ایک مالی کی ضرورت تھی اور وہ بذاتِ خود مالی تھے۔

میں نے دل میں سوچا کہ یہ حضرت مالی کا کیا کام کریں گے۔ ان کا پتلا پن ان کی کمزوری کی دلیل تھا۔ مگر مونچھیں اور سامنے کے دانت جن میں سونے کی میخیں لگی ہوئی تھیں ان کے تجربہ کار ہونیکے شاہد تھے۔ غرضیکہ یہ فیصلہ ہوا کہ دس روپیہ ماہانہ پر میرے ہاں مالی کا کام کیا کریں گے۔

دوسرے دن صبح مالی صاحب تشریف لائے اور پوچھا کہ باغیچہ کس قسم کا لگایا جائے۔

میں یہ سوال سن کر جھجکا یا۔ سوچنے لگا کہ باغیچہ کی کونسی قسم بتاؤں۔ آخر ہمت کر کے کہا کہ مالی سنو! تم سے دو سیدھی سادی باتیں کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں کوئی شاہجہاں تو ہوں نہیں کہ تاج محل جیسا گلزار لگوانے کی جرأت کر سکوں۔ بس کسی قسم کا باغیچہ ہو۔ یعنی معمولی سی قسم کا۔ دوسرے یہ کہ چونکہ آجکل زمانہ میں آزادی کا دَور دَورہ ہے اس لئے میں نے باغیچہ لگانے میں تم کو مکمل آزادی دے دی۔ جس طرح چاہو باغیچہ لگاؤ۔ جو چاہو کرو۔ مگر اس ویرانے کو بسا دو۔ مالی "سلام سرکار" کہہ کر رخصت ہوا۔

اس دن مالی نے اس اُجڑی زمین کا جائزہ لینے میں صرف کیا۔ اس زمین کو ہر ایک زاویئے سے دیکھا۔ اس کی مٹی کو ہاتھ اور پاؤں دونوں سے ٹھکور ٹھکور کر دیکھا۔ اپنی انگلی سے چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے خیالی دائرے کھینچے۔ بیچ میں اُگے ہوئے درختوں پر غور کیا۔ غرضیکہ ہر پہلو سے اس معاملہ کو بھانپا۔ پھر گویا اس دن کا کھیل ختم کر کے کسی انجینئر کی طرح اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

تیسرے دن صبح کو پھر مالی صاحب نظر آئے۔ کہنے لگے۔ "سرکار اس زمین کے گرد جنگلہ لگنا چاہیئے تاکہ بچے، ڈھور، ڈنگر اور اسی قسم کی چیزیں بننے والے باغ میں سے نہ گذر سکیں۔" میں نے پوچھا "پھر کیا کیا جائے؟" مالی نے کہا "جی کچھ نہیں۔ تین چار روپئے کے بانس، ایک بیلچہ، پھاوڑا، سو گز تار اور اسی قسم کی کچھ اور چیزیں درکار ہونگی۔ میں خود جنگلہ کھڑا کر لوں گا۔

یہ نئے عشق کی پہلی مشکل تھی۔ نئی نئی تنخواہ آئی تھی۔ میں نے بیس روپئے حضرت مالی کی نذر کئے اور کہا کہ سب سامان لے آؤ۔ اور جنگلہ وغیرہ شروع کر دو۔ چنانچہ جنگلہ وغیرہ بننا شروع ہو گیا اور کچھ عرصے تک بنتا رہا۔ جب بن چکا تو میں نے سوچا کہ اب باغیچہ لگتا

شروع ہو جائیگا۔ اور پھر گھر کے سامنے باغ اور باغ میں بیٹھ کر بند؟ شام کی چاء پیا کریگا۔ اور مشکل مسائل پر غور کرتے وقت اس میں ٹہلا کریگا۔ میں انہی خیالات میں تھا کہ مالی صاحب پھر تشریف لائے اور کہا کہ "حضور جنگلہ تو تیار ہو گیا اب اس کو رنگ کرنا چاہیئے بہت خوش نما معلوم دیگا۔"

مجھے بہت غصہ آیا۔ مالی پر غصہ آیا۔ اس چمار پر بھی غصہ آیا، جس نے اس مالی کو میرے پاس ملازم ہونے کی صلاح دی تھی۔ اور سب سے زیادہ خود پر غصہ آیا کہ کیوں میں نے یہ دردِ سر مول لیا۔ او غصہ آنے کی وجہ بھی تھی۔ میں باغیچہ لگوانے کی فکر میں تھا اور مالی جنگلہ کھڑا کر رہا تھا اور اس کو رنگنے کی فکر میں تھا۔ مگر میں نے پھر سوچا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جو کام آہستگی سے ہوگا وہ اچھا ہوگا۔ اس لئے میں نے جنگلہ رنگنے کی تجویز کو بھی پسند کیا اور رنگ و برش کیلئے پیسے مالی کو دیدیئے۔ ایک شام کو جبکہ میں جنگلے کا پاس سے معائنہ کر رہا تھا تو میں نے مالی کو زیرِ لب گنگناتے سُنا، بالکل سہگل کی طرح:۔

اک جنگلہ بنے نیارا

خیر سے جنگلہ بھی رنگا گیا۔ دوسرے دن پھر مالی صاحب آموجود ہوئے۔ کہنے لگے "صاحب! باغیچہ لگانے کیلئے بیج لانے ہونگے۔ اس کے علاوہ پانی کا انتظام بھی کرنا پڑے گا جس کیلئے دو کنستر دل اور ایک فوارہ کی ضرورت ہو گی"۔ مالی کو میں نے ان سب چیزوں کے لئے بھی پیسے دیئے اور اس نے کام شروع کر دیا۔ پہلے چند دن تو کیاریاں بنانے میں لگ گئے۔ پھر اس نے شاید بیج بوئے۔ اور روزانہ جب میں کام کر کے واپس آتا تو مالی جانفشانی سے باغ میں پانی دے رہا ہوتا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک دو پھول بھی باغیچہ میں اُگ پڑے۔ مگر باغیچہ ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ میں اس میں بیٹھکر چاء پی سکتا یا بیچیدہ گتھیاں سُلجھا سکتا۔

میرا باغیچہ میں بیٹھنے کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ کم بخت زمین کا ٹکڑا باغیچہ کی شکل ہی اختیار کرنے میں نہیں آتا تھا۔ بے چینی کے ایّام کا ذکر ہے کہ مالی صاحب ایک صبح پھر نمودار ہوئے اور اس مرتبہ یہ فرمائش لیکر آئے کہ نئے موسم کیلئے نئے بیجوں کی ضرورت ہوگی۔

سوال پھر پیسوں کا تھا۔ دراصل تمام دنیا پیسوں کا کھیل ہے۔ میں پیسے کمانے کیلئے کام کرتا ہوں۔ میرا باپ پیسے کمانے کیلئے کام کرتا تھا۔ میرا نوکر پیسے کمانے کیلئے میرا کام کرتا ہے۔ لڑکے اسکولوں اور کالجوں میں دن رات اس لئے مطالعہ کرتے ہیں کہ پڑھ لکھکر دنیا میں پیسہ کما سکیں۔ قحبہ پیسوں کیلئے حسن فروشی کرتی ہے۔ وکیل پیسوں کیلئے جھوٹ بولتے ہیں اور پہلوان گردنیں اور شانے تڑواتے ہیں۔ خود میرے مالی نے بھی پیسوں کیلئے یہ جال بچھا رکھا ہے۔ گھٹتے ہوئے دل سے اور دریا میں ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح میں نے پوچھا "مالی! تو کیا پہلے بیج ختم ہو گئے۔ کیا ان کی بہار چل گئی؟ بڑی جلدی چلی گئی۔ میں نے تو صرف دو پھول باغیچہ میں دیکھے تھے۔ پھر وہ پہلے بیج کیا ہوئے؟"

مالی نے یوں جواب دیا۔ جیسے پہلے ہی سے تیاری کر کے آیا ہو "سرکار! دراصل کام موسم کے بیچ میں شروع ہوا تھا اس لئے ادھورا سا رہ گیا تھا۔ اب کے دیکھئے باغیچہ کو پھولوں سے بھر دوں گا۔ آپ کونسی قسم کے پھول زیادہ پسند کرتے ہیں؟"

میں نے شکست خوردہ فریق کی طرح کہا "مالی! خدا کیلئے اس اُجڑی زمین کو سرسبز کر دو۔ کوئی بھی پھول لگاؤ مگر وہ پھول ہوں کوئی اور شے نہ ہو۔ اگر میری صلاح پوچھتے ہو تو مجھے موتیا بہت پسند ہے۔ یہ پھول ہے بھی ہندوستانی طرز کا۔ اور میں نے دل میں سوچا کہ؎

کانٹے سے بھی خراب ہے جس گل میں بُو نہ ہو

اس لئے میرے باغیچہ میں موتیا ضرور ہو۔ یہ کہہ کر مالی کو حسبِ ضرورت بیجوں کیلئے اور پیسے دیئے۔ مالی سلام کر کے رخصت ہوا۔ اور مجھے یہ سوچتا چھوڑ گیا کہ نہ معلوم یہ اخراجات کب تک جاری رہیں گے

مالی کو رکھے ہوئے پانچ مہینے گذر گئے۔ مگر باغ میں یعنی اس زمین میں جس کے گرد باغیچہ بنانے کی خاطر جنگلہ کھڑا کیا گیا تھا ابھی پھول اُگنے شروع نہیں ہوئے تھے۔ مالی کی نت نئی ضروریات ابھی تک طوفانی تیزی سے جاری تھیں۔ اگر میں مالی ہوتا تو مجھے تو روز روز پیسے مانگتے ہوئے شرم آجاتی خاصکر اس حالت میں جبکہ باغیچہ میں ابھی پھول بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ہاں باغیچہ کے بیچوں بیچ ایک جھاڑی سی نمودار ہو رہی تھی۔ عجیب قسم کے بدنما پتوں کے ساتھ! میں نے مالی سے پوچھا کہ "کیوں بھئی! یہ کس قسم کے پھول ہیں؟"

مالی کہنے لگا "حضور! آپ نہیں جانتے؟ یہی تو موتیا ہے"!

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے بھی اپنی زندگی میں موتیا دیکھا تھا مگر شاید مالی کی اصطلاح میں اسی بدنما جھاڑی کو موتیا کہتے ہونگے۔ میں دنیا کے کسی شخص سے ہر ایک شرط لگانے کیلئے تیار ہوں کہ وہ یہ ثابت کر دے کہ جو جھاڑیاں میری زمین میں اُگ رہی ہیں وہ موتیا ہی کی پھول ہیں۔ مزید بر آں موتیا میں تو خوشبو ہوتی ہے۔ نہایت دلفریب خوشبو

جس سے گھر بار مہک جائے۔ ان کمبخت جھاڑیوں میں تو بد بو بھی نہیں آتی۔ بعض داناؤں کا قول ہے کہ انسان کو بدکردار بیوی نہ ملے۔ مگر وہ عاقل شاید مصیبت کی اس کان کو بھول گئے تھے جن کو مالی کہتے ہیں۔ کم از کم میرا مالی تو دن رات میری آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔ ہر ایک بات میں دھوکا دیتا ہے۔ سچ غلطی سے بھی کبھی نہیں بولتا۔ اے دُنیا کو باغیچہ بنانے والو۔ میری یہ بات یاد رکھنا ان انسانوں پر کبھی اعتماد نہ کرنا ورنہ پچھتاؤ گے۔

میرے مالی نے اپنا لباس تبدیل کر لیا ہے۔ آجکل وہ دھوتی نہیں پہنتا بلکہ خاکی قمیص اور خاکی رنگ کا ہی پاجامہ پہنتا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ شاید جنگی لباس پہن کر مجھے ڈرانا چاہتا ہے کہ میں اس کے روزمرہ کے مطالبات پورا کرتا رہوں۔ یا شاید آج کل جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے خاکی لباس نہایت فیشن ایبل متصور ہوتا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے مالی کو اس خاکی رنگ سے محبت ہو اسی وجہ سے تو میرے باغیچہ میں خاک اڑا کرتی ہے اور پھولوں کی جگہ سوکھی ہوئی جھاڑیوں نے لے رکھی ہے۔ وائے نادانی میں نے ایسے شخص کو مالی کیوں رکھا!

اور سنئے! میرا مالی چار عدد بچوں کا باپ ہے اسی لئے تو کمبخت ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ بات مجھے اس طرح معلوم ہوئی کہ جب ایک آدھ مہینے کے بعد اس زمین (جس کو باغیچہ بنوانے کی کوشش میں میں نے اپنی پونجی صرف کر دی ہے) کی جھاڑیاں سوکھ کر اس قابل ہو جاتی ہیں کہ جلائی جا سکیں تو ان ایام میں مالی کے چھوٹے چھوٹے بچے کہیں سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ مرغی کے بچوں کی طرح اپنے باپ کی راجدھانی پر پھیل جاتے ہیں۔ اور آنِ واحد میں اس چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے کی وہی حالت کر دیتے ہیں جو مالی رکھنے سے کچھ دن پہلے تھی۔ یعنی باغیچہ صفاچٹ ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ خاردار جھاڑیاں بھی نہیں رہتیں۔ جنگلے سے گھرا ہوا زمین کا یہ حصّہ بھیڑ بکریاں رکھنے کی جگہ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ چار بچے اپنا کام نہایت صفائی سے کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ میرے مالی سے تو اس کے یہ بچے ہی بھلے۔ کم از کم مہینے میں ایک دفعہ باغ کی ایسی صفائی کر دیتے ہیں کہ تنکا بھی ڈھونڈنے پر نظر نہیں آتا۔

کئی موسم بدل چکے ہیں۔ مالی کو رکھے ہوئے اب ایک سال ہونے کو ہے۔ مالی نے باغ کو بھی اپنا جیسا خاکی لباس پہنا رکھا ہے۔ یعنی گھاس کی جگہ خاک اڑتی رہتی ہے۔ پھولوں کی جگہ خاردار جھاڑیاں روئیدہ ہیں، جو گاہ بگاہ مالی کے گھر میں ایندھن کا کام دیتی ہیں۔

مالی ہر روز میری کھال ادھیڑتا ہے۔ کبھی جھاڑیاں کاٹنے کے لئے قینچی مانگتا ہے۔ گھاس کاٹنے کیلئے مشین کی ضرورت بتاتا ہے۔ زمین کیلئے کھاد چاہتا ہے۔ بیوی بچوں کے رکھنے کیلئے مکان کی بھی ضرورت جتلاتا ہے۔ ان کی دوا دارو کیلئے ڈاکٹر سے نام چٹھی بھی لکھواتا ہے میں کیا کروں اس کے مطالبات کو حتی المقدور پورا کرتا ہوں۔ جب سے مالی آیا ہے میں نے ایک کپڑا نہیں سلوایا۔ جوں جوں مالی کے کپڑے اچھے ہوتے جا رہے ہیں میرے پھٹتے جا رہے ہیں۔ اس پر بھی اس مردِ ملعون کو میری حالت پر رحم نہیں آتا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں بڑا اُلّو ہوں۔ جو اس قسم کے انسان کو نوکری سے علیحدہ کیوں نہیں کر دیتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ایک تو میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح باغیچہ لگ جائے اور بطرف دیگر مالی کے مطالبات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ نہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً حال کا واقعہ ہے کہ مالی صاحب صبح صبح تشریف لائے اور کہنے لگے کہ "سرکار! کچھ سرو کے پودے بک رہے ہیں۔ اگر حکم ہو تو تین چار خرید لاؤں؟"

میں نے کہا "مالی! تمہارا موتیا تو دیکھ لیا۔ اب شاید تم سرو کی جگہ چیڑ کا درخت لگانا چاہتے ہو!"

مالی نے نہایت متانت سے جواب دیا "جی نہیں اس دفعہ بالکل خالص قسم کا سرو لگاؤں گا۔ موتیا تو یہاں ملتا ہی نہیں اس لئے میں نے آپ کو خوش کرنے کیلئے موتیا کی قسم کی ایک اور چیز بو دی تھی"

میں نے کہا "اچھا مالی تو سرو لگا لو"

"بہت بہتر حضور" کہکر مالی نے پھر کہنا شروع کیا "سرکار! میں بال بچے دار ہوں۔ میری تنخواہ بڑھنی چاہئے۔ دس روپیہ میں میرا گذارہ نہیں ہوتا"

میں نے کہا "اچھا مالی! اس معاملے کو سوچیں گے اور سوچ کر جواب دیں گے"

مالی نے پھر کہا "سرکار کچھ گیلے باغ کے گرد لگنے چاہئیں"

میں جل بھن کر کوئلہ ہو گیا۔ باغ میں نام کو بھی پھول نہ تھا۔ اور نہ معلوم یہ شخص گملوں میں کیا لگانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "مالی! گملوں کیلئے اس وقت پیسے نہیں ہیں پھر کبھی سہی"

مالی ان ہستیوں میں سے نہ تھا جو گملوں پر ہی رک جاتا کہنے لگا "سرکار جیسے آپ کی مرضی۔ مگر دیوالی آ رہی ہے اور آپ نے اب تک چراغ نہیں منگوائے اگر حکم ہو تو میں چراغ لے آؤں اور ان کو دھو دھا کر دیوالی کیلئے تیار کر رکھوں"

اب آپ ہی بتائیے ایسے انسان کو کوئی کیا کرے۔ اگر گملوں کیلئے میں پیسے نہیں دیتا تو مالی دیوالی کیلئے چراغ تجویز کردیتا ہے۔ بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول نظر آتا ہے۔ اگر میں کمرہ میں بیٹھا ہوں تو کھانس کھانس کر اپنی موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔ اور جب وہ میرے کمرے کے سامنے آکر آہستہ سے کھانستا ہے تو میری روح قبض ہو جاتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ نئی تجویز پیش ہوگی اس لئے اپنی جیب پر مضبوطی سے ہاتھ دھر لیتا ہوں مگر جب کبھی مالی آتا ہے مجھے اتو بنا کر پیسے لے جاتا ہے۔ مگر باغیچہ ابھی تک نہیں بن سکا۔ اسی طرح بنجر اور ویران ہے جس طرح پہلے تھا۔ پھولوں سے اسی طرح خالی ہے جس طرح میری جیبیں آجکل پیسوں سے ہوتی ہیں۔

میری باغیچہ میں بیٹھکر چاء پینے کی آرزوئیں اور اس میں ٹہلتے ہوئے پیچیدہ گتھیاں سلجھانے کے سہانے خواب حرف غلط کی طرح مٹ چکے ہیں۔ آجکل جس پیچیدہ گتھی کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سلجھا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ کونسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے باغیچہ لگوانے کا قصد کیا تھا۔ اس آفت کو مول لینے سے تو یہی بہتر تھا کہ میں ہاتھی رکھ لیتا۔ کوئی بڑا سا کتا پال لیتا۔ ایسی موٹر خرید لیتا جو ایک گیلن پٹرول سے صرف چھ میل ہی چلتی۔ یا شادی کرکے ایک دو بچوں کا باپ ہی بن جاتا۔ ان چیزوں پر زر خرچ کرکے کچھ فائدہ بھی تو ہوتا۔ مگر اس پتلے مالی نے میری حالت بہت پتلی کردی ہے۔

ہش!! میرے دل کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مالی کے کھانسنے کی میٹھی اور مدھم آواز قریب تر ہو رہی ہے۔ میں اب قلم رکھ دوں تاکہ آنے والی مصیبت کا دونوں ہاتھوں سے مقابلہ کرسکوں۔

اب جگر تھام کے بیٹھوں مرا مالی آیا!

بھارت چند کھنہ

وعدہ فراموش سے!

یہ گھنی پلکوں کے سائے ہیں ترے رخسار پر
ہائے یہ نیچی نگاہیں! ہائے یہ غمگیں جمال
تیرا سینہ اور پریشاں! تیری آنکھیں اور نم!
میں نہیں کہتا کہ تو کیوں وقت پر آئی نہیں
میں نہیں کہتا کہ کیوں تو نے ادائے ناز سے
میں نہیں کہتا کہ اب ملنے کی گھڑیاں جا چکیں
میں نہیں کہتا کہ افشا ہو گیا ہے تیرا راز
میں نہیں کہتا کہ اب تیری تجلی عام ہے
میں تو بس اتنا کہوں گا اے مرے گل پیرہن
وہ جو دل میں ایک چنگاری ہے ہردم بیقرار
اس کی لو سے جب دہک اٹھتا ہے شاعر کا دماغ
روح کہتی ہے "اُسے اس وقت آنا چاہیئے
راہ تکتے تکتے تھک جاتا ہوں، رو دیتا ہوں میں

چھا رہی ہے یا گھٹا ساون کی شالامار پر
کیوں ہے اپنا راز کھل جانے کا تجھ کو احتمال
بڑھ رہا ہے اور بھی ان سے مرا رنج و الم
کیوں مری باہوں پہ تو نے زلف بکھرائی نہیں
میرے دل پر سر نہیں رکھا اسی انداز سے
صبح کی پریاں وہ پورب کے افق پر چھا چکیں
میں نہیں کہتا کہ ٹھہر جائیں ہیں تیرے حسن و ناز
یا تجارت اپنی رعنائی کی تیرا کام ہے
فی الحقیقت یوں نہیں ہوتا محبت کا چلن
وہ جسے کہتے ہیں دنیا کی زباں میں "انتظار"
یعنی جب نس نس میں جل اٹھتے ہیں چاہت کے چراغ
اس کو لانے کے لئے کچھ دور جانا چاہیئے"
آنسوؤں میں اپنی امیدیں ڈبو دیتا ہوں میں

صبح جب اٹھتی ہے مشرق سے برافگندہ نقاب
بیٹھ جاتی ہیں امیدیں ٹوٹ جاتے ہیں حباب

احمد ندیم قاسمی

تماکو

چرخ نے مُردہ جسم میں سے اپنی تھوتنی نکالی اور اوپر اٹھا کر اپنے کانوں کو کھڑا کیا۔ اُس کی زرد زرد آنکھیں اس طرح متحرک ہوئیں گویا وہ نا مطمئن و مشتبہ ہے۔ دُور اندھیرے جنگل میں سے کسی لشکر کے آگے بڑھنے کی آواز آرہی تھی ـــ دھپ، دھپ، دھپ، دھپ!

ایک گِدھ بولا، پھر اپنے پر پھڑپھڑا کر ایک درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا۔ باقی دو گِدھوں نے لمبی اُڑان بھری اور تا دیر کاٹ کاٹ کر اونچے ہونے لگے، یہاں تک کہ ایسے نظر آنے لگے کہ نیلے آسمان کے ریشمی شامیانے میں گم ہو گئے ہیں۔

گِدھ کہہ رہے تھے "تماکو آرہا ہے!"

سگ صورت بندروں کی ایک ٹکڑی جو جھاڑیوں میں غارت گری کر رہی تھی قلانچیں بھرتی باہر میدان میں نکل آئی۔ اُن کے گال پچکے پھڑپھڑا رہے تھے، دُمیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ آگے آگے ایک جغادری تھا جو اِن کا سردار تھا۔

جغادری نے اپنے زرد زرد دانت نکوس کر کہا "تماکو آرہا ہے۔"

باقی سب بندروں نے بھی منہ چڑا کر کہا "تماکو کیلئے راستہ چھوڑ دو۔"

اُن کا سردار ایک چھلانگ مار کر اُوپر پھیلے ہوئے ٹہنیوں کے جال میں پہونچ چکا تھا۔ باقی سارے بندر بھی چھلانگیں مارتے اُس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

چرخ اکیلا کھڑا ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ اس کے سامنے شیر ببر کا چیں خوردہ زبرا پڑا تھا۔ چرخ کی تھوتنی ایک بار پھر زبرا کے مُردہ جسم میں غائب ہو گئی۔ ایک ہی لمحہ بعد اُس نے اپنی خون میں لتھڑی ہوئی تھوتھنی اُٹھائی اور دُور سے آنے والی آواز کی طرف کان لگا کر سونگھنا شروع کیا۔

دھپ! دھپ! دھپ! زمین کانپنے لگی۔ سامنے کا درخت قریب آنے والے کے خوف سے لرزتا نظر آتا تھا۔ پھر ایکا ایکی جنگل کے سناٹے میں دہشتناک چنگھاڑیں گونجنے لگیں۔ جیسے سینکڑوں نقیبوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی ترئی پھونک دی ہو۔ پواو۔ پواو۔ پواو۔ پواو۔

یہ ہاتھیوں کی چنگھاڑ تھی۔ اِن میں سب سے اُونچی ایک آواز تماکو کی تھی جو اپنی ڈار کا سردار تھا۔ اس کی چنگھاڑ کا جواب باقی اور سب ہاتھی دے رہے تھے۔ پواو! پواو! پواو! پواو!

چرخ کے لئے یہ اعلان کافی تھا۔ اُس نے اپنی بالوں سے ڈھکی تھوتنی میں سے کُچلیاں چمکائیں، تیزی سے ایک پلٹا کھایا اور خاک کا ایک بادل سا اُڑاتا ہوا سبز رنگ گھنی جھاڑیوں میں سایہ کی طرح غائب ہو گیا۔

ٹہنی پر بیٹھے ہوئے گِدھ نے ایک زور کا قہقہہ سا لگایا۔ "تماکو آرہا ہے۔"

یک گیدڑ دُم دبا کر راستے میں سے بھاگا۔ کالے ناگ نے بھی بھاری بھاری قدموں اور کچل دینے والی موت کا خطرہ محسوس کر لیا تھا اور جلدی جلدی اپنی کُنڈلی کھول جھاڑی میں سٹک گیا۔

شیر ببر کے پنجوں سے چری ہوئی زبرا کی لاش دھوپ میں پڑی سڑ رہی تھی۔ چیونٹیوں کی چمکدار قطار جو زبرا تک پھیلی ہوئی تھی، وہ بھی یکایک غائب ہو گئی تھی۔ گھنے جنگل کا یہ چھوٹا سا میدان پُر اسرار سناٹے سے معمور ہو گیا تھا۔

بھاری بھاری قدموں کی خوفناک گرج قریب ہی ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی کے ایک پہاڑ نے اِس چھوٹے سے میدان کو ڈھانک لیا۔ سورج کی شعاعیں منقطع ہو گئیں اور جنگل کے سبز رنگ پردوں کو ہٹاتا یہ کالا پہاڑ عجیب شان و شکوہ سے آگے بڑھتا چلا آرہا تھا۔

یہ تماکو تھا جو اپنی ڈار کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کی سونڈ درختوں کو راستے میں سے ہٹاتی جاتی تھی اور راستے چارے کو سونگھتی جاتی تھی۔ بڑے بڑے کان پنکھوں کی طرح ہل ہل کر مکھیوں اور کیڑوں کو بھگا رہے تھے اور تماکو بڑی ہوشیاری سے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ لمبے لمبے زرد رنگ کے دانت موت کے نقیب معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے بھاری بھاری قدم اِسی طرح اُٹھ رہے تھے جیسے کوئی انسان اندھیرے میں بڑی احتیاط سے پنجوں کے بل چلے۔

پواو! پواو! پواو! پواو!

اب تماکو نے یہ آواز اتنی ہلکی نکالی کہ بالکل سرگوشی بن گئی۔

جنگلی سفید چڑیاں اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے پر پھڑپھڑانے اور چہچہانے لگیں۔ تماکو نے اپنا پچھلا دھڑ ذرا سا آگے کو کر دیا۔ اس پر کھٹملوں کی بہت سی بستیاں بڑی ہوئی تھیں اور یہ وہ مقام تھا جہاں کبھی کسی شکاری کی گولی لگی تھی۔

تماکو وہاں آکر ذرا ٹھٹکا جہاں مُردہ زیبرا پڑا تھا۔ تماکو کی بل کھاتی ہوئی سونڈ اُس کی طرف سونگھتی ہوئی بڑھی، پھر سر سے اونچی اُٹھ گئی۔ تماکو کی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور وہ کترا کر الگ ہٹ گیا۔ اسے مُردار سے نفرت تھی۔ یہ تو چرخ اور گِدھوں ہی کا من بھاتا کھاجا ہے۔

درخت پر بیٹھے ہوئے بندر کے قہقہے کی آواز اس نے سُنی۔ اُسے غصہ آگیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اس کی سونڈ درخت کے تنے پر لپٹ گئی اور ایک ہی جھٹکے میں درخت جڑ سے اکھڑ آیا۔ گِدھ اپنی بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے آسمان کی طرف اُڑ گئے۔ تماکو نے اکھڑا ہوا درخت جھاڑیوں کی طرف اُچھال دیا۔ جھاڑی میں دبکا ہوا ہرن چیخ مار کر اور بھی اندر جا چھپا۔

ہاتھی کی آواز سنائی دی: "راستہ صاف کرو تماکو آرہا ہے۔"

جیسے کسی جنازے کے ساتھ لوگ خاموش چلتے ہیں اسی طرح باقی اور سب ہاتھی اپنے سردار کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ گویا جنگل کے سائے قطار بناتے چل رہے تھے۔ چند بچے بیچ میں کلیلیں کرتے جا رہے تھے۔ پرانے ہاتھیوں کے لمبے لمبے دانت نکلے ہوئے تھے۔ ہتھنیاں بچوں کو قطار میں رکھتی چلتی تھیں۔

درختوں کو ہٹاتا، اکھاڑتا، جھاڑیوں کو کچلتا روندتا ہاتھیوں کا یہ جلوس چلا جا رہا تھا۔ چھوٹے سے میدان میں زیبرا کے سڑے ہوئے جسم پر دھوپ کی دھاریں پھر پڑنے لگیں۔ اب پھر اس کھلی جگہ میں سناٹا تھا اور سینکڑوں آنکھیں جھاڑیوں میں سے جھانک رہی تھیں۔

لیکن یہ جھانکنے والے جانور خاموش ساکت تھے۔ گِدھ اب بھی آسمان میں لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ صرف کالے ناگ نے ذرا بلند ہو کر اپنا پھن کھول دیا کیونکہ اب وہ ایک اور بھی زیادہ خطرناک بو پا رہا تھا۔ کوئی انسان قریب آرہا تھا۔

ایک لمحہ بعد وہ انسان جنگل کا پردہ ہٹا کر نمودار ہوا۔ یہ ایک گوری رنگت کا نوجوان تھا۔ دھوپ سے تمتماتے ہوئے چہرے سے مسرت اور وفورِ شوق ظاہر تھا۔ سیدھے ہاتھ میں ہاتھی کے شکار کی رائفل تھی۔

اُس نے آسمان کی طرف نظر نہیں اُٹھائی اور نہ اُن گِدھوں کو دیکھا جو ہوا میں معلق تھے۔ اُس کی نظریں تو ہاتھیوں کے اُن پیر کے نشانوں پر جمی ہوئی تھیں جو تماکو اور اس کی ڈار اپنے جلو میں چھوڑ گئی تھی۔ نیچے جھکے جھکے وہ اس کھوج کو دیکھتا بھاگا سا چلا جا رہا تھا۔

اِس اُجلے رنگ کے نوجوان کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح ایک دیسی کالے رنگ کا بندوق بردار لگا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ایک پرانی خاکی وردی تھی۔ قوسین کی طرح مُڑی ہوئی ٹانگیں جھلسی ہوئی لکڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں تماکو نے ٹھہر کر زیبرا کے مُردہ جسم کو سونگھا تھا اور کترا کر نکل گیا تھا۔

دیسی نے کہا: "صاحب! ان پگوں پر چلنا جان جوکھم کا کام ہے۔"

صاحب نے اپنی نیلی آنکھیں اُس کی طرف اُٹھائیں اور تعجب سے دیکھا۔ دیسی کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔

"عبدل! ہاتھی کا شکار ہی جان جوکھم کا کام ہے۔ ابھی ان کے پیروں کی بو نہیں پائی ہے، آدھ گھنٹے میں ہم انہیں جا لیں گے اور جس کو چاہیں گے گرا لیں گے۔"

دیسی نے دل سے کہا: "یہ پگ خطرناک ہیں صاحب۔"

صاحب کے چہرے سے نفرت ٹپکنے لگی۔

"تو تمہیں ڈر لگ رہا ہے عبدل؟"

دیسی کا سر جھکا رہا۔

"میں نے بہت سے بہادر شکاریوں کی بندوقیں اُٹھائی ہیں صاحب۔"

صاحب نے تنک کر کہا: "پر مجھ سے تو یہی کہا گیا تھا۔"

عبدل نے اسی طرح دبی زبان سے کہا: "صاحب میں اس کام میں بُڈھا ہو گیا ہوں اور کچھ نہیں تو اتنی سمجھ بوجھ تو ہے۔ ایسے ہاتھی کو تو جان کر کے کوئی نہیں مار سکتا۔ آسان نہیں ہے۔"

"ہائیں کیا کہا؟" صاحب نے اپنی بندوق اور بھی زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں نے جو کہا سچ ہے صاحب۔ ہم تماکو کے پگوں پر چل رہے ہیں۔ اُس ہاتھی کے جسے کوئی نہیں مار سکتا۔"

عبدل کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باقی تین دیسی بھی لپکتے ہوئے آگئے اور صاحب کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

صاحب نے عبدل کے الفاظ کو دہرایا: "تماکو! جسے کوئی نہیں مار سکتا! یہ تو پہلی بار میں نے تم سے سُنا ہے۔"

تماکو کا نام دیسیوں کے دماغ پر بجلی بن کر گرا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے خوفزدہ سرگوشیوں میں کہا۔

"تماکو! صاحب تماکو کو ماریگا!"

عبدل نے بڑبڑا کر کہا: "صاحب میں نے آپ سے جو کہا ہے اُس میں جھوٹ نہیں ہے۔ بہت سے شکاریوں نے تماکو کا شکار کھیلنا چاہا مگر ایک بھی اُس کے مارنے کی خبر لیکر نہیں لوٹا۔ جنگل کا سب سے بڑے دانتوں والا

ہاتھی تماکو ہی ہے۔ اس کے دماغ میں ایک بھوت رہتا ہے اور اس کے جسم میں ایک کالے امیر کی رُوح ہے۔ کئی بہادر اور ہوشیار شکاریوں نے تماکو کا پیچھا کیا۔ چھ نے اس پر گولی چلائی۔ ایسی کہ اُسے گر جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ گولی ابھی ڈھلی ہی نہیں ہے جس سے تماکو گر جائے جنگل کے اندھیرے میں سے وہ بپھرا ہوا نکلتا ہے اور جو اُسے شکار کرنا چاہتے ہیں اُنہیں روند ڈالتا ہے۔ اُس کے پیروں سے سات آدمی اب تک روندے جاچکے ہیں۔ صاحب آپ ذرا ہوشیار رہیئے۔ کہیں آٹھویں آپ ہی نہوں"

صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔

"ایسا ہاتھی تو شکار کرنے کے لائق ہے۔ کالے شیطانو۔ میرے ساتھ آؤ۔ اس ہاتھی کو مارنے کے لئے تو میں جہنم تک اس کا کھوج لگاؤنگا"

یہ کہکر بے اختیاری میں آگے بڑھا۔ عبدل نے اُسے روکنے کیلئے اپنا دُبلا سیاہ ہاتھ بڑھایا۔ صاحب نے غصہ سے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اگر تو ڈرتا ہے تو یہیں ٹھہر جا۔ میں کسی ڈرپوک کو اپنے ساتھ لیجانا نہیں چاہتا"

عبدل کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ اُس شخص کے لئے جس کی زندگی کا آغاز ہی ہاتھی کے شکار سے ہوا ہو جس نے ساری عمر اس طرح شکار کھیلا ہو کہ درخت پر سے جنگلی ہاتھی کی پیٹھ پر کود کر اُسے چھری سے مار گرایا ہو، بھلا یہ اتنا بڑا طعنہ کیسے سہہ سکتا تھا! اُس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"صاحب میں آپ کی بندوق اُٹھانے کیلئے نوکر رکھا گیا ہوں اگر آپ جائیں گے تو میں بھی آپکے ساتھ جاؤنگا"

یہ کہکر اس نے اور دیسیوں کو ایک نظر سے دیکھا جس آج تک برس رہے تھے۔ پھر میدان طے کر کے جنگل کے گھنے سبزے میں غرق ہوگیا۔ ان کے جاتے ہی گیدڑ کی تھوتنی جھاڑی میں سے نکلی اور بو سونگھنے کے بعد وہ مُردار زیبرہ کے پاس دبکتا ہوا پہونچ گیا۔

آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر خوسر صاحب اور عبدل نے ہاتھیوں کی ڈار کو جالیا۔ ہاتھی ٹھہر گئے تھے اور جنگلی سبزیاں کھانے میں مصروف تھے۔ بچے اچھلتے پھر رہے تھے اور ہتھنیاں ان کی نگرانی کر رہی تھیں لیکن کان سب کے لٹکے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شکاریوں کے قریب ہونے کا گمان نہیں تھا۔

یہ منظر دیکھکر صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وقت کی ساری قیود توڑ کر وہ لاکھوں سال پہلے کی دُنیا میں پہونچ گیا ہے۔ سامنے ہیں ہاتھی کھڑے اپنے لمبے لمبے دانتوں سے سبزہ کو الٹ الٹ کر کھا رہے تھے۔ سفید جنگلی چڑیاں ہاتھیوں کی پیٹھ پر سے پھدک پھدک کر دوسرے ہاتھیوں کی پیٹھ پر جا بیٹھتی تھیں۔ صاحب اِس وقت تہذیب و تمدن کی دُنیا کو بھول چکا تھا۔ عورتوں کی دلکشی اور بجلی کی روشنی کو فراموش کرچکا تھا۔ اب وہ جانوروں کے ساتھ کھڑا تھا اور خود بھی ایک حیوانِ ناطق سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

اس مختصر سے وقفے میں اُس نے زندگی کا اصلی مزہ چکھا۔ اُس کے دل میں وہی احساس پیدا ہوا جو مرنے والے کے دل میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ جیسے کوئی برکت حاصل کرنے کے لئے گھٹنوں کے بل جُھک جاتے ہیں نوجوان بھی ایک گھٹنے پر جُھک گیا۔ رائفل کا کُندہ اس کے کندھے سے لگ گیا اور ٹھنڈی نال رُخسار سے چُھو گئی۔ تیزی سے اس کی نظر اٹھی اور دو سو گز پرے ہاتھیوں پر جم گئی۔

عبدل نے برابر سے کہا۔ "ہوشیاری سے صاحب!"

بوڑھے دیسی کی نظروں نے ہاتھیوں کی ڈار میں خوفناک تماکو کو پہلے ہی سے تلاش کرلیا تھا۔ اس نے یہ دیکھکر اطمینان کا سانس لیا کہ تماکو اور ہاتھیوں سے کچھ الگ کھڑا جھول رہا تھا۔ جب صاحب نے بندوق چھتیائی تو نال کا رُخ ایک اور ہاتھی کی طرف تھا جو اپنے دانتوں سے زمین اُدھیڑ رہا تھا۔

بندوق کا دھماکہ ہوا۔

دھوئیں کا ایک ہلکا سا پردہ اور بارود کی بُو کا بھبکا دیسیوں کی طرف آیا۔ جب سامنے کی ہوا صاف ہوئی تو اُنہوں نے دیکھا کہ ہاتھی گویا جم کر پتھر کے بن گئے ہیں۔ خوف سے وہ ایسے ساکت کھڑے تھے کہ جُنبش کا نام تک نہیں تھا۔

جس ہاتھی پر گولی چلائی تھی وہ کچھ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنی سُونڈ اوپر اُٹھائی اور زور سے چنگھاڑا۔ اسکے بعد ہی وہ ایک گھٹنے پر جُھک گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کالے پہاڑ کی طرح لڑھک کر ڈھیر ہوگیا۔ دو درخت جو اس کی پیٹ میں آگئے تھے اس طرح ٹوٹ گئے گویا دو چپچیاں تھیں۔

عبدل نے خوش ہوکر کہا۔ "بڑا اچھا نشانہ لگا صاحب!"

صاحب خوشی سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"نیچے نیچے صاحب!"

عبدل نے صاحب کی قمیص پکڑ کر نیچے زمین کی طرف گھسیٹا اور اسی وقت صاحب کو معلوم ہوا کہ جانوروں سے مقابلہ تو اب شروع ہوا ہے۔ کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری ڈار اس طرح حرکت میں آگئی جیسے گھڑی کے سارے پُرزے ایک مقررہ اصول کے ماتحت چلتے ہیں۔ زخمی

ہاتھی دم توڑ رہا تھا۔ اُس کو کپکپاتے دیکھ کر اور ہاتھیوں نے اپنی آنکھیں اُس کی طرف سے پھیر لیں۔

کالے پہاڑ حرکت کرتے رہے یہاں تک کہ سب نے نصف دائرہ بنا لیا۔ یہ اُسی طرح کا ہلال بنایا تھا جیسے افریقہ کے وحشی زولو دشمن سے مقابلہ کرنے میں اپنی صفوں کو آراستہ کرتے ہیں۔ باہر کے رُخ ہاتھی تھے۔ اُن کی سونڈیں اور کان کھڑے ہوتے تھے تاکہ جس رُخ سے بھی بُو یا آواز آئے وہ لے جاسکیں۔ بڑی چالاکی سے بچوں کو پیچھے چھپا لیا گیا تھا۔

یکے بعد دیگرے چالاک سُرخ آنکھوں نے اُس مقام کو تاڑ لیا جہاں صاحب اور چار دیسی زمین پر پڑے ہوئے تھے — صاحب نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی خُنکی رینگتی محسوس کی۔ لیکن ہاتھیوں کی سُرخ آنکھوں نے اُسے مسحور سا کر دیا تھا۔ اُن کے دانت نیچے کو جھکے ہوئے تھے اور وہ کھڑے جھوم رہے تھے۔

آہستہ آہستہ اور کسی ارادے سے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ بہت ہی آہستہ۔ وہ گویا جھوم جھوم کر رقص کر رہے تھے اور اپنے دشمنوں کی طرف بڑھ رہے تھے جنہوں نے اُن کے ایک ساتھی کو مار ڈالا تھا۔ ہاتھیوں کی بُو جیسے ہی صاحب کی ناک میں پہونچی اسکے تو اس بچ ہوگئے۔ اُس نے محسوس کیا کہ ایک کالے ہاتھ نے اُس کے ہاتھ میں ایک رائفل تھما دی تھی۔ اور وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور ساتھ تکنے لگا۔

عبدل نے چیخ کر کہا "ٹھیریئے صاحب ٹھیریئے" کیونکہ وہ ہاتھیوں کے داؤں گھات خوب جانتا تھا۔ لیکن یہ آگاہی دیر تھی۔ رائفل چل چکی تھی۔

صاحب نے اپنی گولی اُس ہاتھی پر چلائی تھی جو ہلال کے وسط میں تھا۔ صاحب کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اُٹھی کیونکہ بیچ والا ہاتھی لڑکھڑا گیا تھا۔ لیکن وہ ہاتھی ایک طرف گر پڑا تھا تاکہ اس کے پیچھے جو سب سے بڑے دانتوں والا ہاتھی تھا وہ آگے بڑھ کر حملہ کرے۔ یہ پہاڑ کا پہاڑ چیختا چنگھاڑتا چشم زدن میں صاحب کے آگے آگیا۔

عبدل نے چیخ مار کر کہا "یہ تماگو ہے صاحب، خونی ہاتھی۔ بھاگو صاحب، بھاگو"

رائفل کی گولی پھر چلی۔ مگر تماگو کے غضبناک حملے کو روک نہیں سکی۔ دیسی منتشر ہو گئے اور جہاں جس کے سینگ سمائے چیختے ہوئے بھاگ نکلا۔ ڈار اپنے داؤ گھات برابر لگا رہی تھی۔ ہلال کے سرے بڑھتے جا رہے تھے اور ان سروں پر خوفناک دانت والے ہاتھی تھے۔

شکاری اب خود شکار بن گیا تھا۔

صاحب بھی اوروں کے ساتھ پلٹ کر بھاگ نکلا تھا مگر اُس کے پیچھے کالا دیو زمین دھلاتا اُڑا چلا آرہا تھا۔ خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ سارا جنگل چیخوں اور چنگھاڑوں سے گونج رہا تھا۔ سارے ہاتھی مرنے مارنے پر تل گئے تھے۔

صاحب کا پاؤں کسی چیز میں اُلجھا اور وہ گر پڑا۔ مرنے سے پہلے اس مختصر سے وقفے میں اُس نے ایک مضحکہ خیز جاگتے کا خواب دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ دوستوں کی ایک محفل میں اُسے پہلی دفعہ جام شراب پیش کیا گیا اور اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں نہیں پیتا۔ اس پر چاروں طرف سے سب اس پر ہنس پڑے۔

یہ اُس کی زندگی کا آخری خواب تھا۔ صور کی سی چنگھاڑ کے ساتھ تماگو اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی سونڈ کمر میں لپٹ گئی اور اُسے ہوا میں اُچھال کر زمین پر دے مارا۔ ان سفید بندروں پر جو اُس کی ڈار کے ہاتھیوں کو مارتے رہتے تھے تماگو کا غصہ دیوانگی کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ بے رحم آنکھیں اُس سفید بندر کو گھور رہی تھیں جو اس کے قدموں میں بے جان پڑا تھا۔ پھر اُس نے ایک بھاری پاؤں اُٹھایا اور سفید بندر کے جسم پر رکھ کر کامیابی کا ایک نعرہ لگایا۔

پُر ر۔ پُراو۔ پُراو۔ پراو۔

ڈار نے جواب دیا۔

پُراو۔ پُرو۔ پُراو۔ پُراو۔

ایک اور شکاری شکار ہو چکا تھا۔ دیسیوں میں سے ایک اور کچلا جا چکا تھا۔

باقی ہاتھیوں کی ڈار بھی اب بڑھتے بڑھتے تماگو کے قریب آگئی تھی۔ اب سارے ہاتھی خاموش کھڑے اپنے سردار کو دیکھ رہے تھے۔ تماگو نے ذرا سا جھک کر اپنے لمبے زرد دانتوں سے ایک ہی وار میں زمین میں ایک گہری قبر کھود دی۔ پھر بڑی نفرت سے اُس نے کچلے ہوئے انسانی جسم کو اپنی سونڈ میں اُٹھا کر قبر میں جھونک دیا۔ یہ تھا سلوک جو وہ اپنی ڈار پر حملہ کرنے کی جرأت رکھنے والوں سے کرتا تھا۔ اس کے بعد بغیر اپنی ڈار کی طرف دیکھے ہوئے وہ اس جگہ سے ہٹ گیا اور دیوانہ وار غصہ کو فرو کرنے کے لیے یہ پہاڑ کا پہاڑ جھومتا جھامتا واپس لوٹنے لگا۔ جب مُردہ ہاتھی کے نزدیک پہونچا تو کترا کر اس ڈھیر کے قریب سے نکل گیا۔ موت سے تو سبھی کو ڈر لگتا ہے۔

موت کے اس خوف کے باوجود تماگو کچھ اوپر سو سال سے اسی جنگل

میں زندہ تھا۔ ہاتھیوں سے لڑ لڑا کر وہ اس ڈار کا سردار بنا تھا۔ کئی سفید آدمیوں نے اسے شکار کرنا چاہا لیکن ناکام رہے۔ یہ تماکو تھا۔ وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا۔

ایک بار پھر اُس نے اپنی سونڈ اُٹھائی اور جنگل کی ہوا کو سونگھنے لگا۔ پھر گھنے جنگل کی طرف چل پڑا اور ڈار اُس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ صرف عبدل ایک درخت میں چھپا ہوا خوف کی نظروں سے ہاتھیوں کو جاتا دیکھ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ کہو رابن کہ ہاتھی دانت کی لالچ میں تم پھر یہاں کھینچ آئے"

یہ الفاظ علاقہ افسر نے ایک اور صاحب سے کہے۔ یہ صاحب دُبلے پتلے اور پستہ قد تھے اور اِس وقت خیمہ میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

رابن نے کہا: "نہیں بھئی۔ ہاتھی کا شکار کھیلنے کے لئے اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ یہ تو جوانوں کا شکار ہے۔ میں تو اپنے حصے کا شکار کھیل چکا۔ میں تو جنگل میں یونہی پھرنا چاہتا ہوں۔ ولایت کے شاندار بازاروں میں پھرنے سے زیادہ لطف مجھے جنگلوں میں آتا ہے۔"

علاقہ افسر نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا: "مجھے اس میں شبہ ہے کہ یہ جوانوں کا شکار ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ بوڑھے شکاری کا نشانہ بہت اچھا ہوتا ہے۔"

رابن نے کہا: "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

علاقہ کے افسر نے کہا: "استوکلی ایک مالدار اور بہادر جوان تھا۔ ہاتھی کے شکار کا بہت شوقین۔ چھ ہفتے ہوئے وہ جنگل میں گیا تھا۔ عبدل اُس کا بندوق بردار تھا۔ جنگل میں ہاتھیوں کا کھوج انہیں مل گیا۔"

"بڑا خوش قسمت تھا!"

"استوکلی کے لئے یہ بدقسمتی کے نشان تھے۔ کیونکہ تماکو اس ڈار کا سردار تھا۔"

"تماکو؟"

رابن کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ بھوری آنکھوں میں گزرے ہوئے دِنوں کی یاد جھلکنے لگی۔

"ہاں۔ استوکلی نے پٹھے کو گرا لیا تھا مگر ڈار نے حسبِ معمول اپنے داؤگھات شروع کر دئے۔"

رابن نے سر ہلا کر کہا: "زدلو کا گھیرا۔ میں جانتا ہوں۔ اور پھر تماکو نے حملہ کیا؟"

علاقہ افسر نے کہا: "ہاں۔ تماکو نے دھاوا بول دیا۔"

ایک لمحہ کیلئے خاموشی رہی۔

رابن نے پوچھا: "کل کتنے اِس موذی کی بھینٹ چڑھے؟"

"آٹھ۔"

پُرانے شکاری نے تعجب سے کہا: "آٹھ۔"

بیتے ہوئے دنوں کی یاد اب بھی اُس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ وہ اُٹھا اور اُٹھ کر اُس نے ایک انگڑائی لی۔ پھر بے پروائی سے بولا: "اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ اُمید ہے کہ پھر آپ سے جلد ملنا ہوگا۔"

علاقہ افسر نے سر ہلایا۔ وہ رابن کو خوب جانتا تھا۔ اور جب رابن ذرا ٹھٹکا تو اُسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ پھر اُسی بے پروائی سے رابن نے کہا: "اچھا، وہ عبدل کہاں ہے؟"

علاقہ افسر نے سر کو جنبش دے کر کہا: "میرے ملازموں میں ہے۔ ایک ہفتہ ہوا کہ اُس نے یہ خبر سُنائی تھی۔"

ایک منٹ بعد علاقہ افسر نے پُرانے شکاری کو عبدل سے باتیں کرتے دیکھا۔ خاکی کپڑوں میں عبدل کا کالا چہرہ چمکنے لگا۔ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا اور بار بار سر ہلا رہا تھا۔ دوسرے منٹ میں اُس نے رابن کا شکاری سامان کندھے پر لاد لیا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے جنگل میں چلا جا رہا تھا۔

علاقہ افسر نے دل ہی دل میں کہا: "اگر یہ تماشہ میں دیکھ سکتا تو اپنی ایک مہینے کی تنخواہ نذر کر دیتا!"

عبدل اپنے معمر آقا کے پیچھے پیچھے ایک جنگلی گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ اِس گیت میں اُس کالے دیو تماکو کا ذکر تھا جس نے آٹھ آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ تماکو جسے کوئی مار نہیں سکتا۔ لیکن صرف ایک زبردست شکاری ہے جس نے ہزاروں ہاتھی مارے ہیں، جس نے تماکو کو گرانے کی قسم کھائی ہے۔ یہ ایک زبردست شکاری ہے۔ رابن صاحب اس کا نام ہے۔

"پُواو۔ پواو پُواو پواو!

تماکو آ رہا ہے!"

سارے جنگل میں ایک کان سے دوسرے کان تک یہ سرگوشی پھیل گئی۔ جتنے جاندار تھے سب کے سب اِس بلائے جان کا راستہ چھوڑ کر کھسک گئے۔ چیتا بھی ناک بھوں چڑھا کر کچلیاں دکھانے لگا اور ذرا کے ذرا ٹھٹک کر جنگل میں جا دبکا۔ سارے جانور اُس کالے پہاڑ سے واقف تھے جو ہاتھیوں کی ڈار کا سردار تھا۔

تنہا شہنشاہ کی طرح تماکو جھومتا جھامتا چلا آ رہا تھا۔ تماکو نے اپنی دم

شان وشوکت کا اندازہ اپنے چالاک دماغ میں لگایا۔ ایک صدی سے زیادہ کا بوجھ اُس پر تھا۔ وہ اُس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب جنگل میں جانوروں کا راج تھا۔ جب شیر کا ڈکرانا، چیتے کا غرّانا اور ہاتھی کا چنگھاڑنا گویا ایک حیوان کا دوسرے حیوان کو دعوتِ جنگ دینا سمجھا جاتا تھا۔

وہ اُن دنوں کی مدھم یاد اجاگر کر رہا تھا جب وہ بچہ تھا اور اپنی ماں کی جھریاں ہوئی کھال سے لگا لگا چلا کرتا تھا۔ وہ اُس بے پایاں مسرت کو محسوس کر رہا تھا جو دلدل کی کیچڑ اپنے بدن پر اُچھالنے میں اُسے حاصل ہوتی تھی۔ اُسے جنگل کا علم سکھایا گیا تھا۔ زہریلے پودوں سے الگ ہٹنا اور جنگل میں چھپی ہوئی موت سے ہوشیار رہنا۔

اُسے جو سبق سونڈ کی مار اور دانتوں کے کچوکوں سے سکھایا گیا تھا یہ تھا کہ "ہمیشہ ڈار کے ساتھ رہو" اتفاق ہی میں طاقت اور ساتھ رہنے ہی میں عافیت ہے۔ سردار کی اطاعت ہر حال میں فرض تصور کی جائے جنگل میں اکیلے پھرنا گویا یقینی موت ہے۔ اکثر ایسا ہوا تھا کہ تماکو کو یہ نصیحتیں بادلِ ناخواستہ قبول کرنی پڑی تھیں اور ڈار کے قانون کی پابندی کرنی پڑی تھی۔

مگر جیسے جیسے اس کے جسم میں دیوؤں کی سی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔ تماکو میں اپنی قوت کا اظہار کرنے کی خواہش بھی بڑھتی جاتی تھی۔ پہلا اظہار اِس قوت و شجاعت کا اُس موقع پر ہوا جب ایک کالی ایال والا شیر ببر ڈار پر جھپٹا اور سارے ہاتھی اُس کے خوفناک پھٹے ہوئے دہانے کو دیکھ کر مارے ڈر کے بدحواس ہو گئے۔ سردار بھی جھجک کر پلٹ گیا اور ساری ڈار اُسکے پیچھے ہولی مگر تماکو وہیں ڈٹ گیا۔

یہ جوان ہاتھی کھڑا ببر سے آنکھیں لڑاتا رہا۔ بڑے بڑے لٹکے ہوئے کان اُبھر گئے، آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ دعوتِ جنگ قبول کر لی گئی تھی۔ متعجب شیر ببر نے اپنا مُنہ اور بھی پھاڑ کر ایک زہرہ گداز دھاڑ ماری جسے سُنکر سارے جانور بدحواس ہو کر دُور دُور تک راستہ صاف کر دیتے تھے۔ دھاڑ کے ساتھ ہی گُپھے دار دُم نے ہوا میں ایک چکر کاٹا گویا حملے کا اعلان کر دیا گیا۔

تماکو نے کچھ نہیں کیا۔ بس کھڑا جھُولتا رہا۔ لیکن اس کی چالاک آنکھوں نے ببر کے سُبک جسم کو غصے سے کپکپاتے دیکھ لیا۔ سفید ناخن مُلائم پنجوں میں سے باہر نکل آئے اور ایک لحظہ بعد ببر اُس پر جھپٹ پڑا۔ لیکن اس کا مُہلک تھپیڑ پڑنے سے پہلے تماکو کی سُونڈ متحرک ہو چکی تھی۔ اس کی ایک ہی بیہوش کر دینے والی ضرب نے ببر کی جست کا رُخ بدل دیا۔ لیکن سفید ناخنوں نے پُٹھے پر جم کر کھال اُدھیڑ دی اور گوشت تک اُتر گئے۔ تماکو تکلیف سے بلبلا گیا۔ تیزی سے پلٹ کر اُس نے دیکھا کہ ببر اُس کے پُٹھے سے رپٹتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔

غصہ سے چنگھاڑ کر تماکو نے اُس کے جسم کو اپنی سُونڈ میں لپیٹ کر اُوپر اُٹھا لیا۔ ببر بے بسی سے ہوا میں پنجے چلاتا رہا اور پھر زمین پر اِس شدت سے پٹخا گیا کہ زمین ہل گئی۔ ایک دھچکے سے سانس لینے کی آواز سُنائی دی اور اس کے بعد ایک بھاری پاؤں ببر پر بیدردی سے رکھ دیا گیا۔ چند لمحوں بعد جانوروں کا بادشاہ کُچلا ہوا سا ڈھیر بن کر رہ گیا، جسے ٹھکانے لگانے کے لئے آن کی آن میں کالی چیونٹیوں کا فیتہ سا بن گیا۔ تماکو چپکے سے ایک طرف کو ہٹ گیا اور لنگڑاتا ہوا ڈار کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

مگر یہ لڑائی دیکھ لی گئی تھی۔ ڈار کے سارے ہاتھیوں نے اپنی سُونڈیں اُٹھا اُٹھا کر تماکو کا خیر مقدم کیا۔ سردار نے اُس کی طرف سوچ بچار کی نظر سے دیکھا۔ اس کے لئے ایک ہمسری کا مُدعی پیدا ہو گیا تھا، ایک پٹھا جس کے دانت ابھی نکلنے ہی شروع ہوئے تھے۔ جب سردار کے دانت دو ہاتھ کے ہو گئے تو وہ ڈار سے الگ ہو کر دلدل کی طرف چل دیا۔ یہ دلدل ہاتھیوں کا قبرستان تھی اور سردار اس میں غرق ہو گیا۔ اب تماکو بے مقابلہ اپنی ڈار کا سردار ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک وہ لڑتا رہا تھا اور اپنی شہنشاہیت تسلیم کرانے کے لئے ہلاک کرتا رہا تھا۔

پھر اصلی مدِمقابل سامنے آیا ۔۔ انسان۔ پہلے چند پستہ قد جنگلی آئے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے اور کلہاڑیاں تھیں۔ یہ بہت مکّار ہوتے تھے، زہریلے حشرات الارض سے بھی زیادہ خطرناک۔ مگر تماکو اور اُس کی ڈار ان کے مقابلے میں فتحمند رہی تھی۔ کتنے ہی کالے کالے جسم شکست کھا کر کُچلے جا چکے تھے۔

لیکن سفید بندر ان سے مختلف تھے۔ انکے ہاتھوں میں شل کر دینے والی لکڑیاں تھیں۔ ان لکڑیوں سے سیدھ باندھی، ان میں سے ایک شعلہ نکلا اور جیسے کسی چیز نے پنجوں سے چیر پھاڑ کر دل نکال لیا۔ ایک ایک کر کے کئی ہاتھی ان سفید بندروں نے اِن لکڑیوں سے مار ڈالے تھے۔ مرے ہوئے ہاتھی تو وہیں چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ بس اُن کے دانت کالے مزدوروں پر لاد کر چل دیتے تھے۔ اِن تباہکاریوں اور شکستوں سے تماکو نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اُسے گوشت کے پرخچے اُڑانے والی گولیوں کی تکلیف کا تجربہ خود بھی تھا۔ اس کے سیاہ چمڑے کو تین گولیاں پھاڑ کر اندر گھس چکی تھیں۔ ایک نے تو اُس کا پچھلا دھڑ بیکار سا کر دیا تھا۔ لیکن آج تک کسی نے اُسے گھٹنوں کے بل بھی نہیں جُھکایا تھا۔ آٹھ سفید بندروں سے تماکو انتقام لے چکا تھا۔ اس کا نام تماکو تھا، وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں

مار سکتا۔

جنگل کی نرم سبزی میں تماکو اپنا مرغوب چارہ تلاش کر کر کے کھا رہا تھا۔ ڈار دو میل دور تھی۔ تماکو اس قطعے میں تنہا آیا تھا تاکہ خوب سیر ہو کر کھائے۔ اس میں بھی بڈھوں کی سی ہوسناکی و خود غرضی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے سب سے الگ تھلگ اپنا پیٹ بھرنے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے زرد دانت زمین کو ادھیڑ رہے تھے۔ چاروں طرف جنگل کا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ تماکو بلا شرکتِ غیری سارے جنگل کا بادشاہ تھا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ ہر چیز پر ایک سستی سی چھائی ہوتی تھی۔ دور سے دلدل کی خوشگوار بو آ رہی تھی۔ اس پرسکون سے سے متاثر ہو کر تماکو نے اپنی سونڈ سورج دیوتا کی طرف شکر گذاری سے اٹھائی۔ پھر ایکا ایکی سونڈ اونچی اٹھکر رہ گئی اور بڑے بڑے کان ہوشیاری سے ہلنے لگے۔ انسان کوئی سفید بندر قریب تھا۔

عقلِ حیوانی نے اسے بتایا کہ وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا شکاری کا نشانہ بن رہا ہے۔ اور یہ بھی اس نے محسوس کیا کہ سفید بندر بڑے صبر و سکون سے اس کی گھات لگا رہا ہے۔ صرف بو سے اس کی موجودگی کا پتہ چلتا تھا۔ اور وہ بھی جبکہ اس کا فاصلہ چند قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ تماکو کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے پیچھے جو چالاک دماغ تھا بجلی کی سی تیزی سے کام کرنے لگا۔ چالبازی کا جواب چالبازی سے دینا چاہئے۔

رابن بھی اکیلا تھا۔ عبدل کو اس نے پیچھے کیمپ پر بیٹھا ہوا چھوڑ دیا تھا۔ خود اکیلا ہاتھی کے پگوں کا کھوج لیتا ہوا یہاں تک پہونچا تھا۔ جنگل میں چلنے کی خاص چال سے، جس میں میلوں چلنے پر بھی تھکان نہیں ہوتی، رابن چلتا رہا اور بڑھاپے کی کمزوری اور زندگی کی بے ثباتی پر غور کرتا رہا۔ اسے اپنی موجودہ زندگی بے کار نظر آ رہی تھی۔ مارو یا مر جاؤ۔ بس یہی اصولِ زندگی ہے۔ شہروں میں بھی اور جنگلوں میں بھی۔ اپنے شکار پر گھات کرنے کیلئے درندے گلی کوچوں کی تاریکی میں بھی چھپتے رہتے ہیں اور جنگل کی قد آدم گھاس میں بھی۔ بجلی کے کھمبے ہوں یا جنگل کے درخت، دونوں انسانی زندگی کی شاہراہِ موت میں یکساں طور پر تباہ کار ہیں۔

لیکن جب رابن کو اس کا خیال آیا کہ آج جنگل میں ایسا مقابلہ ہے جو ادھر یا ادھر ہو کر رہیگا تو اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ برسوں سے یہ پستہ قد سفید آدمی اس عظیم الجثہ بڑے بڑے زرد دانتوں والے ہاتھی کی فکر میں تھا جس کا نام تماکو تھا۔ مختلف موقعوں پر رابن نے پانچ گولیاں اس ہاتھی کی کھال میں پیوست کی تھیں جسے کوئی نہیں مار سکتا۔ لیکن اُن موقعوں پر بھی موت تماکو سے زیادہ رابن کے قریب تھی۔ شکاری کچھ تو اپنی قسمت سے اور کچھ جنگل کی چالبازیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے بچ بچ گیا۔ تماکو پر گولیاں بظاہر بے اثر ثابت ہوئی تھیں اسلئے اُسے بھی اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔

ایسے جانور کا پیچھا اس طرح کرنا کہ رائفل میں صرف پانچ گولیاں ہوں بجائے خود ایک حماقت تھی۔ رابن نے اپنے دل میں ہنس کر کہا، "یہ بھی ایک بڈھے کی بیوقوفی ہے" اس نے ساری عمر جوا کھیلا تھا۔ درندوں کے ساتھ زندگی اور موت کا جوا کھیلنے ہی میں عمر گذری تھی۔ اب تک وہ برابر جیتتا رہا تھا۔ مارو یا مر جاؤ پر اس کا عمل تھا۔ ممکن ہے زندگی کا یہ سب سے بڑا جوا بھی وہ جیت جائے۔ آہستہ آہستہ وہ رینگ کر آگے بڑھا۔ اس کے دبلے پتلے خشک ہاتھ میں رائفل بجز آگے کھسکا۔ لمبی لمبی گھاس میں اس نے کچھ فاصلہ پر ہاتھی کا سایہ دیکھا جانور کے چوکنے ہونے سے اس نے سمجھ لیا کہ وہ بو پا گیا ہے۔ لیکن کیا جانور کو اُس جگہ کی بھی خبر ہو گئی ہے؟ اس نے تماکو کو پھر سونڈ نیچے کر کے چارہ اٹھاتے دیکھا۔ رابن کو یہ چال دھوکہ نہ دے سکی۔ تماکو بھی آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ شکاری اور شکار دونوں ایک دوسرے سے اسوقت جان بوجھکر لاعلمی ظاہر کر رہے تھے۔ رابن ساکت رہا اور تماکو اپنی سونڈ خواہ مخواہ سبزے میں پھراتا رہا۔

آدھ گھنٹے تک یہ ابتدائی حرکات جاری رہیں۔ سفید بندر جہاں پڑا ہوا تھا تماکو کو اس مقام کا صحیح اندازہ تھا۔ اس کی چالاک آنکھوں نے ایک سفید چڑیا کو وہاں سے بچ کر اڑتے دیکھا تھا۔ وہ اکھاڑ اکھاڑ کر کچھ کھاتا جاتا تھا اور دھاوا بول دینے پر غور کر رہا تھا۔ لیکن اگر ایسا کیا تو وہ گز پرے ہی سے شکاری اپنی شعلہ اگلنے والی لکڑی چلا دیگا۔ اس نے اپنے دل میں سمجھ لیا کہ آج جنگل میں کسی بے وقوف سے مقابلہ نہیں ہے۔

شام ہو چلی تھی۔ سورج شفق کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اس پس منظر پر مڑے تڑے درخت کالی پرچھائیاں سی نظر آ رہے تھے۔ اس وقت وہ گھاس متحرک ہوئی جہاں سفید بندر دبکا ہوا تھا۔ چپکے چپکے تماکو چند قدم آگے بڑھا تاکہ خطرے کے مقام سے ہٹ جائے کیونکہ غروب ہونے والے سورج کے پس منظر پر اس کا ڈیل ڈول آسانی سے نشانہ بن سکتا تھا۔ اسکے ہٹتے ہی شکاری بھی کھسکا۔

رابن منہ ہی منہ میں ایک گالی بڑبڑا کر رہ گیا۔ کیونکہ ہاتھی کی اس حرکت نے اُسکے منصوبے درہم برہم کر دئے۔ فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ گولی چلا

کارآمد ثابت نہ ہوتا۔

راہن اور بھی آگے کھسکا۔ تماکو اُسے لالچ دے رہا تھا۔ اُس کا گھاس کھانا فریب آمیز تھا۔ راہن نے قریب کے ایک مضبوط درخت کو تاڑا۔ اگر ہاتھی حملہ کر دے تو جان بچانے کا ایک سہارا بھی ہو سکتا ہے۔ درخت دس گز کے فاصلہ پر تھا۔ بس ایک گز اور اُس کی طرف کھسک جائے تو خطرے سے نکل جائے۔

لیکن اُسی لمحے میں زمین لرزنے لگی۔ تماکو نے اُس کا مدعا تاڑ کر دھاوا بول دیا تھا۔ اب یہ دیو کا دیو اُس کی جانب دانت تانے رتھ کی طرح گرجتا چلا آ رہا تھا۔ راہن کیلئے اب ایک ہی صورت باقی تھی۔ فوراً ایک گھٹنہ جھکا، رائفل چھتیایا اُس نے گولی داغ دی۔ سامنے کا وار وہ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اب جان ہی پر آ بنی تھی تو یہی کرنا پڑا۔

گولی نشانے پر بیٹھی مگر اس ریلے کو کس کی مجال تھی کہ روک سکتا!

راہن ایک ہاتھ میں رائفل لئے لئے درخت کی طرف لپکا اور اُچھل کر ایک ٹہنی میں جھول گیا۔ جب درخت پر چڑھ گیا تو ایک دبی ہوئی چیخ اس کے مُنہ سے نکل۔ ہاتھی کے گزرنے سے ہوا کا ایک زناٹا آیا۔ پھر غصے کی چنگھاڑ سنائی دی۔ اور خاک کا ایک بادل زمین سے اُٹھا۔ چشم زدن میں تماکو پلٹ پڑا اور درخت سے ٹکرایا۔

ایک خوفناک تڑاخہ ہوا۔ ابھی درخت گر جائیگا۔ ٹہنے پر سنبھل کر راہن نے شست لگائی اور اسکے ریڑھ پر گولی چلائی۔

دھماکہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ درخت جھول گیا۔ اس کی گولی نے کھال پھاڑ دی تھی لیکن مہلک ثابت نہ ہوئی تھی۔ تماکو اس کے صدمے سے ذرا کے ذرا رکا اور ایک گھٹنے پر کچھ جھکا بھی مگر راہن اس کی نگونسا بھی دیکھ نہیں سکا۔ وہ کانٹوں دار جھاڑیوں میں گھسا چلا جا رہا تھا۔ رائفل اب بھی اسکے ہاتھ میں تھی۔ درخت سے گرنے میں اُسے چکر سا آ گیا تھا۔ وہاں پڑا ہوا وہ آسمان کی طرف گھور رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب ہاتھی کا پاؤں اس پر پڑا اور اب پڑا۔ چکرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے میں بھی اُسے آسمان سفید نظر آ رہا تھا جیسے کسی مُردے کا چہرہ ہو۔

ہاتھی کا پاؤں راہن پر نہیں پڑا۔ تماکو غصے میں جھنجھلا رہا تھا۔ کوئی چیز اُس کی جان اُس کے جسم میں سے نکال رہی تھی۔ اُس نے اپنی سونڈ اونچی کی اور ڈار کو آواز دی:-

پُواو پُواو پواو پواو!

یہ چنگھاڑ جنگل میں گونج گئی۔ لیکن ڈار کئی میل دور تھی۔ اس سے پہلے کہ سارے کالے پہاڑ جمع ہوں اور گھیرا ڈال کر حملہ کریں موت یا توانسان کو یا جانور کو آنی لازمی تھی۔

چنگھاڑ کی آواز نے راہن کو چونکا دیا۔ وہ اُچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ نیم بیہوشی کی حالت ہی میں اُس نے دیکھا کہ کالا پہاڑ چند گز کے فاصلے پر کھڑا چیخیں مار رہا ہے۔ بڑی ہمت کر کے اُس نے پھر رائفل چھتیائی اور گولی چلا دی۔

دھماکے کے ساتھ ہی ایک اور غصے کی چنگھاڑ سنائی دی اور ہاتھی غائب ہو گیا۔

کیا اس نے کالے پہاڑ کو گرا لیا تھا؟ راہن کے کپڑے کانٹوں میں اُلجھ اُلجھ کر تار تار ہو چکے تھے اور جگہ جگہ کھرچیں لگ لگ کر وہ خون خون ہو رہا تھا۔ کانٹوں کی باڑ میں سے بمشکل تمام وہ باہر نکلا۔ اُسے اُمید تھی کہ سامنے مرا ہوا ہاتھی پڑا ملے گا۔ لیکن وہاں میدان صاف نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین پھٹ گئی اور تماکو اُس میں سما گیا۔

اُس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ شام کی ملگجی روشنی میں اُس نے ایک بڑا سا سایہ جھاڑیوں میں گزرتا دیکھا۔ تماکو فرار ہو رہا تھا۔ راہن تھک کر چور ہو رہا تھا مگر یہ دیکھ کر اُس کی ساری تھکان جاتی رہی اور بڑھتے ہوئے حوصلے سے اسکے تعاقب میں چل پڑا۔

جھاڑیوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوتوں کا جلوس نکل رہا ہو۔ دن کی روشنی تیزی سے غائب ہو رہی تھی۔ لیکن راہن کو روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس آخری کھوج کو وہ کیسے چھوڑ دیتا؟ خون کی ایک لکیر نے بتایا کہ ہاتھی بُری طرح زخمی ہوا ہے اور بجائے سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے راہن جھاڑیوں میں اڑا چلا جا رہا تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں کو کچلنے اور توڑنے کی آوازیں اسکے کانوں میں آ رہی تھیں۔

پھر خاموشی ہو گئی۔ تماکو رُک گیا تھا۔ کیا آخری حملہ کرنے کیلئے تیار ہو رہا تھا؟ راہن ٹھٹکا نہیں۔ اُس نے سمجھ لیا کہ ہاتھی اُس کا انتظار کر رہا ہے اور اب مقابلے کی آخری گھڑی آن پہنچی ہے۔ وہ اُچھل کر اور آگے بڑھا۔

مرنے والے دن کی سسکتی ہوئی روشنی میں تماکو دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کے ڈھنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ ہزیمت خوردہ اور لائق رحم ہے۔ راہن کو اُس پر ترس آنے لگا۔ زمانے نے ایک دفعہ پھر انہیں آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا — پرانا ہاتھی اور پرانا شکاری۔ اُس نے دیکھا کہ تماکو کی دھندلی سرخ آنکھیں اُسے گھور رہی ہیں اور ایک لمحہ کیلئے جو کھیل کربلا تنا ہی ہو گیا تھا، انسان اور جانور ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے۔

جیسے مشین خود بخود چلتی ہے راہن نے بلا ارادہ رائفل پھر چھپائی یہ جان کر کہ ابکے جو وار ہوگا مُہلک ہوگا بوڑھے ہاتھی نے تن کر مقابلہ کیلئے اپنی سُونڈ اوپر اُٹھائی مگر مقابلے کی دعوت دینے والی چنگھاڑ ایک پی ہوئی لرزہ چیخ بن کر نکلی۔

پراو پراو پراو پراو۔
رائفل کا دھماکہ ہوا۔

بارود کے دھوئیں میں سے راہن نے آنکھیں مچکا کر اس سمت ب دیکھا جہاں تماکو کھڑا تھا۔ مگر یہ دیکھکر اُسے حیرت ہوئی کہ بوڑھا کالا دیو ں پر ایک خفگی کی نظر ڈال کر پلٹ گیا اور آہستہ آہستہ آگے چلا گیا۔ بزہ بیچ ثابت ہو چکا تھا۔ کوئی گولی اس ہاتھی کو ہلاک نہیں کر سکتی تھی جسے کوئی یں مار سکتا۔

راہن اول فول بکتا، جاتے ہوئے ہاتھی کے پیچھے لپکا اُسکے پاس صرف ۔ کارتوس اور باقی رہ گیا تھا۔ اُسے ایک گز کے فاصلہ سے ہاتھی پر چلانا ہتا تھا۔ تھکان نے اس کے پیر شل کر دئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ن نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

ایک لمحے بعد ایسا معلوم ہوا کہ کمر تک کا دم نکل گیا۔ بوڑھا شکاری سُود کوشش کرتا رہا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ بات کیا ہے۔ تماکو اُسے اپنے ، دلدل میں لگا لایا تھا۔ وہی دلدل جو ہاتھیوں کا قبرستان تھا۔ یہاں یہ بڑے بڑے جانور مرنے آتے تھے تاکہ اُسی کالی کیچڑ میں دھنس جائیں جس سے کبھی ان کا جسم بنا تھا۔ راہن کے پیروں تلے ہاتھی دانت کا دفینہ تھا مگر دھسن میں وہ اس طرح پھنس چکا تھا جیسے مکھی سریش میں پھنس جاتی ہے۔

اُس نے ناامیدی سے چاروں طرف دیکھا۔ چند گز آگے تماکو دلدل میں خاموش ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ مر بھی رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سے بڑے بڑے آنسو نکل کر بہنے لگے۔ سُونڈ اپنے دُشمن انسان کی طرف بڑھا دی گویا وقتِ آخر دوستی کا ہاتھ اُس کی طرف پھیلا دیا۔ راہن کی کشمکش ختم ہو چکی تھی۔ اُس کا اپنا وقت بھی آپہونچا تھا۔ اُس نے رائفل دُور اُچھال دی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دلدل میں غرق ہوگئی۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ بھی وہیں پہونچ جائے گا جہاں رائفل پہونچ گئی تھی۔

ایک بار پھر انسان اور حیوان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ راہن اپنی قسمت پر صابر ہو چکا تھا۔ یہ انجام دونوں کے شایانِ شان تھا۔ اُس نے لمبے لمبے زرد دانتوں کو دلدل میں دھنسنے دیکھا اور اس نے چلّا کر کہا: ہم پھر ملیں گے تماکو!

اس کے بعد دلدل ان کے سروں پر ہموار ہوگئی اور رات نے اپنا تاریک امن کالی کیچڑ پر پھیلا دیا۔

(ادبی دُنیا) مُترجمہ: شاہد احمد

پھانسی

(بسلسلہ صفحہ ۵۵)

رہلاتی وہ گیلی برف پر رینگ رہی تھی اور اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ براتی راب پر شراب لے رہے ہیں۔

اُس کے دل میں درد ہونے لگا جیسے کوئی نشے میں ہنستے ہنستے ل ہوجائے یا ناچتے ناچتے بےدم ہوجائے — مگر براتی شراب برابر انڈیل کر اُسے دے جا رہے تھے — شراب پر شراب۔

تشدد پسند باغیوں کو قیدِ تنہائی میں جو جو رُوحی تکلیفیں پہونچیں آئندہ پرچے میں انکی پہلی قسط پیش کی جائیگی۔

مترجمہ: شاہد احمد

تصحیح

سالنامہ ساقی بابت جنوری سنہ [illegible] میں جناب محمد مسیح پال امینِ حزیں کی نظم میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ناظرین کرام حسب ذیل تصحیح سے درست فرمالیں:۔

پہلے بند کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرع میں "زہرہ" غلط "زہر" صحیح ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ کا شعر یوں ہے:۔

گر شود پُر نور روزن یا سرا
تو مداں روشن مگر خورشید را

نائب مکان

خریداران ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمائیں تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ منیجر

نقد و تبصرہ

بہاراں

خان بہادر مرزا جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی بی۔ اے، ایم۔ بی۔ ای، ڈپٹی کمشنر سیتاپور کی تقریباً پانسو غزلوں کا مجموعہ "بہاراں" کے نام سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ حضرت اثر غزل گوئی میں ایک خاص رنگ کے مالک ہیں۔ جذبات اور واقعات کی عکاسی میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔ کلام شگفتہ اور بے ساختہ ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دل پر اثر کرتا ہے۔ میر کا یہ شعر زیبِ دو سرورق ہے ؎

چلتے ہو تو چمن کو چلئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

بس اسی شعر کو "بہاراں" کی روح رواں سمجھئے۔ "بہاراں" کا ہر صفحہ ع۔ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

تغزل کے دلدادہ حضرات کے لئے یہ ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔ آخر میں متفرق اشعار "اثرستان" کا انتخاب اور فارسی کلام بھی شریک کیا گیا ہے۔ مجموعی ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ جناب اثر کی عکسی تصویر بھی شامل ہے۔ کتابت و طباعت خوشنما۔ جلد مضبوط۔ سرورق رنگین۔ بانگِ درا سائز۔ قیمت صرف تین روپے۔ غالباً مصنف سے یہ کتاب منگائی جاسکتی ہے۔

"ش س"

دوشیزۂ صحرا

یہ انگریزی کا ایک ناول ہے جس کو مس جون کونکوسٹ نے دلکش پیرائے میں لکھا ہے اور اس کا اردو ترجمہ مسٹر صادق الخیری۔ ایم۔ اے دہلوی نے کیا ہے۔ عزیز موصوف، جو مولانا راشد الخیری مرحوم کے صاحبزادے اور انکی ادبیت کے بھی وارث ہیں، دہلی کی ٹکسالی اردو خوب لکھتے ہیں۔ اس لئے یہ ناول اردو میں بھی اتنا ہی دلچسپ ہوگیا جس قدر انگریزی میں ہے۔ مسٹر صادق الخیری نے اِس کا اردو میں ترجمہ کرکے زبان اور بیان کے لحاظ سے اس کی دلچسپی قائم رکھی ہے۔ ناظرین اس کو محض ایک تمثیل داستان سمجھکر پڑھیں تو اُن کیلئے دلکش ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ناول ادب کی ایک محض تفریحی شاخ ہے، لیکن خیالات پر اس کا ایک غیر محسوس اثر پڑتا ہے۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ ناول کی دلکشی کو کم کردوں، بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ پڑھنے والے اس کو محض تفریحی دلچسپی کے لئے مطالعہ کریں اور اس کو کسی حقیقت پر مبنی نہ سمجھیں۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ کتابت و طباعت پاکیزہ۔ مجلد۔ گردپوش خوشنما رنگین۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اردو بازار۔ دہلی۔

'اسلم جیراجپوری'

گلِ نو

ملک کے مشہور ادیب و انشا پرداز حضرت ایم۔ اسلم کے بارہ تازہ افسانوں کا مجموعہ "گلِ نو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسلم صاحب کے اور دلکش مجموعوں کی طرح یہ مجموعہ بھی نہایت دل آویز ہے۔ گلستانِ ادب میں ایک نیا پھول "گلِ نو" کی صورت میں کھلا ہے۔ اسلم صاحب نے اس شعر کو زیب دہ عنوان بنایا ہے:۔

معطر مغز جاں تک ہو جو میرے داغِ دل سونگھیں
چمن میں مست ہیں کیا بلبلیں پھولوں کی خوشبو پر

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلم صاحب نے اِن افسانوں میں زندگی کے اُن داغوں کو الفاظ کے پھولوں میں لپیٹ کر پیش کیا ہے جن کی ذمہ دار ہماری سوسائٹی ہے۔ ضخامت (۳۵۰) صفحات۔ کتابت و طباعت خوشنما۔ مجلد۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً عہ ہوگی۔ ملک دین محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور سے منگائی جاسکتی ہے۔

"ش س"

شاہ نعمت اللہ ولی

امیر تیمور اور اس کے بیٹے شاہ رخ کے زمانوں میں یہ نامور سادات اور جلیل القدر مشائخ میں گزرے ہیں۔ مزار ماہان علاقہ کرمان میں ہے۔ اِن بزرگ کی سوانح عمری اور ان کی مشہور پیشین گوئی قیامت کا بیان مع نمونہ کلام جناب ایم۔ اے حفیظ نے بڑی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ قیمت مع محصولڈاک بذریعہ منی آرڈر ۴ر آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ راج نرائن سنگھ۔ درگاہ شاہ ارزاں۔ مہندرو۔ پٹنہ۔

"ش س"

بیکاری و مفلسی اور اسکے علاج

یہ چھوٹی سی کتاب اسم بامسمیٰ ہے۔ بہت دلچسپ اور اسکا مطالعہ موجودہ زمانے میں نہایت درجہ مفید ثابت ہوگا۔ معلومات کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ کوزے میں دریا بند کیا گیا ہے۔

ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۱۳ر آنے۔ مگر ساقی کے خریداروں کو صرف ۱۰ر آنے مع محصولڈاک۔ پبلشر کا بیان ہے کہ اگر کتاب ناپسند ہو

تو واپس بھیج کر قیمت طلب کی جاسکتی ہے۔ مگر اُمید ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئیگی۔ ملنے کا پتہ :۔ اپل اینڈ کمپنی۔ مری۔ (پنجاب) "ش"

ادبی دُنیا۔ لاہور (سالنامہ) صلاح الدین احمد صاحب اور میراجی کی ادارت میں رسالہ ادبی دُنیا۔ لاہور، ماشاء اللہ بڑی عمدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ گزشتہ مہینے ادبی دُنیا کا شاندار سالنامہ شائع ہوا ہے جسے اگر اس سال کا بہترین سالنامہ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ اُردو کی حریف زبانوں میں، جن میں ہم انگریزی کو بھی شامل کر سکتے ہیں، اس سالنامہ کا جواب نہیں ملتا۔ مضامین کا معیار اُردو صحافت کیلئے باعثِ فخر ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ پر منفرد ہے۔ مسٹر کرشن چندر کا طویل افسانہ اور میراجی کا علمی مضمون خاص طور پر مستحقِ مطالعہ ہیں۔ رنگین تصویروں سے اعلیٰ درجے کا مذاقِ حُسن ظاہر ہوتا ہے۔ سادہ تصاویر کے انتخاب سے بھی حُسنِ مذاق ظاہر ہے۔ ضخامت بڑے سائز کے تقریباً تین سو صفحے۔ ٹائیٹل ہفت رنگ۔ اور قیمت صرف ۱۲ جو موجودہ گرانی کو دیکھتے ہوئے لاگت سے بھی یقیناً بہت کم ہے۔ مدیرانِ "ادبی دُنیا" مستحقِ مبارکباد ہیں اور اُن کی ہمت لائقِ داد ہے کہ محض صحافتِ اُردو کی ترقی کے خیال سے انہوں نے اتنی مالی زیر باری گوارا کی۔ ادبِ جدید کے دلدادہ حضرات کے لئے سالنامہ "ادبی دُنیا" ایک بیش قیمت تحفہ ہے جو کوڑیوں کے مول انہیں مل سکتا ہے۔ "م"

یورپ کے تاثرات مسٹر بدر شکیب حیدرآباد دکن کے ایک جواں سال ذہین فرد ہیں۔ یورپ کے تاثرات شائع کر کے انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور غایت درجہ زحمت پذیری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب مجموعہ ہے پچیس اُن ہندوستانی حضرات کے مشاہدات و تجربات کا جنہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ یورپ میں گزارا ہے۔ ان میں علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ڈاکٹر سید حسین۔ ڈاکٹر یوسف حسین۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور ڈاکٹر حمید اللہ جیسے جلیل القدر حضرات بھی شامل ہیں۔ مسٹر بدر شکیب نے ان سب حضرات سے برسوں کی کاوش کے بعد مضامین لکھوائے یا اُن کے زبانی خیالات کو تحریر کا جامہ خود پہنایا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کے مقابلے میں یورپ اتنا ترقی یافتہ کیوں ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ "یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ لیکن اس میں دلچسپی سے زیادہ بصیرت و عبرت کا سامان ہے"۔ قیمت ۱۲۔ ملنے کا پتہ :۔ سید عبدالقادر اینڈ سنس۔ تاجرانِ کتب چار مینار۔ حیدرآباد دکن۔ "ش"

انڈین میوزک ایم۔ محتشم صاحب کی یہ کتاب ہندوستانی موسیقی کے متعلق وافر معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ "معارف النغمات" کے بعد اُردو میں یہ دوسری کتاب ہماری نظر سے گزری ہے جس میں پیرایۂ بیان عام فہم اور سلیس اختیار کیا گیا ہو۔ ہر راگ کی مشہور چیزیں اور اُن کی سرگم مع ماتروں کے درج کی گئی ہیں جو ہارمونیم پر آسانی سے نکالی جاسکتی ہیں۔ اُمید ہے کہ فن سیکھنے کے شائقین اس کتاب کو اپنے لئے بہت مفید پائیں گے۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً ۱۲ ہوگی۔ ملنے کا پتہ :۔ میوزک پبلشنگ ہاؤس۔ ڈیوڑھی چھوٹی شہزادی صاحبہ۔ لکھنؤ۔ "ش"

انوارِ اختر محمد اختر صاحب اختر نگینوی کا تیسرا دیوان اس نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ پہلا دیوان "نظمِ دل فروز" چالیس سال پہلے اور دوسرا "ضیائے اختر" کے نام سے تینتیس سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا اختر حضرت داغ مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ زبان و بیان میں اُستادِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ کہنہ مشق اُستاد ہیں۔ کلام پاکیزہ اور زبان ٹکسالی ہوتی ہے۔ "انوارِ اختر" کی ضخامت بڑی تقطیع کے (۲۶۰) صفحات ہے۔ سرورق رنگین۔ قیمت فی جلد عہ۔ ملنے کا پتہ :۔ سید محمد غضنفر کاظمی۔ محلہ سرائے میر۔ نگینہ۔ "ش"

محکومیتِ نسواں جان اسٹوارٹ مل کی تصنیف کا ترجمہ مولوی معین الدین صاحب انصاری نے کیا ہے۔ ہندوستانی مردوں اور عورتوں کے لئے اس کا مطالعہ اتنا مفید ثابت نہیں ہو سکتا جتنا کہ یورپین لوگوں کے لئے ثابت ہو چکا ہے۔ تاہم کتاب پڑھنے کے لائق ہے کیونکہ یورپ میں اس کتاب کو "عورتوں کی آزادی کا صحیفہ" سمجھا جاتا ہے۔ کتاب مجلد اور گرد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ) مکتبۂ پنجاب۔ لاہور سے طلب کیجیے۔ "ش"

شمعِ ازل حضرت زبیری لکھنوی نے نظم میں تاریخ اسلام کی مقتدر ہستیوں کے ولولہ انگیز واقعات کا بیان بڑے پُر اثر طریقے پر کیا ہے۔ اس شمع سے ہر گھر روشن ہونا چاہیئے۔ زبیری صاحب کی کاوش مشکور ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے اسلامی تاریخ کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ہانگ درا سائز ۲۲۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)
ملنے کا پتہ :۔ زبیر منزل۔ پاٹا نالہ۔ لکھنؤ۔ "ش"

شاعر کی دُنیا۔ محمد عظیم الدین صاحب مُحبت نے اِس چھوٹی سی کتاب میں جدید حیدر آباد دکن کے یا حیدر آباد میں رہنے والے چالیس شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام کے منتخب نمونے پیش کئے ہیں۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ:۔ ایم۔ اے۔ رین۔ روبرو نظامت کروڑگیری۔ حیدر آباد۔ دکن۔ "ش"

پنڈت جواہر لال نہرو کا مذہب۔ جناب شبیہ الحسنین بدایونی نے اِس کتاب میں پنڈت جی کو ہندو مت کا متوالا، اسلام دشمن اور مُسلم کش ثابت کیا ہے۔ کتاب دلچسپ اور بصیرت افروز ہے۔ قیمت ۵ر آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد ولی الحسنین۔ قاضی محلہ بدایوں۔ "ش"

عصرِ نو۔ یہ تینتیس صفحے کی نظمیں بقولِ دیباچہ نگار "عصرِ نو کے ایک نوجوان شاعر میاں محمد صادق ضیا کی فکرِ جمیل کی ایک نئی انگڑائی ہے"۔ ۵ر آنے کے ٹکٹ بھیجکر دفتر رسالہ شاعر آگرہ سے منگائی جا سکتی ہے۔ "ش"

اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ پروفیسر محمد عاقل نے عام فہم پیرائے میں اجتماعی زندگی کے ارتقائی پہلو کو واضح کیا ہے۔ انسانوں کی آبادی جب بڑھی تو رہنے بسنے کے اُنہوں نے کیا کیا طریقے اختیار کئے؟ اس سوال کا جواب ہمیں اس کتاب میں ملتا ہے۔ قیمت ۸ر۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی سے طلب کیجئے۔ "ش"

سیاسیات کی پہلی کتاب۔ یہ بھی پروفیسر عاقل کی چھوٹی سی تصنیف ہے جس میں اُردو جاننے والے طلبے کو سیاسیات کے مبادیات کو آسانی اور اختصار کے ساتھ سمجھنے [illegible] فراہم کیا گیا ہے۔ قیمت ۴ر مکتبۂ جامعہ۔ دہلی سے طلب کیجئے۔ "ش"

رسولِ پاک۔ کون تھے؟ کیسے تھے؟ اور آپ نے کیا سکھایا! عبد الواحد صاحب سندھی استاذ مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ نے یہ کتاب بچوں کیلئے لکھی ہے۔ زبان بہت سلیس ہے اور [illegible] اس خوبی سے مرتب کئے ہیں کہ بچے بار بار انہیں پڑھیں گے۔ [illegible] اس لائق ہے کہ چھوٹی جماعتوں کے نصاب میں داخل کی جائے۔ [illegible] ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔ "ش"

[illegible] للعلمین۔ یہ کتاب سیرۃ پاک کی ممتاز کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری [illegible] میں سے تھے۔ سیرۃ کے ہر لفظ سے اُن کی شیفتگی [illegible] سیرت کی [illegible] ہدایت کو [illegible]

جگہ نہیں دی گئی ہے۔ دیگر مذاہب کی مقدس کتابوں سے آنحضرت کی رسالت اور ختمِ نبوت پر استشہاد کیا ہے۔ نہایت مفصّل اور مکمل سیرۃ ہے۔ اس کا صرف حصّہ اوّل مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ پانچواں اڈیشن ہے۔ اُمید ہے کہ بقیہ دو حصّے بھی جلد شائع ہونگے۔ کتاب مجلّد ہے۔ ضخامت ۴۲۴ صفحے۔ قیمت دُو روپے۔ "ش"

ادارۂ ادبیاتِ اُردو خیریت آباد۔ حیدر آباد۔ دکن کی کتابیں۔

سر سید احمد خاں۔ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب۔ ایم۔ اے؛ ایچ۔ سی۔ ایس نے یہ ۱۶ صفحے کی کتاب بچّوں کیلئے لکھی ہے۔ قیمت ۲ر

سر سالار جنگ اعظم۔ تاریخِ دکن میں سر سالار جنگ سے زیادہ شاید ہی اور کوئی ہستی نظر آئے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت و تدبّر کی وجہ سے ہندوستان کے بسمارک کہلائے۔ اُنکے مختصر حالاتِ زندگی شائع ہونے ضروری تھے۔ مولوی ابو المکارم فیض محمد صاحب نے اس خدمت کو بچّوں کیلئے انجام دیا ہے۔ کتاب مجلّد ہے۔ قیمت ۱ر "ش"

نظام الملک آصف جاہ اوّل۔ بانیِ سلطنت آصفیہ کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی عوام اور طلبا کیلئے پرنسپل چاند مرحوم نے تحریر فرمائے تھے۔ اب ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے انہیں

متفرق کتب

ساز ہستی۔ از محزون۔ اس کتاب پر مصنف کو گورنمنٹ بہار نے ساڑھے تین سو روپیہ انعام دیا ہے۔ قیمت مجلد عہ

تاریخ اسلام کامل پانچ جلد از ابو المحمود حامد۔ قیمت مجلد پانچ روپیہ (لصہ)

سفرنامہ (باتصویر) غازی امان اللہ خاں کا سفر یورپ۔ قیمت دو روپے (عگار)

سبد چین مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ۔ ۶ر

جدید دستور کا خاکہ یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک پمفلٹ ہے مترجم شفیق الرحمن قدوائی ۲ر

دیہی صنعتیں دیہات کی نئی تعمیر اور دیہات سدھار پر ایک نئی کتاب۔ قیمت ۳ر

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ اس کتاب میں کاشتکاروں کی کثرت زمین کی قلت اور کسانوں کے افلاس اور ان کے قرضے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے ۴ر

شہری آزادی اس کتاب میں بیرونی ممالک کی انجمنوں اور ان کے شہری حقوق کا ذکر کرتے ہوئے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کسطرح موجودہ حکومت ہندوستانیوں کو ان کے ان حقوق سے محروم کرنے کے درپے ہے جن سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ قیمت ۴ر

ہندوستان میں برطانوی حکومت یہ تو سب جانتے ہیں کہ برطانیہ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ کس طرح اور کس حد تک لوٹا جا رہا ہے قیمت ۸ر

ہندوستان میں دیہی قرض اس چھوٹی سی کتاب میں قرضے کے اعداد و شمار سے یہ ثابت کیا گیا ہے کسانوں کی کیا حالت ہے ایک گاؤں کی مفصل تحقیقات پیش کی گئی ہے قیمت ۴ر

ایک کہانی (چھ ادیبوں کی زبانی) اس کہانی کے چھ باب ہیں ذیل چھ مشہور ادیبوں نے ایک ایک باب لکھکر اس کو مکمل کیا ہے باب اول۔ مولانا نیاز فتحپوری۔ باب دوم۔ پروفیسر علی عباس حسینی۔ باب سوم ل۔ احمد اکبرآبادی۔ باب چہارم سید سجاد صاحب یلدرم۔ باب پنجم سید امتیاز علی صاحب تاج۔ باب ششم حکیم احمد شجاع۔ کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ بغیر ختم کئے ہوئے ہاتھ سے نہیں چھٹتی۔ طباعت کاغذ بہترین۔ قیمت صرف ۶ر

[illegible] قیمت عہ

ڈرامے

- ہیرودیاس ۱۲ار
- سلمیٰ ۸ر
- نرگس جمال عہ
- نجمہ نوری ۱۲ار
- تعلیم زدہ بیوی ۸ر
- پروین و ثریا عہ
- شہنشاہ حبشہ ۵ر
- تسلیم ۶ر
- روح سیاست ۸ر
- پلی پاس اور میلی ساند ۱۲ار
- دو ڈرامے ۸ر
- سیڈیو ڈرامے عہ
- وی ۱۰ ۹ر
- پیکار عہ
- محبت کا انتقام عہ
- نیم شب ۸ر
- معلم اسود ۱۲ار
- پردہ غفلت ۸ر
- انجام ۱۲ار
- گناہ کی دیوار ۸ر
- ہمزاد ۶ر
- صید زبوں ۱۰ر
- نقش آخر ۱۰ر
- نفرت کا بیج ۸ر
- مختار دلہن ۸ر
- ہوش کے ناخن ۱۰ر
- نئی روشنی عہ
- ظاہر باطن عہ
- شہید وفا ۸ر
- میوۂ تلخ ۴ر
- قومی تلوار ۸ر
- دیانت ۲ر
- شریر لڑکا ۳ر
- قوم پرست طالب علم ۳ر
- بچوں کا انصاف ۳ر
- اسکول کی زندگی ۳ر

جوانوں کے لئے نوجوان لٹریچر

- دوشیزہ کی ڈائری عگار
- عورت عگار
- شب عروسی عہ
- شب زفاف عہ
- برتھ کنٹرول عہ
- شب عروسی کے افسانے عہ
- شب نامۂ عروسی عہ
- شادی کی ۷ راتیں عہ
- دلہن کی ڈائری عہ
- دلہن کانفرنس عہ
- بہار شباب عہ
- کیف مواصلت عہ
- لذت شباب عہ
- محبت کے پیغام ۸ر
- تاج العروس ۱۲ر
- ایرانی کوک شاستر عہ
- طلوع شباب عہ
- بہار عروس عہ
- شاہی کوک شاستر عہ
- لذت النکاح عہ
- بیوہ دوشیزہ ۱۲ر
- عیش ونشاط عہ
- مرد و عورت عہ
- رنگینی جوانی ۸ر
- شہزادی شب نو عہ
- سیاہ کا سالوں عہ
- گناہ کی راتیں عہ
- شرمناک افسانے عہ
- بادشاہی دوشیزہ ۸ر
- شباب کی [illegible] ۸ر

سیاسی کتابیں

نام کتاب	مصنف	قیمت
پوری جدوجہد	ہرہٹلر	عگر
سرگذشت مسولینی	مسولینی	عہ۸ر
لینن	ڈاکٹر اشرف	عہ ر
تاریخ کانگریس	پٹا بھائی سیتارامیہ	عگر
تاریخ مسلم لیگ	مظہر انصاری	عگر
وفاق ہند	ڈاکٹر نجم الدین جعفری	عہ ر
یورپ کی حکومتیں	؍؍	عہ ر
کمپنی کی حکومت	باری علیگ	عہ۸ر
سوشلزم	؍؍	۶ر
راجا اور پرجا	ٹالسٹائی	۱۰ر
ہمارے زمانہ کی غلامی	؍؍	۶ر
سیاسیات ہند	مختلف یورپین مصنف	عہ ر
اصلاحات ہند	؍؍	عہ ر
میری کہانی	جواہر لال نہرو	للعہ
تلاش حق	مہاتما گاندھی	سے ر
گاندھی جیون	ظفر نیازی	عہ ر
پیغام آزادی	لوکمانیہ تلک	عہ۱۲ر
انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ	شیخ حسام الدین	عہ ر
انقلابی شرارے	چھبیل داس	۱۲ر
چنگاریاں	؍؍	۱۲ر
ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں	؍؍	۴ر
سوشلزم	؍؍	۸ر
کارل مارکس	ہردیال ایم اے	۴ر
قوم کی آواز	مہاتما گاندھی	عہ۸ر
تقاریر ظفر علی خاں	مولانا ظفر علی	۹ر
سوویٹ روس کا نظام کار	مظہر علی اظہر	عہ۱۲ر
شہید سیکسونی	ایڈیٹر کارواں	۱۲ر
آزادئ ہند	چودھری افضل الحق	عگر
مسلمانان ہند کی سیاست وطنی	محمد امین زبیری	۱۰ر
انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ	منتظر	۸ر
عہد حاضر کے بڑے لوگ (ہندوستان)	محمد مرزا	۸ر
چین و ایران حصہ دوم	؍؍	۸ر
عراق و عرب حصہ سوم	؍؍	۸ر
مصر و [illegible] حصہ [illegible]	؍؍	۸ر

بچوں کے لئے دلچسپ کتابیں

نام کتاب	قیمت
چند پند	۸ر
منتخب الحکایات	۸ر
عثمان کا خواب	۸ر
طرابلس کی شہزادی	۲ر
فتح قسطنطنیہ	۲ر
مجدی لوا	۲ر
اتاترک	۴ر
ارطغرل	۲ر
دکھیارہ شہزادہ	۲ر
لعل شہزادہ	۲ر
شوری تارا ماتے چاند	۲ر
صبر بادشاہ زادہ	۲ر
شہزادہ نے نواز	۲ر
بچوں کے گیت	۲ر
بچوں کا تحفہ حصہ اول	۵ر
؍؍ حصہ دوم	۵ر
طلا دو پیازہ	۴ر
ارمغان عرب	۴ر
آسمانی خزانہ	۲ر
ملک نم نم	۴ر
حکایات ہشت بہشت	۶ر
چور اور گرہ کٹ	۳ر
شہزادہ عبدالرحمٰن	۲ر
تدبیر کی سرزمین	۲ر
تاریخ ہند کی کہانیاں	۸ر
کائنات	۴ر
دنیا کے بسنے والے	۵ر
دنیا کے بچے	۵ر
تعلیمی کھیل	۳ر
بچوں کی نظمیں	۴ر
بچوں کے کھیل	۵ر
بچوں کا چڑیا گھر	۴ر
ننھی مرغابی	۲ر
بچوں کی کہانیاں	۲ر
لال مرغی	۲ر
جگنو کی بتی	۲ر
مرغی اجمیر چلی	۲ر
تانبیل خاں	۲ر
چوری جرکر وحاتی سے نکل بھاگی	۲ر
چھوٹا ممو	۲ر
نیت کا پھل	۲ر
شیدلا	۳ر
چھدو	۳ر
انعامی مقابلہ	۱ر
بے کاری	۳ر
شہزادی گلنار	۳ر
عقاب	۴ر
ترکوں کی کہانیاں	۴ر
دیانت	۲ر
شیر پر لڑکا	۳ر
قوم پرست طالب علم	۳ر
بچوں کا انصاف	[illegible]
اسکول کی زندگی	۳ر
محنت	۳ر
التوحید	۵
الاسلام	۴ر
الآخرت	۴ر
ہمارے نبی	۳ر
آخری نبی	۴ر
قرآن پاک کیا ہے	۴
آنحضرت	۴
درس جنتی	۵
عقائد اسلام	۴
ارکان اسلام	۴ر
ہمارا دین	۲ر
چالیس حدیثیں	۲ر
اچھی باتیں	۴ر
نبیوں کے قصے	[illegible]
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں	[illegible]
حضرت [illegible]	[illegible]

افسانوں کے دلچسپ جلد یہ مجموعے

نام کتاب	مصنف	قیمت
ڈاچی	اوپندرناتھ اشک	۸عہ ر
صدائے جرس	مسز عبدالقادر	۸عہ ر
لاشوں کا شہر	״	۸عہ ر
سازِ فطرت	حسن عزیز جاوید	۸عہ ر
نیلوفر	״	۸عہ ر
سات تارے	سات مشہور ادیب	۸عہ ر
محبت اور نفرت	اختر حسین ملکاپوری	۸عہ ر
اندھی دنیا	اختر انصاری	عہ ر
صنوبر کے سائے	مسز حجاب امتیاز علی	عہ ر
عورت اور دیگر افسانے	ڈاکٹر رشید جہاں	عہ ر
خاموش حسن	ٹیگور	۸عہ ر
شعلے	احمد علی ایم اے	عہ ر
طلسم خیال	کرشن چندر ایم اے	۸عہ ر
دنیا کی حور	کوثر چاندپوری	عہ ر
عورتوں کے افسانے	״	۸عہ ر
دل گداز افسانے	״	عہ ر
کیفستان	قیسی رام پوری	عمر
چاند کا گناہ	مہدی علی خاں	عگ ر
لمحات رنگین	زبیدہ سلطانہ	عگ ر
حاجی لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	۱۲ر
دراتی	״	عہ ر
کیلے کا چھلکا	״	عہ ر
سیاہ کار اور دیگر افسانے	باقر نسیم	عہ
معیار محبت	سیاح سنامی جرنلسٹ	عہ ر
روسی افسانے	سعادت حسین	عمر
آتش پارے	״	عمر
[illegible] کے دھوکے	بلند شکیب	۸عہ ر
طلسمات	عابد علی عابد	عہ ر
مجنوں کے افسانے	مجنوں گورکھپوری	۱۲ر
زاد راہ	منشی پریم چند	عہ ر
آخری تحفہ	״	۸عہ ر
خواب و خیال	״	۸عہ ر
[illegible]ت	״	عہ
[illegible] محبت	״	عمر

مزاحیہ کتابیں

عظیم بیگ چغتائی

- کھرپا بہادر — عہ ر
- خطوط کی ستم ظریفی — ۸ر
- خانم — ۱عہ
- ویپائر — عگ ر
- کولتار — عگ ر
- روحِ ظرافت — ۸عہ ر
- چمکی — ۸عہ
- روحِ لطافت — ۸عہ
- مسز کرڈلے — عمر
- دیکھا جائیگا — عہ
- چینی کی انگوٹھی — ۸ر
- ملفوظات حاجی — ۱۲ر
- تفویطی — ۵ر
- کمزوری — عہ ر
- چغتائی کے افسانے حصہ اول — ۸عہ
- ״ ״ حصہ دوم — ۸عہ
- شہزوری — ۸ر
- مرزا جنگی — ۶ر
- مقراض محبت — ۵ر
- قدردان — ۵ر
- فرزند سرحد — ۵ر

حاجی لق لق

- دراتی — عہ ر
- کیلے کا چھلکا — عہ ر
- حاجی لق لق کے افسانے — ۱۲ر
- فرشتوں کا امتحان — ۸ر

شوکت تھانوی

- موجِ تبسم — عگ ر
- سیلابِ تبسم — عگ ر
- دنیائے تبسم — ۸عہ

- مہرجبیں — عمر
- دل پھینک — عمر
- سوتیا چاہ — عمر
- خانم خاں — عمر
- سودیشی ریل — عمر

علامہ راشد الخیری

- نانی عشو — ۱۰ر
- ولایتی نخطی — ۶ر
- دادا لال بجھکڑ — ۸ر

متفرق مزاحیہ کتب

- چٹکیاں گدگدیاں — ۱۲ر
- مضامین رشید — عگ ر
- مضامین فرحت دوم — عگ ر
- سمداتی — ۸عہ
- گہوارۂ تبسم — ۴ر
- زنانی حماقت — ۶ر
- ہنسانے فسانے — عہ ر
- غنچۂ تبسم — عگ ر
- مرزا جی حصہ اول — عگ ر
- ״ حصہ دوم — عگ ر
- پطرس کے مضامین — ۸عہ
- طوفان تبسم — عگ ر
- ہنسی کی باتیں — ۸ر
- حکایات لطیفہ حصہ اول — عمر
- ״ ״ حصہ دوم — عہ
- ״ ״ حصہ سوم — عمر
- لطائف عجیبہ حصہ اول — عمر
- ״ ״ حصہ دوم — عہ
- ״ ״ حصہ سوم — عہ ر
- حاجی بابا — عگ ر
- مطائبات — عہ
- سات [illegible] کی کہانیاں — ۸عہ

اتاترک

لائبریری ایڈیشن

کتب خانہ علم وادب دہلی کا تاریخی شاہکار

یہ وہ منفرد اور معرکہ آرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک بانی جمہور ترکیہ کے حالات پر آج تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کا مشہور رسالہ اُردو (مورخہ جولائی ۱۹۳۹ء) اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے۔

"اس کتاب میں محمد مرزا صاحب دہلوی نے اتاترک غازی مصطفےٰ کمال کے حالاتِ زندگی بڑی محنت اور غائر مطالعے کے بعد لکھے ہیں۔"

اور یہ غازی اعظم کی تمام وکمال سوانحعمری ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو اور اس کے ہر کارنامے سے بحث کی ہے اُردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی جامع کتاب ابتک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی تھی۔"

اور ہندوستان کا مشہور رسالہ "نگار" اس کے متعلق لکھتا ہے۔

یہ کمال اتاترک پر آخرین تصنیف ہے جس میں ان کے جانشین عصمت انونو کے حالات زندگی بھی جمع کر دئے گئے ہیں۔ فاضل مولف نے اس میں کمال اتاترک کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر نہایت جامعیت سے روشنی نہ ڈالی ہو

حجم ۳۰۰ صفحات اتاترک اور ترکی مشاہیر کی (۲۰) بلاک کی تصاویر ..... لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت اعلیٰ ٹائٹل نہایت ہی دلکش اور دیدہ زیب مجلد قیمت صرف دو روپے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

کتب خانہ علم وادب دہلی سے منگائیے

ناول

ماہ درخشاں پلاٹ نہایت رنگین۔ عشق و محبت کی دلچسپ چاشنی آجکل کی معاشرت کی روشنی میں بیحد دلچسپ ناول از بیگم احمد علی۔ قیمت مجلد عا؎

گئو دان منشی پریم چند آنجہانی کا اپنے خاص رنگ کا آخری ناول قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (للعہ)

فاؤسٹ یہ ناول اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم اور مسحور کن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ شہرۂ آفاق شاعر المانیہ گوئٹے نے دنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس میں آپ اپنی زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سہانا بھی ہے اور بھیانک بھی۔ نیکی، بدی، حسن، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی رنگین داستان کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ مترجمہ شاہد احمد بی اے ایڈیٹر ساقی۔ قیمت عہ

سلامبو شہرۂ آفاق فرانسیسی انشا پرداز گسیتو فلابیئر کا شہ پارہ اب سے دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے آگے آجاتی ہے سلامبو اور ماتو کی محبت کی حسرت ناک کہانی۔ اور حبشیوں کی لڑائیاں وغیرہ از مولوی عنایت اللہ۔ قیمت سے؎

نجم السحر پانچ ہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی تو رب عموں کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سربفلک محلوں میں آنکھیں کھولیں پروان چڑھی۔ جوان ہوئی۔ اور پھر اس کی داستان عشق شروع ہوئی۔ از مولوی عنایت اللہ۔ قیمت للعہ

تائیس یورپ کے بہترین مصنف کی بہترین تصنیف کا اردو کے بہترین مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کے قلم سے۔ یہ ناول تمام دنیا کی ادبیات میں نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے اس کا ترجمہ ایسی قادرالکلامی سے کیا ہے کہ اردو میں ادب لطیف کی ایک غیر فانی یادگار بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپے عا؎

چمکی مصنف کی ناول نویسی اور مزاحیہ نگاری کا عروج آپ انتہائی زیادہ دلچسپ اور رنگین ناول میں دیکھیں گے جس میں چمکی کے حسن و عشق کی دلفریب اور عجیب و غریب کہانی دلنشیں اور پر شرما واقعات۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ (للعہ)

مرزا بہادر چغتائی صاحب نے اس ناول میں ایک عجیب غریب قصہ پیش کیا ہے ایک بدمعاش لفنگے سے ایک نواب نے اپنی چہیتی بیٹی کی شادی ضد میں آکر زبردستی کر دی۔ اس بدمعاش پر شاہی محلوں میں جو کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ وہ الف لیلیٰ کے بھاگتے (ابوالحسن) کے قصے سے بھی زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

دکن کی پری حکیم خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کا نہایت دلچسپ ناول دوسرا اڈیشن۔ قیمت ۶؎

قسمت کا شکار جارج اے برمنگھم کے ناول کا ترجمہ۔ قیمت تین روپے (سے؎)

نازک کٹار رچرڈ ہنری سیویج کی تصنیف مائی آفیشل وائف کا اردو ترجمہ۔ قیمت للعہ

دغا کا پتلا دی ہیرن آف آرسی لوپن کا ترجمہ۔ قیمت دو روپے (عا؎)

لال مقدس ایلن اپہارڈ کے ناول دی ایکسپوزڈ پرنسس کا ترجمہ قیمت دو روپے آٹھ آنے (للعہ)

سراج الدولہ بنگال مشہور مصنف بابو نیکم چندر لاہری بی اے وکیل کے مشہور ناول تمگیر شیش نواب کا پر لطف اردو ترجمہ۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (للعہ)

نور جہاں سلطنت مغلیہ کے مشہور تاجدار جہانگیر کی محبوبہ نور جہاں اور عزیز بہادر بیٹے شاہجہاں کی آویزشوں اور سیاسی چالوں کے تاریخی حالات۔ قیمت ۸؎

لالہ رخ (مصور اڈیشن) مصنفہ ٹامس مور۔ مترجمہ ل۔ احمد اکبرآبادی قیمت مجلد عا

قلوپطرہ ملکۂ مصر۔ سیزر کی داشتہ انیٹنی کی محبوبہ۔ اپنے ملک کی غدار لیکن اپنے جذبات کی غلام۔ سکندریہ کی عشرت کادی کا حسن و عشق کی کونسی خونی داستان ہے جو اس کے نام سے منسوب نہیں۔ از سلمیٰ تصدیق۔ قیمت مجلد عا

داستان پیری لوی کی کتاب افرودائی کا ترجمہ۔ یہ عشق و محبت کی ایک دلگداز داستان ہے جس کا طرز تحریر بالکل مشرقی ہے اس سے زیادہ رنگین و حسین عبارت کسی مصنف کو نصیب نہیں ہوئی۔ قیمت مجلد عا؎

دوشیزۂ صحرا از صادق الخیری ایم اے دہلوی زیر طبع قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

بغداد کا جوہری از اشرف صبوحی زیر طبع قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

طارق بن زیاد۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

شریف قاتل۔ قیمت بارہ آنے (۱۲؍)

خون ملت۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

حجاج بن یوسف۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)

مشہور مصنفوں کی دلچسپ کتابیں

عبدالحلیم شرر

نام کتاب	قیمت
جویائے حق	؎
ایام عرب دو جلد	؏
مقدس نازنین	عہ۸
ماہ ملک	عہ۸
فتح اندلس	عہ۸
شوقین ملکہ	عہ۴
یوسف و نجمہ	عہ۴
طاہرہ	عہ۴
مفتوح فاتح	عہ۴
عزیزۂ مصر	عہ۴
حسن کا ڈاکو	عہ۸
فلورا فلورنڈا	صہ
قیس و لبنیٰ	عہ
زوال بغداد	عہ۴
حبیب داں دلہن	۱۲ر
فلپانا	عہ۸
منصور موہنا	۸ر
رومتہ الکبریٰ	عہ۴
فردوس بریں	۶ر
شہید وفا	۸ر
بدر النسا کی مصیبت	۳ر
حسن بن صباح	۳ر
دربار حرام پور	۸ر
القانسو	۲ر
دلچسپ	۸ر
دلکش	۱۲ر
شاہکار شرر	۱۲ر
نامور ان عالم	عہ۸
پیمان سلف	۱۰ر
ماہ وخت	عہ۴
قدیم مسیحیت	۸ر
حالات اقوام کرد	۶ر
مقالات شرر	عہ۸
سفر نامہ [illegible]	[illegible]

نام کتاب	قیمت
خوفناک محبت	عہ۴
فیروز شاہ	عہ
پردہ	عہ
اسلامی سوانح عمریاں	عہ۸
عصر قدیم	عہ۴
لعبت چین	عہ
مینا بازار	عہ

ایم اسلم

نام کتاب	قیمت
مرزا جی کامل	للعہ ۱۲ر
مہدی	؎
کارزار حیات	؏
نغمۂ حیات	عہ۸
پیغام سروش	عہ۱۲
عروس غربت	عہ۴
ہلال و صلیب	؏
شب غم	عہ۴
سراب ہستی	عہ۸
مضامین اسلم	عہ۸
آشوب زمانہ	عہ
گناہ کی راتیں	عہ
ثمرہ گناہ	عہ
طلسم سامری	عہ۶
بڑی بی	۱۲ر
غزال	۱۰ر
بقائے دوام	عہ

جوش ملیح آبادی

نام کتاب	قیمت
حرف و حکایت	؏
نقش و نگار	؏۴
شعلہ و شبنم	؎
فکر و نشاط	عہ۴
جنون و حکمت	؏

نظم

نام کتاب	مصنف	قیمت
دیوان غالب تاج اڈیشن قسم اعلیٰ	غالب	عـ۵
" " قسم اول	"	صہ
دیوان غالب کا ہر اڈیشن	"	عہ۸
بال جبریل	اقبال	؎
بانگ درا	"	؎۸
شاہنامہ اسلام کامل	حفیظ	؎
سوز و ساز	"	؏
نغمہ زار	"	عہ۴
تصویر احساس	الطاف مشہدی	؏
نوائے حرم	ع - ب	عہ۸
نشاط روح	اصغر گونڈوی	؏
مسدس حالی صدی اڈیشن	حالی	صہ
متاع درد	ثاقب	؏
نغمۂ نور	بہزاد لکھنوی	عہ
حسن کے دونوں رخ	آزاد انصاری	۴ر
مصحف بیدم	بیدم وارثی	۸ر
گلدستہ محسن کاکوری	محسن کاکوری	۶ر
دیوان حالی	انصاف حسین حالی	۱۲ر
شرح دیوان غالب	از عبدالباری آسی	؎
" " "	بیخود دہلوی	؏۱۲
" "	مولانا نتہا	؎
"	حسرت موہانی	صہ
شکوہ جواب شکوہ	اقبال	۶ر
افکار سلیم	سلیم پانی پتی	؎
قصائد ذوق	ذوق	۴ر
دیوان میر درد	میر درد	۴ر
درد زندگی	احسان دانش	؏
نغمۂ روح	اختر انصاری	۱۲ر
باغی	جاذب دہلوی	عہ
نظم بے نظیر	مولوی نذیر احمد	عہ۸
چہار گلزار حالی	حالی	۱۲ر
رباعیات عمر خیام ترجمہ توی	امروہوی	؏
باقیات فانی	فانی بدایونی	عہ۸
گنجینۂ بیخود	بیخود دہلوی	؎
[illegible] بیخود	"	؏

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لی جاتی

جمعات

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصولڈاک فی پرچہ ۸ر
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جلد (۲۱) | ساقی دہلی۔ بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر (۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کے افسانہ نمبر کے لئے اعلیٰ درجے کے افسانے جمع کئے جا رہے ہیں۔ پندرہ افسانے اب تک منتخب ہو چکے ہیں۔ جون کے ساقی میں اُمید ہے کہ ہم مکمل فہرست پیش کر سکیں گے۔ افسانہ نمبر میں صرف وہی افسانے شامل ہو سکیں گے جو ۱۰ر مئی تک موصول ہونگے۔

آل انڈیا ریڈیو اور ہارمونیم کے متعلق متعدد مضامین موصول ہوئے ہیں۔ اِس اشاعت میں ایک محترم بزرگ کی کھلی چٹھی اسی موضوع پر شائع ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے موسس اور کنٹرولر مسٹر فیلڈن، ہارمونیم کو نکالنے کے ہیتے بھر کے اندر ہی اندر اپنے جلیل القدر عہدے کو کھو بیٹھے۔ اب دیکھنا ہے کہ موجودہ کنٹرولر مسٹر اے۔ ایس۔ بخاری، جو ہندوستانی موسیقی سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں، اس ناانصافی کا کیا تدارک کرتے ہیں۔

"شاھد"

ناشرانِ کُتُب دہلی کا متفقہ فیصلہ

قرارداد نمبر ۱۔ دہلی کے ناشرانِ کُتب کا یہ جلسہ بالاتفاق یہ طے کرتا ہے کہ آج کی تاریخ سے اپنی مطبوعات پر مکتبہ جامعہ قرولباغ یا اسکی شاخوں کو صرف اس شرط کے ماتحت پچیس ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائے کہ مکتبہ جامعہ یا اُس کی کوئی شاخ خوردہ فروشی (retail sale) میں ہماری کسی کتاب کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر فروخت نہ کرے۔

پچیس ۲۵ فی صدی کمیشن مکتبہ جامعہ اور اُس کی شاخوں کیلئے مقررہ کمیشن ہوگا۔ اس سے زیادہ کمیشن مکتبہ جامعہ اور اُسکی شاخوں کو کسی حالت اور صورت میں نہیں دیا جائے گا۔ خواہ وہ ایک روپے کی کتاب خریدے خواہ ایک ہزار یا زیادہ کی خریدنا چاہے۔

قرارداد نمبر ۲۔ سکول لائبریریوں یا تعلیم بالغان کی اسکیم کے ماتحت اگر کسی صوبے کی حکومت میں ہماری کتابیں منظور ہونگی تو ہم مکتبہ جامعہ کی معرفت اپنی مطبوعات ارسال نہ کریں گے۔ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اپنی مطبوعات کی ہم خود براہِ راست ترسیل کا انتظام کرینگے۔ لیکن اگر کوئی صوبے کی حکومت ہمارا یہ فیصلہ نہ مانے اور مکتبہ جامعہ ہی کے ذریعے فراہمی کتب پر زور دے تو ایسی صورت میں ہم مکتبہ جامعہ کو اپنی مطبوعات پر اُسی صوبے کی منظور کردہ کمیشن سے زیادہ کمیشن کسی حالت میں نہ دینگے۔

" نمبر ۳۔ ہم ناشرانِ کتب آپس کے اس فیصلہ کے سختی سے پابند رہینگے۔ جو ناشر ہم میں سے اس فیصلہ کی خلاف ورزی کریگا ہم اُسکا تجارتی مقاطعہ کر دینگے۔

" نمبر ۴۔ ناشرانِ کتب کا یہ فیصلہ طبع کر کے شائع کر دیا جائے۔ اس کی ایک ایک کاپی اخبارات کو بغرض اشاعت اور مکتبہ جامعہ اور صوبوں کی حکومتوں کو برائے اطلاع بھیجدی جائے۔

" نمبر ۵۔ آج بتاریخ ۲۴ر اپریل ۱۹۴۸ء سے ہم ناشرانِ کتب دہلی کا یہ فیصلہ ناطق سمجھا جائے گا۔

۱۔ (رشید احمد۔ ایم۔ اے) منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی، ۲۔ (صلاح الدین قریشی) ایوانِ ادب، اُردو بازار دہلی؛ ۳۔ (اشتیاق احمد چشتی) مولوی بشیر الدین احمد اینڈ سنز کھاری باؤلی دہلی؛ ۴۔ (عزیز حسن بقائی) پیشوا بک ڈپو، اُردو بازار دہلی؛ ۵۔ (سید یوسف بخاری) مکتبہ جہاں نما، اُردو بازار دہلی ۶۔ (منشی قربان علی بسمل) چمن اُردو بک ڈپو، اُردو بازار دہلی؛ ۷۔ (اظہر عباس بی۔ اے) حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، اُردو بازار دہلی، ۸۔ (محمد مرزا) دائرۃ ادبیہ، دریا گنج دہلی؛ ۹۔ (انوار ہاشمی) دین دُنیا پبلشنگ ہاؤس جامع مسجد دہلی، ۱۰۔ (محمد عبد المعید) کتب خانہ رشیدیہ، اُردو بازار دہلی۔ ۱۱۔ (سید محمد اشفاق علی) رائل ایجوکیشنل بک ڈپو، اُردو بازار دہلی؛ ۱۲۔ (شاہد احمد۔ بی۔ اے، آنرز) مالک ساقی بکڈپو، دہلی؛ ۱۳۔ (رازق الخیری) مالک عصمت بکڈپو دریا گنج دہلی؛ ۱۴ (سید وصی اشرف) کتب خانہ علم و ادب اُردو بازار دہلی؛ ۱۵ (محمد عبد الحق) مخشر خیال بک ڈپو اردو بازار دہلی۔ ۱۶ (عبد الحمید) مولوی بک ڈپو کوچہ چیلاں۔ دہلی۔

سُوجھ بُوجھ کے ڈھائی انچھر

لیگ اور کانگریس ہیں تو ایک ہی دیس کی دو سبھائیں۔ پر آپس میں ایک نہ ہونے سے دونوں کا راج سے مانگنا بھی الگ الگ ہے۔ کانگریس پورے ہندوستان کی آڑ پکڑ کے اسی گھڑی میں سب کچھ لینے کیلئے مچل رہی ہے۔ لیگ کہتی ہے راج سے اب تک جو کہا جا چکا اور جو گتھیاں سلجھا کے دکھائی جا چکیں۔ راج اُسے مان کے بچن دیدے۔ دینا دلانا پھر ہوتا رہے گا۔ راج کوئی انیلا نہیں، لاکھوں کروڑوں کو بھگتے ہوتے ہے۔ وہ جانتا ہے یہاں والے کتنے پانی میں ہیں اور اسی لئے وہ چاہتا ہے۔ جوں توں کر کے جیسے بھی بنے لڑائی بھڑائی کی یہ بُری گھڑی نکل جائے اور اس سے چھٹکارا مل جائے پھر جو کچھ ہونا ہے ہوتا رہے گا۔ پر مانگنے والوں سے بھی کچھ نہ کچھ کہنا تو چاہیئے۔ اس لئے وہ ہاکے پکارے کہتا ہے۔ جو مانگنا ہے وہ سب مل کے مانگو اور سب ایک ہو کے راج سے جو چاہو لیلو۔ یہاں ملنا اور ایک ہونا کیسا۔ دیسی تین تیرہ بارہ باٹ ہو کے رہ گئے ہیں۔

یہ ملے یونہی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اسی سمجھوتے کیلئے ہز اکسلنسی وائسرائے کے پاس مسٹر جناح اور گاندھی جی کے اب تک کئی پھیرے ہو چکے اور نجانے ابھی اور ایسے پھیرے کتنے ہونگے۔ مسٹر جناح اور وائسرائے میں جو چٹھیاں آئی گئیں وہ بھی اب سب کی سب چھپ چھپا کے سامنے آگئیں۔ یہ بھی نئی بات دیکھی۔ مسٹر جناح جب ہز اکسلنسی سے ملے اور مل کے لوٹے تو اُن میں کوئی ال بل نہ دکھائی دیا۔ جیسے ملنے سے پہلے ویسے ہی ملنے سے پیچھے۔ یہ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے، ان کا ایک ہی سا رنگ رہا۔ پر گاندھی جی مل کے جو پلٹے۔ تو منہ بنائے ہوئے، تیوری چڑھائے ہوئے۔ جو باتیں منہ سے نکلیں وہ سب آس توڑنے والی۔ جیسے جو بھی ہونا تھا وہ ہو چکا اس لئے اب اُن کی آس ٹوٹ گئی۔ پر کچھ دنوں پیچھے وائسرائے کی آس توڑنے والی باتوں ہی میں انہیں ایسی جھلک دکھائی دینے لگی جس سے پھر آس بندھ بندھا گئی اور یہ کہنے لگے ابھی سمجھوتے کے کواڑ بھڑے نہیں کھلے ہوئے ہیں۔

راج ابھی تو کچھ دینا دلاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا وہ تو تیل اور تیل کی دھار دیکھنے میں لگا ہوا ہے۔ گاندھی جی یہ سب دیکھتے ہوئے بھی اب نہ مرن برت رکھ سکتے ہیں اور نہ ستیا گرہ کرنے کو کہہ سکتے ہیں۔ یہ کیوں؟ دیس کی پھوٹ اور آپا دھاپی ان کے سامنے ہے۔ انہی کے ماننے والے انہی کی باتوں میں نئی نئی مین میکھ نکال رہے ہیں۔ پرچار پرچار گاندھی جی کی کوئی نئی بات نہیں۔ اس دوڑ دھوپ کے اسٹیج پر جب سے یہ آئے ہیں جبھی سے چرخا اُن کے ساتھ ساتھ ہے اور دیس سدھار کیلئے اس چرخے پرچار میں اب تک انہوں نے اپنی پوری سکت لگادی۔ پہلے جو بھی ہوا وہ ہو چکا۔ پر۔ اب چرخے کی رُوں رُوں کسی کو اچھی نہیں لگتی اور تو کو نہ مو کو، لے چولھے میں جھونکو کے جتن کئے جارہے ہیں۔ چرخے کی "چرخ چوں" پر ناک بھوں چڑھانا کوئی چھوٹی سی بات نہیں۔ پر ابھی کچھ دن ادھر کلکتے کے اسٹیشن پر جو سماں آنکھوں نے دیکھا اُس کے سامنے چرخے کا ٹھکرانا کچھ بھی نہیں رہتا۔ گالی گلوچ، جوتم جاتا، یہ اُن لوگوں کے ہتھیار ہیں جو پڑھے لکھے نہیں اور یونہی سی بات پر بھڑک اُٹھتے ہیں۔ پڑھے لکھوں کو تو ایسا نہ چاہیئے۔ بنگالی پارٹی کی گاندھی جی سے اَن بن سہی پر اس کے لئے اُن کی باتوں کا نہ ماننا ہی بہت کچھ تھا۔ "فارورڈ بلاک" والے کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہماری کوئی بات چلنے نہیں دیتے اور ہماری چلتی ہوئی گاڑی میں روڑے اٹکاتے چلے جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ پر اس کا یہ توڑ تو تھا جو دن دہاڑے بھرے اسٹیشن پر گاندھی جی پہ جوتا پھینکا گیا۔ سنسار کدھر جارہا ہے؟ دیس کے ایک بڑے پریمی کی اُسی کے ماننے والوں کے ہاتھوں یہ گت؟

یہ بھی سچ ہے۔ جوتا پھینکنے میں اس پوری پارٹی کی ملی بھگت نہیں۔ پر ایک دو جو بھی ہوں ہیں تو اسی ہما کے۔ کیا ایک آدھ نے اور نام اُچھلا پوری پارٹی کا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا، اب مار پیچھے پکار ہوا کرے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ جو بھی ہوا وہ بہت بُرا ہوا۔ یہی وہ ہیں جو گاندھی جی کو الجھاوے میں الجھائے ہوتے ہیں اور دیس کا رنگ ڈھنگ دیکھ کے سمجھ چکے ہیں۔ اب نہ "مرن برت" سے بیڑا پار ہو سکتا ہے اور نہ ستیا گرہ سے۔ "مرن برت" رکھا جائے تو کوئی پاس تک نہ پھٹکے۔ ستیا گرہ کی جائے تو کانگریس سے چھٹکارا ماننے والے جتنے الگ کھڑے ہوئے منہ دیکھتے رہیں اور کانگریس کے گنے چنے چوٹی کے لوگ دھر لئے جائیں۔

اب کی راجندر بابو کے ہٹتے ہی مولنا آزاد کانگریس کے پنچ بنائے گئے۔ کانگریس آڑ میں یہ جتانا چاہتی ہے وہ کسی کو نیچا اونچا نہیں سمجھتی اور سب کو ایک آنکھ سے دیکھتی ہے۔ پہلے ہندوؤں کا نمبر تھا اس لئے ایک کے پیچھے ایک ہندو پنچ بنا۔ اب "مولنا" ہی رہ گئے تھے ان کا نمبر آتے ہی

انہیں پنچ بنا دیا گیا۔ کسی نے ایک ہنسوڑ سے پوچھا۔ کیوں آپ نے بھی کچھ سُنا؟ "مولنٰا" کانگریس کے پنچ بن گئے۔ کہنے لگے تو نئی بات کونسی ہوئی۔ یہ نہ سہی وہ سہی۔ یہ نئے پنچ جی : "گاندھی کی پالسی کا عربی ترجمہ ہیں"۔ اس سے پہلے گاندھی جی کے ہتھکنڈوں کا رُوپ ہندی تھا اور اب عربی۔ روپ الگ الگ سہی پر ان دونوں کی کوک تو ایک ہی ہے۔

آپ کہتے ہوں گے بھلا اُردو، ہندی بات چیت کا لیگ اور کانگریس کے جھگڑے سے کیا لگاؤ؟ ٹھیک تو ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں۔ پر آپنے دیکھا ہوگا رات دن کے ساتھ رہنے سہنے والوں میں کسی بات پر جب اَن بن ہوتی ہے تو پہلے بھاری بھرکم سُوجھ بُوجھ والے جانے دو، رہنے دو، الگ کرو، کہہ کے اُسے ٹالتے اور دبا دینا چاہتے ہیں۔ پر جب اس پر بھی وہ نہیں دبتی اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو پھر ایسی چھڑتی ہے جس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی اور اگلی پچھلی باتیں کُرید کُرید اور کھود کھود کے نکالی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں ٹھوکریں لگ چکی ہیں ایک ایک کر کے وہ سب جگہیں اکٹھی کی جاتی ہیں اور ان کا پورا پورا اتا پتا دے کر نئے پُرانے ہتھکنڈوں کی بھان کی جاتی اور بتیرے کھولے جاتے ہیں۔ دکھانا یہی ہوتا ہے۔ ایک یہی بات نہیں اور سینکڑوں باتوں میں تم ہٹ دھرمی کی ٹھوکریں کھا چکے اور کھا رہے ہو۔ اس تو تو میں میں سے جی کی بھڑاس تو نکلتی ہی ہے پر یہ آس بھی ساتھ ساتھ لگی رہتی ہے۔ سُننے والا سب سُن سُنا کے ہوسکتا ہے پچتائے، لجائے اور اِدھر ہی چلا آئے۔ اُردو، ہندی جھگڑا کانگریس ہی کا اُٹھایا ہوا ہے۔ اس لئے ٹھیٹ لٹریچر کی لپیٹ میں اسکی یونہی سی دو چار باتوں کا آجانا کوئی اچنبے کی بات نہیں۔ بے جوڑ اور اچنبے کی بات تب ہوسکتی تھی جب اس بکھیڑے سے کانگریس الگ تھلگ رہتی اور پھر اُسے اُلاہنا دیا جاتا اور نکو بنایا جاتا۔

یہاں کی کونسی بولی دیس بھاشا بننے کی پوری سکت رکھتی ہے؟ اس پر اب تک نہ جانے کتنی دھُواں دھار اَپیچیں ہو چکیں۔ کتنے گلے پھاڑ پھاڑ کے تبّی کی بھڑاس نکال چکے۔ کتنوں نے اپنے اپنے ڈھب پر اس کی ہندی کی چندی کی۔ جیسے کانگریس نے بڑی چھان بین کر کے "ہندوستانی" کو دکھانے کے لئے دیس بھاشا مانا۔ گاندھی جی جو اُٹھے تو انہوں نے ہندوستانی کے ساتھ ہندی کا بے جوڑ سا جوڑ ملا کے "ہندی ہندوستانی" کر دیا۔ یہ سب ہو چکنے پر بھی ابھی تک دیس بھاشا کی ڈھونڈ ڈھانڈ چلی جا رہی ہے۔ اُردو، ہندی جھگڑا دیکھ کر دیس کے الگ الگ ٹکڑوں کی چھوٹی چھوٹی سی بولیوں نے بھی کروٹ لی ہے اور اب وہ بھی اپنی بڑائی جتانے کی انگڑائیاں لے رہی ہیں۔ ۴ فروری ۴۰ ۱۹ء کے "کانفرنس گزٹ" سے یہ باتیں سُنیئے :-

"ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ" - گزشتہ ہفتے میں دارالحکومت دہلی میں "ہندی ہفتہ" منایا گیا۔ جس میں ایک روز اس مسئلے پر بحث ہوئی کہ کون سی زبان ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے؟ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نمائندوں نے اس جلسے میں تقریریں کیں اور اپنی اپنی زبان کی فضیلت جتائی۔ ان تقریروں کا ماحصل جو ہندو اخبارات میں شائع ہوا ہے حسب ذیل ہے :-

گجراتی زبان کی طرف سے مسٹر امبالال نرسنگھ بھائی پٹیل وشارہ نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ گجراتی زبان ہندی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے اور گجراتی کے حروف بھی ہندی سے بہت مُشابہ ہیں۔ آپ نے کہا کہ گجراتی میں ۸۰ فی صدی الفاظ ہندی کے ہیں اور کاٹھیاواڑ میں بھی گجراتی ہی زبان بولی جاتی ہے۔ گجرات میں کبیر اور نانک وغیرہ کے بھجن خوب گائے جاتے ہیں۔ سلسلۂ تقریر میں آپ نے گجرات کی جغرافیائی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اس کی بدولت اس زبان میں بہت وسعت اور صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

مرہٹی زبان کے متعلق مسٹر آر بی پنڈھارکر نے تقریر کی۔ آپ نے بتایا کہ مرہٹی زبان ہندی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ صرف ایک حرف مرہٹی زبان میں زیادہ ہے جو عام طور پر ہندی زبان والے ادا نہیں کر سکتے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو مرہٹی میں ہندی سے صورت بدل کر آئے ہیں۔

ملیالم زبان کے متعلق مسٹر بی ایس نائر نے انگریزی میں تقریر کی۔ آپ نے کہا کہ ہندوستان میں اس کی ضرورت ہے کہ تمام زبانوں کو ملا کر ایک زبان بنائی جائے جو ہندوستانی یا ہندی کہی جا سکتی ہے۔ ہندی کے کچھ الفاظ ملیالم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ آپ نے ملیالم کی کچھ مثالیں پیش کر کے کہا کہ تلفظ میں تھوڑا بہت اختلاف ہو گیا ہے۔ مدراس میں کچھ آوازیں ناک سے ادا ہوتی ہیں۔ آپ نے یہ اُمید ظاہر کی کہ مدراس میں دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا کامیاب ثابت ہوگی۔

ہندوستانی زبان کے متعلق مسٹر گوپی ناتھ صاحب نے کہا کہ اسی کے ذریعے سے ہندی اُردو کا جھگڑا دور ہو سکتا ہے۔ آپ نے ہندستانی زبان کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے ہندی اُردو بولنے والوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی زبان کو زیادہ سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش کریں۔

اُردو زبان کی طرف سے پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے اپنی تقریر میں اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ صاحب صدر ہندی اور اُردو زبانوں کے ماہر و شاعر ہیں۔ آپ نے کہا کہ زبان کی دشواری اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ سنسکرت داں ہندی والے بن گئے اور عربی فارسی داں اُردو والے حالانکہ یہ زبانیں الگ الگ ہیں۔

آپ نے کہا کہ اُردو زبان میں اکیس ہزار چھ سو الفاظ ہندی کے، سترہ ہزار پانچ سو پانچ الفاظ خالص اُردو کے، سات ہزار پانچسو چوراسی الفاظ عربی کے، چھ ہزار اکتالیس الفاظ فارسی کے، پانسو چون الفاظ سنسکرت کے، ایک سو اکیاسی الفاظ دوسری زبانوں کے، اور پانسو الفاظ انگریزی کے ہیں۔ اس تشریح کے بعد آپ نے کہا کہ اُردو نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی سمجھی جاتی ہے۔

حاضرین کے اصرار پر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقیِ اُردو نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس میں آپ نے بتایا کہ کوئی صوبجاتی زبان ہندوستان کی زبان نہیں بن سکتی، زبان کا تعلق ذات، مذہب، وطن وغیرہ سے نہیں ہے۔ آپ نے ہالینڈ اور فرانس کے متعلق ایک مزاحیہ قطعہ سُنایا جو "وشال بھارت" میں درج تھا کہ اُردو وہاں تک بھی جاتی ہے اور ۱۸۰۲ء میں بیری صاحب نے ہندوستان کی زبان کا جو نمونہ شائع کیا وہ اس زبان سے کہیں مشکل ہے جو کیفی صاحب نے بولی۔

ہندی زبان کی طرف سے پنڈت چتر سین شاستری نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ کوئی صوبجاتی زبان ہندوستان کی زبان نہیں ہو سکتی۔ اب اُردو، ہندی کا معاملہ رہا۔ آپ نے کہا کہ اُردو میں قومی زبان بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اسکے بھاو ملکی نہیں بلکہ غیر ملکی ہیں۔ اس کا رسم الخط ایسا ہے جو بیشتر صوبجاتی زبانوں سے مختلف ہے۔ جبکہ ہندی رسم الخط اُن کے مطابق ہے۔

آپ نے زبان کے یہ تین معیار بتائے کہ عوام اس کو سمجھتے ہوں۔ ملکی حالات کے مطابق ہو اور اس میں ترقی کی صلاحیت ہو۔

آپ نے کہا کہ ہندی ان سب معیاروں پر پوری اُترتی ہے .... " ...."

ہندی اٹھواڑا منانے میں پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی نے اُردو کا جو بجٹ بنا کے سب کے سامنے ڈال دیا وہ دیکھنے کا ہے۔ یوں تو اُس کی ایک ایک پائی الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ پر پتا نہیں لگتا یہ بجٹ بنایا کیسے اور کہاں سے۔ پُرانے کبیشروں (شاعروں) کے چھندوں، دوہوں کے ڈھیروں سے پائی پائی جوڑی گئی ہے تو اس میں سے سنسکرت اور انگریزی کی پونجی نکال دینا پڑے گی۔ کیوں؟ یہ کبیشروں کے گوں کی نہیں اس لئے اس کے نکال ڈالنے سے ٹوٹل گھٹ گھٹا کے رہ جائے گا اور جواب کے پورے یہی کھاتوں سے اس بجٹ کا بھرت پورا کیا گیا ہے تو جب بھی ٹوٹل یہ نہیں رہ سکتا، اسے بڑھانا پڑے گا۔ ایک بات، دوسری بات یہ ہے :- اُردو میں جن بولیوں کی مٹھاس گھل مل چکی اُن کی مٹھاسوں کو الگ الگ کیا جائے تو عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، ترکی، پشتو، انگریزی اور دوسری اور دو ایک بولیاں نکلیں گی۔ انہی سب مٹھاسوں سے گھل مل کے اُردو کی بیچ میل مٹھائی بنی اور پورے دیس میں پھیل گئی۔ پنڈت کیفی نے عربی، فارسی، ہندی، انگریزی، سنسکرت اور کچھ اور الگ الگ بولیوں کے بولوں کی گنتی گن گنا کر "خالص اُردو" کے سترہ ہزار پانچ سو پانچ بول جو گنوائے ہیں۔ اُن کی یہ گنتی سمجھ میں نہیں آئی۔ جیسے اور دوسری بولیاں الگ الگ پہچانی جاتی ہیں ایسے ہی کیا "خالص اُردو" بھی کوئی ایسی الگ بولی ہے جس کے سترہ ہزار پانسو پانچ بول اُردو میں مل ملا گئے ہیں۔ اسے کچھ تو پھیلا کے اور کھول کر لکھنا چاہیئے تھا۔

اِسی ہندی اٹھواڑے کی سبھا میں پنڈت چتر سین شاستری نے اپنے ڈھائی چاول الگ گلائے اور جی کھول کے ہندی کی بڑائی جتائی۔ وہ اپنے دھیان میں اس سے بڑھکر ہندی کو سراہ سکتے ہیں کہ تک؟ جب تک نری ہندی ہی کی بات چیت رہے۔ پر اُنہوں نے جانچ پرتال کے گھسے ہوئے باٹوں سے اُردو اور ہندی کے تولنے میں ڈنڈی مار کے ہندی کا پلڑا بھاری دکھانے کے جتن کئے۔ ایک تو گھسے گھساتے پُرانے باٹ پھر اُس پہ پورا نہ تولنا اور

ڈنڈی مارنا یہ تو ٹھیک نہیں۔ یہ ڈگریوں نہیں نپا کرتی، اس کے لئے اُردو، ہندی کو آمنے سامنے رکھکر ان دونوں کی جوڑان، چکلان اور پھیلاؤ کو پہلے ناپنا چاہیئے تھا اس ناپ تول سے کوئی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی چھپی نہ رہتی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھائی دینے لگتا۔ پر بے جانچے ہوتے تو ہندی کا راگ الاپنا ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ یوں تو مُنہ کہنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ جو جس کا جی چاہے کہے۔ پر۔ سُوجھ بُوجھ والے "کہنا" اسے کہتے ہیں جسے سُنتے ہی دوسرا کچھ نہ کہہ سکے اور سے ماننے چھٹکارا نہ پاسکے۔ پنڈت جی نے اپنی بات کی پچ میں جن تین کسوٹیوں پر ہندی کا ٹھیک اترنا مان لیا ہے وہ ٹھیک نہیں انہیں ٹھنڈے جی سے سوچنا چاہیئے۔ آج پورے دیس کی چھوٹی بڑی بولیوں میں سے اکیلی اُردو ہی ایک ایسی بولی ہے جو ان تینوں کسوٹیوں پر ٹھیکم ٹھیک اور ایسی پوری اُترتی ہے جس میں بال بھر بھی کہیں ال بل نہیں۔ اسی لکھت میں کہیں پہلے کچھ پھیلاؤ سے اس پر لکھا جا چکا ہے اس لئے اب پھر کہی ہوئی باتوں کا دُہرانا اور انہی چباتے ہوئے نوالوں کا پھر چبانا اچھا نہیں لگتا۔

پیچھے مُڑ کر بھی دیکھتے چلئے۔ سب سے پہلے اُردو، ہندی کی نیو ۱۸۰۲ء میں کُھدی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے للوجی لال، للولال جی نام جو بھی ہو پہلے پہل اُن سے "پریم ساگر" لکھوا کر یہ بیج بویا۔ اس کے لکھنے کا ڈھب ناگری رکھا اور اس میں فارسی بولوں کی بہتات اور ریل پیل نہ ہونے دی۔ یہی وہ پہلی لکھت ہے جو اُردو کی بڑھوتری کو روکنے کے لئے اس کے سامنے لاکے ڈال دی گئی۔ گنتی کے کچھ ہندوؤں کو چھوڑ کر اور کسی کو بھی اس لکھت کا ڈھچر اچھا نہ لگا۔ انگریزوں کا راج پاٹ بڑھا تو "فورٹ ولیم" کے کھلاڑیوں نے اپنے پھُولنے پھلنے کیلئے آنے والی باتوں کو بھانپ کے اس اُتھلی نیو کو کھود کھود کے گہرا کر دیا۔ بولی کا ایکا آگے بڑھکر اس کے بولنے والوں میں بھی کہیں پورا ایکا نہ کر دے۔ اس لئے "ہندی" اور "ہندوستانی" نام رکھ کے ایک ہی بولی کے دو ٹکڑے کر دیے اور ان دونوں کی سیوا کیلئے الگ الگ پنڈت اور "مولوی" رکھے گئے۔ انہوں نے چاندی کے پھولوں کی للک میں الگ الگ لکھ لکھا کے لکھتوں کا ڈھیر لگا دیا اور اس ڈھنگ سے اُردو، ہندی کے دو پُتلے جب بن بنا چکے تو ان کھلاڑیوں نے انہیں لڑنے کے لئے دیس کے اکھاڑے میں چھوڑ دیا۔ اس پر بھی بہت دن تک یہ آگ یونہی دبی دبائی پڑی رہی اور بہت سے ہندو مسلمانوں کے ساتھ اُردو کو آگے بڑھانے اور اس کی سیوا کرنے میں دن رات لگے رہے۔

۱۸۶۸ء میں مہاراجہ بنارس کا "چیمبر انسائیکلو پیڈیا" کو اُردو کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے دس ہزار کی نچھاور کرنا اور راجہ برطبہ نرائن سنگھ کا بھاگلپور میں انگریزی اور اُردو کی پڑھائی کے لئے ایک پڑھائی گھر کھلوانا یہ ان باتوں میں سے ڈھائی باتیں بھی نہیں جو ہت۔ وؤں نے اس پھلواری کی سینچنے کیلئے لگاتار کیں۔ ۱۸۳۹ء میں فارسی کو کچہریوں سے نکال باہر کر کے اُردو اس کی جگہ آگئی اور جگہ جگہ یہی دکھائی دینے لگی۔ ۱۸۶۷ء میں "برٹش انڈین ایسوسیشن" والے جب ایک "یونیورسٹی" کھولنے کے لئے دوڑ دُھوپ کی تو اس "ایسوسیشن" میں الگ الگ دھرم والے سبھی تھے۔ ابھی یہ بات پوری ہونے نہیں پائی تھی جو الہ آباد کے بابو سرودھا پرشاد منڈل اپنی ٹولی کو لیکر اُٹھے اور دبی ہوئی آگ کو پھونک پھونک کے سُلگانے لگے۔ بنارس سے ہندی پرچار کی پکار ہوئی اور ہندوؤں کو اُردو کی سیوا کرنے پر جی کھول کے بُرا بھلا کہا جانے لگا۔ یہ ہو ہی رہا تھا جو دیانند سرسوتی آگے بڑھے اور انہوں نے اس سُلگتی ہوئی آگ پہ تیل ڈال کے اُسے بھڑکا دیا۔ سنسکرت کو پھر جلاتے اور اُس کو پھیلاتے، آگے بڑھانے میں اپنی پوری سکت لگا دی۔ یہ آگ یونہی بھڑکتی رہی۔ ہوتے ہوتے ۱۸۷۱ء میں ہندی پرچار کا دھارا بنگال میں بہنے لگا۔ جس سے ۱۸۷۲ء میں نربدا اور جبل پور ڈویژن میں فارسی کی جگہ دیوناگری لکھنے کا ڈھب پھیل گیا اور اس سے جی کی چونپ اتنی آگے بڑھی جس سے دیس کے اور ٹکڑوں میں بھی اِسی ڈھچر کے پھیلانے کے جتن کئے جانے لگے۔ سر سید نے یہ آپا دھاپی دیکھ کر اپنی پوری سکت اس کے دبانے میں لگا دی۔ الہ آباد میں بڑی سبھا جمی۔ جس میں ایک سنٹرل کمیٹی بنی اور جگہ جگہ لوکل کمیٹیاں بنائی گئیں۔ اِدھر اُدھر چٹھیوں پہ چٹھیاں بھیجیں جن میں ناگری پرچار کی چھاڑ کی گئی تھی۔

اِن باتوں نے اُس بڑھتی ہوئی لے کو دبا تو دیا جو آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ پر بھاشا پرچار کے لئے جو سبھائیں بن چکی تھیں وہ چُپکے چُپکے اپنے توڑ جوڑ میں ویسی ہی لگی رہیں اور علی گڑھ کی "سائنٹفک سوسائٹی" کے سامنے ہی ایک "بھاشا سمردھن سبھا" بن بنا گئی۔ جس نے ۱۸۸۲ء میں "رائل ایجوکیشنل کمیشن" کے آگے ایک سانس میں وہ سب کہہ ڈالا جو وہ چاہتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں اسی جھگڑے پر سر سید نے اپنی ایک رپورٹ میں یہ لکھا۔

> "تیس برس کے عرصے سے مجھے مُلک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کے کاموں میں کوشش کریں۔ لیکن جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اُردو زبان و فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور اُن کی شہنشاہیِ ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے،

مٹادی جائے اُس وقت سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اب ہندو اور مسلمان مُلک کی ترقی اور اُس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کرسکتے۔ مَیں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا اُس کی ابتدا اِسی سے ہوئی۔ گو اس کے بعد اور بھی اسباب ہوتے اور اس کے سبب سے اس نفاق کو سوائے ان پُرانے ہندو مسلمانوں کے جو بڈھے اور اگلے زمانے کے ہیں یا دُور اندیش اور سمجھدار ہیں اور دل سے ہندو، مسلمانوں میں اتفاق چاہتے ہیں روز بہ روز ترقی ہے جس کی حد مقرر کرنے کے لئے کوئی پیشین گوئی نہیں ہوسکتی۔ علی گڈھ ہندو، مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لئے مشہور ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسے مقدس شہر میں بھی یہ سبھا جو بنیاد باہمی نفاق کی ہے قائم ہے۔"

سرسید کے آڑے آجانے سے کچھ دنوں کے لئے یہ بات دب دباگئی اور ان کے سامنے اسے آگے بڑھانے کے لئے کسی کا ہواؤ نہ پڑسکا۔ جب یہ دلیس سے بچھڑ چکے تو اس کے دُو ہی برس پیچھے ۱۹۰۰ء میں سرانٹونی میکڈانلڈ نے ہندوؤں کی من مانی باتیں مان کر مسلمانوں کو آپے سے باہر کر دیا۔ یہ بہت بگڑے، بہت بپھرے، بڑی دوڑ دھوپ کی۔ سرسید کے پیچھے نواب محسن الملک نے اُردو کے بچاؤ کا بیڑا اُٹھایا اور لکھنؤ میں اسی کے لئے ایک بڑی بھاری سبھا جمی۔ جس میں عیسائی، ہندو، کشمیری پنڈت بھی مسلمانوں کے ساتھ بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ بھرے پنڈال میں محسن الملک مرحوم نے اپنی دھواں دھار اسپیچ سے ہلچل ڈالدی۔ اُنہوں نے لفٹنٹ گورنر سے بھی اسی جھگڑے پر بے جھجک کھلم کھلا بات چیت کی اور اُنہیں یہ جتلایا اور تو اور دلیس کے اس ٹکڑے کے رہنے والے بنگالی بھی" ہندی "پر اُدھار کھائے ہوئے ہیں اور اس کا پرچار نہیں چاہتے۔ ادھر یہ ہو رہا تھا اُدھر پنجاب اور سندھ میں بھی اسی ہندی پرچار پر بڑا ادھم مچا۔ اور لوگوں نے بہت پیر پھیلائے۔ پر یہ ہانڈی کا سا اُبال آگے نہ بڑھ سکا اور کچھ دنوں میں دب دبا کے رہ گیا۔

ان سب باتوں نے مسلمانوں کی آنکھیں کھولدیں اور اُنہوں نے آپس میں کانا پھوسی کرکے ۱۹۰۷ء میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کی نیو رکھدی۔ اُردو کا بچاؤ اور پھیلاؤ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" اور "انجمن ترقی اُردو" کے ہاتھ ہی میں نہیں "مسلم لیگ" بھی اس کی پوری دیکھ بھال کرتی رہی۔ ۱۹۱۱ء میں لیگ اور کانگریس میں سمجھوتے کے لئے جو بات چیت چھڑی تھی اُس میں اُردو کا بھی ایک نمبر رکھا گیا تھا۔ پھر ۱۹۱۶ء کے "سیف گارڈ" (تحفظات) میں بھی اس کے لئے پوری جگہ نکالی گئی تھی۔ ان سب اگلی پچھلی باتوں کی کڑیاں ملاکر دیکھئے تو یہی پائیے گا۔ ہندو اُردو کا ستیاناس کرکے اور اُسے مٹا کے ہندی ہی کو پھیلانے اور آگے بڑھانے کی دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں۔ پر۔ انہی میں ایسے بھاری بھر کم لوگ بھی ہیں جو یہ لکھ رہے ہیں۔

"۱۹۔ البرٹ روڈ۔ الہ آباد ۲۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

مخدومی مکرمی ڈاکٹر عبدالحق صاحب!

تسلیم و نیاز۔ اگرچہ میری بڑی خواہش تھی کہ مَیں اس موقع پر جلسے میں شریک ہوں لیکن پچھلے تین چار روز سے میری طبیعت پھر ناساز ہوگئی ہے اور مجھے خوف ہے کہ ریل کے سفر سے زیادہ خراب نہ ہوجائے۔ لہٰذا بحالت مجبوری میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ کل شب کو ڈاکٹر صدیقی صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ میں نے اُن سے زبانی بھی عرض کر دیا ہے کہ وہ میری طرف سے معذرت کر دیں۔

اگرچہ میں جلسے میں موجود نہ ہوں گا لیکن مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں آپ کے مقاصد و اغراض سے بہمہ وجوہ وابستہ ہوں اور پوری ہمدردی رکھتا ہوں۔ آپ کا ہمنوا اور ہم آہنگ ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اپنے مقاصد میں پورے طور پر کامیاب ہونگے۔ مَیں اس مسئلۂ زبان کو کسی فرقہ دارانہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مَیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو تنازع اس وقت زبان کے مسئلے کے متعلق ہندوستان میں پیدا ہوگیا ہے۔ اس کی اہمیت اور تنازعات سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ زبان جس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو مسلمان دونوں نے حصّہ لیا ہے۔ تباہ ہوگئی تو وہ تہذیب اور طرزِ زندگی بھی جس کا یہ ظاہری لباس ہے تباہ ہوجائے گی اور کم از کم شمالی ہندوستان میں تو ہم کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک مورخ نے راجہ ٹوڈرمل کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انہیں کے حکم سے حساباتِ سلطنت فارسی میں لکھے جانے لگے اور ہندوؤں نے عام طور پر فارسی کا پڑھنا شروع کیا جس کا آخرکار نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہندوستان میں ایک نئی زبان یعنی اُردو پیدا ہوئی جس کو اگر ہندو قبول نہ کرتے تو ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ یہ غیر ممکن تھا کہ اس زمانے میں تمام ہندو فارسی پڑھ جاتے اور یہ بھی اسی قدر غیر ممکن تھا کہ اس زمانے میں تمام مسلمان ہندی پڑھ جاتے۔ چونکہ دونوں کو اسی ملک میں رہنا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ دنیا کے کاروبار لازمی تھے۔ لہذا ضروریات وقت نے دونوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ ایک ایسی زبان مشترکہ پیدا کی جائے کہ ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی وقعت اور احترام کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی اس قدر آمیزش ہے۔ رفتہ رفتہ اسی زبان کے استادوں نے اس زبان کو اس خوبی سے مانجھا کہ اس کو بذات خود ایک مشترکہ زبان ہونے کا وقار حاصل ہو گیا اور اس کو مشترکہ زبان کہنے میں نہ ہندو اور نہ مسلمان اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہماری ملک میں ایک مشترکہ تہذیب پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کم از کم شہروں میں تو تبادلۂ خیالات میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دہلی، آگرہ، روہیلکھنڈ اور پنجاب کے اطراف میں تو اس زبان کو دیہات میں بھی دخل ہو گیا اور دیہاتی زبان میں بھی ہزارہا الفاظ داخل ہو گئے۔ جن کو ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک کے الفاظ ہیں۔ مگر اب دھارا دوسری طرف بہہ رہا ہے اور اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ چُن چُن کر وہ الفاظ جو مقبول عام ہو چکے ہیں ہماری زبان سے خارج کئے جائیں اور ایک نئی زبان پیدا کی جائے جو کہ تمام ملک پر حاوی ہو۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوشش کیوں اس وقت کی جا رہی ہے۔ ایسی کونسی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اس زبان کو جو کہ دو ڈھائی سو برس سے شمالی ہندوستان میں رائج ہو گئی ہے اس طریقے سے ختم کریں اور اس زبان کے ساتھ اس تہذیب کو بھی ختم کریں جس میں یگانگت کے خیالات پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ حامیانِ اردو، ہندی یا کسی اور زبان پر حملہ کریں۔ مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی اردو پر حملہ نہ کریں۔ اردو اس وقت میرے خیال میں معرض خطر میں ہے اور اس وقت خطرہ زیادہ اس وجہ سے ہے کہ آپس کی جنگ و جدل کی وجہ سے ہندو بھی اُسے بگاڑ رہے ہیں اور مسلمان بھی۔

اگر ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ معمولی الفاظ فارسی یا عربی کے جو ہماری زبان میں جذب ہو گئے ہیں نکال دیئے جائیں تو مسلمانوں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ بجائے ہندی کے معمولی الفاظ کے مشکل سے مشکل الفاظ عربی یا فارسی کے جو عام فہم نہیں ہیں استعمال کئے جائیں۔ اردو کے ساتھ اس سے زیادہ بُرا سلوک اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ انجمن ترقیِ اردو اس معاملے میں پیش قدمی کرے اور ایک معیار زبان کا قائم کر کے اس بات پر اصرار کرے کہ جو کتابیں یا رسالے یا اخبارات اردو میں لکھے جائیں وہ ایسی زبان میں ہوں جو عام فہم ہو۔ تاکہ اس زبان کی روز افزوں ترقی ہو اور اس کو وسعت حاصل ہو۔ یہ ضرور ہے کہ اصطلاحی الفاظ کا ذخیرہ ہمارے یہاں کافی نہیں ہے اور ہم کو دیگر زبانوں سے جس میں کہ میں انگریزی کو بھی شامل کرتا ہوں ایسے الفاظ لینے پڑیں گے۔

ادب کا دائرہ اب نہایت وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں ہماری انجمن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسی کتابیں مستند اردو زبان میں شائع کرے کہ جن کی بدولت ہمارے نوجوانوں کی تعلیم شروع سے آخر تک کافی طور پر ہو جائے۔ مثلاً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ہمارے ادیب ہر حصہ تاریخ ہندوستان کے اوپر ہندو زمانے سے لیکر انگریزی زمانے تک عالمانہ کتاب نہ لکھیں۔ ادب میں تنگ نظری اور تعصب کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب کو کسی ذاتی اعتقاد یا تعصب سے تعلق نہیں ہے۔ وہ ادیب، ادیب نہیں جس میں منصف مزاجی نہ ہو۔ لہذا نہایت ادب کے ساتھ میں یہ عرض کروں گا کہ انجمن ترقی اردو کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرے اور جس انجمن کا روحِ رواں ایسا شخص ہو جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق، اس سے ایسی اُمید کرنا ہمارے لئے بیجا نہ ہوگا۔ آخر میں، میں دُعا کرتا ہوں کہ آپ کا جلسہ کامیاب ہو اور آپ ایسی تجاویز منظور فرمائیں کہ جو عملی طور پر مفید ثابت ہوں۔"

نیاز مند۔ تیج بہادر سپرو۔

(ادبِ لطیف، لاہور۔ جنوری ۱۹۴۱ء)

کیا کہا، کس ڈھنگ سے کہا، اور کس نے کہا اس چٹھی کی یہ سب باتیں یوں نہیں، سوجھ بوجھ کی آنکھوں سے دیکھنے کی ہیں۔ شبد ساگر میں ڈبکی لگانے والوں کے کیول، تتھا، ادھک، ہو دا جیسے کڈھب بولوں کا نہ کہیں اس میں پتا ہے اور نہ کسی اور بولی کے بوجھل بولوں کا۔ پوری چٹھی میں سے آپ ایک آدھ بول بھی ایسا نہیں نکال سکتے جسے بھولا بسرا کہا جا سکے۔ کتنا ہی جانچئے پرکھئے ایک ایک بول گنا چنا اور رگڑا ملا ہی پایئے گا۔ پھر جو کچھ کہا وہ ایسا چپا تلا، ہٹ دھرمی اور بات کی پچ نہ کی جاتے تو اسے مانتے ہی بنے اور بے مانے چھٹکارا نہ مل سکے۔ یہ دکھڑا کب تک اور کہاں تک۔ سنتے سنتے آپ اکتا گئے ہونگے۔ اچھا، اسے چھوڑیئے اور کچھ اور باتیں سنیئے۔

یہاں تک جس اردو نگر کو آپ دیکھتے بھالتے ہوئے چلے آئے۔ اس کی نیو سب سے پہلے سید انشا رکھ چکے ہیں۔ کب؟ جب دلی اجڑ کے لکھنؤ بس رہا تھا۔ سید انشا بڑے پہنچے ہوئے لوگوں میں سے تھے۔ ان کے گیان دھیان کی اونچان مانی ہوئی ہے۔ کیشر نہ بنتے اور اپنے لئے کوئی اور ڈگر نکالتے تو وہ برسوں انہی کی کہلاتی۔ بیتاب نے ان کے لئے جو کہا وہ سچ کہا۔ سید انشا کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علیخاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔ یہ بڑے ہنس مکھ، بات میں سے بات نکالنے والے، جہاں بیٹھ گئے پوری سبھا پر چھا گئے۔ کسی کا ہیا تو نہ پڑتا جو انہیں ٹوک کے ان کے سامنے کچھ چیں پٹاخ کر سکے۔ بہتے ہوئے دھارے کے آگے گھاس پھونس ہے کیا۔ سب کا سب اسی کے ساتھ بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ جس کے پیچھے پڑتے جھاڑ کا کانٹا ہو کے چمٹتے اور اسے پیچھا چھڑانا دوبھر ہو جاتا۔ ٹوٹکے اور منتر سے بڑھ کے ان کی باتیں تھیں۔ روتے ہوؤں کو ہنسا دینا تو ایک کھیل تھا۔ شیخ قلندر بخش جرات پر سرمنڈھی نگوڑی گجراتن والی پھبتی آج بھی کوئی بڑا بوڑھا سید کی ادا اور باتوں کے ساتھ کہنے بیٹھے تو آپ کھلکھلا کے ہنس پڑینگے۔ بے ہنسی کے تو یہ ٹکڑا ہی نہیں توڑتے تھے۔ دن رات ہنسنا ہنسانا ہی رہتا تھا۔ ہنسی کی پونجی پڑے اللّے تللّے سے اڑائی اور ایسی لٹائی جو کھکھ ہو کے رہ گئے۔ دوسروں کا ہنسانا تو بڑی بات رہی۔ کچھ دنوں میں پھر آپ ہی کبھی نہ ہنس سکے اور مرتے مرتے روتے ہی کٹی۔

چھٹ پنے ہی سے نئی سوجھتی تھی۔ لڑکپن میں جب "کافیہ" پڑھتے اور رٹتے تھے تو ستار کے بھی بڑے رسیا تھے۔ "کافیہ" رٹنے کی گڑ اور ستار بجانے کا لپکا دونوں کا ساتھ کیسے نبھ سکتا تھا۔ ستار اٹھاتے تو رٹنا چھوٹتا، رٹتے تو ستار چھو نہ سکتے۔ ان کی نئی اپج رٹنے اور بجانے کا جوڑ ملانے کے لئے "کافیہ" کے عربی بولوں کی گتیں بنا بنا کے ستار پر بجانے لگی۔ لیجے نہ رٹنا چھوٹا نہ ستار، دو انمل باتوں کو اکٹھا کر کے ہی چھوڑا۔

دلی راج کی دھوپ جب ڈھلتی چلی جا رہی تھی تو راج کمار مرزا سلیمان شکوہ دلی چھوڑ لکھنؤ آ رہے۔ ان کی ڈیوڑھی دلی والوں کا ٹھکانا سمجھی جاتی تھی۔ ادھر سے جو ادھر آتا پہلے وہ یہیں ٹھہرتا۔ پہلے پہل جب سید انشا بھی لکھنؤ چھوڑ دلی آئے تو پہلے اسی ٹھکانے پہ آ کے ٹکے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے انہیں اپنے ہی پاس رکھ لیا اور یہیں رہنے سہنے لگے۔ لکھنؤ میں اشنان کا میلا ہونے والا تھا یہ بھنک پہلے ہی سے ان کے کان میں پڑ چکی تھی۔ اشنان کا دن آتے ہی سویرے منہ اندھیرے سے گرگل، سیندور، تلسی، دھوپ، چندن اور نجانے کیا کیا لئے ہوئے سب سے پہلے گھاٹ پہ پہنچ، آلتی پالتی مار ایک مہنت دھرم مورت بن کے بیٹھ گئے اور لگے مالا جپنے اور پکار پکار کے اشلوک پڑھنے۔ جو دیکھتا کشمیری پنڈت سمجھتا۔ دن چڑھا، اشنان والوں کا تانتا بندھا، دھکم دھکا، بھیڑ بھاڑ اور چیخ پکار بڑھنے لگی۔ جو آتا انہیں گورا چٹا، ہٹا کٹا، اونچا پورا، بھاری بھرکم دیکھ کر انہی کے سامنے جھکتا۔ یہ اسے پوجا کر لیتے، اشلوک سناتے اور تلک لگاتے۔ ملنے والوں نے جو انہیں اس روپ میں دیکھا تو انہی میں سے کسی نے جھٹ سے مرزا سلیمان شکوہ سے بھی جا کے کہہ دیا۔ ان کی ڈیوڑھی گھاٹ کے پاس تو تھی ہی۔ سنتے ہی اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ میں یہ بہروپ دیکھنے نکل آئے۔ سید انشا کے آگے آٹا، اناج، پیسوں، کوڑیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہوئے دیکھے اور وہ بھی سب سے بڑھ کے۔ یہ سب ہنسی ہی ہنسی تھی۔ پر اسی آڑ میں یہ بھی دکھانا تھا۔ میں نرا کوی، کبیشر ہی نہیں۔ جدھر نکل جاؤں گا سب سے بڑھ کر کے نکلوں گا۔

یہ جدھر کی سیدھ باندھتے پھر نہ رکتے اور اس پھرتی سے بڑھتے جیسے آندھی پھیلتی اور بجلی کوندتی ہے۔ جی میں جو ٹھان لی وہ ٹھان لی۔ دھیان میں جو آ گئی وہ آ گئی۔ دیس کی بولیاں تو ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ ہندی، مرہٹی، پوربی، پنجابی، کشمیری، پشتو، ان سب میں انہوں نے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ نئی ڈگر نکالنے کی لَو میں لگے رہتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے جو لہر آئی تو ایک ایسی کہانی لکھ لکھا ڈالی جس میں عربی، فارسی کا ایک آدھ بول بھی نہ آنے دیا اور پھر وہی چوچلے اور چہلیں رہیں۔ اس نئے ڈھچر کی کہانی لکھنے سے پہلے اپنے کسی ملنے والے سے باتوں باتوں میں انہوں نے کہیں یہ بات بھی کہدی۔ سنتے ہی اس نے انہی کے منہ پہ وہیں تڑسے کہدیا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ سید انشا اس پر بہت اونٹے اور بہت جھلائے۔ ان کا اونٹنا اور جھلانا دیکھنا ہو تو اس کیلئے انہی کی لکھت کا یہ ٹکڑا دیکھئے۔

سید انشا کی رانی کیتکی

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی، کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پُٹ نہ ملے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے رُوپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے، پُرانے دھرانے ٹھاگ، بڑے ڈھاگ یہ کھٹ اگ لاتے۔ سر ہلا کر، مُنہ تھتھا کر، ناک بھوں چڑھا کر، گلا پُھلا کر، لال لال آنکھیں پتھرا کر لگے کہنے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن بھی نہ ٹُھس جائے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں، جوں کا توں وہی سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے۔ یہ نہیں ہونے کا۔

میں نے ان کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا بڑ بولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں اور بے سُری بے ٹھکانے کی اُلجھی سلجھی تانیں لئے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا مُنہ سے کیوں نکالتا۔ جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سُناتا ہے۔ اپنا ہاتھ مُنہ پر پھیر کر موچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند، اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے۔ دیکھتے ہی ہرن کے رُوپ اپنی چوکڑی بھرے۔

"گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں
اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں"

یہ اسی کہانی کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا ہے جسے "رانی کیتکی" کے نام سے سید انشا لکھ چکے ہیں۔ نجانے کیا بپتا پڑی جو یہ رانی کسی کونے کُھدرے میں مُنہ چھپائے برسوں پڑی رہی۔ کئی برس ہوتے جو "انجمن ترقی اُردو" کی ڈھونڈ ڈھانڈ نے کھوج لگا کے اُسے باہر نکالا۔ باہر نکلی تو دُھول میں اَٹی ہوئی تھی۔ نہلا دُھلا کے چھاپے کے چھپے چھپائے اُسے نئے نئے کپڑے پہنائے۔ برسوں سے ایک جگہ پڑا رہنا اجیرن ہو گیا تھا۔ اب جو نہا دھو کے اُجلے کپڑے پہن چکی تو لگی گھر گھر پھرنے اور اِدھر اُدھر سپاٹے بھرنے۔

کہانی چھپ چھپا تو گئی۔ پر ٹھیک نہ چھپ سکی۔ کہیں بول اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے، کہیں کے بول بگڑ کے کچھ سے کچھ ہو گئے۔ اور کہیں ایک جگہ کے بول دوسرے بولوں کی جگہ چھین کے آگے والے پیچھے اور پیچھے والے آگے بڑھ گئے۔ پھر اسی میں اکا دکا ہی سہی فارسی بول بھی گھُسے ہوئے ہیں۔ سید انشا جنہوں نے عربی، فارسی کو چھوا تک نہیں اور پوری کہانی لکھ لکھا ڈالی۔ وہ بھلا کسی دوسری بولی کے گنتی کے کچھ بول کیسے لکھ جاتے اور پوری سوئیاں نکال چکنے پر آنکھوں کی سوئیاں کیسے چھوڑ دیتے۔ یہ سب کیا دھرا اناڑی لکھنے والوں ہی کا ہے جنہوں نے اس لکھت کے پورا کرنے کی دُھن میں بے سوچے سمجھے اوٹ پٹانگ جو چاہا لکھ لکھا دیا۔ ان لوگوں میں کسی بولی دولی کے لٹریچر کی چھان بین اور اس کی جانچ پرتال کی سکت کہاں ـــــ "رانی کیتکی" کا جو ٹکڑا اُوپر لکھا جا چکا ہے اُسے "انجمن ترقی اُردو" کی چھپی ہوئی کہانی کے اسی ٹکڑے سے ملا کے دیکھئے تو جو کچھ ال بل اور جتنی گھٹ بڑھ ہے وہ سب سامنے آجائے گی۔ "آبِ حیات" کا وہ اڈیشن جو آزاد مرحوم کے سامنے چھپ چھپا چکا تھا اسی سے یہ ٹکڑا لیکر یہاں لکھا گیا ہے اور یہ اس سے بھی ملتا جلتا ہے جسے بیس برس ادھر لٹریچر کے ایک بڑے پریمی کے پاس اسی کہانی میں آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔

فیض آباد کے رہنے والے منشی نعیم الحق اچھے لٹریچر کے پجاریوں میں سے تھے۔ ایک ملنے والے کے ساتھ اُن کے یہاں اُس دن جانا ہوا جو "رانی کیتکی" کے درشن کا دن تھا۔ وہاں اس کے وہ ٹھاٹ دیکھے جنہیں دیکھ چکنے پر بھی پھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کہانی کسی اچھے لکھنے والے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی، جن پتروں پہ لکھی گئی تھی اُن پر یہاں سے لیکر وہاں تک سونے کا ہلکا ہلکا سا چھڑکاؤ اور جگہ جگہ نت نئے رنگ کے پھول بوٹے۔ اردو کے کسی بڑے جوگی نے اُسے لٹریچر کے مندر کی دیوی بنا دیا تھا اور یہ ٹھیک نہ ہو تو پھر یہ کہئے "رانی کیتکی"، سولہ سنگار سے بنی سنوری چوتھی کی دُلھن بن گئی تھی۔ اس کی مُنہ دکھائی کا سماں آج تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ منشی نعیم اسے بہت سینت سینت کے رکھتے اور جو کوئی دیکھنا چاہتا تو ٹال جاتے۔ ٹالنا اور گُد گُداتا تھا۔ دیکھنے والے بھلا کہیں ٹالے سے ٹلتے ہیں۔ جتنا ٹالتے اُتنا ہی اُن کا اور پیچھا کیا جاتا۔ کب تک بچتے اور کہاں تک

ٹالم ٹول کرتے۔ ہوتے ہوتے وہی ہارے اور دیکھنے والے دیکھ کے ہی رہے۔ اس بات کو بیس برس ہو چکے اور "رانی کیتکی" کی گھورا گھاری اب اک دھندلا سا سماں بن کے رہ گئی۔

سید انشا اس سنسار کی سبھا سے کب کے اٹھ چکے۔ انہوں نے جو کچھ چھوڑا وہ اب آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ چلایئے بہایئے جو جی چاہے کیجے۔ وہ جہاں ہیں وہاں سے روکنے ٹوکنے کیلئے تو آنے سے رہے۔ پر یہ دھیان رہے آج نہیں تو کل ہمیں بھی اسی ڈگر پہ چپ چاپ چلنا ہے۔ وہ بچھڑے ہوئے بڑے بوڑھے جو اب کچھ کہہ سن نہیں سکتے ان کا ایک ایک بول انمول سمجھ کے پورے سوچ بچار کر چکنے پر اُن کی اس پونجی کو ہاتھ لگانا چاہیئے جس کے اکٹھا کرنے کی دھن میں وہ رات دن لگے رہے اور اپنی پوری سکت اسی میں لگا دی تھی۔ اس کہانی کے پہلے اڈیشن میں جہاں جہاں بھول چوک ہوئی اور جو جو باتیں رہ گئیں ان سب باتوں سے بچ بچا کے پورے دھیان سے "انجمن ترقی اردو" چاہے تو دوسرا اڈیشن اچھے سے اچھا نکال سکتی ہے۔

تو سید انشا نے اپنا جی بہلانے اور اپنی سکت دکھانے کے لئے پہلے پہل نئے ڈھنگ سے "رانی کیتکی" کی کہانی لکھی اور ہمیں اسی ڈگر پر اردو ہندی کے بڑھتے ہوئے جھگڑے کو دبانے اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے لئے دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ سید انشا نے جس ڈھب سے کہانی کہی اس ڈھب پر میں نے جو باتیں ہو چکی ہیں انہیں جوں کا توں دہرایا۔ ان دونوں میں بڑا اُل پل ہے۔ کہانی کے لئے کوئی روک ٹوک ہی نہیں۔ یہ دھیان کے ساتھ ساتھ دوڑ لگاتی ہے۔ وہ جدھر لے چلا چلی اور وہ جہاں تھما یہ بھی رک گئی۔ کہیں اونچ نیچ دیکھی تو دھیان اس سے کترا گیا اور کہیں کوئی بکھیڑا دکھائی دی تو جھٹ سے وہ پھلانگ کے نکل گیا۔ پر۔ وہ باتیں جو ہو چکیں ان میں یوں ہی سی گھٹ بڑھ کی بھی اب کوئی جگہ نہیں رہی۔ سنسار کے ہاتھ نے انہیں جون سے سانچے میں ڈھالا ویسے ہی وہ ڈھل گئیں۔ ادھر اُدھر سے گھری ہوئی انگنائی میں اس پوری بھیڑ کو ساتھ لئے دوڑ پر دوڑ لگانا ایسا ہی ہے جیسے کٹورا بھر پانی میں سمندر کا سما جانا۔ یہ سب سید انشا ہی کا کیا دھرا ہے۔ وہ یہ ڈھرا نہ نکالتے تو بھولے سے کبھی بھی اس پگڈنڈی کا دھیان تک نہ آتا۔ اس لئے اس لکھت کو انہی کی لکھت سمجھنا چاہیئے۔

اپنا دھیان۔ پہلے پہل جب اردو، ہندی کی بم چخ سُنی تو دھیان آیا۔ ایک جگہ رکھے ہوئے برتن ۔اس تک کبھی نہ کبھی آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ تو بڑے بھلے مانسوں کے دو جیتے ٹھیرے۔ اب تک جو بھی ہوا وہ ایسا نہیں جو آگے بڑھے اور بہت پھیلے۔ آج نہیں تو کل یہ ہانڈی کا سا اُبال آپ ہی آپ دب دبا کے رہ جائے گا۔ پر یہ چلتی ہوئی آندھی اور بڑھتا ہوا جھگڑا رہ رہ کے جب اور بڑھنے لگا تو پھر چپ نہ رہا گیا اور سوچ بچار سے دبانے اور مٹانے کے جتن ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔

ہندوؤں کو یہ کھٹکا تو ہے عربی، فارسی کے کھلے بولوں پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور ہندی کے کڈھب بولوں کی بھرمار اور اُن کے پرچار پر تُلے ہوئے ہیں۔ ملے جلے عربی، فارسی بولوں کی کاٹ چھانٹ کرنا اور اُن کی جگہ ہندی کے بے ڈھب بولوں کو لا لا کے اکھٹا کرنا یہ بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر جھگڑا چکانے کے لئے گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، تارا چند جی کو جتنی چٹھیاں لکھیں ان سب کے لکھنے کا ڈھنگ ایسا رکھا جن میں نہ عربی، فارسی کا کوئی بول آنے پایا اور نہ ہندی کا کوئی بھولا بسرا بول اور یہ جو کچھ کیا گیا سب ہندوؤں ہی کے منانے اور انکے ملانے کیلئے۔ ہندی کی یہ کہاوت آپ نے سنی ہوگی۔ "پھٹے کو سئے نہیں اور روٹھے کو منائے نہیں، تو یہاں کا دھندا کیسے چلے۔"

اپنا دھیان تھا ہندوؤں کو لاگ اور بیر جو کچھ ہے وہ عربی، فارسی بولوں سے اور نئی ہندی کے بول ان کی ٹھونس ٹھانس اُن کی جگہ بھرنے کے لئے کی جا رہی ہے۔ تو لکھنے کا ایسا ڈھچر جس میں یہ دونوں باتیں نہ ہوں اور اس پر بھی لکھنے کا ڈھب اردو ہی رہے۔ عربی، فارسی کے پرانے اور نئی ہندی کے نئے بولوں کو چھوڑ کے اردو لکھنے کا نیا ڈھنگ ہندوؤں کو دکھایا جائے تو وہ نئی بولی بنانے کی کھکھیڑوں سے بچ بچا کے ادھر ہی آ جائیں گے اور اسی کو برتنے لگیں گے جس سے یہ بڑھتا ہوا جھگڑا دب دبا جائیگا۔

سوچا کچھ اور ہوا کچھ۔ پر یہ نرا دھیان ہی دھیان نکلا۔ اس ڈھنگ پر لکھنے لکھانے سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور وہی ٹرٹھس رہی۔ ایسی تو تو میں میں کو دبانا اور بیچ بچاؤ کرانا جبھی ہو سکتا ہے جب جھگڑنے والے کان دھر کے اسے سن تو سکیں جو کہا جا رہا ہے۔ کسی بات کو ٹھنڈے جی سے سن لینا بڑی بات ہے۔ اسی سے آگے بڑھ کر سوجھ بوجھ دھیان کی اس برائی کو ڈھونڈ نکالتی ہے جو چھپی چھپائی من کی گانٹھ بنی من کے کسی کونے کھترے میں پڑی ہوتی ہے۔ اسے نکالتے ہی دھاندلی اور ہٹ دھرمی کی پٹی آنکھوں پر سے ہٹنے لگتی ہے۔ پر۔ جب پہلے ہی سے لوگ نہ سننے اور نہ ماننے پر اڑ جائیں تو پھر ان کے جی میں جی کوئی کیسے ڈالے اور کس ڈھب سے منائے اور کیسے سمجھائے۔ روٹھے ہوؤں کو منانے

لیئے لکھت پڑھت کا جو ڈھچر رکھا گیا۔ جانچنے والے اسی سے پتا لگا سکتے ہیں مسلمان میل جول کے کتنے رسیا اور ملاپ کے لئے کیسی دوڑ دھوپ کیا کرتے ہیں اور ایکا کرنے کی دُھن میں وہ کتنا آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ملنے والوں کی ناک بھوں چڑھانا۔ یہ سب دیکھ کر ملنے والوں نے تیوری چڑھاکے کہا کوئی بہلانے، منانے پر بھی روٹھتا ہی رہے تو پھر اُسے یونہی چھوڑ دینا چاہیئے۔ بھاری پتھر جب لاکھ لاکھ اُٹھانے کے جتن کرتے پر بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکتا تو اُسے چوم کے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ ہندو اپنے بڑے بوڑھوں کی بنائی ہوئی بولی کا ستیاناس کر دینا چاہتے ہیں تو کر لینے دیجئے۔ مسلمان اپنے بڑوں کا کیا کرایا اکارت نہیں کر سکتے۔ نئی ہندی کے ان گھڑ بول اُردو میں جیسے اُدھر ٹھونسے جا رہے ہیں۔ ادھر سے بھی عربی، فارسی کے نئے سئے بولوں کا گہنا پاتا اُردو کو پہنا کر اس کی سندر مورت میں اور چار چاند لگائے جاتے ہیں۔

جب سے آئے دن رکچھا، شکشا، آشا، دشا، سیتی، کلاہل، ادھک، تنھا، مہودا جیسے کڈھب اور بھد لیسلے بولوں کی بھرمار سے ہندو چاہتے ہیں اُردو کے سیتلا نکل آئے۔ تو سیتلا نکلنے سے پہلے ہی اُردو کو سیتلا کا ٹیکا کیوں نہ دیدیا جائے۔ جہاں سے جہاں تک ہوسکے عربی، فارسی کے نئے نئے بولوں کی بدھیاں اور گجرے گوندھ گوندھ کے جتنے پہنائیں جاسکیں اسے پہنائیں جائیں۔ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بولیاں الگ الگ ہو جائیں گی اور پھر یہ گڈمڈ ہونا جاتا رہیگا۔

میں نے اچنبھے سے اُنہیں دیکھا اور مسکرا کے کہا۔ بھئی ایسا تہا؟ ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ کیوں گھبراتے ہو۔ دیکھ لینا ان ہی تلوں سے تیل نکلے گا۔ ہندو نہیں مانتے نہ مانیں۔ کب تک نہ مانیں گے۔ آج نہیں مانتے تو کل مانیں گے۔ پھر ہندوؤں ہی میں سے ان سوجھ بوجھ والوں کو بھی تو دیکھئے جو اس ہٹ میں نہیں اور اُردو کو ویسے ہی مان رہے ہیں جیسے اُن کے بڑے بوڑھے مانتے تھے۔ ایسی باتوں میں جھپا کا بنا بنایا کھیل بگاڑتا اور دھیما پن سدھارتا ہے اور جو اس کا دھیان نہ رکھا جائے تو شیخ سعدی کی یہ ڈانٹ سننا پڑیگی۔

"وگر در ہر دو جانب جاہلانند		اگر زنجیر باشد بگسلانند"

اور ادھر اُدھر دونوں کے دونوں اُجڈ ہی اُجڈ اور اکھڑ ہی اکھڑ ہوں تو لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کو بھی توڑ تاڑ کے رکھدینگے۔

کوئی نئی بولی دو ڈھائی دن میں نہیں بنا کرتی۔ اس کے لئے برسوں دن رات کا اندھیرا اُجالا دیکھنا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے راج کی چھاؤں ہزار بارہ سو برس کے لگ بھگ رہی۔ اتنے برسوں کی لگاتار باتیں گھڑی بھر میں ایسی تو نہیں بن سکتیں جیسے کپڑوں پہ پڑی ہوئی دھول جھٹ سے لیکر جھٹک دی۔ نئی ہندی کا جو گھروندا بنایا جا رہا ہے جی بہلانے کے لئے گھڑی بھر کا کھیل ہے تو یہ اور بات ہے اور جو یہ نہیں تو ایسی باتوں کے لئے برسوں کی جوڑ ان، چکلان بھی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔ اُردو ہی کو دیکھئے اس ندی کا موتی سا چمکتا ہوا پانی جو لہریں مارتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کی سوت کب پھوٹی اور کب پہلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری یونہی سوتیں پھوٹتی اور بڑھتی ہوئی اتنی آگے بڑھیں جنہوں نے مل ملا کے اسے ایسی اُبلتی اور اُمنڈتی ہوئی ندی بنا دیا جس کا چوڑا چکلا پاٹ آج آنکھوں کے سامنے ہے اور جو آپ ہی کی بات ٹھیک نکلی اور ہندو ایسی ہی بے سُری سرگم بھرتے رہے تو پھر اُردو راگنی کا ستیاناس کس سے دیکھا جائیگا۔ اس کے بچاؤ، دیکھ بھال اور روک تھام کے جتنے جتن ہو سکتے ہیں ایک ایک کرکے وہ سب کے سب کئے جائیں گے۔ پر۔ جب بھی آپ عربی، فارسی بوجھل بولوں کی جو بھرمار اُردو میں چاہتے ہیں یہ بات کبھی نہ ہو سکے گی۔ کیا آپ نہیں جانتے؟ بھونڈے بسرے اور کڈھب بولوں کی ٹھونس ٹھانس بولی کو نڈھال کر کے اَدھ موا بنا دیتی ہے۔ ٹکسالی بولی کی یہی پہچان ہے جس میں الگ الگ بولیوں کے جتنے بھی بول ملے ہوئے ہوں وہ سب کے سب گھلے ملے آئے دن کی بات چیت میں بے جھجک منہ سے نکلیں اور انکے بولنے میں کہیں رکنا، ٹھیرنا اور سوچنا نہ پڑے۔

بڑے سے بڑے دیس کو دیکھئے تو اُسے تین ٹکڑوں میں بٹا ہوا پایئے گا۔ سب سے اُونچا جتھا، سب سے نیچا جتھا اور ایک وہ جو اِن دونوں کے بیچوں بیچ ہے۔ سب سے بڑا اور اُونچا جتھا جس میں بڑے چوٹی کے پڑھے لکھے، دھرم کی سیوا کے رنگ میں ڈوبے ہوئے رات دن بات بات میں موٹے موٹے اور بھاری بھاری بول ٹھونستے رہتے ہیں اور رہے اس کے بکھڑا نہیں توڑتے، ان لوگوں کی بولی کو لٹریچر کی سبھا والے آنکھ اُٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔ سب سے نیچا جتھا جو اُوٹ پٹانگ، اناپ شناپ بکتا رہتا ہے، اس کی بکواس بھی لٹریچر کے گون کی نہیں۔ اب ایک پہلے اور تیسرے ان دونوں جتھوں کے بیچ کا جتھا ہی رہ گیا۔ یہی بولی کی اُونچ نیچ دیکھنے، اس کا کھرا کھوٹا پرکھنے، جانچ پرتال کرنے اور لٹریچر کو آگے بڑھانے والا

ہوا کرتا ہے۔ اسی میں سے کوی، کبیشر اور لٹریچر کے پریمی نکلتے ہیں۔ اسی حصے کی دیکھ بھال سے بول سدھرتی اور سنورتی ہے۔ یہی بیج والا حصہ اس پھلواری کو سینچتا اور اسی کی لگاتار دوڑ دھوپ سے لٹریچر پھلتا پھولتا ہے۔ مالی اپنے لگائے ہوئے پودوں اور پیڑوں کی جیسی کاٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے۔ ٹھیک ایسی ہی یہ اپنی بھاشا کی اکھیڑ پچھاڑ کیا کرتا ہے۔ چلن کی کسوٹی پر کس کس کے ایک ایک بول کو دیکھا جاتا ہے۔ جو پرکھنے اور برتالنے میں ٹھیک نکلتے ہیں وہ رکھ لئے جاتے ہیں اور جن میں کھوٹ ہوتی ہے انہیں نکال ڈالا جاتا ہے۔

بڑھنے والی بولی میں نئے نئے بولوں کی بھی مانگ رہتی ہے۔ یہ مانگ اور بولوں کی بڑھوتری آئے دن کی بول چال اور بات چیت کیلئے نہیں۔ پھر کس لئے؟ اور دوسری الگ الگ بولیوں کی کٹھن لکھتیں اپنی بھاشا کے سانچے میں ڈھالنے کی گھڑی آنے پر بہت سی ایسی بیڈھب جگہیں آجاتی ہیں جن کے گہراؤ اور پھیلاؤ کو آئے دن کے بولے جانے والے گنے چنے بول نہیں سمیٹ سکتے تو جب پورے سوچ بچار سے نئے نئے ایسے بول چننا، بنانا اور گھڑنا پڑتے ہیں جو ان جگھوں کو گھیر کر جوں کا توں دکھا سکیں۔ یہی نئے، چنے، بنے اور گھڑے ہوئے بول "اصطلاح" کہلاتے ہیں۔ ان نئے بولوں کی بڑھوتری سے بولی کا پھیلاؤ اور گہراؤ دن دونا رات چوگنا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس میں کٹھن سے کٹھن گیانوں کی لکھتوں کے سمیٹ لینے کی پوری پوری سکت آجاتی ہے۔ اس سائنڈ کو چھوڑ کر کسی بولی میں نئے نئے بولوں کی ٹھونس ٹھانس کے لئے یوں ہی سی بھی اور کوئی جگہ نہیں نکل سکتی۔ بولی کا اتار چڑھاؤ، تاؤ بھاؤ، لوچ اور لچک کا پورا دھیان رکھنا اسی سے ہوسکتا ہے جو اس کے تیور پہچانتا اور اس کے ہتھکنڈے جانتا ہو۔

سید ابو القاسم سرور

آخری منزل

دیرِ حیراں میں پھر رقصاں ہے عزمِ جستجو
دشت گردی کے لئے بیتاب ہے میرا جنوں
آرزو مندی کے شعلوں سے طپاں ہے میرا خوں
پھر تجلی ہے کسی زہرہ جبیں کی کو بہ کو
ان دھندلکوں میں بلاتا ہے مجھے اک خوبرو

اب رہوں اس کے تصور میں کہاں تک سرنگوں
اب تو وہ وحشت ہے سینے میں کہ ہمدم کیا کہوں
اب بہت بے کیف ہے یہ عالمِ بے رنگ و بو
جستجو کی آخری منزل ہے میرے سامنے

اب لپک کر پھاند جاؤں گا بساطِ دو جہاں
ایک پل میں قطع کرلوں گا زمین و آسماں
کون کیا روکے کہ اب محمل ہے میرے سامنے
نزع کی ان آخری سانسوں سے عقدے کھل گئے
روح کی آنکھوں کے گرد آلود پردے دھل گئے

جذبی

تربتِ پیرِ ہندی اقبالؒ

(۱)

جبیں مست نگاہیں ہو رہی ہیں
دعائیں سرد آہیں ہو رہی ہیں
عقیدت کا چڑھاوا چڑھ رہا ہے
غلافِ قبر بانہیں ہو رہی ہیں

(۲)

لحد میں مردِ مومن سو رہا ہے
نزولِ رحمتِ حق ہو رہا ہے
عقیدت پیرِ ہندی سے ہے کس کی!
کہ جو آتا ہے دل سے رو رہا ہے

(۳)

پہنچ کر دردآشنا کی قبر پہ ہوں!
کرم و لذتِ دردِ جگر سے ہوں!
نئے عالم کے نظاروں میں ہوں گم!
الٰہی میں بھی کیا اہلِ نظر ہوں؟

(۴)

کھنچا ہے گردِ تربت حلقۂ نور
یہی موسیٰ منش مردوں کا ہے طور
بزرگوں کی زیارت ہو رہی ہے
وہ رومیؒ[۱] ہیں وہ افغانیؒ[۲] و منصورؒ

امینِ حزیں سیالکوٹی

۱؎ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ، ۲؎ مولانا جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ۔

کتابۂ ضمیر پسند

(۱)

یوں کِھلے گلشنِ ملّت میں خوشامد کے پُھول — "خندہ آمادہ" ہو جیسے کوئی دلگیر و ملول

دیکھکر ان کو بہارِ گزُراں روتی ہے — "زہرخند" آہ خوشامد کی ہنسی ہوتی ہے

فصلِ گل سے نہیں اِن پُھولوں کو بالکل سروکار — یہ تو ہیں گلشنِ ملّت کی خزاں کے آثار

قوم افسُردہ دلئ ایسے ہی کِھلاتی ہے پُھول — مرثیے دورِ خزاں میں ہیں بہاراں کے اُصول

جب تصنّع کی ندامت کا ہٹایا پردہ — دل گرفتہ نظر آئے یہ خزاں پروردہ

کاش یہ پُھول نہ کِھلتے چمنِ ملّت میں — یہ چمن کاش نہ آتا نظر اس صورت میں

(۲)

آہ کس کس پہ خوشامد کے ہیں کیا کیا اثرات — فاش کرنا ہی پڑی مجھکو یہاں راز کی بات

ہو اگر "مُردہ ضمیروں" پہ خوشامد کی زد — شرفِ حج و زیارت کی بھی ہو داد و ستد

زائر اس کو یہ کہے وہ کہے "الحاج" اِسے — پاس ہے فرطِ خوشامد میں حقیقت کا کِسے

کہیں چُھپ سکو وہ انساں جو خوشامد زدہ ہے — خودنُما اُس کے تفاخر کا ہر اک شُعبدہ ہے

حاکموں کا بھی یہ دستورِ خوشامد طلبی، — ن بہانہ ہے خجل جس سے ہی خود "بے سببی"

یاد مجھکو نہیں اے دوست خوشامد کرنا — ایسے موقع پہ میں چاہونگا خوشی سے مرنا

(۳)

مَیں جو لیتا نہیں اَوروں کی خوشامد کا اثر — علم کا ہے یہ طفیل اور اب وجد کا اثر

نہیں آئینِ خوشامد سے مرا دل آگاہ — ہیں تصنّع سے بری میرے اصولِ دلخواہ

دُور مجھ سے درِ اعیانِ خوشامد زدہ ہے — میرے رہنے کیلئے خاص وہ عرفانکدہ ہے

جس میں انسان خوشامد طلب آتا ہی نہیں — میں خوشامد کی ضرورت کبھی پاتا ہی نہیں

مُلک میں لائق تبلیغ عمل میرا ہے — درِ عرفاں کدہ پر میں نے یہ لکھوایا ہے

کوئی انساں کسی انساں کی خوشامد نہ کرے
جَورِ ذلّت نہ سہے خواہ جئے خواہ مرے

علی منظور

حکمِ شعر سازی

(۱)

بجا ہے ناظمِ بزمِ سخن کا حکم بھی لیکن — جو رغبت ہی نہ ہو دل کو تو پھر تعمیل کیوں کر ہو
طبیعت اس قدر ٹھس ہو کہ موزوں ہی نہیں ہوتی — بجا فرمائشِ پیہم مگر تکمیل کیوں کر ہو

(۲)

سخن سنجی بہ فرمائش مرا مسلک نہیں فرحت — دلِ نازک یہ بارِ نامبارک سہ نہیں سکتا
چہکتا ہوں بہ اذنِ طبع، مثلِ بلبلِ بے خود — میں پیشہ ور نہیں شاعر میں حکماً کہہ نہیں سکتا

(۳)

طبیعت میں بغاوت جوش کھاتی ہے تو خودداری — سراسر مانعِ اظہارِ محسوسات ہوتی ہے
تخیّل کی غلامی مجھ سے دیکھی ہی نہیں جاتی — سخن فہمی مری، سر پیٹتی ہے اور روتی ہے

(۴)

کسی کے جبر سے مجبور ہو کر بھی کہوں کیوں کر — مَیں خود مجبور ہو سکتا ہوں، دل آزاد رہتا ہے
میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتا بلا ہیجانِ روحانی — مرا فرمائشی گو مائلِ فریاد رہتا ہے

(۵)

یہ سچ ہے شرکتِ "بزمِ سخن" سے عار ہے مجھکو — کہ یہ ناقابلِ برداشت سا اک بار ہے مجھکو
نہ جانے کیوں طبیعت میں تلوّن ہو ہی جاتا ہے — کہ "حکمِ شعر سازی" دعوتِ پیکار ہے مجھکو

(۶)

مری یہ آن ہے وہ آن جس سے لوگ ناخوش ہیں — مگر میں کیا کروں فطرت پہ قابو پا نہیں سکتا
کسی کے نغمۂ شادی سے مجھکو واسطہ فرحت — مرا دل جبکہ روتا ہو تو حکماً گا نہیں سکتا

فرحت کانپوری

آؤ چوری کریں

کشور:۔ (بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں اپنی بیوی سے) آؤ چوری کریں۔
لاجونتی:۔ (چونک کر) کیا کہا؟۔
کشور:۔ یہ کہا، آؤ چوری کریں۔
لاجونتی:۔ میں سمجھی — اب آپ چوری اور سینہ زوری پر اتر آئے ہیں، یعنی مجھے بتا کر میری کوئی چیز چرانا چاہتے ہیں۔ کیوں ہے نا یہی بات؟۔
کشور:۔ بھئی کیا سمجھی ہو۔ داد دیتا ہوں تمہاری عقل کی۔ میں چوری کرنے کو کہہ رہا تھا، سینہ زوری نہیں، یہ سینہ زوری کا اضافہ تم نے اپنی طرف سے کیا ہے۔
لاجونتی:۔ یہ اب آپ نے گفتگو کا نیا ڈھنگ سیکھا ہے۔ آؤ چوری کریں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ خود بھی چوری کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے بھی چوری کروانا چاہتے ہیں، تو آپ خود چوری کریں، مجھ سے چوری کرانے کی خواہش یہ ہوئی سینہ زوری، سمجھے؟
کشور:۔ آہستہ بولو، چوری چھپ چھپاتے کی جاتی ہے۔ یوں ڈھنڈورا پیٹا نہیں جاتا، ہولے ہولے بات کرو، دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کوئی سن لیگا تو بڑی بدنامی ہوگی۔
لاجونتی:۔ ہونہہ رہے، پہلے سے آپ کا کونسا نام ہے جو بدنامی کا ڈر ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ آپ چور ہیں۔ آپ کی اسکولوں کی چوریاں بھی مشہور ہیں۔ کسی کی کتاب، کسی کی پنسل، کسی کا قلم۔ یہ چیزیں آپ دن دہاڑے اڑا لیا کرتے تھے۔ کرپا رام کا فونٹین پن، ایسا ہضم کر گئے کہ ڈکار تک نہ لی۔
کشور:۔ یہ تم سے کس نے کہا؟
لاجونتی:۔ آپ نے اور کس نے، نرائن صاحب سے باتیں کرتے ہوئے اس روز کیا آپ نے قبول نہیں کیا تھا کہ دس کتابیں اڑا کر آپ نے بیچ ڈالی تھیں۔
کشور:۔ کتابوں وغیرہ کی چوری، چوری نہیں ہوتی اور یہ ہے بھی تو اس زمانے کی بات جب ہم بچے تھے۔
لاجونتی:۔ اور اس عمر میں جبکہ آپ ایک بچے کے باپ ہیں، کیا آپ نے چوریاں نہیں کیں؟
کشور:۔ مثلاً۔
لاجونتی:۔ ابھی کل کی بات ہے کہ بنارسی ساڑھی کی زری نوچ کر جو میں نے الماری میں رکھی تھی وہ آپ بیچ کر کھا گئے، میرے لئے دوا کے طور پر ڈاکٹر نے جو برانڈی دی تھی آپ چپکے چپکے پی گئے اور بوتل میں پانی بھر دیا۔ دس روپے کا نوٹ جو میں اپنے ٹرنک میں رکھ کر بھول گئی تھی آپ نے اڑا لیا اور اس پر ستم یہ کہ ایک روپے کے رس گلے لا کر میرے سر کے اوپر الٹا احسان کیا۔ بجلی کے بل کے روپے آپ ہزاروں مرتبہ کھا گئے اور مجھے دو دو مہینے کا بل اکٹھا دینا پڑا۔ ایک روز آپ نے پانچ روپے کسی اندھ ودیالہ میں دینے کے لئے مجھ سے لئے اور اس کی ایک ایک پائی خود ہضم کر گئے۔ پرسوں نعمت خانے سے گاجر کا حلوہ آپ نے نوش جان کر لیا اور چمچے سے ذرا پھیلا دیا، بھئی چور ہو پر کچے چور۔
کشور:۔ بالکل جھوٹ — میں نے گاجر کے حلوے کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تمہارے گھر میں مودی خانے کے اندر یہ بڑے بڑے موٹے موٹے سنڈے چوہے جو چھلانگیں مارتے پھرتے ہیں وہی تمہارا حلوہ کھا گئے ہونگے۔ اور میں حلوہ کھا بھی کیسے سکتا ہوں جبکہ میرا شکر سے پرہیز ہے۔
لاجونتی:۔ میں ثبوت کے بغیر کوئی بات نہیں کہا کرتی۔ آپ کا وہ رومال ابھی تک میلے کپڑوں میں ثبوت کے طور پر موجود ہے جس سے آپ نے حلوا کھا کر اپنے ہاتھ پونچھے تھے۔
کشور:۔ (تھوڑا وقفہ) خیر.... لیکن تم یہ بتاؤ کہ اب چاہتی کیا ہو۔
لاجونتی:۔ اور کچھ نہیں، فقط یہ کہ آدمی چوری کرے تو پکی چوری اور یہ کہ حلوہ خوردن روئے باید۔
کشور:۔ تو خاموش رہو۔
لاجونتی:۔ بہت اچھا۔

(چند ساعات کے لئے خاموشی طاری رہتی ہے۔)

کشور:۔ ("کیا سنائیں ماجرائے دردِ دل" گنگناتا ہے — پھر دفعتاً جیسے اسے کچھ یاد آیا ہے کہتا ہے۔) لاجونتی!
لاجونتی:۔ کہو کیا کہتے ہو؟۔
کشور:۔ کہتا ہوں کہ آؤ ایک بڑی مزیدار چوری کریں۔
لاجونتی:۔ ارے کچھ کہو گے یا آؤ چوری کریں کی رٹ لگاتے جاؤ گے۔

کشور۔ سنو، ایک پارسل نرائن کا میرے پتے سے آیا ہے، اُسے کھولیں اور صاف ہڑپ کرجائیں۔ کوئی خاص چیز ہوگی جو اُس نے اپنے پتے کے بجائے میرے پتے سے منگائی ہے۔

لاجونتی۔ بھئی ڈر لگتا ہے۔ نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ بعد میں بیکار کا فضیحتہ ہو۔ میں درگذری ایسی چوری کی شرکت سے۔

کشور۔ تم بھی عجب بیوقوف ہو۔ فضیحتہ کیا ہوگا، آخر میں نرائن کو اُلو بنائیں گے اور بات کو ہنسی ہنسی میں اُڑا دینگے۔ وہ اپنا بے تکلف دوست ہے اور یہ کوئی ایسی چوری تھوڑی ہے کہ تھانہ تھنول ہو۔ لاجونتی تم بڑی ڈرپوک ہو۔ میری بیوی اور ایسے کچے دل کی۔

لاجونتی۔ بھئی جو کچھ ہو، ایک تو یوں چوری چکاری سے میرا دل ہلتا ہے اور وہ بھی اپنے ہم چشموں کی۔ آخر میں نظر ملانا مشکل ہوتی ہے۔ تم تو ہوئے دیدہ دلیر۔ تمہاری تو آنکھوں کا پانی مرلیا۔ نہ بابا مجھ سے یہ کام نہ ہوگا۔

کشور۔ ارے، ایک ننھا منا پارسل ہی تو ہے، کوئی سیر دو سیر سونے چاندی کا پارسل تھوڑا ہی ہے۔

لاجونتی۔ اچھا سنو، اگر کوئی پارسل میں زیادہ قیمت کی چیز ہوتی تو بھی میں ہاتھ تک نہ لگاؤں گی۔

کشور۔ لو لئے کھولو۔

لاجونتی۔ پارسل سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی قیمتی چیز ہو۔ پر انہوں نے ہمارے پتہ سے کیوں منگایا؟

کشور۔ تم اسے کھولو تو، ابھی سب کچھ معلوم ہو جائیگا — لو یہ اُسترے کا بلیڈ — بس ادھر سے چیرا جھر کاٹ ڈالو۔

لاجونتی۔ بھئی میرے ہاتھ کانپتے ہیں، ابھی وہ آ گئے تو ہنسی کی کھلپی ہو جائے گی۔

کشور۔ چلو اب کھول بھی دو، بیکار باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔

لاجونتی۔ یہ لو (کپڑا پھٹنے کی آواز) ..... کاغذ ہی کاغذ ہیں ... ...اور یہ ایک بوتل بھی ہے۔

کشور۔

> بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
> جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

یہ تو فقط ایک لفافہ ہے۔

لاجونتی۔ سچ، یہ تو لفافہ ہی نکلا .... پر اب بھی میرے دل میں ہول ہوتا ہے، نہ معلوم اس میں کیا ہو .... سیندور سے اٹا ہوا ہے۔

کشور۔ ذرا ادھر دو نا، دیکھوں اس میں کیا ہے۔ (لفافہ کھولنے کی آواز، کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ) ایک صفحہ کا خط ہے، سوامی ... ہاں، سوامی رام پرکاش جی ہردوار والے نے بھیجا ہے۔

لاجونتی۔ سوامی رام پرکاش ہردوار والے؟ (اشتیاق سے) اور اس پر کیا لکھا ہے؟

کشور۔ پڑھ کے سناتا ہوں.....

لاجونتی۔ تو پڑھو، پڑھتے کیوں نہیں۔

کشور۔ کوئی خاص بات نہیں۔ اُس کے کسی دوست کا خط ہے اور اس بوتل میں سر کے گنج کیلئے تیل ہے۔

لاجونتی۔ میں تمہاری سب چالاکیاں سمجھتی ہوں (خط پر جھپٹنے کی آواز) — اڑا لیا نا — خبردار جو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ اب میں آپ کو پڑھ کے سناتی ہوں۔ (پڑھتی ہے) "ڈیر مسٹر نرائن — آپ کا خط مجھے مل گیا تھا اور روپے بھی، مجھے افسوس ہے کہ آپ کی مطلوبہ شے میں فوراً نہ بھیج سکا۔ اس لئے کہ نوچندی کے اتوار میں کچھ دن باقی تھے، اب میں آپ کو ایک موہنی منتر بھیج رہا ہوں"..... ہوں ..... موہنی منتر..... اچھا......

کشور۔ لاجونتی، تمہیں کسی کا پرائیویٹ خط پڑھنے کا کیا حق حاصل ہے؟

لاجونتی۔ چپ رہو جی..... مجھے پڑھنے دو..... لکھا ہے ..... یہ منتر اماوس کی رات کو ایک سو آٹھ مرتبہ پڑھکر جس کو اپنا گرویدہ اور تابعدار بنانا ہو پھونکا جائے۔ یا داجی کا چمتکار آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ اس کو سنبھالکر اپنے پاس رکھئے، بڑی نایاب چیز ہے اور بوتل میں جو تیل ہے یہ بالوں میں ہر روز لگانے کے لئے ہے، اس سے تمام مرادیں پوری ہو جائینگی ..... منتر یہ ہے.....

کشور۔ لو اب خط دیدو، سب کچھ تو پڑھ لیا۔

لاجونتی۔ ابھی چار سطریں باقی ہیں ..... منتر یہ ہے ..... اونگ نما کا مشیری مدہ مدنش اوتمادے بھرینگ پراسواہا ..... اور آپنے جو کسی کشور صاحب کیلئے منتر مانگا ہے وہ دس پندرہ روز تک آپ کو مل جائیگا۔

کشور۔ لاجونتی، اب مذاق حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے، لاؤ خط میرے حوالے کرو۔ یہ منتر ونتر سب بکواس ہے۔ پارسل میں نے خود تمہیں اور نرائن کو بنانے کیلئے پوسٹ کیا تھا۔

لاجونتی۔ کہاں سے؟ .... کپڑے پر مہر دلی کی لگی ہوئی ہے اور آپ پارسل پوسٹ کرنے دہلی شاید خواب میں گئے ہونگے، کیوں؟ — اجی میں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ اب تو آپ اور نرائن صاحب کی چوری پکڑی گئی .... بھئی کیا لطیفہ ہوا ہے، یعنی آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنا

بھانڈا پھوڑ دیا۔

کشور۔ دیکھو لاج، میں سچ کہتا ہوں، بھیجنے والے کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ نرائن کو بھلا ایسے منتروں کی کیا ضرورت، کچھ بھی ہو لیکن میرے متعلق...

لاجونتی۔ آپ کے متعلق کیا؟

کشور۔ یہ جو لکھا گیا ہے کہ میں نے منتر مانگا ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ اس کا اوّل جھوٹ، اس کا آخر جھوٹ، یعنی سر سے پیر تک جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

کشور۔ نرائن آیا ہے ... دیکھو لاج، پرماتما کے لئے یہ ساری باتیں اپنے دل تک ہی رکھنا... تم نہیں جانتی ہو کہ یہ معاملہ کتنا سنگین ہے..... لاؤ ادھر خط مجھے دیدو۔

لاجونتی۔ خط میں ابھی نہیں دوں گی پر اتنا وعدہ کرتی ہوں کہ نرائن صاحب سے اس کا ذکر تک نہ کرونگی۔

کشور۔ قسم کھاؤ۔

لاجونتی۔ لو اب اتنی سی بات پر مجھے قسمیں کھلوانے لگے۔ کہہ جو دیا کہ نہیں کہونگی۔ اگر نرائن صاحب سے میں نے اس خط کا ذکر کیا تو جو چور کی سزا وہ میری، لو بس اب تو اعتبار آگیا۔

کشور۔ پر تم خط واپس کیوں نہیں دے دیتیں... میں ... میں ... آئیے مسز نرائن ... نمسکار، نمسکار ... تشریف رکھیے ... میں، میں ... میں کیا کہہ رہا تھا لاجونتی؟

لاجونتی۔ (مسز نرائن بڑی روشن خیال خاتون ہیں جو جادو ٹونے، منتر جنتر کو بالکل فضول سمجھتی ہیں۔

مسز نرائن۔ کشور صاحب یہ آپ سے کس نے کہا، میرا تو ان چیزوں پر بڑا اعتقاد ہے، کیوں بہن لاجونتی؟

کشور۔ میں نے کس سے سنا ہے؟ ہاں ... میں ... نرائن ... نہیں..... لاجونتی کس نے کہا تھا کہ انہیں ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

مسز نرائن۔ (کشور سے) آپ کی طبیعت آج خراب معلوم ہوتی ہے؟

کشور۔ میری؟ .... نہیں تو .... مگر .... مگر .... شاید آپنے لاجونتی سے پوچھا ہے، اسکی طبیعت واقعی کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں۔

لاجونتی۔ میری؟ ... کیوں میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے آپکو کیسے معلوم ہوا کہ میری طبیعت خراب ہے۔

کشور۔ (چونک کر) کیا کہا؟ ... جی ہاں میری طبیعت اسوقت کچھ خراب ہے۔

لاجونتی۔ تو آپ......

کشور۔ (جلدی سے) لیکن اتنی خراب نہیں کہ میں آپکے پاس بیٹھ نہ سکوں بلکہ یہاں آپس میں باتیں کرنے سے طبیعت فوراً ٹھیک ہوجائیگی۔

لاجونتی۔ بڑے شوق سے بیٹھیے، پر آپ کو ٹونے ٹوٹکوں اور منتر جنتروں کی باتوں میں حصہ لینا پڑیگا۔

کشور۔ ٹونے منتر......

(نرائن کھانستا ہوا آتا ہے)

نرائن۔ بھئی ہماری بھابی نے کیا دماغ پایا ہے۔ میں جب بھی آیا انہیں کسی نہ کسی دلچسپ موضوع پر بات کرتے پایا ہے.... آج ٹونے منتروں کی بحث شروع ہے..... اوہو.... ہماری "یہ" بھی تشریف رکھتی ہیں؟ ... کہیئے بھابی جان، آپ کے بلانے پر یہ آئیں کہ خود بخود تکلیف گوارا کی.... ارے .... تم کیوں گم سم بنے بیٹھے ہو کشور؟ ..... طبیعت خراب ہے کیا؟

لاجونتی۔ جی ہاں، اور میں نے ان سے ابھی ابھی کہا تھا کہ جائیے دوسرے کمرے میں آرام سے سو جائیے۔

نرائن۔ تو یہ جاتا کیوں نہیں؟

کشور۔ ارے بھئی معمولی سا سر میں درد ہے، ابھی باتوں باتوں میں چلا جائے گا۔

لاجونتی۔ درد سر کے لئے بھی تو کوئی منتر یا ٹونہ وغیرہ ہوتا ہوگا، کیوں بہن ساوتری؟

مسز نرائن۔ لاکھوں... ایک سے ایک اچھے۔

نرائن۔ (کشور سے) تو یہ سناؤ تمہارے سر میں درد کیسے شروع ہوگیا۔ قبض کی شکایت تو نہیں ہے؟

کشور۔ اور تو کچھ نہیں پر ابھی ابھی تمہارے آنے سے چند منٹ پیشتر میرے دماغ کو قبض ہو گیا ہے.... بیٹھے بیٹھے ہی کچھ ہو گیا ہے۔ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔

نرائن۔ کبھی کبھی ایسا ہوجایا کرتا ہے.... تو ہاں بھئی، مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا تھی (ہولے ہولے) میرا ایک پارسل تمہارے....

لاجونتی۔ ساڑھی کا پلہ بہت ہی نفیس ہے۔ تلے کا کام بہت اچھا کیا ہے.... (ذرا اونچی آواز میں) سوامی رام پرکاش ہردوار والے کافی مشہور آدمی ہیں۔

کشور۔ (ایکاایکی) لاجونتی!

نرائن۔ رام پرکاش جی؟؟

لاجونتی۔ جی، کچھ آپنے مجھ سے کہا!

کشور۔ نہیں، میں اس سے بات کر رہا ہوں۔

لاجونتی۔ (مسز نرائن سے) زری کا کام رام پرکاش ہردوار والے خوب کرتے ہیں۔ میں اُن سے دو ساڑھیوں پر کام کرا چکی ہوں۔

مسز نرائن۔ یہ تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتی ہو۔ کون ہیں یہ سوامی رام پرکاش جی ہردوار والے؟

نرائن۔ (چونک کر) کچھ مجھ سے پوچھا تم نے؟

مسز نرائن۔ نہیں تو..... پر میں پوچھتی ہوں آج بات کیا ہے..... یہاں سب بہکے بہکے کیوں نظر آتے ہیں؟ — لاجونتی بات مجھ سے کرتی ہے اور بیچ میں کشور صاحب ٹپک پڑتے ہیں، میں لاجونتی سے کچھ کہتی ہوں اور خواہ مخواہ آپ چونک اٹھتے ہیں — آخر بات کیا ہے؟

نرائن۔ (گھبرا کر) بات کیا ہوگی؟ — بات کیا ہو سکتی ہے؟

مسز نرائن۔ پر آپ پریشان کیوں ہوئے جاتے ہیں؟

نرائن۔ پریشان؟..... (کھسیانی ہنسی ہنستا ہے) یہ پریشانی کی بھی ایک ہی کہی..... یعنی زبردستی مجھے پریشان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے..... سنا کشور تم نے؟

کشور۔ بھئی مجھے کچھ معلوم نہیں..... تم جانو اور یہ جانیں..... مجھے ٹونے ٹوٹکوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

نرائن۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجھے ہے..... بھئی اپنے سر کی بلا ٹالنے کے لئے یہ اچھا گُر گڑھ لیا ہے تم نے؟

کشور۔ اپنے سر کی بلا؟..... گویا میرے سر پر کوئی بلا ہے'..... سو وہ تم ہی ایسی بلائیں پالتے ہو، لاجونتی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ..... (دبی آواز میں) ارے یہ دونوں آپس میں کیا کھُس پھُس کر رہی ہیں؟

لاجونتی۔ (مسز نرائن سے، ہولے ہولے) نا بہن مجھے کچھ معلوم نہیں.....

مسز نرائن۔ (دبی آواز میں) ایک پارسل آئے گا..... میں نے اس پتے سے منگایا ہے؟

لاجونتی۔ (اونچی آواز میں) پارسل؟

کشور۔ پارسل؟

نرائن۔ کونسا پارسل؟

مسز نرائن۔ پارسل؟..... یہی تو میں پوچھتی ہوں، کونسا پارسل؟..... کیا آپ کا پارسل آ رہا ہے کوئی؟

نرائن۔ نہیں تو..... میرا پارسل اس پتے سے کیوں آنے لگا؟..... کیوں بھابی جان، اس سے پہلے میرا کوئی پارسل اس پتے سے آیا ہے؟

لاجونتی۔ اس سے پہلے، کوئی نہیں آیا — اس کی گواہی میں دے سکتی ہوں —!

نرائن۔ لو اب تو آپ کو یقین آ گیا..... (ایکا ایکی چونک کر) اِس سے پہلے؟..... اس سے آپکا کیا مطلب؟..... یعنی میرا کوئی پارسل آجکل میں اس پتے سے آ چکا ہے؟

لاجونتی۔ آپ اپنے دوست سے پوچھ لیں، پارسل وغیرہ وہی وصول کیا کرتے ہیں!

مسز نرائن۔ (گھبرا کر) کیا کہا؟..... پارسل وغیرہ کیا یہی وصول کیا کرتے ہیں؟

لاجونتی۔ آج انہوں نے ہی وصول کیا تھا۔

نرائن۔ کس کے نام کا تھا۔

مسز نرائن۔ کس کا تھا؟..... میرا تو ہو نہیں سکتا۔

لاجونتی۔ اور کیا میرا ہو سکتا ہے؟

کشور۔ یہ تم سے کس نے کہا؟

لاجونتی۔ پھر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ پارسل کس کے نام کا تھا۔

کشور۔ کھولا تمہیں نے ہے، مجھے کیا معلوم؟

لاجونتی۔ کھولا میں نے ہی اور بوکھلائی بوکھلائی باتیں آپ کر رہے ہیں۔

نرائن۔ (گھبرا کر) ہا..... پارسل کھول بھی لیا..... یہ دیکھے..... یہ دیکھے بغیر کھول لیا کہ وہ کس کے نام کا تھا۔

مسز نرائن۔ حد ہو گئی ہے — ایک گھنٹہ ہونے کو آیا ہے، سب پارسل پارسل پکار رہے ہیں، پر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ پارسل کس کا تھا.....

لاجونتی۔ میں کچھ نہیں جانتی بابا — بس میری خطا صرف یہ ہے کہ میں نے اِنکے کہنے پر پارسل کو چاقو سے کھولا اور جو کچھ اُس میں سے نکلا انکے حوالے کر دیا..... اور میں نے اِن سے کہا تھا کہ بھئی ڈر لگتا ہے، نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو، بعد میں بیکار کا فضیحتہ ہو، پر ان پر تو چوری کرنے کا بھوت سوار تھا۔

نرائن۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) لو بھئی میں چلا..... مجھے ایک ضروری کام ہے۔ بیٹھے بیٹھے یہاں کتنی دیر ہو گئی۔

کشور۔ تم ہرگز نہیں جا سکتے..... یہاں بیٹھکر تمہیں میری پوزیشن صاف کرنا ہوگی۔ بھئی واہ، یہ بھی خوب طریقہ ہے کہ یوں چپکے سے کھسک گئے اور دوسروں کو آگ میں جھونک دیا — بھُس میں چنگی ڈال بی جمالو دُور کھڑی ہوئیں۔

مسز نرائن۔ میرے سر میں تو درد شروع ہو گیا ہے..... میں جاتی ہوں لاجونتی بہن، پھر شام کو آؤنگی۔

لاجونتی۔ ذرا تھوڑی دیر تو بیٹھو، اپنے پتی کی پوری کارستانی تو معلوم

کرتی جاؤ۔۔۔ لو یہ خط پڑھو۔ (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)۔۔۔ تمہارے سوامی نے تمہیں مطیع کرنے کے لئے ایک منتر منگایا ہے اور جادو کے تیل کی بوتل ــــ اب تم دن رات اِن پر لٹو رہو گی۔ اِن کے اشارے پر ناچا کرو گی۔

نرائن:۔ یہ ۔۔۔ یہ بالکل جھوٹ ہے، لینی، لینی ۔۔۔ بالکل جھوٹ۔۔۔ بھلا میں کیوں ایسے منتر اور تیل منگانے لگا۔۔ میری اور اِس کی آپس میں کیا بنتی نہیں جو میں ٹونے ٹوٹکے استعمال کروں۔۔۔ اِنکی ضرورت ہوگی کشور کو جس کی آئے دن آپ سے چخ رہتی ہے۔۔ کیوں ساوتری؟۔۔۔ لینی لینی،۔۔ ہم تو آپس میں شیر و شکر ہو کے رہتے ہیں۔۔۔ ہماری زندگی تو دوسروں کیلئے ایک نمونہ ہے۔

کشور:۔ تم خود ایک نمونہ ہو۔۔۔ ابھی ساری حقیقت کھل جاتی ہے۔۔۔ لاجونتی ذرا دینا اِن کے ہاتھ میں وہ خط۔۔۔ پڑھکر ساوتری کو سنائیں جن کے ساتھ یہ شیر و شکر ہو کے رہتے ہیں اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے نمونہ بناتے ہیں اور وہ یوں کہ اپنے ایک دوست کو پھنسانے کے لئے اُس کے پتے سے ٹونے منتر منگاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ کیا کرتے ہیں کہ اُس کے لئے بھی ایک دو منتروں کا آرڈر دے دیتے ہیں ــــ بھئی واقعی بڑا اچھا نمونہ پیش کیا ہے دوستی کا؟۔۔۔ وہ تو لاجونتی عقلمند ہے ورنہ آج تو وہ چچ چلتی کہ توبہ توبہ۔۔۔ میاں کو پیچھا لیدر کر دیتی۔

لاجونتی:۔ یہ لیجئے خط۔۔ (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)۔۔ لو اب سنو ساوتری!

مسز نرائن:۔ سن کے کیا کروں گی؟ ــــ اِکی ساری قلعی تو کھل گئی۔

نرائن:۔ (ایکا ایکی بلند آواز میں) کون کہتا ہے یہ خط میرے نام ہے۔۔۔

مسز نرائن:۔ پھر کس کے نام ہے؟

نرائن:۔ تمہارے۔۔۔ لو دیکھو (کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)۔۔۔ میری قلعی کھلتے کھلتے تمہاری قلعی کھل گئی۔ رنگ ہلدی ایسا زرد پڑ گیا۔ یہ منتر اور تیل تمہیں نے تو منگایا ہے۔۔۔ پر اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ میں تو پہلے ہی سے تمہارا محکوم ہوں پر معلوم ہوتا ہے کہ جتنا تابعدار اور تمہارا مرید میں اس وقت ہوں اُس سے بھی زیادہ تم مجھے اپنا تابعدار اور مرید بنانا چاہتی ہو ــــ پرماتما تم جیسی عورتوں سے بچے۔ ۔۔۔ لو پڑھو۔۔۔ دیکھو۔۔۔ ڈیر مسز نرائن۔۔۔ اور یہ منتر۔۔۔ میری رہی سہی مردانگی کو ختم کرنے کا منتر۔۔۔ اور یہ تیل جس کو بالوں میں لگانے سے تمہاری سب مرادیں پوری ہو جائیں گی۔۔۔ اب آپ نے کیوں منہ میں گھنگنیاں بھر لیں، بھابی جان اب آپ کیوں چپ ہو گئیں۔۔۔

اس میں آپ کا بھی تو ذکر ہے۔۔۔ آپ نے بھی تو اپنے پتی کو اپنے مرید بنانے کے لئے منتر منگوایا ہے اور شاید جادو کا کوئی چورن بھی جس کو کھاتے ہی یہ ہمیشہ کے لئے الّو بن جاتے۔۔۔ کشور دیکھا، یہ ہماری چوری پکڑی نہیں اور اُلٹی اِن کی پوری پکڑی گئی، اسے کہتے ہیں پتال کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا۔ ــ تم یقین مانو، اِن دونوں نے مل کر یہ سازش کی تھی، اور تم بھی کتنے بیوقوف ہو کہ گھبراہٹ میں منہ کو مٹ پڑھ گئے۔۔۔ تم سے یہ بھی نہ کہا گیا کہ مرد ٹونے ٹوٹکوں اور منتر جنتر کو بالکل بیکار سمجھتے ہیں، یہ عورتیں ہی ہیں جو ایسی فضول چیزوں پر اعتقاد رکھتی ہیں۔۔۔ منتر۔۔۔ ہوں ۔۔۔ اور سوامی رام پرکاش۔۔۔ اُس کی ایسی کی تیسی۔

(نوکر کھانستا ہوا آتا ہے۔)

نوکر:۔ نرائن صاحب آپ کے نام ایک پارسل آیا ہے باہر ڈاکیہ لئے کھڑا ہے وصول کر لیجئے۔

نرائن:۔ (بوکھلا کر) پارسل۔۔ پارسل۔۔ کیسا پارسل؟

نوکر:۔ کوئی سوامی رام پرکاش امبرودار والے ہیں جنہوں نے دہلی پر بھیجا ہے۔

نرائن:۔ ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ کوئی غلطی ہوئی ہے۔۔۔ میں ابھی آتا ہوں۔۔۔ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے (کرسی سے ٹکرا کر گرنے کی آواز)۔۔۔

سعادت حسن منٹو

ترلوکی پنڈت

ترلوکی پنڈت انقلابات کا مجسم نمونہ تھے۔ بچپن میں راجہ بخشتاور والی حویلی میں رہے۔ جوانی عیش میں گذری۔ شیش محل کی پریوں کے ساتھ اُڑ دولت لٹائی۔ نشہ اترا تو کانگریس کے کارکن قوم کے لیڈر بنے جیل کی ہوا کھائی۔ پھر جو رنگ بدلا تو گاندھی جی کی جیب سے نکل کر مہاسبھائی ہو گئے اور وہاں سے جو اچھلے تو حکومت کے قدموں میں آ پڑے۔ آخر سرکار نے بھی میں نام لکھوا لیا۔ پڑھے لکھے تو کچھ یونہی سے تھے، مگر زبان خوب چلتی تھی۔ کانگریس میں رہ کر اور بھی ذہن برّاق ہو گیا۔ کچھ دن رنگ اچھا جما تھا، تھوڑے بہت پیسے بھی کما لئے۔ پھر خود بخود اس زندگی سے نفرت سی ہو گئی اور خانہ نشین ہو گئے۔ خانہ نشین ہونے سے میرا یہ مطلب ہے کہ دنیا سے بے تعلق ہو کر بیٹھ رہے ورنہ غریب کا کوئی گھر رہا تھا نہ گھر والے۔ کبڑو پیپل کے سامنے جھوت والی گلی میں ایک زمین دوز دکان کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اسی میں رات دن پڑے رہتے تھے۔

بارہ برس کی عمر سے شراب کا چسکا تھا۔ مدتوں اکٹھا پی۔ سودیشی کا چرچا ہوا تو ٹھرے پر اتر آئے۔ پھر جب ذرا ہاتھ تنگ ہوا تو افیون کھانے لگے۔ ہم نے جب دیکھا افیم گھولتے اور حقہ کا دھواں اڑاتے دیکھا۔ کبھی کبھی کوئی جوگی فقیر آ جاتا تو چرس کی چلم بھی چلنے لگتی تھی۔ ورنہ عموماً اکیلے ہی بیٹھے پلنگ میں جھونٹے کھایا کرتے تھے۔ قریب ہی دو تین منہیاروں کے گھر تھے۔ ان کی بلیاں آ کر اکثر ستایا کرتی تھیں۔ کبھی روٹی نکال لے جاتیں۔ کبھی دودھ پی جاتیں۔ ترلوکی پنڈت بہتیری دوت دُبک کرتے مگر وہ کب مانتی تھیں۔ بیچارے کا روز دو چار پیسے کا نقصان کر جاتیں۔ اول تو افیمی کا غصہ ہی کیا۔ اِدھر مزاج میں تیزی ہوتی اُدھر سر جھکنا اور آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔ دوسرے گوشت کے چھچھڑے کھانے والے بلاؤ، انتہا درجے کے خرانٹ، ذرا چھیڑا اور ٹینٹوے پر آئے۔ پھر پڑوسیوں سے لڑائی کون مول لے۔ کیسا ہی نقصان ہوتا، دو چار کوسنے دس پانچ گالیاں دے کر بیٹھ رہتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ پنڈت جی صبح سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ شاید شاہ برسے کی طرف نکل گئے ہونگے یا کہیں اور نشہ پانی کی دعوت ہوگی۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے واپس آئے۔ رہو کا ایک پٹھا رومال میں لپٹا ہوا تھا۔ اُسے کھولا، بنایا، آگ سلگائی، ہنڈیا چڑھا کر آٹا گوندھا۔ مچھلی تیار ہو گئی تو توا چڑھا کر روٹیاں پکائیں اور ایک کنستر میں رکھ کر پاس کنوئیں پر نہائے۔ افیون گھولی، چسکی لگائی۔ حقہ بھرا اور آسن لگا گدی پر بیٹھ گئے۔ اب پنڈت جی راجہ تھے، دنیا اُن کے سامنے بھان متی کا تماشہ تھی۔ آنکھیں کبھی بند ہو جاتی تھیں کبھی اونگھ کا جھٹکا کھا کر کھل جاتی تھیں۔ دماغ میں عرش معلیٰ سے بھی اُدھر کی خبریں آ رہی تھیں۔ پہلو کے طاق پر مٹی کا ایک چھوٹا سا چراغ ٹمٹما کر بیسیوں قسم کی پرچھائیاں دکھا رہا تھا۔ کہیں مشین گن لگی ہوئی تھی۔ کسی طرف لاٹھی چارج ہو رہا تھا اور کسی جگہ مادر وطن پر خون کی بھینٹ چڑھانے والوں کی جوتیوں کے ڈھیر تھے کہ کوٹھڑی میں کوئی چیز دھڑ سے گری۔ پنڈت جی چونک پڑے کہ توپ کا گولا پڑا۔ پھر آواز آئی "میاؤں!"

آنکھیں جو کھولتے ہیں تو ان کا پرانا دشمن کالا بلا دودھ پر پلا ہوا ہے۔ دُھن جو بندھی تو سمجھے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی گاندھی جی کا مسلمان چیلا ہے۔ میری افیون کی تھیلی چھیننے آیا ہے۔ سنبھل کر ذرا کراہے پن سے بولے کہ "جناب مولانا! اس روپ میں آنے سے کیا فائدہ؟ وقت پر آدمی بن کے آؤ گے تو ایک پیالی تمہارے حقہ کی بھی پیش کر دوں گا۔" جواب میں پھر "میاؤں!" سنا۔ گردن اُٹھائی، دیکھا تو واقعی پڑوس کا بلا تھا۔ خیال آیا کہ میں تو چاندنی چوک میں ایک دکان کے تخت کے نیچے پڑا ہوا نہتوں کا ہتھیاروں سے مقابلہ دیکھتا رہا اور یہ غنڈا میرا دودھ پی گیا۔ بے شرط کہ میں بھی اس کا خون پیوں۔ اتنے میں اندر سے غر غش کی آہستہ آہستہ مختلف آوازیں آنے لگیں۔ پنڈت جی اپنی پینک میں سمجھے کہ بلا کہہ رہا ہے کہ "ہاں! تمہارا دودھ تو میں سب پی گیا اب کہو کیا کہتے ہو۔ ذرا بولے اور میں نے گلا دبایا۔ میرے کئی حمایتی بھی میرے ساتھ ہیں۔"

ترلوکی پنڈت نازک مزاج، نشے باز اور دھرم کے پکے ضرور تھے مگر تھے سمجھدار۔ طبیعت انصاف پسند تھی اس لئے نہ کانگریس والوں سے بنی نہ گورنمنٹ کے طفیلیوں میں رہ سکے۔ دیر تک سوچتے رہے کہ کیا جواب دیں۔ دودھ نہ اُن کا تھا نہ ان کے باپ کا۔ دودھ تھا خدا کی پیدا کی ہوئی اور ہندوستان کے چارے سے پلی ہوئی گائے کا۔ اس پر جس قدر حق پنڈت جی کا تھا اسی قدر اس بلّے کا بھی۔ دل میں قائل تھے، مگر انسان ہمیشہ سے اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔ دوسری

مخلوق کے مقابلے میں تو خیر، اپنے ہمجنسوں سے بھی رات دن اس کے یہی فساد رہتے ہیں۔ پھر قدیم سے یہ بھی رسم چلی آتی ہے کہ کتا روٹی لے جائے۔ گائے منہ ڈال دے۔ بندر برابری کا دعویٰ کرے۔ بلی دودھ پی لے تو گالیاں ڈنڈا۔ بلکہ کسی نہ کسی چیز سے ضرور مقابلہ کرنا چاہیے۔ حقوق کا سوال۔ خاموش رہیں تو اشرف المخلوقات کون کہے۔ انسانی برادری میں نکو بن جائیں۔ اور سب سے بڑھکر یہ خوف تھا کہ کہیں یہ ارذل ترین مخلوق اپنی قوم میں ایک آریاورتی سُورما کی بزدلی کا چرچا نہ کر دے۔ اس لئے تاؤ آ ہی گیا۔ اور ہاتھ سے ناریل رکھکر دست پناہ اُٹھا بلی کی طرف لپکے۔

بلی کی ذات اس میں بھی بِلّا۔ ایک کاشو پنڈت چنیا بیگم کے مُرشد کی اینٹھ اکڑ خوب جانتا تھا وہ ایسی گیدڑ بھبکیوں میں کیا آتا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ انگڑائی لی اور "میاؤں" کہتا ہوا ایک کونے سے ہٹ کر دوسرے کونے میں جا بیٹھا۔ تر لوکی پنڈت کا نشہ جما ہوا تھا۔ مکتی ہتی نظر آ رہا تھا اور ربلے کی آواز میں سوراج زندہ باد کا نعرہ سُن رہے تھے۔ غصہ کو تھوک دیا۔ دستپناہ پھینک ناریل اُٹھا اپنے آسن پر آ بیٹھے۔ اب انہیں بلے کی خُرخُر میں مہاتما بُدھ کے لیکچروں کا مزہ آنے لگا۔ گویا بِلّا کہہ رہا تھا کہ "پنڈت جی مہاراج! ملک کے سیوک بننے کا دعویٰ اور ایسا غصہ۔ اپنے مزے میں ذرا سی کھنڈت برداشت نہ ہوئی۔ آپے سے باہر ہو کر مار پیٹ پر آمادہ ہو گئے۔ آج دستپناہ اُٹھایا ہے کل چھرا نکال لو گے۔ حقہ پیو، تمباکو جل گیا ہے تو اور بھر لو، اور ذرا شانتی سے بیٹھ کر غور کرو کہ کیا پرماتما کا پیار صرف تمہارے ہی ساتھ ہے۔ اس کے ناٹک میں اکیلے تم ہی ایکٹر ہو۔ دنیا کی ساری نعمتیں تمہارے لئے ہیں۔ ہمارا ان پر کوئی حق نہیں۔ اس لئے کہ تم انسان ہو۔ صورت و شکل، عادات و خصائل میں ضرور فرق ہے لیکن خدا کے کارخانہ میں ہمارا تمہارا ایک درجہ ہے۔ ایک مسالہ۔ ایک کاریگر۔ اب یہ ہماری مسکینی اور تمہاری سرشوری تھی کہ تم اپنی زبان زوری سے آقا بن گئے اور ہم میاؤں میاؤں کرتے رہے۔ پھر بھی ایسی بے انصافی کو تو روا نہ رکھو کہ آپ کھاؤ اور ہمیں نہ دو۔ مانگیں تو سونٹا لیکر دوڑو۔ جان تمہاری بھی ہماری بھی۔ بھوک پیاس تمہیں ہی لگتی ہے ہمیں نہیں لگتی۔ ہزاروں چیزیں تم ایسی کھاتے پیتے ہو جن کی طرف ہم آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ دودھ، دہی، مکھن، ملائی، گوشت وغیرہ تھوڑی سی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کے کھانے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے۔ تو آپ ہمارے کھانے پینے سے کیوں جلتے ہیں اور کس قانون سے ہم پر یہ تشدد روا رکھتے ہیں۔

یہ انسان کی پیدائشی ہٹ دھرمی ہے کہ وہ اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتا۔ اپنی برتری کے افسانے گھڑ لئے ہیں۔ اپنے من مانا قانون بنا لیا ہے۔ سچ کہنا اگر یہی دودھ کوئی تلک دھاری پنڈت، کوئی انگریزی مولنا یا کوئی سماجی لیڈر پی جاتا تو کیا اس پر بھی یونہی دستپناہ لیکر دوڑتے؟ ان کی اس بے تکلفی کا تم اُلٹا احسان مانتے۔ وہ تمہارے نزدیک معزز ہیں۔ لیکن اُن کو کیا ہم سے زیادہ بھوک لگتی ہے؟ مہاراج تم کیا کرو تمہاری سوسائٹی کا دستور ہی یہ ہو گیا ہے کہ پیٹ بھروں کو کھلاتے ہو۔ اپنے سے زیادہ طاقت کو ڈنڈوت کرتے ہو۔ اور جو بھوک سے پریشان ہو کر بے بلائے آ جاتے ہیں اُنہیں چور کہتے ہو اور بس چلتا ہے تو لاٹھی پونگے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

یہ سچ ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے۔ چور کی عزت نہیں۔ مگر اول تو دودھ پی جانا چوری نہیں۔ قدرتی پیداوار میں ہم تم سب برابر کے حصہ دار ہیں۔ دوسرے ہم بلے اگر تمہارے چور ہیں تو تم ہماری بہن گائے کے چور ہو۔ پھر چوری کون کرتا ہے۔ وہی جس کو کھانے کو نہیں ملتا۔ جو اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے سے روکا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے بڑے پیٹ والے انسانیت کے ٹھیکیدار سمجھے جاتے ہیں یہ مایا کا جال انہی کا بچھایا ہوا ہے۔ یہی دراصل چور گھر ہیں۔ یہ اگر اپنا رویہ بدل ڈالیں اور غریبوں کیساتھ سلوک کرنے لگیں تو کوئی چور رہے نہ ڈاکو۔

ہمیں دیکھو اِس گھر سے اُس گھر اندھیرے اُجالے میاؤں میاؤں کرتے پھرتے ہیں۔ کسی کی پتیلی میں منہ ڈال دینا یا کسی کے کبوتر کو لے بھاگنا یا جیسے تمہارا دودھ چٹ کر لیا۔ اس طرح کسی کی کھیر کسی کے لڈو کھا جانا تو اور بات ہے ورنہ آپ ہی بتائیے کہ کوئی خدا کا بندہ اپنی خوشی سے روٹی کا ٹکڑا بھی ہمارے آگے ڈالتا ہے۔ کتوں کو گھی چپڑ کر روٹیاں دیتے ہیں سانپوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ چوہوں کو کھیلیں کھلاتے ہیں۔ چیونٹیوں کے بلوں کو میدے اور شکر سے بھرتے ہیں مگر نہیں دیتے تو ہماری قوم کو اس لئے کہ ہم بے ضرر رہیں اور ہمیشہ میاؤں میاؤں کر کے منہ تکا کرتے ہیں۔ آواگون کے چکر میں بھی شاید ہمارا شمار نہیں ہے۔ کیا تمہارا کوئی مرا جیتا بھی بلی کی جون نہیں لیتا۔ جو ہم سے اتنے بیزار ہو۔ اپنے آگے کی جھوٹن نالیوں میں پھینک دیتے ہو اور ہم کو بلا کر نہیں دیتے۔

ہاں اگر اپنی ڈھٹائی سے کوئی بلا تمہارے ہاں پل جاتا ہے تو اس کے مزے ہی مزے ہیں، ایسا موٹا تازہ چکنا چپڑا ہو جاتا ہے جیسے کسی قومی اکھاڑے کا پہلوان یا کسی بوڑھے سرمایہ دار کی جوان بیوی کا بھائی۔ یا کسی یتیم خانہ کا منیجر یا کوئی بہروپیا مولوی۔ مسلمانوں کے بچوں کو

البتہ ہمارے بچوں کا شوق ہوتا ہے۔ مگر ناعاقبت اندیش قوم کا شوق بھی مُصیبت ہوتا ہے۔ شوق کا کوئی معیار نہیں۔ گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت پیار کرتے کرتے، گودیوں میں بٹھاتے بٹھاتے ذرا مزاج بگڑا اور بوری میں بند کر جنگل میں چھوڑ آئے۔"

پنڈت جی ذرا کھسائے اور نشے میں گھٹی ہوئی آنکھیں ٹمٹما کر بڑی متانت سے بولے "مگر چوری تو بہت بڑا اخلاقی جُرم ہے۔ قانون سومرجلنا اچھا اور چوری کرنا بُرا!"

اتنا کہنے پائے تھے کہ بِلاّ ایک چوہے پر جھپٹا۔ کھڑبڑ جو ہوئی تو آپ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پھر وہی سماں سامنے تھا۔ بِلاّ کسی قدر ترشرو ہوکر بولا "چوری کو اچھا کون کہتا ہے۔ لیکن ہماری چوری کا گُناہ تمہاری گردن پر ہے۔ جب کوئی کھانے بیٹھتا ہے یا اس کے ہاں کوئی فالتو کھانے کی چیز ہوتی ہے تو پہلے ہم صورت سوال بن جاتے ہیں "میاؤں میاؤں" یعنی میں آؤں کہہ کر اس سے اپنی بھوک کا اظہار کرتے ہیں اور طرح طرح کی حرکتیں کرکے کھانے کو مانگتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ اگر تم نے بخل کیا یا ہمارا حق ہم کو نہیں دیا تو ہم چوری کریں گے۔ پھر جب تمہاری بیدرد جنس ہماری حالت پر رحم نہیں کرتی بلکہ دھتکار دیتی ہے تو ہم مجبور ہوتے ہیں کہ چوری کریں۔ عجیب منطق ہے کہ ایک بھوکا اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کا سامان کرے تو مُجرم کہلائے اُس کو سزا دی جائے اور جو باوجود استطاعت محتاجوں کی خبر نہ لے بلکہ ان کو اپنے جبر وتشدد کا شکار بنائے اُس سے کوئی بازپرس نہ ہو"

ترلوکی پنڈت کو پھر ذرا قومی جوش سا آیا۔ تیوری پر بل ڈالکر ارادہ کیا کہ اس زبان دراز ہیکڑی بازبلّے کو سزا دینی چاہیئے۔ جھلّا کر کہنے لگے "بس۔ زیادہ شُہد پن پر نہ اترو۔ مغل کبوتر باز نہ شد کہ مادر خواہی کرکے چپ ہورہے۔ کسی ایسی بھائی سے واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ یہاں ہاتھا پائی کا تو دم ہے نہیں اور نہ یہ بھلے آدمیوں کا کام ہے۔ کھانڈ لپٹی ہوئی زہر کی گولیاں بھی دیکھی ہیں، اگر مجھ سے زیادہ اَڑے تو ایک رات میں تم سب کے سب سوتے کے سوتے رہ جاؤ گے۔ اگر زندگی پیاری ہے تو ترلوکی سے ہاتھ نہ ملاؤ۔ تمہاری یہ باتیں بالشویکوں کی سی ہیں۔ سرمایہ داری کے خلاف تمہارا جہاد سوسائٹی کے لئے سخت مُضر ہے"

بِلاّ چوہوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ طاق اور مچان پر سے کبھی کوئی ہنڈیا گرتی تھی کبھی کوئی ڈبّا۔ اب جو کوئلوں کا کنستر رُلا کا تو پنڈت جی کو بِلّے کے قہقہے کا گمان ہوا اور معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہا ہے :-

"آپ کی سوسائٹی سے ہمیں غرض؟ دولتمند سُود خوار دُنیا کو کیا فائدہ پہونچا رہے ہیں؟ سرمایہ دار اگر مٹ جائیں گے تو مفلسوں اور محتاجوں کا کیا نقصان ہوگا؟ مجھے کھانے کو نہ ملے تو میں تمہاری سوسائٹی کو لیکر کیا چولھے میں ڈالوں۔ سماج غریبوں کیلئے کب ہے؟ امیروں کی نمائش گاہ اور تہذیب کا قمار خانہ ہے! مفلسوں کمزوروں اور مزدوروں کا تو وہاں کوئی درجہ ہی نہیں۔ سوسائٹی کے قانون میں افلاس، بھوک، شرم، دیانتداری اور رحم کوئی ناقابل معافی جرم ہیں۔ چور کو سزا دینا اس کا فرض ہے لیکن چوری کے اسباب پر غور کرنا اس کا کام نہیں۔ چور کو سزا دینے کے مسئلہ پر مجھ کو بھی اتفاق ہے آپ چور کو مہینے دو مہینے، سال دو سال کی نہیں، عمر قید کر دیجئے بلکہ پھانسی پر لٹکا دیجئے۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ لیکن تعزیرات ہند میں یہ قاعدہ بھی داخلِ قانون ہو جائے کہ جو حاکم چور کو سزا دے وہ پہلے تین دن تک فاقہ کرے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اُس کی آنکھوں کے سامنے بھوک سے بلکتے رہیں۔ اس پر اگر مجسٹریٹ یا جج صاحب اپنی خودداری کو قائم رکھیں اور اُن کے دل میں چُرا کر کھانے کا جذبہ نہ پیدا ہو تو ایک چور کو کیا بلکہ اُس کے سارے کُنبے کو سولی چڑھا دیں۔۔۔ پنڈت جی مہاراج تم تو سب کھیل کھیل چکے ہو۔ عیش بھی کیا جیل بھی بھگتا۔ اپنے گھر کی ہولی دیکھی۔ غیروں کے دئے جلا کر دیوالی منائی۔ کوئی رنگ چھوٹا نہیں۔ پھر تم نے کیا سمجھ کر دستینا اُٹھایا تھا۔ میرے کہنے کا یقین نہ آئے تو تجربہ کے طور پر سہی آج سے تین روز تک فاقہ کرو۔ نہ افیون کھاؤ نہ سلفہ اڑاؤ۔ نہ دودھ پیو۔ غالباً تم نے ابھی کچھ کھایا بھی نہیں ہے۔ اپنی پچھلی روٹی میرے حوالے کر دو اور ذرا فاقوں کا تماشہ دیکھ لو۔ تین دن کے اندر اندر کیا تم تو فعلی بھائی ہو، کل شام تک ہی جرائم کا کتنا لمبا چوڑا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اگر نتھوا مہتر کی ہنڈیا آنکھ بچا کر نہ لے بھاگو یا کم از کم گھاسی رام کی دکان کا تالا توڑ کر افیون نہ چُرا لاؤ تو جتنا چاہے مار لینا!"

اشرف صبُوحی!

خریدارانِ ساقی سے التماس ہے کہ خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمایا کریں تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ "منیجر"

ادب جدید کا ایک صاحب طرز انشا پرداز

عصر جدید کے ادبا جو صحیح معنوں میں ہماری داد کے مستحق ہیں اور جنھوں نے واقعی ہمارے ادب میں اضافہ کیا ہے بہت زیادہ نہیں ہیں۔ نوجوانوں میں ان کی تعداد اور بھی کم ہے۔ یہ اس لئے کہ بہت سے نوجوان ادیب نئے ادب کا غلط مفہوم سمجھ کر غلط راستے پر پڑ گئے ہیں میرے خیال میں جدید ادب کو اپنی سوسائٹی کے نظام کو برباد نہیں کرنا بلکہ اسے کسی صحیح طریقے سے بہتر بنانا ہے۔ کوئی اہل قلم ہمارے جذبات احساسات اور فطرت کے دیگر عناصر کی صحیح عکاسی کرتا ہے تو وہ یقیناً ایسا ادیب ہے جس کی اس زمانہ میں ضرورت ہے۔ اس کا امتحان یہی ہے کہ اس کی تحریریں دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیں۔ طبیعت کو غور و فکر پر آمادہ کریں۔ نظر کو وسعت دیں اور خیالات کو بلند کریں۔ اس نظریہ کو سامنے رکھ کر جب ہم اپنے نوجوان ادیبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری نظریں ایک ایسے ادیب پر ٹھیرتی ہیں جس کے ادبی کارناموں نے ہر اہل ذوق کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہے۔

اس کا نام صادق الخیری ہے۔ علم و ادب کا ذوق اسے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے، کالج اور یونیورسٹی کا تربیت یافتہ ہے وہ اس خاندان کا چشم و چراغ ہے جس کے بزرگ اردو ادب کے محسنین اور مربی تھے۔ یعنی ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری مرحوم۔

اس کا باپ وہ ہے جس نے اردو میں افسانہ نگاری کو جنم دیا جس نے ناول نویسی کو عروج پر پہونچایا۔ جس نے ہماری سماج کے ایک مظلوم طبقے کو حیات تازہ بخشی۔

صادق الخیری دورِ حاضر کے جواں سال مگر ممتاز ادیب ہیں انھوں نے اردو ادب میں اپنا راستہ آہستہ آہستہ بنایا ہے۔ کون جانتا تھا کہ جیل کی آری (مطبوعہ نیرنگ خیال ۱۹۳۳ء) کا مصنف، یا انتقام کی رات (مطبوعہ ادبی دنیا ۱۹۳۸ء) کا مترجم کہ میں ان دونوں کو ان کے بہت معمولی افسانوں اور ترجموں میں گنتا ہوں اردو کا ایک زبردست فسانہ نگار ایک عمدہ مترجم اور محقق نقاد بننے والا ہے۔ اس مضمون میں میں زیادہ تر ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کروں گا۔ اور وہ بھی صرف افسانوں کے متعلق جو ۱۹۳۴ء یا اس کے بعد لکھے گئے۔

یہاں افسانہ نگاری کی تاریخ طوالت کا باعث ہوگی۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ شروع میں ہمارے ہاں داستانیں اور قصے وغیرہ تھے۔ جن میں خلاف عقل واقعات کی بھرمار ہوتی تھی۔ بیسویں صدی میں علامہ راشد الخیری اور منشی پریم چند نے افسانہ نگاری کو رواج دیا ان کے علاوہ نیاز فتحپوری اور سلطان حیدر جوش نے اپنے طبعزاد افسانوں سے اُردو کے خزانہ میں بیحد اضافہ کیا اور سجاد حیدر یلدرم اور دیگر حضرات نے غیر ملکی زبانوں کے افسانے اُردو میں منتقل کئے۔ بیسویں صدی کے تیس سال گذرنے کے بعد ہم ایک نیا دور شروع کرتے ہیں۔ اس میں وقت اور ضرورت کے لحاظ سے نئے نئے فسانہ نگار پیدا ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ فسانے کے نئے نئے موضوع سامنے آئے۔ اسی زمانہ کے افسانہ نگاروں میں ہمارے جوان العمر ادیب صادق الخیری ہیں۔

ان کی فطرت شاعرانہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں محض شاعری نہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوع زندگی کی تلخیاں اور اصلی واقعات ہیں۔ ان کے ہاں مثالیت (Idealism) بہت کم ہے ورنہ دراصل وہ حقیقت نگار (Realist) ہیں اور کہیں بھی اصلیت (Truth) سے الگ نہیں ہٹتے۔ وہ برابر اپنے گرد و پیش کا بنظر غائر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ مذہب۔ سماج۔ دولت غریبی۔ غم۔ غصہ۔ محبت۔ رقابت اور اس قسم کے دوسرے جذبات نیز خارجی عناصر انسان میں کیا کیا تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں آپ ان کے افسانوں میں پائیں گے۔ انھوں نے مسلمانوں کے امیر اور غریب گھرانوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انھیں سوسائٹی کے طرز عمل اور سماجی انقلاب کے مدارج کا اچھی طرح علم ہے۔ غیر قوموں اور دیگر مذاہب کے پیرووں سے بھی وہ ناواقف نہیں اور سب سے بڑھ کر وہ فطرت انسانی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی جیتی جاگتی تصویریں معلوم ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کے ہاں تصنع کو بہت کم دخل ہے اور وہ ایسے ہی جیسے گوشت پوست کے انسانوں کو اپنے افسانوں کے کردار بناتے ہیں اس لئے وہ افسانے ہم پر براہ راست اثر کرتے ہیں۔ اب ہم ان کے افسانوں کو فنی حیثیت

سے جانچیں گے۔

پلاٹ اور موضوع

صادق الخیری یاس پسند ہیں۔ اس لئے وہ اپنے افسانوں کے پلاٹ ایسے بناتے ہیں جو غم انجام ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی ٹریجڈی مصنوعی نہیں ہوتی۔ وہ اس میں زبردستی موتیں واقع نہیں کرتے۔ ان کے کئی افسانے ایسے بھی ہیں جن میں کوئی نہیں مرتا لیکن افراد قصہ کو حالات ایسے پیش آتے ہیں کہ ہماری آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ بالعموم وہ یہ قضا ناکامی، محرومی اور مایوسی سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کے پلاٹ کسی معاشرتی واقعہ یا سماجی مسئلہ کے مختصر سے مختصر حل پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان میں غیر ضروری پیچیدگیاں یا نامناسب طوالت نہیں ہوتی ان کے افسانوں میں جس طرح بھی ترقی (Development) ہوتی ہے وہ اتنی حقیقت سے قریب ہوتی ہے کہ ہم اسے بالکل سادہ سمجھتے ہیں۔ اس سادگی کے باوجود ان کے ہر افسانے میں کشمکش و پیچ (Suspense) ہوتا ہے۔ وہ سیدھے سادے افسانے بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان میں جگہ جگہ حیرت و استعجاب شاعرانہ رنگینیاں، نفسیاتی بلندیاں اور افسانوی دلکشیاں ہوتی ہیں۔ ان کے کسی افسانے کو شروع کر کے ہم یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آخر میں کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے افسانے کے خاتمہ پر ہمیشہ نقاب ڈالے رکھتے ہیں ان کے پلاٹوں میں تنوع ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے افسانوں کی تعداد بہت کافی ہے ہمیں ان میں یکسانیت (Monotony) محسوس نہیں ہوتی جو کثیر التصنیف فسانہ نگاروں کے ہاں اکثر ہوتی ہے۔ ان کے پلاٹوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر یا کسی خاص مسئلے (Problems) کو حل کرنے کی کوشش میں اسے افسانے کی شکل دیدیتے ہیں۔

اس طرح ان پلاٹوں میں ہمیں مختلف النوع موضوعات ملتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہر قسم کی محبّت، ہر حیثیت کی عورت، ہر درجے کی سماج، غریبی امیری، تقدیر تدبیر، زندگی، موت، شہر دیہات انسانی فطرت اور اس کی مجبوریوں کو جگہ ملی ہے۔ اور وہ ایک ماہر فن کی طرح ان کی نہایت دلفریب تصویریں کھینچتے ہیں۔ جوانی ان کا خاص موضوع معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس سلسلہ میں انھوں نے موپساں جیسے آزاد خیال افسانہ نگاروں کا اثر قبول کر لیا ہے۔ اسی لئے وہ نازک سے نازک موقعوں کی تصویرکشی بغیر کسی جھجک کے کر دیتے ہیں۔ دیور پریم کا مندر۔ حسن و شباب۔ بے باپ کا بیٹا اور گلنار ان کی آزادی اور بے جھجک تحریر کے نمونے ہیں۔ حقیقتاً صادق ان افسانوں میں جوانی اور مستی کی تلخیاں دکھاتے ہیں۔ شاید بعض حضرات ان افسانوں پر عریاں نویسی کا الزام دیں مگر میری رائے میں صادق ان میں ادبیت اور شاعرانہ انشا کے ایسے نادر اور اعلیٰ نمونے سمو دیتے ہیں کہ ان افسانوں کی فنی اور ادبی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے۔ مثلاً انھوں نے حسن و شباب میں سالی بہنوئی کا نازک مسئلہ چھیڑا ہے۔ اس افسانہ میں یہ فلسفی ادیب محبّت و نفس کے مسئلے پر بڑی خوبی اور سچائی سے رائے زنی کرتا ہے۔ اور شاعروں کے جھوٹے دعووں کی تردید کرتا ہے یہ دکھا کر کہ محبّت نفس سے الگ نہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ ہے "دیور" (ساقی) اس کی اشاعت پر خاصا ہنگامہ ہوا۔ اکثر نے تعریف کی اور ایک دو نے مذمت۔ اپنی اپنی رائے ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس افسانہ سے صادق کے مطالعہ نفسیات اور حسیات و جذبات سے باخبری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کا پلاٹ شباب کی مستیوں اور جوانی کی لغزشوں کا مرقع ہے۔ جس میں بیحد دلکشی اور جدت اور Originality ہے۔ بیان اگرچہ عریاں ہے مگر بڑا پُرتاثیر ہے ابتدا میں جتنی شوخی ہے انجام اتنا ہی دردانگیز ہے۔ کوئی آخر تک نہیں کہہ سکتا کہ پلاٹ میں ایسی حیران کن تبدیلی ہونے والی ہے جسے پڑھ کر کلیجہ دھک سے رہ جائیگا۔ افسانہ میں جابجا ڈرامائیت ہے اور انھوں نے منتہا کے علاوہ ایک سے زیادہ جگہ Crisis پیدا کیا ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ مصنف کیسا عجیب و غریب اور خالص اپنا (یوروپ کا چرایا ہوا یا مغرب زدہ نہیں) پلاٹ لیکر آیا ہے اور اس کی تعمیر میں کیسی عمدہ کردار نگاری، منظر نگاری اور جابجا فلسفۂ نفس سے بحث کی ہے۔ محض عریانی کا اعتراض کر کے اسکی خوبیوں کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے۔

بے باپ کا بیٹا کی بنیاد ایک نفسیاتی واقعہ پر رکھی گئی ہے نفسی تحلیل (Psycho-Analysis) کے ایسے عمدہ افسانے اُردو میں کمیاب ہیں۔ ایک عورت آمامی کا ذہن اپنے مجرم کا نام بھول جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ شخص نفس تحت الشعور (Sub-Concious Mind) میں محفوظ ہو جاتا ہے اور آخر میں ایک زبردست سانحہ سے متاثر ہو کر وہ کردار بالائے شعور آجاتا ہے۔ یہ انقلاب اپنی جگہ پڑھنے کے لائق ہے۔ مصنف نے یہاں غیر معمولی طور پر جوانی کے ہنگاموں کا ایک اور رُخ دکھایا ہے اور بتایا ہے کہ حساس "حرامزادے" کی نفسیات و کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ یہاں میں

ایک بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے کسی انگریزی رسالہ میں ایک کہانی "My Mother's Past" پڑھی تھی میرے خیال میں "بے باپ کا بیٹا" کا پلاٹ اس سے ماخوذ ہے یا ممکن ہو اسے پڑھنے کے بعد موصوف کو اس کے لکھنے کا خیال آیا ہو۔ یہ اس لئے گمان ہوا کہ اس میں کئی مقامات ایسے ہیں جو اس انگریزی کہانی میں بیان کئے گئے تھے۔ البتہ میں اسے اپنانے کی بہت کامیاب مثال سمجھتا ہوں۔ اس کہانی کا انجام انگریزی کہانی کا انجام نہیں ہے بلکہ اسے آگے بڑھا کر صادق نے ایک عجیب وغریب چیز پیش کی ہے جو کلیتاً ان کے ذہن کی پیداوار ہے۔ ایک "حرامی" کے ذہنی انتشار کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ اس کا ہیرو جو حرامی ہے آخر میں بہت بڑا آدمی بنتا ہے اور بڑے بڑے لوگ اس کو اپنی بیٹی دینے کے خواہشمند ہیں اور وہ چاہے تو سماج اور مذہب سے انتقام لینے کے لئے شادی کرسکتا ہے مگر:۔

مگر نہیں اس کی روح افسردہ ہے۔ وہ شعلوں کی لپک میں بھی تاریکیاں منڈلاتی دیکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ناجائز اولاد کو کس قدر شرمندگی، کتنی کوفت اور کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بچے اس کے بعد آوارہ روحوں کی طرح ہر در سے دھتکارے جائیں اور لوگ انگلیاں اٹھا کر کہیں "ان کے خاندان میں نقص ہے۔ ان کا باپ حرامی تھا۔"

بیشک صادق الخیری جوانی کے گھناونے رُخ کو زیادہ عریاں کرکے دکھاتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ فلسفۂ زندگی پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ مثلاً جذبہ کور میں وہ ایک فلسفی کی طرح جوانی کے مفید پہلو پر نہایت اچھا درس دیتے ہیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یورپ کے عریاں نویسوں کے لٹریچر نے ان کے خیالات کو بالکل مغرب زدہ کردیا ہے۔ بیشک وہ "محبت اور جسمانی لذت" شباب وگناہ جوانی اور نفس وغیرہ پر صاف صاف لکھتے ہیں مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی تربیت اسلامی فضا میں ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے وہ افسانے جو انھوں نے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے لکھے ہیں ہرگز نظر انداز نہیں کئے جاسکتے "آرام حیات" (جس میں بیوہ کے نکاح ثانی کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے) "طلاقن" (ایک طلاقن کی افسوسناک زندگی) "نالۂ دل" (شفقت پدری سے محروم لڑکی کی دردناک داستان) "دیدۂ تر" (اولاد سے محروم بیوی پر شوہر کے مظالم) وغیرہ وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں موصوف نے خاص خاص مسائل کو چھیڑا ہے۔ ان المیوں (Tragedies) میں انھوں نے ہمارے رسم ورواج اور مردوں کی زیادتی پر دلکش انداز میں طنز کی ہے۔ اور یہاں وہ ہمیں ایک ادیب مصلح کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک اور موضوع ہے "خاندانی تعلقات" چنانچہ انھوں نے دیور بھاوج (دیور) جلیٹھ بھاوج (آخری رات) سالی بہنوئی (حسن وشباب) کے علاوہ سالے بہنوئی (دیدۂ تر) اولاد اور ماں باپ (مامتا افسردگی آرزو باپ کی قربانی) سوتیلی ماں (افسانہ زندگی) سوتیلی بیٹی۔ بہن بھائی۔ میاں بیوی کے متعلق بھی کئی افسانے لکھے ہیں۔ میاں بیوی کی پاک محبت اور ان کے تعلقات پر "ہمدم دیرینہ" (عصمت) میں انھوں نے خوب تبصرہ کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی بوڑھا واقف کار ہمیں اس پر فریب اور پرشباب دنیا سے نکال کر کسی دوسری معصوم دنیا میں لے گیا ہے۔ میاں کے طرز عمل اور بیوی کی خدمت ومحبت پڑھکر ازدواجی زندگی کا ایک اچھا سبق ملتا ہے۔

صادق الخیری شہر کے فسانہ نگار ہیں اور ان کی فسانہ نگاری کی اصلی جولانگاہ شہر کی وسعتیں ہی ہیں لیکن کبھی کبھی وہ دیہات کی بستی میں بھی چلے جاتے ہیں اور جب وہ یہاں کی غریب دنیا کی معصوم باتیں سُناتے ہیں تو جہاں جہاں انہیں موقع ملتا ہے وہ شہر والوں پر طنزیہ فقرے کسنے سے نہیں چوکتے۔ شہر والوں کی نیش زنی کو اکتا کر اور ذہنی خلفشار سے بچنے کیلئے وہ شہر سے دور (نالہ دل) کسی تنہا جگہ کو بسانا چاہتے ہیں۔ دیہات کے متعلق زیادہ تر پریم چند اور اعظم کریوی نے لکھا ہے۔ اور ان کے ہاں دیہات کے سب کردار ہندو ہیں۔ لیکن صادق الخیری کے دیہاتی افسانوں (تمید ہوس) میں ہمیں مسلمان نظر آتے ہیں۔ اور ہمیں مسلمان دیہاتیوں کی بیچارگی اور مفلسی سے واقفیت ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کے افسانے افراط وتفریط سے پاک ہیں۔ وہ ان لوگوں کے سکون واطمینان کا ذکر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کی تکالیف اور مصائب بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کہیں تعصب یا یکطرفہ مضامین نہیں ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں ایک کسان کی حالت اور کش مکش کی کتنی سچی اور دردناک تصویر دکھائی ہے:۔

"تھوڑی سی زمین۔ ایک ہل دو بیل، من دو من

اناج، بس یہی کُل اس کا سرمایہ ہے ......
فصلیں اچھی اتر آئیں تو بیشک پو بارہ ہے۔ مگر
ایسا ہوتا کب ہے؟ شاذ و نادر! ورنہ زیادہ تر
تو کسان بیچارہ بھوکا ہی مرتا ہے۔ دن رات
ایک کرکے، جوانی کا لہو پسینے کی طرح بہا کے،
دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیوں سے منہ موڑ کر وہ
صرف عمدہ فصلیں تیار کرنے کا متمنی اور ساعی
رہتا ہے۔ وہ فصلیں جو اس کی ہو کر بھی اسکی
نہیں ہوتیں۔ اس کو (گوری سرن کو) معلوم ہے
کہ قحط سالی میں بنی نوع انسان کے ان سب سے
بڑے خادموں پر کیا کیا بیتا پڑتی ہے۔ ان کی
آنکھیں آسمان والے سے رحم کی بھیک مانگ
رہی ہیں۔ ان کے دل کال کے اندیشے سے بیٹھے
جا رہے ہیں مگر بارش نہیں ہوتی، اور جب
پانی کا ایک چھینٹا بھی نقصان دہ ہوتا ہے تو
طوفان اور سیلاب اُمڈے چلے آتے ہیں۔

(پنچھی)

صادق الخیری کے پلاٹوں کے متعلق مجھے دو باتیں کہنی ہیں۔
ایک یہ کہ ان کے پلاٹوں میں اچھوتا پن اور تنوع ہے جو بہت کم
افسانہ نگاروں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ بہت سے
افسانہ نگاروں کی طرح وہ بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں کہ انگریزی
افسانوں کو اپناتے ہیں مگر حوالہ نہیں دیتے۔ مثلاً "آہ جوانی" یا
"تیر نیم کش"۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے ان میں بڑی زبردست
تبدیلیاں کی ہیں اور مختلف نئے واقعات پیدا کرکے نتیجے بھی مختلف
اور نئے نکالے ہیں۔ لیکن چونکہ پلاٹ کی داد اصلی مصنف کو ملنی چاہئے
اس لئے انھیں کسی قسم کا حوالہ دیدینا چاہئے تھا۔

کردار نگاری صادق صاحب کے اشخاص قصہ اس وقت سے لیکر جب وہ متعارف ہوتے ہیں اس وقت
تک جب ان کا کام ختم ہوتا ہے جو کچھ بھی کہتے ہیں یا کرتے ہیں اور
جو کچھ ان پر داخلی یا خارجی اثرات ہوتے ہیں سب کچھ عین فطرت ہوتا
ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو ایک دم کہیں سے کہیں نہیں لیجاتے
بلکہ ان میں بتدریج ارتقا ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ ان کو فنا نے
کی بلندی تک پہنچاتے ہیں۔ ان میں جو بھی نشو و نما ہوتی ہے وہ بالکل
ویسی ہوتی ہے جیسی کہ ہونی چاہئے۔ کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ
مصنف نے اپنی طرف سے ان کے عمل یا کردار میں کوئی اضافہ کیا
ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں میں ہمیں نہایت عمدہ کردار نظر
آتے ہیں۔ "دیور" میں سہیل کا کیریکٹر بلند اور فطری ہے۔ وہ
ایک انسان ہے۔ اس سے جوانی میں لغزش ہوتی ہے۔ اس کے
جذبات کی تربیت کبھی نہیں ہوئی اس لئے وہ نہیں جانتا کہ بھاوج
سے ربط ضبط بڑھانا خطرناک ہے۔ لیکن جب موقع آتا ہے تو باوجود
اپنی اس کمزوری کے وہ انسانیت کا ثبوت دیتا ہے۔ "بے زبان"
میں انھوں نے گدھے اور کتے کی کردار نگاری خوب کی ہے۔ اس
سے معلوم ہوا کہ ان کے قلم سے جس پر بھی تبصرہ ہوگا اور وہ جس
کردار کو بھی اپنے قارئین سے روشناس کرائیں گے اس کو ہمارے
سامنے اس کے اصلی رنگوں میں پیش کریں گے۔ "گلنار" میں انھوں
نے اس کی ہیروئن کا کردار شاعرانہ رنگ میں دکھایا ہے۔ "صید ہوس"
میں کلثوم کا کیریکٹر پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے علاوہ کردار نگاری
کی اچھی مثالیں "جیون ایک پہیلی" میں ملتی ہیں۔ جیسے کردار ہیں ویسے
ہی ان کے مکالمے اور افعال ہیں۔ "شعلہ سوزاں" میں ہیروئن کا
کردار بہت اہم ہے جو محبت اور فرض کی کش مکش میں مبتلا ہے لیکن
فرض کی پکار سن کر محبت کو خیرباد کہتی ہے۔ "تیر نیم کش" میں صادق نے
مراد کا کردار بہت بلند کر دیا ہے۔ اور "ماتا" کی ہیروئن تو اس زمانہ
کی مناسبت سے آجکل کی عورتوں کیلئے آئیڈیل ہے۔ اس میں فضا
اور Situations کس طرح تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں
اور وہ خارجی اثرات سے کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں
مصنف کے کمال کردار نگاری پر دال ہیں۔

منظر نگاری صادق الخیری اپنے افسانوں کی ترتیب میں مناظر کو Back Ground یا Fore-Ground جہاں بھی پیش کرتے ہیں وہ اس خوبصورتی سے کہ سارا
سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے کیونکہ ان کے الفاظ نہایت
تصور زا (Suggestive) ہوتے ہیں۔ نیز وہ اپنے کرداروں
کے لطیف احساسات اور جذبات کا اظہار اور فطرت انسانی کی
تشریح ایسی عمدگی اور صفائی سے کرتے ہیں کہ ہم انھیں بجا طور پر
فطرت نگار کہہ سکتے ہیں۔ کہیں کہیں سے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں

ایک دفعہ شب ماہ میں وہ مجھے سیب کا ایک
کھلا ہوا درخت دکھانے لے گیا جو علف زار

میں سپید پھولوں کا ایک ہولے ہولے گرنے والا آبشار معلوم ہو رہا تھا بلکہ دور سے تو ایسا نظر آرہا تھا کہ برف سے ڈھکی ہوئی شمعی انگلیاں معبود تیز کی پرستش کر رہی ہیں۔ (میرا ایشیائی محبوب)

"کھوہ میں گھسا ہوا الو یکبارگی سیٹی بجاتا ہوا اڑا اور فرشتہ اجل کے پروں کی ہیبت ناک پھڑپھڑاہٹ سن کر مریض نے دنیا سے منہ موڑلیا۔ اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں اور جسم محسوسات سے ہمیشہ کیلئے محروم ہوگیا . . . صبیحہ ڈر گئی اور اس نے گھبرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مردہ دانت نکوسے اس کو گھور رہا تھا گویا حیات مستعار کا مذاق اڑا رہا ہے۔ (آلام حیات)

وہ یکسر بدل چکا تھا۔ اس کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک زندہ لاش اپنی روح کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ سامنے پہاڑیوں کی بلند چوٹیاں دونوں وقت ملتے افق کی جھلملیوں میں خواب کی موجیں معلوم ہوتی تھیں۔ اور دائیں بائیں بل کھانے والی بھیانک ادیان مشدر کی نامعلوم گہرائیاں۔ (نیرنگ عشق)

پرانی دلی کا ایک منظر:۔ بیبیوں نے جھولا سنبھالا اور سارا باغ ساون کے گیتوں سے گونج اٹھا۔ کچھ جھول رہی ہیں۔ کچھ جھلا رہی ہیں باقی ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی ہیں جیسے چمن میں تیتریاں ہوں یا جنگل میں ہرنیاں۔ بہو بیٹیوں کا لباس دیکھکر آنکھوں کو فردوس کا گمان ہوتا ہے۔ گلناری۔ ملاگیری۔ گل شفتالو۔ اودے اور گیندئی جوڑے۔ دھانی چوڑیاں۔ آنکھوں میں سرمہ۔ ہاتھوں میں پور پور مہندی رچی ہوئی۔ انگلیوں میں چاندی کے چھلے۔ دانتوں پر مستی کی دھڑی اور لبوں پر لاکھا۔ گویا ایک رنگین خواب دیکھا جارہا ہے یا حوران فردوسی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ فرش زمردیں پر جلوہ گر ہیں۔

ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانوں میں صرف نفسیاتی بلندی اور افسانوی دلکشی ہے بلکہ فنی سحرکاری بھی ہے اور وہ اپنے قاری کو اس میں محو کر لیتے ہیں۔

مکالمہ صادق الخیری اپنے کرداروں کے احساسات کو بعض اوقات اپنے بیان سے زیادہ خود ان کی گفتگو اور مکالمہ کے ذریعہ ذہن نشین کراتے ہیں اور منظر کشی یا تفصیل نگاری میں بے ضرورت وقت نہیں ضائع کرتے۔ ان کے مکالموں سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ ان کے قلم میں طاقت ہے اور جوش خروش ہے اور جذبات کے اظہار پر قدرت ہے۔ ان کے کردار جو بھی باتیں کرتے ہیں وہ نیچرل ہوتی ہیں۔ ان میں بیساختہ پن اور آمد ہے۔ وہ کہیں بھی الجھا کر بات نہیں کہتے۔

چند اور فنی خصوصیات افسانے کے لوازمات خصوصی (پلاٹ۔ کردار۔ مکالمہ وغیرہ) کو جانچنے کے بعد جب ہم افسانہ کی فنی خصوصیات کو جزوی طور پر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کی بھی کمی نہیں۔ ان کے ہاں نہ صرف حقیقت پسندی ہے بلکہ فنی حقیقت (Artistic Truth) ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے افسانہ میں سادگی اور اختصار کے علاوہ زمان و مکان اور عمل اور اثر کا اتحاد (Unity) برقرار رکھیں۔ چونکہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع معلوم ہوتا ہے اس لئے ان کے افسانوں میں تصنع بالکل نہیں ہے۔ افسانہ میں چونکہ تفصیلات معیوب ہیں اس لئے وہ بالعموم اس کی بجائے ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جن میں تصویر آفرینی (Suggestiveness) ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کی ابتدا، خاتمہ اور منتہا بھی اپنی جگہ خوب ہوتے ہیں اور وہ انھیں اپنے دلچسپ اور پُراثر انداز بیان سے اسقدر بلند کر دیتے ہیں کہ ان کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

ان کے افسانوں کے عنوان بھی بڑے تصور زا ہوتے ہیں اور ان کی کشش پڑھنے والوں کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے۔ غرض ان کے افسانوں کا فطری پن، ارتقائی اصول کی پابندی۔ پلاٹ کی دلچسپی۔ تخیل میں جدت اور واقعات میں ڈرامائیت یہ تمام باتیں انہیں اردو کے بہترین افسانہ نگاروں میں کھڑا کرتی ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں کبھی کبھی "اصلاح" بھی ملتی ہے مگر وہ فن کو زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اور بعض اوقات اخلاق کو فن پر قربان بھی کر دیتے ہیں۔

اسلوب بیان کسی نے ایک عمدہ افسانہ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "ایک دلچسپ پلاٹ ایک دلکش اسٹائل میں

لکھا جائے ‘‘ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ سٹائل یا اسلوب بیان بعض اوقات اپنی خوبیوں کی وجہ سے ایک معمولی پلاٹ کو بھی نہایت بلند افسانہ بنادیتا ہے۔ صادق الخیری کو یہ نعمت میسّر ہے۔ ان کے پلاٹوں پر ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اسلوب بیان کے متعلق یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان کی فطرت شاعرانہ ہے اس لئے وہ جذبات کے اظہار کیلئے مترنم الفاظ اور نہایت شستہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ ان کے دلکش جملے چُست بندشیں اور انوکھی ترکیبیں حساسات وکیفیات کی نہایت عمدہ تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک بڑا حسن ان کا طرز بیان ہے جس میں بیساختگی اور زور ہے۔ لیکن ایک بات عجیب نظر آتی ہے۔ ان کے اسٹائل دو طرح کے ہیں۔ ایک خالص دہلوی علامہ راشد صاحب کے رنگ میں، دوسرا مغربی اسالیب سے متاثر ہوکر ان کا اپنا۔ اوّل الذکر بالعموم ان کے ابتدائی افسانوں میں ہے۔ اس کی نمایاں مثال پال کی آگ‘‘ (ساقی ۱۹۳۳ء) ہے۔ جس میں دلّی کے محاورات اور روزمرہ کا استعمال ہے۔ غالباً شروع میں انھوں نے اپنے والد مرحوم کا اسٹائل کا چربہ اتارا ہے۔ ’’پال کی آگ‘‘ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> نسترن تھی تو اسی زمانہ کی اور تعلیم و تربیت بھی آج ہی کل کی ہوئی مگر ماں کے دودھ کا کچھ ایسا اثر چڑھا تھا کہ سہیلیوں کی صحبت اور اُستانیوں کی ہدایت بھی اس کے خیالات متزلزل نہ کرسکی۔ وہ قدامت میں گرفتار تھی نہ جدت کی عاشق زار۔ خیالات کی شستہ عقائد کی پختہ۔ دل کی صاف۔ نیت کی پاک۔ سچ مچ کی انسان اور حقیقی معنوں میں مسلمان تھی چھوٹوں پر شفقت اس کا شیوہ۔ بزرگوں کی عزت اس کی عادت۔ حاجت مندوں کی خدمت اس کی خصلت الختصر عورت کی صورت میں ایک جنّت تھی جو نسیم کو میسّر آگئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر وہ وقت کا دیوانہ فیشن کا پروانہ نخوت میں چُور خوفِ خدا سے ہزاروں کوس دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میاں بیوی میں اکثر اختلاف ہوتا اور بعض دفعہ لڑائی بھی۔ لیکن زبردست کے بسوے بیس۔ یہ کہ بیوی ہی غریب کو جھکنا منانا، بلانا اور منانا پڑتا۔

یا پھر یہ اسٹائل ان کے ان مضامین میں نظر آتا ہے جو انھوں نے اپنے وطن دہلی کے متعلق (جس کی ہر چیز کو وہ دُنیا جہان سے بہتر سمجھتے ہیں) لکھتے ہیں۔ اس قسم کے اسٹائل کو دیکھکر مولانا شاہد احمد صاحب نے جو رائے ظاہر کی ہے اس سے ہر شخص کو اتفاق ہوگا کہ ’’خدا کا شکر ہے کہ علامہ راشد الخیری مرحوم کا اسٹائل ان کے بعد صادق کے ورثہ میں آگیا۔ اب ہم اپنی بہترین توقعات اس امید سے وابستہ کرسکتے ہیں کہ علامہ مرحوم کے اٹھ جانے سے جو جگہ اُردو انشاپردازی میں خالی ہوگئی تھی وہ زیادہ عرصہ خالی نہیں رہے گی ‘‘۔

اُن کا دوسرا اسٹائل انگریزی لٹریچر کے کثرت مطالعہ سے بنا ہے اور بالکل نیا ہے۔ ان کی زبان کی صحت کے متعلق تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ اس پر فصاحت، شیرینی، شاعرانہ بیان اور کہیں کہیں استہزا کی لطیف چاشنی سونے پر سہاگہ ہے۔ ان کے تمام تازہ اور ترقی پسند (Progressive) افسانے اسی جدید اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً صید ہوس۔ حسن وشباب۔ بے باپ کا بیٹا۔ گلناز۔ پھپھی۔ ہمدم دیرینہ۔ بے زبان۔ آلام حیات وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ ان کے انداز بیان میں قنوطیت چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور وہ عام طور پر ایسے جملے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں جو حزن اور یاس کی تصور زائی کریں۔

ترقی پسند عنصر جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے صادق الخیری اگرچہ شاعرانہ فطرت رکھتے ہیں مگر کسی چیز کو اس کی اصلیت سے علیحدہ نہیں کرتے۔ ان کے افسانوں کا اصلی موضوع زندگی اور اس کے متعلقات ہیں۔ وہ اپنے اِرد گرد نظریں دوڑاتے ہیں اور اسی ماحول سے اپنے افسانوں کیلئے مواد حاصل کرتے ہیں۔ جو چیز ان کو جیسی نظر آتی ہے وہ اس کو اسی طرح پیش کردیتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہم میں اور ہماری سماج میں جو کمزوریاں اور خرابیاں ہیں وہ دور ہوجائیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں ’’زندگی اور زندگی کی کش مکش ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمیں صرف بیکسی، مجبوری اور مصائب ہی نہیں ملتے بلکہ ان کی تحریریں بیداری روح اور آزادی و حرّیت پر بھی ابھارتی ہیں۔ لیکن وہ ’’ہنگامہ پرور‘‘ نہیں ہیں اور ان کے ہاں حد سے متجاوز سرکشی بھی نہیں ہے بلکہ وہ صحیح معنوں میں ترقی پسند ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہماری سماج میں اصلاح اور ہماری ذہنیتوں میں پُرسکون طریقے سے تبدیلی ہوجائے۔ وہ بغاوت اور دوسروں کو تباہ و برباد کردینے کے قائل نہیں ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں امارت کا تختہ الٹ دینے کی نہیں بلکہ مفلسی اور غریبی کو دُور کرنے کی خواہش ہے۔ وہ ادب کا مقصد اصلاح و ترقی سمجھتے ہیں اور قاری

محض اشاروں اشاروں میں ان کے مافی الضمیر کو سمجھ جاتا ہے۔ وہ صرف کہیں ایک فقرے سے، کہیں کسی اشارے سے کوئی درس دیتے ہیں۔ اور یہ بہت کم ہوتا ہے کہ وہ کہیں واعظ یا مصلح نظر آئیں صادق مرثیہ گو نہیں ہے۔ اس کے ہاں صرف اسلاف کے کارناموں کی مدح نہیں ہے بلکہ وہ ہمارے موجودہ زمانہ کا ادیب ہے۔ اسے نہ ماضی کا افسوس ہے نہ مستقبل کا انتظار ہے۔ اس کے سامنے صرف حال ہے اور وہ سماج پر اور ہمارے رسم ورواج اور ہمارے عقائد باطلہ پر بے دردی سے تنقید کیے جاتا ہے۔

عورت ان کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ وہ اکثر ترقی پسند ادب میں بھی اس کی حمایت کرتے ہیں "کھلونے" میں ہیروئن کی زبانی عورت کی محکومی کا حال یوں بیان کروایا ہے:-

تم جان کر بھی جاننا نہیں چاہتے کہ ہم عورتوں کی کیا حیثیت ہے۔ ہم تو بس کھلونے ہیں جن سے مرد جس طرح چاہتے ہیں کھیلتے ہیں۔ شادی سے پہلے باپ اور باپ کے بعد بھائی ہم عورتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور جب شادی ہو جائے تو شوہر اور شوہر کے بعد بیٹے کا اختیار ہوتا ہے۔ وہ جو چاہے ہم سے سلوک کرے۔ ہماری کیا مجال کہ کسی معاملہ میں اپنی رائے دے سکیں۔"

— میں اس کے دل کی صدا عرش کے کنگورے ہلا رہی تھی کہ اے معبود! بیکس لڑکیاں ظالم اور زبردست مرد سے تحفظ عصمت کیونکر کریں۔"

وہ سوسائٹی کی بے عنوانیاں اور عورت کے معاملے میں مردوں کی زیادتی دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ "طلائق" میں انھوں نے ایک طلائق کی مصائب سے دبی ہوئی زندگی کا دلخراش مرقع کھینچا ہے اور اسی کی زبانی چیلنج کے انداز میں سماج پر تبصرہ کیا ہے۔ سماج مذہب، رسم ورواج کے علاوہ وہ قدرت کو بھی ٹوکنے سے نہیں جھکتے "سیدہوس" میں ایک فقرہ بڑا چبھتا ہوا ہے:-

— کبھی کبھی گاڑیبان کے چکارنے یا کسی فاقہ زدہ کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی جو آسمان کی طرف منہ اٹھائے اپنے پیدا کرنے والے سے جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی اپنی بیچارگی کی شکایت کر رہا تھا۔"

امارت وحکومت پر "جیون ایک پہیلی" میں خوب طنز کی ہے:-

کارخانہ کا مالک بڑا بد مزاج اور مغرور شخص تھا۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک حقارت سے دیکھا "تو تم نوکری کرو گے؟ ہوں!! پتھر تم سے کاہے کو کٹیں گے؟ کدال تم سے کیسے چلے گی۔ تم تو بابو ہو بابو۔ تم نے اس لالچ میں پڑھا کہ سرکار تمھیں نوکری دے دیگی۔ جاؤ نا اب اس کے پاس! تمھیں ان حالوں پھرتے دیکھتے اسے لجا نہیں آتی

ایک اور افسانہ میں انھوں نے امیروں کی کوٹھیوں اور غریبوں کے گھروں کی تصویر کھینچی ہے۔ جس میں دراصل یہ دکھایا ہے کہ حقیقی محبت غریبوں میں ہے امیروں میں نہیں۔ پہلے ایک غریب گھرانے کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:-

یہ غریبوں کی بستی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھر ہے سامنے اس خاک سے اَٹے ہوئے طاق میں جس کی کمر بڑھاپے سے دوہری ہو گئی ہے ایک شمع چپکے چپکے رو رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ چند پروانوں کو اس کے شعلۂ حسن نے جلا کر خاکستر کر دیا ہے، دیکھو شمع پروانہ سے کہہ رہی ہے۔ "پیارے! میں تجھ سے ہمکنار نہیں ہو سکتی لیکن اے میرے محبوب! تیرے سوز نے میری جان پر بنا دی ہے۔"

اب امیروں کے مکانوں کو دیکھئے:-

"عالی شان مکانات میں بجلی کے قمقمے ہیں۔ پروانے یہاں بھی آتے ہیں۔ ان کے گرد طواف کرتے ہیں مگر ان کے پر نہیں جلتے۔ ان میں رنجش نام کو نہیں ہوتی۔ اور ہو بھی کیسے؟ یہ شمع تھوڑی ہے ....! ایک پروانہ دیوانہ وار آیا اور اس سے اپنا سر ٹکرانے لگا۔ قمقمے کا مزاج برہم ہو گیا اس نے خشمناک ہو کر کہا۔ ارے دیوانے! کیوں میرا اُجلا بدن میلا کرتا ہے؟ ایسا ہی مرتا ہے تو وہ سامنے دیکھ، آتش دان میں اپنا جسم جھلس لے۔"

ان کا ایک افسانہ "گلناز" ہے۔ ہر جہت سے نرالا ہے۔

ہر طرح نیا اور دلکش۔ اوریجنلٹی (Originality) کا، جو ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں عام طور پر مفقود ہے اعلیٰ نمونہ منتہا (Climax) انتہائی ڈرامائی۔ اس میں آجکل کی کئی چیزیں پائی ہیں آجکل کے نوجوانوں کی زبوں حالی، حقوق اور فرائض، جوانی اور نفسانیت انتقام اور بدمستی، غم روزگار، جسم اور روح کی بھوک، فلاکت اور بیچارگی، اولاد اور سرپرست کی محبت وغیرہ وغیرہ سب کچھ ہونے کے باوجود افسانہ مختصر ہے اور فنی اعتبار سے مکمل اور میرے خیال میں صادق کا شاہکار ہے۔ نیز افسانہ نگار نے اسے ایسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ کئی بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ابتدا دلچسپ اور انجام غمناک ہے ایک دو اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

> یہ اگلے زمانہ کے لوگ اس زمانہ کے نوجوانوں کی ذہنی الجھنوں کا ہرگز اندازہ نہیں کر سکتے جب تک بچارے تعلیم پاتے ہیں سینکڑوں امیدیں ہزاروں ارمان اور ان گنت آرزوئیں ان کے دل میں پرورش پاتی ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر ہم یہ بنیں گے وہ بنیں گے، دولت کی فراوانی ہوگی جو چاہیں گے خریدیں گے اور جس طرح چاہیں گے خرچ کریں گے۔ لیکن حصول تعلیم کے بعد جب بیکاری ایک سوالیہ نشان بن کر ان کے سامنے اپنا بھیانک منہ کھولتی ہے تو ان کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور خوش آئند توقعات کی منور شمع اس طرح گل ہوجاتی ہے گویا اب کبھی روشن نہ ہوگی۔"
>
> "اللہ غنی! ایک آسامی کیلئے ڈھائی سو نوجوان قسمت آزمائی کیلئے آئے تھے! کاش ان کے والدین نے بی۔اے کی ڈگری کو قرآن و حدیث کا حکم اور دولت

ملازمت کی گارنٹی نہ سمجھا ہوتا!"

ہر آرٹسٹ کی طرح صادق الخیری کے بھی چند نظرئیے ہیں مگر چونکہ وہ جوان العمر ہیں اس لئے وہ ابھی اپنے نظریوں پر قائم نہیں ان کے خیالات بدلتے رہتے ہیں اور میری یہ رائے ہے کہ انھیں ابھی آخری نتیجوں پر پہنچنا باقی ہے۔ کبھی وہ تقدیر کا مذاق اڑاتے ہیں اور کبھی کسی افسانہ میں انسان کو بالکل مجبور و عاجز سمجھتے ہیں۔ کبھی وہ زندگی سے مایوسی کا اظہار کر کے موت کو راہ نجات سمجھتے ہیں اور کبھی وہ اسے بھی چیلنج دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا میں رہنا ہے اور یہاں کے تمام مصائب و آلام پر فتح پانی ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کرنی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ صادق الخیری کے پاس اپنے خیالات کے اظہار کے لئے لفظوں کا وسیع خزانہ ہے اور استعارے بھی نئے نئے اور دلکش دیتے ہیں مگر وہ اپنی چند تشبیہوں اور ترکیبوں کو کئی کئی افسانوں میں دہرا جاتے ہیں مثلاً "اس کی ساق ہائے سیمیں دعوت لمس دے رہی تھیں" کو میں نے کوئی تین افسانوں میں پڑھا۔

"جب بزم انجم سراپا گوش ہوتی"

"موت کا سا سکوت" "موت کی سی زردی کھنڈی ہوئی تھی"

وغیرہ بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ کئی افسانوں میں استعمال ہوئے ہیں یہ عیب ناگوار گذرتا ہے۔

ناشکر گذاری ہوگی اگر میں محترم ایڈیٹر صاحب ساقی کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے کمال مہربانی سے مجھے مختلف رسائل جن کی مجھے ضرورت تھی بہم پہنچا کر اس مضمون کی تیاری میں مدد دی۔

حمید الدین
(ایم۔اے۔ پی، سی، ایس)

بنارس

از بنارس نہ روم معبد عام است اینجا
ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

بڑے بڑے مقدس مقامات پر بھی کبھی کبھی ہی روحانی مسرت اور شرحِ صدر نصیب نہیں ہوتا جس کے لئے نہایت ذوق وشوق سے ہم سفر کرتے ہیں۔ تو درحقیقت اتفاقیہ ہی نظر آتا ہے۔

میں تیسری بار بنارس میں وارد ہوئی تھی، دوپہر کا وقت تھا، اور وشواناتھ بازار کا مقدس مقام، تمام بازار پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دکاندار سادھوؤں کی طرح بیٹھے جھونکے کھا رہے تھے۔ لمبے لمبے جنیو پہنے ہوئے منتر پڑھتے ہوئے اور شیوجی کی مورتی سامنے رکھی ہوئی پٹڑی پر آمدورفت بند تھی البتہ کبھی کبھی کوئی چڑیا اِدھر سے اُدھر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھی جو سائبان کے گھونسلوں میں اُڑ کر آتی ہوگی۔ فضا میں وشویشور مندر کے گھڑیال کی گونج اپنا اثر جمائے ہوئے تھی، اِسلئے کہ ہر ایک عبادت گذار ننگے پاؤں مندر میں پوجا کے لئے داخل ہوتا اور رخصت کے وقت گھنٹہ بجا کر جاتا، گھنٹہ کی گونجتی ہوئی لہریں تمام شہر میں اپنا ساحرانہ تقدس نشر کرتی رہتی ہیں۔ یوں خیال فرمایئے کہ لہریں جو تمام بنارس میں منتشر ہوتی ہیں رنج ومسرت اور آمال و آمانی کا مرجع ہیں، گھڑیال ایک نساج ہے جو اتحاد اور اتفاق کے تار بن رہا ہے۔ اور رنج ومسرت کے شکستہ تار بغیر اس کے بے حقیقت ہیں ـــــ،

دروازے سے گذر کر ایک قدم آگے گل فروشوں کی دکانیں ہیں جو شیو کی نذر کیلئے سفید پھول بیچتے ہیں۔ کس قدر پُر لطف مشغلہ ہے۔ شیوجی کی نذر کے لئے روز روز پھول دینا، تمام عمر اسی میں بسر کر دینا، کیا کوئی متنفس بھی ایسا ہوگا جس نے یہ دلچسپ مشغلہ اختیار کیا ہوگا اور روز روز اس نذرانہ کے ذریعے نجات کا تصور کرتے ہوئے اسکی نجات نہ ہو گئی ہوگی؟

اس وقت مجھے مذہب کے قدیم اربابِ تقدس یاد آگئے جو گروہ کے گروہ عبادتخانے کے گرد رہتے ہیں۔ بالکل یہی حال اہلِ بنارس کا ہے جو فصیل کے اندر عبادتگاہ کے آس پاس لپٹے پڑے ہیں۔

بنارس اِس لحاظ سے بالکل جدید ہے کہ اُس کی گنگا کنارے کی بستی تقریباً تین سو برس کے اندر اندر آباد ہوئی ہے، ہندوستان میں قدامت اب بھی اپنا تسلط اس قدر رکھتی ہے کہ اگر تمام آبادی کو مٹا دیا جائے تو دوبارہ اسی نہج پر بنا دیا جائیگا، کسی قدیم شہر نے قدامت کے گیت ایسے نہیں گائے ہونگے، گھروں میں، بازاروں میں، گلیوں میں، ہر جگہ قدامت کے آثار نمایاں ہیں۔ جمو چھتر جو جونپوری پٹھانوں کی تعمیری یادگار ہے ۱۳۰۰ء سے لیکر ۱۴۰۰ء تک کے آثارِ حیات اس سے نمودار ہیں۔ اِسی کے قریب ہم اشوک کے زمانے کی پٹڑیوں کے چھجے اور کٹہرے دیکھتے ہیں جن میں لکڑی کے بجائے پتھر لگا دئے گئے ہیں، یہیں میں نے ایک مکان میں وسیع ہال بھی دیکھا جس میں سے گنگا صاف نظر آتی ہے، یہ مکان یقیناً دو ہزار برس پہلے کا بنا ہوا ہوگا جیسا کہ اس کے مالک کا خیال ہے۔ یہی وشواناتھ بازار جس میں اب ہم چل پھر رہے ہیں وہی دشت ہوگا جس میں سے ویدک زمانے کے بزرگ گذرتے ہونگے۔ جب انہوں نے سب سے پہلے مشرق میں دریائے گنگا کے کنارے سورج نکلتے دیکھا ہوگا، اور اشلوک پڑھتے ہوئے ہوم کیا ہوگا بالکل یہیں جہاں کہ آج وشویشور کا طلائی جنگلہ ہے، سڑک سے زیادہ کوئی جگہ پائدار نہیں ہوتی، جس طرح مغربی ممالک میں باغیچوں اور مکانات کے پیچھے گلیاں ہوتی ہیں اور پگڈنڈیاں ہوتی ہیں جو مرغزار تک چلی جاتی ہیں بالکل اِسی طرح تمام دوسرے ممالک میں بھی گلیاں خاموش تاریخی ثبوت ہیں جن کو کوئی مورخ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا، لیکن اِس چھوٹی سی گلی کے حال کا کون انکشاف کریگا، یا کون ان لوگوں کی موت وحیات پر نظمیں لکھے گا۔ جن کے قدموں نے آمدورفت میں اِس گلی کے پتھروں کو چار ہزار سال قبل چھوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بنارس ایک محقق کے خیال سے بھی زیادہ قدیم ہے، یہاں سرناتھ میں ۵۰۰ قبل مسیح یا کچھ اس سے بھی پہلے سب سے بڑے پیغامِ خداوندی کا الہام ہوا جس کی گونج کبھی تاریخ سے ناپید نہیں ہوئی کہ "زاہدو اچھی طرح سُن لو کہ موت سے نجات کی راہ مل گئی" اور مہاتما بدھ کے دورانِ حیات میں بھی سرناتھ سے اسکی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے "ان سے پہلے بھی یہ نجات کی جگہ سمجھی جاتی تھی اور فلسفہ میں اپنے زمانے کی بہترین یونیورسٹی تھی۔ تین سو سال

کے بعد اشوک نے مہاتما بدھ کی یادگار میں اِن تمام مقامات کے احترام کیلئے گنبد بنا دئے جو پہلے زمین دوز تھے اور جن کو مہاتما بدھ کے قدم مبارک نے مقدس بنا دیا تھا، اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سرناتھ مندر ۵۸۳ قبل مسیح اور پھر ۵۰ قبل مسیح ہی میں خصوصیت کا حامل نہیں تھا بلکہ اس کے درمیانی زمانے میں بھی مسلسل مرجع انام اور مذہبی روایات کا زندہ نشان رہا ہے، اور پھر یہ صرف سرناتھ نہیں تھا جس نے نئے مذہب کے سلسلہ میں مہاتما بدھ کو آتے جاتے دیکھا، اور نہ صرف یہ ایک ابجر یا گھنڈ (مرنے کے بعد کے حقوق کی مقدار جگہ) تھا جو مذہبی تقدس کے لحاظ سے اسلام کے دَور سے پہلے بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وساسومٹھ گھاٹ اور بازار ایک بہت دراز مدت کی یادگار ہے جس میں کم سے کم دس بادشاہی نسلیں ضرور ختم ہوتی ہونگی۔ پاٹلی پتر خاندان کے دورانِ حکومت میں بھی بنارس شاہنشاہی کا اعلیٰ ترین مقام تھا۔ بنارس میں اب بھی دو اشوک کے برج ہیں، ایک تو کالج گراونڈ میں اور دوسرا سرناتھ کا مٹھ۔ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مہاتما بدھ کے ایامِ شباب میں بھی بنارس اعلیٰ صنعت و حرفت کا مشہور مرکز تھا، اس لئے کہ بہت سی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مہاتما بدھ نے شاہانہ خلعت اتار کر جو گیروا لباس پہنا وہ بنارسی ریشم کا بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ وہ ہے جس کو حقیقت میں ہم جانتے ہیں، اصلیّ کہ دریا کا کنارہ قرونِ سابقہ میں جغرافیائی اعتبار سے ہر ملک کیلئے بڑی اہمیت رکھتا تھا، اور بنارس کے گنگا کے شمالی جانب محلِ وقوع نے اس کو تمام مشرقی اور جنوبی ممالک کی منڈی بنا دیا اور اس طرح ہندوستان کا سب سے اہم مرکز بن گیا، اور کہا جا سکتا ہے کہ بنارس سینکڑوں بار لکھی ہوئی قدیم ترین تختی ہے۔ اس میں عمارتوں پر عمارتیں چنی جاتی رہی ہیں اور دَور کے اوپر دَور گزرتے رہے ہیں۔ بنارس کی گھنی آبادی کے مکانات کی بنیادیں اینٹوں کی کانوں پر رکھی ہوئی ہیں جن کے مالک اپنے قدیم آبا کے ورثہ پر بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں ہم نے ایک ایسا مندر دیکھا جس کا فرش عام راستے سے تقریباً دس فٹ نیچے دھسا ہوا ہے اس کی عمر سترہ اٹھارہ سو برس ہوگی۔

اگر ہم بڑی چیزوں کا چھوٹی سے مقابلہ کریں تو بنارس کو ہم اشوک کا کنٹربری کہا جا سکتا ہے، جیسے دہلی بعد میں راجپوت اور مسلمانوں کا فوجی مرکز رہا اسی طرح بنارس مہاتما بدھ کی قرونِ اولی کے لئے تمام شہروں کا مرجع رہا۔ سرناتھ میں بڑے بڑے سناسیوں کی یادگار پیروانِ بدھ و جین نے محفوظ رکھی۔ بنارس میں برہمن بہترین شہری تمدن پیش کرتے ہیں اور عملی طور پر بتا دیتے ہیں کہ اس قادرِ مطلق کے سوا کوئی نہیں ہے۔ شیو چیتے کی کھال پہنے مہاتما بدھ کی طرح مکاشفہ میں بیٹھا ہے جیسا کہ شیو کا سنگین مجسمہ ابھار کے ساتھ منقش الیفنٹا کے دروازے پر بنا ہوا ہے، اور یہ ہندو تخیل بدھ کے مجسمہ کی نقل ہے، اس طرح یہ ویدک شہر جس کی گلیوں میں کبھی مہاتما بدھ چلے تھے شیوجی کا مقدس شہر بن گیا، ان کے نشانات قائم کرنے کے لئے غیر مجسم خدا کے مجسمے تیار ہو گئے، یہ بالکل اسی طرح تیار کئے گئے جیسا کہ مہاتما بدھ کی مقدس یادگار کے لئے بھٹے بنائے گئے تھے، ابھی تک مہاتما بدھ کی ابتدائی یادگاریں باقی ہیں اور انہیں کیساتھ آخر کے زمانہ کی یادگار شیو کی مورتیاں بھی بنارس کی سڑکوں اور گھاٹ پر موجود ہیں جو مہاتما بدھ کے اثر کو ظاہر کرتی ہیں۔

لیکن بنارس ہندوستان کا صرف کنٹربری ہی نہیں ہے بلکہ یہ یہاں کی آکسفورڈ (یونیورسٹی) بھی ہے۔ مٹھ اور مندروں میں اسکول ہیں۔ ماہرانِ سنسکرت کی قیام گاہیں ہیں، اطرافِ ہند کے گوشہ گوشہ سے طلبا کے گروہ کے گروہ علومِ قدیم اور مذہبی تعلیم کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ ندیا یونیورسٹی سنسکرت کی منطق میں مشہور ہے لیکن بنارس سنسکرت کی فلاسفی اور برہمنوں کے علوم میں مشہور ہے، اس لئے وہ مذہبی معاملات اور اعتقادات میں حکم ناطق رکھتا ہے اور اطراف و کناف ہند میں ان طلبا کے ذریعے جو یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر اپنے اپنے صوبوں کو جاتے ہیں اس کا اثر چھایا ہوا ہے۔ بنارس درمیانی زمانے کے تمدن کا گہوارہ ہے۔ یہاں ایک کتاب کے پڑھنے میں آدمی کے بارہ سال صرف ہو جاتے ہیں، اس کے مقابلے میں عصرِ حاضر کے طریقے کے موافق ہم صرف ایک سال میں عموماً سطحی طور پر تقریباً بیس یا اس سے بھی زیادہ کتب کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مضمون کے ایک ہی رُخ سے واقف ہوتے ہیں اور مقابلے کی تعلیم و تبصرہ سے مجبور ہوتے ہیں۔ ہم اس کے صنائع و بدائع سے اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں لیکن مدارج مقابلہ سے بالکل نابلد۔ بنارس اِس صفتِ خاص سے اعلیٰ ماہر تیار کرتا ہے جو نہایت مستقل مزاج اور اپنے شعبہائے علوم کے بیان کرنے میں ایسے بیباک ہوتے ہیں جیسے ترقی یافتہ دنیا کے درمیانی زمانے کے لوگ بنیان اور ولیم بلیک ہیں،

ہم بنارس میں مرکز تہذیب و تمدن ہونے کے لحاظ سے موجودہ زمانے میں بھی (جس میں بنارس کی مرکزیت فنا ہو رہی ہے) ایک اور غیر معمولی دلچسپی محسوس کرتے ہیں کہ وہ سنسکرت تعلیم کا مرکز اور ہندو تمدن کا قبلہ ہے۔ وہ جونپور کا بھی حریف ہے۔ وہ جونپور جو ہندوستان میں اسلامی علوم کا مرکز تھا، حقیقت میں بنارس ہندو صوبوں کی سنسکرت تہذیب اور اسلامی فارسی و عربی تہذیب کا سنگم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بنارس اب بھی ایسے بلند معیار کے افراد رکھتا ہے جنہوں نے دُنیا میں ایک دفعہ قومی تعلیم کا نہایت مکمل نظام کے ساتھ دستور العمل پیش کر دیا تھا۔ سابق ہندو حضرات اپنی طفلی ہی میں صرف سنسکرت ادب کی ہی ترتیب نہیں پاتے تھے بلکہ اس زمانے کے اعلیٰ و ممتاز شاہی ادب یعنی فارسی شاعری کو بھی جزو تعلیم خیال کرتے تھے۔ اس مرکز اتصال یعنی بنارس میں جو دماغ پیدا ہوئے ہندوؤں کے اعلیٰ پنڈت اور مسلمانوں کے بہترین مولوی وہ علامۂ عصر نہیں تھے بلکہ وہ اِس وسیع عالم میں خلق و تہذیب کا بہترین نمونہ تھے، اعلیٰ تہذیب انسانیت ان پنڈتوں کے ساتھ ہی ختم ہو گئی جنہوں نے فارسی کی بھی ترتیب پائی تھی، جن لوگوں نے موجودہ دَور اور گزشتہ دَور کی تہذیب کا مقابلہ کیا ہوگا اُنہیں اس میں کوئی شک نہیں ہوگا کہ علم و ادب کا صحیح ذوق تو گزشتہ لوگوں ہی میں تھا جس کے ہلکے ہلکے آثار اب بھی کہیں کہیں ایشیا میں پائے جاتے ہیں۔

بنارس حقیقت میں ایک اعلیٰ یونیورسٹی ہے جس میں وسطی دَور کی اور یونیورسٹیوں کی طرح طلبا کی باہمی امداد کے ایک وسیع جال کے ذریعہ امداد کی جاتی ہے۔ جب ایک لڑکے کو علم کی محبت سینکڑوں میل پیدل کھینچ لاتی تو پھر روٹی مانگ لینے میں کیا ذلت ہے۔ درمیانی زمانے میں آکسفورڈ یا ہنڈل برگ یونیورسٹی میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا، یہی طلبا ہیں جن کے لئے ہمارے اسکول اور کالج قائم کئے گئے ہیں، ایسے طلبا کی ضروریات کا انتظام شہری خاندانوں کی بیویاں کر دیتی ہیں، لیکن بنارس میں صرف کھانے کی ضرورت ہے۔ موسم سرما کی ایک تاریک شب کو میں بنگالی ٹولہ کی طرف سے اشنان گھاٹ کو جا رہی تھی کہ میں نے دُور سے سنسکرت پڑھنے کی آواز سُنی، میں فوراً ہی ایک طالب علم کے قریب جا پہونچی جو رات بھر ایک اعلیٰ مکان کے پتھر کے چبوترے پر سویا تھا اور اس سردی سے بچنے کے لئے ایک معمولی بوری کا پردہ تان کر رات گزاری تھی اور صبح پانچ بجے سے پہلے اٹھ کر لالٹین کے ذریعے دن کیلئے مطالعہ کر رہا تھا، ایک اور طالب علم دیکھا جس کے پاس نہ بچھانے کیلئے بوری تھی اور نہ لالٹین تھی، وہ تمام رات کھلے ہوئے فرش پر اپنے ایک کمبل میں لپٹا پڑا رہا تھا اور ایک معمولی دیئے کی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔

اس محنت و غربت کے ساتھ ان میں علم کی محبت ہے۔ انکے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ کچھ کما لیں اور پھر اپنے اسکولوں کا کام بھی پورا کر لیں، اُمرا، شرفا اور تاجروں کی سخاوت بیشک درمیانی زمانہ میں کافی تھی، جس وقت کہ مذہبی جوش بہت تھا اور ضروریات محدود تھیں اُن چند پنڈتوں کا خیال کافی تھا جن کے گھروں میں لڑکے رہتے تھے، مگر موجودہ زمانے میں چھتر کی درسگاہیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہر میں تین سو پینسٹھ ہیں۔ چھتر ایسے مقام کو کہتے ہیں جہاں ایک مقررہ تعداد کو روز کھانا ملتا ہے، کہیں دو ڈول ملتے ہیں، کہیں برہمنوں کے علاوہ دوسروں کو بھی ملتا ہے، بہت سوں کیلئے پرہیزگار بیواؤں اور راجاؤں کی طرف سے مقرر ہے۔ لیکن یہ اہلِ شہر کا فرض ہے کہ وہ تمام طلبا کے لئے کھانا مہیا کریں۔ کیا بنارس شیو کے اُن لڑکوں کیلئے انا پورن ماں نہیں ہے جسکے ہاتھ غلے سے پُر ہوں۔

بنارس کی عظمت صرف مندروں سے ہی وابستہ نہیں ہے اور نہ وہ محض ایک یونیورسٹی ہے اور نہ یہ کہ وہ تین ہزار سال کا تاریخی اور صنعتی مرکز ہے بلکہ وہ ان سے بھی بڑھکر عظیم الشان دلچسپیاں خود سے وابستہ رکھتا ہے، مقدس من کرنیکا سب سے اعلیٰ قون شمشان گنگا کے عین مقابل واقع ہے۔ جو بنارس میں مرتا ہے اُسے نجات حاصل ہوتی ہے، الفاظ دلی کیفیت کے ترجمان ہیں ایسے حسین ترین گھاٹ پر کون مرنا پسند نہیں کریگا جبکہ شب ہلکے سانس لے رہی ہو یا صبح بنارس کی ابرو پر طلوع ہو رہی ہو، مندروں کی گھنٹیاں، برہمنوں کے اشلوک سُنائی دے رہے ہوں شیو کے وعدے اور گزشتہ عظمت اس کے دل میں ہو——— ایسی موت بذاتِ خود مسرت و شادمانی کا سبب ہے، کیا یہی نجات نہیں ہو گئی!۔

"اے خدا تُو میرے دل میں خلوت نشیں ہے" یہ الہام تھا جو ایک شخص پر ہوا جبکہ وہ گل فروشوں کی سہ دری سے دشویشور کے آس پاس ہجوم کئے ہوئے برہمنوں کے اشلوک سُننے کے لئے جُھکا۔ ایسا آدمی پھر کبھی خدا کو تخت پر بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا خواہ اُس کے بچے بھی اُس کے پاس ہوں، اس لئے کہ یہ راز اس

منکشف ہوگیا ہے کہ شیو انسان کے دل میں ہے، خدا علم محض ہے، نور مجسم ہے اور ذات مطلق ہے — ہم میں سے کون نہیں مرگیا اُس مقام پر جہاں ذات مطلق کا نورانی پیغام دل میں سما رہا ہو۔

تمام ہندوستان اسے محسوس کرتا ہے، تمام ہندوستان اِس دعوت کو سُن رہا ہے، اور ایک کے بعد ایک قدم قدم چلتے ہوتے سر جُھکاتے ہوتے، ننگے پاؤں اطرافِ ہند سے وہ لوگ آرہے ہیں، (خصوصاً بیوائیں اور سادھو) جنہوں نے زندگی ہی میں تمام خواہشات کو ترک کر دیا ہے اور محض خاتمہ بخیر چاہتے ہیں۔ بنارس میں بہت سی ستی کی یادگاریں دکھائی دیتی ہیں، کچھ ستی کرنیکا گھاٹ پر اور بہت سے نشانات باہر جنگلوں اور سڑکوں پر موجود ہیں۔ یہ بیواؤں کے نقشِ وفا ہیں جو رنج و الم میں کامیاب ہوئیں۔ یہاں بنارس میں کچھ نقش وفا و مسرت اور ہیں، سفید کپڑے سفید ساڑھی پہنے ہوئے۔ نہاتے ہوتے روزہ رکھتے ہوئے، دُعا کرتے ہوتے تاریک گلیوں میں ہزاروں وہ عورتیں رہتی ہیں جن کی زندگی آخرت کی نیکیوں کی تحصیل کے لئے ایک طویل جد و جہد ہے اور عام لوگ اگر قومی خدمت گار ہیں تو زاہد بھی کچھ کم نہیں ——— عمل عورت کی شمع مورتی کے چرنوں میں تاریک سائبان کے نیچے جل رہی ہے، اس میں بالکل لرزش نہیں۔ کیا یہی روشنی تمام دُنیا میں نہیں پھیل رہی ہے۔

بنارس تمام ہندوستان کی قومیت کا اجتماعی سنگھم اور مرکز ہے، اور اگر کوئی نیا شخص دریا کے بہاؤ کی طرف کشتی میں سیر کرے تو وہ مندروں اور اشنان گھاٹوں کی ایک طویل قطار کے پاس سے گُزرے گا۔ اُن میں سے جب ہر ایک کی تاریخ دُہرائی جائے گی تو پھر ایک خوبصورت عمارت کا نظارہ کرتے ہوتے وہ محسوس کرے گا کہ ہندوستان کے تمام مذاہب کی رہنمائی بنارس کو ہی کرنی چاہیئے۔

یہاں کیدار ناتھ کا مندر ہے جو شمالی سادھوؤں کا مرکز ہے اور جو اہل بنارس کے لئے ہمالیہ یاترا کی تمام خوبیوں کا نمونہ ہے۔ قریب ہی اہلیا بائی رانی کا گھاٹ ہے جو زبردست مرہٹہ رانی گزری ہے، جس کے مندر اور سڑکیں تمام ہندوستان میں رانی کے مہربان دل کی گواہی دیتی ہیں، اس کے بعد شنکر اچاریہ کا مٹھ اور ناگپور محل وغیرہ زبردست چیزیں یکے بعد دیگرے بنی ہیں، اگرچہ یہ شیو کا شہر ہے لیکن تمام چیزیں شیو جی کے نام پر ہی معنون نہیں ہیں، یہاں بنی مادھو کا بھی مندر ہے جو وشنو کا عزیز ترین نام ہے۔ یہاں تو مسلمان حکومت کے آثار بھی بھلائے نہیں جا سکتے، اکبر کے زمانے کے مان مندر

اس کے کتھا کے ہال اور سائبان میں انتہائی انسانی صناعی صرف کی گئی ہے، اور اورنگ زیبی مسجد اپنے میناروں میں اسلامی معتقدات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ حقیقت میں گنگا کا نظارہ اور بھی پُرلطف ہو جاتا ہے جب ہم گزشتہ کا خیال کرتے ہیں اور مجموعی طور سے شہر پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے کوئی نئی عمارت نہیں بنوائی بلکہ اُس نے امرت سر کے ساتھ ایک ناقابل شکست نشانی وشویشور مندر میں قائم کر دی ہے۔ یعنی اس کی چھت میں سونے کے پتر جڑ دیئے ہیں، بنگال کے زمیندار، پنجاب کے سکھ، راجپوتانہ کے شرفاء نے غرضکہ تمام نے مندر، چھتریاں، سدا برت اور دوسرے صدقات قائم کر کے نیکیوں میں حصّہ لیا ہے جو پانچ کوس تک پھیلے ہوتے ہیں۔

بنارس صنعتی صدر مقام بھی ہے، اس کے بُنے ہوتے خوشنما نازک تھانوں کے علاوہ ہم بنارس میں مدراسی اور دکھنی ساڑھیاں بھی خرید سکتے ہیں۔ وشو ناتھ بازار میں لکڑی کا پنجابی صنعتی کام ملیگا اور اسی بازار میں ناسک ترچنا پولی۔ نیپالی سرحد کا پیتلی سامان خریدا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے دیگر مقامات کی نسبت یہاں گیا، جبل پور اور آگرہ کے مٹی کے برتن اور نربدا کے شیو اور گومتی و نیپال کے سالگ رام اچھے دستیاب ہوتے ہیں، یہاں کی گلیوں میں ہر صوبے کا کھانا خریدا جا سکتا ہے۔ یہاں کی چہار دیواری میں ہندوستان کی ہر ایک زبان سُننے میں آتی ہے۔

ایک مقدس شہر میں یقیناً سکانِ شہر کو باہمی امداد کی اپنی حفاظت کے لئے عظیم ترین ضرورت ہوتی ہے، اس قسم کے شہر کے لئے دیگر مقامات کی بہ نسبت پولس کی زیادہ ضرورت ہے۔ صفائی، تیمار داری، شفاخانوں اور بدمعاشوں کے لئے کیا انتظام کیا گیا تھا، یہ چیزیں درمیانی زمانے میں اُسی نام سے موسوم نہیں ہونگی لیکن یقیناً اس قسم کے کسی نہ کسی صورت میں سب انتظامات ہونگے۔ باشندے ایک احلطے یا ایک گلی کی جماعت بنا لیتے تھے، بنارس چھوٹی چھوٹی گلیوں اور فصیلوں سے بھرا پڑا ہے۔ شاہراہ سے چھوٹی چھوٹی گلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ہر ایک کے سرے پر ایک دروازہ بنا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے ان میں سے ہر ایک اپنا محافظ رکھتا تھا۔ اکثر مقامات سے پھاٹک اتار لئے گئے ہیں، لیکن سُتون، کُندے اور چوکھٹیں اب تک قدامت کے آثار اور شہادت موجود ہیں۔ بعض جگہ پھاٹک دیوار کے سہارے سے لگے ہوتے ہیں اور گزرنے والا آدمی ایک لمحہ ٹھہر کر سوچنے لگتا ہے کہ یہ کتنے برس پہلے

آخری مرتبہ بند کئے گئے ہوں گے۔ ہر ہر احاطے کے ہندوؤں کی جانب سے بنائے ہوئے دروازے حقیقت میں بنارس کی صفائی کی خاموش شہادت ہیں۔ ایڈنبرگ اور پیرس کی طرح یہاں بھی اُمرا کے احاطے رات ہوتے ہی بند کر لئے جاتے تھے اور وہ اِس احاطے میں آزادانہ طور سے اچھائی اور بُرائی کے ذمہ دار ہوتے تھے، احاطہ کی صفائی کا تعلق شہر کی زمین دوز نالیوں سے ہونا ضروری تھا جو بالکل قدیم پاٹلی پتر کی طرح تھا۔ وہاں بیماروں کے لئے نہایت ذمہ دارانہ طور سے تیمار داری کا انتظام ہوتا تھا۔ اور اس احاطے کے اراکین مجموعی طور سے شہری اُمور میں پورا پورا حصّہ لیتے تھے۔ اگر ہم کسی محلہ یا احاطے کے دروازے پر غور کریں جہاں بعض جگہ اب بھی چوکیدار باہر کھڑا ہوا ہے تو ہم درمیانی زمانے کے دماغوں کی قابلیت کے شہری انتظام اور حفاظت کی نسبت اندازہ کر سکیں گے۔ اس لئے کہ ان دروازوں پر ہم خدائی کوتوال کا بھیروں کا پتلا بنا ہوا دیکھتے ہیں، جو ہر شب کو شیو کے شہر میں لکڑی اور کتّے کے ساتھ گھومتا ہے۔ سنتری اور چوکیدار جس کی پوجا کرتے ہیں، اور جو کمزور اس مبارک سرحد میں آنا چاہیں اُن کا داخلہ اسکے اختیار میں ہے، ہر ایک شہر کا محافظ خود کو اُس خدائی کوتوال کا نائب اور دُنیاوی نمائندہ تصوّر کرتا ہے۔ کال بھیروں یعنی شیو کی اُس سیاہ مورتی کی پوجا میں ہم درمیانی زمانے میں بنارس کے شہری انتظام کی تمام تاریخ پڑھ سکتے ہیں۔

اور مقامات کی بہ نسبت نیا زمانہ یہاں کچھ دیر میں آیا لیکن آ ہی گیا۔ جب یہ یہاں آیا تو اس کا کام اور مقامات کی طرح وہی لاتعداد مسائل تھے؛ اور ان طریقوں کی وقعت اُٹھا دینا تھا جو آہستہ ترقی کے دور میں دریافت کئے گئے تھے۔ وہ تمام خود حفاظتی رسّیاں جو بہت سے مقامی رشتوں سے اور مُلکی ذمہ داریوں سے بٹی ہوئی تھیں، اور جن کے ذریعے بنارس اپنی ضروریات پوری کرتا تھا سب منقطع ہو گئیں۔ فرقہ وارانہ ذہنیت کو سخت نقصان پہونچا اس لئے کہ یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ یہ اجتماعی اور مرکزی طاقت کے مقابلہ میں بیکار ہے۔ اس لئے ذاتی اختیارات اور شہر کے خانگی انتظامات کا خاتمہ ہو گیا۔ اِسی اثنا میں ریلوے نے بنارس کو تمام ہندوستان سے ملا دیا۔ اور یہ ممکن کر دیا کہ ایک روز میں اس قدر بیمار، آوارہ اور بھوکے لوگ آکر بھر جائیں جتنے کہ ایک سال کی مدت میں پیدل چلکر یا کشتی کے ذریعے آسکتے تھے۔ اس لئے موجودہ بنارس نئے دریات کا گہوارہ بن گیا ہے جسکے سامنے گذشتہ قوم کی عقلمندیاں خدمت اور اقتصادی شہری نظم بیکار ہے۔

جب غریبوں کی آرزوؤں کی آخری کرن بھی ماند پڑ جاتی ہے تو وہ اُمید لگا کر یہاں آتے ہیں کہ ایشور اُن کو اپنے شہر میں پناہ دیگا۔ قدیم ایام میں جبکہ بنارس ایک دولتمند شہر تھا، اس وقت یہ لوگ بعض مکانوں میں یا اپنے ضلع سے آئے ہوئے دولتمند لوگوں کے احاطوں میں گنجائش پا سکتے ہونگے اور اُن کی اعانت سے رفتہ رفتہ کام سے بھی لگ جاتے ہوں گے لیکن اب تو وہ خود کو بیگانوں میں پاتے ہیں صرف مندر کی گھڑیال کی موسیقی ان کی ایک آشنا صدا ہے۔ پُجاری اور گرد تو انجان ہیں ہی، اور آخر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بلدِ امین میں پے در پے آفتوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔

یا غریب طالبعلم یہاں پڑھنے آتا ہے، زمانۂ قدیم میں اسکے لئے اُستاد یا کسی امیر سرپرست کے وہاں کمرہ اور کھانے کا انتظام ہو جاتا تھا، اگر وہ بیمار پڑ جاتا تھا تو گھر کے ایک رُکن کی طرح اس کی خدمت کی جاتی تھی، لیکن آجکل اس قسم کے طالب علموں کی کثرت ہے۔ اور عام طور سے ان میں اکثر کاہل ہیں۔ بہت سی خواہشات نے انہیں لاجمع کیا ہے، اور ہر وہ اخلاقی قدیم رشتہ جو احاطوں اور دُور کے ممالک میں تھا وہ بھی جاتا رہا، بسا اوقات ان طالب علموں میں نہایت محنتی اور اچھے طالب علم بھی جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے سڑکوں پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جب بیمار ہوتے ہیں تو کوئی ان کی خبر لینے والا نہیں ہوتا، اس لئے کہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ چھتر کی بیٹک بردست درسگاہیں ہیں جو اپنے بچّوں کی ضروریات پوری کر کے اِس قدیم شہر کی خلافِ اُمید طاقت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لیکن چھتر مکانات اور شفاخانے مُہیا نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اِن چیزوں کی بھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔

اور آخر میں شریف عورتوں کا معاملہ ہے جو اپنے وفات یافتہ کیلئے دُعا کرنے بنارس آتی ہیں، دوسروں کی طرح ان کے لئے بھی عام طور سے یہاں کوئی سامان مُہیا نہیں ہے۔ آجکل وہ کسی ملاقاتی کے یہاں نہیں آسکتی ہیں، بلکہ اُنہیں کمرہ کرایہ پر لینا پڑتا ہے، مالک مکان کو کرایہ دینا پڑتا ہے۔ ہم ساہوکاروں کو بُرا کہنے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے جو اپنے کرایہ دار کو باہر نکال دیتا ہے ——— خواہ وہ ناز و نعم میں پلی ہوئی ایک عورت ہی کیوں نہ ہو، جبکہ کرایہ بہت عرصے کا باقی ہو۔ اس لئے کہ اگر وہ خود کو تباہی سے بچانا چاہتا ہے تو بیشک وقت کے دباؤ کے موافق اسی معیار و رفتار سے وہ بھی عمل کریگا۔ ان سب سے زیادہ مؤثر چیز پولیس کا خوف ہے جو ہر جگہ بیکسوں میں (بقیہ بر صفحہ ۴۴)

بُت تراش

ہماری مہذب دُنیا کے ہمہموں سے بے نیاز بُت تراش کی اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا آباد ہے۔ پہاڑ کے غیر ہموار ٹیلوں پر، شاداب مگر خاردار جھاڑیوں میں، آوارہ بادلوں میں، پریشان ہواؤں میں، گنگناتے ہوتے آبشاروں میں، قصہ گو ستاروں میں۔ ہماری مہذب دُنیا کے ہمہموں سے بے نیاز، بُت تراش کی اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا آباد ہے!

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے۔ ظلمت آفریں شب کی معصیت آشکار تاریکی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ مگر ابھی تک رات کے سیاہ آنچل پر شب زندہ دار ثوابت و سیار کامدانی کی طرح دمک رہے ہیں! ہوا کے سرد جھونکے خوابیدہ درختوں کی شاخوں اور پتیوں کو گدگداتے ہوئے نہ معلوم کہاں جا رہے ہیں؟

جس طرح سوتے سوتے کبھی کوئی بچہ اُچھل پڑتا ہے، اسی طرح گیدڑوں کی آواز سے جنگل کی خاموشی بار بار لرز اُٹھتی ہے۔ سپاہیاں مضطرب ہو کر پھر مجتمع ہو جاتی ہیں۔

پَو پھٹ رہی ہے۔ عالم آغوشِ سحر میں کروٹیں بدل رہا ہے۔ جانور بیدار ہو چکے انسان بیدار ہونا باقی ہے — وہ انسان جو اپنی اس غیر مرئی دُنیا کی طرح عالمِ رنگ و بو کے اور انسانوں سے مختلف بھی ہے اور بے نیاز بھی! اس سب کے باوجود اس کی ہستی زندگی کے ہر ممکن شعبہ سے مزیّن ہے، مگر کسی قدر مختلف! اس کی اخلاقیات مقتضائے فطرت پر منحصر ہیں۔ اس کی معاشرتی زندگی کا پہلو وحوش و بہائم سے وابستہ ہے، اس کا فلسفہ اقتصادیات اسکے الفاظ پر کار کن ہے۔ اسکا مقصدِ حیات محبّت اور صرف محبّت ہے۔ جس کو یہ آج تک نہیں پا سکا ہے۔ کل کی خبر نہیں ہے۔ محبّت! — آہ کتنا دلکش لفظ ہے!

دن نکل آیا — سنہری دُھوپ۔ شبنم آلود پتیوں کو جگمگاتی ہوئی غار کے اندر داخل ہوئی اور بُت تراش کے گرد آلود آہنی چہرے پر چمکنے لگی۔

"تُو نے نہیں اُٹھایا؟" دُھوپ نے غار کی ہوا سے کہا۔

"بہت اُٹھایا۔ اُٹھاتے اُٹھاتے ہار گئی .... مگر نہ اُٹھنا تھے نہ اُٹھے۔ ..." ہوا نے کسی قدر سرد مہری سے جواب دیا۔

"تجھے جگانا نہیں سُلانا آتا ہے، مَیں اُٹھاتی ہوں دیکھ!" دُھوپ نے ہوا سے کہا اور اپنی تابانی کو فروغ دیا۔ "اب تو اُٹھ بیٹھو، لو مَیں آگئی ہوں!" دُھوپ نے بُت تراش سے کہا۔

بُت تراش نے ایک کروٹ لی اور پھر خراٹے لینے لگا۔

"یہ نہیں ہو سکتا .... اب مت سو .... اب اُٹھ بیٹھو ... دیکھو تو پتھروں پر لگی ہوئی کائی تک بیدار ہو چکی ہے .... اور تم سو رہے ہو!"

بُت تراش نے اپنے لانبے اور نکیلے ناخنوں سے اپنی اُلجھی ہوئی اور پریشان ڈاڑھی کو کھجایا اور چت ہو گیا۔

"یوں نہیں اُٹھو گے!" دُھوپ نے کہا اور اپنی شعاعی انگشت راز اُنگلیوں کو نہایت آہستگی سے بالوں میں سے گذار کر بُت تراش کے چہرے پر پہونچا دیا۔

"... اب اُٹھتے ہو یا بتاؤں؟" دُھوپ نے پھر پوچھا۔

بُت تراش اُسی سکون اور اطمینان سے سوتا رہا۔ دُھوپ نے تنگ آکر اُس کے چہرے کو گدگدایا، بُت تراش نے ایک آدھ مرتبہ اپنے سر کو اِدھر اُدھر جنبش دی اور آنکھیں کھول دیں۔

بُت تراش نے ایک جمائی لی اور آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا: "تو آپ آگئیں .... آں ... بہت دیر ہو گئی؟"

"تمہیں کیا، مَیں دو گھنٹے سے اُٹھا رہی ہوں .... تمہیں کچھ اور بھی آتا ہے .... دن بھر بیٹھے بیٹھے کھٹ کھٹ کھٹ پتھر توڑا کرتے ہو اور یا پھر رات بھر سویا کرتے ہو۔" دُھوپ نے جل کر کہا۔

"آتا تو نہیں .... مگر شاید آجائے!" بُت تراش نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آجائے .... ذرا مجھے تو بتاؤ!" دُھوپ نے کسی قدر تیز ہو کر پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم!" بُت تراش نے اپنی گنجان ڈاڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر وہی واہی تباہی باتیں ... تمہیں نہیں معلوم تو پھر آ کیا جائے؟ ...."

دُھوپ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ بُت تراش نے بات کاٹتے

ہوئے کہا "تو میں اب چلا... تم بھی جاؤ... پہاڑ کے اس طرف سیب اور آڑو کے ننھے منّے پودے تمہارے منتظر ہیں!"

بُت تراش لغزیدہ قدموں کے ساتھ غار سے باہر نکلا اور اپنی لانبی اور گھنی پلکوں کو دو چار بار جلدی جلدی جھپکا کر آسمان کو گھورنے لگا۔ سورج کسی قدر اور بلند ہو کر پہاڑ کی دوسری جانب چمک رہا تھا۔ اُس نے اپنی پنجہ شکن انگلیوں سے دو تین مرتبہ اپنی بڑی اور گلابی آنکھوں کو ملا۔ ایک دفعہ پھر آسمان پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالی اور گردن جھکائے ہوئے ایک طرف کو ہو لیا، اُس کی گفتگو غیر معمولی حد تک فلسفیانہ ہوتی تھی۔ اُس کی رفتار میں دیوانگی کے ساتھ ساتھ عظمت نمایاں تھی.... اُسکی وحشی اور متجسس آنکھیں روشن اور پُر آب تھیں اور اُس کے جسم پر اُگے ہوئے بال "خودرو" گھاس کی طرح لانبے نرم اور شاداب تھے! یہ اپنے ہاتھوں کو ہلاتا ہوا.. کسی خیال میں کھویا ہوا.... کچھ جاگا ہوا کچھ سویا ہوا چلا جا رہا تھا کہ یکایک شاہ بلوط کے درخت کی آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو بگاڑ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا "کہاں چلے بُت تراش۔ آج تو کئی دن میں ادھر آنا ہوا ہے، آؤ بیٹھو تو کچھ باتیں ہی رہیں" درخت نے کہا۔

"وہ آج ذرا معبد جانا ہے نا... پھر کسی روز آؤنگا" بُت تراش نے بغیر اپنی رفتار کو کم کئے ہوئے جواب دیا اور چلتا رہا۔ فرق صرف اسقدر ہوا کہ پہلے ایک رفتار تھی اور اب ایک اضطراب، یا یوں کہئے کہ پہلے ایک دیوانگی تھی اور اب ایک زندگی۔ یا یوں سمجھئے کہ پہلے ایک جمود تھا اور اب ایک حرکت.... یا اس سب کے برخلاف سمجھ لیجئے۔ غرض اس کی گذشتہ اور موجودہ رفتار میں ایک بیّن فرق تھا جو یا یہ تھا یا وہ تھا! رفتہ رفتہ بُت تراش کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی اور وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ٹھہر گیا۔ پتاور اور نکیلے پتھروں کی مدد سے وہ اس پہاڑی پر چڑھا اور آہستہ آہستہ ایک طرف کو چلا۔ یہاں پہنچکر اس نے دیکھا کہ اس کا عزیز چشمہ ــــ ع ــ

سوکھا پڑا ہے وسعتِ دریا لئے ہوئے!

بُت تراش کو دیکھتے ہی چشمہ نے کہا "آؤ آؤ بُت تراش، ٹھٹک کیوں گئے؟"

"کچھ نہیں دُبرو۔ وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا...."

"کیا بتائیں بُت تراش، بارش ہی نہیں ہوئی، پانی کہاں سے لائیں... بڑا افسوس ہے...."

"اچھا پھر چلے... کسی قدر ضروری کام ہے.... وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا.... ذرا "منیرا" کو اور دیکھ لیں"

"ہاں ہو آؤ شاید کام چل جائے.... بارش ہی نہیں ہوئی بُت تراش پانی کہاں سے لائیں"

"وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا..." بُت تراش نے کہا اور کسی خیال میں اور زیادہ مستغرق ایک طرف کو چل دیا پہاڑوں کی تین قطاریں طے کرنے کے بعد یہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی نے اہلاً و سہلاً مرحبا کہکر اُسے چونکا دیا!

"خیر تو ہے، آج اِدھر کیسے آنکلے... دُبرو سے دوستی ہو گئی ہے ...اب اِدھر کیوں آنے لگے؟"

"نہیں نہیں منیرا یہ بات نہیں... وہ ذرا قریب ہے نا، بس یہی بات ہے... آج گئے تھے دُبرو کے بھی پاس، بیچارہ خشک پڑا تھا، کہنے لگا بارش ہی نہیں ہوئی بُت تراش پانی کہاں سے لائیں.... تم سے ملے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا تھا.... اور پھر وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا........"

"ٹھیک تو کہتا تھا غریب بارش ہی نہیں ہوئی پانی کہاں سے لائے... لو پانی، کہو کتنا پانی چاہیئے.... بات یہ ہے بُت تراش، جو کسی کے تابع رہتے ہیں وہ بیچارے نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے ... اور جو اپنے نہاں خانۂ دل میں چشمہ رکھتے ہیں اُنہیں اس سب کی ضرورت نہیں! اپنے اندر چشمہ بہالو بُت تراش، پھر دُبرو اور منیرا دونوں سے بے نیاز رہے....!"

"اپنے اندر بہالوں.... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"چشمہ تمہیں میں ہے بُت تراش۔ منہ بند ہے، کوشش کرو بہنے لگیگا"

"اچھا تو بہنے لگیگا... پھر دُبرو اور منیرا دونوں سے بے نیازی ہے۔ مگر وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا" بُت تراش یہ کہکر جھرنے کے پاس بیٹھ گیا اور نہلانے لگا۔

"تم اکثر معبد جایا کرتے ہو... وہاں کس کی عبادت ہوتی ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم" بُت تراش نے ڈاڑھی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا کیا مذہب ہے؟"

"شاید جستجو میرا مذہب ہے اور محبت میرا ایمان ہے منیرا!"

"مگر وہاں تو تمہارے اپنے بنائے ہوئے بُت ہیں نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے... شاید انہیں کی پوجا کرتا ہوں"

"سب کی؟ وہ تو بہت سے ہیں!"

"نہیں ایک کی... حقیقت تو سب کی پتھر ہی ہے نا؟"
"مگر وہ تو تمہارے بناتے ہوئے ہیں، اپنے بناتے ہوئے کی آپ پوجا کرتے ہو؟"
"ہاں پوجا تو اپنے ہی کی ہوتی ہے... آن نہیں ہوتی. مجھے کچھ معلوم نہیں.... پتہ لگا تو بتاؤں گا.... اچھا تو پھر چلا مَیں..... وہ آج ذرا معبد جو جانا ہے نا؟"

بُت تراش نہا دھوکر وہاں سے چلدیا۔ اُس کے سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں پانی کے شبنمی قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے. وہ اپنے جذبات کی رو میں بہتے بہتے اس حد تک پہونچ گیا تھا، یہ شاید اُسے بھی نہ معلوم تھا کہ اُسے کہاں پہونچنا ہے! وہ چلتا رہا اور اپنے غار پر پہونچا. یہاں سے اُس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور اپنے نئے بناتے ہوئے بُت کو نہایت احترام سے اُٹھاکر معبد کی طرف چلدیا. پتھریلی چٹانوں پر پابرہنہ گھومنے سے اُس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے. مگر وہ اس سب کی پروا نہ کرتا تھا. اُس کے نزدیک زندگی نام تھا حرکت کا اور اس کے قائم رکھنے کے لئے اُس کے راستے میں کوئی چیز حائل نہ ہو سکتی تھی. وہ طوفان کی طرح پہاڑوں اور میدانوں سے گذرتا چلا جاتا تھا ــــ اسی طرح وہ آج ہی جا رہا تھا!

بالآخر وہ اپنے معبد پر پہونچ گیا، یہ جگہ پہاڑ کی ایک اونچی سی چوٹی پر واقع تھی وہاں نہ کوئی عمارت تھی اور نہ کوئی مکان! ـ مگر معبد تھا صرف معبد! اس چوٹی پر اُس کے بناتے ہوئے متعدد بُت رکھے ہوتے تھے. جب یہ کوئی نیا بُت بناتا تھا تو اُسے نہایت احترام کیساتھ یہاں لاکر رکھتا تھا. اور اس جگہ کو معبد کہا کرتا تھا!

بُت تراش نے اپنے بُتوں کے مختلف نام رکھ چھوڑے تھے!
بانگِ درا، بالِ جبریل، اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق ضربِ کلیم وغیرہ وغیرہ اور آج جو بُت یہ بناکر لایا تھا اُس کا نام تھا مُسافر!

مُسافر کو منزلِ مقصود پر پہونچانے کے بعد بُت تراش نے سکون اور اطمینان کا ایک ٹھنڈا سانس لیا اور آہستہ آہستہ پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے اُتر آیا! دُھوپ تیز تھی، بُت تراش کو پسینہ آ رہا تھا وہ بیٹھنا چاہتا تھا مگر جا رہا تھا. اُس کی نگاہ اُٹھی اور اُس نے دیکھا کہ سامنے والے درخت کی ایک پتلی سی شاخ پر فاختہ کا جوڑا بیٹھا ہوا ہے، فاختہ آنکھیں بند کئے، پر پھیلائے بیٹھی ہے اور نر اپنی چونچ سے اُسکے سر اور پَروں کو کھجا رہا ہے!

"او ہو بُت تراش... کہاں چلے! یہاں آؤ یہاں آؤ" فاختہ نے پکارا. دوسری فاختہ نے اپنے پھُولے ہوئے پروں کو سمیٹتے ہوئے آنکھیں کھولدیں۔

"کہیں نہیں" بُت تراش نے جوابدیا اور درخت کے نیچے آگیا۔
"کہاں سے آ رہے ہو بُت تراش"
"معبد سے"
"اور کہاں جا رہے تھے؟"
"جہاں پہونچ جاتا!"
فاختہ کو ہنسی آگئی "تم کس قسم کی باتیں کیا کرتے ہو؟"
"مَیں کس قسم کی باتیں کیا کرتا ہوں؟ تمہارے سوال کا جواب دے رہا تھا"
"یہ تمہیں نہیں معلوم کہ تم کہاں جا رہے تھے؟"
"مجھے واقعی نہیں معلوم"
"پھر کسے معلوم ہے؟"
"جانے اور لیجانے والی ہستی کو" بُت تراش نے اپنے پاؤں کی مٹی کو مسلتے ہوئے جواب دیا۔
"وہ کون ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم!"
"تمہیں یہ بھی نہیں معلوم، وہ بھی نہیں معلوم، تو پھر آخر تمہیں کیا معلوم ہے؟"
"مَیں تو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ کبھی کبھی تو صرف مَیں ہوتا ہوں... مگر بہت کم... اور کوئی نہیں ہوتا ــــ اور اکثر کوئی اور ہی ہوتا ہے اور... میں... نہیں... ہوتا"
"اچھا جب تم ہوتے ہو تو تم کیا کیا کرتے ہو؟"
"وہ مجھے یاد نہیں رہتا.... اس لئے کہ جب مجھے یہ احساس شروع ہو جاتا ہے کہ میں تھا تو اُس وقت عالمِ امکان پر کوئی اور کارفرمائی کر رہا ہوتا ہے!"
فاختہ نے کسی قدر سنجیدگی سے جواب دیا "اس کی وجہ یہ ہے کہ تم تنہا ہو، تمہاری زندگی ایک عجیب کشمکش سے دوچار ہے... جہاں بے بسی ہے اور مایوسی (بُت تراش غور سے سُنتا ہے) وہ اُبھرنا چاہتی ہے مگر مُجھ کر رہ جاتی ہے.... اپنی زندگی کو کسی سے معنون کر دو...

اُس کے بعد تمہاری جبینِ شوق میں سجدے بیدار ہوں گے ....
اُنہیں اُسی سے منتسب کر دو ..... یہ کیفیت جاتی رہیگی بت تراش !"

"زندگی کہاں ہے جو کسی سے منتسب کی جا سکے"

"محبت کرو بت تراش، زندگی اور زندہ داری دونوں پیدا ہو جائیں گی"

"محبت، وہ تو میرا ایمان ہے ؟"

"ہاں مگر بعینہٖ تعین کے بیکار بھی ہے اور خوابیدہ بھی — پہلے بیدار کرو، تعین خود بخود ہو جائیگا !"

"مگر میں محبت تو کرتا ہوں نا شاید ؟"

"کس سے کرتے ہو، اچھا ذرا بتاؤ تو سہی ؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم !"

"ہاں تو بس یہی تو کہہ رہی ہوں" فاختہ نے کہا "یہی تو معلوم کر لینے کی ضرورت ہے !"

"تو آخر کس سے محبت کرنے لگوں ... تمہیں بتاؤ"

"اپنے آپ سے .... اپنی ذات سے" فاختہ نے کہا۔

"یہ کیسے ممکن ہے ؟" بت تراش نے بھوؤں پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"حیرت سے گذر جاؤ بُت تراش اور تعینات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو ———— یہی مقصدِ حیات ہے !"

"کیا کہا حیرت سے گذر جاؤں ... یہی مقصدِ حیات ہے .... یہ حیرت کیا چیز ہے ؟"

"محبت کی خاموش لہروں میں سویا ہوا طوفان !"

بُت تراش خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ دوسری فاختہ نے جو اس تمام دوران میں آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی، اپنی دُم ہلا کر آنکھیں کھولدیں اور اپنے پیروں کو کھجانے لگی۔

فاختہ نے کہا "اب گھر جا کر سوچنا ... ہم تو چلے بُت تراش .... دوپہر ڈھل گئی کچھ دانا تلاش کریں"

بُت تراش نے زمین پر گڑی ہوئی آنکھوں کو اوپر اُٹھایا ..
... اور فاختہ کا جوڑا ایک طرف کو اُڑ گیا .... اور تھوڑی ہی دیر میں پہاڑی کے اُس طرف جا کر بُت تراش کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا !

وہ دوسروں کی خوشی اور مسرت کو غور سے دیکھتا ہے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اُسے کس طرح مل سکتی ہے۔ اُسکی زندگی ہمیشہ غم سے دوچار رہی ہے اور آج بھی ہے۔
خوشی شاید کوئی چیز ہوتی ہو گی — مگر وہ اُس سے واقف نہ تھا۔

"حیرت سے گذر جاؤ اور تعینات کی زنجیروں میں آزادی کی جُستجو کرو ...... یہی مقصدِ حیات ہے" سوچتا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا بُت تراش جس طرف سے آیا تھا اُسی طرف کو چلدیا، فاختہ کے اس فقرے نے بُت تراش کے نظریۂ حیات کو عجیب طرح سے متاثر کیا تھا! یہ فقرہ اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا وہ مبہوت تھا، بات یقیناً سلیقہ کی تھی مگر اس کا حصول اپنی جگہ ایک سوال تھا، وہ اپنی منزل کی طرف چلتا رہا — نامعلوم منزل کی طرف — غیر محسوس طریقہ پر چلتا رہا۔ پہاڑ کے مختلف نشیب و فراز سے گذرنے میں آج اُس کے قدم اتنے نہیں ڈگمگا رہے تھے — آج اُس کے راستہ میں روشنی سی تھی — اُس کے ارادے میں کسی قدر استقلال، مگر اُس کا دماغ ہمیشہ سے زیادہ پراگندہ تھا اور اُس کے خیالات ضرورت سے زیادہ متلاطم! راستہ میں بہت سی چیزوں نے اُسے روکنا چاہا مگر وہ ہر ایک سے یہی کہتا ہوا کہ "حیرت سے گذر جاؤ اور تعینات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو۔ یہی مقصدِ حیات ہے" آگے بڑھتا چلا گیا اور بالآخر اُس نے اُس وقت دم لیا جب وہ اپنے غار کے سامنے پہونچ گیا — اُس کی رفتار کم ہو گئی اور اُس کے اعضا مضمحل! وہ سیدھا اپنے غار میں چلا گیا اور بغیر کچھ کھائے پئے ایک طرف کو لیٹ گیا۔

تین دن اور تین راتیں اسی طرح گذر گئیں وہ جہاں لیٹا تھا وہیں لیٹا رہا، اُس کی آنکھیں غار کی سیاہ اور کائی آلود چھت کو نہایت خوفناک طریقے پر گھورتی رہیں، گذشتہ تین روز سے ہر چیز بُت تراش کی منتظر ہے — سوائے غار کی نم آلود ہوا، ٹیڑھے اور غیر ہموار پتھروں اور کنارے پر لگی ہوئی کائی کے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ بت تراش کہاں ہے اور کس حال میں ہے — مگر کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔
اس کا سب کو احساس تھا۔ نہ معلوم کیوں ؟

رات ہو چکی ہے .... ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے ... شمشاد اور شاہ بلوط کے تناور درخت عفریت پیکر دیوؤں کی طرح اپنے سروں کو ہلا رہے ہیں ———— آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پراگندہ ہو رہے ہیں! چاندکی سرد اور نورانی وادیوں میں بہنے والی

دوشیزہ ہوا کی تیز رفتار لہروں پہ بیٹھکر زمین کی سیاحت کے لئے آہستہ سے دنیا میں آئی اور خاموشی سے غار میں داخل ہوئی ——— غار کی تاریکی مجسم چاندنی سے بدل گئی ——— بُت تراش بے خبر سو رہا ہے ——— تین دن کے بعد آج اُس کی آنکھ لگی ہے ——— غار کی ہر چیز سو رہی ہے ——— وہ دبے پاؤں واپس لوٹ گئی ——— آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پراگندہ ہو رہے ہیں۔

سوتے سوتے بُت تراش ایک دم اُچھلا اور آنکھیں کھولدیں کچھ عرصے تک بغیر پلک جھپکاتے ہوئے وہ غار کے باہر دیکھتا رہا اور اس کے بعد یکلخت کھڑا ہو گیا ———

اُس نے کچھ دیکھا ہے ——— ایک خواب ——— ایک رنگین نغمہ ——— مجسم نغمہ ——— جو اُس کے دماغ پر حاوی ہے ——— جو ایک عرصہ سے اُس کے قلب کی تنہائیوں میں پرورش پا رہا تھا ——— جسے دیکھنے کی تمنا اُسے ہر وقت بے چین رکھتی تھی ——— جس کے حصول کی آرزو میں وہ زندہ تھا ——— جس کے لئے اُس نے غیر محسوس طریقے پر یہ بہت سے بُت بنا کر ایک معبد تیار کیا تھا ——— آج اُسے بُت تراش نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا!

اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اُس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور رات کی ملی جلی چاندنی اور تاریکی میں اپنے غار سے نکل کر سیدھا معبد کی طرف چلدیا۔ بت تراش نے اُسی درخت کے نیچے جاکر دم لیا جہاں تین چار روز ہوئے اُس نے بڑی دیر تک فاختہ سے باتیں کی تھیں، وہاں پہونچکر اُس نے اپنے اوزار زمین پر رکھدئے اور درخت کے تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے اپنے تصور کی دُنیا میں پھر اُسے ایک بار دیکھنا چاہا جسے وہ ابھی ابھی دیکھ چکا تھا، مگر کامیابی نہ ہوئی اور اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولدیں!

بت تراش تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور اس کے بعد اُٹھکر اپنے معبد کے نیچے پہونچا، وہاں سے اُس نے ایک بڑا سا پتھر کا ٹکڑا اُٹھایا اور پھر اُسی درخت کے نیچے آبیٹھا۔ اُس نے اپنے اوزار اُٹھائے اور پتھر کے ٹکڑے کو جگہ جگہ سے توڑنے اور بنانے لگا!

تاریکی آہستہ آہستہ کم ہوئی .... پو پھٹی .... دن نکل آیا .... دوپہر ہو گئی .... بُت تراش اُسی طرح بیٹھا ہوا کچھ بناتا رہا!

فاختہ کا جوڑا پھر کہیں سے آکر اسی درخت پر بیٹھ گیا۔

"کیا بنا رہے ہو بُت تراش؟"

"جو اکثر نہیں بناتا تھا!"

"اکثر کیا بنایا کرتے تھے بُت تراش؟"

"جو آج نہیں بنا رہا!"

"ہمیں بھی تو معلوم ہو .... کچھ"

"انسانی نسل کے تعلیمیافتہ جہلاء کے لئے ایک معمہ!"

"اور آج کیا بنا رہے ہو؟"

"اپنے لئے ایک معمہ!" بُت تراش نے کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا!

دوپہر، شام میں تبدیل ہو گئی اور شام رات میں .... رات پھر صبح میں بدلی اور صبح اپنے مختلف مدارج سے گذر کر رات ہو گئی اسی طرح پانچ دن اور پانچ راتیں آئیں اور گئیں .... مگر بُت تراش اسی طرح بیٹھا ہوا اپنا کام کرتا رہا!

چھٹے دن صبح کو دو پہر دن چڑھے بُت تراش نے اپنے اوزار رکھدئے .... پتھر کا غیر ہموار ہشت پہل ٹکڑا اور مجسموں سے مختلف .... ایک عورت کا مجسمہ بن چکا تھا!

مجسمہ بن چکا تھا مگر ابھی اُس میں کسی چیز کی کمی تھی! بُت تراش کو اس چیز کا احساس تھا! وہ مجسمہ کو اُٹھا کر معبد پر لے گیا۔ یہاں پہونچکر اُس نے اپنے تمام بت ایک ایک کر کے پھینکدئے جو معبد کی بلندی سے گرے اور زمین کی پستی پر پہونچتے پہونچتے فنا ہو گئے۔ اس کے بعد اُس نے اپنے پریشان بالوں سے معبد کے ایک حصّہ کو صاف کیا اور وہاں اپنے اس نئے مجسّمے کو بڑے "تزک و احتشام" سے رکھا اور اپنا پہلا حقیقی سجدۂ عبودیت اُسکی بارگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔

——— محبت کا وہ سجدۂ اولیں جو ہر مخلوق نے دقیانوسی کہکر ربِّ اعلیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا تھا .... اور جس کے بعد موسیقی کی تخلیق ہوئی تھی اور دُنیا .... آگ دھوئیں اور پانی کی دُنیا .... روشن ہو گئی .... اور جانے کیا کیا ہوا تھا .... اور جس سجدے کو اُس نے اُس بارگاہ پر نچھاور کرنے سے انکار کر دیا تھا .... اور جسے اُس نے اِس آستانے کی نذر کیلئے اس طرح چھپایا تھا جس طرح ایک خوبصورت اور حسین دوشیزہ محبت اور ولا کے لطیف ——— شیریں اور معصوم ——— اچھوتے اور "کنوارے" ——— دردناک اور باایں ہمہ کیف آور تاثرات

کو بنفشہ اور گلِ مہندی کی عطر بیز اور نشہ آمیز خوشبوؤں سے بچا کر اپنے اعماقِ قلب کے منوّر مگر سرد گوشے میں دفن کر لیتی ہے ——

بُت تراش چاہتا تھا کہ دیوی کم از کم اُس کے اس سجدے کو تو شرفِ قبولیت بخش کر اُسے مایوس نہ جانے دے —— ورنہ کہیں تقدیر تماشہ نہ بنا دے!

اس سے فارغ ہو کر اُس نے مجسمہ پر پھر ایک نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ مجسمہ یقیناً اُس کے خواب کی تعبیر تھا —— مگر حرارت کی کمی تھی —— زندگی کا فُقدان تھا! —— اس خیال کے آتے ہی بُت تراش کچھ دیر کے لئے مایوس ہو گیا، لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُس کا چہرہ مسرّت سے تمتما اُٹھا، اُس نے اپنے اوزاروں میں سے چھینی اُٹھائی اور بائیں جانب اپنے دھڑکتے ہوتے دل میں بھونک لی اور مجسمہ کے قدموں سے لپٹ گیا ——

تازہ تازہ خون دھڑکتے ہوتے دل کی زندہ رگوں میں سے اُچھل اُچھل کر مجسمہ پر گر رہا تھا —— دُنیائے محبت میں حُسن اور عشق ہولی کھیل رہے تھے۔

—— دل کا اضطراب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا

…… مجسمہ بھی مکمل ہوتا جا رہا تھا اور مجسمہ ساز بھی ——

مجسمہ کی تکمیل ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ بُت تراش کی بھی!

فاختہ کا جوڑا یہ کہتا ہوا اُڑ گیا "حیرت سے گذر جاؤ …. تعینات کی زنجیروں میں آزادی کی جستجو کرو …. یہی مقصدِ حیات ہے!"

راحت سعید

بنارس —— (بسلسلۂ صفحہ ۳۰)

موجود ہے، اور جس کی وجہ سے مالک مکان کراہتے ہوتے لبِ دمِ مفلس کو نکالنے پر مجبور ہوتا ہے، اِس خیال سے کہ کہیں بعد میں وہ متوفی کے مال چرانے کے الزام میں گرفتار کر کے کچہری میں نہ کھینچا جائے۔

قدیم زمانے کا مکمل ترین شہر اس وقت عہدِ جدید کے شکست انگن گستاخ ہاتھوں میں مجبور پڑا ہوا ہے کیا یہ اپنی اولاد کے لئے چار ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ کی مسلسل ترقی کے بعد اب صرف ایک یادگار بن جائے گا، یا ایک ساحرانہ قوت ایک نئے جوش کے ساتھ ظاہر ہو گی جو قوم کی رگوں میں دوڑ رہی ہے جو اسکے دریائے

نغمۂ نور

دل میرا تیرا تابعِ فرماں ہے کیا کروں
اب تیرا کفر ہی مرا ایماں ہے کیا کروں

باہوش ہوں مگر مرا دامن ہے چاک چاک
عالم یہ دیکھ دیکھ کے حیراں ہے کیا کروں

کہتا نہیں ہوں اور زمانہ ہے باخبر
چہرے سے دل کا حال نمایاں ہے کیا کروں

ہر طرح کا سکون ہے ہر طرح کا ہے کیف
پھر بھی یہ میرا قلب پریشاں ہے کیا کروں

دامن کروں نہ چاک یہ ممکن تو ہے مگر
مضطر مرا ایک تارِ گریباں ہے کیا کروں

اشکوں کی داستاں کو چھپانا محال ہے
دامن پہ ایک داغ نمایاں ہے کیا کروں

اک بیوفا کے واسطے سب کچھ لُٹا دیا
بہزاد اب نہ دیں ہے نہ ایماں ہے کیا کروں

بہزاد لکھنوی

حیات کو نئے سرے سے موجزن بنا دیگی۔

(مارگریٹ) مترجمہ عبید اللہ قدسی:

خدا کے حریف

شاعر

شعر میرے پھول بھی ہیں اور انگارے بھی ہیں
سنگ ریزے بھی ہیں، سیارے بھی، مہ پارے بھی ہیں

شعر سے میں نے کیا ہے گرمِ حشرِ کارزار
شعر سے میں نے اُلٹ دی ہے بساطِ روزگار

شعر میں پیدا کیا میں نے محبت کا ظہور
شعر سے میں نے مٹایا ہے حکومت کا غرور

شعر سے برسائی ہے میں نے ستم خانوں پہ آگ
شعر سے چھیڑا ہے زندانوں میں آزادی کا راگ

شعر سے چھیلا ہے جابر کی رگِ آزاد کو
شعر سے دی ہے شفا میں نے دلِ بیمار کو

شعر ہیں لبریز میرے کیفیت سے درد سے
طور بن کر یہ نکلتے ہیں حجابِ گرد سے

شعر میرے وحی بھی، پیغام بھی، الہام بھی
قائدِ اعظم ہوں، پیغمبر ہے میرا نام بھی

بادہ خوار

ظرف ہے میرا سمندر، میرا ساغر آفتاب
نکہتِ سرو سمن مستی، شفق میری شراب

چاندنی بہتی ہے میرے ساغرِ زرکار سے
نور کا چشمہ اُبلتا ہے دلِ سرشار سے

ڈال کر نظریں جواں ہر شے کو کر دیتا ہوں میں
خشکیوں میں مستیوں کا رنگ بھر دیتا ہوں میں

رنگ بھرتا ہوں گُنا ہوں کا میں زلفِ شام میں
جذب کر دیتا ہوں فتنے گردشِ ایام میں

میرے مشرب سے ہویدا ہیں رموزِ بے خودی
صوفیوں کے زہد کا سرمایہ میری زندگی

ایک دنیا ہے خرابِ غم مری تقلید میں
میرے ساغر کی کھنک ہے نغمۂ ناہید میں

چند جُرعے پی کے جب بدمست ہو جاتا ہوں میں
دو جہاں کو ٹھوکروں میں سجدہ سا پاتا ہوں میں

سرمایہ دار

سیم و زر نے ہر طرف سے یوں مجھے رکھا ہے گھیر
پھیل جاتے ہیں فلک پر جس طرح تاروں کے ڈھیر

دل میں نشۂ ملکیت کا سر میں دولت کا غرور
بھاگتی ہے مفلسی سائے سے میرے دُور دُور

بے گُنہ لوگوں کو سولی پر چڑھا سکتا ہوں میں
مجرمِ سنگین کو پھانسی سے بچا سکتا ہوں میں

جوہرِ عصمت مرے سکوں کی تعدادِ قلیل
میرا اِک اُگلا نوالہ لاکھ کُنبوں کا کفیل

میری وزنی تھیلیوں میں خون ہے مزدور کا
ہر اشارہ میرا اِک قانون ہے مزدور کا

پُرخطر میری محبت دوستی بھی خوفناک
پیار سے میں ڈالتا ہوں دوستوں کے سر پہ خاک

زندگی کی بھی ضرورت ہو تو دے سکتا ہوں میں
میرا دعویٰ ہے خدا کو مول لے سکتا ہوں میں

انسان

میری ہستی کا نہیں پیدا دو عالم میں جواب — آب و گِل میرا نقاب اور مَیں حقیقت کا حجاب
میرے ایواں کا ہمالہ ایک قد آور ستوں — چاند سورج قمقمے، چھت آسمانِ نیلگوں
نزہتیں میرے لئے رنگینیاں میرے لئے — حسن بھی ہے اک نشاطِ جاوداں میرے لئے
حاصلِ ایجاد، فطرت کا ہوں یکتا شاہکار — نازشِ کونین، عالم ساز، فخرِ روزگار
میرا دل کچھ بھی سہی لیکن دُرِ نایاب ہے — اس کی نازک رگ میں رنگ و نور کا سیلاب ہے
دبدبے بھی مانگتے ہیں میری ہیبت سے پناہ — زلزلوں کی بھی مرے آگے لرزتی ہے نگاہ

ضد پر آؤں تو کسی سے بھی نہیں ڈرتا ہوں میں
سجدہ بھولے سے خدا کو بھی نہیں کرتا ہوں مَیں

شیطان

میں خدا کی بزم کا اک عابدِ مغرور ہوں — اب خدا سے بھی زیادہ دہر میں مشہور ہوں
جاگتا ہوں صبح کو مَیں پہلوئے زردار میں — رات کو سوتا ہوں اکثر حسن کے بازار میں
جھونپڑی پر میرا سایہ قصر بھی میرا مکاں — خاک پر بھی حکمراں مَیں تخت پر بھی حکمراں
اب خدا بھی میری ہستی کو مٹا سکتا نہیں — آگ جو میں نے لگا دی ہے بجھا سکتا نہیں
روزِ اوّل سے جہاں کو کرتا آیا ہوں خراب — کون ہے جولانیٔ میری شورش و یورش کی تاب
میری نظریں حق شکن ہیں اور مَیں یزداں شکار — ہوں علمبردارِ مکر و فن خدائے انتشار

یہ مرا بڑھتا ہوا طوفان رک سکتا نہیں
حشر تک میرا سرِ مغرور جھک سکتا نہیں

مخمور جالندھری

گدھا کانفرنس

کیوں جناب ہم نہ کہتے تھے؟ اور بنایئے انجمنیں اور کیجئے کانفرنسیں لا لاکھ لاکھ سمجھایا بار بار جتایا کہ دیکھو یار دگھر کے حواس کلھیا میں بند کر کے، گرہ کی عقل کوال چھوڑ کے، پرائے خشکے پہ شکرا پالنا، بات بات پہ، وہ جو مثل ہے کہ نون نہیں، لا میری پالکی، تیل نہیں، لا میری پالکی۔ نوے تکاری کے لئے، چولھے چکی کے لئے انجمنیں بنانا، کانفرنسیں بٹھانا تمہیں راس نہیں آنے کا، بقول ہمارے لالہ جی کے، بچے ما ملو تو بڑو کھوٹو ے ساب منکہ۔ تو بھلے مانس کان میں انگلیاں دئے بیٹھے رہے۔ ایک نہ سُنی۔ گلی پھانس اور بنی انجمن، آئی چھینک اور رچائی کانفرنس! پھر یہ آندھی چلی تو اللہ دے اور بندہ لے۔

اتنے ہی پہ قرار آجاتا تو بس تھا، ایک لال بجھکڑ کا بیٹا جو بھولا، تو نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس سرے سے اُس سرے تک اپنے بیگانے، اڑوسی پڑوسی سب کو سمیٹ، لگا دُم گزا نام رکھا "آل انڈیا کانفرنس" اب حالت یہ ہے کہ یہی آل انڈیا جو آکاش بیل کی طرح پھیلا ہے، تو ہمالیہ کی چوٹی سے لنکا جی کی ایڑی تک، تو میں، ایرا غیرا، نتھو خیرا سبھی اس نماجال کے جنجال میں پھنسے ہیں۔ جیسے آل انڈیا پیٹ بھرے کانفرنس، آل انڈیا خالی پیٹ کانفرنس، آل انڈیا سالن کانفرنس، آل انڈیا روٹی کانفرنس، آل انڈیا میاں کانفرنس، آل انڈیا بیوی کانفرنس آل انڈیا دھوتی کانفرنس، آل انڈیا ٹوپی کانفرنس، آل انڈیا یہ کانفرنس آل انڈیا وہ کانفرنس۔ غرض کہ اس آل انڈیا کے ایک انڈے سے اتنے بچے نکلے ہیں کہ اب گھر میں کھانے کو دانہ ہے نہ خیر سے ٹاپے میں رہنے کو ٹھکانا، آپ بھگتئے اس کانفرنس بازی کا خمیازہ، یعنی سُن لیجئے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑا۔ غضب خدا کا جو مخلوق قطب شمالی سے قطب جنوبی تک سندی احمق، بین الاقوامی گھامڑ کہی سُنی اور سمجھی جاتی تھی، اُس نے بھی سنبھالا لیا، اور عین اُس وقت کہ ہم کہہ رہے ہیں اور آپ سُن رہے ہیں، گدھا کانفرنس جُڑی ہے، اور صدارت کا خطبہ صادر ہونے کو ہے۔

افسوس ہے کہ جلسے کا پورا پورا لطف آپ نہ اُٹھا سکیں گے، وجوہ ناگزیر ہیں، تقریب گدھوں کی ہے، کارروائی راز میں ہے اور خود آپ کا رپورٹر غیر برادری ہونے کی بنا پر، یا دولتیوں کے ڈر سے جلسہ گاہ سے باہر۔

لیجئے ہل چل بند، چیخ پکار ممنوع۔ فضا میں سناٹا، کان کھڑے ہیں، دُم بلی، صدر صاحب شروع ہو گئے۔

"قوم کے کھمبو! برادری کی چھتو! بھائی گدھو اور گدھی بہنو! جیسے بیساکھ کی چلچلاتی دوپہر، تپتی دھوپ اور جھلسی ہوئی دوب کے اس فرحت بخش بنجر میں آپ کے یہ مطمئن اور بشاش چہرے، آپ کی یہ خاموش اور ہمہ تن جوش بھیڑ دیکھ کر جی بے اختیار "ہیں چو ہیں چو" کرنے کو چاہا، مگر میرے جذبات خود داری جوتی پیزار، دھینگا مشتی پر اتر آئے؛ جب میں نے محسوس کیا کہ اس یادگار موقع پر آپ میں سے بعض حضرات کے پھولے ہوئے نتھنے اور لٹکی ہوئی تھوتھڑیاں چغلی کھا رہی ہیں کہ جیسے خدا نہ کرے مجھ میں انس کی بو آتی ہو۔ منہ میں ہری گھاس لیکر کہتا ہوں کہ اگر میرے شبہات صحیح ہیں تو آپ نے گدھے کی فطرت میں بٹا لگایا، اور قصور معاف، اپنے کردار کے خلاف بغاوت کی۔ آپ بدگمان نہ ہوں۔ حریفوں میں عمر کا سوفی صد حصہ گزارنے، اور دودھ کے دانت گرنے سے، دُم جھڑنے تک، دشمنوں میں یک جان دو قالب کی طرح بسر کرنے کے باوجود، پاتا ہوں کہ نصیب عدا آدمیت کی بوباس سے آج بھی ویسا ہی معرّا ہوں جیسا کہ روئے خس کی مہک سے مٹی کا تیل، یا خود ہمارے سر سے سینگ! یقین کیجئے کہ آپ کی روایتی بردباری اور پشتینی تحمل پر مجھے بدہضمی کی حد تک اعتماد نہ ہوتا تو شاید آسمانی سلطانی، یا بجلی پانی کی بڑی سے بڑی طاقت اس پیر خرف کو اپنے خداوند مجازی یعنی کلوا دھوبی کی ہاتی برابر لادی پٹک کر راہ فرار اختیار کرنے، اور اس قومی جلسے کی صدارت کا خوشگوار بار اُٹھانے پر مجبور نہ کر سکتی۔ یہی نہیں، نیک نیتی مجھے یہ عرض کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ خدانخواستہ گدھا کانفرنس کی صدارت کا اعزاز اگر آپ نے اس مغالطے میں بخشا ہے کہ یہ ہیچ مداں قوم کا سب سے برگزیدہ تجربہ کار اور زمانے کا نبض شناس فرد ہے، تو معاذ اللہ مجھے آپ کے حسن ظن پر ماتم اور اپنے ساتھ ساری جماعت کی پوزیشن صاف کرنا پڑیگی، سمجھئے اور ہو سکے تو یاد رکھئے گدھے کی حیثیت سے ہماری ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ حُسن اتفاق سے جو گدھا ہے وہ ازل ہی سے گدھا ہے، اور اُس کا فرض عین ہے کہ ابد تک گدھا ہی رہے، اتنا ہی نہیں، گدھے پن میں اصول مساوات پر ہمارے اسلاف اتنے مصر اور سختی سے کاربند رہے؟

ہیں، کہ ہر گدھے کا بچہ ماں کے پیٹ ہی میں آخری کسر تک باپ گدھے کے مساوی ہی تسلیم کیا گیا ہے، آزمائش کے لئے آپ میں سے جس کا جی چاہے آدمی کا بہروپ بھر دیکھے، چیلنج دیتا ہوں کہ رنگ روغن جب اُڑے گا۔ گدھا اور نرا گدھا ہی برآمد ہوگا۔

بہرکیف باپ دادا کے نقشِ قدم پر چلنے والا یہ بدنام کنندہ نکونامے چند کسی مغالطے یا خود فریبی کو اپنے لیے کسی قیمت پر بھی جائز رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ مدارج کی زبان سے زیادہ برتری جو آپ کے کسی فرد پر بے سر تھوپی جا سکتی ہے اتنی ہی ہے، کہ دو منہ گھاس آپ سے بڑھ کر کھائی ہوگی، یا چار دولتیاں آپ سے زیادہ جھاڑی ہونگی، بس۔

دوستو! آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ آرام کی میٹھی نیند سونیوالے کو جھنجوڑ کر چونکا یا جائے تو تنتالیسویں صدی پاؤں کی عزت بات میں لے لیتا ہے، پھر یہ بیسویں صدی کے فلفل مزاج گدھے کچھ ایسی پتلی کانچ کا مزاج لیکر آئے ہیں، کہ ادھر کسی بُرانے خرانٹ کے منہ کی بھاپ لگی، ادھر تاؤ تیز ہوا، اور ہوئے چھن سے ایک کے ہزار ٹکڑے، اسی خطرے سے بچاؤ کے لئے میں نے آپ کی صدارت کا جوا کاندھے پر رکھتے ہوئے ٹھان لی تھی، کہ دھواں دھار تقریر اور علم کے رزولیشنوں سے اتنا ہی گریز کروں جتنا پانی سے افیمی، یا پولس سے بدمعاش، اور بیداری کی پہلی جماہی آتے ہی یاد دلا دوں کہ آپ کیا تھے، کیا ہوئے۔ اور بنصیب دشمناں اب بھی لوٹ نہ لی تو کیا ہو جائیں گے، ہم گدھے نہیں لدھے ہیں، اگر بارہ برس بعد اُس کے دن پھر سکتے ہیں تو کیا معنی کہ آپ کے دن نہ پھریں۔

علم سینہ کی بعض پیچ در پیچ اور گول مول بلکہ بیچ پوچھیے تو بےمعنی روایتوں سے ہمارے کسی نہ کسی جدِ اعلیٰ کا وجود اس دور میں ثابت کیا جا سکتا ہے جب حکیم تقنس مشہور ماہر فلکیات کی تحقیق کے مطابق آسمان زمین نئے نئے بنے تھے، سورج برف کا ٹھنڈا گولہ، اور چاند کی بڑھیا تاروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی، اور بادلوں سے پانی کے بجائے کھیلے بتاشے، یا لڈو پیڑے برسا کرتے تھے۔ ان ہی روایتوں سے اس بات کے بھی آتے پتے ملتے ہیں کہ ہماری جدیت کے دعویدار دو بزرگوار تھے، ایک گھوڑے صاحب، دوسرے خچر میاں، اپنے اپنے دعووں کے ثبوت میں دونوں نے کیسا کیسا لت یاؤ کیا ہوگا تاریخ کا منہ کیلا ہوا ہے۔ البتہ ہمارے پرائیویٹ احساسات ٹٹولے جائیں تو لے سمجھے بوجھے یہ بدیہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں اولوالعزم ہستیوں میں ہمارے دادا بننے کی اتنی ہی صلاحیت پائی جاتی ہے جتنی کسی مرغی میں انڈے دینے کی قابلیت، کان کی نوکیں چھانٹ دیجئے، دو مٹھی دُم عنایت ہو، بات بھر بیل بڑھ جائے۔ اور گلا ایک ذرا سُریلا ہو جائے، پھر کوئی ملوتری ہم میں اور گھوڑے داد میں رتی بھر فرق نکال دے تو چونیا گرا دیجئے، اور یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ میاں خچر اور ہمارے درمیان صرف مزاج کی ٹیڑھ اور رفتار کی اونچ نیچ کا بل ہے، سو۔ ایک توے کی روٹی، کیا چھوٹی کیا موٹی۔

غرض کہ رچ۔ دو عملی میں ہمارا آشیاں تھا۔ کہ تاریخ کے حروف ما نا پڑ گئے، اور پیڑھی در پیڑھی گزرنے پر دوبارہ اُبھرے تو وہ سنہری دور آ چکا تھا جب ایک کلّے پر چانٹا کھا کے دوسرے کی بھی ننگی دکھانا ثواب سمجھا جاتا تھا، اور ہمارا منطقی بھائی انسان، انسانیت کے اونچے چھپر سے قلابازی کھا کر آدمیت کی خندق میں نہیں گرا تھا، اپنے منہ میاں مٹھو بننا اگر عیب نہ گنا جاتا۔ تو خاک چاٹ کے کہتا ہوں، ڈھول پیٹ پیٹ کر یہ بھید کھولتا کہ یہ ہماری مرنجان طبیعت، یہ سیدھا سپاٹ مزاج، اور ہماری یہ پالیسی کہ "اودھو کا دین نہ مادھو کا لین" جو اس کھینچ تان کے زمانے میں بھی ہمارا قومی امتیاز ہے، اُسی دورِ زرّیں کی امانت ہے جس کی ایک ادنیٰ سی برکت یہ ہے کہ دنیا ایک ہی گت ناچتے ناچتے اتنی اکتائی کہ بے تالی ہو گئی۔ مگر ہم ہیں کہ آج تک اسی لے میں گڑے ہوئے ہیں جس سے اُٹھے تھے۔

بھائیو آؤ! اس زمانے کی یاد تازہ کرتے ہوئے ایک جھرجھری لیں، اور منہ اٹھا کر بیساختہ "ہیں چوں ہیں چوں" کریں، یوں دنیا کو جتا دیں، کہ ع۔

ہر چند بے سُرے ہیں مگر بولتے تو ہیں،

برادرانِ ملت پر بات یاد پھر آئی۔ ہو چکی تھی اگرچہ ساری بات، آج مجمع کو اغیار سے خالی پاکر جرأت کرتا ہوں، اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ایسی ڈھکی چھپی بھی تم پر کھول دوں جس کو بھلا کر تم نے ہمسایوں کی نگاہ میں اپنا نہیں ساری گدھا برادری کا وقار غت ربود کر دیا، اور انہیں یقین دلا دیا کہ ان بہری خچگوں کے جارحانہ تو کیا مدافعانہ ہتھیار بھی کند ہو گئے۔

جانتے ہو کہ تمہارے کردار کو ایک مکمل گدھے کی باعزت حیثیت تک ترقی دینے میں باہری علتوں کے سوا ایک اندرونی حادثہ بھی کارفرما ہے، یہ تمہارے اعضا کی بناوٹ اور کردار سے اُن کے لگاؤ کا مسئلہ ہے، اور اس حد تک نازک اور دقیق ہے کہ بجز ہمارے قومی مفکروں کے تحقیق اور جستجو کے دوسرے مدعی اس کو نظر انداز کر دینے پر ہمیشہ مجبور پائے گئے ہیں، باوجودیکہ اس کم سواد پر قومی معلومات کے ماہرِ اعظم

ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ مگر میں بھی پریشان ہوں کہ دم سے شروع کروں یا سر سے۔ گدھے کی کوئی چیز ایک دوسرے سے افضل نہیں۔ بہرصورت گفتگو کی ابتدا سر سے کیجئے، تو آپ پائیں گے کہ اس کے اندر بھیجا تو ہے مگر کھانے کے کام کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ذات بھائی دنس پانچ ملکر کبھی کاؤں کاؤں کرتے سنائی نہیں دیتے۔ اپنی اپنی جگہ اپنے خیال میں ڈوبے ہوئے کھڑے ہیں تو کھڑے ہیں۔ جس کا جی چاہے اس یکسوئی کی تقلید کرے۔ طرفہ ماجرا یہ کہ اس بھیجے میں نہ کوئی تجرہ ہے نہ دالان۔ کہ عقل سی مفسدِ صحت، مخلِ اوقات، بِس کی گانٹھ، فساد کی پُڑیا، فتنے کی جڑ اوس میں رہتے بسے، اور کرایہ میں ہماری ہی زندگی اجیرن کر دے۔ بھیجے کی اس سادگی کا طفیل ہے کہ آج تک ہماری قوم کا کوئی فرد نہ کبھی جیل گیا نہ پاگل خانے میں دیکھا اور چھٹے چھ ماہے کوئی بھولا بسرا اگر کانجی ہوس چلا بھی گیا، تو اس کا محرک ہمارا دماغ نہیں گیہوں یا چنے کا وہ لہلہاتا کھیت ہوتا ہے جس کی سبزی اور گل ریزی کا لطف اٹھانے اور راتب ہی من بھایا تو نمک چشی کے لئے چار تنکے منہ میں ڈال لینے بھر کے ہم ذمہ دار ضرور ہوتے ہیں، یا وہ خسیس تنگ دل اور بدمذاق کسان، جو ہمارے ذوقِ بہار پرستی کی داد نہ دیتے ہوئے اپنے پتے پتے کو جیون مور کی بوٹی یا اکسیرِ اعظم سمجھ کر ہمارے اور کھیت کے درمیان ببول کے کانٹے حائل کر دیتا ہے، اور ذرا نہیں شرماتا کہ ہم کس فراخدلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے آبائی رمنوں میں اُس کو گھاس چھیلنے یا الاؤ کے لئے سوکھے پتے بٹورنے دیتے ہیں اور ذرا نہیں کرتے، خیر، یہ ایک سرسری بات تھی۔ ہماری قوتِ حافظہ اس ڈھنگ پر رکھی گئی ہے کہ حد سے زیادہ پاؤں نہ پھیلا سکے، نہ خواہ مخواہ ہمارے روزمرہ میں دخل دے۔ خانگی افکار، یا قومی کاروبار میں ڈھیلے ڈھالے، دن دُو دن، کسی چراگاہ میں، قصبے کی گلی کوچوں میں، یا کسی ادھر بنجر میں گزر رہا ہیں، تو یاد دلا دے کہ اب مٹھو دھوبی کے گھر جانا ہے یا رامو کمہار کے، اور یہ نہ بتائے کہ اس رخصت بلا استحقاق پر ڈنڈے پوجیں گے، لات کی کے ذریعہ جو بازپرس ہوگی، اُس کا "ہیں چو، ہیں چو" کے سوا ہمارے پاس اور کوئی جواب بھی ہے۔

ہونٹوں چڑھی کوٹھوں چڑھی، کے ڈر سے صاف صاف نہیں کہہ سکتا، اشارے کنائے کی آڑ میں کہتا ہوں، کہ اسی دماغ میں ان خوردبینی جراثیم کی پیشینگوئی بھی کی گئی ہے، جن کی پُراسرار اور ترقی یافتہ قوتوں سے ایک زمانہ آئے گا کہ دجّال سی فتنہ خیز ہستی اُٹھے گی اور فائدہ اُٹھائے گی، یہ سوال کہ اس کے انتخاب کی داد دی جائے یا اپنی قوم کو مبارکباد، آج تک چیستاں بنا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہم ہر وقت گردن ڈالے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ گویا ایک پیکرِ جمود ہیں کہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے، کم نظرے کیا جانیں کہ یہ دراصل ہماری دماغی ادھیڑبن کی دلیل ہے کہ گھاس کی درآمد برآمد، گھسیاروں کی چوری اور سینہ زوری، یا واشنگ کمپنیوں کی کمی زیادتی کا ہماری آئندہ زندگی پر کیا اقتصادی اثر پڑنے والا ہے، یا پھر علامت ہے اُس انکسار کی جو طاؤس، لقہ کبوتر اور راج ہنس سی اکڑباز شیخی خوروں کے ہاں عنقا کا حکم رکھتا ہے۔

کبھی اپنی بتیسی دیکھی ہے؟ کیسی صاف جیسے موتی، کیسی مسلسل، جیسے مالا، اور کتنی بے ضرر کہ ڈرپوک سا ڈرپوک، آپ سے نڈر! آپ پر شیر کا گماں؟ نعوذ باللہ! آپ کے جبڑوں سے اندیشہ؟ استغفر اللہ!

اس موقع پر یہ بھی نوٹ کیجئے کہ اگر ہم گدھے اہنسا کے قائل نہ ہوتے تو اپنے سُم پنجوں سے بدلوا کر اُس خونی برادری میں جنم لیتے جس کا نام سُن کر، ورنہیں اور نہیں، تپ تو چڑھ ہی آتی ہے، ہمارے نزدیک مچھر کی نکسیر پھوڑنا بھی قتلِ عمد کے مساوی ہے، چنانچہ یہ سُم تو ہماری ٹانگوں کی طاقتِ رفتار کو اعتدال پر رکھنے کے کام آتے ہیں۔ یا ایسے ہی کبھی دولتی چلانے کی نوبت آئے تو اُس کے جھٹکے کو چوٹ پروف بناتے ہیں۔

دوستو! گفتگو شیطان کی آنت ہو چلی، میں دیر تک تمہارے ضبط سے کھیلتا رہا، ایک جملہ اپنی کھال کے متعلق بھی سُن لو، وہ یہ کہ فی الحال تمہاری کھال شال کا کام دیتی ہے، مگر جب تم نہ ہوگے، تمہاری کھال کی یادگار، کیمخت کے جوتے برتے جائیں گے، اور قیامت کے بگل بجنے تک تمہاری ارواح کو ثواب پہونچائیں گے۔ لو، گفتگو ختم ہوئی فقط دُم کی کسر ہے، سر سے پاؤں تک تمہارے بدن میں بے چین اگر کوئی ہے تو تمہاری دُم ہے، کوئی مانے یا نہ مانے، مگر کسی طبلچی سے اپنی دُم کی قدر پوچھو۔ "گدھے کی دُم کا ٹھیکہ بجاتا ہے"، تمہاری اُستادی، اپنی شاگردی کا معترف ہے اور تمہارا نام آتے ہی کان پکڑتا ہے۔

غرض کہ یہ تھے ہم، اور یونہی رہتے اگر بدقسمتی سے یہ آدمی کا بچہ ہمارے معاملات میں دخل در معقولات نہ بنتا اور عقل کی لگائی بجھائی میں آکر ہم سے دشمنی نہ باندھتا، اس نے ہر چیز پر اپنا کرورا بٹھایا، جھاڑ پہاڑ کیڑے مکوڑوں تک اپنا گز سکہ چلایا۔ ہم گدھے تھے، ہم نے احتجاج کیا، اپنی پوری پوزیشن واضح کی، مگر آدمی جو آج تک خود نہ سمجھ سکا کہ میں کیا ہوں، کیا جانتا کہ گدھے کون ہیں، پھر کیا ہوا؟ ناگفتنی ہے، مختصراً ہم اڑے رہے کہ گدھے رہیں گے، وہ مُصر رہا کہ آدمیت سیکھنا ہوگی۔ جدائی کی بنیادیں پڑ گئیں، علیحدگی کی دیواریں کھڑی ہوگئیں، رفتہ رفتہ ہم نے

اپنی دُنیا الگ بنائی۔ اور اپنے رسم و رواج کو سینے سے لگائے ہوئے وہ کیا جو ایک گدھے کو کرنا چاہیئے تھا، یعنی آدمی اور اُس کی گڑھی ہوئی آدمیت کو، بھاری پتھر تھا، چُوم کر چھوڑ دیا اور ایسے ہوگئے کہ ۔ ان تلوں تیل ہی نہ تھا گویا، ہم سے کچھ میل ہی نہ تھا گویا' اِس ترک موالات کا انتقام آدمی نے اُس گندے پروپگنڈے سے لیا' جو صدیوں سے ہمارے خلاف جاری ہے' اور اگر ہم گدھے ہی رہے، جیساکہ رہینگے، تو اُس وقت تک جاری رہیگا کہ دجّال کی پُرجلال تشریف آوری کا ہلڑ مچے، اور ہمیں اُن کی سرپرستی اور غاشیہ برداری کا شرف حاصل ہو۔

آپ کی دلچسپی کے لئے، نقلِ کُفر کُفر نہ باشد، آدمی کی زباندرازی کے دوچار نمونے سُناتا ہوں، ہنسی اس پر آتی ہے کہ تیزی میں آکر کہہ تو جاتا ہے، مگر ذرا نہیں سوچتا کہ اُلٹی آنتیں اُسی کے گلے پڑتی ہیں، مشہور ہے کہ ؎

خرِ عیسےٰ اگر بہ مکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

اوّل تو تاریخ کے اعتبار سے اِس واقعہ کا امکان غلط، پھر ہم کہتے ہیں کہ بھلے آدمی تیری ذات والے کتنے ایسے ہیں جو وہاں جاکر آدمی ہی لوٹتے ہیں۔ شکر ہے کہ ہم تو جیسے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے! ایک کہنے والے نے یہ کہکر اپنے نزدیک بڑا ہدف مارا کہ ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

یعنی گھوڑے بوجھوں مرتے ہیں، گدھے سونے کے طوق پہنتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ اس مطلبی آدمی نے، گھوڑے دادا کو چنگ پر چڑھا کر ہم سے بدظن کرانے کی ٹھانی۔ کوئی پوچھے کہ بھیّا طوق ملنے پر تجھے کس قاعدے سے حسد ہوا، اس کا گلہ کوئی بھیڑا کرتا تو واجبی تھا ہم دونوں بھگت لیتے۔

یہی کیا، ہمیں چڑانے کے لئے مذموم چیزوں کے لئے ہمارا نام لگا کر الفاظ تراشے، جھجی کوڑی کو "شتر مُرغ"، "فیل وار" کہتے منہ دُکھتا تھا، "خرمہرہ خروار" کہا۔ زخم کے لئے "خراش"۔ گڑھا۔ غل غپاڑے کے لئے "خروش" بنایا، چڑچڑے کو "خردماغ" کہا۔ بُرے کو "خراب" ویرانے کے لئے "خرابہ" وضع کیا۔ مکروہ صورت کیکڑے کو "خرچنگ" پکارا بڑھے "خرف" بنے۔ مال گنوا کر "خرچ" کیا۔ شراب خانے کو "خرابات" جھگڑے کو "خرخشہ" بنایا۔ اس پر چین نہ آیا، کتے نے کاٹا "گوش خر" تجویز ہوا۔ کھا کھا کر موٹا ہوا تو "گدھے کی طرح پھولا"! دوستو! سُنتے سُنتے کان بہرے ہو جائینگے اور یہ فہرست ختم نہ ہوگی۔

واقعات ہوچکے، حالات سُن چکے، مطالبات کی باری ہے۔

گدھوں کی خیر رہے۔ گرمی کی رُت آئے، بیت جھڑ ہو، گھاس سوکھے، تب اسی بنجر میں، اسی چلتی لو میں، آئندہ جیٹھ کی پو۔ نمائشی کو ہم تم پھر ملیں گے۔ لوند ملا کے سال کے تیرہ مہینے دیتا ہوں، سوچ بچار کے آنا کہ بس کانفرنس کی رائے میں یہ اور مشین گنوں کے ساتھ ساتھ دُنیا کا جغرافیہ بدلنے کے لئے گدھوں کے بل بیوانا بھی کارآمد ہے، توجہ میں گدھوں کی سفرمینا بھی رکھی جائے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں گھوڑے اور گدھے میں تمیز کرنا ہمارے قومی احساسات کی توہین ہے، جرم قابلِ دست اندازی پولس قرار دیا جائے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں ڈربی کی ریس میں صرف گھوڑے دوڑانا گدھوں کے سول حقوق کو پامال کرنا ہے۔ آئندہ ہمارے منتخب نمائندوں کو بھی اشتراکِ عمل کی دعوت دی جائے، ورنہ گدھے اپنے کو دیوانی چارہ جوئی پر مجبور پائیں گے۔ اور مہنگے خرچے کا بوجھ نہ اُٹھائیں گے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں جائز نہیں ہے کہ آدمی اپنے کسی ہم جنس کو ہمارے معزز نام سے یاد کرے، بشرطیکہ گدھوں کی پنچایت یہ ملیہ آراسٹ کردے کہ مسمی، ہمارے کم از کم تین پوتھوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔

یہ کہ، اس کانفرنس کی رائے میں .... دوستو ٹھہرو! وہ دُور سے کلو دھوبی ہاتھ میں ڈنڈا، بغل میں رسّی دبائے دکھائی دے رہا ہے، خطبہ ختم کانفرنس ملتوی، باعزت پسپائی، ورنہ پہلے پکار کی نوبت نہ آئے۔ راہ مولا ایک ایک دولتی جھاڑو اور دم دبائے جدھر سینگ سمائے غائب ہو جاؤ۔

"آوارہ"

انتقام

۱۔ سازِ شکستہ

رات سنسان تھی لیکن کیف و رومان سے لبریز۔ بعض وقت کی تنہائی بھی کتنی نشاط انگیز ہوتی ہے۔ جھیل شوشتر کے کنارے سلمیٰ خالہ کی چھوٹی سی سبز کوٹھی زمرد بجلی کی روشنی میں انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ جھیل کا پانی بالکل خاموش اور ساکت تھا جیسے کوئی سفید چادر۔ دور جھیل کے اس پار نشاط ریسٹوران میں ایک اکیلی روشنی جاذبِ توجہ تھی —— اس وقت گیارہ بجے رات کو اس روشنی کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے! وہی جس کے لئے ریسٹوران بدنام تھا —— سلمیٰ خالہ کتب خانہ کی قدِ آدم کھڑکی کھولے عجب محویت کے عالم میں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی سبز اونی چادر اُن کے شانوں سے کھسک کر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں کھڑکی کا ایک پٹ پکڑے پاس ہی کھڑی تھی۔ مغربی ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے بہت نشہ آور تھے رات رانی کی خوشبو سے سارا کمرہ اُڑا جاتا۔

سلمیٰ خالہ کے چہرے کی نرم گلابی کھال چمک رہی تھی۔ اُن کی صاف اور شفاف بلند پیشانی رنج والم کے نشانات سے پاک تھی لیکن اُن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بڑی ہی گہرائی تھی جس کو اُن کی لمبی لمبی پلکیں بھی نہ چھپا سکتیں۔ ان کی اس وقت کی خود فراموشی بڑی ہی دلفریب تھی۔

دفعتاً خالہ میری طرف مخاطب ہوئیں: "رضیہ وہ روشنی دیکھو!" اُنہوں نے جھیل کے اُس پار کی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جیسے مستقبل بعید کی کوئی اُمیدِ موہوم!" میں نے کہا۔

"نہیں! جیسے ماضی بعید کی کوئی تڑپتی یاد" سلمیٰ خالہ نے ایک تلخ ہنسی ہنستے ہوتے کہا۔

"کیوں خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"چاروں طرف کی تاریکی تو دیکھو!"

"آپ کیا یاد کر رہی ہیں؟ بتایئے!" میں نے خالہ کا مغموم چہرہ دیکھ کر بڑی لجاجت سے انکا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بتاؤں؟" بڑی محبت سے مسکراتے ہوئے خالہ میری طرف جھکیں دریچھ کہنے ہی کو تھیں کہ پھر رک گئیں —— جیسے کوئی کسی پیاسے کی حلق پر پانی ڈالنے کے لئے صراحی جھکائے لیکن جیسے ہی پہلا قطرہ ٹپکنے کو ہو صراحی پھر سیدھی کر لے —— میں پیاسی کی پیاسی ہی رہ گئی۔

خالہ نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور کہنے لگیں: "مستقبل بعید کی کوئی اُمیدِ موہوم! تیری شادی! بڑی مکار ہے تو!"

وہ ہنس رہی تھیں لیکن میں سمجھی کہ ان کا دل کُڑھ رہا ہے۔ میں اپنی خوابگاہ کی طرف چلی گئی۔

۲۔ جوانی دیوانی

صبح کی پہلی کرنوں میں سلمیٰ خالہ کا چہرہ اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے اُن کے ہیروں کے آویزے۔ رات کی سیاہی کے ساتھ اُن کے غم کی سیاہی بھی کافور ہو چکی تھی۔ وہ اس پھول کی طرح شاداب تھیں جسے پہلے پہل نسیمِ سحر نے جگایا ہو۔ ناشتہ کے بعد ہم لوگ باغ میں ٹہلنے چلے گئے۔

"کیسی ہے یہ نئی ماما کلثوم" خالہ نے پوچھا۔

"بہت بری" میں نے منہ بنا کر کہا۔

خالہ بے اختیار ہنسنے لگیں "کیوں؟"

"صورت نہیں اچھی اس کی! چڑیل ہے پوری چڑیل" میں نے کہا۔

خالہ اتنا ہنسیں کہ ہنستے ہنستے بے دم ہو گئیں اور ایک بنچ پر بیٹھ گئیں۔ "چھانٹ کر رکھا ہے میں نے اِسکو!"

"یہ آخر کیوں؟ آپ اپنا گھر بھوت خانہ بنانا چاہتی ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بھوتوں سے بچنے کیلئے!" خالہ ہنستی ہی چلی جاتیں۔

"جب کبھی گت کی ماما رکھو ہمیشہ اُس کے پیچھے دو چار مَردُوئے کوٹھی کے اِرد گِرد ضرور پھرا کرتے۔ کتنے بدمعاش ہوتے ہیں یہ مرد۔ اچھی صورت دیکھی نہیں کہ پھسلے۔ مجھے تو نفرت ہے ان کی صورت سے!" اب خالہ سنجیدگی کا رنگ اختیار کر رہی تھیں: "سایہ کی طرح پھرا کرتے ہیں یہ عورت کے پیچھے۔ کہاں تک بیچاری اپنی جان بچاتے۔ سکینہ —— وہی —— تھی نہیں وہ گورے رنگ کی چھوٹی سی لڑکی! بڑا کام کرتی تھی وہ! میں نے ہی پالا پوسا بڑا کیا اُسکو اور مَردُووں نے تاک لیا۔ جب دیکھو کوٹھی کے اِرد گِرد گھوم رہے ہیں لوگ!

کوئی درخت کی آڑ میں ہے تو کوئی اصطبل میں چھپا ہوا ہے اور کوئی اپنے باپ کا گھر سمجھ کر گھسا جاتا ہے باورچی خانے میں! جان عذاب کر ڈالی۔ جان! پھر نکال دیا میں نے اس کو!"

"یہ آپ کی دُلاری کلّو تو نہیں کرتی ایسا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی بڑے بس کی گانٹھ ہے۔ نہ صورت نہ شکل بھاڑ میں سے نکل۔ اسکے فراق میں بھی میں نے کل احاطہ میں ایک پرچھائیں دیکھی تھی"

"اس بیچاری پر کون عاشق ہوگا نگوڑا!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن خالہ کی سنجیدگی کم نہ ہوئی۔

"یہ نہ کہو بی بی! جوانی تو دیوانی مشہور رہی ہے۔ یہ کالی ہے تو کیا کرے جوان تو ہے!"

میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن خالہ نے ٹوک دیا: "میں تو کہتی ہوں کہ یہ لڑکیاں ہی بدمعاش ہیں آج کل کی آخر میں بھی تو جوان تھی کبھی؟ مجال تھی کسی کی ...."

میں نے خالہ کی طرف دیکھا وہ کچھ گھبرا سی گئیں۔ انہوں نے فوراً آنکھیں نیچی کرلیں اور کہتی ہوئی بات بھول گئیں۔ یہ کیا! میں سمجھ نہ سکی!

۳۔ یہ مَردُوے بھلا

سلمیٰ خالہ میری دُور کی رشتہ کی خالہ تھیں۔ بڑے دولتمند ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ نازو نعم سے پالی گئیں اور پندرھویں برس بڑے حوصلے اور ارمان سے شہر کے ایک ہونہار خوبرو نوجوان کو بیاہی گئیں۔ لیکن شادی کے دو ہی برس کے بعد نہ ماں باپ رہے اور نہ شوہر۔ دنیا میں بیچاری بالکل ہی اکیلی رہ گئیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید بہت جلد عقد ثانی کرلیں اور اس سلسلہ میں بہت سے واقعات بھی سننے میں آئے لیکن خالہ نے اپنی بیوگی کے جامے کو کبھی نہیں اُتارا۔ اپنی پرانی چار پانچ ماماؤں کے ساتھ وہ شہر کے باہر "زمرد" میں رہنے لگیں اور وہیں اپنی بیوگی کے ستائیس سال نہایت سلامت روی سے کاٹ دئے۔ بیچاری مجھے بہت چاہتیں۔ میں اکثر اُن کے یہاں جایا کرتی اور دو دو چار چار روز رہتی۔ بڑی خاطر کرتیں اور مثل اپنی لڑکی کے سمجھتیں۔

شہر کے باہر رہنے سے سلمیٰ خالہ نے اپنے شہر کے رشتہ داروں سے تعلقات منقطع نہیں کرلئے تھے۔ وہ اکثر اُن کے یہاں جایا کرتیں۔ اور شہر میں کوئی قابل ذکر تقریب ایسی نہ ہوتی جس میں وہ اپنی شرکت ضروری نہ سمجھتیں۔ خالہ بہت خلیق، ملنسار اور ہنس مکھ تھیں۔ باتیں کرتیں تو معلوم ہوتا پھول جھڑتے۔ جو اُن سے ملتا اُن کا گرویدہ ہو جاتا اور اُن کی قدر کرتا۔ خالہ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی لیکن ابھی تک شباب کے آثار اُن کے چہرے سے صاف عیاں تھے۔ جوان لڑکیوں سے ملتیں تو اُن میں ایسا گھل مل جاتیں کہ انہی میں سے ایک معلوم ہوتیں۔ لیکن خالہ کے کردار میں ایک چیز بہت زیادہ ناقابل فہم تھی ــــ بہت ہی زیادہ ــــ انہیں مَردوں سے سخت نفرت تھی۔ گفتگو کا کوئی موضوع ہو لیکن وہ اپنے اس جملے کی اس میں ضرور گنجائش پیدا کرلیتیں: "بڑے بیوفا ہوتے ہیں یہ مَردوے!" ــ اس میں اُن کی جوانی کا کوئی راز نہاں تھا، اور خالہ اس راز کو صرف اپنا ہی رکھنا چاہتیں۔

۴۔ من کی آگ

ایک روز میں نو بجے خالہ کے یہاں پہونچی۔ معلوم ہوا کہ ابھی خوابگاہ سے نہیں نکلیں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا لیکن جیسے ہی میں نے پہلے زینے پر قدم رکھا میں نے دیکھا خالہ خود آرہی ہیں۔ آج ان میں غضب کا نکھار تھا۔ چہرے کی جگمگاہٹ میں معلوم ہوتا جیسے جلد کے اندر سے کوئی روشنی نکل رہی تھی، خالہ عجب والہانہ انداز سے چل رہی تھیں۔ کوئی شرابی بھی کیا چلے گا! سر کی جنبش دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ ہر قدم پر خمار بڑھتا ہی جاتا۔ ان کے لانبے لانبے بال بڑی بے ترتیبی سے اُن کے سینے پر جہاں خود ایک حشر بپا تھا کھیل رہے تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی ایک خاص ترتیب تھی جو خالہ کے حُسن کار ہاتھوں کی شرمندۂ احسان معلوم ہوتی۔ خالہ قریب آئیں تو عطر دان بن گئیں۔ ان کے جسم سے عطر کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اس "جوشِ بہار" پر میں دنگ رہ گئی۔

میں نے سلام کیا خالہ نے لپک کر چپٹا لیا۔ اتنی زور سے کہ میں چیخ اُٹھی۔

"آج کچھ رنگ بیڈھب ہے!" میں نے ہنستے ہوئے کہا

"اتنی دیر سے آئی کُتیا! اور اوپر سے کہتی ہے کہ رنگ بیڈھب ہے۔ کیوں نہ ہو بیڈھب؟" خالہ نے چُھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کچھ جھینپ سی گئیں۔

"چل ناشتہ کرلے۔ آج تجھے ایک بات بتاؤں گی:" خالہ مجھے کھینچتے ہوئے لے چلی گئیں

ہم لوگ ناشتہ کے بعد نشست گاہ پہونچے تو مجھ سے نہ رہا گیا۔

"پھر بتائیے خالہ! وہی بات! جو بتلانے کو کہی تھی"

"تیرے کام کی نہیں وہ!"

"نہیں!" میں نے ٹھنک کر کہا۔

"کیا کرے گی سُن کر پچیس تیس برس کی بات!"

"واہ یہ اچھی رہی! خود ہی آپ نے کہا تھا کہ ایک بات سنائیے گا!"

"تو یہ تھوڑی کہا تھا کہ تو میری جان کو آجا۔ اچھا سُن!" خالہ نے اپنی آنکھیں چمکا کر کہا۔ "تو نے بھی کی ہے کبھی کسی سے محبت!"

"کی کیوں نہیں" میں نے کہا اور ہنسنے لگی۔

"تو میں نے بھی کی" خالہ نے کہا۔

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے تو بتا؟" خالہ نے کہا۔

"نہیں"

"نہیں"

میں خفا ہو کر اُٹھ کر جانے لگی۔ خالہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اچھا سُن لیکن خبردار جو کسی سے کہا!"

"کیا مجال!" میں نے اطمینان دلایا۔

"ایک مالی کے لڑکے سے!" خالہ نے شرمندگی میں اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"پھر!"

"پھر بڑھی یہ محبت!"

"پھر!" میں نے پوچھا۔

"پھر اُس نے وہی کہا جو ہر مرد ہر محبت میں کہتا ہے"

"کیا!"

"بھاگ چلو میرے ساتھ یا پھر شادی کر لو"

"آپ نے کیا کہا؟"

"تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کہتیں؟"

"بھاگ چلوں گی" میں نے کہا۔

"آہ! میں نے یہ نہیں کہا! میں نے ڈانٹ دیا اسکو۔ خبردار جو ایک شریف لڑکی سے ایسی باتیں کیں۔ اپنی اوقات نہیں پہچانتے تم!"

"پھر اُس نے کیا کہا؟"

"چلا گیا چُپ چاپ، یہ کہتا ہوا کہ ہاں مجھ بھوکے سے کون شادی کر سکتا ہے؟"

"پھر"

"محبت کی کشتی بھوک کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی" خالہ نے بڑی حسرت سے کہا۔

"بس!"

"نہیں! وہ پچیس برس نہیں آیا لیکن اب پھر آگیا ہے"

"آگیا ہے! کہاں ہے؟" میں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"شہر میں ہے۔ کافی روپیہ کما لایا ہے وہ۔ اب کوئی تجارت شروع کرنے والا ہے"

"آپ سے کہاں ملا؟"

"آیا تھا مجھ سے ملنے! لیکن پرانی باتوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ آج پھر آئیگا چار بجے! وہ اب بھی ویسا ہی بانکا جوان ہے!"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا!" میں فرطِ محبت سے خالہ سے لپٹ گئی۔

"پہلے وہ بھوکا تھا اور اب میں۔ من کی آگ تن کی آگ سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے"

خالہ بے اختیار سسکیاں بھر بھر کر رونے لگیں معلوم ہوتا جیسے اُن کا دل ٹوٹا جا رہا ہو۔ میں نے اب اور آگے انہیں چھیڑنا نہ چاہا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ انکی خوش مزاجی کی کائی کے نیچے کتنا گہرا سمندر ہے!

۵۔ انتقام

اُس دن میں دو ہی بجے خالہ کے یہاں سے چلی آئی لیکن دوسرے دن سویرے ہی سے پہونچ گئی۔ وہ تنہا باغ میں چہلقدمی کر رہی تھیں اور ضرورت سے زیادہ بشاش اور مسرور نظر آئیں۔

"کیا ہوا سلمیٰ خالہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہوتا کیا؟ وہ آیا اور چلا گیا!"

"کیا کہا اُس نے؟" میں مارے اشتیاق کے مری جاتی۔

"اُس سے اپنا انتقام لے لیا۔ پچیس برس کے بعد میرا بوجھ میرے سر سے ہٹ گیا۔ میں نے اُسکی بھوک ٹھکرائی تھی اُس نے میری بھوک ٹھکرا دی" خالہ نہایت اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔

"وہ کیسے؟"

"اُس نے کہا، پچیس برس ادھر تم نے سچ کہا تھا اور اب جھوٹ کہہ رہی ہو۔ سماج نے ہماری قسمتوں پر مُہر لگا دی ہے۔ تم دولتمند ہو اور میں بھک منگا ہمارا تمہارا جوڑ نہیں ہے!"

"پھر!"

"پھر میں ہنسنے لگی اور وہ چلا گیا!"

وجاہت سندیلوی

ہماری دھوبن

ظاہر ہے کہ عورت ہے مگر ہمارے خاندان کے سب چھوٹے بڑوں کو ناکوں چنے چبواتی ہے۔ ہر دفعہ وعدہ کرتی ہے کہ فلاں دن کپڑے لے آؤنگی مگر آج تک اس نے کبھی وعدہ پورا نہیں کیا۔ کبھی اُس کے رشتہ دار مر جاتے ہیں جس کی وجہ سے وعدہ خلافی ہو جاتی ہے۔ کبھی خاص اُس کے گھاٹ پر ہی موسلادھار بارش پڑتی ہے اس لئے کپڑے نہیں سوکھ سکتے۔ بعض دفعہ خود بیمار بن بیٹھتی ہے۔ غرضکہ اُس کو لاکھوں بہانے یاد ہیں، مگر سال میں ایک دفعہ اس کا بہانہ بہانہ نہیں ہوتا۔ یعنی زچگی کی وجہ بتلاتی ہے اور ساتھ ہی اپنا نیا بچہ بھی ثبوت کے طور پر لاتی ہے۔ جس کو دیکھکر ہمارے خاندان کے بزرگ بچے سب گلے بھول جاتے ہیں اور اُس کے بچے سے پیار کرتے ہیں۔ دھوبن خوش ہوتی ہے۔ سب مسکراتے ہیں نام پوچھتے ہیں اور بعد میں سب کے سب "اگلی مرتبہ وقت پر کپڑے لانے" کی درخواست کرتے ہیں۔ دھوبن مسکراتی ہے اور کہتی ہے: "ضرور لاؤنگی!" مگر یہ تو وہ ہر دفعہ ہی کہتی ہے۔ اسکے وعدے معشوق کے وعدوں سے بھی کم اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہر دفعہ یقین دلاتی ہے۔ اپنے فن کی ماہر ہے یعنی جھوٹے وعدے کر کے یقین دلاتی ہے کپڑے دھونا اس کا کام نہیں صرف بہانہ ہے۔

بالو پانچ فٹ سے ہرگز اونچی نہیں! اکہرے بدن کی۔ پتلی پتلی ٹانگوں والی۔ ساڑھی گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے رکھتی۔ سر میں کبھی تیل نہیں ڈالتی سوکھے بال ہمیشہ ہمارے خاندان کے ارکین کی طرح پریشان رکھتی ہے۔ ہر دم ڈاڑھ میں پان دبائے رکھتی ہے۔ ایک آنکھ سے ترچھا دیکھتی ہے۔ اسکے ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ دھوبی اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ کپڑے لے جانے کے لئے گدھے رکھتے ہیں۔ مگر ہماری بالو کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس نے بیل گاڑی بنا رکھی ہے۔ اُسی میں کپڑے لاد کر لے جاتی ہے اور جب دل چاہتا ہے لے بھی آتی ہے۔

یہ سال میں گیارہ دفعہ کپڑے دھو کر لاتی ہے۔ اسی وجہ سے گھر کے چند نئی روشنی کے نوجوانوں نے اس کے خلاف علمِ بغاوت بھی بلند کیا تھا مگر خاندان کے پرانے اصولوں کی طرح اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ایک زمانے سے یہ ہمارے گھر والوں کے کپڑے دھوتی آتی ہے۔ اور جب سے اس نے ہمارے خاندان کے کپڑے دھونے کا ذمہ اپنے سر لیا ہے اس دن سے گھر کے تمام نوکر کپڑے دھونے کے فن میں ماہر ہو گئے ہیں۔

گھر کے اخراجات میں سوا دس روپے کا کپڑے دھونے کا صابن بھی ہر ماہ شامل ہوتا ہے۔ گھر ہمیشہ دھوبی گھاٹ بنا رہتا ہے۔ گھر میں جتنے نل پانی کے ہیں وہ بارہ گھنٹے چلتے رہتے ہیں اُن کے نیچے مختلف آدمی طرح طرح کے کپڑے دھوتے رہتے ہیں اور دھو دھو کر گھر کے برآمدوں میں سوکھنے ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح ہمارے گھر والوں کو پانی کا ٹیکس بھی عام شرفا سے زیادہ دینا پڑتا ہے۔ (شاید دُنیا میں ہر ایک سفید پوش کا یہی حال ہو؟) پانی اور صابن کے خرچ کے علاوہ اس دھوبن کو ملازم رکھنے سے بجلی کا بھی خرچ بہت بڑھ گیا ہے: بجلی کی استری ہمیشہ گرم رہتی ہے بلکہ کپڑے استری کرنے کے لئے گھر کی ایک ہی استری کو استعمال کرنے کے لئے گھر کے ارکین میں ہر دم جنگ چھڑی رہتی ہے۔ بعض اوقات گھر کے کمسن بچے استری سے کھیلتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں جلا بیٹھتے ہیں تو ڈاکٹر کا خرچ اور بڑھ جاتا ہے۔ غرضکہ گھر میں عجب ہنگامہ مچا رہتا ہے۔

کپڑے دھونے کا کام دھوبن کے آنے کے ایک ہفتہ بعد تک بند رہتا ہے کیونکہ اُن دنوں دھوبن کے دُھلے ہوئے کپڑے پہنے جاتے ہیں۔ مگر استری برابر گرم رہتی ہے کیونکہ دھوبن کے استری کئے ہوئے کپڑے دراصل بغیر استری کئے ہوتے ہوتے ہیں۔ پھر بھی دھوبن کا یہ کہنا ہے کہ وہ برابر استری کرتی ہے۔ چند سالوں سے اب اس موضوع پر بحث نہیں کی جاتی۔ بلکہ یہ امر طے پا چکا ہے کہ ہر شخص اپنے کپڑے پہننے سے قبل خود استری کر لیا کرے۔ اس کام کے ہم عادی ہو چکے ہیں — اس قدر عادی کہ اگر کسی معجزے کے باعث ہماری دھوبن درحقیقت کپڑے ٹھیک طرح سے استری کر کے لے بھی آئے تو بھی سب گھر والے اُن کو پھر سے استری کر کے ہی پہنیں گے۔

جس دن دھوبن کپڑے دھو کر لاتی ہے وہ دن بھی ہمارے گھر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گھر کے سب نوکر اُس دن عید مناتے ہیں۔ کیونکہ ایک ہفتہ کے لئے اُن کو کپڑے دھونے کے کام سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ عام طور پر گھر کا کوئی بچہ دھوبن کی بیل گاڑی کو دور سے آتا دیکھکر گھر کے کونے کونے میں یہ خبر پہونچا دیتا ہے۔ نوکر دھوتے ہوئے کپڑے اُسی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ اور گھر کے ارکین کو جب یہ خبر پہونچتی ہے تو سب کے چہرے شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ ع :

ع؎ اُسکے آنے سے ہی آجاتی ہے "نہ پہ رونق

اور اپنے بارونق چہروں کے ساتھ تمام گھر والے گھر کے تمام پہننے اوڑھنے اور بچھانے والے کپڑے کمروں سے نکال نکال کر دھوبن کے لئے ڈھیروں کی شکل میں جمع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک مدت سے میلے ہو گئے ہوتے ہیں اور پچھلے ایک ماہ سے دھو دھو کر استعمال ہو رہے ہوتے ہیں۔ دھوبن مُسکراتے ہوئے آتی ہے اور ہر ایک کے کپڑے الگ الگ جما کر رکھ دیتی ہے۔ اس گھر کا ہر فرد و بشر اپنے کپڑوں کا حساب خود لکھتا ہے اس لئے دھوبن ہر ایک کا حساب چکاتی ہے۔ ہمیشہ کپڑے کم لاتی ہے جب کوئی شکایت کرے تو اوّل تو انکار کرتی ہے کہ وہ کوئی کپڑا رکھکر نہیں آئی مگر جب ڈرا کر، پیار سے، اور آخر گھٹنوں کے بل بیٹھکر آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس سے التجا کی جاتی ہے کہ وہ ہمارے کہنے کو مان لے اور جو کپڑا رکھ آئی ہے وہ لا دے تو وہ مان جاتی ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ "آئندہ دُھلائی کے ساتھ لے آؤں گی" مگر عام طور پر نہیں لاتی اور اگر بفرضِ محال کبھی غلطی سے لے بھی آئی تو اس دفعہ کی دُھلائی میں سے ایک کی بجائے دو کپڑے رکھ آتی ہے۔ اس لئے گھر کے تجربہ کار لوگ ایسی شکایت کرتے ہی نہیں اور ایک ہی کپڑا کھو کر یہ کہتے ہیں کہ۔ "خدا جو کرتا ہے بھلے کیلئے کرتا ہے"

میں تجربہ کار نہیں ہوں مگر یہ کہنے سے دریغ نہ کروں گا کہ ان معاملوں میں خدا جو کچھ کر چکا ہے، کر رہا ہے اور کریگا اس میں دھوبن کا ہی فائدہ ہوگا۔

کچھ عرصے تک یہی کپڑے لینے اور دینے کا سلسلہ مع تکرار و شکوہ جاری رہتا ہے۔ آخر دھوبن سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر میلے کپڑوں کی گٹھڑیاں باندھ کر اُن کو بیل گاڑی میں لادتی ہے اور جس مَردوے کو ساتھ لاتی ہے وہ گاڑی ہانکتا ہے۔ یہ ساتھ بیٹھکر پان کی تھیلی کھول کر نیا پان لگاتی ہے۔ ہمارے گھر کے تمام مرد عورت برآمدے میں کھڑے ہو کر دھوبن کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ان میں سے بعض ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں اور زبانِ حال سے یوں کہتے ہیں "اے دھوبن تو پھر کب آئیگی؟"

بیل، چابک کھا کر چلتے ہیں اور گاڑی کو مع دھوبن کے کم از کم پانچ ہفتوں کیلئے ہم سب کی نظروں سے غائب کر دیتے ہیں!

جونہی دھوبن رخصت ہوتی ہے اُسی دم گھر کا ہر فرد و بشر اپنے اپنے کمرے میں جاکر اپنے کپڑوں کی ڈھیری کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ ایک عدد قینچی، سوئی دھاگہ، مختلف رنگوں کے بٹن کہیں سے فراہم کر لیتا ہے اور ہر ایک کپڑے کا کھول کھول کر معائنہ کرتا ہے۔ ہر ایک کپڑا قابلِ مرمت ہوتا ہے۔ بعض دھوبن کی مار کھا کر پھٹ گئے ہوتے ہیں۔ قمیصوں اور پتلونوں کے بٹن غائب ہوتے ہیں۔ اس لئے سب اپنی اپنی جگہ اس طرح بیٹھ جاتے ہیں جس طرح مورچوں پر سپاہی بیٹھے ہوں۔ اور سلائی کا کام تین چار گھنٹے تک برابر جاری رہتا ہے۔ غرض کہ دھوبن کے آتے ہی گھر دھوبی گھاٹ سے بدل کر کسی پُرانے پارچہ فروش کا گھر معلوم ہوتا ہے اور اُس کے جاتے ہی گھر کا نقشہ پھر بدل جاتا ہے اور اب کے ہمارا گھر کسی درزی کی درسگاہ یا رفوگر کی دکان کی طرح بن جاتا ہے۔ یہ کام ختم ہو جانے کے بعد استری کرنے کا کام شروع ہوتا ہے اور شام اسی طرح ہو جاتی ہے۔ اُس دن گھر کا کوئی شخص کہیں باہر نہیں جا سکتا۔

ایک دفعہ میں سردی کی چھٹیاں گھر گذار رہا تھا۔ دھوبن آئی اور میرے سب کپڑے پھاڑ کر لائی۔ مجھے نہایت غصہ آیا۔ میں نے اُسے ڈانٹا۔ "تم کیوں سب قمیصیں اور پاجامے پھاڑ لائیں۔ اور شیروانیوں کے سب بٹن غائب ہیں! تم بٹنوں کا بیوپار تو نہیں کرتیں؟"

اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "سرکار آپکے سب کپڑے کثرتِ استعمال کی وجہ سے بوسیدہ ہو گئے ہیں۔ کپڑوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک دن کتنا ہی اچھا کپڑا کیوں نہ ہو ضرور پھٹ جاتا ہے۔ البتہ شیروانی کا ایک آدھ بٹن ضرور میری سوکن کے داماد سے ٹوٹ گیا ہے۔ میں اُسے تنبیہ کر دوں گی کہ آئندہ سے بٹنوں والے کپڑوں کو پتھر پر زور سے نہ پٹخا کرے۔ آپ شیروانیوں میں ایسے بٹن کیوں نہیں لگاتے جو دھوتے وقت علیٰحدہ کر دئے جائیں؟"

میں نے کہا "دھوبن تم سے باتوں میں کوئی جیت نہیں سکتا۔ مگر اس دفعہ میں چند نئی قمیصیں دھونے کے لئے دے رہا ہوں۔ یہ ریشمی ہیں اور نہایت مہنگی ذرا میرے حال پر رحم کرنا!"

دھوبن نے میری نئی قمیصوں میں سے ایک کو ہاتھ میں لیکر غور سے دیکھا اور بولی "حضور یہ کپڑا جاپانی ہے۔ دیکھنے میں ریشم نظر آتا ہے مگر نہایت ناقص ہے اگر یہ قمیصیں پھٹ گئیں تو میں ذمہ دار نہ ہونگی۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور تڑخ جائیں گی!"

میں نے دل ہی دل میں کہا ؎

دھوبن سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جو پھاڑنے پہ آئے تو پہلے پکار دے

(بقیہ بر صفحہ ۶۲)

رباب شکستہ

مایوسِ تمنا کی اللہ رے بیتابی
رونے سے بھی اب دل کی تسکین نہیں ہوتی

آہ نہ پوچھ ہمنشیں خواب میں کیا نظر پڑا
تھمتے نہیں سرشک اب قلب پہ یہ اثر پڑا

میں اور سے مخاطب، وہ اور سے مخاطب
پابندیوں نے کھولی یہ راہِ ہمکلامی

دل کا ہر گوشہ تمہاری یاد سے آباد ہے
مجھکو سب کچھ بھول جانے پر بھی سب کچھ یاد ہے

چاندنی، سبزہ، لبِ جو، لوگ محوِ اختلاط
تم اگر ہمراہ ہوتیں، ہم بھی ہنستے بولتے

عارضِ گلگوں پہ اشکِ گوہریں یاد آ گئے
خوں ہوا جاتا ہے دل پھولوں پہ شبنم دیکھکر

اپنی حقیقت کو جانتا ہوں مگر آہ
مجھکو تمنا پہ اختیار نہیں ہے

ہاں تیرا تصور بھی نہیں کیف سے خالی
چشم ولب وآغوش کی تسکین کہاں اب

تیرے سوا کوئی حسیں دل میں سما سکتا نہیں
جویائے نکہت کیلئے تصویرِ گُل بیکار ہے

"پریم پجاری"

مَیں نہیں جانتی!!

کون سی چیز میرے دل کو متاثر کر رہی ہے — ؟ آہ مَیں نہیں جانتی!۔

کیا شرمیلی کلیوں کی وہ دلفریب ادا ! جو سُورج کی پہلی کرن کو دیکھکر مُسکرا پڑتی ہیں ؟۔

یا غمگین چڑیا کا وہ پہلا نغمہ ؟ — جو گرم موسم کی صبح میں گونجتا ہے ؟۔

اور جو میری خوابگاہ کے قریب دریچے کے پاس ہارسنگھار کی پتلی سی ٹہنی پر بیٹھ کر گھنٹوں گایا کرتی ہے ؟۔

مَیں نہیں جانتی۔ مَیں بعض وقت اُداس کیوں ہوجاتی ہوں ؟ اور کونسی چیز میرے دل کو متاثر کرتی ہے ؟۔

کیا وہ غمناک تاریک اُداسی جو آفتاب کے غروب ہوتے ہی گیہوں کے کھیتوں پر چھا جاتی ہے ؟۔

یا اُداس قبروں کے بھُورے شکستہ پتھروں کی یاد ! جنکے نیچے سینکڑوں رومان دفن ہیں ؟۔

اے رازکے جویا !! مجھ سے نہ پوچھ — کہ مَیں کیوں یکایک اُداس ہوجاتی ہوں۔ مَیں نہیں جانتی — میری اُداسی کا سبب کیا ہے ؟

کیا اس حسرتناک افسانے کی یاد ؟ —————— کہ پروانہ کس طرح جمالِ آتشیں کو چُومنے کی آرزو میں جل مرتا ہے ؟۔

یا وہ مرتعش تاریکی جو شمع کے گُل ہوجانے کے بعد کمرے پر طاری ہوجاتی ہے ؟۔

مجھے نہیں معلوم —————— مَیں نہیں جانتی !!

فکرِ شعر

جُھکی ہوئی شاخوں پر شام کی ہوائیں نڈھال ہیں۔
اور سبز پتے سکوت میں گُم ہیں۔
دن رات میٹھے گیت گانے والا چشمہ اپنے سر دھیمے کر چکا۔
شیریں تریں ! تو سر جُھکاتے اس کنجِ باغ کی تنہائی میں کس سوچ میں مصروف ہے —————— ؟

خدا کے لئے شہد کی مکھیو ! آہستہ آہستہ بھنبھناؤ۔ اور اے سیاہ بھونرے ! اس جگہ سے چُپ چاپ نکل جا۔

جون کے گول اور نارنجی رنگ کے آفتاب کی سُرخ کرنیں تیرے بالوں کو چمکا رہی ہیں۔

اور بُلبُل —————— دُور عشقِ پیچاں کی بیلوں کے پیچھے مُنہ دئے بیٹھ گئی ہے۔

ایسے سمے میں۔ ان کاسنی پھُولوں کے درمیان اے خواب کے شیدائی ! تو کس سوچ میں مصروف ہے ؟۔

حجاب امتیاز علی،

(بسلسلہ ماہ اپریل)

تحلیل نفسی

مختلف دبستان

گزشتہ مضمون میں بالتفصیل بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح فرائڈ نے تنِ تنہا تحلیل نفسی کے بنیادی اصولوں اور ابتدائی قانونوں کی بنیاد رکھی۔ پہلے پہل تو وہ اکیلا ہی مشاہدات اور تجربات کے اس بے کنار سمندر میں غوّاصی کرتا پھرا۔ لیکن بعد میں (بیسویں صدی کے اوائل میں) جرمنی کے چند طلبا، علم طب اس کے شاگرد بن کر اس کے ماتحت تحقیق و تفتیش کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ آہستہ آہستہ اس کے شاگردوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وائنا اور وسطی یورپ کے شہر اس کے شاگردوں سے بھرپور ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان کثیر التعداد شاگردوں میں روحِ تعاون پھونکنے کیلئے متعدد کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ اور ان جلسوں میں تحلیل نفسی کے متعلق نئے نئے مسائل اور جدید ترین ایجادات پر بالتفصیل تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ فرائڈ کے اولین شاگردوں میں تحلیل نفسی کے جن ماہروں کی خاص شہرت ہوئی ان میں برلن کے رہنے والے ابراہیم (Abraham) اور نیویارک کے رہنے والے برل (Brill) سب سے پیش پیش تھے۔ ان حضرات نے ۱۹۱۰ء کے قریب قریب فرائڈ کی توجیہات اور نظریات کی تبلیغ میں خاص زور مارا۔ اگرچہ تحلیل نفسی کا فن جلد ہی دنیا کے گوشہ گوشہ میں جا چمکا۔ اور کئی بیرونی حکما اس فن میں اور اس اسکول میں خاص الخاص مراتب پر متمکن ہوئے (مثلاً ڈاکٹر ارنسٹ جونز ایم۔ ڈی؟ ۱۹۲۰ء میں تحلیل نفسی کے بین الاقوامی جرنل کے ایڈیٹر مقرر ہوئے) لیکن قدرتی طور پر اس دریائے فن کا سرچشمہ وائنا ہی میں قرار پایا۔ اور اس دبستان کی صدارت کا فرض خود فرائڈ کے سپرد ہوا۔ چنانچہ یہ سکول فرائڈ اور اس کے مددگار شاگردوں یعنی فرنشی (Ferenczi) اور رینک (Rank) وغیرہ کے ہاتھوں ترقی کرتا ہوا آسمانِ کمال تک جا پہنچا۔ ان حضرات کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ مثال کے طور پر فرنشی نے احساسِ[1] حقیقت کے ارتقا اور اس پر روشنی ڈالی ہے اور برل نے اکلوتے بچے کا نفسیاتی[2] مطالعہ کیا ہے، رینک[3] نے پیدائش کے نفسی حادثہ کے متعلق بہت تحقیق کی ہے۔ (یہ وہ دھچکا ہے جو بچے کو پہلے پہل بیرونِ رحم زندگی سے دوچار ہونے پر لگتا ہے)

اب تحلیل نفسی کے ان دبستانوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو فرائڈ کے نظریات سے ذرا پرے ہٹ گئے ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں ایک کتاب موسوم بہ "لفظی تلازم کے چند مشاہدات" (Studies in word Association) شائع ہوئی۔ ینگ اور رکلن کی یہ تصنیف ان کے تجربات اور مشاہدات کا نچوڑ اور دبستانِ زیورچ (Zurich School) کا اولین شاہکار تھی۔ اس کتاب کی بدولت ایک تو تجرباتی نفسیات کے ایک مشہور طریقے یعنی لفظی تلازم کا استعمال تحلیل نفسی میں عملی طور پر رائج ہو گیا اور دوسرا یہ کہ نفسی معلومات کے احاطہ میں ایک ایسے نئے رجحان کا داخلہ ہوا جو کافی حد تک تلازم کے مذہب عالیہ (Classical Associationism) سے مشابہ ہے۔ اس رجحان کے زیر اثر جملہ ذہنی زندگی ایک قسم کے تلازمات کا عکس قرار پائی۔ اور امتحانِ تلازم کا فرض ٹھہرا کہ اس جذبات اور خیالات کے تانے بانے سے پیچیدہ تخیل جال کی گتھیاں سلجھائے۔ ذہنی الجھاؤ دور کرنے کا یہ طریقہ وونٹ (Wundt) کے سادہ طریقے سے مشابہ تھا۔ اور زیادہ تر استقرائی (Inductive) تھا۔ یعنی امتحانِ تلازم[4] کے وقت کی کمی بیشی پر عمر، صنف اور تعلیم کے اثرات کی تحلیل کی گئی۔ اور تلازم کی

---

1. In "Sex in Psycho-Analysis" Ferenczi 1906.
2. The only or favourite child in adult life in his volume Psycho-Analysis (Third Edition, 1922.)
3. Das Trauma der Geburt. 1924.

۴۔ امتحانِ تلازم (Association Test) کے مختلف طریقے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ تجربہ کرنے والا بے ربط اور عام الفاظ کی ایک لمبی سی فہرست پہلے سے تیار کر لیتا ہے۔ معمول کا کام یہ ہوتا ہے کہ جونہی وہ ایک لفظ عامل کی زبان سے سنے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مختلف قسموں کی جماعت بندی کی گئی۔ اس میدان میں ژُنگ نے بہت کارنمایاں کئے ہیں۔ اور تجرباتی نفسیات کے ماہروں نے اس کی انتھک ہمت کی بہت داد دی ہے۔ ژُنگ کے طریقے کی عملی تشریح اور اس کی وقعت کے ثبوت کا ایک ادنیٰ نمونہ فرسٹ[1] (Furst) کے وہ تجربات ہیں جس میں اس نے ایک خاندان کے جملہ افراد کی اقسام تلازم میں فطری یکرنگی اور قدرتی یگانگت کی موجودگی ثابت کر دکھائی ہے۔ ان امکانات کے باوجود جس چیز نے تجربے کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچا ہے وہ یہ کیاتی (Quantitative) استعمال نہ تھا بلکہ وہ تو یہ خیال تھا کہ کسی طرح انسانی جذبات کی صفاتی (Qualitative) تحلیل کے لئے امتحانات تلازم سے مدد حاصل کی جائے۔ ماہران تحلیل نفسی امتحان تلازم میں مندرجہ ذیل امور پر نظر رکھتے ہیں۔ دستور سے بہت زیادہ سُست یا چُست جواب۔ معمول کا عامل کے الفاظ کو دُہرانا۔ معمول کے چہرے یا دیگر حرکات وسکنات سے کسی خاص جذبہ کا ظاہر ہونا (مثلاً کھانسنا۔ الفاظ بخوبی ادا نہ کرسکنا) ان کے خیال میں اس قسم کے خاص الخاص اشارات خفیہ جذباتی کش مکش کا اظہار کرتے ہیں۔ اور وہ ان خفیہ اشارات اور دیگر آشکارا علامات کو تحلیل نفسی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اوّل اوّل ایک تو ژُنگ اور اس کے ہمراہیوں نے اس طریقے کو فرائڈ کے طریقے (مریض کا آزاد تلازم) کا نعم البدل نہ قرار دیا اور دوسرا خود فرائڈ نے اس نئے طریقے کو اپنے پرانے طریقے کا معاون گردانا۔ اور اس وجہ سے کافی مدّت تک ان دونوں استادو کے تعلقات خوب گہرے رہے۔

آہستہ آہستہ ژُنگ اپنے نظریات اور توجیہات کے سلسلوں میں نئی نئی تبدیلیاں کرنے لگا، اور آخر کار فرائڈ کا یہ نوجوان شاگرد اپنے استاد کو چھوڑ کر ایک نئے اسکول (یعنی دبستانِ زیورچ) کا صدر بن بیٹھا۔ اگرچہ فرائڈ کی تعلیمات اور زیورچ اسکول کے خیالات میں بہت زیادہ امورات میں فرق ہے۔ لیکن بنیادی فرق توجیہہ جذبۂ الفت (Theory of Libido) میں نمایاں ہوتا ہے۔ ژُنگ کے نزدیک فرائڈ کا جنسی تعلقات پر اتنا زور دینا بے بنیاد اور غلط ہے۔ بقول ژُنگ انسانی کوششوں کی بنیاد زیادہ تر اس نفسی قوت پر قائم ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو نئے رنگوں میں[2] نمایاں کرتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا خیال ہے کہ نفسِ لاشعور محض انسان کے دبے ہوئے تجربات کا خزینہ ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک قسم کا بہروپیہ یعنی المنودجی مادہ کا مجموعہ (Symbolic Material) ہے جو انسانی خواہشات کے اظہار کے علاوہ بعض ایسے امور کا آئینہ بردار بنتا ہے جو ایک فرد کو اپنے والدین سے ورثہ میں ملتے ہیں۔ قاعدہ ہے کہ زندگی کی وہ تمام سہولتیں اور عیش وعشرت کے وہ تمام امکانات جو والدین کو نصیب ہوسکتے تھے اور جن سے وہ تمام غیر مصنوعی وجوہات کے سبب غیر ارادی اجتناب کرتے رہے ہیں ان کی اولاد کو امنگوں، اکساہٹوں اور رجحانات کی صورت میں بطور ورثہ مل جاتے ہیں۔ یعنی بچے غیر ارادی طور پر اپنے والدین کی زندگی کی مجبوریوں کی تلافی پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات حد سے بڑھے ہوئے دیندار والدین کے ہاں سخت بد اخلاق بچے پیدا ہوتے ہیں اور ایک غیر ذمہ دار اور فضول خرچ باپ کا لڑکا بلند ہمتی کا مجنون[3]

(بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق) وہ فوراً اس کے جواب میں ایک اور لفظ کہہ دے یعنی عامل کے لفظ کو سن کر بغیر سوچے سمجھے جو پہلا لفظ اس کے ذہن میں پیدا ہو وہی ادا کرے عامل ان الفاظ کو لکھتا جاتا ہے اور بعد میں ان دونوں فہرستوں کے تقابل سے معمول کی نفسیاتی افتاد پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ جتنے وقت میں معمول عامل کے ایک لفظ کے جواب میں کوئی دوسرا لفظ بولتا ہے اسے امتحان تلازم کا وقت (Association Time) کہتے ہیں۔

[1] See Jung "The Association Method." Am. J. Psychol. XXI 1910.

[2] اس کے ساتھ ہی ژُنگ جذبۂ شہوانی کی اہمیت سے منکر بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ایک کتاب "نفسِ لاشعور کی نفسیات (Psychology of The Unconscious)" میں رقمطراز ہے "ہم جذبۂ الفت Libido سے مختلف اشکال میں دوچار ہوتے ہیں۔ بچپنے میں یہ جذبہ زیادہ جبلت نقود ونما کا بھیس بدلتا ہے۔ . . . . جسمانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس جذبہ کے استعمال کی نئی نئی راہیں نکلتی آتی ہیں. . . اس کا سب سے آخری لیکن عملی طور پر سب سے اہم استعمال کا احاطہ شہوت حیوانی کا احاطہ ہے"

4. C. G. Jung: Contributributions to Analytical Psychology 1928.

بن جاتا ہے۔ ژُنگ کے خیال میں یہ بہروپ بدلنا جذبات و خواہشات کے دبانے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفس لاشعور کی فطری وحشت کا تقاضا ہے کہ ایک فرد استعارہ و کنایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ نظریات کے اس تغیر کے طفیل تحلیل نفسیات ژُنگ کے ہاتھوں تک پہونچ کر فرائڈ کی تحلیل نفسی نہ رہی۔ بلکہ ایک نئی شکل اختیار کر گئی۔ ایک عالم نفسیات کی فرائڈ کی پیروی میں یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا مریض اپنے مرض کو خود سمجھ کر اپنی برباد شخصیت کو پھر سے ایک نئے سانچے میں ڈھال لے۔ عام حالات میں اپنے خوف، نمائش اور حقارت وغیرہ کے جذبات کی ماہیت اور سبب سے متعارف ہو جائے۔ لیکن ژُنگ کے ہمنواؤں کے نزدیک تحلیل نفسی کا مسئلہ اس سے کہیں گہرا ہے۔ ان کے خیال کے بموجب معالج کو جذبہ الفت (Libido) کے نئے نئے تغیر اور بہروپ تلاش کرنے کے لئے ہر بار نئے سرے سے دیومالا، صنمیات، تاریخ، مذہب اور فنون لطیفہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مریض کے اوہام کی تاریکیوں میں راہ نکالنے کے لئے یہی تغیرات اور بہروپ مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ یہ اوہام جو فرائڈ کے نزدیک محض پنہاں خواہشات کی تخیلی تکمیل کے سبب پیدا ہوتے ہیں اور جن کا ارادی کوشش سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ بقول ژُنگ جذبہ الفت (Libido) کے عالی شان محل کا بنیادی پتھر ہیں۔ اور چونکہ ایک فرد کی یہ نفسی قوتیں ہمیشہ نئے نئے بھیس بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے تحلیل نفسی ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جس طرح کثر نفسیات کے ماہروں کے نزدیک فرائڈ کی توجیہ محض ایک خیالی گھروندا ہے۔ اس طرح فرائڈ کے ہمنواؤں کے نزدیک ژُنگ کا نظریہ ایک بے بنیاد تخیلی محل ہے۔

اس نظریہ کی چھان بین اور جذبہ الفت (Libido) کی ان شعبدہ بازیوں کی تحقیق کے سلسلہ میں ژُنگ کو مختلف قسم کی شخصیتوں کی جماعت بندی کا خیال پیدا ہوا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بعض افراد میں جذبات باہر نکلنے کیلئے زور مارتے ہیں۔ اور بعض حضرات میں یہ جذبات اندر کو گھستے ہیں۔ خارجی (Extrovert) افراد اپنے گرد و پیش کو افعال و کردار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے برعکس باطنی (Introvert) افراد کی قوتوں کا رخ اندر کی طرف پلٹتا ہے۔ یہ تخیل کی دنیا کے بسنے والے ہوتے ہیں۔ اور ان میں وہ تمام شاعر نقاش سنگتراش اور مغنی شامل ہیں جو تخیل کی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں۔ باطنیت اور خارجیت مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور جو ماہروں نے ژُنگ کے اس نظریہ کے الاؤ سے دیئے جلائے ہیں وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ دونوں حالتیں انتہائی حالتیں ہیں۔ واٹسن (Watson) کا خیال ہے کہ "تمام افراد ہرگز ہرگز ان دو اقسام میں تقسیم نہیں ہو سکتے۔ فی الحقیقت یہ دونوں قسمیں علیحدہ علیحدہ پیدا نہیں۔ یعنی عام انسان نہ تو صرف باطنی ہوتے ہیں اور نہ ہی صرف خارجی .... بلکہ کبھی ان کا خارجی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ان کا باطنی رنگ چمک جاتا ہے۔ (یعنی وہ Ambivert ہیں)"۔ باطنیت انسان کو خواب کی دنیا کا باشندہ بنا کر اسے ایک غیر اجتماعی (Unsocial) شخصیت بنا دیتی ہے۔ اس کے اثرات کا انتہائی شکار ایک قسم کا ذہنی مریض ہوگا جسے کریپلین (Kraepeline) نے Dementia Praecox کا نام دیا ہے۔ ژُنگ اس چیز کے مریضانہ پہلو پر اتنا زور نہیں دیتا۔ اس کا قول ہے کہ اندر کی دنیا اور مشاہداتی دنیا اپنی حقیقت میں یکساں ہیں۔ اس لئے کسی ایک دنیا پر مائل ہونا کچھ زیادہ قابل اعتراض امر نہیں۔

اگرچہ ژُنگ کی نفسیات میں ہر پھر کر ذہنی امراض کے تذکرے ہیں۔ پھر بھی اس نے اپنی توجیہ (Theory) کا مرکز نفس شعور قائم کیا ہے۔ جس طرح فرائڈ کی توجیہ کا خمیر عام طور پر مریضوں کے مشاہدہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح ژُنگ نے اپنے نظریات کے مشاہدات ثبوت ادب سے فراہم کئے ہیں۔ ژُنگ کا نفسی اصول ات کو اسی طرح پس پشت ڈال دینا فرائڈ کو بہت ناگوار گذرا۔ چنانچہ اسی رنجش کے باعث فرائڈ نے اپنی کتاب General Introduction to Psycho-Analysis کے صفحہ ۲۲۲ پر کہا تھا کہ "کبھی وہ دن بھی تھا جب ژُنگ محض ایک ماہر نفسیات ہونے پر ہی قانع تھا۔ یا اب اسے یہ دن لگے ہیں کہ پیغمبری کا دعویٰ کرتا پھرتا ہے"۔

فرائڈ اور ژُنگ کے مذکورہ بالا دبستانوں کے علاوہ فرائڈ کے ایک اور شاگرد الفریڈ ایڈلر نے دنیا میں ایک تیسرے دبستان کی بنیاد رکھی۔ ایڈلر کے ابتدائی کارنامے اس احساس سفلی (Sense of Inferiority) سے متعلق ہیں جو کسی عضوی نقص یا کسی جسمانی ناہمواری سے پیدا ہوتا ہے۔[2]

---

1. B. Watson "Character tests of 1926. Vocational Guidance Magazine V 1927.
2. Study of Organic Inferiority & its Psychical Compensation 1907.

اس کا خیال تھا کہ عام حالات اور ذہنی امراض کی علامات کو بخوبی سمجھنے کے لئے ہمیں ان غیر شعوری کوششوں پر خاص نظر رکھنی چاہیئے جو جسمانی کمزوریوں کی تلافی کرنے کے لئے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ گو دبستانِ فرائڈ کے حکما نے ایڈلر کی پیش کردہ توجیہات میں سے چند ایک نظریات کو بجا ہی تسلیم کیا۔ پھر بھی انھوں نے ایڈلر کی خدمات کو کوئی خاص وقعت نہ دی۔ ادھر ایڈلر بھی اپنے نام کا ایک تھا اس نے فرائڈ سے بیٹا ہونا کسی صورت پسند نہ کیا اور اپنا علیحدہ اسکول قائم کر لیا۔ اس نئے دبستان کی پہلی سرگرمیوں کے طور پر احساسِ سفلی کی توجیہ بالتفصیل حاشیہ آرائی کی گئی۔ اور غیر شعوری تلافی (*Unconscious Compensation*) کے ثبوت سماج کے افعال و کردار سے بہم پہنچائے گئے۔ ذہنی امراض کے پیدا ہونے کے متعلق یہ حکم لگایا گیا کہ یا تو اس تلافی کا فقدان یہ امراض پیدا کر دیتا ہے یا کبھی کبھار کوئی فرد تلافی کرتے کرتے حدِ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے اور اس طور (*Superiority Complex*) میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس توجیہ کے نئے نئے شاخسانے نکالنے کے علاوہ ایڈلر اسکول کے حکما دو اور باتوں پر بھی متفق ہیں۔ ایک تو ان کا یقین ہے کہ خواب کی تعبیر کبھی بھی سچی اور یقینی ہو ہی نہیں سکتی۔ یا بالفاظ دیگر خواب کے حقیقی معنی کبھی بھی بیان نہیں ہو سکتے، دوسرا یہ کہ نفسِ لاشعور اور نفسِ شعور ہرگز ہرگز ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔ واضح ہو کہ اگرچہ ایڈلر کی شہرت اس کی ان توجیہات پر قائم ہے جو احساسِ سفلی و علوی سے متعلق ہیں لیکن اس کی دبستانِ فرائڈ سے علیحدگی اس کے مذکورہ بالا دو اصول موضوعہ ہیں یعنی تعبیرِ خواب اور اقسامِ نفس سے انکار۔

ایڈلر کی ایک امریکی تصنیف "*The Science of Living*" "زندگی بسر کرنے کا فن" کے دیباچہ میں ایڈلر کو مغربی ممالک کا کنفیوشس مانا گیا ہے۔ اس دیباچہ کے مصنف فرماتے ہیں۔

"یہ خیال کہ نفسِ لاشعور ایک قسم کا حیاتیاتی حافظہ (*Biological Memory*) بن جاتا ہے نفسیات میں عام ہے۔ اس تصور (*Concept*) کو زیادہ متعین کرنے کے پیرایہ میں یہ حکم لگایا تھا کہ صرف انہی فتوحات یا ناکامیابیوں کی یاد ہی حیاتیاتی حافظہ بن سکتی ہے جو کسی نہ کسی طرح جنسی جذبات سے متعلق ہوں۔ ژنگ نے فرائڈ کے اس نظریہ کو تنگ اور محدود سمجھ کر خاندانی اور جدی یاد کی اہمیت کو بھی ثابت کر دکھایا۔ ان ہر دو حضرات کی خدمات سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی نفسِ لاشعور کو حیاتیاتی حقائق سے مکمل طور پر ملانے کا شرف ایڈلر کو ہی حاصل ہے۔ ایڈلر نے ابتدا ہی میں یہ ثابت کر دکھایا کہ ہر فرد کا نظامِ حافظہ (*Scheme of Memory*) مختلف ہے یعنی تمام افراد میں لاشعوری حافظہ ایک ہی مرکز کے گرد پیدا نہیں ہوتا۔ یا بالفاظ دیگر آپ یہ سمجھ لیں کہ ہر ایک شخص کی لاشعوری یاد کی تہ میں جنسی جذبات ہی پنہاں نہیں ہوتے بلکہ تحقیق کرنے سے پتہ ملتا ہے کہ ہر ایک فرد اپنے مشاہدات اپنے کسی اصول کے ماتحت چن چن کر اپنے حافظہ میں محفوظ رکھتا جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ انتخاب کا یہ اصول کیسے رد پذیر ہوتا ہے؟ ایڈلر کا خیال ہے کہ اس انتخابی اصول کی بنیاد کسی عضوی اشتہا کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہر ایک روح اپنی مادی اور جسمانی حقیقتوں سے باخبر ہے اور کسی ایک کی کمی کی تلافی کئے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ مثال کے طور پر ایک نحیف الجثہ فرد کی تمام زندگی اس امر کی کوشش ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح جلد ہی عظمت اور بلندی حاصل کرے۔ ایشیائی حکما کے کلام سے بھی یہ خیال مترشح ہے اور شاید ذوق مرحوم نے کسی ایسے ہی جذبہ سے متاثر ہو کر فرمایا تھا کہ ؎

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ!
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

اگرچہ یہ اصول ہر ایک جگہ مستقل ہے۔ لیکن خیال رہے کہ اس کا استعمال بعض مواقع پر بہت پیچیدار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایک تو مختلف خامیوں کا اجتماع اصول کو اکثر پیچیدہ بنا دیتا ہے اور دوسرا اکثر افراد کا خیالی اور وہمی خامیوں میں مبتلا ہونا اصول کو گھلک کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ جنسی جذبات انسانی زندگی کی روحِ رواں بننے کی بجائے اسی اصول تلافی میں سما جاتے ہیں۔ کیونکہ شہوت جذبات

---

1. *The Neorotic Constitution.(1912.)*
2. *Understanding Human Nature.(1927.)*
3. *Phillipe Mairet.*

کے احاطہ میں داخل ہے اور جذبات کا احاطہ اسی اصول تلافی و انتخاب کے اشاروں پر قائم ہے۔

اس اصول کے طفیل حیاتیات اور نفسیات آپس میں بغل گیر ہو جاتی ہیں اور یہیں سے اصطلاح حق بہ کردہ روحانی رجحانات کی گرہ کھلتی ہے اور مادی ارتقا کی بھی ان کوششوں کے ماتحت ہیں جو ان خامیوں کی تلافی کیلئے عرصۂ عمل میں لائی جاتی ہیں۔ بلکہ ایڈلر کے نزدیک تمام غیر معمولی حرکات و سکنات کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ یہاں یہ خیال رہے کہ تلافی کا یہ اصول ایڈلر سے کافی پہلے کی اختراع ہے۔ ایڈلر سے پہلے یہ معلوم تھا کہ جسم کے کسی حصے کو زخم کی تلافی کیلئے جسم کا کوئی اور حصہ زیادہ پرورش پا جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کا ایک گردہ بیکار ہو جائے تو اس کا دوسرا اگر وہ غیر معمولی نشوونما پاکر دونوں کی خدمات انجام دینے کے قابل بن جائیگا۔ تلافی کے طور پر یہ جسمانی نشوونما ایڈلر سے پیشتر بھی کسی ثبوت کی محتاج نہ تھی لیکن اس تصور کو نفسیات کا بنیادی اصول بنا دینے کا سہرا ایڈلر ہی کے سر ہے۔

اگرچہ موجودہ دور کا قرب نگاہِ مشاہدہ کو چندھیا دیتا ہے اور جدید زمانہ کے متعلق کوئی ٹھیک رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ پھر بطور مشتے از خروارے تحلیل نفسی کی جدید نشر و اشاعت کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی مناسب ٹھہرتا ہے۔

جرمن زبان بولنے والے ممالک[1] میں اس توجیہ نے بیسویں صدی کے آغاز سے ترقی کرنا شروع کیا اور اب تک یہ مسئلہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا جا رہا ہے اور حکما کے اعتراضوں کے باوجود ان ممالک کے جملہ اطبا اب تک اس مسئلہ کے بنیادی اصولوں سے مکمل طور پر واقف ہو چکے ہیں۔ یورپ کے دیگر ممالک میں یہ نظریہ نہ تو اس نہ تو نفسی فنون پر اثر انداز ہوا ہے اور نہ ہی نفسیات کو اپنے رنگ میں رنگ سکا ہے۔ البتہ برطانیہ اور امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں اس کے تتبع کے آثار ہیں۔ اس توجیہ کے امریکہ کے نفسی فنون میں داخل کرنے کا فخر برل[2] کو حاصل ہے۔ کیونکہ اس نے کمال تندہی سے فرائڈ کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کر کے امریکہ کے حکما پر اس فن کے تمام باب وا کر دیئے ہیں۔ برل کی ان تمہیدی کاوشوں کے بعد فرائڈ اور ژنگ نے بہ نفس نفیس کلارک یونیورسٹی[3] میں لیکچر دے کر اس مسئلہ کی اشاعت امریکہ میں عام کر دی۔ برطانیہ میں اس توجیہ کا شاخسانہ جنگ عظیم کے بعد اٹھایا گیا۔ اور حکما "جنگ کے ذہنی دھچکوں" کا مطالعہ کرتے کرتے اس نظریہ کی طرف مائل ہوئے۔ ان سب میں River[4] پیش پیش تھا۔ ان اسباب نشر و اشاعت کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ نفسی فنون میں آگے ہی ایسے رجحانات موجود تھے جو تحلیل نفسی کے مددگار ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر Meyer اور Hoch کے نظریات کو فرائڈ کی توجیہ کا عکس تو نہیں کہے جا سکتے۔ پھر بھی ان دونوں حکما کے نزدیک تمام ذہنی امراض کی تہہ میں جسمانی عارضے کی نسبت نفسیاتی اثر زیادہ کارکن ہیں۔ میئر کا "نفس دار دماغی عادات" کا بار بار ذکر کرنا اور ہوچ کا یہ کہنا کہ باطنیت کا مسکن گوشۂ تنہائی ہے صرف فرائڈ کی تقلید ہی ظاہر نہیں کرتا بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ موجودہ دور میں کریپلن، جینٹ اور مارٹن پرنس وغیرہ کے زیر اثر شخصیت کے مطالعہ کا شوق بہت عام ہو گیا ہے۔ فی الحقیقت موجودہ دور میں مختلف نظریات کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ آج نہ صرف تحلیل نفسی کی حدود متعین کرنا ہی سخت مشکل ہے بلکہ مختلف مسئلہ جات پر فرائڈ اور اس کے حواریوں کی تعلیمات کے اثرات کا اندازہ لگانا بھی بہت کٹھن امر بن گیا ہے۔

خود نفسیات تحلیل نفسی کی توجیہات ماننے سے سراسر منکر ہے۔ یہ انکار کی عادت برطانیہ کی نسبت امریکہ میں کہیں زیادہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کمرۂ تعلیم اور دار التجربہ کی بجائے اس مسئلہ کے نشیمن دماغی ہسپتال قرار پاتے ہیں۔ امریکہ کے حکما تجرباتی نفسیات میں خوب ماہر ہیں۔ اور اس کے برعکس برطانیہ کے ماہران نفسیات تجرباتی نفسیات کو بہت غیر اہم چیز سمجھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں

---

[1] ہماری مراد سوئٹزرلینڈ، جرمنی، آسٹریا اور ان کے قریبی علاقوں سے ہے۔
[2] اس نے "تعبیر خواب از فرائڈ" کا ترجمہ ۱۹۱۳ء میں شائع کیا تھا۔
[3] یہ لیکچر ۱۹۰۹ء میں ہال کی دعوت پر دیئے گئے تھے۔
[4] ملاحظہ ہو River کی لکھی ہوئی "جبلّات اور نفس لاشعور" "Instinct And the Unconscious (1920)

تحلیل نفسی کی بہت زیادہ قدر ہوئی ہے۔ برطانیہ کے ماہرینِ نفسیات کی رائے ہے کہ شخصیت کے گورکھ دھندے کو سلجھانے میں تجرباتی نفسیات کی نسبت فرائڈ کی توجیہات بہت زیادہ کارآمد ثابت ہوئی ہیں۔ برطانیہ کے مشہور اہلِ قلم J.A. Thomson نے اپنی کتاب (1922) "Outline of Science" میں فرائڈ کی تعلیمات کو "جدید نفسیات" کا نام دیا ہے۔ اور انہی دنوں برطانیہ میں سیڑ اردو تعلیمی نصاب تحلیل نفسی کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ کی جدید ادبی تاریخ میں تحلیل نفسی کی اتنی عزت کا ایک آدھ واقعہ روپذیر نہیں ہوا۔

نفسیات کا اس مسئلہ سے متاثر نہ ہونا چند در چند وجوہات پر مبنی ہے۔ ایک تو نفسِ لاشعور کا تصور اور غیر فنی اصطلاحات (مثلاً قوتِ محبت (Libido)، سنسر، الخ) قابلِ اعتراض چیزیں ہیں۔ دوسرا شہوتِ حیوانی کا ذکر اور خاص طور پر بچپنے کے جذباتِ جنسی کی داستان۔ جو فرائڈ کی توجیہ کی جان ہے مذاقِ سلیم پر بار گزرتے ہیں۔ تیسرا خالص فنی تجربات کا فقدان اور خود تحلیل نفسی کے درمیان اختلاف تحلیل نفسی کی قدر و منزلت گھٹاتا ہے۔ لیکن ان اسباب کے باوجود آجکل کونسی تصنیف ہے جس میں فرائڈ کی خاص الخاص اصطلاحات کا گزر نہیں۔ اور آجکل ایسا اہلِ قلم کہاں موجود ہے جو شخصیت باطنیت۔ خارجیت اور دیگر نفسی مقامات سے غیر متعارف و ناواقف ہے ——— موجودہ نثر و نظم پر مسئلہ تحلیل نفسی کے اثرات کا ذکر کسی آئندہ مجلس کیلئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔

ے باقی د ماہتاب باقی

انور مختار صدیقی
بی اے، ایل ایل بی

علیگ یہاں: سلسلہ کا سبق

؎ ملاحظہ ہو River کا وہ لیکچر جو اس نے نیویارک میں ۱۹۱۹ء میں دیا تھا۔

ہماری دھوبن

(بسلسلہ صفحہ ۵۴)

کہتے ہیں کہ۔ دیج ہے "رنج کا خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج" ۔۔۔ رنج کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" چنانچہ میں بھی دھوبن کے برتاؤ سے مانوس ہو چکا ہوں۔ شکوہ و شکایت کبھی نہیں کرتا۔ اکثر کپڑے گھر میں دھلوا کر پہنا کرتا ہوں۔ خود ہی استری کرلیتا ہوں۔ سوئی دھاگہ اور قینچی سے مسلح رہتا ہوں اور جب دھوبن کپڑے لاتی ہے تو چند گھنٹے صرف کرکے اپنے چیتھڑوں کو اس قابل بنانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ پہننے کے قابل ہو جائیں۔ کسی طرح گزر کر رہا ہوں مگر اے خدا ہمارے گھر والوں کو اتنی جرأت عطا کر کہ وہ کسی نئے دھوبی کو آزمانے کی کوشش کر سکیں۔

بھارت چند کھنہ

قیدِ حیات و بندِ غم

دیر کی بات ہے دل آرزو آباد بنا
اور اک کھلتے ہوئے پھول کی خاطر میں نے
تج دیا اپنی جوانی کا لہکتا گلزار!
کچھ دنوں تک یہ مرا پھول جناں ساز رہا
اور میں لوٹتا گیا اُسکے تبسم کی بہار!
آخرِ کار شفق زار ونکی سُرخی اک شام
خُلد کو لے گئی ساتھ اُسکے وہ سولہ سنگھار
"بہہ گیا آنکھ سے دل خونِ تمنا ہو کر"
کچھ جگر پارے اچھل آئے بشکلِ اشعار!
میری تقدیر کہ میں شاد سے ناشاد بنا!

مختار صدیقی!

پھانسی

دسواں باب

دیواریں گر رہی ہیں

ورنر زندگی اور کشمکش سے تھک چکا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ زندگی سے بیحد محبت کرتا تھا۔ تھیٹر، ادب اور آپس کے میل جول میں اُسے لطف آتا تھا۔ قدرت نے اُسے اعلیٰ درجے کا حافظ اور مضبوط قوتِ ارادی بخشی تھی۔ اِس ودیعتِ خاص کی بدولت اُس نے یورپ کی کئی زبانیں بڑی عمدگی سے سیکھ لی تھیں اور ان پر اُسے اتنا عبور حاصل تھا کہ جرمنی، فرانس یا انگلستان والوں کو اسکے اہلِ زبان ہونے میں کسی قسم کا شُبہ نہیں ہوتا تھا۔ جرمن زبان جب بولتا تو بالعموم بویریا والوں کے لہجے میں لیکن جب چاہتا برلن والوں کی طرح بھی بولنے لگتا۔ عمدہ لباس کا اُسے شوق تھا اور خوش اخلاقی میں تو جواب نہیں رکھتا تھا۔ انجمن کے کل ممبروں میں صرف ورنر ہی اکیلا ایسا ممبر تھا جو اُونچی سوسائٹی کی دعوتوں میں اس طرح شریک ہو سکتا تھا کہ کسی کو اُس کے غیر ملکی ہونے کا شُبہ تک نہ ہو۔

مگر کافی عرصے سے اُس کے دل میں بنی نوعِ اِنسان کی طرف سے نفرت جاگزیں ہو کر راسخ ہو گئی تھی۔ اس نفرت میں لوہی اور خوفناک تھکن کا جُزو بھی شامل تھا۔ مگر اُس کے دوستوں کو اس کیفیت کا مطلق علم نہیں تھا۔ فطرتاً وہ مُہندس زیادہ اور شاعر کم تھا۔ اب تک اُسے کشف کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ کبھی کوئی سربدی اُمنگ ہی اُس کے دل میں اُٹھی تھی۔ بعض اوقات اُسکے خیالات پاگلوں جیسے ہو جاتے تھے اور انسانی خون کی پیاس لگنے لگتی تھی۔ وہ دشمن جس سے روزانہ کشمکش کرتا تھا بجائے عزّت واحترام کے نفرت وحقارت کے جذبات میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ یہ ایک جال تھا کم عقلی، فریب اور مکّاری کا۔ ذلّت اہانت اور پست فریب کاریوں کا۔ آخری واقعہ جس نے زندگی سے اُسے ہمیشہ کیلئے بیزار کر دیا ایک سرکاری افسر کا قتل تھا۔ اس افسر کو اُس نے انجمن کے حکم سے قتل کیا تھا۔ قتل کرتے وقت ورنر کو مطلق ہراس نہیں ہوا لیکن جب اُس نے مُردہ چہرے پر رحم طلب آثار دیکھے تو ورنر اپنی ذات اور اپنی اس حرکت سے بے زار ہو گیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ منفعل ہو گیا بلکہ وہ اپنے اس فعل کو وقعت کی نظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی ذات سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ گویا کوئی بے حقیقت چیز تھی، بالکل اجنبی۔ لیکن چوں کہ مضبوط قوتِ ارادی رکھتا تھا اِس لیے انجمن سے علیحدہ نہیں ہوا۔ بظاہر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی چیز تھی، سرد اور تکلیف دہ۔ اس کے بارے میں وہ کسی سے گفتگو نہیں کرتا تھا۔

ورنر میں ایک اور صفت بھی تھی۔ جیسے بعض آدمی ہوتے ہیں کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ دردِ سر کسے کہتے ہیں۔ اسی طرح ورنر نہیں جانتا تھا کہ خوف کسے کہتے ہیں۔ جب اور لوگوں کو وہ ڈرتے دیکھتا تو اُسے نہ تو اُن پر اعتراض ہوتا اور نہ ترس آتا۔ جیسے کسی متعدی مرض کو وہ شخص دیکھے جو خود اُس مرض سے بچا رہے۔ اپنے ساتھیوں پر اُسے افسوس ہوتا تھا خصوصاً کیتھرن پر۔ لیکن اِس افسوس کی نوعیت افسرانہ تھی، جس میں سرد مہری ہو۔ جیسا افسوس بعض اوقات منصفوں کو ہوتا ہے۔

ورنر جانتا تھا کہ پھانسی کے معنی صرف موت کے نہیں تھے۔ بلکہ اس سے علیحدہ کچھ اور بھی تھے۔ لیکن اُس نے تہیّہ کر لیا کہ سکون کے ساتھ اُس سے دوچار ہو۔ جیسے کوئی ناقابلِ التفات چیز ہے۔ آخیر تک اس طرح زندہ رہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں، گویا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ صرف یہی ایک طریقہ تھا جس سے وہ قتل کی سزا کی تحقیر کر سکتا تھا اور روح کی اُس آزادی کو قائم رکھ سکتا تھا جو اس سے زبردستی چھینی نہیں جا سکتی تھی۔ جب مقدمہ عدالت میں پیش تھا۔ اور اس کے ساتھی بھی جو اُس کے تکبّر آمیز و بے خوف رویّہ سے بخوبی واقف تھے شاید یقین نہ کرتے ورنر نہ تو موت کا خیال کر رہا تھا اور نہ زندگی کا بلکہ اپنا خیال بڑی یکسوئی اور طمانیت سے شطرنج کی ایک مشکل بازی پر جمائے ہوئے تھا۔ ورنر شطرنج کا بہت اچھا

کھلاڑی تھا۔ قید ہونے کے پہلے ہی دن سے اُس نے غائب شطرنج کی بازی شروع کر دی تھی اور اُسے ابتک برابر جاری رکھا تھا۔ پھانسی کے حکم تک نے اس کی خیالی بساط پر ایک مہرے کی بھی کمی نہیں کی۔

یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس بازی کے ختم ہونے سے پہلے زندگی کی بازی ختم ہو جائے گی اُس نے کھیل جاری رکھا اور زندگی کے آخری دن صبح کو اُس نے جب یہ بازی جاری رکھی تو ابتدا گزشتہ دن کی ایک غلط چال کی تصحیح سے کی۔ گھٹنوں میں اپنے ہاتھ دبائے بہت دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ چلنے کا طریقہ عجیب تھا۔ اُوپر کا دھڑ آگے کو جھکا ہوا اور زمین پر ایڑیاں جما کر چلتا تھا۔ خشک زمین پر بھی اس کے نقش قدم صاف دکھائی دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ سیٹی بجا رہا تھا جس میں ایک اطالوی گیت کی دُھن بجا رہا تھا۔ اس سے سوچنے میں اُسے مدد ملتی تھی۔

لیکن اب کے کسی وجہ سے کام ٹھیک نہیں ہوا۔ ایک ناخوشگوار خیال تھا کہ شطرنج کی بازی میں کوئی بڑی، کوئی بُری غلطی ہو گئی ہے۔ اس لئے کئی دفعہ ساری بازی پر پھر سے غور کیا۔ کوئی غلطی نظر نہیں آئی لیکن غلطی سرزد ہونے کے خیال نے نہ صرف اسکا پیچھا نہیں چھوڑا بلکہ اور بھی شدید اور ناگوار ہو گیا۔ یکایک ایک غیر متوقع خیال اُس کے دل میں آیا۔ شطرنج کھیلنا ہی سرے سے غلطی تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اُس میں منہمک ہو کر پھانسی کی طرف سے خیال ہٹانا اور موت کے خوف سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو؟ کیونکہ یہ خوف تو ہر اُس شخص کے لئے ناگزیر ہے جسے موت کا حکم سُنایا جا چکا ہو۔

"سب بیکار ہے" آخر اس سے کیا حاصل؟" ڈرزر نے سرد مہری سے یہ الفاظ کہے اور شطرنج کی خیالی بازی روک دی۔ اور اُسی انہماک و توجہ سے جس سے بازی کھیل رہا تھا اُس نے اپنی موجودہ حالت کی بے بسی اور خطرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اپنی کوٹھری پر ایک نظر ڈالی، ایسی کہ کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ گویا کسی سخت امتحان میں مبتلا تھا۔ پھانسی میں کتنا وقت باقی تھا، ایک ایک گھڑی گن ڈالی۔ پھانسی کے منظر کو پورا اور صحیح تصور کیا اور جب مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی تو بے بسی سے اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا۔ پھر جیسے کسی سے پوچھ رہا ہو بولا "لیجئے۔ یہ موجود ہے۔ خوف کہاں ہے؟"

حقیقت میں خوف کا وجود نہیں تھا۔ نہ صرف خوف موجود نہیں تھا بلکہ کوئی اور چیز بالکل ہی اس سے مختلف، متضاد، رونما ہوئی۔ مبہم لیکن عظیم و وحشیانہ مسرت کا احساس اور وہ غلطی جس کا اُسے اب تک سراغ نہیں ملا تھا، اب اُس کی طبیعت میں پریشانی اور رنجیدگی پیدا نہیں کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غلطی اب کسی اچھی چیز کے غیر متوقع طور پر مل جانے کی خوشخبری سُنا رہی تھی۔ جیسے کسی عزیز دوست کے مر جانے کا یقین ہو اور وہ دوست زندہ سلامت، ہنستا ہنستا سامنے آ کھڑا ہو۔

ڈرزر نے پھر اپنے کندھوں کو جھٹکا دیا اور اپنی نبض دیکھی —— اُس کا دل ذرا تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن مضبوطی و ہمواری سے، جس میں مسرت کا بھی شائبہ تھا۔ اُس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا، غور سے، جیسے کوئی پہلی دفعہ قید خانے کی کوٹھری کو دیکھے —— دیواروں کو دیکھا، دروازوں کی چٹخنیوں کو دیکھا اور کرسی کو دیکھا جو فرش میں جڑی ہوئی تھی اور سوچنے لگا:-

"مجھے اتنا سکون کیسے حاصل ہو گیا؟ اتنی خوشی اور اتنی آزادی میں کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ میں سوچتا ہوں کہ کل مجھے پھانسی دی جائیگی —— اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھانسی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ میں دیواروں کو دیکھتا ہوں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی موجود نہیں ہیں۔ اور میں اس قدر آزاد محسوس کرتا ہوں گویا قید خانے میں نہیں ہوں بلکہ ابھی ابھی کسی ایسے قید خانے سے چھوٹا ہوں جس میں میری ساری عمر گزری ہو۔ یہ کیا بات ہے؟"

اُس کے ہاتھ کانپنے لگے —— ایسی کپکپی کا پہلے کبھی اُسے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اُس کے خیالات وحشت زدہ پرندوں کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔ حالت یہ تھی جیسے آگ کی لپٹیں اُسکے دماغ میں اُٹھنے لگی ہوں اور یہ آگ بھڑک کر باہر نکلنا چاہتی ہو اور دُور تک اُس فاصلہ کو منور کر دینا چاہتی ہو جو رات کی طرح تاریک تھا۔ اب آگ پھوٹ کر باہر نکل آئی تھی اور اُس کی

روشنی سے دُور تک فاصلہ جھمک اُٹھا تھا۔

وہ تھکن جو گزشتہ دو برس سے ورنر کو اذیت پہونچا رہی تھی غائب ہوگئی تھی۔ وہ مُردہ، سرد، بھاری اژدہا جس کی آنکھیں بند اور مُنہ موت سے بھنچا ہوا تھا، ورنر کے سینے پر سے گر چکا تھا۔ موت کے رُوبرو حسین شباب، اس کے جسم میں دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ حقیقت میں حسین شباب سے بھی زیادہ کچھ اور تھا۔ روح کی اُس پُراسرار شفافی میں جو کبھی کبھی چند لمحوں کیلئے انسان کو میسر آتی ہے، ورنر نے یکایک زندگی اور موت دونوں کو دیکھا۔ ایسا پُرشکوہ منظر اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اُسے دیکھکر وہ مبہوت ہوگیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ سب سے اُونچی پہاڑی چوٹی پر وہ چل رہا ہے۔ اور راستہ ایسا ہے جیسے تلوار کی باڑ۔ ایک طرف اُسے زندگی نظر آئی اور دوسری طرف —— موت —— جیسے دو جھلجھلاتے گہرے حسین سمندر ہوں، جو حدِ نظر پر ایک لامحدود سطح میں مُدغم ہوگئے ہوں۔

ورنر نے آہستہ سے کہا "یہ کیا ہے؟ کیسا سرمدی منظر ہے!" یہ کہہ کر غیرارادی طور پر سیدھا ہو بیٹھا، گویا کوئی عظیم المرتبت ہستی اُس کی نظروں کے سامنے تھی۔ دیواروں، وقت اور فصل کی قیود کو تنک کر ورنر کی نظر اُس زندگی کی گہرائی میں پہونچی جس سے اُسے بہت جلد جُدا ہونا تھا۔

اور زندگی اب اُسے ایک نئے رُوپ میں نظر آئی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا تھا، اب اُسے پہلے کی طرح الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش ورنر نے نہیں کی۔ اور نہ کم مایہ انسانی زبان میں ایسے الفاظ ہی موجود تھے۔ بنی نوعِ انسان کی طرف سے اُسکے دل میں جو نفرت اور بُرے خیالات تھے اب یکسر معدوم ہوچکے تھے۔ جیسے کوئی ہوائی جہاز میں اُونچا اُڑے اور اسے تنگ و تاریک گلی کوچوں کی گندگی نظر نہ آئے اور بُری اور بدنما چیزیں بھی خوشنما نظر آنے لگیں۔

انسان اُسے اب کچھ اور ہی دکھائی دیتے تھے ہنسکھ اور نہیں دیکھکر جی خوش ہو۔ وقت کی قید سے بلند ہوکر اُسے بالکل صاف نظر آرہا تھا کہ بنی نوعِ انسان جو کل تک جنگلی درندوں کی طرح دہاڑ رہے تھے، اور خوفناک، نفرت انگیز اور ناقابلِ معافی نظر آتے تھے، اب ایکا ایکی بیحد محبوب ہوگئے تھے۔ جیسے کوئی بچہ بڑوں کی طرح چلنے سے معذور رہا، جیسے کوئی بچہ بے معنی باتیں بڑبڑائے اور اس میں سمجھ اور عقلمندی جھلک رہی ہو۔ بچے کی مضحکہ خیز غلطیوں اور چوٹ پھیٹ لگ جانے کی طرح، انسان بھی بے بس و مجبور نظر آنے لگا تھا۔

ورنر کے دل میں انسانوں کی محبت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ یکایک مُسکرایا اور اس کے انداز میں جو ایک شان تھی یکلخت معدوم ہوگئی۔ اور وہ پھر ایک قیدی بن گیا تھا جو اپنی تنگ کوٹھری میں بند ہو۔ دروازے کے سوراخ میں سے دیکھنے والوں کی نظروں نے اُسے تھکا دیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی ابھی ایک لمحہ پہلے اُس نے جو کچھ دیکھا تھا سب بھول چکا تھا۔ اور اس سے زیادہ عجیب یہ کہ اس منظر کو دوبارہ دیکھنے کی اُسنے کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا اور دیواروں اور سلاخوں کو دیکھنے لگا۔ لبوں پر ایک عجیب شفقت آمیز مُسکراہٹ تھی جو اس کی اپنی مُسکراہٹ سے بالکل علیحدہ چیز تھی۔ ایک اور نئی بات بھی ورنر کے ساتھ ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی —— اُس نے ایکدم سے رونا شروع کردیا۔ وہ روتا رہا اور کہتا رہا "میرے پیارے ساتھی۔ میرے پیارے ساتھی!"

خدا جانے وہ کیا پُراسرار طریقے تھے جنہوں نے مغرور بد دماغ، ورآزاد منش ورنر کو رقیق القلب اور محبِ خلق بنا دیا۔ ورنر کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی۔ اُسے اپنے ساتھیوں پر ترس آرہا تھا یا اس کے آنسو کسی اور بہت تیز احساس کو چھپا رہے تھے؟ اس کے نئی زندگی سے دھڑکنے والے دل کو اکی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا "میرے پیارے ساتھی۔ میرے پیارے ساتھی!"

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ زار زار روتا اور آنسوؤں میں سے مُسکراتا انسان وہی مغرور اور من چلا ورنر ہے۔ منصف بھی اسے نہیں پہچان سکتے تھے، اس کے ساتھی بھی، بلکہ خود ورنر اپنے آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

گیارھواں باب

پھانسی کے راستے پر

جن لوگوں کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی انہیں گاڑی میں بٹھانے سے پہلے سبکو ایک بڑے کمرے میں بھیجا گیا تھا یہ کمرہ

سرد تھا اور اُس کی وضع ایسی تھی جیسے کسی دفتر کا کمرہ ہو جو خالی پڑا ہو یا کوئی اُجاڑ مہمان خانہ ہو۔ قیدیوں کو اب آپس میں بات چیت کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔

صرف تانیا نے اس اجازت سے فوراً فائدہ اُٹھایا۔ اوروں نے خاموشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ گرمجوشی سے دبایا۔ ان کے ہاتھ برف کی طرح سرد اور آگ کی طرح گرم تھے۔ اور خاموش، ایک دوسرے سے نظریں چُرانے سکے سب کھوئے ہوئے سے ایک جگہ جمع ہوگئے۔ اب جبکہ سب اکٹھے ہوئے تو سب اپنی اپنی جگہ پر شرمندہ و نادم تھے اُس احساس کے خیال سے جو تنہائی میں اُن پر طاری ہوا تھا۔ اس ندامت کو دیکھنے یا چھُپانے کے لئے وہ ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے۔

لیکن تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اُنھوں نے ایک دوسرے کی طرف اُٹھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور مُسکرائے اور فوراً ہی اُن کا حجاب جاتا رہا اور پہلے کی طرح گھُل مل گئے۔ اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اور اگر ہوئی بھی تھی تو اتنی غیر محسوس کہ کسی ایک میں بھی پہچانی نہیں جا سکتی تھی۔ سب باتیں کر رہے تھے اور مِل جُل بھی رہے تھے لیکن عجیب طرح سے۔ اُن میں کوئی توازن نہیں تھا۔ رُک رُک کر یا ایکدم سے۔ بہت تیز یا بہت آہستہ۔ بعض اوقات الفاظ کی کثرت سے اُن کا گلا گھٹ جاتا اور ایک ہی بات کو کئی کئی دفعہ دُہراتے۔ کبھی کوئی بات ادھوری ہی رہ جاتی اور وہ سمجھتے کہ پوری کہہ چکے ہیں۔ انہیں کچھ فرق معلوم نہ ہوتا۔ انکی پلکیں جھپکنے جاتی تھیں اور معمولی معمولی چیزوں کو بھی تعجب سے دیکھتے تھے، گویا انہیں پہچان نہیں سکتے تھے۔ جیسے کسی کو عینک کی عادت ہو اور اس کی عینک اُتار لی جائے۔ سب کے سب بار بار پلٹ کر دیکھتے تھے گویا کوئی اُنہیں آواز دیکر کچھ دکھا رہا ہے۔ لیکن انہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی۔ مسیا اور تانیا کے رُخسار اور کان جل رہے تھے۔ سرجے شروع میں ہلدی کی طرح زرد تھا لیکن جلدی ہی وہ سنبھل گیا اور جیسا پہلے دکھائی دیتا تھا ویسا ہی نظر آنے لگا۔

صرف ویسلی سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان سب کی موجودگی میں بھی وہ عجیب اور بھیانک نظر آ رہا تھا۔ ورنر پریشان ہو کر جھکتے سے مُسیا سے کہنے لگا "مُسیا یہ ویسلی کو کیا ہو گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ــــ کیا؟ مجھے اُس کے پاس جانا چاہیئے۔"

ویسلی نے ورنر کی طرف دُور سے دیکھا اور اس طرح کہ جیسے اُسے پہچانتا ہی نہیں۔ پھر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

ورنر نے کہا "وسیا، تم نے اپنے بالوں کا کیا حشر کیا؟ کیا ہو گیا تمہیں؟ کچھ پروا نہیں عزیز من، کچھ پروا نہیں۔ بس اب ختم ہوا جاتا ہے۔ تمہیں ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ نہیں ہارنی چاہیئے۔"

ویسلی خاموش تھا لیکن جب یہ معلوم ہونے لگا کہ اب یہ کچھ نہیں بولیگا تو ایک گھُٹی ہوئی مُردہ سی آواز سنائی دی جیسے کوئی قبر میں سے بول رہا ہو۔

"میں ٹھیک ہوں۔ میں نہیں ہارا۔"

پھر اس نے الفاظ دُہرائے "میں نہیں ہارا۔"

ورنر خوشی سے اُچھل پڑا۔ "یہی بات ہونی چاہیئے۔ یہی بات ہونی چاہیئے۔ شاباش لڑکے۔ یہی بات ہونی چاہیئے۔"

لیکن اُس کی نظریں ویسلی کی تاریک اور تھکی ہوئی نظروں سے دوچار ہوئیں اور افسردگی سے بولا "یہ کہاں سے دیکھ رہا ہے؟ یہ کہاں سے بول رہا ہے؟" اور جیسے کسی عزیز کی قبر دیکھکر کوئی بولے، ورنر نے بڑی دلسوزی سے کہا "وسیا، سُن رہے ہو؟ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

ویسلی کی زبان بڑی مشکل سے ہلی "اور میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔"

یکایک مُسیا نے ورنر کا ہاتھ پکڑ کر تعجب سے کہا "ورنر یہ کیا؟ تم نے کہا 'میں محبت کرتا ہوں'؟ تم نے اِس سے پہلے 'میں محبت کرتا ہوں' کسی سے نہیں کہا۔ اور تم کیوں، کیوں سراپا رقیق القلب بن گئے ہو؟ کیوں؟"

مُسیا نے یہ الفاظ اس طرح جما جما کر ادا کئے جیسے کوئی ایکٹریس تماشہ گاہ میں ادا کرتی ہے اور ورنر نے بھی مسیا کا ہاتھ زور سے دبا کر کسی ایکٹر کی طرح جواب دیا "ہاں، اب میں بہت محبت کرتا ہوں۔ اوروں سے اِس کا ذکر مت کرنا۔ غیر ضروری سی بات ہے مجھے شرم سی آتی ہے لیکن میں دل سے

محبت کرتا ہوں۔"

ان کی نظریں ملیں اور ان میں چمک پیدا ہو گئی اور ان کے چاروں طرف جو کچھ بھی تھا، ایسا معلوم ہوا کہ اندھیرے میں چھپ گیا۔ جیسے بجلی کی چمک میں اور سب روشنیاں فوراً اپنا نور کھو بیٹھتی ہیں اور بھاری زرد شعلے کا سائیہ زمین پر پڑنے لگتا ہے۔

مُسیا نے کہا "ہاں ہاں ورنر۔"

ورنر نے جواب دیا "ہاں۔ ہاں مُسیا۔ ہاں۔"

ان دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور اس لمحے کوئی چیز ان میں استواری سے طے ہو گئی۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور ورنر کے دل میں پھر ایک طوفان اُٹھا اور وہ جلدی سے سرجے کی طرف بڑھا۔

"سرلوژا!"

لیکن سرجے کے بدلے تانیا نے جواب دیا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے پر ناز کرے اور ممتا کے جوش میں رونے لگے۔ تانیا نے سرجے کی آستین کو جھٹکا دیکر کہا "سنو ورنر میں اس کے لئے رو رو کر مری جاتی ہوں اور یہ ہے کہ ورزش کے خیال میں مصروف ہے!"

ورنر نے مسکرا کر کہا "مگر کی بتاتی ہوئی ورزش؟"

سرجے کی سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں آیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "ورنر ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں نے پوری طرح یقین کر لیا ہے ——"

سب نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک دوسرے سے قوت و ہمت حاصل کر کے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنا توازن پھر قائم کر لیا۔ پھر ویسے ہی ہو گئے جیسے پہلے تھے۔ لیکن انہوں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ اور سمجھے کہ کبھی بدلے ہی نہیں تھے۔ یکایک ورنر نے سرجے کو بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا تو سب کی ہنسی بند ہوئی۔ ورنر نے کہا "تم سچ کہتے ہو سرلوژا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔"

کول ون نے خوش دلی سے کہا "نہیں، لیکن تمہیں سمجھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم ——"

لیکن اتنے ہی میں انہیں روانہ ہونے کا حکم ملا۔ ان کے محافظوں نے اتنی مہربانی اور کی کہ انہیں دو دو کے جوڑے بنا لینے کی اجازت دیدی۔ محافظ فی الجملہ مہربان ہی نہیں تھے بلکہ بہت زیادہ مہربان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محافظ کچھ تو اپنی نرم دلی دکھانی چاہتے تھے اور کچھ یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا تو عدم وجود برابر ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے گویا کسی مشین سے ہو رہا ہے۔ ان سب کا رنگ زرد تھا۔

ورنر نے ونسیلی کی طرف اشارہ کر کے کہا "مُسیا تم اُسکے ساتھ ہو جاؤ۔"

ونسیلی بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ مُسیا نے سر کے اشارے سے کہا "میں سمجھ گئی۔ اور تم؟"

"میں؟ تانیا سرجے کے ساتھ جائیگی۔ تم ونسیا کے ساتھ۔ ......میں اکیلا جاؤنگا۔ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ میرے لئے یہ ٹھیک ہے۔ تم جانتی ہی ہو۔"

جب سب باہر صحن میں آئے تو سیلی ہوئی ملائم تاریکی اُن کے چہروں اور آنکھوں سے ٹکرائی اور اُنکا دم گھٹنے لگا۔ پھر ایکا ایکی ہلکی ہلکی گرمی ان کے جسم میں داخل ہو کر انہیں فرحت پہونچانے لگی۔ مشکل سے یقین آتا تھا کہ ایسا فرحت بخش اثر محض موسم بہار کی ہلکی گرم اور نم آلود ہوا کا تھا۔ بہار کی عجیب رات پگھلتی برف کی خوشبو سے بھری ہوئی تھی اور سناٹے میں بوندوں کے گرنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی۔ یہ بوندیں جلدی جلدی گر رہی تھیں گویا ایک دوسرے کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جب زمین سے ٹکراتیں تو ایک مدھم سا نغمہ پیدا کرتیں۔ کبھی کبھی ان میں سے ایک اس طرح بھی گرتی کہ نغمے کو بے سُرا کر دیتی اور اس کی آواز بھی منتشر موسیقی میں جذب ہو جاتی پھر کوئی موٹی سی بوند گرتی اور نغمۂ بہار کا تسلسل پھر قائم ہو جاتا۔ شہر کے اُوپر اور گڑھی کی چھتوں پر بجلی کی روشنیوں نے زرد سُرخ نور پھیلا رکھا تھا۔

سرجے نے ایک لمبا سانس لیا اور تازہ فرحت بخش ہوا کو پھیپھڑوں میں روک لیا۔

ورنر نے پوچھا "یہ موسم کب سے ہے؟ بڑا عمدہ بہار کا موسم ہے۔"

جواب ملا "آج دوسرا ہی دن ہے۔ اس سے پہلے اکثر کہر چھائی رہتی تھی۔"

کالے رنگ کی گاڑیاں سڑک پر روانہ ہو رہی تھیں۔ اُن میں دو دو قیدی بیٹھے جاتے تھے اور اندھیرے میں گاڑیاں غائب

ہوتی جاتی تھیں۔ اُن کی منزل وہ مقام تھا جہاں پھاٹک پر ایک لالٹین جھول رہی تھی۔ ہر گاڑی کو محافظ دستے کے سوار گھیرے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے نعل زمین سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہے تھے یا کبھی کبھی پگھلتی برف پر گھوڑے کا پاؤں پڑتا تو چھپا کا سُنائی دیتا۔

گاڑی میں سوار ہونے کے لئے جب ورنر جُھکا تو ایک سپاہی نے چُپکے سے کہا "تمہارے ساتھ ایک اور آدمی بھی جا رہا ہے۔"

ورنر کو بڑا تعجب ہوا "کہاں؟ کہاں جا رہا ہے؟ اچھا! کوئی اور بھی ہے؟ کون ہے وہ؟"

سپاہی خاموش رہا۔ گاڑی کے اندر اندھیرے میں کوئی کونے میں بے حس وحرکت دبکا بیٹھا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ورنر نے اس کی کھلی آنکھ چمکتی دیکھی۔ بیٹھتے ہوئے ورنر کا پاؤں اس کے پاؤں سے ٹکرا گیا۔ ورنر نے کہا "معاف کرنا ساتھی۔"

اُس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا جب گاڑی روانہ ہوئی تو اُسنے اکھڑ زبان میں بڑی مشکل سے پوچھا "تم کون ہو؟"

"میں ورنر ہوں۔ اقدامِ قتل کے جُرم میں پھانسی کا حکم ملا ہے۔ اور تم؟"

"میں یانسن ہوں۔ مجھے پھانسی نہیں ملنی چاہیئے۔"

یہ دونوں گاڑی میں سوار چلے جا رہے تھے تاکہ دو گھنٹے بعد اُس ناقابلِ فہم رازِ عظیم سے دوچار ہو جائیں جسے سمجھنے کیلئے زندگی سے گزر کر موت کی سرحد میں داخل ہونا پڑتا ہے ــــ اور یہ دونوں بیٹھے ایک دوسرے سے اپنا تعارف کر رہے تھے۔ زندگی اور موت دونوں ساتھ ساتھ گزر رہی تھیں اور آخری وقت تک اپنی تمام مضحکہ خیز اور بدمزہ خصوصیات کے ساتھ زندگی زندگی ہی رہی۔

"تم نے کیا کیا تھا یانسن؟"

"میں نے اپنے آقا کو چھری سے مار ڈالا۔ میں نے روپیہ چرایا۔"

اُس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ یانسن کو نیند آ رہی ہے۔ ورنر نے اُسکا ڈھیلا ڈھالا ہاتھ اندھیرے میں ٹٹول کر اپنے ہاتھ میں لیا اور محبت سے اُسے دبایا۔ یانسن نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا۔

ورنر نے پوچھا "کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"میں پھانسی پانا نہیں چاہتا۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ ورنر نے یانسن کا ہاتھ پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر زور سے دبایا۔ ورنر کے ہاتھ خُشک تھے اور ہتھیلیاں جل رہی تھیں۔ یانسن کا ہاتھ ساکت پڑا تھا جیسے بیجان ہو، لیکن اُس نے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

گاڑی بند تھی اور اس میں دم گھٹنے لگا۔ سپاہیوں کے کپڑوں کی سیل اور گیلے جُوتوں کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے کی گدّی پر جو سپاہی بیٹھا تھا اُس کا گرم سانس ورنر کے مُنہ پر لگ رہا تھا۔ اور اس کے سانس میں پیاز اور گھٹیا تمباکو کی بدبو تھی۔ لیکن کہیں کہیں دراروں میں سے ٹھنڈی تازی ہوا کی رمق آ جاتی تھی اور اس کی وجہ سے موسمِ بہار اس بند گھٹی ہوئی گاڑی میں اور بھی شدّت سے محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی کبھی دائیں کو مڑتی کبھی بائیں کو۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ واپس چل رہی ہے۔ کبھی یہ معلوم ہوتا کہ کسی وجہ سے ایک ہی جگہ کے چکّر گھنٹوں سے کاٹے جا رہی ہے۔ شروع میں ایک نیلی بجلی کی روشنی چڑھی ہوئی کھڑکی کی دراروں میں سے جھلکی۔ پھر یکایک ایک موڑ کے بعد اندھیرا ہو گیا۔ اور صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اب وہ کسی اُجاڑ بازار میں سے گزر رہے ہیں اور ریل کے اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی جب گاڑی ایکدم سے مُڑتی تو ورنر کا زندہ گھٹنا سپاہی کے زندہ گھٹنے سے ٹکرا جاتا اور یقین نہ آتا تھا کہ موت قریب ہے۔

یانسن نے یکایک پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

گاڑی کے بار بار مُڑنے سے اُسے چکّر سا آ رہا تھا اور جی بھی متلا رہا تھا۔

ورنر نے جواب دیا اور اُسکا ہاتھ اور زور سے دبایا۔ گویا بہت مہربانی، شفقت ومحبّت سے اونگھتے ہوئے ساتھی کو جواب دیا۔ ورنر کو اُس سے ایسی محبّت ہو گئی تھی کہ ابتک کسی اور سے نہیں ہوئی تھی۔

"پیارے بھائی، تم بڑے بے آرام بیٹھے ہوئے ہو اِدھر ہو جاؤ۔"

یانسن تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا "شکریہ تمہارا۔ میں ٹھیک بیٹھا ہوں۔ کیا تمہیں بھی پھانسی دینے لے جا رہے ہیں؟"

"ہاں"

ورنر نے اس طرح ہنس کر جواب دیا گویا کوئی بڑی خوشی کی بات تھی اور اپنا ہاتھ اس طرح ہلایا گویا یانسن نے کسی مضحکہ خیز بات کا ذکر کیا ہے یا کسی مذاق کی یاد تازہ کر دی جو اس کے ساتھ کیا جانے والا ہے۔

یانسن نے پوچھا "کیا تمہاری بیوی ہے؟"

"نہیں۔ میری بیوی نہیں ہے، میں نے شادی نہیں کی"

یانسن نے کہا "میں نے بھی شادی نہیں کی۔ اکیلا ہوں"

ورنر کا سر بھی چکرانے لگا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ کسی میلے کی سیر کو جا رہے ہیں۔ عجیب بات تھی کہ جتنے بھی پھانسی پانے جاتے سبھی کو ایسا ہی محسوس ہوتا۔ غم و خوف میں ایک نامعلوم خوشی کا جُزو بھی شامل ہوتا۔ پھانسی پانے والے جب انجام پر غور کرتے تو ایک طرح کی مگھم خوشی کا احساس بھی ہوتا۔ حقیقت کو دیوانگی و موت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ اور یہ لشہ جب زندگی سے آمیز ہوتا تو عجیب عجیب پرچھائیاں نظر آتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی خوشی کا تہوار ہے اور سب گھروں پر جھنڈیاں لہرا رہی ہیں۔

جب گاڑی ٹھہری تو ورنر نے خوش ہو کر کہا "پہونچ گئے ہم" یہ کہکر گاڑی میں سے کُود کر نیچے اُتر گیا۔ لیکن یانسن کے ساتھ دوسرا ہی معاملہ تھا۔ خاموشی سے اونگھ میں جھومتے کھاتا وہ اُترنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ جب اُسے اُتارنا چاہا تو اُس نے دروازے کی ہتھی پکڑ لی۔ سپاہی نے آہستہ سے اُسکی کمزور اُنگلیوں کو کھولا اور اُسکا ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر یانسن نے گاڑی کا کونہ پکڑ لیا، پھر دروازہ، پہیا وغیرہ لیکن سپاہی کی ذرا سی کوشش پر اُسنے ہر چیز کو چھوڑ چھوڑ دیا۔ حقیقت میں اُسنے ان چیزوں کو پکڑا ہی نہیں تھا بلکہ نیند میں ہر چیز سے چمٹ رہا تھا اور آسانی سے کھینچ لیا جاتا تھا۔ بالاخر وہ جاگ اُٹھا۔

جھنڈیاں وغیرہ کچھ نہیں تھیں۔ ریل کا اسٹیشن سُنسان پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ریلیں آجا نہیں رہی تھیں۔ اور جو گاڑی ان مسافروں کیلئے کھڑی تھی اُسکے لئے روشنی یا چہل پہل کی ضرورت نہیں تھی۔ ورنر نے ایکدم سے تھکن محسوس کی۔ کوئی خوف یا کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ بلکہ جیسے کوئی بہت ہی تھک کر بیدم ہو گیا ہو اور چاہے کہ کہیں جاکر زور سے آنکھیں بھینچ کر پڑ رہے۔ ورنر نے انگڑائی لی اور آہستہ آہستہ جمائی لی۔ یانسن نے بھی انگڑائی لی اور جلدی جلدی کئی جمائیاں لیں۔

ورنر نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "انہیں جو کچھ کرنا ہو جلدی سے کر کرا کے ختم کریں" یانسن خاموش اور سُکڑا جا رہا تھا۔

جب سارے ملزم پلیٹ فارم پر سپاہیوں کے گھیرے میں جمع ہوئے اور اندھیرے ڈبوں کی طرف چلے تو ورنر نے اپنے قریب سرجے گولوون کو دیکھا۔ سرجے اپنے ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف بتا کر کچھ کہہ رہا تھا لیکن صرف ایک لفظ "لالٹین" سمجھ میں آیا۔ باقی سارے الفاظ جمائی لینے میں غائب ہوگئے۔

ورنر نے بھی جمائی لیکر پوچھا "کیا کہہ رہے تھے تم؟"

سرجے نے کہا "لالٹین۔ لالٹین کا کلا بھڑک رہا ہے"

ورنر نے پلٹ کر دیکھا۔ لالٹین کا کلا واقعی بہت بھڑک رہا تھا۔ اُوپر سے چمنی کالی ہو چکی تھی۔

"ہاں بھڑک رہا ہے"

یکایک اُسے خیال آیا "مجھے اس سے کیا؟ کلا بھڑکے تو اور نہ بھڑکے تو۔ کیونکہ ———"

سرجے نے بھی شاید اپنے دل میں یہی سوچا کیونکہ اُسنے ایک نظر ورنر کی طرف دیکھا اور مُنہ پھیر لیا۔ دونوں کی جمائیاں رُک گئی تھیں۔

ڈبوں میں سب کے سب خود جا بیٹھے۔ صرف یانسن کو دھکیلنا پڑا۔ پہلے تو اُس نے اپنے پاؤں کھینچے اور اس کے جوتے ایسا معلوم ہوا کہ پلیٹ فارم کے فرش سے چپک گئے۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے موڑ لئے اور سپاہیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا۔ اُس کے پاؤں اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے کوئی بیہوش شرابی ہو اور جوتے فرش پر گھسٹ رہے تھے۔ ڈبے میں اُسے دھکیلنے تک خاصی دیر لگ گئی۔

وسیلی کیشرن بھی چل رہا تھا، چل کیا رہا تھا اپنے ساتھیوں کی حرکات کی نقل بے جانے بُوجھے اُتار رہا تھا۔ جو وہ سب کرتے وہی یہ بھی کرتا۔ لیکن جب گاڑی میں سوار ہونے لگا تو اُس کے پاؤں لڑکھڑا گئے اور ایک سپاہی نے کہنیوں میں ہاتھ دے کر اسے سنبھال لیا۔ وسیلی لرزنے لگا اور ایک تیز چیخ مار کر اپنے ہاتھ سپاہی سے کھینچ لئے۔ ورنر اُس کی چیخ سُنکر دوڑ کر آیا اور پوچھنے لگا "کیا ہے وسیا؟" وسیلی خاموش تھا۔ اُسکا رُواں رُواں

کانپ رہا تھا۔ اس حرکت پر سپاہی خود حیران اور ناراض تھا۔ بولا "میں نے تو گرنے سے بچایا تھا مگر یہ ـــــ"

"آؤ میں تمہیں لے چلوں وسیا" یہ کہہ کر ورنر نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن وسیلی نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور ایک چیخ پہلے سے بھی زور کی ماری۔

"وسیا! میں ہوں ورنر"

"مجھے معلوم ہے۔ مت چھوؤ مجھے۔ میں خود چلا جاؤنگا"

اور کپکپاتا لرزتا وہ خود ہی ڈبے میں چڑھا اور ایک کونے میں جا بیٹھا۔ مسیا کی طرف جھک کر اور آنکھوں سے وسیلی کی طرف اشارہ کرکے ورنر نے آہستہ سے پوچھا "اس کی کیا حالت ہے؟"

مسیا نے بھی آہستہ سے کہا "بہت بری۔ وہ تو مر چکا ہے۔ ورنر مجھے یہ تو بتاؤ کہ موت بھی کیا واقعی کوئی چیز ہے؟"

ورنر نے سنجیدگی سے جواب دیا "میں نہیں جانتا مسیا، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی چیز نہیں ہے"

"یہی خیال میرا بھی ہے۔ لیکن وہ؟ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھنا مجھے اجیرن ہوگیا ـــــ بس جیسے میں نے کسی لاش کے ساتھ سفر کیا ہو"

"میں نہیں جانتا مسیا۔ شاید کوئی ایسی چیز بعض لوگوں کے لئے ہوتی ہے جسے موت کہا جائے۔ فی الحال شاید اس کا کوئی وجود ہو لیکن آیندہ موت کوئی چیز نہیں ہوگی۔ پہلے میرے لئے بھی موت کا وجود تھا لیکن اب اس کا کوئی وجود نہیں ہے"

مسیا کے زرد رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی اسنے پوچھا "تو اسکا وجود تھا ورنر؟ تھا نا؟"

"ہاں تھا۔ لیکن اب باقی نہیں ہے۔ بالکل وہی میرے لئے ہے جو تمہارے لئے ہے"

ڈبے کے دروازے میں کچھ شور سنائی دیا۔ مشکا سگانوک جوتے زور زور سے پٹختا اور کھنکارتا تھوکتا داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور ٹھہر گیا۔ تھکے ہوئے سپاہی کی طرف پلٹ کر دیکھا اور چیخ کر بولا "میرے لئے یہاں آرام کرنے کی جگہ نکالو ورنہ میں ہرگز نہیں جاؤنگا۔ یہیں سامنے کے کھمبے پر مجھے لٹکا دو۔ کیا گاڑی دی ہے مجھے ان کتوں نے۔ ارے یہ گاڑی ہے؟ یہ تو شیطان کا پیٹ ہے۔ گاڑی ہے یہ؟"

لیکن یکایک اس نے اپنا سر جھکایا، گردن آگے بڑھائی اور آگے اوروں کی طرف بڑھا۔ ان کے بکھرے ہوئے بالوں اور ڈاڑھی میں سے کالی کالی آنکھیں وحشت بلکہ دیوانگی سے چمک رہی تھیں۔

"اچھا شرفا بیٹھے ہیں! یہ بات ہے۔ کہئے جناب!"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ ورنر کی طرف ایکدم سے بڑھا دیا، اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر ذرا آگے جھک کر ایک آنکھ دبائی اور جلدی سے اپنا ہاتھ گلے پر رکھکر بولا:-

"تم بھی؟ ہائیں؟"

ورنر نے مسکرا کر کہا "ہاں"

"کیا ہم سبکو پھانسی ملنے والی ہے؟"

"سب کو"

سگانوک نے دانت پھاڑ کر کہا "اوہو!" اس کے دانت چمک رہے تھے۔ ایک ہی نظر میں اس نے سبکو بھانپ لیا۔ مسیا اور یانسن پر ذرا دیر تک اس کی نظر ٹھہری۔ پھر آنکھ مار ورنر سے بولا "وزیر اعظم؟"

"ہاں۔ وزیر اعظم۔ اور تم؟"

"جناب میں یہاں اور ہی سلسلے میں ہوں۔ مجھ جیسے آدمی وزیروں سے واسطہ نہیں رکھتے۔ میں تو جناب قاتل ہوں بس یہ ہوں میں۔ ایک معمولی قاتل۔ خیر کچھ پروا نہ کیجئے جناب۔ ذرا اودھر ہوجایئے۔ میں اپنی مرضی سے آپ لوگوں کا ہم جلیس نہیں بنا ہوں۔ ہم سب کے لئے دوسری دنیا میں کافی جگہ ہوگی"

اس نے ایک تیز مشتبہ وحشیانہ نظر میں سبکو تاڑ لیا۔ سب کے سب اسے خاموشی اور سنجیدگی اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر اپنے دانت چمکائے اور کئی دفعہ ورنر کے گھٹنے پر تھپکی دی۔

"یہ بات ہے جناب! کیا بول ہیں اس گیت کے؟
مت دھن سر کو ہرے جنگل کی ماتا........"

"تم مجھے "جناب" کیوں کہتے ہو؟ ہم سب تو....."

سگانوک نے کہا "ٹھیک۔ جب تمہیں بھی میرے ہی ساتھ پھانسی ملنے والی ہے تو پھر تم کس قسم کے جناب ہوئے؟ وہ ہے تمہارے جناب" اور یہ کہہ کر اس نے ایک خاموش سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ پھر وسیلی کی طرف آنکھ سے اشارہ کرکے بولا "وہ ہم سے کمتر درجے کا نہیں ہے جناب، اجی جناب آپکو ڈر لگ رہا ہے نا؟"

ونیلی نے بڑی مشکل سے جواب دیا "نہیں"۔

"خیر اس نہیں وہیں کو چھوڑو۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے سکتے تو ہو نہیں تم کہ پھانسی پانے جاؤ اور دُم ہلاتے رہو آخر انسان ہو۔ وہ افیونی کون ہے؟ تمہارا ساتھی تو نہیں معلوم ہوتا یہ"۔

اُس نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور سانپ کی طرح پھنکارتا اور تھوکتا رہا۔ پالسن بیجان سی گٹھڑی بنا کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ پرانے کنٹوپ کے پاکھے ہل رہے تھے مگر وہ خاموش ہی رہا۔ ورنر نے اُس کے بدلے جواب دیا "اُس نے اپنے آقا کو مار ڈالا"۔ سگا نوک نے تعجب سے کہا "یا اللہ! ایسے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت کیوں مل جاتی ہے؟"

کچھ دیر سے سگا نوک کنکھیوں سے مُسیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب ایکدم سے مُڑ کر اس نے گھور کر مُسیا کو دیکھا۔

"صاحبزادی! تم مسکراؤ"۔

پھر ورنر کے گھٹنے پر اپنی فولادی انگلیاں جما کر بولا "دیکھو وہ تو واقعی ہنس رہی ہے۔ دیکھو دیکھو!"

مُسیا کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا اور اُس نے بھی پریشان ہو کر مسکرا کر اس کی وحشیانہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

گاڑی تیز چل رہی تھی اور پہیے بہت شور مچا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں پٹریوں پر اچھل رہی تھیں۔ جب کوئی موڑ آتا یا سڑک پر سے گزرنا ہوتا تو انجن کرخت آواز کی سیٹی دیتا —— انجن چلانے والے کو خوف ہوتا کہ کوئی چپیٹ میں نہ آجائے۔ عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ جس گاڑی میں پھانسی پانے والے سوار ہوں اُس کے چلانے میں اتنی احتیاط برتی جا رہی تھی۔ دُنیا کی سب سے بڑی دیوانہ وار حرکت اس سادگی و عقلمندی سے کی جا رہی تھی۔ گاڑی چل رہی تھی اور اس میں انسان بیٹھے تھے جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے۔ اور یہ سفر کر رہے تھے جیسا کہ عام طور سے سب کرتے ہیں، اور پھر گاڑی حسبِ معمول ٹھہر جائے گی۔

"گاڑی پانچ منٹ کیلیے ٹھہر جائے گی"۔

اور وہاں موت انکا انتظار کر رہی ہو گی ——

ابدیت —— رازِ عظیم۔

(اور جب گاڑی ٹھہری تو ان سات پھانسی پانے والوں کی کیا حالت ہوئی؟ پھانسی کے پھندے پڑنے تک ان ساتوں نے کیا کیا؟ اور بالآخر موت کا استقبال کس طرح کیا؟ اسکی پوری روداد آیندہ قسط میں دیکھیے۔ آخری باب موت کے وحشتناک احساسات کا دل ہلا دینے والا مُرقع ہے۔)

شاہد

آل انڈیا ریڈیو اور ہارمونیم۔

کھلی چٹھی

ڈھاکا۔ ۱۴ر اپریل سنہ۴۰ء

پیارے شاہد، اپریل کا ساقی ملا۔ ریڈیو اسٹیشنوں سے ہارمونیم کے اخراج کے متعلق تم نے جو نوٹ لکھا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ دراصل تم نے میرے دل کی بات چھین لی اور بڑی خوبصورتی سے بیان کی۔ تمہارا بیان اس قدر معقول اور مدلل ہے کہ اُسے پڑھ لینے کے بعد بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص تم سے اختلاف رائے کر سکے۔ ہاں اس کی سمجھ ہی اُلٹی ہو یا بر بنائے مصلحت ہٹ دھرمی پر اُتر آئے تو بات دوسری ہے۔

اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ آئندہ صرف وہی لوگ ریڈیو پر گایا کریں گے جو فنِ موسیقی کے ماہر ہیں تو البتہ ہارمونیم کا بائیکاٹ چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ماہر گانے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہر ریڈیو اسٹیشن کو ایسے گانے والے کافی تعداد میں مل نہیں سکتے اور بفرضِ محال اگر مل بھی جائیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ چند ہی روز میں عام سننے والے اُنکے گانے سے بیزار ہو جائیں گے بلکہ انہیں گانے کے نام سے نفرتِ کلی ہو جائیگی۔ جس طرح سونے چاندی کا نرخ بیان ہوتے وقت بڑے بڑے سوداگروں کے سوا دوسرے لوگ اپنا اپنا ریڈیو بند کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر صرف "اُستاد" لوگ ہی ریڈیو پر گائیں تو سوائے اُن لوگوں کے جو فنِ موسیقی میں اچھی دستگاہ رکھتے ہیں اور کوئی بھی اس استادانہ گانے کو سننا پسند نہ کریگا۔ اجناس کے نرخ صرف چند منٹ بیان کئے جاتے ہیں اس لئے لوگ اُسے صبر سے برداشت کر لیتے ہیں لیکن گانے کا پروگرام تو اتنا مختصر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اسے نکال ڈالا جائے تو پھر اسکے بعد عام سننے والوں کے نقطۂ نظر سے ریڈیو میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ رامپور میں ایک بڑے "اُستاد" کہیں باہر سے تشریف لائے۔ میں بھی ایک دوست کے ہمراہ اُن کا گانا سُننے گیا۔ اُستاد نے اپنی اُستادی کے خوب خوب جوہر دکھائے اور چند جاننے والوں نے جو اس محفل میں موجود تھے، اُستاد کی تعریف بھی بہت کی لیکن عام طور پر سامعین بہت بے لُطف ہوئے۔ مجھے بھی خاصی کوفت ہوئی کیونکہ وہ خدا کا بندہ گھنٹہ بھر تک "گلے بازی" ہی میں مصروف رہا۔ "آ آ آ" یا سرگم کی تکرار کے سوا مشکل ہی سے کوئی لفظ اُسکے مُنہ سے نکلا ہوگا۔ لوٹتے وقت میں نے راستہ میں اپنے دوست سے پوچھا کہ کہو گانا پسند آیا؟ انہوں نے بڑی حیرت سے کہا کہ گانا؟ کہاں تھا گانا؟ اسکا نام گانا ہے؟ ایسا ہی گانا سُننا ہو تو انسان کتے کے اینٹ نہ مارے۔ اور یہ خیال استادی گانے کے متعلق عام ہے۔

جن حضرات نے ہارمونیم کے خلاف رائیں دی ہیں اُن میں ہندوستان کے بعض مقتدر لوگ بھی شامل ہیں۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کو ہارمونیم کی مخالفت کرتے دیکھکر انسان مرعوب ہو جاتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ ایک مغالطہ ایک فریب ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی مُلک کا گورنر ہونیکی کافی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو مگر گانے کے متعلق اُسکی معلومات اتنی بھی نہ ہوں جتنی بخشا قوال یا واعظ قوال کی ہیں۔ انجنیر کیلئے حکیم اور پروفیسر کیلئے مصوّر ہونا ضروری نہیں۔ ان بزرگوں میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں موسیقی سے ذرا بھی مس نہیں۔ پوچھا جائے تو شاید دو چار سے زیادہ راگ راگنیوں کے نام بھی نہ بتا سکیں۔ اُنکی مخالفت کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماہرین کے نقطۂ نظر سے ہارمونیم کا ایک نامکمل ساز ہونا سب کو معلوم ہے۔ اسلئے ان حضرات نے بھی اُسی فنی نقطۂ نظر سے ماہرین کی رائے کا اعادہ ضروری سمجھا تاکہ لوگ انہیں موسیقی سے بے بہرہ نہ سمجھیں۔ دوسرے ابھی چند سال ہوئے ایک یورپین سیاح نے جس کا نام اسوقت مجھے یاد نہیں رہا ہندوستان کے دورانِ قیام میں یہاں کی موجودہ موسیقی اور فنِ تعمیر وغیرہ کے متعلق اسٹیٹسمین میں ایک مضمون لکھا تھا۔ موجودہ ہندوستانی موسیقی کی ہجو کرتے ہوئے اُسنے کہا تھا کہ "ہندوستان کی موجودہ موسیقی کی پستی اسی سے ظاہر ہے کہ وہاں ہارمونیم جیسا ناقص ساز گانے کے ساتھ بجایا جاتا ہے۔" گورے نقاد کا بیان کالے بڑے لوگوں نے بھی پڑھا اور حسبِ معمول آمنّا و صدّقنا کہا اور اب جو اظہار رائے کا موقع ملا تو بڑی دھوم دھام کے ساتھ، ہارمونیم کی آواز سے بھی کہیں زیادہ بلند آہنگی سے "ہز ماسٹرس وائس" کو دُہرا دیا۔ تاکہ پانچویں سواروں میں اُنکا نام بھی شامل ہو جائے مگر یہ نہ سوچا کہ ماہرینِ موسیقی کے نقطۂ نظر سے ہارمونیم ایک نامکمل ساز سہی مگر ریڈیو کی موجودہ ضروریات کیلئے تو نامناسب نہیں ہے۔ ریڈیو پر جو تھیٹریکل قسم کے گانے گائے جاتے ہیں وہ خود کونسے مکمل ہوتے ہیں کہ اُنکے لئے مکمل ساز کی ضرورت پیش آئے۔ بقول آپکے ہارمونیم کے بغیر قوالی کا تو خاتمہ ہے۔ اور بقول پروفیسر مرزا محمد سعید کے ہارمونیم کے بغیر ہندوستانی آرکسٹرا بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں استادوں کے سوا ریڈیو کے عام گانے والوں

۴۳
"ایک دفعہ کا ذکر ہے ــــ!"
(ایک دلپسند رومان بغداد)
سال رواں کا بہترین افسانوی پیکش
ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی شروع ہوتی ہے اور ملک کے نامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے جدید طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے۔ مگر اُردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو۔ یہ طویل افسانہ ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے۔ عورت کی شوہر پرستی اور دلداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے۔ ہوس پرست، حسن بیں عاشق زار شوہر محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمتِ بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ سطر بہ سطر پائیں گے۔
بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینۂ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے۔ اکثر نیک نفس بیویاں انیس جلیس جیسی عفت مآب اور دیوانۂ شوہر بیوی بننا پسند کرینگی۔
خلیفہ حمزہ کے حرم کے راز سربستہ۔ بغداد کی روزمرہ زندگی خالص الف لیلائی ماحول۔ عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ۔ روح کی بیباک تمنائیں۔ عورت کا تڑپتا ہوا دل مرد کی ہوس کارانہ جنوں سامانیاں۔ پُر تکلف ایوان۔ لق و دق صحرا۔ رنج، راحت، مسرت و کلفت پہلو بہ پہلو۔
احمد جوہری اور انیس جلیس کی پُرسوز اور حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بیخودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی۔ بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے۔ نفیس عبارت۔ بلیغ طرز بیان۔ چست و رواں عبارت پڑھنے والے کو حواس پر چھا جاتی ہے۔
مجلد نہایت خوشنما مجلد قیمت عہ ر علاوہ محصول ڈاک
علم و ادب اردو بازار دہلی

مسلمانانِ ہند کی

حیاتِ سیاسی!

ملک کے مشہور مصنف اور نامور صحافی جناب محمد مرزا [illegible] دہلوی کا تازہ سیاسی شاہکار!

ہندوستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاسی زندگی کا مکمل جائزہ!

اہم وطنی تحریکوں میں مسلمانوں نے کیا شاندار قربانیاں پیش کیں——؟ ایک شاندار مرقع!!

سیاست ماقبل اور مابعد جنگ پر نہایت بے لاگ مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ!!!

نظریہ قومیت متحدہ کا بطلان خالص سیاسی اور منطقی نقطہ نظر سے، کانگرس کی متعصبانہ سرگرمیوں اور ریاکارانہ سیاسی چالاکیوں کا صحیح ترین نقشہ، خود اس کی اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے ان پر بڑی جامعیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ایک بلیغ انداز تحریر میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اُن سب اہم ملکی مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جن سے اسوقت جداگانہ مسلم قومیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔

مسلم لیگ کے درخشاں کارناموں، اور اس کے سیاسی مسلمات، اور جداگانہ مسلم سلطنت کے قیام کی اسکیم کا صحیح جائزہ۔ اور دوسری "نیم سیاسی نیم مذہبی" جماعتوں ("خلافت"، "جمعیۃ العلماء" احرار وغیرہ) کی مکمل تاریخ اور ان کا نصب العین بھی پیش کر دیا گیا ہے اور ملک کے حالات و واقعات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ جماعتیں کس حد تک مسلمانوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں!

اس کے علاوہ مارچ ۱۹۴۰ء تک کے سیاسی حالات نہایت جامعیت کے ساتھ اس کتاب میں درج کر دیئے گئے ہیں حتیٰ کہ حال ہی کے کیکسٹن ہال (لندن) کے سانحہ (قتل سر مائیکل اوڈوائر سابق گورنر پنجاب اور اس کے ردعمل کے [illegible] پر بھی نہایت صفائی سے بحث کی گئی ہے!!

[illegible] مسلم سیاست پر یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ جو مصنف کے سالہا سال کے [illegible] مطالعہ اور صحافتی تجربہ کا نتیجہ ہے۔

ہر مسلمان پر جو اپنے ملک اور اپنی سیاست سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا پڑھنا فرض ہے!

[illegible] محدود تعداد میں طبع ہوئی ہے۔ اس لئے اپنی کاپی حاصل کرنے کے لئے جلد لکھیئے۔ ضخامت [illegible] صفحات، کتابت [illegible]

مجلد قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

[illegible] کتب خانہ علم و ادب [illegible]

سیاسی وتمدنی ادب میں نیا اضافہ

انسان کے حقوق

ایچ جی ویلز کا مباحثۂ عالم اُردو زبان میں

(مرتبہ اظفر قریشی بی۔اے)

انسان کے پیدائشی مدنی حقوق کیا ہیں۔
جمہوری حکومتیں کیوں ہٹلر سے جنگ کر رہی ہیں۔
تشدد اور وعدہ خلافیوں کے خلاف دنیا کا انسان کیا سوچ رہا ہے۔
برطانیہ اور اتحادی حکومتیں امن عالم کے لئے لڑ رہی ہیں۔ کیوں؟
کیا انفرادی آزادی اور حق قانون سازی ہر انسان کا فطری ورثہ ہے۔
بے روزگاری اور اقتصادی حالت۔
دنیا کن مدنی امراض کا شکار ہے۔
غاصبانہ طرز حکومت کو مٹا کر دنیا کو "پر امن باغ عدن" کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔
کسی حکومت کے قابو چی عمال سے انسانوں کو کیونکر بچایا جا سکتا ہے۔

یہ اور اس ہی قسم کے دیگر سوالات اور خیالات آجکل ہر صاحب فکر کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب ایک "مباحثۂ عالم" کا موضوع بن گیا ہے۔ جس میں تمام دنیا کے بڑے آدمی اور عام صاحب الرائے حضرات وخواتین نے حصہ لیا ہے۔ اس "مباحثہ" کی صدارت مسٹر ایچ جی ویلز برطانیہ کے شہرۂ آفاق مفکر و مصنف کر رہے ہیں اور انہوں نے دس نکات ایسے تیار کئے ہیں جو ان کی رائے میں آزادی منفرد اور حقوق مدنی کی بنیاد ہیں اور دنیا کی موجودہ سیاسی و معاشرتی نیز معاشی مشکلات اور ابتلا کا واحد علاج ہیں۔ جارج برنارڈ شا۔ پروفیسر جے ہیرلڈ لیکی۔ رومان رولاں۔ جواہر لال۔ گاندھی جی۔ چیمبرلین۔ ریمنڈ ویسٹ۔ وغیرہ مشہور اہل فکر اس مباحثہ میں حصہ لے رہے ہیں۔ کتبخانہ "علم وادب" دہلی نے اس مباحثۂ عالم کو مع حواشی اور تشریح اصطلاحات سیاسی شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ترتیب وتشریح اور تدوین ملک کے مشہور ادیب مسٹر ظفر قریشی بی۔اے کی زیر ادارت عمل میں آرہی ہے۔ اس موضوع پر ہندوستان کے اہل الرائے حضرات سے بھی آراء و خیالات حاصل کئے جا رہے ہیں۔ کتاب مئی کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ جنتو جلد [illegible] [illegible] کی جائیگی اور صرف سلسلہ وار فرمائشیں ہی پوری کی جا سکیں گی اسلئے ادارہ کے پاس نام [illegible] مستقل [illegible] تقریباً تین سو صفحات (زیر طبع)

کتبخانہ علم وادب اردو بازار۔ دہلی

سیاسی کتابیں

ہٹلر اعظم۔ پروفیسر چندر شاستری۔ قیمت ؏ر
مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (؏ر)
تاریخ مسلم لیگ۔ ؏ر
میری جدوجہد (ہٹلر کی آپ بیتی) ؏ر
مسولینی۔ (ڈکٹیٹر اٹلی کی آپ بیتی) ؏ر
آنادے کے ہند (چودھری افضل حق) ؏ر
انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ ۸ر
سوئٹ روس کا نظام کار (مظہر علی اظہر) ۱؏ر
کمپنی کی حکومت (باری علیگ) ؏ر
اتاترک (محمد مرزا) ؏ر
عہدِ حاضر کے بڑے لوگ کامل سیٹ ؏ر
حصہ اوّل ہندوستان (۔۔) ۸ر
۔۔ دوم چین وایران (۔۔) ۸ر
۔۔ سوم عراق وعرب (۔۔) ۸ر
۔۔ چہارم مصر ومراکش (۔۔) ۸ر
شہید میکسونی ۱۲ر
چیمبرلین ۱۴ر
[illegible] ولٹ ۱۲ر
اسٹالن (مترجم شانتی نارائن) ؏ر
اسٹالن (مترجم رام فیروز پوری) ۱۲ر
اسٹالن (گوپال متل) ۶ر اسٹالن (مترجم محمد اشرف خاں عطا) ۶ر
[illegible] (اکبر اشرف) عہ ر۔ لینن (دھرم دیو) ۴ر
[illegible]) ۶ر۔ سوشلزم (چھبیل داس) ۸ر
[illegible]) ۴ر کمیونسٹ مینوفسٹو (عبدالسمیع) ۶ر
[illegible]) ؏ر۔ ہندوستان کی پولیٹکل اکانوی ؏ر
[illegible] ہندوستان عہ ر
[illegible]

ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں ۴ر۔ قوم کی آواز (گاندھی جی) عہ ر
تاریخ کانگرس (پٹابھائی سیتارامیہ) ؏ر
غدر ۱۸۵۷ء (رام سروپ کوشل) ؏ر
غدر ۱۸۵۷ء (شیخ حسام الدین) عہ ر
سیاستیاتِ ہند عہ ر
پولیٹکل رپورٹ ۱۹۳۵ء عہ ر
مزدوروں کا پیغمبر (ہردیال) ۴ر
محمد علی جناح ۵ر
گیری بالڈی (لاجپت رائے) عہ ر
چنگاریاں (چھبیل داس) ۱۲ر
راجا وپرجا (ٹالسٹائی) ۱۲ر
ترکی جمہوریہ (ہاشمی) ؏ر
میری کہانی (جواہر لال نہرو) للعہ
سوئٹ روس (۔۔) عہ ر
تلاشِ حق (گاندھی جی) ہے
لیگ آف نیشنز (ایم۔ ایچ بھی) ۱۲ر
یورپ کی حکومتیں (نجم الدین جعفری) ؏ر
گاندھی جیون (ظفر نیازی) ؏ر
پیغام آزادی (لوکمانیہ تلک) ۱؏ر
مولانا محمد علی (عباس) ۵ر۔ مسولینی فاشیٹ (عباس) ۵ر
تحریک مدح صحابہ (مظہر علی اظہر) ۱۰ر
تقاریر ظفر علی خاں ۹ر
دنیا کی کہانی (پروفیسر مجیب) ؏ر
جدید دستور کا خاکہ ۲ر۔ سیاست کی پہلی ۴ر
حکومت خود اختیاری۔ (طفیل احمد) عہ ر
سوشلزم کی بنیادی حقیقت [illegible] ؏ر
[illegible] (عبدالماجد [illegible]) ؏ر

مشہور مصنفین کی دلچسپ کتابیں

عبدالحلیم شرر

- جویائے حق
- ایام عرب
- ماہ ملک
- فتح اندلس
- مقدس نازنین
- یوسف و نجمہ
- مفتوح وفاتح
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- خوفناک محبت
- ماہ وخت
- ملک العزیز ورجنا
- رر رر قسم دوم ۸ر
- فلورا فلورنڈا
- رر رر قسم دوم ۱۰ر
- طاہرہ
- قیس ولبنیٰ
- فلپانا
- آغا صادق کی شادی ۱۰ر
- مینا بازار
- رومتہ الکبریٰ
- فیروز شاہ
- الفانسو ۱۲ر
- ابوبکر شبلی
- لعبت چین
- سیر العلما
- مسلمان تاجداران ہند ۱۲ر
- شاہکار شرر ۱۲ر
- منصور موہنا ۸ر
- حسن انجلینا
- فردوس بریں
- شہید وفا
- میوۂ تلخ
- حسن بن صباح ۴ر
- بدر النساء کی مصیبت ۳ر
- عزیزۂ مصر
- عیب داں دلہن ۱۲ر
- مقلدین اسلام ۱۲ر
- ابو الحسین ۸ر
- ذی النورین ۱۰ر
- ثانی اثنین ۶ر
- سیرہ عائشہ ۸ر
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- افسانۂ قیس ۳ر
- تذکرہ مشاہیر عالم
- پردہ
- مخدرات مشاہیر عالم حصہ اول
- رر رر حصہ دوم
- اسلامی سوانحعمریاں
- حالات اقوام کرد ۶ر
- مقالات شرر
- سفرنامۂ ہستی

عظیم بیگ چغتائی

- خانم
- کولتار
- موج ظرافت
- مسز کرہ سطے
- چمکی
- چینی کی انگوٹھی ۸ر
- کمزوری
- کھرپا بہادر
- خطوط کی ستم ظریفی ۸ر
- شریر بیوی
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

علامہ اقبال پر

- سیرۃ اقبال
- پیام اقبال
- جوہر اقبال
- مقالات یوم اقبال
- حیات اقبال
- اقبال اور اسکا پیغام ۸ر
- بانگ درا اقبال
- شکوہ رر ۶ر
- نظم اقبال رر ۴ر

ایم اسلم

- مہدی
- کارزار حیات
- تفسیر حیات
- مرزا جی کامل
- نغمۂ حیات
- سراب ہستی
- شب غم
- ہلال وصلیب
- پیغام سروش
- گناہ کی راتیں
- بقائے دوام
- چار سہیلیاں
- بڑی بی ۱۲ر
- نرگس
- ثمرۂ گناہ
- آشوب زمانہ

شدرشن

- سولہ سنگار
- چندن
- سدا بہار پھول ۱۲ر
- محبت کا انتقام

- راج سنگھ
- قدرت کے کھیل ۱۲ر
- کنج عافیت ۶ر
- چٹکیاں ۴ر
- بیگناہ مجرم
- پتھروں کا سوداگر ۱۲ر
- قوم پرست
- پارس ۱۴ر

منشی پریم چند

- گئودان
- میدان عمل
- غبن
- پردۂ مجاز
- خواب وخیال
- آخری تحفہ
- زادراہ
- وادات
- بیوہ
- دودھ کی قیمت
- روحانی شادی ۶ر
- آسمان کی پری ۲ر

شوکت تھانوی

- موج تبسم
- سیلاب تبسم
- دنیائے تبسم
- گہرستان (دیوان)
- دل پھینک
- سونیا چاہ
- خانم خاں
- بڑبس

اصغر گونڈوی

- نشاط روح
- سرود زندگی

کتب خانہ میں نئی کتابوں کا اضافہ

ہر کتاب کا [illegible]

نام کتاب	مصنف یا مترجم	موضوع	قیمت
بغداد کا جوہری	اشرف صبوحی	ناول	صہ ر
دوشیزۂ صحرا	صادق الخیری	″	عہ ر
تلو پطرہ	سلمیٰ تصدق	″	عگر
رنبرۂ مینا	۵۰ افسانہ نگار	افسانے	ســے ر
سحر فرانس	طاہر قریشی	″	عہ ر
سوز ناتمام	عاشق بٹالوی	″	عہ ر
باسی پھول	سید علی عباس حسینی	″	عہ ر
صحرا نورد کے خطوط	مرزا ادیب	″	عگر
محشرستان	محشر عابدی	″	عہ ر
نظر کے دھوکے مصور	بدر شکیب	″	عہ ر
مقالات ہاشمی	نصیر الدین ہاشمی	مقالات	عگر
حیات اقبال	مرتبہ ملک کمپنی	سوانح	عہ ر
پریم سوگ	حسام الدین	تنقید و سوانح	۸ر
نہتارانا	دتاتریا کیفی	ناول	عہ ر
مثنویات میر	سید محمد	نظم	عگر
صوت تغزل	طباطبائی	دیوان	عگر
ڈاچی	اوپندر ناتھ اشک	افسانے	عہ ر
[illegible] جرس	والدہ سراج الدین ظفر	″	عہ ر
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	″	عہ ر
طلسم خیال	کرشن چندر	″	عہ ر
[illegible]	اختر شیرانی	دیوان	عہ ر
[illegible]	اصغر گونڈوی	″	عگر
[illegible] فانی	فانی بدایونی	″	عہ ر
[illegible]	ڈاکٹر لطیف	تنقید	عہ ر
[illegible]	عزیز	افسانہ	۸ر
[illegible]	خلیل احمد	سوانح	عہ ر
[illegible]	[illegible] دہلوی	مضامین	عگر
[illegible]	[illegible]	افسانے	عہ ر
[illegible]	[illegible]	سوانح	عہ ر
[illegible]	[illegible]	افسانے	[illegible]

نام کتاب	مصنف یا مترجم	موضوع	قیمت
خواب خیال	مجنوں گورکھپوری	افسانے	عگر
تاریخ جمالیات	″	تاریخ	عہ ر
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	مزاحیہ	عہ ر
افسانۂ پدمنی	احتشام الدین ایم اے	تنقید	عہ ر
مطالعہ حافظ	″	سوانح	عہ ر
دیوان حافظ مترجم منظوم	″	دیوان	[illegible]
پھول اور کانٹے	گوپال متل	افسانے	[illegible]
داستان عجم	نصیر حسین خیال		عہ ر
مادر ہند	شاد عظیم آبادی	مثنوی	۱۲ر
ظہور رحمت	″	نظم	۸ر
فکر بلیغ	″		عہ ر
اسٹینڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری	انجمن ترقی اردو	لغات	[illegible]
شاہنامہ اسلام حصہ سوم	حفیظ جالندھری	نظم	ســے ر
خیاباں	محمود اسرائیلی	″	عہ ر
جام طہور	اثر صہبائی	″	عہ ر
محبت کا فسانہ	ل۔ احمد	افسانہ	عگر
زندگی کے کھیل	″	″	صہ ر
اقبال اور اس کا پیغام	ڈاکٹر تصدق	تنقید	۸ر
دنیا کے سچے افسانے	گوپال متل	افسانے	عہ ر
غریب کی آہ	ڈاکٹر ہری چند	″	۱۲ر
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	افسانہ	صہ ر
شب کی پکار	راحت آرا بیگم	″	۸ر
بانسری کی آواز	″	″	۸ر
نخچیر افسانہ	″	″	۸ر
دیوان رنگین و انشا	رنگین و انشا	نظم	عہ ر
دیوان جان صاحب	جان صاحب	″	عہ ر
انتخاب ندیم	راس مسعود	″	عگر
شرح دیوان غالب	[illegible]	شرح	عگر
[illegible]	[illegible]	[illegible]	عہ ر
[illegible]	[illegible]		[illegible]

چندہ سالانہ پانچ روپے. ششماہی
تین روپے، مع محصول ڈاک؛
فی پرچہ ۱۰ ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
ساقی ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں

جرعات

شائع ہوتا ہے. اور ہر سال ایک
دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں.
مستقل خریداروں سے ان کی
قیمت الگ نہیں لی جاتی؛

جلد ۲۱ ساقی دہلی. بابت ماہ جون سنہ ۱۹۴۶ء نمبر ۶

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ناظرینِ ساقی نے سید ابوالقاسم صاحب سرور کا مضمون "سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر" (جو ساقی میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے) بہت پسند کیا ہے. واقعہ بھی یہ ہے کہ اتنے دقیق مسائل کو اتنی سلیس عبارت میں واضح کرنا سید صاحب ہی کے بس کا کام ہے۔ افسوس ہے کہ اس اشاعت میں اس مضمون کی قسط شامل نہیں ہو سکی۔ اگست کے ساقی میں آخری قسط پیش کی جائے گی۔

زیرِ نظر اشاعت میں پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی کا ایک بے مثل مضمون "دلّی کی بیگمات" شامل ہے۔ یہ مضمون "نظامِ ادب" سے نقل کیا گیا ہے۔ "نظامِ ادب" طلبۂ نظام کالج۔ حیدرآباد دکن کا ششماہی رسالہ ہے جس کا پہلا شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ساقی کے قلمی معاون سید بادشاہ حسن صاحب اس کے عملۂ ادارت میں شامل ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے "نظامِ ادب" اردو کے بہترین پرچوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ظاہری شکل و صورت بھی عمدہ اور دلکش ہے۔ قیمت دو روپے سالانہ یا ایک روپیہ فی پرچہ ہے۔ امید ہے کہ ایسے پاکیزہ پرچے کو زندہ رکھا جائے گا اور نظام کالج میگزین کی طرح بے توجہی کا شکار نہیں ہونے دیا جائے گا۔

حضرت ایم۔ اسلم کی تصنیف نرگس ساقی بک ڈپو سے شائع ہوئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن بہت خوشنما شائع ہوا ہے۔ قیمت میں بھی ۸ر کی کمی کر دی گئی ہے۔ یعنی اب عہ۱ر میں طلب کی جا سکتی ہے۔

دلّی ریڈیو کی بدعُنوانیاں ضرب الامثال کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً کوئی غلط اُردو بولے تو کہا جاتا ہے کہ ریڈیو کی زبان بول رہا ہے۔ کوئی بے سُرا الاپے تو کہا جاتا ہے کہ اس ریڈیو کو تو بند کرو۔ کسی محکمے کی ابتری بیان کرنی ہو تو کہا جاتا ہے کہ ریڈیو والوں سے بھی بدتر ہے۔ چکنے گھڑے کی پھبتی بھی اب پُرانی ہو چکی۔ کوئی ڈھٹائی کرے تو کہا جاتا ہے کہ خاصے ریڈیو بنے ہوئے ہو! دلّی ریڈیو کی اس "ہر دلعزیزی" کا سہرا اکثر معصوم اسٹیشن ڈائریکٹر کے سر ہے۔ یہ ڈائریکٹر صاحب سندھی ہیں اور اُردو ہندی میں بھی اتنے ہی کورے ہیں جتنے کہ موسیقی میں؛ دلّی اسٹیشن کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ یہ بزرگ اس پر مسلط کئے گئے ہیں۔ سابق کنٹرولر مسٹر فیلڈن کی مردم ناشناسی کی اِس یادگار کو اگر قائم ہی رکھنا ہو تو مناسب ہوگا کہ موجودہ کنٹرولر صاحب سندھ میں ایک نیا اسٹیشن کھولنے کی تجویز پر غور فرمائیں۔ بقول ہمارے ایک محترم دوست کے (جو انگریزی میں سوچتے ہیں) "دلّی اسٹیشن کتّوں کو جا رہا ہے"۔ ہم موجودہ کنٹرولر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ ان بدعُنوانیوں کا تدارک فرمائیں اور دلّی اسٹیشن کو "کتّوں کو جانے" سے بچا لیں۔ زبان کو انہوں نے کافی برباد کر لیا۔ موسیقی کو تباہ کرنے پر آئے تو ہارمونیم کا جنازہ تک نکال دیا۔ ع۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ناظرینِ ساقی میں یہ غمناک خبر افسوس سے سُنی جائے گی کہ ساقی کے خاص قلمی معاون مسٹر سعادت حسن منٹو کی والدہ نے گذشتہ ہفتے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے بابرکت سائے سے اپنے پیارے بچے کو محروم کر گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوارِ عاطفت میں جگہ دے اور منٹو صاحب کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

آئندہ ماہ ساقی کا "افسانہ نمبر" شائع ہوگا۔ افسانے بڑی کاوش سے جمع کئے گئے ہیں۔ تعداد تقریباً تین درجن ہوگی۔ مفصّل اشتہار صفحہ ۲ پر ملاحظہ فرمائیے۔

"شاہد"

یورپ پہلی نظر میں

یورپ کی پہلی جھلک نے مجھ پر جو اثر ڈالا تھا وہ ابھی تک مجھے بھولا نہیں ہے۔ ہمارے دیس کی سڑکوں اور گھروں میں جو ایک عام بے ترتیبی اور خرابی ہوتی ہے، اُسے دیکھ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ان کی دیکھ ریکھ کسی کنوارے بوڑھے کے سپرد ہے۔ جسے انتظام اور بندوبست سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یورپ کے بناؤ سنگار میں مجھے سب سے پہلے عورت کا ہاتھ نظر آیا۔ یہاں میرا مفہوم بچے پیدا کرنیوالی اور جھاڑو دینے والی عورت سے نہیں، بلکہ اُس عورت سے ہی جو آرٹ کی محرک سمجھی جاتی ہے۔

اسکے برعکس مجھے یورپ کے آسمان سے نفرت ہوتی۔ مجھے آکاس سے لگاؤ ہے اور اُس کے تاروں سے محبت ہے۔ لیکن یورپ کے مٹیالے آسمان میں تارے اتنے ہی کمیاب ہیں جتنے وہاں کے گاؤں میں دیے اور چراغ۔ مجھے یہ کمی ہمیشہ اکھری، اور یہ شک اب بھی ہوتا ہے کہ اگر یورپین میں تخیل کی کمی . روانیت کی زیادتی ہے تو اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ آسمان میں کچھ نہیں دیکھتا، اسکی آنکھیں زمین پر لگی رہتی ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد ہی یہ سمجھ میں آگیا کہ یورپین کیوں زندہ دل اور خوش مذاق، اور ایشیائی عموماً کیوں اداس اور بدمذاق ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ یورپین سماج حرفتی ہوگیا ہے اور جب بہت سے لوگ ایک ساتھ کام کرتے اور رہنے کے عادی ہوجائیں تو انہیں ایک سنگت سکھ سا ملتا ہے اور ہنستے ہنستے گاتے بھلا بُرا کٹ ہی جاتا ہے۔ لیکن جن دیسوں کی سماجی زندگی کا دارومدار کھیتی پر ہو ــــ میرے آگے ہندوستان کے سوا چین اور پرانے روس کی مثالیں ہیں ــــ تو وہاں کے لوگ رفتہ رفتہ اداس اور بے دلے ہوجاتے ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی معاشرتی زندگی کو بنانے بدلنے میں عورت کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس وجہ سے ہنسی مذاق فحش ہونے نہیں پاتے اور مرد کی طبیعت کی سختی کو عورت کا پاس نرم کردیتا ہے۔

جب پت جھڑ آئی تو مجھے دکھ ہوا۔ ایک دو ہفتے کے اندر پیڑ پودے ننگے ہوگئے اور کسی باغ کو جانا گویا درد سر بلانا تھا۔ مگر جب بہار آئی اور ہر راہ چلتا ٹھہر کر نئی کونپلوں اور کھلتی ہوئی کلیوں کو دیکھنے لگا تو معلوم ہوا کہ یورپ میں اس کی مشینوں اور کارخانوں کے باوجود کسی حد تک آرٹ کا چرچا کیوں ہے۔

اب میں نے اپنے آس پاس کے یورپین کو غور سے دیکھا۔ بظاہر اس میں ایک حیوانی قسم کی تندرستی تھی۔ وہ اپنی ذات کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ اور اس کی چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ کا یہ انداز تھا گویا دنیا کی ہر چیز اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ پہلی نظر میں اس میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آئی۔ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل اسی وقت اور اسی مقام پر چاہتا تھا۔ ہندوستان میں مروت کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ اس میں بالکل ناپید تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر راہگیر دوسروں کو دھکا دیتا ہوا چلا جاتا تھا یا یہ سڑکیں نے اور جھوڑ دکریم بھائی اور لالہ جی کے نعروں سے گونج رہے ہوں۔ ہر طرف کھا کھچی تھی لیکن ایک کو دوسرے کے آرام کا خیال تھا۔ ہر شہری نے اس اصول کو سب نے گرہ میں باندھ رکھا تھا کہ سماج کے بھلے ہی میں آدمی کا بھلا ہے۔

یورپ میں میرا زیادہ وقت فرانس میں کٹا اور زبان سیکھنے کے لئے میں ایک فرانسیسی گھرانے میں رہنے لگا۔ اُن کے لئے کسی ہندوستانی سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہندوستان کے متعلق ان کے خیالات عجیب و غریب تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے مجھے اپنا ہاتھ دکھلانا چاہا اور جب میں نے اس فن سے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو انہیں کچھ اچنبھا سا ہوا۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں دو قسم کے انسان آباد ہیں، راجہ مہاراجہ جن کا وقت رنواسوں اور خواجہ سراؤں میں گذرتا ہے۔ اور سادھو یا جوگی جو جنگلی پہاڑوں میں بیٹھے عبادت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے آدمیوں کے متعلق ان کی دلچسپی یہاں ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد اُن کی توجہ یہاں کے ہاتھیوں، سانپوں اور شیروں کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ مقدس سانڈوں اور بندروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ کشمیر کی شال اور گولکنڈے کے ہیرے کے علاوہ وہ ہماری کسی چیز کو نہیں جانتے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان اُن کے نزدیک ایک چڑیا گھر اور عجائب خانہ ہے جسے کہ، دوسرے خدا نے پیدا کیا تھا۔ بعض پڑھے لکھوں نے مجھ سے ٹیگور کی ڈاڑھی اور گاندھی جی کی بکری کا بھی ذکر کیا۔

سب سے بڑا سبق جو مجھے پہلے پہل یورپ میں ملا یہ تھا کہ وہاں انسان انسان سمجھا جاتا ہے۔ کیا مجال کہ گھر کے نوکر یا ہوٹل کے خادم سے کوئی بُرا برتاؤ کرلے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں مالک اور نوکر کا ناتا اس معنی میں ہے ہی نہیں۔ کسی کے پاس پیسہ ہے۔ کسی کے پاس محنت ہے۔ اور ان دونوں میں باہمی ادلا بدلی ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے ابھی ہم میں نوکر کو غلام سمجھنے کی عادت باقی ہے۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہاں کے لوگ عام طور پر آرٹ کا ذوق رکھتے ہیں۔ اچھی موسیقی، مصوری یا ادب کو سمجھنے والے وہاں بھی کم ہیں۔ انگریزوں کا تو ذکر ہی کیا، فرانس میں بھی پیرس کے علاوہ کہیں اور ان چیزوں کا شوق کم ہے۔ ہر طرف مغربی قوالی یعنی 'جاز' کا زور ہے۔

ہمارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یورپ سے مذہب کا نام اُٹھ گیا۔ پادریوں کا جُبہ وہاں اتنا ہی عام ہے جتنی یہاں مولوی کی قبا یا پنڈت جی کا تلک۔ اور اتواروں کو گرجا گھر اتنے ہی آباد ہوتے ہیں جتنی جمعہ کو یہاں کی مسجدیں یا تیوہاروں کے دن یہاں کے مندر لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب ان کے گھر میں رہتا ہے سڑک پر نہیں چلتا۔ مذہب کے بارے میں کوئی کسی سے بات چیت یا بحث نہیں کرتا اور یہ بالکل ذاتی چیز سمجھی جاتی ہے۔ مذہبی حجت وہاں بداخلاقی اور بدتہذیبی کی انتہا سمجھی جاتی ہے۔ میں ایسے کئی گھرانوں کو جانتا ہوں جہاں بیوی کٹر دین پرست اور شوہر بالکل بے دین ہے۔ اس کے باوجود اُنکی گھریلو زندگی بڑے مزے میں بسر ہوتی ہے۔

سڑکوں پر بھکاری بہت کم دیکھنے میں آئے۔ وہ سڑکوں پر گاتے بجاتے چلے جاتے تھے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے تھے۔ یا دیا سلائیاں بیچا کرتے تھے۔

پہلے پہل مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی اسپتال میں مدتوں رہ کر صحت مندوں کے بیچ میں آگیا ہوں۔ ان میں بھی امیر غریب سب تھے۔ زندگی یہاں بھی بہتوں کے لئے کٹھن تھی۔ لیکن اس میں ایک قسم کا توازن سا تھا۔ وہاں لوگ محنت کرنا تو جانتے ہی ہیں لیکن فرصت کی گھڑیوں کو سُکھ چین سے گذارنا اس سے زیادہ جانتے ہیں زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرنا بڑا آرٹ ہے اور وہ اس کے ماہر ہیں — ہمارے یہاں تو لوگ زندگی کو ایک لمبا کام کا دن یا لمبی چھٹی سمجھتے ہیں۔ یورپ میں یہ بات نہیں۔

اس تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی میری آنکھیں رُکیں نفسی نفسی کا بازار وہ گرم تھا کہ توبہ۔ جان پہچان کی ایک بڑی بی، جن کے مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، گھر سے بہت خوش حال، اپنا وقت ہمیشہ ناچوں اور فلموں میں گذارتی تھیں۔ ان کی سگی بوڑھی بہن جو غریب تھی پاس کے اسپتال میں دم توڑ رہی تھی۔ لیکن بڑی بی کو آخر دم تک توفیق نہ ہوئی کہ اپنی بہن سے ملنے جائیں۔ ڈر یہ تھا کہ علاج کے لئے روپے نہ مانگ بیٹھے۔ کوئی کسی کے غم کا شریک نہیں۔ نغمہ سُننے والے سب، نالہ سُننے والا سگا بھائی بھی نہیں۔ خودی اور غرض کا وہ سیلاب اُمڈا ہوا نظر آیا جس میں جل تھل برابر تھے۔

دوسری چیز جو آنکھوں کو بہت کھٹکی وہ بڑھیوں کا سنگار تھا۔ کسی حسین کے لئے سنگار تو نُورٌ علیٰ نور ہے اور زیبا بھی ہے۔ مگر میرے خیال میں کوئی کشمکش اتنی نفرت انگیز اور دردناک نہیں جتنی بڑھاپے سے بوڑھی عورت کی لڑائی۔ کوئی تلاش اتنی مایوس کن نہیں جتنی بدصورت عورت کی حُسن کی تلاش۔ مگر یورپ میں بوڑھی عورتوں کو بنج درج کا شوق سب سے زیادہ ہے۔ پوپلے چہرے پر وہ لیپا پوتی کی جاتی ہے، ہونٹوں پر وہ دھڑی جماتی ہیں، نوک پلک یوں درست کرتی ہیں کہ دور سے یا اندھیرے میں دھوکا ہو ہی جائے! لیکن ہائے بڑھاپا! عمر کو کون دھوکا دے سکتا ہے۔

یہاں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ عورت کی ساری توجہ سیکس اپیل یعنی جنسی ترغیب پر تھی۔ اور یہ رجحان کچھ ایسے بھونڈے پن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی تمام ترقی پسندی کے باوجود میرے آرٹسٹک کلچر کو یہ چیز ناگوار ہوئی۔

شہروں سے زیادہ مجھے یورپ کے دیہاتوں نے متاثر کیا۔ وہاں میں نے شہر اور گاؤں کے تمام آراموں کو یکجا پایا اور ان کی تنظیم اور صفائی ایسی تھی کہ میں دنگ رہ گیا۔ پہلی مرتبہ جس چھوٹے سے گاؤں میں میں جاکر رہا اس میں روز ڈاک آتی تھی۔ ایک معمولی سا چائے خانہ جس میں بلیرڈ کھیلنے کا انتظام تھا۔ روز شہر کی بڑی دکانوں کے ایجنٹ گھر گھر مال دینے اور آرڈر لینے کو آتے تھے۔ بہت سے گھروں میں ریڈیو سیٹ تھے اور اخبار صبح صبح مل جاتے تھے۔ مجھے اب بھی وہ مالی یاد ہے جو ایک پرانے محل کی گھاس پھوس صاف کرتے ہوئے مجھ سے چین اور جاپان کی جنگ پر بحث کیا کرتا تھا۔

یورپ کے معیار سے دیکھا جائے تو دیہاتی اب بھی کسی نہ کسی حد تک جاہل اور وہم پرست ہیں۔ چنانچہ ایک فرانسیسی کسان جو پچھلے انتخاب میں سوشلسٹ پارٹی کو ووٹ دے چکا تھا، ہر اتوار کو اپنے

گرجا گھر میں گھنٹہ بجایا کرتا تھا! دیہاتوں میں پادری کا بڑا اثر پایا۔ اور کسانوں کو یہ سُن کر سخت حیرت ہوتی کہ میں عیسائی نہیں ہوں۔ انہوں نے دبی زبان سے مجھے راہِ راست پر آنے کی تلقین بھی کی۔

شاید ہر ایشیائی کو یورپ کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ ہے زمان و مکان کو سمیٹنے کی کوشش۔ دُنیا کے زیادہ سے زیادہ لوازمات ایک ہی جگہ ایک ہی زندگی میں مل جائیں ——— میرے نزدیک یورپین تہذیب کا یہ نچوڑ ہے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور مختصر ہے، اسے جتنی اچھی طرح گذارا جا سکے، جتنے تجربات، مشاہدات اور لوازمات سے مالامال کیا جا سکے، کر لیا جائے۔ مثلاً رہنے سہنے کے ہی مسئلہ کو لیجئے۔ تین چار آدمی ایک ساتھ ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ فلیٹ چھوٹا سا ہے۔ لیکن اس کی ایک ایک انچ جگہ کسی نہ کسی مصرف میں آتی ہے۔ قرینہ اور صفائی درجۂ کمال پر ہے۔ غریبوں کے گھر بھی بیسد تصویریں ہیں۔ ریڈیو نہیں تو گراموفون ہی ہے۔ کرسی میز سب کچھ ہے۔ گھر کے آس پاس زندگی کی تمام ضروریات مل جاتی ہیں۔ یہاں کی طرح نہیں کہ کپڑا بریلی میں ملے تو تاگا راسے بریلی میں اور جوتے بانس بریلی میں۔ دُکاندار کو فون کیجئے تو ہر چیز گھر پر موجود ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ گو ہر لحاظ سے یورپ کا ایک بڑا شہر بمبئی، کلکتہ وغیرہ سے سو گنا زیادہ آرام دہ ہے لیکن معمولی قسم کا یورپین معیارِ زندگی نبھانے کے لئے بھی یہاں وہاں سے زیادہ روپے خرچ کرنے ہوتے ہیں اور پھر بھی صاحبیت رائسر کری سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

اگر پردیسی انسانیت سے کام لیں تو فرانسیسی کو میں نے خلیق اور صاحبِ دل پایا۔ چپراسی اور جمعدار جو ہر جگہ چھوٹے موٹے نانہ شاہ ہوتے ہیں یہاں رعایا کے دوست اور مددگار نظر آئے۔

یورپ میں میرا زیادہ وقت فرانس میں کٹا اور اس کا زیادہ حصہ پیرس میں۔ میں نے جو کچھ کہا یا کہوں گا اُسے فرانس تک محدود سمجھنا چاہیئے۔ یورپ میں بھی سماجی ماحول، آب و ہوا ور نسلی و تاریخی روایتوں کے مطابق مزاجوں اور اداروں میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

ایک چھوٹا سا پیرس تو وہ ہے جسے چلتے پھرتے پردیسی ہر تیسرے روز کے اندر دیکھ جاتے ہیں۔ نہ شراب و شباب، نغمۂ و رباب کا پیرس ہے۔ یہ وہ پیرس ہے جہاں جنس کے بھوکے سیاح آتے اور بسی ہوئی ہڈیوں کو چبا کر اپنے گھر لوٹ جاتے اور صوفیانہ انداز میں وہاں کی گناہ پرستیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس پیرس کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس نے ان چیزوں کو جو دُنیا کے ہر حصہ میں نہایت ہی کریہہ اور بھونڈے طریقے سے موجود ہیں، زیادہ سجا اور بنا کر ایک جگہ رکھ دیا ہے۔

لیکن ان پیرس جو مغرب کے افکار و فنون کا گہوارہ ہے وہ کچھ اور ہے۔ اسے جاننے کے لئے آدمی کو وہاں برسوں رہنا، زبان سیکھنا اور چل پھر کر اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ وہ مغرب کی جمہوری تہذیب کا گھر ہے اور وہ چوراہا ہے جس پر ہر ملک کے لوگ آکر ملتے اور ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔

پیرس شہر کی جو چیز پہلی بار سیاح کو متوجہ کرتی ہے ——— وہ ہے عمارتوں کا محل وقوع۔ ہر نکڑ کی چیز اپنی اپنی جگہ پر نگینہ کی طرح جڑی ہے اور شہر کی تقسیم میں تناسب اور تقسیم کا یہ اہتمام کیا گیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ لندن انگریزوں کی کند ذہنی طبیعت اور ذہنی الجھاؤ کی مثال ہے۔ برلن جرمنوں کی جسمانی صفائی مگر مزاجی سوندھین کا مثالیہ ہے۔ پیرس فرانسیسیوں کی خوش ذوقی اور دماغی صفائی کی نظیر ہے۔

میں روحانی اور خیالی آوارہ گردی کا قائل ہوں۔ پیرس میں قدم رکھتے وقت میری کیفیت نامور فرانسیسی ادیب رومین رولاں کے آرٹسٹ ہیرو ژاں اکرستوف کی سی تھی۔ اس کی طرح میں بھی کچھ ڈھونڈنے وہاں گیا تھا۔ یہ نہ ڈگری کی تلاش تھی نہ مال، دولت کی۔ اس قسم کے بہت سے لوگ دُور دُور سے وہاں آتے اور رم جاتے ہیں۔ کچھ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور کچھ ناکام ———

(اے۔ آئی۔ آر۔ بمبئی)

(ڈاکٹر) **اختر حسین** رائے پوری

تربتِ شہید

ظاہر میں گو یہ قبر ہے مٹی کا ڈھیر ہے لیکن اسی کی اوٹ میں اللہ کا شیر ہے
وہ شیر جس کو اپنی خودی کا شعور تھا جو فیضِ سوزِ عشق سے خود نخلِ طور تھا
دھاڑا وہ جس کی دشت میں شورِ نشور تھا جس کے نفس نفس میں نہاں نفخِ صور تھا
تھی جس کی آنکھ برقِ تہور کا آسماں گرتی تھیں جس سے کفر کے حاصل پہ بجلیاں
باطل پرست لرزہ براندام ڈرے تھے بھٹکی ہوئی نگاہ میں لرزاں شرر سے تھے
فرعونیوں کی روح تھی جس سے عذاب میں تھا جاگتے میں چین جنہیں اور نہ خواب میں
افسردہ جس نے آتشِ نمرودِ وقت کی جس پر نہ چل سکی کسی آذر کی آذری
جس کا عصا تھا درد وہ موسیٰ یہی تو تھا ایمان جس کا تھا یدِ بیضا یہی تو تھا
باطل کو اپنی قوتِ بازو پہ ناز تھا شیرِ خدا کا آپ خدا کارساز تھا

قدرت خدا کی اپنا کرشمہ دکھا گئی
تیغِ جفا ہی جامِ شہادت پلا گئی

کیوں کہئے موت یہ تو دوامِ حیات ہے اس موت میں ثبات و قیامِ حیات ہے
اک شب کہ جس کی گود میں صبحِ نشور ہے اک شمعِ کشتہ جس کی رگ و پے میں نور ہے
طوفانِ نوبہار بداماں گلِ چمن خونی کفن شفق میں ستاروں کی انجمن
قفس کا سوز سازِ حیاتِ نوی ہوا یعنی فنا کا فعل نئی زندگی ہوا
آئینہ ٹوٹ کر کئی آئینے ہو گئے اک نور کے امین کئی سینے ہو گئے
پھینکا گیا ہے توڑ کے اک کوکنار کو دعوت نمود کی ہے یہی لالہ زار کو
غنچہ لیا تو بو کو ملا اذنِ انتشار کٹنے سے اور پھیل کے رہتی ہے شاخسار
حق پر نثار ہو کے شہادت جو پا گیا اپنے عمل سے ہم کو یہ نکتے سمجھا گیا
اس موت کا شمار ہے اُن ممکنات میں جن کا کوئی جواب نہیں کائنات میں

جس قوم میں شہید نہیں نا اُمید ہے
یعنی حسین اس کا غلام یزید ہے

امینِ حزیں

مکتب کی گزران

بچپن کے وہ دن، جب بہشت نصیب اماں باوا نے ہمیں حیوان سے آدمی، اور بن جائیں تو آدمی سے انسان بنانے کی فکر میں مکتب بٹھایا تھا، آج پچاس برس کے سن میں بھی یاد آتے ہیں تو اللہ جانتا ہے یہ تالو چٹ کھوپڑی، یہ ٹھنڈا اٹوٹی پیٹھ، یہ گھگھیر سی ہتیلیاں معاذ اللہ معاذ اللہ کرنے لگتی ہیں، ہڈی ہڈی الامان پکارتی ہے، ہنسی کی بات نہیں مکتب کی گزران کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جس نے دودھ کے دانت گرنے سے عقل داڑھ نکلنے تک مہینے کے چار جمعے، اور سال میں عید بقرعید کے دو دن چھوڑ کر، کچھ اوپر ایک صدی کے بچے کھچے میاں جی کے آگے ٹاٹ کے پھٹے فرش پر، دوزانو بیٹھ کر قمچیوں کے سائے میں گزاری ہو اور منہ سے اف نہ کی ہو، ورنہ خطا معاف، جس کے پیر نہیں بوائی وہ کیا جانے پیر پرائی۔

آپ جانتے ہیں کہ مکتب کی پہلی سیڑھی بسم اللہ ہوتی ہے اور حیثیت کے مطابق امیر غریب سبھی یہ مبارک تقریب کرتے ہیں، اور پرانے چلن پر چلے تو خدا رات سے چلتے ہیں۔ بلاوا جاتا ہے، شام ہوتے ہی ٹولی بھر بھر کے برادری کی بیویاں اترنے لگتی ہیں، ڈومنیوں کو کھچڑی جاتی ہے، کڑھائی چڑھتی ہے، اور ڈھولک کی غوں غوں، غوں غوں، میں رات بھر گلگلے تلے جاتے ہیں، اور یہ رت جگا منا کر تاروں کی چھاؤں اور جھونک کی روشنی میں اللہ میاں کا رحم اور گلگلوں کے طباق، محلے کی مسجد بھجوائے جاتے ہیں؛ جہاں طاق بھرنے کے بعد یہ زنانی رسم ختم ہو جاتی ہے؛ پھر دوپہر ڈھلے تک مہمانوں کے کھانے دانے سے فراغت ہو، بچے کو نہلا دھلا کے نوشہ بناتے ہیں، اور اللہ دے تو باجے گاجے سے گھوڑے پہ بٹھا کے مسجد کے سلام کو بھجواتے ہیں، عصر کے قریب مہمانوں کے جھرمٹ میں گھر کا کوئی بزرگ بچے کی زبان سے بسم اللہ کہلوا دیتا ہے اور مبارک سلامت ہو کر لوگ آئے گئے ہو جاتے ہیں۔

یہی معمولات کم و بیش ہمارے ہاں بھی برتے گئے، اور دولہا بننے کی خوشی میں ہم ایسے اترائے کہ گلدم کی طرح پھولے ہوئے جھم جھم سے لڈوؤں اور چمیلی کی بدھیوں میں مچل مچل کے جو سوئے تو ساری رات یہی خواب دیکھتے رہے کہ موتی چور کے لڈوؤں سے کھیل رہے ہیں، چار برس چار مہینے چار دن کی کھوپڑی کے وہم میں بھی یہ تعبیر نہ گزری کہ

صبح کو باسی ہو کر جب بیدار ہوں گے تو میاں جی کے مکتب اور قاعدہ بغدادی کی بھول بھلیوں میں پھنسنا ہو گا۔

گٹ پٹ کے یہ اسکول جو آج کل نئے دھڑی کے بھاؤ سے گلی گلی ملتے ہیں، ان دنوں تو نے ماشے کے حساب بکتے تھے، عام رواج یہ تھا کہ کھاتی پیتی سرکاروں میں جہاں رئیس، کھاتے پیتے ہاتی ... ٹیم ٹھاٹ کے اور لوازمے ہوتے ہیں، وہاں گھر کے بچوں کی تعلیم تربیت کے لئے ایک میاں جی کا اکھاڑا بھی ضرور ہوتا، جو برکت کے پانچ روپے تنخواہ اور عیدی جمعراتی کی بالائی پر بکے ہوئے الف بے سے لے کر پنج رقعہ، ملینا بازار تک گھٹوانے میں مشاق ہوتے، ریں ریں کرتے بچے مکتب کے پنجرے میں بند کئے جاتے، اور زیادہ مدت نہ گزرتی کہ خاصے ہزار داستان کی طرح چہکتے ہوئے برآمد ہوتے۔

ایسا ہی ایک مکتب تھا جس میں بسم اللہ ہوتے ہی رونے دھونے اور خوب توبہ تلا مچانے کے باوجود ہمیں بٹھا ہی دیا گیا، میاں جی نے بڑی آؤ بھگت کی، چمکارا، تاکند بجھے سے کی طرح پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور مٹھائی اور کھلونوں کے داؤں پر رکھ کے قاعدے کا پہلا صفحہ چت کیا اور میاں بھیا جی کہتے کہتے "الف بے جیم" کے جنجال میں الجھا دیا، پیار کے بھروسے پر پہلے دن کا سبق ازبر ہو گیا، چھٹی بھی جلد مل گئی۔

یہی چہ مہ... "عین غین" تک پہنچنے پائے تھے کہ جمعرات آئی اور سند لیا لائی کہ آموختہ سنانا ہو گا، چل تو جلال تو آئی بلا کا خوف کیجئے، یا آنے والے جمعے کی خوشی کہ لتے دن کا کہا پیا ہضم، معدہ خالی، یعنی ہفتے بھر کی محنت اکارت۔ اول سے آخر تک پوری تقطیع ناروا، مطلع صاف آگے عین غین پیچھے عین غین۔ ناگہاں ترسے میاں کے نابند شدہ دانت نکلے، نچلا ہونٹ دبا، بھویں سکڑیں، آنکھیں جھمکیں، سیدھے ہاتھ سے کان کی لو پکڑ، الٹے سے ایک دو انگشتا چٹکی جو رسید فرماتے ہیں تو کلیجہ بیٹھا جاتا ہے، مگر آنسو بھری آنکھوں سے تحمل کا تعلّل کرتا دکھائی دیا کہ تارے جھاڑ بڑا "الف" کھڑا ہے، اس کے ساتھ میں سیدھی سیدھی اور یہ موٹی "ب" پڑی ہے۔ اور "جیم" کے پیٹ میں نقطے کی جگہ ہم خود دبکے بیٹھے ہیں۔

بہر حال کھونٹی اٹھتے ہی چکارا بولا، بھولا ہوا آموختہ فرفر چلنے لگا

رخ ہی قرأت سے صحیح تیم تنزجوں کے ساتھ، پتلی کی گرفت بھی ڈھیلی پڑگئی۔ اور کلے پر جوالاالف روز بہران" بن گئے تھے، وہ بھی موٹے موٹے آنسو ؤں سے دھو دئے اور بڑکا سایہ اطمینان محسوس ہوا کہ اپنے تو بلاسے، کان میں منت کا جو در پڑا تھا اس نے میاں جی صاحب کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا زنبور بھی تھوڑی دیر کے لئے ضرور موتھرا کر دیا ہوگا۔ سے کر لیا تھا کہ جیئی ملتے ہی میاں جی کے خلاف گھر کی کچہری میں مقدمہ دائر کریں گے۔ اور ایک چھوڑ دو دو جرموں کے ارتکاب پر سزا ہو طرفی تو نہ ہو، تبادلہ تو کرا ہی لیں گے، مگر قسمت جس پر ازل سے مکتب کندہ تھا کھوٹی تھی۔ کراہ کراہ کے، سسک سسک کے، تو ٹے ہوئے کان کی لو، ٹتے کا درد ایک سے ایک بڑھ کر دیا، مگر ممی جان اور ابا جان کے متفقہ اجلاس سے فیصلہ ہمارے خلاف ہی صادر ہوا، گوشمالی اور چپکٹ بحال ہے۔ ابا جان تو خیر ان میاں جی کے پرانے شاگرد اور شاید ابتک ہم سے زیادہ بڑے حضرت سے جھکتے تھے، مگر یہ نانی اماں! ان سے بڑی امیدیں تھیں، وہ بھی صرف "ہج! بُرا ہوا میرے لال" کہہ کر ٹال گئیں۔ بوا فہیمن نے بے شک میاں جی کو بدر بار کوسا، اور امرتی کا ایک ٹکڑا دے کر شکایت مضمحل کر دی، اس طرح ہماری مسل داخل دفتر ہو گئی۔

مکتب کی گزران میں یہ بڑا وسعت ہے کہ پڑھائی کا کوئی نصاب مقرر نہیں ہوتا۔ نہ مردوں کی بدھانی برسی کی طرح ششماہی، سالانہ امتحان کی بیخ۔ کتاب ختم ہوئی، پانچ پیسے کے بتاشے آئے، مصنف رحمتہ اللہ علیہ کی روح پر فتوح کو پنج آیت کا ثواب بخشا گیا اور نئی کتاب شروع۔ یا فتاح رب یسر ولا تعسر۔ بتاشوں کا حساب یہ کہ پیسے آدھے میاں جی کے، باقی آدھے میں سے پاؤ خلیفہ کا حق، بچا چورا چارا، وہ سارے مکتب پر تقسیم۔ ہاں جائز تھا کہ کتاب موٹی تگڑی ہو، تو فاتحہ بھی سات پیسے صد ڈھائی آنے تک، اور بتاشوں کی جگہ جلیبیاں ۔۔۔ حاضری کے باب میں بھی مکتب کی روایت مخصوص تھی، یعنی لبستہ دبائے، تختی لٹکائے آگئے تو خیریت، اور جو بیچ رستے میں ہوا ہیر، جامن، امرود کا درخت، اور شروع کر دی بقول شخصے "کلوخ اندازی" اور ہوتی دیر ہو گیا تھا، چھوٹے چار مسٹنڈے، اور پنج ہ۔

پا بدست دگرے دست بدست دگرے

لاتے بھگوڑے کو تھی کر کے!

ان ہی حالات و واقعات کو جھیلتے بھالتے تھوڑے ہی دن میں مکتب کی ہوا ہمارے اندر خوب سرایت کر گئی، اور قاعدے کے بعد "آنا پانا جانا دل لے سُن لے" والی کتاب ختم کر کے اردو کی چوتھی پڑھتے۔ اور نوبت یہ ہے "تک تختی لکھنے لگے تھے کہ کریما گلے پڑی، اور خلیفہ جی کی کمان میں بیس تک پہاڑے۔ اور پونے، سوئیے، ڈیوڑھے بھی رٹنا قرار پائے ـــ!

مکتب میں خلیفہ کا وہی رتبہ ہوتا ہے جو اسکول میں کلاس مانیٹر کا۔ فرق اتنا ہے کہ مانیٹر اپنا ہم سبق، اور جزوی جزوی اختیارات کا حامل ہوتا ہے، برخلاف اس کے، خلیفہ مکتب کا سینئر شاگرد، چغلی کھانے میں حاق، مار کھلانے میں چاق، اور میاں جی کا پرائیوٹ ڈکٹیٹر ہوتا ہے، تِل کے لڈو پہ پھسلائے، باجرے کی ٹکیاں آدھوں آدھ بیٹو الے، مگر وقت پڑے پر جس کا کھائے، اسی کو سب سے پہلے بیو نت پٹوا دے۔ خلیفہ کی خطرناک پوزیشن کا اس سے اندازہ کیجئے کہ مکتب کے مجرمین کے لئے آلات زدوکوب کی فراہمی اسی کے ذمہ ہوتی ہے۔ چھٹی کے دن باغ سے جنگل زیلے محلّے کی ٹال سے چن چن کے لانا، اور میاں جی کی بھینٹ چڑھانا۔ چنانچہ بڑے حضرت کے دائیں بائیں قمچیوں کی پوری پلٹن ہمیشہ فالن رہتی۔ قصور کی اہمیت کے لحاظ سے ان کا استعمال بھی الگ الگ تھا، شاید بات میں دیدے جڑے تھے کہ بن دیکھے موزوں چھڑی ہی پر پڑتا، مثلاً چمڑ وہ لیدپاتی چھڑی تھی جو صرف ہتیلی اور انگلیوں کے لئے مخصوص تھی، اور اس وقت بکار آمد ہوتی، جب تختی کی مشق کا "الف"، نوکیں چھوڑ کر تین نقطے سے کم زیادہ ہو، یا "بے" کی کشش، ، و، یا اا، نقطے سے گھٹ بڑھ جائے، یا جیم کا دائرہ آفتابی یا بیضاوی ہونے کی بجائے لٹک کر شہد کا چھتا ہو جائے، نہیں تو کسی سے چٹکی لی ہو، گدگدایا ہو، قلم توڑا ہو، یا دوات پھوڑی ہو، اس کی ضربیں تابڑ توڑ ہوتیں، اور ہتیلی کی چکنی سطح پر اس طرح پڑتیں جیسے تاشے پر چوب!

شفتالو کی وہ تلخی مزاج چھڑی جو ہفتے میں ایک آدھ دفعہ ہی برتنے میں آتی، دھنو تھی، یہ حملے سے پہلے میاں جی صاحب کے سر پہ گردش کرتی، اور فضا جب اس کے سناٹے سے بولنے لگتی، تب شکرے کی طرح کندے تول کر شکار یا شاگرد کی پیٹھ پر گرتی۔ اور اپنی آمد کی یادگار ایک نیلی بدھی چھوڑ کر اٹھ جاتی، اور ایسے دو ہی چار جھپٹوں میں پیٹھ پر اودا گلہریا بن جاتا، جھوٹ بولنے، فحش بکنے، آموختہ بھولنے، یا حاجت کے بہلانے مکتب سے ندارد ہونے کی پاداش میں دھنو کی مقدار خوراک بات دو بات ہی ہوتی، مگر یہی دھنو اس وقت بے پناہ ہو کر برستی، جب بہ نفس نفیس یا کو ہندوں کے ذریعے میاں کو کسی موزوں طبع شاگرد کے بچگانہ افکار کا پتہ چلتا، جن کے

موضوع خو، بدولت ہی ہوتے، جیسے "تختی پہ تختی، میاںجی کی آئی کم بختی" یا "کریا پہ بخشا نے بھونے چنے، کڑھائی میں ڈالے تو خوب ہی بنے، جو لڑکوں نے مانگے تو دو دو بنے، میاںجی نے مانگے تو ڈنڈے پڑے"۔

ایک چیچک رو، خمدار لکڑی اور تھی جو شاید کسی سابق خلیفہ نے پہاڑی علاقے سے لاکر نذر رگڑی تھی، اس کی ہر ضرب میں چونکہ ضرر شدید پوشیدہ تھا، جس کا نتیجہ یقیناً کوتوالی اور کھلا ہوا جیل، اس لئے کم نکلتی۔ اس خاصیت کو بمصلحت راز میں رکھا جاتا، اور رکتب اتنا ہی جانتا کہ خدانخواستہ "کبڑی" کا اٹھنا اور صور کا پھکنا ایک ہی معنی رکھتا ہے، البتہ مولا بخش نام، ذات کے آبنوسی، قد کے لانبے تھکے بیل کی طرح تھان ہی پر بندے رہتے، معتبر روایت ہے کہ میاں جی کی جوانی اور ان بزرگوار کی عمر لگ بھگ تھی، اب یہ اتنے جہاندیدہ ہوچکے تھے کہ کسی بڈھے کرنیل کی طرح زبانی ڈرانے دھمکانے اور جوانی کے کارنامے سنانے بھر کے رہ گئے تھے۔

مکتب میں ڈسپلن قائم رکھنے کا یہ ضابطہ بالواسطہ تھا، اسکے سوا "سلف پنشمنٹ" یا خود بخود سزا کے دو طریقے اور بھی رائج تھے، یعنی "اٹھابیٹھی" اور "مرغابنانا"۔ اٹھابیٹھی اگر اکہری ہوتی تو ذرا نرم ہی تھی "دوہری" البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی، خصوصاً اس وقت کہ دوگانہ کی ایک فرد لمبی پوئی کی ہو، اور دوسری چھوٹی راس کی۔ "مرغابننا" زیادہ تران کند ذہن بدشوقوں کے لئے تجویز ہوتا جو سب کچھ کرتے مگر سبق ہی یاد کرتے، ان مرغوں کی سیر اس وقت زیادہ پر لطف ہوتی، جب حسن اتفاق سے ایک چھوڑ کئی کئی بناتے جاتے۔ اپنے مزے سے ٹانگوں میں سے ہات نکالے، کان پکڑے، پیٹھ اچکائے، سر جھکائے ایک قطار میں اکڑوں بیٹھے جھول رہے ہیں، گردن پر ٹھیکری رکھی ہے، ہلے اور گری، گری اور رہے ضابطے باہر، اور بڑھی سزا کی میعاد، یہانتک کہ منہ لال چقندر ہوگیا۔ دل کا بخار آنسو بن کر کچھ آنکھ سے کچھ ناک سے ٹپکنے لگا، توبہ تلا ہوئی، تب جاکر آئندہ کے وعدے وعید پہ بخشے گئے۔

"اکتا گئے ہوگے؟ مکتب کی گزران کا یہ ایک شوشہ ہے، ابھی خوشنولیسی، نقاشی، بیت بازی، صنم آمد، وغیرہ کے دلچسپ مشغلے، میاں جی کی طرز تعلیم، اور اپنے ہم مکتبوں سے روشناس کرانا باقی ہے جی لہرایا، اور کسی کی پسند آیا، تو پھر کسی ملاقات میں، ورنہ آگے آیت"

والسلام۔

"آوارہ"

برات

مصروفِ گشت ہے کسی زردار کی برات
ڈوبی ہوئی ہے شام کے جلووں میں کائنات

باراتیوں کا سیل ہے یوں رہ گذار میں
جیسے چلت حساب دلِ سود خوار میں

نوشہ کے ہیں مکٹ پہ وہ موتی جڑے ہوئے
دکان دار دیکھ رہے ہیں کھڑے ہوئے

بازار میں چھتوں پہ تماشائی دور تک
یوں محوِ دید ہیں کہ جھپکتی نہیں پلک

باجوں پہ ہے اترتی ہوئی دھوپ جلوہ گر
پرچھائیاں سی کانپ رہی ہیں اِدھر اُدھر

نغمے گھلے ہوئے ہیں نشیلی ہواؤں میں
تانوں کے جال پھیل رہے ہیں فضاؤں میں

یہ زر کا کھیل دھوم دھڑکے کا کاروبار
نظروں میں ناچتے ہیں ستارے سے بار بار

دلہن کی پالکی ہے زری پوش و زرنگار
محنت سے ہیں عرق میں نہائے ہوئے کہار

اے ہمنشیں ہٹا کے ذرا سطح سے نظر
اس منظرِ جمیل کی تہ پر بھی غور کر

رسم و رواج ڈھونگ رچاتے ہیں کس طرح
فطرت کے اقتضا کو چھپاتے ہیں کس طرح

شب خون رونما ہے لباسِ بہار میں
محشر نہ کیوں بپا ہو دلِ داغدار میں

کانٹوں کے دوش پر ہے گلِ جانفزا کا رتھ
ظلمت کے بیل کھینچ رہے ہیں ضیا کا رتھ

کیا حقیقتوں پہ ستم ڈھا رہے ہیں لوگ
دوشیزگی کی لاش لئے جا رہے ہیں لوگ

احسان دانش

آؤ کھوج لگائیں

کشور۔ (اپنی بیوی سے، بڑے سنجیدہ لہجہ میں) آؤ کھوج لگائیں۔

لاجونتی۔ کھوج لگاؤ گے ـــ تم کھوج لگاؤ گے ـــ تم جیسے لال بجھکڑوں کی بابت ہی تو وہ کہاوت مشہور ہے۔

کشور۔ کون سی کہاوت؟

لاجونتی۔ وہ۔ ہاتھی کے پاؤں کا نشان دیکھکر ایک لال بجھکڑ نے کہا تھا۔ چکی کا پڑ باندھکر کوئی ہرنا ناچا ہوئے۔

کشور۔ لاجونتی تمہیں شرم نہیں آتی میرا مذاق اڑاتے۔ اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ میرا اتنا نقصان ہو گیا ہے۔

لاجونتی۔ آپ کا نقصان کیا ہوا ہے۔ وہ تو میرے ہی گھر میں ہونجا پھرا ہے۔ میرا ہی سب کچھ غارت ہوا ہے۔ آپ کا گیا گیا ہے۔ ایک فاؤنٹین پن اور وہ موا سگرٹ کیس۔

کشور۔ لو بھئی تم نے یہ نیا شوشہ چھوڑ دیا ـــ تمہاری نظر میں تو میرے سگرٹ کیس اور پن کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ گویا بخشیش کے تھے۔ میرا سگرٹ کیس اصلی چاندی کا تھا جنگ سے پہلے اس کی قیمت بیس روپے تھی۔ آجکل تو کم از کم تیس روپے کی ہوگی اور وہ پن کوئی ایسا ویسا تھوڑی تھا۔ ساڑھے سترہ روپے میں خریدا تھا۔

لاجونتی۔ بس تمہیں تو اپنی ہی چیزوں کی فکر ہے چاہے دوسرے کا سارا گھر بار لٹ جائے۔

کشور۔ تمہارا گھر بار کیا میرا گھر بار نہیں؟

لاجونتی۔ مجھے اس وقت نہ ستاؤ نہ کے بتا ـــ مجھے اس وقت نہ ستاؤ ـــ میں اس وقت بھری بیٹھی ہوں ـــ (آہ بھر کر) پرماتما کرے نہ رہے اس دنیا کے تختے پر جس نے مجھ غریب پر اتنا ظلم کیا۔ کڑکتی بجلی گرے ـــ پرماتما کرے کسی موٹر کے نیچے آجائے ـــ کوڑھی ہو کے مرے ـــ!

کشور۔ لو تم نے تو رونا شروع کر دیا ـــ نہ رو لاجونتی، نہ رو۔ تم روتی ہو تو میرا بھی جی بیٹھنے لگتا ہے۔ لو بس اب چپ ہو جاؤ۔ ایسے صدمے آدمی کے لئے کوئی نئے نہیں ہیں۔ سچ پوچھو تو ہمیں اب اس کی بابت غور ہی نہیں کرنا چاہیئے اور صبر شکر کرکے خاموش ہو جانا چاہیئے۔

لاجونتی۔ خاموش ہو جانا چاہیئے۔ کیوں۔ کوئی ہم پر ستم ڈھائے اور ہم اُف بھی نہ کریں۔ دن دہاڑے ہمیں لوٹ لیا جائے اور ہم اسکی شکایت نہ کریں۔ کیوں۔ تو پھر بتاؤ جی ہلکا کیسے ہو۔

کشور۔ جی ہلکا یوں ہو سکتا ہے کہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کریں۔ ہنسی مذاق میں اس دکھ کو اڑا دیں۔ لاجونتی۔ تم خود سمجھدار ہو۔ آخر کب تک ہم یوں آہیں بھرتے رہیں گے۔

لاجونتی۔ سب کچھ سمجھتی ہوں مگر کیا کروں۔ نگوڑے اس دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ چاہتی ہوں دھیان ادھر سے ہٹ کر کسی دوسری طرف لگ جائے مگر بیٹھے بیٹھے کلائی پر نظر پڑتی ہے تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے ـــ ٹوٹ جاتی۔ اس کا ایک ایک پرزہ میری آنکھوں کے سامنے کوئی علیحدہ کر دیتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔ زیادہ دکھ تو اس بات کا ہے کہ معلوم نہیں کس کے پاس ہے کس کے پاس نہیں ہے۔ اپنے پاس رکھی ہے یا بیچ باچ دی ہے۔

کشور۔ تم اب اپنی جان ہلکان نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے کہیں اچھی گھڑی لا دونگا۔ سونے کی۔ جو رات کو بھی وقت بتائے۔ لو اب ہٹاؤ اس قصے کو۔ آؤ کوئی اور بات کریں۔

لاجونتی۔ لیکن چوری کس صفائی سے کی گئی ہے۔ مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے ـــ میری نیند کو اس روز کیا ہو گیا۔ آپ کی تو خیر بہت بھاری نیند ہے کہ پاس ڈھول پیٹے جائیں اور آپ کو خبر نہ ہو۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ چور آیا، گھڑیاں، پیالے، سگرٹ کیس، قلم ـــ اور کیا ـــ؟

کشور۔ اب چھوڑ بھی دو نا اس داستان کو۔

لاجونتی۔ ہاں۔ چور بڑے مزے سے آیا۔ گھڑیاں، پیالے، سگریٹ کیس، قلم اور آپکے اُسترے کے نئے بلیڈ لیکر چمپت ہوا اور ہم دونوں آرام سے سوتے رہے۔ اگر وہ میز کرسیاں بھی اٹھا کر لے جاتا تو ہمیں خبر نہ ہوتی۔

کشور۔ ذرا آہٹ بھی تو نہیں ہوئی۔ لیکن چھوڑو۔ میں کہتا ہوں اگر ذرا سی آہٹ بھی ہوتی تو میں فوراً جاگ پڑتا۔ لیکن اب ان باتوں سے کیا فائدہ ہوگا۔ ہاں تم یہ بتاؤ میرا پُل اوور کب تیار ہوگا۔ اُون تو میں نے ایسی اتنی بڑھیا لا کر دی ہے تمہیں، بس اب ایسا پُل اوور بنے کہ طبیعت خوش ہو جائے ـــ نرائن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز)

نرائن۔ نرائن کی آنکھیں تو اس وقت کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں جب اُس نے یہ سُنا تھا کہ تمہارے گھر پرسوں رات چور آیا اور گھڑیاں، قلم دوات اور نہ معلوم کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے گیا۔ نمسکار بھابی جان ــــ مجھے ابھی ابھی گھر سے معلوم ہوا کہ آپ کی چوری ہو گئی ہے ـــــ ہاں بھئی کشور یہ تو بتاؤ آخر ہوا کیا۔ میں نے سنا ہے تم مزے سے سوتے رہے اور چور اپنا کام کر گیا ــــ کیا یہ سچ ہے؟

کشور۔ جو کچھ بھی اب کہا جائے سچ ہے۔

نرائن۔ یہ بھی کوئی جواب ہے۔ مجھے سارا واقعہ سناؤ۔ چور کب آیا، کب گیا، کون کون سی چیزیں اُٹھا کر لے گیا، کس راستے سے اندر داخل ہوا۔ جب وہ آیا اس وقت تم سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ تمہیں کس پر شبہ ہے۔ نوکر سے پوچھ گچھ کی۔ تمہارے ہمسائے کیا کہتے ہیں۔ پولیس میں رپٹ لکھوائی اگر لکھوائی تو اس کا کیا حشر ہوا۔ یہ سب باتیں مجھے بتاؤ۔ آخر چوری ہوئی ہے۔

کشور۔ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا

نرائن۔ بھئی واہ۔ تو یہ چوری کیسے پکڑی جائے گی۔ مجھے بتاؤ کہاں کہاں سے چیزیں اُٹھائی گئی ہیں۔ میز پر یا کہیں اور انگلیوں کے نشان ملے۔ کیا فرش پر پاؤں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اگر کھڑکی کے راستے چور اندر آیا ہے تو جنگلے پر ضرور نشانات ہوں گے ــــ اور ہاں میں نے سنا ہے کہ وہ تمہارے استرے کے نئے بلیڈ بھی لیتا گیا۔ اس کے متعلق تم نے غور کیا۔ بلیڈ کس چھاپ کے تھے ــــ اور گھڑیوں میں کیا کوک بھری ہوئی تھی۔

کشور۔ کوک شام کو بھری تھی یا رات کو۔ قلم میں روشنائی نیلی تھی یا سبز۔ بلیڈ پر جو کاغذ چڑھا ہوتا ہے کس رنگ کا تھا۔ اب جانے دو، نا شرلک ہومز بننے کی کوشش نہ کرو۔ جیسے بلیڈوں کا چھاپ معلوم کر کے آپ چوری کا کھوج لگا لیں گے۔

نرائن۔ اور یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے سے تم ضرور چوری کا پتہ لگا لو گے ــــ نہ بتاؤ۔ میری بلا سے۔ آج کل میں کوئی اور چور آئے گا اور گھر میں جھاڑو پھیر کر چلا جائے گا پھر بھی کچھ نہ کرنا۔ تمہیں میری قسم ہے کھوج لگانے کی ذرا کوشش نہ کرنا۔ مجھ سے بھول ہوئی جو میں نے ہمدردی کے طور پر تم سے یہ باتیں کیں۔ اب کچھ تم سے پوچھوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔

کشور۔ تم ناحق بگڑتے ہو، بات دراصل یہ ہے کہ میں اس چوری کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا ــــ ع۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!

لاجونتی۔ یعنی کوئی ہمیں اُٹھا کر نہیں لے گیا۔ سو آپ جب یونہی گھوڑے بیچ کر سویا کریں گے تو ایک روز یہ بھی ہو جائے گا۔ نرائن صاحب ذرا ان کی نیند ملاحظہ ہو کہ چور کمرے میں داخل ہوا۔ میزوں کی سب درازوں کی تلاشی اُس نے لی ــــ اور تو اور اس تپائی پر سے اُس نے گھڑی اُٹھائی جو ان کے سر کے ساتھ جڑی رہتی ہے لیکن انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ بھئی کیا نیند پائی ہے۔

کشور۔ مجھے کوسے چلی جاتی ہو۔ تپائی کی طرف تو تم ہی سوتی ہو۔ تمہیں کیا سانپ سونگھ گیا تھا۔

لاجونتی۔ کیا [illegible] ہوئی جا [illegible] تو دوسرے کمرے میں ہے

کشور۔ [illegible] تپائی کی چار [illegible] تو دوسرے کمرے میں

[illegible] رہا تھا ــــ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تپائی جو بستر کے ساتھ جڑی رہتی ہے کیوں نہ بلی۔ تمہارا کیا خیال ہے نرائن، مجھے تو یہ چور بڑا ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔

نرائن۔ تم میاں بیوی سے تو معمولی سے معمولی چور بھی ہوشیار ہو گا۔ ہاں تو آپ دونوں ایک پلنگ پر سو رہے تھے کہ ــــــ

لاجونتی۔ نرائن صاحب۔

نرائن۔ جی

لاجونتی۔ میں بھول گئی کہ میں کیا کہنے والی تھی ــــ ہاں نرائن صاحب یہ چور چوری کیوں کرتے ہیں؟

نرائن۔ (ہنستا ہے) چور چوری کیوں کرتے ہیں (ہنسنا بند کر کے) نہیں، بات معقول ہے۔ چور چوری کیوں کرتے ہیں سوچنا چاہیئے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ چور کس لئے چوری کرتے ہیں۔

کشور۔ اسلئے چوری کرتے ہیں کہ میاں بیوی میں لڑائی ہو۔

لاجونتی۔ بس آپ کو تو ہر وقت لڑائی جھگڑے ہی کی سوجھتی ہے۔

نرائن۔ چھوڑیئے اس قصے کو ــــ ہاں بھئی کشور تم یہ بتاؤ کہ چور زیادہ مرد ہوتے ہیں یا عورتیں۔

لاجونتی۔ عورت بیچاری کیا چوری کرے گی۔ ہزار میں ایک ہو گی ورنہ چور ہوتے ہی مرد ہیں۔ [illegible] نامی گرامی لکھنؤ کا چور گذرا ہے جو چھت سے چھت [illegible] کر چھپکلی سا چمٹ جاتا تھا۔

کشور۔ کمتی خانہ بدوش کی [illegible] عورت پنجاب میں ایسی گذری ہے جس نے بڑے بڑے چوروں کے بھی کان کاٹے ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکو دور دریا لے جا کر بپا سالاتی تھی۔

لاجونتی۔ میرے گلے کا لاکٹ تمہارے اس رامو نے ہی چرایا تھا۔

کشور:۔ اور میرا ٹائم پیس تمہاری وہ درگاہی میا ں میں چھپا کر بھاگ رہی تھی۔

نرائن:۔ تو ثابت ہوا کہ مرد اور عورتیں دونوں چور ہوتے ہیں۔

کشور:۔ ثابت کچھ نہیں ہوا — اب ہمارا تماشہ دیکھنے کی کوشش نہ کرو لاجونتی اب بند کرو اس گفتگو کو — بتاؤ وقت کیا ہوا ہے۔ مجھے باہر جانا ہے۔

لاجونتی:۔ وقت — لیکن گھڑی کہاں ہے۔ (آہ بھر کر) پرماتما کرے وہ کلائی ہی ٹوٹ جائے جس پر میری گھڑی باندھی جاتے۔ موئے نے بیچ بھی دی ہوگی اونے پونے داموں میں۔ پرماتما کرے کیڑے چلیں اس کے جسم میں — ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دے۔

(دروازے پر دستک)

کشور:۔ کون ہے؟

(دروازے پر دستک)

کشور:۔ (کرسی پر سے اٹھنے کی آواز)۔ اس وقت کون آیا ہے۔ کون ہے۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

کشور:۔ فرمائیے آپ کو کس سے ملنا ہے۔

ملاقاتی:۔ آپ سے۔

کشور:۔ آپ کا اسم گرامی۔

ملاقاتی:۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ جو گفتگو ابھی ابھی آپ لوگوں کے درمیان ہو رہی تھی اس کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں آپ کا ممنون ہونگا۔

کشور:۔ اندر تشریف لے آئیے — (دو تین سکنڈ کے لئے خاموشی۔ پھر کرسیوں کی آواز) — بیٹھئے — ہاں۔ یہ میری وائف ہے اور یہ میرے دوست مسٹر نرائن۔

ملاقاتی:۔ نمسکار — میں آپ دونوں کو جانتا ہوں۔

کشور:۔ کیا کہا آپ نے۔

نرائن:۔ مجھے — مجھے آپ کیسے جانتے ہیں؟

ملاقاتی:۔ میں زیادہ دیر تک آپ لوگوں کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں آپ سب کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کے تو میں کئی افسانے پڑھ چکا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور میں صرف آپ ہی ہندوستان کے بڑے افسانہ نگار ہیں کیونکہ آپ کے تخیل میں ندرت ہے۔ آپ ترقی پسند ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمارے ادب نے ابھی تک افسانہ پیدا ہی نہیں کیا مگر آپ نے —

نرائن:۔ قدر افزائی کا شکریہ — آپ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ہندوستانی ادب میں افسانہ ناپید ہے۔ جو لکھنے والے ہیں —

کشور:۔ مگر ابھی تک ہم سب اندھیرے میں ہیں۔

ملاقاتی:۔ معاف کیجئے گا میں اور نرائن صاحب افسانے کی رو میں بہہ گئے۔ ہاں تو نرائن صاحب آپ سے ہندوستان کے افسانوی ادب پر پھر کبھی باتیں ہونگی۔ مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہیئے تھا۔ خاکسار وہ چور ہے جس نے یہاں کی چیزیں چرائی ہیں۔

لاجونتی:۔ (چونک کر) چور —!

کشور:۔ کیا کہا آپ نے۔

نرائن:۔ آپ چور ہیں؟ — اور میرے افسانے —

ملاقاتی:۔ میں آپکے افسانوں کے متعلق پھر بات کرونگا۔ جی ہاں خاکسار وہی چور ہے جو پرسوں رات یہاں حاضر ہوا تھا۔

لاجونتی:۔ میری گھڑی۔ (ایکا ایکی چونک کر۔ چیخ کے ساتھ۔)

ملاقاتی:۔ جی ہاں یہ آپ ہی کی گھڑی ہے جو میں نے اپنی کلائی پر باندھ رکھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ ٹھیک وقت دے گی مگر اب معلوم ہوا کہ یہ پندرہ منٹ تیز چلتی ہے۔

لاجونتی:۔ میں — میں —

ملاقاتی:۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ کے انتخاب کو اچھا نہیں سمجھتا۔ آپ کا ذوق یقیناً بہت اچھا ہے۔ آپ کے سنگار کی دوسری چیزیں اس کی گواہ ہیں۔ مگر آپ نے مجھے گالیاں دیکر احترام کے اس جذبے کو ضعیف کر دیا ہے جو کہ میرے دل میں آپ کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔ گہری نیند سونے والی خاتونوں اور آرٹسٹک انتخاب رکھنے والی عورتوں کا رتبہ میری نگاہوں میں ہمیشہ بلند رہا ہے۔ لیکن آج جب میں نے آپ کی زبان سے اپنے متعلق غیر مناسب الفاظ سنے تو یقین مانیئے مجھے بیحد صدمہ ہوا۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ جیسی بلند سیرت خاتون نے میری تذلیل کی۔

نرائن:۔ تذلیل۔

کشور:۔ چور کی تذلیل — آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ملاقاتی:۔ یہی کہ میری بیحد تذلیل ہوئی ہے۔ اس گھر میں جس کی ہر ایک شے میں بڑی آسانی سے اٹھا کر لے جا سکتا تھا آپ سب نے مل کر میرے وقار پر حملہ کیا ہے۔ میرے تعزز کی مٹی پلید کی ہے۔ میری غیر موجودگی میں آپ نے میرے پیشے کو برا بھلا کہا ہے۔ ایک شریف آدمی کی اس سے

بڑھکر اور کیا ہتک ہو سکتی ہے۔

کشور۔ بے وقار۔

لاجونتی۔ تعزز۔

کشور۔ شریف آدمی۔

نرائن۔ سگرٹ شوق فرمائیے۔

(دیا سلائی جلانے کی آواز)

ملاقاتی۔ شکریہ۔ (سگرٹ سلگاتا ہے) میں یہاں صرف اپنی پوزیشن صاف کرنے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ قانون کی نظر میں ہم لوگ سوسائٹی کے دشمن ہیں لیکن اگر اس دشمن پر تہمتوں کے انبار لگا دئے جائیں اور اُسے ذلیل و رسوا کیا جائے تو بتائیے اس کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہونچے گی۔ ہمیں ایک عام پیشہ ور کی حیثیت سے کیوں نہیں دیکھا جاتا۔ میں اس سوال کے منطقی اور معاشرتی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا پیشہ اس شئے لطیف کے بالکل قریب ہے جسے ہم آرٹ کہتے ہیں۔ ہمارے پیشے میں وہ تمام عنصر موجود ہیں جو آرٹ کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً فراخ ہمتی، امنگ، خیال آرائی، تخلیق تحریک، روحانی فیضان اور ایجاد کا مادہ۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ چور بننے کے لئے فطری صلاحیت کا ہونا اشد ضروری ہے تو شاید آپ میرا مذاق اڑانا شروع کر دیں مگر یہ حقیقت ہے بعض لوگ قدرتی طور پر غیر معمولی حافظے کے مالک، حاضر دماغ اور تیز نگاہ ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں بلا کی پھرتی ہوتی ہے۔ ان کی قوت لامسہ بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ لوگ اگر آپ یقین فرمائیں صرف اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ شاندار رسّے باز بنیں، اور جیب تراشی کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے بڑی چابکدستی، حرکت کے زبردست تیقن، مشاہدے اور توجہ کی انتہائی شدت اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح شاعر پیدا ہوتا ہے اسی طرح چور پیدا ہوتا ہے۔ دراصل چور کو آپ کسی حیلے سے بھی لالچ دے کر اُسے اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتے۔ اچھی ملازمت کی پیشکش، قیمتی سے قیمتی تحفے حتیٰ کہ عورت کی محبت بھی اُسے ورغلا نہیں سکتی اس لئے کہ اس کے پیشے میں خطرے مستقل خوبصورتی، کھٹکے کی مسرت افزا گہرائی۔ دل دہلنے کا لطف، نبض حیات کی تیز دھڑکن ہے۔ ان سب کے اوپر ایک کیف ہے — ایک وجد — ایک ناقابل بیان ترنگ ہے۔

کشور۔ (ہنستا ہے۔ خوب ہنستا ہے) بھئی لطف آگیا۔ ان سب کے اوپر ایک کیف۔ ایک وجد۔ ایک ناقابل بیان ترنگ ہے — اور اسکے اُوپر میرے معزز ملاقاتی کا سر — (ہنستا ہے)

ملاقاتی۔ نرائن صاحب۔ آپ اپنے دوست سے کہیں کہ وہ زیادہ نہ ہنسیں۔ ہنسی وہ ہے جو خود بخود آئے۔ زبردستی ہنسنا صحت بخش نہیں ہوتا۔

نرائن۔ اسے ادب آداب سے کوئی واسطہ نہیں۔ آپ جو کچھ کہہ رہے تھے اُسے جاری رکھئے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

ملاقاتی۔ میں یہ عرض کرنے والا تھا کہ آپ لوگ قانونوں۔ قسم قسم کے تالوں، بندوقوں، تلواروں، پولس کے سپاہیوں اور ٹیلیفونوں سے مسلح ہیں۔ لیکن ہمارے پاس صرف پھرتی، ہوشیاری اور بیباکی ہے جس کے ذریعے سے ہم آپ کا مقابلہ کرتے ہیں — اور ہاں کیا آپکو معلوم ہے کہ ہمارے دیہاتوں میں صاحب ذکاوت لوگ جو کہ آرٹسٹک طبیعت کے مالک ہوتے ہیں اکثر گائے چور بن جاتے ہیں یا گھوڑے چرانا شروع کر دیتے ہیں۔

کشور۔ کیوں

ملاقاتی۔ اس کے سوا وہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ یہ زندگی اونچی فضاؤں میں پرواز کرنے والی روحوں کے لئے بہت کم حقیقت۔ تنگ اور نہایت درجہ خشک اور بے کیف ہے۔

لاجونتی۔ وہ ذہانت اور ذکاوت کس کام آئیگی جو بری جگہ استعمال ہو۔

ملاقاتی۔ خاتون محترم۔ ذہانت اور ذکاوت اگر مسجد مندر سے الگ ہٹ جائے تو بھی اُس کی خوبصورتی میں فرق نہیں آتا۔ ترقی ایک قانون ہے اور چوری بھی مخلوق ہوتی ہے — یہ لیجئے اپنی گھڑی — اس گھڑی کا اسٹریپ میں نے بدل دیا ہے۔ چونکہ پہلا بہت ہی ان آرٹسٹک تھا۔ میں ان لوگوں کی گھڑیاں اپنے پاس نہیں رکھا کرتا جو مجھے گالیاں دیں اور میرے پیشے کو بالکل غلط رنگ میں دیکھیں — اچھا اب میں جانا چاہتا ہوں۔

نرائن۔ سگرٹ شوق فرمائیے۔

ملاقاتی۔ شکریہ — یہ آپ کا سگرٹ کیس بہت اچھا ہے۔

(سگرٹ سلگانے کی آواز)

نرائن۔ میں ایک بات آپ سے پوچھ سکتا ہوں؟

ملاقاتی۔ بڑے شوق سے۔

نرائن۔ آپ کشور کے بلیڈ کیوں چرا کر لے گئے تھے؟

ملاقاتی۔ (ہنستا ہے)۔ بلیڈ — قصہ یہ ہے کہ جس روز میں یہاں آیا اُسی روز میں نے نئے قسم کے بلیڈوں سے ڈاڑھی مونڈی تھی۔ مجھے

داہیات بلیڈ ہیں۔ گھاس کھودنے والا اوزار ان سے بہتر ہوگا۔ سنگھار میز پر جب میں نے ان کو دیکھا تو اٹھا کر جیب میں رکھ لئے۔ تاکہ صبح اُٹھکر جب یہ ڈاڑھی مونڈنے لگیں تو آپریشن سے محفوظ رہیں۔ میز کی داہنی دراز جو کہ مقفل تھی میں نے کھولی تھی، مگر اس میں ان کے پرائیویٹ خط تھے۔ ایک خط میں نے پڑھا تھا۔ داغ ان کو بہت پسند ہے۔ جگہ جگہ آپ نے اُس کے شعر ٹھونسے تھے۔ یہ خط آپ نے پوسٹ نہ کیا ہو تو ایک شعر درست کر لیجئے۔ آپ نے لکھا ہے:۔

میری فریاد دوسرا نہ سُنے
بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سُنے

یہ غلط ہے۔ آپ نے امیر اور داغ دونوں کے شعروں کو خلط ملط کر دیا۔ امیر کا شعر یوں ہے:۔

میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو
بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سُنے

اور داغ فرماتے ہیں:۔

میری فریاد دوسرا نہ سُنے
تم سُنو اے بتو خدا نہ سُنے

امیر کے مضمون میں اتنی ترقی پیدا کرنا داغ ہی کا حصہ ہے —— اچھا اب میں رخصت چاہتا ہوں۔ نرائن صاحب میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف ارشاد فرما دیجئے گا —— اور ہاں کشور صاحب آپ کی دوسری چیزیں اس پارسل میں موجود ہیں۔ آداب عرض۔

(تھوڑی دیر خاموشی پھر دروازہ بند کرنیکی آواز)

لاجونتی:۔ آپ نے یہ خط کس کو لکھا ہے۔

کشور:۔ نرائن —— پکڑو جانے نہ پائے۔

نرائن:۔ کون؟

کشور:۔ یہی چور اور کون —— وہ کس آرام سے آیا اور چلا بھی گیا۔ تم نے اُسے پکڑا بھی نہیں —— چلو —— چلو اُسے پکڑ کر پولس کے حوالے کر دیں ——!

لاجونتی:۔ آپ میری بات کا جواب دیجئے۔ یہ آجکل شعروں بھرے خط کسے لکھے جا رہے ہیں۔ کیا کوئی نئی بلا پالی ہے۔

کشور:۔ کون سے خط —— چلو نرائن —— چلو۔ ابھی وہ سیڑھیوں ہی پر ہوگا۔

لاجونتی:۔ بات نہ ٹالئے —— مجھے اس بات کا جواب دیجئے کہ آجکل خط کس کو لکھے جا رہے ہیں۔ رات گیارہ بجے تک آپ اپنے کمرے میں کیا کرتے رہے تھے!۔

کشور:۔ جھک مار رہا تھا۔ ادھر چور ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور ادھر اس نے اپنی تفتیش شروع کر دی ہے۔ چلو نرائن۔

نرائن:۔ اماں چھوڑو۔ آدمی دل کا اچھا ہے۔ جانے دو۔

لاجونتی:۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں؟

کشور:۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں۔

لاجونتی:۔ میز کی دراز میں کس کے خط ہیں۔ اور وہ شعروں والا خط آپ نے کس کو لکھا ہے۔

کشور:۔ کون سے خط۔ کیسے شعر۔ وہ تمہیں بنا گیا ہے۔ یہ لو چابی اور جا کے دیکھ لو۔ اُس نے یہ شوشہ ہی اس لئے چھوڑا تھا کہ ہم لوگ اس بک بک میں پڑ جائیں اور وہ آرام سے چلا جائے۔ اور تم ہو اوّل درجے کے چغد۔ اُس نے تمہارے افسانوں کی تعریف کر دی اور چلو تم خوش ہو گئے۔ اب اتنی دیر کے بعد اُسے کس طرح پکڑا جا سکتا ہے۔ پنجرے میں آ کر کس صفائی سے باہر نکل گیا۔

نرائن:۔ چلو اب چھوڑو اس قصے کو —— لو سگرٹ پیو —— ارے۔ میرا سگرٹ کیس کدھر گیا —— میرا سگرٹ کیس —— میرا سونے کا سگرٹ کیس ——!

کشور:۔ (ہنستا ہے)۔ اُس نے اس کی تعریف جو کی تھی۔ (ہنستا ہے) پریشان کیوں ہوتے ہو، وہ تو تمہارے افسانوں کا مداح ہے۔ تمہیں ہندوستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہے —— ارے —— کدھر چلے ——؟

نرائن:۔ مذاق نہ کرو کشور۔ میرا سگرٹ کیس بہت قیمتی تھا —— میں دیکھتا ہوں، شاید وہ بازار میں مل جائے۔

(کشور ہنستا ہے۔)

سعادت حسن منٹو

ہونے والی بھکارن سے

یہ تری حیران نگاہیں یہ تری مایوس چال
دم بخود ہے کس لئے تیرا جمالِ بے مثال
کر نہ دیں نظمِ جہاں کو یہ ادائیں پائمال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

مفلسی نے قہر برسایا ہے تیری جان پر
لیکن اب تک آسکا دھبہ نہ تیری آن پر
اب سرِ بازار پھیلاتی ہو کیوں دستِ سوال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

جانتا ہوں تیرے سینے پر ہے فاقوں کی خراش
ہو نہ جائے آئینہ لیکن حیا کا پاش پاش
ایک جیتی جاگتی عفت ہے تیرا بال بال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

اطلس و کمخواب کی لذت سے تو بیگانہ ہے
تیرا احساسِ خودی اِک گوہرِ یک دانہ ہے
کیوں تجھے رہتا ہے اپنی کمتری کا احتمال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

میرے زخمی ہونٹ، الجھے بال، سوکھے ہات دیکھ
آئنے میں میری صورت کے مرے حالات دیکھ
بھیک کی جانب نہیں جاتا مگر میرا خیال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

پپڑیاں ہونٹوں پہ اور زلفوں پہ تیری گرد ہے
دھندلی دھندلی تیری آنکھیں رنگ تیرا زرد ہے
عزم بھر کر دل میں یہ گرتی ہوئی حالت سنبھال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

رات کافی ڈھل گئی ہے سارا عالم سو گیا
اے صبوحی دم بخود کیوں ہے؟ تجھے کیا ہو گیا؟
کیوں اچانک جم گئی دل پر ترے گردِ ملال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

کیا تجھے یہ خوف ہے اب بھوکوں مر جائیگی تو
پیٹ بھرنے کیلئے کچھ بھی نہیں پائے گی تو
دل میں اپنے ایسے بے بنیاد خطروں کو نہ پال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

تیری خاطر پیٹھ پر پتھر اٹھا سکتا ہوں میں
گولیاں تیرے لئے سینے پہ کھا سکتا ہوں میں
جھڑکیوں کے گو مرے رخ پر بچھے جاتے ہیں جال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

جھڑکیاں سرمایہ داروں کی سہے گا میرا دل
حشر تک ہوگی : لیکن میری قوت مضمحل
تھک کے سستانا مرا راہوں پہ ہے یکسر محال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

کھا چکی ہے گو بہت دھوکے مری روحِ شباب
سن رہا ہوں دیر سے لیکن نویدِ انقلاب
وہ لئے پھرتے ہیں طیارے وطن کے نونہال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

قہر بن کر دہر کی وسعت پہ چھا جائیں گے یہ
مفلسی کے دیو کے جبڑے چبا جائیں گے یہ
دفعتاً سوئے ہوئے شیروں کو آئے گا جلال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

میری شہزادی! تری محزوں نگاہوں کی قسم
بھوک کی شدت سے یہ تیری کراہوں کی قسم
کر نہ دے میرے ارادوں کو تری حالت نڈھال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

یہ کنول کے پھول سے ہاتھوں پہ مٹی کی تہیں
ہائے کب تک ضبط سے میری امیدیں کام لیں
یہ ترا میلا انگرکھا، یہ تری بوسیدہ شال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

سر پھرا کوئی تجھے جھنجلا کے ٹھکرا دے اگر
آنچ آ جائے گی تیرے حسن میرے عشق پر
بھیک مانگے گا تری خاطر ندیمِ خوش خیال
ہائے تو اپنے گلے میں بھیک کی جھولی نہ ڈال

احمد ندیم قاسمی

سازِ آزادی

فلک کے نیلگوں شیشے کی نیلی جھلملاہٹ میں — فلک سیر ابر کے ٹکروں کے شور اندوز جھرمٹ میں
اُڑی جاتی ہے اک زہرہ جبیں قوسِ قزح بنکر — شرابِ ارغواں کا ایک رنگیں ساقدح بن کر
رواں ہیں نغمے اس کے نرم اور گلرنگ ہونٹوں پر — وہ نغمے دوڑتی ہے جس سے سُرخی اُسکے گالوں پر
نگاہوں میں غلامی کے نشیمن کی تباہی ہے — تجلّی ریز چہرے پر وقارِ کج کلاہی ہے
شباب اس کا نشاطِ جاوداں کی ایک دعوت ہے — محبّت کا سکوں ہے اور نویدِ صبحِ راحت ہے
سُنہرے گیسوؤں کے جال کی زرتار زنجیریں — زبر دستوں کی گردن کیلئے ہیں تیز شمشیریں
یہ اُس کے نرم و نازک پاؤں ہیں ننھے کبوتر سے — غلامی ہو رہی ہے ریزہ ریزہ جن کی ٹھوکر سے
نوا پیرا ہے دستِ مرمریں میں سازِ آزادی — وہ جس سے پھوٹتا ہے چشمۂ آوازِ آزادی

غلامی کی اجل ہے ساز کے ہر تار سے پیدا
ہے گلبانگِ مسرّت تار کی جھنکار سے پیدا

جہاں یہ ساز نازک اُنگلیوں سے چھیڑ دیتی ہے — وہیں اک نوجوانی کی فضا انگڑائی لیتی ہے
وہاں گمراہیاں رہگیر کی قائد نہیں ہوتیں — زبان و دست پر پابندیاں عائد نہیں ہوتیں
وہاں نازک رگِ احساس کو کچلا نہیں جاتا — وہاں انسان کو زنجیر سے جکڑا نہیں جاتا
وہاں مجبوریاں، معذوریاں ڈھونڈے نہیں ملتیں — فریب و مکر کی غم کوشیاں ڈھونڈے نہیں ملتیں
وہاں خواہش دبائی جا نہیں سکتی تشدّد سے — وہاں پڑتا نہیں ہے واسطہ دل کو تردّد سے
وہاں ذوقِ طرب کی داد دے سکتا ہے ہر کوئی — فضا میں سانس آزادی سے لے سکتا ہے ہر کوئی
وہاں رہتے ہیں سب آپس میں مل جل کر محبت سے — وہاں دیکھا نہیں جاتا کسی کو چشمِ نفرت سے
وہاں لب پر جہاں گیری کے رنگیں قصّے ہوتے ہیں — حکومت میں وہاں سب کے مساوی حصّے ہوتے ہیں
سیاست کا وہاں کچھ اور ہی مفہوم ہوتا ہے — وہاں پر بربریت کا نشاں معدوم ہوتا ہے

برسنے کو ہیں پھر خاکِ وطن پر دل نشیں نغمے
غزلخواں سازِ آزادی کے کوثر آفریں نغمے

مخمور جالندھری

دِلّی کی بیگمات

سُبحان اللہ! کیا مزے کی بات ہے کہ مردوں سے فرمائش ہوتی ہے کہ وہ بیگماتی زبان میں لکھیں، تقریر کریں اور مرد وے اپنے چاروں طرف بیویوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اُجڑ دنگیاں شہدے کے لٹھ ہوگئیں۔ وضع دیکھو تو وہ آدھ مردی، لباس دیکھو تو وہ مردانہ۔ کسی کو تحریر تقریر کا شوق ہوا تو جانے مردوا باتیں کر رہا ہے، خیر ہزاروں برس سے مرد ہی عورت کے اُستاد ہیں۔ داؤں پیچ سکھا کر خوب چت ہوتے ہیں۔ میں بھولا بھی چلوان بیویوں کو اُن کی بھولی ہوئی باتیں یاد دلادوں۔ میں نے اٹھارویں صدی کی بیگمیں دیکھی ہیں۔ اور اکثر بڑھیائیں ایسی دیکھیں جو محمد شاہی عہد دیکھنے والیوں کو دیکھ چکی تھیں۔ اس لئے میری تقریر شاہ عالمی زمانے سے شروع ہوگی۔ میرے چھٹپنے میں جو صورتیں دلّی والوں کو پسند تھیں اور جو اُن کا مذاقِ حُسن تھا وہ یہ تھا کہ گوراسبزہ رنگ ہو۔ گورا رنگ موتی کی آب کا پسند کیا جاتا تھا۔ فرنگی لون سفید نہ سمجھا جاتا اور نہ اس کو گورا کہا جاتا۔ بھورا یا لال کہلاتا۔ اور اس رنگ کے مالک لال دیو یا لال بونیا کہلاتے۔ بال سیاہ اور گھندار پسند کئے جاتے۔ بھویں پتلی اور کھنچی ہوئی جٹی ہوئیں تو کیا کہنا۔ قد مدرا، ڈیل گدرا مائل بلاغری۔ پیشانی محرابی دار یا بی ہوئی۔ ناک پتلی۔ نتھنے تنگ اور نازک۔ دہن پستہ۔ ہونٹ پتلے اور بستہ۔ بتیسی چھوٹی اور چمکدار۔ شانے گول۔ کمر پتلی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ پتلی پتلی اُنگلیاں لمبوتری۔ پوریں قدرے لمبی اور ناخن آبدار، اگر بن مہندی کے ہوں تو گلابی۔ اور گوشت انگشت کے برابر، نہ نکلے ہوتے نہ ہٹے ہوئے۔ یہ شاہ عالمی آئینِ حُسن تھا جو شہر آبادی میں اکبر شاہ بہادر شاہ تک رہا اور شہر بربادی میں صورتوں کے دلدادہ دلّی والے اسی معیار پر کستے اور پرکھتے رہے۔ یہی مذاقِ حُسن اُنیسویں صدی کے آخر تک رہا۔

دلّی میں بیگموں کے تین بڑے طبقے تھے۔ اوّل شہزادیاں، ان میں دُو درجے تھے۔ ایک بادشاہِ وقت کی بیگمات اور بیٹیاں بھتیجیاں دوسرے سلاطین زادیاں۔ کہ جن کے اسلاف صاحبِ تخت و تاج رہے تھے۔ یہ بادشاہ کے بھائی بند بھی کہلاتے تھے۔ ان میں دُو درجے تھے۔ ایک تو وہ جن کا سلسلہ حضرت عالمگیرؒ تک جا پہونچتا اور یہ نو محلے میں رہتے ان کی بیگمات نو محلے والیاں کہلاتیں۔ اور جن کا سلسلہ حضرت بابر بادشاہ تک نشمی ہوتا وہ بڑی بُنیاد والے کہلاتے اور انکی بیگمات بڑی بُنیاد والیاں۔ اور جن کا سلسلہ حضرت تیمور صاحبقراں سے جا ملتا وہ چھوٹی بُنیاد والے کہلاتے، اور اُن کی بیگمات چھوٹی بُنیاد والیاں۔ ان میں اتاخیل بھی شریک تھے۔ دوسرا طبقہ نواب زادیوں کا تھا۔ ان میں دُو درجے تھے۔ ایک تو ان جو پوتروں کی امیر زادیاں تھیں۔ وہ اپنے کو شہزادیوں سے کم نہ سمجھتیں۔ اور دوسرے وہ جن کے مرد ولایت سے آتے یہاں خدمات بجالاتے۔ بادشاہ تک رسائی ہوتی۔ منصب پاتے۔ جنگ و ولائی ملکی کے خطابات سے سرفراز ہوتے۔ یہ دولتئے کہلاتے اور تین چار پشت تک حسد اور رشک کی نظروں سے قدیم امیروں میں دیکھے جاتے۔ تیسرا طبقہ شریفوں کا تھا۔ ان میں خوش باش جن کے پاس گاؤں، باغ، مکان، دُکانیں ہوتیں اور اُس کی آمدنی سے بسر کرتے۔ دوسرے نوکر پیشہ کہ یہ شاہی نوکریاں کرتے لیکن خطاب، جاگیر اور منصب سے محروم رہتے۔ تیسرے مولوی چوتھے حکیم۔ شریفوں میں ان چاروں ذیلی طبقوں کی بیویاں بیگمیں کہلاتیں۔ اِسی طبقہ میں ایک ذیلی طبقہ تھا۔ جو پیروں کا طبقہ کہلاتا۔ شاہانِ مغلیہ میں اکبر بادشاہ سے پیری مُریدی کی بُنیاد پڑی اور اکثر مقربِ بارگاہ۔ ارادت مند، عقیدت کیش اور مُریدِ خاص کہلاتے اور یہ رنگ آخر بہادر شاہ بادشاہِ غازی تک رہا۔ جو مُرید کرتے۔ اور عمل بخشتے اور اسم بتاتے۔ یہ بادشاہ کسی صاحبِ دل کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ اس کی توجہ لیتے اور کسبِ باطن کرتے۔ رعیت کے عقیدے میں ظلِ اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہی وہ صاحبِ تصرف سمجھے جاتے اور لوگ اُن کو صاحبِ کشف و کرامات سمجھتے۔ اور اُن کی روحانی قوّت اور خرقِ عادات کے قائل تھے۔ یہ بادشاہ ایسے خوش عقیدہ تھے کہ اکثر نے اپنی بیٹیاں اُن پیروں کو یا اُن کی اولادوں کو دیں جن کے وہ معتقد ہوتے۔ اس لئے اکثر دلّی میں پیروں کے گھرانے ایسے تھے جنکا ننھیالی رشتہ شاہی خاندان سے تھا۔ اور دلّی والے انیسوی صدی تک بہت پیر پرست رہے۔ اور اِن پیروں کا بہت اثر آبادی پر تھا اور ان کی بادشاہ کے بعد عزّت کی جاتی بلکہ ایسے زمانے گزرے ہیں جبکہ بعض کو تو بادشاہوں پر بھی فوقیت دی جاتی۔ اور بادشاہ ان کے حلقوں میں حاضر ہونا اپنی سعادت سمجھتے۔ اور اُن کے وجود کو اپنی

اور اپنی سلطنت کے بقا کا موجب جانتے۔ ان پیروں کے ہاں کی مستورات بھی بیگموں میں شمار ہوتیں۔

پردہ شاہی خاندان میں کم تھا۔ کیونکہ رعایا اولاد سمجھی جاتی اور اولاد سے پردہ کہاں۔ امیروں اور شریفوں میں پردہ سخت تھا اور عورتیں گھروں میں رہتیں۔ برسات اور گرمی میں جن کے باغ ہوتے وہ پردے کا انتظام کرا کے دنوں اور مہینوں ان باغوں میں جاکر رہتیں۔ امرتوں میں جھولے پڑتے، کڑھائیاں چڑھتیں۔ جھرنوں، مدرسوں، مقبروں اور جنگلوں میں سیر کو جاتیں۔ فالیز پر شام کو جاتیں پردے کا انتظام ہوجاتا۔ اور خربوزے تربوز کھائے جاتے۔ ریتی پر ڈیرے خیمے لگ جاتے۔ بجرے لواڑوں ناوؤں میں بیٹھتیں۔ مچھلی کا شکار ہوتا۔ اور وہیں تل کر کھاتیں۔ زندگی کی ساری دلچسپیاں گھروں میں موجود رہتیں۔ اور آئے دن خوشی کی ایسی تقریبیں نکلتی رہتیں کہ جس کے بہانے سو پچاس بیویاں بلائی جاتیں اور کھانا، گانا، ہنسنا بولنا ہوجاتا۔ کچھ نہ ہوا بہار میں جلاب لے لئے۔ منضجیں پی جارہی ہیں۔ رنگ اور خون کی صفائی کے لئے مارالجبن (مال جوبن) لئے جارہے ہیں۔ گلابی محل کی دیواروں پر گلابی رنگ ہوا۔ فرش گلابی ہوا۔ پردے گلابی چھٹے۔ جھاڑ کنول، دیوار گیریاں، ہانڈیاں، مردنگ سب گلابی۔ ماماؤں، اصیلوں، لونڈیوں، باندیوں نے گلابی جوڑے پھڑکائے۔ ملنے جلنے والیاں کنٹھے، رنگ کے قرابے، پانوں کے بیڑے۔ بن سوپیاری (سپیاری) دھنیا، الائچیاں بھجوا رہی ہیں۔ گنگا جمنی الائچیاں ہیں۔ چکنی سپیاری پر چاندی سونے کے ورق چڑھے ہیں۔ باجرے کے دانے برابر گول گول چھالیا کتری ہے۔ اور اس پر سونے چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ الائچی کے دانوں پر بھی سونے چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ پستے بادام کھوپرے کی پھول پتیاں کاٹ کر زعفران، شہاب میں رنگ کر، پھول گل بناکر گلدستے بنا گلدانوں میں سجا کشتیاں آراستہ کر بھجوائی ہیں۔ سواریوں پہ سواریاں اتر رہی ہیں۔ ڈومنیوں کا ناچ گانا ہو رہا ہے۔ نقلیں ہو رہی ہیں۔ خوب چہل پہل اور آ ہا ہو ہو ہے۔ کوئی بات رنج کی جلابن بیگم کے کانوں میں نہیں پڑنے پاتی کہ کہیں جلاب بگڑ جائیں اور خون جگر کھا جائے رنگ جل کے چٹے اور چھائیاں نہ پڑ جائیں گھروں میں بیگمیں اپنا کام کرنا عیب نہ سمجھتیں اور جب کام سے فارغ ہوتیں بنا سنورا کرتیں۔ صبح پو پھٹے اٹھنا، ضروریات اور نماز سے فارغ ہوئیں۔ اور حمام کی سوجھی۔ ہر حویلی میں حمام کا ہونا ضروری تھا۔ محلسراؤں میں سنگِ مرمر کے پانچ پانچ درجے کے حمام ہوتے جن میں فرش، اجارہ، حوض، ستون اور محرابیں سنگِ مرمر کی ہوتیں۔ چھتیں لداؤ کے گنبد کی ہوتیں۔ جس کے بیچوں بیچ روشندان ہوتا۔ اور اس میں روشنی آنے کے لئے چھوٹے چھوٹے مربع شیشے لگے ہوتے، کھڑکیاں ہوتیں جن میں چونے کی زرہ بناکر شیشے بٹھاتے تاکہ حمام خوب روشن رہیں۔ حمام گرم اور سرد دونوں ہوتے۔ ایک درجہ جامہ کن کہلاتا۔ جہاں کپڑے اتارے جاتے۔ اور ایک درجہ معتدل ہوتا۔ جس میں گرم حمام کے بعد آ بیٹھتیں۔ ساتھ ماماکیں، مغلانیاں، لونڈیاں باندیاں رہتیں۔ اکثر اپنا کام یہیں کرتیں۔ کوئی سیتی پروتی۔ کوئی مہندی لگاتی۔ لگنیوں میں مہندی گندھی رکھی ہے۔ مہندی میں رنگ آنے کے لئے کتھا اور چڑیا کی بیٹ ملاتے۔ اور اگر سیاہی مائل سرخ رنگ پسند ہے تو اس میں ذرا سا نیلا تھوتھا ملا دیتیں۔ دلہنوں کے حمامی مہندی لگائی جاتی۔ کوئی چھلا چور مہندی لگاتی۔ کوئی ہتھیلیوں پر مچھلیاں بناتی۔ کوئی چاند، کوئی سورج، کوئی ٹکیا بناتی۔ بعض تن تی مہندی لگاتیں۔ کوئی جالی کی مہندی لگاتی۔ مہندی لگانے کے بعد ارنڈ کے پتے ہاتھوں میں لپیٹ کر حنا بند جو سرخ قند یا سرخ فلتے کے ہوتے اور جن میں سبز مغزی لگی اور گوٹا لگا ہوتا، باندھ دئے جاتے۔ پاؤں میں بھی مہندی ہاتھوں ہی کی وضع کی لگائی جاتی۔ اکثر رات کو لگا کر سوتیں اور صبح حنا بند کھول، ارنڈ کے پتے الگ کر، مہندی چھڑا چنبیلی کا تیل مل تھوڑی دیر میں ہاتھ پاؤں دھولیتیں اور مہندی ایسی رچتی جیسے سرخ سرخ باقرخانیاں یا بیر بہٹیاں۔ ناشتہ بھی یہیں کر لیا جاتا۔ پانچ چھ گھنٹے حماموں میں گزرتے۔ جب دن گرم ہوجاتا تو ان حماموں میں سے نکلا جاتا۔ حمامی عورتیں نہلاتی دھلاتی اور مشت مال کرتیں۔ ان حماموں میں اگر کی بتیاں خوشبو کے لئے روشن کی جاتیں اور کوڑیالوبان کی دھونی دی جاتی۔ گرمیوں میں سرد حماموں میں نہاتیں۔ گھر کی نہروں اور حوضوں میں تیرتیں۔ چھینٹے کھیلتیں۔ گھنٹوں پھواروں کے نیچے بیٹھی رہتیں۔ گرمی کی چاندنی راتوں میں کھانے سے پہلے نہایا جاتا۔ ان نہانوں میں نری عورتیں ہوتیں۔ مرد کے نام چوہے کا بچہ نہ ہوتا۔ جو پانی سے ڈرتی اسکو زبردستی گھسیٹ کر پانی میں ڈالتیں۔ اور ڈوبنے نہ دیتیں۔ اس کی کفن پھاڑ چیخیں اور دوسریوں کی ہنسیاں ان قہقہہ دیوار کی محلسراؤں میں ایک اودھم مچا دیتیں۔ سر، آنولوں، بیری کے پتوں اور اڑد کی دال سے دھویا جاتا، تاکہ بال ہمیشہ کالے رہیں اور بڑھیں۔ نرم ہوں اور ان میں حلقے پیدا ہوں۔ جاڑوں میں جلد کو نرم رکھنے کے لئے فتنہ ملتے اور پھٹے ہوتے حصوں پر موم روغن لگایا جاتا۔ جلد کا روکھا پن عیب میں داخل تھا۔ چکنے چپڑے چہرے پسند کئے جاتے۔ اس لئے

باہر والیاں چہروں پر ہلکا ہلکا تیل مل لیا کرتیں۔

سیر تفریح نہ ہو تو بیگمیں رات دن حویلیوں میں رہتیں۔ اِس چار دیواری کی دُنیا میں اُن کے لئے تمام دلچسپی کے اسباب جمع رہتے۔ صبح کی نماز وظیفے کے بعد پیش خدمت نے فوراً زیر انداز مسند کے سامنے لا بچھایا۔ زیر انداز کھاردے، بانات اور مخمل کے ہوتے اور عام طور پر عنّابی رنگ کے ہوتے۔ سادے اور حاشیہ دار۔ حاشیہ یا کرڑی کا ٹپک کا ہوتا۔ یا کلابتونی یا کارچوبی ہوتا۔ آفتابچین نے سلپچی، استادہ اور مقابہ دالی نے مقابہ سامنے رکھا۔ جھک کر مجرا عرض کیا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گئی۔ مقابے میں بیسن دانی۔ کھلی دانی۔ منجن کی ڈبیہ۔ جیبی۔ پیلو کی مسواک۔ صندل کی ٹکیاں اور بٹنے کی ڈبیا ہوتی۔ آفتابچنیں، آفتابے ٹھنڈے گرم پانی کے لئے کھڑی ہیں۔ رومال خانے والیوں نے زانوپوش زانوؤں پر ڈال دیا۔ زانوپوش بانات، اطلس، مخمل اور گلبدن کے ہوتے۔ روپاک سے چہرہ پوچھا، دستمال سے ہاتھ، پاپاک سے پاؤں پوچھے اور یہ سامان بڑھا دیا گیا۔ سنگار دان سامنے آیا۔ سنگار دان میں آئینہ، گیسو دانی۔ شانہ پیچ میں کنگھی۔ حنا بند۔ ایک چھوٹی سی تلہ دانی میں سوئی تاگا۔ اور مباف جن کے کناروں پر دھنک کی بنی کلیاں اور کرن یا تمل کے پھول ٹکے رہتے۔ سُرمہ دانی۔ سلائی۔ کجلوٹی۔ تیل گیری۔ تیل کی کپّی۔ تیل کی کٹوری۔ مسّی کی ڈبیہ۔ افشاں کی ڈبیہ۔ قینچی۔ ایک ڈبیہ میں کاشکاری (کاشغری) سفیدے کی پوٹلی بندھی رکھی۔ ایک ڈبیا میں سیپ کے سفوف کی۔ ایک کٹوری میں شہاب۔ ایک ڈبیہ میں کارچوبی نزلے بند۔ ایک ڈبیا میں کاشانی مخمل کے خال۔ ایک کٹوری میں گوند کا پانی۔ لکھوٹی میں لاکھا۔ ایک گنگا جمنی نلکی میں سُرمے، کاجل، شہاب، مسّی، زعفران لگانے کی سلائیاں۔ ایک سلائی ذرا موٹی سی بھی ہوتی۔ جس پر لٹیں لپیٹ کر بال گھونگر والے بنائے جاتے۔ مشاطہ نے عمر اقبال اور سُہاگ کی دُعائیں دیں۔ ست پوتی، کوکھ اچھوتی۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ کوکھ مانگ بھری رہے۔ اللہ اللہ کر کے اب بناؤ شروع ہوا۔

مشاطہ نے پہلے صندل کا چھاپہ گلے اور مانگ پر ہلکا سا دیا۔ پیچھے گھٹنوں پر بیٹھ کر بیگم صاحب کے تیل گیری پیٹھ پہ ڈال کپّی میں کر تیل کی کٹوری میں۔ سے تیل نکال بالوں میں تیل لگایا۔ شانہ پیچ سے کنگھی نکالی موٹے دندانوں سے بال سلجھائے۔ باریک دندانوں سے سونتے۔ مانگ نکالی۔ چاند بیریوں کا یا محمد شاہی پٹیوں کا سر گوندھا۔ کنواری لڑکیوں کے سیپ کے سر گوندھے جاتے تا کہ مانگ پھٹ کر چوڑی نہ ہو جائے اور کوڑے کے مباف ڈالے جاتے کہ بالوں کی نوکیں پھٹیں نہیں محفوظ رہیں اور بال بڑھیں۔ بچاری لڑکیاں بیچ میں یاد آ گئیں۔ ہاں بیگم صاحب کا بناؤ سنیئے۔ کھجوری چوٹی گوندھ، مباف دانی میں سے جوڑے کے رنگ پر کھلنے والے رنگ کا مباف نکال۔ ڈالا، مانگ بھری، افشاں چُنی۔ بیگم صاحب نے سیپ کے سفوف کی پوٹلی سے مُنہ پر سفوف مَل کر باریک ململ سے برابر کیا۔ پھر روئی سے شہاب لے کر رُخساروں پر غازہ لگایا۔ پپوٹوں پر اور حدقۂ چشم پر ہلکا ہلکا ایم زعفران اور سوت کا لیپ کر کے آنکھوں میں حلقے بنائے۔ دُنبالے دار سُرمہ لگایا۔ شہاب سے دو خط دُنبالے سے زاویہ بناتے ہوئے اوپر نیچے کھینچے کہ آنکھ مچھلی بن گئی۔ کاجل سے بھویں بنائیں کن پٹیوں پر گوند لگا جڑاؤ یا کارچوبی نزلے بند چپکائے۔ ٹھوڑی پر بالائی لب سے ہٹا ہوا اُنگلی تل لگایا۔ کتھا چونا ملا لاکھا بنایا اور سلائی سے ہونٹوں پر باریک خط لاکھے کا کھینچا۔ اس پر مسّی کی تحریر سلائی سے دی۔ جامدار خانے والی نے جوڑوں کے دست بقچے حاضر کئے۔ موسم اور رُت کے اعتبار سے کھلتا ہوا رنگ پسند کیا۔ پیش خدمتوں نے اوٹ کھڑی کی۔ پوشاک بدلی۔ مشاطہ نے مدد دی۔ مشاطہ کا کام معذّا نیاں ہی اسی زمانے میں کرنے لگی تھیں۔ چاند(؟) کی ہشت پہل انگیٹھی میں سونے کی سلائی گرم کی اور اُس پر لٹوں کو لپیٹ، حلقے بنا چھوڑ دئے۔ زلفیں بنائیں۔ کالا دانہ اتار آگ میں ڈالا کہ دیکھنے والیوں کی نظر نہ لگے۔ اور بناؤ میں کھنڈت نہ ہو۔ چٹ چٹ سر سے پیر تک کی بلائیں لیں۔ خدمت کی سرفرازی کا آداب بجا لا، اُلٹے قدموں دعائیں دیتی رخصت ہوئی۔ اب جواہر خانے والیوں نے زیور کے خوانچے اور کشتیاں پیش کیں۔ سگھڑ گھڑیوں کے گھڑے اور چتر جڑیوں کے جڑے، بنے جن پر ہوشیار میناگروں نے باغ و بہار۔ ہزار رنگے اور گل اندر گل کے مینے کئے اور کُندن گروں نے کندن کئے۔ یا سادہ کاروں نے تناسب کو ٹھیاں بنا اور حساب سے پانی ڈال، زیبہ بٹھا، آواز دار زیور بنائے۔ اور رنگ ایسی خوبصورتی سے برابر بٹھائے کہ ایک ڈال جوہر ہونے کا دھوکا ہوا۔ جڑائی میں وہ صفائی کہ چینی غلتہ پھیرو تو کیا مجال جو ذرا ریشم سے اُلجھ جائے۔ زیبہ ایسی کہ کندن گردن کے کندن کو پرست پڑتے۔ جس رنگ کا جوڑا پہنا ہے تو زیور اسی رنگ کا پہنا جاتا۔ اگر لباس دو رنگ کا ہے تو زیور کے نگینے بھی دو رنگ کے ہوتے۔ میں نے اپنے بچپنے میں شہر آبادی کے زمانے کا ایک جوڑا دیکھا، یہ ریشمی تھا اور بارہ مختلف چہچہاتے رنگوں کی الگ الگ چوڑی پٹریاں پڑی تھیں، اور ہر پٹڑی میں چھوٹی چھوٹی بوٹیاں تھیں۔ تہ پوشی کا ریشم بہت بنے

روئی کا روئی اور نرم۔ اور محرم کرتی کا ریشم باریک بافت کا نرم، معلوم نہیں کس شہر کا تھا۔ چادرا رامپور کا بنا ہوا کھیس تھا۔ بیحد نرم اور دبیز۔ اسکے ساتھ کے تمام زیور میں بارہ بارہ رنگ کے مختلف نگ جڑے تھے۔ جو جوڑے کے رنگ سے ملتے تھے۔ اور اُسی کے ساتھ کی ایک شال تھی جامہ وار کی جس کی میں نے کٹوا کر شیروانی سلوالی۔ نگوں کے رنگوں میں بھی موسم کا خیال کیا جاتا۔ مختلف خاندانوں میں مختلف جواہر بھاگوان اور منحوس سمجھے جاتے۔ سعد اور نحس کا بڑا وہم کیا جاتا۔ بعض نگ بعض کو سازگار ہوتے اور دوسروں کو ناساز۔ نیلم منحوس سمجھا جاتا۔ لہسنیہ بعض کو سازگار اور بعض کو ناساز ہوتا۔ نیا نگ پہلے سوتے وقت تکیے کے نیچے رکھکر سوتے اور دو چار دن تک اُس کے اثرات کا خیال رکھتے اور ان دنوں میں جو کچھ ہوتی ہوتی وہ نگ کے اثر سے تعبیر کی جاتی۔ اور اہلِ خاندان اور متوسلین کو اس کے سعد و نحس خواص کا عقیدہ ہو جاتا۔ عقیق یمن جگری بھاگوان سمجھا جاتا۔ ہیرے سے دھڑکن دور ہوتی شودر ورن یعنی کالا ہیرا منحوس سمجھا جاتا فیروزہ اگر موافق ہے تو دافع بلیات سمجھا جاتا۔ زمرد سے سانپ اندھے ہوتے۔ دل قوی ہوتا اور دافع نظر بد سمجھا جاتا۔ یاقوت سے جرأت بڑھتی۔ لال سے لالن کی قوت گویائی بڑھتی اور مدعیوں کی زبان لال ہوتی۔ موتی سے دل کی گرمی دور ہوتی اور کالا موتی پیامِ مرگ سمجھا جاتا۔ پکھراج بسنت رت میں پہنا جاتا۔ یاقوت جاڑے میں موتی گرمی میں اور زمرد برسات میں۔ ہیرے کا کوئی موسم نہ تھا۔ برہما برن ہیرا بے عیب سفید ہوتا۔ اور بیحد پسند کیا جاتا۔ چھتری برن ہیرا نیلگوں آبِ زیادہ پسند نہ کیا جاتا۔ بیش برن ہیرا زردی لئے ہوتا اور یرقان کی بیماری پیدا کرتا اور نحل پر دال تھا۔ ہیرے کی ترصیع چاندی میں اور بجلیاں یا جھپکے کے بالے بہت پسند کئے جاتے۔ چندن ہانس اور گل جیب بھی اکثر چاندی کے گھاٹ کے ہوتے اور یہ چاندی میں جڑے ہیرے کے زیور چاندنی راتوں یا جشن مہتابی میں پہنے جاتے۔ عوام میں یہ سفید سونے کے زیور سمجھے جاتے۔ سبز سونا بہت نادر سمجھا جاتا اور اس کے لخلخے ترنج ملکہ زمانی کے ہاتھ میں رہتے۔ یہ سُنے ہیں دیکھے نہیں۔ البتہ کتابوں پر لوحیں اور جدولیں سبز سونے کی دیکھیں۔ قدیم پشواز اور سیدھے تنگ پاجامے کا رواج کم ہو گیا تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں ایک نئی قسم کا پاجامہ ایجاد ہوا جو قلفی دار کہلاتا تھا۔ پائنچے میں اوپر کُندے ہوتے اور گھٹنے سے نیچے کُندے کی نوک سے ایک ایک کلی کی نوک ملا کر پائنچہ سی لیا جاتا۔ جو کولھے سے گھٹنے تک تو پھنسا رہتا اور گھٹنے کے نیچے سے ٹخنوں تک بتدریج ڈھیلا ہو جاتا۔ موریوں پہ پٹھا چڑھا ہوتا یا مغزی

لگی رہتی۔ اکثر سنجاف بھی لگاتیں۔ یہ پیجامہ پہن کر بیگمیں پا موز مرغیاں یا کبوتریاں معلوم ہوتیں۔ اندر محرم، محرم کے اوپر پشواز۔ سر پر تین گز کا روپٹہ۔ اُنیسویں صدی سے کچھ پہلے پہلے پشواز بالکل چھُٹ گئی۔ اور وہ صرف نیلنوں اور گھوسنوں میں رہ گئی۔ البتہ باہر والی دُلہنوں کو چوتھی کے جوڑے میں پشواز چڑھتی اور وہ باہر والوں میں تلک کہلاتی۔ شہر میں پشواز کی جگہ اڈی کی کرتی نے لے لی۔ جو بابریسٹ، روڈ جالی اور لاہی یا کسی اور باریک کپڑے کی سِلی ہوتی۔ جس کپڑے کی کرتی ہوتی اُسی کپڑے کی محرم ہوتی۔ اڈی کی کُرتی پیچھے گدی کے نیچے سے پانچ اُنگل چوڑی ہوتی ہوئی پسلیوں سے لپٹی ہوئی سینے سے دُو اُنگل اوپر تک رہتی اور سامنے کوڑی سے ناف تک آتی۔ اور پنڈے پر چُست رہتی۔ دُو بند کھوون پر سِر ہوتے سامنے کی پاکھیوں میں سِلے ہوتے اور سامنے کی دونوں پاکھیوں میں سیدھے ہاتھ کی طرف تو تمام اور بائیں ہاتھ کی طرف کاج ہوتے۔ جو پہن کر لگا لیتے جاتے۔ محرم، کنٹھی پٹھے کی ہوتی جس کی وجہ سے گدگی کے نیچے تک کا حصہ کھلا رہتا۔ چڑیا میں دونوں طرف چار چار ٹکیوں کی کٹوریاں جو مونڈھوں سے سامنے کی طرف کھُلی ہوتیں، اور پیچھے مونڈھوں میں پچھوے جڑے ہوتے۔ ملکٹ کی دُو تکیاں چڑیا سے جڑی ہوتیں اور یہ تکیاں اگاڑیوں سے سِلی ہوتیں۔ اور یہ اگاڑیاں بغلوں سے مونڈھوں اور پچھوں سے مِلی ہوتیں۔ سِی دی جاتیں۔ پچھوں میں اُوپر نیچے بیچ کلیوں میں دُو دُو بند ٹکے ہوتے جو پیٹھ پر کس کر باندھ لئے جاتے اور پُشت پر اُن کی بندش سے ایک لوزات سی بن جاتی۔ مونڈھوں میں چُست آستینیں لگی ہوتیں جو کبھی کلائی تک آتیں اور کبھی آدھے بازوؤں تک رہتیں۔ محرم اور کرتی بالکل اُوپر کے جسم کے حصّے کی ساخت کی ہوتیں اور جسم سے چپکی رہتیں۔ روپٹے، محرم، کُرتی اور پاجاموں کی سلائی پر بڑی بڑی ہنرمند مغلانیاں دیدہ ریزی کر کے وہ وہ نئے نئے کام ڈھنگ پیک، گوکھرو۔ مقیش گوکھرو۔ کلابتوں، سلمے، ستارے بنکوڑے۔ گجائی۔ کٹوریوں، حباب۔ کرن۔ تعل۔ ٹھپتے۔ بانکڑی۔ چمپا۔ ننھی جان اور ریشم کے کرتیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے اور ان ٹکنوں ہی کی وجہ سے ان ٹکنوں کے کام کی بدولت ہزار بیگمیں کسی ایک محفل میں ہیں تو ان سب کو لباس الگ الگ معلوم ہوں گے اور ایک کا دوسری سے نہ ملیگا۔ حالانکہ وہی چار پارچے۔ روپٹہ، محرم، کرتی اور پاجامہ ہوتے، لیکن کیا مجال کہ ایک بیگم کی وضع کسی دوسری سے تو مل جائے۔ اس سے مغلانیاں سیتے وقت بڑی احتیاط کرتیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی بیگم صاحب سے پہلے یہ ٹکن عام ہو جائے۔ جاڑوں میں چھیل چھبیلی بیگمیں تو

باریک حباب سے دوپٹے اوڑھتیں۔ لیکن شال۔ دوشالے۔ کھیس چادریں، دولائیاں اور چھینکی۔ ادھ پتی۔ پوسیری روئی کی رضائیاں اوڑھی جاتیں۔ صدریاں۔ کمریاں اور نیمہ آستین بھی پہنی جاتیں۔ انگرکھے یا چکنیں پہننا شہدیانی وضع سمجھی جاتی۔ لیکن اکثر بانکیاں پہنتیں۔ دولائیاں رضائیاں چادرے پاجامے غف کپڑوں کے ہوتے۔ دوپٹے، پشوازیں، محرم کرتیاں باریک کپڑوں کی ہوتیں۔ کبھی کبھی رنگین میان نہ دیکر دولائیوں اور رضائیوں میں باریک ابرے لگاتے۔ پاجامے کمخواب، مشجر، زربفت، نیم زری۔ پوتھ۔ دریائی لشر۔ کنادیز۔ اطلس۔ غلتہ۔ چوڑیا۔ زادھا نگر۔ بانک کشار۔ مشروع، گلبدن۔ مخمل۔ نین سکھ۔ تن سکھ۔ کمرک، گورنٹ پرمٹا۔ ساٹن۔ ساٹن کلاٹ۔ مشہدی۔ ریشمی سوسی، اٹیلین۔ نرما۔ الچہ (الاچہ) خاصہ۔ چھینٹ۔ قلم کاری۔ مومی چھینٹ۔ سٹی۔ گٹی۔ چھال ٹین، بانات۔ کشمیرا۔ موٹرا۔ دھوپ چھاؤں۔ پھلالین۔ ان میں کمپنی بہادر کی بدولت کمرک۔ گورنٹ آئے اور انگریزی حکومت میں پرمٹا، ساٹن، ساٹن کلاٹ، اٹیلین، لٹھا، نرما، پھلالین آئے۔ بیگمیں ان میں سے بعض کپڑے اپنی باندیوں کے لئے خریدتیں۔ باریک کپڑے ململ، تن زیب، آب رواں، ہوا دریا، حسینی گھاس، لاہی، محمودی، تار ترنگا، چھونا، چوتاری، سربصاف، گنگاجل، اساوری، پنجتولیہ، بھوار، ریتا بسی، پشتولیہ۔ سیلہ۔ بنارسی۔ جامدانی۔ ڈھاکہ پاٹن، گلشن، ڈورجالی، بابرلیٹ۔ کتان۔ رنل، چکن، رینگ، کریب، جامدانی ٹانڈے اور سیکاکوں کی۔ ململ چندیری اور ڈھاکے کی پسند کی جاتی۔

قلعے میں جوڑے ایک رنگ کے ہوتے، اور دو رنگ کم پہنے جاتے۔ دوپٹہ، محرم کرتی ایک ہی رنگ کے ہوتے اور تہ پوشی دوسرے رنگ کی۔ کبھی تین رنگ کے جوڑے ہوتے۔ دوپٹے کا الگ رنگ، محرم کرتی ایک رنگ کی۔ تہ پوشی اور رنگ کی۔ لیکن تین رنگ کے جوڑے پہننا بہت مشکل تھا۔ اس میں بہت سلیقہ اور خوش مذاقی درکار تھی۔ تین رنگ اس طرح ملائے جاتیں کہ وہ آنکھوں کو بھائیں۔ مثلاً اودی تہ پوشی، سبز محرم کرتی اور نارنجی دوپٹہ ہوتا۔ اگر ان تین رنگوں میں سے ایک رنگ نکال کر کوئی اور رنگ شامل کر لیا جاتا تو اس پر پھبتیاں ہوتیں۔ تین ترنگا دیوالی کا ہیجڑا۔ ترنگی بلی یا دیوالی کی کلھیا۔ یہی حال دو رنگوں کا تھا کہ اُن کا ملانا بھی سہل نہ تھا۔ کاسنی اور شربتی۔ فیروزی اور بادامی۔ انگوری اور پیازی۔ کافوری اور سوسنی، شنگرفی اور پستئی۔ تربوزیا اور کاہی۔ شفقی اور طاؤسی۔ سروئی اور زنگاری۔ گل ناری اور سبز۔ بسنتی اور آسمانی۔ زعفرانی اور بیجنی۔ ماشی اور جوزی۔ دھانی اور فالسائی آتشی اور زبرجدی۔ ارغوانی اور زمردی۔ سرخ اور سبز۔ لیکن اس پر کبھی کبھی مرچوں کے کھیت اور کچے پکے بیروں کی پھبتی ہو جاتی۔ البتہ نیلا اور سرخ ملا کر کوئی نہ پہنتا۔ اگر کوئی باہر والی پہنے دکھائی دیتی تو کلیجی پھیپھڑے کی پھبتی کسی جاتی۔ زرد اور سیاہ کا بھی میل نہ ملاتے۔ کیونکہ کڑہی پہ کوئیلا کون سنتا۔ عباسی۔ ناسپاتی۔ اگری۔ صندلی۔ ملاگیری۔ شتری۔ کشمشی۔ دودھیا کاسنی۔ جنبئی۔ سیپی۔ کوکناری۔ سرمئی۔ توتیائی۔ گندکی۔ کپاسی۔ سنہری۔ روپہلی۔ جوگیا۔ کشنیزی۔ مٹیالا۔ سیندوری۔ گیروا۔ خاکستری۔ بھورا۔ لاکھی۔ تیلیا۔ لاجوردی۔ کرنجوی۔ گڑہلی۔ شہابی۔ گیندئی۔ نافرمانی۔ نیلوفری۔ کستوری۔ گلابی۔ مستی۔ زہریا۔ آبی۔ سفید موتیائی۔ غرض کہاں تک رنگوں کے نام لوں۔ رنگوں کی ایک دنیا تھی۔ پھر ان میں ہلکے گہرے شوخ، چمپاتے۔ سن۔ سوتے۔ مدھم۔ رنگوں نے مل کر وہ رنگ برنگی پیدا کر دی تھی کہ رہے نام رنگیلی کا۔ صوفی اور شاعروں کی دنیا دورنگی تھی اور بیگموں کی دنیا لکھ رنگی۔ لیکن اب تو بے رنگی کا دور دورہ ہے اس کا کوئی کیا کرے۔

کلی دار پیجاموں کے بعد فرشی تہ پوشیوں کا رواج ہوا۔ جن میں بیس بیس کلیاں ہوتیں یہ کلیاں پائنچوں میں چوڑ کلی کے بعد ایک دوسرے میں سی دی جاتیں۔ جن کی نوکیں اوپر چوڑ کلی کے پاس رہتیں اور سرے نیچے کی طرف۔ اس طرح دونوں پائنچے نیچے کی طرف بہت چوڑے ہو جاتے اور کولھوں پر سمٹے رہتے۔ ان پائنچوں کو پیچھے چھوڑ دیا جاتا تو توڑے ہوئے بڑے بھلے معلوم ہوتے جیسے مور کی دم۔ ان پائنچوں پر پانچ پانچ منزل کی اور سات سات منزل کی گوٹیں چڑھائی جاتیں لیکن یہ گوٹیں سات انگل سے بڑھنے نہ پاتیں۔ کیونکہ دلی میں ایک بالشت سے زیادہ گوٹ گنوارو سمجھی جاتی اور گوٹوں کے چوڑے اور پتلے ہونے سے بیگمات میں تمیز ہو جاتی کہ کس طبقے کی ہیں۔ پانچ انگل کی کم گوٹ ہندنیوں کی سمجھی جاتی اور بالشتی گوٹ ثقہ اور وضعدار۔ تہ پوشیوں کے پائنچوں کو پیچھے چار چار چھوکریاں سنبھالتی ہوئی چلتیں۔ ان فرشی تہ پوشیوں کا اب تک رواج ہے۔ اور کم سے کم چوتھی کے جوڑے میں دوپٹہ تین گز کا۔ محرم۔ اڑی کی کرتی اور ڈھیلے پائنچوں کے پاجامے اب تک دئے جاتے ہیں۔ اور شادی کی سمدھنیں اسی وضع کا لباس پہن کر بیاہنے چڑھتی ہیں۔ تہ پوشی کا پہننا کمال تھا اور پائنچوں کا سنبھالنا اور زینے میں اُترنا یا کلائی پر ڈال یا پیچھے چھوڑ کر چلنا وہ ادا ہے دکھاتا ہے کہ اس کو تلوار باندھنے والے ہندوستان کے مردوں سے پوچھئے۔ نیفے لال قند۔ کالے پرمٹے اور کالی یا لال گورنٹ کے لگائے

جاتے۔ جوانیں اور سہاگنیں لال قند کے نیفے لگاتیں اور بیگماتی لغت میں لال نیفہ یا لال نیفے والی سے مُراد عورت ہوتی اور کہتیں "لے اس موئے زرغل مردوئے کو صورت کا کیا شعور نفاقتے کو لال نیفہ چاہیئے"۔

شہر بربادی میں روپٹہ، محرم کُرتی اور تنگ (موری کے) پاجامے بھی پہنے جانے لگے تھے۔ یہ تنگ پاجامے سیدھے اور چُست ہوتے، اُوپر پائینچوں میں کُندے لگائے جاتے اور چورکلی سے دونوں پائینچے جوڑے جاتے اور موریاں یا تو لڑھیا دی جاتی یا پتلی مغزی لگاتے۔ اور اُس لڑھیادن یا مغزی سے اُوپر بانکڑی یا پیمک ٹانکی جاتی۔ نیفے کے منہ کے نیچے چورکلی کی نوک رہتی اور عام طور پر چورکلی کی لمبان سوا بالشت رہتی جو ٹکنے کے بعد ایک بالشت کی رہجاتی۔ موریاں کا دُم ہوتیں اور پنڈلیوں پر پھنسی رہتیں۔ اور اکثر بیگمیں موریاں کھول کر پہنتیں اور پہننے کے بعد اُن کو اُسٹ کرسی لیتیں تاکہ پنڈلیوں پر ایسی پیوست ہو جائیں کہ چٹکی لی جائے تو گوشت نہ آئے۔ اُنیسویں سدی کے آخر میں آڑے پاجاموں کا رواج ہوا۔ جو یا تو تھیلے کی تراش کے ہوتے یا سموسے کی تراش کے۔ یہ قدرے گھٹنوں سے اُوپر کوکھوں تک ذرا ڈھیلے رہتے اور پنڈلیوں پر خوب چُست۔ ٹخنوں پر تھوڑی سی چوڑیاں رہتیں۔ ان پر گھٹنوں سے نیچے کُرتے پہنے جاتے۔ اور گریبان کاج پٹی کے ہوتے اور گلے ناخونی گلے، گریبان، مونڈھوں، آستینوں اور گھیر میں کٹاؤ کا کام کرکے اُن پر ستائے کی حکری دیتے۔ جو مہین کرتوں میں سے ٹیبنوں کی طرح جھم جھم کرتے کُرتوں کے نیچے محرم رہتی۔ اور اُس میں بھی کٹاؤ کا کام ہوتا اور نینسکھ کی پھول پتیاں کاٹ کر اور اُس پر ستائے جما کر باریک کپڑوں کے نیچے تیپچی کرکے ٹانک دیتے۔ کُرتے اور روپٹے ایک ہی قسم کے باریک کپڑے کے ہوتے اور رنگ بھی ایک ہی ہوتا۔ قلعے میں کُرتے کا نام نہ لیتے، اور منحوس سمجھتے۔ اس کے لئے تھنکارے کا کنایہ تھا۔ اگر منہ سے کُرتے کا لفظ نکل جاتا تو تھو تھو کر دیتے۔ کیونکہ کُرتا رنڈ سالے میں دیا جاتا۔ لیکن شہر بربادی میں انیسویں سدی کے آخر سے شہر میں کُرتوں کا رواج عام ہو گیا۔ سُہاگنیں اور رانڈیں سب ہی پہننے لگیں۔

کہتے ہیں آڑے پاجامے پنجاب سے آئے۔ پہلے پہلے دلّی کی پنجابی تاجروں کی عورتوں نے یہ وضع اختیار کی۔ اس کے بعد کوٹھے والیوں نے پھر نوجوان نواب زادیوں نے۔ اور لوگوں نے خوب خوب نام دھرے۔ لیکن پھر یہ وضع عام ہو گئی۔ صرف بڑی بوڑھیاں یا چکھنیاں سیدھے پاجامے اور اونچے کُرتے پہنتی رہیں۔ اکثر گھرانوں میں گرمیوں میں بیگمیں نین سُکھ کے غرارے دار پائیجامے پہنتیں جنکا پائینچہ عرض کا ایک ہوتا ہے اور اُس کی موریوں پر چکن کی کنگورے دار بیل یا چلن کا ہوتا۔ لیکن یہ وضع اچھی نہ سمجھی جاتی۔ کیونکہ مرد غرارے دار پائیجامے جن کو تمان (تنبان) کہتے تھے، پہنتے۔ مولویوں کے گھرانے کی بیویاں سیدھے پاجامے جو چُست نہ ہوتے پہنتیں اور جہاں وہابیت کا اثر ہو گیا تھا وہ شرعی پیجامے پہنتیں جن کی موریاں ذرا ڈھیلی رہتیں اور پنڈلیوں پر اس قدر ڈھیلے ہوتے کہ جسم کی ساخت نظر نہ آئے۔ اُن کے کُرتے اور روپٹے ذرا غف کپڑے کے ہوتے تاکہ جسم ذرا سا بھی اُن میں سے نہ جھلکے۔

بیسویں سدی میں تین کلی کے پاجاموں کا رواج ہوا۔ مدرسوں میں پڑھنے والی لڑکیوں نے اس کو زیادہ پسند کیا۔ جس کی وضع ایسی ہوتی جیسے انگریزنوں کے دو سایوں کو جوڑ دیا گیا ہو۔ اس پر اُٹنگے کُرتے پہنے اور تین گز کے روپٹے اوڑھے جاتے۔ بمبئی کی زبیدہ خاتون دلّی میں حکیم اجمل خاں سے علاج کرانے آئیں اور دلّی کی بیگمات سے میں تراکنٹہ دلّی والیوں نے اُن کی وضع انوکھی سمجھ کر اس کو اختیار کر لیا۔ تراہے کے منتی والوں میں کی بعض لڑکیاں بمبئی والوں میں بیاہی گئیں اُنہوں نے بمبئی کے بوروں کی وضع اختیار کی اور ان کی ریس اکثر نے دلّی میں کی۔ سہنگے بھی پہنے جاتے مگر بہت کم۔ یہ لہنگے کی طرح ہوتے۔ ایک ہی پائینچہ ہوتا اور اس میں پانچ پانچ کلیاں پیچھے کی طرف ڈالی جاتیں۔ کلیوں کی نوکیں اوپر رہتیں اور سرے نیچے۔ سہنگے میں چونکہ دونوں ٹانگیں ایک ہی پائینچے میں رہتیں اس لئے اندر گھٹنے پہنے جاتے۔ اس پر کُرتا ذرا اُٹنگا گھٹنوں سے ایک بالشت اونچا رہتا یا محرم کُرتی کے ساتھ پہنتے اور اُس کے ساتھ دوپٹہ گاتی مار کر اوڑھا جاتا۔ ساڑیاں دلّی میں ہمیشہ حقیر سمجھی گئیں۔ کیونکہ یا تو گھسیاریاں پہنتی تھیں یا ٹانڈے کی نٹنیاں۔ کبھی کبھی پورب سے جو مونڈھے والیاں آتیں تو گرمیوں میں باریک ساڑھیاں باندھتیں۔ ہندنیاں لہنگے پہنا کرتیں۔ ساڑی وہ بھی نہ باندھتیں۔ زیور اناپ شناپ لادنا عیب تھا۔ زیور کا پہننا آسان نہ تھا اور گہنوں کا سلیقے سے پہننا بڑی تعریف کی بات سمجھا جاتا۔ سر کے زیور پھول تھے۔ سیس پھول۔ چاند۔ سُورج۔ مانگ، تعویذ، سیس جال اور جڑاؤ چوٹی تھے۔ ماتھے کے زیور جھومر۔ جھپکے، ٹیکہ، سیس پٹی، ڈامنی، مرزا بے پروا تھے۔ کنپٹیوں کے زیور نڑلے بنا۔ نظر بند۔ اور مہ اسریاں تھیں۔ کان اُوپر کے چار چھیدے جاتے اور نیچے کے تین یا چار چھیدے جاتے۔ اس لئے ہر کان میں سات یا آٹھ چھید ہوتے۔ کن بندھے، دھار باندھ کر چھید کرتے اور کن بندھائی

کی تقریب میں کھوپرا مصری تقسیم ہوتی۔ گانا ہوتا۔ بیویاں بلائی جاتیں اور کھانا کھلایا جاتا۔ اُوپر کے چار چھیدوں میں پتّے بالیاں پہنی جاتیں جو طرح طرح کی ہوتیں۔ جڑاؤ، سادی، مولسری کے پھول کی۔ موتی چور کی ہوتیں۔ نیچے لَو کے چھید میں جھلنیاں۔ جھمکے، کرن پھول۔ لڑے۔ جھڑے۔ چاند چودانیاں۔ تمر چودانیاں۔ مچھلیاں، بالے۔ بالے جھلے۔ لٹکن۔ جھمکے کے بالے۔ بُندے۔ آویزے۔ انٹیاں۔ مُرکیاں۔ مور بھنور جھمکے مگر۔ دُرّ نجم لونگ۔ کرن پھول۔ کنٹھلے۔ کان اور رواج پہنے جاتے۔ نیچے لَو کے چھید میں لمبے زیور عام طور پر پہنے جاتے۔ جیسے جھلنیاں۔ لڑے۔ جھڑے۔ جھمکے کے بالے۔ یا چاند چودانیاں وغیرہ۔ اس سے اُوپر کے سُوراخ میں پھولوں بھری بالیاں پہنی جاتیں۔ بیچ کتے باہر والیاں چھداتیں۔ اور اس میں خوشہ یا بالی پہنتیں۔ ناک کے سیدھے نتھنے میں ایک سُوراخ کیا جاتا۔ ناک کے زیور کیل اور نتھ تھے۔ پھلی، لونگ، موتی، توتا، بیسر، بلاق باہر والیوں کے زیور تھے۔ بلاق شہر میں اور قلعہ میں منّت کے لئے کبھی کبھی چھیدا جاتا۔ اور جن کو بلاق پہناتے اُن کے نام مرزا بلاقی اور بلاقی بیگم رکھے جاتے۔ لیکن مور، توتا اور بیسر ہندوانی گہنے سمجھے جاتے جو گنواریاں اور باہر والیاں پہنتیں۔ گلے میں اُوپر گلوبند یا ٹیپ پہنی جاتی۔ اس کے نیچے چگنی اور چمپا کلی، جوے کی یا بادامی ہوتی۔

اکبر بادشاہ کے زمانے میں کان کا ایک زیور پتوں سے ملتا چمپا کلی بھی تھا۔ ہنسلی باہر والیوں کا زیور تھا۔ یا میراثیوں میں بچوں کے گلے میں منّت کی ہنسلیاں پہنائی جاتیں۔ مالا۔ موہن مالا۔ دُگدگی۔ ڈھولنا۔ تعویذ۔ ہار۔ چندن ہار۔ چندن ہانس۔ کنٹھی ست لڑا۔ گجرے کا توڑا۔ چھلے۔ توڑے۔ پنچ لڑا۔ دو لڑا۔ بدھی۔ ادھی۔ ادھی بدی۔ طوق، کیری، عطر دان، زنجیر، ہیکل، حمائل۔ گلے کے زیور تھے۔ بازو بند۔ نورتن۔ جوشن۔ بھج بند۔ گل جیب۔ تعویذ۔ بل۔ بل ڈنڈ۔ اکے۔ سرنگے۔ نونگے۔ تعویذ بازو کے زیور تھے۔ کڑے طرح طرح کے ہوتے۔ شیر دہاں۔ مگر دہاں۔ توتے کے سر کے۔ مور کے سر کے، مینڈھے کے سر کے۔ ہوتے اور سب کے آگے پہنے جاتے۔ کڑے پیچھے پہننا گنوارپن اور باہر والا پن سمجھا جاتا۔ اور اکثر کمہاریاں پہنا کرتیں ــــ چوڑیاں، جہانگیریاں، جوئی۔ سمرن۔ دست بند۔ تعویذ لچھے۔ پری چھم۔ چھن۔ چوہے دنتیاں۔ کنگن۔ کوکر دنتیاں۔ تیتر پنکھیاں۔ گجرے۔ پہنچیاں، چوڑا۔ بنگڑیاں پچھلیاں۔ کلائی کے زیور تھے۔ چھن۔ پری چھم۔ بنگڑیاں باہر والیاں پہنتیں۔ پچھلیاں جو سب زیور کے پیچھے پہنی جاتیں اُن کا رواج کم تھا۔ انگلیوں میں انگوٹھی، چھلے اور پوریں پہنی جاتیں۔ انگوٹھے میں آرسی ہوتی۔ ہتھ پھول انگلیوں اور پہنچے میں پہن کر پشت دست پر بنتا۔ کمر میں کمر بند ہوتا جس کو ازار بند کے دونوں سروں میں پرو لیا جاتا۔ تاگڑی۔ کمر پیٹی۔ زنجیر۔ چھدر کھنڈکا۔ کٹ میکھلا، ہندنیاں پہنتیں۔ خلخال۔ جھانجن۔ چوڑیاں۔ بل۔ کڑے۔ رم جھول۔ پازیب۔ بانک۔ پایل، توڑے۔ گھنگرو۔ لنگر۔ پینجنیاں پاؤں میں پہنے جاتے۔ لنگر اور پینجنیاں باہر والیوں کے زیور تھے۔ اور گنوارو سمجھے جاتے۔ پاؤں کی انگلیوں میں چٹکی چھلے پہنے جاتے۔ بچھوے۔ انوٹ۔ انوٹ بچھوے۔ باہر والیاں پہنتیں۔ پگ پھول کا رواج بہت کم تھا۔ زیوروں کے نام بہت ہیں۔ اگر انکی ساخت اور وضع قطع بیان کی جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب ہو جائے۔

بیگموں میں لکھنا۔ پڑھنا۔ خوشنویسی۔ سینا پرونا۔ کاڑھنا۔ کھانا پکانا۔ ہنروں میں داخل تھے۔ قلعہ میں ان ہنروں کے علاوہ گانا۔ ناچنا، اور ساز بجانا بھی کمال میں داخل تھے۔ لیکن شہر والیوں میں ناچنے کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ البتہ ڈھول بجانے اور گانے میں مضائقہ نہ تھا۔ قلعہ میں شادی کرتے وقت جب لڑکی کے جہان اور کمالوں کی کھوج کی جاتی وہاں دریافت کرتے کہ ناچ میں توڑا کیسے لیتی ہے۔ نشانہ لگانا۔ تلوار چلانا۔ تیرنا۔ درختوں پر چڑھنا۔ گھوڑے کی سواری۔ بڑے گھرانوں کی بیگمیں جانتی تھیں اور شہزادیوں کو چوگان کا بھی شوق تھا۔ چوگان میں صرف عورتیں ہی شریک ہوتیں۔ اور قلعہ کے نیچے بیلے میں چوگان کا میدان تھا۔

کھانا دن میں چار دفعہ کھایا جاتا۔ صبح نو بجے تک ناشتہ۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا۔ تیسرے پہر چا۔ پانچ بجے ناشتہ اور رات کو دس گیارہ بجے کھانا۔ سارے دن خشک، و تر میوہ، ترکاریاں یعنی مقامی میوے مٹھائیاں حلوے اور طرح طرح کے چٹخے مٹھے سارے دن کھائے جاتے۔ اور کہا جاتا ہے کہ جیڑا چلے ستر بلا ٹلے۔ صبح مٹھے والی آئی گرما گرم حلوا پوری۔ پھر پھراتی کچوریاں۔ بیوڑیاں۔ مٹھڑیاں۔ خستہ کچوریاں۔ جلیبیاں۔ قلاقند۔ گلاب جامنیں مال پوے۔ رس گلے، موہن بھوگ، لائی۔ پھر ملائی والی آئی صاف ستھری جگمگاتی تھالی میں یہ دل دار روئی کی روئی ملائی جمی ہے۔ دُھلے دُھلائے ہرے ہرے پتوں کے دونے بنے ہیں۔ سیر آدھ سیر ملائی تول دی۔ دوپہر ہوئی برف والی آئی۔ کھیرے کی برف۔ خربوزے کی برف، رنگترے کی برف۔ شربت کی برف۔ انگور کی برف۔ آم کی برف۔ فالسے کی برف۔ بادام کی برف۔ پستے کی برف۔ کھرچن کی برف۔ ملائی کی برف

ربڑی کی برف۔ لسی کی برف کے سوندھے سوندھے مٹی کے آبخورے جمے ہیں۔ یاجست کی قلفیاں ہیں۔ ہنڈا لے بیٹھ گئی۔ قلفیاں اور آبخورے کھول کھول کھلانے شروع کئے۔ یہ گئی، کاچھن آئی۔ رت کی ساری ترکاریاں ہیں۔ فصل کے میوے ہیں۔ لئے اور کھائے۔ پھر دہی بڑے والی آئی۔ جل جیرے سونٹھ کا پانی۔ بتاشے۔ بوندیاں۔ بڑے۔ سونٹھ کے چھوارے۔ پھلکیاں۔ پتے۔ سموسے۔ منگوچھیاں۔ لونگ چڑے قلمی بڑے۔ دال سیو۔ پپڑیاں۔ سیویاں۔ تلے ہوئے کابلی چنے آئی دے گئی۔ کہ اتنے میں کچالو والی آئی۔ امرود کے کچالو۔ آلو کے کچالو۔ پنڈالو کے کچالو۔ کچالو کے کچالو۔ کھیرے کے کچالو۔ کیلے کے کچالو۔ اُبلی مٹر کے کچالو۔ انناس کے کچالو۔ آم کے کچالو۔ پھوٹ کے کچالو۔ لوکاٹ کے کچالو۔ سنگاڑے کے کچالو۔ آڑو کے کچالو۔ ککڑی کے کچالو۔ جس ترکاری کی رت ہوئی اُس کے کچالو بنائے۔ بارہ مصالحہ ڈالے۔ (کالی مرچ۔ لال مرچ تتا مرچ۔ سانبھر نمک۔ لاہوری نمک۔ منہاری نمک۔ کالا نمک۔ سفید زیرہ۔ کالا زیرا۔) اور کھلائے۔ سی سی کر رہی ہیں۔ چٹوری زبان رکتی نہیں۔ آنکھ۔ ناک۔ کان سے رطوبت ٹپکے پڑ رہی ہے۔ آلو چھولے والی آئی۔ آلو چھولے طرح طرح کی گھنگنیاں دے گئی۔ حلوائین آئی۔ پستے کی لوز۔ بادام کی لوز۔ کھوپرے کی لوز۔ فالسے کی لوز، زعفرانی لوز، برفیاں۔ دال موٹ۔ دال بی جی۔ نکتیاں۔ دربہشت۔ امرتیاں۔ انگور دانے۔ موتی چور کے لڈو۔ بیسن کے لڈو۔ مونگ کے لڈو۔ میوے کا قلاقند۔ اندرسے۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں۔ کھجلے۔ جو موسم کی مٹھائی ہوئی دے گئی۔ کوابن آئی، تکی کے کواب، مچھلی کے کواب، گولی کے کواب۔ کلیجی کے کواب۔ بھیجے کے کواب۔ چڑیا کے کواب پسندے کے کواب، مولی کے کواب، گولر کے کباب، خوب چٹنی مصالحہ ڈال دے گئی۔ گھر میں بیٹھے یہ نعمت چلی آتی ہے۔ مالن پھول کنٹھے گجرے دے گئی، اپنا انعام لے گئی۔ منہاری طرح طرح کی چوڑیاں لائی پہنائیں اور اپنا نیگ لیا۔ دعائیں دیتی رخصت ہوئی۔ عطر والی طرح طرح کے عطر۔ مستی۔ کاجل۔ سرمہ۔ اگر۔ لوبان۔ صندل۔ خوشبو۔ چنبیلی چمپیلا۔ ناگرموتھا۔ بال چھڑ۔ کیور کچری۔ خوشبودار تیل۔ خوشبودار کھلیاں دے گئی۔ اپنی تقدیر کا انعام لے گئی۔ کچے رنگ کے کپڑے جن میں کتھ اور نیل کا میل ہوتا رنگریزنیں رنگنے لے جاتیں۔ اجلی کے گھر کپڑے دھلنے جاتے۔ بیویوں کے کپڑے میل خورے کو دینے بے شرمی سمجھی جاتی، بلکہ شہر آبادی میں رومالیاں کھولکر رکھ لی جاتیں۔ کندے اور پائنچے الگ کر کے کھیپ میں دئے جاتے۔ چھوٹے کپڑے گھر ہی میں چھوچھوئیں دھو لیتیں۔ استری کا رواج نہ تھا۔ کلف کندی کی جاتی۔ کپڑے والی۔ گوٹے والی۔ بساطن۔ غرض کسی چیز کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی ہر شے موجود ہو جاتی اور گھر میں مینا بازار لگ جاتا۔ سودے سلف خرید و فروخت سے فرصت ہوئی تو گھر گھر پھرنے والیوں نے سارے شہر کی خبریں سنا دیں۔ گھر گھر کا حال بتا دیا۔ بھلا اب اخبار کے پیچھے کون دیدے پھوڑے۔ اُن سے فرصت ہوئی رات کو کھانے کے بعد قصہ خواں عورتیں قصہ پڑھ رہی ہیں۔ داستان گو عورتیں داستان سنا رہی ہیں۔ کوئی پہیلیاں بجھوا رہی ہے، کوئی کہ مکرنی۔ ان مل۔ ڈھکوسلا سنا رہی ہے۔ یہ نہ سہی ڈھولکی بجنے لگی۔ اور لگی چھوکریاں گانے ناچنے۔ تھک کر سو رہے۔ پھر صبح ہوئی اور وہی زندگی۔

بیویاں گلہریاں پالتیں۔ کبوتر پالتیں۔ لال۔ مینا۔ طوطے پالے جاتے۔ بلیاں بندر پالے جاتے۔ اور اکثر بیویاں اپنے شوق کے ناموں سے مشہور ہو جاتیں۔ جیسے بندر والی بیگم صاحب۔ گھر کے چمنوں میں جو درخت ہوتے اُس سے بھی مشہور ہو جاتیں۔ جیسے بیری والی بیگم صاحب۔ کھجور والی بیگم صاحب۔ املی والی بیگم صاحب۔ نواب بھولا بیگم۔ کھٹولے پر بیٹھی رہتی تھیں اس لئے کھٹولے والی بیگم صاحب کہلاتی تھیں۔ نواب ولیداد خاں رئیس مالاگڑھ کی بیگم کی آنکھیں شہر بربادی کے ہنگامے میں جاتی رہی تھیں۔ اس کے بعد سے وہ اندھی بیوی کہلاتی تھیں۔

لو وقت تو ہوا ہو گیا۔ اللہ سب کی زندگیوں کی خیر رکھے اور لڑائی کا منہ جلدی کالا ہو جو دلوں کو چین اور اطمینان نصیب ہو۔ پھر آپ میری باتیں سنیں۔ اللہ بیلی۔ اللہ نگہبان۔

(نظامِ ادب) **آغا حیدر حسن دہلوی**

ردِ عمل

انگلستان میں چھ سال کے قیام نے حسین کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ جب وہ یورپ کی آزادانہ زندگی سے اپنے آبائی دیہاتی ماحول کی بندشوں اور بے سبب رکاوٹوں کا مقابلہ کرتا تھا تو اُس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی زندگی یورپ میں گذار دے۔

"اُف ہم ہندوستانی مرد عورتوں کے ساتھ کس قدر نامنصفانہ سلوک کرنے کے عادی ہو گئے ہیں"۔ وہ اکثر سوچتا: "ہم نے خود ذہنی نشو و نما اور ترقی کے سارے دروازے اُن پر بند کر رکھے ہیں لیکن سمجھتے اور کہتے یہ ہیں کہ عورتیں جسمانی اور دماغی طور پر ہم سے اس درجہ پست ہیں کہ ہم اُن سے مساویانہ برتاؤ کر ہی نہیں سکتے"۔ انگلستان کی عورتوں کا کلچر، اُن کی تعلیم، اُن کی طرزِ زندگی سے وہ اس درجہ متاثر ہو گیا تھا کہ وہ اُنہیں نسائیت کا اعلیٰ ترین اور قابلِ رشک نمونہ سمجھنے لگا تھا۔ ابتدا میں کھانے کی میز پر جب وہ اپنی لینڈ لیڈی کی لڑکیوں کو سائنس، فلسفہ، بین الاقوامی سیاست پر گفتگو کرتے سنتا تو اُس کے کان میں اپنی ماں اور بہنوں کی گھریلو باتیں، ماماؤں کے قصے قضیے، ہمسایوں کے خانگی معاملات کے تذکرے گونجنے لگتے اور اُس وقت اُسے آپ ہی آپ اپنے اوپر شرم سی آنے لگتی۔ اُسے اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ اُن لڑکیوں کی عام معلومات کا ذخیرہ اُس کے اپنے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع تھا۔ وہ برابر سے یہ سمجھتا آیا تھا کہ مرد عورت سے صرف جہالت تنگ نظری پست خیالی اخذ کر سکتا ہے لیکن انگلستان میں وہ حیرت کے ساتھ محسوس کرتا تھا کہ عورتوں کی روزمرّہ ملاقاتوں اور گفتگو سے خود اُس کی واقفیت اور علم میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ "عورت بھی مرد کی افزونیِ علم و دانش کا ذریعہ بن سکتی ہے!" اُسے یہ مشاہدہ شروع میں عجیب سا معلوم ہوا تھا۔

یورپ کی زندگی نے حسین کو اس کا کامل یقین دلا دیا تھا کہ عورت مرد سے مساویانہ حقوق طلب کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ "کوئی وجہ نہیں کہ مرد اپنے مقابلہ کی ایک ہستی کو اس طرح پامال کرتا رہے۔ عورتوں کو اپنی روزمرّہ زندگی میں اس حد تک آزادی ملنی چاہیئے جتنی مرد کو حاصل ہے۔ اُنہیں اپنی زندگی کی باگ ڈور آپ سنبھالنے دینا چاہیئے۔ وہ اپنے اچھے بُرے کی آپ تمیز کر سکتی ہیں۔ مرد کو کیا حق ہے کہ اُنکے افعال وکردار پر اپنے فیصلے منضبط کرتا رہے؟"

حسین نے اکثر ارادہ کیا کہ وہ اپنی دوستوں میں سے کسی ایک کو اپنی شریکِ زندگی بنا لے۔ لیکن وہ برابر اس ارادے کی تکمیل کو ملتوی کرتا رہا: "اس میں جلدی کیا ہے۔ ہندوستان واپس جاتے وقت دیکھا جائے گا"۔ یہانتک کہ ہندوستان کی واپسی کا وقت آگیا اور حسین اپنی ایک عزیز ترین دوست سے شادی کا وعدہ لیکر سینہ میں داغِ مفارقت چھپائے انگلستان سے روانہ ہو گیا۔ ہندوستان پہونچکر حسین ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا اور شادی ملازمت کے حصول پر ملتوی رکھی گئی۔ عرصے تک بیکار کوششیں کرنے کے بعد حسین کو کلکتہ میں ایک بنک کی منیجری مل گئی۔ تنخواہ اتنی نہ تھی کہ حسین ایک یورپین بیوی کے اخراجات کی کفالت کر سکتا۔ پھر ایک عرصے کی مسلسل علیحدگی کے بعد "ہر چہ از دیدہ دور از دل دور" کے مصداق محبت کی آگ بھی کچھ مدھم سی پڑ گئی۔ خلاصہ یہ کہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا۔ اور حسین کو اپنی نظرِ انتخاب ہندوستانی لڑکیوں کی طرف پھیرنی پڑی۔ لیکن اس کا معیار کافی بلند تھا: "لڑکی نہایت تعلیم یافتہ ذہین اور روشن خیال ہو۔ اعلیٰ سوسائٹی میں ملنے جلنے کے قابل"۔ کوئی ہندوستانی لڑکی اس کی نظر میں جچتی نہ تھی۔

حسین نے مس خالدہ بی۔ اے۔ سے شادی کر لی۔ شادی دفعتاً نہیں ہوئی۔ پہلے ملاقاتیں ہوئیں، پھر دوستی پیدا ہوئی اور آخر میں شادی۔ حسین جیسی بیوی چاہتا تھا اُسے مل گئی۔ خالدہ خوبصورت تھی، تعلیم یافتہ، روشن خیال اور ساتھ ہی فنونِ لطیفہ کی ماہر۔ سوسائٹی کی اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ میں اُس کی آؤ بھگت ہوتی تھی؛ اس کی بدولت حسین کے تعلقات کلکتہ کے اُن گھرانوں سے پیدا ہو گئے جہاں شادی سے قبل وہ کسی کی سفارشی چٹھی لیکر بھی مشکل سے پہونچ سکتا تھا۔

"کیوں آج بنرجی کے یہاں پارٹی میں نہ جاؤ گی؟ ۴ بجے ہیں۔ پانچ بجے کا وقت ہے نا۔ تم نے تو اب تک کپڑے تک نہیں بدلے ہیں"۔

"نہیں میں تو آج نہ جا سکونگی"۔

"کیوں؟" حسین نے تعجب سے سوال کیا۔

"جانتے ہو۔ دسمبر میں آل انڈیا آرٹ اگزیبیشن ہونے والی ہے۔ میں نے ابتک اپنی تصویر کا موضوع تک نہیں سوچا ہے۔ تمہیں یاد ہے، جمالی میری پچھلی تصویر کی کس قدر تعریف کر رہا تھا۔ جمالی خود آرٹسٹ بھی ہے اور آرٹ کا نقاد بھی۔" خالدہ کے چہرے پر اس کیفیت کی جھلک نمایاں تھی۔ جب ہم کسی ممتاز شخصیت سے متاثر ہو کر محظوظ ہوتے ہیں۔ حسین نے اسے محسوس کیا اور اس کا چہرہ بے رونق ہوگیا۔ "آج ۵ بجے وہ آئے گا۔ مجھے اُسے لانے کیلئے اسٹیشن جانا ضروری ہے۔ میری طرف سے بنرجی سے معافی مانگ لینا!"

"لیکن کیا ضرور کہ تم خود لانے جاؤ۔ شوفر کو ....."

"نہیں جمالی بڑا ذکی الحس ہے۔ آرٹسٹ فطرتاً ذرا نازک مزاج بھی ہوتا ہے۔ گرچہ میں اس سے مستثنیٰ ہوں۔" خالدہ نے حسین کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے اپنا رخسار اُس کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ حسین نے خالدہ کا بوسہ لے لیا۔ لیکن بالکل اضطراری طور پر بے کیفی کے ساتھ۔ حسین کو خود اس کا احساس بھی ہوا۔

"اچھا۔ تو کیوں نہ جمالی کو تم ساتھ لیتی آجاؤ۔ کچھ دیر ہی ہوجائیگی تو کیا؟"

"جمالی یونہی بے بلائے وہاں پہونچ جائیگا؟ وہ تم سے زیادہ شریف اور باعزت ہے۔" خالدہ نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو تم نہیں آؤگی؟" حسین نے شکست خوردہ آواز میں پوچھا۔

"کیسے آسکتی ہوں؟"

"اچھا تو پھر تم کار اسٹیشن لے جاؤگی؟ میں ٹیکسی منگوا لیتا ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

ٹیکسی کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ حسین کے دماغ میں بے ربط خیالات کا سلسلہ بن رہا تھا۔ "خالدہ کی جمالی سے دوستی مذاق کی ہم آہنگی کی بنا پر ہے۔ دونوں آرٹسٹ ہیں۔ آرٹ آخر ہے کیا؟ اور پھر کلاسیکل آرٹ۔ مجھے تو ایک بے معنی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ رفائیل، جبرئیل، مانی آخر ان کی مقبولیت کا کچھ باعث بھی تو ہوگا؟ مگر کیا مختلف اوقات میں انسانی دماغ میں اثر پذیر ہونے کی مختلف صلاحیتیں نما ہوتی رہتی ہیں۔ بعض وقت ہمیں ساری چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ کسی کو موقع سے اُن کی تصویریں بھلی معلوم ہوگئی ہونگی۔ دو چار کے نزدیک اُس نے تعریفیں کر دیں۔ زیادہ تر انسان دوسروں کے فیصلہ پر اچھے بُرے کی تمیز کرنے کے عادی ہیں۔ اِن تعریفوں کے زیر اثر اُنہیں بھی یہ تصویریں اچھی معلوم ہوتی ہونگی۔ پروپگنڈا ہوگیا۔ رفائیل اور مانی پیدا ہوگئے۔ بعد کی نسلیں ان کی روایتی تعریفوں سے متاثر ہو کر ان پر نظریں ڈالتی رہیں۔ اُنہیں بھی یہ اچھی ہی معلوم ہوئیں۔ محسوسات کا معاملہ ہے۔ فلسفہ یا ریاضی کا مسئلہ نہیں کہ اُن کی صحت و غیر صحت ثبوت یا دلائل کے ذریعے پرکھی جاسکتی۔ آرٹ وارٹ صرف ڈھکوسلا ہے۔ فرائڈ بھی تو یہی کہتا ہے۔ انسان کی فطرت ادنیٰ اس کی آئیڈیل (مثالی) شخصیت کو دھوکہ دیکر آرٹ کے بھیس میں اپنی تسکین کرتی ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کمزور شخصیتیں آرٹ کی مداح ہوسکتی ہیں جنہیں حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی قوت نہیں۔ میں ان شخصیتوں میں نہیں! حقیقت کا مقابلہ اس کے اصلی رنگ میں کرنا چاہیئے۔ میں اگر اپنے نفسانی محرکات سے مغلوب ہوجاتا ہوں تو کامل اعتراف کے ساتھ۔ لیکن یہ احمق آرٹسٹ خود کو اور اپنے ساتھ ایک عالم کو مبتلائے فریب کرکے اُنہیں ترغیبات کے شکار ہوتے ہیں۔ شاید خالدہ کو آرٹ سے روشناس جمالی ہی نے ....." موٹر بنرجی کے دروازے پر رُکی اور حسین کوٹھی میں داخل ہوگیا۔

کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی کے بیشتر افراد پارٹی میں موجود تھے۔ حسین ان سبھوں سے پوری طرح روشناس ہوچکا تھا۔ ان میں سے ہر شخص حسین سے خالدہ کے نہ آنے کا سبب پوچھ رہا تھا۔ حسین کو ان کے سوالات سے تکلیف ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ اُس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا یا اس لئے کہ اس کے پاس کوئی معقول جواب نہ تھا۔ یا اس لئے کہ خالدہ کا اُس کے ساتھ نہ ہونا خود اُسے بھی شاق گذر رہا تھا۔

"آپ تنہا کیوں ہیں؟ مسز حسین کو کہاں چھوڑا؟ آئیں گی نا؟" بنرجی نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

حسین نے محسوس کیا کہ بنرجی کو اس کے آنے کی کوئی خوشی نہ تھی، اُسے صرف خالدہ کے نہ آنے کا افسوس ہو رہا تھا۔ حسین کو یہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ پارٹی میں حسین کا مطلق جی نہ لگا اور وہ بنرجی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کرکے پارٹی ختم ہونے سے قبل واپس ہوگیا۔

خالدہ جمالی کو لیکر آچکی تھی۔

"تم آگئے۔ بہت جلد فرصت ہوگئی۔ جمالی اس کمرے میں ہے۔ تم کھانا تو نہ کھاؤگے؟ میں ابھی آئی۔" خالدہ نے یہ ساری باتیں ایک ساتھ کہہ ڈالیں اور حسین کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے چلی گئی۔ حسین کو اس کا یہ انداز غیر سنجیدہ معلوم ہوا۔ وہ جمالی کے کمرے میں پہونچا۔

جمالی کپڑے اتار کر قد آدم آئینے کے سامنے بال درست کر رہا تھا۔ کمرہ میں قدم رکھتے ہی حسین کو جمالی کا عکس نظر آیا۔ دبلا پتلا جسم، ضرورت سے زیادہ لمبی ناک پتلی پتلی خمدار انگلیاں گھونگریالے بالوں کے پیچ وخم میں الجھی ہوئیں۔

"اسے عورت ہونا چاہیئے تھا" حسین کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا۔

جمالی نے حسین کے قدموں کی آہٹ پا کر مڑ کر اسکی طرف دیکھا۔

"ہلو مسٹر حسین۔ پارٹی سے اس قدر جلد فرصت ہو گئی؟" حسین کو ایسا محسوس ہوا جیسے جمالی چاہتا ہو کہ وہ پارٹی سے دیر سے واپس آتا۔

"ہاں میں قبل ہی چلا آیا۔"

"میں بھی ان پارٹیوں سے زیادہ تر جلد ہی بھاگ جایا کرتا ہوں میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح مختلف خیال اور مختلف مذاق کے لوگ اگر ایک جگہ اکٹھا ہو گئے تو اس میں تفریح کون سی ہوئی۔ آپ جانتے ہیں مجھے آرٹ سے دلچسپی ہے۔ اگر ایک عامیانہ اور غیر لطیف مذاق کا انسان میرے برابر پارٹی میں بیٹھ جائے اور مجھ سے چھیڑ چھیڑ کر میونسپلٹی اور کونسل کے انتخابات پر گفتگو کرنے لگے تو آپ ہی بتایئے اس سے سنگین سزا میرے لئے اور کونسی تجویز کی جا سکتی ہے۔"

حسین نے ایسا محسوس کیا کہ جمالی کا روئے سخن اسی کی طرف تھا۔

"شاید آپ میرے اس خیال سے متفق ہونگے کہ ہمارا سماجی دماغ اب تک اس درجہ دقیانوس اور پست ہے کہ ہمارے بیشتر افعال بے معنی اور مہمل ہونے کے باوجود اپنے اندر ہمارے لئے جاذبیت رکھتے ہیں۔ صاحب میں تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے وہ افراد جنہیں اپنی ترقی اور اپنے کلچر پر ناز ہے اسی حد تک روایتی رسوم وقیود کے پابند ہیں جس قدر ایک سیدھا سادا دیہاتی کاشتکار۔ یقین مانیئے مجھے تو کوئی آدمی ملنے کے قابل نظر نہیں آتا۔ شاید آپکو بھی اس کی واقفیت ہوگی کہ سوسائٹی میں میں سوشل نہ ہونے کی بنا پر کافی بدنام ہوں۔"

"درست ہے" حسین نے غیر ارادی طور پر کہا۔ اسے جمالی کے کیرکٹر میں ایک غالب عنصر نظر آ رہا تھا "یہ شخص بڑا مغرور ہے۔"

"اچھا مسٹر جمالی آپ آرام سے کپڑے وغیرہ اتار کر ٹھیک ہو جایئے۔ پھر ملاقات رہیگی۔"

تھوڑی دیر بعد جمالی، حسین اور خالدہ کھانے کے کمرے میں پہونچے۔ حسین نے جمالی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اسکی بغل میں دوسری کرسی پر خود بیٹھ گیا۔ خالدہ میز کی دوسری طرف بیٹھی۔ گرچہ آداب نشست کے اعتبار سے اسے جمالی کے بغل میں بیٹھنا چاہیئے تھا۔ اسے خود ان باتوں کی چنداں پروا نہ تھی لیکن حسین ان کا سخت پابند تھا۔ اسے حسین کی اس فروگذاشت پہ کچھ اچنبھا سا ہوا۔

"آرٹ اکزبیشن کے لئے آپ اپنی تصویر مکمل کر چکے ہونگے، مسٹر جمالی؟" حسین نے پوچھا۔

"میں نے ایک تصویر تو ان دنوں بنائی ہے لیکن اکزبیشن کے لئے نہیں۔ سچ پوچھیئے تو میں آرٹ کی نمائش کا قائل نہیں۔ صنعت حرفت کی نمائش میری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ تجارتی دنیا میں اشتہار کی ضرورت پیشہ ربائی ہے اور صنعت وحرفت کے اشتہار اور ان کے فروغ کا نمائش سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ لیکن آرٹ کی نمائش کے معنی کیا ہوئے؟ آرٹ کا مقصد صنعت وحرفت کے مقاصد سے بالکل جدا گانہ ہے۔ صنعت وحرفت کی غرض وغایت ملک کی معاشی واقتصادی حالت کی سدھار ہے۔ برخلاف اس کے آرٹ کسی خارجی ضرورت کی فراہمی نہیں کرتا۔ آرٹ کا صحیح نصب العین آرٹ فور آرٹ سیک (آرٹ آرٹ کیلئے) ہے۔ میں تو آرٹ کو ذریعہ شہرت تک سمجھنا آرٹ کے لئے ناروا سمجھتا ہوں۔ چہ جائیکہ آرٹ کو صنعت وحرفت کی صف میں لا کر اسے بھی کسب معاش کا ذریعہ بنایا جائے۔ صنعت وحرفت کا تعلق خالص ہماری مادی اور خارجی ضروریات سے ہے۔ آرٹ کا لگاؤ ہماری وجدانی اور تخئیلاتی تسکین سے ہے۔ آرٹ کی تخلیق اور صنعتی ایجاد کا بنیادی فرق ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ صنعت کے ذریعے ہم فطرت کے مادی خزانوں میں نفاذ کرتے رہتے ہیں اس لئے کہ فطرت تنہا ہماری بڑھتی ہوئی عملی ضرورتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ مادے کی فطرتی ترتیب میں الٹ پھیر پیدا کر کے اسے فکر انسانی کے وضع کردہ سانچوں میں ڈھالنا ہی صنعت کا کمال ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے لئے نئے نئے ایجادات پیش کرنا سائنس کا مقصد عالی تصور کیا جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سائنس کی بلندی وپستی کی جانچ اس کے عملی نتائج کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے آرٹ کیلئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہنی کارخانوں کو معطل کر کے اپنی صنعتی صلاحیتوں سے دست بردار ہو جائیں اور پھر وجدانی شعاعوں کی باریک کرنوں سے اس نقاب کو ادھیڑ پھینکیں جو فطرت کے چہرے پر ذہن نے کمال احتیاط کے ساتھ بن رکھی ہے۔ آرٹسٹ فطرت میں جذب ہو کر فطرت کا بے واسطہ

مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا آرٹ اسی مشاہدہ کی نامکمل ترجمانی ہے۔ میرا خیال ہے مسٹر حسین دنیا تیزی سے پستی کی طرف جا رہی ہے۔ انسانی دماغ کا فطری تنوع جس کے ذریعے وہ زندگی کے مختلف پہلو پر جداگانہ نگاہ ڈال سکتا تھا رفتہ رفتہ اپنا اثر کھوتا جا رہا ہے ہم ہر چیز کو ڈپیا کر یٹک اصول پر رکھنے لگے ہیں۔ آرٹ کی جانچ پڑتال کے لئے بھی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جن کے فیصلوں کا انحصار مجالس قانون ساز کی طرح کثرت آرا پر ہوتا ہے۔ لیکن آپ تصور کیجئے آرٹ کو جمہوریت سے پابند کرنا کیسی فاش غلطی ہے۔ سوشلزم مجھے بھی اچھی لگتی ہے لیکن اس نوع کی نہیں جس میں انسان کی انفرادی صلاحیتوں کا فرق نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ عوام اور خواص کا فرق مادی ضرورتوں اور خارجی آرام و آسائش کے اعتبار سے مٹایا جا سکتا ہو۔ لیکن فطری اور خصوصاً جمالیاتی صلاحیتوں کے اعتبار سے عوام اور خواص کا فرق قطعاً غائب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ یہی فرق زندگی کے ارتقائی منازل کا آئینہ ہے۔ اس کو مٹانے کی کوشش زندگی کی ارتقا کا منکر ہونا ہے۔ زندگی اپنا ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ چند خصوصی صلاحیتوں کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ پھر اپنے تخلیقی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے زندگی ایک لمحے کو اپنی فنکاری پر ناز کرتی ہوئی ٹھٹک جاتی ہے۔ لیکن بہت جلد ہی یہ صلاحیتیں عام ہو کر لے مایہ بنجاتی ہیں۔ زندگی دوسرا قدم اٹھاتی ہے۔ ارتقا اسی طرح ہوتا رہا ہے۔ اور شاید ہوتا رہے گا۔ کوئی اسے کس طرح روک سکتا ہے؟ سوشلزم اور بالشوزم کا سیلاب تو خود زندگی کے فطری تلاطم کا ایک وقتی اور عارضی مظہر ہے۔ اس کی رو اگر زندگی کے دھارے کے خلاف جا رہی ہے تو بہت جلد فنا ہو جائے گی۔ دریا کی سطح کا تموج کبھی دریا کے بہاؤ کا راستہ نہیں مقرر کر سکتا۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں مارکس اور لینن کی سوشلزم موجودہ سیاسی ہیجان میں کس طرح اپنے اصولی راستہ سے بھٹکتی چلی جا رہی ہے۔"

"اُف۔ تم لگے فلسفہ بکنے۔ شاید آپ کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ آپ نے اس وقت ایک خاص لمبی تقریر فرما دی۔ جمالی تم نے کبھی خموش رہ کر بھی کھانا کھایا ہے؟" خالدہ نے اکتا کر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے جمالی کیلئے کئی خاص چیزیں پکوائی تھیں۔ جنہیں جمالی گفتگو کی رو میں قطعاً بے توجہی کے ساتھ کھا رہا تھا۔

"معاف کرنا خالدہ میں بھول گیا تھا۔ تمہیں میری گفتگو پسند نہ آئی ہوگی۔ تم تو ہر سال نمائش میں تصویر بھیجا کرتی ہو" خالدہ کھسیانی سی ہو گئی۔ "یہ میرے ذاتی خیالات تھے۔ ممکن ہے تمہیں ان سے موافقت نہ ہو۔ ٹھیک ہے۔ تم عورت ہو۔ عورت کی فطرت میں نمائش ضروری ہے۔ کیا عجب ہے فطرت نے اپنے جمالی پہلو کے نمود کی غرض سے عورت کی تخلیق کی ہو۔ اور عورت کی شخصیت کا راز فطرت کے اسی ارادے کی تکمیل ہو۔ پھر تو عورت اور نمائش لازم و ملزوم ہیں۔ اگر میری گفتگو تمہیں پسند نہ آئی ہو، تو میں خوشی سے واپس لے سکتا ہوں۔" جمالی نے متجیانہ نگاہ سے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جمالی تم باوجود فلسفی ہونے کے نرے احمق ہو" خالدہ نے ہنسکر جواب دیا۔

"ہاں۔ احمق اور فلسفی تو ہم معنی الفاظ سمجھے جاتے ہیں" حسین نے سنجیدگی سے کہا۔

حسین کو اس طرح نہ کہنا چاہیئے تھا! خالدہ نے محسوس کیا۔

کھانا ختم ہوا اور جمالی شب بخیر کہکر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

حسین اور خالدہ سونے کے کمرے میں گئے۔

"تمہیں جمالی کو اس طرح احمق نہ کہنا چاہیئے تھا"

"لیکن میں نے تو تمہارے بعد کہا"

"مجھ سے تو اس کے دیرینہ تعلق ہے۔ تم سے وہ اتنا بے تکلف نہیں ہوا ہے۔ ممکن ہے اُسے بُرا لگا ہو"

"اُسے بُرا لگا ہو یا نہیں لیکن تمہیں ضرور بُرا لگ رہا ہے" حسین نے ترشروئی سے کہا۔

"کیوں نہیں۔ میرے دوست کی توہین میری اپنی توہین ہے۔" خالدہ نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

"ہوا کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم جمالی کی شخصیت پر کیوں اس قدر فدا ہو۔ مجھے تو وہ ایک نہایت مغرور انسان معلوم ہوتا ہے۔ حد درجہ خود بیں اور خود پسند۔ ساری بکواس کی غرض اس کی اپنی خودستائی تھی۔ سمجھتا ہے کہ اس جیسا روشن دماغ اور بلند نظر کوئی دوسرا انسان نہیں ——"

"حسین! میں جمالی کی شان میں یہ توہین آمیز جملے برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اس کی شخصیت کی عزت کرتی ہوں" خالدہ چادر میں مُنہ ڈھانک کر لیٹ گئی۔

دوسرے دن صبح حسین حسب معمول دفتر کے کام میں مصروف ہو گیا اور ۱۱ بجے چلا گیا۔ اس کی طبیعت کام میں نہ لگی اور وہ سویرے ہی دفتر سے واپس چلا آیا۔ خالدہ اور جمالی باہر گئے ہوئے تھے۔ حسین ارام کرسی پر دراز ہو گیا اور خیالات کے سمندر میں بہنے لگا۔ خالدہ کی جمالی سے

دوستی کب سے ہے؟ خالدہ کے تعلقات خود اس کے ساتھ نہایت ناگوار معلوم ہوتے۔ اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ پھر خالدہ اس قدر برافروختہ کیوں ہوگئی؟ خالدہ، جمالی کو چاہتی تو نہیں؟" اس خیال پر اس کے دماغ میں ایک ناخوشگوار دھندلکا چھا گیا۔ "نہیں دونوں کی دوستی ہے، مذاق کی ہم آہنگی کی بنا پر۔ لیکن مذاق کی ہم آہنگی اتنا گہرا تعلق پیدا نہیں کرسکتی؟ خالدہ جمالی کی شخصیت کا احترام کرتی ہے لیکن اتنا زیادہ کہ جمالی کے خلاف ایک بات سُن نہیں سکتی؟ کیا واقعی خالدہ جمالی کی شخصیت کی صرف عزت کرتی ہے؟" اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں سے اس سوال کا جواب اُسے اثبات میں مل جاتا۔

خالدہ اور جمالی کمرے میں داخل ہوئے۔ خالدہ حسین کو اسوقت بہت زیادہ حسین معلوم ہورہی تھی۔ اور جمالی حسین کی نگاہ میں پس منظر کا کام کررہا تھا۔ خالدہ بہت زیادہ خوش نظر آرہی تھی۔ حسین کے دماغ نے فیصلہ کیا کہ اس نے اُسے کبھی اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ حسین کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

"ہم لوگ کل ایک ہفتہ کے لئے دارجلنگ جا رہے ہیں۔ اکزبیشن کے اب کم ہی دن رہ گئے ہیں۔ یہاں تو ایک منٹ چین سے بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر ایک ہفتہ کے لئے بھی یہاں کی ہنگامہ آرائیوں سے دور نہ ہوجاؤں گی تو پھر اس دفعہ اکزبیشن میں میری تصویر نہ جاسکیگی گرچہ مسٹر جمالی اُسے ایک حماقت سمجھتے ہیں۔ کیوں صاحب ــــ؟" خالدہ نے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جمالی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

حسین کو وہ اس وقت بہت زیادہ حسین معلوم ہوتی۔ شاید وہ کبھی اتنی حسین نظر نہ آئی تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ جمالی اس وقت اس جگہ نہ ہوتا۔

"کل جاؤگی؟" حسین نے کچھ دیر خموشی کے بعد یکبارگی سوال کیا۔ جیسے وہ دفعتاً چونکا دیا گیا ہو۔

"ہاں کل ہی تو"

"کس وقت؟"

"صبح سویرے یہاں سے روانہ ہونگی"

"کیا جانے کا فیصلہ قطعاً کرچکی ہو؟"

"کیا کروں بغیر جاتے بنے گا نہیں"

"اچھی بات ہے" حسین نے جملہ کافی دیر میں ادا کیا جیسے کوئی اس سے زبردستی بلوا رہا ہو۔

"تم دفتر سے ابھی آئے؟"

"ہاں!" حسین نے بجائے اختصار کو راست گوئی پر ترجیح دی۔ شاید اس لئے کہ وہ اس وقت اس سے زیادہ کچھ بول نہ سکتا تھا۔

خالدہ اور جمالی دارجلنگ چلے گئے۔ خالدہ کے جانے کے بعد حسین طرح طرح کی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ اُسے رات بھر نیند نہ آتی۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے پراگندہ خیالات مجتمع رہتے۔ وہ کبھی فیصلہ کرتا کہ تار بھیجکر خالدہ کو واپس بلالے لیکن اُسے خود اپنا یہ فیصلہ حماقت آمیز معلوم ہوتا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی مرض میں مبتلا ہورہا ہو۔ اس کی بھوک مردہ ہوگئی تھی، وہ اپنے قلب کی رفتار میں اضمحلال محسوس کرنے لگا تھا۔ اپنی اس کیفیت کا کوئی سبب اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

خالدہ کی روانگی کے چوتھے دن اُس نے یکبارگی فیصلہ کیا کہ وہ اسے تار بھیجکر بلالے گا۔ اُسے اپنے فیصلہ پر بھروسہ نہ رہا تھا اسلئے اس نے فوراً اس پر عمل کرڈالا۔ تار چلا گیا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ خالدہ کے سامنے کونسا عذر پیش کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ اس نے اپنے دماغ کو جذبے کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ "خالدہ کو مدنا پور بھیجدونگا۔ کلکتہ سے دور، یہاں کی مسموم اور گناہ پرور فضا سے دور، دیہات کی سادہ اور معصوم آب وہوا میں۔ اُسے کچھ دن وہیں رہنا چاہیئے" مگر کیوں۔ اس نے اپنے دماغ سے کبھی یہ سوال نہ کیا۔ شاید اس لئے کہ وہاں اُسے کوئی جواب نہ مل سکتا تھا۔

خالدہ دوسرے دن دارجلنگ سے واپس آگئی۔ سہمی ہوئی، طرح طرح کے توہمات سے۔ اُس نے گھبرائی ہوئی نظر حسین پر ڈالی۔ حسین کا چہرہ اُسے بے رونق معلوم ہوا۔ انتشار آگیں۔ اس نے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"خیریت۔ تم نے تار میں سبب نہ لکھا۔ میں راستے بھر طرح طرح کے خیالات سے اُلجھتی رہی۔ خدا کا شکر ہے تمہیں بخیر پارہی ہوں۔ جلد کہو کیا بات ہے"

"کل ہمیں ایک خاص ضرورت سے مدناپور چلنا ہے۔ اسی لئے تمہیں بلانا پڑا!"

"آخر کونسی ضرورت ہے؟" خالدہ نے بےرخی سے سوال کیا۔

"میں تمہیں بعد میں بتاؤنگا"

"لیکن میں تو ابھی جاننا چاہتی ہوں۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم ایسی اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کررہے ہو۔ تمہیں مجھے مدناپور جانے کا

سبب بتانا ہی ہوگا۔"

"نہیں میں ابھی نہیں بتاؤنگا!"

"تمہیں بتانا ہوگا" خالدہ کا چہرہ غصہ سے گلابی ہوگیا۔

"میں نہیں بتا سکتا" حسین نے بے اثری سے کہا۔

"تو پھر میں بھی مدنا پور نہیں جاسکتی" خالدہ نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جانا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں تم کس طرح نہیں جاتیں۔ تم میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتیں۔ میں نے تمہیں سر چڑھا رکھا ہے، تم عورتیں کبھی اس برتاؤ کی مستحق نہیں۔ تمہاری قوم کبھی اس قابل نہیں کہ اُسکے ساتھ رواداری کا سلوک کیا جائے۔ میں تمہاری خودسری اب ایک منٹ کو برداشت نہیں کرسکتا" حسین غصہ سے تھرا رہا تھا۔

خالدہ نے اُسے کبھی اس طرح غصہ ہوتے نہ دیکھا تھا اور وہ بھی اپنے اُوپر۔ اس کے حواس مختل ہو گئے۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ اُس کی حلق میں پھنس گئے۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔ زار و قطار۔ حسین کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن حسین، خالدہ کو مدنا پور لے گیا اور اُسے وہیں چھوڑ کر کلکتہ واپس چلا آیا۔

حسین کا آبائی گھرانہ نہایت قدامت پرست، رسم و رواج کا پابند اور موجودہ تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھا۔ اُس کی ماں ایک پُرانے خیال کی عورت تھی جو مکان کی چہار دیواری کے اندر بند رکھا جانا اپنا فطری حق سمجھتی ہے اور جس کے نزدیک گھر سے باہر قدم نکالنا جلاوطن کروئے جانے کے برابر ہے۔ جو گھر سے باہر نکلنے والی عورتوں سے پردہ کرنا اتنا ہی ضروری سمجھتی ہے جتنا کسی غیر مرد سے۔ حسین کی آزادانہ روش اُس کی ماں کو مطلق پسند نہ تھی اور حسین کی خالدہ سے شادی اُس پر نہایت شاق گزری تھی۔ ایسے ماحول میں خالدہ کس طرح زندگی گذار سکتی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دماغی صلاحیتیں رفتہ رفتہ معطل ہو کر مفقود ہوجانے والی تھیں۔ اُس نے حسین کو اپنے کلکتہ آنے کے متعلق متواتر خطوط لکھے لیکن حسین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حسین کی اس خاموشی کا راز کیا تھا حسین نے اُسے مدنا پور کیوں بھیجدیا۔ حسین اپنے گھر کی فضا سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ وہ اس فضا میں رہنا ایک منٹ کے لئے بھی پسند نہ کرتی تھی۔ حسین خود بھی تو اپنے والدین کی قدامت پسندی اُنکی دقیانوسی روش کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ پھر اُس میں دفعتاً ایسا انقلاب کیوں پیدا ہوگیا؟ اُسے حسین پر غصہ آنے لگا جس نے رفتہ رفتہ نفرت کی صورت اختیار کرلی۔ حسین اُسے ایک مکار، فریبی، خودغرض انسان معلوم ہونے لگا جس کی موجودہ تہذیب و تمدن پر فریفتگی ایک کھوکھلی نقالی تھی۔ اُسے اب تک حسین کے متعلق ایک بڑی غلط فہمی رہی تھی۔ وہ اُسے ابتک ایک روشن خیال، صحیح معنی میں ترقی یافتہ اور سمجھدار انسان سمجھتی رہی تھی لیکن اب اُس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا تھا۔ وہ اس حالت میں اپنی زندگی کا باقی ماندہ حصہ حسین کے ساتھ کس طرح گذار سکتی ہے، لیکن خالدہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ حسین سے کس طرح علیحدہ ہوجائے، اُس کا دماغ کچھ روز تک ایک عجیب کشمکش میں مُبتلا رہا۔ یہاں تک کہ ذہنی کشاکش کے برداشت کی قوت اس میں باقی نہ رہی اور اُس نے اپنی آئندہ زندگی کے متعلق فیصلہ کرلیا۔" وہ مدنا پور سے کہیں بہت دُور چلی جائے گی۔"

رات کے بارہ بجے وہ بستر سے اٹھی۔ اُس نے حسین کے نام خط لکھا اور پو پھٹنے سے قبل دبے پاؤں مکان سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چلدی۔ اسٹیشن پہونچکر لیٹر بکس میں اُس نے خط ڈالا اور جو پہلی گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی اُسے کلکتہ اور حسین سے دُور لے گئی۔

حسین دفتر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ اُسے خالدہ کا خط ملا۔ خط مختصر تھا۔

"میں تمہاری نہایت مشکور ہوں کہ تم نے مجھے ایک گہری غلط فہمی سے نجات دلادی۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کے جو دن گذرے ہیں نے اُنہیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ گویا میری زندگی کا گذشتہ ایک سال مجھے واپس مل گیا ہو اور مجھے پھر اُسے اپنے طور پر گذارنے کا حق حاصل ہو۔ اس سودے کے لئے میں صرف ایک ہی قیمت ادا کرسکتی تھی، یعنی یہ کہ ہمیشہ کیلئے کلکتہ اور وہاں کے تعلقات سے کنارہ کش ہوجاؤں۔ میرا یہ فیصلہ صرف میرے ہی نجات کا سامان بہم نہیں پہونچائیگا، مجھے یقین ہے کہ یہ تمہیں بھی مطمئن کر دیگا۔"

خط پڑھکر حسین دفعتاً کرسی پر گر گیا۔ اُس کے دماغ میں متضاد خیالات تیزی کیساتھ اُبھرنے لگے۔ "خالدہ چلی گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ اپنے جمالی کے پاس گئی ہوگی۔ ذلیل کمینہ انسان! وہ اُسے خاک میں ملا کر چھوڑیگا۔ ٹھیک ہے۔ خالدہ کو اپنے کرتوت کی سزا ملنی چاہیئے"۔ اسکے چہرے پر وحشیانہ خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ "لیکن خود اسے بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا"۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑگیا۔ "خالدہ اُسے رسوائی اور ذلت کا شکار بنا کر چلی گئی۔ وہ کسی کو کس طرح مُنہ دکھا سکے گا؟ نہیں وہ کمال احتیاط سے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش

کریگا! اس نے فوراً گھر ایک تار روانہ کر دیا: "خالدہ یہاں آگئی ہو آپ لوگ مطمئن رہیں"

خالدہ جب سے کلکتہ سے گئی تھی کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں اُس کی کمی کافی محسوس کی جارہی تھی۔ ہر ملاقاتی حسین سے اس کے متعلق سوال کرتا۔ حسین نے لوگوں کے استفسار کے ڈر سے دفتر کے سوا دوسری جگہ آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ خالدہ کے بھاگ جانے کے بعد اُسکے لئے دفتر جانا بھی دشوار ہوگیا تھا۔ اسے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا کہ خالدہ کے غائب ہونے کی خبر دوسروں کو مل نہ چکی ہو۔ کہیں کوئی راستہ میں اس سے اس کی بابت سوال نہ کر دے۔ اُسکے کمرے میں کسی کے آنیکی آہٹ سنائی دیتی تو اُسکا دل دھڑکنے لگتا۔ شاید آنے والا اس سے خالدہ کے بھاگنے کا سبب پوچھنے آرہا ہی۔ اس نے دفتر سے طویل رخصت لیلی اور مدنا پور چلا گیا۔ گھر والوں پر وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ خالدہ کلکتہ میں ہے۔

حسین کی رخصت ختم ہونے کو آئی لیکن اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی قوت اُس کو کلکتہ جانے سے روک رہی ہے۔ جیسے کلکتہ جانا اُسے کسی ایسی آفت میں گرفتار کر دیگا جس سے چھٹکارا محال ہو۔ وہ کب تک کلکتہ والوں سے خالدہ کے بھاگنے کا راز چھپائے رکھنے میں کامیاب رہ سکتا ہی۔ آخر یہ راز ظاہر ہو کر ہی رہیگا۔ اور وحشی شعلوں کی طرح سارے کلکتہ میں پھیل جائیگا۔ وہ اپنے آپکو ان شعلوں میں گھرا ہوا پاتا تھا۔ اُنکے مقابلے کی قوت اُسے اپنے اندر محسوس نہ ہوتی تھی۔ اُس نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔

حسین اب ایک کٹر ملا کی سی زندگی گزار رہا ہی۔ وہ غریب کا ایک رانہ مقلدین گیاہے۔ اُسکے دن کا بیشتر حصہ مسجد کے اندر ورد و وظائف میں صرف ہوتا ہی۔ مسجد میں صبح و شام جھاڑو دینا اُسکی زندگی کا اہم ترین جزو بن گیا ہے۔ اپنے دماغ کے ہیجان سے اس نے مذہب کی خود فراموشی میں پناہ حاصل کی۔ اُسے کہیں اور سکون مل بھی نہ سکتا تھا۔

محمد محسن

تم

آنکھوں میں اشکِ غم جو مرے پا رہے ہو تم
اللہ جانتا ہے کہ یاد آ رہے ہو تم

کہنے بھی دو سکوں سے مجھے داستانِ غم
یہ کیا کہ بات بات پہ شرما رہے ہو تم

شاید سکون ہی نہیں دل کے نصیب میں
نظروں سے دُور رہ کے بھی تڑپا رہے ہو تم

ہاں ہاں وفا کرو گے یہ مجھکو یقین ہے
بیکار میرے سر کی قسم کھا رہے ہو تم

تم سے نہ نبھ سکے گا یہ پیمانِ عاشقی
پھر بات درمیاں میں وہی لا رہے ہو تم

تم مجھ کو دیکھ دیکھ کے ہنستے ہو کس لئے
جو آگ بجھ چکی ہے وہ بھڑکا رہے ہو تم

یہ دل وہ ہے کہ جس پہ تصدق ہی کائنات
اللہ ایسی چیز کو ٹھکرا رہے ہو تم

یا خود ہی بڑھ گئی ہے یہ تابانیٔ جہاں
یا گوشۂ نقاب کو سرکا رہے ہو تم

حیرت میں کیوں ہو تم مرے سجدوں کو دیکھکر
مجھکو تو ہاں کچھ اور نظر آ رہے ہو تم

سمجھوں نہ سمجھوں اس سے تو کوئی غرض نہیں
پر یہ سمجھ رہا ہوں کہ سمجھا رہے ہو تم

دیر و حرم کی حد تو کبھی کی گذر چکی
بہزاد اب کدھر کو بہے جا رہے ہو تم

بہزاد لکھنوی

صبحِ چمن

وہ جاڑے کی رُت اور صبحِ چمن ۔۔۔ روپہلی فضائیں، سنہری کرن
وہ کہرے کی چادر بہت ہی مہین ۔۔۔ دھندلکا، مگر انتہا کا حسین
اُجالے میں کہرا نکھرتا ہوا ۔۔۔ سحر کا تبسم بکھرتا ہوا
اندھیرا چھٹا، دھوپ چڑھنے لگی ۔۔۔ حرارت بتدریج بڑھنے لگی
ہوا ڈالیوں سے جو ٹکرا گئی ۔۔۔ کلی کے لبوں پر ہنسی آ گئی
اُبھرنے لگے پھولوں کے خط و خال ۔۔۔ نکھرنے لگا گلستاں کا جمال
چٹک کر جو غنچوں نے آواز دی ۔۔۔ گلوں کی مہک نے بھی انگڑائی لی
ہوائیں چلیں گیت گاتی ہوئیں ۔۔۔ بہکتی ہوئیں، لڑکھڑاتی ہوئیں
لچکتی ہوئیں ڈالیوں کے تلے ۔۔۔ جھلکتی ہوئی اوس کی سرد مے
وہ سبزے کی بدمست انگڑائیاں ۔۔۔ مچلتی ہوئیں سبز پرچھائیاں
ہواؤں میں اُڑتی ہوئیں تتلیاں ۔۔۔ پلک مارتے میں یہاں سے وہاں
پرندوں کے نغمے، وہ بھونروں کے گیت ۔۔۔ تخیل کی ہر گام پر ہار، جیت
کہیں بلبلوں کے ترانوں کا رنگ ۔۔۔ کہیں فاختاؤں کے نغموں کی چنگ
روپہلی، روپہلی چنبیلی کے پھول ۔۔۔ محبت کے جس طرح سادہ اصول
گلوں کے کٹورے چھلکتے ہوئے ۔۔۔ گہرہائے شبنم ڈھلکتے ہوئے
گلستاں کی زینت مہکتے گلاب ۔۔۔ کہ جیسے عروسِ نوی کا شباب
دمکتے کنول، مسکراتے کنول ۔۔۔ ہر اک پھول، اک مطلعِ برمحل
درختوں کے پتے ہیں یا مورچھل ۔۔۔ ہر اک شاخ حافظ کی رنگیں غزل
لہکتی ہوئی عشق پیچاں کی بیل ۔۔۔ کہ جنگل میں جیسے ہرن کی کلیل
وہ جنت جو ملٹن سے کھوئی گئی ۔۔۔ یہاں ہر کلی میں سموئی گئی
گلستاں نہیں، مرکزِ رنگ و بو ۔۔۔ مقابل ہیں رنگینیاں، چار سو
نظر پھول کو چوم کر رہ گئی ۔۔۔ فضائے چمن پھول کر رہ گئی

ماہر القادری

ہم کیوں غصہ کرتے ہیں؟

انسانی جذبات میں، تماشائیوں کے نقطۂ نظر سے، غصہ سب سے پُرلطف جذبہ ہے۔ آئیے ہم لوگ غصہ پر ایک ایسے زاویہ سے روشنی ڈالیں جس میں غصہ اس خطرناک شکل میں ظاہر نہ ہو جس میں عموماً یہ ظاہر ہوتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسانی جسم کا ہر حصہ حرکت اضطراری کا مرکز بنجاتا ہے۔ دل دھڑک کر دورانِ خون کو تیز کر دیتا ہے۔ اس نے جسم کے وہ حصے جو عموماً حالت سکون میں اپنے اندر خون کی تھوڑی سی مقدار رکھتے ہیں، زیادتی خون کی وجہ سے سُرخ ہو جاتے ہیں مثلاً چہرہ، آنکھیں وغیرہ۔ چہرہ تمتما اُٹھتا ہے، چہرے کے گوشت اور پوست طرح طرح سے پھیلنے اور سُکڑنے لگتے ہیں، آنکھوں میں سُرخ ڈورے ابھر آتے ہیں، پتلیاں پھیلنے اور سکڑنے لگتی ہیں، ہونٹ تن کر باریک ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیوست ہو جاتے ہیں یا پھر غصہ اگر گالیوں اور سخت کلامیوں کیساتھ آرہا ہے تو ہونٹ سُکڑ کر مسوڑے کی جڑوں سے جا لگتے ہیں اور پوری بتیسی باہر نکل آتی ہے۔ تھوک کے باریک قطرے ہر زوردار فقرے کے ساتھ اُڑ اُڑ کر باہر آنے لگتے ہیں اور اگر غصہ کچھ دیر تک تھم گیا تو تھوک خشک ہو کر لیسدار ہو جاتا ہے، زبان سُوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہے اور بات کرتے وقت چٹ پٹ، چٹ پٹ کی آواز نکلنے لگتی ہے۔ گردن کی رگیں پھول کر اُبھر جاتی ہیں اور چہرہ ایک مہیب سی چیز ہو کر رہ جاتا ہے جسکو دیکھکر بیساختہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

چہرے کی تبدیلی کے بعد ہاتھوں کا نمبر آتا ہے۔ ہاتھ اُٹھتے ہیں اور گرتے ہیں، گرتے ہیں اور اُٹھتے ہیں، کبھی مٹھی بندھ جاتی ہے اور کبھی کھُل جاتی ہے۔ کبھی انگشتِ شہادت دیگر انگلیوں سے بغاوت کر کے تن تنہا کھڑی ہو جاتی ہے اور مغضوب کی آنکھوں اور چہرے کے آگے ناچ کر ناچنے اور تھرکنے لگتی ہے۔ کبھی پانچوں انگلیاں پانچ سپاہیوں کی طرح مل کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور غریب مخالف کے گال سے کچھ الگ رہ کر نسے طمانچہ کی دھمکی دیتی ہیں۔ ہاتھ کبھی آسمان کی طرف اُٹھکر گویا خدا کو انصاف کیلئے بلاتے ہیں اور کبھی زمین کی طرف جھک کر مخالف کو قبر، دفن وغیرہ کی یاد دلاتے ہیں۔ سانس زور زور سے آنے لگتے ہیں، دل کی رفتار بھاگتے ہوئے گھوڑے کی چال سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ پیٹ کے تمام گوشت پوست سُکڑ جاتے ہیں، آنتیں بل کھانے لگتی ہیں، صفرا کی تھیلی سکڑ جاتی ہے اور صفرا کافی مقدار میں معدہ میں چلا آتا ہے جو اکثر غصہ کرنے والے کی متلی کا سبب بن جاتا ہے۔ جلد کے مسامات بند ہو جاتے ہیں جس سے پسینہ کی آمد و رفت میں رُکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ اور تمام اعصاب کثرت اشتعال کی وجہ سے حد درجہ ذکی الحس ہو جاتے ہیں۔ شدید غصہ کی حالت میں یہ ذکاوت غائب ہو جاتی ہے اور دماغ و اعصاب غبی ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت مطلق باقی نہیں رہتی۔ ضرب شدید بھی ہلکی پھلکی خراش معلوم ہونے لگتی ہے۔ جسم کے اندر جتنے غدود ہیں اس میں بعض اپنا فعل بالکل بند کر دیتے ہیں اور بعض معمول سے زیادہ کام کرنے لگتے ہیں۔ پاؤں کی قوت میں توازن قائم نہیں رہتا۔ شدید غصہ کی حالت میں قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ سکون اضطرار سے بدل جاتا ہے اور رہ رہ کر پاؤں اس چیز کی طرف اُٹھنے لگتے ہیں جس پر غصہ آتا ہے۔ کبھی پاؤں وزنی موگدر کی طرح دھم دھم کرتے ہوئے زمین پر پٹکے جاتے ہیں۔ اس دھماکے سے آس پاس کی فضا میں، جو طرح طرح کی آواز سے معمور ہو چکی ہوتی ہے، ایک خاص قسم کا مہیب تلاطم پیدا ہو جاتا ہے جس سے غصہ کئے جانے والی ہستی پر رُعب چھا جاتا ہے۔ الغرض غصہ خیز بیولوجیکل نقطۂ خیال سے ایک دلچسپ معمہ ہے جس پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ انسانی جذبات میں، بھوک اور خواہشِ جنسی کے بعد اس کا نمبر آتا ہے جس میں انسان موجودہ تہذیب، تمدن، علم و عقل کے باریک نقاب کو پھاڑ کر پھینک دیتا ہے اور پھر ایک بار اپنے آبا و اجداد کے اس دَور کی جھلک دکھا دیتا ہے جب وہ جانور تھے گوشت خوار قسم کے، جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے، دن رات لڑتے اور جھگڑتے تھے، کبھی اپنے دُشمن کو کاٹ کھاتے تھے اور کبھی اپنے زبردست دُشمن سے بچنے کیلئے چیختے چلاتے ہوئے، اپنی دُم کو اُٹھائے ہوئے پہاڑوں میں قلابازیاں کھاتے پھرتے تھے۔

اب آئیے اس غصہ پر ایک دوسرے زاویہ سے روشنی ڈالیں۔ غصہ کیوں آتا ہے، کس لئے آتا ہے اور کیونکر جاتا ہے۔ انسانی فطرت خود غرض اور اندھی واقع ہوئی ہے۔ اگر کوئی شے اسکے مزاج کے خلاف ہو جائے تو اُسے ناگوار گذرتا ہے اور یہ جھنجلا کر اپنی صدا سے

احتجاج غصّہ کی صورت میں پیش کرتی ہے مثلاً ایک بچّہ صابن کے جھاگ کو پینے کے پانی میں ملانا چاہتا ہے۔ اگر اس سے صابن چھین کر پانی کے مٹکے کو ڈھنک دیجئے تو وہ جھنجلا کر غصّہ کرے گا اور اگر اس کا یہ غصّہ صابن اور مٹکے کو واپس نہ لا سکا تو وہ رونے لگے گا جو اظہار ہے غصّہ، نفرت، ضد اور رعب ڈالنے کا۔ اسی طرح ایک عورت آئینہ کے سامنے بیٹھکر گھنٹوں اپنی صورت دیکھتی ہے، کبھی آنکھیں نیم باز کرتی ہے، کبھی مسکراتی ہے، کبھی اپنے دانتوں کو طرح طرح سے نکالکر دیکھتی ہے، کبھی بالوں کے پیچ وخم کو چھیڑتی ہے اور پھر پیار سے انکو اپنی جگہ پر تھپک دیتی ہے، کبھی کھڑی ہو کر سیدھی طرح اپنے تمام جسم کو آئینے میں دیکھتی ہے، کبھی آنچل کو سینے پر کھینچکر اپنے جسم کو ترچھی ہو کر دیکھتی ہے۔ اگر عین اسی سنگار یا دیکھ بھال کے وقت آپ نے دبے پاؤں آکر کہدیا۔ "اجی بہت ہوا۔ ذرا خوبصورت ہوتیں تو اور نہ جانے کیا کرتیں!" تو بس سمجھ لیجئے کہ آپ کے اس معصوم سے جملہ پر اُس کو غصّہ آجائیگا اور شدید قسم کا۔ اس پر بھی وہی تشنجی کیفیت کا دَورہ پڑجائے گا جس کا ذکر آگے ہوچکا ہے۔ عورت چونکہ اہنسا کی قائل ہے اس لئے وہ بھوک ہڑتال کر دیگی۔ خاموش ہو کر گفتگو بند کر دے گی اور اگر ان باتوں کے باوجود غصّہ زائل نہ ہوگا تو بال پریشان کر کے رو دیگی، ماتم کریگی، شور مچائیگی اور اس طرح غصّہ کرنے کا یہ مقصد کہ غصّہ کئے جانے والے پر رعب ڈالا جائے، پورا ہو جائے گا۔

اب ایک نوجوان مرد کو لیجئے، کڑے خاں پٹھان کو، بھلا ان کا کیا کہنا، یہ تو غصّہ کرنے کو پیدا کئے گئے ہیں، بات بات پر غصّہ، منٹ منٹ پر غصّہ، قدم قدم پر غصّہ۔ کسی کو اپنی شامت لائی ہو تو ان کے صافہ کے رنگ کو بُرا کہہ دے۔ یا اُنکی مونچھوں کے بل کو ٹیڑھا بتا دے، یا اُن کی مرزاپوری لاٹھی کی تعریف نہ کرے، یا اُنکی ہاں میں ہاں نہ ملائے۔ یہ حضرت اکڑ کر آگے بڑھیں گے، جسم پر، چہرے پر، الغرض اپنے جسم کے ہر حصّہ پر وہی تشنجی کیفیت طاری کر لیں گے جس کا بیان آگے ہوچکا ہے اور غریب شامت زدہ کو وہ دھول لگائینگے کہ وہ چاروں شانے چت جا پڑیگا۔ اگر اس طرف بھی کوئی فولاد خاں ہوئے تو بس سمجھ لیجئے کہ لطف آگیا۔ گالیوں کا آغاز "ابے چل، دُور ہو، بڑا آیا، وہ دونگا، کیا دیکھتا ہے ابے، اماں" وغیرہ جیسے بے معنی الفاظ سے ہوگا۔ کچھ دیر تک دور دُور سے پھبتی، گالی، سخت کلامی سے اظہار غصّہ و نفرت کیا جائیگا۔ نیز اس وقت خیریت ہے اگر دو مضبوط اور مسٹنڈے قسم کے صلح پسند حضرات آدھمکے تو خیر، بیچ میں پڑ کر دونوں کو کھینچتے ہوئے دُور لے جائیں گے اور الگ کر دینگے گرچہ اس کھینچا تانی کے دوران میں بھی گالیوں کا وظیفہ بدستور جاری رہیگا جو کچھ دیر بعد خود بخود آہستہ آہستہ بند ہو جائیگا۔ اگر بدقسمتی سے صلح کرانے والے حضرات نہ ہوئے اور ہوئے بھی تو کمزور اور بُزدل قسم کے تو پھر نہ پوچھئے کہ غصّہ کی ایکٹنگ حرف بحرف پوری ہو کر رہیگی۔ پاؤں زور زور سے زمین پر پٹکے جائینگے، ہاتھ مختلف والنواع اقسام کے حرکات میموئی کرنے لگیں گے، چہرہ مہیب اور خوفناک ہو کر بچّوں کے خوف اور عورتوں کے اختلاجِ قلب کا باعث بن جائے گا، فریقین کا درمیانی فاصلہ کم ہو کر غائب ہو جائیگا۔ گالی گفتار، دھول دھپّا، دھینگا مشتی، اُٹھا پٹخ، مار پیٹ، لٹھم لٹھّا، خون خرابا وغیرہ قسم کی حرکات ہونے لگیں گی۔ جن کو بیان کرنے کے لئے لغت میں یہ مرکبات وضع کئے گئے ہیں۔ اس قسم کا غصّہ خون کے بہنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتا ہے یا پھر پولیس کی لال پگڑی سے۔

جوانوں کے بعد بڈھوں کا نمبر آتا ہے گرچہ غصّہ کی فہرست میں ان کو سب سے اوّل جگہ دینا چاہیئے تھی۔ ساٹھ سال کے بعد زندہ رہنا اگر گناہ نہیں تو کم از کم جرم ضرور ہے۔ اس عمر کے بعد تمام قویٰ مضمحل ہو کر ڈھیلے پڑجاتے ہیں مگر غصّہ کرنے کی صلاحیت جوان تر ہو جاتی ہے۔ بڑے میاں ظاہرہ دیکھنے میں سفید ریش وبروت سے ڈھکے ہوئے روئی کے گالے نظر آتے ہیں مگر ذرا ان کو چھو کر دیکھئے تو کرختگی میں سنگِ خارا اور فولاد سے کم نہیں۔ آپ نے ایک کہی نہیں کہ دس سُن لی۔ آپ نے کہا "دادا میاں، آج کیا کھائیے گا؟" دادا میاں گویا اسی انتظار میں ساون بھادوں کے بادل کی طرح بھرے بیٹھے تھے، گرج کر برس پڑے "چل دُور ہو مردود، تیرا اور کوئی دادا ہوگا حرامخور، نالائق، مسخرا وغیرہ" الغرض بڑے میاں نے ایک معقول سوال کے جواب میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جس کو اس سوال سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس موضوع کو چھیڑا تک نہیں جو زیر بحث تھا۔ بڈھے غصّہ کرتے ہیں اور بات بات پر غصّہ کرتے وقت اُن پر بھی وہی تشنجی دورہ پڑجاتا ہے مگر چونکہ اُن کے اعضاء کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں اس لئے بیک وقت اتنے شدید جذبات کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اُن کے سارے جسم میں کپکپی ہونے لگتی ہے۔ ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، پاؤں ڈگمگانے لگتے ہیں۔ سر میں رعشہ ہونے لگتا ہے اور لاٹھی جو اُٹھکر غصّہ کئے جانے والے پر پڑنا چاہتی ہے تھر تھرا کر غلط نشانہ پر لگتی ہے۔ اپنی اس غلط اندازی پر بڑے میاں بجائے اسکے کہ پشیمان ہو کر خاموش بیٹھ جائیں اور برہم ہو جاتے ہیں اور

لگاتار سانپ کے بدلے لکیر پیٹنے لگتے ہیں۔ یہ سماں ایک فلسفی کی نگاہ میں خواہ کچھ بھی بے ثباتیِ حیات کا نقشہ کھینچتا ہو مگر کمسن دماغوں میں تو یہ ہمیشہ تالیاں بجا بجا کر اور فرش ہو ہو کر ہنسنے کا باعث بنتا رہا ہے۔ بڑھاپے میں غصہ کا آنا اکثر دماغ میں شریان کے پھٹ جانے کا باعث ہوتا ہے جس کے بعد فالج اور موت کے مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں مگر اس حکیمانہ نصیحت کو کون بڑے میاں بغیر غصہ کئے ہوئے مانیں گے ؟۔

غصہ پیشہ کے اعتبار سے بھی کم یا زیادہ مقدار میں آتا ہے مثلاً بنئے کو غصہ نہیں آتا یا اگر آتا ہے تو بہت مدھم قسم کا۔ وہ بدستور نظریں نیچی کئے ہوئے سامان تولتا جائے گا مگر اس کے لب کو غور سے دیکھئے تو وہ ہلتے ہوئے پائے جائیں گے۔ یہ لبوں کا ہلنا بنئے کے غصہ کا تمام و کمال مظاہرہ ہے جو وہ بطور صدائے احتجاج آپ کے کہے ہوئے کم نرخ پر بلند نہیں پست کرتا ہے۔ یا پھر ملّا مسجد نشیں کا مسلسل اور چھچھورے قسم کا غصہ جو محلہ والوں کی ہر کفایت شعاری پر ابھر آتا ہے اور معصوم بچوں پر جو مکتب آتے ہیں اُن پر اُترتا ہے۔ یہ مولوی غصہ کرنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے اور معصوم بچوں کے حرف حرف پر غلطیاں نکالتا ہے اور بات بات پر پیٹتا ہے۔ یہ اپنے معصوم شکار کو جتنا مارتا ہے، اُس پر جتنا ظلم کرتا ہے اتنا ہی اسکے غصہ کی آگ بھڑکتی جاتی ہے حتیٰ کہ لڑکا بیہوش ہو کر دُنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جاتا ہے یا مکتب سے اُٹھکر ایسا بھاگتا ہے کہ پھر مرتے دم تک کبھی لَوٹ کر نہیں آتا۔

لیڈروں کو غصہ موقع موقع سے آتا ہے۔ لیڈر جب دیکھتا ہے کہ اب غصہ کرنے سے اس کے سامعین بھی غصہ کریں گے تو وہ فوراً اس موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ غم و غصہ کی اعلیٰ درجے کی ایکٹنگ کرتا ہے۔ مخلوق جو جلسوں میں عقل گھر چھوڑ کر جاتی ہے، لیڈر کے غصے کو دیکھکر آگ بگولا ہو جاتی ہے اور انقلاب انقلاب کے نعرے لگاتی ہوئی مشین گنوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیڈر ایک محفوظ مقام سے اپنے غصے کے جراثیم کے پھیلتے ہوئے مُہلک اثرات کو دیکھتا ہے اور قتل و غارتگری کے لمحوں کے بعد میدان میں آتا ہے، زخمیوں کو دادِ شجاعت دیتا ہے اور مُردوں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ پھر فریقِ ثانی سے گفتگو مصالحت کر کے کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ لیتا۔

غصہ پیغمبروں کو بھی آتا ہے۔ ان کا غصہ کسی عالمگیر تباہی یا سیلاب یا وبا کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ان کے غصہ میں رحم کی بھی آمیزش ہوتی ہے یعنی یہ ایک سانس میں غصہ کرنے والوں کو گمراہی سے ڈراتے ہیں تو دوسرے سانس میں اپنے کئے پر پچھتاتے ہیں۔ اکثر پیغمبر ایسے ہوئے ہیں کہ اگر اُن کے غصہ کا ہر لفظ صحیح ہوتا تو آج یہ دُنیا اجرامِ فلکی سے خارج ہوتی یا پھر اس پر آباد ہونے والے گنہگار انسان کے بدلے پردار فرشتے ہوتے۔

پاگلوں کا غصہ ایک اچانک اور بالکل غیر ارادی فعل ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسے کب غصہ آئے گا اور کس بات پر آئے گا اور آکر کونسی صورت اختیار کرے گا۔ چیخنا، چلانا، بھاگنا، دھمکیاں دینا، کپڑے پھاڑنا وغیرہ تو عین پاگل کی شان ہے۔ یہ چیزیں اگر نہ ہوں تو انسان پاگل کیوں کہلائے مگر ان باتوں کے ساتھ اگر کہیں غصہ آگیا تو پھر اُس کی خیریت نہیں جس کی وجہ سے غصہ آگیا ہے۔ پاگل زنجیر توڑ کر، دیوار پھاند کر، آگ اور پانی سے گذر کر اپنے خیالی نقصان کا بدلہ لیتا ہے اور بُری طرح جسکو دیکھکر انسانی دل ہل جاتے ہیں اور تہذیب دامن میں مُنہ چھپا کر رونے لگتی ہے۔

غصہ کرنے والوں کی ایک قسم اور ہے، جن کا غصہ سوائے ان کے یا اَوروں کے لئے مخدوش نہیں ہوتا۔ آپ نے سُنا ہوگا "قہرِ درویش برجانِ درویش"۔ اس قسم میں نمبر ایک پر حضرت درویش آئے۔ ان کے بعد عاشق کی باری آتی ہے۔ یہ حضرت بھی غصہ اپنی جان پر کرتے ہیں، خود اپنا خونِ دل پیتے ہیں اور لختِ جگر کھاتے ہیں۔ عاشق کے بعد قیدی یا کمزور غلام آتے ہیں جن کے لئے کوئی راہِ فرار نہیں۔ اس قسم کے غصہ کرنے والوں میں مہاتما بھی آتے ہیں جو غصہ اس لئے نہیں کرتے کہ ندامت کون اُٹھائے یا مفت کی مار کون کھائے۔

قصہ مختصر غصہ ایک شدید قسم کا وقتی جنون ہے۔ اس جذبہ کے تحت میں انسان انسان نہیں رہتا۔ اس سے ہر وہ حرکت سرزد ہو جاتی ہے جس پر بعد میں پشیمانی ہوتی ہے اور مارے ندامت کے رونے کو جی چاہتا ہے۔ ہر غصہ کرنے والے سے میری اتنی سی درخواست ہے کہ وہ غصہ تنہائی میں کرے یا غصہ کی حالت میں اپنی صورت آئینہ میں دیکھ لے مجھے یقین ہے وہ اپنی صورت دیکھکر شرما جائیگا یا نہیں تو کم از کم ہنس ضرور دیگا۔

(ڈاکٹر) محمد نصیر الدین۔

گنہگار

آلو ایک لاری ڈرائیور تھا۔ مگر پیٹ بھرنے کا یہ ذریعہ اختیار کرنے سے پہلے اُس نے زندگی کے کئی پہلو دیکھ رکھے تھے۔ درحقیقت وہ جمنا داس سیٹھ کے سائیس کا بیٹا تھا اور اُسی سیٹھ کے اصطبل کے پہلو کے کمرے میں اُس کی پیدائش ہوئی تھی۔ مگر جب اُس کی عمر صرف پانچ برس کی تھی اُسکے ماں باپ کا سایہ اُس کے سر پر سے اُٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں پلیگ کا شکار ہوگئے تھے اور اپنے اکلوتے بیٹے کو سیٹھ جمنا داس کے متعدد نوکروں کے سُپرد کر گئے تھے۔ پانچ برس کی عمر سے لیکر ۱۰ برس تک آلو سیٹھ صاحب کے گھر میں رہا اور مختلف قسم کے چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ انہی ایام میں اسکو سیٹھ صاحب کے نوکروں کے دھول دھپے اور گالی گلوج بھی سہنے پڑے۔ آخر بارہ برس کی عمر میں ایک دن وہ چُپ چاپ سیٹھ صاحب کے مکان اور اُن کے نوکروں کو خیرباد کہہ کر نکل پڑا اور بارہ برس سے بائیس برس کی عمر تک اُس نے ہزاروں پاپڑ بیلے۔ نان بائیوں کی دُکان پر برتن ملنجے۔ تیس تا چالیس روپے کے گریڈ کے بابوؤں کے گھر کا انتظام سنبھالا۔ مزدوری کی۔ سنیماؤں میں جھاڑو دی۔ غرضکہ ایک بے چپّو کی کشتی کی طرح جو متلاطم سمندر میں کسی منزل کا رُخ کئے بغیر موجوں کے تھپیڑوں سے ڈول رہی ہو آلو بھی دُنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو رہا تھا۔ مگر زندگی کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے جب اُس نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تو وہ ایک شرابی بن چُکا تھا۔ جُوئے کا اس کو چسکا لگ چکا تھا۔ مختصراً وہ ہر ایک بُری عادت کا شکار تھا۔ ایک کمپنی کی لاری چلانے کے عوض میں پچیس روپے ماہانہ وصول کر لیتا تھا۔ اور ایک گندے سے بازار کے کونے کی کوٹھری (جسکو اُس نے تین روپے ماہانہ کرایہ پہ لے رکھا تھا) میں رات کو شراب پی کر آتا اور پڑ رہتا۔

دھنو ایک نہایت معمولی کاشتکار تھا۔ پچاس برس کی عمر میں بھی اُسے بڑی جانفشانی سے محنت کرنی پڑتی تھی کیونکہ اپنے کثیرالتعداد کُنبے کو پالنے کا ذریعہ صرف محنت تھا۔ بدقسمتی سے اُس کے پہلے چھ بچوں میں سے ایک بھی اولادِ نرینہ نہ ہوئی تھی بلکہ سب لڑکیاں تھیں۔ باقیماندہ چار بچے مرد تھے مگر ابھی اس قابل نہ ہوتے تھے کہ اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بٹا سکتے۔ بطرف دیگر لڑکیاں جوان ہوتی جا رہی تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی کی شادی اُس نے گاؤں کے ایک کسان سے کر دی تھی مگر اُسکی دوسری لڑکی چمپا بھی اب ساڑھے چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ اس لئے دھنو اور اُسکی بیوی دونوں پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اُس کی شادی بھی ہو جائے تو اس طرح ایک تو گھر سے ایک عدد کھانے والا کم ہو جائے اور دوسرے جوان کنواری لڑکی کا گھر میں رکھنے کا خدشہ بھی مِٹ جائے۔

قسمت ایک شام آلو کو چند سواریاں لیکر اُسی گاؤں کی طرف لے گئی جہاں دھنو رہتا تھا۔ وہاں اُس کی لاری بگڑ گئی اور ہزار کوشش کرنے پر بھی نہ ٹھیک ہو سکی۔ مجبوراً وہ رات اُسے وہیں کاٹنی پڑی۔ اُسی شام کو اتفاقاً چمپا اُس کے نظر پڑی۔ اُس کی اُٹھتی جوانی اور دیہاتی حُسن دیکھکر وہ بھوچکا سا رہ گیا۔ اُس کے دل میں ایک زبردست خواہش اُٹھی کہ کسی طرح چمپا کو اپنے بس میں کرے۔ مگر چمپا کوئی فاحشہ عورت تو تھی نہیں جس کو وہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ ادا کر کے اپنی نفسانی خواہشات کی آگ بُجھا لیتا۔ چمپا کا حسب نسب دریافت کر کے وہ دھنو کے پاس پہونچا اور چمپا سے شادی کرنے کی درخواست نہایت میٹھے لفظوں میں پیش کر دی۔ دھنو کو ایسی درخواست سے تعجب ضرور ہوا مگر معمولی سا دریافت کرنے کے بعد اور حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اُس نے یہی سوچا کہ آلو اور چمپا کا جوڑ خوب رہیگا۔

چنانچہ آلو کی لاری بگڑنے کے ایک ہفتہ بعد ایک سہانی شام کو آلو چمپا کو بیاہ کر اپنے ساتھ لاری میں بٹھائے گھر لے جا رہا تھا۔ بھولی بھالی چمپا کے دل میں نامعلوم مستقبل کے ڈر کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کی پریاں ناچ رہی تھیں۔ شہروں کے پکے گھر، صحن کے نل، بارونق بازار، مٹھائی اور کپڑوں کی دُکانیں، سنیما، پھولوں سے بھرے باغ۔ وہ بچاری اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ اُس کو ایک شہری شوہر نصیب ہوا۔ وہ اپنے کپڑوں میں پھولے نہ سماتی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کنوؤں سے پانی لانا، گوبر سے گھر کو لیپنا، تیل کے چراغ جلانا۔ برسات میں ٹپکتی چھت کی مرمّت کرنا اُس کی زندگی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ وہ موٹر میں اُڑی جا رہی تھی اور اپنے شوہر کے موٹر چلانے کے کمال سے مرعوب ہو رہی تھی۔ نئی زندگی کے خوشگوار خواب دیکھنے کے لئے اُسکا

معصوم دل ناچ رہا تھا۔ مگر جب آنو اُس کو اپنی کوٹھری میں لے گیا تو اُسکی غلاظت اور بے ترتیبی دیکھ کر اُس کے دل پر پہلی چوٹ لگی اور سہاگ کی رات کے آنے سے پہلے اُس نے آنو کی گندی بالٹی لیکر بازار کے نل سے پانی بھرا اور پھر جھاڑو لیکر کمرے کو جھاڑا اور دھویا اور پھر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ رہی۔ شہروں کے پکے گھر، صحن کے نل، بارونق بازار۔ مٹھائی اور کپڑوں کی دکانیں، سنیما اور پھولوں سے بھرے باغ اُس کے دماغ سے اوجھل ہو چکے تھے۔ نئی زندگی سے لڑنے کیلئے وہ تیار بیٹھی تھی بلکہ اپنے شوہر کے کمرے کو جھاڑ جھٹک کر اِس جدوجہد میں پہلا وار بھی کر چکی تھی۔

آنو اگرچہ اوباش اور شرابی تھا لیکن ابھی بائیس سال کا جوان تھا اور اس لئے اُس کی آوارہ زندگی اُس کی مردمی میں کچھ کمی نہ پیدا کر سکی تھی۔ اُس نے اس آسانی سے بچے پیدا کروانے شروع کر دئے جیسے پرانے زمانے کی عورتیں دو گھڑے پانی کے اٹھا کر کنوئیں سے لے آتی تھیں۔ چنانچہ شادی ہونے کے تین سال کے اندر اندر چمپا تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

آنو نے شادی کے بعد اپنا رویّہ بالکل تبدیل نہیں کیا بلکہ وہی شادی سے پہلے کی عادتیں جاری رکھیں۔ مثلاً وہ ہر رات گھر آنے سے پہلے خوب شراب پیتا اور جب گھر پہونچتا تو ہمیشہ مدہوش ہوتا اور اس طرح وہ عقل و ہوش کھو دینے کے بعد چمپا کے شکایت کرنے پر اُسکو گالیاں سناتا اور بچوں کے رونے پر اُن کو مارتا اور اکثر اُن کو بچانے کی خاطر چمپا بیچ میں پڑ کر آنو کے ہاتھوں پٹا کرتی۔ مگر آنو کو اپنی بیوی اور بچوں پر ذرا ترس نہ آتا۔ اُس کے لئے چمپا محض اس لئے تھی کہ اس کو روٹی پکا کر کھلاتی اور رات کو جب شراب کی گرمی سے اُس کا خون کھولتا تو اس کی نفسانی خواہشات کو فرو کرتی۔ اور اس حرکت سے جو بچے پیدا ہوتے اُن کی پرورش کا ذمہ دار وہ نہ تھا۔ درحقیقت شراب کے نشہ نے اُسکو اس معاملہ پر غور کرنے کی فرصت ہی نہ دی تھی۔

بدقسمت چمپا نے پہلے سال تو آنو کو سمجھا کر راہِ راست پر لانیکی کوشش کی مگر جب اس کو معلوم ہو گیا کہ اُس کے شوہر پر چکنے گھڑے کی طرح کچھ اثر نہ ہو سکا تو اُس نے خود محنت مزدوری کرنی شروع کی اور اس طرح بمشکل اپنے دو بچوں کا گزارا چلاتی رہی۔ شادی ہونے کے بعد اُس نے ایک بھی نیا کپڑا نہ سلوایا تھا۔ وہی شادی میں ملی ہوئی ساڑھی اور چولیوں کو دھو دھو کر اور سی سی کر وہ اپنا تن ڈھانکتی۔ شہری زندگی اور شوہر کی موجودگی کے سکھ اب اُسے سپنوں میں بھی نظر نہ آتے تھے۔

اُس کی ازدواجی زندگی کا تیسرا سال تھا۔ حال ہی میں تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا۔ شہر کے ایک محلّے میں ایک مکان تعمیر ہو رہا تھا۔ یہ بچاری اپنے دو بچوں کو اُٹھائے اور تیسرے کو ساتھ لیکر روزانہ وہاں جاتی اور صبح سے شام تک اینٹیں ڈھویا کرتی۔ واپسی پر اپنے بازار کے گوالے مدھو سے بچوں کے لئے دودھ خریدتی ہوئی گھر واپس آجاتی۔ شوہر کے لئے کھانا تیار کرتی اور تھکان سے چور ہو کر ایک کونے میں بیہوش پڑ جاتی۔

چمپا کی قسمت میں سُکھ نام کو نہ لکھا تھا۔ جب سے تیسرا بچہ پیدا ہوا تھا، خوراک کی کمی اور محنت و مشقت کی زیادتی کی وجہ سے اُس کا دودھ سوکھ گیا تھا۔ اس لئے اپنے دو چھوٹے بچوں کے لئے وہ کام پر جاتے وقت کچھ دودھ ایک بوتل میں ڈال کر ساتھ لے جاتی اور وہاں اُن کے رونے پر جب اُن کو دودھ پلانے لگتی تو مکان بنانے والے راج مزدور اس پر پھبتیاں اُڑاتے۔ ٹھیکہ دار اس کو سستی سے کام کرنے پر فحش گالیاں دیتا۔ یہ بچاری سب کی باتیں خاموشی سے سنتی اور شام کو جب تین آنے گرہ میں باندھ کر گھر کی طرف واپس لوٹتی تو اپنی زندگی پر غور کرتے ہوتے اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکل سکتے۔

کمائے ہوئے تین آنوں سے وہ گھر کا خرچ نہ چلا سکتی تھی۔ بچوں کے لئے دودھ کی ضرورت تھی، اپنے اور شوہر کے لئے آٹا اور دال خریدنا ضروری تھا۔ ایک شام جب وہ مدھو گوالے سے دودھ لے رہی تھی تو مدھو نے للچائی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھکر کہا "چمپا تمہیں شوہر کچھ نہیں دیتا۔ مجھے تعجب ہے کہ تم گزارا کس طرح کرتی ہو"

چمپا نے جواب دیا "میری تقدیر ہی بُری ہے"

مدھو نے پھر کہا "چمپا تم جوان اور خوبصورت ہو۔ تمہارا شوہر تمہاری پروا نہیں کرتا۔ تمہارے بچوں کی پروا نہیں کرتا، پھر تم کیوں اُسکی پروا کرتی ہو؟"

چمپا کا جواب تھا "وہ میرا شوہر ہے"

مدھو نے جوش میں آکر کہا "تو پھر تمہاری اور تمہارے بچوں کی پرورش کیوں نہیں کرتا؟ تم خواہ مخواہ تکلیف اٹھا رہی ہو۔ میں تمہیں روز دودھ مفت دیدیا کرونگا اگر تم گھر جاتے وقت....."

پیشتر اسکے کہ مدھو اپنی بات پوری کرتا چمپا اپنا دودھ اُٹھا بچوں کو ساتھ لئے وہاں سے نکل گئی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ گھر جا کر خوب روئی۔ آخر جب دل ہلکا ہوا تو بچوں کو دودھ پلایا مگر وہ تین بچوں کیلئے کافی نہ تھا۔ بچاری نے کسی طرح لوریاں سنا سنا کر اُن کو بھوکے پیٹ

سُلا دیا۔ اُس رات جب آنو حسبِ معمول شراب کے نشے میں چور ہو کر گھر آیا تو اُس نے روتے ہوئے بچّوں کی حالت اُس کو سُنائی۔ اُس نے چمپا کو الٹی دھمکایا، گالیاں سُنائیں اور جب بھوکے بچّے باپ کے شور سے جاگ اُٹھے اور رونا شروع کیا تو اُس نے اُن پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ بدبخت چمپا نے بچّوں کو بچانے کیلئے پھر شوہر کی مار کھائی اور آخر جب خاوند سو گیا تو وہ بھی روتے روتے کسی وقت نیند کی آغوش میں پڑ گئی۔

دوسرے دن جب وہ کام پر گئی تو سارا دن بھوکے بچّوں کے بلکنے کی آواز اُسے ستاتی رہی۔ شام کے وقت جب مدھو گوالے کے پاس دودھ لینے گئی تو اُس نے پھر موچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنی تجویز پیش کی۔ چمپا پھر اُس کی بات پر دھیان دئے بغیر دودھ لیکر نکل آئی۔ رات کو پھر بچّوں نے بھوک کی وجہ سے چلّانا شروع کیا۔ شرابی شوہر آنو نے پھر اُن کو پیٹنے کی کوشش کی۔ چمپا نے اُن کو مار سے بچانے کی خاطر پھر آنو سے مار کھائی۔

آخر ایک شام جبکہ امیر لوگ ٹینس کھیل کر برج کھیل رہے تھے اور آنو اپنا دن کا کام ختم کر کے شراب خانے کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا تو چمپا دھنو کے گھر کے اندر کی کوٹھری میں ایک بے بستر کی چارپائی پر لیٹی آنکھیں بند کئے اپنے بلکتے بچّوں کا تصوّر جمائے دودھ حاصل کرنے کے لئے اپنی حرمت و آبرو بیچ رہی تھی....

دن اسی طرح گزرتے گئے۔ وہ ہر شام کام سے لوٹتے وقت مدھو کے پاس جاتی۔ مدھو قیمت وصول کر کے اُس کو اتنا دودھ دیدیتا جو اُس کے بچّوں کی پرورش کے لئے کافی ہوتا۔ اسی قسم کی ایک شام تھی۔ چمپا مدھو کے گھر سے بچّوں کو اُٹھائے گھر جا رہی تھی۔ بازار کے قصائی نے اپنے سامنے کے میوہ فروش سے کہا "یہی ہے چمپا، آنو کی بیوی اور مدھو کی آشنا" میوہ فروش نے جو دکان کی چھت سے لٹکتے ہوئے کیلوں کے گچھے کو ٹھیک کر رہا تھا، مسکراتے ہوئے جواب دیا "آج کل کی عورت ہی۔ بڑی گناہ گار ہے"

چمپا کے کانوں میں "بڑی گناہگار ہے" کے لفظ گرم سیسے کی طرح پڑے۔ جلدی جلدی بیجان ٹانگوں کو بمشکل حرکت دیتے ہوئے وہ گھر پہونچی اور بچّوں کو دودھ گرم کر کے پلایا اور سُلا دیا۔ رات کو آنو شراب سے بدمست آیا اور قے کرتے ہوئے اپنی چارپائی پر بیہوش ہو کر پڑ گیا۔

چمپا کے کانوں میں میوہ فروش کے وہی الفاظ گونج رہے تھے۔ "بڑی گناہگار ہے" ایک بچّے کو سینے سے چمٹاتے وہ سوچنے لگی کہ۔ "کون گناہگار ہے؟"

بھارت چند کھنّہ

ٹوئلے کی کان کے باہر

کولوں کی کثیف فضا میں کب ہے لطف ساماں میرے لئے
فطرت کا پجاری ہوں فرحتؔ، ہے محفلِ امکاں میرے لئے

یہ گوشہ عزلت، کنجِ خنک، یہ سرد ہوا، خاموش فضا
مخمور صبا، مدہوش گھٹا، ہے محفلِ رنداں میرے لئے

کیوں چھوڑ نہیں دیتے وہ مجھے، تسکینِ قلبِ پریشاں کو
کیوں در پئے استبداد ہیں خود، اربابِ گلستاں میرے لئے

اک منظرِ فطرت کافی ہے، شاعر کے سکونِ خاطر کو
کیوں دوست یہ اصرارِ پیہم، ہیں حمتِ خنداں میرے لئے

بہنے میں پہاڑی چشموں کے، پُرکیف و مسلسل نغمے ہیں
یہ سلکِ صوت و موسیقی، ہے لطف کا ساماں میرے لئے

اِن ننھی ننھی بوندوں میں، ان گھرتی کھلتی گھٹاؤں میں
ہے یاس و اُمید کا محشر سا، مستور و نمایاں میرے لئے

اس دور روکشادہ جنگل میں آباد ہے یہ چھوٹی سی جگہ
پُرکیف مناظر چاروں طرف ہیں بزمِ سلیماں میرے لئے

ہر گل ہے نمونہ چھوٹا سا، قدرت کی بڑی صنّاعی کا
ہر ٹہنی کی نازک سی لچک، ہے رشکِ گلستاں میرے لئے

ہر شاخ لچک کر جھکتی ہے، جھکنے میں نسیم اٹھلاتی ہے
ہر ایک گلِ صحرائی ہے، خود یوسفِ کنعاں میرے لئے

ہر غنچۂ نورس، ایک سبو، ہر ٹہنی اک مے خانہ ہے
ہر جنبشِ موجِ ہوا ایسا ہے، اک شورشِ رنداں میرے لئے

فرحتؔ یہ فضائیں وادی کی مخمور بھی ہیں، مدہوش بھی ہیں
بے سود ہے دعوتِ جام و سبو، اے محفلِ رنداں میرے لئے

فرحتؔ کانپوری

برج اور میری مایوسی

ساڑھے چار کا وقت ہے۔ نئے نئے ٹینس کے شوقین کلب کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ادھر خانساماں پر خفگی ہو رہی ہے کہ چاء تیار نہیں ہوئی اُدھر اُن حضرت پر جن کو قانون میرا شوہر اور میں صاحب کہتی ہوں، غصہ آ رہا ہے کہ تیار ہوتے نصف گھنٹہ ہو گیا مگر اُنکی واپسی کا پتہ نہیں۔ کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے کام زیادہ ہو گا، کبھی یہ کہ شاید موٹر کا ٹائر پھٹ گیا ہو۔ اسی سوچ میں ایک ایک منٹ گھنٹوں کی طرح گزرتا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں جیسے گزرتی ہیں اُس سے ہر ایک واقف ہے۔ خدا خدا کر کے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ چلو جان میں جان آئی کہ کم از کم ایک سٹ ٹینس کا تو ملجائیگا۔ صاحب بہادر آتے ہیں کبھی تو خوش مزاج اور کبھی ایسے کہ اگر ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو ناک ہی اُڑا دیں۔ اکثر جب تشریف لاتے ہیں تو مجھ سے خطاب کرنے سے پہلے رَیکس (جو ہم دونوں کا اکلوتا کتّے کا پِلّا ہے) سے پندرہ منٹ کھیلنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اِدھر میں ریکٹ ہاتھ میں لئے وقت گزرتے دیکھکر غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتی ہوں اور ڈرائنگ روم میں فرضی ٹینس کھیلنا شروع کر دیتی ہوں جس سے کمرے کی سجاوٹ کے لئے رکھی ہوئی چند چیزوں کی اصلی حالت بگڑ جاتی ہے۔ آخر کیا کروں مجھے ٹینس کی بیماری ہے، اور اس بیماری کے علاج کے لئے صاحب کی مدد کی ضرورت رہتی ہے کیونکہ رَیکس کی طرح موٹر بھی گھر میں ایک ہے اور کلب ہمارے گھر سے پانچ میل کے فاصلے پر ہے۔ بعض اوقات سوچتی ہوں کہ گھر سے پیدل چلدوں مگر پھر یہ خیال آتا ہے کہ اگر کسی طرح پانچ میل کی مسافت طے بھی کر لوں گی تو ٹینس کھیلنے سے پہلے بیہوش ہو کر گر پڑوں گی۔ اسی کا نام مجبوری ہے۔ غرضکہ کتّے کا دل بہلانے کے بعد صاحب بہادر نہاتے ہیں اور کپڑے وغیرہ پہن کر ٹماٹر سوپ یا لسی یا دونوں کے ایک دو گلاس حلق سے نیچے اتارتے ہیں۔ اور جب آخرکار وہ کلب جانے اور مجھے ساتھ لے جانے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں تو وقت ہمیشہ ساڑھے چھ کا ہوتا ہے۔ بھلا آپ ہی خیال فرمائیے کہ میرے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔

خیر کچھ اُمید لئے ہوئے کہ شاید تھوڑا بہت کھیلنے کو مل جائیگا موٹر میں دھڑکتے ہوئے دل سے بیٹھ جاتی ہوں۔ کلب پہونچکر وہی ہمیشہ والا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یعنی بہت سی ٹینس کی بیمار بیویاں اور شوہر (جو ہمیشہ مجھ سے پہلے پہونچ جاتے ہیں) مینڈکوں کی طرح کھیلنے کے انتظار اور خوشی میں ٹرّا رہے ہوتے ہیں کیونکہ میں ابھی اس کھیل میں اناڑی کی حیثیت رکھتی ہوں اس لئے دیر سے پہونچنے پر رہا سہا کھیلنے کا موقع بھی نہیں رہتا۔ اچھے کھیلنے والے مجھ سے کھیلنے سے آنکھ چراتے ہیں۔ یوں تو اخلاقاً یہ کہا جاتا ہے کہ "میڈم آپ کھیلئے۔ اگر یونہی بیٹھی رہیں گی تو کھیلنا کبھی نہیں آسکیگا۔" مگر میں اُن کے دل کا حال جانتی ہوں اور اُنکا کھیل خراب نہیں کرتی۔ بس شکریہ کہکر اَوروں کو کھیلتے دیکھا کرتی ہوں۔ صاحب ٹینس کے شوقین نہیں۔ ہوں بھی کس طرح جب وہ صبح اُٹھکر ہر روز مگدروں اور سپرنگ سے اتنی ورزش کر لیتے ہیں کہ باقی ساڑھے تیئیس گھنٹے آرام کا متلاشی رہنا پڑتا ہے۔

اندھیرا ہوتے ہی "چھوکرا برج کی میز جماؤ" کی صدا بلند ہوتی اور ساتھ ہی دوست احباب اصرار کرتے ہیں کہ "آؤ بھئی برج کھیلیں" صاحب کی مُراد بر آتی ہے۔ مگر چونکہ میں ساتھ رہتی ہوں اسلئے براہِ راست کھیلنا شروع نہیں کرتے بلکہ دوستوں سے آنکھوں آنکھوں میں مدد کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ اِن کو مجبور کرتے ہیں۔ یہ میری طرف دیکھتے ہیں۔ اِن کے دوست مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں کہ "میڈم براہِ خدا ان کو اجازت دے دیجئے۔" میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی! اپنی عزّت قائم رکھنے کے لئے کہہ دیتی ہوں کہ "ضرور کھیلئے۔" اگر یہ نہ کہوں تو بھی وہ برج کھیل کر رہیں گے، اسی لئے تو کلب جاتے ہیں۔ صاحب یہ کہکر کہ "اچھا ایک بازی کھیل ہی لیتا ہوں" کرسی کھینچکر بیٹھ جاتے ہیں۔ کلب کی سب عورتیں ایک ایک کر کے چلی جاتی ہیں۔ صرف برج کے مریض رہ جاتے ہیں۔ کھیل شروع ہوتا ہے اور سوائے "ون نو ٹرمپ"، "ٹو سپیڈز"، "فائیو ڈائمنڈز"، "ڈبل"، "ری ڈبل" کے کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ ہر ایک ہاتھ ختم ہونے کے بعد گلے اور نکتہ چینی شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ کھلاڑی بحث کرتے کرتے کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک طوفانِ بدتمیزی مچ جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اب لڑے۔ آخر دوسرا ہاتھ بانٹا جاتا ہے۔ کوئی بزرگ کہتا ہے کہ "گزری ہوئی باتوں کی یاد مت کرو آئندہ سے غلطی نہ کرو

اس پر اُبھرے ہوتے جوش فرو ہوجاتے ہیں، کسے ہوئے مُکّے ڈھیلے ہوجاتے ہیں۔ پتے اُٹھا کر دوسرا ہاتھ شروع ہوتا ہے جس کے بعد پھر وہی باتوں کی جنگ شروع ہوتی ہے اور کچھ دیر جاری رہ کر پھر کھیل شروع ہوجاتا ہے۔

ایک "ربر" ختم ہوتا ہے۔ دوسرا شروع ہوتا ہے۔ پھر تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا اور اسی طرح سات، آٹھ۔ لو اور دس بج جاتے ہیں۔ اس دوران میں جو میری حالت ہوتی ہے اُسے صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اگر غلطی سے کبھی صاحب سے پوچھ بیٹھوں "گھر کب چلو گے؟ بھوک لگ رہی ہے" تو جواب ملتا ہے "ہاں چار ہارٹس بنانے ہیں۔ بڑا دلچسپ ہاتھ بٹا ہے۔ دیکھو کس طرح بناتا ہوں"

یہ بے تکی سُن کر مجھے ہنسی آجاتی ہے اور رونا بھی کہ صاحب کو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا۔ دیوانے ہوگئے ہیں جو میری سیدھی سادی بات نہیں سمجھ سکتے۔

آخر ساڑھے دس بجے جب برج کا دور ختم ہوتا ہے تو میری بُھوک ٹینس کھیلنے کی اُمید کی طرح مرچکی ہوتی ہے۔ سب لوگ کرسیوں پر سے اُٹھتے ہیں۔ ایک صاحب حساب کرتے ہیں۔ صاحب بھی اُٹھتے ہیں۔ حساب کرنے والے صاحب اُن کو بتاتے ہیں کہ وہ صرف پونے چار روپے ہارے ہیں۔ صاحب میرے بیگ کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ پھر بہت ہی محبت سے کہتے ہیں "معاف کیجئے دیر ہوگئی، آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی"... پھر گلا صاف کرکے کہتے ہیں۔ "آج قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ خواہ مخواہ تین روپے بارہ آنے ہار گیا۔ نہ ہی کھیلتا تو اچھا تھا۔ ہاں آپ کے پاس ریزگاری ہوگی۔ عنایت فرمایئے تاکہ برج کا قرضہ چکا دوں۔ پھر جب جیتونگا تو لوٹا دونگا"

مجھے ہاری ہوئی رقم دینی ہی پڑتی ہے۔ مگر یہ اُمید کہ صاحب جیت کر واپس کر دینگے کبھی پوری نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمارے صاحب ہارنے کے ماہر ہیں۔ جب سے اُن کو برج کھیلنے کا چسکہ لگا ہے میں نے ایک بھی ساڑھی نہیں خریدی۔ خریدوں بھی کیسے جو تنخواہ آتی ہے اُس میں سے کچھ مکان کے کرائے اور کچھ گھر چلانے کے کام آتی ہے۔ باقی جو بچتا ہے وہ ریکٹ کے لئے پٹے اور لبکٹ خریدنے اور پانچ روپے روز برج کی ہار کا حساب چُکانے میں صرف ہوجاتا ہے۔

جب گھر پہونچتے ہیں تو کپڑے بدلتے ہوئے صاحب کہتے ہیں "کیا کروں دوست واحباب کو بھی خوش کرنا پڑتا ہے... یہ برج کا کھیل بھی عجب ہے۔ ایک وقت اگر بیٹھ جاؤ تو اُٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی

مگر باوجود اس کے آپ کی تکلیف کا خیال کرکے اُٹھنے ہی والا تھا مگر چونکہ ہار رہا تھا اس لئے جیتنے کی اُمید میں اتنی دیر بیٹھا رہا... آج پتے بالکل نہیں آتے اور میرا پاٹنر بھی عجب چغد تھا۔ کمبخت ہمیشہ ہارا کرتا ہے۔ پھر بھی نہ کھیلنا ترک کرتا ہے نہ کھیلنے میں کسی قسم کی ترقی کرتا ہے... وغیرہ وغیرہ" اِن سب باتوں کا جواب میرے پاس سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ہوتا"

کھانا زہر مار کرکے ہم اپنے اپنے پلنگ پر پڑجاتے ہیں۔ صاحب تو لیٹتے ہی سوجاتے ہیں اور مجھے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مجھے اپنا ٹینس کا ریکٹ یاد آتا ہے جس کو میں نے کس شوق سے خریدا تھا۔ اس کی تانت کا وارنش بھی ابھی تک نہیں اُترسکا کاش ہمارا گھر کلب کے پاس ہوتا.....

"سکس کلبز۔ آپنے ڈبل کیا تو میں نے ری ڈبل کی۔ جیت لی بازی.... مار لیا میدان۔ چار سو اسّی نیچے۔ پانچ سو اوپر سات سو ربر کے.... اکیس پوئنٹس کا ربر ہے۔ کیوں پاٹنر کیسا ری ڈبل کیا......"

صاحب بڑبڑا رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نیند میں برج کھیل رہے ہیں۔ جو اصل زندگی میں نہیں جیت سکتے تو خواب میں اپنی آرزو پوری کررہے ہیں۔ یہ کانٹرک برج یعنی معاہدے کی برج کے مریض کا حال ہے۔ کاش کہ اُن کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ نکاح کرکے جو معاہدہ اُنہوں نے کیا ہے اُسکے فرائض کیا ہیں!

بیگم وہاب الدین احمد

تحلیلِ نفسی

تعارف: گزشتہ دو قسطوں میں عام فہم نظریہ، تاریخی ارتقا، پس منظر، اور جملہ مروجہ دبستانوں پر بالتفصیل بحث ہو چکی ہے۔ اب انفرادی مسئلہ جات پر روشنی ڈالنا در پیش ہے، اس ضمن میں مندرجہ ذیل موضوع ملتہاتے نظر ٹھہرتے ہیں،۔
جنسی مسئلہ جات، خواب، مذاق و مزاح، قلم اور زبان کی لغزشیں اور دو نفسیاتی حالتیں جنہیں حکما ــــ احساس سفل و علوی ــــ ـــــــ Superiority and Inferiority Complex کا نام دیتے ہیں ــــ
پیش نظر قسط میں قلم و زبان کی لغزشوں اور آئے دن کی دیگر غلطیوں پر بحث تمحیص کی گئی ہے۔ ـــــــ

بےخودی بے سبب نہیں غالبؔ　　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اِس مقالے میں ہم ٹھوس منطقی بحث اور خشک تاریخی چھان بین سے حتی الوسع کنارہ کشی کرتے ہوئے اپنا قدم تحقیق و تفتیش کے تجرباتی میدان میں رکھینگے۔ آج کے اِن دلچسپ تجربات و مشاہدات کیلئے ایک ایسی غیر اہم چیز چُنی جائے گی جس سے ہر خاص و عام واقف ہے، جسے نفسی بیماریوں سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ اور جس میں سوسائٹی کا ہر فرد و بشر مُبتلا ہے۔ ہماری مُراد اِن لغزشوں سے ہے جو تمام اشخاص سے سرزد ہوتی ہیں۔ یعنی ایک تو زبان کی فروگزاشتیں، قلم کی لغزشیں، غلط پڑھنا، غلط سننا، (خیال رہے کہ یہ فروگزاشتیں اور لغزشیں کسی عضوی خامی یا بیماری کا اثر نہ ہوں) ــ دوسری قسم کی غلطیاں عارضی نسیان کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً کسی واقف شخص کا نام اِس طرح بھول جانا کہ وہی نام زبان پر پھرے لیکن یاد نہ آئے؛ اِن فروگذاشتوں کی تیسری قسم کسی چیز کو کہیں رکھکر بھول جانا ہے۔ ان متعین اقسام کے علاوہ اِن لغزشوں کے کئی اور نمونے بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک مخصوص وقت کے لئے کسی بات کو سچ مان لینا حالانکہ اس سے پہلے یعنی عہد ماضی میں اسی امر کا غلط ہونا معلوم تھا۔ اور اس کے بعد یعنی عہد مستقبل میں اِس بات کو جھوٹ سمجھا جائے۔ خیال رہے کہ اس قسم کی غلطیاں عارضی ہوتی ہیں، ان سب لغزشوں کو ایک ہی سلسلہ میں پرونے کے لئے اور ان کا اندرونی تطابق نمایاں کرنے کے لئے اس قسم کی تمام غلطیوں کو جرمن زبان میں ایسے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے جن کا آغاز لفظ (Ver-) سے ہو۔ انگریزی میں اس مطلب کے لئے (mis-) کا استعمال روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ ترکیب ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ آپ اِسے اُردو زبان کی تنگ دامانی کا کرشمہ کہہ لیں کہ اس زبان میں اس قسم کی غلطیوں کے لئے ایسے مترادف اور متوازی الفاظ جن میں کسی قسم کی تجنیس کا پہلو نکلے سرے سے پیدا ہی نہیں ــــ بہرحال آج ہم اِنہی لغزشوں کی چھان بین کے لئے تحلیل نفسی کا حربہ بروئے کار لائیں گے ــ

باقاعدہ مطالعہ و مشاہدہ شروع کرتے سے پہلے آپ یہ کہیں گے کہ آخر ان معمولی فروگذاشتوں کی اتنی اہمیت ہی کہاں ہے کہ دُنیا، روح، نفس اور دماغ کے دیگر اہم ترین مسائل پر وقت صرف کرنے کی بجائے ہم اپنے قیمتی لمحات یہ دریافت کرنے میں گزار دیں کہ فلاں مقرر نے اپنی تقریر میں فلاں لفظ غلط کیوں استعمال کیا یا فلاں شخص اپنی کنجیاں کہیں رکھکر کیوں بھول گیا؟ اگر تحلیل نفسی کو بیشتر وقت اِن فروعی اور غیر اہم امور پر ہی صرف کرنا ہے تو ایسے فن کو ہمارا دُور سے سلام ہے۔ فرائڈ اِس اعتراض کے جواب میں رقمطراز ہے،" یہ سچ ہے کہ تحلیل نفسی کبھی غیر اہم اُمور سے کنارہ کشی نہ کر سکی۔ بلکہ حقیقت تو یوں ہے کہ تحلیل نفسی کی امتحانی نلکیوں میں عموماً وہ اجزا تحلیل کئے جاتے ہیں جو مادی دُنیا کے دیگر علوم و فنون کے دارالتجارب میں غیر اہم اور معمولی قرار پاتے ہیں۔ لیکن یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ اہم اشیا عام نہیں ہو سکتیں؟ مثال کے طور پر آپ اس امر کو لیں کہ نوجوان عاشق کو یہ کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا سنگدل محبوب اب مہربانی پر آمادہ ہو چلا ہے؟ کیا محبوب کوئی تحریری اقرارنامہ بحق عاشق محفوظ کر دا دیتا ہے؟ یا لطف و کرم کے جوش میں از خود اپنی باہیں عاشق کے گلے میں ڈال دیتا ہے؟ کیا عشاق پر محبوب کی آمادگی تلطف ظاہر کرنے کے لئے ایک پُراں نظر، ایک گہرا سانس، ایک غمزۂ غماز ہی کافی سے زیادہ نہیں؟ دیگر مثال کے لئے آپ اپنے آپ کو ایک ایسا جاسوس سمجھ لیں جو کسی روپوش قاتل کے سراغ میں سرگرداں ہے۔ کیا آپ یہ اُمید رکھیں گے کہ قاتل جاتے وقت اپنا فوٹو مع ایڈریس آپ کی یادداشت کیلئے مقام قتل پر چھوڑ جائیگا؟۔ اور کیا آپ صرف چند

غیر اہم نشانیوں سے قاتل کا کھوج نکالنے کی سعی نہ فرمائیں گے؟۔

اہمیت اور عمومیت کی اس بحث کے بعد ایک نیا روڑا تحلیل نفسی کی راہ میں اٹکتا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی بعض لوگ کہیں گے کہ کیا تحلیل نفسی کے اصولوں سے علیحدہ رہ کر ان فروگزاشتوں کی تشریح نہیں ہوسکتی؟۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ یہ غلطیاں محض عضوی خامی کا نتیجہ ہوں یا اُن کی تہ میں خفیف دماغی بیماریاں پنہاں ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک عام آدمی میں زبان و قلم کی لغزشیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب یا تو وہ بہت تھکا ہوا ہو یا بیمار ہو یا جذباتی جوش میں ہو۔ یا اس کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو رہی ہو۔ یہ تو عام آدمی بھی جانتے ہیں کہ دردِ سر یا جسمانی تھکاوٹ کی حالت میں عارضی نسیان کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض ممالک میں معروف اشخاص کے نام بھول جانا دردِ سر میں مبتلا ہونے کی پہلی نشانی سمجھا جاتا ہے؟ جذباتی جوش میں آکر الفاظ کا ٹھیک ادا نہ ہوسکنا بھی ایک مشہور بات ہے۔ ایشیائی حکما و شعرا نے جذباتی جوش کے بہت نئے نئے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ اور اس ضمن میں عاشق کی طرف سے حیرت، حسرت، وحشت اور محبوب کی طرف سے حیا و شرم، انفعال و اجتناب کے نقشے کھینچے ہیں[۱]۔ انحراف توجہ کے سبب لغزشیں کھانے کی صدہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً لاہور کے مشہور مزاح نگار کی بابت مشہور ہے کہ ایک دن آپ شام کو دفتر سے ذرا دیر میں گھر واپس آئے۔ اور خاموش اوپر کی منزل پر پہونچے۔ وہاں ایک کمرے میں آپ نے اپنی چھتری کو ایک لحاف میں لپیٹ کر بڑے آرام سے چارپائی پر لٹا دیا۔ اور آپ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کسی سوچ میں کھڑے ہوگئے۔ وہ تو بھلا ہوا ایک دوست کا کہ اُن کی تلاش میں اوپر آ پہونچا ورنہ وہ حضرت تو شاید تمام رات وہیں کھڑے کھڑے گزار دیتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آپ اپنی نئی تصنیف کا ڈھانچہ اور پلاٹ سوچ رہے تھے!۔

اِن جملہ مثالوں سے بادی النظر میں تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان لغزشوں کی چھان بین تحلیل نفسی کی کسی خاص توجیہ کی محتاج نہیں۔ لیکن کیا یہ لازم نہیں ٹھہرتا کہ تحلیل نفسی کے دامن کو چھوڑ دینے سے پہلے ہم ایک نظرِ تعمق ان مذکورہ بالا دلائل اور اسباب پر دوڑائیں؟ —— سب سے پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ جن اُمور کو قلم و زبان کی لغزشوں کا سبب قرار دیا جاتا ہے وہ تمام کے تمام ایک دوسرے کے ہم جنس نظر نہیں آتے۔ پہلی قسم خفیف عضوی بیماریوں اور دورانِ خون کے جملہ نقائص کی ہے۔ ان لغزشوں کی عضویاتی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔ دوسری قسم میں جوش، ہیجان، تھکاوٹ اور فقدانِ توجہ شامل ہیں۔ یہ اسباب پہلی قسم سے مختلف ہیں۔ انہیں ہم "عضویاتی نفسی" یا —— Psycho-Physiological اسباب کا نام دے سکتے ہیں۔ اور ان پر آسانی سے ایک توجیہ تراشی جاسکتی ہے۔ یعنی اوّل تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان جملہ لغزشوں کا بنیادی سبب توجہ کی کمی ہے اور بعد میں یہ ثابت کر دکھایا جاسکتا ہے کہ تھکاوٹ، ہیجان وغیرہ کی حالت میں توجہ میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ دورانِ خون کے نقائص اور دیگر عضوی خامیوں سے بھی توجہ میں تغیر و تبدل واقع ہو جاتا ہے اور ان وجوہات کی بنا پر پیشِ نظر فعل نادرست طور پر سرانجام پاتا ہے۔ یعنی لغزشوں کی تہ میں ہمیشہ فقدانِ توجہ کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ خواہ یہ نفسی اُمور سے پیدا ہو یا عضویاتی اسباب سے پھوٹ نکلے —— یہاں تک تو راستہ بالکل صاف ہے۔ لیکن اِس توجیہ کی روشنی میں مشاہداتی اُمور پر روشنی ڈالنا اس توجیہ کے لئے ازحد مضر ثابت ہوتا ہے۔ ہمیں پہلی ہی نظر میں پتہ ملتا ہے کہ نہ تو اس توجیہ کے سہارے جملہ مشاہدات کی تشریح ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس توجیہ سے جملہ لغزشیں منطقی طور پر اخذ کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت ہے کہ بسا اوقات یہ لغزشیں ایسے افراد سے سرزد ہوتی ہیں جو نہ تو تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور نہ کسی جوش و جذبہ کے ماتحت ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں[۲]۔ اور پھر اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ زیادہ تر حالات میں توجہ کی کمی یا زیادتی پیشِ نظر فعل پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے۔ اور بعض اُمور بغیر کسی خاص توجہ کے سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً دفتر جاتے وقت آپ ہمیشہ ٹھیک راستہ اختیار کریں گے۔ اور بغیر کسی خاص توجہ کے سیدھے دفتر پہونچ جائیں گے۔ دیگر مثال کے لئے آپ کسی باکمال ٹائپ کرنے والے کی حرکات ملاحظہ فرمائیں۔ اور خود دیکھ لیں کہ وہ کس قدر عدم توجہی سے اپنا کام سرانجام دیتا ہے۔ اور پھر یہ کہ وہ بہت کم اغلاط کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ بعض اُمور ایسے بھی ہیں جو صرف اسی حالت میں ٹھیک

---

[۱] چند نمونہ جات ملاحظہ ہوں:۔

جوش میں کہتا تھا کچھ مُنہ سے نکل جاتا تھا کچھ — کیا مجھے خفت ہوئی ہے نامہ بر کے سامنے

کہتے ہیں تجھکو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں (مومن)

شرم سے نام تک نہیں لیتے — اب ہمارا خطاب ہے "کوئی"! (داغ)

[۲] یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ ان لغزشوں کا سبب یہ کہدیں کہ وہ ایسی لغزشوں کے ہنگام غیر شعوری طور پر جوش یا تھکاوٹ میں مبتلا تھے!

طور پر سرانجام دئے جاسکتے ہیں جب ہم اُن کی طرف بہت کم متوجہ ہوں۔ اور طُرفہ یہ کہ جوں جوں ہم اپنی خاص توجہ ان پر مبذول کرتے جائیں گے توں توں ان میں غلطیاں بڑھتی جائیں گی۔ آپ کہیں گے کہ توجہ کی زیادتی اور کثرت کے باعث ہیجان پیدا ہو جاتا ہے لیکن شاید آپ اس کا کچھ جواب نہ دے سکیں گے کہ یہ جوش توجہ کو کم کرنے کی بجائے اور زیادہ کیوں نہیں کرتا؟ لیعنی زیرِ مطالعہ توجیہہ کے سہارے آپ کبھی بھی نہ بتا سکیں گے کہ ایک مقرر کی زبان سے کیوں اور کس طرح دورانِ تقریر میں غلطی سے اسکے خیالات کے بالکل برعکس لفاظ نکل جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ چند دیگر اُمور بھی پیدا ہیں۔ جو اس توجیہہ کی مدد سے کسی طرح بھی سمجھے نہیں جاسکتے۔ مثلاً آپ عارضی طور پر کسی دوست کا نام بھول گئے ہیں۔ آپ اس نام کو یاد کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اپنی تمامتر توجہ اور دماغی قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ نام آپ کی زبان کے سِرے پر آکر پھرتا ہے لیکن آپ اسے ادا نہیں کر سکتے۔ اور پھر اگر اس وقت کوئی اور شخص وہ نام لے لیتا ہے تو آپ سو فی صدی یقین کے ساتھ اس نام کو پہچان لیتے ہیں۔ ایک اور مثال لیجئے۔ بعض حالات میں جب ہم کسی غلطی کو درست کرنے لگتے ہیں تو اور کسی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور جوں جوں ہم اُس کی دُرستی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں توں توں غلطیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ مثلاً آپ کو کسی سے ملنا ہے۔ اور آپ کو اس سے ملنا یاد نہیں رہتا۔ بار دیگر آپ تہیّہ کر لیتے ہیں کہ اس دفعہ ضرور عمل کرونگا۔ اور ایسے آپ کو اپنا عہد تو یاد رہتا ہے لیکن آپ کو مقررہ دن نہیں یاد رہتا۔ یا آپ کسی فراموش شدہ نام کو یاد کرنے کی کوشش میں ہیں اور اس کوشش میں آپ ایک دوسرا نام فراموش کر بیٹھتے ہیں حالانکہ اس دوسرے نام سے پہلا نام یاد کرنے میں کافی مدد ملتی تھی۔ یا آپ شاعر ہیں۔ آپ کو ایک مصرع سوجھتا ہے آپ اس پر دوسرا مصرع لگا کر شعر مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ دماغ پر بہت زور ڈال کر مصرع تیار ہوتا ہے لیکن تب پتہ چلتا ہے۔ کہ پہلا مصرع ہی ذہن سے اتر گیا ہے۔ اب پہلے مصرع کی ڈھونڈھی پڑتی ہے۔ اور اس دوران میں دوسرا مصرع بھی فقرّو ہو جاتا ہے۔ چھاپہ خانہ کے کمپوزیٹر اس قسم کی غلطیاں عام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک اخبار میں یہ فقرہ نظر پڑا۔ "مدعو حضرات میں مسخرہ شاہزادہ (Clown - Prince) بھی موجود تھا!" دوسرے دن پرچے میں معذرت کے ساتھ اس فقرے کی دُرستی اس طرح کی گئی تھی۔ "مدعو حضرات میں کوا شاہزادہ (Crow - Prince) بھی موجود تھا!" یہ سب ولی عہد شاہزادہ (Crown - Prince) کی مسخ شدہ صورتیں تھیں!۔

شاید آپ اس امر سے واقف نہ ہوں کہ آپ اثر آفرینی — suggestion کے زیر اثر دیدہ و دانستہ دوسروں سے یا اپنے آپ سے زبان کی غلطیاں سرزد کرا سکتے ہیں۔ اس دلیل کو پُختہ تر بنانے کیلئے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔

"خاتونِ آرلینز" (Maid of Orleans) کا ڈرامہ اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ ایک نوآموز ایکٹر کا پارٹ یہ تھا کہ وہ بادشاہ کے دربار میں جا کر بآوازِ بلند یہ کہدے کہ "جناب کانسٹبل صاحب اپنی تلوار (sword) واپس بھیجتے ہیں"۔ ریہرسل کے دوران ایک چیف ایکٹر ازراہِ مذاق اُس سے یہ فقرہ کہلواتا رہا۔ "کامفورٹیبل[1] — comfortable اپنا گھوڑا (steed) واپس بھیجتے ہیں"۔ اگرچہ اس نئے ایکٹر کو معلوم تھا کہ یہ مذاق ہے اور اصل ڈرامہ کے وقت اس کو صحیح فقرہ بولنا چاہیئے۔ پھر بھی ڈرامہ میں اس کے مُنہ سے بلیاختہ یہی مذاقیہ فقرہ نکل گیا۔

مندرجہ بالا نکات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ یہ توجیہہ کہ "غلطیاں فقدانِ توجہ کا لازمی نتیجہ ہیں" کچھ مکمل اور تسلی بخش معلوم نہیں ہوتی۔ یہ نہیں کہ یہ توجیہہ سرے سے ہی غلط ہے عین ممکن ہے کہ اس توجیہہ میں بہت کچھ صداقت پنہاں ہو۔ لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ اس توجیہہ میں سے کوئی ایک آدھ ایسی کڑی مفقود ہے جس کے بغیر یہ توجیہہ بیکار اور لایعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اور مزید یہ کہ بہت سی غلطیاں ایک اور نظریہ کے ماتحت بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

نمونہ کے لئے پہلے زبان کی لغزشوں کا مطالعہ شروع کیا جاتا ہے۔ مگر مطالعہ شروع کرنے سے پہلے یہ امر ذہن نشین ہو جانا چاہیئے کہ ابتک ہم اس مسئلہ پر صرف سوچ بچار کرتے رہے ہیں کہ کب اور کن حالات کے ماتحت زبان سے غلط الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اور ہم نے اپنی توجہ کو اس طرف مبذول نہیں کیا کہ فلاں حالات میں کیوں ایک مخصوص غلط لفظ زبان سے ادا ہو جاتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ جب تک اس سوال کا تسلی بخش جواب

---

[1] جرمن کرخنداروں کی زبان میں ایک گھوڑے والی بگھی کو کہتے ہیں۔

نہ مل جائے۔ تب تک ہم اِن غلطیوں کی ماہیت سے بخوبی روشناس نہیں ہو سکتے۔ بلکہ تب تک یہ غلطیاں ہماری نگاہ میں ایک نفسیاتی حادثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ایک فرد ایک لفظ کے انتخاب میں غلطی کرتا ہے تو وہ غلط لفظ کے لئے ہزارہا الفاظ میں سے کوئی ایک لفظ چن سکتا ہے یا اصلی لفظ کو ہزار ہا طریق سے مسخ کر سکتا ہے۔ اب یہ سوچنا ہو کہ یہ مخصوص غلط لفظ کسی اندرونی طاقت کے ماتحت چنا جاتا ہے یا یہ انتخاب محض ایک حادثہ ہے۔ جسے جذبۂ شعور اور قوتِ تعقل و ادراک کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں۔

۱۸۹۵ء میں ایک ماہر عضویات اور ایک ماہر مسمریزم[۵] نے اس مسئلہ کو اسی نظریہ کے ماتحت حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے زبان کی غلطیوں کے بہت سے نمونے فراہم کئے۔ اور ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا۔ اگرچہ ان کی یہ تقسیم کچھ زیادہ بصیرت افروز نہ تھی۔ پھر بھی اس پر چند ایک موجودہ توجیہات کی بنیادیں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ ان حضرات کی ایک ادنیٰ مثال ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں: "الفاظ کے مسخ شدہ ہونے کی صورتیں ہیں۔ منجملہ ان کے ایک صورت یہ بھی ہے کہ الفاظ اپنی مقررہ جگہ تبدیل کر لیں۔ مثلاً "شریف حسین بخاری" کی بجائے "بخار حسین شریفی"۔" اس تقسیم کے بعد ان حضرات نے جو حل پیش کیا وہ بقول فرائڈ بہت حد تک غیر مکمل ہے۔ ان ہر دو حضرات کا خیال تھا کہ "الفاظ کی آوازوں اور ارکان کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اور بلند درجے کی آوازیں نچلے درجے کی آوازوں کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ یا اُن پر چھا جاتی ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ ان کا یہ نظریہ صرف چند ایک قسم کی لغزشوں کی تشریح کے کام آسکتا ہے۔ مثلاً وہ غلطیاں جن میں شین قاف کی تکرار بدرجہ تنافر موجود ہو۔ یا جن میں مستقبل بینی — [illegible] کا اثر نمایاں ہو۔ دیگر اقسام کی فروگزاشتیں عموماً الفاظ کے صوتیاتی اثرات کی مرہونِ منت نہیں ہوتیں۔ بلکہ زیادہ تر واقعات میں ہم صحیح لفظ کی بجائے عموماً ایک ایسا لفظ استعمال کر بیٹھتے ہیں جو حقیقی لفظ سے بہت حد تک مشابہ ہوتا ہے۔

بایں ہمہ زبان کی لغزشوں کی سب سے عام اور عیاں قسم وہ ہے جس میں ہم صحیح لفظ کے عین برخلاف لفظ کہہ دیتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی فروگزاشتیں ظاہرا طور پر مشابہت اور آوازوں کے اثرات سے غیر متاثر ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض حکما کے نزدیک متضاد الفاظ میں ایک ایسا تصوری تعلق پنہاں ہوتا ہے جو ان الفاظ کو نفساتی طور پر ایک ہی رنگ میں سمو دیتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثالیں بکثرت پیدا ہیں۔ جس طرح متضاد الفاظ تصوری تعلق کی بنا پر غلطیوں کی وجہ بن نکلتے ہیں اس طرح دیگر اقسام کے تصوری تعلق بھی بسا اوقات ایسے ہی نتائج پیدا کر دکھاتے ہیں۔ اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان غلطیوں کی تہ میں آوازوں کے اثرات اور لفظوں کی مشابہت کے علاوہ لفظوں کے تصوری تعلقات بھی پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تمام تر اسباب کی فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی۔

ہم ابھی تک یہ سوچ بچار کر رہے تھے کہ یہ فروگزاشتیں کن حالات کے ماتحت سرزد ہوتی ہیں اور کن اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ہم نے ابھی تک اِن غلطیوں کے نتائج پر غور نہیں کیا۔ اگر ہم اِن غلطیوں پر نگاہِ غور دوڑائیں گے تو ہم جلد اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ یہ غلط الفاظ بھی بہت پُرمعنی ہوتے ہیں۔ یعنی ہم باوثوق طور پر کہہ سکتے ہیں کہ غلطیاں کرنا ایک مکمل اور دماغی فطری فعل ہے۔ اور پھر مزید یہ کہ یہ فعل کسی مقصد کو لئے ہوتا ہے اور اس کے نتائج مکمل اور بامعنی ہوتے ہیں۔ آپ حیران ہونگے کہ ابھی تک تو زبان کی لغزشیں ایک قسم کی فروگزاشتیں تھیں اور اب یہ فطری فعل بنی جا رہی ہیں۔؟

سُنیئے۔ اکثر حالات میں غلطی کے معنی عیاں اور بیاں ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ ایک پارلیمنٹ کے صدر نے اپنے افتتاحیہ خطبہ میں ارشاد فرمایا "معزز حاضرین — میں دیکھتا ہوں کہ پارلیمنٹ کے جملہ آداب و قواعد جلسہ کو شروع کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس لئے میں اِس اجلاس کو برخاست کرتا ہوں!" — بقول فرائڈ صدر کے اس غلط لفظ کے استعمال سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے دل میں اس اجلاس کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اس اجلاس سے کوئی بہتر نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا۔ اس لئے وہ مناسب سمجھتا ہے کہ ایسے اجلاس پر وقت ضائع نہ کیا جائے۔

دیگر مثال:- ایک خاتون جو اپنے شوہر پر بہت رُعب رکھتی تھیں فرماتی ہیں۔ "میرے شوہر نے حکیم صاحب سے استفسار فرمایا کہ کون سی غذا اُن کے لئے بہتر ثابت ہوگی۔ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ اُن کے لئے کوئی خاص پرہیزی غذا کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر وہ چیز کھا پی سکتے ہیں" (خاتون) "انہیں بتاؤں!"

---

[۵] Meringer and Mayer

اب اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ نہ صرف چند ایک لغزشیں بلکہ ہماری جملہ غلطیاں اور تمامتر فروگذاشتیں اپنے دامن میں گوناگوں مقاصد و معانی لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ تو پھر ہمیں باقی تمام اثرات و وجوہات سے قطع نظر کرتے ہوئے عنانِ توجہ کو یک قلم اِن معانی کی چھان بین کی طرف موڑنا پڑے گا۔ اس وقت ہمیں تمام عضویاتی اور "نفسی۔ عضویاتی" وجوہات کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔ اور اپنی تمام تر توجہ اِن غلطیوں کے معانی و مقاصد کی طرف مبذول کرنا ہوگی۔

نامناسب نہ ہوگا اگر آپ ہمارے ہمراہ ان غلطیوں پر ایک نظر مذکورۂ بالا نیت سے دوڑانے سے پہلے مندرجہ ذیل اُمور پر ایک نگاہِ غور ڈالیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شاعر لوگ زبان کی غلطیوں یا دیگر فروگزاشتوں کے استعمال سے مضامین کو چمکاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ان غلطیوں کے کچھ نہ کچھ معنی ضرور ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ یہ غلطیاں ارادتاً پیدا کرتے ہیں۔ اگر یہ غلطیاں اتفاقاً سرزد ہوتیں تو ضرور بالضرور طبع ثانی میں صاف ہو جاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر لوگ ان غلطیوں سے اپنے کرداروں کے افعال و اخلاق پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ کبھی تو کسی مخصوص کردار کی بد دماغی کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ کبھی کسی کردار کو تھکا ماندہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی کسی اور وجہ سے یہ حربہ بروئے کار لایا جاتا ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو شلر (Schiller ـــــ) کا لکھا ہوا "والن شٹین" (ـــ Wallenstien) (Piccolomini, Act I, Scene 5. ـــ Piccolomini)۔ گزشتہ سین یہ ہے کہ نوجوان پکولومینی ڈیوک والن شٹین کا طرف دار بن گیا ہے۔ اور صلح اور آشتی کی بھلائیاں بیان کر رہا ہے۔ اصل میں وہ صلح کی اِن خوبیوں سے اپنے ایک گزشتہ سفر میں متعارف ہوا ہے۔ اور اس تعارف کرانے والی ہستی کو نواب والن شٹین کی مہ پارہ دختر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ نوجوان پکولومینی کے اسٹیج چھوڑنے کے بعد اسٹیج پر آک ٹے ویو ـــ Octavio (پکولومینی کا والد) اور اُس کا مصاحب خاص گوشٹین برگ تشریف لاتے ہیں:

گوشٹین برگ :- "آہ! یہ کیا ہو گیا؟ دوست کیا ہم اُسے ایسے دھوکے میں مبتلا رہنے دینگے؟ کیا ہم اُسے یونہی ہاتھ سے گنوا بیٹھیں گے؟ کیا ہم اس کی آنکھوں سے یہ غلطی کی پٹی دور نہ کر سکیں گے؟ کیا ہم اس کی آنکھیں نہ کھول سکیں گے؟"

آک ٹے ویو :- (کسی گہرے خیال سے بیدار ہوتے ہوئے) "اُس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اور میں ضرورت و خواہش سے زیادہ دیکھ رہا ہوں"

گوشٹین برگ :- "کیا مطلب؟"

آک ٹے ویو :- "اِس کے بس سفر پر لعنت!"

گوشٹین برگ :- "لیکن یہ کیوں؟"

آک ٹے ویو :- "بس۔ بس دوست، مجھے چلنا چاہیئے۔ اور حقیقت حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ چلو ـــ"

گوسٹین برگ :- "کہاں ـــــــ کہاں جاتے ہو؟"

آک ٹے ویو :- "اس کی طرف، اس عورت کی طرف" ـــ (To her, herself ـــــ)

گوسٹین برگ :- "کہاں ـــــــ؟"

آک ٹے ویو :- (غلطی کو درست کرتا ہوا) "اس کی طرف، نواب کی طرف، آؤ چلیں ـــ!"

آک ٹے ویو کہنا چاہتا تھا کہ نواب کی طرف چلیں۔ لیکن اس کی زبان پھسلتی ہے۔ اور وہ نواب کی لڑکی کا نام لے دیتا ہے اور اس طرح یہ راز آشکار کر دیتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے متاثر ہونے کی اصل وجہ سے واقف ہے۔ دیگر مثال کے لئے آپ او، رینک (O. Rank ـــ) کی وہ مثال ملاحظہ کریں جو اُس نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ "تاجر وینس" (Merchant of Venice ـــــ) سے ڈھونڈ نکالی ہے ـــ بہتر ہوگا کہ یہاں رینک کے ایک پیرا کا ترجمہ پیش کر دیا جائے۔ فرماتے ہیں:-

"شیکسپیئر کی وہ غلطی جو "تاجر وینس" کے تیسرے ایکٹ کے دوسرے سین میں سرزد ہوتی ہے، عجیب شاعرانہ احساسات بیدار کرتی ہے۔ اور شاعر کے فنی کمال کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس غلطی کی طرح جو "والن سٹین" میں سرزد ہوتی ہے، اور جس کا ذکر فرائڈ نے اپنی کتاب "ہر روز کی نفسی امراض کا معالجہ" (Psycholog of every-day Life ـــ) میں کیا ہے۔ شیکسپیئر کی اس غلطی سے ظاہر ہے کہ شعراء اِن غلطیوں کی ماہیت اور معانی و مقاصد سے واقف ہوتے ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ پڑھنے سننے والے بھی ان اُمور سے بخوبی واقف ہونگے۔

پورشیا اپنے باپ کے حکم کے بموجب اپنے شوہر کا انتخاب بذریعے قرعہ اندازی کرنے پر مجبور ہے. اب تک حسن اتفاق سے تمام خواہشمند نوجوان ناکامیاب رہے ہیں۔ اب بزانیو (ہ [illegible]) کی باری ہے. پورشیا اُس سے محبت کرتی ہے اور ڈرتی ہے کہ قسمت اُسے بھی قرعہ اندازی میں ناکامیاب نہ رکھے. وہ چاہتی ہے کہ کسی طرح اُسے وہ یہ بتا دے کہ قرعہ اندازی میں ناکامیاب رہنے کے بعد بھی وہ اُسے چاہتی رہے گی. اور اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گی. لیکن چونکہ وہ باپ کے سامنے حلف اُٹھا چکی ہے اس لئے اس کی زبان بند ہے. اس اظہار کشمکش میں شاعر کی قابلیت چمکتی ہے اور وہ پورشیا کے منہ سے یہ الفاظ ادا کراتا ہے۔

پورشیا، "میں تمہیں بتا سکتی ہوں کہ کونسی ڈبیا میں کامیابی کا نمبر پوشیدہ ہے. لیکن میں ایسا نہ کرنے کی قسم کھا چکی ہوں. اس لئے میں کبھی ایسا نہ کروں گی...... تمہاری نظروں نے میرے دو برابر حصے کر دئے ہیں. ایک آدھ تو تمہارا ہے اور دوسرا آدھ "تمہارا" ــــــ مجھے کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ ایک آدھ میرا ہے. لیکن چونکہ میری ہر چیز تمہاری ہے اس لئے یہ آدھ بھی تمہارا ہے. اور اس طرح میں تمام کی تمام تمہاری ہوں ــــ"

اِن مثالوں کے بعد قلم پھر سے غلطیوں کے معانی کی طرف پلٹتا ہے. یہ کہنا کہ ہر غلطی شرمندۂ معانی ہے اصل میں یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر غلطی ایک نفسی عمل ہے جس میں نیت کی جھلک اور دیگر نفسی افعال کی ترتیب موجود ہے. یعنی ہم اپنی مذکورہ بالا مثالوں میں معانی کی بجائے نیت اور رغبت کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ ایک سُنہری دھوکا تو نہیں؟ کہیں یہ سب کچھ شاعرانہ اغراق کی کرشمہ سازیاں تو نہیں؟ــــ

آیئے پھر سے چند مثالوں کو مشعلِ راہ بنائیں. صدر اجلاس کی افتتاحیہ تقریر میں یہ فقرہ کہ میں "اجلاس کو برخاست کرتا ہوں" اسکی نیت کی غمازی کر رہا ہے. اگرچہ بعض حالات میں یہ نیت اتنی عیاں و بیاں نہیں ہوتی پھر بھی تھوڑا سا تدبر و تدلل ہمیں پنہاں نیت تک لے ہی پہونچتا ہے. بسا اوقات غلطی ہمیں اصل معنی کے علاوہ ایک اور نیا معنی عطا کر دیتی ہے. اور اس صورت میں فقرہ ایک قسم کا اختصاری جملہ معلوم ہوتا ہے. مذکورہ بالا خاتون والی مثال میں خاتون کا فقرہ مندرجہ ذیل فقروں کا نچوڑ معلوم ہوتا ہے:- "میرا خاوند جو چاہے کھا سکتا ہے؟! لیکن اس کا اتنا اختیار ہی کب ہے کہ وہ کسی چیز کا انتخاب کرے. اس لئے میں خود ہی اس کے لئے انتخاب کروں گی ــــ" پہلی اور دوسری مثال میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک حالت میں ایک ارادہ دوسرے ارادے پر مکمل طور پر غالب آگیا ہے. اور دوسری میں غلبہ ادھورا ہے. اور اس لئے صحیح الفاظ کے عین برعکس الفاظ استعمال نہیں ہوتے. بہر حال اِن مثالوں سے بقول فرائڈ یہ ظاہر ہے کہ یہ غلطیاں نہ تو نفسیاتی حادثات ہیں اور نہ ہی بے معنی. بلکہ یہ نفسیاتی فطری افعال ہیں. اور گوناگوں معانی کی حامل ہیں. اور یہ کہ یہ ارادوں کی تکرار اور اُن کے بیک وقت پیدا ہونے سے پیدا ہوتی ہیں. اب دو سوال پیدا ہوتے ہیں. ایک تو یہ کہ کیا یہ توجیہ زبان کی ہر قسم کی غلطیوں کی تشریح کر سکتی ہے؟ اس کا جواب فرائڈ یہ دیتا ہے کہ آپ کو زبان کی ہر غلطی کی تہ میں یہی نکتہ پوشیدہ ملے گا. اگرچہ یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ اس تکرارِ ارادہ کے بغیر کوئی غلطی سرزد ہو ہی نہیں سکتی. پھر بھی ہم بابمہ وثوق یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی زیادہ تر لغزشیں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں. اور عین ممکن ہے کہ زبان کی تمام تر غلطیاں اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہوں ــــ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ توجیہ زبان کی لغزشوں کے علاوہ دیگر اقسام کی غلطیوں پر بھی استعمال کی جا سکتی ہے؟ فرائڈ نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے. لیکن اس جواب کی مکمل تفسیر بیان کرنے سے پہلے ایک مسئلہ قابلِ توجہ ہے. یعنی دورانِ خون، تھکاوٹ، ہیجان، بے توجہی. وغیرہ کی جانچ پڑتال۔

آپ اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ فرائڈ کے پیرو ان چیزوں کو یکقلم رد نہیں کرتے. ان کا خیال ہے کہ کمزوری، تھکاوٹ وغیرہ کی حالت میں اکثر زبان کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں. لیکن وہ یہ ماننے سے انکاری ہیں کہ یہ چیزیں غلطی پیدا کرنے کے ضروری اسباب میں شامل ہیں. فی الحقیقت اِن غلطیوں میں مبتلا ہونے کے لئے کسی خاص عضویاتی ماحول میں داخل ہونا ضروری نہیں. یہ غلطیاں صحیح و سالم دماغ اور جسم میں بھی رُو پذیر ہو سکتی ہیں. پس یہ ثابت ہوا کہ جسمانی علامات محض امدادی اثرات کا رنگ رکھتی ہیں. یعنی یہ غلطی پیدا کرنے والے انجن کو صاف چلنے میں مدد دیتی ہیں. فرائڈ نے اس کی مثال اس طرح پیش کی ہے کہ فرض کریں کہ آپ اندھیری رات میں کسی غیر آباد حصۂ شہر میں گشت لگا رہے ہیں. وہاں ایک چور آپ پر حملہ آور ہوتا ہے اور آپ سیدھے ہاتھوں اپنا بٹوا اور طلائی گھڑی اس کے سپرد کر دیتے ہیں. اب اندھیرے کے سبب آپ نے چور کی شکل

نہیں دیکھی۔ اس لئے تھانہ پہونچکر آپ اپنی ابتدائی رپورٹ اس طرح لکھواتے ہیں "تنہائی اور تاریکی نے میرا قیمتی مال چھین لیا" اس پر تھانہ انچارج کہتا ہو کہ "صاحب اِس میکانیکی نقطۂ نگاہ کو چھوڑئے۔ اور یوں فرمائیے کہ تاریکی کے پردے میں اور آپ کی تنہائی سے فائدہ اُٹھاکر کسی نامعلوم چور نے آپ کا مال ہتیالیا ہو۔ اور سب سے اہم کام یہ ہے کہ چور کا پتہ لگایا جائے:

یہ حقیقت ہے کہ فقدانِ توجہ، ہیجان، بے توجہی وغیرہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ تو صرف ہوائی گھوڑے ہیں یا بالفاظِ دیگر یہ ایک قسم کے پردے ہیں اور ہمیں اِن پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی چیزوں کا مُطالعہ ضروری ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرنا لازم ہے کہ ہیجان "بے توجہی پیدا کیوں ہوتی۔ اس سلسلے میں الفاظ کی صوتیات کے تناسب اور حروف کی مشابہت پر غور کرنا بھی کافی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ امور غلطی کو ایک نیا رستہ بتاکر ایک لحاظ سے اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی سوچنا لازم ہے کہ اگر آپ کے سامنے ایک راستہ موجود ہو تو کیا یہ اس رستہ پر جانا ضروری ٹھہرتا ہے؟ کیا آپ کو قوتِ ارادی اور کسی جنبش دینے والی قوت کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لحاظ سے آواز کے یہ تناسب اور حروف کی یہ مُشابہتیں دیگر عضویاتی اُمور کی مثل زبان کی غلطیوں کی ممد تو ثابت ہوسکتی ہیں لیکن ان کی اصلی وجہ نہیں بن سکتیں۔ مشہور فلاسفر Meringer کا قول ہے کہ زبان کی لغزشیں تب پیدا ہوتی ہیں جب جسمانی تھکاوٹ کے سبب قوتِ تلازم association قوتِ ارادی پر فتح حاصل کرلیتی ہو۔ اگرچہ بعض حالات میں اس کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہو۔ لیکن ہمارا مُطالعہ و مُشاہدہ ہمیں ہزار ہا ایسے واقعات سے دوچار کراتا ہو جب زبان کی لغزشیں تلازم اور تھکاوٹ کی غیرموجودگی میں بھی سرزد ہوتی ہیں۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ہم کس طرح ان دو ارادوں کا پتہ لگا سکتے ہیں جن کی باہمی کشمکش ہمیں غلطی میں مُبتلا کردیتی ہو۔؟ ۔۔ یہ تو آپ مان لیں گے کہ وہ ارادہ جس کی راہ میں رکاوٹ حائل ہوتی ہے اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ خود غلطی کرنے والا فرد اس ارادے سے واقف ہوتا ہے اور ہمیں بخوبی بتاسکتا ہے کہ اس کا ارادہ کیا تھا۔ البتہ دوسرے ارادے کو متعین کرنا ذرا دُشوار نظر آتا ہے۔ اُوپر بیان ہوچکا ہے کہ بعض حالات میں یہ راستے میں اٹکنے والا روڑا بہت اچھی طرح عیاں و بیاں ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو مذکورہ بالا صدر اجلاس والا بیان۔ لیکن بعض حالات میں یہ ارادہ اصلی ارادے کی راہ میں کچھ اس طرح حائل ہوتا ہے اور صحیح لفظ کو کچھ اس طرح مسخ کردیا جاتا ہے کہ اس ارادے کی تلاش صیغۂ ناممکنات میں جاپڑتی نظر آتی ہے۔ پھر بھی بعض اُمور کی مدد سے ہم اس ارادے کا کھوج لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک قسم کی غلطیوں میں ہم غلطی کرنے والے کی رائے دریافت کرتے ہوئے حقیقتِ حال تک پہونچ سکتے ہیں۔ یہ تحلیلِ نفسی کا طریقہ ہے۔ اب آپ اعتراض کریں گے کہ ماہرِ نفسیات ہر حالت میں غلطی کرنے والے کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ اور اُن کا یہ عام وطیرہ ہے کہ جو بات اُنکی توجیہ کو امداد دے اُسے تو وہ لے لیتے ہیں اور جو بات اُنہیں ناپسند ہو وہ بلا دلیل رد کردیتے ہیں۔ اس کے جواب میں فرائڈ کمرۂ عدالت کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہاں اگر مُلزم اقبالِ جُرم کرلے تو عدالت اُس کا بیان صحیح تسلیم کرلیتی ہے۔ اگر ملزم اقرارِ جُرم سے انکاری ہو تو عدالت کبھی اس کی بات نہیں مانتی۔ کیونکہ اس طریقۂ کار کے بغیر عدل و انصاف میں قانون کی آمیزش نہیں ہوسکتی۔ یہ تو آپ بھی کہیں گے کہ یہ طریقہ کار باوجود چند ایک نقائص کے کافی کارآمد ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ ان غلطیوں پر تحلیل نفسی کا عمل کہاں سے آغاز ہو۔ اگر غلطی کرنے والا خود ہی امداد کرنے پر آمادہ ہو۔ تو پھر معاملہ ہی صاف ہے۔ اب اگر وہ اپنی غلطی کی کوئی تشریح پیش کرنے سے قاصر ہو تو کن اُمور پر نظر رکھنا لازم ہوگا؟ ۔۔۔ فرائڈ اس ضمن میں چند ایک چیزوں کا نام لیتا ہے۔ اوّل غلطی کرنے والے فعل کے مشابہ افعال کے ساتھ مقابلہ کرنا، مثلاً ایک شخص کے نام کو مسخ کردینے کو ارادی فعل سمجھ لینا اور پھر اس کی تحلیل اسی طرح کرنا جیسے مذاق یا تمسخر کی تحلیل کی جاتی ہے۔ دوسرا، غلطی کے نفسیاتی ماحول کا مطالعہ کرنا اور اس ضمن میں غلطی کرنے والے کے عام کردار اور اس مخصوص واقعہ کے افعال و کردار کا مُطالعہ کرنا، عام طور پر یوں خیال کیا جاتا ہے کہ عام اُصولوں کے ماتحت غلطی کے معانی دریافت کرلیتے ہیں۔ اوّل اوّل میں یہ ایک قسم کا اندازہ ہی ہوتا ہے البتہ بعد میں نفسیاتی ماحول کا مطالعہ ہمارے نتائج کی تصدیق کردیتا ہے۔ بعض اَوقات ہمیں واقعاتِ مُستقبل کا انتظار کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اکثر حالات میں یہ غلطیاں کسی آئندہ امور کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور اس حالت میں واقعاتِ مُستقبل کے بعد ان کے مطالب دریافت نہیں کئے جاسکتے۔ مثال ملاحظہ ہو ۔۔ ایک مجلس کے عام اجلاس میں ایک نوعمر رکن نے اپنی زبردست اور جوشیلی تقریر میں ارکانِ کمیٹی (Leaders) کی بجائے غلطی سے "ساہوکارانِ

کمیٹی" ([illegible]) کے الفاظ استعمال کئے۔ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس غلطی کرانے میں کوئی ایسا ارادہ یا جذبہ کارکن ہوگا جسے کسی طرح قرض دلانے سے کوئی نسبت ہوگی۔ بعد میں تحقیقات سے پتہ چلا کہ مقرر صاحب مالی مشکلات میں گرفتار تھے اور قرض لینے کی فکر میں غلطاں تھے، اس لئے اُن کے دل میں ضرور یہ خیال پنہاں ہوگا۔" مخالفت میں ذرا کمی ہی مناسب ہے۔ کیونکہ سامعین میں اکثر ایسے افراد موجود ہیں جو قرضہ دینا پسند کریں گے"۔ یہ تو ہوئی زبان کی لغزش کی مثال۔ دیگر مثالوں کے لئے ہمیں دوسری قسم کی غلطیوں کی طرف راجع ہونا پڑیگا۔ بقول فرائڈ اگر کوئی آدمی کسی واقف کار کا نام بھول جائے ——— اور باوجود کوشش کے بھی اس کا نام یاد نہ رکھ سکے، تو آپ یقین کر لیں کہ اس کے تعلقات اس نام والے شخص سے اچھے نہیں ہیں۔ اس خیال کے ماتحت آپ مندرجہ ذیل مثال ملاحظہ کریں۔

مسٹر الف[1] ایک خاتون پر عاشق ہوئے۔ خاتون نے اُن کی محبت کو ٹھکرا دیا اور مسٹر جیم سے شادی کرلی؛ اگرچہ اس واقعہ سے پہلے مسٹر الف اور مسٹر جیم آپس میں واقف تھے۔ اور انکے درمیان تجارتی تعلقات قائم تھے۔ پھر بھی اس ازدواج کے بعد مسٹر الف عموماً مسٹر جیم کا نام بھول جاتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ مسٹر جیم کی ناخوشگوار یاد کو فراموش کیا چاہتے ہیں۔

ایک اور مثال[2]۔ ایک خاتون اپنی ——— ایک عزیز سہیلی کے متعلق ایک حکیم صاحب سے استفسار و مشورہ کے دوران میں اپنی سہیلی کا "اسمِ دوشیزگی" (Maiden Name) استعمال کرتی ہیں۔ بلکہ فی الحقیقت وہ اپنی سہیلی کا "ازدواجی نام" (Married Name) ہی فراموش کر بیٹھی ہیں۔ وہ خود جانتی ہیں کہ وہ اس رشتہ کے برخلاف تھیں۔ اور اب بھی اپنی سہیلی کے شوہر سے حد درجہ متنفر ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اس نفسانی حالت کا مطالعہ مکمل کر لینا چاہیئے جس حالت میں افراد سے یہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

کسی پکے ارادے کو فراموش کرنے کی تہ میں عموماً مخالف احساسات کی زبردست ردِعمل پذیر ہوتی ہے اور یہ ہمارے پختہ ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچنے نہیں دیتی۔ یہ نہیں کہ صرف ماہرانِ تحلیل نفسی ہی اس مخالف احساسات کی رد کے قائل ہوتے ہیں۔ بلکہ سماج کے جملہ افراد اس رد کی موجودگی کے قائل ہیں۔ اگر کوئی حاکم کسی سفارش کو بھول جائے تو سفارش کرنے والا فوراً سمجھ جائیگا کہ حاکم کی مرضی ہی نہیں ہے کہ اس کا کام کرے۔ اس وجہ سے فراموش کاری سماج کی جملہ حالتوں میں سخت نکتہ چینی کا ہدف بنائی جاتی ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ ایک میزبان اپنے مہمان کا استقبال اِن الفاظ میں کرتا ہے۔" اوہو! — معاف کیجئے گا۔ مجھے تو یاد ہی نہ تھا کہ آج آپ کی دعوت ہے!" یا آپ اندازہ کریں کہ ایک نوجوان عاشق اپنی محبوبہ سے مقررہ موقع پر ملاقات نہ کرسکنے کی وجہ یہ پیش کرتا ہے کہ وہ مقررہ موقع بھول گیا تھا۔ کیا اُسکی محبوبہ کبھی بھی مان سکے گی کہ اس کا عاشق محض اس وجہ سے مقررہ موقع پر نہ پہونچ سکا؟ ——— شاید آپ کو پتہ ہو کہ فوج میں "بھول جانا" کوئی بہانہ نہیں۔ اور یہ بہانہ کسی فرد کو سزا سے ہرگز ہرگز نہیں بچا سکتا، اور پھر طرّہ یہ کہ فوج کا یہ قاعدہ بہت پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، حیرانی کی بات ہے کہ اگر تمام لوگ اس موقع پر مان لیتے ہیں کہ فلاں غلطی کے فلاں معنی ہیں تو وہ دیگر قسم کی غلطیوں کو کیوں مطالب و معانی سے بے نیاز گردانتے ہیں۔

ارادوں کو فراموش کر دینا بہت آسان اور عیاں فعل ہے اور اس پر زیادہ وقت صرف کرنا فضول ہے۔ اب ایک اس سے زیادہ گنجلک امر کی طرف عنانِ توجہ پھرائی جاتی ہے۔ یعنی چیزوں کا کہیں رکھکر بھول جانا، بادی النظر میں یہ بات مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ کہ اس غلطی کا مرتکب اِس غلطی کی تہ میں کوئی مطلب چھپائے بیٹھا ہے۔ لیکن مثالیں مکمل ثبوت بہم پہونچاتی ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔ مثال[3]۔ ایک نوجوان طالبعلم اپنا ایک عزیز قلم کہیں رکھکر بھول گیا۔ چند دن ہوئے اُسے اپنے بہنوئی کا خط ملا تھا جس میں یہ فقرہ درج تھا۔" نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ میری نیت ہے کہ تمہاری اِن خرافات اور فروعات پر قلم اٹھاؤں"۔ ساتھ ہی یہ پتہ چلا کہ یہ قلم اسی بہنوئی کا تحفہ تھا۔ اگر ہمیں اِن دونوں واقعات کا پتہ نہ ہوتا تو شاید ہم کبھی بھی غلطی کے معانی تک نہ پہونچ سکتے۔ اس قسم کی کافی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بقول فرائڈ عام آدمی ان حالات میں چیزیں عموماً کہیں رکھکر بھول جاتا ہے۔ یا عجب بے پروائی کی حالت میں ان کو گرا کر یا کسی اور طریقے سے توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں فرائڈ، ماتیڈر (Maeder) برل (Brill) ارنسٹ جونز، اسٹارکی (J. Starcke) اور

۱؎ From A. A. Brill ۲؎ From C. G. Jung ۳؎ From B. Dattner

دیگر ماہرانِ نفسیات کی تصنیفات میں بکثرت موجود ہیں۔ اب ہم ان سے قطع نظر کرتے ہوئے دو اہم امور کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں۔ ایک تو جمع ہوتی ہوئی غلطیاں ہیں اور دوسرا اپنے نتائج کی تصدیق بعد کے واقعات سے کرنا ہے۔

جمع کی ہوتی غلطیاں ایک دلچسپ مُطالعہ پیش کرتی ہیں اور اگر ہمیں صرف غلطیوں میں معانی کی موجودگی ہی ثابت کرنا ہوتا تو ان سے بہتر شاید ہی کوئی اور ثبوت موجود ہو۔ کیونکہ ان کے مطالب بہت عیاں اور ظاہر ہوتے ہیں اور پھر غلطی کا اعادہ تو کبھی حادثہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔۔۔ ارنسٹ جونز کہتے ہیں کہ اُنہوں نے ایک دفعہ ایک خط لکھکر میز پر رکھا اور کافی دن گزرنے کے باوجود وہ مکتوب یونہی میز پر بلا وجہ دھرا رہا۔ آخر کار ایک دن کافی ہمت سے اُنہوں نے وہ خط ڈاک میں ڈال ہی دیا۔ لیکن جلد ہی اُنہیں وہ خط واپس مل گیا۔ کیونکہ اس پر کسی کا پتہ درج نہ تھا۔ اب کے اُنہوں نے پتہ لکھا اور خط کو لیکر لیٹر بکس کا قصد کیا۔ وہ خط ڈاک کے ڈبے میں ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ اُنہیں دھیان آیا خط پر ٹکٹ مفقود ہے۔ ایسے اُنہیں خط نہ لکھنے کی وجوہات سمجھ میں آگئیں۔ اور انہوں نے خط سپردِ ڈاک نہ کیا۔ ایک اور واقعہ میں کسی چیز کو غلطی سے اُٹھا لینا اور پھر کہیں رکھکر بھول جانا جمع تھا۔ ایک خاتون[۵] اپنے بہنوئی کے ساتھ اٹلی گئی۔ اُس کا بہنوئی ایک زبردست مصوّر تھا۔ اٹلی میں اس مصوّر کو ایک سُنہری تمغہ پیش کیا گیا۔ لیکن اس مصوّر نے کمال بے توجہی سے وہ تمغہ ایک میز کی دراز میں رکھ چھوڑا۔ اس خاتون کو تمغے کی اس بے قدری پر بہت افسوس ہوا۔ جب وہ سفر سے واپس لوٹے، اور خاتون اپنے بہنوئی سے الوداع ہو کر اپنے گھر پہونچی، تو اُسے معلوم ہوا کہ غلطی سے وہ تمغہ اُس کے بیگ میں آگیا ہے۔ اُس نے فوراً اپنے بہنوئی کو اس غلطی کی اطلاع دی۔ اور لکھا کہ جلد ہی وہ تمغہ اُسے واپس بھیجدیگی۔ لیکن جب وہ دوسرے دن تمغہ واپس بھیجنے لگی، تو اُسے معلوم ہوا کہ وہ تمغہ کسی جگہ رکھکر بھول گئی ہے۔ اور اب اُسے خیال آیا کہ اسکی اس عدم توجہی کی تہ میں یہ راز پنہاں ہے کہ وہ تمغہ اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اس قسم کی دیگر مثالیں پیش کرنا کافی دلچسپ امر ہوگا۔ لیکن اب ہم ایک دوسرے امر کی طرف متوجّہ ہونا لازم سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ واقعات جہاں ہمارے لگائے ہوئے اندازوں کو آنیوالے واقعات سچّا ثابت کر دکھاتے ہیں۔

ان واقعات کی بُنیادی شرط یہ ہے کہ غلطی کرتے وقت ہم تجزیاتی نفسانی حالات سے واقف نہیں ہو سکتے اس لئے اس موقع پر ہمارا حکم محض ایک اندازہ ہوتا ہے جس کو خود ہمارا دل بھی کوئی خاص وقعت نہیں بخشتا۔ بعد کے واقعات ہمارے اندازوں کی تصدیق کر دیتے ہیں فرائڈ نے ایک مثال پیش کی ہے۔ "میں ایک نئے بیاہے ہوئے جوڑے کا مہمان تھا۔ نوجوان بیوی نے مجھے اپنا جدید ترین دلچسپ واقعہ سُنایا۔ کہ کس طرح وہ "ماہِ عسل" سے واپسی کے بعد اپنی بہن کے ہمراہ بازار گئی اور کس طرح اُس نے سڑک کے پار ایک نوجوان آدمی کو دیکھکر بے ساختہ اپنی بہن سے کہا "دیکھو وہ مسٹر الف ہیں"۔ وہ بھول چکی تھی کہ یہ مسٹر الف عرصہ دو ہفتہ سے اُس کے شوہر بن چکے تھے "میں اس واقعہ کو سُنکر کانپ اُٹھا۔ لیکن میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ کچھ مدت بعد پتہ چلا کہ اُنکی شادی سخت ناکامیاب رہی ہے"

دیگر مثال:۔ ایک مشہور جرمن کیمیا داں کے متعلق مشہور ہے کہ اُس کی شادی محض اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ وہ شادی کے دن گرجا جانے کی بجائے غلطی سے اپنے دار التجربہ میں جا نکلا۔۔۔ اور یہ تو اس کی عقلمندی کا ثبوت ہے کہ وہ اس تلخ تجربہ کے بعد شادی کرنے سے تمام عمر کے لئے فارغ رہا۔ اور مرتے دم تک ان بندھنوں سے آزاد رہا۔

اُوپر کہیں ذکر ہو چکا ہے کہ غلطیاں دو ارادوں کی باہمی کشمکش کے سبب پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک ارادہ دوسرے ارادے کی راہ میں حائل ہو کر افراد کو لغزشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ اب اِس سدِ راہ بننے والے ارادے کے متعلق دو سوال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ سوال کہ کونسی قسم کی نیتیں اور ارادے یوں سدِ راہ بنجاتے ہیں اور دوسرا یہ سوال کہ جن دو ارادوں میں باہمی نزاع پیدا ہوتا ہے انکے مابین کس قسم کا تعلق نمودار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں زبان کی لغزشوں کو مشعلِ راہ بناتے ہوئے ہم پہلے دوسرا سوال حل کرینگے۔

اکثر حالات میں حائل ہونے والا ارادہ صحیح ارادے کے ساتھ معانی کے لحاظ سے متعلق ہوتا ہے۔ ان حالات میں عموماً غلط ارادہ صحیح ارادے کی تردید ہوتا ہے۔ یا اس پر اصلاح اور یا ایزاد کا عمل آزماتا ہے۔ زیادہ گنجلک اور پیچیدہ واقعات میں عموماً ان دو ارادوں کے درمیان کوئی معنوی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کے معنوی تعلقات کی مثالیں ہم اُوپر عرض کر چکے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو صاحبِ صدر کی وہ مثال جس کے افتتاحیہ خطبہ کے اندر یہ خیال بھی موجود تھا "میں اجلاس کو شروع کرتا ہوں۔ لیکن میں بہتر سمجھتا ہوں کہ یہ اجلاس برخاست ہی رہے"۔۔۔

[۵] From:- R. Reitler

دوسری قسم کے تعلقات (یعنی جہاں معنوی تعلقات غیر موجود ہوں) بادی النظر میں کچھ غیر فطری نظر آتے ہیں۔ اور خیال گزرتا ہے کہ معنوی تعلقات کے بغیر یہ دو ارادے اوّل تو اکٹھے کس طرح ہو جاتے ہیں؟ اور پھر حائل ہونے والا ارادہ اپنی موجودگی کا اظہار کس طرح کرتا ہے؟ مشاہداتی واقعات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لغزش واقع ہونے سے پیشتر غلطی کرنے والا فرد اپنے دماغ میں ایک خیالات کی رَو سلتے ہوئے ہوتا ہے۔ حائل ہونے والا ارادہ انہی خیالات میں پنہاں ہوتا ہے۔ اور یہ ارادہ اپنا اظہار بلا کسی روک ٹوک کے بطور "تاثر مابعد" (after effect ـــــ) کے کرتا ہے۔ خیال رہے کہ اس اظہار کے وقت یہ بالکل لازم نہیں کہ اظہار پہلے ہو چکا ہو یا ابھی پردۂ خامشی میں پنہاں ہو آپ اسے ایک قسم کی گونج (Perseveration ـــــ) کہہ سکتے ہیں، اگرچہ یہ کہے ہوئے الفاظ کی صدائے بازگشت نہیں۔ واضح ہو کہ تلازم کا تعلق تو یہاں بھی دونوں ارادوں کے مابین پیدا ہوتا ہے لیکن یہ معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو ایک مصنوعی تعلق ہوتا ہے جو خیالات کی قوت کے ماتحت حقیقی معنوی تعلق کا کام دے جاتا ہے ـــــ

اب ہم بحث کے اہم ترین سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سوال جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے یہ ہے کہ کونسی قسم کی نیتیں اور ارادے یوں سدِّ راہ بن جاتے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ ان ارادوں کی گوناگوں اقسام پیدا ہیں۔ لیکن ہم کوشش کرینگے کہ کوئی ایسی علامت دریافت کریں جو ان سب میں یکساں موجود ہو۔ مثالوں کا مطالعہ و مشاہدہ ہمیں تمام اقسام کے تین گروپ بنا دے گا۔ پہلا گروپ اِن واقعات پر مشتمل ہے جن میں غلطی کرنے والا فرد غلطی کرنے سے پہلے حائل ہونے والے ارادے سے واقف تھا۔ اور وَہ اس کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ دوسرا گروپ اِن اقسام سے پیدا ہوتا ہے جن میں غلطی کرنے والا فرد یہ تو مانتا ہے کہ حائل ہونے والا ارادہ اسی کا ہے لیکن وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ غلطی کرتے وقت یہ ارادہ اس کے اندر متحرک تھا۔ ان حالات میں وہ ہمارے اندازہ کو صحیح تو مان لیتا ہے لیکن کچھ حیران سا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے واقعات کی مثالیں زبان کی غلطیوں کی نسبت دیگر لغزشوں میں زیادہ پیدا ہیں ـــــ تیسرے گروپ میں غلطی کرنے والا فرد ہمارے اندازے کو سختی سے جُھٹلاتا ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ غلطی کرتے وقت کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ ارادہ آج تک کبھی اس کے دماغ میں جگہ نہیں پاسکا۔ ان حائل ہونے والے ارادوں کو اِن تین گروپوں میں تقسیم کرنے کے بعد آئیے اور اِن اقسام میں کوئی مشابہت ڈھونڈئے۔ پہلے دو گروپوں میں غلطی کرنے والا فرد حائل ہونے والے ارادے سے واقف ہوتا ہے۔ اور ان دو حالات میں یہ ارادہ دبایا جاتا ہے۔ تقریر کرنے والے افراد نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اس خیال کو ہرگز ہرگز الفاظ کا جامہ نہ پہننے دیں گے۔ اِس ماحول میں اِن کی زبان لغزش کھاتی ہے۔ اور یہ ناقابلِ اظہار خیال خواہ مخواہ اُن کی مرضی کے برخلاف ان کی زبان سے کسی نہ کسی صورت میں ادا ہو جاتا ہے۔ یعنی کبھی تو اصل خیال سے مل جلکر کبھی مسخ شدہ صورت میں اور کبھی اصل خیال کو باہر نکال کر خود اس کی جگہ پر متمکن ہو جاتا ہے۔ یہ ہے زبان کی غلطیوں کی ترکیب۔ فرائڈ تیسرے گروپ کو اسی ترکیب کے سانچے میں ڈھال دکھاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ان تینوں گروپوں میں فرق یہی ہے کہ اس حائل ہونے والے خیال کو کسی میں کم دبایا جاتا ہے اور کسی میں زیادہ۔ کسی میں یہ دباؤ زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے اور کسی میں کم، پہلے گروپ میں یہ حائل ہونے والا ارادہ موجود ہوتا ہے۔ اور تقریر سے پہلے محسوس ہو سکتا ہے اور تقریر کے بعد اِس کی تردید کی جاتی ہے، دوسرے گروپ میں یہ تردید کافی پہلے کی جاتی ہے اور اسی وجہ سے یہ ارادہ تقریر سے پہلے محسوس نہیں ہوتا۔ یعنی یہ تردید اس کو احاطۂ محسوسات سے باہر نکال آتی ہے۔ تیسرے گروپ میں یہ تردید اس سے بھی پہلے کی چیز قرار پاتی ہے۔ اور یہ تردید اتنی مستحکم اور قوی ہوتی ہے کہ خود غلطی کرنے والا فرد اس کی مالکیت سے منکر ہو جاتا ہے۔ اِن تینوں گروپوں کے مُطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ارادے کا دبا دیا جانا کسی زبان کی غلطی کے پیدا ہونیکا بُنیادی سبب ہے۔

مذکورہ بالا بحث و تحیص سے مندرجہ ذیل اُمور ثابت ہوئے ہیں۔

اوّل یہ کہ غلطیاں مطالب و معانی سے آسودہ ہیں۔ دوم یہ کہ معانی و مطالب پہچانے جا سکتے ہیں۔ سوم یہ کہ غلطیاں دو ارادوں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہیں۔ چہارم یہ کہ حائل ہونے والا ارادہ صرف اس لئے غلطی کا سبب بن نکلتا ہے کہ اس کی حرکت میں کوئی روڑا اٹکایا جاتا ہے۔ یعنی پیشتر اس کے کہ وہ خود سدِّ راہ بن سکے یہ لازم ہے کہ اس کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا نتائج جملہ لغزشوں کی خاطر خواہ اور تسلی بخش تشریح پیش نہیں کر سکتے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جُوں جُوں ہم حل کے قریب پہنچتے جائیں گے ہم پر اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ تیز ہوتی جائے گی ـــــ مثلاً ایک اعتراض یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو ارادوں کی باہمی کشمکش کیوں صلح یا کوئی اور سادہ پہلو اختیار نہیں کر لیتی؟ یعنی یا تو صحیح ارادہ غالب ہو یا مکمل طور پر مفتوح ہو جائے۔ یہ کیا ہوا کہ اس کا کچھ حصّہ ہار گیا اور کچھ حصّہ غالب آ گیا؟ ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اِس

نصف یا نصف جیت کے اسباب نفس انسانی میں ضرور پنہاں ہوں گے۔ لیکن ہم صرف اندازہ لگا سکتے ہیں کوئی تحقیقاتی ثبوت یا مشاہداتی دلائل پیش نہیں کر سکتے۔

ہم تمام بحث میں اپنی توجہات زبان کی غلطیوں سے پیش کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اُن کے متعلق تو اب کچھ کہنا تحصیلِ حاصل کا مصداق ٹھہرے گا البتہ دیگر اقسام کی غلطیوں کے متعلق فروعی طور پر کچھ نہ کچھ کہنا ہی لازم ہے۔ قلم کی لغزشیں زبان کی فروگزاشتوں سے اس درجہ مشابہ ہیں کہ ان میں نئے نقطۂ نظر تلاش کرنا سعیِ لاحاصل ہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک بات کافی دلچسپ ثابت ہوگی یعنی یہ انکشاف کہ قلم کی ادنیٰ اور فی غلطیاں حروف کھا جانا۔ فقرے کے آخری الفاظ کو پہلے لکھ جانا وغیرہ وغیرہ سے غلطی کرنیوالے کی بے اتفاقی اور عجلت پسندی ظاہر ہوتی ہے۔

غلط پڑھنا، زبان اور قلم کی لغزشوں میں پیدا ہونے والی نفسانی حالت سے کوسوں دُور ہے۔ یہاں جو دو ارادے باہمی نزاع میں مبتلا ہوتے ہیں ان میں سے ایک ارادہ کی جگہ احساسی ہیجان لے لیتا ہے۔ اور یہ ہیجان دیگر ارادوں کی نسبت کمزور ہوتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ زیرِ مطالعہ چیز انسان کی اپنی پیداوار نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر واقعات میں زیرِ مطالعہ الفاظ کی جگہ سرے سے نئے الفاظ پڑھ لئے جاتے ہیں۔ اور ان ہر دو الفاظ میں عموماً لفظی مناسبت کے سوا کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے حائل ہونے والے ارادے کی تلاش میں نکلتے وقت ہمیں زیرِ مطالعہ خیال کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیئے اور تحلیل نفسی کو ان دو سوالوں سے شروع کرنا چاہیئے۔ اوّل یہ کہ تلازمِ آزاد (free association) کی رُو سے غلط پڑھا ہوا لفظ کونسا خیال پیدا کرتا ہے؟۔ دوّم یہ کہ یہ غلط پڑھنے والا واقعہ کسی ماحول میں وقوع پذیر ہوا؟ چند حالات میں صرف دوسرے ہی سوال کا جواب کافی ہوتا ہے لیکن اکثر حالات میں اور خاص طور پر جب صحیح الفاظ اور غلط الفاظ میں کوئی نمایاں تعلق نظر نہیں آتا اس وقت مکمل تحلیل کرنا بہت مشکل امر نظر آتا ہے اور اس وقت ہمیں ایک ماہرِ تحلیل نفسی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن خیال رہے کہ زیادہ تر حالات میں غلط پڑھنے کے کسی واقعہ کی تشریح بہت آسان امر ثابت ہوتا ہے کیونکہ غلطی کرنیکے اسباب کافی سے زیادہ عیاں و بیاں ہوتے ہیں۔

پکّے ارادوں کا بھول جانا ہمیشہ ایک ہی بات ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ بات اتنی ظاہر اور نمایاں ہوتی ہے کہ ہر کس و ناکس بآسانی اس بُرائی کی جڑ پکڑ سکتا ہے۔ یہاں حائل ہونے والی نیت ہمیشہ صحیح ارادے کی مخالف ہوتی ہے۔ یعنی ایک قسم کی نارضامندی۔ اور عموماً یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آخر اس جذبۂ نارضامندی کو چھپایا کیوں گیا تھا۔ کسی پکّے ارادے پر عمل نہ کرنے کے واقعات عموماً اتنے عیاں اور بالتفصیل ہوتے ہیں کہ اُن پر تحلیل نفسی کا منتر چلانا کچھ ضروری نہیں ٹھہرتا۔ ان سب میں ایک قسم کی مخالف قوتِ ارادی عمل پذیر ہوتی ہے جسے ہر شخص بغیر کسی علم نفسیات کے جانچ سکتا ہے۔

افراد اور شہروں کے نام بھول جانا بھی ایک قسم کے مخالف ارادہ کا مرہونِ احسان ہوتا ہے۔ اور یہ ارادہ کبھی تو سیدھی سادی نفرت یا ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے اور کبھی پیچ در پیچ خیالات کے اجتماع سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایسے نام بھول جانا جن سے کوئی تکلیف دہ یاد وابستہ ہو خاص مطالعہ کے لائق ہے۔ اس سلسلہ میں کسی کا شعر ہوا ہے :-

سہ　　وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں　　اچھا کیا جو مجھکو فراموش کر دیا!

خود تکلیف دہ یادوں اور احساسات کا فراموش کر دینا بھی اِسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس جگہ اکثر حضرات یہ کہیں گے کہ عام مشاہداتی واقعات اور روزمرّہ کے حالات اِس توجیہ کے برخلاف ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ نفسِ انسانی تکلیف دہ یادگاروں کو فراموش کر دے یہ تکلیف دہ یادگاریں لاکھ کوششوں کے باوجود بھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اور یہ کرب انگیز احساسات بار بار اُٹھ اُٹھ کر انسان کو زیادہ تکلیف میں مبتلا رکھتے ہیں۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ یہ مشاہداتی کیفیت تو درست ہے لیکن اعتراض منطقی طور پر غلط ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نفسِ انسانی ایک قسم کا اکھاڑہ ہے جس میں ہر وقت مخالف ارادے اور جذبے مصروفِ پیکار رہتے ہیں۔ نفسِ انسانی کی بنیاد ہر قسم کے ارادوں اور اِن کی ضدوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اور اس طرح نفسِ انسانی ایک مجموعۂ اضداد ہو گیا ہے۔ اس لئے ایک ارادے کی موجودگی کا ثبوت اُس کی ضد کے فقدان کا ثبوت نہیں بن سکتا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں ارادے پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ ہاں اس صورت میں اہم ترین سوال یہ ہوگا کہ دونوں مخالف ارادے آپس میں کیا تعلق رکھتے ہیں اور ان کا مجموعی اور انفرادی طور پر کیا اثر پیدا ہوتا ہے۔

چیزوں کا کہیں رکھکر بھول جانا اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ ایک واقعہ کے کئی معنی نکل سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک غلطی کرتے وقت بارہا مختلف

نموں کی حائل ہونے والی نیتیں موجود ہوتی ہیں۔ البتہ جو چیز سب حالات میں یکساں موجود ہے وہ کسی چیز کے گم کر دینے کی خواہش ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ خواہش ہر بار کسی نئے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ آدمی عموماً کوئی اپنی چیز تب کھو دیتا ہے جب وہ چیز پرانی ہو گئی ہو اور وہ غیر شعوری طور پر اسی نئی چیز سے تبدیل کرنا چاہتا ہو۔ یا اسے اب اُس چیز کی ضرورت یا پروا نہ رہی ہو۔ یا یہ چیز کسی ایسے فرد کے پاس سے اُسے پہونچی ہو جس سے اُس کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے ہوں۔ یا یہ چیز کسی ایسی حالت میں دستیاب ہوئی ہو جسے اب اس چیز کا مالک یاد نہ رکھنا چاہتا ہو۔ چیزوں کو گرا دینا، توڑنا یا اُن کو خراب کر دینا بھی یہی مطلب رکھتا ہے۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز بغیر اپنی وقعت کھوئے گم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی خود ساختہ اور خود عائد کردہ قربانی ہوتی ہے جو کسی آنے والی مصیبت کو دُور کرنے کیلئے کی جاتی ہے اور یہ مخصوص قسم کی رضاکارانہ قربانی مہذب ترین ممالک میں بھی پیدا ہے۔ اس ضمن میں چیزوں کا گم کر دینا کبھی کبھار غصہ یا خود عائد کردہ سزا کا پرتو بن نکلتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ چیزیں گم کرنے کی تہ میں ہر قسم کے ارادے پناہ گزین ہو سکتے ہیں۔

یہ ہے ہماری روزمرہ کی غلطیوں کا کچا چٹھا۔ اُمید ہے کہ آپ اس بحث کے بعد آئے دن کی فروگذاشتوں کو محض ایک حادثہ سمجھ کر نظرانداز نہ کر دیں گے اور آپ موقع بننے پر اپنے آپ پر ضرور سوال کریں گے کہ کیا یہ محض حادثہ ہے کہ بسا اوقات ہم اپنے آپ کو بلا حیل وحجت خطرہ میں ڈال دیتے ہیں یا اپنے آپ کو کوئی اور نقصان پہونچا بیٹھتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اِن فروگذاشتوں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی نمایاں ہے کہ بہت سے اعتراضات اور سوال بغیر جواب دینے کے چھوڑ دئے گئے ہیں اور اس طرح پڑھنے سننے والے حضرات کو اپنی تحلیل نفسی کرنے کا کھلا موقع دیا گیا ہے لیکن بہ وجوہِ احسن اب اِس قسط کو فرائڈ کے ایک فقرے پہ ختم کیا جاتا ہے:-

"جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے اگر سماج کے عام معیاری افراد غلطیوں کی ماہیت کو اس قدر سمجھتے ہیں اور بسا اوقات اسی طرح عمل کرتے ہیں جیسے وہ اُن کے مطالب ومعانی سے بخوبی روشناس ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان غلطیوں کو 'حادثہ'، 'لایعنی'، اور 'فضول' قرار دیتے ہیں؟ اور پھر کیا سبب ہے کہ وہ اس تشریح کو جو تحلیل نفسی کا طریقہ پیش کرتا ہے بلاوجہ راندۂ درگاہ قرار دیتے ہیں؟"

(مے باقی و ماہتاب باقی)

انور مختار صدیقی
بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی؛

آرزو

آغازِ آرزو ہوا انجامِ آرزو
مجھ سے زیادہ ہے کوئی ناکامِ آرزو؟

وہ ترکِ آرزو کی کشاکش بھی یاد ہے!
دل کانپتا ہے لیتے ہوئے نامِ آرزو!

کب ہوگا دل؟ کشاکشِ امید و بیم سے
باقی ہیں گرچہ ہی سحر و شامِ آرزو!

دل کو قبول ترکِ غمِ آرزو نہیں
اب آرزو ہے آپ ہی انعامِ آرزو!

یہ بھی تری نگاہِ کرم کا طفیل ہے
دل اور اُٹھا سکے غم و آلامِ آرزو!!

مایوسِ آرزو ہوں مگر اس کو کیا کروں؟
دیتی ہے ہر نظر تری پیغامِ آرزو!!

توڑا ہے دم اُمید نے اب دل کی خیر ہو
آغاز ہو چکا ہے مرا انجامِ آرزو!

اب اعتبارِ عشرتِ غم بھی ہے ناگوار
میں ہوں فریب خوردۂ ایامِ آرزو!

قیدِ اُمید و بیم سے دل کیا نجات پائے؟
ہر زخم دل ہے، حلقۂ سر دامِ آرزو!

تابش بصد سرور و مسرت قبول کر
اس عہدِ آرزو میں ہے، غم، نامِ آرزو

تابش دہلوی؛

علی منظور اپنے دہاتی دوست کو قصر ... دکھا رہے ہیں

یہ ہے اے دوست! نواب آسماں توقیر کا ایواں ۔۔۔ اگر آئینہ حیرت ہو اس کا خوشنما ساماں
نہ بڑھنے پائے پھر بھی تیری چشم دل کی حیرانی ۔۔۔ پڑھائے گی سبق عبرت کا دولت کی فراوانی
فریم اس دلربا تصویر کا دیکھا نہیں تو نے ۔۔۔ ابھی پردے نہیں اطراف کے نقش و نگیں تو نے
سلیقہ سے ہے یوں آراستہ یہ قصر عالیشاں ۔۔۔ اسے "جنت بداماں" مان لے دیکھے اگر رضواں
ہرے مخمل کا فرش اتنا بڑا ہال!! آج ہی دیکھا ۔۔۔ زمرد جیسی پیاری شے کو پامال آج ہی دیکھا
اگر ایک ایک کرسی کم سے کم سو سو روپے کی ہے ۔۔۔ تو ان کی واجبی قیمت ہزاروں تک پہونچتی ہے
جب اتنی کرسیوں کی قیمتیں پہونچیں ہزاروں تک ۔۔۔ تو لاکھوں ہی روپے کا ہے یہ فرنیچر نہیں کچھ شک
کبھی صوفے خریدے جاتے ہیں اب تک کبھی قالیں ۔۔۔ رقم ہوتی نہیں کس روز نذر خواہش تزئیں
جو طبعاً ہیں یہ مسرف ہوتے ہیں کچھ انکے چرچے بھی ۔۔۔ نقابت ان کی کرتے ہیں کئی زر دوست پرچے بھی
کمی کرتے نہیں ہرگز یہ اپنے بھی سنورنے میں ۔۔۔ کہ حاصل ہے ید طولیٰ رقم کے صرف کرنے میں
دکھاتی ہے وہی رو ہر گھڑی "دریا دلی" انکی ۔۔۔ نشہ میں رات کی تمیز انکو ہے نہ کچھ دن کی
مہک اٹھے شبستاں جبکہ عید الفطر آجاتے ۔۔۔ گلابی، صندلی، مشکی، حنائی عطر آجاتے
اسی اسراف بے جا کیلئے محفوظ دولت ہے ۔۔۔ نہ رہنے پائے ارماں کوئی بھی، دل میں یہ حسرت ہے
یہ ساماں دیکھکر اے دوست میرے ہوش بھی گم ہیں ۔۔۔ مگر خود کو سنبھالونگا کہ تیرا رہنما ہوں میں
ادھر دو ہیں ادھر دو روبرو ہیں چار اسٹیچو ۔۔۔ نہ ہو اتنا ابھی اٹلی کے فنکاروں پہ حیراں تو
فرانس، انگلینڈ، یوناں، جرمنی ہر ملک کے تاجر ۔۔۔ ہیں ان سے مستفید اتنے ہی جس رتبے کے ہیں ماہر
مفید ان سب کے حق میں انکے موروثی خزانے ہیں ۔۔۔ بہتے اہل وطن تو دس روپے اور چند آنے ہیں
جب آئی کیا شی سالانہ کا ہنگام آتا ہے ۔۔۔ زباں پر ان کی ابنائے وطن کا نام آتا ہے
نظر آتی نہیں کیا ان کو مزدوروں کی بدحالی ۔۔۔ نہ سمجھیں اب اسے نواب ہے حق میں خوش فالی

غضب ہے ملکیوں کا حال اس درجہ زبوں دیکھیں
وطن میں خاک اڑتی آسماں توقیر یوں دیکھیں

علی منظور

نیلوفر

موسم سرما میں دوپہر کے دو بجے جبکہ درختوں کے سائے ڈھلنے ہونے شروع ہوگئے تھے "سہراب لاج" پر ایک عجیب دلفریب خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے باغ میں ماہ جبین نازک اندام نیلوفر ایک ریشمی خوشنما چھتری لگا آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ گلاب کی مانند تروتازہ چہرہ مسرت کے باعث پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ آنکھیں بظاہر سامنے میز پر رکھے ہوئے پھولدان پر گڑی ہوئی تھیں لیکن ... صرف .... صرف پرویز کا خیال دماغ میں تھا۔ ہوا پھولدار ٹہنیوں کو ہلا رہی تھی۔ گلاب خاردار شاخوں کے درمیان لچک لچک کر سر اٹھا رہا تھا۔ ایک ننھا سا پرندہ ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر اڑتا پھر رہا تھا۔ لیکن اسے ان میں سے کسی بات کی خبر نہ تھی۔ صرف پرویز کا خیال دل میں تھا۔

یکایک اس نے اپنی دراز ریشمیں پلکوں کو اوپر اٹھایا اور ایک عجیب انداز سے مسکرائی۔ ایک لمبی لمبی پشم والی ایرانی بلی بھاگتی ہوئی آئی اور ایک چھلانگ مار کر اس کی گود میں بیٹھ گئی۔ نیلوفر پیار سے اپنی مخروطی صندلی انگلیاں اس کے سر پر پھیرنے لگی۔ پھر ایک دم اس نے جذبات سے بے قابو ہوکر بلی کو زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور کہنے لگی: "نیلم تجھے معلوم بھی ہے کہ تیری نیلو آج کتنی خوش ہے؟ تو حیران ہی سہی لیکن تو بھی میری خوشی میں شریک ہوجا، ورنہ خوشی کی شدت سے میرا سینہ پھٹ جائیگا۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ پرویز کو پاکر کیا دنیا میں کوئی لڑکی کسی اور بات کی خواہش کرسکتی ہے۔ نہیں!! نہیں! میری خوشی پر دنیا بھی خوش نظر آتی ہے۔ یہ ننھا پرندہ کس قدر شوخی کر رہا ہے۔ یہ تازہ کھلے ہوئے پھول کیسے خوش نظر آتے ہیں۔ یہ سرخ گلاب کیسا اٹھلا اٹھلا کر اٹھتا ہے۔ چمن کا ذرہ ذرہ، زمین آسمان سب خوش نظر آتے ہیں۔ مجھ پر مسرتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ لیکن آہ اگر آج میری امی جان زندہ ہوتیں.....؟" یہ کہتے ہوئے نیلوفر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے: "افسوس اگر آج وہ ہوتیں تو کیسے کیسے ارمان نکالتیں۔ ان کی اکلوتی پیاری نیلوفر کی کل شادی ہو لیکن وہ بے خبر سو رہی ہیں اور ابا جان بھی۔ دونوں نے اپنی نیلو کو بھلا دیا ہے۔ ہائے امی جان کی روح کل کتنی بے قرار ہوگی۔ اپنی نیلو کو دلہن بنا ہوا دیکھنے کے لئے وہ کتنی بے چین ہوں گی۔ اب اس دنیا میں میرا کون دیکھکر خوش ہونے والا ہے۔ صرف ایک ضعیف چچا سہراب۔

پیارے چچا جان!!! کس قدر بھولے بھالے۔ نیک طبیعت، میری خوشنودی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار، سب کچھ ماننے کو راضی۔.... مگر امی جان آپ اطمینان رکھئے آپ کا ہونے والا داماد پرویز انسان نہیں فرشتہ ہے، آپ کی نیلوفر کی زندگی اس کے ساتھ بہشت ہوگی۔ پرویز تعلیمیافتہ خوبصورت اور شریف ہے اور ایک بڑے امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بھی خوش قسمتی ہے۔ ورنہ اگر پرویز غریب ہوتا تو چچا جان مشکل سے راضی ہوتے اور شاید نہ بھی ہوتے۔ ہماری پہلی ملاقات بھی کیسی عجیب طرح ہوئی۔ صرف پندرہ ہی دن تو گزرے ہیں۔ سینما دیکھکر باہر نکلی تو موٹر ابھی نہ آئی تھی۔ میں انتظار میں پریشان کھڑی تھی کہ پرویز صاحب تشریف لائے۔ وہ الفاظ اب تک میرے کان میں گونجتے ہیں "محترمہ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں اپنی کار میں آپ کو دولت خانہ تک پہنچا دوں"۔ میں نے تکلفاً کہا: "نہیں رہنے دیجئے آپ کو ناحق تکلیف ہوگی" کہنے لگے "نہیں زحمت کی کیا بات ہے میں تو اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا" یہ تھی ہماری ملاقات جس نے زندگی ہی پلٹ دی۔ دوسرے دن میں نے ان کو چائے کے واسطے مدعو کیا اور بس.... تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم دونوں کو معلوم ہونے لگا کہ زندگی ایک دوسرے کے بغیر بے معنی اور ناممکن ہے..... اور..... اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہم دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لئے ہیں۔

چچا جان تو پہلی ہی ملاقات میں پرویز کے گرویدہ ہوگئے۔ اور کون ہے جو پرویز کو پسند نہ کرسکے۔ چچا جان کو اس سے بہتر کون لڑکا فرزندی کے لئے مل سکتا تھا۔ فوراً پرویز کے خاندان کے متعلق تفتیش شروع کردی اور جب پرویز نے میرا ہاتھ چچا جان سے طلب کیا انہوں نے فوراً منظور کرلیا۔ یہ سب کچھ کتنی جلدی ہوگیا۔ پندرہ ہی دن میں۔ کل میری شادی ہوجائے گی۔ پرویز میرا پرویز، ہمیشہ کے لئے میرا ہوجائے گا۔ نوکر چاکر شادی کی تیاری میں کیسے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ گھر کو کیسا سجا کر دلہن سا بنا دیا ہے۔ پیارے چچا جان آج کل مجھ پر کس قدر مہربان ہیں۔ بار بار مجھے پیار کرتے ہیں۔ بات بات پر ان کی آواز بھرا جاتی ہے کیونکہ میں ان سے جدا ہوجاؤں گی۔ کل کا دن بھی کیسا پُر لطف ہوگا"

نیلوفر یہ باتیں کر رہی تھی کہ پیروں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔

آنکھ اُٹھاکر دیکھا تو ایک نہایت ہی حسین لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں قیامت کی چمک تھی۔ لیکن اُن آنکھوں میں سے شُعلے نکل رہے تھے۔ وہ شُعلے جو چاہتے تھے کہ نیلوفر کو ایک لمحہ میں پھونک کر راکھ کر دیں۔ خوبصورت چہرہ فرطِ غصّہ سے تمتما رہا تھا وہ نیلوفر کو گھور رہی تھی۔ نیلوفر اس کی نظریں دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے کچھ پریشان سی ہوگئی لیکن پھر فوراً ہی مسکراتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ اور ایک کرسی کو آگے کرکے بولی: "آداب عرض بہن، آئیے تشریف رکھیئے مجھے آپ کو دیکھکر بہت ہی مسرت ہوئی۔ کیا آپ یہیں کہیں قریب رہتی ہیں؟"

نووارد لڑکی نے بے رخائی سے مُنہ موڑ لیا اور بغیر جواب دیے کُرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر ایک غمگین انداز سے سر کو، اپنے کندھے پر ڈال دیا۔ نیلوفر اُس کی یہ حالت دیکھکر پھر بولی: "بہن کیا آپ کی کچھ طبیعت ناساز ہے؟"

نووارد لڑکی نے دُرشتی سے جواب دیا: "تمہارا نام نیلوفر ہے نا؟ ہاں میں بیمار ہوں... میرا جسم بیمار نہیں بلکہ میری رُوح بیمار ہے.... اُف خدا.... او خدا۔ تم نیلوفر! ہاں۔ تم مکّار ہو۔ غاصب ہو... تم نے سب مجھے لُوٹ لیا، مجھے تباہ کر دیا برباد کر دیا... تم لُوٹنے والی ہو، تم تہذیب یافتہ بنی پھرتی ہو لیکن دوسروں کے مال پر ڈاکہ ڈالتی ہو اور پھر خوش ہوتی ہو، خدا کے غضب سے نہیں ڈرتیں؟"

نیلوفر: بہن آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں میں نے تو آج آپ کو پہلی دفعہ دیکھا ہے میں آپ کو کس طرح کوئی نقصان پہونچا سکتی ہوں جبکہ آپ کا نام تک میں نہیں جانتی۔

نووارد لڑکی: میرا نام بھی جانتیں.... ہاں.... میرا نام شیریں ہے۔ میرا سب کچھ تباہ کرکے، میرا سب کچھ لیکر مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں کیسے نقصان پہونچا سکتی ہوں۔ پرویز، آہ جان سے عزیز پرویز۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے۔ تم نے اُسے پھانس لیا، اپنے پھندے میں۔ نہ صرف مجھ سے چھین لیا بلکہ مجھ سے اُس کو بیزار بھی کر دیا اب وہ مجھے اپنی صورت تک دکھانے کا روادار نہیں رہا۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ شدید محبت۔ اُسکے ساتھ مر سکتی ہوں لیکن اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

نیلوفر: محترم بہن، ممکن ہے جو آپ کہہ رہی ہیں سچ ہو لیکن میں اسکا مطلق یقین نہیں کر سکتی۔ کیونکہ پرویز مجھ سے قسم کھا کر کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے آج تک کسی لڑکی سے سوائے میرے محبت نہیں کی۔ کیونکہ اُن کی ہر بات پر یقین کرنا میرا ایمان ہے اس لئے میں آپ کی ہر بات کو صرف پرویز پر سفید جھوٹ اور بہتان سے زیادہ نہیں سمجھتی۔

شیریں: ہاں تم اس کو جھوٹ سمجھتی ہو۔ کیوں نہیں۔ کل تو تمہاری اس سے شادی ہونے والی ہے۔ اس خیال سے دل تو خوش کر لو لیکن کان کھولکر سُن لو کہ پرویز میرا رشتہ دار ہے۔ ہم دونوں کی بچپن سے منگنی ہوئی ہوئی ہے اور جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جو روز بروز بڑھتی جارہی تھی لیکن صرف پندرہ دن سے آہ میری زندگی میں انقلاب برپا ہوگیا تم نے کھیل بگاڑ دیا۔ اس کو اُلّو بنا لیا۔ پرویز تو سیدھا سادا ہے بھولا بھالا وہ ان فریب کی باتوں میں پھنس گیا۔ اگر تم مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوتیں تو خیر صبر بھی تھا لیکن تمہاری صورت نہیں بلکہ یہ تمہاری جادو بھری باتیں ہیں جنہوں نے اُسے پاگل بنا دیا ہے۔ لیکن تم کبھی خوش نہ رہ سکو گی وہ درحقیقت مجھ سے محبت کرتا ہے مگر تم نے میرے پریم مندر کو اُجاڑ دیا ہے۔

نیلوفر (تلخی سے) پیاری بہن مجھے آپ کی ناکامی پر بہت افسوس ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ آپ کی اتنے برسوں کی سچی محبت اس قدر جلد ہی بدل جاتی۔ جس سے ظاہر ہے کہ آپ کی محبت سچی نہ تھی۔ اور آپ کی پریم مندر کی دیواریں اس قدر کمزور تھیں کہ ہوا کے ایک ہی جھونکے سے گر گئیں لیکن آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں، خدا آپ کے حُسن کو برقرار رکھے پرویز سے بھی بہتر قدرداں مل سکتے ہیں۔

شیریں: (سختی سے) بس خاموش ظالم لڑکی! تم میرا مذاق اُڑاتی ہو۔ میرا سب کچھ لُوٹ کر تباہ و برباد کر دو۔ لیکن مت خوش ہو۔ تم بھی ایک دن اسی طرح تباہ ہوگی۔ میرے انتقام کی آگ تم دونوں کو جلا دے گی، پھونک دے گی۔ تم کبھی چین سے نہ رہو گی۔ لِلّٰہ پرویز کو مجھے واپس دیدو، مجھے دوزخ میں نہ دھکیلو۔

نیلوفر: (بے رخائی سے) آپ لے لیجئے اگر لے سکیں۔

شیریں: میں کیسے لے سکتی ہوں تم چھوڑو بھی۔

نیلوفر: میں نے کیا انہیں باندھ رکھا ہے؟ آپ کہتی ہیں کہ وہ آپ سے سچی محبت کرتے ہیں۔ اور........

وہ بات بھی ختم نہ کرنے پائی تھی کہ پرویز آجاتا ہے۔ پرویز کو دیکھکر شیریں کی رنگت زرد پڑ جاتی ہے اور پرویز شیریں کی طرف دیکھکر ایک دم پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ یہاں کس لئے آئی۔ نیلوفر فوراً پرویز کی طرف دوڑتی ہے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہتی ہے: "پرویز... میرے پرویز، یہ لڑکی کہتی ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ اب سے نہیں کئی سال سے، اور صرف پندرہ دن سے تم بدل گئے ہو" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے پھر کہتی ہے: "پرویز قسم کھا کر کہدو کہ تم اس لڑکی کو نہیں جانتے نہ اس سے

محبت کرتے ہو پرویز!!! تمہارے اس جواب پر میری زندگی منحصر ہے۔"

پرویز۔ نیلوفر... نیلوفر۔ میری رُوح اتنی سی بات پر رو رو کر اپنی پیاری آنکھیں خراب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ۔ (پھر سختی سے شیریں سے کہتا ہے) شیریں تم یہاں کیوں آئیں! کس نے بلایا؟"

شیریں۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) اتنی سختی سے کیوں بولتے ہو پرویز مجھے کسی نے نہیں بلایا مجھے تمہاری محبت یہاں کھینچ لائی۔ کیا تمہارے سب وعدوں اور چار سال کی محبت کے بعد بھی مجھے تم سے کچھ سوال کرنے کا حق نہیں۔"

پرویز۔ میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی نہ کوئی وعدہ کیا۔ تم جھوٹ بولتی ہو اور محض نیلوفر کو ستانے آئی ہو۔ نیلوفر، یہ لڑکی میری رشتہ دار ہے صرف اس وجہ سے میں اسے جانتا ہوں۔ میں اس سے کبھی محبت نہیں کر سکتا۔

شیریں۔ پرویز، پرویز! میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

پرویز۔ (غضبناک ہو کر) اگر سچی محبت کرتی ہو تو خاموش رہو محبت کی خاطر کچھ قربانی کرو اور محبوب کی رضا پر راضی رہو اور اب یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔"

شیریں۔ تم مجھے نکال کیوں رہے ہو یہ تمہارا مکان تو نہیں ہے۔

پرویز۔ کمینی یہاں سے فوراً دور ہو جا۔"

نیلوفر، پرویز کو غصہ میں دیکھ کر کانپ جاتی ہے۔

شیریں۔ (رو رو کر کہتی ہے) آہ اتنے وعدوں کے بعد ایسا سخت دھوکا۔ خدایا کیا خبر تھی کہ قسمت میں یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔"

پرویز۔ بس بس یہ مکاری ختم کر۔"

شیریں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے تک لے جاتا ہے۔ نیلوفر روکنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔

پرویز۔ بس جاؤ فوراً نکل جاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

شیریں خاموشی سے آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔ نیلوفر بالکل ساکت اپنی جگہ پر کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا میرے لئے بھی یہی دن کھڑا ہے کہ پرویز نے آ کر چونکا دیا۔

پرویز۔ نیلوفر خاموش کیوں ہوں؟ بیٹھو اب تو بلا ٹل گئی۔"

نیلوفر کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔" دیکھو تو پیاری نیلوفر میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں۔"

جیب میں سے ایک ننھی سی ڈبیا نکال کر کھولتا ہے۔ ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی جگمگانے لگتی ہے۔ انگوٹھی کو نکال کر چومتا ہے پھر نیلوفر کی انگلی میں پہنا دیتا ہے۔ نیلوفر بولنا چاہتی ہے لیکن شکریہ کی جگہ آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

پرویز۔ ہائیں تم رو کیوں رہی ہو؟۔

نیلوفر۔ پرویز قسم کھا کر بتاؤ کہ تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے۔

پرویز۔ میری نیلوفر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس لڑکی سے محبت نہیں کرتا۔ کیا تم مجھ پر شبہ بھی کر سکتی ہو۔ بیشک یہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن میں اس کا جواب نہ دے سکا نہ کبھی دے سکتا ہوں، اسی لئے یہ انتقام لینے آئی تھی۔ ہماری شادی میں رخنہ ڈالنے۔"

نیلوفر۔ اچھا انتقام لینے آئی تھی یہ بات ہے... ہاں پرویز اب میرا اطمینان ہو گیا۔ (ہارن کی آواز آتی ہے) اہا چچا جان آ گئے۔ (پھر مسکرا کر پرویز سے) لیکن پرویز میرا خیال ہے تم اس وقت چلے جاؤ۔ کیونکہ چچا جان ہم دونوں کو اس طرح بیٹھا دیکھ کر دل میں کیا کہیں گے۔"

پرویز۔ ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں نیلوفر۔ کل کا دن بھی کس قدر مبارک ہے کہ پھر تم کو کبھی شبہ کرنے کا موقع نہ ملے گا نیلوفر، اب تو خوش ہو جاؤ۔

نیلوفر۔ ہاں ہاں میں خوش ہوں پیارے پرویز، میں تم پر پورا بھروسہ کرتی ہوں، اچھا خدا حافظ، چچا جان آ گئے۔

پرویز چلا جاتا ہے۔ نیلوفر سیٹھ سہراب جی کے پاس دوڑی دوڑی آ کر کہتی ہے: "چچا جان آج تو آپ بہت جلد واپس آ گئے۔"

سہراب جی۔ ہاں بیٹا اب مجھے واپس جانا ہے رات کے نو بجے واپس آؤنگا۔ چلو چلکر چاء پی لیں۔ اور دیکھو نیلوفر میں تمہارے لئے بہت سی چیزیں لایا ہوں۔ سب موٹر میں رکھی ہیں۔ پرویز نے بھی تمہارے واسطے ایک ساڑھی بھیجی ہے۔ چاء پی کر دیکھنا۔"

چاء پی کر سہراب جی تو پھر چلے جاتے ہیں نیلوفر خوشی خوشی جا کر ساڑھیاں اور کپڑے موٹر میں سے لاتی ہے۔ سب کو اپنے کمرے میں رکھ دیتی ہے۔" اہا کتنی پیاری چیزیں۔ کیسے قیمتی کپڑے اور اوہو یہ زرتار ساڑھی، کل پہننے کے لئے پرویز کی طرف سے... کتنی خوبصورت ہے۔" اُوپر اُٹھاتی ہے۔ ایک پرچہ گرتا ہے۔" اپنی نیلوفر کو پرویز کی طرف سے" پرچے کو اُٹھا کر پڑھتی ہے اور محبت سے بے قابو ہو کر چوم لیتی ہے۔ پھر کہتی ہے" پرویز اس قدر فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی۔ اچھا میں کل اس ساڑھی کو پہنوں گی۔ کتنی نفیس اور قیمتی ہے۔"

ایک دم دروازہ کھلتا ہے اور نوکر ایک خط دیتا ہے اور ایک چھوٹا سا پیکٹ دیتا ہے کہ حضور یہ ایک آدمی دے گیا ہے۔ کہ شیریں بیگم نے بھیجے ہیں۔ کچھ پریشان سی ہو کر نیلوفر خط لے لیتی ہے اور کھول کر پڑھتی ہے:-

پیاری بہن نیلوفر!

آپ کو جس وقت یہ خط ملے گا اُس وقت میری رُوح اِس

ناکارہ جسم کو چھوڑ چکی ہوگی۔ جو کچھ ہوا خیر میری قسمت میں یہی لکھا تھا میں نے سچی محبت کی اس کا خوب پھل ملا جس پر جان فدا کی اسی نے مجھے ٹھکرا دیا۔ پامال کر دیا۔ رُخ بدل دیا۔ پیاری بہن! مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو بے جا باتیں کہیں۔ مگر بہن برائے کرم مجھے معاف کر دینا کیونکہ محبت نے میری آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ پرویز کی طرف شبہ کرنے ہی کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن جب حقیقت نے پردہ اُٹھا دیا تب اصلیت معلوم ہوئی۔ خدا کے لئے بہن مجھو معاف کر دینا۔ میری حالت رحم کے قابل ہے۔ آہ میرا سب کچھ لُٹ گیا، تباہ و برباد ہو گیا۔ میری اُمیدوں کا خون ہو گیا۔ میری آرزوئیں پامال ہو گئیں، میری حسرتیں مٹ گئیں۔ میری خوشیاں فنا ہو گئیں۔ اب اس دُنیا میں رہنے سے کیا فائدہ۔ زندگی پرویز کے بغیر بیکار ہے، بالکل بے معنی۔ مجھے اس پر کچھ حق حاصل نہیں بے شک آپ حق دار ہیں کیونکہ آپ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ خدا آپ کی شادی مبارک کرے اور آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ آخر میں یہ آپ سے پھر کہتی ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا تھا بالکل سچ ہے۔ پرویز مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اب سے تین مہینے پہلے وہ سیر کے واسطے کشمیر گئے تھے وہاں سے اُنہوں نے مجھے یہ چھ خط بھیجے تھے۔ آپ محبت کا اندازہ انہیں خطوں سے خوب لگا لیں گی۔ دل تو نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو یہ خط دکھاؤں لیکن اس خوف سے کہ آپ تمام عمر جھوٹا خیال نہ کرتی رہیں، یہ بھیجتی ہوں۔ خدا کرے پرویز آپ کے ساتھ وفادار رہیں۔ اچھا اب خدا حافظ، موت میرا انتظار کر رہی ہے۔ خدا آپ پر خوشیوں کی بارش کرے۔ حرماں نصیب

شیریں"

خط نیلوفر کے کپکپاتے ہاتھوں سے گر پڑتا ہے وہ پیکٹ کھولکر ایک خط نکالتی ہے لکھائی دیکھتے ہی پورا یقین ہو جاتا ہے کہ پرویز کا ہے فوراً تاریخ دیکھتی ہے۔ تین مہینے پہلے کی تاریخ پڑی ہوتی ہے۔ ایک ایک کر کے سب خط پڑھ لیتی ہے۔

"آہ، یہ خط، ایک ایک لفظ محبت سے بھرا ہوا ہے۔ شیریں سچ کہتی تھی۔ اُف پرویز یہ تم نے کیا کیا۔ کتنا بڑا دھوکا۔ کتنا سفید جھوٹ، اس کے ساتھ قسمیں کہ میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی، اور بیچاری اس لڑکی کو جو پندرہ دن پہلے محبوبہ رہ چکی ہو اس طرح دھکے دیکر نکالنا۔ ہائے پرویز تم انسانیت کے پردے میں حیوان نکلے۔ سخت دغاباز۔ تم قاتل ہو۔ تم نے شیریں کی جان لی۔ آہ کیا خبر تم میری بھی جان اسی طرح لو لیکن میں اس سے پہلے ہی اپنی جان دے دونگی میں ہی شیریں کی موت کا سبب بنی۔ اس کی موت کے بعد مجھے زندہ رہنے کا کیا حق ہے۔ ہائے پرویز، میرے پرویز۔ تم سے یہ اُمید نہ تھی۔ تم نے مجھے جنت دکھا کر چھین لی۔ کتنا سخت دھوکا ہوا۔ پرویز میں تم کو دیوتا سمجھتی تھی۔ میں نے تمہاری پوجا کی۔ ان پندرہ دنوں میں ہر سانس تمہارا ہی نام پکارتی تھی۔ افسوس تم دروغگو ہو، بزدل ہو، کمینے ہو، سچ بولنے سے ڈرتے ہو۔ تم نے ایک کمزور عورت کو اپنی محبت میں پھنسا کر پھر اُسے ذلیل کیا۔ اور پھر ایک دوسری کمزور عورت کو فریب دے رہے ہو لیکن میں فریب میں نہ آؤں گی۔ میں اس سے پہلے اپنی جان دیدوں گی۔ میں اپنی زندگی ایسے شخص سے وابستہ نہیں کر سکتی۔ لیکن آہ اس سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میں اب بھی اُس سے محبت کرتی ہوں۔ آہ پرویز میں اب بھی تمہاری محبت میں کھنچی جا رہی ہوں۔ دل سے مجبور ہوں۔ مگر تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ افسوس تم نے بڑا سخت دھوکا دیا۔"

یہ کہتے کہتے نیلوفر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ پھر ایکدم کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایرانی بلی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ نیلوفر دوڑ کر اُسے گود میں اُٹھا لیتی ہے اور کہتی ہے "میری نیلم سنتی ہو پرویز نے مجھے دھوکا دیدیا۔ اب سب کچھ لُٹ گیا تباہ ہو گیا۔ دل چاہتا ہے اپنے آپ کو بھی تباہ کر ڈالوں۔ ان کپڑوں کو ــــ ہاں ان قیمتی کپڑوں کو جلا دوں پھونک ڈالوں۔ اُف، یہ کیا ہو گیا۔ اے زمین پھٹ جا، تاکہ میں تجھ میں سما جاؤں۔ اے برق تو ہی گر پڑ اور پھونک ڈال مجھے، اس گھر کو، ہر چیز کو۔ ہاں ہاں میں آگ لگا دوں گی ابھی کمرے کو سب کچھ جل جائیگا۔ یہ کپڑے، یہ پردے، یہ قالین، صوفے، میزیں، کرسیاں، گدے۔ چچا جان گھر سے باہر ہیں نو بجے واپس ہونگے۔ اس وقت ۸ بجے ہیں۔ نوکر سب دُور ہیں۔ آگ کا اس وقت باہر پتہ چلے گا جب قابو سے باہر ہو جائیگی۔ سُنتی ہے نیلم، تیری نیلوفر اسی کمرے میں خاک ہو کر رہ جائے گی۔ تیرا دل چاہے تو تو بھی رہ جا۔ مگر تو کیوں اپنی جان دے" یہ کہہ کر بلی کو کمرے سے باہر چھوڑ دیتی ہے۔ پھر کمرے کے دروازے بند کر دیتی ہے۔ قالین فرش پر سے اٹھا کر کھڑکی میں رکھ کر کہتی ہے "کھڑکی میں رکھنے سے یہ جلدی آگ پکڑ لے گا۔ پردہ جلتے ہی یہ بھی جلنے لگے گا۔" کرسیاں بھی کھڑکی کے قریب رکھتی ہے پھر خود ایک کرسی پر بیٹھ کر بیکسی کے عالم میں رونا شروع کر دیتی ہے "آہ میں کیا کروں ــ میں کیا کروں ... ۔"

شام کے چھ بجے ہیں۔ شیریں بھی اپنے کمرے میں بیقرار ہے۔ اضطراب نے اُس کی صورت ہی بدل دی ہے۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے سُرخ ہیں۔ چہرہ حد سے زیادہ غمگین ہے۔ اپنے آپ سے کہتی ہے: "آہ سب کچھ لٹ گیا۔ رونے کو کچھ باقی نہیں۔ میری قسمت میں محرومی ہی لکھی تھی۔ لیکن اوخُدا ان سب مایوسیوں کے باوجود جان دینی کس قدر مشکل معلوم ہورہی ہے۔ مجھے ایک خط پرویز کو بھی لکھنا چاہیئے۔ پیارے پرویز کو آخری خط۔ آخری سلام۔ ہائے اس ظالم پرویز نے مجھے تباہ کر دیا" کُرسی پر بیٹھکر جلدی جلدی خط لکھ کر نوکر کو دیتی ہے کہ پرویز کو دے آئے۔ یہ کہتی ہے: "نیلوفر کو بھی اب میرا خط پہونچ گیا ہوگا۔ شاید وہ خوش ہوگی کہ اُس کی خوشیوں کی راہ سے کانٹا نکل گیا۔ مگر مجھے کیا۔ موت مجھے پکار رہی ہے۔ آہ باہر کس قدر سردی ہے۔ کیسا بھیانک منظر ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے" اوڑھنے کے لئے شال اُٹھاتی ہے۔ پھر ایک دم چھوڑ کر کہتی ہے "میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ اس جان کو تو برباد کرنے جارہی ہوں مگر آسائش کا خیال اب بھی دل میں ہے۔ اس وقت سردی سے بچ گئی تو کیا دو منٹ بعد جب کنوئیں کے سرد پانی میں میری لاش پڑی ہوگی تب کیا ہوگا" اس خیال سے اس کو پھریری آگئی "ہائے میری امّی میرے ابا جان جب اپنی شیریں کی لاش دیکھیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔ کن کن ارمانوں سے پرورش کیا یہ انجام دیکھکر اُن کا دل پھٹ جائے گا۔ میں تو اسوقت ہونگی نہیں خدا ہی اُن کو صبر دیگا"

یہ سوچ کر اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ وہ ہمّت کرکے سب کی نظروں سے بچتی ہوئی کنوئیں پر پہونچ جاتی ہے۔ کنوئیں پر کھڑے ہوکر اندر دیکھتی ہے اور کہتی ہے "اُف کس قدر تاریک، کتنا بھیانک، گویا موت مُنہ کھولے ہوئے ہے۔ اف خدا میری ہمت پست ہوئی جاتی ہے۔ پرویز میرے پیارے پرویز میں اِس دُنیا سے جارہی ہوں تم خوش ہوجاؤ۔ آہ کس قدر سردی ہے۔ میں کیسے اس سرد یخ پانی میں کُودجاؤں مگر وقت گُزر رہا ہے۔ مجھے جلدی کرنی چاہیئے۔ اچھا لے دُنیا والو خدا حافظ۔ زندگی اسی کا نام ہے" اپنے گھر کی طرف حسرت بھری نگاہ ڈالتی ہے "الے میرے عزیزو خدا حافظ۔ پرویز خدا حافظ۔ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہارے نام پر جان دے رہی ہوں" یہ کہتے ہوئے شیریں پانی میں کُود جاتی ہے۔ پانی میں ایک دھما کا ہوتا ہے اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔

شام کے چھ بجے کا وقت۔ پرویز ڈریسنگ روم میں نیلوفر کے گھر جانے کے لئے لباس پہنے تیار آئینے کے سامنے کھڑا ہے۔ نوکر داخل ہوتا ہے اور شیریں کا خط دے کر چلا جاتا ہے۔ پرویز خط کھولکر پڑھتا ہے:

"پیارے پرویز!

جس وقت آپ کو یہ خط ملے گا اُس وقت میری لاش کنوئیں کے سرد پانی میں تیر رہی ہوگی۔ میں اس لئے جان نہیں دے رہی کہ آپ نے میرے ساتھ ایسا سُلوک کیا۔ وہ تو میری قسمت تھی۔ بلکہ میں اس لئے جان دے رہی ہوں کہ جس سے میری زندگی وابستہ تھی جب اُسی نے مجھے چھوڑ دیا تو زندہ رہنے ہی سے کیا فائدہ۔ کاش میرے موت کی خبر آپ کے دل کو خوش کرسکے۔ خدا کرے آپ نیلوفر کے ساتھ ہمیشہ خوش رہیں۔ خُدا اپنی رحمتوں کی بارش آپ پر کرے۔ وقت کم ہے اس لئے خط ختم کرتی ہوں۔ میرا آخری سلام قبول کیجئے۔ جو کچھ میں نے کیا اُس کو خدا کے لئے معاف کر دیں۔ میں اب بھی آپ سے محبت کرتی ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک کرتی رہوں گی بلکہ مرنے کے بعد بھی میری رُوح آپ کے لئے تڑپتی رہے گی۔ اچھا خدا حافظ۔ ہاں جو خط آپ نے مجھے کشمیر سے بھیجے تھے وہ میں نے نیلوفر کو بھیجدئے۔ کیونکہ مجھے اُن کے رکھنے کا اب کوئی حق نہیں۔

ہمیشہ آپ کی

شیریں"

خط پڑھکر پرویز بدحواس سا ہوجاتا ہے "آہ پیاری شیریں یہ تم نے کیا کیا؟ تم تو بہت تیز نکلیں۔ خدایا میں قاتل ہوں، مجھے معاف کردے۔ آہ میں نے ہی شیریں کی جان لی۔ اُف میں کیا کروں۔ آخر تم نے جان کیوں دی مجھ دھوکے باز کی خاطر۔ اومعبود مجھے معاف کردے۔ اب میں نیلوفر کے پاس جاکر یہ رُوح فرسا خبر سناؤں گا کہ پیاری شیریں نے اپنی زندگی ہم پر سے قربان کر دی"

فوراً کمرے سے باہر نکل جاتا ہے اور "سہراب لاج" کا رُخ کرتا ہے۔ وہاں پہونچکر دیکھتا ہے کہ قیامت کا سماں ہے۔ مکان سے آگ کے شعلے نکل نکل کر آسمان تک پہونچ رہے ہیں۔ آگ بُجھانے والے انجن برابر پانی ڈال رہے ہیں۔ لیکن آگ ہے کہ اور بھی بھڑک رہی ہے۔ نوکر چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ "خدا کے لئے کوئی سیٹھ صاحب کی بھتیجی کو بچالے۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ سیٹھ صاحب اُس کو مالامال کر دینگے" سب سُن رہے ہیں لیکن اپنی جان خطرے میں ڈالنے سے ہچکچاتے ہیں۔ پرویز یہ حالت دیکھکر مجنوں سا ہوگیا۔ ابھی ایک محبوبہ شیریں کی موت کا صدمہ

دل پر تھا کہ دوسری محبوبہ نیلوفر کو موت کی گود میں پایا۔ فوراً بھاگتا ہوا آگ کے شعلوں میں گھس گیا۔ دروازے کو جھنجوڑا لیکن وہ بند تھا۔ فوراً کھڑکی پر سے کود "نیلوفر، نیلوفر" پکارتا اندر گھس گیا۔ نیلوفر دھوئیں میں گھٹی ہوئی تھی۔ پرویز نے اس کو پکڑ کر کھینچا۔ "پیاری نیلوفر چلو، جلدی بھاگو" لیکن نیلوفر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور کہنے لگی "پرویز تم دھوکے باز ہو، میں نے تمہارے خط پڑھ لئے۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ درحقیقت تم شیریں سے محبت کرتے تھے، اس نے تمہاری خاطر اپنی جان دیدی۔ اب تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ میں نے تم سے محبت کی، تمہاری پوجا کی لیکن تم دغاباز ثابت ہوئے"

پرویز گھٹنوں کے بل نیلوفر کے آگے جھک جاتا ہے۔ "میری نیلوفر مجھے معاف کردو۔ شیریں نے بھی مجھے معاف کر دیا تم بھی معاف کردو۔ للہ مگر باہر چلو میری جان، ورنہ ہم دونوں ہی یہاں مرجائینگے"

نیلوفر:۔ "اگر میرا باہر نکلنے کا ارادہ ہوتا تو میں گھر میں آگ ہی کیوں لگاتی ـــــ"

پرویز:۔ (حیرت سے) "تو کیا آگ تم نے لگائی؟"

نیلوفر:۔ "ہاں میں نے"

پرویز:۔ "کیوں؟"

نیلوفر:۔ "کیونکہ میں اب تم سے شادی نہیں کرسکتی تھی اور نہ انکار کرسکتی تھی۔ کیونکہ میں اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اس لئے میں نے اپنی جان اس طریقے سے دینے کا ارادہ کرلیا۔ مگر تم آزاد ہو۔ اب بھی چلے جاؤ پرویز۔ تم اب بھی بچ سکتے ہو"

پرویز:۔ "نہیں میں نہیں جاؤں گا"

نیلوفر:۔ (خوشی سے چیخ کر) "ہائیں، کیا نہیں جاؤ گے؟"

پرویز:۔ "ہاں میں نے بھی ارادہ کرلیا ہے کہ نہیں جاؤں گا یہیں تمہارے ہی ساتھ مروں گا۔ میں بھی جان دے سکتا ہوں۔ بزدل نہیں ہوں ـــــ نیلوفر اب تو معاف کردو"

"میرے پرویز، میرے پرویز" کہتی ہوئی نیلوفر دوڑ کر پرویز سے لپٹ جاتی ہے اور کہتی ہے "میری جان میں سمجھتی تھی کہ میں نے تم کو کھو دیا مگر نہیں، میں نے پھر دوبارہ تم کو پالیا۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے ..." وہ بات ختم کرنے بھی نہ پائی تھی کہ مکان کی چھت ان پر چڑ چڑ کرتی ہوئی گر پڑی اور دو محبت سے دھڑکتے ہوئے دل خاک کے اس ڈھیر کے نیچے ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے۔

اختر قریشی۔ بی۔اے؛ بی۔ٹی؛

ایک نئے بچے کا عزم

زمانے کے حوادث سے کبھی ہم منہ نہ موڑینگے
قسم ماضی کی مستقبل کو روشن کرکے چھوڑینگے

کرینگے اک نہ اک دن چاک ہم دریا کے سینے کو
نکالیں گے بھنور سے ناخدا بنکر سفینے کو

جو ناممکن ہے دنیا میں اُسے ممکن بنائیں گے
ہمیں بڑھنے تو دو ہم بڑھکے تارے توڑ لائینگے

نہ لیگا نام ظلم و جور کا کوئی زمانے میں
ڈھلے گا عدل کا سکہ ہمارے کارخانے میں

پلٹ جائیگی قسمت دیکھ لینا فاقہ مستوں کی
جھکیں گی گردنیں مفلس کے در پر زرپرستوں کی

ہر اک چھوٹے بڑے کو دینگے ہم درسِ رواداری
دماغوں سے نکالیں گے خیالِ مردم آزاری

بدل جائے گی دنیا جب ہمارا دور آئے گا
مسرت ساز چھیڑے گی زمانہ گیت گائے گا

محسن اعظم گڑھی؛

ہارمونیم کی موت کے بعد؟

ہندوستان جنت نشان کے کسی رنگین شہر کے ایک حسین بازار میں ایک بے ڈول بدقوارہ حبشی صاحب گذر رہے تھے، راستے میں دور ایک مرصع خوبصورت آئینہ اُلٹا پڑا تھا۔ عجوبہ چیز دیکھ کر چپکے چپکے پاس آئے اور اُٹھا کر جیسے ہی دیکھا اپنی ہولناک اور بدہیبت صورت نظر پڑی۔ گھبرا کر لاحول پڑھی اور اسی طرح اوندھا رکھدیا۔ سنا ہے کہ گھر آکر ہم قوموں سے حال بیان کیا اور بعد مشورہ یہ طے پایا کہ ایک تیز تنقید آئینہ پر لکھی جائے اور ہر زبان میں لکھی جائے۔ غالباً انگریزی میں اسکا ترجمہ ہو۔ The Beauty Mirror on... ...Negger's Ban & what they say about it.. اور شاید مولوی شاہد صاحب یا ممتاز بی۔ اے، بی۔ ٹی، یا شاہِ مترجماں مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے اس کا ترجمہ یوں کر دیں "مرقع حسن وجمال ڈلاؤ پر"

ہندوستان کی موسیقی بندر کا ناریل ہے۔ جس طرح ہر دیہاتی اہل زبان ہے اسی طرح ہر کس و ناکس اس کا ماہر ہے۔ کیونکہ اپنے ملک کی اور اپنی چیز ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جس تاریخ سے اے۔ آئی۔ آر۔ نے نزولِ اجلال فرمایا ہے جو مٹی پلید اس غریب کی ہو رہی ہے خدا "نازی" کی بھی نہ کرے۔ عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے زمانے میں تو اس فن کا نقلی جنازہ نکالا گیا تھا اور اے۔ آئی۔ آر کے دورِ حکومت میں اصلی کام شروع ہے۔

شاہد صاحب کا تبصرہ اپریل میں پڑھا تھا۔ خیال آیا کہ کچھ ہم بھی لکھ ڈالیں مگر واللہ خدا کی قدرت آجکل موسموں کا تداخل ہے۔ فاسد مادہ ہر طرف خود بخود نکل رہا ہے معلوم نہیں یہ آنکھیں کیا کچھ نہ دکھائیں، چیچک ہو رہے۔ پرسوں کا واقعہ عجیب ہوا، شام کے وقت آندھی کے جھونک میں دو چار اوراق پریشان کہاں سے کس طرح اُڑ آتے۔ واللہ اعلم کسی صاحب نے پڑھکر اور مطلب کچھ نہ پاکر (Thrown to the winds) "ایں دفتر بے معنی!..." آندھی کے سپرد کر دئے ہوں۔ بچوں نے دوڑ کر ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُنکے مطلب کی سب سے پہلی چیز "تصویریں" اور تصویروں میں بھی وہ مایۂ ناز تصویر "Give them a chance" دیکھی جانے گی۔ ایک صاحبزادی نے ہولناک "اُوئی" کے ساتھ کہا "توبہ کیسی بُری صورت کے بچے ہیں!" دوسری اُن سے ذرا سنجیدہ اور ... تھیں فرمایا کہ "بیوقوف ہو بچے تو خاصی پیاری پیاری صورت کے ہیں۔ تصویر اُتارنے والوں کو کہو کہ صورتیں بگاڑ کر اُتاری ہے"

ہم نے یہ مصرع موزوں کیا ع:۔

ایک وہ ہیں کہ دیا انکی بھی صورت کو بگاڑ

خدا نہ کرے کہ تداخل کا فاسد مادہ کسی کے جسم میں رہ جائے اور خدا نہ کرے کہ وہ اخلاق و کردار کو یوں بگاڑ دے جس طرح بچوں کی صورتیں بگڑ گئیں۔ تصویر سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہارمونیم کی کریہہ آوازی سے بچوں کے منہ پھٹ گئے۔ انصاف تو جب تھا جب اے۔ آئی۔ آر کے ڈائرکٹر صاحب بہادر اپنے کسی مایۂ ناز پروفیسر موسیقی جو طنبورے پر گاتے ہوں اُن کی بھی دو چار، دھرپد، دھرپت اور خیال گاتے وقت کی شائع فرماتے۔ تاکہ ناظرین کرام جس طرح ہارمونیم کی کراہت کا معصوم بچوں پر اثر دیکھتے اسی طرح طنبورے کے حسن کا اثر ایک خرانٹ گوئیے پر بھی ظاہر ہو جاتا۔ چونکہ حقیقت کا انکشاف نہ اُن کے بس کی بات تھی اور نہ مقصود تھا اسلئے مجبور تھے۔ اُن کو غالباً یہ راز معلوم نہیں کہ خرانٹ گوّیا عام اس سے کہ وہ کریہہ الصوت ساز پر گاتا ہو، خواہ حسین الصوت ساز پر اس کی صفت یہ ہے کہ الفاظ کو غیر مفہوم اور صورت کو مفہوم بنا ڈالے۔ یعنی ہندوستان کا اصلی اتھالی اے۔ آئی۔ آر کا گوّیا وہ ہے جس کو بزبانِ شعریوں کہا جائے ع:۔

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ڈائرکٹر صاحب کا یہ فلسفہ کہ کریہہ الصوت ساز کے ساتھ گانے سے صورت بھی کریہہ ہو جاتی ہے یقیناً عقل سلیم سے اتنا ہی دور ہے جتنے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے "بندہ" سے دور ہیں۔ اور یقیناً یہ فلسفہ ہنستے ہنستے رو دینے کے لائق ہے۔ ان اوراق پریشاں کو دیکھکر دوسری بات جس سے طبیعت گونہ محظوظ ہوئی وہ اس کی زبان ہے۔ رسالہ کا اسم گرامی اور اُس کی زبان۔ گویا ہندوستانی سامعین سے خطاب کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب نے انگریزی زبان منتخب

فرمائی۔ اگر یہ رسالہ انگریزوں کے لئے ہے تو انڈین کا لفظ اس کے لئے ایسا ہی غیر موزوں ہے جیسے ہندوستانی ڈائرکٹر کے لئے "ہیٹ" (Hat) یعنی اس نیٹوی چہرے پر اور ہیٹ کی زیبائش۔ مٹی کی صراحی پر بلور کا پیمانہ۔ کاش ڈائرکٹر صاحب فنِ تسمیہ کے اس حق پر غور فرماتے۔

نفسِ مضمون سے بحث کرنے سے قبل صرف مندرجہ بالا دو نکات فیصلہ کر لینے والوں کے لئے کافی ہیں۔ اور ڈائرکٹر صاحب یا ایڈیٹر صاحب "انڈین لسنر" کے اس مضمون سے ایک ثقہ پڑھنے والا اس ذہنیت کا اندازہ کر سکتا ہے جس کی ماتحت یہ زرّیں مقالہ سپردِ قلم کیا گیا۔ زندگی کی کشمکش اور تنازعۃ البقا کی تگ و دو میں انسان کیا کچھ نہیں کرتا اور جہاں تک روٹی کپڑے کا سوال ہے ممبرانِ سلے۔ آئی۔ آر نے حقِ نمک ادا کیا۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں تک نفیس خوراک، اچھی پوشاک موٹی آمدنی کا سوال ہے دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی ہولناک۔ محیر العقول۔ انسانیت سے منحرف اور اخلاقیات سے باغی حرکت آپ کر ڈالئے انشاء اللہ تعالیٰ پیسوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوگا۔ آئیے ہم آپ کو ہردوار کے میلے، پیران کلیر کے عُرس کی سیر کرائیں۔ پہلے ایسے بازار میں چلئے جہاں دُکانیں ہیں، سودے والے چیخ چیخکر، گا گا کر، رو رو کر آوازیں لگا رہے ہیں۔ ہر کس و ناکس ہنستا ہے ادھر سے گذرتا ہے مگر خریدتا نہیں، خریدیگا وہ جو گھر سے اس کا عزم کر کے پیسے لیکر آیا ہے۔ ہر شخص پر ان چیخوں کا، نغموں کا۔ اثر نہیں۔ آئیے اب آپ کو ایسے مقام کی سیر کرائیں جہاں سڑک کے دونوں طرف انجمن فقراء الہند کے رُکن اپنی کرشمہ سازیوں میں مشغول ہیں۔ کوئی صاحب اوپر کا جسم آدھا زمین میں دفن کئے پڑے ہیں۔ کوئی صاحب جلتی زمین پر لوٹ رہے ہیں۔ کسی نے سارے جسم میں چاقو گھسیڑ رکھے ہیں۔ کوئی آنکھوں میں تکلے چبھوئے بیٹھا خون میں نہا رہا ہے۔ کوئی خرافات بک رہا ہے ان سب ہولناک حرکتوں میں وہ جاذبیت ہے کہ آنے جانے والا تو یہ توبہ کر کے پھریریاں لیکر پیسہ دھیلا ڈال جاتا ہے اور اس طرح مالِ غنیمت کا انبار صبح سے شام تک ان حضرات کی جیبیں گرم کر دیتا ہے۔ ایک سوامی ویدانت کے مسئلہ پر کھڑے چیخ رہے ہیں ایک مولوی صاحب توحید پر گرما رہے ہیں۔ کون سُنتا ہے فغاں درویش، سننے والوں کا ہی مجمع نہیں ہوتا۔ عمل تو دُور رہے۔ دوسری طرف ایک مداری سانپ گلے میں ڈالے ڈگڈگی بجا رہا ہے، لوگ جوق جوق جا رہے ہیں اللہ رے کشش۔ جہاں تک اس بیان سے تعلق ہے ہارمونیم کے استخراج پر یہ محیر العقول مقالہ دستِ غیب کا اثر رکھتا ہے۔ تسخیرِ قلب کا عمل ہے۔ اس کے لکھنے والوں اور اس پر عمل کرنیوالوں کیلئے اس بے روزگاری کے زمانے میں پیسوں کا گھاٹا نہیں۔

شاہد صاحب نے اس مقالہ کے متعلق اجمالی مقالہ لکھا ہے اسی قدر کافی تھا مگر سلے۔ آئی۔ آر کا یہ طرزِ عمل محض اس وجہ سے کہ پبلک کا پیسہ اُن کے پو۔ ڈے کے نیچے کافی ذرا جید قسم کا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اُس کا رد بھی تواتر کے ساتھ کیا جائے اور پورے زور اور قوت کے ساتھ کیا جائے۔

آئیے اب ذرا فنی حیثیت سے بھی سلے۔ آئی۔ آر کے اس اقدام کا تجزیہ کیا جائے۔ اور ہندوستانی موسیقی کے لئے ان حضرات نے جو عروسی لباس تیار کیا ہے اُس کے تار و پود کو بکھیرا جائے۔ اس بحث میں پہلی ضرورت تو یہ دیکھنے کی ہے کہ ہندوستانی موسیقی جو آج ہر شخص کی وردِ زبان ہے اور جس کی اصلاح و دُرستی کو چند نااہل حضرات نے سامانِ زندگی بنایا ہے، وہ کیا چیز ہے۔ کیا اہمیت ہے کیا اصلیت ہے، کیا مروّج ہے۔ جب ان پہلوؤں پر روشنی پڑ جائے تو کچھ آگے چلا جائے اور یہ غور کرنا ہے کہ آج کل کے طرزِ موسیقی کی تنظیم کی تکمیل کن ہاتھوں میں ہو سکتی ہے۔

زمانہ حال کی موسیقی کے متعلق ہمارا صرف ایک اعلان چیلنج کی صورت میں ہے اور ہم آرزومند ہیں کہ حضرات ریڈیو اسٹیشن کچھ کاوش سے اس پر سپردِ قلم فرمائیں۔ آج کل کا طرزِ موسیقی وہ طرز ہے جو پُرانے زمانے کی گرنتھوں میں سے کسی گرنتھ کا پابند نہیں۔ ایک روایت ہے کہ موسیقی کا جنم ہندوستان میں شیام وید سے ہے۔ جہاں تک تاریخ ولادت کا تعلق ہے یہ روایت صحیح ہے مگر برائے خدا موجودہ زمانے کی سنگیت کو شیام وید کی کسوٹی پر کس کر دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ سرے سے شیام وید کا نظامِ موسیقی ہی آج تک پراچین کال پر قائم نہیں۔ زمانہ کے مذاق کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ اور جو سرگم پہلے تھی آج نہیں۔ دوسرے یہ کہ شیام وید مذہبی نقطۂ نظر سے مقدس کتاب ہے اور اس میں صرف اشلوکوں کو غنا کے ساتھ ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا ہم کو اپنے اعلان کا مزید ثبوت دینے کے لئے قدیم سے قدیم ہندوستانی موسیقی کی تلاش کرنی ہوگی۔ اس فن پر ہزارہا کتابیں ہونگی مگر موجودہ زمانہ میں ؎

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

زمانے کے حوادث سے بچی۔ بچائی صرف ایک کتاب سننے میں آتی ہے جس کو "رتناکر" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب

پرانی سنسکرت میں ہے اور آج ہندوستان میں کوئی "گندھرب" یا گنی ایسا نہیں ہے جو اس کو سمجھ سکتا ہو برتنا تو درکنار۔ کچھ ماہرین موسیقی کا یہ قول ہے کہ ہندوستانی موجودہ موسیقی "ہنونت مت" کی ہے اور اس کی اصل "سنگیت درپن" سے ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اسکو تسلیم کر لیجئے کہ یہ صحیح ہے۔ آئیے اب عملی صورت میں اس کو دیکھئے۔ ہنونت مت کے اعتبار سے ہنڈول راگ کلاسیکل میوزک کے اعتبار سے۔ رکھب اور دھیوت چھوڑ کر گانا چاہیئے۔ پروفیسر صاحبان آجکل رکھب اور پنچم چھوڑ کر گاتے ہیں اور پھر فخر کرتے ہیں کہ یہ راگ مطابق اصل ہے۔

اور آگے چلئے۔ مالکوس راگ کو ہنونت مت نے سمپورن یعنی سات سُر کا مانا ہے ہمارے ماہرین اس کو پانچ سُر کا گاتے ہیں اور بس۔ وقس علیٰ ہذا۔ اگر طوالت کا خیال نہ ہوتا تو اس کلاسیکل میوزک یعنی پراچین سنگیت کی جو بندر کے ناریل کی طرح اے۔ آئی۔ آر آج نشر کر رہا ہے اچھی طرح قلعی کھول دی جاتی۔ اب تسلیم کرنا پڑیگا کہ کلاسیکل میوزک کی وہ بنیاد جو پراچین سنگیت کے مسالے سے تیار کی جاتی ہے سرے سے فرضی ہے۔ ہندوستانی موسیقی کی صحیح تاریخ خاندان خلجی سے شروع ہوتی ہے اور خاندان مغلیہ پر ختم۔ اس لئے جو ٹیپ ٹاپ۔ اختراع اور حرمت اس فن میں ہوئی وہ وہاں ختم ہوگئی اور ہر ایک وہ بادشاہ جو موسیقی سے ذوق رکھتا تھا بقدر ہمت ذوق اس میں رنگینیاں بھرتا گیا۔ پھر ہماری موسیقی جس کو کلاسیکل کہئے یا کسی اور موہوم نام سے موسوم کیجئے قلابازیاں کھاتے کھاتے جب ٹھری تو مندرجہ ذیل اشکال میں رہ گئی۔

(۱) الاپ۔ (۲) دھرپد۔ (۳) ساورہ۔ (۴) خیال۔ (۵) ہولی یا ہوری۔ (۶) ٹپہ۔ (۷) ٹھمری۔ (۸) قوالی۔ (۹) غزل۔ (۱۰) ترانہ۔ (۱۱) جھنرنگ۔ (۱۲) سرگم۔

اللہ اللہ اس سنگیت کے بنانے والوں کی رواداری کو ہم کیا کہیں، اور موجودہ زمانے کے مٹانے والوں کی سینہ زوری کو کیا روئیں۔ انہوں نے تو اس کو اس ڈھنگ سے ڈھالا کہ خرانٹ سے خرانٹ اوجھڑ اور جیر ٹے کی تانیں مارنے والے بائیس بائیس انچ کی گردن والے بھی گا گئیں۔ نازک اندام، صراحی دار گردن اور پتلے بدّھی کے گلے والے اور والیاں بھی گائیں۔ معصوم بچے بھی گا گئے۔ ایک طرف اگر تان مارنے سے چھت کی مٹی گرنے لگے، گھوڑے پچھاڑی تڑانے لگیں تو دوسری طرف چلتی ہوئی ہوا اور بہتا ہوا پانی ٹھیر جائے۔ ایک طرف اگر ٹھیکرے پھوٹنے کی آواز سے کان گنگ ہوجائیں تو دوسری طرف نغمہ کی نرمی اور گداز سے دل پگھل جائے۔ یعنی موجودہ طرز موسیقی علمبردار ہے اس رواداری کا جس میں گھوڑوں کے ہنہنانے، ہاتھیوں کے چنگھاڑنے، شیروں کے دھاڑنے کی بھی گنجائش ہے، اور کوئل پپیہے کی کوک بھی۔ یاد رکھنے والی بات ہے کہ موسیقی فنونِ لطیفہ کے اس شعبہ سے تعلق رکھتی ہے جس کا رشتہ سامعہ، دل اور دماغ سے ہے۔ اور یہ بھی تسلیم کرنے والی بات ہے کہ ہر شخص کے عصبات سامعہ، دل اور دماغ یکساں نہیں ہوتے کوئی نرم اور ملائم آواز پسند کرتا ہے۔ کسی کو توپ کی گرج بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کسی کو طنبورے کی میاؤں میاؤں اچھی معلوم ہوتی ہے اور پیرس ریڈ کے ہارمونیم کو چاہتا ہے۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ چند پیسوں کی لالچ سے اے۔ آئی۔ آر۔ کے آرٹسٹ اگر طنبورے کے ساتھ ڈھیاؤں، ڈھیاؤں اور میاؤں میاؤں فرمائیں تو اُن کی "مہیب صدا" جو اعصاب سماعت پر فالج کا اثر پیدا کرنے والی ہو وہ نغمہ سامعہ نواز سمجھا جائے۔ اور ایک خوش لحن قوال سُریلے ہارمونیم کے ساتھ غالب یا جگر کی غزل گائے تو وہ نغمہ نہیں "ہنکارنا" (   ) ہے۔ ہے ہے۔

بریں عقل و دانش بہ باید گریست

خدا بھلا کرے اس نااہلیت کا، اور لعنت ہے اس شیطان لعین پر جو کھاتے پیتے انسانوں کے دل میں وسواس پیدا کرے۔ موجودہ زمانہ کی شتر بے مہار موسیقی کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ غور کیجئے کہ ساز کیا چیز ہے اور وہ کیسا ہونا چاہیئے۔

آلاتِ موسیقی دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ جو ساز کا درجہ رکھتے ہیں دوسرے وہ جو صرف نغمہ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ساز گانے والے کی قوت بازو ہیں مددگار ہیں معاون ہیں مؤید ہیں۔ اس غریب سے جو مافوق العادت اپنے اعصاب کو ہلا ہلا کر، پھلا پھلا کر، جھنجوڑ جھنجوڑ کر آپ کو خوش کر رہا ہے آپ اتنے رحمدل ہیں کہ وفورِ ذوق میں اس غریب کو آس کا بھی سہارا نہ دیں۔ موسیقی کے اناڑی منتظمو، ذرا اس نکتہ کو سمجھو کہ گانے والے کا "مخرج صوت" اندھا ہے۔ گانا دیکھکر نہیں گایا جاتا ربط اور مشق سے گانے والا مخرج صوت پر قابو کرتا ہے پھر بھی اس کو ایک "لاٹھی" کی ضرورت ہے کہ وہ منزل پر آسانی سے پہونچ جائے۔ لطی الفہم اس کو یوں سمجھ لیں کہ اس کو ایسے ساز کی ضرورت ہے جس کے سُر آواز کے ہم آہنگ ہوں جو کھلے ہوئے آنکھیں کو سامنے ہوں۔ جس میں بہ اعتبار سرگم جگہ اور استھان ہر ایک سُر اسکی نظر کے

سامنے ہو نہ ایسے ساز کی جس کو بجانے والا ٹٹولتا رہے۔ بھئی کیا لطیف وہ سنگیت ہوگی جس میں گانے والا بھی ٹٹولے اور سازندہ بھی ٹٹولے، گویا اندھے کو اندھا منزل پر لے جا رہا ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔ اور اے۔ آئی۔ آر والے حضرات سوئے ہوئے کو سوئے ہوئے سے جگائیں گے۔

اب اگر آپ اے۔ آئی۔ آر والوں سے استفسار فرمائیں کہ حضرات گانیوالا جب کسی راگ کو گاتا ہے تو حسنِ ادا کے خیال سے کن قواعد اور کن اصولات کی پابندی اپنے اوپر عائد کرتا ہے تو وہ آپ کو بالکل وہی جواب دیں گے جو ایک ملّاجی "ایک اور ایک کے ہوتے" کا جواب دیں گے یعنی۔۔۔ دو روٹیاں۔ لیجئے اس مشکل کو ہم حل کریں۔ گانے والا جن اصولات کی پابندی کریگا ان کو سنگیت کی اصطلاح میں لچھن کہتے ہیں۔ اور آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ یہ لچھن صرف دفتر پارینہ کتابوں کی زینت رہ گئے ہیں اور یہ کتابیں یا تو طاق پر رکھی ہیں یا "ورگور"۔ آج کل جو موسیقی خرانٹ سے خرانٹ گویا ادا کرتا ہے، جو لچھن بہ اعتبار "پتنا کر" رائج الوقت ہیں وہ وادی سمواد الوادی۔ اور دیو وادی پر ختم ہیں۔ اگر اِن لچھنوں کی تشریح کی جائے تو یہ مضمون نہ صرف طویل ہوگا بلکہ "خبط"۔ البتہ عندالضرورت اتنا سمجھنا ضروری ہے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ وادی سُر، راگ کی جان جس سے راگ زندہ ہو۔ سموادی یعنی وہ سُر جو راگ کے اعضا، صورت، شکل اور ڈھانچہ بنائیں۔ الوادی وہ سُر جو مابقی ہوں جن سے راگ کی سرگم کا تکملہ ہو۔ دیو وادی سُر وہ جو راگ کا دشمن جس کا ترک کرنا موسیقی کی سنت اور استعمال کرنا بدعت۔ اس کے علاوہ گویے کو آرٹسٹ بننے کے لئے دو ایک صولات کا پابند ہونا پڑتا ہے جو گرنتھ کے دوسرے ناموں سے پکارے جاتے ہیں مگر موجودہ زمانے کے آرٹسٹ صرف "مینڈ" پر اکتفا کرتے ہیں۔

اب ان گذشتہ سطور سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ جو باجہ موسیقی میں ساز کا درجہ رکھتا ہو اس میں مندرجہ صفات کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) آواز کا ہم آہنگ ہو نہ جھنگھناتا ہو نہ چیں چیں کرتا ہو۔

(۲) بجانے میں اتنا سہل الحصول ہو کہ تمام لچھن آنکھوں کے سامنے ہوں ٹٹولنا نہ پڑے۔

(۳) آواز کے ساتھ تمام لچھنوں کی پابندی کرتا ہو۔

(۴) سُریلا ہو، کرخت نہ ہو۔

(۵) مینڈ ہو۔

اب اہلِ ذوق اس کسوٹی پر ہارمونیم کو کس کر دیکھیں گے تو ارباب ریڈیو کی "اناڑیت" اور ظلم کا اندازہ لگا لیں گے۔

آئیے اب ذرا ان اہل الرائے حضرات کی بیش قیمت آرا کا تجزیہ کیا جائے جنہوں نے ان حضرات کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔ کیا اندھیر ہے کہ ایک تانگہ والا تھکے ہوئے گھوڑے کو مارے اور زبردستی چلائے تو اس کا چالان کیا جائے۔ اور یہ حضرات گویئے کو بے ساز کے چلائیں تو ان کی روٹیوں میں اضافہ ہو۔ آہ نہ ہوئی آج کانگریس برسر اقتدار ورنہ موسیقی کا بل رکھا ہوا ہوتا۔ لیجئے ان تمام آرا کو "کوٹ چھان" کرنے کے بعد ہارمونیم کی مخالفت میں دو گولیاں تیار ہوتی ہیں۔

(۱) اس کو نکال دو یہ بے سُرا ہے اور چیختا ہے۔

(۲) اس کو نکال دو اس نے ہماری موسیقی میں مغربیت کا رنگ بھر دیا۔

اس کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ آپ ہارمونیم کو بے سُرا کہتے ہیں آہ! آپ نے اس کے سائنٹفک پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ اس میں بے سُرے پن کی گنجائش ہی نہیں۔ واللہ آپ نے کبھی اصلی ہارمونیم سنے ہی نہیں اس کا نام اس کی خوبیوں کا شاہد ہے۔ یہ بعد میں چیختا ہے پہلے آپکے گویئے چیختے ہیں۔ یہ آپ کے گویوں کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ یہ اُن کو صحیح راستے پر لے جائے گا کیونکہ اس کے سُروں کے استھان کھونٹے کی طرح مستحکم ہیں۔

دوسرا الزام اس غریب پر یہ ہے کہ اس نے آپ کی موسیقی میں انگریزیت کا رنگ بھر دیا۔ اس کے جواب میں دو گز لمبی آہ کے بعد گذارش ہے کہ آپ کی موسیقی کو بگاڑا ہے فلمستان نے اور الزام ہے ہارمونیم پر۔ کاش آپ نے فلم اسٹار اور آرٹسٹوں کے گلے سُنے ہوتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ان کی تراکیب، آواز مدّ و جزر کس طرف بہا جا رہا ہے۔ ان صائب الرائے حضرات میں بعض ایسی مقتدر ہستیاں ہیں جن کے متعلق اعتراض کرنا بھی سوء ادبی ہے مگر واللہ جذبہ حمایت بھی عجیب جذبہ ہے۔ ع ؎

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کہتے جاتے ہیں کہ ہم کو موسیقی سے ذوق نہیں، واسطہ نہیں مگر پھر بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ اس لئے یہ آرا قابلِ اعتنا نہیں، کیوں کہ ان میں جو کچھ الزام ہارمونیم پر عائد کئے گئے ہیں اُن کے جواز میں کوئی معقول استدلال نہیں۔ اب رہی اڈیٹر صاحب یا کنٹرولر صاحب اے آئی۔ آر کی رائے، اس کا تجزیہ زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ انہوں نے ایسے مسئلہ پر ہاتھ ڈال دیا جو اُن کی طاقت سے باہر ہے۔ اس گرامی رائے کا لفظ لفظ اپنے اندر اِن حضرات کی عدم واقفیت، علم موسیقی میں کم مائیگی کا ایک بحرِ بیکراں رکھتا ہے۔ عبارت کی بندش سے ہم

زیادہ بحث نہیں کیونکہ یہ "ادب" کا مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ جس مسئلہ پر یہ مقالہ لکھا گیا ہے ضروری تھا کہ اُس پر کافی استدلال کے ساتھ بحث کرکے نقائص نکالے جاتے۔ درآں حالیکہ جو الفاظ ہارمونیم کے الزام میں استعمال کئے گئے ہیں وُہ اس درجہ مفلوج اور نحیف ہیں گویا گردن توڑ بخار نے ان کو توڑ مروڑ کر رکھدیا ہے۔ پہلا الزام ہے کہ:-

(۱) ہارمونیم بذاتِ خود خراب آلہ موسیقی ہے، لفظ خراب اپنے اندر اظہار معنی کی وہ فرد مایگی اور وہ اپاہجگی رکھتا ہے کہ سبحان اللہ۔ گویا جناب ایک جامع لفظ کہہ ڈالنے کے بعد مزید استدلال سے اس طرح فارغ جیسے کلین شیو اپنے بالوں سے۔ اب یہ قاری کا فرض ہے کہ جس طرح اور حضرات نے آپ پر ترس کھاکر ہاں میں ہاں ملادی وہ بھی آپکے اس لفظ "خراب" کی الوہیت پر گردن جھکادے۔ اور سرِ تسلیم خم کردے۔ خراب کا لفظ جس طرح ہارمونیم لے لئے استعمال ہوا اسی طرح عقل کے لئے بھی آسکتا ہے۔ فی الجملہ تو ہم خراب سے یہ مطلب سمجھے کہ کوئی پُرانا دُھرانا کباڑی بازار کا ہارمونیم زیر استعمال رہا ہوگا جس نے پریشان کیا ہوگا۔ ورنہ بفضلہ تعالیٰ ابھی ہندوستان میں خاص ہندوستان کے بنے ہوئے باجے اور خاص ہندوستانی ماہرین ایسے موجود ہیں کہ اگر آپ سُنیں تو خراب کا لفظ آپ کے دماغ سے نکال کر نغمے کی شراب بھردیں۔ اگر میسّر نہ ہوں تو دفتر رسالہ ساقی سے استصواب کیجئے۔

دوسرا اعتراض:- ہندوستانی موسیقی کے لئے مضرت رساں ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب بھی بشرح صدر؛ افسوس ہندوستانی موسیقی سے نااہلیت کی بنا پر یہ الفاظ آپ کی قلم سے "ریٹ" گئے۔ ہندوستانی موسیقی کے متعلق پہلے ہمارے مقالے کے حصۂ اولیں کو پڑھئے پھر بتایئے کہ ہندوستانی موسیقی سے آپ کیا سمجھے۔ اس کے بعد یہ فرمایئے کہ ہندوستانی موسیقی سے کون سی موسیقی مراد ہے۔ سنگیت پاریجات کی، رتناکر کی۔ چتر پنڈت کی یا وہ موسیقی مراد ہے جو آپ کے چند گز کی ریڈیو کی دُنیا میں آپ کے چند نمک خوار آرٹسٹ ارباب ریڈیو کا اسباب زندگی فراہم کرنے کے لئے اپنے گلوہائے مبارک سے نشر فرماتے ہیں! آپ ہندوستانی موسیقی کی تشریح میں، پتے آپ کو اس قدر فرو ماندہ پائیں گے کہ آپ اپنے انحطاطِ بیان میں خود جذب ہوکر رہ جائینگے۔ جناب والا جس ہندوستانی موسیقی کا آپ خواب دیکھ رہے ہیں اسکے متعلق گذارش فدوی کی یہ ہے کہ جو موسیقی آپ کے خیال میں ہندوستانی موسیقی کہلاتی ہے اور ہندوستان میں اس موسیقی کے جتنے "سماج" اور ان سماجوں کے جتنے "فاضل" اور پنڈت اس سائنس اور آرٹ کے ہیں ان میں آپس میں اتنا اختلاف ہے کہ ہر جگہ راگ، راگنیوں کی صورتیں اور برتاوے جداگانہ ہیں۔ یہاں ہندوستان غریب کو آج تک سوراج نصیب نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر ایک سماج اور سنگھٹن میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس طرح حکومت کی جائے کوئی کہتا ہے اُس طرح۔ آپ نے یہ جرأت فرمائی کہ باوجود اس اختلاف کے سوراج حاصل کرلیا اور ریڈیو جیسی پنچایتی چیز پر حکم لگادیا۔ پھر آپ کی ہندوستانی موسیقی میں صرف پکّے گانے نہیں ہیں بلکہ لَے اور بول کی چیزیں ہیں جو جہاں تک نغمہ اور صوت کا تعلق ہے ہارمونیم میں ڈوبی ہوئی ہیں اور رہا ہارمونیم اُن میں۔ معلوم نہیں آپ کا علم موسیقی کتنا وسیع ہے۔ ہم آپ کی مدد کرتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ہندوستانی موسیقی کے آرٹ سے آپ کا مطلب سُر کی اس باریکی سے مُراد ہے تو اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوجایئے کہ اِن سُرتیوں کا وجود فرضی ہے عملی نہیں۔ ہندوستان میں آج تک کوئی ماہر نہ ایسا پیدا ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی اُمید ہے جو صحیح معنوں میں سُرتیوں کو استعمال کرسکے۔ اس لئے جملہ ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ ہماری موجودہ موسیقی میں صرف بارہ ۱۲ سُر ضروری ہیں جس سے تمام راگ راگنیاں برتی جاسکتی ہیں۔ اب حسنِ ادا کے اعتبار سے موسیقی کی ایک صنعت باقی رہ گئی جسکو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں اور اس کو مینڈ کہتے ہیں۔ تار کے باجوں میں اس کو "سوت" کہتے ہیں۔ تسلیم ہے کہ یہ صنعت ہارمونیم میں نہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھا بجانے والا اس مشکل پر بھی عبور رکھتا ہے اور جو گویا خود بجاکر گاتا ہے وہ بہمہ وجوہ اس کو پیدا کرلیتا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ ہندوستانی مایۂ ناز آلہ ہائے موسیقی پر ہارمونیم کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ اگرچہ مقالہ میں استدلال مفقود ہے مگر پھر آپ کی مدد کی جاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ہندوستان میں جتنے آلہ ہائے موسیقی رائج ہیں اُن میں تفریق اس امر کی کرنا کہ کونسا آلہ گوّیے کی سنگت کرتا ہے اور "ساز" ہے اور کونسا صرف نغمہ کے لئے بجایا جاتا ہے غالباً آپ کی طاقت سے باہر ہوگا۔ اس میں ہم آپ کی پھر رہبری کرتے ہیں۔ جان لیجئے کہ پُرانے زمانے کا صرف ایک واحد آلہ سارنگی ایسا ہے جس کو ساز ہونے کا شرف حاصل ہے باقی سب نغمہ کیلئے ہیں۔ آہ اور پھر آہ آپ اس کی صورت شکل اور حُسن کو برقرار نہ رکھ سکے، اور مس وائلن تشریف لے آئیں۔ مگر افسوس ہے کہ آپنے وائلن شہر بدر نہ کیا بلکہ اس سے مرعوب ہوکر شانہ پر چڑھالیا۔

الغرض بہت سے ایسے آلات ہیں جو آپ کے ہندوستانی مایہ ناز آلات کا چربہ ہیں اُن پر آپ نے توجہ نہ کی۔ سارنگی کی مشکلات آپ کے ادراک سے باہر ہیں اس لئے اُن پر آپ نے غور نہیں کیا۔ سب سے پہلی مشکل یہ ہے کہ گانے والا خود نہیں بجا سکتا۔ اور اگر بجاتے گا تو کمل کر گا نہیں سکتا۔ اس لئے سارنگی کے ساتھ موسیقی دو دل اور دو دماغ پر منقسم ہے جس کا نتیجہ معلوم۔ گانے والا گاتے گاتے ایک تان لگاتا ہے، سارنگیا اس کی سنگت دو تین ماتر بعد کرتا ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس۔ ہارمونیم اس مشکل سے بری ہے۔ گانے والا خود بجاتے اور دھوم سے گائے۔ اگر پھوہڑپن سے بجائے گا۔ دھونکنی کو کھال کی طرح دھونکے گا تو خواہ مخواہ ہارمونیم غل مچانے کا چیخے گا۔ بجانے والا اگر آواز کے مدوجزر سے واقف ہے تو اسی حساب سے بجائے گا۔ اتنی بحث کے بعد قارئین کرام نتیجہ خود نکال لیں گے، اور معلوم کر لینگے کہ ہندوستانی موسیقی غریب کو نقصان ہارمونیم سے پہونچ رہا ہے یا "نااہلیت سے۔" "ساقی" میں بہت سے مضامین ارباب ریڈیو اسٹیشنز کی نااہلیت کے متعلق سپردقلم ہو چکے۔ جو کچھ اُن کا اثر ہوا خدا بہتر جانتا ہے۔ حقیقت ہے کہ ع؎

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا

سائنس والوں کا مقولہ ہے کہ برقی قوت سے زیادہ بڑی کوئی قوت نہیں اور تجربہ و مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ روپے سے زیادہ کوئی قوت نہیں۔ بہرحال جو پروپگنڈا اس قوت سے چلایا جائے اس کا اثر چاہے اور کچھ نہ ہو مگر اتنا تو ضرور ہوگا کہ قوال ریڈیو اسٹیشن جاتے وقت گھر بھول جائیں گے اور وہاں رو رُلا کر اپنے پیسے سیدھے کرلیں گے۔ مگر اس پروپگنڈے کی اصلی قیمت یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر ٹیگور کی طرح ہارمونیم کو کنوئیں میں پھینک دیں۔ ہمارے خیال میں ڈائرکٹر صاحب اللہ نے روپیہ دیا ہے، زود اثر پروپگنڈا تو یوں ہوگا کہ ہارمونیم کی تجویز فرمائیں اور ہارمونیم خرید خرید کر جلاتے رہیں۔ اور اس پروپگنڈے کو اس طرح دو آتشہ کیا جا سکتا ہے کہ ہارمونیم بنانے والے کاریگروں پر بھی تدارک کا حلقہ ڈالا جائے۔ یا سب سے بہتر یہ ترکیب ہے کہ مجلس قانون ساز کے ذریعے ایک عدد "بل" پاس کرا لیا جائے۔ کچھ دنوں تک تو اس شاندار کامیابی کا اچھا اثر رہیگا۔ مگر اس کے بعد دلدادگان ریڈیو کی طرف سے ہارمونیم کے نعم البدل کا تقاضہ ہوگا اور اگر تقاضہ نے شدہ شدہ عدم تعاون کی ہولناک صورت اختیار کی تو مجبوراً ڈائرکٹر صاحب کو ہندوستانی باجے کی تلاش ہوگی۔ ایک طرف زور ہوگا کہ ہارمونیم کو نکالا ہے تو تغریب شدہ تمام باجوں کو نکالو ورنہ سنبھالو اپنا ریڈیو۔ ایسی حالت میں سیکوفون۔ کلارنٹ وغیرہ کی ڈوڑ ہوگی پھر وہی طبلہ سارنگی۔ مگر یاران طریقت نغمہ میں حلاوت اور کیفیت کا مطالبہ کرینگے۔ تو پھر کیا ہوگا۔ ایسی صورت میں رسالہ ساقی کا یہ مضمون عنداللہ آپ کی اعانت کریگا اور اس وقت آپ اس کا مطالعہ فرمائینگے تو یہ نیک مشورہ مشعل ہدایت ہوگا۔ کہ کم خرچ اور بالانشین قسم کا ساز "پونگی" استعمال کیجئے۔ گراں آرٹسٹ کے بجائے سپیرے ملازم رکھ لیجئے کیوں؟ اس لئے کہ جب ہندوستان کا نظام چرخہ قائم کر سکتا ہے تو ریڈیو کا نظام پونگی قائم کرے گی۔ جب ہندوستان کی حکومت میں جلاہے برسر اقتدار ہونگے تو ریڈیو کی حکومت میں سپیرے کیوں پیچھے رہیں...... انقلاب زندہ باد۔

مضحک دہلوی؛

پھانسی

بارھواں باب

پھانسی دی جاتی ہے۔

ریل کے چھوٹے چھوٹے ڈبے چلے جا رہے تھے۔

ایک زمانے میں سرجے گول ون اپنے چند عزیزوں کے ساتھ اسی راستے پر ایک دیہات میں برسوں رہا تھا۔ بارہا اسی راستے سے دن کو بھی اور رات کو بھی گزرا تھا۔ اس لئے ہر مقام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگا۔ میں تو اپنے گھر جا رہا ہوں۔ شہر میں دوستوں کے ساتھ دیر ہوگئی۔ اب آخری گاڑی سے لوٹ رہا ہوں۔

اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور تاریک کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا: "بس اب ہم وہاں پہونچے جاتے ہیں۔"

کسی نے جنبش نہ کی اور نہ کوئی بولا۔ صرف مگالوک نے جلدی جلدی کئی مرتبہ تھوکا۔ اور گاڑی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس نے کئی بار دیکھا، گویا کھڑکیوں، دروازوں اور سپاہیوں کو ٹٹول رہا تھا۔

ویسلی کیشرن نے کہا: "بڑی سردی ہے۔" اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، جیسے واقعی جم گئے ہوں اور اس کے الفاظ کی آواز بڑی عجیب سنائی دی۔

تانیا نے اٹھکر ادھر ادھر کچھ ڈھونڈا۔

"لو یہ رومال اپنے گلے میں باندھ لو۔ بڑا گرم ہے۔"

سرجے نے چونک کر پوچھا: "گلے میں؟" مگر کسی نے اسکے سوال کو نہیں سنا کیونکہ ہر ایک کے دل میں یہی خیال آیا تھا۔ گویا کچھ کہا ہی نہیں گیا تھا۔ گویا سب نے ایک ہی وقت میں ایک ہی بات کہی تھی۔

ورنر نے کہا: "وسیا کچھ خیال نہ کرو۔ گلے میں باندھ لو۔ گرم رہیگا۔" پھر یانسن کی طرف پلٹ کر دلجوئی سے بولا: "اور تمہیں دوست؟ تمہیں بھی سردی لگ رہی ہے؟"

مسیا نے کہا: "ورنر، شاید وہ سگرٹ پینا چاہتا ہے۔ کیوں ساتھی پینا چاہتے ہو؟ ہمارے پاس سگریٹ ہے۔"

"ہاں۔"

ورنر نے خوش ہو کر کہا: "مسٹر یوژرا ایک سگریٹ انہیں دیدو۔" لیکن سرجے خود سگریٹ نکال رہا تھا۔ سب کی نظریں ہمدردی سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ دیکھ رہی تھیں کہ انگلیاں سگریٹ کو کس طرح پکڑتی ہیں، کس طرح دیا سلائی جلتی ہے اور پھر نیلا دھواں یانسن کے منہ سے کس طرح نکلتا ہے۔

یانسن نے کہا: "شکریہ۔ سگریٹ اچھا ہے۔"

سرجے بولا: "کیسا عجیب ہے!"

"کیا ہے عجیب؟" ورنر نے پلٹ کر پوچھا: "کیا ہے عجیب؟"

"میرا مطلب ہے — سگریٹ۔"

یانسن کی انگلیوں میں ایک سگریٹ تھا، ایک معمولی سگریٹ۔ اُس کے معمولی زندہ ہاتھوں میں۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور وہ تعجب سے بلکہ خوف سے سگریٹ کو دیکھ رہا تھا۔ سب نے کاغذ کی اُس نلی پر نظریں جما دیں جس کے ایک سرے سے دھوئیں کا ایک نیلا فیتا سا نکل رہا تھا اور سانس کے ٹکرانے سے منتشر ہو رہا تھا۔ راکھ جمع ہوتی جا رہی تھی۔ گاڑی کی روشنی گل ہوگئی۔

تانیا نے کہا: "روشنی گل ہوگئی۔"

"ہاں گل ہوگئی۔"

"بجھنے دو۔" ورنر نے کچھ بےچینی سے یانسن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یانسن کا ہاتھ جس میں سگریٹ تھا، اس طرح لٹکا ہوا تھا جیسے مردہ ہو۔ مگالوک نے یکایک جلدی سے پلٹ کر ورنر کی طرف دیکھا۔ جھک کر قریب تر ہوگیا۔ روبرو ہو کر اور گھوڑے کی طرح سفید سفید دیدے گھما کر چپکے سے بولا: "کیوں جناب کیا خیال ہے سپاہیوں کے بارے میں؟ اگر ہم — کیوں؟ کریں کوشش؟"

ورنر نے بھی چپکے سے جواب دیا: "نہیں ایسا نہ کرو۔ جو کڑوا پیالہ ہمارے لبوں سے لگایا گیا ہے اُسے ہم پی کر ختم ہی کرینگے۔"

"نہیں کیوں؟ لڑائی میں زیادہ لطف آئیگا۔ وہ مجھے مارتا ہے، میں اُسے مارتا ہوں۔ اور تمہیں معلوم بھی نہیں ہوگا کہ کس طرح کام تمام ہوگیا۔ اور تم گویا مرنے سے بچ گئے۔"

"نہیں تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" ورنر نے اتنا کہا اور یانسن کی جانب رُخ کر لیا۔ "دوست تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے؟"

یکایک یانسن کے چہرے پر سے فراست کے جملہ آثار معدوم ہو گئے اور غمناک جھریاں پڑ گئیں۔ جیسے کسی نے ڈوریوں کو کھینچکر ساری جھریوں کو متحرک کر دیا ہو۔ اور جیسے کوئی خواب میں بولے گھٹی ہوئی خشک آواز میں بے آنسوؤں کے رو کر بولا۔ "میں سگریٹ پینا نہیں چاہتا۔ اہا۔ اہا۔ اہا۔ مجھ پھانسی کیوں دی جاتے؟ اہا۔ اہا۔ اہا!"

سب نے اس کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا۔ تانیا دھاروں رو رہی تھی۔ کبھی اُس کے شانوں کو تھپکتی اور کبھی اُس کے گلے ہوئے کنٹوپ کے لٹکے ہوتے پاکھے ٹھیک کرتی۔ اور کہتی "میرے پیارے، رو نہیں۔ بچارا بدقسمت!"

مسیا نے منہ پھیر کے دیکھا۔ سگا نوک نے مسیا کی نگاہوں کو تاڑا اور دانت چمکا کر بولا "کیسا عجیب آدمی ہے! چاء پیتا ہے اور کہتا ہے کہ سردی لگ رہی ہے۔" یہ کہکر ہنسا لیکن یکایک خود اُس کا چہرہ سیاہی مائل نیلا پڑ گیا۔ جیسے ڈھلا ہوا لوہا ہو اور اس کے بڑے بڑے زرد دانت چمکنے لگے۔

ایکا ایکی ریل کے چھوٹے چھوٹے ڈبے لرزے اور اُن کی رفتار گھٹ گئی۔ یانسن اور کیشرن کے علاوہ سب کے سب کھڑے ہوتے اور پھر جلدی سے بیٹھ گئے۔

سرجے نے کہا۔ "لو اسٹیشن آ گیا!"

سب کو ایسا معلوم ہوا کہ ڈبے میں سے ساری ہوا کھینچ لی گئی۔ سانس لینا مشکل ہو گیا۔ دل اتنا بڑا ہو گیا کہ سینہ پھٹنے لگا۔ دل گلے میں دھڑک رہا تھا۔ اور دیوانہ وار اچھل رہا تھا اور ڈر سے خون بھری آواز میں بخ رہا تھا۔ آنکھیں کپکپاتے فرش پر جمی ہوئی تھیں اور کان سن رہے تھے کہ پہیئے چلنے میں کس طرح اپنی رفتار گھٹا رہے تھے — پہیوں نے پھسلن کر ایک چکر اور کاٹا اور پھر یکایک ... رک گئے۔

ریل رک گئی تھی۔

پھر ایک خواب دکھائی دینے لگا۔ یہ خواب خوفناک نہیں تھا بلکہ عقل کو دنگ کرنے والا تھا۔ کبھی ایسا عجیب و غریب خواب پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواب دیکھنے والا خود تو ایک طرف ہٹ گیا ہے اور اس کا بے جسم چھلاوا اِدھر اُدھر پھر رہا ہے، اس طرح بول رہا ہے کہ آواز سنائی نہ دے، اس طرح چل رہا ہے کہ پاؤں کی چاپ سنائی نہ دے، کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن تکلیف میں مبتلا ہے۔ گاڑی میں سے سب کے سب اس طرح اُترے جیسے خواب میں ہوں۔ دو دو کے جوڑے بناتے اور جنگل کی تازہ بادِ بہاری میں لمبے لمبے سانس لئے۔ یانسن نے چلنے سے انکار کیا، لیکن جیسے کوئی خواب میں مزاحمت کرے، اور خاموشی سے گاڑی میں سے باہر کھینچ لیا گیا۔

اسٹیشن کی سیڑھیوں پر سے سب اُترے۔

کسی نے جیسے خوشی کے لہجے میں پوچھا "کیا ہمیں چلنا پڑیگا؟"

کسی اور نے بھی خوشی سے جواب دیا "اب کچھ دُور نہیں ہے۔"

اب سب کے سب ایک شب رنگ انبوہ کی شکل میں گیلی ناہموار سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ جنگل میں سے، برف میں سے، تازی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ پاؤں پھسل رہے تھے، کبھی نرم برف میں ڈوب جاتے اور غیر ارادی طور پر ساتھی ایک دوسرے سے چمٹ جاتے۔ محافظ دستے کے سپاہی اچھوتی برف پر سڑک کے کنارے کنارے چل رہے تھے اور اُنکے سانس پھولے ہوتے تھے۔ کسی نے غصّے کی آواز میں کہا "انہوں نے سڑک صاف کیوں نہیں کی؟ کیا برف میں ہمارے لڑھکنے کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے؟"

کسی اور نے اقرارِ جُرمانہ کے انداز میں جواب دیا "صاف تو کر دی تھی حضور۔ مگر برف گر رہی ہے۔ کیا کیا جائے۔"

قیدیوں کو اِس کا احساس ہو چلا کہ وہ کیا کر رہے ہیں لیکن یہ احساس کامل نہیں تھا — ٹکڑے ٹکڑے اور منتشر حصوں میں۔ اب اُنکی سمجھ میں عملاً یہ بات آ گئی تھی کہ "سڑک کو برف سے صاف کرنا ناممکن ہے۔"

ہر چیز پھر فنا ہو گئی۔ صرف سونگھنے کی قوت باقی رہ گئی۔ برف کے پگھلنے کی اور جنگل کی ناقابل برداشت تازگی کی خوشبو۔ شعور غیر معمولی طور پر بیدار ہو گیا۔ جنگل، رات، سڑک اور یہ حقیقت کہ انہیں پھانسی ملنے والی ہے۔ ان کی بات چیت جو سرگوشیوں کی صورت میں ہوتی تھی اب چھوٹے چھوٹے جملوں میں نمایاں ہونے لگی۔

"اب چار بجا چاہتے ہونگے۔"

"ہم بہت جلدی چل پڑے۔"

"سورج پانچ بجے نکلتا ہے۔"

"بیشک۔ پانچ بجے۔ ہمیں —"

ایک اندھیری چراگاہ میں سب ٹھہر گئے۔ تھوڑی دور پر، لنڈ منڈ درختوں کے پیچھے دو چھوٹی چھوٹی لالٹینیں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ یہی پھانسیاں تھیں۔

سرجے نے کہا۔ "میرا ایک ربڑ کھو گیا۔"

[ورنر نے کہا] "اچھا!" گو سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا کہ سرجے نے کیا کہا۔

"میرا ایک ربڑ کھو گیا۔ بڑی سردی ہے۔"

"وسیلی کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ وہ رہا۔"

وسیلی خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔

"اور مسیا کہاں ہے؟"

"میں یہاں ہوں۔ کیا تم پوچھ رہے ہو ورنر؟"

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ تاکہ پھانسیاں اور ان کی متحرک روشنیاں اپنا بھیانک پیام انہیں نہ پہونچائیں۔ بائیں جانب بے برگ و بار جنگل تنگ ہوتا چلا گیا تھا اور کوئی بڑی سی سفید چپٹی چیز پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں سے گیلی ہوا آ رہی تھی۔

سرجے نے دردناک آواز اور منہ سے لمبے سانس لیتے ہوئے کہا "سمندر۔ سمندر ہے وہ۔"

مسیا نے مترنم آواز میں کہا "میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو مسیا؟"

"میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے۔ زندگی کے ساحل اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔"

سرجے نے مسیا کی آواز سنی اور اس کے الفاظ سرجے کو بہا لے گئے۔ بہت سوچ کر بولا، جیسے مسیا کی صدائے بازگشت ہو "میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے۔"

ورنر نے بھی الفاظ دہرائے "میری محبت سمندر کی طرح وسیع ہے" اور ایکدم سے متعجب اور مسرور ہو کر بولا "مسیا تم کس قدر کم عمر ہو؟"

سگانوک نے ایکا ایکی پھولے ہوئے سانس سے ورنر کے کان میں گرمجوشی سے کہا "جناب! جناب! وہ رہا جنگل! یا اللہ! وہ کیا ہے؟ وہ — جہاں لالٹینیں دکھائی دے رہی ہیں — کیا وہی ہیں پھانسیاں؟ اس کے کیا معنی؟"

ورنر نے اس کی طرف دیکھا۔ سگانوک موت سے پہلے کرب صعب میں مبتلا تھا۔

تانیا نے کہا "ہمیں ایک دوسرے سے مل کر خدا حافظ کہنا چاہیئے۔"

ورنر نے جواب دیا "ابھی ٹھہرو۔ ابھی حکم پڑھ کر سنایا جائے گا۔ یانسن کہاں ہے؟"

یانسن برف پر گر پڑا تھا اور لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے تھے ہوا میں امونیا کی بو تھی۔

کسی نے بےچینی سے پوچھا "کیوں ڈاکٹر، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں صرف غش آ گیا ہے۔ اسکے کانوں پر برف ملو۔ ہوش آ رہا ہے۔ تم حکم پڑھ کر سنا دو۔"

سیاہ لالٹین کی روشنی کاغذ اور سفید ہاتھ پر چمکی۔ کاغذ اور ہاتھ دونوں کچھ کپکپائے اور آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"حضرات۔ غالباً یہ ضروری نہیں ہے کہ حکم پڑھ کر آپکو سنایا جائے آپ سب اس سے واقف ہی ہیں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟"

ورنر نے سب کی طرف سے جواب دیا "مت پڑھیئے" اور لالٹین جلدی ہی بجھا دی گئی۔

سب نے پادری کی خدمات بھی ضروری نہیں سمجھیں۔ سگانوک نے کہا "مقدس باپ، اپنی چاپلوسی کو بند کیجیے۔ آپ تو مجھے معاف کر دیں گے مگر یہ مجھے پھانسی پر لٹکا دینگے۔ جائیے — جہاں سے آپ آئے ہیں۔"

اور پادری کا سیاہ عکس خاموشی اور تیزی سے غائب ہو گیا۔ پوپھٹ رہی تھی۔ برف زیادہ سفید ہو گئی۔ لوگوں کی شکلیں زیادہ واضح ہو گئیں اور جنگل سکڑ گیا اور زیادہ اُداس ہو گیا۔

"حضرات آپ کو دو دو کی جوڑیاں بنا کر جانا ہے۔ جسے آپ چاہیں اپنا ساتھی چن لیں۔ لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ذرا جلدی کیجیے۔"

ورنر نے یانسن کی طرف اشارہ کیا۔ دو سپاہیوں نے اُسے سہارا دیکر کھڑا کر رکھا تھا۔ ورنر بولا "میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ اور تم سرگوژا وسیلی کو ساتھ لیلو۔ چلو آگے بڑھو۔"

"بہت اچھا۔"

تانیا نے کہا "تم اور میں ساتھ چلیں گے۔ ہے نا مسیا؟ آؤ ہم پیار کر کے رخصت ہوں۔"

جلدی سے انہوں نے ایک دوسرے کو پیار کیا۔ سگانوک نے زور سے پیار کیا۔ اتنا کہ دونوں نے اسکے دانت چبھتے محسوس کئے۔ یانسن نے نرمی سے، جیسے کوئی نیند میں ہو۔ منہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کچھ بھی خبر نہیں کہ کیا کر رہا ہے۔

جب سرجے اور کیشرن چند قدم آگے بڑھ گئے تو یکایک رک کر انہوں نے اونچی آواز میں کہا۔

"خدا حافظ ساتھیو۔"

سب نے مل کر جواب دیا: "خدا حافظ ساتھی!"

وہ دونوں چلے گئے۔ خاموشی چھا گئی۔ درختوں کے پیچھے لالٹینیں ساکت ہوگئیں۔ سب منتظر تھے کہ کوئی چیخ سنائی دے گی یا شور مچیگا۔۔۔ لیکن وہاں بھی اتنی ہی خاموشی تھی جتنی یہاں تھی ۔۔۔ اور زرد لالٹینیں ساکت تھیں۔

کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "یا میرے اللہ!" سب نے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ سگالوک تھا جو موت کے خیال سے بےچین ہو رہا تھا۔ پھر بولا: "انہیں لٹکایا جا رہا ہے۔"

سب نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ سگالوک مچل رہا تھا اور ہوا کو پکڑ رہا تھا۔

"یہ کیا بات ہے حضرات؟ کیا مجھے اکیلا جانا پڑیگا؟ ساتھ مرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ حضرات اس کے کیا معنی ہیں؟"

اُس نے ورنر کا ہاتھ پکڑا۔ پہلے انگلیاں بھینچیں اور پھر ڈھیلی پڑگئیں۔

"پیارے آقا۔ کم ازکم آپ تو میرے ساتھ چلئے۔ کیوں؟ مجھ پر یہ کرم کیجئے؟ انکار نہ کیجئے۔"

ورنر نے تکلیف سے جواب دیا: "میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا بھائی۔ میں اسکے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"یا میرے اللہ! تو پھر مجھے اکیلا ہی جانا پڑے گا؟ میرے اللہ! یہ کیسے ہوگا؟"

مُسیا نے آگے بڑھکر کہا: "تم میرے ساتھ چل سکتے ہو۔"

سگالوک پیچھے ہٹ گیا اور اُس کے سفید سفید دیدے گھومنے لگے۔۔۔

"تمہارے ساتھ!"

"ہاں۔"

"لو ذرا اِسے تو دیکھو! اتنی سی لڑکی! کیا تمہیں ڈر لگتا ہے؟ اگر تم ڈر رہی ہو تو میں اکیلا جانا پسند کرونگا۔"

"نہیں۔ مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔"

سگالوک نے دانت پھاڑ کر کہا: "ذرا اِسے تو دیکھو! لیکن کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں ایک قاتل ہوں؟ کیا تم مجھے نفرت سے نہیں دیکھتیں؟ بہتر یہ ہے کہ تم میرے ساتھ نہ چلو۔ میں تمہارے نہ جانے سے ناراض نہیں ہونگا!"

مُسیا خاموش رہی۔ اور صبح کی مدھم روشنی میں اُس کا چہرہ زرد اور پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ پھر یکایک وہ سگالوک کی طرف جلدی سے بڑھی اور اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اُس کے لبوں کو زور سے چوم لیا۔

سگالوک نے اُس کے شانے پکڑ کر الگ کیا۔ پھر چٹخارے لے لیکر اُسکے لبوں، ناک اور آنکھوں کو پیار کیا۔

"آؤ!"

ایک سپاہی جو اُن کے قریب کھڑا تھا یکایک لڑکھڑایا اور اُسکے ہاتھ سے بندوق چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ اُسے اُٹھانے کے لئے وہ نہیں جُھکا بلکہ ایک لمحے تک ساکت کھڑا رہا۔ پھر ایکدم سے پلٹا اور کسی اندھے آدمی کی طرح جنگل کے رُخ برف پر روانہ ہوگیا۔

ایک اور سپاہی نے خوفزدہ آواز میں چیخ کر کہا: "تم کہاں جا رہے ہو؟ ٹھہرو!"

لیکن وہ گہری برف میں اُفتاں وخیزاں خاموش چلا جا رہا تھا۔ پھر کسی چیز سے اُلجھا ہوگا جو اُس کے ہاتھ آٹھے اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اور وہیں پڑا کا پڑا رہ گیا۔

سگالوک نے دوسرے سپاہی سے سختی سے کہا: "بندوق اُٹھا لے بے وقوف۔ ورنہ میں اُٹھا لوں گا۔ تجھے اپنے فرض کی بھی کچھ خبر نہیں۔"

ننھی لالٹینوں نے پھر ہلنا شروع کر دیا۔ اب کے ورنر اور یانسن کی باری تھی۔

سگالوک نے اونچی آواز میں کہا: "خدا حافظ جناب۔ دیکھنا ہم دوسری دنیا میں ملیں گے۔ مجھ سے منہ مت پھیرنا۔ جب مجھے دیکھو تو مجھے تھوڑا سا پانی پینے کا لا دینا۔۔۔ وہاں بہت گرمی ہوگی۔"

"خدا حافظ!"

یانسن نے اونگھتے ہوئے کہا: "میں پھانسی پانا نہیں چاہتا۔"

ورنر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور یانسن اکیلا چند قدم چلا۔ لیکن بعد میں دکھائی دیا کہ وہ ٹھہر گیا۔ اور برف میں گر پڑا۔ سپاہیوں نے جُھک کر اُسے اُٹھایا اور بغلوں میں ہاتھ دیکر لے چلے۔ وہ کسمساتا رہا۔ وہ چیخا کیوں نہیں؟ وہ شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ ایک آواز بھی رکھتا ہے۔

زرد رنگ کی لالٹینیں ساکت ہوگئیں۔

تانیا نے غمناک آواز میں کہا: "اور میں مُسیا، کیا مجھے اکیلا ہی جانا ہوگا؟ ہم ہمیشہ ساتھ رہے لیکن اب۔۔۔"

"تانیا پیاری۔۔۔"

لیکن سگالوک نے گرمجوشی سے اس کی طرفداری کی۔ مُسیا کا

ہاتھ پکڑ کر، گویا کوئی اُسے چھین نہ لے، جلدی جلدی تانیا سے کہنے لگا۔

"خاتون تم اکیلی جا سکتی ہو۔ تمہاری رُوح پاک ہے۔ جہاں چاہو اکیلی جا سکتی ہو۔ لیکن میں ـــ مَیں نہیں جا سکتا۔ قاتل!...... سمجھیں؟ میں اکیلا نہیں جا سکتا۔ مجھ سے پوچھا جائے گا: "ارے قاتل! تو کہاں جا رہا ہے؟" میں نے تو گھوڑے تک چُرائے ہیں۔ واللہ! لیکن اس کا ساتھ بالکل ایسا ہے ـــ بالکل ایسا ہے جیسے کسی معصوم بچے کے ساتھ میں جاؤں۔ سمجھیں؟ سمجھیں یا نہیں؟۔

"ہاں۔ جاؤ۔ آؤ، مَیں تمہیں ایک بار پھر پیار کر لوں مُسیا!"

سگالوک نے کہا "پیار کرو۔ ایک دوسرے کو پیار کرو۔ یہ عورتوں ہی کا کام ہے۔ ایک دوسرے کو گرمجوشی سے خدا حافظ کہو"

مُسیا اور سگالوک آگے بڑھے۔ مُسیا ہوشیاری سے چل رہی تھی۔ پاؤں کبھی کبھی برف پر رپٹتے۔ وہ عادتاً اپنا سایہ ذرا اُٹھائے چل رہی تھی۔ اور مرد اُس کا ہاتھ پکڑے قدم جما جما کر رکھتا ہوا استقامت سے موت کے قریب لے جا رہا تھا۔

روشنیاں ساکت ہو گئیں۔ چاروں طرف سناٹا اور تنہائی تھی۔ سپاہی خاموش تھے اور صبح کی بے رنگ مدھم روشنی میں سائے نظر آ رہے تھے۔

تانیا نے یکایک ٹھنڈا سانس بھر کے کہا: "میں اکیلی ہوں۔ سریوژا مر چکا۔ ورنر مر چکا ـــ اور مُسیا بھی۔ مَیں تنہا ہوں۔ سپاہیو، سپاہیو! مَیں اکیلی ہوں۔ اکیلی ـــ"

سمندر پر سُورج طلوع ہو رہا تھا۔

لاشیں ایک بکس میں رکھ دی گئیں اور اُنہیں اُٹھا کر لے چلے۔ گردنیں کھنچ کر لمبی ہو گئی تھیں۔ آنکھیں اُبل پڑی تھیں۔ نیلی، پھُولی ہوئی زبانیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے نامعلوم بھیانک پھول۔ خون کی کف آلود ہونٹوں میں دبے ہوئے ہیں ـــــــ مُردہ جسم اُسی راستے سے واپس لیجائے جا رہے تھے جس سے وہ زندہ آئے تھے موسم بہار کی برف ویسی ہی ملائم اور تازہ تھی۔ بادِ بہار ویسی ہی پُر زور اور خوشبودار تھی۔ اور برف پر سریوژا کا کالے ربڑ کا جوتا بھیگا ہوا اور کچلا ہوا پڑا تھا۔

طلوع ہونے والے سورج کا یوں خیر مقدم کیا گیا۔

(ختم شُد)

(اینڈریو) شاھد

نقد و تبصرہ

حیاتِ سیاسی - محمد مرزا صاحب دہلوی سیاسی کتب کے مصنف کی حیثیت سے ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ "اتاترک" مبصرین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ "ایشیا کے بڑے لوگ" (چاروں حصّے) مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے "مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی" لکھی ہے، جسے اگر ایک بڑا کارنامہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ گزشتہ سو سال میں ہندوستانی مسلمانوں پر کیا کیا گزری؟ انگریزوں اور ہندوؤں نے اُن کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ یہ عبرتناک تاریخی شواہد ہیں جنہیں مصنف نے منصف کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت قدم قدم پر واضح ہوتی جاتی ہے کہ ہمسایہ قوم نے مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان پہونچایا۔ اعلانیہ بھی اور پوشیدہ بھی۔ مخالف بن کر اور موافق بنکر۔ مرزا صاحب نے اِن تمام امور کو بدلائل ثابت کیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دو مہینے پہلے تک کی پوری سیاسی معلومات، اس میں شامل ہے۔ ملک کی کل سیاسی جماعتوں اور ان کی کارناموں پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہر مصنف کا ایک زاویۂ نظر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا زاویۂ نظر ایک ہمدرد اور سچے مسلمان کا زاویۂ نظر ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ہر مسلمان کو سیاستِ وطن سے بخوبی واقف ہونے کے لئے "حیاتِ سیاسی" کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحے۔ مجلد۔ مضبوط گرد پوش۔ قیمت عہ۔

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب۔ اردو بازار۔ دہلی۔　　"ش"

بغداد کا جوہری - اشرف صبوحی صاحب دہلوی اردو کے صاحبِ طرز مضمون نگار ہیں۔ ناظرینِ ساقی ان کے اکثر افسانے ساقی کے صفحات پر دیکھ چکے ہیں۔ اب اُن کی ایک نہایت پاکیزہ کتاب "بغداد کا جوہری" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ بغداد کے ایک لکھ پتی جوہری احمد کا قصّہ ہے جو الف لیلہ کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ احمد جوہری جتنا مالدار تھا اُتنا ہی حسین بھی تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ رومان کی تلاش میں اُس کی رسائی خوبصورت انیس جلیس تک بھی ہوئی جو بالآخر احمد کی شریکِ حیات بنی۔ انیس کی خوبصورتی سے زیادہ اُسکی خوش سیرتی دیکھنے کی چیز ہے۔ حُسن و عشق کے نازک و لطیف معاملات قصّے کے پیرائے میں اتنی عمدگی سے پیش کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا پھڑک جاتا ہے۔ بقولِ تعارف نگار "اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک لطیف و پُر معنی تمثیل ہے جس میں فلسفۂ حیات اور فلسفۂ حُسن کے بہت سے رموز و نکات پوشیدہ ہیں" یہ داستان غایت درجہ دلچسپ ہے اور شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے جی نہیں مانتا۔ یہ قصّہ انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اتنا عمدہ کہ طبعزاد پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ مضبوط جلد۔ رنگین گرد پوش۔ ضخامت ۱۰۷ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب۔ اُردو بازار۔ دہلی:　　"ش"

ساقی کا شاندار

افسانہ نمبر

ساقی بابت جولائی ۱۹۴۰ء افسانہ نمبر ہوگا۔ جس کے لئے نہایت کاوش سے اعلیٰ درجے کے افسانے فراہم کئے گئے ہیں۔ افسانوں میں بیحد تنوّع ہے۔ مُلک کے بہترین انشا پردازوں سے یہ افسانے لکھوائے گئے ہیں۔ ایسا نادر مجموعہ آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ مندرجہ ذیل حضرات کے افسانے شامل کئے جا چکے ہیں :-

(۱) ایم۔ اسلم؛ (۲) لطیف الدین احمد؛ (۳) کرشن چندر؛ (۴) پروفیسر محمد مسلم؛ (۵) مرزا عظیم بیگ چغتائی؛ (۶) صادق الخیری (۷) قیسی رامپوری؛ (۸) عصمت چغتائی؛ (۹) شاہد لطیف؛ (۱۰) راجندر سنگھ بیدی؛ (۱۱) ممتاز مفتی؛ (۱۲) اُپندر ناتھ اشک (۱۳) سید رفیق حسین؛ (۱۴) ظفر قریشی؛ (۱۵) اشرف صبوحی؛ (۱۶) وجاہت سندیلوی؛ (۱۷) احمد ندیم قاسمی؛ (۱۸) بھارت چند کھنہ؛ (۱۹) ماہر القادری؛ (۲۰) ساون مل ترکھا؛ (۲۱) پروفیسر محمد مُحسن؛ (۲۲) عبد القادر فاروقی؛ (۲۳) سعادت حسن منٹو؛ (۲۴) ایس۔ ڈبلیو۔ حیدر؛ (۲۵) امان اللہ؛ (۲۶) سراج الدین احمد؛ (۲۷) علامہ مضحک دہلوی؛ (۲۸) عبد الجلیل؛ (۲۹) ریاض رؤفی؛ (۳۰) کرشن چندر سکسینہ؛ (۳۱) کوکب شاہجہانپوری؛ (۳۲) سید احمد حسن اسعد گیلانی؛ (۳۳) سید کریم احمد؛

افسانہ نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ ہوگی۔ محصول ڈاک مع رجسٹری چار آنے!

مُستقل خریداروں سے علیحدہ کوئی قیمت نہیں لی جائیگی۔ اگر آپ مُستقل خریدار نہیں ہیں تو اب بن جائیے تاکہ یہ نفیس تحفہ آپ مُفت حاصل کر سکیں!

مہتمم "ساقی"

ہر کتاب کا محصول ڈاک بذمہ خریدار
سال رواں
کا بہترین
افسانوی پیشکش
"ایک دفعہ کا ذکر ہے ــــ!"
(ایک دلپسند رومان بغداد)
ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی شروع ہوتی ہے اور ملک کے نامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے جدید طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے۔ مگر اردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر، ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو۔ یہ طویل افسانہ ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے۔ عورت کی شوہر پرستی اور دلداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے۔ ہوس پرست، حسن بیں عاشق زار شوہر محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمت بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ سطر بہ سطر پائیں گے۔
بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینۂ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے۔ اکثر نیک نفس بیویاں انیس جلیس جیسی عفت مآب اور دیوانۂ شوہر بیوی بننا پسند کریں گی۔
خلیفہ حمزہ کے حرم کے راز سربستہ۔ بغداد کی روزمرہ زندگی خالص الف لیلائی ماحول۔ عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ۔ روح کی بیباک تمنائیں۔ عورت کا تڑپتا ہوا دل مرد کی ہوس کارانہ جنوں سامانیاں۔ پُرتکلف ایوان۔ لق و دق صحرا۔ رنج، راحت، مسرت و کلفت پہلو بہ پہلو۔
احمد جوہری اور انیس جلیس کی پُرسوز اور حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بیخودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی۔ بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے۔ نفیس عبارت۔ بلیغ طرز بیان۔ چست عبارت پڑھنے والے کو حواس پر چھا جاتی ہے۔
سرورق نہایت خوشنما مجلد قیمت عمر علاوہ محصول ڈاک
مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی

دوشیزۂ صحرا

صحرائے عرب کی خوں آشام زہرہ کا فسانۂ محبت

اس پرفسوں و سحر خیز داستان میں مصنفہ نے سرزمین حُسن کا ایک انوکھا قصۂ عشق سُنایا ہے، جس میں محبت و نفرت، خشم و انتقام، ظلم و ستم اور جنگ و جدل کبھی آپ کو ونگشت بدنداں کریں گے اور کبھی حسُن کی سرگوشیاں، عشق کی کارفرمائیاں اور رقابت کی مسوتیں آپ کو انگشت بدنداں کردیں گی۔

بنتِ شیخ کی تعیش گاہ، اجڑی ہوئی خانقاہ کی الوہیت، ہیلن کی جرأت و مردانگی، الف کا ہیمان وفا الاسد کا جنون، نہایت نابینا یوسف کا لرزہ براندام کردینے والا انتقام اور حسین و جمیل زہرا کا —— جس کی دہشتناک خونریزی اور بے پناہ قتل و غارت سے ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ کانپ اٹھتا ہے —— ہیلن کے محبوب کی الفت میں گرفتار ہونا مگر حصول مقصد میں ناکام و مایوس ہوکر کو صحرا کو پاؤں تلے روندتے ہوئے فرار شدہ محبت و محبوب کو تہ تیغ کردینے کی کوشش کرنا...... یہ سب چیزیں آپکو ایک نئی دنیا میں لیجائینگی

اس ناول کو پڑھ کر آپ عرب اور عرب کے جنگجو قبیلوں کے جملہ حالات، مثلاً ان کے رسم و رواج، ان کی مہمان نوازی، عادات و خصائل، بہادری اور جرأت، فنون حرب سے آگاہی، رہنے سہنے کے طریقے، مذہب، معاشرت وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہوجائینگے اس کی مصنفہ مس جون کو نکوئسٹ ہیں، جنہوں نے ایک عرصہ تک عرب میں رہکر اور وہاں کا بہ نظر غائر مطالعہ کرکے اس کو قلم بند کیا تھا۔ اور اب اسے اردو کے مشہور ادیب و مترجم مسٹر صادق الخیری ایم۔ اے دہلوی نے نہایت دلکش اور دلفریب اسلوب میں ہماری زبان کا جامہ پہنایا ہے۔

کتابت طباعت بہترین۔ سرورق نہایت خوشنما۔ قیمت مجلد عہ

طامس مور — ل۔ احمد

لالہ رُخ ایڈیشن

جدید مصوّر

۱۹۳۹ء کا ادبی کارنامہ

انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصورات اور نازک تخلیلات عشق پر مبنی ہے تین ہزار گنی دیکر لانگ کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھکر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور اسکی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچا دیگا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کرینگے "مقنع ونقاب پوش پیغمبر" "آتش پرستاران فارس" "پری او بہشت" "اور نورمحل" چار قصے ہیں ترجمہ ملک کے نامور ادیب ل۔ احمد اکبرآبادی نے کیا ہے۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اس کو مصور چھاپنے کیلئے تقریباً تین درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اسکے ایک ناپید ولایتی ایڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر خرچ کرکے حاصل کیگئی ہیں۔ اردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی بہترین کاغذ۔ بے پناہ ادب رومان۔ دلنشین تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کیساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول ڈاک۔

اتاترک :- لائبریری ایڈیشن

کتب خانہ علم و ادب دہلی کا تاریخی شاہکار

یہ وہ منفرد اور معرکۃ آرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک بانی جمہوریہ ترکیہ کے حالات پر آج تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ انجمن ترقی اردو ہند کا مشہور رسالہ اردو (مورخہ جولائی ۱۹۳۹ء) اس کتاب کے متعلق لکھتا ہے "اس کتاب میں محمد مرزا صاحب [illegible] نے اتاترک غازی مصطفےٰ کمال کے حالات زندگی بڑی محنت اور غائر مطالعے کے بعد لکھے [illegible] کی تمام و کمال سوانحعمری ہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو اور اس کے ہر [illegible] کی ہے۔ اردو میں اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن ایسی جامع [illegible] نہیں لکھی گئی تھی" اور ہندوستان کا مشہور رسالہ "نگار" اسکے [illegible] کمال اتاترک پر توین تصنیف ہے جس میں [illegible] جانشین عصمت [illegible] فاضل مصنف نے اس میں کمال اتاترک کی [illegible] نہایت جامعیت سے روشنی ڈالی ہے حجم ۴۰۰ [illegible] کتابت چھپائی اعلیٰ [illegible]

سات تارے

ایک ہی پلاٹ پر سات مشہور افسانہ نگار صاحبان

ایم اسلم۔ قیسی رامپوری۔ شاہد احمد۔ فضل حق قریشی۔ انصار ناصری۔ اشرف صبوحی۔ ابوطاہر داؤد

کے شاہکار افسانے۔ ہر افسانہ کچھ ایسے پیرایہ میں لکھا گیا ہے کہ اچھوتا معلوم ہوتا ہے۔ ہر افسانہ نگار نے اپنی انشا پردازی کا سلطان دو حرف کردیا ہے اس ہفت رنگ مجموعہ میں ادب لطیف کا کمال دیکھئے۔ پلاٹ ایک ہی ہے لیکن ہر افسانہ نگار کی جنبش قلم نے کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی بالکل نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ حسن کاری کا افسانوی مجموعہ آپ کو غیر زبانوں میں بھی نہیں مل سکتا۔

قیمت مجلد عہ علاوہ محصول ڈاک

سیاسی کتابیں

ہٹلر اعظم۔ پروفیسر چندر شاستری۔ قیمت ۸ر
مسلمانان ہند کی حیات سیاسی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۸ر)
تاریخ مسلم لیگ۔ ۸ر
میری جدوجہد (ہٹلر کی آپ بیتی) ۸ر
مسولینی۔ (ڈکٹیٹر اٹلی کی آپ بیتی) ۸ر
آزادیٔ ہند (چودھری افضل حق) عار
انقلاب میں کسانوں کا حصہ ۸ر
سوئٹ روس کا نظام کار (مظہر علی اظہر) ۱ر
کمپنی کی حکومت (باری علیگ) ۸ر
اتاترک (محمد مرزا) عار
عہد حاضر کے بڑے لوگ فی جلد
حصہ اول ہندوستان (”) ۸ر
” دوم چین و ایران (”) ۸ر
” سوم عراق و عرب (”) ۸ر
” چہارم مصر و مراکش (”) ۸ر
شہید میکسونی ۱۲ر
چیمبرلین ۱۲ر
سعد زغلول ۱۲ر
اسٹالن (مترجم شانتی نارائن) ۸ر
اسٹالن (مترجم رام فیروز پوری) ۱۲ر
اسٹالن (گوپال متل) ۶ر اسٹالن (مترجم محمد اشرف خاں عطا) ۶ر
لینن (ڈاکٹر اشرف) عہ۔ لینن (دھرم دیو) ۴ر
[illegible] (باری علیگ) ۸ر۔ سوشلزم (چھبیل داس) ۸ر
[illegible] (باری علیگ) ۶ر۔ کمیونسٹ مینوفسٹو (عبداللہ بیگ) ۶ر
[illegible] (باری علیگ) ۸ر۔ ہندوستان کی پولیٹکل اکانومی ۸ر
[illegible] ۔ آئینۂ ہندوستان عہ
[illegible] (ٹالسٹائی) ۸ر

ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں ۴ر۔ قوم کی آواز (گاندھی جی) عہ
تاریخ کانگرس (پٹا بھائی سیتا رامیہ) ۸ر
غدر ۱۸۵۷ء (رام سروپ کوشل) ۸ر
غدر ۱۸۵۷ء (شیخ حسام الدین) عہ
سیاستیات ہند عہ
پولیٹکل رپورٹ ۱۹۳۵ء عہ
مزدوروں کا پیغمبر (ہردیال) ۴ر
محمد علی جناح ۵ر
گیری بالڈی (لاجپت رائے) عہ
چنگاریاں (چھبیل داس) ۱۲ر
راجا و پرجا (ٹالسٹائی) ۱۲ر
ترکی جمہوریہ (ہاشمی) عار
میری کہانی (جواہر لال نہرو) للعہ
سوئٹ روس (”) عہ
تلاش حق (گاندھی جی) ۷ر
لیگ آف نیشنز (ایم۔ ایچ سبحی) ۱۲ر
یورپ کی حکومتیں (نجم الدین جعفری) ۸ر
گاندھی جیون (ظفر نیازی) ۸ر
پیغام آزادی (لوکمانیہ تلک) ۱۲ر
مولنا محمد علی (عباس) ۵ر۔ مسولینی فاشیٹ (عباس) ۵ر
تحریک مدح صحابہ (مظہر علی اظہر) ۱۰ر
تقاریر ظفر علی خاں ۹ر
دنیا کی کہانی (پروفیسر مجیب) ۸ر
جدید دستور کا خاکہ ۲ر۔ سیاست کی پہلی ۴ر
حکومت خود اختیاری۔ (طفیل احمد) عہ
سوشلزم کی بنیادی حقیقت (رفیع الدین) ۸ر
مذاہب [illegible] (مہرپال ایم اے) ۸ر

مشہور مصنفین کی دلچسپ کتابیں

عبدالحلیم شرر

- جویائے حق — ۳/
- ایام عرب — ۱۲/
- ماہ ملک — ۱؎
- فتح اندلس — ۱؎
- مقدس نازنین — ۱؎
- یوسف و نجمہ — ۱؎
- مفتوح و فاتح — ۱؎
- زوال بغداد — ۱؎
- حسن کا ڈاکو — ۱؎
- خونناک محبت — ۱؎
- ماہ وخت — ۱؎
- ملک العزیز ورجنا — عہ/
- " " قسم دوم — ۸/
- فلورا فلورنڈا — عہ/
- " " قسم دوم — ۱۰/
- طاہرہ — ۱؎
- قیس و لبنیٰ — عہ/
- فلپانا — ۱؎
- آغا صادق کی شادی — ۱۰/
- مینا بازار — عہ/
- رومتہ الکبریٰ — ۱؎
- فیروز شاہ — عہ/
- الفانسو — ۱۲/
- ابوبکر شبلی — عہ/
- لعبت چین — عہ/
- سیر العلما — ۱۲/
- مسلمان تاجداران ہند — ۱۲/
- شاہکار شرر — ۱۲/
- منصور موہنا — ۸/
- حسن انجلینا — ۸/
- فردوس بریں — ۸/
- شہید وفا — عہ/
- میوۂ تلخ — ۸/
- حسن بن صباح — ۳/
- بدر النساء کی مصیبت — ۳/
- عزیزہ مصر — ۱؎
- عیب دان دلہن — ۱۲/
- مقلدین اسلام — ۱۲/
- ابوالحسین — ۸/
- ذی النورین — ۱۰/
- ثانی اثنین — ۶/
- سیرۂ عائشہ — ۸/
- خواجہ معین الدین چشتی — ۶/
- افسانۂ قیس — ۳/
- تذکرہ مشاہیر عالم — ۱۲/
- پردہ — عہ/
- مخدرات مشاہیر عالم حصہ اول — ۱؎
- " " حصہ دوم — ۱؎
- اسلامی سوانح عمریاں — ۱؎
- حالات اقوام کرد — ۶/
- مقالات شرر — ۱؎
- سفرنامۂ ہستی — ۱؎

عظیم بیگ چغتائی

- خانم — للعہ/
- کولتار — ۱۲/
- روح ظرافت — ۱؎
- مسز گرو کے علے — عہ/
- چمکی — ۱؎
- چینی کی انگوٹھی — ۸/
- کمزوری — عہ/
- کھرپا بہادر — عہ/
- خطوط کی ستم ظریفی — ۸/
- شریر بیوی — ۱؎
- دیباچہ — ۱۲/
- چغتائی کے افسانے — ۳/
- روح لطافت — ۱؎

علامہ اقبال پر

- سیرۃ اقبال — ۱؎
- پیام اقبال — ۱۲/
- جوہر اقبال — ۱؎
- مقالات یوم اقبال — ۱؎
- حیات اقبال — عہ/
- اقبال اور اسکا پیغام — ۸/
- بانگ درا اقبال — ۸/
- شکوہ " — ۶/
- نظم اقبال " — ۳/

ایم اسلم

- مہدی — ۳/
- کارزار حیات — ۱۲/
- تفسیر حیات — ۱۲/
- مرزا جی کامل — للعہ/
- نغمۂ حیات — ۱؎
- سراب ہستی — ۱؎
- شب غم — ۱؎
- ہلال و صلیب — ۱۲/
- پیغام سروش — ۱؎
- گناہ کی راتیں — عہ/
- بقائے دوام — عہ/
- چار سہیلیاں — عہ/
- بڑی بی — ۱۲/
- نرگس — ۱۲/
- ثمرۂ گناہ — عہ/
- آشوب زمانہ — عہ/

سدرشن

- سولہ سنگار — ۱؎
- چندن — ۱؎
- سدا بہار پھول — ۱۲/
- محبت کا انتقام — عہ/
- راج سنگھ — عہ/
- قدرت کے کھیل — ۱۲/
- کنج عافیت — ۶/
- چٹکیاں — ۶/
- بیگناہ مجرم — عہ/
- پتھروں کا سوداگر — ۱۲/
- قوم پرست — عہ/
- پاؤں — ۱۴/

منشی پریم چند

- گئودان — ۳/
- میدان عمل — ۱۲/
- غبن — ۱۲/
- پردۂ مجاز — ۱۲/
- خواب و خیال — ۱؎
- آخری تحفہ — ۱؎
- زاد راہ — عہ/
- واردات — ۱؎
- بیوہ — ۱؎
- دودھ کی قیمت — عہ/
- روحانی شادی — ۶/
- آسمان کی پری — ۲/

شوکت تھانوی

- موج تبسم — ۱۲/
- سیلاب تبسم — ۱۲/
- دنیائے تبسم — ۱؎
- گہرستان (دیوان) — ۱؎
- دل پھینک — عہ/
- سوتیا چاہ — عہ/
- خانم خاں — عہ/
- پردیس — عہ/

اصغر گونڈوی

- نشاط روح — ۱۲/
- سرود زندگی — ۱۲/

کتب خانہ میں نئی کتابوں کا اضافہ

ہر کتاب کا محصول ڈاک بذمہ خریدار

نام کتاب	مصنف یا مترجم	موضوع	قیمت
بغداد کا جوہری	اشرف صبوحی	ناول	عمر
دوشیزۂ صحرا	صادق الخیری	"	۱۲ر
تلوپطرہ	سلمیٰ تصدق	"	۸ر
رنبرۂ مینا	۵۰ افسانہ نگار	افسانے	سے ر
گوفرانس	طاہر قریشی	"	۱۲ر
سوز ناتمام	عاشق بٹالوی	"	۱۲ر
باسی پھول	سید علی عباس حسینی	"	۱۲ر
صحرانورد کے خطوط	مرزا ادیب	"	۸ر
محشرستان	محشر عابدی	"	۸ر
نظر کے دھوکے مصور	بدر شکیب	"	۱۲ر
مقالات ہاشمی	نصیر الدین ہاشمی	مقالات	۸ر
حیات اقبال	مرتبہ مطلع کمپنی	سوانح	عہ ر
پریم سوگ	حسام الدین	تنقید و سوانح	۸ر
نہتارانا	دتاتریا کیفی	ناول	۱۲ر
مثنویات میر	سید محمد	نظم	عار
صوت تغزل	طباطبائی	دیوان	عار
ڈاچی	اوپندرناتھ اشک	افسانے	عہر
صدائے جرس	والدہ سراج الدین ظفر	"	۱۲ر
دانہ و دوام	راجندر سنگھ بیدی	"	۸ر
طلسم خیال	کرشن چندر	"	۱۲ر
نغمۂ حرم	اختر شیرانی	دیوان	۱۲ر
نشاط روح	اصغر گونڈوی	"	عار
فانیات فانی	فانی بدایونی	"	۸ر
غالب	ڈاکٹر لطیف	تنقید	۸ر
[illegible]	عزیز	افسانہ	۸ر
[illegible]	خلیل احمد	سوانح	عمر
[illegible]	خلیقی دہلوی	مضامین	عار
[illegible]	سیل حسامی	افسانے	عمر
[illegible]	[illegible] کماری	سوانح	عمر
[illegible]	سید [illegible] جعفری	افسانے	۱۲ر
[illegible]	[illegible]	[illegible]	عمر

نام کتاب	مصنف یا مترجم	موضوع	قیمت
خواب خیال	مجنوں گورکھپوری	افسانے	عا
تاریخ جمالیات	"	تاریخ	۸ر
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	مزاحیہ	۸ر
افسانۂ پدمنی	احتشام الدین ایم اے	تنقید	عہ
مطالعہ حافظ	"	سوانح	۱۲ر
دیوان حافظ مترجم منظوم	"	دیوان	۱۲
پھول اور کانٹے	گوپال متل	افسانے	۱ر
داستان عجم	نصیر حسین خیال		عہ
ماردہند	شاد عظیم آبادی	مثنوی	۱۲
ظہور رحمت	"	نظم	۸ر
فکر بلیغ	"		۱۲ر
اسٹنڈرڈ اردو انگلش ڈکشنری	انجمن ترقی اردو	لغات	عـه
شاہنامہ اسلام حصہ سوم	حفیظ جالندھری	نظم	ے
خیابان	محمود اسرائیلی	"	عہ
جام طہور	اثر صہبائی	"	۸ر
محبت کا فسانہ	ل۔ احمد	افسانہ	عا
زندگی کے کھیل	"	"	عہ
اقبال اور اس کا پیغام	ڈاکٹر تصدق	تنقید	۸ر
دنیا کے سچے افسانے	گوپال متل	افسانے	۱۲ر
غریب کی آہ	ڈاکٹر ہری چند	"	۱۲
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	افسانہ	عہ
شب کی پکار	راحت آرا بیگم	"	۸ر
بانسری کی آواز	"	"	۸ر
غنچۂ افسانہ	"	"	۸ر
دیوان رنگین و انشا	رنگین و انشا	نظم	۱۲ر
دیوان جان صاحب	جان صاحب	"	۸ر
انتخاب نذیر	عباس مسعود	"	عار
شرح دیوان غالب	نظامی	شرح	۸ر
پھول اور کلیاں	تمکین	افسانے	۸ر
گہوارۂ تبسم	ظریف دہلوی	[illegible]	۱۲ر
[illegible]	[illegible]	[illegible]	ے

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جُرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں مستقل
خریداروں سے اُن کی
قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۲۲ | ساقی دھلی؛ بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اوّلین

اَرون ہسپتال ہے یا قتل گاہ؟

رنگروٹ ڈاکٹروں نے ۵ سالہ معصوم بچّی کو کس طرح قتل کیا؟

خان بہادر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی. مترجم قرآن مصنف کتب کثیرہ کی ۵ سالہ پوتی (نعیمہ) ایک طفلانہ غلطی سے ایک دھیلا اور ایک پائی (تانبے کے سکّے) نگل گئی۔ محبت کرنے والے ماں باپ نے احتیاط کے لئے دہلی کے سب سے بڑے شفاخانے (اَرون ہسپتال) میں ۳ جولائی کو دِن کے ڈھائی بجے معائنہ کرایا۔ ۳ ڈاکٹروں نے عکس ریز لیا جس سے معلوم ہوا کہ سکّے کھانے کی نالی میں اُتر چکے تھے۔ لیکن اسکے باوجود ان جلّاد صفت جاہل رنگروٹ ڈاکٹروں نے اس ۵ سالہ معصوم بچّی کو نہایت بے پروائی سے کلورو فارم سے بیہوش کیا۔ اور نہایت سفّاکی، بے رحمی اور غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے اس ننھے گلے کی باریک لیکن ریشم سے زیادہ باریک نالیوں میں آہنی اوزاروں سے پون گھنٹے تک سکّے نکالنے کی مشق اس طرح کی کہ گویا یہ بچّی ذی رُوح نہیں ہے۔ معصوم بچّی ان بے رحم قصائیوں کے ناتجربہ کار ہاتھوں، اور گوبر بھرے ہوئے دماغوں کی وجہ سے ماہیِ بے آب اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپتی رہی۔ اور مشق ستم جاری رہی۔ جب کلوروفارم کا اثر کم ہوا، تو ان ہٹلر سے زیادہ سفّاک ڈاکٹروں نے دوبارہ کلوروفارم دیا۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ نالائق ڈاکٹر سکّے نکالنے میں ناکام رہے۔ مینا کی طرح باتیں کرنے والی بچّی ان ڈاکٹروں کی ہاتھوں نیم مُردہ حالت میں والدین کو سونپی گئی۔

پوری رات نہایت بے چینی میں بچّی نے کاٹی، اور دوسرے روز صبح کو مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کو دکھایا گیا۔ انہوں نے عکس ریز لیکر بتایا کہ۔

"سانس کی نالی آہنی آلہ جات کے غلط اور بے دردانہ اور بے ضرورت استعمال سے پھٹ گئی ہے، اور زخم ہو گئے ہیں، جن میں پیپ پڑ گئی ہے"

ڈاکٹر جوشی کی رائے سے بے گناہ بچّی کے والدین اور متعلقین کے پیروں کے نیچے کی زمین نکل گئی۔ اسی وقت دہلی کے تمام مشہور ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا۔ اور اُس نے متفقہ طور سے ڈاکٹر جوشی کی رائے سے اتفاق کیا۔

بیدریغ روپیہ صرف کرنے، انتہائی دوڑ دھوپ کرکے بہترین طبّی امداد حاصل کرنے کے باوجود ۱۲ دن کی رُوح فرسا تکلیف کے بعد بھوکی پیاسی نعیمہ نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، سسکیاں لے لیکر پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستی باپ کی آنکھوں کے سامنے ماں کی آغوش میں جان دیدی۔ جس نے نو مہینے پیٹ میں اپنا خون پلاکر پرورش کیا، ۲ سال چھاتی سے دودھ پلایا، اور پال پوس کر بڑا کیا۔ آہ بہار کے دن آنے سے پہلے ہی یہ غنچہ کھلنے سے مُرجھا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہم اس بے رحمانہ اور سفاکانہ اور وحشیانہ قتل پر ڈائرکٹر جنرل شفاخانہ جات ہند اور آنریبل چیف کمشنر دہلی کو خصوصیت سے توجہ دلاتے ہیں۔ اور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس قتل کا ذمہ دار دہلی کا چیف میڈیکل افسر ہے، یا یہ تینوں رنگروٹ ڈاکٹر جنہوں نے اپنی مشق کیلئے اس ہونہار بھولے بھالے لال کو منتخب کیا؟ کیا انسانی جان اتنی ارزاں ہے کہ جاہل، کندۂ ناتراش، بزاخفش ڈاکٹروں کے نام پر جلّادوں کے تختۂ مشق کیلئے ایسی آزادی دی جاتے؟

ضرورت ہے دوسرے انسانوں کی جان کی حفاظت کیلئے ان لوگوں کے خلاف سخت محکمانہ قدم اُٹھایا جائے۔ جو اس قتل کے ذمہ دار ہیں۔ اور ان تینوں ڈاکٹروں کے خلاف فوراً دیوانی اور فوجداری مقدمات پبلک مفاد کیلئے دائر کئے جائیں جن کی نالائقی اور جہالت سے یہ معصوم بچّی شہید ہوئی۔ شاید اس مقدمہ کی بدولت ان غریب مریضوں سے بہتر سلوک ہو۔ اور آئندہ احتیاط ہو، جن کو محض افلاس کی وجہ سے جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ انسانیت کی اور بیکس مریضوں کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔

خان بہادر محمد مسیح پال امین حزیں کا مجموعہ کلام "گلبانگِ حیات" کے نام سے اسی مہینے میں شائع ہونے والا ہے۔ کتاب مجلد، خوشنما اور بانگِ درا سائز کی ہوگی۔ اُردو اکیڈمی لاہور سے منگائی جاسکیگی۔

جناب احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "بگولے" کے نام سے مکتبۂ اُردو لاہور سے شائع ہونیوالا ہے۔ اس میں پندرہ افسانے شامل ہونگے۔ کتاب مجلد ہوگی۔ مسٹر کرشن چندر نے دیباچہ لکھا ہے۔

"شاھد"

یورپ سے واپسی پر ہندوستان پہلی نظر میں

پچھلی مرتبہ میں نے آپ کو یورپ کی وہ جھلک دکھائی تھی جو وہاں پہونچنے کے بعد میرے آگے آئی۔ اب میں آپ کو اپنے وہ تصورات سُنانا چاہتا ہوں جو ابھی ابھی ہندوستان لوٹ کر میرے دل میں پیدا ہوتے۔

جہاز پر میری ملاقات ایک ہندوستانی کسان سے ہوئی۔ جو یو۔ پی کا رہنے والا تھا اور کسی سندھی سیٹھ کا رسوئیا بن کر کچھ عرصہ سے اٹلی میں رہنے لگا تھا۔ اب وہ گھر لوٹ رہا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جہاز پر بیٹھتے وقت اُس نے کالی دیوی سے منتا مانی ہے کہ صحیح سلامت گھر پہونچتے ہی ایک بکرا ان کی نذر کرے گا، نیز بالے میاں کی مزار پر سوا روپے کی شیرنی بھی چڑھائے گا۔ یہی نہیں بلکہ وہ تیرتھ کرنے اور محلے کے برہمنوں کو دعوت دینے کا بھی تہیہ کر چکا تھا۔ جہاز پر بیٹھنے کے بعد اُس نے سمندر دیوتا میں کئی پیسے پھینکے اور اب ان چھوٹے بڑے دیوتاؤں سے یوں دعدے وعید کر کے وہ دیس جا رہا تھا۔ اس نے پتلون کے نیچے ایک لنگوٹی میں اپنی ساری جمع پونجی چھپا رکھی تھی۔ یہ کسان اوہام اور جہالت کا پتلا تھا۔ بات بات پر سب سے لڑتا اور گالیاں بکتا تھا۔ پورٹ سعید سے اُس نے گھر والوں کو خط لکھ کر ہدایت کی تھی کہ باجے لیکر اس کا استقبال کرنے اسٹیشن آئیں۔ یہ کسان بُرا آدمی نہ تھا اس میں چند خوبیاں بھی تھیں لیکن دبی ہوئی۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرے دیس میں اَن گنت آدمی ایسے ہی ہیں مجھے انہیں کے بیچ میں رہنا ہے اور اگر کچھ کرنا ہے تو انہیں کیلئے کرنا ہے۔

جس وقت میں یہ جملے تحریر کر رہا ہوں رات بھیگ رہی ہے اور بمبئی کے اس صاف ستھرے محلے کے ایک مکان میں بیٹھا ہوا ہوں، سامنے کے مکان میں رہنے والے پٹھان لامتناہی ایک سُری آواز میں کوئی پشتو گیت گا رہے ہیں۔ سامنے کے چمن میں چمپی والے لوگوں کی کھوپڑیوں کی مرمت کر رہے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر لاتعداد بے گھر بے سخت پتھروں پر پڑے ہوتے ہیں۔ لوگ پان کھاتے ہوئے اِدھر اُدھر تھوک رہے ہیں۔ آج صبح میں ایک مہیب آواز سُنکر اٹھ بیٹھا۔ کیا سنتا ہوں کہ پورا محلہ کھانس کھنکار رہا ہے۔

یہ سب نئی باتیں نہ تھیں۔ تھوک، کھانسی، کھنکار، کھٹمل، مکھی، مچھر۔ یہ سب ہر ہندوستانی کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ مگر عرصہ کے بعد یہاں لوٹنے پر مجھے یہ سب چیزیں عجیب عجیب سی معلوم ہوئیں۔ یہ سچ ہے کہ مچھر اور کھٹمل کو فنا کرنے میں بہت دیر لگے گی۔ لیکن یہ تو بہت آسان ہے کہ ہمارے دیس والے پان کھا کر اِدھر اُدھر تھوکنے اور بُری طرح ڈکارنے یا کھنکارنے کی عادت چھوڑ دیں۔ ذرا سی سمجھداری سے کام لیا جائے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اپنے پڑوسیوں کے سر پر دھرپد الاپنا اور ہارمونیم بجانا نہ چھوڑ دیں۔

خیر یہ سب تو ہے۔ لیکن سب سے پہلے ہندوستان کی جس خصوصیت نے مجھے جھٹکا سا پہونچایا، وہ یہ احساس تھا کہ یہ مَردوں کا ملک ہے۔ اکّی دکّی عورت نظر آجائے تو بہت ہے، ورنہ بندھیاچل کے اوپر چاروں جانب یک جنسی پرچم لہرا رہا ہے۔

بمبئی ہندوستان نہیں ہے، ہندوستانیت کو اس سے زیادہ تعلق بھی نہیں ہے۔ دُور سے یہ کوئی یورپین شہر معلوم ہوتا ہے۔ ایک یورپین پروفیسر نے جو میرے ہم سفر تھے، مجھ سے پوچھا کہ بمبئی والے اس قسم کی عمارتیں کیوں بنوا رہے ہیں جو تیز دھوپ کیلئے بالکل ناموزوں ہیں اور ان پر ایسی قلعی کر رہے ہیں جو دھوپ میں آنکھوں کو کھلتی ہیں۔ میں اس کا جواب کیا دیتا۔ یہ تو عام مرض ہے۔ بعض لوگوں پر جدت پرستی کا بھوت اس طرح سوار ہے کہ عمارت سازی میں ہی اندھی تقلید نہیں کرتے بلکہ اس دیس میں ننگا کلب بنانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ صاحب آپ کو دھوپ اشنان کی ضرورت ہی کیا۔ یہاں تو آپ چاہیں نہ چاہیں سال بھر سورج سر پر دھرا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں باہر سونا ہے۔ دن بھر سورج اور مہینے میں ہفتے بھر سورج جگمگائے۔ یہ مستقل روشنی انسان کے اعصابی نظام کے لئے بہت مضر ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔

جہاز سے اُترتے ہی قلیوں نے آپس میں گالی گلوج شروع کی، بندرگاہ کے بابوؤں نے مسافروں کو شک و شبہ سے دیکھنا شروع کیا۔ اب کوئی شک نہ رہا کہ میں ہندوستان میں ہوں۔ بات بات پر شکریہ، اور معاف کیجئے کے دن گئے۔

آواز اٹھاتے تھا کوئی سنتا ہی نہیں اور ہر طرف مچھلی بازار سا لگا ہوا ہے۔ یہاں مجھے یہ بھی پوچھنا ہے کہ آخر ہم لوگوں میں خواہ مخواہ چیخ چیخ کر بولنے کی عادت کیوں ہے۔

جب میں بمبئی کی سڑکوں سے گزرا تو دیکھا کہ بدلا کچھ نہیں ہے۔ دیسی فلموں کے اشتہاروں میں وہی پرانی تصویریں ——ایک مسٹنڈا ہیرو جس کی مونچھوں کی لمبائی کچھ بڑھ گئی ہے، کسی ہیروئن کا آنچل پکڑ کر کھینچ رہا ہے اور یہ آنچل کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ فلموں کے ناموں میں البتہ ذرا سا سدھار ہوا ہے۔ "فولادی پہلوان" اور "کالا چور" جیسے نام پہلی نظر میں دکھائی نہ دئے۔ لوٹنے کے بعد کوئی دیسی فلم اب تک نہیں دیکھا۔ معلوم نہیں اب بھی ان کے ہیرو مرنے سے پہلے گاتے ہیں یا نہیں، جنگلوں میں طبلے بجتے ہیں یا نہیں۔ سننے میں آیا کہ یہ لغویات اب کم ہوتی جاتی ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

دوسری چیز جو کھٹکی وہ بھکاریوں کا ہجوم تھا۔ بمبئی جیسے شہر میں جدھر جاتا ہوں بھکاری ہاتھ پھیلائے کھڑے ملتے ہیں۔ ان میں کم عمر لڑکے زیادہ ہیں۔ یورپ میں بھکاری بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں اور ان کی بھی یہ صورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں ساحل پر قدم رکھتے ہی بھکاری پیچھا پکڑتے ہیں۔ خالدہ ادیب خانم مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ ہندوستان کی تصویر میرے ذہن میں ایک اندھے فقیر کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ فقیر تاریخ اور قدرت کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑا کسی چیز کی بھیک مانگ رہا ہے۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ مجھے ہندوستان میں کھانا کھاتے اور کپڑا پہنتے ہوئے شرم آتی تھی کیونکہ خیال آتا تھا کہ پاس ہی کوئی ننگی بھوکی ماں رہتی ہوگی۔....

بہت دنوں کے بعد اتنے پرندے دیکھنے میں آئے۔ بمبئی جیسے شہر میں بھی ان کے لئے جگہ نکل آتی ہے۔ خصوصاً کوّے مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئے۔ یورپ میں ایسے کوّے نہیں ہوتے اور نہ وہ معاشرتی زندگی میں اتنا اہم حصّہ لیتے ہیں۔ کوّے جو دعوتوں اور مہمانوں کی آمد کی خبر پھیلاتے ہیں اور سورج سے پہلے صبح ہونے کا اعلان کرتے ہیں کتنی بڑی تعداد میں اس دیس میں رہتے ہیں۔

پہلی ہی رات کھٹملوں سے بھی سلام علیک ہوئی۔ انہیں پلنگ سے نکالئے تو دیوار میں رہتے ہیں اور وہاں سے ہٹائیے تو چھت پر چڑھ کر جسم پر ٹپکنے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں گرمیوں کے بعد یہ مر جاتے ہیں یا مینڈکوں کی طرح مدتوں سمٹے پڑے رہتے ہیں اور اپنا موسم آتے ہی پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔

تیسری چیز جو کھٹکی وہ شہر کی گندگی تھی۔ بمبئی کی صفائی ہندوستان میں مشہور ہے۔ لیکن اس کے بعض حصّوں کو چھوڑ دیجئے تو ہر طرف سڑکوں پر کچھ نہ کچھ کوڑا کرکٹ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں غالباً محکمۂ صفائی سے زیادہ شہریوں کا قصور ہے۔ ہندوستان کی قدیم روایت ہے کہ اپنے گھر کی گندگی پڑوسی کے دروازے پر۔ یہ مثل کسی نہ کسی حد تک اب بھی صادق آتی ہے۔

ایک یہ چیز بھی عجیب سی معلوم ہوئی کہ یورپ میں اگر عورتیں ٹانگیں دکھاتی ہیں تو یہاں مرد اپنی ٹانگیں دکھاتے ہیں۔ یہ ہماری دھوتی کی برکت ہے۔ یہ مبحث بہت دلچسپ ہے اور ایک خاص مقالے کا محتاج۔ ابھی تو اتنا ہی کہنا ہے کہ بدصورت ننگی پنڈلیوں سے زیادہ بدنما جسم کا کوئی حصہ نہیں۔

میں سرسری طور پر اپنے تصوّرات آپ کو سنا رہا ہوں پھر یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ ہمارے دیس میں جو ایک عام تہذیبی پستی ہے اس کا علاج کیا ہے۔ میں بڑے بڑے مسائل کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ چھوٹی چھوٹی سی چیزوں کا ذکر ہے جو دن رات دیکھنے میں آتی ہیں اور تھوڑی سی رواداری اور سمجھداری سے سدھر سکتی ہیں۔

اب میں سفر کے لئے تیار بیٹھا ہوں۔ ریل پہ بیٹھ کر دور جانا ہے۔ معلوم نہیں اسٹیشنوں کی وہی حالت ہے یا کچھ بدلی ہے۔ کیا اب بھی وہاں ہندو چائے اور مسلم چائے کے نعرے لگتے ہیں؟ کیا اب بھی کچھ لوگ ڈبے کے پائدان پر بیٹھ کر نہاتے اور دھوتیاں ڈبوں کی کھڑکیوں پر لٹکاتے ہیں؟ کیا اب بھی رات کے دو بجے خوانچے والے ڈبے میں سر ڈال کر گوشت روٹی کھانے کا اصرار ببانگِ دہل کرتے ہیں؟ کیا اب بھی ہمارے دیس بھائی اپنی بیویوں کے دوش بدوش جانے اور دوسروں کو اس نظارۂ لطیف سے محروم رکھنے کے لئے پردے کا خاص انتظام کرتے ہیں؟ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ کنارے کی دو چھوٹی چھوٹی بنچوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اس کے ارد گرد دیوں پردہ کھینچتے ہیں کہ کسی محل کی شکل بن جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ ریل والے اس بدعت کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ تو ہے ہی۔ اس میں دنگا فساد کے بھی بہت امکانات ہیں۔ مناسب ہو کہ ایسے لوگ فراق کی چند گھڑیاں برداشت کریں اور اپنی بیویوں کو زنانہ ڈبوں میں بٹھائیں۔

یہ سب دیکھنا ابھی باقی ہے۔ دلی دُور ہے اور وہاں پہونچتے پہونچتے معلوم نہیں کیسے کیسے نظاروں سے دوچار ہونا ہے۔ سب کچھ وہی ہے صرف میری آنکھیں بدل گئی ہیں۔ میں نے ایک دوسری دُنیا دیکھی ہے اور وہ دُنیا میری آنکھوں میں بسی ہوتی ہے۔

معلوم نہیں میری غیر حاضری میں ہندوستانی ادب میں کس قسم کی تبدیلیاں ہوئیں۔ یہ سب ابھی دیکھنا ہے۔ اب تک تو ہندوستانی زبان کے چند اخباروں کے سوا کچھ نظر سے نہیں گذرا اُنہیں دیکھکر اردو کی اخبار نویسی کے متعلق میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ مجھے یورپ کی اٹھارھویں صدی کی اخبار نویسی کی یاد دلاتی ہے جب یہ فن نیا نیا شروع ہوا تھا۔

یہ سب ہے پھر بھی وطن کی کئی چیزیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں کی برسات، خصوصًا ساون کا مہینہ، وہ جھولوں کے دن! یورپ میں یہ کہاں۔ یہاں کے پھول سونگھنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی کبھی جامع مسجد کے اس کباب بنانے کے کباب چکھنے سے بھی انکار نہیں ہے۔ یہاں کی سنگیت منڈلیوں سے زیادہ جو چیز دلچسپ ہے وہ یہاں کا مشاعرہ ہے اور اُسے بھی ایک بار دیکھنا ہے۔

کبوتر بازی، مُرغ بازی، بٹیر بازی ــــ ان سب کو میں ایک ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ چیزیں مر رہی ہیں اور میری متجسس طبیعت کسی مقام پر نہیں رُکتی۔ ان تمام پُرانی چیزوں کو پھر سے دیکھنے کی خواہش ہے۔

یہ بھی سوچتا ہوں کہ صرف مُلک کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں کیا نہیں ہے۔ پوری دُنیا کا یہ اختصار ہے۔ ہر قسم کی آب و ہوا، ہر قسم کے مزاج اور لوگ یہاں موجود ہیں۔ انہیں بنانا بدلنا یا بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے حال پر پُرانی روایتوں اور اوہام کا اتنا بڑا بوجھ ہے کہ کمر ٹوٹ رہی ہے اور مستقبل کی طرف بڑھنا دوبھر ہو رہا ہے۔

چلتے چلتے مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ ہماری بعض خوبیوں کا مقابلہ یورپین نہیں کر سکتے۔ جس کسان کا ذکر میں نے ابھی ابھی اوپر کیا ہے، وہ اٹلی میں ہر صبح محلّے کے بچوں کو پیسے بانٹا کرتا تھا۔ فیاضی ہندوستان کی اکثریت کا زیور ہے اور امریکہ کو چھوڑکر مغرب میں لیس اور یہ بات کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اسی طرح یہاں کے لوگوں کے مزاج میں جو جذبات پرستی پائی جاتی ہے وہ یورپین میں بالکل نایاب ہے۔ مثلاً میں نے وہاں موسیقی کے بڑے بڑے جلسوں میں کبھی سامعین پر وہ کیفیت طاری ہوتے ہوئے نہیں دیکھی جو یہاں ہر سنگیت منڈل میں پائی جاتی ہے۔ اور نہ ہمارے عوام میں ذاتی نفس پرستی اور خود غرضی کا روگ اس حد تک موجود ہے جو یورپ کو خود کشی کی طرف لے جا رہا ہے۔

یہ سب وہ خیالات ہیں جو پہلی نظر میں میرے دل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ جسے مغرب و مشرق کی ٹکر کہتے ہیں اسے میں سامنے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن کیا یہ کشمکش ایسی ہے کہ کبھی سُلجھ ہی نہ سکے گی؟ اس کا جواب مستقبل دیگا۔

اختر حسین رائے پوری!

فتنۂ وطنیت

ہنگامۂ حیات نہیں رستخیز ہے — دل دیکھ دیکھکر جسے خوں نابہ ریز ہے

نازِ خرامِ دہر کی ٹھوکر ہے اور ہم — غم بربطِ حیات کا گویا ہے زیر و بم

رگ رگ میں التہاب ہے نارِ جحیم کا — نقشہ کھنچا ہوا ہے "عذابٌ الیم"[1] کا

ہر سو جہاں میں پستیِ فطرت کا زور ہے — یعنی وفورِ فتنہ و غوغا و شور ہے

گویا نمودِ زیست فقط شور و شر سے ہو — اس نیستاں کا نام ہی روشن شرر سے ہو

تشنوں کو آبِ زر کے تقاضے پہ ناز ہو — یہ فطرتِ خموش بڑی چالباز ہے

راحت کے سبز باغ دکھاتی ہے کس طرح!
مے میں ملا کے زہر پلاتی ہے کس طرح!

مضمر ہے جن میں موت وہی خواہشات ہیں — لچھن یہی تو زیرِ فلک واہیات ہیں

بدمست ہو کے بادۂ فسق و فجور سے — تیغِ جفا کو سونت کے ظالم غرور سے

بے دست و پا کا خون گراتے ہیں رات دن — کمزور کے لہو میں نہاتے ہیں رات دن

کمزور یا تو دب کے رہے یا قتیل ہو — یعنی قبول موت کرے یا ذلیل ہو

لاٹھی ہے جس کی بھینس پہ قبضہ اسی کا ہو — بیباک جو نہنگ ہے دریا اسی کا ہے

وہ ذہنیت کہ جو تھی کبھی نازِ زندگی — اب ہو کے رہ گئی ہے سراپا درندگی

روحِ سکوں کو جس نے ستایا یہی تو ہے
فطرت کے دل کو جس نے دکھایا یہی تو ہے

حق العباد[2] کا جو کبھی احترام تھا — جس وصف سے بشر کا ملائک میں نام تھا

اس جذبۂ شریف کا فقدان ہے ان دنوں — دنیا بھی تو دست و گریباں ہے ان دنوں

آدم نے رازِ "اخوتِ مومن[3]" بھلا دیا — فتنہ وطن کا ایک نیا ہی جگا دیا

کیا دلفریب ڈھونگ ہے دنیا میں رچ رہا! — سارے جہاں میں شورِ وطن کا ہے مچ رہا

یہ امتیازِ احمر[4] و اسود اسی سے ہے — قوموں میں بیر اسی سے آئیں کہ اسی سے ہو

اقوام جب تلک "وطنیت" نواز ہیں — محرومِ سوزِ دل ہیں حریفِ گداز ہیں

اس "کینہ زا" وطن کے تصور کو چھوڑیئے
جنگ و جدال کا ہے یہ بت اس کو توڑیئے

امینِ حزیں سیالکوٹی

[1] دردناک عذاب۔ [2] بندوں کا حق Duty to Man [3] کل مومن اخوۃ۔ تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ [4] سرخ (گورے) اور کالے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل سے پروانے تو رخصت ہوتے جاتے ہیں

انسان کی زندگی بلبلے جیسی ہے کہ ذرا ٹھیس لگا اور ٹوٹ گیا! اس تھوڑی سی زندگی کیلئے آدمی کیا کچھ نہیں کرتا! عیش و آرام کی ہوس، جاہ و ثروت کی تمنا، شہرت و نمود کی آرزو! غرض آدمی اس قدر بے فکری اور استغراق کے ساتھ دُنیا کی دلچسپیوں میں اُلجھ جاتا ہے، جیسے سدا یہیں رہنا ہے، اور یہ سرائے فانی منزل جاودانی ہے۔ اس فانی اور مٹنے والی زندگی کو دلچسپ بنانے کیلئے آدمی جھوٹ بولتا ہے، غیبتیں کرتا ہے، فریب دیتا ہے، حق تلفیاں روا رکھتا ہے، اسی دُنیا میں جو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور اور ناپائدار ہے، عیش و مسرت سمیٹنے کی ہوس میں بھائی، بھائی کا گلا کاٹتا اور بیٹا باپ کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔

اس فانی دُنیا کے انقلابات ــــ خُدا کی پناہ ــــ! بابل کے معلق باغیچوں (ــــ Hanging Gardens) اور نینوا کے فلک بوس ایوانوں کے رہے سہے کھنڈروں پر اُلو بولتے ہیں۔ طاقِ کسریٰ کی شکستہ دیواروں پر میں نے خود اپنی آنکھ سے عراقی چرواہوں کو دوڑتے دیکھا ہے۔ رومۃ الکبریٰ کی سطوت کا آج ڈھونڈے سے نشان نہیں ملتا۔ مصر و یونان کی تہذیب کا چراغ، انقلابات کے ایک جھونکے میں گل ہو گیا، قرطبہ کے کھنڈروں میں حجازی امیروں کے اُجڑے ہوئے مکانوں کو دیکھکر عبرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

سکندر، جس کی شہرت اور ناموری کا آج تک غلغلہ مچا ہوا ہے، کس کو خبر ہے کہ اُس کی ہڈیاں، زمین کے کس خطہ کی خاک میں دب کر رہ گئیں۔ تاریخ اپنی تمام روشن دلیلوں کے ساتھ نہیں بتا سکتی کہ کیقباد و کیخسرو کس زمین کا پیوند ہو کر رہ گئے۔ ملک الموت کا خوفناک اور مضبوط پنجہ، فقیر کے گلے اور بادشاہ کے حلقوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ انقلابات کے طوفان برق و باد کی نگاہ میں جھونپڑی کا ٹمٹمانے والا مٹی کا دیا اور محل میں جگمگاتا ہوا فانوس دونوں برابر ہیں۔ پھول سے زیادہ نازک و ملائم جسم اور پتھر اور فولاد سے بڑھکر سخت بدن، اسی پیروں سے روندی جانے والی زمین کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اسی خاک میں وہ بھی سو رہے ہیں جن کو دنیا نے ہر قدم پر ٹھکرایا، جن کی تمناؤں کو سدا ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور جو پیٹ پر ہاتھ رکھکر "روٹی، روٹی" پکارتے ہوتے چل بسے، اور وہ بھی ہزاروں من مٹی میں دبے پڑے ہیں، جن کے چاروں طرف عیش و مسرت کے ساز چھڑے رہتے تھے، اور جن کی کوئی تمنا کبھی ناکام نہیں ہوئی۔

بقا اور ہمیشگی اُسی کے نام اور اُسی کے کام کو ہے جو روح و جسم کا خالق اور کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اُس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی اور مٹنے والی ہے، وہ جیسا ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ تک ویسا ہی رہے گا۔ خدا کی نشانیاں ہر طرف بکھری پڑی ہیں، مگر مادہ پرست نگاہ دیکھ نہیں سکتی۔ اور دیکھتی بھی ہے تو اپنے خود ساختہ زاویہ نگاہ سے! وہ تمام کا تمام انقلابی لٹریچر آگ لگا دینے کے قابل ہے۔ جس میں خالقِ کائنات کے وجود کا انکار کرتے ہوئے پھبتیاں کہی گئی ہوں۔ لوگ اپنی شہرت اور ناموری کے گھمنڈ میں اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ خدا شناسی کا پہلا زینہ خود شناسی ہے ــــ وہی خود شناسی جس کو اقبال خودی کے نام سے پکارتا ہے:۔

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تُو سمجھا نہ میں سمجھا

جب ہی تو کہا گیا ہے: جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے خُدا کو پہچان لیا۔

منظرِ عبرت، اقبال کی قبر پر رحمت کے پھول برسیں، کتنی سچی بات کہی ہے اُس نے:۔

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

واقعی دُنیا اسی اُلٹ پھیر سے عبارت ہے۔ آج ہم جس طرح دوسروں کی موت کا ذکر کر رہے ہیں، کل ہمارا اسی طرح ذکر کیا جائیگا۔ آج ہم دوسروں کو "مرحوم" اور "آنجہانی" لکھ رہے ہیں، کل ہمارے مر

ناموں کے ساتھ یہ لفظ لکھے جائیں گے. ہم آج دوسروں کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ہیں، کل ہماری قبریں فاتحہ کی محتاج ہوں گی۔

وہ امیر بنا میر اور پریشان حالوں کا امن و ملجا جسے دنیا مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام سے جانتی تھی، اور جس کی مدح و توصیف میں لوگ قصیدے پڑھتے ہوئے دعا کرتے تھے کہ :

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آج اُس کو "آنجہانی" کے ساتھ یاد کیا جارہا ہے. جس کا بدن سچ مچ پھولوں میں تُلتا تھا، وہ جلتی ہوئی چتا میں بھسم ہو کر جلی ہوئی راکھ کی صورت میں گنگا میں بہانے جانے کیلئے، اسی ایوان میں، تابوت کے اندر رکھا ہوا ہے، جہاں وہ امارت و ثروت۔ اور عزت و جاہ کی تمام ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ چلتا پھرتا تھا۔

جس ایوان میں مہاراجہ کشن پرشاد صبح کو برآمد ہوتے تھے تو فوج سلامی دیتی تھی، اور خوشی کے شادیانے بجتے تھے، اسی ایوان سے اُن کا جنازہ اُٹھا، اور ہزاروں آدمیوں نے انسان کی مجبوری اور بیچارگی کا منظر دیکھ لیا. مہاراجہ بہادر اپنے ساتھ "ایوانِ شاد" کا ایک تنکا بھی نہیں لے گئے، لیکن اُن کے مرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایوانِ شاد کے سہاگ کو کسی نے کھسوٹ لیا اور اس محفل کی رونق چھین لی گئی۔ نوکر چاکر، پولس، فوج، مامائیں، اصیلیں، دربان، شاگرد پیشہ، سب کے سب ایوانِ شاد میں بدستور موجود ہیں، مگر ایک "شاد" کے نہ ہونے سے ساری محفل ناشاد اور اُجڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اینٹوں، پتھروں میں کیا رکھا ہے، مکان کی زینت تو مکیں سے ہے، مکیں کے اٹھتے ہی رونق بھی جاتی رہی۔

کاش! مہاراجہ بہادر کی روح دیکھ سکتی قصر و ایوان کی اداسی کو، کہ در و دیوار فقیروں اور بھکاریوں کی صداؤں کی گونج کے لئے ترس رہے ہیں. کاش! اُن کی آتما، سینکڑوں دلوں کی دھڑکنوں، ہزاروں سوگوار آنکھوں کے آنسوؤں کا نظارہ کرسکتی۔!

سوانح نگار تفصیل کے ساتھ مہاراجہ بہادر کی زندگی پر روشنی ڈالیں گے، اور اُن کی زندگی مختلف ابواب و عنوانات پر تقسیم کی جائیگی۔ مہاراجہ بہادر آنجہانی کے یہاں تقریباً بارہ برس تک میرا آنا جانا رہا، ذیل کے واقعات اسی وابستگی اور مشاہدے کا نچوڑ ہیں۔ ان کی نوازشیں اور مہربانیاں یاد آتی ہیں تو دل بے چین سا ہو جاتا ہے — اس خود پرست زمانہ میں، جہاں ریلوے کا ٹکٹ کلکٹر اور پولس کا جمعدار اپنے کو "لارڈ کرزن" سمجھتا ہے، مجھے تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا، جو اس جاہ و ثروت کے باوجود، اس قدر محبت اور تواضع کے ساتھ لوگوں سے ملتا ہو۔

میں نے مبالغہ اور بیجا ستائش سے قلم کو آلودہ نہ کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے، سچے واقعات اور صحیح مشاہدات کو جوں کا توں پیش کر دیا ہے، جہاں تفصیل قدرے رنگین ہو گئی ہے وہ میرے تاثرات قلبی کا اثر ہے!

بچپن۔ مہاراجہ بہادر کا بچپن اگرچہ عیش و تنعم میں گذرا، لیکن خاندانی اختلافات کی بدولت یہ دوران کیلئے بہت سخت تھا۔ مہاراجہ بہادر فرمایا کرتے تھے کہ اُن پر گھر کے لوگوں ہی نے جادو کرایا، مگر قدرت ان کی حفاظت کر رہی تھی، اور اس بچے کو ایک دن "یمین السلطنۃ" ہونا تھا۔

مہاراجہ بہادر نے خالص مشرقی ماحول میں نشو و نما پائی۔ ان کے بچپن میں نہ بجلی کی روشنی تھی، نہ موٹریں تھیں اور نہ بائیسکل تھا، میانہ، پالکی، ہوادار، بگھی، ہاتھی، یہی سواریاں استعمال ہوتی تھیں۔ خاندانِ مغلیہ کے بچے کھچے آثار دکن میں باقی رہ گئے تھے، ان ہی مغلیہ نشانیوں کے سایہ میں مہاراجہ بہادر کا بچپن بسر ہوا، مکتب میں تعلیم پائی، فارسی کی کتابیں پڑھیں، وہی کریما، مقیماں، بہار دانش، گلستاں، بوستاں، رقعات عالمگیری وغیرہ۔ بڑے ہو کر مطالعہ کا ذوق ہوا تو شاہنامہ، یوسف زلیخا اور مشہور شعراء کے دیوان بھی مطالعہ کئے۔ اس زمانے میں انگریزی کا چرچا نہ تھا، لہذا اس طرف توجہ نہ ہوئی، خوب جوان ہونے کے بعد انگریزی کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس زبان کو سیکھا، اور ایک حد تک اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے قابل ہو گئے۔ کمسنی زندگی میں خطاطی بھی سیکھی، اور بڑے ہوئے تو گھوڑے کی سواری شروع کر دی۔ اور اپنے ہم عمروں میں اچھے شہسوار سمجھے جانے لگے۔

پریشانی کے بعد۔ جوان ہوئے تو خاندانی اختلافات سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کے خاندان ہی کے بعض لوگ ان کے مخالف اور جاگیر و پیشکاری کے دعویدار تھے۔ یہ پریشانی کا زمانہ تھا۔ ایک مرتبہ یہاں تک نوبت آئی کہ مقروض ہونے کی بنا پر، ڈگری کی تعمیل کے لئے قرقی کا حکم ہو گیا، مہاراجہ بہادر خود فرماتے تھے کہ قرقی کی خبر ملی تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میں اسی غمناک حالت میں بیٹھا ہوا تھا اور ایک خدا رسیدہ

بزرگ بھی وہیں تشریف فرما تھے، انہوں نے اس پر کہا۔

"ارے تو پریشان کیوں ہوتا ہے! تیرے گھر میں تو سینکڑوں جھمیاں کھڑی ہیں، لوگ تجھے سلام کر رہے ہیں، ارے دیکھ! تیرے گھر میں کتنے بہت سے لوگوں کی بھیڑ ہے۔"

مہاراجہ بہادر یہ فرماتے تھے کہ اُن بزرگ کا یہ فرمانا میری مدارالمہامی اور وزارت کی طرف اشارہ تھا۔ اور تھوڑے دن کے بعد وہی ہوا جو انہوں نے کہا تھا۔

مہاراجہ بہادر ان حالات میں اعلحضرت نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفراں مکاں کی خدمت میں برابر معروضے گذران تے رہے تھے۔ اور قدرت ان کے ضبط و صبر کا امتحان لے رہی تھی، آخر کار "دریائے محبوبیت" کو جوش آیا، مہاراجہ بہادر کی یاد دہوئی اور سرفرازیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، جاگیریں بحال ہوئیں، پیشکاری کی خدمت عطا ہوئی، اور اُس کے بعد فوج کی وزارت (معین المہامی) تفویض فرمائی گئی۔

حضرت غفراں مکاں مشرقی بادشاہوں کی یادگار تھے جس کو نوازا اُسے نہال کر دیا۔ مہاراجہ بہادر پر بھی خاص مہربانی تھی اور ان کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ "راجہ کشن" کہکر مخاطب فرماتے تھے۔ مہاراجہ کی ادائے نیازمندی، حضرت غفراں مکاں کو پسند آگئی تھی۔ یہی چیز ترقی کا باعث ہوئی، فوج کی وزارت سے ترقی دیکر مدارالمہامی کی خدمتِ جلیلہ تفویض ہوئی، راجہ راجایان اور مہاراجہ بہادر کے خطاب کے ساتھ ساتھ "یمین السلطنۃ" کا خطاب جو اس سے قبل دکن میں کسی کو نہیں ملا تھا، خاص مہاراجہ بہادر کی ذات کیلئے وضع ہوا۔

حضرت غفراں مکاں مہاراجہ بہادر اپنے محسن و آقا حضرت غفراں مکاں کی نوازشِ و اکرام کا اکثر تذکرہ فرمایا کرتے تھے، بعض وقت حضرت مرحوم کا ذکر کرتے کرتے آنکھیں نمناک ہوجاتیں۔ کہا کرتے تھے کہ جب صبح کے وقت حضرت غفراں مکاں برآمد ہوتے تھے، تو وہ سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نوشاہ برات کے ساتھ جانے کے لئے شادی کے مکان سے نکل رہا ہے۔ لارڈ کرزن کے مشہور شاہانہ دربار کا ذکر کرتے ہوئے مہاراجہ بہادر نے کہا کہ تمام والیان ایک طرف ایستادہ تھے، اور حضرت غفراں مکاں ہم لوگوں کے ساتھ۔ لارڈ کرزن کے قریب کھڑے ہوئے گفتگو فرما رہے تھے، باتوں باتوں میں لارڈ کرزن نے حضرت غفراں مکاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یور ہائنس! تمام راجے، مہاراجے اور نواب قیمتی جواہر پہنے ہوئے ہیں، اور آپ کا لباس جواہرات سے خالی ہے۔"

اس پر غفراں مکاں نے فرمایا۔

"میں خالی نہیں ہوں، میرے پاس بھی جواہر ہیں۔"

لارڈ کرزن نے متحیر ہوکر پوچھا۔

"آپ کے پاس تو ایک سیفٹی پِن کے سوا مجھے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔"

اس پر حضرت غفراں مکاں نے مہاراجہ بہادر اور دوسرے مصاحبین کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔

"میرے جواہر یہ ہیں، میرے جواہر یہ ہیں۔"

اس فقرے کو لارڈ کرزن نے بہت پسند فرمایا اور دیر تک حضرت غفراں مکاں کا ہاتھ تھام کر اس جوہر شناسی کی تعریف کرتے رہے۔

مہاراجہ بہادر اپنے محسن حضرت غفراں مکاں کی داد و دہش اور قدرشناسی کے واقعات کا اکثر تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اگر یہ واقعات تحریر میں آجاتے تو شاہانہ روایات کی تاریخ میں چند زرّیں اوراق کا اضافہ ہوجاتا۔

صدارتِ عُظمےٰ حضرت غفراں مکاں کی وفات حسرت آیات کو مہاراجہ بہادر نے بُری طرح محسوس کیا۔ اعلحضرت شاہ میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہٗ سریر آرائے حکومت ہوئے تو پرانے حالات بدل چکے، نئے واقعات منظرِ رونما ہو رہے تھے، چند سالوں کے بعد مدارالمہامی کا عہدہ توڑ دیا گیا اور اُس کی جگہ باب حکومت (ایکزکٹیو کونسل) کا قیام عمل میں آیا، کونسل کے صدر کا لقب "صدرِ اعظم" رکھا گیا۔ سر علی امام کو صدارتِ عظمےٰ کا قلمدان عطا ہوا۔

حالات نے پلٹا کھایا اور کئی صدر اعظموں کے ردو بدل کے بعد جلالۃ الملک خسرو دکن کی نگاہ و انتخاب مہاراجہ بہادر پر پڑی اور آپ صدر اعظم ہوگئے۔

مہاراجہ بہادر کی صدارتِ عظمےٰ کا دور، امن و اطمینان کا دور تھا، فرقہ وارانہ جھگڑے اُن کے عہدِ صدارت کے بعد پیدا ہوئے، اُن کے دورِ صدارت کی تاریخ ان افسوسناک ہنگاموں سے

خالی ہے۔ مورخ کا ذمہ دار قلم مہاراجہ بہادر کے عہد صدارت کو امن و امان کا دور لکھے گا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دفتری کاروبار:-

مہاراجہ بہادر کو مدار المہامی اور صدارتِ عظمیٰ دونوں زمانوں میں اپنے معتمدین اور زیر دستوں پر پورا اعتماد رہا۔ اسی اعتماد اور اعتبار کی بنا پر وہ نیچے سے آئی ہوئی کارروائیوں کی زیادہ چھان بین نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس بات کا انتہائی خیال رکھتے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

دل شکنی اور دل آزاری اُن کے مشرب میں کفر تھی۔ کسی کا دل دُکھانا تو جانتے ہی نہ تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ کسی محکمہ میں کوئی جگہ خالی ہوتی اور مہاراجہ بہادر کے پاس مختلف اوقات میں لوگ آکر کوشش کرتے، مہاراجہ "نہیں" تو کہتے ہی نہ تھے، ایک ہی جگہ کیلئے بہت سی درخواستوں پر حکم صادر فرما دیتے۔

مہاراجہ بہادر شاہانہ اقتدار میں کسی قسم کی مداخلت کو پسند نہ فرماتے تھے۔ اور یہ آئے دن کی دستور سازیاں اور قانون طرازیاں اُن کو پسند نہ تھیں، وہ ذات شاہانہ کو حکومت دکن کے سطوت و اقتدار کا "مظہر کامل" سمجھتے تھے۔ حیدرآباد میں جب آریہ سماجی تحریک کا فتنہ اُٹھا تو انہیں بہت دُکھ ہوا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک معرکہ آرا مضمون لکھا، جسکے شکریہ کے لئے پبلک کی جانب سے جلسہ عام کیا گیا۔

عہدِ شباب اور اُسکے بعد!

جوانی، مال و دولت کی فراوانی، جاہ و منصب! لغزشیں نہ ہوتیں تو تعجب تھا۔ مہاراجہ بہادر کی زندگی کا یہ دور رنگین تھا، جوانی کی امنگوں کے لئے ہر طرح کے اسباب مہیا تھے۔ اس تقویٰ شکن دور میں اُن کو بھی جذبات کی ہنگامہ آرا وادیوں سے گذرنا پڑا۔ بڑھاپے میں جوانی کی باتوں اور رنگ رلیوں کو یاد کر کے سر دُھنتے تھے، اور اس شعر کو بڑی حسرت کے ساتھ پڑھتے تھے ؎

دریغا کہ عہد جوانی گذشت
جوانی مگو، زندگانی گذشت

اور اس سلسلہ میں کہا کرتے تھے کہ مغربی تہذیب نے جوانی کو بھی کمزور کر دیا ہے، یہ ننگی تصویریں، سینما، برہنہ ناچ جوانی کے دُشمن ہیں، اور آج کل کے نوجوان تو زندگی کا صحیح لطف بھی اُٹھانا نہیں جانتے۔

کوئی بڑھاپے کی بُرائی کرتا، تو اُن کو اچھا نہ لگتا تھا، لوگ بیان کرتے کہ فلاں راجہ کی عمر سوا سو سال کی ہوئی، فلاں شخص کی عمر نوّے سال کی ہے، اور وہ اب تک چلتا پھرتا ہے، تو ایسی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ یہ دُنیا کہنے کو تو پریشانیوں کا گھر ہے، مگر یہاں سے کون جانا چاہتا ہے! مہاراجہ بہادر کے لئے تو اس دُنیا میں بیشمار دلچسپیوں کے سامان تھے، لہٰذا وہ زیادہ سے زیادہ دن تک رہنا چاہتے تھے۔ لیکن آدمی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے، انسان تو اپنی فکر سے ایک سفید بال کو بھی سیاہ نہیں کر سکتا۔ موت آئی تو تمام آرزوئیں اور دلچسپیاں مُنہ دیکھتی رہ گئیں۔

بادشاہ سے عقیدت اور شاہانہ قدر دانی:-

اپنے بادشاہ کے فدائی تھے، اعلیٰ حضرت خسروِ دکن جب یاد فرماتے تو قصرِ شاہی جانے سے قبل ایک خاص تاثر طاری رہتا۔ راستہ سے اعلیٰحضرت کی سواری گذرتی اور مہاراجہ بہادر راہ میں ہوتے تو دستار، بگلوس لگا کر سڑک پر کھڑے ہو جاتے۔ سواری شاہانہ گذر جاتی، لیکن وہ حسب دستور سلام کرتے رہتے۔ اعلیٰحضرت بھی اپنے قدیم وزیر کی قدر فرماتے تھے، ایک مرتبہ نواب سالار جنگ بہادر کی ڈیوڑھی میں مجلس ہو رہی تھی، جلالۃ الملک شاہِ دکن پہلے سے رونق افروز ہو چکے تھے، مہاراجہ بہادر آئے، نہایت ادب سے سلام کیا اور ذرا دور ہٹ کر بیٹھنا چاہا۔ جلالۃ الملک نے فرمایا۔ "مہاراج قریب آؤ"!

مہاراج دو تین قدم بڑھکر پھر بیٹھنے لگے، اس پر مکرر قریب آنے کیلئے ارشاد ہوا۔ مہاراجہ بہادر عقیدت مجسم اور نیاز سراپا بنکر دو زانو بیٹھ گئے، جلالۃ الملک کا سلام، لکھنؤ کے مشہور سوز خواں منجھو صاحب نے سُنانا شروع کیا، جلالۃ الملک نے مہاراج بہادر کی تعریف فرمائی اور ہر شعر پر اُن ہی کو مخاطب فرماتے تھے۔

مہاراجہ بہادر جب صدارتِ عظمیٰ کی خدمت سے سُبکدوش ہوئے تو جلالۃ الملک نے مہاراج بہادر کی خدمات کا اعتراف فرمایا۔ مہاراج بہادر کی علالت کے زمانے میں جلالۃ الملک بہ نفس نفیس عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور اُن کے مرنے کی اطلاع ملی تو اُس وقت بھی رونق افروز ہوئے اور ارشاد فرمایا:-

"پرانی بساط کا آخری مہرہ اٹھ گیا"
نطق شاہانہ، مہاراجہ بہادر کی سیرت اور پوزیشن کا کتنا صحیح آئینہ دار ہے!

عام قبولیت:- مہاراجہ بہادر کو پبلک میں خاص قبولیت حاصل تھی، عہدیداروں میں بھی اور رعایا میں بھی! ایک مرتبہ شاہی ڈنر میں جلالۃ الملک نے مہاراجہ بہادر کا نام بدوران تقریر لیا تو تمام دربار تالیوں سے گونج اٹھا اور تھوڑی دیر تک جلالۃ الملک کو ٹھہر جانا پڑا۔ مہاراجہ بہادر جس جلسہ اور تقریب میں جاتے لوگ احترام و محبت کے ساتھ استقبال کرتے۔

مرنے کی خبر شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی، مہاراجہ کی "ارتھی" کے ساتھ کم و بیش ساٹھ ہزار کا مجمع تھا، سب لوگ متاثر تھے، گھر گھر افسوس کیا جا رہا تھا، صبح کو شہر میں ہڑتال ہوئی، اخباروں نے تعزیتی مقالے لکھے اور ایک دن کی عام تعطیل ہوئی۔

خطابات و مناصب:- آصفی دربار سے راجہ راجایان، مہاراجہ، یمین السلطنۃ اور حکومت انگریزی سے، کے. سی. آئی. ای اور جی. سی. آئی. ای جیسے گرانقدر خطاب عطا ہوئے، جس زمانہ میں پیشکار اور مدار المہام اور بعد میں صدر اعظم تھے، تو ہندوستان میں وائسرائے کے بعد ان ہی کی سب سے بھاری تنخواہ تھی، پھر لاکھوں روپیہ سالانہ کی جاگیر اس پر مستزاد۔ سرکار انگریزی میں قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ لارڈ کرزن نے انکی ڈیوڑھی میں بیٹھکر حیدرآباد کے محرم کے لنگر کا تماشہ دیکھا۔ آج کل سیاسی انقلابات نے حالات کو بہت کچھ بدل دیا ہے، اب تو وائسرائے بہادر گاؤوں میں جاکر کسانوں سے بات چیت کرتے ہیں اور بیلوں کی پیٹھوں کو تھپکتے ہیں، مگر جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اس زمانے میں تو ایک ادنیٰ اٹامی سے ملنے میں لوگ فخر محسوس کرتے تھے۔

مہاراجہ بہادر کو خدا کے فضل سے ہر قسم کا اعزاز حاصل تھا، فوج کے کپتان اور میجر تو ان کے ایڈی کانگ تھے، ان کے خانگی ملازموں میں سے بعض کی تنخواہ آٹھ سو ماہانہ تھی، لیکن اس تمام شکوہ و سطوت کے باوجود وہ ہر شخص سے جھک کر ملتے تھے۔ امارت کا تکبر ان کو چھوا بھی نہ تھا۔ کسی کو کچھ عطا کرتے تو۔

ع — جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ

کی مجسم تصویر بن جاتے۔ ہر شخص کی بات توجہ کے ساتھ سنتے، اوپر کہا جا چکا ہے کہ دل شکنی اور دل آزاری انکے مذہب میں کفر تھی، لہذا انکے دربار میں کوئی، کیسی ہی سادہ اور غیر ضروری بات کیوں نہ کرتا وہ اس کو نہ ٹوکتے۔ مثلاً کوئی کہتا۔

"سرکار! آگرہ میں تاج محل ایک اچھی عمارت ہے"
اس پر مہاراجہ بہادر بغیر کسی اثر کے، کہنے والے کا دل رکھنے کے لئے کہتے۔

"ہاں! آگرہ میں تاج محل ہے — خوب!"
اس مثال سے ان کے ضبط اور عالی ظرفی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وضعداری کا یہ عالم کہ جس سے ایک دفعہ جس انداز میں ملتے آخر تک وہی انداز قائم رہتا، اور اس میں کبھی فرق نہ آتا۔ عرسوں اور نذر و نیاز کے جو معمولات ان کے یہاں سے مقرر تھے وہ بدستور رہتے چلے، اور ان تقریبوں میں خود بھی شریک ہوتے۔ بعض صوفیوں سے وہ آخر میں خوش نہ تھے اور پہلی سی عقیدت نہ رہی تھی، لیکن ان کے ملنے ملانے کے انداز میں فرق نہ آیا اور ساری عمر وضعداری نباہتے رہے۔

وضعداری اور فقیر دوستی کا یہ انداز کہ شب میں وائسرائے بہادر کے ساتھ ڈنر کھایا اور صبح میں ایک شکستہ مکان میں بیٹھے ہوئے جھوم جھوم کر قوالیاں سن رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، ہاتھ سے سخاوت کا مینہ برس رہا ہے۔

تحصیل علم و فن کا ذوق:- اوپر لکھا جا چکا ہے کہ بچپن میں مہاراجہ بہادر نے فارسی پڑھی تھی، پھر انگریزی اور عربی بھی سیکھی۔ عربی برائے نام آتی تھی تھوڑی بہت بات چیت کر لیتے تھے۔ علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، ہر فن میں دخل حاصل کرنا چاہتے تھے، ایک فلاکت زدہ ترک آگیا۔ تو اس سے ترکی پڑھنا شروع کر دی، اس بہانہ سے اس کی امداد بھی ہو گئی چند مہینے یہ سلسلہ جاری رہا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر سے سنسکرت بھی پڑھی، مگر زندگی بہت سے مشاغل میں بٹ چکی تھی، دماغ کو سکون نہ تھا، طالب علمی کا زمانہ گذر چکا تھا، مگر پھر بھی اس زمانہ میں علم حاصل کرنے کا شوق، اپنی جگہ ہزار آفریں و رصد ہزار ستائش کا مستحق ہے۔

خطاطی میں بہت اچھی مشق تھی، ایران کے مشہور کاتب عماد کے کتبوں کو سامنے رکھکر مشق کیا کرتے تھے، خط نسخ خوب لکھتے تھے، روزمرہ کی تحریر بھی منشیانہ اور سنجیدہ تھی۔ تصویر کشی سے خاص ذوق تھا، موسیقی میں بھی درک رکھتے تھے، فنون حاصل کرنے کا

ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ پچھتر سال کی عُمر میں تلوار اور بنوٹ سیکھنے کیلئے ایک اُستاد کو نوکر رکھ لیا، اور چند دن تک مشق جاری رہی۔

کوئی اُن کی غلطی پر ٹوکتا تو بُرا نہ مانتے، ایک مرتبہ اُن کی تازہ غزل پڑھی جا رہی تھی جس میں اُنہوں نے "اپنا" کی جگہ "تمہارا" استعمال کیا تھا۔ حیدرآباد کی عام بول چال میں "اپنے" کی جگہ "تمہارا" بولتے ہیں۔ میں نے اس فروگذاشت کی طرف اشارہ کیا تو سوچنے لگے، اور بیاض ہاتھ میں لیکر اُس شعر کے نیچے لکیر کھینچ دی، ایک صاحب نے اس پر ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ "سرکار! حیدرآباد میں تو اسی طرح بولتے ہیں۔"

اس پر مہاراجہ بہادر نے فرمایا: "اہلِ زبان کی تقلید ضروری ہے، ماہر ٹھیک کہہ رہے ہیں!"

نثر و نظم کی بہت سی تصنیفیں چھوڑیں، کئی کتابیں سفر کے حالات پر مشتمل ہیں، نظم میں سب سے اچھی تصنیف "پریم درپن" ہے۔ یہ نظم مثنوی کی بحر میں ہے، زبان رواں اور شستہ ہے اور ہندو مسلم اتحاد کیلئے دل سے نکلی ہوئی آواز۔!

مصاحبین کے کہنے سے مہاراجہ بہادر کو شوق ہوا کہ "پریم درپن" کو سنیما کے پردے پر لایا جائے، اس کام کے لئے ایک کمپنی قائم ہوئی، نظم کو نثر کی صورت میں بطرزِ مکالمہ منتقل کیا گیا، دو چار سین بھی لئے گئے، مگر آخر کار یہ کمپنی ٹوٹ گئی اور وہ خواب تشنۂ تعبیر ہی رہا۔

قومی خدمات کی قدردانی — قومی اور ملکی کام کرنے والوں کی قدر کرتے تھے، مگر فتنہ و فساد اور سوڈا واٹر کی طرح فنا ہو جانے والے انقلابات کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ گاندھی جی نے جو سیاسی لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کو "مہاتما" اور "بھگت" بنا کر پیش کیا ہے، اور ہر بات میں دل کی آواز کے منتظر رہتے ہیں، اس پر مہاراجہ بہادر طنزیہ انداز میں تنقید فرمایا کرتے تھے، لیکن وہ قومی و ملکی کارکنوں کی مخلصانہ خدمات کو سراہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک رسالہ دیکھ رہے تھے، رسالہ میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کا فوٹو نظر سے گذرا، تو اُس کو بے اختیار چُوم لیا اور مولانائے مرحوم کی تعریف کرتے رہے۔

سخاوت — سخاوت مہاراجہ بہادر کا خاندانی جوہر تھا، اپنی بساط اور حیثیت سے زیادہ خیرات کرتے، صبح سے شام تک کچھ نہ کچھ بانٹتے ہی رہتے۔ شہر کی سڑکوں سے گذرتے تو فقیر فقرا راستوں پر جمع ہو جاتے، اور مہاراجہ روپے، اٹھنیاں، چونیاں اور دونیاں پھینکتے ہوئے نکلتے۔ مانگنے والے ان کو "بچے والے راجہ" کہکر پکارتے تھے۔ وہ اس لئے کہ مہاراجہ بہادر کے ساتھ اُنکے نواسوں اور نواسیوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ راستوں میں فقیروں کی بھاگ دوڑ اور اُن کے جمگھٹوں کو دیکھکر لوگ پہچان جاتے تھے کہ مہاراجہ بہادر کی سواری گذرنے والی ہے، ایک مرتبہ بابِ حکومت کے اجلاس میں مہاراجہ بہادر کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، بابِ حکومت کی سڑک اور دروازے پر پہلے سے فقیر اور بچے جمع ہو چکے تھے۔ میں نے خود دیکھا کہ یہ لوگ مایوسی کے ساتھ "آج بچے والا راجہ نہیں آئے" کہتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے۔

لوگوں کی امداد کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے، اور عالی ظرفی کا یہ عالم کہ اپنی داد و دہش اور سخاوت کا بھولے سے تذکرہ نہ فرماتے۔ اسی سخاوت اور شاہ خرچی کی بدولت لاکھوں کے مقروض ہو گئے تھے، اپنے ذاتی مصارف کیلئے بعض دفعہ خرچ کی تنگی ہو جاتی، مگر اس عالم میں بھی اُن کا ہاتھ رُکتا نہ تھا۔

اہلِ کمال اور صاحبِ علم و فضل کی قدردانی اُن کا شیوہ تھا، باہر کا آیا ہوا شاید ہی کوئی ایسا اہلِ کمال ہو، جس کو مہاراجہ نے نہ نوازا ہو، اُنکے یہاں کی دعوتیں اپنی آپ نظیر تھیں، ناممکن تھا کہ باہر سے کوئی بڑا آدمی آئے اور مہاراجہ بہادر اُسے مدعو نہ کریں۔ بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیوں میں ایک ایک لاکھ تک خرچ کیا۔ اولاد کثیر تھی مگر سب کا خیال رکھتے تھے۔

سرکاری حیثیت سے دورے پر جاتے تو بھی اپنے پاس سے ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے، دورے کے زمانے میں گاؤں کے لوگ دُور دُور سے اُن کے دیکھنے کیلئے آتے تھے۔ ایک مرتبہ بنگلور جا رہے تھے، سکندرآباد ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کا ایک ہجوم تھا، داد و دہش بھی ہو رہی تھی، یہ عالم دیکھکر ایک پوربی برہمن نے پیتل کی لٹیا میں پلیٹ فارم کے نل سے پانی بھر کر آواز دینی شروع کی، "سرکار! میں بنارس سے آپ کیلئے گنگا جل لیکر آیا ہوں۔"

مہاراجہ بہادر نے اُسے بُلایا اور پانی کی لُٹیا اپنے ہاتھ میں لیلی، ایڈیکانگ کو اشارہ کیا، اور مُٹھی بھر روپے اُس پنڈت کے انگوچھے میں پہونچ گئے۔

یہ مقولہ بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ سخاوت، آدمی کی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ سخاوت، مہاراجہ کی عادتِ ثانیہ بن گئی تھی، اور اُن کے کردار کا سب سے زیادہ روشن باب یہی سخاوت اور داد و دہش ہے۔

مزاح و ظرافت:- طبیعت میں ظرافت بھی تھی، کبھی کبھی فی البدیہہ مزاحیہ اشعار کہتے، بہت ہی خاص محفل ہوتی تو اشعار سُنا دیتے، ورنہ جس سے بے تکلفی ہوتی اُسے قریب بُلا کر اشعار دکھا دیتے اور تھوڑی دیر لُطف لیکر کاغذ کو چاک کر دیتے۔ کوئی رنگین باتیں کرتا، اور بے تکلفی کی گفتگو ہوتی تو اپنی طرف سے ایک آدھ چُبھتا اور پھڑکتا ہوا جملہ کہکر چھڑی ہوئی داستان کو اور زیادہ رنگین بنا دیتے۔

ایک مرتبہ ایک بوڑھے شاعر، جو مہاراجہ بہادر کے یہاں مُلازم رہ چکے تھے، حاضر ہوتے۔ اور اپنے ساتھ اپنے چھوٹے بچوں کو بھی لاتے، سب سے چھوٹے بچے کی عُمر تین چار سال کی ہوگی۔ ایک صاحب نے کہا: "اس عُمر میں بھی آپ کے اولاد ہوتی ہے۔ ماشاءاللہ"

شاعر صاحب نے مہاراجہ بہادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سرکار کے نمک کا اثر ہے"

اس پر مہاراج بہادر ہنس کر بولے "خوب! میرے نمک کا مجھ میں تو اثر باقی نہیں رہا، آپ میں باقی ہے!"

بس ایسے ہی سنجیدہ فقروں سے وہ سُننے والوں کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پیدا کر دیتے تھے۔

نجوم اور جوتش:- نجوم اور رمل پر بہت اعتقاد تھا، کئی نجومی مُلازم تھے، باہر سے جو کوئی مشہور منجم اور ہاتھ دیکھنے والا [illegible] آتا، اُس کو ضرور بُلاتے اور گھنٹوں پاس بٹھا کر باتیں پوچھتے۔ کہیں سفر پر جانا ہوتا تو پہلے نجومی دن اور گھڑی کا تعین کرتا۔ بات بات پر جوتشیوں سے مشورہ کرتے۔ نجومی کے کہنے پر بعض وقت رات کا کھانا کھا کر ریلوے اسٹیشن پر سیلون ہی میں جا کر سو جاتے۔ تمام بچوں کے زائچے نجومیوں کے پاس بنے ہوتے تیار رہتے، ظاہر ہے کہ خدا کا کاروبار ان نجومیوں اور جوتشیوں کے زائچوں اور پوتھیوں پر تھوڑی چلتا ہے، جب کوئی بات جوتشی کے لگائے ہوئے حکم کے خلاف ہو جاتی، تو اُس سے سبب پوچھتے۔ وہ اُس کی کوئی مبہم سی توجیہہ کر دیتا اور مہاراجہ بہادر کی سادگی مطمئن ہو جاتی۔

فقیر دوستی:- فقیر اور درویشوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ اس میں کسی مذہب و ملت کی قید نہ تھی۔ خانقاہوں اور مزاروں کے سجادہ نشینوں، مندروں کے پجاریوں اور گُردواروں کے مہنتوں، سب سے عقیدت اور احترام کے ساتھ ملتے تھے۔ اُن کے دل میں یہ بات سما گئی تھی کہ ان کو فقیروں اور درویشوں کی دُعا کی برکت سے اعزاز و منصب ملا ہے۔ فقیروں کا ادب بھی کرتے تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ جو شخص بھی فقیرانہ لباس میں آتا، اُس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے، کہا کرتے تھے "میں تو لباس اور نسبت کی عزت کرتا ہوں"

ایک دفعہ فقیروں اور درویشوں کا ذکر ہو رہا تھا، کہنے لگے کہ حضرت غفراں مکان (نواب میر محبوب علی خاں) نے ایک دفعہ بھرے دربار میں مصاحبین سے پوچھا: "ہمیں کوئی ولی کامل اور اہلِ دل نہیں ملا"

اس پر ایک درباری نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: "سرکار! جو سچا فقیر اور ولی ہوگا وہ آپ کے یہاں کیوں آنے لگا!"

حضرت غفراں مکان اس پر "بیشک، لاریب، سچ کہا" فرمانے لگے۔ تو مہاراجہ بہادر اس فقیر دوستی کے باوجود اس بات کو بھی سمجھتے تھے کہ اہل اللہ، بادشاہوں اور امیروں کے آستانوں کی طرف نہیں دوڑتے،

علامہ اقبال نے اس چیز کو کس لطیف انداز میں پیش کیا ہے ؎

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

سب کچھ جانتے ہوتے مہاراجہ بہادر کے یہاں سے ایک صاحب اسی بات کی تنخواہ پاتے تھے کہ مجذوبوں اور فقیروں سے مل کر، اُن کی کہی ہوئی باتیں مہاراجہ تک پہونچائیں۔ امیروں کو شاید زوال نعمت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

اُردو کی سرپرستی:- مہاراجہ، اُردو زبان کے سرپرست اور حامی نہیں بلکہ عاشق تھے۔ ہندی اُردو کے جھگڑے پر شدید افسوس کا اظہار کرتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ اُردو زبان ہی وہ متحدہ مرکز ہے جس پر ہندوستان کی تمام قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ کہتے تھے کہ اُردو زبان کے خلاف جو ہنگامہ برپا ہے، اس سے رہا سہا ہندو مُسلم اتحاد بھی جاتا رہے گا، اُردو زبان ان کا اوڑھنا بچھونا تھی، اور اُن کے مرنے سے اُردو زبان اپنے ایک چاہنے والے سرپرست سے محروم ہو گئی۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان کو مُستند سمجھتے تھے، اور اُسی زبان کو بولنے اور لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ شمالی ہند کے رہنے والے اہلِ فضل و کمال سے ہمیشہ صحبتیں رہیں، اور اُن کی بہت قدر دانی کی۔ حیدرآباد میں بعد ازیہ سماجیوں نے جب ملکی اور غیر ملکی تحریک کا

ہنگامہ بپا کیا اور اچھے خاصے سمجھدار مسلمان بھی دھوکے میں آگئے، تو مہاراجہ بہادر اس سے متاثر ہو کر کہنے لگے:-

"آصف جاہ اول دہلی سے آئے تھے، وہ بھی تو غیر ملکی تھے اور میں بھی غیر ملکی ہوں"

اُن کی عالی ظرفی اس قسم کے امتیازات کی پروا نہ کرتی تھی۔

اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور بھاشا سے بھی مناسبت تھی بھاشا زبان میں ٹھمریاں، دوہے اور ہولیاں کہتے تھے۔ فارسی کی ضرب الامثال یاد تھیں، جن کو موقع سے استعمال کیا کرتے تھے۔ عربی جملے اور ضرب الامثال بولنے کا بہت ذوق تھا۔ الحمدللہ، انشاءاللہ اور ماشاءاللہ تکیہ کلام تھا، جب کوئی شخص کسی بادشاہ یا امیر کے زوال اور بربادی کا قصہ سُناتا تو استغفار و توبہ کرکے یہ حدیث شریف پڑھتے:-

"اللھم احفظنا من الحور بعد الکور"

ایک مرتبہ اُن کے سکریٹری نے اطلاعی گزارش پیش کی جس میں کسی عہدیدار کے مرنے کی اطلاع درج تھی، مہاراجہ بہادر نے اس پر "انا للہ وانا الیہ راجعون" لکھکر دستخط کر دئے۔

میں نے ملازمت کے سلسلہ میں چند واقعات لکھکر مہاراجہ کی خدمت میں پیش کئے۔ اس پر اُنہوں نے تحریر فرمایا:-

"مجھ پاس کوئی اسکیم اب تک نہیں آئی۔ آپ دریافت کیجے کہ کس محکمے میں اسکیم بن رہی ہے، معلوم ہو تو انشاءاللہ تعالیٰ کارروائی کی جائے گی۔ درآید درست آید۔ التعجیل من الشیطان والتاخیر من الرحمٰن۔ ان اللہ مع الصابرین۔

ع:- صبوری مراکامگاری دہد..... شاد"

مہاراجہ بہادر کی اس مختصر سی تحریر میں عربی اور فارسی کے متعدد جملے پائے جاتے ہیں، جس سے اُن کے عربی اور فارسی ذوق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مہاراجہ بہادر کا مکتوب:-

میں لوگوں کے خطوط اور محبت نامے جمع کرنے میں "بے نیاز" بلکہ "بے پروا" واقع ہوا ہوں۔ مہاراجہ بہادر کے بہت سے کرم نامے افسوس ہے کہ اسی بے پروائی کی نذر ہو گئے۔ بڑی تلاش اور جستجو کے بعد پچھلے کاغذوں اور مسودوں میں اُن کی چند تحریریں ملیں اُن کے ایک خط کو یہاں درج کرتا ہوں:-

۷ جمادی الاول ۱۳۵۴ھ

مائی ڈیر ماہر صاحب!

آپ کے خطوط پہونچے۔ ایک سر ہزار سودا۔ اسلئے اولئے جواب میں تاخیر ہوئی، آپ کو جاکر عرصہ ہوا، ہر روز وقت مقررہ پر آپ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے، دو تین مرتبہ آدمی سے میں نے کہا کہ تیموری صاحب اور ماہر صاحب کو بلالو، پھر خیال آیا کہ ماہر صاحب دیدہ زیب . . . . کے درشن میں مصروف ہوں گے، شاد کیسے یاد آتے اور کیوں نہ ہو کہ شباب بھی ہے، شاعر بھی، خوش مزاج، پاکیزہ مذاق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر دعویٰ تقویٰ ہو تو غور کے قابل ہے۔ بارش وہاں بھی ہو رہی ہے اور یہاں بھی، جب کبھی وہاں بارش ہوتی ہوگی تو ساون بھادوں کا لطف آ ہی جاتا ہوگا۔ دوشیزاؤں کے گروہ باغوں میں جھولے ڈالتے ہوں گے اور کسی کی محبت کی پینگ لیتے ہوتے سُریلی اور دلکش آواز میں یہ گاتے ہونگے۔

باغوں میں جھولا ڈالا مورے راجہ!
ہم جھولیں اور تم دیکھو تماشہ!

جلد آئیے:- ؎

فرض کردم کہ بیادِ تو دلم خورسند است
لیکن این دیدۂ دیدار طلب را چہ علاج

خدا حافظ پھر ملیں گے۔ آپ کا مضمون نظر سے نہیں گذرا شکریہ قبول ہو۔ میں نے بھی ایک مضمون ایک رسالے میں جس کی سُرخی "بانسری" ہے، دیا ہے۔ اس میں مہاراج کرشن جی کی تعریف ہے، حسب درخواست ایڈیٹر لکھکر بھیجدیا۔ معلوم نہیں طبع ہوا کہ نہیں۔ والسلام! غزلیں بہت سی ہوئی ہیں، انشاءاللہ آنیکے بعد ــــــ"

مہاراجہ بہادر کے اس مکتوب سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس محبت و مساوات کے ساتھ اپنے وابستگان سے پیش آتے تھے ــــ اس خود نما اور غرض پرست دنیا میں اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے، کاش! تاریخ اپنے کو دُہرا سکتی۔

میرے حال پر مہاراجہ بہادر کی بہت کچھ نوازش تھی، حکام تحت کو ہموار کرنے کا فن مجھے نہیں آتا۔ اسی لئے دفت لائن میں مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن میں خوش ہوں کہ مجھ پر کسی مغرور کا احسان تو نہیں ہے۔

- - - - - - -

متفرق حالات:۔ مہاراجہ بہادر نہایت خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے، سفید لباس زیادہ پسند تھا، قمیص، کُرتہ، پاجامہ، شیروانی اور ترکی ٹوپی روزمرّہ کا لباس تھا، میں نے اُن کو ایک مرتبہ کے سوا کبھی انگریزی لباس میں نہیں دیکھا۔ جوانی میں اپنے شہر کے خوشرو لوگوں میں تھے، بڑھاپے میں بھی لباس خُوب پھبتا تھا، جاڑوں میں شیروانی پر مخمل نیم آستین پہنتے، اور اس پر پھر تنگی شملہ باندھتے تو دربار اکبری کے "رتن" معلوم ہوتے تھے۔ کھانا انگریزی اور مغلئی ملاجلا کھاتے تھے، مٹھاس سے بہت رغبت تھی۔ بدایوں کے پیڑوں کے تو عاشق تھے، بدایوں کے پیڑے کوئی بطور ہدیہ پیش کرتا تو صبر نہ ہوتا، آدھا تہائی پیڑا فوراً چکھ لیتے۔ مرزا غالب کی طرح آموں کے بھی شیدائی تھے، کہا کرتے تھے، غالب نے آموں کے بارے میں خُوب کہا ہے:۔

"میٹھے ہوں اور بہت ہوں"

بعض کھانے اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔ انگریزی دواؤں کی کثر برائی بیان کرتے کہ اُن کو پیتے ہوتے زبان پناہ مانگنے لگتی ہے۔ یونانی دواؤں کی مزے لے لیکر تعریف کرتے کہ اُن کے اجزا کتنے لطیف ہوتے ہیں:۔

"گلاب کی پتیاں، بید مشک، زعفران، سچے موتی، الائچی، مصری، بادام، پستہ، چاندی سونے کے ورق"

اور اُن کے نام:۔

"خمیرہ مروارید، گلقند، سیب کا مربّہ، شربت انار"

کھاؤ تو گھنٹوں تک خوشبو کی لپٹیں نکلتی رہیں، اور زبان پہروں چٹخارے لیتی رہے ـــ اسی خوش اعتقادی کا اثر تھا کہ وہ اکثر و بیشتر یونانی دوائیں استعمال کرتے تھے، بعض دواؤں کے اجزا اور ترکیبوں سے خود بھی واقف تھے، اور بہت سے مجرب نسخے اُن کی بیاضوں میں درج تھے۔

اُن کا سب سے زیادہ محبوب شغل "حقہ نوشی" تھا۔ ہر وقت حقہ کی نے ہونٹوں میں دبی رہتی۔ شوق کی حد ہے کہ موٹر کار میں بھی حقہ پیتے! چلم بھرنے والے چلمیں بدلتے رہتے تھے، اور حقہ نوشی کی بدولت اُن کا باورچی خانہ "آتشکدۂ ایران" بنا رہتا۔ شاید ہی کبھی آگ بجھتی ہو۔

سنیما کا آخر عمر میں بہت شوق ہوگیا تھا۔ انگریزی فلموں پر ہندوستانی فلموں کو ترجیح دیتے تھے۔ ریل کی سواری بہت پسند تھی۔ آخر میں فنگر بلیرڈ کھیلنے کی دُھن ہوگئی تھی گھنٹوں کھیلتے رہتے۔ یہ کھیل اُنہوں نے غم غلط کرنے کا مشغلہ سمجھکر اختیار کیا تھا۔ لیکن کثرت نے اُنکے دماغی اعصاب کو متاثر کر دیا۔

نواسوں اور نواسیوں سے بہت محبت تھی، ہزاروں روپیہ ان پر صرف ہوتا، ان کو ساتھ لئے بغیر باہر نہ جاتے۔ چھوٹے بچوں کا خوش رکھنا کتنا مشکل کام ہے، مگر مہاراج بہادر کے برتاؤ نے بچوں کو بہت زیادہ مانوس کر دیا تھا کوئی بچّہ بیمار ہو جاتا تو بے چین ہو جاتے، جوشی سے اُس کی صحت کے متعلق سوالات کرتے اور چہرہ متغیر نظر آتا۔

جنوبی ہند کے مشہور پہاڑ اوٹی کمنڈ سے کتوں کی ایک جوڑی مول لیکر آئے، یہ جوڑی صبح کو چائے نوشی کے وقت اُن کے سامنے آکر بیٹھ جاتی، اور مہاراجہ بہادر اُن کو کیک، پیسٹری کھلاتے، ان میں کا ایک کتا کھو گیا، تو اُس کے نہ ملنے تک یاد کرتے رہے، جب کتا دُم ہلاتا ہوا سامنے آیا تو بولے "ـــ اِسے دوسرے گھر آرام نہیں ملا، اس لئے ذرا دُبلا ہوگیا!"

دربارِ شاد:۔ مہاراجہ بہادر کا دربار، شاہانِ مغلیہ کے دربار کا منظر پیش کرتا تھا، اور اکبر و شاہجہاں کے دربار کی جو باتیں کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اُن کی ایک جھلک دربارِ شاد میں نظر آتی تھی۔ مہاراجہ بہادر عین وسط میں مخمل گدّے لگی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھتے، سامنے میز ہوتی، میز کے دونوں طرف دُور تک کرسیاں صوفے بچھے رہتے، جن میں دربار میں حاضر ہونیوالے آکر بیٹھتے۔ پہلے چاء کا دَور ہوتا، بعض وقت اپنے ہاتھ سے پیالیوں میں چاء بنا کر تقسیم کرتے۔ چائے نوشی کے بعد اہلِ غرض درخواستیں گذرانتے، عرض معروض کرتے۔

کسی صاحب نے اُردو قصیدہ سنایا۔ یہ ختم ہوا تو ایک ایرانی نے فارسی قصیدہ چھیڑ دیا، اس کے بعد کسی عرب صاحب نے عربی اشعار پڑھنے شروع کئے، یہ حجازی ساز بند ہوا تو کسی پنڈت نے اپنی بھیرویں چھیڑ دی۔ اس کے بعد علمی مسائل پر گفتگو ہونے لگی فلسفہ، منطق، ادب، ہیئت، سائنس، طب، غرض ہر قسم کے مسائل لوگ بیان کرتے اور مہاراجہ ہر بحث کو دلچسپی کے ساتھ سنتے۔

کوئی شاہنامے کے اشعار سناتا، کوئی راماین کی چوپائی پڑھتا، اور اُس وقت جبکہ کوئی علمی بحث چھڑی ہوتی، اے ڈی کانگ صاحب فوجی سلام کے بعد عرض کرتے :- سر مرزا محمد اسمٰعیل وزیر اعظم میسور ملنے

کیلئے تشریف لاتے ہیں؟

مہاراجہ بہادر یہ کہتے ہوئے "ابھی آتا ہوں" پرائیویٹ کمرہ میں چلے جاتے، اور دیوانِ میسور کو شرفِ ملاقات بخشتے۔ دیوان میسور رخصت ہوئے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین تشریف لے آئے۔ اُن سے تھوڑی دیر بات چیت کی اور پھر دربار میں آ گئے، لوگوں کو خود ہی جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھتے ہی فرماتے:۔

"ہاں! تو ہارون الرشید کے دربار میں شاہِ فرانس کا سفیر باریاب ہوا ــــ"

مہاراجہ بہادر کے اس اشارے کے بعد وہ ادھوری بحث پھر چھڑ جاتی۔

دربار گرم ہے، مختلف بحثیں ہو رہی ہیں، کہ نیچے سے سڑکوں پر گھومنے والی گاین نے اونچے سُروں میں الاپا کہ:۔

تم جو چاہو تو مرے درد کا درماں ہو جائے

یہ سنتے ہی مہاراجہ نے ایک جھرجھری لی، آنکھیں نم آلود ہو گئیں، اور محفل پر ایک اور ہی عالم طاری ہو گیا۔

دن کے ایک بجے کے قریب دربار برخاست ہوا، اور ہر شخص یہ تاثر لیکر رخصت ہوا کہ مہاراجہ بہادر نے آج سب سے زیادہ اسکی جانب توجہ کی۔

اب یہ باتیں صرف کتابوں میں لکھی ہوئی ملیں گی!۔

مذہب و عقائد:۔ "مذہب و عقائد" مہاراجہ بہادر کی سیرت کا سب سے زیادہ اُلجھا ہوا باب ہے۔ لوگوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں جن کا اظہار یہاں مناسب نہیں۔ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ مہاراجہ بہادر کی طبیعت کا توحید کی طرف میلان تھا۔ بزرگانِ دین سے خاص عقیدت تھی، حضرت سرورِ کائنات فخرِ موجودات پیغمبر اسلام نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا نامِ نامی کوئی اُن کے سامنے لیتا تو ادب سے گردن جھکا لیتے اور بعض وقت درود شریف بھی پڑھتے۔ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں سے خاص لگاؤ تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ سے تو عشق تھا۔ کئی مرتبہ اجمیر شریف حاضر ہو کر دربارِ خواجہ غریب نواز میں نیاز و عقیدت کی نذر پیش کی۔ مہاراجہ بہادر کہتے تھے کہ میں نے اجمیر شریف جانے سے قبل ایک خواب دیکھا تھا جس میں حضرت خواجہ غریب نواز کا مزار مبارک تفصیل کے ساتھ مجھے دکھایا گیا۔ قوالی بہت شوق سے سنتے اور خواجہ غریب نواز کی منقبت گائی جاتی تو بے اختیار ہو جاتے۔ اولیائے متاخرین میں حضرت حاجی وارث علی شاہ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مُرادآبادی سے بہت عقیدت رکھتے تھے، حضرت حاجی صاحب کی تو تصویر ہر وقت اُن کی صدری کی جیب میں رہتی تھی، وارثی فقیروں کا بہت ادب کرتے تھے، جب ان بزرگوں کا ذکر آتا تو زانو پر ہاتھ مار کر حسرت کے ساتھ کہتے "ہائے! ہمیں کوئی ایسا کامل فقیر نہیں ملا"۔

اہلِ بیت رسولؐ، حضرت مولا علیؓ، اور حضرات حسنینؓ سے خاص لگاؤ تھا۔ مگر حضرات خلفائے ثلاثہ کا بھی انتہائی احترام کرتے، اور ان نفوس قدسیہ کو بُرا کہنے والوں کو اچھا نہ سمجھتے۔ اولیاء اللہ کی کرامت کے دل سے قائل تھے۔ ایک صاحب جو مہاراج بہادر کے یہاں حاضر باشوں میں سے تھے، قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ مرنے سے چند دن پہلے میں مہاراج کے یہاں گیا تو کہنے لگے: "محمدؐ کے غلام کا مرنے کے بعد جسم جل جانے سے کچھ نہیں بگڑتا"۔

دوسری طرف ہندو اوتاروں اور رشیوں، منیوں کو بھی مانتے تھے، مہاراج کرشن جی سے خاص لگاؤ تھا۔ ہندو تہواروں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے، اور ایسے قصّوں کا بھی اعتبار کرتے کہ ہنومان جی نے سیتا جی کو اپنا سینہ چیر کر دکھایا تو "رام" لکھا ہوا تھا۔

تصوّف:۔ بعض ناواقف اور مکّار صوفیوں نے تصوّف کو یا تو غلط طور پر سمجھا ہے یا اُسے قصداً غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسلام کے لٹریچر میں "تصوّف" کا لفظ بہت دن کے بعد شامل ہوا۔ رسول اللہؐ کے عہد مبارک میں مسلمان ایک ہی جماعت کے فرد سمجھے جاتے تھے۔ اہلِ ظاہر، اہلِ باطن اور اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت کے گروہوں میں مسلمان بٹے ہوئے نہ تھے۔ شریعت کی تقلید اور سنت نبویؐ کا اتباع ہی ظاہر و باطن کی تربیت اور تزکیہ کا سبب سمجھا جاتا تھا۔ بعد میں چل کر ذاتی لطائف اور انفرادی وجدانیات کو لوگوں نے "اصل" سمجھ کر اصطلاحات تصوّف کا ایک نیا لٹریچر پیش کر دیا۔ یہ تصوّف پہلے تو عجمی خیالات سے متاثر ہوا اور ہندوستان پہونچکر تو اس پر بہت سے غلاف چڑھ گئے۔ اسی تلبیس اور امتزاج کا یہ اثر ہے کہ بعض صوفی، تزکیۂ باطن کے لئے اتباعِ شریعت کو ضروری قرار نہیں دیتے۔ نذر و نیاز اور

عُرس و مزار کی بہت سی بدعات و خرافات کا ضامن یہی "ویدانت زدہ تصوف" ہے۔ اسلام ایک انتہائی سادہ اور فطری حقیقت کا نام ہے۔ اور اس عجمی تصوف نے اس سادگی کو لطائف میں اُلجھا کر پیچیدہ بنا دیا ہے۔

حقیقی تصوف و طریقت کے اماموں اور اہلِ دل نے اس قسم کے خیالات کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی، حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جو طریقت کے امام ہیں، شدت کے ساتھ پابندِ سنت و شریعت تھے، اکبری دور کے مجاہد حضرت امام ربانی مجدد الفِ ثانی سرہندی قدس سرہٗ نے تو صاف اور واضح طور پر فرما دیا کہ :-

"ہر وہ چیز جو شریعت کے خلاف ہو، رد کر دینے اور ٹھکرا دینے کے قابل ہے"

تو مہاراجہ بہادر کو کبھی ایسے ہی صوفیوں سے واسطہ پڑا، جنہوں نے وحدت الوجود اور "تو مجھ میں ہے میں تجھ میں لئے جلوۂ جانانہ" جیسی بحثوں میں اُن کو اُلجھا دیا۔ اس قماش کے صوفیوں نے "حرم و دیر" اور "کفر و اسلام" کے امتیازات کو اعتباری اور اضافی بتایا، اسی تعلیم و تلقین کا نتیجہ تھا کہ مہاراجہ بہادر اس قسم کے اشعار بہت زیادہ پسند کرتے تھے:-

(۱) نہیں معلوم کس جانب نگاہ لطف ہے تیری
یہ کعبہ اور یہ بتخانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے؟

(۲) مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

(۳) پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

وصیت! یہ بات باوثوق ذرائع سے معلوم ہوئی ہے کہ مہاراجہ بہادر نے وصیت لکھ کر محفوظ کرا دی تھی جس میں اُنہوں نے اپنے آبائی مذہب کا اقرار کیا، اور مرنے کے بعد نعش کے جلائے جانے کی وصیت کی۔ اس تبدیلی خیال کی چند وجوہ ہیں، پہلی چیز تو وہی بعض گمراہ صوفیوں کی غلط رہنمائی۔ دوسری چیز یہ تھی کہ اُن کو اپنی ہندو رانی سے آخر میں بہت محبت ہو گئی تھی، رانی کا انتقال ہوا تو ہندو اولاد کی طرف اس طوفان کا رُخ پھر گیا، خصوصاً اپنے ہندو بیٹے راجہ خواجہ پرشاد ارجن کمار کے لئے وہ دُنیا کی تمام نعمتیں سمیٹ دینا چاہتے تھے۔ آبائی مذہب کا خیال اور یہی دُنیوی محبتیں مل ملا کے "حجاب اکبر" بن گئیں۔ بہرحال اُنکی روح اب ہمارے فتووں کی دسترس سے باہر ہے؛ اور قطعی [illegible] کے ساتھ کون کہہ سکتا ہے کہ کس مرنے والے کے ساتھ آخرت میں کیا معاملہ ہو رہا ہے!

مشاعرے:- مہاراجہ بہادر کے یہاں اگر چھ گھنٹے دربار رہتا تو کم از کم چار پانچ گھنٹے شعر، شاعری کا ذکر ہوتا۔ اُن کے یہاں کی ہر صحبت مشاعرہ ہوتی، اُن کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھکر بہت سے لوگوں نے شعر کہنا شروع کر دیا۔ وکیل اور اہلِ غرض کسی کام سے آتے تو مہاراجہ بہادر کو متوجہ کرنے کے لئے اِدھر اُدھر کا ذکر نکال کر اشعار سُناتے۔

بہت دن تک ہفتہ واری مشاعرہ ہوتا رہا، پھر بڑے پیمانہ پر ماہانہ مشاعرے کا سلسلہ شروع ہوا۔ فارسی اور اُردو دونوں بازلوں کی طرحیں دی جاتی تھیں، مہاراجہ بہادر اس بڑھاپے کے باوجود آخر تک مشاعرے میں بیٹھے رہتے۔ قویٰ کمزور ہو گئے تھے، حقہ پیتے پیتے نیند آ جاتی، اور جب چونکتے تو بے اختیار داد دیتے ہوئے، مشاعرے کی دلچسپی میں شریک ہو جاتے۔ اپنی غزل کسی ترنم سے پڑھنے والے سے پڑھواتے تھے۔

سالگرہ مبارک کے مشاعرے بڑی دھوم سے ہوتے تھے، ایوان میں روشنی ہوتی، رقص و سرود کا انتظام کیا جاتا، ایک دو مرتبہ آتشبازی بھی چھُٹی تھی۔ پرتکلف دعوت۔ سجی ہوئی محفل، جگمگاتے ہوئے قمقمے، قالین، گاؤ تکئے، چاندنی، اگلدان۔ پھر ان کی محبت اِن سب سے بڑھ چڑھ کر، پوری رات ان ہی دلچسپیوں میں کٹ جاتی

ہندوستان میں ہزاروں مشاعرے ہوں گے، مگر مہاراجہ شاد کے مشاعروں کی بات کہاں آئے گی!

شاعری:- شاعری مہاراجہ بہادر کی گھٹی میں پڑی تھی، عنفوانِ شباب ہی سے اُنہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ انکے بعد اُردو کلام نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کو دکھانے لگے، فارسی غزلیں نواب ضیا یار جنگ بہادر ضیا کے پاس اصلاح کیلئے بھیجتے تھے۔ شعر بہت جلد کہتے تھے کوئی شخص شگفتہ زمین میں غزل سُناتا، تو اُس کا ایک شعر یا مصرع لکھ لیتے اور اس پر غزل کہتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ایک غزل سنائی اُس پر اُنہوں نے دوسرے دن غزل کہی، دو تین مہینے کے بعد میں نے پھر وہی غزل سُنا دی، تو اُنہوں نے اُسی غزل پر ایک اور غزل کہہ دی، اس طرح ایک ہی زمین اور ایک طرح میں اُن کی

بیاض میں کئی کئی غزلیں موجود ہیں۔ مہاراجہ بہادر کو اپنے شعر یاد نہ رہتے تھے، طبیعت سادگی اور صاف گوئی کی طرف مائل تھی۔ شعر کو چیستاں نہ بناتے تھے، تصوف کے مسائل کو کسی نہ کسی طرح اشعار میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔ نزع، موت، اور گورِ غریباں جیسے الفاظ اور مضامین سے حتی المقدور گریز فرماتے تھے۔

یہ دُنیا ہے! یہاں سچ پوچھو تو کوئی سُکھی نہیں! ہر شخص کو کوئی نہ کوئی فکر لگی ہوئی ہے، فکر و غم کا یہ سلسلہ فقیر کی جھونپڑی سے لیکر بادشاہ کے قصر تک پھیلا ہوا ہے، مہاراجہ بہادر بھی اس تمام شان و شکوہ کے باوجود افکار سے بے نیاز نہیں ہیں۔ جلد متاثر ہونے والی طبیعت پائی تھی، کئی جوان بیٹے مر چکے تھے۔ چہیتی اور لاڈلی بیویاں اُٹھ گئی تھیں، شاہ خرچی کے سبب مالی مُشکلات میں سدا مبتلا رہے، صدارتِ عظمیٰ کے آخری چند سال اسی دُگدا میں گذرے کہ اب علیحدہ ہوتے ہیں، تب فرمان آتا ہے! اس سے دل میں گداز پیدا ہوگیا تھا اور یہی گداز شعر بن کر زبان و قلم سے ظاہر ہوتا تھا، مجھے اپنے اِس شعر پر سے

گذر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ناہر
کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانے کو

مہاراجہ بہادر کی سسکیاں ہی اب تک یاد ہے۔

فارسی شعرا میں خسرو، حافظ، سعدی، عراقی، مغربی، حسن سنجری، اور مولانا روم کا کلام بہت پسند کرتے تھے۔ حضرت حسن سنجری کا دیوان تو مہاراجہ بہادر کی کوششوں ہی سے شائع ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ مولانا روم کی مثنوی کے عاشق تھے۔ اُردو شعرا میں یوں تو سب ہی اُستادوں کی تعریف کرتے تھے، مگر غالب اور انہیں کے کلام سے خاص شغف تھا۔ غالب سے ان کو عشق تھا۔ ایک مرتبہ ذکر آیا کہ ہندوستان کا ایک شاعر غالب کو بُرا کہتا ہے، تو فرمانے لگے "یہ پاگل پن ہے، جو شخص غالب کو بُرا کہتا ہے میں اس کو شاعر ہی نہیں مانتا"

نظم کے مقابلے میں غزل کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ نئی قسم کی شاعری سے جس میں الفاظ کے طلسم کے سوا کچھ نہیں ہوتا، بہت بیزار تھے۔ علامہ اقبال کے وہ اشعار، جن میں پوری قوت کے ساتھ صاف لفظوں میں اسلام کو پیش کیا گیا ہے، سُننے تو سوچ میں پڑ جاتے، اس لئے کہ اُن کے کان تو ایسے اشعار سننا چاہتے تھے، جن میں "کفر و اسلام" اور "شیخ و برہمن" کے امتیاز کو اٹھا دیا گیا ہو۔ لیکن اقبال کے کمال کے معترف تھے۔

غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی، مسدس، ترجیع بند، غرض تمام اصنافِ سخن میں فکر کرتے تھے، لوگوں کے ناموں سے سجع بنانے کی بھی مشق تھی۔ تاریخیں اچھی نکالتے تھے۔ نواب صلابت جاہ بہادر مرحوم کی وفات پر دو تاریخیں کہیں:۔

صلابت جاہ مرشد زادہ مُرد آہ
۴۳ ۱۳ ف

دوسری تاریخ:۔ بے آرام درخلد آرمیدہ
۵۲ ۱۳ ھ

جناب فانی بدایونی کے دیوان کی تاریخ:۔

دانما دیوانِ فانی باقیات الصالحات

کہی، جس میں ۱۳۴۵ فصلی نکلتا ہے۔

مہاراجہ بہادر شاد کے اُردو فارسی کے تمام اشعار ہزاروں سے کیا کم ہونگے، مہاراجہ بہادر کی دلی تمنا تھی کہ اُن کا کلام سختی کے ساتھ انتخاب ہونے کے بعد منظر عام پر آئے۔ افسوس ہے کہ اس تمنا کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے، چند اشعار، جو مہاراجہ بہادر کی اجازت سے انکی بیاض سے میں نے منتخب کئے تھے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

ہے اُس کی ذات کا جلوہ تمام عالم میں
عیاں ہے وحدت و کثرت کسی کو کیا معلوم

ہر چند زمانہ میں ہزاروں ہی حسیں ہیں،
صورت تری اُن سے کبھی صورت نہیں ملتی

وعدے پہ نہ آنے کی کوئی وجہ بھی آخر
فرصت نہیں یا تم کو اجازت نہیں ملتی

احسان مند ہوں نگہِ امتیاز کا
پہلا مجھی پہ وار کیا تیغِ ناز کا

وہ حکم دیں جب ہاتھ لگا سکتا ہے کوئی
شیشہ نہ کسی کا ہے نہ پیمانہ کسی کا

ہوتا ہے وہی جو ہے مقدر
تقدیر پہ زور ہے کسی کا!

تدبیر کوئی ہو نہ سکی دستِ جنوں کی
دامن کو سنبھالا تو گریباں نہیں دیکھا

مطمئن تھا جب بشر آیا عدم آباد سے
دیکھکر ہستی کا ہنگامہ پریشاں ہوگیا۔

(بقیہ برصفحہ ۶۷)

دو ایکٹ کا ڈراما۔

غریبوں کا انصاف

افرادِ تمثیل

سر قربان علی۔ ایک لکھ پتی نو دولت رئیس۔ کشادہ دماغ، تنگ دل۔ بیگم کا غلام۔
اختر ورانی۔ ایک ماہر فن نقاش۔
نادر مرزا۔ ایک اشتراکی عیار نوجوان۔
غلام حسین۔ نادر مرزا کا دوست۔
لیڈی قربان علی۔ اعلیٰ خاندان بیگم۔ تند مزاج۔ شوہر پر جابر۔
مسز دارا۔ سر قربان علی کی ایک آشنا دوست

بابو قربان علی نے ایک موٹر کمپنی کے گودام منشی کی ادنیٰ حیثیت سے زندگی شروع کی۔ کمپنی فیل ہوگئی۔ وہ خود اپنی اور بازاری صلاحیتوں کی بدولت ترقی کرکے تیس برس کے اندر انڈین موٹر ٹرانسپورٹ کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر، موٹروں کے در آور تاجر، برما آئل پٹرول کمپنی کے حصہ دار، زمیندار، تاجر، سر قربان علی ہو گئے۔ کلکتہ سے دہلی تک شہر شہر اور قصبہ قصبہ ان کے موٹر بسوں اور ٹیکسیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

دس سال ہوئے اُن کی شادی بمبئی کے ایک معزز خاندانی سیٹھ کی لڑکی سے ہوئی۔ جب ان کی عمر چالیس سال تھی۔ بیگم حسن و شباب کی طاقت کے علاوہ خاندانی وقار اور دولت میں بھی سن رسیدہ سر قربان علی سے بدرجہا افضل ہے اور اوّل روز سے ان کو اپنے آگے ناک رگڑواتی چلی آتی ہے۔ سر قربان علی اصولِ تجارت میں نہایت سخت گیر، باہر اپنے بیوپاریوں، ایجنٹوں اور ماتحتوں پر شیر، اور بیگم کے سامنے بلی۔

پہلی مجلس

پہلا منظر

کلکتہ۔ سر قربان علی کا محل

سر قربان۔ میں آج ایک خاص ضرورت سے شملہ جا رہا ہوں۔ ایک ہفتہ میں واپس آجاؤں گا۔

لیڈی قربان علی: "خاص ضرورت"؟ ہاں میں بھی، وہاں کوئی رقاصہ آئی ہوگی۔ ایسی ضرورتیں تو تم کو بارہا پیش آتی ہیں۔ اب یہ خاص تو نہیں عام ضرورت ہوگئی ہے۔

سر قربان۔ آپ کے سر کی قسم۔ امریکن موٹر ساز کمپنی کا ایک ایجنٹ ہے۔ اس سے معاملہ کرنا ہے۔

لیڈی قربان۔ مرد ہے یا عورت؟ خیر بتانے کی ضرورت نہیں تم جانتے ہو مجھے آپ ہی سب خبر مل جاتی ہے۔ تمہارے واپس آنے سے پہلے مجھے سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ اگر پھر کبھی ایسی بات کا پتہ چلا تو تم مجھے اس گھر میں نہ پاؤ گے۔

سر قربان۔ پیاری فیروزہ، مجھے تمہارا اعتماد کب نصیب ہوگا! تم دشمنوں کی مبالغہ آمیز اطلاعات پر فوراً اعتبار کرلیتی ہو۔ سمجھنے کی بات ہے مجھے اپنے کاروبار سے اتنی فرصت کب ملتی ہے کہ لونڈوں کی طرح آوارہ گردی کرتا پھروں؟

لیڈی قربان۔ چاہیے تو یہی تھا مگر نئی دولت میں ایک جوش اور گرمی ہوتی ہے۔ وہ یوں ہی اُبل کر گرتی ہے۔ صحیح راستہ نہیں ملتا تو غلط راستہ سے خارج ہوجاتی ہے۔ قصور تمہارا نہیں، ظرف کا ہے۔ جنگ یورپ میں لاکھوں کا مال دیکر سر کا خطاب خریدا۔ مگر کسی مدرسے، شفاخانے یا قومی مصائب پر ایک کوڑی نہیں نکالی۔ ہاں شراب اور بازاری عورتوں پر تو ڑسے اُٹھ جاتے ہیں۔ بیشک تمہارا سن عیاشی کا نہ تھا۔ مگر ظرف میں جو ہوتا ہے وہی ٹپکتا ہے۔

سر قربان۔ دیکھئے آپ نے پھر وہی دلخراش باتیں شروع کیں۔ میں

نہیں سن رکھا۔ گویا دُنیا میں ایک عالی خاندان آپ ہی ہیں۔

لیڈی قربان:۔ بس بس منہ نہ کھلواؤ۔ جہاں جانا ہو جاؤ۔ مگر میں جو کچھ کہہ چکی وہی ہوگا سمجھے!

خانساماں:۔ (داخل ہوتا ہے) سامان بندھ چکا ہے۔

سر قربان:۔ چلو آیا! (خانساماں چلا جاتا ہے)

اچھا پیاری فیروزہ چلتے چلاتے تو من جاؤ۔ مجھے خوشی سے رخصت کرو۔ یقین ہے اب کے پیر کو میں تمہیں یہاں ہنستا ہوا دیکھونگا۔ خدا حافظ۔

لیڈی قربان:۔ خدا حافظ۔

(برساتی تک آتی ہے۔ موٹر کو رخصت کر کے اندر واپس جاتی ہے۔)

دوسرا منظر

شملہ جارج کلب کا بڑا ہال۔

مس پاربتی بائی مشہور رقاصہ آرٹسٹ، سیاحہ امریکہ و یورپ، ناچ رہی ہے۔ دورِ شراب چل رہا ہے۔ مصور ہفتہ وار میں پاربتی کی تصویر رقص ہاتھوں ہاتھ بکتی ہوئی سر قربان علی کے ہاتھ میں آتی ہے۔

سر قربان علی:۔ واہ کیا نزاکت ہے، لوچ ہے، ادا ہے! کس نے بنائی ہے؟ یہ اے درانی کون نقاش ہے؟

مسز دارا:۔ آپ ان کو بھول گئے؟ اٹلی میں میں نے آپ کو انہیں سے تو ملایا تھا۔ وہاں کی نمائش میں ان کو اپنی نقاشی پر دوسرے درجے کا انعام ملا تھا۔

سر قربان علی:۔ ہاں خوب یاد آیا۔ اب وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں؟

مسز دارا:۔ وہ یہاں موجود ہیں۔ کرتے کیا ہیں۔ اس ابھاگے دیس میں آرٹسٹ جس حال میں ہوتے ہیں وہ بھی ہیں۔ فاقہ کرتے ہیں اور خوش ہیں، وہی آرٹسٹ کا غرور اور اکڑ ہے۔ دیکھئے بلاتی ہوں۔

(اٹھکر بلا لاتی ہے۔ اختر درانی انگریزی لباس میں سامنے آتا ہے۔ سر قربان علی ہاتھ ملاتے ہیں۔)

سر قربان علی:۔ آپ کو دیکھکر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

درانی:۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔

مسز دارا:۔ پیارے قربان۔ میری آرزو ہے کہ مسٹر درانی کے ہاتھ سے آپ کی ایک نیم قد آئیل پینٹنگ تصویر ہوتی۔ آپ دونوں کے اکٹھے ہونے کا اس سے بہتر موقع ملنا دشوار ہے۔

سر قربان علی:۔ میں تمہاری بات اٹھا سکتا ہوں۔

مسز دارا:۔ پھر کل سے آپ درانی صاحب کے سٹوڈیو میں صرف ایک گھنٹہ روزانہ آ بیٹھئے۔ کیوں مسٹر درانی! کتنے دن لگیں گے؟

درانی:۔ زیادہ سے زیادہ چار روز۔

سر قربان:۔ مجھے منظور ہے بشرطیکہ تم بھی وہاں موجود رہو۔ تمہارے بغیر روزانہ ایک گھنٹہ بُت بنے بیٹھے رہنا مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ اور ہاں اجرت؟

مسز دارا:۔ یہ بت پرست پرستش کیلئے حاضر رہے گی۔ اور ہاں درانی صاحب مناسب اجرت بتائیے۔

درانی:۔ آپ سے صرف پانچ۔

سر قربان:۔ خدا کی پناہ! اتنی! میں ایک سو سے زیادہ نہیں دے سکتا۔

درانی:۔ یہ میں نے مسز دارا کی خاطر کم بتائی ہے۔ ورنہ ایک ہزار زیادہ نہیں۔ اٹلی میں آپ نے میرے ہاتھ کی تصویریں بھی دیکھی ہیں اور اُن کی فروخت کی قیمتیں بھی سُنی ہیں۔

سر قربان:۔ یہ اٹلی نہیں ہندوستان ہے۔ یہاں نقاشی کے عاشق ویسے گاہک نہیں۔

مسز دارا:۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر آپ اُن گھامڑوں میں سے نہیں ہیں جو فن کی قدر نہ جانتے ہوں۔ دیس کے اہلِ فن کی حوصلہ افزائی بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ پیارے مجھے تمہاری بولتی تصویر کا بہت اشتیاق ہے ——!

سر قربان:۔ خیر میں کل سے آؤں گا۔ دن کے نو بجے سے ٹھیک ہیگا؟ ہاں پتہ کیا ہے؟

درانی:۔ جی ہاں بالکل ٹھیک۔ وائیٹ ویلا ۲۲ ہیون ایونیو۔

(کارڈ نکال کر دیتا ہے۔)

(اختر درانی چلا جاتا ہے۔ سر قربان علی اور مسز دارا جامِ شراب کا مبادلہ کرتے ہیں اور اختلاط کرتے ہوئے پہلو کے کمرے میں غائب ہو جاتے ہیں۔)

تیسرا منظر

شملہ۔ جارج کلب کا ڈرائنگ روم

اختر درانی تصویر لئے داخل ہوتا ہے۔ سر قربان علی شوق سے لیکر دیکھتے ہیں، چہرے کے پٹھے کھنچتے اور سکڑتے ہیں، آنکھیں پھیلتی ہیں نتھنے پھولتے ہیں ——

سر قربان۔ اور تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر تم نے مجھے ساٹھ برس کا بوڑھا خبیث بنا دیا ہے۔ یہ کیا؟

درّانی۔ اپنی صحیح عمر تو آپ جانیں۔ مگر شبیہہ بالکل اصل کے موافق ہے۔

سر قربان۔ تو میں ساٹھ برس کا ہوں؟ مہمل بیہودہ۔

درّانی۔ یہ تو میں نہیں جانتا۔ مگر آپ واقعی جو کچھ بھی ہیں تصویر وہی بتاتی ہے۔

سر قربان۔ استغفراللہ۔ میں ابھی چالیس میں ہوں۔ یہ تصویر میرے والد ماجد کی ہو سکتی ہے۔

درّانی۔ پھر تو زیادہ قدر کرنا چاہیے۔ یہ ایک تبرک بھی ہو گیا۔

سر قربان۔ مذاق بند کرو۔ دُور کرو اسے۔ میرے کسی کام کی نہیں۔ پانچ دن میں نے اپنے قیمتی گھنٹے مُفت برباد کئے۔

درّانی۔ سر قربان علی۔ اس معاملہ میں آپ کا فیصلہ ناطق نہیں ہو سکتا۔ کسی ماہرِ فن کو دکھائیے۔ مسز دارا ہی سے مشورہ کیجئے۔ دیکھئے لوگ کیا کہتے ہیں۔ مجھے اُمید تھی آپ کو اس پر ناز ہو گا۔

سر قربان۔ جہنم میں جاؤ تم، تمہارا فن مسز دارا کو دکھاؤں جو تمہاری دلّالہ ہے؟ مجھے کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں۔

درّانی۔ آپ میری طے شدہ اُجرت دے دیجئے پھر میں خوشی سے جہنم میں جاتا ہوں۔ ورنہ عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کرتا ہوں اور مسز دارا آپکی قدیم آشنا اور میری دلّالہ بھی سہی، گواہ ہونگی۔

سر قربان۔ جاؤ۔ دفع ہو، لے جاؤ اپنا غلیظ عمل یہاں سے۔ جو چاہو کرو۔ دیکھا جائے گا۔

(درّانی تصویر لئے نکل جاتا ہے)

چوتھا منظر

شملہ۔ ایک چائے خانہ۔

نادر مرزا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ سر قربان علی نے غریب درّانی کے پانسو روپے مفت مار رکھے۔ غریب پوانی مقدمہ بھی ہار گیا۔ مسز دارا بھی انکے ہاتھوں بِک گئی۔ دولت ہر شے خرید سکتی ہے۔ انصاف بھی ایک بازاری جنس ہے۔ بیچاری مسز دارا کی شہادت کیا مال تھی۔ اچھا جو اگر پانسو کے ایک ہزار نہ وصول کر دے ہوں تو نادر مرزا نہیں۔ ان کمینے سرمایہ داروں کا چارہ دیوانی یا فوجداری عدالت نہیں، ہماری عدالت ہے۔

غلام حسین۔ وہ کیسے؟

نادر مرزا۔ وہ تم دیکھ لینا پرسوں تک ایک ہزار اس مردود سے کس طرح وصول کئے لیتا ہوں۔

غلام حسین۔ آپ کوئی خدائی فوجدار ہیں۔ سب کا فیصلہ کرنے کو تیار۔ کوئی جعل فریب کرو گے اور جیل سدھارو گے۔

نادر مرزا۔ فریبی کیساتھ فریب کے سوا چارہ نہیں۔ ورنہ غریبوں کا کہیں مرافعہ نہیں۔ کتابوں کے اوراق، پلیٹ فارم پر اونچی اونچی باتیں اور بڑے بول اور ہیں، ننگی حقیقت اور۔ قانون اور عدالت نے وقت پڑنے پر کبھی مظلوم کی مدد کی ہے؟ یا تو حقیقت پر نقاب ڈالدی یا شکل بدل دی ہے۔ یا کسی مرے قتل کے بعد اس نے جنبش کی تو یہ انصاف قانون کے لنگڑے گدھے پر سوار اُسوقت پہونچتا ہی جب مظلوم تباہ ہو چکتا ہے اور انصاف بے سُود۔

غلام حسین۔ پھر کیا کرو گے؟

نادر مرزا۔ پرسوں تک سُن لینا۔

دوسری مجلس

پہلا منظر

شملہ۔ چارج کلب کا ڈرائنگ روم

(بیرا ایک کارڈ دیتا ہے۔ سر قربان علی پڑھتا ہے)

سر قربان علی۔ مسٹر اے۔ آر چودھری نمائندہ گرین ہِل زراعت چائے دار جلنگ۔ سلام دو۔

بیرا جاتا ہے۔ ایک نوجوان نفیس انگریزی لباس میں داخل ہوتا ہے۔ سر قربان ہاتھ ملاتے ہیں۔

چودھری۔ سر قربان علی، بلاتقرر وقت میری خلل اندازی کو معاف فرمائیے۔ میں آپ حضرات کے وقت کی قیمت سے واقف ہوں۔ مگر مجھے آج ہی تار سے کلکتہ سے طلبی آئی ہے۔ مجبور تھا۔ اگر زحمت ہو تو کسی اور وقت حاضر ہوں؟

سر قربان۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ میں چند منٹ آپ کو دے سکتا ہوں، کہئے کیا کام ہے؟

چودھری۔ ہمارے مینجنگ ڈائرکٹر نے آپ کی خدمت میں اس لئے بھیجا ہے کہ وہ سالِ نو میں اپنے کیلنڈر میں آپ کی رنگین تصویر شائع کرکے پبلک

پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کے رتبے کے روسا و عمائد کا طبقہ ان کی چائے کا شائق ہے۔

(چائے کا پیکٹ بڑھاتے ہوئے)

یوں تو آپ بھی چائے روزانہ پیتے ہی ہوں گے اور سارے حکام والسرائے سے نائب تحصیلدار تک پیتے ہیں، پھر بھی یہ چائے ذرا مزا بوجھکر نوش فرمانے اور فیصلہ کرنے کیلئے نذر ہے۔ یہ ہماری بہترین قسم "شہزادی" ہے۔

سر قربان علی۔ (مسکراتے ہوئے پیکٹ لیکر) خوب! میرے پاس بالفعل کوئی تازہ فوٹو موجود نہیں۔ خیر انتظام ہو جائے گا۔

چودھری۔ اس زحمت کی بھی آپ کو ضرورت نہیں۔ یہ ہمارا کام ہے۔ ایک مرقع خانہ سے ہم نے آپ کی ایک بہترین تصویر حاصل کرلی ہے۔

سر قربان۔ وہ کون سی؟ میں دیکھ سکتا ہوں؟

چودھری۔ ضرور۔ وہ میرے ساتھ موٹر میں آئی ہے۔ ابھی لاتا ہوں۔

(لانے چلا جاتا ہے۔)

سر قربان۔ (تنہائی میں آپ ہی آپ) واللہ یہ منت کی ناموری کا سامان نکل آیا۔ ہندوستان انگلستان اور تمام برطانوی مقبوضات میں گلی گلی گھر گھر نہیں التجار سر قربان علی کی تصویر مشتہر ہوگی۔ کامل ایک سال یہ دیوار رہے گی۔ واہ وا۔ فیروزہ کا ناطقہ تو بند ہو جائے گا۔ اب شاید آئے دن اٹھتے بیٹھتے یہ میری عزت آبرو پر طعن نہ کریگی۔

(چودھری تصویر لئے پھر داخل ہوتا ہے۔ سر قربان علی چونک جاتا ہے۔ تصویر ہاتھ میں لیکر ــــــ)

اوہ! ہاں ــ مگر ــ خیر ــ یہ بہت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

چودھری۔ سر، میں خود نقاش ہوں۔ فن کے لحاظ سے صرف میں نے نہیں کئی مانے ہوئے اُستادانِ فن نے اس کی تعریف کی ہے۔ چنانچہ کمپنی نے اسے فوراً خرید لیا۔ صرف آپ کی باقاعدہ اجازت اور دستِ خاص کی تحریر اور دستخط کی ضرورت ہے اور میں اسی لئے آپ کی خدمت میں بھیجا گیا ہوں ــــ!

سر قربان علی۔ خیر مجھے عذر نہیں۔ آپ تحریر کیا چاہتے ہیں۔

چودھری۔ اس کا مسودہ بھی تیار ہے۔

(جیب سے کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیتا ہے۔)

(سر قربان پڑھتا ہے)

گرین ہل دارجیلنگ چائے شہزادی کی جانفزا بو باس
اور رنگ ہمیشہ سے مجھے دل و جان سے پیاری ہے
اس کے مقابلے میں مجھے یا لیڈی قربان علی یا او خواتین
اور احباب کو دوسری چائیں قطعاً نہیں بھاتیں۔

قربان علی

د۔ ۹-۳۹

سر قربان۔ بالکل درست ہے۔ تو میں اسی کی نقل کر دوں؟

چودھری۔ (جیب سے پنسل نکال کر) بلاک بنوانے کے لئے پنسل سے لکھنا ضروری ہے۔ تصویر کے دونوں پہلوؤں کی بیاض میں بالکل اسی طرح لکھا جائے بجنسہٖ آپ کا خط اور دستخط منعکس ہو جائے گا۔ یہ عبارت کمپنی کیلئے بہت مفید ثابت ہوگی اور کمپنی ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہے گی۔

سر قربان۔ خیر اس کی ضرورت نہیں فنی باریکیاں تو میں جانتا نہیں۔ لائیے پنسل میں اسی طرح بجنسہٖ نقل کئے دیتا ہوں۔

(سر قربان تصویر پر مسودہ کی عبارت نقل کرتا ہے۔ دستخط اور تاریخ درج کر کے چودھری کے حوالہ کرتا ہے)

چودھری۔ بہت بہت شکریہ! ڈائرکٹر صاحب بلاک کا پروف لیکر خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونگے۔

سر قربان۔ گڈ لک۔

(چودھری کاغذ اور تصویر لئے چلا جاتا ہے۔)

دوسرا منظر

کلکتہ۔ کلایو اسٹریٹ۔ سر قربان علی کا دفتر۔

(سر قربان علی دفتر میں کام کر رہا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ ایک ٹائپسٹ لڑکی کان لگاتی ہے۔ واپس آتی ہے۔)

لڑکی۔ سر، کوئی ٹیلیفون پر آپ کو بلاتا ہے۔

سر قربان۔ اوہ خدا! پیاری کلارا پوچھو کون ہے کیا چاہتا ہے؟

کلارا۔ وہ صرف آپ سے بات کرنا مانگتا ہے۔

(سر قربان ٹیلیفون پر جاتا ہے)

سر قربان۔ ہیلو ہیلو! آپ کون ہیں۔

مدھم آواز۔ میں اے۔ آر۔ چودھری نمائندہ گرین ہل دار جیلنگ چائے ہوں ــــ!

سر قربان۔ خوب! آپ کیا چاہتے ہیں؟ بلاک تیار ہو گیا؟

مدھم آواز۔ اسی کے متعلق عرض کرنا ہے۔ غور سے سنیئے۔

سر قربان۔ ہاں ہاں کہیئے۔

مدھم آواز۔ فرض کیجئے کہ آپ کی ایک تصویر جو آپنے اپنی محبوبہ "شہزادی" مشہور رقاصہ کرشن ٹاکی کو اپنی خاص تحریر اور دستخط کے ساتھ نذر کی ہو، کسی کے ہاتھ آگئی۔

سر قربان۔ ہرگز نہیں۔ ناممکن! یہ کیا بکواس ہے؟ تمہارا کیا مطلب ہے ــ؟

مدھم آواز۔ جی ایسی تصویر میرے قبضے میں ہے اور اس پر آپ کے دست خاص اور دستخط کے ساتھ یہ عبارت درج ہے:۔

"شہزادی کی جانفزا بوباس مجھے دل و جان سے پیاری ہے۔ لیڈی قربان علی یا اور خواتین قطعاً نہیں بھاتیں" قربان علی

۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء

سر قربان۔ جعل، فریب، دغا، میں نے ایسی کوئی تحریر کسی کو نہیں دی ہے۔ دکھاؤ مجھے۔

مدھم آواز۔ آپے سے باہر نہ ہوں۔ ذرا صبر سے سنیئے۔ میں نے آپ کی تصویر کے دونوں پہلوؤں پر آپسے جو عبارت لکھوائی تھی یاد ہے؟

سر قربان۔ ہاں مگر وہ اور تھی۔

مدھم آواز۔ تو داہنی طرف کی عبارت آسانی سے ربر سے مٹا کر صاف کر دی گئی، بائیں طرف جو عبارت مع دستخط و تاریخ باقی رہ گئی وہ وہی ہے جو میں نے ابھی آپ کو سنائی۔

سر قربان۔ جعل، فریب، ٹھگی۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دونگا۔

مدھم آواز۔ جعل کا کوئی ثبوت آپ نہیں دے سکتے۔ آپکے دستخط اٹل شہادت ہے اور آپ نے درانی کے ساتھ جو بدعہدی کی ہے اسے نہیں کہتے؟

سر قربان۔ اچھا فضول بکواس کا وقت میرے پاس نہیں۔ جلد بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟

مدھم آواز۔ میں وہی تصویر آپکے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔

سر قربان۔ خیر اس کا مضائقہ نہیں۔ کیا لوگے؟

آواز۔ ایک ہزار۔

سر قربان۔ ایں؟ ایکہزار۔ ارے میں تو اُسکے پانسو چکا چکا تھا۔

آواز۔ مجھے سب معلوم ہے۔ تو پانسو درانی کی اجرت ہوئی اور پانسو میں مقدمہ کے اخراجات اور اس کی دلی ایذا اور کوفت کا معاوضہ۔ زیادہ تو نہیں؟

سر قربان۔ نہیں نہیں، میں اتنی قیمت نہیں دے سکتا۔

آواز۔ تو پھر ایک اور گاہک سے سودا کرتا ہوں۔

سر قربان۔ کس سے؟

آواز۔ لیڈی قربان علی سے۔

سر قربان۔ ارے توبہ، نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ چیک لے جاؤ اور تصویر فوراً دے جاؤ۔

آواز۔ چیک نہیں نقد۔ دو روز کے اندر میں کہیں آپسے ملکر لونگا اور تصویر دیدونگا۔ سو سو کے نوٹ اپنی جیب میں تیار رکھیں۔ خدا حافظ۔

تیسرا منظر

کلکتہ۔ ایک ہوٹل

اختر درانی۔ نادر یار میرے لئے تو پانسو کافی ہیں۔ باقی تم رکھو۔

نادر۔ ابے خاموش۔ پیسے تیرے پاس رہیں یا میرے پاس بات ایک ہی ہے: صرف اس ناپاک کنجوس سیٹھ کے پاس نہ رہنا چاہیئے تھا۔

غلام حسین۔ نادر تو ایکدن جیل کی سیر ضرور کریگا۔ یہ بلیک میلنگ کب تک چلے گی؟

نادر۔ غریب جعلسازی یا جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں تو زیادہ تر پیٹ کے دکھ سے، ورنہ فریب دہی، سرقہ، بلیک میلنگ تو سرمایہ داروں کا کمال ہنر ہے، گو اسکے نام کچھ اور رکھ لئے جاتے ہیں ہاں جیل غریبوں کیلئے مخصوص ہیں جن کیلئے نہ قانون ہے نہ انصاف مگر یاد رکھو یہ چور، نقب زن، جعلساز، عصمت فروش بھوکے ننگے مرد اور عورتیں جو سرمایہ داروں کے اعمال کے پھل ہیں، ایکدن سرمایہ داری کو کچلکر رکھ دینگے۔ دنیا پر معاشی انقلاب کی بجلی گرا دینگے اور اس کا یادر ہاؤس جیل ہوگا۔ وہ دن دور نہیں، بس آیا ہی ہوا سمجھو۔

(سب ملکر گاتے ہیں:۔) کورس

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش | اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
آملینگے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک | یعنی گل کی ہمنفس بادِ صبا ہو جائیگی
دیکھ لوگے سطوت رفتار دریا کا مآل | موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائیگی
نالۂ صیاد سے ہونگے نوا ساماں طیور | خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

محمد مسلم

ایک دیر آشنا سے

بیت گیا ساون کا مہینہ — اے کافر انداز حسینہ
نیندوں سے مخمور ہیں آنکھیں — اور تھکن سے چور ہیں آنکھیں
آنا اب بے کار ہے تیرا — مُردہ اب احساس ہے میرا
تیری گوری گوری باہیں — میخانہ بر دوش نگاہیں
لب پہ ہنسی، ماتھے پہ پسینہ — اور سینہ قاروں کا دفینہ
یہ پتلی آواز کا جادو — یہ نیلے ملبوس کی خوشبو
کانوں میں موتی آویزاں — ہر موتی میں بجلی رقصاں
ہونٹوں پہ بوسے رقصیدہ — اور بیباک نظر دزدیدہ
ریشم اور کمخواب کا پیکر — تاروں پر پھولوں کا بستر
اپنے نشوں میں چور جوانی — یہ تیری بھرپور جوانی
اب سب کچھ بیکار ہے پیاری — تجھ سے جی بیزار ہے پیاری
اتنے چرکے دل پر کھائے — تو دیکھے تو شرما جائے
رونے میں گزریں برساتیں — سُونے دن بے رونق راتیں

جا اور رقصِ مستانہ کر — سرمایہ داری کے در پر
وہ در جس پر میں نے دیکھے — مزدوروں کے خون کی چھینٹے
کچلے سینے بیواؤں کے — اور جگر بے بس ماؤں کے
دیتی ہیں جس در پہ صدائیں — بھوک کی ماری دوشیزائیں
بے گھر بچے بے زر انساں — اک سوکھی روٹی کے خواہاں
تیرا گھر زردار کا دل ہے — تیرا گھر عیار کا دل ہے
میں اک بھولا بھالا شاعر — پردیسی سیلانی طائر[لہ]
روتے روتے بھی جی لونگا — مے نہ ملی آنسو پی لوں گا
بیت گیا ساون کا مہینہ — کھیل ہے اب مرنا جینا
ڈوبا اُمیدوں کا سفینہ — اے کافر انداز حسینہ

نیندوں سے مخمور ہیں آنکھیں
اور تھکن سے چور ہیں آنکھیں

احمد ندیم قاسمی

لہ [illegible]

کیمبرج میں ہندوستانی طالب علم

کسی زمانے میں دہلی اور لکھنؤ ہندوستان کی زبان اور تہذیب کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ آجکل یہی رُتبہ انگلستان میں کیمبرج اور آکسفورڈ کو حاصل ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تہذیب و تمدن کسی شہر کے اینٹ اور پتھر کی تاثیر نہیں۔ جہاں اہل کمال جمع ہونگے وہیں سے یہ پھول کھِلنے لگیں گے۔ چنانچہ کیمبرج کے شہر کو دیکھئے تو انگلستان میں اس جیسے سینکڑوں چھوٹے بڑے قصبے اور شہر ملیں گے۔ لیکن آٹھ سو سال سے جو دھاک کیمبرج کے عالموں اور فاضل طالب علموں نے دُنیا پر بٹھا رکھی ہے اس کا جواب اس زمانے میں کہیں اور شاید ہی مل سکے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے نام سے کون پڑھا لکھا ناواقف ہوگا۔ آج کل جس شخص کے نام کے ساتھ کینٹب کا لفظ لکھا ہو یہ سند اس بات کی کہ اس نام کا مالک اپنی علمی فضیلت اور ادب، قاعدے کے اعتبار سے ایک خاص وقعت کا حقدار ہے۔ پہلے مَیں آپ کو کیمبرج کی سیر کراتا ہوں۔ اُس کے بعد یہاں کے ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا حال سُناؤں گا۔

کہنے کو تو کیمبرج ایک چھوٹا سا قصبہ ہے لیکن علمی دنیا میں اس کی شہرت نہ دریائے "کیم" کی وجہ سے ہے، جس کے کنارے یہ شہر آباد ہے۔ نہ یہ اُن خوبصورت چراگاہوں اور ہرے بھرے خیابانوں کی وجہ سے مشہور ہے کہ جو شہر کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کی شہرت کا تمامتر راز یونیورسٹی کے نام میں مضمر ہے۔ لیکن کیمبرج آکر آپ کسی سے یونیورسٹی کا پتہ پوچھئے تو شاید ہی کوئی آپ کے سوال کا جواب دے سکے۔ کیونکہ کیمبرج یونیورسٹی عبارت ہے ان کالجوں سے جو اس شہر میں جا بجا کھڑے زبانِ حال سے اپنی عظمت اور تاریخی وقار کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔ کیمبرج میں اس وقت سترہ کالج یونیورسٹی سے ملحق ہیں، جن میں سب سے پُرانا پیٹر ہاؤس تیرھویں صدی کے آخر میں بنا تھا۔ اور سب سے نیا ڈاؤننگ کالج ۱۸۰۰ء میں تیار ہوا۔ باقی کے سب کالج اس سات سو سال کے اندر بنے ہیں۔ اور ہر کالج کی زندگی۔ روایات، گویا کیمبرج کی تاریخ کا ایک ایک باب ہیں، کہ جن سب کے مجموعے کا نام کیمبرج یونیورسٹی ہے۔

ہر کالج کا نظم و نسق پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔ جسے یہاں کی زبان میں ماسٹر کہتے ہیں۔ یونیورسٹی کا مجموعی طور پر انتظام چانسلر کے سپُرد ہے اور اس عہدے پر ان دنوں انگلستان کے سابق وزیر اعظم لارڈ بالڈون مامور ہیں۔ لیکن چانسلر کا عہدہ صرف اعزازی سمجھا جاتا ہے۔ فی الحقیقت یونیورسٹی کے کاروبار کی نگرانی وائس چانسلر کرتا ہے۔ جو کالجوں کے پرنسپل آپس میں کسی ایک کو چُن لیتے ہیں۔

کالج کا خرچ اپنے سرمایہ اور فیسوں کی آمدنی سے چلتا ہے۔ ہر کالج کے نام پر صدیوں سے لاکھوں پونڈ کی جائداد۔ زمین یا گاؤں وغیرہ وقف ہیں۔ اور اسی آمدنی کے سہارے کالج چل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کو ہر سال سرکار کی طرف سے بہت کافی گرانٹ بھی ملتی ہے۔ ہندوستانی کالجوں کی طرح ہر کالج میں پرنسپل کے تحت بہت سے اُستاد رکھے جاتے ہیں۔ کیمبرج میں ان اُستادوں کو فیلو کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یا دو فیلو لڑکوں کے ٹیوٹر یعنی اتالیق مقرر ہیں۔ اور یہاں اتالیق کا وہی منصب ہے جو گھر پر ماں باپ کا ہوتا ہے۔ لڑکوں کی نگرانی: ان کی تعلیم کا خیال، ضابطے کی پابندی اور ڈانٹ ڈپٹ کا تلخ فرض ٹیوٹر کے سپرد ہے۔ اس لئے عام طور پر لڑکے یونیورسٹی میں یا تو ٹیوٹر سے ڈرتے ہیں یا اپنے کالج کے دربان سے۔

تقریباً آٹھ سو سال سے کیمبرج کی روایات قائم ہیں۔ اور ہر طالب علم کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان قدیم روایتوں پر کاربند ہوکر اپنی انفرادیت کو یونیورسٹی کی زندگی میں مدغم کر دے۔ اگر بفرضِ محال کوئی منچلا اپنی ذاتی اپج کی بنا پر ان روایتوں کو توڑنا بھی چاہے تو یونیورسٹی کے قانون اور دوسرے طالب علم اُسے آزاد ہونے نہیں دیتے۔ اور اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ اس لئے ہر طالب علم اپنی انفرادی طبیعت کے باوجود اپنے آپکو یہاں کی زندگی کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اور یہی کیمبرج کی سب سے قدیم روایت بھی ہے۔

انگلستان کے تعلیمی نظام کے مطابق اسکول ختم کرنے کے بعد تین سال میں بی۔ اے کی ڈگری ملتی ہے۔ گویا ہر طالب علم کو کم از کم تین سال تک یونیورسٹی میں رہنا پڑتا ہے! البتہ ہندوستان کے گریجویٹ

طالب علموں کے لئے یہ تین سال کی مدت صرف دو سال ہی ہو سکتی ہے۔ دستور کے مطابق یونیورسٹی کی زندگی کا پہلا سال کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں نہیں بلکہ شہر کے کسی مستند گھر میں گذارا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کے رہنے سہنے کا خاطر خواہ انتظام کالجوں میں نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ کالج سے باہر رہ کر لڑکے بورڈنگ کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اجی توبہ کیجئے۔ یونیورسٹی کے قاعدے قانون اس قدر سخت ہیں کہ ان سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اول تو آپ کیلئے شہر میں گھر کالج والے ڈھونڈیں گے۔ پھر اس گھر کی مالک سے کہ جسے کیمبرج میں لینڈ لیڈی کہتے ہیں اس قدر کڑی شرطیں کی جاتی ہیں کہ یہ آپ پر ماں باپ سے زیادہ نگرانی سے۔ مثلاً کالج کا قانون ہے کہ رات کو دس بجے سے پہلے اپنے اپنے کمرے پر پہونچ جائیے اس کے بعد آنے پر دو آنے جرمانہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کالج میں رہتے ہیں تو دیر میں آنے کی رپورٹ کالج کا دربان کرتا ہے۔ اور اگر آپ شہر میں رہتے ہیں تو یہ فرض آپکی لینڈ لیڈی ادا کرتی ہے۔ غرض ہر حالت میں رات کو دیر میں آنے کی رپورٹ صبح دس بجے آپ کے ٹیوٹر کی میز پر پہونچ جاتی ہے۔ ایک آدھ دن دیر میں آنے کی سزا صرف جرمانہ ہے۔ اور اگر دیر میں آنا آپ کی عادت بن گیا ہے۔ تو یہ جرمانہ ذرا سخت قسم کی ڈانٹ ڈپٹ بن جاتا ہے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد آنے والوں پر دو آنے کی جگہ چھ شلنگ آٹھ پنس جرمانہ ہوتا ہے۔ جو طالب علمی کے زمانے میں خاصہ ناگوار گذرتا ہے۔ اس لئے بہت سے لڑکے اس جرمانہ اور اتالیق کی ناگوار ڈانٹ سے بچنے کے لئے آئے دن نت نئے ڈھنگ اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اور ان اختراعوں میں چھت پھاند کر کالج میں داخل ہونا سب سے زیادہ دلچسپ صورت ہے۔

کالجوں کی دیواروں اور چھتوں کو پھاندنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ کیونکہ سب کالجوں کی عمارتیں قدیم طرز تعمیر پر قلعہ نما بنی ہیں۔ لیکن یاروں نے اس مہم کو بھی ایک فن بنا لیا ہے۔ اور ہر روز نئے نئے طریقوں سے دیواریں پھاندنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے اس فنِ لطیف پر ایک نہایت مفصل کتاب بھی چھپی ہے۔ جس کے تجربہ کار مصنفوں نے ہر کالج کی تصویر دے کر دیوار پھاندنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن بہت پرانا ہے۔ اور اس مضمون پر ایک عرصے سے طبع آزمائی ہوتی چلی آ رہی ہے لیکن اسکے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دیوار پھاندنے والے بہادر اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر کام کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مجرموں کو دیوار پھاندنے کی پاداش میں یونیورسٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کا ایک اور قانون کہ جس کی پابندی بہت لازم سمجھی جاتی ہے یہ ہے کہ سورج چھپنے کے بعد ہر ایک طالب علم کو سیاہ گاؤن اور سیاہ ٹوپی پہننی پڑتی ہے۔ چنانچہ چراغ جلے کیمبرج کے بازاروں اور گلی کوچوں میں جا بجا کالے گاؤن ہوا میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ کالا گاؤن پہن کر کوئی طالب علم سگریٹ نہیں پی سکتا۔ ایسے قانونوں کو توڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی کی طرف سے دو پروکٹر (نگراں) اور چار سپاہی اس کام پر مقرر ہیں کہ رات کو بازاروں اور گلی کوچوں میں پھر کر طالب علموں کی جانچ پرتال کرتے رہیں۔ یہاں کی زبان میں ان چار سپاہیوں کو بل ڈاگ کہتے ہیں۔ اور واقعی یہ ہیں بھی بل ڈاگ ہی۔ چراغ جلے کے بعد سے یہ شہر کا گشت لگانا شروع کرتے ہیں۔ اور جہاں کسی طالب علم کو خلاف قانون حرکت کرتے دیکھ پاتے ہیں بہت ادب سے جا کر اس کا نام اور کالج کا پتہ پوچھتے ہیں۔ دوسرے روز جرم کی نوعیت کے لحاظ سے طالب علم پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔ کیمبرج اتنا چھوٹا سا شہر ہے کہ پروکٹر اور اسکے سپاہیوں کی نظر سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ سنا ہے کہ ہمارے موجودہ بادشاہ سلامت جب کیمبرج میں پڑھتے تھے تو ایک دن شام کو گاؤن پہنے بازار میں سگرٹ پی رہے تھے۔ بھلا پروکٹر جیسا نظرباز کب چوک سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سگریٹ بادشاہ سلامت کو بہت مہنگا پڑا۔ کیونکہ دوسرے دن جرمانے کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل تھا۔

اِن بندشوں اور قاعدے قانون کی پابندیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علموں اور شہریوں میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔ اور شہر کی زندگی میں یونیورسٹی کی وجہ سے بہت چہل پہل رہتی ہے۔

کیمبرج کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۲ء میں یہاں کل طالب علموں کی تعداد مشکل سے ڈیڑھ ہزار تھی۔ اور ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد بڑھتے بڑھتے پانچہزار تک جا پہونچی۔ ان میں سے زیادہ تعداد تو ایسے طالب علموں کی ہے جو بی۔ اے میں پڑھتے ہیں۔ انہیں کیمبرج میں انڈر گریجویٹ (Under-graduate) کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ لڑکے ایسے بھی ہیں جو بی۔ اے کے بعد کسی خاص مضمون میں تحقیق کرتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ سنکر غالباً آپ کو تعجب ہوگا کہ کیمبرج میں ایم۔ اے کا امتحان نہیں ہوتا۔ بلکہ

بی۔اے پاس کرنے کے دو سال بعد ہر طالب علم کو ایم۔اے کی سند مل جاتی ہے۔ صرف یونیورسٹی کو تین پونڈ فیس کے ادا کرنے پڑتے ہیں۔

کیمبرج کی زندگی کا دارومدار تمامتر بی۔اے کے طالب علموں پر سمجھنا چاہیئے۔ شہر کی رونق بازاروں کی چہل پہل، سنیما اور تھیٹروں کی گھما گھمی سب انہی نوجوانوں کے دم سے ہے۔ چراغ جلے ان نوجوان طالب علموں کو کالے گاؤن سے پہچانا جاسکتا ہے۔ لیکن دن کے وقت بھی یہ شہریوں سے بالکل الگ پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ انکے لباس کی بے پروائی، لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، اور چہروں سے ذہانت اور شوخی کے آثار انہیں دوسرے شہریوں سے نمایاں کردیتے ہیں۔ خاص طور پر لباس کے معاملے میں کیمبرج کے طالب علم اس قدر بے پروا ہیں کہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ سارے کیمبرج میں کوئی طالبعلم خوبصورت تراش کا صاف ستھرا سوٹ پہنے نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر کوئی نوجوان عمدہ لباس میں نظر بھی آجائے تو سمجھ لیجئے کہ یا تو یہ کسی دکان پر سامان دکھانے والا ملازم ہے یا لندن سے کوئی سیاح آنکلا ہے۔ طالب علموں کی گردنوں کے گرد سردیوں میں اپنے اپنے کالج کے رنگین مفلر لپٹے رہتے ہیں۔ اور یہ مفلر اس قدر لمبے ہوتے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو غالباً انہیں کمبل کی جگہ اوڑھا بھی جاسکتا ہے۔ یہاں کے طالب علموں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چاہے جتنی سردی پڑے اوور کوٹ نہیں پہنتے۔ معمولی کوٹ میں سوں سوں کرنا یہاں بانکپن کی نشانی ہے۔ اس سال سردی کے موسم میں جب چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور کئی کئی فٹ برف جم گئی تھی اس وقت بھی یہ بانکے بازاروں اور سڑکوں پر اسی طرح بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ کیونکہ چھتری کا استعمال یا ٹوپی پہننا بھی شیوۂ جوانمردی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اکادکا اس روایت کو توڑ بھی دیتے ہیں۔

کیمبرج کی زندگی کا نقشہ شاید اس طرح آپ کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آجائے گا اگر میں ایک طالب علم کی دن بھر کی کیفیت بیان کردوں۔ طالب علم خواہ کالج میں رہے یا گھر پر صبح جلدی اٹھنے کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لئے کیمبرج میں عام طور پر صبح دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض لکچر صبح نو بجے بھی شروع ہوتے ہیں۔ لیکن لکچروں کی حاضری ضروری نہیں ہے، اس لئے اس سے طالب علموں کی زندگی پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ طالب علم جب جی چاہتا ہے اٹھتے ہیں، ناشتہ کمرے ہی میں مل جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر جی چاہا تو کسی لکچر میں شامل ہوگئے ورنہ اپنے کمرے ہی میں اخبار اور کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ دوپہر کو ایک بجے کالج ہال میں لنچ ملتا ہے۔ لیکن اس میں بھی حاضری ضروری نہیں ہے۔ اس لئے دوپہر کا کھانا زیادہ تر لڑکے شہر کے ہوٹلوں میں کھاتے ہیں۔ سردیوں میں دن چونکہ چھوٹے ہوتے ہیں اس لئے لنچ کے فوراً بعد ہی کھیل کی تیاری شروع ہوجاتی ہے۔ کیمبرج جس قدر اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے مشہور ہے اس سے کہیں زیادہ یہاں کھیل کود کا چرچا ہے۔ طالب علموں اور یونیورسٹی کی جان یہاں کے کھیل ہیں۔ اور تقریباً ہر ایک طالب علم ان میں حصہ لیتا ہے۔ سب سے زیادہ یہاں کشتی چلانے کا شوق ہے۔ کیونکہ شہر کے تین طرف دریا ہے۔ بلکہ بعض کالجوں کی دیوار کے نیچے دریا بہتا ہے۔ ہر سال کیمبرج اور آکسفورڈ کا کشتی کی دوڑ میں جو شاندار مقابلہ ہوتا ہے اب اس کی دھوم ریڈیو کے ذریعے تمام دنیا میں پھیل چکی ہے۔ اس مقابلے کی کئی مہینے پہلے سے تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ اور ان خوش قسمت نوجوانوں کو خاص عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ جو اس مقابلے میں اپنی یونیورسٹی کی طرف سے شریک ہیں۔ انہیں یونیورسٹی کی طرف سے نیلے مفلر انعام میں ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں "کیمبرج بلو" کہا جاتا ہے۔ جو یہاں بہت بڑے فخر کی بات ہے۔

ہاں تو میں کھیلوں کا ذکر کررہا تھا۔ تیسرے پہر سے کھیل شروع ہوجاتے ہیں۔ سردیوں میں ہاکی، فٹ بال، رگبی، سکواش اور مکے بازی کا زور رہتا ہے۔ گرمیوں میں جب موسم ذرا کھل جاتا ہے تو کرکٹ شروع ہوتی ہے۔ شام تک کھیل کود سے فارغ ہوکر سب اپنے اپنے کمرے پر پہونچ جاتے ہیں۔ اب چائے کا دور چلتا ہے۔ ہر ایک طالب علم اپنے دوستوں کے ساتھ چاء پیتا ہے۔ چائے کے بعد گپ اور تاش کی بازی اڑتی ہے۔ اتنے میں رات کے کھانے کا وقت ہوجاتا ہے۔ ہفتہ میں کم از کم پانچ دفعہ کالج میں کھانا ضروری ہے۔ اس لئے اپنے اپنے گاؤن پہن سب کالجوں کو چل دیتے ہیں۔ کھانے کے بعد کچھ لڑکے سنیما، تھیٹر یا کسی کلب کے جلسے میں چلے جاتے ہیں۔ اور پڑھنے لکھنے والے کمرے پر جاکر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ رات کے دس بجے تک کیمبرج کے سنیما، تھیٹر، قہوہ خانے اور بازار طالب علموں سے بھرے رہتے ہیں۔ لیکن دس بجتے بجتے سب خالی ہوجاتے ہیں اور ہر طالب علم تیزی سے اپنے گھر یا کالج کا راستہ ناپتا نظر آتا ہے۔ اسی ہجوم میں بل ڈاگ اور پرد کٹر بھی قانون شکنوں کے پیچھے

بھاگتے نظر آتے ہیں۔ دس بجے کے بعد بازاروں میں اکا دکا طالب علم نظر آتے ہیں۔ اور آدھی رات کے بعد تو بازار بالکل سنسان ہوجاتے ہیں۔ اور اگر اب بھی کوئی آپ کو باہر نظر آجائے تو سمجھ لیجئے کہ ان حضرت کا ارادہ دیوار پھاندنے کا ہے۔

اسی بھاگ دوڑ اور زندگی کی چہل پہل میں کیمبرج کے طالب علم بہت سی انجمنوں اور مجلسوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ ہر مذاق اور ہر طبیعت کے طالب علموں کے لئے کلب یا انجمن موجود ہے۔ اور عام طور پر ہر ایک طالب علم دوچار انجمنوں کا ممبر بھی ضرور ہوتا ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہی مجلسیں اور انجمنیں کیمبرج کی سماجی زندگی کی جان ہیں۔ ان میں شریک ہونے سے اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور بولنے چالنے کے قاعدوں سے واقفیت ہوجاتی ہے۔ اور کیمبرج کے طالب علموں کی آئندہ زندگی میں جو ایک خاص قسم کا ستھرا پن، سنجیدہ مذاق اور شگفتگی پائی جاتی ہے اِن سب باتوں کی بُنیاد انہی انجمنوں میں رکھی جاتی ہے۔ ایسی مجلسوں میں سب سے بڑی کیمبرج یونین سوسائٹی ہے۔ جس کی رو ائتیں ہاؤس آف کامنز سے کم نہیں۔ اس میں ہر ہفتے منگل کی شام کو دلچسپ مباحثہ ہوتا ہے۔ اور عام طور پر اُس روز باہر سے کوئی معزز مہمان بھی بُلوایا جاتا ہے۔ یونین کے جلسوں میں شریک ہونے سے ایک تو عام واقفیت کافی بڑھتی ہے، دوسرے تقریر کرنے کا انداز معلوم ہوجاتا ہے۔ جو آئندہ بہت کام آتا ہے۔ یونین کے جلسوں کا ہال اور کتب خانہ دیکھنے کے قابل جگہ ہے۔ اس کا انتظام طالب علموں کے سُپرد ہے۔ اور یونین کا صدر طالب علموں میں بہت بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔

یونین کے علاوہ کیمبرج میں چھوٹی بڑی بہت سی انجمنیں ہیں۔ ہندوستانیوں نے اپنے لئے ایک مخصوص انجمن بنائی ہے۔ اس کا نام مجلس ہے۔ مجلس میں ہندوستانیوں کے علاوہ بہت سے انگریز بھی شریک ہوتے ہیں۔ تھیٹر اور ڈرامے کے رسیا طالب علم ہر سال ایک آدھ ڈرامہ بھی اسٹیج کرتے ہیں۔ اور یہ جاننا پڑیگا کہ ان کے ڈرامے لندن کے اچھے اچھے ڈراموں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ کیمبرج کی انجمنوں کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک کا نام مگرمچھوں کی انجمن ہے۔ اسکے ممبر ایک خاص ٹائی باندھتے ہیں جس پر مگرمچھ کی تصویر ہوتی ہے۔ ابھی حال میں چند ہندوستانیوں نے اردو ہندی کے میل جول کے لئے ایک انجمن بنائی ہے اس کا نام کھچڑی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ کھچڑی کے ممبروں کی ٹائی پر کونسا نشان بنایا جائے۔

اب آپ ایک طالب علم کی دن بھر کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا وقت مختلف دلچسپیوں میں اس قدر بٹا رہتا ہے کہ اُسے پڑھنے لکھنے کا بہت کم وقت ملتا ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ یونیورسٹی کی زندگی میں پڑھنے لکھنے سے زیادہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت لگ جاتا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ان کا یہ وقت ضائع ہوگیا۔ نہیں یہ بھی اُنکی تعلیم کا ایک ضروری جزو ہے۔ کیمبرج میں سال بھر میں تین دفعہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اور جو زمانہ کہ طالب علم یونیورسٹی میں گذارتے ہیں وہ ایک ایک ٹرم کہلاتا ہے۔ سال کی پہلی ٹرم اکتوبر سے دسمبر تک، دوسری جنوری کے آخر سے مارچ تک اور تیسری اپریل سے جون کے آخر تک ہوتی ہے۔ ایک ایک ٹرم تقریباً آٹھ ہفتہ کی ہوتی ہے۔ گویا سب ملاکر سال بھر میں مشکل سے چھ مہینے یونیورسٹی میں رہنا پڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دنوں میں پڑھنے لکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ عام طور پر اصلی کام چھٹیوں میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ٹرم کے دوران میں بھی آپ کبھی یونیورسٹی لائبریری چلے جایئے تو سینکڑوں طالب علم کتابیں پڑھتے نظر آئیں گے۔ لیکن یہاں یہ صرف مواد جمع کرتے ہیں۔ گویا گائے بیل کی طرح لے جلدی جلدی نگل لیتے ہیں۔ پھر چھٹیوں میں فرصت سے بیٹھ کر اس کی جگالی کرتے ہیں۔ بہت سے طالب علم چھٹیوں میں بھی یونیورسٹی ہی میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن دنوں کھیلوں تماشوں سے فرصت مل جاتی ہے۔ اور یکسوئی سے دل لگا کر پڑھ سکتے ہیں۔

سب سے حیرت کی بات کیمبرج میں یہ دیکھنے میں آئی کہ یہاں لڑکیوں کو لڑکوں کے کالجوں میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک مدت تک تو انہیں یونیورسٹی میں داخل ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب تقریباً ستر سال سے لڑکیوں کے لئے دو کالج کھل گئے ہیں۔ اور ۱۹۲۱ء سے لڑکیوں کو باضابطہ بی۔ اے کی ڈگری ملنے لگی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے لڑکیاں پڑھتی ضرور تھیں۔ مگر انہیں امتحان پاس کرنے کے باوجود ڈگری لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب بھی لڑکیوں کو گاؤن پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ ان دونوں کالجوں میں مجموعی طور پر صرف پانسو لڑکیاں پڑھ سکتی ہیں۔ اس سے زیادہ داخل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سب سے لطف کی بات یہ ہے کہ کیمبرج یونین میں لڑکیوں کو ممبر نہیں بنایا جاتا۔ اور یونین کے جلسوں میں مہمان کی حیثیت سے بھی یہ ہال میں نہیں بیٹھ سکتیں۔

بلکہ ان کے بیٹھنے کیلئے ہال کے اُوپر ایک خاص گیلری ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہاں یہ بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔ اگر کوئی لڑکی حاضرین کے ساتھ مل کر بھی تالیاں بجادے تو یونین کے عہدے دار اُسے فوراً روک دیتے ہیں۔

اب چند سال سے یونیورسٹی کے لکچروں میں لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ شامل ہونے کی اجازت مل گئی ہے۔ لیکن عام طور پر ان لکچروں میں لڑکیاں اچھوتوں کی طرح لڑکوں سے الگ بیٹھتی ہیں۔ اور لکچر کے دوران میں اُستاد کبھی لڑکیوں سے مخاطب نہیں ہوتے۔ بلکہ ان سے ایسی بے رُخی برتتے ہیں جیسے لڑکیاں جماعت میں ہیں ہی نہیں۔ جنگ عظیم کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ سُننے میں آیا ہے کہ ان دنوں کیمبرج کے ایک مشہور پروفیسر ہمیشہ اپنا لکچر لفظ جنٹلمین سے شروع کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کی جماعت کے سب لڑکے غیرحاضر ہوگئے۔ اُس روز لکچر میں صرف لڑکیاں ہی شریک ہوئیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنی عینک کے شیشوں میں سے تمام جماعت پر نظر دوڑائی اور یہ کہتے ہوئے جماعت سے نکل گئے کہ آج کوئی سُننے والا ہی نہیں آیا تو میں لکچر کیا خاک دوں۔

اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کیمبرج کی عام زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں ہندوستانی طالب علموں کا خاص طور پر کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ جب تک آپ کیمبرج کی زندگی کا نقشہ اپنے ذہن میں نہ جمالیں اس وقت تک یہاں کے ہندوستانی طالبعلموں کا حال سمجھنا دشوار ہے۔ انگلستان کے متعلق ہندوستانیوں کو اب تک یہ شکایت ہے کہ یہاں ہندوستانیوں سے برابری کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ممکن ہے کہ یہ شکایت اور شہروں کے متعلق دُرست ہو۔ لیکن کیمبرج کی تعلیمی زندگی میں ایسا فرق کبھی روا نہیں رکھا جاتا۔ اِسی لئے ہندوستانی یہاں آکر یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ہم وطن سے ہزاروں میل دُور ایک نئے ملک میں ہیں۔ کیمبرج کے پانچ ہزار طالبعلموں میں ہر سال تقریباً سوا سو ڈیڑھ سو کے درمیان ہندوستانی طالب علم شرکت کرتے ہیں۔ نسبتاً ان کی تعداد مشکل سے تین فی صدی نکلتی ہے۔ لیکن اسکے باوجود ہندوستانی طالب علموں نے اپنی ذہانت اور قابلیت کا سکہ بٹھا دیا ہے، پڑھنے لکھنے والوں میں ہر سال دو چار ہندوستانی نام فہرست کے اُوپر نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ علمی اور ذہنی اعتبار سے ہندوستان کبھی مغرب سے پیچھے نہیں رہا۔ سب سے فخر کی بات یہ ہے کہ کھیل کود انگریزوں کی قومی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس میدان میں بھی اکثر ہندوستانی اپنے انگریز حریفوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ مثلاً کیمبرج کی کرکٹ ٹیم میں آج تک رنجیت سنگھ جی کا نام ادب سے لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ابھی چند سال ہوئے جموں و کشمیر کے نوجوان کھلاڑی بھارت چند کھنہ اور پنجاب کے جہانگیر خاں نے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ ٹینس خاص یورپ کا کھیل ہے۔ لیکن ہر سال کیمبرج کی اوّل درجے کی ٹیم میں ایک دو ہندوستانی ضرور شامل رہتے ہیں۔ اِن سب باتوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان بھی انگریز نوجوانوں کے دوش بدوش مقابلہ کرسکتے ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ کیمبرج میں ہندوستان کے حالات سے کافی دلچسپی لی جاتی ہے۔ مثلاً کیمبرج یونین کی بحثوں میں اکثر ہندوستان کی سیاسیات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ گذشتہ سردیوں میں ہندوستان کے متعلق ایک بحث سُننے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ یونین ہال اور گیلری میں کھڑے رہنے تک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اِسی زمانے میں ایک بہت بڑا جلوس ہندوستان کی حمایت میں نکالا گیا تھا جس میں ہندوستانی طالب علموں سے زیادہ تعداد انگریز لڑکوں اور لڑکیوں کی تھی جو بڑے بڑے پوسٹر اُٹھائے ہندوستان کی آزادی کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ہندوستان کے اقتصادی حالات کے متعلق ایک نہایت دلچسپ نمائش بھی ہوئی تھی جس میں صبح شام طالب علموں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اس وقت کیمبرج میں بہت سے ایسے پروفیسر موجود ہیں کہ جن کا ایک مدت تک ہندوستان سے تعلق رہا ہے۔ مثلاً ایک کالج کے پرنسپل سی۔ پی کے سابق گورنر سر مانٹیگو بٹلر ہیں۔ جن کے بڑے بھائی سر ہارکورٹ بٹلر کا نام لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور یہ خود بھی ایک عرصہ تک پنجاب اور دھلی میں رہ چکے ہیں۔

کیمبرج مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک عرصہ سے مشہور ہے۔ بلکہ انگلستان میں سب سے پہلے کیمبرج ہی کے ایک فاضل اُستاد نے سنسکرت کی تعلیم کی بُنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ یورپ کی اور یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں پر ایک زمانے سے تحقیق ہو رہی تھی۔ فارسی ادبیات کی تاریخ میں پروفیسر براؤن کا نام کون نہیں جانتا۔ مشرقی زبانوں کیلئے جو کچھ اُنہوں نے کام کیا ہے اس کی مثال دُنیا بھر میں ملنی مشکل ہے۔ یہ بھی کیمبرج ہی کے اُستاد تھے۔ کچھ عرصے سے کیمبرج میں اُردو اور ہندی پڑھانے کا بھی باقاعدہ انتظام ہو گیا ہے۔ اگرچہ فی الحال اِن زبانوں کی تعلیم انڈین سول سروس کے اُمیدواروں تک محدود ہے۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو اُردو کے مشہور ادیب شمس العلماء ڈاکٹر سید حسین بلگرامی مرحوم

چغلخورہ

چُغلی کھانے والے کو چغلخورہ کہتے ہیں۔ کسی کی پیٹھ پیچھے جھوٹ سچ بُرائی کرنے کو چغلی کھانا کہتے ہیں۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے خبر نہیں، ورنہ پتہ چلاتے کہ چغلی کھانے والے پہلے پہلے کہاں سے آئے اور کیونکر اتنے پھولے پھلے کہ آج ان کا ہر طرف بول بالا ہے۔ جہاں تک آواز کا تعلق ہو لفظ چغلخورہ سُن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی کیڑہ ہو، ٹیڑھا کُبڑا جو رینگ کر چلتا ہو، تنگ سُوراخ سے بھی بل کھا کر اور اینٹھ کر نکل جاتا ہو، ملائم گوشت پر چپک جاتا ہو اور سوکھی ہڈی پر پھسلتا ہو، سامنے کے دو بال جیسی لبلبیوں سے آواز کی دھمک اور فضا کی گرمی سردی کا پتہ لگا کر موافق جگہ میں ٹھہر جاتا ہو اور نازک مقام سے دبے پاؤں بھاگ نکلتا ہو۔ یہ تمام صفتیں کنکھجورے میں پائی جاتی ہیں جو چغلخورے کا ہم آواز لفظ ہے۔ چغلخورہ، کنکھجورہ۔ دونوں اپنی خاصیت میں ایک ہیں گرچہ ایک آدمی ہے اور دوسرا کیڑا۔ ہر وہ انسان جس کا دماغ کسی وجہ سے بھی ہو، سڑ گل کر کنکھجورہ جیسا ہو جائے تو وہ چغلخورہ ہو جاتا ہے۔ یہ میرا ایک قاعدہ کلیہ ہے جہاں استثنا صرف اس قاعدے کو پایۂ ثبوت تک پہونچانے میں مدد دیتے ہیں۔

آپ کہیں گے کنکھجورہ کیڑا ہے اور چغلخورہ انسان، دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ اب میری بات ذرا دھیان دیکر سُنئے۔ جس طرح یہ کیڑا رینگ کر آہستہ آہستہ چلتا ہے اسی طرح چغلخورہ جب چغلی کھانے جاتا ہے تو اتنا دبے پاؤں کہ کسی کو اُس کے آنے کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ جس طرح یہ کیڑا تنگ سُوراخ سے بھی بل کھا کر نکل جاتا ہے اسی طرح یہ انسان بھی بھری محفل میں دبتا دبتا نکل جاتا ہے اور سرگوشیوں میں چغلی کھانے لگتا ہے۔ اگر اُس وقت آپ غور سے دیکھیں تو اس کا جسم بھی بل کھاتا اور اینٹھتا ہوا دکھائی دیگا۔ جس طرح یہ کیڑا ملائم گوشت پر چپک جاتا ہے اور سُوکھی ہڈی پر پھسلتا ہے اسی طرح یہ انسان بھی صرف موٹے بیں کے پاس بیٹھتا ہو جو ملائم قسم کا ہلکے کان والا ہو۔ چغلخورے کی دال ایسے آدمیوں کے پاس نہیں گلتی جو خشک اور سخت قسم کے ہوں۔ کنکھجورے کے اگلے حصہ میں دو بال جیسے باریک آلۂ حس ہوتے ہیں جس سے وہ آس پاس کی حالت کا پتہ لگاتا ہو۔ چغلخورے کے پاس بھی دو آنکھ، دو کان اور ناک کے دو سُوراخ ہوتے ہیں۔ جس طرح کنکھجورہ گرم جگہ میں نہیں ٹھہرتا یا وہاں نہیں رُکتا جہاں خطرہ ہو، بالکل اسی طرح یہ چغلخورہ انسان اس جگہ ہرگز نہ ٹھہریگا جہاں اس کی حد درجہ حساس آنکھیں، کان یا ناک خطرہ کا پتہ دیں۔ چغلخورے کے حواس خمسہ اس کی عادت کی وجہ سے ہر وقت منجھے ہوئے رہتے ہیں۔ اس کو خطرہ وہاں نظر آئے گا جہاں کچھ بھی نظر نہ آتا ہو۔ اسکے کان باریک سے باریک آواز کو بھی سُن لیں گے، اسکی ناک آنے والے خطرے کو آسانی سے سُونگھ لیگی بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس نے ایک چھٹا حس بھی پیدا کر لیا ہے جس کے ذریعے وہ چغلی کھانے کا موزوں وقت سمجھتا ہے اور اپنی کھائی ہوئی چغلیوں کی بدولت آنیوالے خطرے سے قبل از وقت آگاہ ہو جاتا ہو۔

چغلخورہ اگر انسان ہے تو کس قسم کا؟ ذرا حلیہ ملاحظہ فرمائیے:۔

ٹھنگنا سا دُبلا پتلا آدمی جو ظاہرا دیکھنے میں نفیس مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اسکے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ہوتا ہے جس کو وہ احتیاط سے رکھتا اور پہنتا ہے۔ ناک سوکھی اور آگے کی طرف جھکی ہوئی جیسے طوطے کی چونچ یا پھر موٹی اور چھوٹی جیسے بوتل کی کاگ۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو گھسی ہوئی مگر اُن میں تیکھا پن اور چمک بہت زیادہ جیسے سانپ کی آنکھیں۔ دہانہ پھیلا ہوا۔ لب پتلے، ٹھوڑی چوڑی اور چھوٹی، پیشانی تنگ، جس پر گھنے اور قرینے سے سنوارے ہوئے بال۔ دانت سفید اور چمکیلے مگر منہ میں مسوڑوں کی خرابی کی وجہ سے بدبو۔ بات کم کرنے والے مگر جب کریں تو ٹھہر ٹھہر کر، رُک رُک کر، آہستہ آہستہ، اِدھر اُدھر دیکھکر سرگوشیوں میں جیسے بڑے راز اور اہمیت کی باتیں کر رہے ہیں۔ بات کرتے وقت تھوک جھاگ بن کر منہ کے دونوں کونوں میں جم جاتا ہے اور دونوں لبوں کے بیچ میں بھی تار بن کر آ جاتا ہے۔ یہ تار ٹوٹتا نہیں بلکہ گفتگو کے وقت جو منہ کے خلا میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے اُسی لحاظ سے یہ بھی بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ گفتگو کے وقت چغلخورے کا چہرہ بھان متی کا پٹارہ ہو جاتا ہے۔ اسکے چہرے کا اتار چڑھاؤ، پیشانی پر آدھے درجن بل، ابروؤں کا تنکر کمان ہو جانا، منہ کے کونے کا کبھی اُوپر کی طرف اُٹھ جانا اور کبھی نیچے کی طرف لٹک جانا جیسے مسکرا رہے ہیں یا رو رہے ہیں، کبھی دانتوں کی پوری بتیسی کا دکھائی دینا اور کبھی منہ کا بھیانک طرح سے اتنا کھل جانا کہ حلق کا کوا دکھائی دینے لگے۔ آواز کا کبھی مدھم ہو کر بجھتے ہو

چراغ کی لو کی طرح ہو جاتا اور کبھی اتنا آہستہ ہو جاتا کہ سننے والا "جی جی" کہہ اٹھے اور پھر بھی سن نہ سکے تو اخلاقاً سر کے اشارے سے کہے "اچھا، یہ تھا مطلب۔" چغلخورہ جب بات کرنا چاہتا ہے تو پہلے ادھر ادھر دیکھتا ہے، پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر جھانکتا ہے اور واپس آتے وقت کھڑکی اور دروازوں کو آہستہ سے بند کرتا آتا ہے۔ پھر مالک مکان سے مزید تحقیقات کرتا ہے کہ "آس پاس کوئی ہے تو نہیں؟" پھر فدویانہ انداز سے بہت سکڑ کر تھوڑی سی جگہ میں بیٹھ جاتا ہے جہاں سے آہستہ آہستہ کھسک کر گفتگو سننے والے کے قریب تر ہو جاتا ہے۔ اتنا قریب کہ اسکا منہ سننے والے کے کان سے جا لگتا ہے۔ گفتگو کرتے وقت اسکے ہاتھ کبھی ہوا میں اٹھتے ہیں اور کبھی زانو پر گر کر ہلکی سی تھپکی کی آواز پیدا کرتے ہیں۔ اس کے سارے جسم میں ایک قسم کی کپکپی ہوتی ہے جس کا اثر اس کی آواز میں تھرتھراہٹ بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ گفتگو کے بعد چغلخورہ پھر اسی فدویانہ اور خیرخواہانہ انداز سے اٹھتا ہے، ادھر ادھر دیکھتا ہوا جھک کر آداب بجا لاتا ہے اور دبے پاؤں آہستہ سے دروازہ کھول کر پہلے آنکھ پھر سر اور بعد میں سارا جسم باہر نکالتا ہے۔ جاتے وقت ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ پھر اپنی چھڑی کو ہوا میں نچاتا ہے اور سیٹی بجاتا ہوا نہایت تیزی سے اطمینان کی جگہ پہنچکر آزادی کا سانس لیتا ہے۔

آدمی چغلی کیوں کھاتا ہے؟ دیکھنے میں اچھا خاصا انسان خاصیت میں کیڑا کیوں ہو جاتا ہے؟ میں یہاں پھر کہونگا کہ یہ دماغ کے ایک گندے قسم کے مرض کی نشانی ہے۔ جس میں قوت فیصلہ جیسی اہم اور نازک شے کی کمی ہو جاتی ہے۔ چغلخورہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ برا ہے یا بھلا۔ ایسا کرنا اچھا ہے یا خراب۔ کھوپڑی میں "شے لطیف" کی کمی کی وجہ سے جہاں مختلف قسم کے ناشایستہ حرکات سرزد ہوتے ہیں وہاں یہ چغلی کھانے کی عادت بھی ہے۔

چغلخورے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو پیدائشی جن کی فطرت اوروں کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے کی ہے۔ یہ بغیر سوچے سمجھے چغلی کھاتے جائیں گے۔ ان کی بلا سے کوئی رہے یا جائے، کوئی اٹھے یا گرے۔ ان کی تو روزمرہ کی عادت ہے۔ جب تک دو چار دوستوں کی دو چار ہمدردوں سے چغلی نہ کھالیں گے ان کا کھانا ہضم ہی نہ ہوگا۔ یہ صبح سے شام تک ایک کی دوسرے سے چغلی کھائیں گے۔ بھلے چنگے انسان میں خواہ مخواہ طرح طرح کے نقص نکال کر اسکے نام نہاد عیوب کی قصیدہ خوانی کرتے پھرینگے۔ الغرض یہ اس بچھو کی طرح ہیں جو دشمنی سے نہیں بلکہ عادت سے مجبور ہو کر ہر چیز میں ڈنک مارتا پھرتا ہے۔ چغلخوروں کی دوسری قسم ایسی ہے جنہوں نے چغلی کھانا اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔ یہ دوسری قسم نہایت خطرناک اور سوسائٹی کیلئے بارود کی سرنگ ہے۔

اس قسم کے چغلخورے ہر جگہ ہر سوسائٹی میں مہذب آدمی کی طرح زندگی بسر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی گذر ہر بڑی جگہ میں ہے۔ ہر رئیس کا دسترخوان ان کے لئے کشادہ ہے۔ ہر بڑا صاحب ان کو بڑا بابو بنانے کو تیار ہے۔ الغرض ہر جگہ، ہر طرف، زمین میں، آسمان پر، ہوا میں، پانی پر اس قسم کے خوش اور تاک میں بیٹھے ہوئے چغلخور دکھائی دیگے انکی چغلی کھانے میں اپنی غرض پنہاں ہے۔ یہ صرف اسکی چغلی کھائیں گے جسکے گرنے سے انکا فائدہ ہوگا۔ یہ عموماً چغلی کھانے سے پہلے سازش کرتے ہیں، ثبوت جمع کرنے کیلئے ہر طرح کی ذلیل حرکت کرتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں، لالچ دلاتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں اور جب انکو یقین ہو جاتا ہے کہ اب شکار پھنس گیا ہے تو پھر بڑی بیدردی سے آنکھیں پھیر کر چغلی کھاتے ہیں اور اپنے جال میں معصوم بے خبر شکار کو پھنستے دیکھکر دل ہی دل میں خوشیاں مناتے ہیں۔ انکے دل سیاہ ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں تل ہوتا ہے۔ انکے دل میں کسی کی محبت یا کسی کی ہمدردی نہیں ہوتی۔ یہ زندہ رہتے ہیں تو اپنے لئے۔ اس قسم کے چغلخور شاید انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں اس لئے کہ جب ہم جنت میں تھے تو وہاں بھی ہمارے ساتھ ایک چغلخورہ رہتا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہ کیڑے بڑھتے ہی جارہے ہیں اور گھٹنے کا نام تک نہیں لیتے۔ ہر زمانے میں چغلخورے ہوئے ہیں مثلاً جولیس سیزر کیلئے کیسی، عیسیٰ علیہ السلام کیلئے جوڈا، نپولین کیلئے ٹالی اینڈ، جہانگیر کیلئے ابوالفضل، سراج الدولہ کیلئے میر جعفر، اور ٹیپو سلطان کیلئے میر صادق اور پرنایا وغیرہ۔ اسی طرح ہر دور کے ہر بڑے آدمی کو دیکھو، اس کو فلاح کسی چغلخورے کی بدولت ہوئی اور دوسرے بڑے آدمی کی تباہی اسی کے ہاتھوں آئی۔ قصہ کوتاہ، بڑے آدمی بننے کے لئے موافق چغلخوروں کی ضرورت ہے اور کسی بڑے آدمی کو گرانے کیلئے بھی چغلخوروں کی مدد چاہیئے۔ گویا یہ ایک قسم کے معمار ہیں جو ایک محل کو ڈھا کر اسکے کھنڈروں پر دوسرا تیار کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ چغلخوروں کا میدان عمل رئیسوں کی ڈیوڑھیاں ہیں۔ انکی بھاگ دوڑ ایک ڈیوڑھی سے دوسری ڈیوڑھی تک ہے۔ انکے وہم میں بھی کبھی غریبوں کی جھونپڑیاں نہیں آتیں اور یہ غریبوں کیلئے اچھا ہے کہ انکے گوشۂ تنہائی میں اس قسم کی کوئی آفت نہیں آتی۔ چغلی کھانے کا پیشہ ان دنوں ترقی پذیر ہے۔ چغلی کھانے کی ذلیل حرکت کو موجودہ دورِ تہذیب اتنا جلا دے رہا ہے کہ یہ ایک قسم کا آرٹ ہو کر رہ گئی ہے۔

پہلے چغلخور انفرادی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اب پوری جماعت نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا ہے چنانچہ ہر مہذب حکومت میں ایک محکمہ چغلخوری کا بھی ہے جس کی حقیقت کو چھپانے کے لئے طرح طرح کے بانکے ترچھے نام دئے گئے ہیں۔

انسانی دورِ حیات میں ناسمجھی کے زمانے دو ہوتے ہیں جن میں برے بھلے کی تمیز کم ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی۔ یہ زمانے بچپن اور بڑھاپے کے ہیں۔ ان دو حیات کی انتہائی سروں پر قریب قریب ہر انسان چغلخور ہوتا ہے ایک لڑکے کو دیکھئے جو اپنے بھائی بہنوں سے ممتاز بننے کے لئے اپنے والدین کے آگے جا کر ان کی چغلی کھاتا ہے۔ مثلاً "ابا جی، دیکھئے نا آج حبیب بھیا بازار کی مٹھائی خرید کر کھا رہے تھے، میں نے نہیں کھائی" یا پھر "اماں جان، حلیمہ بڑی شریر ہو گئی ہے، اس نے خوانچے والے پر ڈھول جھٹک دی تھی"۔ یہاں بچے اپنے دوسرے بھائی بہنوں کی چغلی کھا کر والدین کی نگاہ میں صرف اپنی سرخروئی چاہتے ہیں اور والدین کی محبت اوروں کی طرف سے کم کرانا چاہتے ہیں۔ اکثر بچے ہوش سنبھالتے ہی اس بری عادت کو چھوڑ دیتے ہیں، اگر ان کی یہ عادت بچپن میں چھڑائی نہیں گئی تو آگے چل کر اٹل ہو جاتی ہے، سینکڑوں مصیبتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ یہی حال گھر کے بوڑھے بزرگوں کا ہے۔ بیٹا گھر میں آیا نہیں کہ بہو کی چغلی کھائی جانے لگی یا پھر پوتے نواسوں کی شرارتوں کی شکایت ہونے لگی۔ بوڑھے بیچارے کمزور اور ناتواں ہوتے ہیں وہ جس چیز کو قوتِ بازو سے حاصل نہیں کر سکتے وہاں چغلی کھا کر اپنے نفس کو تشفی دیتے ہیں۔

چغلخور بڈھے بھی اکثر گھروں میں ناخوشی اور شکر رنجی کا باعث بنتے ہیں۔ ان کی یہ عادت ایسی بے ضرر نہیں کہ ہنس کر کہا جائے

ع۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

چغلخور عورتوں سے زیادہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ عورتیں چغلخور ہوتی ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ایسی بستی ہوگی جو چغلخور نہیں۔ یہ پیدا ہونے کے بعد سے مرتے دم تک کسی نہ کسی صورت میں چغلخور رہتی ہے۔ یہاں بھی ان کی حمایت میں یہ کہنا پڑے گا کہ بیچاری کمزور ہوتی ہیں اس لئے بازوؤں کا کام زبان سے لیتی ہیں۔ سبب کچھ بھی ہو مگر پناہ خدا! ان کی زبان چغلی کھا کھا کر وہ چٹخارے لیتی ہے کہ کوئی دیکھتا ہی رہے۔ یہ اپنی زندگی کے ہر دور میں چغلخور ہوتی ہیں: بچپن میں بات کرنے کی صلاحیت آئی نہیں کہ بھائی کی چغلی ماں سے اور ماں کی باپ سے کھانے لگیں۔ کچھ بڑھ کر مدرسے میں آئیں تو محمودہ، میمونہ، حمیدہ، بڑی استانی، چھوٹی استانی کی چغلیاں کھانے لگیں۔ جوان ہوئیں تو سہیلی کی چغلی کھانے لگیں۔ جوان ہو کر بیاہی گئیں تو شوہر تو اپنے ہر ملنے والی کی چغلی کھانے لگیں۔ مثلاً "اوئی توبہ، انور جہاں، یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے جس کی صورت نہ شکل" یا پھر "چہ چہ فاطمہ بیچاری کیسی اچھی لڑکی ہے، ذرا چہرے کے چیچک کے داغ بدنما ہو گئے ہیں" یا پھر "جی ہاں، خورشید جمال نے بی۔ اے کر لیا ہے مگر نوج ایسی پڑھائی پر جب چال چلن ہی درست نہ رہا" وغیرہ وغیرہ۔ ایک بھولا سا معصوم چہرہ جو ہر وقت مسکراتا ہو چغلی کھاتے وقت گمبھیر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس گمبھیرتا پر ہزاروں شوخیاں صدقے، بھلا ایسی چغلی پر کون کافر ایمان نہ لے آئے گا؟ الغرض چغلی کھانا عورتوں کی عادت سی ہو جاتی ہے جو مرتے دم تک نہیں جاتی۔

چغلی کھانا چونکہ ایک قسم کا آرٹ ہے اس لئے یہ صرف چند لوگوں کے بس کی بات ہے۔ ایسا آدمی جو آرٹسٹ نہ ہو اسے چغلی ہرگز نہ کھانا چاہیئے۔ ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑتی ہیں۔ مثلاً آپ نے "الف" کی چغلی "ب" سے کھالی کہ وہ ایسا ہے اور ویسا ہے مگر "ب" کے تعلقات جو "الف" سے ہیں ان پر غور نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ "ب" "الف" سے کہہ دیگا کہ آپ اس کی چغلی کھا رہے تھے۔ الف یقیناً آپ کا دشمن ہو جائے گا اور آپ کی چغلی اوروں سے کھانے لگے گا اور اگر الف ذرا آرٹسٹ قسم کا ہوا یا چغلخور ہوا تو پھر آپ کی خیر نہیں ہر جگہ، ہر مجلس میں، اٹھتے بیٹھتے آپ کی چغلی کھا کھا کر آپ کا زندہ رہنا دشوار کر دیگا اور اس طرح روزے بخشوانے کی فکر میں نماز گلے پڑ جائے گی۔ محض ایک ذرا سی لغزش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عرصہ تک آپ اطمینانِ قلب کھو بیٹھیں گے۔ اس لئے میری نصیحت ہے کہ اگر آپ کسی کو عیب کرتے بھی دیکھئے تو خاموش رہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ اس سے بڑھ کر کوئی عیب کر رہے ہوں جس کی آپ کو خبر نہیں۔ اگر آپ نے کسی کے عیب کی چغلی کھائی تو پھر آپ کے عیب بھی منظرِ عام پر آ کر رہیں گے۔ دوسروں کی عیب پوشی میں خود اپنی عیب پوشی ہے۔

محمد نصیر الدین

تحفہ

بھائی شاہد! ہندوستان کے سب سے بڑے "فلسفی ادیب" کا یہ تحفہ جو ایک "پیام" کی شکل میں شادی کے چند دن بعد موصول ہوا ہے اس قابل ہے کہ ہر نوجوان کی نظر سے گذرے اس لئے اسے نذرِ "ساقی" کر رہا ہوں۔

عاصم

"عاصم!

ارادہ یہ تھا کہ جس ساعت تمہاری ازدواجی زندگی کا نیا دن شروع ہوا اُسی دن یہ چند سطریں تمہاری نظر کے سامنے آئیں۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔

نوجوان جو حسن و عشق کے فلسفے کو اپنے تخیل کے سربفلک میناروں پر بٹھا دیتا ہے اور ازدواجی زندگی کے تصورات میں اپنا ایک صنم خانہ تعمیر کرتا ہے اکثر اس جمالیاتی کیفیت میں مرد اور عورت کے روحانی رشتہ کی اہمیت کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اس کی نفسیات ازدواجی زندگی کے ابتدائی دور میں جنسی خواہشوں کے ہجوم میں مبتلا رہتی ہیں لیکن وہ اپنے جنسی تقاضوں کے چہرے پر بہت ہی خوبصورت نقاب ڈال دیتا ہے اور اپنے نفس کو اکثر یہ دھوکا دیتا ہے کہ خواہش گویا محبت ہے! چند روز تم بھی اپنے تصورات کو یہی دھوکا دو گے۔ لیکن خبردار اس دھوکے میں عورت کی عزت کم نہ کر دینا۔ مرد جب عورت سے اپنے جنسی تقاضوں کا جواب مانگتا ہے تو وہ انسانیت کے ایک ادنیٰ درجے پر پہونچ کر الفاظ اور اصطلاحات کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسکو وہ محبت کہتا ہے ـــ وہ کچھ نہیں ہوتی سوائے ایک جسمانی بے حجابی اور شہوانی خلوت کے ـــ نوجوان کی شادی کے بعد یہ ہنگامۂ فریب عرصے تک جاری رہا کرتا ہے۔ تاآنکہ مرد کی خواہشوں کی چڑھی ہوئی آندھی اُتر جائے پھر جب وہ آندھی اُتر جاتی ہے تو محبت کی کشتی کے پتوار ٹوٹے ہوئے اور بادبان پھٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب عورت اور مرد کے درمیان ایک کاروباری اور معاشی زندگی کا دور شروع ہوتا ہے لیکن اگر خواہشوں کے طوفان میں تم نے عورت کی جنسی آبرو کو اپنے لئے بہت کم قیمت، اور سستا نہیں بنایا ہے تب تو تمہارے گھر میں، تمہارے اور تمہاری بیوی کے تعلقات میں وہ روحانیت پیدا ہو سکتی ہے جو زندگی کی حسن کاری کا ایک شاہکار ہے۔ لیکن اگر تم نے عورت کو صرف اپنی جوانی کا ایک مشغلہ سمجھا ہے تو یقین جانو کہ تم نے زندگی کے اس شاہکار کو تباہ کر ڈالا ہے۔ تمہاری ازدواجی زندگی میں روحانیت کے ارتقاء کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ انسانیت کا شرف یہ ہے کہ عورت کو احتیاط کے ساتھ ہاتھ لگاؤ ـــ جیسے تم نازک پھول کو چھوتے ہو۔ اگر تمہاری نبض میں جوانی کا خون ـــ جو حیوانیت کا گرم خون ہوتا ہے ـــ تمہیں جنسِ لطیف کی اس شعریت سے بے پروا کر دے جو ہمارے لاکھوں گھروں میں جنسی خواہشات پر اس طرح قربان کی جاتی ہے جس طرح شکاری کتوں کے پنجے میں جنگل کی کوئی فاختہ، تو یقین جانو کہ تم اپنے گھر کو ایک بازاری دُکان بناتے ہو جہاں تم کپڑے روپے کی صورت میں معاوضہ دیکر اپنی جوانی کے دیو کیلئے ایک سستا سودا خریدتے ہو یا ان ایک قربان گاہ ہے جہاں تم ہر روز ایک بکری ذبح کرتے ہو۔ تاکہ تم اپنی خواہشوں کو تسکین بخشو۔ بے پروا جوانی عورت کی ہیئتِ مخصوص سے ہمیشہ بیگانہ رہتی ہے۔ کہیں تم نے شاعر اور فلسفی کی نظر سے مرد اور عورت کے کسی عمر رسیدہ اور ضعیف جوڑے کو پہلو بہ پہلو بیٹھے دیکھا ہے اگر اس جوڑے نے اپنے جنسی تعلقات کے فطری توازن کو قائم رکھا ہے تو بڑھاپے کی آخری انتہا پر بھی ان دونوں کی نظروں میں جوانی باقی رہتی ہے۔ یہ جوڑا ازدواجی زندگی کی شعریت کا ایک دلنواز مرقع ہوتا ہے۔

وہ ایک مرصع غزل کا مقطع ہوتا ہے!

دنیا کے یہ دو سیاح پچاس ساٹھ کے رفیق اپنی محبت سے زندگی کی شام کو صبح بنا لیتے ہیں صرف اس لئے کہ انہوں نے آغاز ازدواج کے جنسی طوفانوں میں اپنی رُوح کی شعریت کو تباہ نہیں کر ڈالا۔

عورت کے دو جذبے فولاد کی سختی اور نارِ جہنم کی گرمی رکھتے ہیں۔ وہ محبت کرتے ہیں تو زندگی کی قربان گاہ پر اپنی ساری پونجی رکھ دیتی ہے لیکن اگر نفرت کرتی ہے تو زندگی کی رگوں کے خون کا آخری قطرہ بھی کھینچ لیتی ہے۔ زندگی کے کارخانے میں یہ بہت خاموش مگر بہت حساس ہستی ہے اور اس کی محبت اور نفرت کو تم کسی معمولی پیمانے سے ناپ نہیں سکتے تاوقتیکہ ایسی نظر پیدا نہ کرو جس میں شعریت زیادہ ہو اور جوانی کی حیوانیت کم! زندگی کا یہ نازک معاہدہ جو مردوں اور عورتوں کے درمیان مرتب ہوتا ہے نہ بیعنامہ ہے اور نہ رہن نامہ، یہ ایک شراکت نامہ ہے جس میں ہر شریک کے حقوق معین ہیں کاروبار کی اصطلاحوں، اس لئے میں یہ بات کہتا ہوں کہ تم خود کاروباری آدمی ہو، نوجوان کی جوانی اس شراکت نامہ کو بیعنامہ تصور کر لیتی ہے اور

جب وہ ایسا کرتی ہے تب ہی ازدواجی زندگی اور جنسی شعریت کے نقش و نگار مسخ ہوجاتے ہیں ـــــ عمر بھر کے لئے مسخ ہوجاتے ہیں۔ آج تم اپنی زندگی کا جو اسلوب قائم کروگے وہی تمہارے گھر کو جنت بھی بنا سکتا ہے اور دوزخ بھی۔ اپنے نفس اور اپنے فہم سے محاسبہ کا وقت یہی ہے اپنی زندگی میں اپنی شریک زندگی کا آج تم جو مرتبہ معین کروگے اسکے برے یا اچھے نتائج عمر بھر تمہارے دامن سے لپٹے رہیں گے۔

ایک بات اور کہدوں۔ یہ اولاد کا مسئلہ ہے۔ اولاد پیدا کرنے میں جلدی نہ کرو۔

غلاموں کے ملک کو زیادہ اولاد کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ بھوکوں کے ملک کو بہت سے بچے درکار ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کی زندگی کا توازن قائم رکھنے کے لئے ضبط تولید پر عمل کرو۔ مذہبی لوگ ایسے مشوروں نامعقول قرار دیتے ہیں مگر آگے کیوں جاؤ ذرا ان ہی بزرگوں کی اولاد کا حال دیکھ لو!

بہرحال میرے دل کی بات تو یہ ہے کہ مسلمان کا ایک تندرست اور آزاد بچہ دس کمزور اور آدھے پیٹ روٹی کھاکر زندہ رہنے والے بچوں سے بہتر ہے۔ خدا حافظ۔ تمہارا ...."

عاصم پریمی

کیمبرج میں ہندوستانی طالب علم (بسلسلہ صفحہ ۲۹)

کیمبرج میں اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ اسکے علاوہ یونیورسٹی لائبریری میں عربی، فارسی، سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے متعلق نہایت عمدہ مواد موجود ہے۔ جس کا ذکر انشاء اللہ کسی اور صحبت میں کرونگا۔

اسقدر لکھنے کے باوجود کیمبرج میں ہندوستانی طالب علموں کا نقشہ مکمل نہیں ہوا۔ کیونکہ جب تک میں ہندوستانی ہوٹل کا ذکر نہ کروں کیمبرج کی زندگی ادھوری رہی جاتی ہے۔ کیمبرج میں یوں تو سینکڑوں ہوٹل اور ریسٹوران ہیں لیکن ہندوستانی ہوٹل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو چٹخارہ اور لطف، ذائقہ کو یہاں ملتا ہے کہیں اور نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے اکثر ہندوستانی اپنے انگریز احباب کو ایک آدھ مرتبہ یہاں کا مزہ ضرور چکھا دیتے ہیں۔ لیکن جو انگریز ایک دفعہ بھی یہاں کا مزہ چکھ لیتا ہے اسے ہندوستانی کھانوں کی ایسی چاٹ لگتی ہے کہ بقول استاد ذوق؎

ع ـــ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی ـــــ اور یہی ہندوستان کی سب سے بڑی جیت ہے۔

آغا محمد اشرف، ایم۔ اے

مچلتی ہوئی آگ

اب مری پیاس کو درکار ہے جلتی ہوئی آگ
ساقیا! لوٹ دے! ساغر میں پگھلتی ہوئی آگ

سوزِ الفت ہے مرے دل سے نکلتی ہوئی آگ
یہ مئے تند ہے ساغر میں ابلتی ہوئی آگ

پردۂ تاک میں پوشیدہ ہے جلتی ہوئی آگ
مئے انگور ہے ساغر میں کہ گلتی ہوئی آگ

تیرے شیشے سے بصد ناز و ادا اے ساقی!
خود مری سمت لپکتی ہے مچلتی ہوئی آگ

ایک عالم نے شفق جس کو سمجھ رکھا ہے
ہے مرے خونِ تمنا کی اچھلتی ہوئی آگ

شر انگیز و شرر خیز و شرر در آغوش
بادۂ ناب ہے یا سانچے میں ڈھلتی ہوئی آگ

اس میں اک تلخیٔ شیریں ہے کہ شیرینیٔ تلخ
بادہ ہے چشمۂ حیواں سے نکلتی ہوئی آگ

اس کی گرمی کا ہے احساس مری رگ رگ میں
خونِ دل ہے کہ مرے جسم سے چلتی ہوئی آگ

الاماں سوزِ دروں! الحذر اے جوشِ جنوں!
نکلی جاتی ہے مرے دل کو مسلتی ہوئی آگ

دل دھڑکتا ہے مرے سینے میں یا اے فرحت
میرے پہلو میں تڑپتی ہے مچلتی ہوئی آگ

فرحت کانپوری

ریڈیائی تمثیلچہ :-

جھگڑا

افراد :- میاں ۔ بیوی ۔ نوکر :

(دروازہ کھڑکھڑانے کی آواز)

بیوی :- (باآوازِ بلند) کریم ۔ کریم ۔ دیکھ تو باہر دروازے پر کون ہے ۔

کریم :- (دُور سے) بہت اچھا بیگم ۔

(کریم جاتا ہے ۔ دروازہ کھولتا ہے)

میاں :- (دُور ۔ باہر دروازے پر) کون ۔ تم ہو کریم بیگم جاگتی ہیں کیا ؟

کریم :- (دُور ۔ باہر دروازے پر) جی حضور ۔ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہیں ۔

(وقفہ)

(میاں داخل ہوتے ہیں)

بیوی :- اچھا تو آپ آ گئے ۔

میاں :- خیال تو ایسا ہی ہے ۔

بیوی :- ابھی تو ساڑھے گیارہ ہی بجے ہیں ۔

میاں :- ساڑھے گیارہ ؟ میرا خیال تھا ———

بیوی :- جی ہاں آپ کے خیال میں تو آدھی رات تک سات ہی بجے رہتے ہیں ———"

میاں :- ذرا دم لے لوں ۔ تو تم سے جھگڑا شروع کر دوں ۔ بس ذرا ایک منٹ ۔

بیوی :- کیوں میں کیا جھگڑتی ہوں ۔

میاں :- تمہارے جھگڑنے کو کون بُرا مانتا ہے ۔ یہ دُنیا ، زندگی ، سب جھگڑا ہی جھگڑا ہے ۔

بیوی :- یعنی میں جھگڑا ہوتی نا ۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے ۔

میاں :- تم کیا ، جینا بذاتِ خود ایک جھگڑا ہے ۔ تم ہی کہو ۔ اگر میاں بیوی جھگڑیں نہیں تو وقت کیسے کٹے ۔

بیوی :- کیوں ، کیا جھگڑنے کے علاوہ اور کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی ۔

میاں :- پیار تو بھی دو ایک دن ہی چلتا ہے نا ۔ پھر جھگڑا ہی جھگڑا ۔ سال ہا سال تک ۔

بیوی :- جی ہاں آپ کو تو جھگڑنے کے سوا اور کوئی دلچسپی نظر ہی نہیں آتی ۔ اپنا اپنا نصیب ہے ۔

میاں :- میں کہتا ہوں ، ذرا سوچو تو ۔ میاں بیوی آپس میں جھگڑیں نہیں تو سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں اور گھر پر قبرستان کی سی رونق چھائی رہے ۔ یعنی دُنیا بھر کے خاوندوں کے لئے گھر بیٹھنا مشکل ہو جائے ، ہے نا ؟

بیوی :- یعنی آپ کے خیال میں محبت کوئی چیز ہی نہیں ۔

میاں :- محبت بھی تو ایک جھگڑا ہے ۔ دلچسپ رنگین سا جھگڑا ۔

بیوی :- اوہ ! میں سمجھی ، یعنی آپ اِدھر اُدھر کی کہہ کر بات ٹال رہے ہیں ۔

میاں :- چلو مان لیا کہ بات ٹالنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ مگر جانتی ہو کہ بات ٹالنے کی کوشش بذات خود اک اَن کہی معذرت ہے ؟

بیوی :- ہو گی ۔ میں اَن کہی باتوں کو کیسے سمجھ سکتی ہوں ۔ اگر میں سمجھ سکتی ۔

میاں :- بھئی ہم میں تو اتنی ہمت نہیں ۔

بیوی :- کیسی ہمت ؟

میاں :- کسی کے دل کا حال جاننے کی ۔

بیوی :- کیوں ؟

میاں :- میرا مطلب ہے .... یعنی .... فرض کرو اللہ میاں مجھ سے کہیں کہ "مسٹر سلیم ہم تم سے بہت خوش ہیں ۔ اور تمہیں یہ قوت بخشتے ہیں کہ آج سے تم لوگوں کے دل کا حال جان سکو گے !" تو میں ہاتھ جوڑ کر عرض کروں کہ اللہ میاں آپ کا دیا بہت ہے ۔ مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ لوگوں کے دل کا حال جان سکوں ۔

بیوی :- مگر کیوں ؟

میاں :- خواہ مخواہ لوگوں کے دل کا حال جان کر اپنی جان کو روگ لگا لینا ۔ دل تو مداری کے تھیلے کی طرح جانے کیسی اُلٹی سیدھی باتوں سے بھرا ہوتا ہے ۔

بیوی :- آپ کے دل میں ایسی ویسی باتیں ہونگی ۔ ہمارا دل تو بالکل صاف ہے ۔

میاں :- (قہقہہ لگا کر) بھئی واہ ۔ یہ بھی خوب رہی ———

بیوی :- (چڑ کر) اب آپ بات بڑھا رہے ہیں یا میں ۔

میاں :- اوہ ۔ یعنی تمہارا مطلب ہے کہ دیر سے آنے کی رسمی طور پر معذرت پیش کروں ۔

بیوی :- میں یہ کب کہتی ہوں کہ ———

میاں :- اچھا تو بیگم صاحبہ ۔ میں آپ کی خدمت میں ———

بیوی ،۔ آپ پھر مذاق کرنے لگے نا۔
میاں ،۔ تم تو میری ہر بات کو مذاق ہی سمجھتی ہو۔
بیوی ،۔ آپ کو مجھے چھیڑنے میں مزا آتا ہے نا۔
میاں ،۔ اچھا تو مذاق برطرف۔ بات یہ تھی کہ مجھے ظہیر نے بلا بھیجا تھا۔ بہت ضروری کام تھا اس لئے دفتر سے اٹھکر سیدھا انکے ہاں چلا گیا۔
بیوی ،۔ بس میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اس ظہیرو کے سوا اور کسی کا کام نہیں۔
میاں ،۔ کیسا کام؟
بیوی ،۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ اس میں ایسا کونسا وصف ہے کہ اسکے بغیر آپ کا دم نکلتا ہے۔
میاں ،۔ کیوں۔ میں تو ــــــ
بیوی ،۔ (اپنی ہی دھن میں) توبہ سانپ کی سی آنکھیں ہیں اسکی۔
میاں ،۔ مگر اس بات کو دوستی سے کیا تعلق۔
بیوی ،۔ دوست بھی تو کسی ڈھب کے ہونے چاہئیں۔ یہ تو نہیں کہ جسکے سر پہ ٹوپی رکھی جا سکے اسی کو دوست بنالیا .... اتنی غنڈی آنکھ ہے اس کی کہ توبہ۔
میاں ،۔ (توقف) اصل میں تمہارا قصور نہیں۔ ہر عورت مرد کو پرکھنے کیلئے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتی ہے مگر ــــــ
بیوی ،۔ آنکھوں ہی سے تو کسی کی شرافت کا پتہ چلتا ہے .... سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے مردوں کو گھر میں آنے کی اجازت ہی نہیں دینی چاہیئے۔
میاں ،۔ کیوں؟
بیوی ،۔ جب وہ یہاں آکر کریم سے کہتا ہے "بہن جی کو میرا سلام کہدو" تو مجھے بیحد بُرا لگتا ہے۔
میاں ،۔ کیوں، بہن جی کہنا بُری بات ہے کیا؟
بیوی ،۔ مجھے بہن کہنے والا وُہ ہے کون۔ خدا جانے چمار ہے یا کیا۔ خواہ مخواہ آکر رشتہ جتاتا۔ مجھے تو بُرا لگتا ہے۔
میاں ،۔ میں پوچھتا ہوں تمہیں میرے دوستوں سے اسقدر چڑ کیوں ہے۔
بیوی ،۔ مجھے آپ کے دوستوں سے چڑ کیوں ہو۔ ملک صاحب بھی تو آپ ہی کے دوست ہیں۔ اور وہ بھاٹیہ صاحب جی، میں کیا ان سے چڑتی ہوں البتہ مجھے یہ ظہیرو بالکل پسند نہیں۔
میاں ،۔ کیوں بھول گئیں کیا۔ میں ملک صاحب کے ہاں جایا کرتا تھا تو بھی تم بگڑ جایا کرتی تھیں۔
بیوی ،۔ وہ کب۔ میں تو ہمیشہ سے اُن کی عزت کرتی ہوں۔ اور وہ ہیں بھی قابل عزت۔ سچی کہوں گی چاہے آپ برا ہی کیوں نہ مانیں۔ ملک صاحب اس ظہیرو کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تو نہیں دیکھتے۔
میاں ،۔ یعنی اس کا یہ مطلب ہوا کہ یا تو تم ظہیر سے ڈرتی ہو اور یا اپنے آپ سے۔
بیوی ،۔ کیوں میں اُس سے کیوں ڈرنے لگی میں اسے سمجھتی ہی کیا ہوں۔
میاں ،۔ اگر یہی بات ہے تو اُس کی آنکھوں کے متعلق اتنے لمبے چوڑے لکچر کا فائدہ۔
بیوی ،۔ بس آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی طرح اُس سے ہنسوں کھیلوں اور قطعی پردہ نہ کروں۔ میں یہ سب سمجھتی ہوں۔
میاں ،۔ مگر میں یہ کب کہتا ہوں۔
بیوی ،۔ مُنہ سے نہیں کہتے نا۔ میں کوئی بچہ نہیں۔ سب سمجھتی ہوں۔ مجھ سے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ اُس لفنگے کا اعتبار ہی کیا ہے۔
میاں ،۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔
بیوی ،۔ سچ جو کہہ رہی ہوں۔ سچی بات کڑوی لگتی ہے نا۔ آپ بیشک پہروں اسکے پاس بیٹھے رہیں۔ مجھ سے تو یہ نہ ہو سکے گا۔
میاں ،۔ خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہو نا۔ میں کیا پہروں اُس کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔
بیوی ،۔ اور نہیں کیا۔ چار بجے سے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک حساب تو کیجئے ذرا۔
میاں ،۔ افوہ! کیا حماقت ہے۔ تم بات تو کر لیا کرو پہلے۔
بیوی ،۔ روز ہی سنتی ہوں۔ میں کیا جانتی نہیں کہ آپ کس طرح باتوں میں بہلانا جانتے ہیں۔ باتیں ہی باتیں تو ہیں۔ اور ہے ہی کیا۔
میاں ،۔ لاحول ولا قوۃ میں تو تمہیں بتا رہا تھا کہ ظہیر کی والدہ آئی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مجھے بلا بھیجا تھا۔ ظہیر کی شادی کے متعلق مجھ سے مشورہ کرنا تھا۔
بیوی ،۔ کیوں آپ کیا دفتر شادی کے ایجنٹ ہیں جو آپکو بلا بھیجا۔
میاں ،۔ بھئی تم بھی حد ہو۔ بس تھوڑی سی بات سنی اور لے اڑیں۔
بیوی ،۔ سچی بات کڑوی لگتی ہے نا۔
میاں ،۔ سنو بھی تو .... انہیں ظہیر کے متعلق کئی پیغام آئے ہیں۔
بیوی ،۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ کون ہوگا جو آنکھیں بند کرکے اپنی بیٹی کو بھاڑ میں جھونک دیگا۔
میاں ،۔ یہ تو زبردستی کی لڑائی ہوئی نا .... تم بات تو سنتی نہیں۔
بیوی ،۔ اچھا تو میں نہیں بولتی اب آپ اپنی بات کر لیجئے۔
میاں ،۔ (رازدارانہ) میرا مطلب ہے، یہ ڈپٹی نذیر احمد ہیں نا۔ انکی طرف سے پیغام بھجوانے کیلئے اشارہ کیا گیا ہے۔

بیوی:۔ کون یہ اپنے ڈپٹی صاحب۔

میاں:۔ ہاں ہاں، وہی۔

بیوی:۔ آپ کا مطلب ہے کہ آسیہ کے رشتے کیلئے۔

میاں:۔ یہی تو کہہ رہا ہوں۔

بیوی:۔ میں کل ہی جاؤں گی نا۔ اور اُس کا سارا کچا چٹھا سُنا دوں گی، دیکھوں گی پھر ـــــ،

میاں:۔ تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسکی والدہ سے کہہ دیا ہے کہ وہ یہ کام نہ کریں۔

بیوی:۔ اوہ۔ اتنا گھمنڈ ہے۔ دیکھیں گے اُسے کون سی حور پری ملتی ہے۔

میاں:۔ یعنی تم اُسے کنوارا رکھنے پر اتنی مصر کیوں ہو؟

بیوی:۔ میری جوتی سے۔ آخر لوگ اندھے ہو کر اپنی بیٹیاں نہیں دیدیتے، جانے کتنی بیویاں کریگا وہ۔ ایسی غنڈی آنکھ والے کا کیا اعتبار۔

میاں:۔ مگر اُس کی شادی کا تو فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔ خان صاحب رفیق حسین کی بیٹی سے۔ سُنا ہے لڑکی بہت خوبصورت اور سلیقے والی ہے۔ گھر کا کام کرنے کو عار نہیں سمجھتی۔

بیوی:۔ مجھے کیا، ہوگی کوئی چڑیل۔

میاں:۔ یعنی تمہارا بس چلے تو اُسکی شادی ہی نہ ہونے دو۔

بیوی:۔ کیوں۔ میں کیا لوگوں کے رشتے تڑواتی پھرتی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں اللہ اُسے ایسی بیوی دے کہ میاں چار دن میں سیدھے ہو جائیں۔ سارا غنڈہ پن نکل جائے۔

میاں:۔ واہ یہ بھی خوب رہی میں یہ پوچھتا ہوں کیا اللہ میاں آنکھیں دیتے وقت بندے کی مرضی پوچھتے ہیں کہ میاں تمہیں کس فیشن کی آنکھیں چاہئیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ بیویاں غنڈی آنکھیں پسند کرتی ہیں۔ تم نے عورتوں کو گاتے ہوئے نہیں سُنا۔

بیوی:۔ کیا؟

میاں:۔ خدا جانے وہ کیا گیت ہے۔ پنجابی گیت ہے وہ .... ہاں۔

امبر سر دا منڈا ہووے   اکھیاں تو گُنڈا ہووے

بیوی:۔ اُف، کیسا بازاری گیت ہے۔

میاں:۔ بازاری ہی سہی۔ بہرصورت حقیقت تو ہے۔ یعنی۔ بازاری گیت ایک جاٹ کی طرح مُنہ پھٹ ہوتا ہے اور مہذب گیت میں مخملی الفاظ نیا لبسی ہوتی ہے۔

بیوی:۔ میں کیا جانوں۔

میاں:۔ تم ہی تو بار بار کہہ رہی ہو (نقل اُتارتے ہوئے) اُس کی آنکھیں غنڈی ہیں۔ دیکھوں گی اُسے کون رشتہ دیگا۔

بیوی:۔ اب آپ ہی اس کا ذکر چھیڑ رہے ہیں نا۔ میں تو اُس کا نام سننے کی بھی روادار نہیں۔ لیکن آپ کو اس کے سوا کچھ سوجھتا بھی ہو۔ پیارا دوست جو ہوا۔

میاں:۔ تم تو اُس سے یوں چڑتی ہو جیسے وہ تمہاری سوکن ہو۔

بیوی:۔ (آبدیدہ آواز) آپ ہمیشہ یونہی میری بےعزتی کرتے ہیں۔ میں کب چڑتی ہوں۔ آپ ہی اپنے دوستوں کی بات سُنکر جل جاتے ہیں۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ مجھ سے اکتا گئے ہیں۔ آخر بُری صحبت کا بُرا نتیجہ ہی ہونا تھا.... میرا کیا ہے میں آج میکے چلی جاؤں گی۔ پھر جی بھر کے اُس کے ساتھ رنگ رلیاں منانا۔

میاں:۔ اُف! تم تو خواہ مخواہ بگڑتی ہو۔

بیوی:۔ میں کہاں بگڑتی ہوں۔ آپ کے اپنے تیوری چڑھے ہوئے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں ہوں۔ جب بھی آپ اُس کالے مُنہ والے کے پاس سے ہو کر آتے ہیں تو آپ بات بات پر بگڑتے ہیں۔ میری ہر بات آپ کو الٹی سنائی دیتی ہے۔

میاں:۔ (نرمی سے) اوہ۔ تم تو بالکل ہی خفا ہو گئیں۔ میں تو سمجھ رہا تھا ـــ

بیوی:۔ جی ہاں آپ تو یہ سمجھتے ہیں کہ تفریحاً بہروپ بدلتی ہوں... کسی کے دل کا حال کون جانے۔

میاں:۔ اچھا ناراض۔ چلو اب اس بات کو ہی جانے دو۔

بیوی:۔ کیوں میں کب بات ـــــ

میاں:۔ اوہ۔ پھر وہی بات۔ ایمان سے تم جتنی پیاری ہو اتنی ہی ضدی ہو۔

بیوی:۔ ضد تو آپ ہی ـــــ

میاں:۔ چلو چھوڑو بھی اب۔ (وقفہ) اچھا یہ تو بتاؤ۔ کیا کر رہی تھیں تم۔

بیوی:۔ کچھ بھی نہیں ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

میاں:۔ جھوٹ۔

بیوی:۔ کیوں؟

میاں:۔ وہ دیکھو میز پر پڑی ہوئی کتاب جھٹلا رہی ہے تمہیں، دیکھا۔

بیوی:۔ ویسے ہی دیکھنے بیٹھی تھی۔

میاں:۔ دیکھوں تو کیسی کتاب ہے۔

(اُٹھ کر کتاب لاتا ہے۔)

بیوی:۔ افسانے ہیں۔

میاں:۔ یہ تو عجیب سا عنوان ہے۔ (پڑھتا ہے) ظاہرہ ـــ ظاہرہ عجیب سا نام ہے۔

بیوی:۔ طاہرہ تو ہی۔ آپ تو زبردستی اُسے ظاہرہ پڑھ رہے ہیں۔
میاں:۔ یہ دیکھو نقطہ۔ ہے نا۔ افوہ، میں سمجھا۔ یہ تو پنسل سے بنایا گیا ہے۔ تم نے بنایا ہے؟
بیوی:۔ نہیں تو۔
میاں:۔ یہ دیکھ لو۔ اور کتاب میں پنسل بھی رکھی ہے۔
بیوی:۔ میرے ہاتھ میں پنسل تو تھی۔ شاید بے خبری میں لگ گیا ہو۔
میاں:۔ بے خبری میں؟ طاہرہ۔ ظاہرہ (سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ کہتا ہے) (وقفہ) ۔ میں کہتا ہوں یہ طاہرہ کیا ہے۔
بیوی:۔ نام ہے اور کیا۔ خدا جانے کیا کہانی ہے۔ میں نے تو اچھی طرح سے پڑھا بھی نہیں۔ ترکی رواج کے مطابق طاہر کی بیوی کا نام طاہرہ ہوا یعنی خاوند کے نام کے پیچھے ہ بڑھا دی تو بیوی کا نام ہوگیا۔
میاں:۔ اوہ، یہ بات ہے۔ یعنی اس رواج کے مطابق چونکہ میرا نام سلیم ہے، تمہارا نام سلیمہ ہونا چاہیئے، ہے نا۔
بیوی:۔ سلیمہ۔ کیسا بھدا نام ہے، گنواروں کا سا۔
میاں:۔ کیوں تمہیں نہیں پسند۔
بیوی:۔ اونہوں!
میاں:۔ اچھا تو ہم اس رواج کو اُلٹ دیتے ہیں۔ یعنی تمہارا نام زائرہ ہے، اس لئے میرا نام زائر (رُک جاتا ہے) .... اوہ۔ میرا مطلب۔ یعنی۔ یعنی کہ.... ہاں۔ یعنی تم نے طائرہ پر نقطہ لگا کر اپنا نام بنا لیا ہے۔ زائرہ اور ظاہرہ کوئی خاص فرق تو نہیں۔
بیوی:۔ میں نے کوئی جان کر نقطہ لگایا ہے۔ توبہ آپ تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔
میاں:۔ اوہ۔ سمجھتی نہیں! میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔
بیوی:۔ آپکے مذاق کی بھی دھار ہوتی ہے۔
میاں:۔ (ہنستے ہوئے) یعنی اگر "ط" پر نقطہ لگا دیا جائے تو "ظ" دھار بن جاتا ہے۔
بیوی:۔ دیکھا نا۔ اب آپ ہی بات بڑھا رہے ہیں۔
میاں:۔ اچھا بابا۔ بھول ہوئی۔ چھوڑو اب۔ (وقفہ)
میاں:۔ میں کہتا ہوں زارہ۔ میرا کوئی خط تو نہیں آیا۔
بیوی:۔ نہیں! (وقفہ)
میاں:۔ ہاں تو اُس کپڑے کے متعلق تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔
بیوی:۔ مجھے کوئی کپڑا وپڑا نہیں چاہیئے۔
میاں:۔ یعنی بالکل ہی ناراض ہوگئی ہو۔
بیوی:۔ مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت۔ (وقفہ)
میاں:۔ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ ہیں؟
بیوی:۔ میں کیوں بُرا ماننے لگی۔
میاں:۔ میرا مطلب ہے کیا تم نے غصہ میں کبھی آئینہ دیکھا ہے۔ ایمان سے حد ہو جاتی ہے۔ ایک تو تم اور پھر غصے کی ہلکی ہلکی لالی۔
بیوی:۔ مجھے کیا معلوم۔
میاں:۔ جبھی تو بتا رہا ہوں تمہیں۔
بیوی:۔ نہ میں نہیں سنتی۔
میاں:۔ سنتی بھی نہیں۔ افوہ۔ بڑی مصیبت ہوئی۔
بیوی:۔ آپ کو کیسی باتیں بنانی آتی ہیں۔ پہلے تو چھیڑ دیا پھر بہلانے لگے۔
میاں:۔ اصل میں تمہارا قصور نہیں۔ ہر حسین عورت غصیل ہوتی ہے۔

(وقفہ)

میاں:۔ ہاں۔ میں کہتا ہوں۔ کوئی مجھ سے ملنے تو نہیں آیا تھا۔
بیوی:۔ وہ لڑکا آیا تھا۔۔۔ نذیر۔
میاں:۔ نظیر۔ کون نظیر؟
بیوی:۔ توبہ۔ آپکے تو کان بجتے ہیں۔ میں تو کہہ رہی ہوں کہ چچی عطیہ کا بیٹا نذر آیا تھا۔
میاں:۔ تم نے تو نذیر کہا تھا۔
بیوی:۔ توبہ توبہ۔ آپ تو بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں۔ صاف تو کہا تھا کہ نذر آیا تھا۔ (آبدیدہ آواز میں) میں کیا آپ کے دل کی باتیں سمجھتی نہیں۔ آپ کے کانوں میں تو ہر گھڑی اُسی مردود کا نام گونجتا رہتا ہے۔ صاف ہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ اُسے میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ یونہی الزام لگاتے ہیں تو میں ہزار بار کہوں گی۔ ظہیر۔ ظہیر۔ ظہیر۔ ظہیر۔ خدا غارت کرے اُسے۔ سارا اُسی کا جھگڑا ہے۔ (روتی ہے)
میاں:۔ زارہ۔ خدا کے لئے اب رونا تو بند کرو۔ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا... اُف کیا مصیبت ہے۔
بیوی:۔ سُن لے کوئی۔ میرا کیا جاتا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ساری دُنیا کو معلوم ہو جائے کہ کس بات پر آپ نے میری زندگی حرام ـــــ ـــــ، (روتی ہے۔)
میاں:۔ میں کہتا ہوں۔ خدا کیلئے ـــــ،
بیوی:۔ میں کل ہی میکے چلی جاؤنگی۔ میرا یہاں رکھا ہی کیا ہے۔
میاں:۔ اُف۔ کیا قیامت ہے۔
(رونے کی آواز مدھم پڑ جاتی ہے) (وقفہ)

میاں:۔ خدا کے لئے بات تو سُنو تم۔ واقعی غلطی ہوگئی مجھ سے۔ اب جانے دو بابا۔
بیوی:۔ نہیں، آپ روز ہی کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا کر دیتے ہیں۔
میاں:۔ اچھا، آج سے میں کوئی بات نہیں کرونگا۔ ہیں۔
بیوی:۔ کیوں میں کیا یہ چاہتی ہوں کہ آپ گونگے بنکر بیٹھ رہیں۔
میاں:۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسی بات نہ کرونگا جو تمہیں ناگوار ہو۔
بیوی:۔ میرا تو اب لڑنے سے جی گھبراتا ہے۔
میاں:۔ میں بھی تو جھگڑے وگڑے کے خلاف ہوں۔
بیوی:۔ پہلے آپ ہی تو جھگڑا چھیڑ لیتے ہیں۔
میاں:۔ تمہاری قسم میں تو یہ نہیں چاہتا کہ تم کو ناراض کروں اور جھگڑا پیدا کروں۔
بیوی:۔ لو۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ یہ سب جھگڑا ہی جھگڑا ہے ــــ؟
میاں:۔ میرا مطلب تھا کہ دل میں کئی ایک غبار ہوتے ہیں۔ جن کا ہمیں خود علم نہیں ہوتا۔
بیوی:۔ شاید آپ کے دل میں ایسے ویسے غبار ہوں، ہمارے دل میں تو اُجالا ہی اُجالا ہے۔
میاں:۔ ہاں ہاں تمہارے دل میں تو ضمیر کا اُجالا ہے۔
بیوی:۔ کیا کہا ظہیر کا اُجالا۔ دیکھا نا آپ پھر ــــ
میاں:۔ نہیں نہیں۔ میں تو کہہ رہا ہوں، ضمیر کا اُجالا۔
بیوی:۔ توبہ توبہ۔ میرے دل میں ظہیر کا اُجالا کیوں ہو۔ کالے مُنہ والا مردود۔
میاں:۔ جانے دو، اُس کا ذکر ہی چھوڑو۔
بیوی:۔ میں تو اُس کا نام سُننے کی بھی روادار نہیں۔

ممتاز مفتی

ــــ کے خط کے جواب میں

نامۂ شوق ترا آج مجھے آن ملا
جان پہچان کے انداز میں انجان ملا
محوِ حیرت ہوں کہ کس طرح لکھوں اس کا جواب
دستِ زاہد کو سکھاؤں میں وہ طلبِ شراب؟
خیر، رسماً یہ مجھے فرض ادا کرنا ہے
تیرے احسان کا کچھ قرض ادا کرنا ہے

تیری تحریر کی شوخی نہ گئی آج تلک
شیشۂ حال میں ماضی کی نظر آئی جھلک
تم مجھے یاد دلاتی ہو وہ برسات کی رات؟
پیرِ میخانہ کو بھولے گی خرابات کی رات؟
کیا کہا "بربطِ الفت کا ترانہ" تم تھیں؟
ہاں، مرے رازِ محبت کا فسانہ تم تھیں!

وقت نے تیرے خیالات بدل رکھے ہیں
اور جذبات محبت کے مسل رکھے ہیں
پڑ چکی ہے مرے جذبات پہ بھی اوس مگر
اپنی حالت کے تغیر پہ ہے افسوس مگر
مُنہدم ماضی پہ اُٹھتی نہیں تعمیر کوئی
عشق وہ خواب ہے جسکی نہیں تعبیر کوئی

بھول جا شاہدِ معصوم مجھے یاد نہ کر
بخدا لطف سے للہ مجھے برباد نہ کر
اُسکی خاطر تری تحریر میں کیا رکھا ہے؟
جسکو قسمت کے نوشتہ نے مٹا رکھا ہے!

منظور احسن۔ بی اے (آنرز)

تاریخ کا ایک صفحہ

دنیا میں آغازِ جنگ کے ساتھ ہی، کمزوروں نے اپنے بچاؤ اور طاقتوروں نے انہیں زچ کرنے کی تدبیریں نکال لی تھیں. محاصرہ اور محصورانہ مدافعت کرنے لگے تھے. انسان نے جب پہلے پہل بادیہ نشینی کی زندگی سے ترقی کر کے شہری زندگی شروع کی ہوگی تو درختوں، غاروں میں چھپتے چھپتے، مختلف قوموں، نسلوں، جماعتوں اور خاندانوں کی باہمی جنگ جوئی نے طاقتور کو محاصرہ کی ترغیب دی ہوگی، اور مغلوب ضعیف محصور ہو جانے پر مجبور رہا ہوگا کیونکہ خانہ بدوش بستیاں بنا کر رہنے لگے تھے۔

تاریخ میں شہر آباد ہونے کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں اور طاقت نے ضعف پر چھاپہ مارا، وہ قدیم ترین محاصرہ "ازوت" تھا. جو سمیتک اعظم کی زیرِ قیادت کیا گیا یہ محاصرہ ۲۹ برس تک جاری رہا مگر اس کے حالات ایسی تاریکی میں ہیں کہ تفصیل معلوم نہیں. اس کے بعد سب سے زیادہ دنیا کا قدیم محاصرہ طروئ (Troja) ہے، جس کا افسانہ یونان کے مشہور سحر طراز اور ابوالشعر ہومر (Homer) نے الیڈ (Illyad) میں نظم کیا تھا. اگرچہ شاعرانہ افسانہ طرازی اور یونانی علم الاصنام کے خرافات کی آمیزش سے اس کے اصلی واقعات معلوم کرنے دشوار ہیں، تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ زمانۂ قدیم کی ایک بہت بڑی انسانی خونریزی اور تاریخ حرب کا ایک عظیم الشان محاصرہ تھا. محاصرہ طروئ دس برس تک جاری رہا اور اس کی نسبت جنگ و مقاتلات کے عجیب و غریب واقعات ہومر بیان کرتا ہے۔

اس ہولناک نیم افسانوی محاصرہ کے بعد قرونِ اولیٰ کے محاصروں کی تاریخ ایک حد تک تاریخی روشنی میں آجاتی ہے. اور دنیا کے دو مشہور قدیم ترین محاصرے ہمارے سامنے آتے ہیں. ایک یروشلم بیت المقدس کا اور دوسرا قرطاجنہ (کارتھیج) کا. اِن میں سے یروشلم کے محاصرے کی مختصر داستان سنیئے۔

۷۰ عیسوی کا آغاز تھا کہ روم سے جنگ آزماؤں اور حملہ آوروں کا ایک سیلابِ عظیم شام کی طرف اُمڈا. اور شہنشاہ طیطس (Titus) نے بنی اسرائیل کی ہزارہا سالہ عظمت و جبروت کے مسکن. حضرت داؤد کے عظیم الشان ہیکل اور تخت گاہ سلیمان پر فوج کشی کی تھی. اسرائیل کے گھرانے کی یہ وہ آخری بربادی تھی، جس کی یسعیاہ نبی نے خبر دی تھی اور نسلِ اسحٰق کی بداعمالیوں کی وہ سب سے آخری سزا تھی جس پر حزقیل نبی نے ماتم کیا تھا.

خداوند خدا نے کہا تھا کہ "اے اسرائیل کی بدکار عورت! تو نے مجھے چھوڑا! بس میں غیر قوموں کو بھیجونگا جو تیری عظمت و ناموس کو ناپاک کریں گے"۔

چنانچہ یہی رومی فوج کشی وہ آخری عذابِ الٰہی تھا، جس کے بعد جلالِ خداوندی نے ہمیشہ کیلئے اولادِ اسرائیل سے اپنا رشتہ توڑ دیا اور سعید کی روشنی نے فاران کی چوٹیوں کو اپنا مطلع اور مبداء بنالیا۔

رومی فوج نے شہر کے قریب پہنچکر اپنا قاصد بھیجا اور باشندگانِ شہر سے کہا کہ شہر حوالے کر دیں. مگر وہ بیت المقدس کے مستحکم حصار اور آہنی عمارات جنگ کی مضبوطی پر مطمئن تھے. انہوں نے تسلیم شہر سے انکار کر دیا۔ اب رومیوں کیلئے محاصرہ ناگزیر تھا. تیس ہزار آہن پوش فوج نے چاروں طرف سے شہر کو گھیر لیا۔

بیت المقدس اس وقت نہایت محفوظ اور ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا. یکے بعد دیگرے تین انتہائی مستحکم شہر پناہیں تھیں اور اُنکے باہمی فاصلے مدافعت کے آلات و اسبابِ جنگ سے آراستہ، بڑی بڑی فولادی عمارتیں درمیان میں استادہ، طیطس نے اپنے لشکر کے چار حصے کر دیے، تین حصے شمالی جانب پر مامور کئے جو بیرونی شہر پناہ سے ایک میل کے فاصلے پر جم گئے. باقی ایک حصہ مشرق کی طرف معین کیا جو مشہور مسیحی مقدس پہاڑ کوہ زیتون کے حوالی میں تھا۔

رومی حملہ آوروں کے ساتھ اس زمانے کے ترقی یافتہ آلاتِ جنگ بے شمار تھے. علی الخصوص طویل طویل وزنی گرز. سنگ بار منجنیقیں. آتش فشاں پہیے دار منارے اور قدیم زمانے کا وہ عجیب و غریب آلۂ جنگ جس کے لئے عربی میں کبش کا لفظ استعمال ہوتا تھا. گرز ایرانی قوموں کے سب سے بڑے آلاتِ جنگ میں شمار ہوتے تھے. جس کو رستم و سہراب کے کندھوں پر شاہنامہ میں ہم نے ہمیشہ دیکھا ہے، لیکن رومیوں کا گرز ایک خاص طرح کا ہوتا تھا جسے وہ محاصرے کے موقع پر کام میں لایا کرتے تھے. یہ معمولی گرز سے بہت زیادہ لمبا اور اسکی ضرب کا لٹو بدرجہا وزنی بنایا جاتا تھا. اس سے عموماً شہر پناہ کی دیواریں اور قلعہ کے دروازے توڑے جاتے تھے. منجنیق ایک کثیر الاستعمال

مشین تھی جس کے ذریعے بڑے بڑے گولے جب اُس سے نکل کر اُڑتے تھے تو اُن کی ضرب قلعہ کے در و دیوار پر بہت سنگین پڑتی تھی۔ ہندوستان کے بعض قدیم قلعوں میں بھی اس طرح کے گولے ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی کبھی ان کا استعمال ہوتا تھا۔ مگر کوئی منجنیق دیکھنے میں نہیں آئی۔

آتش فشاں منارے لکڑی کے بنائے جاتے تھے، پہیے دار تاکہ گاڑی کی طرح نقل و حرکت ممکن ہو، ان کی کئی کئی منزلیں ہوتی تھیں۔ کسی میں سپاہی بیٹھتے تو کسی میں سامانِ حرب رہتا۔ اِن میں بیٹھ کر حملہ آور محصورین کی طرف تیزی سے بڑھتے اور برجوں سے آتشیں روغن وغیرہ شہر کی دیواروں اور عمارتوں پر پھینکتے۔

"کبش" اس دَور کا بہترین ہتھیار تھا۔ اس کی وضع بھی ایک بڑی بھاری جنگی گاڑی کی سی ہوتی تھی۔ کچھ آدمی اُسے کھینچتے اور کچھ اس کی حفاظت کرتے۔ یہ گاڑی شہر پناہ سے بھڑا دی جاتی اور اس کے اندر بیٹھے ہوئے سپاہی محصورین کی تیراندازی سے محفوظ رہ کر دیواروں میں نقب لگا دیتے۔ عربوں نے اس کا نام "کبش" اسلئے رکھا کہ اسکے سامنے کے رُخ پر مینڈھے کا مصنوعی سر بنا کر لگا دیا جاتا تھا۔

محاصرے کا آغاز ہوا تو شہر کی بیرونی فصیل اور رومی لشکر کے شمالی حصّے کے مابین جو آباد قطعے تھے اُن کے تمام درخت اکھڑوا ڈالے گئے تاکہ فوجی نقل و حرکت میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اطراف شہر کی سرسبزی کا اس وقت یہ حال تھا کہ یہ سارے قطعات طرح طرح کے شاداب درختوں کی کثرت سے ایک جنّتِ ارضی کا منظر معلوم ہوتے تھے۔ اور اس افراط کے ساتھ تھے کہ صرف ان کی جڑوں کے کھودنے اور اکھاڑنے میں رومی فوج نے کامل چار دن صرف کئے۔ یہ شام کی سرزمین تھی جس کی نسبت قرآن کریم نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے "بارکنا حولہٗ" یعنی ہم نے بیت المقدس کے اطراف کو اپنی برکات سے مالا مال کر دیا تھا۔

اس کے بعد فوج شمال کی جانب بڑھی اور ایک ایسے مقام پر خیمہ زن ہو گئی جہاں سے بیرونی حصار کا ایک گوشہ نظر آتا تھا۔ یہاں محاصرین نے چار برج تعمیر کئے اور اُن میں بیٹھ کر بیت المقدس پر سنگی گولے برسانے شروع کر دیئے۔ یہ وہی بیت المقدس تھا جسے خدائے ذوالجلال نے اپنی رحمت و برکت کا نشیمن بنایا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے سے جو الٰہی وعدے ہوئے تھے، انکے ایفا کا پہلا گھر اسی میں تھا۔ بنی اسرائیل کی عظمت و جبروت کے سیلاب اس کی شہر پناہ سے نکلتے تھے اور دُنیا کی بڑی بڑی عظیم الشان سرزمینوں کو مع اُن کے بسنے والوں کے بہا لے جاتے تھے۔ مگر انہوں نے اس پیمان و عہد کو توڑ دیا جو مصر کی غلامی سے نجات پانے کے بعد خداوند خدائے قدوس سے سینا کے پہاڑ پر باندھا تھا۔ جب وہ قسم قسم کی بداعمالیوں اور فسق و فساد میں مبتلا ہو گئے تو رحمت الٰہی ان سے روٹھ گئی اور اُس نے اپنی رحمت و برکت کی جگہ اپنے قہر و غضب کو بھیجدیا۔

خدا کا اس دُنیا میں سب سے بڑا قہر یہ ہے کہ وہ کسی قوم سے حکومت اور فرماں روائی کی عزت چھین لے اور غیر قوموں کی غلامی و محکومی کی زنجیریں اُس کے پاؤں میں ڈال دے۔ پس یہودیوں کیلئے بھی اب اس سزا کے سوا کچھ نہ تھا۔ بخت نصر کی فوج کشی اور بابل کی قید کے بعد عزیز کی آہ و زاری نے ان کی سزا کی مُہلت بڑھا دی تھی۔ لیکن انہوں نے اس فرصت سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ اس لئے ضرور تھا کہ آخری غضب الٰہی کسی جابر قوم کے استیلا و تسلط کی صورت میں ظاہر ہو۔ اور وہ جب کسی قوم سے روٹھتا ہے تو اس کی عادت ہے کہ اپنی کسی جابر مخلوق کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ پھر وہ اس کے تختِ حکومت کو اُلٹ دیتی ہے۔ غلامی اور محکومی کے طوق گلوں میں ڈال کر خاکِ مذلت پر لٹاتی ہے۔ عزتِ ملی اور شرفِ قومی کی رُوح ان کے اندر سے کھینچ لیتی ہے۔

رومیوں کا یہ حملہ یہودیوں کے لئے اسی سلسلہ غضب الٰہی کی آخری سزا تھی جس کے بعد بنی اسرائیل کی عظمت کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل ہو گیا۔ بخت نصر اور بابلیوں کا ورود پہلا عذاب تھا اور یہ آخری، انہی دو عذابوں کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے:-

"اور ہم نے بنی اسرائیل سے ان کی کتاب تورات میں صاف صاف کہدیا تھا کہ تم ضرور زمین پر دو مرتبہ فساد میں مبتلا ہو گے اور اپنی بداعمالیوں میں مغرور ہو کے نہایت سخت زیادتیاں کرو گے۔ تو اے بنی اسرائیل کے لوگو! جب تم میں ظہور فساد و عدوان کا پہلا وقت آیا تو ہم نے تمہارے مقابلے میں بابل کے ان لوگوں کو بھیجدیا، جو نہایت جابر اور سخت گیر تھے۔ وہ تمہاری بستیوں کے اندر پھیل گئے۔ (اور وہ سب کچھ کیا جو اُن کو کرنا تھا) اور اللہ کے وعدے کو پورا ہونا تھا اور وہ ہو کر رہا"

یہ قوموں کے اعمال کے قدرتی نتائج ہیں جس بیت المقدس پر ملائکہ الٰہی رحمت و برکت کے پھول چڑھاتے تھے، سب نے دیکھ لیا کہ حملہ آوروں کے برجوں سے اس پر پتھر کے گولوں کی بارش ہو رہی تھی!! عروج و زوالِ اُمم کا الٰہی قانون یہی ہے اے کاش آج وہ اسلام کے پیرو، جن کو خدا نے بنی اسرائیل کی امامت و عظمت و جبروت

کا جانشین بنایا تھا اور جو اس خلافت ارضی کے وارث قرار دئے گئے تھے۔ جس کی اہلیت داؤد اور سلیمان علیہم السلام کی نسل میں باقی نہیں رہی تھی تاریخ کے ان نتائج قریبہ سے عبرت پکڑیں اور آنے والے وقت سے ڈریں۔ "اسی طرح اللہ گذشتہ قوموں اور ملکوں کی مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ غافل قومیں عبرت حاصل کریں"

یہودیوں کی حالت اس وقت نہایت افسوسناک تھی۔ بابل کی قید اور عرصے کی غلامی نے پھر اسی سیرۃ اولیٰ پر پہونچا دیا تھا، جس سے دریائے نیل کے کنارے حضرت موسیٰ نے انہیں نجات دلائی تھی۔ تاہم انہوں نے پھر ایک دفعہ جھرجھری لی اور اس موقع پر اپنے تمام قویٰ کو جمع کیا اور پوری جانبازی کے ساتھ مدافعت کا سامان کرنے لگے۔ لیکن مشکل اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ رومیوں کے سے آلات جنگ در اسلحہ ہلاکت اُن کے پاس کہاں تھے۔ دشمنوں کے سنگبار برجوں، عظیم الشان کبشوں اور آتشیں روغن کی بارش کا کیا حالی ہاتھ پاؤں سے جواب دیتے۔ پھر ممکن تھا کہ وہ طاقت کا ہمت اور ساز و سامان کا بے سروسامانی ہی سے مقابلہ کرتے۔ مگر قدرتِ الٰہی کے بھیجے ہوئے عذاب یا اپنے اعمالِ بد کے قدرتی نتائج کا کیا علاج تھا؟

"پس عذابِ الٰہی نے انہیں جا پکڑا اور وہ اپنے ظلموں کی وجہ سے اسی کے مستحق تھے"

نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ عرصے کے بعد بیرونِ شہر کی سرحد محاصرین نے فتح کر لی۔ اور اب رومیوں نے زیادہ شدت اور مستعدی سے قدم آگے بڑھانے۔ کوہِ زیتوں کی مشرقی فوج نے اپنی منجنیقوں کا رُخ مقدس ہیکل کی جانب کر دیا۔ ساتھ ہی مشتعل روغن نفت کی بارش بھی شروع کر دی۔ یہ ایک معدنی نہایت سریع الاحتراق تیل تھا جس جگہ پڑتا شعلے بھڑکنے لگتے۔ قدیم زمانے کی اکثر متمدن قومیں اسے استعمال کرتی رہی ہیں۔ روغن نفت کی بارش نے یہودیوں پر سچ مچ جہنم کا دروازہ کھولدیا وہ نہایت مضطرب ہوئے۔ ادھر سنگباری اُدھر آتش فشانی، ہیکل کی دیواریں لرزنے لگیں۔

پچھلی لڑائیوں میں چند ٹوٹی پھوٹی منجنیقیں انہیں مل گئی تھیں، وہ نکالی گئیں اور محصورین کی طرف سے بھی لوگوں کے جواب میں پتھر پھینکے جانے لگے۔ لیکن لٹتے ہوتے خدائی قہر کو کون ٹال سکتا ہے، ابھی اس انتظام کو زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ خبر ملی، یعنی لوگوں نے دیکھا کہ شمالی شہر پناہ کے اندر جا بجا رخنے اور شگاف پڑ گئے ہیں۔ اور اس مصیبتناک اطلاع نے پھیلتے ہی محصورین کی

چھکے چھڑا دئے۔ دل بیٹھ گئے۔ ہمتوں نے جواب دیدیا۔ بالآخر مایوس ہو کر اس طرح شہر کی پہلی فصیل پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا۔

پھر دوسری شہر پناہ کی تسخیر کا سامان ہونے لگا۔ محاصرہ کیلئے برجوں کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور اس عرصے میں رومیوں نے بار ہا محصورین سے تسلیم شہر کی درخواست کی۔ طرح طرح کے پیام بھیجے۔ بہت سمجھایا کہ کسی صورت سے خوں ریزی نہ ہو۔ شہر والوں کی جانیں تہ تیغ ہونے سے بچ جائیں مگر یہودی بابل میں قید و غلامی کا تجربہ کر چکے تھے۔ انہوں نے ہر مرتبہ اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا اور بدستور محصور رہے۔

جنگ میں کامیابی ایمان کی مضبوطی اور خدائی مدد کے سوا ظاہری سامان پر منحصر ہے۔ پھر ایمان، تو یہودیوں کا جیسا پکا تھا سب جانتے ہیں۔ خدا کی مدد کہاں سے آتی۔ رہے آلات جنگ وہ پہلے سے مہیا کئے جاتے، تو ہوتے۔ بہرحال اسلحہ کے باب میں یہودی رومیوں کی نسبت بہت کمزور یا بالکل صفر تھے۔ مردانہ وار رُو در رُو مقابلہ ناممکن تھا۔ علاوہ ازیں ایک شہر پناہ مسخر ہو چکی تھی اور اس سے قوم کی اخلاقی حالت میں فرقِ عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے یہودیوں نے ہاتھوں کا کام دماغ سے لینے کی ٹھانی اور کمزور مگر باتدبیر اقوام کے مشہور ہتھیار "حیلہ طرازی" کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ شہر پناہ کے اندر سے ایک عمیق سرنگ رومی لشکرگاہ تک کھود ڈالی۔ یہ تدبیر ایسی تھی کہ اِدھر سُرنگ پوری ہوئی اور اُدھر غنیم کے ہاں ہلچل مچ گئی۔ یعنی زمین کے کھوکھلے ہوجانے کی وجہ سے ان کے سارے کے سارے برج دفعتاً اڑا ڑا دھم کر کے بیٹھ گئے۔ رومیوں کو واقعی سخت نقصان پہونچا۔ کئی روز تک وہ پریشان رہے۔ مگر جس ساز و سامان کے ساتھ وہ آئے تھے معمولی نہ تھا۔ ایسے دھچکے اُن کا کیا بگاڑ سکتے۔ فوج بدستور محاصرہ کئے پڑی رہی۔ اور برج بھی از سرِ نو تعمیر ہو گئے۔ غرضکہ دوسری شہر پناہ بھی یہودیوں کو چھوڑتے بنی اور رومی فوج نے اسے بھی سر کر لیا۔

اب یہودی تیسری شہر پناہ میں محصور تھے اور یہ حفاظت کا آخری نشیمن تھا۔ کیونکہ اس کے بعد چوتھی شہر پناہ تھی۔ اس کے اندر ہیکل اعظم اور تمام مقامات مقدسہ تھے۔ اس کا مفتوح ہونا گویا قلع کا بند تھا۔ اور پھر موت یا غلامی! کمزور طاقتور کے مقابلے میں اور کچھ نہیں کر سکتا تو بد دعائیں ہی دیتا ہے، یہودیوں نے تو پھر ہاتھ پیر ہلائے۔ دوبارہ سُرنگیں لگانا شروع کیں اور ایسی محنت و جانفشانی کے

ساتھ کہ چند دن میں تمام زمین کھوکھلی کر دی۔ اور رومی برج و عماراتِ محاصرہ بھسم ہو کر رہ گئے۔ ایکے رومیوں کا پہلے سے بہت زیادہ نقصان ہوا اور وہ غیظ و غضب میں بھڑک اُٹھے۔ جوشِ انتقام نے انہیں دیوانہ بنا دیا اور انہوں نے اپنی اژدہا پیکر منجنیقیں اور کوہ شکن فولادی مینگھے لینی کبش لیکر بڑے زور سے ہلہ بول دیا۔ وہ برابر ہلاکت اور بربادی پھیلاتے ہوئے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ آخری شہر پناہ بھی چھلنی ہو گئی۔

غضب یہ ہوا کہ آتش انگیز روغن نفت کی پچکاریوں نے مقدس ہیکل کی دیواروں تک پہونچنا شروع کر دیا تھا۔ بدبخت یہودیوں نے ہرچند کوشش کی، اس میں شک نہیں کہ جانیں لڑا دیں مگر افسوس اپنے ہزار رس رعظمت کے گھر کو نہ بچا سکے۔ اصل یہ ہے کہ اب اسرائیل اور اسحٰق کا خدا بھی اُسے بچانا نہیں چاہتا تھا۔ مقدس ہیکل کا بڑا حصہ آتشزدگی سے برباد ہو گیا۔ گنبدوں اور میناروں میں سنگی گولوں نے سوراخ ڈال دئے۔ خرقیل نبی نے کہا تھا "میں ہیکل کے گنبدوں پر غیر قوموں کے لگائے ہوتے دھبے دیکھ رہا ہوں"۔ اس طرح بالآخر اس بدبخت اور خدا کی مغضوب قوم کی آخری سزا کی تکمیل ہو گئی۔ اور عروج و زوالِ امم کے قانونِ الٰہی کے نفاذ کو کوئی انسانی سعی نہ روک سکی۔ رومیوں کے برجوں کی گولہ باری کا اب جواب ممکن نہ تھا۔

ایک دن صبح کو یہودیوں نے دیکھا کہ رومی لشکرِ عظیم قتل و غارت اور نہب و سلب کے ہتھیار ہاتھوں میں لئے آخری شہر پناہ کے اندر داخل ہو رہا ہے۔ پھر وہ سب کچھ ہوا جو اسکے بعد ہونا تھا۔ اس قتل و غارت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو کئی روز تک اس مقدس شہر میں جاری رہا! عورتوں اور معصوم بچوں تک کو خونخوار فاتحوں کی تلوار سے اماں نہ تھی۔ عمارتیں جل کر خاک سیاہ اور مال و متاع غارت و تباہ۔ موت نے جنہیں قبول نہ کیا وہ قیدی بنا لئے گئے اور جو بھاگ گئے انہوں نے پھر بنی اسرائیل کے ہزار سالہ گھرانے کی نسبت کوئی اچھی خبر نہیں سُنی!!

"پھر انسانوں کی کتنی بستیاں ہیں کہ ہم نے انہیں ہلاک برباد کر دیا۔ کیونکہ وہ نافرمان تھیں اور انہوں نے احکامِ الٰہی سے سرتابی کی تھی۔ بس وہ اس طرح اُجڑ گئیں کہ اکی بڑی بڑی عمارتوں کی دیواریں اپنی چھتوں پر گر پڑیں۔ اُنکے لبریز کنوئیں بیکار ہو گئے۔ اور پکی اینٹوں کے عظیم الشان بنائے ہوئے محل ویران نظر آنے لگے! پھر کیا دُنیا کے غافل انسانوں نے زمین پر سیر و سیاحت نہیں کی ہے؟ اور گزشتہ قوموں اور ملکوں کے ان انقلابات کو نہیں دیکھا ہے؟ اگر نظرِ عبرت سے دیکھتے تو انکے پاس دل ہوتے جو صدائے الٰہی کو سنتے۔ اصل یہ ہے کہ جب کسی قوم کے بُرے دن آتے ہیں تو لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں ہو جاتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو اُنکے سینوں کے اندر پوشیدہ ہیں"۔

اشرف صبوحی (منشی فاضل)

آہ یہ ہندوستان کِسکا ہے؟

(خاص ہندوستان والے انسانوں کیلئے)

لوگ کہتے ہیں کہ چار یار جن کو دُنیا کے تمام ذوقوں میں صرف ایک ذوق اور تمام دلچسپیوں میں سے صرف ایک دلچسپی "افیون" سے تھی، خانہ نشیں رہتے رہتے بالکل اسی طرح گھبرا گئے جس طرح "ہندوستانی" بدیسی راج سے۔ اللہ کا نام لیکر" بہ یک جان و چہار قالب" سفر کے لئے چل کھڑے ہوتے۔ سفر.... بہت سے لوگ اس کو "صورتِ سقر" بتاتے ہیں، مگر اللہ میاں ہمیں "سیروفی الارض" کا حکم بھی دیتے ہیں۔ کیوں؟۔ دُنیا والوں کو اور اُن کی زندگی کو دیکھنے کے لئے۔ غالبًا اسی ثواب کی نیت سے یہ یار بھی چل کھڑے ہوتے۔ ابھی اپنے پروگرام کی پہلی منزل سے بھی دُور تھے۔ ایک سبزہ زار کے پاس سے گُزرے، ایک صاحب نے رائے دی، بھئی کوئی بات ہے کہ ہم چلیں سفر کو اور کچھ نہ دیکھیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی لمبی چوڑی زمین پر پھریں اور اُس کی نعمتوں سے لُطف اندوز نہ ہوں، دیکھنا واللہ۔ آہا آہا بھئی کیا سبزہ ہے کیا ہوا ہے، کیا باغ ہے۔ چندے یہاں ٹھہرنا مناسب ہے۔ بات ٹھکانے کی تھی کمر کھولدی۔ باغ کا ایک ٹھنڈا اور شاداب گوشہ دیکھکر ٹھہر پڑے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک صاحب نے کہا کہ بھئی واللہ کتنی بڑی ناشکر گذاری ہوگی جو کچھ کام ثواب کا نہ کیا جائے۔ دیکھنا باغ کے پرے اُس سرے پر وہ مسجد دکھائی دیتی ہے۔ بھئی گنوار تو پھر گنوار ظالموں نے لق و دق چٹیل میدان میں مسجد بنادی۔ برسات اور گرمی کی دُھوپ میں کس کی چندیا کھجائی ہے جو ظہر اور عصر کی نماز یہاں ادا کرتا ہوگا۔ لاؤ لگے ہاتھوں پہلا ثواب یہی کماؤ۔ مسجد کو اُٹھا کر چھاؤں میں رکھدو۔ تیسرے صاحب نے تائید کی کہ بالکل ٹھیک ہے، اماں غضب خدا کا بھلا ایسی مسجد سے فائدہ کیا۔ ایک تو یوں ہی لوگ نماز سے ڈر کر اسکو اجیرن بناتے ہیں دُھوپ کا اور بہانہ ہوگا۔ ٹھنڈا اور چھاؤں میں دل لگا کر نماز پڑھیں گے اور کچھ نہیں تو ہمیں دُعا ہی دینگے۔ یعنی ہمارے سفر کا یہ اجر۔ اللہ اکبر! چوتھے صاحب بولے بالکل ٹھیک تو ہے مگر خدار یہ تو بتاؤ کہ ہاتھ تلے کا ثواب چھوڑ کر یہ کام کریں۔ اللہ کے بندو اور پیارے بھائیو، ذرا اس وقت کو دیکھو، فضا کو دیکھو اور اپنے شوق کو دیکھو۔ بھلا اس وقت بھی اگر چاشنی کا دور نہ ہوا تو افیونیوں کی دُنیا پر کیا منہ دکھائیں گے، ثواب کے بدلے یہ گناہ کون لے۔ پہلے لگے ہاتھ اس سے فارغ ہو لو پھر جو جی چاہے کرنا۔ مسجد کو اُٹھانا معمولی کام نہیں ہے۔ طاقت، ہمت اور جرأت سب کچھ درکار ہے۔ بھلا یہ سب سامان ڈبیا میں بند رہے خالی مُنہ کام کیا خاک ہوگا۔

"بھئی کیا پتے کی کہی"! ایک نے کہا۔

"کیوں نہ ہو موقع شناس ہیں، صاحب دماغ"! دوسرے نے کہا۔

تیسرے سُبحان اللہ اور واللہ کہکر رہ گئے۔ آن کی آن میں شغل ہوگیا۔ کلی غرارہ کر نقل کھا پی کر سامان ایک ٹھکانے رکھا۔ اللہ کے چار بندے۔ ہمت، جرأت، طاقت، سنگھٹن کو اپنے اُوپر وارد کرکے مسجد اٹھانے چلے، ایک ایک کونا چاروں نے تھاما اور انقلاب زندہ باد کہکر زور لگاتا تھا کہ پینک صاحبہ تشریف لے آئیں۔ اس اثر سے اس وقت فارغ ہوئے جب جُھٹ پٹا ہوگیا۔ ایک صاحب ہوشیار ہوئے۔ چھاؤں دیکھکر گھبرا کر چیخ پڑے..... "بس بس کیا غضب کرتے ہو کہاں لے جاؤ گے۔ اماں یہیں رکھدو مسجد تو چھاؤں میں آگئی...."!

خدا کی عنایت بھی ہے غضب بھی۔ اس غریب ہندوستان کے حالِ زار پر عنایت تو یہ ہے کہ اس ملک کے ہر گوشہ میں چار آنے چندہ دینے والوں سے لیکر بڑی بڑی رقمیں دینے والوں تک۔ اور دستخط کی جگہ انگوٹھا لگانے والوں سے لیکر شاندار دستخط کرنے والوں تک نے اپنی اپنی انجمن، سنگھٹن، سبھا، لیگ، کانگریس الغرض صدہا قسم کی جماعتیں بنا ڈالیں۔ ہر ایک مندرجہ بالا ممبر نے اپنے اُوپر۔ ترقی۔ آزادی۔ حریت، مذہبیت، اُنتی، اُدھار کے مطالبات کی گٹھریاں لادلیں۔ اور ایسی راستہ پر چل پڑے ہیں جس پر "گول" (Goal) صرف لیڈروں کو نظر آرہا ہے۔ تو جناب عالی گذارش ہے کہ یہ سب باتیں خدا کی عنایات ہیں۔ احساسِ بیداری بہت بڑی نعمت ہے اور ایسا کرنے سے اللہ میاں کی مدد بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔ غضب اس معنی کر کے عرض کیا گیا کہ آج اِس غریب دُنیا کو جس پر ہمارا ملک بھی ایک خاک تودہ کی طرح چپکا نظر آتا ہے، پیدا ہوتے

ہزارہا سال ہوگئے اور ہر ایک مذہب والا اور لامذہب نیچری، دہریہ، جید سے جید سائنس داں بھی اس کا قائل ہے کہ دنیا کی خاص ایک عمر طبعی مقرر ہے اس کے بعد اس کو فنا ہونا ہے۔ اس لئے ہم کو بیداری کا احساس اس وقت ہوا جب یہ غریب دنیا زندگی کے سانس زیادہ لے چکی کم لینے باقی ہیں۔ اور ممالک آزادی کے مزے اڑا رہے ہیں ہمارے مزدوروں کے درخت ابھی پھولے بھی نہیں پھلنے کا حال خدا جانے۔ ہاں اپنی زندگی کو سرگرم عمل بنانا ہی، ع:۔

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ورنہ اپنے نزدیک تو جس طرح زیادہ گذر گئی مابقی بھی گذار دی جائے۔

ع:۔ ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

دوسرا پہلو اس اللہ کے غضب کا زیادہ ہولناک یوں ہے کہ آج تک کسی انجمن کے کسی لیڈر نے یہ فیصلہ نہ کیا کہ جس بھارت ماتا کو سنوارنے کی کوشش کی جارہی ہے وہ ہے کس کی، ہم انسانوں کی یا ......؟ کس کی۔ اور جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوتا تمام سرگرمیاں ایسی ہی ہیں جیسے مسجد کو اٹھا کر دھوپ سے چھاؤں میں لایا گیا۔ دل چاہتا ہے اسی مسئلہ پر ایک بسیط نظر ڈال کر ہندوستانیوں کو یہ بتا دیا جائے کہ اللہ کے بندو جس سرزمین کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو اور کان کھول کر سنو یہ کس کا مال ہے؟ اقلیت کا یا اکثریت کا۔

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے کچھ معیاری حدود قائم کرنے ضروری ہیں۔ کیونکہ ہندوستان جیسے لمبے چوڑے ملک کے بقدر طول و عرض بحث کی جائے تو انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں تیار ہو جائیں اس لئے ضروری ہے کہ اس بحث کو سمیٹ کر اتنا چھوٹا کر دیا جائے کہ ایک ہی نشست میں ختم ہو جائے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اتنی لمبی چوڑی بحث کس طرح سمٹ جائیگی پھر حیرت میں اور اضافہ ہوگا جب یہ اعلان کیا جائے گا کہ یہ بحث صرف چند ثبوت پر مشتمل ہوگی۔

پرانے زمانے کے لوگوں نے کہا ہے کہ جس کی لاٹھی اسکی بھینس لاٹھی یعنی "اکثریت" اور بھینس یعنی ملک۔ جس ملک میں جس قوم اور جس جنس کی کثرت ہوگی وہ ملک اسی قوم اور اسی جنس کا ہے۔ اس نظریہ کو سنتے ہی ایک سیاست داں فوراً ہندوستان کی مردم شماری پر پک جائیگا۔ اور اگر وہ فرقہ پرست مہاسبھائی ہے تو جتنی دیر میں ایک مُنڈی ایک انڈا دیتی ہے اس سے بھی کہیں زود تر عجلت کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ ہندوستان میں مسلمہ اکثریت ہندو بھائی کی ہے اور یہ ملک یہ بھارت ماتا صرف اسی قوم کی ماتا ہے باقی جتنی آبادی ہے وہ بے ماں کی یا پردیسی۔ اس لئے اس مسئلہ زیر بحث کا صرف یہ ہی ایک نتیجہ ہو سکتا ہے اور بس۔ ہمارا خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے مضحکہ انگیز عجلت سے کام لیا ہے اور ہندوستان کی آبادی کا شمار کرنے میں غلطی نہیں بلکہ نافہمی کا اظہار کیا۔ آبادی کے اعداد و شمار کا حساب کرنے میں وہ اللہ کا بندہ مردم شماری کی طرف دوڑ گیا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس حرکت اور فعل کو صحیح مان لیں تو پھر اس میں دیانت داری سے کام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ اس کے سب سے بڑے لیڈر مہاتما جی ... (سیاسی لیڈر کے لئے مہاتما کا پیوند اتنا ہی حسین اور موزوں ہے جیسے ایک پیغمبر یا اوتار کو سیٹھ جی کہدیا جائے) ... کو ابھی پورا یقین نہیں ہے کہ "اچھوت" کس طرف شمار ہونگے۔ بہرحال ہمارا کہنا یہ ہے کہ کسی ملک کی آبادی صرف مردم شماری کو نہیں کہتے۔ یہ ایک زبردستی کی اصطلاح ہے شدت کے ساتھ مہمل۔ مردم کہتے ہیں آدمی کو۔ بچہ اگرچہ آدمی کا ہے مگر مردم نہیں ہو سکتا ہے، بچہ ہے۔ کھینچ تان کر تذکیر و تانیث کے دونوں صیغہ اس میں شامل کر دیجئے اور عورت اور مرد کے معنی لگا دیجئے۔ انگریزی میں اس کو سن سس (census) کہتے ہیں۔ اس میں ایک لطیفہ اور بھی ہے کہ آدمی کی مردم شماری کو "سن سس" کہتے ہیں اور مویشی کی مویشی شماری کو (Cattle census) قصہ مختصر یہ کہ ہر ایک ذی روح کے اعداد و شمار کرنے کو (census) کہدیجئے تو روا ہے اس اعتبار سے فرقہ پرست مہاسبھائی نے اکثریت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی۔ صحیح اکثریت کا اندازہ اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب ہندوستان کی پوری آبادی کا جائزہ لیا جائے۔ آپ حضرات گھبرا جائیں گے اور اس جائزہ کو محیر العقول بات سمجھ لیں گے، مگر موجودہ زمانہ علم و فضل میں جب سائنس والوں نے ستارے گن ڈالے، برق پاروں کی تقسیم اور گنتی کرلی۔ اسی علم الحساب کے ذریعے ہندوستان کی آبادی کا شمار کر لینا کیا مشکل ہے۔

تارسا عمق اور بلندیاں، طول بلد عرض بلد الغرض اسی قسم کی بہت سی پیمائش اور شمار آج اس فضیلت مآب زمانے نے بہم پہنچا دئیے اور آئے دن نت نئی معلومات فراہم ہو رہی ہیں پھر ہندوستان کی آبادی کا شمار کیا مشکل ہے۔ لیجئے اس کا نہایت سہل طریقہ پیش ہے جانچ لیجئے پورا باون تولہ پاؤ رتی اتریگا۔ پہلے ہندوستان کی کل آبادی معلوم کرنے کیلئے یہ سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد صرف انسانی آبادی نہیں ہے بلکہ ہر وہ شے جو زندہ ہو ہندوستان میں رہتی ہو وہ آبادی میں داخل ہے۔ حساب لگانے سے پہلے اپنی حسابی عقل کو سکیڑ کر ایک کائی (unit)

پر لائیے۔ فرض کیجئے کہ یہ ہندوستانی زندگی کی اکائی بدھو چمار کا گھر ہے۔ ایک آپ ایک منگل، دو سوکھے سا کھے بچے، ایک مریل بکری، دو پوست در استخوان قسم کے بیل، یہ تو موٹی آبادی ہوئی۔ اب دوسری قسم کی آبادی میں مچھر، کھٹمل، پسو، مکھیاں، اور تمام کیڑے مکوڑے۔ اس لئے آپ کو بدھو کے مکان میں تین قسم کی آبادی ملے گی۔ انسان، حیوان، حشرات الارض۔ انسان الگ گن لیجئے، حیوان الگ۔ حشرات الارض کو شمار کرنے کے لئے عقل کو وسعت دیجئے۔ ایک کونے میں جتنے مچھر ہوں اس رقبے کو ناپ لیجئے اربعۂ تناسب کے ذریعے سارے گھر کے مچھروں کے اعداد معلوم ہو جائیں گے پھر اسی تناسب واربعہ کے ذریعے ہندوستان بھر کے معلوم ہو جائینگے اسی طرح اور حشرات۔ اب دیکھئے کہ بدھو کے گھر کا رقبہ انسان، حیوان اور حشرات الارض میں کیا تناسب رکھتا ہے۔ پھر ان ہی اعداد سے ہندوستان کے رقبہ کا تناسب نکال لیجئے۔ مختصر یہ کہ اسی طرح ہندوستان کی مردم شماری، حیوان شماری اور حشرات الارض شماری کر کے دیکھئے۔ اگر اس جنجال میں پھنسنا پسند نہیں ہے تو مان لیجئے کہ ہر ایک آباد سے آباد قسم کے مکان کی حشراتی آبادی بہ اعتبار آب و ہوا، یعنی اگر آب و ہوا گرم خشک یا سرد خشک ہے تو صرف ایک ہزار گنی اور اگر آب و ہوا مرطوب ہے تو چار ہزار گنی۔ پھر آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کی انسانی، حیوانی اور حشراتی آبادی میں کم از کم یہ تناسب ہوگا۔ ہندوستان میں انسانی آبادی ایک حصہ، حیوانی آبادی چار حصہ۔ (اس میں اگر بنگال کے شیر شامل ہیں تو وار دھا کی بلمیاں بھی) اور حشرات الارض آبادی ایک ہزار سے چار ہزار حصہ۔

ایک مسئلہ اقلیت و اکثریت کا اس طرح طے پایا۔ اور ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ اس ہندوستان جنت نشان میں خدا کے فضل و کرم سے انسانی آبادی سے کئی ہزار گنی زیادہ حشرات الارض کی آبادی ہے اور اُن کو جو اکثریت حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ حضرت انسان کے ہاں تولید و تناسل کے اعداد کا جائزہ اور شمار کیا جائے تو کسی گھر میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ دو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی شاذ و نادر ورنہ معمولاً ایک بچہ۔ حشرات الارض میں ایسی کون سی کم نصیب بے اولادی ماں ہوگی جو بیک وقت کم از کم پچاس بھی بچے نہ دیتی ہوگی۔ زیادہ کا تو شمار عقل سے باہر ہے۔ پھر حضرت انسان کے ہاں اور بھی پابندی ہے۔ تولید و تناسل کے لئے عمر کی حد مقرر ہے۔ بعض ماں باپ مدۃ العمر بے اولاد رہتے ہیں بعض کی اولاد ہزار اللہ آمین کے بعد بھی نہیں جیتی۔ بعض حضرات ایسے خوش نصیب کہے جاتے ہیں کہ سوائے اولاد نرینہ کے اور کچھ نہیں جانتے، بعض ایسے بدنصیب ہوتے ہیں کہ لڑکیاں ہی لڑکیاں حصہ میں آتی ہیں۔ اس قسم کے واقعات اور حقائق حشرات میں مفقود ہیں۔

آپ نے دلچسپی کے ساتھ کبھی علم حشرات الارض کا مطالعہ کیا ہوگا۔ البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں، مشاہدہ بھی اور تجربہ بھی بتاتا ہے کہ ابھی ابھی مکھیاں گھروں سے مفقود ہیں ایک ہفتہ کے اندر وہ کثرت ہے کہ اللہ کی پناہ۔ رات کو جاڑے میں مچھر غائب ہیں مگر ان کے لواحقین پسو اور کھٹمل موجود ہیں۔ جب گرمی آنے لگی طپش نے ان ظالموں کو فنا کیا تو مچھروں کا وہ زور ہے کہ رات رات بھر حملہ سے نجات نہیں۔ ہاں اگر آسمان سے مچھر دانیاں فلٹ کے پیپے اور اسی قسم کے فنا کے سامان برسنے لگیں تو شاید نجات ہو۔ اس پر بس نہیں اور آگے چلئے، برسات میں دن کو مکھیاں رات کو مچھر۔ اور ایسے مچھر کہ ہم آپ تو درکنار ڈاکٹر تک خائف ہیں۔ ملیریا کے نام سے تھراتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہاتھی کو جب بخار آنے والا ہوتا ہے تو وہ پہلے سے اُسے دیکھ دیکھ کر چیخت ہے، چنگھاڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح برسات کے اوائل میں ڈاکٹر حضرت بھی اُفقِ مستقبل پر ملیریا کو دیکھ کر چیختے چلاتے ہیں۔ خود بچنے کی کوشش کرتے ہیں دوسروں کو بچاتے ہیں۔ الغرض پروردگار عالم کے کرم سے بارہ مہینے حشرات میں، تولید و تناسل کا وہ زور ہے کہ بنیاد بخدا۔

فنا ان کے لئے بھی ہے اور اموات ایسی تعداد میں آتی ہیں کہ اگر انسانوں میں آئیں تو یقیناً چند روز میں دنیا خالی ہو جائے۔ مگر نظام عالم کی ترازو کچھ اس طرح ان کے حق میں وضع ہوئی ہے کہ موت سے زیست اور فنا سے زیادہ تولید کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ پھر دنیا کی کون سی قوم ایسا کلہ جبڑا اور منہ رکھتی ہے جو ان کی اکثریت سے ٹکر کھا سکے۔ دوسری برکت حشرات کی افزائش میں اور بھی شامل ہے۔ اوّل تو قدرتاً اور فطرتاً کی نسل آپس کے تولید و تناسل سے بڑھتی ہی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ دو ایک قوتیں اس افزائش میں اور بھی شامل ہیں۔ اوّل تو تناسخ۔ دنیا میں جتنے خونی، مردم آزار اور ایذا پہونچانے والے انسان مرتے ہیں اُن کی ارواح بذریعہ تناسخ پاداش عمل میں مچھر، کھٹمل، پسو، مکھی اور اسی قسم کے حشرات بنتی رہتی ہیں۔ دوسرا اضافہ ارتقا کے ذریعے ہوتا ہے۔ یعنی زندگی کا ہر ایک وہ اکائی جو بندرا یا امیبا کی صورت میں بذریعہ ارتقا کے بندر اور پھر انسان بننے والی ہے وہ کسی اندرونی حادثہ کی وجہ سے ارتقا کے کل مدارج نہیں طے کر سکتی اس لئے حشرات الارض بن کر رہ جاتی ہے۔ ایک کمہار کے پزاوہ میں اینٹوں کے بھٹے ہیں۔ ہر ایک برتن اور ہر ایک اینٹ درجہ اوّل نہیں ہوتی، بہ اعتبار صورت۔ حالت پختگی اس کے بہت سے

درجے ہوتے ہیں۔ اس طرح ارتقا کے پڑاوے میں ہرچیز انسان ہی نہیں بنتی بلکہ حشرات بھی بن جاتی ہے۔ بدنصیبی سے یہ دونوں اکثریت کو بڑھانے والی صورتیں انسان کو میسر نہیں۔ اور آج انسان کو اشرف المخلوقات بن جانے کا مزہ آرہا ہوگا کہ کس ناقابل بیان افسوس کے ساتھ انسان بننے کا مادّہ ضائع ہوکر حشرات بن رہا ہے۔ کاش اس سے زیادہ اشرف کوئی مخلوق ہوتی تو تناسخ اور ارتقا کا فائدہ اس غریب کو بھی ملتا۔ البتہ تولید و تناسل کے ذریعے اپنی اکثریت بڑھائی جاسکتی ہے۔ جب عناصر کے امتزاج، بجلی کی قوت اور ہزار ہا سائنس کے کرشموں سے انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو کیا فضیلت تاب انسان کے لئے اپنی نسل بڑھا لینی ممکن نہ تھی۔ تھی اور ضرور تھی مگر ایسے ہاتھی کا کیا علاج جو اپنی فوج کو مارے۔ ہمارے نیک بھائی بند سب طرف سے چلا رہے ہیں اور بہانگِ دہل چلا رہے ہیں کہ انسانی نسل کے لئے ضبط تولید کی ضرورت ہے۔ دنیا اس کے بوجھ سے بھاری ہو رہی ہے۔ آہ ایک ہاتھی کا وزن ہیئر آدمیوں کے برابر، ان کی نسل زمین کا بوجھ نہیں ہے اگر ہے تو غریب انسان کی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ ضبطِ تولید اگر فی الاصل کوئی فطری شے ہوتی یا دُنیا کی بقا کیلئے ضروری ہوتی تو اللہ کی اور مخلوق میں قدرت کی طرف سے اس کا نفاذ ضروری تھا۔ بہت ممکن ہے چند عقل پر سوار ہونے والے علمائے سائنس یہ کہہ اٹھیں کہ ضبطِ تولید کیلئے فطرت نے بڑی موٹی موٹی "جھاڑو" طاعون، ہیضہ، میریا، نمونیا، انفلوئنزا کی صورت میں بنا رکھی ہیں تو اس کا جواب صاف ہے۔ یہ سب بیماریاں حشرات کے دم سے ہیں، جو انسان کی اقلیت کے درپے۔ طاعون، پسّو اور چوہے پھیلائیں۔ ہیضہ کی ذمہ دار مکھیاں۔ ملیریا کے موجد مچھر۔ الغرض ہزارہا جراثیم یہ حرکتیں کر رہے ہیں، کیوں، صرف انسان کو فنا کرنے کے لئے۔ انسان کی اقلیت کو مسل ڈالنے کے لئے۔ بس اے موٹی عقل کے موٹے کپڑے پہننے والے انسان کیا اب بھی تجھے باور نہیں ہے کہ یہ غریب بھارت صرف اُسی کے لئے ہے جس کی اکثریت ہو۔ اور اس معاملہ میں حشرات کے سامنے تو ایک ذلیل ترین اور پست ترین اقلیت ہے اور اقلیت کو حکومت کا مجاز نہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ ہم اقلیت میں سہی مگر اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی اعلیٰ تہذیب، تمدن، معاشرت سے اس ملک کی سرزمین کو سنوارنے والے ہیں۔ اور حکومت کے مدعی ہیں۔ ہماری عقل حشرات کیا بہا تم کو زیر کرسکتی ہے۔ کیڑے مکوڑے ہم کو زیر نہیں کرسکتے۔ بیشتر اس کے کہ ہم ہندوستانی "انسان" کے اس دعوے کو تسلیم کریں "بھارت ماتا" کی سنتان کی سبھتا، سماج اور جیون پر نگاہ ڈالنی ضرور ہے۔ ہندوستان جنت نشان میں جتنی قومیں اُتنے ہی تہذیب و شائستگی کے نمونے جتنے منہ اُتنی باتیں۔ پہلے یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ کون سے فرقے کی تہذیب، تمدن و معاشرت کو کسوٹی بنایا جائے تاکہ اس کو سامنے رکھکر جانچا جائے۔ زیادہ طوالت سے بچنے کے لئے مناسب یہ ہے کہ ہر ایک فرقہ اور اُس کے افراد کی تہذیب کو چھوڑیئے جو اونچی اونچی سبھائیں اور انجمنیں یارانِ طریقت نے اپنے اپنے فرقوں کی درستی کیلئے بنا رکھی ہیں ذرا اُن کو پرکھ کر دیکھئے۔ کوئی سبھا تو یہ سبق سکھاتی ہے کہ جسم دھرم کرم سماج غرض زندگی کے ہر پہلو کے اعتبار سے اُتم اور سب سے بلند اور سب سے زیادہ سرافراز اتنے سرافراز کہ کوئی پگڑی بھی تھام کر دیکھے تو ہمارا چہرہ نہ دیکھ سکے گا۔ اور اس ملک کی باقی انسانی آبادی ہمارے پیروں کے نیچے۔ ایک سبھا کی یہ تعلیم دوسری سبھا اپنے ممبران کو دھرماتما اور اُتم تو نہیں بناتی مگر لوگوں کو کسی کا محکوم نہیں دیکھنا چاہتی بلکہ اپنی اپنے آپ حکمراں بننا چاہتی ہے۔ یعنی ہر ایک محکوم بہ نفسِ نفیس اپنا خود حاکم بھی اور رہنما بھی۔ منطق کے اعتبار سے ایک شخص میں دونوں فوقیتیں سمیٹ کر بھر دینا مشکل سی بات ہے۔ تصوف کے اعتبار سے "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" درست ہو مگر مشاہدہ کیا ہے۔ ہم سے سنئے اور آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ ایک ممبر میونسپل بورڈ کی زندگی کو۔ محلہ میں اندھیرا ممبر صاحب کے مکان کے سامنے روشنی موجود۔ محلہ میں کوڑے کباڑ کا کیا ٹھکانا ممبر صاحب کے مکان کے آگے چندن پڑا ہے۔ غرض مہتر، بہشتی اور اس قسم کے جتنے میونسپل ملازم ہیں اُن کو تنخواہ آپ دیں کام کریں اُن کا۔ جب ایسی چھوٹی چھوٹی پنچایتی حکومتوں میں جہاں پنچوں کے اختیارات کی حدود صرف شہر یا قصبہ کی چار دیواری کے اندر بند ہیں تو نفس پرستی کا یہ عالم ہے اور جب آپنے اس کو صوبے تک پھیلا دیا تو اللہ ہی حافظ ہے اس ایوانِ حکومت کا۔ یہ ایک ادنیٰ مثال ہے اسی پر قیاس کر لیجئے۔ غرض اس ملک میں جتنی سبھا اور انجمنیں ہیں اُن کے مقاصد میں مع ان کی ذہنیت اُن کی تعلیم میں اور پھر اُن کی مساعی میں اتنا اختلاف ہے کہ اگر ساری زمین اور سمندر کو ملا کر گارا بنایا جائے اور اُس سے اس اختلاف کے شگاف کو بند کیا جائے تب بھی اس کی مرمت ناممکن۔ تو کس منہ سے مسور کی دال کھائی جائے۔ کونسے انجنیر اور معمار، بیلدار اور مزدور اس ملک کی "استعماریت" کو بنائیں گے۔ آئے دن اخباروں میں ذکر ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ ہو رہا ہے۔ اوّل اوّل کے دنوں میں اخباروں کا یہ عنوان ہوتا ہے کہ سمجھوتہ امید افزا

ہے۔ اسی درمیان میں مہا سبھا کی طرف سے للکار سنائی دیتی ہے کہ خبردار کانگریس والو تم آل انڈیا نیشنل کانگریس ہوا کرو ہندو قوم کے نمائندے نہیں ہو۔ ایک طرف سے حضرات حریت چیختے ہیں باش لے مسلم لیگ تو ہندوستان کے جملہ مسلم کی نمائندہ کہاں سے ہو گئی۔ لیجئے سمجھوتے کے درمیان دو ایک جو ایسے بمب گرے تو ایک تڑاخے کی آواز آئی اور پھر اخبار والوں نے یہ دیکھا کہ اختلاف کا شگاف دو چار میل اور لمبا ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ الغرض جتنے مذہبی، سیاسی ادارے ہیں سب کی یہ کیفیت ہے تو ذرا پنچ لوگ بتائیں اب ہندوستان کس طرح سنورے گا۔ اختلاف کے خس و خاشاک کس طرح صاف ہونگے۔ ایسے میاں غضب خدا کا جس ملک میں معبدوں کے آگے باجہ بجانا۔ دوسروں کی دل آزاری کی غرض سے گاؤکشی کرنا۔ مدح صحابہ و تبرا یہ سب مذہب کی تزئین کیلئے ازبس ضروری ہے وہاں سنگھٹن کی بنیاد گویا براتِ عاشقاں بر شاخ آہو۔ آہ یہ ہندوستان جس میں "ہندو پانی" "مسلمان پانی" اسٹیشن کی زینت ہو وہاں کا سمجھوتہ معلوم.....

پس اے عقل و ہوش کے دشمن ہندوستانی انسان، اے بھارت ماتا کے کھدر پوش سپوت لال سمجھ لے اور اچھی طرح سمجھ لے اور جان لے کہ جس ارتقا نے تجھ کو بندر سے انسان بنایا اس نے تیرے ساتھ ایک قسم کی ستم ظریفی یہ بھی کی ہے کہ دنیا کی ہر جاندار چیز کو انسان نہیں بنایا۔ ایک کثیر اکثریت کو حشرات کی صورت میں تجھ پر مسلط کر دیا ہے۔ یہ اکثریت ہر طرح سے تیری جان اور مال کو تیری املاک کو گھن کی طرح کھا رہی ہے یا تو ایسی ایسی ترکیبیں اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے کر ڈال کہ تو اس کثرت پر حاوی ہو جائے ورنہ بھاگ جان بچا کر کیونکہ اب ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی حکومت یہ کیڑے مکوڑے تجھ سے چھین لیں گے۔ اور اس سے پہلے اور بہت پہلے کہ ؎

پردہ داری می کند بر کاخ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

کی نوبت آئے آ اور دوسری کسی دنیا میں چل جہاں تیری اکثریت ہو۔ اور حشرات الارض سے پاک صاف ایک ہندوستان بنا ڈال اور سوراج کر، ایسا سوراج جس میں نہ ساورکاری دھوتیاں ہوں نہ گاندھی ٹوپیاں، نہ جناحی سوٹ ہوں اور نہ احراری کلہاڑے۔ نہ خاکساری بیلچے ہوں اور نہ سرداری کرپان۔ نہ جمیعتی ہاضم توندیں ہوں نہ تبرے کے عقل سوز شعلے جس میں ہزار مذہب ہوں" اور ایک "ایمان" جس میں ہزار جان ہوں اور ایک دل۔ اور قومی نعرہ... انسان زندہ باد حشرات الارض برباد....

علامہ مضحک دہلوی

یکسوئی

خود ہی حسین برا کہے ورکے اس انتشار کو!!
اب تو سمیٹنا پڑا وسعتِ کاروبار کو

دل میں جماتے جاؤں گا دھیان فقط اسی کا میں
دل سے مٹاتے جاؤں گا اب جو دوئی کے نقش ہیں

راستہ میکدہ کا یوں؟ جی نہیں مانتا مرا
قصد صنمکدہ کروں؟ یہ نہیں راستہ مرا

میکدہ و صنمکدہ اب طرب آفریں نہیں
چھوڑ کے کوئے دوست کو جاؤں ادھر؟ نہیں نہیں

دیدِ جمال ہر صنم اب نہ رہی جلائے دل
ہے فقط اک "حسین بت" رونق مدعائے دل

کیوں مرا عشقباز دل زہد کا اشتہار دے
میری حیاتِ عشق کو کیوں نہ وہی سنوار دے

جس کے غیاب میں بھی میں وقفِ پرستش آج ہوں
سایہ میں جس کی یاد کے خوشدل و خوش مزاج ہوں

درخورِ یادِ دوست ہے یک جہتی خیال کی
روح فزا یگانگت ہے مرے حال و قال کی

حسن غیور کی قسم دل مرا پاکباز ہے
غیرتِ حسن ہی مری پاک دلی کا راز ہے

تازہ بہ تازہ نو بہ نو حسن کی یہ تجلیاں
میری نظر کے واسطے بن گئیں خود نگاہباں

جن کے معاملات میں حرص و ہوا کا میل ہے
اُن کا معاشقہ نہیں "وقت پسند کھیل" ہے

کھوئی جنہوں نے آبروئے آرزوئے وصال کی
اُن سے روش نہ مل سکی میرے کسی خیال کی

حد شہود و علم میں ہے جو یگانۂ جہاں
ہیں اُسی مہرِ حسن کی میرے لئے تجلیاں

دوست کی ہیں تجلیاں روح فزا مرے لئے
میری نظر وفا کشا ہے مرے دوست کے لئے

علی منظور

تحلیل نفسی

تعارف:۔ عنوان اعلیٰ تحلیل نفسی کے تحت میں انفرادی مسئلہ جات پر بحث و تحقیقات کی یہ دوسری کڑی ہے۔ اس میں مزاح اور نفس غیر شعور کے ساتھ مزاح کے تعلقات کا ذکر ہوگا۔ پہلے تحلیلی بحث ہے پھر ترتیبی تذکرہ ہوگا اور سب سے اخیر توجیہاتی مطالعہ کیا جائیگا۔ واضح ہو کہ اس مقالہ میں زیادہ مدد پروفیسر فرائڈ کی تصنیفات سے لی گئی ہے۔ البتہ مثالوں کو ایشیائی رنگ دینے میں ہم اپنے محترم بزرگ مولوی انور حسین خان بہادر یالقابہ کی گراں قدر امداد کے ممنون ہیں۔

تحلیلی باب

تمہید فلسفہ اور نفسیات کے لٹریچر پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ایک تو Wit¹ (مزاح) کے باب میں بہت کم حکما نے خامہ فرسائی کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جن چند ایک حکمانے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے Wit کو ظرافت (Comic) کی ایک قسم گردانا ہے۔ ان سب کے نزدیک Wit کے مطالعہ کے لئے ظرافت کا مطالعہ کرنا از بس ضروری ہے۔ لپس (Lipps) کے نزدیک Wit بنیادی طور پر ظرافت کا ایک موضوعی یا داخلی پہلو ہے۔ یعنی یہ ظرافت کا وہ حصہ ہے جسے ہم خود متغیر کرتے ہیں؛ جو ہمارے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے اور جس کے ساتھ ہمارا تعلق ایک موضوع اعلیٰ (Superior Subject) کا سا ہوتا ہے۔ فشر (Fischer) ظرافت اور Wit کے تعلقات کو شخصی کارٹون یا انگارہ (Caricature) کی مدد سے واضح کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اس قسم کے کارٹون کی جگہ ظرافت اور Wit کے بین بین ہے۔ ایک اور جگہ یہی مصنف Wit کو تفریحی فیصلہ (Playful judgement) قرار دیتا ہے۔ اسی رنگ میں جین پال (Jean Paul) کا قول ہوا ہے کہ "آزادی سے Wit پیدا ہوتی ہے اور Wit سے آزادی" یعنی Wit خیالات کی آزاد حرکت کا دوسرا نام ہے۔ قدیم ایام سے Wit کی ایک تعریف یہ بھی چلی آئی ہے کہ یہ ایک ایسی قوت ہے جو تضاد میں تطابق کو ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ جین پال اس خیال کو نئے استعارہ سے واضح کرتے ہوئے رقمطراز ہے:۔

"Wit ایک چھپا ہوا پادری ہے۔ جو ہر ایک جوڑے کو نکاح کی زنجیر پہنا دیتا ہے" Vischer اس فقرہ پر ایزاد کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ پادری زیادہ تر ان جوڑوں کی شادی رچاتا ہے جنھیں خاندانی مخالفت کی بنا پر آپس میں شادی کرنا میسر نہیں۔ اس ضمن میں لپس کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ سب تعریفیں اس Wit کی ہیں جو مزاح پیدا کرتی ہے یعنی بہ لحاظ ایک قوت کے موجود ہیں اور یہ کہ یہ تعریفیں ہرگز ہرگز اس Wit پر صادق نہیں آسکتیں جو اس قوت کے نتائج کے طور پر مزاح پیدا کرنے والے کی پیداوار کہلاتی ہیں۔ اس ضمن میں چند ایک دیگر حکما کی تعریفوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جو صفات Wit کی ملکیت قرار پاتی ہیں ان میں حرکت، داخلی تعلق، تفریحی فیصلہ، تضاد کا اجتماع، ابہام، خفیہ معانی کی فوری چمک اور اختصار وغیرہ داخل و شامل ہیں۔

1.

Techniqe of Wit

Wit کے صنائع بدائع اور مختلف طور طریقے

ارباب نظر کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ فلاں فلاں فقرے میں Wit کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ظاہرا طور پر اس کے پیدا ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ طریقہ ہے کہ یہ مزاح خود وہ خیال بن جائے جو کسی فقرہ میں ملفوف کیا جا رہا ہے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ مزاح اس فقرہ کی طرز ادا سے بے محابا مترشح ہو جائے یعنی یا تو یہ تخیل ہو یا طرز ادا۔ اکثر حالات میں یہ محض طرز ادا کا کرشمہ ہوتا ہے۔ اور ان واقعات میں یہ چیز نشہ زن

---

1. Wit کے لئے ہم بوجوہ احسن "مزاح" کا لفظ استعمال کریں گے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ یہ اس کا صحیح ترجمہ نہیں ۱۲

کرنے سے زائل ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں فشر کا قول ہے کہ اکثر حالت میں اور بنیادی طور پر Wit ایک لفظی گورکھ دھندا ہے۔ جین پال کا خیال ہے کہ "اکثر حالات میں عموماً اور سپاہیوں یا الفاظ کی حالت میں خصوصاً سرونا ان کی نشست ہی خوشگوار نتائج پیدا کرتی ہے"۔

مخلوط الفاظ کی بندش

مطالعہ اور مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی خیال کو Wit کا جامہ پہننے میں مندرجہ ذیل ادوار سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے تو اس پر اختصار کا عمل آزمایا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ ایک قسم کا ایزادی تشریحی جملہ چسپاں کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہائنے Heine (جرمنی کا یہودی شاعر اور ڈرامہ نویس) کا ایک کردار جو لاٹری ایجنٹ ہے گویا ہوتا ہے۔ "نواب راتھ شیلڈ مجھ سے برابر کا سلوک روا رکھتا ہے یعنی بالکل — Famillionaire"۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں مزاح اس نئے لفظ کی بندش کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ یہ نیا لفظ دو لفظوں کی آمیزش سے بنا ہے۔ ایک تو Familiar (بخوبی واقف) اور دوسرا Millionaire (لکھ پتی)۔ نقشہ کے طور پر یہ آمیزش اس طرح بیان کی جا سکتی ہے۔

Famil i ar

Milli onaire

Familli onaire

معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لفظ کسی دباؤ کے ماتحت ایک دوسرے میں ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ یہ دبانے والی قوت ایک لفظ پر زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے اور وہ لفظ زیادہ مختصر ہو گیا ہے۔ اور اسی قوت کے ماتحت دوسرے لفظ سے دست و گریبان ہو گیا ہے۔ اس قسم کی آمیزش کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

۱۹۱۶ء میں جب ترک جنگ بلقان میں کود رہے ہوئے تھے اس وقت رومانیہ کا رویہ ظاہر کرنے کیلئے پنچ میں ایک لطیفہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا Kleptorumania - یہ نیا لفظ Kleptomania (چوری کرنے کا خبط) اور Rumania کا امتزاج مجسم ہے یعنی

Klepto mania

Ru mania

Kleptoru mania

یا ایک مختصر افسانہ نیا ایک کردار کرسمس کے ایام کو Alco-holidays - کا نام دیتا ہے۔ اس کا گراف یوں ہوگا :۔

Alco hol

holidays

Alco-hol - idays

یہاں یہ اختصار ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایام شغل بادہ کے دن ہیں۔

اختصار قدرے تصرف و تبدل کے ساتھ

مثال ملاحظہ ہو میں اس کے ساتھ Tele-bete جا رہا تھا۔ تشریح کرنے سے Tele - bete کی بندش کھلتی ہے اور یہ مضمون ہویدا ہوتا ہے کہ میں اس کے ساتھ Tele جا رہا تھا اور وہ ایک حیوان bete ہے۔ اب غور کے لائق یہ امر ہے کہ ہر دو تشریحی جملے مزاح پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ مزاح تو جبھی پیدا ہوتا ہے جب Tete اور bete کو ایک انوکھے طریقے سے اکٹھا کیا جائے۔ اسے اختصار یا ادنیٰ تغیر کہیں گے۔ یہ تغیر و تبدل جس قدر لفظی اختصار کا حامل ہوگا اسی قدر مزاح کی فراوانی ہوگی۔ ہائنے نے الفریڈ موسے (فرانسیسی شاعر) کی نسبت کہا تھا کہ تکبر اس کی چار اچیلیز کی ایڑیوں میں سے ایک ایڑی ہے۔ یہاں تغیر یہ ہے کہ جہاں سپارٹا کے مشہور بہادر کی ایک ایڑی اس کا کمزور حصہ جسم تھی وہاں الفریڈ موسے کو چار ایڑیاں دے دی گئی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ چار ایڑیاں حیوانوں کی ہوتی ہیں)۔ یعنی یہاں دو فقروں کو بادنیٰ تصرف ایک فقرہ میں مختصر کیا گیا ہے۔ ایک فقرہ تو یہ ہے کہ اگر اس کا تصرف نظر انداز کر دیا جائے تو وہ ایک معزز آدمی ہے۔ دوسرا فقرہ یہ ہے۔ پھر بھی مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ کیونکہ وہ ایک حیوان ہے!

اس قماش کی کئی ایک دیگر مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور فرائڈ نے اس اختصار کی بہترین مثالیں اپنی مشہور کتاب "تعبیر خواب" میں پیش کی ہیں۔ لیکن ہم ان مثالوں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے ایک دیگر قسم کی مثال کو زیر مطالعہ لاتے ہیں۔

الفاظ کی تقسیم

ایک ناچ کی محفل میں نپولین اول نے ایک اطالوی خاتون کو مخاطب کر کے کہا "تمام اطالوی اچھی طرح نہیں ناچ سکتے"۔ جس پر اس خاتون نے مندرجہ ذیل فقرہ کہا :۔ "Non tutti, ma, buonaparte:" (تمام نہیں البتہ زیادہ تر) خیال رہے کہ یہاں Buona-Parte خود نپولین کے نام کی تقسیم ہے۔ اس مزاح کی یہ صفت ہوئی کہ ایک لفظ یعنی نپولین کا

نام دو طرح اور دو معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ کبھی سالم اور کبھی نصف نصف۔

تکرار با تبدیل معانی

اوپر کی مثال سے ظاہر ہے کہ ایک لفظ کو مختلف طریقوں سے پیش کیا جاسکتا ہے اور ایک لفظ کی تکرار جبکہ ہر بار اس کے نئے معنی لئے جائیں عموماً مزاح پیدا کرتا ہے۔ مثال:۔

دو مزاحیہ مقرر اکٹھے ایک دعوت پر مدعو تھے۔ الف نے ب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "حضرت ب لاجواب مقرر ہیں۔ اگر آپ ان کا منہ کھول کر اس میں ایک عدد کھانا رکھ دیں تو اس میں سے فوراً ایک عدد تقریر نکل آئے گی"۔ اس پر حضرت ب نے جوابی تقریر میں فرمایا۔ "آپ بندہ کی تعریف تو سن ہی چکے ہیں۔ اب لگے ہاتھوں حضرت الف کی تعریف بھی سن لیجئے"۔ اگر آپ مجلس میں سے کسی ایک صاحب کا منہ کھول کر اس میں ان کی تقریر ڈال دیں تو اس میں سے ایک عدد کھانا نکل آئے گا"۔ یہ مثال تو مکمل تکرار کی ہے۔ البتہ بعض اوقات جب بار دیگر انہی الفاظ کو دہرایا جاتا ہے تو تھوڑی بہت ترمیم کی جاتی ہے مثلاً برگسن نے آلیور وینڈل ہومز (مشہور مصنف اور شاعر) کا ایک فقرہ لکھا ہے۔ *Put not your trust in money, but put your money in trust.* (اپنا اعتقاد روپے پر نہ رکھو بلکہ اپنا روپے کو کسی اعتباری جگہ پر رکھو!)

اسی طرح اس نے ایک دیگر مثال کے طور پر دو لفظ پیش کئے ہیں:۔ *Amentes* اور *Amantes* (عاشق اور پاگل) اس ضمن میں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ الفاظ بہت آسانی سے نئے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور اس طرح کئی الفاظ جہاں محاورہ کے زیر اثر ایک نئے معنی کے حامل ہو سکتے ہیں وہاں اپنے لغوی معنی سے بھی وابستہ رہتے ہیں۔ مثلاً ایک اندھے نے ایک اپاہج سے پوچھا "کیسی چال ہے؟" اپاہج نے جواب دیا "جیسی دیکھتے ہو"۔

ذو معنی الفاظ اور ضلع جگت

اگر ہم الفاظ کی تکرار یا تبدیل معانی پر غور کریں گے تو ہمیں جلد ہی ذو معنی الفاظ اور ضلع جگت سے سابقہ پڑیگا۔ یہ صنعت بہت قدیم ہے۔ اور مزاح پیدا کرنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جو تقریباً تمام ملکوں اور زبانوں میں کبھی نہ کبھی رائج رہا ہے۔ عام طور پر ذو معنی الفاظ کی بندشوں کی تین ترکیبیں ہیں۔

۱۔ کسی معروف نام اور اس کے لغوی معانی کے استعمال سے ضلع جگت پیدا کرنا۔ مثلاً کسی اسد کا شعر ہے:۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش، رحمت خدا کی

اس میں بار بار بندر درت کے وقت نام کو بھی سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً خاقانی ہند استاد ذوق:۔

نہ جیا آہ تری چشم کا مارا نہ جیا[1]

حضرت مومن دہلوی اور مولوی محمد نوح صاحب نوح ناروی مدظلہ نے اسی صنعت کے طفیل اپنے تخلص بڑے سلیقے اور نفاست سے نبھائے ہیں۔

۲۔ ایسے الفاظ استعمال کرنا جو لغوی اور محاوراتی معنی کے طفیل ضلع جگت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کا شعر ہے:۔

سن کے چرچا غیر نے جا کر چھچھوندر چھوڑ دی
گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا توتا ہوا

یہاں چھچھوندر اور توتا آتشبازی کی اشیا کے نام بھی ہیں۔ اور شگوفہ چھوڑنے اور نقصان ہونے کے معنی بھی دیتے ہیں۔ یا:

نقاب کہتی ہے میں فتنۂ قیامت ہوں
یقیں نہیں تو کوئی دیکھ لے اٹھا کے مجھے

۳۔ مکمل ذو معنی الفاظ کی تکرار۔ یہاں نہ تو الفاظ کو توڑا پھوڑا جاتا ہے اور نہ ہی روزمرہ کی بدولی جاتی ہے بلکہ ایک لفظ کلی طور پر دو معنی دیتا ہے۔ اور اس کے استعمال سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ مثلاً:

غیر نے تم کو جاں کہا، مجھے بھی اس نے کیا کہا؟
یعنی کہ بے وفا کہا، جان کا اعتبار کیا!!

یا:

نہ دیوے لے کے دل وہ جو رمشکیں
اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو!

یا ہو ریشیو و نشلو امریکی خاندانوں کا تاریخی ارتقا یوں پیش کرتا ہے:۔

Gold Mine ______ سونے کی کان

---

[1] ملاحظہ ہو مکمل واقعہ جو خاقانی ہند کے بیان میں آب حیات میں مرقوم ہے۔

سونے کا چمچہ ________ Gold Spoon
سونے کی مدد سے علاج ________ Gold Cure

سونے کی کان سے مراد ٹونٹ کرنے والے لا امداد ہیں۔ سونے کا چمچہ ان کے تازہ نعمت میں پلے ہوئے بچوں کا ذکر کرتا ہے۔ اور چونکہ سونے کی مدد سے شراب خواری کا علاج کیا جاتا ہے اس لئے یہ ذکر ہے امیر والدین کے شراب خوار اور عیاش بچوں کا۔

(Ambiguity) لفظوں کی تکرار اور اعادہ

ابہام ایک نئی صنعت کے ماتحت بھی مزاح پیدا کر دکھاتا ہے اسے ابہام یا (Ambiguity) کہتے ہیں۔ مثلاً مرزا غالب مرحوم کی رباعی ہے سہ

کہتے ہیں کہ وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

یہاں ہاتھ اٹھانا دومعنی دیتا ہے یعنی قطع تعلق کرنا اور مارنا اسی قسم کی صنعت کو فرائڈ نے ذومعنی ابہام کا نام دیا ہے۔ دیگر مثال کیلئے حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ملاحظہ ہو سہ

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی!

واضح ہو کہ یہاں نکل گئی کا اشارہ دو طرف ہے۔ ایک طرف تو حسرت کا نکلنا مقصود ہے اور دوسری طرف دختر کا نکل جانا بمعنی اغوا ہو جانا مطلوب ہے۔

اب تک آپ جن مختلف اقسام کی صنائع بدائع سے متعارف ہو چکے ہیں ان کا ایک نقشہ پیش کر دینا آپ کی یادداشت کیلئے کافی کارآمد ثابت ہوگا۔

۱۔ اختصار

۱۔ الفاظ کی مخلوط بندشوں کے ساتھ۔
۲۔ ادنیٰ تغیر و تبدل کے ساتھ

۲۔ تکرار

۱۔ یعنی انہی الفاظ کا اعادہ
۲۔ مکمل یا جزوی
۳۔ ترتیب کو بدلاکر
۴۔ ادنیٰ تغیر کے ساتھ
۵۔ انہی الفاظ کا محاوراتی اور غیر محاوراتی استعمال

۳۔ ذومعنی استعمال

۷۔ اسم ہائے معروف اور ان کے لفظی معنی
۸۔ لغوی اور محاوراتی معانی کا استعمال
۹۔ مکمل ذومعنی الفاظ کا استعمال
۱۰۔ ابہام
۱۱۔ ابہام بمعہ تلمیح

بقول فرائڈ صنائع بدائع کا اتنی کثرت سے استعمال چشم حافظ کیلئے اندوختہ کن ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اس لمبی چوڑی فہرست کو ایک ہی عنوان کے تحت میں لکھا جائے۔ چونکہ یہ تمام کی تمام صنعتیں ایک ہی مطلب حصول کرتی ہیں اس لئے ان سب کو ضرور اکٹھا کیا جاتا ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ گروپ نمبر ۲ اور گروپ نمبر ۳ بہت آسانی سے اکٹھے کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ ذومعنی الفاظ کا استعمال فی الحقیقت تکرار اور اعادہ کی ایک مخصوص قسم ہے۔ اب یہ مسئلہ رہ گیا کہ گروپ نمبر ۱ کو کس طرح دیگر دو اقسام سے مطابق کرایا جائے۔ بقول فرائڈ یہ مسئلہ بہت آسان ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک تکرار اور اعادہ اختصار کی ایک خاص قسم ہے۔ اور ذومعنی الفاظ کے استعمال کو وہ اختصار بلا بدل (Condensation without Substitution) قرار دیتا ہے۔ اس طرح اختصار بنیادی قسم قرار پاتی ہے۔ اور اس اختصار کو وہ "کفایت شعارانہ رجحان" کا نام دیتا ہے۔

مذکورہ بالا مثالوں میں سے تقریباً ہر ایک مثال کو تحلیل کرنے سے بآسانی ہم اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ تمام صنائع بدائع اسی کفایت شعارانہ رجحان کا نتیجہ ہیں۔ لیکن ہم اس جزوی اور تفصیلی تحلیل میں پڑنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ یہ رجحان کہاں سے پیدا ہوتا ہے اور کس طرح مزاح پیدا کرنے میں سب سے پیش پیش رہتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ تمام قسم کے مزاح اس کفایت شعاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں کہ یہ "کفایت شعاری" ہمیشہ مزاح پیدا کرتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ صرف ایک مخصوص قسم کی کفایت شعاری ہی مزاح پیدا کر سکتی ہے۔ اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جب تک ہمیں کفایت شعاری کا یہ خاصہ معلوم نہ ہو جائے تب تک صنائع بدائع کو ایک عنوان کے تحت میں جمع کرنا چنداں سودمند ثابت نہ ہوگا۔ بہرکیف ہم اس خصوصیت کو معلوم کرنے سے پیشتر مزاح کی چند ایک دیگر اقسام

ملاحظہ کرلیں تاکہ بعد میں اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔

رعایت لفظی ہم نے ابھی تک اس سب سے عام صنعت کا ذکر محض اس لئے نہیں کیا کہ یہ صرف ایک پست قسم کا مزاح پیدا کرسکتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقہ بہت آسان اور سہل ہے۔ جس طرح الفاظ کے گورکھ دھندے بُننے اور ذومعنی الفاظ کی صنعتیں پیدا کرنے میں زبردست دماغی قوتوں کا استعمال ضروری ہے اس کے عین برعکس رعایت لفظی میں طرز و اسلوب کا استعمال بہت کم مقدار میں کیا جاتا ہے۔ ایہام اور بلند قسم کی مراعات النظیر میں دونوں معانی ایک ہی لفظ میں سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن زیر بحث صنعت میں اتنا ہی کافی ہے کہ دونوں معانی کے حامل الفاظ آپس میں کتابت کے طور پر یا صوتی طور پر یا کسی وجہ سے مشابہ ہوں پروفیسر کراموبل کا فقرہ ہے "اہل روما نے اپنا مذہب تبدیل کرتے وقت جوپیٹر (*Jupiter*) کو یہودی پیٹر (پطرس) *Jew-Peter* میں تبدیل کرلیا" دیگر مثال ایک ماہر علم حیوانات کو آڑے ہاتھوں لینے کے ارادے سے اس کے چند شاگردوں نے چند مختلف کیڑوں کے اعضا جمع کرکے ایک نیا کیڑا بنالیا اور پروفیسر صاحب سے پوچھا کہ یہ کونسی قسم کا *Bug* کیڑا ہے۔ پروفیسر نے برجستہ کہا *Hum*-bug ہے۔ دیگر مثال کیلئے اکبر الہ آبادی کا مصرعہ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں ؎

مس کو چولیا، مجھ سے یہ مس ٹیک ہوئی!!

فشر (*Fischer*) کا خیال ہے کہ *Pun* اور ایہام میں نمایاں فرق ہے۔ اس کے نزدیک *Pun* لفظوں کا غلط استعمال ہے کیونکہ اس میں ہم الفاظ کو ان کے معانی سے قطع نظر ان کی آواز کے سبب استعمال کرتے ہیں۔ فرائڈ کے نزدیک فشر کا یہ قول کچھ زیادہ درست نہیں۔ اور یوں بھی رعایت لفظی اور ایہام کا فرق دریافت کرنا بے معنی سا امر ہے۔ کیونکہ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ رعایت لفظی کا کمال ایہام اور مراعات النظیر کی منزل پر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مان لیا تو رعایت لفظی کا ایہام ہی کی ایک قسم بن جانا لازم ہے۔

Displacement. مزاح کی چند ایک اقسام ایسی بھی ہیں جو مذکورہ بالا عنوانات سے کسی ایک کے تحت میں بھی نہیں آسکتیں مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ دو ادیب ایک ملاقات کے کمرے میں بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں ایک لکھ پتی فرانسیسی داخل ہوئے۔ متعدد افراد ان کے ساتھ تھے۔ قدم قدم پر لوگ ان کے آگے پیچھے بچھے جاتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ایک ادیب بولا "دیکھو انیسویں صدی کے لوگ کس طرح سنہری بچھڑے (*Golden Calf*) کی پوجا کر رہے ہیں" اس پر دوسرا ادیب گویا ہوا "نہیں یہ تو عمر میں کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے"! اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مثال سے مزاح کس طور پیدا ہے۔ فشر کے نزدیک یہ ذومعنی لفظوں کے استعمال سے پیدا ہے۔ یعنی سنہری بچھڑا حرص و ہوا کے بھوت کے معنی دیتا ہے۔ اور اس سے بت پرستی کا خیال بھی ہوتا ہے۔ اور پھر اس سے ایک ایسے انسان کا تصور بھی کیا جاسکتا ہے جو بہت مالدار اور بہت احمق ہو۔ اگر ہم سنہری بچھڑے کا لفظ نکال دیں تو مزاح غائب ہو جاتا ہے۔

دیگر مثال:۔ ایک حاجت مند نے اپنے کسی امیر رشتہ دار سے دس روپے قرض لئے۔ شام کو وہی رشتہ دار اسے ایک ہوٹل میں ملا وہاں وہ حاجت مند بیٹھا پلاؤ اور زردہ اڑا رہا تھا۔ اس پر وہ رشتہ دار گویا ہوا "تم مجھ سے روپیہ ان فضول خرچیوں کیلئے قرض لیتے ہو؟" حاجت مند کا جواب یہ تھا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو جب میرے پاس روپیہ نہیں ہوتا تو میں یقیناً پلاؤ اور زردہ نہیں کھا سکتا۔ اور جب مجھے روپیہ میسر ہے تو بقول تمہارے مجھے پلاؤ اور زردہ ہرگز ہرگز نہ کھانا چاہیئے۔ اب تم ہی کہو کہ میں کب پلاؤ اور زردہ کھاؤں؟" یہاں کوئی ذومعنی الفاظ استعمال نہیں ہوئے اور نہ ہی "پلاؤ اور زردہ" کی ترکیب کی تکرار کی وجہ سے مزاح پیدا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ غریب انسان اس کے سوائے کیا کہہ سکتا تھا اور پھر منطق کی رو سے اس کا جواب کس قدر مکمل اور درست ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا جواب منطقی قوانین کی رو سے سراسر غلط ہے۔ وہ حاجت مند یہ ثبوت کرتا ہے کہ وہ ادھار لی ہوئی رقم کو جس طور چاہے خرچ کرسکتا ہے اور یہ غلط ہے۔ قرض خواہ نے اسے ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا کہ وہ اس سے روپیہ قرض لیکر کیوں اڑا رہا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی تنگ دستی کے دوران میں اسے ایسی فضول خرچی کا خیال بھی نہیں آنا چاہیئے تھا۔ یہ تھی امیر قرض خواہ کا نکتہ، لیکن اس کے جواب میں غریب قرضدار اپنے جواب کو ایک نئی طرف پھیر دیتا ہے۔ وہ اس طور جواب دیتا ہے گویا وہ سوال کا مطلب سمجھنے سے ہی قاصر رہا ہے۔

کیا جواب کا اس طرح ایک نئی طرف پھیر دینا ہی اس مثال میں مزاح پیدا کرنے کا سبب نہیں؟ پہلی مثال کو تحلیل کرنے سے معلوم

معلوم ہوگا کہ وہاں بھی یہی صنعت کارفرما تھی۔ اسی چیز کو فرائڈ Displacement کا نام دیتا ہے۔ ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ شادی کروانیوالے یہودی دلال نے شادی کے خواہاں نوجوان کو یقین دلایا تھا کہ دوشیزہ کا والد فوت ہوچکا ہے۔ منگنی کے بعد یہ راز کھلا کہ لڑکی کا باپ زندہ ہے اور زندان میں قید ہے۔ اس پر نوجوان بہت آتش زیر پا ہوا اور دلال کو اس دھوکہ دہی پر لعنت ملامت کرنے لگا۔ دلال جواب میں گویا ہوا "اور میں نے تمھیں کیا کہا تھا۔ کیا یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔۔۔ ؟" اس مثال میں ایک تو ذومعنی لفظ زندگی کا استعمال ہے اور دوسرا ۔۔۔۔ Displacement کا استعمال ہے۔ یعنی دلال زندگی کو موت سے بے تعلق کرکے اس کے محاوراتی معنی لیتا ہے۔

بے معنی الفاظ کا استعمال

اب ایسے فقرات کا بیان مقصود ہے جہاں کسی لایعنی اور بے معنی عنصر کی مدد سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو اکبر الہ آبادی مرحوم کا وہ مصرعہ جہاں انھوں نے اکبر اور امرود کا ایک ہی سانس میں تذکرہ کردکھایا ہے۔ فرائڈ نے اس کی مثال یہ دی ہے:۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ فانی انسان کیلئے مطلق پیدا نہ ہونا سب سے اعلیٰ نعمت ہے لیکن ستم یہ ہے کہ لاکھوں افراد میں مشکل سے کسی ایک کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے"۔ اس قول کا آخری حصہ بالکل بے معنی ہے اور "مشکل سے" کا شعوری استعمال اسے اور بھی بے نیاز معانی گردانتا ہے۔ دیگر مثال:۔ ایک عالم تقریر کررہا تھا کسی فقرہ پر ایوانِ اجلاس تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس پر وہ عالم اپنے قریب بیٹھے ہوئے دوستوں سے مخاطب ہوکر گویا ہوا "کیا میں نے کوئی احمقانہ فقرہ کہا تھا؟" اس عالم کا یہ فقرہ کچھ بے معنی اور بے ڈھنگا سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے معنی بہت جلد عیاں ہوجاتے ہیں اس کا مطلب یہ تھا: میں نے کیا کہا ہے۔ جسے اس احمق گروہ نے اس قدر پسند کیا؟" ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔ لیشنبرگ (Lisch- ...) حیران تھا کہ بلی کی کھال میں دو سوراخ عین اس جگہ پیدا ہیں جہاں بلی کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی باتوں پر تعجب کرنا بے معنی امر ہے۔ لیکن یہ بھی عیاں ہے کہ یہاں تعجب ظاہر کرنے والا کوئی مطلب حصول کرنا چاہتا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ یہ مقصد کیا ہے۔ اسے ہم آئندہ کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔

منطقیانہ غلط دلائل

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح منطق کے غلط استعمال سے Absurdity اور Displacement پیدا کی جاتی ہے۔ اور پھر کس طرح ان صنائع کی مدد سے مزاح پیدا کیا جاتا ہے اب منطقیانہ غلط دلائل کی ایک اور قسم ملاحظہ ہو۔ مثال:۔ ایک آدمی کسی حلوائی کی دوکان پر گیا اور ایک سیر جلیبیاں مانگیں۔ حلوائی نے موعودہ چیز باندھ اس کے حوالے کی۔ اس نے قیمت تو نہ دی لیکن جلیبیاں واپس کردیں اور کہا کہ ان کے بدلے آدھ سیر گلاب جامن دے دیئے جائیں۔ حلوائی نے مال باندھ دیا۔ وہ آدمی وہیں کھڑے کھڑے تمام گلاب جامن چٹ کرگیا اور بغیر دام چکائے وہاں سے چلنے لگا۔ حلوائی نے اسے روک کر پیسوں کا مطالبہ کیا۔ اس پر وہ گویا ہوا "بھائی پیسے کیسے؟" حلوائی نے کہا "گلاب جامنوں کے"۔ وہ بولا "لیکن وہ گلاب جامن تو میں نے جلیبیوں کے تبادلہ میں لئے تھے"۔ حلوائی نے کہا "تو پھر جلیبیوں کے ہی دام چکایئے"۔ اس نے جواب دیا "لیکن وہ تو میں نے اسی وقت تمھیں لوٹادی تھیں۔" بادی النظر میں گاہک منطقی دلائل استعمال کررہا ہے۔ لیکن ذرا غور و فکر ہمیں دلیل کی خامی سے متعارف کراتا ہے۔ گاہک نے جلیبیاں لیں اور لوٹادیں۔ سو اسے ان کے دام چکانا لازم نہیں۔ پھر اس نے گلاب جامن لئے۔ سو اسے ان کی قیمت دینا ہے۔ دیگر مثال:۔ ایک دلال شادی کے لئے لڑکی والوں کو لڑکے کے اوصاف سے روشناس کرارہا ہے اور گویا ہوتا ہے۔

لڑکے میں کوئی عیب نہیں سوائے اس کے کہ وہ کبھی کبھی پیاز کھا لیتا ہے۔

لڑکی والے:۔ بھلا یہ کبھی کبھی پیاز کھا لینا اسے کیوں لازم ٹھیرتا ہے؟

دلال:۔ جب کبھی گوشت کھاتا ہے تو پیاز بھی کھانی ہی پڑتی ہے۔

لڑکی والے:۔ اور یہ گوشت کب کھایا جاتا ہے؟

دلال:۔ ہر روز تو نہیں کھایا جاتا، البتہ جس دن شراب کا شغل ہوا تو ساتھ گوشت وغیرہ بھی شامل کرلیا۔

لڑکی والے:۔ ایں ۔ شراب بھی پیتا ہے؟

دلال:۔ ہر روز نہیں ۔ کبھی جوئے میں جیتا تو شراب پی لی!

لڑکی والے:۔ پھر تو آپ جواری بھی ٹھیرے!

دلال:۔ ہاں جب کبھی چوری میں مال ہاتھ آیا تو جوا بھی کھیل لیا۔

لڑکی والے:۔ چوری کرلیتا ہے؟

دلال :- ہاں کبھی جیل سے باہر ہو تو چوری بھی کر لی ۔

لڑکی والے :- اچھا تو قید بھی رہتا ہے ۔

دلال :- ہوا کیا ؟ کیا آپ یہ ممکن سمجھتے ہیں کہ کسی لڑکے میں ایک بھی عیب نہ ہو ؟

اس مثال میں دلال ایک عیب کیلئے وجہ جواز پیدا کرتے کرتے اس سے شدید تر عیوب بیان کر دیتا ہے ۔ اور پھر ہر ایک عیب کو انفرادی طور پر لیتے ہوئے آخری عیب کو صرف ایک عیب ہی گردانتا ہے ۔ یہ منطقی طور پر غلط ہے ۔ دیگر مثال :- بنارس کے بڑے مندر میں سب سے بڑا مہنت اپنے چیلوں کو تعلیم دے رہا تھا ۔ باتیں کرتے کرتے اس نے بے اختیار ایک چیخ ماری اور دھڑام سے الٹا جا گرا ۔ چیلوں کے استفسار پر اس نے بتایا کہ پریاگ کا بڑا مہنت ابھی ابھی فوت ہو گیا ہے ۔ اس پر تمام جماعت پریاگ کے متوفی مہنت کے ماتم میں مشغول ہو گئی ۔ کچھ دنوں کے بعد چند پجاری پریاگ سے بنارس آئے تو سبھی ان سے پوچھنے لگے کہ پریاگ کا مہنت کس عارضے سے پرلوک سدھارا تھا ۔ وہ انگشت بدنداں رہ گئے کیونکہ وہ پریاگ کے مہنت کو زندہ سلامت چھوڑ کر آئے تھے ۔ بعد میں مکمل تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ مہنت ابھی تک زندہ ہے ۔ انکشاف حالات پر ایک آدمی بنارس کے مہنت کے ایک شاگرد کو آڑے ہاتھوں لینے لگا اور بولا "تمھارا مہنت عجیب آدمی ہے ۔ اب تم نے بھی سن لیا ہو گا کہ پریاگ کا مہنت ابھی تک زندہ ہے ۔" اس پر بنارس کے مہنت کا وہ شاگرد گویا ہوا "اگر پریاگ کا مہنت زندہ ہے تو کیا ہوا ۔ کیا یہ معجزہ نہیں کہ ہمارے استاد نے اتنے فاصلے پر سے دیکھ لیا ۔" اس مثال کی منطق میں یہ غلطی ہے کہ اتنے فاصلہ سے دیکھنا بھی معجزہ ہو سکتا ہے ۔ اگر ٹھیک دیکھ لیا جائے ۔ ورنہ یہ اشراق (Telepathy) نہیں کہلا سکتا ۔ بلکہ محض گپ ہے ۔

خیال کی بے اختیار غلطیاں

ایک دلال شادی کے خواہاں لڑکے کو لڑکی والوں کے ہاں لے گیا ۔ کمرۂ ملاقات میں اکیلے بیٹھے ہوئے اس نے لڑکے کی توجہ ایک شیشے کی الماری کی طرف مبذول کرائی جو قیمتی سامان آرائش سے پُر تھی ۔ اور کہا "دیکھو ! کس قدر امیر خاندان ہے ۔" اس پر محتاط نوجوان بولا "ہو سکتا ہے کہ یہ تمام سامان محض آج کے لئے پڑوسیوں سے انھوں نے عاریتاً لیا ہو ۔" اس پر دلال گویا ہوا "کمال کرتے ہو بھلا ایسوں کو کون عاریتاً دیتا ہے !" صاف ظاہر ہے کہ دلال کے منہ سے یہ فقرہ بے اختیارانہ نکلا ہے ۔ وہ لڑکے کو لڑکی والوں کی امارت کا قائل کروانا چاہتا ہے اور بے اختیار ایک ایسا فقرہ بول جاتا ہے جو اس کی تمام محنت پر پانی پھیر دیتا ہے ۔

معانی کے برعکس الفاظ کا استعمال

فریڈرک اعظم (شہنشاہ جرمنی) نے ایک پادری کو بلا بھیجا ۔ اس پادری کی نسبت مشہور ہو چکا تھا کہ وہ جن بھوت سے ہم کلام ہوتا ہے ۔ دربار میں پیش ہونے پر بادشاہ نے اس سے پوچھا "کیا تم بھوتوں کو بلا سکتے ہو ؟" پادری جواب میں بولا "جہاں پناہ ! میں تو ان کو بلا سکتا ہوں لیکن وہ حاضر نہیں ہوتے ۔" یہاں پادری کا جواب معانی کے لحاظ سے نفی میں ہے ۔ لیکن وہ "ہاں" اور "لیکن" کے استعمال سے "نہیں" کا مفہوم لیتا ہے ۔ اسی "نہیں" کے طریقۂ اظہار پر کسی نے کہا ہے ؎

ایک ہی مطلب نہیں رکھتی تمھاری ہر "نہیں"
ایک شرما کر "نہیں" ہے ایک جھنجلا کر "نہیں"

اس صنعت کا استعمال ایشیائی شعراء کے کلام میں بھی عام ہے ۔ اور حضرت مومن دہلوی مرحوم نے تو اس میدان میں کمال کر دکھایا ہے ۔ فرماتے ہیں اور کس طنز سے فرماتے ہیں ؎

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ولہٗ

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

ایضاً

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہو گا
مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہو گا

فرائڈ نے اس صنعت کی مثال ہائنے کے کلام سے پیش کی ہے ہائنے ایک خاتون کی تعریف میں گویا ہوتا ہے ۔ وہ زہرہ (دیوی) کا مجسمہ معلوم ہوتی ہے ۔ اسی مجسمہ کی مثل وہ عمر رسیدہ ہے ۔ اسی طور اس کے دانت غائب ہیں اور اسی طرح اس کے جسم پر سفید داغ (برص) ہیں ۔ انگریزی میں اس صنعت کا بہترین استعمال شیکسپیئر نے اپنے بے مثل المیہ "جولیس سیزر" میں اس جگہ کیا ہے جہاں مارک انطونی بار بار یہ فقرہ دہراتا ہے "بروٹس ! تو ایک معزز اور شریف انسان ہے ! ـــــ"

But Brutus is an honourable man!

لیکن اس کا مطلب بین السطور یہ ہے کہ بردوش غدار ہونے پر بھی شریف انسان ہونے کا دعی ہے۔

گنجلک طریقہ اظہار مع تلمیح

ایک امریکی لطیفہ ملاحظہ ہو۔ دو غیر خاندانی آدمی تجارت میں داؤں فریب کے طفیل بہت جلد امیر ہو گئے۔ سماج میں اپنا مرتبہ بلند کرنے کی غرض سے جہاں اور مختلف ذریعے انھوں نے استعمال کئے وہاں ملک کے بہترین مصور سے اپنی قد آدم تصویریں بنوا کر ایک جلسہ میں ان کی نمائش کا انتظام بھی کیا۔ نمائش کے وقت ان میں سے ایک شخص ایک مشہور نقاد فنون لطیفہ سے جو وہاں مدعو تھا ان تصویروں کی داد کا خواہاں ہوا۔ نقاد کچھ دیر تو ان ہر دو تصویروں کو جو سامنے کی دیوار پر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر ٹنگ رہی تھیں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر تصویروں کے درمیان خالی جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "اور مسیح ناصری کہاں ہیں؟" مطلب صاف ظاہر ہے۔ نقاد کو یہ دونوں تصاویر وہ سماں یاد دلاتی ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ اور جب ان کے دونوں طرف ایک ایک چور کو دار پر کھینچا گیا تھا۔ یہ ایک سیدھی بات کو الٹ پھیر سے کہنے کا ایک انوکھا طریقہ ہے۔ اور اس میں تلمیح کا استعمال نمایاں ہے۔ واضح ہو کہ یہاں جو طریقہ تلازم استعمال کیا گیا ہے وہ قوت تخیل کا مرہون منت ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تلازم ہر طریقہ سے پیش ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہم آواز یا ہم شکل الفاظ بھی یہی مطلب حصول کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس میدان میں بڑے بڑے کارنمایاں کئے ہیں اور مروجہ محاوروں کی مدد سے بڑے بڑے شاہکار پیدا کئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کریما ببخشائے برحال بندن
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندن
عمر گذری ہے اسی بزم کی طرح داری میں
دوسری پشت ہے چندہ کی طلبگاری میں

صاحب تاریخ اردو اسے "استحصال بالجبر" کا نام دیتے ہیں۔

حذف Omission

یہ صنعت بھی جو ایک طرح کا اختصار ہے تلمیح کی ایک قسم ٹھہرتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر تلمیح میں خیال کی رو کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور چھوڑ دیا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آیا یہ خلا نیاں نمایاں ہے یا اس خلا کو پُر کرنیوالے الفاظ۔ اس لحاظ سے خلا کی مثالیں بڑھتے بڑھتے تلمیحات بن نکلتی ہیں۔ خالص خلا کی مثال ملاحظہ ہو۔ ایک دفعہ "دی آنا" میں ایک سخت قسم کا ہجوگو رہتا تھا۔ وہ اپنے قلم کی بدولت بارہا لوگوں سے پٹ چکا تھا۔ ایک جگہ گفتگو کے دوران میں کسی نے ذکر کیا کہ اس کے مخالفین میں سے کسی نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا ہے۔ اس پر کسی نے کہا کہ جب وہ (ہجوگو) یہ بات سنے گا تو بلاشبہ مار کھائے گا۔" اس مزاح کی صنعت بہت گنجلک معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ظاہری تضاد موجود ہے۔ یعنی کیونکر ہو کہ ایک آدمی محض ایک بات سننے کی وجہ سے مار کھائے۔ جب ہم خلا کو اس فقرہ سے پُر کرتے ہیں کہ "یہ بات سن کر وہ ضرور ایک عدد ہجو سپرد قلم کرے گا۔ اور یہ ہجو سن کر .... وغیرہ وغیرہ" تو تضاد غائب ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس مزاح میں جو صنعت استعمال ہوئی ہے وہ تلمیحاتی تضاد کی ایک ایسی قسم ہے جو خلا سے پیدا ہوتی ہے۔ دیگر مثال کیلئے یہ مشہور شعر ملاحظہ ہو:۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

ظاہر ہے کہ مگس کے باغ میں جانے اور خون پروانہ ہونے کے درمیان ایک ٹکڑا محذوف ہے۔ اور اس ٹکڑے کا اس طور حذف کرنا ہی اس شعر کی جان ہے۔ اسی صنعت میں ایک شعر امراؤ مرزا انور دہلوی کا ہوا ہے۔

نہ ہم سمجھے، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اسی طرح حذف کی عیاں ترین مثال مرزا غالب مرحوم کا مشہور شعر ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

حقیقت یہ ہے کہ تلمیح ایک ایسی صنعت ہے جو ہمیشہ مزاح پیدا کرنے میں پیش پیش رہی ہے اور جو ہماری عام گفتگو میں بیحد داخل و شامل ہے۔ اس کے باوجود اس کی پائداری بیحد کم ہے اور پھر یہ ہر ملک کی روایات کے ساتھ کچھ اس طرح وابستہ ہے کہ دوسرے ممالک کے لوگ اس سے کما حقہٗ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ خیال رہے کہ ہر ایک تلمیح مزاح پیدا نہیں کر سکتی۔ صرف وہ تلمیحات مزاح پیدا کر سکتی ہیں جن میں کوئی علیحدہ مزاحیہ عنصر تلمیح کے علاوہ بھی موجود ہو۔

تقابل جیسا کہ مذکورہ بالا صنعتوں کے بیان میں عرض ہو چکا ہے ہر ایک صنعت سو فیصدی مزاح پیدا نہیں کر سکتی یعنی صرف کسی ایک صنعت کا استعمال ہی مزاح پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ نتیجۃً ہم کہہ سکتے ہیں کہ محض تقابل مزاح پیدا نہیں کر سکتا۔ پھر بھی بارہا مزاحیہ فقرات میں تقابل کا استعمال عجیب گل کھلاتا ہے مثال ا۔ میں تنقید و تبصرہ کو بچوں کی ایک بیماری سمجھتا ہوں۔ یہ بیماری اکثر شیر خوار کتابوں پر نازل ہوتی ہے۔ بارہا تندرست کتابیں اس کے حملہ کی تاب نہیں لا سکتیں۔ اور بارہا کمزور ترین تصانیف اس حملہ سے بچ نکلتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اس حملہ سے محفوظ رہیں اس حملہ سے بچنے کیلئے مختلف تدابیر بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ انتساب اور دیباچوں کے تعویذ باندھے جاتے ہیں یا بارہا تختی احترافات اور کثر نفسیوں کے سہارے بچاؤ ڈھونڈا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام نسخے اکثر نقش بر آب ثابت ہوتے ہیں۔

دیگر مثال از افادات مہدی: "غالب اگر زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی۔ جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانی پر آئی ہوئی بچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعراء سے گاڑھی چھنی۔ باقتضائے سن بری طرح کھل کھیلی۔ ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو ہو کر رہ گئے۔ اور بال بال بچی۔ آخر کار ملک کے منچلے یعنی ناول نویس یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا کبھی کبھی دبی زبان سے اسے یہ کہتے سنا ؎

اری اٹھ جاؤں گی میں صحنک سے"

فرائڈ نے لیشن برگ سے ایک مثال پیش کی ہے جس طرح ہوا کا رخ ظاہر کرنے کیلئے بتیس دو بتیس سمتیں مقرر ہیں اسی طرح ہمارے کردار جن ارادوں اور نیتوں کے طفیل پیدا ہوتے اور بنتے ہیں انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اور ہوا کی مختلف سمتوں کی طرح ان کو مختلف نام رکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً روٹی ــ روٹی ــ شہرت، شہرت ــ شہرت روٹی ــ لیشن برگ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جس میں اس نے صنعت تقابل کو بے معنی صفات کے ساتھ واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "ایک دوہری خواب آور خاتون اور گرجا میں ایک اکہری خواب آور تقریر"

ظاہر ہے کہ دونوں کے پس پردہ ایک بستر کا تصور ہے۔ اور دونوں جملات میں تلمیح کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ ایک حالت میں تقریر کے نوم آور اثرات کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف نیند لانا (؟) موضوع تقریر کا ذکر ہے۔ ایک مثال مشہور یہودی شاعر ہائنے کی بھی ملاحظہ ہو جو اپنی وسعت۔ قوت تقابل اور ندرت کی وجہ سے بے مثل مثال کہی جا سکتی ہے "اس کا چہرہ ایک ایسا کاغذ تھا جس پر لکھے ہوئے حروف مٹا کر کچھ اور لکھ دیا گیا ہو۔ تازہ لکھے ہوئے خوشخط کلمات انجیل کے نیچے سے آدھے مٹے ہوئے پرانے شہوت انگیز یونانی اشعار جھانکتے تھے"!!

مذکورہ بالا مثالوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ صنعت تقابل بنفسہٖ مزاح پیدا نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی کوئی دوسری صنعت محض اپنے بل بوتے پر قصر مزاح تعمیر کر سکتی ہے۔ ان نتائج کے علاوہ ہم ابھی تک باوثوق طور پر نہیں کہہ سکتے کہ تقابل میں مزاح پیدا کرنیوالا عنصر کونسا ہے۔ بہرحال ہم اس عنصر کی تحقیقات کا مسئلہ معرض التوا میں ڈال کر مزاح کے رجحانات (Tendencies) کا ذکر شروع کرتے ہیں۔

2.

مزاح کے رُجحانات

TENDENCIES OF WIT.

جہاں مزاح کی فطرت پرکھنے کیلئے کئی اور طریقے بھی پیدا ہیں وہاں ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مزاحیہ فقرات سننے والوں کے تاثرات کا مطالعہ کیا جائے یعنی اس سے کوئی خاص مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات یہ کسی مقصد کا آلۂ کار بن نکلتا ہے۔ اس حالت میں یہ بعض افراد کو خوب آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ بعض حکما ایسے مزاح کو جو بغیر کسی رجحان کے ہو مزاح مجرد (Abstract Wit) کا نام دیتے ہیں۔ لیکن فرائڈ اس کو بے ضرر مزاح (Harmless Wit) کہتا ہے

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں مزاح کی دو اقسام ہیں۔ لفظی مزاح اور معنوی مزاح۔ اس تقسیم کا اطلاق زیر بحث تقسیم پر کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ لفظی یا معنوی مزاح مجرد یا رجحانی مزاح آپس میں بالکل غیر متعلق ہیں اور ایک دوسرے سے کسی قسم کا رابطہ نہیں ڈھونڈھتے۔ فی الحقیقت یہ مزاحیہ پیداوار کی دو علیحدہ علیحدہ

قسمیں ہیں۔

بے ضرر مزاح اور رجحاناتی مزاح سب سے پہلے اس غلط فہمی کا ازالہ لازم آتا ہے کہ بے ضرر مزاح ہرگز ہرگز کمزور یا ادنیٰ (Shallow) قسم کے مزاح کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ بلکہ یہ رجحاناتی مزاح (Tendency wit) کے مقابل کی اصطلاح ہے۔ مثالوں سے بخوبی واضح کیا جاسکتا ہے کہ بے ضرر مزاح بھی فنی طور پر لاجواب شاہکار پیش کرسکتا ہے۔ اب ہم گر مزاح کے تخیلی مغز اور اس کے لفظی ملفوف پر غور کریں گے تو بقول فرائڈ اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ہمارا مزاحیہ فقرات سے لطف اندوز ہونا حاصل کلام (Contents) اور مزاحیہ حرکت (Wit activity) پر برابر برابر قائم ہے۔ اور عموماً ان میں سے ہر ایک چیز ہمیں دوسرے کی وقعت سمجھنے نہیں دیتی۔ اس لئے ہمیں مزاح کی تحلیل ہی حقیقتِ حال سے آگاہ کرسکتی ہے لفظی مزاح ہمارے اس نتیجہ پر بخوبی روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً "تجربہ صرف اُن چیزوں کے تجربہ میں آنے کو کہتے ہیں جن کا ہم تجربہ کرنا نہیں چاہتے" سن کر ہم گھبرا سے جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ضرور کوئی نئی حقیقت ہم نے سن لی ہے۔ اور ہمیں کافی مدت تک پتہ نہیں لگتا کہ اس فقرہ کی تہ میں اصل فقرہ یہ ہے "کہ حوادث درسِ عقل دیتے ہیں یعنی بقول مرزا مرحوم ؎

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

پھر بعض اوقات اس کے برعکس حالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں یعنی تخیلی مغز اس قدر مسحور کن اور تابدار ہوتا ہے کہ مزاحیہ حرکت کو ابھرنے ہی نہیں دیتا۔ مثلاً جب لیشن برگ تعجب ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح بلی کی کھال میں عین اس کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ پیدا ہیں تو بظاہر اس کے اس فقرے میں مزاح نمودار نظر آتا ہے۔ اور ساتھ ہی کسی قدر حماقت بھی۔ لیکن جب ہم سوچتے ہیں تو بقول گوئٹے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس ادیب کا ہر مزاح اپنے اندر ایک مشہور مسئلہ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ یعنی زیر بحث مزاح میں لیشن برگ نے مسئلہ ارتقا اور علت غائی (Teleological Reason) پر عجیب مزاحیہ رنگ سے روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان میں یہ بات اکبر الہ آبادی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

حکما کے نزدیک اور توجیہاتی تشریح کیلئے بے ضرر مزاح رجحاناتی مزاح کی نسبت اور ادنیٰ مزاح اعلیٰ مزاح کی نسبت کہیں زیادہ اہم ہے۔ بے ضرر اور ادنیٰ مزاح اپنی سادگی اور راستی کے سبب زود فہم ہوتے ہیں۔ اور پھر ان میں کسی چھپے ہوئے مقصد کا فقدان ہمارے ذہن کو ہر قسم کی پراگندہ خیالی سے پاک صاف رکھتا ہے۔ یہ نوعیت ہے کہ ان حالات میں ہمیں تحقیقات کرنے میں کافی سہولت ہو جاتی ہے۔

مخالفت اور کثیف مزاح ہمارا مشاہدہ اور مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ مزاح میں خوشی کا مہیج پیدا کرتے وقت رجحاناتی مزاح کو بالائے طاق رکھنا حد درجہ نامناسب ہے۔ بے ضرر مزاح درمیانہ درجے کے اثرات پیدا کرتا ہے۔ کچھ دیر کیلئے سننے والے کے چہرے پر اطمینان، بشاشت جھلکی۔ زیر لب خندہ نے کروٹ لی، اور یہ تخیل کا کرشمہ ختم ہوگیا۔ محفل کو کشتۂ زعفران بنا دینا تو صرف رجحاناتی مزاح کا ہی حصہ ہے چونکہ دونوں میں صنائع بدائع تو وہی مستعمل ہیں اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر ہم کہہ دیں کہ رجحاناتی مزاح کو شگفتگی کے یہ بے پناہ خزینے بارگاہ مطلب و مقصد سے ہی حاصل ہیں۔

جہاں بھی مزاح بے مطلب اور بے ضرر نہیں وہاں یہ زیادہ سے زیادہ دو رجحانات میں سے ایک کی خدمت کرسکتا ہے۔ یعنی یا تو یہ مخالف (Hostile) بن کر ہجو یا طنز قرار پاتا ہے یا کثیف مزاح کے دائرہ میں داخل ہو کر جنسی نمائش کا ذریعۂ اظہار بنتا ہے۔ ذہن نشین رہے کہ مزاح کا لفظی یا معنوی ہونا یہاں کچھ اثر نہیں رکھتا۔

ہم پہلے کثیف مزاح پر بحث کریں گے۔ سب جانتے ہیں کہ ابتذال و عریانیات سے جنسی واقعات یا تعلقات کو برسرِ عام لانا ہے۔ یہ تعریف ایک لحاظ سے غیر مکمل ہے۔ یعنی ایک پروفیسر عضویات کے کسی مسئلے پر تقریر کرتا ہوا بے حد عریاں ہوسکتا ہے۔ لیکن کبھی بھی ابتذال کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مبتذل مزاح کا لازمہ ہے کہ ایک تو اس کا مخاطب کسی ایسے فرد سے ہو جو اس کو شہوت سے ابھار سکے۔ دوسرا یہ ہو کہ سننے والا کہنے والے کے جنسی انتشار سے واقف ہو کر خود بھی جنسی جذبات کی رو میں بہہ جائے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سننے والا جنسی طور پر انگیخت ہونے کی بجائے کچھ گھبرا سا جائے۔ اور جذبۂ شرم محسوس کرے۔ لیکن خیال رہے کہ سننے والے کا یہ رویہ بھی کہنے والے کے جنسی انتشار کا ایک گونہ تشفی ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ مبتذل مزاح اول اول صرف جنس لطیف سے متعلق ہوتا تھا۔ اور ہم اسے ایک چھوٹے پیمانہ پر عصمت دری کی

پیش کہہ سکتے ہیں۔ اب سماجی ضروریات اور اخلاقی بندشیں اس بات کا موقع نہیں دیتے کہ ایسا مزاح عورتوں کی موجودگی میں پیش کیا جائے۔ اس لئے موجودہ دور میں ایسا مزاح پیش کرتے وقت عورتوں کی موجودگی فرض کر لی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی فرد رکیک مزاح سن کر ہنسے تو یہ بالکل ایسا ہے جیسا کوئی کسی کو جنسی پیش قدمیاں کرتے دیکھ کر خوشی ظاہر کرے۔

فی الحقیقت مبتذل مزاح جنس مخالف کو عریاں کرنے کی خواہش کو لفظی جامہ پہنانے کا دوسرا نام ہے یعنی الفاظ کے ذریعے حریف کی آنکھوں کے سامنے جسم کے مخصوص اعضا کی یا جنسی فعل کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ کہنے والے کی نظریں بھی اس تصویر پر بلا روک ٹوک پڑ رہی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے مزاح کا اولین مقصد جنسی فعل کو دیکھ کر اس سے خوشی حاصل کرنا تھا۔ یہاں بہتر ہوگا کہ حرف مطلب کو زود فہم بنانے کیلئے بنیادی اصولوں پر ایک نظر ڈالی جائے۔ جیسا کہ بہت پہلے بیان ہو چکا ہے جنسی فعل کو نمایاں دیکھنے کی خواہش ہمارے جذبۂ الفت (Libido) کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ یا زیادہ صحیح تو یہ ہے کہ آپ اس دیکھنے کو چھونے کی ترقی یافتہ حالت ہی سمجھیں۔ اور یہ تو عام بات ہے کہ دیکھنے کی خواہش اکثر چھونے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے۔ حکما کا خیال ہے کہ دیکھنے اور چھونے کا جذبۂ الفت ہر انسان میں یا تو فعلی (Active) ہوتا ہے یا انفعالی (Passive) یا بالفاظ دیگر مذکر یا مونث ہوتا ہے۔ اور پھر جذبہ جنسی کے طفیل کسی ایک طرف زیادہ زور پکڑ جاتا ہے۔ ننھے بچوں میں ننگے مظاہرے کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور بارہا نوجوان افراد میں یہ خواہش چند در چند وجوہات کے سبب ایک عارضہ بن جاتی ہے۔ جیسے مرض عریانی (Exhibitionism) کہتے ہیں۔ جنس لطیف میں اگرچہ یہ نمائش کا انفعالی جذبہ ہمیشہ جنسی حیا کے نیچے دبا رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اکثر اوقات زنانہ ملبوسات کی مدد سے اس جذبے کے اظہار کے طریقے نکال ہی لئے جاتے ہیں۔

مبتذل خیالات کا مبتذل مزاح میں تبدیل ہونے کا عمل

افراد میں یہ جذبۂ نمائش جذبۂ الفت کا ایک قابل قدر حصہ بن کر جنسی فعل کو آغاز کرنے میں مدد دیتا ہے۔ پہلے پہل جنس مخالف سے دوچار ہونے پر الفاظ کا استعمال دو وجوہات کے سبب روا رکھا جاتا ہے ایک تو جنس مخالف پر اپنی خواہش کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے اور دوسرا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جنس مخالف کی قوت تخیل ان الفاظ کے ذریعے سے اس میں ایک جنسی اشتہا پیدا کرتے ہوئے اسے انفعالی (Passive) نمائش پر اکسائے۔ اور پھر اگر جنس مخالف جلد ہی اظہار رضامندی کر دے تو یہ مبتذل مزاح جنسی فعل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر جنس مخالف رضامندی کے بجائے حریفانہ رویہ اختیار کرے تو پھر صورت حالات تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ جنسی شہوت انگیز الفاظ مبتذل مزاح کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ جنسی پیش قدمی کا [illegible] ہے۔ اس لئے انسان اس مبتذل مزاح پر ہی اکتفا کر بیٹھتا ہے۔ اور پھر دیگر جذبات الفت کے انسداد کی طرح جوں جوں اس خواہش کی راہ میں زیادہ روڑے اٹکائے جاتے ہیں توں توں یہ مزاح اپنی فطرت میں مخالف اور تکلیف دہ ہوتا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے جنس مخالف کی سرکشی مبتذل مزاح کے پیدا ہونے کی ایک ضروری بنیاد ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ انکار رضامندی التوا کا پہلو لئے ہوئے ہو۔ اور اس کی تہ میں اقرار کی جھلک نمایاں ہو۔ عورت کی طرف سے ایسے اقرار نما انکار کی معیاری صورت یہی ہے کہ کسی دیگر نر فرد کی موجودگی کی وجہ سے وہ رضامندی ظاہر نہ کر سکے۔ یہ تیسرا فرد مبتذل مزاح کے ارتقا کیلئے بہت اہم ہے۔ اس لحاظ سے یہ عورت اہمیت میں اس سے دوسرے درجے پر ہے۔ دیہاتی اور اجڈ گنوار لوگوں میں جب تک کوئی ادنیٰ قسم کی عورت موجود نہیں ہوتی تب تک مبتذل مزاح پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن مہذب سماج میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یعنی یہاں جنس لطیف کی آمد مبتذل مزاح کو ختم کر دیتی ہے اور نر افراد ایسے مزاح جن کیلئے اول اول شرمیلی عورتوں کی موجودگی فرض کر لی جاتی تھی محض غیر مخلوط مجلس کیلئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اس طرح دیکھنے والا بتدریج سننے والا بن جاتا ہے اور عورت کی جگہ ہدف مزاح ٹھیرتا ہے۔ اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی رکیک فقرے مبتذل مزاح بن جاتے ہیں۔

اب ہم اپنی تمام تر توجہ اس تیسرے فرد کی طرف اور مبتذل مزاح کی اندرونی ماہیت کی طرف مبذول کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ رجحانی مزاح کیلئے تین اشخاص ضروری ہیں۔ ایک تو مزاح پیدا کرنے والا، دوسرا اس کا مخالف مزاح یا جنسی پیش قدمی کا نشانہ۔ اور تیسرا وہ فرد جسے اصلی مزاح کا فائدہ (یعنی خوشی پیدا کرنا) حاصل ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مزاح پیدا کرنے والے کی نسبت سننے والا فرد زیادہ خوشی اور انبساط محسوس کرتا ہے۔ رجحانی

مزاح کا یہ طرفہ تعلق مبتذل مزاح میں اسی نسبت سے قائم رہتا ہے
مبتذل مزاح کے فعلیاتی عمل کو فرائڈ اس طرح بیان کرتا ہے ۔ جب نمبر۱
فرد کے جذباتِ الفت یعنی تبادلہ صہبا کی خواہش کی راہ میں روڑا اٹکایا جاتا
ہے تو وہ نمبر۲ فرد کی طرف مخالفانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے اور نمبر۳
فرد کو (جس کی موجودگی کی وجہ سے ابتداً عورت نے فرد نمبر۱ کی
خواہش پوری نہیں کی تھی) کو اپنا رفیق اور راز دار قرار دیتا ہے ۔
فرد نمبر۱ کے مبتذل مزاح کی وجہ سے عورت کو فرد نمبر۳ کے سامنے
عریاں کیا جاتا ہے اور فرد نمبر۳ اپنے جذبہ الفت کی اس آسان
تکمیل کے سبب اس مبتذل مزاح سے حد درجہ لطف اندوز ہوتا ہے

ان رکیک فقرات میں فنی طور پر مزاح کی صفات صرف اس
وقت پیدا ہوتی ہیں جب اس میں بہت مہذب اور بلند درجے کے
افراد کو شرکت حاصل ہوتی ہے ۔ اس وقت رکاکت مزاح بن نکلتی
ہے اور اس مزاحیہ عنصر کے سبب بار خاطر نہیں ٹھہرتی ۔ اس ضمن میں
جن صنائع بدائع کا استعمال روا رکھا جاتا ہے ان میں سے تلمیح یعنی
اشارہ کنایہ کا استعمال سب سے پیش پیش ہے ۔ اور پھر جس قدر بھی کنایہ
لطیف ہوگا اسی نسبت سے مزاح کا درجہ ارفع ہوگا اور اسی قدر اعلیٰ
درجہ کی محفل میں اسے بار حاصل ہوگا ۔

رجحانات کی خدمت میں مزاح کی کارکردگی

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہو چکا ہے کہ
مبتذل مزاح کن کن رجحانات کی خدمت میں کمر بستہ رہتا ہے اور کس طور
اس کی مدد سے اکثر افراد رکاوٹوں کے باوجود اپنی مخالف یا جنسی خواہشات
کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتے ہیں اور رکاوٹ سے بچ نکلتے ہیں ۔ یا ایک سلوک
راستے میں سے ہو کر طرب و انبساط حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں
فی الحقیقت یہ رکاوٹ اعلیٰ تہذیب اور تعلیم کی پیداوار ہے جس کی وجہ
سے جنس لطیف جنسی شہوانیات کو عریاں دیکھنا گوارہ نہیں کر سکتی ۔ افراد
کی اس خود ساختہ رکاوٹ کو فرائڈ (Repression) کہتا ہے
اور یقین رکھتا ہے کہ جو نفسی عمل شدید ترین عصبی امراض میں جذبات
کو نمودار ہونے سے روکتے ہیں وہی نفسی عمل یہاں بھی کارکن ہیں ۔

مزاح کی مدد سے حملے کرنا

اب ہم عناد کے رجحان اور مزاح کے
تعلقات کی طرف عنانِ قلم پھیرتے
ہیں ۔ اس میدان میں بالکل وہی حالات (Condition) پیدا
ہیں جو مبتذل مزاح کے بیان میں مذکور ہو چکے ہیں ۔ انفرادی بچپن اور
بنی نوع انسان کے اجتماعی بچپن سے ہی ہمارے جذبہ عناد کو ہمارے
جنسی جذبات کی طرح بہت سخت پابندیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے ۔ ایک تو
ہم خود بھی اتنے مہذب نہیں ہو سکے کہ اپنے دشمنوں کو بھی پیار کر سکیں
اور ایک گال پر چپت پڑنے سے دوسرا گال بھی آگے کر سکیں اور دوسرا
بقول فرائڈ فعلی عناد کے جملہ اخلاقی قوانین سے ظاہر ہے کہ وہ محدود
قبیلوں کیلئے وضع کئے گئے تھے ۔ اس وجہ سے ہم اپنے محدود حلقہ میں
جذبۂ عناد کو قابو میں رکھتے ہیں ۔ لیکن بین الاقوامی تعلقات میں ہم ان
بندشوں کو بالائے طاق رکھ دینا کچھ نامناسب نہیں سمجھتے ۔ اس مسئلہ پر
لیٹن برگ رقمطراز ہے "جہاں ہم ان دنوں کہتے ہیں "معاف کیجئے گا"
وہاں اگلے وقتوں میں ایک گھونسہ جڑ دیا جاتا تھا ۔ اب ایک طرف تو بچپن
میں یہ جذباتِ عناد خوب طاقت پکڑ جاتے ہیں ۔ اور دوسری طرف ملکی
قوانین اور تہذیبی بندشیں ہمارے اقوال و کردار کو سخت محدود کر
دیتے ہیں ۔ گفتار و افعال کے ذریعے حریفانہ جذبات کے اظہار کے رستے
مسدود پا کر مبتذل مزاح کی طرح ہم مخالف مزاح سے کام لیتے ہوئے
دیگر افراد کو اپنے برعکس اپنی حمایت پر اکساتے ہیں اور اپنے حریف کو
دوسروں کی نگاہوں سے گرا کر ہم سننے والوں کے قہقہوں کو نفرت کی
فتح و نصرت قرار دیتے ہیں ۔ ایک مثال :۔ ایک دفعہ مسٹر وینڈل فلپ
(امریکہ میں انسدادِ غلامی کے مسئلہ میں ایک مشہور کارکن) امریکہ کے کسی
شہر میں تقریر کرنے کے بعد کسی اور شہر کو واپس جا رہے تھے ۔ راہ میں
ان کی ملاقات ایک پادریوں کی جماعت کے ساتھ ہو گئی ۔ ایک پادری نے
مسٹر فلپ کو پہچان لیا اور ان سے پوچھا "کیا آپ حبشیوں کو آزادی
دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں ؟" مسٹر فلپ کے اثبات میں جواب
دینے پر وہ پادری گویا ہوا "پھر آپ پاگل خانہ میں کیوں نہیں جاتے ؟"
اس پر فلپ بولے "معاف کیجئے گا کیا آپ پادری ہیں اور روحوں کو
دوزخ میں جانے سے بچانے کی تعلیم دے رہے ہیں" پادری کے اثبات
میں جواب دینے پر انھوں نے پھر کہا "پھر آپ کیوں دوزخ کو تشریف
نہیں لیجاتے ؟" اس پر تمام سننے والوں نے وہ قہقہہ لگایا کہ پادری صاحب
کو خفیف ہو کر دوسرے کمرہ میں جانا پڑا ۔ اس مثال سے رجحاناتی مزاح
اور جذبۂ عناد کا تعلق بخوبی ظاہر ہے ۔ پادری کا رویہ بہت حریفانہ تھا
لیکن مسٹر فلپ تہذیبی قوانین کے سبب دم نہ مار سکتے تھے ۔ انھوں نے
اپنا قافیہ تنگ ہوتے دیکھکر اپنے حریف کی دلیل کو اسی پر الٹ دیا اس
سے نہ صرف انھوں نے پادری کو لاجواب اور حقیر کر دکھایا بلکہ دیگر پادریوں
کو ہنسا کر ان کو اپنی طرف کھینچ لیا ۔ دیگر مثال :۔ ایک یونانی امیر زادہ
اپنے ہم شکل نووارد سے گویا ہوا "کیا کبھی تمھاری والدہ ہمارے ہاں

نوکر تھی ؟ ـــ"

نووارد نے بے ساختہ کہا: "نہیں میرا باپ آپ کے ہاں نوکر تھا" اس مزاح کی فطرت واضح ہے ۔ مثال دیگر :- الف نے ب کو کہا "بتا سالے" (بتاسا ۔ لے یا بتا ۔ سالے) ب نے جواباً عرض کیا۔ "عاصالے" (اَ ۔ سالے یا عاصا ۔ لے) یعنی عصا لے ۔

مزاح کے سہارے بڑوں پر آوازے کسنا طعن و تشنیع کی

عیان و بیان

ممانعت بارہا بڑوں پر حملہ کرنے کیلئے یا اعتراض کرنے کیلئے رجحانا تی مزاح کا سہارا پکڑتی ہے ۔ اس لحاظ سے مزاح کی طفیل ایک تو ایسی بزرگی کے خلاف ایک سدِ سکندری کھڑی کی جاتی ہے اور دوسرا ایسے دباؤ سے راہِ مفر نکالی جاتی ہے ۔ اس ضمن میں انگارہ یا کارٹون بھی عجب سامانِ مزاح پیدا کر دکھاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس رجحان کی وجہ سے غیر مکمل اور ادنیٰ قسم کے کارٹون بھی بہت پسند کئے جاتے ہیں ۔

مزاحیہ طنز

ہم صنائع بدائع کے ضمن میں طنز کی ایک آدھ مثال پیش کر چکے ہیں ۔ اس لئے ان کا اعادہ بے معنی معلوم ہوتا ہے ۔ البتہ یہاں یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔ کہ بقول فرائڈ طنز کا بہترین اور سب سے رائج ہدف "شادی خانہ آبادی" کا مسئلہ ہے ۔ شاید اس لئے کہ ایک تو جنسی آزادی سب سے زیادہ انفرادیت کی حامل ہے اور دوسرے یہ کہ تہذیب و تمدن نے سب سے زیادہ دباؤ جنسی تعلقات پر ڈالا ہے ۔ مثال :- "بیوی چھتری کی مانند ہے لیکن ضرورت پڑنے پر بگھی کا استعمال بھی جائز ہے ۔" یہ کافی گنجلک مثال ہے جو فطری طور پر مزاح کے عنصر سے خالی ہے اور صنعت کے لحاظ سے تلمیح اور حذف کا امتزاج مجسم ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ تقابل کا استعمال بھی کافی معاون ثابت ہوتا ہے ۔ تحلیل ملاحظہ ہو :- جنسی خواہشات کی پیاس بجھانے کیلئے انسان شادی کرتا ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ زیادہ قوی خواہشات والے افراد کیلئے ایک بیوی کافی ثابت نہیں ہوتی ۔ بالکل اسی طرح جیسے چھتری زبردست بادو باراں میں انسان کو بھیگنے سے محفوظ نہیں رکھ سکتی ۔ ان حالات میں انسان بہتر حفاظت کی جگہ ڈھونڈھتا ہے ۔ یعنی بارش میں کسی کرایہ کی بگھی کا استعمال کرتا ہے اور دوسری حالت میں بازاری عورتوں سے تشفیٔ خاطر کا سامان بہم پہنچاتا ہے ۔

طنز کے تحت میں اکثر ملحدانہ فقرات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں مزاح کے سہارے مذہبی قوانین اور خدا تعالیٰ کی ذات پر بھی (نعوذ باللہ) حملے کئے جاتے ہیں ۔ اس ضمن میں ایشیائی شعرا جنت اور اس کی لوازمات کا ذکر اکثر عجیب طنزیہ پیرایہ میں کرتے ہیں ۔ اور بارہا طنز کی حد سے گذر کر شطحیات کی حد میں جا پڑتے ہیں ۔ ملاحظہ ہوں چند مثالیں :-

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جسمیں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

یا ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

اَمَوتٌ ، ثم بعثٌ ، ثُمَّ نَشرٌ
حَدِیثٌ خرافَۃٌ یَا اُمَّ عَمرو

(کیا مرنے کے بعد حشر نشر بھی ہوگا ۔ اے بی ام عمرو یہ سب تمہاری خرافات ہے)

طنز کی ایک قسم (Skeptical Wit) تشکیکی مزاح بھی ہے ۔ فرائڈ نے اس کی عجیب مثال پیش کی ہے ۔ دو یہودی ایک ریلوے اسٹیشن پر ملے ۔

پہلا یہودی :- آپ کہاں جا رہے ہیں ؟
دوسرا :- بنام کراکو جا رہا ہے ۔

پہلا یہودی :- جھوٹ بک رہے ہو ۔ جب تم مجھے اپنا کراکو جانا جتاتے ہو تو ظاہر ہے کہ تم مجھے اپنا لمبرگ جانا منوانا چاہتے ہو لیکن چونکہ مجھے یقین ہے کہ تم کراکو جا رہے ہو اس لئے تمھیں جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا ۔

باب ترتیب اگلی قسط میں پیش ہوگا ۔

(مے باقی و ماہتاب باقی)

انور مختار صدیقی

بدنامی

ایک تو برسات کی سڑی ہوئی اُمس اور پھر ذہنی خلجان ——— مولوی صاحب بنیائن اور تہمد پہنے گھر سے باہر نکل آئے۔ باہر گلی میں راٹھنڈ تھی۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دائیں جانب میونسپلٹی کا دُھندلا لیمپ ٹمٹما رہا تھا۔ سامنے مرزا جعفر اپنے مکان کے دروازے پر لیٹے اس زور سے خراٹے بھر رہے تھے جیسے سو میل کی رفتار سے کوئی موٹر سائیکل چل رہی ہو۔

"استغفر اللہ" مولوی صاحب نے کہا اور ایک لمبا سا قدم اُٹھا کر آگے بڑھ گئے۔

کلوا تیلی بالکل برہنہ اپنے پلنگ پر اس انداز سے دراز تھا جیسے سی اکھاڑے میں پچھڑ گیا ہو۔ اُس کی کھلی ہوئی دھوتی اُس کی گردن سے لپٹی ہوئی تھی اور اُس کے منہ اور ناک کے پاس کچھ پھر پھرا رہی تھی۔ اسکے ہاتھ اس طرح سے اس کے سر سے اُوپر اُٹھے ہوئے تھے جیسے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا رہا ہو، اور اُس کے پیر اس تکلیف دہ حد تک پھیلے ہوئے تھے جیسے کوئی زمیندار کسی کاشتکار کو مُرغا بنا کر لگان وصول کر رہا ہو۔ کلوا کی تیلن رامی پاس ہی زمین سے چمٹی پڑی تھی۔ ایک بچہ اُس کے کھُلے ہوئے سینے میں پیوست تھا اور دوسرا اُس کے پیروں پاس اُس کے لہنگے میں گھُسا جا رہا تھا۔

"نعوذ باللہ" مولوی صاحب بڑبڑائے اور بھونکتے ہوئے کتوں کی طرف بڑھے۔

گلی کے ایک نکڑ پر محلہ بھر کے کتے اپنا کوئی جلسہ منعقد کر رہے تھے۔ بگھیلا (محلہ کا سب سے بدمعاش اور بڑا کتا جس کو اہل محلہ بگھیلا کہتے) اپنا خطبہ صدارت پڑھ رہا تھا۔ لیکن معترضین کے درمیان بیچارا بالکل چیمبر لین بنا ہوا تھا۔ ہر طرف سے پُرجوش احتجاجی نعرے بلند ہو رہے تھے اور ایک کتے صاحب نے جو سب سے خفا معلوم ہوتے تھے اپنا دوسرا اینٹی کیپرومائز خطبہ شروع کر دیا۔ اس پر بڑی چل پوں مچی۔ "چُھٹ بھیّوں" نے بھی حلق صاف کرنا شروع کر دیا۔ تھوڑی بہت لیا ڈگی بھی ہوئی لیکن قبل اسکے کہ یہ اسپین کی خانہ جنگی کی صورت اختیار کرے مولوی صاحب موقع واردات پر پہونچ گئے۔ انہوں نے مجمع پر لاٹھی چارج کر دیا اور مجمع ان کو گالیاں دیتا کوستا اِدھر اُدھر منتشر ہو گیا۔

"کتے حرامزادے! یہ اور نیند حرام کرتے ہیں رات کو"

سامنے والے مکان سے بڑے شور و شغب کی آوازیں آرہی تھیں۔ مولوی صاحب اپنی ڈاڑھی کھجاتے مجاہدانہ انداز سے اُس کی طرف بڑھے۔ اس مکان میں چند مچھ مُنڈے، دہریہ رہتے تھے، وہ زور زور سے اول فول بک رہے تھے۔

"اللہ میاں خود بھی تو جمہوریت پسند نہیں!"

"یہ بڑے میاں کیا ظلم و تعدی، دیکھتے نہیں؟"

"اوئی! اوئی!" ایک مسخرا لڑکا بیچ میں بولا۔

"ہٹلر کی شادی چڑیل کی لڑکی سے ہو جائے"

"اوئی! اوئی!"

"یہ پاکستان سے زیادہ ضروری مسٹرستان اور مولویستان ہے۔ مُلک کے ٹکڑے ضرور ہو جانا چاہئیں"

"جہنم میں تمہاری ماں کے دو ٹکڑے ہو جانا چاہئیں" مولوی صاحب ناک بھویں سکیڑتے آگے بڑھ گئے۔

میکو بسکٹ والے کے یہاں تنور کے سامنے پانچ چھ چوڑی چکلی نعشیں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی خراٹے لے رہی تھیں۔ پاس ہی نالہ بہہ رہا تھا اور اُسکی بساندھ میں ناک نہ دی جاتی۔

"لاحول ولا قوۃ" مولوی صاحب ٹہلتے ہوئے دائیں جانب مڑ گئے۔ نیگو بنیہ اپنی دکان کے دروازے سے چپٹا پڑا تھا۔ اس کا لڑکا بھا کھسکتے کھسکتے چبوترے کے کونے پر آگیا تھا۔ نالی میں گرنے کیلئے اب صرف ایک کروٹ کی کسر رہ گئی تھی۔

بڈھا دھوبی جے رام گدھوں کے بیچ میں غافل پڑا تھا۔ یہ گدھے بڑے موذی تھے۔ سارے محلہ کو ان سے نفرت تھی لیکن وہ ہر صبح اپنی بے پناہ ڈھینچوں سے اعلان کر دیتے کہ "ہمیں تمہاری نفرت کی کوئی فکر نہیں ہم گدھے ہیں اور گدھے ہی رہیں گے" محلہ بھر میں شاید ہی کوئی فرد ہو جو سویرے اپنے بستر سے ان گدھوں کو گالیاں دیتا ہوا نہ اُٹھتا ہو۔ محلہ میں کئی دفعہ کمیٹیاں ہوئیں کہ جے رام اور اُس کے گدھوں کو محلہ سے نکال دیا جائے لیکن پھر اس کی مسکینی، اس کی بے عذر خدمت اور جوان بیوی کام آگئیں۔ محلہ بھر کے سب سفید پوشوں کی عزت کا دھی

ذمہ دار تھا اور پھر یہ کیسے گوارا کیا جاسکتا کہ اس کی بیوی ایسی جوان اور چنچل دھوبن محلہ چھوڑ دے۔

کامنی دھوبن ایسی نازک مزاج بھلا گدھوں کے بیچ میں کیا سو سکتی۔ وہ دھوبی سے دس گز کے فاصلہ پر باقاعدہ بستر لگائے پلنگ پر سو رہی تھی۔ مولوی صاحب کو اس کی بدمست نیند پر بڑا رشک آیا۔

مولوی صاحب کے جوتے کا نعل ایک اینٹ پر اتفاقیہ بجا۔ کامنی نے انگڑائی لیتے ہوئے کروٹ لی اور سر اٹھا کر مولوی صاحب کو دیکھا لیکن شاید اندھیرے میں پہچانا نہیں۔

کتوں نے اب پھر بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے شاید محلہ کے کسی دوسرے حصہ میں جلسہ منعقد کر دیا اور مولوی صاحب کے لاٹھی چارج کے خلاف دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ غیظ و غضب کا یہ طوفان تھا کہ حاضرین جلسہ میں ہر فرد اپنی جگہ مقرر بنا ہوا تھا۔ تقاریر کی روانی اور بلاغت کا یہ عالم تھا کہ دس دس منٹ تک مقرر بن سانس ہی نہ لیتے۔

کامنی نے انگڑائی کچھ اس انداز سے لی تھی جیسے کسی تیر انداز نے تیر مارا۔ مولوی صاحب نے اپنے ڈنڈے اور تسبیح کی گرفت زیادہ مضبوط کر لی۔ یہ سوچنے کے لئے کہ آگے جانا چاہیئے یا اب پلٹ چلنا چاہیئے مولوی صاحب چند لمحوں کے لئے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ دس ہی قدم آگے جدن کا مکان تھا۔ یہ بہت مشتبہ گھر تھا۔ مولوی صاحب اس کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہتے تھے۔ جدن کے دو جوان لڑکیاں تھیں اور بہت رات گئے تک لوگ ان کے پاس آتے جاتے رہتے۔

کامنی نے پھر کروٹ لی اور مولوی صاحب غیر ارادی طور پر دو چار قدم آگے بڑھ گئے اور بالکل ہی جدن کے دروازے پر آ گئے۔ سامنے سے ایک پرچھائیں آتی نظر پڑی اور قبل اس کے کہ مولوی صاحب پاس ہی والی گلی میں مڑیں اس پرچھائیں نے لپک کر "سلام علیکم" کا بم پھینک دیا۔ آنے والے کی آنکھیں مولوی صاحب کی آنکھوں سے زیادہ روشن تھیں۔

"وعلیکم اسلام" مولوی صاحب نے طوعاً کہا۔

"کہاں اس وقت حضرت مولٰنا" آنے والا قریب آ گیا۔

"تم ہو عبداللہ! کہیں نہیں گرمی بہت تھی ٹہل رہا تھا"

"ٹہل رہے تھے مولٰنا یا طواف کر رہے تھے" عبداللہ نے قہقہہ لگایا۔

مولوی صاحب کو اس موقع پر یہ مذاق بہت ناگوار گذرا۔ تاؤ آ گیا لیکن پھر یہ سمجھ کر خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے کہ واقعی وہ اس وقت نہایت مشتبہ مقام پر کھڑے ہیں۔

"مسجد جا رہا ہوں اب" مولوی صاحب نے نہایت معصومیت سے کہا۔ وہ عبداللہ کی دروغ بافیوں سے بہت ڈرتے تھے۔

"مسجد! ابھی اسی وقت۔ بڑے گھٹے ہوئے ہو!" عبداللہ نہایت بدتمیزی سے مولوی صاحب کے زہد و تقویٰ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

"جیسے تم خود ہو ویسا ہی دوسرے کو بھی سمجھتے ہو"

"من خوب می شناسم پیرانِ پارسا را" عبداللہ نے پھر قہقہہ لگایا۔

اب تو مولوی صاحب سٹپٹائے۔ ان کا قیافہ صحیح نکلا۔ عبداللہ اس بات کو بڑھانا چاہتا اور ان کو بدنام کرنے کی فکر میں تھا۔

"بھائی چلہ کھینچ رہا ہوں آج کل۔ اس وقت سے نفلیں پڑھتا ہوں"

عبداللہ بڑی حقارت سے مسکرایا "دیکھوں گا میں بھی کیسی پڑھتے ہو نفلیں؟"

ذلت اور رسوائی کے خوف سے مولوی صاحب کا دل کانپ رہا تھا۔ عبداللہ ذرا کھسکا تو مولوی صاحب فوراً ہی پیچھا چھڑانے کی خاطر مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے اور فوراً ہی دو رکعت نفلوں کی نیت باندھ لی۔ سلام پھیرا تو انہوں نے مسجد کے کٹہروں سے دیکھا کہ کامنی کے دروازے پر عبداللہ کھڑا ان کو گھور رہا ہے۔ مولوی صاحب نے پھر دو رکعت نفلوں کی نیت باندھ لی۔

نماز میں تو مولوی صاحب کی طبیعت لگی نہیں۔ وہ بار بار یہی سوچتے: "نہ پڑھی میں نے نماز اس وقت تو بہت پریشان کریگا سویرے۔ میں روز اس سے نماز پڑھنے کو کہتا یہ آج اسی کا بدلہ لے رہا ہے ملعون جہنمی شیطان ــــــــ میلاد شریف اور نماز کے لئے لوگوں کے وقت کے علاوہ کتنی رقت انگیز ہوتی ہے ایک مولوی کی زندگی! ــــــــ یہ عبداللہ گھوم رہا ہے سانڈ کی طرح رات کے وقت اور کچھ نہیں۔ اپنی عیاشیاں خود کہتا پھرتا ہے سب سے اور کچھ نہیں ــــــــ اور میں صرف ٹہلنے چلا آیا یہاں تک۔ لعنت اللہ۔ استغفراللہ نعوذ باللہ۔ لاحول ولاقوۃ!" مولوی صاحب نے پھر سلام پھیر کر دیکھا تو عبداللہ اپنی جگہ پر موجود تھا بلکہ اب تو اس کا ایک ساتھی بھی آموجود ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے پھر نیت باندھ لی۔

ــــــــ ٭٭٭ ــــــــ

"یہ کامنی کو بری نیت سے دیکھتا تھا! نکالو! اسے نکالو!"

ایک لمبا تڑنگا جلاد آیا اور اُس نے مولوی کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا سر کے اُوپر لے جاکر زور سے پھینکا ہے ——— ایک چیخ کے ساتھ مولوی صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ سویرا ہونے ہی والا تھا اور مولوی صاحب مسجد کے صحن میں سجدے میں پڑے ہوتے تھے۔ اُنہوں نے جھانک کر دیکھا تو اَب بھی عبداللہ قطب کی طرح کامنی کے دروازے پر کھڑا تھا۔

اب مولوی صاحب کے لئے صبر کا یارا نہ تھا۔ اُنہوں نے دانت پیکر اپنا ڈنڈا اُٹھایا اور تیزی سے مسجد کی سیڑھیوں سے اُترے ——— کامنی کے دروازے کے سامنے الگنی پر ایک سفید چادر پڑی ہوئی تھی! یہ تھا عبداللہ!!!

وجاہت سندیلوی!

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر

(بسلسلہ صفحہ ۱۸)

نہ داغ دل مٹائے اشکِ حسرت
نشانی ہے یہ اک نامہرباں کی

میکش کو ترے ساقی یہ نشۂ وحدت ہے
میخانۂ عالم میں آج اسکی حکومت ہے

کہتے ہو تم کہ صبر سے لو کام ہجر میں
یہ جبر تو نہیں ہے مرے اختیار کا

مہاراجہ بہادر مرگئے، ہم کو بھی مرنا ہے، آؤ چلتے چلتے کچھ بھلائی کر چلیں کہ اعمال کے سوا دُنیا کی کوئی چیز آدمی کے ساتھ نہیں جاتی۔

ماہر القادری:

بھکاری

(بسلسلہ صفحہ ۲۷)

"سالے بیچ سڑک پر اندھے ہوکر چلتے ہیں جیسے انکے باپ دادا نے سڑک مول لے لی ہو"

ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کسی کے قہقہہ کی آواز آئی۔

"کہو چوٹ تو نہیں آئی" کوئی بالکل قریب سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

ایک نورانی چہرہ مجھ پر جھکا ہوا شفقت آمیز نظروں سے میری طرف تاک رہا تھا۔

کرشن چندر سکسینہ!

مومیائی

مصر کی پُراسرار سرزمین میں جہاں اور حیرت انگیز باتیں ہیں، وہیں لاشوں کی مومیائی بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ مومیائی جس کو انگریزی میں (Mummy) کہتے ہیں قدیم زمانے میں اور ملکوں میں بھی رائج تھی۔ لیکن مصری مومیائی چار ہزار سال قبل مسیح جیسے پرانے زمانے ہی میں اپنے عروج پر پہونچ چکی تھی، جس کا ثبوت آپ کو عجائب خانوں سے کافی طور پر مل سکتا ہے۔

لاشوں کی مومیائی کیسے شروع ہوئی؟ اور کن کن طریقوں سے اس کام کو انجام دیا جاتا تھا؟ اِن سوالات کا جواب نہ صرف ایک دلچسپ داستان ہے بلکہ اسی قدر حیرت انگیز بھی ہے کہ قدیم مصری حکما کی عقل و دانش پر بے ساختہ آفریں نکلتی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دنیا کا بڑا حصہ ہنوز حیوانِ ناطق اور حیوانِ مطلق کے درمیان حدِ فاصل کے لئے کوئی گہرا خط نہیں کھینچ سکا تھا! لیکن مصریوں کے کارنامے ان مُردہ لاشوں کی بدولت آج تک زندہ ہیں۔

لاشوں کی مومیائی کیسے شروع ہوئی؟ اس کے متعلق مصر کی میتھیالوجی (Mythology) سے جو قصہ دستیاب ہوا ہے اسے چاہے آپ باور کیجئے یا نہ کیجئے، لیکن وہ اتنا دلچسپ ہے کہ اُسے سُن کر نہ صرف آپ متحیر ہوں گے بلکہ اس سے آپ حظ بھی اُٹھائیں گے۔

کہا جاتا ہے کہ مصری دیوی نوط (Nut) کو اس کے شوہر نے اُس کی بےوفائی کی وجہ سے اِن الفاظ میں بددعا دی کہ "سال کے کسی مہینے میں کسی دن اس کے اولاد نہ ہو۔" نوط کا تعلق ٹوٹ (Thoth) سے تھا جس کے ساتھ وہ نرد بازی کیا کرتی تھی۔ ان میں زیادہ تر ٹوٹ ہی جیتتا تھا۔ یہ جیت روپوں پیسوں کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ ہر روز وہ دن کا بہترواں حصہ جیت کر اپنے قبضے میں کر لیتا تھا۔ نوبت یہ اینجا رسید کہ ٹوٹ نے پورے پانچ دن جیت لئے۔ ان دنوں کو اس نے سال کے آخیر میں جوڑ دیا۔ اس طرح سال کے بارہ مہینوں کے علاوہ یہ پانچ دن زائد ہوگئے۔ نوط کے شوہر کی بددعا کا اطلاق اِن دنوں پر نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس میں سے ایک دن نوط کے ہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام اوسیرس (Osiris) رکھا گیا۔ اوسیرس مصریوں میں بڑا مقبول ثابت ہوا۔ اور اس نے انہیں فنونِ زراعت اور آئینِ تہذیب سے بہرہ ور کیا لیکن جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اچھوں کے دشمن بھی اکثر ہوتے ہیں۔ مصری دیو سیط (Set) یا طیفون (Typhon) اوسیرس کا جانی دشمن تھا۔ اس نے اوسیرس کو دھوکے سے ایک تابوت میں بند کر کے دریائے نیل میں پھینک دیا۔ جب یہ جگر گداز خبر اوسیرس کی بہن ایزیس ( ) کو، جو کہ اس کی بیوی بھی تھی، ملی تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اور اپنے بھائی اور شوہر کی تلاش میں روانہ ہوئی۔ ادھر تابوت بہتے بہتے ملک شام کے شہر ببلوس (Byblus) میں پہونچ گیا۔ اور وہاں ایک بڑا خوبصورت درخت اُگ آیا جس کی کھوکھل میں وہ تابوت پوشیدہ ہوگیا۔ بادشاہ وقت کو وہ درخت بہت بھایا اور اُس نے اس کے تنے کو کٹوا کر اپنے محل میں ستون کی طرح قائم کر دیا۔ جب ایزیس شام پہونچی اور اُسے یہ واقعہ معلوم ہوا تو اُس نے کھلائی بن کر شاہی محل میں اپنی رسائی پیدا کر لی اور شہزادے کی خدمت کر کے بادشاہ کا دل خوش کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا "بول کیا انعام مانگتی ہے؟" ایزیس نے اُس درخت کا تنا مانگ لیا۔ اور وہ اُسے مل گیا۔ لیکن طیفون تو بہرحال شیطان تھا۔ وہ کہاں چین سے بیٹھنے والا تھا۔ ایک دن ایزیس اپنے بیٹے "ہورس" سے ملنے گئی تھی۔ اس نے موقع پاکر تابوت اڑا لیا اور اوسیرس کی لاش کے چودہ ٹکڑے کر کے مختلف جگہوں پر پھینک دئے۔

ایزیس کو بڑا سخت دھکا لگا۔ لیکن جس تس طرح اس نے ان ٹکڑوں کو تلاش کر لیا۔ اس کا رونا پیٹنا دیکھ کر دیوتاؤں کو بھی رحم آگیا۔ چنانچہ سورج کے دیوتا "را" ( ) نے محکمہ دیوتاؤں کو حکم دیا کہ اِن سب ٹکڑوں کو جوڑ کر ان پر پٹیاں لپیٹ دیں۔ اور اس کی مومیائی بنا دیں۔ اس طرح اوسیرس کو نئی زندگی مل گئی..... اور یوں پہلی مومیائی بنائی گئی۔

اتباعِ عام دستور رہے۔ اس واقعہ کی یادگار میں یا شاید حیاتِ نو کی اُمید میں تمام مصریوں نے اپنے مردوں کی مومیائی بنوانا شروع کر دیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے مصرِ قدیم کے تقریباً تمام باشندے حشر نشر پر اعتقاد رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد روح کو مختلف امتحانوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ان میں پوری اُتری تو

تو ایک نہ ایک دن پھر جسم میں واپس آ کر لاش کو زندہ کر دیتی ہے۔ اس لئے لاش کو بہترین حالت میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ نیکی بدی کے حساب کتاب میں اکثر سحر و جادو کی بھی ضرورت پڑتی ہے جس کے اثر سے نیکیوں کا پلڑا جھک جاتا ہے۔ چنانچہ جادو کے مختلف نقوش کپڑے وغیرہ پر بنا کر تابوت میں رکھدئے جاتے تھے۔

مشہور عالم یونانی مورخ ہیرو دوتس (Herodotus) نے مومیائی بنانے کی ترکیب بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:-

مصر قدیم میں پیشہ ور مومیائی ساز ہوتے تھے۔ اور تین قسم کی مومیائی بناتے تھے۔ قسم اوّل جو سب سے اعلیٰ درجے کی تھی اور جس کا خرچ صرف اُمرا اور بادشاہ ہی برداشت کر سکتے تھے، تقریباً دو سو اسّی انگریزی پونڈ یعنی اندازاً چار ہزار دو سو روپے میں پڑتی تھی۔ دوسری قسم کی قیمت ساٹھ پونڈ یعنی ساڑھے سات سو روپیہ تھی اور تیسری پر دس پونڈ یعنی ڈیڑھ سو روپے خرچ ہوتے تھے۔ جب مُردے کے ورثا، لاش کو مومیائی گر کے پاس لے جاتے تھے تو وہ اُن سے پوچھ لیتا تھا کہ کس قسم کی مومیائی تیار کی جائے اور اُنکی حسب منشا کام کر دیتا تھا۔

پہلے لوہے کے ایک خمدار ٹکڑے سے مُردے کا بھیجا ناک کے نتھنوں کی راہ نکالا جاتا تھا۔ اس کے بعد سر کو رقیق اشیا سے صاف کر کے پیٹ میں شگاف دیکر بدن کی تمام آلائش دُور کی جاتی تھی۔ اور پھر تمام جسم کو خوشبوؤں سے دھو کر خلا کو تبرکات اور دیگر مسالہ جات کے آبِ زلال سے بھر کر ستر دن تک لاش کو کسی خاص قسم کے نمک کے پانی میں رکھا جاتا تھا۔ پھر اُسے نکال کر نہایت باریک ریشم سے گوند لگا کر لپیٹ دیتے تھے۔ اس کے بعد یہ مومیائی ایک صندوق میں رکھ دیتے تھے۔ یہ صندوق مرنے والے کے بدن کے پیمانے کا ہوتا تھا جس کو سانچہ کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا اور زیادہ سستا طریقہ یہ تھا کہ پچکاریوں میں صنوبر یا دیودار کی قسم کے درختوں کا تیل بھر کر مُردہ جسم میں پہونچایا جاتا تھا۔ اور بدن کے تمام سُوراخ بند کر دئے جاتے تھے تاکہ تیل نکل نہ سکے۔ ایک معین وقت تک یہ لاش نمک کے پانی میں پڑی رہتی تھی۔ اس کے بعد اُسے نکال کر تمام سُوراخ کھول دیتے تھے تاکہ تیل نکل جائے وہ اپنے ساتھ بدن کی تمام آلائش کو تحلیل کر کے بہا لاتا تھا۔ نمک کے اثر سے بدن کا تمام گوشت گھل جاتا تھا۔ صرف کھال اور ہڈی باقی رہ جاتی تھی۔

مومیائی کا تیسرا اور سب سے زیادہ سستا طریقہ یہ تھا کہ ایک قسم کی رقیق دوا سے جسم کی آلائش صاف کر کے لاش کو ستر دن تک نمک میں رکھا جاتا تھا اور اس کے بعد لاش ورثا کے حوالے کر دی جاتی تھی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ وہ جانیں اور اُن کا کام۔

بڑے بڑے اُمرا کی بیویوں اور حسین عورتوں کی لاشیں موت کے تین چار دن بعد مومیاگر کو دی جاتی تھیں تاکہ وہ لاش کے ساتھ بے ادبی نہ کر سکیں۔

مصر میں پُرانی مومیائیاں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہیں۔ حضرتِ انسان کی دست درازیوں کی بدولت کوئی مومیائی آپ کو اصلی حالت میں مشکل سے ملیگی۔ اُنکی جگہ اب عجائب خانوں میں ہے۔ لیکن حُسنِ اتفاق سے ایک سیاح امیلیا۔ بی۔ ایڈورڈس (Emelia. B. Edwards) کو ایک مومیائی شدہ لاش کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا حال اُس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ جب لاش کو باہر نکالا گیا تو تابوت میں سے ایک پیالہ، ایک گیند اور ایک شے چرمی (cheese) کی شکل کی برآمد ہوئی۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ چونکہ تقریباً ہر ملک میں قدیم اقوام مُردوں کے ساتھ اُن کی استعمالی اشیا بھی رکھ دیتی تھیں۔ مگر ایک اور خاص بات جو اِن لاشوں میں دیکھنے میں آئی، یہ تھی کہ تقریباً سب کے دانت نہایت مضبوط اور صحیح سلامت موجود تھے۔ لندن میں دُنیا کے ڈاکٹروں کی جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں دو ڈاکٹروں نے، جنہوں نے مصر کی قدیم لاشوں کے تقریباً ۵۳۴ دانتوں کا معائنہ کیا تھا، بیان کیا کہ ڈھائی ہزار برس کے پُرانے دانتوں میں بمشکل ۸ء۲۶ فی صدی دانتوں پر زمانے کا اثر ہوا ہے۔ حالانکہ فی زمانہ باون فی صدی دانت خراب ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ مذکورہ ڈاکٹروں نے یہ بیان کی کہ قدیم مصری موٹے اور نیم سائیدہ آٹے کی روٹی کھاتے تھے۔ اس لئے روٹی کے ریزے اُن کے دانتوں میں نہیں گھُستے تھے۔ اور دانت صاف رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دانتوں کے لئے یہ ریزے ہی سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔

اکثر مصری امیر صرف لاش کی مومیائی ہی کو کافی نہ سمجھتے تھے چونکہ اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہ پتھر کے مجسمے بھی ترشوا کر رکھدیتے تھے۔ تاکہ وقت ضرورت وہ اصلی جسم کی جگہ لے لیں۔

اکثر جانوروں، مثلاً کتے، بلی، بیل، مچھلی اور سانپ وغیرہ کی مومیائی شدہ لاشیں بھی دیکھنے میں آئیں۔ لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس مقصد سے بنائی جاتی تھیں۔ یہ بات البتہ مشاہدے میں آئی کہ...

خلیل جبران کے دو ۲ مرقعے

گونگا جانور

ایک دن شام کو میں شہر سے باہر نکلا۔ میں اس وقت تخیلات کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک بوسیدہ اور غیر آباد مکان کے پاس جا پہونچا۔ قریب کے کھیتوں میں گھُن لگ گیا تھا اور مکان پر وحشت اور ویرانی برس رہی تھی۔ وہیں زمین پر مجھے ایک بیمار اور خاموش کتا نظر آیا۔ بیماری اور کمزوری سے اُس کی ایک ایک پسلی نظر آرہی تھی۔ اُس کی آنکھیں چھُپتے ہوتے سورج کی طرف تھیں۔ وہ آنکھیں جن پر ذلت کے آثار نمایاں، جن میں بیکسی اور مایوسی کے مرقعے جھلک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھوں نے بھانپ لیا ہے کہ سُورج اپنی شعاعوں کی گرمی کو اس ویرانہ سے واپس لے جارہا ہے —— وہ ویرانہ جو ایک نحیف اور بیمار جانور کا ملجا و ماویٰ ہے۔ سُورج کو وہ —— آخری بار —— اندوہناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ میں قریب ہی ٹہل رہا تھا کہ کاش میں اس بیکس کی زبان جانتا ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہمدردی اور بیمار پرسی کر سکتا۔

جب میں اُس کے بالکل قریب پہونچ گیا تو مجھے دیکھکر وہ ڈر سا گیا۔ اُس نے اپنی انتہائی طاقت کے ساتھ اپنے بیمار اور کمزور اعضا کو ہلانے کی کوشش کی۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن وہ ہل بھی نہ سکا۔ اس ناکامی کے بعد اُس نے میری طرف اپنی نظریں اُٹھائیں اس کی نظروں میں استرحام کی تلخی اور محبت و ہمدردی کی مٹھاس تھی بیکسی اور ملامت تھی۔ اس کی نگاہیں، جو گویائی کا بدل تھیں، انسان کی زبان سے زیادہ فصیح اور عورت کے آنسوؤں سے زیادہ بلیغ تھیں۔ اسکی نظروں سے میری نظریں ملیں۔ اُسکی آنکھوں نے میرے جذبۂ رحم کو جگا دیا۔ اور خود بیکسی کا مرقع بنکر میرے سامنے پھرنے لگیں۔

اِن مرقعوں میں اُس کی دردبھری کہانی تھی۔ وہ دردبھری کہانی جس کو ہماری زبان بھی پورے طور پر ادا نہیں کرسکتی۔ میں نے اُسکی نگاہوں میں محسوس کیا کہ وہ کہہ رہا ہے: "میری مصیبت اور انسان کا ظلم —— جس کا میں نشانہ بنا ہوں —— ناقابلِ بیان ہے، میں بیماریوں کا شکار بنا۔ تم نے مجھے اس ویرانے میں چھوڑ دیا۔ انسانوں کے مظالم سے تنگ آکر میں اس راکھ پر آبیٹھا جو انسانوں کے قلب سے زیادہ نرم ہے۔ میں اس ویرانے میں آکر چھُپ گیا جو انسانی رُوحوں سے کم بھیانک اور مہیب ہے۔ میں یہاں سُورج کی گرمی سے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا ہوں۔ تم میرے پاس سے چلے جاؤ۔ تم بھی تو انھیں اہلِ زمین میں سے ہو جنکے احکام ناقص ہیں، جن کے یہاں نہ انصاف ہے اور نہ وفا۔ میں ایک بیکس جانور ہوں۔ میں نے آدمی کی غلامی کی۔ دن رات اس کی خدمت میں رہا۔ اس کے گھر میں وفادار اور مخلص بن کر رہا۔ ہمیشہ اس کے ساتھ اس کی حفاظت کرتا ہوا چلا۔ میں اُس کے غم کا ساتھی اور اُس کی خوشی میں شریک رہا۔ اس کی جُدائی میں پریشان اور اس کے آنے کا مُنتظر رہا۔ میں اس کے دسترخوان کے ٹکڑوں اور اُس کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں پر عمر بھر قناعت کرتا رہا لیکن —— آہ —— جب بوڑھا اور کمزور ہوگیا، بیماری اور لاچاری نے اپنے ناخن میرے جسم میں گڑو دئے۔ تو اُس نے اپنے گھر سے مجھکو نکال دیا۔ میں شریر اور بے رحم لڑکوں کے ڈھیلوں کا نشانہ بنا۔ اس وقت میں دُنیا بھر کی بُرائیوں کا مرکز تھا —— اے ابنِ آدم! میں ایک کمزور جانور ہوں لیکن میں تمہارے ان بھائیوں کی طرح ہوں جن کے قویٰ کمزور ہوگئے، جن کی روزی کے لالے پڑ گئے اور جن کی حالت خراب و خستہ ہے۔ میں فوج کے اس سپاہی کی طرح ہوں جو وطن کے لئے جوانی میں لڑتا ہے اور بڑھاپے میں اُس کا صلہ چاہتا ہے۔ لیکن جب اس کی زندگی کا موسم سرما آتا ہے، وہ کارآمد نہیں رہتا اور نکال دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگ اس کو بھول جاتے ہیں۔

میں اُس عورت کی طرح ہوں کہ جب اس کا بچپن ہوتا ہے تو وہ اپنی جوانی کے لئے بناؤ سنگار کرتی ہے۔ جب وہ 'بیوی' بن جاتی ہے تو بچوں کی پرداخت میں اکثر رات رات بھر جاگتی ہے۔ اور مستقبل کے انسان پیدا کرنے اور بنانے میں انتہائی جانفشانی کرتی ہے لیکن جب وہ بوڑھی اور ضعیف ہوجاتی ہے تو اُس کی خدمات بُھلا دی جاتی ہیں۔ اس کو ناقابلِ بیان یا دو ناقابلِ التفات سمجھا جاتا ہے۔ تم کتنے ظالم ہو! اے ابنِ آدم کسقدر سنگدل!

اس کی نگاہیں باتیں کر رہی تھیں۔ میرا دل سمجھ رہا تھا۔ میری رُوح اس پر مہربان تھی اور اپنے بھائیوں سے متنفر۔ پھر جب اُس نے

اپنی پلک جھپکائی تو یہ منظر ختم ہو چکا تھا۔ سوچتا ہوا میں بھی واپس ہوا کہ "کیتنا ظالم اور سنگدل ہے انسان!

محل اور جھونپڑا

تصویر کے دو رخ:۔

محل — شام ہو چکی ہے۔ برقی قمقمے محل میں چاروں طرف جگمگا رہے ہیں۔ ملازمین زرق برق وردیاں پہنے اور سینے پر چمکتے ہوئے نشان لگائے ہوئے محل کے دروازے پر کھڑے ہیں اور آنے والوں کا استقبال کر رہے ہیں۔

باجوں کی دل فریب آواز فضا میں دور تک پھیل رہی ہے۔ امرا اور اُن کی بیگمیں اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار محل کی طرف جا رہی ہیں۔ — جہاں پہونچ کر وہ، اپنے قیمتی لباس کی نمائش کرتی ہوئی، انتہائی فخر و غرور کے ساتھ اندر داخل ہو جاتی ہیں۔

زیادہ دیر نہ ہونے پائی تھی کہ مرد کھڑے ہو گئے اور عورتوں کو ناچ کے لئے مدعو کیا گیا۔ وہ ہنسی خوشی آگے بڑھیں —— فضا میں ایک نغمہ گونجا۔ —— اور انہوں نے اپنے اپنے چاہنے والوں کو چن لیا۔ ناچ شروع ہو گیا۔

ہال کی اس وقت وہی حالت تھی جو پھولوں سے لدے ہوئے باغ کی ہوتی ہے کہ اس میں ترنم ریز ہوا کے گذر جانے سے پھول فخر و غرور سے جھومنے لگتے ہیں۔

اس فضائے نغمہ و رقص میں، آدھی رات کے قریب سب لوگ کھانے کی میز پر پہونچے۔ جس پر بہترین کھانے اور پھل چنے ہوتے تھے۔ کھانے کے بعد شراب کا دور چلا۔ جس نے سب کو بدمست کر دیا۔ اب صبح ہو گئی تھی۔ امرا و شرفا کو ہوش آ چلا تھا۔ —— جن کو رات بھر کی بیداری نے بیکار کر دیا تھا۔ شراب نوشی سے اُن کے دماغ معطل ہو گئے تھے اور اعضا رقص کی تھکن سے چور چور۔ وہ اُٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اور — گھر پہونچکر — اپنے نرم و گداز ریشمی اور مخمل بستروں میں گھس گئے۔

جھونپڑا۔ آفتاب غروب ہو گیا ہے۔ ایک بوسیدہ جھونپڑے کے دروازے پر ایک شخص موٹا جھوٹا لباس پہنے کھڑا ہے اور کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔ دروازہ کھل گیا، وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور بچوں کے قریب ہی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی نے رات کا کھانا لا کر دسترخوان پر رکھ دیا سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اور اُٹھ گئے۔ پھر ایک چراغ کے سامنے آ کر بیٹھے جس کی زرد شعاعیں اندھیرے میں تیر کی مانند پڑ رہی تھیں۔

کچھ رات گئے تک وہ باتیں کرتے رہے پھر وہاں سے اٹھکر بستروں پر دراز ہو گئے اور اپنے آپ کو نیند کی ملکہ کے سپرد کر دیا۔

صبح کے وقت وہ غریب کسان اُٹھا۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روٹی اور دودھ کا ناشتہ کیا۔ اپنے کاندھوں پر بھاری کدال رکھا اور بچوں کو پیار کر کے کھیت کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں اُس کو خون پسینہ ایک کر کے اپنی روزی حاصل کرنا تھی۔ وہ سرمایہ دار کی طرح کاہل نہیں ہے جو اپنی راتیں — کل رات کی طرح — عیاشی اور آرام طلبی میں بسر کرتے ہیں۔

آفتاب پہاڑ کی آڑ سے نکل آیا اور گرمی کی شدت دھیرے دھیرے بڑھتی جا رہی تھی، یہانتک کہ دوپہر کا تیز اور روشن سورج کسان کے سر پر چمکنے لگا۔ آرام طلب سرمایہ دار اپنے اونچے اونچے محلوں میں اب تک نرم و گداز بستروں پر پڑے سو رہے تھے۔ زمین پر انسان کا یہ انتہائی ظلم ہے! کم لوگ ہیں جو اس پر غور کرتے ہیں۔

مترجمہ۔ محمد انور انصاری!

مومیائی۔

(بسلسلہ صفحہ ۶۶)

ہر ایک جانور کے دفن ہونے کا مقام علیحدہ تھا۔ مثلاً بیل کی لاش سقارہ (Saqqara) میں، بندر کی تھیبس (Thebes) میں اور کتے کی سیٹیو ([illegible]) میں پائی گئیں۔ اکثر لاشوں کے ساتھ گیہوں بھی نکلتے تھے جن کی رنگت ہزارہا برس کے زمانے نے سیاہ کر دی ہے۔ مگر یہ گیہوں بہت ہی نادر الوجود ہیں۔ اصلی گیہوں شاید قاہرہ کے عجائب گھر میں مل جائیں ورنہ اکثر مصری باشندے گیہوں کو کسی نہ کسی طرح سیاہ کر کے تحفے اور تبرک کے طور پر سیاحوں کے ہاتھ بیچتے ہیں اور بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ یہ ہے ایک مختصر سی داستان ان مصری مومیائیوں کی جن کو آج ہم عجائب خانوں میں عجوبہ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر اُن فراعنہ کی لاشیں ہیں جن کی عظمت و جبروت کے سامنے بڑے بڑوں کی گردنیں خم تھیں اکثر وہ حُسن کی دیویاں تھیں جن کا سکہ تمام ملک پر بیٹھا ہوا تھا۔ مقبروں کو دیکھکر اتنا اثر ہمارے دل پر نہیں ہوتا جتنا کہ ان لاشوں کے نظارے سے ہوتا ہے۔ غور تو کیجئے ہزارہا برس کے چلتے پھرتے انسان آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ حیرت ہے ان قدیم مصریوں کے علم پر اور آفرین ہے ان دواؤں پر جنہوں نے آجتک لاشوں کے رنگت روغن کو برقرار رکھا۔

محمد مختار زمن!

بھکاری

باوجود اسکے کہ آج تین روز سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور سردیوں کی تیز ہوا جسم کے اندر دوڑتے ہوئے گرم خون کو منجمد کرتی ہوئی کلیجو کو برما رہی تھی مگر پیٹ کی آگ تھی کہ کم ہونے کے بجائے لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔ پرسوں رات کو ایک ابلی شکرقند اور تھوڑے سے چنے ہی، جو دن بھر بھیک مانگ کر ملے تھے، کھا کر سو رہا تھا کہ کل کچھ جلد مانگنے چلا جاؤنگا۔ مگر صبح جب بھوک کی شدت سے آنکھ کھل گئی اور میں انگڑائی لیتا جھونپڑی کے دروازے پر پہونچا تو ننگے جسم پر سرد ہوا تیر کی مانند لگتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ باہر ایک بڑا طوفان آیا تھا۔ چاروں طرف خوفناک اندھیرا تھا۔ بارش زور سے ہو رہی تھی اور سردی کا یہ عالم تھا کہ خدا کی پناہ!۔

مجھے سینے کے اندر اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا۔ شکم پری کی امید یاس کی صورت میں مبتدل سامنے کھڑی تھی۔ دروازہ بند کرکے میں چٹائی پر پڑے ہوئے کمبل کو اوڑھ کر بیٹھ رہا۔ مگر پیٹ کا سوال در پیش تھا۔ کوئی اندر ہی اندر پیہم پوچھ رہا تھا "آج کھاؤ گے کیا؟"

میں نے ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح ان خیالات سے چھٹکارہ پا سکوں مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھر وہ کسی نہ کسی نئی شکل میں آکر سامنے کھڑے ہو جاتے منہ پھیلا کر سوال کرتے "آج کھاؤ گے کیا؟"

بارش کی رفتار تیز ہونے لگی اور ساتھ ہی بھوک بھی لحظہ بہ لحظہ تیز ہوتی گئی۔ ناچار کملی اوڑھ کر جھولی ہاتھ میں لی اور لاٹھی ٹیکتا ہوا مینہ برستے میں نکل پڑا۔

———— ۲ ————

شام کو جب دن بھر در بدر، بازاروں اور گلیوں میں پھرنے کے بعد جھونپڑی میں واپس آکر جھولی الٹ کر خالی کی تو چٹائی پہ مٹھی بھر مکئی۔ تھوڑے سے جو اور کچھ چاول گر پڑے۔ یہی سارے دن مینہ میں بھیگتے ہوئے مانگ کر جمع کی ہوئی پونجی۔ گیلے کمبل کو خشک ہونے کو پھیلا کر جب سرد اور ٹھٹھرتے جسم کو گرمی پہونچانے کیلئے پچھلے دن کی جمع کی ہوئی لکڑیوں سے آگ روشن کی اور چھاؤ کی ٹٹی سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا تو صبح کی نسبت بھوک کی شدت میں کچھ بھی کمی نہ تھی۔

شعلے ہوا کی مدد سے عجیب و غریب شکلیں بنانے اور بگاڑنے میں مشغول تھے۔ جھونپڑی بھی گرم اور روشن تھی۔ نظریں لپٹوں پر جمی انکے اٹھنے اور غائب ہونے کا منظر دیکھکر دنیا کی بے ثباتی کا سبق سیکھ رہی تھیں اور دماغ بے حد پراگندہ اور منتشر۔ دن بھر کے واقعات گویا تخیل کا جامہ پہن کر میرے گرد و پیش پھر رہے تھے.....

.. میں جھونپڑی سے نکلا... میرا ساتھی رام دین اپنے یہاں بیٹھا مزے سے ناریل پی رہا تھا... بولا "بڑے لوبھی ہو یار، آج بھی مانگنا نہیں چھوڑا....!"

میں نے کہا "لوبھی ہوں؟ کل سے روٹی کا ٹکڑا ابھی نہیں ——"

"ٹکڑا ابھی نہیں!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھکر چلایا اور حیرت سے اسکا منہ کھل گیا... اس نے چھینکے پر سے کپڑے میں بندھی روٹیاں اٹھائیں۔ دو سرخ موٹی روٹیوں پر گاڑھی دال رکھکر اس نے مجھے پیش کی... فقیر کی خیرات! میرا دل کانپ اٹھا۔ مگر پیٹ جو اپنی ضرورت کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اس ذلت کو بھی نظر انداز کر گیا... میں شرم سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ "بھکاری کی بھیک!" دل پھر ایک بار لرز اٹھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا "آج تمہاری ذلت کی انتہا ہو گئی۔ بھکاری کی بھیک"..... رام دین کہہ رہا تھا "اب کہاں جا رہے ہو؟ کون دیگا مینہ برستے میں تمہیں بھیک؟ یہاں ہی رہ جاؤ۔ شام کو بھی کھا لینا!"

ہر دروازے پر اپنی خودداری کو خیرباد کہکر صدا لگاتا اور ہر مرتبہ ایک نئی امید بندھتی مگر نتیجہ بیشتر وہی ہوتا جس کے ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ کسی نے بڑی مہربانی کی تو ہماری آواز کو فضول اور مہمل سمجھکر جواب ہی نہیں دیا اور کسی نے کچھ کہنے کی تکلیف گوارا بھی کی تو ایک سانس میں سینکڑوں مغلظات سنا ڈالیں اور دیا پھر بھی کچھ نہیں۔ کسی رحم دل نے مٹھی بھر چنے یا مکئی کے دانے دے بھی دیے تو یہ سمجھا کہ میں اس پر بڑا احسان کر رہا ہوں۔ اب ان چند دانوں سے مکئی اور جو کو پیسوں کہاں؟ اور کس طرح؟ اگر کہیں یہی بات ان سے کہدی جاتی تو فوراً جواب دیتے "تمہارے باپ کا کچھ قرض آتا ہے ہم پر؟ نہیں دیتے روٹی یا پیسہ! چلو، ہٹو۔ اپنی راہ لو!"

ہاں، ایک خدا ترس نے آج دو روٹیاں اور ساگ بھی دیا تھا۔ روٹیاں باریک تھیں اس لئے ہوا لگنے سے بالکل خشک ہو چکی تھیں اور جس وقت انہوں نے انکو دور سے میرے ہاتھوں پر چھوڑا تو ان میں اس طرح کی آواز پیدا ہوتی جس طرح برگد کے دو خشک پتوں کے ٹکرانے سے ہوتی ہے۔ سبزی میں تو

دُور ہی سے بُسے کی بُو آرہی تھی۔ یہ آج اس طرح کا پہلا ہی اتفاق نہ تھا۔ ہم لوگوں کو کھانے پینے کی چیز ملتی ہی جب ہے جب وہ اُس کو نہ کھا سکے ہوں اور وہ رکھے رکھے خراب ہوگئی ہو۔ مگر خیر میں بھوکا تھا اور مجھے کھانے کی ضرورت تھی۔ کھانا مل گیا۔ میں نے کہا: بابوجی خدا بھلا کرے۔ کھا۔ لوں۔ تو۔ پانی ۔"

"پانی وانی کچھ نہیں۔ کیا سب میرے ہی سر ٹھیکا ہے؟" انہوں نے بے طرح جوش میں آکر کہا: "کہیں اور پی لینا پانی۔ اب تین گھنٹے تمہارے لئے بھیگتا کون کھڑا رہے۔" اور انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ میں اُس وقت یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اِن سے تو ہمارا رام دین ہی بدرجہا بہتر ہے۔ پانی کیلئے انکار کر دیا۔ توبہ! توبہ!!

میں سوچنے لگا۔ گداگری بھی کتنی بُری چیز ہے۔ سب ہم کو ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بُری نظروں سے جس سے وہ چور، اچکے یا بدمعاش کو دیکھتے ہیں۔ ہر دروازے پر روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنی عزت اور خودداری فروخت کرنا پڑتی ہے۔ پھر بھی کوئی بھلا آدمی کچھ دیدیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں: "حرام کا کھاتے تمہیں شرم نہیں آتی؟" اور فقیر سنکر خاموشی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہمارا دُنیا کی بدترین لعنتوں میں شمار کیا جاتا ہے اور خصوصاً ہندوستان کیلئے تو یہ اس افلاس میں ایک بارِ گراں ہے ہی... آخر کیوں نہ اس کو ترک کر دوں اور محنت مزدوری کرکے باعزت طریقے پر اپنا پیٹ پالوں۔

میں نے پچھلے واقعات پر نظر ڈالی اور حافظہ پر زور دیکر غور کرنے لگا "آخر میں فقیر بنا ہی کیوں؟"

"میں چھوٹا تھا۔ ماں باپ اپنے ساتھ بھیک مانگنے لے جاتے تھے۔ مظلوم و مفلوک صورت بناکر دروازے دروازے دستک دیتے۔ زمانہ اچھا تھا لوگ کچھ نہ کچھ دے ہی دیتے تھے۔ اور اُن کی بخیر و خوبی بسر ہو جاتی تھی جب میری عمر چھ، سات برس کی ہوئی تو وہ مجھے بھی الگ ایک دروازے پر کھڑا کر دیتے۔ میں آواز لگاتا: "مائی، خدا بھلا کرے"۔ کمسنی، افلاس اور سوزِ گلو کے باعث لوگ مجھ پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور میں ماں باپ سے زیادہ مانگ لیا کرتا تھا۔ والدین خوش تھے۔ مجھے بھی اسی میں لطف آنے لگا۔ بس ایک آواز لگائی: "مائی بابا خدا بھلا کرے" اور وہاں سے کچھ نہ کچھ مل ہی گیا۔ میں خوش ہوکر آگے چل دیتا۔ کاش میں اُس وقت کی خوشی کی حقیقت سے آگاہ ہوتا۔ لوگ مجھے بھیک نہ دیتے اور میں مجبور ہو کر کوئی باعزت پیشہ اختیار کرتا۔

رفتہ رفتہ عمر کی ترقی کے ساتھ آمدنی تنزل کرتی گئی۔ ماں، باپ مرگئے اور میں آج اِس حالت کو پہونچ گیا کہ دن بھر مینہ میں بھیگ کر مانگنے پر بھی پیٹ بھر روٹی نہ مل سکی۔

شاید خدا نے میرے ساتھ ناانصافی کی یا ممکن ہے کہ یہ میرے ہی فعلوں کی سزا ہو۔ اگر میں کسی رئیس کے یہاں پیدا ہوا ہوتا تو؟ متعدد نوکر... نفیس کوٹھی... لذیذ کھانے... ناشتہ... چاء... کاش! ــــ ایک عالیشان عمارت... سردیوں کے دن... آرام دہ گرم کمرہ... کرسی... میز... اشتہا انگیز کھانے... میں... بڑا... آدمی...۔

۳

صبح جب آنکھ کھلی اور میں نے بےچینی سے چاروں طرف نظر ڈالی تو وہی پھُوس کی جھونپڑی تھی جہاں شام کو بیٹھا تھا۔ سر لکڑیوں کے ڈھیر پر تھا، اور جسم سکڑا ہوا جھاڑ کی ٹٹی سے لگا۔ لکڑیاں جل کر بجھ چکی تھیں۔ میرے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ اس وقت میرے دل کی کیفیت کا اندازہ کچھ وہی کر سکے گا جو کبھی خواب میں بادشاہ بن گیا ہو اور صبح ہونے پر سارا طلسم ٹوٹ جائے اور اپنے کو اسی چٹائی پر پڑا پائے جس پر وہ گذشتہ رات لیٹا تھا۔ اب نہ وہ عالیشان عمارت تھی نہ وہ کمرہ اور کھانے والے کا تو کہیں ذکر بھی نہیں۔ پیٹ میں کوئی پنجوں سے نوچ رہا تھا۔ آہ! بھوک! دنیا کی اولیں اور آخریں مصیبتوں کی باعث کمبخت بھوک! سارا جسم نڈھال تھا آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں اور میں نے اس سخت سردی کے موسم میں اپنے جسم میں تپ کی سی کیفیت محسوس کی۔ مگر صبر و شکر کے علاوہ چارہ ہی کیا تھا۔

بالآخر ہمت کی۔ کانپتے ہوتے ہاتھوں سے کملی سنبھالی اور لاٹھی کے سہارے مینہ برستے میں چل پڑا۔ جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی تھی مگر دل پھر بھی خوش تھا کہ آج محنت مزدوری کرکے پیٹ بھرونگا۔ چنانچہ چار چھ گھر جہاں سے کچھ مل رہنے کی اُمید تھی اُن کو بھی نظر انداز کرتا ہوا سیدھا وہاں پہونچکر خاموش کھڑا ہوگیا۔ میں ابھی اسی فکر میں تھا کہ سیٹھ جی سے مزدوری کیلئے کیسے کہوں کہ انہوں نے کمرے کے اندر سے اپنے پیروں پر شال سنبھالتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا: "کیوں کھڑا ہے بے؟ کیا بات ہے؟"

موقع کو غنیمت سمجھکر میں نے ڈرتے ڈرتے کہدیا: "مزدوری کروں گا سیٹھ جی۔"

"مزدوری؟" سیٹھ جی نے ذرا تعجب سے دُہرایا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے زیرِ لب مُسکرا کر بولے: "کیا لیگا؟"

میں نے دل میں کہا: "اتنے بڑے سیٹھ ہوکر میرے ساتھ بے ایمانی کیا کرینگے۔ اس لئے میں نے کہا: "جو مائی باپ دیدیں گے۔"

کہنے لگے: "دس پیسے ملیں گے۔"

"دس پیسے!" جیسے میرے جسم میں کسی نے نئی رُوح پھونکدی ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہوئی محسوس کی۔ میرے لئے تو چار

چھ پیسے ہی کافی تھے۔ اب شاید کچھ دنوں کے پس انداز سے میں رام دین کے احسان کا بوجھ بھی اُتار سکونگا۔ میری حالت اب بہتر۔۔۔۔

"بول، راضی ہے؟" سیٹھ جی کی گرجتی ہوئی آواز سے میرا سلسلۂ خیال ٹوٹ گیا۔

"جی" میرا مختصر جواب تھا۔

"تو جاؤ۔ اُدھر" سیٹھ جی نے اپنی توند پر سے ہاتھ اُٹھا کر انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں سے اینٹیں اُٹھا کر کام پر لیجاؤ۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کے کنارے اینٹوں کا انبار لگا تھا۔ اور سات، آٹھ مزدور رانوں تک لنگی، پھٹا ہوا چیتھڑا لپیٹے، جن کے جسم دھوپ سے سیاہ اور پیٹ مسلسل بھوکے رہنے سے اندر گھُس گئے تھے۔ کمزور پتلی گردن کے غیر متناسب سر پر دس دس بارہ بارہ اینٹیں رکھے سوکھی اور مڑی ہوئی ٹانگوں پر ڈگمگاتے چلے آرہے تھے۔ بوجھ سے انکی آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو رہے تھے اور بھویں پسینہ سے تر تھیں۔ سیٹھ جی نے ایک مزدور سے جو نسبتاً کمزور تھا اور سب سے پیچھے ذرا سُست رفتار سے چلا آرہا تھا ڈپٹ کر کہا۔ "اتنی دیر میں واپس آیا اور وہ بھی آٹھ ہی اینٹیں لیکر۔ حرام خور کہیں کا۔"

بوجھ سے دبا ہوا بیچارہ غریب کچھ نہ کہہ کر ذرا تیز رفتار سے چلنے لگا۔ یہ تھا وہ باعزت طریقہ روٹی کمانے کا جس کیلئے میں یہاں آیا تھا۔

مزدور پر سے نظریں ہٹا کر سیٹھ جی میری طرف مخاطب ہوئے۔ "تو اب کھڑا سوچتا کیا ہے؟ کام کرنا ہو تو شروع کر دے۔ میرے پیسے کوئی مفت کے ہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "سیٹھ جی تین دن کا بھوکا ہوں کچھ کھانے کو۔۔۔ مل۔۔۔ جاتے۔۔۔ تو۔۔۔ کام کرنے۔۔۔ لائق۔۔۔"

"تو کیا میرے ہی پیسوں پر اُدھار کھاتے بیٹھا تھا! عجب دستور ہے۔ میری عمر ہونے کو آئی مگر میں نے ایسا کھرا مزدور نہیں دیکھا۔ کام پیچھے پیسہ پہلے۔ بھوکا ہے تو میں کیا کروں۔ بھیک مانگ جا کر کہیں۔" سیٹھ جی ارنے بھینسے کی طرح غصہ سے لال لال آنکھیں نکالے ایک سانس میں بولتے ہی چلے گئے۔

بھیک! میں کانپ اُٹھا۔ کیا سچ مچ مجھے ساری عمر بھیک ہی مانگنی پڑیگی۔ کیا یہ قوتِ بازو سے روٹی پیدا کرنے کی کوشش بیکار جائے گی؟ کیا میری زندگی فقیری ہی میں۔۔۔۔

"اب ٹلتا ہے یہاں سے۔ موت بنکر سر پر سوار ہو گیا۔" سیٹھ جی نے اسی پر اکتفا نہ کر کے پھولی ہوئی سانس سے کہا۔ "ہو چکا تجھ سے کام۔ وہ تو تیری شکل ہی کہے دیتی ہے۔"

"سیٹھ جی۔۔۔" میری آواز کانپ رہی تھی۔

"سیٹھ جی۔ سیٹھ جی۔ کان کھا گیا جب سے۔ چل چل۔ آگے دیکھ کام۔۔۔۔ نہیں ہٹتا؟ کیا بلواؤں کسی کو؟"

"خدا بھلا کرے" میرے منہ سے نکلا اور میں لاٹھی کی مدد سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا میں نے پوچھا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

دل نے جواب دیا۔ "وہی جو تقدیر نے لکھا ہے۔"

"یعنی! فقیری؟"

دل خاموش تھا۔

کچھ دُور چل کر ایک حلوائی کی دُکان ملی۔ شیشے کی الماری میں مٹھائیاں قرینے سے سجی رکھی تھیں۔ اور ایک کڑھائی میں بھٹی پر رکھا دودھ گرم ہو رہا تھا۔ میں نے بھوک سے بیدم ہو کر کہا۔ "بابا خدا بھلا کرے۔ کچھ کھانے کو مل جائے۔"

"مٹھائی کھاؤ گے یا دودھ؟" حلوائی نے اپنے چہرے پر شیطنت کے آثار پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔ مگر مجھے اس کے تاثرات سے کیا۔ میں بھوکا تھا۔ اور مجھے کھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے کہا۔ "جو مل جائے گا بھاگوان۔"

"جو مل جائے گا بھاگوان۔" اس نے سفلی جذبے سے مغلوب ہو کر میرا منہ چڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ منہ اور مسور کی دال۔ مٹھائی کھائیں گے لاٹ صاحب۔"

"قہر درویش بر جان درویش" بھلا میں اس کا جواب کیا دیتا۔ "خدا بھلا کرے" میں لاٹھی ٹیکتا ہوا آگے قدم بڑھانے لگا۔

کیا یہ پیٹ ہی نہ تھا کہ جس نے مجھے بلا وجہ آج در بدر ذلیل و خوار کیا۔ اور نہ جانے کب تک دربدر ایسی سینکڑوں ٹھوکریں کھلوائے گا۔ آخر ان کو میرے ساتھ مذاق کر کے جلے پر نمک چھڑکنے کا کیا حق؟ میں نے مانگا اگر نہیں دینا تھا تو انکار کر دیتے۔ بس۔

قاعدہ ہے کہ اگر پہلی جگہ سے انکار ہو جائے تو اُس روز بہت مشکل ہی سے کچھ ملتا ہے۔ سیٹھ جی نے میری تضحیک کر دی تھی اور اب چار بج رہے تھے مگر میرے منہ میں ایک کھیل بھی اُڑ کر نہیں گئی تھی۔ پیٹ کی جلن اب کافی تیز ہو چکی تھی۔ میں نے خیال کیا شاید پیاس کی وجہ سے ہو۔ آج میں نے ابھی تک پانی بھی تو نہیں پیا۔ قریب ہی ایک آراستہ اور وسیع دُکان میں چار خوش پوش جوان بیٹھے تاش سے دل بہلا رہے تھے۔ میں نے عاجزی سے کہا۔ "بابو جی پانی۔ خدا بھلا کرے۔"

"پانی؟" ایک نے ٹھٹھا مارتے ہوئے کہا۔ "آج تین روز سے پانی ہی تو برس رہا ہے۔ پھر بھی تمھیں پانی کی ضرورت باقی ہی رہ گئی۔"

"پیاسا ہوں سرکار" میں نے اُنکی دل لگی کو نظر انداز کرتے ہوئے پیشتر سے زیادہ انکساری سے کہا۔

"تو وہ دیکھ، اُس طرف، وہاں پی لے" دوسرے نے ہاتھ سے اُس کوٹھی کی طرف اشارہ کیا جہاں زمین سے تقریباً چار فٹ کی اونچائی پر لوہے کے پائپ سے برساتی پانی گر رہا تھا۔ اور جب میں وہاں سے نااُمید ہو کر آگے چلنے لگا تو میں نے اُنہیں کہتے سُنا "کون جاتا سردی میں اُٹھکر اس کے لئے پانی لینے"

بھوک کی آگ پانی سے بُجھانے کے لئے میں پائپ کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ یہ ضمیر کی آواز تھی "برساتی پانی ہے۔ سامنے گھر کی غلاظت اور چھتوں کی گندگی بہہ کر آرہی ہے۔ یہ پانی کیسے پیا جاسکتا ہے؟"

مگر پیاس جو انسانی ضرورتوں میں سے شاید بھوک پر بھی اہمیت رکھتی ہے مجھ پر غالب آچکی تھی اور میں یہ کہتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہ کئی روز سے مینہ برس رہا ہے کیا اب بھی غلاظت باقی ہی رہ گئی ہوگی، پانی پینے کیلئے ہاتھ پھیلا کر نیچے بیٹھ گیا۔

جب خوب پیٹ بھر پانی پی لیا اور اُٹھنے کی کوشش کی تو آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھاگیا اور ہر طرف روشنی کے بڑے چھوٹے دائرے ناچنے لگے۔ کچھ دیر بعد جب طبیعت ذرا ٹھیک ہوئی اور پھر تلاشِ معاش کی کوشش لاحاصل کے لئے اُٹھا تو میرے کلیجے میں درد ہو رہا تھا۔ شاید پانی لگ گیا تھا۔

آپ میری حیرت پر تعجب کریں گے جب میں نے کئی سڑکوں کا چکر لگانے کے بعد اپنے کو ٹھیک اسی کوٹھی کے مقابل پایا جو کل خواب میں میری ملکیت تھی۔ پانی کی پھوار پڑ رہی تھی۔ دُود کش سے دھواں نکلکر آہستہ آہستہ غائب ہو رہا تھا اور حویلی کے اندر سے اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دل کو ایک گونہ تسلی ہوئی اور میں یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوگیا کہ اب میری بہتری کی قوی اُمید ہے۔ قدرت نے رات بدلنے ہی مجھے یہاں آنے کی خواب میں بشارت دی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے صدا لگائی "مائی خدا بھلا کرے"

تیسری آواز کے دیر بعد جبکہ میں تقریباً نااُمید ہوچکا تھا ایک ہاتھ دروازہ کھلا۔ گویا میرے سُوکھے دھانوں پر مینہ پڑگیا ہو۔ ایک عورت نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ منہ بگاڑ، ناک پر اُنگلی رکھکر بولی "اوئی اللہ، خدا کی مار ان موئے فقیروں پر جب دیکھو دروازہ پر ہی کھڑے رہتے ہیں۔ ان مُشٹنڈے بیٹوں کو مینہ بوندی میں بھی چین نہیں۔ توبہ۔ توبہ۔ میں بھی کہوں کون ملنے والا آیا ہوگا۔ ارے میں کہتی ہوں تم لوگ محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے۔ تم ایسے مشٹنڈوں کیلئے یہاں کچھ نہیں۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آواز میں رقت پیدا ہوگئی میں نے کہا "آج تین روز سے بھوکا ہوں مائی ... ایک سیٹھ کے یہاں مزدوری کے لئے بھی گیا تھا مگر ..." "آ۔ را۔ را۔ را رُھا ..." میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے کا دروازہ بند ہوچکا تھا۔ دل میں ایک زبردست جھٹکا محسوس ہوا اور اس کی رفتار ہمیشہ کے لئے مدھم پڑگئی میری ناتوانی نے شام کی سیاہی کا ساتھ دیا اور دُنیا غیر معمولی طور پر اندھیری معلوم ہونے لگی وہاں کھڑے رہنے سے فائدہ ہی کیا تھا مجبوراً لاٹھی بڑھاتی اور مخمور شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا آگے چلدیا۔

میرے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ مامانے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے فیصلہ صادر کردیا۔ مالک سے بھی ذکر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شاید وہی کچھ میری حالت پر رحم کھاتے۔ مگر جیسی رُوح ویسے فرشتے جس گھر کی نوکرانیوں کا یہ حال ہو تو اُس گھر والوں سے کیا اُمید کی جاسکتی ہے ..... جب بھیک مانگتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں محنت مزدوری کر جب محنت مزدوری کرنے جاتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں بھیک مانگ ... آخر یہ بڑے لوگ ہم پر التفات کیوں نہیں کرتے۔ جن کو خدا نے دیا ہے وہ کیوں نہیں دیتے اور جو دُنیا چاہتے ہیں اُن کو خدا نے کیوں نہیں دیا ... یہ اگر ہمارے لئے نہیں تو اپنے لئے ہی کچھ دے دیا کریں .... یہ لوگ امیر کہلانے کے جب تک ہی مستحق ہیں جب تک ہم غریبوں کا دم غنیمت ہے ورنہ پھر امارت ایک کلمہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور پھر امیر اور غریب یہ دو الفاظ دُنیا کی لغت سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے ... ... اور ... ..."

بھوں، بھوں۔ میں یکایک چونک پڑا۔ میں نے دور نزدیک اتیز مدھم، بجلی اور گیس کی متعدد روشنیاں دیکھیں ---- شاید بازار میں آ نکل ہوچکا تھا۔ بھوں۔ بھوں۔ پھر ایک مرتبہ آواز آئی اور ساتھ ہی چوراہے سے مُڑتی ہوئی دو نہایت تیز روشنیاں آگے بڑھتی ہوئی مجھ پر پڑیں۔ بھوں بھوں۔ موٹر آرہا تھا۔ میں بچنے کے لئے ایک طرف کو مُڑا اور ساتھ ہی پیچھے سے ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ کی آواز آئی جو بتدریج تیز ہوتی گئی۔ کسی نے چیخ کر کہا "ہٹ۔ بچ" مگر قبل اس کے کہ میں ایک طرف کو ہٹ سکوں مجھ سے ٹکراتا ہوا کچھ آگے بڑھتا چلا گیا اور میں مُنہ کے بل سڑک پر آرہا۔ مگر فوراً کسی نے مجھے ٹانگ پکڑ کر ایک طرف کو گھسیٹ لیا۔ تانگہ اپنی پوری رفتار سے بغیر رُکے آگے کو بڑھتا چلا گیا۔ کوچبان کہہ رہا تھا۔

(بقیہ بر صفحہ ۹۴)

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——!

(ایک لپسند روان بغداد)

ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی شروع ہوتی ہے اور ملک کے نامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے جدید طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے مگر اردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو۔ یہ طویل افسانہ ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے۔ عورت کی شوہر پرستی اور دلداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے۔ ہوس پرست حسن بین عاشق زار شوہر محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمت بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ سطر بسطر پائیں گے۔

بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینہ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے۔ اکثر نیک نفس بیویاں، انیس جلیس جیسی عفت مآب اور دیوانہ شوہر، بیوی بننا پسند کریں گی۔

خلیفہ حمزہ کے حرم کے راز سربستہ۔ بغداد کی روزمرہ زندگی خالص الف لیلائی ماحول۔ عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ۔ روح کی بیباک تنہائیں۔ عورت کا تڑپتا ہوا دل مرد کی ہوس کارانہ جنون سامانیاں پُرتکلف ایوان۔ لق و دق صحرا۔ رنج، راحت، مسرت و کلفت پہلو بہ پہلو۔

احمد جوہری اور انیس جلیس کی پُرسوز اور حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بیخودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی۔ بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے۔ نفیس عبارت۔ بلیغ طرز بیان۔ چست و رواں عبارت پڑھنے والے کو حواس پر چھا جاتی ہے۔ سرورق نہایت خوشنما مجلد قیمت عـہ

ایک کہانی چڑیلوں کی زبانی

اُردو میں اس طرز کی آج تک کوئی کہانی نہیں لکھی گئی کہ جسے مشہور انشاپردازوں نے ملکر لکھا ہے۔ یہ دلچسپ کہانی اور بھی زیادہ دلچسپ اس وجہ سے ہوگئی ہے کہ ہر انشاپرداز نے اپنا اپنا انداز بیان صرف کر دیا ہے ملا رموزی، نقش [illegible] اور پروفیسر علی عباس حسینی، سجاد حیدر بلدرم لطیف الدین احمد [illegible] حکیم احمد شجاع نے [illegible] کی زبان پیش کی ہیں کہانی [illegible] اور بھی [illegible] قیمت [illegible]

مسلمانان ہند کی حیات سیاسی!

ہندوستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاسی زندگی کا مکمل جائزہ!!

اہم وطنی تحریکوں میں مسلمانوں نے کیا شاندار قربانیاں پیش کیں ——

—— ایک شاندار مرقع!! سیاست ماقبل اور مابعد جنگ پر نہایت بے لاگ مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ!!!

نظریہ قومیت متحدہ کا بطلان خالص سیاسی اور منطقی نقطہ نظر سے کانگریس کی متعصبانہ سرگرمیوں اور ریاکارانہ سیاسی چالاکیوں کا صحیح ترین نقشہ خود اس کی اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے ان پر بڑی جامعیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ایک بلیغ انداز تحریر میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سب اہم ملکی مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جن سے اسوقت جداگانہ مسلم قومیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔

مسلم لیگ کے درخشاں کارناموں اور اس کے سیاسی مسلمات اور جداگانہ مسلم سلطنت کے قیام کی اسکیم کا صحیح جائزہ۔ اور دوسری نیم سیاسی نیم مذہبی" جماعتوں "خلافت"، "جمعیۃ العلماء" "احرار" وغیرہ کی مکمل تاریخ اور ان کا نصب العین بھی پیش کر دیا گیا ہے اور ملک کے حالات و واقعات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ جماعتیں کس حد تک مسلمانوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں!

اس کے علاوہ مارچ ۱۹۴۰ء تک کے سیاسی حالات نہایت جامعیت کے ساتھ اس کتاب میں درج کر دئے گئے ہیں حتیٰ کہ حال ہی کے کیکسٹن ہال (لندن) کے سانحہ (قتل سر مائیکل اوڈوائر سابق گورنر پنجاب) اور اس کے رد عمل کے امکانات پر بھی نہایت صفائی سے بحث کی گئی ہے!! غرض مسلم سیاست پر یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ جو مصنف کے سالہا سال کے سیاسی افکار و مطالعہ اور صحافتی تجربہ کا نتیجہ ہے۔

ہر مسلمان پر جو اپنے ملک اور اپنی سیاست سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا پڑھنا فرض ہے!

کتاب ایک محدود تعداد میں طبع ہوئی ہے۔ اس لئے اپنی کاپی محفوظ کرنے کے لئے جلد کیجئے۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات، کتابت طباعت نہایت پاکیزہ و اعلیٰ درجہ کی ہے۔ مجلد قیمت صرف عـہ

[illegible]

چندہ سالانہ پانچ روپے، ششماہی تین روپے، مع محصولڈاک فی پرچہ ۶/ ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال سالگرہ نمبر شائع ہوتا ہے خریداروں سے قیمت الگ نہیں لی

جلد ۲۲ | ساقی دہلی، بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۰ سنہ ء | نمبر ۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

اخبار "ریاست" دہلی کے ایک وارثی شذرہ سے معلوم ہوا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے موجودہ کنٹرولر مسٹر اے. ایس. بخاری کچھ عرصے بعد اپنے موجودہ عہدے سے سبکدوش ہو کر محکمہ تعلیمات پنجاب میں اپنے سابقہ عہدے پر واپس چلے جائیں گے۔ نئے کنٹرولر کوئی آئی. سی. ایس. ہونگے جو فی الحال کار آموز کی حیثیت سے بخاری صاحب سے وابستہ رہیں گے۔ اس خبر کے شائع ہونے کے بعد سے تعلیمیافتہ طبقہ میں مایوسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ہے۔ مسٹر اے. ایس. بخاری نے گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں جو خدمات انجام دی ہیں اتنی قابل قدر اور اتنی غیر معمولی ہیں کہ اُن کے مخالفین کو بھی ان کا اعتراف ہے. جس وقت سے بخاری صاحب نے دلّی میں قدم رکھا اُسی وقت سے آل انڈیا ریڈیو نے ترقی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے دلّی میں ایک کے چار اور بمبئی میں ایک کے دو بڑے اسٹیشن قائم ہوتے۔ ان کے علاوہ کلکتہ اور مدراس کے دو دو بڑے اسٹیشن بنے۔ لاہور، پشاور، لکھنؤ، ڈھاکہ اور ترچناپلی کے اسٹیشن کھولے گئے۔ اور اس طرح سارے ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو کی لہریں چھا گئیں۔ اسٹیشن قائم کرنے سے پہلے بخاری صاحب نے ہر مقام اور اُس کے قرب و جوار کا دورہ کیا۔ وہاں کے مقامی حالات کا بغائر نظر مطالعہ کیا اور ضروریات کے مطابق وہاں کے پروگرام وغیرہ تیار کرائے اور وہاں کے جملہ انتظامی اُمور کو بڑی عمدگی سے مکمل کیا۔ آل انڈیا ریڈیو کا اتنا وسیع تجربہ کسی اور افسر کو نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایسا کنٹرولر جو ہندوستان کے چپے چپے کے حالات سے واقف ہو۔ براڈکاسٹنگ کی دشواریوں پر عبور حاصل کر چکا ہو۔ اپنی اعلیٰ علمی و ادبی قابلیت کی وجہ سے کئی مسائل متنازعہ بڑی خوش اسلوبی سے حل کر رہا ہو۔ جس کا ناخن تدبیر ہر اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے میں مشّاق ہو، سوائے اے. ایس. بخاری کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آل انڈیا ریڈیو کی یہ انتہائی بدنصیبی ہوگی کہ ایسے موزوں اور لائق افسر کی سرپرستی سے محروم ہو جائے۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں ہم دی آنریبل ممبر کمیونیکیشنز سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان واقعات پر ایک بار پھر غور فرما کر ہمیں شکر گزار فرمائیں۔

پیشِ نظر اشاعت میں محمد احمد صاحب سبزواری کا مضمون بطور خاص آپ کے مطالعہ کا مستحق ہے۔ مختلف اعداد جو اس مضمون میں دیے گئے ہیں وہ بڑی محنت و کاوش سے فراہم کئے گئے ہیں۔ سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی نے اپنے بہترین افسانے پیش کئے ہیں۔ عصمت صاحبہ کا افسانہ بہت دلچسپ ہے۔ انور مختار صاحبان کا علمی مضمون نہایت وقیع ہے۔ ماہر القادری نے ستھری زبان کا نمونہ پیش کیا ہے۔ بقیہ مضامین بھی داد چاہتے ہیں لیکن۔ ع،

خامشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تُست

ساقی کی آئندہ اشاعت میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ایک معرکۃ الآرا مضمون خدائے سخن میر تقی میر پر شائع ہونے والا ہے۔ ناظرین منتظر رہیں۔ اس کے علاوہ پروفیسر بر لاس، مولوی عنایت اللہ دہلوی، کرشن چندر ایم. اے. پروفیسر محمد مسلم، عصمت چغتائی، لطیف اور اشرف صبوحی صاحبان کے شہ پارے بھی شائع ہونگے۔

شاہد

اُردو

مستقل زبان یا ہندی کی شاخ

ہندوستان میں مردم شماری کے سلسلے میں ہندی کو ایک مستقل زبان تسلیم کیا گیا ہے اور اس کو مغربی ہندی اور مشرقی ہندی، دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے، مگر اُردو کو جس کے بولنے والوں، سمجھنے والوں اور لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے مغربی ہندی کی ایک شاخ مانا گیا ہے، گویا اِسے ایک بولی سے زیادہ حیثیت نہیں دی گئی، سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے موقع پر بعض حلقوں کی جانب سے حکومت ہند کو اس فروگذاشت کی طرف توجہ دلائی گئی تھی، چونکہ وقت تنگ تھا اس لئے اس مسئلہ پر غور و خوض نہ ہو سکا اس مرتبہ ان حلقوں سے اس تحریک کو پھر اُٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ضرورت ہے کہ اُردو سے محبت کرنے والے، اور اس کی خدمت کرنے والی جماعتیں اور ادارے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں، اس سلسلہ میں انجمن ترقی اُردو، ریاست حیدرآباد اور دوسری ریاستیں کافی اثر ڈال سکتی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بتانے کیلئے کہ آیا اُردو کو ایک مستقل زبان بننے کی حیثیت حاصل ہے یا نہیں، ذیل کا مختصر سا مضمون لکھا جا رہا ہے جس میں اُردو کی پیدائش اور ترقی کا حال، اور اُردو بولنے، اور لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس سے اُردو کی صحیح صحیح اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو عرب کے تمدن و تہذیب پر عجمی رنگ بہت غالب آگیا، ہندوستان میں جو مسلمان شمال و مغرب سے داخل ہوتے وہ ایرانی اثر سے کافی متاثر ہو چکے تھے اس لئے ان کو تمدنی حیثیت سے عربوں کے بجائے "ایرانی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام سے قبل یا اسلام کے ابتدائی زمانے میں عرب کے باشندوں کے سندھ یا مغربی ساحلی مقامات سے تجارتی تعلقات تھے۔ مگر ان کا توسط سمندر تھا، یہی وجہ ہے کہ ان آنے والوں کی زبان خالص عربی رہی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں سندھی زبان پر عربی کا زیادہ اثر پڑا۔ اس کا رسم الخط بھی عربی سے ہے اور اس میں عربی کے اکثر الفاظ صحیح مستعمل ہیں[1]۔ لیکن ہندوستان میں شمال و مغرب سے آنیوالوں کی تعداد زیادہ رہی، اور ان کی زبان اب فارسی ہو چکی تھی۔ محمود غزنوی اور محمد غوری کے زمانے میں ہند پر جو حملے ہوتے گو اُس وقت فاتحین نے ملک میں مستقل طور پر قیام نہ کیا، مگر اُن کے کچھ ساتھی، سپاہی وغیرہ ہند ہی میں رہ پڑے۔ دراصل یہیں سے ایک نئی زبان کی ابتدا ہوئی۔ اس زمانے میں شمالی ہند کے بڑے حصے میں پراکرت زبان رائج تھی، جو دراصل سنسکرت کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی[2]۔ پرتھوی راج کے دربار میں چندر کوئی نامی ایک شاعر تھا جس نے سنہ ۱۱۹۳ء میں "پرتھوی راج راسا" لکھی، جس کا نمونہ یہ ہے:۔

"پتر یاتے گھال پرتھی راج بانہ دین سلطانگ۔ کر سلام
تہ بار پری آنگل سلطانگ لگت چوٹ چوہان کی ادرت تیلس
من گاری۔ بارہ بانس بین گج اونگل چار پرمان ہ[3]

یہ سنسکرت نہیں ہے، پر اس میں سلطان، سلام، فرمان وغیرہ فارسی کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے بھی پہلے کی ایک اور کتاب سنہ ۱۱۵۵ء میں نرپت لعل نے جو اُن پڑھ شاعر تھے لکھی، یہ نظم میں ہے اور اس کا نام "وسیل دیو راسو" ہے۔ اس میں جا بجا عربی اور فارسی کے الفاظ آتے ہیں[4]۔ گویا اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ محمود غزنوی اور اُسکے باپ سبکتگین نے آخری دسویں صدی یا ابتدائی گیارھویں صدی میں جو حملے ہند پر کئے اُنہوں نے یہاں کی زبان کو کافی متاثر کیا۔

یہ بالکل قدرتی چیز ہے کہ جب دو مختلف زبانیں بولنے والے ایک جگہ رہتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہونے کی

---

[1] اُردو اور اُس کے بعض تاریخی ماخذ۔ محمد ابو لیث صدیقی۔ سالنامہ سہیل سنہ ۳۶ء صفحہ ۱۰۹۔

[2] سنسکرت ایک مشکل زبان ہے اور عوام اسکے بولنے پر زیادہ قادر نہ ہو سکے اس لئے وہ صرف ادبی حیثیت تک محدود رہی مگر بولی کی حیثیت سے اُسکی شکل بگڑنے لگی، اور اس بگڑی ہوئی شکل نے دوسری ہندوستانی زبانوں کے میل جول سے پراکرت کی شکل اختیار کی، جو بعد میں ادبی زبان بھی بن گئی۔

[3] و [4] "اُردو اور اُس کے بعض تاریخی ماخذ" سالنامہ سہیل۔ صفحہ ۱۰۱۔

کوشش کرتے ہیں، اور جب ان کو رہتے سہتے ایک عرصہ ہو جاتا ہے تو آپس کے میل جول اور دو زبانوں کے اشتراک سے ایک تیسری زبان پیدا ہونے لگتی ہے۔ ہندوستان میں بھی یہی ہوا۔ پراکرت اور فارسی کے ملاپ سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی جسے ایک عرصے تک کبھی ہندوستانی، کبھی ہندی، کبھی ریختہ وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا رہا اور جو بعد میں اُردو کہلائی۔ اس لئے رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو صدر انجمن ترقی اُردو کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ:

"اُردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباواجداد سے ایک مشترکہ و مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے"

اُردو کو عربی یا فارسی کی ایک صورت تصور کرنا صحیح نہیں اور اس کا اندازہ اُردو کے الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ پروفیسر سلیم مرحوم نے سید احمد دھلوی کے مشہور لغت فرہنگ آصفیہ کے حوالے سے مختلف زبانوں کے الفاظ کی حسب ذیل جدول پیش کی ہے:۔

فرہنگ آصفیہ کے مجموعی الفاظ کی تعداد ۵۴۰۰۹ ہے جنکی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ ہندی جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی زبانوں کے بعض خاص الفاظ شامل ہیں۔	۲۱۶۴۴
۲۔ اُردو، یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کے ساتھ مل کر بنے ہیں۔	۱۷۵۰۵
۳۔ عربی۔	۷۵۸۴
۴۔ فارسی۔	۶۰۴۱
۵۔ سنسکرت	۵۵۴
۶۔ انگریزی	۵۰۰
۷۔ مختلف	۱۸۱
میزان:۔	۵۴۰۰۹

اس جدول پر نظر ڈالنے سے خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ اُردو کو عربی اور فارسی سے اتنا ربط و تعلق ہے جتنا کہ ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں سے ہے۔

اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھنا نادانی کی بات ہے، انکی مذہبی زبان عربی ہے۔ عربی کے بعد فارسی کی اہمیت ہے، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ کو پڑھے لکھے لوگ بھی نیم مذہبی حیثیت کی کتابیں سمجھتے ہیں۔ ابھی چند سال پہلے تک جب انگریزی کا زیادہ رواج نہ ہوا تھا، مسلمان بچوں اور بچیوں کو قرآن شریف اور مذہبی کتابوں کے ساتھ کریما، گلستاں، بوستاں وغیرہ ضرور پڑھائی جاتی تھیں۔ یہ سمجھنا کہ اُردو مسلمان بادشاہوں کے اثر سے پھیلی صحیح نہیں، کیونکہ دورِ شاہجہانی جس کو اُردو کے فروغ کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، اُس زمانے میں، بلکہ اورنگ زیب اور اُس کے بعد کے بادشاہوں کے زمانے میں بھی دربار کی زبان فارسی تھی۔ فرمان، احکام اور سارا کاروبار فارسی میں ہوتا تھا، حالانکہ خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہوں میں سے اکثر اُردو کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ اُردو شعرا کی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ مگر درباری زبان اور اُردو میں کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ اب تو موجودہ تحقیقات نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ اُردو کی ادبی حیثیت کی ابتدا جنوبی ہند سے ہوئی۔ چنانچہ نثر کی پہلی کتاب "معراج العاشقین" ۸۲۵ھ سے قبل لکھی جا چکی تھی۔ کیونکہ کتاب کے مصنف سید محمد گیسو دراز کا انتقال اس سال ہوا۔[۱] اُردو کا پہلا شاعر وجدی دکنی بھی دکن میں پیدا ہوا اور اسکی مثنوی "تحفہ عاشقاں" ۱۰۵۱ھ میں لکھی گئی۔[۲]

بہرحال شاہجہاں کے دور سے شمالی ہند میں اُردو کی ترقی شروع ہوئی۔ شاہ عالم ۱۷۵۹-۱۸۰۶ء اور دوسرے بادشاہ اس کے قدرداں بن گئے۔ شعر و شاعری کا آغاز ہوا۔ دلی جو برائے نام آخری مغل شہنشاہوں کا دارالخلافہ تھی اُردو کا مرکز بنی، دلی کالج قائم ہوا۔ جہاں مغربی علوم کی تعلیم کا انتظام مشرقی زبانوں میں کیا گیا۔ قرآن کے متعدد ترجمے ہوئے، نظم کے ساتھ ساتھ نثر کی کتابیں بھی اُردو میں پیدا ہونے لگیں۔ ممکن تھا کہ اُردو اپنے قدر دانوں کی بدولت اور ترقی کرتی کہ ۱۸۵۷ء میں شورش ہوئی، مغلیہ حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گُل ہوگیا۔ بادشاہ کو رنگون بھیج دیا گیا، دلی اُجڑ گئی، اور دلی کالج کا خاتمہ ہوگیا، دلی کے بعد اُردو کا دوسرا مرکز لکھنؤ تھا، وہ بھی شاہ اودھ کے مٹیا برج بھیجے جانے کی وجہ سے تباہ ہو چکا تھا، دلی اور لکھنؤ کے شریفوں، عالموں، شاعروں اور باکمالوں کو جب کوئی مربی نظر نہ آیا تو انہوں نے ریاستوں پر نظر ڈالی۔ حیدرآباد، بھوپال، رامپور، گوالیار، اور راجپوتانہ کی اکثر ہندو ریاستیں ان لوگوں کا مرکز بنیں۔ بالخصوص ابتدائی تین ریاستوں کا اُردو کی ترقی میں بڑا حصہ رہا ہے۔ دوسری طرف کچھ ہی عرصے بعد ڈاکٹر جیان گل کرائسٹ نے کلکتہ میں اورینٹل کالج قائم کیا۔ فارسی، سنسکرت اور

---

[۱] شذرات سالنامہ سہیل۔ جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ (م) ؛ [۲] "اُردو اور اُس کے ماخذ" صفحہ ۴۹ ؛

[۳] اُردو کی مختصر تاریخ : محمد احمد سبزواری۔ گہوارۂ ادب۔ جنوری ۱۹۴۳ء صفحہ ۵ ؛

انگریزی کی علمی کتابوں کے ترجمے اُردو میں کرائے، اور اُردو کی کئی ڈکشنریاں تیار کی گئیں۔ اسی زمانے کی بعض آسان اور عام فہم کتابیں ناگری رسم الخط میں شائع ہوئیں اور گویا یہیں سے اس "ہندی" کی ابتدا ہوئی جس معنوں میں آج یہ لفظ مروّج ہے جتنی زیادہ تعلیم عام اور اُونچی ہوتی گئی اُتنی ہی زیادہ فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ سے واقفیت بڑھتی گئی لوگوں نے عوام پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کیلئے مشکل الفاظ استعمال کرنا شروع کئے۔ اور دونوں زبانیں مشکل سے مشکل ہونے لگیں۔ مذہبی تعصبات نے اُردو ہندی کی بحث کڑی کر دی اور اس طرح ان دونوں کی تفریق کی خلیج دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

گو کہ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں اُردو کو پیدا ہوئے ۹۰۰ برس ہو رہے تھے مگر ابھی تک اس میں جدید معلومات کی بڑی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عرصے تک اس زبان کی حیثیت ایک بولی کی رہی۔ امیر خسرو، کبیر صاحب اور شمال و دکن کے دوسرے لوگوں نے اس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، یا گیسوئے اُردو کو سنوارنے والوں میں حاتم، میر، سودا، انیس، مومن، ذوق، غالب حالی، داغ، اکبر وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یا نثر کی لاج رکھنے والوں میں سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ، رتن ناتھ سرشار، مولانا حالی، شبلی، شرر وغیرہ ہیں۔ مگر اس کے باوجود قدیم زبانوں کے مقابلے میں وہ بڑی ہی کم مایہ تھی، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے سرسید نے ایک انجمن بنائی اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اور اسی غرض سے ۱۹۰۱ء میں انجمن ترقی اُردو قائم ہوئی جس نے علوم و فنون کی جدید کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے علاوہ قدیم کتابوں کو زندہ کرنے میں بھی بڑا حصہ لیا۔ مگر اس کے باوجود اردو کو وہ علمی حیثیت حاصل نہ ہوئی جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کمی کو ایک طرف حیدرآباد نے پورا کیا جہاں ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کی بنیاد پڑی اور اس کے ایک سال قبل دارالترجمہ قائم ہوا جہاں سے اب تک معاشیات، عمرانیات، ریاضی، کیمیا، تاریخ، فلسفہ، اور سائنس وغیرہ کی دو سو سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی تک مختلف فنون کی تعلیم اُردو زبان میں دی جاتی ہے۔ دوسری جانب تحریک ترک موالات کے زمانے میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی کوششوں سے جامعہ ملیہ دہلی قائم ہوئی، جس نے اب بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے، یہاں بھی ذریعہ تعلیم اُردو ہے، اسکے علاوہ اُس نے عام علمی، اخلاقی اور بلند پایہ کتابیں شائع کر کے اُردو کو عوام تک پہونچانے میں بڑی مدد دی ہے۔

اُردو پر ہندوؤں کو بھی اسی طرح کا حق ہے جس طرح کہ مسلمانوں کو، اور اس کی ترقی میں اُن کا بڑا ہاتھ رہا ہے، راجہ چندولال، مہاراجہ سرکشن پرشاد، تلوک چند محروم، دیا شنکر نسیم، برج نرائن چکبست، جگت موہن لال رواں، نوبت رائے نظر، ہرگوپال تفتہ، ٹیک چند بہار، درگا سہائے سرور، اردو کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ رتن ناتھ سرشار اردو کے بہترین ناول نگار تھے، منشی پریم چند کے مقابلے میں اُردو میں چھوٹے چھوٹے افسانے لکھنے والا اس پایہ کا کوئی اور شخص پیدا نہیں ہوا۔ منشی نولکشور نے اُردو کی اشاعت کے لئے ایک مطبع قائم کیا اور عرصے تک ہندوستان میں اُردو کی عمدہ طباعت کا یہی ایک واحد ادارہ تھا۔ انہوں نے "اودھ" اخبار بھی نکالا جو اَب تک جاری ہے، دلی کالج میں ماسٹر رامچندر اور اورنٹیل کالج میں للولعل کوی وغیرہ شامل رہے ہیں۔ دیا نرائن نگم، پیارے لال شاکر، اور ڈاکٹر تارا چند اُردو کے کامیاب ادیب اور جرنلسٹ ہیں، تیرتھ رام فیروزپوری نے ڈیڑھ سو سے زائد ناولوں کے اُردو ترجمے کئے ہیں، ہندوستان کی اکثر ہندو خواتین اُردو کی شاعر رہی ہیں۔ جن میں حیدرآباد کی مہ لقا بائی اور چندا بائی زیادہ مشہور ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے صدر رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو ہیں اور اس کے اسسٹنٹ سکریٹری پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے وہاں ۴۵ فی صد کے قریب ہندو لڑکے زیر تعلیم ہیں۔ یونیورسٹی میں اکثر پروفیسر اور لیکچرار اور بعض شعبوں کے چیرمین ہندو ہیں۔ خود دارالترجمے میں بعض ہندو مترجم کام کر رہے ہیں۔

ہندوستان سے کل کتنے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اُن کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ لیکن آل انڈیا پریس مینول بابت ۳۹-۱۹۳۸ء کے دیباچہ میں ان کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے جن میں برما اور لنکا کے اخبار وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مگر مینول میں جن اخباروں اور رسالوں کا تفصیلی ذکر ہے اُن کی تعداد صرف ۶۲۴ ہے، اور اس میں سے ۲۰۴ اُردو کے ہیں جو کل اخبارات کا ۳۲ فی صد ہیں۔ نیز ان میں سے ۶۱ اخبار اور رسالے ایسے ہیں جنکے ایڈیٹر، پبلشر، اور پرنٹر مسلمان نہیں ہیں۔ وہ غیر مسلم حضرات الگ ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

ہمارے اکثر بھائی اُردو کے بجائے ہندی کو ہندوستان کی "لنگوا فرنکا" قرار دیتے ہیں، مگر وہ اس سلسلے میں مدراس کے اس واقعہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں جب وہاں کانگریسی وزارت نے برسر اقتدار آکر ہندی کو رائج کرنے کی کوشش کی، اگرچہ تحریک کو حکومت اور دوسرے بڑے بڑے لیڈروں کی پوری پوری تائید حاصل تھی مگر اس کے باوجود ہزاروں آدمیوں نے اسکے خلاف ستیہ گرہ کیا اور سینکڑوں جیل گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عام زبان کے خلاف

اس قدر ہنگامہ کیوں پیدا ہوا، اس کے برخلاف ہندوستانی (اُردو) کو ہندوستان کے بڑے بڑے رہنماؤں مثلاً پنڈت جواہرلال نہرو، بابو راجندر پرشاد نے ملک کی عام زبان تسلیم کر لیا ہے۔ اور یہ کوئی نئی چیز بھی نہیں ہے بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں سے اس کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں میجر سی ای لارڈ ایم۔ اے (آکسن) جو سنٹرل انڈیا میں مردم شماری کے سپرنٹنڈنٹ تھے لکھتے ہیں:۔

"مغربی ہندی وسطی ملک کی عام زبان تھی، اور ابتدا میں گنگا کی دوآب کی مادری زبان یہی تھی، اس کے بعد دہلی سے اس کی ایک شکل کچھ فارسیت لئے ہوئے مسلمانوں کے اثر سے پھیلی اور اس طرح اُردو سارے شمالی ہند کی "لنگوا فرنکا" بن گئی"۔[۱]

اب تک ہم نے کہیں اعداد و شمار کا ذکر نہیں کیا، اب آئیے ان کی مدد سے بھی اپنے نتائج کی جانچ کر لینا چاہیئے، پہلے اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد کو لیجئے۔ ۱۹۳۱ء میں بلوچستان، سی پی و برار، دہلی، پنجاب سنٹرل انڈیا ایجنسی، حیدرآباد اور جموں وکشمیر کے اعداد دئے گئے ہیں، دوسرے مقامات کے اعداد دستیاب نہیں ہوتے۔ یہ اعداد حسب ذیل ہیں۔[۲]

ہندی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸،۸۸،۱۲۲

اُردو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲،۴۳،۲۱۸

رومن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱،۰۰،۶۰۶

سی پی و برار کے ہندی اعداد میں مرہٹی کے اعداد بھی شامل ہیں؛ نیز رومن کے متعلق لکھا ہے کہ فوج کے محکمہ میں ہندوستانی رومن خط میں لکھی جاتی ہے۔[۳] گویا یہ اعداد صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ ہندوستان میں اُردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد ہندی کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

اب اُردو بولنے والوں کی تعداد کا حال سُنئے۔ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۲۶۷ زبانیں یا بولیاں رائج ہیں جن میں سے ۲۲۵ زبانیں ہندوستان اور برما کی ہیں، ۱۷ افریقہ اور ایشیا کی اور ۲۰ یورپ کی[۴]۔ ہندوستان اور برما کی زبانوں کو ان چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

(۱) آستروی زبانیں۔
(۲) چینی تبتی زبانیں۔
(۳) دراوڑی زبانیں۔
(۴) ہندی یورپی زبانیں۔

پھر ہندی یورپی زبانوں کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:۔

- ۱ مشرقی شاخ (ایرانی)
  - بلوچی
  - پشتو
- ۲ دارد شاخ
  - شنیا
  - کاشمیری
- ۳ شمال مغربی شاخ
  - لندھا
  - سندھی
- ۴ مرکزی شاخ
  - بھیلی
  - گجراتی
  - پنجابی
  - مغربی ہندی
    - ہندوستانی
    - اُردو
    - ہندی
  - راجستھانی
- ۵ جنوبی شاخ
  - مرہٹی
- ۶ پہاڑی شاخ
  - مرکزی پہاڑی
  - مشرقی پہاڑی
  - مغربی پہاڑی
- ۷ درمیانی شاخ
  - مشرقی ہندی
- مشرقی شاخ
  - اوڑیہ
  - بہاری
  - بنگالی
  - آسامی

ہندوستان کی چند بڑی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد حسب ذیل ہے[۵]۔

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد (فی دس ہزار)	کہاں زیادہ بولی جاتی ہے؛
(۱) مغربی ہندی	۲،۴۰۱	یوپی، پنجاب صوبہ متوسط و برار، راجپوتانہ، سنٹرل انڈیا، حیدرآباد، گوالیار، دہلی؛
(۲) بنگالی	۱،۵۲۵	بنگال و آسام؛

[۱] رپورٹ بھوپال بسلسلہ سنٹرل انڈیا بابت ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۷۰؛ [۲] و [۳] رپورٹ مردم شماری ہند حصہ اول جلد اول بابت ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۹۶؛ [۴] رپورٹ مردم شماری ہند حصہ اوّل، جلد اول بابت ۱۹۳۱ء صفحہ ۳۴۵؛ [۵] رپورٹ مردم شماری حصہ اوّل، جلد اوّل صفحہ ۳۷۳؛

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد (فی دس ہزار)	کہاں زیادہ بولی جاتی ہے
(۳) بہاری	۷۹۷	بہار و اڑیسہ
(۴) تلگو	۷۵۲	حیدرآباد، مدراس، میسور
(۵) مرہٹی	۵۹۶	بمبئی، سی پی، حیدرآباد
(۶) تامل	۵۸۲	مدراس، میسور
(۷) پنجابی	۴۵۲	پنجاب، جموں، کشمیر
(۸) راجستانی	۳۹۷	راجپوتانہ، سنٹرل انڈیا
(۹) کنڑی	۳۲۰	میسور، کورگ۔
(۱۰) اڑیہ	۳۱۹	بہار، اڑیسہ، مدراس۔

اس جدول پر نظر ڈالنے سے ہی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ بنگالی، بہاری، مرہٹی، پنجابی وغیرہ مقامی زبانیں ہیں اور وہ صرف ایک مخصوص حصہ میں بولی جاتی ہیں، البتہ مغربی ہندی ہندوستان کی عام زبان ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں بولی جاتی ہے۔ اب مغربی ہندی کی تشریح سن لیجئے "ہندوستانی زبانوں کی تحقیقات" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"مغربی ہندی سرہند (پنجاب) سے الہ آباد تک بولی جاتی ہے — شمال میں مغربی ہندی ہمالیہ کے پورے نشیبی حصہ میں پھیلی ہوئی ہے، مگر جنوب میں جمنا کی وادی سے آگے نہیں بڑھی، البتہ مشرق میں یہ بندیل کھنڈ اور صوبہ متوسط و برار تک پھیل گئی ہے، اس کی مختلف بولیاں ہیں جن میں سے خاص خاص ہندوستانی، برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی ہیں۔ اب ان میں ہندوستانی ہی مغربی ہندی کی ادبی زبان ہے۔ اردو ہندوستانی کی وہ شکل ہے جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور جس میں فارسی کے کافی الفاظ استعمال ہوتے ہیں — مغربی ہندوستان کے قصبات میں ہندو اور مسلمانوں کی عام بولی یہی ہے"۔ [۱]

ہندوستان کی حلقہ واری رپورٹوں میں بعض جگہ مثلاً بمبئی، برما، سی پی و برار، اجمیر و مارواڑ، راجپوتانہ ایجنسی، ویسٹرن انڈیا ایجنسی، بڑودہ اور ٹراونکور میں صرف مغربی ہندی درج ہے۔ بعض جگہ اس کو تین شاخوں میں، اردو، ہندی اور ہندوستانی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بنگال، انڈمان، جموں و کشمیر، سنٹرل انڈیا اور صوبہ سرحد میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے، بعض جگہ اردو ہندی کے جھگڑے سے بچنے کے لئے شمار کنندوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ اردو یا ہندی کے بجائے ہندوستانی لکھیں۔ چنانچہ صوبہ متحدہ، بہار و اڑیسہ، میسور، دہلی اور پنجاب میں اس طریقے پر عمل کیا گیا۔ مدراس میں مغربی ہندی کی دو شاخیں گنی گئیں ایک ہندی اور دوسرے ہندوستانی، ہندوستانی سے ان کی مراد غالباً اردو ہے۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان کو ۲۵ حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا، اس وقت ہمیں بلوچستان، کورگ اور حیدرآباد کی رپورٹیں دستیاب نہ ہوسکیں، اردو کے لحاظ سے حیدرآباد کی کافی اہمیت ہے، اور وہاں اردو بولنے والوں کی بڑی کافی تعداد موجود ہے، بہرحال بقیہ ۲۲ رپورٹوں سے ذیل کے اعداد جمع کئے گئے ہیں۔ رپورٹوں میں دو نقشے ہیں، ایک مادری زبان کے لحاظ سے اور دوسرا ذیلی زبان کے اعتبار سے۔ ذیلی زبان سے یہ مطلب ہے کہ ایک شخص کی مادری زبان ایک ہے، مگر اس کے علاوہ وہ دوسری زبان بھی بولتا ہے، تو یہ اس کی ذیلی زبان ہوگی۔ ان دونوں نقشوں سے ذیل کے اعداد حاصل ہوتے ہیں۔

مادری زبان

نام زبان	بولنے والوں کی کل تعداد
مغربی ہندی	۹۳،۰۳،۳۰۴
ہندوستانی	۸،۵۱،۹۱،۳۷۹
اردو	۱۰،۵۶،۳۶۴
ہندی	۴۰،۴۴،۷۸۷
جملہ	۹،۹۵،۹۵،۸۳۴

ذیلی زبان

نام زبان	بولنے والوں کی کل تعداد
مغربی ہندی	۲،۹۸،۶۸۱
ہندوستانی	۲۱،۷۰،۵۴۰
جملہ	۲۴،۶۹،۳۲۱

جملہ میزان:۔ ۔ ۔ ۔ ۱۰،۲۴،۶۵،۰۵۵

گویا مغربی ہندی، ہندوستانی، ہندی بولی کے اعتبار سے اردو ہی کے مختلف نام ہیں، اگر حیدرآباد، بلوچستان، اور کورگ کے اردو بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ ہی رکھ لی جائے تو ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد پونے گیارہ کروڑ کے قریب ہوجاتی ہے جو کل آبادی کا ۳۰ فی صد ہے۔

پونے گیارہ کروڑ تو ان لوگوں کی تعداد ہے جن کی مادری یا ذیلی زبان اردو ہے، حالانکہ اس کے علاوہ متعدد بولیاں ایسی ہیں جن کو قریب قریب

[۱] رپورٹ مردم شماری صوبہ متوسط و برار پہلا حصہ صفحہ ۳۰

اُردو ہی سمجھا جا سکتا ہے مثلاً مالوی، بنجاری، میواتی، پوربی، برج بھاشا، قنوجی، بندیل کھنڈی، گوجری، روہیل کھنڈی، بہادوری اور مارواڑی کا کچھ حصہ، بعض لوگوں نے تو پنجابی، راجستانی، بھیلی اور گجراتی کو بھی ہندوستانی میں شامل کیا ہے، بہرحال اس طرح اُردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لئے پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:-

"جہانتک ہندوستانی کا تعلق ہے مجھے صحیح اعداد تو یاد نہیں پڑتے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیوں کے بولنے والوں کی تعداد ۱۴ کروڑ سے کم نہیں، اسکے علاوہ اس زبان کے تھوڑا بہت سمجھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اور ہے جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔" [1]

بہرحال کیسے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ وہ زبان جو آبادی کے ۳۰ فی صد لوگوں کی مادری یا ذیلی زبان ہو، جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد ۱۴ یا ۱۵ کروڑ کے لگ بھگ ہو، جس زبان کے اخبارات کی تعداد کل اخباروں کی ۳۲ فی صد ہو، جس کی دو مستقل یونیورسٹیاں ہوں، جو دوسری یونیورسٹیوں کے امتحانات میں بھی شریک ہو، اور طالب علموں کو اس زبان میں جواب دینے کا حق حاصل ہو، اور جس میں سائنس، فلسفہ، ریاضی اور دوسرے علوم و فنون کی کئی سو کتابیں ترجمہ اور تصنیف ہو چکی ہوں، جس کو خود "مغربی ہندی کی واحد زبان" تسلیم کر لیا گیا ہو، اس کو بطور ایک بولی کے سمجھنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے۔ یہ تو اس قابل ہے کہ اس کو بطور ایک مستقل زبان کے شمار کیا جائے اور دوسری بولیاں اس کی شاخیں سمجھی جائیں۔

محمد احمد سبزواری

---

[1] پنڈت جی نے اس سلسلہ میں ایک نوٹ بھی دیا ہے جس میں لکھا ہے کہ :- "میرا خیال ہے کہ یہ اعداد سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری سے جمع کئے گئے ہیں، اور اگر موجودہ (سنہ ۱۹۳۱ء) اعداد و شمار جمع کئے جائیں، تو اس مرتبہ اور زیادہ اضافہ نظر آئے گا۔"
ملاحظہ ہو :- میری کہانی، جواہر لال نہرو۔ مترجمہ مکتبہ جامعہ دہلی جلد دوم۔ صفحہ ۲۹۹۔

بکھرے ہوئے پھول

پہلی نظر تھی دل کا مول
اب آنسو کے موتی رول

شاید وہ پھر آ جائیں
کہتے ہیں دھرتی [1] ہے گول

آنکھیں کچھ گھبرائی سی
دل کی حالت ڈانواڈول

عشق کی ناقدری مت پوچھ
سونا بھی مٹّی کے مول

دُنیا کیا! اُمیدیں کیا!
پیتل پر چاندی کا جھول [2]

سُورج سر پر آ پہونچا
سونے والے، آنکھیں کھول

بادل، ٹھنڈک، ہریالی
اور اس پر کوئل کے بول

ظلم کا بدلہ پیار سے دے
کنکر لیکر ہیرے تول

ماہرؔ اُن کا کیا کہنا
اچھی صورت، میٹھے بول

ماہر القادری

[1] زمین؛ [2] ملمع؛

جہانِ خویش

ٹوٹے ہوئے ساز کی صدا ہوں
اک نالۂ مجلسِ عزا ہوں
مَیں شاخِ شکستۂ شجر ہوں
ساحل کی صدف ہوں بے گہر ہوں
گلشن میں ہیں جس طرح خس و خار
میں اپنی نمود سے ہوں بیزار
پیکارِ حیات سے ہوں عاری
جینا مرا کیا ہے؟ دم شماری!
اک شمعِ خموش بے فتیلہ
کوچے کا گدائے بے وسیلہ
میں ذرّۂ خاکِ رہگذر ہوں
بازو سے جو گر گیا وہ پر ہوں
منت کشِ غیر زندگانی
پیری سے بتر مری جوانی
دو حرف کی مری داستاں ہے
گلشن ہی میرا آشیاں ہے

آزاد نہیں غلام ہوں مَیں
مے خوار ہیں غیر جام ہوں مَیں

تلخ آبِ حیاتِ زندگی پلا دے!
مے نوش پیالے کو بنا دے!
رندی کا کمال بخش ساقی!
رندوں کا جلال بخش ساقی!
میخانہ مرا ہو میری مے ہو!
مضراب مری ہو میری لے ہو!
اعجاز عطا ہو "کن فکاں" کا!
بن جاؤں حریف آسماں کا!
افلاک کی بتیاں بجھا دوں
اس بزم کو داستاں بنا دوں!
خود اپنا جہاں اک بساؤں!
فطرت کی طرح اسے سجاؤں!
ہو جس کی بہار جاودانہ
حوروں کا جو ہو نگار خانہ
فانوس مرے خیال کے ہوں
شاہد جو مرے کمال کے ہوں

آزاد مری "خودی" جہاں ہو
میری وہ زمیں وہ آسماں ہو!

امین حزیں
(سیالکوٹ)

تین تحفے

راگ اور محبت دل پر ایک جیسا اثر کرتے ہیں۔ دونوں کے سُر ایک جیسے نرم و نازک اور تیز و تُند ہیں، دونوں میں تلخی اور شیرینی پہلو بہ پہلو کروٹیں لیتی ہے۔ دونوں رُوح کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ موسیقی محبت سے زیادہ طاقتور ہے ـــــ وادیِ نیل میں پہلی بار قدم رکھنے والی رقاصہ نبیلا راگ اور محبت کے ہر سُر کی خفیف سے خفیف لرزش سے واقف تھی اور وہ محسوس کرتی تھی کہ مصر کے سب سے بڑے معبد کی مشہور مغنیہ پلینگو بھی اُس کے مقابلے میں ہیچ ہے۔

سات برس تک وہ وادیِ نیل کی رنگین فضاؤں میں اپنی زندگی کا کوئی نیا سپنا دیکھے بغیر سانس لیتی رہی ـــــ سات برس تک وہ اپنی زندگی کا ایک ہی ورق پڑھتی رہی اور اُسے نیا باب کھولنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی مگر جوں ہی اس کے شباب نے بیسویں منزل میں قدم رکھا اُمنگیں دوڑ کر اُس کے سینے میں داخل ہوگئیں اور اس کی کتاب زندگی کے نئے اوراق مچلنے لگے ـــــ اس کا شباب جو کہ پہلے گونگا تھا بولنے لگا اور اُسکے کان دُنیا کی دوسری آوازوں پر بند ہو کر اُس کی جوانی کی باتیں سُننے میں مشغول ہوگئے۔

ایک صبح جبکہ سُورج کی کنواری کرنیں دریائے نیل میں نہار رہی تھیں نبیلا جوانی کی بھاری نیند سے بیدار ہوئی۔ اسکے سنبھالے نہ سنبھلنے والے شباب نے اسے تھکا دیا تھا۔ اُس کی بوڑھی خادمہ پاس ہی قالین پر بیٹھی اس کی تھکاوٹ دُور کرنے کیلئے ایک گیت گا رہی تھی۔

گیت

سحر کی طرح خنک اور جاں فزا ہو تم
کہ اک مجسمۂ نکہت و ضیا ہو تم
گھنی بھویں ہیں تمہاری دراز پلکیں ہیں
کسی حسین مصوّر کی التجا ہو تم
تمہاری آنکھوں سے یوں جھانکتی ہے موسیقی
کہ جیسے جسم کے بربط میں اک نوا ہو تم (عدم)

وہ یہ گا ہی رہی ہوتی ہے کہ نبیلا مضطرب ہو کر اس سے کہتی ہے۔

نبیلا۔ جالا ـــ جالا ـــ طربین اتار دے۔ سازوں کے تار توڑ ڈال۔ اپنے گلے میں سر کو ہمیشہ کے لئے دبا دے اور آ میرے ساتھ رو۔ اس دن کا ماتم کر جب نبیلا پیدا ہوئی تھی۔

جالا۔ آج پھر جذبات میں وہی طوفان آیا ـــــ میں جانتی تھی کل کی خاموشی ضرور رنگ لائے گی۔

نبیلا۔ میں تجھ سے کیا کہوں جالا ـــ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور جوانی یوں ہی بہتی چلی جا رہی ہے رنگینیوں کے بغیر ـــ دل سے کوئی ہوک نہیں اُٹھتی۔ جگر میں کوئی ٹیس نہیں ہوتی ـــــ ہونٹ نہیں مُسکراتے۔ آنکھیں نہیں روتیں۔

جالا۔ پھول پیدا ہوتا ہے خوشبو دینے کے لئے۔ وہ جنگل میں رہے یا باغ میں، شاخ پر رہے یا کسی کے بستر پر خوشبو دیتا ہی رہے گا۔ تو پھول ہے نبیلا جو حُسن کی ٹہنی پر کھلا ہے۔ یہ خواہش نہ کر کہ تجھے کوئی توڑ کر مسل دے۔

نبیلا۔ جو مستی شراب بھرے بند پیالے کے ٹوٹنے میں ہے بند صراحی میں نہیں ـــ انگوروں کو مسل کر شراب بنائی جاتی ہے اور پھول جب مسلے جاتے ہیں تو اُن سے عطر بنتا ہے۔

جالا۔ (ستار کے تار چھیڑ کر) کل رات جو آیا تھا ـــ وہ، پھول لیکر۔

نبیلا۔ سب کے سب مُرجھا گئے ـــ کون لیکر آیا تھا ـــ کب آیا تھا۔ ـــ مجھے کچھ یاد نہیں رہا ـــ مجھے نیند آ رہی تھی ـــ کیا پھر آئے گا۔ نہیں مجھے کچھ نہ بتاؤ۔ میں کچھ سُننا نہیں چاہتی ـــــ لاؤ مجھے میری چوڑیاں دو۔

(چوڑیوں کی کھنکھناہٹ)

نبیلا۔ جالا چوڑیاں کھنکھناتی ہیں پر میری زندگی کس قدر خاموش ہے۔ میری کتنی خواہش ہے کہ میری کشتی موجوں میں گھر کر تھپیڑے کھائے۔

جالا۔ ہر دن ایک نیا تھپیڑا ہے۔

نبیلا۔ نہیں جالا تو نہیں سمجھتی ـــــ دُنیا میں ہر جگہ دیوتا آسمان سے اُتر کر عورتوں سے محبت کرتے رہے ہیں ـــ میں کن آنکھوں سے انکی راہ دیکھوں۔ کن جنگلوں میں انہیں تلاش کروں۔ کون سی دُعائیں مانگوں کہ وہ میرے پاس آئیں ـــ وہ، یا تو مجھے کچھ سکھائیں یا سب کچھ بُھلا دیں۔ اگر یہ دیوتا اپنے نشیمنوں میں اوندھے پڑے رہے تو جالا کیا تیری یہ رفیق دیکھے بغیر مر جاؤں گی جو میری زندگی میں ہولناک حادثے برپا کرے۔

جالا۔ تیرے سپنے بڑے انوکھے ہیں۔

نبیلا۔ اور سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ اگر کسی نے مجھ سے محبت کی تو میری سب سے بڑی خواہش یہ ہوگی کہ وہ میری محبت کے نیچے پس جائے۔ وہ لوگ جو اب میرے پاس آتے ہیں اس قابل نہیں کہ میری آنکھیں اُن کے لئے ایک ننھا سا آنسو بھی اُگلیں ـــــ میری جوانی ایک ایسے ساتھی کی تلاش میں ہے جو ساتھی سے کچھ زیادہ ہو ـــــ جو میری زندگی میں ہلچل مچادے۔

جالا۔ تیری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ پر مجھے ڈر ہے کہ کوئی بہت بڑا حادثہ برپا ہوگا ـــ سمندر کی زبان جب خاموش ہو تو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ بہت بڑے طوفان کا پیغام دے رہی ہے۔

نبیلا۔ وہ طوفان کب آئے گا، جالا۔

جالا۔ جب دو الگ الگ رستوں پر چلنے والے ستارے آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

مخالف سمت چلنے والا ستارہ: دمیتا صنم تراش تھا ـــ مصر کی ملکہ اس خوبصورت نوجوان کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس لحاظ سے وہ وادیِ نیل کا مالک تھا۔ مصر کے سب سے بڑے معبد کے لئے حُسن وعشق کی مورتی اُس چابکدست بُت ساز نے تیار کی تھی ـــ اس کا حُسن اور اس کی صنعت دونوں پوجے جاتے تھے۔ اس کی بنائی ہوئی مورتی پر مصر کی حسین ترین عورتیں، رنگا رنگ کے پھول، قسم قسم کے پھول اور سمرنا کی کبوتریاں چڑھادا چڑھاتی تھیں، جن کے پر ناز و ادا کے مانند اُجلے اور پیر بوسوں کی مانند سُرخ ہوتے تھے ـــــ وادیِ نیل کی ہر دوشیزہ اپنی کتاب محبت دمیتا کے اُس بُت کے سامنے کھولنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یوں کہیئے کہ مصر کا یہ حسین بُت تراش وہاں کی ہر حسین عورت کے دل میں دھڑکن بن کر سما گیا تھا۔

جس راستے سے اُس کو گذرنا ہوتا تھا اُس پر کئی پرستار عورتیں اپنا نام لکھ دیتی تھیں اور وہ ان کو پڑھے بغیر گذر جاتا تھا۔ اُس کی ڈھیلی قبا اِن ناموں کو اکثر مٹا دیا کرتی تھی۔ اگر کسی روز وہ مسلے ہوئے پھول کی پتیاں بکھیرتا آگے بڑھ جاتا تو عورتیں اُن پر ٹوٹ پڑتی تھیں اور تبرک کے طور پر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔

اس کے پاس دولت تھی، حُسن تھا، جوانی تھی، ملکہ مصر اُس کی ایک ادنیٰ کنیز تھی مگر وہ ناخوش تھا۔ وہ خود کو ایک ایسی کھیتی سمجھتا تھا، جو مسلسل بارش کے باعث دلدل بن جائے۔ وہ محبت کئے جانے سے گھبرا کر خود محبت کرنا چاہتا تھا اور آج اِن ہی خیالات میں غرق دریائے نیل کے کنارے ڈوبتے ہوئے سُورج میں اپنی موجودہ زندگی کا عکس دیکھ رہا تھا کہ نبیلا زیورات میں لدی پھندی اپنی چال سے آپ ہی مست ہوتی اُسکے پاس سے گذری۔

دمیتا نے مُنہ پھیر لیا۔ نبیلا کے گہنوں سے اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی طوائف ہے اس لئے اس کے سلام سے بچنے کے لئے اپنا مُنہ موڑ لیا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مصر کی حسین عورتوں کے بے نقاب چہرے دیکھ دیکھ کر وہ اُکتا چکا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے دل میں اکساہٹ پیدا ہوئی اور اُس نے کنکھیوں سے نبیلا کی طرف دیکھا جو چہرے پہ زرد رنگ کی نقاب ڈالے دریائے نیل کے زرنگار پانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس نے دمیتا ـــ مصر کے سب سے خوبصورت نوجوان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا ـــــ اُس نے مصر کے سب سے بڑے بُت ساز کی موجودگی کی پرواتک نہ کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف ہوا میں تازگی اور ٹھنڈک ڈھونڈ رہی ہے اور شام کی فضا کے ارتعاش سے اپنا دل بہلانا چاہتی ہے۔

دمیتا کے سینے میں ہیجان پیدا ہوگیا ـــ یہ عورت اسوقت نیل کے کنارے کیا کرنے آئی تھی ـــ کسے ڈھونڈ رہی تھی ـــــ اس کو دیکھکر اس کے قدم رک کیوں نہ گئے ـــــ اس نے یقیناً اسے دیکھا تھا۔ جب وہ اس کے پاس سے گذری تھی تو اُسے ملکہ مصر کے محبوب کی موجودگی کا علم تھا مگر وہ آداب بجائے بغیر بے پروا ہوا کی مانند پاس سے گذر گئی ـــ کیوں ـــ کیوں ـــ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نبیلا لوٹی ـــ اسی دلکش انداز سے ـــ دمیتا سے نہ رہا گیا ـــ وہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔

دمیتا۔ اے تیز رو حسینہ میرا اسلام قبول کر۔

نبیلا۔ کرلیا۔

دمیتا۔ یہ تیز قدم تجھے کدھر لئے جارہے ہیں۔

نبیلا۔ واپس۔

دمیتا۔ بالکل اکیلی۔

نبیلا۔ بالکل اکیلی۔

دمیتا۔ اپنے شوہر کے پاس۔

(نبیلا قہقہہ لگا کر ہنستی ہے۔)

دمیتا۔ سورج دریائے نیل میں غوطہ لگا گیا ہے۔ اب اندھیرے میں تو کیسے ڈھونڈ رہی ہے۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔

نبیلا۔ مجھے کسی کی تلاش نہیں ـــ مَیں اکیلی سیر کیلئے نکلی ہوں۔

دمیستا۔ لیکن یہ زیور تُو نے صرف اپنا دل خوش کرنے کے لئے نہیں پہنے ——اور یہ پیلا نقاب۔

نبیلا۔ میں نے یہ زیور صرف اپنی خوشی کے لئے پہنے ہیں اس لئے کہ یہ بتاتے ہیں میں خوبصورت ہوں اور چلتے ہوتے میں اپنی نازک انگلیوں کی طرف دیکھتی ہوں جو ان انگوٹھیوں کی شان دوبالا کرتی ہیں۔

دمیستا۔ تیرے ان ہاتھوں میں ایک آئینہ ہونا چاہیئے جس میں تُو صرف اپنی آنکھیں دیکھتی رہے —— یہ آنکھیں —— اُف یہ آنکھیں۔

نبیلا۔ اِن آنکھوں میں اب نیند آگئی ہے —— میں تھک کر چور چور ہوگئی ہوں —— مجھے اب جانا چاہیئے۔

دمیستا۔ کس راستے سے کدھر۔

نبیلا۔ میں ہرگز نہیں بتاؤں گی —— واہ، تُو نے مجھ سے یہ پوچھا تک نہیں کہ اس میں میری خوشی ہے کہ نہیں —— کس راستے سے کدھر —— کیا بے تکلفی سے تو نے یہ کہہ دیا —— کیا تو سمجھتا ہے کہ میں ایک بازاری عورت ہوں —— تجھے معلوم ہے کہ مصر میں کن کن دروازوں پر میرا استقبال ہوتا ہے —— تو نے کیا وہ تمام آدمی شمار کئے ہیں جو نبیلا کے التفات کو سرمایۂ حیات سمجھتے ہیں —— کس راستے سے کدھر —— میں تجھے ہرگز نہیں بتاؤں گی —— یہیں کھڑا رہ یہ چلا جا۔ میری ہم رکابی کا شرف تجھے ہرگز نصیب نہ ہوگا۔

دمیستا۔ تُو شاید نہیں جانتی کہ میں کون ہوں۔

نبیلا۔ میں تجھے اچھی طرح جانتی ہوں —— تو دمیتا سنگتراش ہے۔ تیرے ہاتھوں نے اس دیوی کی مورتی تیار کی ہے جس کو میں پوجتی ہوں، تو ملکہ مصر کا عاشق ہے اور اس شہر کا مالک، پر میری نظروں میں تو ایک حسین غلام ہے اس لئے کہ آج تو نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میری محبت میں گرفتار ہوگیا ہے —— میری طرف یوں گھور گھور کے نہ دیکھ۔ کچھ کہنے کی کوشش نہ کر، میں جانتی ہوں تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی بلکہ تجھ سے محبت کی جاتی رہی ہے —— پر اب تو میری محبت میں گرفتار ہوچکا ہے۔ اس وقت سر جھکائے تو میری گھنی پلکوں کی خوبصورتی پر غور کر رہا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میرے ہونٹ کتنے نازک ہیں۔ میرے بال کس قدر ملائم ہیں۔ جن باتوں پر تو آج غور کرتا ہے اُن پر لاکھوں آدمی ایک زمانے سے غور کر رہے ہیں۔ میرے حُسن کے چرچے مصر کے ذرّے ذرّے کی زبان پر ہیں۔ پچھلے برس میں نے بیس ہزار آدمیوں کے سامنے رقص کیا اور مجھے معلوم ہے کہ تو اُن خوش قسمت آدمیوں میں موجود نہیں تھا —— کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو چھپاتی ہوں —— نہیں —— منقل پر سب میرے چند صیاد دینے والے حُسن کی بہار دیکھ چکے ہیں —— لیکن تو —— ایک صرف تو مجھے پھر کبھی نہیں دیکھے گا۔ جو کچھ کہ میں ہوں، جو کچھ کہ میں محسوس کرتی ہوں، میری محبت اور میرے حُسن کی بابت تو کچھ کبھی نہ جان سکے گا —— تو ایک حقیر، پست، چھچھورا، ظالم، بے حس اور بزدل انسان ہے —— مجھے حیرت ہے کہ ابھی تک کسی عورت کے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا نہیں ہوتی کہ وہ تجھے اور ملکہ مصر دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دے۔

(وقفہ)

دمیستا۔ دمیتا کے ساتھ چلنے سے انکار کرکے جو تو نے شان پیدا کی ہے بالآخر تیرے لئے بہت مہنگی ثابت ہوگی —— میں پوچھتا ہوں تجھے ڈر کس بات کا ہے۔

نبیلا۔ تو جو کہ دوسروں کی محبت کا عادی ہے کیا بتا سکتا ہے کہ اس عورت کو کیا دینا چاہیئے جو محبت نہ کرتی ہو۔

دمیستا۔ میں تیرے قدموں میں مصر کا سارا سونا ڈھیر کردونگا۔

نبیلا۔ اس سے زیادہ سونا میرے بالوں میں ہے —— مجھے سونا نہیں چاہیئے۔ مجھے صرف تین چیزوں کی خواہش ہے۔ کیا تو دے سکتا ہے۔

دمیستا۔ بول وہ تین چیزیں کیا ہیں۔

نبیلا۔ مجھے چاندی کا ایک آئینہ چاہیئے کہ میں اُس میں ہر روز اپنی آنکھوں کا خمار دیکھا کروں۔

دمیستا۔ تجھے مل جائیگا۔ بول۔ جلدی بول باقی دو چیزیں کیا ہیں۔

نبیلا۔ مجھے ہاتھی دانت کی ایک کنگھی چاہیئے جو میرے بالوں میں اس طرح غوطے لگائے جیسے کرنوں بھرے پانی میں ماہی گیر کے جال۔

دمیستا۔ تیسری چیز۔

نبیلا۔ موتیوں کی ایک مالا جسے پہن کر میں تیرے لئے سہاگ کا ناچ ناچوں گی۔

دمیستا۔ بس۔

نبیلا۔ مجھے یہ مالا مل جائے گی نا۔

دمیستا۔ جیسی تو چاہے گی۔

نبیلا۔ جیسی میں چاہوں گی —— میں بھی یہی کہنا چاہتی تھی۔ بول اب میں کیا اپنے تحفے انتخاب کرلوں۔

دمیستا۔ کیوں نہیں۔

نبیلا۔ کیا تو قسم کھاتا ہے کہ مجھے یہ چیزیں لا دیگا۔

دمیستا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔

نبیلا۔ کس کی۔
دمیستا۔ جس کی تو کہے۔
نبیلا۔ حسن وعشق کی اُس دیوی کی قسم کھا جس کی مورتی تو نے تیار کی ہے۔
دمیستا۔ میں اُسی کی قسم کھاتا ہوں۔
نبیلا۔ تو میں نے اپنے تحفے چن لئے۔
دمیستا۔ اتنی جلدی۔
نبیلا۔ واقعی میں نے اپنے تحفے بہت جلدی چنے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں چاندی کا کوئی ایسا آئینہ قبول کر لوں گی جو مصر کے بنجارے بازاروں میں بیچتے پھرتے ہیں —— مجھے وہ آئینہ چاہیئے جس میں یونان کی مشہور شاعرہ سیفو اپنا چہرہ دیکھتی رہی ہے اور جو اَب یہاں کی مشہور طوائف سارہ کے پاس ہے۔ وہ اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ تو اُسے چرا لائے گا۔
دمیستا۔ یہ سراسر دیوانگی ہے — تو چاہتی ہے کہ میں چوری کروں۔
نبیلا۔ میں یہ سمجھتی تھی کہ مرد اپنے قول پر قائم رہا کرتے ہیں۔
دمیستا۔ میں اپنے قول پر قائم ہوں — آگے بول۔
نبیلا۔ اور یہ جو ہاتھی دانت کی کنگھی میں تجھ سے مانگ رہی ہوں معمولی کنگھی نہیں —— یہ وہ کنگھی ہے جو یہاں کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی کا اپنے بالوں میں لگائے رکھتی ہے۔ یہ کنگھی اُس ملکہ کے پاس تھی جو آج سے پانچ سو برس پہلے وادیٔ نیل پر حکمران تھی۔
دمیستا۔ پر میں یہ حاصل کیسے کرونگا۔
نبیلا۔ اس کو قتل کر کے —— یہ کنگھی مجھے کل دوسرے تحفوں سمیت مل جانی چاہیئے۔
دمیستا۔ پہلے چوری پھر قتل — چلو ایسا ہی سہی۔
نبیلا۔ تیسرا تحفہ موتیوں کی وہ مالا ہے جو تیرے ہاتھ کی بنائی ہوئی مورتی کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔
دمیستا۔ تو حد سے بڑھ گئی ہے نبیلا — سُن لے، تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ نہ آئینہ، نہ کنگھی اور نہ موتیوں کی مالا — تو میرے جذبات کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں کھیل سکتی۔
نبیلا۔ تیری زبان جو کچھ کہتی ہے اُس کو تیرا دل نہیں مانتا —— اپنے آپ کو دھوکا نہ دے —— یہ تینوں تحفے تو کل مجھے یقیناً لادے گا —— پھر تو میرے پاس آیا کرے گا — ہر شام کو — اور میں مقررہ وقت پر سولہ سنگار کر کے تیری راہ دیکھا کروں گی — میرا لباس تیری مرضی کے مطابق ہوگا، میرے بال تیری خواہش کے مطابق گوندھے جائیں گے۔

میں تیرے پیار کے لئے تیار رہا کروں گی جیسے سیپی سمندر کی گود میں بارش کے قطرے پینے کے لئے تیار رہتی ہے۔ اگر تو نرم و نازک محبت چاہے گا تو میں تجھے بچوں کی مانند کھلاؤں گی۔ اگر تو چاہے گا کہ میں خاموش رہوں تو میں چاندنی راتوں کی طرح چپ چاپ رہوں گی۔ اور جب تیری خوشی ہوگی کہ میں گاؤں تو تیرے یہ کان ملک ملک کے گیت سُنیں گے۔ مجھے ایسے گیت یاد ہیں جو چشموں کی آبی نغموں سے بھی دھیمے ہیں اور ایسے گیت بھی یاد ہیں جو کڑکتی بجلی سے بھی زیادہ خوفناک ہیں۔ مجھے ایسی سیدھی سادی اور تر و تازہ بولیاں بھی آتی ہیں جو کنواری لڑکیاں اپنی ماؤں کو سناتی ہیں اور ایسی غزلیں بھی یاد ہیں جو صرف تنہائی میں سُنی جاتی ہیں۔ اگر تو کہے گا تو رات رات بھر میں تیرے حضور میں ناچوں گی۔ ایسے ناچ جو تتلیوں کو تھرکنا بھلا دیں اور عُود کے دھوئیں کو پریشان کر دیں —— ملکہ مصر دولتمند ہے مگر اُس کے محل کے اندر ایسا کوئی بھی کمرہ نہیں جو میرے حجلۂ خاص کا مقابلہ کر سکے۔ — اس کے اندر سجاوٹ اور زیبائش کے ایسے سامان ہیں جن کی تعریف کے لئے بڑے بڑے شاعر آج تک لفظ نہیں ڈھونڈ سکے —— اور تو جانتا ہے سب سے بڑی سجاوٹ کون ہے — نبیلا۔ جس سے تو محبت کرتا ہے، پر اُسے اچھی طرح نہیں جانتا — تو نے صرف میرا حسین چہرہ دیکھا ہے لیکن تو نہیں جانتا کہ میں ساری کی ساری حسین ہوں — دمیستا۔ ایک نہیں ایسے ہزاروں تعجب تجھے ہر روز ہوں گے جب ہر بار تجھ پر میرا حُسن ایک نئی چیز کا انکشاف کریگا۔ آہ تو مجھ سے کس قدر والہانہ محبت کرے گا — میری باہوں میں فرطِ مسرت سے تو کیسے کانپ کانپ اُٹھے گا —— مجھے یقین نہیں آتا کہ تو نے وہ فضول سی کنگھی لانے سے انکار کر دیا ہے جبکہ میرے سنہرے بالوں کی ساری لٹیں تیرے شانوں پر بل کھایا کریں گی — نہیں ابھی نہیں — اس وقت تو انہیں ہاتھ لگانے کا حقدار نہیں — کل — کل . . . .
دمیستا۔ ہاں کل — کل تینوں تحفے تیرے قدموں میں ہونگے۔
نبیلا۔ اور اگر تو میرے لئے موتیوں کی وہ مالا بھی لے آیا جو عشق کی مورتی کے گلے میں پڑی ہے تو میں تجھے بتاؤں گی کہ میرے ہونٹوں میں اتنے بوسے ہیں جتنے سات سمندروں میں موتی — لو اَب کل ملیں گے۔

———

کل . . . یعنی دوسرے دن دمیستا صنم تراش کو ایک عورت کیلئے جس کے حُسن نے اُس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی تین عجیب و غریب تحفے لے جانا تھے — مصر کی حسین ترین عورتوں پر راج کرنے والا ایک غلام بن کے رہ گیا تھا۔ اگر نبیلا اس کے دل و دماغ پر پوری طرح نہ چھا گئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ اس عورت کی عجیب و غریب

خواہشات کو دریائے نیل کی لہریں سمجھتا جو پتھریلے ساحل کے ساتھ ٹکراتی ہیں اور جھاگ بن کر لوٹ جاتی ہیں۔ مگر وہ نبیلا کے حُسن کی تیز و تُند لہروں میں بہہ گیا تھا۔ اور بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سیلاب، پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلنے پائے اُسے مصر کے سب سے بڑے کاہن کی بیوی کی خوابگاہ تک لے گیا اور اُس نے وہ کام کیا جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا — کنگھی حاصل کرنے کے لئے اُسے کاہن کی بیوی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پڑے۔ جب دمیتا نے اُس عورت کے سینے میں زہریلی سُوئی چھوئی تو اس کا دل اس مسرت سے دھڑکتا دھڑکتا بند ہو گیا کہ اس کا قاتل مصر کا وہ حسین نوجوان ہے جس کے دیدار کیلئے وہ اپنی سو جانیں بھی قربان کرنے کے لئے تیار تھی — کنگھی حاصل کرنے کے بعد، یعنی اپنے عشق کی پہلی خونیں منزل طے کر کے دمیتا نے بڑی صفائی سے مشہور رقاصہ سارہ کے مکان سے چاندی کا وہ آئینہ چُرایا جس میں شعلہ نفس شاعرہ سیفو اپنا روئے نگار دیکھا کرتی تھی — شبہ ایک جوان سال لڑکی پر کیا گیا جس کے شباب کا شعلۂ اوّلیں ابھی لپکنے بھی نہ پایا تھا۔ اس دوشیزہ کو اس جُرم میں سُولی پر چڑھا دیا گیا —

نبیلا کے عشق کو دمیتا نے خون کا یہ دوسرا گھونٹ پلایا اور موتیوں کی وہ مالا لینے کے لئے روانہ ہو گیا جو اُس کی اپنی بنائی ہوئی مورتی کے گلے میں پڑی تھی۔ یہ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے حُسن و عشق کی مورتی کے گلے سے جُدا کی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُس نے رات کے آسمان کی پیشانی سے تاروں کی ساری افشاں چھین لی ہے۔ دیوی کی اِس بے حُرمتی پر اُسے افسوس ہوا مگر نبیلا اُس سے بڑی دیوی تھی — اب تینوں تحفے اُس کے پاس تھے اور جب وہ اُنہیں ساتھ لیکر نبیلا سے ملنے گیا تو اُسے یقین تھا کہ وہ اُسے کسی نئے اور کڑے امتحان میں ڈال دیگی — وہ اسکے لئے تیار تھا۔

نبیلا۔ لے آیا میرے تحفے — تو لے آیا میرے تحفے — مجھے یقین تھا کہ تو خالی ہاتھ کبھی ملنے نہ آئے گا۔

دمیتا۔ اس لئے کہ تیرے حکم کی تعمیل لازم تھی۔

نبیلا۔ آہ۔ دمیتا۔ میرے پیارے دمیتا۔ تو کتنا اچھا ہے — جو کچھ اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا — مقدّس دیوتاؤں کی قسم مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ محبت کیا ہے — پیارے آب میں تجھے اس سے کہیں زیادہ دوں گی جس کا میں نے تجھ سے کل وعدہ کیا تھا — وہ عورت جو سمندر میں ٹھوس چٹان کی مانند کھڑی تھی آج پاش پاش ہو گئی ہے — بوڑھے آسمان نے شاید ہی ایسا انقلاب دیکھا ہو — تُو یہ سمجھتا ہو گا کہ میں تجھ سے صرف محبت کروں گی — نہیں۔ آج میں اپنے حُسن کی تمام خوبیاں تیری نذر کرتی ہوں۔ اپنی ساری معصومیت تیری بھینٹ چڑھاتی ہوں۔ اپنی کنواری رُوح کی تمام کپکپاہٹیں تیرے حوالے کرتی ہوں — آ — اب یہ شہر چھوڑ کر کچھ عرصے کے لئے کہیں بھاگ جائیں۔ کسی ایسی جگہ جا رہیں جہاں تیرے میرے سوا اور کوئی نہ ہو — کوئی نہ ہو — جہاں ہم ایسے دن گذاریں جن پر سُہاگ کی راتیں رشک کریں — عشق و محبت کی تاریخ میں شاید ہی ایسے کارنامے کا ذکر ہو جو کہ تُو نے میرے لئے سر انجام دیا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس روئے زمین پر مجھ ایسی والہانہ محبت کرنیوالی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہو گی — پر تیرے ہونٹوں پر یہ مہرِ خاموشی کیوں لگی ہے — تو بولتا کیوں نہیں۔

دمیتا۔ میں کیا بولوں — حیرت مجھے نہ جانے کہاں بہا لے گئی ہے — میں سمجھا تھا آسمان بہت اونچا ہے پر اس وقت وہ مجھے زمین پر لیٹا دکھائی دے رہا ہے۔

نبیلا۔ یہ تو نے کیا کہا — یہ تو نے کیا کہا۔

دمیتا۔ میں کہتا ہوں الوداع — الوداع۔

نبیلا۔ الوداع — یہ میں کیا سُن رہی ہوں دمیتا — یہ تین تحفے تو نے اتنی مشکلوں سے صرف اس لئے حاصل کئے تھے کہ مجھ اور میری محبت کو الوداع کہدے۔

دمیتا۔ مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا تھا سو میں نے کر دیا۔

نبیلا۔ میں سمجھی نہیں۔

دمیتا۔ تو سمجھے یا نہ سمجھے مجھے اب اس سے کوئی سروکار نہیں — یہ چھوٹا سا اسرار، یہ ننھی سی گتھی اب تیرے ناخنِ تدبیر کے لئے چھوڑتا ہوں — الوداع۔

نبیلا۔ دمیتا — دمیتا..... یہ میں کیا سُن رہی ہوں — یہ لہجہ کہاں سے پیدا ہو گیا — کیا سچ مچ یہ لفظ تیری زبان سے نکلے ہیں — مجھے کچھ تو بتا — آخر ہوا کیا۔

دمیتا۔ کیا میں ایک ہی بات ہزار بار دُہراؤں۔ تیرے ہی لئے ہاتھی دانت کی کنگھی لانے کے لئے میں نے کاہن کی بیوی کو قتل کیا۔ تیرے ہی لئے میں نے سارہ کے یہاں سے آئینہ چُرایا اور اصل مجرم کے بجائے ایک معصوم دوشیزہ پھانسی پر چڑھا دی گئی۔ تیرے ہی لئے میں نے حُسنُ عشق کی مورتی کے گلے سے موتیوں کا ست لڑا ہار اُتارا۔ یہ تین تحفے

مجھے تیرے حضور میں حاضر کرنا تھے جن کے عوض میں تیری طرف سے مجھے صرف ایک چیز ملنا تھی ـــ تیرا التفات ـــ اس وقت میں نے یہ سودا بہت مہنگے داموں پر قبول کر لیا۔ لیکن اب مجھے اس جنس کی قدر و قیمت معلوم ہو گئی ہے جسے میں خرید رہا تھا ـــ اب میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتا ـــ تو بھی ٹھیک اسی طرح مجھ سے کچھ طلب نہ کر۔ اور چپ چاپ چلی جا ـــ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایسی سیدھی سادی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی ـــ،

نبیلا۔ اگر یہی بات ہے تو یہ تحفے اپنے پاس رکھ ـــ کیا تو سمجھتا ہے کہ مجھے ان کی ضرورت ہے ـــ نہیں میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں ـــ صرف تجھے۔

دمیتا۔ مجھے معلوم ہے ـــ مگر میں اب تجھے نہیں چاہتا اور چونکہ ایسے معاملوں میں طرفین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اس لئے ہمارا ملاپ ناممکن ہے ـــ میں نے کھلے الفاظ میں تجھے سمجھانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ میں اپنے دل کی بات تجھ پر واضح نہیں کر سکا۔ دراصل مجھ میں اتنی قدرت بھی نہیں ہے کہ تجھے اچھی طرح سمجھا سکوں اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ تو اس حقیقت کو جیسی بھی وہ ہے قبول کر لے ـــ تو یہ راکھ کریدنا چاہتی ہے اس یقین کے ساتھ کہ یہ راکھ نہیں ہو سکتی ایسی حالت میں ہماری گفتگو سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

نبیلا۔ میری طرف سے لوگوں نے یقیناً تیرے کان بھرے ہیں۔

دمیتا۔ تیرے شکوک بے بنیاد ہیں۔

نبیلا۔ نہیں نہیں۔ میں سب جانتی ہوں ـــ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ لوگوں نے ضرور میرے بارے میں زہر اگلا ہے ـــ انکار نہ کر ـــ وادیٔ نیل میں اتنے ذرے نہیں جتنے کہ میرے دشمن ہیں ـــ میرے خلاف یقیناً تجھ سے کہا گیا ہے۔ لیکن دمیتا، تجھے ان کی زہریلی باتیں ہرگز نہیں سننا چاہیئے تھیں ـــ مقدس دیوتاؤں کی قسم جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے سفید جھوٹ ہے۔

دمیتا۔ مجھ سے تیرے خلاف کسی نے کچھ نہیں کہا۔

نبیلا۔ دمیتا، تو نے یہ نہیں سوچا کہ میں تجھے دھوکا دے ہی نہیں سکتی اس لئے کہ میں تجھ سے سوائے تیرے اور کسی چیز کی طالب نہیں۔ تو پہلا آدمی ہے جس سے میں نے ان الفاظ میں گفتگو کی ہے۔

دمیتا۔ ایسی باتوں کا وقت گذر چکا ـــ ایک بار تو میری ہو چکی ہے ـــ ایک دفعہ میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں۔

نبیلا۔ کب، کہاں، کیسے ـــ یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے

دمیتا۔ میں سچ سچ کہتا ہوں ـــ تجھے اپنانے بغیر میں تجھے اپنا بنا چکا ہوں۔ تجھ سے جو کچھ میں چاہتا تھا غیر ارادی طور پر تو نے مجھے دیدیا ہے ـــ تو مجھے خوابوں کی دنیا میں لے گئی۔ میں مانتا ہوں پر میں اب اس دنیا میں واپس جا کر اس حسن اور خوبصورتی کا نظارہ کرنے کی مجھ میں تاب نہیں، اور نہ تو مجھے اس دنیا میں پھر لے جا سکتی ہے ـــ ایک ہی راستے پر مسرت اور شادمانی سے دو مرتبہ ملاقات نہیں ہوا کرتی ـــ ہم ایک سڑک پر مخالف سمتوں سے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر ہمارے قدم رکے مگر اب ہمیں جدا ہو جانا چاہیئے ـــ تیرا راستہ ادھر ہے اور میرا ادھر۔

نبیلا۔ صرف ایک ہی نظارے سے تیری نگاہیں سیر ہو گئیں ـــ ایک ہی بار خوابوں کی دنیا میں جا کر تیرا جی بھر گیا ـــ پھولوں بھرے باغ میں جا کر تو ایک ہی کلی پر قناعت کر گیا۔

دمیتا۔ تو اصلیت کے قریب پہونچ گئی ہے ـــ میں ایک ہی نظارے، خوابوں کی دنیا کی ایک ہی سیر اور پھولوں بھرے باغ کی ایک ہی کلی پر قانع رہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ میں اس نظارے کے حسین تخیل، اس سیر کی مسرت بخش یاد اور اس کلی کی پیاری مہک کو اپنے دل و دماغ میں قائم رکھنا چاہتا ہوں ـــ میں نے تیری تصویر کو جس سنہرے فریم میں دیکھا ہے اسے بدلنے کی کوشش نہ کر۔

نبیلا۔ اور میرے ـــ میرے متعلق تو کیا کہتا ہے جو اتنی بھیانک باتیں سننے پر بھی تجھ سے محبت کرتی ہے ..... کیا میں نے وہ خواب دیکھا ہے جس کا ذکر تو بار بار کرتا ہے اور کیا میں اس مسرت اور شادمانی کی گھڑیوں میں تیری شریک رہی ہوں جو تو نے مجھ سے چرائی ہیں ـــ ہاں چرائی ہیں ـــ،

دمیتا۔ کیا اس وقت تجھے میرا خیال تھا جب میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تو نے مجھ سے تین شرمناک فعل کرائے ..... تین شرمناک فعل جو ساری زندگی مجھے تین ہیبت دیو بن کر ڈراتے رہیں گے .... صرف ایک لمحے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر تو نے مجھ سے تین احکام منوائے جو میری زندگی کو پاش پاش کر سکتے تھے۔

نبیلا۔ میں نے یہ صرف اس لئے کیا کہ تو میرا ہو جائے ـــ سارے کا سارا میرا ـــ تیری ہو کر میں تجھے اپنا کبھی نہ بنا سکی۔

دمیتا۔ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔ لیکن صرف چند لمحات کے لئے ـــ تو نے مجھے اپنا غلام بنانا چاہا اور بنا لیا۔ پر اب میں تیری غلامی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

نبیلا۔ دمیتا۔ تو کسی کا غلام نہیں۔ میں تیری کنیز ہوں۔

دمیستا۔ ہم میں سے وہی دوسرے کا غلام ہو جو کہ محبت کرتا ہو... غلامی ... غلامی... یہ ہے عشق کا دوسرا نام... تم سب عورتوں کے دل و دماغ میں ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ تمہاری کمزوری مرد کی طاقت پاش پاش کر دے اور تمہاری بے شعوری اس کی ذکاوت پر حکومت کرے۔ تم محبت کرنا یا محبت کئے جانا پسند نہیں کرتیں ـــ شباب کی آمد کے ساتھ ہی یہ خواہش تمہارے سینے میں کروٹیں لینے لگتی ہو کہ تم کسی مرد کو غلام بناؤ۔ اسکو ذلیل کرو اور سر جھکا کر اُس پر اپنے چپّل رکھدو۔ پھر تم ہم لوگوں سے اپنی مرضی کے مطابق تلوار، تیشہ، قلم اور ہر وہ چیز جو تم پر قادر ہے چھین سکتی ہو، توڑ سکتی ہو ـــ اس وقت تم چاہو تو ہرکیولس پہلوان سے گُرز لے کر اسکے ہاتھ میں چرخہ دیدو ـــ لیکن تم کسی مرد کی گردن جھکانے میں ناکام رہتی ہو تو ان ہاتھوں کو اچھا سمجھتی ہو جو تمہارے گورے بدن پر نیل ڈال دیں۔ اس مرد کو دیوانہ وار چاہتی ہو جس کا سخت گھٹنا تمہاری گردن دباتا ہے ـــ حتیٰ کہ اس مرد سے بھی التفات کرتی ہو جو ہر روز تمہاری توہین کرے۔ وہ مرد جو تمہارے پاؤں چومنے سے انکار کر دے تم اُسے سر پر بٹھا لوگی ـــ وہ مرد جس کی آنکھیں تمہاری رُخصت پر نمناک نہیں ہوتیں تمہاری چُٹیا پکڑ کر جہاں چاہے تمہیں لے جا سکتا ہے ـــ محبت زدہ عورت چونکہ تو غلام نہیں بنا سکی اس لئے تجھے غلامی قبول کرنا ہوگی۔

نبیلا۔ ومیتا۔ تو مجھے مار، پیٹ، میرا بدن نیلوں سے بھر دے مگر اسکے بعد مجھ سے محبت ضرور کر۔

دمیستا۔ نہیں، اب مجھے تجھ سے نفرت ہے۔

نبیلا۔ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تیری رُوح کے اندر میں سما چکی ہوں۔ تو صرف ایک عورت کے سامنے جھکنے سے شرماتا ہے۔ لیکن پیارے اگر صرف اتنی سی بات تیرے وقار کی تسکین کے لئے کافی ہے تو مجھے تیری غلامی قبول ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لئے میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ جو تُو نے اب تک مجھے دیا ہے... بول میں تیرے لئے کیا قربانی کر سکتی ہوں۔ ایک بار تجھے اپنا بنا کر مجھے زندگی سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔

دمیستا۔ کیا تُو قسم کھاتی ہے۔

نبیلا۔ حُسن و عِشق کی دیوی کی قسم میں تیرے لئے ہر قربانی کرنیکو تیار ہوں۔

دمیستا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لیا۔

نبیلا۔ دیر نہ کر، جلدی بول۔ تو مجھ سے کیسی قربانی چاہتا ہو۔

دمیستا۔ بالکل معمولی۔ میں تجھ سے تیری طرح تین تحفے نہیں مانگتا اسلئے کہ یہ رواج کے خلاف ہوگا ـــ لیکن میں تجھے تحفے قبول کرنے کے لئے ضرور کہہ سکتا ہوں۔ کیا نہیں۔

نبیلا۔ کیوں نہیں۔

دمیستا۔ یہ آئینہ، کنگھی اور ہار منگاتے وقت کیا تجھے ان کو استعمال کرنے کا خیال تھا ـــ اس چوری کے آئینے، اس خون آلود کنگھی اور اس مقدس ہار کو ـــ یہ ایسے جواہرات نہیں ہیں کہ ان کی عام نمائش کی جاتے....؛

نبیلا۔ بہت دُور کی سُوجھی۔

دمیستا۔ پہلے میرا ایسا خیال نہیں تھا مگر اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو نے محض ظلم ڈھانے کی خاطر مجھ سے تین جُرم کرائے ـــ تین جُرم جن سے مصر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے ـــ اب تجھے ان تحفوں کی عام نمائش کرنا ہوگی ـــ آئینہ ہاتھ میں لیکر، کنگھی بالوں میں سجا کر اور ہار گلے میں پہن کر تو باغ میں سیر کے لئے جائے گی۔ لوگ تجھے دیکھیں گے اور فوراً ہی ملکہ کے سپاہیوں کے حوالے کر دیں گے ـــ لیکن تجھے وہ چیز مل جائے گی جس کی تجھے خواہش تھی اور میں سورج طلوع ہونے سے پہلے زنداں میں تیری ملاقات کے لئے آؤنگا ـــ الوداع۔

جس طرح دمیستا اپنے وعدے پر قائم رہا اُسی طرح نبیلا نے اپنا قول پورا کیا۔ چنانچہ اسی روز شام کو جبکہ سورج کی کرنیں دریائے نیل کی لہروں کو چوم رہی تھیں، نبیلا اٹھی اور اپنی بوڑھی خادمہ کو حکم دیا کہ وہ اُسے اچھی طرح سجائے۔ سج سجا کر اُس نے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی جمائی، گلے میں ست لڑا پہنا اور ہاتھ میں آئینہ لیکر باغ عامہ کی سیر کو چل دی۔

لوگوں نے وہ تین چیزیں دیکھیں جن کے گم ہو جانے پر سارے مصر میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور حیرت میں غرق ہو گئے۔ بعض عورتیں اس نظارے کی تاب نہ لا سکیں اور نبیلا کے خوفناک انجام نے اُن پر کپکپی طاری کر دی ـــ مگر نبیلا کے قدم پہلے سے زیادہ مضبوط تھے۔ باغ کی پتھریلی روشوں پر چلتے ہوئے وہ سنگ مرمر کا ایک حسین مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

فوراً ہی آگ کی طرح یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ حُسن و عِشق کی مقدس دیوی کا ست لڑا ہار، سارہ کا آئینہ جس میں سیفولیا چہرہ دیکھا کرتی تھی اور کاہن کی بیوی کی کنگھی نبیلا رقاصہ کے

پاس ہے۔ چنانچہ نبیلا ابھی باغ کی تیسری روش ہی پر چل رہی تھی کہ ملکہ مصر کے سپاہیوں نے اُسے گرفتار کر لیا اور زندان میں قید کر دیا۔

ساری رات وہ اس اندھیرے زندان میں طرح طرح کے ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ بار بار وہ کسی دہشتناک خیال سے کانپ اُٹھتی۔

اِس اُدھیڑبُن میں صبح ہو گئی اور حسبِ وعدہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ دمیتا زندان میں داخل ہوا اور اُس کے پیچھے پیچھے جلاد جس کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ تھا۔ پیشتر اس کے کہ نبیلا، دمیتا سے کچھ کہے زہر کا پیالہ اسکے ہاتھ میں دیدیا گیا — محبت کا یہ آخری جام اپنے ہونٹوں سے لگایا اور سارا زہر غٹا غٹ پی گئی۔

زہر پینے کے بعد اُس نے کنکھیوں سے دمیتا کی طرف دیکھا گویا وہ اس سے یہ کہنا چاہتی ہے: "دیکھ، موت کا بوسہ یوں لیا کرتے ہیں!" مگر دمیتا نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

زہر نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ اُس کے پاؤں دبا کر جلاد نے پوچھا: "کیا تجھے کچھ محسوس ہوا؟"

نبیلا نے جواب دیا: "نہیں!"

پھر جلاد نے اُس کے گھٹنے دبائے: "اب؟"

پیشتر اس کے کہ نبیلا جواب دے وہ لڑکھڑا کر چوبی تخت پر گر پڑی۔ دمیتا سے آخری بار کچھ کہنے کے لئے اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر زہر اپنا کام کر چکا تھا — آخری بات، اُس کی زبان پر موت کی سردی نے منجمد کر دی اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا کی تاریکی میں سو گئی۔

کہتے ہیں کہ نبیلا کی لاش کو سامنے رکھکر دمیتا سنگ تراش نے مُردہ حُسن سے زندہ حُسن پیدا کیا — اُس نے مصر کی اس حسین و جمیل رقاصہ کی تمام رعنائیاں — پوشیدہ اور ظاہر — سنگ مرمر کے ایک بُت میں ہمیشہ کے لئے قید کر دیں۔

نبیلا کا مجسمہ جب تیار ہو گیا تو لوگوں نے اس کی زبان سے یہ لفظ سُنے۔

"یہ عورت اب مجھ سے اور اپنے آپ سے کہیں زیادہ دیر تک زندہ رہے گی!"

سعادت حسن منٹو

لیلائے سکون

سرسراتی نہ گذر ایسے شگافوں سے نسیم
اِن نکیلی سی چٹانوں میں ہے جن کا بستر
خامشی کو جو ڈرا دیتی ہیں ساری مل کر
جس کی آغوش میں اسرارِ فلک ہیں مضطر
اُن میں ممکن نہیں پوری ہو تمنائے سکوں

مرتعش ہیں جہاں مہتاب کی سیمیں کرنیں!
امن کی ڈھونڈتی پھرتی ہے وہاں تو راتیں
ہے تمنا کہ سکوں ڈالے گلے میں باہیں
الحذر! یہ تو تصور کی ہیں رنگیں باتیں
اس چمن میں نہ ملیگی تجھے لیلائے سکوں

دُھندلی دُھندلی سی وہ خوابوں کی حسیں گہرائی
جسکے اسرار ہیں کچھ دُھندلے طلسمی منظر
ان دُھندلکوں میں ہے پوشیدہ تمنا کی سحر
میزباں ہے جہاں آکاش کا نیلا شہپر
اُس جگہ جلوہ فگن ہے تری لیلائے سکوں

ہرندرناتھ ۔ ۔ ۔ مترجمہ: عبدالجلیل دہلوی

مغرب زدگی

برسات میں ہر نے سے ٹپکتے ہیں قرینے
ہیں ماحصلِ سال یہی چند مہینے

فطرت نے بدل دی ہے عناصر کی طبیعت
حدّت نہ حرارت نہ یبوست نہ پسینے

جب ایک گھٹا اپنے دکھا جاتی ہے جوہر
تب دوسری آتی ہے لٹانے کو خزینے

بوندوں سے ہے ہر شان ترنم سا ہویدا
مدّھم کے سلیقے ہیں تو پنچم کے قرینے

مینائے مے ناب لنڈھائی ہے فضا نے
"چھوڑی ہے بلندی سے مئے ناب کسی نے"

بیدار ہے اشجار کے رگ رگ میں "سُلالہ"
جھلسے ہوئے سبزے کو نہایا ہے "تری" نے

بن بن کے لہو۔ جوشِ نمو دوڑ رہا ہے
ڈوبی ہوئی نبضوں کو ابھارا ہے جھڑی نے

بگلوں کی قطاریں طرفِ ابرِ سیہ مست
بہتے ہوئے جاتے ہیں سمندر میں سفینے

پیپل کی جھکی شاخ سے پروا کا الجھنا
پتّوں پہ کیا رقص نسیمِ سحری نے

کیلوں کو شمیمِ چمن آرا کے جھکولے
سمٹے ہوئے پر کھول دئے سبز پری نے

بلبل کی الاپوں میں تقرب کے ترانے
قمری کی صداؤں میں جدائی کے قرینے

نظارۂ روئے شفقِ شامِ افق میں
یاقوت گلایا۔ سببِ تشنہ لبی نے

ہونٹوں پہ شبابوں کے "مدھر گیت" "ملاریں"
لہروں پہ مچلتے ہوئے جھولوں کے سفینے

آکاش کے ماتھے پہ چمکتے ہوئے تارے
الواحِ زبرجد پہ ضیا تاب نگینے

ایسے میں۔ ملا مجکو وہ "انگریز طبیعت"
مشرق میں برتتا ہے جو مغرب کے قرینے

جو خوبیِ تقدیر سے ہو آیا ہے یورپ
نیچے ہیں جہاں حُسنِ لبِ بام کے زینے
بِکتا ہے جہاں ایک اشارے میں تبسّم
لُٹتے ہیں جہاں حُسنِ خراماں کے خزینے
اظہارِ محبّت ہے جہاں "چائے کی پیالی"
ہوٹل میں جہاں بزمِ حسیناں کے قرینے

جو ہند کی تہذیب کو کہتا ہے جہالت
جو ہند میں سمجھا ہے کہ بستے ہیں "کمینے"
کالر میں چُھپاتا ہے جو چہرے کی سیاہی
مجبور کیا ہے جسے ہندی نسبی نے
"مکّہ وخمِ عیسیٰ" کی تلمیح مکمل
ہاں یہ کہ ذرا مانجھ دیا بدنظری نے
مقہور کیا ہے اُسے "نیچر" نے سمجھکر
مارا ہے اُسے اُس کی وجاہت طلبی نے
کہتا ہے نہیں ہند میں سامانِ تفرّج
ڈوبے ہیں حجابوں میں نقابوں کے سفینے
آزادیِ نسواں کا وہ ہڑبونگ نہیں ہے
اعضائے نجابت پہ جو لے آئے پسینے
بچ بچ کے نکلتے ہیں یہاں جلوۂ رنگیں
تہذیب سے مُنہ پھیر لیا "بے ادبی" نے
مشرق ہے کہ بیٹھا ہے چُھپائے ہوئے جوبن
مغرب ہے کہ جاتا ہے اُبھارے ہوئے سینے

ہے حامیِ تخریبِ رسوماتِ شرافت
"بے راہ" کیا اس کو شریر النفسی نے
اپنے ہی اب وجد پہ یہ الزامِ جہالت
لُٹیا ہی ڈبو دی، کفِ عشرت طلبی نے
"پھولوں کی تمنّا چمنستانِ حیا سے"
کانٹوں میں گھسیٹا ہے اسے "پردہ دری" نے

یہ ! اور اسی قسم کے جتنے بھی ملیں شاد
دریا میں ڈبو دیجئے بھر بھر کے سفینے

شاد عارفی

اُردُو کے مُحسِن جان گلکرسٹ

غالباً میرا یہ کہنا کوئی شاعرانہ تعلّی نہیں کہ مولانا آزاد کی "آب حیات" بچپن سے میری گھٹّی میں پڑی ہے۔ ابھی مَیں پوری طرح پڑھنے لکھنے سے واقف بھی نہیں تھا کہ گھر پر والد مرحوم کو آبِ حیات اور مولانا آزاد کی دوسری کتابوں کی کاپیاں پڑھتے سُنا کرتا۔ جب وہ ان کاپیوں کا کسی دوسرے کی مدد سے مقابلہ کرتے تو مَیں چُپ چاپ پاس بیٹھا انہیں دیکھا کرتا۔ چنانچہ بچپن ہی میں مجھے مصحفی اور انشا کے معرکے، سودا اور میر غلام غنچہ کے قصّے، امیر خسرو کی پہیلیاں، انمل، کہہ مکرنیاں اور دو سخنے زبانی یاد ہوگئے۔ اور انہیں آپ ہی آپ دُہرا کر مزے لینے لگا۔ ایک روز میں نے آبِ حیات کے یہ فقرے سُنے کہ اب تک مجھے یاد ہیں۔

"اِدھر یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں میں اُمرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا اُدھر دانائے فرنگ جو فورٹ ولیم کے قلعہ پر دُوربین لگائے بیٹھا تھا، اُس نے دیکھی۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے مگر تربیت چاہتا ہے۔"

میں نے ان فقروں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا اور بچپن کی خیالی دنیا میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ فورٹ ولیم کلکتہ میں ایک بہت بڑا قلعہ ہوگا۔ اس کے مینار یا برج پر ایک بڈھا کھوسٹ انگریز دُوربین لگائے بیٹھا تھا۔ ایک دن قلعہ کے نیچے سے یہ چونچال لڑکا (مصیبت کا مارا) گذرا۔ اس بڈھے نے دُوربین کے شیشوں میں اس لڑکے کو بھانپ لیا اور دل ہی دل میں کہا کہ اِسے پکڑ کر اپنے دلیس لے چلو۔ مدتوں میرے ذہن میں دانائے فرنگ اور اس چونچال لڑکے کے متعلق یہی خیالات آتے رہے۔ جب ذرا پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوا تو آبِ حیات پڑھنی شروع کی۔ اور جب اِس عبارت پر پہونچا تو پھر وہی خیالات کا سلسلہ قائم ہوگیا لیکن اب میں استعارے اور تشبیہ کو سمجھنے لگا تھا۔ اور جب اسی دوران میں جان گلکرسٹ کا نام پڑھا تو ان کی عزّت میرے دل پر نقش ہوگئی۔ انہیں میرے ذہن نے دانائے فرنگ کا مجسمہ تصوّر کیا۔ اور جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ باغ و بہار جیسی دلچسپ کتاب میر امّن نے ان ہی کے حکم سے لکھی تھی تو گلکرسٹ میری خیالی دُنیا کے ایک دیوتا بن گئے۔ کیونکہ اس وقت تک میں باغ و بہار کئی دفعہ مزے لے لیکر پڑھ چکا تھا۔ اور ہر مرتبہ اسکے پڑھنے میں مجھے ایک نیا لُطف آتا تھا۔

انگلستان آکر میں نے جان گلکرسٹ کے حالات ڈھونڈنے شروع کئے تو معلوم ہوا کہ یہ ۱۷۵۹ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک مشہور شہر اڈنبرا میں پیدا ہوئے اور وہیں کے ایک مدرسے میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔ اس مدرسے سے گلکرسٹ کو اتنی محبت تھی کہ مرتے وقت اپنی وصیت میں اس مدرسے کے نام بہت سا روپیہ چھوڑ گئے۔ ڈاکٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد گلکرسٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اُس زمانے میں ہندوستان جانا بہت جان جوکھوں کا کام سمجھا جاتا تھا کیونکہ عوام کے دل میں ہندوستان کے متعلق طرح طرح کے شبھے پیدا ہوگئے تھے۔ کچھ لوگ تو سمجھتے تھے کہ اس مُلک میں سوائے بیماری اور درندوں کے کچھ اور نہیں ملتا۔ بہر حال گلکرسٹ اسسٹنٹ سرجن ہوکر اپریل ۱۷۸۳ء میں کلکتہ جا پہونچے۔ جہاں گیارہ سال بعد یہ سول سرجن بن گئے۔

اس وقت ہندوستان میں مغل حکومت کا چراغ اگرچہ بالکل گل نہیں ہوا تھا لیکن ٹمٹما رہا تھا۔ اور شاہی حکومت سمٹ کر دلّی کے شہر پناہ اور لال قلعہ کے اندر محصور ہوتی جا رہی تھی۔ دیوانی کے اختیارات پر آہستہ آہستہ کمپنی نے قبضہ جما لیا تھا۔ لیکن دفتروں کی زبان اس وقت تک فارسی ہی تھی۔ اس لئے کمپنی کے ملازم فارسی سیکھنے پر مجبور تھے۔ گلکرسٹ کو احساس ہوا کہ اب ہندوستان میں فارسی صرف دفتری زبان رہ گئی ہے۔ اور وہ دن بھی دُور نہیں کہ دفتروں سے بھی نکالی جائے۔ ہندوستان کے عام لوگوں کی بول چال اُردو ہے۔ جسے سیکھے بغیر ہندوستان پر انگریزوں کا حکومت کرنا مشکل ہے۔ فارسی تو انہیں آتی ہی تھی۔ کچھ دن بعد اُنہوں نے سنسکرت سیکھنی شروع کی اور اس میں بھی خاصی مہارت پیدا کرلی۔ پھر ہندوستانی بھیس بدلکر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور اُن شہروں میں خاص طور پر جا کر رہے جہاں کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی۔ فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اُنہوں نے اور بھی مشرقی زبانیں سیکھیں۔ لیکن جس شوق سے اُردو زبان کی خدمت کی وہ شوق ہمیں اور زبانوں کے سلسلہ میں نظر نہیں آتا۔

گلکرسٹ کے اِس شوق سے کمپنی کے اور انگریز افسروں کی ہمت بھی بندھی۔ اور بہت جلد اُردو سیکھنے کا رواج عام ہوگیا۔ اب گلکرسٹ نے

محسوس کیا کہ اُردو سیکھنے کے بعد انگریزوں کیلئے اُردو پڑھنے کی مناسب
کتابیں نہیں ہیں۔ اس وقت تک ہماری زبان کا سرمایہ لے دے کے چند
دیوان تھے کہ جن کا سمجھنا انگریزوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ نثر کا میدان
اب تک دریافت بھی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ کتابیں لکھنے کا تو ذکر ہی کیا ہے
شرفا اُردو میں خط پتر تک لکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ گلکرسٹ نے
سب سے پہلے اس میدان میں خود قدم بڑھایا اور ۱۷۸۶ء میں کلکتہ سے دو
جلدوں میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری شائع کی اور اسکے نو سال
بعد اُردو کی گرامر انگریزی میں چھاپی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اس گرامر کا
ایک نسخہ موجود ہے جو کلکتہ کے کرانیکل پریس سے ۱۷۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔
اسکے سرورق پر سودا کا یہ قطعہ درج ہے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعوے نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کہ کیا نظم و بیاں ہے

اسکے نیچے فارسی کا یہ جملہ لکھا ہے۔

"ہر جا کہ سہوے و خطاے واقع شود بذیل کرم بپوشند
و بقلم اصلاح بر آں جاری دارند"

اس گرامر میں گلکرسٹ نے ہر بات کی سند شعر سے دی ہے۔ اور
شعر بھی غیر معروف شاعروں کے نہیں بلکہ بڑے بڑے اُستادوں کے ہیں۔
اگر آپ کا جی گرامر جیسے خشک مضمون پڑھنے کو نہ چاہے تو اس کتاب کے
شعر ہی پڑھ ڈالئے جو تفریح طبع کے لئے بہت کافی ہیں۔ مثلاً لفظوں
کی تذکیر و تانیث کے سلسلہ میں ایک پوری غزل نقل کی ہے۔ اس کے
صرف دو شعر سن لیجے۔

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھالیاں
دل لے کے بولتا ہے جو تو اب ٹھٹھولیاں
ہر بات ہے لطیفہ و ہر یک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

ایک اور بحث کے سلسلہ میں پھر سودا کا ایک قطعہ نقل کیا ہے
جو لطف سے خالی نہیں۔

یوں کہا شیخ نے شیطاں سے کہ آ ہم سے مل
آشنا مت ہو تو سودا سے خراباتی کا
سن کے بولا کہ ہے اس میں تو سعادت میری
لیک ہے خوف مجھے آپ کی بد ذاتی کا

گلکرسٹ نے ۱۷۹۸ء میں ایک اور کتاب مرتب کی کہ جس میں
ہندوستانی کہانیاں۔ دوہرے۔ غزلیں اور چند جنگی احکام کا اُردو ترجمہ
بھی شامل تھا۔ مضمون کے لحاظ سے ان کی کتابوں میں یہ مجموعہ سب سے
زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کے آخر میں انہوں نے چند غزلوں اور گیتوں کی
دھن انگریزی موسیقی کے اصول پر باندھی ہے۔ جو پیانو اور وائلن وغیرہ
انگریزی سازوں پر بجائی جا سکتی ہے۔ سب سے پہلے تو خواجہ حافظ کی وہ مشہور
غزل ہے کہ جس کا مطلع ہے۔

مطرب خوش نوا بگو تازہ بتازہ نو بہ نو
بادۂ دل کشا بجو تازہ بتازہ نو بہ نو

بات ہی بات نکل آئی تو وہ بھی سن لیجے کہ ایک دن اُردو کی کتابیں
دیکھتے دیکھتے کیمبرج یونیورسٹی میں مجھے اُردو شعرا کا ایک انتخاب ملا۔ اسے مولانا
امام بخش صہبائی نے غالباً دلی کالج کے طلباء کے لئے مرتب کیا تھا۔ اور
پنڈت موتی لال پرنٹر و پبلشر نے دہلی اُردو اخبار پریس مکان مولوی محمد باقر
صاحب سے ۱۸۴۵ء میں شائع کیا تھا۔ اس انتخاب میں شعرا کے حالات
اور انتخاب کلام کے بعد چند گیت اور غزلیں بھی درج ہیں۔ اور سب سے
پہلی غزل بھی خواجہ حافظ کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں
خواجہ صاحب کی یہ غزل شرفا کی محفلوں میں بہت شوق سے گائی جاتی تھی
ورنہ مولانا صہبائی جیسا زاہد خشک اسے کبھی نقل نہ کرتا۔

گلکرسٹ نے سودا کی ایک اور غزل کی دھن بھی انگریزی طرز
پر باندھی ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

اس شوخ سے اس دل کے لگ جانے کو کیا کہیے
ناحق کی اذیت سے دکھ پانے کو کیا کہیے

اس وقت لارڈ ولزلی ہندوستان کے گورنر جنرل تھے انہوں نے
گلکرسٹ کی بہت ہمت بندھائی۔ اور ۱۸۰۰ء میں انگریزوں کے اُردو
سیکھنے کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کر کے اس کا پرنسپل گلکرسٹ کو
بنایا۔ اب انہیں اُردو کی خدمت کا پورا پورا موقع ملا اور نہایت تندہی اور
دلجمعی سے اس کام میں لگ گئے۔ اور اُردو نثر کی موزوں کتابیں لکھوانے
کے لئے مناسب لوگوں کو جمع کیا۔ ان میں سے چند بزرگوں کے نام ابتک
مشہور ہیں۔ مثلاً سید محمد حیدر بخش حیدری۔ میر بہادر علی حسینی۔ میر امن۔
حفیظ الدین احمد۔ شیر علی افسوس۔ نہال چند لاہوری۔ کاظم علی جواں،
للو لال کوی۔ مظہر علی ولا۔ اور اکرام علی وغیرہ۔ ان حضرات کی لکھی ہوئی
کتابیں آج تک ہماری زبان کا بنیادی سرمایہ سمجھی جاتی ہیں اور ان میں
سے اکثر کتابیں اس قدر زمانہ گذرنے کے باوجود اُردو کی چوٹی کی کتابیں

گنی جاتی ہیں۔ اس بات کا فخر گلکرسٹ کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا کہ ان ہی کے اشارے سے ہماری زبان میں نثر کا راستہ تیار ہوا۔ اور اسی بات کا اعتراف اِن تمام بزرگوں نے اپنی اپنی تصنیف میں بھی کیا ہے۔ میں اِن میں سے ایک آدھ مصنف کی تحریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں اس سے ایک تو آپ کو اس زمانے کی طرز عبارت کا ڈھنگ معلوم ہو جائے گا، دوسرے یہ بھی دیکھ لیں گے کہ اپنے محسن جان گلکرسٹ کا ذکر کس محبت اور ادب سے کرتے ہیں۔

منشی سید حیدر بخش حیدری نے فارسی سے طوطی نامہ کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں کیا۔ اور اس کا نام توتا کہانی رکھا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کا ۱۸۰۶ء کا مطبوعہ ایک نسخہ موجود ہے۔ اسکے دیباچے میں منشی صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہ جہاں آبادی .... دست گرفتہ عالی جناب ... جان گلکرسٹ صاحب بہادر .... کا ہے۔ بموجب فرمائش صاحب موصوف .... طوطی نامہ کا .... زبان ہندی میں موافق محاورہ اُردوئے معلےٰ کے نثر میں عبارت سلیس و خوب، الفاظ رنگین و مرغوب سے ترجمہ کیا .... تاکہ صاحبانِ نوآموز کی فہم میں جلد آوے .... آمدم بر سر مطلب، سُنا چاہیے کہ کیا کیا خون جگر کھایا ہے اور کیسا کیسا مضمون باندھا ہے۔"

میر امن نے ۱۸۰۱-۲ء میں باغ و بہار تیار کی۔ کتاب کے شروع میں ایک عرضی میر امن دلی والے کی شامل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی کتاب لکھنے پر انعام مقرر تھا۔ جسے میر امن نے کتاب لکھ کر مانگا ہے۔ میر امن دیباچے میں اپنے خاندان اور زبان کی تاریخ لکھنے کے بعد کہتے ہیں:۔

"اب خداوند نعمت صاحب مروت نجیبوں کے قدر داں جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تلک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اِسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

نہال چند لاہوری نے ۱۸۰۴ء میں بکاؤلی کے قصے کو اُردو نثر میں لکھا اور اس کا نام 'مذہب عشق' رکھا۔ لیکن اس قصے کو شہرت گل بکاؤلی ہی کے نام سے ہوئی۔ ۱۸۱۵ء کے کلکتہ ایڈیشن کے دیباچ میں نہال چند لکھتے ہیں:۔

"اس مستمند نہال چند لاہوری کو (کہ مولد اس نحیف کا شاہ جہاں آباد ہے) آب و خور نے کھینچ کر اشرف البلاد کلکتہ کے بیچ (جو اس وقت میں دار الامارت ہندوستان کا ہے) لا ڈالا۔ اور یہ خاکسار کپتان ڈیوڈ روبرٹسن کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ انہیں کی دستگیری سے .... جناب جان گلکرسٹ صاحب .... کے حضور تک رسائی ہوئی .... اور صاحب بہادر کے تفضلات سے اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی .... ایک وز خداوند نعمت نے ارشاد کیا کہ قصہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا فارسی سے ہندی ریختے کے محاورے میں ترجمہ کر ....۔"

۱۸۰۴ء میں گلکرسٹ نے انگریزوں کو اُردو سکھانے کیلئے بول چال کا ایک رسالہ خود بھی مترتب کیا۔ جس میں اوّل سے آخر تک دو آدمیوں کی بول چال لکھی ہے۔ اس کا بھی ایک آدھ جملہ سُن لیجے۔ اور غور فرمایئے کہ اُس عہد میں انگریز کیسی زبان بولتے تھے۔

ایک شخص کہتا ہے:۔

"اس زبان کو سیکھنے میں آپ کو بہت شوق ہے۔"

دوسرا جواب دیتا ہے:۔

"بے شک میں ایسا قصد کیا چاہتا ہوں۔ لیکن اب میں بیس تیس لفظوں اور کوئی مروّج جملوں کے سوا نہیں جانتا ہوں۔ سو میں نے انہیں اچھی طرح لوک زبان کیا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ سیکھیں گے۔"

اس پر مجھے ایک ذاتی لطیفہ یاد آگیا۔ ایک مرتبہ میں اپنے ایک انگریز دوست کے ساتھ لاہور سے کراچی کا سفر کر رہا تھا۔ انہیں اُردو (اور وہ بھی فصیح و بلیغ اُردو) بولنے کا بہت شوق تھا۔ پہلے ہی اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو آپ نے کھڑکی سے مُنہ نکال کر ایک لڑکے کو اشارے سے بُلایا، اور ارشاد کیا: "اس مقامِ اتصال کا اسم شریف کیا ہے۔"

وہ لڑکا بیچارہ حیرت سے اِن کا مُنہ دیکھتا وہاں سے بھاگ گیا۔

فورٹ ولیم کالج میں جو خدمت جان گلکرسٹ نے اُردو زبان

کی کی وہ سونے کے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے۔ ایک طرف تو کمپنی کے ڈائرکٹر ہندوستان کی کسی زبان پر روپیہ صرف کرنا فضول سمجھتے تھے اُدھر ہمارے عالم اور فاضل ہندوستانی، اُردو زبان کی مدد کرنا اپنی فضیلت کے دامن پر ایک بدنما داغ تصوّر کرتے تھے۔ آفریں ہے گلکرسٹ کی ہمت پر کہ چو مکھی لڑائی لڑتے رہے۔ اور اکیلے وہ کام کر دکھایا جو آج ہزاروں مل کر نہیں کر سکتے۔ اس لگاتار محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی صحت خراب رہنے لگی اور آخر ۱۸۰۴ء میں ہندوستان سے اپنے وطن جانا پڑا۔ چلتے وقت ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے ایک مراسلے میں کمپنی سے اُن کے کام کی بہت تعریف کی اور آئندہ خدمات کے لئے سفارش بھی کی۔ اڈنبرا یونیورسٹی نے ان کے کام کو بہت اس طرح سراہا کہ انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ اسی یونیورسٹی نے تقریباً سو سال بعد ڈپٹی نذیر احمد کو بھی یہی اعزاز بخشا تھا۔

۱۸۰۹ء میں گلکرسٹ کمپنی کی ملازمت سے بالکل سبکدوش ہو گئے۔ اور اڈنبرا کے شہری معاملوں میں دلچسپی لینے لگے۔ لیکن ان کی نازک مزاجی اور زود رنج طبیعت سے لوگ اکثر خائف رہتے تھے۔ کہ یہ ذرا ذرا سی بات پر چڑ جاتے تھے۔ اور پھر جو منہ میں آتا تھا کہہ جاتے تھے۔ تفریح طبع کے طور پر انہوں نے اپنے گھر میں بہت سے ہندوستانی پرندے پال رکھے تھے اور ان کا پنجرہ اس طرح بنایا تھا کہ ہر وقت راہ چلتوں کی نظر کے سامنے رہے۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا۔ لیکن یہ کسی کی کب سنتے تھے۔ بعد میں ایک دوست کی شرکت سے ایک بنک بھی قائم کیا۔ مگر اس کی دوسرے بنکوں سے ساکھ قائم نہیں ہو سکی اس لئے نقصان اٹھا کر بنک بند کرنا پڑا۔

۱۸۱۶ء میں یہ اڈنبرا سے لندن آ گئے اور لسٹر سکوائر میں کمپنی کے ملازموں کو ہندوستان جانے سے پہلے اُردو پڑھانے کا کام شروع کیا۔ کچھ مدت بعد کمپنی نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ بات مان لی کہ انگریزوں کو ہندوستان جانے سے پہلے لندن میں اُردو سیکھنی چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے ڈاکٹر گلکرسٹ کو اُردو کا پروفیسر مقرر کیا۔ اب ڈاکٹر صاحب لندن میں باقاعدہ اردو پڑھانے لگے۔ اور کمپنی کی طرف سے انہیں مکان کا کرایہ بھی ملنے لگا۔ لیکن کمپنی نے شرط یہ لگا دی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کسی طالب علم سے تین گنی سالانہ سے زیادہ فیس نہ لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں کسی طالب علم سے اُردو پڑھانے کی فیس بالکل نہیں لونگا۔ لیکن طالب علموں سے کہدیا کہ جماعت میں داخل ہونے سے پہلے میری سب کتابوں کی ایک ایک جلد خرید لو۔ ان کی سب کتابوں کی قیمت کوئی دس پندرہ پونڈ ہوتی تھی۔ اس طرح انہوں نے فیس سے تگنی رقم وصول کر لی۔ اس پر کمپنی کو اعتراض ہوا۔ دوسرے یہ باقاعدہ پڑھانے بھی نہیں آتے تھے۔ اس پر بھی لوگوں نے شور مچایا۔ لیکن انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی۔ آخر تنگ آ کر کمپنی نے اِن کی تنخواہ اور مکان کا کرایہ دینا بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بھی کمپنی سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ اور سب سے بڑی شکایت یہی کہ اُن سے اُردو پڑھنے کے لئے کمپنی کے سب ملازم نہیں آتے تھے۔ بلکہ صرف اسسٹنٹ سرجن بھیجے جاتے تھے۔ ان کی سالانہ رپورٹوں میں کمپنی سے اس قسم کی نوک جھونک اکثر چلا کرتی تھی۔ آخر میں انہوں نے اپنی سب رپورٹوں کو ایک کتاب کی شکل میں چھاپ دیا اور اس میں خوب جی بھر کر کمپنی کو بُرا بھلا کہا۔ اور اُردو زبان سے بے رخی پر کمپنی کی خوب ہی دل کھول کر خبر لی۔ گویا اسی جھگڑے میں ۱۸۲۶ء تک یہ اُردو پڑھاتے رہے۔ اب کمپنی نے یہ کام ڈنکن فوربس کے سپرد کر دیا۔ اب بھی ڈاکٹر صاحب ہفتہ میں ایک آدھ دفعہ جا کر جماعت میں لکچر دے آتے تھے۔ لیکن اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ اب یکایک انہیں خیال آیا کہ میری کتابیں بکنی بالکل بند ہو گئیں۔ اس لئے انہوں نے فوربس کی جماعت کے مقابلے میں قریب ہی ایک اور جماعت کھول دی۔ اب فوربس سے زیادہ برداشت نہ ہو سکا۔ اور انہوں نے ۱۸۲۸ء کی سالانہ رپورٹ میں ڈاکٹر صاحب کے خلاف کافی زہر اُگلا۔ اس کے بعد گلکرسٹ بالکل گوشہ نشیں ہو گئے۔ اور ۱۸۴۱ء میں ۸۳ سال کی عمر میں پیرس میں انتقال کیا۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ فارسی اور اُردو زبان کی خدمت دو ایسے انگریزوں نے کی ہے کہ جن کا تعلق براہ راست زبان یا ادبیات سے نہیں بلکہ طب اور ڈاکٹری سے تھا۔ میرا اشارہ فارسی کے مشہور فاضل پروفیسر براؤن اور گلکرسٹ کی طرف ہے۔ کہ جب تک دُنیا میں فارسی اور اُردو زبانیں بولی اور سمجھی جاتی رہینگی اس وقت تک اِن دونوں بزرگوں کا نام بھی زندہ رہے گا۔ کیونکہ انہوں نے اپنی ہمت اور جوانمردی سے ایک نیا راستہ نکالا اور پھر اسے اسقدر استوار اور ہموار کر دیا کہ آئندہ نسلیں اس پر بے خوف و خطر چلتی رہیں گی۔

خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

آغا محمد اشرف

طلائی مہر

ہڈیاں چٹخیں، پسلیاں چرچرائیں۔ اور سوکھے گلوں سے پژمردہ چیخیں بلند ہوئیں: "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

اور اب پٹواریوں اور نمبرداروں کے ہجوم میں سے تھانیدار اپنی پگڑی کو ٹیڑھا کرتے ہوئے نکلا اور کڑکا: "ایسا ضرور ہوگا! یہ میرا حکم ہے۔ اور میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے۔ مہینہ بھر کے لئے تم اپنی زمینوں میں ہل نہیں چلا سکتے۔ نہ تم کھیتوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہو۔ نہ گوبھی کی کیاریوں کو پانی دے سکتے ہو۔ تم نے ڈاکوؤں کو پناہ دے رکھی ہے۔ اور جب تک تم اپنے کئے کی سزا نہیں بھگتو گے تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔ تم لاتوں کے بھوت ہو!"

ایک پھٹے ہوئے چولے والا نوجوان مجمع کو چیر کر آگے بڑھا۔ اسکے گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں، بازوؤں کے پٹھے تن گئے تھے۔ اور رنگ چقندر کی طرح لال تھا۔ وہ تھانیدار کے مقابل جا کر پکارا: "لیکن ہم تباہ ہو جائینگے، ہم مر جائینگے۔ ہم غریب آدمی ہیں!"

اور مجمع سے دبی دبی آوازیں آئیں: "اے فیض، فیض! کیا کرتے ہو۔ پیچھے ہٹ آؤ!"

اور سامنے سے تھانیدار نہایت تند لہجے میں، اس کی ماں اور بہن کی آبرو ریزی کرتا ہوا دھاڑا: "یہ منہ پھٹ چھوکرا کون ہے؟ بدزبان، بے حیا۔ ارے تم غریب ہو۔ تو یہ تمہارے اپنے ماتھے کا لکھا ہے۔ تمہاری غریبی میرے حکم کی راہ میں روڑا بن کر کیوں اٹکے؟ کل شام تک تم سب اپنے جھونپڑے چھوڑ چھاڑ کر گاؤں میں جا بسو۔ پورے ایک مہینے تک نہ ہل چلاؤ، نہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرو، نہ گوبھی کو پانی دو۔ ورنہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میری بینتوں کی ضرب اسقدر سخت ہے کہ بے شمار بدمعاش آج تک تم پر پٹیاں باندھے میرے سائے سے چھپتے پھرتے ہیں!"

ایک بوڑھا کھوسٹ پرلی طرف ایک بیری کے تنے کا سہارا لیکر اٹھتے ہوئے بولا: "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم پر رحم کیجئے مالک!"

اور تھانیدار پلٹ کر جاتے ہوئے بولا: "میں پتھر ہوں۔ اور پتھر رحم نہیں جانتا۔ میرا حکم اس علاقے کا قانون ہے!"

اور دُور سفید بادل کے سائے میں ایک باز ایک بھٹکے ہوئے نیلے کبوتر پر جھپٹا۔ اور اسے پنجوں میں دبوچ کر نُچے کھچے پر فضا میں بکھیرتا تھانے کی کالی عمارت کی طرف اُڑ گیا!

ان دنوں علاقوں میں دو ڈاکو پھر رہے تھے۔ جنہوں نے قرضے کے بوجھ سے تنگ آ کر گاؤں کے ایک سیٹھ کا پیٹ چاک کر دیا۔ اور لمبی لال پوتھیاں جلا دیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مفرور پولیس کی زد میں آگئے مگر پولیس والوں کو معلوم تھا کہ ان کے پاس سرحد پار کی بندوقیں ہیں۔ اور ان کی بے پناہ نشانہ بازی کے چرچے تو دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکوؤں کی آمد کی خبر پاتے ہی وردیاں پہننے اور پیٹیاں کسنے لگتے۔ اور ڈاکو اندھیری گھاٹیوں کے گہرے غاروں میں دبک جاتے —— اور پھر اُوپر رپورٹ بھیجدی جاتی۔ کہ گاؤں والے ڈاکوؤں کو چھپائے رکھنے پر متفق ہو گئے ہیں۔ لیکن ان پر مناسب دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ عنقریب انہیں زبردست زک پہونچے گی —۔ گاؤں پر پچھلے دو مہینوں سے تعزیری چوکی کا دیو بھی مسلط کر دیا گیا۔ اور وہ لوگ جو صبح جَو کی روٹی کھولتے ہوئے پانی کے ساتھ نگل کر شام کے کھانے کی فکر میں غرق ہو جاتے تھے۔ ہر مہینے کچھ رقم مہیا کرنے پر مجبور کر دئے گئے! اس سلسلے میں اتنا سننے میں آیا کہ ایک بوڑھا اپنی کنواری بیٹی کا رات بھر غائب رہنا صرف اس لئے برداشت کر لیتا ہے کہ صبح سویرے اُس کی ڈبڈبائی آنکھوں والی لڑکی اس کی ہتھیلی پر چونی یا اٹھنی رکھ دیتی ہے۔ اور ایک بڑھیا جس کا خاوند مر چکا تھا اور بیٹا شُبے کی بنا پر پھانسی چڑھ گیا تھا کھاتے پیتے لوگوں کا غلہ پیستے پیستے چکی کے پاٹوں پر سر رکھ کر ٹھنڈی ہو گئی!

اور جب اس قدر سختی کے باوجود ڈاکوؤں نے خود بخود تھانے آ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہ کیا تو اُوپر سے حکم لیا گیا کہ گاؤں سے باہر جو لوگ کھیتوں کی حفاظت کے لئے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، ڈاکوؤں کو پناہ دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہل چلانے، کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے، اور گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا جائے۔ تاکہ وہ اس دباؤ سے تنگ آ کر سرکار کا ہاتھ بٹا سکیں۔

زمینیں ٹھنڈ سے اکڑ گئیں! کھیت مرجھا گئے! گوبھی کی پھولیں برگ پر جم گئی۔ لیکن حکم حاکم مرگ مفاجات۔ چُپ سادھے بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی دبے پاؤں اپنے کھیت دیکھنے چلے جاتے۔ اور مینڈھوں کی خشک گھاس پر جمی ہوئی یخ کی چادر اُن کے پاؤں کے نیچے چٹختی تو اُن کے کلیجے

کٹ جاتے! اور جب گوبھی کے زرد پتوں پر زردی بکھری ہوئی دیکھتے تو انکی
رونمیں رونمیں سے چنگاریاں جھڑنے لگتیں۔

لیکن اس قدر تباہی کے باوجود فیض کی کیاریاں اسی آن بان
سے لہلہاتی رہیں۔ اور جب شام کو تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل ٹنڈ
منڈ بیریوں کے آبنوسی سائے جم کر رہ جاتے۔ اور جب جھیل کے اس
طرف کوئی بھٹکی ہوئی مرغابی کنارے کی کائی میں پھڑپھڑاتی ہوئی گھس
جاتی تو فیض گھر سے باہر نکلتا اور دیواروں سے مل مل کر چلتا۔ جھاڑیوں کو
پیچھے دھکیلتا، آباد راہوں سے کتراتا، اپنے کنوئیں پر چلا جاتا ہے۔ اور اس پر
ٹین کا ڈول لٹکا لٹکا کر پانی نکالتا اور گوبھی کی کیاریوں کو لبریز کر کے
موٹے موٹے چاند ایسے پھول اکھیڑ کر ایک ٹوکرا بھرتا اور قصبے کے بوڑھے
سبزی فروش کے ہاں پہونچا کر گاؤں لوٹ آتا۔ اور جب جھٹپٹے کے وقت
لوگ مسجد کی طرف جاتے، اور دن چڑھے واپس آتے تو فیض کو اپنی
جھکی ہوئی ڈیوڑھی کے اندر بھوری گائے کے اس طرف ایک موٹا کمبل
اوڑھے خراٹے بھرتا پاتے۔

فیض گاؤں بھر میں ایک شرمیلا اور کم ہمت نوجوان سمجھا جاتا
تھا۔ لیکن اپنے دوست فتح دین کے بیاہ میں شریک ہونے کے بعد اچانک
اس کے دل نے ایک پھریری لی۔ اور دوسرے روز اس نے اپنے ایک دشمن
پر ایک گلی میں بے دھڑک آوازے کس دئے! اسکے ہم عمر دوست بہت
سٹپٹائے۔ اور فیض کی فطرت کے اس زبردست پلٹے پر قسم قسم کی
خیال آرائیاں کیں۔

"کہیں سے پستول ہاتھ لگ گیا ہوگا"

"ایکے اس کی گوبھی کی کیاریاں آباد ہیں نا!"

اور اس قسم کی دیگر باتیں۔ لیکن اصل بات کسی کو نہ سوجھی۔ اور
وہ بات بہت چھپی چھپی تھی۔ کیونکہ اس بات کو صرف فیض اور سونی ہی
جانتے تھے۔

سونی گاؤں کے بوڑھے چوکیدار کی لڑکی تھی۔ بہت شرمیلی اور
نٹ کھٹ تھی۔ جیسے گلاب کی کلی جو سورج کی روشنی اور گستاخ جھونکوں سے
لجا کر پتوں میں چھپ چھپ جائے! باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لئے اپنی
ماں کی مرضی کے خلاف بنی ٹھنی رہتی تھی۔ گلابی پاؤں میں سبز چمڑے کا جوتا
بنتی چھینٹ کا لہنگا۔ جاپانی اودے ریشم کی قمیص۔ سر پر تاروں بھری
اوڑھنی۔ ناک میں چاندی کی موتی ایسی کیل۔ کانوں میں جھم جھم کرتے بندے
جن کے نیچے شبنم کے قطرے لس لس کرتے رہتے۔ گلے میں ہنسلی، جس سے
چاندی کے گھنگرو لٹکے رہتے۔ گوری باہوں میں دھانی چوڑیاں۔ اور
پھر پاؤں میں سبز جوتوں کے اوپر ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھیں جو ہر قدم
پر ایسا دلآویز چھناکا پیدا کرتی تھیں جیسے بیشمار کوئلیں نیم کے چھتنار
میں چھپی رُک رُک کر کوکو پکار رہی ہوں!

فیض، فتح دین کی شادی پر اپنا بہترین لباس پہنے اپنے دوستوں
کے ہمراہ چھت پر بیٹھا کنواریوں کے گیت سن رہا تھا۔ آٹھ دس لڑکیاں
مل کر گاتیں۔ جوان میراثن سینہ تانے ڈھولک بجاتی، دانت نکالتی اور
جھومتی۔ اور جب گیت کا آخری سُر نازک گلوں میں مدغم ہوتے ہوتے
ختم ہو جاتا۔ تو ڈھولک کی دھما دھم دھپ کے ساتھ نئے گیت کی ابتدا
ہو جاتی۔ کوٹھوں پر گاؤں والے دبکے بیٹھے تھے۔ اور ٹنڈ منڈ بیریوں اور
نیموں میں شریر بچے چھپے، گیت سن رہے تھے۔ اور بیچ صحن میں لال
اور پیلی اوڑھنیاں اور اودے اور گلابی لہنگے لالٹینوں کی پیلی روشنی
میں مٹتی ہوئی قوس قزح کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ ایک نیا گیت
شروع ہوا میراثن کی انگلیاں ڈھولک پر والہانہ رقص کرنے لگیں۔
اور لڑکیوں کی پتلی پتلی آوازیں بلند ہوئیں۔ جیسے کوئی سازندہ آٹھ دس
سارنگیاں گود میں دبائے بیک وقت آٹھ دس تاروں کو جھنجھنا رہا ہو۔
کہ اچانک سب لڑکیاں خاموش ہو گئیں، اور سارے مٹیالے منظر کو
ایک تنہا آواز کا تیز نشتر چیرتا ہوا افق کی طرف اڑ گیا۔ الفاظ فضا میں
گردش لینے لگے۔

ترس ترس کر جی اور ہنس ہنس کر مر
کہ ترستی زندگی اور ہنستی موت ---!

اور اچانک آواز رک گئی۔ اور گانے والی کو احساس ہوا کہ شریر
لڑکیاں اس کی آواز سننے کے لئے چپ ہو گئی ہیں اور وہ اس سازش
پر غصے اور شرم کے مارے میراثن کی ڈھولک کے قریب فرش پر سر
رکھ کر سہمی سہمی کھلکھلانے لگی۔ اور لڑکیاں جھک جھک کر اور لیٹ لیٹ
کر اس قدر ہنسیں کہ جیسے سارے اندھیرے منظر میں ستارے ٹوٹ ٹوٹ
کر بکھر گئے!

چھت پر بیٹھے ہوئے نوجوان ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے
ایک بولا۔ "آواز تھی یا سونے کا ایک تیر تھا۔ جو دلوں کو چیرتا ہوا
پار ہو گیا"

دوسرے نے کہا۔ "آواز تھی یا اس کبوتر کی اڑان تھی جس کے
پنجوں سے گھنگرو بندھے ہوتے ہوں!"

اور ایک طرف سے فیض دبی دبی آواز میں بولا۔ "آواز تھی یا شفاف
تالاب کی تہ میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں"

نوجوان رُک رُک کر ہنستے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور فیض کو ٹہوکا دیتے ہوئے بولے:۔

"کچھوا، اور ناچے!"

"مینڈک، اور ملہار گائے!"

"چھچھوندر، اور سر میں چنبیلی کا تیل ڈالے!"

اور فیض اپنی ذرا ذرا سی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

"بھئی ہمارے بھی دل ہے!"

اور سب نوجوان چُپ ہو گئے۔ جیسے انہیں فیض کی یہ دلیل پسند آ گئی ہو۔ اتنے میں منڈیر کے قریب سے ایک نوجوان سر اُٹھا کر بولا،

"لیکن یہ تھی کون؟"

"سوتی!"

"سوتی!"

"ہاں، چوکیدار کی لڑکی۔ وہ جو بھڑکیلے کپڑے پہنتی ہے۔ اور لجائی رہتی ہے۔"

"ہاں ہاں، وہ بجلی!"

"اچھا، وہ جادوگرنی!!"

اور جب دس بجے رات کو لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے، اور لڑکیاں بھی لمحہ بھر کے لئے آرام کرنے کیلئے سو گئیں اور کچھ اپنے اپنے گھروں کو چل دیں، تو فیض ایک اندھیری تنگ گلی میں یہ سوچتا جا رہا تھا کہ بعض لوگوں کی آوازیں کتنی مٹھاس ہوتی ہے جیسے کانوں کے رستے کوئی شہد کے گھونٹ پلا رہا ہے! اور اس کا جسم تپ گیا اور دل ناچنے لگا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کا یوں نکو بن کر بیٹھے رہنا اس جوانی کے ماتھے پر کالا بدنما داغ ہے۔ اور سوتی یا کسی اور الھڑ لڑکی کو باہوں پر ڈال کر اندھیری گھاٹیوں میں دھیرے دھیرے ترستی زندگی اور مہتی موت کے گیت گانے میں جو کیفیت ہے، وہ آرام سے ٹھنڈی ہوا کے ہلکوروں میں لمبی تان کر سونے میں بھی نہیں۔

چونکہ اس کا گھر گاؤں کے پرلے سرے پر تھا، اس لئے اسے یہ انوکھی باتیں سوچنے کے لئے بہت وقت مل گیا۔ اور جب وہ پرانے قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے قریب سے گذر رہا تھا، تو چرچر کرتے جھینگر اچانک چُپ ہو گئے۔ اور ٹڈیاں اپنی طویل اور باریک بین پیر کو روک کر دم بخود رہ گئیں۔ ساری فضا پر ایک خوفناک خاموشی چھا گئی۔ کہ اچانک فیض ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے کانچ کی چوڑیوں کی آواز سُنائی دی — اور اسے احساس ہوا کہ کوئی لڑکی اس سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر بیٹھی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہے۔ اور یہ کھنکھناہٹ فیض کو فتح دین کے صحن میں لے آئی! اور پھر وہ گرجتی ہوئی ڈھولک اور جھومتی ہوئی میراثن وہ رنگا رنگ لباس اور وہ چوڑیاں — اور پھر سوتی کی آواز، جو اندھیرے منظر کو چکا چوند کرتی اُفق کی گود میں سو گئی — اور اسے ترستی زندگی اور ہنستی موت کا خیال آیا — موت اور ٹوٹی ہوئی قبروں والا قبرستان! — سوکھے ہوئے ڈھچر اور خوفناک ڈائنیں، جو راتوں کو چوڑیاں بجاتی ہیں، اور شکستہ دیواروں کے سوراخوں میں راہ چلتوں کو دبوچنے کی تاک میں چھُپی رہتی ہیں! لمحہ بھر کے لئے اس کے دل پر جیسے برف کے گالے پڑ گئے! لیکن اچانک ایک اضطراری حالت میں وہ گرج کر پکارا۔

"کون ہے تو؟"

"سوتی" آواز آئی۔ اور فیض کو محسوس ہوا۔ کہ واقعی قبرستان کے ایک کونے پر چھوٹے سے گڑھے میں پانی جمع ہو گیا ہے۔ اس کے نیچے کسی کی ہوئی جل پری نے، جس کی کلائیوں پر چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ کروٹ بدلی ہے۔ جسم کے ہر مسام سے پھوٹتا ہوا پسینہ اور پسینے کے ہر قطرے میں چھپاتی ہوئی چنگاریاں اور دہکتا ہوا اور تھِرکتا ہوا بدن اور رقص کرتی ہوئی رُوح! — فیض کے اوسان لڑکھڑائے اور اس اندھیرے منظر کی خنک تنہائی میں اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سوتی کے ہمراہ کسی دور دراز مُلک کی طرف اُڑا جا رہا ہے۔ اس حالت میں کہ سوتی کا سر اس کے کاندھے پر ہے۔ اور اس کی زلفیں فضا میں مور ناگنوں کی طرح لہرا رہی ہیں۔ اور اسکے ٹخنوں کی جھانجھنوں کی چھنک سے فضا گنگنا رہی ہے!

اچانک جھینگروں اور ٹڈوں کی مسلسل تانیں خاموش نظاروں پر نشتر زنی کرنے لگیں اور فیض اس قبرستانوں اور تاریکیوں کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اور بولا: "یہاں کیا کر رہی ہو سوتی؟"

اور سوتی بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "یہاں میری سونے کی مُہر گر پڑی ہے۔ میں نے یہ مُہر جاگیردار کی بیٹی سے آج رات کے لئے لی تھی۔ اور میں اب فتح دین کے گھر سے اُٹھ کر آ رہی تھی کہ یہاں مجھے چند ایک سہیلیوں نے چھیڑا۔ اور ٹھٹّے مخول میں مجھے مُہر کا خیال نہ رہا۔ اور جب میں گھر پہونچی تو ماتھے کو خالی پا کر میرا دل دہل گیا۔ واپس آ کر یہاں اندھیرے میں خاک پر ہاتھ پھیر رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں مُہر لڑھک کر ادھر دھنسی ہوئی قبروں میں گر گئی تو کب ملے گی۔ اور مجھ پر باپ بہت خفا ہوگا کہ میں نے دم بھر کی رونق کیلئے ایسا غضب ڈھایا!"

فیض کا جی بھر آیا۔ جیب سے ڈبیا نکالی اور ایک دیا سلائی روشن

کی پہلی نظر سونی کے ماتھے پر پڑی۔ جس کے عین وسط سے سیدھی مانگ لپک کر اوپر اوڑھنی میں چھپ گئی تھی! اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں! اور پتلے پتلے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ اسکی مکھن ایسی کلائیوں میں کانچ کی بیشمار چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اسکے ہاتھ خاک آلود تھے۔

"فیض!" وہ تعجب سے پکاری! اور فیض خوشی سے ہانپنے لگا۔ کہ سونی اس کا نام جانتی تھی۔ اور کسی دوشیزہ کو ایک نوجوان کا نام یاد رہنا کا یہ مطلب ہے کہ اس نوجوان میں کوئی خصوصیت موجود ہے۔

چھر رچھر ر، دیاسلائیاں جلنے لگیں اور زمین پر بجھتی ہوئی چنگاریوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور آخر کار فیض ایک قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑیوں کی جڑ میں سے مہر اٹھا لایا۔ اُسے قمیص سے پونچھا اور سونی کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا: "لو سونی، شکر ہے مل گئی!" اور جب اسکی خاک آلود انگلیاں سونی کی خاک آلود انگلیوں سے مس ہوئیں تو اندھیرا اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ ٹڈیاں چیخ اٹھیں اور جھینگر چلانے لگے اور دونوں نے محسوس کیا کہ انکے جسم کپکپا رہے ہیں۔ انکی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں۔ اور انکی انگلیاں پسیج رہی ہیں۔

کانپتی ہوئی آواز میں سونی بولی: "تم نے بہت تکلیف کی۔ قبرستان کے کنارے، قبروں کے درمیان ہاتھ پھیرتے پھرنا بہت حوصلے کا کام ہے۔"

اور فیض بولا: "اور یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ہماری ملاقات قبرستان کے کنارے اور قبروں کے درمیان ہوئی ــــ اور سونی یہ اندھیرا کتنا گہرا اور گاؤں کتنا خاموش ہے ــــ اور سونی، تم نے وہ ترستی زندگی اور ہنستی موت کا گیت کتنا اچھا گایا تھا ــــ لیکن سونی تم شرما کیوں گئی تھیں ــــ اور تم اب کس رستے سے گھر جاؤ گی، کہو تو میں تمہارے گھر پہونچا آؤں ــــ اور سونی ــــ سونی، تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟"

اور سونی اندھیرے میں ٹوٹی ہوئی دیوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھتی ہوئی بولی: "میں تو تمہارا نام مدت سے جانتی ہوں۔ کیونکہ تم میری پھوپی کے پڑوس میں رہتے ہو۔"

اور فیض یہ بھولا بھالا جواب سُن کر جھینپ سا گیا۔ اور بولا: "اکیلی جاؤ گی؟"

"ہاں کیا ہرج ہے۔ ادھر جاگیردار کا کتا کبھی کبھی جھپٹ پڑتا ہے۔ ورنہ کیا ہرج ہے۔"

اور پھر جب فیض اُسے ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس پہونچا کر واپس لوٹنے لگا تو سونی بولی: "تم نے بہت تکلیف کی!"

بہت پرے ایک گلی کے نکڑ پر بیٹھا ہوا بوڑھا چوکیدار چلایا۔ "خبردار بھائیو ــــ" اور فیض نے آہستہ سے کہا "تمہارا باپ جاگ رہا ہے۔ ہولے ہولے چلو۔ تمہارے ٹخنوں کی جھانجھنوں کا چھناکا نہ سُن لے!" ــــ اور فیض نے محسوس کیا کہ سونی اندھیرے میں مسکرا رہی ہے!

وہ رات کی وجہ سے سونی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے دل و دماغ پر ایک خاص پیکر کا نقشہ جم گیا۔ جس کی مانگ ستاروں کو گھول کر بنائی گئی تھی۔ اور جس کا خوبصورت سینہ اور ابھرے ہوئے کولے اور سفید ٹخنوں پر گنگناتی جھانجھنیں اور گرد آلود ہاتھ اور رستی انگلیاں اور ــــ اور وہ بہت سی باتیں تھیں جن کا اُسے پہلے کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ لیکن جو اب ایک مکمل شکل اختیار کر کے اُسکے دماغ کی شریانوں میں نشے بن کر گھوم رہی تھیں۔

اور یونہیں زندگی کے اڑتے ہوئے لمحوں میں فیض اور سونی نے چند ایسی گھڑیاں چُن لیں۔ جن میں ان کے دھڑکتے دل رُک جاتے۔ اور جھپکتی آنکھیں ایک دوسرے کو گھورتی رہ جاتیں۔ اور سونی گلیوں میں سینہ تانے، بازو لہراتی، آنچل پھر پھراتی، کوندے کی طرح لپکتی ہوئی پھرتی گلیوں میں غائب ہو جاتی۔ اور فیض ننھی ننھی مونچھوں کو بل دے کر ایسے ایسے پتھر اٹھاتا کہ کسی بیل کی پیٹھ پر رکھ دئے جاتے تو وہ بچک کر زمین سے لگ جاتا!۔

اب سونی کی ایک سہیلی کا بیاہ نزدیک تھا۔ اور جاڑوں کی ایک سرد رات کو جب سارے گاؤں پر ایک کہرا سا پھیلا ہوا تھا۔ اور بکھری ہوئی کھیتیوں کے کنارے ٹڈے چرچرا رہے تھے۔ ایک کھنڈر کے پار فیض نے سونی کے صاف چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "تم اتنی گھبرا کیوں رہی ہو؟ میں لے آؤں گا تمہارے لئے سونے کی مہر۔ میں اپنے گوبھی کی رقم اکٹھا کر تا رہونگا اور تمہاری سہیلی کے بیاہ سے دو چار دن پہلے گورے ستنے کی ایک چمکتی دمکتی مہر تمہارے اس چاند سے ماتھے پر جھم جھم کرتی نظر آئے گی۔ اور سونی شاید تم نہیں جانتیں کہ میں اس قسم کی کتنی [illegible] تمہارے قدموں پر نچھاور کر سکتا ہوں۔ اور سونی ــــ [illegible] کتنی اچھی ہو!"

اور سونی نے فیض کے بالوں میں اٹکی ہوئی ننھی سی کنکھی کو اپنی انگلیوں میں گھما کر کہا: "تمہیں تکلیف ہوگی فیض ــــ اور سونے کی مہر میں جاگیردار کی بیٹی سے مانگ لوں گی۔ اور پھر اچانک انہیں پہلی

رات یاد آگئی. جب جاگیردار کی بیٹی کی مُہر ایک دھنسی ہوئی قبر کے کنارے جلی ہوئی جھاڑی کی جڑوں میں پڑی ملی تھی۔ اور پھر وہ انجانوں کا آتشیں مس! اور اس کے بعد وہ راتوں کی پرشور گھڑیاں —— دونوں کُہرے کے دھندلے سایوں میں ایک دوسرے کی ڈبڈباتی پتلیوں میں ماضی کا ناٹک دیکھنے لگے۔ اور تب تک دیکھتے رہے جب ایک ... نے دور ایک نیم کی ٹہنی پر اس زور سے بانگ دی کہ سونی کا جسم کانپ گیا۔ اور فیض کی آنکھیں جھپک گئیں!

اور اب تھانیدار کے حکم سے لوگوں کو گوبھی کی کیاریوں کو پانی دینے سے روک دیا گیا۔ لیکن راتوں کو فیض کے کنوئیں سے بے شمار ڈول چھلکتے ہوئے نکلتے اور گوبھی کی کیاریوں میں سرنگوں ہو جاتے۔ لوگ فیض سے شکایت کرتے کہ تم چمگادڑ کی طرح دن کو کیوں سوتے ہو؟" اور فیض جواب دیتا کہ "جب انسان بیکار ہو تو رونے یا سونے کے سوا وقت کیسے کٹے!"

اور بیس دن بعد جب فیض کے پاس چودہ روپے جمع ہو گئے، تو وہ قصبے کے سنار سے ایک مُہر بنوا لایا۔ جس کے پیچھے گو لاکھ چپٹی ہوئی تھی۔ لیکن جس کے سامنے سونے کا ایک پتلا پترا جگمگ کر رہا تھا۔ اور جیسے ساتھ ننھی سیپیوں ایسے پترے اور شفاف شبنم ایسے موتی یوں لٹک رہے تھے جیسے چاند کے کناروں پر کسی نے جھالر ٹانک دی ہو۔

شام کو وہ گاؤں سے آدھ میل کے فاصلے پر پہونچا تھا کہ راستے کے کنارے گنجان جھاڑیوں کے جھرمٹ میں سے چار سائے لپکے اور اُسے دبوچ لیا۔ وہ بہت چیخا چلایا۔ وجہ پوچھی۔ لیکن اُسے گھسیٹ کر چوپال لایا گیا۔ یہاں تھانیدار گیس کی روشنی میں اپنے لمبے طرّے سمیت بیٹھا سامنے ٹکٹکی گھور رہا تھا۔ فیض کو دیکھکر اس کے نتھنے پھول گئے اور ہنٹر اوپر فضا میں اٹھ گیا اور پھر شڑاپ شڑاپ کا شور —— اور الّو کے پٹھے! کمینے! حرامزادے! بدمعاش!! اور جانے کیا کیا —— اور پھر ادھ موئے فیض کا گٹھڑی بنا ہوا جسم بوڑھے چوکیدار نے گھسیٹ کر ایک طرف کر دیا۔ اور تھانیدار پکارا کہ "رات کو چھپ چھپ کر اس نے کیاریوں کو پانی دیا ہے اور گوبھی کے پھول بیچے ہیں۔ میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر پھر کوئی اس قسم کا بدمعاش میرے ہتھے چڑھ گیا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کے آگے ڈالدوں گا! میں تمہاری ماؤں اور بہنوں ——" اور پھر دہقانوں سے پٹی ہوئی گلیاں اچانک سنسان ہو گئیں۔ تھانیدار پیچوان کے کش لگاتا اندر گدگدے پلنگ پر دراز ہو گیا اور بوڑھا چوکیدار اس کے پاؤں دبانے لگا۔ فیض چوپال کی سیڑھیوں سے کھسک کر اترا اور کراہتا ہوا گلی کے اندھیرے میں چھپتا قبرستان کی شکستہ دیوار کے پاس بیٹھ کر سستانے لگا۔ اور تاروں بھرے آسمان کے بالمقابل جمے ہوئے ٹنڈ منڈ بیریوں کے آبنوسی سایوں نے دیکھا کہ ایک لڑکی نے جس کے ٹخنوں سے لپٹی ہوئی جھانجھیر ہر قدم پر ایک دلآویز چھناکا پیدا کرتی ہیں اور جس کی ناک میں موتی ایسی چاندی کی کیل ہے۔ اپنی پیلی چھینٹ کے لہنگے سے اس کے زخم دھوتے اور جب فیض کی خون آلود انگلیوں نے ایک طلائی مُہر اسکی حنائی انگلیوں میں تھمادی تو اندھیرا گہرا ہو گیا۔ ستارے ماند پڑ گئے ٹڈیاں اور جھینگر چیخ اٹھے! اور ملائم، دہکے ہوئے، بھیگے ہوئے گال ایک زخم خوردہ چوڑی چھاتی پر بہت دیر تک پڑے دھڑکتے رہے!

احمد ندیم قاسمی

میرا بچہ:-

کیوں رے کتّے

"لے لو سوا سات سیر کے — چھوٹے سیر سے" رشید کی ماں نے اپنا سوکھا ہوا ہاتھ رضائی سے نکال کر پھر واپس رکھ لیا۔ گویا اس ڈھنگ کی دُنیا سے وہ تو دستبردار ہو گئیں!

"اور گھی وہی گھاسلیٹ کا! بہن، لالہ جی تو مُنہ پر نہیں دھرتے مَیں تو دودھ منگا کر گھر میں بلو لیتی ہوں۔ اور چھاچھ بھی کام ہی آجاتی ہے" سُہانی نے کنجوسی سے متاثر ہو کر کہا۔

"ترکیب تو اچھی ہے۔ رشید بھی گھی دیکھ کر مُنہ بناتا ہے۔ کہتا ہے رُوکھی کھاؤں گا پر گھاسلیٹ تو نہیں چلتا۔ بہت کچھ کرتی ہوں۔ بہن میری بلونا اب کون کرے ہاں مکھن منگا لیتی ہوں!"

"مکھن میں کیا میل نہیں ہوتا؟ اللہ مکھن میں تو بڑے مزے سے تیل ملا دیتے ہیں۔ دودھ میں ہی ملا دیتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلتا — تم یہ کرو —" اور وہ نہ جانے کیا ترکیبیں بتانے لگیں۔

برجو کا دم گھٹنے لگا۔ ماسی کو پرنام کر کے وہ کونے میں بیٹھی اپنی ساری کے پلو سے کھیل رہی تھی اور اس آٹے دال کے بھاؤ سے تو اُسکا دل اور بھی گھبرا رہا تھا، وہ کیوں آئی آخر!

"مرچیں تو مہینے کے مہینے پسوا لیتی ہوں"! بچپن کی بچھڑی دو سہیلیاں پھر وہی غیر دلچسپ باتیں کرنے لگیں۔ اگر شاما یا اختری ہوتی تو برجو کبھی بھی اُن سے اس قسم کی خشک گفتگو نہ کر سکتی۔ اور پھر جو ذرا کپڑوں کے متعلق گفتگو چھڑی تو برجو نے بھی دلچسپی کا اظہار کرنے کی ہمت کی مگر اُس کا دل ٹوٹ گیا جب دریوں، جھاڑنوں اور نواڑوں وغیرہ کا ذکر ہونے لگا۔ نیلی جارجٹ کی کنی دار ساڑھی اور شیفون کے آڑے جمپر کی کسی نے بات بھی نہ پوچھی۔ وہ پھر اپنے ناخن سے ساڑھی کا پلو کھرچنے لگی۔ مگر جب مٹکیوں اور صراحیوں کا ذکر آیا تو اُس کے گلے میں جیسے پھندا پڑنے لگا اور وہ بولا کر کھڑی ہو گئی۔ کسی نے بھی اس کا نوٹس نہ لیا۔ چونکہ دونوں سہیلیاں بڑی سے بڑی مٹکی حیرت انگیز سستی قیمت پر خریدنے کا فخریہ قصہ سُنانے پر تیار تھیں۔ دونوں کے میکوں میں مفت سے بھی سستی صراحیاں ملتی تھیں اور اتفاق سے دونوں کی سسرالوں میں ٹھگ بدیا کھلے بندوں ہوتی تھی۔ پلنگ کی ادوانوں اور بان کے چھینکوں کا ذکر آدھا سُنا ہی چھوڑ کر وہ برآمدے میں آگئی۔ باہر پڑوسن کے دو بچے کھڈیوں پر بیٹھے کوئی نہایت دلچسپ مسئلہ پر لڑ رہے تھے۔ دُور ایک گائے کھڑی کوڑا کھا رہی تھی۔ برجو اُلجھ کر برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں کو دیکھنے لگی۔ وہ ایک خوش رنگ پھول توڑ کر اُس نے اپنی لمبی چوٹی کے بالائی سرے میں اُڑس لئے اور نیچے کیاریوں میں سے دھنیے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے لگی۔ بڑے سنہڑا سے میں آکر اُس نے منڈیر پر اُگی ہوئی بیکار گھاس کو نوچ کر الگ کر دیا اور ہتھیلی کی مڑی ہوئی ڈالیوں کو سیدھا کرنے لگی۔

"برجو — او برجو" ایک کرخت آواز اُسے سُنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔

"ارے سُنا نہیں برجو وو وے" آواز اور بھی بھاری اور کرخت ہو گئی وہ ڈر کر جلدی سے برآمدے میں آگئی۔

"برجو برجو — برجو —" کوئی مکروہ آواز پکارے گئی، اس کا دل چاہا جلدی سے ماں پاس بھاگ جائے جہاں لمبی آٹے دال کا بھاؤ سُنتی رہے۔ مگر آواز اور بھی دھمکی آمیز اور ساتھ ساتھ امداد طلب نظر آئی کیا وہ ڈرپوک تھی جو کچھ ڈر جاتی۔ نہ جانے کون جنگلی اُسے کیوں پکار رہا تھا۔ آواز پھر آئی اور کوٹھے پر سے آتی معلوم ہوئی۔

نہ جانے کیوں وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی — یقیناً وہاں کوئی اُسے پکار رہا تھا۔ اماں تو نہ تھی — اتنی موٹی اور بھدی آواز! اور بابوجی کا تو گمان بھی — خیر! وہ چڑھتی چلی گئی۔

"معلوم ہوتا ہے آج اِس کی شامت آئی ہے۔ ارے برجو!" کسی نے سامنے سے پکارا اور وہ ڈر کر روندتی ہوئی دروازے تک آئی —!

سامنے میز کے پاس ایک کرسی پر ایک چوڑی سی برہنہ پیٹھ ایک قلم سے کھجتی ہوئی نظر آئی۔

"کہاں مر گیا تھا کمینے" پیٹھ کا مالک بغیر مڑنے کی تکلیف اُٹھائے ڈانٹ کر مخاطب ہوا۔ "خدا کی قسم ذرا یہ صفحہ ختم کر لوں تو — ہاں یہ تو بتا گیا کہاں تھا — کیوں رے کتّے؟" قلم ویسے ہی ایک لمبے صفحے پر چلتا رہا۔ اور سر جُھکا رہا۔ برجو کو ہنسی آئی اور تھوڑی دیر کو غصّہ بھی کہ یہ کون گستاخ تھا جو اس بیہودگی سے اس سے خطاب کرنے کی جرأت کر رہا

تھا۔ اُس کے بابوجی بیٹھانہ ہونے کی وجہ سے اُسے ہمیشہ "برجو بیٹے" ہی کہتے تھے — مگر یہ —

"اَب کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے کتے" چوڑی پیٹھ والے نے "تے" پر زور دیکر کہا "جا گلاس میں پانی لا!"

برجو کا جی چاہا زور سے کھانسے اور غرور سے تنکر اُسے بتائے کہ تم خود کتے! مگر —

"اب جاتا ہے کہ مَیں اُٹھوں —" بغیر دیکھے اُٹھنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا گیا۔

برجو لوٹ آئی — اُسے غصہ آرہا تھا — یقیناً پاگل تھا کوئی — پرماسی کے گھر میں پاگل اور اُنہیں پتہ بھی نہیں۔ اُس نے سوچا جا کر حالات سے ماسی کو مطلع کرے اور پھر کلیجے پر پتھر رکھکر آٹے دال کی قیمت پر بحث کر ہی ڈالے۔ مگر اُس نے سیڑھیوں پر سنا۔

"جو تو نے دیر کی تو سر توڑ دوں گا جوتوں کے مارے، سُنا، ٹھنڈا پانی لائیو!"

اُس کی جوتی لاتی تھی پانی بدتمیز کے لئے — مگر نیچے جا کر اُس نے صراحی میں سے پانی اُنڈیلا اور نہ جانے کیوں وہ دل میں ایک دلچسپ مہم کا خیال لیکر مسکراتی ہوئی چلی۔

اُس نے سیڑھیوں پر سے سُنا: "تو ہم کُچل ڈالیں گے — جب انتہا ہو جاتی — جب .... ہوں — ٹھیک۔ ہاں جب ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو مظلوم ظالم کا گلا چبا ڈالتا ہے ..... "

برجو کو ایک جھُرجھُری آئی اور اُس کا دل چاہا وہ فوراً لوٹ جائے "گلا چبا ڈالتا ہے" اورے!!

"برجو —" ایک لمبی پکار پر اُس نے جلدی جلدی چڑھنا شروع کیا۔

"کیوں؟ کیا کنواں کھود رہا تھا؟ —" قلم تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا — برجو چُپ کھڑی رہی۔

"جس کام کو بھیجو مر کے رہ جاتا ہے .... تو نے تو بس تھکا دیا۔ اور وہ خط ڈال آیا تھا — ارے خیر — میں پورا کر دونگا اور بس تو نے دیر کی تو پھاڑ دونگا سر تیرا!"

برجو کا عجیب حال تھا۔ وہ چاہتی تھی ایک دم بھاگ جائے۔ یہ معاملہ کیا ہے!۔

"اب کیا سر پہ رکھے گا میرے — رکھدے نا یہ گلاس!" ہاتھ نے قلم سے میز کا کونا کھٹکھٹا کر کہا۔

برجو نے گلاس رکھدیا اور لوٹنے لگی۔ مگر پھر رُکی! کیونکہ —

"ٹھیر — یہ چلا کہاں — پھر وہی گلی ڈنڈا ..... ایک ملک ایک قوم .... ہاں ابکے جو میں نے تجھے کلوا کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو بس — یہی ایک علاج ہے — مگر —"

برجو کا شُبہ یقین کی حد تک پہونچ گیا۔ کوئی پولٹیکل پاگل ذرا دو لفظ پڑھتا ہے تو دو لفظ خود بخود بڑبڑانے لگتا ہے۔ اگر گلی رتو ہوتی تو برجو اُس سے گڑ چنے مانگ کر چھیڑتی۔ رحمان خاں ہوتے تو اُن سے مُرغی کے انڈوں اور پتلی دال کا ذکر کر کے تنگ کرتی۔ وہ کوئی پاگل سے ڈرتی تھی — مگر یہ عجیب و غریب پاگل۔ اُس کا جی چاہا ایک دم بھاگ کھڑی ہو۔ مگر جیسے کسی نے اُسکے پیر پکڑ لئے۔

"ہاں۔ ذرا ٹھیر میں پیکٹ بنالوں — گوند — گوند کھا گیا کتے! اوہ —"

گوند میز پر ہی مل گیا۔ پھر سیٹی بجنے لگی اور گھٹنے ہلنے لگے — ناخونوں سے میز پر طبلہ بجا — "سا لوریا من بھایا —" بے سُرے سُروں میں گایا گیا۔ برجو حیرت سے کھڑی سنتی رہی۔ اب اُسے ذرا اور ڈر لگا۔ اُس نے چاہا چُپکے سے کھسک جائے۔ مگر .....

"اور ہاں یہ تو میری کیاریوں میں کیا کر رہا تھا؟" برجو نے کیاریوں پر کوئی دست درازی تو کی نہیں مگر پھر بھی وہ چونک پڑی اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہ دیکھ لی گئی ہے۔

"میں نے تجھے کتنی دفعہ منع کیا کہ تو میری کیاریوں سے دھنیا مت توڑا کر مگر جب دیکھو چٹنیاں پیس پیس کر بھکس رہا ہے۔ ابکے میں نے تجھے کیاری کے پاس سے بھی گذرتے دیکھا تو —"

قلم پھر تیزی سے چلا: "یہ ختم کر لوں تو دوں — جب تک تو مُرغا بن — سمجھا!"

برجو کو مُرغا بننا نہ آتا تھا۔ وہ بالکل بھی سمجھ نہ سکی۔ اس کو حیرت تھی کہ یہ کیسا پاگل ہے جو بولتا بھی جاتا ہے لکھتا بھی جاتا ہے اور سیٹی بھی وقتاً فوقتاً بجا دیتا ہے۔ وہ بھاگ کیوں نہ کھڑی ہوئی۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں لپک کر دبوچ نہ لے اور پھر — چبا ڈالتا ہے — "کچل ڈالیں گے" — کتنا عجیب پاگل! وہ چُپکے چُپکے کھسکی! مگر پھر رُکی! ظالم پھر گرجا۔

"اور یہ میرے سفید پھول کس نے توڑے تھے — بول۔ اگر جو تو نے پھول چھوا تو بس یاد ہی کرے گا۔ آخر تو میری کیاریوں کے کھیتر ہی کیوں ہے؟" اور پھر سیٹی بجنے لگی۔

برجو کا مارے غصہ کے منہ لال ہوگیا. وہ سدا سے ماسی کے یہاں آتی تھی، جتنے پھول جی میں آتا تھا توڑتی تھی۔ اور تو اور جو گلاب پسند آتا لے جاتی اور یہ آخر کون کمینہ تھا جو اُسے منع کرنے کی ہمت کر رہا تھا. اُسے شاید پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے ــــ لالہ کھیم چند کی اکلوتی بیٹی ــــ اور ــــ اور ــــ برج رانی. جسے کبھی کسی نے ترچھی نظر سے نہیں دیکھا. اُس کا خون کھول رہا تھا۔

"کہتا ہوں لان پر مت لوٹا کر ــــ"

برجو نے صرف بیکار گھاس نوچی تھی!

لفافہ تیار ہوگیا۔ اور بیٹھ مڑی۔ برجو ذرا دور کھسکی۔ وہ پچھتانے لگی آخر دال آٹے کے بھاؤ میں ایسا کیا عیب تھا جو اس کا ذکر بھی وہ نہ سن سکی اور اس مصیبت میں پھنسنے کو آگئی

"ایک بات! تو نے میرے موزے دھوئیے" لفافہ پر پتہ لکھا گیا۔ برجو اور موزے دھوئے!

"بولتا کیوں نہیں ــــ کیوں رے گُتّے!!"

اور چوڑی پیٹھ دیوار کی طرف چل گئی ــــ اور ــــ گھنے بالوں والا سر گھوما۔

"آپے... آپ... آ... آ... میں" لفافہ جان کر گرایا گیا اور پھر اُٹھا لیا گیا ــــ وہ ایک عجیب گھبرائی ہوئی حرکتیں سرزد ہوئیں ــــ

"میں ــــ برجو ــــ وہ جانے کہاں گیا ــــ" بے ضرورت سر جھکایا گیا۔

دروازہ کھلا اور بوکھلائی شکل کا ایک میلا سا چھوکرا تھیلی میں کچھ لئے ذرا ہانپتا ہوا آیا۔ برجو نے اطمینان سے ایک لمبی سانس لی اور ذوا بچ لمبی کھنچ گئی۔

"اوہ ــــ" برجو کچھ کھسیانی اور بہت سٹپٹاتی لوٹ پڑی۔ سیڑھیوں پر نیچے اُترتے وقت وہ پھر چونکی۔

"کیوں بے برجو آپ لوٹا ہے تو جب کا گیا! ــــ چل اب سیدھی طرح ــــ بن مرغا ــــ گھنٹہ بھر" تڑ سے تھپڑ کا پٹاخہ سُنائی دیا ــــ "کیوں رے گتے؟!"

برجو ماسی کے قریب بیٹھکر پھر ساری کے پلو سے کھیلنے لگی۔

"اور بہن میں نے جو اچار ڈالا تھا سو بھی ساری پھپھوندی لگ گئی" برجو کی ماں بے تکان کہہ رہی تھی!

عصمت چغتائی!

"کیف و سرور کا ایک ورق

خود پاؤں بڑھے منزل کی طرف
میں کھینچ کے چلا منزل کی طرف

دیکھے تو کوئی یہ اُن کا کرم
وہ دیکھ رہے ہیں دل کی طرف

قاتل کی نگاہیں خود ہی جھکیں
اُنگلی نہ اُٹھا قاتل کی طرف

اے کھیون ہارے یہ کیا ہے
کشتی کو بڑھا ساحل کی طرف

رُخ پھیر کے او جانے والے
رُخ پھیر بھی لے بسمل کی طرف

اُن کو واپس آتے دیکھا
جو لوگ گئے منزل کی طرف

آہوں سے عاجز ہوں میں
لے چل اے دل مشکل کی طرف

تم سے بڑھکر رنگین نہیں
دیکھو ماہِ کامل کی طرف

بہزاد زباں کچھ کہہ نہ سکی
دیکھا جو رُخِ قاتل کی طرف

بہزاد لکھنوی!

رازِ سربستہ

ڈاکٹر کا نام یوتن تھا۔ وہ کچھ عرصے سے شہر کے اُس حصّے میں آکر رہنے لگا تھا، جہاں دن بھر کے تھکے ماندے مزدور رات کو آکر سو رہتے ہیں۔ ڈاکٹر یوتن کی معمولی کوٹھی کے سوا دُور دُور تک کسی پُختہ عمارت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کہیں کہیں پر اُپلے کی ٹال جیسی جھونپڑیاں تھیں جن میں صرف شام کے وقت دُھواں اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ مزدوروں اور "کمینوں" کے بچے ننگ دھڑنگ ان جھونپڑیوں کے سامنے ٹوٹی ہوئی اینٹ، پتھر کے ٹکڑے، سُوکھی ٹہنیاں اور گھاس پات سے کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ اِن بچّوں کے ماں باپ دن بھر گھر سے دُور کسی کارخانہ یا کھیت میں کام کرتے تھے۔ ڈاکٹر کی کوٹھی کے احاطے میں چاروں طرف اُونچی خاردار جھاڑیوں کی دیوار تھی جس سے کوٹھی قریب قریب بالکل چھپ گئی تھی۔ ڈاکٹر بوڑھا، پستہ قد اور دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید تھے جو چند یا پر اُڑ چکے تھے۔ وہ آدھی آستین کا سفید قمیص، سفید پتلون اور سفید کینوس کے جوتے پہنتا تھا۔ اُس کا پتلون ڈھیلا ہوتا تھا جو گیلیس پر لٹکا رہتا تھا۔ ڈاکٹر کی عینک کا فریم سیاہ سینگ کا تھا، جس کے اندر کے شیشے دو حصّوں میں تقسیم تھے۔ اُوپر کا حصہ دُور کی چیزوں کے دیکھنے کیلئے تھا اور نچلا قریب کی چیزوں کیلئے۔ ڈاکٹر کی مونچھیں بڑی اور ڈاڑھی پُرانے طرز کی فرنچ کٹ تھی۔ رنگ صاف تھا۔ اور چہرے پر شکن کثرت سے تھے۔ آنکھیں پھولی ہوئی پل کے اندر چھوٹی معلوم ہوتی تھیں اگرچہ حقیقتاً وہ اتنی چھوٹی نہ تھیں۔ ان کا رنگ گہرا سیاہ تھا جس میں ذہانت اور رحم دلی کی روشنی صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ پیشانی پر کثرت انہماک اور غور و خوض سے شکنوں کی اُبھری ہوئی لکیریں بہت نمایاں ہوگئی تھیں۔ ناک لمبی اور پتلی تھی۔ تھوڑی پُر گوشت اور خم دار تھی۔ ڈاکٹر کے ہاں اُس کے ایک بوڑھے ملازم کے سوا اور کوئی نہ تھا، جو اسکے ساتھ آیا تھا۔ ڈاکٹر صبح سے شام تک اپنی کوٹھی کے ایک کمرے میں بند رہتا تھا۔ جس میں شیشیاں، دوائیں اور دیگر آلات سے بیٹھنے تک کی جگہ باقی نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو محلّے اور گاؤں کے کتوں سے بڑی دلچسپی اور محبت تھی۔ کتے کھانے کے لالچ میں ڈاکٹر کی کوٹھی کا طواف کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈاکٹر کو آئے ہوتے دو سال ہوگئے تھے مگر شہر یا پڑوس میں کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ لیلا رام کی آسیب زدہ کوٹھی میں آکر رہنے والا کون ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ سڑک پر گذرنے والے حضرات نے کوٹھی یا کوٹھی کے احاطے پر کوئی تبدیلی محسوس نہ کی۔ وہی پُرانی کوٹھی تھی جو باد و باراں کے زیرِ اثر ہر برسات میں سبز اور گرمی میں سیاہ ہوجاتی تھی۔ جس کے کارنس اور محراب میں پیپل کے درخت نکل آئے تھے، جس کے دروازوں کو دیمک کھا کر ختم کر دیا تھا اور جس کی کھڑکی اور دروازے کے شیشے ایک ایک کر کے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ احاطہ میں خودرو گھاس اور جھاڑیوں سے زمین دکھائی نہ دیتی تھی۔ البتہ بوڑھے ملازم کے دن بھر میں صرف ایک بار آنے جانے سے یہ ہوا تھا کہ کوٹھی سے سڑک تک لمبی گھاس کے جھک جانے کے سبب سے ایک پگڈنڈی سی بن گئی تھی جو صرف غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر غالباً کچی ترکاریاں اور پھل کھانے کا زیادہ عادی تھا اس لئے کہ باورچی خانے کی ٹوٹی ہوئی چمنی سے شاذ و نادر ہی دھواں نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ڈاکٹر کے پڑوس میں کوئی "شریف" نہیں رہتا تھا۔ اس لئے اس کی کرید کسی کو نہیں ہوئی کہ اس کوٹھی میں کون رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ غریب محنت کرنے والوں کو اپنے پیٹ کی آگ بُجھانے سے کب فرصت ملتی تھی کہ وہ اس قسم کی "عیاشیوں" میں اپنا وقت گذارتے۔ ڈاکٹر کی کوٹھی کے ایک طرف یہ غریب مزدور رہتے تھے اور دوسری طرف شہر کا قبرستان تھا۔ مُردے بھی مزدور کی طرح دوسروں کی عیب جوئی یا راز جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔

ڈاکٹر کی عادت تھی کہ صبح اُٹھکر وہ لاوارث کتّوں کو اپنے کمرے میں کھانے کا لالچ دیکر بلاتا تھا اور اُن میں سے کسی ایک کو پکڑ کر باقی کتّوں کو باہر نکال دیتا تھا۔ کتّے ڈاکٹر سے بہت مانوس ہوگئے تھے اور کتّوں کی آبادی میں روزانہ بھوکے اور "لنگڑے" کتّے آکر اضافہ کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر آدھی رات گئے تک لالٹین کی مدھم روشنی میں کام کیا کرتا تھا۔ یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کونسا تجربہ کر رہا ہے جسکے لئے اُس نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔

ڈاکٹر ایک رات حسب معمول اپنے معمل میں بیٹھا کچھ دواؤں کی آمیزش کر رہا تھا جس سے عجیب قسم کی ناخوشگوار بُو پیدا ہو رہی تھی کہ کوٹھی کے دوسرے حصّے میں کچھ کھٹکا سنائی دیا۔ ڈاکٹر نے خیال کیا: "اُونہہ! یہ کتّے رات کو بھی یہاں سے نہیں جاتے!" کچھ دیر بعد پھر وہی کھٹکا ہوا۔ برسات

کی رات سیاہ اژدہے کی طرح پوری دُنیا کو اپنی گرفت میں کئے ہوئے تھی. آسمان پر سیاہ بادل بھوکے شیر کی طرح بھاگتے پھر رہے تھے، بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی اور مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہی تھی. ہوا ہائے ہو کرتی ہوئی اور درختوں اور جھاڑیوں سے سجدۂ عقیدت لیتی ہوئی پچھم سے پورب کی طرف بہہ رہی تھی. رہ رہ کر بارش کے بڑے بڑے قطرے شور مچا رہے تھے اور اپنی آواز کو ہوا کی سنسناہٹ میں ملا کر فضا میں ایک خوفناک قسم کا تلاطم پیدا کر رہے تھے. پاس ہی قبرستان سے گیدڑوں کے نالہ و زاری کی آواز آ رہی تھی. چھت کی نالی سے پانی سائبان کے ٹین پر گر کر نہایت بھیانک آواز پیدا کر رہا تھا. اس شور و غل میں ڈاکٹر دبے پاؤں اُس طرف آیا جہاں سے کھٹکے کی آواز آ رہی تھی: بجلی چمکی اور اُس کی روشنی میں ایک مرد اور ایک عورت دکھائی دئیے جو سائبان میں کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے.

"پیارے، میری جان! آہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گی" عورت رو رہی تھی اور رہ رہ کر سسکیاں لے رہی تھی.

مرد کی آواز کرخت اور بھدّے قسم کی تھی. اُس نے کہا: "ریحانہ! دغاباز ریحانہ! اس وقت تو تُو ٹسوے بہا رہی ہے، تجھے شرم نہیں آتی کہ تو مجھ سے دعوئ محبت کرنیکے بعد بھی وسیم سے ملتی رہی ہے"

"آہ! نہیں نہیں، مجھے یوں الزام نہ دو تم کو غلط فہمی ہو گئی ہے. وسیم بیچارہ میرا خالہ زاد بھائی ہے"

مرد نے ڈانٹ کر کہا: "بس بس! زیادہ پارسائی کے دعوے نہ کر میں تجھے اچھی طرح پہچان گیا ہوں. ناپاک! آوارہ! بدچلن"

عورت نے بڑے درد سے دوزانو ہو کر کہا: "ہائے! کیا کروں، تم نہیں مانتے. مجھے ناحق خراب ناموں سے پکارتے ہو. تم کو شرم کرنی چاہیئے کہ تم اپنی منکوحہ سے ایسی باتیں کر رہے ہو جو چند مہینوں میں تمہارے بچّے کی ماں بننے والی ہے"

مرد نے غصّہ سے بیتاب ہو کر کہا: "ریحانہ، بہت ہوا. اب میں برداشت نہیں کر سکتا. اب تیری بے غیرتی اتنی انتہا تک پہونچ چکی ہے کہ تو اس حرامی بچّے کو میرے سر تھوپنا چاہتی ہے. نہیں، میں ایسا ہرگز نہ ہونے دونگا"

عورت نے بہت ہی نحیف آواز میں زمین پر گر کر کہا: "پیارے اب زیادہ نہ ستاؤ. جاؤ! جاؤ! تمہارا جہاں جی چاہے جاؤ! مجھے چھوڑ دو. میرا بھی خدا حافظ ہے"

مرد نے عورت کا گلا دباتے ہوئے کہا: "میرا بھی خدا حافظ ہے یا وسیم حافظ ہے. ناپاک، کیا میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں کہ تو اپنے عاشق کے ساتھ مزے اُڑاتی پھرے"

ڈاکٹر نے اندھیرے میں زور آزمانے اور کشمکش کرنے کی آواز سُنی. عورت نے ایک خوفناک چیخ ماری جیسے بکرے کو ذبح کرتے وقت نکلتی ہے. ڈاکٹر چلّاتا ہوا آگے بڑھا: "ٹھہر او حرامزادے کیا کرتا ہے!"

تاریکی میں کسی کے بھاگنے کی آواز سُنائی دی. ڈاکٹر کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ جھک کر رک گیا. بجلی چمکی جس کی تیز روشنی میں ڈاکٹر نے دیکھا کہ عورت خاک اور خون میں لتھڑی ہوئی آخری سانس لے رہی ہے اور اُس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی ہے، جس سے خون اُمنڈتا ہوا بہہ رہا ہے. ڈاکٹر نے عورت کو اس حال ہی دیکھتے ہی فوراً کچھ فیصلہ کر لیا. وہ اُلٹے پاؤں اپنے ملازم کے کمرے کے سامنے گیا اور دستک دی. ملازم کو لیکر فوراً واپس آیا اور عورت کی لاش کو اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں سامان جراحی رکھا ہوا تھا. اس کمرے میں دو آپریشن کی میزیں تھیں. پہلی میز خالی تھی اور دوسری پر ایک بے حس و حرکت کتا پڑا ہوا تھا جس کے صرف سانس چلنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ زندہ ہے. ڈاکٹر نے خالی میز پر عورت کی لاش کو رکھدیا اور ملازم سے کچھ کہا. بوڑھا ملازم جو اب تک دیکھنے میں بہت کمزور اور کاہل معلوم ہوتا تھا موقع کی نزاکت کو سمجھ کر ایسی چُستی سے کام کرنے لگا جیسے وہ جوان اور بہت پھُرتیلا ہو. دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر اور اُس کے ملازم دونوں نہایت تجربہ کار سرجن کی طرح عورت کی کٹی ہوئی گردن کو سینے لگے. جب تمام کٹے ہوئے گوشت پوست سِل کر تیار ہو گئے تو ڈاکٹر نے کہا: "میرے دوست! میری تمام زندگی کی محنت اور تجربہ کی آزمائش کا وقت آن پہونچا ہے. میں آج دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری زندگی سے انسان کا کچھ فائدہ ہوا یا یونہیں ایک اُمید موہوم کے پیچھے رائیگاں ہو کر رہ گئی ہے. خدا بخش! میں آج اس بات کو دکھا دونگا کہ واقعی چوپائے کا خون انسان کے جسم میں ڈال کر اُس سے انسانی خون کا کام لیا جا سکتا ہے یا نہیں!"

ڈاکٹر یہ کہہ رہا تھا اور بیہوش کتے کی پسلیاں کاٹ کر اُسکے پھڑکتے ہوئے دل کو باہر نکال رہا تھا. جب دل اور اُس کے ساتھ والی موٹی رگ شریان باہر آ گئی تو ڈاکٹر نے رگ شریان میں انجکشن کے ذریعے کچھ دوا بھر دی اور دونوں میزوں کو پہلو بہ پہلو کر دیا. عورت کے بازو پر شگاف لگا کر ایک موٹی سی ورید نکالی اور ایک ربر کی نالی

کے ذریعے کتے کی موٹی رگِ شریان کو عورت کی ورید سے جوڑ دیا۔ کتے کا خون عورت کے جسم میں جانے لگا۔ ڈاکٹر قریب پڑے ہوئے اُونچے اسٹول پر بیٹھ گیا اور کبھی کتے کے پھڑکتے ہوئے دل اور کبھی عورت کے کاغذ جیسے سفید چہرے کو دیکھنے لگا جس پر موت کی تمام علامتیں ظاہر ہو چکی تھیں۔ باہر آسمان اُتنا ہی بھیانک تھا۔ ہوا زور شور سے کمرے کی کھڑکیوں کے ایک ٹوٹے ہوئے شیشے سے ٹکرا کر طرح طرح کی فریاد کر رہی تھی گویا وہ انسانی دستِ قدرت کی ایک نئی ہمت پر ٹھٹھے لگا رہی تھی اور تالیاں بجا رہی تھی۔ کمرے کے اندر ہر چیز خاموش تھی۔ خدا بخش نہایت احتیاط سے مُردہ عورت کے جسم کو موٹے اونی کمبلوں سے ڈھانک رہا تھا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر اُمید و بیم کی عجیب کیفیت نمایاں تھی۔ اُس کی حالت اُس ملزم کی طرح تھی جو حاکمِ عدالت کے چہرے کو فیصلہ سُنانے سے پہلے دیکھتا ہے۔ اور اُس کے لب کی ہر جنبش سے اپنی موت و حیات کا شگون نکالتا ہے۔ ڈاکٹر کی انگلیاں عورت کی نبض پر تھی اور اسٹتھسکوپ (Stethoscope) عورت کے دل پر۔ اُس کی آنکھیں عورت کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ دس منٹ کا یہ وقفہ جو اپنی اہمیت اور نتیجے کے لحاظ سے دس صدیوں سے کم نہ تھا، ڈاکٹر کے لئے بھی موت اور حیات کی کشمکش سے کم نہ تھا۔ اسکے نتیجے پر اس کی زندگی کی چالیس سالہ محنت کا دارومدار تھا۔ ڈاکٹر خود ایک بے جان مجسّمے کی طرح عورت کی لاش پر جُھکا ہوا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھا اور مُردہ عورت کے ساکن دل کی حرکت سُننے کے لئے اتنا بیتاب اور بیقرار تھا کہ اکثر شدّتِ بیتابی میں اس کو خود اپنی انگلیوں کی نبض پر عورت کی نبض کے چلنے کا شُبہ ہو جاتا تھا اور خود اپنے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز کو سُن کر اُچھل پڑتا تھا کہ یہ عورت کے دل کی آواز ہے۔ ڈاکٹر اسی ہاں نہیں میں مُبتلا تھا کہ کچھ دیر بعد عورت کے دل میں واقعی ایک ہلکی سی پھڑک پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے غور سے سُنا۔ یہ پھڑک دوبارہ ہوئی اور اب یہ رہ رہ کر ہونے لگی۔ عورت کے سفید سفید بے رونق چہرے پر ایک ہلکی بہت ہی ہلکی سی سُرخی نمایاں ہونے لگی۔ ڈاکٹر خوشی سے اُچھل پڑا اور اپنے اسٹول سے کُود کر زمین پر چک پھیریاں لینے لگا۔ ڈاکٹر کے بوڑھے اور مضمحل جسم میں اس وقت نوجوانوں کی سی پھرتی اور تیزی تھی۔ وہ خوشی سے چیخنے اور چلانے لگا اور کمرے میں دیوانہ وار دوڑنے لگا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار اور چیخنے کی شدت بڑھتی ہی گئی۔ وہ خوشی میں اتنا بے خود ہو گیا کہ اس کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا: میں نے پالیا۔ میں نے معلوم کر لیا۔" خدا بخش اپنے آقا کی اس بیقراری اور اظہارِ مسرت کو سہمی ہوئی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ صرف اس چیز کو دریافت کرنے کیلئے اُسکے آقا نے کس طرح گذشتہ چالیس سال سے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس کا آقا یہ نہیں جانتا تھا کہ حیات اور لطفِ حیات کیا چیز ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے مسلسل وہ صبح سے شام تک اسی خیال میں ڈوبا رہتا تھا اور اتنی لمبی محنت کو بار آور ہوتے ہوئے دیکھکر اس پر جتنی بھی خوشی نہ کی جائے وہ کم تھی۔ مگر خدا بخش نے کچھ دیر بعد ڈر کر دیکھا کہ اس کا آقا چیخنا چلانا بند نہیں کر رہا ہے بلکہ اس میں زیادتی ہوتی جا رہی ہے اور اب ڈاکٹر کی آنکھیں بے معنی اور بے ربط سی ہو کر صرف چھت کو دیکھ رہی ہیں۔ ڈاکٹر اُچھلنے اور بھاگنے میں ایسا مشغول ہے کہ اُن چیزوں کی مطلق پروا نہیں کر رہا ہے جن سے اُسے بار بار ٹھوکر لگ رہی ہے۔ خدا بخش نے آگے بڑھکر اپنے آقا کو اس مجنونانہ حرکت سے باز رکھنا چاہا مگر ڈاکٹر اتنے جوش میں تھا کہ کمزور خدا بخش کے پنجوں کی گرفت میں نہ آسکا۔ ڈاکٹر نے اپنے ملازم کو اُسکی بات سُنے بغیر اور اسکو پہچانے بغیر ایسا دھکا دیا کہ وہ چاروں شانے چت اُس میز پر گرا جس پر بیہوش کتا پڑا تھا۔ خدا بخش کے گرنے سے میز دُور تک کھسکتی ہوئی چلی گئی اور وہ ربر کی نالی جس سے کتے کے جسم کا خُون مُردہ عورت کے جسم میں داخل ہو کر اس میں حیات کی چنگاری ڈال رہا تھا، الگ ہو کر نیچے گر گئی۔ خدا بخش نے اُٹھکر پھر ڈاکٹر کو شانت کرنا چاہا۔ ڈاکٹر اس دفعہ تیزی سے اُچھلتا کودتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ اُسے کمرے میں رکھے ہوئے لوہے کی ترازو سے ٹھوکر لگی اور وہ مُنہ کے بل زمین پر گرا۔ خدا بخش نے جھپٹ کر اپنے آقا کو اُٹھانا چاہا مگر وہاں اب کیا دھرا تھا؟ ڈاکٹر کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی تھی مگر اُسکے لب اب بھی ہل رہے تھے جیسے وہ کہہ رہا ہو "میں نے معلوم کر لیا!" کمرے کے باہر برسات کی کالی رات اسی طرح اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھی۔ آسمان پر رہ رہ کر برسنے والے سیاہ بادل اسی طرح پچھم سے پورب کی طرف ہوا کے کاندھوں پر سوار اُڑے چلے جا رہے تھے! اور کمرہ کی کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر دیوانی ہوا اب بھی اپنا سر مار رہی تھی اور انسانی کوشش کی بے سروسامانی پر کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ کمرے کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں ایک میز پر ایک کتے کی لاش پڑی ہوئی تھی اور دوسری پر ایک جوان خوبصورت لڑکی کی۔ جس کی گئی ہوئی حیات اُسکے ساکت دل میں دوبارہ آکر لوٹ گئی تھی۔ کمرے کے دوسرے کونے میں ایک بوڑھا وفادار خادم اپنے مُردہ آقا کا سر اپنے زانو پر لئے سرنگوں بیٹھا تھا۔ موت و حیات کا رازِ سربستہ اس آقا کے دماغ میں مقفل تھا جو خود ہی آج موت کا شکار بن گیا تھا۔ یہ تھا انسانی جرأت کی چالیس سالہ مسلسل اور انتھک کوشش کا نتیجہ جس پر برسات کی متوالی اور دیوانی ہوا ٹوٹے ہوئے شیشے سے جھانک جھانک کر ہنسی سے بلبلا رہی تھی۔

پریتم پیارے، میری رُوح کی مالک

جی چاہتا ہے آج کچھ تمہاری نذر کروں۔ مگر میرے پاس تو ایسی کوئی چیز بھی نہیں جو تمہاری نذر کے لائق ہو۔ ہاں ایک چیز ہے جو دُنیا کی نظر میں بالکل بے حقیقت مگر تمہارے نزدیک بہت قیمتی ہے۔ اس ویران، سُنسان رات کی بھیانک تنہائی میں، دل کی گہرائیوں سے اُمنڈ کر آنسوؤں کی چند بوندیں پلکوں تک آگئی ہیں، انہیں کو تمہاری نذر کرنا چاہتی ہوں۔

تمہیں یاد ہے ایک دفعہ میں تم سے خفا ہو کر رونے لگی تھی؟ شاید آنسوؤں کے دو ہی قطرے میری آنکھوں سے گرے تھے کہ تم بیتاب ہو گئے، تڑپ اُٹھے، اور دوڑ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ منتیں کیں، معذرت کی، پیار کیا۔ اور آخر گدگدا کر مجھے ہنسا دیا اس وقت تم نے کہا تھا "رضیہ، تمہیں اندازہ نہیں کہ میری نظر میں تمہارے آنسوؤں کی کتنی قیمت ہے؟ یہ آنسو نہیں، موتی اور ستارے ہیں"! انہیں موتیوں اور ستاروں سے آج میری گود بھری ہے لیکن انہیں کوئی مُفت بھی لینے والا نہیں۔ انہیں کیونکر تم تک پہونچاؤں؟ خط پہنچ سکتی تو اُسی میں جذب کر کے بھیجدیتی۔ مگر اب تو یہ بھی ممکن نہیں۔ دردِ دل کے اظہار کا اب صرف یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا ہے کہ رسوائیوں کی طرف سے آنکھ بند کر کے افسانہ بن جاؤں اور ان رازوں جو مجھے صرف تم سے کہنا چاہیئے تھا ساری دُنیا کے سامنے کھولکر رکھدوں، شاید اس طرح وہ تم تک بھی پہونچ جائے۔

میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ میرا پیام جو میں نے گذشتہ اپریل میں بھیجا تھا تم تک پہنچ گیا ہوگا مگر افسوس میری یہ حسرت بھی پوری نہ ہو سکی اور قیامت یہ کہ تم میری اس طویل خاموشی کی بنا پر مجھ سے بدگمان اور آزردہ ہو۔ شاید مارچ کی ابتدا میں تمہارے بھیجے ہوئے چند شعر مجھے ملے تھے۔ میں نے فوراً جواب لکھا مگر وائے محرومی کہ وہ تم تک نہ پہونچا۔ کاش تم اُسے دیکھ لیتے، پڑھ لیتے۔

تمہارا پہلا خط مجھے پار سال جولائی میں ملا تھا۔ فوراً جواب لکھنا ممکن ہوتا تو فوراً ہی لکھتی مگر مجبور تھی، نہ لکھ سکی۔ ارادہ تھا کہ جلد سے جلد لکھوں گی مگر خدا جو چاہے سو ہو۔ ۲۵ اگست کو ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئی ایک ہفتہ گذرا، دو ہفتے گذرے، تین ہفتے گذرے۔ حالت بہت اندیشناک ہوئی جسم گھل گیا، ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گیا اور بس۔ نہ دوا، نہ غذا، نہ تیمار دار، تنہائی اور بے بسی۔ بہرحال وقت گذر رہا تھا۔ سوچتی تھی کہ شاید اب "قیدِ حیات و بندِ غم" دونوں سے ایک ساتھ ہی رہائی مل جائیگی۔ کبھی کبھی کشمکش زندگی سے آزاد ہو جانے کا خیال بہت ہی سُہانا معلوم ہوتا تھا اور کبھی تم سے ہمیشہ کیلئے چھوٹ جانے کے تصور سے جان ہی نکلنے لگتی تھی۔ آہ کیا بتاؤں اس زمانے میں تم مجھے کیسا کیسا یاد آئے ہو۔

بارہا وہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی۔ جب کئی برس ہوئے تم نے زندگی میں پہلی بار اور آخری بار میری تیمارداری کی تھی۔ ہائے کیا اچھا تھا وہ زمانہ اور کتنی خوش نصیب تھی میں، مسیحا اپنے بیمار کے سرہانے موجود تھا۔ بیخودی میں کئی دفعہ میں تم سے باتیں کرنے لگی۔ ایک مرتبہ تمہارا نام لیکر تمہیں پُکارا۔ اتفاق سے اس وقت ایک نوکر کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا۔ خدا جانے وہ کیا سمجھا۔ کچھ دنوں کے بعد اُسی نے یہ بات مجھے بتائی۔

اُن دنوں ٹائیفائڈ کا یہاں بہت زور تھا۔ خود ہمارے محلہ میں کئی جوان موتیں ہوئیں۔ ایک عورت تو برابر والے گھر ہی میں مری۔ موت کی بھیانک صورت ہر وقت آنکھوں میں پھرتی تھی۔ ان دنوں کسی وقت بھی تمہارا خیال دل سے نہیں نکلتا تھا۔ بہت جی چاہتا تھا کہ تمہارے پُرانے خط نکال کر پڑھوں مگر پڑھنا کیسا، یہاں تو آنکھ کھولنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ چھ ہفتے میں بُخار کم ہو گیا مگر ہلکی ہلکی حرارت رہنے لگی۔ اس نامراد بیماری نے میری صحت کو بالکل ہی برباد کر دیا۔ تم مجھے دیکھو تو شاید پہچان بھی نہ سکو۔ صورت پہلے ہی کونسی اچھی تھی، اس بیماری نے اُسے بھی تباہ کر دیا۔ اب تو آئینہ دیکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ الغرض اس طرح فروری کا مہینہ آگیا اور میں گوناگوں مجبوریوں کی وجہ سے تمہارے پیارے خط کا جواب نہ لکھ سکی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا مجھے کتنا قلق تھا۔

فروری کے آخر یا مارچ کے شروع میں تمہارے بھیجے ہوئے اشعار ملے۔ پڑھکر بہت تکلیف ہوئی۔ جلد سے جلد جواب لکھا مگر افسوس کہ وہ تم تک پہونچا ہی نہیں۔ میں خود حیران تھی کہ میری اس دُکھ بھری کہانی کو پڑھکر تم نے ایک آہ بھی نہ کی۔ ایک سطر بھی جواب میں نہ لکھی۔ میں تو کبھی کوئی بات تم سے نہیں چھپاتی۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اب کچھ دنوں سے پھر یہ خیال ہو چلا تھا کہ شاید تم مجھے بھول گئے۔ اور اگر تم واقعی مجھے

بھول جاتے تو اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی۔ نہ میں تمہیں قصوروار سمجھتی کیونکہ حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔

اس مہینے میں شروع ہی سے کچھ بے کلی تھی اور جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے ذہنی خلفشار اور روحانی اذیت بڑھتی جاتی تھی! ایک دن جو بہت ہی جی بیچین ہوا (اور غالباً یہ جولائی کی پندرھویں تاریخ تھی)، تو میں نے اپنی سب سے قیمتی کتاب نکالی۔ جانتے ہو یہ کونسی کتاب ہے؟ وہی جس کا ذکر ایک بار میں نے تم سے کیا تھا۔ یہ اوّل سے آخر تک میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے تمہارے سب خطوں کی نقلیں اس میں جمع کی ہیں، اور تمہارے سب اشعار بھی، اور تمہاری تصویر بھی اس کے شروع میں لگا دی ہے۔ میں نے اسے کھولا۔ تمہاری تصویر سامنے تھی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں تمہارے پاس پہونچ گئی۔ تم میرے سامنے اپنی مسہری پر لیٹے مسکرا رہے تھے۔ سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہوگیا۔ یہ وہی سینٹ تھا جو اُس دن تم نے لگایا تھا، اُس دن جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ کون ایسی باتوں کا یقین کریگا۔ تم سات سمندر پار، مجھ سے ہزاروں کوس دُور، اور میرا دماغ اُس بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہوگیا جو کئی برس ہوئے تم نے لگائی تھی۔ تو پھر کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ ایسا ممکن ہے یا نہیں، اس سے مجھے بحث نہیں۔ مگر میں نے تو ایسا ہی محسوس کیا۔

جس طرح سینما کے پردے پر انسان تھوڑی سی دیر میں زندگیوں کی پوری داستانیں دیکھ لیتا ہے، یہی کیفیت عالمِ خیال میں تھی، وہ ہماری محبت کی ابتدا، وہ نادیدہ شیفتگی، وہ ابتدائے کار کی آسانیاں، پھر مشکلیں، پھر آفتیں، پھر یک بیک وہ رُوح پرور ساعتیں، وہ پہلی ملاقات، اور اس کے بعد وہ خونیں واقعات، پھر تمہاری نظربندی اور جلاوطنی، اور میری بے بسی۔ آہ زندگی کی پوری ٹریجڈی چند لمحوں میں نظر سے گذر گئی۔

میں انہیں خیالات میں کھوئی ہوئی، دُنیا و مافیہا سے بے خبر، جذبات کے طوفانی سمندر میں ڈوبتی اُچھلتی، بہتی چلی جا رہی تھی کہ پوسٹمین نے تمہارا خط لا کر دیا۔ تم خود تصوّر کر سکتے ہو کہ اُسوقت تمہارا خط پا کر میری کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ اُفوہ، دل کسقدر زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ خون کا دوران کسقدر تیز ہوگیا تھا۔ فرطِ مسرّت سے حواس پر ایک بیخودی سی چھائی جا رہی تھی۔ جلدی سے میں نے خط کو کھولا۔ اُفوہ، دل پر کیسی چوٹ لگی یہ دیکھکر کہ خلافِ معمول یہ خط "رضیہ پیاری" سے شروع نہیں ہوا تھا۔ بہرحال پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتی گئی اور دل میں برچھیاں ٹوٹتی گئیں۔

خط تمام ہوگیا اور میری وہ خیالی مسرّتیں بھی تمام ہوگئیں جنہوں نے آج تک ہر قسم کی تلخیوں اور اذیتوں کو بھلا رکھا تھا۔ اچھا، مانا، میں اس قابل نہیں کہ تم مجھے "رضیہ پیاری" سے خطاب کرتے۔ مگر میری رُوح کے مالک! کیا یہ بھی ضروری تھا کہ خط کے خاتمہ پر تم اپنا نام بھی نہ لکھو۔ ہائے کیسی بے رحمی کیسی بیدردی سے تم نے کام لیا۔

تم تو لکھا کرتے تھے: "تمہارا پرستار...، تمہارا، صرف تمہارا...، تمہاری آرزو میں جینے والا...، زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا..." اور اب کچھ بھی نہیں۔ اپنا نام تک لکھنا گوارا نہ کیا۔ ہاں، تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا اس لئے کہ میں بیوفا ہوں، میں نے کہیں اور سکون کی تلاش کی ہے، میں نے تمہیں اور تمہاری محبت دونوں کو ایک خوابِ پریشاں کی طرح بھلا دیا۔ کیوں، یہی بات ہے نا؟ جبھی تو تم نے لکھا ہے کہ "اپنی محبوب ترین شے کے "پرائی" ہو جانے کے احساس نے میرے سب ارمان خاک میں ملا دئے!"

آہ، پریتم، میرے پیارے! میری رُوح کے مالک! کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری رضیہ کا پیمانِ وفا اتنا بودا نہیں جو حوادثِ روزگار کی کشکش سے ٹوٹ جائے۔ رضیہ کا جسم تمہاری ملکیت نہ ہو سکا۔ نامراد رضیہ کو اس پر کوئی اختیار نہ تھا، مگر رضیہ کی رُوح تمہاری، صرف تمہاری، اور ہمیشہ کیلئے تمہاری ہے۔

میری مجبوریوں، گرفتاریوں اور تنہائیوں کا تمہیں اچھی طرح علم ہے۔ جب بہت جی گھبراتا ہے تو کچھ لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔ تم نے یہی تو مجھے سکھایا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے ایک چھوٹا سا افسانہ لکھا تھا، بالکل تمہارے انداز میں، بس اتنا ہی فرق تھا جتنا اصل اور نقل میں ہو سکتا ہے۔ تمہاری سی تحریر تو میں اگر مر کر جیوں تب بھی نہ لکھ سکوں۔ تم تو لکھتے نہیں، لفظوں سے جادوگری کرتے ہو۔ پڑھنے والے کلیجہ تھام تھام کر رہ جاتے ہیں۔ آہیں، آنسو، شعلے، بجلیاں، نشتر، زہر، شبنم، امرت، سب کے خزانے تمہارے پاس موجود ہیں جن کی مدد سے تم پڑھنے والوں کے جذبات کو طوفانی سمندر کی طرح متلاطم کر دیتے ہو۔

ہاں، تو وہ افسانہ جب شائع ہوا، لوگوں نے اُسے پسند کیا اور مجھے خوشی ہوئی کہ درحقیقت یہ بھی تمہاری ہی دی ہوئی ایک قیمتی نشانی ہے، ورنہ پہلے مجھے کچھ لکھنے کا سلیقہ ہی کب تھا۔ یہ سب کچھ تو ہوا مگر ایک دن بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کہیں خدانخواستہ تم خود کسی غلط فہمی میں پڑ جاؤ۔ کہیں اس افسانہ کو حقیقت نہ سمجھ لو۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ رشکِ محبت نے تمہیں اتنا سوچنے کی

اجازت نہ دی کہ جس طرح زمین صرف سورج ہی کے گرد گھومتی ہے، اسی طرح ایک عورت بھی صرف ایک ہی مرد سے محبت کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ حقیقی معنوں میں عورت ہو، ورنہ ہوا و ہوس کی پتلیاں تو ہر بازی گر کے ہاتھ میں ناچنے لگتی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا محبت بھی تقسیم ہونے والی چیز ہے؟ نہیں، اور ہرگز نہیں۔ تو پھر تم ایک خیالی افسانہ کو حقیقت سمجھکر مجھ سے بدگمان کیوں ہو گئے؟

"میرے لئے یہ امر موجب مسرت ہے کہ تم نے افسانۂ ماضی کو فراموش کر کے اپنے لئے از سرِ نو دلچسپی کا سامان پیدا کر لیا.... الخ"

آہ نہ پوچھو تمہارے ان الفاظ سے میرے دل پر کیسی چوٹ لگی۔ ہائے نامراد رضیہ تمہیں بھول گئی! اپنے محبوب کو، اپنے پرستار محبوب کو بھول گئی؟ زندگی کی تمام تلخیوں اور ناکامیوں کے باوجود جس کی یاد آج بھی میرے لئے دُنیا کی بہترین مسرت ہے، کیا میں اُسے بھول سکتی ہوں؟ کیا اُسے بھولنا میرے اختیار میں بھی ہے؟

تم چاہتے ہو کہ تمہاری یاد کا کوئی حصہ اگر میرے دل کے کسی گوشہ میں باقی رہ گیا ہو تو میں اُسے نکال دوں اور تمہیں ہمیشہ کے لئے بھول جاؤں۔ میں اگر تمہیں بھول سکتی تو اب تک کب کا بھول چکی ہوتی! انسان اُمیدوں کے سہارے جیتا ہے، مگر میری تو سب اُمیدیں ختم ہو چکیں، تم جہاں ہو وہاں تک میرا خیال بھی مشکل سے پہونچ سکتا ہے۔ تمہاری رہائی اور واپسی کی موہوم اُمید بھی مدت ہوئی کہ ٹوٹ چکی۔ کبھی تمہیں پا لینے اور اپنا بنا لینے کے تمام امکانات ختم ہو چکے، مگر کیا مایوسیوں نے تمہاری آرزو کو بھی کچل ڈالا، تمہاری محبت کو بھی مٹا دیا؟ نہیں وہ تو آج بھی پہلے دن کی طرح میرے قلب و رُوح کی گہرائیوں میں سمائی ہوئی ہے۔ آج تمہارا یہ شعر حرف بحرف میرے حسبِ حال ہے:۔

فلک سے چاند کیونکر میرے پہلو میں اُتر آئے

خداوندا نہ اتنا بھی کوئی مجبور ہو دل سے

ناممکن کی تمنا کرنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ جانتی ہوں کہ میں تمہیں کبھی نہیں پا سکتی، پھر بھی یہ آرزو اتنی پیاری ہے کہ میں اِسے اپنے ساتھ قبر میں لے جانا چاہتی ہوں۔ جب یہ صورت ہے تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں تمہیں کس طرح بھول جاؤں؟ اور تمہیں بھول جاؤں تو پھر کسے یاد رکھوں؟ میری رُوح کی تسکین صرف تمہاری یاد ہے۔ کیا تم میری رُوح کی تسکین مجھ سے چھین لینا چاہتے ہو؟ کیا تم اپنی پرستار کنیز، اپنی نامراد رضیہ سے واقعی اس قدر بیزار ہو گئے ہو؟ یہ بھی میری قسمت ہے۔ ہاں تم مجھے بھول جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکتی۔ مجھے بھول جانے کی کوشش کرو۔ مگر مجھے اُمید نہیں کہ تمہیں اس میں کامیابی ہو سکے۔

مدت کے بعد اس مرتبہ تم نے اپنے چند شعر بھیجے ہیں، کہاں سے الفاظ لاؤں جو اُن کی تعریف کر سکوں۔ مجھے تو یہ اشعار خود اپنے جذبات کی تصویر اور اپنی رُوح کی آواز معلوم ہوتے ہیں:۔

بتا اے چاند کس عالم میں تو نے اُنکو چھوڑا تھا

سرشک آلودہ تھی کیا اُنکی مژگاں شورشِ دل سے

ہائے چاند کے سوا تم میرا حال اور کس سے پوچھ سکتے ہو؟ کاش وہ تمہیں بتا سکتا کہ شورشِ دل نے تمہاری دُور اُفتادہ، نامراد رضیہ کا کیا حال بنایا ہے۔ اُس نے بارہا مجھے آدھی رات کو تمہارے لئے "موتیوں کی مالا" تیار کرتے دیکھا ہے۔ اُنہیں موتیوں کی جو تمہاری نظر میں بہت قیمتی ہیں۔ اُسے دیکھکر کبھی کبھی میں خود بھی سوچا کرتی ہوں کہ یہ وہاں سے آ رہا ہے جہاں میرا چاند ضیا گستر ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس سے پوچھوں "تو نے اُنہیں کس حال میں چھوڑا؟ کبھی وہ مجھے یاد کرتے ہیں؟" کاش یہ میرا پیغام تم تک لے جاتا۔ میرا حال تم سے کہہ دیتا۔ ہائے کیسے دیوانہ پن کے خیالات دل میں آتے ہیں۔ چاند بھی کبھی کسی کا قاصد بنا ہے۔

کچھ ایسی ہی فضا، ایسی ہی شب، ایسا ہی منظر تھا

نہ پوچھو آہ، کیا یاد آ گیا تاروں کی جھلمل سے

آہ، کیسا دردناک یہ شعر تم نے کہا ہے۔ تمہارے اشعار، اشعار نہیں، افسانے ہوتے ہیں۔ افسانے نہیں واقعات۔ گذرے ہوئے بیتے ہوئے۔ تمہیں کیونکر بتاؤں کہ اس شعر نے مجھے کس دُنیا میں پہونچا دیا اور کیا کیا یاد دلا دیا۔ آہ وہ تاروں بھری رات اب تک یاد ہے اور وہ سب کچھ یاد ہے جو تاروں کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

سوتے میں رات اُس کا گریبان کھُل گیا

میں چونک اُٹھا کہ صبح نمودار ہو گئی

پریتم، خدا کیلئے تم میری اتنی تعریف نہ کیا کرو۔ میں مغرور ہو جاؤنگی، خدا جانے اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگونگی۔

اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تم نے مجھے خواب میں دیکھا تھا کہ میں کانوں میں ہیرے کے پھول پہنے ہوئے ہوں۔ یہ پھول تو ابھی پچھلے دنوں میں نے بمبئی کے ایک جوہری سے خریدے ہیں۔ تمہیں ان کا حال کیونکر معلوم ہو گیا۔ تم نے تو مجھے کانوں میں پھول پہنے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ جب ملاقات ہوتی تھی تو میں جھمکے پہنے ہوتے تھی۔ سچ بتاؤ یہ شعر تم نے کیونکر کہا

بنا گوش میں اُس کے الماس پارہ

درخشندہ جیسے شفق میں ستارہ

(بقیہ بر صفحہ ۵۲)

تین خط

یہ میری طالب علمی کے زمانے کا واقعہ ہے۔ طالب علمی کا زمانہ بھی عجب ہوتا ہے۔ زندگی کے وہ مسائل اور پیچیدگیاں جو آجکل گلے کا ہار بنی ہوتی ہیں پاس بھی نہ پھٹکنے پاتی تھیں۔ گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور میں لاہور سے اپنے خاص دوست چونی لعل صاحب کے ساتھ جموں چلا گیا۔ یہ حضرت میرے ہم جماعت تھے اور خدا نے انکو اعلیٰ درجے کی زندہ دل شخصیت عطا کی تھی۔ ہم دونوں بچپن سے ہم پیالہ وہم نوالہ رہے تھے اور جب کبھی ممکن ہوتا تعطیلات اکٹھے ہی گزارتے۔

چونی لعل صاحب کا گھر عین لب سڑک واقع تھا۔ اس مکان کی اُوپر کی منزل کا ایک کمرہ مجھے دیدیا گیا۔ میرے لئے یہ کمرہ نہایت موزوں تھا کیونکہ اس میں وہ تمام ضروری چیزیں موجود تھیں جو ایک مرد مجرد کے لئے آسائش کا سامان ہوتی ہیں۔ مثلاً لوٹنے کیلئے کونے کا پلنگ جس کے بائیں طرف ایک تپائی پر ٹیبل لمپ گہرے ہرے رنگ کے شیڈ کے ساتھ رکھا تھا۔ ایک آرام کرسی اور متعدد راکھ جھاڑنے کی طشتریاں۔ میں نے کتابیں وغیرہ نکال کر طاقچے پر جما دیں۔ ہم دونوں نے سوچا تھا کہ اِن چھٹیوں میں خُوب پڑھیں گے تاکہ امتحان سے پہلے کمر جی کے ضخیم خلاصے رٹنے کی دردسری سے بچ جائیں۔ مگر قسمت نے اِن چھٹیوں کیلئے ہمارے واسطے ایک خاص شغل کے لوازمات میسّر کر رکھے تھے اسلئے پڑھنے کی کارروائی حسب دستور امتحان کے پہلے ہفتے کیلئے بالائے طاق رکھدی گئی اور ہم دونوں اس دلچسپ مہم میں کھپ گئے۔

چونی لعل صاحب کے گھر کے عین سامنے ایک گھر تھا جس میں ہم نے سُنا کہ جموں کے ایک بڑے رئیس سیٹھ رہتے تھے۔ مجھے جموں آئے ایک دو دن ہی ہوتے ہونگے جبکہ ایک صبح میں ناشتہ کر کے سگرٹ سُلگاتے کسی بے وجہ خوشی کے زیر اثر کمرے کی کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر لیٹا اقبال کا مشہور شعر گنگنا رہا تھا۔ ع۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ میری مُراد بر آئی اور سامنے کی کھڑکی کی چلمن کو کسی نے آہستہ آہستہ اُٹھانا شروع کیا۔ میری گنگناہٹ خود بخود بند ہو گئی۔ کان کھڑے ہو گئے اور آنکھیں چلمن کے پس پردہ سے ظہور ہونے والی "حقیقت" کو دیکھنے کیلئے بیتاب ہو گئیں۔ پہلے سفید دھوتی نظر آئی اور اسکے بعد ع۔

گویا کہ بجلی سی گری!

کیونکہ دھوتی ختم ہونے پر ایک دم ڈھلکا ہوا ننگا پیٹ اپنی گولائی اور عظیم الشان پھیلاؤ کے ساتھ ظاہر ہونا شروع ہوا۔ اس پیٹ کی ناف بلا مبالغہ اتنی عمیق تھی کہ اس میں کرکٹ کی گیند آسانی سے رکھی جا سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ پیٹ پورا جلوہ افروز ہو گیا۔ اسکے بعد دو ڈھلکے ہوئے پستان یعنی مری ہوئی جوانی کی نشانیاں نظر آئیں۔ پھر ایک دم گُلگُلے کی مانند پھولا ہوا مگر پلپلا چہرہ سامنے آ گیا۔ گردن چونکہ تھی ہی نہیں اس لئے نظر نہیں آ سکی۔ اگر تھوڑی بہت ہوگی تو وہ بھی کثیر التعداد ٹھوڑیوں کے پیچھے اس طرح چھپی ہوئی تھی جس طرح موجودہ جنگ میں فرانسیسی سپاہی میجنولائن کے پیچھے دبکے بیٹھے ہوں۔ سر گنجا تھا اور چکلا مگر کنپٹیوں پر کچھ کچھ بال پریشان حال تھے۔ یہی اس گھر کے مالک سیٹھ صاحب تھے۔ ان کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں اور کسی زمانے میں بارعب بھی ہونگی مگر اب بڑھاپے کی آمد کے ثبوت میں اپنی اصلی کالی رنگت کھو چکی تھیں۔ میں نے اپنی تقدیر کو خُوب کوسا۔ سوچنے لگا کہ اگر تمام چھٹیاں اسی پری چہرہ کے دیدار میں گزارنی پڑیں تو ممکن ہو کہ میں بھی گوتم بدھ کی طرح دُنیا چھوڑ کر جنگلوں میں اپنا آشیانہ بنالوں۔

کھڑکی کے پاس پڑی ہوئی چوکی پر سیٹھ صاحب بیٹھ گئے اور ایک ڈبے میں سے ایک بُرش نما چیز کو کسی شیشی کے سیال میں بھگو بھگو کر اپنی مونچھوں پر پھیرنے لگے۔ آن واحد میں اُن کی مونچھوں کی سفیدی اس طرح غائب ہو گئی جس طرح مداری کے تھیلے میں سے انڈے یا پہلو سے دل۔ مگر چوکی پر چوکڑی جمائے اور اپنی مونچھوں کے کالے پن کو دیکھ دیکھکر مسکراتے ہوئے (جس سے انکے سامنے کے ٹوٹے ہوئے دانت والا راز فاش ہوا جا رہا تھا) یہ سیٹھ صاحب مجھے چینیوں کے اُس خوشحالی اور تسکین کے دیوتا کے مشابہ نظر آتے جس کے بت انگریز لوگ اکثر اپنے طاقچوں پر سجاوٹ کیلئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ مونچھیں رنگ کر سیٹھ صاحب جوان نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی عمر یقیناً ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ مغربی ممالک اور جاپان میں ساٹھ برس کا آدمی بوڑھا نہیں سمجھا جاتا مگر ہندوستان میں کچھ تو خوراک کی بداعتدالیوں اور کچھ زندگی کی بے قاعدگی، ورزش کی غیر موجودگی اور موسم کی سختی کی

وجہ سے ساٹھ برس میں انسان عام طور پر قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوتا ہے۔ ہمارے سیٹھ صاحب بھی اسی زمرے میں تھے مگر اصلی چیل مارکہ خضاب کے استعمال سے "دنیا اور خود اپنے آپ کو دھوکہ دینے پر تُلے نظر آتے تھے۔

میں انہی خیالات میں غرق تھا کہ جوجوتی لعل صاحب نے آکر مجھ سے پوچھا کہ کس سوچ میں پڑے ہوتے ہو۔ میں نے سامنے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہی سوچ رہا تھا کہ "اڑھائی مہینے تک روزانہ اِکے دیدار کرنے کے بعد اگر میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا تو اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا کونسا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہوگا!"

میرے دوست نے مجھے نصیحتانہ انداز میں سمجھایا: "تم ازل سے احمق ہے ہو اور نہ معلوم تمہیں بات بات پر خودکشی کرنے کا خیال کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اجابت صاف نہ آئے تو خودکشی! چا وقت پر نہ ملے تو خودکشی!! کرکٹ کے کھیل میں کامیابی نہ ہو تو خودکشی!!! آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ اگر یہ منظارہ تم سے برداشت نہیں ہو سکتا تو کھڑکی بند کر لو، یا کرسی پھیر کر بیٹھ جاؤ مگر تم کو یہ دونوں حکمت عملیاں اختیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ سامنے والا سین اُس گھر کے ناٹک کا ایک دردناک مگر عارضی نظارہ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم کو تصویر کا دوسرا پہلو نظر آئیگا تو تمہاری زندگی میں رومان کا سیلاب اُمڈ آئیگا۔"

میں نے پوچھا: "وہ تصویر کا دوسرا پہلو کیا ہے؟"

جواب ملا: "یہ ایک افسوسناک کہانی ہے۔ سیٹھ جھگن مل جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں ایک نہایت دولتمند شخص ہیں۔ کپڑے کے بیوپار میں انہوں نے بہت دولت پیدا کی ہے مگر قسمت سے اِن کے اولاد نہیں۔ انکی پہلی بیوی دمہ کی بیماری سے دو سال ہوئے رحلت کر گئی اور سیٹھ صاحب نے اولاد حاصل کرنے کی خاطر اس عمر میں دوبارہ شادی کر لی۔ ایک غریب گھرانے کی لڑکی جس کے والدین نے زر کے لالچ میں آکر اپنی نوجوان لڑکی کی جوانی غارت کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ سیٹھ جھگن مل کی عمر کے ساتھ ساتھ اُن کی بیوی شیلا دیوی کی جوانی کا جوش بھی بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ بیچاری کیا کرے زندہ درگور ہو گئی۔ ان حالات میں اگر اس کا چال چلن نیکی کے راستے سے بھٹک جاتے تو اس میں اس بیچاری کا کیا قصور ہو سکتا ہے؟ قصور اگر کسی کا ہو سکتا ہے تو وہ سیٹھ صاحب کا ہوگا جنہوں نے اس ضعیفی کی عمر میں ایسی جوان لڑکی سے شادی کی، یا شیلا کے ماں باپ کا جنہوں نے اپنی لڑکی کو دیکھتے دکھاتے دولت کے ہاتھ بیچ دیا اور یا پھر ہمارے سماج کا جو ایسی شادیاں ہونے کی اجازت دیتا ہے۔"

ہم اسی سوچ بچار میں بیٹھے تھے کہ سیٹھ صاحب اُٹھ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اُن کا غائب ہونا تھا کہ ایک عورت سادے کپڑوں میں ہماری نظروں کے سامنے آئی اور چوکی پر سے مونچھیں رنگنے کا سامان اٹھا کر لے گئی۔ عورت واقعی جوان تھی۔ جوان اور خوبصورت، مگر اس کے سفید کپڑوں اور مُرجھائے ہوئے چہرے سے اُس کی پھوٹی قسمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے پوچھا: "یہی شیلا تھی؟ معلوم ہوتا ہے کہ جھگن مل اس بیچاری کو کپڑے اور زیور بھی جن کے لئے یہ بکی تھی مہیا نہیں کرتا۔ وہ شخص سچ مچ شیطان ہے۔"

میرے دوست نے ایک آہ بھر کر کہا: "نہیں یہ شیلا نہ تھی۔ تمہارا اندازہ اس دفعہ پھر غلط نکلا۔ سیٹھ جھگن مل اتنا بُرا انسان نہیں ہے جتنا تم اُسے سمجھتے ہو۔ یہ شیلا کی بھاوج لیلا تھی۔ بدقسمت لیلا بھی ہندو سماج کا شکار بن چکی ہے۔ اُس کا خاوند یعنی شیلا کا بھائی شادی کے چھ ماہ بعد ہی پلیگ کا شکار ہو گیا تھا۔ پانچ سال تک یہ بیچاری شیلا کے والدین کے گھر رہی مگر جب سے شیلا کی شادی ہوئی ہے یہ بھی سیٹھ صاحب کے گھر میں پناہ گزین ہے۔ جھگن مل ہر ممکن طریقے سے اسکی دلجوئی کرتا ہے۔ مگر بدبخت لیلا، شیلا کی طرح کپڑوں، لذیذ کھانوں اور سونے جواہرات کی بھوکی نہیں۔ یہ دونوں زندگی چاہتی ہیں مگر ہر دو اس سے محروم ہیں!"

شیلا اور لیلا کا قصہ بہت دردناک تھا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ دن گزرتے گئے۔ شہر جموں میں ہمارا ایک شخص واقف تھا۔ اگرچہ اس کا نام رام سنگھ تھا مگر چونکہ وہ اُلٹی کھوپڑی کا تھا اس لئے ہم اُسے چڑانے کے لئے ہمیشہ سنگرام کہہ کر پکارتے۔ سنگرام خود کو نہایت حسین سمجھتا تھا اور اکثر دعویٰ کیا کرتا کہ جس عورت کی نظر اُس پر پڑ جاتی وہ اپنا صبر و قرار کھو بیٹھتی تھی۔ ہمیں اس کی یہ لن ترانیاں ذرا نہ بھاتیں۔ دیکھنے میں وہ غیر معمولی طور پر معمولی شکل وصورت کا انسان تھا۔ قد میانہ، جسم مائل بہ فربہی، رنگت گندمی، دانت ناہموار اور ہمیشہ پان سے سُرخ۔ البتہ اس کے بال غیر معمولی گھنے تھے۔ اور وہ اپنے بالوں کو بہت کم کٹوایا کرتا تھا۔ اور اکثر خوشبودار تیل سے تر رکھتا۔ اُسکے کپڑے بھڑکیلے اور خراب سِلے ہوتے ہوتے تھے۔ مختصراً وہ ہندوستانی فلم کا اچھا خاصہ ہیرو نظر آتا تھا۔ اُس کی شیخیاں ہمارے لئے وبالِ جان تھیں۔ ایک دو دفعہ بے لگام ہونے کے جرم میں وہ ہم سے پٹ بھی چکا تھا۔ مگر مدت سے مار کا اثر زائل ہو گیا تھا اور ہم اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس کو پوری طرح سے اُلو بنائیں تاکہ وہ آئندہ خاموش رہے۔

اِسی دوران میں ایک دن سنگرام میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا

کہ شیلا اُس کی نظر پڑ گئی۔ جب اُس کی زندگی کا حال اُسے سُنایا تو وہ چُپ سا ہوگیا اور بات ٹال دی۔ مگر اُس دن کے بعد جو دیکھتے ہیں تو سنگرام دن میں دس بارہ دفعہ اس سڑک پر سے گزرتا دکھائی دیا۔ اور جب چھگن لال کے گھر کے نیچے سے گزرتا تو کبھی سگرٹ سُلگانے کے بہانے کھڑا ہو جاتا۔ کبھی اُسے بے تحاشہ کھانسی آ دبوچتی اور وہ رنگ برنگے ریشمی رومال نکال کر اُن کو عجیب انداز سے ہلا کر اپنا مُنہ پونچھتا۔ کبھی اس کے بوٹ کا تسمہ وہاں آکر ڈھیلا ہو جاتا۔ غرضکہ سنگرام کو اس طرح منڈلاتے دیکھکر میں نے سمجھ لیا کہ یہ شخص ضرور اپنی سمجھ میں شیلا کو گھائل کر چکا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ہمیں سنگرام کو سبق سکھانے کی ایک تجویز یہ سُوجھی کہ شیلا کی طرف سے سنگرام کو ایک خط لکھیں اور دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ بڑے غور و فکر کے بعد ہم نے طے کیا کہ ساتھ کے مکان والے آٹھ برس کے لڑکے کو اس سازش میں قاصد کا پارٹ ادا کرنے کے لئے شامل کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے چاند کو بلا کر اُسے اچھی طرح سمجھایا کہ سنگرام کو ہرگز یہ پتہ نہ لگے کہ خط ہم نے دیا ہے بلکہ اُس سے یہی کہا جائے کہ چھگن لال کے گھر کی ایک عورت نے آپ کو دینے کیلئے کہا ہے۔ جب ہمیں راز داری کا پورا پورا اطمینان ہوگیا تو میں نے مندرجہ ذیل مضمون ایک معمولی کاغذ پر ٹیڑھے بنگے خط میں لکھا اور ایک سادے لفافہ میں بند کر کے چاند کے حوالے کر دیا۔

"پریتم۔ پرنام۔

جب سے تمہیں سامنے کے گھر کی کھڑکی کے پاس بیٹھے دیکھا ہے میرا ہردے ویاکل ہوگیا ہے مگر کیا کروں۔ چوری چھپے آپکو کبھی کبھی گزرتے دیکھکر جی ٹھنڈا کر لیتی ہوں۔ اگر مجھے جواب دینا ہو تو اس لڑکے کے ذریعے ہی بھجوانا۔

تمہاری پریم پجارن"

اُس شام سنگرام کو خط مل گیا۔ چاند کو آٹھ آنے مل گئے اور ہمیں کل جواب ملنے کی اُمید ہوگئی۔ حسب وعدہ دوسرے دن چاند، سنگرام کا دیا ہوا خط نہایت اعلیٰ قسم کا گلابی رنگ کا لفافہ لے آیا۔ بڑے اشتیاق سے ہم نے لفافہ چاک کیا۔ ڈھائی صفحوں کا خط تھا اور اس میں سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ سنگرام صاحب نے تفصیل وار بتلایا تھا کہ اُنہیں بہت مہلک قسم کا مرضِ عشق ہوگیا تھا۔ رات کی نیند حرام ہو چکی تھی، دن کا قرار تباہ ہوگیا تھا۔ کاش کہ وہ ہوا ہوتے تو کم از کم گھر میں تو بلا کھٹکے داخل ہو سکتے اور اس طرح اپنے معشوق کا دیدار کر سکتے۔ یا چڑیا ہی ہوتے تو پریتم کے کمرے میں گھونسلا بنا کر رہ جاتے۔ مگر تقدیر نے اُنکو ایک انسان بنا کر اُن سے صد درجہ کی ناانصافی کی تھی۔ اُنکا سڑک سے گزر جانا اور کبھی اتفاق سے ایک لمحہ کے لئے دیدار کر لینا ایسا ہی تھا جیسے ایک پانی کا قطرہ کسی بڑے صحرا کو تر کرنے کی کوشش کرے۔ اُن کی آگ دن بدن بھڑک رہی تھی اور وہ بیقرار ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے بعد شیلا کے حُسن کی تعریف تھی۔ کئی اشعار لکھے ہوتے تھے۔ آخر میں: "بھول نہ جانا۔ بھُول نہ جانا" کہکر بھیک مانگی تھی اور جواب نہ دینے پر میری طرح خودکشی کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

خط پڑھکر ہم بہت خوش ہوئے اور سوچا کہ اب سنگرام کو اُسکی شیخیوں کا پورا پورا مزا چکھائیں گے۔ ادھر سنگرام بھی ہمارے پاس گاہے بگاہے آنے جانے لگا۔ ہم نے ایک دو دفعہ پوچھا کہ آجکل کیا شغل ہے مگر سنگرام نے ہمیشہ مُسکرا کر یہی جواب دیا کہ "کچھ نہیں"۔ خیر جب خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہوگیا تو ہم نے سوچا کہ اب سنگرام سے کچھ اینٹھا جائے۔ مجھے مدت سے ایک فونٹین پن کی ضرورت تھی۔ چنانچہ پریم پجارن نے اپنے پریتم کو بڑی ترکیب سے سمجھایا کہ پجارن کے پنسل سے لکھے ہوئے خط پڑھتے وقت پریتم کو بہت دقت ہوتی ہوگی مگر کیا کرے اُسکے گھر والے پُرانے خیالات کے آدمی ہیں اور تختی پر لکھنے والی سیاہی استعمال کرتے ہیں۔ خط ملتے ہی سنگرام ایک دن کے لئے غائب ہوگیا۔ بعد میں جب ہم کو اُس کا خط اور ایک بہترین قسم کا پارکر قلم چاند کے توسط سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ لاہور قلم خریدنے گیا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

"جان سے پیاری پجارن۔ پریم پتر ملا۔ اس کو آنکھوں سے لگایا، کلیجے سے لگایا، ہونٹوں سے بھی لگایا اور اب سینہ سے لگا رکھا ہے۔ میں بڑا احمق ہوں جو اب تک آپ کے لئے فونٹین پن لانے کا خیال نہ آیا۔ میرا گناہ واقعی قابلِ معافی نہیں۔ مگر سزا اس شخص کو دی جاتی ہے جو اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے جُرم کرے۔ میرے حواس تو اُس گھڑی سے کھو چکے ہیں جب آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میں بڑا بدقسمت ہوں مجھے کبھی ایسا موقع بھی نہیں ملا کہ آپکے پاؤں کی خاک ہی چُوم سکوں۔ آپ کے گھر کے سامنے جو رہتے ہیں اُن کو میں جانتا ہوں مگر وہ پاجی انسان ہیں۔ مسخرے ہیں۔ بات بات پر شک کرتے ہیں ورنہ اُنکے ہاں ہی آکر پڑا رہتا۔

گھر بھی قسمت سے ترے گھر کے مقابل نہ ہوا
تو نہ آتا تیری آواز تو آیا کرتی

محبت کا پیاسا۔ مجرمِ الفت
رام سنگھ"

قلم واقعی بہت قیمتی تھا مگر چونکہ سنگرام کی پسند کا تھا اس لئے اُسکو کیڑوں کی طرح اس کا رنگ بھی بھڑکیلا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اب سنگرام کو شیلا کے پاؤں کی خاک چومنے کی دعوت دینی چاہیئے۔ چنانچہ اُسکے بھیجے ہوئے فونٹین پن سے اس مضمون کا خط اُسے لکھ بھیجا کہ اُن کا بھیجا ہوا قلم بہت پیارا تھا اور مرتے دم تک پجارن کے پاس رہے گا۔ پھر یہ خواہش ظاہر کی کہ کاش پریتم سامنے والے مکان میں رہتے ہوتے تو درشن کرنے میں کس قدر آسانی ہو جاتی۔ جو لوگ وہاں رہتے تھے وہ واقعی بڑے گنوار معلوم ہوتے تھے۔ ہر دم قہقہے لگاتے رہتے تھے۔ پریتم جیسی ضعداری اور خوبیاں اُن میں نام کو نہ تھیں۔ پھر یہ التجا کی کہ وہ کل رات گیارہ بجے کے قریب مکان سے پچاس گز کے فاصلے پر سڑک کے کنارے انتظار کریں، اُنکی پجارن ملاقات کرنیکی کوشش کریگی۔

یہ خط ملنے کے دوسرے دن سنگرام ہمارے گھر آیا۔ ہم نے بات بات پر خواہ مخواہ قہقہے لگانے شروع کر دئے۔ سنگرام ہمیں اس طرح ہنستے دیکھکر مسکرایا اور کہنے لگا "تمہارا اس طرح گرجتے ہوئے ہنسنا تہذیب کے خلاف ہے۔ نہ معلوم تم دونوں کیوں ہمیشہ اسقدر خوش رہتے ہو"

میرے دوست نے جواب دیا "بس خوش رہنے کیلئے ہم اسقدر خوش رہتے ہیں۔ یہ ہماری عادت ہے"

اُس رات دس بجے کے بعد ہم نے اپنے کمرے کی بتیاں بجھا دیں تاکہ سنگرام کی نقل و حرکت دیکھ سکیں۔ دس سے گیارہ تک وہ شیلا کے گھر سے سو گز کے فاصلے پر ٹہلتا رہا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ تک پچاس گز کے فاصلے پر آ گیا۔ ساڑھے گیارہ کے بعد اس کے بے چین اور تھکے ہوئے جسم اور شیلا اور ہمارے گھر کے درمیان صرف دس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ عورتوں کا صبر و قرار غارت کرنے والا سنگرام مدھم سیٹیاں بجا رہا تھا۔ جب سیٹی بجاتے بجاتے دم پھول گیا تو اُس نے گانا شروع کر دیا۔ مختلف گانے مثلاً:-

"پیا بن ناہیں آوت چین"
"دُکھ کے دن اب بیتت ناہیں"
"غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا"
"دلِ ناداں بہلتا نہیں بہلانے سے"
"وہ آزردہ نہ مجھ سے ہو گیا ہو"
"مگر آخر ہوئی مجھ سے خطا کیا؟"
"بڑے ہی بے اثر ہیں میرے نالے"
"ٹانگوں میں ضعف آ گیا میری کھڑے کھڑے"

آخر جب بارہ بج گئے اور سنگرام شاید مایوس ہو کر گھر جانے کی فکر میں تھا تو ہم دونوں گھر سے باہر نکلے اور سنگرام کی طرف لپکے۔ اُس نے جب آہٹ سُنی تو آہستہ آہستہ گھر سے پرے بڑھنا شروع کیا۔ ہم جلد ہی اُسکے پاس پہونچ گئے اور اُسے اندھیرے میں پہچان کر پوچھا "تم اتنی رات گئے سڑک پر کیا کر رہے ہو؟"

سنگرام نے مرنی آواز میں جواب دیا "بھئی مجھے رات کی خاموشی میں سیر کرنے کا بہت شوق ہے اور میں اکثر راتوں کو لمبی سیر کی خاطر گھر سے نکل جاتا ہوں"

میں نے کہا "خوب، یہ عادت بہت اچھی ہے۔ ہم بھی سیر کے بہت شوقین ہیں چلو آج اکٹھے سیر کریں۔ صحت قائم رکھنے کیلئے راتوں کی سیر سے بہتر اور کوئی چیز نہیں"

غرضکہ رات کے دو بجے تک ہم نے خوبصورت سنگرام کو چلا چلا کر آدھ موا کر دیا اور آخر اس کو گھر چھوڑ آئے تاکہ وہ دیوانہ پھر کہیں شیلا کے گھر کے نیچے نہ آ کر بیٹھ جائے۔ دوسرے دن اس کو چاند کے ذریعہ مطلع کر دیا کہ پجی کی طبیعت دفعتاً خراب ہو جانے کی وجہ سے نہ آ سکی تھی۔ سنگرام نے جواب میں رات کے انتظار، شیطانوں کی آمد اور بعد کی ورزش کا حال بالتفصیل قلمبند کر کے بھیجا۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ ہم کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو سنگرام کو ترکیب سے لکھ بھیجتے۔ وفادار عاشق ہمیشہ ہمارے حکم کی تعمیل بجا لاتا۔ مثلاً جب ہم کو رومالوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہم نے لکھ بھیجا کہ "اب تو آنسوؤں کا دریا اس درجہ بہنا شروع ہو گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے زنانے رومال اسکو روکنے کے نااہل ثابت ہو رہے ہیں!" جواب میں ایک درجن بڑے بڑے ریشمی رومال اور ایک عدد "اولڈ دل بہار" نامی سینٹ کی شیشی مرحمت ہوئی۔ رومال چونکہ سنگرام کی پسند کے تھے اس لئے عجیب تھے۔ بعض پر شیر اور ریچھوں کی تصویریں تھیں مگر کیا کرتے مجبوری تھی۔ چھ چھ بانٹ لئے۔

ایک دفعہ ہم نے سنگرام کے تحفہ و تحائف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُسے ہدایت کی کہ وہ غلطی سے بھی ساڑھی نہ بھیجے کیونکہ ساڑھی سے راز فاش ہو جانے کا اندیشہ ہوگا اور یہ بھی لکھا کہ "کاش میں مرد ہوتی تو اپنے پریتم کیلئے کوئی نشانی خود خرید کر لا سکتی۔ مگر چونکہ میرے پاس روپیہ وافر ہے اس لئے تم کسی اچھے جوہری سے پانچسو روپے کی قیمت کی انگوٹھی بنوا لو۔ قیمت میں ادا کر دونگی" چنانچہ سنگرام ایک دفعہ پھر لاہور گیا اور ایک انگشتری بننے دے آیا۔ بیعانے کے طور پر اس کو پچاس روپے جوہری کے

پاس جمع کرانے پڑے تھے۔ سنگرام اپنی شیخیوں کی قیمت پوری پوری ادا کر رہا تھا۔ ہمیں گو یہ تسلی تھی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ سنگرام کا عشق زور پکڑتا گیا۔ مگر ایکدن جب چاند حسب معمول سنگرام کا خط لایا تو اس میں سے دو تحریریں نکلیں۔ حیرت میں ڈوبے ہوئے ہم نے دونوں کو پڑھا ایک خط "کھڑکی والی" نے یوں لکھا تھا۔

"سڑک پر پھرنے والے مِتر۔ پرنام۔ بہت دنوں سے میں آپکی نقل و حرکت پر غور کر رہی ہوں۔ آج تک میں نے ضبط سے کام لیا۔ مگر اب مجبور ہو گئی ہوں۔ اگر ہو سکے تو ملنے کا کوئی انتظام کرو۔ تمہیں بے چین دیکھ کر مجھے بڑا دُکھ ہوتا ہے۔

تمہاری "کھڑکی والی"

سنگرام نے یوں لکھا۔

"پیاری پُجارن۔ کل شام کے جھٹپٹے میں ساتھ والا خط کھڑکی سے پھینکا گیا تھا۔ جو تمہیں بھیج رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید تم ہی نے چاند کے ذریعے بھیجنے کے بجائے کھڑکی میں سے خط پھینکدیا ہوگا مگر تحریر دیکھکر معلوم ہوا کہ یہ تمہارے پیارے ہاتھوں کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ حیران ہوں کہ کیا کروں بہرحال میں تابعدار ہوں دونوں کا اور حکم کا منتظر ہوں۔ جواب جلدی دینا تاکہ بے چینی دُور ہو۔ تمہارا اپنا رام سنگھ"

عجیب اتفاق تھا۔ جس بات کو ہم مذاق کے طور پر پورا کر رہے تھے وہ حقیقت بن گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ "کھڑکی والی" شیلا یا لیلا میں سے ایک ہوگی۔ سنگرام کو اس قدر کثرت سے گھر کے پاس گھومتے دیکھکر اسکو واقعی سنگرام کی ایکٹر نما شخصیت سے دلچسپی پیدا ہو کر محبت کی شکل اختیار کر گئی ہوگی۔ واقعہ کچھ بھی ہو مذاق اُلٹا ہم پہ عائد ہو رہا تھا اور ہماری جان سخت عذاب میں تھی کہ اب کیا کریں۔ اپنے سنگرام کو جواب دیں۔ اسی کشمکش و پیچ میں ایک دو دن گزر گیا۔ اور ہم فیصلہ نہ کر سکے کہ کس طرح اس پیچیدہ گتھی کو سلجھائیں۔ ابھی اسی سوچ بچار میں تھے کہ ایک صبح سنگرام گھبرایا ہوا ہمارے پاس آیا اور بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا "بھئی ایک بات پوچھتا ہوں بتاؤ گے؟"

میرے دوست نے جواب دیا "بشوق۔ فرمایئے"

سنگرام "پہلے وعدہ کرو کہ جو میں پوچھونگا اُسے پوشیدہ رکھو گے۔ یہ ایک بڑا اہم معاملہ ہے۔

ہم دونوں نے وعدہ کیا۔ اسکے بعد سنگرام نے پوچھا "سامنے گھر میں کتنی عورتیں رہتی ہیں؟"

چونی لعل "دو۔ ایک چھگن مل کی بیوی شیلا اور دوسری اُسکی بھاوج لیلا"

سنگرام نے پھر کہا "تمہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں اُس گھر میں تین عورتیں رہتی ہیں"

ہم نے اُسے یقین دلایا کہ اُس گھر میں صرف دو عورتیں رہتی تھیں نوکروں کے علاوہ تیسرا شخص چھگن مل تھا اور اُسے عورت قرار دینا ایسا ہی ہوگا جیسے یہ کہا جائے کہ میں حسین ہوں۔

سنگرام نے کچھ پس و پیش کے بعد اپنی جیب میں سے تین خط نکالے اور ہمارے سامنے میز پر رکھدئے۔ ایک تو میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوں میں سے ایک تھا۔ دوسرا "کھڑکی والی" کا تھا جس میں اُس نے اپنی بے چینی کا پھر ذکر کیا تھا۔ تیسرے خط کی تحریر ان دونوں سے جداگانہ تھی۔ یہ بھی کھڑکی میں سے پھینکا گیا تھا اور اس کا مضمون یہ تھا۔

"گھر کے گرد چکر لگانیوالے نوجوان۔ میں ایک جوان بیوہ ہوں۔ ایک عرصہ سے چاہتی تھی کہ تمہیں اپنے دل کا حال کہہ سناؤں مگر پھر خیال آتا تھا کہ کہیں بدنامی مول نہ لینی پڑے۔ مگر اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میری مُردہ زندگی میں نئی جان ڈال سکتے ہو میں اپنا دل تمکو دے چکی ہوں اگر تمہارے دل میں ذرا بھی رحم ہو تو اُسے مت ٹھکرانا۔ خط کا جواب ہمارے مکان کے دروازے کے نیچے کل شام کے نو بجے کھسکا دینا۔ میں منتظر رہونگی۔ تمہاری داسی لیلا"

ہمیں تو معلوم ہو گیا کہ اِن تین خطوں کے لکھنے والے کون تھے۔ حیرت انگیز واقعہ تھا۔ شیلا اور لیلا دونوں سنگرام کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ درحقیقت ان دونوں کی زندگی کے حالات ہی ایسے تھے۔ سارا قصور سماج کا تھا سنگرام حیرت میں غرق تھا کہ اس طرح یکایک عشق کا سیلاب کہاں سے اُمڈ آیا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ کیا واقعی وہ اتنا حسین تھا کہ تین عورتوں کو وقت واحد میں بیقرار کر سکتا۔ آخر جب اس کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی تو میں نے اپنے کوٹ کی اندر کی جیب سے اُس کا دیا ہوا قلم نکالا اور اُسے بتاتے ہوئے کہا کہ یہ تیسرا خط اس قلم سے لکھا گیا تھا۔ سنگرام نے بہت منت سماجت کی کہ اسکے بھیجے ہوئے خطوط اس کو واپس کر دیں۔ مگر ہم نے ایسا کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ کم از کم ہمارے سامنے آئندہ سے شیخی نہ بگھاریگا۔

اسی دوران میں ہماری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور ہم جموں اور سنگرام کو چھوڑ کر چلے آئے۔ سنگرام کے عشق کا کیا حشر ہوا اسکے متعلق ژاں جاکس روسو کے الفاظ میں، میں نے جو واقعات آپکے سامنے رکھدئے ہیں، خود ہی گن ناپ کر اندازہ لگا لیجئے"

بھارت چند کھنہ

تحلیلِ نفسی

باب ترتیب

انبساطی مشین اور مزاح گزشتہ تحلیلی حصے میں بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح جذبۂ اطمینان جو ایک تحلیلی جیسے مزاح سے پیدا ہونیوالے انبساط سے علیحدہ ہے۔ اور پھر خود کس طرح مزاح دو ابواب میں منقسم ہے۔ یعنی صنائع اور رجحانات۔ اس ترتیبی حصے میں ہم ان امور سے پیدا ہونے والے انبساط کے متعلق بحث کریں گے۔

حکما کا خیال ہے کہ ایک ناقابلِ تکمیل رجحان کی تکمیل ہو جانے کے سبب رجحاناتی مزاح سے انبساط و طرب پیدا ہوتا ہے۔ رہا یہ امر کہ یہ تکمیلِ خواہش کس طرح خداوند انبساط بن نکلتی ہے بغیر کسی تشریح کے ثابت ہے۔ البتہ مزاح کے سبب تکمیلِ رجحان ہونے میں چند ایسی شرائط پیدا ہیں جن کا مطالعہ لازم ٹھہرتا ہے۔ اس ضمن میں دو قسم کے حالات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ سادہ حالت تو یہ ہے کہ رجحان کے پورا ہونے کے راستہ میں کوئی بیرونی رکاوٹ درپیش ہو۔ اور مزاح اس رکاوٹ سے کنارا کاٹ کر نیا راستہ نکال لے۔ اور دوسری حالت یہ ہے کہ بیرونی امور کی بجائے اندرونی رکاوٹیں (مثلاً مخصی جذبات) رجحان کے پورا ہونے کی راہ میں روڑا اٹکائیں۔ ان ہر دو حالتوں میں یکساں عمل رو پذیر ہوتا ہے یعنی مزاح کے ذریعے سے رجحان کو کسی نہ کسی طرح پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ اور اس طور ایک نفسی سدِ سکندری کو پیدا ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو دونوں حالات میں ایک ہی نفسیاتی حالت پیدا ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک حالت میں تو پیدا شدہ رکاوٹوں کو نیست و نابود کیا جاتا ہے اور دوسری حالت میں ان رکاوٹوں کو پیدا ہونے سے روکا جاتا ہے۔

نفسیاتی ماہر جانتے ہیں کہ کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے یا کسی رکاوٹ کے قائم رکھنے میں نفسی قوت خرچ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ بالا ہر دو حالت میں اگر رجحاناتی مزاح وجہ انبساط بنے تو ہم یقین کر سکتے ہیں کہ یہ انبساط نفسی قوتوں کے بارے میں کفایت شعاری برتنے سے پیدا ہوگا۔ خیال رہے کہ اس نفسی کفایت شعاری کا ذکر صنائع کے بیان میں ہو چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں لفظوں کے استعمال میں کفایت شعاری مقصود تھی اور یہاں نفسی قوتوں کی کم خرچی مطلوب ہے۔

بے ضرر مزاح کی تحقیقات کے وقت ہم اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ یہاں انبساط کی بنیادیں صنائع پر قائم ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کہیں یہ انبساط نفسی کفایت شعاری کا اثر تو نہیں۔ رعایتِ لفظی سے مزاح پیدا ہوتے وقت مستقل صنعت یہ تھی کہ نفسی دباؤ معانی سے ہٹا کر صوتیات پر ڈالا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس صنعت سے نفسی قوت کا خرچ بہت کم ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر لفظوں کے گورکھ دھندے ہمارے لئے وجہ انبساط بن نکلیں تو بلاشبہ یہ انبساط نفسی کفایت شعاری کا اثر ہے۔ اور پھر یہ بھی خیال رہے کہ ایک لفظ میں اکٹھے ہو جانے والے خیالات میں جس قدر بھی زیادہ بُعد و اختلاف ہوگا اسی قدر انبساط کی فراوانی ہوگی۔

چند اقسام کے صنائع بدائع اس لحاظ سے اکٹھے کئے جا سکتے ہیں کہ ان میں ایک امر یکساں ہے یعنی ان کے طفیل جس جگہ کسی نئی چیز ملنے کی امید ہوتی ہے وہاں ہمیشہ آگے ہی دیکھی بھالی چیز سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان صنائع میں مخصوص اجتماع، ہم صوت الفاظ یا ایک لفظ کے مختلف استعمال، مشہور محاورات کو بگاڑ لینا، مخصوص تلمیحات وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب حالات میں معروف اشیا سے سابقہ پڑنا انبساط پیدا کرتا ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں نفسی کفایت شعاری کا دور دورہ ہے۔ اس ضمن میں ارسطو کا قول ہے: "کسی امر کا دوبارہ دریافت کرنا لطیف انبساط پیدا کرتا ہے"

مزید ثبوت کیلئے ملاحظہ ہو کہ کس طرح قافیہ ردیف کا استعمال صنعتِ اشتقاق اور وہ تمام صنائع جن میں ہم آواز الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے انبساط پیدا کرتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان حالات میں دیکھی بھالی اشیا سے دوبارہ سابقہ پڑنا ہی باعثِ انبساط ٹھہرتا ہے۔

مقامی یا موسمی عنصر

معروف اشیا سے دوبارہ ملاقات کے ضمن میں ایک نئی قسم کے مزاح کا ذکر بھی لازم آتا ہے۔ یہ مزاح حقیقی اشخاص، اشیا اور واقعات کے ذکر پر قائم ہوتا ہے۔ اس قسم کے مزاح کی مثال مختلف اخباروں کے "افکار و حوادث" یا مولانا ظفر علی خاں کے چٹکلوں سے پیش کی جاتی ہے۔ یہ مزاح موسمی کیفیت کی آئینہ برداری کرنے کے سبب بہت ہی مقبول ہوتا ہے۔ لیکن زمانہ کی رفتار اسے جلدی ہی پھیکا اور سُست بنا دیتی ہے۔ فی الحقیقت زیادہ اقسام کے مزاح اپنی عمر کے مختلف ادوار سے گذرتے ہوئے جلد ہی شباب و شیب کی منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ لوگ نئی نئی باتوں کی تلاش میں اپنے موضوع مزاح بھی جلد از جلد تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اور آئے دن کے واقعات کی رفتار اس تبدیلی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اگرچہ ظاہرا طور پر یہ موسمی یا مقامی عنصر بالکل معروف اشیا کی دریافت نہیں کہلا سکتا۔ پھر بھی یہ اس کی ایک مخصوص صورت متصور ہوگا۔ یعنی یہ معروف اشیا کو ایک نئی تازگی اور ایک جدید رنگ بخشنے والا امر ہے۔

لفظوں سے اور بے معنی فقرات سے انبساط کی پیداوار

جب بچہ پہلے پہل اپنی مادری زبان سے متعارف ہوتا ہے تو اسے لفظی تجربات سے بہت خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ محض قافیہ اور ردیف سے لطف اندوز ہونے کیلئے بے معنی تراکیب گھڑ لیتا ہے۔ آہستہ آہستہ بچے کو اس بے معنی تفریح سے خوشی حاصل کرنے کی ممانعت ہو جاتی ہے لیکن یہ دبا ہوا جذبہ باہر نکلنے کیلئے بیتاب رہتا ہے اور نشو و نما پاتا ہوا بچہ کھوئی ہوئی تفریح حاصل کرنے کیلئے لفظوں کو توڑتا موڑتا اور انھیں نت نئے طریقوں سے مسخ کرتا رہتا ہے۔ اگرچہ ابتدا میں بچہ کی اس حرکت کی وجہ معلوم نہیں ہو سکتی۔ لیکن بقولِ فرائڈ بعد میں وہ شعوری طور پر اس تفریح میں حصہ لیتا ہے اور خشک منطق سے کنارہ کشی کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے پر اگرچہ تعلیم و تہذیب کے قوانین اسے اس بے معنی تفریح میں حصہ لینے سے بند رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی حکمت اور فن کے خشک مطالعہ کے بعد وہ شام کو کسی نہ کسی فنی مقالہ کو مسخ شدہ صورت میں پڑھ کر یا سُن کر اپنا بھولا بسرا شغل قائم رکھتا ہے۔

تفریح اور پھبتی Play & jest

بچہ کی ان ابتدائی کوششوں میں جب وہ پہلے پہل خیالات اور الفاظ کو جوڑنا توڑنا سیکھتا ہے تفریح کی جھلک صاف نمایاں ہوتی ہے۔ شاید یہ تفریح بچہ کی اندرونی قوتوں کی بیداری کا نتیجہ ہے۔ ان ایام میں اس کی حرکات یعنی مشابہ الفاظ کا استعمال، صوتی تلازم وغیرہ ایک قسم کی غیر مترقبہ نفسی کفایت شعاری کا رنگ لئے ہوتی ہیں اس لئے وہ معانی اور فقرات کی ہم آہنگی سے قطع نظر صرف تفریح کیلئے الفاظ اور خیالات کا استعمال کرتا ہے۔ یہ مزاح کی منزل کی طرف اس کا پہلا قدم ہے۔

تنقید و تدبّر جلد ہی تفریح کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ تنقید اس تفریح کو لایعنی اور احمقانہ گردانتی ہے اور تدبّر اس پر ذہن کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ اب ہر روز اس تفریح تک رسائی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ البتہ گاہے ماہے نوجوان فرد ان بھولی ہوئی بچوں کی حرکات کو دوہرا کر تجدید انبساط کر سکتا ہے۔ لیکن چونکہ بہت کم افراد اتنی دیر صبر کر سکتے ہیں اس لئے وہ اس انبساط کو پیدا کرنے کے نت نئے نئے راستے نکال لیتے ہیں۔ اب مزاح کا ارتقاء دو خواہشات کے زیر اثر ہوتا ہے۔ ایک تو تعقل کو بالا بنانے کی خواہش اور دوسرا بچہ بننے کی آرزو۔ یہ مزاح کی دوسری منزل ہے اور اسے پھبتی (jest) کہتے ہیں۔ پھبتی کسنے کا مطلب جذبۂ تدبیر کو مغلوب کرنا اور تفریحی انبساط حاصل کرنا ہے۔ اس دوہرے مطلب کو حاصل کرنے کیلئے بے معنی ترکیبوں کو بامعنی بنانا لازم ہے۔ اور اس کام کیلئے مزاح کا تمام عمل اس شرط پر پورا اترنیوالے الفاظ اور معانی کی تلاش پر مبنی ہوتا ہے۔ پھبتی میں مزاح پیدا کرنیوالی تمام صنعتوں کا استعمال روا رکھا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے ہمارے ادیب و حکما پھبتی اور مزاح کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ فی الحقیقت پھبتی اور مزاح میں فرق یہ ہے کہ پھبتی میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ان کا اچھا، بامعنی اور باقیمت ہونا لازم نہیں۔ صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ بیان ہو سکیں۔ خواہ وہ متروک، حشو یا لغو ہوں۔ پھبتی کی وقعت صرف اتنی ہے کہ اس کے طفیل تدبّر سے دامن چھڑانے میں آسانی ہوتی ہے اور یہ وجہ انبساط ہے۔

مزاح کی صنعتوں کے ذکر میں یہ امر ہمارے لئے سخت حیران کن تھا کہ نہ تو یہ صنعتیں صرف مزاح کیلئے مخصوص ہیں اور نہ ہی ان کے بغیر مزاح ممکن ہے۔ اب ہم بخوبی اس نتیجے پر پہونچ سکتے ہیں کہ یہ

صنعتیں مزاح کیلئے انبساط پیدا کرنے کے خزینے ہیں۔ اور اس لئے اگر دیگر عمل بھی اس خزینے سے انبساط حاصل کرتے ہیں تو ہمارے لئے یہ امر کچھ تعجب انگیز نہ ہونا چاہئے۔

پھبتی اور مزاح (Jest & Wit) اب دیکھئے کہ کس طرح پھبتی بڑھکر مزاح بن جاتی ہے۔ واضح ہو کہ جب کوئی پھبتی وجہ انبساط بنتی ہے تو تدبّر کو دھوکا دینے کیلئے وہ کسی نہ کسی رجحان کو فریب نظر بنا کر آگے رکھ لیتی ہے۔ لیکن جب یہ پھبتی خود بھی بامعنی ہو تو اسے مزاح کہا جاتا ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر اب معانی بھی توجہ طلب ہوتے ہیں اور طرزِ ادا میں بھی دلکشی پیدا کی جاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ امتزاج معانی و طرزِ ادا غیر شعوری نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی تہ میں اس کا سبب ڈھونڈھنا نامناسب نہ ہوگا۔ ہم آگے بیان کر چکے ہیں کہ ایک عمدہ مزاح سے ایک عام جذبۂ اطمینان پیدا ہوتا ہے اور اس وقت ہم فی البدیہہ طور پر نہیں کہہ سکتے کہ خوشی پیدا کرنے میں معانی کا زیادہ حصہ ہے یا طرزِ ادا کا۔ بلکہ بارہا ہم یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ یہ انبساط کہاں سے پیدا ہو رہا ہے اور کیونکہ ہم ہنس کیوں رہے ہیں۔ تدبر کی اس لغزش پر مزاح کی وجوہات کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ یعنی ایک طرف تو ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچنے کیلئے اور زیادہ وقعت حاصل کرنے کے لئے معانی مزاحیہ فقرات کا بھیس اوڑھ لیتے ہیں۔ تو دوسری طرف ان کا یہ ملبوس بدلنا ہمارے تدبر کو مسحور اور لرزاں کرنے کیلئے اختیار کیا جاتا ہے۔ اس منزل تک مزاح صرف تفریح کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے۔

آئندہ تحقیقات کیلئے صرف یہ دیکھنا ہی کافی ہوگا کہ تفریح کے علاوہ مزاح کا استعمال کیا ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ مزاح ایک قسم کا بہت اہم نفسی عنصر خیال کیا جاتا ہے۔ اور ہمارے ذہن کی خواہشات اور رجحانات اپنے مقصد حاصل کرنے کے لئے مزاح کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ اور اس طرح وہ بے مقصد مزاح جو پہلے پہل تفریح کے طور آغاز ہوا تھا رجحانات اور میلانات کے ساتھ مل جل جاتا ہے اور یہ تو ہم پہلے بھی دیکھ چکے کہ اس میدان میں وہ حریفانہ، طنزیہ، نمائشی اور تشکیکی رجحانات کے ساتھ کس طرح دست و گریبان ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ دیگر دلائل یا افعال کی نسبت مزاح کا حربہ نفسیاتی طور پر کس قدر زیادہ زود اثر اور کارگر ہے۔ اس ضمن میں میرے کانوں میں بے اختیار والٹیر (Voltaire) کے متعلق مشہور یورپائی ادیب اناطول فرانس کے یہ الفاظ گونجتے ہیں "ہنستا اور ناچتا ہوا قلم اس کے ہاتھوں میں زمانہ کا سب سے بڑا اور زبردست ہتھیار تھا۔"

اصول انبساط پیشیں (The Fore-Pleasure Principle.) پھبتی کا معانی اور طرزِ ادا کی مدد سے مزاح کے میدان میں قدم رکھنا اور پھر رجحانات کی طفیل انبساط پیدا کرنا تو ملاحظہ ہو چکا۔ اب انبساط پیدا کرنے کا نیا اصول ملاحظہ ہو:۔

ایک مثال:۔ آپ ایک بے فرد کو بے عزت کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کی اس خواہش کی مخالفت پر ایک ایسی خواہش اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو تہذیب اور شرافت کی پروردہ ہے۔ اب اگر کسی جذباتی تغیر کے سبب آپ کی یہ پہلی خواہش (کسی کو بے عزت کرنے کی) رستہ تڑا نکلے تو آپ کے دل میں بعد کو سخت تکلیف دہ قسم کا جذبۂ انفعال پیدا ہوگا۔ اس تکلیف سے بچنے کے لئے آپ کسی کو عیاں طور پر بے عزت نہیں کرتے۔ بلکہ آپ اپنی خیالات اور الفاظ کو جو آپ کی پہلی خواہش میں صرف ہونے والے تھے مزاح کے رنگ میں سمو دیتے ہیں یعنی آپ اپنی پہلی خواہش سے حاصل ہونیوالی خوشی کو بھی حاصل کر لیتے ہیں اور تکلیف دہ تاثراتِ مابعد (after effects) (یعنی پشیمانی یا انفعال) سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ ان حالات میں جب خواہشِ عناد ایک رجحاناتی مزاح میں ممتزج ہو جاتی ہے عموماً فلک شگاف قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ اور اس طور ہمیں ایک ایسی صورت کا مطالعہ نصیب ہوتا ہے جہاں ایک تھوڑی مقدار کے انبساط کی مدد سے ایک بہت کافی مقدار میں خوشی حاصل کر لی جاتی ہے۔ اور بقول فرائڈ یہ ایک ایسا اصول بنا لیتی ہے جو نفسی عالم میں بہت جگہ رائج ہے اور جسے اصول انبساط پیشیں کا نام دیا جاتا ہے۔

تفریحی انبساط وغیرہ مذکورہ بالا بحث کے بعد ہم رجحاناتی مزاح کے اثرات کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ عنصر مختلف رجحانات کی خدمت میں حاضر ہو کر اور مختلف دباؤ اور بندشوں کو ہٹا کر نئی خوشی پیدا کرتا ہے اور کہ وہ اس کارکردگی کے دوران میں مزاحی انبساط کو انبساط پیشیں کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ پچھلے لکھے ہوئے صفحات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مزاح شروع سے لے کر اختتام تک اپنی فطرت کے مطابق رہتا ہے۔

شروع شروع میں تفریح کے طور پر پیدا ہو کر الفاظ و معانی کے غیر مربوط استعمال سے خوشی حاصل کرتا ہے۔ جب بڑھتا ہوا تدبر اس بے معنی اور لغو تفریح کا انسداد کر لیتا ہے تو اس وقت یہ اپنی عنانِ توجہ پھبتی کی طرف پھیر کر نئی خوشیوں کے خزینے ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ پھر بصیر مزاح کے بھیس میں یہ تنقیدی تعقل کے سامنے معانی کی قلعہ بندی کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے اور اس طرح مختلف خوشیاں اکٹھی کرتا ہے۔ آخر کار یہ دبی ہوئی اور ابھری ہوئی زبردست خواہشات اور میلانات کے جسم میں نفوذ حاصل کر لیتا ہے اور انبساط پیشین کے اصولوں پر عمل کرتا ہوا اندرونی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ اس طرح یہ باری باری عقل، تنقید، دباؤ سے لڑتا جھگڑتا اپنے اصول انبساط پر قائم رہتا ہے اور پھبتی سے شروع ہو کر اخیر تک نت نئی خوشیوں کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔ اس کی حاصل کردہ خوشیاں (خواہ تفریحی انبساط کی قسم سے ہوں خواہ رکاوٹوں کو دور کرنے والے انبساط ہوں) ہمیشہ نفسی کفایت شعاری سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ ایک تو یہ نفسی کفایت شعاری خود بڑھ کر اصولِ انبساط کی تردید کرنا ہی شروع نہ کر دے اور دوسرا یہ کہ نفسی کفایت شعاری دیگر میدانوں میں بھی کچھ نہ کچھ اثر پیدا کر دکھائے۔

مزاح کے مقاصد

جب یہ بیان ہو چکا ہے کہ مزاح کا مقصدِ اعلیٰ انبساط پیدا کرنا ہے تو اس کے بعد مزاح کے مقاصد تلاش کرتے پھرنا اگرچہ ایک حد تک نامناسب امر معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی دو وجوہات کے سبب اس موضوع پر تحقیقات کرنا ہی پڑتی ہے۔ ایک تو ہو سکتا ہے کہ مزاح پیدا کرنے میں اور مقاصد بھی کارکن ہوں، دوسرا حکمت کی رو سے مزاح کے داخلی Subjective پہلو پر روشنی ڈالنا لازم ٹھہرتا ہے اور پھر مزاح کے داخلی پہلو پر بحث کرنا اس لحاظ سے بھی ضروری قرار پاتا ہے کہ مزاح پیدا کرنے کی قوت ہر کس و ناکس میں یکساں پیدا نہیں۔ بلکہ لیاقت، حافظہ اور قوتِ تخیل کی طرح یہ قوت بھی مخصوص افراد میں گھٹتی بڑھتی ہے۔

مزاح کا داخلی پہلو ملاحظہ ہو آئینے کی مثال جس کا ذکر ہم اس مقالہ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ اور جس میں آئینے دو لفظوں یعنی "واقف" (familiar) اور لکھ پتی (Millionaire) کو ملا کر ایک نیا لفظ وضع کر لیتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ فقرہ (میں نواب سلیمان راتھ شیلڈ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اور وہ مجھ سے برابر کا سلوک کرتا تھا بالکل اس طرح جیسے Famillionaire) ہی شاعر کی اپنی زندگی کا آئینہ بردار ہے اور بعض جگہ تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کرداروں کے پس پشت خود آئینے بول رہا ہے۔ جب ایک کردار اپنے نام کی تبدیلی کی وجہ بتاتا ہے تو اربابِ دانش خود ہی سمجھ لیتے ہیں کہ یہ خود آئینے کے واقعات بیان ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنا نام بالکل انہی حالات کے ماتحت تبدیل کیا تھا، پھر آئینے کی زندگی سے واقف حضرات جانتے ہیں کہ ہمبرگ میں آئینے کا ایک امیر چچا رہتا ہے جس کا نام سلیمان تھا۔ اور آئینے نے نواب سلیمان راتھ شیلڈ کے واقعات بیان کرتے وقت اپنے اور اپنے چچا کے تعلقات کا ذکر کیا ہے اور بقول فرائڈ آئینے کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچیں گے کہ (Famillionaire) کا مزاح آئینے کے شخصی جذبات سے پیدا ہے۔ اگرچہ یہ مثال داخلی اثرات کا زندہ ثبوت ہے پھر بھی یہ خیال رہے کہ ہر ایک مزاح میں شخصی اور داخلی اثرات کا اس شدت سے پیدا ہونا لازم نہیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی دھیان رہے کہ نفسی امراض کے مریض اکثر مزاح نگاری میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔ اگرچہ نفسی امراض اور مزاح کا یہ تعلق سو فیصدی قائم نہیں۔

مزاح کے دیگر مقاصد اور داخلی پہلو بھی پیدا ہیں۔ مثلاً بے ضرر مزاح پیدا کرنے کا مقصد اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر دکھانا ہے۔ یہ خواہشِ نمائش بہت حد تک جنسی نمائش سے مشابہ ہے۔ دبی ہوئی خواہشات رجحاناتی مزاح پیدا کرنے میں سہولت پہنچاتی ہیں اور مبتذل مزاح جذبہ نمائش (جنسی یا غیر جنسی) کا مرہونِ منت ہے۔

مزاح کو نشر کرنے کی خواہش یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی فرد صرف اپنے لئے مزاح پیدا نہیں کرتا بلکہ مزاح پیدا کرنا اور مزاح پھیلانا لازم و ملزوم ہیں۔ ظرافت کے ضمن میں بھی یہ اصول کارگر ہے۔ اور ظرافت پھیلانے کی ضرورت اظہر من الشمس ہے۔ پھر بھی وہاں اس اصول کی مستثنیات موجود ہیں۔ اور اکیلے فرد کا ظرافت سے لطف اندوز ہونا ممکن ہے۔ لیکن مزاح کے متعلق یہ اصول بلا استثنیٰ عمل پذیر ہے۔ یہاں ظرافت اور مزاح کے متعلق ایک امر اور بھی غور طلب ہے۔ یعنی جہاں آپ کسی ظرافت سے دوچار ہونے پر تنہائی میں بھی

قہقہے بھی لگا سکتے ہیں اور کسی دیگر فرد کو اس ظرافت سے دوچار کرنا آپکی خوشی کو دہ چند کر دیتا ہے۔ وہاں باوجود اس امر کے کہ خود ساختہ مزاح آپ کیلئے کافی انبساط پرور ہے پھر بھی آپ اپنے مزاح پر تنہائی میں قہقہے نہیں لگا سکتے۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ یہ مزاح کسی دوسرے شخص کو سنا کر اس کی کھلتی ہوئی باچھوں سے نظارہ سے دل کیلئے سامانِ فرحت و انبساط مہیا کیا جائے۔

سوال اٹھتا ہے کہ ایک تو ہم کیوں اپنے خود ساختہ مزاح پر قہقہے نہیں لگا سکتے۔ اور دوسرا یہ کہ سننے والا فرد عملِ مزاح میں کیا درجہ رکھتا ہے۔ ہم دوسرے سوال کا جواب پہلے لکھیں گے۔

ظرافت میں دو افراد سرگرمِ کار ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے "ایغو" کے علاوہ ایک ایسا فرد بھی موجود ہوتا ہے جس کی ہستی سے ظرافت ٹپکتی ہے۔ اور اگرچہ چند اشیا مجھے ظرافت انگیز معلوم ہوتی ہیں تو یہ ایک ایسے تمثیل (Personification) کا اثر ہے جو ہماری تخیلی دنیا میں بہت عام ہے۔ بہرحال جو اور کچھ ہو سو ہو یہ حقیقت ہے کہ عملِ ظرافت دو افراد سے مکمل ہو جاتا ہے یعنی "ایغو" اور ایک خارجی ہستی سے، ممکن ہے کہ ایک تیسرا فرد بھی اس عمل کے شکنجے میں جکڑا جائے لیکن اس تیسرے فرد کی موجودگی اشد ضروری نہیں۔ اس کے برعکس مزاح اپنے ابتدائی مراحل میں یعنی لفظی اور معنوی تفریح کی منزل پر تو کسی خارجی فرد سے بے نیاز ہوتا ہے لیکن پہلے قدم یعنی پھبتی کے میدان میں ہی اسے ایک ایسے فرد کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جسے وہ اپنے نتائج سنا سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مزاح کے متعلق ایغو کو صرف اپنی ذاتی رائے سے تسلی نہیں ہوتی اس لئے وہ کسی دیگر فرد کی رائے سے تحقیقِ نتائج کرتا ہے۔ اسی طرح بے ضرر مزاح بھی یہ دیکھنے کیلئے کہ اس کا مقصد حاصل ہوا ہے یا نہیں کسی دوسرے فرد کی مدد کا محتاج ہوتا ہے اور اسی طرح جنسی اور عنادی رجحانات کے ساتھ مل کر مزاح تین افراد پر مشتمل ایک نفسی عمل بن جاتا ہے۔ اس سننے والے فرد کی حیثیت اور وقعت کے متعلق شیکسپیر اپنی تصنیف "Love's Labour's Lost" (ایکٹ ۵، سین دوسرا) میں رقم طراز ہے:۔

"ہر ایک پھبتی سننے والوں کے کانوں میں جا کر پھولتی پھلتی ہے اور مزاح کبھی بھی محض کہنے والے کو فرحت نہیں پہنچا سکتا۔ اس لحاظ سے دیگر افراد کو لطائف سنانا تین مطلب حصول کرتا ہے۔

اوّل:۔ کہنے والے کو مزاح کی قوتوں کا خارجی ثبوت مل جاتا ہے۔

دوم:۔ سننے والے کو ردِّ عمل (Reaction) کی بدولت کہنے والے کے انبساط میں گونہ ترقی پیدا ہو جاتی ہے۔

سوم:۔ آگے سنتے ہوئے لطیفہ کو سنانے کی حالت میں یہ کہنے والے میں از سرِ نو خوشی کی رَو پیدا کر دیتی ہے۔

مزاح کا فرد نمبر ۳

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے مزاح سے پیدا شدہ انبساط کہنے والے کی نسبت سننے والے میں زیادہ واضح اور ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ ہم انبساط ناپنے کا کوئی آلہ ایجاد نہیں کر سکے اس لئے ہم لفظ "واضح" کا استعمال ہی روا رکھتے ہیں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ جب کوئی کہنے والا کمال متانت سے کوئی لطیفہ سناتا ہے تو سننے والا بے محابہ قہقہے پر قہقہے لگانے لگ جاتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اگر کوئی فرد کہیں سے سنے ہوئے لطیفہ کو دوہراتا ہے تو سننے والوں پر بہترین اثرات قائم کرنے کیلئے اصلی راوی کی مکمل حرکات و سکنات وغیرہ کی مکمل نقل اتارتا چلا جاتا ہے۔ اس مثال سے فرائڈ نے مزاح کی پیدائش کے نفسی عمل کے متعلق اصول تراشنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں پہلے تو وہ چند ایک حکما کے اقوال پر تبصرہ کرتا ہے اور پھر اپنے اصول ڈھالتا ہے۔ تبصرہ کے دوران میں پہلے تو اسپنسر کے مقالہ "ہنسی کا عضویاتی پہلو" پر بحث ہے۔ اسپنسر کا خیال ہے کہ ہنسی ایک قسم کے نفسی خلفشار کے اخراج (discharge) کا نام ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اس خلش کی نفسی کھپت کی راہ میں یکایک کوئی رکاوٹ پیش آ گئی ہے۔ اس نفسیاتی حالت کے متعلق جو ہنسی میں رونما ہوتی ہے اس کا قول ہے: "فطری طور پر ہنسی تبھی پیدا ہوتی ہے جب نفسِ شعور اچانک اہم اشیا سے غیر اہم اشیا کی طرف مبذول کر دیا جاتا ہے۔ اس مضمون کو A. Bain نے اس طرح ادا کیا ہے: "ہنسی ایک رکاوٹ سے پیچھا چھڑانے کا دوسرا نام ہے۔" فرائڈ، اسپنسر اور بین کے اس نظریہ پر صاد کرتا ہوا یہ اصول تراشتا ہے: "ہمارا خیال ہے کہ ہنسی تبھی پیدا ہوتی ہے جب تمام کی تمام وہ نفسی قوتیں جو کسی نفسی عمل میں استعمال ہو رہی تھیں یکایک بے مصرف رہ جاتی ہیں۔ اور مکمل اخراج کے قابل بن سکتی ہیں۔"

ہنسی بحیثیت ایک اخراج کے

مذکورہ بالا اصول کی رو سے ہنسی کے لوازمات میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی جگہ استعمال ہونے والی نفسی قوت بے مصرف رہ جائے اور آزاد اخراج کی منزل حاصل کر بیٹھے۔ اور چونکہ تمام قسم کی ہنسی کو خوشی کی آئینہ برداری نہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خوشی کسی نہ کسی

طرح آگے سے موجود قوت کی آزادی سے متعلق ہے۔ یعنی جب ہم دیکھتے ہیں کہ مزاح سننے والے کے ذہن میں تو بند قوتوں کے خزانے کھل گئے ہیں اور کہنے والے کی نفسی قوتوں کی راہ آزادی یا اخراج میں رکاوٹیں حائل ہیں۔ سننے والے کے نفسی عمل کا بہترین مطالعہ مزاح فرد منبسط کی نفسی تحلیل سے ہو سکتا ہے۔ یعنی مزاح کے الفاظ لازمی طور پر چند ایسے خیالات اور لفظی اجتماع پیدا کر دیتے ہیں جن پر چند در چند رکاوٹوں کے سبب اس کے ذہن میں آنے کے راستے مسدود تھے۔ اگر وہ فرد منبسط کی طرح انھیں خود بخود پیدا کرتا تو اسے مختلف رکاوٹوں اور بندشوں کو دور کرنے کیلئے بہت سی نفسی قوتوں کا استعمال کرنا پڑتا۔ لیکن موجودہ حالت میں وہ اس خرچ سے بچ رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہم گذشتہ بحث کے ماتحت کہہ سکتے ہیں کہ اس کی خوشی اس کی کفایت شعاری کا نتیجہ ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہنسی کی مشین کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ قوتیں جو رکاوٹوں میں خرچ ہو رہی تھیں اچانک آزاد ہو گئی ہیں اور اب ہنسی کے راستے نکلنے پر آمادہ ہیں۔ خیال رہے کہ ان ہر دو نتائج میں کچھ نمایاں فرق نہیں ہے بلکہ ایک ہی بات کو دو طرح سے کہا گیا ہے۔

لطیفہ سنانیوالا کیوں نہیں ہنستا

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اگر لطیفہ سنانے والا نہ ہنسنے پر مجبور ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ اسے مزاح کے فرد منبسط کے عمل سے اختلاف ہے۔ یعنی یا تو اس کی دبی ہوئی قوتیں آزاد نہیں ہو سکتیں اور یا وہ آزاد ہو کر بھی خارج نہیں ہو سکتیں۔ آزادی حاصل کرنے کے بارے میں فرائڈ کا خیال ہے کہ رکاوٹوں میں مستعمل قوت تو ضرور رہا ہو جاتی ہے کیونکہ مزاح کا ابتدائی کام ایسی رکاوٹوں کو دور کرنا ہی تو ہے۔ اور پھر ان رکاوٹوں کو دور کرنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ بھی تو لطیفہ کہنے والے کو حاصل ہے۔ ان آزاد قوتوں کے خارج ہونے کے متعلق فرائڈ کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ یہ آزاد قوت کسی اور طرف مبذول ہو جائے اور خارج نہ ہو سکے۔ ان دو وجوہات کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آزاد شدہ قوت اتنی ضعیف ہو کہ وہ کسی کام نہ آ سکے اور یہ تو اوپر بھی بیان ہو چکا ہے کہ کس طرح ہنسنے والے کو بہت سی نفسی قوت خرچ بھی کرنا پڑتی ہے۔ یہاں ایک اور ثبوت بھی پیدا ہے یعنی جہاں کسی سننے والے فرد کو دماغی قوت خرچ کرنا پڑے وہاں وہ بخوبی قہقہے نہیں لگا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مزاح کی صنعتیں زیادہ کامیاب بننے کے لئے سادگی کی حدود میں کام کرتی ہیں اور یہیں سے معمہ اور لطیفہ کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

عمل مزاح کے از خود پیدا ہونیکی قوت

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ نفسی قوت ایک عمل سے آزاد ہو کر کسی دوسرے عمل میں خرچ ہونے لگتی ہے چونکہ مزاح اپنے مقاصد محض اس قوت کے اخراج سے حاصل کر سکتا ہے اس لئے وہ اسے ایک عمل سے دوسرے عمل تک نہیں جانے دیتا۔ وہ اس تبدل مصرف کو مختلف طریقوں سے روکتا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ توجہ کو حملہ کرنے کیلئے بہت کم پہلو نظر آئیں انتہائی طور پر مختصر طرز ادا اختیار کی جاتی ہے۔ دوسرے یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ فقرات اور معنی زود فہم ہوں۔ کیونکہ ذرا سی دماغی مشقت جہاں نفسی قوت کی کفایت شعاری زائل کرتی ہے وہاں وہ نفسی قوت کے مصرف کی تبدیلی کا باعث بھی بن نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ مزاح توجہ کو دھوکا دینے کیلئے ایک اور حربہ بھی استعمال کرتا ہے۔ وہ ادھر تو توجہ کو کسی مسحور کن طرز ادا سے وابستہ کئے رکھتا ہے اور ادھر چپکے سے رکی ہوئی قوتوں کو آزادی اور اخراج کی منزل پر لے آتا ہے۔ اس مطلب کیلئے مختلف صنعتیں استعمال کی جاتی ہیں مثلاً الفاظ کا حذف کرنا، یا معمہ کی قسم کی چیزیں پیش کرنا۔

یہاں دو امور اور بھی لائق مطالعہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں کیوں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہم فلاں لطیفے سے کیوں ہنس رہے ہیں۔ اگرچہ بعد میں تحلیلی تحقیقات آسانی سے خندۂ مبہم کی وجہ ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہنسی خود بخود ایک عمل کرنیوالے فعل کا نتیجہ ہے جو ہماری شعوری توجہ کو دور رکھ کر احاطۂ ممکنات میں داخل ہوتا ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ مزاح سننے والے پر تبھی اثر کر سکتا ہے جب وہ اس کیلئے نیا اور فوری ہو۔ مزاح کی یہ خصوصیت جو اسے چند روزہ بناتی ہے اور جو ہمیں ہمیشہ نیا مزاح پیدا کرنے پر اکساتی ہے صرف اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ تعجب انگیز امور صرف ایک ہی دفعہ ایک ہی فرد پر اثر انگیز ہو سکتے ہیں۔ جب ہم اس لطیفے کو دوہراتے ہیں تو بیدار شدہ حافظہ ہمیں پہلی شنید یاد دلاتا ہے۔ اس امر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کیوں ہم ایسے افراد کو لطائف سنانا چاہتے ہیں جنھوں نے ان کو آگے نہ سنا ہو۔ یعنی سننے والا جب کسی لطیفے کی تازگی سے پیدا ہونیوالے انبساط سے محروم ہو جاتا ہے تب وہ کسی نو وارد میں وہی خوشی پیدا ہوتی دیکھ کر خود بھی خوش ہوتا ہے۔

کفایت شعاری اور خرچ

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم اس تمہیدی باب کے اختتام پر پھر سے ایک دفعہ پلٹ کر چند مشاہدات لکھا ہیں کفایت شعاری کے اس عنصر پر ڈالیں جس کا ذکر ہم پہلے بھی مزاح کی صنعتوں میں کر چکے ہیں۔ اس وقت ہم نے اس

شاعرہ کی موت

رات اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دریائے نیل پر چمک رہا تھا۔ پُرشکوہ دریا دونوں طرف سے اپنی بڑی اور چھوٹی موجوں کو سمیٹتے ہوئے نہایت سکون سے بہا چلا جا رہا تھا۔ ساحل کے چھوٹے اور چمکیلے ذرّے کسی کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ ہوا ساکن تھی، فضا خاموش تھی اور فطرت کے پہرہ دار کھجوروں کے سربلند کنج نے اس خاموشی میں بڑی حد تک اضافہ کر رکھا تھا۔ اگر کوئی شوخ اور چنچل موج اپنا سر اُٹھا کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی تو دریا ساحل سے اُسے ٹکرا دیتا تھا اور اس وقت چھپاکے کا ایک ہلکا سا شور اس لامتناہی خاموشی میں مخل ہو جاتا تھا۔ فطرت کبھی کبھی اپنی نیند سے چونک کر ایک انگڑائی لیتی تھی اور پھر سو جاتی تھی۔

بہت دُور ساحل پر کسی نے اپنی نازک اور لانبی اُنگلیوں سے بربط کے تاروں کو چھُوا۔ مضراب کی ایک ہلکی سی جُنبش نے نغمہ کے لطیف ترین اجزاء کو پریشان کر دیا اور محبت اپنی لاہوتی مملکت کو چھوڑ کر فضائے بسیط کی ٹھنڈی اور غیر متحرک گود میں اپنی زندگی کے ارتقائی مدارج طے کرنے لگی۔ دُور جنگل میں گا رہا ہے کوئی ـــــ من وجہک المنیر لقد نور القمر ـــــ بربط کے تاروں کی جھنجھناہٹ اُس کی آواز کے رس میں کھو گئی۔ اُس نے اب اپنے گیت کا موضوع بدل دیا ـــــ وہ مستقل گا رہی تھی ـــــ تم جھُوٹے ہو.... میرے رباب زندگی کے شکستہ تاروں سے کھیلنے والے تم عورت کے جذبات سے بے نیاز ہو.... تم اُس کے احساسات سے بے خبر ہو.... تمہیں کیا معلوم کہ وہ صرف تمہارے ہی لئے جیتی ہے اُس کی ہار ہی محبت کے اس کبھی نہ ختم ہونے والے کھیل میں اُس کی سب سے بڑی جیت ہے.... تمہیں کیا خبر کہ اُس نے تمہاری محبت کو اپنے دل میں کس طرح چھپایا ہے.... اُس زخم خوردہ فاختہ کی طرح کہ جو اپنے دل میں چُبھے ہوئے نوکِ پیکاں کو اپنے پروں میں.... سفید اور فاختئی.... سنہری اور سنجابی پروں میں طنابِ خیمہ ہستی کے آخری جھٹکے تک چُھپائے رکھتی ہے.... تم کیا جانو میرے پیارے کہ اُس نے اس جذبۂ ملکوتی کو سورج کی سنہری اور چاند کی روپہلی کرنوں تک سے چُھپا کر حتیٰ کہ اپنے تک سے چُھپا کر اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پرورش کیا ہے.... تم تو صرف اُس کے زخمی جذبات سے کھیلنے کے عادی ہو اور وہ بھی بہت بیدردی سے.... آہ تم جھُوٹے ہو ـــــ اُسکے نغمے کا زیر و بم موجوں کے خفیف سے جوار بھاٹے میں کھو گیا.... بربط اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر ریتیلے ساحل پر گر پڑا.... وہ خاموش ہو گئی اور عالم پر ایک مرتبہ پھر موت کی سی خوفناک خاموشی چھا گئی.... جسے موجوں کا چھپاکا کبھی کبھی توڑ دیتا تھا ـــــ

ریحانہ ٹکٹکی باندھے ہوئے دریا کی روانی کو تک رہی تھی۔ اپنے سُنہری خوابوں کی دُنیا میں کھوئی ہوئی وہ فطرت ہی کا ایک حصّہ معلوم ہوتی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ساحل پر مرمریں زہرہ کا بُت رکھا ہوا ہے جس کی پرستش میں دریا کی موجیں، آبی پودے، ننھے ذرّات، کھجوروں کے کنج، نیلا آسمان، منوّر چاند اور چمکتے ہوئے تارے سبھی تو مصروف ہیں۔ ساحل سے ذرا نیچے اور گہری موجوں سے کسی قدر ہٹی ہوئی آبی گھاس کبھی کبھی ہلتی تھی اور اُس کی یہ خفیف سی جُنبش ایک موج میں سے سینکڑوں ننھی ننھی موجیں پیدا کرتی اور فنا کر دیتی تھی، نازک اور نازک تر حباب اپنی اوّلیں اور آخری زندگی کے نامعلوم لمحات طے کرتے ہوئے موجوں پر آتے تھے اور آبی پودوں کے اتصال سے دریا بن جاتے تھے، یہ تھا فطرت کا وہ ازلی اور ابدی کھیل جس نے ریحانہ کو اس درجہ مسحور کر رکھا تھا کہ اُسے اپنے سر کے دوپٹہ کے ڈھلکنے تک کا احساس نہ ہوا۔ دوپٹہ ایک خفیف سی غیر محسوس سرسراہٹ کے ساتھ اُس کی گود میں آ رہا، اور اُس کے بھونرا جیسے کالے اور لانبے بال روپہلی شب کو دعوتِ تیرگی دینے لگے۔ اُس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اُس کا گداز اور نورین سینہ موجوں کی طرح ایک بار اُبھرا اور پھر بیٹھ گیا اور اُس وقت مناظر فطرت کو یہ احساس ہوا کہ ریحانہ اِن سُرمگیں راتوں میں اپنی زندگی کے اُس کیف آگیں دور سے گذر رہی ہے جو دوشیزگی اور نسائیت کے بین بین ہوتا ہے اور پہلی نظر میں لڑکے اور عورت کا تفاوت ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ فطرت مُسکرا دی.... شہابِ ثاقب کی رنگین پرواز کے متزلزل عکس نے اُسے چونکا دیا۔ اس نے کھجوروں کے کنج کی طرف ایک حسرت بھری نظر سے دیکھا۔ اور اس کا سینہ نیل کی

مضطرب اور تیز رو موجوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ اُس کی نگاہیں اب اس کنج ہی پر جم کر رہ گئیں.... کوئی آ رہا ہے.... جنیدی.... جنت نگاہ اور فردوس گوش.... حشر بداماں اور معصیت بدوش.... آخر وہ آ ہی رہا ہے.... اُس نے محسوس کیا۔

کھجوروں کے کنج سے کسی قدر تیز تیز کوئی آ رہا ہے.... یہ جنیدی ہے، ریحانہ کے خیالات کی دنیا.... اس کی معصوم محبت کا دیوتا.... جس کی پوجا.... دریا کے کنارے.... چاندنی بھری راتوں میں.... یا تاروں بھری چاندنی میں وہ اپنی دوشیزگی کے سرخ اور گلابی پھولوں سے کیا کرتی تھی ــــ مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے.... ملائے اعلیٰ کے وہ لطیف قطرات جن سے فرشتوں کی تخلیق ہوئی تھی.... اور اب یہ دشمنِ ایمان و آگہی، سراپا رہزنِ تمکین و ہوش نظر آنے لگی۔ ہوا کچھ کچھ چلنے لگی تھی، اس کے کپڑے بار بار اُلجھتے تھے اور ریتیلے ساحل پر مختلف شکنوں کے ساتھ پھیل جاتے تھے۔

کچھ فاصلے سے جنیدی چلایا "ریحانہ"

اسکے جواب میں ریحانہ نے راستہ بھٹکی ہوئی ہرنی کی طرح اپنی گردن اُٹھائی اور صرف مُسکرا دی.... ایک ایسا تبسم جس کے ساتھ خدا مُسکرا رہا تھا، نظامِ عالم پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی... فطرت اپنے خواب سے بیدار ہو کر رقص کرنے لگی۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی.... رقصاں اور لرزاں.... لرزاں اور رقصاں آگے بڑھی.... جنیدی اور قریب آ گیا.... اور ریحانہ رُک گئی.... اُس کا اُلٹا پاؤں کچھ آگے بڑھا ہوا تھا۔ اور سیدھا پاؤں آگے بڑھنے اور نہ بڑھنے کی رومانوی کشمکش میں گرفتار تھا.... اس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے تھے اور دوپٹہ.... ہلکے رنگ کا چینی دوپٹہ ساحلِ نیل پر، نیل کے زہرناک افعی کی طرح بل پر بل کھا رہا تھا جنیدی نے اپنے دونوں ہاتھ ریحانہ کے شانوں پر رکھ دئے، اُس نے اپنی نظر اُٹھائی.... پلکیں آہستہ آہستہ بلند ہوئیں اور جنیدی نے اپنی قسمت کے ستارے کو سرِ مژگاں ڈبڈباتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھبرا گیا۔ "ارے تم رو رہی ہو؟ــــ"

"نہیں، میں ہنس رہی ہوں.... جاہل جو ہرے نرو دلشیاں دیکھا؟" یہ کہتے ہوئے وہ جنیدی کو تکتی رہی.... ایک ساتھ مسکرائی اور آنسو پونچھ کر اپنے بربط کی طرف چلدی....

"تم ناراض ہو گئیں ریحانہ.... مجھے ذرا دیر ہو گئی۔"

"نہیں میں کس پر ناراض ہوتی.... تمہیں تہمت اُٹھانے کی کچھ عادت بھی ہو گئی ہے۔"

"میں آ تو گیا.... اب دیر نہیں ہوا کریگی۔ معاف کر دو۔"

"پھر وہی بات، میرا کسی نے قصور ہی کیا کیا ہے جو میں معاف کر دوں.... اور اگر تم نہ آتے تو بھی میں تمہارا کیا کر لیتی.... تم آ گئے یہ تمہارا کرم ہے...."

"تم نہ جانے کب سے میری مُنتظر ہو گی؟"

"شاعرہ کا وجود دُنیا میں کسی کا انتظار کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ وہ تو صرف اپنی منتظر رہتی ہے۔ محض اپنی۔ وہ کسی کی ساجد ہے اور نہ کسی کی مسجود، وہ صرف اپنی ہی پوجا کرتی ہے.... اُس کی پرستش کا طریقہ بھی دُنیا سے نرالا ہے.... وہ اپنی رُوح کے بربط کو اپنی زندگی کے مضراب سے چھیڑتی ہے.... اور اُس سے نکلے ہوئے گیت کو خود اپنی ہی بارگاہ پر بھینٹ کر دیتی ہے.... اُس وقت وہ دیوی ہوتی ہے.... دیوی.... جسے دونوں عالم سجدہ کرتے ہیں.... اور ہاں وہ کبھی تنہا بھی نہیں رہتی.... فطرت.... صرف فطرت ہی نہیں بلکہ وہ سب چیزیں جو اس دُنیا میں ہیں، اور وہ بھی جو ہنوز حجابِ عدم میں ہیں اور وہ چیزیں تک جو تمہاری نگاہ سے فنا ہو چکی ہیں، اس کی ہم نوا ہوتی ہیں ــــ تم کہتے ہو گے جنیدی کہ اُس نے پھر وہی پگلی باتیں شروع کر دیں.... نہیں نہیں، میں تو تمہیں صرف اسلئے سمجھا رہی تھی کہ کہیں اس خیال سے کہ میں تمہارا تنہا انتظار کر رہی تھی تمہیں تکلیف نہ ہونے لگے ــــ"

"تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ تم یہاں میری منتظر نہیں تھیں؟"

"اور کیا"

"نہیں تھیں؟"

"ہاں تھی" (مُسکراتی ہے)

"اور ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ تم کسی کا انتظار نہیں کر رہی تھیں"

"میں نے یہ کب کہا.... پر بہتان جوڑ دیا میرے سر"

"تو اور کیا کہہ رہی تھیں؟"

"میں تو کہہ رہی تھی کہ شاعرہ کسی کی منتظر نہیں ہوتی!"

"تم شاعرہ نہیں ہو؟"

(کسی قدر سنجیدگی کے ساتھ) "نہ، شاعرہ کو تو میں بہت دُور کہیں

کسی ننھی سی گلاب کی کلی میں سُلا آئی ہوں.... یہاں تو صرف ریحانہ ہے...
اور یقیناً ریحانہ دُنیا میں صرف تمہارا انتظار کرتی ہے۔"
"تو میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ میری ریحانہ کب سے میری مُنتظر
تھی ___؟"

"کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتی، ہاں اتنا کہہ سکتی ہوں کہ جب
میں آئی تھی تو چاند میری پُشت پر تھا اور اب میرے مُنہ کے سامنے ہے
.... کچھ اور نہ سمجھ لینا، میں صرف چاند کو کہہ رہی ہوں.... اور ہاں
دیکھو تو ہی وہ ہے نہ ایک چمکدار ستارہ.... وہ میری اُنگلی کی سیدھ
میں.... وہ ستاروں کے اُس گُچھے کے اوپر... ہاں ہاں وہی...
وہ جب تک نہیں نکلا تھا... سمجھے!"
"اس کے معنی تو یہ ہوئے ریحانہ کہ تمہیں تین گھنٹے سے زائد ہو گئے۔
... تم بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی ہو گی"
"نہیں کچھ دیر تو میں تمہاری مُنتظر رہی اور جب انتظار کے
غیر فانی لمحوں میں میں نے اپنے آپ کو کھو دیا تو میں تمہیں پا گئی۔"
"تم انتظار کی تکلیف دہ گھڑیوں کو کس مسرت سے غیر فانی
بنا رہی ہو؟"

"ہاں سچ تو کہہ رہی ہوں.... غیر فانی تو ہوتی ہی ہیں۔"
"کیسے؟ کیا میرے آجانے کے بعد تم اب بھی میری مُنتظر ہو؟"
"ہاں پہلے سے زیادہ؟"
"میں نہیں سمجھا یہ فلسفہ ریحانہ؟"
"تم ایسے نہیں سمجھ سکتے میرے دیوتا، تم ہمیشہ چاہے گئے ہو،
تم نے خود کبھی کسی کو نہیں چاہا۔"
"میں تمہیں چاہتا ہوں۔"
"تم جھوٹے ہو!.... خیر چھوڑو اس جھگڑے کو اس سے اور
گتھیاں بڑھتی ہیں.... ہاں تو میں کہہ یہ رہی تھی کہ تمہیں پا کر میں نے
نیل کا مقدس پانی اور اپنے اچھوتے شباب کے تازہ نیوفر تمہارے
قدموں پر چڑھا دیئے.... تم اس وقت ایک دیوتا تھے اور یہ غریب شاعرہ
ایک پجارن... تم مُسکرانے لگے تو میں نے اپنے بربط کو اُٹھایا اور آج
صبح کے کہے ہوئے تازہ گیتوں سے تمہاری پوجا کرنے لگی ___ میری
پوجا ادھوری رہ گئی اور تم آ گئے!"
"تو میں پھر چلا جاؤں، تم اپنی پوجا پوری کر لو اُسے کیوں ادھوری
چھوڑتی ہو؟"

"یہ تو میں اُسی وقت سمجھی تھی جب تم آئے تھے ___ تمہیں جانا ہے
تو جاؤ ___ مجھ پر کیوں احسان رکھتے ہو؟"
(کچھ عرصے اُسی طرح خاموش رہنے کے بعد)
"اے سُنو ایک بات کہیں مان لوگی؟"

"ہاں"
"میں بھی کچھ کہوں مان لوگے؟"

"ہاں!"
"میں اب یہاں گھبرا گئی ہوں، مجھے ایسی دُنیا میں لے چلو
جہاں کی ہر چیز کا وجود ہماری ہستی کا منت کش ہو.... جہاں صرف ہم
ہی ہم ہوں ___ جہاں زندگی کے جُھولے میں پریم کا راگ الاپا
جا سکے ___ جہاں محبت ایک گناہ ہو ناقابلِ معافی مگر جہاں اس
گناہ کی سزا بھی صرف محبت ہو ___ ایک ایسی سزا جو کبھی نہ ختم
ہونے والی ہو ___ میں اپنی نیم شکستہ کشتی کو
ایک ایسے سمندر میں لے جانا چاہتی ہوں... جس کی خوفناک موجیں
میری کشتی سے ٹکرا ٹکرا کر اُسے پاش پاش کر دینا چاہیں... اور میرے
ناخدا تم اُسے اُسی اطمینان اور سکون کے ساتھ ایک نامعلوم منزل کی
طرف کھیتے چلے جاؤ.... جنیدی مجھے محبت کی ایک ایسی سرزمین میں
پہونچا دو۔"

اُس کی نیم وا آنکھیں [illegible] جنیدی کی آغوش میں آ رہی.... اُس کے گرم اور تیز سانس جنیدی کے نیم
مضطرب جذبات سے کھیلنے لگے..... جنیدی کی آغوش تنگ ہوتی
گئی اور اس کا سر نیچے جُھکتا گیا.... یہاں تک کہ عشق کے دیوتا کی سُرخ
اور نازک کمان پر جنیدی کے لب پیوست ہو کر رہ گئے.... ریحانہ
نے بے قابو ہو کر آنکھیں کھول دیں ___ ایک شعلہ تھا جو چمکا اور اپنے
مرکز کی طرف واپس چلا گیا.... ریحانہ، تھوڑی دیر کے لئے اپنی دُنیا کی
اُس سرزمین میں پہونچ چکی تھی ___ جنیدی نے سر اُٹھایا ___
ریحانہ کی لانبی اور گھنی پلکوں کو جنبش ہوئی اور [illegible] نے اپنی آنکھیں
کھول دیں ___ !

"کچھ سُنا دو۔"
"ہاں ضرور ___ اب میری پوجا مکمل ہو چکی ہے!"
وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے بربط کے تاروں کو کچھ یونہیں
سا چھیڑا اور بہت نیچے اور دھیمے سُروں میں اپنے گیت کو اُٹھایا....
وہ گا رہی تھی ___
"میں اپنے اُس چھوٹے سے دریا پر ایک مرتبہ پھر جانا چاہتی ہوں

جو سمندر میں مل کر سمندر ہو جاتا ہے اور اپنی ہستی کے مقصد کو پا جاتا ہے"!

.... (اُس کی آواز بلند ہونا شروع ہوئی یہاں تک کہ عطارد اور مریخ سے پرے ننھے فرشتوں نے اپنی پرواز کو بند کر دیا ۔) وہ گا رہی تھی ۔ "دریا کی ننھی ننھی لہریں اُس کے مرمریں کناروں کو دھوتی ہیں اور ساحل پر اُگے ہوئے بانس کے شاداب جھنڈوں کو سیراب کرتی ہیں ۔ اس کی سیمابی بوندیں سرسبز کونپلوں میں چھپ جاتی ہیں اور پھر کسی ایک خفیف سے جھٹکے کے ماتحت دریا میں کود کر کسی ایک طرف کو چلی جاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں ایک جھنڈ سے دوسرے جھنڈ پر اور دوسرے سے تیسرے پر جاتی ہیں مگر وہ مادہ جو اپنے وجود سے ایک دوسرا وجود تخلیق کرتے میں اس درجہ مشغول ہے کہ اپنے آپ کو بھول چکی ہے کہیں نہیں جاتی اور صرف کبھی کبھی اپنی چونچ سے اپنے انڈوں کو گھماتی ہے ایک پھریری لیتی ہے اور پھر سینے سے لگ جاتی ہے ۔ چاندنی کی شروع اور آخری تاریخوں میں سبز بالوں والی جل پریاں اپنی سنہری کشتیوں میں آتی ہیں۔ رات بھر کی محفلِ رقص و سرود کے بعد صبح ہونے سے پہلے پھر دریا کی نامعلوم گہرائیوں میں کسی سیپی کے اندر سو جاتی ہیں، وہ چاندنی کی بھرپور راتوں میں اس لئے نہیں نکلتیں کہ مبادا اُن کے عریاں جسم کسی ارضی انسان کا مرکزِ نگاہ نہ بن جائیں ۔ یہ عرصہ وہ اپنے مونگے کی چٹانوں ہی پر رقص کرنے میں گزار دیتی ہیں"!... (جذبات نے اُسے بے قابو کر دیا.... اُس نے اپنے بربط کو پھینک دیا اور کھڑے ہو کر رقص کرنے لگی ۔ بے تحاشہ رقص کرتے ہوئے وہ ساحلِ نیل کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی ۔) "یہ سب ہوتا ہے مگر میں بدنصیب گھاس پر بیٹھی ہوئی اپنے گلابی آنسوؤں سے دریا کے پانی میں اضافہ کرتی رہتی ہوں چاندنی رات میرے لئے ایک ایسے کفن بردوش جوڑے کی طرح ہے جو رہ رہ کر مجھے ستاتی اور چڑاتی ہے ۔ میں تنہائی سے گھبرا کر موت کی مقدس دیوی کو پکارتی ہوں اور نہ معلوم اُس وقت وہ چڑیل کن پتھریلی چٹانوں میں اپنا منہ چھپائے ہوتی ہے.... کاش زندگی کے یہ نشیب و فراز.....!"

رقص کرتے کرتے ریحانہ کا پاؤں پھسلا اور دیکھتے دیکھتے دریا نے اپنی آغوش اُس کیلئے وا کر دی۔ موجیں ایک لمحہ کیلئے تتر بتر ہوئیں اور دریائے نیل پھر اسی خاموشی اور سکون کے ساتھ بہنے لگا ۔ فضا ایک کبھی نہ ختم ہونیوالی خاموشی میں ڈوب گئی جسے موجوں کا چھپاکا کبھی کبھی توڑ دیتا تھا۔ (لوگ کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں اب بھی بربط کے تاروں کی جھنجھناہٹ نیل کی موجوں پر رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔)

راحت سعید

پریتم پیارے میری رُوح کے مالک

(بسلسلہ صفحہ ۳۷)

تشبیہ تو لاجواب ہے مگر مبالغہ سے خالی نہیں۔ یہ ہیرے کے پھول تو بیشک ستاروں کی طرح چمکتے ہیں مگر کہاں شفق اور کہاں میرے کان کی لَو۔ تم ہمیشہ مجھے اسی طرح آسمان پر چڑھایا کرتے ہو۔ کبھی شفق بنا دیا، کبھی دھنک بنا دیا۔

اُس المناک حادثہ کا حال پڑھکر حد سے زیادہ صدمہ ہوا۔ جب میرا دل اتنا متاثر ہے تو شدتِ غم نے تمہارا کیا حال بنایا ہوگا۔ کاش میں وہ سب کچھ سپردِ قلم کر سکتی جو اس وقت میرے دل میں ہے، مگر میں ڈرتی ہوں کہ کہیں کوئی اور اُلجھن نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے ہونٹوں پر خاموشی کی مُہر لگا لی ہے۔ خدا تمہیں سکون نصیب کرے۔

تمہیں کبھی نہ بھولنے والی، تمہاری نامراد کنیز

رضیہ

۲۰ جولائی سنہ ۴۰ء

تفاوتِ راہ

رمیش نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، اپنے گھبرا کر اُٹھنے کی وجہ اُسے معلوم نہ ہو سکی! اُس نے محسوس کیا کہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا۔ اُس نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن طوفان میں جہاز جس طرح غرق ہو جاتا ہے اور سطح پر پتہ بھی نہیں چلتا بالکل اسی طرح اُس کے دماغی ہیجان نے اُسکے خواب کے محسوسات کو معدوم کر دیا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا: "جہاز تباہ ہو جاتا ہے تو اُس کا ایک آدھ تختہ کنارے پر لگ ہی جاتا ہے۔ لیکن ڈوب ہی جائے تو ــــ"

اُس نے کروٹ بدل کر سیدھی جانب دیکھا۔ اُسکے اور شیاما کے درمیان سویا ہوا آروند لوٹتے لوٹتے دیوار کے پاس پہونچ گیا تھا۔

اُسنے آہستہ سے آروند کو اُٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور اس پر چادر اور رگ اُڑھا دیا ــــ ساتھ ہی اسکی نظر شیاما پر پڑی۔

مدت کے بعد کھڑکی سے چاند کا کنارہ یا صحن میں موتیا کی بیل کو پھولتی پھلتی دیکھکر جو مسرت ہوتی ہے بالکل یہی کیفیت شیاما کی دید سے رمیش کی تھی!

برسہا برس سے اس کا صبح کا پروگرام یہ تھا ــ شیاما کے باورچی خانے میں سلگاتے ہوتے اسٹو کی آواز آتے ہی رمیش ایک کروٹ بدل کر دوسری کروٹ ہو جاتا۔ کیتلی میں پانی ڈال کر شیاما اُسے اُٹھانے آتی تو یہ آنکھیں کھول دیتا۔ کچھ دیر پریم بھری باتیں کرنے کے بعد رمیش اُٹھ جاتا! اس طرح دونوں ایک دوسرے پر دیوانہ وار شیفتہ تھے۔ ان کیلئے ہر روز روزِ عید اور ہر شب شب برات تھی۔ محبت و خلوص نے گھر کو جنت بنا رکھا تھا۔ وہ دونوں ایک ایسی دنیا میں مقیم تھے ؎

جہاں رنگینیوں کو کام ہے نکہت طرازی سے
مچلتے ہیں جہاں نغمے ادائے دلنوازی سے

ہر روز ہنسی مذاق کرتے ہوئے بستر سے اُٹھنے کی رمیش کو چھ سال سے عادت سی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج شیاما کو بستر پر گہری نیند سوتے ہوتے دیکھکر اُسے گمان ہوا کہ کہیں اُس نے خواب تو نہیں دیکھا ــــ جنگل میں کسی رہرو کو کچھار میں محوِ آرام جنگل کی ملکہ جیسی دکھائی دیتی ہے۔ شیاما ویسی ہی معلوم ہو رہی تھی!

اپنے یکایک جاگنے کا سبب اب کہیں رمیش کے ذہن میں آیا۔

شیاما اپنی چچا زاد بہن کی شادی کے لئے آج دوپہر کی گاڑی سے آٹھ دس روز کیلئے گاؤں کو جانے والی تھی۔ شادی کے بعد چھ سال کے عرصے میں رمیش کے لئے شیاما کی جدائی کا یہ دوسرا کٹھن وقت تھا۔ پہلا تو یہ کہ شادی کے مہینہ بھر بعد ہی اُس کی چچی اُسے لے گئی تھی! اس وقت فرقت کے یہ دن اس کیلئے دس سال سے کم نہ تھے۔ اگر آج اسے یہ دس دن دس صدیاں معلوم ہوں تو کون سی تعجب کی بات! رات جب شیاما لیمپ کی بتی دھیمی کر رہی تھی تو رمیش نے سوال کیا تھا: "تم وہاں صرف آٹھ ہی دن رہو گی نا؟"

"اگر گنتے گنتے غلطی سے آٹھ کے نو ہو جائیں تو؟"

"تو اسپیشل ہوائی جہاز ایک دن آنا پڑیگا ــ اور پھر ــ"

"پھر کیا؟"

"ملایا رے کے غیر معمولی خرچ کی بنا پر رانی صاحبہ کے ہیرے کے بندوں کی خواہش دل کی دل ہی میں رہ جائیگی!"

رمیش کی باتیں سنتے سنتے اور لیمپ کی تیز روشنی دھیمی کرتے ہوتے ــــ اس قدر دھیمی کہ رمیش کو اس کے گل ہونے کا گمان ہوا ــــ شیاما ہنستے ہنستے کہہ رہی تھی: "اگر آٹھ کے سات ہو جائیں تو ٹھیک ہوگا نا؟"

رات کی اس پر لطف گفتگو کا خیال آتے ہی رمیش نے کھونٹی پر ٹنگے ہوتے لیمپ کو دیکھا! "آٹھ کے سات" کہتے ہوئے شیاما نے اُسے کس قدر مدھم کر دیا تھا۔ رمیش نے خیال کیا "مدھم کیا ہوا چراغ جس طرح خود بخود بڑھتا ہے کہیں ایسا ہی شیاما کا چچی کے پاس قیام بھی طول نہ کھینچے۔ کیا بھروسہ! شادی سے پہلے سال بھر وہ اپنی چچی کے پاس ہی تھی۔ وہاں کی اس کی سہیلیاں ــــ کاشی اور دوسری شاید کملا موجود ہیں ــــ شادی کے بعد پہلے پہلے شیاما نے کتنی مرتبہ اُن کی یاد کی تھی! ان دونوں سہیلیوں سے تقریباً چھ سال کے بعد اب ملاقات ہو گی! شیاما کے پاس دو رتن بھی تو بتانے کو ہیں۔ چچی کے خلوص اور سہیلیوں کی پر لطف صحبتوں میں شیاما تو وہاں اطمینان سے رہے گی مگر ادھر میرا کیا حال ہو گا ــ" شیاما کے گلے میں پڑے ہوئے گجرے کی طرف اس کا خیال پلٹا "کل ان پھولوں میں کس قدر معطر اور مسرور کن خوشبو

تھی لیکن آج ان خشک پھولوں کی طرف دیکھنا بھی ناگوار معلوم ہوتا۔ غیر معلوم طور پر رمیش، اس کے اپنے دل کا مقابلہ ان مرجھائے ہوئے پھولوں سے کرنے لگا۔

شیاما نے لیٹے لیٹے نہایت سنجیدگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آج شاہ خاور مغرب سے طلوع ہو رہا ہے۔"

"جب پورنماشی کا چاند یکایک غروب ہونے لگے تو اس سے ملنے کیلئے سورج کو آنا ہی چاہئیے۔" رمیش نے نہایت متانت سے جواب دیا ۔۔۔۔ اسکے اس جملے میں کس قدر گہرا مفہوم تھا۔

شادی ہونے کے بعد سے گھر ہی رمیش کی دنیا تھی۔ کالج میں جو تین چار گھنٹے صرف ہوتے صرف اتنا ہی وقت وہ شیاما سے علیحدہ رہ کر گزارتا۔ باقی صبح سے شام تک آٹھوں پہر بارہ مہینے وہ اور شیاما چاند اور چکور کی طرح گزارتے۔ تنہائی پسند رمیش کا دائرہ احباب بھی وسیع نہ تھا۔ جو تھوڑے سے دوست تھے وہ بھی "ایک بیوی ہزار دوست" کی نئی ضرب المثل تراش کر اس کے گھر آتے اور چائے پی کر جلد ہی اپسر چلے جاتے۔ رمیش کو کرکٹ کا تھوڑا بہت شوق تھا لیکن کبھی شیاما کے بغیر وہ میچ دیکھنے نہ جاتا۔

رمیش جس چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا اس کا نام میاں بیوی کی دیوانہ وار شیفتگی کو دیکھکر چند زندہ دل احباب نے "آشیانہ" رکھدیا تھا۔ کسی اونچے درخت کی پھننگ پر نرم نرم روئی اور گھاس کے تنکوں سے سجائے ہوئے گھونسلے میں پرند کا جوڑا اطمینان و سکون سے چونچ میں چونچ ڈالے بیٹھکر سورج کا طلوع و غروب اور دریا کا تلاطم، شادی کی بارات، جاترا کا میلا اور دنیا کے دیگر ہنگاموں اور شور و شر کو یہ خیال کرتے ہوئے دیکھتا کہ وہ کسی اور دنیا کے بسنے والے ہیں بالکل یہی کیفیت چھ سال سے شیاما اور پروفیسر رمیش کے سنسار کی تھی ۔۔۔ کل کے دلفریب خواب کی تعبیر آج شیاما کی جدائی تھی!

شیاما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے رمیش کہنے لگا: "مجھے ایک بچن دو!"

شیاما مسکراتے ہوئے گویا ہوئی: "رات تو آٹھ دن کے سات ہوگئے۔ اب شاید سات کے چھ کرنے مقصود ہونگے! جانے کے وقت تک چھ کے پانچ ہو جائیں گے اور سہ پہر میں ٹرین کے جانے تک یہ چھ کا ہندسہ ایک پر پہونچ جائے گا اور میرا رخت سفر سامانِ اقامت سے بدل جائے گا!"

شیاما کی دلچسپ گفتگو کا جواب دیتے ہوئے رمیش کہنے لگا: "شادی سے پہلے تم سال بھر چچی کے پاس ہی رہی ہو۔ اگر اب تم نہ جاؤگی تو انہیں رنج ہوگا۔ لیکن ۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟ ہوائی جہاز سے جاکر ہوائی جہاز سے واپس آجاؤں؟"

رمیش کسی قدر افسردگی کیساتھ کہنے لگا: "وہاں آٹھ دن تو رہو مگر ہر روز ایک خط ضرور لکھنا!"

"چچی کا گاؤں تو ایک معمولی قریہ ہے۔ بھول گئے کیا؟ وہاں تو تین پیسے کا کارڈ بھی وقت پر نہیں ملتا!"

"یہاں سے اگر بہت سے ٹکٹ اور لفافے لیجائے جائیں تو شاید گڈس سے لیجانا ہوگا!"

شیاما ہنس پڑی اور رمیش بھی ہنسنے لگا۔

رمیش کی محبت بھری آغوش سے جدا ہونا شیاما کو بھی بار معلوم ہوا۔ عورت کی زندگی کی ساری مسرتوں کا مرکز اس کے شوہر کا پریم ہی ہوتا ہے۔ شیاما نے آج یہ بری طرح محسوس کیا۔ اٹھتے ہوئے اسکی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ یہ دیکھکر رمیش بھی متاثر ہوا۔ مگر اس کی دلجوئی کیلئے کہنے لگا: "کاش! میں آج مصور ہوتا!"

شیاما سے کنکھیوں کا لطف لیتے ہوئے شیاما نے اس کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھا۔ رمیش بول اٹھا: "شاہکار کے لئے آج ایک اچھی چیز ہاتھ آئی!"

"عنوان کیا ہوگا؟"

"بیرونِ آشیانہ!"

شیاما ہنسنے لگی۔ رمیش ہنستے ہوئے کہنے لگا: "اس تخیل پر کتنی بہترین تصویر بن سکے گی! ایک بلند درخت پر ایک خوبصورت آشیانہ ہے۔ ایک پرند اس کے باہر جا رہا ہے۔ اس کا ساتھی باہر جھانک کر دیکھ رہا ہے باہر جانے والا پرند پیچھے مڑکر دیکھتا ہے اور اپنے ساتھی کو دیکھکر اس کا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ مجبوراً آشیانے کے پاس آکر چونچ میں چونچ ڈالکر ۔۔۔"

چائے پینے کے بعد شیاما تیاری کرنے لگی۔ رمیش اسکے دائیں بائیں ہی منڈلا رہا تھا۔ ٹرنک میں بچوں کے استری شدہ کپڑے رکھتے ہوئے شیاما نے پوچھا: "کیا آج کوئی تصنیفی کام نہیں ہے؟ ۔۔۔"

رمیش کو اس کا یہ سوال بڑا خشک معلوم ہوا۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا: جب چھوٹے بچے کے ہاتھ میں دی ہوئی کوئی میٹھی چیز ختم ہو جاتی

ہو تو وہ ہاتھ چاٹنے لگتا ہے۔ اسی طرح میں بھی تیری پُرلطف صحبتوں کے بیتے ہوئے وقت سے محظوظ ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم یہ نہ سمجھ سکیں: اس قسم کا سوال اسکے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ لیکن شیاما کے دل میں رمیش کو بنانے کا خیال آیا اور وہ کہنے لگی: "اگر کتاب جلد ختم نہ ہوئی تو میرے لئے ہیرے کے بُندوں کی خریداری میں دیر نہیں ہوگی کیا؟"

رمیش نہایت خاموشی سے اپنے کتب خانے والے کمرے میں چلا گیا اُس نے کل کے لکھے ہوئے کاغذ الٹ پلٹ کر کے دیکھے۔ ناول کے آخری نامکمل باب کی تکمیل پر غور کرنے لگا۔ قلم اٹھایا اور ابھی کچھ لکھا ہی تھا کہ یکایک اُسکے دل میں کوئی خیال آیا اور وہ قلم رکھکر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ اس جہاز کی طرح معلوم ہو رہا تھا جو لنگر انداز ہو جانے کے باوجود طوفانی تھپیڑوں کے ساتھ اپنی جگہ پر ہی ڈگمگاتا رہتا ہے۔

آج پنج قومی کرکٹ ٹورنامنٹ کے ہندو مسلم مقابلے کا آخری دن تھا۔ سامنے والے گھر میں ریڈیو شروع ہوتے ہی رمیش وہاں پہونچ گیا ہندوؤں کی باری کے وقت وہ درمیان ہی میں چلا آیا۔

شیاما نے پوچھا: "میچ کا کیا ہوا؟"

رمیش نے جواب دیا: "شیلا کا گرم کوٹ لے لیا ہے نا؟ ورنہ وہ رات میں سردی کی وجہ سے روتی رہیگی۔"

شیاما بھانپ گئی کہ اس کے شوہر کا دل کرکٹ میں بھی نہیں لگا۔ مگر اس پر اُسے ہنسی نہ آئی۔ صبح سے اس کا دل بھی جگہ پر نہ تھا! رہ رہ کر اُسے خیال آتا ــــ خدانخواستہ گاؤں میں شیلا یا اروند بیمار ہو جائیں تو ڈاکٹری امداد بھی نہیں ملے گی! اور جہاں اپنے پتی کا دیدار نہ ہوگا وہاں راتوں کو نیند کس طرح آئیگی؟ سچ ہے، گرہستی کا گھر ہی اسکی دُنیا ہے۔ اس دنیا کے باہر جانا یعنی ــــ

اسٹیشن پر ایک دوسرے سے جُدا ہوتے وقت دونوں اس قدر متاثر تھے کہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے ایک دو آدمیوں نے تو یہ گمان کیا کہ یہ نئے شادی شدہ ہیں مگر بازو کی کھڑکی کے قریب دونوں بچّوں پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک پڑے اور انکی حیرت اور زیادہ ہو گئی۔

رمیش بھاری بھاری قدموں سے گھر میں داخل ہوا اور دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔ کتنے دنوں سے اُس نے یہ تصویریں نہیں دیکھی تھیں۔ مگر اب وہ ہر تصویر کے سامنے کھڑے رہ کر بڑے ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد کی "دونوں کی تصویر" اروند کی تصویر، شیلا کی تصویر اور سب کا ایک گروپ۔ ان تصاویر کو بغور دیکھنے سے چھ سال پہلے کے سارے واقعات سنیما کے پردے کی طرح اُسکے دماغ میں اُجاگر ہونے لگے۔

لیکن اس تصویر کو دیکھتے دیکھتے اس کا دلی ہیجان بڑھتا ہی گیا۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں گراموفون تھا۔ اُسکے دل میں ایک آدھ ریکارڈ بجانے کی خواہش ہوئی۔ مگر فوراً ہی اُس کے کانوں میں کچھ آواز آئی اور اُسے محسوس ہوا کہ اُسکے گھر کی ملکہ کہیں دور چلی گئی اور وہ اکیلا ہی خشک اور تلخ فضا میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ شاید کسی کتاب کے مطالعہ سے سکون میسر ہو جائے اور اس ارادے سے وہ الماری کے قریب گیا مگر الماری کھولتے کھولتے اسے کوئی خیال آیا اور کتاب کے لئے بڑھایا ہوا ہاتھ جہاں کا تہاں ہی رُک گیا۔

اُس کی آنکھوں میں ایک نہایت دلکش منظر پھر گیا ــــ اسی طرح ایک مرتبہ جب وہ الماری کھول رہا تھا پیچھے سے شیاما آئی اور کہنے لگی: "یہ دیکھا آپ نے؟" رمیش نے مُڑ کر دیکھا۔ اُسکے ہاتھ میں کھوپرے کا ٹکڑا تھا۔ میٹھا کھوپرا شیاما کی من بھاتی چیز تھی اس لئے وہ لے آئی تھی۔ مگر اس کا ایک کنارہ کھایا ہوا دکھائی دیا۔ رمیش نے کہا: "کبھی دوسرے کا جھوٹا ہم نہیں کھاتے!" اسکے جواب میں اُس نے موقع پاکر اپنا کترا ہوا کھوپرے کا ٹکڑا اسکے مُنہ میں ٹھونس دیا تھا ــــ شاید وہ شیاما کے لبہائے لعلیں سے مس کر چکا تھا۔ اسی لئے وہ شہد سے زیادہ شیریں تھا اس خیال نے رمیش کو اور بھی زیادہ بے چین کر دیا۔ الماری سے کوئی کتاب لئے بغیر ہی وہ واپس چلا گیا۔ شیاما کے بخیر و عافیت پہونچنے کی اطلاع پرسوں تک ملیگی۔ تب تک بھوت کی طرح گھر میں اکیلا ہی رہنا پڑیگا اس فکر سے رمیش بہت اُداس ہو گیا۔

چھ سال پہلے شیاما چچی کے پاس گئی تھی۔ اس وقت کے خطوط اُس نے محفوظ رکھے تھے۔ موسم گرما میں جس طرح ہوا کے جھونکے راحت و سکون کا باعث ہوتے ہیں اسی طرح اس فرقت کے سمے میں ان خطوط کی یاد نے اسے ایک گونہ مسرور کر دیا ــــ وہ جملہ سات خط تھے! لیکن ہر خط میں ایک آدھ جملہ ایسا ضرور تھا کہ مصری کی ڈلی کی طرح دل میں گھول گھول کر اس سے حظ اٹھایا جائے۔

پہلے خط میں شیاما نے لکھا تھا: "کل رات میں رہ رہ کر جاگ اُٹھتی تھی۔ بیدار ہو کر آنکھیں کھولتی تو جی میں آتا کہ اگر الہ دین کا چراغ میرے پاس ہوتا تو اُسے رگڑنے کے بعد موکل کے سامنے کھڑے ہو کر کہتی ابھی اسی وقت مجھے اُن کے پاس لے چل! ہاں ــ اس موکل سے بالکل خائف نہ ہو کر میں ایسا ہی حکم دیتی اور اس کے ساتھ ہی تمہارے پاس ہوتی!"

دوسرے خط کا آخیر ایسا تھا:"کاش! ان چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ٹیلیفون ہوتا۔ تاکہ ہر روز میں تمہارے میٹھے میٹھے بول سُن کر دل کو تسکین دے لیتی!"

تیسرے میں شیاما نے لکھا تھا:"پریت کا چسکا بڑا بُرا ہوتا ہے اس سے آدمی کا دل تو دل دماغ بھی غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ پہلے میری سہیلیاں کملا و بملا ایک دن نہ ملتیں تو کسی طرح چین نہ آتا۔ گو اب میں اُن کے پاس بیٹھی باتیں کرتی ہوں مگر تمہاری ہی لَو لگی رہتی ہے!"

رمیش کو محسوس ہوا کہ وہ سات پُرانے خطوط نہیں ہیں —— وہ محبت و اُلفت کے سات دریا ہیں کہ پڑے لہریں لے رہے ہیں۔ اسکے خوش آیند اور دلفریب تصورات میں پرسوں تک کسی طرح وقت کاٹ ہی لونگا۔

تیسرے دن خط کی راہ رمیش نے بڑی بیتابی سے دیکھی لیکن اس دن شیاما کا کوئی خط نہ تھا۔ ساری رات اُس نے کروٹیں بدلتے ہی گزاری۔ شیاما نے کسی کو خط ڈاک خانے میں ڈالنے کو ضرور دیا ہوگا مگر وہ وقت پہ ڈاک خانہ نہیں پہونچا ہوگا۔ اس طرح اُس نے اپنے دل کو تسکین دی۔

دوسرے دن خط کے انتظار میں رمیش کا حال اُس کاشتکار کا سا تھا جو مرگ کارتی نہ برسے تو متفکر و ملول ہو کر نہایت بیچینی سے بارش کا انتظار کرتا ہو۔ مگر افسوس اس دن بھی خط نہ آیا۔

رمیش کو تشویش ہوئی۔ شیاما یا آروند بیمار تو نہیں ہو گئے! یا خود شیاما کے دشمنوں کا مزاج خراب ہوگا؟ اگر فی الفور تار دیا جائے تو ——؟

چچی ہنسیں گی! شیاما کا مذاق اُڑائیں گی! کل اگر خط نہ آیا تو تار دینے میں مضائقہ نہیں۔ شیاما کے پُرانے خطوط دیکھتے دیکھتے اُس نے یہ دن بھی گزار دیا۔

کسی پیاسے کے منہ میں امرت ٹپکانے سے جو کیفیت ہوتی ہے وہی حال اس کا شیاما کے خط کے دیکھنے سے ہوا۔ توقع تھی کہ خط بہت طویل ہوگا۔ مگر لفافہ چاک کرتے ہی وہ صورتِ یاس بن گیا۔ خط کا مضمون تو بالکل ہی غیر متوقع تھا......!

"خط لکھنے میں دو دن کی تاخیر ہوئی، معاف کیجئے! حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ پر سخت غصہ آرہا ہے!"

شیاما نے آگے لکھا تھا:"چھ سال تک آپ نے مجھے اپنے گھر میں کانچ کے سامان کی طرح حفاظت سے بند رکھا باہر کی سرد ہوا بھی لگنے نہ دی۔ لیکن صرف سرد ہوا کے خوف سے تم نے مجھے باہر کی دُنیا سے محروم کردیا اور خود بھی محروم رہے۔ اس بسیط دُنیا میں میرے دل پر صرف تین دن میں تین زبردست چرکے لگے۔ ان چرکوں سے میرے دل کی حالت دگرگوں ہوگئی ہے۔

میں یہاں جس دن پہونچی اسی دن میری چچا زاد بہن کی شادی ملتوی ہوگئی اور رشتہ ٹوٹ گیا۔ لڑکے کو ایک ہزار پانچسو روپیہ دینے والا کوئی غرض مند مل گیا اور ——؟ جس لڑکی کا رشتہ ایک مرتبہ ٹوٹ جائے اُسے ٹوٹا ہوا شیشہ ہی سمجھنا چاہیئے!

دوسرے دن میں کاشی سے ملنے گئی۔ اُس کا شوہر نمونیہ میں مُبتلا تھا۔ دیہاتی لوگوں میں کسی شہری ڈاکٹر کو لانے کی سکت کہاں؟ صرف بیماری پر ہی نہ ٹلی ——

میں کاشی کی جھونپڑی میں گئی تو اُس کی برادری کے بہت سے لوگ اُس کی رنگین چوڑیاں توڑ رہے تھے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ چوڑیوں کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی اس کی مسرتوں اور شادمانیوں کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے۔ اُس وقت کی یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!

کملا کے پاس گئی تو وہ دس دن کی زچہ تھی! ایک ایک نوالے کے لئے وہ محتاج ہوگئی ہے۔ شوہر یہاں سے دس میل دُور رہے اُس کو وقت پر مزدوری بھی نہیں ملتی! قدرت کی ستم ظریفی سے چھ سال میں چھ بچوں کی ماں بن گئی ہے۔ بیچاری کے جسم و رُوح پر ضعف طاری ہو گیا ہے۔

ہم جیسے لوگوں کے گھروں میں تو سُکھ اور چین کا بول بالا ہے، لیکن ان گھروں میں کس قدر حسرت و یاس اور افلاس پھیلا ہوا ہے! کاش ہم کو اپنے آشیانوں کے باہر کی دُنیا کے دیکھنے کی عادت ہوتی! اب مجھے دو ہی راستے دکھائی دیتے ہیں۔ اس آتشِ یاس و حرماں اور افلاس کے ملتہب شُعلوں کو بجھانے کی کوشش کرنا یا خود بھی اپنے ہمجنسوں کے ساتھ اس آگ میں جلکر خاکستر ہو جانا!"

رمیش نے اس خط کو پھینک کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ان تینوں ستم رسیدہ لڑکیوں کی صورتیں ناچنے لگیں۔ اُس نے آنکھیں کھولدیں! "تفاوت راہ"۔ "تفاوت راہ" کے کرخت الفاظ اسکے کانوں میں گونجتے ہوئے معلوم ہوتے!

محمد عبدالقادر فاروقی

پرنالہ

شررر شررر شڑاق۔

پرنالہ ٹوٹا اور پانی کی دو شلشلاتی ہوئی دھاریں دیوار پر پیچ و خم کھاتیں فرش پر رینگنے لگیں۔ تھپ سے ایک گارے کا تودا اور نیچے آ رہا۔ اور دھاروں نے ایک دیواری دریا کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں لہریں بھی تھیں اور لہروں میں پیچ و تاب بھی۔ فرش پر چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ اماں جان نے کہا: "جاؤ ارشد پرنالہ درست کرآؤ ورنہ مکان میں پانی ہی پانی ہو جائے گا"

میں نے دروازے سے سر باہر نکال کر جھانکا، پانی کی ایک بوند میری کنپٹی پر پڑی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میری کنپٹی میں چاقو گھسیڑ دیا ہو۔ میں نے سر اندر کھینچ لیا: "اماں میں تو بارش میں باہر نہیں نکلونگا مجھے نمونیہ ہو جائیگا"

انہوں نے کہا: "جاؤ بیٹا کبھی شیروں کو بھی نمونیہ ہوا کرتا ہے۔ اور پھر گھر میں تمہارے سوا ہے بھی کون؟"

میں لنگوٹ باندھ کر پھاوڑا تلاش کرنے لگا۔

"پوس ماگھ کی جھڑیاں! دھیمی دھیمی برساتیں!! شمالی سرد ہوائیں اور پھر کسی کا پرنالہ ٹوٹ جائے! میں نے یہ سوچتے ہوئے پھاوڑا کندھے پر رکھ ایک قدم دروازے سے باہر نکالا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور روئیں میرے مساموں میں سوئیوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ میں جھجکا مگر پھر دل کڑا کر کے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے دریا میں تیرنے والے برف کے تودے پر پھینک دیا ہے۔ جو میرے قدموں تلے سے نکلا جا رہا ہے۔ میں گر پڑا۔ پھاوڑا دور جا پڑا میں تھوڑی دیر ویسے ہی پڑا رہا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زمین تیزی سے گردش کر رہی ہو اور میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ کر ایک عمیق غار کی گہرائیوں میں چلا جا رہا ہوں۔ ابا جان نے کہا: "ارشد سنبھل کر کام کرو"

اماں کہنے لگیں: "میرے بیٹے کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی" اور میں خجالت رفع کرنے کیلئے روئی ہنسی ہنسنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو میرا جسم سردی سے سن ہو گیا۔ لیکن پھاوڑے کی ہر ضرب میرے جسم میں گرمی پیدا کر رہی تھی۔ جب ٹوکری گارے سے بھر گئی۔ تو سر پر رکھ ایک ہاتھ میں پرنالہ اٹھا آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کانپتی ہوئی ٹانگوں اور لرزتے ہوتے جسم کے ساتھ میں کوٹھے پر چڑھ گیا۔ ٹوکری منڈیر پر رکھ دی اور اس سوراخ کو دیکھنے کے لئے جھک گیا جس کی وجہ سے پانی مکان میں ٹپک رہا تھا۔ سوراخ کافی بڑا تھا۔ اور وہ تمام پانی جو چھت سے بہہ کر پرنالے کی طرف آرہا تھا اس سوراخ سے مکان میں ٹپک جاتا تھا۔

بوندوں کی ٹپ ٹپ، تیز ہوا کی سائیں سائیں، قدرت کی اس پُرسکون موسیقی میں تھپ تھپ کی ایک آواز مجھے متوجہ کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میرے قریب ہی دوسرے مکان کی چھت پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سلّو تھی۔ اس کی باریک باریک انگلیاں بڑی تیزی سے گارا اٹھا اٹھا کر ایک بڑے سے سوراخ پر لگانے میں مصروف تھیں۔

"سلّو آج بارش تو بڑے زوروں پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارے سال کی آج ہی برس جائے گی"

ایک ہلکی سی سسکی؛

میں ذرا اس کے قریب کھسک گیا۔

"کیا سوراخ بند کر رہی ہو؟"

— پھر دوسری —

میں اور قریب ہو گیا۔

"مکان میں پانی تو بہت جمع ہو گیا ہوگا؟"

پھر تیسری —

میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔

"ارے تم رو رہی ہو؟"

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں نے کئی بار کہا بھی کہ میرے پاؤں میں درد ہے لیکن امی کہنے لگیں کہ تمہیں سوراخ بند کرنے کے لئے کوٹھے پر جانا ہی پڑے گا۔ شبو بھی تو پاس ہی بیٹھا تھا اسے کیوں نہ کہا۔ کہنے لگیں تمہارے پھول تھوڑی ہی جھڑ جائیں گے۔ آخر سوتیلی ہی جو ٹھہریں۔ میری ماں ہوتی تو مجھے اس بارش میں باہر نکلنے کے لئے کبھی نہ کہتی!" وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔

میں سوچنے لگا یہ سوتیلا پن بھی کتنی بڑی لعنت ہے۔ میں بھی وہی کام کرنے کے لئے کوٹھے پر آیا ہوں اور سلّو بھی! مجھے بھی وہی

الفاظ کہے گئے جو آسے۔ بلکہ میری کہنی میں تو ابھی تک ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اس چھلی ہوئی جگہ سے جب کوئی ہوا کا جھونکا ٹکراتا تو معلوم ہوتا کہنی میں سینکڑوں سوئیاں بیک وقت چُبھ گئی ہیں۔ لیکن فرق صرف کہنے والوں میں ہے جب ماں وہی الفاظ کہتی ہے تو وہ شیریں اور قابل تسلیم اور جب سوتیلی کہے تو وہ بغض و عداوت کے مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ صرف لفظ سوتیلا پن ہے جو اِن تمام فسادوں اور جھگڑوں کا سبب ہے۔

کھٹ سے میری کھوپڑی پر جیسے کنکر پڑا اور میرا سر بھنا گیا۔ میں نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ سلّو بولی: "دیکھو اولے گرنے لگے!" اور میں نے دیکھا تو مکی کے برابر برف کے سے سفید سفید دانے برس رہے تھے۔ میرا شک رفع ہوگیا۔ سلّو کی اُنگلیاں ابھی تک گارے میں مصروف تھیں۔ وہ بھیگے ہوئے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی گٹھڑی سی بنی سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں اُس پر جھک گیا۔

"سلّو تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی"؟

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اور زیادہ جُھک گیا۔ اُس کے بھیگے ہوئے بال جن پر بارش کے قطرات موتیوں کی طرح جڑے ہوئے مجھے بہت بھلے معلوم ہوتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی راجکماری بال بال میں موتی پروئے میرے سامنے بیٹھی ہو۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔ قدرت کی کاریگری خاک میں مل گئی۔ تمام پاکیزہ موتی شرما کر پانی پانی ہوگئے۔ میری اُنگلیاں اسکے بالوں کی جڑوں تک پہونچ گئیں۔ کسی صناع نے کس خوبصورتی سے گھٹا کو تاروں میں کھینچ دیا تھا۔ سلّو کے بال تھے یا یخ بستہ گھٹا! میں اور جُھک گیا۔ آہستہ آہستہ جھکتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کا سر میرے سینے سے لگ گیا!

"دیکھو میں نے تمہیں اولوں سے بچا لیا"

وہ خاموش رہی۔

ایک بڑا سا اولہ میری ریڑھ کی ہڈی پر آکر لگا۔ اور مجھے وہاں دو سلّو بیٹھی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بارش کے قطروں میں ایک آنسو بھی سلّو کے ہاتھ پر گرا۔

"ارے تم رو رہے ہو" اُس نے سر اوپر اُٹھا کر کہا۔ اُس کا چہرہ میرے بالکل مقابل تھا۔ یہاں تک کہ اُس کا گرم گرم تنفس بھی میں محسوس کر رہا تھا۔ اُسکے لب جواب کے انتظار میں نیم وا تھے۔ سرد ہوائیں اور گرم گرم سانسیں! اُس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں گرم گرم آنسو اور مچلتی ہوئی گھٹاؤں میں ٹھنڈے ٹھنڈے قطرات! میں سردی کے دوزخ اور گرمی کے بہشت کے درمیان معلق تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ جو آنسوؤں کی تہ میں تیرتی پھرتی تھی۔ بادل گرجا میں اور جُھک گیا۔ بجلی لہرائی میرے ہونٹ کانپے! اُس کے لرزے! بھیگے ہوئے سرد ہونٹ! سردی سے میرے اعضا سُن ہو رہے تھے۔ لیکن اسکے لب کتنے گرم تھے اور کتنے نرم!

ابا جان کی آواز آئی: "ارشد پانی ابھی تک کیوں نہیں بند ہوا؟"

اور ہم چونک پڑے۔ میں جلدی سے ٹوٹے ہوئے پرنالے کی طرف بڑھا۔ سلّو سے علیحدہ ہو کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں گرم گرم لحاف پھینک کر یخ بستہ جوہڑ میں کود پڑا ہوں۔

میں نے جواب دیا: "ساری چھت کے پانی کا بہاؤ اسی طرف ہونیکی وجہ سے ابھی تک بند نہیں ہوا۔ ابھی ہو جائیگا!" اور میں جلدی جلدی پرنالہ اپنی جگہ پر لگانے لگا۔ میں تھامے ہوئے تھا اور سلّو اُس پر گارا لگا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں پرنالہ لگ چُکا تھا۔

میں نے کہا: "سلّو پھر بھی کبھی ملوگی؟"

کہنے لگی: "ہر وقت ملا ہی تو کرتے ہیں۔ میں کیا آج کہیں دیس جا رہی ہوں؟"

"ہر وقت کہاں ملا کرتے ہیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

کہنے لگی "یہیں بیسیوں بار سامنا ہو جاتا ہے"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

کہنے لگی: "دیکھو میں تمہیں ملاقات کے موقع بتلاؤں، سنو! کنوئیں پر جب میں پانی بھرنے جاؤں اور تم نہانے! اور یا تمہارے قدم تمہیں خود بخود کنوئیں پر لے جائیں"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگی: "شمع پر پروانے جمع ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ اور جہاں لیلیٰ کا منظر ہو وہاں کی حالت کیا ہوگی؟"

میں نے کہا: "تم تو معمّوں میں باتیں کرتی ہو"

"کیوں! معمّوں میں کیوں؟ کیا یہ سچ ہے کہ جب صبح پنگھٹ پر لڑکیوں کا ہجوم ہوتا ہے وہاں تم بھی پہونچ جایا کرتے ہو؟"

"میں ہی کیا اور بھی تو ہوتے ہیں"

"خیر یہاں تم سے تعلق ہے، اچھا چھوڑو اِن باتوں کو۔ اب اور سنو!"

میں نے کہا: "بتلاؤ"

کہنے لگی: "جب کبھی ہم بھڑبھونجے کے ہاں دانے بُھنانے جائیں"

"اور؟"

"اور یا میں تو دانے بھنانے جاؤں اور تم چلم ہاتھ میں لئے ہوئے وہاں پہونچ جاؤ۔ آگ لینے کیلئے۔"

"اور؟"

"تم تو کہیں مسجد میں نماز پڑھنے جاؤ اور میں وہاں تیل ڈالنے۔"

"اور؟"

"اور.... اور.... ہاں اور.... سنو....!" وہ مسکراتے ہوئے بولی: "جب میں نیاز کی گھوگنیاں بانٹنے جاؤں تو گھوگنیاں لینے والوں میں تم بھی ہو۔"

"اور؟"

"جب میں صبح کوڑے کرکٹ کی ٹوکری سر پر رکھے کھیتوں کی طرف جاؤں اور تم میرے پاس سے۔ "گا۔ تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دُکھ تینوں ناہیں دسنا"۔ گاتے ہوئے گذر جاؤ۔"

"اور؟"

"یہیں! اس صورت میں کہ تم بھی بارش میں کوٹھے پر سوراخ بند کرنے آؤ اور میں بھی!"

"وہ کس طرح؟"

"وہ اس طرح....!" وہ مسکرائی اور آہستہ سے جاکر اپنا پرنالہ ذرا اُکھیڑ کر نرم کر دیا، اور ہماری چھت پر اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے ذرا سا سوراخ۔

بارش تھم چکی تھی۔ ہم مسکراتے ہوئے جدا ہو گئے۔

دوسرے دن شام کے وقت پھر گھٹا چھائی اور بادل فضا میں اس طرح معلوم ہوتے تھے جیسے کسی گڑھے کے تھرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک دیا جاتے۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی سے پھاوڑا لیکر مٹی کھودنے لگوں۔ میں صحن میں کھڑا دور قصبہ کو جانے والی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں چمکتا ہوا پانی کسی چیچک زدہ شخص کے چہرے پر کریم کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان کا خیال تھا کہ اس دن بہت سردی تھی، وہ اماں جان سے کہنے لگے: "اپنے بیٹے کو چائے پکا کے پلاؤ۔"

اماں کہنے لگیں: "مجھے آپ سے زیادہ فکر ہے۔ آپکے کہنے سے پہلے ہی پکا رکھی ہے۔ ابھی بشیر کو ولنے دیکھ مثل کھتری کے ہاں چائے کیلئے بھیجا تھا لیکن اسے نہ مل سکی تو ابھی نمبردار کے ہاں سے چٹکی لیکر آتی ہوں۔"

ابا کہنے لگے: "آؤ بیٹا چائے پی لو۔"

میں نے کہدیا: "میرا تو ابھی جی نہیں چاہتا!" میرے جسم میں جیسے آگ لگی ہوتی تھی۔ میں بےچینی سے صحن میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا کہ بجلی چمکی اور میری روح کو منور کر گئی۔ بادل گرجا اور میرا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ اتنے میں ایک بوند میرے کان پر پڑی اور دوسری ماتھے پر۔ خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں جلدی سے پھاوڑا اُٹھا کر مٹی کھودنے لگا۔

ابا کہنے لگے: "کیوں مٹی کیوں کھودتے ہو؟" اور میں بوکھلا گیا۔ کہدیا: "یونہی! یہ دیکھنے کیلئے کہ بارش سے زمین کہانتک بھیگی ہے۔"

اب بوندا باندی ذرا تیز ہو چلی تھی۔ میں آکر دالان میں کھڑا ہو گیا موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ مجھے کسی آواز کا انتظار تھا کہ اتنے میں شڑرر شڑاق دھم کی آواز آئی اور میں جلدی جلدی لنگوٹ باندھ پھاوڑا سنبھالنے لگا۔

ابا کہنے لگے: "کیوں کیا ہے؟"

"اپنا پرنالہ جو ٹوٹ گیا ہے" میں نے پھاوڑا کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اپنا پرنالہ تو چل رہا ہے۔"

اور میں نے جھینپ کر پھاوڑا رکھدیا۔ مجھے رہ رہ کر سوراخ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں ٹپکا! اور میں بالکل اسکے نیچے کھڑا پریشان بھٹکی ہوئی نگاہوں سے بار بار اُسے دیکھ لیتا تھا۔ اتنے میں ٹپ سے ایک قطرہ میرے سر پر آکر پڑا اور میں اُچھل کر پھاوڑے کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اور پھر پھاوڑا کندھے پر رکھ "سوراخ کہیں بڑا نہ ہو جائے!" کہتا ہوا صحن میں جاکر مٹی کھودنے لگا۔ اور پھر تو ٹوکری میرے سر پہ اُڑتی چلی جا رہی تھی آخری زینے پر میں نے سنا اماں کہہ رہی تھیں: "ہمارے ارشد جیسا بیٹا تو دنیا میں چراغ لیکر ڈھونڈے سے نہیں ملیگا۔ ورنہ آج کل کے لڑکے جو چار حرف پڑھ جاتے ہیں تو ہاتھ پاؤں ہلانا گناہ سمجھتے ہیں!"

اندھیرا ہو چلا تھا۔ میں چھت پر کھڑا ہو گیا۔ سامنے منڈیر پر ایک سایہ متحرک نظر آیا۔ دو سائے آگے بڑھے اور پھر ایک ہو گئے۔

میں نے کہا: "سلو خدا کرے یہ پرنالے تو روز ٹوٹا کریں!"

کہنے لگی: "معلوم نہیں دنیا میں کتنے پرنالے ٹوٹتے ہیں اور کتنے سائے چھتوں پر کانپ کانپ کر بڑھتے ہیں اور ایک ہو جاتے ہیں!"

بجلی چمکی، تڑپی، پیچ و تاب کھائے اور بادلوں کی زبان میں دنیا والوں کو نہ معلوم کیا کچھ کہا مگر کوئی کچھ نہ سمجھ سکا۔

اب بھی بجلیاں چمکتی ہیں۔ بادل گرجتے ہیں، تو نہ معلوم کتنی روحیں گلے ملتی ہیں۔

اسعد گیلانی

۱؎ اے میرے محبوب میں تیرے سامنے بیٹھا روتا رہونگا۔ تمہاری محبت میں کڑھتا رہونگا۔ مگر تمہیں اپنے دردِ دل سے آگاہ نہیں کرونگا۔

شکستِ دریوزہ گری

گردشِ ایام پر تجدید ہے چھائی ہوئی
صبح ہے مہکی ہوئی اور شام گرمائی ہوئی

ہو چکا ہے مشرقِ نو سے درخشاں آفتاب
ہر گھنیری چھاؤں میں ہے برق لہرائی ہوئی

کر رہی ہے اب چراغاں ظلمتِ کونین میں
صورتِ تہذیب جو پہلے تھی سنولائی ہوئی

جہل و ناشائستگی کا ٹوٹتا جاتا ہے دم
دیو استبداد کو ہچکی سی ہے آئی ہوئی

چھو رہی ہے آسمانوں کی بلندی ناز سے
سطوت و اخلاق کی تصویر خم کھائی ہوئی

سوز سے پگھلا رہی ہے ظلم کے قلب و جگر
آتشیں تخییل جو پہلے تھی برفائی ہوئی

لیکن اے ہندوستان اے کشورِ فسق و فجور!
آج بھی تجھ پر اندھیری رات ہے چھائی ہوئی!

اے غلام آباد اے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
اے غلامی کے طمانچے عمر بھر کھائے ہوئے

خستہ حالی بام و در پر گلستانوں پر خزاں
جگمگاتے تیرے نظارے ہیں دھندلائے ہوئے

رطب و یابس، خار و خس سے پُر ترے شہر اور گاؤں
لعنتوں کے ہر طرف پرچم ہیں لہرائے ہوئے

شرم اے زرخیز خطے، حیف اے کانِ گہر!!
نصف آبادی ہے درویشی کو اپنائے ہوئے

بے نواؤں سے ہیں یوں لبریز تیری رہگذار
کھیت پر دل ٹڈیوں کے جیسے منڈلائے ہوئے

گڑگڑا کر مانگتے ہیں بھیک ہر رہگیر سے
یہ ترے فرزند، دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے

اِن کے چوڑے چکلے سینے گندگی کی پوٹ ہیں
اِنکے غیرت سوز دل پر ہیں دھوئیں چھائے ہوئے

کوئی ہے نامِ خدا پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
کوئی ناکارہ ہے اک جھولی سی لٹکائے ہوئے

"کان سے بہری ہوں میں، منہ میں زباں رکھتی نہیں"
یہ عبارت کوئی کاغذ پر ہے لکھوائے ہوئے

سوز کی لے میں ہے کوئی رہگذر پر نالہ بار
جسم پر کچھ زخم مصنوعی سے بنوائے ہوئے

رینگتا ہے خاک پر کوئی مکوڑوں کی طرح
بھیک کی خاطر کوئی چلتا ہے لنگڑائے ہوئے

گھر سے نکلا ہے کوئی لیکر فلاکت کا جلوس
خود کو دو بہیوں کے اک چھکڑے پہ لدوائے ہوئے

ہیں بہت سوں کیلئے دنیا میں سامانِ معاش
بال بکھرائے ہوئے اور جسم گدرائے ہوئے

یہ لئے پھرتے ہیں کاندھوں پر جنازہ ملک کا
قبرِ غیرت اور خودداری کی کھدوائے ہوئے

یہ نظر آئیں گے ہر کوچے میں ہر بازار میں
جھڑکیاں کھاتے ہوئے پیرایۂ ادبار میں

سو طرح کے ڈھنگ انکو مانگنے کے یاد ہیں
یہ بہانے ہیں "ہم ہیں بابا مبتلا آزار میں"

خانماں برباد ہیں تقدیر ہے پھوٹی ہوئی
گھر ہمارے بہہ گئے سیلابِ آفت بار میں

زلزلوں کے سخت جھٹکوں سے ہیں گھبرائے ہوئے
آ گئے ہیں ہم زمیں کی فتنہ گر رفتار میں

قحط کی یورش سے دست و پا ہیں مرجھائے ہوئے
اب سکت باقی نہیں جنبش کی جسمِ زار میں!!

یہ بہانے اور یہ دھوکے فسانے ہیں تمام
صاف ہوتی ہے بناوٹ کی جھلک گفتار میں
مانگنے کے اور بھی اس سو مہذب ہیں طریق
سرزمینِ ہند تیری بزم فتنہ کار میں

خانقاہیں، گھاٹ، مندر، مسجدیں، تکیے، مزار
چل رہا ہے بھیک کا ان سب گھروں میں کاروبار
یہ ادارے ہیں جو بیواؤں یتیموں کے لئے
ہے تن آسانوں کا ان کی بھیک پر دار و مدار
شکل میں چندوں کی ہر سُو مانگتے پھرتے ہیں بھیک
مُلک کے یہ جاں فروش اور قوم کے خدمتگذار
یہ محل سے رشوتیں لے لیکے بنوائے ہوئے
درحقیقت بھیک کی لعنت کے ہیں آئینہ دار
قرض دیکر کر رہے ہیں قطع انسانوں کی نسل
چشمِ بینا میں ہیں بھوکے یہ تونگر سُود خوار
ٹیکس اور جرمانے کیا ہیں بھیک کے کشکول ہیں
بھیک کے ٹکڑوں سے ہے نظمِ حکومت پائدار
یہ بھکاری کیا لڑینگے جنگِ آزادیِ مُلک
بھیک پر ہے ان کی کاہل زندگی کا انحصار

ہوں جہاں یہ لعنتیں بے شرمیاں و رخواریاں
سلب کرلیں کیوں نہ ہمت کو وہاں ناکامیاں
ہو جہاں منزل غبار و گرد میں کھوئی ہوئی
کارواں کو کیوں نہ پھر گھیریں وہاں گمراہیاں
روشنی کے راستے میں ہوں نہ کچھ ساماں جہاں
کیوں نہ ہوں ہر سو وہاں چھائی ہوئی تاریکیاں
ہو جہاں قسمت سے ترتیبِ نشیمن ہی غلط
کیوں نہ ٹوٹیں گی وہاں بامِ فلک سے بجلیاں
ہوں جہاں پھیلی ہوئی مہلک وبائیں چار سو
کیوں نہ پھیلیں گی وہاں دربار کی بیچینیاں
گلستانوں پر جہاں صیاد ہوں ٹوٹے ہوئے
کیوں نہ ہوں حدِ نظر تک پھر وہاں ویرانیاں
جاگ اے ہندوستاں فتنوں پہ پانی پھیر دے
پاؤں کے نیچے بجھا دے آتشیں چنگاریاں

مخمور جالندھری

تحلیل نفسی

(بسلسلہ نمبر ۴۸)

کفایت شعاری کے سادہ ترین تصور یعنی اختصارِ الفاظ اور تلازم معانی سے پیدا ہونے والی نفسی کفایت شعاری کا ذکر کیا تھا تب ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ محض اختصار مزاح نہیں پیدا کر سکتا۔ اگرچہ ابتدا میں وہ انبساط جو لفظوں اور خیالات کے تانا بانا بننے سے پیدا ہوتا ہے محض کفایت شعاری کا نتیجہ ہے لیکن جب تفریح منزل مزاح میں داخل ہوتی ہے تو اس وقت کفایت شعاری کے اصول کے نئے نئے استعمال ڈھونڈھے جاتے ہیں۔ وگرنہ عین ممکن تھا کہ لفظوں کے تکرار اور پر معنی جدید ترکیبوں سے جو کچھ بھی نفسی قوت بچائی جائے وہی قوت (بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ قوت) دماغی افعال میں خرچ ہو جائے اور کفایت شعاری کا اصول بے معنی بن کر رہ جائے اس بات کو واضح کرنے کیلئے فرآئڈ نے ایک تجارتی فرم کی مثال پیش کی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں اس کا آزاد ترجمہ ہدیۂ ناظرین کر دیا جائے "جب تک فرم کے لین دین کا پیمانہ مختصر ہے تب تک عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اخراجات بہت کم اٹھائے جائیں اور ہاتھ تنگ رکھا جائے۔ بعد میں جب تجارتی تعلقات خوب پھیل جائیں تو تجارتی خرچ خود بخود ہی نسبتاً کم ہو جائیں گے اور اس وقت اگر لین دین اور نفع کی مناسب مقدار قائم رہی تو جتنا بھی خرچ اٹھایا جائیگا مناسب معلوم ہوگا۔ بلکہ اس وقت تجارتی خرچ کو کم کرنا ایک طرح کی غلطی اور نقصان ہوگا۔ ساتھ ہی یہ خیال کرنا کہ اتنے خرچ کرنے سے نفع کی صورت پیدا نہ ہو سکے گی غلط معلوم ہوتا ہے اسی تجارتی مثال کی طرح ہماری نفسی کفایت شعاری بھی مروجہ اصولوں پر عمل کرنے سے ایک وجہ انبساط بنتی ہے۔

(تا باقی و ماہتاب باقی)

انور مختار صدیقی

ناک کا مسّہ

بلقیس کی قسمت کا فیصلہ ایک مسّہ نے کیا۔ اگر اُسکے چہرے پر وہ مسّہ نہ ہوتا تو جو رنج اسکی وجہ سے اُسکے عزیزوں کو پہونچے، نہ پہونچتے جو صدمے اُسے اور اُسکے والدین کو اُٹھانے پڑے نہ اُٹھانے پڑتے، جو بدمزگیاں خاندان بھر میں پیدا ہوئیں نہ پیدا ہوتیں۔ اور یقیناً اُس کی زندگی بالکل مختلف ہوتی ـــ،

قدرت کی ستم ظریفیاں بھی بعض اوقات عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ یہ قدرت کا مذاق ہی تھا کہ اُس نے بلقیس کے چہرے کو ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالا مگر اُس پر ایک بدنما داغ لگا کر اپنی صناعی کے بہترین نمونے کو اپنے ہی ہاتھ سے تباہ کر دیا۔ اور داغ بھی لگایا تو اس مقام پر جو آنکھوں کے بعد بلقیس کے تمام چہرے میں اُسکے حسن کی جان تھا۔

وہ مسّہ بلقیس کی سُبک اور سُتواں ناک کے نہایت خوبصورتی کے ساتھ ترشے ہوتے نتھنے پر تھا۔ پہلے تو یہ مسّہ اتنا چھوٹا تھا کہ سرمہ کے ٹیکے کی طرح معلوم ہوتا تھا، اور بلقیس کے معصوم چہرے کو بدنما بنانے کے بجائے اُسے اور دلآویز کر رہا تھا۔ اُسکے والدین اُس کا حسن و جمال دیکھ دیکھکر دل ہی دل میں خوش تھے۔ اُنہیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ایسی مہ پارہ لڑکی کیلئے بر کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ شادی کے بازار میں لڑکی کی قیمت اُس کے حسن سے مقرر ہوتی ہے۔ ان کی بیٹی کے پاس جنسِ حسن موجود تھی، اُسکے خریدار بآسانی پیدا ہوجائینگے۔

لیکن اُنکی خوشی زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی۔

بلقیس کی عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی اُس کا مسّہ زیادہ سیاہ، زیادہ بڑا اور زیادہ بدنما ہوتا گیا۔ پہلے تو وہ سُرمے کے ٹیکے کی طرح تھا لیکن جب بلقیس اپنے حسن کی انتہا پر پہونچی اور اُس کا چہرہ نو شگفتہ گلاب کی طرح شاداب اور سُرخ ہوگیا تو یہ مسّہ ایک بڑے کالے بھونرے کی طرح معلوم ہونے لگا جو بیدردی کے ساتھ اسکے حسن کو چوس رہا تھا۔

اوّل اوّل بلقیس اس کالے بھونرے سے بالکل بے خبر تھی کیونکہ ابھی وہ دن نہیں آئے تھے جب عورت کو خود اپنے حسن میں دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے۔ اُسے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ ایک دولت کی مالک ہے جسے ایک چور لوٹ رہا ہے۔ اسکو نہ بناؤ سنگار کی پروا تھی نہ آئینہ میں منہ دیکھنے کی۔ اُسکا زیادہ وقت کھیلنے کودنے اور ہنسنے بولنے میں گزرتا تھا۔ اگر اُسکی ماں اس کا بناؤ سنگار کرتی تو اُسے ناگوار ہوتا تھا۔ مگر جب جوانی نے اُسے بچپن کے خواب سے جگایا تو اُسکے دل میں احساسِ حسن پیدا ہوگیا۔ اب وہ بالوں کو سنوارتی، آنکھوں کو سُرمے سے جِلا دیتی، رُخسار کو غازہ سے گلگوں بناتی۔ اور جب کبھی موقع ملتا آئینے میں اپنا حُسن دیکھکر محظوظ ہوتی۔ لیکن جب اُس کی نظر اُس کالے کالے بدشکل مسّے پر پڑتی اس کا دل مُرجھا جاتا۔ وہ اُسکی آنکھ میں بل کے کوئلے کی طرح چبھتا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اُسے نوچ کر پھینک دے۔ مگر ایسا کرنا اُسکی طاقت سے باہر تھا۔ آخر کار چُبھتے چُبھتے مسّہ نے اُسکی آنکھوں میں جگہ کر ہی لی اور کھٹک کم ہوگئی۔ مسّہ کو روز دیکھتے دیکھتے بلقیس اسکی عادی ہوگئی اور اُس کا وہ پہلا گھناؤنا پن جاتا رہا۔ وہ اسکو نظر انداز کرنے لگی۔ جب وہ آئینے میں اپنا مسّہ دیکھتی تو خود بخود وہی رُخ سامنے رکھتی جس پر مسّہ نہیں تھا لوگوں سے باتیں کرتی تو بھی زیادہ تر چہرے کے مسّہ والے حصّہ کو مُڑا ہوا رکھتی۔ اس طرح اسکو گردن ذرا ٹیڑھی کرکے باتیں کرنیکی عادت ہوگئی۔

مسّہ اس سے زیادہ اُسکے والدین کو تکلیف دے رہا تھا۔ پہلے تو یہ اُنہیں اسلئے آنکھ کے تل کی طرح عزیز تھا، لیکن جب سے یہ بڑھا تھا اور اُس پر بال نکل آئے تھے، یہ اُنکی آنکھوں میں اس طرح کھٹک رہا تھا گویا کہ اُنکے ایک ایک پپوٹے کے اندر ایک ایک مسّہ نکل آیا ہو۔ کئی مرتبہ اُنکے جی میں آیا کہ بلقیس کی ناک سے مسّہ کو ہٹوا کر اُسکے دل کی خلش اور اپنی آنکھوں کی کھٹک کو ہمیشہ کیلئے دُور کر دیں، لیکن اس خیال سے چُپ ہو رہے کہ کہیں مسّہ نکلوانے سے اسکو بہت تکلیف نہ ہو اور اُسکی شکل نہ بگڑ جائے۔ اُنکی تقدیر سے کچھ ایسے قدرتی اسباب پیدا ہوگئے کہ اُنکی آنکھوں کی کھٹک ایک حد تک کم اور قابلِ برداشت ہوگئی۔ بلقیس کیلئے بغیر ڈھونڈے ایک اچھا بر مل گیا اور اس کی نسبت ہوگئی۔

بلقیس کی نسبت اُس وقت ہوئی جب وہ کُل تیرہ سال کی تھی۔ ابھی مسّہ چھوٹا تھا اور بجائے بدنما معلوم ہونیکے خاصا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ بلقیس کو اُسکے ماموں زاد بھائی وحید نے اپنا شریکِ زندگی بنانے کیلئے پسند کیا۔ وحید اس وقت بیسویں سال میں تھا اور بی۔ اے کی ڈگری لیکر ولایت جانیوالا تھا۔ اُسکے والدین نے یہ مناسب سمجھا کہ اُسکے ولایت روانہ ہونے سے قبل اُسکی منگنی کر دیں۔ گھر میں لڑکی موجود تھی۔ لڑکے کی مرضی پاکر والدین نے بات چیت شروع کر دی۔

شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکیوں کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلقیس سے بھی نہیں پوچھا گیا کہ وہ وحید کو پسند کرتی ہے یا نہیں۔ اور اس سے پوچھنے کا نتیجہ کچھ ہوتا بھی نہیں کیونکہ وہ ناسمجھ لڑکی تھی تاہم وحید بھائی اُسے اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ گھر بھر میں سب سے زیادہ کالے تھے اور اُنکے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ انکو غصہ اکثر آتا رہتا تھا۔ وہ اس سے اتنی نرمی سے بات نہیں کرتے تھے جتنے اُسکے اور ماموں زاد اور چچا زاد بھائی۔ اسلئے وہ اُنکو اوروں کے برابر پسند نہیں کرتی تھی۔ اگر وہ جوان ہوتی تو شاید وحید بھائی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیتی۔ لیکن اس سے ہوتا کیا تھا۔ اسکے ماں باپ کو رشتہ پسند تھا۔ لڑکا ہونہار تھا۔ اسکے والدین کے پاس کافی دولت تھی، اور خود اُس کا مستقبل کافی روشن نظر آرہا تھا، اس لئے نسبت ہوگئی اور یہ طے پایا کہ وحید کے ولایت سے آتے ہی شادی ہو جائیگی۔

وحید تعلیم کے سلسلہ میں چار سال آکسفورڈ میں رہا اور علم المعیشت میں ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں لیکر کامیاب و سُرخرو ہندوستان واپس آیا۔ آتے ہی اُسے محکمۂ فنانس میں ساڑھے تین سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ اب خود اُسے اور اُسکے والدین کو شادی کی فکر ہوئی۔ نکاح کی تاریخ مقرر کرنے کیلئے بات شروع ہوگئی۔ تیاریاں دونوں طرف سے پہلے ہی ہو چکی تھیں، تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔

بلقیس کے والدین خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ انکو بے محنتُ مشقت ایسا داماد مل گیا تھا جیسا دوسروں کو برسوں کی تلاش کے بعد بھی نہیں ملتا۔ اس میں چند عیب ضرور تھے۔ وہ بدشکل تھا، بدمزاج تھا۔ کچھ مغرور بھی تھا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ اُس میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ ذہین اور ہونہار تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انکی لڑکی بہت بھاگوان ہے۔

خود بلقیس کو نہ شادی کی کوئی خاص خوشی تھی نہ رنج۔ اور بہت سی لڑکیوں کی طرح وہ بھی سو شادی کے دن نہیں گِن رہی تھی۔ اسکو اس خیال سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوتی تھی کہ وہ وحید کی شریکِ زندگی بننے والی ہے۔ جب کوئی جان کر اُسکے سامنے وحید کا تذکرہ کرتا اور اُسکی قابلیت کی تعریفوں کے پُل باندھتا تو اسکے جسم میں خوشی کی لہر نہیں دوڑتی تھی اور اسکو دیکھنے یا اُس سے ملنے کی آرزو پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وحید اسکے لئے سراسر دلکشی سے خالی تھا۔ اُس نے وحید کو ایک معصوم اور ناسمجھ لڑکی کی آنکھ سے دیکھا تھا۔ جو نقوش اسکے دل پر اُس زمانے میں قائم ہوئے تھے وہ بہت دُھندلے اور دلکشی سے خالی تھے۔ اُس کا فوٹو بھی جو جوانی میں اس نے دیکھا تھا، اُسے پسند نہ آیا تھا۔ جب اُسکی سہیلیاں اُسے یہ کہکر چھیڑتیں کہ اُس کا دولھا کالا اور بدشکل ہے تو اُسے دلی رنج ہوتا۔ شادی اُسے ایک مرحلہ معلوم ہو رہی تھی جس پر سے گزرنا اس کا فرض تھا۔ اس فرض کو پورا کرنے کیلئے وہ سکون آمیز استقلال اور مردانہ دلیری کے ساتھ تیار تھی۔

وحید کی حالت اُس سے جُدا تھی۔ وہ نکاح کا ایک ایک دن گِن رہا تھا۔ اس کا اشتیاق خاص طور پر اس لئے بڑھا ہوا تھا کہ جب سے بلقیس کے ساتھ اس کی نسبت ہوئی تھی اُس نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ جوان ہوکر اسکی شکل کیسی ہوگئی ہوگی۔ جب اُسنے آخری مرتبہ اُسے دیکھا تھا ــــ اُسے اب پانچ سال سے زیادہ ہوگئے تھے ــــ تو وہ ایک بھولی بھالی، الھڑ، تیز و طرار لڑکی تھی۔ اسکے خدوخال بہت سبک اور موزوں تھے اور اس بات کا یقین دلاتے تھے کہ وہ جوان ہوکر بہت دلفریب حُسن کی مالک ہوگی، اس وقت اس کا معصوم حُسن اور بھولپن کی پیاری ادائیں اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر ان میں وہ دلفریبی نہیں تھی جو عورت کی ہر ہر حرکت میں مرد کیلئے ہوتی ہے۔ مگر اب ــــ اب تو اس میں جوانی کی سحرکاریاں پیدا ہوگئی ہوں گی۔ وحید تخیل کی مدد سے بلقیس کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچتا۔ وہ جوان ہوکر اسکے تصور میں آتی۔ وہ اُسکی آنکھوں میں جوانی کا رس بھرا ہوا دیکھتا۔ اُسکے چہرے میں اب بچپن کے پُرسکون رنگ کی جگہ جوانی کی التہاب پیدا کرنیوالی آگ سلگتی ہوئی نظر آتی۔ اُسکے بال جو کبھی صرف شانوں پر پڑے رہتے تھے اب کمر تک لہراتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اس کا جسم بجلیوں کا بھرا ہوا معلوم ہوتا۔ اُسے اس خیال سے خوشی ہوتی کہ یہ عورت اب اسکی ہونیوالی ہے۔ اور اُسکے ہونٹوں پر کامیابی کا تبسم آجاتا۔

لیکن پھر وہ سوچتا کیا میں اسکے لئے موزوں شوہر ہوں۔ وہ خوبصورت ہے اور میں بدشکل۔ اگر اُسنے مجھے پسند نہ کیا اور دونوں میں نہ نبھی تو پھر؟ مگر بدشکل ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر اُسکے پاس حُسن کی دولت ہے تو میرے پاس فن اور علم کی۔ اگر وہ نرم و نازک ہے پھولوں کی طرح تو میں طاقتور اور مضبوط ہوں شمشیر کی طرح۔ وہ اپنی خوبصورتی سے تھوڑی دیر کیلئے میرا دل لُبھا سکتی ہے تو میں اُسے اپنے زورِ بازو سے محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس دولت ہے۔ میں اُسکے حُسن میں اضافہ کر سکتا ہوں۔

کیا واقعی وہ میرے موزوں بیوی ہے۔ وہ ضرور حسین ہوگی۔ لیکن حُسن ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے آتے ہیں جب حُسن میں دلکشی نہیں رہتی۔ اگر میری زندگی میں ایسا ہی وقت آیا تو پھر؟ حُسن کے علاوہ بلقیس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ وہ علم سے بے بہرہ ہے۔ اسکی ذہنی سطح بہت ہی نیچی ہے۔ وہ ان بلندیوں پر کبھی نہیں پہونچ سکتی جہاں میں ہوں۔ پھر وہ کیسے اچھی شریکِ زندگی بن سکتی ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی وہ محسوس کرتا کہ اس سے شادی کرنے میں

بلقیس کوئی قربانی نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ وہ بلقیس پر احسان کر رہا ہے۔ اگر وہ چاہے تو ہر خوبصورت اور تعلیمیافتہ عورت سے شادی کر سکتا ہے۔

وحید کیلئے بلقیس میں صرف ایک لفریبی تھی ـــ اس کا حُسن ایک دن یہ بھی جاتی رہی۔ وہ دن آن دونوں کی زندگی میں بیحد اہم تھا کیونکہ اس میں ان کی قسمتوں کا فیصلہ ہو گیا۔

وحید کی شادی میں دس دن باقی تھے۔ وہ اپنے چچا زاد بھائی اور بے تکلف دوست راحت سے باتیں کر رہا تھا۔

"یار ہندوستان میں یہ کیا فضول رسم ہے کہ منگنی ہوتے ہی لڑکی کو اُسکے ہونیوالے شوہر سے چُھپا دیا جاتا ہے آخر اس میں مصلحت کیا ہے"!

راحت نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا "شاید مصلحت یہ ہے کہ کچھ عرصے تک مرد کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنے کی وجہ سے لڑکی اسکے لئے زیادہ دلکش بنجائے جس چیز کو آدمی روزانہ دیکھتا رہتا ہے وہ اُسکی آنکھوں میں چڑھ جاتی ہے اور دل سے اُتر جاتی ہے۔ انگریزی کی مثل ہے نا کہ۔ Familiarity breeds Contempt

"ہا ہا ہا۔ بات تو بڑی فلسفیانہ کہہ رہے ہو مگر...."

"ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے...."

"وہ بھی کہہ ڈالو۔ تم تو ہر پُرانی رسم کے حامی ہو نا؟"

راحت نے اُسکی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا "منگنی کے بعد مرد عورت سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ہو گئے۔ یہ احساس اکثر خطرناک ہوتا ہے شادی سے پہلے ان دونوں کے لئے بہت خراب نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں"

"کیا خراب نتیجے پیدا ہو سکتے ہیں" وحید نے سینہ پُھلا کر اور کرسی پر تن کر بیٹھتے ہوئے پوچھا گویا کہ وہ بحث کیلئے کمربستہ ہے۔

"تم خود غور کر لو"

"میں نے خوب غور کیا ہے مگر مجھے تو یہ ہندوستانی رسم حماقت سے لبریز نظر آتی ہے۔ یورپ میں منگنی کے بعد مرد عورت بہت آزادانہ ملتے ہیں اور کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلتا"

"نتیجوں کی اچھائی بُرائی سمجھنے والے پر ہوتی ہے۔ جو چیز تمہاری نگاہوں میں اچھی ہے وہ لاکھوں ہندوستانیوں کی نظر میں بُری ہو سکتی ہے"

"میرے خیال میں تو عورت مرد کے ملنے سے نقصان کے بجائے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح ان کی زدواجی زندگی میں مدد ملتی ہے"

"کبھی کبھی وہ اتنی اچھی طرح ایک دوسرے کو سمجھنے لگتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہی مثل یاد کر لو Familiarity breeds contempt. شادی سے پہلے ہی ازدواجی زندگی کا لُطف اُٹھانے کے بعد جب اُنکی نیتیں سیر ہو جاتی ہیں تو پھر اپنی نئی شریک زندگی کی تلاش کرنی پڑتی ہے"

"تمہارے تو یار وہی دقیانوسی خیالات ہیں تمہیں کوئی کیا خاک سمجھائے۔ مگر مجھے تو یورپ کا طریقہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جب ایک چیز ایک شخص سے منسوب ہو گئی تو پھر اس کو چُھپانا کیا معنی رکھتا ہے"

"کیا آجکل بلقیس کی یاد بہت ستا رہی ہے" راحت نے معنی خیز تبسم کے ساتھ پوچھا۔

"بات تو یہی ہے"

"یوں کہو۔ پھر ناک اسقدر چکر دیکر کیوں پکڑی۔ پہلے ہی صاف اُردو میں کہدیتے کہ مجھے بلقیس کا پردہ بہت ناگوار ہے"!

"مجھے واقعی بلقیس کا چھپنا بہت ناگوار ہے۔ پانچ سال سے میں نے اسکی شکل بھی نہیں دیکھی"!

"تو کیا ہے۔ بہت گئی تھوڑی رہی۔ ایک ہی ہفتہ کی تو بات ہے۔ پھر خوب جی بھر کر دیکھ لینا"

"نہیں میں اُسے شادی سے پہلے دیکھنا چاہتا ہوں ... اور میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا ... اب تو یار وہ بہت بدل گئی ہو گی" اُسنے لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی زیادہ بدلی بھی نہیں"

"تم روز دیکھتے ہو، تمہیں کیا تبدیلی معلوم ہو گی۔ میرے لئے تو وہ بالکل ہی نئی ہستی ہو گی۔ جب میں نے پانچ سال پہلے اُسے دیکھا تھا تو وہ ایک ناسمجھ لڑکی تھی۔ اب جوان عورت ہے۔ یہ کیا کم تبدیلی ہے۔ اس میں تو اب زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہو گا"

"مجھے تو صرف ایک فرق نظر آتا ہے"

"وہ کیا" وحید نے بڑا شتیاق لہجے میں پوچھا۔

"نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ تمہیں شاید رنج ہو گا"

"کیوں کیا ہوا؟ کیا چیچک نکل آئی، یا گال پر پھوڑا ہو گیا، یا eczema ہو گیا، یا بہت موٹی ہو گئی، یا ....."

"رہنے دو یار، کیا بُری بُری باتیں مُنہ سے نکال رہے ہو"

"اور اسکے علاوہ رنج کا کیا سبب ہو سکتا ہے"

"یہ سب کچھ تو نہیں ہوا ....."

"پھر آخر کیا ہوا" وحید نے بے صبری سے کہا۔

"بات صرف اتنی سی ہے کہ بلقیس کی ناک پر جو مستہ تھا وہ بڑا ہو گیا ہے"

"واقعی؟" وحید نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!" راحت نے جواب دیا۔

"کیا بہت بڑا ہو گیا ہے؟"

"ہاں بہت بڑا۔ اور اُس پر کالے کالے بال بھی نکل آئے ہیں۔"

"تو اس سے تو اسکی شکل بگڑ گئی ہوگی۔"

"ہاں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چاند کو گرہن لگ گیا۔"

"تب تو یار میں ضرور دیکھونگا۔ تم کوئی ترکیب بتاؤ۔"

"دیکھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ اب تو نکاح کے بعد ہی دیکھنا۔"

"نہیں، میں نکاح سے پہلے دیکھوں گا۔ حیرت ہے کہ اس کا ذکر پہلے کسی نے مجھ سے نہیں کیا۔"

"ذکر کرنے سے فائدہ کیا تھا۔ تمہیں اور اُلٹا رنج ہوتا۔ میں بھی باتوں باتوں میں کہہ گیا، ورنہ نہ کہتا۔"

"یار اب بلقیس کو دکھانے کی کوئی ترکیب کرو۔" وحید نے مصر ہوتے ہوئے کہا

"بلقیس کو دکھانا تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ ہمارے یہاں حامدہ کے پاس اکثر آتی رہتی ہے۔ کل ہی اُسے بلایا جا سکتا ہے۔ اور تم چھپ کر اُسے دیکھ سکتے ہو۔ مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا۔"

"نہیں راحت میں اُسے ضرور دیکھونگا۔ کل تم اُسے حامدہ سے کہکر بلا لو۔"

یہ چیز وحید کیلئے بالکل نئی تھی۔ اس سے اسکو تعجب اور افسوس ہوا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ بلقیس اب پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہو گئی ہوگی۔ اسی لئے وہ اُس سے شادی کرنیکے واسطے تیار تھا۔ ورنہ وہ جانتا تھا کہ اس کیلئے اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر اسکی نسبت بلقیس سے نہ ہو چکی ہوتی تو شاید وہ کسی اور لڑکی سے شادی کرتا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ وہی مسّہ جو ایک دن بلقیس کے حُسن کو چار چاند لگا رہا تھا اب اس پر کالی گھٹا کی طرح چھا جائیگا۔

وہ دن وحید نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ راحت کی گفتگو کے بعد سے برابر اُسکے سامنے بلقیس کے مسّہ کا تصور بندھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مسّے کے بہت بڑے ہو جانے سے اسکی شکل کیسی بگڑ گئی ہوگی۔ تخیل میں مسّہ اسکو بہت ہی بڑا، بہت ہی کالا اور بہت ہی بدنما نظر آ رہا تھا۔ اُسنے پہلے بھی دو ایک عورتوں کے چہرے پر مسّے دیکھے تھے۔ واقعی اُن سے شکل بگڑ جاتی ہے.... اور پھر ناک کا مسّہ.... اس خیال ہی سے اسکو تکلیف ہوتی تھی۔

بڑی مشکل سے وہ دن اور رات کٹی۔ دوسرے روز وحید بلقیس کو دیکھنے پہونچا جس ہال میں وہ بیٹھا تھا اُسکے برابر والے کمرے میں بلقیس کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ جب وہ پہونچا ہے تو بلقیس نہیں آئی تھی۔ اسلئے وقت گزارنے کو وہ راحت سے باتیں کرنے لگا۔ مگر اُس کا دل باتوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ آخر کار دُور ہی سے اُسنے بلقیس کے ہنسنے کی آواز سُنی۔ اس آواز کو وہ بھولا نہیں تھا۔ یہ وہی آواز تھی جس سے کبھی اُسکے دل میں عجیب عجیب جذبات پیدا ہونے لگتے تھے۔ اس میں اب لوچ اور گہرائی آ گئی تھی۔

اُسکی آواز سُنتے ہی وحید اُٹھ کھڑا ہوا اور بیتابی کے ساتھ ایک باریک دراز میں سے جھانکنے لگا۔ اُسکا دل دھک دھک کر رہا تھا اور چہرے پر کچھ عجیب قسم کے آثار تھے۔ جب بلقیس کمرے میں داخل ہوئی تو اُسکے چہرے کا عین وہی رُخ وحید کے سامنے تھا جس پر مسّہ تھا۔ مسّہ اب اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اتنے فاصلہ سے بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ واقعی راحت نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ مسّے نے بلقیس کے حُسن پر سیاہی پھیر دی تھی۔ اسکی ناک پر وہ کیسا بدنما معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سنگِ مرمر کی دیوار پر کالا سا اُپلا۔

وحید جب بلقیس کو دیکھکر ہٹا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اور وہ بالکل خاموش تھا۔ اُسکی حالت دیکھکر راحت نے تعجب سے پوچھا "کیوں خیر تو ہے۔ یہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیسی اُڑنے لگیں۔"

وحید کے خیالات ابھی مسّے پر منڈلا رہے تھے۔

"مسّہ تو واقعی بہت ہی بدنما معلوم ہوتا ہے میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنا بڑا، اتنا کالا اور اسقدر حسن کُش ہو گیا ہوگا۔"

"ہاں بلقیس کے چہرے پر مسّہ پیدا کر کے قدرت نے اُسکے ساتھ ظلم کیا ہے۔"

وحید سوچ میں پڑا ہوا تھا۔

"تم آخر اس قدر چپ کیوں ہو؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ اس مسّے کا کچھ علاج ہونا چاہیئے۔"

"مسّے کا صرف ایک علاج ہے۔ وہ یہ کہ اسے کٹوا دیا جائے۔"

"ہاں اسے کٹوانا چاہیئے۔"

"جب شادی ہو جائے تو کٹوا دینا۔ اس سے بلقیس کو تکلیف تو ہوگی کیونکہ مسّہ بہت بڑا ہے۔ اور ممکن ہے اُسکی ناک پر آپریشن کا نشان ہمیشہ رہے۔"

"مسّہ ابھی کٹنا چاہیئے۔"

"کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ شادی میں گیارہ دن باقی ہیں اتنی جلدی کیسے زخم ٹھیک ہوگا۔"

"زخم ٹھیک نہیں ہوگا تو شادی ملتوی کی جا سکتی ہے۔"

"شادی ملتوی کرنے کو کیا تم نے کھیل سمجھ لیا ہے۔ تمام انتظامات ہو چکے ہیں۔ بلاوے بھیجے جا چکے ہیں۔ ذرا سوچو تو سب کو کتنی زیر باری ہوگی اور کسقدر شرمندگی اُٹھانی پڑیگی۔"

"مگر شرمندگی اور زیر باری کے خیال سے میں اپنے سر ایک کوفت تو نہیں لے سکتا۔ اگر مسّہ ٹھیک نہ ہوا تو وہ میرے لئے ہمیشہ سوہانِ روح رہیگا۔"

"تو اسکے یہ معنی ہیں کہ اگر آپریشن کے بعد بلقیس کی ناک کا عیب

نہ کٹا تو تم اس سے شادی نہ کروگے؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

اُسکی اس صاف گوئی پر راحت کو غصہ آیا۔ وہ خود بہت صاف گو تھا۔ اُس نے اُسی لہجے میں کہا جس میں مذاق بھی تھا اور سختی بھی۔ "کیا خوب! ایک مسّہ آپ کیلئے سوہانِ رُوح ہوجائیگا۔ ذرا آئینہ میں اپنی شکل دیکھو۔ اگر شادی کی کامیابی میاں بیوی کی خوبصورتی پر ہو تو کیا تمہاری شکل کی وجہ سے بلقیس کی زندگی عذاب نہیں ہوجائیگی؟"

اس جملہ کا نتیجہ راحت کی اُمید سے زیادہ خراب ہوا۔ وحید سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بھڑک اُٹھا۔ ہمیشہ سے وہ مخالف تنقید کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اگر کوئی اُسکی بات میں ذرا بھی نقص نکالتا تو وہ بھناجاتا تھا اور نکتہ چیں کو فراموش نہیں کرتا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ بدشکل ہے لیکن اگر کوئی مذاق میں بھی اُسکی بدشکل ہونیکی طرف اشارہ کرتا تو وہ غصہ سے تلملا جاتا تھا۔ وحید کی کھلم کھلا تنقیص سے اُسکے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اُسنے درشتی کے ساتھ کہا: "مجھے اپنی باتوں کا اختیار ہے۔ آپ خوبصورت ہیں تو آپکو دوسروں کو بدشکل کہنے کا کیا حق ہے۔ ہر شخص اپنے لئے اچھی چیز چاہتا ہے۔ میں خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور کرسکتا ہوں۔ میرے پاس علم ہے، دولت ہے، طاقت ہے۔ میں جہاں چاہوں شادی کرسکتا ہوں۔"

"یہ مُنہ اور مسور کی دال!" راحت کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔ اس کا غصہ بھی تیز ہوگیا تھا۔

وحید نے یہ جملہ سُن لیا اور آگ بگولا ہوگیا۔ راحت ذرا مُنہ سنبھالکر بولو۔ تم مجھ سے چھوٹے ہو۔ چھوٹوں سے مَیں کسی قسم کی گستاخی پسند نہیں کرتا۔"

وہ دونوں ہال کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے تاکہ دوسرے کمرے میں آواز نہ جائے۔ مگر غصہ آتے ہی اُن کی آوازیں اُونچی ہوگئیں۔ راحت ڈرا کہ اگر اُنکی گفتگو اندر سُن لی گئی تو غضب ہوجائیگا اُسنے بات رفع دفع کرنے کیلئے کہا: "بھائی صاحب، گستاخی ہوئی۔ مَیں معافی چاہتا ہوں، آئندہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ اچھا اب تم باہر چلو۔ اگر کسی کو معلوم ہوگیا کہ میں تمہیں بلقیس کو دکھانے کیلئے یہاں لایا ہوں تو مُفت کی شرمندگی اُٹھانی پڑیگی۔" اسکے لہجہ میں ابھی کچھ سختی باقی تھی۔

وحید اُٹھ کھڑا ہوا۔ راحت اس کو ساتھ لیکر باہر گیا۔

راحت کا غصہ معدنیات کی گرمی کی طرح تھا جو معمولی ٹھنڈک سے کم ہوجاتی ہے۔ باہر پہونچتے پہونچتے اُسکی طبیعت اعتدال پر آگئی تھی۔ پہلے بھی معمولی معمولی باتوں پر اُسکی وحید سے لڑائیاں ہوچکی تھیں۔ مگر چاہے وہ جذبات کی رَو میں کچھ کہہ جاتے دل میں بات نہ رکھتا تھا اور لُوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑ لیتا تھا۔ اسکو اسوقت اپنی غلطی کا احساس ہورہا تھا۔ اُسنے میل کرنے کیلئے کہا، "میں نے تمہارے ساتھ کی تھی نیکی اور ہوگئی بدی۔ اچھا ہوتا کہ تم بلقیس کو نہ دیکھتے۔ بیکار اپنی طبیعت بدمزہ کی۔ شادی کے بعد اُس سے ملتے تو اُسکی شخصی خوبیاں مسّے وسّے کو بھلادیتیں۔"

وحید اب بھی ایسے گرم پانی کی طرح تھا جس میں اُبال آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو۔ "اچھا ہوا کہ تم نے اسوقت بلقیس کو مجھے دکھا دیا۔ بیماری سے پہلے ہی اُسکا علاج کرلینا اچھا ہوتا ہے۔ میں شادی سے پہلے بلقیس کا مسّہ ضرور کٹواؤں گا۔ اگر مسّہ نہ کٹا یا ٹھیک نہ ہوا تو شادی نہ کرونگا۔"

راحت نے اسوقت اس سے زیادہ اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔ "اچھا تم بعد میں غور کرلینا۔ جیسا مناسب معلوم ہو ویسا کرنا۔"

وحید بغیر سلام دُعا کے چلا گیا۔ راحت پچھتا رہا تھا کہ ناحق اُسنے اُسکے سامنے مسّے کا ذکر کیا۔ اب اگر شادی میں جھگڑا پڑے تو اس کا الزام اُس کے سر ہوگا۔ لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ وحید ایسا اوچھا آدمی ہے۔ وہ اُس کے کردار پر غور کررہا تھا۔

راستہ بھر وحید راحت کی گفتگو اور بلقیس کے مسّے پر غور کرتا رہا۔ کبھی مسّے کا خیال پیش منظر میں آجاتا، کبھی راحت کی گفتگو۔ یہ الفاظ اب بھی اُسکے دماغ میں سُلگ رہے تھے "یہ مُنہ اور مسور کی دال!" یہ منہ اور مسور کی دال! کیا خوب! وہ بدشکل ہے تو کیا ہوا۔ اُسکے پاس علم ہے، دولت ہے، طاقت ہے۔ بلقیس تو کیا چیز ہے، وہ جس عورت سے چاہے شادی کرسکتا ہے۔ خوبصورت ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ دکھا دیگا کہ بدشکل ہونے کے باوجود وہ کیا کچھ کرسکتا ہے۔ بلقیس کا مسّہ کٹے گا اور ضرور کٹے گا۔ کون اُسکے حکم سے سرتابی کرسکتا ہے۔ اگر بلقیس نے یا اُسکے والدین نے مسّہ کٹوانے سے انکار کیا تو وہ شادی سے انکار کردیگا۔ کوئی اُس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ وہ راحت کو دکھا دیگا کہ وہ کتنی خوبصورت عورت سے شادی کرسکتا ہے۔ یہ مُنہ اور مسور کی دال! کیا خوب! وہ دکھا دیگا کہ بدصورت ہونا کوئی بدقسمتی نہیں ہے۔ طاقت، طاقت کے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ نہیں وہ ہرگز ہرگز بلقیس سے شادی نہیں کریگا جبتک کہ اس کا مسّہ نہ کٹ جائے۔ مسّہ نے اسکو کسقدر بدشکل کردیا تھا۔ مسّہ اُسکی آنکھوں کے سامنے کالے پہاڑ کی طرح آیا جس نے بلقیس کے حُسن کو چُھپا دیا۔

انہیں خیالات میں اُلجھا ہوا وہ گھر پہونچا۔ سب سے پہلا کام جو اُس نے کیا یہ تھا کہ اپنی ماں کو اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔ اُسکی ماں اور چھوٹی بہن اُس وقت کمرے میں بیٹھی ہوئی دُلہن کا جوڑا تیار کررہی تھیں۔ وہ خاموشی سے جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ مگر وہ کام میں اسقدر محو تھیں کہ اُنہوں نے اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ اُسنے اپنے ہاتھ ملتے ہوئے ذرا تلخی سے کہا، "ہر بات مجھ سے پوشیدہ کیوں رکھی جاتی ہے؟"

اُسکے اس غیر متوقع اور بے تکے سوال پر اُن دونوں نے ایک ساتھ اپنی گردنیں اُٹھائیں۔ ماں نے حیرت سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"آپ لوگوں میں سے کسی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ بلقیس کی ناک کا مسّہ بہت بڑا ہو گیا ہے"

اب تو اُن دونوں کو اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ اُسے کیسے معلوم ہو گیا کہ بلقیس کی ناک کا مسّہ بڑا ہو گیا ہے۔ ماں کو اس کی بے جھجک گفتگو کچھ ناگوار بھی ہوئی۔

"تم سے کس نے کہا؟"

"میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں"

"اے بیٹا صد رحمت ہے تجھ پر۔ شادی ہوئی بھی نہیں کہ تو لڑکی کو دیکھ آیا۔ دس دن تو اور صبر کیا ہوتا"

"دس دن اور صبر کرتا تو آپ بلقیس کو میرے سر منڈھ ہی دیتیں۔ اچھا ہوا کہ میں نے نکاح سے پہلے اسکی شکل دیکھ لی"

"شکل کو کیا ہوا؟"

"مسّے سے اُس کی شکل بگڑ گئی ہے"

"اے اپنے حواسوں پر سے صدقے۔ کیا شکل بگڑ گئی ہے جیسی پہلے تھی ویسی ہی اب بھی ہے"

"آپ نہیں جانتیں، مسّہ مجھے بہت ہی بُرا معلوم ہوتا ہے"

"پھر؟" اُسکی ماں نے ذرا سختی سے پوچھا۔ اُسکی بہن تعجب سے اُسکے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

"پھر یہ کہ مسّہ کٹنا چاہیئے"

"شادی کے بعد بلقیس تمہاری چیز ہے، جو چاہے کرنا۔ چاہے مسّہ کٹوانا چاہے بال چھوٹے کرانا"

"نہیں مسّہ شادی سے پہلے کٹنا چاہیئے" اُس نے سخت اور پُر استقلال لہجہ میں کہا۔

"لے لو اور سنو۔ تیری عقل تو نہیں ماری گئی ہے۔ نکاح میں گیارہ دن باقی رہ گئے ہیں۔ اتنی جلدی کیسے چہرہ لگے گا اور کیسے زخم ٹھیک ہوگا"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر مسّہ کٹ کر چہرہ بالکل بے داغ نہ ہو گیا تو میں شادی نہ کرونگا" اُسنے فیصلہ کُن الفاظ میں کہا۔ اور بغیر کوئی اور بات کہے اُٹھکر چلا گیا۔ وہ اس وقت اپنی طاقت سے پورا لُطف اُٹھا رہا تھا۔ وہ ایک آمر تھا جسکی بات کوئی نہیں ٹال سکتا۔ کسقدر لذت تھی اس احساس میں۔

اب اُسکی ماں اور بہن کو لمحہ کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ اُسکی مختصر سی گفتگو نے تمام گھر والوں کی خوشی پر پانی پھیر دیا۔ اور کھلبلی مچا دی۔ اُسکے والدین کی نظر میں اسکی یہ ہٹ بالکل ہی بے موقع اور ناجائز تھی۔ شادی میں کل گیارہ دن باقی تھے۔ بلاوے جا چکے تھے، زیادہ کام ہو گئے تھے، تھوڑے رہ گئے تھے۔ آپریشن کا اتنا بڑا مرحلہ کیونکر طے ہوگا۔ اگر وحید اپنی بات پر اڑا رہا تو شادی وقت پر کیسے ہوگی۔ وہ کیسے اپنے رشتہ داروں اور دوست احباب کو منہ دکھائینگے کیونکہ وہ لڑکی کے ماں باپ سے اسوقت یہ مطالبہ کرینگے کہ وہ بلقیس کا مسّہ کٹوا دیں....

غرض یہ کہ وہ سب سخت اُلجھن میں تھے۔ ایک دن اور ایک رات برابر گھر میں کھچڑی پکتی رہی۔ اُن سب نے ہر ممکن کوشش کر لی کہ وحید اپنی ضد چھوڑ دے۔ مگر جتنا جتنا وہ اُسے سمجھاتے تھے، اتنا ہی وہ اڑتا تھا۔ آخر جب وہ اُسے سمجھا کر، اسکی خوشامد کر کے ہر طرح ہار گئے تو اُسکی ماں نے اپنے بھائی کو بلایا اور ڈرتے ڈرتے سارا معاملہ جسقدر خوبصورتی سے ہو سکا اُنکے سامنے رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بیٹی والوں کا دل چھوٹا ہوتا ہے۔ بلقیس کے باپ سارا قصہ سُنکر ہکا بکا رہ گئے۔ وہ گھبراتے ہوئے اپنی بیوی کے پاس پہونچے اور جو کچھ سُنا تھا اُس سے اُنہیں آگاہ کیا۔ بلقیس کی ماں کے ہاتھوں کے گویا طوطے اُڑ گئے۔ جتنی خوشی بیٹی کی شادی کی تھی آن واحد میں راکھ کی چٹکی کی طرح اُڑ گئی۔ اب کیا ہوگا۔ لڑکی ذات کا معاملہ ہے۔ اگر وقت پر شادی نہ ہوئی تو کیسی کرکری ہوگی۔ دُشمن کیسی کیسی پھبتیاں کسینگے، حاسد خوش ہو ہو کر کیسی کیسی بغلیں بجائیں گے۔ لڑکی سُنے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اگر مسّہ کٹوایا گیا اور لڑکی کی شکل اور بھی بگڑ گئی تو اس بیچاری کا کیا حشر ہوگا ــــ یہ خیالات لڑکی کے ماں باپ کے دماغوں میں آگ کے گولوں کی طرح دوڑ رہے تھے۔

جو کچھ اُنکے امکان میں تھا اُنہوں نے وحید کو سمجھانے کیلئے کیا راحت کے ذریعے اُس سے کہا۔ اسکے ماں باپ کی خوشامدیں کیں کہ وہ کسی طرح اسکو اسکی ضد سے ہٹائیں۔ اُنہیں سمجھایا کہ سارے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ اگر وقت پر شادی نہ ہوئی تو ہر جگہ تھڑی تھڑی ہوگی اور ہمیشہ کیلئے خاندان کی ناک کٹ جائیگی۔ مگر وہ خود مجبور تھے۔ جس حد تک ماں باپ اولاد پر زور ڈال سکتے ہیں اُنہوں نے ڈال لیا تھا۔ اسکو سمجھایا تھا، اسکی خوشامدیں کی تھیں، اُسے دھمکایا تھا۔ اس سے زیادہ وہ کر کیا سکتے تھے۔ مگر وہ تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔

وحید کے والدین اسکی اس حرکت پر اس سے ناراض تھے اور بلقیس کے والدین کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ انکا تو خون اونٹ رہا تھا۔ لڑکی کی نسبت کر کے اور تاریخ ٹھہرا کر وہ اپنے ہاتھ کٹا چکے تھے، ورنہ وہ ہرگز ایسے ضدی اور بےحس انسان سے اپنی لڑکی کی شادی نہ کرتے چاہے وہ عمر بھر گھر ہی بیٹھی رہتی۔

پورے ایک دن اور ایک رات وہ بھی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہے اور اُنہوں نے بلقیس کو خبر نہ ہونے دی۔ لیکن جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ مسّہ

کٹانے بغیر چارہ کار ہی نہیں تو بادلِ ناخواستہ انہیں بلقیس سے سب کچھ کہنا پڑا۔

وحید کے عجیب غریب مطالبہ سے بلقیس کے ایک دھکا سا لگا۔ اُسکے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وحید کوئی اس قسم کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اُسے صدمہ اس بات کا نہیں ہوا کہ اُس کی ناک پر مسہ ہے۔ اگر وحید خود خوبصورت ہوتا اور اُس کی ناک کے مسّے کو ناپسند کرتا تو اُسے اپنی بدشکل ہونے پر رنج ہوتا۔ لیکن وحید خود بدشکل تھا۔ وہ کس مُنہ سے اس کا مسّہ کٹوانے کا مطالبہ کررہا تھا۔ اگر اُسکی ناک پر ایک مسّہ تھا تو وحید کا پورا چہرہ داغدار تھا۔ پھر کیوں نہ اُس نے وحید کو پہلے ہی ٹھکرا دیا؟ اس لئے کہ وہ ماں باپ کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ اگر وہ اپنے انتخاب میں آزاد ہوتی تو وحید کو اپنا شریک زندگی ہونے کیلئے کبھی پسند نہ کرتی چاہے وہ ذہن میں افلاطون ہوتا اور دولت میں قارون۔ مگر وہ ماں باپ کیلئے ایک قربانی کررہی تھی — اور بہت خندہ پیشانی کے ساتھ قربانی کررہی تھی۔ وحید نے اُسکی قربانی کو ٹھکرا کر اس کا دل توڑ دیا۔ کیوں؟ اپنی قابلیت کے غرور میں، اپنی دولت کے گھمنڈ میں، اس لئے کہ وہ مرد تھا اور اُسے کمزور سمجھ کر ٹھکرا سکتا تھا؟ ہاں تو وہ کیوں اُسے نہیں ٹھکرا سکتی۔ وہ اُسکی غلام نہیں ہے۔ وہ خود مختار ہے اور اُسے دکھا دیگی کہ اس کا غرور بے بنیاد ہے۔ یہ اس کی کمزور ٹھوکر سے ہوائی قصر کی طرح گر سکتا ہے۔

بلقیس نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ مسّہ ضرور کٹوائیگی۔ اگر اسکی شکل بگڑ گئی تو وحید اُس سے شادی نہیں کریگا۔ یہ اُسکے لئے اچھا تھا۔ وہ خدا سے چاہتی تھی کہ وحید اُس کا شوہر نہ بنے۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے آپریشن کامیاب ہوا اور اسکے چہرے کا داغ ہمیشہ کیلئے مٹ گیا تو وہ ہرگز ہرگز وحید سے شادی نہ کریگی۔ چاہے اِدھر کی دُنیا اُدھر ہوجائے، چاہے وہ عمر بھر کنواری رہے۔ چاہے اُسے کسی فقیر سے شادی کرنی پڑے۔ شادی سے انکار کرنے میں بدنامی ہوگی۔ ہوا کرے۔ بدنامی تو اب بھی ہوگی جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس۔ مگر وہ وحید کا غرور توڑ دیگی — ضرور، ضرور، ضرور ضرور — یہ الفاظ اسکے کان میں گونج رہے تھے۔

بلقیس کے والدین کو جب معلوم ہوا کہ وہ مسّے کا آپریشن کرانے کیلئے تیار ہے تو اُسکی فرمانبرداری پر اُنکی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے مگر وہ دل ہی دل میں رنجیدہ تھے کہ وہ انکی وجہ سے تکلیف اُٹھا رہی ہے۔ آخر اُنہوں نے دہلی کے ایک مشہور سرجن سے مشورہ کیا۔ اُس نے مسّہ دیکھکر کہا کہ یہ معمولی آپریشن ہے۔ بہت آسانی سے ہوجائیگا اور زخم بھی جلدی ہی بھر جائیگا۔ مگر وہ ایک ہفتہ میں زخم بھرنے کی ذمہ داری لینے کیلئے تیار نہیں ہوا۔ اور ڈاکٹروں کو دکھایا اُنہوں نے بھی ہاتھ نہ دھرا۔ اس میں ایک دن گذر گیا۔ شادی میں آٹھ دن باقی تھے اور وہ متفکر تھے، جو معلوم ہوا کہ شہر میں ایک بہت ہوشیار جرّاح ہے۔ وہ بڑی کامیابی سے چیرہ لگاتا ہے۔ مسّے کے آپریشن میں تو اُسے خاص مہارت ہے۔ وہ بہت لوگوں کے مسّے کاٹ چکا ہے۔ بہت سے آدمی اسکی مہارت کی شہادت دینے والے بھی مل گئے۔ چنانچہ فوراً اُسے بلایا گیا۔ اُس نے کہا کہ مسّہ کاٹ کر آٹھ دن میں اچھا کردینا کیا بڑی بات ہے۔ وہ پانچ ہی دن میں مسّے کو ایسا اُڑا دیگا جیسے کہ وہ تھا ہی نہیں۔ پھر اُس نے تعلیمیافتہ لوگوں کی ڈاکٹر نوازی اور جرّاحوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کا ماتم کیا۔

اُس نے اپنی تعریفیں اور ڈاکٹروں کی بُرائیاں کرکرکے مسّہ کاٹنے کی تیاری کی۔ بلقیس، اُس کی ماں، اور گھر کی کچھ اور عورتوں کو پردے کے پیچھے بٹھایا گیا۔ اُن سب کے دلوں کی عجیب کیفیت تھی۔ ایک زبردست واقعہ ہونیوالا تھا جس کا سب سہمے ہوئے انتظار کررہے تھے۔ بلقیس کا چہرہ زرد تھا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے، جسم تھر تھر کانپ رہا اور ہر مسام سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ قریب قریب یہی حالت اُسکی ماں کی تھی۔

جرّاح نے اپنے میلے کچیلے پرانے اٹیچی کیس میں سے کچھ لمبی لمبی سوئیاں، ایک پرانی وضع کا نشتر، ایک چاقو، ایک لمبی پرانی سی قینچی، اور دو ایک دوائیں نکالیں۔ اور تسلی دے دیکر عمل جراحی شروع کردیا۔

خدا خدا کرکے مسّہ کٹا۔ اس سے بلقیس کو اتنی تکلیف ہوئی کہ وہ بیہوش ہوگئی۔ ایک بہت بڑا مرحلہ طے ہوگیا۔

جرّاح آخر وقت تک اطمینان دلاتا ہوا رخصت ہوا۔ اُسنے بیسیوں ایسے لوگوں کی مثالیں دیں جن کے اُس نے بہت کامیاب آپریشن کئے تھے۔ اس سے بلقیس کے عزیزوں کو کچھ اطمینان ہوا۔ مگر اُنکے دل میں کھٹکا لگا ہوا تھا دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ دوسرے ہی دن انکا ڈر انکی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

آپریشن کے آٹھ دس گھنٹے بعد بلقیس کی ناک سوجنے لگی۔ دوسرے دن تو ناک پھول کر کپا ہوگئی اور سوجن آنکھوں تک پہونچ گئی۔ زخم میں ٹیسیں اس بلا کی تھی کہ رات تڑپتے گذری۔ شدت درد سے اُسے بخار بھی ہوگیا۔ اب تو اس کے والدین پر سناٹا چھاگیا اور پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسکی سسرال میں بھی ہلچل مچ گئی۔ سب کو ڈر ہوا کہ کہیں لڑکی کی جان پر نہ بن جائے۔ جس گھر میں شادی کی چہل پہل تھی، وہاں خیریت پوچھنے والوں کا ہنگامہ ہوگیا۔ آپریشن کے وقت سے اسکے سسرال والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ایک آتا تھا ایک جاتا تھا۔ ہر ایک کے دل میں یہی خیال تھا دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ وحید کو بھی سب خبریں پہونچ رہی تھیں۔ ہر ایک اُسے شرمندہ کررہا تھا کہ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ ضد نہ کرتا تو چپکے سے شادی ہوجاتی۔ دُور پار دشمنوں کو کوئی

اونچ نیچ ہوگئی تو سارا الزام اُسکے سر ہوگا۔ اُسکو اپنی غلطی کا احساس تھا لیکن جب کوئی اُس سے کچھ کہتا تو وہ جواب دیتا کہ جرّاح سے آپریشن کیوں کرایا۔ کیا ڈاکٹر مر گئے تھے۔ غلطی کی ہے تو خمیازہ بھگتو۔

لڑکی کے ماں باپ کی عجیب حالت تھی۔ وہ بار بار اسی بات پر پچھتا رہے تھے کہ وحید کی ضد سے ڈر کر کیوں چیرہ لگوایا اور لڑکی کی جان خطرے میں ڈالی۔ اگر وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا نہ کرتا۔ بلا سے وہ گھر بیٹھی رہتی، مگر یہ تو نہ ہوتا۔ اب اگر زخم اتنا بڑھ گیا کہ ناک کاٹنی پڑی تو کیا ہوگا۔ اور اگر دشمنوں کی جان پر بن گئی تو؟ — اس کا خون انکی گردن پر ہوگا۔ اُنہوں نے کیوں اس معصوم کی جان خطرے میں ڈالی۔ انہوں نے کچھ لوگوں کے قصے سُنے تھے، جنکی جان معمولی زخموں سے جاتی رہی تھی۔ جب وہ انکا خیال کرتے تھے تو سہم جاتے تھے۔ خدا نہ کرے کہ معاملہ اتنا سنجیدہ ہو۔ سب شادی کو بھولے ہوئے تھے، سب کا خیال لڑکی کی طرف لگا ہوا تھا۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں کی جا رہی تھیں کہ لڑکی اچھی ہو جائے۔ شادی جائے چولہے میں۔ اگر جان ہے تو شادی بھی ہو جائیگی۔ وحید کے ساتھ نہ سہی کسی اور کے ساتھ۔ لڑکی ہے تو لڑکا بھی مل ہی جائے گا۔

زخم پر سوجن آتے ہی فوراً ایک بہت ہوشیار ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ اُس نے کہا کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے معمولی سُوجن ہے۔ اچھا ہوا کہ فوراً دیکھ بھال کر لی گئی۔ اگر زخم زہریلا ہو جاتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

چار روز تک سُوجن چڑھی رہی، مگر ڈاکٹر کی تدبیروں سے پانچویں دن اُترنی شروع ہوئی۔ بخار ہلکا ہوگیا اور زخم کی تکلیف بھی کم ہونے لگی لیکن بلقیس کی حالت اس قابل نہیں ہوتی تھی کہ اسکی شادی کی جائے۔ لوگوں کو اطلاع دیدی گئی کہ یکایک لڑکی کے بیمار ہو جانیکی وجہ سے شادی ملتوی کی جاتی ہے۔

نکاح کی تاریخ آئی اور گزر گئی۔ جو بدنامی ہونی تھی ہوگئی۔ اب تو سبکو لڑکی کا خیال تھا، وہ اچھی ہو جائے تو شادی ہوتی رہیگی۔ بیس دن میں بلقیس کا زخم بالکل اچھا ہوگیا۔ پھاہا اُترا تو ناک پہ نیا گوشت آگیا تھا جسکا معمولی نشان باقی تھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان دلایا کہ کچھ دن میں وہ بھی جاتا رہیگا۔ اسکے شفا پانے کی سبکو اتنی خوشی ہوتی جتنی شاید شادی کی بھی نہ ہوتی۔ نیازیں ہوئیں، میلاد پڑھے گئے، مٹھائیاں بٹیں، اور لوگ مبارکباد دینے آئے۔

بلقیس کیلئے سچی خوشی کا دن تھا جب زخم کا نشان بالکل مٹ گیا۔ اور اسکی ناک صاف شفاف ہوگئی۔ اب اُسکے حُسن کا ماہتاب اپنی پوری آب و تاب پر تھا۔ اُس پر سے بادل کا سیاہ ٹکڑا ہٹ گیا تھا۔

وحید کو بھی خبر مل گئی کہ پھول پر سے بھونرا اُڑ گیا۔ وہ بہت خوش تھا کچھ اسلئے کہ اسکی بات ہر ایک کو ماننی پڑی تھی اور اُسنے راحت کو دکھا دیا تھا کہ اُس میں کتنی طاقت ہے، اور کچھ اس لئے کہ وہ اب ایک واقعی حسین عورت سے شادی کریگا۔ لیکن اس کو معلوم نہیں تھا کہ جسے وہ فتح سمجھ رہا تھا وہ شکست کی ابتدا تھی۔

اُس نے اپنے والدین سے کہکر شادی کی تاریخ ٹھہرانے کیلئے بات چیت شروع کرائی۔ بلقیس کے والدین اُس سے ناراض تھے۔ مگر لڑکی کی نسبت ہو چکی تھی۔ اسکو توڑنے میں بدنامی تھی۔ اس لئے وہ شادی کی گفت و شنید کیلئے تیار تھے مگر جب بلقیس کو اسکی خبر ہوئی تو اُس نے اپنی سہیلیوں کے ذریعے اپنے والدین کے کان میں یہ بات ڈلوادی کہ وہ ہرگز ہرگز وحید سے شادی نہ کریگی۔ اگر اب اس کو شادی کیلئے مجبور کیا گیا تو وہ زہر کھالے گی۔

وحید بلقیس سو شادی کرنے پر اڑا ہوا تھا جسقدر تاریخ ٹھہرنے میں دیر ہو رہی تھی اتنا ہی اس کا اضطراب بڑھ رہا تھا اور بلقیس اسکے لئے زیادہ دلکش ہوتی جا رہی تھی۔ اسکے سوائے اُسے کسی اور عورت میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ جس عورت سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ بلقیس اسکے لئے گویا دُنیا کی حسین ترین عورت بن گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اسے پالے۔ اور اسکو حاصل کرنے کیلئے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ مگر اب وہ اسکی پہونچ سے بہت دُور تھی۔ اسکو یقین نہیں آتا تھا کہ بلقیس اُسے ٹھکرا سکتی ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا انکار عارضی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ راہ پر آجائیگی۔

مگر بلقیس کی بات پتھر کی لکیر تھی۔ وحید کی جسقدر خوشامدیں کی گئی تھیں، اُس سے زیادہ اسکی خوشامدیں ہوئیں۔ سب ہی نے اس کو سمجھایا، مجبور کیا، سبز باغ دکھائے۔ مگر وہ کسی کی باتوں میں آنے والی نہیں تھی۔ جو بات اُس نے ایک دفعہ کہدی اس پر اڑی رہی۔ اس میں اسکی بدنامی بھی ہوئی، اس پر انگلیاں بھی اٹھائی گئیں۔ اُسے بے حیا اور نہ معلوم کیا کیا کہا گیا۔ مگر وہ وحید سے شادی کے مقابلے میں ہر بات برداشت کرنیکے لئے تیار تھی۔ اُسکے پے در پے انکار سے خاندان میں جھگڑے ہوتے۔ پھوپا پھوپی نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مگر وہ نہ سمجھی۔ ماں باپ نے پہلے تو سمجھایا بجھایا۔ مگر پھر چُپ ہو رہے۔ غرض یہ کہ پانچ سال کی نسبت لڑکی کی ضد سے ٹوٹ گئی۔ بلقیس کی تھوڑی بہت بدنامی ضرور ہوئی، مگر اُسکے حُسن کا چرچا دُور دُور ہوگیا۔ اب اُسکی شادی کے بیسیوں پیغامات آرہے ہیں۔ اُسکے والدین کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے منظور کریں اور کسے نامنظور۔ وحید کی شادی کی بھی کوشش ہو رہی ہے مگر کوئی معقول لڑکی نہیں ملتی۔ اُسے اپنی قوت پر شُبہ ہونے لگا ہے۔ وہ اس طرح پچھتا رہا ہے جس طرح بادشاہ باز کو مار کر پچھتایا تھا۔

حسن الدین

برج اور میری مایوسی

بیگم وہاب الدین احمد صاحبہ نے توجون کے ساقی میں اپنی بیتی کہہ ڈالی یہ سکس کلبز، آپ نے ڈبل کیا تو میں نے ری ڈبل کیا۔ جیت لی بازی مارلیا میدان وغیرہ وغیرہ۔ صاحب بڑبڑا رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں نیند میں برج کھیل رہے ہیں۔ جو اصل زندگی میں نہیں جیت سکتے تو خواب میں اپنی آرزو پوری کر رہے ہیں۔ یہ کانٹرکٹ برج یعنی معاہدہ کی برج کے مریض کا حال ہے۔ کاش کہ اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ نکاح کرکے جو معاہدہ اُنہوں نے کیا ہے اُس کے فرائض کیا ہیں؟" اب ہماری سُنیئے، ہمارے صاحب بھی عجیب نکلے۔

ابھی میاں کمسن ہی تھے کہ ان کی ہماری شادی ہوگئی۔ شادی سے پہلے ہجولیوں سے باتیں کرتی، تو یہی کہتی تھی: "نہ بابا ڈاڑھی والا تو مجھے پسند ہی نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔" اور میری ایک باجی تھیں اُن کو چِڑاتی کہ ڈاڑھی والے سے کیا تم کو ڈر نہیں لگتا؟ اور اپنے لئے اللہ پیر مناتی کہ ڈاڑھی والے کا ساتھ نہ ہو۔

جب میری شادی ہوئی اور جو مَیں نے اِن بجّو کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ کوئی خوبصورت تو تھے نہیں مگر اللہ کے فضل سے ڈاڑھی کے ساتھ مونچھ بھی غائب تھی۔ علی گڑھ کالج میں بی۔ اے میں پڑھتے تھے، علیگڈھ کٹ پائجامہ، اُونچے کالر کی شیروانی پہنتے تھے۔ صفائی کا خاص خیال تھا اور سوٹ بھی پہننے کا کافی شوق۔ صاحبیت کا اشتیاق۔ اور انگریزیت غالب تھی۔ اور ولایت جانے کی دُھن۔ تو پھر کیا ہوا اگر ان کی ناک کچھ چوڑی تھی۔ بھویں گھنی تھیں۔ مرد میں کچھ عورت کا حُسن تھوڑا ہی چاہیئے۔ حُسن مردانہ تھا۔ اور مجھے کیا چاہیئے تھا۔ اپٹوڈیٹ تھے۔ گفتگو خوب کرتے تھے اور بڑے پُرمذاق تھے۔ شادی ہوگئی اور ہم دونوں بہت خوش تھے۔ مگر ایک فکر مجھے اب تھی اور کافی تکلیف دہ تھی کہ اُنہیں کیا کہکر پکاروں۔ شوہر کا نام لیکر پکارنا تو رسم کے خلاف۔ ولایت میں تو اُنہوں نے پڑھا نہیں۔ کوئی نوکری ہے نہیں۔ ابھی تو طالب علم ہیں۔ صاحب کہتے ہوتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ مولوی صاحب کہنے سے رہی۔ میر صاحب یا سید صاحب کہنے کا رواج گھر میں نہیں۔ کوئی بچہ پیدا ہوا نہیں کہ مُنا کے ابا پکارتی۔ بڑی مشکل تھی۔ اجی یا اُن کہتے ہوئے بُرا معلوم ہوتا تھا۔ عجیب پریشانی تھی۔

شادی کو ابھی چند ماہ گذرے تھے کہ میاں صاحب بی۔ اے پاس ہوگئے۔ ولایت جانے کی دُھن تو تھی ہی۔ ہمارے بھائی جان جارہے تھے تین گھنٹے میں تیار ہوگئے اور چلدئے۔ مَیں اُنکے جانے پر روئی ضرور مگر دراصل خوش تھی کہ یہ اب پکّے صاحب ہوجائیں گے۔ پُکارنے کی دقت بھی حل ہوجائیگی، اور جب واپس آئیں گے تو مجھے اِن بند چہار دیواریوں سے چھٹکارہ مل جائیگا۔ چارپائی پر بیٹھنے سے نفرت ہوگئی تھی۔ یہ بیہودہ چارپائی سے نجات ہوگی۔ دسترخوان پر کھاتے کھاتے جی اُکتا گیا تھا۔ میز پر کھانا ہوگا۔ پان سے تو مجھے نفرت ہی ہے اور یہ بھی نہیں کھاتے۔ چلو پاندان کا سلسلہ ہی نہیں رہیگا۔ ان کی واپسی پر، شام کو انکے دوست آئیں گے، اُن کی بیگمات ہوں گی۔ ہم ڈرائینگ روم میں بیٹھیں گے۔ چائے ہوگی۔ لان پر ٹینس ہوگی۔ رات کو وریںڈا پر برج ٹیبل سجیگی اور ہم سب برج کھیلیں گے۔ اور چنانچہ میں نے اپنے ماموں زاد اور خالہ زاد چھوٹے بھائیوں سے برج بھی کھیلنا سیکھ لیا۔ ٹینس کی تیاری بھی کرلی۔ بلّا بھی خرید لیا۔ اور انکے ولایت سے واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

میاں صاحب یا اَب اُنہیں صاحب ہی کہوں، ایک سال گذرا، دو سال ہوئے، تیسرا گیا اور چوتھا بھی چل بسا، ایکدم غائب ہوگئے۔ میری طبیعت گھبرانے لگی۔ ان کے صاحب بننے کا شوق میرے دل میں دھڑکن پیدا کرنے لگا۔ پہلے شروع میں خطوط آئے مگر رفتہ رفتہ خط و کتابت کا سلسلہ کم ہوتا گیا اور اب مہینوں غائب۔ شروع میں وہ یورپ کی شکایتیں کرتے رہے اور میں سمجھی کہ پردیس میں طبیعت گھبراتی ہے اس لئے یہ باتیں لکھتے ہیں۔ لکھ مارا کہ لندن کلکتہ سے بڑا شہر ہے بس اور کچھ نہیں۔ مَیں تو جانتی تھی کہ لندن اور پیرس دُنیا کی جنّت ہیں۔ مگر پھر بعد میں کچھ اُنکے دوستوں کے خطوط سے اور کچھ مضامین جو چھپتے رہے اور جن میں ان کا بھی تذکرہ رہا، اُس سے پتہ چلا کہ میرے صاحب اب واقعی صاحب ہوگئے ہیں۔ انکے ایک دوست لکھتے ہیں کہ اب وہ کریم صاحب سے احمد ہوگئے ہیں۔ اور احمد کو چھوڑ اَب ایمڈ بن گئے ہیں، اُردو کو خیرباد کہدیا اور سوائے بائی جو ([illegible]) اور گیڈ ([illegible])، کچھ نہیں بولتے۔ اُردو زبان کے ساتھ اُردو کھانے کو بھی چھوڑا۔ یہ آفتاب صاحب نے ان کا مذاق اُڑایا تھا۔ مگر مجھ سے پوچھئے تو

میں دل میں خوش تھی کہ اب یہ پورے صاحب ہو گئے اور دل کی بات پوری ہو گئی۔ اس درمیان میں ان مجھے اپنی تصویریں بھیجتے رہے اور میں خوش ہوتی رہی۔ کبھی پورے سوٹ میں، کبھی ٹینس کا بلّا ہاتھ میں، کبھی کرکٹ کا، کبھی گھوڑے پر، کبھی گلے میں بڑا گلوبند اور موٹر میں۔ اور کبھی پلس فور میں ٹیڑھی ٹوپی لگائے۔ اور کبھی ڈنر سوٹ میں۔ جب یہ تصویریں آتیں تو میں، بےحد خوش ہوتی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں سینے سے لگاتی اور پھولی نہ سماتی کہ یہ میرا شوہر کیسا خوش رو اور اپٹوڈیٹ ہے۔

اور ان کے واپس آنے کی دعا کرتی کہ الٰہی اس جنجال سے جلد نجات ہو۔ اماں جان اور خالہ جان کیلئے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے چھالیا کاٹتے کاٹتے بس عاجز ہو چکی تھی اور انکے ٹھوک سے پریشان۔

ان کی تصویر پھر ایک آئی۔ اسی خوشی سے میں نے کھولا۔ مگر، اس میں تو یہ حضرت ڈاڑھی دار تھے۔ ایسی نفرت ہوئی اس تصویر سے اور ڈاڑھی سے کہ بس۔ پہلے بھی ایک تصویر بھیجی تھی اور اس میں مونچھ تھی۔ طبیعت تو گھبرا گئی مگر میں نے سوچا کہ مجھے چڑانے کو بھیجی ہے۔

اللہ اللہ کر کے ان کا تار بمبئی سے آیا کہ ہم آ رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور ان کے آمد کی تیاری کرنے لگی۔ کمرہ ٹھیک کیا۔ میزیں لگائیں۔ کرسیاں رکھیں۔ تخت کو دور کیا۔ سفید سفید فرش دور کیا۔ قالین بچھایا۔ چارپائی دور کمرے میں پھنکوائی۔ پاندان بند ہوا۔ کانٹے چھری ٹھیک ہوئے۔ مچھلی کے لئے الگ، سالن کیلئے الگ۔ پھل کے لئے الگ۔ بقیہ سامان بازار سے آیا۔ ابلے انڈے کا گلاس، پھل کھانے کی طشتری، توس رکھنے کا ریک، جام رکھنے کا پیالہ۔ انگلیاں بھگونے کے شیشہ کے پیالے۔ نیپکن وغیرہ وغیرہ۔

موٹر کے ہارن نے زنانخانے میں اطلاع کر دی کہ صاحب آ گئے۔ میں بھاگی ڈیوڑھی میں پہونچی کہ دیکھوں کیسے ہیں۔ میں سمجھی تھی کہ ایک نہایت عمدہ پلس فور پہنے ہونگے۔ ٹیڑھی ٹوپی لگی ہوگی۔ منہ میں پائپ لگا ہوگا۔ چہرہ نہایت صاف گورا گورا، مسکراتے ہوتے آئیں گے۔

مگر کیا دیکھا، اس کا اللہ ہی گواہ ہے۔ پہلے میری نظر ان کے پاؤں پر پڑی۔ نہایت بھدا موٹا جوتا مگر خیر صاف۔ پھر ایک خاکی فلالین کا پتلون جس کا کنارہ اب کٹ چلا تھا۔ اور پتلون گول ہو گیا تھا۔ یہ پتلون کاہے کو تھا اچھا خاصہ پاجامہ ہو گیا تھا۔ میں سمجھی کہ سفر کی وجہ سے خراب ہو گیا ہوگا۔ پھر بھی گاڑی ہی میں کیوں نہ بدل لیا۔ عجیب آدمی ہیں۔ جب اترے تو کوٹ بھی نظر آیا۔ ایک چارخانے کا موٹا کوٹ جس کی آستینوں میں چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک سرخ اونی قمیص پہنے ہوئے تھے۔

آگے جو دیکھا تو طبیعت خوش ہوئی۔ منہ سے پائپ لگا ہوا تھا۔ اب جو غور سے دیکھنے کا موقع ملا تو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں بیہوش ہونے والی تھی کہ دوڑ کر کمرے میں چلی گئی اور ان کی تصویریں دیکھنے لگی۔ اور سوچتی رہی کہ الٰہی آخر انہیں ہو کیا گیا۔ ان کی ٹھوڑی پر اچھی خاصی ڈاڑھی تھی اور لب پر پتلی مونچھ۔ وہ دونوں تصویریں اب ایک ساتھ نظر آ رہی تھیں۔

ہمارے صاحب گاڑی سے اترتے ہی اپنے والد صاحب کے پاس چلے گئے۔ ان سے ملے، اپنے بھائیوں سے ملے۔ جو ملنے والے آتے تھے ان سے ملے۔ میں انتظار کر رہی تھی کہ دیکھئے کب دیدار نصیب ہو۔ گھبرا کر آخر لونڈیا کو بھیجا کہ دیکھ صاحب کیا کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ غسل خانے میں ہیں۔ اب وہ اندر تشریف لائے تو کیا دیکھا کہ ایک ڈھیلا پاجامہ اور ویسا ہی ڈھیلا کرتا جو کہ ان کے بھائی صاحب کا تھا، پہن لیا ہے۔ اور مع ڈاڑھی چلے آتے ہیں۔ آتے ہی آپ نے اس مردود ماما کی جھاڑو لگی چارپائی کھینچی، جس کو کمبخت نے منع کرنے پر بھی چھوڑ دیا تھا، اور کرسی سے ایک گدا اٹھا، لیٹ ہو گئے۔ مجھ سے فرمایا: "کہو اچھی ہو؟ خوشی ہوئی کہ ہم آ گئے؟" اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا کہ "ذرا پان تو کھلانا!"

میرا سر چکرانے لگا۔ اور میں کمرے سے بھاگ چلی گئی۔ نہ معلوم انہیں کہاں سے پان بھی مل گیا۔ آگ لگے پان میں اور ہاتھ سڑے پان دینے والی کا۔

اب پتہ چلا کہ حضرت سوشلسٹ سے بھی دو تین نمبر آگے ہو گئے ہیں۔ روس ہوتے ہوتے تشریف لاتے ہیں۔ مزدور پیشہ کے حامی ہیں۔ ہندوستان غریب ہے اس لئے یہی تدبیر ہندوستان کے لئے موزوں ہو۔ یہ آپ کا خیال ہے۔

اسی لئے آپنے غریبی کا بھیس بدلا ہے۔ کوٹ میں چمڑے کا پیوند لگوایا ہے اور ایسا بھاری موٹا جوتا پہنتے ہیں۔ انگریزیت کو چھوڑ کر نری ہندوستانیت پر اتر آئے ہیں۔ وہی ہاتھ سے کھانا اور پان چبانا۔ کیونکہ یہ سب ہندوستان کی چیزیں ہیں اور کیوں چھوڑی جائیں۔ دن رات پڑھنے میں وقت گذارتے ہیں۔ کبھی پیلی کتاب ہوتی ہے اور کبھی لال۔ مگر ان پر چاند کی طرح ٹیڑھی چھری ضرور بنی ہوتی ہے۔

وہ میرے خیال۔ بس خواب ہی ہو کر رہ گئے۔ برج بھول گئی، ٹینس کا بلا کمرے میں پڑے پڑے سڑ گیا۔ اور نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔
وہ دالان میں لیٹے، پیٹ کھلا ہوا، پاجامہ چڑھا ہوا، پان سے منہ بھرا ہوا اور اگالدان پیک سے، کتابیں دیکھتے رہتے ہیں۔ وہی منحوس کتابیں۔ اور غالباً ہندوستان میں کایا پلٹ دینے کی تدبیر سوچتے رہتے ہیں۔
اور میں۔ چارپائی پر بیٹھی چھالیا کاٹتی ہوتی ہوں۔
ہائے رے میری کانٹرکٹ برج یعنی معاہدے کی برج کاش کہ ان کو یہ بھی معلوم ہوتا کہ نکاح کر کے جو معاہدہ انہوں نے کیا ہے اس کے فرائض کیا ہیں۔
اب آپ ہی بتائیں میں ان کو کیا کہکر پکاروں؟ یہ کہتے ہیں کہ ان کو کامریڈ پکارا جائے۔

مجبوبہ کریم احمد

تمہیں معلوم ہے!!

تمہیں معلوم ہے دوشیزۂ پردہ نشیں ہوں میں
مجھے دیکھا نہیں جی بھر کے ساون کی گھٹاؤں نے
مجھے چوما نہیں اچھی طرح ٹھنڈی ہواؤں نے
بڑی مشکل سے دیکھا ہے مجھے ننھے ستاروں نے
فلک کی گود میں بیٹھے ہوئے ان ماہ پاروں نے
تمہیں معلوم ہے دوشیزۂ پردہ نشیں ہوں میں!

شکایت ہے تمہیں مجھ سے مری بے اعتنائی کی
ہو رسوائی زمانے بھر میں میری بیوفائی کی
مری مجبوریوں سے کیا نہیں ہے تم کو آگاہی؟
سمجھتے ہو مجھے شاید کہ ہوں میں کوئی ہرجائی
تمہیں معلوم ہے دوشیزۂ پردہ نشیں ہوں میں

تم آنکھیں بند کر کے کیوں مجھے بدنام کرتے ہو؟
جو سینے میں نہاں ہے راز اس کو عام کرتے ہو
دل ناشاد کو تم اور بھی ناشاد کرتے ہو
میں خود برباد ہوں تم اور کیوں برباد کرتے ہو
تمہیں معلوم ہے دوشیزۂ پردہ نشیں ہوں میں

سنا ہے شہر کی تم شاہراہوں پر بھٹکتے ہو
سنا ہے میری گلیوں میں تم اپنا سر پٹکتے ہو
جنوں کو زندگی اور زندگی کو دل سمجھتے ہو
غبار کارواں کو جادۂ منزل سمجھتے ہو
تمہیں معلوم ہے دوشیزۂ پردہ نشیں ہوں میں

مظفر حسین شمیم

سنگاپور میں ایک مسلم دوشیزہ کو محوِ رقص دیکھکر

حُسن کی عریانیاں، باعثِ فخر و کمال،
عظمتِ انسانیت، آہ یہ تیرا زوال

کاش کہ ملتا مجھے جلوۂ ماضی ترا
آہ، ودلیعت ہوا مجھکو ترا عہدِ حال

سنگِ خرد، بارِ عقل، ہو ہی گیا کامیاب
آہی گیا آخرش شیشۂ ہستی میں بال

کِتنی اداؤں کے ساتھ آج ہے محوِ خرام
گردنِ اخلاق پر خنجرِ تہذیب حال

جلوۂ افرنگ کی، آہ، یہ افسوں گری
کل کہ جو شے تھی حرام، آج وہ شی ہے حلال

حُسن کہاں! حُسن کا صرف ہے وہم و فریب
عشق نہیں عشق کا صرف ہے، اک اختلال

حُسن میں ہے اب کہاں دلکشی و زندگی
پست ہے شوقِ نظر مُردہ ہے ذوقِ جمال

عِشق کو افسوس ہے حُسن کی تقدیر پر
ایک نگاہِ ہوس قیمتِ نازو جمال

سازِ رمِ ذوق میں بربطِ پُر شوق میں
اب نہ سرودِ نیاز اب نہ فغانِ بلال

پی کے مئے مغربی ہو نہ بہت جوش میں
ہوش میں آ ہوش میں ترا نہیں یہ کمال

چشمِ بصیرت مری دیکھ چکی آہ آہ،
موت سے پہلے ترا سانحۂ انتقال

نذرِ ہوس بار یاب شوقِ نظر کامیاب
آہ لُٹے اس طرح دولتِ حُسن و شباب

جلوۂ عریاں نہیں ذوقِ نظر کے لئے
حُسن جسے کہتے ہیں وہ تو ہے زیرِ نقاب

حُسن کا مرکز ہے عشق حُسن کا مظہر ہے عشق
کیسا تر و تازہ ہے شاخ میں اپنی گلاب

عشق کا آئین اور حُسن کا آئین اور
اس کو تبسم گناہ۔ اس کو تبسم ثواب

کس کی نظر کھا گئی، کس کی ادا لے اُڑی؟
عِشق کا خونیں جگر حُسن کا رنگیں نقاب

نغمۂ حاضر سے ہے قلب پریشاں بہت
مطربِ ماضیٔ شوق، چھیڑ دے اپنا رباب

ہے مرا خوابِ نمو، نغمۂ اللہ ہو
اور مری آرزو زندگیٔ اضطراب

خود کو بھی ہشیار کر مجھکو بھی ہشیار دیکھ
اشہدان لا الہ، ہے میری تعبیرِ خواب

اشہدان لا الہ میری نواؤں میں ہے
میری نواؤں میں ہے میری اداؤں میں ہے

سیّد اختر حیدرآبادی؛

ساقی بک ڈپو دہلی کی دلکش کتابیں

سلامبو۔ دوہزار سال پہلے قرطاجنہ کی تہذیب و معاشرت کے پس منظر پر حُسن و عشق کی خونیں داستان۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات ۔ ۔ ۔ قیمت ۳ر

نجم السحر۔ پانچ ہزار سال پہلے مصر کی شان و شوکت اور ایک ملکہ کی دلربا داستانِ عشق۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

تائیس۔ سرزمین مصر کی عروسِ بازاری، نظر بھر کے دیکھنے سے جس کا حُسن میلا ہوتا تھا، اس کی عبرتناک داستان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

ہیرودیاس۔ سلومی کا ناچ موت کا ناچ تھا۔ اُس نے پیغمبر یوحنّاؑ کا سر العام میں مانگا اور اُس کے مُردہ لبوں کو چُوما ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

چنگیز خاں کے سوانح حیات۔ خدا کا قہر چنگیز خاں کی صورت میں نازل ہوا۔ اس قہراللہ کے حالاتِ زندگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

سحرِ بنگال۔ طاہرہ دیوی شیرازی کی دلکش نثر اور اچھوتے پلاٹ کے افسانوں کا مجموعہ۔ مجلد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

نرگسِ جمال۔ موریس مترلنک کی ایک رنگین تمثیل جس میں عشق و محبت پر بحث کی گئی ہے۔ مترجمہ شاہد احمد۔ مجلد ۔ ۔ ۔ ۔ عہ ر

فاؤسٹ۔ شاعر کی مصوری اور مصور کی شاعری کی شہرۂ آفاق کہانی۔ اردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرائے میں پیش کی گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

سرگذشتِ عروس۔ دُلہن کا روزنامچہ جس میں اُس نے اپنے دل کے تمام زخم کھول کر پڑھنے والے کو دکھا دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

پروین و ثریا۔ بلجیم کے مفکرِ اعظم موریس ماترلنک کی دلدوز تمثیل، جس میں محبت کا نازک موضوع پیش کیا گیا ہے۔ مجلد ۔ ۔ ۔ ۔ عہ ر

چندر اموہنی۔ انصار ناصری کا لکھا ہوا غمناک ناول، جسے پڑھ کر آپ اپنے آنسو نہ ضبط کر سکیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ ر

نغمۂ نوری۔ ماں کی ممتا اس ڈرامے میں جس کامیابی کے ساتھ پیش کی گئی ہے کسی اور ڈرامے میں پیش نہیں کی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

سلمیٰ۔ شہرۂ آفاق آسکر وائلڈ کی تمثیل "سلومی" کا سب سے عمدہ ترجمہ۔ از انصار ناصری۔ مجلد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۸ر

تعلیمِ زن و بیوی۔ فضل حق قریشی کا لکھا ہوا ڈرامہ جس کو پڑھ کر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے۔ عبرتناک بھی ہے ۔ ۔ ۔ ۸ر

لال قلعہ کی ایک جھلک۔ سید ناصر نذیر فراقؔ نے مغلیہ دربار اور محلات کے دلکش واقعات بیان کئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ عہ ر

دلی کا آخری دیدار۔ غدر سے پہلے کی دلی کی مُنہ بولتی تصویر آپ کو اس کتاب میں نظر آئے گی۔ یہ کہانی ایک شہزادی کی زبانی ہے ۔ ۔ ۱۲ر

اخوان الشیاطین۔ سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ۔ ایسے افسانے اُردو میں بالکل نہیں لکھے گئے۔ عجیب و غریب افسانے ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

عروسِ ادب۔ دل میں کُھب جانے والے افسانوں کا مجموعہ۔ تین سو صفحے کا مجموعہ۔ زبان نہایت سادہ اور صاف ۔ ۔ ۔ عہ ر

خانم۔ دیورانی جٹھانی کی پُرلطف نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلد سنہری ٹھپّہ ۔ ۔ ۔ للعہ ر

کولتار۔ تھی تو بیچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام کولتار صاحب رکھ دیا۔ پھر کیسے کیسے واقعات پیش آتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۶ر

ویمپائر۔ زانی مرد خونخوار درندے کی طرح ایک بیکس عصمت مآب خاتون پر جھپٹتا ہے، اسکی زندگی برباد کرتا ہے۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۶ر

شریر بیوی۔ اس قدر شریر عورت تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی۔ کیا کیا ناک میں دم کیا ہے اس شریر بیوی نے! ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اس کی زندگی خراب کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر

چسکی۔ عورت کی فطرت جان جائے پر آن نہ جائے۔ غیرت و شرافت کی مُنہ بولتی تصویر "چسکی" میں دیکھئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

روحِ ظرافت۔ "انگوٹھی کی مصیبت" اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا ۔ ۔ ۸ر

روحِ لطافت۔ "مہارانی کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا عبرتناک افسانہ آپنے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیانک مگر دلکش ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

مسز گرمسلے۔ ایک بے انتہا ہنسانے والی کہانی۔ مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی کی جدید ترین تصنیف ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

دیکھا جائیگا۔ ایک لڑکی پر تین مردوے عاشق ہوگئے تو "دیکھا جائیگا صاحب" کچھ فیصلہ نہ کر سکے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

ملفوظاتِ ٹامی۔ کتے، مرغے مُرغیاں اور گھریلو جانور انسانی زبان بولنے لگے۔ کیسی عجیب عجیب باتیں کی ہیں انہوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲

ساقی ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک۔ فی پرچہ ۸؍
ممالکِ غیر سے ۱۲ شلنگ

ہر سال ساقی کے ۲ دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں مستقل خریداروں سے ان کی قیمت الگ نہیں لیجاتی۔

جُرعات

جلد ۲۲ | ساقی دہلی، بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر ۴

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کو بفضلہٖ اُردو کے بہترین ادیبوں اور انشا پردازوں کی قلمی اعانت حاصل ہے۔ ہماری تو یہی کوشش ہے کہ آپ کی تسکینِ ذو کیلئے عمدہ سے عمدہ مضامین فراہم کریں لیکن آپ کے مشورے لغیر ہماری کاوش وجد وجہد مکمل نہیں ہوسکتی۔ ناظرینِ ساقی میں اکثر وہ حضر شامل ہیں جن کا مشورہ ہمارے لئے شمع ہدایت ہوتا رہتا ہے۔ ہم اُن کی آراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اُن پر بڑی حد تک عمل بھی کر ہیں۔ مگر ہماری خواہش ہے کہ ساقی کے اگر کل نہیں تو بیشتر خریدار حضرات اپنے مشوروں سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع دیں۔ اس لئے ناظ سے استدعا ہے کہ ہمیں اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں۔ آجکل کی کساد بازاری اور ہماری مجبوریوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے جو ہمدردانہ مش دیا جائے گا اس کے لئے ہم شکرگزار ہونگے۔ ساقی کے دیرینہ خریداروں میں سے چند حضرات شاکی ہیں کہ ساقی اب وہ نہیں رہا جو دس، پہلے تھا۔ ان کی خدمت میں ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کچھ ساقی ہی پر موقوف نہیں ہے۔ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور ضروری ہے کہ دورِ گردشِ زمانہ کا ساتھ دے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اس گیارہ سال کے عرصے میں ساقی کے کتنے قلمی معاون ہم سے بچھڑ گئے! کتنی بڑی تع موت کی بھینٹ چڑھی! کچھ زندہ درگور ہوتے کچھ فکرِ روزگار میں مبتلا ہو کر چھوٹ لے اور کچھ اختلاف کر کے رُوٹھے۔ مگر اب بھی لکھنے وا میں بعض ایسی وضعدار ہستیاں ہیں کہ طوفانِ حوادث کی شکار ہیں مگر ساقی سے مفارقت انہیں گوارا نہیں۔ سچ پوچھئے تو انہیں حضرات ساقی کی لاج رکھی ہے اور انہیں حضرات کی توجہ سے ساقی کی انفرادیت قائم ہے۔

سالنامۂ ساقی کیلئے مضامین جمع کئے جارہے ہیں۔ جو مضامین ابتک موصول ہوچکے ہیں اُن کی تفصیل نومبر اور دسمبر کے پرچ میں پیش کی جائے گی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ جنوری ۱۹۴۱ء کا سالنامہ ساقی کے گزشتہ سب سالناموں سے بڑھ چڑھ کر شائع ہوگا انشاءاللہ۔ مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اکتوبر کے آخر تک اپنے اپنے مضامین بھیجدیں تاکہ سالنامہ مرتب کرنے دُشواری نہ ہو۔

"کیف و سرور" کے نام سے حضرت بہزاد لکھنوی کا دوسرا مجموعۂ کلام ساقی بک ڈپو کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ پہلا مجموعہ "نغمۂ نور" مقبولیتِ عام حاصل کرچکا ہے۔ اُمید ہے کہ "کیف و سرور" اس سے بھی زیادہ مقبول ہوگا۔ کتاب کے متعلق صرف اتنا کہنا کاف کہ کتب خانہ ساقی سے شائع ہوئی ہے اور خاص اہتمام سے شائع کی گئی ہے۔ کاغذ کی گرانی کے باوجود قیمت میں اضافہ نہیں کیا گیا ہے قیمت رکھی گئی ہے جو "نغمۂ نور" کی ہے۔ یعنی عہ علاوہ محصولڈاک (۶)

شاھد

ساقی بک ڈپو سے ہر قسم کی کتابیں طلب کی جاسکتی ہیں۔ آپکو جس کتاب کی ضرورت ہو ساقی بکڈپو سے طلب فرمائیں۔ سب کتا نہایت احتیاط سے بھیجی جاتی ہیں۔ مختلف اداروں سے طلب کرنے کے بجائے ہم سے کتابیں منگائیے تاکہ محصولڈ کی آپ کو کفایت رہے۔ فہرست کتب مُفت طلب فرمائیے۔

مہتمم رسالہ ساقی۔ دہلی!

میر صاحب کا ایک خاص رنگ

میر حسن نے اپنے "تذکرۂ شعرائے اُردو" میں لکھا ہے کہ میر صاحب کی طرز حکیم شفائی کی طرز سے ملتی جلتی ہے[۱]۔ خود میر صاحب کا بیان ہے کہ میں محسن تاثیر کا تتبع کرتا ہوں۔[۲]

صاحب "آب حیات" کے نزدیک میر صاحب "گویا اُردو کے سعدی ہیں"[۳]

علامہ نظم طباطبائی کا یہ قول حقیقت سے خالی نہیں کہ میر صاحب جب تناسب لفظی اور ضلع کی طرف جُھکتے ہیں تو امانت لکھنوی اور شاہ نصیر دہلوی کو مات کر دیتے ہیں۔[۴]

عام طور پر زبان کی سادگی اور سوز و گداز کو میر صاحب کا خاص انداز کہتے ہیں۔

مگر میر صاحب کا ایک خاص رنگ اور بھی ہے جو اُن کے اور تمام رنگوں سے زیادہ شوخ اور زیادہ گہرا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف اسباب کی بنا پر یہ رنگ ماند پڑ گیا اور عام طور پر لوگ اس سے واقف نہیں۔ دوسروں کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر اگر کوئی شخص میر صاحب کے کلام کا بالاستیعاب مُطالعہ کرے تو وہ ضرور اِس نتیجے پر پہونچیگا کہ میر صاحب کا موضوعِ سخن "سادہ رویوں سے عشقبازی" ہے۔ اور اُنکے کلام کا بیشتر حصہ اُنکے اس ایک شعر کی تفسیر ہے ؎

کیا میر تو روتا ہے پامالیِ دل ہی کو ان لونڈوں نے تو دِلّی سب سر پہ اُٹھالی ہے ۔

اس داستانِ محبت کے اہم اجزا میر صاحب کے چھ دیوانوں میں بِکھرے پڑے ہیں، اُنہیں یکجا کر دینے کے بعد اُس دَور کے اخلاق و معاشرت کی ایک اچھی خاصی روداد مرتب ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ میر صاحب کی تاریخ وفات سے لیکر آج تک کہ ۱۳۴ برس ہوتے ہیں، میر صاحب اور اُن کی شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا لیکن جہانتک موصوف کے اس خاص رنگ کا تعلق ہے سب کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ میر صاحب اپنے اس رنگ میں بالکل منفرد ہیں۔ "دِلّی کے لونڈے" اس کثرت سے اور کہیں آپ کو نہ ملیں گے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اربابِ نقد نے میر صاحب کی شاعری کے اس نہایت اہم پہلو کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ بظاہر اسکے دو سبب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) یا تو یہ کہ میر صاحب کی عظمت و شہرت سے مرعوب ہو کر کسی نقاد کو اتنی جرأت ہی نہ ہوتی کہ اُنکی شاعری کے دامن کا یہ بدنما داغ دوسروں کو بھی دکھاتا۔

(۲) یا پھر لکھنے والوں نے کلیاتِ میر کا بالاستیعاب مطالعہ ہی نہیں کیا، ورنہ یہ ناممکن تھا کہ میر صاحب کی اس اہم خصوصیت کی طرف کسی کی نظر نہ جاتی۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک خوش ذوق انسان کیلئے میر صاحب کے پورے کلام کا مُطالعہ کرنا کوئی سہل کام بھی نہیں۔ میر صاحب کے مجموعۂ اشعار کو جو تقریباً بیس ہزار ابیات پر مشتمل ہے اگر ایک وسیع صحرا سے تشبیہہ دی جائے تو بیجا نہیں۔ جس طرح ریگستان میں سینکڑوں کوس سفر کرنے کے بعد کہیں ایک پانی کا چشمہ اور کھجور کے چند پیڑ نظر آ جاتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی سینکڑوں اشعار پڑھنے کے بعد کہیں دس پانچ شعر کام کے نکلتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے کلامِ میر کا جو انتخاب شائع کیا ہے وہ بجائے خود ایک تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے مذکورِ بالا دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ میر صاحب کے اشعار غزلیات کی تعداد چودہ ہزار سے کچھ اُوپر ہے جس میں سے کُل (۱۷۲۶) سترہ سو چھبیس شعر ڈاکٹر صاحب نے انتخاب کئے ہیں۔

---

[۱] "طرزش مانا بطرز شفائی"۔ تذکرۂ شعرائے اُردو۔ تالیف میر حسن۔ صفحہ ۱۷۵۔ علیگڈھ ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۲ء۔ راقم الحروف نے شفائی کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ میر صاحب اور شفائی کے طرز کلام میں کوئی خاص مماثلت نظر نہیں آتی۔

[۲] نظم محسن کی رہی سر مشق دیر اس مرے بھی شعر میں تاثیر ہے (میر)

محسن تاثیر کے متعلق لطف علی بیگ آذر صاحب آتشکدہ نے لکھا ہے کہ "باوجود آنکہ تخلصش تاثیر است، سخنش بے تاثیر است"

[۳] آب حیات، تالیف شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد۔ صفحہ ۲۱۲۔ لاہور ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۱۷ء

[۴] شرح دیوانِ غالب، صفحہ ۹۵، انوار المطابع، لکھنؤ۔

یہ انتخاب بہت نرمی سے کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مختصر مجموعے میں سینکڑوں شعر ایسے موجود ہیں جو کسی بلند پایہ اُستاد سے منسوب کئے جانے کے قابل نہیں۔ میر صاحب نے الف کی ردیف میں ۷۰ غزلیں لکھی ہیں جن میں سے پوری ڈھائی سو غزلیں ایسی ہیں جنہیں ڈاکٹر عبدالحق صاحب جیسے مداح میر نے ذرا برابر قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور اُن میں سے ایک شعر بھی منتخب نہیں کیا۔ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کلام کس پایہ کا ہے کہ صرف ایک ردیف کی پوری ڈھائی سو غزلیں نظر انداز کر دی گئیں اور ان میں سے ایک شعر بھی انتخاب میں نہ آسکا۔ حالانکہ معیارِ انتخاب چنداں بلند نہیں ہے۔

یوں تو میر صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ "امرد نامہ" کہلانے کا مستحق ہے مگر ہم نے عموماً وہی اشعار منتخب کئے ہیں جن میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں اور جو صراحتاً اپنے موضوع پر دلالت کرتے ہیں۔ میر صاحب کے زمانے میں سوسائٹی کا جو رنگ تھا اُس کی پوری تصویر تو میر صاحب کے کلام سے پیش کی جائیگی لیکن اس کا پس منظر قائم کرنے کیلئے ہم صرف ایک شخص کا مختصر حال میر صاحب کی نکات الشعرا اور میر حسن کے تذکرہ شعرائے اُردو سے نقل کرتے ہیں۔ میر صاحب عبدالحی تاباں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

جوانِ بامزہ، خوبصورت، معشوقِ عاشق پیشہ، فرقۂ شعرا میں اُس جیسا خوش ظاہر آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔

میر صاحب اور تاباں سے خاصہ ربط ضبط تھا مگر آخر میں ناچاقی ہو گئی تھی۔ تاباں کی جوانمرگی کا ذکر میر صاحب نے اِن الفاظ میں کیا ہے:۔

"معشوق عجیبے از دست روزگار رفت، افسوس، افسوس!"

میر حسن نے زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ تاباں:۔

بے انتہا حسین تھے۔ ساری دُنیا اُن پر مرتی تھی۔ بلکہ ریختہ کی گرم بازاری اُس شعلہ رو کی بدولت دوبالا ہو گئی۔ بہت سے لوگوں نے صرف اس لئے شاعری اختیار کی تھی کہ اس حیلہ سے تاباں کی صحبت میں باریاب ہو سکیں۔ تاباں ایک معشوق تھے عاشق مزاج۔ سلیمان نامی ایک لڑکے پر جان دیتے تھے۔ عین جوانی میں قضا کی۔

میر صاحب اور میر حسن نے جس والہانہ انداز میں تاباں کا ذکر کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ دونوں بزرگ بھی تاباں کی "تیغ نظر" کے گھائل تھے اور کیوں نہ ہوتے جبکہ ایک عالم اُن کی شمع جمال کا پروانہ تھا۔ اس ایک مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت "اہلِ ذوق" میں امرد پرستی کس حد تک مقبول تھی۔ آئیے اب ذرا میر صاحب کے کلام کا مطالعہ کریں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ "فنِ شریف" یعنی عشقِ ساده رویاں اس زمانہ کی سوسائٹی میں کس درجہ ہر دلعزیز تھا۔

میر صاحب نے ہر بات کو اس تفصیل اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ واقعات مجسم ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ پڑھنے والا خود دلی کی گلیوں میں گھوم رہا ہے جہاں قدم قدم پر کُسے حُسن وعشق کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ کہیں کوئی کج کلاہ پری چہرہ محوِ خرام ہے، کہیں کوئی عاشق دل باختہ اپنے بے وفا محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہے، کہیں عاشق ومعشوق ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رازونیاز کی باتیں کرتے چلے جاتے ہیں، کہیں خوبرویوں کے جھگڑے ہیں، کہیں کل شب کی ملاقات کے لئے وعدے ہو رہے ہیں، کہیں رنجش بے جا کے گلے ہیں، کہیں عاشق ناکام کو رسوا کر کے گلی سے نکالا جا رہا ہے۔ غرض ہر طرف ایک قیامت برپا ہے، ہر طرف ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ کوئی متنفس ایسا نظر نہیں آتا جو اس رنگین کھیل میں حصہ نہ لے رہا ہو ساری دلی گلستاں کا باب ہجم بنی ہوئی ہے۔

شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے ظُلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر المفالِ شہر لائے ہیں آفت جہان پر

کیا لڑکے دلّی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ دل لیں ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

گر ٹھہرے ملک آگے اُنہوں کے تو عجب ہے پھرتے ہیں پڑے دلی کے لونڈے جو پری سے

کیا میر تو روتا ہے پامالیِ دل ہی کو ان لونڈوں نے تو دلّی سب سر پہ اُٹھالی ہے

کیا چاہیے خدا نے تجھے ان خوش پسر کو دینا تھا تنک رحم بھی بیداد گروں کو

کچھ ابردانِ المفال میں یہ بہت جو میرا آبرو بھی تمہاری رہے

رفتہ رفتہ یہ طفلِ خوش ظاہر فتنۂ روزگار ہوتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار میں میرؔ صاحب نے دلّی کے پری چہرہ لڑکوں سے ایک عام تعارف کرایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اُن کے حُسن و جمال نے کیسی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ وہ کس بلا کے شوخ، کس غضب کے عیّار تھے اور کس خاموشی کے ساتھ لوگوں کے دل چھین لیتے تھے۔ انسان کیا فرشتہ ہو تو اُن کے فریبِ جال سے نہ بچ سکے۔ صورت دیکھو تو گلاب کے پھول مگر طینت میں سفّاکی، بیدردی، بے مہری کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی۔

اس محل پر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ اچھی صورت والے اتنے ظالم اور بیداد گر کیوں ہوتے تھے؟ کیا حُسن و جفا لازم و ملزوم ہیں؟ اس سوال کا مفصل جواب ہم اپنے مضمون "فارسی غزل اور جفائے محبوب" مطبوعہ ساقی بابت جنوری ۱۹۳۸ء میں دے چکے ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک "نازنین پسر" کی صفات محبوبی ایک شاعر کیلئے تو فریفتگی کا باعث ہو سکتی ہیں لیکن خود شاعر میں وہ صفات سادہ روئی کہاں جو اُس کے محبوب کے جذباتِ محبت کو برانگیختہ کر سکیں۔ اس لئے لازمی طور پر محبوب کی طرف سے بے اعتنائی ظہور میں آئے گی اور اگر اس کی طبیعت غیرتمند واقع ہوئی ہے تو وہ خود کو اس رسوائی سے بچانے اور عاشقِ نافرجام سے اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے ظلم اور بیداد گری سے بھی پرہیز نہ کریگا۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو سادہ رویوں سے سروکار رہا اُنہوں نے ظلم و ستم کو لازمۂ حُسن قرار دیدیا اور مقلّد شاعروں نے رفتہ رفتہ اسے ایک حقیقت کے درجہ پر پہونچا دیا۔

یہ تو دلّی کے عام لڑکے تھے۔ آئیے اب اُن خوبرویوں سے آپ کی ملاقات کرائیں جن کا ذکر میرؔ صاحب نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ ایک تو ان میں ایسا عالم آشوب اور فتنۂ روزگار ہے کہ بس آپ ہی اپنا جواب ہے۔

لڑکے شوخ بہت ہیں لیکن ویسا میرؔ نہیں کوئی ۔۔۔ دُھوم قیامت کی سی ہے ہنگامہ اُسکے اُودھم کا

ایک اور مہ جبیں تو اداباش مگر بلا کا خوبرو، اسکی دلربائی کا عالم نہ پوچھو۔ ایک ایک ادا پر سو سو جوان قربان ہوتے ہیں۔

انداز و ناز اپنے اسی اوباش کے ہیں قہر ۔۔۔ سو سو جوان مرتے ہیں ایک ایک آن پر

ایک اور خوش پسر ہے جو سر سے پاؤں تک حُسن کے سانچے میں ڈھلا ہے۔ پھول سا چہرہ دیکھتے تو دم دبڑیے اور خرامِ ناز کو دیکھئے تو لوٹ ہو جائیے۔

مُنہ اس کا دیکھ رہیئے کہ رفتارِ ناز کو ۔۔۔ سر تا قدم ہے لُطف ہی اس خوش پسر کے بیچ

ایک ایسا پری زاد ہے کہ بس جان ہی لیکر چھوڑے۔ جوان اُس کے دلداوہ، بوڑھے اس پر فریفتہ۔ ہر طرف اُسی کا چرچا ہے۔

بلائے جان ہے وہ لڑکا پری زاد ۔۔۔ اُسی کا شور ہے پیر و جواں میں

دلّی کے پری چہرہ لڑکوں کے اشغال، اُن کی وضع قطع، اُنکے اخلاق و اطوار، سب باتوں کو میرؔ صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہم بخوفِ طوالت صرف اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

ان میں سے بعض طرحدار ابھی مکتبوں میں پڑھتے ہیں۔ مگر اس کمسنی کے باوجود فنِ معشوقی میں کمال رکھتے ہیں۔ اچھے اچھوں کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں۔ عشاق سے وہ وہ چالیں چلتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔

ہر گرچہ طفلِ مکتب وہ شوخ ابھی تو لیکن ۔۔۔ جس سے ملا ہے اُس کا اُستاد ہو ملا ہے

اور کوئی ان میں ایسا خوبرو ہے کہ حُسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میرؔ صاحب نے شہر کے تمام مدرسے چھان مارے مگر اس جیسی پیاری صورت کہیں نظر نہ آئی۔

ان درس گہوں میں ویسا آیا نہ نظر کوئی ۔۔۔ کیا نقل کروں خوبی اس چہرہ کتابی کی

انہیں خوش جمالوں کے حُسن کی کشش تھی جو دل والوں کو کسی طرح مدرسے سے نکلنے نہیں دیتی تھی۔ ساتھی ایک ایک کر کے فارغ التحصیل ہو کے چلے گئے مگر یہ ہیں کہ ڈٹے ہوئے ہیں۔ برس گذر گئے مگر جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پڑھتے پڑھتے ایک زمانہ ہو گیا مگر کتابیں کسی طرح ختم ہی ہونے میں نہیں آتیں، مدرسہ نہ چھوڑنے کے لئے آخر کچھ تو بہانہ چاہیئے۔

ساتھ کے پڑھنے والے سب فارغ تحصیل علم سے ہوئے ۔۔۔ جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

مکتب کے باہر ان سادہ رویوں کے اشغال طرح طرح کے ہیں۔ بعض ان میں بڑے کھلنڈرے ہیں۔ جب دیکھو کھیل کود میں مصروف ہیں۔ گھومتے پھرتے

کسی گلی کوچے میں کہیں عاشق سے ملاقات ہو گئی تو ذرا اُسے بھی بہلا دیا۔ یہ نہیں کہ گھڑی بھر کیلئے اس کے پاس بیٹھیں اور اُسکے دل کی آرزو پوری کریں۔

ہم نہ جانا اختلاط اس طفل بازی گوش کا ۔۔۔ گرم بازی آگیا تو ہم کو بھی بہلا گیا

ہجر میں اس طفل بازی گوش کے رہتا ہوں جب ۔۔۔ جا کے لڑکوں میں ٹک اپنے دل کو بہلاتا ہوں میں

بعض کو سواری کا شوق ہے مگر گھوڑا کہاں، بانس کا ڈنڈا ٹانگوں میں دبایا اور دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ یہی بانس انکا گھوڑا ہے اور وہ اسکے سوار عشاق بھی ساتھ ساتھ ہیں جیسے سوار کے ہمراہ نفر دوڑتا ہے۔ ہائے کیا کریں بیچارے دل سے مجبور ہیں۔

چاہت بری بلا ہے کل میر نالہ کش بھی ۔۔۔ ہمراہ لے سواراں دوڑے پھرے نفر سے

کیا بد بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میر جی ۔۔۔ دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نفر چلے

بعض کو گیند کھیلنے سے دلچسپی ہے۔ گیند اُچھالتے پھرتے ہیں۔ چاہنے والے اسی ادا پر مٹے جاتے ہیں۔

یہ سر تبھی سے گوے ہے میدانِ عشق کا ۔۔۔ پھرتا تھا جن دنوں میں تو گیندیں اُچھالتا

پتنگ بازی اور تمام کھیلوں سے زیادہ ہر دلعزیز ہے۔ جسے دیکھو پتنگ اُڑا رہا ہے۔ چاہنے والے یہاں بھی موجود ہیں۔ ملنے آئے ہیں۔ کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہاں اتنی فرصت کِسے۔ پتنگ اُڑاتے اُڑاتے کچھ حیلہ بہانہ کر کے ٹال دیا۔ کوئی چکمہ دیکر چلتا کیا۔ کس بلا کے چالاک ہیں۔

ٹالا نہیں کچھ مجھکو پتنگ آج اُڑا سے ۔۔۔ بہتوں کے تئیں باد کا رُخ اُن نے بتایا

جب کا کاغذ باد کا ہے شوق اُسے ۔۔۔ ایک عالم اس کے اُوپر ڈور ہے

بعض ان میں ایسے شوخ اور شریر ہیں کہ اگر کسی عاشق نے خط لکھا تو انہوں نے اُسے پتنگ کی طرح اُڑا دیا۔ یہ حال دیکھکر میر صاحب نے تو خط بھیجنا ہی موقوف کر دیا تھا۔

ہم نہیں لکھتے اسلئے اسکو شوخ بہت ہے وہ لڑکا ۔۔۔ خط کو کاغذ بادی کر کے باد کا رُخ بتلا دیگا

جب طول میں دیا ہے نامہ کو شوق کے تب ۔۔۔ جوں کاغذ ہوائی اُن نے اُڑا دیا ہے

بدی نوشتہ کی تحریر کیا کروں میں ۔۔۔ کہ پہنچے نامہ تو پھر کاغذ ہوائی ہو

اس ضمن میں میر صاحب کا صرف ایک شعر اور سُن لیجئے۔

اُڑاتا گڈی وہ باہر نہ آوے ۔۔۔ مبادا مجھکو بھی گُڈا بناوے

عاشق مزاجوں کو دیوانہ بنانے کیلئے اِن فتنہ گروں کا حُسنِ عالم آشوب ہی کیا کم تھا کہ آرائش جمال نے اور بھی قیامت برپا کر دی۔ ہر ادا میں بانکپن، ہر بات میں دلفریبی کے انداز، ٹوپی اوڑھیں گے تو ٹیڑھی کر کے، لباس پہنیں گے تو نہایت چُست تاکہ بدن کا حسن اچھی طرح نمایاں ہو جائے۔ آئیے پہلے کجکلاہوں سے ملئے اور انصاف سے کہیئے کہ انہیں دیکھکر کون اپنا سر نہ پھوڑ لیگا۔ وہ دیکھئے سامنے کوئی جھومتا چلا آرہا ہے۔ شراب نہیں پی فقط اپنے بادہ حسن سے سرشار ہے۔

کیا کیا تم نے فریب کئے ہیں سادگی میں دل لینے کو ۔۔۔ ٹیڑھی کر کے کلاہ آئے تھے مے ناخوردہ ماتے تھے

سر پھوڑنا ہمارا اس لڑکے پر نہ دیکھو ۔۔۔ ٹک دیکھو اس شکستِ طرف کلاہ کو بھی

اور ذرا ان کا لباس تو دیکھو۔

کیا پہناوا خوش آتا ہے ان لڑکے چسپاں پوشوں کا ۔۔۔ مونڈھے چسے ہیں چولی پھنسی ہے ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں

سیر قابل ہیں تنگ پوش اب کے ۔۔۔ کہنیاں پھلتی چولیاں چستے

بعض کو اپنی زلف گرہ گیر کی قوت پر ناز ہے۔ لہذا انہوں نے بال کھول دئے ہیں۔ دُنیا ہے کہ کھنچی چلی آتی ہے اور اس جال میں گرفتار ہو رہی ہے۔

کھولکر بال سادہ رو لڑکے ۔۔۔ خلق کا کیوں وبال لیتے ہیں

دلوں کا شکار کرنے کیلئے یہ فتنہ گر نئی سے نئی وضع ایجاد کرتے ہیں۔ ایک انوکھی طرز یہ نکالی ہے کہ پگڑی کے پیچوں میں بالوں کو گھرس لیتے ہیں بختاق

ہیں کہ اس ادا پر مٹے جاتے ہیں۔ جان دے دیتے ہیں۔ میر صاحب بھی آخر انسان ہیں فرشتہ نہیں۔ ان کے پہلو میں بھی جذبات سے لبریز دل ہے، بجس گوشت کا لوتھڑا نہیں۔ اس بے پناہ حربے کی تاب کہاں تک لاتے۔ اس ادا پر ایسے فریفتہ ہوتے کہ ہر وقت یہی تصویر آنکھوں میں پھرتی ہے۔ جب غزل لکھنے بیٹھتے ہیں ایک شعر اس مضمون کا ضرور لکھ دیتے ہیں۔ آپ کو یقین نہ ہو تو نمونہ حاضر ہے:۔

اگلے کیا پیچ تمہارے نہ تھے بس عاشق کو — بال جو اور گھُرسنے لگے دستار کے بیچ
اک جمع کے سر او پر روز سیاہ لایا — پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ گھُرس کر
کیوں سر چڑھے ہو ناحق ہم بخت سیاہوں کے — مت پیچ میں پگڑی کے بالوں کو گھُرس ظالم
رہتا تھا سرِ زلف بھی زیر کلہ آگے — سو بال گھُرس نکلے ہیں دستار میں صاحب
بل کیوں نہ کھاتیے کہ لگا رہنے ابتو واں — بالوں میں، اور پیچ میں پگڑی کے، بل پڑا
یار کے بالوں کا بندھنا قہر ہے پگڑی کیساتھ — اک عالم دوستاں اس پیچ میں مارا گیا
اٹکھیلی کی بھی اسکی دل تاب نہیں لاتا — کیا پگڑی کے پیچوں میں لے بالوں کو بل ڈالا
میں نے سراپنا دُھنا تھا تبھی، اس شوخ نے جب — پیچ سے پگڑی کے باندھا تھا اٹھا کاکل کو
بال بل کھاتے ہوئے پیچوں سے پگڑی کے گئی — طرز کیں چتون کی پائی سر میں شور جور ہے

ایک اور رسم یہ تھی کہ گوری گوری کلائیوں میں سُرخ بندھن باندھتے تھے۔ دلدادگانِ حُسن کیلئے یہ ادا بھی قہر تھی:۔

گئے بہتوں کے سر لڑکوں نے جو یہ باندھنوں باندھے — شہید اک میں نہیں ان باندھنوں کے شوخ چیرؤں کا

اِن میں جو صاحبِ استطاعت تھے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے اور جس وقت وہ سڑک پر سے گذرتے تھے تو ایک عجب عالم ہوتا تھا۔ صبا رفتار گھوڑا آندھی کی طرح آیا اور بجلی کی طرح کوندتا ہوا نکل گیا۔ دیکھنے والے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آرزوئے دید پوری نہ ہوئی۔ دل دھک دھک کر رہے ہیں۔ سینوں میں جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا ہے:۔

بجلی سا مرکب اس کا کڑک کر چمک گیا — لوگوں کے سینے پھٹ گئے جانیں دھڑک گئیں

عشاق میں بعض من چلے ایسے بھی ہوتے تھے کہ اپنی جان سے ہاتھ دھو کر گھوڑے کے سامنے آ کھڑے ہوتے تھے۔ ناچار سوار کو باگ روکنی پڑتی تھی:۔

اُسکے گھوڑے کے آگے سو نہ ٹلے — ہم بھی دُبلے شکار کے مانند

اِن گھڑ سوار معشوقوں کا ذکر کرتے ہوئے میر صاحب ایک خاص محبوب کے متعلق لکھتے ہیں کہ بس معشوق یہی تو وہ ہے۔ اُس کے مقابلے میں دوسرے محبوبوں کا وہی مرتبہ ہے جو ایک سوار کے مقابلے میں ایک سائیس کا ہوتا ہے:۔

تجھ سا تو سوار ایک بھی محبوب نہ نکلا — جس دلبرِ خود کام کو دیکھا سو نفر ہے

آئیے اب ذرا اِن اچھی صورت والوں کے اخلاق و اطوار پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ میر صاحب کا بیان ہے کہ یہ سب کے سب نہایت بد وضع اوباش اور بدمعاش ہیں، دل لینے کے بعد طرح طرح سے جھگڑا کرتے ہیں، بات بات پر بگڑتے ہیں، خواہ مخواہ لڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو انہیں حرکتوں کے باعث ان سے کنارہ کش ہو گئے اور کنارہ کش کیا نہ ہو جائیں۔ بھلا ایسے اوباشوں سے ملنا کسی بھلے آدمی کا کام ہے:۔

صحبت میں اس کی کیونکہ رہے مرد آدمی — وہ شوخ و شنگ بے تہ و اوباش و بدمعاش
ایک ایک بات اُوپر ہیں پیچ و تاب سو سو — رہتے نہیں ہیں سیدھے یہ لونڈے ٹیڑھے بانکے
دل لیکے کیسے کیسے جھگڑے مچادتے ہیں — بد وضع یاں کے لڑکے کیا خوش معاملے ہیں
اوباش بھی ہمارا کتنا ہے ٹیڑھا بانکا — دیکھ اسکو ہو گئے ہیں کیا کیا کشیدہ مردم
میر بلا ناساز طبیعت لڑکے ہیں خوش ظاہر بھی — ساتھ ہمارے راہ میں ہیں پھر ہم سے لڑتے جاتے ہیں
ناسازیِ طبیعت کیا ہو جوان ہوتے پر — اوباش وہ ستمگر لڑکا ہی تھا لڑاکا

اِن بدمعاشوں کو عاشق کا کچھ خیال ہی نہیں، عاشق ان کی نظر میں کچھ مال ہی نہیں۔

کچھ پاس نہیں یاری کا اِن خوش پسروں کو — اس دشمن جانی سے عبث یار ہوتے ہم
پاس آنا یکطرف مطلق نہیں ہے اسکو پاس — کچھ گئے گذرے سے سمجھا وہ پسر آیا ہمیں

اور اپنے آپ کو خدا جانے کیا سمجھتے ہیں کہ مارے غرور کے کسی کی کچھ قدر وقیمت ہی اُن کی نظر میں نہیں۔

کیا باطل ناچیز یہ لونڈے قدر پہ اپنی نازاں ہیں — قدرتِ حق کے کھیل تو دیکھو عاشق بے مقدور ہوئے

وعدہ خلافی اور بہانہ سازی تو اِن کی گھٹی میں پڑی ہے۔

وعدے ہیں سارے خلاف اور حرف ہیں یکسر فریب — تم لڑکپن میں کہاں سے ایسے عیارے ہوئے

روز عاشق سے وعدے کرتے ہیں کہ اچھا آج ضرور تمہارے ساتھ چلیں گے مگر آج ہی آج میں ایک زمانہ گذر گیا۔

روز کہتے ہیں چلنے کو خوباں — لیکن اب تک تو روز اول ہے

اور جب اُدھر سے زیادہ اصرار ہوا تو کوئی نیا بہانہ کر دیا۔ مثلاً یہ کہ پاؤں میں چوٹ لگ گئی ہے چلا نہیں جاتا، کیونکر چلیں، پاؤں اچھا ہو جائے گا تو چلیں گے۔

"پاؤں میں چوٹ آگئی" پیارے بہانے جانے دے — پیشرفت آگے ہمارے کب یہ عذرِ لنگ ہے

قیامت ہے کہ کوئی مر رہا ہو تب بھی یہ اپنی حیلہ سازیوں سے باز نہیں آتے۔

جان تو ہے یاں گرمِ رفتن لیت ولعل واں ویسی ہی — کیا کیا مجھکو جنوں آتا ہے اس لڑکے کے بہانوں پر

اور بظاہر اگرچہ بھولے بھالے ہیں مگر درحقیقت بلا کے عیار ہیں۔ کوئی انکی کمسنی پر نہ جائے۔ ع۔ یہ چھوٹے چھوٹے فتنے قیامت سے کم نہیں۔

یار کی ان بھولی باتوں پر نہ جائے ہمنشیں — ایک فتنہ ہے وہ اس کو آہ مت لڑکا سمجھ
ٹک پاس آکے کیسے صرفے سے ہیں کشیدہ — گویا کہ ہیں یہ لڑکے پیر زمانہ دیدہ

ایک دُنیا ہے کہ ان کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر یہ عیار کسی کے ہتھے نہیں چڑھتے۔ کسی سے کچھ حیلہ کر دیا، کسی کو کچھ کہہ کے ٹال دیا۔

اک خلق تلاشی ہے پر ہاتھ نہیں لگتے — لڑکے تو ہو پر سب کو ٹالے ہی بتاتے ہو

اور کسی سے ملتے بھی ہیں تو بڑی سرد مہری کے ساتھ۔ بیچارہ عاشق ابھی آیا ہے۔ بیٹھنے نہیں پایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہاں سے تشریف لیجائیے۔

گرچہ ملتے ہیں خنک غیرتِ مہ یہ لڑکے — دل جگر دونوں کو یکلخت جلا دیتے ہیں
صحبت جو اُس سے رہتی ہے کیا نقل کرئے ہائے — جب آگئے ہم تو کہا اُن نے یاں سے جاؤ

کسی پر بہت ہی مہربان ہوئے اور اس نے بڑی منت سماجت کی تو گھر سے اُٹھکر اسکے ساتھ ذرا بازار تک چلے گئے۔

کیا سلوک اس بیوفا کے نقل کرتے ہمنشیں — منتیں کرتے تو یاں تک گھر سے اُٹھکر آئے وہ

ایک طرف تو چاہنے والوں سے یہ بے اعتنائی برتتے ہیں اور دوسری طرف دلربائی کی اداؤں سے بھی نہیں چوکتے جہاں کسی "دلفروش" کو دیکھا اسکی طرف آنکھ مار دی۔ ع۔ بھلا اس شرارت کی کچھ انتہا ہے۔

چشمک کرے ہے میری طرف تو نگاہ کر — وہ طفلِ شوخ چشم، قیامت شریر ہے

چاہنے والوں کو ستانے کی نئی سے نئی ترکیب اِنہیں سُوجھتی ہے۔ عاشق نے محبت نامہ بھیجا ہے۔ خدا جانے کیا کیا کچھ دردِ دل کا اظہار کیا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔ جواب آتا ہے۔ عاشق بیتاب ہو جاتا ہے سمجھتا ہے کہ دردِ محبت نے اثر کیا۔ پتھر کو جونک لگی، ظالم کا دل پسیج گیا۔ سراپا شوق بنکر خط کھولتا ہے۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ کہیں کچھ لکھا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس شرارت کو تو دیکھو۔ ظالم نے سادہ کاغذ لفافہ میں بند کر کے بھیجدیا۔ ہائے اِس جوابِ صاف سے بیچارے عاشق پر کیا گذری ہوگی۔ کیسی مایوسی ہوئی ہوگی۔

ننوشتہ نامہ آیا، یہ کچھ ہمیں لکھا ہے — اس سادہ رُو کے جی میں کیا جانیئے کہ کیا ہے

ایک عجیب بات ہے، جتنا کوئی اُنکے ساتھ عجز و نیاز سے پیش آتے اتنا ہی یہ اور سرکش ہو جاتے ہیں۔ سلام کا جواب تک نہیں دیتے۔

میں جو نرمی کی تو دونا سر چڑھا وہ بدمعاش — کھانے ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حلوا سمجھ

جُھک جُھک سلام کرنے سے سرکش ہوا وہ اور　　ہو بیٹھے نااُمید جوابِ سلام سے

ایک بڑی مُصیبت یہ تھی کہ "یک انار و صد بیمار" والا معاملہ تھا۔ ایک ایک خوبرو کے پیچھے سو سو طلبگار پھرتے تھے:۔

لڑکے دِلّی کے ترے ہاتھوں میں کب آتے میر　　پیچھے ایک ایک کے سو سو پھریں ہیں ڈاگ لگے

یہ خوش جمال آپس میں بھی معاشقہ کرتے تھے جس سے عشاق کے معاملہ میں اور بھی اُلجھنیں پیدا ہوجاتی تھیں:۔

اب وہ مہرو اک اور مہ سے ملا　　چند در چند یہ حکایت ہے

ایک ایرانی "اُستاد" نے اسی قسم کے ایک "معاملہ" کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کیا خوب اپنے "کمال" کا اظہار کیا ہے کہتا ہے:۔

عاشق شدن منافی معشوقی تو نیست　　خواہم کشید تنگ در آغوش ہر دو را

بعض ان میں ایسے بھی تھے جو از روئے طبع نرم و مہربان تھے اور بسہولت عشاق کے ہاتھ لگ جاتے تھے:۔

لڑکے جہان آباد کے یک شہر کرتے ناز　　آجاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا

مذکورِ بالا اشعار میں دلّی کے پری چہرہ لڑکوں کے اخلاق و اطوار کا ایک اجمالی خاکہ آپنے ملاحظہ فرمایا۔ اگر آپ کو اس کی تفصیل دیکھنی مقصود ہو تو میر صاحب کے کلّیات کا مُطالعہ فرمائیے۔ اس ضمن میں ایک بات البتہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جسے میر صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اِن کجکلاہوں کے کیرکٹر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اُنکی زر دوستی اور لالچ ہے:۔

پیسوں پر ریجھتے ہیں یہ لڑکے　　عشق سیمیں تناں کو زر ہے شرط

ابتدائے کار میں میر صاحب کا یہ خیال تھا کہ اِن زر دوست خوبرویوں کو ہرگز دل نہ دینگے:۔

یوں نہ دینگے دل کسی سیمیں بدن زر دوست کو　　ابتدائے عشق میں اپنا بھی گھر دیکھیں گے ہم

مگر افسوس کہ اس ارادے پر قائم نہ رہ سکے۔ دل بھی دیا اور زر بھی دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالکل قلاش ہوگئے:۔

جب کچھ اپنے کنے رکھتے تھے تب بھی صرف تھا لڑکوں کا　　اب جو فقیر ہوئے پھرتے ہیں میر اِنہیں کی بدولت ہے

ان سادہ رویوں کو اپنے چاہنے والوں سے کوئی دلی لگاؤ تو ہوتا نہ تھا۔ محض پیسے کے لالچ سے ملتے تھے لہذا بر بنائے تنگدستی جب اِدھر سے ہاتھ رُکا تو اُدھر سے بے اعتنائیاں ہونے لگیں یہاں تک کہ ناچاقی ہوگئی:۔

ان بن ہی کے سبب ہیں اُس لالچی سے سارے　　یاں ہے فقیری محض، واں چاہئے ہے اسباب

مفلسی کی بنا پر خوبرویوں سے نہ مل سکنے کا ذکر میر صاحب نے بڑی حسرت کے ساتھ کیا ہے:۔

سیمیں تنوں کا ملنا چاہے ہے کچھ تموّل　　شاہد پرستیوں کا ہم پاس زر کہاں ہے

کبھی کسی زر دوست محبوب کو اسکی زر دوستی پر ملامت کرتے ہیں مگر بڑے پیار کے ساتھ:۔

کیا چیز ہے تو پیارے مفلس ہیں داغ تیرے　　پیسے لئے پھرے ہیں زردار تیری خاطر

مگر کبھی کبھی لہجہ کسی قدر دُرشت بھی ہوجاتا ہے:۔

غریبوں کی تو پگڑی جامے تک لے ہے اُتروا تو　　تجھے اے سیمبر لے بر میں جو زردار عاشق ہو

ایسے زر دوست ہو تو خیر ہے اب　　ملتے اُس سے جو کوئی مال رکھے

اور بعض اوقات تو مزاج بہت ہی برہم ہوجاتا ہے اور خوب کھری کھری سُناتے ہیں:۔

کیسہ پر زر ہو تو جفا جو یاں　　تم سے کتنے ہماری جیب میں ہیں

کسی خاص معاملہ میں جس شخص کو تلخ تجربے ہوتے ہوں وہ قدرتی طور پر دوسروں کو اُس بلا میں مُبتلا ہونے سے بچانا چاہتا ہے۔ میر صاحب کو معلوم ہے کہ امیروں کے لڑکوں سے عشقبازی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے اسی لئے سب کو یہ صلاح دیتے ہیں بلکہ نصیحت کرتے ہیں کہ خدارا اِن امیر زادوں سے نہ ملنا ورنہ ان کی فرمائشیں پوری کرتے کرتے دیوالہ نکل جائیگا۔

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

امیرزادوں سے دلّی کے مل نہ تا مقدور کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انہیں کی دولت[1] سے

میرصاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زر دوستی ان معشوقوں کی فطرت میں داخل تھی۔ مگر درحقیقت یہاں بھی وہی نفسیاتی عنصر کام کر رہا ہے۔ عاشق و معشوق کو ایک دوسرے سے وابستہ رکھنے والی چیز طرفین کی محبت ہی۔ مگر جہاں محبوب کوئی "خوش پسر" ہو تو ظاہر ہے کہ وہاں محبت یکطرفہ ہوگی۔ محبوب اپنے چاہنے والے سے گھبرائیگا، بھاگے گا۔ ملنا نہ چاہے گا۔ تو اب ملاقات کی کیا صورت ہو؟ محبوب کا التفات کیونکر حاصل کیا جائے؟ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ یعنی جناب قاضی الحاجات حضرت "زر"[2] سے مدد لی جائے۔ یہ بزرگوار وہ بلائے بد ہیں کہ انسان کیا آہن و فولاد کو پگھلا دیں۔

ع۔ زر بر سر فولاد نہی نرم شود

لڑکے آخر لڑکے ہی تو ہوتے ہیں۔ دولت کے جال میں اگر پھنس جائیں تو تعجب کیا۔ پیسے کا لالچ تو وہ بُری بلا ہے کہ اچھے اچھوں سے بُرے سے بُرے کام لئے جاسکتے ہیں اور لئے جاتے ہیں۔ زر دوستی انسانی فطرت کی ایک عام کمزوری ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ ہر شخص کی ایک قیمت ہے اور اُس قیمت پر اُسے خریدا جاسکتا ہے۔ لہذا یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ میرصاحب کے زمانہ میں لالچ اور زر دوستی دلی کے خوبصورت لڑکوں کے کیرکٹر کی خصوصیت تھی۔

میرصاحب کے "امردنامہ" کے چند باب آپنے ملاحظہ فرمائے مگر اس کہانی کا زیادہ دلچسپ درزیادہ عبرتناک حصہ ابھی باقی ہی۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان اشعار میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ حقیقت ہیں یا افسانہ اس لئے کہ ہمارا موضوع بحث میرصاحب کی ذات نہیں بلکہ انکی شاعری ہی۔

میرصاحب نے لکھا ہے کہ ہمارے اباجان، خدا انہیں جنّت نصیب کرے، بہت ہی اچھے آدمی تھے انہوں نے کبھی امردپرستی نہیں کی۔

فردوس ہو نصیب، پدر آدمی تھا خوب دل کو دیا نہ اُس نے کسی خوش پسر کے تئیں

اور صرف یہی نہیں کہ خود اس فعل شنیع سے پرہیز کیا بلکہ مجھے بھی ہمیشہ یہی نصیحت کیا کرتے تھے کہ بیٹا یہ امردپرستی بڑا خطرناک کھیل ہی۔ خدا کیلئے کبھی بھول کر بھی اس کی طرف رُخ نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جاؤگے۔ ہائے افسوس میں نے اُن کی بات نہ مانی اور آخر وہی ہوا جو انہوں نے کہا تھا۔ سادہ رویوں کی دوستی نے کہیں کا نہ رکھا۔

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

میرصاحب کو دنیا کے سربرآوردہ عشاق کا یہ اصول پسند نہیں کہ بس ایک ہی کے ہو رہے۔ میاں مجنوں ہیں تو سوائے لیلیٰ کے اور کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں، بی زلیخا ہیں تو سوائے اپنے ایک زرخرید غلام کے اور کسی کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتیں۔ مگر میرصاحب کا یہ اصول ہے کہ:۔

دے نہیں تو انہوں کا بھائی اور عشق کرنے کی کیا منائی ہے

ہماری چاہ نہ یوسف ہی پر ہے کچھ موقوف نہیں ہے وہ تو کوئی اور اس کا بھائی ہو

امردپرستی سوسائٹی کا ایک محبوب مشغلہ ضرور تھی پھر بھی لوگ اُسے دوسرے ممنوعات کی طرح چھپا کر ہی کرنا پسند کرتے تھے۔ ع۔ عشق اور مشک چھپائے سے کہیں چھپتا ہے۔ میرصاحب نے بھی ہرچند احتیاط کی مگر بھانڈا پھوٹ ہی گیا۔

میر ہرچند میں نے چاہا لیک نہ چھپا عشق طفل بدخو کا

رفتہ رفتہ یہ خبر عام ہوگئی کہ میرصاحب نے بھی شاہد بازی شروع کردی اور ہر طرف لوگ اس کا چرچا کرنے لگے۔

کیا قہر ہوا دل جو دیا لڑکوں کو میں نے چرچا ہے یہی شہر کے اب پیر و جواں میں

اور بالآخر جب لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حضرت قبلہ راتوں کو سادہ رویوں سے ملتے ہیں تو ہر طرف سے آپ پر طعن و ملامت کی بوچھار ہونے لگی

کہا بدوضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے ہوا صحبت میں ان لڑکوں کی ضائع روزگار اپنا

میرصاحب اس رسوائی سے بہت متاثر ہوئے اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ اب محبوب کو ساتھ لیکر کہیں گھومنے نہ جایا کرینگے اور بڑی منت کے ساتھ اُس سے کہہ بھی دیا کہ پیارے ہمیں معذور سمجھو۔ اب ہم تمہارے ساتھ سیر کو نہ جاسکیں گے۔ تمہاری بدولت ہم سارے زمانے میں بدنام ہوگئے۔

---

[1] دولت سے یعنی بدولت (شاداتی) [2] لے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

مجرم ٹھہر گئے ہم پھرنے سے ساتھ تیرے　　　بہتر ہے جو رکھے تو اس سے ہمیں معاف اب

مگر رُسوائی کے ڈر سے کہیں محبت کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ میر صاحب کی اس معذوری پر اس شہر آشوب نے بھی کچھ آزردگی کا اظہار کیا ہو۔ بہرحال یہ سلسلہ جاری رہا اور اب کسی کو میر صاحب سے ملنا ہو تو کسی کوچے میں، کسی بازار میں کہیں تلاش کرے۔ وہاں دل کا سودا کر رہے ہونگے۔

جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میر　　　ایک ظالم ہے وہ لوطی سرفروش

میر کو طفلانِ رہ بازار میں　　　دیکھو شاید ہو وہیں وہ دلفروش

یہ دورِ زندگی کا ایک المناک دور تھا۔ بڑی بڑی تکلیفیں بیچارے میر صاحب کو اُٹھانی پڑیں۔ گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔

گلیوں میں بہت ہم تو پریشان سے پھریں ہیں　　　اوباش کسی روز لگا دینگے ٹھکانے

کبھی دیکھئے تو خوشامد کے مارے بیٹھے "اس" کے پاؤں داب رہے ہیں:۔

جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی داب ہو اُسکے میر　　　کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت دبو

کبھی مجرموں کی طرح گھنٹوں دُھوپ میں کھڑے جل رہے ہیں:۔

دُھوپ میں جلتے ہیں پہروں اُسکے آگے میر جی　　　رنجش سے دل کی ٹھہرے ہیں گنہگاروں میں ہم

بقول میر صاحب یہ لوگ ہرجائی تو ہوتے ہی ہیں۔ ایک سے سائی ایک سے بدھائی۔ آج اس سے میل کل اُس سے لڑائی۔ وعدہ میر صاحب سے ہے اور چلدئے کسی اور کے ساتھ۔ اب میر صاحب بیچارے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ کسی نے کہا ہم نے جامع مسجد پر دیکھا تھا۔ بس جامع مسجد پہونچے۔ کسی نے کہا ہم سے کشمیری دروازے ملاقات ہوئی تھی، بس کشمیری دروازے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ وہ ظالم نہ یہاں ملتا ہے نہ وہاں اور ملے کیونکر، وہاں ہو تو ملے۔ محلہ کے لوگ خواہ مخواہ میر صاحب کو پریشان کرنے کیلئے جھوٹ موٹ کہدیتے ہیں کہ یہاں دیکھا تھا اور وہاں دیکھا تھا۔

نشاں دیں ہیں جہاں اس کا وہ ہرجائی نہیں ملتا　　　محلہ کے ہمیں اب لوگ یوں ہی خوار کرتے ہیں

پھر یہ خواریاں صرف جگہ جگہ مارے مارے پھرنے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ ان "اوباشوں" نے میر صاحب کو ایسا ایسا ذلیل کیا کہ سُنکر خون کھولنے لگتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میر صاحب بیچارے اپنے شاعرانہ انداز میں اظہارِ نیاز کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کاش میں تیرا فرش راہ بنجاؤں تاکہ ہر وقت تیری قدمبوسی نصیب ہو۔ یہ سُنتے ہی اُس بدمعاش نے بیچ ہی مار مار کر میر صاحب کو بچھا دیا۔

اتنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش　　　سو تو نے مار مار کے آکر بچھا دیا

مگر عاشق کے نزدیک تو ذلت و عزت کا مفہوم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ وہ ذلت کو ذلت اور رسوائی کو رُسوائی ہی نہیں سمجھتا۔ محبوب ہے کہ ٹھوکریں مار رہا ہے مگر یہ ہیں کہ کسی طرح وہاں سے نہیں سرکتے۔

خاک ایسی عاشقی میں ٹھکرائے بھی گئے کل　　　پاؤں کنے سے اس کے پر میر جی نہ سرکے

اس مار میں اور اس ٹھوکر میں وہ لُطف ہے کہ دُنیا کی تمام لذتیں اس پر قربان ہیں مگر اس کا مزہ ایک تجربہ کار عاشق ہی جانتا ہے۔

مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہے وہی　　　کسی کی جس نے کبھو لات کتی کھائی ہو

میر صاحب کہتے ہیں کہ میں جب بھی اس اوباش کے کوچے میں گیا مار کھائی مگر اس لُطف کی خاطر وہاں کا جانا ترک نہ ہوا:۔

رُوِیت اپنی اُس گلی میں کم نہیں　　　ہر جگہ ہر بار ماریں کھائیاں

مگر یہ مار پیٹ، یہ لات گھونسا، انسان اُسی وقت برداشت کر سکتا ہے جبکہ اُسکے ساتھ ساتھ محبوب کچھ اظہارِ نوازش بھی کرے۔

مار بھی آسان ہے، دُشنام سہل　　　یار اگر ہے اہل تو ہے کار سہل

لیکن میر صاحب کو جن بدمعاشوں سے سابقہ پڑا تھا وہ حد درجے کے کمینے تھے۔ ہمیشہ مارتے تھے اور کبھی پیار نہیں کرتے تھے آخر تنگ آکر میر صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کبھی اس بیوفا کے کوچے میں قدم نہ رکھیں گے اور اس کو کہہ بھی دیا کہ اب اگر کبھی ادھر کا رُخ بھی کر دوں تو مجھے سید نہ کہنا۔

در پر سے تیرے اب کے جاؤنگا تو جاؤنگا　　　یاں پھر اگر آؤں گا سید نہ کہاؤں گا

غالباً کوئی رقیب روسیہ بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میر صاحب اپنے دل سے بُری طرح مجبور ہیں۔ آتیں اور بیچ کھیت آتیں

میر صاحب کو چھیڑنے کیلئے کچھ کہدیا۔ بس میر صاحب آگ بگولا ہوگئے۔ مگر رقیب کا کیا بگاڑ سکتے تھے محبوب اسکی حمایت پر موجود تھا۔ بس اتنا کہا کہ اچھا بچہ کبھی اکیلے میں ملوگے تو سمجھونگا۔ اگر جوتے نہ مارے ہوں تو سید نہیں چمار کہنا۔

اے غیر، میر تجھکو گر جوتیاں نہ مارے سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

دلی کے یہ شوخ لڑکے یہ سمجھتے تھے کہ میر صاحب بھولے بھالے سیدھے سادے ہیں۔ ان کا دل چھین لینا آسان کام ہے مگر میر صاحب تو رفتہ رفتہ اس فن کے "امام" ہوگئے تھے۔ وہ وہ حکمتیں ان کو معلوم تھیں کہ افلاطون وارسطو کو بھی معلوم نہ ہونگی۔

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اسکو سادہ سا سمجھ

چنانچہ ایسے ایسے اوباش چھوکرے جو کسی کے ہتھے ہی نہ چڑھتے تھے میر صاحب ایک دو چٹکلوں میں اُنہیں رام کر لیتے تھے۔

کون مل سکتا ہے اُس اوباش سے اختلاط اُس سے ہمیں اک ڈھب سے تھا

جہاں دوسروں کو روپے خرچ کرنے پڑتے تھے وہاں میر صاحب آنوں میں کام نکال لیتے تھے۔

تھے زمانے میں جنکے خرچے روپے ٹھالنسا کرتے ہیں اُن کو آنوں پر

کبھی جان بوجھ کر دیوانے بن جاتے تھے۔ دراصل فنِ شاہد بازی کا یہ بھی ایک اُستادانہ پیچ تھا۔

جان کے تو میں آپ بنا ہوں اِن لڑکوں میں دیوانہ عقل سے بھی بہرہ ہے مجھکو، اتنا میں نادان نہیں

اگر دیکھا کہ ٹھہرنے میں خطرہ ہے تو بس اپنا کام کیا اور کھسک گئے۔

بوسہ لیکر سرک گیا کل میں کچھ کہو کام اپنے کام سے ہے

یہ سب کچھ تھا مگر انجام کار میر صاحب نے محسوس کر لیا کہ ان فتنہ گروں کی محبت میں مفت ہی زندگی برباد ہوئی۔ اپنی نادانی پر اُنہیں بڑا ہی افسوس، بڑا ہی پچھتاوا تھا۔

سمجھے نہ کہ بازیچۂ اطفال ہوتے لڑکوں سے ملاقات ہی نادانی ہے

کہن سالی میں شاہد بازیاں کاہے کو زیبا تھیں دیا لڑکوں کو دل میں نے قیامت میں بھی ناداں ہوں

میں خرد گم عشق میں اس لڑکے کے آخر ہوا یہ ثمر لایا نہ، دیکھا چاہنا نادان کا

معقول اگر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے لڑکوں سے عشقبازی ہنگامِ کہنہ سالی

امرد پرستی ایک فعل شنیع ہے اور جس زمانے میں اس کا چرچا عام تھا اُس زمانے میں بھی کسی نے اسکی قباحت سے انکار نہیں کیا۔ اسی بنا پر خواجہ حافظ اور بعض دوسرے شعرائے اپنی صفائی بھی پیش کی خواجہ صاحب کا ایک شعر ہے۔

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

اسی طرح ہمارے میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا ہے کہ ہم سادہ رویوں کے ساتھ کسی بُری نیت سے عشق نہیں کرتے۔ فقط نظارۂ حُسن مقصود ہے۔

مجھے منظور کیا ہے زلف وخال وخطِ خوباں سے خدا نے دیکھنے کی لت سی آنکھوں کو لگادی ہے

علاوہ ازیں ہماری اس عشقبازی کی غایت اصلی کچھ اور ہی ہے۔

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا ہے عشق سے بتوں کے مرا مُدعا کچھ اور

میر کو واشد نہیں، ہے مقصد اُس کا اور ہی عشق سے لڑکوں کے دل کو کب تلک بہلاوے وہ

مولانا محمد حسین آزاد نے میر صاحب کے حال میں لکھا ہے کہ۔

"(۱) محلہ کے بازار میں عطار کی دکان تھی۔ آپ کبھی کبھی اُس دکان پر جا بیٹھتے تھے۔ اس کا نوجوان لڑکا بہت بناؤ سنگار کرتا رہتا تھا۔ میر صاحب کو بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں۔"

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت ہیں　　اس نسخہ کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

(۲) کسی وقت طبیعت شگفتہ ہو گئی ہو گی جو فرماتے ہیں:-

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوتے جسکے سبب　　اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں[1]

مولانا آزاد کے بیان کا پہلا حصہ خود اُن کی طبعزاد حکایت معلوم ہوتی ہے۔ مصراع ثانی "اس نسخہ کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد" صاف طور پر چغلی کھا رہا ہے کہ میر صاحب کسی گذرے ہوئے واقعہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ امتدادِ ایام کی وجہ سے اُنہیں اس "نسخہ" کی کوئی دوا تک یاد نہیں رہی تھی لیکن مولانا آزاد کا دعویٰ ہے کہ عطار کے لڑکے کا بناؤ سنگار کرنا میر صاحب کو ناگوار گذرا اس پر یہ شعر کہا۔ حکایت گڑھتے وقت غالباً مولانا آزاد کو بھی اس اشکال کا احساس ہوا ہو گا لہذا پہلے مصراع کے فعلِ ماضی کو فعلِ حال میں تبدیل کر دیا جس سے شعر بالکل ہی غارت ہو گیا۔ در اصل مصراعِ اولیٰ اس طرح ہے:- "کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت تھیں" اور یہی ہونا بھی چاہیئے۔ ورنہ اختلافِ زبان کی وجہ سے دونوں مصرعوں میں ربط باقی نہ رہیگا۔

مولانا آزاد کے بیان کا دوسرا حصہ اور بھی زیادہ قابلِ غور ہے۔ غالباً وہ اپنے قارئین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ دو شعر اتفاقی طور پر میر صاحب کے قلم سے نکل گئے ہیں حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقع ہے۔ اس لئے کہ میر صاحب نے صرف ایک عطار کے لونڈے ہی پر بس نہیں کی بلکہ ؎

لختے برداز دل گذرد ہر کہ زپیشم　　من قاشِ فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم

کا مصداقِ صحیح بن کر دکھا دیا اور:-

سید پسر، مطرب پسر، مغنی پسر، باغبان پسر، زرگر پسر، سپاہی پسر۔ معمار کا لڑکا، طبیب کا لڑکا، اٹھانہ خاں کا لڑکا، برہمنوں کے لڑکے:۔ مفتی کا لونڈا، قاضی کا لونڈا، آتش باز کا لونڈا، عطار کا لونڈا۔ دھوبی کا، معمار کا، صراف کا، اُتو کش کا، گلفروش کا، کشتی گیر کا۔ طفلانِ بازار، طفلانِ نہ بازار، طفل آتش بار۔ سپاہی زادہ، طبیب زادہ، برہمن زادہ، مغل زادہ۔ مغل بچہ، ترک بچہ، برہمن بچے، ہندو بچے:۔

غرض کوئی بھی ان کی نظرِ التفات سے محروم نہیں رہا۔ آئیے آپ بھی معشوقوں کی اس فوج کا جائزہ لے لیجئے:-

سید پسر:-
سجدہ کریں ہیں سُنکر اوباش سارے اُسکو　　سید پسر وہ پیارا ہے گا امام یاں کا
کیوں نہ لے سید پسر دل کھینچ یہ موئے دراز　　اصل زلفوں کی تری گیسوئے پیغمبر سے ہے[2]

مطرب پسر:-
ہم تو مطرب پسر کے ماتے ہیں　　گو رقیباں کچھ اور گاتے ہیں

مُغنی پسر:-
پُر شور سے ہے عشق مغنی پسراں کے　　یہ کاسۂ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے

باغبان پسر:-
کیا جانے قدرِ غنچۂ دل باغباں پسر　　ہوتے گلاب ایسے کسو میرزا کے پاس

زرگر پسر:-
ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر　　پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

سپاہی پسر:-
ہم اس مرتبہ پھر بھی لشکر گئے　　تعب ایسے گذرے کہ مر مر گئے
نظر اک سپاہی پسر سے لڑی　　قریب اس کی تلوار کر کر گئے

معمار کا لڑکا:-
معمار کا وہ لڑکا، پتھر ہے اس کی خاطر　　کیوں خاک میں ملا تو اے میر دل شکستہ

طبیب کا لڑکا:-
یک نسخہ عجیب ہے لڑکا طبیب کا　　کچھ غم نہیں ہے اسکو جو بیمار ہو کوئی

اُٹھانہ خاں کا لڑکا:-
اُٹھانہ خاں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے　　قصہ ہمارا اس کا یارو شنیدنی ہے

برہمنوں کے لڑکے:-
لڑکے برہمنوں کے صندل بھری جبینیں　　ہندوستاں میں دیکھے سو اُن سے دل لگائے

عطار کا لڑکا:-
لڑکا عطار کا ہے کیا معجون　　ہم کو ترکیب اس کی بھائی ہے

مفتی کا لونڈا:-
کیا ملا مفتی کا لونڈا سر چڑھا ہے ان دنوں　　آ دے ہے گویا کہ مجھ پر قاضی کا اعلام لے

---

[1] دیکھو آبحیات، ذکر میر۔ [2] استغفر اللہ۔

قاضی کا لونڈا۔ میر اُس قاضی کے لونڈے کیلئے آخر ہوا شب کو قضیہ اُسکے جینے کا تھا بارے رُک گیا
آتشباز کا لونڈا۔ کیا اُس آتشباز کے لونڈے کا اتنا شوق میر بہ چلی ہے دیکھکر اس کو تمہاری رال کچھ
عطار کا لونڈا۔ کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت تھیں اس نسخہ کی کوئی نہ رہی حیف دوا یاد

دھوبی کا۔ وہ دھوبی کا کم ملتا ہے میل دل اپنے پر ہے بہت کوئی کہے اُس سے ملنے میں تجھکو کیا ہم دھولیں ہیں
معمار کا۔ گھر سے وہ معمار کا جو اُٹھ گیا حال ابتر ہوگیا گھر بار کا
صراف کا۔ کھٹ بان ہی کی ہیں صراف کے نے ہم سے پیسے دئے بردئی کی پھر لے گئے کھری کی[1]
اَتو کش کا۔ وہ اتو کش کا مجھی پر کیا ہے سرگرم جفا مارے تلواروں کے اُن نے بہتوں کو اُتو کیا
گلفروش کا۔ کل ہم نے سبز باغ میں دل ہاتھ سے دیا اک سادہ گلفروش کا آکر سبد بدوش
جاتا رہا نگاہ سے جوں موسم بہار آج اُس بغیر داغ جگر میں سیاہ پوش
پھولوں سے اُٹھ نگاہیں کھڑی پہ اُسکے ٹھہریں وہ گل فروش کا جو آیا دکان کے اُوپر
کشتی گیر۔ کیا ہی خوش پرکار ہے دلبر توجہ کشتی گیر اپنا کوئی زبردست اس سے لڑ کر عہدہ سے کب برآیا

طفلانِ بازار۔ یہ طفلانِ بازار جی کے ہیں گاہک وہی جانتا ہے جو سودا کرے ہے
طفلان تہ بازار۔ کہا میں شوق میں طفلانِ تہ بازار کے کیا کیا سخن مشتاق ہیں اب شہر کے بیرو جواں میرے
جوانی میں نہ رسوائی ہوئی تا میر غم کھینچا ہوئے اطفال تہ بازار گاہک جی کے پیری میں
طفل تہ بازار کا عاشق ہوں میں دل فروشی کوئی مجھ سے سیکھ جائے
طفل آتشباز۔ گیا نظر سے جو وہ گرم طفل آتشباز ہم اپنے چہرے پہ اُڑتی ہوائیاں دیکھیں

سپاہی زادہ۔ دل لشکر میں ایک سپاہی زادہ نے ہم سے چھین لیا ہم درویش طلب میں اسکی ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں
طبیب زادہ۔ وصل اس طبیب زادہ کا جی چاہتا رہا آخر اس آرزو ہی میں بیمار ہم ہوئے
برہمن زادہ۔ برہمن زادگانِ ہند کیا پُرکار سادے ہیں مسلمانوں کی یاراِنے ہی میں تکفیر کرتے ہیں
سخت کافر ہیں برہمن زادگاں مسلموں کی ان کے ہاں تکفیر ہے
مغل زا۔ اُس مغل زا سے نبھی ہر بات کی تکرار خوب بدزبانی کی بھی اُس نے تو کہا بسیار خوب

مُغل بچہ۔ اک اُس مغل بچہ کو وعدہ وفا نہ کرنا کچھ جا کہیں تو کرتا "آئے، بلے" ہمیشہ
اے گل مغل بچہ وہ، مہ زا ہے اُسکے آگے کچھ بھی بھلا لگے ہے مُنہ لال لال تیرا
تُرک بچہ۔ تُرک بچہ سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے رفتہ رفتہ ہندستاں سے شعر مرا ایران گیا
برہمن بچے۔ کفر اختیار کرنے میں ابرام کر چکے صندل کے قشقے دیکھ برہمن بچوں کے بیچ
ہندو بچے۔ ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو یہ کبھو انگ وان دیتے ہیں؟
مت جو کو اس جنس گراں کو دل کی وہیں لیجاؤ تم ہندوستان کے ہندو بچوں کی بہت بڑی سرکار ہے آج

---

[1] نولکشوری نسخہ میں یہ شعر اسی طرح چھپا ہے اور ظاہر ہے کہ بالکل غلط ہے۔

لگے ہاتھوں میرؔ صاحب کے "امرد نامہ" کے تھوڑے سے منتخب اشعار اور بھی سن لیجئے:-

دل لے کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے
اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

سب طرح دار لڑکے دیں بیٹھنے تب اسکو
جب جی سے اپنے کوئی ہر طرح دل اٹھا دے

نکل آتا ہے گھر سے ہر گھڑی ننگے بدن باہر
بُرا یہ آ پڑا ہے عیب اُس آسائش جاں میں

پاس غیرت تم کو نہیں کچھ دریا پر سن غیر کو تم
گھر سے اُلٹ کے چلے جاتے ہو نہانے کے ہی بہانے سے

کیا تم کو پیار سے وہ اے میرؔ منہ لگائے
پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اس کا

جلے کیوں نہ چھاتی کہ اپنی نظر ہے
کسو شوخ پُرکار رعنا پسر پر

دل دو ہو میر صاحب اس بدمعاش کو تم
خاطر تو جمع کر لو ٹک قول سے قسم سے

خدانا کردہ رُک جاؤں، جہاں رُک جائیگا سارا
غلط کرتے ہیں جو لڑکے مجھے دلگیر کرتے ہیں

اوباش لڑکوں سے تو بہت کر چکے معاشر
اب عمر کاٹیئے گا کسی میرزا کے ساتھ

تا بجز دی سے مرغ دلِ ناتواں یہ میرؔ
اس شوخ لڑکے سے مجھے باہم جناغ ہے

نہیں کچھ رہا تو لڑکا تجھے پر ضرور ہے اب
ہوس اور عاشقی میں ٹک امتیاز کرنا

لڑکا نہیں رہا تو جو کم تمیز ہووے
عشق و ہوس میں اب ہے کچھ امتیاز واجب

اب تو تُو لڑکا نہیں عشق و ہوس میں کر تمیز
آشنا سے فرق ہوتا ہے بہت نا آشنا

ہنوز لڑکے ہو تم قدر میری کیا جانو
شعور چاہیئے ہے امتیاز کرنے کو

کیا جانو تم قدر ہماری مہر و وفا کی لڑکے ہو
لوہو اپنا دیں ہیں تمہارے گرتے دیکھ پسینے کو

برنائی ہی میں تم سے شرارت نہیں ہوئی
لڑکے پنے بھی تم تو قیامت شریر تھے

ہر فرد پاس ابھی سے دفتر ہے تجھ گلے کا
ہے قہر جبکہ ہوگا حرفوں سے آشنا تو

کر رکھا تعویذ طفلی میں مجھے
اب تو وہ لڑکا سیانا ہو گیا

خونریز ہی لڑکوں سے لڑا رہتی ہیں آنکھیں
گر قتل کریں ہم کو سزاوار ہیں ہم لوگ

چھو سکتے بھی نہیں ہیں ہم پیٹے بال انکے
ہیں شانہ گیر سے جو یہ لڑکے نرم شانہ

میرؔ صاحب کے متعلق جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:-

"جو شخص میرؔ کے حالات اور اُن کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو وہ اُنکے کلام کو پڑھکر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود اُن کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو تاڑ جائے گا۔"[1]

عندلیب شادانی

---

[1] مقدمہ انتخاب کلام میر، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو۔ صفحہ ۲۷؛

نوٹ:- میں نے مکان بدل دیا ہے۔ احباب نیا پتہ نوٹ کر لیں:- عندلیب شادانی۔ نمبر ۴، بیگم بازار روڈ۔ ڈھاکا۔

بہ درگاہِ ساقی

خمِ الست سے تھوڑی سی آبگینے میں
فروغِ طورِ تمنا ہو جب سے سینے میں
تری نگاہ کے میخانے کی قسم ساقی!
بغیر کیف نہیں کوئی لطف جینے میں

کمی نہیں سروری جب ہو نہ سازینے میں
یہ کیف آئے تو آئے کہاں سے پینے میں
سرِ مژہ مری آنکھ تشنہ لب پیالے ساقی!
ذرا سی جب جام میں اور کچھ آبگینے میں

تڑپ جگر میں نہ ہے اضطراب سینے میں
نظر ملا سا مجھے آ رہا ہے جینے میں
کبھی کبھی ہی طبیعت نہ کیوں ہو اے ساقی!
رہی ہے جام میں کچھ اور نہ آبگینے میں

مزا بھی ہے جو اسی میکشوں کے جینے میں
ہوا ایک میکدہ آباد اپنے سینے میں
خموں کے خم ہوں دھرے سربمہر گوشوں میں
کمی ہو مئے شب غم میں آبگینے میں

(گلبانگِ حیات "زیرِ تدوین کا ایک ورق۔)

امینِ حزیں سیالکوٹی۔

ہندوستان میں مسلمان عورت کی زندگی

(پروفیسر نورالحسن برلاس نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ اگرچہ ہندوستان میں مسلمان عورت پردے میں رہتی ہے تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سوسائٹی میں اُس کا درجہ مردوں سے پست ہے۔ یہ تقریر ۱۹ اپریل کو کلب خواتین توکیو کے جلسے میں کی گئی جو مسز رابرٹ ماس صاحبہ کی صدارت میں امریکن کلب میں منعقد ہوا تھا۔ کلب کا ہال خواتین سے بھرا ہوا تھا۔ مسز ہیپنر صاحبہ صدر شعبہ بسوکس نے مقرر کا تعارف کراتے ہوئے بیان کیا کہ سخت نزلے کی وجہ سے وہ اپنی تقریر نہیں پڑھ سکیں گے بلکہ یہ خدمت مسز ڈوہز صاحبہ انجام دینگی، جو امریکن سفارت خانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ تقریر کے بعد وہ سوالات کا جواب دینگے۔

تقریر کے خاتمے پر سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ پروفیسر برلاس نے شادی وطلاق اور ترکے کے متعلق بہت سے سوالات کا جواب دیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ مسلم خواتین میں اور دیگر ہندوستانی خواتین میں بہت سی باتوں کا فرق ہے۔ مثلاً اُن میں پردہ زیادہ سخت ہے، مذہب اُنہیں زیادہ آزادی دیتا ہے، کھانے پینے اور میل جول میں وہ بہت زیادہ آزاد ہیں اور شادی کے بارے میں آخری فیصلہ اُنہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ تعلیمی لحاظ سے ہندو خواتین بہت ترقی کر گئی ہیں کیونکہ اُن میں پردے کی اتنی قید نہیں ہے اور وہ مسلم خواتین سے پہلے اس طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔ ماں کا درجہ بہت بلند ہے۔ مسلمانوں میں اس قول پر عمل ہوتا ہے کہ ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں ہے مگر اکثر مسلمانوں نے یہ باتیں ہندوؤں سے سیکھ کر اختیار کر لی ہیں۔ مسلمانوں کی نزدیک اصلی شرافت کسبی ہے۔ نسبی شرافت کی بھی قدر کی جاتی ہے مگر اُسی وقت جب اس میں کسب شامل ہو۔ دولت کے ساتھ شرافت لازمی نہیں ہے بلکہ اکثر غریبوں میں پائی جاتی ہے۔

جن عورتوں نے پردہ ترک کر دیا ہے اُن کی تعداد بہت کم ہے۔ ایسی خواتین دو تین فی صدی سے زیادہ نہیں مگر اُن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بیوہ اور مطلقہ خواتین شادی کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں۔ مسلمانوں میں داشتائیں رکھنے کا رواج نہیں ہے مگر وہ چار بیویاں تک کر سکتے ہیں۔ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی شرائط اس قدر سخت ہیں کہ معمولی انسان ہمت نہیں کر سکتا۔ مثلاً ہر بیوی کے ساتھ مساویانہ سلوک نہایت مشکل ہے۔ عموماً ایک سے زیادہ شادی نہیں کی جاتی۔ البتہ نواب راجہ شرعی اجازت سے مستفید ہوتے ہیں۔ تمام بیویوں کا درجہ قانوناً مساوی ہوتا ہے اور وہ مساوی ترکے کی حقدار ہوتی ہیں۔ ہر بیوی کی اولاد بھی ترکے میں مساوی حق رکھتی ہے۔

(اقتباس از جاپان ایڈورٹائزر)

تقریباً ایک ہزار برس ہوتے کہ مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے۔ جب اُن کا قبضہ مستحکم ہوگیا تو انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنالیا۔ اُنہوں نے ہندوستانی تمدن میں عربی وایرانی تہذیبوں کا جوڑ لگا کر اُسے مالا مال کر دیا ہے۔ ہندوستان کی مسلمان عورت تین تہذیبوں کا مرکب ہے۔ اس میں عربوں کی سادگی اور دلیری پائی جاتی ہے جس میں اسلام کی مساوات رچی ہوئی ہے۔ وہ ایرانیوں کی طرح شان وشکوہ کی دلدادہ ہے اور اُن ہی جیسے شائستہ آداب برتتی ہے۔ اُس میں ہندوستانی عورت کی مسکینی اور نرمی ہے اور اُسی کی طرح ذات پات کا فرق بھاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ان تمام اوصاف کا مظاہرہ کرتی ہے۔

سخت پردے کی وجہ سے سوسائٹی میں اُس کی عجیب حیثیت ہوگئی ہے۔ شاید حکمراں قوم کا جزو ہونے کی وجہ سے اُس نے اپنا وقار قائم رکھنے کی غرض سے پردے کی اتنی سخت قیود خوشی سے منظور کر لیں، جو خالص اسلامی ممالک میں عائد کرنی ممکن نہیں تھیں۔ وہ غریبوں کے سوا کبھی گھر سے نہیں نکلتیں۔ اُس وقت بھی مردوں کی نظر سے بچنے کے لئے کپڑوں میں خوب لپٹی لپٹائی اور سواریوں میں چھپی ہوئی نکلتی ہے۔ اُس کے لئے خرید وفروخت مرد رشتے دار کرتے ہیں جن کو بار بار پھیر کر کے اُس کی مرضی کے مطابق سودا لانے میں بڑی اُلجھن ہوتی ہے۔ خصوصاً جوتی کی ایک جوڑی خریدنے میں بڑی کوفت ہوتی ہے کیونکہ اُسکا مذاق

بہت شستہ ہو اور جوتی کے معاملے میں وہ ہرگز بدمذاقی کا اظہار گوارا نہیں کرتی۔ شوہر یا بھائی کو دکاندار کے جملہ فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ دکان سے کئی جوڑیوں کا ایک ایک پاؤں بغل میں دبا کر انتخاب کے لئے گھر لے جانا پڑتا ہے۔ اگر بیوی کو کوئی وضع پسند نہ آئی تو شوہر کو پھیرے پر پھیرے کرنے پڑتے ہیں۔

اپنے گھر میں وہ ملکہ ہے۔ وہی تمام امور سرانجام دیتی ہے۔ صرف معاملات خارجہ کا بندوبست مرد کے سپرد ہوتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ گھر چلانے کیلئے روپیہ مہیا کر کے بیوی کے سامنے لا رکھے۔ تمام اجناس کی خرید وہ خود کرتی ہے البتہ مرد رشتہ داروں یا ملازموں کے توسط سے۔ خود ہی بل ادا کرتی ہے۔ تہواروں پر وہ خود تقریبوں کا انتظام کرتی ہے۔ بچوں کی شادی کے معاملے میں آخری فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

شوہر کے آرام کا انتظام اس کا خاص شغل ہے۔ اس کی لذت دہن کی تسکین کا خاص اہتمام کرتی ہے۔ کھانا پکانے کا انتظام خواہ نوکروں کے ہاتھ میں ہو اس کی پسند کا کوئی نہ کوئی کھانا خود پکاتی ہے۔ ہندوستانی کھانا پکانا بہت مشکل ہے اور اس میں بہت دیر لگتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا اکثر وقت باورچی خانے کی دیکھ بھال میں بسر ہوتا ہے۔ عام طور سے ناشتہ گھر میں نہیں پکایا جاتا۔ روزانہ صبح کو کچھ پکی پکائی چیزیں بازار سے منگائی جاتی ہیں اور چائے کے ساتھ پیش کر دی جاتی ہیں۔ ناشتے سے فراغت پاکر وہ دوپہر کے کھانے کے انتظام میں لگ جاتی ہے جس میں اس کا بہت وقت صرف ہو جاتا ہے۔ شوہر کا کھانا توشہ دان میں رکھ کر کسی کے ہاتھ دفتر میں بھیج دیتی ہے۔ رات کا کھانا عموماً ہلکا ہوتا ہے اور سب گھر والے مل کر کھاتے ہیں۔

سہ پہر کو وہ سینا پرونا ہے اور گھر کے دوسرے کام کاج کرتی ہے۔ اپنے اور بچوں کے کپڑے اور شوہر کے کرتے پاجامے خود سی لیتی ہے۔ اکثر پڑوسنوں کے گھر میں خوش گپی کے لئے یا ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے چلی جاتی ہے۔ ہندوستان میں پڑوسیوں کے بہت حقوق ہیں اور ان کا بہت لحاظ کیا جاتا ہے۔ چونکہ عورتیں باہر نہیں نکلتیں اور پڑوسنوں کی صحبت آسانی سے میسر آجاتی ہے لہذا باہمی دوستی بہت بڑھ جاتی ہے۔

اس کا ایک نہایت پسندیدہ مشغلہ مکتب چلانا ہے۔ تعلیم کی شوقین خواتین جن کی مسلمانوں میں کمی نہیں ہے پڑوس کی لڑکیاں جمع کر کے انہیں قرآن شریف پڑھاتی ہیں۔ وہ مادری زبان لکھنے پڑھنے کی بھی ابتدائی تعلیم دیتی ہیں اور سینا پرونا اور کھانا پکانے کے فنون سکھاتی ہیں۔ اخلاق و آداب بھی سکھاتی ہیں۔ مکتب میں ان کے قوائے ذہنیہ کو نہ صرف معقول مصرف مل جاتا ہے بلکہ وقت گزارنے کا ایک مفید حیلہ بھی مل ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ اعزازی استانیاں مسلم سوسائٹی میں نہایت قابل قدر خدمت انجام دے رہی ہیں۔ شہر کا کوئی محلہ ایسا نہ ہوگا جہاں ایسی نیک نفس خواتین موجود نہ ہوں۔

گھر میں اہل خانہ کے ذمے سب سے زیادہ کام ہوتا ہے کیونکہ تمام خاندان والے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں جن میں لڑکے اور بہوئیں اور ان کے بچے سب شامل ہیں۔ اس طرز زندگی میں ساس اور بہو کا پیچیدہ سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں رہتے۔ ساس بہو کے پھوہڑپن کی شکایت کرتی ہے اور بہو ساس کی سختی کی۔ مگر ان تعلقات میں کبھی اتنی کشیدگی پیدا نہیں ہوتی کہ طلاق کی نوبت آجائے۔ بہوئیں اپنے میکے میں جا سکتی ہیں اور وہاں کئی کئی دن گزار دیتی ہیں۔ گویا وہ بیوی کی خدمت سے رخصت لیتی رہتی ہیں۔ اس طرح انہیں وقتاً فوقتاً آزادی میسر آجاتی ہے۔ اس امید میں ان کا دل گھر کے کام کاج میں لگا رہتا ہے۔

شوہر سے وابستگی اس کا خاص وصف ہے۔ مگر بچوں، والدین اور دیگر گھر والوں سے اسے کچھ کم وابستگی نہیں ہوتی۔ والدین کی خدمت گزاری میں جہاں آرا بہت مشہور ہے جو شاہجہاں کی لڑکی تھی جس نے اپنی محبوب ملکہ کے انتقال پر ایک خوبصورت مقبرہ بنایا ہے جو دنیا بھر میں عدیم النظیر ہے۔ چونکہ بادشاہ نے پھر کوئی شادی نہیں کی جہاں آرا نے اپنے باپ کی دلجوئی کیلئے خود کنواری رہ کر اس کی خدمت میں عمر بسر کر دی۔

لڑکیاں گھر کے انتظام اور فنون خانہ داری کی تعلیم اپنی ماں سے حاصل کرتی ہیں جو انہیں آداب میں بھی طاق کر دیتی ہے۔ مسلمان لڑکی خواہ کسی حیثیت کی ہو خانگی تربیت کی وجہ سے شائستگی کا نمونہ ہوتی ہے، بڑوں کے آگے خاکسار، چھوٹوں کے آگے شفیق اور ہم عمروں اور غیروں کے آگے متواضع۔ وہ اپنی نانی دادی سے خاندانی روایات کا علم حاصل کرتی ہیں۔ نانیاں، دادیاں بچوں کی بہت شوقین ہوتی ہیں، ان کی جسمانی ضروریات اس خوبی سے پوری کرتی ہیں کہ بچوں کی معمولی بیماریوں کا علاج خود کر لیتی ہیں شاذ ہی حکیم ڈاکٹر کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اسلام نے جو حقوق عورت کو عطا کئے ہیں پردہ نشینی کی وجہ سے وہ ان سے محروم نہیں رہتی۔ اس کی شخصیت قائم رہتی ہے، اس کا نام بھی شادی کے بعد نہیں بدلتا۔ وہ اپنی جائداد کی خود مالک ہوتی ہے اور اپنی مرضی سے اس میں تصرف کر سکتی ہے۔ نرینہ ورثا کی موجودگی میں بھی وہ اپنے والدین اور شوہر سے ترکہ پاتی ہے۔ شوہر سے اسے مہر بھی ملتا ہے جس کی ادائیگی کا شادی کے وقت اس نے وعدہ کیا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی سوسائٹی میں پردہ نشینی کی وجہ سے عورت کا درجہ کبھی پست نہیں ہوا بلکہ مردوں نے ہمیشہ اُسے اپنی ناموس سمجھا ہے۔ مردوں کے لائق کام کرنیکی قابلیت کا ثبوت اُس نے بارہا دیا ہے۔ مسلمانوں میں منتظم اور مدبر اور سپاہیانہ اوصاف کی خواتین ہوگزری ہیں، مثلاً سلطانہ رضیہ، ملکہ نورجہاں اور چاند بی بی۔ مصنف اور شاعرہ خواتین تو بہت ہوئی ہیں۔ عالمہ خواتین کی بھی کمی نہیں۔ بہتوں نے مدرسے چلائے ہیں اور اب بھی چلا رہی ہیں بعض خواتین کی شہرت کی وجہ سے اُنکے مدرسوں میں لڑکے بھی کھنچ آتے ہیں اور یہ اُنکی پیٹھ پر بڑی آزادی سے بید گھماتی ہیں۔ زمانۂ حال میں علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ والیٔ بھوپال مایۂ نازہستی گزری ہیں۔ اُنہوں نے علیگڈھ یونیورسٹی کے عہدۂ چانسلر کو زینت بخشی تھی۔ اُنکے زمانہ تک دُنیا کی کسی قوم میں عورت کو یہ عزت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

عورت کے دائرۂ عمل کے موجودہ معیار پر مسلمان عورت پوری نہیں اُتری بلکہ بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ابتک وہ اپنے تئیں مرد کا تکملہ سمجھتی رہی ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت مرد دونوں مل کر مقصدِ آفرینش پورا کر سکتے ہیں۔ وہ کبھی مرد کے مقابلے پر کھڑی نہیں ہوئی مگر زمانے کی روش سے اُس کی ذہنیت میں بڑا تغیر پیدا ہو رہا ہے۔ وہ اب پردے سے نکل کھڑی ہوئی ہے اور پبلک زندگی میں مرد کے قدم بقدم چلنے لگی ہے۔ سیاست میں اُسے حقِ رائے دہندگی حاصل ہو گیا ہے۔ اگرچہ اسکے حصول میں اُس نے خود کوئی کوشش نہیں کی۔ قانون ساز مجلسوں میں انتخاب کیلئے وہ میدان میں آگئی ہے اور کئی صوبجاتی کونسلوں میں عورتیں منتخب بھی ہو چکی ہیں۔ ایسی مدبر خواتین بھی پیدا ہو گئی ہیں جن کا تقرر وزارتوں کے اعلیٰ عہدوں پر ہو گیا ہے۔ حکومتِ ہند کے دستور سازی کیلئے جو مشاورتی مجلسیں منعقد ہوئی تھیں اُن میں مسلمان عورت معقول خدمت انجام دے چکی ہے۔ وہ مردانہ یونیورسٹیوں سے علمی ڈگریاں حاصل کر رہی ہے۔ اور تعلیمی، طبی اور قانونی پیشوں میں داخل ہونے لگی ہے۔ وہ اعزازی مجسٹریٹ کی خدمات انجام دے رہی ہے۔ وہ رسالے اور اخبار نکالتی ہے۔ وہ کلب اور انجمنیں چلاتی ہے۔ وہ پبلک جلسوں میں تقریر کرتی ہے۔ وہ طیارہ چلاتی ہے۔ غرضکہ وہ ہر میدانِ عمل میں نظر آنے لگی ہے اور موجودہ سوسائٹی کی مفید رُکن ثابت ہو رہی ہے۔

نورالحسن برلاس

ایک بچی کی وفات پر

کیا قیامت ہے نئے چاند پہ چھائیں بادل!

اللہ آمیں کا جگر گوشہ چھنا جاتا ہے
کوئی عنواں نہ رہا زیست کے افسانے کا
تھی بہا جس کی اُمیدوں کا لہکتا گلزار
وُہ کلی ایک حسیں نام تھی مُرجھانے کا
تتلی بن جائے نمو پا کے جو نورس غنچہ
عذر ملتا ہے اسے باغ سے اُڑ جانے کا
جو بھی رنگینیاں ساون کی دھنک بنتی ہیں
نیلِ افلاک میں عنواں ہیں گھل جانے کا!
آگ دینگے اِسے چھن گئی مورت اسکی
اب ہے کیا فائدہ ہستی کے صنم خانے کا؟!
جس سے میخانہ عبارت تھا وہ مینا ٹوٹی
اب عجب کیا جو بیاباں بنے میخانے کا
درد کی دھوم ہے سب کہتے ہیں دل ہے دل ہے
ٹوٹنے پر بھی وہی نام ہے پیمانے کا
ہم سے مُنہ پھیر کے جلدی ہی تو اپنی ہو کر
موت بیگانی تھی، شکوہ نہیں بیگانے کا!

دِل کے ٹکڑے کی جو کفناتا ہے ارمان میت   گُل بداماں ہے کہ ہے داغ بداماں میت

پھُنک گئیں میری بہاریں مگر اشکِ خونیں
لوگ کہتے ہیں کہ فردوس بداماں ہونگے
شمع بجھتی ہے، مگر اس پہ مُصر ہیں سارے
شعلے گرم آہوں کے اب شمعِ شبستاں ہونگے!
غنچہ مُرجھا گیا، لیکن یہ ہوئی ہے تلقین،
داغ اب غیرتِ صد روضۂ رضواں ہونگے
زندگی تھی ترے آنے ہی تک اے شامِ الم!
تو نئی فاتح ہے تجھ سے نئے پیماں ہونگے
دَین پھیری ہے جو داتا! تو نہ ہم ہستی کے
تیرے ہوتے ہوئے شرمندۂ احساں ہونگے!!

رات ہے سر پہ، ہوا گُل مرا ننھا سا کنول!!
کیا قیامت ہے نئے چاند پہ چھائیں بادل!

مختار صدیقی

ایک چور کا روزنامچہ

ایک ہی گھر کے دو مالک

روزنامچہ شروع ہوتا ہے:-

"گو برسوں گذر گئے ہیں لیکن جب کبھی اُس مکان پر نظر پڑی شکر کیا کہ جان خوب بچی۔ سُنیئے واقعہ یہ ہے کہ ایک دن آدھی رات گئے میں اپنے گاؤں سے چوری کے ارادے سے نکلا۔ گاؤں سے باہر دُور تک جنگل تھا۔ کانٹوں کی جھاڑیاں جگہ جگہ بکثرت تھیں۔ آبادی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ ہوا ایسی سرد تھی کہ جسم کے پار ہوئی جاتی تھی۔ جاڑے کا وہ زور کہ الاماں! چلتے چلتے دیکھا کہ جس سڑک کے کنارے میں جا رہا ہوں اُس سے ایک دوسری سڑک پھُوٹ کر دُور تک چلی گئی ہے۔ میں بدستور بغل میں ایک مضبوط لکڑی دبائے جیب میں پستول لئے اپنا رستہ چلتا رہا۔ سردی سے بُرا حال تھا۔ جب کچھ دُور نکل آیا تو سامنے مگر کچھ دُور کسی قدر بلندی پر ایک روشنی نظر آئی۔ بس اب میں اس روشنی کی سیدھ باندھکر اُدھر ہی ہولیا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ مکان کی ہیئت کچھ نظر نہ آتی تھی۔ اتنے میں پچھلے پہر جاند نکلا ہلکی ہلکی چاندنی میں مکان کی ہیئت کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی۔ وہ ایک بڑی مربع عمارت تھی۔ چھت پر بہت سی چمنیاں نظر آئیں اور سمجھ میں آیا کہ روشنی مکان کی اوپر والی منزل میں ہے اور ایک لمبی سی دیوار کچھ دُور تک چلی گئی ہے۔ ڈرتا تھا کہ کہیں کھڑکی کی وہ روشنی نہ بُجھ جائے۔ جب دس پانچ قدم اور آگے چلا تو وہ روشنی یکلخت گُل ہوگئی۔ مگر اسکے گُل ہوتے ہی پاس والے کمروں میں روشنیاں جھلکنے لگیں۔ میں سمجھا کہ رات زیادہ گئی ہے گھر والے سونے جاتے ہوں گے۔ اتنے میں نہایت سرد اور تیز ہوا کا جھونکا مکان کی چمنیوں کی طرف سے آیا اور ایک بڑی دردناک چیخ ہوا کے شور میں صاف سنائی دی۔ پھر بجز ہوا کے شور کے اور کوئی آواز نہ سُنی۔

جب دیوار کے قریب پہونچا تو معلوم ہوا کہ یہ مکان کی پُشت ہے اور دیوار کے نیچے ایک خندق ہے۔ اب میں اس خندق کے کنارے کنارے چلا۔ جب خندق کا موڑ آیا تو میں بھی مڑا۔ تھوڑی دُور چلا تھا کہ وہ سڑک ملی جسے پہلے راستے میں دیکھا تھا۔ مکان کے سامنے کا رُخ اسی سڑک کے کنارے تھا۔ کچھ دُور تک احاطہ کی دیوار کھنچی تھی اور اس دیوار کے وسط میں مکان کا پھاٹک تھا۔ پھاٹک کے سامنے برساتی تک سنگلیز روش تھی میں پھاٹک میں گھُس کر اس روش پر چل کر برساتی میں آیا۔ برساتی سے برآمدے میں پہونچا۔ یہاں چھت میں ایک قندیل دھیمی دھیمی روشن تھی۔ صدر دروازہ مکان کا کچھ بند اور کچھ کھلا تھا۔ آگے بڑھکر میں نے دروازے کو پورا کھولا تو دروازہ کھُل گیا۔ کسی قسم کی آواز نہ ہوئی۔ اتنی رات گئے دروازے کو کھُلا دیکھکر مجھے خیال ہوا کہ اس گھر کے لوگ بڑے بے احتیاط ہیں۔ اب میں اسی دروازے سے مکان کے اندر گھُسا۔ یہاں دیکھا کہ ایک بڑا ہال ہے جس کے چاروں طرف نیچے کی منزل کے کمروں کے دروازے کھُلتے ہیں اور دیواروں میں جا بجا کھونٹیوں پر چھوٹے بڑے کوٹ پادریوں کے پہننے کے لٹکے ہیں۔ اسی ہال میں سامنے کے رُخ ایک بہت ہی خوشنما چوبی زینہ اور زینے کے نیچے ایک طرف ایک میز رکھی ہے، جس پر بہت سی چیزیں اناپ شناپ پڑی ہیں اور میز کے نیچے ایک بھورے بالوں والا بڑا کتا پیٹھ ادھر کو خم کئے بے خبر سوتا ہے۔ کتے کو دیکھکر میرے اوسان خطا ہوئے اور میں نے پاؤں سے بوٹ اُتار کر اپنے بائیں ہاتھ میں لئے چپکے چپکے زینے پر چڑھنا شروع کیا۔ جب اُوپر پہونچا تو بائیں ہاتھ کو ایک کمرے میں جس کا دروازہ کھلا تھا روشنی دیکھی اور کانوں میں کنٹر سے گلاس کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ اس آواز نے شراب کے لئے کچھ دل ایسا بےچین و بیقرار کیا کہ میں بوٹ ہاتھ میں لئے بے تکلف کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دیواروں سے لگی چاروں طرف الماریوں میں کتابیں چُنی ہیں۔ سامنے آتشدان ہے جس میں کچھ کوئلے روشن ہیں اور قریب ہی ایک آرام کُرسی پڑی ہے۔ کمرے کے بیچ میں ایک میز بچھی ہے جس پر سُرخ رنگ کا میز پوش پڑا ہے اور وہاں ایک آدمی اس طرح کھڑا ہے کہ اُس کی پرچھائیں دروازے میں نہ پڑے۔ اس کمرے کی بغل میں ایک اور کمرہ ہے جس کے دروازے پر ایک پردہ پڑا ہے۔ اس آدمی کی وضع یہ ہے کہ گلے میں ایک بے ڈھنگا سا کوٹ پادریوں کے پہننے کا ہے اور وہ مونڈھوں پر سے ایسا ڈھیلا ڈھالا ہے کہ مانگے کا معلوم ہوتا ہے۔ سپید کالر لگائے

کالے رنگ کی بریچز اور ان کے نیچے سیاہ رنگ کے موزے ہیں اور قالین کی بناوٹ کا ایک سلیپر پاؤں میں بڑی بے تکلفی سے پڑا ہے۔ چونکہ چہرہ اُس کا تاریکی میں تھا اس لئے اُس کا نقشہ مجھے اچھی طرح نظر نہ آیا۔ مگر اتنا ضرور دیکھا کہ چوڑے چکلے چہرے پر چندھی چندھی آنکھوں میں بلا کی تیزی اور شرارت بھری ہے۔ عمر اسکی تقریباً پچاس برس کی ہوگی۔

گلاس اور کنٹر کی آواز نے مجھے کچھ ایسا بے تاب کیا تھا کہ سوائے اس خیال کے کہ شراب کسی طرح پینے کو ملے مجھے اور کسی بات کا لحاظ نہ رہا۔ جب میں کمرے میں گھسا ہوں تو یہ آدمی داہنے ہاتھ میں شراب کا بھرا گلاس لئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھکر اُسے مطلق حیرت نہ ہوئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ جس ہاتھ میں گلاس تھا اُسے جنبش ہوئی اور شراب چھلک کر نیچے قالین پر اور کچھ اُس کے ہاتھ پر گری۔ مجھے دیکھتے ہی گلاس اس نے میز پر رکھ دیا اور جلدی سے جیب سے رومال نکالنا چاہا۔ مگر رومال جیب میں نہ تھا۔ اُسنے ہاتھ مل کر انگلیوں سے شراب پونچھ ڈالی اور کہنے لگا: "واللہ آپکے اس طرح آنے سے تو میں چونک پڑا!"

اتنا کہکر اُس نے شراب کا گلاس مُنہ کو لگایا اور پورا گلاس ایک دم سے ختم کر دیا اور کہنے لگا: "یہ تو فرمایئے کہ مکان میں داخل کدھر سے ہوئے۔"

مجھے اُس کی اس بے پروائی پر حیرت ہوئی اور میں نے جواب دیا کہ "مکان کے صدر دروازے سے۔"

اس آدمی نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا: "ہاں میں اُسے بند کرنا بھول گیا تھا۔ میرے خیال میں آپ نے چوری کی غرض سے یہاں تک تکلیف فرمائی ہے۔"

میں۔ جی نہیں۔ رستہ بھول جانے کی وجہ سے میرا ادھر آنا ہو گیا۔ اس جنگل میں شام سے پریشان اور سرگرداں ہوں۔

وہ آدمی۔ تو کیا بوٹ بھی برابر ہاتھ میں لئے ہیں؟"

میں۔ نہیں جناب۔ بوٹ تو میں نے آپکے کتے کے خوف سے اتار لئے تھے۔

وہ آدمی۔ کتا تو بالکل قدرتی انداز سے زمین پر غافل پڑا سوتا ہے۔

میں۔ بجا ہے۔ غافل بھی کیسا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھال میں بھُس بھرا کتا زمین پر پڑا ہے۔

میرے مُنہ سے اتنا سُن کر اس آدمی کے چہرے پر ایک قسم کی گھِن اور کراہت کے آثار ظاہر ہوتے اور کہنے لگا: "گو آپ چور ہیں مگر ضرورت سے زیادہ ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتے ہیں۔ ایک چور میں بھلا ایسی تیزی اور ذہانت کہاں۔ مہربانی فرما کر آپ اپنے بوٹ کہیں رکھ دیں ان سے پانی ٹپک رہا ہے۔ فرش خراب ہوا جاتا ہے۔ ان بوٹوں سے آپ کا مجرم ہونا ثابت ہو رہا ہے۔ اس وقت شغل شراب میں ایک چور کو شریک کرنا ہے مگر بہرکیف اس کا معقول شکل و لباس میں ہونا میں زیادہ پسند کرتا ہوں۔"

اب وہ آدمی آتشدان کے قریب گیا اور وہاں سے ایک بھاری سیخ جو آگ کریدنے یا کوئلوں کو توڑنے کی ہوتی ہے اُٹھالی اور وہی لوہے کی سیخ لیکر وہ میری طرف بڑھا۔ گو چہرہ اس کا زرد ہو رہا تھا مگر صورت پر متانت اور خودداری بھی برس رہی تھی۔

کہنے لگا: "آپ سمجھے بھی کہ یہ سیخ میں نے کیوں اُٹھائی ہے؟"

میں۔ جی خوب سمجھا۔ ہاتھ خالی نہ رہے۔ کچھ ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔"

اتنا کہکر میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کہا کہ "میرے پاس ایک پستول ہے۔"

وہ آدمی۔ مگر وہ تو مینہ میں سیل کر بیکار ہو گیا ہوگا۔

میں۔ جی نہیں میں نے اس پر موم جامے کا غلاف چڑھا رکھا ہے۔"

اتنا سنکر اُس نے وہ لوہے کی سیخ آتشدان کے کٹہرے سے لگا کر رکھدی اور بولا: "آپ کا پستول اس سیخ سے زیادہ کارگر ہے۔ میں ہار گیا آپ جیتے۔ مگر اتنا خیال رہے کہ اگر پستول کی آواز ہوئی تو آس پاس کے سب لوگ جمع ہو جائیں گے اور پھر سوائے اس کے کہ آپ پھانسی پر چڑھائے جائیں اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ پستول آپ بیشک چلا سکتے ہیں لیکن اس کے انجام پر غور کر لیجئے۔ مجھے اس کی مطلق پروا نہیں کہ آپ پھانسی پر لٹک کر مریں یا کسی اور طرح۔ مجھے آپکے جینے مرنے سے کچھ بحث نہیں۔ اس وقت آپ سے ملاقات ہوئے پورے پانچ منٹ بھی نہیں ہوتے ہیں۔ اس مکان میں سوائے میرے کوئی دوسرا رہنے والا نہیں۔ دو برس سے میں یہاں رہتا ہوں۔ البتہ میری خدمت کیلئے ایک خانساماں اور ایک پکانے والی ماما رہا کرتے تھے۔ لیکن کل میں نے اُن دونوں کو برطرف کر دیا۔ انہوں نے حرکت ہی ایسی بے جا کی تھی کہ میں آپکے سامنے اُسے کھول کر بیان نہیں کر سکتا۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر گرجا ہے جس کا میں داروغہ ہوں۔ بس میں ان دونوں کو وہاں لے گیا اور فوراً ان دونوں کی شادی کر کے میں نے اُنہیں وہیں قطعی جواب دیدیا۔ اب تو کُل حالات آپ کو معلوم ہو گئے۔ یہ فرمایئے کہ اب میں آپ کے لئے کیا کروں جو آپ یہاں سے دال فے عین۔ ہو جائیں۔"

میں۔ جناب عالی میں نے اپنے اسی پستول سے کئی آدمیوں کے سروں کو نشانہ بنایا ہے لیکن آپ جیسے شریف اور محتاط شخص کو نشانہ بنانے کا خیال تک ذہن میں نہ گذرا۔ دل چاہتا ہے کہ آپ سے زیادہ راہ و

رسم پیدا ہوآپ جیسا شریف جب کسی کو مل جائے تو پھر سوائے اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ پہلے کچھ کھانے پینے کی ٹھہرے پھر بات سو بات!"

میری اس گفتگو سے وہ خوش ہوا۔ دیوار سے لگی کھانے کی الماری تھی۔ وہاں جاکر اُسے کھولا۔ دو رکابیاں، ایک گلاس اور دو کنٹر شراب کے نکالے۔ ایک رکابی میں بسکٹ، دوسری میں خشک انجیر تھے۔ ایک کنٹر میں شیری شراب اور دوسرے میں پورٹ وائن بھری تھی۔ یہ سب چیزیں اس نے میز پر لاکر رکھدیں اور کہنے لگا کہ "اگر کچھ کھانے کو جی چاہے تو بھنا ہوا گوشت بھی موجود ہے۔"

میں بولا "جی نہیں۔ صرف ایک بسکٹ کافی ہوگا۔ آپ نے شاید سائنسوں کو کہتے سُنا ہوگا کہ تو بڑے سے زیادہ بالٹی کی طرف رغبت ہوا کرتی ہے۔ جو برانڈی آپ پی رہے ہیں میری نیت تو ادھر لپکتی ہے۔"

وہ آدمی: "مگر برانڈی میں پانی ملانے کو قریب نہیں ہے۔"

میں: "مجھ میں تو آج اتنا پانی جذب ہو چکا ہے کہ وہی کم سے کم اس بوتل کے ختم کرنے کو کافی ہوگا۔"

اب میں اپنی کرسی کھسکا کر میز کے پاس لایا۔ جیب سے پستول نکالکر میں نے میز پر رکھدیا اور اپنا گلاس شراب بھرنے کے لئے اس آدمی کے سامنے کیا۔ اس نے برانڈی کا ایک گلاس بھر کر پہلے خود پیا اور کرسی کھسکا کر وہ خود بھی میز کے قریب آن بیٹھا۔ اور شراب کی ایک چسکی لیکر کہنے لگا "ہاں ابھی میں آپ سے اپنے خانساماں کا تذکرہ کرتا تھا۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اتنی بڑی اخلاقی لغزش دیکھکر بھی مجھے غصہ نہ آتا!"

میں: "آپ کا یہ غصہ تو میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔"

اگر میں کوئی اور جواب دیتا تو شاید اس سے وہ خوش ہوتا۔ کہنے لگا "یہ خیال مجھے اکثر گذرا کہ قصور کی سزا میں نے کسی قدر زیادہ سختی سے دی۔ چونکہ میں پادری ہوں ایسی حرکت پر غصہ کا آنا قدرتی بات تھی لیکن مہربان جب سے میں نے اپنے غریب مارکن سن کو برطرف کیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے میرے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں۔ یہ دستور سا چلا آتا ہے کہ آقا اکثر اپنے خانساماؤں کا قصور معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن میرا خانساماں تو کیا بتاؤں کیسا ہوشیار اور لائق خدمت گذار تھا۔ وہ معمولی خانساماؤں میں سے نہ تھا۔ نہایت ہی لائق اور ہوشیار آدمی تھا۔ مذاق ایسا صحیح و سلیم رکھتا تھا کہ اگر آپ دیکھتے تو یہی کہتے کہ مجھ میں اور اس میں کچھ فرق نہیں۔ علم سے بہرہ ور تھا کبھی کبھی کوئی کتاب پڑھوا کر اس سے سنا کرتا تھا۔ خوش لحن ایسا تھا کہ اُس کا پڑھا سُنکر دل باغ باغ ہو جاتا۔ کپڑوں میں میری اُترن تک اس کے ایسے ہی ٹھیک آتی تھی جیسے میرا لباس میرے بدن پر چُست ہوتا ہے۔ جو طور طریقہ میرا تھا وہی اُس کا تھا اگر سلینی ہاتھ میں نہ ہو تو وہ اسی شان سے کمرے میں داخل ہوتا جیسے کہ میں ہوتا ہوں۔ بات چیت میں نرمی اور شرافت، عورتوں کی طرف سے بے پروائی جو مجھ میں ہے وہی اس میں تھی۔ میری خوبیاں تو خوبیاں میرے عیب تک اُس میں موجود تھے۔ پھر تو کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ مجھے اس سے آرام نہ ملتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ شکل و صورت، طبیعت، عادات و خصائل میں وہ ہو بہو مجھ جیسا تھا۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ اس کی غلطی پر میں اُسے سزا نہ دیتا۔"

میں: "سُنئیے جناب، آپ کی اس گفتگو سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ سر دست آپ کو ایک خانساماں کی ضرورت ہے۔"

وہ آدمی: "ہاں واللہ خوب سمجھے۔"

میں: "تو اب آپ مجھے چور یا رہزن نہ سمجھیں، اپنا خادم اور خانساماں باور کریں۔ اور مجھے یہاں اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت دیں۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ میرے ساتھ کوئی بدتر سلوک کریں اور مجھے گرفتار کرا دیں۔ میں نے بھی یہاں کے ایک نامی گرامی درس گاہ میں تعلیم پائی ہے۔ یونانی اور لاطینی زبانوں سے ابھی تک واقفیت رکھتا ہوں۔ جو کتاب آپ پڑھوا کر سُنیں گے اُسے نہایت دلکش آواز میں پڑھکر سُناؤں گا۔ رہا شراب کا شوق اور اُس کے ذائقے کی پہچان، یہ تو میں نے ہمیشہ مفت پی کر حاصل کی ہے۔ پکانے والی ماما آپ کیسی ہی کیسی بدصورت ڈھونڈ کر رکھیں مجھے اس کی مطلق پروا نہ ہوگی۔ میری درخواست ہے کہ اب مجھے اس گھر میں خانساماں کی جگہ عنایت کریں۔"

وہ آدمی: "میں اُسے چالیس روپے ماہوار سے کچھ اوپر دیا کرتا تھا۔"

میں: "اس تنخواہ پر میں آپ کو بہت سستا پڑونگا۔"

اُس آدمی نے اب اپنا گلاس شراب سے بھرا اور صورت ایسی بنائی کہ گویا کسی مشکل بات کو حل کرنے کی فکر میں ہے۔ صورت اسکی ایسی خشک و عبوس تھی جیسے کسی عدالت کے جج کی ہو۔

ایک منٹ کے بعد اُس نے کہا کہ "اس کام میں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ آپ کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے فن میں ابھی نوآموز ہیں۔ آپ نے ابھی کہا تھا کہ اب آپ مجھے چور یا رہزن نہ سمجھیں بلکہ اپنا خادم اور خانساماں سمجھیں، اس میں شُبہ نہیں کہ آپ کے اس فرمانے سے میرے دل میں آپ کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی اور یہ بات آپ نے ایسی ہی کہی جیسے کوئی کہے کہ اب میں وعظ و پند بیان کرنے کی جگہ تصویر کشی کا پیشہ اختیار کرونگا۔ آپ کی ملازمت کی درخواست نے میرے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ابھی آپ اپنے پیشے میں پورے ماہر

نہیں ہیں"

میں: "آپ اس پر بھی تو غور کریں کہ میں نے جو کچھ آپ سے مانگا ہے وہ کتنا کم ہے۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اپنے موجودہ پیشہ کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام شروع کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک ماہ کی آزمائش پر آپ مجھے اپنا خانساماں مقرر کرلیں۔ اگر اس زمانے میں آپ کو میرا کام ناپسند ہو تو جواب دیدیں اور میں اس گھر سے صرف ایک ماہ کی تنخواہ جیب میں لئے نکل جاؤنگا" اتنا کہکر میں نے اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا اور کہا: "آپ جائیں جہنم میں۔ جب اس جاڑے پالے میں جنگل میں ٹھوکریں کھاتا اتنی قلیل تنخواہ کے لئے یہاں آیا ہوں تو پھر مجھ سے سستا آدمی آپکو کہاں ملے گا؟"

وہ آدمی: "کاش آپ پارکن سن سے واقف ہوتے!"

"دو پورے گلاس برانڈی کے پینے کے بعد جب میں تیسرا گلاس پیتا ہوں تو میری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ غصے اور بدکلامی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ جتنے جرائم میں نے کیے ہیں وہ اسی تیسرے گلاس کے نشے میں کیے ہیں۔ اب میں نے اس آدمی کو بری طرح گھورنا اور سخت و سست کہنا شروع کیا اور کہا: "سنیئے جناب میں پارکن سن وارکن سن کا نام سننا نہیں چاہتا۔ آپ کا جو کچھ منشا ہے اُسے میں سمجھ گیا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میرا نشہ بڑھے اور میں کرسی سے گر کر میز کے نیچے لڑھک رہوں اور حقیقت میں اب میری حالت یہی ہوتی جاتی ہے اور آپ جس طرح باتیں کر رہے ہیں وہی بکواس کرتے رہیں!"

وہ آدمی: "ذرا یاد کیجیے، آپ خود ہی یہاں آئے اور خود ہی یہاں رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ بیشک آپ نے برانڈی پی۔ مگر میں نے اپنی طرف سے آپ کو شیری اور پورٹ وائن پیش کی تھی!"

اتنا کہکر اُس نے مجھے شیری شراب کا ایک کنٹر دیا۔

میں نے ایک گھونٹ اُس کا پی کر بہت منہ بنایا اور کہا "ایسی بدمزہ اور ہلکی شراب میں نہیں پی سکتا"

اتنا سنکر وہ آدمی کھڑا ہوا اور میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا: "لائیے ہاتھ دیجیے۔ آپ کو نشہ اتنا تیز ہے کہ آپ شراب کے ذائقے میں بھی تمیز کرنی بھول گئے۔ آپ یہ ہلکی شراب نہ پئیں۔ ابھی ابھی آپنے میرا خانساماں بننا قبول کیا تھا۔ مجھے اس وقت تامل ہوا تھا۔ اب آپ مجھ سے پھر وہی درخواست کریں میں فوراً آپ کو اس خالی جگہ پر مقرر کردوں گا اور یہ دوسرا کنٹر شراب کا بھی آپ اپنے ہی پاس رکھیں سوتے وقت کام آئے گا"

ہم دونوں نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور وہ آدمی شمع اٹھا کر آگے آگے ہوا اور میں ہاتھ میں بوتل لئے اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ جب وہ نیچے ہال میں آیا تو اُس نے روشنی تیز کی۔ اتنے میں میری نظر اس کتے کی طرف گئی۔ جس طرح پہلے اُسے پڑا دیکھا تھا اب بھی اُسی طرح پڑا دیکھا۔ وہ جیتا کتا نہ معلوم ہوتا تھا بلکہ کتے کی کھال میں بھس بھرا جانور معلوم ہوتا تھا۔ میرے دل میں اب اس آدمی کی طرف سے کچھ شبہ سا ہونے لگا۔ اب ہال میں بائیں ہاتھ کے ایک کمرے کی طرف وہ گیا اور دروازے کے لٹو پر ہاتھ رکھکر میرا منتظر ہوا کہ میں اس کی طرف بڑھوں۔

میں نے اُس سے کہا کہ "یہاں تک تو جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا لیکن مجھے اس کا کیونکر یقین آئے کہ آپ مجھے اس وقت سونے کے کمرے میں لئے جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تو یہاں سوتا ہوں اور آپ ہمسایوں کو اکٹھا کر کے مجھے گرفتار کرادیں؟"

وہ آدمی: "جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس پر آپ کو اعتبار کرنا چاہیئے۔ شریف اپنے قول سے نہیں پھرا کرتے۔ قول مرداں جان دارد۔ میں کبھی آپ کے یہاں آنے کا حال کسی سے نہ کہونگا اور ایک حرف بھی کسی سے آپ کے متعلق زبان پر نہ آئے گا"

میں: "یہ جو کچھ آپ نے فرمایا مجھے اس کا پورا یقین ہے۔"

اتنا سُن کر اُس نے دروازہ کھولا۔ اندر ایک رستہ سا نظر آیا جس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ بائیں طرف کے کمرے کا دروازہ اُس نے کھولا۔ یہ ایک چھوٹا اور تنگ کمرہ تھا مگر گاؤں کے مکان کے جس کمرے میں سویا کرتا تھا اُس سے بدرجہا بہتر تھا۔

وہ آدمی: "بس اب آپ اپنے بھاری کپڑے اتار کر ہلکے پھلکے ہو کر آرام کریں۔ پلنگ کی چادر اور تکیوں کے غلاف اُجلے ہیں اور میں ابھی آپ کو ایک قمیص لائے دیتا ہوں کپڑے اتار کر اُسے پہن لیں اور سو جائیں"

میں: "آپکے احسانوں کی تو حد نہ رہی۔"

وہ آدمی: "واللہ آپ کی خوبیوں میں سے ننانوے فی صدی خوبیوں کی میں قدر نہیں کرتا۔ لیکن آپکے شوق شراب اور شرابوں کے ذائقہ میں تمیز کرنے کا قائل ہوں"

اتنا کہکر ایک منٹ کے بعد وہ پھر آیا اور دروازے ہی میں سے ایک لمبی سی قمیص میری طرف پھینک کر چلا گیا۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں کپڑے اتار کر پلنگ پر لیٹتے ہی غافل سو گیا ہونگا۔ لیکن یہ مجھ سے نہ ہو سکا بلکہ بوٹ جو ایک ہاتھ میں لئے تھا اُنہیں میں نے پہن لیا اور رات بھر پلنگ کی پٹی پر بیٹھا شمع کو جلتے دیکھا

کیا، یہاں تک کہ شمع جل کر ختم ہو گئی۔ جب شمع بجھ گئی تو میں کمرے کی کھڑکی کو دیکھتا رہا۔ کھڑکی کے شیشوں پر جو کپڑا تھا اُس کی رنگت بدلی اور معلوم ہوا کہ باہر صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔ سر سے پاؤں تک میں برف ہو رہا تھا اور میرا دانت سے دانت اس طرح بج رہا تھا جیسے کسی کو لرزہ بخار ہو۔ کبھی سوچتا تھا کہ چوری کا ناپاک پیشہ چھوڑ کر اب اچھا کام اختیار کر رہا ہوں۔ اتنے میں ایک آواز میرے کان میں آئی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ہال میں دیکھا تو وہی آدمی دبی چال سے آہستہ قدم صدر دروازے سے باہر نظر آیا۔

اس دغا بازی اور فریب نے مجھے بالکل بے حس و حرکت کر دیا۔

میں پلنگ سے کودا اور دروازہ چوپٹ کھول کر باہر نکلا۔ رستہ ٹٹولتا ہوا ہال میں آیا۔ ہال میں سناٹا تھا روشنی دھیمی تھی۔ اب مجھے خیال آیا کہ جو کچھ بھی ہو اس مکان کا بھید لینا چاہیے۔ یکایک میری نظر اس کتے پر پڑی جو میز کے نیچے پڑا تھا۔ میں قریب گیا اور اُس کی گردن پر جہاں پٹہ ہوتا ہے میں نے ہاتھ ڈالا۔ میری انگلیاں اندر چلی گئیں۔ میں اُسے اٹھا کر بیچ ہال میں لایا کہ روشنی میں اُسے اچھی طرح دیکھوں۔ یہاں جو دیکھا تو کتے کا گلا ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالکل کٹا ہے۔

کچھ یاد نہیں کہ کتے کی لاش کو زمین پر پٹخ کر میں نے دوسری حرکت کتنی دیر میں کی۔ دو مرتبہ پاؤں اٹھا کہ دروازے سے نکل کر بھاگ جاؤں۔ مگر نہیں۔ میں فوراً ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا جس کمرے میں ہم دونوں نے شراب پی تھی وہاں آیا۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں آنے لگی تھی۔ یہاں بغل کے کمرے میں جس کے دروازے پر پردہ پڑا تھا اُسے میں نے ہٹایا اور دروازہ کھول کر اندر گیا۔ یہاں کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی سے ملا ایک پلنگ بچھا ہے اور پلنگ پر کوئی چیز چادر میں لپٹی لمبی سی پڑی ہے۔ فوراً ہی معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی ہے۔ چادر ہٹا کر میں نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ رنگت زرد ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور پیشانی کے دونوں طرف سپید سپید کا کلیں چھوٹی ہیں۔ چادر اور تکیہ کے غلاف پر جو نظر گئی تو معلوم ہوا کہ خون کے دو دھبے ہیں۔ لاش کروٹ سے پڑی ہے اس طرح کہ ایک ہاتھ باہر نکلا ہوا ہے جیسے کوئی سوتا ہو۔ اب سمجھ میں آیا کہ مکان کا اصلی مالک یہی ہے اور وہ آدمی جو کہتا تھا کہ میں یہاں دو برس سے رہتا ہوں وہ دراصل اس اصلی مالک مکان کا قاتل تھا۔ خانساماں کا حال بیان کر کے مجھے خانساماں مقرر کرنے میں یہ چال تھی کہ جب قتل کا حال معلوم ہو تو گھر میں میرے سوا دوسرا کوئی نہ ملے تو اصلی قاتل کی تلاش سے بے فکر ہو کر لوگ مجھے ہی قاتل سمجھ کر گرفتار کر لیں۔

اب میں سمجھا کہ خانساماں کی جگہ قبول کرنے میں میں نے کیسی بڑی غلطی کی۔ اُس کی ذمہ داریاں سمجھتے ہی میں ایک دم تین تین سیڑھیاں اترتا ہوا دروازے سے نکل کر بڑے زور سے بھاگا۔

باہر نکلا تو مینہ اور زور کی ہوا چلنی بند ہو چکی تھی۔ اور صبح کی روشنی بھیگے جنگل پر نمودار ہونے لگی تھی۔ میں سر سے پاؤں تک بالکل سرد تھا مگر سوائے بھاگنے کے دوسرا کام نہ تھا۔

عنایت اللہ دھلوی

کیفِ بہار

پھر باغِ دہر غیرتِ باغِ عدن ہوا ۔۔۔ فیضِ بہار سے چمن اندر چمن ہوا
پھر گوشہ گوشہ وقفِ گُل و نسترن ہوا ۔۔۔ پھر چپّہ چپّہ عالمِ سرو سمن ہوا
پھر قطرے قطرے سے چمنستاں برس پڑے ۔۔۔ پھر ذرّے ذرّے پہ کرمِ ذوالمنن ہوا
پھر ہر طرف بہار کی زُلفیں ہیں مشک بیز ۔۔۔ پھر کُل جہاں جہانِ خطا و ختن ہوا
پھر چار سُو نشاط کے دریا اُبل پڑے ۔۔۔ پھر قلزمِ وفورِ طرب موجزن ہوا
پھر اذنِ بادہ نوشی و شغلِ طرب ملا ۔۔۔ پھر حکمِ چارۂ غم و رنج و محن ہوا
پھر محشرِ نشاط بہ مقدارِ شوق اُٹھا ۔۔۔ پھر افتتاحِ عیش بوجہِ حسن ہوا
پھر شیخ و برہمن ہیں شرابِ طرب سے مست ۔۔۔ پھر ختم دین و کُفر کا بیگانہ پن ہوا
پھر میکشوں پہ رحمتِ یزداں ہے بادہ بار ۔۔۔ پھر دُور دل سے وسوسۂ اہرمن ہوا
پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مُرید ہے ۔۔۔ پھر زاہدوں کا نقشۂ تقویٰ ہرن ہوا
پھر محوِ سادہ زاہد تقویٰ شعار ہے ۔۔۔ پھر رہنِ بادہ خرقۂ زہدِ کہن ہوا
پھر جام لیکے ساقیِ رنگیں ادا اُٹھا ۔۔۔ پھر گرمِ نغمہ مطربِ گل پیرہن ہوا
پھر صحنِ گلستاں میں بساطِ طرب بچھی ۔۔۔ پھر شغلِ میکشی لبِ نہرِ چمن ہوا
پھر جلسۂ طرب میں غزلخوانیاں چھڑیں ۔۔۔ پھر انعقادِ محفلِ شعر و سخن ہوا
پھر چار سمت سروقدوں کے ہجوم ہیں ۔۔۔ پھر اجتماعِ لالہ رُخانِ زمن ہوا
پھر ہم زبان ہر صنمِ گلبدن بنا ۔۔۔ پھر مہربان ہر بُتِ غنچہ دہن ہوا
پھر اخترِ مقدرِ عالم چمک اُٹھا ۔۔۔ پھر آفتابِ لطفِ خدا ضوفگن ہوا

پھر اِک رُت میں چار طرف اتنے خم لُنڈھے
آزادِ فاقہ مست بھی پی کر مگن ہوا

حکیم آزاد انصاری

ایک ایکٹ کا ریڈیائی ڈرامہ:-

دروازہ

کردار

ماں :- عمر پینتالیس سال۔ آواز میں وہ سوز و گداز جو اندھوں کے گلے میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔
کانتا :- ـــــ بڑی بیٹی، عمر سولہ سال۔
شانتا ـــــ چھوٹی بیٹی، عمر چودہ سال۔
مالک مکان
اجنبی ـــــ عمر ۲۰ سال۔

(کھڑکی زور سے کھلتی ہے، بادل کی گرج، ہلکی سی، اور ہوا کے فراٹے کے ساتھ بارش کی آواز کمرے کے اندر سُنائی دیتی ہے۔)

ماں :- اب تو بارش بھی شروع ہو گئی۔ بیٹی ـــ (وقفہ) ـــ اور یہ ہوا کا طوفان ـــ (وقفہ) ـــ اب کون آئے گا اس طوفان کے اندھیارے میں ـــ (وقفہ) ـــ کانتا بیٹی، اب کیا وقت ہو گا؟

کانتا :- مجھے نہیں معلوم۔

ماں :- بتا بھی دے، بیٹی، (آبدیدہ ہو کر) اگر آج میری آنکھیں ہوتیں، تو میں خود دیکھ لیتی۔

کانتا :- گھڑی شانتا کے پیچھے میز کے اوپر پڑی ہے۔ شانتا میز پر سے ہٹے تو میں وقت معلوم کروں۔

ماں :- شانتا بیٹی!

شانتا :- (کمرے کے دوسرے کونے سے آواز) ماں، ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔

(وقفہ)

ماں :- ساڑھے ... آٹھ ... رات ہو گئی، رات اور طوفان ... اس طوفان میں اب کون آئے گا؟

شانتا :- میں نے وِنّود سے کہا تھا۔

ماں :- وِنّود کیوں ہمارے گھر آنے لگا۔ وِنّود کیوں کسی غریب بہن سے راکھی بندھوانے گا؟ وِنّود! تم نے وِنّود سے کب کہا تھا؟

شانتا :- صبح ہی، ابھی وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اُس کی بہن نے اُس کے راکھی باندھ دی تھی۔ اور اس نے اُسے ایک پونڈ دیا تھا۔ سچ مچ کا پونڈ سونے کا پونڈ، جب میں وِنّود کے گھر گئی، تو اس وقت وہ ہنس ہنس کر اپنی بہن سے باتیں کر رہا تھا۔ لال چندن کا تلک اُس کے ماتھے پر تھا، بال پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ ہاتھوں پر سنہری تاروں سے گندھی ہوئی راکھی، میں نے اُس سے کہا بھیا راکھی بندھوا لو (آبدیدہ ہو کر) اُس نے کہا شانتا تم گھر چلو، میں ابھی آتا ہوں ... اب ساڑھے آٹھ بجے ہیں ... رات ہو گئی۔

ماں :- رات اور طوفان!

(شانتا سسکیاں لیتی ہے)

ماں :- رو نہیں میری بیٹی، ادھر آ۔ میرے پاس۔ اگر اس وقت تیرا بھائی ہوتا، میرا پیارا چاند! ہائے بُرا ہو اُن ڈاکوؤں کا جو میرے چاند کو اٹھا کر لے گئے۔ (کھٹکا)

کون ہے؟

شانتا :- وِنّود!

(بلی کا بولنا)

کانتا :- (کمرے کا دروازہ کھول کر) نہیں۔ بلی ہے۔ بارش سے پناہ مانگ رہی ہے۔ (میاؤں، میاؤں)

بچاری بالکل بھیگ گئی ہے۔ کیسی پیاری بلی ہے۔

(میاؤں، میاؤں)

ماں :- کانتا، اسے اندر لے آ۔

کانتا :- لیکن ہم اسے کھلائیں گے کیا؟ گھر میں تو اب کچھ بھی نہیں۔

ماں :- صبح کی ایک روٹی بچی تھی۔

شانتا :- (شرمسار ہو کر) مجھے بھوک لگی تھی ماں، میں نے کھالی۔

(میاؤں، میاؤں)

ماں :- اگر تمہارے پتا اس وقت زندہ ہوتے ـــ،

کانتا :- (طنز سے) اگر ـــ

ماں :- کیا کہا۔

کانتا۔ کچھ نہیں۔

ماں۔ کچھ تو کہا ہے۔ بیٹی، اپنی اندھی ماں کو نہ بتاؤ گی۔

کانتا۔ (چڑ کر) کچھ کہا ہو تو بتاؤں، تمہارے کان تو جیسے ہوا میں ہر وقت کسی کی آواز کو سنتے رہتے ہیں۔

ماں۔ لیکن مجھے وہ آواز کبھی نہیں سُنائی دیتی، جب میرا پیارا چاند مجھے کہا کرتا تھا "ماں!" "ماں مجھے بھوک لگی ہے" "ماں مجھے ماسٹر نے مارا ہے" "ماں مجھے پیسہ دو" اُس کا وہ گورا گورا ہر وقت ہنستا ہوا چہرہ۔

کانتا۔ (ناراضگی سے) ماں!

ماں۔ (ان سنی کرکے) جب وہ ہنستا تھا، تو اُس کے داہنے گال پر ایک عجیب خم سا پڑتا تھا، جو مجھے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اور جب میں اُس کے بال سنوار کر اُسے ٹوپی پہناتی تھی! اُس وقت میں اندھی نہ تھی بیٹی!

کانتا۔ ماں!!

ماں۔ ایک دن وہ سکول سے دوڑتا دوڑتا گھر پہونچا۔ کہنے لگا ماں آج قصبہ میں جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے ہیں کہ آج یہاں ڈاکہ پڑیگا۔ قصبے کے سب لوگ پریشان ہو رہے ہیں، ماسٹر جی نے ہمیں جلد چھٹی دیدی ہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد چاند کے پتا بھی آ گئے۔ انہوں نے بھی یہی بات سنائی۔ وہ دن ہم نے جس پریشانی میں گزارا... تم تو اُس وقت پیدا ہی نہوئی تھیں۔ اچھا ہوا، ورنہ ڈاکو تمہیں بھی اُٹھا لے جاتے، اور پھر وہ رات، وہ کالی بھیانک رات۔

کانتا۔ ماں!!!

ماں۔ (چیخکر) میرا آٹھ سال کا بچہ! پلا پلایا۔ میرا لاڈلا اکلوتا چاند، ہائے وہ سب کچھ تو لے گئے تھے، لیکن میرے بچے کو تو نہ لے جاتے۔ میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑے، اپنے بال کھول کر اُن کے پاؤں پر دھرے۔ لیکن اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ کہتے تھے کہ ایک مہینے کے اندر پانچہزار روپے ادا کر دو گے تو تمہارا چاند تمہیں واپس مل جائے گا۔ میری ان آنکھوں کے سامنے وہ میرے لال کو اُٹھا کر لے گئے۔ تمہارے پتا رسیوں سے جکڑے ہوئے چارپائی پر پڑے تھے۔ چاند چلّا رہا تھا ایک ڈاکو نے اس کے مُنہ پر زور سے طمانچہ دیا اور اس کے لبوں سے خُون کی دھار پھوٹ کر بہنے لگی ....وہ میرے سامنے میرے لال کو لے گئے۔ کاش میں جنم سے اندھی ہی پیدا ہوتی — یوں کُڑھ کُڑھ کر اندھی ہونا میرے نصیبوں میں لکھا تھا — تمہارے پتا بھی اسی سوچ میں گھُل گھُل کر مر گئے کہ کہیں سے پانچہزار روپیہ اکٹھا ہو .....

(بادل کی گرج۔ بارش کی آواز تیز ہو جاتی ہے)

کھڑکی بند کر دو کانتا، ہوا کے تیز فرّاٹے میرے رخساروں کو جیسے چیر رہے ہیں۔

شانتا۔ کانتا بہن۔ کھڑکی کھلی رہنے دو۔ شاید ونّو بھیا آتے ہوں۔ کھڑکی بند دیکھکر واپس چلے جائیں گے۔

کانتا۔ (دُور سے۔ کھڑکی کے قریب جا کر باہر سر نکالتے ہوئے) کوئی بھی تو نہیں آ رہا۔ گلی سنسان پڑی ہے۔ چوراہے پر پولیس کے سپاہی لیمپ کے نیچے کھڑا بارش میں شرابور بھیگ رہا ہے۔ اب کون آئیگا۔ شانتا بہن تم نے ایک ونّو سے کہا، تو میں نے کتنوں سے کہا۔ رام بھروسے سے، شنکر لال سے، دوپا ناتھ سے، لیکن سبھی ٹال گئے۔ سبھی کہتے تھے گھر آ کر بندھوائیں گے۔ دیکھو کوئی اس وقت تک پہونچا؟ کون آئیگا؟ کسے ضرورت ہے کہ غریب بہنوں کا بھائی بنے۔ مفت کا خرچ — اور پھر ہماری راکھی بھی کیا ہے۔ کچے سوت کا لال دھاگا جس میں نہ زری کے تار، نہ موتیوں کی جھلک، نہ ریشم کے مُسکراتے ہوئے پھول۔ ہماری راکھی بھی ہماری زندگیوں کی طرح پھیکی، اُداس اور بے رنگ و بو ہے۔ اس راکھی کو کون پسند کرے گا۔ تم ونّو پر آس لگائے بیٹھی ہو، بیٹھی رہو۔ میں کھڑکی بند کئے دیتی ہوں۔

ماں۔ بیٹی، یہ اچھا نہیں ہوا۔ یہ راکھی کا پوتر تیوہار ہے۔ تم کسی برہمن ہی کو بُلا لاتیں۔ اُسے ہی راکھی باندھ دیتیں۔ یہ اچھا نہیں ہوا بیٹی، تمہیں راکھی ضرور باندھنی چاہیئے۔

کانتا۔ (طنز سے) تو جا کر اُس پولیس مین کے راکھی باندھ آؤں۔ جو چوراہے پر کھڑا ہے.....

ماں۔ ناحق غصہ کرتی ہو کانتا بیٹی۔

شانتا۔ کانتا، آج تمہیں کیا ہوا ہے؟

کانتا۔ تمہارے ونّو بھیا جو ابھی آ رہے ہیں۔ ہا ہا ہا، ونّو بھیا!

ماں۔ کانتا! کانتا!!

کانتا۔ (بلند آواز میں) تو میں کیا کروں؟ جیسے میں نے پنڈت بنارسی داس کے بیٹے کو کہا نہیں۔ جیسے میں نے چترویدی جی کے لڑکے سے ہاتھ جوڑ کر التجا نہیں کی۔ کہ کہئے۔ اور ہم سے راکھی بندھوا جائیے۔ لیکن کوئی آئے بھی تو۔ اس گھر میں کون آئے گا؟ اور کوئی یہاں آئے بھی کیوں؟ راکھی بندھوا کر اُسے کون سی دکشنا مل جاتی۔ یہی سوکھی ہوئی روٹی، اور باسی دال۔ اور اب تو یہ گھر بھی ہمارا نہیں رہیگا۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں، کہ مالک مکان آج دوپہر کو مجھے گھر سے باہر ملا تھا۔ کہہ رہا تھا آج تیسرا مہینہ شروع ہو گیا ہے لیکن کرایہ ابھی تک نہیں پہونچا۔ کہتا تھا اگر ایک مہینے تک کرایہ نہ ادا کیا تو اس مکان سے باہر نکلنا ہوگا۔

ماں۔ ہے بھگوان! اِن لوگوں کا خُون کس قدر سفید ہو گیا ہے۔ لیکن سبھی لوگ تو ایسے نہیں ہوتے، سبھی لوگوں کے دل تو ایسے کٹھور نہیں ہوتے، راکھی کی کتھا میں شرون کمار کا بھی برنن ہے۔ شرون کمار بھی تو ایک برہمن کے بیٹے تھے۔ لیکن اُنہوں نے اپنے اندھے ماں باپ کی کتنی سیوا کی۔ دن رات اُنہیں ڈنگوری میں بٹھاتے کاندھوں پر اُٹھاتے پھرے۔ اور سارے بھارت ورش کی جاترا کرا دی۔ یہی شرون کمار جنتی کا دن ہے۔ اور آج کوئی غریب بہن کو راکھی بھی باندھنے نہیں دیتا۔ کہ شاید مرجاوا کا پالن کرنا پڑے۔ آج راکھی کا پوتر تیوہار ہے۔ اور اشنان اور پوجا پاٹ کے بعد وید منتروں کے اچارن اور ہون کے ساتھ لوگ پُرانے جنیو بدلتے ہیں۔ گویا زندگی کا ایک نیا چولا، نیا رُوپ بدلتے ہیں.... اور میری بچّی کی کوئی راکھی نہیں قبول کرتا.

کانتا۔ (تلخی سے) یہ بھی تو ایک نیا رُوپ ہے۔

شانتا۔ ماں، کیوں اپنے جی کو ہلکان کرتی ہو۔ کانتا، تو بھی لیڈ ل کچوکے پر کچوکے دیتے جاتی ہے۔ ماں! اس جی جلانے سے کیا حاصل؟ اب سو جاؤ۔

ماں۔ میں سوتی رہوں یا جاگتی رہوں، میرے سونے اور جاگنے میں اب فرق ہی کیا ہے۔ میرے لئے تو کل دُنیا اُسی دن ایک کالی رات بن گئی تھی، جس دن میرا لال مجھ سے چھینا گیا تھا۔ پھر جب پتی مر گئے تو زندگی کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی، میرے لئے تو اِس جنم میں اندھیارا ہی اندھیارا ہے۔ یہ وہ کالی رات ہے بیٹی جس کی کوئی صبح نہیں۔ وہ درد ہے جس کی کوئی دوا نہیں۔ وہ دُکھ ساگر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

(ہوا کا جھونکا روزنوں میں سے ایک دردناک سیٹی پیدا کرتا ہوا گزرتا ہے۔)

یہ کس نے آواز دی؟

شانتا۔ کوئی نہیں ہے، ماں! گلی بالکل خالی ہے۔ یہ ہوا روزنوں میں سے آواز پیدا کرتی ہوئی گزر رہی ہے۔

کانتا۔ سو جاؤ، ماں، اور اپنے اِن گیلے رخساروں کو پونچھ ڈالو.... اُٹھو، ماں۔

ماں۔ بہت اچھا بیٹی، بہت اچھا بیٹی، چلو۔ مجھے اُوپر سونے کے کمرے میں لے چلو۔

(فرش پر لکڑی ٹیکنے کی آواز۔ قدموں کی آواز)
کانتا گنگناتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ پُرسوز لے میں گاتی ہے:۔

نیر بھرے نینن کی پنچھی
کس بدھ پیاس بجھاؤں
من کی بینا ٹوٹ چکی
اب کیسے اِسے بجاؤں
چھوٹی سی نینن کی نیا
بیچ سہایو ساگر
پلکوں کے پتوار لگا کر
کس بدھ پار لگاؤں
پنچھی کس بدھ پیاس بجھاؤں

ہردے میں دُکھ درد بہت ہے
گھاؤ بہت ہیں پیڑ بہت ہے
پھر بھی یہ سونی ہی بستی
کیسے اِسے بساؤں!
پنچھی کس بدھ پیاس بجھاؤں

پنچھی!

شانتا۔ کانتا بہن، تم رو رہی ہو۔

کانتا۔ (کھڑکی کھول کر) مینہ تھم گیا۔

(دروازے پر دستک)

کانتا۔ تمہارے بھیّا وِنود ہونگے۔

شانتا۔ نہیں پنڈت ودیا ناتھ ہونگے۔

آواز۔ دروازہ کھولو۔

(دروازہ کھولنے کی آواز)

کانتا۔ اخاہ، آپ ہیں۔ تشریف رکھئے۔ کہئے اس وقت کیسے آنا ہوا۔ غالباً آپ راکھی بندھوانے کے لئے آئے ہیں۔ ذرا ٹھہرئیے میں ابھی لال دھاگا لاتی۔

مالک مکان۔ میں... ار... ا... میں... راکھی... ار ار... میں حاضر ہوا تھا۔ یہ کہنے کے لئے کہ آپ نے تین ماہ کا کرایہ ادا نہیں کیا ہے.... میں ار... ار... راکھی نہیں بندھواؤنگا.... میں تو کبھی کی بندھوا چکا۔ بات یہ ہے کہ اگر آپ نے پرسوں تک کرایہ ادا نہ کیا تو آپ کو اِس مکان سے نکلنا ہوگا۔

کانتا۔ اچھا، یہ بات ہے۔ آج صبح ایک ہفتہ کی میعاد ملی تھی۔ اب دو دن رہ گئے۔ شرمیان جی آج راکھی کے دن بھی آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ٹھہرئیے میں لال سوت لاتی ہوں۔

مالک مکان:- ارے نہیں نہیں، میں یہی کہنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ میں اب چلتا ہوں۔ مجھے ضروری کام ہے۔

(دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے)

(وقفہ)

شانتا:- گیا۔

کانتا:- نہیں سمجھو سر پر ایک اور آفت آئی۔

شانتا:- اب کیا ہوگا ــ (وقفہ) ــ کانتا بہن! ــ (وقفہ) ــ کانتا بہن! یہ تم کھڑکی میں کھڑی کسے دیکھ رہی ہو۔

کانتا:- اپنے آنے والے دنوں کو۔

شانتا:- میں نے وہ جو بستر کی چادر کاڑھ کر دی تھی اُس کے مجھے صرف آٹھ آنے ملے ہیں۔

کانتا:- دو روپے کرایہ کیلئے میں نے بھی بچا کر رکھے ہیں۔

شانتا:- یہ تو ڈھائی روپے ہوئے۔ ابھی چھ روپے اور چاہئیں۔

کانتا:- ہاں، چھ روپے اور چاہئیں۔

شانتا:- اب کیا ہوگا؟ پرسوں تک چھ روپے کہاں سے آئیں گے، مجھے تو کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔

کانتا:- (طنز سے) ماں کی اندھی آنکھوں کی طرح!

شانتا:- کانتا بہن تم تو مذاق کرتی ہو۔ بیہودہ مذاق۔ مجھے تمہاری یہ عادت مطلق پسند نہیں۔ اپنی ماں کے متعلق یہ الفاظ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ .... میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ یہ چھ روپے ہم پرسوں تک کہاں سے لائینگے۔

کانتا:- سوچو! دماغ پر زور دو۔

شانتا:- مجھے تو کچھ نہیں سوجتا۔

کانتا:- جب سب دروازے بند ہو جائیں اُس وقت بھی عورت کیلئے ایک دروازہ ہمیشہ کیلئے کھلا رہتا ہے۔

شانتا:- تم کیا کہہ رہی ہو۔

کانتا:- اس دُنیا میں مرد مالک ہیں اور عورتیں غلام۔ مرد خریدار ہوتے ہیں اور عورتیں جنس خرید، مرد کتے اور عورتیں ہڈیاں۔ مرد راکھی بندھوانا پسند نہیں کرتے، وہ راکھی توڑنا پسند کرتے ہیں۔

شانتا:- کانتا بہن۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

کانتا:- سُنو۔ اس کھڑکی کے پار ایک دوسری کھڑکی ہے۔ اُس میں ایک اوباش مزاج نوجوان مجھے اکثر گھورا کرتا ہے۔ وہ ایک لحاظ سے خوبصورت بھی ہے، دولت مند بھی ہے۔ اور پھر اس کے مکان کے نیچے گیرج میں اُس کی ایک موٹر بھی ہے۔ اُس نے کئی بار مجھے پریم پتر لکھے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی کسی کا جواب نہیں دیا، مجھے اس کی کھڑکی میں سے ابھی تک روشنی نظر آ رہی ہے۔

شانتا:- کانتا بہن کھڑکی بند کر دو۔

کانتا:- تمہاری سب آشائیں پوری ہو سکتی ہیں۔ سبھی ــــ چھ روپے نہیں سینکڑوں روپے ہزاروں روپے۔ بولو۔

شانتا:- کانتا بہن۔ کھڑکی بند کر دو .... کھڑکی سے پرے ہٹ جاؤ .. نہیں، مجھے خود ہی اسے بند کرنا ہوگا۔

(کھڑکی کے بند ہونے کی آواز)

کانتا:- تم نے کھڑکی بند کر دی ــ بھولی شانتا! لیکن میں اس کھڑکی سے باہر تو نہ کود سکتی تھی۔ میں تو جب جاؤں گی سامنے کا دروازہ کھولکر جاؤں گی۔ (فرش پر چلنے کی آواز)

(فرش پر تیز تیز قدموں سے بھاگنے کی آواز، کسی جسم کے دروازے سے زور سے لگنے کی آواز)

کانتا:- ہٹو، مجھے جانے دو۔

شانتا:- نہیں، میں نہیں جانے دونگی۔

کانتا:- دروازہ کھولدو۔

شانتا:- نہیں، میں دروازہ کبھی نہیں کھولونگی۔

کانتا:- میں کہتی ہوں، دروازہ کھولدو۔ دروازہ کھولدو۔

شانتا:- نہیں، نہیں، کبھی نہیں۔

کانتا:- معلوم ہوتا ہے تم ایسے نہیں ہٹو گی۔

(کشمکش کی آواز۔ شانتا کے مُنہ سے ایک بلند چیخ نکلتی ہے لیکن کانتا فوراً ہی اُس کے منہ پر ہاتھ رکھدیتی ہے۔)

(وقفہ)

(دروازے پر دستک، زور زور سے دستک)

(وقفہ)

آواز:- دروازہ کھولو۔ (وقفہ)

کانتا:- (سرگوشی سے) دروازہ کھولدو اب تو!

(دروازہ کھلنے کی آواز)

(ایک اجنبی اندر داخل ہوتا ہے)

اجنبی:- اوہ۔ میں سمجھا کوئی خون خرابہ ہو رہا ہے۔ میں باہر سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک چیخ سنی۔

کانتا:- چیخ یا قہقہہ؟

اجنبی:۔ کچھ سمجھ لو بہن، لیکن مجھے تو چیخ ہی سُنائی دی۔
شانتا:۔ بیٹھ جائیے۔ تشریف رکھیے۔
اجنبی:۔ شکریہ۔ (وقفہ)
کیا آپ دونوں بہنیں اکیلی یہاں رہتی ہیں۔
کانتا:۔ یہ آپنے کیسے جانا کہ ہم دونوں بہنیں ہیں۔
اجنبی:۔ (ہنستے ہوئے) آپکے چہروں سے۔
شانتا:۔ جی ہم اپنی ماتاجی کے ساتھ یہاں رہتے ہیں۔
اجنبی:۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں پوچھوں کہ جھگڑا کس بات پر ہو رہا تھا۔
کانتا:۔ راکھی کے تیوہار پر۔
اجنبی:۔ اچھا، آج راکھی ہے؟
کانتا:۔ آپ کو معلوم نہیں؟
اجنبی:۔ میں بہت مدّت سے سفر پر ہوں۔ اس جگہ ابھی ابھی وارد ہوا ہوں۔ سفر میں آدمی بہت سی باتیں بُھول جاتا ہے.... اچھا تو پھر کیا ہوا۔
کانتا:۔ یہ کہہ رہی تھی کہ راکھی کا تیوہار اچھا ہے۔ اور میں کہہ رہی تھی کہ مجھے اتنا پسند نہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ہم بہنوں کو آج بہت مایوسی ہوئی ہے۔ آپ دیکھیے، ہمارا کوئی بھائی نہیں۔
شانتا:۔ اور آج کسی نے ہم سے راکھی نہیں بندھوائی۔
کانتا:۔ اور میں بہن شانتا سے کہہ رہی تھی کہ دروازہ کھول دے۔ میں سامنے کے مکان.....
شانتا:۔ خاموش! کانتا!۔۔ تو کیسی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہے۔
(وقفہ)
اجنبی:۔ ہُم! یہ بات ہے۔ (وقفہ)
کانتا بہن میرے راکھی باندھ دو۔۔۔ اور شانتا بہن تم بھی!
کانتا:۔ کیا آپ راکھی بندھوائیں گے؟ سچ سچ۔
شانتا:۔ لیکن آپ تو پردیسی ہیں۔
اجنبی:۔ پردیسی بھی بھائی بن سکتے ہیں، بہن۔
کانتا:۔ میں ابھی لال دھاگا لائی۔
شانتا:۔ آپ کا نام کیا ہے؟
اجنبی:۔ مجھے اجے کمار کہتے ہیں۔
کانتا:۔ لیجیے، ہاتھ بڑھائیے۔۔۔ شانتا تم بھی۔۔۔ دوسری کلائی پہ
شانتا:۔ اجے بھیا۔

(سیڑھیوں سے اُترنے کی آواز)
شانتا:۔ یہ کیا، پونڈ۔ سچ مچ کے پونڈ۔ سونے کے پونڈ۔
اجنبی:۔ غریب بھائی کی طرف سے یہ نذر قبول ہو۔
(لکڑی ٹیکنے کی آواز قریب ہو جاتی ہے۔)
شانتا:۔ (سرگوشی میں) ماں جی ہیں!
ماں:۔ کون ہے؟ کیا جھگڑا ہو رہا ہے۔
شانتا:۔ (سرگوشی میں) آپ ٹکٹکی لگائے انکی آنکھوں کی طرف کیوں تک رہے ہیں۔ انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔
کانتا:۔ ماں۔ ہم راکھی باندھ رہے تھے، اور شانتا خوشی سے ناچ رہی تھی۔
ماں:۔ کیا دتّو آ گئے؟
شانتا:۔ نہیں ماں۔ یہ اجے بھیا ہیں۔ (سرگوشی میں) ماتاجی کو پرنام کرو۔!
اجنبی:۔ ماتاجی پرنام۔
ماں:۔ جیتے رہو بیٹا۔ تم کون؟ ادھر کیسے آئے؟
اجنبی:۔ جی، میں باہر سے گذر رہا تھا۔ اس کمرے میں ان دونوں بہنوں کے جھگڑنے کی آواز سُنی۔ دروازے پر دستک دی، اور (ہنس کر) اندر چلا آیا۔ یہاں ان دونوں شریر لڑکیوں نے مجھے راکھی سے باندھ دیا۔
ماں:۔ یہ بہنیں ہیں بیٹا، یہ تمہاری بہنیں۔ اس عمر میں راکھی باندھنے کی بہت چاہ ہوتی ہے۔ اچھا بیٹا تم اس شہر میں کیسے آ رہے ہو۔
اجنبی:۔ یونہی ڈھونڈتا ہوا آ رہا ہوں۔ کھوج نکالنے کیلئے نکلا ہوں۔
ماں:۔ کسے ڈھونڈ رہے ہو بیٹا؟
اجنبی:۔ اپنے ماں باپ کو، مدّت ہوئی مظفر گڑھ سے مجھے ڈاکو اُٹھا لے گئے تھے۔ بہت مدت تک اُن کے ساتھ رہا۔ پھر ایک دن اُن کے جنگل سے نکل بھاگا۔ بمبئی جا کر ملازمت اختیار کر لی۔ پھر ماں باپ کا پتہ لگانے نکلا۔ مظفر گڑھ گیا معلوم ہوا پتاجی کا انتقال ہو گیا ہے۔ پھر اس شہر کا کسی نے پتہ دیا۔ اور میں ادھر.....!
ماں:۔ (اُٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لکڑی زمین پر گر جاتی ہے) ادھر آؤ بیٹا۔ اجے کمار۔ ذرا میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں اپنی اندھی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔
(قدموں کی آواز)
اور قریب آؤ بیٹا۔ تمہارا چہرہ کہاں ہے۔ کہاں ہو تم۔ اجے کمار۔ بیٹا...

مذہب اور اُسکی قیمت؟

ایک شام کی معمولی صحبت میں بھڑ بھڑے شاہ، بے تکے خاں، رام جیون، تامسن اور میں بیٹھے تھے۔ سہ پہر کو جامع مسجد کے سامنے مہابیر جی جھنڈے گذرنے کیلئے ہندو مسلمانوں میں خوب سر پھٹول ہو چکی تھی۔ اسی واقعہ پر گفتگو تھی۔ رام جیون بول اُٹھے :-

"یارو یہ مذہبوں کی بلا جس قدر جلد ہمارے سروں سے ٹل جاتی بہتر تھا۔ یہ دُنیا میں چار دن شانتی شانتی کی ہانک پکار لگا کر جب شکتی حاصل کر لیتے ہیں تو راون کی طرح منش کا لہو پینے لگتے ہیں۔ انہوں نے سنسار کو جتنا سُکھ دیا ہے اس سے کہیں زیادہ دُکھ۔ دھرموں کے نام پر دُنیا میں کتنی وحشیانہ جنگیں اور خونریزیاں ہوتی رہی ہیں۔ ایشیا کی پسماندگی، پستی، ذلت، اور ساری بپتاؤں کا کارن یہی ہیں۔ ہماری تہذیب و تمدن کی راہ میں یہی سب سے بڑے پتھر ہیں۔ جب تک ہم سب مل کر ان کو ہٹا نہ لینگے مغرب کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور سُکھ نہیں پا سکتے۔ آخر دھرم کے بنا مغرب کا کیا بگڑا؟ اس کا جیون ہر پرکار سے اُتّم، اُچت اور سکھی ہے۔"

بے تکے خاں بولے :- رام جیون جی مذہب تو اصل میں اسی دُکھ کو مٹانے کیلئے آئے تھے جس کا تم رونا رو رہے ہو۔ یہ آپس کی جنگیں اور سر پھٹول مذہب کے کارن نہیں بلکہ اسکے غلط تصور کی بنا پر ہیں۔ سب بگڑ گئے، اس سے دُور بھٹک بھٹک گئے، انکو روگ لگ گئے۔ دوش انکی جنموں کا نہیں، ضرورت علاج اور آپریشن کی ہے۔"

رام جیون :- "جو کچھ بھی ہو، جب تک ان روگوں کا کوئی ماہر ڈاکٹر موجود نہیں، مذہبوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے اُن سے چھٹکارا ہی اُچت ہے۔ اندھوں کا دوڑ دوڑ کر کنوؤں میں گرنے سے نہ چلنا ہی بہتر ہے، زہر سے پیٹ بھرنے سے بھوکا رہنا ہی اچھا ہے۔"

بھڑ بھڑے شاہ :- یہ بالکل سچ ہے پر ذرا صبر کرو۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ لامذہبی نے دُنیا کو کیا سُکھ دے رکھا ہے؟ آج مادہ پرست، زر پرست، لامذہب مغرب میں خدائے رحیم و کریم کی جگہ شیطان، زر اور طاقت کے راکشوں نے لے رکھی ہے۔ انہیں بھوتوں کی پوجا ہو رہی ہے۔ جسکی لاٹھی اسکی بھینس کا منتر جپا جا رہا ہے۔ اگر مذہبی جھگڑے انسان کے دُکھ کا کارن ہیں تو آج نسلی، قابتیر اور قومی عداوتیں کچھ کم لعنتیں ہیں؟ کیا اس زمانے کی ہولناک خونریز جنگیں جو نسلی برتری کی خاطر قوم اور وطن کے ناموں پر لڑی جا رہی ہیں اور کمزور قوموں کو جس طرح کُچلا جا رہا ہے وہ انسانیت کیلئے کچھ کم شرمناک ہے؟ کیا مذہبوں نے ان نسلی جنگوں سے زیادہ خونریزی کی ہے؟ نسل کے بھوتنے ایک صدی کے اندر پانی خشکی اور ہوا میں ہتھیاروں اور زہریلی گیسوں سے اور دوست بنکر بے ہتھیار جتنی جانیں ضائع کی یا انسانی خون چوس چوس کے جتنے زندوں کو مُردوں سے بدتر بنا رکھا ہے اس کی تعداد کا مقابلہ بیس صدیوں کی ہنگامہ خیز مذہبی جنگیں بھی نہیں کر سکتیں۔ کیا انسانیت کا خون پی پی کر ایڑیاں رگڑانے والی، نہ جینے دینے والی، نہ مرنے دینے والی تہذیب کی چڑیل کو یہ حق پہونچتا ہے کہ سامنے سے حملہ کرنے والے مذہب پر منہ آتے؟ سُوپ پر ہنسے چھلنی جس میں بہتر چھید!۔

رام جیون :- ہاں شاہ صاحب یہ تو ٹھیک ہے کہ اس سمے طاقت سب سے بڑا حق اور کمزوری سب سے بڑا جرم ہے۔ کوئی دو طاقتیں کبھی برابر نہیں ہو سکتیں اور ہوں بھی تو اُن کا ٹکراؤ لازمی ہے۔ نتیجہ ہے لگاتار بے انت جنگیں اور خونریزیاں۔ پر اس سے مذہب کی صفائی کب ثابت ہوتی ہے؟ ایک اندھا ایک کوڑھی، اچھا کسے کہیئے؟ فرق صرف بیش و کم کا ہے۔ بانی زور ہمیشہ اُچھلتا رہا ہے، اُچھلتا رہیگا اور کمزوروں کو کچلا ہی کرے گا۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اس کا مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

بھڑ بھڑے شاہ :- علاج مذہب ہے اور رہیگا۔ مگر موجودہ روگی مذہب نہیں، تندرست، اصل، خالص، پیدائشی مذہب۔ مذہب خدا نے طاقتوں کے اسی فرق کو مٹانے اور اُونچ نیچ کو برابر کرنے کو پیدا کیا تھا اور اب بھی کر سکتا ہے تو یہی۔

رام جیون :- یہ کس طرح؟

بھڑ بھڑے شاہ :- یہ بتانے سے پہلے آؤ ہم مذہب کی اصلیت پھر اُسکی قدر و قیمت کو جانچیں اور دیکھیں آیا جو کیڑے اس میں نکالے جاتے ہیں وہ اُسکے اندرونی اور لازمی اجزا ہیں یا بیرونی یا عارضی؟ اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مذہب ہے کیا اور اس کا مقصد کیا ہے یا ہونا چاہیئے؟

مختلف مذہب والے اس کا جواب مختلف طور پر دینگے۔ ایک ویدانتی ہندو کہیگا آتما کا پرماتما سے ملاپ۔ کیوں رام جیون جی؟

رام جیون :- جی ہاں۔

بھڑبھڑے شاہ:۔ عیسائی کہے گا' خدا کی محبت' کیوں ٹامسن؟

ٹامسن:۔ بیشک۔

بھڑبھڑے شاہ:۔ بُدھسٹ کہے گا 'نروان' مسلمان کہیگا: خدا کے ساتھ صلح' اسکے حکموں پر سر جھکانا' کیوں خاں صاحب؟۔

بے تکے خاں:۔ بیشک' تم کہے جاؤ۔

بھڑبھڑے شاہ:۔ اب سوال یہ پیدا ہو سکتے ہیں کہ آتما سے پرماتما کا ملاپ اگر ممکن ہے تو کس طرح؟ مخلوق سے کٹ کر خالق سے ملنا؟ پھر اس ملنے، جدا ہونے اور لوٹنے کے معنی کیا ہیں؟ خدا سے محبت کیسے کی جاتے جب وہ ہمارے جسمانی حواس اور ادراک سے بلند اور ہماری محبت نفرت اور ہر جذبۂ انسانی کی پہونچ سے بالاتر ہے؟ خدا کے حکم یا مرضی کے آگے سر جھکانے کیلئے ضروری ہے کہ ہمیں اس کی مرضی معلوم ہو۔ وہ کیا ہے؟ خدا سے صلح کے معنی جب اُس سے جنگ ناممکن ہے۔ جہاں کوئی اختیار نہیں، طاقت نہیں، قدرت نہیں وہاں صلح اور جنگ کا سوال کیسا؟

یہ سوالات اصل میں سب ایک ہی ہیں۔ ہم مختلف مذاہب پر تاریخ کی روشنی میں نگاہ ڈالیں یعنی ان کے بانیوں کی زندگی اور تعلیمات پر نظر کریں تو سب سوالات کا جواب ایک ہی اور ان ظاہری اضداد میں ایک اندرونی اتحاد پائیں گے۔ اگر خالق سے وصال ممکن ہے تو مخلوق کے واسطے اور زینے سے۔ پرماتما سے براہِ راست ملاپ ناممکن ہے' دھوکا ہے۔ خدا کی محبت کے معنی ہیں مخلوق کی محبت۔ خدا سے صلح کے معنی ہیں اُسکے بندوں سے صلح اور یہی خدا کی مرضی ہے۔ اس مرضیِ الٰہی کے آگے سر جُھکانا خدا کے آگے سر جھکانا ہے۔ بعض لوگ کہا کرتے ہیں 'مذہب نام ہے انسان اور خدا کے درمیان تعلقات کا' مگر صحیح یہ ہے کہ مذہب عبارت ہے انسان اور انسان کے باہمی تعلقات سے جو بالآخر انسان کو خدا سے متعلق کر دیتے، قریب تر کر دیتے بلکہ ملا دیتے ہیں۔

اب آئیے مذہب کی اس تعبیر کی تصدیق اس کے معلّموں کی تعلیمات سے کی جاتے۔ ویدانت کی اصل تعلیم یا فلسفہ ہے وحدۃ الوجود' ہمہ اوست۔ اس کے معنی جو میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ مخلوقات کی زندگی کی حرمت و تقدّس' ان کی برابری' آزادی اور درجہ بدرجہ عروج و ترقی کی یکساں لیاقت یا دوسرے لفظوں میں وحدتِ کل مؤثر انداز میں دُنیا کے ذہن نشین کر دی جاتے۔ اور خلقی نسلی فرقہ وارانہ، جماعتی یا انفرادی امتیازات اور ظلم اور سپاسداری کا ہر دروازہ بند کر دیا جاتے۔

بھاگوت گیتا میں وارد ہے:۔

"جو کسی مخلوق کی بُرائی نہیں چاہتا، محبت آشنا، رحمدل، حرص طمع، انانیت اور خودی سے پاک، خوشی اور غم میں یکساں، درگذر کرنے والا، ہمیشہ قانع، صلح جو، نفس پر قابو رکھنے والا، ارادے کا پکّا، دل و دماغ سے مجھ پر توکّل رکھنے والا ہے، میرا ایسا فدائی مجھے عزیز ہے، وہ فدائی جس سے دُنیا نہ بھاگے، جو دُنیا سے نہ بھاگے، خوشی، غم اور خوف کے جھمیلوں سے آزاد ہو، مجھے پیارا ہے۔ بب ۱۲ آیت ۱۳-۱۵

یکساں دوست اور دشمن کیلئے، عزّت و ذلّت میں، گرمی و سردی میں، خوشی و غم میں .... وہ آدمی مجھے عزیز ہے۔ ب ۱۲۔ آیت ۱۸-۱۹۔

اے بھارت بے ضرری، سچائی، دھیرج، تیاگ، صلح آشتی، سلامت روی، جانداروں پر رحم۔ بے طمعی، نرم دلی، حیا، مستقل مزاجی، تُنکتی، درگذر، تحمّل، صاف باطنی۔ کینہ کپٹ اور غرور و گھمنڈ سے پاکی اُس آدمی کے گُن ہیں جو صفاتِ الٰہی کا حامل ہے۔ ریا، غرور تکبر۔ غصہ تندی اور ناوانشمندی اُس کے گن ہیں جو شیطانی صفات کا حامل ہو۔ ب ۱۶۔ آیت ۱-۴

آج یہ میری کارستانی ہے، کل وہ مقصد میں حاصل کرونگا' وہ مال میرا ہو چکا۔ یہ کل میرا ہونے والا ہے، اس دشمن کو میں نے قتل کیا، کل دوسروں کو میں قتل کرونگا۔ میں مالک میں کامل، میں قوی، میں سکھی، میں دولتمند، میں فتحمند، میں عالی نسب۔ میرا جیسا یا مجھ سے بڑھ کر جہان میں کون ہے؟ .... من کا یہ فریب خوردہ، نفس کا غلام پستی میں گرتے گرتے المناک جہنّم میں جا رہیگا۔ ب ۱۶۔ آیت ۱۳-۱۶"

کیا کسی مذہب نے ان تعلیمات پر کچھ زیادہ اضافہ کیا یا گھٹایا ہے؟ کیا ہندوؤں کا موجودہ چھوت چھات اور جات پات کے تفرقہ کا رواجی دھرم دید اور بھاگوت گیتا کی تعلیمات سے کوئی تعلّق رکھتا ہے یا اصلیت پر مبنی ہے؟ کیا یہ اصل کی ضد نہیں، غیر ہندوانہ یا غیر ویدی نہیں؟ کیا چوپایہ جانداروں کی جانیں دوپایہ سے زیادہ قیمتی اور منش کا لہو ڈھوروں سے سستا ہے؟ یہ سب دھرم کی سیوا نہیں جاتیوں اور نسلوں کا بچار ہے۔

حضرت موسیٰ نے بے شک سری کرشن، محمد رسول اللہ اور دوسرے عملی پیغمبروں کی طرح دشمنوں کے مظالم کے خلاف جنگ کی اجازت دی ہے' "تم اُن کو چین سے رہنے دو نہ اُن کا بھلا چاہو" (توریت۔ ب ۵۔ آیت ۲۳-۲۴) پھر بھی آپ نے اعلان کیا: "اپنے ہمسایوں کے ساتھ اپنے برابر محبت

رکھو، (ب۳۔ آیت ۱۹: ۱۸) کوئی اجنبی تمہارے ملک میں تمہارے ساتھ آرہے تو وہ تمہیں میں سے ایک ہے، گویا تمہارا ہم قبیلہ۔ اُس کے ساتھ ویسی ہی محبت کرو جیسی اپنے ساتھ؛ (ب۳۔ آیت ۱۹: ۳۳-۳۴) اس پر اسرائیلی دَور میں عیسائیوں پر دردناک مظالم، خود حضرت عیسیٰ کا قتل، سود خواری کی شکل میں خونخواری، پھر جنت کی تنہا ملکیت کا دعویٰ، موسوی تعلیم اور پیغام سے کتنی مناسبت رکھتا ہے؟

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور زندگی کی یہ امتیازی شان ہے جس میں وہ اپنے پیشرووں اور پس آیندوں سے کوسوں آگے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں: "اپنے دشمنوں سے محبت رکھو، جو تم پر لعنتیں بھیجتے ہیں تم اُن پر رحمت بھیجو، جو تم سے نفرت رکھتے ہیں تم اُن کے ساتھ نیکی کرو، جو تم سے عداوت کا برتاؤ کرتے ہیں اور تم کو اپنے غضب کا نشانہ بناتے ہیں اُن کے لیے دعائے خیر کرو، تاکہ تم اُس خداوند باپ کے فرزند بنو جو آسمان پر ہے، کیونکہ وہ اپنا سورج اچھے اور بُرے سب پر برابر طلوع کرتا اور اپنا مینہ ظالم اور عادل سب پر یکساں برساتا ہے۔ کیونکہ جو تم سے محبت کریں تم انہیں سے محبت رکھو تو کیا اجر؟ کیا محصول لینے والے بھی یہی نہیں کرتے؟ اور اگر تم فقط اپنے بھائیوں ہی کو سلام کرو تو کیا زیادہ کرتے ہو۔ کیا غیر قوموں کے لوگ بھی ایسا ہی نہیں کرتے؟ پس تم کامل بنو جیسا تمہارا آسمانی باپ کامل ہے۔" (متی ۵، آیت ۴۴-۴۸) یہ کمال ہماری نظر میں طاقت بشری سے کتنا ہی بعید یا محال معلوم ہو، حضرت مسیح نے اس کا صرف پرچار ہی نہیں کیا بلکہ برت کر دکھا دیا اور اپنی زندگی اسی پر قربان کر دی۔ اسکے مقابلے میں آج عیسائیت کی نام لیوا قوموں کی نفس پروری اور خونخواری کا مقابلہ کرو۔

اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ نے انتقام اور مدافعت کی اجازت اور عمل کے باوجود ہمیشہ رحم و کرم کو ترجیح دی ہے۔ جب آپ اور آپکے پیرو اہل مکہ کے مظالم کا شکار ہو رہے تھے، کسی مسلمان نے تنگ آکر عرض کیا کہ ظالموں کے حق میں بددعا فرمائیں اور اُن پر عذاب الٰہی مانگیں، آپ نے فرمایا: "نہیں، میں تو اللہ کے بندوں کے حق میں رحمت بناکر بھیجا گیا ہوں نہ کہ لعنت"۔ کافروں یعنی ظالموں کے مظالم پر آپ کی زبان سے نکلا تو صرف اتنا کہ "الٰہی یہ ناسمجھ ہیں ان کو صحیح راستہ بتادے"! یہ تھے وہ سنگدل دشمن جنہوں نے آپ سے اور آپکے پیرووں سے وطن چھڑایا۔ مدینہ میں دلیس نکالا دیا۔ اور وہاں بھی کئی دن لوٹ مار اور جنگوں سے چین نہ لینے دیا۔ آخر مسلمانوں نے جب مکہ فتح کرلیا تو انتقام یا سزا کے عوض اعلان کر دیا کہ تم سے تمہارے کرتوتوں کا مواخذہ نہ کیا جائیگا۔ اللہ ہمیں اور تمہیں معاف کرے؛ آپ غیر مسلم اجنبی مسافروں کو مدینہ کی مسجد میں مہمان کرتے اور وہاں اُن کے مذہب کے مطابق اُنہیں عبادت کرنے کی اجازت ہوتی۔ یہاں تک کہ ان کا غلیظ اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ ایک بار ایک غیر مسلم گنوار عرب مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ مسلمان بگڑ کر اس کے ساتھ سختی سے پیش آنا چاہتے تھے، حضرت نے روکدیا۔ پہلے پیشاب سے پوری فراغت کرنے دی، پھر نرمی سے سمجھا دیا کہ یہ خدا کی عبادت کی جگہ ہے۔ آپ کا یہ اخلاق دیکھکر وہ پانی پانی ہوگیا اور فوراً مسلمان ہوگیا۔ رسول اللہ اور آپکے جانشینوں کے دَور میں ایسے واقعات ایک دو نہیں بیشمار ہیں۔

بے شبہ قرآن گیتا کی طرح کافروں یعنی ظالموں سے مدافعتی جنگوں کی اجازت ہی نہیں حکم دیتا ہے جو اس وقت تک ناگزیر ہیں اور رہینگی جب تک فطرت انسانی میں خیر کے ساتھ شر کے عناصر شامل ہیں، مگر ایسی خاص حالت سے قطع نظر، دین اسلام عالمگیر صلح، امن اور مساوات انسانی کے اُصولوں پر مبنی ہے۔ قرآن بتاتا ہے:-

"دین کے معاملہ میں جبر اور زبردستی نہیں۔ ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے ہیں یہ پیغام لیکر کہ اللہ کی اطاعت کرو اور شیطان سے بچو۔ کچھ لوگوں نے ہدایت پائی اور کچھ گمراہی میں مُبتلا رہے۔ (س۱۶، آیت ۳۶)۔ اے رسول کہدو ہم اللہ پر اور اُن سب حکموں پر ایمان رکھتے ہیں جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب پر، اُن کے لوگوں پر اور موسیٰ عیسیٰ اور اللہ کے دوسرے رسولوں پر نازل کیے گئے ہیں۔ ہم ان تمام پیغمبروں میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتے، ہم اللہ کے تابعدار ہیں۔ پس اگر ان (مخاطبوں) کا عقیدہ وہی ہو جو تمہارا ہے تو وہ صحیح رستے پر ہیں (س۲، ۱۶۱: ۱۳۶-۱۳۷) اے محمد ہم نے تمکو جو سچائی کی کتاب دی ہے وہ اگلی کتابوں کی محض تصدیق و استحفاظ ہے۔ ۶-۷: ۴۸"

پس قرآن کے مطابق ہر زمانہ اور ملک میں تمام مذاہب کے تمام پیغمبروں کی تعلیم کی بنیاد ایک ہی ہے۔ وہ بتاتا ہے: "تم سب ایک واحد امت ہو اور میں تم سب کا رکھوالا ہوں۔ بس میرا کہا مانو۔ پھر سب کٹ کٹ کر دین میں ایک دوسرے سے جُدا ہوگئے، مگر سب کو پھر میرے ہی پاس لوٹنا ہے۔ تو جو کوئی بھلا کرے اور سچا ایمان رکھے وہ مومن ہے اسکی جزا اُسے ملیگی۔ (۱۷: ۹۲-۹۴) قرآن کی اس تبلیغ و تعلیم کے مقابلے میں اپنے خاص فرقہ کے سوا باقی تمام فرقوں اور مذہبی جماعتوں کو جہنم میں جھونکنا

رام جیون:۔ تمام دھرموں میں کامن فیکٹر (قدر مشترک) کیا ہے؟۔

بھڑ بھڑے شاہ:۔ ایک لفظ میں "مساوات"۔ دین کی اوّل اور آخر شرط ہے توحید۔ معبود کی وحدت، جس کے مفہوم میں فطرت انسانی کی مساوات۔ اس مفہوم سے جدا توحید کے کوئی معنی نہیں۔ گیتا، ویدانت اور بدھی تعلیمات اسی وحدت پر زور دینے میں اس حد تک آگے بڑھ گئی ہیں کہ وہ صرف انسان کی نہیں تمام مخلوقات کی مساوات (وحدۃ الوجود) کا پرچار کرتی ہیں۔ دین موسوی اور محمدی انسان کی مساوات کے مدعی ہیں۔ پس اتنا جزو (مساوات انسانی) تمام مذاہب میں مشترک ٹھہرا۔

تامسن:۔ جی ہاں۔ اگرچہ تاریخی ماحول کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ خاص طور سے اپنی کھوئی ہوئی اسرائیلی بھیڑ کی رہنمائی پر مامور تھے، آپ نے غیر اسرائیلیوں اور محصول گیروں کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھا۔ ہر کوڑھی، اپاہج، اندھے، لنگڑے، بیمار کا جو اعتقاد کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا علاج کر کے چنگا کر دیتے۔ آسمانی سلطنت میں داخلہ کیلئے صرف ایک حق درکار تھا اور وہ نیکی تھی۔ چنانچہ آپ اعلان کرتے ہیں کہ جب تک تم راستبازی میں عالموں اور فریسیوں سے بڑھ نہ جاؤ گے، آسمانی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکتے (متی ۵۔ آیت ۲۰) ہر شخص جو میرے پاس آکر خداوند، خداوند کہے آسمانی سلطنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف وہ جو میرے باپ کی، جو آسمان پر ہے مرضی پہ چلے گا۔ اس روز کتنے ہی لوگ میرے پاس آکر کہیں گے خداوند، خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے شگون نہیں لئے، بد روحوں کو نہیں نکالا اور بہت سے معجزے نہیں دکھائے؟ تب میں ان سے صاف صاف کہدونگا میں تمہیں نہیں جانتا۔ اے بدکارو میرے پاس سے چلے جاؤ۔"

(متی ۷۔ آیت ۲۱-۲۳)

بے تکے خاں:۔ اسی طرح محمد رسول اللہ نے فرمایا قیامت کے روز میرے رفقا صرف پرہیزگار ہونگے۔ اگرچہ قرابت داروں میں میرے قریب تریں عزیز ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ تو نیکیاں لے لیکر میرے پاس آئیں اور تم صرف قرابت کے دعوے سے محمدؐ محمدؐ پکارتے آؤ اور میں تم سے منہ پھیر لوں۔

بھڑ بھڑے شاہ:۔ قرآن انسان کی کامل مساوات کا اعلان کرتا ہے۔ اپنی تمام طاقت اور اقتدار کے ساتھ بھی اسلام نے زمین و آسمان کی سلطنت کبھی اپنے لئے مخصوص نہیں کی۔ قرآن کہتا ہے۔ "مسلم، یہودی، عیسائی، صابی اور جو کوئی اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے، اسے کوئی خوف اور رنج نہ ہوگا۔ (۲: ۸: ۶۲)"؛ "سب آدمی یکساں نہیں ہوتے۔ اہل کتاب میں ایسے بھی ہیں جو اللہ کی کتاب میں تلاوت کرتے اور راتوں کو اس کی تلاوت میں مشغول رہتے، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے، لوگوں کو نیکیوں کی فہمائش کرتے، برائیوں سے روکتے اور خود نیکیوں میں سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، نیکوکار وہی ہیں" (۳: ۱۲: ۱۱۲۔ ۱۱۳) زمین کی سلطنت کے بارے میں قرآن، زبور کی تائید کرتا ہے: "ہمارے نیک بندے زمین کے وارث ہونگے" (۲۱: ۷: ۱۰۵)؛ "اللہ نے ان بندوں سے جو اس پر بشواس رکھتے اور نیکوکار رہیں وعدہ کر رکھا ہے کہ زمین پر اس کے نائب ہونگے" (۲۴: ۷: ۵۵)؛ "یہ نیابت اگلے وقتوں میں ہم نے دوسری قوموں کو بخشی تھی، جب وہ جفا کار اور ہمارے پیغمبروں سے برگشتہ ہو گئے، ہم نے ان کو فنا کر دیا اور ان کے نام و نشان مٹا دیئے۔ ان کے پیچھے ہم نے تم کو نائب بنایا ہے، اب دیکھتے ہیں تم کیا کرتے ہو" (۱۰: ۲: ۱۳۔ ۱۴) قرآن کی رو سے مسلمان کی بڑائی نہ خون اور نسل پر موقوف ہے نہ زبان اور وطن پر، بلکہ نیکی کے پھیلانے اور برائی سے روکنے پر (۳: ۱۲: ۱)۔ "اس جدوجہد میں ایک مسلم پر جو کچھ بھی گذرے بھگت لے کہ یہ بڑا مقصد ہے" (۲۱: ۲: ۱۷) "لوگوں کو مالک کی راہ پر بلاؤ۔ دانشمندی اور نرمی سے اور نہایت ملائم سبھاؤ سے ان سے بحث کرو۔" ۱۶: ۱۶: ۱۲۵"

"فتح مکہ کے دوسرے روز جب کہ محمد رسول اللہ کا فرض، جو اللہ کی طرف سے آپ کے سپرد کیا گیا تھا، پورا ہو گیا تو آپ نے کوہ صفا کی بلندی سے کھڑے ہو کر خدا کا آخری پیغام یوں سنا دیا:۔

"انسانو ہم نے تم کو مرد اور عورت سے ایک طرح جنم دیا، تم کو قبیلوں اور گھرانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے کہ ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ، ورنہ اللہ کی نظر میں سب سے بڑا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ اور خدا کو سب کی خبر ہے" (۴۹: ۲: ۱۳)

تامسن:۔ یہی تو حضرت مسیح کا ارشاد بھی ہے۔

رام جیون:۔ اور جیسا کہ شاہ صاحب ابھی گیتا کے اشلوک میں سنا چکے ہیں: "میرے پرستار جو مجھے عزیز ہیں وہ لوگ ہیں جو کسی سے بیر نہیں رکھتے، مہربان، دیالو، درگذر کرنے والے دوستوں اور دشمنوں سے یکساں" سری کرشن جی کا پیغام بھی یہی ہے۔

بھڑ بھڑے شاہ:۔ "مذاہب کی جتنی بالمقابلہ تحقیقات کی جائیگی یہ حقیقت نمایاں ہوتی جائے گی کہ سب کی بنیادی تعلیم ایک ہے۔ سب کا مقصد سنسار میں شانتی، صلح، کلیان، خیراندیشی ہے۔ اور ذریعہ ہے انسانوں کی برادری برابری اور ـــــ"

بے تکے خاں:۔ آزادی ـــ

بھڑ بھڑے شاہ:۔ ہاں میں یہی کہنے والا تھا مگر رک گیا یہ سوچ کر کہ

اس لفظ کے معنی کی تعیین نہیں، اس لئے یہ بہتیری غلط فہمیوں اور فسادوں کا باعث ہے۔ خیر لفظوں سے کیا کام۔ رُوحانی آزادی سمجھ لو۔ تو میں کہہ رہا تھا سب مذاہب ایک ہی اُصولِ اخلاق پر مبنی ہیں خواہ وہ موسیٰ کے دس احکام ہوں یا ساکیا مُنی کی دس آگیا یا زرتشت کے تین اصل اصول (پاک نیت، پاک قول، پاک فعل) عیسیٰ کے پہاڑ کا وعظ ہو، قرآن کا فرمان ہو یا گیتا کے ارشادات، سب ایک ہی منزل کے رستے ہیں ؎

یہ رازِ دل شکن کعبہ میں جا کر کھل گیا آخر
کہ یہ منزل نہیں راہوں میں ہے اک راہ منزل کی

رام جیون۔ گیتا کی ہدایت ہے "انسان مختلف رستوں سے مجھ تک پہونچتے ہیں۔ وہ جس رستے سے بھی چل کر میری طرف آتیں میں اُن کی پیشوائی کرتا ہوں، کیونکہ سب رستے میرے ہی ہیں"۔

بھڑ بھڑے شاہ:۔ بیشک! پوجا پاٹ، کریا کرم اور سارے رسوم ورواج مذاہب کے فروعی اور مقامی پہلو ہیں۔ اصل بنیاد ایک ہی ہے۔ اگر ایک جڑ کی شاخوں، ایک منزل کے رستوں، یا ایک مقصد کے ذریعوں میں فرق ہو تو اُس کے کارن ایک دوسرے کا سر پھوڑنا یا جان لینا کونسا دھرم ہے؟ کوئی خدا سے لَو لگاتا ہے، کوئی موسیقی کے نغموں سے، کوئی کتاب کی تلاوت و سماعت سے، کوئی چُپکے چُپکے دھیان کر۔ معبود تو ایک ہی ہے اور اُس پرماتما کی پوجا بھجن عبادت اور حمد و ثنا کیلئے کوئی طریقہ اور بول بس نہیں۔ آؤ ہم عمر خیام کے ساتھ مل کر گائیں:۔ ؎

رب کے بلاوے گھنٹے تاسے سنکھ اذان
مالا تر سُل تسبیح اُس کے نام و نشان
لاکھ زبانیں مِل مِل گائیں ایک کے گُن
گرجا مندر مسجد سب بھجنوں کے ستھان

رام جیون۔ پچھلی صدی سے کئی بزرگوں نے دھرم کے نام پر ادھرم اور انیائے اور خدا کے نام پر شیطان کے کرتوت دیکھ دیکھ کر، سچائی کی روشنی کو باطل کے سیاہ بادلوں سے صاف کرنے کی وقتاً فوقتاً جدوجہد کی ہے۔ ان میں کبیر داس، گرو نانک، چیتنیا، دیوکانند، دیانند، بہاؤ اللہ، راجہ رام موہن رائے اور ان کے خلیفہ کیشب چندر سین قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر مختلف مذاہب میں تطبیق یا انکے بہترین عناصر کے انتخاب و اخذ کی کوشش کی ہے مگر نتیجہ صفر۔

بھڑ بھڑے شاہ:۔ ان تمام بزرگوں کی باستثنائے بہاؤ اللہ تمامتر کوشش ہندوؤں کے حالات کی مطابقت میں صرف ہندو دھرم کی اصلاح تک محدود رہی ہے۔ لیکن آجکل جبکہ تمام جغرافی حدود ٹوٹ چکے ہیں، ساری دُنیا کے گہرے سماجی، تجارتی، تہذیبی تعلقات کے لحاظ سے ضرورت صرف مقامی نہیں بلکہ سارے سنسار کی اصلاح کی ہے۔

کیشب چندر سین نے ایسا حوصلہ کیا جو قابل تعریف اور سبق آموز ہے۔ ۱۸۸۱ء میں شریعت نو کا جھنڈا گاڑتے ہوئے انہوں نے یہ فصیح و بلیغ موقر خطبہ دیا تھا:۔

"یہ جھنڈا ہے زمین و آسمان کے پروردگار، رب الاعلیٰ کا.... دیکھو اس کے اُوپر تمام انبیاء اولیا کی روحیں، ایک مقدس برادری، اکٹھی ہے۔ جن کے اتحاد میں ایمان، آشا اور آنند کا میل ہے۔ اس مقدس علم کے نیچے پاک آیات درج ہیں۔ ویدمت، بودھ مت، مسیحیت، اور اسلام کی، جو قرنوں اور جگوں کی بدھی، گیان، بزرگوں کے وحی و الہام کے خزانے اور ہماری شمع ہدایت ہیں..... یہاں ایشیا یورپ افریقہ امریکہ کا بین الاقوامی سنگم ہے..... یہاں دل و دماغ، روح، نیت، گیان، پریم، فرض و قربانی کا تناسب و توافق ہے۔ ..... سُبحان ربی الاعلیٰ۔ صلوٰۃ و سلام ہے آسمان کے تمام انبیاء و اولیا پر اور زمین کی تمام کتب الہٰی پر!"

کیشب چندر سین کے نزدیک مذاہب کا اتحاد عبارت تھا مختلف تعلیمات، صحف انبیا اور تہذیبوں کے اتحاد سے، وہ تمام نوع انسان کے لئے ایک مشترک دین اور تمام مذاہب کے اجزائے مشترک کے اختلاط و اتحاد سے ایک بین الاقوامی واحد مذہب کی بُنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس مقصد کی عظمت کو دیکھکر ایک عملی مصلح کی حیثیت سے دقتوں کو محسوس کیا۔ ضرورت تھی ہر ملک میں ایک کیشب کی اور کیشب تھا ایک ہی۔ آخر اُس نے اپنے دیس سے ابتدا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چُنانچہ وہ اقرار کرتا ہے:۔

"ہندوستان کا مستقبل مذہب بالکل قومی ہونا چاہیئے۔ دُنیا کے جس مستقبل مذہب کا میں نے نقشہ کھینچا ہے وہ تمام اقوام کا مذہب ضرور ہوگا مگر ہر قوم میں اُس کا نشو و نما مقامی طور پر ہوگا اور اپنے اپنے امتیازی رنگ میں۔ نوع انسان ایک واحد مذہب میں متحد تو ہو جائیگا، مگر ساتھ ہی یہ اتحاد ہر قوم کے مخصوص حالات اور ماحول کے موافق ہوگا اور مختص قومی شکل اختیار کریگا، نہ تقلید۔ ہندوستان کے مذہبی رسوم و رواج، روایات، مذاق، افکار و خیالات اسے عزیز و مقدس ہیں..... الغرض روحیں ایک ہونگی شکلیں مختلف۔ یوں پرماتما کی تسبیح و تقدس کے راگ ہندوستان اپنی ہندی لے میں

اور انگلستان امریکہ اور دُنیا کی اور اقوام اپنے اپنے ساز پر گائیں گی۔ مگر یہ سارے راگ اور جُدا جُدا لَے مل جُل کر ایک شیریں اور دلنواز نغمہ بن جاتے گی۔ آسمان اور زمین پر پروردگار کی الوہیت در بوبیت اور انسان کی اخوت و عبدیت کے اعلان میں ایک دلگداز مقدس بھجن اور تسبیح و تہلیل کا آہنگ......"

مگر افسوس کیشب چندر سین کی یہ پاک تمنّا ایک ہندوستان میں نصف صدی میں بھی پوری نہ ہو سکی۔ ان کی اور دوسرے مصلحوں کی کوششو سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ بحالت موجودہ اقوام عالم کے سر کوئی ایک مذہب یا نئی شریعت تھوپی نہیں جا سکتی، نہ اس کی ضرورت ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اقوامِ عالم اپنے اپنے دین کے سرچشمہ کی طرف لوٹ چلیں۔ وہ سرچشمہ جس سے تمام مذاہب کی ندیاں نکل نکل کر کچھ دور پر جُدا جُدا ہو جاتی اور الگ الگ نام پاتی ہیں۔ یہ سرچشمہ اب تک پاک صاف، فرحت بخش اور صحت بخش ملے گا، جہاں ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ رواداری، تنظیم و محبت پر مجبور ہونگے اور کسی سے بَیر نہ ہوگا۔

بے تکے خاں:۔ ہر پھر کر تم آ گئے اپنے تصوّف پر جو خود ایک گورکھ دھندا ہے۔ اس کا مقصد معیّن نہیں۔ کوئی نفس کشی کو تصوف کہتا ہے، کوئی روحانی مسرّت کو، کوئی دین و مذہب سے بے نیازی کو، کوئی دھرم کی سیوا کو۔ تم کیا کہتے ہو؟

بھڑ بھڑے شاہ:۔ میں وہی کہتا ہوں جو ہر گیانی، رازدانِ حقیقت، رومی اور سعدی اور مغرب میں صوفی تحریک کا پرچارک عنایت خاں کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "سچا دین سچائی کا سمندر راور مختلف مذاہب دھرم اور مت اس کی موجیں ہیں۔ وقتاً فوقتاً خدا کی ایک شریعت جوار کی طرح آتی اور گذر جاتی ہے۔ جو چیز ہمیشہ باقی رہ جاتی ہے وہ خود سمندر ہے، سچائی ہے۔ جو دوسروں کو غلط راہ پر سمجھتے ہیں اکثر وہ خود ٹھیک رستے پر نہیں ہوتے، کیونکہ جو سیدھے رستے پر ہوتا ہے وہ ہر رستے کو جلد یا دیر سے ایک ہی منزل کی طرف جاتا ہوا پالیتا ہے۔ صوفی کسی خاص مذہب کا پیرو نہیں، نہ کسی کو بناتا ہے۔ اس مشرب میں داخل ہونیوالا دُنیا کے تمام دھرموں میں داخل اور کسی خاص مذہب کا پابند نہیں ہوتا۔

دین رُوح کی آزاد بلند پروازی ہے، قید و بند نہیں۔ ہر شخص جس دھرم کو سچا یقین کرے اس پر ایمان رکھنے میں آزاد ہے مگر ایک بلند ترین مقصد پر سب کو ایمان لانا ہے۔

اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی؛

تامسن:۔ اس اخوت و محبت کے پھیلانے کا پہلا زینہ کیا ہے؟

بھڑ بھڑے شاہ:۔ پہلا اور آخری زینہ اقبالؔ کی اصطلاح میں خودی ہے۔ خود غرضی و خود پروری نہیں، خود شناسی، احتساب نفس۔ ساری زندگی کا راز اسی میں مضمر ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی کا یہی گُر ہے۔ یہی اصل دین ہے۔ موجودہ جنگ میں جب کہ ساری دُنیا درہم برہم ہے، یہ پیغام خدائی پیغام ہے۔ تم اپنے آپ کو جتنا سمجھو گے اتنا ہی دوسرے مذہب کو صحیح روشنی میں دیکھ سکو گے اور سب کچھ صاف دکھائی دینے لگے گا۔ تصوّف، سچا تصوّف، ایسا ہی نور ہے جو تمہارے مذہب کو تم پر روشن کرتا ہے۔ تمہارے کمرے میں جہاں تمہارے کام کی سب چیزیں موجود ہیں مگر نظر نہ آتی تھیں، روشنی ہوتے ہی سب کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔"

رام جیون:۔ اپنے آپکو پہچاننا یا حقیقت کو جاننا بیشک من کا بڑا آنند ہے، پرآتما کی شانتی اور آنند کا بھید کیا ہے؟

بھڑ بھڑے شاہ:۔ اسی کو تو عرض کر رہا ہوں۔ مَن عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ، جس نے اپنے آپ کو جان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ سچا آنند حاصل کرنے کیلئے اصل ضرورت دماغ کو ہر اُس چیز سے پاک صاف کرنے کی ہے جو پریشانی اور پراگندگی پیدا کرتی ہے اور ہمواری اور سکون حاصل کرنے کی۔ دل کے سکون کو غارت کرنے والے صرف داخلی جذبات ہی نہیں بلکہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو ہمارے خیال اور مذاق سے موافق نہیں اور ہم ان سے نفرت رکھتے اور دُکھ محسوس کرتے ہیں۔ پرارتھنا، دعا، دھیان گیان سب بے سُود ہیں اگر دماغ ان خارجی اثرات سے خالی نہ ہو۔ اپنے اندر صلح اور شانتی رکھنے کے لئے کوئی قیمت یا قربانی زیادہ نہیں۔ یہ وہ سبھاؤ ہے جو ہمیں اُن چیزوں کے سہنے کا عادی بناتا ہے جو ہمیں اچھی نہیں لگتیں، اُن چیزوں سے بے تعلق کرتا ہے جن سے ہم بے تعلق ہونا نہیں چاہتے، اور ان چیزوں کو بھلاتا اور درگذر کرتا ہے جن کو بھلانے اور درگذر نے کو ہم تیار نہیں ہوتے۔

یہ ہم آہنگی حاصل ہوتی ہے اپنے آپ کو تمام موجودات اور حالات سے آشنا اور موافق کرنے سے۔ جو اپنے آپ کو دوسروں سے ہم آہنگ نہیں کرتا وہ دوسروں کو اپنا ہم آہنگ بنانا چاہتا ہے اور دوسروں کو اپنے سُر پر لانے کی کوشش میں طنبورے کا تار ہی توڑ ڈالتا ہے۔ فطرتاً ہر رُوح ہم آہنگی ڈھونڈتی ہے مگر شاذونادر کوئی اُسے پیدا کرنا بھی جانتی ہے۔ ہم اکثر چلاّ اُٹھتے ہیں "یہ شور ہمارے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا ہے"

دماغ مختل کئے دیتا ہے، شور کو ہم روک نہیں سکتے، شور سے اپنا احساس کو روک سکتے ہیں، ہمیں اسی کی مشق کرنا ہے کہ اپنے آپ کو شور سے یوں بھی بے پروا بنالیں کہ اسے صرف برداشت ہی نہ کرسکیں بلکہ اس سے بلند تر ہوجائیں کہ ناموافقت باقی نہ رہے۔

اسی توافق، تناسب، ہم آہنگی کے حصول اور اس کیلئے ضروری قربانیوں میں مضمر ہے آتما کی شانتی آنند، دُنیاوی اور اخروی۔ اُسے یوگ کہو، ویدانتزم کہو، بھگتی کہو، تصوّف کہو، جس نام سے چاہو پکارو۔ اس کے اجزا ہر طرف بکھرے ہوتے ہیں، ہر دھرم اور مذہب میں، ہر فلسفہ میں، وقت آگیا ہے کہ ان کو گوندھ کر ایک مجموعہ میں جمع کر دیا جائے اور دھرم کی طرح اختیار کر لیا جائے، دھرم اور مذہب نہیں، اس سے ماسوا اور ماورا۔ تمہارا دین دھرم جو کچھ بھی ہو، سنسار کی برادری کے ایک فرد کی حیثیت سے یہ ماورائے دین مشرب بھی تمہیں اختیار کرنا اور برتنا چاہئے اور اس دُنیا پر آسمانی سلطنت قائم کرنا چاہیئے جس کی عملداری عالم آخرت تک ہوگی۔

بے تکے خاں:- اس مشرب کی قیمت تو مذہب سے بڑھ گئی۔ پھر جُدا جُدا مذہبوں کی ضرورت ہی کیا رہی؟۔

بھڑبھڑے شاہ:- مذہب کے دو حصّے ہیں، اعتقادات اور اعمال۔ اعتقادات کی اصل دُنیا سب میں ایک ہی ہے۔ توحید، یعنی مساوات کامل اور وحدت موجودات، جو مقتضی بلکہ مرادف ہے محبت، صلح، شانتی کی۔ مشربِ تصوف دراصل مذہب کا یہی عضو رئیس ہے، جو مذہب سے جُدا نہیں بلکہ جوہر ہے رُوح ہے۔ رہے اعمال کرم اور رسوم، وہ دیس دیس کی آب وہوا، ماحول اور مقامی حالات کے لحاظ سے جُدا جُدا ہیں اور رہیں گے۔ کیونکہ انکی پیدائش اُس وقت ہوئی تھی جب دُنیا کے ممالک ایک دوسرے سے کم لگاؤ یا بے لگاؤ تھے۔ ذرائع آمد ورفت، میل جول، تعلقات اتنے وسیع نہ تھے جتنے آج، کہ کوئی دیس دوسرے سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ جغرافی حدود ٹوٹ چکیں پھر بھی دیس دیس کے معمولاتِ زندگی، اعمال معاشرت، احکام وطریق عبادت الگ الگ تھے، ہیں اور رہیں گے۔ اور مذہب کے اس عارضی جزو یا خارجی پہلو میں ان فرقوں سے کوئی ہرج بھی نہیں۔ بس مذہب کے عملی حصّہ میں دُنیا ایک نہیں ہوسکتی نہ ضرورت ہی، تو اعتقادی، مثالی اور رُوحانی جزو میں کیوں نہ ایک ہوجائے؟ غرض تصوف مذہب سے جدا نہیں بلکہ ضروری اور اہم حصّہ ہے، رُوح ہے، جان ہے!

بے تکے خاں:- تم نے اپنے زورِ طبیعت اور اپچ سے مذہب کی خوب تعبیر کی ہے"۔

بھڑبھڑے شاہ:- مذہب کی یہ تعبیر میری اپنی اُپج نہیں۔ قرآن، گیتا اور بائبل کی آیات سے میں اس پر کافی روشنی ڈال چکا ہوں۔ پھر بھی اسے اچھی طرح ذہن نشیں کرنے کو بوستاں میں شیخ سعدی کی ایک حکایت یاد دلاتا ہوں جو غالباً تورات یا تالمود سے ماخوذ ہے۔

حضرت ابراہیم کی مہماں نوازی ضرب المثل ہے۔ وہ کسی مسافر وارد وصادر کے بغیر کھانے کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ ایک بار ایک ہفتہ گذر گیا اور کوئی مہمان نہ ملا۔ دنوں کے بُھوکے بے چین مہمان کی تلاش میں نکلے۔ آخر ایک صد سالہ پیر فرتوت ہاتھ آگیا۔ بڑی خاطر واخلاق سے گھر لائے۔ ہاتھ دُھلایا۔ گھر والوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھے۔ سب نے بسم اللہ کہکر کھانا شروع کیا۔ اُس مسافر نے بسم اللہ نہیں کہی۔ یہ بات عجیب تھی۔ لوگوں نے سبب پوچھا پیر مرد نے کہا میں مجوسی ہوں، حضرت ابراہیم نے بدمزہ ہوکر اُس آتش پرست کافر کو دسترخوان سے اُٹھا دیا۔ فوراً اللہ کا عتاب نازل ہوا، جسے ہم نے سو برس زندگی اور غذا دی تم اُسے ایک لحظہ کیلئے گوارا نہ کرسکے؟ وہ آگ کے آگے سر جھکاتا ہے تو جھکائے تم اُس سے اپنا دست کرم کیوں کھینچو؟"

اس سے بھی زیادہ عبرتناک اور صاف وصریح واقعہ حضرت موسیٰ اور گڈریئے کا ہے جو مولانا رومی نے بیان فرمایا ہے۔

"حضرت موسیٰ کے عہد نبوت میں ایک گڈریا اپنے رب کے عشق کی سرشاری وسرمستی میں اسے یوں مخاطب کر رہا تھا۔

"میرے داتا تو کہاں ہے! اپنا چہرہ دکھا کہ میں تیری سیوا کروں، تیری جوتیاں گانٹھ دوں، بال سنوار دوں، پھٹے کپڑے سی دوں، جوئیں چُن دوں، تجھے تازہ دودھ پلاؤں، دُکھ درد ہو تو تیمار داری کروں، تیرے پیارے پیارے ہاتھ پاؤں چُوموں، تیری سیج سجاؤں۔ کم از کم اپنا گھر ہی بتا دے کہ گھی مکھن، دودھ پنیر، گھی چپڑی روٹیاں، شراب، عمدہ دہی صبح شام پہونچا دیا کروں۔ میرا کام بھوجن پہونچانا تیرا کام بھوگنا ہوگا۔ میری مالک میں، میرے بال بچے، گھر بار، بھیڑ بکریاں سب تجھ پر قربان! ذرا بتادے تو ہے کہاں؟"

اس اثنا میں حضرت موسیٰ اُدھر سے گذرے اور اسکی زار نالی سُن لی، پوچھا تو کس سے فریاد کر رہا تھا؟ اس نے کہا: اپنے رب، آسمان وزمین کے پروردگار کے آگے؛ حضرت موسیٰ نے غصہ میں اُسے رکھکر جھنجوڑ دیا۔

"بے تمیز، گستاخ، یہ کیا بکواس ہے؟ تو تو کافر مشرک ہوگیا۔ ان کلمات کفر سے زبان روک جن سے فضا غلیظ ہو رہی ہے اور

زمین پر قہرِ الٰہی نازل ہونے کو ہے۔ جونیاں، لباس، غذا مجبور مخلوق کو درکار ہیں، پروردگار ان کا محتاج نہیں۔ وہ جسم و اعضا سے بے نیاز اور آزاد ہے۔ ان کے بغیر دیکھتا، سنتا، چلتا پھرتا، جانتا بوجھتا اور سارے کام کرتا ہے۔"

بھولا گڈریا اپنی گستاخی و بے ادبی پر بہت نادم ہوا۔ زبان بند کر لی۔ جی مسوس کر صرف ایک آہ کھینچی اور جنگلوں میں نکل گیا۔ اللہ نے موسیٰ پر وحی بھیجی:-

"تو نے ہمارے بندے کو ہم سے چھڑا دیا۔ ہم نے تجھے اپنے آپ کو بندوں سے ملانے بھیجا ہے یا چھڑانے؟ ہم نے ہر شخص کو اس کی مخصوص اصطلاح اور زبان دی ہے۔ وہ ایک کیلئے موزوں اور دوسرے کیلئے ناموزوں ہو سکتی ہے۔ ہم اصطلاحوں اور زبانوں سے بے نیاز اور بلند تر ہیں، اُس کی ہو یا تیری، ہم زبان یا طرز ادا کو نہیں دیکھتے بلکہ دل اور نیت کو۔ میں جو چاہتا ہوں وہ پاک دل اور گرم محبت ہے۔ جا ویسی ہی محبت کی آگ اپنے دل میں روشن کر اور تمام عقائد اور ارکان و شعائر کو آگ لگا دے۔ جو میری محبت میں کھو جائے وہ ہر ایک مذہب و مشرب، آداب و رسوم سے آزاد ہے اور میرے سوا اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

بے تکے خاں:- پھر تو تم ترکِ دنیا اور سر بنا سی ور فنا فی اللہ کے حق میں ہو؟"

بھڑ بھڑے شاہ:- ہاں ویدانتیوں، بھگتوں، بیراگیوں، صوفیوں اور اہلِ باطن نے اس عشقِ حقیقی پر حد سے زیادہ زور دیکر رہبانیت اور بیراگ کی بنیادیں کھڑی کر لی ہیں۔ خاص حالات میں، زندگی کے کسی دور میں سنیاس اور بیراگ کوئی معنی اور قیمت رکھتا ہے۔ مگر سنسار کی سبھا اور سماج کے ممبر کی حیثیت سے، انسانیت کی خاطر، یہ مفید نہیں، بلکہ صاف صاف سُن لو، مجرمانہ ہے۔ سری کرشن جی، زرتشت، موسیٰ، عیسیٰ، محمد صلوات اللہ علیہم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ تنگ خیالی، خود کشانہ قنوط ہے، روگی ذہنیت ہے۔ ذرا غور کرو ہمارے جھونپڑے سے کچھ دور پڑوس میں آگ لگی ہے۔ ہماری کٹیا کے نیچے وادی میں سیلاب مردوں عورتوں جوانوں بوڑھوں بچوں مویشیوں کو بہائے جاتا ہے، مدد مدد دُہائی دہائی کی چیخ پکار ہے۔ اور ہم اپنی خشک اور محفوظ کٹیا میں مگن بیٹھے پرمیشور سے دھیان لگائے اپنے اور ان جلنے یا ڈوبنے والے انسانوں کے پروردگار کی محبت میں سرشار و بیخود انکی کراہ اور کشمکش سے بے خبر پڑے ہیں۔ کیا یہ عمل یا بے عملی رحمانی کے عوض شیطانی نہیں؟ دنیا ایسے دکھوں سے کب خالی ہوتی ہے؟ قحط، وبا، زلزلہ، سیلاب، جنگ، فقر و فاقہ کی دائمی بپتاؤں سے کبھی اتنی فرصت مل سکتی ہے کہ ہم دھیان گیان، کشف و مراقبہ، ریاضت اور تپسیا میں کھوئے ہوئے اپنی ذاتی نجات اور مکتی کی فکر میں ڈھیلے رہیں؟ کیا یہ خود غرضی نہیں؟ سچے دھرم اور اخلاق کی خلاف ورزی نہیں؟ اگر ہم تقدس و تزکیۂ نفس کے اس باطل زعم اور خود غرضی کو اپنے دلوں سے دُور اور روحوں کو پاک نہ کریں تو ہم زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔

گوتم بدھ نے ایک عمر کے سنیاس، تیاگ اور راہبانہ تجربوں کے بعد اس فریبِ نفس کو سمجھا اور اس حقیقت کو پہونچ گئے کہ انسانیت سے باہر کوئی خدا نہیں۔ خدا ملتا ہے محبت سے، اور محبت عمل میں آتی ہے اسکی مخلوق کی خدمت سے، قربانیوں سے۔ اپنے آپکو جذب کر کے، خدا میں نہیں اُسکے مظہرِ اعلیٰ مخلوق میں، جو اس واسطے سے بالآخر انسان کو خدا سے ملا دیتی ہے۔ جیسے ایک جھرنا چٹانوں، شگافوں، نالوں، ندیوں سے گذرتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے۔ اسی طرح انسان انسانیت کے متعدد راستوں اور گلیوں سے گذر کر، کل کیلئے جُزو اور جماعت کیلئے افراد کی قربانیوں سے خدا کو پاتا ہے۔ دلو کا نند نے خوب کہا ہے "آجکل بہت ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی مُکتی کیلئے سنسار کو تیاگ کیا ہے۔ جہنم میں ڈالو سب کو اور اپنی مُکتی کو اور دوسروں کی سیوا کرو۔"

۵ جو شیخ کو مسجد میں نہ طاعت سے ملا
جوگی کو نہ اک عمر ریاضت سے ملا
اک رندِ خرابات کو وہ خالقِ کل
بازار میں مخلوق کی خدمت سے ملا

تامسن:- بات تو یہی سچ ہے شاہ جی اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ لڑکپن میں ہم نے ایک انگریزی نظم 'ابو بن ادھم' پڑھی تھی، اس میں بھی یہی تعلیم ہے۔

بے تکے خاں:- وہ کیا تھی؟

تامسن:- سُنو گے؟ ایک رات ابو بن ادھم کو اپنے کمرے میں ایک فرشتہ کچھ لکھتا دکھائی دیا۔ ابن ادھم نے پوچھا 'کیا لکھ رہے ہو؟' اس نے کہا 'اُن لوگوں کے نام جو رب سے محبت رکھتے ہیں۔' ابن ادھم نے سکون سے کہا 'اچھا میرا نام اُن لوگوں میں لکھ لو جو اللہ کے بندوں سے محبت رکھتے ہیں' فرشتے نے لکھ لیا اور غائب ہو گیا۔ دوسری رات فرشتہ پھر آیا، اُس کے نور کی شعاعوں سے ابن ادھم کی نیند ٹوٹ گئی۔ فرشتے نے اُنکی فہرست دکھائی جو خدا کی محبت سے سرفراز ہوئے اور ابن ادھم کا نام سب کے اوپر تھا۔

بھڑ بھڑے شاہ:- حق ہے۔ دُکھی انسانیت کا علاج نہ اعلیٰ تمدن ہے، نہ قومیت و جمہوریت، نہ کوئی سیاسی نظام۔ آزادی، شانتی، صلح و امن ایک

میسرا بچھرا۔

بن بُلایا مہمان

کہتے ہیں اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، ہم ہندوستانی کچھ ایسے جنگجو واقع ہوتے ہیں کہ بس بات بے بات جوتم پیزار۔ مسجد کے سامنے کافرون نے ڈھول پیٹے مسلمانوں نے ڈھول پیٹنے والوں کو پیٹ ڈالا۔ مندر کے آگے سے تازئے نکلے اور لٹھ چلا۔ دراصل ہم لوگ حسّاس بہت واقع ہوتے ہیں ــــ!

پیپل کا ایک شہر بر گُدّا عین سڑک پر جھک آیا اور جب قد آور تازیوں نے اُدھر سے جہقدمی کی کوشش کی، تو جھکنے کی ضرورت پڑی۔ تازئے ادر جھکیں! اور کٹ جائے بھی پیپل کا! توبہ کیجئے اسی طرح ڈٹا رہا نتیجہ؟ سینکڑوں گھر لُٹ گئے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھر پھونک دئے مسلمانوں نے ہندوؤں کو کاٹ کے رکھدیا۔ یہ تو لمبی داستان ہے، مگر ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے لئے یہ نئی بات ہے۔ ہمارے پرداد کے وقت سے لیکر ابتک تازیوں اور پیپل کے گُدّوں کا خاندانی بیر چلا آرہا ہے۔ اور خدا نہ کرے جو ہم اپنی قومی خوبیوں کو خیرباد کہیں۔ اور جب مسلمانوں نے گدّا کاٹا تو اندازہ لگا لیجئے کیا ہوا۔

اور جب ہندو مسلمان لڑ رہے ہوں تو برجو، ماسی جی کو دیکھنے کیسے جاتے۔ گلی میں جب "لیجیو، جلیو" کا غل مچتا تو برجو کمینہ مسلمنٹوں کو اُن کے مظالم سے باز رکھنے کیلئے تلسی کے پیڑ کے آگے دونوں وقت ہاتھ جوڑ کر ماتھا ٹیکتی ـــ مگر اس دن کمبختوں نے تلسی کے گملے کو بھی تو ہانا پائی اور دھکا پیل میں کچل کر رکھدیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے غول بیابانی بڑے پھاٹک کو پھاند کر آن پہونچا تھا۔

رات کو وہ اپنے کمرے میں آنے سے پہلے ماں سے لپٹ کر اطمینان کر لیتی کہ گھر میں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا اور اس کے کمرے کے پاس ہی گورکھوں کو تعینات کر دیا گیا ہے۔ پر کوئی رات کے گیارہ بجے جبکہ وہ خواب میں اپنے کپڑوں والے زخمیوں کو گلیوں میں گرتا پڑتا دیکھ رہی تھی ایک دم اس کی آنکھ ایک غیر معمولی کھٹکے سے کھل گئی اور ایک بھیانک سایہ دُھند لکے میں کھڑکی میں سے داخل ہوتے دیکھکر اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس سے قبل کہ اُسکی چلانے کی طاقت عود کر آئے وہ بھیانک سایہ لپکے اوپر جھک کر عجب طرح غرّایا کہ وہ سہم گئی۔

"خبردار جو.....!" اور برجو بستر میں دبک گئی۔ نیچے بے طرح غل مچ رہا تھا۔ شاید کوئی شکار گلی والوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُسکے کمرے میں پناہ لینے آیا تھا... لیکن ـــ اگر وہ اُسے قتل کرنے آیا تھا تو؟ وہ پھر چیخنے لگی۔ سائے نے فوراً اپنے کھردرے سخت ہاتھوں سے اس کا منہ بھینچ دیا۔

"تم چیخوگی تو ـــ میں تمہارا گلا دبا ڈالونگا ـــ سمجھیں ـــ وہ مجھے مارنے آرہے ہیں ـــ مار ڈالیں گے ـــ کمینے" اُس نے ہانپتے ہوئے کہا اور گرفت ڈھیلی کر دی۔

برجو بستر پر اُٹھکر بیٹھ گئی۔ اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔

"تم بڑی ڈرپوک ہو" مخاطب کے لہجہ میں ہنسی کا شائبہ تھا۔

"تم ـــ ہو کون؟"

"میں کوئی بھی ہوں.... وہ لوگ مجھے مارنے آرہے ہیں.... خدا کی پناہ.... شاید انہوں نے مجھے آتے دیکھ لیا" اس نے ذرا اُٹھتے ہوئے کہا۔ گلی میں غل سنائی دے رہا تھا۔

اندھیرے میں اُسے بولنے والے کا نقشہ تو نظر نہ آیا ـــ مگر "خدا کی پناہ" سے وہ پہچان گئی کہ کوئی مسلمان ہے ـــ بعض وقت خدا کا نام لینا بھی آفت میں پھنسا دیتا ہے۔

"تم نکل جاؤ میرے کمرے سے... ابھی..." وہ پیچھے کھسک کر اُٹھنے لگی۔

"ابھی؟" اُس نے حیرت سے کہا "اس ـــ حالت میں ـــ توبہ کر دو وہ مجھے...."

"ہاں اس حالت میں ـــ" برجو اُسے ذرا دبتا دیکھکر بہادر بنی۔

"خوب!" اِس مصیبت میں بھی اُسے خوش مذاقی سوجھ رہی تھی "اور جو وہ مجھے کتے کی موت مار دیں تو پھر ـــ آپ ـــ آپکا کیا جائے"

"میں ـــ میں" وہ شاید کسی کو پکارنے کی دھمکی دینے والی تھی۔

"اگر آپ چلائیں تو مجھے مجبوراً آپ کے نازک گلے کو اپنے کریہہ ہاتھوں سے گھونٹنا پڑیگا۔ میں کہتا ہوں آپ ڈرتی کیوں ہیں، میں کوئی حوا تو ہوں نہیں جو آپ کو کھا جاؤنگا۔ چپکی پڑی رہیئے"

"آپ کو اس طرح میرے کمرے میں آنیکا کیا کوئی ـــ"

"بالکل نہیں ـــ قطعی نہیں۔ مگر سنیئے تو ـــ میرے پیچھے چاڈری

سے ڈیڑھ سو کے قریب لفنگے لگے ہوئے ہیں ۔۔ نہ جانے کیسے کیسے گھنٹہ بھر سے بھاگم بھاگ یہاں تک آیا ہوں اور مجبوراً مجھے آپکے دولت خانہ میں بغیر اجازت کے گھسنا پڑا ۔۔ یقین مانیئے مجھے رات کے بارہ بجے آپ جیسی حسین چھوکریوں کے کمروں میں گھسنے کی قطعی عادت نہیں ۔۔ ہاں ۔۔ اور میں ذرا دیکھوں تو آپ ۔۔ کہاں ہے آپکا ۔۔ وہ آپ کی بجلی ۔۔ ذرا جلائیے تو ۔۔"

"بالکل نہیں۔ آپ نکل جائیے یہاں سے ورنہ ۔۔۔" برجو نے ذرا تن کر کہا۔

"ورنہ؟ ۔۔ ورنہ کیا؟" آنے والے نے بجلی کے بٹن کو تلاش کرنا شروع کیا۔

"ورنہ یہ کہ میں ابھی ....."

"کسی کو بلالیں گی! یہی نا؟"

"ہاں"

"پھر؟"

"پھر ... پھر ... تم ...."

"کتے کی طرح آپ کے کمرے میں ذبح کر دیا جاؤنگا"

میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کرنے پر برجو کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ "کیوں بے کتے؟" اُس کے دماغ میں گونجنے لگا۔ ماسی کے گھر والا دیوانہ انسان خون اور کیچڑ میں لتھڑا چیتھڑوں میں ملبوس، ہاتھ میں ایک حقیر سی چھڑی لئے لیمپ کی روشنی سے گھبرائی ہوئی آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ رشید اُس کی ماسی کا بیٹا۔ وہ کچھ متحیر اور کچھ خوفزدہ اپنے کو ساڑھی میں لپیٹتی ہوئی پلنگ کے دوسری طرف کھڑی ہوگئی۔

"کیا آپ پسند کریں گی کہ آپ اس وقت باہر گلی میں چلی جائیں"

اُس نے شاید برجو کو نہ پہچانتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہو کہ آپ میرے کمرے میں رہیں"

"اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی بوٹیاں نچوانے باہر چلا جاؤں"

"آپ بڑے بزدل ہیں؟"

"ہیں؟ میں؟ ۔۔ مگر ذرا سوچئے تو ۔۔ میں نے ۔۔ میں کس طرح اتنے درندوں سے لڑ سکتا ہوں"

"میں کیا جانوں"

"لیجئے وہ ۔۔ شاید وہ پھر آگئے" شکار نے احاطے میں غل سُن کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" برجو نے گھبرا کر کہا۔

"شاید دروازہ بند کر رہا ہوں" اس کے لہجہ میں ایک تلخ تبسم جھلک رہا تھا۔ "اور پھر ....."

"میں ۔۔ آپ کو ابھی اُن کے حوالے کر دوں گی" برجو نے جھلا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا آپنے فیصلہ کر لیا کہ مجھے مرجانا چاہیئے" بن بلائے مہمان نے ذرا طنز سے کہا۔

"یہ میں نہیں جانتی" برجو نے ذرا تکلف سے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے ۔۔ میں یہیں مروں گا؟" اور وہ کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

برجو ٹھٹکی "تمہیں باہر جانا پڑیگا" اُسنے رعب سے کہا۔

"مرنے کیلئے نا؟ خوب ا ۔۔ جی نہیں میں یہیں اسی جگہ مرونگا ۔۔ تاکہ آپ بھی دیکھیں کس طرح میری گردن میں سے خون کے شرارے نکلتے ہیں ۔۔ یعنی جہاں میرا دل چاہے گا وہیں مروں گا۔ نہ کہ آپکے حکم کے مطابق"

برجو نے جھرجھری لی۔

"اور تازہ تازہ خون! لال لال! یہاں بہے گا" اُس نے اپنے چاروں طرف اشارہ کیا۔

"مگر ۔۔" برجو ٹوٹ پڑی۔

"اگر نا مگر ۔۔ اور پھر، میں بھوت بنکر آپ کو ۔۔ آپکو ۔۔ بس سمجھ لیجئے خوب ا ۔۔"

"آپ کمرے سے چلے جائیے" برجو کچھ لاچار سی ہوگئی۔

"جی نہیں ۔۔ اب تو آپ دیکھیں ۔۔ آپنے کبھی بکرے کٹتے دیکھے ہیں ۔۔ کبھی کچا گوشت کا قیمہ بنتے۔ ہڈیوں کا چورا ہوتے دیکھا ہے" کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا۔

برجو نے دو دفعہ قصائی کی دکان دیکھی تھی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"اور میرا سر وہ لوگ اینٹوں سے پھوڑیں گے ۔۔ میرا بھیجا یہاں ۔۔ اور کیا عجب جو یہ سب آپ کی خوبصورت چیزیں میرے خون سے لتھڑ جائیں۔ بہتر ہو کہ ذرا آپ اپنا سامان وغیرہ کھسکا لیں۔ کیونکہ وہ لوگ مجھے آسانی سے ذبح نہ کر سکیں گے۔ وہ گھمسان کی لڑائی ہوگی ۔۔ یاد رکھئے ۔۔ آپ مجھے بزدل کہتی ہیں۔ چار کو مار کے مروں گا"

"آپ ـــ بڑے عجیب آدمی ہیں!" برجو مجبور ہو کر مڑی۔

"کیا سمجھتی ہیں آپ؟ ـــ سمجھا کیا تھا آپ نے مجھے ـــ" اکڑ کر سینہ تانتے ہوئے کہا گیا۔ "دیکھئے گا آپ خون کا دریا بہہ جائے گا۔ بس خون ہی خون! چھ سات لاشیں گرینگی ـــ" احاطے میں غل کو بڑھتے دیکھکر عجیب و غریب پاگل بولا۔

برجو دروازے کے قریب گئی تو اُسے زور زور سے بولنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ بلوائی شاید شکار کو نوکروں کے حصہ میں ڈھونڈنے کے بعد خاص مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ گورکھے اتنے بڑے انبوہ کو سنبھالنے میں ذرا مشکلات محسوس کر رہے تھے۔

"وہ مکان میں تلاشی لینے آرہے ہیں ـــ" برجو نے گھبرا کر کہا۔

تھوڑی دیر کیلئے اُس بے فکر انسان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"آپ کو مجھے چھپانا ہوگا!" اُس نے برجو پر دباؤ ڈالا۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔

"میں کہیں آپکو نہیں چھپاؤں گی!" برجو غصہ سے تن گئی۔

"جلدی کرو ـــ" اور اُس نے برجو کے کندھے جھنجوڑ ڈالے۔

"تمہیں معلوم نہیں ـــ میں مرنا پسند نہیں کرتا"

"تم کمینے ہو!" وہ جھٹکے سے دُور کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑا رہا۔ برجو نے اُسے غور سے دیکھا۔ اُسکے جسم اور چہرے پر کیچڑ لگی ہوئی تھی گریبان نیچے تک پھٹا ہوا تھا اور ایک ٹانگ بالکل برہنہ تھی۔ باوجود سردی کے وہ پسینہ میں نہایا ہوا تھا۔ پریشان بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ اگر وہ اتنا گندہ نہ ہوتا تو اچھی خاصی شکل تھی۔

"تم واقعی چاہتی ہو کہ میں مارا جاؤں.... ذرا سوچو اگر تمہارا اکلوتا بیٹا اس طرح بلا میں پھنس جاتا تو تم کیا اُسے ان درندوں کو دیدیتیں تاکہ وہ اس کی بوٹیاں چبا ڈالیں ـــ" اُسے دروازے کی طرف کوئی آتا معلوم ہوا۔ لپک کر اُس نے بجلی بجھا دی اور مضبوطی سے برجو کے کندھے گرفت میں لے لئے۔

"اگر تم بولیں تو میں ـــ" اُس نے خوفناک طریقے پر دانت بھینچ کر کہا۔ "تمہیں بھی میرے ساتھ مرنا ہوگا ـــ سمجھیں"

"اچھا ـــ اُس پردے کے پیچھے چھپ جاؤ ـــ" برجو مجبور ہو کر بولی۔ وہ خون خچر کے خیال سے لرز گئی۔ آنے والے نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"بی بی!" کسی نے ڈری ہوئی آواز سے پکارا۔

"بالکل خاموش!" گھٹی ہوئی تاریکی میں برجو نے سُنا اور کندھوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔

"چُھپ جاؤ ـــ پرماتما کیلئے چُھپ جاؤ" اُس نے اجنبی دیوانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بی بی ـــ لوگ آرہے ہیں ـــ" اور ساتھ ساتھ اُسے غل بالکل برآمدے میں سُنائی دیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ انہوں نے ایک آدمی اِسی سمت آتے دیکھا تھا۔

"چلو ـــ میں تمہیں اِدھر چُھپا دوں گی" لیکن جیسے وہ کچھ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ بُت کی طرح کھڑا رہا۔

"چلئے" اُس نے ذرا التجا آمیز طریقے پر اُسے ڈھکیلا۔

"نہیں ـــ تم کہتی ہو میں بزدل ہوں ـــ میں تمہیں دکھاؤنگا ـــ ذرا دروازہ کھول دو ـــ" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"نہیں ـــ یہ کیا کرتے ہو وہ تمہیں مار ڈالیں گے"

"بلا سے" اور وہ اُسے ڈھکیلتا آگے بڑھا۔

"دیا کیجئے ـــ پرماتما کے نام پہ" وہ اُسے روک کر بولی۔

"کیوں؟"

"میں خون نہیں دیکھ سکتی"

"ہوں بڑی خود غرض ہیں آپ! اچھا آپ چلی جائیے ـــ اور مجھے ـــ"

"نہیں، میں آپ کو مرنے نہیں دونگی جلدی کیجئے۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بھی ڈھونڈ چکے اب اِدھر ہی آرہے ہیں"

"میں نے کہدیا کہ میں دکھا دونگا آپ کو ـــ یقیناً خوش ہو جائینگی آپ ـــ ہا ہا ـــ" وہ بیدردی سے ہنسا۔

"میں آپکے ہاتھ جوڑتی ہوں!" برجو سسکیاں بھرنے لگی۔

"یہ خوب زبردستی ہے!" اُس نے روٹھے ہوئے بچے کی طرح کہا۔ اور برجو اُسے گھسیٹتی ہوئی پردے کے پیچھے لے گئی۔

"خاموش، اگر آپ ذرا ہلے تو وہ دیکھ لیں گے" اُس نے اُس کے کان کے قریب کہا۔

پردہ برابر کر کے اُس نے لیمپ جلایا اور جلدی جلدی اُس نے وہ کیچڑ اور مٹی جھاڑ دی جو کہ فرش اور قالین پر لگ گئی تھی ـــ جلدی سے کھڑکی بھی بند کر دی اور ایک گلدان اور چند کتابیں اُٹھا کر وہاں رکھ دیں تاکہ کوئی سمجھے کہ کھڑکی کھلی ہی نہ تھی۔

"کون ہے" اُس نے دروازہ کھولا۔

دروازے پر اُس کی آیا کھڑی کانپ رہی تھی۔ اور اُسکے پیچھے اُسکی ماں دوڑی آتی دکھائی دی۔

"بی بی وہ لٹیرے آگئے۔۔۔ ناس جاتے ان کا کہتے ہیں کوئی مسلمان آپکے کمرے میں آگیا ہے:

"میرے کمرے میں؟" برجو ہنکر بولی۔

"ہاں اُنہوں نے اُسے دیوار پر چڑھتے دیکھا۔ اور۔۔ لے لوہ آ بھی گئے۔۔۔ آگ لگ جائے اُن کو" ماں اُنہیں کوسنے لگی۔

تھوڑی دیر میں یہ معلوم ہوا کہ برآمدہ نہیں کناری بازار ہے اور وحشیوں کی سی ہیئت کی چند قحط زدہ شکلیں دروازے میں نظر آئیں۔

"کیا ہے" ایک مہارانی کی سی شان سے برجو آگے بڑھی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ شریمتی جی ایک ملیچھ آپ کے کمرے میں ہم نے آتے دیکھا ہے"

"میرے کمرے میں؟" برجو نے حیرت سے اُنہیں داخل ہونیکا راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور بہت سی اور بھی عجیب عجیب شکلیں آگے آئیں۔ لیکن ایک ہی لمحے میں اُنہیں سوائے چند مسحور کن اشیا کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ وہ لوگ حیرت سے اُن عجیب و غریب کرسیوں اور میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر کیلئے شکار کو بھول گئے جو شاید غور سے سنتے تو سانس کی آواز سن لیتے۔

"یہاں کون آتا" برجو نے دل میں لرزتے ہوئے کہا۔

"یہاں کون آتا" ان میں سے شاید انکا لیڈر بولا۔

"کوئی بھی نہیں" سیٹھانی نے اطمنان سے کہا۔

ذرا نا اُمید ہو کر جاتے ہوئے بلوائی یقین دلا گئے کہ وہ محض قومی همدردی سے مجبور ہو کر ایک دُشٹ سے اُنہیں بچانے آئے تھے۔۔۔!

اُس کی ماں بے طرح گھبرائی ہوئی تھی اور اُسے مجبور کیا کہ وہ چل کر اُس کے پاس سوئے یا کم از کم اپنی آیا کو تو پاس سلا ہی لے۔۔۔!

برجو نے ہنسکر اُسے یقین دلایا کہ وہ قطعی نہیں ڈر رہی ہے ڈرنے کی ایسی بات ہی کیا تھی۔ وہی لوگ تھے۔۔۔ اُس نے اپنے حسین کمرے میں آیا کی گودڑی آنے کے تصور کا مذاق اڑا کر بہانا بنا دیا۔ آیا اُسے گذرے زمانے کی باتیں یاد دلا کر رعب جمانے لگی جب برجو ننھی سی تھی اور اسی گودڑی میں کس مزے سے سوتی تھی۔

"اب میں بڑی ہوگئی ہوں" وہ ہنسی۔

دروازہ بند کر لینے کی سخت تاکید کر کے اور "دُشٹوں" سے بچے رہنے کی دُعا دیتی ہوئی بھولی بھالی بڑھیوں کے جانے کے لبعد برجو پردے کی طرف مخاطب ہوئی جس کے بیچ میں ایک مسخرہ چہرہ مُسکرا رہا تھا۔

"اب تم فوراً چلے جاؤ" اُس نے اپنی پہلی سختی سے کہا۔

"ہوں!" اور وہ نہایت اطمینان سے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"سُنا نہیں؟ اب جانا چاہیئے تمہیں"

"اوہ ذرا۔۔۔"

"نہیں اب تم ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتے"

"نہیں جاتا میں۔ بُلا لو اُن جنگلیوں کو۔ تم سے تو وہی بہتر تھے" اُس نے بے بات جھلّانا شروع کیا۔

"تمہیں بات کرنا نہیں آتی"

"اور تمہیں کونسی بات کرنا آتی ہے۔ ایک پٹے پٹلے بھوکے پیاسے انسان سے یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اوہ۔۔۔ اچھا مگر اس وقت تو تمہیں بھوکا ہی جانا ہوگا"

"تو بلا لو اُنہیں۔۔۔۔ بہتر ہے وہ مجھے مار ڈالیں" اُس نے غصّہ سے دانت پیس کر کہا "یہ نہیں دیکھتیں۔۔" اُس نے اپنی کہنیاں اور خون آلو گھٹنے دکھا کر کہا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے" وہ پانی لینے چلی۔

"اور کیا، ہونا ہی چاہیئے" اُس نے بڑبڑانا شروع کیا۔ لوٹا برجو کے ہاتھ سے لیکر پہلے تو اُسے پی کر بالکل خالی کر دیا اور پھر اور مانگا۔

"کبھی کسی نے تمہیں لڑکیوں سے بات کرنا نہیں سکھایا۔ ادھر لاؤ اپنا بازو" برجو نے کپڑے میں سے زائد پانی نچوڑ کر بزرگانہ لہجہ سے کہا۔ مگر اُسے ترس آ رہا تھا۔

"ہونھ۔۔۔ کوئی کیا بات کرنا سیکھے۔۔۔ تم لوگ خواہ کیسی ہی بہادر ہو جہاں کوئی اجنبی آیا اور تم لوگ نئے تیتر کی طرح بھڑکیں کہو بھلا میں خود مُصیبت میں ہوں تمہیں کیا نقصان پہونچا سکتا ہوں مگر نہیں۔ تم تو وہی پُرانے دستور پر چلوگی۔ اور ہم لوگ جان نہ پہچان جہاں کسی لڑکی کو مُصیبت میں دیکھا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر پہونچے۔ اگر تم اس وقت اس طرح گھر جاتیں تو یقین مانو جان دینے میں

بھی مجھے عُذر نہ ہوتا۔ مگر تم ۔۔۔۔۔"

"دُکھتا تو نہیں؟" برجو نے بات بدلنے کے لئے زخم کو کپڑے سے چھو کر پوچھا۔

"قطعی نہیں ربڑ کا بنا ہوا ہوں!"

برجو ہنسنے لگی۔

"اب تو جانے میں کوئی عذر نہیں؟" خون پوچھنے کے بعد کہا۔

"اس طرح؟" اُس نے اپنے چیتھڑوں کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا۔

"تو میری ساڑھی اور جمپر پہن جاؤ" وہ بستر پر بیٹھ کر ہنسنے لگی۔

"تمہیں کسی نے لڑکوں سے بات کرنا نہیں سکھایا" اُس نے طعن سے دُہرایا۔

اور تھوڑی دیر بعد وہ برجو کی سفید ساڑھی کو آدھا اوڑھے اور آدھا لپیٹے جانے کیلئے تیار ہو گیا اور کھڑکی کھولنے لگا۔

"اِدھر سے؟"

"اور نہیں تو پھر کدھر سے۔ تم سمجھتی ہو میں تمہارے گھر کے کونے کونے سے واقف ہوں" اس نے نہایت بُرا مان کر کہا۔

"پھاٹک سے نکل جاؤ"

"گورکھے؟"

"اوہ گورکھے!"

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔

"ماں کو خبر دینی ہو گی"

"تم جانو۔۔۔ دیکھو مارا گیا تو ۔۔۔"

"چُپ رہو"

"مگر سُنو تو ۔۔۔ اِدھر تو کوئی دکھائی نہیں دیتا" اُس نے کھڑکی کھول کر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے لمحے وہ سُنسان گلیوں میں سمٹتا بچتا چلا جا رہا تھا۔

عصمت چغتائی

---

۴۴ تصوف ہی سمجھ لو، سچی درویشی اور بھگتی صرف ناموں اور اصطلاحوں کا فرق ہے۔

محمد مسلم

دروازہ

(بسلسلہ صفحہ ۳۰)

یہ آنکھیں تمہیں پہچان نہیں سکتیں۔ لیکن ماں کی اُنگلیاں تمہیں پہچان لینگی۔ ہاں یہ وہی ناک ہے، وہی ہونٹ، یہ کان کے پاس وہی تل۔ میرے لال، میرے چاند، میری چھاتی سے لگ جاؤ بیٹا۔ تم نے مجھے بہت دُکھ دیا ہے۔

(سسکیاں لیتی ہے)

اجنبی:۔ ماں!۔

کانتا، شانتا:۔ بھیا!۔

ماں:۔ ہاں ہاں وہی تو ہے۔ تمہارا بھیا چاند۔ وہی گھنگریالے بال ہیں، جن میں کنگھی کر کے تمہیں ٹوپی پہنایا کرتی تھی، وہی ابرو۔ اور یہاں زخم کا نشان۔ بیٹا، مجھے اچھی طرح سے پکڑ لو۔ مجھے گرنے نہ دینا۔ اپنے طاقتور بازوؤں کا سہارا دو۔ میرے چاند، میری اندھی آنکھوں کے روشن ستارے، میری اُجڑی زندگی کے اُجیارے ۔۔۔۔۔

اجنبی:۔ ماں!

کرشن چندر

مذہب اور اسکی قیمت

(بسلسلہ صفحہ ۳۸)

پریشان خواب ہے، دھوکا ہے۔ علاج صرف ایک ہے اور وہی حقیقت ہے سچائی ہے، آزادی ہے، صلح و امن ہے، اندر اور باہر۔ اور وہ دھرم ہے دھرموں کا جوہر۔ اس کے حاصل کرنے اور پھیلانے کیلئے ہر قربانی کم ہے۔ اس کے لئے آرام گاہوں سے نکل نکل کر، جانوں کی بازی لگا لگا شیطانوں سے لڑنے کی ضرورت ہے۔ یہی قربانی دین ہے، تصوّف ہے مکتی ہے نروان ہے، چین ہے کلیان ہے، آزادی ہے روحوں کی جانوں کی، دُنیا میں آخرت میں۔ دھرم ہے باطل سے دائمی جنگ! اندر اور باہر، حق سے صلح، اپنے اندر اور باہر جس کا نتیجہ ہو۔

"محبت کی جہانگیری، اخوت کی فراوانی"

بے تکلے خاں:۔ یہ مذہب ہوا یا تصوّف؟۔

پھکڑ بھڑے شاہ:۔ میں تو کہہ چکا ہوں اسی کو مذہب سمجھتا ہوں مذہبوں کا نچوڑ اور جوہر۔ مذہبوں والے مُلّا، پادری، پنڈت خواہ اسے مذہب نہ کہیں نہ کہنے دیں، نہ سہی۔ کم سے کم اسے

ہمارا قصبہ

یہ کوئی بیس پچیس برس پہلے کا ذکر ہے۔ ہمارا قصبہ چند ہزار نفوس پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ دُنیا اور دُنیا کے ہنگاموں سے کچھ بے نیاز سی۔ صبح و شام صرف دو دو وقت ریل گاڑی گزرتی تھی۔ اس وقت اسٹیشن پر دوسرے قصبوں اور شہروں کو جانے کیلئے زیادہ سے زیادہ دس پانچ ٹکٹ بکتے ہوں تو بکتے ہوں۔ لیکن چند ہی سال میں یہ تعداد سینکڑوں تک پہونچ گئی۔ یہی نہیں بلکہ قصبہ میں جگہ جگہ لاریوں کے اڈے قائم ہوگئے اور لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ ملک کی وسیع آبادی کی زنجیر میں ہمارے قصبے کو بھی ایک کڑی کے ذریعے پرو دیا گیا ہے۔ اُس وقت ہمارے قصبے میں اتنی بڑی بڑی عمارتیں بھی نہ تھیں اور نہ ہی بازاروں میں یہ رونق اور چہل پہل تھی۔ اب تو جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھو دو منزلے اور سہ منزلے مکان اور دوہری دوہری چوڑی دُکانیں دکھائی دیتی ہیں۔ میونسپل کمیٹی قائم ہوتے ہی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی ضروریات کی طرف لوگوں کی توجہ ہوئی۔ سڑکوں کی مرمت کرائی گئی اور صبح و شام دونوں وقت چھڑکاؤ ہونے لگا۔ شروع شروع میں یہ کام بیل گاڑیوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ لیکن ادھر چند سال سے ایک موٹر لاری خرید لی گئی ہے اور اب تو بجلی بھی آگئی ہے اور کئی کئی تفریح گاہیں بھی بن گئی ہیں اور ایک چھوڑ دو دو بائیسکوپ قائم ہوگئے ہیں، اور یہ سب میرے دیکھتے دیکھتے ہوا ہے۔ جب میں سوچتا ہوں کہ گذشتہ بیس پچیس سال میں ہمارا قصبہ کہاں سے کہاں پہونچ گیا ہے۔ اُسنے کتنی عظیم الشان ترقی کی ہے اور اُس میں کتنی نفاست اور خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے تو خوشی کے مارے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ لیکن جب دوسرے ہی لمحے میری نظر اُس پگڈنڈی اور راستہ پر پڑتی ہے جس پر ہو کر ترقی کی یہ منزلیں طے کی گئی ہیں تو میری نظروں کے سامنے سینکڑوں ہزاروں ایسے انسانوں کی لاشیں آجاتی ہیں جو ترقی کی اس تگ و دو میں کچلے جاچکے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں جو زمانہ کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے اور اب وہیں پڑے دم توڑ رہے ہیں۔ باقی وہ لوگ ہیں جن کے جسم راستہ کی صعوبتوں کا مقابلہ نہ کرسکے اور جو تھکے ماندے آبلہ پا کسی نہ کسی طرح منزل کی طرف بڑھے چلے جارہے ہیں ـــ اور میں اپنے حلق میں ایک تلخی اور خشکی سی محسوس کرنے لگتا ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت سارے بازار میں آرائشی چیزوں کی کوئی دکان نہ تھی۔ صرف ضروریاتِ زندگی ہی میسر آسکتی تھیں۔ پھر حاجی محمد نے سب سے پہلے ایک قسم کی دکان لگائی۔ جس میں جہاں اور بہت سی چیزیں تھیں کچھ بساط خانے اور زیبائش کا سامان بھی تھا۔ ہمارے قصبے کے لوگوں کیلئے یہ چیزیں بالکل عجیب اور نرالی تھیں اور ہم میں سے اکثر اُن کے ناموں تک سے واقف نہ تھے۔ حاجی محمد ہر چھٹے ساتویں مہینے دلی جاتا اور وہاں سے طرح طرح کی نئی نئی چیزیں لاتا۔ رفتہ رفتہ یہ چیزیں ہمارے قصبے میں بھی رواج پاتی گئیں اور اُن کی کافی کھپت ہونے لگی۔ کاروبار کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ حاجی محمد کے دلی کے پھیرے بھی بڑھتے گئے۔ بازار کے دوسرے دُکاندار حاجی محمد کی قسمت پر رشک کرنے لگے، اور رشک کی یہ بات ہی تھی اس لئے کہ شروع شروع میں، جب اُس نے اپنی دُکان کھولی تھی تو مشکل سے اُس کے یہاں پچاس ساٹھ روپے کا مال ہوگا۔ لیکن چند ہی سال میں اس کا کاروبار کہیں سے کہیں پہونچ گیا۔ اور کاروبار پھیلنے کی وجہ سے اُسے اُس چھوٹی دُکان کو چھوڑ کر ایک بڑی دُکان لینی پڑی۔

حاجی محمد کی کامیابی کو دیکھکر ہر شخص کے دماغ میں خیال جم گیا کہ اگر دُکان کی جائے تو بساط خانے اور آرائشی چیزوں کی، اور یہ خیال اُن سے بعض پر کچھ اس طرح مسلط ہوا کہ انہوں نے جو سوچا تھا وہ کر بھی دکھایا۔ اور دیکھتے دیکھتے ایک دُکان کی بجائے اس قسم کی چار دُکانیں ہوگئیں۔ لیکن ان دکانوں کی حالت بھی غریبوں کی اولاد کی طرح تھی جو پیدا بھی جلدی جلدی ہوتی ہے اور اتنی ہی جلدی مر بھی جاتی ہے۔ چنانچہ ان دکانوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ کوئی پانچویں مہینے بند ہوگئی اور کوئی ساتویں۔ ان میں سب سے زیادہ عرصے تک جو دُکان قائم رہی وہ دلدار حسین کی تھی۔ لیکن گیارھویں مہینے اُسے بھی اپنا کاروبار سمیٹ لینا پڑا۔

یہ "جنگ عظیم" سے پہلے کی باتیں ہیں۔ لڑائی ختم ہونے کے کچھ دن بعد تک تو بازار کا یہی حال رہا۔ لیکن اسکے بعد ایکدم عجیب و غریب تغیر ہوا اور چیزوں کے دام یکلخت گر گئے۔ اس تبدیلی کا کتنے ہی لوگوں پر

گہرا اثر ہوا اور اس دھکے کو نہ سہ سکے اور انہیں مجبوراً اپنی دکانیں بند کر دینا پڑیں۔ لیکن حاجی محمد کی دکان پھر بھی سلامت رہی، گو وہ اکثر اپنے گھاٹے کا لوگوں کے سامنے دکھڑا روتا رہتا۔

اسی زمانے میں ایک پنجابی نے اسی بازار میں ایک نئی نئی دکان کھولی۔ اس نے اپنا کاروبار ذرا بڑے پیمانے پر شروع کیا اور بازار کی سب سے بڑی دکان کرایہ پر لی۔ اور دکان کو لکڑی کی بڑی بڑی الماریوں سے آراستہ کرکے ان میں قرینے سے تمام اشیاء سجائیں۔ صبح سویرے وہ اور اس کا لڑکا دکان کھولتے اور رات گئے جب سب دکانیں بند ہو چکتیں تو یہ اپنی دکان بند کرتے۔ حاجی محمد کسی نہ کسی طرح اس کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن پھر سودیشی کی تحریک نے اس کی کمر بالکل ہی توڑ دی۔ اور اس نے کسی نہ کسی طرح آدنے پونے اپنا سارا مال فروخت کرکے کچھ رقم اٹھالی۔ اسی زمانے میں اسکے لڑکے نے اینٹوں کے بھٹے کا کام شروع کیا جس میں اسے غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اگر وہ عمر بھر بھی بساط خانے کا کاروبار کرتا رہتا تو بھی شاید اسے اتنی آمدنی نہ ہوتی۔ اور اب تو حاجی محمد اور اس کا لڑکا بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ ہر شخص ان کو ٹھیکیدار کے نام سے یاد کرتا ہے اور لوگ کیوں نہ عزت کریں، اس نے کافی جائداد خرید لی ہے۔ اور پھر قصبے میں بھی اس نے دو بڑے بڑے مکان بنا رکھے ہیں جن میں سے ایک میں انکا اپنا خاندان رہتا ہے اور دوسرا کرایہ پر اٹھا رکھا ہے۔

لیکن پنجابی دکاندار بھی برا نہیں رہا۔ حاجی محمد کی دکان اٹھتے ہی اس نے آہستہ آہستہ چیزوں کی قیمتیں بڑھانا شروع کیں۔ ہمارے قصبہ کے لوگ اب ان چیزوں کے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ وہ انکی ضروریات زندگی میں داخل ہو گئی تھیں، اس لئے وہ مجبور ہو کر بڑھی ہوئی قیمتوں پر ہی ان اشیاء کو خریدتے۔ کئی سال تک اس کا کاروبار خوب چمکا۔ لیکن محض اتفاقی طور پر اس کا بھی ایک حریف پیدا ہو گیا جو اس سے کہیں زیادہ مالدار تھا۔ چنانچہ اسکی محنت اور کوششوں کو بھی لونی لگنا شروع ہو گئی۔

ہوا یوں کہ رائے صاحب جو ہمارے قصبے کے سب سے بڑے رئیس ہیں ان کے بیٹے نے آوارہ گردی کی طرف تیزی سے قدم بڑھانا شروع کئے۔ رائے صاحب آدمی بڑے سوجھ بوجھ کے ہیں۔ اور یہ انکی سوجھ بوجھ ہی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ہمارے قصبہ کے سب سے بڑے رئیس بنے بیٹھے ہیں۔ ورنہ انکے والد نے تو صرف تھوڑی سی زمینداری اور چند مکانات ہی چھوڑے تھے۔ انہوں نے اسکی شادی کی فکر کی۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے انہوں نے بیٹے کی شادی کے معاملے میں بڑی روشن خیالی کا ثبوت دیا۔ بیوی کے انتخاب کو انہوں نے بالکل اپنے بیٹے پر چھوڑ دیا اور اس نے جہاں پسند کیا وہیں اسکی شادی کر دی۔ یہ ان کی اور انکے بیٹے کی خوش قسمتی تھی کہ اسے جو لڑکی پسند آئی وہ کھاتے پیتے گھرانے اور اپنی برادری ہی کی تھی۔

شادی کے بعد دوسرا کام جو رائے صاحب نے کیا وہ کاروبار کا انتخاب تھا۔ خوب سوچ سمجھکر اور اپنے پرایوں سے رائے لیکر انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو زمینداری کے جھمیلوں میں ابھی نہ ڈالیں گے بلکہ اس سے تجارت شروع کرائیں گے کیونکہ تجارت میں زمینداری سے زیادہ ترقی کرنے کے امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ زمینداری کے کام کی دیکھ بھال وہ خود ہی کر لیا کرتے تھے اور انہیں کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ گیا تھا کہ کونسی تجارت شروع کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وہ کئی بار اپنے بیٹے کے ساتھ کلکتے اور بمبئی گئے اور یہ طے پایا کہ ایک اس قسم کی دکان کھولی جائے جس میں یورپ کے زیادہ سے زیادہ ملکوں کا بنا ہوا فیشن کا سامان مل سکے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہاں بھی رائے صاحب نے وقت کی رگ پہچان لی۔ قصبہ میں روز بروز تعلیم کا رواج بڑھتا جاتا تھا۔ چند سال پہلے تک وہاں انگریزی کے صرف آٹھویں درجے تک کی پڑھائی کے لئے اسکول تھا۔ لیکن پھر یہ اسکول ہائی اسکول ہوا اور دس جماعتوں تک تعلیم ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ وہاں ایک چھوڑ تین تین پرائیویٹ اسکول اور کھل گئے اور وہ پرانا اسکول کالج میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور اس طرح مضافات کی آبادی بھی روز بروز قصبے کی طرف کھنچتی چلی آتی تھی۔ پھر انگریزی تعلیم کے عام رواج کے ساتھ لوگ روز بروز بدیشی وضع کی چیزوں کو تیزی سے اپنی زندگی میں داخل کرتے جا رہے تھے۔ اسلئے ان حالات میں اور لوگوں کا رجحان دیکھتے ہوئے ایک ایسا کاروبار جس میں بدیشی وضع کی چیزوں کی خرید فروخت ہو، منفعت بخش ہونا ہی چاہیئے۔

چنانچہ رائے صاحب نے سب سے پہلے بازار میں جو ان کی پرانی وضع کی پانچ چھ دکانیں تھیں ان کو تڑوایا، پھر باہر سے انجنیر بلایا گیا۔ نقشے بنے، کاریگر آئے اور چند ہی مہینوں میں رائے صاحب نے ایک عالی شان عمارت بنوا کر کھڑی کرا دی۔ دکان کو بالکل انگریزی وضع پر سجایا گیا۔ بجلی کے قمقموں سے جگمگاتی ہوئی رنگ برنگ کی بلوری الماریاں۔ کئی کئی بجلی کے، چھت اور میز کے پنکھے۔ اور سلیقے سے سجی ہوئی اشیاء۔ دکان کے باہر برآمدوں میں نمائش کے لئے علیحدہ الماریاں آویزاں کی گئیں جن میں قرینے سے رکھی ہوئی چیزوں کو

دیکھکر ہر کسی کا اُن کو خریدنے کو جی چاہے، پھر لوکر جاکر. سارا کام تیزی اور پھرتی سے کیا جاتا۔ ہر گاہک سے چاہے وہ چند آنوں ہی کی چیز خریدے نہایت اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتا —— پرانی وضع کی دُکانوں کے درمیان یہ دُکان بڑی بوڑھیوں کے گروہ میں ایک نئی نویلی سجی دھجی دُلہن کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

نئی روشنی کے دلدادہ حضرات اپنی بہو، بیٹیوں سمیت آتے، شام کے وقت تو بعض اوقات یہ محسوس ہوتا کہ پرستان کا ایک چھوٹا سا قطعہ اس بازار میں آگیا ہے. عورتوں، مردوں، بچوں، سب ہی کے مذاق کی چیزیں تھیں، اور حضرات اپنی ضرورتوں سے زیادہ چیزیں خریدتے. اور جن کی جیبیں اس بارگراں کی متحمل نہ ہوسکتیں وہ باہر ہی سے کھڑے کھڑے اس ساز و سامانِ آرائش اور چہل پہل کو دیکھ دیکھکر اپنا جی خوش کر لیتے۔

اُدھر اس بیچارے پنجابی کی کمر، جس نے دو تین ہی جھٹکوں میں حاجی محمد جیسے پُرانے اُستاد کو چت کر دیا تھا، جھکنا شروع ہو گئی۔ گو اس کی دُکان آج تک قائم ہے لیکن اُس کی حالت اُس شخص کی سی ہے جس کو خُون کے زیادہ دباؤ کی شکایت ہو اور جسکے دل کی حرکت نہ جانے کب بند ہو جائے۔

آبادی اور ضروریاتِ زندگی کے بڑھنے کی وجہ سے قصبہ میں بازار کے علاوہ اِدھر اُدھر بھی پچھلے چند سالوں سے کچھ اور دُکانیں کُھل گئی ہیں لیکن کسے خبر کہ کل کسی کے جی میں آئے اور وہ اپنی قندیل روشن کر کے ایک ہی پھونک میں ان سارے ٹمٹماتے ہوئے دیوں کو گُل کر دے۔

اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ سیر کے سوالیوں کی اِس دنیا میں کمی تھوڑی ہے. ممکن ہے کسی وقت یہ زمین کوئی ایسا گانٹھ کا پورا اُگل دے جو رائے صاحب سے زیادہ سوجھ بوجھ سے کام لے اور اس سے کہیں اعلیٰ تر پیمانے پر اپنا کاروبار شروع کر دے۔ اور اگر یہ ایک شخص کے بس کی بات نہ بھی ہو تو اس کا امکان تو بہرصورت ہے کہ دو چار، ایسے باہوش دیوانے آپس میں مل جائیں اور زیادہ اُستوار زمین پر اپنے کاروبار کی عمارت کی تعمیر شروع کر دیں اور پھر، پھر شاید رائے صاحب کی بھی وہی حالت ہو جو اس وقت اس پنجابی دکاندار کی ہے۔ اور خدا جانے یہ سلسلہ آگے بڑھ کر اور کتنوں کو پنجابی دکاندار اور رائے صاحب جیسا بنا دے۔

یہ خیال میرے دماغ میں رہ رہ کر کروٹیں لیتا ہے۔ اسلئے کہ یہاں تو میں نے ایک اور صرف ایک چیز کا ضمناً تذکرہ کیا ہے ورنہ بالکل اسی قسم کے آثار چڑھاؤ زندگی کی دوسری چیزوں میں ہوتے رہے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اب سے بیس پچیس سال پیشتر دولت زیادہ لوگوں کے پاس تھی۔ عوام کی حالت بھی اس سے کسی قدر بہتر ہی تھی اور وہ اتنے ہراساں اور پریشان نظر نہ آتے. ممکن ہے اس کی وجہ دراصل آمدنی کی کمی اور ضروریاتِ زندگی کا ساتھ نہیں دیتی کیونکہ اگر ایک طرف ضروریاتِ زندگی اور آبادی بڑھ گئی ہے تو دوسری طرف پیداوار بھی تو کہیں زیادہ ہو گئی ہے۔

اپنے قصبے کی حالت دیکھکر میں دُنیا کی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر یہی حالت رہی تو مٹھی بھر انسانوں کے ہاتھ میں دُنیا کی اس عظیم الشان آبادی کی زندگی ہو گی۔ اگر ایسا ہو تو کیا ہو گا۔

یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ غالباً کوئی عظیم الشان اور بنیادی تبدیلی !!!

شاہد لطیف

"بن باسی دیوی" کا ایک باب۔

انسان اور جنگلی بجار

زمین کی ابھی تقسیم نہیں ہوئی ہے نہ دریاؤں کے نام رکھے گئے ہیں۔ پہاڑوں کے وار پار جانے آنے کی بھی نوبت نہیں آئی ہے۔ اس دھرتی پر جسے ہندوستان کہتے ہیں سب سے اونچے پربت کے دامن میں کوسوں تک سنسان جنگل پڑا ہے۔ سفید، کالے، لال کئی رنگ کے ریچھ شور مچا رہے ہیں۔ رات کا آخری حصہ ہے۔ زمین سے آسمان تک اندھیرا۔ ٹھنڈی ہوائیں۔ طرح طرح کے درندوں کی بھیانک آوازیں وادیوں سے ٹکرا ٹکرا کر خاموش فضا میں ہل چل ڈال رہی ہیں۔ اب مشرق کی طرف آسمان پر سفیدی جھلکنے لگی۔ رات کے شکاری پرندے جو اپنے اپنے گھونسلوں سے اڑ کر دور چلے گئے تھے تھکے ماندے واپس آنے لگے۔ الو کی ہوک جس سے پہاڑ کی چٹانیں گونج رہی تھیں بند ہو گئی اور افق پر سورج دیوتا کی آمد کے آثار نمایاں ہو گئے۔

اچانک ایک طرف سے ڈکرانے کی گرجتی ہوئی مہیب آواز آئی۔ وادی اور میدان دہل گئے۔ جنگلی بجار جاگ اٹھے تھے۔ ایک بڑے بڑے سینگوں والا موٹا تازہ بوڑھا خرانٹ سانڈ آگے آگے، پیچھے پیچھے اس کا قبیلہ۔ گائیں، بچھڑے، جوان بیل گلہ کا گلہ اونچے پربت کی تلیٹی والے سبزہ زار سے۔ جس کی نرم نرم لہلہاتی گھاس پر رات گزاری تھی اٹھ کر انگڑائیاں لیتا جا رہا تھا۔ کبھی کوئی گائے ادھر منہ ڈالتی کبھی کوئی بچھڑا ادھر منہ مارتا۔ آپس میں کلیلیں ہو رہی تھیں کہ یک بیک سانڈ نے کان کھڑے کئے۔ ایک طرف ٹکٹکی باندھ کر بڑے زور سے ڈکرایا۔ کنبے کے سارے چھوٹے بڑے چوکنے ہو گئے۔ سب نے دُمیں دبا لیں اور اس کے پاس خاموش کھڑے ہو گئے۔ سانڈ کی وحشت دم بدم بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے کھروں سے مٹی اڑانی شروع کی۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور سر جھکا کر لمبے لمبے سینگ اس طرح سامنے کر کے کھڑا ہو گیا جیسے کوئی سپاہی دشمن کے مقابلے میں سنگین جھکا لے۔

جنگل کے رہنے والے پتوں کے کھڑکنے کی آوازیں تک سمجھتے ہیں۔ ان کی ناک کوسوں سے اپنے دشمن کی بو سونگھ لیتی ہے۔ لحیم شحیم بجار نے درختوں کے ایک جھنڈ کے اس طرف اپنی بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں گڑا رکھی ہیں۔ نتھنے پھلا پھلا کر پھنکارے مار رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی آنے والی آواز کی تھاہ لگانا چاہتا ہے اور حسِ جانی بوجھی بو نے اسے خطرے کی اطلاع دی ہے اس کو پوری طرح جانچتا ہے۔ جانور ہمیشہ سے آدمی کی نسبت زیادہ جتھے باندھ کر رہنے والے ہیں۔ اور ان کا سردار جتنا اپنے گلے کی دیکھ بھال رکھتا ہے گڈریا بھی کیا رکھے گا۔ دشمن کے مقابلہ میں یہ ایک دوسرے کی ایسی حمایت کرتے ہیں کہ انسان کو نصیب نہیں۔ میانے والی بھیڑیں ڈکارنے والے شیر پر جا پڑتی ہیں۔ مریں یا جئیں لیکن ساتھیوں کو نہیں چھوڑتیں۔ بجار کے پیچھے اس کی ساری ٹولی چپ کھڑی اپنے سردار کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ سانڈ کوئی دس منٹ اس حالت میں رہا ہوگا کہ ایک دفعہ ہی پھنپھنا کر چلا۔ اس کے ساتھی بھی ساتھ ہی دوڑے۔ مشکل سے میدان کو طے کر کے درختوں کے جھنڈ کے قریب پہونچے ہوں گے کہ ایک قسم کی نہایت ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں۔ گلے کے سارے جانور سیدھے جاتے جاتے پلٹ پڑے اور ایک کھلی جگہ میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بچھڑوں نے اپنی ماؤں کے تھنوں کے نیچے پناہ لی۔ جوان بیل اور جن ماؤں کے بچھڑے نہ تھے ادھر ادھر ٹہلنے لگیں۔ جیسے پہرہ دار پہرہ دیتے ہیں۔ کسی نامعلوم دشمن کا خوف بڑھتا جاتا تھا۔ دشمن کون ہے؟ بے زبان کیا بتائے۔ لیکن تھی سب کو اپنی اپنی حفاظت کی پڑی ہوئی۔ چند منٹ کے بعد آوازیں قریب آنے لگیں۔ گلے کا منڈا۔ اس کٹم کا بڑا وہ جگادری سانڈ پھر ڈکرایا۔ اس کے نتھنے پھولنے لگے۔ خاردار جھاڑیوں اور گنجان درختوں میں سے کچھ بھیانک دانت چمکاتے نظر آئے۔ ڈرپوک گائیں بے تحاشہ بھاگیں۔ انہیں اپنے بچوں کی بھی سدھ نہ رہی۔ بھیڑیئے جب تک انتہائی بھوکے نہیں ہوتے بڑے جانوروں پر حملہ نہیں کرتے۔ وہ عموماً چاروں طرف ریوڑوں کو گھیر کر ڈراتے ہیں تاکہ مائیں بچوں کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور پھر وہ اطمینان کے ساتھ انہیں نوش جان کریں۔

اس سانڈ نے یہ تماشے اکثر دیکھے تھے۔ وہ خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنے سینگ سیدھے کر کے دوڑا۔ بھیڑیئے تو نکل گئے مگر یہ اپنی رو میں برابر چلا جا رہا تھا کہ سامنے چند گز کے فاصلے پر ایک جھاڑی ہلی۔ سانڈ ٹھٹھک کر اچھلا۔ ساتھ ہی ایک آدم زاد نے جھاڑی

کے پیچھے سے سر نکالا۔ برچھی تان کر اُس کے سینے میں ماری۔ اور چاہا کہ اُچھل کر بجار کی زد سے ہٹ جائے۔ بجار دیوزاد، غصہ میں اندھا، اس پر چوٹ کھایا ہوا اور یہ کچھ یونہی سے بدبد، قضا سر پر کھیل رہی تھی۔ بدن کو تولتے ہی رہے کہ بڑے بڑے سینگوں نے لپک لیا۔ ہوا میں اُڑا کر زمین پر دے مارا۔ ان کی چیخ پکار کو کون سُنتا۔ دو گز دور پر آدمی سے چیتھڑا بن گئے۔

آدمی جب اُس زمانے میں خونخوار درندہ تھا تو جانوروں کا کیا پوچھنا ہے وہ کیسے کچھ آفت ہونگے۔ غصہ میں بھرے ہوئے بجار نے پہلے تو اپنے سینگوں سے اُسے خوب روندا اور پھر اپنے سینگوں پر اس کی لاش کو فتح کا نشان بنا کر ہلانے لگا۔ وہ آدمی بھی اکیلا نہ تھا اُس کے حمایتی بھی آس پاس لگے ہوئے تھے، اُنہوں نے تیر برسانے شروع کئے۔ سانڈ گھبرا کر اُدھر چلا۔ وہ نُچھ تیلے تھے درختوں پر چڑھ گئے۔ یہ جھونجل میں پھر اپنے شکار کے پاس آیا۔ اور اس کے مُردہ جسم کو روند روند کر ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ کبھی پیچھے ہٹ ہٹ کر سینگ زمین پر مارتا کبھی ان تیروں سے نجات پانے کیلئے جو اس کی موٹی کھال میں سئی کے کانٹوں کی طرح پیوست ہو گئے تھے، اپنے بدن کو جھڑجھڑاتا۔ آخر ہانپ گیا اور خون میں نہایا ہوا اپنے گلے کی طرف بھاگا۔

بھاگ کر کہاں جاتا؟ ایک آدمی کا خون کیا تھا وادی تنگ تھا جسم زہر میں بجھے ہوئے تیروں سے چھلنی۔ تھوڑی دور جا کر زور زور سے ڈکرانے لگا۔ سارا جنگل اپنی ہیبتناک آوازوں سے سر پر اُٹھا لیا۔ ادھر تو بجار کی اُمت اپنے سردار کی یہ گت دیکھکر سہمی ہوئی ایک ایک کا مُنہ دیکھ رہی تھی اُدھر ایک نیا شور اُن کے کانوں میں پڑا۔ یہ غل ڈھولوں، نرسنگھوں اور سیٹیوں کا تھا جو مرنے والے آدمی کے ساتھی بجاتے چلے آرہے تھے۔

ریوڑ چاروں طرف سے گھر گیا تھا۔ نکل بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں، پھندیت پھندے ڈالنے برچھیت برچھے ہاتھوں میں لئے شکار کو تیار تھے۔ سانڈ اپنے ریوڑ کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ گائیں اندھا دُھند دھکا پیلی کر رہی تھیں۔ گرے ہوئے درختوں نے جال باندھ دیا تھا۔ بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی؛ گلہ کا گلہ اب ان شکاریوں کے گھیرے میں تھا۔ انہوں نے سانڈوں کو پھانسنے کیلئے جہاں تہاں باڑے بنا رکھے تھے۔ خندقیں کھود رکھی تھیں جنہیں درختوں کی پتلی پتلی ٹہنیوں سے پاٹ دیتے اور ہری ہری دوب بچھا دیتے۔ سارے راستے روک کر جانوروں کو ہانکا کر کے ادھر لے جاتے اور پھانس لیتے۔ اپنے اس دستور کے مطابق اِن وحشی آدمیوں نے اس ریوڑ پر بھی گھیرا ڈالا اور ہانک کر لے چلے۔ اور تو سارا گلہ الیل تھا فقط یہ خرانٹ بجار ذرا دیر میں داؤں پر چڑھا۔ اسی جگادری کے پھنسنے کی کسر تھی۔ اب جو یہ بھی کمزور ہو کر اپنے ریوڑ میں آگیا تو باقی کیا رہا۔ بیل، گائیں، بچھڑے کل کے کل ایک جگہ گھر گئے۔ ان کا بے لبر ہونا تھا کہ باڑے کے باہر سے تیر پڑنے لگے۔ گلے میں ہل چل مچ گئی۔ پتھروں اور تیروں کی بارش نے بولا دیا۔ کئی چھوٹے بچھڑے لوٹ گئے۔ مائیں ان کو سونگھتیں چاٹتیں اور ممتا کی ماری خود زخمی ہوتیں۔ جوان بیل اور عضیل گائیں اِدھر کی اُدھر، اُدھر کی ادھر قلانچیں مارتیں کہ کسی طرح قید سے نکل جائیں لیکن انسانوں کی لگائی ہوئی باڑ سے کیا نکل سکتیں۔ سانڈ پہلے ہی ادھ موا ہو گیا تھا اس کے زخم چرّا رہے تھے۔ پھر بھی اُسے جوش آگیا اور اپنے گلے کی پریشانی سے بے قرار ہو کر آخری حملے کے لئے چلا۔ ایک آدمی اُسے باڑ کے پیچھے نظر آیا۔ انتقام کے جذبے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ انسان ہو یا حیوان جب اپنے دُشمن سے بدلا لینا چاہتا ہے تو مرتے مرتے بھی بدلہ لئے بغیر نہیں چھوڑتا وہ غصہ میں بھڑک کر اس زور سے لپکا کہ باڑ تک پہونچ کر سنبھل نہ سکا گرا۔ گرا تو باڑ پر۔ شکاری نے جو وہیں تھا ہزار بھاگنے کی کوشش کی نہ بھاگ سکا۔ بجار کے گرنے سے باڑ ٹوٹی، جھاڑ جھنکار اتنی بھاری لاش کو کیا سہارتے۔ باڑ کے نیچے وہ اجل رسیدہ بھی دب گیا۔ پہاڑ آپڑا تھا۔ منٹوں میں جان نکل گئی۔

باڑ ٹوٹی، راستہ کُھلا۔ گلے کو بچ نکلنے کا موقع ملا۔ بجار لوٹ پیٹ کر اُٹھا اور بھاگا تو اس کے ساتھ سارا گلہ بھی قید خانہ سے نکلا۔ سانڈ ایک دفعہ اور اپنے دُشمنوں کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا۔ قید خانہ بھی اُس نے توڑ دیا تھا لیکن اس کی حیوانی قوتیں کہاں تک اُس کا ساتھ دیتیں۔ کمزوری اور تکلیف بڑھتی جاتی تھی۔ کُھلے میدان میں آکر وہ زور زور سے چیخیں مارنے اور اپنے سینگوں اور کھُروں سے زمین کی مٹی اچھالنے لگا۔ اِدھر اس کے ڈکرانے اور خاک اُڑانے کا شور تھا اُدھر دُور سے آدمیوں کی ماتمی آوازیں سُنائی دیں — غم اور خوشی کے اظہار کی آوازیں نکال کر وہ اپنے ساتھیوں کو خبر دیا کرتے تھے تاکہ اُن کے چیتے والے سمجھ لیں کہ کوئی خوشی کا واقعہ پیش آیا ہے یا غم کا اور وہ سب جمع ہو جائیں۔

اشرف صبوحی دہلوی

میں دروازے سے قریب دو چار قدم کے فاصلہ پر تھا۔ اندر کا شور وغل صاف سُنائی دے رہا تھا۔ کافی تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ کچھ ہنسی تھی۔ قہقہے تھے۔ کوئی ڈیکس پر اُنگلیوں سے تال لگاتے ہوئے دھیمے سُروں میں گا بھی رہا تھا۔ "پیا مِن کو جانا"۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا سب کھڑے ہو گئے۔ کچھ گڑبڑ سی ہوئی اور پھر سب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

میں نے کلاس پر ایک نظر ڈالی — ہر قسم و ہر فرقہ کے نمائندے موجود تھے۔ کچھ وہ بھی تھے جو موٹروں پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ وہ بھی تھے جو اپنے تانگوں پر آتے ہیں، جن کا نوکر ان کا بستہ لئے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ کلاس میں داخل ہوتا ہے۔ بعض ایسے بھی تھے جن کے پاس سائیکلیں تھیں۔ جو اسکول شروع ہونے سے پہلے اپنی سائیکلوں پر طرح طرح کے کمالات سے اپنے ساتھیوں کو مرعوب کرتے ہیں۔ کوئی دونوں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلاتا، کوئی منٹ دو منٹ کیلئے سائیکل کھڑی کر دیتا۔ وہ لوگ بھی تھے جن کے پھٹے اور میلے کپڑوں پر پسینہ اور سیاہی کے جگہ جگہ دھبے تھے۔ جن کے کوٹ کی جیبیں پھٹ کر آدھی باہر لٹک رہی تھیں اور بار بار ہاتھ ڈالنے سے جیب کے سرے پسینہ سے کالے ہو رہے تھے، جن کے کوٹ اور قمیص کے بٹن غائب تھے۔ گلے کے کالر پسینہ صاف کرنے کی کوشش کے نذر ہو چکے تھے — غرض کہ اسکول کی ہر کلاس اپنے اندر ایک چھوٹی سی دُنیا لئے ہوتے تھی۔

میں عرصے سے معلّم ہوں، اس لئے تھوڑا بہت انکی نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کم عمر کے بچے سبق جلد ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ ان کا ذہن خام ہوتا ہے اور تجسس کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ اس کدو کی بیل کی مانند ہیں جو ابتدا میں ہر سہارے پر آسانی سے لپٹ جاتی ہے مگر پختہ ہونے کے بعد اس کا علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نو عمر لڑکے ہر کلاس میں زیادہ تیز اور چالاک ہوتے ہیں۔ اسی لئے یہ خیال صحیح ہے کہ ابتدائی تعلیم کا انسانی زندگی پر گہرا اور دیرپا اثر ہوتا ہے — مگر یہ آٹھویں جماعت ہے۔ اس میں بہت سے پختہ عمر کے لڑکے بھی ہیں۔ لیکن وہ اپنے چھوٹے ساتھیوں سے جماعت میں پیچھے رہتے ہیں۔ ہاں مجھے ایک تجربہ اور بھی ہوا ہے۔ اکثر امیروں کے لڑکے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ نصابی پڑھائی پر بہت کم توجہ دیتے ہیں دوسرے لڑکوں کی چائے اور سگریٹ سے تواضع کرکے اور انہیں سینما کی دعوت دے کر انکے حل شدہ سوالات نقل کر لیتے ہیں۔ وہ غریب اور میلے کچیلے لڑکوں سے بہت کم ملتے ہیں۔ اپنی ٹولی الگ بنائے رہتے ہیں۔ انکا اکثر موضوع گفتگو کوئی نیا کرکٹ میچ یا نیا فلم ہوتا ہے۔ انہیں ہندوستانی تاریخی واقعات تو بہت کم یاد رہتے ہیں۔ مگر انٹرنیشنل کرکٹ اور اسکے کھلاڑیوں کے نام اور فلم کی تاریخ نوک زبان ہوتی ہے۔

یوں تو دیکھنے میں سب خاموش اپنے کام مشغول تھے مگر میں جانتا تھا کہ ان میں سے بہت سے اپنی کاپیوں پر اپنی دستخط کی مشق کر رہے ہیں۔ بہت سوں کے سامنے کتاب کھلی رکھی تھی۔ نظریں الفاظ پر تھیں مگر وہ اپنے برابر والے سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ کوئی رات کے سینما کے سُنے ہوئے اشعار اپنی کاپی پر نقل کر رہا تھا۔ کوئی، کوئی بازاری رسالہ کاپی میں چُھپائے پڑھنے میں مشغول تھا۔

میں نے کتاب کھولی۔ حامد کی طرف اشارہ کیا کہ وہ آج کا سبق پڑھے۔ سرسراہٹ کی آواز ہوئی۔ تمام لڑکوں نے کتابیں کھول کر سامنے رکھ لیں۔ حامد نے کھڑے ہو کر پڑھنا شروع کیا۔

"..... تم ایک جدید شہر کی مثال سامنے رکھو۔ نیویارک" جہاں لوگ کھانا پکانے، کپڑوں پر استری کرنے، بال اور ڈاڑھی بنانے، گھر صاف کرنے کیلئے بھی بجلی کی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے کارخانے ہیں جن میں طرح طرح کا سامان تیار ہوتا ہے۔ کہیں کپڑا بُنا جاتا ہے کہیں بڑی بڑی مشینیں تیار کی جاتی ہیں۔ کہیں جہاز بنائے جاتے ہیں۔ یہ تمام کارخانے بجلی کی طاقت سے چلتے ہیں، یہاں ٹرام ہیں، زمین کے اندر چلنے والی ریل گاڑیاں ہیں۔ چالیس چالیس منزلہ اُونچے مکانوں سے اُترنے چڑھنے کیلئے بجلی کی سیڑھیاں ہیں ٹیلیفون، تار گھر، ریڈیو، سینما سب بجلی کے ذریعے چلتے ہیں۔ اِن تمام کاروبار کا مدار ایک شخص پر ہے جو سوئچ بورڈ پر بیٹھا

ہے۔ اب تم خود خیال کرو ایسے شہر میں اگر پانچ سیکنڈ کے لئے بھی بجلی بند ہو جاتے تو کیا نہ قیامت ہوگی۔؟ یہ ہماری اس وسیع دنیا کے ایک شہر کا حال ہے ــــ تو اس ساری دنیا کا کاروبار جو باقاعدہ ایک ترتیب و تنظیم کے ساتھ جاری و ساری ہے ــــ اور یہ نظامِ شمسی جہاں ہماری زمین سے دس گنا بڑے بڑے سیارے ایک معیّنہ وقت کے ساتھ گردش کر رہے ہیں ــــ کیا یہ آپ سے آپ بن گئے؟ کیا ان کا کوئی سوئچ بورڈ نہیں؟ ــــ کیا ان کی کوئی نگرانی نہیں کرتا؟ ــــ یقیناً اِن سب کا پیدا کرنے والا موجود ہے۔ وہ لازوال ہے۔ ساری کائنات اُس نے بنائی۔ زندگی و موت اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کاتبِ تقدیر ہے۔ جسے چاہے جلاتا ہے جسے چاہے مارتا ہے۔ اسکے بغیر حکم پتہ بھی نہیں ہلتا۔ وہ چاہے تو بادشاہ کو فقیر اور فقیر کو بادشاہ بنادے ــــ غریب اور امیر سب اُسی نے بنائے۔ وہ جسے چاہے ذلّت دے جسے چاہے عزّت دے۔ وہ رحیم ہے۔ کریم ہے۔ قہار ہے۔ جبّار ہے ــــ وہ ......"

"سر!" سعید نے کھڑے ہو کر دریافت کیا "ذرا اِن جملوں کا مطلب وضاحت سے سمجھائیے ــــ: وہ جسے چاہے جلاتا ہے جسے چاہے مارتا ہے۔ اسکے بغیر حکم پتہ بھی نہیں ہلتا۔"

"مطلب بالکل صاف ہے" میں نے کہا "تم بجلی کی طاقت والی مثال کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ بجلی کی طاقت سے سینکڑوں مشینیں چل رہی ہیں۔ ایک ایک مشین میں لاتعداد پُرزے اپنے مخصوص فرائض کی انجام دہی میں عمل پیرا ہیں ــــ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ پُرزے بغیر بجلی کی طاقت کے اپنی حرکت جاری رکھ سکتے ہیں؟ کیا انکی زندگی بجلی کی طاقت کے دم سے قائم نہیں؟"

"سر" احمد نے کھڑے ہو کر تیزی سے کہا "کیا اسکے یہ معنی نہیں کہ ہم ایک بڑی مشین کے پُرزے ہیں؟ ہمیں اپنے کسی فعل پر اختیار نہیں۔ زندگی کی باگ ایک غیر مرئی قوت کے اختیار میں ہے جو اسے جب چاہے ختم کر سکتی ہے۔ اگر ہماری حرکات اور زندگی کا سرچشمہ وہی غیر مرئی طاقت ہے تو پھر ثواب و گناہ کیسا؟ ہم اپنے کسی فعل کے ذمہ دار کیونکر ہوئے؟"

احمد ایک غریب ذہین لڑکا تھا۔ عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی۔ آج سے چار سال قبل اسکے والد جو چنگی پر محرر تھے انتقال کر گئے۔ خوش قسمتی سے وہ دنیا میں تنہا ہی تھا۔ والدہ پہلے ہی کوچ فرما چکی تھیں۔ اب اُسے روزی کی فکر ہوئی۔ چار سال اسی افراتفری کے نذر ہوئے۔ چند بارسوخ لوگوں کی سفارش سے اُسے پھر اسکول میں لے لیا گیا۔ فیس معاف کر دی گئی۔ ہوسٹل میں بھی اُسے کھانے اور رہنے کے اخراجات نہ دینے پڑتے تھے۔

"تم نہیں سمجھتے احمد!" میں نے کہا "انسان مشین کا پُرزہ نہیں۔ اُسے اپنے فعل پر اختیار حاصل ہے۔ مشین کے پُرزے میں انکار کی طاقت نہیں، لیکن تم انکار کر سکتے ہو، اپنا اچھا اور بُرا خود سوچ سکتے ہو تمہیں عقل و فہم دی گئی ہے اور دونوں راستے بتا دئے گئے ہیں۔ اب جو راستہ اپنے لئے تم مناسب سمجھو اختیار کر لو"

"اگر ہمیں اپنے فعل پر اختیار حاصل ہے" احمد نے سنجیدگی سے کہا "تو اس کا کیا مطلب ہوا؟۔ ایک پتہ بھی بغیر اس کے حکم کے نہیں ہل سکتا۔ وہ فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو فقیر بنا سکتا ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دیتا ہے جسے چاہے ذلت دیتا ہے ــــ کیا وہ ذلیل و خوار بھی کرتا ہے تو آخر کس خطا میں؟۔ کسی کو امیر بنا دیا کسی کو غریب۔ ایک بڑے طبقہ کو ایک چھوٹے طبقہ کے رحم و کرم پر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا۔ کیا یہ بھی اسی کی مرضی ہے؟۔ ماسٹر صاحب غور کیجئے غریب کو اپنے فعل پر کہاں تک اختیار ہے؟ اور پھر وہ اپنے فعل کا ذمہ دار بھی ہے؟۔ وہ لوگ جو محنتی اور جفاکش ہیں افلاس اور بیکاری، بے روزگاری، ناخواندگی اور مہلک امراض کے پنجے میں گرفتار ہیں صرف اس لئے کہ وہ اُن چند لوگوں کے آرام و آسائش کے سامان مہیا کریں جنہوں نے خود کو دانستہ معذور و ناکارہ بنا رکھا ہے ــــ ایک طرف دکھ اور درد اور ازلی تکالیف ہیں ــــ دوسری طرف عیش و آرام۔ کیا یہ بھی اُسی کی مرضی ہے۔؟"

مجھ کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ میں نے اپنے آخری حربے سے کام لیتے ہوئے کہا "یہ سب اس کی مصلحت ہے۔ اس کے رازوں کو وہ خوب جانتا ہے ــــ غریب اسکے نیک بندے ہیں وہ محنت و مزدوری کیلئے بنائے گئے ہیں اور امیر......"

"عیش و آرام کے لئے! یہی مطلب ہے نا آپ کا؟" احمد نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا "آپ نے غریبی کا مزہ نہیں چکھا۔ غریب کی دنیا جہنم سے کم نہیں۔ وہ واقعی ایک بڑی مشین کا پُرزہ ہے۔ دوسروں کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح اُسے حرکت کرنی پڑتی ہے۔ اور اس پر بھی اُسے زندگی بھر آرام و سکون نہیں ملتا۔ جس کھیت کو وہ خون پانی ایک کر کے سینچتا ہے اُس کھیت کی پیداوار اُسے کھانے نہیں ملتی

وہی لوگ جو کارخانے میں سینکڑوں گز کپڑا تیار کرتے ہیں، ننگے رہتے ہیں۔ کیوں ـــ! کیا محض اس لئے کہ خدا جسے چاہے ذلت دے، جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے امیر جسے چاہے غریب بنا دے ـــ آخر یہ کس جرم کی سزا ہے ـــ؟ کیا یہ ظلم نہیں ـــ؟ اسے ہی انصاف......"

"بس خاموش!" میں نے غصّے سے چیختے ہوئے کہا "تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہ تم کسے الزام دے رہے ہو ـــ نعوذ باللہ کیا پروردگار ظالم ہے ـــ؟ غیر منصف ہے ـــ؟ تمہیں ہوسٹل کی روٹیاں لگ گئی ہیں ـــ مردود۔ ملعون ـــ کان کہیں کا ـــ نکل جاؤ کلاس سے باہر ـــ ٹھہرو، میں ابھی ہیڈ ماسٹر کو تمہاری منطق سُناتا ہوں۔ اسکول سے نہ نکلوا دیا تو کہنا ـــ"

احمد کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے کلاس سے باہر نکل گیا۔ میری غصہ سے بُری حالت تھی۔ بھلا اب پڑھایا کیا خاک جاتا۔ تمام لڑکے سہم کر خاموش بیٹھے تھے ـــ میں نے وقت گذارنے کیلئے یونہی کتاب کے اوراق اُلٹنے شروع کئے۔

گھنٹہ ختم ہونے پر میں رجسٹر لئے ہیڈ ماسٹر کے آفس کی طرف جانے لگا۔ راستہ میں احمد کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:۔

"ماسٹر صاحب! مجھے معاف کر دیجئے ـــ میں نے سخت غلطی کی۔ میں صدقِ دل سے توبہ کرتا ہوں ـــ ماسٹر صاحب! خدا کیلئے میری شکایت نہ کیجئے۔ آپ میری حالت سے واقف۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے معاف نہ کریں گے ـــ میری زندگی تباہ ہوجائے گی ـــ واقعی مجھے خیال نہ رہا ـــ ایسی باتیں کرنا تو کفر ہے ـــ"

ریاض رؤفی

تجلّیات

چارہ گری سے اُن کی، اچھا اُنکا مریضِ غم نہ ہوا
دل پہ اُنہوں نے ہاتھ جو رکھا درد بڑھا کچھ کم نہ ہوا

تیری تجلّی اور یہ عالم! اسیر ہوا ہے دیدۂ شوق
لُطف تماشا جب ہے، دکھا وہ جلوہ جو عالم نہ ہوا

غم بھی مسلسل ہو تو خوشی ہے، ایسی خوشی مقسوم کہاں
درد بھی شاید دل بن جاتا درد مگر پیہم نہ ہوا

کچھ بھی سہی یہ دیر و حرم! ہے پھر بھی حقیقت تیرا مجاز
سب نے دیکھا تجھکو لیکن کوئی ترا محرم نہ ہوا

گریہ بقدرِ ذوق نہیں ہے تشنگیِ دل خاک بُجھے؟
آنسو کیا وہ جن سے مرا دامانِ مژہ بھی نم نہ ہوا

میری طلب بھی تیری بخشش، میں نے مانگا تُو نے دیا
تیری عطا کا کیا کہنا!؟ اندازۂ بیش و کم نہ ہوا

دادِ تمنّا اب کیا چاہیں جب وہ تمنّا ہی نہ رہی
آپ شریکِ غم کیا ہوتے دل بھی شریکِ غم نہ ہوا

تابشؔ میں ہر ناکامی کو اپنا مقدّر کرتا ہوں
اور اگر اس پر بھی مزاجِ حسرتِ دل برہم نہ ہوا

تابش دہلوی

پاگل

دسمبر کی سنسان تاریک رات تھی، پانی برس کر تھم چکا تھا لیکن سیاہ مُہیب بادلوں کا غصّہ کم نہ ہوا تھا اور وہ اب بھی گرج رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ کلیجہ ہلائے دیتے۔ رزیڈنسی کے کھنڈر بیکسی سے سر بگریباں کھڑے تھے۔ نالہ کی گڑگڑاہٹ سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی لیکن کبھی کبھی ہوا کا کوئی بیباک جھونکا چھتر منزل کلب کا کوئی قہقہہ چرا لاتی۔ سامنے شکستہ مینارے پر یونین جیک چپ ساکت کھڑا تھا جیسے اسکے بھی ضمیر ہو۔ اس کے پاس ہی ایک اُلو بیٹھا حکومت کی جبروت اور عظمت کا ڈنکا پیٹ رہا تھا۔

رزیڈنسی کی ویران بستی دیکھکر میرے دل میں ایک جُھرجُھری سی پیدا ہوئی۔ یہ سرزمین مادرِ وطن کے کتنے سپوتوں کے خون کی ضامن ہے۔ یہاں ایک شعلہ اُٹھا تھا غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کیلئے۔ یہاں نہ خاکسار تھے نہ جہابیر دل، یہاں ہندوستانی تھے اور صرف ہندوستانی جو ہندوستان کیلئے لڑے تھے۔ یہاں پہلی مشعل تھی جو ہندوستان کی آزادی کیلئے روشن کی گئی۔ یہاں عدم تشدد اور چرخہ کا فلسفہ نہ تھا یہاں مردانہ وار تلوار کا جواب تلوار تھا۔

میں چسٹر کے کالر اُونچے کئے اور ٹوپی کو کانوں تک گھسیٹتے ہوئے تیزی سے جارہا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور مجھے اب گھر پہونچ جانا چاہیئے تھا۔ پچاس قدم کے فاصلے سے مجھے رزیڈنسی کے دروازے پر ایک پرچھائیں نظر پڑی۔ میں قدم بڑھاتے آگے چلا گیا؛ بجلی کے لیمپ کی روشنی میں وہ پرچھائیں ایک عورت بن گئی اور ہوا میں اسکی ساری کا پلّو اُڑا۔ میرے قدم اور تیز ہوگئے اور چند ہی لمحوں میں مَیں اُسکے قریب آگیا۔ ایک دُبلی پتلی جوان عورت جس کی جوانی اپنی فیاضی سے بُڑھاپے کو دعوت دے رہی تھی، مجھکو دیکھکر مُسکرا دی۔ میں رُک گیا۔ وہ پہلے ہی سے ٹھہر چکی تھی۔

"آپ کون ہیں؟ اسوقت کہاں؟" اس سنسان فضا میں مَیں بڑی جلدی سے خدائی فوجدار بن گیا۔

"آپ مجھے گولہ گنج پہونچا سکتے ہیں" اُس نے کہا۔

"کہاں جایئے گا آپ؟" میں نے پوچھا۔

"مکان! قریب ہی ہے یہاں سے۔ آپ کو تکلیف ہوگی؟" اسکے لہجہ میں ناز بھی تھا اور نیاز بھی۔

"آیئے! میں اسی طرف جارہا ہوں۔ لیکن آپ کو دیر کیسے ہوگئی؟"

"دیر! دیر تو نہیں ہوئی ابھی۔ آٹھ بجے ہیں" اُس کا لہجہ عجب رازدارانہ تھا۔

میں اپنے حساب پہلے ہی سے بہت کچھ سمجھ چکا تھا لیکن میں اُسکے مُنہ سے کہلوانا چاہتا۔ بعض اوقات کی ہمدردی کس قدر جذبۂ انتقام سے پُر ہوتی ہے۔ میں نے نہایت ہمدردانہ لہجہ میں از سر نو جرح شروع کی۔

"آپ روز جاتی ہیں ٹہلنے"

"جی ہاں۔ کبھی کبھی" اس نے جواب دیا۔

"آپ ساتھ آئی تھیں کسی کے"

اس سوال پر وہ مُسکرا دی۔ نہ معلوم غیرت سے اور نہ معلوم میرے طفلانہ اشتیاق پر۔ تاریکی میں مَیں دیکھ نہ سکا۔

"آپ کو بہت دیر ہوگئی۔ سردی لگ رہی ہے؟" میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ ابھی تک میں اپنی تفتیش میں اسقدر محو تھا کہ میں نے خیال بھی نہ کیا کہ ٹھنڈی ہوا کے تیر و نشتر چل رہے ہیں اور وہ صرف ساری اور ایک ہلکا سا سوئٹر پہنے ہوئے ہے ــــ!

"جی ہاں، بہت تیز ہوا ہے!"

"آپ میرا چسٹر پہن سکتی ہیں"

"جی نہیں اب مکان قریب آگیا ہے" اُس نے کہا۔

میری خود غرضی نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں اپنا چسٹر ایک بازاری عورت کو دیدیتا۔ میں نے صرف رسمی طور پر پوچھ لینا ہی اپنا بہت بڑا ایثار سمجھا۔

"کیا کرتی ہیں آپ؟" یہ سوال کر کے مجھے پچھتاوا ہوا۔ وہ اچھی خاصی سمجھدار معلوم ہوتی۔

"کچھ نہیں!" اُس نے اپنے جواب سے میرے سوال کو بہت کچھ معصوم کر دیا۔

سڑک سے وہ ایک گلی میں مُڑ گئی۔ اب آگے وہ تھی اور پیچھے میں۔ بل کھاتی ہوئی بہت سی سنسان گلیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ ایک

چھوٹے سے دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ اُس نے خاموشی سے گھوم کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ میں اب واپس جانا چاہتا میرا گھر قریب ہی تھا اور میں اس مذاق کو یہیں تک رکھنا چاہتا تھا۔ شاید وہ میرے ارادے کو بھانپ گئی ــــ!

"آپ اندر آسکتے ہیں!" اُس نے کنڈی کھٹکھٹائی۔

قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں دروازہ کھُل گیا۔ اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں دھیمی لالٹین جل رہی تھی اور آٹھ دس سال کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔

"اماں" لڑکی نے کہا۔ معلوم ہوتا جیسے وہ بڑی دیر سے منتظر تھی۔

"آیئے" عورت نے مجھ سے کہا اور میں غیرارادی طور پر اندر چلا گیا۔ لڑکی نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور اپنی پھٹی ہوئی رضائی میں منہ لپیٹ کر ایک کونے میں پڑرہی۔ یہ سب باتیں کچھ اس سرعت سے ہوئیں کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ معلوم ہوتا جیسے کوئی ڈرامہ ہے اور ہر چیز اپنے وقت سے ادا ہو رہی ہے۔

"میں جانا چاہتا ہوں اب!" میں گھبرا گیا تھا۔

عورت نے خوب گھور کر مجھے تعجب سے دیکھا۔ اس کی سیاہ فلاکت زدہ آنکھوں میں غربت معصیت سے گلے مل رہی تھی۔

"دیر ہو رہی ہے مجھے!" میں بڑی بےچینی کا اظہار کر رہا تھا۔

عورت نے مجھے نہایت غصّہ سے دیکھا۔ وہ اپنی چارپائی پر بستر دُرست کر رہی تھی۔ میں اس کی نظر کی تاب نہ لاسکا۔ میری آنکھیں نیچی ہوگئیں۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو روپے نکال کر بستر پر پھینک دئے۔ عورت کی طرف بغیر دیکھے ہوئے میں مُڑا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ فوراً کلبلا کر لڑکی اُٹھ بیٹھی اور اُس نے دروازہ میں کنڈی لگا دی۔

"دو روپے" ماں نے وفورِ مسرّت سے کہا۔

"اب وہ نہیں آئے گا ماں!" لڑکی نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں"

"اُس نے تو لالٹین بھی نہیں بُجھائی ماں!" لڑکی ہنس رہی تھی ــــ

"وہ پاگل تھا پاگل!" ماں بیٹیاں دونوں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے بھاگا ــــــــ

وجاہت سندیلوی

بیداری کے خواب

یہ نظریہ کہ انسان دنیا میں خوابیدہ آتا ہے اور خوابیدہ ہی رخصت ہوتا ہے، موت اس کی بیداری کا ابتدائی گجر ہے، جس کے بعد پھر خواب نہیں۔ ارسطو نے سب سے پہلے اپنے نامور شاگرد افلاطون پر پیش کیا۔ لائق شاگرد نے استاد کے نظریہ کو بہت پھیلا کر اشراقی تعلیمات میں داخل کر لیا۔ لیکن "بیداری کے خواب" کی تشریح و تحلیل جو مشرقی فلاسفہ و حکما کی عقل و نظر کی جولانگاہ رہی ہے وہ الہیاتی فلسفہ کی حدود سے بہت کم باہر ہوتی ہے۔

جدید نفسیات نے اس مبحث کے مطلق، کلی اور بے مصرف رخ کو ترک کر کے صرف اسے کلی اور کارآمد رخ کی تشریح و تحلیل کی ہے جو بنی نوع آدم کی عملی زندگی اور مطالعہ ذات سے زیادہ قریب ہے۔

ذہن انسانی کے ہزارہا عملی پہلوؤں میں سے ایک رخ "بیداری کا خواب" ہے جس میں ہر متنفس کم و بیش مبتلا پایا جاتا ہے۔ عام بول چال میں اس کو خیالی پلاؤ پکانا کہتے ہیں اور اطبا مالیخولیا کی ایک قسم میں داخل کر کے اس کے لئے مختلف طرح کے ادویاتی اور نفسیاتی علاج تجویز کرتے ہیں۔ جدید علم نفسیات نے ہماری زندگی کے واقعات اور تجربات سے ثابت کر دیا ہے کہ چاہے یہ کوئی مرض ہو یا نہ ہو اس کا وجود ہر شخص میں کچھ نہ کچھ ضرور پایا جاتا ہے۔ البتہ جہاں نظام اعصاب کمزور یا زندگی کے حوادث قوتِ برداشت سے باہر یا توہم پرستی اور مزمن امراض اپنے ماں باپ سے ورثے میں پہونچے ہوں وہاں "بیداری کے خواب" یا خیالی پلاؤ انسان کی عملیت کو تباہ اور زندگی کو تاریک کر دیتے ہیں۔ بیشک "بیداری کے خواب" کی یہی نوعیت بنی نوع انسان کی شدید ذہنی بیماری ہے۔ اور اس کا علاج بھی ہر شخص کو بآسانی تمام حاصل ہے۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنا مطالعۂ نفس کرتا رہے اور جہاں تک ممکن ہو اپنی بیداری کے اوقات کو مفید لائحۂ عمل کے تحت بالکل مصروف کر لے۔ بیکاری اس مرض کے تخم کی سب سے موافق زمین ہے، جہاں یہ فوراً برگ و بار لاتا اور حیاتِ شخصی کی ساری فضا پر چھا جاتا ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حیات ذہنی کی ایسی ناکام اور بے نتیجہ رفتاروں کو شرح و بسط سے روشنی میں لایا جائے جو خصوصاً ہماری قوم کے نوواردوں کے لئے بہت زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔

خود ہی خیالی دنیا بسانا اور خود ہی متاثر ہونا، ذہن انسانی کا ایسا دلچسپ مشغلہ ہے جس میں دنیا کا تقریباً ہر شخص مبتلا نظر آتا ہے۔ اس قسم کے خیالی پلاؤ پکانا مطلق تسلسل خیال سے مختلف ہے۔ مطلق تسلسلِ خیال یا فری ایسوسی ایشن آف آئیڈیاز میں خیالات کا سلسلہ وار تانتا سا بندھا رہتا ہے۔ اور ایک خیال دوسرے خیال کی یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ مثلاً آپ کھڑکی میں بیٹھے ہیں۔ آپ کی نظر اپنے پڑوسی کے کتے پر پڑتی ہے۔ کتے کو دیکھتے ہی آپ کو اس کا مالک یاد آجاتا ہے، جو ایک بدمزاج شخص ہے۔ بدمزاجی کا خیال اپنے ساتھ ساتھ آپ کے مرحوم بدمزاج دوست کی یاد دلاتا ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اس دوست کی موت کا نقشہ آپ کی نظروں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ غرض یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی دوسرا شخص یا واقعہ آپ کی توجہ اپنی طرف نہ پھیر لے۔ اس کے برعکس خیالی پلاؤ پکانے والے کے پیش نظر ہمیشہ مستقبل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے متعلق نئی نئی تجویزیں سوچتا ہے، چاہے تجویزیں کتنی ہی مضحکہ خیز یا ناقابلِ عمل کیوں نہ ہوں۔

خیالی پلاؤ میں عام طور پر ایک ہیرو (بڑی شخصیت) کا وجود لازمی ہے۔ کبھی تو یہ ہیرو "فاتح" کی حیثیت میں ہوتا ہے اور کبھی "شکست خوردہ" کی حیثیت میں۔ لیکن دونوں صورتوں میں خیالی پلاؤ پکانیوالے کی ذاتی شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

ایک شیخ چلّی کا قصہ مشہور ہے جو خیالی پلاؤ پکانے میں ضرب المثل تھا، وہ مفلسی سے تنگ آکر کانچ اور چینی کا سامان لیکر سرِ بازار دکان لگا بیٹھا۔ تھوڑی دیر خریداروں کا منتظر رہا پھر اپنی خیالی دنیا بسانے میں مشغول ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اس سامان کو بیچ کر کچھ روپیہ خرچ کرونگا اور باقی رقم سے مرغیاں خریدونگا۔ مرغیاں بڑھتی اور بکتی رہیں گی اور انڈے نفع میں بیچتا رہونگا۔ جب روپے بہت جمع ہو جائیں گے تو بھینسیں خریدوں گا۔ ایک مربعہ اراضی ان کی چرائی کے لئے خریدونگا، ان کو خوب بڑھاؤں گا۔ دودھ، مکھن، دہی، چھاچھ اور پنیر فروخت کراؤنگا۔ جب بھینسیں بہت بڑھ جائیں گی تو اُن کی سوداگری شروع کر دونگا۔ پھر تو میں امیر ہو جاؤں گا۔ ہزارہا گاؤں خریدونگا اور بڑا جاگیردار بن جاؤنگا۔ اس وقت حاکم وقت کی بیٹی سے شادی کا پیغام بھیجونگا۔ حاکم وقت میرے پیغام کو غنیمت سمجھے گا اور فوراً شادی کر دیگا۔ پھر تو مجھے کوئی حسرت

باقی نہ رہیگی۔ بیوی تابعدار ہوگی۔ ہر کام اشارے پر ہوگا۔ بڑی شان اور شوکت سے میری سواری شہر میں نکلے گی ـــ البتہ ایک وقت ضرور ہوگی بچے بھی ہونے لگیں گے، ۱۰، ۵ ، دس گے دھونیں گے، مجھے اور میری بیوی کو ستائیں گے، ہم حتی الوسع برداشت کرینگے مگر آخر کہاں تک۔ میں بھی سزا دینے پر آمادہ ہوجاؤنگا اور ڈنڈے سے کام لونگا ـــ وہ خیالی بھول بھلیوں میں اس قدر کھو گیا کہ اپنی موجودہ حالت اور شیشہ آلات کی دُکان کو بالکل بھول گیا۔ امیر گھر، حسین بیوی اور رونے دھونے بچوں کی صورتوں سے اُس کی خیالی دُنیا آباد تھی۔ اس نے بچوں کی تنبیہ کا ارادہ کیا ـــ ڈنڈا اُٹھا کر زمین پر دے مارا۔ تمام برتن چکنا چور ہوگئے۔ اب اس کو ہوش آیا، اور ساتھ ہی شیرازۂ خیال بکھر گیا۔ اس قصہ میں مفلس دکاندار نے فاتح ہیرو کی حیثیت سے اپنے ذہن پر اپنا احضار کیا تھا۔ بعض دفعہ ان خیالات کا مرکز ہم خود نہیں بلکہ کوئی ایسا شخص ہوتا ہے جس سے ہمیں دلی تعلق ہو۔ ایک ماں کا ہیرو اس کا بیٹا اور ایک بیوی کا ہیرو اُس کا شوہر ہوتا ہے۔ ماں اپنے بیٹے کو سب سے ممتاز مرتبے پر فائز دیکھتی ہے اور خیال ہی خیال میں اپنے بیٹے کی اہمیت محسوس کرتی اور لذت اندوز ہوتی ہے۔

اپنے آپ کو فاتح شخصیت (ہیرو) تصوّر کرنا تو ایک حد تک حق بجانب ہے کیونکہ اس سے ہمارے جذبات کی تسکین ہوتی ہے لیکن اپنے آپ کو شکست خوردہ ہیرو تصوّر کرنا بہت تشریح طلب مسئلہ ہے۔ کیونکہ یہ بات ظاہراً خارج از عقل معلوم ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ کوئی شخص اپنے آپ کو دُنیا کا سب سے بدنصیب انسان تصوّر کرنے لگے۔ عشق میں اندیشۂ ناکامی، دوستوں یا اہلِ معاملہ کی دغا بازی کا گمان، آئندہ واقعات کے متعلق قبل از وقت خطرناک بدظنی وغیرہ ایسے ذہنی اعمال ہیں جن پر عقل خود بخود متردد ہوتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ ایسی غیر واقعی دُنیائے خیال آباد کرنے اور اس کی دل دُکھانے والی تکلیفوں میں اپنے آپ کو مبتلا دیکھنے سے انسان کو کیا تسکین ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے خود ساختہ اندیشوں سے اپنے آپ کو خود ہی منغض اور مردم آزار بنا لیتا ہے۔ اس کا جواب بچوں کی باتیں سُننے سے مل جائے گا۔ جب ذرا سا خون نکل آنے پر ایک بچہ دوسرے بچے کو روتا دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ "واہ بھئی واہ، تم تو ذرا سی بات پر رو دیے، میرا جب سر پھٹا تھا تو اتنا خون نکلا تھا کہ ایک پتیلی بھر گئی تھی، تمہارا تو ہاتھ ہی چھلا ہے، یہ بھی کوئی چوٹ میں چوٹ ہے؟"

دوسرے الفاظ میں بچے کی بات کا یہ مطلب ہوا کہ میری چوٹ تمہاری چوٹ سے زیادہ خطرناک تھی۔ باوجود اس کے میں نہیں رویا۔ اس لئے تم سے زیادہ اہمیت رکھتا ہوں۔ اور مجھے بجا طور پر اپنے اُوپر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ بڑی عمر کے لوگ عام طور پر اپنے حوادث یا امراض بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اور یہ صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اپنی اہمیت جتائی جائے۔ اپنے آپ کو مصیبت زدہ یا شکست خوردہ تصوّر کرنے کا بھی یہی مقصد یعنی ایک نوعیت کا فخر ہوتا ہے۔

فرض کیجئے کسی دوست نے آپ کا مذاق اُڑایا جس سے آپ کے جذبات کو ٹھیس لگی۔ اس موقع پر اگر آپ غصّے کا اظہار کرتے تو شاید آپ کا اور زیادہ مذاق اُڑایا جاتا۔ اس لئے آپ مجبوراً خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑا صابر اور ضابط سمجھ کر اپنے زخمی جذبات پر مہر تلخ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود کو ایسا شکست خوردہ دیکھتے ہیں جس میں دوستوں نے آپ کے ساتھ بہت زیادہ ناانصافی اور بدسلوکی کی۔ آپ کے اس عمل ذہنی کا نفسیاتی تجزیہ اس طرح ہوگا کہ آپ مذاق اُڑانے کے قابل نہیں بلکہ ایسے دل شکستہ انسان ہیں جس کے ساتھ سب کو ہمدردی ہونی لازمی ہے۔ آپ نے خود کو مصیبت زدہ اس لئے تصوّر کیا تاکہ آپ کی اہمیت اپنے مدمقابل سے بڑھی چڑھی رہے اس طرح آپ کے جذبۂ خود بینی کو تسکین پہنچتی ہے۔

عام طور پر شکست خوردہ ہیرو اپنے آپ کو دُنیا کا شریف ترین اور سیدھی ڈگر چلنے والا انسان سمجھتا ہے، اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ لوگ اُسے سمجھ نہ سکے۔ یہاں بھی آپ کو انسان کا جذبۂ خود پسندی کارفرما نظر آئے گا۔

اس جذبہ کا اظہار ایک اور صورت میں بھی ہوتا ہے، وہ یہ کہ ایک شخص تخیل میں اپنے آپ کو بجید مکار اور نڈر انسان تصوّر کرنے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا جذبۂ خود ستائی و خود بینی کسی معمولی یا غیر معمولی الزام سے یا خود اس کے جُرم و خطا سے مجروح ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ناحق کا ملزم یا زبردست مجرم تصوّر کرنے لگتا ہے۔ یہ سب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان کسی صورت میں بھی اپنی اہمیت کم کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کا الزام ناقابلِ تلافی اور اس کی اعلیٰ شان سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، یا اگر جُرم کیا ہے تو ایسا زبردست جُرم ہے جس سے لوگوں پر اسکے اہم ہونے کی ہیبت یا احساس فرومائدگی طاری ہو۔

جوانی کے آغاز کے ساتھ ساتھ انسان میں آزادی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بڑے بوڑھوں کا دباؤ خواہشات کے پورا کرنے میں حارج ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں اپنے بزرگوں

کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ہمارے ذہن میں طرح طرح کے انتقامی خیالات آتے ہیں کہ دیکھو ہم بھی تمہیں کیسا مزا چکھاتے ہیں۔ ساری عمر یاد کرو گے۔ جب ہم جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے، اس وقت تمہیں احساس ہوگا کہ ہماری بربادی کا باعث تم ہی لوگوں کا جبر و تشدد ہوا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب ہم اس رنج کا جو بڑے بوڑھوں کو ہمارے بگڑنے کی وجہ سے ہوگا تصور کرتے ہیں تو ہمیں خوشی سی محسوس ہوتی ہے۔

اِن تمام اشکال سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود کو شکست خوردہ تصور کرنا بھی اپنے جذبۂ خود پسندی و خود بینی کی تسکین کیلئے ہوتا ہے۔

اگرچہ عام طور پر خیالی پلاؤ پکانے کا مقصد اپنے جذبۂ خود پسندی و خود بینی کی تسکین یا اپنی اہمیت جتانا ہوتا ہے لیکن اسکے علاوہ بھی اور کئی مقاصد پیش نظر ہو سکتے ہیں۔ جب ہم کسی کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو عام طور پر ہمارے خیالات کا مرکز ہمارا محبوب ہوتا ہے۔ کبھی تو ہم اپنے تصور میں اس کے وصل سے مستفید ہوتے ہیں کبھی طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا۔ رقابت و رشک، درِ محبوب کی کشیدگی یا عسرت حصول محبوب اور اندیشۂ ناکامی کا تصور بھی ایسی خیالی دُنیا پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔ جس میں، شکست خوردہ، ہیرو اپنی زندگی کے حال اور مستقبل کو تاریک سے تاریک تر پاتا ہے۔ یاد رکھنے کے قابل نکتہ یہ ہے کہ محبت کے خیالی پلاؤ میں جنسی جذبات کا عنصر زیادہ غالب ہوتا ہے۔

خیالی پلاؤ پکانے والوں کی ایک قسم اور بھی ہے۔ یہ لوگ بیٹھے بیٹھے بے سبب ہنسنے لگتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھو کہ کیوں ہنس رہے تھے تو جواب ملتا ہے کہ یہ سوچ رہے تھے کہ اگر ہم سر نیچا اور ٹانگیں اوپر کرکے چلنے لگیں تو کیسا لطف آئے۔ یہ مذاقیہ قسم کا خیالی پلاؤ ہے۔

گانے کے شوقین بھی اکثر اپنے آپ کو گانا سنتا ہوا تصور کرتے ہیں۔ اگر ان میں ایجاد کا مادہ ہوتا ہے تو خیال ہی خیال میں نئی نئی طرزیں ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

یہی حال پروفیسروں اور طالب علموں کا ہوتا ہے۔ جوں جوں گرمی کی چھٹیاں قریب آتی جاتی ہیں یہ لوگ خیال ہی خیال میں چھٹیوں کا پروگرام تیار کرتے رہتے ہیں۔ بعض طالب علم تو یہ خیال کرکے خوش ہوتے ہیں کہ خوب جی بھر کر سوئیں گے۔ کسی کے ذہن میں کشمیر کے مناظر چکر لگاتے ہیں تو کوئی اپنے آپ کو جھیل ڈل میں کشتی چلاتے ہوئے تصور کرتا ہے تو کوئی ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کی سیر میں مصروف پاتا ہے۔

غرض یہ کہ خیالی پلاؤ ہماری ان خواہشات کی تسکین کا اچھا ذریعہ ہے جو کبھی قوت سے فعل میں نہیں آ سکتیں۔

بیداری کے خواب عام طور پر فرصت کی گھڑیوں ہی میں دیکھے جاتے ہیں۔ ایک مضبوط ارادے والے انسان کی غرض ان سے صرف تفریح ہوتی ہے۔ وہ ایسے خیالی پلاؤ سے لطافت و ظرافت کا کام لیتا یا شعر و ادب کے بہترین مرقع تیار کر لیتا ہے۔ ایسے مرقع زندگی میں ذریعہ معاش اور موت کے بعد اس کی بہترین یادگار ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ جن میں قوت ارادی کی کمی یا خواہش کی واجبیت و ناواجبیت کی تمیز مفقود ہوتی ہے۔ وہ دُنیا میں کوئی کام کرنے کی بجائے ایسے ہی خوابوں کی دُنیا کے ہو رہتے ہیں۔ زندگی میں ان کا وجود و عدم یکساں ہو جاتا ہے۔ ان پر تردد، شرم اور جھجک غالب آجاتی ہے۔ ایسے لوگ دُنیا کی عظیم الشان مشین کے ناکارہ پرزے یا زنگ خوردہ چکر ثابت ہوتے ہیں۔ اور بیشتر صورتوں میں ناکامیوں اور مصیبتوں سے تنگ آکر اپنی موت کے طلبگار ہو جاتے ہیں۔

مسرت جہاں بیگم

واللہ اعلم بالصواب

مَیں نہ تو اچھی روحوں کا قائل ہوں نہ بُری کا۔ نہ بھوت پریت ہی کو مانتا ہوں، نہ پیروں اور ولیوں کے سایۂ عافیت کا قائل ہوں۔ لیکن بعض دفعہ واقعات کچھ اس طرح جمع ہو جاتے ہیں کہ انسان کی عقل کام نہیں کرتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیکرا کر انسان توہم پرستی میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی بھوتوں سے ڈرتا ہے کبھی قبروں کو پوجتا ہے، کبھی خبط الحواس انسانوں کو ولی اور قطب سمجھنے لگتا ہے۔ ورنہ دراصل ایک ننگا اور پاگل انسان چند بوسیدہ ہڈیوں پر اینٹ اور چونے کا ڈھیر، مرگھٹ کا گھنا پیپل کا درخت اپنے اندر کسی خاص قوت کو نہاں رکھتا ہو! کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، کبھی کبھی واقعات اس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں، کہ انسان ان باتوں کو ماننے کے واسطے خواہ مخواہ مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ میرے ساتھ بھی ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اب اس سے نتیجہ نکالنا اور اصلیت پر پہونچنا ناظرین ہی پر چھوڑتا ہوں۔ جو صاحب جس نتیجے پر پہونچ جائیں۔

ایک روز حسب دستور محمود اور احمد اور اُن کی پارٹی کے لوگ بغیر اطلاع کے سہ پہر کی گاڑی سے آ دھمکے۔ وہی ہو حق۔ وہی اودھم، وہی بیگم کا جزبز ہونا۔ شاہ گڈھ کا چھوٹا سا مکان، ذرا سی بستی سب ہی میں ہلچل سی مچ گئی۔ قہقہوں سے مکان گونجنے لگا۔ کمروں کا فرنیچر اور سامان اُلٹ پلٹ ہونے لگا۔ اندر گھر میں گھی دودھ انڈے اور مرغوں کی برداخت ہوئی۔ مزید روشنی کی تلاش میں کئی آدمی روانہ کر دیے گئے۔ برتنوں کو خدا حافظ کہہ کر چاد روانہ کر دی گئی۔ باہر حسب دستور بُرج اور گانے، قہقہے اور شکار کے قصے اور گلاس، پیالیوں، اور کرسیوں کے شہید ہونے اور سگرٹ کی خالی ڈبیوں پر شرط بد بد کر گولی بازی میں جب اندھیرا ہو گیا تو خانو کی بے سُری تانیں، ممار شید (مرحوم) کے بے وجہ قہقہے دھیمے پڑ گئے۔ صاحبزادے اور للن میاں بھی اپنی اپنی رائفلیں لیکر چاند ماری سے آ گئے۔ تاشوں کو مہلت ملی برج کی کالیں بند ہو گئیں، تو اب کام کی بات چیت ہوئی کہ کل کا کیا پروگرام ہو۔ سب نے اپنی اپنی رائے دی۔ کوئی قلعے کے ہانکے کے واسطے تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ شاہ گڈھ کے ہرنوں سے باز پرس کی جائے۔ کوئی صاحب چاہتے تھے کہ مینا کوٹ کی جھاڑیوں میں مُرغے پھر بہت آ گئے ہیں

ان کا شکار کیا جائے لیکن میں نے یہ رائے دی کہ علی الصبح اُٹھکر یہاں سے موٹر ٹرالیوں پر بائیفرکیشن چلنا چاہیئے پھر وہاں سے ہاتھیوں پر بیٹھکر چوکہ ڈھائے میں گھُس کر گوند مارے جائیں۔ میں نے یہ اس وجہ سے کہا تھا کہ اوّل تو مجھے بائیفرکیشن پر ایک ضروری کام تھا، دوسرے میری رائیفل کی کارتوس ختم ہو گئے صرف تین باقی تھے۔ مسعود خاں سب انسپکٹر ٹانڈے کے پاس بھی ۲۷۵ بور تھا اور اُنہوں نے حال ہی میں کارتوس منگائے بھی تھے تو میرا خیال تھا کہ راستہ میں اُن سے کچھ کارتوس لے لونگا۔ اس لئے یہ رائے پیش کی تھی۔ میری اس رائے کی تائید پروفیسر عصمت، احمد میاں، ممار شید اور صاحبزادے نے بہت زور سے کی، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس پروگرام میں ان کو برج کھیلنے کا کافی وقت مل رہا تھا۔ جب یہ رائے منظور ہو گئی تو محمود میاں نے اس میں یہ ضمیمہ اور لگایا کہ "کل کا پروگرام تو یہ ہوا، اور رات کاٹنے کا پروگرام یہ ہے کہ مَیں اور سید میاں (یعنی ہوں) اور جلن ماموں میں کٹ تھروٹ چلے۔ اور تم لوگ برج کھیلو۔ منظور ـــــ"

میں نے کہا "منظور!"

محمود بولے "پھر وقت خراب کرنے سے کیا فائدہ بچھ جائیے!"

چُنانچہ میں نے جلدی جلدی کل کے واسطے جو انتظام کرنا تھے کر دیے۔ ٹانڈے، ٹھاکر صاحب کو ایک ہاتھی کے واسطے خط روانہ کر دیا۔ کالے خاں مہاوت کو بُلا کر رام پیاری ہتنی کو اُسی وقت بائیفرکیشن چلے جانے کی ہدایت کر دی۔ سردار کو بُلا کر سمجھا دیا کہ اپنا سامان درست کر لے۔ پہلی ہی ٹرالی کے پیچھے اپنا ٹھیلا باندھ لے۔ ان سب باتوں سے فارغ ہو کر اب جو کٹ تھروٹ میں لگا تو صبح ہو گئی۔ پروفیسر، احمد میاں، رشید مرحوم اور صاحبزادے تو شاید ایک یا دو بجے سو گئے مگر ہم تینوں ایک منٹ نہ سوئے، ایسے ہی تاشوں میں صبح ہو گئی۔

دونوں موٹر ٹرالیاں آ کر کھڑی تھیں۔ ایک ایک چاد کی پیالی پی کر ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ سب سے اگلی ٹرالی پر احمد میاں، خانو، للن میاں، پروفیسر لد گئے۔ ان کی ٹرالی سے سردار صاحب کا ٹھیلا مع لوازمات باورچی خانہ باندھ دیا گیا۔ رشید صاحب برتنوں کے بکس پر بیٹھ گئے۔ ان کے روانہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد مَیں محمود میاں،

جلن ماموں اور صاحبزادے میاں، دوسری ٹرالی پر بیٹھ گئے۔ بلدیوا ٹرالی میں پائیدان پر بیٹھ گیا۔ دسمبر کا مہینہ تھا کئی دن سے کہرا اور بدلی تھی۔ اُس صبح کہرا اور بھی زور پر تھا۔ یہاں نیپال کے دامن میں موسم سرما میں ہر سال سخت کہرا چھاتا ہے۔ اور کسی کسی سال تو مہینوں دھوپ نہیں نکلتی۔ آسمان بادلوں اور کہرے سے سفید معلوم ہوتا ہے۔ اِن دنوں بھی یہی حالت تھی۔ اسی واسطے آہستہ رفتار سے جا رہے تھے۔ جس وقت ہماری ٹرالی کل بجر سے نکل کر ٹانڈے کے برابر آگئی تو میں نے احمد میاں سے معذرت کی اور ان کو سمجھا کر راضی کر لیا کہ "میں اور بلدیوا یہیں اُترے جاتے ہیں۔ تم لوگ چلو۔ وہاں سب انتظام ہے۔ ہاتھی موجود ملیں گے۔ سردار ساتھ ہے۔ ابھی کچھ ناشتہ کر لینا۔ گیارہ بجے تک میں بھی آ جاؤنگا۔ کھانا وانا کھا کر بارہ ایک بجے چلیں گے۔ میں مسعود خاں سے کارتوس لیکر ابھی آتا ہوں۔"

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ لائن کے کنارے کنارے آتا ہوا ایک فقیر ہمارے پاس سے گذرا۔ سیاہ کملی۔ لمبے لمبے سیاہ بال اور ڈاڑھی ہاتھ میں ٹیڑھا بکڑا موٹا سا ڈنڈا۔ ٹرالی کے پاس آکر کچھ ٹھٹکا، تو محمود نے جھک کر بڑی عقیدت مندی کے اظہار کے ساتھ سلام کیا۔ صاحبزادے نے اور بھی جھک کر تسلیم کی۔ جلن ماموں نے اور بھی نیازمندی کی اور کہا کہ "شاہ صاحب میرے واسطے دعا کیجیے۔" ہمیں نے بھی ہاتھ اُٹھا کر سلام کر لیا لیکن فقیر شاید تاڑ گیا کہ یہ ٹولی کیسے لوگوں کی ہے۔ کیونکہ رُکا نہیں یہ کہتا ہوا چلدیا "سب پر فضل! سب پر فضل رہے گا۔ دعا ہے۔ دعا ہے۔ فضل ہے"

چنانچہ فقیر صاحب کا فضل حاصل کرنے کے بعد وہ لوگ اُدھر چلدیے اور میں بلدیوا کو ہمراہ لیکر ٹانڈے چلا گیا۔ وہاں مسعود خاں نے بہت روکا اور جب میں کسی طرح نہ رُکا تو اپنا رہلو یا گھوڑا لے جانے پر مجھے مجبور کرنے لگے۔ مگر میں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ "پانچ میل کا راستہ ہے کوئی بات بھی ہے۔ جنگل یہاں سے میل بھر پر شروع ہوتا ہے۔ پیدل ہی جاؤں گا۔ راستے میں شاید کچھ شکار ہی مل جائے"

مسعود خاں نے دو سو کارتوس منگائے تھے اُن میں سے آدھے میں نے لے لیے اور چلدیا۔

اب قصہ آگے بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ میں ٹرالی لائن، نہر، شاہ گڈھ، ٹانڈہ، بائیفرکیشن وغیرہ کا ایک نقشہ سا کھینچ کر یہ واضح کر دوں کہ یہ جگہیں ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں، جنگل کس طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاہ گڈھ آر۔ کے۔ آر لائن پر پیلی بھیت سے دوسرا اسٹیشن ہے۔ یہاں سے دو فٹ کی ایک لائن شروع ہو کر تین میل کے بعد نہر سارده کی ہردوئی والی شاخ سے جا ملتی تھی۔ اور پھر اسی شاخ کے کنارے کنارے جا کر اصل نہر سارده کے ساتھ ساتھ بن بسہ تک چلی گئی تھی۔ شاہ گڈھ سے بائیفرکیشن ساڑھے گیارہ میل پر ہے۔ بائیفرکیشن کے معنی ہیں وہ مقام جہاں سے ایک چیز دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے۔ چنانچہ سارده نہر اس مقام پر دو شاخوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ بائیفرکیشن سے اگر جنگل میں سے ہو کر جایا جائے تو چار میل جنگل میں سے اور ایک میل صاف میدان کے بعد مادھوٹانڈہ پانچ میل پر واقع ہے لیکن ٹرالی لائن کا راستہ چھ میل سے زیادہ کا ہے۔

ساڑھے آٹھ یا نو بجے ہونگے جب میں مادھوٹانڈے سے چل کر ٹھیک اُس جگہ پہونچا جہاں برائی کی سڑک جنگل میں داخل ہوتی تھی۔ بلدیو سے رائیفل لیکر میگزین بھر لی۔ اور گھنے بَن کے جنگل میں گھس گیا۔ یہاں سے سیدھا بائیفرکیشن کا رُخ کیا اور تیز قدم چل پڑا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ گیارہ بجے سے پہلے پہونچکر مہمانوں سے جا ملوں۔ آسمان پر کہرا اور بادل بدستور تھا۔ یہ تک معلوم نہیں ہوتا تھا کہ سورج کس جگہ ہے۔ سردی بھی خوب تھی۔ ایک طرح موسم خوشگوار تھا۔ بلدیوا میرے پیچھے پیچھے۔ میں رائفل ہاتھ میں لیے نال زمین کی طرف، گھنے میں آنکھیں گڑے چاروں طرف دیکھتا چلتا رہا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک جانور کی بھی جھلک تک نہ معلوم ہوئی۔ چلتے چلتے اب مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں بہت دیر سے چل رہا ہوں۔ ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ اپنی رفتار کے حساب سے مجھے کب کا بائیفرکیشن یا اُس کے اطراف میں ہردوئی برانچ نہیں تو کھیری برانچ پر کسی جگہ نکل آنا چاہیے تھا۔ میں اِسی سوچ میں تھا کہ سامنے پتلے اور گھنے سال کے درختوں میں کچھ حرکت سی معلوم ہوئی۔ میں حسب قاعدہ ٹھٹک کر ساکت سا کھڑا ہو گیا۔ مگر وہاں تو کھٹ پٹ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ آگے بڑھکر دیکھتا کیا ہوں چران سی بھری ہوئی بیل گاڑیاں آ رہی ہیں! ارے! یہ کیا؟ اور آگے بڑھا سڑک بھی ہے۔ یہ کونسی سڑک ہے۔ میرے سیدھے ہاتھ پر بلدیو تھا، اُس کی طرف گھوما تو دیکھتا کیا ہوں کہ جنگل کا کنارہ لگا ہوا ہے۔ آگے بڑھکر باہر جو ہم دونوں نکلے تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سامنے میدان پڑا تھا۔ ہم دونوں ٹھیک اُسی جگہ جنگل کے کنارے تھے جہاں سے گھسے تھے۔

"ارے بلدیوا یہ کیا ہوا؟"

"سوحب سمجھ نا پڑتی، کا بھوا، گھومت گھومت اِئی سے کتے

آئے گئے۔"

برسوں کا جنگل میں گھومنے والا کبھی اس طرح نہ بھٹکا تھا۔ اپنی اس حماقت پر ہنسی آگئی اور ٹھٹھے مارتا ہوا پھر بائیفرکیشن کی سیدھ باندھکر جنگل میں گھس گیا۔

"بلدیوا اب دیر ہو جائے گی۔ تیز چلنا چاہیے۔ لوگ کھانے پر انتظار کریں گے۔"

"چلئے سواحب ساتھ نہ چھوڑیوں۔" بلدیوا نے ڈٹ کر جواب دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا قد چھ فٹ کا ہے اور ٹانگیں بھی غالباً تناسب اعضا کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی لمبی ہیں۔ میری چال بہت تیز ہے۔ ایسی کہ چلنے والے ساتھ ساتھ چلتے گھبرا نے ہیں۔ اسی واسطے برابر ترالی والے بدلتا رہتا تھا۔ ادھر قریب ایک سال ہوا اتفاقاً یہ لونڈا بلدیوا ہاتھ آگیا تھا۔ چل لیتا تھا۔ ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔

دوبارہ میں اپنی پوری رفتار سے بائیفرکیشن کی سیدھ لیکر روانہ ہوا۔ بلدیوا کبھی کبھی تیزی سے چلتا اور کبھی بھاگتا۔ دائیں بائیں ساتھ ساتھ لگا رہا۔ لیکن چلتے چلتے ایک دفعہ پھر جبکہ میں بائیفرکیشن پر یقینی طور پر نکلنے ہی کی اُمید کر رہا تھا۔ ہم دونوں براہی کی سڑک سے سَو سوا سو قدم مغرب کی طرف اسی کنارے پر پھر نکل آئے۔ اب تو مجھے غصہ آگیا۔ بلدیوا کے سوا اور کون تھا اسی کے سر ہو گیا۔

"اُو بے اُلو تو نے پھر مجھے بہکا دیا۔ کئی دفعہ منع کیا مگر پاگل کی سمجھ میں ہی نہ آیا برابر بائیں کو ہی کٹتا رہا۔"

بلدیوا نے بہت کچھ عذر معذرت کی کہ وہ بے گناہ ہے۔ مگر میں نے ایک نہ سُنی۔ سب الزام اُسی کے سر تھوپ کر ابکی اُس سے کہا کہ وہ آگے آگے چلے اور میں پیچھے رہونگا۔ جب بھی وہ دائیں بائیں سیدھ سے ہٹے گا فوراً اُسے بتاؤں گا۔ پھر جنگل سے باہر کھڑے ہو کر سیدھ باندھی اور اُسی سیدھ پر آگے ایک درخت کے پاس بلدیوا کھڑا کیا۔ اب اسے چلنے کا حکم دیا۔ جب وہ درخت آگیا تو فوراً کسی دوسرے درخت کو اُسی سیدھ میں تاک لیا جہاں بلدیوا سیدھی یا اُلٹی طرف غلط ہٹا فوراً منع کیا۔ اس طرح کرتے ہوئے چلا۔ لیکن بَلا کا گھنا جنگل۔ دس بارہ گز سے آگے کا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ اس سیدھ در سیدھ درختوں کا اندازہ لگانا تھوڑی ہی دور چل سکا۔ پھر بھی دائیں کو ہٹ بائیں کو ہٹ کرتا ہوا چلتا رہا۔ ابکی کچھ زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ بڑے اطمنان سے جنگل کے اندر ہی اندر ایک گول چکر لگا کر پھر اُسی کنارے پر نکل آئے۔ یا اللہ یہ کیسی عقل خبط ہوئی ہے آج میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

"ارے بلدیوا تو ہی بتا کہ کیا بات ہے۔"

"سواحب کچھ نا ہی پڑتی۔ اب ای کا چھوڑ دیو کنار کنار چالو پھر نہر پکڑ لی ہیں۔"

"ہوں کیوں بے بودم! بجائے اس کے کہ مجھے بتائے جب میں بھکوں سیدھا ایک طرف چلا چلے۔ اب کہتا ہے باہر باہر چلوں۔ دیکھا ابکی جو اگر بھٹکا تو تیرا سر پھاڑ دونگا۔ چل آگے آ نے! اتنا سا ٹکڑا ابھی پار نہیں کیا جاتا۔ وہی کولھو کے بیل کی طرح گھوم گھام اسی جگہ نکل آتے ہیں۔ اگر ابکی پھر گھوم آیا تو سُن لے بلدیوا تیری شامت ہی آجا ئیگی۔"

"موری مانت کب ہو سواحب اب کی لے چلیو سیدھا آنگلے چلوں تو کہنا۔"

اب بلدیوا صاحب نے رہنمائی قطعی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اگر میں کہوں کہ ابلے پھر بائیں کو ہٹ گیا تو بولیں۔ "بولو نا سواحب۔ اب چلے چلو۔ بولو نا سواحب۔"

چلتے چلتے جب ایک گھنٹہ ہو گیا تو میں نے کہنا شروع کیا کہ "معلوم ہوتا ہے تو تو پھر بہک گیا۔"

اور وہی ہوا۔ بہک گئے تھے۔ لیکن ابکی بجائے بائیں کو کٹتے کٹتے ایک دائرہ بنا کر دہیں کے دہیں نکلتے، بائیں کو ہٹتے ہٹتے گول گھیرا بنا کر براہی کی سڑک پر جنگل کے اندر ہی اندر کسی جگہ پر آگئے تھے چونکہ اس حصہ میں کوئی دوسری سڑک تو ہے ہی نہیں اس لئے یہ تو طے شدہ تھا کہ سڑک براہی کی ہی ہے لیکن سمتوں کا بالکل ہی دھیان نہ ہونے سے یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کس طرف براہی کا رُخ ہے اور کس طرف باہر کا۔ آخر میں نے سوچا کہ ڈھائی تین بجے کا وقت ہے اب اگر کوئی گاڑی اس سڑک پر سے گذری ہوگی تو جنگل سے باہر ہی کو نکلنے والی گاڑی ہوگی۔ بیلوں کے پیر دیکھے۔ سب سے تازے پیر کے نشان پر چل پڑا۔ ایک میل چلنے کے بعد پھر اسی مقام پر آگیا جہاں کہ صبح آٹھ بجے سفر شروع کیا تھا۔ اب یہ حالت کہ بھوک، غصہ، پیاس اور جھلاہٹ، تھکن اور تاؤ پر تاؤ آ رہے ہیں۔ جاؤں گا تو اسی جنگل کے ٹکڑے میں سے ہو کر جاؤنگا۔ بلدیوا نے بھی اس غصہ اور جھلاہٹ کے موقع پر خاموشی اختیار کر لی۔ بغیر آپس میں بات کئے یا ایک لفظ بھی بولے پھر دونوں جنگل میں گھس گئے۔ مجھ پر جتنی تھکن سوار ہوتی رہی اتنا ہی غصہ بڑھتا رہا اور جتنا غصہ بڑھتا جائے اتنا ہی تیز چلتا جاؤں۔ اب بندوق کندھے پر، منہ پر پسینہ، پیروں اور ٹخنوں پر

ڈھول چل رہا ہوں اچل رہا ہوں۔ گھڑی ساتھ نہ تھی۔ چلتے چلتے شاید ڈھائی گھنٹے ہوگئے ہونگے کہ بلدیو نے کچھ کہنا چاہا اور "سواحب" ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے کانپتی ہوئی مگر سخت آواز میں بہت زور سے کہا "چپ" پھر بلدیو اچپ میں چپ۔ اسکے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے امیرے پاؤں لڑکھڑاتے ہوئے! وہ پسینے میں نہایا ہوا میں پسینے میں نہایا ہوا۔ چل رہے ہیں۔ چل رہے ہیں۔ بڑی دیر ہوگئی آخر ایک جگہ بلدیو اُرک گیا اور بولا "نا سواحب اب نا چپ رہیوں" ایک پیڑ کے تنے پر ہاتھ رکھکر اور اس کے اوپر لال چیونٹیوں کے چھتے کی طرف اشارہ کرکے "یو درکھت اور با دیکھ با" سوگز سے کچھ دور پر سال کی گھنی چوٹیوں میں سے جھانکتی ہوئی ایک سوکھی ڈالی دکھا کر "بابا سوکھا پیڑ"

میں نے جھلا کر کہا "ہاں تو پھر؟"

بولا "سب سواحب ایا ہیں کے ایر گیر پھر رہے ہیں تین دفعہ تو جا ہی پیر کو دیکھ چکا ہوں باس اب چالو باہر!"

اب تو مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہوئی۔ معلوم ہوا جیسے سر گھوم رہا ہے۔ سب غصہ فرار ہوگیا۔ تھکن سے اب معلوم ہوا کہ گرا پڑتا ہوں۔ یہ معلوم ہو گویا کسی سحر میں پڑ گیا تھا۔ ابھی کچھ ہوش آیا ہے۔ اور شاید پھر اسی جادو کی سی بے ہوشی چھانے والی ہے۔ اب تو میں نے ہمدردی طلب لہجے میں بلدیو سے کہا "ارے بھیا نکلیں تو کیسے کس طرف چلیں۔ کنارہ کدھر ہے۔۔۔؟"

اس سوال پر تو اب بلدیو کو بھی پریشانی ہوئی، سوچتے سوچتے بولا "کوئی اونچا پیڑ ملے تو چڑھکر دیکھوں"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے۔ ارے دیکھ وہ ہے پیڑ اسی پر چڑھکر دیکھ"

بلدیو پیڑ پر چڑھنے لگا اور میں رائفل آگے ٹیک کر اسکا سہارا لیکر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے اوپر چڑھتے ہی کہا "سواحیب جو تو کنارہ ہی ہے جو کا ہے تمرے پاچھے"

ہم دونوں تھکے ہارے بھوک اور پیاس سے بے حال اب جنگل کے کنارے کنارے نہر کی طرف چلے۔ شام ہو چلی تھی، دن کی روشنی تیزی کے ساتھ کم ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ میل چلنے کے بعد جس وقت میں نہر کو پار کرکے (اُس زمانے تک نہر مکمل نہیں ہوئی تھی، اس لئے پانی ابھی نہیں چھوڑا گیا تھا۔) ٹرالی لائن پر پہونچا تو کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ اب چار میل اور چلنا تھا۔ خیر ہم دونوں روانہ ہوئے۔ اندھیرا، جنگل کا راستہ، چار میل کا فاصلہ ہمارے سامنے تھا، روانہ ہوگئے۔ لیکن خوش قسمتی سے ابھی روانہ ہوئے ہی تھے کہ پیچھے سے ٹرالی کی آواز آئی۔ دونوں رک گئے۔

ٹرالی جب پاس آئی تو معلوم ہوا کہ سردار نے مادھو ٹانڈے میرے ہی بلانے کے لئے بھیجی تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس پر بیٹھکر تھوڑی دیر میں بائیفرکیشن پہونچ گیا۔ مہمانوں میں سے ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے جاتے ہی سردار سے کھانے کو مانگا۔ اور جب وہ چاء لیکر آگیا تو سب حال معلوم ہوا کہ ایک بجے تک سب نے میرا انتظار کیا پھر کھانا کھالیا۔ اس کے بعد تین بجے تک اور انتظار کیا۔ ٹھاکر صاحب کا ہاتھی کہیں گیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ نہ پہنچ سکے، اکیلی رام پیاری ہی تھی۔ اس پر احمد، محمود، ممار رشید، للن میاں، اور پروفیسر چلے گئے تھے۔ جلن ماموں، صاحبزادے اور خانو پیدل گئے ہوئے ہیں۔ لیکن میں چاء پی ہی رہا تھا کہ یہ لوگ بھی آگئے۔ کچھ ہتھنی پر اور کچھ پیدل آتے ہی چاؤں چاؤں۔ چہل پہل۔

ایک ہی وقت میں اتنی آوازیں:-

"کیوں سید میاں یہ کہاں کا طریقہ ہے ہم کو چھوڑ دو غائب ہوگئے" (للن میاں)

"ارے سید، بھائی محمود تو آج بچ ہی گئے" (احمد میاں)

"دیکھو کیسا زبردست سانبھر مارا ہے" (جلن ماموں)

"ارے پروفیسر نے تو گلدار مار لیا یہ دیکھو۔ کالے خاں ہاتھی بٹھلو ہاتھی بٹھاؤ" (ممار رشید)

"سردار بھئی سردار میرے لئے خوب اسٹرانگ چاء لانا" (محمود میاں)

رام پیاری پر سے اچھے قد و قامت کا ایک گلدار اُتار اگیا۔ دو مزدوروں نے لٹھیا میں لٹکا ہوا سانبھر کا ایک سر لاکر رکھدیا۔ سینگ اچھے تھے بلکہ بہت اچھے تھے۔ جلن ماموں اور صاحبزادے نے دو مرغے اور ایک مرغی اور ایک کالا تیتر رکھدیا۔ ادھر سردار نے بھی چاء لاکر رکھدی تو اب شور مچانے والے منہ، انڈے پوری اور چاء سے کچھ کچھ بند ہوئے۔ بات چیت کچھ قرینے پر آئی۔

محمود:- "سید میاں یہ کیا حرکت تھی۔ خود کیوں رہ گئے۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں"

میں:- "بھائی کیا بتاؤں۔ اچھا میں پھر بتاؤں گا۔ پہلے تم تو بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

محمود:- "آپ کو یہ نہ چاہیئے تھا۔ مسعود خاں نے روک لیا اور رُک گئے، مہمان یہاں پڑے انتظار کر رہے ہیں"

میں :- "نہیں بھائی میں تو اُسی وقت وہاں سے چل پڑا تھا - راستہ بھول گیا کچھ عجب قصہ ہے پھر بتاؤں گا پہلے تم لوگ اپنا قصہ سناؤ کیا ہوا تھا ؟"

احمد :- "ملاجی کی جمنی ! یہ نہیں ، کیوں صاحب چلے ہیں ہم کو بہکانے ۔ راستہ بھول گئے اور سید میاں "

میں : "ارے مجھے تو فی الحال چھوڑ دو - میں پھر بتاؤنگا ۔ پہلے یہ تو بتاؤ گلدار کس نے ...... ؟"

پروفیسر :- (میری بات کاٹ کر) "آہاں ! آہاں ۔ ادھر آہاں آہاں (چٹکی چٹکی بھر کی موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے) اس خاکسار نے وہ گیدڑ مارا ہے"

میں :- "بکومت ، چپ رہو"

محمود :- "ارے بھئی ایک ہاتھی وہ بھی چھوٹے سے گدھے کا ، میں بھیا ، للن میاں ، رشید اور پروفیسر[۱] گھس پل کر بیٹھ گئے ۔ لیکن ادھر تو بھیا ایکساں ڈھکیلے جائیں ۔ اُدھر پروفیسر ایک انچ بھی نہ کھسکے ۔ میں بڑی مصیبت میں ہاتھی کی دُم کے پاس ایک ہاتھ سے رسا پکڑے دوسرے سے بندوق - لٹکا سا چلا جا رہا تھا ۔ نہر پار کی پھر جوکا کے ڈھاے میں اترنے لگے ۔ وہیں پر اتفاق سے ایک تین شاخا درخت مجھے نظر پڑا ۔ میں نے ہاتھی رکوا کر بھیا سے کہا کہ "میں تو اس تشاخے پر بیٹھا جاتا ہوں ۔ ترائی سے جنگل میں ، یا اِدھر اُدھر سے آتا جاتا اگر کوئی جانور نکلا تو مار لونگا ۔ یہ لوگ نشیب میں جا کر گوند ڈھونڈیں اور ماریں ۔ واپسی میں مجھے پھر یہاں سے اتار لیں "

احمد :- "ہاتھی ہم نے رُکوا دیا ۔ تشاخا ابھی اونچا تھا محمود ہاتھی پر کھڑے ہو گئے ۔ نیچے اُن کی ٹانگوں کو سہارا دیا گیا تو یہ گدالے کو پکڑ کر اوپر چڑھ گئے ۔ جب یہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو ہم لوگ چلدیے ۔ کلک اور نرکلوں میں پھرا گئے ۔ ایک دو گوند اٹھے بھی لیکن فیر نہ ہو سکا ۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد واپس آگئے ۔ اب جو محمود کے درخت کے قریب آئے تو محمود ہاتھ سے چپ رہنے اور آہستہ آہستہ بڑھنے کا اشارہ کر رہے ہیں - یہ خیال ہوا کہ ضرور کسی جانور پر فیر کیا ہے اور زخمی جانور آس پاس ہی ہے ۔ میں نے چاروں طرف جلدی جلدی نظر دوڑائی ۔ لیکن کچھ نظر نہ آیا - اب ہم درخت کے قریب آ گئے لیکن محمود برابر انگلی کے اشارے سے چپ رہنے کو کہہ رہے ہیں ۔ خیر بالکل خاموشی سے ہاتھی بالکل پاس لا کر کھڑا کر دیا ۔ لیکن اب ہتھنی نے بھی برابر کلبلانا شروع کر دیا ۔ پچھلی کھڑی ہی نہ ہو ۔ مہاوت انکس اُٹھائے تو اوپر سے محمود کھس کھس کر کے کہیں "ہوں ہوں ، نہ مارو نہ مارو گا ۔ بندوق ہم کو پکڑا کر محمود بجائے لٹک کر گدے پر کودنے کے تھنے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر نیچے گھس گھساتے رگڑتے پھسل آئے ۔ تمام کوٹ بھی پھٹ گیا ۔ ہاتھی پر آتے ہی بولے : "بڑھاؤ - بڑھاؤ " ہاتھی بڑھایا گیا ۔ ابھی تک ہم کو کچھ خبر نہیں ہے ۔ جب اس پیڑ سے پچاس ساٹھ فٹ ہٹ آئے تو پھر محمود نے ہاتھی کو رکوایا "

پروفیسر :- "اور میں نے بندوق اُٹھا کر ٹھائیں سے گولی دی ، فاختہ کی طرح نیچے آ پڑا "

محمود :- "کیوں عصمت ملاجی کی جمنی پہ ٹمیں ؟ "

احمد :- "چپ رہو ، چپ رہو ۔ سُنیے سید میاں --- اب بھی میں اِدھر اُدھر ہی دیکھوں - جب محمود نے بندوق اسی درخت کی چوٹی کی طرف چھتیائی تو میری نگاہ پڑی ۔ میں نے بھی فوراً ہی رائفل سنبھالا ۔ محمود کا فیر ہوتے ہی گلدار اوپر سے گرا - اور گرتے ہوئے پر ہوا میں ہی للن میاں نے چودہ بور کے دو فیر کئے ۔ گلدار پھر بھی گر کر اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک گولی میں نے رسید کی "

محمود :- "بھیا ، پروفیسر کی تو بات رہ ہی گئی وہ بھی تو کہو "

للن میاں :- "یہ بھی کمال ہی کر دیا - جونہی محمود نے بندوق کی نال آسمان کی طرف کی آپ کی نگاہ پڑ گئی ۔ کیسی پھرتی کی ہے میرا چسٹر گھسیٹ ، کمل کھینچ دونوں چیزیں اوڑھ سب کے بیچ میں اوندھے پڑے ہیں ۔ واللہ یاد رہیگی بھائی کی یہ حرکت بھی "

میں :- "یارو تو قصہ کیا تھا ؟ "

محمود :- "سید میاں ۔ حضرت گلدار اس درخت پر پہلے ہی سے موجود تھے ۔ تشاخہ بہت اونچے پر تھا اتنا کہ ہاتھی کی پیٹھ پر کھڑے ہو کر بھی مشکل سے چڑھا گیا تھا ۔ وہ درخت بھی کمبخت عجیب قسم کا تھا تشاخے کی دو شاخیں تو ایسی ہی معمولی تھیں وہیں پر ٹوٹ ٹاٹ کر دہ ہو گئی تھیں ، اور تیسری شاخ یعنی اصل تنہ ۔ جہاں میں بیٹھا تھا اسی پر سیدھا بہت اونچا چلا گیا تھا ۔ اوپر پھر سات آٹھ ڈالیوں اور ٹہنیوں کی ایک چھتری سی تھی ، انہیں میں یہ حضرت (گلدار) بیٹھے تھے ۔ بھیا تو ہاتھی لیکر چلے گئے میں اطمینان سے بیٹھ گیا ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اوپر پتوں میں

---

۱ احمد میاں اور محمود میاں ، حاجی عبدالمجید خاں مرحوم کے صاحبزادگان ہیں ۔ جلال الدین خاں صاحب عرف جگن ماموں انکے ماموں ہیں ۔ اس لئے سب کے ہی ماموں ہو گئے ۔ ۲ برج اور فلاش کے معاملے میں پروفیسری کا شرف حاصل ہوا ہے ۔

کُھس کُھس ہوئی۔ میں نے خیال کیا مور ہوگا یا بندر۔ میں بیٹھا رہا۔ ایک دفعہ وہ جو ذرا ہلا تو سارا درخت ہل گیا۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا سر پر گلدار سوار ہے۔ بڑی طبیعت گھبرائی۔ نیچے اُترنے کی سوچی مگر وہ بھی ناممکن۔ اتنی اونچائی پر پورے تنے پر ایک ڈالی نہ تھی۔ فیر کرتا ہوں تو وہ زخمی ہو کر بھی سیدھا میرے سر پر گرتا ہے۔"

محمود اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے کہا "پھر"

محمود۔ "پھر کچھ بھی نہیں، آگے قصہ تو آپ نے سن ہی لیا"

میں۔ "سر پر گلدار اور تم بیٹھے رہے"

محمود۔ "ہاں"

میں۔ "اوپر گلدار بیٹھا ہے نیچے تم بیٹھے ہو۔ دونوں بیٹھے ہیں"

محمود۔ "ہاں"

میں۔ "تم ہاتھی کے آنے کے انتظار میں ہو اور گلدار تمہارے ہٹنے کے انتظار میں۔ اسی طرح دو گھنٹے گذار رہے"

محمود۔ "ہاں"

میں۔ "شاباش ہے بھائی تم کو"

محمود۔ "شاباش کی کیا بات ہے۔ موقع ہی ایسا آگیا تھا۔ سوائے چپکے بیٹھے انتظار کرنے کے میں کر ہی کیا سکتا تھا میں تو میں، گلدار بھی اسی مخمصے میں تھا، وہ بھی کیا کرتا۔ نہ حملہ ہی کر سکتا تھا اور نہ کہیں جا سکتا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شاخ دار درخت پر تو بلی کی طرح نہایت پھرتی سے یہ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن سیدھے درخت پر اسے چڑھنے اور خاص کر اترنے میں تکلف ہوتا ہے۔ اچھا یہ تو ہوا۔ اب سچ سچ بتایئے کہ دراصل آپ راستہ ہی بھول گئے تھے"

میں۔ "ہاں راستہ بھول گیا تھا مگر ٹھہرو پھر بتاؤں گا، پہلے خاتون کے سانبھ کو بھی سن لوں۔ ہاں ہاں"

خاتون۔ "سید میاں کچھ بھی نہیں۔ میں نے نہیں مارا رکھا یا ہوا پڑا تھا سینگ اچھے تھے، دیکھتے ہی میں لوٹ گیا چاقو سے سر کاٹ لایا۔ سڑ چلا ہے، بو آنے لگی ہے۔ آپ اپنی واردات سنایئے۔"

میں نے تفصیل سے اپنا قصہ سنایا۔ جس کو بڑی دلچسپی سے ہر ایک سنتا رہا۔ اور جب میں اپنا واقعہ بیان کر چکا تو تھوڑی سی رد و قدح کے بعد ہر ایک اسی بات پر متفق ہو گیا کہ سب یہ اثرات اسی فقیر کی موجودگی کی برکت کے ہیں۔ (جو کہ ہم سے اگلی ٹرالی والوں کو بھی ملا تھا) اور میں چونکہ مرتد قسم کا آدمی ہوں، میں نے اس رائے سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا۔

میں نے کہا "اچھا اگر مان بھی لیا جائے کہ فقیر کی برکت سے محمود کی جان بچی تو اس ظالم کو مجھے دن بھر راستہ بھٹکانے سے کیا ملا"

"آپ کا نہ جانا ہی بہتر ہو"

"اجی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی"

"سید میاں یہ فقیروں کے راز ہیں" وغیرہ وغیرہ آوازیں بلند ہوئیں۔

ان ہی باتوں میں رات کے نو بج چکے تھے جلدی جلدی سب نے اپنا سامان سمیٹا، پھر موٹر ٹرالیوں پر سوار ہو کر سب شاہ گڈھ واپس آئے۔ یہاں کھانا تیار تھا میں تو کھانا کھاتے ہی پڑ کر سو گیا۔ کئی رات کا جاگا، دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیکن ان لوگوں میں برج رات بھر ہوا کیا۔ دوسرے دن شاہ گڈھ کے قلعے کا ہانکا کیا گیا۔ کوئی خاص بات ایسی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اس ہانکے کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ایک سور اور دو جھانک مارے گئے۔ پانچ ہی بجے شکار سے گھر واپس آ کر ہم سب چائے اور ناشتے میں جٹے ہوئے تھے کہ مسعود خاں سب انسپکٹر مادھو ٹانڈہ بھی آ گئے۔ گپ شپ بات چیت کے بعد کل کے قصے سنائے گئے۔ پھر مجھے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ راستہ بھولنے کا قصہ سنانا پڑا۔ انہوں نے اس قصہ کو خاص دلچسپی سے سنا۔ ہر ایک بات کو کرید کرید کر اس طرح پوچھا کہ مجھے بھی تعجب ہوا فقیر کا حلیہ دریافت کیا، ٹھیک ٹھیک جگہیں دریافت کیں۔ جہاں سے میں جنگل میں گھسا تھا اور پھر واپس نکلا تھا۔

میں نے دو ایک مرتبہ پوچھا بھی کہ "تم اس قدر کیوں دلچسپی لیکر ہر ایک بات پوچھ رہے ہو؟"

مسکرا کر بولے کہ "واقعی محمود اور آپ کی دونوں کی جانیں خطرے میں آ گئی تھیں۔ لیکن آپ بڑے خطرے میں پڑ گئے تھے۔ یہ انہیں شاہ صاحب کی برکت تھی۔ معلوم ہے سید میاں اگر آپ ویسے ہی سیدھے نکل کر بائیفر کیشن کے قریب چلے جاتے تو کیا ہوتا؟ وہیں پر آدھے میل جنگل کے اندر سلطانہ اور اس کا گینگ پڑا ہوا تھا۔ کل دن بھر وہ لوگ وہیں چھپے رہے۔ سر شام نکل کر رات کے نو بجے انہوں نے برائی کے اُتر میں، بن کٹا گاؤں کو لوٹا اور اب سیر کوٹ کی ترائی میں کہیں موجود ہیں۔ اسی واسطے تو میں سات بجے کی گاڑی سے پیلی بھیت، صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا رہا ہوں۔ بھئی خوب بچے سید میاں۔ اور رائفل کارتوس بھی ساتھ تھے۔ ارے وہی نہ پانچ، ستو۔ غضب ہو جاتا۔ نہ معلوم ان کارتوسوں سے اور اس رائیفل سے کیا کیا غضب ڈھائے

پہلی پرواز

بحری بگلہ کا بچہ اپنی چٹان پر اکیلا تھا۔ اُس کے دو بھائی اور ایک بہن ایک دن قبل ہی اُڑ گئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اُڑنے میں خائف تھا۔ ہمت کر کے جب وہ چٹان کے کنارے کی طرف آگے کو بھاگا اور اپنے پَر پھڑ پھڑانے کی کوشش کی تو وہ ڈر گیا۔ سمندر کی انتہائی وسعت نیچے موجیں مار رہی تھی۔ اور نیچے اس قدر فاصلہ تھا ـــــ میلوں نیچے۔ اسکو یقین ہو گیا کہ اس کے بازو اسے سہارا نہ دے سکیں گے۔ چنانچہ اُس نے اپنا سر جھکایا اور اس چھوٹے سوراخ میں بھاگ کر واپس آ گیا جہاں وہ رات کو سوتا تھا۔ اس وقت بھی جب اُس کے دونوں بھائی اور بہن جن کے بازو اس کے بازوؤں سے کتنے ہی چھوٹے تھے کنارے کی طرف دوڑے اور اپنے بازو پھڑ پھڑائے اور اُڑ گئے۔ وہ اس جان جوکھم کے کام میں پڑنے کیلئے جو اس کو اس قدر خطرناک معلوم ہوتا تھا اپنی ہمت نہ بندھا سکا۔ اس کے ماں باپ اسکو باریک آواز سے پکارتے ہوئے، ملامت کرتے ہوئے اور اگر وہ نہ اُڑے تو چٹان پر اسکو بھوکا مار دینے کی دھمکی دیتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ مگر وہ وہاں سے کسی طرح بھی نہیں ہل سکتا تھا۔

اس واقعہ کو چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس وقت سے اس کے پاس کوئی نہیں آیا تھا۔ ایک دن پہلے اُس نے اپنے ماں باپ کو اپنے بھائیوں اور بہن کے چاروں طرف اُڑتے ہوئے ان کو پرواز کے فن میں ماہر بنلتے اور یہ بتاتے ہوئے کہ لہروں کو چھوتے ہوئے کس طرح اُڑتے ہیں اور مچھلی پکڑنے کیلئے کس طرح غوطے لگاتے ہیں سکھاتے ہوئے تمام دن دیکھا تھا۔ اُس نے سچ مچ اپنے بڑے بھائی کو پہلی مچھلی پکڑتے اور ایک چٹان پر کھڑے ہو کر نگلتے ہوئے دیکھا تھا جبکہ اس کے ماں باپ مفتخر آواز میں کڑکڑاتے ہوئے اس کے گرد اُڑ رہے تھے۔ اور صبح کو تمام خاندان اس کو اس کی بزدلی پر چڑاتا ہوا سامنے کی چٹان کے نیچے والے مسطح پہاڑ پر گھومتا رہا تھا۔

سورج اب آسمان پر بلند ہو رہا تھا اور اس کی چٹان پر جو جنوب میں تھی بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اُس نے گرمی محسوس کی کیونکہ اس نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر اُسے چٹان کے دُور کے کونے پر مچھلی کی سوکھی ہوئی دُم کا ٹکڑا ملا۔ اب کھانے کا ایک حصہ بھی باقی نہ بچا تھا۔ اس نے اس ناہموار اور گرد آلود گھونسلے کو ٹٹول کر جس میں وہ اور اس کے بھائی اور بہن انڈوں میں سے نکلے تھے ایک ایک چپہ چھان مارا۔ اس نے دھبے دار انڈوں کے سوکھے ہوئے چھلکوں تک کو کُترا۔ یہ اپنے آپ کو کھانے کے برابر تھا۔ اس کے بعد وہ چٹان کے ایک سرے سے دوسرے تک گھوما۔ اس کا چٹان جیسا بھورا جسم، اس کی لمبی بھوری ٹانگیں نزاکت سے بغیر اُڑے ہوئے ماں باپ کے پاس پہونچنے کی ترکیب معلوم کرنے کیلئے آگے کو اٹھ رہی تھیں۔ لیکن اس کے ہر طرف چٹان کا یکایک ڈھلان تھا، نیچے سمندر تھا۔ اور اس کے اور اس کے ماں باپ کے درمیان ایک بڑا گہرا اور چوڑا خلا تھا۔ اگر وہ چٹان کی سیدھی جانب شمال کی طرف جا سکتا ہے تو وہ یقیناً ان کے پاس پہونچ سکتا تھا۔ چٹان بالکل سیدھی کھڑی تھی اور شاید اس کی چوٹی کا فاصلہ نیچے سمندر سے زیادہ تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چٹان کے کنارے کی طرف بڑھا اور ایک ٹانگ کو اپنے بازوؤں میں چھپاتے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑے ہو کر اُس نے ایک آنکھ بند کر لی۔ پھر دوسری بھی اور سو جانے کا بہانہ کیا۔ پھر بھی اُنہوں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ اس نے اپنے دو بھائیوں اور بہن کو اپنے سر گردنوں میں لئے اُونگھتے دیکھا۔ اس کا باپ اپنی کمر کے سفید پروں کو چونچ سے سنوار رہا تھا۔ صرف اس کی ماں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنا سفید سینہ باہر نکالے حدب کے ایک معمولی سے اونچے ٹیلے پر کھڑی تھی۔ کبھی کبھی وہ ان مچھلی کے ٹکڑوں کو چیرتی تھی جو اس کے قدموں میں پڑی تھیں اور پھر اپنی چونچ کو چٹان سے رگڑتی تھی۔ کھانے کے منظر نے اس کو دیوانہ کر دیا۔ وہ کھانے کو اس طرح چیرنے اور اپنی چونچ کو کبھی کبھی تیز کرنے کے لئے رگڑنے کو کس قدر پسند کرتا تھا۔ وہ باریک آواز سے کڑکڑایا۔ اس کی ماں بھی کڑکڑائی اور اس کی طرف دیکھا ـــ۔

"گا۔ گا۔ گا" وہ اس سے کچھ کھانا لانے کی درخواست کرتے ہوئے چلایا "گو۔ او۔ لا" وہ جواباً تمسخر سے چلائی۔ لیکن وہ غم آلود انداز سے پکارتا ہی رہا اور تقریباً ایک منٹ بعد اُس نے ایک مسرت بخش آواز لگائی۔ اس کی ماں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اُٹھا لیا تھا اور اُسے

لیکر اُس کے پاس اُڑ کر آ رہی تھی۔ اپنے پنجوں کو چٹان پر مارتے ہوئے وہ اُس کے نزدیک پہونچنے کی کوشش میں جونہی اس کے پاس آئی وہ مشتاقانہ آگے کو جھکا۔ لیکن جب وہ چٹان کے قریب اس کے بالکل مقابل تھی تو رُکی۔ اُس کی ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے بازو غیر متحرک تھے۔ چونچ میں مچھلی کا ٹکڑا اس کی چونچ کی پہونچ میں تھا۔ یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وہ زیادہ قریب کیوں نہیں آئی اُس نے اُس کا حیرت سے ایک لمحہ انتظار کیا اور پھر بھوک سے دیوانہ ہو کر وہ مچھلی کی طرف جھکا۔ ایک زوردار چیخ مار کر وہ باہر اور نیچے کی طرف فضائے بسیط میں گرا۔ اس کی ماں جھپٹ کر اوپر چلی گئی تھی۔ جونہی وہ اس کے نیچے سے گذرا اُس نے اُس کے پروں کا سڑاکا سُنا۔ تب اُس پر انتہائی خوف طاری ہو گیا اور اُس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ وہ کچھ نہ سُن سکتا تھا۔ لیکن یہ چند لحظہ ہی رہا۔ اگلے وقفہ اُس نے اپنے بازو باہر کو کھلے ہوتے محسوس کئے۔ ہوا اُسکے سینے کے پروں سے ٹکرائی اور پھر اس کے پیٹ کے نیچے کی طرف نہیں گر رہا تھا۔ اب وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ اُس نے اپنے آپکو کچھ سراسیمہ سا محسوس کیا۔ تب اُس نے ایک مرتبہ اپنے بازو مارے اور اونچا ہو گیا۔ اُس نے مسرت کُن چیخ لگائی اور پھر بازو مارے۔ وہ اور اُونچا ہوا۔ اُس نے اپنا سینہ نکالا اور ہوا سے ٹکرایا۔

"گا۔ گا۔ گا۔ گو۔ او۔ لا"! اُس کی ماں بازوؤں سے پُرشور آواز پیدا کرتی ہوئی اس کے قریب تیزی سے نکل گئی۔ اُس نے اس کو ایک دوسری چیخ سے جواب دیا۔ پھر اس کا باپ چیختے ہوتے اس کے اوپر اُڑنے لگا۔ تب اُس نے اپنے دونوں بھائیوں اور بہن کو اپنے چاروں طرف اُڑتے، جھپٹتے اور مچھلی کا شکار کھیلتے اور اُوپر کو چڑھتے اور غوطہ لگاتے دیکھا۔

اس وقت وہ یہ بالکل بھول گیا کہ وہ ہمیشہ سے اُڑنے کے لائق نہ تھا اور باریک آواز سے شور مچاتے ہوتے خود غوطہ لگانا اور اوپر چڑھنا اور چکر کاٹنا شروع کر دیا۔

وہ اب سمندر کے قریب تھا اور بالکل اُس کے اُوپر اُڑ رہا تھا اور وہ اس کے بالکل مقابل تھا۔ اُس نے اپنے نیچے نہایت وسیع ہرا سمندر دیکھا جس کے اُوپر چھوٹی چھوٹی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ اور اُس نے اپنی چونچ اِدھر اُدھر گھمائی اور خوشی سے چیخنے لگا۔ اس کے ماں باپ اور اسکے بھائی اور بہن اس کے سامنے اس سبز فرش پر اتر گئے تھے۔ وہ باریک آواز سے پکار کر اس سے اشارے کر رہے تھے۔ اُس نے ہرے سمندر پر کھڑے ہونے کے لئے اپنی ٹانگیں لٹکائیں۔ اس کی ٹانگیں اس میں ڈوب گئیں۔ وہ خوف سے چیخا اور اپنے بازو پھڑپھڑا کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھوک سے کمزور اور تھکا ہوا تھا اور اس عجیب ورزش سے اور بھی تھک کر اُٹھ نہ سکا۔ اُس کی ٹانگیں سبز سمندر میں ڈوب گئیں اور پھر اس کا پوٹا اس سے چھو گیا اور وہ زیادہ نہ ڈوبا۔ وہ اس پر تیر رہا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف اس کا خاندان چیخ چیخ کر اس کی تعریف کر رہا تھا اور اُن کی چونچیں اس کو مچھلیوں کے ٹکڑے پیش کر رہی تھیں۔

اس نے اپنی پہلی پرواز کی تھی۔

(ترجمہ) سید اصغر علی

روٹی

شہر کی گنجان آبادی سے دُور ایک درسگاہ بنائی گئی تاکہ علمی فضا شہریت کے مذموم اثرات سے پاک رہے۔ درسگاہ کے کئی بورڈنگ تھے۔ جن کی عمارتیں بڑی عالیشان تھیں، ان ہی شاندار عمارتوں کے قریب چند خس پوش چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں جن میں وہ مزدور رہتے تھے جو دُور دراز کے دیہات سے یہاں محنت مزدوری کرنے آئے تھے مگر تعمیر کا کام ختم ہوجانے کے بعد اپنے گاؤں کو واپس جانے کے بجائے یہیں رہ پڑے، کچھ لوگ بورڈنگ کے باغیچے میں درختوں کو پانی دینے کے لئے ملازم ہوگئے، بعضوں نے قرب وجوار کے ذی حیثیت گھرانوں میں ملازمت اختیار کرلی، اور کچھ اب تک مزدوری ہی کرتے تھے۔ مگر ان کا معاملہ ایسا ہی تھا کہ ایک ہفتہ کام مل گیا تو دوسرا ہفتہ یوں ہی گذر گیا ان کی عورتیں جو پہلے مٹی اور چونا ڈھوتی تھیں، اب گھروں میں جھاڑو دینے، میلے برتن دھونے اور کنوئیں سے پانی لانے کا کام کرنے لگی تھیں، جن کو قلیل تنخواہ کے علاوہ کبھی کبھی گھر کا بچا ہوا کھانا اور سال میں ایک آدھ مرتبہ بیگم صاحبہ کی پرانی ساری مل جاتی تھی۔

بورڈنگ میں کئی سو لڑکے رہتے تھے، اور ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی وہیں تھا۔ طعام خانہ میں روزانہ "معمولی" کھانا پکتا تھا، البتہ جب کبھی ٹی پارٹی ہوتا، یا غیر معمولی تقریب، یا کوئی بڑا اور معزز مہمان آتا تو مختلف قسم کی چیزیں تیار کی جاتی تھیں، جن کی خوشبوؤں سے ڈائننگ ہال کی دیواریں ہفتوں تک مہکا کرتی تھیں۔ اور شاید ان ہی کھانوں کی خوشبوؤں کی کشش نے ڈائننگ ہال کے گرد کتوں، بلیوں اور مزدوروں کے بچوں کا ایک غول پیدا کردیا تھا جو دن بھر طعام خانہ کا طواف کرتا رہتا تھا۔

جب لڑکے کھانا کھانے بیٹھتے تو روٹیوں کے چوڑے چوڑے کنارے، خواہ وہ جلے ہوتے اور کچے ہوں یا نہ ہوں توڑ کر بیچ کا حصّہ کھایا کرتے تھے، بعض نفاست پسند طلبا تو روٹیوں میں سے ایک ہی نوالہ لیتے اور باقی حصّہ چھوڑ دیتے تھے، کھانا ختم ہونے کے بعد میز پر ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے، طعام خانہ اور بورڈنگ کے ملازم جن کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کو جمع کرکے اچھے، صاف اور بڑے ٹکڑے اپنے کھانے کیلئے الگ کردیتے تھے، اور دوسری بچی ہوئی چیزوں کے ساتھ ان کو بھی آپس میں تقسیم کرلیتے تھے، جلے ہوتے، کچے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، رکابیوں کے جھوٹے چاول، جن کو وہ کھانا پسند نہ کرتے تھے، چچوڑی ہوئی ہڈیوں اور چبائے ہوئے چھیچھڑوں کے ساتھ ایک لگ ٹوکری میں رکھکر ایک اونچی کھڑکی سے نیچے پھینک دیا کرتے تھے، کھڑکی کے نیچے خارش شدہ اور بیمار مختلف قدوقامت کے سفید اور سیاہ کتے ہوتے تھے یا مزدوروں کے ۷۔ ۸ سالہ بچے اور بچیاں، جن کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی ہوتی تھی یا کبھی کسی کے گلے میں اپنے بڑے بھائی کی کوئی بوسیدہ اور میلی قمیص نظر آجاتی تھی، چھوٹے بچے عموماً بالکل برہنہ ہی رہتے تھے، جب اوپر سے چیزیں پھینکنے کا وقت آتا تو قمیص والے یا جن کی لنگوٹیاں ذرا بڑی ہوتی تھیں اپنی اپنی جھولیاں پھیلا دیتے، بعض اِدھر اُدھر سے مٹی کے گھڑوں کے ٹکڑے یا مٹی کی ٹوٹی ہوئی رکابیاں اُٹھا لاتے، اور جن کو کچھ بھی نہ ملتا وہ اپنے دونوں ہاتھ ہی پھیلا کر کھڑے ہوجاتے تھے۔

پھینکی ہوئی چیزیں اُن کے بالوں، سروں، اور جسموں پر سے ہوتی ہوئی، جھولیوں، مٹی کے ڈھوبروں اور ہاتھوں میں گرتی تھیں اور کچھ زمین پر گرجاتی تھیں، جس بچے کی جھولی یا برتن میں سب سے زیادہ حصّہ گرتا وہ خوش قسمت سمجھا جاتا تھا، وہ خوشی کے مارے بھاگتا اور دوسرے اس کا تعاقب کرتے۔ اگر وہ طاقتور ہوتا تو دوسروں کو مار کر بھگا دیتا تھا اگر کمزور ہوتا تو دوسرے اس کا حصّہ چھین لیتے تھے، اور وہ روتا رہ جاتا تھا، بعض وقت چھینا جھپٹی میں ان کی ساری نعمت زمین پر گرجاتی اور یہ حسرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے، پھر کسی کمزور کو قصوروار ٹھہرا کر اس کو گالیاں دیتے، اور آپس میں ریٹ شروع ہوجاتی۔ لڑائی کے درمیان ہی کوئی ہوشیار بچہ زمین کی گری ہوئی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر جلد جلد کھانا شروع کردیتا تو دوسرے بھی اُس کی تقلید کرتے، اور پھر سب دوست ہوجاتے اور دوسرے کھانے کا انتظار کرنے لگتے تھے۔

بچوں اور کتوں میں بڑی دوستی تھی۔ انتظار کا وقت کاٹنے کیلئے دونوں آپس میں کھیلا کرتے تھے، بچے کتوں کو پیار کرتے، انکے کان پکڑتے اور ان کے جسم پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ کبھی کوئی بچہ کسی کتے کی دم زور سے کھینچ لیتا تو وہ بھوں بھوں کرتا ہوا بھاگ جاتا مگر

پھر تھوڑی دیر میں پاس آ کر دُم ہلانے لگتا تھا، جو چیزیں زمین پر گرتی تھیں وہ کتوں کا حصہ ہوتی تھیں، پھر بچے اپنی جھولیوں اور رکابیوں سے ہڈیاں بھی اُن کے آگے ڈال دیتے تھے اس لئے ان میں کبھی تکرار نہ ہوتی تھی، اور دونوں امن وچین سے زندگی کے دن گذارتے تھے، جب بوڑھا کتا سو جاتا تو چھوٹا پلا اس کی جگہ لے لیتا تھا۔ اور جب کوئی بچہ محنت مزدوری کے قابل ہو جاتا اور حسن اتفاق سے اس کو کوئی کام بھی مل جاتا تو دوسرا چھوٹا بچہ اسکی جگہ آنے لگتا تھا۔

درسگاہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بند ہوئی، اور جب تین ماہ بعد بورڈنگ کھلا تو بڑی دھوم تھی، تین ماہ کے بچھڑے ہوئے دوست مل رہے تھے، بعض پُرانے احباب رخصت ہو چکے تھے اُن کی جگہ نئی نئی صورتیں نظر آ رہی تھیں، باورچی خانہ کا چولھا جو تین ماہ سے ٹھنڈا پڑا تھا پھر گرم ہو رہا تھا، طعام خانہ کے ملازم جو آرام کی نیند کے عادی ہو چکے تھے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے، کتے اور بچے جو اس عرصہ میں کافی مضمحل اور اداس ہو گئے تھے پھر صبح ہی سے طعام خانہ کا چکر لگا رہے تھے، دوپہر کے کھانے کا سب کو انتظار تھا، طالب علموں کو اس لئے کہ سب ایک جگہ جمع ہوں گے، ہنسی مذاق رہے گا، نئے لوگوں پر فقرے چست کئے جائیں گے، ان کو پریشان کرنے کے لئے اُن پر روٹیوں کی گولیاں بنا بنا کر پھینکی جائیں گی، بچوں اور کتوں کو اسلئے کہ آج پھر طویل مدت کے بعد اُن کو انکا حصہ ملے گا۔

خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا، حسب معمول چیزیں جمع کی گئیں اور کھڑکی سے نیچے پھینکی گئیں، بچوں اور کتوں کا غیر معمولی ہجوم تھا، اتفاق سے ملازمین کی نظر سے بچ کر چھوٹے ٹکڑوں میں ایک جلی ہوئی پوری روٹی آ گئی، ایک بچے نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ زمین پر گر گئی، قبل اس کے کہ وہ اس کو اُٹھا سکے ایک کتے نے اس کو منہ سے اُٹھا لیا، بچہ اپنی نعمت غیر مترقبہ کو یوں آسانی سے کھونے کیلئے تیار نہ تھا۔ اس لئے اس کو غصہ آ گیا اور اُس نے جھنجلا کر بچے کی ران کو بھنبوڑ ڈالا، بچہ درد سے بلبلا اُٹھا، گھبراہٹ اور تکلیف میں روٹی اسکے منہ سے گر گئی جس کو جلدی سے ایک دوسرے لڑکے نے منہ میں رکھ لی۔ پھر کتے کے ایک پتھر زور سے کھینچ مارا، جو اس کی ٹانگ پر پڑا، کتا لنگڑاتا اور چیختا ہوا بھاگ گیا۔

شام کو لنگڑاتا ہوا کتا اور ران پر ہلدی لگا ہوا بچہ، دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے پھر شام کے کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔

"ہانی سو"

وَاللہُ اعلم بالصواب

(بسلسلہ صفحہ ۶۲)

جاتے، بڑی خیریت ہو گئی کبھی وہ فقیر مجھے مل جائے تو مزا ہی آ جاتے"

میں نے کہا: "تو یار تمہارے خیال میں وہ فقیر نہیں تھا؟"

مسعود خاں: "تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ وہ ضرور اسی گینگ کا آدمی تھا"

میں: "بہرحال کوئی بھی ہو میرے اس راستہ بھولنے کو اور اُس فقیر کو کوئی بھی واسطہ نہ تھا۔

افسوس کہ اس فلسفہ پر اس سے آگے اور باتیں نہ ہوئیں دوسری گپیں شروع ہو گئیں انہی میں شام ہو گئی۔ سات بجے کی گاڑی سے مسعود خاں اور یہ سب لوگ بھی چلے گئے۔ لیکن ناظرین نے خیال کیا ہو گا کہ کس مزے سے خود بخود فلسفانہ اور عالمانہ گفتگو کسی ایک خاص نتیجہ پر پہونچنے والی تھی۔

خیر وہ باتیں ختم ہوئیں، وہ وقت نکل گیا، برسوں گذر گئے۔ میں بھی ان واقعات کو بھول سا گیا۔ کوئی تین برس کے بعد جبکہ بریلی سے پیلی بھیت آ رہا تھا، بھوجی پورہ اسٹیشن پر بہت سے سپاہیوں اور قیدیوں کو دیکھا۔ انہی میں بلدیو اصاحب بھی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ میرے پاس سے اُسی زمانے میں کبھی کی نوکری چھوڑ کر چلدئے تھے۔ اب جو ان کو اس حال میں دیکھا تو رنج ہوا۔ وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا کہ سلطانہ کے گینگ کی گرفتاری کے سلسلہ میں آپ بھی ایک مرد ہیں۔ بڑا تعجب ہوا۔ جب گاڑی میں بیٹھ کر چلدیا تو از خود پُرانے واقعات یاد آنے لگے۔ اور اس یقینی نتیجے پر پہونچ گیا کہ اُس دن کا دن بھر بہکنا بلدیو اصاحب کی مہربانی تھی۔ مجھ پر رحم کھا کر برابر مجھے سلطانہ کی ملاقات سے محروم کر رہے تھے لیکن پھر شک کی گنجائش یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیا اُن کا یہ ترحم اُسی فقیر کی دُعا کا اثر تھا یا میری خوش قسمتی کا باعث۔ واللہ اعلم بالصواب،

سید رفیق حسین،

مسز برلاس کا خط

عزیز بھائی میاں شاہد صاحب

جب سے دہلی سے آئی ہوں یہ حال ہے کہ کسی عنوان دل یہاں نہیں لگتا۔ بس نہیں چلتا کہ گھڑی کی چوتھائی میں پھر وطن پہونچ جاؤں۔ سبکی محبت اور یاد پہلے سے دوگنی دل کو تڑپا رہی ہے۔ خیر کبھی تو خدا ہماری بھی سُنے گا۔

چار مہینے سے زیادہ ہولنے آئے والدہ صاحبہ کا کوئی خط نہیں آیا سخت فکر ہے حالانکہ میں پابندی سے ہر ماہ خط لکھ رہی ہوں۔ اگر وہ صحت مند ہوتیں تو شاید اتنی بیقراری نہ ہوتی مگر اب تو دل کا بُرا حال ہے۔ روزانہ آنکھیں ڈاک میں اُن کے خط کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تقریبًا تھک چکی ہیں آخر تم کو تکلیف دے رہی ہوں کہ کسی نہ کسی طرح خود معلوم کرکے یا عزیز اخلاق احمد کو بھیجکر ان کی خیریت کے دو حرف سے مجھے مطلع کرو۔ شکر گذار ہونگی اور اُن سے تاکید کرادو کہ خدا کیلئے مجھ پر دیر پر یہ کیسا ظلم ہے کہ مہینوں خط کا پتہ نہیں۔

میں تنہا بغرض شانگھائے آئی ہوں کچھ روز ٹھہرونگی۔ برلاس صاحب وہیں توکیو میں ہیں۔

امریکہ کے جہاز پریسیڈنٹ لاتن میں سفر کیا ہے ۲۳ ہزار ٹن کا فلک بوس شاندار جہاز ہے، چھ منزلہ ہے۔ صرف فرسٹ کلاس کے ڈائننگ ہال میں ۲۷ میزیں ہیں۔ کیبن بھی کشادہ مع غسلخانوں اور واش بین کے ہیں۔ نشست کے بڑے بڑے دو ہال ہیں اور ایک لائبریری کا کمرہ ہے ایک جمناسٹک کا ایک اور مختلف کھیلوں کا مثلاً پنگ پونگ، رنکو وغیرہ۔ تمام کمرے عمدہ فرنیچر اور بجلی کے پنکھوں سے آراستہ ہیں۔ تیسری منزل پر تیرنے کے لئے حوض موجود ہے بالکل اوپر کی چھت پر ٹینس کورٹ اور کتوں کے کیبن ہیں۔ وہیں کیپٹن اور مختلف افیسر کے کیبن ہیں۔

فرسٹ کلاس کا ڈیک اس قدر بڑا ہے کہ اگر اسکے چاروں طرف آٹھ پھیرے کرو تو ایک میل کے برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ لوگ چہلقدمی کیا کرتے تھے۔ دوسری منزل میں قیمتی اور ملک در ملک کی مشہور چیزوں کی دُکان موجود ہے۔ ڈائننگ ہال میں لاوڈ اسپیکر لگا ہوا ہے کھانے کے دوران میں ضروری اعلانات سے ہمیں مطلع کیا جاتا ہے۔

اس جہاز کا کھانا نہایت عمدہ اور بہتات سے ملتا ہے۔ یہ نہیں کہ سسکتی نے دیا بلکتی نے کھایا۔ جیب جلی نہ سواد پایا۔ کھانا میز پر دیکھتے ہی جی سیر ہو جاتا ہے۔ ڈشیں کی ڈشیں آدمی کہاں تک دوزخ میں اتارے جائے۔ کیبن میں برف سے بھرے تھرماس اور عمدہ سے عمدہ امریکہ کے پھل رکھے ملتے ہیں۔ امریکہ کا چھوٹا خربوزہ بادامی رنگ کا بڑا خوش ذائقہ اور شیریں ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے خربوزے سے قدرے بڑا ہوتا ہے۔

رات کو سینما اور ڈانس ہوتا ہے۔ امریکن لوگ بڑے بااخلاق ہیں۔ جس روز کوبے سے جہاز نے لنگر اُٹھایا اس کے دو گھنٹے بعد سمندر میں بلا کا طوفان آیا اور شام تک اس قدر زور پکڑا کہ خدا کی پناہ جہاز کے سب دروازے اور کھڑکیاں ایکدم بند کر دی گئیں۔ ۲۳ ہزار کا قلعہ نما جہاز مثل پتہ کے جھکولے کھا رہا تھا۔ میری طبیعت بہت خراب ہوئی اور سر مُنہ اوندھا کئے کیبن میں پڑی رہی۔ استفراغ نے ادھ مؤا کر دیا۔ نرس نے تیمار داری کی۔ خدا خدا کرکے کہیں صبح سمندر میں سکون ہوا کئی وقت کے فاقہ اور چکروں نے بے حال کر دیا تھا۔

شانگھائے پہونچنے سے پہلے تقریبًا چھ سات گھنٹے جہاز دریائے ینگسی کیانگ کے مَیلے اور پیلے پانی میں میّوں میّوں رینگتا ہوا رات کے ساڑھے آٹھ بجے سمندر میں جاکر ٹھہرا۔ اور وہاں سے موٹر لنچ پر مُسافروں کو لاد کر ساڑھے نو بجے جٹی پر پہونچایا۔ طوفان کی وجہ سے آٹھ گھنٹے جہاز دیر میں پہونچا۔

زندگی میں جہاز کا سفر پہلی دفعہ تنہا کیا ہے۔ توکیو میں برلاس صاحب نے امداد دی تھی۔ مگر جیسے ہی توکیو سے ریل میں قدم رکھا سب ذمہ داری اپنے کندھوں پر ہو گئی۔ ریل کا سفر بخیر و خوبی ختم کرکے جہاز پر پہونچی سامان کی دیکھ بھال کی اور سب کام کر کرا کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس سفر سے پہلے سفر کی بیرونی ذمہ داری سے ہر طرح نجات تھی برلاس صاحب کے دامن کے سائے تلے اِدھر سے اُدھر کھنچے پھرتے تھے اس دفعہ تنہا سفر کیا اور وہ بھی جہاز کا۔ شاہد میاں اپنی بہن کی اس جُرأت پر ضرور خوش ہونگے۔ کم از کم مجھے تو خاصی خوشی ہے کہ اب تو برلاس صاحب مجھکو مضغۂ گوشت نہ کہینگے۔

شانگھائے میں مَیں نیو ایشیا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ گھنٹوں پیدل چلکر شہر کا خوب چکر لگایا۔ ڈاکخانے جاکر خط ڈالے، پھر جہاز کی کمپنی امریکن پریسیڈنٹ لائن میں گئی اور اپنے لئے اس جہاز میں ٹوکیو کی واپسی کے لئے فرسٹ کلاس کا کیبن رزرو کرایا۔ ہفتوں پہلے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے نہیں تو جگہ نہیں ملتی۔ یہ صرف منیلا تک جاکر واپس آجائے گا۔

شانگھائے کی ہندوستانی سکھ پولیس بڑی اچھی ہے اس نے میری جگہ جگہ مدد کی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لمبے لمبے قدآور سکھ گھنی گھنی ڈاڑھی مونچھوں اور سر کے بالوں کا بوجھ لئے خاکی وردیاں پہنے تعینات ہیں۔ بڑا دل خوش ہوا کہ ان کا سلوک بڑا اچھا ہے۔ ایک سکھ سنتری نے تو حد کر دی کہ میرے جائے قیام پر ہندوستانی کھانا پہنچانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ معذرت کی۔ مگر وہ برابر اصرار کرتا رہا۔ ایک دکان پر چینی دکاندار اجنبی دیکھکر ناجائز فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھا سکھ صاحب نے آڑے ہاتھوں لیا۔ تب اُس نے جائز قیمت پر چیز حوالہ کی۔

جہاز میں ایک ہندوستانی لڑکی کو دیکھکر خوشی ہوئی تھی کہ کوئی تو ہندوستانی بھنگا دکھائی دیا دلبستگی رہیگی۔ مگر تو بہ اُلٹی کوفت اُٹھانی پڑی۔ میں نے جان بوجھ کر ڈائننگ ہال کے منتظم سے جو کھانے کی میزوں کا نقشہ ہاتھ میں لئے کھڑے ہوتے تھے جاکر کہا کہ دونوں ہندوستانی خواتین کو ایک ہی میز پر بٹھا دیجئے۔ اس نے میرے اس خیال کو پسند کیا اور کاٹ چھانٹ کر دونوں کو ایک ہی میز پر بٹھا دیا۔

جونہی میں میز پہونچی صاحبزادی نے گلے میں مرکی دیکر کہا۔ "ہلو ہاؤ ڈو یو ڈو" میں جواب دیکر بیٹھ گئی اور کچھ دیر بعد میں نے باتیں شروع کیں۔ معلوم ہوا آکسفورڈ کی تعلیم سے فارغ ہوکر واپس آرہی ہیں چار سال یورپ میں قیام کیا۔ وہ وہاں کی فضا سے بہت متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ اُردو میں ایک لفظ نہیں بولتیں۔ میں نے اُن سے خود کہا کہ آپ اُردو جانتی ہیں بہتر ہوگا کہ ہم دونوں اپنی مادری زبان میں بات کریں۔ کیونکہ بے فائدہ انگریزی کو اوڑھنا بچھونا بنانا مجھے پسند نہیں۔ مگر وہ اپنی ضد پر ڈٹی رہیں۔ جب مجھ سے بات کرتیں انگریزی میں اور میرا یہ حال کہ ہر بات اردو میں۔ وہ صبح ناشتہ پر گڈ مارننگ کہیں تو میں سلام علیکم۔ غرض یہ کہ ان کی ہر بات اور نشست برخاست سے انتہائی بیہودگی اور چھچھورا پن ظاہر ہو رہا تھا کھانے کی میز پر بیٹھیں تو دُور دور بیٹھنے والے یورپینوں سے خواہ مخواہ ہاتھوں کے اشارے، بھدی ہنسی سے بدتمیزی ظاہر کرتیں۔ ٹیبل بوائے سے مثل دوستوں کے باتیں ہوتیں۔ اپنا پروگرام اس کو سنائے بغیر بے کل رہتیں۔ نہ اس کا ہاتھ پکڑنے میں تامل تھا اور نہ بے تکلف بات چیت کرنے میں۔ اپنے ہی ٹیبل بوائے تک محدود نہ تھیں بلکہ اڑوس پڑوس کی میزوں کے ٹیبل بوائے سے بھی باتیں ہوتی تھیں۔ اس لڑکی کے سوائے کسی اور دوسرے یورپین مسافر کو کبھی کھانے کے کمرے میں ایسی حرکتیں کرتے ہوتے نہیں دیکھا۔ ہندوستانی کالے آدمیوں کی طرف مس صاحبہ رجوع نہ ہوتی تھیں۔ یورپین کی دُم کے پیچھے یہاں وہاں لگی پھرتی تھیں۔ جب میں نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو اپنے لب پر مُہرِ سکوت لگا لی، وہ خود بولتی تو میں مختصر سا جواب دے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ دراصل میں اپنے کئے پر پچھتا رہی تھی کیونکہ اُس کی صحبت مجھے ایک آن نہ بھائی۔ سب کیا دھرا میرا اپنا تھا، مجبوراً سہا کی۔

طوفان کی وجہ سے میری طبیعت خراب تھی اور کیبن آباد تھا، تین وقت جب میں ڈائننگ ہال نہیں گئی تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار "ہلو" کہتی ہوئی میرے کیبن میں مزاج پرسی کے لئے آئیں۔ میں نے انکا شکریہ ادا کرکے چھالیہ الائچیوں کا بٹوا پیش کیا۔ وہ "نو تھینکیو" کہکر ایسی پیچھے ہٹیں کہ کہیں بٹوا انہیں چمٹ نہ جاتے۔ چار سال کے بعد جو شخص اپنے وطن آتے اور اس کی چیزوں سے مثل ہیجا کے ڈرے، کہاں قابل درگزر ہے۔ چھالیہ الائچی تو کا ہے گا ہے یورپین بھی کھالیتے ہیں۔ ان کی اس بے پروائی سے مجھے افسوس ہوا۔ حد یہ کہ خیر سے آپ ہندوستانی خد و خال کو بھی بھلا چکی ہیں۔ ایک دوسرے ہندوستانی صاحب پیچھے کی میز پر بیٹھے تھے میں نے اُن سے بات کی تو پوچھنے لگیں یہ کون ہیں میں نے کہا ہندوستانی ہیں تو آپ نے لمبی تان سر کہا: "اوریلی" میں نے جواب دیا دُنیا میں کبھی بھی ہندوستانی خد و خال خوبصورت روشن آنکھیں اور ستواں ناک چُھپائے نہیں چُھپ سکتا۔

میں نے جہاز پر دیکھا فلپین لوگ سفر کر رہے تھے۔ وہ انگریزی میں خوب ماہر ہیں مگر جب آپس میں بات کرتے تو اپنی زبان میں۔ میرا دل اس لڑکی سے گھبرا گیا کیونکہ یہ تو اپنے دونوں لبوں کی شربت بنفشائی لاکھی کُلھیا کی شکل بنا کر ہر وقت "اوریلی اوریلی" کرتی رہتی تھیں جس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ آخر میں سکنڈ کلاس کے ہندوستانی مسافروں کے پاس اُٹھنے بیٹھنے لگی۔ مگر اس جہاز میں ایک دقت تھی کہ بغیر اجازت کے فرسٹ کلاس والے

سیکنڈ میں نہیں جا سکتے تھے اور سیکنڈ کلاس والے فرسٹ کلاس میں۔ فرسٹ کلاس ڈک پر قفل پڑا ہوا تھا۔ اجازت لو تو کھول دیا جاتا تھا۔

صورت اور لباس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ صورت خدا کی عطا کردہ ہے اور لباس اپنی پسند پر۔ مگر اور بیہودگیاں اترا ہٹ زہر لگی۔ ایسی لڑکیاں کیا ملک و قوم کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔ کاش اُن کی تربیت اپنے ملک میں پہلی اچھی ہوتی تب اعلیٰ تعلیم اُن کے کار آمد تھی۔ میں کیا، اس لڑکی کو جو کوئی دیکھے گا ناپسند کریگا۔ کسقدر افسوس کی بات ہے کہ ہماری لڑکیاں تھوڑے عرصے باہر رہ کر اس قدر متاثر ہوتی ہیں کہ انھیں اپنے ملک کی ہر چیز بری لگتی اور دونوں دونوں ہاتھوں سے اپنے تمدن کو روندتی ہیں۔ خدا رحم کرے۔

شانگھائے میں ہندوستانی میرا بہت خیال کر رہے ہیں ہر طرح میری مدد کرتے ہیں۔ یہ خط تو رفتہ رفتہ مضمون کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے اس لئے ختم کرتی ہوں۔ میں نے ہرگز اسکو اشاعت کی غرض سے نہیں لکھا اور نظر ثانی کی بھی فرصت نہیں۔ مگر ایک اڈیٹر کی نظر کا کسی کو کیا علم۔ بہرحال اگر قابل اشاعت سمجھو تو ساقی کی نذر ہے.........؟ دُعاگو بہن

اشرف جہاں برلاس

غزل

تھی نظر ملانے کی آرزو زمانے سے — ہوش ہو گئے رخصت کیوں نظر ملانے سے

مل گیا پتہ ان کا دیکھ لی گلی ان کی — ہو گیا سکوں دل کو لگ گیا ٹھکانے سے

ذوق دید پیہم بھی کاش وہ عطا کر دیں — لطفِ سجدہ قائم ہے جن کے آستانے سے

مضطرب نہیں ہوں میں مطمئن نہیں ہوں میں — ہو گئی عجب حالت دل کسی پہ آنے سے

سرگذشتِ دل میری۔ واہ اس کا کیا کہنا — بن گئے کچھ افسانے اک اسی فسانے سے

بیقرار کرنے کی آ گئی ادا اُن کو — باز اب نہ آئیں گے وہ نظر چُرانے سے

خوش توجہِ خاطر کر رہی ہے دونوں کو — دوست کیوں پریشاں ہو دوست کے ستانے سے

دیکھ دیکھ کر مجھ کو مے پلائی ساقی نے — جُھوم جھوم کر نکلا میں شراب خانے سے

کیا غضب ہے اے منظور اُس بت پری رو کا
مُسکرا کے اٹھ جانا نیند کے بہانے سے

علی منظور

سڑک

زُلف کھولے، مُنہ اُٹھائے، سینہ تانے وہ سڑک — چیرتی جاتی ہے بازاروں کی چھاتی بے دھڑک

حُسنِ رنگا رنگ کے ضو ریز آئینے لئے — قہقہوں کے زلزلے، شورش کے ہنگامے لئے

پاؤں، نعلوں، پہیوں اور ٹاپوں سے ہے کچلی ہوئی — بوجھ اٹھاتے تھک گئی لیکن کمر سیدھی رہی

آج بھی یہ مستعد ہے رہنمائی کے لئے — آج بھی اس کی ضرورت ہے رسائی کے لئے

ہے کلیجہ وقف اس کا ٹھوکروں کے واسطے — شہر میں مشہور ہے یہ حادثوں کے واسطے

جنّت و کوثر کی رعنائی کا ہے آئینہ دار — صبح کو اس کا نکھار اور شام کو اس کا سنگار

اس کی رونق ایسے نظارے ہیں فردوسِ نظر — جس طرح ہو حُسن کی لبریز جلوہ رہگذر

ایک تتلی جا رہی ہے رنگ سامانی لئے — ہر ادا میں دعوتِ عیش و ہوس رانی لئے

کھڑکیوں سے جھانکنے والے مسخر ہو گئے — دل کے شیشے اس طرح ٹوٹے کہ ساغر ہو گئے

"چھپے والے" کی صدا دل میں سمجھ کر رہ گئی — ہر نظر ساری کی لہروں میں اُلجھ کر رہ گئی

دوڑتی جاتی ہے وہ موٹر تھرکتی، بولتی — بار سے سرمایہ داری کے لرزتی، ڈولتی

ہچکیاں لیتے ہوئے تانگوں میں لوگوں کا گروہ — دیکھتا جاتا ہے حیرت سے مکانوں کا شکوہ

چیختا دوڑا کوئی اخبار کے پرچے لئے — "جرمنی نے ناروے کے چند قلعے لے لئے"

دُور وہ رکھے ہیں کوڑے کے جہاں پر ڈھیر سے — کر رہا ہے اک سپیرا کچھ تماشہ دیر سے

سامنے "سینما" کی چھت پر جگمگاتے ہیں نجوم — لگ رہا ہے ساریوں، بُرقعوں کا سوٹوں کا ہجوم

زر، حکومت، عیش و عشرت کی نہیں ہے جستجو — نیش زن دل میں ہے لیکن بس یہی اک آرزو

سایۂ گردِ دُنیا کی وسعت پر ہو دامانِ فلک
زیرِ پا پھیلی ہوئی ہو پُر فضا لمبی سڑک

مخمور جالندھری

بہترین سُرمہ بالکل مُفت حاصِل کریں

اس وقت اشتہار جس رنگ میں دئے جاتے ہیں، وہ لوگوں کیلئے سچائی کا معلوم کرنا بالکل ناممکن بنا دیتا ہے۔ لفاظی اور آسمان و زمین کے قلابے ملانے میں ان لوگوں کو ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگ دو آنے کی چیز مفت تقسیم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور چو۴ آنے اخراجات ڈاک کے نام پر طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ اسی خرچ ڈاک کے نام پر وہ تین سو فی صدی نفع حاصل کر لیتے ہیں۔ اِن حالات کو دیکھتے ہوئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے دواخانے کا سُرمہ میرا خاص و اکسیر چشم کی پچاس شیشیاں بالکل مفت صرف اس شرط پر رسالہ ساقی کے خریداروں کے نام ارسال کریں گے، کہ وہ اس کے استعمال کا وعدہ کریں۔ اور اس کے بعد اس کے نفع یا نقصان کی پوری پوری کیفیت بھی لکھ بھیجیں اور اگر مفید پائیں تو اپنے دوستوں سے اس کا ذکر کرتے رہیں۔

سُرمہ میرا خاص دھند، جالا، نظر کی کمزوری، سُرخی چشم، پانی بہنے وغیرہ امراض کے لئے مُفید ہے۔ اور اکسیر چشم ککروں اور ناخُنہ وغیرہ کی قسم کی امراض کے لئے مُفید ہے۔ ہم لمبی چوڑی تعریف کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ منگواکر استعمال کریں۔ اور خود ہی فیصلہ کر لیں۔ سُرمہ رجسٹرڈ پارسل کی صورت میں ارسال ہوگا۔ جس پر سات آنے فی پارسل خرچ آتا ہے۔ جو ہم خود ادا کریں گے۔

ملنے کا پتہ

مینیجر۔ دواخانہ خدمتِ خلق۔ قادیان۔ ضلع گورداسپور (پنجاب)

ساقی ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصولڈاک۔ فی پرچہ ۶/
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جُرعات

ہر سال ساقی کے دو خاص نمبر
شائع ہوتے ہیں۔ مستقل
خریداروں سے اُن کی
قیمت الگ نہیں لی جاتی۔

جلد ۲۲ | ساقی دہلی۔ بابت ماہِ نومبر ۱۹۴۰ء | نمبر ۵

قیمت فی پرچہ چھ آنے (۶/)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

ساقی کی گزشتہ اشاعت میں ناظرینِ ساقی سے مضامین کے متعلق مفید مشورے طلب کئے گئے تھے۔ لیکن بہت کم حضرات نے مشورہ دینے کی زحمت گوارا فرمائی۔ مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی فرماتے ہیں کہ "جس دن سے ساقی جاری ہوا ہے برابر ترقی کر رہا ہے اور بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اُردو کے علاوہ ہندی میں بھی ساقی ایک خاص شہرت کا مالک ہے۔ جس طرح اُردو کے اکثر اخبار اور رسالے ساقی کے مضامین نقل کرتے ہیں ہندی میں بھی ساقی کے افسانے نقل کئے جاتے ہیں۔ پچھلے تین مہینے میں ساقی کے سات افسانے ہندی کے مختلف رسائل میں دیکھ چکا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ مضامین نقل ہوئے ہوں کیونکہ ہندی کے سب رسالے میری نظر سے نہیں گزرتے۔ اُردو کے رسالوں میں یہ فخر صرف ساقی ہی کو حاصل ہے"۔ ایک اور مہربان جو بہار کی طرف کسی اسکول میں پڑھتے ہیں لکھتے ہیں کہ "ساقی کا حصۂ نظم بہت کمزور ہوتا ہے۔ میں اپنی چند غزلیں بھیج رہا ہوں۔ انہیں شائع کر دیجئے"۔ نور الحسن صاحب دیوریاسی لکھتے ہیں کہ "ساقی میں طویل تراجم شائع نہیں ہونے چاہئیں"۔ ایک محترم خاتون جو شروع سے ساقی کی خریدار ہیں لکھتی ہیں کہ ——— "پچھلے دنوں میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ساقی منگانا بند کر دوں کیونکہ اس میں ایسے مضامین شائع ہونے لگے تھے کہ ساقی شریف عورتوں کے پڑھنے کے لائق نہیں رہا تھا۔ مگر اب آپ نے اپنی روش بدل دی ہے اس لئے میں نے بھی اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ برائے کرم اس بات کا خاص لحاظ رکھئے کہ ساقی کے پڑھنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی ہے"۔ ہم ان سب حضرات کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اپنے مفید مشوروں سے ہمیں مستفیض فرمایا۔

سالنامۂ ساقی کے لئے جو مضامین موصول ہو چکے ہیں اُن سے نصف پرچہ مرتب کیا جا چکا ہے۔ انکی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) شاہسوار (افسانہ) از حضرت ایم۔ اسلم۔ (۲) سہرا ہے (مزاحیہ) از مسٹر امتیاز علی تاج۔ (۳) زمین کی گردش (افسانہ) از محترمہ حجاب امتیاز علی۔ (۴) سوزِ محبت کا آتشکدہ (علمی مقالہ) از حضرت ماہر القادری۔ (۵) سلتے (افسانہ) از مسٹر احمد ندیم قاسمی۔ (۶) شکنتلا (ڈرامہ) از مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے۔ (۷) لیکچر (طنزیہ) از محترمہ عصمت چغتائی۔ (۸) تہذیب کا مستقبل (علمی مقالہ) از پروفیسر سراج حسین نقوی۔ (۹) لفنگا (افسانہ) از ڈاکٹر نصیر الدین۔ (۱۰) ریحانہ (ڈرامہ) از مسٹر حفیظ جاوید "کامران"۔ (۱۱) فسادی باتیں (مزاحیہ) از جناب ناکارہ حیدرآبادی۔ (۱۲) انتقام (افسانہ) از مسٹر بھارت چند کھنّہ۔ (۱۳) شرم کی نفسیاتی تحلیل (علمی مضمون) جناب محمد احمد سبزواری۔

ان مضامین کے علاوہ چغتائی صاحب اور جناب "آوارہ" کے مزاحیہ مضامین، ڈاکٹر عندلیب شادانی کا تنقیدی مقالہ، پروفیسر مسلم اور سید بادشاہ حسین کے علمی مضمون، سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر اعظم کریوی، اشرف صبوحی دہلوی، ممتاز مفتی، شاہد لطیف، مدھوسودھن راھی، بلونت سنگھ اور دوسرے مشہور افسانہ نگاروں کے افسانے بھی سالنامے میں شامل ہونگے۔ اُمید ہے کہ دسمبر کے ساقی میں ہم مفصل فہرست پیش کر سکیں گے۔ شائقین منتظر رہیں۔

افسوس ہے کہ اس اشاعت میں سب مطبوعاتِ موصولہ پر تبصرہ شائع نہیں ہو سکا۔ اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت میں مزید تبصرے شائع ہو سکیں گے۔

"شاھد"

نمبر ۱

دورِ حاضر اور اُردو غزلگوئی

طومارِ اغلاط

پچھلی دو قسطوں میں بادشاہِ متغزلین[1] کی اضطراری "جدتوں" اور حضرتِ جگر کی "مستانہ وار" لغزشوں پر ہلکی سی روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ ارادہ تھا کہ اس مرتبہ حضرت اصغر کے "بہترین شاہکار ادب" سے قارئین کی ضیافتِ طبع کا سامان کیا جائے۔ مضمون تقریباً لکھا جاچکا تھا کہ اتنے میں رشید احمد صاحب صدیقی، پروفیسر علیگڈھ یونیورسٹی کا ایک مقالہ اصغر مرحوم کے متعلق رسالہ جامعہ میں نظر سے گذرا۔ اُسے پڑھکر مرحوم کی ذاتی خوبیوں کا طبیعت پر کچھ ایسا اثر پڑا کہ اُن کی شاعرانہ کوتاہیوں کا تذکرہ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔ اس لئے اس مضمون کی اشاعت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اصغر صاحب کے بعد حضرتِ فانی کی باری ہے۔

"باقیاتِ فانی" کے مقدمہ نگار کے بقول فانی صاحب کی شاعری میر، غالب اور مومن کی شاعری کا نچوڑ ہے اور "غالب کے مقابلہ میں تو انکو ایک امتیازی حیثیت دی جاسکتی ہے"۔ اس محل پر "امتیازی حیثیت" کے معنی ترجیح نہیں بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ فانی صاحب کے کلام میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اُن کے اور غالب کے کلام میں فوراً امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک خصوصیت یہ ہے کہ آپ جس لفظ کو جس محل پر جس معنی میں چاہیں استعمال کرسکتے ہیں۔ غالب کو یہ بات نصیب نہیں۔ غالب کے یہاں الفاظ کے وہی معنی ہیں جو سب کے نزدیک مسلّم ہیں اور محلِ استعمال بھی معین ہے۔ مگر بیسویں صدی کا متجدد شاعر اس رسمِ کہن کی تقلید ضروری نہیں سمجھتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنے سے شعر ایک اعجوبہ بلکہ اضحوکہ بن جاتا ہے مگر "شانِ امتیاز" بہرحال باقی رہتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

ماسولے دل میں اک ہنگامہ برپا کر گیا   چشمِ کافر کا وہ دل لیکر مکرر دیکھنا

"ماسوائے دل" کے معنی ہیں "دل کے علاوہ اور جو کچھ ہے"۔ لہٰذا شعر کا مطلب یہ ہوا کہ چشمِ کافر نے دل لینے کے بعد جب مکرر دیکھا تو دل کے علاوہ اور جو کچھ ہے اس میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اب اگر "ماسوائے دل" محدود معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق صرف اپنی ذات سے ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ دل کے علاوہ دوسرے اعضا اس سے متاثر ہوئے مثلاً پیٹ چلنے لگا، یعنی چشمِ کافر نے مسہل کا کام کیا۔ اور اگر "ماسوائے دل" وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہوگئے مثلاً اٹلی نے حبش پر قبضہ کرلیا۔ غالب اپنے تخیل کی بلند پروازی کیلئے مشہور ہیں مگر یہ بات کہاں۔ یہ صرف حضرتِ فانی کا حصّہ ہے۔

ایک مولوی صاحب کا خیال ہے کہ "فانی صاحب کو "ماسوا" کے لغوی معنی معلوم نہ تھے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا اور جو کچھ ہے اُسے "ماسوا" کہتے ہیں کیونکہ یہ دراصل "ماسوا اللہ" کا مخفف ہے۔ اور اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ مخلوقات و موجودات ہے۔ اس لئے ماسوا بمعنی دنیا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کہیں کہ "ماسوا سے دل لگانا اچھا نہیں" تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ "دنیا سے دل لگانا اچھا نہیں" مگر ظاہر ہے کہ یہ مجازی معنی ہیں۔ فانی صاحب بیچارے کلمہ کی اصل وضع سے تو واقف نہ تھے۔ ماسوا کے معنی "دنیا" کہیں سُن لئے تھے۔ لہٰذا لکھدیا "ماسوائے دل" یعنی "دل کی دنیا"۔ یہ نہ سمجھے کہ دل کے ساتھ مرکب ہونیکے کے بعد "ماسوا" کچھ اور ہوگیا اور ماسوائے دل کے معنی ہوئے "دل کے علاوہ اور جو کچھ ہے"۔

ممکن ہے مولوی صاحب کا خیال ہی صحیح ہو مگر ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ حضرتِ فانی نے جدت سے کام لیا ہے اس لئے دورِ حاضر کا ایک مسلم الثبوت اُستاد اتنا ناواقف نہیں ہوسکتا کہ "ماسوا" کے معنی نہ جانے۔

---

[1] رگھوپتی سہائے صاحب فراق ایم۔اے۔ پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی نے غالباً ازراہِ قدردانی یا شاید ازراہِ نیازمندی مولانا حسرت موہانی کو "بادشاہِ متغزلین" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

مجھکو مضطر دیکھکر ان کو حجاب آنے لگا　　　　ہو چلی ہیں وہ نگاہیں راز دانِ اضطراب

دوسرے مصراع میں لفظِ "اضطراب" صاف چغلی کھا رہا ہے کہ پہلے مصراع میں لفظ "مضطر" بمعنی مضطرب استعمال ہوا ہے۔ مگر مضطر اور مضطرب ہم معنی نہیں ہیں اس لئے اس محل پر مضطر کا استعمال غلط ہے۔ مضطرب کے معنی ہیں پریشان اور مضطر کے معنی عاجز و بیچارہ۔

سنا ہے کسی عقلمند کے پاس اس کی محبوبہ کی ایک تصویر تھی وہ اُسے فریم میں لگانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس ایک فریم بھی تھا مگر تصویر سے چھوٹا۔ تصویر بڑی تھی۔ ظاہر ہے کہ فریم تو بڑا ہو نہیں سکتا تھا لہذا اُس دانشمند نے کاٹ چھانٹ کر تصویر ہی کو چھوٹا کر لیا اور فریم میں لگا دیا۔ اس قطع و برید سے تصویر بالکل تباہ ہو گئی مگر فریم بہرحال کام میں آگیا۔ قریب قریب یہی عمل شاعر صاحب نے بھی کیا ہے۔ "مضطرب" ایک بڑا لفظ تھا۔ مصراع میں اس کی گنجائش نہ تھی لہذا کاٹ چھانٹ کر اُسے مختصر کر لیا۔ اس میں شک نہیں کہ مضطرب جب مضطر بنا تو اسکے معنی بھی بدل گئے اور اس ایک لفظ کے معنی پر تغیر ہو جانے سے پورا شعر غارت ہو گیا مگر وزن بہرحال قائم رہا اور بحر میں کوئی خلل نہیں پڑا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون کی طرح حضرتِ فانی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ بندر ہی ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا ہے اور اُس کی دم گر گئی ہے۔ ورنہ دونوں کی اس درجہ مشابہت کے کیا معنی؟ غالباً الفاظ کو بھی آپ اسی نظریہ ارتقا کی عینک سے دیکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ "مضطرب" کی دُم (یعنی ب) گر گئی ہے اور مضطر باقی رہ گیا ہے۔ لہذا دونوں ایک ہی ہیں۔ کیونکہ شکل میں کچھ ایسا فرق نہیں۔ غالب بیچارے کے فرشتوں کو بھی یہ بات نہ سوجھی ہوگی۔

نہ بارِ منتِ ناخن نہ خطرۂ سوزن　　　　مجالِ بخیۂ زخمِ جگر نہیں ہے مجھے

خطرہ عربی لفظ ہے۔ اسکے معنی ہیں (۱) ایک قسم کی گھاس۔ (۲) اونٹ کی پنڈلی میں ایک خاص قسم کا داغ۔ (۳) ایکبار۔ (۴) بھوت پریت کا سایہ۔ لہذا خطرۂ سوزن کے معنی ہوتے (۱) سوئی کی گھاس۔ (۲) سوئی کی پنڈلی میں داغ۔ (۳) سوئی کی ایک بار۔ (۴) سوئی کے بھوت کا سایہ۔

ظاہر ہے کہ زخمِ جگر کے بخیہ کو ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ لہذا شاعر نے یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ فارسی میں یہ لفظ پایا ہی نہیں جاتا۔ اُردو میں بیشک خوف اور ڈر کے معنی میں مستعمل ہے مگر اس معنی میں خطرہ اُردو کا لفظ ہے۔ لہذا ایک فارسی لفظ سوزن کے ساتھ اسکی ترکیب صحیح نہیں۔

دُنیا کی ہر زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ الفاظ جب ایک زبان سے دوسری زبان میں جاتے ہیں تو کبھی اپنی اصلی حالت میں باقی رہتے ہیں اور کبھی اُن کے تلفظ یا معنی میں تغیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً بٹن (Button) اُردو میں آکر بٹن ہی رہا۔ مگر لین ٹرن (Lantern) لالٹین بن گئی اور ریل (Rail) پٹری کے بجائے گاڑی کے معنی میں استعمال ہونے لگی۔ اب یہ تینوں لفظ انگریزی نہیں اُردو ہیں کیونکہ اُردو زبان میں رائج اور مستعمل ہیں۔ اسی طرح عربی ترکی یا دوسری زبانوں کے جو الفاظ بتغیر یا بلا تغیر فارسی زبان میں مستعمل ہیں وہ فارسی ہی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ فارسی نے انہیں اپنا لیا ہے اور قواعد صرف و نحو کا عمل ان پر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح خالص فارسی الفاظ پر۔

فارسی زبان کا یہ ایک مسلمہ اُصول ہے کہ کسی زبان کا کوئی لفظ جو فارسی میں مروج نہیں اضافت کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اسمائے علم اس کلیہ سے خارج ہیں۔ اُردو میں بھی اس قاعدے کی پابندی کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیئے۔ لہذا ایسی تمام ترکیبیں غلط سمجھی جائیں گی جن میں ایک لفظ فارسی (خواہ اصلی ہو خواہ ماخوذ) اور دوسرا کسی غیر زبان کا ہو۔ مثلاً لبِ سڑک، نمائشِ کھدر۔ وکیلِ ہائی کورٹ۔ قانونِ لگان جھٹکۂ انگشت۔ ضابطۂ فوجداری۔ حدودِ چھاؤنی، عرقِ منڈی وغیرہ۔

اسی قبیل سے ہے فانی صاحب کا خطرۂ سوزن کیونکہ خطرہ فارسی زبان کا لفظ نہیں نہ اصلاً نہ بطریق اخذ۔ اساتذۂ دورِ حاضر کے تتبع میں گنگا جمنی ترکیبیں اب عام ہوتی جاتی ہیں اور اگر اس طوفانِ بے تمیزی کو روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو لوگ جلد ہی دھوتیِ گاڑھا، دودھِ بھینس اور چوچۂ مرغی وغیرہ بولنے لگیں گے۔

اے عرضِ شوق مژدہ کہ دل چاک ہوگیا　　　　تکلیفِ پردہ داری حسرت نہیں رہی

"تکلیفِ پردہ داری" کی ترکیب بھی "خطرۂ سوزن" کے خاندان سے ہے۔ تکلیف عربی لفظ ہے۔ فارسی میں اسکے معنی ہیں کسی کام کیلئے

کہنا یا حکم دینا۔ اُردو میں دُکھ، درد، رنج، ایذا کے معنی میں مستعمل ہے۔ جب اِن معنوں میں استعمال کیا جاتے تو تکلیف اُردو لفظ ہے فارسی نہیں۔ مذکور بالا شعر میں بھی ایذا استعمال ہوا ہے لہذا "تکلیف پردہ داری" کی ترکیب اُسی طرح غلط ہے جس طرح "لبِ سڑک" کی۔

ہائے دُنیا وہ تری سُرمہ تقاضا آنکھیں　　　کیا مری خاک کا ذرّہ کوئی بیکار نہیں

کھچڑی کے اجزا دال اور چاول ہیں۔ اور یہ دونوں اناج ہیں۔ اب اگر کوئی عقلمند یہ سمجھ لے کہ دو اناج ملا کر پکانے سے کھچڑی تیار ہو جاتی ہے اور گیہوں اور جَو ملا کر پکائے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ کھچڑی نہ ہوگی کچھ اور ہوگا کھچڑی تو صرف دال اور چاول ہی سے تیار ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دو لفظوں کی ترکیب سے ایک خاص مفہوم پیدا ہوتا ہے مگر اس کے لئے اصول و قواعد مقرر ہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی سے دو لفظ اُٹھا کر ملا دئے اور جو مفہوم چاہا پیدا کر لیا۔

فانی صاحب نے سرمہ تقاضا بمعنی سرمہ طلب استعمال کیا ہے۔ انہوں نے سوچا کہ طلب اور تقاضا ہم معنی ہیں لہذا طلب کی جگہ تقاضا استعمال کر لیا جاتے تو کیا ہرج ہے۔ مگر انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس محل پر طلب تقاضا کا بدل نہیں ہو سکتا۔ یہاں صیغۂ امر کی ضرورت ہے۔ طلب اسم ہونے کے علاوہ صیغۂ امر بھی ہے لیکن تقاضا امر نہیں۔ لہذا سرمہ تقاضا سرمہ طلب کے معنی نہیں دے سکتا۔ فانی صاحب نے وہی گیہوں اور جو ملا کر کھچڑی پکائی ہے۔

طور تو ہے "رَبِّ اَرْنی" کہنے والا چاہیئے　　　لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے

ہمارے شعرا کو حضرت موسیٰ کی طرح اللہ میاں کی صورت دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ ہمت کا تو یہ عالم کہ چہرۂ حقیقت سے نقاب اُٹھانا چاہتے ہیں اور لیاقت کا یہ حال کہ "ربِّ اَرِنی" تک کہنے کا سلیقہ نہیں۔ جب کہیں گے "اَرْنی" بروزنِ برنی کہیں گے۔ ان نیک بختوں کو کم سے کم اتنا تو جاننا چاہیئے کہ صحیح لفظ اَرِنی ہے۔ "ر" ساکن نہیں بلکہ متحرک اور مکسور ہے۔ رشک:-

اب تو باتیں بھی ہو گئیں موقوف　　　اَرِنی ہے نہ لن ترانی ہے

نہیں کہ آہ میں تاثیر ہی نہیں لیکن　　　یہ دلفگار کبھی آسماں فگار ہوئی

فانی صاحب نے پھر وہی گیہوں اور جو ملا کر کھچڑی پکائی ہے۔ دل اور فگار دو لفظ جوڑ دئے اور سمجھ لیا کہ اسم فاعل بن گیا۔ "دل فگار" یہاں "دل کو زخمی کرنے والا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ دل فگار کے معنی ہیں ایسا شخص جس کا دل زخمی ہو۔ اسم فاعل بنانے کیلئے ضرورت تھی کہ دل کے بعد صیغۂ امر لایا جاتا مگر نہ فگاریدن کوئی مصدر نہ فگار صیغۂ امر۔ یہی حال آسماں فگار کا ہے۔ اور یہ دونوں ترکیبیں غلط ہیں۔

چارہ تپ فراق کا شکر نہیں تو کچھ نہیں　　　بوئے مزاجِ یار ہے نبضِ بہانہ باز میں

"بہانہ باز" کالیستھوں کی خانہ ساز فارسی ہے۔ جیسے دل لگی باز۔ اہل زبان بہانہ ساز یا بہانہ جو بولتے اور لکھتے ہیں۔

ابو طالب کلیم:-　　خوش آں زماں کہ عتابت بہانہ ساز بود　　　زبان تیغ جفا ایں قدر دراز نہ بود

صائب:-　　نازِ بہانہ جو را بریک طرف نہادہ　　　شرمِ ستیزہ خُو را در خاک و خوں کشیدہ

مُرقّع ہے کسی کی ہستیِ موہوم کا فانی　　　وہ آن کا دیکھتے ہی دیکھتے رُو پوش ہو جانا

مُرقّع کے تین معنی ہیں:- (۱) تصویروں کا البم[1]۔ (۲) خوشنویسی کے قطعات کی کتاب۔ (۳) فقیروں کی گدڑی۔ اس شعر میں مرقع کے معنی تصویروں کے البم یا قطعات کی کتاب کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ اب رہ گئی گدڑی۔ تو ظاہر ہے کہ کسی کی ہستیِ موہوم کی گدڑی کو ان کے دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً فانی صاحب نے یہ شعر تصوف میں کہا ہے اسی لئے اس کا مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا۔

مرقع کے معنی اگر تصویر فرض کر لئے جائیں تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے مگر دشواری یہ ہے کہ مرقع تصویر کو نہیں کہتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ فانی صاحب نے زبان کو وسعت دینے کے خیال سے مرقع کے لئے یہ ایک نئے معنی تجویز کئے ہوں۔

---

[1] کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں داغ ہیں　　　اس مرقع میں بھی کیا کیا ہے ورق تصویر کا　　(داغ)

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایک بار رہے　　　　بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے

فانیؔ صاحب اگر اپنے محبوب کو صرف مشقِ تغافل کا مشورہ دیتے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا کیونکہ کسی کے پرائیویٹ معاملات میں دخل دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں مگر وہ تو تغافل کی نہیں خوئے تغافل کی مشق کرنے کو کہتے ہیں۔ ہمیں صرف یہ پوچھنا ہے کہ کیا خو یا عادت کی مشق بھی کی جاتی ہے۔ اور کیا عادت بھی مشق کی محتاج ہے؟

فرض کیجئے ہمارے شعرا کو قبر کے اندر سے بولنے کی عادت ہے تو آپ وہ لازماً قبر کے اندر سے بولیں گے، اس کے لئے مشق کی ضرورت نہیں اور اگر نہ بولیں تو پھر اُسے عادت نہیں کہہ سکتے۔ مثل مشہور ہے کہ علّت جائے دھوئے دھائے عادت دم کے ساتھ۔ اسی لئے عادت کو طبیعتِ ثانی کہتے ہیں۔ آج اگر تغافل محبوب کی عادت ہے تو وہ بہرحال تغافل کریگا۔ اس کیلئے نہ مشق کی ضرورت ہے نہ مشورۂ مشق کی۔

ہے جو اس کانِ ملاحت سے طلبگارِ نمک　　　　زخمِ دل شاید تبسم آفریں ہونے کو ہے

"تبسم آفریں" کے معنی ہیں تبسم پیدا کرنے والا یعنی ہنسانے والا۔ اور تبسم آفریں اس شخص یا چیز کو کہہ سکتے ہیں جسے دیکھکر دوسروں کو ہنسی آئے۔ آپ کے دل کا زخم کوئی چارلی چیپلن کی فلم تو ہے نہیں جسے دیکھکر خواہ مخواہ انسان ہنسنے لگے۔ زخم دل کا ہو یا ناک کا اُسے دیکھکر دیکھنے والے کو یا تو کچھ تکلیف محسوس ہو سکتی ہے یا کراہت۔ ہنسی بہرحال نہ آئیگی چاہے اُس پر پوری کانِ ملاحت ہی کیوں نہ اُلٹ دی گئی ہو۔

خدا ہی جانے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ تبسم آفریں سے آپ کا مطلب شاید متبسم ہے کہ زخم پر نمک چھڑکا جائے گا تو وہ چاک چاک ہو جائے گا یعنی ہنسنے لگے گا۔ مگر متبسم اور تبسم آفریں ہم معنی نہیں ہیں۔

عہدِ خزاں میں فتنۂ آشوبِ ہوش ہوں　　　　بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں

صرف موسم ہی کو نہیں بلکہ آپ اِس اُصول کو بھی بھُولے ہوئے ہیں کہ زبان میں قیاس کا نتیجہ عموماً گمراہی ہوتا ہے میں نے کھایا، میں نے مارا، میں نے دیکھا صحیح، مگر اس کے قیاس پر "میں نے لایا" غلط۔ "میں لایا" چاہیئے۔ حالانکہ لایا بھی کھایا اور مارا کی طرح فعل متعدی ہے وجہ اس کی کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اہلِ زبان اِسی طرح بولتے ہیں۔ آپ نے چارہ گر، زرگر، آئنہ گر وغیرہ کے قیاس پر دیوانہ گر بنایا مگر اہلِ زبان دیوانہ گر نہیں بولتے۔ اس لئے ٹکسال باہر ہے۔

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں　　　　زخمِ دل پیدا کریں یا زخمِ دل اچھا کریں

فانیؔ صاحب کی مشقِ سخن اگر اسی طرح جاری رہی تو جلد ہی اُردو میں ایک نیا لغت تیار ہو جائے گا۔ نئے لغت سے یہ مراد ہے کہ اس میں ہر لفظ کے ایک نئے معنی ہونگے۔ مثلاً ماسوائے دل کے معنی دل کی دُنیا۔ مرقع کے معنی تصویر۔ مضطر کے معنی مضطرب۔ سرمۂ تقاضا کے معنی سرمۂ طلب۔ دلفگار کے معنی دل کو زخمی کرنے والا۔ تبسم آفریں کے معنی متبسم۔ وغیرہ وغیرہ

مذکورہ بالا شعر میں قاتل کے جو معنی بیان کئے گئے ہیں وہ ان سب سے زیادہ عجیب ہیں۔ فانیؔ صاحب کی اصطلاح میں قاتل اُسے کہتے ہیں جو کسی کو زخمی کر دے۔ اس سے بحث نہیں کہ زخم رسیدہ مرجائے یا زندہ رہے۔ بلکہ قرینہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ اب اگر کوئی کسی کی ناک کاٹ لے تو وہ بھی قاتل ہے۔ اس لئے کہ قاتل کا کام فقط اتنا ہے کہ مجروح کر دے۔ مار ڈالنا اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ مگر لغت، قانون اور شریعت کی رُو سے اُس وقت تک کسی کو قاتل نہیں کہہ سکتے جب تک وہ کسی کو ہلاک نہ کر دے۔ دوسرے مصراع کو اگر اس طرح بدل دیا جائے تو قاتل کا صحیح مفہوم یا یوں کہیئے کہ پُرانا مفہوم ادا ہو سکتا ہے:-

ع:- مار ڈالیں چاہنے والوں کو یا زندہ کریں

اگرچہ شعر تو نہ پہلے تھا نہ اب ہوا۔ رُذل قافیہ البتہ کہہ سکتے ہیں۔ "زخمِ دل پیدا کرنا" بھی محلِ نظر ہے۔ کسی مستند اہلِ زبان نے لکھا نہیں نہ کوئی اس طرح بولتا ہے۔

جہانِ بے سکوں میں سکوں ہی سکون تھا　　　　مری نگاہِ مضطرب ہے رازِ انقلاب کا

"جہانِ بے سکون" میں سکون کے نون کا اعلان اہلِ زبان کے نزدیک جائز نہیں۔ مگر دورِ حاضر کے اساتذہ ضرورتِ شعری سے مجبور ہو کر یا ناواقفیت کی بنا پر کبھی کبھی اس جائز اور ناجائز کی بحث میں پڑنا پسند نہیں کرتے۔

نہ دن کو چُپ ہیں راتوں کو تیری طرح اُداس　　جلے ہوتے تو چراغ مزار ہم بھی ہیں

عربی کے شُہرۂ آفاق لغت نویس مجدالدین بن یعقوب فیروز آبادی، صاحبِ قاموس کے متعلق ایک حکایت مشہور ہے کہ اُس نے ایک عرب خاندان میں شادی کرنی چاہی۔ عرب کی عصبیت مشہور ہے۔ وہ لوگ غیر عرب سے کبھی رشتہ نہیں کرتے تھے کیونکہ اس میں اپنی توہین سمجھتے تھے۔ فیروز آبادی نے اپنے تئیں عرب ظاہر کیا اور چونکہ وہ عربی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا اس لئے سب نے اُسے عرب ہی سمجھا۔ خیر، شادی ہوگئی۔ رات کو جب سونے کا وقت ہوا تو فیروز آبادی نے اپنی بیوی سے کہا کہ "اُقتل السراج" یعنی چراغ بُجھادو۔ اتنا سُننا تھا کہ بیوی چراغ پا ہوگئی۔ لگی شور کرنے کہ لوگو دوڑو، غضب ہوگیا۔ ہمارے ساتھ دغا کی گئی یہ عرب نہیں عجمی ہے۔ لوگ جمع ہو گئے۔ تحقیق حال کے بعد ثابت ہوگیا کہ میاں فیروز آبادی عجمی ہیں لہذا اُسی وقت بیوی کو طلاق دینی پڑی۔

بات دراصل یہ ہے کہ فارسی میں چراغ بُجھانے کو چراغ کُشتن کہتے ہیں۔ فیروز آبادی نے بے خیالی میں اسی کا عربی میں ترجمہ کر دیا۔ عورت فوراً سمجھ گئی کہ یہ عرب نہیں ہے ورنہ اُقتل السراج کبھی نہ کہتا۔ کیونکہ اقتل السراج محاورۂ عرب کے بالکل خلاف ہے۔ انگریزی لکھنے اور بولنے میں اس قسم کی مضحکہ خیز غلطیاں ہم لوگ بھی اکثر کرتے ہیں۔ بنگال کے ایک گورنر صاحب دارجلنگ سے کلکتہ واپس گئے تو ایک نواب صاحب اُن سے ملنے گئے۔ چھوٹتے ہی بولے۔ "Your Excellency looks bloody" "حضور والا بلڈی (bloody) نظر آتے ہیں" گورنر صاحب یہ الفاظ سُنکر سناٹے میں آگئے۔ نواب صاحب کا مطلب تو یہ تھا کہ ماشاء اللہ آپ خوب تندرست ہیں۔ چہرہ پر خون دوڑ رہا ہے۔ (بلڈ خون کو کہتے ہیں) مگر اس عبارت کا مطلب یہ ہوگیا کہ "آپ تو خونی معلوم ہوتے ہیں"۔

ان مثالوں کے پیش کرنے سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ لفظی ترجمہ کرنا بعض اوقات نہایت ہی لغو اور مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی معنی بالکل ہی بدل جاتے ہیں چنانچہ فانی صاحب نے اس شعر میں فارسی کے ایک لفظ کا ترجمہ کرکے قارئین کی ضیافت طبع کا سامان کیا ہے۔

فارسی میں بجھے ہوئے چراغ کو شمع خاموش کہتے ہیں۔ اُردو میں بھی اگر چراغ کی صفت خاموش لائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر فانی صاحب نے خاموش کے بجائے اس کا ترجمہ "چُپ" استعمال کیا۔ شمعِ مزار سے کہتے ہیں کہ تو دن کو چُپ رہتی ہے اور "راتوں کو اداس"۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر اس کا یہ سبب ہے کہ تو سوختہ ہے تو ہم بھی سوختہ ہیں۔ مگر ہم تو دن کو بولتے بھی ہیں اور رات کو اداس بھی نہیں رہتے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ چراغ صرف دن کو چُپ رہتا ہے رات کو نہیں۔ رات کو ضرور بولتا ہے، مگر چراغ کو بولتے کسی نے سُنا نہیں۔ نہ رات کو نہ دن کو۔ اُردو میں چراغ کے بُجھنے کو چپ ہونا نہیں گل ہونا کہتے ہیں۔

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ شعر بزم میں　　باری تب اُن کی آئی کہ گُل ہو گئے چراغ

اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ پہلے مصراع میں "دن" واحد اور "راتوں" جمع کیوں لائے۔ یا تو دنوں اور راتوں ہوتا یا دن اور رات۔ اس محل پر ایک لفظ واحد اور دوسرا جمع لانا شاعر کے عجز طبع پر دال ہے۔

سُنکے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی　　آج تیرا نام لیکر کوئی غافل ہوگیا

شعر کا مطلب صاف ہے یعنی کوئی تو خدا کا نام سُنکر آنکھیں کھول دیتا تھا اور کوئی خدا کا نام لیکر آنکھیں بند کر لیتا ہے (یعنی غافل ہو جاتا ہے) یہ شعر تصوف میں ہے۔ شاعر نے صوفیوں کے "حلقۂ ذکر" کی تصویر کھینچی ہے غالباً پہلے زمانے میں یہ دستور تھا کہ پیر اور مرید حلقہ بنا کر بیٹھتے تھے اور آنکھیں بند کرکے مراقبہ میں مشغول ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد پیر یکایک "الا اللہ" کا نعرہ مارتا تھا۔ اس آواز کو سُن کر سب آنکھیں کھول دیتے تھے۔ اب طریقہ بدل گیا ہے۔ آجکل یہ دستور ہے کہ حلقہ میں بیٹھتے ہیں تو آنکھیں بند نہیں کرتے آہستہ آہستہ "ذکر" میں مشغول رہتے ہیں۔ پھر پیر یکایک الا اللہ کا نعرہ مارتا ہے مرید بھی اُس کی تقلید کرتے اور پھر سب آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اُن پر ایک محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے شعر اچھا ہے مگر شعری حیثیت سے کچھ نہیں۔

ایک صوفی صاحب کو میں نے یہ شعر سُنایا اور یہی مطلب بیان کیا تو وہ بہت بگڑے اور کہنے لگے کہ آپ نہ صوفیوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں نہ شعر سمجھنے کی آپ کو لیاقت ہے۔ شعر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ شاعر نے محبوب سے خطاب کرکے عاشقِ بیمار کا حال بیان کیا ہے کہ ناطاقتی کے باعث وہ آنکھیں بند کئے پڑا رہتا تھا۔ مگر جب کوئی تیرا نام لیتا تھا تو وہ فوراً آنکھیں کھول دیتا تھا۔ آج اس کی حالت غیر تھی۔ اُس نے تیرا نام لیکر آنکھیں

بند کرلیں اور بیہوش ہوگیا یا مر گیا"

میں نے کہا کہ دونوں مصرعوں میں لفظ "کوئی" پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک شخص کا حال نہیں دو مختلف آدمیوں کی سرگذشت ہے۔ اچھا کسی اور شاعر کا ایک شعر سنیئے :-

کوئی کہتا ہے کہ اللہ کا گھر ہے کعبہ　　　کوئی کہتا ہے کہ خود خانۂ کعبہ دل ہے

اب بتایئے کہ دونوں مصرعے ایک شخص کا قول ہیں　　یا دو شخصوں کا۔ کہا دو شخصوں کا۔ میں نے کہا تو پھر کیا وجہ ہے کہ فانی صاحب کے دونوں مصرعوں کو دو علیحدہ علیحدہ شخصوں سے متعلق نہ سمجھا جائے جبکہ دونوں میں "کوئی" موجود ہے۔ اگر ایک ہی شخص مراد ہوتا تو دوسرے مصراع میں ضمیر لاتے۔ کہا ہاں یہ غلطی ضرور ہے دوسرے مصراع میں کوئی کی جگہ "وہ" ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے کہا ہونا چاہیئے تھا سے بحث نہیں۔ جو کچھ ہے اُس کا کیا مطلب ہے۔ کہا آپ شاعر نہیں صرف "قواعد داں" ہیں۔ قواعد کی رُو سے تو وہی مطلب ہوگا جو آپ کہتے ہیں یعنی دونوں مصرعوں میں "کوئی" سے علیحدہ علیحدہ شخص سمجھا جائیگا۔ مگر شاعری کی رُو سے شعر کا مطلب یہی ہے جو میں نے بیان کیا۔

راز نیرنگی حقیقت ہوں　　　میں ہوں فانی حقیقتِ نیرنگ

اس شعر سے معلوم ہوا کہ آپ دو چیزیں ہیں ایک نیرنگی حقیقت اور دوسری حقیقتِ نیرنگ، اب اگر دونوں کے ایک ہی معنی ہیں تو ایک محض بیکار ہے۔ اور اگر یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں تو اجتماع ضدین ممکن نہیں۔ اور اگر دونوں دو مختلف چیزیں ہیں تو دونوں کو باقی رکھا جا سکتا ہے مگر دونوں مصرعوں میں "ہوں" کی تکرار کسی طرح صحیح نہیں۔ ایک "ہوں" محض بیکار رہا۔

دو تین ہچکیوں میں دمِ نزع کہہ گیا　　　شرح درازِ زندگی مختصر کو میں

اختصار قابل داد ہے اور "شرح کہنا" داد سے مستغنی۔

اے داغ دل، اے کھوئے ہوئے دل کی نشانی　　　آ فانیِ بے دل تجھے سینے سے لگا لے

داغ دل کوئی چھڑی یا چھتری تو ہے نہیں کہ کہیں لے اور بھول آئے۔ جہاں دل ہوگا وہیں دل کا داغ بھی ہوگا۔ جب دل گُم ہوگیا تو داغ بھی اس کے ساتھ ہی گیا۔ جہاں ڈول وہاں رسی پھر فانی بیدل سے داغ کی کہاں ملاقات ہوگئی۔ ممکن ہے فصیح الملک حضرت داغ کی طرف اشارہ ہو

دے اذنِ عامِ عشق کو تاراجِ ہوش کا　　　بیٹھا ہوں دل میں صبر کی دولت لئے ہوئے

ہوش کے ایک معنی تو وہی ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔ دوسرے اور نئے معنی فانی صاحب نے بیان کئے۔ آپ کی اصطلاح میں صبر کو ہوش کہتے ہیں۔ صبر کی دولت آپکے پاس موجود ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ یہ لُٹ جائے لہذا "اس" سے استدعا کرتے ہیں کہ عشق کو ہوش کے لوٹنے کا اذن عام دیدے۔ تاکہ وہ میرا ہوش بھی لُوٹ لے۔ مگر ہوش آپکے پاس ہے نہیں۔ صبر ہے۔ لہذا اس صبر ہی کو آپ کا ہوش سمجھنا چاہیئے۔ ایسے ہی موقع پر کسی نے کہا ہے کہ "ہوش کی دوا کرو"

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کے چلدی　　　ٹھہر کہ خارِ تمنا ابھی کھٹکتا ہے

اجل کا کام ہی زندگی کو ختم کر دینا۔ اور جب زندگی ختم ہوگئی تو تمنا کا باقی رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہاں اجل کے معنی موت نہیں بلکہ بطور معمہ یہ شاعر کی محبوبہ کا نام ہے (اور بہت ممکن ہے کہ یہ نام "زاہدہ بی" ہو کیونکہ زاہدہ بی اور اجل کے عدد برابر ہیں) شاعر کے پاؤں میں یا تو سچ مچ کانٹا چبھ گیا تھا یا شاید اس نے بہانہ کیا۔ بہرحال محبوبہ نے وہ کانٹا نکال دیا اور جب جانے لگی تو شاعر صاحب نے کہا کہ خدا کیلئے ذرا ٹھہرو۔ دل کی تمنا تو ابھی نکلی ہی نہیں۔ پاؤں کا کانٹا تو تم نے نکال ہی دیا۔ دل کا کانٹا بھی تو نکالتی جاؤ۔

خانۂ تصویر میں آنے کو ہے تصویرِ یار　　　آئنہ میں قدِ آدم آفتاب آنے کو ہے

تصویر کے فریم یا چوکھٹے کو "خانۂ تصویر" نہیں کہتے۔ اس کے علاوہ بیچارے شاعر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قدِ آدم تصویر آئینہ میں نہیں لگائی جاتی اتنی بڑی تصویر ہمیشہ روغنی (Oil Painting) ہوتی ہے اور روغنی تصویر کیلئے آئینے کی ضرورت نہیں۔

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گذار دی　　　اک مرگِ ناگہاں کے غمِ انتظار نے

"گذار دی" کا فاعل "غمِ انتظار" ہے۔ یعنی غم نے عمر گذار دی۔ ماشاءاللہ کیا خوب بات کہی ہے۔ وہی مثل ہے کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ

انسان اپنی عمر خود گذارتا ہے کوئی دوسرا اُسے نہیں گذار سکتا پھر غم نے آپ کی عمر کیونکر گذار دی۔ ہاں غم میں عمر گذر تی ہے اور گذاری جاسکتی ہے۔ لہذا اگر شعر۔ اس طرح ہوتا کہ:-

ہم نے تو ساری عمر ہی فانیؔ گذار دی اک مرگ ناگہاں کے غمِ انتظار میں

یا:-

اپنی تو ساری عمر ہی فانیؔ گذر گئی اک مرگ ناگہاں کے غمِ انتظار میں

تو مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جاتا۔

تمہارے عشق کا اللہ رے فیض جگر میں دھوم ہے درد جگر کی

جدت اِسے کہتے ہیں۔ جگر میں درد جگر کی دھوم ہے، درد شکم کی نہیں۔ راقم الحروف نے بھی ایک شعر اسی رنگ میں عرض کیا ہے:-

وہ دہی جو پی لیا تھا یہ اُسی کا سب اثر ہے مجھے آرہی ہیں چھینکیں، مرے سر میں درد سر ہے

یہ انداز فانیؔ صاحب کو بہت پسند ہے چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں۔

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانیؔ روتی ہے گلے مل کے سحر شمع سحر سے

گردش وہی یہاں بھی سپہر کہن میں تھی غربت میں بھی وہی ہے جو قسمت وطن میں تھی

مثل مشہور ہے کہ اُتر جاؤ یا دکھن وہی کرم کے لچھن۔ وطن میں آپ کو راحت نصیب نہ تھی۔ پردیس گئے تو وہاں بھی آرام نہ ملا۔ وہیں یہ شعر کہا۔ مضمون اگرچہ پامال ہے پھر بھی قابل اعتراض نہیں۔ لیکن پہلے مصراع میں کہتے ہیں کہ "یہاں بھی وہی گردش تھی" اور دوسرے مصراع میں فرماتے ہیں کہ غربت میں بھی وہی قسمت ہے۔ یہ "تھی" اور "ہے" کی تُک سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر فانیؔ صاحب کے نزدیک "تھی" اور "ہے" کے ایک ہی معنی ہیں تو خیر ورنہ "تھی" کے بجائے "ہے" چاہیئے۔ کیونکہ غربت کی موجودہ زندگی کا ذکر کر رہے ہیں نہ کہ زمانہ ماضی کا۔

بھر کے ساقی ایک جام زہر ہی آلو دلا یعنی خاکم در دہن آج آتشِ دل تیز ہے

"یعنی" ہمیشہ ایسے موقع پر استعمال کیا جاتا ہے جبکہ قول ثانی سے قول اوّل کی تفسیر مقصود ہو۔ لیکن فانیؔ صاحب نے حسب عادت یہاں بھی جدت سے کام لیا ہے اور "یعنی" بمعنی "کیونکہ" استعمال کیا ہے۔

مشتاق خبردار رہیں دل سے جگر سے ملتی ہے زمانہ کی نظر اُن کی نظر سے

دوسرا مصراع اس طرح ہونا چاہیئے تھا:-

ملتی ہے نظر اُن کی زمانہ کی نظر سے

مگر شاعر صاحب نے یہ خیال کیا کہ بات ایک ہی ہے۔ چاہے خربوزہ چھری پر گرے چاہے چھری خربوزے پر۔ کٹے گا ہر حال میں خربوزہ ہی۔

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

"ہمہ تن" میں چونکہ لفظ "تن" موجود ہے اس لئے ہمہ تن انہیں اشیاء کے متعلق بولا جاتا ہے جن کا تعلق جسم و جسمانیات سے ہو۔ عمل کوئی جسمانی چیز نہیں، لہذا "ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی" کہنا بھی درست نہیں۔

میں ہوں عالم کو بیدلی کا پیام خیر و شر مدعا نہ صلح نہ جنگ

دوسرے مصراع کی ترکیب بہت معیوب ہے۔ ایک "نہ" "خیر و شر" کے پہلے اور ایک "نہ" "مدعا" کے پہلے چاہیئے۔ یعنی عبارت اس طرح ہو:-

"نہ خیر و شر، نہ مدعا، نہ صلح نہ جنگ" ورنہ شاعر کا مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔

ہجر ساقی میں ہمارے گھر کی کیفیت نہ پوچھ بند در، ہر شیشہ خالی، دل بھرا، ساغر کھلا

ہجر ساقی میں اپنے گھر کا دروازہ بند ہے تو گویا جب ساقی موجود ہو گا تو دروازہ کھول دیں گے۔ حالانکہ اس شغل کے وقت تو دروازے کا بند رہنا ہی مصلحت ہے تاکہ کوئی خلل انداز نہ ہو۔ "ہر شیشہ خالی" اور "ساغر کھلا" سے یہ بھی معلوم ہو گیا آپ کے یہاں شراب کی بوتلیں تو کئی تھیں مگر گلاس فقط ایک ہی تھا جس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ اکیلے ہی مے نوشی کیا کرتے ہیں یاروں کو شریک نہیں کرتے۔ مگر میخواری کا لطف تو جبھی ہے کہ

حریفانِ بادہ کش موجود ہوں بہرحال یہ اپنی اپنی پسند ہے اس پر ہمیں اعتراض کا کوئی حق نہیں۔

اگر کوئی مریض ڈاکٹر سے اپنا حال بیان کرتے وقت یہ کہے کہ میرا قلب ضعیف ہے اور میرا ہارٹ ویک (heart weak) ہے اور میرا دل کمزور ہے تو غالباً ڈاکٹر اُسے دل سے زیادہ دماغ کا مریض سمجھیگا۔ مگر حضرات شعرا کے یہاں ایک بات کو دو زبانوں میں کہنا شاید اندازِ بیان کا حُسن ہے۔ پھر بھی جن لوگوں کو خدا نے نقد و نظر کی صلاحیت دی ہے اُن سے اس حسنِ بیان کی رکاکت پوشیدہ نہیں۔ چنانچہ عربی اور فارسی کی اصطلاح میں اسے حشو کہتے ہیں، ہماری زبان میں ٹھونس ٹھانس کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً فانی صاحب فرماتے ہیں:-

نگاہِ دلدوز کی دُہائی، جمالِ جاں سوز کی دُہائی		رہِ محبت میں غم نے لوٹا شکیب و صبر و قرار میرا

ناواقف یہ سمجھے گا کہ شکیب اور صبر اور قرار تین چیزیں لُٹ گئیں۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے اِسلئے شکیب اور صبر ایک ہی چیز ہے۔ شکیب فارسی ہے اور صبر عربی، معنی دونوں کے ایک ہی ہیں۔

غالباً خود کو حریفِ غالب ثابت کرنیکے شوق میں فانی صاحب نے غالب کی طرح بعض نامانوس بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اس کا نتیجہ حد درجہ افسوسناک نکلا ہے یعنی قدم قدم پر آپ مُنہ کے بل گرے ہیں۔ غالب کی ایک مشہور غزل ہے:-

آکہ میری جان کو قرار نہیں ہے		زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے

اس بحر کا نام ہے منسرح مثمن مطوی منحور۔ اور اس کا وزن ہے:- مُفْتَعِلُنْ فَاعِلَاتُ مُفْتَعِلُنْ فَعْ۔

فانی صاحب نے بھی غالب کے مقابلے میں بہ تبدیلِ قافیہ اس بحر میں غزل کہی ہے۔ اس کا مطلع ہے:-

عیشِ جہاں باعثِ نشاط نہیں ہے		خندہ تصویر انبساط نہیں ہے

اِس غزل میں کُل ۷ شعر ہیں۔ پانچواں شعر ملاحظہ ہو:-

انکی جفا میں بھی رنگِ وفا نہیں یعنی		غیر سے بھی اب وہ ارتباط نہیں ہے

شعر میں کوئی خرابی نہیں اِلّا یہ کہ پہلا مصراع دوسرے مصراع سے کسی قدر بڑا ہو گیا ہے اور ساقط الوزن ہے اگر اس طرح پڑھیں تو موزوں ہو:-

ان کی جفا میں رنگِ وفا نہیں یعنی

مگر اب اس میں معنی کی تلاش بیکار ہے۔ آخری شعر ہے:-

داغ باندازۂ جگر نہیں فانی		وسعتِ منزل بقدرِ بساط نہیں ہے

یہاں دوسرا مصراع لمبائی میں پہلے سے بڑھ گیا اور کہتے ہیں کہ یہ شعر کا حُسن ہے کہ دوسرا مصراع پہلے مصراع سے بڑھ جاتے۔ بہرحال یہ اس طرح موزوں ہو سکتا ہے:- "وسعتِ منزل قدرِ بساط نہیں ہے"۔ مطلب اس میں فانی صاحب سے ڈلوائیے۔

فانی صاحب کی ایک اور غزل ہے:-

کیا کہیں کیوں خاموش ہوئے ہیں، سُنتے ہیں تری فرقت کی خبر ہم		نالۂ دل کے جلنے تھے اجزا ہو گئے سارے[1] درہم برہم

اس بحر کا نام ہے متقارب مثمن (مضاعف) اثرم اور اس کا وزن ہے:- فِعْلُ فَعُولُن، فعلِ فعولن، فعلِ فعولن فعل فعولن

اس غزل میں آپنے سات شعر کہے ہیں جن میں سے دو کے مصرعے وزن سے خارج ہیں:-

(۱) گو بیٹھے بھی اُٹھے بھی ہم		محفلِ دُشمن میں تیری خاطر

(۲) کوئی گھڑی اے ہجر دی غم		دم لینے دے سنبھلنے دے

ایک اور غزل جس کا مقطع ہے:- فانی گو کیسا ہی سہی پھر بھی تجھی سے نسبت تھی		دیوانہ تھا، تھا کس کا، تیرا ہی دیوانہ تھا

اس شعر کے مصراع ثانی کے وزن کو اگر معتبر سمجھا جائے تو باقی اشعار کے بعض مصرعے ناموزوں ہو جائیں گے۔ مثلاً

عہدِ جوانی ختم ہوا، اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔ مطابق وزن:- عہدِ جوانی ختم ہوا، اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔

اختصار کے خیال سے اتنے ہی پر اکتفا کی گئی۔ ورنہ ابھی فانی صاحب کے بہت سے اشعار قابلِ توجہ ہیں۔ کُل ساٹھ ورق کے پاکٹ سائز دیوان میں اغلاط بھی فانی صاحب کو غالب کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت دینے "کیلئے کافی ہیں۔

عندلیب شادانی

[1] یہاں سارے کی جگہ "سب" چاہیئے۔ شادانی

نکات

بال و پر نیاز سے اتنا ہے بے نیاز کیوں؟
گر رہے ہوا تا ہوا شہپرِ شاہباز کیوں؟
خاک ہی خاک ہو اگر منظرِ کائناتِ زیست
آنکھ میں ہو لگا ہوا سرمۂ امتیاز کیوں؟

کہتے ہیں عجز میں وفور جب ہو تو جبر کی شان ہے
کہتے ہیں عجز میں وہ نگاہ جب ہو تو کبر کی شان ہے
تھی بلند ہو نظر آتی ہی یہ بھی ہے بلند
خاک کو پوچھتا ہے کون؟ ذوقِ نظر کی شان ہے

ہے اسی امتیاز سے خاک تری ہی ملک جناب
تجھ کو خبر نہیں مگر تو ہی فلک کا ہے جواب
بانِ عرش سے ہے پیر سے معان کا جام
مصحفِ کائنات کی ہے تو ہی ام الکتاب[1]

کیفِ مئے شعور اور ذوقِ نگاہ دو نہیں
اشکِ چکیدۂ سحر اور تری آہ دو نہیں
عمر کے تجربات نے مجھ کو یہی سکھا دیا
زیبِ غروری کا خون اور خواہشِ جاہ دو نہیں

امین حزیں سیالکوٹی

[1] سورۃ فاتحہ

مولوی

کالج میں رہ کر ڈاڑھی رکھنے کیلئے ہمت چاہیئے۔ اور پھر ڈاڑھی رکھنا ایسا کوئی فرض بھی نہیں اس لئے محمود نے ڈاڑھی نہیں رکھی تھی۔ یوں تو فیضؔ اور تاثیرؔ نے ڈاڑھیاں رکھلی تھیں مگر اکثر اُن کی ڈاڑھیوں کے گھونسلے بناکر اس میں انڈے رکھدئے جاتے تھے اور کلاس سے باہر ان کو 'مولانا' یا 'مولوی' کہکر پکارا جاتا تھا۔ مولویوں سے محمود کو دلی بغض تھا اس لئے وہ ڈاڑھی رکھکر مولوی جیسے مکروہ نام سے پکارا جانا ہرگز گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ مولوی اسلام کی تباہی کا باعث تھا، یہ مذہب کو بیچتا تھا، اُٹنگے پاجامے اور لمبے کرتے پہنتا تھا۔ مسجد میں چٹائی پر بیٹھکر لڑکے پڑھاتا تھا اور محلہ میں روٹی کے بدلے فاتحہ اور درود پڑھتا پھرتا تھا۔ محمود کو ان مولویوں سے حد درجہ نفرت تھی۔ اگر اشارۃً بھی کوئی کسی کو مولوی کہدیتا تو محمود اُس 'مولوی' سے دل ہی دل میں کُڑھنے لگتا تھا۔ محمود بی اے میں پڑھتا تھا اور کلاس کے نہایت خوش پوشش طالب علموں میں سے تھا۔ آدمی بھی خوبصورت گورا چٹا تھا اس لئے ہر لباس اس پر خُوب کھلتا تھا۔ محمود کا خیال تھا کہ ڈاڑھی مونچھ مُنڈواؤ، کوٹ پتلون پہنو، میز کرسی پر کھانا کھاؤ مگر نماز ضرور پڑھو، روزے کبھی نہ چھوڑو اور ہر فرض مذہبی پر سختی سے عمل کرو۔ چنانچہ محمود پتلون پہنے، سر پر رومال باندھ کر، راہ چلتے اگر نماز کا وقت ہوجاتا تو کوئی مسجد یا کسی مسلمان کی دُکان پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوجاتا تھا۔ چاہے امتحان سر پر ہو مگر رمضان کے تیسوں روزے ضرور رکھتا تھا۔ کالج کے ڈرامے ناچ گانے لسے لغو اور فضول معلوم ہوتے تھے۔ وہ کھیل کُود سے بھی حتی الامکان پرہیز کرتا تھا۔ البتہ شام کو صحت قائم رکھنے کے لئے ٹینس کھیل کر ورزش ضرور کرلیتا تھا۔ کالج کے جو لڑکے اچھا گاتے تھے ان سے محمود کو خواہ مخواہ ضد سی ہوجاتی تھی۔ اور وہ ان کو اکثر "میراسی" کہہ کر پکارتا تھا۔ جو لڑکا بہت ہنستا ہو، یا بہت بولتا ہو یا زندہ دل کی باتیں کرتا ہو وہ محمود کی نگاہ سے گرجاتا تھا۔ عورت، اس کے خیال میں بھی کبھی نہ آئی تھی۔ عورت اس کی نگاہ میں تمام کثافتوں کی جڑ تھی۔ وہ اس راستے سے کبھی بھول کر بھی نہیں گذرتا تھا جہاں کوئی لڑکی یا عورت اکثر جھانکتی ہوتی دیکھی گئی ہو۔ شراب۔ اف شراب کے نام سے وہ چراغ پا ہوجاتا تھا۔ ایک دفعہ لسے راستہ میں مدہوش شرابی ملا تو اُس نے لسے دھکے دیکر پاس کی غلاظت بھری نالی میں دھکیل دیا تھا۔ ایمانداری، راست بازی اور اُصول کی سختی سے پابندی محمود کے لئے سامان تفریح پیدا کرتے تھے۔ وہ ٹھیک وقت پر سوتا، ٹھیک وقت پر اٹھتا، نمازیں پڑھتا، ورزش کرتا اور کلاس جاتا تھا۔ اس کے اس روزمرہ کی تقسیم اوقات میں بال برابر بھی ردوبدل نہ ہوتا تھا البتہ جمعہ کے دن وہ خاص اہتمام سے نہاتا، سوٹ کے بدلے عمدہ چکن کی اچکن اور دوپلیہ ٹوپی پہنتا عطر لگاتا اور نماز جمعہ میں شریک ہوتا تھا۔ اسکے دانت موتی کی طرح سفید اور چمکیلے تھے۔ وہ پان کبھی نہ کھاتا تھا۔ سگریٹ پینے والے ہم جماعت کو ذرا نیچے قسم کا طالب علم سمجھتا تھا اور ان سے دُور بیٹھ کر سگرٹ پینے کو کہتا تھا۔ محمود کی عمر اور علم کی وسعت جوں جوں بڑھتی گئی اُس نے تاریخ اسلام کا گہری نظر سے مُطالعہ کیا اور اسلام کے گرنے کی وجہ پر غور کرنے لگا۔ اسے خلفائے راشدین کا زمانہ بہت پسند تھا جب اسلام میں جمہوریت تھی، انصاف تھا، ہمدردی تھی اور مولوی نہ تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے ہر کام کو، اپنی ہر چیز کو دورِ راشدین کے نمونہ پر چلائے۔ اس کو اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر تھا اور ان کی خوبیوں پر گھنٹوں بحث کرتا تھا اور لوگوں کو قائل کرتا تھا۔ چھٹی کی گھڑیوں میں اُس نے قرآن اور حدیث کو براہ راست سمجھنے کے لئے عربی پڑھنا شروع کی اور بہت جلد عربی میں اچھی قابلیت حاصل کرلی۔ اب وہ موقع موقع سے کسی بحث طلب نکتہ کو قرآن کی ایک چھوٹی سی آیت پڑھکر ختم کردیتا تھا۔ اس کو حدیث سے زیادہ قرآن پر عبور حاصل ہوگیا تھا۔ محمود مولویوں سے چڑتا تھا اور ان کو خوب خُوب جلی کٹی سناتا تھا۔ لڑکے جب اس کی مولوی پر پھبتیاں کستے سُنکر خُوب ہنستے تھے۔ محمود، سچ ہے کہ اُن کی نقل اُتارنے اور ان کو چڑانے بنانے میں کمال کرتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے نقال بن کر ان کے اُٹھنے، بیٹھنے، کھانے پینے کی ایسی ہنسانے والی نقلیں اتارتا تھا کہ دیکھنے والے ہنس ہنس کر لوٹ جاتے تھے۔ محمود دل ہی دل میں اسلام کی تباہی پر غور کرتا اور ہر بار اس نتیجہ پر پہونچتا کہ مولوی اور صرف مولوی جھوٹے طلسم کا مذہب پھیلا کر اس غارتگری کا باعث بنا ہے۔ محمود اسلام کے دورِ زریں کا دلدادہ تھا اس لئے اُس نے کوشش کرنا شروع کی کہ اپنی زندگی کو اس دور کا نمونہ بنائے اور صرف صحیح مذہب کی پیروی کرے۔ اسلام کی خدمت اور مولوی کی بیخ کنی اس کی زندگی کے نصب العین تھے۔

گرمی کا موسم تھا، رات کے آٹھ بجے، شہر کے باہر سول لائن کی ایک نہایت آراستہ کوٹھی کے باغ میں فرش بچھا ہوا تھا۔ جگہ جگہ شمع جل رہی تھی۔ برقی قمقمے سرو اور مولسری کے درختوں میں لٹکائے گئے تھے۔ گویا ایک نیا آسمان بن گیا تھا جس میں رنگ برنگ کے ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ جگہ جگہ لوبان جل رہا تھا جس کی بو باغ کے بیلا، جوہی، گلاب اور دیگر قسم کے پھولوں کی مہک کے ساتھ مل کر بیک وقت دین اور دنیا کی یاد دلا رہی تھی۔ احاطے کے باہر قرینے سے سڑک پر موٹروں کی قطار لگی ہوئی تھی جن سے اترنے والے بڑے، لوگوں کا استقبال محمود خود کر رہا تھا۔ محمود اب سب جج تھا اور آج اس نے بارھویں شریف کے موقع پر اپنے ہاں محفل میلاد منعقد کی تھی۔ اس نے شہر کے ہندو مسلمان رؤسا کو بلایا تھا اور شہر کے غریب مسلمان بھی آئے تھے۔ ملک کے مشہور مقرر اور مبلغ رسول اقدس کی حیات پر ایک نئے زاویہ سے روشنی ڈال رہے تھے اور خلفاءِ راشدین کے عہد کے چیدہ چیدہ واقعات بھی بیان کرتے جا رہے تھے۔ سامعین بڑے غور سے سن رہے تھے۔ ان کے چہرے پر درد انگیز رقت طاری تھی۔ محمود سفید شیروانی، پاتجامہ اور رومی ٹوپی پہنے رؤسا کے جھنڈ میں بیٹھا مقرر کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے اسلاف کے کارنامے اور رسول کی ہدایت کا ذکر سن کر عقیدت کے آنسو سے ڈبڈبائی ہوئی ... وہ رہ رہ کر ٹھنڈا سانس لے رہا تھا اور کبھی کبھی اپنے سفید رومال سے اپنی آنکھیں پونچھ لیتا تھا یا ناک صاف کر لیتا تھا۔ اسی فرش پر، مگر صاف ستھرے رئیسوں کے حلقہ سے دور، شہر کے غریب مسلمان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ محمود کی عقیدت کو عزت اور حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں کبھی محمود کی طرف دیکھ کر سرگوشیوں میں کچھ باتیں کر لیتے تھے۔ شہر کے رئیسوں میں ایک لالہ جی جو رائے بہادر تھے اور اردو زبان کے شاعر بھی مقرر کی ہر بات پر ٹھنڈا سانس لے رہے تھے اور رہ رہ کر اپنے ہاتھ زانو پر مار رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے جن کو جذب کرنے کیلئے وہ مسلسل جھکے ہوئے اپنی آنکھوں کو رومال سے ڈھکے ہوئے تھے۔ غریب مسلمان جو اپنی چھوٹی بڑی اولاد کے بغیر ایسی مجلسوں میں ہرگز نہیں جاتے آج بھی اسلام کی چھوٹی چھوٹی پود کے ساتھ آئے ہوئے تھے، بچے کوٹھی، باغ، رنگین قمقمے اور اپنے والدین کے مؤدبانہ انداز کو دیکھ کر مرعوب ہو رہے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں البتہ چین سے نہ تھیں۔ یہ محفل کی ہر چیز کو حیرت اور غور سے دیکھ رہی تھیں۔ بہت سے بچے شغل نہ ہونے کی وجہ سے اونگھنے لگے تھے اور بہت پڑ کر سو گئے تھے۔ غریبوں اور امیروں کی ٹولیوں کے درمیان محمود کے دفتر کے ہندو اور مسلمان اہلکار بیٹھے تھے۔ دفتر کے پیشکار ایک معمر مسلمان تھے۔ وہ جھکے ہوئے دوزانو بیٹھے تھے، وہ رو رہے تھے۔ ان کے رونے کی ہلکی ہلکی چیخ اکثر بلند ہو جاتی تھی۔ دفعتاً انہوں نے ایک زوردار چیخ ماری اور بیہوش ہو کر فرش پر گر گئے۔ محمود نے ان کو بیہوش ہوتے دیکھا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور پانی لینے کیلئے اپنی کوٹھی کی طرف ننگے پاؤں دوڑا۔ کوٹھی کا ہر شخص میلاد کی محفل کی طرف مخاطب تھا۔ کوٹھی تاریک اور سونی پڑی تھی۔ محمود بھاگتا ہوا غسلخانے میں داخل ہوا جہاں پانی کے گھڑے رکھے تھے۔ اس نے بجلی کا بٹن دبایا۔ دفعتاً پھیلنے والی روشنی میں کوٹھری جگمگا اٹھی۔ فرش پر محمود کا جوان لڑکا گھر کی جوان چھوکری کے ساتھ لیٹا پڑا تھا۔ اس نظارے نے محمود کے سر پر جیسے ضرب شدید لگا دی۔ اس کا سر چکرا گیا۔ کوٹھری کی چھت نیچے چلی آئی اور زمین چھت بن گئی۔ پانی کے گھڑے اوندھے ہو کر ہوا میں معلق ہو گئے۔ غسلخانے میں رکھے ہوئے تولیے اس طرح ہلنے لگے جیسے وہ طوفان میں الگنی پر لٹک رہے ہوں۔ محمود نے محسوس کیا کہ وہ اپنے سر کے بل کھڑا ہے اور اس کی ٹانگیں ہوا میں پھڑپھڑا رہی ہیں۔ اسکی حیرت فوراً جاتی رہی اور اسکی جگہ غصہ پہاڑی ندی کی طرح بپھرتا ہوا آ گیا۔ محمود نے لڑکے کی گردن اور چھوکری کے بال پکڑ کر انہیں کھڑا کیا، یہ کہکر "حرامزادے، ملعون" دونوں کو پوری قوت سے ایک ایک گھونسہ مارا۔

لڑکی گھونسے کے دھکے سے کوٹھری سے باہر جا گری اور لڑکا چوکھٹ پکڑ کر سنبھلا۔

محمود نے کہا: "حرامزادو، ذرا میلاد ختم ہولے تو میں تم لوگوں کی خبر لیتا ہوں۔"

یہ کہکر محمود نے پانی کا لوٹا اٹھایا اور تیزی سے بھاگتا ہوا محفل میں پہنچا جہاں سرد پانی کے متواتر چھینٹوں کے بعد پیشکار صاحب کو ہوش آیا۔ کچھ دیر بعد محفل ختم ہوئی۔ موٹر غراتے ہوئے رات کی تاریکی میں کھو گئے۔ غریب مسلمان ایک ہاتھ میں شیرینی کی طشتری اور دوسرے ہاتھ سے سوتے ہوئے بچے کو گود میں کھینچے ہوئے ماشاء اللہ سبحان اللہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ محمود غصہ سے دیوانہ کوٹھی میں آیا اور اپنے لڑکے کو بلا کر پوچھا: "مردود! غسل خانہ میں کیا ہو رہا تھا؟"

لڑکا بیس سال کا خوبصورت نوجوان تھا۔ بی۔ اے کا امتحان دے کر آیا تھا۔ محمود کے سوال کو گردن جھکائے سنتا رہا اور خاموش رہا۔ محمود نے ڈپٹ کر پوچھا: "بولتا کیوں نہیں؟"

لڑکے نے کہا: "ابا کچھ بھی نہیں، میں معافی چاہتا ہوں۔"

محمود غصہ سے پاگل سا ہو رہا تھا۔ اس کو حیرت تھی کہ اس کا لڑکا اور ایسے وقت میں گناہ کبیرہ کر رہا تھا اور اسی کے گھر میں۔ اُف، توبہ۔ اسکا گھر جہاں کے چپہ چپہ پر مصلیٰ بچھ چکا تھا اور تلاوت قرآن ہو چکی تھی۔ کیسا موذی اور کمینہ تھا اس کا لڑکا جس نے ایسی مقدس فضا میں ایسی سڑی غلاظت لاکر گندگی پھیلا دی تھی، اُف، اس کا لڑکا اور زنا کرے۔ توبہ۔ توبہ۔ یہی ملعون، ناپاک، ناشدنی، ناخدا ترس لوگوں نے مذہب کو بدنام کیا ہے اور اسلام کو تباہی میں لا رہے ہیں۔ محمود کو اسلام کی تباہی کے خیال کے ساتھ خلفائے راشدین کا دور یاد آگیا اور پھر حضرت عمرؓ کا۔ حضرت عمرؓ نے ایسے موقع پر اپنے لڑکے کو کوڑے مار مار کر مار ڈالا تھا۔ محمود نے کمرے میں ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ ایک کونے میں اُس کی موٹی بید کی چھڑی پڑی تھی جس کو وہ روز شام کو لیکر ٹہلنے جاتا تھا۔ محمود نے لپک کر چھڑی اُٹھائی اور نتیجے سے بے خبر ہو کر لڑکے کو بے پناہ پیٹنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے حضرت عمرؓ کوڑا لئے اپنے بیٹے کو مار رہے تھے۔ لڑکا "اب نہیں ابا، اب نہیں!" کہکر چھڑی کے ضرب کو اپنے ہاتھوں پر روک رہا تھا۔ محمود کا غصہ بھڑکتا جا رہا تھا۔ وہ جلاد کی طرح لڑکے کی بوٹی بوٹی کو چھڑی کی چوٹ سے کچل رہا تھا۔ لڑکا گھبرا اُٹھا، چیختا ہوا کمرے سے باہر بھاگا۔ محمود کی بیوی چیخ سُن کر پریشان دوڑی، شوہر سے لپٹ گئی اور اس کو بڑی مشکلوں سے شانت کیا۔ محمود نے غصہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "بلاؤ اس قطامہ چھوکری کو۔" مگر چھوکری اس بُلاوے سے بہت پہلے اپنا حشر جان چکی تھی اور غائب ہو چکی تھی۔ محمود کا لڑکا اس دن کے بعد سے پھر کبھی گھر لوٹ کر نہیں آیا۔ محمود کہتا: "اچھا ہوا ایسے زانی اولاد کے ہونے سے نہ ہونا اچھا ہے۔" محمود کی بیوی پوشیدہ طرح سے اپنے بیٹے کو رو رو کر تلاش کراتی، اِدھر اُدھر خط لکھتی مگر لڑکے کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔

محمود ایک دن برآمدہ میں حسب معمول تخت پر بیٹھا قرآن کی تلاوت کر رہا تھا۔ صبح کا سُہانا وقت تھا۔ چیت کا موسم تھا ٹھنڈی ٹھنڈی رُوح پرور ہوا کے جھونکے درختوں کی دھانی کونپلوں کو چھیڑتے بہ رہے تھے۔ فضا میں ہلکی سی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ آموں کے درخت بور سے لدے پھندے کھڑے تھے جن پر کوئل میٹھی کوک رہی تھی۔ محمود قرآن کریم کی سورہ رحمان پڑھ رہا تھا جہاں خدا کی دی ہوئی نعمتیں ایک ایک کرکے گنائی گئی ہیں۔ وہ اس سورۃ کے خوبصورت مترنم الفاظ کو خوش الحانی سے پڑھ رہا تھا اور کنکھیوں سے خدا کی نعمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ باغ میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے، مشرق کی طرف ایک ہلکی، بہت ہی ہلکی سی سُرخی پھیلتی جا رہی تھی۔ پھول کی خوشبو نسیم سحری کی لہروں میں مل کر اُس کے دل و دماغ کو تازگی دے رہی تھی، باغ سے بلبل اور شاما کی آوازیں اسکے کانوں میں آرہی تھیں۔ دُنیا میں ہر طرف آنند، سکون اور اُمنگ پیدا کرنے والی کیفیت طاری تھی۔ محمود نے ٹھنڈا سانس لیکر کہا: "فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن۔"

محمود یہ کہہ ہی رہا تھا کہ لاٹھی ٹیک کر چلنے کی آواز آئی۔ ایک بڑھیا، جھکی ہوئی، بیمار، میلے کپڑے پہنے ہوئی آئی اور محمود کے سامنے کانپتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔ محمود کو اس اچانک آمد پر جبکہ وہ خدا کی حمد گا رہا تھا، غصہ آگیا اور وہ بڑھیا کو تیکھی نظروں سے دیکھنے لگا۔

بڑھیا نے ڈرتی ہوئی آواز میں کہا: "جج صاحب، پرنام۔"

محمود نے بگڑتے ہوئے پوچھا: "تو کون ہے، کیا چاہتی ہے؟"

بڑھیا کمزور تھی اور شاید بیمار بھی، ہانپ رہی تھی۔ مشکلوں سے سانس روک کر کہا: "میری بیٹی، اسکو چھوڑ دو، پرماتما تمہارا بھلا کریگا۔"

محمود نے نفرت سے بڑھیا کو دیکھا اور بیقراری سے پوچھا: "کون، کیا، تیری بیٹی، کیا نام؟"

بڑھیا نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے محمود کو آس بھری نظروں سے دیکھکر کہا: "رام پتیا۔"

محمود نے اور زیادہ نفرت سے بڑھیا کی طرف دیکھکر کہا: "رام پتیا وہی جس نے اپنے گھر میں بغیر لائسنس کا چکلہ کھول رکھا ہے؟"

بڑھیا محمود کے لہجہ سے ڈر گئی اور سہمی آواز میں کہنے لگی۔ "جج صاحب چکلہ نہیں، میں غریب نادار ہوں، بیمار بھی رہتی ہوں، میری وہی ایک لڑکی ہے، وہ اگر کمائے نہیں تو اُس کا اور میرا پیٹ کیونکر بھرے۔ ہم دونوں بھوکوں مر جائیں۔"

محمود کہاں خدا کے صاف ستھرے صفات کا بیان پڑھ رہا تھا جس کو سُن کر رُوح اور باطن میں صفائی آتی ہے اور کہاں یہ چکلہ، یہ زنا جیسی مکروہ اور گندی چیزوں پر بحث ہونے لگی۔ محمود نے محسوس کیا وہ دفعتاً بلندی سے پستی کی طرف گرتا چلا آرہا ہے۔ اپنی اس خیالی جنت کو دنیاوی گندگیوں سے آلودہ ہوتے دیکھکر محمود جھلا اُٹھا اور بگڑ کر کہنے لگا: "بڑھیا، ناپاک، آوارہ، بدچلن، بیٹی کی سفارش کرنے آئی ہے۔ کیا تیری بیٹی کوئی شریف پیشہ اختیار کرکے تیرا اور اپنا پیٹ نہیں بھر سکتی؟"

بڑھیا نے روتے ہوئے کہا: "رام تمہارا بھلا کرے، بیٹا، وہ اور کیا کر سکتی ہے۔ لنگڑی ہے کالی اور چیچک رو ہے۔ اُس سے مزدوری ہو نہیں سکتی، کوئی اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

محمود کے پاس کوئی جواب نہ تھا مگر پھر بھی کیا یہ بڑھیا چکلہ

نہیں رہتی تھی اور کیا یہ زنا سے حاصل کئے ہوئے پیسے نہیں کھاتی تھی؟ محمود نفرت اور غصہ سے بیتاب ہوگیا۔ اس کا بس چلتا تو اس کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش کی چٹیا پکڑے ہوئے گھسیٹتا اپنے احاطے سے باہر پھینک آتا۔ اُف یہ گناہوں کی پروردہ زال کہن سال، یہ کٹنی، قطامہ، مکارہ! اپنے گھر میں زنا جیسے گناہ کبیرہ کو ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور خدا سے نہیں ڈرتی۔ اف، یہ کافر، ناپاک گناہوں کی سرچشمہ، طاعون کی چوہیا۔ اسکے جسم کو چھونے والی ہوا زہر آلودہ ہو جاتی ہے۔ اسکی ناک سے جہنم کی تپتی ہوا نکل رہی ہے، اس کا پیٹ ابلیس کا خزانہ ہے۔ یہ جہنم کی شعلہ ہے، ناپاک، گندی، کمینی۔ محمود کے خیالات نے جہنم کا نقشہ پیش کر دیا۔ جس کے شعلوں میں اور آگ کے ڈھیر میں بڑھیا پڑی جل رہی تھی اور چیخیں مار رہی تھی۔ آسمانی فرشتے، سیاہ ہتھکڑے، ہاتھوں میں گرز لئے اس کا کچومر نکال رہے تھے۔ گرم گرم پانی، پیپ اور خون پلانے کے لئے دو فرشتے اس کا منہ پھاڑے ہوئے تھے اور مٹکے بھر بھر کر پیپ اور خون انڈیل رہے تھے۔ بڑھیا آنکھیں پھاڑے، کسی خوفناک جلے بھنے ہوئے درندے کی طرح چنگھاڑ مار رہی تھی۔ بڑھیا کھانس رہی تھی۔ محمود چونک پڑا اور چیخ کر کہنے لگا: "ارے کوئی ہے، نکالو اس قطامہ کو یہاں سے اس چڑیل نے چکلہ کھولا ہے، ناپاک زانیہ!"

محمود کا چپراسی، لمبا تڑنگا سرحدی پٹھان بڑھیا کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا اور اس کو لوٹے ہوئے ٹین کی طرح سڑک پر پھینک آیا۔ محمود کے دماغ میں تمام دن "زنا، ناپاک، گناہ کبیرہ" جیسے الفاظ گونجتے رہے۔

اس نے رام پیتا کو تین سال قید بامشقت کی سزا دی اور دل میں کہنے لگا: "اس ناپاک زانیہ کیلئے یہ بھی کم ہے، اے کاش دور راشدین ہوتا!"

محمود ایک دن کچہری سے قبل از وقت چلا آیا۔ اسکے سر میں درد تھا اور بخار جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بنگلہ میں داخل ہوا۔ ایک دس سالہ لڑکا میلے کچیلے کپڑے پہنے مشکوک طرح سے اس کے بنگلہ میں داخل ہو رہا تھا۔ محمود نے لڑکے کو ڈانٹ کر کھڑا رہنے کو کہا۔ لڑکا محمود کو دیکھتے ہی ڈر سے سفید ہوگیا اور بھاگنا چاہتا تھا کہ محمود نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور ڈانٹ کر پوچھا "تو کون ہے، کہاں سے آرہا ہے؟"

لڑکے نے سہمے ہوتے کہا "ٹھیکیدار صاحب کے ہاں سے"

ٹھیکیدار صاحب کا بنگلہ محمود کے بنگلہ سے کچھ فاصلہ پر تھا۔ ٹھیکیدار نے جنگ کے زمانے میں لوٹے پھوٹے زنگ آلودہ لوہے کے ٹکڑوں کو بیچ کر ایک کثیر دولت پیدا کر لی تھی اور اب ڈسٹرکٹ بورڈ کی سڑکوں کے ٹھیکیدار تھے۔ ان کی آمدنی معقول تھی۔ ذات کے کنجڑے تھے اور شہر کے روسا میں اُن کی نمایاں عزت تھی۔ محمود نے پوچھا "کیا کام ہے؟" لڑکا خوش رہا۔ محمود نے پھر ڈانٹ بتائی تو لڑکے نے رو کر ایک خط جیب سے نکال کر پیش کر دیا۔ محمود نے خط لیکر لڑکے کو بھگا دیا۔ لڑکا اپنی آستین سے آنسو پونچھتا ہوا چلا گیا۔ محمود کے ہاتھ میں ہلکے گلابی رنگ کا لفافہ تھا جس سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ محمود نے برآمدہ میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر خط کھولا۔ لکھا تھا۔

"میری جان رقیہ،

یہ ہمارے خط کے گھوڑے کب تک دوڑتے رہیں گے؟ کیا ہم یونہی پڑے تڑپا کریں گے۔ میری جان، شاید تم کو میرا خیال نہیں۔ تم اپنے والد سے ڈرتی ہو، ابا تمہارا کچھ نہیں کر سکتے۔ اب تم بالغ ہو اور اپنے ارادے کی مالک۔ ہم جب راضی ہیں تو ہمیں شادی سے کون روک سکتا ہے۔ پیاری، یہ گھڑی دو گھڑی کے لئے چھپ چھپ کر ملنے سے فائدہ۔ تم تو آتش فرقت کو تیز تر کر کے چلی جاتی ہو۔ میری جان، جلدی کوئی تدبیر کرو کہ ہم قریب تر ہو جائیں ورنہ تمہارا یہ پجاری، تم سن لو گی کہ کسی نہ کسی دن زہر کھا کر تمہاری یاد میں چل بسا۔ رقیہ پیاری، جلد ملو میری جان کہ اس دھڑکتے ہوئے دل کو سکون نصیب ہو۔

اپنی پیاری رقیہ کا پیارا قمر"

یہ پڑھکر محمود کا سر چکرانے لگا اور ہاتھ تھرتھرانے لگے۔ ہلکے سرخ رنگ کا کاغذ کسی سرخ جھنڈے کی طرح لہرانے لگا۔ خط کے حروف ٹیڑھے کیڑے نظر آنے لگے اور سطریں آڑی ترچھی معلوم ہونے لگیں۔ زمین گھومتی ہوئی چکی کی طرح چکراتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ محمود غم اور غصہ سے مریض کی طرح بے کل ہوگیا۔ اس کے خیال نے تیزی سے پہلے رقیہ کو نظروں کے سامنے پیش کیا۔ بھولی بھالی سی اس کی لخت جگر جسکی تعلیم پر وہ شروع سے خاص توجہ دیتے ہوتے تھا۔ آج ۱۹ سال کی عمر میں اس کی ساری محنت کو تباہ کرنا چاہتی تھی۔ آہ رقیہ، بھولی سی رقیہ جس کو پردہ، سنت نبوی، ارکانِ مذہب اور دینداری کی تمام باتیں اس نے خود سکھائی تھیں اور جس کی عصمت پر اُسے پورا بھروسہ تھا آج اس ٹھیکیدار کے لڑکے قمر سے پوشیدہ ملتی رہی تھی اور خط و کتابت کر رہی تھی۔ اُف یہ بے شرم لڑکی، نامحرم مرد سے ملنے میں اُسے ملنے میں کچھ شرم نہیں آئی؟۔ اس کے خیال نے پھر نفرت سے قمر کو پا بہ زنجیر پیش کیا۔ یہ قمر، خوبصورت، تعلیم یافتہ سہی مگر مجرم تھا، کمینہ، بزدل، اسکی بھولی لڑکی کو خراب کر رہا تھا۔ محمود کا خیال پھر رقیہ کی طرف گیا۔ اُف یہ اندھیر، ایسی مجرمانہ حرکت اور ایسا شدید گناہ، یہ رقیہ کو کیا ہوا کہ وہ ایک کنجڑے

کے لونڈے کے ساتھ بھاگنا چاہتی ہے۔ یہ رقیہ، یہ گناہوں کی گٹھڑی، یہ عورت، یہ ناپاک ناقص العقل چھوکری۔ محمود غصہ سے اُٹھا اور اندر داخل ہوا۔ محمود کی بیوی سو رہی تھی اور رقیہ ایک آرام کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ نیچے پڑا ہوا تھا اور خوبصورت بڑے بڑے بالوں کی چوٹی لٹک کر زمین کو چھو رہی تھی۔

محمود نے رقیہ کو دیکھا۔ اُف یہ گناہوں کی مجسم دوزخ، رقیہ کی لٹکتی ہوئی چوٹی سانپ بن کر محمود کو ڈسنے لگی۔ رقیہ باپ کو آتے دیکھکر کرسی سے اُٹھی اور دوسرے کمرے میں جانے لگی۔ محمود نے بڑھکر اُس کی چوٹی پکڑ لی اور پوری طاقت سے اسکے گورے گال پر ایک طمانچہ مارا۔ لڑکی کی آنکھوں تلے تارے ٹوٹنے لگے اور اس کے سفید گال پر اُنگلیوں کے نیلے نشان اُبھر آئے۔ وہ غش کھا کر گرنا چاہتی تھی کہ محمود نے جھنجوڑ کر اُسے کھڑا کیا اور پاس رکھی ہوئی قینچی سے رقیہ کی خوبصورت لمبی چوٹی کو جڑ سے کاٹ کر پھینکدیا۔ رقیہ چیختی ہوئی کمرے سے نکل بھاگی، اس کی ماں گھبرائی ہوئی نیند سے جاگ اُٹھی، دوڑ کر شوہر سے لپٹ گئی اور اسکے ہاتھ سے قینچی چھین لی۔ محمود غصہ سے انگارہ ہو رہا تھا۔ بیوی کو دھکے دیکر پلنگ پر گرا دیا اور اس کی گود میں سُرخ خط کو پٹخکر بولا۔ "دیکھو یہ اپنی بیٹی کے کرتوت۔"

محمود کی بیوی خط پڑھ رہی تھی اور وہ غصہ سے کمرہ میں ٹہل ٹہل کر بول رہا تھا۔ "رقیہ، یہ خوف خدا سے نہ ڈرنے والی حرافہ، خدا غارت کرے، کیسی بدچلن نکلی، اُف کیا کروں، اچھا محمود، دیکھ ایسی سزا دیتا ہوں کہ تیرا عشق کافور بنکر اُڑ جاتا ہے، بدمعاش، بدچلن" کمرے میں رقیہ کی کٹی ہوئی چوٹی پڑی تھی۔ وہ رہ رہ کر محمود کو کالے ناگ کی طرح ڈس رہی تھی۔ یہ کالی چوٹی! ایک ناپاک گناہ کبیرہ کرنے والی لڑکی کی!! محمود کی نظروں میں یہ چوٹی طرح طرح سے اینٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جیسے کوئی زخمی سانپ بل کھا کر رہ جائے۔ محمود کو اسکی بیوی نے بڑی مشکلوں کے بعد ٹھنڈا کیا۔ محمود جس کو کم از کم اپنا گھر دور راشدین کی یاد دلاتا تھا آج بت کدہ سے کم نظر نہ آ رہا تھا۔ اسکے چپہ چپہ سے جہاں صفائی اور تقدس کی کیفیت محسوس ہوتی تھی آج اُس کی نظریں گناہ خانے کی ایسی ہوئی تنگ و تاریک کوٹھری بن گئے تھے۔ اُس نے اپنی زندگی بآغاز سے روشنی ڈالنی شروع کی۔ اس کو اپنی تمام عمر ایک چمکتے ہوئے ہیرے کی طرح نظر آئی جس میں گناہ یا آلودگی کا کوئی ہلکا سا بال بھی نہ تھا۔ اس کی زندگی شروع سے ایک اچھے پاکباز مسلمان کی طرح گذری تھی جس میں عشق، محبت، گناہ، زنا جیسی مکروہات کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ اپنی حیات کے چمکدار سُورج پر دُنیا کے کثیف اور کالے بادل کو چھاتے دیکھکر غصہ سے جھنجلا اُٹھا۔ آخرش یہ بادل، سورج کی تیز روشنی سے پگھل کر غائب کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہ کیوں آہستہ آہستہ بڑھکر اس عالمتاب خورشید کی روح پرور روشنی کو چھپانے میں کامیاب ہوتے جا رہے ہیں؟ آہ خلفائے راشدین کا روشن دور جب اُجالا تھا اور تاریکی کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔

محمود خود بخود کہہ اُٹھا۔ "رقیہ میرے سُورج کی سیاہ بدلی ہے مگر میں اسے یوں تاریکی پھیلانے کو چھوڑ نہ دونگا۔"

رقیہ دوسرے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ اپنے باپ کے غصہ اور پاکیزہ خیالات سے اچھی طرح واقف تھی۔ محمود نے جب رات کو مزید تنبیہہ کے لئے رقیہ کو بُلایا تو وہ نہیں ملی۔ ہزار ڈھونڈا گیا مگر کہیں پتہ نہ چلا۔ نہ جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

محمود کو اب پنشن ملنے میں دو چار سال باقی رہ گئے تھے۔ اب وہ سیشن جج تھا۔ اس کے خیالات پہلے سے زیادہ پختہ ہو گئے تھے۔ اس کو مولوی سے ابتک نفرت تھی۔ مولوی مذہب و ایمان کی تباہی کا آلہ تھا۔ یہی دین فروش مذہب کو تباہ کر رہے تھے اور اسلام کو پستی میں لا رہے تھے۔ محمود صبح کی چاء پی کر مقامی اخبار دیکھ رہا تھا۔ اخبار کے پہلے ورق پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔

"فلم اسٹار کی کوٹھی میں قتل!

ملزمہ نے عدالت میں روتے ہوئے جج کو ابا کہکر پکارا!!

ملزمہ کو پھانسی کی سزا!!!"

محمود نے اخبار رکھ دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ اُسی کے اجلاس کا واقعہ تھا۔

محمد نصیر الدین

مغربی گھٹائیں

اُٹھیں سمت مغرب سے اُودی گھٹائیں
ہوئیں تیرہ سارے جہاں کی فضائیں

لطافت، نزاکت، نفاست میں ایسی
کہ جل تھل بھریں جو برسنے پہ آئیں

نہ اولے نہ مینہہ اور نہ ہلکی پھواریں
رسیلی نسیمیں، نشیلی صبائیں

نہ گرجیں نہ برسیں نہ چمکائیں بجلی
مگر ہر طرف رنگ اپنا جمائیں

دھکیلے لئے دُور سے آ رہی ہیں
گھٹاؤں کو شیطاں کے دل کی دُعائیں

بیاباں اُداس اور بن دم بخود ہیں
بگولے ہیں سہمے تو چُپ ہیں ہوائیں

پرندوں، چرندوں، درندوں میں غل ہے
زمیں اب پھٹے اور ابھی ہم سمائیں

ہے ناگن کی پھنکار محفوظ ان میں
جو سونگھے اُنہیں، اُس کو یہ سونگھ جائیں

بنی نوع انساں سے یہ چاہتی ہیں
تصدق کریں جان، آنکھیں بچھائیں

لدی مغربی مردم آزاریوں سے
دکھاتی ہیں عقل و خرد کی ادائیں

ہوائی جہازوں کی ہے لام بندی
عقابی مشینوں سے پُر ہیں فضائیں

بہادر مشینوں میں پھرتے ہیں اُڑتے
کہیں اشتہار اور کہیں بم گرائیں

سمندر میں ہیں تار بجلی کے بچھے
زمیں پر ہیں بجلی کے کھم دائیں بائیں

خبر گرم ہے دوست دُشمن کی ہر سو
کہ بے تار آتی ہیں سب کی صدائیں

کہیں مکر و حیلہ، کہیں زور و طاقت
ہُنر ہوتے جاتے ہیں ان کے خطائیں

عجب کیا اگر زہر کی ہناز پھیلے
جو دیکھے صواب اور نہ دیکھے خطائیں

نفس کے ذریعے بر اچھے گی شش ہیں
کریگی یہاں سے انوکھی جفائیں

نہ توپ و تفنگ اور نہ تلوار و خنجر
نہ حملہ کریں اور نہ خندق کھدائیں

نہ کوئی محاذ اور نہ فوجوں کا مرکز
نہ پھٹ پھٹ، نہ دھوں دھوں نہ شائیں نہ دھائیں

بلاؤں کو دعوت گھٹاؤں نے دی ہے
گھٹاؤں کی ہیں منتظر کربلائیں

سیاسی پھندر ہیں اس دُھن میں غلطاں
کہ تیریں تو ہم اور سب ڈوب جائیں

دغاؤں فریبوں میں اُلجھے ہوئے ہیں
نہیں اتنی فرصت کہ سر بھی کھجائیں

بحیثیت فن ہیں قومی مفکر
مگر خلد میں ان کی دولت سرائیں

بنی نوع انساں کے یہ بھیڑیے ہیں
جسے پائیں کمزور اُسے پھاڑ کھائیں

یہ سب کچھ ہے لیکن برسنے پہ تُل ہیں
انہی بھیڑیوں کے سروں پر گھٹائیں

لبیب

تہذیب کا مستقبل

نوٹ:۔ اس سلسلہ کی تین تقریریں آل انڈیا ریڈیو کے بمبئی اسٹیشن سے زبان انگریزی میں نشر کی گئی تھیں اور اب بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب "ساقی" کیلئے ان کا ترجمہ اردو میں کیا گیا۔

تمہید

حکمائے قدیم علم اصول کے مطابق پیشین گوئیاں کرتے آتے ہیں۔ قانون فطرت کے ماتحت چاند اور سورج گرہن کے اوقات قبل از وقوع دریافت ہو جاتے تھے لیکن عوام پر ان اصولوں کا انکشاف نہیں کیا جاتا تھا۔ ان تحقیقات کو حکما اپنی معجز نمائی کہا کرتے تھے۔ جوں جوں زمانہ بدلتا گیا علم اصول کے جاننے والے بڑھتے گئے اور عوام میں بھی واقعات عالم کے وجوہ جاننے کا ذوق پیدا ہوتا گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ بازی گری کی حدود سے نکل کر اس فن نے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کرلی۔ تحقیقات کے جذبہ میں ارتعاش بڑھتا گیا اور معلومات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔

اگر ہم کسی واقعہ کی وجہ بخوبی سمجھتے ہیں تو یہ ہوسکتا ہے کہ ضروریات کے مطابق ردو بدل کرکے اس واقعہ کو آئندہ نسلوں کیلئے خوشگوار تر بنا سکیں۔ اس طرح طبعی میلانات کے زیر اثر مستقبل کو ترقی کی شاہراہ پر لگانے میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ آج سے پچاس برس بعد ہندوستان کی مرکزی آئینی مجلس کے صدر اعلیٰ کا نام پنڈت رام بھروسے ہوگا یا مولانا محمد عارف۔ اور اس کے جاننے سے کچھ حاصل بھی نہیں۔ لیکن یہ بتانا ممکن ہے کہ ایک صدی یا دس صدی بعد ہماری نسلوں کی طرز رہائش کیا ہوگی۔ اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ ۱۹۴۱ء میں کسی قرعہ اندازی میں آپ کو پہلا انعام ملے گا یا ایک لمبی کالی عورت آپ کی بیوی بننے کا شرف حاصل کرے گی تو قانون مجھے فریب اعتماد کا مجرم قرار دیگا۔ کیونکہ اس کو کہتے ہیں قیاس یا اٹکل۔ لیکن اصطلاحی پیشین گوئیاں اکثر صادق آتی ہیں۔

ایک وحشی کو فکر فردا نہیں ہوتی۔ وہ دریا پر پل باندھتا ہے لیکن اسکی تعمیر آنے والے سیلابوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہیں کرتا۔۔۔ برخلاف اس کے ایک مہذب انسان کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہے۔ وہ اسکے متعلق معلومات فراہم کرنے میں سرگرم رہتا ہے۔ زراعت کیلئے آئندہ موسم کا جاننا بہت ضروری اور کارآمد خیال کرتا ہے۔ لیکن ٹیٹری کے بولنے پر اب وہ بارش کی امید نہیں لگاتا بلکہ مشاہدات کی بنا پر جو کیفیت اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہے اس سے وہ اپنی فصلوں کی کاشت کے لئے مناسب زمانہ مقرر کرتا ہے اور عام طور پر اُسے دھوکا نہیں ہوتا۔ اگر اسی قسم کا رجحان دوسرے شعبہائے زندگی کا مستقبل دریافت کرنے کی طرف بھی ہوتا تو تہذیب کی بہت سی غلطیوں سے ہمارا دامن پاک رہتا۔

ماہرین کیمیا نے بہت سے غیر معلوم عناصر کی موجودگی اور ان کی جملہ خاصیتوں کو اُن کے علم میں آنے سے بہت پہلے مفصل بتا دیا تھا اور جب یہ عناصر عالم انکشاف میں آئے تو وہ پیشینگوئیاں لفظ بہ لفظ پوری اتریں۔ یہ معلومات ایک منقش آئین کے ذریعے دریافت کئے گئے تھے۔ پچاس سال قبل دنیا نے کیمیاگروں کا مذاق اڑایا کیونکہ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ ایک دھات دوسری دھات میں تبدیل کی جاسکتی ہے۔ آج یہی تغیر فی الذات صرف ممکن ہی نہیں بلکہ عنقریب پایۂ تکمیل کو پہونچنے والا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ جو نظریہ رواج پا جاتا ہے اسکو مقبولیت کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک سائنسداں یہ سمجھتا ہے کہ قید ازدواج ایک رواجی امر ہے جو کہ وقت اور آب وہوا کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً وہ یہ خیال کرتا ہے کہ آئندہ نسلیں حالات کے بموجب ممکن ہے کہ دو یا دس شادیاں کرنا بہتر خیال کریں۔ البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تبدیلیاں کب ظہور پذیر ہونگی۔ مستقبل کے متعلق صحیح اوقات کا تعین کر دینا نہایت دشوار ہے لیکن مستقبل بعید پر روشنی ڈالنے کیلئے تاریخوں کو زیادہ اہمیت بھی نہیں دینی چاہیئے۔ بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جہاں تجارتی مفاد کے متعلق کسی غیب گو نے کوئی میعاد مقرر کی اس کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا کیا روپ ہوگا لیکن چونکہ اس کا رونما ہونا ایک اتفاقی امر ہے یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ انکشاف کب ہوگا۔ مثلاً اس صدی کے شروع میں ایچ۔ جی۔ ویلس جیسے باکمال غیب گو نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ سنہ ۲۰۰۰ء سے بہت قبل اور غالباً سنہ ۱۹۵۰ء کے قریب پہلا ہوائی جہاز فضا میں اڑتا

نظر آئیگا۔ لیکن ابھی اُن کی اس تحریر کی سیاہی کو خشک ہوتے چھ سال بھی نہ ہوتے تھے کہ رائٹ برادرس، آزادانہ ہوا میں اُڑتے دیکھے گئے۔ مگر تاریخوں کے صحیح نہ اُترنے سے مستقبل کی اہمیت اُن لوگوں کے نزدیک جو آئندہ نسلوں کی زندگی سدھارنے میں کوشاں ہیں کچھ کم نہیں ہوتی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر ایسی اصطلاحی غیب گوئیوں پر کماحقہٗ رجحان دیا جاتا تو دنیا کو انسانی زندگی کیلئے خوشگوار تر بنایا جاسکتا۔ مثلاً اگر اہل برطانیہ ایچ۔ جی۔ ولیس کی اِس صدی کی اِبتدا میں اس پیشین گوئی کو کہ آئندہ جنگ میں ٹینک (Tanks) استعمال کئے جائیں گے کان دھر کر سنا ہوتا تو اس آنے والی مُصیبت کیلئے پہلے سے تیار رہتے اور پچھلی جنگ عظیم چند ہفتوں میں ختم ہو جاتی۔ اس قسم کے واقعات نے ہمیشہ عوام اور سیاست والوں کو اچنبھے میں ڈالا۔ موجودہ زندگی میں انتشار اور تلاطم ایسی ہی بے خبریوں اور بے اعتنائیوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ گزشتہ کے تجربے پھر نہ دُہرائے جائیں تو ہمیں موجودہ حالات کا بغور مطالعہ کر کے ممکنات سے باخبر رہنا چاہیئے۔

ہر سائنس کی ابتدا مؤثر واقعات کے عالم انکشاف میں آنے سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر طوفان اور بخار کو لے لیجئے۔ ان مشاہدات کے بعد صحیح اندازہ اور پیمائش کی کوشش ہوتی ہے اور اکثر یہ دقت پیش آتی ہے کہ پیمائش کس شے کی کی جائے تاکہ واقعات زیر تحقیق کا پورا پورا حل مل جائے۔ طوفان اور بخار دونوں کی کیفیت جاننے کے لئے شیشے کی نلی میں پارے کی لمبائی ناپنے سے پتہ ملا۔ اُس کے بعد منقش تخمین اور جدولی اعداد سے مدد لی گئی جن سے کہ ایک اوسطِ انسان کو ہمیشہ اُلجھن رہی۔ ان دماغی کشمکشوں کے بعد یکایک ایک نئے اور سہل الیقین خیال نے ذہن میں جگہ لی۔ طائرِ خیال کو پر ملنے تھے کہ اُڑا اور طرح طرح کے راز فاش ہونے لگے۔ طوفان، عنصر کہربائی، (Anti-toxin) ماء الجبن (— [illegible]) جراثیم اور (— [illegible]) کی تحقیق ہو گئی۔ سائنس کا یہ زرّیں اصول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غیر متوقع امر ہمیشہ عالمِ ظہور میں آتا ہے اور ایک محقق کی نظریں ذہین سے ذہین تماشائی سے کچھ زیادہ دُور تک جاتی ہیں۔

اس تمہید سے میرا مقصد صرف اصطلاحی پیشینگوئیوں کی اہمیت ذہن نشین کرانا تھا۔ اب آپ کشادہ دلی کے ساتھ میرے ہمراہ ہو جائیے اور تھوڑی دیر کیلئے کوتاہ نظری اور جذبۂ احساس کے بجائے دلائل عقلی کو رہبرِ منزل بنا لیجئے جو کہ ایک طالب علم کا شعار ہونا چاہیئے۔

تعلیم

سب سے پہلے مجھے تعلیم کے مسئلہ پر بحث کرنی ہے۔ خیال ہے کہ مستقبل قریب میں تعلیم کا ایک خاص مقصد مقرر ہو جائے گا۔ یہ بات ابتک پیدا نہیں ہوئی کہ ایک باپ آپ سے یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنی استطاعت کے مطابق بہترین تعلیم دلا رہا ہے۔ لیکن اگر آپ اس سے یہ سوال کریں کہ یہ تعلیم کس غرض سے دلائی جارہی ہے تو وہ کچھ لکنت کے بعد جواب سے قاصر نظر آئیگا۔ تعلیم بذاتِ خود ایک مقصد تصوّر کیا جاتا ہے لیکن دو شخص کبھی اس مفہوم پر ہم خیال نہیں پائے جاتے۔ معلوم نہیں کہ یہ تعلیم انسان کو آئندہ زندگی کے مطابق بنانے کے لئے دی جاتی ہے یا محض دماغی نشو و نما کیلئے۔ شاید اکثر باپ یہ اُمید کرتے ہیں کہ اُن کے بچے ہر شعبے سے تھوڑی تھوڑی خوشہ چینی کر کے آئندہ زندگی میں اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ انہیں یہ نہیں معلوم کہ بہت سی راہیں فطرتی قانونِ وراثت کی بنا پر ان کی اولاد کیلئے پہلے ہی سے بند ہو چکی ہیں۔

یہ تو آپ کو علم ہے کہ پُرانی روش کے اساتذہ کیلئے آجکل کے مدرسوں میں کوئی جگہ نہیں لیکن یہ بھی واضح رہے کہ آج کل کے مدرسین کا بھی آئندہ کی درسگاہوں میں وہی حشر ہونے والا ہے۔ زمانہ مستقبل کے والدین اپنے بچوں کو ایک مضمون مطالعہ کرنے پر صرف اس وجہ سے مجبور نہ کرینگے کہ وہ مضمون انہوں نے خود پڑھا تھا بلکہ اُن کو احساس ہوگا کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کی تعلیمی ضروریات وقت اور حالات کی مناسبت سے دیگر تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی ہیں۔ سائنس اور ایجادیں جس رفتار سے ترقی ہو رہی ہے اُسے ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس رفتار کی سرعت تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے۔ نئے انکشافات ایک کے بعد ایک حیرت انگیز روانی کے ساتھ عالمِ وجود میں آرہے ہیں۔ ابھی ہم بمشکل بغیر تار کے طلعزاف سے رابطہ پیدا کر سکے تھے کہ لاسلکی ٹیلیفون ایک اصلیت کا جامہ پہن کر ہمارے سامنے تھا اور چند ہی سال کی مدّت میں سُننے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی۔ اشتہار کا ایک بالکل نیا طریقہ ایجاد ہوگیا۔ اب ایک مقرر اپنی آواز کروڑوں سُننے والوں تک ایک ہی وقت پہونچا سکتا ہے اور وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اخباروں میں بے جان مضامین کے ذریعے کبھی نہ حاصل ہوا تھا۔ یہ تو ابھی صرف ابتدا ہے۔ ٹیلی وژن (Television) ہم کو ایک دوسرے سے اور قریب تر کر رہا ہے۔ انسانی بصارت اور سماعت کی حدیں فاصلہ اور وقت دونوں لحاظ سے وسیع ہوتی جارہی ہیں۔ فلم پر آواز کا عکس اُتارنے کی جدّت نے

ہر گذرے ہوتے واقعہ کی خاموش تصویر کی بجائے چلتا پھرتا اور بولتا نقش، ماضی کی صحیح اور مکمل یادگار بنا کر ایک ہستی فانی کو بقائے جاودانی کا حامل کر دیا۔ اسی قسم کی ترقی دوسرے شعبہائے زندگی میں بھی ساتھ ساتھ ہو رہی ہے اور ہوتی جائیگی۔

مال اور مسافروں کی نقل و حرکت کی رفتار، سہولت اور حفاظت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ وقت دُور نہیں جبکہ کل سطح ارض پر ہر شخص کی رسائی ممکن ہوجائیگی۔ ہماری نسلیں سہ پہر کے وقت تفریح کی غرض سے اُسی آسانی کے ساتھ ٹمبکٹو جاسکیں گی جس طرح آجکل بمبئی کے رہنے والے جوہو ([illegible]) کے ساحل پر شام گذارنے آجاتے ہیں۔ اور وہ دُنیا کے جس گوشے میں بھی جائیں گی انہیں مانوس آوازیں سُنادیں گی جن سے کہ اُن کے کان لاسلکی ٹیلیفون کے ذریعے آشنا ہونگے۔ یہ سہولتیں ممکن ہے کہ بین الاقوامی زبان کی ایجاد کا پیش خیمہ ہوں اور مستقبل بعید میں ایک ایسی زبان بنجائے جس کے ذریعے ایک قوم دوسری قوم کے احساسات اور خیالات کا بخوبی اندازہ کرسکے گی۔ زبان کے اختلاف سے جو غلط فہمیاں ہمہ گیر ہو رہی ہیں اور جن سے ہر طرف جنگ کا بازار گرم رہتا ہے ہمارے دلوں سے دُور ہوجائیں گی۔ کسقدر افسوسناک ہے یہ بات کہ دو ملکوں کے ماہرین فن اگر اپنے مضمون پر تبادلہ خیالات کرتے ہیں تو انہیں کسی ترجمان کی مدد لینی پڑتی ہے۔ طلبائے سائنس کو غیر ممالک کی تحقیقات پر عبور حاصل کرنے کیلئے کتنا قیمتی وقت ضائع کرنا ہوتا ہے۔ مُردہ زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں اس کا نتیجہ تنزّلی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن تہذیب کے دُشمنوں کو اس میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ دُنیا کی ایک زبان ہوجانا لازم اور یقینی ہے کیونکہ اقوام کے تعلقات کچھ اس قدر پیچیدہ اور ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہوتے جارہے ہیں کہ انہیں براہِ راست علاقہ رکھنا ہی پڑے گا۔ بقائے نسل اور قومی فلاح کا راز اسی میں مضمر ہے۔

تحصیل علم کے جن طریقوں میں تضیع اوقات ہوتی ہے اُن کو یا تو مٹا دیا جائے گا یا مناسب ردوبدل کرکے بہتر بنا دیا جائے گا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ اسکولوں میں طلباء کا کتنا وقت لکھنا سیکھنے میں صرف ہوجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری نسلیں حروف تہجی ٹائپ رائٹر پر سیکھیں گی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک اصولی دُنیا کے رہنے والے کیونکر بھدّی اور بدخط تحریروں کے لئے اپنے عزیز وقت اور ذوق کا خون کرینگے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ٹائپ رائٹر سے انسان کی شخصیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا یہ کہنا کہ پیدل چلنے والے انسان کی شخصیت کا اندازہ موٹر پر چلنے والے کی شخصیت سے زیادہ بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے۔ ٹائپ رائٹر کی نوعیت میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہوجائینگی۔ یہ آلہ جیبی کیمرے کی قسم کا ہوگا اور نہایت ہلکی دھات سے بنایا جائے گا، تاکہ ہر وقت اور ہر جگہ استعمال ہوسکے۔ یہ ترقی بالکل ویسی ہی ہوگی جیسی کہ اُنگلی کے ناخن سے بتدریج فاؤنٹین پن کی ایجاد۔

بُنیادی زبانوں کی اختراع میں جو کوشش ہو رہی ہے اس سے تو آپ واقف ہی ہونگے۔ تھوڑے الفاظ میں مطالب ادا کرنے کی فکریں نتیجہ ہیں ہمارے حرکات و سکنات زندگی کی سرعت کا۔ رفتار میں اضافہ کے ساتھ گفتار میں اختصار ہونا لازمی امر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جسوقت ہمیں اپنی معاشرتی تہی مغزیوں کا احساس ہونے لگے گا تو لغویات میں ہم اپنا وقت ضائع نہ کرینگے بلکہ رسمی گفتگو کیلئے اسی طرح علامات مقرر کردئے جائیں گے جیسے کہ آجکل تار بھیجنے میں مستعمل ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کوئی کاروباری آدمی کسی گاہک سے ملتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ کہے: "کیسا پیارا موسم ہے! لیکن ممکن ہے کہ کل بارش ہو۔ اچھا! کہئے آپ کے بال بچے کیسے ہیں؟" وہ بڑبڑا دیگا: "دو سو چودہ، چار سو چھبیس"! اور گاہک جواب میں کہدیگا۔ "آٹھ سو ساٹھ"! اس طرح ابتدائی باتیں آناً فاناً ختم کرکے ایمانداری یا بے ایمانی کے ساتھ معاملات پر آجائیں گے۔ اندازہ لگائیے کہ سائنس اور ریاضی والوں کو کس قدر عزیز وقت برباد کرنا ہوتا اگر وہ علامات کا استعمال نہ کرتے ہوتے۔ کسی دفتر میں جاکر دیکھئے ایک صاحب خط کی عبارت لکھواتے ہیں دوسرے صاحب شارٹ ہینڈ ([illegible]) میں اُسے لکھتے جاتے ہیں اور پھر اُسے پڑھکر سُناتے ہیں۔ اسکے بعد وہ خط ٹائپ کیا جاتا ہے اور اوّل الذکر صاحب کے پاس تصیح اور دستخط کے لئے آتا ہے جب کہیں تکمیل کو پہونچتا ہے۔ بھلا زمانہ مستقبل کے سرعت پسند لوگ اس انداز معشوقانہ اور ستم ظریفی کے کب متحمل ہوسکیں گے۔ ان کی کوشش یہ نہ ہوگی کہ وقت کیلئے کام نکالا جائے بلکہ کام کیلئے وقت کی تلاش ہوگی۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنا انکا نصب العین ہوگا۔ وہ تو ایسے آلے استعمال کرینگے جن میں ہمہ گیر علم آواز اور اختصار کے اُصول پر ایک محرک صفحہ قرطاس پر آواز یا برقی لہروں کے ذریعے آناً فاناً الفاظ یا خیالات کے نقوش اُتر آئیں۔ لیکن قبل اسکے کہ انہیں اس میں کامیابی ہو اُن کو آواز کے مطابق الفاظ کے ہجے بنانے پڑینگے اور کل مقامی بولیوں ([illegible]) کو مٹا دینا ہوگا۔

اسکولوں میں تعلیم کا منشاء یہ نہ ہوگا کہ بچے کے معلومات میں اضافہ

کیا جائے۔ بلکہ اُس میں ایسی صلاحیت پیدا کرتا ہوگا جس سے کہ وہ خود تحصیل علم کرسکے۔ آج کل کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ واقفیت حاصل کی جاتی ہے وہ بالکل ہی ناکافی ہے۔ طالب علم میں یہ احساس پیدا کردینا کہ ساری عمر اُسے تجسس و فکر میں مصروف رہنا چاہیئے صحیح تعلیم ہے۔ مستقبل کے ضابطہ تعلیم میں ایسے لوگ عنقا ہونگے جو کہ خود غرض، متعصب اور ضدی کہے جاسکیں۔ آج کل آپ کو کتنے ایسے تعلیم یافتہ مل سکیں گے جو کسی معاملے کا تصفیہ حالات کی بنا پر بغیر نظائر اور کتابوں کی امداد کے کرسکتے ہیں۔ ہماری آئندہ نسلوں میں جدت طرازی کا جذبہ اپنے آپ پر بھروسہ اور لکیر کے فقیر رہنے سے اجتناب بیّن طور سے رونما ہونگے۔ ایسے بچے تلاش سے بھی نہ ملیں گے کہ جن سے اگر پوچھیئے کہ پانچ آٹھے کیا ہوتے ہیں تو بتادیں، چالیس، لیکن اگر پوچھیئے کہ آٹھ پنچے کیا ہوتے تو جواب ملے ہم نے ابھی آٹھ کا پہاڑہ نہیں یاد کیا۔ بیخبری کے ساتھ پہاڑے اور تاریخوں کا یاد کرلینا معدوم ہوجائیگا۔

جس طریقے سے کہ ہم دینیات کی تعلیم اپنے بچوں کو دے رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ بڑھکر یا تو ملحد ہوجاتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے کہ وہ کسی شے پر اعتقاد نہیں رکھتا اور یا نہایت ہی متعصب و مجذوب قسم کا انسان بن جاتا ہے جسے چند اقوال کے بلا سمجھے بوجھے بار بار دُہرانے ہی میں اک خاص قسم کا سکون و اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان خامیوں کو مستقبل میں اصولی تبدیلیوں سے دُور کردیا جائیگا۔ مستند مذاہب کے اصول اس طرح ذہن نشین کرائے جائیں گے کہ شکوک اور اَوہام کی گنجائش ہی دلوں میں باقی نہ رہے گی اور تعصب پاس نہ آنے پائے گا۔

ہم اب بھی بچوں کو اقلیدس کا یہ نظریہ سیکھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان مختصر ترین فاصلہ ہے حالانکہ آئنسٹائن (Einstein) کا نظریہ اس کے متعلق کچھ اور ہے۔ تاریخ کے معاملے میں تو ہم اس قدر روایات اور ہٹ دھرمی کی بھول بھلیوں میں پڑگئے ہیں کہ ایک علم اصول سے ماہر دماغ کو بھی جنگ، پیدائش، موت اور قوانین کے دائرے سے باہر قدم نکال کر اصلیت تک پہونچنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں علم تاریخ کے مطالعہ کا اصول بھی بدل دینگی۔ شاہان مغلیہ کے سوانح حیات اور اکبر کی بیگمات کے حالات سے دلچسپی نہ رہیگی۔ بلکہ بچوں کو یہ احساس ہوگا کہ اس قسم کا مطالعہ وقت کی بربادی ہے۔ وہ اپنی کوششیں دنیا کے اقتصادی اور تمدنی مد و جزر کے جاننے میں صرف کرینگے اور اس سے آئندہ کیلئے مفید نتائج نکالیں گے۔

ایچ۔ جی۔ ویلس غالباً دور جدید کا پہلا مصنف ہے جس نے تاریخی واقعات کی نسبتی اہمیتوں میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اسکول میں بتایا گیا تھا کہ انگلستان کا عہد نامہ عظیم (Magna Charta) آزادی کی شاہراہ میں ایک بڑا قدم تھا لیکن ہم کو اس دستاویز کے پڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا ورنہ شاید ہم کسی دوسرے نتیجے پر پہونچتے۔ اصل میں یہ بادشاہ وقت اور چند برسراقتدار نوابوں کے درمیان ایک سمجھوتہ تھا جس کی رُو سے مال غنیمت کی تقسیم اُن کے درمیان کی جاتی تھی۔ بہت سی تاریخیں ایسی ہیں جو ہمیں ساری عمر یاد رہتی ہیں لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ملیں گے جو کہ طباعت کی ایجاد کا سال صحیح طور سے بتاسکتے ہیں۔ حالانکہ اس ایجاد نے تہذیب پر فتوحات، عہد ناموں اور لڑائیوں سے کہیں زیادہ اثر کیا ہے۔

آنے والے دور میں تاریخ کا مطالعہ مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا جائے گا۔ جن ماہرین نے اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے حالات کا جائزہ اس اُصول کے ماتحت لیا تھا اُنہیں پچھلی جنگ عظیم کے متعلق پیشینگوئی کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ چند سور ماؤں نے ۱۸۹۴ء میں ایک کتاب "سنہ ۱۹۱۴ء کی لڑائی" کے عنوان سے لکھی جس میں ہونے والی جنگ عظیم کے وجوہ اور نتائج بالتفصیل بیان کئے تھے۔ یہ اقوال لفظ بہ لفظ صادق آئے۔ اگر ہم تاریخ سے سبق لیکر مستقبل کو سُدھار نہیں سکتے تو شاید ہم کسی بھی ذریعے سے یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتے۔ اگر سائنس کے قائم کردہ اُصول سے کماحقہٗ واقفیت حاصل ہو تو آئندہ صدی کی ترقیوں کا نقشہ کھینچنا گذشتہ صدی کے صحیح واقعات لکھنے سے زیادہ آسان معلوم ہوگا۔

امتحان کے طریقوں میں بھی بہت کچھ تبدیلیاں ہونگی۔ یہ تو ہمیں ابھی احساس ہے کہ کسی کی ذاتی قابلیت اور صلاحیت کا صحیح اندازہ امتحان کے نتائج سے نہیں کیا جاسکتا۔ کسی لڑکے کے ریاضی کے پرچے میں اوّل آنے سے یہ نہیں یقین کیا جاسکتا کہ وہ ایک اچھا نجومی بن سکے گا اور ممکن ہے کہ وہ لڑکا جو اس پرچے میں ناکامیاب رہتا ہے طبعزاد خیالات کا حامل ہو اور اختراع کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ذہانت اور پیشے کا رُجحان جانچنے کیلئے نئے اُصول بنانے ہونگے۔ ممکن ہے کہ طبی ذرائع سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا ایک لڑکا بہتر منیم ہوگا یا ڈاکٹر۔ اور یہ پتہ لگ جانے کے بعد اُسے مناسب تعلیم دیکر اس شعبہ کا ماہر بنادیا جائیگا۔ تحریری امتحانات بھی ریڈیو کے رائج ہونے پر خطرے سے خالی نہ ہونگے۔

دورِ جدید کا اُصول یہ ہے کہ لڑکوں کو بلا سوچے سمجھے امتحانات پاس کرائے جاتے ہیں اور اسکے بعد کسب معاش کیلئے جد و جہد شروع ہوتی ہے۔ اُنکے رُجحان کا اُن کے پیشے سے عموماً کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن آئندہ آئین کے مطابق پہلے سے کسی خاص شعبہ کی ضروریات کا اندازہ لگا کر مناسب میلان کے بچوں کا انتخاب کر لیا جائے گا اور انہیں غذا، ماحول اور اصطلاحی مشوروں کے ذریعے ان سب اوصاف کا حامل بنا دیا جائیگا جن کی کہ اُس پیشے میں ضرورت ہوگی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹری اور جراحی کی مدد سے کسی خاص پیشہ کی صلاحیت پیدا کر دی جاسکے۔ قبل پیدائش کچھ ایسے علاج دریافت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس سے بچہ پیدا ہونے پر مطلوبہ میلانات اور صفات کا مالک ہو۔ ظاہر ہے کہ اصول تعلیم جب اس حد تک ترقی کر جائے گا تو ایک کامیاب مدرس بننے کیلئے اس قابلیت سے کہیں زیادہ ضرورت ہوگی جو کہ کامیاب وزیر اعظم بننے کے لئے درکار ہوگی۔ اور ان کی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مدرسین کی تنخواہیں ملک کی دیگر اسامیوں سے کہیں زیادہ ہونگی۔

آجکل کے عشقیہ افسانے ہماری نسلوں کو بالکل مہمل معلوم ہونگے۔ کیونکہ سائنس کے دور میں ایسی باتیں غیر فطری سمجھی جائیں گی۔ ممکن ہو کہ علم تحقیق محبت کو بعض برقی لہروں اور انکے تصادم کا نتیجہ ثابت کر دے اور جذبِ محبت کی مختلف منازل انہیں لہروں کے مد و جزر پر منحصر خیال کی جائیں۔ ابھی حال ہی میں امریکہ میں ایک آلہ ایجاد ہوا ہے جسکے ذریعے بوسے کے دوران میں عاشق و معشوق کے خلوصِ محبت کا صحیح طور سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک جان دو قالب، کا نظریہ جو فلم اور ناولوں میں پیش کیا جاتا ہے ایسی تحقیقات کے مقبول عام ہونے پر لغو معلوم ہوگا۔ نگاہیں لڑنا، مسکرانا اور اس قسم کی دوسری ادائیں محبت کا ثبوت تصور نہ کی جائینگی۔ ایسے دعووں کی دارالتجربہ میں آزمائش کر کے یہ بتایا جا سکیگا کہ ان میں کس حد تک خلوص ہے۔ یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ اکثر شادیاں بغیر محبت بازی کے کی جاتی ہیں اور یہ بسا اوقات محبت والی شادیوں سے کہیں زیادہ کامیاب ثابت ہوتی ہیں۔ مجھے اس میں بالکل شبہ نہیں کہ عورتوں کو موافقت کی تعلیم دینے کیلئے درسگاہیں قائم کی جائیں گی جن میں عملی طریقوں پر زیادہ زور دیا جائیگا۔ بچے پریوں اور دیوؤں کی کہانیاں پڑھنا پسند نہ کرینگے۔ بلکہ انجن اور مشینوں میں انہیں زیادہ دلچسپی ہوگی۔ بھلا کسے اتنا دماغ اور صبر ہوگا کہ مالوہ کی رات یا بنارس کی صبح کی دلکشی کا اندازہ کتابوں سے پڑھکر کرے جبکہ ہمہ گیر ٹیلیوژن یہ سب مناظر اصلیت کے جامے میں ایک بٹن دباتے ہی پیشِ نظر کر رہا ہو۔

سراج حسین نقوی

ثمرات

حقیقت کی حدیثِ بیکراں معلوم ہوتا ہوں
وہ ذرہ ہوں کہ وسعت میں جہاں معلوم ہوتا ہوں

مجھی سے ہیں یہ پیہم شوخیاں امواجِ طوفاں کی
مگر اپنی جگہ سنگ گراں معلوم ہوتا ہوں

کہاں سے ہو کہاں پہونچی بکھر کر عشق کی دُنیا
کہاں سمجھا گیا ہوں میں، کہاں معلوم ہوتا ہوں

کوئی آساں ہے اندازہ مری پروازِ پیہم کا
ازل سے بے نیازِ آشیاں معلوم ہوتا ہوں

بباطن کوئی پایاں ہی نہیں ہو میری قوت کی
بظاہر ایک جانِ ناتواں معلوم ہوتا ہوں

گماں اپنے پہ کرتا ہوں کبھی خاکِ پریشاں کا
کبھی شیرازہ بند دو جہاں معلوم ہوتا ہوں

مرے عجزِ طبیعت میں ہے ایسا ناز کا پہلو
زمیں مسکن ہے میرا آسماں معلوم ہوتا ہوں

مجھے بخشا ہے میری فکر نے رنگِ دوام ایسا
چمن زارِ حیاتِ جاوداں معلوم ہوتا ہوں

کسی ذرے کا دل نیشِ الم سے دُکھ گیا شاید
بجائے نغمہ سرگرمِ فغاں معلوم ہوتا ہوں

کوئی جام اور بھی ساقی، کوئی جام اور بھی ساقی
جواں معلوم ہوتا ہوں، جواں معلوم ہوتا ہوں

یہ جذبِ داستانِ حسنِ رنگیں اے معاذ اللہ
کہ میں خود حُسن کی اک داستاں معلوم ہوتا ہوں

مری ہستی سے ہے کون و مکاں کو ارتباط اتنا
تمنائے دلِ کون و مکاں معلوم ہوتا ہوں

مری ہستی نہیں نیرنگ سمجھو اک جزو کل کا
کہیں رہرو، کہیں میں کارواں معلوم ہوتا ہوں

مجھے آیا نہیں شایستۂ خاکِ وطن ہونا
اگر خاکِ وطن پر میں گراں معلوم ہوتا ہوں

ہوا ہے جب سے عرفاں مجھکو حاصل اے نہال اپنا
مجسم اک بہارِ گلستاں معلوم ہوتا ہوں

[illegible]

احساس کی قندیل

روکیں مجھے کیا عشق کی اُلجھی ہوئی راہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں

اِس دھر میں جب کوئی نہیں ہوتا ہے میرا ؎ جب ابر کے جنگل میں گرجتا ہے اندھیرا
جب باڑھ پہ آجاتی ہے ساون کی جوانی ؎ کھیتوں کو چبا لیتا ہے دریاؤں کا پانی
بل کھا کے لپکتی ہیں بگولوں کی قطاریں ؎ چلتی ہیں ہواؤں کی دہکتی ہوئی دھاریں
بے خوف بڑھے جاتا ہوں بھرتا ہوا آہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں

جب رُوح کی ظلمت سے اُٹھے دُکھ بھری فریاد ؎ جب دہر کی ہر شے نظر آنے لگے برباد
جب خلوت شب میں کوئی تارا بھی نہ چمکے ؎ جب قلب کی پہنائی میں طوفان ہوں غم کے
جب دل کے دھڑکنے پہ بلکنے کا گماں ہو ؎ جب اپنا وجود اپنی نگاہوں سے نہاں ہو
پاتا ہوں میں گردن میں حمائل تری باہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں

جب بھوک سے پھٹ جاتا ہے مفلس کا کلیجہ ؎ کہتا ہے: "خدا نے مجھے کیوں دہر میں بھیجا
یہ بھولا سا بچہ۔ یہ بہشتوں کا کھلونا ؎ کیوں اسکے مقدر میں ہے دن رات کا رونا
یا بھوک مٹانے کا سجھا کوئی سلیقہ ؎ یا چین سے مرنے کا بتا کوئی طریقہ"
سنتا ہوں جب احساس کی پُر درد کراہیں
احساس کی قندیل سے روشن ہیں نگاہیں!

احمد ندیم قاسمی

میراجیؔ

بچہ

فساد بڑھتا گیا۔ گورنمنٹ نے دونوں پارٹی کے ممبروں کو بغیر تحقیق جیل میں ٹھونسنا شروع کیا۔ مارنے والا اور پٹنے والا دونوں گئے۔

اُسی ہنگامے میں رشید کو پھر اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے نکلنا پڑا۔ شہر کے گلی کوچوں میں معلوم ہوتا تھا سنیما کے سین دکھائے جا رہے ہیں۔ سنسان گلی میں ایک دم بھگدڑ پڑ جاتی۔ اور پھر وہی موت کی سی خاموشی۔ جھگڑے فساد کے درمیان میں ہی رشید ایک ننھے سے ننگے دھڑنگے بچے کو بلوائیوں کے پیروں سے کچلنے سے بچا کر اِدھر اُدھر سے بچتا اپنے گھر پہونچا تو ایک اور ہی مصیبت آن پڑی۔ ایک تو ماں بیمار اوپر سے بچے کا پالنا۔ نوکر بلوے کے سلسلہ میں نہ جانے کہاں اُڑے ہوئے تھے، گھر پر ایک تباہی چھا گئی تھی۔ جھاڑو دینے اور کھانا پکانے اور ماں کی تیمارداری کرنے میں رشید کا دماغ لوٹا جاتا۔ اور جب سے بچہ آیا تھا اُسکے اور بھی حواس گم تھے۔ اُسے نہلانے دُھلانے میں اسے قیامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بچہ صرف گھٹنوں چلتا تھا اور کچھ کھا بھی نہ سکتا تھا۔ وہ چار چار دفعہ بچے کو بالکل ایک گلاس کی طرح کھنگال ڈالتا اور پھر بھی وہ میلا ہی رہتا۔ نہلاتے میں نہ جانے کتنی دفعہ صابن ہاتھ سے پھسلتا۔ کتنی دفعہ بچہ لوٹا اَوندھا دیتا اور کتنی ہی مرتبہ خود بچہ ہاتھ سے پھسلکر موری میں جا پڑتا۔

اور پھر اُسے کپڑے پہنانا!۔۔ خدا کی پناہ۔۔ رشید نے اپنی ساری بنیان اُسے پہنا ڈالے پھر تکیے کے غلافوں کی باری آئی اور آخر میں اُس نے اُسے چیتھڑے پہنا کر اوپر سے دھجیوں کی مدد سے ایک کرتے کی شکل میں جسم پر باندھ دیا۔ اُس کے کمرے میں میلے اور گیلے کپڑوں کے انبار میں بچہ کھیلا کرتا۔ وہ بیچین تھا کہ کب بلوہ ختم ہو اور وہ اُس ختنہ کو اُس کے ماں باپ تک پہونچا دے۔ مگر ایک بات تو یہ کہ اُس کی خشک کتابوں کی زندگی میں بچہ نے ایک دلچسپ ہلچل مچا دی اور اس کا کام کرنے میں اُسے گونہ دلچسپی ہوتی تھی۔ وہ گھنٹوں اُسکے ساتھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کرتا اور بچہ بھی بہت مانوس ہو گیا تھا۔ کبھی وہ اس سے نہایت سنجیدگی سے کھانا پکانے اور اُس رات کے واقعہ پر یک طرفہ بحث کیا کرتا تھا۔

بلوہ دب گیا اور گلی کوچے گذرنے کے قابل ہو گئے گو سینکڑوں گھر لُٹ گئے اور یتیموں کی تعداد کئی گنی ہو گئی۔

رشید نے بچے کو کسی یتیم خانے میں دینے کا ارادہ کر لیا تھا کیونکہ وہ اُسے سڑک پر لیکر "پانی چیز پرائی چیز" کے نعرے تو لگا نہیں سکتا تھا۔ اُسے کچھ افسوس سا ہوا جب وہ بچے کو ایک تولیہ میں لپیٹ کر یتیم خانے لے گیا۔

"اس کے ماں باپ کون تھے؟" مہتمم یتیم خانہ نے پوچھا۔ اور رشید کی لاعلمی ظاہر کرنے پر صاف کہدیا کہ "جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ یہ بچہ کسی ہندو کا ہے ہم اِسے ہندو یتیم خانہ میں نہیں رکھ سکتے۔ ویسے ہی شہر میں بلوہ ہو چکا ہے اور ابھی ہندو مسلمان کسی طرح بھی ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔"

رشید کو غصہ تو آیا لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اُسے کسی مسلم یتیم خانہ میں دے آئے۔ مگر اس کی حیرت اور غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُن لوگوں نے اِسے مفسدوں کے گروہ کا نمائندہ بتا کر کہدیا کہ وہ ان چالوں میں نہیں آئیں گے۔ یتیم خانوں کا معاملہ ہے اگر پھر بلوہ ہو گیا تو یہ معصوم بھی پھنس جائیں گے۔

رشید گھبرا کر بے جواب دیئے باہر نکل آیا اور اُس نے بچے کو لیکر ایک طرف چلنا شروع کیا۔

"اچھا مسٹر اب صاف صاف بتا دو کہ تم ہو کون بلا؟" اُس نے بچے کو پُل کی منڈیر پر بٹھا کر پوچھا۔

بچے نے ہنس کر ایک تھپڑ مار دیا۔

"ارے ۔۔۔ میں کہتا ہوں مولانا یہ مذاق کا وقت نہیں۔ بہتر ہے آپ سنجیدگی سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور صاف صاف اپنی ولدیت مذہب اور ذات پات سے خاکسار کو آگاہ کریں۔" اُس نے سنجیدگی سے تھپڑ کی زد سے بچ کر کہا۔

"غوں ۔۔۔ اوں" بچہ ہنستا رہا اور اُسکے بٹن کو دانتوں سے پکڑنے کیلئے زور لگاتا رہا۔

"اوہ ۔۔۔ آپ نہیں سمجھتے؟" اور وہ بچے کو اُٹھا کر چلنے لگا۔

یہ تو ناممکن تھا کہ وہ بچے کو خود پالنا شروع کر دے۔ گو اب نوکر بھی واپس

...یا تھا۔

وہ دیر تک چلتا رہا۔

"کیوں نہ جس کا مال ہو اُسے ہی دیدیا جائے" اُس نے بچّے کو ...کے کنارے بٹھانے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ اُترنے پر تیار نہ ہوا۔ رشید ...یقین تھا کہ اگر وہ اس طرح بچّے سے چھٹکارہ پا جائے تو اُسے کوئی نہ کوئی ...ہی لے جائے گا۔ اس نے بچّے کو بہلا پھسلا کر سگرٹ کا ڈبہ اور کاغذ ...سیرہ دیکر ایک سنسان سڑک کے کنارے بٹھا دیا۔

اور خود آہستہ آہستہ آگے چلا۔

"ڈا ڈا" بچہ بولا۔ اس کے پاؤں رُکے، مگر پھر بڑھا —— بچّے نے مُنہ لبورا۔

"حضرت میں آپ سے ڈرتا نہیں" اور وہ دو قدم اور بڑھا۔

"آ آ!" بچہ رونے لگا۔ رشید کے قدم کسی نے دو سکنڈ کے لئے روکے —— مگر وہ پھر بھی چلتا گیا۔ اُس نے بچّے کے رونے کی آواز سے بچنے کے لئے دونوں کان بند کر لئے اور لمبے لمبے ڈگ مارتا چلا —— بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ رشید رکا —— واپس مڑا۔ پھر چلدیا —— پھر مڑا۔ اور تھوڑی دیر رُکنے کے بعد وہ پھر چلدیا —— مگر ابکے اُس سمت جدھر سے بچے کی رحم طلب معصوم آواز آرہی تھی۔

رشید نے غصّہ ہو کر اُسے اُٹھا لیا تھوڑی دیر غور سے اُسے گھورا۔ بچہ پھر لبورا۔ رشید خاموش چلنے لگا۔ بچہ اُسے تھوڑی دیر ایسے دیکھتا رہا جیسے روٹھی ہوئی ماں کو دیکھتا ہے۔ پھر ننھا سا ہاتھ ہوا میں اُٹھا اور پورے زناٹے سے رشید کی کنپٹی پر پڑا۔

"بڑے بدمذاق ہیں آپ!" رشید نے ہنسی روک کر کہا۔

دوسرا تھپیڑ۔

"اچھا —— اچھا معاف کرتے" اُسنے بچّے کو کلیجہ سے لگا کر کہا۔

———٭٭٭———

پھر وہی بچہ اور وہی بیمار ماں اور گھر! لیکن اب وہ اتنا سُونا نہ نظر آتا تھا۔ وہاں ہر وقت ایک بچّے کی کلکاریاں اور ایک نیم پاگل انسان کے قہقہے گونجا کرتے۔ رشید نے اُسے پولیس کے سپرد کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مگر وہ انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کس کا! جب پولیس کو دینا ہی ہے تو پھر دو دن کیا اور چار دن کیا؟۔ اور دوسرے اُسے بچّے کو دینے جانے کے لئے کوئی نہایت موزوں وقت بھی تو نہیں ملتا تھا۔

———٭٭٭———

پھر ایک دن برجو اپنی ماں کے ساتھ آئی تو اُسے بچہ بڑا دلچسپ نظر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایسے بن گئے گویا کبھی پہلے ملے ہی نہیں ہیں۔ برجو نے پہلے تو بچّے کے بے ڈھنگے کپڑوں کا مذاق اُڑا کر رشید کو خوب جلایا۔

"ہونہہ بچّے کا پالنا بھی کوئی کمال ہے!" اُس نے غرور سے جواب دیا۔ "میں اِسے پندرہ روز سے بڑے مزے سے پال رہا ہوں!"

"پندرہ روز سے پال رہے ہیں؟ پندرہ روز؟ کیا کہنے ہیں آپکے!" برجو ہنستی رہی۔ "اور جیسا آپ پال رہے ہیں وہ خوب نظر آرہا ہے —— یہ —— یہ —— دیکھئے —— واہ!" اُسنے بچّے کے کُرتے کا مذاق اُڑایا اور بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگی۔

"آپ تکلیف نہ کریں میں اِسے نہلا کر ابھی سب کچھ ٹھیک کر لونگا!" اور وہ اُسے بڑی احتیاط سے نہلانے لگا۔

برجو کی معترض نگاہوں کے آگے رشید کے آتے حواس چلدیے کئی دفعہ بچہ پھسلا اور خود رشید کے کپڑے کیچڑ اور پانی میں ڈوب گئے۔ برجو ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ جس پر رشید اور کھسیانہ ہو گیا۔ جب بچّے کی آنکھوں میں صابن لگا تو برجو سے نہ رہا گیا اور وہ بے چین ہو کر بڑھی اور بچّے کو لے لیا۔

"ہٹئے آپ تو مار ہی ڈالیں گے بچارے کو"

"ہونہہ۔ یعنی اتنے دن سے ——"

"آدھ موا تو کر دیا" برجو نے بچّے کو سلیقہ سے سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔ تو گویا آپ بڑی ماہر ہیں۔ دیکھیں تو آپ کیا کمال دکھاتی ہیں" رشید نے اپنے کپڑے نچوڑتے ہوئے ایک طرف ہو کر کہا۔

برجو نے بچہ کو نہلا کر بدن پونچھنا چاہا تو رشید بے طرح گھبرا گیا اُس نے چاروں طرف دیکھ کر اپنی قمیص کھونٹی پر سے اتاری۔ کیونکہ کل چادریں اور تولئے کیچڑ میں بھری کونے میں پڑے تھے۔

"قمیص سے؟" برجو نے بُرا مان کر کہا اور رشید سر کھجانے لگے۔

"لائیے وہ میز پوش!" برجو نے معاملہ کو سمجھ کر طعن سے مُسکرا کر کہا۔ جب بچہ نہا چکا تو۔ رشید تازہ دُھلا ہوا بنیائن لئے بڑے مستعد کھڑے تھے۔ برجو نے صرف نفرت سے بنیائن دُور پھینک دیا اور بچّے کو اُسی تولئے میں لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں آج ہی اِسے دے آؤنگا" رشید نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا اور اُداس ہو کر بیٹھ گیا۔

"آپ اسے مجھے دیدیجئے"

"آپ کو۔۔ آپ کیا کریں گی۔۔ میں تو پولیس میں دیدونگا وہ اِسے پہنچا دیں گے اسکے گھر"

"اچھا تو ابھی چلئے۔۔ جب تک اسکے ماں باپ ملیں پولیس سے کہکر اسے میں رکھوں گی"

"آپ کیوں یہ دردِ سر مول لیتی ہیں"

"یہ دردِ سر نہیں" برجو نے اونگھتے ہوئے بچے کو پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

پولیس بچے کے ماں باپ کا پتہ کبھی نہ لگا سکی۔ مصیبت کے مارے بلوے کی نذر ہو چکے ہونگے برجو کا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال میں گذرنے لگا۔ رشید وقتاً فوقتاً بچے کو دیکھنے آتا اور دونوں میں کبھی کبھی جھگڑا ہو جاتا بچہ برجو سے ایسا مانوس ہوا کہ رشید کی ساری خوشامدوں کا جواب صرف منہ موڑ کر دیتا۔

برجو اور رشید میں بچے کی طرز پرورش پر بھی بحث ہوتی۔ وہ کہتا کہ یہ فراکیں لڑکوں کو پہنا کر عورتیں مردوں کی جنس پر چوٹ کرتی ہیں، اور برجو اُسے وہ تکیے کے غلاف اور بنیان یاد دلا کر شرمندہ کرتی جو وہ کبھی بچے کو پہنایا کرتا تھا۔

رشید بچے کو خوب چھیڑتا اور رلاتا جس پر برجو بگڑ جاتی۔ وہ اُسے ہمیشہ بُرے ناموں سے پکارتا اور برجو کی فرمائش تھی کہ سینما کے مشہور ترین ہیرو کے نام پر اس کا نام رکھے۔ وہ بچے کو پیاری پیاری لوریاں سُناتی تو رشید بالکل اُس کا اُلٹا کر کے برجو کو چھیڑتا۔ وہ کبھی بگڑ جاتی۔

"آپ ہوتے کون ہیں۔ میرا جی چاہے جو کچھ کروں۔ میرا بچہ ہے۔۔!"

"خوب! اور کیا میرا بچہ نہیں ہے۔ آپکو بگڑنے کا کیا حق!"

"یہ میں کب کہتی ہوں کہ آپ کا نہیں" بھولپن سے برجو بولی

"دونوں کا ہے"

"دونوں کا!" رشید نے اُمید اور بیم کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر پوچھا۔

برجو کا سر جھک گیا۔۔ اور وہ بچے کو لیکر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

قوم نے پھر جاگنا شروع کیا۔ بہت جلد چند معزز ہستیوں کو پتہ لگ گیا کہ ایک "مسلمان" بچہ ہنود کے یہاں پرورش پا رہا ہے۔ ہندوؤں کو بھی فوراً اس بچے کی حمایت میں اُٹھنا پڑا۔ کیونکہ اُنہیں یقین تھا کہ بچہ کسی اونچی ذات کا ہندو ہے۔ دونوں طرف دھرم نشٹ ہونے کا خوف اور "اسلام خطرہ" میں ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا۔ قوم کے سب سے بڑے خدمت گار یعنی ایڈیٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر اُٹھنے لگے۔ اور پھر جلسے ہوئے جس میں اس بچے کے مذہب کے خطرے میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی تباہی کے آثار نظر آنے لگے۔ وہی بچہ جسے ہندو مسلمان دونوں نے دھتکار دیا تھا اگر اپنی اور بہم انجام ہستیوں کی طرح سڑک پر کتوں کے ساتھ جھوٹے ٹکڑوں اور چچوڑی ہڈیوں کے پیچھے لڑ کر کسی روز خاموشی سے سڑک پر ہی آخری سانس لے لیتا تو کچھ نہ تھا۔ بَریں اُس کے دھرم کی گت اور اُسکے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کے مذہب کا زوال یقینی تھا۔ بھلا کس سے دیکھا جاتا۔ معاملہ اور بڑھا۔ دونوں فریقوں نے لاتعداد گواہ اُس بچے کے مذہب ثابت کرنے کے لئے مہیا کر دیے۔ مگر رسی کھنچتی ہی رہی۔ دونوں طرف زور شور سے چندے جمع کئے جانے لگے اور باقاعدہ فنڈ قائم ہو گئے جو شاید کسی زلزلہ زدہ شہر کے لئے بھی نہ کئے جاتے۔ اور جب کہ نہ جانے کتنے ہی معصوم مذہب سے دور جن کا دھرم صرف غربت تھی۔ فاقہ کشی میں گھرے ہوئے تھے لاکھوں روپیہ وکیلوں اور گواہوں کی جیبوں میں اُنڈیلا جا رہا تھا۔ یہ تو ہوئی ایک ملک کی مذہب پرستی!

جو کبھی فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہوتا تو فوراً اسلامی جھنڈے ہوا میں لہرانے لگتے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے سوتی قوم کو جگا دیا جاتا۔ روپیہ کی بوچھاڑ ہوتی اور بچہ دوسری پارٹی کی طرف منتقل ہو جاتا۔ لیکن فوراً ہی ملک ہماری پنڈت اور قوم کے موٹے موٹے لیڈر آکاش کے کل دیوتاؤں کو تڑپ تڑپ کر پکارتے اور بچہ پولو کی گیند کی طرح کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر لڑھکا دیا جاتا۔ انسانی زندگی کا یہ کھیل انتہائی دلچسپی پر پہونچ گیا۔

معاملہ اور بھی نازک ہو گیا۔ برجو نے صاف انکار کر دیا کہ ثبوت ملنے سے پہلے وہ کسی طرح بچے کو جُدا نہ کرے گی۔ اس کے ماں اور باپ انتہا سے زیادہ پریشان تھے۔ انہوں نے اُسے بہت سمجھایا کہ چولھے میں ڈالے بچے کو اس سے دست بردار ہو جائے۔ مگر وہ ایک ضدی بچی کی طرح اڑ گئی۔ بچے کی محبت عوام کی زیادتی کہ وہ اس کے پیچھے فضول لڑ رہے تھے اور اوپر سے اس کی ضدی طبیعت، ان تینوں چیزوں نے مل جل کر اسے دیوانہ بنا دیا۔ یہانتک کہ وہ رشید کے سمجھانے پر اور بگڑ گئی۔

اُسے پروا نہ تھی کہ فیصلہ ہندوؤں کے موافق ہو یا مسلمانوں کے۔ وہ تو صرف بچے کو چاہتی تھی۔

اور آخر اُس کے صبر کی انتہا ہو گئی۔ جب بچے کو ایک پارٹی کے حق مکمل فیصلہ ہو جانے کی وجہ سے اس سے درخواست کی گئی کہ وہ بچے کو اودے۔

"کبھی نہیں یہ میرا بچہ ہے" اُس نے باولوں کی طرح چیخ کر کہا۔

"تمہارا بچہ؟" وکیل نے دھوکا کھا کر جرح کی۔

"میں نہیں دونگی" وہ کچھ مجبور ہو کر اور بھی دیوانی ہو گئی۔

"تمہیں ثبوت دینا ہوگا کہ یہ تمہارا بچہ ہے"

برجو نے پریشان ہو کر سر جھکا لیا۔ واقعہ ایک نئی صورت میں تبدیل ہونے لگا۔

"کیا کوئی ماں یہ ثبوت دے سکتی ہے کہ اس کا بچہ اسی کا بچہ ہے" دوسرے وکیل نے کہا "ثبوت یہی ہے کہ وہ اس کی ماں ہے اور وہ اس کا بچہ"

کچہری میں غلغلہ مچ گیا۔ برادری کی لاج اور بدنامی کا خاکہ اڑنے لگا۔ لالہ جی نے چاہا کہ وہ اُسے زبردستی گھر لے جائیں مگر برجو پر ضد بُری طرح سوار تھی۔

"نہیں میں اسے نہیں دونگی" اُس نے بچے کو چمٹا کر کہا۔

"آپ دیکھتے نہیں کہ بچے کے جدا کرنے کے خیال سے ہی لڑکی کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور پھر بھی آپ ثبوت مانگتے ہیں۔ دیکھئے ذرا دیکھئے! کیا اب بھی آپ کو کوئی شک ہے؟" وکیل نے کہا اور ممتا کا ایک دلدوز سین دیکھ کر سب کے سر معنی خیز طور پر ہلنے لگے۔ کئی آنکھوں میں تو آنسو آ گئے!

"مگر تمہیں ثبوت دینا ہوگا! اس کا باپ کون ہے؟" جج کی بھاری آواز گونجی۔

"باپ؟" برجو نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں تمہیں بچے کے باپ کا نام بتانا ہوگا"

"میں نہیں جانتی" برجو نے ہارتے ہوئے کہا اور اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور سر جھک گیا۔

"ظلم ہے یہ صریحاً ظلم ہے۔ آپ ایک شریف لڑکی سے اُسکے ناجائز بچے کے باپ کا نام پوچھتے ہیں" نکواسی وکیل بولا۔

"یہ جھوٹ ہے" لالہ جی تڑپ کر بولے۔

"ہر باپ کو بیٹی کے ایسے معاملے کو جھوٹ کہنے کا حق ہے" وکیل بڑبڑایا۔

معاملے کی عجیب و غریب ہیئت کو دیکھکر برجو بدحواس ہو گئی۔

"یہ میرا بچہ نہیں ہے" اس نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"ہاں سچ سچ — غریب لڑکی — عزت کے آگے ممتا کچلی جا رہی ہے" وکیل نے تاسف اور رنج بھرے لہجہ میں کہا۔

برجو نے بچے کو علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ اس سے چمٹ گیا۔ برجو اور بھی پریشان ہوئی۔ وکیل کی ہمت بڑھی۔

"بیسویں صدی میں ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں۔ کیا تم اس بچے کو یتیم خانے میں چھوڑ دوگی تاکہ وہ قوم کے ایک ناکارہ فرد کی طرح بڑا ہو — کیا تمہارا دل اس ناانصافی کو قبول کرے گا" وکیل بے بات برجو سے الجھ پڑا اور یتیم خانوں کی دردناک حالت کا ذکر کر کے اس نے اُسے دہلا دیا۔ اُسنے بچے کو پیار سے اپنے قریب کر لیا۔

"میں اسے نہیں چھوڑ سکتی" اس نے خود سے کہا۔

"کوئی ثبوت کوئی اور ثبوت؟ یہ بچہ تمہارا ہے۔ بشرطیکہ تم اسکے باپ کا نام بتاؤ" برجو کے خاندان والوں کی چیخ پکار کے درمیان جج نے فیصلہ کیا۔

برجو کا سر پھر جھک گیا اور جب اُس کی شکست خوردہ آنکھیں دوبارہ اُٹھیں تو رشید کے چہرے پر پڑیں جو پہلے ہی سے پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ خاموشی سے لوگوں میں اشارے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا گیا اور معاملہ صاف نظر آیا۔

رشید بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ برجو نے بچے کو چھوڑ دیا اور وہ رینگتا ہوا رشید کے پاس جا پہونچا۔ محبت کا یہ دردناک سین دیکھکر لوگوں کو بے اختیار آنسو چھپانا پڑے۔

اور پھر غیب سے فرشتوں نے دیکھا کہ دو ہاتھ ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہاتھ برجو کا تھا اور دوسرا رشید کا۔

اب بھی اِن دونوں میں بچے کی وجہ سے ویسی ہی دلچسپ لڑائیاں ہوتی ہیں۔

"میرا بچہ!" ایک کہتا ہے۔

"میرا بچہ!" دوسرا ضد کرتا ہے۔

"ہم دونوں کا بچہ!" دونوں اتفاق رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔

عصمت چغتائی

تادیب

سوچنا تو چاہیئے اے شاعرِ ہم شکل خضر
یعنی اعصابی تعطل سے نہیں تو باخبر
خبطِ موسیقی مگر پائے تلفظ مضمحل
صورت و معنیٰ کی بے ربطی۔ سے بزمِ شعر میں
رعشہ بر اندام لیکن وصلِ جاناں کی ہوس
عالمِ زہد و ریاضت میں "امامِ خوش لقا"
نوجوانوں سے کہیں بڑھکر تجھے سودائے زلف
وسعتِ دشتِ جنوں پرور تری وحشت کو تنگ
جادۂ منزل سے وارستہ نظر آتا ہے تو
جس کے دامن تک نہ پہنچے کوئی تو گردِ راہ
تجھکو خاطر میں نہیں لاتا کوئی کافر نظر
بزمِ دلبر تک رسائی ہے نہ آسائش نصیب
تیرے سجدوں کا تواتر باعثِ سوہانِ عقل
التماسِ حالِ دل پر بے زبانی حرف گیر
تیرا وہ محبوب جو سارے زمانے کا محبّ
تیرا وہ مطلوب جو عیاریوں میں اپنی فرد
وہ "وفا نا آشنا" دشمن کے گھر مصروفِ عیش
"مہ جبیں" کی آڑ میں "چنگیز خاں" سی تجھکو عشق
"بر سرِ مقتل" جو ہے آمادۂ "قتلِ عمد"
تیری آہوں کا کرشمہ نظمِ اجرامِ فلک
"اسپِ سودا" ہے کہ تیرا "توسنِ عمرِ رواں"
دیکھ آئینہ کبھی اے طوطیِ شیریں زباں
کانپتے لب۔ ہانپتے نغمے۔ تنفس، ہچکیاں
تیرے بوڑھے منہ کہا سوتی ہزاروں پھبتیاں
جھریاں چہرے پہ۔ دل مُردہ۔ تمنائیں جوان
شاعری کی دُھن میں یکا بندۂ حسنِ بتاں
آستیں ٹکڑے، گریباں چاک، دامن دھجیاں
سبزۂ خود رو سے تجھ کو گھر پہ صحرا کا گماں
ذلتِ قطعِ منازل۔ اتباعِ کارواں
تیری جانب سے چلا جاتا ہے وہ دامن کشاں
تیرے نالے پست ہمت، تیری آہیں ناتواں
پاسباں تیرا مخالف۔ تیرا دشمن آسماں
گھستے گھستے گھس گیا اُس بُت کا سنگِ آستاں
داستانِ غم بیاں کرنے کو آنکھوں میں۔ زباں
کوچۂ و در پر عدو ہیں کارداں درکارواں
"انتہائے شیطنت" "دہرا بنایا ہے مکاں"
انتظارِ دید میں پھرتی ہیں تیری پُتلیاں
"آستیں میں دشنہ خفتہ" ہاتھ میں تیر و کماں
خنجروں سے اُس کے تو بھرتا ہے دل کا دوکداں
آسماں میں رات کو سوراخ ہیں، تارے کہاں

روتے روتے ختم ہو جاتے ہیں جب آنسو ترے
چشم "شب پیما" سے دل کا خون ہوتا ہے رواں

ناک میں دم سا رہے ہمسایوں کا تیرے شور سے
اور بستر پر اگر ڈھونڈو نہیں ملتا نشاں

شاخِ گل پر آشیاں تیرا رہینِ ہر بلا
شدتِ طوفانِ باد و حدتِ برقِ تپاں

جب قفس میں آب و دانہ کھینچ لاتا ہے تجھے
توڑ لیتا ہے تڑپ کر تو قفس کی تیلیاں

تجھ کو جب زنداں میں پہونچاتا ہے جرمِ عاشقی
پاؤں کی زنجیر بھی رہتی ہے تجھ سے سرگراں

قربِ دخترِ رز تو کیا آنکھوں نے بھی دیکھی نہیں
پھر بھی حاصل تجھ کو فخرِ بیعتِ پیرِ مغاں

بدلجامی کیوں سکھاتا ہے سمندِ عمر کو
ہیچ جولانگاہِ عالم میں تری سرگرمیاں

تیرا ہر مضمون ہلکا تیرا ہر دعویٰ سُبک
اور اک اک شعر میزانِ حقیقت پر گراں

ٹکروں سے توڑنا دیوار۔ اب اک مضحکہ
یا کسی دیوار کے سائے سے دبنا چیستاں

اب رگِ گُل سے پرِ بلبل کا بندھنا واہیات
اب ہے یہ نازک خیالی داخلِ نقصِ بیاں

اب بھی دور از کار تشبیہوں سے تو گرمِ ستیز
اب بھی ہے محبوبِ خوش قد غیرتِ سروِ رواں

اَب بھی تیرے واسطے "رفتارِ جاناں" حشر خیز
اب بھی ہیں خلخالِ پا میں صور کی دلدوزیاں

اب بھی سوزِ غم سے دل جلنے کا تو ہے معتقد
اب بھی تیرے سر پہ منڈلاتا ہے آہوں کا دھواں

اب بھی تیرے پائے استقلال کو جنبش نہیں
اَب بھی اُس بستی میں ہے تھا سو برس پہلے جہاں

اب بھی تجھکو ریگ پر ہوتا ہے دریا کا خیال
اب بھی موجوں پر تجھے ہوتا ہے ساحل کا گماں

اُونٹ پر اب بھی نظر آتی ہے عذرا کی جھلک
اب بھی لیلیٰ کو لئے جاتا ہے ظالم سارباں

اب بناوٹ سے نہیں تہذیبِ حاضر ملتفت
اب نگاہوں کو نہیں جچتی ملمع سازیاں

اب جہازوں کے لئے طوفان اک ہلکی سی لہر
اب دُخانی کشتیاں بے خوف موجوں پہ رواں

پھر بھی تو ٹوٹے سفینے میں ہے سرگرمِ سفر
جس میں خطرے سے نہیں خالی سوال بادباں

الحذر اے ذالِ میدانِ تغزل الحذر
الاماں اے شہسوارِ ہر زہ تازی الاماں

تمنا عارفی

رانی رادھا بائی

وہ دیکھو سامنے سے وہی چلی آرہی ہے۔ ہاتھ میں بیلن اس طرح پکڑ رکھا ہے جس طرح پرانے زمانے کے سورما گرز پکڑا کرتے تھے۔ چہرے پر غصے کے آثار ضرور ہونگے مگر رنگت کے غیر معمولی گہرے ہونے کے باعث ماتھے کی تیوریاں اور منہ کے ارد گرد کے نشانات جو غصہ آنے پر پیدا ہو جاتے ہیں، نظر نہیں آسکتے۔ صرف سرخ آنکھوں کی چمک دیکھکر اس کے غصے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دانت بھی اس آبنوسی چہرے میں ضرور چمکتے۔ مگر رانی صاحبہ نے اپنے شباب میں اور حسن ڈھل جانے کے بعد بھی مسّی اور پان کا باقاعدہ اور کثرت سے استعمال جاری رکھا ہے اس وجہ سے ان کے دانت بھی انکے چہرے کی سی رنگت اختیار کر چکے ہیں۔ تو گویا ان کے چہرے کی رنگت زردے والے پان کی سرخی اور مسّی کی سیاہی ملانے سے جو رنگ تیار ہو، ویسی ہے۔ یہ ابھی ابھی ہمارے گھر کے بھوی (حیدر آباد کی اصطلاح میں برتن مانجھنے والے کو کہتے ہیں) کی مرمت کر کے چلی آرہی ہیں۔ قصور یہ تھا کہ اس نے ابھی تک تو اکیوں نہیں مانجھا تھا۔ بھوی انکے عتاب در غصہ کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا ہے یہاں تک کہ توا اس کے ہاتھ سے پھسلکر گر گیا ہے اور گر کر اسنے بھی ڈر کے مارے کانپنا شروع کر دیا۔

رادھا بائی ہمارے گھر میں کھانا پکانے پر نوکر یا یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ چار سال ہوتے یہ ہمارے گھر کا کھانا پکانے پر مامور ہوئی تھی۔ مگر جلد ہی اس نے اپنی قابلیت یا ہمارے گھر والوں کی ناقابلیت اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس گھر کی عنانِ حکومت ہٹلر کی طرح اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اسی لئے میں اس کو رانی رادھا بائی کہہ کر پکارتا ہوں۔ مگر وہ مجھ سے بہت ناراض ہیں اور ایک مدت سے انہوں نے میرے خلاف اعلانِ جنگ کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں گھر سے تین سال غائب رہ کر انگلستان سے واپس آیا تو گھر میں ایک نمایاں تبدیلی یعنی رادھا بائی کی رنگیلی شخصیت نظر آئی۔ گھر میں ان کا دور دورہ تھا۔ ہر شخص بوڑھا بچہ، مرد عورت، آقا غلام اس کے عتاب سے خوف کھاتے تھے۔ انگلستان کی آزاد فضا سے آنے کے بعد مجھے سارے ہندوستان کی محکوم فضا نہایت واضح طور پر نظر آرہی تھی مگر اس کو درست کرنے کے لئے ملک کے بہترین دماغ جدّ و جہد کر رہے تھے اس لئے مجھے گونہ تسلّی تھی مگر خود ہمارے گھر میں رادھا بائی کی حکومت کا سکہ اس استحکام سے بیٹھا ہوا تھا جیسے سفید کاغذ پر سیاہی سے لکھی ہوئی عبارت یا معشوق کو کھو کر ہندوستانی عاشق کا دل۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً علم بغاوت بلند کر دیا۔ سب سے زیادہ جو چیز مجھے رادھا بائی کی ناپسند تھی وہ اسکی آواز تھی۔ اوّل تو اسکی آواز بہت موٹی اور بے سری تھی دوسرے وہ آہستہ کبھی نہ بولتی تھی۔ تیسرے خدا نے اس کو بولنے میں ایسی روانی دی تھی جس کی تیزی ایسی ہی تھی جیسے بدکے ہوئے آہو یا چمکے ہوئے گھوڑے کی رفتار ہو۔ اگر کسی پاس بیٹھے ہوئے انسان سے بات کرتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ مشین گن چل رہی ہے اور اگر اس کا مخاطب ذرا فاصلے پر ہوتا تو ایسا سنائی دیتا جیسے بادل گرج رہے ہوں اور بجلی کڑک رہی ہو۔ میں شروع ہی سے خاموشی پسند انسان تھا مگر انگلستان جاکر مجھے خاموشی اور سکون سے خاص طور پر انس ہو گیا تھا۔ عام طور پر انسان اپنے گھر میں چین اور اطمینان حاصل کرتا ہے مگر جب تک رادھا بائی گھر کے دالان کی رسوئی یا اس کے آس پاس چپکی رہتی ایک ہنگامہ مچا رہتا۔ چنانچہ میں نے رادھا بائی سے نہایت شریفانہ طریقہ سے درخواست کی کہ وہ کم بولا کرے اور جب بولے تو آہستہ بولا کرے کیونکہ گھر کے سب افراد میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جو بہرہ ہو۔ میں نے اپنی بات کو موثر کرنے کی خاطر اسے سمجھایا کہ زور سے بولنا بد تہذیبی میں داخل ہے۔ اخلاق یہی سکھاتا ہے کہ آہستہ بولا جائے۔ اور خدا نے بھی انسان کے دو کان اور ایک زبان اسی لئے بنائی ہے کہ وہ بولے کم اور سنے زیادہ......، چند لمحوں تک رادھا بائی خاموش رہی۔ میں نے سوچا الخاموشی نیم رضا اور عورت کبھی اپنے منہ سے ہاں، نہیں کہتی۔ چلو یہ معاملہ بھی آسانی سے رفع دفع ہو گیا۔ میں واپس ہوا اور اپنے کمرے کی طرف چلدیا جہاں ایک دلچسپ کتاب پڑھتے ہوئے رادھا بائی کے نعروں نے مجھے وعظ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے کہا اب اطمنان سے پڑھ سکونگا۔ مگر میں کمرے کے دروازے تک ہی پہونچا ہونگا کہ ایک شیطانی شور و غوغا بلند ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں ریل گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہوں یا کسی جنگل میں شیر اور ہاتھیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی ہو۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ درحقیقت رادھا بائی چند لمحوں تک اس لئے خاموش رہ گئی تھی۔ شاید حیرت میں غرق تھی کہ یہ کل کا چھوکرا اتنی جرأت کس طرح کر سکا تھا کہ اسکے سامنے اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑے ہو کر پند و نصائح کا دفتر کھولدیا! جب اسکی حیرت کم ہوئی تو اس نے بغیر کسی کو مخاطب کئے

گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر بولنا شروع کر دیا تھا۔

"اب تو صاب بن گئے ہیں ناں... مجھ پر حکم چلانے آئے تھے کہ خاموش بیٹھی رہا کر۔ میں کیا کروں۔ اپنی زبان کاٹ ڈالوں؟ یا سوئی دھاگا لیکر منہ سی لوں! روٹی پکاتے وقت ہزار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مانگوں یا نہ مانگوں۔ مانگوں تو لاٹ صاب کے لئے شور مچتا ہے، نہ مانگوں تو کھانا نہیں پک سکتا۔ ہر طرف سے میرا ہی منہ کالا ہوتا ہے۔ کیا کروں اماں بھی کچھ نہیں بولتیں۔ غضب ہو گیا! کسی نے مجھ سے آج تک ایسا نہیں کہا کہ منہ میں گھنگھنیاں بھر کے بیٹھ جا۔ یہ ماٹھی ملے نوکر بھی تو نہیں سنتے۔ پچاس دفعہ بلاتی ہوں تو ایکدفعہ جواب دیتے ہیں۔ میری تکدیر ہی بُری ہے۔ پرماتما بھی ایسا انیائے ہوتا دیکھکر کیوں خاموش ہے۔ میں اس گھر میں نوکری نہیں کر سکتی۔ کام کرنے کو آئی تھی جُپ سادھنے تھوڑا ہی آئی تھی.... (اور پھر ماسٹر رحمت کے انداز میں) اے زمین تو پھٹ جا تا کہ میں اس میں سما جاؤں"

یہ اُس معرکتہ الآرا تقریر کا تھوڑا سا حصہ ہے جو مجھے یاد رہ گیا ورنہ دراصل رادھا بائی متواتر پینتالیس منٹ تک بولتی رہی تھی اور تب تک بولتی رہی تھی جب تک کہ گھر کے سب لوگ اپنے اپنے حجروں سے باہر نہیں نکل آئے۔ گھر کی عورتوں نے اُسے سمجھایا۔ بعض اُسکے سامنے گڑگڑائیں اور اُسے چمکار پچکار کر نوکری نہ چھوڑنے کا وعدہ لیا۔ مجھے سب نے بُرا بھلا کہا۔ مجھ پر پھبتیاں اُڑائیں کہ میں تو بالکل انگریز بن گیا تھا اور بعضوں نے یہانتک کہدیا کہ "تم کو چاہیے کہ میم بیاہ لو اور ایک گھر کسی جنگل میں بنا کر رہو۔ نہ رہیگا بانس نہ بجے گی بانسری" میں نے سب کے ہاتھ جوڑے اور یہ کہکر گلو خلاصی کرائی کہ اصل میں میں ہی پاگل ہو گیا ہوں جو رادھا بائی کی کوئل کی طرح پیاری پیاری آواز مجھے دلخراش اور بُری معلوم ہوتی ہے۔

اُس دن سے رادھا بائی میری نظروں میں اور حقیقتاً رانی رادھا بائی بن گئی ہے۔ اور اُسی دن سے وہ مجھے اپنی حکومت میں روڑا سمجھتی ہے اور مجھ سے ناراض ہے اور میری ہر ایک عادت کو بُری عادت سمجھتی ہے۔ میرے پسند کی ہر ایک چیز سے نفرت کرتی ہے اور میری ہر ایک بات کو لغو اور واہیات گردانتی ہے۔ چونکہ اس کا راج ہے اس لئے میں زیادہ سے زیادہ شکوہ کر سکتا ہوں اور وہ بھی اُس سے نہیں اور نہ ہی گھر والوں سے بلکہ ونسٹن چرچل کی طرح دُنیا سے کہ وہ میری حالت دیکھے، مجھ پر رحم کھائے اور عبرت حاصل کرے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں وہ کونسی ایسی خوبی ہے جس نے سب گھرانے کو موہ لیا ہے اور میرے تمام اقارب و معاونین کو میرے خلاف کر دیا ہے۔ شاید اُس کے جسم میں کوئی جاذبیت ہو جو مجھے نظر نہیں آتی۔ میں اِس ساحرہ کا حُلیہ بیان کئے دیتا ہوں۔ چہرے کی رنگت کا ذکر تو پہلے ہی کر چکا ہوں۔ مُنہ کی ساخت بھی عجیب ہے۔ پتلا سا مُنہ چوہیا کی طرح ہے جس میں سُرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہتی ہیں۔ بال مُنہ کی رنگت اور چمک سے ملتے جُلتے ہیں اس لئے نمایاں طور پر نظر نہیں آتے۔ قد عام ہندوستانی عورتوں کی طرح ہے مگر جسم بہت دُبلا پتلا۔ ہمیشہ ہلکے گلابی رنگ یا طوطے کے رنگ کی ساڑھی پہنے رہتی ہے۔ میں آرٹسٹ یا مصوّر نہیں ہوں جو ان رنگوں کی موزونیت یا غیر موزونیت پر بحث کر سکوں مگر ظاہر ہے کہ رادھا بائی کے چہرے پر ان رنگوں کی ساڑھی پھبتی نہیں۔ عورت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ وہ ایسا رنگ پہنے جو اس کو سجے۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ کیوں رادھا بائی ایسے ہلکے رنگوں میں ملبوس رہتی ہے۔ ایک طرح سے اچھا ہی کرتی ہے جو ہلکے رنگ کی ساڑھی پہنتی ہے کیونکہ اگر یہ کبھی گہرے جامنی رنگ کی ساڑھی پہن کر نکل آئے تو دُور سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہو کہ برہنہ چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جوان نظر آنا چاہتی ہو کیونکہ اس کی عمر بتانا بہت مشکل ہے۔ چہرے سے تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکتا اس میں سمجھتا ہوں کہ پینتیس اور پینتالیس کے درمیان کہیں ہوگی۔ وہ ہاتھوں میں کثرت سے چوڑیاں پہنتی ہے اور پاؤں میں ایسے چھلّے اور کڑے جو چلنے کو گھنٹیوں کی طرح بجتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ نہ بولتے ہوئے چل رہی ہو (ایسا ہفتے عشرے میں کبھی ہو جاتا ہے) تو ایسا سُنائی دیتا ہے جیسے کسی صحرا میں اونٹوں کا قافلہ جا رہا ہو۔ مگر جب بولتے ہوئے چل رہی ہو (جیسا اکثر ہوتا ہے) تو اُس کے کڑوں اور چھلّوں سے پیدا ہونے والی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح غرق ہو جاتی ہے۔

رانی رادھا بائی بنارس میں پیدا ہوئی تھی۔ وہیں پلی اور جوان ہوئی اور اُسی مقدس شہر میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ مگر سنتے ہیں کہ شادی کے ایک سال بعد اس کا شوہر پاگل ہو گیا تھا اور شہر چھوڑ ایک دن ایسا غائب ہُوا کہ آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ مجھے رادھا بائی کے شوہر سے بہت ہمدردی ہے۔ ایسی عورت کا شوہر اگر پاگل ہو جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب تو مجھے تب ہوتا اگر وہ پاگل نہ ہو جاتا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ درحقیقت وہ پاگل نہ ہوا ہو گا بلکہ اپنی جان چھڑانے اور آزادی حاصل کرنے کی غرض سے اُس نے پاگلوں کا سا ایکٹنگ کیا ہو گا۔ بہرحال واقعہ کچھ بھی ہو رادھا بائی اپنے شوہر اور وہ رادھا بائی سے آزاد ہو چکا ہے۔

یہ تو معلوم نہیں کہ شوہر کے آزاد ہو جانے کے بعد جوان رادھا بائی کے شباب کا کیا ہُوا مگر جب سے اُس نے ہمارے گھر میں سکونت اختیار کی ہے اسکے جنسی احساسات اور اُمنگوں کا کچھ پتہ چلا ہے۔ ہمارے گھر میں

جہاں اور نوکر ہیں وہاں ایک ڈرائیور بھی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ رادھا بائی نے اسکو بالکل اپنے قابو میں کر لیا ہے۔

اِن دونوں کی شادی تو ابھی نہیں ہوئی مگر شادی کے بعد جو رشتہ اور ذمہ داریاں میاں بیوی کے درمیان پیدا ہو جاتی ہیں وہ اُنکے تعلقات سے عیاں ہیں۔ مثلاً ڈرائیور ہمیشہ دردِ کمر کی شکایت کرتا ہے۔ تنخواہ ملنے پر رادھا بائی کے لئے چوڑیاں، کنگھی، تیل، صابن وغیرہ لاکر دیتا ہے۔ بطرف دیگر رادھا بائی ڈرائیور کا کھانا خاص احتیاط سے پکاتی ہے۔ جو کچھ ہمارے سالن اور روٹیوں کیلئے ملتا ہے اُس کا بیشتر حصہ ڈرائیور کے پراٹھوں میں جذب ہو جاتا ہے۔ یہ خود کھانا لے جاتی ہے اور سامنے بیٹھکر محبت سے کھلاتی ہے اور اس کے کھا لینے کے بعد کہیں خود کھاتی ہے۔ کیوں نہ ہو بڑے سلیقے والی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ڈرائیور پر بھی رادھا بائی کے خاوندوں کا اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اپنی بہن کی شادی کی وجہ بتاکر اس نے ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ ڈیڑھ مہینہ ہو چکا ہے مگر اس کا پتہ نہیں۔ شاید رادھا بائی کے شوہر کی تلاش کر رہا ہے۔

ہمارے گھر کے اکثر لوگ اور خاص طور پر میں مرچ سے ایسا بھاگتے ہیں جیسے لاحول سے شیطان یا امپثار سے انگریز عورت۔ اسلئے میں نے رادھا بائی سے کئی مرتبہ درخواست کی کہ وہ سالنوں میں مرچ نہ ڈالا کرے۔ مگر جس کام کرنے کو میں منع کروں اُسے بھلا رادھا بائی کیونکر نہ کرے۔ وہ مرچ ڈالتی ہے اور زیادہ ڈالتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے سخت طیش آیا۔ اپنے گھر والوں پر جنہوں نے اس منحوس کو نوکر رکھا تھا۔ مرچ کھا کھاکر میری حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ میں نے گھر والوں سے صاف طور پر کہدیا کہ یا تو سالنوں میں مرچ نہ ہوا کرے یا میں گھر سے نکل جاؤنگا اور کسی نانبائی کے ہاں نوکری کر لونگا تاکہ مرضی کے مطابق دو نوالے کھانا تو نصیب ہوں۔ اس پر گھر والوں نے محسوس کیا کہ حالت واقعی نازک ہو گئی ہے۔ انہوں نے رادھا بائی کو ڈانٹنے کی کوشش کرتے ہوئے تاکید کی کہ آئندہ سے سالنوں میں ہرگز ہرگز مرچ نہ ڈالے۔ رادھا بائی نے اُس شام سب سالنوں میں نمک اور ہلدی تک نہ ڈالی۔ اور جب کھانے پہ شکایت کا طوفان مچا تو اُس نے گرجکر کہا کہ "خود ہی کہتے ہیں کہ مرچ نہ ڈالو اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ سالن پھیکے ہیں"۔ اس دن کے بعد سے اب مرچ کی شکایت کوئی نہیں کرتا۔

ع۔ مرچیاں اتنی کھیں مجھ میں کہ شکر ہو گئیں

رانی رادھا بائی کی عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ صبح سویرے اُٹھتی ہے اور نہا دھوکر اپنی دن بھر کی تقاریر کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ اِدھر آفتاب اس کے ڈر سے کانپتا ہوا نکلتا ہے اور ساتھ ہی رادھا بائی کی گرج سب گھر والوں کیلئے یہ پیغام لاتی ہے۔

نہ بیکار چادر میں مُنہ کو چھپاؤ عبث اپنے کانوں کو تم نہ دباؤ
اگر چین چاہتے ہو گھر چھوڑ جاؤ نہیں تو زباں پر گلہ تم نہ لاؤ
اُٹھو سونے والو میں چلا رہی ہوں

سب گھرانہ بیدار ہو جاتا ہے۔ بچارا کتا جو ساری رات چوکیداری کا فرض ادا کرکے اونگھ رہا ہوتا ہے وہ بھی کان پھڑپھڑاکر جیسے شیطان کو جھٹک رہا ہے ایک جگہ سے اُٹھکر دوسری جگہ لیٹ کر سونے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ میں رادھا بائی کیلئے یہ دعا کرتا ہوا کہ اُسے سکتہ ہو جائے اُٹھ بیٹھتا ہوں اور تکیوں کو پلنگ پر دس بیس دفعہ پٹکتا ہوں۔ آنکھوں سے شرارے نکالتا ہوں۔ ایک دو گالی بھی دبی زبان سے اُگل دیتا ہوں مگر قہرِ درویش برجانِ درویش۔ اُٹھنا ہی پڑتا ہے۔ اسکی صبح کی دھاڑوں سے اگر کوئی شخص خوش ہے تو وہ ساتھ والے گھر کا کلرک ہے جسکو ہر صبح سات بجے دفتر میں پہونچکر صاحب کے لئے دس بجے سے پہلے دس صفحے ٹائپ کرنے ہوتے ہیں۔ وہ اکثر میرا شکریہ ادا کرتا ہے کہ ہماری نوکرانی کی وجہ سے اسکا حاکم اُس پر خوش رہتا ہے۔ مگر وہ بچارا کیا جانے کہ ہم پر دن بھر کیا گذرتی ہے۔ وہ تو ساڑھے چھ بجے رات کا بنایا ہوا ناشتہ اور کھانا یکمشت کھاکر سات بجے دفتر پہونچ جاتا ہے۔ ادھر ہماری شامت آجاتی ہے۔

"گھر میں لکڑیاں نہیں ہیں، پھر نہ کہنا روٹی نہیں پکی۔ بڑی بہو نے ابھی تک غلہ نکالکر نہیں دیا پھر نہ کہنا دال میں کنکرے ہیں۔ سارا گھر اس طرح دوپہر تک سوتا رہیگا تو رسوئی کس طرح تیار ہوگی۔ ارے کھوی۔ موئے تیری صورت کو انگار لگو۔ تیرے سر پر راکھ پڑو۔ تیرے مُنہ میں مٹی پڑو ابھی تک ہوا پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ چل اُٹھ رات کے پڑے برتن مانجھ نہیں تو کھود کے گاڑ دونگی رسوئی دھو نہیں تو ٹانگیں کاٹ کے بلی کو کھلا دونگی۔ انگیٹھی میں کوئلے ڈال نہیں تو سر پھوڑ دونگی۔ بالٹی میں پانی بھر نہیں تو . . . . "

یہ لاتمناہی سلسلہ اسکے اُسوقت تک جاری رہتا ہے جبتک رانی رادھا بائی بول بول کر تھک نہیں جاتی اور پھر ڈرائیور کے کمرے میں (جبتک وہ چھٹی لیکر غائب نہیں ہو گیا) اندر سے دروازہ بند کرکے سو نہیں جاتی۔ صبح سے شام تک گھر مچھلیاں بیچنے کی منڈی یا کسی تھیٹر کا اسٹیج معلوم ہوتا ہے جہاں ایک ہی ایکٹر اپنا پارٹ یاد کرنیکی مشق کر رہا ہو۔ رادھا بائی کی وجہ سے گھر میں ہزاروں جھگڑے ہو چکے ہیں۔ باری باری ہر ایک شخص گھر چھوڑ دینے، ڈوبکر مرجانے، افیون کھا لینے یا گرم سیسہ کانوں میں ڈالکر بہرہ ہو جانیکی دھمکیاں دیچکا ہے مگر ابھی تک کسی کو اس بات کا خیال نہیں آسکا کہ آپس میں لڑنیکے بجائے فساد کی جڑ کو دور کرنیکی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ میں اسی گھڑی کے انتظار میں ابھی تک زندہ ہوں جب انی رادھا بائی

فیچر کہانی:-

نپولین کی موت

سن اٹھارہ سو اکیس ۔ اپریل کی انتیس تاریخ ۔ رات کے دو بجے ہیں۔ "لانگ وڈ" کے سارے آدمی جاگ رہے ہیں۔ سب باری باری اس آدمی کی تیمارداری کر رہے ہیں جو بستر پر لیٹے آخری سانس لے رہا ہے ۔ شہنشاہ نپولین جس نے ایک بار کہا تھا: "میں ایک ایسی چٹان ہوں جسے فضا میں پھینک دیا گیا ہو۔" سینٹ ہیلینا میں بسترِ مرگ پر پڑا ہے۔ اب تھوڑی ہی دیر میں اس چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے ہیں۔ موت سرہانے کھڑی ہے اور یورپ کے اس عالی وقار حکمراں پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔

نپولین:- (ہذیانی کیفیت میں)... ڈاکٹر بیکسٹر... ڈاکٹر بیکسٹر... کہاں ہے ڈاکٹر بیکسٹر... تم آ گئے... تم آ گئے... کہاں ہو تم... اِدھر آؤ ڈاکٹر... اِدھر آؤ.....!

مارشان:- عالی جاہ ڈاکٹر بیکسٹر یہاں نہیں ہیں ۔ عالی جاہ!

نپولین:- ڈاکٹر تم ہماری بات کیوں نہیں مانتے۔ ہم بیمار ہیں۔ سخت بیمار ہیں ۔ کتنے تعجب کی بات ہے! ۔ ہم بیمار ہیں۔ یہ دیکھو ہماری بیماری کے متعلق چھپے ہوئے بلیٹین۔ کیا اب بھی یقین نہیں آیا۔ کیا تمہیں قید خانے کے داروغہ نے ہماری نگرانی کے لئے نہیں بھیجا۔ ہمیں تمہاری بات نہیں سنائی دیتی۔ ذرا اونچے بولو ڈاکٹر بیکسٹر۔

مارشان:- عالی جاہ۔ زیادہ گفتگو نہ کریں ۔ ڈاکٹر بیکسٹر انگلستان چلے گئے ہیں۔

نپولین:- تم ٹھیک کہتے ہو ۔ تم ۔ ٹھیک کہتے ہو.... (آواز دھیمی ہو جاتی ہے)

(مارشاں اور انطومارشے آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں)

مارشاں:- رات بھر ڈاکٹر بیکسٹر کو بلاتے رہے ہیں۔

انطومارشے:- تعجب کی کوئی بات نہیں۔ شہنشاہ کو ڈاکٹر بیکسٹر سے نفرت ہے۔ ہذیانی کیفیت میں اُن کے اصلی جذبات ظاہر ہو رہے ہیں تیز بخار ہے اور نبض کی رفتار ایک سو آٹھ ہے۔

(نپولین بڑبڑاتا ہے)

نپولین:- انطومارشے تم ہی ڈاکٹر بیکسٹر سے کہو کہ ہم بہت بیمار ہیں ۔ ہم سخت علیل ہیں... ہم بہت تکلیف برداشت کر رہے ہیں... کوئی ڈاکٹر بیکسٹر تک ہمارا پیغام کیوں نہیں پہونچاتا ۔ او میرا ۔ تم سُن رہی ہو ہم کیا کہتے ہیں ۔ ہم یورپ ہیں ۔ یورپ۔ سارا یورپ سمٹ کر ہمارے اندر سما گیا ہے ۔ فرانس کی شکست ناممکن ہے۔ ہمارے جانباز سپاہی آخر دم تک لڑیں گے اور فتح اُن کی ہوگی۔ (دیوانہ وار) شہنشاہی شکست ناممکن ۔ .... ناممکن ہے ۔ (سہم کر).... پر یہ لوگ کیوں آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ کون ہے جو گِدھوں کے مانند منڈلا رہے ہیں (بلند آواز میں) ڈاکٹر بیکسٹر تم ہمارا علاج کیوں نہیں کرتے ۔ آہ۔ لیکن ڈاکٹروں اور جرنیلوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کی غلطیوں سے قبرستان آباد ہوتے ہیں ۔ اور بیکسٹر جیسے کئی ڈاکٹر میں نے مولیئر کے مزاحیہ ڈراموں میں دیکھے ہیں ۔ ڈاکٹر او میرا کہاں ہے... اِدھر آؤ او میرا... ہماری نبض دیکھو۔ کیا کہتے ہو۔ بولو۔ (نپولین جواب کے انتظار میں خاموش ہو جاتا ہے)

مارشان:- (دبے لہجے میں) عالی جاہ خاموش رہیں ۔ یہاں نہ ڈاکٹر بیکسٹر ہے اور نہ ڈاکٹر او میرا ۔ آپ آرام فرمائیں۔

نپولین:- بتاؤ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یورپ کی بساطِ سیاست ہم کبھی اُلٹنے نہیں دینگے۔ ڈاکٹر بیکسٹر تم بتاؤ ہمیں اب کیا کرنا چاہیئے (مشتاہی) تم سیاست سے بالکل کورے ہو۔ سپاہیانہ جذبہ بھی تمہارے اندر موجود نہیں ۔ او میرا تم خاموش کیوں کھڑے ہو۔ ہماری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ ہم پوچھتے ہیں روس کے برفانی علاقوں میں ہماری فوجوں کا گذر کیوں ممکن نہیں ۔ نپولین ٹھوس چٹانوں میں سے گزر سکتا ہے۔ کیا یہ جھوٹ ہے۔

مارشاں:- عالی جاہ!! ۔ انطومارشے اب مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ مجھ سے شہنشاہ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی.... عالی جاہ خاموش رہیں۔ زیادہ نہ بولیں۔ آپکو اور تکلیف ہوگی۔

(نپولین بڑبڑاتا ہوا سو جاتا ہے)

نپولین:- تکلیف... تکلیف... مقابلہ کرنا ہے... ہمیں بہت سے مقابلے کرنا ہیں....!

مرشان:- عالی جاہ۔ رات بہت دیر تک آپکے دُشمنوں کی طبیعت خراب رہی۔

نپولین:۔ ہنستا ہے دشمنوں کی ۔۔۔ مارشان لیکن اب ہم بالکل ٹھیک ہیں صرف تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ بدن ٹوٹ رہا ہے ۔۔۔ مارشان بیماریاں جنگ سے زیادہ کڑی ہوتی ہیں۔

مرشان:۔ عالی جاہ، آپ کی پسندیدہ شراب کا ایک جام حاضر ہے ۔۔۔ نوش فرمائیے گا۔

نپولین:۔ ضرور ۔۔۔ ضرور ۔۔۔

(مرشاں شراب کا جام پیش کرتا ہے۔)

نپولین:۔ (پینے کے بعد) کتنی فرحت بخش ہے ۔۔ کتنی اچھی ہو....

مرشاں:۔ عالی جاہ۔ ڈاکٹر انطومارشے تشریف لائے ہیں، آپکی خیریت دریافت کرنے کے لئے۔

نپولین:۔ ہم سب جانتے ہیں وہ کس لئے آیا ہے ۔۔۔ مارشاں اس سے کہدو ہم دوا ہرگز نہیں پئیں گے ۔۔۔ یہ چیزیں ہمارے مزاج کے موافق نہیں ہیں۔

انطومارشے:۔ صبح بخیر عالی جاہ۔

نپولین:۔ آہ۔ تم آگئے ۔۔۔ آؤ۔ آؤ ۔۔۔ لیکن دیکھو ہم دوا وغیرہ کی کوئی بات نہیں سنیں گے۔

انطومارشے:۔ پستر کوئی دوا نہیں عالیجاہ۔

نپولین۔ پستر! پلستر ۔۔۔ یہ اب نئی بلا کیا آئی ہے۔

انطومارشے:۔ کچھ نہیں عالی جاہ۔ صرف حضور کے پیٹ اور پنڈلیوں پر مجھے دو پلستر لگانے ہیں۔ ان سے آپ کو فائدہ ہوگا۔ تھکاوٹ بہت کم ہوجائے گی۔

نپولین:۔ یہ سب واہیات چیزیں ہیں۔ ہمیں ان پر کوئی اعتقاد نہیں یہ تمہاری طب وب سب بکواس ہے

انطومارشے:۔ مگر عالی جاہ ان پستروں کا لگانا بہت ضروری ہے۔

نپولین:۔ بہت ضروری ہے تو لگادو ۔۔۔ ایسا ہی سہی مگر ہمیں یقین ہے کہ ان سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا ۔۔۔ ہمارا آخری وقت قریب آگیا ہے اس لئے ہم ضد نہیں کرنا چاہتے ۔۔۔ چلو لگاؤ پلستر ۔۔۔ یہ حیلہ بھی کرکے دیکھ لو۔

انطومارشے:۔ اور دوا کی یہ چھوٹی سی خوراک۔

نپولین:۔ (بگڑ کر) چھوٹی ہو یا بڑی ہم ہرگز نہیں پئیں گے ۔۔۔ تمہیں صرف پلستر لگانے کی اجازت دی گئی ہے ۔۔۔ دوا ہم نہیں پئیں گے۔

انطومارشے:۔ عالی جاہ۔

نپولین:۔ مرشان۔

مرشان:۔ جہاں پناہ۔

نپولین:۔ ہم چشمے کا پانی پینا چاہتے ہیں۔

مرشان:۔ ابھی حاضر کرتا ہوں عالی جاہ۔

انطومارشے:۔ حضور اجازت دیں تو میں پلستر تیار کروں۔

نپولین:۔ تمہیں اجازت ہے ۔۔۔ لاؤ مرشان پانی لاؤ۔

(مرشان پانی کا گلاس دیتا ہے۔)

نپولین:۔ (پی کر) اس پانی نے کتنی فرحت بخشی ہے ہمیں ... ہم تمہارا شکریہ ادا کرتے ہیں مرشان ۔۔۔ دیکھو اگر ہمیں وہاں مرنے کی اجازت دے دی گئی جہاں ہم پیدا ہوئے تھے تو ہمیں اس چشمے کے پاس دفن کرنا جہاں سے یہ پانی لایا گیا ہے۔

... رات سب ڈرائنگ روم ہی میں سوتے ہیں۔ پھر بخار ہوجانے کے باعث مریض کچھ دیر تک تکلیف سے سانس لیتا رہتا ہے ۔۔۔ آدھی رات کو ایکا ایکی ایک شور ہوتا ہے ۔۔۔ نپولین اٹھ کر بستر میں بیٹھ جاتا ہے۔

(ہماہمی)

نپولین:۔ لکھو ۔۔۔ لکھو ۔۔۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں لکھو ۔۔۔ فوراً لکھو ۔۔۔ (لہجہ تحکمانہ ہوجاتا ہے) ہم کہہ رہے ہیں لکھو ۔۔۔ سنتے ہو مونتھولون۔

مونتھولون۔ عالی جاہ (کانپتی ہوئی آواز میں) .... عالی جاہ ....

نپولین:۔ ہم کہہ رہے ہیں لکھو۔ ہم بولتے جائیں گے تم لکھتے جاؤ ۔۔۔ (زوردار آواز میں) .... لکھتے ہو یا نہیں۔

(کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ)

مونتھولون:۔ (گھبراہٹ میں) .... لکھتا ہوں عالی جاہ ۔۔۔ میرا قلم کہاں ہے ۔۔۔ ٹھہریئے میں شمع روشن کرلوں ۔۔۔ (وقفہ) ۔۔۔ ارشاد

نپولین:۔ دشمن فرانس پر حملہ آور ہو رہا ہے مونتھولون۔ (سخت لہجہ میں) سنتے ہو ۔۔۔ ایک آندھی سی اٹھتی دکھائی دے رہی ہے ہمیں .... ایک طوفان سا امڈا چلا آرہا ہے ہمارے وطن کی جانب ۔۔۔ اٹھو۔ اٹھو۔ روکو اسے ۔۔۔ فرانس کے بہادر سپوتو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤ۔ دیکھو تمہاری آزادی سلب نہ ہونے پائے ۔۔۔ دشمن کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالو ۔۔۔ حلف اٹھاؤ ۔۔۔ اپنے شہنشاہ کے روبرو حلف اٹھاؤ .... حسن و عشق سے بیگانگی۔ ازدواجی زندگی سے پرہیز۔ رحم و استرحام سے ناآشنا رات کی سیاہی اور دن کے اجالے میں تلواروں اور بندوقوں کا بخوف استعمال ۔۔۔ امید، خوف اور مستقبل سے بے نیازی ۔۔۔ قتل ۔۔۔ غارتگری ۔۔۔ انتقام۔ حتیٰ کہ تمہارا وطن دشمن کے وجود سے پاک ہوجائے ۔۔۔

لکھ رہے ہو موتھولون۔

موتھولون۔ لکھ رہا ہوں عالی جاہ۔ مگر۔۔۔۔

نپولین۔ یاد رہے کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جو کہ زندہ رہنے کا سلیقہ نہ جانتی ہو ـــ جینے کا سلیقہ موت سے سیکھو۔ میدانِ جنگ کی خون آلود گھاٹیوں سے حاصل کرو ـــ لہو، لہو، لہو ـــ رگوں سے لہو بہنے دو اس لئے کہ یہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ بہے۔۔۔۔ اور۔۔ خون کے وہ قطرے جو کہ وطن کی عزت اور ناموس بچانے کے لئے تمہاری رگوں سے نکلیں گے فتح و نصرت کی دلہن انہیں اپنا سب سے قیمتی زیور بنا کر رکھے گی ـــ فرانس ـــ فرانس ـــ نپولین اعظم کی جوانی کا سب سے حسین خواب۔ دنیا کی انگوٹھی میں سب سے درخشاں نگینہ ـــ خبردار جو کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ـــ اٹھو۔ اٹھو اور سارے فرانس میں فوجوں کا جال بچھا دو۔۔۔ اور۔۔۔۔ ڈاکٹر ہیکسٹر تم کہاں ہو۔ ـــ مرشان، مرشان، دیکھو لوگ ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔ وہ ہمیں موت کے گھاٹ اتار کر انقلاب کو فنا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی حفاظت کریں گے اسلئے کہ انقلاب ہم ہیں ـــ نپولین اعظم ہی انقلاب ہے۔ نپولین کا دبدبہ۔ ـــ نپولین کا دبدبہ ـــ لکھو۔ لکھو موتھولون تمہارا قلم ہمارے خیالات کا ساتھ نہیں دیتا۔

موتھولون۔ عالی جاہ، لکھ رہا ہوں۔

نپولین۔ رکو نہیں موتھولون۔ لکھتے جاؤ ـــ تم جانتے نہیں ہم یورپ کی تقدیر ہیں ـــ آہ، آزادی۔ آزادی۔ کس قدر اونچی ہے وہ انسان جو آزاد ہو اور کس قدر نیچے گر جاتا ہے جب وہ غلام ہو جائے ـــ فرانس کبھی غلامی قبول نہیں کرے گا ـــ کبھی نہیں کرے گا ـــ کبھی نہیں کرے گا۔ ۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ (وقفہ۔ نپولین کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے) نہیں نہیں ہم چشمے کا پانی پئیں گے ـــ تم لوگ میدانِ جنگ میں کیوں نہیں جاتے ـــ مجھے۔۔۔ لکھو۔۔ لکھو۔۔۔۔

موتھولون۔ عالی جاہ اب مجھ سے نہیں لکھا جاتا ـــ آپ آرام فرمائیے۔

نپولین۔ (تھکے ہوئے لہجے میں) آرام۔۔۔۔ آرام۔۔۔۔ کیسا آرام۔۔۔۔

(بڑبڑاتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے)

موتھولون۔ (مرشان سے) خدا کرے کہ اب انکی آنکھ لگ جائے۔

مرشان۔ معلوم ہوتا ہے تکلیف بہت زیادہ ہے۔ ابھی صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی ہیں (نپولین بڑبڑاتا ہے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے)

موتھولون۔ آہستہ بولو مرشان، آپ سو رہے ہیں۔ (چند لمحات بالکل خاموشی طاری)

مرشان۔ موتھولون، موتھولون۔ (مضطرب ہو کر) دیکھو شہنشاہ تکیے کے نیچے کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔

نپولین۔ میرا بیٹا کہاں ہے۔ میرا بیٹا کہاں ہے ـــ تم لوگوں نے اسکے ساتھ کیا سلوک کیا ہے ـــ میرا بیٹا۔ میرا بیٹا۔ مرشان، مرشان۔ تصویر لاؤ۔ میرے بیٹے کی تصویر کہاں ہے۔

مرشان۔ حضور۔ عالی جاہ ـــ تصویر وہ سامنے لٹک رہی ہے ـــ آپ لیٹ جائیے۔ آرام فرمائیے۔

نپولین۔ ہاں، ہاں۔۔۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے۔۔۔۔

دوسری رات

موتھولون۔ مرشان آج عالی جاہ کی طبیعت میں کچھ سکون ہے۔

مرشان۔ یہ سکون ہی تو کسی زبردست طوفان کا پیش خیمہ ہے ـــ مجھے ڈر ہے۔۔۔۔

(نپولین اٹھ کر زور سے گرجتا ہے)

نپولین۔ اگر روسو نہ ہوتا تو فرانس میں انقلاب برپا نہ ہوتا ـــ نپولین نہ ہوتا تو نقشِ کہن مٹانے کا خیال پیدا نہ ہوتا ـــ مرشان۔

مرشان۔ عالی جاہ۔

نپولین۔ طولون کا محاصرہ ہو رہا ہے ـــ اُف ـــ میری ٹانگ پر گہرا زخم آیا ہے ـــ ڈاکٹر کیا بکواس کر رہا ہے کہ ہمیں بستر پر آرام کرنا چاہئے۔ زخمی ٹانگ کے لئے ہم اپنا وقار زخمی کرا لیں؟ ـــ ہرگز نہیں۔ سنو ڈاکٹر ہماری ٹانگ کو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ قطعی طور پر کچھ نہیں ہو گا ـــ کچھ ہو ہی نہیں سکتا ـــ کل یا پرسوں طولون پر ہمارا جھنڈا لہرائیگا۔ ـــ طاقت ـــ طاقت۔۔۔۔ اور طاقت ـــ ہم طاقت چاہتے ہیں۔ وہ طاقت جسے ہم نے اتنے برس اپنی داشتہ بنا کے رکھا ـــ ہمیں طاقت سے محبت ہے۔ جس طرح موسیقار اپنے ساز سے محبت کرتا ہے اس طرح ہم طاقت اور عظمت سے محبت کرتے ہیں اس لئے کہ ہم اس ساز سے جیسا نغمہ چاہے نکال سکتے ہیں ـــ یہ پوپ ہمارا حکم کیوں نہیں مانتا۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ ہمارے احکام مانے۔ اس لئے کہ سیاسی دنیا کے علاوہ مذہبی دنیا پر بھی ہم حکومت کرنا چاہتے ہیں ـــ ہماری طاقت، ہماری عظمت، ہمارے وقار سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کسی کو انکار کی جرات نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے ہمیں دی گئی ہیں ـــ پانچ برسوں میں۔ صرف پانچ برسوں میں ساری دنیا پر نپولین اپنے نقشِ قدم چھوڑ جائیگا (رعب دار آواز میں) ـــ یہ کس نے کہا کہ یہ سراسر دیوانگی ہے ـــ

(بستر پر سے کود پڑتا ہے)

مرشان۔ مونتھولون، برٹرینڈ، دوڑو۔ عالی جاہ کو کچھ ہو گیا ہے۔

(نپولین، مرشان کا گلا پکڑ لیتا ہے اور دباتا ہے)

مرشان۔ (بھنچی ہوئی آواز میں) عالی جاہ ــــ عالی جاہ ــــ مونتھولون مجھے بچاؤ۔

(دو تین آدمی مل کر مرشان کو نپولین کی گرفت سے چھڑاتے ہیں اور بستر پر لٹا دیتے ہیں ــــ)

مرشان۔ (کھانستا ہے) ــ اُف ــ اُف ــ کتنی زبردست گرفت تھی۔

نپولین۔ مرشان۔

مرشان۔ عالی جاہ۔

نپولین۔ فرانس کے بہادر جرنیلو ــــ دَیسے۔ اَسٹیگل اور مسینا، فتح قریب ہے..... دوڑو، بھاگو۔ بریگیڈ نمبر ۲۹۳ چلو فتح تمہاری ہے۔ ــــ خبردار جو کسی کے قدم پیچھے ہٹے ــ ہمیں ــ ہمیں ایک لاکھ آدمیوں کی ضرورت ــــ ایک لاکھ بہادروں کی جو ہماری سرکردگی میں آندھی بن کر تمام دُنیا پر چھا جائیں ــ ایک بار پھر یورپ میں زلزلہ آئے۔ ایک بار پھر جنگ کے شعلے لپکیں۔ ایک بار پھر اقوام عالم کی سیاست ہمارے حضور میں کانپے۔ ایک بار پھر فتح و نصرت ہمارے قدم چومے ــ (جوش میں آکر) پورے زور سے حملہ کرو ــ ساری دُنیا ہماری ہے ــ بڑھو ــ بڑھو ــ بڑھو)

مرشان۔ عالی جاہ!! ــ دیکھو مونتھولون کہیں گر نہ جائیں ــــ کہیں چوٹ نہ آجائے۔

مونتھولون۔ زور سے پکڑ رکھو ــ زور سے مرشان۔

نپولین۔ بڑھو ــ بڑھو ــ بریگیڈ نمبر ۲۹۳ بڑھو ــ بڑھو ــ

مرشان۔ لیٹ جائیے عالی جاہ۔

نپولین۔ (تھک کر) بڑھو ــ بڑھو ــ بڑھو ــ بڑھو ــ

(آواز کمزور ہوتی جاتی ہے۔)

مونتھولون۔ بس اب چھوڑ دو۔ آرام کرنے دو۔

(چند لمحات خاموشی طاری رہتی ہے)

نپولین۔ (بڑے رحم انگیز لہجے میں) ... ماں ... ماں، تم کہاں ہو۔

⁂

..... جب شہنشاہ کی حالت نازک بیان کی گئی تو سینٹ ہلینا کے گورنر سر ہڈسن لو کو بہت فکر لاحق ہوئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکا قیدی مر جائے۔ وہ نپولین کی جان بچانے کیلئے بہت کچھ کر گذرنے کو تیار تھا۔ چنانچہ فوراً ہی اُس نے چار طبیبوں کی ایک مجلس قائم کی تاکہ وہ مریض کی جان بچائیں۔ ڈاکٹر آرنٹ، ڈاکٹر انٹوماریشے، ڈاکٹر شارٹ اور ڈاکٹر مچل شامل تھے۔

⁂

ارنٹ۔ میری رائے ہے کہ انہیں تھوڑا سا دودھ دیا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے ڈاکٹر برٹرینڈ۔

برٹرینڈ۔ ڈاکٹر انٹوماریشے سے پوچھئے۔

انٹوماریشے۔ جہاں تک مجھے علم ہے شہنشاہ کبھی دودھ نہیں پی سکتے۔ ایسی حالت میں.....

ارنٹ۔ لیکن حضرت دودھ تو غذائیت سے بھرپور ہے ــ کیوں نہ امتحاناً پلا کے دیکھیں۔

انٹوماریشے۔ میں اسکے خلاف ہوں۔ شکمی امراض میں دودھ کی ممانعت ہے اس لئے کہ وہ زود ہضم نہیں ہوتا۔

شارٹ۔ یہ بحث مباحثہ فضول ہے۔ جب تک مریض کا معائنہ نہ کیا جائے کوئی رائے نہیں دی جاسکتی۔

برٹرینڈ۔ میں اندر جاکر شہنشاہ سے دریافت کرتا ہوں۔ شاید وہ آپ لوگوں کو معائنے کی اجازت دیدیں۔

(وقفہ)

برٹرینڈ۔ عالی جاہ، ڈاکٹر حاضر ہوئے ہیں۔ آپسے ملاقات کرنا چاہتے ہیں ــ۔

نپولین۔ ڈاکٹر ــ ملاقات ــــ (باخبر ہوکر) ملاقات ــــ تو ہمارا آخری وقت قریب آگیا۔

برٹرینڈ۔ نہیں عالی جاہ ــــ حضور کی حالت نازک ہے مگر خطرناک نہیں ــ ہم صرف احتیاط کے طور پر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔

نپولین۔ نہیں ــ ہم ان سے ملاقات نہیں کریں گے۔

برٹرینڈ۔ عالی جاہ ....

نپولین۔ (تحکمانہ لہجے میں) برٹرینڈ۔

برٹرینڈ۔ بہت اچھا عالی جاہ۔

(وقفہ)

مونتھولون۔ کیوں کیا خبر لائے۔

برٹرینڈ۔ شہنشاہ نے ملاقات سے انکار کر دیا ہے۔

ارنٹ۔ اُن کی حالت بہت نازک ہے صاحبان ــ بیحد خطرناک ہے

لیکن ہمیں نااُمید نہ ہونا چاہیئے اور کوئی تدبیر سوچنا چاہیئے۔

انطومارشے:۔ میرا خیال ہے کہ شہنشاہ کے معدے میں رسولی نہیں ہے صرف ورم ہے — مرض کا اصل مرکز جگر ہے۔

برٹرینڈ:۔ صاحبان۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ جلد کسی نتیجے پر پہونچ کر علاج شروع کر دیا جائے —— ایک ایک لمحہ اس وقت بہت قیمتی ہے۔

ارنٹ:۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے پاس آنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ جب مریض اپنے طبیب کو پاس تک نہ پھٹکنے دے تو علاج کیا خاک ہوگا۔

انطومارشے:۔ میری ہدایت پر بھی انہوں نے کبھی عمل نہیں کیا۔

مجل:۔ صاحبان۔ میری رائے ہے ایک تگڑا جلاب دیا جائے —— اس سے ضرور افاقہ ہوگا۔

شارٹ:۔ آپ کا خیال صحیح ہے ڈاکٹر مجل —— دس گرین کیلومل ٹھیک رہے گا۔

انطومارشے:۔ لیکن یہ خیال رہے صاحبان کہ پارہ کسی شکل میں بھی شہنشاہ کے مزاج کے موافق نہیں آئے گا۔

مونتھولون:۔ لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ انہیں دوا پلائی کیسے جائے۔ صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ مرشان پانی میں دوا ملا کر انہیں پلا دیں۔ (مرشان سے) مرشان۔ عالی جاہ کو بچانے کے لئے اب یہ آخری حیلہ ہے۔

.... دوپہر کو نپولین کی حالت زیادہ تشویشناک ہو جاتی ہے لیکن جونہی بخار کم ہوتا ہے وہ سنبھل جاتا ہے اور ان لوگوں سے بات چیت کرتا ہے جو کہ اس جلاوطنی میں اسکے ساتھ تھے۔

نپولین:۔ مونتھولون۔ تم ہماری پیٹھ پر او۔ ڈی کلون کی مالش کرنا چاہتے ہو —— تمہیں اجازت ہے (ذومعنی انداز میں) سائنس نے علاج معالجے کے طریقوں میں کتنی ترقی پیدا کر دی ہے —— تم کہتے ہو اس سے گُردوں کو تقویت پہونچے گی —— لو پہونچاؤ تقویت گردوں کو —— مرشان۔

مرشان:۔ عالی جاہ۔

نپولین:۔ پینے کے لئے پانی۔

مرشان:۔ (پانی اُنڈیلنے کی آواز) حاضر ہے عالی جاہ۔

نپولین:۔ (غٹاغٹ پی جاتا ہے —— دوا کا ذائقہ محسوس کرتا ہے) مرشان —— تم بھی ہمیں دھوکا دے گئے .....

مرشان:۔ (ندامت بھری آواز میں)... معافی چاہتا ہوں عالیجاہ۔

نپولین:۔ سادے پانی کا ایک گلاس۔

مرشان:۔ (پانی انڈیلنے کی آواز) حاضر ہے عالی جاہ۔

نپولین:۔ (پی کر)... کتنا اچھا ہے —— کتنا اچھا ہے —— شاید یہ ہمارا آخری گلاس ہو.... مونتھولون ہم بس چند دنوں کے مہمان ہیں۔ سینٹ ہلینا کا مہمان بہت جلد موت کا مہمان ہوگا.... تم لوگوں نے اس جلاوطنی میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہم تمہارے ممنون ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ ہماری یاد تمہارے دلوں میں دیر تک قائم رہے —— دیکھو ہمیں بھول نہ جانا —— کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے ہماری یاد کو ضعف پہونچے۔

(ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز)

نپولین:۔ بزدل نہ بنو —— بزدل نہ بنو .....

.... رات کو دوا نے اثر کیا اور نپولین کی حالت ابتر ہو گئی —— ماتھے پر سرد پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ شب بھر وہ کراہتا رہا۔ تین اور چار مئی کی درمیانی شب اسی حالت میں گذری —— صبح کو زبردست آندھی چلنا شروع ہوئی۔ جس پُرانے گھر میں نپولین قید تھا وہ اس آندھی کے باعث کانپنے لگا....

نپولین:۔ سینٹ ہلینا میں طوفان آرہا ہے —— نپولین خود ایک طوفان تھا جو سارے یورپ پر چھایا رہا —— (ہذیانی کیفیت شدت اختیار کرتی جاتی ہے) .... یورپ میں شرارت پسند حکمرانوں کا تسلط مٹ چکا ہے۔ ایک نیا زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ نپولین کی طاقت کے سامنے سرنگوں ہو جاؤ۔ وہ ظل الٰہی ہے۔ طاقت اور حکومت کا سرچشمہ ہے —— زندہ باد نپولین بونا پارٹ —— پائندہ باد انقلاب —— برنادتھ صرف تمہاری وجہ سے پورا ایک دن ضائع ہو گیا ہے —— پورا ایک دن۔ تمہیں جاننا چاہیئے کہ ساری دُنیا کی قسمت صرف ایک دن سے وابستہ ہے —— تیلی رین روس کے ساتھ عہد نامے کا مسودہ فوراً تیار کرو —— کیا کہا۔ اتنی جلدی کیا ہے —— تیلی رین، مجھے صرف ایک روس سے نہیں اور کئی ملکوں سے نبٹنا ہے .....

مونتھولون:۔ (دبے لہجے میں) مجھے آثار اچھے نظر نہیں آتے مرشان۔

(مرشان آہ بھرتا ہے)

نپولین:- جوزفائن ــــ جوزفائن ــــ میرے پاس آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ جب سے تم جدا ہوئی ہو میں مغموم رہتا ہوں ــــ میرے حافظے میں تمہارے بوسے اور تمہارے آنسو چمک رہے ہیں ــــ صرف تمہاری خاطر میں نے اٹلی پر فتح حاصل کی صرف تمہاری خاطر میں نے دشمنوں کے اکیس جھنڈے چھینے ــــ جوزفائن ــــ جوزفائن ــــ تم بیوفا نکلیں۔ تم نے اپنے عاشق سے دغا کی ــــ تمہاری بیوفائیوں نے کئی بار یورپ کے فاتح اعظم کی آنکھیں نمناک کی ہیں ــــ آہ، میری ویلیوسکا ــــ تم عورت نہیں فرشتہ ہو۔ تمہاری وفاشعاریوں نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے ــــ خدا کی قسم ہم اُس عورت کو عزیز سمجھتے ہیں جو ہمارے جلال سے نہیں بلکہ ہم سے محبت کرتی ہے ــــ

(وقفہ)

نپولین:- (جوش سے) تمام طاقتیں اکٹھی ہوجائیں میدان ہمارے ہی ہاتھ رہے گا ــــ فرانس کا جھنڈا ہمیشہ بلند رہے گا ــــ آسٹریا کی فوجوں کو ہم نے شکست دی۔ سیریا اور مصر کا میدان ہماری بہادر فوجوں نے جیتا۔ اٹلی کی فوجوں کو ہم نے پسپا کیا ــــ اُٹھو، اُٹھو۔ ہمت نہ ہارو، فرانس کو بچاؤ ــــ اپنے وطن کی حفاظت کرو ــــ طوفان بن کر دشمن پر چھا جاؤ ــــ اُٹھو اور اپنے وطن پر قربان ہو جاؤ ــــ قسمت وسمت کچھ نہیں محض ڈھکوسلا ہے۔ صرف موقع دُنیا پر حکومت کرتا ہے۔ موقعہ سے فائدہ اُٹھاؤ۔ دُنیا تمہاری ہے۔ سیدھی لکیر ہمیشہ ٹیڑھی لکیر سے چھوٹی ہوتی ہے ــــ نپولین سیدھی لکیر ہے......

(چند لمحات کیلئے طوفان کا شور پیدا کیا جائے جس کی شدت زیادہ ہو)

(ایکا ایکی نپولین زور سے چیخ مارتا ہے۔ اسکے اردگرد سب لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔ ہما ہمی ــــ نپولین اُٹھکر مونتھولون کا گلا پکڑ لیتا ہے اور اسے دباتا ہے ــــ مونتھولون خود کو چھڑاتا ہے۔)

مونتھولون:- مرشان.... مرشان.... مدد.... مدد.... عالیجاہ۔

نپولین:- سپاہیو، آگے بڑھو ــــ فرانس ــــ فرانس ــــ فوج ــــ سالار جنگ......

(آہستہ آہستہ نپولین کی آواز ڈوب جاتی ہے)

(طوفان کا شور ہلکا ہو کر غائب ہوجاتا ہے)

......شور سُن کر سب دوڑے آتے ہیں ــــ نپولین خاموش ہو جاتا ہے۔ سب مل کر شہنشاہ کو بستر پر لٹا دیتے ہیں جو آہستہ آہستہ موت کی سرد آغوش میں چلا جاتا ہے ــــ چار مئی سن اٹھارہ سو اکیس کو نپولین بونا پارٹ فاتح اعظم اکیس منٹ کم چھ بجے اس جہان سے رخصت ہوجاتا ہے......!

سعادت حسن منٹو

جب اُس نے چاہا

اُسکی تسبیح کیا ٹوٹی کہ اُس پر رنج والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بیچارے کے آنسو ہی نہ تھمتے تھے۔ میں نے کہا بھی کہ آپ گھبرائیے نہیں میں ابھی سب دانے چُن کر پھر پرو دونگا۔ لیکن وہ تسبیح کے دوبارہ پروئے جانے تک روتا ہی رہا۔ اور پھر کہنے لگا کہ وہی ٹوٹا ہوا دھاگا دوبارہ اس میں ڈال دو۔ اور میں نے بھی اسے ہی گرہ دیکر پرو دیا۔

یہ کوئی فقیر نما انسان تھا۔ بڑھے ہوئے بال اور وحشت زدہ غم آلود آنکھیں۔ لیکن وہ فقیرانہ سنت سے بے پروا تھا۔ اسکے کپڑے گیروے نہ تھے۔ ڈوگرز کا میلا سا صافہ، ٹوٹی ہوئی جوتی اور میلا سا تہمد۔ قمیص کی شاید اسے حاجت نہ تھی۔ سینے کے بکھرے ہوئے گرد آلود بال جنگلی گھاس کی طرح خشک معلوم ہوتے تھے۔ وہ تسبیح سینے سے لگائے کافی دیر تک روتا رہا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ اور پھر تو ٹھوڑی کے بالوں کے سروں پر نمودار ہوکر قطرہ قطرہ گرنے لگے۔ اسے دل کی بھڑاس نکال لینے کا موقع دینا ہی میں نے مناسب سمجھا۔ آخر آنسو پونچھ کر وہ کافی دیر تک خالی خالی نظروں سے اُفق کی طرف دیکھتا رہا۔ اُفق پر راج ہنسوں کا جوڑا نمودار ہوا۔ لامحدود فضا میں ان کی محبت کی پکاریں ہمیں دُور سے سُنائی دے رہی تھیں۔

وہ کہنے لگا: "ہم سے تو یہ آزاد پرندے ہی خوش قسمت ہوتے ہیں"

"سائیں جی آپ سچ کہتے ہیں" میں نے کہا: "ان کی آخر کوئی منزل بھی ہے؟"

"مولا جانے!" اُس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور پھر تسبیح کو چومنے لگا۔ اُسے سینے سے لگایا اور مٹھی میں دبا کر میری طرف اسی طرح دیکھنے لگا جیسے میں اس سے چھین ہی تو لونگا۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔

میں نے پوچھا: "کیا میں آپ......"

"میں تمہیں اس کے متعلق سب کچھ بتلا دونگا" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس سے محبت تھی۔ اور کچھ دنوں تو مجھے اسے دیکھنے کا جنون ہوگیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اسے ہر وقت دیکھا کروں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ اور پھر محبت تو کوئی ایسی چیز نہیں کہ چھپائی جائے، یا چھپائی جاسکے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ میں کپڑوں میں عطر لگا کر بھی لوگوں کو معلوم نہ ہونے دوں تو سخندا میں بھی محبت چھپا سکتا تھا۔ لیکن میں تو چھپانا چاہتا ہی نہ تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ میری نولمئے محبت پر جھوم جائے۔ اور ہر ذی رُوح میری محبت کا گواہ ہو۔ تو بھلا ایسی خواہش رکھتے ہوئے بھی میری محبت چھپ سکتی تھی۔ آخر ظاہر ہوکر ہی رہی۔ بچے بچے کی زبان پر یہی ذکر تھا۔ سخنداگاؤں کے کتے بھی ہماری طرف عجیب نظروں سے دیکھتے تھے اور یا شاید مجھے ہی کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کسی نے بالو کا نام لیا اور میری رُوح کانپ گئی۔ اس کا پورا نام کچھ بھی ہو لیکن گاؤں میں تو وہ بالو کے نام سے ہی مشہور تھی۔

ہم دونوں ہمجولی تھے۔ اکٹھے کھیلتے کودتے تھے۔ گڑیوں سے کھیلنے میں وہ مجھ سے زیادہ ماہر تھی، لیکن آنکھ مچولی میں میں اُس سے بازی لے جاتا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں اس کی ماں نے کہا کہ بالو میری ہم عمر تھی اور ہم ایک ہی دن پیدا ہوتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں اس دن سے میں اس کے بہت قریب ہوگیا۔ اب مجھے اسکے ساتھ کھیلنے میں بھی زیادہ لُطف آتا تھا۔ میں اسے اپنا سمجھتا تھا۔ بالکل اپنا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر رُوٹھ جاتا۔ وہ مجھے مناتی۔ جیسے وہ میری منگیتر ہی تو تھی۔ ایک دن جب اُس کی گڑیوں کا بیاہ تھا تو مجھے بھی اطلاع دی گئی۔ ایک پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا گیا۔ قصبہ کو جانے والی سڑک پر ریت کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیں بنا کر مکانات بنائے گئے۔ صحن، کمرے، دالان اور پھر ریت میں گھاس کے چھوٹے چھوٹے تنکے لگا کر بنایا ہوا باغیچہ! ان مکانات میں سبھی کچھ تو تھا۔ انہیں مکانوں میں ضیافت کا انتظام تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹھیکریاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، کسی میں بھُنے ہوئے چنے تو کسی میں گڑ۔ کسی پر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور کسی میں گھر سے چُرائے ہوئے اُبلے ہوئے چاول! گوشت کا انتظام میرے ذمے تھا۔ ہمارے مکان کی چھت پر بہت سی لکڑیاں اور خشک گھاس کے گٹھے رکھے تھے۔ وہاں چڑیوں نے گھونسلے بنا کر انڈے دے رکھے تھے۔ کچھ بچے بھی نکلے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ میں اباجان کی جیب سے چُرایا ہوا پنسلیں تراشنے کا چاقو تھا۔ کچھ زیادہ تیز تو نہ تھا لیکن ہمیں اس سے کیا تعلق۔ بالو چڑیوں کے بچے پکڑ لانے پر مقرر تھی اور میں ذبح کرنے پر۔ جس طرح بیئے کے گھونسلے سے بندر ہاتھ ڈال کر بچے نکال لیتا ہے بالکل اسی طرح بالو نکال رہی

تھی۔ کھونسلوں میں سے اس کی مٹھیاں چوں چوں کرتے ہوئے بچوں سے پُر نکلتی تھیں۔ ایک ایک بار میں وہ کئی کئی بچے نکال لیتی تھی۔ لٹکتے ہوئے چوں چوں کرتے بچے! کسی کی دم اس کی انگلیوں میں دبی ہوتی ہوتی تو کسی کی گردن اس کی مٹھی میں اور کسی کی ٹانگ اس کی انگلیوں میں پھنسی ہوئی!! میرا چاقو بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ ایک طرف سر تو دوسری طرف دھڑ۔ سروں اور دھڑوں کی دو الگ الگ ڈھیریاں تو لگ گئیں۔ اور پھر جب سڑک پر ڈبیروں کو کھڑا کر کے گوشت پکایا گیا تو وہ کتنا لذیذ تھا میں اس کا مزہ آج تک نہ بھول سکا۔

آخر ہمارے کھیلنے کے دن مدرسہ کی چہار دیواری میں مقید کر دیئے گئے۔ میں ہر روز مدرسہ جاتا۔ رونی صورت بنائے۔ گھسٹتے، کھسکتے۔ آہستہ آہستہ کہیں مدرسہ پہونچتا۔ مجھے مدرسے سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ وہاں کوئی آنکھ مچولی کھیلتا نہ گڑیوں سے! نہ کبڈی ہوتی نہ گلی ڈنڈا۔ الف، بے، تے، کا ایک بے ہنگام شور۔ آخر میں نے اس مصیبت سے بچنے کے کئی رستے نکال لئے۔ جوہڑ میں دن بھر نہا کر شام کو بستہ لئے گھر آجانا! جنگلی بیریوں کے بیر کھانے کے لئے چلے جانا!! اور اسی طرح کے بہت سے بہانے تھے۔ لیکن آخر کب تک۔ جب گھر میں پتہ چل گیا تو اتنی مار پڑی کہ اس کی یاد اب بھی میری پیشانی پر نقش ہے"

اُس نے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں زخم کا ایک بڑا سا نشان تھا۔

"میاں! ذرا حقہ مل جائیگا!" اُس نے دُور تمباکو کے کھیت میں کسی کسان کے اوندھے پڑے ہوئے حقہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"حضور ابھی لایا!"

چوپال کی انگیٹھی سے دھواں اُٹھ اُٹھ کر پیپل کے پتوں میں سے پیچ و تاب کھاتا کسی آسمان کی طرف جانے والے سوار کی گرد معلوم ہوتا تھا۔ میں اُٹھا اور چوپال کا حقہ بھر کر لے آیا۔

"اور پھر میں نے مڈل بھی پاس کر لیا!" اس نے ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ "بالو ملاجی کے گھر قرآن مجید پڑھتی تھی۔ اب وہ مجھ سے بہت کم ملتی تھی۔ وہ جوان ہو رہی تھی لیکن بچپن کا احساس کہ وہ میری تھی ابھی تک باقی تھا۔ مشہور تھا کہ ملاجی کی جیب کالی تھی اور اُن کی ہر دُعا ضرور منظور ہو جاتی تھی۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یہ سنکر خاموش رہا۔ لیکن یہ میرا ایک تلخ تجربہ تھا۔ اب مجھے اس خیال سے بھی پسینہ آجاتا ہے——!

مڈل پاس کرنے کے بعد میں بیکار تھا۔ گاؤں کی گلیاں ناپنا۔ چوپال میں بیٹھ کر گپیں ہانکنا، کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر کوڑیوں سے اور شام کو کبڈی کھیلنا ہی میرا مشغلہ تھا۔ گاؤں کے تمام آوارہ لڑکے میرے دوست تھے۔ اور آخر میں بھی اُن سے وہ سب کچھ سیکھ گیا جس سے وہ اکثر فائدہ اُٹھایا کرتے تھے۔ دو تین پیسے، چند کوڑیاں اور کچھ گھسی ہوئی باریک پیسہ کی ٹھیکریاں جیب میں ڈالے کسی لڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے جیب کو ذرا جھٹک دینا ہی کافی تھا۔ اور یا گاؤں کی دُکان سے ایک پیسہ کی ریوڑیاں لئے پھانکتے اور پیسے کے پانچ والے لمپ کے سگریٹ منہ میں دبائے جب پنگھٹ سے پانی بھر کر آنیوالی کے قریب سے سگریٹ کا دُھنواں اُڑاتے ہوئے گزر جائیں تو اس کی کمر کیوں نہ لچک جائے! اس کا گھونگھٹ ہوا سے کیوں نہ اُڑ جائے!! اس کا کپڑا کیوں نہ بار بار سینے سے سرک جائے۔ اس کی نگاہیں کیوں نہ بھٹک جائیں۔ اور اسکا لہنگا کیوں نہ ہوا سے بار بار اڑ کر اس کی پنڈلیوں کو برہنہ کر دے۔

لیکن جب یہی تجربہ میں نے بالو پر کیا تو اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کہنے لگی:- "گامو! میں تمہیں ایسا تو نہ سمجھتی تھی۔ کیا تم نے مجھے دوسر لڑکیوں کی طرح سمجھا ہے۔ خبردار اگر تم نے پھر کبھی ایسی جرأت کی!" میں سچ کہتا ہوں میاں! اس دن سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ وہ تو ایک دیوی تھی۔ کپاس کے پھولوں سے بھی زیادہ پاک و رچڑیا کے ان بچوں سے بھی زیادہ معصوم جو کبھی ہم نے ذبح کئے تھے۔

گھنٹیوں کی آواز نے اُسے چونکا دیا ستلو بھینس کو پانی پلانے کیلئے جوہڑ کی طرف چھڑی گھماتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی چال کتنی معصومانہ تھی۔ سائیں جی کہنے لگے:- "بالکل ایسی ہی تھی میری بالو! بالکل اسی طرح چلتی تھی۔ دیکھو چال کتنی دلفریب ہے!" میں ستلو کو دُور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا دوپٹہ رستے میں جھاڑو دیتا مجھے دُور تک نظر آتا رہا۔ بچپن دم توڑ رہا تھا اور جوانی سینہ سے اُٹھ اُٹھ کر جھانک رہی تھی۔ سائیں جی میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے، کہنے لگے۔

"ارشد! تم بڑے خوش قسمت ہو!"

میں نے کہا:- "وجہ؟"

وہ مسکرا کر جوہڑ کی طرف دیکھنے لگے۔ جہاں کنارے پر ستلو کھڑی ڈھیلے مار مار کر بھینس کو پانی سے باہر نکال رہی تھی۔

"اور پھر میں وہ گامو نہ رہا جس نے بالو کو سرِ راہ چھیڑا تھا میں اپنے سجدوں کے نشان اب بھی مسجد کے مصلوں پر پہچان لیتا ہوں اور یقیناً میری پیشانی بھی اس کی گواہ ہوگی!" وہ کش لینے کے لئے رک گیا۔ اور ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا:- "اس دن کے بعد سے بیچ میرے

ہاتھ سے کبھی جدا نہ ہوتی۔ اگر تسبیح پر دس بار خدا کا نام لیتا تو ایک بار بالو کا بھی زبان پر آ ہی جاتا تھا۔ مجھے اس سے حقیقی محبت تھی۔ میری محبت اب برساتی نالے کی طرح نہ تھی کہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ بہتا ہے اور تھوڑے ہی دنوں میں خشک ہو جاتا ہے۔ اب میری محبت جھیل کی طرح اتھاہ تھی کہ جس کی سطح پر سکون ہوتا ہے اور جس کی تہ کو سورج کی کرنیں کبھی نہیں چومتیں۔ طوفان اب بھی اٹھتے تھے مگر تہ میں! سطحی طوفان اب ختم ہو چکے تھے۔

میری محبت اب خاموش تھی اور میرے جذبات معصوم۔ کچھ دنوں میں بالو کی شادی ہو گئی۔ لیکن وہ ایک حساس لڑکی تھی۔ شاید اسے بھی مجھ سے محبت تھی۔ اس کی اپنے خاوند سے کبھی نہ بنی۔ بالو کے گاؤں سے چلے جانے کے بعد تو میں بالکل مسجد ہی کا ہو رہا۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے چند معصوم بچوں کو گھونگھنیاں اور گڑ دیکر کہا تھا کہ "تم دعا کرو بالو پھر واپس آجائے"۔ ننھے ننھے ہاتھوں کو یوں اٹھا ہوا دیکھ کر مجھے ایک قسم کا اطمینان سا ہو گیا تھا اور پھر ایک دن گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ بالو کے شوہر نے اُسے طلاق دیدی۔ دوسرے دن میں نے بھی اُسے پنگھٹ پر گاگر اٹھائے آتے دیکھا۔ وہ کپاس کا ایک پژمردہ پھول تھی۔ میں خاموش گھر لوٹ آیا۔

"اگر محبت کرنی ہو تو تمام ذرائع کا گلا گھونٹ دینا چاہیئے"۔ اس نے حقہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں نے محبت پر سے آرزوؤں کے زنگ کو کھرچ دیا۔ خواہشات کے دھبے ایک ایک کر کے صاف ہو گئے تھے۔ اب مجھے اس سے محبت تھی۔ پاک اور معصوم۔ خاموش اور بے بس۔ اس محبت میں الفاظ کو کچھ دخل نہ تھا۔ گفتگو کی ضرورت نہ تھی۔ پیام و سلام کی حاجت نہ تھی۔ اس محبت کی دنیا پر پھر خاموشی اور آنکھوں کی حکمرانی۔ نگاہوں کی باتیں اور نظروں کی گفتگو۔ اب محبت بیچارگی کی حد تک پہونچ چکی تھی۔ لیکن کیا بالو اس سے بے خبر تھی؟ اس کو ان سب باتوں کا پورا پورا احساس تھا ایک دن میں کنوئیں پر نہانے کیلئے جا رہا تھا اور بالو میرے پیچھے پیچھے سر پر گھڑا رکھے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ میری تسبیح گر گئی اس نے اٹھا دی۔ شرم کے بوجھ سے دبی ہوتی پلکیں اٹھ گئیں اور نگاہوں نے فیصلہ کر ہی دیا۔

کتنی تاریک اور ڈراؤنی رات تھی۔ گاؤں سے دور۔ ایک ویران کھنڈر میں میں ایک بیری کے درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا۔ وہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ مجھے دور مینڈھ پر ایک متحرک سایہ سا نظر آیا۔

"بالو ہو گی!"

"ممکن ہے کسی کو پتہ چل گیا ہو!"

دونوں خیال میرے دماغ میں بیک وقت پیدا ہوئے اور میں بیری کے ساتھ لگ گیا۔ سایہ آگے بڑھا۔ پھر جھک گیا۔ ایک ہلکی سی چیخ جیسے کسی نے سسکی لی۔ سایہ غائب ہو گیا۔ میں اسے واہمہ سمجھا۔ اور میرے ہاتھ میں تسبیح کے دانے تیزی سے گردش کرنے لگے۔ انتظار..... انتظار..... انتظار..... پو پھٹنے لگی۔ میں گھر چلا آیا۔ مسجد کی گلی میں داخل ہوا۔ آواز آئی۔—

اللہ اکبر

اللہ اکبر

اللہ اکبر

اللہ اکبر

اور میں جلدی سے مسجد میں داخل ہو گیا۔

گھر آیا تو سنا بالو کھیتوں میں مُردہ پائی گئی۔ سانپ نے کاٹ کھایا۔ مختلف افواہیں تھیں، اور بعض ان میں سے سچ۔ میں پاگل سا ہو گیا۔ لیکن میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ مرجاتا تو بالو کا نام کون لیتا— اور اس کے بعد وہ گاؤں کا منچلا گامو موجودہ گامو کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

وہ اٹھنے لگا۔

میں نے کہا: "سائیں جی گھر چلئے۔"

کہنے لگا: "دل چاہتا ہے کہ اپنی داستانِ محبت ہر ذی روح کے کانوں تک پہونچا دوں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ میری محبت سے آشنا ہو۔ تو کیا تم میرے کام میں حارج ہونا چاہتے ہو؟"

میں اسے کافی دیر تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہانتک کہ وہ دور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

اسعد گیلانی

سلمیٰ اور شاعر

سلمیٰ

جوان راتوں میں، بیساختہ، نئی دُھن سے
تُو اپنے شعر سُناتا نہیں مجھے شاعر!

کہاں گئی تری شوخی، وہ کیا ہوئے شکوے؟
ستا ستا کے رُلاتا نہیں مجھے شاعر!

وفورِ شوق سے بھرائی سی وہ اِک آواز
عروجِ شب میں سُناتا نہیں مجھے شاعر!

مَیں دیکھتی ہوں کہ نغموں میں سوز و کرب سا ہے
تری حیات پہ افسردگی سی کیوں چھائی؟
یہ کیوں سکوتِ مسلسل یہ کیوں جمودِ حیات؟
ترے شباب کو آخر یہ موت کیوں آئی؟

تری نگاہ کو عرفان کیوں نہیں شاعر؟
غم والم تجھے آسان کیوں نہیں شاعر؟

فریب قصۂ ماضی کی دل نشیں باتیں!
وہ کیا ہوئیں تری پُر کیف و آتشیں راتیں؟

مرے دریچے نہ معلوم کب سے ہیں خاموش؟
نہ جانے کب سے ہے بے مُدّعا تری آغوش؟

مرے جمال کو لِلّٰہ گدگداتا جا
مرے شباب کو اک بار پھر جگاتا جا

مجھے حیات کی رنگینیوں میں کھونے دے
مجھے شباب کی رعنائیوں میں سونے دے

تجھے قسم ہے ترے لامکاں تخیّل کی
تجھے قسم ہے ترے بیکراں تجمّل کی

بھٹک گئی ہوں مجھے راستہ دکھاتا جا — اُسی غزل کو اُسی دُھن میں گنگناتا جا

شاعر

دماغ و دل نے وہ صدمے اُٹھائے ہیں کہ نہ پوچھ! — سبق زمانے نے اتنے سکھائے ہیں کہ نہ پوچھ!
مری نگاہ کو عرفان تو وہی ہے مگر — مرے پیام میں باقی نہیں رہا ہے اثر!
زمانہ برسرِ پیکار و خاکداں پُرسوز — جدال و جنگ کے جھگڑے مٹے نہیں ہیں ہنوز
فریبِ فرقہ پرستی میں گر گئیں اقوام — مری نظر میں ہے ہندوستان کا انجام!
ہلاکِ دشنۂ سرمایہ دار ہے مزدور — قتیلِ خنجرِ پروردگار ہے مزدور
ہنوز خون سے دہقاں کے رنگ باری ہے — خدائے دولت و ثروت پہ وجد طاری ہے
مگر میں بن کے خزاں چھاؤں گا بہاروں پر — میں بڑھ کے آگ لگا دوں گا کوہساروں پر
مٹا کے چھوڑوں گا ثروت کے ان فسانوں کو — جگا کے مانوں گا سوئے ہوئے کسانوں کو
میں انتقام کے جذبے کو لے کے اُٹھا ہوں — نئے نظام کے جذبے کو لے کے اُٹھا ہوں
میں اپنے نغموں کو اب نالہ و شرر بنا لوں گا — حرم کی خلوت رنگیں میں خوں اُچھالوں گا
میں کوہ و دشت میں پھیلاؤں گا جنوں کی آگ — تجھے سناؤں گا شعلے بغاوتوں کے راگ
میں گیت گاؤں گا طوفاں کی تند موجوں میں — میں گنگناؤں گا آندھی کے تیز جھونکوں میں
غرض نظامِ دو عالم بدل کے مانوں گا — میں ایک بار ابھی پھر سنبھل کے مانوں گا

سناؤں گا تجھے پھر تیرے دل پسند اشعار — بتاؤں گا تجھے الفت کے پھر نئے اسرار
بناؤں گا تری جنت مہکتے پھولوں میں — سلاؤں گا تجھے پُرکیف و نرم جھولوں میں
میں اپنی آنکھ سے موتی گرا گرا کے ابھی — بناؤں گا تری زلفیں سجا سجا کے ابھی
ترے دریچے ترنم سے مرے گونجیں گے — پھر ایک بار محبت کو دونوں پوجیں گے
میں تجھ کو کھویا ہوا راستہ بتاؤں گا — قدم قدم پہ نئی منزلیں دکھاؤں گا
مری قسم نہ ہو مایوس بے رُخی سے مری — کہ کھو نہ جائے محبت ہی زندگی سے مری

راحت سعید

دیوانگی

ایک کُتا کہیں سے روٹی کا ٹکرا چُرا لایا۔ بھوکے کتوں نے دیکھا۔ بس جھپٹ پڑے۔ بھوں بھوں شروع ہوگئی۔ اور پھر۔ لڑائی۔ لڑائی۔ لڑائی......

آج کل طبیعت بڑی پریشان رہتی ہے۔ دماغ میں عجیب عجیب خیالات گھومتے رہتے ہیں۔ ذرا چین نہیں۔ کتاب پڑھتے پڑھتے، کسی خاص جُملے پر تو، بس جی چاہتا ہے کہ اپنے بال نوچ لوں۔ کپڑے پھاڑ ڈالوں اور کہیں نکل جاؤں۔ یہ کتابیں انسانیت کی کیسی عریاں تصویریں پیش کرتی ہیں۔ جیسے انسانی جسم کا ایکس ریز فوٹو۔ اُف! صداقت کس قدر تلخ ہوتی ہے۔ کسی صداقت کا اچانک انکشاف بھی انسان کو دیوانہ بنا دینے کیلئے کافی ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسا جی چاہتا ہے کہ ان تمام کتابوں کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ اس قدر باریک باریک ٹکڑے کہ وہ ہوا میں اُڑتے ہوئے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پہونچ جائیں۔ شاید پھر کبھی مل جائیں؟۔ جلا کر راکھ کر دینا بہتر ہے کہ نہ دُنیا انہیں دیکھ سکے، نہ پڑھ سکے، نہ کسی کی طبیعت پریشان ہو، نہ لوگ دیوانگی کا الزام دیں۔ اور یہ اخبار انہیں کیا کیا جائے؟۔ بس آدمی کا پاگل ہو جانا بہتر ہے — خدا نہ کرے کہ کوئی سوچ سمجھ سکے۔

لڑائی — لڑائی — لڑائی — بہت سے کتوں کی لڑائی — روٹی کے ٹکڑے کیلئے — ڈاکوؤں کی لڑائی چوری کے مال کے لئے۔ تم دُنیا کو لوٹتے ہو، اپنی طاقت کے بل بوتے پر۔ لو ہم بھی طاقتور ہو جاتے ہیں۔ اپنی لوٹ میں ہمیں بھی شامل کر لو۔ یا حصے بخرے کر لو۔ نہیں مانتے تو آؤ! ذرا زور آزمائی کر لیں۔

دُشمن سر پر آگیا۔ ہر طرف سُرخ سُرخ بدلیاں چھائی ہوئی ہیں۔ اب تو خیر نظر نہیں آتی۔ یوں کام نہ چلے گا۔ کوئی نیا فتنہ جگایا جائے۔

دودھ پلا پلا کر آستین میں ناگن پالی تھی۔ سمجھے تھے کہ اشارہ پاتے ہی دُشمن کو ڈس لیگی۔ پھر ہمارے لئے میدان صاف ہے۔ مگر وہ تو اُلٹی ہم پر حملہ آور ہوئی۔

مداری کے تھیلے میں دُنیا بھر کے عجائبات بھرے پڑے تھے۔ اُسے سینکڑوں منتر یاد تھے، سینکڑوں گُر جانتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ دُنیا میری مٹھی میں ہے۔ جدھر چاہونگا پھیر لونگا۔ آخر یہ جادو کب تک کام دیتا۔ ذرا اثر کم ہوا تو لوگ بیدار ہوئے آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ سب کچھ مداری کے تھیلے میں پہونچ چکا ہے۔ بس زندگی ہی زندگی رہ گئی ہے۔ ساری بستی کانپ اُٹھی۔ غصے سے تمتما اُٹھی۔ مگر کیا کرتی۔ گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط — مداری کو ضرورت پڑی انسانی خون کی — اس لئے پھر سادہ لوحوں کو پھانسنا چاہا۔ مگر وہ ہوشیار ہو چکے تھے۔ انہوں نے غصہ سے گھور کر مداری کی طرف دیکھا۔ "تم اب ہمیں بیوقوف نہیں بنا سکتے"

مگر مداری پھر مداری تھا — اس نے چھوٹے چھوٹے خوبصورت رنگین سانپ ٹوکری سے نکالے اور فضا میں بکھیر دئے۔ کیسے خوبصورت خوشنما سانپ تھے! کیا معشوق کی کمر۔ معشوق کی زلف، معشوق کے ابرو، معشوق کے مژگاں — یہ جمہوریت ہے۔ یہ انصاف ہے۔ یہ حق۔ یہ مذہب۔ یہ تمدن۔ اور یہ — بستی رام ہو رہی ہے۔ مگر ان کے کاٹے کا علاج؟ کون جانے؟

ذرا آرام نہیں، سکون نہیں۔ میرا دماغ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ یہ خیالات میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ بیٹھو وہی — لیٹو وہی — کتاب پڑھ رہے ہیں۔ چل رہے ہیں۔ پھر رہے ہیں، مگر دماغ میں وہی بھرا ہے — اُف! جینا مشکل ہو گیا۔ حد ہو گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں۔ ایک نکیلی چٹان پر انسانیت نیم عریاں، چیتھڑے لگائے کھڑی ہے — ہر طرف سے بڑے بڑے خوفناک سیاہ اژدہے مُنہ کھولے نگلنے چلے آرہے ہیں۔ اُن کے اطراف خون کا ایک دریا ہے جسکی تلاطم خیز موجیں آسمان تک اونچی اٹھتی ہیں۔ زہریلی آتشیں ہواؤں کے طوفان چلے آتے ہیں۔ بجلی کی کڑک، بادل کی گرج۔ اُف! ایک قیامت ہے۔ یکایک انسانیت کے مُنہ سے ایک دردناک چیخ نکلتی ہے۔ میں بستر پر کانپتا ہوا ہوشیار بیٹھا ہوں — کاش میں پاگل ہوتا؟

میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ بھائی صاحب کچہری سے واپس آئے۔ اور والد صاحب سے کہنے لگے "آج شہر میں ایک قتل ہو گیا"

"کیسے؟" والد صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے وہی حسن پور کے مالگزار کے لڑکے نے اپنی بیوی کے گولی ماردی"

میں اخبار پھینک کر کمرے میں چلا آیا۔ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اُس پر تو کانٹے بکھرے ہوئے تھے۔ آرام کہاں؟ چین کہاں؟ میرے دماغ کے سفید پردے پر تو ایک فلم دکھائی جارہی تھی۔

"شیلا! تم کتنی حسین ہو! کتنی سُندر ہو" پریم نے کہا "یہ تمہاری سیاہ آنکھوں کی گہرائی۔ جیسے دُور اُفق کے کنارے پانی ڈول رہا ہو — اور یہ تمہارے لانبے لانبے سیاہ بال، جیسے رات کو چاند نکلتے وقت درختوں کے وسیع تاریک سائے —" اُس نے شیلا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اور یہ تمہاری پتلی پتلی نازک انگلیاں۔ نکلتے سُورج کی کرنیں۔ اور یہ تمہارے لب" اس نے ایک پیاسے کی طرح اُس کے ہونٹوں کو تکتے ہوئے کہا۔ "جیسے شبنم آلودہ گلاب کی دو پنکھڑیاں، بادِ سحر کے لطیف جھونکوں سے وا ہوگئیں"

بہرحال وہی ہوا جو ہونا تھا۔ آپ بھی کسی دوشیزہ کی اُس کے سامنے تعریف کیجئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ شادی ہوگئی۔ چند دن خوب مزے رہے۔ اور پھر نڈھال۔ جیسے آفس کے کلرک یا مل کے مزدور۔ دن بھر کے تھکے ہارے بستر پر گرے پڑتے ہیں۔ فطرت تو تغیر و تبدل کی طرف مائل ہے۔ تشنگی اور بڑھ گئی۔ پریم جیسے جوان اور مالگزار کے لڑکے کیلئے جوانی کا بستی میں کیا کال تھا۔ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کوئی کتنی ہونگی۔ جن کے گلابی رخساروں کی چمک دمک کو پریم کے آتشیر تنفس نے جُھلس ڈالا۔ کتنی ہی ہیں۔ جو راستے میں سامنا ہونے پر شرم سے پرے ہٹ جاتی ہیں۔ اُسے مُنہ بنا بنا کر خوب کوستی ہیں۔ گالیاں دیتی ہیں۔ شریر۔ کمینے۔ ذلیل۔ لیکن اُن کی نظریں دُور تک اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوجاتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گھر لوٹتی ہیں۔

شیلا بیچاری۔ آخر وہ بھی انسان تھی۔ کیا کرتی؟۔ پریم کے دوست سے تعلق ہوگیا۔ میرے دماغ نے آخری تصویر پیش کی۔ پریم۔ شیلا کو گولی کا نشانہ بنارہا تھا۔ "اُف! ظالم" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں۔ "بہت اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ وہ عورت ہی بڑی دلیسی تھی۔ راستہ چلتوں کو تاکا کرتی تھی"

اُف! اُف!! اُف!!! میں نے سر تھام لیا۔ خدا نہ کرے کہ کوئی کچھ سوچ سمجھ سکے۔

علی الصباح انوار تشریف لائے۔ مجھ سے کہنے لگے: "آج دوپہر کو انجمن انسدادِ گداگری کا پہلا جلسہ ہے۔ میں نے تمہارا نام بھی لکھوا دیا ہے۔ اور ہاں! وہاں تمہیں تقریر بھی کرنی ہوگی"

میں پھٹ پڑا۔ جیسے کسی نے بارود کو دیا سلائی دکھادی۔ "تمہیں شرم نہیں آتی۔ آخر اس طرح کب تک دُنیا کو دھوکا دو گے۔ انجمن انسدادِ گداگری۔ انجمن انسدادِ مفلسی۔ انجمن انسدادِ بے روزگاری۔ آخر یہ کیا ڈھونگ رچا رکھے ہیں؟۔ آنکھ رکھتے ہوئے اندھے بنتے ہو اور دُنیا کو اندھا بنانا چاہتے ہو۔ آخر کب تک؟ کب تک لوگوں کو بیوقوف بناؤ گے؟"

"یہ تم کیا بک رہے ہو؟" انوار نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"میں بک رہا ہوں؟ جی! میں بک رہا ہوں!! میرا مطلب ہے کہ جھوٹ کی عُمر پانی کے بلبلے کے مانند ہے۔ تم زیادہ عرصے تک لوگوں کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ تم ایک شخص کو رات کو زہر دیتے ہو اور صبح مزاج پُرسی کو جاتے ہو۔ تمہارے لگائے ہوئے زخموں سے ایک شخص قریب المرگ ہے، اور تم ہی زخموں پر مرہم رکھتے ہو؟۔ یہ جانتے ہوئے کہ درخت کی جڑ کو دیمک چاٹ چکی ہے تم اُسے پانی دیتے ہو۔ اس کی خبرگیری کرتے ہو۔ کیا یہ دھوکا نہیں؟۔ فریب نہیں؟ اور کیا جھوٹ کے سینگ ہوتے ہیں؟۔ کیا اچھے اچھے الفاظ تراشے ہیں تم نے؟۔ انجمن انسدادِ گداگری۔ انجمن انسدادِ بیروزگاری۔ انجمن انسدادِ عصمت فروشی۔ کڑوی کنین کی گولیوں پر شکر چڑھائی جارہی ہے یہ انجمن سازیاں! یہ رنگین نقاب!!۔ اب زیادہ کام نہ دینگے پہلے شہر میں ہیضے کے جراثیم پھیلا دینا۔ پھر کنوؤں میں دوا ڈالتے پھرنا اور اپنے ہم خیال ساتھیوں کی جماعت کا نام رکھنا "انجمن انسدادِ ہیضہ" یہ ہے خدمتِ عامّہ؟۔ کیوں؟؟ ٹھیک ہے نا؟؟؟۔ مگر ہاں! میں تمہیں یقین دلاسکتا ہوں کہ وہ زمانہ اب بہت قریب آرہا ہے جب گداگری اور مفلسی خود بخود کم ہوجائے گی۔ بھک منگوں کی بستی میں کون لے اور کون دے۔ مگر انسان مرنے سے رہا۔ شاید اس کی خودداری بیدار ہوجائے۔ اگر پیٹ خالی ہیں تو جیل بھی خالی ہیں۔ پیٹ نہیں بھرتے مگر جیل تو بھرے جاسکتے ہیں —"

"انوار! تم بھڑکیلے اور نفیس ملبوس میں انسانیت کے جسم کے داغ کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے — تم پھوڑے کے مُنہ پر مرہم رکھ کر مطمئن ہو کیا یہ نہیں جانتے کہ وہ اندر ہی اندر بڑھتا جارہا ہے۔ میرے دوست! جاؤ — جاؤ — اور جس عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہوچکی ہیں وہاں مرمت سے کام نہ چلے گا۔ اُسے ڈھادو۔ اور ایک نئی عمارت تعمیر کرو"

انوار بڑے بڑے دیدے نکالے عجیب وحشت بھری نظروں سے مجھے

گھور رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھ رہا ہے۔

"جاؤ میاں — جاؤ" اُس نے ٹوپی سر پر رکھی اور دروازے کی طرف چلا۔ میں کہتا رہا "جاؤ! — اور اب بھی اگر نہ سنبھلے تو یہ سمجھ لو کہ وہ زمانہ اب قریب آ رہا ہے جب چند دن کی فاقہ کشی کے بعد شاید قید خانے سے گداگر اور بیلچے تمہارے لڑکوں کے پیٹ بھرنے کا ذریعہ بن جائیں — اور بازاری کوٹھوں کی اجڑی ہوئی رونق تمہاری لڑکیوں کی زندگی کا آسرا ہو جائے —" لیکن وہ میرے آخری جملے سننے سے پہلے ہی کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔

ہاں! وہ مجھے پاگل سمجھ رہا تھا — پاگل — حواس باختہ۔ اسلئے کہ میں کھوکھلی دیواروں پر پلاسٹر چڑھانے کی بجائے اُسے ڈھا دینا چاہتا ہوں۔ میں گھوڑے کی — انسان کو بھی اگر خطرناک مرض ہو تو گولی مار دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے مہلک جراثیم دنیا میں نہ پھیلا سکے۔ میں سماج کے جسم کے ناسور پر مرہم لگانا نہیں چاہتا۔ میں جسم کا اتنا حصہ کاٹ دینا چاہتا ہوں — میں جسم کا اتنا حصہ کاٹ دینا چاہتا ہوں — میں پاگل ہوں — پاگل — دیوانہ —

ہم سب کیفے میں بیٹھے تھے۔ میں، انوار، شاہد، نسیم۔ سامنے سڑک سے دنیا گزر رہی تھی۔ ایک منظر پر میری نگاہیں جم گئیں۔ میرے خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ میری آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ دوستوں نے گھبرا کر دیکھا۔ چند سپاہی ایک نیم عریاں کمزور اور لاغر انسان کو بیڑیوں کا زیور پہنائے لئے جا رہے تھے۔

"ارے؟ یہ وہ ہے" انوار نے تیزی سے کہا "کل اس نے ایک مہاجن کے گھر میں گھس کر غلہ چرایا تھا"

"چوری کی تھی اس نے!" میں بم کی طرح پھٹ پڑا "چوری کی تھی اس نے؟ ذرا اس کی طرف دیکھو — دیکھو؟ — کیا وہ چوری کر سکتا ہے؟ — عقلمندو! اُسے خود کسی نے لوٹ لیا۔ تباہ کر دیا — اُس کی ہستی کو جونک کی طرح چوس ڈالا — چوری! کیا وہ چوری کر سکتا ہے —؟"

"تمہارے دماغ کو تو فلسفے کے کرم نے چاٹ لیا ہے" نسیم نے ہنستے ہوئے فقرہ کسا۔ "یہ جو سارا شہر جانتا ہے کہ اُس نے چوری کی۔ تو کیا یہ سب پاگل ہیں؟"

"جی نہیں — میں خود پاگل ہوں — میرا دماغ خراب ہو گیا ہے — اُف!" میں نے سر تھام لیا۔ میرے دوست ہنس رہے تھے۔

میں سائبان میں کرسی ڈالے پڑا تھا۔ اختر اور نسیم آ گئے۔ بڑے بھائی صاحب نے شاید ان سب سے کہہ دیا تھا کہ میں دن بھر کمرہ بند کئے اندر پڑا بڑبڑایا کرتا ہوں۔ لوگوں کو خیال ہو چلا تھا کہ اگر یہی حالت رہی تو میں بہت جلد پاگل ہو جاؤں گا — اے کاش ایسا ہوتا۔

"منروا میں آج بڑی اچھی پکچر ہے۔ ہم تمہیں ضرور ساتھ لیجائیں گے" ان کا اصرار تھا۔ "اور یاد رکھنا اگر وہاں ایسی ویسی حرکت کی تو اس سموم" نسیم نے میرے سر کے بال کھینچ کر کہا۔ "جتنی گرمی چڑھ گئی ہے سب نکال دونگا"

اتنے میں ایک قسمت کے مارے اچھے ہٹے کٹے فقیر صاحب کا نزول ہوا۔ انہیں دیکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ کسی نے مجھے بجلی کا تار چھوا دیا۔ اُس نے اپنی تقریر کا پہلا فقرہ — "حضور! صبح کا بھوکا ہوں" دہرایا ہی تھا کہ میں نے کرسی سے کود کر اس کے گال پر تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کیا "بھر گیا پیٹ؟" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا "اب خاموشی سے یہاں سے چلے جاؤ — ورنہ میں تمہارا سر کچل دونگا"

"یہ کیا حرکت تھی تمہاری؟" فقیر کے جانے کے بعد نسیم نے متعجب ہو کر کہا۔ "کیا اس حرکت سے بھی تمہیں دماغی سکون حاصل ہوتا ہے؟"

"ہاں! یقیناً تھوڑا سا سکون ضرور ملا" میں کرسی پر دراز ہو گیا۔ "کاش آج سے وہ اپنے اندر احساس خودداری اور جذبۂ محنت پیدا کر سکے —"

"کیا مطلب تمہارا!" نسیم نے تیزی سے پوچھا "کیا آج سے وہ اس طرح در در پھر کر گڑگڑا کر بھیک نہ مانگے۔ تو کیا چوری کرے؟ ڈاکے ڈالے؟!"

"بس! بس! میرا سر نہ کھاؤ —" میں نے چیخ کر کہا "وہ کچھ بھی کرے۔ چولہے میں جائے مگر ہاتھ پاؤں اور محنت و مشقت کا نام نہ کرے — چوری کرے — ڈاکے ڈالے۔ ساری دنیا میں آج کل یہی ہو رہا ہے —"

میں نے تازہ اخبار کھولا۔ پہلی ہی سُرخی سے میرا خون کھولنے لگا۔ "اف!" — میں بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اس پر تو کانٹے بکھرے ہوئے تھے۔ ذرا چین نہیں — آرام اور سکون کا کوسوں پتہ نہیں

میرے سر میں جیسے گھوڑ دوڑ ہو رہی تھی۔ مجھے چکر آنے لگا۔ میں نے محسوس کیا۔ کہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پر گرا جا رہا ہوں۔ آخر میں یہ تکالیف کب تک سہوں؟ — یہ دکھ کب تک برداشت کروں۔ نسیم اند۔ داخل ہوا۔ "کہئیے مزاج کیسے ہیں؟ دماغ کا پارہ انتہائی بلندیوں پر دکھائی دیتا ہے۔ کہیں حباب بن کر اڑ نہ جانا" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ کرسی پر بیٹھ کر اخبار پر نظر ڈالی زور سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلی ہی سرخی تھی :۔

"کانپور میں ہندو مسلم فساد"

"بس خاموش!" میں نے ایک تکیہ اسکے سر پر کھینچ مارا۔

"کیوں؟ کیا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

میں نے اپنا سر دوسرے تکئے میں چھپا لیا۔ کانپور — ہندو — مسلمان — مر گئے — زخمی ہو گئے — گائے — باجا — مذہب — آزادی — اور معلوم نہیں کیا کیا؟ میری دماغ میں خیالات کا دریا پوری روانی پر بہا جا رہا تھا۔

نسیم نے دوسری سرخی پھر زور سے پڑھی :۔

"لکھنؤ میں شیعہ سنی میں پھر فساد ہو گیا"

دوسرا تکیہ زور سے نسیم کے سر پر پڑا۔ "واقعی میں پاگل ہو گیا۔" جاؤ — نکل جاؤ — کمرے سے باہر نکل جاؤ — فوراً نکل جاؤ — اسی وقت نکل جاؤ — " یہ چیختے ہوئے میں نے گلدان ہاتھ میں اٹھایا —

اف! حد ہو گئی — میرے خیالات مجھے چین نہیں لینے دیتے — عجیب عجیب خیالات دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ایسا جی چاہتا ہے کہ میز پر رکھی ہوئی تمام کتابوں کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دوں — اس قدر باریک باریک ٹکڑے، کہ وہ ہوا میں اڑتے ہوئے دنیا کے مختلف گوشوں میں پہونچ جائیں — نہیں — ان سب کو جلا کر راکھ کر دینا ہے۔ نہ کوئی انہیں دیکھ سکے۔ نہ پڑھ سکے۔ نہ کسی کی طبیعت پریشان ہو۔ نہ لوگ دیوانگی کا الزام دیں۔

ریاض رومی

> خریداران ساقی سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں، نیز پتہ خوشخط اور صاف تحریر فرمایا کریں۔ (منیجر)

اُردو

موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اُردو
طبعِ دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اُردو

ہند والوں پہ ضروری ہے تحفظ اس کا
باہمی ربط و محبت کا نشاں ہے اُردو

اس میں ملتی ہے خریدار کو ہر میل کی چیز
علم و آداب کی کیا خوب دکاں ہے اُردو

غالب و مومن و خسرو ہوں کہ تلسی و کبیر
سب کی کوشش سے زمانہ میں عیاں ہے اُردو

جس نشیمن کی ہو تعمیر بہ اندازِ فساد
اُس نشیمن کیلئے برقِ تپاں ہے اُردو

اس کو چھیڑا تو بکھر جائے گا شیرازۂ دل
ہند ہے جسم تو اس جسم کی جاں ہے اُردو

کیا مٹائے گا کوئی اُس کو مٹانے والا
دل میں، آنکھوں میں، خیالوں میں نہاں ہے اُردو

اس کو قوموں کے تمدن نے کیا ہے پیدا
کون کہتا ہے کہ لشکر کی زباں ہے اُردو

جو دیا جاتا ہے ہر ملک کو ذوقِ فطری
بس اسی ذوق کی تفسیر و بیاں ہے اُردو

اہلِ محفل تمہیں ماہر کا سخن یاد رہے
ہمتیں اپنی جواں ہیں تو جواں ہے اُردو

ماہر القادری

کھوٹا سکہ

وہ ایک بھکاری تھا، اور ایک مدت سے اس کا معمول تھا کہ دن بھر شہر کی سڑکوں پر گھومتا، ہوٹلوں کے چکر لگاتا، دکانوں کے سامنے ٹھہری ہوئی موٹروں کے سامنے آکر رکتا، اور لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔ دن میں اکثر مرتبہ اس کو لوگوں کی دھمکیاں سننا پڑتی تھیں۔ لبعض اسکو بے غیرت، بے حیا اور بے شرم کہتے تھے۔ لبعض مرتبہ پولیس والوں کی گھڑکیاں سننا پڑتی، کبھی ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ کوئی ادھر آتا جاتا سپاہی اس کے ایک آدھ بید بھی جما دیتا، مگر وہ اس سب کو برداشت کرتا اور اپنے پیشے سے باز نہ آتا تھا، دن میں جو تین چار آنے مل جاتے وہ اُن میں سے کچھ کی روٹی لے لیتا، ایک پیسے کی بیڑیاں، اور ایک پیالی چائے، یہی اُس کی زندگی تھی وہ اسی میں مگن تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ کسی بڑے مالدار آدمی کا بیٹا تھا، اور باپ کے مرنے کے بعد ہزاروں کی جائیداد کا مالک ہوا۔ مگر دوست احباب اسکو مکھیوں کی طرح لپٹے، اور جب تک کہ اسکے پاس ایک پیسہ بھی رہا اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ کچھ دنوں کہیں ادھر اُدھر ملازمت بھی کی، مگر اب تو وہ بھکاری ہے۔ اُس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی، مگر معلوم ہوتا تھا کہ ساٹھ برس کا بڈھا ہو۔

دسمبر کا زمانہ تھا اور اس پر کئی روز سے بھاوٹ۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ لوگ گرم لبادے اور موٹے کپڑے پہنتے پھرتے تھے مگر پھر بھی دانت سے دانت بج رہا تھا۔ چائے خانوں اور شراب خانوں کی بن آئی تھی، آدمی پر آدمی گر رہا تھا۔ ملازموں کو دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ سردی پورے شباب پر تھی۔ منچلے نوجوان فطرت کے اس موقع سے خوب فائدہ اُٹھا رہے، مگر بھکاری پر مُصیبت آگئی تھی۔ اس کو بھیک ملنا مشکل ہوگئی تھی۔ آج تیسرا فاقہ تھا، کل دو پیسے ملے تھے جس کی اُس نے ایک چائے کی پیالی پی لی تھی۔ مگر آج کا سارا دن یوں ہی گذر گیا۔ شام ہو چکی تھی اور تاریکی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، مگر تاریکی کے ساتھ ہی ساتھ بھکاری کی بیقراری بھی بڑھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سردیوں میں بازار بہت جلد سنسان ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی شاہراؤں پر تیزی سے پھرا مگر اس کو ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ سردی کے مارے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ ایک پُرانا اوورکوٹ پہنے جس میں سردی کو مارنے کی بالکل گنجائش نہ تھی، پھٹا اور میلا پاجامہ پہنے، ننگے سر اور ننگے پیر ادھر اُدھر پھر رہا تھا، پانی کی ننھی ننھی بوندیں اس کے بکھرے ہوئے لمبے بالوں میں جمع ہو رہی تھیں، اور وہ دس پانچ منٹ کے بعد اپنا سر جھٹک کر ان کو گراتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔ بازار کی بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں، سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہو چکی تھی۔

"اے خدا کیا آج کی رات بھی یوں ہی گذر جائے گی؟" اُس نے اپنے دل میں کہا۔ معاً اُس کے ذہن میں خیال آیا کہ ایک چکر شہر کے سب سے بڑے "بار" کا لگائے، شاید اس کو وہاں کچھ مل جائے۔ "بار" بازو والی سڑک پر تھا، وہ جلدی سے اس پر ہو لیا۔ "بار" کے سامنے ایک موٹر کھڑی تھی۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ اسکی ساری اُمیدیں جاگ اُٹھیں، اور وہ لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا موٹر کے پاس پہونچ گیا۔ ایک منٹ میں اپنے اردگرد کا جائزہ لیکر وہ سمجھ گیا کہ موٹر کا مالک اندر ہے۔ وہ انتظار میں ٹہلنے لگا۔ وہ آدھے گھنٹے تک ٹہلا ہوگا، مگر اس کو معلوم ہوتا تھا کہ آدھی رات آگئی ہے۔ مختلف خیالات بڑی تیزی سے اُس کے ذہن میں آرہے تھے، کبھی وہ سوچتا کہ آنے والا کوئی خوش فکر نوجوان ہوگا۔ شاید وہ اُسے ایک آنہ دیدے، لیکن اگر کوئی بڈھا کھاگ ہوا تو اس کو ایک پیسہ ہی ملے گا لیکن اگر کوئی خاتون ہوئی تو دو آنے تک کی اُمید ہے، اور اگر کوئی رنگین جوڑا ہوا تو وہ نازک اندام حسینہ سے التجا کرے گا اور وہ اس کو ایک چونی دلوا دے گی۔ دو آنے کی گرم روٹیاں دو پیسے کی چائے، ایک پیسے کی بیڑیاں رات خوب گذر جائے گی۔ ایک دم اُس کی نظر بڑی بڑی سڑک پر ایک فقیر جا رہا تھا، اس لئے جلدی سے پیٹھ پھیر لی کہ کہیں وہ اُس کو دیکھ ادھر نہ آجائے، وہ تھوڑی دور آگے بڑھ گیا۔ اور آہستہ سے پیچھے مڑ کر دیکھا، جب اطمینان ہو گیا کہ وہ فقیر ادھر نہیں آیا تو وہ پھر موٹر کے پاس آگیا۔ اب وہ بھکاریوں کو گالیاں دے رہا تھا، ایسی سرد راتوں میں بھی یہ کمبخت گھر نہیں بیٹھتے، حالانکہ ان میں سے لبعض کافی مالدار ہیں، پھر ان کے چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں اور بیویاں بھی کما کر لاتی ہیں، مگر میں تو اکیلا ہوں، پھر کل صبح سے کچھ نہیں ملا، پھر اس کے خیالات اِدھر اُدھر بھٹکنے لگے، مگر اتنے میں اندر سے کوئی شخص باہر نکلا، اس کے خیالات یک قلم کافور ہو گئے۔ وہ جلدی سے

موٹر کے قریب آگیا، ایک خوش پوش نوجوان موٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"حضور کچھ دیا کیجئے"

"ہش"

"حضور تیسرا فاقہ ہے، سردی کے مارے مرا جا رہا ہوں"

نوجوان نے اس پر سر سے پاؤں تک نگاہ ڈالی، اور جیب میں ہاتھ ڈالا، روپوں کی کھنکھناہٹ سے بھکاری کی آنکھیں چمکنے لگیں، ہاتھ جیب سے باہر آیا اور دوسرے لمحہ میں اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ تھا۔ بھکاری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ کھلا۔ نوجوان موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ اب اس کو احساس ہوا کہ اس نے اتنے بڑے محسن کا شکریہ ادا نہیں کیا، وہ کچھ کھو سا گیا، اسے یہ امید نہ تھی وہ دل میں نادم تھا۔ لیکن خیر اب اس کے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا، اس نے پھر ایک مرتبہ روپے کو دیکھا، گویا تعین کرنا چاہتا تھا کہ وہ روپیہ ہی ہے۔ واقعی اس کی ہتیلی پر ایک چمکدار چیز چمک رہی تھی، اس نے جلدی سے مٹھی بند کی، اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اسکو دیکھ تو نہیں رہا اور وہاں سے چلدیا۔

اب اس کی چال میں تیزی آچکی تھی، سردی بھی کم معلوم ہو رہی تھی، وہ واقعی بھاگنے لگا۔ اور جیسے ہی اس کو پہلا ہوٹل نظر آیا وہ بے دھڑک اس میں داخل ہوگیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بیچ کی کرسیوں پر بیٹھے، مگر اس کو اپنے کپڑے اور بالوں وغیرہ کا خیال آیا اور وہ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے تحکمانہ لہجہ میں بوائے کو آواز دی "یہاں آؤ"

"کیا مانگتا ہے" ایک آدمی نے آکر اس سے حقارت سے دریافت کیا۔

"کھانے کیلئے کیا ہے؟"

"سب کچھ" اس نے اسی حقارت سے جواب دیا۔

"ایسے سب کیا؟"

"مرغ، قورمہ، بریانی، شامی کباب، آلو گوشت، مٹر گوشت، نمکین گوشت، پسندے، شیرمال ـــــ" بوائے نے بدستور دوسری طرف دیکھتے ہوئے ایک سانس میں کہا۔

"ایک بریانی اور ایک شامی کباب لاؤ" اس نے جملے کو کاٹتے ہوئے کہا۔

"گرہ میں دام بھی ہیں"

اسکو اپنی توہین پر بڑا غصہ آیا، مگر وہ بھوکا تھا اس لئے بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا، اس نے زور سے کہا "روپیہ ہے روپیہ" او اپنی مٹھی کھول بوائے کو روپے کی جھلک دکھلائی۔ پھر مٹھی زور سے بند کر لی کہ کہیں وہ روپیہ لے نہ بھاگے۔ قہوہ خانوں اور ہوٹلوں دونوا جگہ کا ایک حال ہے، یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ آنے والا کون ہے بلکہ اسکے پاس کیا ہے۔ اب بوائے مجبور تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل کرے وہ چیزیں لے آیا۔ بھکاری نیم گرم بریانی پر ایسا گرا کہ جب تک پلیٹ صاف نہ ہوئی اس نے سر بھی نہ اٹھایا۔ مگر وہ اب بھی بھوکا تھا، اُ نے کچھ اور منگوایا۔ پھر دو پیالیاں چائے پی کر وہ اطمینان سے اپنا کرسی سے اُٹھا، بوائے نے آواز دی "دس آنے"۔ اس نے روپیہ لاکر کے سامنے رکھدیا۔ مالک نے روپے کو زور سے شیشے کی میز پر مارا بھد کی آواز آئی۔ بھکاری ذرا چونکا ہوا۔ مالک نے دوبارہ روپے کو بجا پھر وہی آواز آئی۔ بھکاری کا خون خشک ہوگیا۔

"دوسرا روپیہ دے"

وہ خاموش رہا۔

"ابے دوسرا لا" مالک نے چیخکر کہا۔

"میرے پاس نہیں ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

"بدمعاش کھوٹا روپیہ چلانا چاہتا ہے، ابے قاسم ذرا پولیس والے کو آواز دے"

تھوڑی دیر میں پولیس کا ایک سپاہی ہوٹل میں موجود تھا۔ اُ چند صلواتیں سنائیں، دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں پھر ہوٹل کے ایک لڑکے سے اس کی جامہ تلاشی کرائی، مگر وہاں سوائے چند دیا سلائیوں او جلی ہوئی بیڑیوں کے اور کچھ نہ ملا۔

"اچھا میں اس کو تھانے لے جاتا ہوں"

"ذرا سی چائے پی لیجئے" مالک نے خوشامد میں کہا۔

سپاہی نے وہیں کھڑے کھڑے چائے پی، پھر جیب سے ایک چھوٹی سی رسی نکالی اور اس کے ہاتھ باندھ کر قریب کے تھانہ میں لے گیا۔ چلتے وقت بھکاری نے تیزی سے اپنا روپیہ اُٹھالیا۔

تھانہ میں جمعدار نے اس کو لاکھوں گالیاں دیں، صلواتیں سنائیں، اور اس سے کھوٹے سکے بنانے والوں کا پتہ ونشان پوچھنا چاہا۔ بھکاری نے ہزار طرح سمجھانے کی کوشش کی اس کا جعلسازوں سے کوئی تعلق نہیں، اور اس کو یہ روپیہ ایک شخص نے دیا ہے، مگر جمعدار کو اس کا یقین ہی نہیں آیا۔ ان کی دلیل تھی کہ ایسی صورت اور اس حلیہ پر ایک روپیہ خیرات نہیں مل سکتا۔ (باقی

عصمت یا حیرت؟

۱

نعیم الدین ہاتھ دھوکر دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ اُن کی بیوی نے کھانا دیتے ہوئے کہا: "وہ دیکھو! سنا آپ نے؟ آواز آئی نا؟"

"پھر وہی آواز! آواز! کاہے کی آواز؟" جھلا کر نعیم الدین نے کہا "ہر وقت آواز کی رٹ لگی رہتی ہے۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ جب دیکھو وہی ہیا یا دکھڑا۔ کبھی یہ آواز آئی کبھی وہ آواز آئی۔ میں پوچھتا ہوں آخر اس سے مطلب؟"

"مطلب کیسے نہیں؟" تیورا کر سلمہ نے کہا: "پڑوسی نہ سہی لیکن بحیثیت انسان کے بھی تو فرض ہے؟ اپنے بال بچوں کی فکر و پرداخت اور اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ سکھی بنانے کا خیال تو جانوروں کو بھی ہوتا ہے۔ انسان کو تو اس سے ارفع و اعلیٰ ہونا چاہیے؟ میں اتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ یہ پڑوسی روز اپنی عورت کو مارتا پیٹتا ہے۔ مجھ کو یہ نہیں دیکھا جاتا۔ یا تو جاکر اسے سمجھائیے یا پھر یہ مکان ہی چھوڑ دیجیے!"

"آہستہ بولو! آہستہ!" نعیم الدین نے دبی آواز میں کہا: "کہیں وہ سُن نہ لے ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے جھگڑا کراؤ گی؟"

"اس میں جھگڑے کی بات ہی کیا ہے؟" رکابی شوہر کے آگے سرکاتے ہوتے سلمہ نے کہا۔

"جھگڑے کی تو بات ہی ہے۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ اپنی عورت کو مارتا ہے؟ سُنی سنائی باتوں پر۔۔۔۔"

"سُنی سنائی باتوں پر میں بھروسہ نہیں کرتی" سلمہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن اپنے ہی کانوں پر یقین کیسے نہ کیا جائے؟ یہ جو ہر روز "دھما دھم" ہوتی ہے۔ ہوا کا یا پھر میرے کانوں کا فتور ہے؟"

"نہ ہو۔ مگر دھما دھم اس پڑوسی کے عورت کو پیٹنے کی ہی ہوتی ہے یہ کیسے مان لیا جائے؟ اکثر چھت پر جب بچے کھیلتے کودتے ہیں تو بھی ایسی آواز آتی ہے؟"

"لیکن رات میں دس دس بارہ بارہ بجے کس کے بچے چھت پر کھیلتے دوڑتے ہیں؟ آپ تو جیسے مجھے پاگل ہی سمجھ رکھا ہے!"

"ہرگز نہیں! ایسا سمجھتا تو تم سے شادی ہی کیوں کرتا؟" یہ مسکراتے ہوتے نعیم الدین نے کہا: "اچھا اچھا پھر کہو کیا بات ہے؟"

"اب بھی کیا کچھ کہنے کی بات رہ گئی ہے؟ اتنے دنوں سے تو کہہ رہی ہوں پر آپ کے کان پر تو جیسے جوں تک نہیں رینگتی الٹا مجھے ہی جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا جانے آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ آپ کا دل ہے یا پتھر؟"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کروں؟ بیٹھے بٹھائے اس سے جھگڑا مول لوں؟ مان بھی لو کہ وہ اپنی عورت کو پیٹتا ہے تو ہم کیا کریں؟ جب وہ اس کی عورت ہے تو وہ چاہے اُسے پیٹے چاہے پیار کرے چاہے اور کچھ، کسی تیسرے آدمی کو انکے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق؟"

"جب آپ جیسے سمجھدار لوگ بھی ایسا کہتے ہیں تو جاہل اور بیوقوف لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے؟ آخر مرد جو ہیں! لیکن کیا عورتوں کے جان نہیں؟ مرد اُن سے جو چاہے کام لیں وہ اُف بھی نہ کریں؟ کیا انہیں صرف ظلم و ستم کے جوالا میں جلنے ہی کا حق ہے؟"

نعیم الدین نے سلمہ کے چہرے کے بدلتے ہوتے رنگ کو دیکھا۔ ابھی وہ اس کے روٹھ جانے کے الٹی میٹم کا مقابلہ کرنے تیار نہ تھے بات ٹالنے کے خیال سے مسکرا کر بولے: "لیکن حقوق کی بحث کھانے کے بعد بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو کسی بھی وقت ہو سکتی ہے" تیوری پر بل ڈال کر سلمہ نے کہا: "لیکن بحث کرتا کون ہے؟ تم سب مرد مرد ایک ہو۔ سارے حقوق کا ٹھیکہ تو تم ہی نے لے رکھا ہے نا؟ عورت پٹتی ہے تو پٹے۔ جور و ستم کا تختہ مشق بنتی ہے تو بنے۔ تمہاری بلا سے!"

اس مرتبہ نعیم الدین کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہاتھ دھو کر وہ چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

۲

نعیم الدین کے سامنے والے مکان میں کوئی نیا کرایہ دار ہے۔ مگر کون ہے کسی کو نہیں معلوم۔ سنا گیا کہ نیا کرایہ دار ایک نوجوان شخص ہے اور ساتھ ایک عورت بھی ہے جو شاید اس کی بیوی ہو۔ آس پاس کے سارے رہنے والے ان کے رہنے سہنے کے ڈھنگ سے متعجب تھے وہ کب گھر میں رہتے تھے اور کب باہر۔ یہ بہت کم لوگوں ہی کو معلوم ہوتا

تھا۔ گھر کا دروازہ یا تو اندر سے بند ہوتا تھا یا پھر باہر سے مقفل۔ اُوپر کے کمرے کی ساری کھڑکیاں اور دروازے ہر وقت بند رہتے تھے۔ روشندان سے دکھائی دینے والی روشنی سے صرف اتنا پتہ چلتا تھا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی تو باہر قفل ہوتا اور کمرے میں روشنی ہوتی تھی۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ باہر جاتے وقت وہ روشنی بند کرنا بھول گئے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ باہر تو قفل ہوتا اور اندر روشنی کے ساتھ ہی ساتھ کسی کے رونے اور ڈانٹ ڈپٹ کی بھی آواز آ جاتی تھی۔ روشنی بھی نہ معلوم کتنی دفعہ جلتی اور بجھتی تھی۔

اِن واقعات سے سب سے زیادہ تشویش نعیم الدین اور ان کی بیوی کو ہوتی۔ ان کے پڑوسی کا یہ حیرت انگیز طرزِ عمل ان کے لئے اچھا خاصا چیستاں بن گیا تھا۔ کئی بار سلمہ نے نعیم الدین سے ان واقعات کی چھان بین کیلئے کہا مگر اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں؟ اگر کچھ سمجھتے بھی تو بدنامی کے ڈر سے وہ کچھ کرنے کی قدرت اپنے میں نہیں پاتے۔ کانٹوں میں اُلجھے ہوئے قمیص کے دامن کو نکالنے کیلئے وہ پاجامہ کو اُلجھانا قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے تھے اسی لئے چُپ تھے۔ مگر سلمہ کے تقاضے کم نہیں ہو رہے تھے۔

ایک دن جب نعیم الدین دفتر سے دیر میں آئے تو دیکھا کہ سلمہ چھت پر کھڑی اینٹوں کی جالی میں سے سامنے والے مکان کی طرف بڑے ہی غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے سب اچھی طرح بند تھے صرف روشندان سے روشنی جھانک رہی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے سلمہ نے نعیم الدین کو اپنے پاس بلایا اور چپکے سے اُنکے کان کے پاس مُنہ کر کے کہا "یہاں چپ چاپ کھڑے ہو کر ذرا سنو تو۔ کیا ہو رہا ہے؟"

دونوں سانس روک کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ دکھائی تو نہ دیا لیکن کسی کے لات، گھونسے سے پیٹنے اور سسکنے کی آواز ضرور آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی کے کچھ بولنے کا بھی گمان ہوتا تھا، مگر کون کیا کہہ رہا ہے صاف سُنائی نہیں دے رہا تھا۔ نعیم الدین کو تو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سانس روکے ہوئے وہ سب کچھ بڑے دھیان سے سُن رہے تھے۔ درمیان میں کبھی کبھی انہیں ایسی آواز بھی آتی تھی جیسے کسی کا سر فرش یا دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ زیادہ دیر تک وہ وہاں کھڑے نہ رہ سکے۔ چُپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد سلمہ کمرے میں داخل ہوئی اور بتی جلائی۔ روشنی میں ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سلمہ کی آنکھوں میں آنسو صاف جھلک رہے تھے۔ وہ گُم سُم بجلی کے سوئچ کے پاس پڑے ہوئے صوفے پر پڑی رہی۔ نعیم الدین کے منہ سے تو جیسے آج کوئی لفظ ہی نہیں نکل رہا تھا۔ رُک کر بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولے "سلمہ، ذرا اسکی عورت سے کچھ حال وال تو معلوم کرو۔ بات کیا ہے؟ شاید پھر کچھ کیا جا سکے ۔۔!"

"لیکن کیسے کروں؟ میں نے تو بہتیری کوشش کی مگر اس کی تو صورت ہی دکھائی نہیں دیتی۔ مکان کا دروازہ تو ہمیشہ بند ہی رہتا ہے پھر بھی کچھ تو ہونا ہی چاہیئے!"

"دیکھو کچھ سوچیں گے" کہکر نعیم الدین نیچے جانے کیلئے زینے کی طرف چلدئے۔

۳

سلمہ کسی ضرورت سے جوں ہی دروازے پر آئی۔ اُس کی نظر سامنے والے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی ایک درمیانے قد کی دبلی پتلی عورت پر پڑی۔ جو اپنے میلے کچیلے کپڑوں کو ایک سفید چادر سے ڈھانکے کھڑی تھی۔ سلمہ کے پاؤں کی آہٹ پا کر اُس نے آنکھیں اوپر کیں اور دوسرے ہی لمحہ نیچی کر لی۔ سلمہ نے موقع غنیمت جان کر ایک تیر چھوڑا۔

"بڑی خوش قسمتی ہے کہ آج تمہاری دید نصیب ہوئی بہن!"

لیکن سامنے کھڑی ہوئی عورت نے کچھ جواب نہ دیا اور نہ نظریں اوپر کیں۔

سلمہ نے دوسرا تیر چھوڑا "آج کہاں جا رہی ہو بہن؟"

اس مرتبہ اُس نے اپنی آنکھیں اوپر اُٹھائیں اور بادقت تمام ایک لفظ کہا "دواخانہ!"

"کیوں، کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟" سلمہ نے پوچھا۔

جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اُس نے آنکھیں نیچی کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو کیا اکیلی ہی جاؤ گی؟" سلمہ نے پھر سوال کیا۔

"نہیں" نیچی نظریں کئے ہوئے دبی ہوئی آواز میں بولی "وہ ساتھ رہے ہیں۔ تانگہ لینے گئے ہیں"

"تم کبھی ادھر کیوں نہیں آتیں؟" سلمہ نے پوچھا۔

سلمہ کا جملہ پورا ہوتے نہ ہوتے اس کا شوہر تانگہ لیکر آ پہونچا۔ بات کا جواب وہ نہ دے سکی۔ سلمہ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ تانگہ چلا ۔۔۔ دواخانہ یا نہ معلوم اور کہاں!!

تانگے کے لوٹنے کی اُمید سے سلمہ گھر کا تھوڑا بہت کام کر کے بار دروازے پر آتی اور کچھ نہ پا کر پھر لوٹ جاتی۔ آخر کار کوئی ڈیڑھ گ

ـدوہ تانگہ لوٹتا۔ مگر ایکی دفعہ دونوں ساتھ ہی اُترے۔ اس لئے سلمہ کو بات
ـرنے کا موقع نہ ملا۔

اس کے بعد تو سلمہ نے جیسے دروازے کے پاس لگے رہنے کی
ـسم ہی کھالی تھی۔ جب بھی کوئی تانگہ آتا جاتا تو وہ اپنی پڑوسن سے ملنے
ـکے خیال سے دروازے پر آتی اور پھر نااُمید ہوکر لوٹ جاتی۔ اس طرح
ـنا دن کئی ہفتے اور مہینے بیت گئے لیکن سلمہ کو پھر کبھی اپنی پڑوسن سے
ـلنے کا موقع نہ ملا۔ کبھی کبھی تو سلمہ کو یہ گمان ہونے لگتا کہ کہیں وہ لوگ
ـکان چھوڑ کر نہ چلے گئے ہوں ـــ کیونکہ آجکل مار پیٹ کی دھما دھم بھی
ـت کم ہوگئی تھی۔ مگر اُوپر کے بند دروازے اور روشندان سے چھن کر
ـیوالی روشنی اس کے گمان کو غلط ثابت کر دیتی تھی۔

۴

گھر کے صحن میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے سلمہ کچھ بُن رہی تھی۔ نیچے
ـی ہوئی ٹوکری میں سلائیاں اور ریشمی دھاگے رکھے تھے۔ اسکی دونوں
ـھیں اس کی اپنی اُنگلیوں کی چال پر لگی ہوئی تھیں۔ یکایک پیچھے سے کسی
ـے آہستہ سے کھانسنے کی آواز آئی۔ سلمہ نے مُڑ کر دیکھا۔ اسے اپنی پڑوسن
ـپہچاننے میں دیر نہ لگی۔ "ارے تم آج ادھر کیسے بھٹک گئیں؟" کہتے
ـے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی کی طرف کھینچتے ہوئے
ـی: "بیٹھو بہن! تم سے تو آج تک ملاقات ہی نہ ہوسکی۔ مجھے تو تم سے بہت
ـباتیں کرنی ہیں"

نظریں نیچی کئے ہوئے وہ بولی: "بیٹھنے یا باتیں کرنے کا یہ موقع
ـب۔ میں آپ کو کچھ تکلیف دینے آئی ہوں"

"تکلیف کیسی۔ جو کام ہو بے تکلف کہدو بہن۔ آخر میں ہوں کس لئے؟"

"ان کی طبیعت رات سے بہت خراب ہے۔ قے پر قے ہو رہی ہے۔
ـکسی دوا یا ڈاکٹر کا انتظام کرسکیں گی؟"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ میں ابھی آدمی بھیجکر ڈاکٹر کو بلوائے
ـا ہوں۔ تم انکے پاس جاؤ"

اپنی پڑوسن کے جانے کے بعد سلمہ نے نوکر کو ڈاکٹر کو بلانے
ـنے بھیجا۔ ڈاکٹر نے آکر مریض کو دیکھا اور بتایا کہ کثرتِ شراب نوشی
ـنتیجہ ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ـــ اس نے دوا دی اور نوکر
ـلے کر سیدھا وہاں پہونچ گیا۔

کوئی دو ڈھائی گھنٹے بعد سلمہ نے دیکھا کہ اُس کی پڑوسن پھر
ـہا ہے۔ اس مرتبہ اس کی آنکھیں نیچی نہیں تھیں۔ اس کی آنکھوں
ـایک ہلکی سی مُسکراہٹ تھی۔ بڑی ہی لجاجت سے وہ بولی: "آپ نے

آج اُن کی جان بچادی ورنہ میں اکیلی کیا کرتی؟ آپ کا یہ احسان میں کبھی
نہ بھولوں گی"

"چھوڑو بھی اِن باتوں کو۔ اب تو بیٹھوگی نا؟ ان کی طبیعت اَب
کیسی ہے؟"

"اب تو اچھی ہے" فرش پر بیٹھتے ہوئے اُس نے کہا: "دوا سے آرام
پہونچا اور انہیں نیند آگئی۔ اب تو میں تھوڑی دیر بیٹھ سکونگی"

"لیکن بہن۔ اپنا نام تو بتاؤ۔ میں کیا کہہ کر تمہیں مخاطب کروں"

"اس کی ضرورت ہی کیا۔ جانے بھی دیجئے۔ آپکے منہ سے "بہن"
سُنکر میرا دل باغ باغ ہوجاتا ہے اور کسی قدر ڈھارس اور اطمینان بھی!"
کچھ رک کر ـــ "لیکن نہیں۔ آپ جیسی پتی ورتا اور حور خصال عورت کی
بہن مجھ جیسی کنگال اور گنہگار کیسے ہوسکتی ہے؟ آپ مجھے آج سے فرخندہ
کہہ سکتی ہیں"

سلمہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بھر آئی ہیں۔ اس کے ہونٹ،
کان اور گردن پر چرکوں کے لال نشان اس کے گورے جسم پر آئینے کے
میل یا دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جسم کی چوٹیں اور میلے
کپڑے اُس کی بدبختی کی چغلی کھا رہے تھے۔ اُس کے گلابی رخساروں پر
آنسوؤں کے قطرے شبنم کی طرح ڈھلک رہے تھے۔ گویا دلی جذبات کا
طوفان آنکھوں میں اُمنڈ آیا تھا۔ سلمہ یہ سب دیکھکر بے چین ہوئی جا رہی
تھی۔ کرسی سے اُٹھکر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی: "یہ تمہارا کیا حال
ہے بہن؟"

آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ فرخندہ
نے کہا: "کوئی خاص بات تو نہیں۔ البتہ کئی دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں
رہتی ہے"

"لیکن تمہارے جسم کے یہ نشان بھی کیا طبیعت کی خرابی کے سبب
سے ہیں؟"

فرخندہ چُپ رہی۔ اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

"تم تو بہن ایسی سخت نگرانی میں رہتی ہو کہ شاید جیل کے قیدی اور
قفس کے پرندے بھی نہیں رہتے ہونگے۔

اسدفعہ بھی فرخندہ کچھ نہ بولی۔

"یہ جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ کون ہیں؟"

"یہ تو میرے . . . ." یکایک فرخندہ رُک گئی۔ پھر نہایت بھرائی
ہوئی آواز میں بولی: "میرے شوہر ہیں"

"لیکن شوہر تو ایسے سخت گیر اور ظالم نہیں ہوتے۔ یہ روز روز

رہیٹ تو مجھ سے سُنی نہیں جاتی۔ نہ معلوم تم کیسے سہتی ہوگی ؟"

فرخندہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن آوازِ حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ نیچی
ریں کئے ہوئے وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ سلمہ نے جب ٹھوڑی پکڑ کر
س کا چہرہ اُوپر اُٹھایا تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے موتیوں کے سے بڑے
بڑے آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ نیل پڑے ہوئے اس کے ہونٹ خوف
اِس سے کانپ رہے تھے۔ سلمہ زیادہ دیر تک یہ حالت نہ دیکھ سکی۔
س کی آنکھیں برس پڑیں اور وہ فرخندہ کو اپنی چھاتی سے لگا کر بولی
بہن تو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کیوں کر رہی ہے؟ ساری باتیں صاف
صاف کیوں نہیں بتا دیتی؟ شاید میں تیری مدد کر سکوں!"

"بھلا آپ کو دھوکا دینے کی جرأت میں کیسے کر سکتی ہوں؟
سچ تو یہ ہے کہ اپنی حالت کے اظہار سے زبان کانپ اُٹھتی ہے۔ اب
جو کچھ بھی میرا حال ہے اُس کی ذمہ دار میں خود اور میری ناعاقبت اندیشی
ہے" الفاظ اسکے حلق میں پھندا بنا رہے تھے۔

"آخر معلوم تو ہو۔ بات کیا ہے؟"

"میں ناگپور کے ایک شریف اور معزز خاندان کی بیٹی ہوں،
یہ میرا ساتھی میرا شوہر نہیں ہے۔ اس کا نام منظر.... نہیں طاہر ہے۔
یہ ہمارے گھر کے پاس ہی رہتا تھا۔ میں ابھی شادی کی سنہری زنجیروں
میں جکڑی نہیں گئی تھی بلکہ دوشیزگی کی حسین آغوش میں پل رہی تھی۔
ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ محبت کیا اپنے ہاتھوں
اپنی ہی قبر کھود رہے تھے۔ ہم دونوں شرابِ عشق سے مخمور تھے۔ سچ ہے
کہ عشق کا پرندہ سر پر منڈلانے لگتا ہے تو انسان ہوش و حواس کھو بیٹھتا
ہے۔ میں ناسمجھ، مستقبل سے ناآشنا۔ انجام سے ناواقف اس کے فریبی جال
میں نہایت آسانی کے ساتھ پھنس گئی۔ اپنا بھانڈا پھوٹ جانے کے خوف
سے یہ مجھے یہاں بھگا لایا۔ یہاں لاکر اُس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ
بیان سے باہر ہے۔ اُف خدا! — اُس نے ایک پھول کو چھوا — اور
مسل بھی دیا —"

یہ کہکر فرخندہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کچھ سنبھل کر اُس نے
پھر کہنا شروع کیا" گھر سے بھاگتے وقت میں جو کچھ زیور اور روپے لائی
تھی وہ تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو گئے۔ طاہر نے اِدھر اُدھر نوکری کی
تلاش کی مگر کوئی صورت بن نہ آئی۔ جب دوزخِ شکم نے "ھل من مزید"
کے نعرے لگانے شروع کئے تو اس محبت کے دعویدار نے مجھے پیشہ ور
کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ پہلے تو میں اس کے لئے راضی نہ ہوئی
مگر جب اس نے اور اس کے شرابی دوستوں نے لگاتار کئی دنوں تک

مجھے مار پیٹ کی اور میری عصمت کا پردہ اُس نے خود اپنی آنکھوں کے
سامنے چاک کروا دیا تو مجھے اس کے لئے تیار ہونے کے سوا کوئی راستہ
ہی نظر نہ آیا۔ پچھلے دو تین مہینوں سے اُس نے میری جو حالت بنا رکھی
ہے وہ اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ ہر روز ہوس کے بندوں کو
لاتا ہے جو رات کی تاریکیوں میں چھپے چھپے اپنی ہوس کاریوں کی تکمیل
کر کے چلے جاتے ہیں اور مجھے چار و ناچار اُن کے خون کی اس آگ کو
جو شراب کے تیز گھونٹوں سے پیدا ہوتی ہے اپنی عصمت کی چھینٹیں دیکر
بجھانا ہی پڑتا ہے۔ ذرا یہ دیکھئے"

یہ کہکر فرخندہ نے جمپر اُوپر اُٹھایا۔ اس کے سینے کی چوٹوں اور
زخم کے نشانوں کو دیکھ کر سلمہ کانپ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی
آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے آنسو بہاتی رہیں۔ پھر
فرخندہ نے اپنی میلی ساری سے آنسو پونچھنے اور اُٹھتے ہوئے کہا۔
"اب جاتی ہوں۔ شاید دوا دینی ہوگی۔ موقع ملا تو پھر آؤں گی۔ مجھے
اس گندگی سے نکالنے کی آپ کچھ کوشش کیجئے۔ ورنہ سڑ تو رہی
ہوں —"

"لیکن بہن تم نے اپنے گھر کا پتہ تو بتایا ہی نہیں۔ بتاؤ تو تمہارے
والد کو خبر کر دیں۔ شاید وہ تمہاری نجات کا سامان کر سکیں"

"نہیں۔ اُن کا نام تو میں قصداً نہیں بتانا چاہتی۔ میرا بھاگ آنا
کیا ان کے لئے کم بدنامی کا باعث ہوگا؟ میں یا آپ جانتی ہیں کہ یہ میری
بیوقوفی ہے مگر دُنیا تو انہیں کو خطاوار کہے گی؟ پھر میرا اس گھر میں واپس
جانا سماج کے کتنے کرتا دھرتا کیلئے دُکھ کا باعث ہوگا؟ یہ تو زخموں پر
نمک پاشی ہوگی"

"ٹھیک ہے، میں ہی کچھ کرونگی!"
ایک سرد آہ کھینچکر فرخندہ چلی گئی۔

(۵)

فرخندہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے طاہر نے کہا۔
"جاؤ ذرا دیکھو! دروازہ کون کھٹکھٹا رہا ہے؟"

فرخندہ نے دروازہ کھولا تو نعیم الدین کھڑے دکھائی دئے۔ دروازہ
آدھا کھلا چھوڑ کر ایک لمبا سا گھونگھٹ کھینچکر وہ پیچھے ہٹ گئی —
نعیم الدین نے آنکھیں نیچی کئے ہوئے کہا" طاہر کا مزاج اب کیسا ہے؟
کیا میں آسکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔ خوشی سے تشریف لائیے" اندر چارپائی پر بیٹھے بیٹھے

ہی طاہر نے کہا۔

فرخندہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نعیم الدین نے اندر پہونچکر طاہر کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کہیئے! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ جی کچھ ہلکا ہوا؟"

"جی ہاں۔ اب تو کافی فرق ہے!" بناوٹی مُسکراہٹ کیساتھ طاہر نے کہا۔ "سنائیے اور کیا کیفیت ہے؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔ آج دفتر کی چھٹی ہے۔ سوچا: چل کر آپ کو دیکھ ہی لوں۔ آج کل کام اتنا ہے کہ دم مارنے کی فرصت نہیں۔ آپ تو اتنے مشغول رہتے ہیں کہ گھر کے پاس رہنے کے باوجود کبھی علیک سلیک نہ ہوسکی!"

"جی ہاں۔ بیشک مجھے بھی اس کا سخت افسوس ہے لیکن مجھے باہر اتنا کام رہتا ہے کہ اکثر رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے کبھی گھر لوٹنا ہی نہیں۔ اسوقت کسی شریف آدمی کو کیا تکلیف دی جائے!"

"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ وہ گھر اور یہ گھر کوئی دو دو تھوڑی ہیں۔ آپ مجھے اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھیئے۔ جب کبھی کوئی ضرورت ہو آپ بلاتکلف کہہ سکتے ہیں!"

"کیوں نہیں ـــــ"

دس دس روپے کے دو نوٹ جیب سے نکال کر نعیم الدین نے طاہر کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کے خرچ کے لئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان دنوں آپ کو کافی تنگی ہوگی۔ پھر جب کبھی ضرورت پڑے آپ مجھ سے کہہ سکتے ہیں!"

نوٹوں کی طرف دیکھکر طاہر نے کہا۔ "لیکن جب مجھے ضرورت ہوگی لے لونگا۔ اسوقت تو قطعی ضرورت نہیں ہے!"

"نہیں! کچھ نہیں!! یہ آپ کو رکھنا ہی ہوگا۔ اب میں جاتا ہوں پھر آؤنگا!" نعیم الدین اُٹھے اور چُپ چاپ باہر نکل گئے۔

دو تین منٹ طاہر چُپ چاپ نوٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں آہوئے رمیدہ کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی فرخندہ وہاں آئی۔ نوٹوں کو دیکھکر تعجب سے بولی۔ "اوہو! آج تو روپے برسے ہیں۔ روپے؟"

"ہاں برسے ہیں! لے، لیکر اپنے سر پر مار لے!" دونوں نوٹوں کو فرخندہ کے سامنے پھینکتے ہوئے طاہر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تو نے اُن سے جاکر سارا رونا رو دیا ہے۔ ورنہ اُنہیں کیا خبر کہ ہمارے پاس کھانے تک کو پیسے نہیں۔ اور نہ معلوم کس مقصد سے وہ یہ روپے دے گئے؟"

"تم ہر وقت دوسروں کے متعلق سوءظن رکھتے ہو۔ میں نے تو کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ کیا نہیں جانتے کہ تم اتنے دنوں سے بیمار ہو۔ کاروبار بھی کوئی خاص نہیں۔ اسی لئے کچھ دے گئے۔ ان کا اور کیا مقصد ہوسکتا ہے؟"

کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد طاہر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تو مجھے یہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیگی؟"

کچھ جواب دئے بغیر فرخندہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

(۶)

نعیم الدین جب دفتر سے لوٹے تو سلمہ نے کہا کہ اُن کے پڑوسی نہ معلوم کب مکان چھوڑ کر چلے گئے۔ سُنا ہے کہ پچھلے تین ماہ کا کرایہ بھی نہوں نے ادا نہیں کیا۔ مالک مکان کے منشی سے یہ معلوم کرکے انہیں اور بھی حیرت ہوئی کہ اس شخص کا نام طاہر نہیں بلکہ منظر تھا۔ دونوں میاں بیوی کو اس کا سخت افسوس ہوا کہ وہ فرخندہ کی بھلائی کیلئے کچھ بھی نہ کرسکے۔ مگر اب ہو ہی کیا سکتا تھا؟ اس کی اپنی قسمت!

فرخندہ اور طاہر کا انہیں پھر کوئی پتہ نہ چلا ـــ کچھ دن بعد ان کی نظر مقامی اخبار کے ایک کالم پر پڑی ـــ "جواریوں کے اڈّے کا پولیس سرگرمی سے پتہ چلا رہی ہے۔ کل رات منظر نامی ایک "شریف آدمی" کے گھر پر پولیس نے دھاوا کیا اور اس کو اپنی عورت سے پیشہ کروانے اور اس سے کمائے ہوئے روپے پر گزر بسر کرنے کے جرم میں گرفتار کیا ـــ؟"

اس طرح کی خبریں وہ اخباروں کے کالم میں پہلے بھی کئی دفعہ پڑھ چُکے تھے۔ لیکن نہ معلوم اسے پڑھ کر وہ کیوں اپنے آنسو نہ روک سکے!

محمد عبدالقادر فاروقی

کھوٹا سکہ

(بسلسلہ صفحہ ۴۹)

آخر طے ہوا کہ اب اسکو حوالات میں بند کر دیا جائے، صبح کو دیکھ لیا جائے گا۔ ایک سپاہی نے ایک اندھیری اور سرد کوٹھڑی کا دروازہ کھولا، بھکاری اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔

صبح جب تحقیقات کیلئے حوالات کا دروازہ کھولا گیا تو بھکاری حوالات اور جمعدار سب سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُسکی مٹھی بند تھی اور اس میں وہی روپیہ چمک رہا تھا۔

نہالی سو

دیوالی کا چراغ

ٹھاکر گجراج سنگھ کے یہاں آج دیوالی ہے۔ ویسے تو گلاب لیدار اور انگنے چمار کے گھر بھی دیپ مالکا کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ انگنے نے گزشتہ ماہ کی بچائی ہوئی قلیل پونجی سے اس تیوہار کے موقع پر اپنے پانچ برس کے لڑکے کے لئے لال پیلے پھولوں والی کالی ٹوپی خریدی تھی۔ لڑکی کے واسطے صرف اوڑھنی خرید سکا۔ بیوی کے لئے بلو کا اور اپنے لئے محض دھوتی پر اکتفا کی۔ بیوی نے کوٹھے اور چھپر کی لونی لگی پرانی دیواروں کو پنڈول سے پوت لیا تھا۔ کچے فرش پر گوبری پوتی تھی آج پھر سے لیپنا باقی تھا۔ باہر کی دیواروں پر اس نے گیرو کے ذریعے نہایت محنت سے دیہاتی مصوری کے چند نمونے بنائے تھے۔ ایک تو تھا اپنے ایک کان والے ملاح کے۔ دو مضبوط بیل جن کے سینگ بیلوں سے زیادہ ہرنوں کے سینگ سے مشابہ تھے۔ نصف دائرے کا انسانی چہرے والا ڈوبتا ہوا سورج اور اسی طرح بہت سے اور۔ بڈھے گلاب نے بھی آج احتیاط سے رکھی ہوئی نئی وردی نکالی۔ پھٹے ہوئے چمڑے کی پرانی چیز اس پر روغن کیا اور پیتل کی گول مہر کو راکھ سے مانجھ کر چمکا لیا۔ نائی سے آج ہی حجامت بنوائی اور نئے جوتے بھی نکال لئے۔ اس بڑھاپے میں اپنی اکیلی جان کے لئے وہ اس سے زیادہ اور کرتا بھی کیا۔ اور ان ہی لوگوں پر کیا منحصر ہے سارے ہندوستان میں آج دیوالی کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی ہیں بلکہ اس کے باہر بھی جو سینکڑوں ہزاروں کے لئے سودمند اور اس سے کئی گنوں کے لئے ضرر رساں ثابت ہونے والی تھی۔ لیکن در اصل دیوالی ان ہی کی ہے جن پیسے والے ہیں کیونکہ لکشمی پوجا کا ہی دوسرا نام دیوالی ہو۔

انگنے نے پانچ پیسے والا گنیش لکشمی کا جوڑا بھی کل خرید لیا تھا۔ اور اب اس کے پاس ایک روپیہ پونے سات آنے بچے تھے جس میں سو ایک چوتی اس نے اپنی قسمت آزمائی کے لئے نکال لی تھی مگر کون جانتا تھا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ باقی سب دام کھیلیں بتاشے اور مٹھائی کے لئے کافی تھے۔ ان چند گھروں کی مشترکہ چوپال کو سب نے مل کر صاف کیا تھا اور اب وہ گھاس پھوس سے بالکل پاک لیا بنا گویا اس تیوہار کے روایتی کھیل کی شروعات کا منتظر اپنی آنکھیں بچھائے پڑا تھا۔

گجراج مکھیا کے یہاں آج خاصے اہتمام ہیں باہر متعدد دیئے جل رہی تھیں جن پر شکر کے کھلونے، بتاشے کھیلیں اور دیگر بہت سی مٹھائیاں تیار ہو رہی ہیں۔ جو ان کی لڑکی چندا کی سسرال، جس کی شادی گذشتہ جون میں ہوئی تھی، بھیجی جانے والی ہیں۔ چھٹو بھڑبھوجے نے ڈیڑھ من کھیلیں بھیجی تھیں۔ حلوائی تو بیگار یا اتنی کم روزانداری پر پکڑے ہی گئے تھے جو ان کے لئے دیوالی جیسے نفع بخش موقع پر بیگار کے برابر تھی۔ دھنو کمہار مالکانہ میں پانسو چراغ اور کچھ گھڑے دے آیا تھا۔ گاؤں کے آٹھ دس کوری چمار جو بتائی کے کام سے واقف تھے زمیندار نے چار روز سے پکڑ رکھے تھے۔ سارا گھر لوتا جا چکا تھا اب صرف باہر کا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ آج دیوالی ہونے کی وجہ سے کئی راج غیر حاضر تھے۔ مگر پوتائی تو شام سے قبل ختم ہی ہونا تھی۔ اس لئے کچھ لوگ اور بھی کام پر لگائے جانے کی تجویز ہوئی جن میں انگنے کا بھی شمار تھا۔ اور ٹھیک جس وقت وہ اپنا بڑا سا جادر لے بازار جانے کو گھر سے نکل رہا تھا کہ زمیندار کے نوکر نے اسے خبر دی کہ آج اسے مکھیا کے گھر بتائی کرنا ہے۔ بیگا۔! اور وہ بھی عین دیوالی کے روز، جبکہ وہ اپنے بچوں کے لئے مٹھائی اور کھلونے خریدنے جا رہا ہو۔ مگر غریب کرتا ہی کیا۔ بادل ناخواستہ تیار ہو گیا۔ یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تیار ہونا پڑا۔ آج نئے نئے کپڑے پہن کر اسے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بازار کی سجی ہوئی دکانوں کا لطف اٹھانا چاہیئے تھا نہ کہ وہ بتائی کے مخصوص چھینٹے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہن کر بیگار کی تیاریاں کرتا۔ مگر ان معاملوں کو کچھ دیہات کی غریب رعیت ہی بہتر سمجھتی ہے جو اپنے زمینداروں کی نظروں میں ان کے زر خرید کتوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

الغرض ڈیڑھ بجے جب کھانے کی چھٹی پر محنت سے تھک کر چور ہونے کے بعد وہ منہ لٹکائے آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھ رہا تھا تو تصور میں اس نے اپنی بیوی کو غمگین اور مرجھایا ہوا دیکھا۔ بچے دروازے پر اس کے منتظر نظر آئے جو اس کے آتے ہی خوشی سے تالیاں بجا بجا کر اچھلنے لگے۔ "چچا اب مٹھائی لینے کب چلو گے۔ آج تو دیوالی ہے۔ آج بھی کام!"

اور تب اس نے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "بیٹا آج کام پر نہیں گیا تھا۔ مکھیا نے بلوایا تھا۔"

بچے کہتے "کھیا نے! آج ہی! دیوالی کے دن!"

اور پھر وہ کہتا "کاش تم لتنے بڑے ہوتے کہ ان باتوں کو سمجھ سکتے"

مگر ان تصورات سے وہ اس فیصلہ پر تو ضرور پہونچ گیا تھا کہ وہ اب شام کو کام پر نہ جائے گا اور نہ ہی اس سے اس کے لئے کہا گیا ہے۔ اُسے کم از کم اتنی تسلی تو ضرور تھی کہ وہ ہی اس گاؤں میں اکیلا نہیں ہے جو دیوالی کے روز بیگار میں پکڑا گیا ہو۔

گھر پہونچکر اس نے اپنی بیوی کو کچھ رنجیدہ کچھ ناخوش دروازے پر اپنا منتظر پایا۔ بچے چوپال میں کھڑے اسکے آنے کی راہ تک رہے تھے۔ جو اس کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کی قلمی سے سنی ہوئی پتلی پتلی ٹانگوں کے گرد لپٹ گئے اور مچل مچل کر بازار چلنے کو مجبور کرنے لگے۔ بمشکل اُسے نہا کر کھانا کھانے دیا اور جب وہ چلم پینے بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے دائیں بائیں جا بیٹھے، جو اب ہر لمحہ اُس کے اٹھنے کا بیچینی سے انتظار کر رہے تھے۔

سورج ڈھل چکا تھا۔ چوپال میں سایہ آگیا تھا اور اس کے ساتھی فرش بچھانے کا سامان کر رہے تھے کہ وہی صبح والا مکروہ صورت نوکر فرشتہ اجل کی طرح اُس کے دروازے پر نمودار ہوا۔ کہنے لگا "تمہاری چھٹی کھانے کے لئے ہوئی تھی نہ کہ مزے کرنے کی۔ وہ اتنا حصہ اور پوت وو پھر چھٹی ہی چھٹی ہے جو چاہو کرنا۔ اور لوگ کام پر آگئے ہیں۔ چلو مکھیا نے بلایا ہے۔"

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ اُس کی بیوی بول اٹھی "آج ہی کا دن مکھیا کو بھی پتائی کے لئے رہ گیا تھا۔ اب تیوہار کو اپنا گھر چھوڑ کر کون پتائی کرنے جائے۔ صبح کے گئے تو اب لوٹے ہیں، اب بازار ہاٹ بھی کریں گے کہ نہیں۔ بال بچے منہ باندھے ہیں۔ سودا سلف سب ابھی خریدنا ہے۔ مکھیا سے کہدینا کہ اس وقت نہیں آسکیں گے۔"

مرد فطرتاً عورت کے سامنے اپنے کو ذلیل یا کمزور ہونا پسند نہیں کرتا۔ پھر یہ تو خود اسکی اپنی بیوی تھی۔ عورت کے تیز جملے سنکر کچھ اُسے بھی اپنی خودداری کا احساس ہوا۔ کہنے لگا "اگر پتائی کرانا تھی تو پہلے سے بلوایا ہوتا۔ اس کے لئے مجھے انکار ہی کیا تھا مگر اسوقت تو ہم بازار جا رہے ہیں۔"

خود انگنے کی زبانی یہ الفاظ سنکر نوکر کو بھی غصہ آگیا اور وہ زیر لب بڑبڑاتا واپس لوٹ چلا۔ عجلت اور غصہ یہ دو باتیں ہمیشہ کام خراب کر دیتی ہیں۔ انگنے کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا جب اُسنے اپنی اور مکھیا کی شخصیتوں کا باہم مقابلہ کیا اور اس نے فوراً ہی دوڑ کر نوکر کو پکارا جو اب نرنجن تیلی کے دروازے پر پہونچ چکا تھا۔ نوکر رک گیا وہ سمجھا کہ شاید خود ہی سوچ سمجھ کر یہ راہِ راست پر آگیا ہے۔ مگر قریب جا کر انگنے نے نہایت لجاجت آمیز لہجے میں خفت سے سر جھکائے ہوئے کہا "بھیا، گھر کے معاملوں کو تم بھی خوب جانتے ہو۔ تمہارے بھی تو بال بچے ہیں۔ تمیرا صبح سے بازار بازار کی دھن لگائے ہے ابھی تو کھیل کھلونے بھی نہیں لایا۔ سوچتا ہوں اسے بازار بھی دکھ لاؤں اور سامان بھی لیتا آؤں۔ تم مکھیا سے کہدینا کہ جب میں پہونچا اس سے پیشتر ہی وہ بازار جا چکا تھا یا یہ کہ اُسے بڑے زور کا بخار آگیا ہے۔ اچھا میرا بھیا۔ جیسا مناسب سمجھنا کہدینا۔ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔" نوکر بغیر کسی جواب کے واپس چلدیا۔ انگنے نے سمجھا کہ شاید وہ میری بات مان گیا ہے۔

لیکن بڑے لوگوں کے نوکر اپنے کو اکثر انکے برابر نہیں تو ان سے کم بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ ظالم مالک کی روٹیوں سے پل کر انہیں کے بل بوتے پر انہیں کی طرح اپنے ہمجولیوں پر جو اب خود ان کی اپنی نظروں میں نہایت ذلیل اور حقیر ہو جاتے ہیں، اسی طرح ظلم روا رکھتے ہیں جس طرح اُن کے مالک۔ اس طرح سے مکھیا کے ساتھ اسکی اپنی توہین بھی تو ہوئی۔ وہ بلانے جائے اور اُس کی یہ مجال کہ انکار کرتا کیا اب اس کو اس گاؤں میں نہیں رہنا ہے؟۔ مکھیا سے اُس نے سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا جس نے اس سے پیشتر بھلا ایسے جواب کاہے کو سنے تھے۔ دو مضبوط آدمیوں کو اسے زبردستی پکڑ لانیکا حکم دیا گیا۔ ایک ادنیٰ سے چمار کی یہ سرکشی! ہرگز قابلِ عفو نہیں۔

انگنے ابھی اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لئے اُجلے کپڑے پہنے نکڑ پر ہی پہونچا تھا کہ ان دونوں آدمیوں نے اُسے جا لیا۔ خیر اتنی نیکی تو انہوں نے اسکے ساتھ کی بلا تشدد اور جبر کے انسانیت سے اسے مکھیا کے یہاں چلنے کو کہا۔ خوف سے اس کا پتہ پانی ہوگیا وہ سمجھ گیا کہ نوکر نے سارا واقعہ ویسا کا ویسا ہی بیان کر دیا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اور سوائے اس کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا کہ وہ سیدھی طرح سے ان آدمیوں کے ساتھ ہولے۔ چنانچہ بچوں کو کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا کر گھر روانہ کیا اور خود اپنے نصیبے کو کوستا آنے والی مصیبتوں کے اندیشے سے کانپتا مکھیا کی چوپال میں داخل ہوا۔ آگے جو کچھ ہوا وہ بالکل قدرتی تھا۔ مختصراً گھونسوں، لاتوں اور جوتوں سے اس کو خوب پیٹا گیا اور اسکے بعد بقیہ پتائی ختم کرنے کا فرمان صادر ہوا۔ ناچار حسرت سے اپنے کپڑوں کو دیکھتا آنسو پونچھتا سیڑھی پر چڑھا۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو رہا تھا۔ سائے لمحہ بہ لمحہ دراز ہوتے جا رہے تھے۔ بازار میں چہل پہل بڑھنے لگی اور لوگ جوق در جوق دکانوں کی سجاوٹ سے لطف اندوز ہونے گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ مگر غریب انگنے! بیچارے کا بُرا حال تھا۔ دن بھر کی بلا موقع بیگار پھر اُس پر مار۔ اس کا سارا جسم تھکاوٹ سے بالکل نڈھال تھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ ہاتھ پیر بے قابو ہوتے جا رہے تھے پھر دماغ کو منت جُدا۔ قلعی سے پُتی ہوئی دیوار پر، پردۂ تصویر کی طرح اس کو بیتے کل کا سارا حال دکھائی دے رہا تھا۔ چوپال میں ساتھیوں کا ایک دائرہ کی شکل میں جھنڈ لگا ہے جس سے مختلف طرح کی خوشی اور حیرت کی آوازیں نکل رہی ہیں۔ کچھ لوگ بے فکری سے بازار میں گھومتے نظر آتے۔ بچے اپنے ساتھیوں سے کہہ رہے تھے "چچا مٹھائی لینے گئے ہیں۔ ہمارے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاتے ہونگے۔ بیوی بھی شاید یہاں سمجھے بیٹھی تھی۔ انگنے کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ جو کیفیت ایک نو عمر طالب کی مولوی صاحب کے ترچھے کھڑے ڈنڈے کے خوف سے پڑھنے بیٹھ جانے پر ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے ساتھیوں کو مزے سے گیند اُچھالتے، بلے گھماتے، کودتے پھاندتے، میدان کی طرف کھیلنے جاتے دیکھتا ہوتی ہے ٹھیک ہی حالت اُسوقت انگنے کی بھی تھی۔ وہ اسوقت ایک نہایت ہی عظیم ناقابل بیان ذہنی خلجان میں مبتلا تھا۔

ان ہی اُلجھنوں میں پھنسے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ اکڑا ہوا زمین پر سرسری طور سے سیڑھی آگے بڑھائی تاکہ وہ باقی حصہ پوت سکے۔ مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ کچھ حصہ پھر بھی بچ رہا اور اُسے دوبارہ سیڑھی کو اِترا اس کو آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن قدر جھک کر وہ اسکو یہاں سے بھی پوت سکتا تھا۔ لہذا اُس نے ایسا ہی کیا مگر ڈنڈے سے اُس کا پیر ہٹنا تھا کہ سیڑھی کا بھی دایاں بازو اُٹھ گیا اور انگنے ایک زوردار دھماکے کے ساتھ اس طرح کروٹ سے نیچے گرا کہ سیڑھی اسکے اُوپر تھی۔ پسلیوں میں بیلوں کا کھونٹا اس زور سے گھس گیا کہ شاید کئی ٹوٹ بھی گئی ہوں۔ اور گارے کا تسلا تو غریب کی کنپٹی میں تقریباً دو انچ اندر گھس گیا۔ شدتِ درد سے اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بیہوش ہو گیا۔ خون کی دو دھاریں تیزی کے ساتھ زخم کے دونوں سِروں سے بہنے لگیں۔ لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ تسلہ سر سے نکالا۔ سیڑھی ہٹائی، اور اس کو قریب کے تخت پر چت لٹا دیا۔ خون اب اور بھی شدت سے نکل رہا تھا اور وہ کپڑا جو اس کے زخم پر لگا تھا ٹپکنے لگا۔ دفعتاً اس کا نصف بالائی جسم تخت سے ایک جھٹکے کے ساتھ قدرے اُٹھا۔ منہ اور آنکھیں کھل گئیں اور ایک زبردست خون کی قے ہوئی۔ صرف اس قدر اُس کے منہ سے سنا جا سکا: "آہ! کیسی موت آئی"! اور دوسرے لمحہ اس کا جسم سرد پڑ گیا۔ کھلے ہوتے بے نور دیدے بلا حرکت کے آسمان کی طرف تاک رہے تھے گویا وہ اس قادرِ مطلق سے اپنے ظلم کے انصاف کا منتظر ہے جو عرشِ معلیٰ پر بیٹھا ہر شخص کی نیکیوں اور بدیوں کا خاموشی سے جائزہ لیا کرتا ہے۔ اب وہ مر چکا تھا۔ اور ہر شخص اپنی جگہ پر متاسف خاموش کھڑا تھا۔ زمیندار اس کو دوبارہ بردستی بلوانے پر، نوکر اسکی بیجا شکایت کرنے پر، اور باقی لوگ اسکی بے موقع اور عبرت خیز موت پر۔

اس حادثہ کی اطلاع پولیس کو کی گئی اور تھانیدار فوراً ہی موقع پر آموجود ہوا۔ ایک عجیب طرح کی بے تعلقی اور درشتی سے، جو ان لوگوں کے پیشہ سے وابستہ ہوتی ہے، اُس نے زمیندار کے سارے احسانات کو یکقلم نظر انداز کرتے ہوئے لاتعداد سوالات اس سے پوچھ ڈالے اور زمیندار کو اس خطرے سے آگاہ کیا جس میں وہ نادانستہ پھنس چکا تھا۔ مکھیا بھی ایک ہی مردم شناس آدمی تھا۔ سب انسپکٹر کے بدلے ہوئے تیوروں کا مطلب وہ بآسانی سمجھ گیا۔ نہایت اخلاق سے وہ اُسے اپنی بیٹھک میں لے گیا اور جب وہ کچھ دیر بعد باہر نکلے تو دونو کی حالت بدلی ہوئی تھی۔ گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے تھانیدار نے کہا۔ زمیندار صاحب کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے آپ بے فکر رہیں ۔۔۔"

تھانہ پہونچکر اُس نے اس واقعہ کا اندراج روزنامچہ میں اس طرح کیا۔ "آج شام کو ٹھاکر گجراج سنگھ کے یہاں ایک حادثے کی اطلاع پاکر فدوی فوراً موقع پر پہونچا۔ ایک چمار مسمی انگنے چوپال میں پُتائی کرتا ہوا سیڑھی سے گر کر مر گیا۔ سر میں گہرے زخم اور اندرونی چوٹ سے اس کا دم فوراً نکل گیا جس سے اُس کا کوئی بیان نہ لیا جا سکا۔ چشمدید گواہوں سے تحقیقات پر معلوم ہوا کہ مکھیا مذکور نے انگنے کو کام پر بلایا مگر اُس نے آنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ جوا کھیلنے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اُسے مکھیا سے لئے ہوئے قرض کی بنا پر مجبور کیا گیا تو اُس نے زمیندار کو مصیبت میں ڈالنے کی یہ نئی چال نکالی کہ وہ قصداً سیڑھی سے گر کر چوٹ کھائے۔ مگر ایسا کرنے میں اتفاق سے اُسے ضربات شدید آئیں اور وہ موقع واردات پر فوراً ہلاک ہو گیا۔"

لاش اُٹھوا کر اُس کی جھونپڑی میں بھجوا دی گئی اور ساتھ ہی چالاک زمیندار نے ۳۰ روپے بھی اُسکے کفن دفن کے نام سے روانہ کر دئے

حالانکہ غریب کے جنازے پر مشکل سے چھ روپے کا خرچ تھا۔

شام کا دُھندلکا اماوس کی شب تار میں تبدیل ہوچکا تھا ——— عالیشان شہروں سے لیکر بے رونق دیہاتوں تک میں چراغاں ہی چراغاں تھا۔ کہیں آنکھیں خیرہ کرنے والی بجلی کے بلب، کہیں خود بخود جلنے اور بُجھ جانے والے رنگ برنگ کے مختلف شعلوں والے قمقمے۔ کہیں چراغوں کی ترتیبی آطبی آرائش۔ کہیں پر ایک سیدھی قطار جو دُور سے روشنی کا ایک طویل شعلہ سا معلوم پڑتا تھا۔ امیروں کے لڑکے بدیشی آتشبازیاں جلاجلا کر غیر ملکیوں کو لکشمی پوجا کا نادر موقع پیش کر رہے تھے۔ کیا ایسے وقت کبھی کسی نے سر اُٹھا کر یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارہ کی کہ ان لاکھوں کروڑوں چراغوں سے پیدا شدہ کتنا زہر دست دُھواں انکے سروں پر منڈلا رہا ہے کس قدر کثیف اور مُہلک۔ انگنے کی بیوی نہیں، نہیں بیوہ نے اپنے شوہر کی لاش پر بیہوشی میں ایک آہ بھری اور ان دھوئیں کے بادلوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ گاؤں میں ہر طرف خوشیاں منائی جارہی تھیں او۔ ہر جگہ روشنی ہورہی تھی مگر افسوس انگنے کی جھونپڑی میں دیوالی کا کوئی چراغ روشن نہ تھا۔ بجز اسکے جو ایک بڑے طاق میں رکھا اپنی کمزور اور زرد کانپتی ہوئی لو سے اندھیرے پر غالب آنے کی جدوجہد کر رہا تھا جس سے اندھیرے اور اجیالے کے اشتراک سے ایک عجیب یاس انگیز دھیمی دھیمی مٹیالی روشنی پیدا ہوگئی تھی۔ جس میں لاش کے بے رونق چہرے پر انتہائی حسرت اور مظلومیت۔ بیوہ کی رقت خیز حالت لڑکی کے نہ تھمنے والے آنسو اور بچے کا اپنے باپ کے اُٹھ بیٹھنے کا بےچینی سے انتظار کچھ نہایت ہی پُردرد طریقے پر نظر آرہے تھے۔

تو کیا ہم اسی کو دیوالی کا چراغ کہہ سکتے ہیں؟ ———

شاید نہیں!

کرشن چندر سکسینہ

پاگل

جارہا ہے بڑبڑاتا، رقص کرتا بے ہراس
اک جنونی، بے شعور، آوارہ سر، خبط الحواس
کررہی ہیں دیر سے مبہم اشارے انگلیاں
باندھ رکھی ہیں کمر سے کس کے سن کی رسّیاں
جارہا ہے یوں نفورِ عقل و دانش کا شکار
جس طرح وحشی بگولا تند جھونکوں پر سوار
گریہ اس کا جیسے گیدڑ نصف شب کو چیخ اُٹھیں
قہقہہ جس طرح اولے ٹین کی چھت پر پڑیں
ایک لمحہ کم نہیں ہوتا ہے چلانے کا زور
رات کو جیسے سمندر سے اُٹھے مہمل سا شور
یہ پروں کی سر پہ ٹوپی ہے کہ تاجِ زرنگار
رعب اتنا جیسے اک معزول شوکت شہریار
ہورہی ہے چیتھڑوں سے اسکے یہ رمز آشکار
چشم بینا میں لباسِ زندگی ہے تار تار
پوٹلی میں جمع کچھ کوڑا ہے اور کچھ خاک ہے
جس سے ظاہر ہے کہ دامان جہاں ناپاک ہے
پُرزے پُرزے کر رہا ہے چند اوراقِ کتاب
جس کا مطلب ہے کہ مہلک ہے تمدن کا شباب
پٹیاں لپٹی ہوئی ہیں اس حقیقت کا نشاں
کاٹ دو جکڑے ہوئے ہیں روح کو جو رسّیاں
صاف ہے تقریرِ بے معنی سے پیدا یہ سوال
حورِ آزادی کا کیا ممکن ہے باتوں سے وصال؟!
سُرخ دھبے جسم پر غمّاز ہیں اس راز کے
جسم انسانی نہیں لہو و لعب کے واسطے
سر پٹک کر کہہ رہا ہے یہ بھیانک استان
ضرب سر سے توڑ دو سنگیں قفس کی تیلیاں
اس کا ہر فعل ایک نکتہ، ہر اشارہ کیمیا
دیکھنے میں ایک پاگل اصل میں راز آشنا
کس قدر چھائی ہوئی ہے روح پر بے چارگی
ہر قدم پر دے رہا ہے دعوتِ آوارگی

مخمور جالندھری

دیش بھگت

شام ہو چکی تھی۔ میں چھوٹے بھائی کو چٹھی لکھ رہا تھا کہ اتنے میں چچا اندر داخل ہوئے، بغیر کسی تمہید کے بولے "سنو! آج ذرا خاص کام ہے۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا!"

"خاص کام" والے الفاظ سنکر میں نے سرہانے سے صفا جنگ[1] اٹھائی اور اسے فرش پر ٹیک اٹھ کھڑا ہوا۔

"مسلمانوں کا محلہ ہے.... میاں لوگوں کا، سمجھے؟.... اور پھر روپے کا معاملہ[2]...!"

میری ان سے کوئی رشتہ داری نہ تھی، بس ہمارے گاؤں کے رہنے والے تھے، والد صاحب سے بھی کچھ دعا سلام تھی۔ مجھ پر مہربان تھے اور قدرے بے تکلف بھی۔ میری عمر تقریباً بائیس برس کی تھی، قد ذرا نکلتا ہوا، چوڑا سینہ، سڈول بازو، مضبوط ہاتھ پاؤں، باوجود چار مرتبہ کوشش کرنے کے بھی ایف۔ اے۔ پاس کر پایا تھا۔ چچا کا میانہ قد، گندمی رنگ، کھچڑی ڈاڑھی، دبلے پتلے مگر سخت ہڈی کے تقریباً پینتالیس سالہ بزرگ۔ انہیں پنجاب چھوڑے تین سال ہو چکے تھے۔ اس جگہ ان کا ایک اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ تھوڑا بہت ٹھیکیداری کا کام بھی مل جاتا تھا۔

غبار اور دھند کے گہرے کفن نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا بازاروں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یکہ والوں کے آوازے اُن کی گالیاں، اور قوالیاں ــــ دور دھندلکے میں مسجد کے قریب، کسی گھر کی چھت پر سفید سفید کبوتروں کی ٹکڑیاں ہوا میں پرواز کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم گھنٹہ کے قریب سے ہو کر بیگم سرائے کی طرف چل کھڑے ہوئے نکڑ پر بادشاہ خاں پٹھان کی چائے کی دکان تھی، اس جگہ سود خوار پٹھانوں کا اجتماع ہوتا تھا، بیٹھے چائے پیتے، یا قہوہ اڑاتے، دو تین بے بال و پر، گل رخ چھوکرے، آگ جلانے، پیالیاں دھونے، چائے بنانے اور پھر گاہکوں کے ساتھ ہنس ہنسکر باتیں کرنے کے فرائض انجام دیا کرتے تھے اور کبھی ریکارڈ بجتے ــ

لڑام دے لڑام
وہ مورے را دوکا لڑام دے لڑام

کبھی کوئی خان اپنی شلوار اوپر چڑھا، ٹانگیں رانوں تک ننگی کر، کسی ہندوستانی موچی سے جھگڑنے لگتا۔ اور کہتا:۔

"آمرا کابل میں چپل ادتا، تمرا دیس میں چپلی"

یا پھر پہلو والی "گرم گرم قلیہ پراٹھا" کی دکان پر شاہ صاحب ایک بزرگ سبز پوش، ڈاڑھی مہندی سے سرخ کئے آن بیٹھتے۔ آنکھیں جلالِ معرفت کے مارے خونِ کبوتر، چہرہ کندن کی طرح تاباں، زلفیں چکنی چپڑی اور عطر بیز.... انکے تشریف آور ہوتے عقیدتمندوں کے غول کے غول جمع ہونا شروع ہو جاتے، مجھو (منظور) شہر کے بے تاج بادشاہ، چھبن رنگ ساز، قمر جلد ساز، اور للو مالک،ــ

"جانے کہاں ہو کس طرف خیال ہے
گھڑیوں کا بس یہی اسپتال ہے"

وغیرہ جیسی ہستیاں آن اکٹھی ہوتیں، گراموفون کو چابی دیکر ملکہ عالم کا ریکارڈ چڑھا دیا جاتا، اور سب لوگ تالیوں کے ساتھ "اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو" گانے لگتے۔

اس طرف پیسہ اخبار والا چلاتا "ہٹلر کی پیش قدمی،ــ برطانیہ کا دنداں شکن جواب.... جاپان کی برطانیہ کو گیدڑ بھبکی۔ ... ایک پیسہ میں"

یہ سنکر وہ بزرگ سبز پوش سر کو زور کے ساتھ گردش دیکر نعرہ لگاتے "یا علی" اور پھر وہی "اللہ ہو، اللہ ہو"

ادھر یہ ہنگامہ تو ادھر کھجلی کے مارے ہوئے کتے شامی کبابوں کی بو پاکر تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر ہوا میں سونگھا کرتے اور کبھی موقع پاکر کچھ نہ کچھ لے بھی اڑتے تھے۔

کچھ دور جانے کے بعد چچا ہنگی پنواڑن کی دکان کے آگے جا کر رک گئے۔ ہنگی کی عمر بتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بدن کی بھاری، گورا رنگ، ناز و ادا کی کمی نہ تھی، بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشہ کاجل، ہونٹوں پر مستی کی دھڑی۔ پان کا بیڑا بڑھاتی تو اپنی نشیلی اور کٹیلی آنکھیں پہلے تو گاہک کی آنکھوں سے لڑا دیتی، تب شرما کر اور مسکرا کر نظریں جھکا لیتی، اور پنڈلیوں کو دھوتی سے

---

[1] ایک قسم کی کلہاڑی، سکھوں کا ایک ہتھیار۔ [2] یہ ان کا بہت فرسودہ اور بے معنی بہانہ تھا۔

ڈھانپ کر اپنی چاندی کی پازیبوں پر نظریں گاڑ دیتی۔

میلے کچیلے چیتھڑے پہننے والے مزدور، ڈاکخانہ کے قریب بیٹھنے والے خطوط نویس منشی یا ہوٹلوں کے گاہک نشہ کی ترنگ میں آتے اور اُسے دیکھ کر مچل جاتے۔ اپنی اندر دھنسی ہوئی مخمور آنکھوں سے اُسے دیکھتے۔ کبھی اتنا کہنے لگتے: "ہائے ری آج تو غضب کا بناؤ سنگار کر رکھا ہے۔" کبھی کسی کجری کا بول از قسم:

"گھر سے نکسی سند بہو جیا
جُلم دو نوں جوڑی ہے، سانوریا!"

اور کبھی پان لیتے وقت اُس کی ہتھیلی کو اپنی اُنگلی سے کھجا دینے کی تمنا میں ایک پیسہ کے پان اور ایک پیسے کی چار والی برکی مارکہ سگریٹ خرید لیتے تھے۔

چچا کو دیکھتے ہی اُس نے جھک کر سلام کیا: "اے پنجابی بابو! کون دیس رہت ہو آپ؟"

"ہنگی بس کیا پوچھو ہو، تم تو ہمن کو بھولت نا نہہ۔"

ہنگی سر پر آنچل کھینچ سنبھل کر ہو بیٹھی اور پان لگاتے ہوئے کہنے لگی: "اور وہ ہمرے لئے تم چُندری لان کو کہت رہے؟"

چچا سُنی اَن سُنی کر کے اس کے لال لال گالوں کی طرف للچائی ہوئی نظر سے تاکتے ہوئے بولے: "اب لاؤ، دیوگی بھی، نہیں!"

ہنگی کچھ لجا گئی، اور ملامت آمیز نظروں سے چچا کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے میں اور گاہک بھی آ گئے۔ میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بائیں طرف برآمدے میں ایک بڑھیا کسی چالاک لومڑی کی طرح سب کو تاڑ رہی تھی، اس کے قریب ہی ٹاٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی جس میں سوائے اسکے کہ جوان تھی اور کوئی خوبی نہ تھی۔ نوجوان عورت نے مجمع کے آدمیوں کو اپنی طرف چھپی نظروں سے دیکھتے ہوئے پایا تو جھٹ سے قمیص کے بٹن کھول، گریبان الٹ الٹ کر لالٹین کی روشنی میں کھٹمل پکڑنے لگی۔ اور گاہے گاہے سارڑھی ہٹا کر اپنی ٹانگیں کھجانے لگتی۔

کچی اور سیاہ دیواروں پر پان کی پیک کے نشانات ایسے دکھائی دیتے تھے، جیسے بھوت ناچ رہے ہوں۔ کمرے کے اندر جاپانی عورتوں کی نیم عریاں، پھٹی پرانی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف کھاٹ پر بستر بچھا ہوا تھا، اور اسکے پاس ہی فرش پر ایک مٹیالے رنگ کا اُگالدان بھی پڑا تھا۔

ایک مرد نے نوجوان عورت کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کچھ پوچھا، تو بڑھیا نے تاریکی میں آگے جھک کر حلق میں سے آواز نکالتے ہوئے آہستہ سے کہا: "آٹھ آنے۔" اور پھر پُر حسرت آنکھوں سے اسکی طرف دیکھنے لگی۔

تاریک اور پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتے ہوتے ہم چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی گلی کے نکڑ پر سرکاری لیمپ کی دُھندلی روشنی پر صفاجنگ کی چمک اور میری گھیر دار شلوار سے خائف ہو کر بچے گھروں میں گھس کر کواڑ بند کر لیتے تھے۔

کمہاروں کے محلے کے قریب پہونچکر چچا گندے نالے کی طرف چل دئے۔ راستہ گھوڑوں اور گدھوں کی لید سے اٹا پڑا تھا، چھپروں والے ٹوٹے پھوٹے کچے مکانات تھے، کمہاروں کی بھاری بھرکم عورتیں کچے چبوتروں پر لیٹی، روتے ہوئے ننھے بچوں کو دودھ پلا کر چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گندے نالے کے پُل پر سے گُذرتے وقت میں نے ناک پگڑی کے شملے سے ڈھانپ لی۔ اس کے بعد ہم بڑے تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ یہاں شہر بھر کی گندگی جمع تھی، لوگ ٹٹی بھی یہیں پھرتے تھے۔ جب وہ اُٹھکر چلے جاتے تو بھنگیوں کے محلہ سے سُور آ کر منہ مارنے لگتے۔ کہیں کہیں کتے دم توڑتے نظر آتے تھے۔ کہیں کسی گدھے کا پنجر پڑا تھا اور کسی طرف گھوڑے کے جبڑے کے پاس کوئی گدھ مرا پڑا تھا۔ یہ کچا تالاب بہت بڑا تھا۔ اس کے اندر کئی انسانوں اور جانوروں کا پیشاب اور غلاظت جمع تھی۔ اس کا پانی بہت گاڑھا، از حد بدبودار اور سیاہ رنگ کا تھا۔ چاند کی چاندنی اس کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔ اس کی سطح پر ابھرے ہوئے بلبلے اس طرح دکھائی دیتے تھے۔ جیسے کسی شخص کے جسم پر آتشک کے زخم۔

یہاں سے گذر کر بہت دیر تک ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر کار چچا ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے آگے رکے اور آوازیں دینے لگے: "مجید! او مجیدے!!"

میں نے کہا: "چچا آپ نے فضول میں اتنا بڑا چکر لگایا، یہ گلی وہی نہیں جو اسٹیشن سے آنے والی سڑک سے جا ملتی ہے؟"

چچا دیدے چمکا کر بولے: "ارے میاں! اُدھر جاتے تو بھلا یہ سیر کیسے ہوتی، بس تم تو بھوند وہی رہے۔ ... ہی ہی اُدھر کیا رکھا تھا... ہی ہی... ابے او مجیدے او!"

"ہجور گلام تو ادھر کھڑا ہے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا، چوڑے شانوں والا مرد جھکا فرشی سلام کر رہا ہے۔ باوجود سردی کے ایک میلا کچیلا تہبند کمر سے لپیٹے ہوئے تھا۔ اور جسم پر صرف ایک چادر۔

"آئیے آئیے آکا! اندر چلے آئیے۔"

یہ کہکر اس نے ٹاٹ کا گلا سڑا پردہ اُٹھایا۔ اور ہم اندر داخل ہوگئے۔

"کرّان کسم (بہن کی گالی دیکر) سالوں نے جینا مسکل کر دیا ہے۔ یا پولس بھی بس کھدا کی پناہ ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے چھوٹے سے صحن کے کونے میں ایک پاخانہ، پاس ہی لکڑیوں کا انبار، گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواروں پر اُپلے، ایک طرف کھٹملوں سے بھرپور ٹوٹی ہوئی کھاٹ، اُدھر چولھے کے قریب مٹی کے تیل کی کپی، اس کی چھوٹی سی لَو بےپناہ تاریکی سے جنگ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ چولھے کے قریب ایک بڑھیا اینٹ پر بیٹھی ایک باسی روٹی توڑ توڑ کر کھا رہی تھی، ہاتھ میں پیاز اور فرش پر چٹنی کا پتہ۔

مجید چچا کو بتا رہا تھا کہ کیسے اُن کے محلے میں کسی نے ایک ہندو پر لاٹھی چلا دی جس سے اُس کا سر تو بچ گیا مگر ایک کان صاف اُڑ گیا۔ اور کسی طرح وہ چیختا چلاتا محلہ کے ناکے کی طرف بھاگا، اور پھر ناکے کے صحن میں بیہوش ہوکر گر پڑا تھا۔ اور کیسے پولیس اُس کو (مجید کو) ناحق دو گھنٹہ سے کوتوالی میں بٹھائے دق کر رہی تھی، اور اب کہیں جاکر اس کی خلاصی ہوئی تھی۔ چچا یہ باتیں سُنکر کچھ پریشان ہوگئے۔

مجید چولھے کی طرف گیا، پتہ میں سے انگلی پر چٹنی لگا کر چاٹی، اور چٹخارہ لیکر بولا: "کا ہے کی ہے؟"

"پیاج کی۔"

پھر وہ چھت سے لٹکی ہوئی ہنڈیا میں ڈال کر ٹٹولنے لگا "نانیا کو کاں ہے؟"

پوپلے مُنہ والی بڑھیا بولی: "بوتیے کے پیچھے۔"

مجید حقہ پینے لگا۔ چچا کی جانب دیکھکر بڑھیا کی طرف ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے بولا: "ماں ہے میری۔"

اتنے میں پردہ اُٹھا۔ ایک کالے کلوٹے مرد نے اندر جھانک کر دیکھا: "کوہی مجید کھاں! پولیس میں کا ہُوا؟"

چچا اُس کی صورت دیکھکر گھبرا گئے، اس کا سر اُسترے سے مُنڈا ہوا، یہ موٹی گردن، لٹکے ہوئے کان، چوڑے نتھنے۔۔۔۔

چچا نے میرا ہاتھ دبایا۔

"بتلائیں گے۔" یہ کہکر مجید اٹھا اور اُس کے پاس جاکر کانا پھوسی کرنے لگا، خیر وہ شخص تو چلا گیا اور مجید پھر آکر حقہ گڑگڑانے لگا۔

چچا نے پیشانی سے پسینہ پونچھا، کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے: "اچھا بھئی مجید اب کچھ معاملہ کی بات ہونی چاہیئے۔"

"ہاں ہاں" مجید نے سر گھما کر کہا۔ پھر بڑھیا کی طرف جھکا۔ "کیوں ماں! (آنکھ مار کر) بکھائے گئی کیا؟"

بڑھیا نے دبی زبان میں کچھ جواب دیا۔

"دھت تری کی ماں! تو بھی عجب لول جلول ہے۔"

اس نے حقہ رکھدیا اور "ابھی آیا" کہکر جانے لگا۔

چچا گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے: "مجید! ہم باہر سڑک پر کھڑے ہوتے ہیں، تم اسے اُدھر ہی لے آنا۔"

"کسم اللہ پاک کی، پنجابی بابو جدھر حکم ہو لے آؤں۔"

"اچھا تو ہم سڑک پر کھڑے ہیں۔"

یہ کہکر چچا بھاگم بھاگ سڑک پر آکھڑے ہوئے۔ اور اسٹیشن سے آتے یکّوں کو دیکھنے لگے۔

***

چچا، مجید، ایک نوجوان لڑکی، بڑھیا اور میں، کُل پانچ اشخاص ایک تواریخی باغ کی چار دیواری کے پاس کھڑے تھے۔

مجید نے کچھ طویل بیان شروع کر رکھا تھا، اور لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے چچا سے کہہ رہا تھا: "۔۔۔۔ روج پوجا کرن جات رہی۔۔۔ میں نے سمجھایا، بگلی پوجا سے کا ملی؟ چل پنجابی سنگ سادی کرا دینگا بس پنجاب ولیس جا، گہنا کپڑا پہن، کھانا پینا مجا اڑانا۔۔۔۔ بس لیسی ڈھیل میں پھنس کر لایا ہوں، پنجابی سردار! لونڈیا کا ہے ہیرا سمجھو۔۔ گریب ہیں کو یلوں میں رکھا۔۔۔ تمرے پاس جاکر چمک بڑھوا ہی کرے گی۔"

لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ یا چودہ برس کی ہوگی۔ گندمی رنگ، ناک چوڑی، ہونٹ جیسے سنگترے کی پھانکیں، بڑی بڑی زرد آنکھیں، بال خشک بدبودار، ہاتھوں اور کلائیوں پر نسیل، دبلی پتلی، سہمی ہوئی کبوتری کی طرح ایک میلی سی پھولدار چادر اوڑھے کھڑی تھی۔

چچا لڑکی کو لیکر چند قدم آگے نیم کے ایک درخت کے نیچے

جا کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر خاموشی سی طاری رہی، پھر چچا کی دبی دبی باتوں کی آواز آنے لگی "..... کیا نام؟ .... بتاؤ نا! .... ایسے بتاؤ .... ہوں؟ کیا کہا؟ اچھا ... اچھا۔ واہ! خوب نام ہے ..... ہاں! ہاں!! سردی لگتی ہے؟ ہاں لگتی ہوگی ... بولو نا! تم تو کچھ بھی نہیں کہتیں .... مُنہ کیوں چھپاتی ہو .... ارے رے روتی ہو؟ .... اچھا جانے دو .... روتی کیوں ہو .... لو نہ سہی .... او ... اوہ ... اوہو ... ارے نہیں ....."

"تم کاکرت ہو، چھوٹے ٹیچاپی؟" مجید نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"پڑھتا ہوں"

"پڑھت ہو؟ ... ہو ہو ہو ... ہی ہی ... بابو ہو جاؤ گے"

چچا اور لڑکی واپس آ گئے۔

مجید نے مجسّم سوال بن کر چچا کی طرف دیکھا۔ چچا بولے۔

"ابھی جھینپتی ہے ..."

مجید نے لڑکی کی ٹھوڑی اٹھا کر کہا: "اری چھرماتی کیوں ہے، سونے کے کنگن ملیں گے ... چندریا ملے گی ..."

لڑکی نے زرد زرد آنکھوں سے مجید کی طرف دیکھا ... اور پھر لمبی اور گہری سسکی بھر کر خاموش ہو گئی۔

بڑھیا اور لڑکی کو واپس گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا، اور ہم تینوں تاڑی خانہ پہونچے۔

یہ چچا کے رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہمیں تین لوہے کی کرسیاں اور تین ٹانگ کی ایک میز مل گئی۔

تاڑی کی بُو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے جہاں دیوار پر ایک "گندی بیماریوں کا شرطیہ علاج" نمایاں حروف میں رقم تھا ایک چاٹ والے کی دُکان تھی۔ مزدور لوگ تاڑی کے نشہ میں مست وہاں بینگن کے پکوڑے دہی ڈلوا ڈلوا کر کھا رہے تھے۔ دیوار کے سایہ میں ایک گونگی بھکارن بیٹھی تھی۔ اس کی صورت مکروہ تھی۔ اور جسم پر ٹاٹ کے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے، جب کوئی شخص دہی آلود پتہ نالی کی طرف پھینکتا تو دُبلے پتلے کتوں اور اس گونگی بھکارن کے درمیان پتہ حاصل کرنے کی کشمکش مزدور لوگوں کی مسرت کا سامان بہم پہونچاتی تھی، وہ خوش ہوتے تھے کہ دُنیا میں کسی کی بے بضاعتی پر وہ ہنس سکتے ہیں، وہ وحشیانہ انداز سے دانت نکال نکال کر قہقہے لگاتے اور اُچھل اُچھل کر اپنے چوتڑ پیٹتے تھے۔

مجید دو آبخوروں میں تاڑی اور ایک مٹی کی چینی میں کُھنی ہوئی کلیجی لایا۔ تاڑی فروش نے ایک صراحی تاڑی سے بھر کر ہمارے سامنے رکھدی۔ اب دونوں تاڑی پینے لگے۔

لالٹین کی دُھندلی روشنی میں عجب عجب لوگ نظر آ رہے تھے، نشہ میں چُور واہی تباہی بک رہے تھے، کہیں لوٹے ہوئے آبخورے کہیں کوئی چھوڑی ہوئی ہڈی پڑی تھی ــــ اور کسی طرف کوئی کتا نشہ میں بیہوش شرابی کا مُنہ چاٹ رہا تھا۔

چچا نے دوبارہ آبخورہ بھر کر کہا "لیکن اسکی ٹانگیں بہت پتلی ہیں ... کمزور ہے بیچاری ..."

"ابی عمر ہی کا ہے"

بہت دیر تک دونوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی۔ پھر مجید بلند آواز میں بول اُٹھا: "ارے یا بی حاجر ... اور حکم کے گلام ہیں ... وہ وہ مٹھائی کھلاؤنگا جو ایک بار کی یاد کبھی کر دیم"

"مگر جو بات ہم نے کہی وہ کھونا نہیں"

"ارے نہیں صاب! جب کہو تبی ہو جائے جسن .... پھکر کا ہے"

اتنے میں ہم ایک شرابی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا: "ارے کوئی ہمری بھی سنو۔ دیکھو یہ لونڈا ....."

"اماں جا" ایک اور بھاری بھرکم پہلوان نے اُس کی پیٹھ پر دھول جما کر کہا .... اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں تاڑی سے لبریز آبخورہ لیکر اُٹھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ــــ اُس نے چھلکتا ہوا آبخورہ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا: "میں دیپ اُر ہوں ... دیپ داس! ... (زور سے کھانس کر) دُکھ کے ... دُکھ کے ... ہا ... ہا!! دُکھ کے اب دن ....."

اتنے میں تائی کا لونڈا پہلے شرابی سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا ــــ پہلوان نے زور کی لات اُس شخص کے رسید کی: "ابے او ... آ ... اِدھر آ .. چلا آ ... ہاں بیٹے ... ہاں، توبہ کر ... ہاتھ جوڑ ... دُعا مانگ۔ دیکھ جیسے میں مانگتا ہوں۔

"یا الٰہی اُسے لگائی .... اور آو عوعو عو وو"

معاً اس کا تہبند کھل کر زمین پر آ رہا، اس کے مُنہ سے قے کا فوارہ نکل پڑا ... اور اس کی استرے سے مُنڈی ہوئی ٹانگوں پر قے کا مینہ برس گیا۔

تین چار دن کے بعد — میں سنیما دیکھنے کے بعد دس بجے کے قریب گھر جا رہا تھا، سوچا، چلو تھوڑی دیر چچا سے گپ رہے۔

چچا ایک بھوجنالیہ میں سب سے اُوپر کی منزل پر ایک کمرہ میں رہتے تھے۔

اوپر پہونچا۔ مگر دروازے کے پاس جا کر میں ٹھٹک گیا اندر سے کچھ باتوں کی بھنک سُنائی دے رہی تھی۔

میں نے چُپکے سے درار میں سے جھانکا، دیکھا کہ وہی لڑکی کھڑی تھی۔ چچا اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، مجید نے آگے جُھک کر کہا: دیکھ تُو ت حرمجدگی کرے گی تو حلال کر کے پھینک دونگا۔۔۔۔

لڑکی نے انتہائی کرب کی حالت میں تڑپ کر خود کو آزاد کیا اور دروازے کی طرف لپکی۔ وہ چلانا چاہتی تھی مگر مارے دہشت کے اسکے مُنہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ چچا بڑے جوش وخروش کے ساتھ جھپٹے، انہوں نے اسکو دبوچا، اور پلنگ پر پٹخ دیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی نے جدوجہد بند کر دی۔۔۔۔۔

مجید نہایت اطمینان کے ساتھ گورونانک صاحب کی تصوٗیر کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اور تصویر کو احترام کی نظروں سے دیکھنے میں مگن تھا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اسٹیشن کے بُک اسٹال سے چل کر کوئی رسالہ وغیرہ خریدا جائے۔

جب بھوجنالیہ کے قریب پہونچا تو دیکھا کہ چچا سیڑھیوں پر سے اُتر رہے ہیں۔ مجھے اشارے سے بُلایا اور پوچھنے لگے کہ بھائی اتنے دن کہاں رہے، دکھائی نہیں دئے۔

سیڑھیوں کے پاس ہی پنڈت جی کی دُکان تھی۔ پنڈت جی پان بھی بناتے اور لسی بھی بیچتے تھے۔ چچا کو دیکھتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھ (کہنیوں تک) جوڑ کر کہا: "جے واہگورو جی کی"

"کہیے پنڈت جی، چت پرسن ہے نا؟"

چچا اس وقت اکالیوں والی پگڑی باندھے تھے۔ کھدر کا لمبا کُرتا، گلے میں پیلی رنگ کی صافی اور پھر کرپان۔۔۔۔

"سردار جی آج تو بہت دیر سے اُترے" پنڈت جی نے سوال کیا۔

چچا نے نہایت متانت سے سر جُھکا کر جواب دیا: "پنڈت جی! آج سکھ منی صاحب کا پاٹھ کرتے ہوتے دیر ہوگئی۔"

اتنے میں کچھ اور لوگ بھی آگئے، چچا اور پنڈت جی دونوں نے ایک بھکارن کو دھتکارا۔ پنڈت جی بولے "مایہ کر مایہ کر۔۔۔۔ حرامجادی۔۔۔ نکھرے مت دکھا۔۔۔ بہت دیکھے"

عورت ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ پنڈت جی نے مونچھوں کو ہٹا کر گنگا جل کی لُٹیا مُنہ سے لگالی۔ اور پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولے "جب پھدگانیوں نے بھارت ورش پر حملہ کیا تو یہی لوگ تھے جنہوں نے ان کا مکابلہ کیا، ابلاؤں کی رکشا کی۔ بہت پرا پکاری لوگ ہیں یہ"

چچا نے اپنے دُبلے پتلے کمزور کاندھوں کو حرکت دی۔ اور پھر اپنی نو انچ تلوار کو سنبھالتے ہوئے بولے: "پیڑے ہیں پنڈت جی؟ دو گلاس لسی۔۔۔۔"

"چچا میں تو لسی پی کر آرہا ہوں، مجھے اجازت دیجئے" میں نے کہا۔

اسٹیشن پر جا کر دیکھا تو اس قدر بھیڑ تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پلیٹ فارم تک پہونچنا ناممکن ہوگیا۔ لہذا باہر سے ہی تماشہ دیکھتا رہا، اتنے میں ایک شخص نے بلند آواز میں نعرہ لگایا: "بولو راشٹر پتی پنڈت جواہر لال کی جے!"

ساری مخلوق نے گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا: "راشٹر پتی جواہر لال کی جے! مہاتما گاندھی کی جے!! بھارت ماتا کی جے!!!"

اور جب جواہر لال جی بگھی پر آکر بیٹھ گئے۔ تو اتنے میں چچا ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار لئے نمودار ہوئے۔ انہوں نے متعدد بار پرنام کرنے کے بعد ہار پنڈت جی کے گلے میں پہنا دیا۔

"مجید کہاں" بھی کھدر کا کرتا پہنے کانگرسی رضاکار کی حیثیت سے اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

یکایک ہٹو، بچو، بڑھو، جے رام جی کی، رام رام، راشٹر پتی ہاں ہاں، نہیں نہیں کا شور بلند ہوا۔ اور جلوس شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ سب لوگ حُبِ قومی کے جوش میں نہایت عقیدتمندانہ انداز سے گا رہے تھے ؎

جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا
جھنڈا۔۔۔۔۔۔۔۔

چچا کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔

جب جلوس مجید کے محلّہ کے پاس پہونچا تو سڑک کے کنارے بھیڑ میں مجھے وہی میلی کچیلی لڑکی دکھائی دی۔ وہ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِن جھنڈا اونچا رکھنے والوں کو دیکھ رہی تھی، وہی گرد آلودہ بال، سہمی ہوئی بے زبان صورت، زرد زرد آنکھیں۔

معاً گلی میں سے ایک کتّا نکلا اور مجید کو دیکھکر بے طرح بھونکنے لگا۔ وہ بھاگ کر بھیڑ میں گھس گیا۔

ایک ہوا کے جھونکے سے اس کوچے کی خاک اُڑی اور چچا کی چکنی ڈاڑھی گرد سے اَٹ گئی۔

بلونت سنگھ

کلامِ فرحت

ایک دل اور اس قدر دلداریاں
حُسن کی اللہ رے شیریں کاریاں

گھٹ نہ پائیں جب مری لاچاریاں
بڑھ گئیں اُن کی غریب آزاریاں

کیوں نہ بھڑکیں شوق کی چنگاریاں
دل کو فرصت، غم کی شیریں کاریاں

ایک دل اور سینکڑوں بیماریاں
کس کی کس کی کیجئے غمخواریاں

ہم کو جو غم دیجئے منظور ہے
بڑھ نہ جائیں آپ کی دشواریاں

موت دیکر "قُم باذنی" کا ہو وِرد
کون سمجھے حُسن کی پرکاریاں

خوابگاہِ ناز میں، بے لبِ نیاز
حُسن کی اللہ رے بیداریاں

ظُلم خود ہم پر ہوں ہم دیکھا کریں
ہائے رے مجبوریاں، لاچاریاں

خود کو بُھولا ہوں تو اک تیرے لئے
بیخودی میں ہیں عجب خودداریاں

خود پیئے اور درسِ توبہ ہم کو دے
کوئی دیکھے شیخ کی مکّاریاں

اپنے کُشتوں کو لئے ہیں دوش دوش
اہلِ دُنیا کی یہ دُنیاداریاں

آج توبہ کل ہیں بادہ مستیاں
ہائے رے معذوریاں لاچاریاں

مُفلسی میں بھی سیہ مستی وہی
دیکھ لیں فرحت کی بھی ناداریاں

فرحت کانپوری

گجراتی افسانہ

پوسٹ آفس

پچھلی رات کی مدھم روشنی چھوٹے چھوٹے ستاروں سے اس طرح چمک رہی تھی جیسے زندگی میں گزرے دنوں کی خوشگوار یادیں چمکتی رہتی ہیں۔ جاڑے کی برف کی طرح ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے بچنے کے لئے اپنے جسم پر ایک پھٹے پرانے انگرکھے کو اچھی طرح لپیٹے، ایک بڈھا شہر کے درمیانی حصے سے ہو کر جا رہا تھا۔ آزاد زندگی بسر کرنے والے کتنے ہی گھروں سے گھنٹیوں کی خوشگوار آواز، عورتوں کی دھیمی آواز سے مل کر اس طرح بوڑھے کے ساتھ ساتھ آ رہی تھی جیسے اُس کی مددگار ہو۔ کتوں کی آواز دُور سے سُنائی دیتی ہوئی جلدی جلدی اُٹھنے والے قدموں کی آواز، یا کسی بے وقت جاگے ہوئے پرندے کی آواز ہی سُنائی دے رہی تھی۔ اس کے سوا شہر میں بالکل سناٹا تھا۔ لوگ میٹھی نیند سو رہے تھے اور سردی سے رات اور بھی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ مُنہ پر رام رام اور بغل میں چھری، والے انسان کی طرح جاڑے کی سرد رات اپنے دھوکے کو پھیلا رہی تھی۔ بوڑھا کانپتا ہوا، اطمینان سے قدم بڑھاتا ہوا، شہر کے دروازے سے باہر ہو کر ایک سیدھی سڑک پر آ پہونچا اور آہستہ آہستہ اپنی لکڑی کے سہارے آگے بڑھا۔

ایک طرف درختوں کی قطار تھی اور دوسری طرف شہر کا باغیچہ۔ یہاں سردی زیادہ تھی اور رات اور بھی خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور ستاروں کی میٹھی دھیمی روشنی زمین پر برف کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ باغیچے کے سرے پر ایک بالکل نئے ڈھنگ کا رونق دار مکان بنا ہوا تھا۔ اُسکی بند کھڑکیوں اور دروازوں سے چراغ کی روشنی باہر آ رہی تھی، جس طرح کوئی بھگت مندر کا بُرج دیکھکر خوش ہو جاتا ہے اسی طرح بڈھا اس مکان کی محراب کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ محراب پر لگے ہوئے پُرانے سائن بورڈ پر نئے الفاظ لکھے تھے —— پوسٹ آفس!

بوڑھا پوسٹ آفس کے باہر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اندر سے کوئی خاص آواز نہیں آ رہی تھی۔ صرف آپس کی باتوں کی آواز سُن پڑتی تھی گویا کام میں لگے ہوئے چار چھ آدمی باتیں کر رہے ہوں۔

"پولیس سپرنٹنڈنٹ!" اندر سے آواز آئی، بوڑھا چونکا، مگر پھر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اُمید اور محبت اس سردی میں بھی اُسے دلاسا دے رہے تھے۔

اندر سے آواز پر آواز آنے لگی، سارٹر انگریزی خطوں کے پتے پڑھ کر پوسٹ مین کی طرف پھینک رہا تھا —— کمشنر، سپرنٹنڈنٹ، دیوان صاحب، لائبریرین .... اسکے بعد یکے بعد دیگرے مختلف نام لینے کا عادی سارٹر تیزی سے چٹھیاں پھینکتا جا رہا تھا۔ اتنے میں اندر سے ایک مزاح آمیز آواز آئی —— کوچوان علی بابا!

بڈھا اُٹھ کھڑا ہوا، شکر گزاری سے آسمان کی طرف دیکھا اور آگے بڑھکر دروازے پر ہاتھ رکھا۔

"گوکل!"

"کون ہے؟"

"میری چٹھی ہے نا؟ ... میں آیا ہوں!"

جواب میں ایک ظالم طنزیہ قہقہہ سُنائی دیا۔

"بابوجی یہ ایک پاگل بوڑھا ہے، یہ ہمیشہ چٹھی لینے کیلئے پوسٹ آفس کے دھکے کھانے آیا کرتا ہے۔"

سارٹر نے یہ الفاظ پوسٹ ماسٹر سے کہے، اتنے میں بوڑھا پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ پانچ سال سے اس جگہ بیٹھنے کی اُسے عادت ہو گئی تھی۔

پہلے علی ایک ہوشیار شکاری تھا۔ آہستہ آہستہ وہ شکار کا اتنا عادی ہو گیا کہ جس طرح افیونی بغیر افیون کے نہیں رہ سکتا، اسی طرح وہ شکار کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مٹی کے ڈھیلوں کے ساتھ مٹی بنے ہوئے چتکبرے تیتر پر جہاں علی کی نظر پڑی کہ وہ اُسی وقت ہاتھ میں ہوتا۔ اُسکی تیز نظر خرگوش کی کھوہ میں جا پہونچتی۔ آس پاس کی سوکھی بھوری گھاس میں چھپ کر کان لگائے بیٹھے ہوئے ہوشیار خرگوش کے بھورے رنگ کو جسے کبھی کبھی شکاری کتے بھی نہ دیکھ سکتے، وہ آگے بڑھ جاتے اور خرگوش بچ جاتا۔ مگر اُٹلی کے عقاب کی مانند علی کی تیز نظر ٹھیک خرگوش کے کان پر جا کر ٹھہرتی اور دوسرے ہی لمحہ وہ ڈھیر ہو جاتا۔ کبھی کبھی علی ماہی گیروں کا دوست بھی بن جاتا تھا۔

لیکن جب شامِ زندگی قریب معلوم ہوئی تو یہ شکاری اچانک دوسری طرف مُڑ گیا۔ اس کی اکلوتی بیٹی مریم کی شادی ہوئی اور وہ سُسرال گئی۔ داماد فوج میں نوکر تھا اس لئے وہ اُس کے ساتھ پنجاب کی طرف چلی گئی اور وہ لڑکی جس کے لئے علی زندگی کی قید میں تھا، آج پانچ سال سے اُس کی کوئی خبر نہ ملی۔ اب علی کو معلوم ہوا کہ محبت اور جدائی کیا

چیز ہے۔ پہلے وہ تیتر کے بچوں کو پریشان و ہراساں دیکھ کر ہنستا تھا، وہ اُس کی، ایک شکاری کی، خوشی تھی۔

شکار کا نشہ اس کی نس نس میں بھر گیا، مگر جس دن مریم چلی گئی اور اُسے زندگی میں سُونا پن معلوم ہوا تو اُس دن سے وہ شکار کو بھول کر ایک ٹک نظر سے دھان کے سبز کھیتوں کو تاکا کرتا تھا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ فطرت میں محبت کی لذّت اور جدائی کے آنسو بھی ہیں۔ اس کے بعد ایک روز علی ڈھاک کے درخت کے نیچے بیٹھ کر جی کھول کر رویا اور اس دن کے بعد وہ روزانہ صبح چار بجے اُٹھ کر اس پوسٹ آفس میں آیا کرتا ہے۔ اس کے نام کا خط تو کبھی آتا نہیں مگر مریم کی چٹھی ایک دن ضرور آئیگی، اس طرح ایک بچے کی سی اُمید اور پُر اُمید خوشی میں وہ روزانہ یہاں آیا کرتا ہے۔

پوسٹ آفس، شاید دُنیا میں سب سے زیادہ بے مزہ جگہ، اُسکے لئے کعبہ یا زیارت گاہ بن گئی۔ اس کی حالت سے واقف ہو جانے پر سب لوگ اُس کا مذاق اڑاتے ہیں اور کبھی کبھی خط نہ ہونے پر بھی مذاق سے اس کا نام لیکر اُسے بیٹھنے کی جگہ سے پوسٹ آفس کے دروازے تک دوڑاتے ہیں۔ ایک ناقابلِ شکست اُمید کی حالت میں وہ روز آتا ہے اور خالی ہاتھ لوٹ جاتا ہے۔

علی بیٹھا ہوا تھا، ایک کے بعد ایک چپراسی اپنے افسروں کی چٹھیاں لینے آنے لگے۔ اس بیسویں صدی میں زیادہ تر چپراسی افسروں کی عورتوں کے گھریلو منتظم سے ہوتے ہیں اس لئے اس وقت سارے شہر کے افسروں کی خانگی تاریخ پڑھی جا رہی تھی۔

کسی کے سر پر صافہ تھا، کسی کے پیروں میں چمچماتے ہوئے جوتے، سب اپنے اپنے مخصوص جذبات کی نمائش کر رہے تھے۔ اتنے میں دروازہ کھلا، چراغ کے اُجالے میں توبے کا سا سر اور ہمیشہ کا پُر ملال سنجیدہ چہرہ لئے پوسٹ ماسٹر بیٹھے تھے۔ جن رُخساروں، چہرے یا آنکھوں میں نور نہیں ہوتا وہ انسان زیادہ تر گولڈسمتھ کا "ویلج سکول ماسٹر" یا اس صدی کا کلرک یا پوسٹ ماسٹر ہوتا ہے۔

علی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔

"پولیس کمشنر!" کلرک نے آواز دی، اور ایک مغرور نوجوان نے پولیس کمشنر کا خط لینے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔

"سپرنٹنڈنٹ!" ایک دوسرا چپراسی آگے آیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے ہزاروں نام پڑھنے والا سارٹر روزانہ مشق کر لیا کرتا ہے۔

آخر کار سب چلے گئے۔ علی اُٹھا اور پوسٹ آفس کو سلام کر کے چلا گیا — ایک صدی پہلے کا دیہاتی! گویا اُس کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں —!

"یہ پاگل ہے کیا؟" پوسٹ ماسٹر نے پوچھا۔

"جی، کون؟ علی؟ جی ہاں، پانچ سال سے یہ برابر خط لینے آتا ہے چاہے کوئی بھی موسم کیوں نہ ہو۔ اس کا خط شاید ہی کبھی آتا ہے" کلرک نے جواب دیا۔

"کوئی بیکار تھوڑی رہتا ہے، کون روز روز چٹھی لکھتا پھرے"

"بابوجی اس کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے، پہلے یہ بڑا ظالم تھا ایک بار اس نے کسی عبادتگاہ میں کوئی پاپ کر دیا اب اسکا پھل بھوگ رہا ہے" پوسٹ مین نے کہا۔

"پاگل بڑے عجیب ہوتے ہیں"

"جی ہاں احمد آباد میں میں نے ایک بار ایک پاگل کو دیکھا تھا وہ سارے دن ریت کا ڈھیر لگایا کرتا تھا، بس اور کچھ نہیں۔ ایک پاگل کو ہمیشہ شام کے وقت ندی کے کنارے جا کر پتھر پر پانی ڈال لینے کی عادت تھی"

"اجی ایک پاگل کو ایسی عادت تھی کہ وہ سارے دن اِدھر اُدھر گھوما کرتا، ایک دوسرا پاگل ہمیشہ ایک گیت گایا کرتا اور ایک تو ایسا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے گال پر چانٹے ہی لگایا کرتا اور پھر یہ سمجھ کر رونے لگتا کہ کوئی دوسرا آدمی اُسے مار رہا ہے"

آج پوسٹ آفس میں پاگلوں کی روایتیں چل پڑی تھیں۔ ہمیشہ اسی طرح ایک آدھ قصہ چھیڑ کر اس پر دس پانچ منٹ باتیں کر کے جی بہلانے کی تقریباً سبھی نوکروں کو عادت پڑ گئی تھی — شراب کی عادت کی طرح!

آخر میں پوسٹ ماسٹر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے بولے "ان پاگلوں کی بھی ایک دُنیا معلوم ہوتی ہے، یہ پاگل ہم لوگوں کو پاگل سمجھتے ہوں گے اور ضرور اِن کی دُنیا بھی شاعروں کی دُنیا کی مانند ہوگی"

آخری الفاظ کہتے ہوئے پوسٹ ماسٹر ہنس کر چلے گئے۔ ایک کلرک وقت ملنے پر کبھی کبھی نظمیں لکھ لیا کرتا تھا! اس لئے سب اُسے چڑاتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر نے بھی اِسی لئے آخری فقرہ ہنستے ہنستے اُسی کی طرف مُڑ کر کہا تھا۔۔۔ پوسٹ آفس پھر پہلے کی طرح خاموش ہو گیا۔

ایک بار بوڑھا علی دو تین دن تک نہیں آیا۔ علی کے دل کو سمجھ لینے والی ہمدردی اور وسیع نظری پوسٹ آفس کے کسی آدمی میں نہیں تھی۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں، اس بات پر سب کو تعجب تھا۔ بعد میں علی آیا

بھی مگر اُس دن وہ ہانپ رہا تھا اور اس کے چہرے پر زندگی کی شام کے آثار عیاں تھے۔

آج بھی اُسنے بیقرار ہوکر پوسٹ ماسٹر سے پوچھا: "بابو صاحب میری مریم کی چٹھی آئی؟"

پوسٹ ماسٹر اُس دن گاؤں جانے کی جلدی میں تھے، اُن کا دماغ ٹھیک نہ تھا کہ اس نئے سوال کو برداشت کرتے، جھڑک کر بولے ـــ

"نہ جانے تم کیسے آدمی ہو"

"میرا نام علی ہے"، علی کابے تکا جواب ملا۔

"ٹھیک ہے، مگر یہاں تمہاری مریم کا نام کیا کسی نے لکھ رکھا ہے؟"

"لکھ لیجئے نا صاحب، شاید کسی وقت خط آئے اور میں یہاں نہ ہوں تو آپ کو پریشان ہونا پڑے"

جس کی پوری زندگی تُنکار میں گزری، اُسے کیا معلوم کہ مریم کا نام اُسکے باپ کے سوا اور کسی کے لئے دو کوڑی کا بھی نہیں۔

پوسٹ ماسٹر گرم ہو گئے ـ "پاگل تو نہیں ہو گیا ہے، جا یہاں تیری چٹھی آئیگی تو کوئی کھا نہیں جائیگا"

پوسٹ ماسٹر جلدی سے چلے گئے اور علی دھیمی چال سے باہر نکلا۔ باہر جاتے جاتے اُس نے ایک بار گھوم کر پوسٹ آفس کی طرف دیکھا، آج اُس کی آنکھوں میں بیتیوں کے آنسو جھلک رہے تھے، اُمید تھی مگر صبر ختم ہو چکا تھا۔ اوہ، اب مریم کی چٹھی کیسے پہونچے گی۔

ایک کلرک اُسکے پیچھے آتا معلوم ہوا، علی اُسکی طرف مُڑا۔

"بھیّا!"

کلرک چونکا۔ مگر وہ شریف آدمی تھا۔

"کیوں؟"

"دیکھو یہ میرے پاس ہے" اتنا کہنے کے بعد اُس نے اپنے پاس کی ایک پرانی سی ڈبیا سے پانچ گنّیاں نکالیں۔

کلرک چونک پڑا۔

"چونکو مت، تمہارے لئے یہ بڑے کام کی چیز ہے، میرے لائق اب نہیں ہیں ـــ ایک کام کردگے؟"

"کیا؟"

"وہ اُوپر کیا نظر آتا ہے؟" علی نے آسمان کی جانب اُنگلی اُٹھائی۔

"آسمان!"

"اُوپر اللہ ہے، اس کی موجودگی میں میں تمہیں یہ گنّیاں دیتا ہوں، میری مریم کی چٹھی آئے تو تم پہونچا دینا"

کلرک تعجب سے کھڑا کا کھڑا رہ گیا، پوچھا: "کہاں کہاں پہونچانا ہوگا؟"

"میری قبر پر!"

"ایں؟"

"سچ کہتا ہوں آج میرا آخری دن ہے، آخری! مریم نہ ملی چٹھی بھی نہ ملی!"

علی کی آنکھوں میں ایک نشہ تھا، کلرک آہستہ آہستہ اُسکے پاس سے ہٹ کر چلا گیا، اُسکی جیب میں تین تولے سونا پڑا تھا۔

اس کے بعد علی کبھی دکھائی نہیں دیا اور اس کا پتہ لگانے کی فکر کسی کو نہ تھی۔ ایک دن پوسٹ ماسٹر ذرا اُداس تھے، اُن کی لڑکی پردیس میں بیمار تھی اور اُس کے خط کے انتظار میں وہ اُداس بیٹھے تھے ـــ

ڈاک آئی اور چٹھیوں کا ڈھیر لگ گیا، ایک لفافے کو اپنا سمجھ کر پوسٹ ماسٹر نے جلدی سے اُٹھا لیا مگر اُس پر لکھا تھا ـــ

"کوچوان علی بابا"

جیسے اُنہیں ایک دھکا سا لگا۔ خط کو اُنہوں نے نیچے پھینک دیا۔ غم و فکر کی حکومت میں چند لمحوں کے لئے اُن کی افسرانہ حالت جاتی رہی اور قدرتی انسانی حالت باہر نکل آئی۔ اُنہیں اچانک خیال آیا کہ یہ اُس بوڑھے کا خط ہے اور ضرور اُسکی لڑکی مریم کا بھیجا ہوا ہے۔

"لکشمی داس!" پوسٹ ماسٹر نے آواز دی۔

لکشمی داس اُس آدمی کا نام تھا جسے اُس دن علی نے گنّیاں دی تھیں۔

"جی، کہیئے؟"

"یہ تمہارے کوچوان علی بابا... آجکل کہاں ہے وہ؟"

"تلاش کرونگا"

اس دن پوسٹ ماسٹر کی لڑکی کی کوئی خبر نہیں آئی۔ ساری رات اُنہوں نے شک و فکر میں گزاری، دوسرے دن صبح تین بجے وہ پوسٹ آفس میں بیٹھے تھے۔ چار بجے علی آئے گا اور اپنے ہاتھ سے میں یہ خط اُسے دونگا، یہی آج اُنکی خواہش تھی۔

علی بابا کی حالت کو اب پوسٹ ماسٹر صاحب سمجھ گئے تھے آج ساری رات اُنہوں نے صبح آنے والے خط کے انتظار میں گزاری تھی، پانچ سال تک ایسی بے پناہ راتیں گزارنے والے کے لئے آج اُن

دل پہلی بار ہمدردی سے بھرا تھا۔ ٹھیک پانچ بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوسٹ ماسٹر اُٹھے، باپ کی دلی تکلیف کا احساس کر کے وہ بڑھے اور جھپٹ کر دروازہ کھولدیا۔

"اوہ، بھائی علی، یہ لو تمہاری چٹھی"

دروازے پر ایک مسکین بوڑھا لکڑی کے سہارے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ آخری آنسوؤں کی بوندیں، ابھی اُسکے گالوں پر تازہ تھیں اور چہرے کی جھریوں میں سختی کے رنگ پر شرافت کا برش پھرا ہوا تھا۔

اُس نے پوسٹ ماسٹر کی طرف دیکھا اور پوسٹ ماسٹر ذرا چونک پڑے۔ بوڑھے کی آنکھوں سے انسانی چمک مفقود تھی!

"کون ہے بابو جی، علی ہے کیا....؟" لکشمی داس ایک طرف سے آکر دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

پوسٹ ماسٹر اُس کی طرف نظر نہ کر کے دروازے کی طرف ہی دیکھتے رہے۔ تعجب سے اُنہوں نے آنکھیں پھاڑ دیں، دروازے پر کوئی بھی نہ تھا۔ یہ کیا؟ وہ لکشمی داس کی طرف مڑے۔

"ہاں علی بابا۔۔۔ کون، تم ہو؟"

"جی ہاں علی بابا مر گیا اسکی چٹھی مجھے دیدیجئے"

"ایں، کب مر گیا، سچ کہتے ہو لکشمی داس؟"

"جی ہاں، اس بات کو تو تین مہینے ہو گئے" سامنے سے ایک پوسٹ مین آرہا تھا اُس نے جوابدیا۔

پوسٹ ماسٹر کچھ کھو سے گئے۔ مریم کا خط ابھی تک دروازے میں پڑا تھا، علی کا مجسمہ اُن کی آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لکشمی نے آخری دن علی نے اُسے کس طرح بلایا تھا۔۔۔ یہ بھی کہہ سنایا۔ پوسٹ ماسٹر کے کانوں میں دروازے کی تھپتھپاہٹ گونجنے لگی اور علی کا مجسمہ اُنکی نظروں کے سامنے آگیا، اُن کا دل فکر میں ڈوب گیا۔ میں نے علی کو دیکھا ہے یا وہ صرف ایک دھوکا تھا، یا وہ لکشمی داس تھا؟....

پھر روز کا معمول شروع ہوا۔۔۔ پولیس کمشنر، سپرنٹنڈنٹ... لائبریرین... سارٹر تیزی سے چٹھیاں پھینکتا جاتا تھا۔

مگر ہر ایک خط کی طرف آج پوسٹ ماسٹر اس طرح دیکھ رہے تھے گویا اُن میں باپ کا دھڑکتا ہوا دل ہو۔ لفافہ چار پیسے کا ہے اور کارڈ تین پیسے کا یہ خیال آج غائب ہو گیا تھا۔ افریقہ کے صحراؤں سے کسی بیوہ کے اکلوتے لڑکے کا خط آتے اس کے کیا معنی؟ پوسٹ ماسٹر سنجیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

انسان اپنی نظر چھوڑ کر دوسرے کی نظر سے دیکھے تو آدمی دُنیا شانت ہو جائے۔

اُسی دن شام کو آہستہ آہستہ لکشمی داس اور پوسٹ ماسٹر علی کی قبر کی طرف جا رہے تھے۔ مریم کا خط اُن کے پاس تھا، قبر پر خط رکھکر وہ واپس لوٹ پڑے۔

"لکشمی داس کیا آج سچ مچ تم ہی صبح سب سے پہلے آئے تھے؟"

"جی ہاں"

"مگر پھر... پھر... سمجھ میں نہیں آرہا کہ ـــــ"

"کیا؟"

"ہاں ٹھیک ہے... کچھ نہیں" پوسٹ ماسٹر نے جلدی سے بات پلٹ دی پوسٹ آفس کا چبوترہ آتے ہی لکشمی داس سے الگ ہو کر وہ سوچتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ان کا دل علی کو نہ سمجھ سکا اس کا اُنہیں دُکھ تھا۔ اور آج بھی لڑکی کی ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ تعجب، فکر اور پشیمانی کی سدگتی آگ میں جلتے ہوئے وہ اپنے آفس میں بیٹھ گئے اور قریب رکھی ہوئی انگیٹھی میں جلتے ہوئے کوئلوں کی دہکتی آگ کو دیکھنے لگے۔

"دُھوم کیتو" ـــــــ "راہی"

نقد و تبصرہ

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے غالبؔ کو ہم سے متعارف کرایا۔ ج جو آپ اُردو داں طبقے میں غالبؔ سے عقیدت اور عام شیفتگی پاتے ہیں بجنوری مرحوم کے اُس بے مثل مقالہ کا نتیجہ ہے جو نسخۂ حمیدیہ میں بطور مقدمہ شامل ہے۔ یہ غیر فانی مقالہ ڈاکٹر بجنوری کے بقائے دوام کا ضامن ہے۔ افسوس کہ اس باکمال نقاد کو زمانے کی نظر کھا گئی اور ہم افادات بجنوری سے محروم ہو گئے۔ ڈاکٹر بجنوری نے اپنی مختصر حیاتِ ادبی میں چند اور مضامین بھی لکھے تھے۔ چند منظومات اور چند خطوط بھی اپنی یادگار چھوڑے تھے۔ یہ مقدس ترکہ مرحوم کے صاحبزادے محمد فاتح فرخ صاحب نے بڑی عمدگی سے یکجا کر کے "باقیاتِ بجنوری" کے نام سے اہلِ ذوق کیلئے پیش کیا ہے۔ یہ ڈھائی سو صفحے کی کتاب ہے جو تمام و کمال ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ دیباچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ صرف ایک کمی اس کتاب میں نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے مختصر واقعاتِ زندگی اس میں شامل نہیں ہیں۔ کتاب اِس کمی کے باوجود بہت قابلِ قدر ہے۔ اور ہر صاحبِ ذوق کے مطالعہ میں آنی چاہیئے۔ قیمت ڈھائی روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ۔ قرول باغ۔ نئی دلی۔

"ش"

تعلیم بالغان کیلئے مکتبۂ جامعہ کی کتابیں

مثل مشہور ہے کہ "کہیں بڈھے طوطے بھی پڑھے ہیں؟" اور اس میں شک بھی نہیں کہ بڑی عمر والوں کا پڑھنا اُس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ اُن کے لئے کوئی نیا طریقۂ تعلیم اختیار نہ کیا جائے۔ بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی جاتی ہیں بڑوں کے لئے بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ اُردو میں بالغوں کی تعلیم کے لئے کوئی سلسلہ ابتک ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اب مکتبۂ جامعہ دہلی نے ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بالغ مبتدیوں کے لئے ۲۶ کتابوں کا ایک نہایت مفید سلسلہ شائع کیا ہے جس سے اُردو لکھنے پڑھنے کی اچھی خاصی مشق ہو سکتی ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والے کو جاہل نہیں کہا جا سکے گا۔ کتابوں کے ناموں سے اُن کے موضوع اور افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱) نماز۔ (۲) حکایتیں۔ (۳) حکایتیں۔ (۴) حبیب خدا۔ (۵) نظمیں۔ (۶) میونسپلٹی۔ (۷) صدیقِ اکبر۔ (۸) خط کتابت۔ (۹) ضلع کا انتظام۔ (۱۰) قومی گیت۔ (۱۱) غزلیں۔ (۱۲) ہمارا ہندوستان۔ (۱۳) امامی بھی پڑھنے لگے۔ (۱۴) عمر فاروق (۱۵) ڈسٹرکٹ بورڈ۔ (۱۶) شہید کربلا۔ (۱۷) ہماری دُنیا۔ (۱۸) ایشیا۔ (۱۹) یورپ (۲۰) فسانۂ عجائب۔ (۲۱) مثنوی میر حسن۔ (۲۲) گل بکاؤلی۔ (۲۳) چار درویش اوّل۔ (۲۴) چار درویش دوم۔ چار درویش سوم۔ (۲۶) چار درویش چہارم۔ ہر کتاب ۱۶ صفحے کی ہے اور قیمت ایک آنہ ہے۔

"ش"

نازو

جناب اخترؔ انصاری دہلوی اپنے دل آویز اشعار اور دلپذیر افسانوں کی وجہ سے ملک میں مشہور ہو چکے ہیں۔ اس مہینے اُن کے چوّدہ افسانوں کا مجموعہ "نازو" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اخترؔ صاحب جدید افسانہ نگاری کے اسلوبِ نگارش کے خاص نمائندے ہیں۔ یعنی صحیح معنوں میں ترقی پسند ادیب ہیں۔ انکے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے انسانوں کے نمونے ہوتے ہیں۔ کرداروں کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، محسوسات و محرکات، سب فطری ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار میں یہ خوبی اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ اس کا مشاہدہ گہرا اور نفسیاتی تحلیل پر اُسے عبور حاصل ہو۔ اِن افسانوں میں ایک خوبی اور ہے۔ اور وہ ہے ندرتِ بیان جسے آپ اگر چاہیں تو حسین و موثر کہہ سکتے ہیں۔ کتاب مجلد ہے۔ رنگین گرد پوش ضخامت پونے دو سو صفحے۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔

مکتبۂ جہاں نما۔ اُردو بازار۔ دہلی۔

"ش"

نئی پود

جناب اظہر قدوائی کے سترّہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں "زمانہ اور قصّے" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مضمون بھی شامل ہے۔ یہ سب افسانے بھی جدید رجحانات کے حامل ہیں اور ادبیاتِ حیات کے اچھوتے نمونے ہیں۔ ہماری رائے میں ترقی پسند ادب کیلئے طرزِ نگارش زیادہ موزوں ہے سب افسانے زندگی کی تصویریں ہیں مگر اُن میں فحاشی یا گندگی تو کیسی سوقیانہ یا عامیانہ عنصر تک کہیں آنے نہیں پایا۔ "نئی پود" ڈرامہ خصوصیت سے پڑھنے کے لائق ہے۔ ضخامت (۱۹۶) صفحات۔ کتاب شمع بک ڈپو دہلی نے شائع کی ہے اور مکتبۂ جامعہ قرول باغ نئی دلی سے ایک روپیہ میں منگائی جا سکتی ہے۔

"ش"

اُردو شاعری پر ایک نظر:- مصنفہ حکیم الدین احمد صاحب پروفیسر شعبۂ انگریزی پٹنہ کالج۔ کتاب کی قیمت درج نہیں ہے۔ عظیم پبلشنگ ہاؤس بانکی پور۔ پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

اُردو ادب اور شاعری سے متعلق اب تک بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں شاعر یا ادیب کے حالات اس کی تصانیف کی فہرست اور معمولی سی تنقید کے علاوہ، جس کو تنقید کہنا بھی زیادتی ہے، کچھ بھی نہیں ہوتا اور یہ سب بھی "آبِ حیات" اور "گلِ رعنا" جیسی بعض پرانی کتابوں سے اخذ ہوتا ہے۔ جدید تنقیدی اصولوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے واقعات کے بجائے رُجحانات کی تاریخ لکھی ہے اور یہ کام نہایت سلیقہ سے کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ پرانے شاعروں سے متعلق ہے اور دوسرے حصے میں جدید شاعروں اور ان کے رُجحانات کا تذکرہ ہے۔ مصنف نے تنقید کے ذیل میں تمام شاعروں کو نہیں لیا ہے بلکہ مختلف ادوار کے چند مشہور و مستند شعراء ہی پر اکتفا کیا ہے اور اُن کے اشعار پر تنقید کرکے ہر دور کے رجحانات سے بحث کی ہے لیکن یہ حصہ بہت زیادہ تشنہ ہے اور شاعروں کی نظموں کا جو انتخاب دیا گیا ہے اس میں دقتِ نظر سے کام نہیں لیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری ترقی پسند اور انقلابی شاعری کا ایک بڑا حصہ پروپیگنڈے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس قسم کی شاعری کی عمر اس قدر کم ہے کہ ابھی ان شاعروں کے متعلق کوئی مستقل رائے قائم کرنا دشوار ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اُردو شاعری کے مستقبل کو تاریک سمجھنے لگیں۔ "ش۔ ل"

افی جینیا:- مترجمہ:- ابوالقلم دبیر۔ قیمت ۱۰/ ۔ یہ گوئٹے کا مشہور ڈراما ہے جس کا ابوالقلم دبیر نے ترجمہ کیا ہے۔ گوئٹے کی دیگر تصانیف کے ترجمے بھی ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ ان ترجموں کے مقابلے میں یہ ترجمہ کس حد تک پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ مکالمے میں وہ برجستگی اور بے ساختہ پن قائم نہیں رہ سکا جو انگریزی ترجمہ میں ہے۔ "ش۔ ل"

اُردو مثنوی کا ارتقا:- از عبدالقادر سروری۔ ایم۔ اے؛ ایل۔ ایل۔ بی۔ اُستاد ادب اُردو جامعہ عثمانیہ۔ حیدرآباد دکن۔ ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر۔ ادارہ ادبیات اُردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد (دکن)۔ قیمت ۱۲/

ہر زبان میں مثنوی قدیم ترین صنفِ نظم ہوتی ہے۔ اُردو میں بھی مثنوی کی ابتدا اب سے لگ بھگ سات سو برس پہلے ہو چکی تھی۔ دورِ جدید میں مثنوی ناپید ہے۔ اس لئے قدیم لٹریچر کی شیرازہ بندی کرنے کیلئے نیز جدید لٹریچر میں مثنوی کی چاشنی دینے کیلئے اس کتاب کی تالیف بہت ضروری تھی۔

زیرِ نظر کتاب میں دکن کی بے شمار مثنویوں کا ذکر ہے۔ پھر دلی اور لکھنؤ میں اس کی جو عہد بعہد ترقی ہوئی اس کا مفصل حال درج ہے۔ مصنف نے یہ التزام رکھا ہے کہ مثنوی سے بحیثیت فن کے بحث کی ہے اور جس قدر نمونے درج کئے ہیں وہ بطور مثال کے ہیں۔ "ش۔ ل"

گلبانگِ آزادی:- حضرت نہال سیوہاروی کی ولولہ انگیز نظموں سے ناظرینِ ساقی مستفید ہوتے رہے ہیں۔ حال ہی میں اُن کی (۷۶) رباعیوں کا چھوٹا سا مگر بڑا قیمتی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ہر رباعی کا موضوع "آزادی" ہے۔ شاعر کی ذہانت، فکرِ رسا اور قدرتِ بیان ہر رباعی سے ظاہر ہے کہ ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا ہے۔ شروع میں پروفیسر سعید احمد صاحب کا بصیرت افروز مقدمہ ہے۔ کتابت نہایت دیدہ زیب چھپی ہے۔ جلد لچکدار اور مضبوط ہے۔ قیمت ۸/ ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان۔ دہلی۔ "ش"

شادی:- توقیر مرزا صاحب رزقی۔ ایم۔ اے؛ نے ڈاکٹر میری اسٹوپ کی کتاب "دی میریڈ لو" کا ترجمہ "شادی" کے نام سے کیا ہے۔ مصنفہ جنسیات اور علم نوعی کی بہت بڑی ماہر ہیں۔ یہ کتاب دنیا بھر میں مشہور ہو چکی ہے۔ توقیر مرزا صاحب نے اس کا ترجمہ کرکے اردو میں ایک ضروری کتاب کا اضافہ کیا ہے جس کے لئے اُن کی سعی مشکور ہوگی۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ:- ایس۔ اے۔ رحیم۔ جنرل مرچنٹ۔ سالار جنگ بلڈنگ حیدرآباد۔ دکن۔ "ش"

ایثار:- یہ ایک طویل افسانہ ہے جس میں ایک متوسط گھرانے کے غمناک حالات بیان کئے گئے ہیں۔ نورالحسن صاحب کا پیرایۂ بیان بہت مؤثر ہے۔ بعض جگہ طویل بحثیں درج کی گئی ہیں مثلاً تعددِ ازدواج کے متعلق۔ مناسب ہوگا کہ آئندہ اڈیشن میں انہیں اختصار سے درج کیا جائے۔ قیمت ۸/ ملنے کا پتہ معتمد انجمن ترقیِ اُردو۔ بنجارہ روڈ۔ حیدرآباد۔ دکن۔ "ش"

مفت **گھر کا طبیب** مفت

اس زمانہ کی زبردست ایجاد

ساقی کے خریداروں کے سامنے ہم نے گذشتہ ماہ اپنے دواخانہ کے دو مفید سُرموں کا اشتہار پیش کیا تھا ان کے متعلق
خواستیں آرہی ہیں۔ آج ہم اپنی ایک اور ایجاد پیش کرتے ہیں اور وہ تریاق کبیر ہے۔ تریاق کبیر اس خیال سے ایجاد کیا گیا ہے کہ
وں میں فوری بیماری کے وقت جو پریشانی ہوتی ہے اس سے نجات حاصل ہو۔ ہر بیماری پر ڈاکٹر کو بلوایا جائے تو یہ ناقابل
برداشت خرچ ہے۔ اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہو لیکن ڈاکٹر نہ میسّر ہو تو یہ بھی پریشان کُن ہوتا ہے۔ ہر گھر والے طب سے اسقدر واقف
نہیں ہوتے کہ خود مختلف مرضوں کا علاج تجویز کریں۔ کئی دفعہ مرض کا نام تک وہ نہیں جانتے۔ اس کا علاج ایک ہی ممکن ہے کہ
کوئی ایسی دوا ہو جو وقتی طور پر ان حاجتوں کو پورا کر سکے۔ اور ہر مرض کا یا علاج ہو یا اسکی شدت کو دُور کر کے مرض کو قابو میں رکھے۔ یہاں تک کہ
ڈاکٹر پہونچ جاوے۔ اس غرض کو پورا کرنے کیلئے "تریاق کبیر" ایجاد کیا ہے۔ سر درد ہو تو ذرا سا انگلی پر لگا کر ماتھے، کنپٹیوں پر گردن کے
پچھلے حصہ پر مل لیجئے۔ گلے کی تکلیف ہو تو گردن کے بیٹھوں پر مل لیجئے۔ اور ساتھ ہی ایک ایک قطرہ تھوڑی سی مصری پر ڈالکر یا گرم پانی
میں ڈالکر پی لیجئے فوراً آرام آجاویگا۔ بھڑ کاٹے تو اُس پر انگلی سے یا روئی سے نصف قطرہ لگا لیجئے۔ درد میں تسکین ہو جاویگی اور ورم کم
اسہال، بخار، کھانسی، نزلہ، پیٹ کا درد، جگر کی خرابی، سستی، قبض کے نقصانات، جوڑوں کے درد میں، متلی، قے، ہیضہ، غرض
مرض ہیں جن میں اس کا ایک ایک قطرہ مریض کیلئے مفید ہو سکتا ہے۔ گھر بھر کو پریشانی سے بچا سکتا ہے۔ اسوقت تک اس میدان میں
امرت دھارا نے بڑی شہرت پائی ہے بہتوں نے اسکی نقل کی مگر ناکام رہے۔ ہم نے نئے اُصول پر یہ دوا تیار کی ہے تجربہ سے
ثابت ہوا ہے کہ بعض فوائد میں امرت دھارا سے بھی بڑھکر ہے۔ مختلف علاقوں میں تجربہ کیلئے ہم اشتہار کے ذریعے اعلان کرتے ہیں کہ ہم چھوٹی
شیشیاں بطور نمونہ ہم خریداران ساقی کے نام خود ہی محصولڈاک ادا کر کے بھجوانے کو تیار ہیں تاکہ وہ تجربہ کر کے اپنی آراء سے
اطلاع دیں۔ پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا۔ جو خرید نا چاہیں انکے لئے قیمت چھوٹی شیشی ۸ر درمیانی شیشی ۱۲ر بڑی شیشی ۱ؔ ؎

نظر کی کمزوری

(۱) سُرمہ اکسیر چشم۔ ککروں، ناخنہ وغیرہ کیلئے ازحد مُفید ہے۔ قیمت فی تولہ ۱۲ر ۶ ماشہ ۱۰ر ۳ ماشہ ۱۲ر
(۲) سُرمہ ممیرا خاص۔ برائے آشوب چشم، دُھند، کمزوری نظر وغیرہ کے لئے۔ قیمت فی تولہ ۱ر ۶ ماشہ ۱۱ر ۳ ماشہ

ملنے کا پتہ:۔ **دواخانہ خدمتِ خلق۔ قادیان** (پنجاب)

زمین سے سونا پیدا کیجئے

ں مارکہ ہڈی کی کھاد نمبر سی (c) نہایت زود اثر، زرخیز کھاد ہے

جیب کھاد ہڈی میں بے مثل، بیش قیمت اجزا شامل کر کے بڑی کوشش اور سخت جانفشانی سے

کی ہے۔ یہی ایک ایسی پیداوار بڑھانے والی کھاد ہے جس میں صحیح سائنٹفک ضروریات کے مطابق

گینک میٹر (مادۂ نباتات)، فاسفورس اور دیگر قیمتی اجزا شامل ہیں جن سے حیرت انگیز طور پر پیداوار بڑھتی

اثر ہوتا ہے اور زمین کو اسقدر طاقت بخشتی ہے کہ اسکے لگاتار استعمال سے پیداوار دگنی تگنی ہو جاتی ہے۔

ی (c) کھاد سے بہتر کھاد مل نہیں سکتی۔ مشہور مشہور کھیتوں، باغات کے مالکان

نٹ ڈپارٹمنٹ ہم سے خریدتے ہیں۔ ملک کی اس عجیب، قابلِ فخر، بے بہا

سے فائدہ اٹھائیے اور ابھی منگائیے۔

کے علاوہ دیگر ہڈی اور کھری کے کھاد بھی اسٹاک میں موجود ہیں۔ خاص آپ کے کھیتوں

حالات کے مطابق ہم نہایت ہی مفید مشورہ دینے کیلئے ہر وقت تیار ہیں۔

ایجنسی حاصل کرنے کیلئے شرائط ایجنسی منگائیے

منیجر ہاپوڑ بون ملز۔ ہاپوڑ۔ یو۔ پی۔

علم وادب کی بہترین کتابوں کا ذخیرہ

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
افسانہ	مجنوں	تنقید	عہر
ادب اور زندگی	؍؍	؍؍	عہ ر
اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد ایم اے	؍؍	عگار
مقالات ہاشمی	نصیر الدین ہاشمی	؍؍	عگار
اردو میں ڈرامہ نگاری	سید بادشاہ حسینی	؍؍	عگار
اقبال	مرتبہ انجمن ترقی اردو	مضامین	عگار
اقبال	از احمد دین	تنقید	عگار
اقبال اور اسکا پیغام	ڈاکٹر تصدیق	؍؍	۸ ر
ارباب نثر اردو	سید محمد ایم۔ اے	؍؍	عگار
فکر بلیغ	شاد عظیم آبادی	؍؍	عہر
مغل اور اردو	نصیر حسین خیال	؍؍	عگار
داستان عجم	؍؍	اردو نثر میں شاہنامۂ فردوسی	عہ ر
مادر ہند	شاد عظیم آبادی	مثنوی	۱۲ ر
ظہور رحمت	؍؍	اخلاق نبوی (نظم)	۸ ر
دیوان غالب مرقع چغتائی	چغتائی	دیوان	عصہ ر
دیوان نقش چغتائی	؍؍	؍؍	صہ ر
؍؍ تاج اڈیشن قسم اعلیٰ	مرتبہ تاج کمپنی	؍؍	عہ ر
؍؍ ؍؍ قسم دوم	؍؍	؍؍	صہ ر
؍؍ ؍؍ قسم سوم	؍؍	؍؍	عہر
؍؍ ؍؍ قسم چہارم	؍؍	؍؍	۱۲ ر
؍؍ طاہر اڈیشن	آغا محمد طاہر	؍؍	عہر
؍؍ قسم دوم	؍؍	؍؍	۸ ر
؍؍ مشرح	وحید الدین بیخود	شرح	عگار
؍؍	آغا محمد باقر	؍؍	عگار
؍؍	عبدالباری آسی	؍؍	سے ر
؍؍	نظامی بدایونی	؍؍	عگار
بہارستان	ظفر علی خاں	نظم	للعہ ر
شاہنامہ اسلام کامل	حفیظ جالندھری	؍؍	لعہ ر
سوز و ساز	؍؍	؍؍	عگار
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	دیوان	عگار
گل نغمہ	عظیم الدین	؍؍	عگار

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
نغمہ نور	بہزاد لکھنوی	دیوان	عہ ر
کیف و سرور	؍؍	؍؍	عہ ر
موج طہور	؍؍	؍؍	۸ ر
پیغام اقبال	طارق بی اے	تنقید	عگار
حیات اقبال	مرتبہ تاج کمپنی	سوانح	عہ ر
صحیفہ ادب	طارق بی اے	دیوان غالب پر مقدمہ	عہر
شعلہ و شبنم	جوش ملیح آبادی	دیوان	سے ر
حرف و حکایت	؍؍	؍؍	عگار
فکر و نشاط	؍؍	؍؍	عہر
نقش و نگار	؍؍	؍؍	عگار
جنون و حکمت	؍؍	رباعیات	سے ر
گلبانگ آزادی	نہال سیہاروی	؍؍	۸ ر
خیاباں	محمود اسرائیل	دیوان	عہ ر
نشاط روح	اصغر گونڈوی	؍؍	عگار
باقیات فانی	فانی بدایونی	؍؍	عہر
گفتار بیخود	بیخود دہلوی	؍؍	سے ر
درشہوار بیخود	؍؍	؍؍	عگار
کلیات اکبر	اکبر آبادی	کلیات	للعہر
کلیات آتش	آتش	؍؍	عہر
کلیات مومن	مومن	؍؍	عہر
تصویر احساس	الطاف مشہدی	دیوان	عگار
نغمۂ حرم	اختر شیرانی	؍؍	عہر
نغمۂ روح	اختر انصاری	؍؍	۱۲ ر
نور مشرق	ضیاء	؍؍	عہ ر
شکوہ جواب شکوہ قسم خاص	اقبال	؍؍	۶ ر
بانگ درا	؍؍	؍؍	عگار
انتخاب حسرت	حسرت موہانی	؍؍	۸ ر
دیوان جان صاحب	جان صاحب	؍؍	عہر
دیوان رنگین و انشاء	رنگین و انشاء	؍؍	عہر
گلدہ	عزیز لکھنوی	؍؍	عہر
فغاں آرزو	آرزو لکھنوی	؍؍	عگار

پتہ: کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
نوائے سروش	طالب اناوی	دیوان	عمر
آہنگ	مجاز علیگ	"	عمر
متاع درد	ثاقب کانپوری	"	عگار
پیام جاوید	مجازی	"	عمر
صوت تغزل	طباطبائی	"	عگار
انتخاب زرین	راس مسعود	نظم	عگار
آہنگ رزم	وقار انبالوی	"	۸ر
دیوان ذوق	مرتبہ آزاد	دیوان	عگار
قصائد ذوق	مرتبہ شاہ سلمان	قصائد	عہ۸ر
قصائد عزیز	عزیز لکھنوی	"	سے ر
قصائد ذوق معمول	ذوق	"	۴ر
گلدستہ محسن کاکوری	محسن کاکوری	نظم	۶ر
شہر کی پکار	راحت آرا بیگم	افسانے	۸ر
غنچہ افسانہ	"	"	۸ر
بانسری آواز	"	"	۸ر
دنیا کے سچے افسانے	گوپال متل	"	عہ۴ر
معیار محبت	سیاح سنامی	"	عمر
محبت اور نفرت	اختر حسین رائے پوری	"	عہ۴ر
سوز ناتمام	عاشق انبالوی	"	عہ۴ر
سحر فرانس	طاہر قریشی	"	عہ۴ر
نظارے	کرشن چندر	"	عمر
طلسم خیال	"	"	عہ۴ر
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	"	عہ۸ر
پریم کا جادو	سراج الدین احمد	"	عہ۸ر
شعلے	احمد علی ایم اے	"	عمر
آتش پارے	سعادت حسین منٹو	"	عمر
روسی افسانے	"	"	عمر
نظر کے دھوکے	بدر شکیب	"	عہ۴ر
محشرستان	محشر عابدی	"	عہ۸ر
حماقت نامے	سات مشہور ادیب	"	عہ۸ر
ایک کہانی	چھ مشہور ادیب	"	۶ر
جوہر ادب	عباس حسین	"	عمر
عورتوں کے افسانے	کوثر چاند پوری	"	عہ۴ر

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
دنیا کی حور	کوثر چاند پوری	افسانے	عمر
دلگداز افسانے	"	"	عمر
دردناک افسانے	نسیم انہونوی	"	عگار
ریزۂ مینا	پچاس مشہور ادیب	"	سے ر
اخوان الشیاطین	افضل حسین چشتی	"	عہ۴ر
موپساں کے افسانے	نصیر حیدر	"	عمر
صدائے جرس	والدہ سراج الدین ظفر	"	عہ۴ر
لاشوں کا شہر	"	"	عہ۸ر
پھول اور کلیاں	ٹیگور	"	عہ۴ر
خاموشی حسن	"	"	عہ۴ر
نیلوفر	حسن عزیز جاوید	"	عہ۴ر
ساز فطرت	"	"	عہ۴ر
عورت اور دیگر افسانے	رشید جہاں	"	عمر
طلسمات	عابد علی عابد	"	عمر
سیاہ کار	محمد باقر نسیم	"	عمر
غریب کی آہ	ہری کرشن	"	۱۲ر
چاند کا گہنا	مہدی علی خاں	"	عگار
اندھی دنیا	اختر انصاری	"	عمر
نانڈوا اور دیگر افسانے	"	"	عمر
میری ناتمام محبت	حجاب امتیاز علی	"	عہ۹ر
تحفے	"	"	عہ۸ر
صنوبر کے سائے	"	"	عمر
نیرنگ	ایس۔ آر۔ کے	"	عہ۸ر
شرارے	آہ سیتاپوری	"	عہ۴ر
تین پیسے کی چھوکری	قاضی عبدالغفار	"	عہ۸ر
لیلےٰ کے خطوط	"	"	عہ۴ر
مجنوں کی ڈائری	"	"	عمر
عجیب	"	"	عمر
انوکھی مصیبت	حیات اللہ انصاری	"	۱۲ر
منزل	علی سردار جعفری	"	۱۲ر
الہامی افسانے	مرتضیٰ احمد خاں	"	عگار
زاد راہ	منشی پریم چند	"	عمر
آخری تحفہ	"	"	عہ۴ر

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
خواب وخیال	منشی پریم چند	افسانے	عہ۸ر
دلدات	"	"	عہ۸ر
جوش فکر	سلطان حیدر جوش	"	عہ۸ر
خطوط کی ستم ظریفی	عظیم بیگ چغتائی	"	۸ر
چغتائی کے افسانے	"	"	ےر
روح ظرافت	"	"	عہ۸ر
روح لطافت	"	"	عہ۸ر
گناہ کی راتیں	ایم اسلم	"	عہر
رقاصہ	"	"	عمر
تفسیر حیات	"	"	ع۸ر
کارزار حیات	"	"	ع۸ر
لمحات رنگین	زبیدہ سلطانہ	"	عار
حاجی لق لق کے افسانے	حاجی لق لق	"	۱۲ر
درانتی	"	"	عمر
کیفستان	قیسی رامپوری	"	عمر
سیب کا درخت	قاضی عبدالغفار	"	۱۲ر
ڈاچی	اوپندر ناتھ اشک	"	عہ۸ر
صحرائی	ناکارہ حیدرآبادی	"	عہ۸ر
کیلے کا چھلکا	سندباد جہازی	"	عہر
اندھا دیوتا	مرزا ادیب	"	۱۲ر
صحرانورد کے خطوط	"	"	ع۸ر
لق لقہ	حاجی لق لق	نظم	عہر
موج تبسم	شوکت تھانوی	مزاحیہ	عار
سیلاب تبسم	"	"	عار
بحر تبسم	"	"	عار
دنیا کے تبسم	"	"	عہ۸ر
سودیشی ریل	"	"	عہر
منشی جی	"	"	عہر
خانم خاں	"	"	عہر
سوتیا چاہ	"	"	عمر
برسبس	"	"	عہر
خنداں	رشید احمد صدیقی	"	ع۸ر
مضامین رشید	"	"	عار
سات طاقتوں کی کہانیاں	فراق دہلوی	"	ہر

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
تماشہ پر تماشا	ناکارہ	مزاحیہ	۴ر
گہوارۂ تبسم	عباس حسین	مزاحیہ دیوان	۴ر
مسز کرد علے	عظیم بیگ چغتائی	" ناول	عمر
کمزوری	"	"	عمر
کھرپا بہادر	"	"	عمر
دیکھا جائے گا	"	"	عمر
کولتار	"	"	عار
ویمپائر	"	"	عار
فل بوٹ	"	"	عمر
آدم خور	"	"	عہ۸ر
شہزوری	"	"	۸ر
خانم	"	"	للعمر
میدان عمل	منشی پریم چند	ناول	ع۸
گئودان	"	"	ےر
غبن	"	"	ع۸ر
پردہ مجاز	"	"	ع۸ر
قلوپطرہ	سلمیٰ تصدق	"	ع۸ر
داستان	پیری لوی	"	عار
دوشیزۂ صحرا	صادق الخیری	"	عہ۸ر
بغداد کا جوہری	اشرف صبوحی	"	عمر
لالہ رخ	ل۔ احمد	"	ع۸ر
عورت ذات	ملا رموزی	"	ے۸ر
لاٹھی اور بھینس	"	"	عہ۸ر
شفاخانہ	"	"	عہ۸ر
زندگی	"	"	ع۸ر
سہاگ رات	پنڈت کرشنا	"	ع۸ر
تائیس	مولوی عنایت اللہ	"	ع۸ر
نجم السحر	"	"	ع۸ر
سلامبو	"	"	ےر
ہیملٹ	"	ڈرامہ	عمر
انطونی کلا پطرہ	"	"	عمر
ہیرودیاس	"	"	۱۲ر
پروین وثریا	شاہد احمد	"	عمر
فاؤسٹ	"	"	عہ۸ر

پتہ :- کتب خانہ علم وادب اردو بازار دہلی

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
نرگسی جمال	شاہد احمد	ڈرامہ	عہ ر
ریڈیو ڈرامے	فضل حق قریشی	”	عہ ر
لیڈر	”	”	۳ر
تعلیم زدہ بیوی	”	”	۸ر
نجمہ نوری	انصار ناصری	”	۱۲ر
سلمیٰ	”	”	۸ر
روح سیاست	نور الٰہی محمد عمر	”	۸ر
پیلی پاس میلی ساند		”	۱۲ر
ظاہر باطن	فضل الرحمٰن	”	عہ ۸ر
نئی روشنی	”	”	عہ ۸ر
حشرات الارض	”	”	عہ ۸ر
معلم اسود	اشتیاق حسین قریشی	”	۱۲ر
سولہ سنگار	سدرشن	افسانے	عہ ۸ر
چندن	”	”	عہ ۸ر
چٹکیاں	”	”	۶ر
کنج عافیت	”	”	۶ر
خوش انجام	”	”	۴ر
پارس	”	”	۱۴ر
محبت کا فسانہ	ل۔احمد	ناول	عا ر
انشائے لطیف	”	افسانے	عا ر
زندگی کے کھیل	”	”	عہ ر
نغمات	”	”	عہ ر
چنگاریاں	چھبیل داس	سیاست سیر سوانح	۱۲ر
سوشلزم	”	”	۸ر
ہٹلر کیا چاہتا ہے	”	”	۱۲ر
میری جد وجہد	ہٹلر	”	عا ۸ر
مسولینی کی آپ بیتی	مسولینی	”	عہ ۸ر
تاریخ مسلم لیگ	اختر حسین بی اے	”	عا ۸ر
اسٹالن	شانتی نرائن	”	عہ ۸ر
اسٹالن	تیرتھ رام	”	۱۲ر
اسٹالن	گوپال متل	”	۶ر
اسٹالن	محمد اشرف	”	۶ر
لینن	ڈاکٹر اشرف	”	عہ ر
لینن	دھرم دیو	”	۴ر

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
غلامی کا انسداد	ٹالسٹائی	سیاست سیر سوانح	۱۲ر
راجا و پرجا	”	”	۱۳ر
ہمارے زمانہ کی غلامی	”	”	۶ر
ہٹلر اعظم	چندر شبکو	”	عا ۸ر
ہم سوراج کیوں چاہتے ہیں	چھبیل داس	”	۴ر
وفاق ہند	مظہر انصاری	”	عہ ر
یورپ کی حکومتیں	ڈاکٹر نجم الدین	”	عہ ۸ر
تحریک مدح صحابہ	مظہر علی اظہر	”	۱۰ر
سلاطین قائدین اسلام	یوسف احمد	”	عہ ر
سوویٹ روس	جواہر لال نہرو	”	عہ ر
میری کہانی	”	”	للعہ ر
تلاش حق	گاندھی جی	”	سے ر
قوم کی آواز	”	”	عہ ر
نپولین بوناپارٹ	دھرم دیو	”	۱۰ر
اتاترک	محمد مرزا	”	عا ر
مسلمانان ہند کی؟	”	”	
حیات سیاسی	”	”	عہ ۸ر
عہد حاضر کے بڑے لوگ اول	”	”	۸ر
ایضاً دوم	”	”	۸ر
” سوم	”	”	۸ر
” چہارم	”	”	۸ر
دنیا کی کہانی	پروفیسر مجیب	”	عہ ۲ر
گاندھی جیون	ظفر نیازی	”	عہ ر
دولت غزنویہ	محمود الرحمٰن ندوی	”	عا ر
پیغام آزادی	تلک	”	عا ر
سرمایہ داری	عبداللہ ملک	”	۲ر
تعمیر نو	عبداللہ انور بیگ	”	عہ ۴ر
جنگ آزادی	غلام حید	”	عہ ۲ر
مسلمانوں کا ماضی و حال مستقبل	میاں بشیر احمد	”	۴ر
راجہ رکسان	عبداللہ بٹ	”	۶ر
کمونسٹ مینو فسٹو	باری علیگ	”	۶ر
انقلاب فرانس	”	”	۶ر
کارل مارکس	باری علیگ	”	۶ر
غدر ۱۸۵۷ء	شیخ حسام الدین	”	عہ ر

ہر کتاب ...

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
مسلمانانِ ہند کی سیاست ملی	ابن زبیری	سیاست سیر سوانح	۱۰ر
سیاسیات ہند	سرجان	〃	عہ ر
اصلاحات ہند	〃	〃	عہ ر
مسولینی	خواجہ احمد عباس	〃	۵ر
محمد علی	〃	〃	۵ر
محمد علی جناح		〃	۸عہ ر
لیگ آف نیشنز	ایم ایچ بھٹی	〃	۱۲ر
دیولیرا	تیرتھ رام	〃	عہ ر
شہید میکسونی	پنڈت اندر	〃	۱۲ر
انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ		〃	۸ر
گیری بالڈی	لاجپت رائے	〃	عہ ر
سیرۃ سید احمد شہید	ابوالحسن ندوی	〃	عا ر
مضامین محمد علی اول	مولانا محمد علی	〃	۸ر
〃 〃 دوم	〃	〃	۸ر
تقاریر ظفر علی خاں	مولانا ظفر علی	〃	۹ر
انقلاب عثمان	آغا رفیق	〃	۸عہ ر
تاریخ جمالیات	مجنوں گورکھپوری	〃	عا ر
ہندوستان کی بہادر عورتیں	〃	〃	۸ر
آغاز ہنسی	〃	〃	۱۲ر
مسلمانوں کا درخشاں مستقبل	طفیل احمد	〃	۸ر
حکومت خود اختیاری	〃	〃	عہ ر
ابلیس کا خطبہ صدارت	نظامی پریس	〃	۸ر
انقلاب دہلی	〃	〃	۸عہ ر
تہذیب عمل		〃	عہ ر
اقبال دلہن	بشیر الدین احمد	اخلاقی ناول	۸عہ ر
حسن معاشرت	〃	〃	عہ ر
عصائے پیری	〃	〃	عہ ر
بچیوں سے دو دو باتیں	〃	〃	عہ ر
فرامین سلاطین	〃	فرمان	۸ر
فغان اشرف	اشرف جہاں	اخلاق ناول	۸عہ ر
ابن الوقت	مولوی نذیر احمد	〃	عہ ر
رویائے صادقہ	〃	〃	عہ ر
محصنات	〃	〃	عہ ر
ایامیٰ	〃	〃	عہ ر

نام کتاب	مصنف	موضوع	قیمت
مراۃ العروس	مولوی نذیر احمد	اخلاق ناول	۱۲ر ۸ر
توبۃ النصوح	〃	〃	عہ ۱۰ر
بنات النعش	〃	〃	۱۲ر ۸ر
چند پند	〃	نصیحتیں	۸ر
منتخب الحکایات	〃	〃	۸ر
محبوب خدا	چودھری افضل حق	سیرۃ نبی	۸عہ ر
موتی	یوسف بخاری	اقوال	۱۲ر
خواب و خیال	مجنوں گورکھپوری	افسانے	عا ر
مجنوں کے افسانے	〃	〃	۱۲ر
مصری افسانے	سجاد میرٹھی	〃	۸ر
خیالستان	سجاد حیدر	〃	۸عہ ر
جمالستان	نیاز فتحپوری	〃	[illegible]
نگارستان	〃	〃	عا ر
شہاب کی سرگزشت	〃	〃	عہ ر
داستان غدر	میر مہدی مجروح	داستان	عہ ر
الف لیلے		〃	۸عہ ر
چہار درویش	میر امن	〃	۸ر
فسانہ عجائب			۱۲ر
حاتم طائی			۸ر
خطوط شبلی	عطیہ فیضی	خطوط	عہ ر
خطوط اکبر	خواجہ حسن نظامی	〃	۸عہ ر
مکاتیب اکبر	〃	〃	عہ ر
خطوط سرسید	سرسید	〃	ے ر
لڑکیوں کی انشا	راشد الخیری	〃	۱۲ر
انشائے بشیر	بشیر الدین احمد	〃	۸عہ ر
زنانہ خطوط	مولانا خاموش	〃	۵ر
ٹیپو سلطان	امجد علی	سوانح	۱۲ر
افسانہ پدمنی	مولوی احتشام الدین	تنقید	عہ ر
مطالعہ حافظ	〃	〃	۸عہ ر
افادات سلیم	وحید الدین سلیم	مضامین	عا ر
نگارشات	آغا محمد باقر	〃	۸عہ ر
گیتان جلی	ٹیگور	نظم	عہ ر
ڈرامہ اکبر	محمد حسین آزاد	ڈرامہ	عہ ر
نیرنگ خیال	〃	مضامین	۸عہ ر

نئی کتابیں

نازو اور دوسرے افسانے — یہ افسانے زندگی کی جانگداز داستانیں ہیں جنہیں سماج کی بصیرت افروز مرقع بھی شامل ہیں اور محبت کے دلفریب رومان بھی۔ اگر جذبات کی سچی ترجمانی اور جذبات کی کامیاب تصویر دیکھنی ہے توان افسانوں کا مطالعہ فرمائیں۔ از اختر انصاری قیمت مجلد عہ ر

باقیات بجنوری — ڈاکٹر عبد الرحمان بجنوری مرتب دیوان غالب نسخہ حمیدیہ کی بہترین انشا پردازی کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ کتاب مندرجہ ابواب پر مشتمل ہے۔
گوتا مجلی، وضع اصلاحات علمیہ، سیر لکھنؤ، داشتہ آید بکار، مکاتیب منظومات، مع مقدمہ پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ قیمت مجلد عگ ر

خنداں — یہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو چکی ہیں ان میں آپکو وہی اعلیٰ قسم کا مزاح، لطیف ترین طنز اور خواہ مخواہ دل کو گدگدا کر محظوظ کرنے کی صفات ملیں گی۔ جو مضامین رشید میں پائی ہونگی مجلد عگ ر

ہم اور وہ — یہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ پیش رفتگاں بہت اچھے تھے اور ماضی قریب اور زمانہ حال کے لوگ بہت برے ہیں ان کا حال ناگفتہ اور مستقبل بد سے بدتر نظر آتا ہے۔ خواجہ شفیع صاحب نے اس متنازعہ فیہ مسئلہ پر نہایت حسن و خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ایک طویل بحث کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بزرگ بُرے تھے جو آزاد پیدا ہوئے اور غلام مرے یا ہم برے ہیں جو غلام پیدا ہوئے اور آزاد مرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ نسل بری تھی جس نے آنکھیں بند کر کے آزادی عیش کی بھینٹ چڑھا دی یا موجودہ نسل بری ہے جو باوجود بے دست و پائی کے ہاتھ پیر ہلا رہی ہے۔ قیمت ۱۲ ر

روپ متی — روپ متی اور باز بہادر کا افسانہ عشق و محبت تاریخ ہندوستان کا ایک ارماں آفریں واقعہ ہے جسے جناب خواجہ شفیع صاحب نے از سر نو تازگی بخشی ہے۔ ڈرامہ کی تاریخی حقیقت حسن و عشق کی ہنگامہ آرائیاں ناز و نیاز کی سرمستیاں ایسے عجیب و لطیف انداز سے پیش کی ہیں کہ پڑھنے والا اس فضا میں مدہوش ہو جاتا ہے ۱۲ ر

ہٹلر کیا چاہتا ہے — بین الاقوامی سیاست کے ایک ماہر کے قلم سے۔ کتاب کا مضمون نام سے ظاہر ہے۔ مجلد ۱۲ ر

آئندہ زمانہ — محمد فضل الرحمٰن صاحب بہترین مزاحیہ سماجی ڈرامہ۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر

جدید جغرافیہ پنجاب — پنجاب کی سیاسی جماعتوں کے بڑے بڑے لیڈروں، وزراء اور ارباب حکومت کی سیرت رمز کنایہ کے پیرائے میں مزے مزے کی چوٹیں۔ لطیف اشارے سند باد جہازی نے اس کتاب میں سیاسیات کو ظرافت اور ظرافت کو جغرافیہ میں ایسا سمویا ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ پڑھ کر مزے لیتے اور قہقہے لگاتے ہیں۔ قیمت مجلد عہ ر

نمستے علیکم — ادیب شہیر حضرت ایم اسلم کی تازہ ترین تصنیف قیمت مجلد عہ ر

بحر تبسم — حضرت شوکت تھانوی کے ان بائیس مضامین کا مجموعہ جن میں کا ہر مضمون مزاح لطیف کا ایک معیار تسلیم کیا گیا ہے قیمت مجلد عگ ر

منشی جی — ایک ہی کردار کی گیارہ مضحکہ خیز تصویریں جن کو مزاحیہ رنگ میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ منشی جی کا ہیولیٰ پورے خدوخال کے ساتھ پیش نظر ہو جاتا ہے اور ان کی گھریلو زندگی ہر نقشہ پڑھنے والے کے لئے دیوار قہقہہ کر دیتا ہے قیمت عہ ر

ادب اور زندگی — حضرت مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ اس میں سے اکثر مضامین ریڈیو میں نشر بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت عہ ر

اخلاق اور فلسفۂ اخلاق — اصول اخلاق انواع۔ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق کے تمام گوشوں پر دلپذیر اور مکمل بحث اور اسلام کے ابواب اخلاق کی علمی تشریح جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ علم و تحقیق کے معیار پر تمام ملتوں کے ضابطہائے اخلاق کے مقابلہ میں واضح ہو جاتی ہے۔ از مولوی حفظ الرحمان سیوہاروی قیمت للعہ

غلامان اسلام — جس میں ان مقتدا ہستیوں کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و جستجو سے یکجا کئے گئے ہیں جن کو غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کی باوجود اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور اصلاحی کارنامے نقش دوام بنکر سینۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں۔ تالیف مولانا سعید احمد ایم اے قیمت للعہ

پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی

ایک دفعہ کا ذکر ہے ——! ہر کہانی بلاشبہ یوں ہی

"(ایک نئی پسند رومان بغداد)"

شروع ہوتی ہے اور ملک کے نامور ادیب جناب اشرف صبوحی نے بھی "بغداد کے جوہری" کا قصہ اپنے جدید طرز بیان کے ساتھ یوں ہی شروع کیا ہے مگر اردو زبان میں فطرت انسانی کی ایسی لاجواب تفسیر ایسے دلکش انداز میں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہو۔ یہ طویل افسانہ ایک نفیس و دلچسپ نفسیاتی نکتہ کا حل پیش کرتا ہے۔ عورت کی شوہر پرستی اور وفاداری اسے ہر نوع کی قربانی پیش کرنے کے لئے کیوں مجبور کر دیتی ہے۔ ہوس پرست حسن بن عاشق زار شوہر محبت کرنے والی بیوی کو کس جنونی جذبہ کے ماتحت آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور عورت اس کا جواب کس ہمت بیدار کے ساتھ دیتی ہے اس کا جواب اس ناول میں آپ سطر بہ سطر پائیں گے

بہت سے شوہر بغداد کے احمد جوہری کے آئینۂ زندگی میں اپنا مجرم چہرہ پائیں گے۔ اکثر نیک نفس بیویاں، انیس جلیس جیسی عفت مآب اور دیوانۂ شوہر بیوی بننا پسند کریں گی۔

خلیفۂ حمزہ کے حرم کے راز سربستہ۔ بغداد کی روزمرہ زندگی خالص الف لیلائی ماحول۔ عیش و تنعم کی دہکتی ہوئی آگ۔ روح کی بیباک تمنائیں۔ عورت کا تڑپتا ہوا دل مرد کی ہوس کارانہ جنوں سامانیاں پُر تکلف ایوان۔ لق و دق صحرا۔ رنج، راحت، مسرت و کلفت پہلو بہ پہلو۔

احمد جوہری اور انیس جلیس کی پُر سوز اور حیرت انگیز داستان محبت و زندگی آپ کو ایک طلسم بیخودی میں لیجا کر چھوڑ دے گی۔ بہت بلند پایہ تصنیف ہے اور بلاشبہ افسانہ طرازی کا ایک اعجاز ہے۔ نفیس عبارت۔ بلیغ طرز بیان۔ چست و رواں عبارت پڑھنے والے کو حواس پہ چھا جاتی ہے۔ سرورق نہایت خوشنما۔ مجلد عہ

لالہ رخ ایڈیشن جدید مصور: انگلستان کے مشہور شاعر طامس مور کی مثنوی جو خالص مشرقی تصورات اور نازک تخیلات عشق پر مبنی ہے تین ہزار گنی دے کر لانگ کمپنی نے اسے شائع کیا تھا اور تمام انگریزی داں طبقہ اس کو دیکھ کر چونک پڑا تھا۔ افسانے کا پلاٹ رومان اور طلسم کی ایسی دنیا میں آپ کو پہنچا دیگا کہ آپ خود اس قصہ کا ایک کردار بننا پسند کریں گے۔ مقنع (نقاب پوش پیغمبر)" آتش پرستاران فارس" "پری اور بہشت" اور "نور محل" چار قصے ہیں۔ ترجمہ ملک کے نامور ادیب ل۔ احمد اکبرآبادی نے کیا ہے۔ کتب خانہ علم و ادب۔ اس کو مصور چھاپنے کے لئے تقریباً تین درجن آرٹ کی بہترین تصاویر کا اہتمام کیا ہے جو اس کے ایک ناپید ولایتی ایڈیشن سے خاص طور پر زر کثیر صرف کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ اردو میں ایسی بے مثل کتاب نہیں چھپی۔ بہترین کاغذ۔ بے پناہ ادب و رومان۔ دلنشین تصاویر اور دیدہ زیب آرائش کے ساتھ اس نادر ادبی کارنامہ کو شائع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد عہ علاوہ محصول ڈاک

مسلمانان ہند کی حیات سیاسی!

ہندوستان کے مسلمانوں کی صد سالہ سیاسی زندگی کا مکمل جائزہ!! اہم وطنی تحریکوں میں مسلمانوں نے کیا شاندار قربانیاں پیش کیں ——؟ ایک شاندار مرقع!! سیاست ماقبل اور مابعد جنگ پر نہایت بے لاگ مدلل اور بصیرت افروز تبصرہ!!!

نظریہ قومیت متحدہ کا بطلان خالص سیاسی اور منطقی نقطۂ نظر سے کانگریس کی متعصبانہ سرگرمیوں اور ریاکارانہ سیاسی چالاکیوں کا صحیح ترین نقشہ، خود اس کی اپنی پچاس سالہ سیاسی زندگی کی تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے ان پر بڑی جامعیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ ایک بلیغ انداز تحریر میں روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سب اہم ملکی مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے جن سے اس وقت جداگانہ مسلم قومیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔

مسلم لیگ کے درخشاں کارناموں، اور اس کے سیاسی مسلمات اور جداگانہ مسلم سلطنت کے قیام کی اسکیم کا صحیح جائزہ۔ اور دوسری "نیم سیاسی نیم مذہبی" جماعتوں" (خلافت"، "جمعیۃ العلماء" "احرار وغیرہ) کی مکمل تاریخ اور ان کا نصب العین بھی پیش کر دیا گیا ہے اور ملک کے حالات و واقعات کی روشنی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ یہ جماعتیں کس حد تک مسلمانوں میں انتشار اور لامرکزیت پیدا کرنے کی ذمہ وار ہیں!۔

اس کے علاوہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء تک کے سیاسی حالات نہایت جامعیت کے ساتھ اس کتب میں درج کر دئے گئے ہیں حتیٰ کہ حال ہی کے کیکسٹن ہال (لندن) کے سانحہ (قتل سر مائیکل اوڈوائر سابق گورنر پنجاب اور اس کے ردعمل کے امکانات پر بھی نہایت صفائی سے بحث کی گئی ہے!! غرض مسلم سیاست پر یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ اس سے بہتر کتاب آج تک نہیں لکھی گئی جو مصنف کے سالہا سال کے سیاسی افکار و مطالعہ اور صحافتی تجربہ کا نتیجہ ہے۔

ہر مسلمان پر جو اپنے ملک اور اپنی سیاست سے دلچسپی رکھتا ہے اس کا پڑھنا فرض ہے!

کتاب ایک محدود تعداد میں طبع ہوئی ہے۔ اس لئے اپنی کاپی حاصل کرنے کے لئے جلد لکھئے۔ ضخامت ۲۰۶ صفحات، کتابت طباعت نہایت پاکیزہ اور دیدہ زیب۔ مجلد قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
مع محصول ڈاک، فی پرچہ ۸؍
ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ

جرعات

ہر سال ساقی کے ... شائع ہوتے ہیں ... خریداروں سے الگ نہیں ...

جلد ۲۲ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء | نمبر [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

سالنامہ ساقی کیلئے جو مضامین موصول ہو چکے ہیں اُن کی فہرست آپ کو اِسی اشاعت میں کسی اور صفحے پر نظر آئے گی۔ اُس پر آپ ایک نظر ضرور ڈال لیں تاکہ سالنامے کی قدر و قیمت کا آپ کو کسی حد تک اندازہ ہو جائے۔ سالنامے کی ایک نمایاں خصوصیت جس کی طرف ہم آپ کو بطورِ خاص متوجہ کرنا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اس میں چند نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں اور یہ نئے لکھنے والے ایسے ہیں کہ ان کے مضامین پڑھکر آپ پھڑک جائیں گے۔ یہاں شاید اس امر کا اعادہ کرنا بیجا نہ ہو گا کہ صرف ساقی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہر سال چند ایسے جوہرِ قابل پیش کرتا ہے جن سے ادب جدید کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور جو صحافتِ اُردو کیلئے باعث فخر ثابت ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ہم نے محترمہ عصمت چغتائی اور جناب سید رفیق حسین صاحب کو متعارف کرایا تھا۔ اور اب اُردو رسائل کے اعلیٰ درجے کے لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سالنامے میں مسٹر بلونت سنگھ، مسٹر عصیم بیگ چغتائی اور مسٹر مدھوسودن کے افسانے پڑھکر آپ خود فیصلہ کرینگے کہ ہماری نظرِ انتخاب کیسی رہی۔

چار سال کے طویل عرصے کے بعد مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی سے ملنا ہوا۔ اُن کی حالت دیکھکر دل کٹ گیا۔ چار سال سے صاحبِ فراش ہیں۔ ٹی، بی، جیسے موذی مرض میں گرفتار۔ جاورہ کا چیف جج اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح گذارہ کر رہا ہے۔ اُن کے صبر و استقامت کو شاباش ہے کہ زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آتا۔ صحت نے ساتھ چھوڑ دیا ہے مگر مایوسی کے بجائے مطمئن اور ایک حد تک بشاش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس زمانے میں مرض کی شدت کچھ کم ہو جاتی ہے تو لیٹے ہی لیٹے کچھ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ہمارے ایک مشہور رسالے کے اڈیٹر صاحب کی ستم ظریفی کا ایک واقعہ چغتائی صاحب نے سُنایا۔ اڈیٹر صاحب بگڑ رہے تھے کہ چغتائی صاحب نے انہیں بھلا دیا اور ساقی کو برابر مضامین دے رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ عصمت صاحبہ سے بھی "ساقی ہی" میں لکھوا رہے ہیں۔ (حالانکہ عصمت صاحبہ کے مضامین سے چغتائی صاحب کو کوئی واسطہ نہیں۔) اڈیٹر صاحب نے پیشکش کی تھی کہ ساقی کے بجائے خود اُن کا رسالہ موجود ہے جو معاوضہ بھی دے گا۔ اس لئے مضامین وی۔ پی بھیجے جائیں۔ چغتائی صاحب نے بتایا کہ "اڈیٹر صاحب کے حکم کے مطابق انہیں ایک مضمون وی۔ پی بھیجا گیا جو واپس کر دیا گیا۔ شکایت کرنے پر دوبارہ مضمون کا وی۔ پی طلب کیا گیا اور دوبارہ واپس کر دیا گیا۔ وجہ نہ معلوم۔ عصمت صاحبہ کہتی ہیں کہ میں اپنا کوئی مضمون کسی قیمت پر بھی اُن کے رسالے میں نہیں بھیج سکتی۔ اب بھلا بتائیے کہ مجھ سے شکایت کیوں کی جاتی ہے۔ رہا ساقی کا معاملہ! اُن تعلقات کو بھی اگر نظر انداز کر دیا جائے جو دس سال سے ہمارے اور آپ کے خاندان کے چلے آتے ہیں، تب بھی لکھنے والے یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ کسی ایسے پرچے میں اُن کا مضمون شائع ہو جو پڑھے لکھے طبقہ میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ اس طرح مضمون کی وقعت کچھ بڑھ سکتی ہے، گھٹ نہیں سکتی"۔

چغتائی صاحب سے ملاقات کا حال ایک مستقل مضمون چاہتا ہے جو کبھی لکھا جائے گا۔ انشاءاللہ۔ اُن کے چھوٹے بھائی مرزا عصیم بیگ کا مضمون بھی سالنامہ ساقی میں، دیکھئے اڈیٹر صاحب موصوف خدا جانے کتنے ناراض ہونگے!

ہمیں افسوس ہے کہ نومبر ۴۹ء کے ساقی میں جناب احمد ندیم قاسمی کی نظم کا آخری شعر غلط چھپ گیا۔ آخری شعر یوں ہونا چاہیئے۔

سُنتا ہوں جب افلاس کی پُر درد کراہیں
احساس کی قندیل سے جلتی ہیں نگاہیں

"شاہد"

تہذیب کا مستقبل

کھیل تفریح

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کھیل اور تفریح نے دُنیا کو ایک عظیم صنعت کے اسباب مہیا کر دئے ہیں۔ قریباً چار کروڑ چالیس لاکھ پونڈ سالانہ گولف (Golf) پر یعنی گیند کو چند سُو راخوں میں کامیابی کے ساتھ پہونچانے میں صرف ہوتے ہیں۔ اس سے کئی گُنا زیادہ فٹ بال، کرکٹ، ٹینس اور دیگر کھیلوں پر ہر سال صرف کیا جاتا ہے۔ سینما اور تھیٹر جیسی تفریح گاہوں میں جو روپیہ لگایا جاتا ہے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آئندہ بھی یہی حالت برقرار رہیگی۔

میرا خیال ہے کہ آنیوالے دَور میں ہماری نسلیں کام اور کھیل میں ایسی غیر شعوری تفریق کو جائز نہ رکھیں گی جیسی ہم نے کر رکھی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لکڑی میں کیل ٹھوکنا کیوں کام تصوّر کیا جاتا ہے اور گیند کا سُوراخ میں ڈالنا کھیل۔ ایک شخص کرکٹ کھیلتا ہے اور اُسے تفریح بتاتا ہے دوسرا اُسے کام کہتا ہے۔ درحقیقت کوئی ایسی شئے معلوم کرنا جو کہ محض تفریح کہی جا سکے بہت دشوار ہے۔ سینما میں نہایت آرام دہ کرسی پر بیٹھکر تصویر دیکھنا بھی کام کی ضمن میں آجاتا ہے جبکہ ایک نقاد کو اس کے لئے اُجرت دی جاتی ہے کہ وہ عوام کو یہ بتائے کہ کونسی فلم زیادہ تفریح بخش اور لائق تحسین ہے۔ لیکن کام اور کھیل میں تفریق کے لئے یہ نقطۂ نظر آئندہ مقبول نہ رہ سکے گا۔ ممکن ہے کہ ہماری نسلیں ہر شغل کو کام تصور کریں بلکہ گمان غالب تو یہ ہے کہ ان کو ہر شغل میں سامانِ تفریح نظر آئیگا۔ یہ امتیاز نقطۂ نظر کے اختلاف پر مبنی ہے اسلئے یہ مسئلہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

یہ کہاوت کہ مشقت بغیر تفریح کے، بچّے کو کُند اور غبی بنا دیتی ہے، صحیح نہیں جب تک کہ کام کی تعریف آپ یوں نہ کریں کہ ہر وہ شغل جو آپ کرنا نہ چاہتے ہوں لیکن کسی دوسرے شغل کے وقت آپ کو کرنا پڑے کام ہے۔ تفریح کے اُصولوں کو کچھ ایسا پس پشت ڈالدیا گیا ہے کہ اب لوگ کام کو مفرّح خیال کرنے لگے ہیں۔ اور اس سے پہلے کبھی یہ وقت نہ آیا تھا کہ محض کسب معاش ہی کیلئے نہیں بلکہ دماغی مشغلہ کیلئے کام کی تلاش ہوتی ہو۔ بہتیرے کھیل تفریح کے طریقے ایسے بنائے گئے ہیں کہ ان میں کم سے کم دماغ صرف کرنا ہو کیونکہ ہمارا تخیل ہی یہ ہے کہ غور و خوص اور تفریح ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتے۔ اب رفتہ رفتہ یہ احساس پیدا ہو رہا ہے اور آئندہ اس میں اور ترقی ہوگی کہ دماغ کو معطل رکھنے کا لازمی نتیجہ ذہنی اور جسمانی تنزل ہے۔

بہائمی جذبات پر، جنکی تحت میں کھیل ایجاد کئے گئے تھے قابو حاصل کر لیا جائے گا۔ اور لوگ یہ محسوس کرینگے کہ خونریزی کی تشنگی بجھانا اور اعتدال سے زاید کھانا اور پینا ایک ہی قسم کے "کھیل" ہیں۔ تھوڑا ہی زمانہ ہوا جبکہ نیزے، بھالے اور تلواروں سے لڑنا لوگوں کا عام مشغلہ تھا۔ اس سے کچھ اور قبل لوگوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنا یا انسانوں کا درندوں کی نذر کیا جانا "تفریح" میں شامل تھا۔ آج ہم اپنے کو کسی قدر ترقی یافتہ خیال کرتے ہیں اس لئے کہ جان لینے کے طریقوں میں ہم نے سائنس کے اُصولوں سے کام لیا ہے اور صرف خاص جماعتوں کے سامنے خُون بہایا جاتا ہے۔ لیکن اب بھی مردم کُشی سے بہت لوگوں کو تفریح ہوتی ہے۔ خرگوش اور لومڑی وغیرہ کے شکاری اپنی ناشایستگی پر یہ کہکر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ ان جانوروں کو بھی تگ و پو میں لطف آتا ہے جیسا رُومن کہا کرتے تھے کہ عیسائیوں کو شیروں سے پھاڑے جانے میں فرحت ہوتی ہے۔ لیکن آج کل کے میلانات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جانداروں کو ہلاک کرنا زیادہ عرصے تک سامانِ تفریح بنا نہ رہ سکیگا۔ بلکہ اگر اقتصادی نقطۂ نظر سے کسی خاص قسم کے جانوروں میں تخفیف کرنی ضروری سمجھی گئی تو وہ زیادہ آسانی اور بغیر تکلیف رسانی کے عمل میں لائی جائیگی۔ آئندہ نسلوں کو محض اس خیال ہی سے تنفر ہوگا کہ لومڑی کا خون نوجوان عورتوں کے چہروں پر ملنے اور انہیں حسین بنانے کے لئے کیا جائے اور اس کی دُم کو کھانے کے کمرے میں لٹکانا صد درجہ کی بد ذوقی سمجھی جائے گی۔ اگر لوگ ایسی ناشایستہ خواہشات کی تکمیل کرنی بھی چاہیں گے تو مصنوعی کلدار جانوروں کو دوڑا کر موٹروں پر ان کا پیچھا کر کے توڑ پھوڑ ڈالنے سے پورا حظ حاصل کر لیں گے۔ برقی خرگوشوں نے اب بھی زندہ خرگوشوں کی ایک حد تک جگہ لے لی ہے۔ اور رحمدل نشانہ باز مٹی کے کبوتروں کو کلوں کے ذریعے اڑا کر مشق

کرنے کو ایک پریشان مقید طائر کو پنجرے سے رہا کر کے مار ڈالنے پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اگر خون بہانا ہی ضروری ہوگا تو اس قسم کے مصنوعی جانور بنالئے جائیں گے جن میں خون کی رنگت کا عرق بھرا ہو اور اس عرق کو ایسا معطر کر دیا جائیگا کہ شوقین مزاج خواتین کو اُسے اپنے نازک چہروں پر مل کر کافی فرحت ہو۔

یہ تو آجکل بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ بہتیرے کھیلوں میں مہارت اور کامیابی کھلاڑیوں پر اتنی منحصر نہیں ہے جتنی کہ سائنسدانوں پر۔ ایک کھینے والی کشتی کی ساخت میں تھوڑی اصلاح سے اس کی رفتار میں وہ اضافہ کیا جا سکتا ہے جو چلانے والوں کی تمام کوششوں سے کہیں زیادہ ہو۔ ہوشیار انجنیر مختلف نمونوں کی کشتیاں بنانے میں سرگرم رہتے ہیں اور طرح طرح کے تجربے کیا کرتے ہیں۔ پھر کوئی دوڑ جیت لینے میں ملاحوں کا کیا کمال۔ جیت ہوئی تو ان موجدوں کی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تیز رفتاری ہی اگر مقصود ہے تو کیوں نہ موٹر والی کشتیاں استعمال کی جائیں اور بہت کچھ جسمانی تھکن اور قیمتی وقت بچا لیا جائے۔ ہم تیراندازی کی مشق پر ہنستے ہیں اور تیراندازوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ کیونکہ آجکل کے اسلحوں کے سامنے اس ہنر کی کوئی اہمیت نہیں۔ مگر لوگ کیوں ہزاروں کی تعداد میں کھینے والی کشتیوں کی دوڑ دیکھنے جاتے ہیں جبکہ ہم ان سے زیادہ تیز رفتار موٹر والی کشتیاں استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ سائنس کو کھیل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور آجکل کا مخلوط نظام ناقابل اطمینان اور عارضی ہے۔ ایک دن وہ آنے والا ہے کہ انعام کا حقدار موجد تصور کیا جائیگا اور کھیلوں اور دوڑوں میں۔ سائنسداں ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے۔ کامیابی کے فیصلہ کیلئے دارالتجربہ میں آزمائش کافی ہوگی اور جس کی ایجاد بہتر ثابت ہوگی اُسے انعام کا مستحق سمجھا جائیگا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ جن کھیلوں میں کامیابی اتفاقات پر مبنی ہے اُن سے زیادہ لوگ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے تو بہت اچنبھے کی بات ہے کہ صرف اس اتفاق کے جزو کو نکالنے کیلئے لاکھوں روپے صرف کئے جاتے ہیں۔ کرکٹ اور گولف کے میدانوں کو ہموار اور درست رکھنے میں کسقدر پیسے کی بربادی ہوتی ہے اور محض اس لئے کہ اتفاق کے ممکنات کم ہو جائیں۔ بلیارڈ (Billiards) کی میز اور گیندوں کے اختراع میں کس قدر صنعتی مہارت اور احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد اسی صنعتی استعداد کو کھیل کی صلاحیت سے تعبیر کیا جائے گا بجائے اس کے کہ اسکے استعمال کی داد دی جائے۔ کام اور کھیل میں ایک ممکن فرق یہی ہو سکتا ہے کہ ایک کا معاوضہ ملتا ہے اور دوسرا بلا معاوضہ ہوتا ہے۔ پھر بھی تعجب کی بات ہے کہ لوگ کھیل زیادہ پسند کرتے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ آئندہ ہر کام کھیل ہوگا۔ مثلاً انجنیر کے لئے باغبانی، باغبان کیلئے کرکیٹ، پیشہ ور کرکیٹ کے کھلاڑی کیلئے کوئلہ کھودنا، کھیل کی حیثیت رکھیں گے۔ کیا عجب ہے کہ ہوشیار حکومتیں کھیل کے بہانے ہی اپنے سب کام چلا سکیں!

بہت ممکن ہے کہ ماحول کی تبدیلی اور آرام کے متعلق پُرانے خیالات کی تجدید کی جائے۔ تعطیلوں سے بہ نسبت فائدہ کے نقصان زیادہ پہونچتا ہے۔ کیونکہ شہر کے کاروباری آدمی کا دماغ اس عرصہ میں بالکل معطل رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹروں کی آمدنی ایسے زمانہ میں بڑھ جاتی ہے۔ کام کے عادی دماغ کو بیکاری میں طرح طرح کے روگ لگ جاتے ہیں۔ مستقبل میں تفریح کے اسلوب ایسے ایسے ایجاد ہونگے جن سے دماغی ورزش بھی ہوتی رہے۔ ممکن ہے کہ کثیر الاشغال شخص کو ریاضی کے مسائل حل کرنے میں سبز میز پر سفید گیند لڑھکانے سے زائد لطف آئے۔ کھیل کے ساتھ خوشی اور حظ کا تخیل وابستہ ہے اور اکثر لوگوں نے خوشی کی جستجو میں اپنی حالت زبوں کر رکھی ہے۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ خوشی کو کھیل یا کام سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ سکا تعلق ذہنی احساس سے ہے۔ ممکن ہے کہ ماہرین فطرت انسانی خوشی حاصل کرنے کے اُصول دریافت کر کے اس مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہماری نسلیں گھونسہ بازی اور کشتی کی جگہ ذہنی، تخیلی اور منطقی کھیل ایجاد کریں گی۔ ایسے کھیلوں میں نہ مادی جسموں کے ملنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کثیر رقم ضائع ہوگی۔ جس طرح آجکل شطرنج کھیلی جاتی ہے اُسی طرح بہت سے بین الاقوامی مقابلے ٹیلیفون، لاسلکی اور ٹیلیویژن کے ذریعے تکمیل کو پہونچائے جا سکیں گے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ موٹر کشتیوں کی دوڑ انہیں بغیر یکجا کئے ہوئے عمل میں لائے گی۔ مثلاً ایک کشتی آسٹریلیا میں ہے اور دوسری انگلستان میں۔ ایک ہی وقت لاسلکی کے ذریعے اُن کی روانگی اپنی اپنی جگہ سے کی جا سکتی ہے اور اگر دونوں مناظر ساتھ ساتھ ایک ہی لہر کے پیمانے پر نشر کر دئے جائیں تو شائقین اپنے ٹیلیویژن کے آلوں پر اس دوڑ کو ایک ہی جگہ واقع ہوتے ہوئے دیکھ لیں گے اور ہار جیت کا فیصلہ بآسانی ہو جائے گا۔ حال ہی میں اس قسم کا ایک کرشمہ دکھایا جا چکا ہے۔ بمبئی میں ایک بٹن دباتے ہی امریکہ

کی نمائش گاہ کی ساری بتیاں روشن ہوگئیں۔ دولت اپنی آغوش ایک ایسے موجد کیلئے پھیلاتی ہے جس کی ایجاد تفریح کے ساتھ ساتھ دماغی نشوونما بھی کرسکے۔ ایسے کھیلوں کی طرف جن کا مقصد محض وقت گذارنا ہے کوئی اعتنا نہ کی جائے گی۔ مثلاً ٹینس اور کرکٹ بالکل بے فیض کھیل ہیں، دنیا کو ان سے کسی طرح مدد نہیں ملتی لیکن موٹر گاڑیوں کی دوڑ کم ازکم موجدوں کو ایسی صنعت میں طرح طرح کے تجربے کرنے پر آمادہ کرتی ہے جس سے تہذیب کو ترقی ہوتی ہے۔ ہوائی جہازوں کی دوڑ نے اگر کچھ نہیں تو کم ازکم اس غلط فہمی کو توڑ دیا کہ انسانی جسم دو سو میل سے زائد رفتار کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ اور اس دوڑ کی بدولت ہلکے طیاروں کی ایجاد ہوئی۔ موٹر کشتیوں کی دوڑ سے تجارتی جہازوں کی اسٹریم لائننگ (stream-lining) میں ترقی ہوئی جس کے نتائج ہمارے آرام میں اضافہ اور مصارف میں تخفیف ہیں۔

جسمانی مقابلے آنے والے دور میں متروک ہوجائیں گے کیونکہ اُبھرے ہوئے پٹھے (muscles) تنزلی کی علامت سمجھے جائیں گے۔ کوئی اگر اس بات پر فخر کرے گا کہ وہ ایک گھنٹہ میں دس میل دوڑ سکتا ہے تو لوگ اُس پر آوازے کسیں گے، کیونکہ بلامشقت اتنے ہی وقت میں موٹر کار دو سو میل لے جاسکے گی۔ ہماری نسلوں کو یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوگا کہ ۱۹۴۰ء کے لوگ ساری زندگی اور کثیر دولت بادبانی کشتیوں کی دوڑ پر صرف کرتے تھے حالانکہ موٹر کشتیاں نصف لاگت پر دوگنی رفتار کے ساتھ انہیں لے جاسکتی تھیں۔ کھیل اور تفریح زمانے کی ذہنیت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اور یہ معلوم کرکے کہ گھونسے بازی کے مقابلے میں ایک لڑنے والے کو پچاس ہزار پونڈ دوسرے مقابل کی ناک پر گھونسہ ماردینے کے عوض میں دیا گیا ایسا احساس ہوتا ہے کہ ابھی سائنس کا دور شروع ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر ناک توڑ دینا ہی قابل آفریں ہے تو پستول یا بندوق گھونسے سے کہیں زیادہ موثر ثابت ہونگے۔

یقین کیا جاتا ہے کہ دوسروں کو اُجرت دیکر اپنے لئے سامان تفریح مہیا کرنا بربری ذہنیت سمجھا جائے گا اور زیادہ عرصہ تک اس کا رواج باقی نہ رہیگا۔ کسی مشرقی حکمران سے جب یہ کہا گیا کہ آج شاہزادہ انگلستان اپنا ناچ دکھائیں گے تو جواب ملا کہ ہم تو اپنے ملک میں دوسروں کو معاوضہ دیکر اپنی تفریح کیلئے نچواتے ہیں۔ یہ خیال اُس زمانہ کے لئے بالکل درست تھا۔ لیکن آج بھی لوگوں کو فٹ بال اور گولف وغیرہ کھیلنے کی اُجرت دی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ چند لوگوں کو کچھ دیکر اپنے لطف کے اسباب جمع کرنا دماغی کاہلی کی دلیل ہے۔ اگر واقعی کمال و ہنر کی قدر کی جاتی تو موٹر انجنیر کو سب کھلاڑیوں سے زاید معاوضہ ملتا نہ کہ گولف یا ہاکی میچ جیتنے والوں کو۔ لوگ مکہ بازی کے مقابلے دیکھنے کیلئے جوق جوق اُمنڈ آتے ہیں اور اس ذوق کی ذمہ دار انکی یہ ذہنیت ہے کہ وہ بھی کسی کو مار کر پچھاڑ سکتے ہیں۔ انہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ بیہوشی کی سستی دوائیں تو سائنس بہت پہلے ایجاد کرچکی ہے۔ ٹینس کے بلّے اور گولف کی خمدار لکڑی سے ہاتھ کی صفائی اور مہارت دکھانا ایسے زمانے میں لوگوں کو نہیں بھا سکتا جبکہ مشینوں کا استعمال انسانی جسم سے کہیں بہتر شعبدے دکھا سکتا ہو گولف اگر کھیلا بھی گیا تو لاسلکی سے چلنے والے پتلے انسانوں کی جگہ لیں گے۔ کھلاڑی کلب میں بیٹھے ہوئے اپنی ریڈیو کی مشینوں کے ذریعے ان پتلوں کو چلائیں گے اور تماشائی گھر بیٹھے اپنے ٹیلیویژن کے آلہ پر اس کھیل کا لطف اُٹھائیں گے۔ آجکل تو لوگ بغیر کھیل میں حصہ لئے کھلاڑی کہلانے لگتے ہیں۔ تھوڑے چاندی کے کپ کسی کلب کو پیش کردئے اور "ایک مشہور کھلاڑی" کا لقب مل گیا۔

مقصد کہنے کا یہ تھا کہ کوئی کھیل محض وقت گذارنے کیلئے نہ کھیلا جائے گا۔ مستقبل میں 'وقت' کی اہمیت پوری طرح سمجھ لی جائیگی۔ انسان سے اس کا وقت چھیننے کا صرف ایک طریقہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اُسے بیہوش کردیا جائے۔ آپ اس سے ٹیکس وصول کرسکتے ہیں یہاں تک کہ جسم پر ایک کپڑا نہ رہ جائے۔ آپ اس کی سب دولت چرا سکتے ہیں، آپ اسے بھوکا مار سکتے ہیں لیکن آپ اس کے دن کے چوبیس گھنٹوں میں اور ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ میں کوئی کمی نہیں کرسکتے۔ وقت گذارنے کی کوشش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وقت یہ کام خود بلامنت غیر کرسکتا ہے۔ اگر ہم کسی محدود وقت میں معمول سے دوگنا بھی کام کریں تو بھی ہم وقت کو بچا نہیں سکتے البتہ اس فعل سے ہم نے مشقت میں ضرور تبدیلی پیدا کردی۔ کھیل اور تفریح کا سارا انحصار 'وقت' پر ہے۔ آج کل کی سوسائٹی کے برگشتہ نظام میں چونکہ غیر محدود وقت بیکاری میں صرف ہوتا ہے اکثر لوگ یہ پسند کریں گے کہ ان کو کوئی ایسی بیہوشی کی دوا دیدی جائے جو انہیں سوچنے یا سمجھنے کی صلاحیت سے اس وقت تک کیلئے بے نیاز کردے جب تک کہ پھر ان کے فرائض منصبی کا وقت نہ آجائے۔ اور اس زمانہ میں شراب خواری کا اصل مقصد ہے بھی یہی۔ لیکن

مستقبل کے منظم زمانے میں ضائع کرنے کے لئے وقت ملے گا ہی نہیں۔ کیونکہ فضائی لہریں کئی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے دوڑتی ہیں اور سارے رسل و رسائل اور دیگر امور انہیں لہروں کے ذریعے انجام دئے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ شراب کے برعکس کوئی چیز ایسی ایجاد ہو جائے جس کی تاثیر سے وقت کی رفتار دھیمی معلوم ہو۔ اس طرح آرام کے چند لمحے، کام کے طویل وقت کے برابر معلوم ہو سکیں گے۔ بھلا آنے والے دور میں لوگوں کو اتنا صبر کہاں ہوگا کہ برج کے باون پتّوں کو بار بار تقسیم کئے جائیں اور اتفاقات پر بھروسہ کئے ہوئے کھیلے جائیں۔ لیکن جیسا میں نے پہلے عرض کیا ہے ایک مرتبہ سائنس کا مناسب دخل ہوا اور اتفاق کا جزو رخصت ہوا۔ نئے نئے کھیل ایجاد ہو گئے جن میں مہارت صرف ذہنی کمالات پر مبنی ہوگی۔ جوں جوں جسم کے اعضا کا استعمال گھٹتا جائے گا کھیل اور تفریح خود اختیاری ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد موٹروں کی دوڑ نشست کے کمرے میں ہونے لگے۔ انجنیر کھلاڑی اپنی مشینوں کے متعلق مفصل معلومات ایک ماہر حَکَم کے سامنے پیش کر دیں گے جو اُن کے دعووں کی چھان بین کر کے فیصلہ کر دے گا کہ کس کی مشین زیادہ تیز رفتار ہے۔ ہاں اگر فیصلہ کو طرفین نے دُرست نہ سمجھا تو طاقت کے استعمال سے تصفیہ کرنا ہی پڑیگا کیونکہ جنگ اور کھیل دونوں کا مشترک مخرج یہی طاقت ہے۔

سراج حسین نقوی

بوسیدہ سپاری

برباد تمنّا دل جذبات سے عاری ہے
یعنی وہ تخیل کا اُکھڑا ہوا زینہ ہے
ٹوٹا ہوا ساغر ہے پھوٹی ہوئی مینا ہے
مسلا ہوا غنچہ ہے باقی نہ ہو بُو جس کی
اک شاخِ شکستہ ہے بسمل ہو نمو جس کی
اک سیپ ہو موتی سے خالی ہو شکم جس کا
اک لوتھ ہے اٹکا ہو حلقوم میں دم جس کا
ندّی ہے نہ ہو جس میں کچھ آبِ رواں باقی
اُجڑا ہوا گلشن ہو جس کے ہوں نشاں باقی
اک دانہ ہو تھوتھا سا مٹّی جسے ہونا ہے
کس نے اسے کھانا ہے اکنے لِسے بونا ہے
سوتیں ہی سہارا ہیں چشموں کی روانی کا
جذبات ہی سے قائم ہے جوشش جوانی کا
جذبات سے عاری دل "بوسیدہ سپاری" ہے

امین حزیں سیالکوٹی۔

قلندر

مدّت کی بات ہے جب وطن کا ہنگامہ مجھ پر گراں ہونے لگا تو واقعات سے مجبور ہو کر اپنا مختصر سازوسامانِ سفر سمیٹ کر میں ایک گاؤں میں آگیا۔ یہ گاؤں ایک پہاڑ کے دامن میں تھا۔ کوئی دو یا اڑھائی سو نفوس کی آبادی تھی۔ گاؤں والے زیادہ تر جنگل میں سے لکڑی کاٹنے کا کام کرتے۔ کچھ بری بھلی کھیتی باڑی بھی کر لیتے۔

ایک کوہستانی رود بار دو پہاڑوں کے درمیان میں بہتی تھی، پانی اتنا تیز تھا کہ پاؤں ڈالنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ دیودار اور چیل کے درختوں کا جنگل دونوں طرف تھا۔ اس جنگل میں ریچھ، بھیڑیے اور چیتے کثرت سے تھے۔ لانبی لانبی گھاس میں بڑے بڑے موذی سانپ بھی چھپے رہتے۔ لیکن گاؤں والے غریب پیٹ کی خاطر اِن آفات کی موجودگی میں بھی دن بھر جنگل میں کام کرتے۔ بڑے بڑے درخت گراتے اور ہزار دقت سے انہیں کھینچ کھانچ کر دریا کے کنارے پر لاتے اور پانی میں پھینک دیتے۔

جنگل میں کام کرنے والوں کا جمعدار کٹے ہوئے درختوں کی گنتی کرتا اور کام کرنے والوں کو چھ آنے یومیہ کے حساب سے آٹھ دن بعد اُجرت ادا کرتا۔ میں اِسی چوکیدار کے پاس مقیم تھا۔ چوکیدار کا نام جبّار تھا۔

جبّار سے میری بہت دنوں کی ملاقات تھی۔ یہاں آنے سے پیشتر وہ شہر میں، جہاں میں رہتا تھا، دریا کے گھاٹ پر ملازم تھا۔ میں سیر کیلئے دونوں وقت دریا پر جایا کرتا۔ یہیں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی بیوی بیمار تھی مجھے کچھ ہومیوپیتھک میں دسترس تھی۔ میں نے علاج کیا جبّار کی بیوی اچھی ہو گئی۔ وہ کچھ معاوضہ دینا چاہتا تھا لیکن میں نے کچھ لینا پسند نہ کیا۔ کبھی کبھار اسکے وطن سے جب کوئی آتا تو وہ میرے لئے شہد منگوا لیا کرتا۔ کوئی پانچ سال کے بعد جبّار وطن واپس چلا گیا۔ مہینے میں دو ایک خط اسکے میرے نام آتے اور ہر خط میں یہی تقاضہ ہوتا کہ چند دن کے لئے میں بھی اُسکے وطن کی سیر کر دوں۔

***

مجھے جبّار کے پاس ٹھہرے بہت روز ہو چکے تھے۔ لوگ مجھے حکیم جی کہہ کر خطاب کرتے۔ دس دس بیس بیس کوس تک میری حکمت کی شہرت تھی۔ معاوضہ کے طور پر کہیں سے شہد ملتا، کہیں سے چلغوزے اور اخروٹ اور کبھی کوئی اللہ کا بندہ پانچ سات روپے بھی دیدیتا۔ شہروں سے جب لکڑی کے سوداگر آتے تو یہ شہد، چلغوزے اور اخروٹ بھی جو میرے پاس جمع ہوتے فروخت ہو جاتے۔ جب تک میں گاؤں میں رہتا دونوں وقت کا کھانا جبّار کے گھر کھاتا، اور اس کے عوض اِدھر اُدھر سے گھی، آٹا، دال وغیرہ لے آتا۔ مجھے گونہ اطمینان تھا کہ میں غریب جبّار پر کسی قسم کا بار نہیں۔ جوں جوں میری حکمت کی شہرت پھیلتی گئی ویسے ہی میں گاؤں سے زیادہ باہر رہنے لگا۔ کبھی دو روز کبھی پانچ سات روز اور کبھی اس سے بھی زیادہ عرصہ!

***

اسی گاؤں میں کبھی کبھی ایک بوڑھا قلندر بھی آیا کرتا تھا۔ یہ قوم کا پٹھان تھا۔ چہرے بشرے سے معزز آدمی معلوم ہوتا تھا۔ دو دو روز تین تین روز ٹھہر کر چلا جاتا۔ سیاہ کفنی اس کا لباس تھا اور رباب بجانے میں اُسے ایسا کمال تھا کہ باید و شاید! لیکن بجاتا اپنی مرضی سے تھا۔ مجھ پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ میں جب گاؤں میں ہوتا تو اکثر دریا کے کنارے پر وقت گذارتا۔ یہ رباب نواز قلندر جب گاؤں میں آتا تو میرے پاس آ بیٹھتا۔ جو کچھ جھولے میں ہوتا نکال کر میرے آگے رکھ دیتا۔ کبھی بربط بجاتا کبھی ہاتھ کا تکیہ بنا کر سو رہتا۔ کبھی لیٹے لیٹے گانے لگتا۔ کبھی پشتو کبھی اُردو!!

ایک روز میں ندی پر بیٹھا تھا کہ بوڑھا قلندر بھی کہیں سے رباب بجاتا ہوا آ نکلا اور میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"سائیں جی! آپ کا وطن کہاں ہے!" میں نے پوچھا۔

"حکیم جی!" اُس نے گاؤں کے گورستان کی طرف اشارہ کر کے کہا "اُدھر!"

"وہ تو سب کا وطن ہے" میں نے کہا۔

"یہی اصل وطن ہے" بوڑھے قلندر نے کہا "باقی سب سرائے"

"پھر بھی!" میں نے پوچھا "کہیں گھر بھی تو ہوگا"

"گھر ہوتا!" قلندر نے جواب دیا "تو در بدر کیوں پھرتا۔۔۔

تم یہاں کیسے آیا؟"

"وطن کی ہوا جب راس نہ آئی تو یہاں آگیا" میں نے جواب دیا۔

"راس کیوں نہ آئی؟" بوڑھے قلندر نے پوچھا۔

"جب زمانے کی ہوا بدلی!" میں نے جواب دیا "جب ہوئے اپنے بیگانوں سے سوا!"

"بال بچے بھی ہیں؟" قلندر نے پوچھا۔

"اللہ کا نام!" میں نے جواب دیا۔

"آپ بھی دنیا کے ستائے ہوئے ہیں؟" قلندر نے پوچھا۔

"دنیا کا کیا قصور!" میں نے کہا "قسمت کی بات ہے"

"سچ ہے!" قلندر بولا "کسی کو خاک کا بستر کسی کو سنگ مرمر ملے! لطف تو یہ ہے کہ کسی کو خاک کا بستر بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس غریب کی لاش جنگل کے جانور کھاتے ہیں"

میں نے مسکرا کر کہا "خدا کی باتیں خدا ہی جانے!"

"لیکن انسان بھی تو خلیفۃ اللہ ہے" بوڑھے قلندر نے کہا۔

میں نے کہا "سائیں جی! عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی! خلیفۃ اللہ ہونے سے کیا بنتا ہے"

"سچ کہا حکیم جی تم نے" قلندر نے مسکرا کر کہا "یہ جنت اور جہنم تو واقعی عملوں کا نام ہے۔ لیکن ایک بات تم ہم کو بتاؤ"

"فرمایئے!" میں نے کہا۔

"تصور اور خیال کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے"

"ان دونوں چیزوں کا تعلق دماغ سے ہے" میں نے جواب دیا۔

"ہم سمجھے نہیں" قلندر بولا "دماغ کیا کرتا ہے"

"سنیئے" میں نے کہا "آپ کو کسی چیز کی جستجو ہے یا کسی چیز کی ضرورت ہے۔ یا کوئی چیز حاصل ہو کر کھوئی گئی ہے تو قدرتی طور پر آپکو ہمہ وقت اسی کا خیال رہے گا اور کبھی اس چیز کا تصور بھی آپکی آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔ یہ سب دماغ کا کرشمہ ہے"

"گویا!" قلندر بولا "آپ کا مطلب ہے کہ حقیقت کچھ نہیں ہوتی"

"خیال کی حقیقت کیا ہو سکتی ہے" میں نے جواب دیا "آپکو اگر کچھ فکر ہے یا کسی کی تلاش ہے یا کسی کی یاد ہے تو بس آپ کا دماغ آپ کو ہمیشہ اسی طرف متوجہ رکھیگا اور کبھی آپ اس چیز کو ہو بہو اپنے سامنے موجود بھی دیکھیں گے"

"خواب میں جو صورت نظر آتی ہے" قلندر نے مسکرا کر پوچھا

"وہ بھی دماغ کا کام ہے"

"یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے" میں نے کہا "اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کا دن رات ہم کو خیال ہوگا خواب میں بھی وہی نظر آئے گی اور کبھی آنے والے واقعات کی بھی خواب میں انسان کو بشارت مل جاتی ہے"

"تم بہت گہری بات کرتے ہو حکیم جی!" قلندر نے ہنسکر کہا "تم ہم کو یہ بتاؤ کہ جو لوگ مر چکے ہیں وہ بھی کبھی نظر آسکتے ہیں"

"بعض لوگ مانتے ہیں بعض نہیں مانتے" میں نے جواب دیا۔

"کسی کے ماننے یا انکار کرنیکا سوال نہیں" قلندر بولا "آپنے کیا پڑھا ہے۔ آپ کو کیا معلوم ہے"

میں نے کہا "مجھے اس مضمون سے کبھی دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس لئے میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا لیکن آپ ایک خدا رسیدہ بزرگ آدمی ہیں، آپ کا کیا خیال ہے"

یہ سنکر قلندر نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا "ہمارا خیال ہے کہ جس پر ظلم ہو اسکی روح کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"محض پریشان کرنے کیلئے!" قلندر نے جواب دیا "دوسرے کا جینا حرام کرنے کیلئے"

"کوئی واقعہ معلوم ہے آپ کو؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم ہے حکیم جی!" قلندر نے جواب دیا "لیکن شاید آپ کو اعتبار نہ ہوگا"

"کیوں نہیں" میں نے کہا "آپ کی بات کو کون غلط کہیگا"

"حکیم جی!" قلندر ہنسکر بولا "تم کس خیال میں ہو، ہم تو بڑے گنہگار ہیں۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی"

"معاذ اللہ!" میں نے کہا "ایسا مت کہیئے۔ سونا اگر مٹی میں بھی ملا ہو تو چمک ویسی ہی رہتی ہے"

قلندر ہنسکر کہنے لگا "ارے حکیم جی! تم ہماری اس سپید ریش پر دھوکا کھا گئے، بہت پاگل ہو تم ــ اچھا بتاؤ جنگلوں میں کون مارا مارا پھرتا ہے؟"

"جسے خدا کی جستجو ہو" میں نے جواب دیا "جو جویائے حق ہو"

"کوئی اور بھی؟" اس نے پوچھا۔

"جسے کسی کا عشق ہو" میں نے جواب دیا۔

"کوئی اور بھی" اس نے پھر پوچھا۔

"جیسے کسی چیز کی تلاش ہو" میں نے جواب دیا۔

"کوئی اور بھی؟" قلندر نے پھر پوچھا۔

میں نے ہنس کر کہا "اور کون ہو سکتا ہے"

"مجرم بھی تو ہو سکتا ہے" قلندر نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں!" میں نے کہا "ہو تو سکتا ہے، لیکن جرم تو کبھی چھپا نہیں رہتا"

"ٹھیک ہے حکیم جی!" قلندر بولا "جرم کبھی چھپا نہیں رہتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ مجرم ہمیشہ گرفتار ہو جائے"

"درست ہے" میں نے کہا "لیکن اس بحث کو چھوڑئیے اور وہ واقعہ پہلے سنا دیجئے"

"سنو حکیم جی!" قلندر نے [illegible] ذرا کروٹ بدل کر بولا۔ "ہم تم کو اپنے ملک کی ایک بات سناتے ہیں"

"ارشاد!" میں نے کہا "میں ہمہ تن گوش ہوں"

بوڑھا قلندر کچھ دیر تو یونہی لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور بولا "حکیم جی تمہیں رباب سننے کا بھی تو کچھ شوق ہے"

"بہت تو نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تو سنو!" یہ کہکر اس نے رباب سنبھالا۔

میں نے کہا "اور وہ قصہ؟"

"تم پہلے رباب سنو حکیم جی!" بوڑھے قلندر نے رباب کے تاروں کو چھیڑتے ہوئے کہا

بوڑھا فقیر رباب بجانے لگا۔ رباب کا ہر تار رلانے والی اور الم کی داستان سنانے لگا۔ پھر راگ نے کسی شکستہ دل کی آہوں کی صورت اختیار کرلی۔ جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو۔ اور خود بجانے والا رباب کے نغموں میں کھویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "حکیم جی! گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ اتنی خوبصورت جیسے انار کا دانہ۔ اتنی نازک جیسے شاخ گل۔ اس لڑکی کا نام یاسمن تھا۔ لیکن گھر والے محبت سے اسے سمی کہکر پکارتے۔ سمی کو دیکھ کر چاند بھی شرماتا تھا، سنا حکیم جی!"

"ہاں!" میں نے جواب دیا "سن رہا ہوں"

"اور گاؤں میں ایک جوان لڑکا بھی رہتا تھا" بوڑھے قلندر نے کہا "اتنا بانکا اتنا خوبصورت جیسے شیر کا بچہ۔ اس کا نام فیروز گل تھا۔ اور اسی گاؤں میں ایک ملک بھی تھا اور اس ملک کا بھی ایک بیٹا تھا۔ بس ایک ہی۔ اس کا نام عزیز گل تھا گھومنے گھامنے کے سوا اسے اور کوئی کام نہ تھا۔ سنا حکیم جی!"

"ہاں! سن رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"فیروز گل بھی یاسمن کو چاہتا تھا اور عزیز گل بھی۔ لیکن ان دونوں میں سے کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سمی کس کو پسند کرتی ہے۔ چاندنی رات میں چشمے کے پاس جب گاؤں کی لڑکیاں بیٹھ کر گاتیں تو عزیز گل بھی ان کے پاس جا بیٹھتا۔ چونکہ وہ ملک کا بیٹا تھا اس لئے کوئی اُسے منع بھی نہ کرتا۔ فیروز گل چونکہ غریب تھا اس لئے وہ اگر کبھی پاس جا نکلتا تو لڑکیاں بُرا مانتیں اور اسے وہاں سے ہٹا دیتیں۔ فیروز گل کا باپ لوہار تھا۔ اور سمی ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ فیروز گل کا باپ بھی غریب۔ سمی کا باپ بھی غریب۔ لیکن عزیز گل امیر آدمی تھا۔ اس کا گاؤں میں رعب بھی تھا اور رسوخ بھی اور اس کے پاس دولت بھی تھی۔ عزیز گل کا دوسروں سے لباس بھی اچھا ہوتا۔ گو وہ کچھ دبلا پتلا سا تھا تاہم بہت شگفتہ مزاج جوان تھا۔ سنتے ہو حکیم جی!"

"ہمہ تن گوش ہوں" میں نے جواب دیا۔

قلندر بولا "ایک روز راستے میں دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ اور باتوں باتوں میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ عزیز گل اکڑ کر بولا "زیادہ ملک اس کرو گے تو گاؤں سے نکلوا دوں گا"

"خیر!" فیروز گل نے کہا "یہ تو بعد میں دیکھا جائیگا۔ لیکن اگر آج سے تم کبھی چشمے پر گئے تو اچھا نہ ہو گا"

"کیا ہو گا؟" عزیز گل نے پوچھا۔

"یہ وہاں بتلاؤں گا" فیروز گل نے جواب دیا۔

اتنے میں کھیتوں کی جانب سے یاسمن آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اسی طرف آرہی تھی۔ دونوں کو جھگڑتے دیکھکر وہ پاس آکر کھڑی ہو گئی اور بولی "یہ تم لڑ کیوں رہے ہو"

عزیز گل بولا "یہ کمینہ اب بہت سر چڑھ چلا"

"کمینہ!" فیروز گل غضبناک ہو کر بولا "ٹھہرو....."

"ٹھہرو!" یاسمن دونوں کے بیچ میں آکر بولی "عزیز گل! کیوں مُفت میں فساد کرتے ہو۔ مان لیا کہ تمہارا باپ مالدار ہے۔ لیکن غریبوں کو بھی عزت کا پاس ہوتا ہے"

"تمہیں معلوم بھی ہے یہ مجھ سے کیا کہہ رہا تھا" عزیز گل بولا۔

"کیا کہہ رہا تھا تم سے!" سمی نے پوچھا۔

"یہ کہتا ہے کہ میں چشمہ پر نہ آیا کروں" عزیز گل نے جواب دیا۔

"تم چشمہ پر کیوں آتے ہو" سمی نے پوچھا۔

"تمہیں دیکھنے!" عزیز گل نے جواب دیا۔

"عزیز گل! میں ابھی تم سے کہہ چکی کہ غریبوں کو بھی عزت کا پاس ہوتا ہے۔ کیا واسطہ ہے تمہارا مجھ سے؟" یاسمن نے ذرا اکڑ کر پوچھا۔

"واسطہ پوچھتی ہو سمّی!" عزیز گل نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں!" یاسمن نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر کہا۔

"سمّی!" عزیز گل نے مسکرا کر کہا "مجھے تم سے محبت ہے۔"

یہ سنتے ہی فیروز گل کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ لیکن سمّی اسکی طرف دیکھ کر بولی "اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہیں تمہیں بھی تو مجھ سے محبت ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں!" فیروز گل نے جواب دیا "اور میری ماں آج یا کل تمہارے گھر پیغام لیکر آنے ہی والی ہے۔"

"ابھی نہیں!" سمّی بولی "میں صرف اس شخص سے شادی کرونگی جس کے سینے پر سونے کا تمغہ ہوگا۔ سن لیا تم دونوں نے۔"

"وعدہ کرتی ہو؟" فیروز گل نے پوچھا "قسم کھاؤ گی؟"

یاسمن بولی "جسے محبت ہو وہ نہ وعدہ لیتا ہے نہ قسم کھانے کو کہتا ہے۔"

"سمّی!" فیروز گل بولا "اگر زندگی ہے تو وہ دن بھی دور نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ تو اپنی راہ ہو لیا۔ لیکن عزیز گل وہیں کھڑا رہا۔

اگلے روز فیروز گل کو سفر کی تیاری کرتے دیکھکر اس کی ماں نے پوچھا "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں پلٹن میں نوکری کروں گا۔"

"کیوں؟" ماں بولی "دیکھتے نہیں تمہارا باپ کئی دن بیمار رہتا ہے۔ اور میں بوڑھی ہوں۔ تم چلے گئے تو ہماری گزران کیسے ہوگی۔"

"میں ہر مہینے تمہیں روپے بھیجونگا" فیروز گل نے جواب دیا۔

"لیکن ابھی دو چار دن ہوئے تم نے مجھے سمّی کے لئے پیغام دینے کو کہا تھا؟" ماں نے پوچھا "شادی نہیں کروگے؟"

"میں تو تیار ہوں" فیروز گل نے جواب دیا "لیکن سمّی نہیں مانتی۔۔۔"

"تم نے پوچھا؟" ماں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں!"

"کب؟"

"میں نے کہہ جو دیا!" فیروز گل نے جوابدیا۔

"لڑکیاں یوں ہی کہا کرتی ہیں" ماں نے کہا "میرا خیال ہے اُس کی ماں مان جائیگی۔ کیا کہا تھا تم سے سمّی نے؟"

"سمّی نے کہا تھا کہ میں اُس شخص سے شادی کرونگی جسکے سینے پر سونے کا تمغہ ہوگا" فیروز گل نے جوابدیا۔

"تم نے کیا کہا؟" ماں نے مسکرا کر پوچھا۔

"میں نے اُس کی شرط پوری کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔" فیروز گل نے جواب دیا۔

فیروز گل اپنا مختصر سا سامان لیکر اسی روز گاؤں سے چلدیا۔

"سنتے ہو حکیم جی!"

"ہاں سائیں!" میں نے کہا "سن رہا ہوں۔"

بوڑھا قلندر پھر رباب کے تاروں کو چھیڑنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رباب نہیں بج رہا بلکہ کوئی شکستہ دل فریاد کر رہا ہے۔

"حکیم جی!" قلندر نے رباب پرسے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا "وقت کتنی جلدی گذرتا ہے۔ ایک سال بھی گزرا، دوسرا بھی گیا۔ اب تیسرا بھی ختم ہونے کو تھا۔ فیروز گل کی قسمت یاور تھی۔ وہ پلٹن میں جمعدار تھا۔ اس کے سینے پر ایک کی بجائے تین تمغے تھے۔ دو چاندی کے ایک سونے کا۔ اُس نے پلٹن سے چھٹی لی اور یاسمن کیلئے ریشمی کپڑے، سونے کی چوڑیاں، سونے کا ہار خرید کر وطن کو چلدیا۔ لیکن تین سال کے عرصے میں دنیا ہی بدل گئی۔ اس کی تقدیر پلٹ گئی۔ سنتے ہو حکیم جی!"

"سب سن رہا ہوں" میں نے جوابدیا۔

بوڑھا قلندر کہنے لگا "حکیم جی! ایک شام کا وقت تھا۔ تانگہ پتھریلی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور فیروز گل تانگے میں بیٹھا ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن سفر تھا کہ ختم ہونے میں آتا ہی نہ تھا۔ وہ کبھی تانگے والے سے اُلجھتا اور کبھی رباب بجاتا۔ رباب بجاتا اور گاتا۔ سنتے ہو حکیم؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا "سن رہا ہوں۔"

قلندر نے پھر رباب اُٹھایا اور رباب بجاتے ہوئے بولا۔ "حکیم جی! فیروز گل یاسمن کو یاد کرتا۔ رباب بجاتا اور گاتا ؎

شبِ غم کے کیسے سناؤں ستم!

تمہاری قسم! بہت یاد آئے!

تمہاری قسم!! تمہاری قسم!!

بس یہ گاتا تھا اور رباب بجاتا تھا۔ آخر وطن کے پیارے

بیارے نشان اور دیکھی بھالی چیزیں نظر آنے لگیں۔ اچانک تانگہ کسی پتھر سے ٹکرایا۔ ایک پہیہ ٹوٹ گیا۔ لیکن گاؤں ابھی دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ فیروز گل نے اسباب تانگے میں چھوڑا اور تلوار کمر سے باندھ کر پیدل چلدیا۔ تانگے والا بھی پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ کبھی فوجی انداز سے قدم اٹھاتا کبھی کسی بھگوڑے سپاہی کی طرح بھاگنے لگتا۔ فیروز گل کا باپ تو اس کی عدم موجودگی میں مرچکا تھا۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ لیکن اس وقت نہ تو اسے ماں سے ملنے کی جلدی تھی نہ کسی دوست آشنا کو گلے لگانے کی آرزو۔ ایک یاسمن کا خیال تھا۔ اور اسی خیال سے اُمیدوں اور آرزوؤں کی بستیاں بساتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا۔

فیروز گل نے جس وقت گاؤں میں قدم رکھا تو اسے طوطیوں اور شہنائیوں کی دلکش آواز سنائی دی۔ اسے اُس نے ایک نیک شگون سمجھا۔ اتنے میں دو لڑکے پاس سے گذرے۔ فیروز گل نے انہیں روک کر پوچھا: "یہ شہنائیاں کیسی بج رہی ہیں!"

ایک لڑکے نے جواب دیا: "عزیز گل کی شادی ہے۔ اس کی برات جارہی ہے"

"کون عزیز گل؟" فیروز گل نے پوچھا۔

جواب ملا: "ملک کا بیٹا"

"برات کہاں جارہی ہے؟" فیروز گل نے پوچھا۔

جواب ملا: "سمی کے گھر!"

لڑکے تو اتنا بتلا کر چلدیے اور فیروز گل اسی جگہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُمیدوں اور آرزوؤں کی وہ بستی جو اُس نے ایک مدت سے آباد کر رکھی تھی یکلخت برباد ہوگئی۔ سُنتے ہو حکیم جی!"

"سُن رہا ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"برات اسی طرف آرہی تھی" قلندر کہنے لگا "سمی کا گھر اسی طرف تھا۔ اور فیروز گل اپنے گھر جانے کی بجائے یاسمن کے گھر کی طرف جارہا تھا۔ سامنے سے مشعلوں کی روشنی نمودار ہوئی۔ پھر براتی نظر آنے لگے۔ شہنائی نواز اس کے پاس سے گزرے۔ اُنکے پیچھے مطربوں کا طائفہ تھا۔ براتی اُن کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ دس بیس قدم چلکر طائفہ کھڑا ہوجاتا۔ جہاں فیروز گل بیٹھا تھا طائفہ اس سے کچھ آگے جاکر کھڑا ہوگیا۔ عزیز گل گھوڑے پر سوار پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ آج خوب سجا ہوا تھا۔ گھوڑے کے ساتھ ایک مشعل والا تھا۔ لیکن جب طائفہ کھڑا ہوا تو مشعلبردار بھی طائفہ والوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ درخت کے پاس پہونچکر عزیز گل کا گھوڑا رک لیا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا اور یہاں اندھیرا بھی تھا۔ رقیب کو دیکھکر فیروز گل کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے نیام سے تلوار نکالی اور ایک ہی ہاتھ میں عزیز گل کو کاٹ کر نیچے گرا دیا۔ عزیز گل نے ایک چیخ ماری۔ لیکن پیشتر اس سے کہ کوئی آ کے دیکھے فیروز گل اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ سُنتے ہو حکیم جی!"

"توبہ ہے!" میں نے کہا "عین شادی کے روز قتل کر ڈالا ظالم نے!"

"اُس نے بھی تو اس کی آرزوؤں کا خون کر ڈالا" بوڑھے قلندر نے جواب دیا۔

"پکڑا گیا پھر!" میں نے پوچھا "مارا گیا قصاص میں؟"

"نہیں!" بوڑھا قلندر بولا "نہیں! رقیب کو قتل کرنے کے بعد وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ اس کی بوڑھی ماں چولھے کے پاس بیٹھی برتن صاف کررہی تھی۔ فیروز گل کو دیکھتے ہی اُٹھی اور بھینچکر اُسے سینے سے لگالیا۔ ابھی ماں بیٹا بیٹھے باتیں کرہی رہے تھے کہ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔

"یہ شور کیسا ہے؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"عزیز گل کی برات جارہی ہے" ماں نے جواب دیا۔

"کہاں شادی ہے" فیروز گل نے پوچھا۔

"بیٹا!" بڑھیا بولی "میں نے سمی کی ماں سے وعدہ لے لیا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ تمہاری بات پکی ہوگئی ہے۔ لیکن ملک نے زور ڈال کر سمی کے ماں باپ کو مجبور کردیا"

"کیوں؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"عزیز گل کی خاطر" ماں نے جواب دیا "سمی بھی عزیز گل کو ہی چاہتی تھی۔ ملک کی بہو کہلانا کچھ کم عزت تھی کیا؟"

"اور جو اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا" فیروز گل نے پوچھا۔

"بیٹا!" ماں بولی "وہ تو محض تمہیں ٹالنے کیلئے تھا"

اتنے میں خون! خون! قاتل! خونی! پکڑو پکڑو! کی آوازیں آنے لگیں۔

"یہ کون قتل ہوگیا" بڑھیا تعجب سے بولی۔

"خدا جانے!" فیروز گل نے جواب دیا۔

بڑھیا اُٹھکر باہر گئی۔ اور پانچ سات منٹ بعد بہت گھبرائی ہوئی واپس آئی اور بولی "کسی نے عزیز گل کو مار ڈالا ہے"

"دولھا کو؟" فیروز گل نے پوچھا۔

"ہاں دولھا!" بڑھیا نے جواب دیا۔
"کس نے مارا؟" فیروز گل نے پوچھا۔
"یہ کسی کو معلوم نہیں" بڑھیا بولی۔
"کسی نے قاتل کو دیکھا بھی؟" فیروز گل نے پوچھا۔
"نہیں" بڑھیا بولی "براتی طائفہ والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے، قاتل اپنا کام کر گیا"
"جہنم میں جائے!" فیروز گل نے کہا۔
"جہنم میں تو جائے ہی گا" بڑھیا نے کہا۔
"کون؟" فیروز گل نے پوچھا۔
"قاتل اور کون؟" بڑھیا نے کہا۔
دونوں میں اسی قسم کی کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ شور و غل اب بند ہو چکا تھا۔ فیروز گل اٹھکر باہر جانے لگا تو ماں نے پوچھا۔
"کہاں چلے تم!"
"ذرا سامان دیکھتا ہوں" فیروز گل نے کہا "تانگہ لوٹ گیا تھا"
"نا بیٹا!" ماں بولی "مت جاؤ باہر"
"فکر مت کرو!" فیروز گل نے کہا "لیکن میرے آنے کا کسی سے ذکر مت کیجیو"
یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔ تانگے کی گھسر رگڑ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ راستے ہی میں تانگے والے سے جا ملا۔ تانگے والے نے پوچھا "تم گاؤں نہیں گئے"
"میں گاؤں چلا جاتا تو سامان کس کے حوالے کرتا" فیروز گل نے جواب دیا۔
"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا" تانگے والے نے مطمئن ہو کر کہا۔ "راہزن کا خطرہ تو یہاں قدم قدم پر ہے"
"اللہ مالک ہے" فیروز گل نے جواب دیا۔
دونوں گاؤں کی طرف چلے۔ جب گاؤں کے پاس پہونچے تو مسجد کے پاس دو چار آدمی بیٹھے تھے۔ فیروز گل کو پہچان کر بڑے تپاک سے ملے۔ پھر ان میں سے ایک نے عزیز گل کے قتل ہونے کا واقعہ بیان کیا۔
"کتنی دیر ہوئی" فیروز گل نے پوچھا۔
"ہو گئے تین چار گھنٹے"
"قاتل پکڑا گیا" فیروز گل نے پوچھا۔
"ابھی تک تو نہیں"
"کون تھا؟" فیروز گل نے پوچھا۔
"یہ بھی معلوم نہیں"
"کسی نے دیکھا بھی نہیں؟" فیروز گل نے پوچھا۔
"نہیں!"
"پاس کوئی نہیں تھا" فیروز گل نے پوچھا
"سب طائفہ والوں کا تماشہ دیکھ رہے تھے"
یہ لوگ باتیں کرتے کرتے فیروز گل کو اس کے گھر پہونچا گئے۔
سنا حکیم جی؟"
"ہاں!" میں نے کہا۔ "بہت چالاک نکلا۔ لیکن آخر پکڑا بھی تو گیا ہوگا"
"نہیں!" قلندر نے جواب دیا۔
"بھاگ گیا کہیں" میں نے پوچھا۔
"بھاگنے کی ضرورت ہی کیا تھی" بوڑھے قلندر نے جواب دیا۔ "کس نے دیکھا تھا اسے —— تو پیر! اگلے روز وہ بھی عزیز گل کے جنازے میں شامل ہوا۔ اور دوسرے تیسرے روز اس کے باپ کے پاس جاکر گھڑی دو گھڑی بیٹھا بھی کرتا۔ دس پندرہ روز گذر گئے۔ لیکن سمی کہیں نظر نہ آئی لیکن ایک روز اسی چشمہ کے پاس اس سے ملاقات ہو گئی۔
وہ پانی بھرنے آئی تھی۔ اکیلی ہی تھی۔ فیروز گل کو دیکھکر وہ ٹھٹک سی گئی۔ دونوں چشمے سے ذرا ہٹ کر انار کے درختوں کے نیچے جا بیٹھے۔ سمی کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ وہ آج بھی اتنی خوبصورت تھی جتنا گل نار!
"کب آئے تم؟" سمی نے پوچھا۔
"جب تم نے دیکھ لیا" فیروز گل نے جواب دیا۔
"بہت دنوں بعد وطن یاد آیا تمہیں!" سمی نے کہا۔
"تم نے جو شرط لگا رکھی تھی اسے پورا کئے بغیر کیسے چلا آتا" فیروز گل نے جواب دیا۔
"شرط!" سمی بولی "مجھے تو یاد نہیں"
فیروز گل نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔
"قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے" سمی نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "کب تک رہو گے؟"
"اب تو واپس جانیکا ارادہ نہیں" فیروز گل نے جواب دیا۔
"کیوں؟" سمی نے پوچھا۔

"اب ضرورت ہی کیا ہے" فیروزگل نے جواب دیا۔

"لو!" سمی اُٹھتے ہوئے بولی "میں تو اب چلتی ہوں"

"پھر کب ملو گی" فیروزگل نے پوچھا۔

"کیا حاصل ہوگا ملنے ملانے سے؟" سمی نے کہا۔

"عزیزگل یاد آتا ہے" فیروزگل نے طنزاً کہا۔

"جو چیز پاس ہو" سمی بولی "اس کی یاد کیسی؟"

"بہت محبت تھی تمہیں عزیزگل سے؟" فیروزگل نے پوچھا۔

"تھی کیا؟" سمی بولی "ہے کہو"

"لیکن وہ ہے کہاں؟" فیروزگل نے کہا۔

سمی نے دل پر ہاتھ رکھا اور بولی "یہاں!"

یاسمن گاؤں کی طرف چلی گئی۔ اور فیروزگل وہیں بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ پھر پیغام بھیجے لیکن ایک تو ملک کا دستور ابھی اس بات کی اجازت نہ دیتا دوسرے لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے کا بھی خیال تھا۔ فیروزگل نے کئی ایک بار سمی سے پرانی رسم و راہ تازہ کرنی چاہی لیکن یاسمن سے اب کچھ کہنا سننا پتھر سے کہنا سننا تھا۔ ایک مہینہ دو مہینے تین مہینے گذر گئے۔ فیروزگل کی چھٹی ختم ہوگئی۔ اس نے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس عرصے میں اس نے یاسمن کے باپ سے بھی تعلقات بڑھالئے لیکن یاسمن کو رام نہ کر سکا۔ سمی کو کئی روز سے تپ آتا تھا پھر کھانسی بھی اُٹھنے لگی۔ گاؤں میں حکیم یا طبیب کہاں۔ تین چار مہینے میں مرض نے اتنا زور پکڑا کہ گھر والے بے آس ہو گئے۔ دیکھنے والے کوئی دن کا مہمان سمجھتے تھے۔ سمی چارپائی پر پڑی ہر وقت دروازے کی طرف دیکھتی رہتی۔ تیماردار اس کے منہ میں کسی کسی وقت دو دو دو ٹپکاتے رہتے۔ آس پاس کی بوڑھی عورتیں بھی رات کو پاس آبیٹھتیں۔ ایک روز رات کا وقت تھا۔ آج سمی کی حالت بہت خراب تھی۔ فیروزگل بھی وہاں موجود تھا۔ سمی جس کوٹھڑی میں تھی اس میں چراغ جل رہا تھا۔ چراغ کی ہلکی ہلکی روشنی میں بھی سمی کا چہرہ چمکتا نظر آرہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک نوجوان آدمی اندر آیا۔ یہ عزیزگل تھا۔۔۔۔"

"عزیزگل؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں عزیزگل" قلندر نے جواب دیا۔

"لیکن اسے تو فیروزگل نے قتل کر دیا تھا" میں نے کہا۔

"سنو حکیم جی!" قلندر بولا "عزیزگل سمی کی چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی سمی مسکرائی اور دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ عزیزگل اس کی چارپائی کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور چراغ گل ہو گیا۔ اس اندھیرے میں وہ دوسری دنیا کو چل دی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ سو رہی ہے۔

"اور عزیزگل؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کا تو اسے انتظار تھا" قلندر نے کہا "لینے آیا تھا لے گیا"

"کسی نے جاتے بھی تو دیکھا ہوگا" میں نے پوچھا۔

"آتے تو سبھی نے دیکھا تھا" قلندر نے جواب دیا "لیکن اندھیرے میں جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔ گھر والے تو رو پیٹ رہے تھے، فیروزگل وہاں سے نکل کر چشمہ کی طرف جہاں وہ اکثر سمی سے ملا کرتا تھا ہو لیا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل رہے تھے۔ لیکن جب وہ چشمہ پر پہونچا تو اس نے جو کچھ دیکھا وہ حکیم جی! شاید تم مانو گے نہیں"

"کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"حکیم جی!" قلندر بولا "عزیزگل اور یاسمن دونوں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے ایک پتھر پر بیٹھے تھے۔ فیروزگل کو روتے دیکھ کر دونوں نے ایک قہقہہ لگایا اور اُچھلتے کودتے انار کے پیڑوں کی طرف چلے گئے"

اتنا بیان کرنے کے بعد قلندر نے پھر رباب اُٹھایا اور ایک دلسوز گت بجانے لگا۔

قلندر رباب بجا رہا تھا اور میں پاس خاموش بیٹھا تھا۔ آخر میں نے پوچھا "یاسمن کے مرنے کے بعد فیروزگل نے بھی شادی کر لی ہوگی"

"نہیں!" قلندر بولا "محبوب کے مرنے کے بعد کس سے شادی کرتا۔ اس نے تو گاؤں تک چھوڑ دیا"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب گاؤں میں اس کے لئے رکھا ہی کیا تھا" قلندر نے جواب دیا۔ "پھر جہاں رقیب ہو وہاں کون رہنا پسند کرتا ہے"

"رقیب کو تو اس نے قتل کر دیا تھا" میں نے کہا "پھر اس کا کیا ذکر؟"

"سنو حکیم جی!" قلندر بولا "اچھا ہوتا جو فیروزگل قصاص میں مارا جاتا! کم از کم اس عذاب سے تو چھوٹ جاتا"

"عذاب سے!؟" میں نے پوچھا۔

"یہ عذاب کیا کم ہے" قلندر بولا۔ "کہ عزیز گل اور یاسمن عموماً اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"تم دیے بھی کبھی کسی کا مذاق اڑایا کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ستھیا گئے ہو تم سائیں۔"

"ہم جھوٹ نہیں بولتے" قلندر بولا۔ "ہر جمعہ کے روز وہ کہیں نہ کہیں اسے نظر آتے ہیں اور اسے دیکھ کر قہقہے لگاتے ہیں۔"

"جمعہ کے دن میں کیا خصوصیت ہے" میں نے پوچھا۔

"وہ جمعہ کا ہی تو دن تھا جب فیروز گل نے عزیز گل کو قتل کیا۔" قلندر نے جواب دیا۔

"آج بھی تو جمعہ ہی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "لیکن جانے فیروز گل کہاں ہوگا اس وقت۔"

"دن کہاں گذرا" قلندر نے کہا۔ "ابھی تو سورج غروب ہی ہوا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رباب بجانے لگا۔

***

شفق کی سرخی جنگل اور کہسار پر مسلط ہو چکی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کی ہر چیز نے حنا لگا رکھی ہے۔ ادھر ادھر کسانوں کی کھیتیاں تھیں۔ میدان تھے اور میدانوں کے عقب میں پہاڑ تھے اور پہاڑوں کے عقب میں آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ رات کے سکوت کی کیفیتیں ابھی سے بیدار ہو رہی تھیں۔ پیڑوں پر خواب کا سا ہلکا ہلکا رنگ پھیل رہا تھا۔ بوڑھا قلندر ایک عالم بیخودی میں رباب بجا رہا تھا اور کبھی کبھی ہولے ہولے

شب غم کیسے سناؤں ستم!
تمہاری قسم!
بہت یاد آئے! تمہاری قسم!!

گنگنانے لگتا۔ اچانک دریا کی جانب سے کسی کے قہقہوں کی آواز آئی — قلندر اور میں دونوں دیکھنے لگے۔ دریا کے اس پار ایک دبلا پتلا مرد اور ایک حسین عورت ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے، پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہنس رہے تھے۔

بوڑھا قلندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "یاسمن! گذشتہ پچاس سال سے تم نے میری زندگی حرام کر رکھی ہے۔ لیکن ستی! میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا ہے۔ اب تحمل کی مجھ میں تاب نہیں۔"

یہ کہہ کر بوڑھے قلندر نے دریا میں چھلانگ ماری اور موجوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں خوف اور حیرت سے بت کی طرح خاموش کھڑا تھا کہ اچانک پھر قہقہوں کی آواز آئی۔ اور وہی مرد اور وہی خوبصورت عورت ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اچھلتے کودتے جنگل کی طرف جاتے نظر آتے اور میرے دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دشت و جبل پر تاریکی پھیل چکی تھی۔ اور کوہسار کی خاموشی انسان کی بے مائگی کا الم انگیز افسانہ سنا رہی تھی۔ بوڑھے قلندر کا رباب زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے رباب اٹھا لیا اور گاؤں کی راہ لی۔ جب درختوں میں ہوا سنسناتی تو یہی معلوم ہوتا کہ غم کی دیوی ستار بجا رہی ہے۔

ایم۔ اسلم

اثرِ بہار

یہ لہلہاتی کھیتیاں، یہ کیف برساتی ہوا
یہ خاک پر بکھرے ہوئے بوندوں کے درِّ بے بہا

یہ اُونچی اُونچی چوٹیوں پر بادلوں کی دھاریاں
یہ وادیوں میں دم بخود جھرنوں کے فیتے جا بجا

یہ آسماں کے چار سُو دُھندلے اُفق کے حاشیے
وہ کروٹیں لیتی ہوئی ہر سُو نسیمِ جانفزا

مینڈھوں پہ اٹھلاتی ہوئی نوخیز الھڑ لڑکیاں
چہروں پہ ہے رنگِ شفق، ہاتھوں میں ہے خونِ حنا

جھیلوں پہ بگلوں کے پرے، موجوں کا جھولا جھولتے
یوں یک بیک گم ہو گئے جیسے یہاں کچھ بھی نہ تھا

گاؤں سے دُور اک کنج میں بیٹھا ہوں جانے کس لیے
چنگاریاں ہیں بوندیاں، شعلے ہیں امواجِ صبا

دل میں صبوحی کا ہے یوں دُھندلا ہیولیٰ مضطرب
پنگھٹ پہ جیسے پَو پھٹے سایہ سا منڈلاتا ہوا

سینے میں یوں انگڑائیاں لے کر اُمیدیں مٹ گئیں
پر پھڑپھڑا کر اُڑ گئی جیسے شجر سے فاختا

ہاتھوں میں مبہم کپکپی، مجبور سی لب پر ہنسی
اور پتلیوں میں ضو فگن، ماضی کا دُھندلا سا دیا

اے سوئی سوئی وادیو، اے کھوئی کھوئی چوٹیو
کیا تم بتا سکتی ہو گزرے وقت کا مجھکو پتا

جب میری ہر اک سانس میں پنہاں تھی عمرِ جاوداں
تارہ سا بن جاتا تھا جب آنکھوں سے جو آنسو گرا

جب روز و شب کی اُلجھنیں میرے لئے کچھ بھی نہ تھیں
جب زندگی پندار و نخوت کا سُنہرا خواب تھا

جامِ نظر لبریز تھا جب حُسن کے انوار سے
میں جوشِ استغنا میں جب یزداں سے بھی باغی رہا

اُس وقت پر قربان ہو میری یہ بے رس زندگی
اُس وقت سے کوئی کہے، مارا گیا ہوں بے خطا

چھٹ جاؤ کالے بادلو، دیوانہ بن جاؤں گا میں
جھونکو سمٹ جاؤ کہیں، بجھ جائے گا دل کا دیا

دوشیزگانِ دلربا چھپ جاؤ کھیتوں کے ورے
ورنہ لہو کے گھونٹ میں پیتا ہوا مر جاؤں گا!

احمد ندیم قاسمی

آیاتِ ادب

رنج و ہم کا قلع قمع کر ڈالا | چشمِ نم کا قلع قمع کر ڈالا
غم نے میرا قلع قمع چاہا تھا | میں نے غم کا قلع قمع کر ڈالا

وحی آئی ہے، ربِ خلق فرماتا ہے | "جو خلق کے درد دکھ کو ٹھکراتا ہے
ہم ہوں کہ ہمارے لطف ہائے بیحد | کوئی اس پر ترس نہیں کھاتا ہے

اللہ، جو کُل جہاں کا ان داتا ہے | اپنی اک وحی میں یوں فرماتا ہے
جو اوروں پر کرم نہیں کرتے ہیں | اُن پر بھی کرم نہیں کیا جاتا ہے

یا رنجِ زوالِ مرحمت لایا ہوں | یا شوقِ کمالِ مرحمت لایا ہوں
تاجر نہیں، بدلِ مرحمت کیا لاتا | سائل ہوں، سوالِ مرحمت لایا ہوں

ملجائے ادب ہوں یہ شرف کیا کم ہے | ماوائے ادب ہوں یہ شرف کیا کم ہے
دارائے زمانہ نہیں، اس کا کیا غم | دارائے ادب ہوں یہ شرف کیا کم ہے

حکیم آزاد انصاری

کبوتروں والا سائیں

پنجاب کے ایک سرد دیہات کے تکئے میں مائی جیواں صبح سویرے ایک غلاف چڑھی قبر کے پاس زمین کے اندر کھدے ہوئے گڑھے میں بڑے بڑے اُپلوں سے آگ سلگا رہی ہے۔ صبح کے سرد اور مٹیالے دھندلکے میں جب وہ اپنی پانی بھری آنکھوں کو سکیڑ کر اور اپنی کمر کو دوہرا کر کے مُنہ قریب قریب زمین کے ساتھ لگا کر اوپر تلے رکھے ہوئے اُپلوں کے اندر پھونک گھسیڑنے کی کوشش کرتی ہے تو زمین پر سے تھوڑی سی راکھ اُڑتی ہے اور اُسکے آدھے سفید اور آدھے کالے بالوں پر جو کہ گھسے ہوئے کمبل کا نمونہ پیش کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بالوں میں تھوڑی سی سفیدی اور آگئی ہے۔

اُپلوں کے اندر آگ سلگتی ہے اور یوں جو تھوڑی سی لال لال روشنی پیدا ہوتی ہے مائی جیواں کے سیاہ چہرے پر جھریوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔

مائی جیواں یہ آگ کئی مرتبہ سلگا چکی ہے۔ یہ تکیہ یا چھوٹی سی خانقاہ جس کے اندر مٹی ہوتی قبر کی بابت اُس کے پردادا نے لوگوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے پیر کی آرام گاہ ہے، ایک زمانے سے اُن کے قبضہ میں تھی۔ گاما سائیں کے مرنے کے بعد اب اُس کی ہوشیار بیوی اس تکئے کی مجاور تھی۔ گاما سائیں سارے گاؤں میں ہر دلعزیز تھا۔ ذات کا وہ کمہار تھا مگر چونکہ اُسے تکئے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لئے اُس نے برتن بنانے چھوڑ دئے تھے، لیکن اُس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کونڈیاں اب بھی مشہور ہیں۔ بھنگ گھوٹنے کیلئے وہ سال میں چھ کونڈیاں بنایا کرتا تھا جن کے متعلق بڑے فخر سے وہ کہا کرتا تھا: "چوہدری لوہا ہے لوہا —— فولاد کی کونڈی ٹوٹ جائے پر گاما سائیں کی یہ کونڈی دادا لے تو اس کا پوتا بھی اسی میں بھنگ گھوٹ کر پیتے۔"

مرنے سے پہلے گاما سائیں چھ کونڈیاں بنا کر رکھ گیا تھا جو اب مائی جیواں بڑی احتیاط سے کام میں لاتی تھی۔

گاؤں کے اکثر بڈھے اور جوان تکئے میں جمع ہوتے تھے اور سردائی پیا کرتے تھے۔ گھوٹنے کے لئے گاما سائیں نہیں تھا پر اُس کے بہت سے چیلے چانٹے جو اب سر بھویں مُنڈا کر سائیں بن گئے تھے، اُس کے بجائے بھنگ گھوٹا کرتے تھے اور مائی جیواں کی سُلگائی ہوئی آگ سُلفہ پینے والوں کے کام آتی تھی۔

صبح اور شام کو تو خیر کافی رونق رہتی تھی مگر دوپہر کو آٹھ دس آدمی مائی جیواں کے پاس بیری کی چھاؤں میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ ادھر کوٹھے میں لمبی لمبی بیل کے ساتھ ساتھ کئی کابک تھے جن میں گاما سائیں کے ایک بہت پُرانے دوست اَبُو پہلوان نے سفید کبوتر پال رکھے تھے۔ تکئے کی دھوپ بھری فضا میں اِن سفید اور چتکبرے کبوتروں کی پھڑپھڑاہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جس طرح تکئے میں آنے والے لوگ شکل و صورت سے معصومانہ حد تک بے عقل نظر آتے تھے اسی طرح یہ کبوتر جن میں سے اکثر کے پیروں میں مائی جیواں کے بڑے لڑکے نے جھانجھ پہنا رکھے تھے بے عقل اور معصوم دکھائی دیتے تھے۔

مائی جیواں کے بڑے لڑکے کا اصلی نام عبدالغفار تھا۔ اُس کی پیدائش کے وقت یہ نام شہر کے تھانیدار کا تھا جو کبھی کبھی گھوڑی پر چڑھ کے موقع دیکھنے کیلئے گاؤں میں آیا کرتا تھا اور گاما سائیں کے ہاتھ کا بنا ہوا ایک پیالہ سردائی کا ضرور پیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ رہی تھی۔ جب وہ گیارہ برس کا تھا تو مائی جیواں اُس کے نام میں تھانیداری کی بو سونگھ سکتی تھی مگر جب اُس نے بارھویں سال میں قدم رکھا تو اُس کی حالت ہی بگڑ گئی۔ خاصا تگڑا جوان تھا پر نہ جانے کیا ہوا کہ بس ایک دو برسوں میں ہی سچ مچ کا سائیں بن گیا یعنی ناک سے رینٹھ بہنے لگا اور چُپ چُپ رہنے لگا۔ سر پہلے ہی سے چھوٹا تھا پر اب کچھ اور بھی چھوٹا ہو گیا اور مُنہ سے ہر وقت لعاب سا نکلنے لگا۔ پہلے پہل ماں کو اپنے بچے کی اس تبدیلی پر بہت صدمہ ہوا مگر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کی ناک سے رینٹھ اور مُنہ سے لعاب بہتے ہی گاؤں کے لوگوں نے اُس سے غیب کی باتیں پوچھنا شروع کر دی ہیں اور اس کی ہر جگہ خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے تو اُسے ڈھارس ہوئی کہ چلو یوں بھی تو کما ہی لیگا۔ کما تو، مانا گیا تھا عبدالغفار جس کو اب کبوتروں والا سائیں کہتے تھے، گاؤں میں پھر پھرا کر آٹا چاول اکٹھا کر لیا کرتا تھا، وہ بھی اس لئے کہ اُس کی ماں نے اُس کے گلے میں ایک جھولی لٹکا دی تھی جس میں لوگ کچھ نہ کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ کبوتروں والا سائیں اُسے اسلئے کہا جاتا تھا کہ اُسے کبوتروں سے بہت پیار تھا۔ تکئے میں جتنے کبوتر تھے اُنکی دیکھ بھال اَبّو پہلوان سے زیادہ یہی کیا کرتا تھا۔

اسوقت وہ سامنے کوٹھڑی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اپنے

باپ کا میلا کچیلا لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ باہر اس کی ماں آگ سلگا رہی تھی ــــ!

چونکہ سردیاں اپنے جوبن پر تھیں اس لئے گاؤں ابھی تک رات کے اور صبح کے دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا یوں تو گاؤں میں سب لوگ بیدار تھے اور اپنے کام دھندوں میں مصروف تھے مگر تکیہ جو کہ گاؤں سے فاصلہ پر تھا ابھی تک آباد نہ ہوا تھا البتہ دُور کونے میں مائی جیواں کی بکری زور زور سے ممیا رہی تھی۔

مائی جیواں آگ سلگا کر بکری کیلئے چارہ تیار کرنے ہی لگی تھی کہ اُسے اپنے پیچھے آہٹ سُنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو اُسے ایک اجنبی سر پر ٹھاٹا اور موٹا سا کمبل اوڑھے نظر آیا۔ پگڑی کے ایک پلو سے اس آدمی نے اپنا چہرہ آنکھوں تک چھپا رکھا تھا۔ جب اُس نے موٹی آواز میں: "مائی جیواں السلام علیکم!" کہا تو پگڑی کا کھُردرا کپڑا اُس کے مُنہ پر تین چار مرتبہ سکڑا اور پھیلا۔

مائی جیواں نے چارہ بکری کے آگے رکھ دیا اور اجنبی کو پہچاننے کی کوشش کئے بغیر کہا: "وعلیکم السلام ــ آؤ بھائی بیٹھو ــ آگ تاپو!"

مائی جیواں کمر پر ہاتھ رکھکر اُس گڑھے کی طرف بڑھی جہاں ہر روز آگ سُلگتی رہتی تھی۔ اجنبی اور وہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ تاپ کر اس آدمی نے مائی جیواں سے کہا: "ماں، اللہ بخشے گاما سائیں مجھے باپ کی طرح چاہتا تھا۔ اُس کے مرنے کی خبر ملی تو مجھے بہت صدمہ ہوا ــ مجھے آسیب ہو گیا تھا، قبرستان کا جن ایسا چمٹا تھا کہ اللہ کی پناہ، پر گاما سائیں کے ایک ہی تعویز سے یہ کالی بلا دور ہو گئی۔"

مائی جیواں خاموشی سے اجنبی کی باتیں سنتی رہی جو کہ اُس کے شوہر کا بہت ہی معتقد نظر آتا تھا۔ اُس نے ادھر اُدھر کی اور بہت سی باتیں کرنے کے بعد بڑھیا سے کہا: "میں بارہ کوس سے چل کر آیا ہوں، ایک خاص بات کہنے کے لئے۔" اجنبی نے رازداری کے انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اُس کی بات کوئی اور تو نہیں سُن رہا اور بھنچے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا "میں سُندر ڈاکو کے گروہ کا آدمی ہوں ــ پرسوں رات ہم لوگ اس گاؤں پر ڈاکہ مارنے والے ہیں۔ خون خرابہ ضرور ہوگا، اس لئے میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اپنے لڑکوں کو دُور ہی رکھنا۔ میں نے سُنا ہے کہ گاما سائیں مرحوم نے اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے ہیں۔ جوان آدمیوں کا لہو ہے بابا! ایسا نہ ہو کہ جوش مار اُٹھے اور لینے کے دینے پڑ جائیں ــ تم اُن کو پرسوں گاؤں سے کہیں باہر بھیجدو تو ٹھیک رہے گا ــ بس مجھے یہی کہنا تھا۔ میں نے اپنا حق ادا کر دیا ہے ــ السلام علیکم!"

اجنبی اپنے ہاتھوں کو آگ کے الاؤ پر زور زور سے مل کر اُٹھا اور جس راستے سے آیا تھا اُسی راستے سے باہر چلا گیا۔

سُندر جاٹ بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اُس کی دہشت اتنی تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو اُسی کا نام لیکر ڈرایا کرتی تھیں۔ بے شمار گیت اُسکی بہادری اور بیباکی کے گاؤں کی جوان لڑکیوں کو یاد تھے۔ اس کا نام سُنکر بہت سی کنواریوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ سُندر جاٹ کو بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا مگر جب چوپال میں لوگ جمع ہوتے تھے تو ہر شخص اُس سے اپنی اچانک ملاقات کے من گھڑت قصے سنانے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا۔ اس کے قدوقامت اور ڈیل ڈول کے بارے میں مختلف بیان تھے۔ بعض کہتے تھے کہ وہ بہت قوی اور جوان ہے، بڑی بڑی مونچھوں والا ان مونچھوں کے بالوں کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دو بڑے بڑے لیموں ان کی مدد سے اُٹھا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بیان تھا کہ اس کا قد معمولی ہے مگر بدن اتنا گٹھا ہوا ہے کہ گینڈے کا بھی نہ ہوگا۔ بہرحال سب متفقہ طور پر اُسکی طاقت اور بیباکی کے معترف تھے۔

جب مائی جیواں نے یہ سُنا کہ سُندر جاٹ اُنکے گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آرہا ہے تو اُس کے آتے اوسان خطا ہو گئے اور وہ اس اجنبی کے سلام کا جواب تک نہ دے سکی اور نہ اُس کا شکریہ ہی ادا کر سکی۔ مائی جیواں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سُندر جاٹ کا ڈاکہ کیا معنی رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب اُس نے ساتھ والے گاؤں پر حملہ کیا تھا تو سکھی لالہ مہاجن کی ساری جمع پونجی غائب ہو گئی تھی اور گاؤں کی سب سے سُندر اور چنچل چھوکری بھی ایسی گُم ہوئی تھی کہ اب تک اُس کا پتہ نہیں ملتا تھا۔ یہ بلا اب اُنکے گاؤں پر نازل ہونے والی تھی اور اس کا علم سوائے مائی جیواں کے گاؤں میں کسی اور کو نہ تھا۔ مائی جیواں نے سوچا کہ وہ اس آنے والے بھونچال کی خبر کس کس کو دے ــ چوہدری کے گھر خبر کر دے ــــ لیکن نہیں وہ تو بڑے کمینے لوگ ہیں۔ پچھلے دنوں اُس نے تھوڑا سا ساگ اُن سے مانگا تھا تو اُنہوں نے انکار کر دیا تھا۔ گھسیٹا رام حلوائی کو متنبہ کر دے۔ . . . . نہیں، وہ بھی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔

وہ دیر تک ان ہی خیالات میں غرق رہی۔ گاؤں کے سارے آدمی وہ ایک ایک کر کے اپنے دماغ میں لائی اور اُن میں سے کسی ایک کو بھی اپنے مہربانی کے قابل نہ سمجھا۔ اس کے علاوہ اُس نے سوچا اگر اُس نے کسی کو ہمدردی کے طور پر اس راز سے آگاہ کر دیا تو وہ کسی اور پر مہربانی کرے گا اور یوں سارے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا جس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ آخر میں وہ یہ فیصلہ کر کے اُٹھی کہ اپنی ساری جمع پونجی نکال کر وہ سبز رنگ کی

غلاف چڑھی قبر کے سرہانے گاڑ دے گی اور رحمان کو پاس والے گاؤں میں بھیج دے گی۔

جب وہ سامنے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھی تو دہلیز میں اُسے عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں کھڑا نظر آیا۔ ماں کو دیکھ کر وہ ہنسا۔ اُس کی یہ ہنسی آج خلافِ معمول معنی خیز تھی۔ مائی جیواں کو اُس کی آنکھوں میں سنجیدگی اور متانت کی جھلک بھی نظر آئی جو کہ ہوشمندی کی نشانی ہے۔

جب وہ کوٹھڑی کے اندر جانے لگی تو عبدالغفار نے پوچھا: ماں، یہ صبح سویرے کون آدمی آیا تھا؟"

عبدالغفار اس قسم کے سوال عام طور پر پوچھا کرتا تھا، اس لئے اسکی ماں جواب دئے بغیر اندر چلی گئی اور اپنے چھوٹے لڑکے کو جگانے لگی" اے رحمان، اے رحمان — اٹھ، اٹھ"

بازو جھنجوڑ کر مائی جیواں نے اپنے چھوٹے لڑکے رحمان کو جگایا اور وہ جب وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا اور اچھی طرح ہوش میں آگیا تو اُس کی ماں نے اُس کو ساری بات سُنا دی۔ رحمان کے تو اوسان خطا ہوگئے۔ وہ بہت ڈرپوک تھا۔ گو اُس کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی اور کافی طاقتور جوان تھا مگر اس میں ہمت اور شجاعت نام تک کو نہ تھی۔ سُندر جاٹ! — اتنا بڑا ڈاکو، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ تھوک پھینکتا تھا تو پورے بیس گز کے فاصلے پر جا کر گرتا تھا، پرسوں ڈاکہ ڈالنے اور لُوٹ مار کرنے کے لئے آرہا تھا۔ وہ فوراً ہی اپنی ماں کے مشورے پر راضی ہوگیا۔ بلکہ یوں کہئیے کہ وہ اُسی وقت گاؤں چھوڑنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

رحمان کو نیتی چمارن یعنی عنایت سے محبت تھی جو کہ گاؤں کی ایک بیباک، شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ گاؤں کے سب جوان لڑکے شباب کی یہ پوٹلی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے مگر وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ بڑے بڑے ہوشیار لڑکوں کو وہ باتوں باتوں میں اُڑا دیتی تھی۔ چوہدری دین محمد کے لڑکے فضل دین کو کلائی پکڑنے میں کمال حاصل تھا۔ اس فن کے بڑے بڑے ماہر دُور دُور سے اُس کو نیچا دکھانے کے لئے آئے تھے مگر اُسکی کلائی کسی سے بھی نہ مُڑی تھی۔ وہ گاؤں میں اکڑ اکڑ کر چلتا تھا مگر اُس کی یہ ساری اکڑفوں نیتی نے ایک ہی دن میں غائب کر دی جب اُس نے دھان کے کھیت میں اُس سے کہا: "تجھے، گنڈا سنگھ کی کلائی مروڑ کر تو اپنے من میں یہ مت سمجھ کہ بس اب تیرے مقابلے میں کوئی آدمی ہی نہیں رہا — آ، میرے سامنے بیٹھ میری کلائی پکڑ، ان دو انگلیوں کی ایک ہی ٹھمکی سے تیرے دونوں ہاتھ نہ چھڑا دوں تو نیتی نام نہیں —"

فضل دین اُس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اُسے یقین تھا کہ اُس کی طاقت اور شہزوری کے رعب اور دبدبے میں آکر وہ خود بخود ایک روز رام ہو جائے گی۔ لیکن جب اُس نے کئی آدمیوں کے سامنے اس کو مقابلے کی دعوت دی تو وہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔ اگر وہ انکار کرتا ہے تو نیتی اور بھی سر پر چڑھ جاتی ہے اور اگر وہ اُس کی دعوت قبول کر لیتا ہے تو لوگ یہی کہیں گے عورت ذات سے مقابلہ کرتے شرم تو نہیں آئی مردود کو۔ اُسکی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے۔ چنانچہ اُس نے نیتی کی دعوت قبول کر لی تھی۔ اور جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے اُس نے جب نیتی کی گدرائی ہوئی کلائی اپنے ہاتھوں میں لی تو وہ سارے کا سارا کانپ رہا تھا۔ نیتی کی موٹی موٹی آنکھیں اُس کی آنکھوں میں دھنس گئیں، ایک نعرہ بلند ہوا اور نیتی کی کلائی فضل کی گرفت سے آزاد ہوگئی — اُس دن سے لیکر اب تک فضل نے پھر کبھی کسی کی کلائی نہیں پکڑی۔

ہاں، تو اس نیتی سے رحمان کو محبت تھی، جیسا کہ وہ آپ ڈرپوک تھا اسی طرح اس کا پریم بھی ڈرپوک تھا۔ دُور سے دیکھکر وہ اپنے دل کی ہوس پوری کرتا تھا اور جب کبھی وہ اُس کے پاس ہوتی تو اُس کو اتنی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ حرفِ مدعا زبان پر لائے۔ مگر نیتی سب کچھ جانتی تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں جانتی تھی۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چھوکرا جو درختوں کے تنوں کے ساتھ پیٹھ ٹیکے کھڑا رہتا ہے اُس کے عشق میں گرفتار ہے۔ اُس کے عشق میں کون گرفتار نہیں تھا؟ — سب اُس سے محبت کرتے تھے، اس قسم کی محبت جو کہ بیریوں کے بیر پکنے پر گاؤں کے جوان لڑکے اپنی رگوں کے تناؤ کے اندر محسوس کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ محبت کرنے کی خواہش البتہ اُس کے دل میں اس قدر موجود تھی کہ وہ بالکل اُس شرابی کے مانند معلوم ہوتی تھی جس کے متعلق ڈر رہا کرتا ہے کہ اب گرا اور اب گرا — وہ بے خبری کے عالم میں ایک بہت اونچی چٹان کی چوٹی پر پہونچ چکی تھی اور اب تمام گاؤں والے اُس کی افتاد کے منتظر تھے جو کہ یقینی تھی —

رحمان کو بھی اس اُفتاد کا یقین تھا مگر اُس کا ڈرپوک دل ہمیشہ اُسے ڈھارس دیا کرتا تھا کہ نہیں نیتی آخر تیری ہی باندی بنے گی اور وہ یوں خوش ہو جایا کرتا تھا۔

جب رحمان دس کوس طے کر کے دوسرے گاؤں میں پہونچنے کیلئے تیار ہو کر تکیے سے باہر نکلا تو اُسے راستے میں نیتی کا خیال آیا مگر اُس وقت اُسنے یہ نہ سوچا کہ سُندر جاٹ دھاوا بولنے والا ہے۔ وہ دراصل نیتی کے تصور میں اس قدر مگن تھا اور اکیلے میں اُس کے ساتھ من ہی من میں اتنے زور روں سے پیار محبت کر رہا تھا کہ اُسے کسی اور بات کا خیال ہی نہ آیا۔ البتہ جب

وہ گاؤں سے پانچ کوس آگے نکل گیا تو ایکا ایکی اُس نے سوچا کہ نیتی کو تو بتا دینا چاہیئے تھا کہ سندر جاٹ آ رہا ہے لیکن اب واپس کون جاتا۔

عبدالغفار یعنی کبوتروں والا سائیں تکیئے سے باہر نکلا۔ اُس کے منہ سے لعاب نکل رہا تھا جو کہ میلے کرتے پر گر کر دیر تک گلیسرین کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ تکیئے سے نکل کر وہ سیدھا کھیتوں کا رُخ کیا کرتا تھا اور سارا دن وہیں گذار دیتا تھا۔ شام کو جب ڈھور ڈنگر واپس گاؤں کو آتے تو اُن کے چلنے سے جو دھول اُڑتی ہے اُس کے پیچھے کبھی کبھی غفار کی شکل نظر آجاتی تھی۔ گاؤں اُس کو پسند نہیں تھا۔ اجاڑ اور سنسان جگہوں سے اُسے غیر محسوس طور پر محبت تھی۔ لیکن یہاں بھی لوگ اُس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے اور اُس سے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے۔ جب برسات میں دیر ہو جاتی تو قریب قریب سب کسان اُس سے درخواست کرتے تھے کہ وہ پانی بھرے بادلوں کیلئے دُعا مانگے اور گاؤں کے عشق پیشہ جوان اُس سے اپنے دل کا حال بیان کرتے اور پوچھتے کہ وہ کب اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، نوجوان چھوکریاں بھی چُپکے چُپکے دھڑکتے ہوئے دلوں سے اُس کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرتی تھیں اور یہ جاننا چاہتی تھیں کہ اُنکے "ماہیا" کا دل کیسا ہے ـــــ عبدالغفار ان سوالیوں کو اوٹ پٹانگ جواب دیا کرتا تھا اس لئے کہ اُسے غیب کی باتیں کہاں معلوم تھیں۔ لیکن لوگ جو اُسکے پاس سوال لیکر آتے تھے اُسکی بے ربط باتوں میں اپنا مطلب ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔

عبدالغفار مختلف کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اُس کنوئیں کے پاس پہونچ گیا جو کہ ایک زمانے سے بیکار پڑا تھا۔ اس کنوئیں کی حالت بہت ابتر تھی۔ اُس بوڑھے برگد کے پتے جو کہ سالہا سال سے اس کے پہلو میں کھڑا تھا اس قدر اس میں جمع ہو گئے تھے کہ اب پانی نظر ہی نہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی مکڑیوں نے مل کر پانی کی سطح پر موٹا سا جالا تن دیا ہے۔ اس کنوئیں کی ٹوٹی ہوئی منڈیر پر عبدالغفار بیٹھ گیا اور دوپہر کی اُداس فضا میں اُس نے اپنے وجود سے اور بھی اُداسی پیدا کر دی۔

دفعتاً اُڑتی ہوئی چیلوں کی اُداس چیخوں کو عقب میں چھوڑتی ہوئی ایک بلند آواز اُٹھی اور بوڑھے برگد کی شاخوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ نیتی گا رہی تھی:۔

ماہیا مرے نے باگ لوایا   چمپا، مروا خوب کھلایا

اَسی نے لوایاں کھٹیاں نے

راتی سونڑ نہیں دیندیاں اکھیاں نے

اس گیت کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماہیا یعنی میرے چاہنے والے نے ایک باغ لگایا ہے، اُس میں ہر طرح کے پھول اُگائے ہیں، چمپا، مروا وغیرہ کھلائے ہیں۔ اور ہم نے تو صرف نارنگیاں لگائی ہیں ـــــ رات کو آنکھیں سونے نہیں دیتیں ـــــ کتنی انکساری برتی گئی ہے۔ معشوق عاشق کے لگائے ہوئے باغ کی تعریف کرتا ہے، لیکن وہ اپنی جوانی کے باغ کی طرف نہایت انکسارانہ طور پر اشارہ کرتا ہے جس میں حقیر نارنگیاں لگی ہیں۔ اور پھر شب خوابی کا گلہ کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

گو عبدالغفار میں نازک جذبات بالکل نہیں تھے لیکن پھر بھی نیتی کی جوان آواز نے اُس کو چونکا دیا اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسنے پہچان لیا تھا کہ یہ آواز نیتی کی ہے۔

گاتی گاتی نیتی کنوئیں کی طرف آنکلی۔ غفار کو دیکھکر وہ دوڑی ہوئی اُس کے پاس آئی اور کہنے لگی: "اوہ، غفار سائیں... تم... اوہ، مجھے تم سے کتنی باتیں پوچھنا ہیں.... اور اِس وقت یہاں تمہارے اور میرے سوا اور کوئی بھی نہیں.... دیکھو میں تمہارا منہ میٹھا کراؤں گی اگر تم نے میرے دل کی بات بوجھ لی اور... لیکن تم تو سب کچھ جانتے ہو.... اللہ والوں سے کسی کے دل کا حال چھپا تھوڑی رہتا ہے"

وہ اُس کے پاس زمین پر بیٹھ گئی اور اُس کے میلے کرتے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

خلافِ معمول کبوتروں والا سائیں مسکرایا مگر نیتی اُس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی، اُس کی نگاہیں کاڑھے کے تانے بانے پر بغیر کسی مطلب کے تیر رہی تھیں۔ کھردرے کپڑے پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے اُس نے گردن اُٹھائی اور آہوں میں کہنا شروع کیا: "غفار سائیں تم اللہ میاں سے محبت کرتے ہو اور میں... میں ایک آدمی سے محبت کرتی ہوں۔ تم میرے دل کا حال کیا سمجھو گے! ... اللہ میاں کی محبت اور اُسکے بندے کی محبت ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی ـــ کیوں غفار سائیں... ارے، تم بولتے کیوں نہیں ـــ کچھ بولو ـــ کچھ کہو... اچھا تو میں ہی بولے جاؤں گی...... تم نہیں جانتے کہ آج میں کتنی دیر بول سکتی ہوں..... تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے پر میں نہیں تھکوں گی....." یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی اور اسکی سنجیدگی زیادہ بڑھ گئی۔ اپنے من میں غوطہ لگانے کے بعد جب وہ ابھری تو اُس نے ایکا ایکی عبدالغفار سے پوچھا: "سائیں، میں کب تھکوں گی؟"

عبدالغفار کے منہ سے لعاب نکلنا بند ہو گیا۔ اُس نے کنوئیں کے اندر جھک کر دیکھتے ہوئے جواب دیا: "بہت جلد"

یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر نیتی نے اُسکے کرتے کا دامن پکڑ لیا اور گھبرا کر پوچھا: "کب؟ ـــ کب؟ ـــ سائیں کب؟"

عبدالغفار نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ببول کے جھنڈ کی

طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ نیتی کچھ دیر کنوئیں کے پاس سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے جدھر سائیں گیا تھا اُدھر چل دی۔

وہ رات جس میں سندر جاٹ گاؤں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے آ رہا تھا مائی جیواں نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات وہ اپنی کھاٹ پر لحاف اوڑھے جاگتی رہی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ رحمان کو اُس نے دوسرے گاؤں بھیج دیا تھا اور عبدالغفار نہ جانے کہاں سو گیا تھا۔ اَتّو پہلوان کبھی کبھی تکیے میں آگ تاپتا تاپتا وہیں الاؤ کے پاس ٹاٹ پر سو جایا کرتا تھا مگر وہ صبح ہی سے دکھائی نہیں دیا تھا، چنانچہ کبوتروں کو دانہ مائی جیواں ہی نے کھلایا تھا۔

تکیہ گاؤں کے اُس سرے پر واقع تھا جہاں سے لوگ گاؤں کے اندر داخل ہوتے تھے۔ مائی جیواں ساری رات جاگتی رہی مگر اُس کو ہلکی سی آہٹ بھی سُنائی نہ دی۔ جب رات گذر گئی اور گاؤں کے مرغوں نے اذانیں دینا شروع کر دیں تو وہ سندر جاٹ کی بابت سوچتی سوچتی سو گئی۔

چونکہ رات کو وہ بالکل نہ سوئی تھی اس لئے صبح بہت دیر کے بعد جاگی۔ کوٹھڑی سے نکل کر جب وہ باہر آئی تو اُس نے دیکھا کہ اَتّو پہلوان کبوتروں کو دانہ دے رہا ہے اور دھوپ سارے تکیے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اُس نے باہر نکلتے ہی اُس سے کہا: "ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ یہ موا بڑھاپا بڑا تنگ کر رہا ہے۔ صبح سوئی ہوں اور اب اُٹھی ہوں... ہاں تم سناؤ کل کہاں تھے؟"

اَتّو نے جواب دیا: "گاؤں میں"

اس پر مائی جیواں نے کہا: "کوئی تازہ خبر سناؤ"

اَتّو نے جھولی کے سب دانے زمین پر گرا کر اور جھپٹ کر ایک کبوتر کو بڑی صفائی سے اپنے ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا: "آج صبح چوپال پر نتھا سنگھ کہہ رہا تھا کہ گام چمار کی وہ لونڈیا..... کیا نام ہے اُس کا؟ ــــ ہاں وہ نیتی کہیں بھاگ گئی ہے؟ ــــ میں تو کہتا ہوں اچھا ہوا... حرامزادی نے سارا گاؤں سر پر اُٹھا رکھا تھا"

"کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے یا کوئی اُٹھا کر لے گیا ہے؟"

"جانے میری بلا..... لیکن میرے خیال میں تو وہ خود ہی کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے"

مائی جیواں کو اس گفتگو سے اطمینان نہ ہوا۔ سندر جاٹ نے ڈاکہ نہیں ڈالا تھا پر ایک چھوکری تو غائب ہو گئی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح نیتی کا غائب ہو جانا سندر جاٹ سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ وہ اُن تمام لوگوں سے نیتی کے بارے میں پوچھتی رہی جو کہ تکیے میں آتے جاتے رہے۔ لیکن جو کچھ اَتّو نے بتایا تھا اُس سے زیادہ اُسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔

شام کو رحمان لوٹ آیا۔ اُس نے آتے ہی ماں سے سندر جاٹ کے ڈاکے کے متعلق پوچھا۔ اس پر مائی جیواں نے کہا: "سندر جاٹ تو نہیں آیا بیٹا پر نیتی کہیں غائب ہو گئی ہے ــــ ایسی کہ کچھ پتہ ہی نہیں چلتا!"

رحمان کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کی ٹانگوں میں دس کوس اور چلنے کی تھکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔

ایکدم یہ تبدیلی دیکھ کر مائی جیواں نے تشویشناک لہجہ میں اُس سے پوچھا: "کیا ہوا بیٹا؟"

رحمان نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا: "کچھ نہیں ماں.... تھک گیا ہوں"

"اور نیتی کل مجھ سے پوچھتی تھی، میں کب تھکوں گی؟"

رحمان نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کا بھائی عبدالغفار آستین سے اپنے منہ کا لعاب پونچھ رہا تھا۔ رحمان نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا اور پوچھا: "کیا کہا تھا اس نے تجھ سے؟"

عبدالغفار الاؤ کے پاس بیٹھ گیا: "کہتی تھی کہ میں تھکتی ہی نہیں... پر اب وہ تھک جائے گی!"

رحمان نے تیزی سے پوچھا: "کیسے؟"

غفار سائیں کے چہرے پر ایک بے معنی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"مجھے کیا معلوم؟..... سندر جاٹ جانے اور وہ جانے"

یہ سُنکر رحمان کے چہرے پر اور زیادہ زردی چھاگئی اور مائی جیواں کی جھریاں زیادہ گہرائی اختیار کر گئیں۔

سعادت حسن منٹو

غسلِ آفتابی

سُورج کی شعاعیں میرے بند بند میں گھُسی جا رہی تھیں۔ جیسے وہ کچھ کُرید رہی ہوں۔ میری نس نس دُھنکی کی طرح بج رہی تھی اور گھڑی کی ٹِک ٹِک گویا اُسکے ساتھ تال دے رہی تھی۔ میں یوں اُٹھ بیٹھا جیسے مجھے کسی نے اُٹھا کر بٹھا دیا ہو۔ میرے مَیلے میلے پنڈے پر ایک کالس سی پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ پہلا دن تھا کہ میں جھجکے بغیر اپنے جسم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنا جسم سمجھ رہا تھا۔۔۔ جیتا جاگتا جسم۔ مٹی کا پُتلا نہیں۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر اپنے اِرد گِرد دیکھا۔ چاروں طرف بوسیدہ دیواریں کھڑی تھیں۔ میں نے یوں محسوس کیا گویا وہ میری طرف تک رہی ہوں۔ اُن کالی کالی چھوٹی اینٹوں پر گزُری ہوئی، بیتی ہوئی داستانیں کھُدی ہوئی تھیں، اور وہ دیواریں اُن اَن کہی کہانیوں کے بوجھ تلے ٹیڑھی ہو گئی تھیں۔ اُس وقت میرے مَیلے میلے پنڈے اور اُن کالی کالی دیواروں میں ایک مناسبت سی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے پیار سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ میرا بدن۔۔۔ میرا اپنا۔۔۔ جیتا ہوا۔۔۔ گیا یا ہوا بدن۔۔۔ میرا ہاتھ میری لمبی ڈاڑھی پر جا رُکا۔ دفعتاً میں نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ڈاڑھی کوئی چادر تھی جو میں نے اوڑھ رکھی تھی۔ جو میرے بدن اور سورج کی کرنوں میں حائل ہو رہی تھی۔ اور مجھے اپنے جسم کو جاننے سے روک رہی تھی۔ خدا جانے کیوں مگر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ اُس ڈاڑھی سمیت دھوپ غسل ممکن ہی نہ تھا۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے تو کہا تھا کہ تمام کپڑے اُتار کر دھوپ لینا لیکن وہ لمبی ڈاڑھی۔۔۔۔ میں نے اُٹھکر کپڑے پہن لئے اور نیچے اُتر آیا۔

دُھوپ غُسل کرتے ہوئے مجھے تقریباً بیسؔ دن ہو چکے تھے۔ مگر اس سے پہلے یہ بات مجھے نہ سُوجھی تھی مجھے یاد ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔ اکثر منہ پر ہاتھ پھیرتا۔ حتیٰ کہ میرا ہاتھ اپنی لمبی ڈاڑھی پر جا رُکتا اور بے ساختہ میرے مُنہ سے۔ آہم۔ آہم۔ نکل جاتا اس وقت مجھ پر واضح ہوتا کہ میں کون ہوں۔ اور کون سی باتیں مجھے گوارا نہیں۔ مجھے کس طرح رہنا سہنا چاہیئے۔ کونسی بات یا خیال پر لاحول پڑھنا چاہیئے۔۔۔ اُس وقت میں زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ البتہ چوری چوری گھڑی کی طرف دیکھتا رہتا جو میں سرہانے رکھ لیا کرتا تھا۔۔۔ کس قدر ہولے چلتی تھی وہ، جیسے جان ہی نہ ہو۔

مجھے ڈاکٹروں پر قطعی اعتبار نہیں۔ وہ تو صرف یہی جانتے ہیں کہ ریڑ

کی ٹوٹیاں جیب میں ڈالیں، ٹھمک ٹھمک کرتے ہوئے چلے۔ گویا بڑے عدیم الفرصت ہیں۔ دُور کھڑے ہو کر مریض کی طرف دیکھا۔ ناک بھوں چڑھا کر، جیسے وہ کوئی مجرم ہو، شارٹ ہینڈ میں باتیں کیں اور فیس جیب میں ڈال کر چلے آئے۔ شاید انہیں مرض سے محبت ہو۔ شاید، مریض سے تو نفرت ہوتی ہے۔ حالانکہ مَیں دوؔ مہینے بیمار پڑا رہا تھا لیکن میں نے کسی ڈاکٹر کا مُنہ تک نہ دیکھا تھا۔ اور وہ حکیم صاحب جو میرا علاج کرتے تھے اِمبیٰ کیا خوب آدمی تھے۔ آکر پہروں میری چارپائی پر بیٹھ رہتے بلکہ میرے ساتھ حقّہ پیتے رہتے۔ اور ایسی ایسی باتیں سُناتے جن میں لطیفے حکمت تشخیص اور چٹکلے ملے جُلے ہوتے۔ اُن کی باتیں سنکر میرا جی ہلکا ہو جاتا تھا۔ بلکہ کئی دفعہ تو مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا وہ باتوں سے ہی میرا علاج کر رہے ہوں۔

خیر وہ بیماری تو جاتی رہی لیکن ابھی نقاہت باقی تھی۔ میں بعید لاغر ہو چکا تھا۔ اُنہیں دنوں میرا پُرانا جماعتی اور دوست ظفری ولایت سے ڈاکٹری پاس کر کے آیا تھا۔ لوگ باگ تو اُسے ڈاکٹر قریشی کہا کرتے لیکن میرے لئے تو وہ سیدھا سادا ظفری ہی تھا۔ وہی پُرانا ظفری۔ تو ظفری نے مجھ سے کہا " ارے بڈھے یہ کیا دوائیوں کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے تم نے فضول بس روز بلا ناغہ کپڑے اُتار کر دُھوپ لیا کرو، دھوپ۔ ایک مہینے میں ہٹّے کٹّے نہ ہو جاؤ تو کہنا۔ آزما دیکھو" اور اُس نے مجھے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دیکھکر کہا " یہ ڈاڑھی دُھوپ کھا کر سُوکھے گی نہیں، ایسی ہی ہری بھری رہیگی۔ فکر نہ کرو بھائی " دوائیوں سے تو واقعی میں اُکتا چکا تھا۔ چونکہ حکیم صاحب کی دوائیاں بھی کٹوروں کے حساب سے پینی پڑتی تھیں۔ بالکل اُن کی باتوں کی طرح۔

تو بیسؔ دن دھوپ غسل کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی ڈاڑھی سے بھی منکر ہو گیا " کیسا بیہودہ خیال ہے " میں نے چھاؤں میں بیٹھ کر سوچا اور پیار کے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگا مگر میرا ہاتھ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی مُردہ چیز کو چھُو رہا ہو۔ یہ تھا میرا اپنا ہاتھ۔ اور میرے جسم کا بند بند " دھنک دھنک " کر رہا تھا۔ گویا میں کوئی روئی کا پُرانا گالا تھا اور وہ مجھے صاف کر رہا تھا۔ میرا بدن اُس ہاتھ کیلئے منتظر اور بیقرار تھا۔ روشندان سے سورج کی کرن اندر گھُس آئی تھی اور فرش پر ناچ رہی تھی۔ چمک چمک کر مجھے بُلا رہی تھی۔ " لاحول ولا قوۃ " میں نے بآوازِ بلند پڑھا اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنا

شروع کر دیا۔ مگر اُس سے میری آواز یوں تھی جیسے کسی "دھنک دھنک" کے نقار خانے میں کوئی طوطی چیخ رہی ہو۔ اور لاحول پڑھنے کے باوجود میری نگاہیں سورج کی اُس شعاع پر جمی ہوئی تھیں۔

ذرا سوچئے تو، یوں بیٹھے بٹھائے اپنی اتنی لمبی ڈاڑھی سے مُنکر ہو جانا یعنی اپنے آپ سے منکر ہو جانا اپنے مخصوص خیالات، امیدوں اور دلچسپیوں کو کھو دینا۔ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جانا کیسی قیامت تھی۔ مسلسل دس سال سے میں نے اس ڈاڑھی کو پالا تھا، اس کی دیکھ بھال کی تھی؛ جو اَب بذاتِ خود میری دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ اور میرے روح کا ایک حصّہ ہو چکی تھی۔ وہ ڈاڑھی!

میں روز سویرے اُٹھکر اُسے تیل لگاتا، کنگھی کرتا ــــــ اور پھر جب اُس بالوں کے ملائم گچھے پر ہاتھ پھیرتا تو میری دُنیا نکھر کر واضح ہو جاتی مجھے معلوم ہو جاتا کہ زندگی کیا ہے، میں کیا ہوں مجھے اس زندگی میں کیا کیا کرنا ہے۔ میری بیوی کی طبیعت کیسی چڑچڑی ہے ــــ مگر خیر۔ آہم اور محلے والے مجھے کس عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور میری رائے کی قدر کرتے ہیں۔ گو وہ دقیق مسائل کو نہیں سمجھتے ــــ مگر خیر، آہم۔ عقل تو اللہ کی دین ہوئی۔ دے دے، نہ دے نہ دے۔ اُس کی مرضی ہے۔ راضی برضائے تو..... آجکل کیسا زمانہ آیا ہے۔ چودھویں صدی جو ہوئی۔ لامذہبی مغربیت لاحول ولاقوۃ۔ سب شیطان کی چالیں ہیں۔ استغفراللہ۔ لیکن میں عاجز۔ آہم۔ شکر الحمدللہ ــــ خیر خیر...... یعنی ایک ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے میری دُنیا یوں قائم ہو جاتی جیسے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنا اور کُن کہدینا ایک ہی بات ہو۔

اسکے علاوہ جب کبھی جاجی کی ماں ــ جاجی میرا بیٹا ہے۔ یہی آٹھ نو سال کا ہوگا۔ بڑا شریر ہے وہ۔ آہم خیر ــــ ہاں تو جب کبھی جاجی کی ماں مجھ سے اپنی فضول باتیں چھیڑ لیتی، جیسا کہ آپ جانتے ہیں عورتوں کی عادت ہے اور اسکی باتیں مجھے ناگوار گذرتیں تو معًا میرا ہاتھ ڈاڑھی کو ڈھونڈتا۔ گویا اس کا سہارا لینا چاہتا ہو۔ فوراً مجھے یہ احساس ہوتا کہ اِن حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے، اور عورتوں کی باتوں پر دھیان دینا ــــ فضول۔ لاحول ولاقوۃ۔ آہم۔ خدا جانے کیا کہہ رہی ہے۔ بیچاری ــ! بالکل نہیں سمجھتی۔ تحقیق نہیں سمجھتی۔ جاہل مطلق۔ خیر آہم۔ پھر اُس کی باتیں نری باتیں ہی رہ جاتیں۔ بے مطلب باتیں۔ یعنی یہ سب اُس ڈاڑھی کا اعجاز تھا۔ اس وقت میری ڈاڑھی میری لاج رکھ لیا کرتی تھی۔ اور جاجی کی ماں کی باتوں کے باوجود میں وہی رہتا جو مجھے ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی جسے لوگ باگ شاہ صاحب کہا کرتے تھے۔ ویسے تو میں قریشی ہوں اور اپنے آپ کو سیدوں کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتا مگر جسے

اللہ عزت دے ــــ خیر خیر آہم۔ آپ سمجھتے ہی ہیں۔

جاجی کبھی دنگا یا ضد کرتا تو میں ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اُسے آواز دیتا۔ "آہم۔ جاجی، یہاں آؤ، بیٹا" میری آواز میں ایک روحانیت سی پیدا ہو جاتی۔ میرے حلق کے نچلے پردے گونجتے اور جاجی شرمندہ سا ہو کر میرے سامنے آکھڑا ہوتا۔ اُسے دیکھکر میں اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور خود بخود میری زبان سے ایسی ایسی نصیحتیں نکلتیں کہ میں خود سُنکر حیران ہوتا۔ کئی باتیں تو میرے لئے بھی قطعی نئی ہوتی تھیں۔ جیسے الہام ــــ خیر خیر آہم۔ میرا مطلب ہے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے زبان کی بجائے میری ڈاڑھی بول رہی ہو۔ یعنی جیسے میری زبان حلق کی بجائے ڈاڑھی سے تعلق رکھتی ہو۔ تو خیر۔ آہم۔

شام کو جب گاؤں کے معزز لوگ میرے پاس دیوان خانے میں بیٹھے ہوتے اور حقہ پیتے پیتے کوئی نہ کوئی مسئلہ چھڑ جاتا تو میں خاموشی سے ہنستا رہتا۔ جب سب اصحاب اپنی اپنی رائے سُنا دیتے تو وہ متوقع نگاہوں سے میرے مُنہ کی طرف دیکھتے۔ اس وقت میں ایک احساسِ فراغت سے حقے کے دو ایک لمبے کش لیتا ــــ میرا ہاتھ ڈاڑھی پر پڑ جاتا آہم ــــ اور معًا میرے دل میں زیر بحث مسئلے کے متعلق عجیب عجیب انکشافات آ جمع ہوتے اور اس الہام کے زیر اثر میں اُنہیں ایسے نکات سمجھا دیتا جو مجھے اکیلے میں کبھی نہ سُوجھے تھے۔ اس کے علاوہ اُس خشک مسئلے کو دلچسپ بنانے کیلئے مجھے کئی ایک چٹکلے اور پُرانے اولیا کی مثالیں یاد آجاتیں۔ مختصر یہ کہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے سے مجھے سارا تذکرہ اولیا یاد آجاتا۔ گویا ذہن کے بجائے میری ڈاڑھی نے اُسے حفظ کر رکھا ہو۔ غرضکہ میری ڈاڑھی الہ دین کے چراغ سے کم نہ تھی۔

اکثر صبح سویرے جب میں اکیلا اپنے دیوان خانے میں بیٹھا ہوتا تو زینب دروازے میں آکھڑی ہوتی۔ وہ سامنے کنوئیں سے پانی بھرنے آیا کرتی تھی۔ ہمارے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ دیوان خانے کے متصل۔ ویسے تو بیوہ تھی مگر تھی ابھی نوجوان ہی۔ اکثر شہر میں اپنے بھائی کے پاس جایا کرتی تھی۔ مہینے میں ایک مرتبہ خرچ لینے تو ضرور ہی جاتی۔ اور آپ جانتے ہیں شہر والیوں کی صحبت ــــ لٹھے کی سلواریں پہننا، آنکھوں میں کاجل لگانا، اور فضول ادھر اُدھر دیکھتے رہنا۔ چڑیا کی طرح پھُدکتے پھرنا ــ آہم خیر خیر۔ مجھے اُس کی یہ باتیں پسند نہ تھیں۔ پھر جب میں اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا تو مجھے خیال آتا کہ بیچاری اچھی ہی ہے وہ۔ آخر لڑکی ہی ہے نا۔ سارے گاؤں نے منتیں کیں کہ نکاح کر لو مگر وہ نیک لڑکی اپنی ضد پر قائم رہی۔ سُبحان اللہ۔ آہم۔ ابھی عمر ہی کیا ہے

یہی اٹھائیس کی ہوگی۔ زمانہ ہی فیشن کا جو ہوا۔ بیچاری کرے کیا۔ ــ آہم۔ ہاں تو شہر کب جاؤگی زینب" میں جھکی جھکی آنکھوں سے پوچھتا۔ "اور تو سب خیریت ہے نا۔ کیوں لڑکی۔ خرچ بھیجا ہے بھائی نے۔ ہیں؟ آہم۔ آہم ــــ اچھا تو بھولے پائی۔ دیر ہو جائے گی تجھے۔ لسّی منگوا لیا کر، سُنا لڑکی"..... اسوقت میں یہ قطعی بھول جاتا کہ میری اپنی عمر پینتیس سال سے زیادہ نہیں اور جب میرا ہاتھ اپنی ڈاڑھی کی لمبائی کو محسوس کرتا تو میرے مُنہ سے بار بار "لڑکی" نکل جاتا۔ اور میں سمجھتا کہ میں ایک بڈھا آدمی ہوں، اور اپنے آپ کو یقین دلانے کیلئے اُسے لڑکی کہتا۔ تو خیر۔ میرا مطلب ہے میری ڈاڑھی ہر مشکل میں میری لاج رکھ لیا کرتی تھی۔ آپ جانتے ہیں کسی نوجوان شوخ بیوہ سے بات کرنا کوئی سیدھی سادھی بات نہیں۔ خیر۔ آہم۔

آپ ہی کہئیے ایسی ڈاڑھی سے منکر ہو جانا خود کشی کی دلیل نہیں تو کیا ہے۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ تھا کہ اُس روز سے مجھے اپنی ڈاڑھی پر ایمان نہ رہا اور وہ ڈاڑھی بھی میری مدد کرنے اور لاج رکھنے سے منکر ہو گئی۔ جیسے الہ دین کا پُرانا چراغ کسی نئے چراغ سے بدل گیا ہو۔

خیر تو دھوپ غسل کے بعد میں کمرے میں بیٹھا تھا کہ جاجی کی ماں داخل ہوئی اور مجھے دیکھکر حسب معمول وہی قصہ چھیڑ بیٹھی: "یہ اور سنو۔ دھوپ میں نہانا۔ آج تک تو ہم نے کبھی سُنا نہ تھا۔ یوں ننگے دھڑنگے کوٹھے پہ پڑے رہنا ــــ میں کہتی ہوں اگر کوئی دیکھ لے تو ــــ؟ ڈاکٹروں کی باتیں!! وہ تو ولایت جا کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ ایسی بے حیائی کو علاج کہتے ہیں کیا؟ ــــ مگر آپ ہی کو کچھ عقل کرنی چاہئے۔ اس ڈاڑھی کا ہی لحاظ کرو۔ جاجی کے ابا آپ نے تو بس حد کر دی"۔ اُس کی باتیں سُنکر میں نے حسب معمول ڈاڑھی پر بار بار ہاتھ پھیرا ــــ آہم۔ مگر وہ بالوں کا ملائم گُچھا مجھے چُبھ رہا تھا اور ہاتھ پھیرنے سے مجھے وہ سُکون وہ مٹھاس میسر نہیں ہوئی۔ اُسکی باتیں مجھے چُبھ رہی تھیں اور میری نس نس غصّے سے دھنک دھنک کر رہی تھی۔ اس وقت میں یہ قطعی بھول گیا کہ عورتیں ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں۔ فضول باتیں۔ حجت، تکرار، لاحول ولاقوۃ ــــ آہم ــ خیر خیر۔ میں نے اپنی پگڑی سر پر رکھی اور باہر نکل گیا۔

باہر چاروں طرف دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ شفاف روپہلی دُھوپ، اور ہوا یوں چل رہی تھی کہ میرے کپڑے اُڑے جاتے تھے۔ گویا وہ مجھے کپڑے اُتار کر دھوپ میں لیٹ جانے کی دعوت دے رہی ہو۔ کھیتوں میں ہرے بھرے پودے لہک رہے تھے۔ درخت دُھوپ میں کھڑے انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ننھے ننھے پتے دھوپ لینے کے لئے سُورج کی طرف جھانک رہے تھے میرے بدن میں اک عجیب سی سرسراہٹ ہونے لگی۔ دلچسپ سرسراہٹ۔ لاحول ولاقوۃ۔ میں نے باآواز بلند پڑھا مگر میرا ہاتھ ڈاڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے رُک گیا۔ اور قمیص کے اندر داخل ہو کر چھاتی پر کھجلانے لگا۔

گھر واپس پہونچکر میں نے تذکرہ اولیا پڑھنا شروع کر دیا۔ عام طور پر جب میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں گویا وہ واقعات نہایت مانوس ہوں اور شخصیتیں مجھ سے ایک مناسبت سی رکھتی ہوں۔ جیسے اُن کی دُنیا میری اپنی دُنیا ہو۔ اسوقت اولیاو کرام میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہو کر میری طرف دیکھ دیکھ کر مُسکراتے اور اللہ کے فضل و کرم سے مجھے اپنایا کرتے۔ مگر اُس روز مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دُنیا کے تعلقہ ہوں۔ کوئی بلند اور برتر دُنیا۔ جیسے مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لیعنی اُس روز اُن کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ گویا وہ سورج تھے اور میں کسی کنوئیں کی تہ اور ہمارے درمیان کچھ حائل تھا ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے اُسکی لمبائی پر سُکون کی بجائے غصّہ سا محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ لمبی ڈاڑھی میرے اور اُس کتاب کے درمیان ایک رکاوٹ ہو۔ بہرحال میں شدت سے اُسے پڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ الفاظ مفہوم سے خالی ہو گئی اور میری اپنی آواز مجھے یوں سُنائی دینے لگی گویا کوئی مکھی بھنبھنا رہی ہو۔ اندر جاجی کی ماں چیخ رہی تھی: "اس لڑکے نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ذرا اس سے پوچھتے تو سہی"ــــ جاجی میرے سامنے کھڑا تھا مگر مجھے کوئی نصیحت نہ سوجھی: "بچّہ جو ہوا۔ بچّے یونہی کیا کرتے ہیں:" جاؤ بیٹا دنگا نہ کرو"۔ میں نے تنگ آکر کہا۔

دروازے میں زینب آکھڑی ہوئی۔ جانے ہونٹوں پر کیا ملا ہوا تھا۔ گلابی ہونٹ اور وہ نوکیلی آنکھیں۔ جیسے ڈولتی ہوئی کشتیاں۔ جھکی جھکی گھنی پلکیں۔ میرا ہاتھ قطعی بھول گیا کہ اس وقت اُسے ڈاڑھی پر ہونا چاہئیے۔ زینب نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پھر اُس کی آنکھوں میں ایک مُسکراہٹ لہرا گئی۔ وہ ڈولتی ہوئی کشتیاں جُھوم جُھوم کر جھکیں اور وہ ٹھمک کر چلی گئی۔ "لاحول ولاقوۃ" بے اختیار میرے مُنہ سے نکل گیا میرا ہاتھ لپک کر ڈاڑھی پر آپڑا ــــ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ وہ تو جا چکی تھی۔ اب لاحول پڑھنے سے فائدہ اور ڈاڑھی ــــ وہ تو میرے خلاف ہو چکی تھی گویا مجھ سے کوئی انتقام لے رہی ہو۔

شام کو جب لوگ باگ دیوان خانے میں اکٹھے ہوئے تو اتفاق دیکھئے اُس روز ڈاڑھی کا مسئلہ چھڑ گیا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے کچھ کہتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ یوں محسوس کر رہا تھا میں گویا میری زبان حلق سے اُکھڑ گئی ہو اور اگر میں نے مُنہ کھولا تو وہ پھُر سے اُڑ جائے گی۔ وہ سب متوقع نگاہوں سے میرا مُنہ تک رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے اصرار کیا تو

مجھے کچھ نا کچھ کہنا ہی پڑا: "ڈاڑھی ــــ آہم آخر ڈاڑھی کیا ہے۔ محض ایک عادت، ایک دستور۔ شرلیت نمائی کا طریقہ۔ اور کیا۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے ــــ آہم۔ جیسے ایک سبز عینک جسے پہن کر انسان اپنے آپ کو دیکھتا ہے جو ــــ جو دھوپ کی کرنوں ــــ آہم۔ سے آنکھوں کو بچاتی ہے۔ آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچاتی ہے۔ اور ــــ لوگوں کے لئے اک سبز پراہن۔ آہم۔ یعنی مطلب یہ کہ دیکھئے نا۔ فرض کیجئے میں آج ہی اپنی ڈاڑھی منڈوا دوں تو میری شخصیت میں تو کوئی فرق نہ آئے گا ہے نا! ــــ آہم ــــ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ حاضرین کے مُنہ کی طرف دیکھتا۔ اس لئے میں نے لپک کر حقہ پکڑ لیا اور کش لینے کے بہانے خاموش ہو گیا۔

"شاہ صاحب کسر نفسی کر رہے ہیں" اُن میں سے کسی نے کہا۔ دیہاتی وہ مجھے اُسی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے جو انہیں پسند تھی۔ جو انہوں نے میرے لئے وضع کر رکھی تھی۔ میں ــــ کٹ پتلی۔ قید ــــ میرا سر گھوم رہا تھا۔

اگلے روز بیٹھے بٹھائے مجھے یہ سُوجھی کہ چلو شہر ہو آؤں۔ شہر ہمارے گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ یعنی نقد آٹھ میل کا سفر۔ اور میں یوں جا رہا تھا جیسے کسی نے بلا بھیجا ہو۔ حالانکہ مجھے وہاں کوئی کام نہ تھا۔ البتہ ایک لالٹین خریدنی تھی۔ لیکن وہ تو چھ مہینے سے میں سوچ رہا تھا کہ لیمپ بہت چھوٹا ہے اس لئے لالٹین لے آؤں۔ پھر خیال آتا کہ چلو گزارا ہو ہی رہا ہے۔ لیکن اُس رات تو مجھے وہ لیمپ بالکل ہی اندھا دکھائی دینے لگا۔ حتیٰ کہ میں نے محسوس کیا کہ لالٹین کے بغیر زندگی ہیچ ہے اور میں حیران تھا کہ اتنی دیر لالٹین کے بغیر ہم کیسے گذارا کرتے رہے تھے۔ تعجب کی بات تھی۔

شہر پہونچ کر لالٹین خریدنے سے پہلے اِدھر اُدھر آوارہ پھرتا رہا۔ اس سے پہلے جب کبھی میں شہر جاتا تو سیدھا حکیم رفیع الدولہ کی دُکان پر پہونچتا اور وہاں بیٹھکر دن بھر حقہ پینے اور باتیں کرنے میں بسر کرتا۔ مگر اُس روز رفیع الدولہ کی دُکان پر جانا میرے لئے دوبھر تھا۔ اتنی دُور چل کر جاؤں، شہر کے اُس طرف کتنی دُور تھی اُس کی دکان۔ اور پھر وہاں حقہ پینے کیلئے جانا۔ فضول گڑ گڑا کرنے کیلئے ــــ تو میں جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ لالٹین تو میرے ذہن سے ہی اُتر گئی تھی۔ حقے کی طلب محسوس کرکے میں نے سوچا کہ کہیں کسی دُکان پر بیٹھ جاؤں۔ یہ ایک محض اتفاقیہ بات تھی کہ جس دُکان پر میں بیٹھ گیا وہ حجام کی دکان تھی۔ وہاں بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ چلو حجامت ہی بنوالوں ــــ میرا ہاتھ ڈاڑھی پر پڑ گیا۔ کیسی بے ڈھب سی ڈاڑھی ہے، میں نے سوچا۔ دُکان میں دو آدمی بیٹھے حجامت بنوا رہے تھے۔ اُسترے اور قینچیاں چر چر چل رہی تھیں۔ میں نے ایسا محسوس کیا گویا وہ میرے راز سے واقف تھے اور اپنی ہی زبان میں میرے متعلق باتیں کر رہے تھے: "چر چر چر چر۔ چراؤں ــــ خرچ۔ خرچ۔ خرورچ" میرا جی چاہا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔ عین اُسی وقت حجام نے مجھ سے کہا۔ "آئیے مولوی صاحب، بال بنوائیں گے آپ۔ بیٹھئے" تعجب سے میرا ہاتھ ڈاڑھی پر جا پڑا۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے کسی نے مجھے دھکا دے دیا ہو۔ خیر میں حجام کے سامنے جا بیٹھا۔

واپسی پر میں غصے سے لالٹین ہلاتا آ رہا تھا: "شکر ہے کمبخت نے میری ڈاڑھی نہیں کاٹ دی۔ ورنہ گاؤں جانا بھی مشکل ہو جاتا۔ لوگ طعنے دیتے۔ تمسخر کرتے ــــ احمق کہیں کا نام کو شہر کا حجام اور بال کاٹنے تک کی تمیز نہیں ــــ آہم"

اِن باتوں کے باوجود میں نے دھوپ غسل کرنا نہ چھوڑا۔ حالانکہ چھاؤں میں بیٹھ کر مجھے اپنی اس حماقت پر غصہ آتا تھا۔ مگر اندھیر تھا ناکہ میرا اپنا بدن۔ دھنک، دھنک کر کے مجھے مذاق میں اُڑا دیتا۔ اور اگلے روز وقت مقررہ پر میں گھڑی بغل میں دبا کر دھوپ لینے کیلئے کوٹھے پر چڑھ جاتا۔

اگلے ہی دن دھوپ لیتے ہوئے مجھے ایک نئی بات سوجھی۔ میں نے پڑے پڑے فرض کر لیا کہ میں شہر سے ڈاڑھی مُنڈوا آیا ہوں۔ تو میں یہ تصور کرتا رہا کہ اب میری شکل کیسی ہوگی۔ ایک نوجوان کلین شیو چہرہ میرے روبرو آ کھڑا ہوا اور مُسکرانے لگا۔ اس روز میں نے یہ محسوس کیا کہ سورج اور میرے بدن کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں اور میرے جسم کا بند بند اور بھی زور سے "دھنک دھنک" کرنے لگا۔

نیچے آکر اتفاقاً میری نظر دیوان خانے کے آئینے پر پڑی۔ میں چونک اُٹھا۔ گویا کسی نے میرے مُنہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ سامنے کوئی اجنبی کھڑا ہوا حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ یہ تو مصنوعی ڈاڑھی ہے کسی نے میرے کان میں کہدیا۔ معاً مجھے یاد آیا کہ میں شہر سے ڈاڑھی منڈوا آیا تھا اور اس لئے کہ گاؤں والے میرا مذاق نہ اُڑائیں میں نے ایک مصنوعی ڈاڑھی خرید کر لگا لی تھی۔ اور اَب ــــ جب بھی میں چاہوں اُتار سکتا ہوں اور ضرورت کے وقت لگا بھی سکتا ہوں۔ جبھی تو اس صبح دُھوپ لیتے ہوئے میں نے اُسے اُتار لیا تھا اور میرے بدن اور سورج کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ تھی ــــ یہ بات یاد کرکے میری بلا اختیار ہنسی نکل گئی۔ خوب مزا رہیگا۔ تمام گاؤں والوں کو بناؤں گا ــــ

بس اُس وقت سے میری دنیا پھر آباد ہوگئی میری باتوں میں رس پیدا ہوگیا۔ میرے مسائل پھر چلنے لگے۔

اُسی وقت زینب دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ میں نے اُسکی طرف دیکھا۔ پھر خفیہ طور پر میں نے اپنی داڑھی اتار دی۔ ایک نوجوان دمکتا ہوا کلین شیو چہرہ میری آنکھوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اپنے اس راز کے متعلق سوچ کر میری رگ رگ "دھنک دھنک" ناچنے لگی یہ میں ہوا میں جھول رہا تھا زینب کو دیکھکر میں نے یوں محسوس کیا گویا سورج اور میرے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں —— فرش پر دھوپ روپہلی کرن ناچ رہی تھی۔ "دھنک، دھنک" میرا بدن تال دے رہا تھا۔ زینب کے ہونٹ بٹوے کے منہ کی طرح بند ہوگئے۔ جیسے وہ کچھ کہہ رہے ہوں۔ اس کی آنکھیں کشتیوں کی طرح ڈولنے لگیں۔ گویا میں ان میں بیٹھا جھول رہا تھا۔ اُس کے آنچل کے تلے موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ اُن جھکی جھکی پلکوں سے کرنیں نکل رہی تھیں۔ میرے جسم میں ایک کالنس سی لہرانے لگی —— وہ چلی گئی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے چلتے چلتے بلا گئی ہے۔

مگر اب وہ روز آتی ہے۔ دبلے دبلے پاؤں جیسے صبح کی پہلی کرن اور میں وہ داڑھی اُتار کر بلاناغہ دھوپ لیتا ہوں۔

شام کو جب گاؤں والے دیوان خانے میں آبیٹھتے ہیں تو میں وہ مصنوعی داڑھی لگا لیتا ہوں میرا ہاتھ اس داڑھی سے کھیلتا رہتا ہے۔ جیسے وہ کسی راز کی حفاظت کر رہا ہو۔ میرے دل میں زیر بحث مسئلے کے متعلق عجیب عجیب انکشافات اُٹھتے ہیں اور گاؤں والے حیرانی اور عقیدت سے میری باتیں سنتے ہیں —— لیکن وہ نہیں جانتے۔ میرا راز نہیں جانتے وہ —— وہ سمجھتے ہیں کہ میری داڑھی اصل ہے —— احمق۔

ممتاز مفتی

ناگفتہ بہ

صدمہ ہائے دردِ فرقت بیش و کم، ناگفتہ بہ
ہے ہماری حالتِ رنج و الم، ناگفتہ بہ

نازِ بیجا بڑھ نہ جائے اے نیازِ ذوق و شوق
ہاں! تمنائے دلِ پُر درد و غم، ناگفتہ بہ

کہہ رہی ہے صاف یہ خاموشیِ لب ہائے زخم
داستانِ قاتل و تیغِ ستم، ناگفتہ بہ

میری چشمِ منتظر ہے بند لب بند آپ کے
حالتِ ضعف و نزاکت ہے بہم، ناگفتہ بہ

بیخودیِ حادثاتِ دھر کہتی ہے یہی
"ماجرائے حُسنِ لیلیٰ قدم" ناگفتہ بہ

قصہ مہر و وفائے غیر کچھ ہم سے نہ پوچھ
بیوفا تجھ سے کہے دیتے ہیں ہم، ناگفتہ بہ

دعویٰ بے صرفہ موسیٰ کا سُن سن کر جواب
آرزوئے جلوہ حُسنِ صنم، ناگفتہ بہ

کُفر کی حالت نہ پوچھ اے داورِ محشر نہ پوچھ
کیا کہوں افسانہ بیت الصنم، ناگفتہ بہ

ہے تپش خاموشیِ شمع لحد سے آشکار
داستانِ کشتہ سوزِ الم، ناگفتہ بہ

ہیبت

سنتری کی لالٹین

حوالات۔ تین آدمی بیٹھے ہیں۔ ایک تاجر، دوسرا شاعر اور تیسرا مزدور، تینوں صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔ صبح انہیں پھانسی دی جائے گی۔ یہ اُن کی آخری رات ہے۔ آدھی رات گزر چکی ہے۔ سناٹا چھایا ہوا ہے۔ حوالات میں ایک مدھم روشنی چمک رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ــــ سنتری کے بھاری جوتوں کی آواز ــــ بندوق کی جھنکار ــــ اور پھر نپے تُلے قدموں کی کرخت آواز۔ سنتری دکھائی دیتا ہے، جیسے سایہ بندوق اُٹھائے چل رہا ہو اور یہ سایہ اس طرح گزرتا ہے جیسے کسی سیاہ کاری کی بھولی بسری یاد تماشائیوں کی یادداشت میں آہستہ آہستہ اُجاگر ہو۔ مزدور ایک سگریٹ جلاتا ہے اور ایک زور کا دم لگانے کے بعد تاجر کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ تاجر ان تینوں میں سب سے زیادہ مبہوت ہے۔ سگریٹ لیکر اس طرح پیتا ہے گویا ارادے کو اس میں کوئی دخل نہیں پھر شاعر کی طرف سگریٹ بڑھا دیتا ہے۔

مزدور۔ (دھوئیں کے چھلّوں کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرکے) ہمارا آخری دھواں۔

(تاجر مزدور اور شاعر کی آنکھوں کو گھور کر دیکھتا ہے اور یکایک خوفناک قہقہے لگاتا ہے، جیسے کوئی جنون میں کھلکھلائے، اور پھر چُپکا ہو جاتا ہے)

مزدور۔ دیوانے کی ہنسی!

شاعر۔ مُردے کی آواز!

مزدور۔ مُردے خاموش رہتے ہیں! وہ کبھی نہیں ہنستے! آؤ دوست! جی مت چھوڑو۔ خوش ہو!

تاجر۔ انسان کس نے بنایا؟

شاعر۔ خدا نے۔

تاجر۔ پھانسی کس نے بنائی؟

مزدور۔ انسان نے۔

تاجر۔ خدا نے انسان بنایا..... انسان نے پھانسی بنائی..... (اُنگلیوں پر گِن کر) اس لئے..... خدا نے پھانسی بنائی..... ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، (ٹہلتا ہے)

شاعر۔ کل! ہماری آخری کل..... رات کتنی حسین ہے! تاروں بھری..... سفید چمکدار تارے! پیاروں کے آنسو!

مزدور۔ پسینے کی بوندیں۔ میرے کروڑوں بھائیوں کے پسینے کی بوندیں!

شاعر۔ دوست! سوچو تو کہ کل پھر اسی وقت رات ہوگی..... کل، پرسوں اور اس سے اگلے دن بھی!..... لیکن تم اور میں اُسے دوبارہ دیکھنے کیلئے یہاں نہیں ہونگے۔

مزدور۔ رات کو تمہاری یا میری کیا پروا؟

شاعر۔ آہ! دُنیا کا حُسن لرزاں! ہماری کمی کس قدر محسوس کریگا۔

مزدور۔ ہماری کمی محسوس کرے گا! ہشت..... دُنیا کا حُسن! یہ تو صرف پیٹ بھرے بے فکروں کا زاویۂ نظر ہے جن کے پاس اتنا بیکار وقت ہوتا ہے کہ اسے حُسن کہنے میں اپنا سر کھپاتے رہیں۔ سنتے ہو! حُسن وُسن سب بہت اچھا ہے۔ لیکن وحشیانہ بے رحمی سے بھرا ہوا ہے!

شاعر۔ تم حُسن کو مجروح کیوں کرتے ہو؟ آج اپنی زندگی کے آخری دن بھی ــــ!

مزدور۔ میری زندگی کا آخری دن؟

شاعر۔ کیا تمہیں افسوس نہیں ہے کہ کل مرنا ہے؟

مزدور۔ کل مرنے کا افسوس؟..... شاعر، میں ایک مزدور ہوں، اُن لاکھوں کروڑوں میں سے ایک جو کبھی زندہ ہی نہیں رہے، ہم جو کہ پیدائش کے دن ہی سے بس زندہ لاشیں ہیں! میں نے کبھی زندگی کو جانا ہی نہیں۔ میں اس نفیس خود رحمی کو کیسے سمجھ سکتا ہوں جسے تم محسوس کر رہے ہو! شیریں حسابِ جُدائی اس محبوب عادت سے جسے تم زندگی کہتے ہو؟

شاعر۔ آہ! لیکن یہ بھیانک ہے! یہ سوچنا کہ بادل آئیں گے بوجھل اور پانی سے بھرے ہوتے اور اودے سیاہ رنگ کے۔ جیسے شاندار ہاتھی پہاڑوں پر سے اُتر رہے ہوں! اِس پُرشکوہ جلوس کو میں نے اپنی زندگی کے ہر سال بڑی محبت سے دیکھا ہے؛ یہ سوچنا کہ میرے بچپن کے باغوں میں مور اپنے سبز اور نیلے منقش پر پھیلا کر برکھا کے دیوتاؤں کے آگے ناچیں گے! آہ! اور درختوں کے ملائم اور ٹھنڈے ساتے روِش پر خاموش پڑے رہیں گے۔ سنسان خیابانوں میں قمریاں محبت کے گیت گائیں گی! اور ہمارے باغوں میں درختوں کی ڈالیاں پھلوں سے لدی کھڑی رہیں گی۔ دوست۔ ذرا

سوچو تو سہی۔

مزدور۔ یہ شاید تمہاری آخری نظم ہے؟

شاعر۔ میری آخری صدا دُنیائے حُسن کو! سوچو تو کہ مجھے فوجی قانون کے ماتحت گرفتار کرنا اور مجھے ایک ایسے جُرم میں ماخوذ کرنا جس کی سزا سے زیادہ اور کوئی سزا نہ ہو۔ مجھے۔ میں نے کیا کیا ہے؟ ہے ایشور! کیا یہ ممکن ہے کہ معصوموں کے ساتھ اس درجہ ظالمانہ اور غیر منصفانہ سلوک کو روا رکھے؟

مزدور۔ (ہنستا ہے) اب تم ایشور کو پکار رہے ہو۔ بیچارے شاعر! اُس کو جس نے تارے اور چاند اور مور اور قمریاں بنائی ہیں۔ ہاں۔ اُسے جس نے "دُنیا کا حُسن" بنایا ہے۔ (دُور ایک گیدڑ بولتا ہے۔) جس نے گیدڑ بنایا ہے جو قبرستانوں میں پھرتا رہتا ہے۔

شاعر۔ (لرز کر) آہ!

مزدور۔ لیکن، ہاں، زرد چاند کی روشنی میں، جو اُس کی دُم کو خالص چاندی میں تبدیل کر دیتی ہے! شاعر! ساری عمر تم نے بھی کیسی زندگی کا خواب دیکھا! اور کل تمہارا سارا خواب ختم ہو جائیگا۔

شاعر۔ نہیں! کبھی نہیں! میں دوبارہ جنم لونگا!

تاجر۔ (نیم بیہوشی میں) کیا میں بھی دوبارہ جنم لونگا؟ مجھے ابھی پانچ لاکھ اور بنانے ہیں! مجھے ابھی اور اُدھار دینا ہے۔ بہت۔ روپیہ! روپیہ!! روپیہ!!! مجھے روپے سے محبت ہے۔ جان سے بھی زیادہ!

مزدور۔ تم آواگون کے قائل ہو؟ بہت اچھا!

شاعر۔ میں پھر واپس آؤں گا۔ اور اس دُنیا کی ہر چیز کو پہچانوں گا۔ پرندوں کا حُسن، پانی اور پہاڑ۔

مزدور۔ مجھے تمہارا یہ طریقہ پسند ہے جو تم نے اپنی تسلی کے لئے موت کی اِس گھڑی میں اختیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بھر تم عیش و آرام میں رہے۔ زندگی واقعی تمہارے لئے ایک عادت تھی۔ اور تمہاری شاعری ایک تخیلی چیز۔ شاعر! میرے لئے تو، جو کہ ہمیشہ مُردہ ہی رہا، دوسرا جنم ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر یاد رکھو میں پھر بھی ہمیشہ زندہ رہونگا!

شاعر۔ میرا کلام زندہ رہیگا۔ اور اسکے ساتھ میں بھی!

مزدور۔ تمہارا کلام حُسن گزشتہ انسانیت کے افیونی خوابوں کا ترکہ ہوگا لیکن میں زندہ رہونگا۔ صرف ایک تخیل کا شاعر۔ ایک عمیق و بسیط تخیل۔ اُس کل شاعری سے عظیم تر جو بادلوں، چاند کی شعاعوں اور موروں کے متعلق ہے۔ ایک تخیل، تلوار کی طرح تیز، آنسو کی طرح شفاف! عوام کی آمریت۔ زندہ باد!

(گھنٹہ پانچ بجاتا ہے۔)

شاعر۔ ایک گھنٹہ اور۔ اور پھر۔ زرد صبح۔ آخری۔

مزدور۔ سُرخ صبح۔ کئی کی پہلی سُرخ صبح!

تاجر۔ کیا یہ ناچنے والیوں کے گھنگروؤں کی آواز تھی؟ واہ واہ! کل میرے لڑکے کی شادی ایک حسین شہزادی سے ہونے والی ہے۔ بادشاہ کو بھی بُلانا چاہئیے۔ ساری عمر اس کی مدد کی ہے۔ اشرفیوں کے توڑے دئے ہیں اُسے۔ اُس نے مجھے ایک خطاب دیا تھا اور اب مجھے ایک اور خطاب دے رہا ہے، اور کل ایک اور، پھر اور۔ اِسی طرح دیتا رہے گا۔

شاعر۔ کیوں دوست، یہ عجیب بات ہے نا کہ ہم موت سے خائف نہیں ہیں؟ جس دن حکم سُنایا گیا اُسی دن کوئی چیز میرے اندر مر گئی۔ لیکن اب تو اس خیال کا میں اس قدر عادی ہو گیا ہوں کہ اس میں دلچسپی سی پیدا ہو گئی ہے۔ شاید اُس دوسری طرف بہت کچھ ہوگا جس پر نظمیں کہی جائیں۔

مزدور۔ تمہارا خواب ایک نشہ ہے مہربان۔ (سنتری کی بندوق کی جھنکار پھر۔ سناٹا۔ سنتری گزرتا ہے۔)

تاجر۔ (چیختا اور گاتا ہے) ارے او سنتری! کل کی شادی کے لئے خیموں اور بجلی کے قمقموں کا کیا انتظام ہوا؟ قمقمے! ایسے ہوں جیسی بعض آنکھیں ہوتی ہیں۔ سُرخ اور بے خوابی سے اُبلی ہوئیں! میں چاہتا ہوں کہ تم کلکتہ تار دیدو کہ تین ناچنے والیاں اور دو طائفے اسپیشل ٹرین سے آ جائیں۔ دس جوڑیاں طبلے کی اور چار ستار بس۔ اور ہاں دیکھو مجھے مت بھولنا۔ مجرے۔

شاعر۔ دوستو! تمہاری آنکھیں اتنی تھکی ہوئی کیوں ہیں؟

مزدور۔ دُور دیکھنے کی وجہ سے۔ جہاں مجھے وہ منظر دکھائی دے رہا ہے جو میرے دوست دیکھیں گے۔ زبردست کشمکش۔ فیصلہ کُن کشمکش۔ اور پھر۔!

(نفیر بجتا ہے)

تاجر۔ دُلہن کو حاصل کرنے کے لئے دولہا تیار ہو رہا ہے۔ کتنے نو عمر ہیں دونوں! کتنی شرمیلی ہے کم عمر دُلہن! مجھے تو نیم عریاں تک دکھائی دے رہی ہے۔ بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں گندھی ہوئی لٹک رہی ہیں۔ بالا قامت و سرو قد۔ ایک لفظ بھی نہیں بولتی۔ دولہا سے بغلگیر ہونے کے انتظار میں کھڑی ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک سُرخ نقطہ ہے۔ جیسے خون۔ جیسے خون۔ اے دُلہن! تو کون ہے؟ تو کون ہے؟ پھانسی... پھانسی!! پھندے! پھندے! خون! خون! ہٹ جا! ہٹ جا! تو مجھے

پسند نہیں ہے۔ میں تجھے اپنی بہو نہیں بناؤں گا۔ اپنی بیوی بھی نہیں بناؤں گا

(ہنستا ہے۔)

شاعر:۔ دوست! صبر۔ بس اب ختم ہوا جاتا ہے۔ اے زندگی! میں نے تجھ سے کتنی گہری محبت کی ہے — کتنا میں نے تجھے خوابوں سے بھرا، اپنی مسرتوں سے، اپنی تکلیفوں سے، اپنے اندیشوں سے! کتنی مرتبہ تجھ سے برسرِ پیکار رہا! لیکن کتنی دفعہ ہم میں پھر گہری دوستی ہو گئی! اے زندگی! یاد رکھیو، میں تجھے نہیں چھوڑ رہا — تو مجھے چھوڑ رہی ہے — مجھے — اتنے کم عمر — اتنے کم عمر کو — ہے ایشور! کیا یہی تیری مرضی ہے؟

مزدور:۔ نہیں! یہ حکومت کی مرضی ہے جس نے ایشور کو ملازم مقرر کیا ہے! آقا نہیں! ہاں میں کہتا ہوں ملازم مقرر کیا ہے تاکہ اپنی ضروریات اُس سے پوری کرائے، میری یا تمہاری ضروریات نہیں۔ شاعر تم پر مجھے ترس آتا ہے۔ جن چیزوں کا سرے سے وجود ہی نہیں اُنکے اندھے خیال نے تمہیں ساری عمر بیوقوف بنائے رکھا تاکہ تم خاموش رہو۔

شاعر:۔ اب بھی تم "اُسے" نہیں مانتے؟

مزدور:۔ میں کسی کو نہیں مانتا سوائے اس کے کہ کمزور انسان نے اپنی ضرورت کی تسلّی کا نام خدا رکھ لیا ہے اور اس سے مجھے سخت نفرت ہے! میرے دوست مجھے اُمید ہے کہ آواگون کے کسی عجیب عمل سے اگر تم پھر جنم لو تو عقل اور قوی اعصاب لیکر پیدا ہونا۔

شاعر:۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ مرتے مرتے بھی ایشور کا ذکر اسقدر حقارت سے کر رہے ہو؟ کیا تم اس سے معافی نہیں مانگو گے؟

مزدور:۔ دوست، اگر کوئی ایشور ہے تو اُسے ہم کروڑوں مزدوروں کے سامنے دوزانو ہونا پڑے گا — اور ہم سے معافی مانگنی ہوگی کروڑوں دفعہ — اور پھر بھی وہ یہی محسوس کرے کہ وہ ہماری معافی کا مستحق نہیں ہے — ہم وہ ہیں جن کا اُس نے خون بہایا ہے، جنہیں اذیت دی ہے اور کچلا ہے صدیوں تک۔ جنہیں وہ تاروں بھرے آسمانوں پر سے اس طرح دیکھتا رہا ہے جس طرح کوئی بے لبس ہو کر کھیل تماشہ دیکھے۔ جیسے کوئی بہت ساری ٹانگوں والی مکڑی ہو کہ پہلے تو درجہ، نسل اور تفریق کے جالے ہمارے چاروں طرف بڑی ہوشیاری سے تن دے اور پھر ہمیں ہڑپ کر جانے کے لئے گھات لگائے .... اے شاعر، شاعر، شاعر! تو نے اپنی زندگی میں سوائے حُسن کے کسی اور کا گیت کبھی گایا ہی نہیں۔ کیا تو نے کبھی نہیں دیکھا اُس گندگی کو، اُس بدنمائی کو، اُس بھیانک کوڑھ کو جو دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ جو دیدہ دلیری سے جھٹلاتی ہے اور للکارتی ہے اُس فلسفہ کو جو تیرے دل میں موجود ہے! کیا تو نے اُن بچوں کو نہیں دیکھا جنہیں آدھا پیٹ روٹی بھی نہیں جُڑتی؟ اُن کے سُوکھے سُوکھے خون سے خالی ہاتھ پیروں نے کبھی تیرے تخیل کو نہیں اُبھارا؟ تو نے کبھی اُن عورتوں کو نہیں دیکھا جو چیتھڑے لگائے پھرتی ہیں اور اُن کے تن پر اتنا بھی کپڑا نہیں ہوتا کہ اپنی زرد عریانی کو چھپا سکیں؟ کیا تو نے ان عمر رسیدہ عورتوں کو نہیں دیکھا جنہیں گلیوں میں نکال دیا جاتا ہے اور وہ صمیمِ قلب سے کوشش کرتی ہیں کہ اُن کے جسم کا کوئی خریدار مل جائے تاکہ وہ اگلے دن اپنے لئے ایک روٹی خرید سکیں! کیا تجھے ہزاروں چور اُچکوں اور حقارت سے دیکھے جانے والوں کا علم نہیں ہے جنہیں دکھاوے اور ڈھٹائی نے، جسے تم سماج کہتے ہو، اس ہدڑے کو پہونچا دیا؟ ان کی تذلیل کی ذمہ دار سماج ہے۔ اور تو حُسن کی باتیں کر رہا ہے۔ تیری طرح کے بہت سے شاعر ہیں جو اپنے محلوں کی چوتھی منزل میں بیٹھ کر بے لبس تکلیف زدہ دُنیا کی سیر کرتے ہیں، تاروں کی چھاؤں میں اُن کے حُسن کے ترانے لکھتے ہیں، دُور سے اُن کے غم کو دیکھتے ہیں اور خوبصورت الفاظ سے اُن میں رنگ بھرتے ہیں۔ ان کی اندھیری جھونپڑیوں اور دم توڑتے بچوں کو ستاروں، دھندلکے اور بادلوں سے جا ملاتے ہیں اور اس طرح دُنیا کے مشہور روحانی شاعروں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا لیتے ہیں۔ شاعر! مجھے اُمید ہے کہ اگر تو واقعی دوبارہ جنم لے گا تو موجودہ آرام پسند شاعر کی بجائے زیادہ ایماندار پیدا ہوگا — مثلاً کسی مزدور کے چوکے میں مٹی کی ہنڈیا جو کچھ کام تو آئے گی، کم سے کم اُس مزدور اور اُس کے بیوی بچوں کے کام تو آئے گی۔ لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ تو ایک مزدور پیدا ہو اور ہمارے کروڑوں بھائیوں کو اُس بھڑکتے ہوئے سُرخ جھنڈے تلے فخریہ جمع کرے جسے دیکھ کر سلطنتوں نے لرزنا شروع کر دیا ہے۔

شاعر:۔ دوست! تم نے وہ وہ باتیں کہی ہیں کہ میں نے بڑے سے بڑے شاعر سے بھی نہیں سُنیں۔ افسوس! — میں نے اب تک کیوں نہیں دیکھا اُس قوت کو، اُس حیرت کو، اُس عریاں حقیقت کو جو کروڑوں کی زندگی کا حصّہ ہے۔ ہے ایشور! اگر تو واقعی موجود ہے! —

(نفیر کی آواز — بُلاوا۔)

(گہری خاموشی — سنتری کی بندوق کی جھنکار —
پھر وہ دروازہ کھولنے کیلئے چابی لیکر آتا ہے۔)

تاجر:۔ آؤ بیٹا! کیا تم شادی کرنے کیلئے تیار ہو؟

(سنتری کچھ نہیں کہتا — دروازہ کھولتا ہے —
ایک ایک کر کے اُنہیں باہر نکالتا ہے —)

شاعر:- ایشور کو سونپا دوستو۔ میں واپس آؤں گا ایک مزدور بنکر۔

ایک مزدور!

تاجر:- (ایکا ایکی ہوش میں آکر) تم مجھے کہاں سے جا رہے ہو۔؟ کہاں ارے کہاں؟ پھانسی دینے! پھانسی! اے میری بیوی، میرے بچے۔ ہائے، ہائے! ۔۔۔ میں نہیں مر سکتا!

(آخری الفاظ ادا کرنے سے پہلے باہر دھکیل دیا جاتا ہے)

مزدور:- آداب) دوست سنتری! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم بھی حکومت کے ایسے ہی شکار ہو جیسے کہ ہم! لیکن زمانہ جلدی ہی بدل جائے گا۔۔۔ انقلاب آئے گا۔۔۔ انقلاب آئے گا۔۔۔ سُرخ، جیسی یہ صبح ہے۔ سُرخ، جیسی یہ صبح ہے۔

انقلاب زندہ باد!

(باہر جاتے ہوئے قومی گیت گاتا ہے ۔۔۔ دُور بہت سی آوازیں بھی گیت اُٹھاتی ہیں، گویا یہ اُس انبوہ کی آواز ہے جو پھاٹک کے باہر کھڑا تھا۔ پھر خاموشی۔ سنتری واپس آتا ہے۔ ہاتھ میں چراغ ہے جس کی تین بتّیاں ہیں اور تینوں روشن ہیں۔ چراغ کی کھڑکی اس طرح کھولتا ہے گویا خود کوئی انسان نہیں بلکہ کَل ہے اور آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے تینوں بتّیوں کو پھُونک مار کر بجھاتا ہے اور چراغ کا تاریک ڈھانچہ اُس کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔)

(ہرندر ناتھ چٹو پادھیا) مُترجمہ:- **شاہد**

فاؤسٹ:- فاؤسٹ اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم دمسحُر کن طویل کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ "فاؤسٹ" وہ آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کے انسان کو اپنی صورت نظر آتی ہے۔ شُہرۂ آفاق شاعرِ المانیہ "گوئٹے" نے دُنیا کی اس بلند ترین فلسفیانہ نظم میں اپنی عمر کے ساٹھ سال صرف کئے تھے۔ اس کہانی میں فلسفۂ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آپ زندگی کا وہ خواب دیکھیں گے جو بیک وقت سُہانا بھی ہے اور بھیانک بھی۔ "فاؤسٹ" فلسفی کی عقل اور شاعر کے تخیل کی آخری حد ہے۔ نیکی، بدی، حُسن، عشق، گناہ، خون، قتل اور موت کی یہ داستانِ رنگیں کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔ قیمت ۱۲؎

ملنے کا پتہ:- ساقی بکڈپو۔ دہلی!

طِلسمِ سیاست

فطرتِ انساں بھی کسدرجہ جنوں آثار ہے
اِس کی مستی بھی دماغِ زندگی پر بار ہے

نازشِ ایجادِ عالم، فتنۂ پندار ہے
ذرّہ ذرّہ، گوشہ گوشہ دیوِ استعمار ہے

تابعِ باطل شکوہِ جاہ سے سرشار ہے
موردِ لعنت، سیاست کا علمبردار ہے

رحم پر اُسکے ہے تہذیبِ سیاست کا طلسم
جس کے بازو میں جوانی، ہاتھ میں تلوار ہے

جیبِ اخلاق و تمدن کے پرچخے اُڑ گئے
اُس کی سنگیں ٹھوکروں میں ہیں جو خونخوار ہے

اس طرح توڑا نوائے وقت نے خوابِ گراں
ہر قدم پر اک نیا فتنہ یہاں بیدار ہے

مل رہی ہیں شاہ زوروں کو زمیں کی رشوتیں
گرم چاروں سمت گویا لُوٹ کا بازار ہے

دہشت انگیزی بھی داخل ہے رموزِ جنگ میں
شورش و شر اک مؤثر حربۂ پیکار ہے

کُھل گیا آخر یہ دُنیا پر کہ ظالم کا وجود
موت سے بھی کچھ زیادہ تلخ و ناہموار ہے

کر چکا گلرنگ انساں کا جُنوں سطحِ زمیں
ہر فضا اور ہر سمندر عرصۂ پیکار ہے

لے رہا ہے کام ابھی تک صبر سے اس کا عتاب
کسقدر مجبور بندوں سے خدا کو پیار ہے

مایوس بیگم

("برج اور میری مایوسی" کے ایک ادیب کے شوہر کے قدموں پر۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔ م)

شوہر کی زبانی

میں ایک شوہر ہوں۔ شوہر کس چیز کا نام ہے یہ ایک شوہر ہی جان سکتا ہے۔ وہ حضرات جو اپنی مجرّدی کے زمانے میں سینماؤں میں میاں بیوی کو درختوں کے نیچے چہچہاتے، ندی کے کناروں پر گیت گاتے یا پھر ہاتھ میں ہاتھ دبائے آرام دہ صوفوں پر بیٹھے دیکھکر شادی، محبت، پریم، الفت، پتنی، گھر، سونے کا کمرہ وغیرہ کی خیالی تصویریں ذہن میں پیدا کر کے اور اس کو ایک میٹھا اور نہ ختم ہونے والا امرت سمجھ کر منہ سے لگا لیتے ہیں یعنی میاں بن جاتے ہیں وہ یقیناً بیوقوف ہیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ اپنی معصومیت کی وجہ سے ان کو شادی کر لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس بندھن میں اور کیا کیا راز مضمر ہیں۔ وہ ایک ایسے بچّے کی طرح جو آگ کے شعلوں کا خوبصورت رنگ دیکھکر اُن کو پکڑنے کی کوشش میں اپنی انگلیاں جلا لیتا ہے، ازدواجی زندگی کے سمندر میں کُود پڑتے ہیں۔ اُن کو اس سمندر کا پانی دلکش اور اسکی لہریں پریاں معلوم ہوتی ہیں۔ مگر وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ سمندر کا پانی گہرا بھی ہوتا ہے۔

اِس لمبی چوڑی تشریح سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہر ایک مرد مجرّد شادی کرنا چھوڑ دے۔ اور نہ میں یہ جتلانا چاہتا ہوں کہ شادی کر کے کوئی سکھی نہیں رہ سکتا۔ بلکہ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ لوگ جو شادی کر کے ایک لا انتہا خوشی، تسکین، راحت اور آرام کی دُنیا میں بس جانیکا اندازہ لگاتے ہیں، وہ خیالی دُنیا میں ہیں اور اُن کی جنّت ایک خواب اگر یقین نہ ہو تو کسی بیاہے ہوئے سے پوچھ لیجئے کہ شادی کرنے کے بعد اُسکی زندگی میں کتنے نئے مسائل پیدا ہو گئے؟ ایک موٹی سی بات لے لیجئے۔ شادی کے بعد ازدواجی زندگی اور اگر میاں بیوی تندرست ہوں اور نئی ترکیبوں سے واقف نہ ہوں تو کنبہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ بھول کے ساتھ خارد الامتنا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک جوڑا ازدواجی زندگی کی مسرت اُٹھاتے اور اللہ میاں خاموش بیٹھے رہیں۔ غرضیکہ بیٹا، بیٹی، بیٹے، بیٹیاں، اُن کی پرورش، تعلیم اور پھر شادیاں ــــ ذرا سوچو، غور کرو!

مگر میں بچّوں پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں ایک شوہر ہوں۔ ایسا شوہر جو خدا اور بیوی دونوں سے خوف کھاتا ہے اور ان کی اطاعت کرتا ہے۔ ان معظم ہستیوں پر میں نے دھرم، ایمان، عقل، وقت اور دل و جان نچھاور کر دئے ہیں اور اپنی زندگی کا ہر ایک لمحہ اُن کو خوش رکھنے کی فکر میں گزار رہا ہوں مگر یہ دونوں مجھ سے خوش نہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر خدا مجھ پر نظرِ عنایت رکھتا تو دُنیا کی مُصیبتیں مجھ پر نازل نہ ہوتیں۔ باقی رہ گئی بیوی سو انہوں نے تو میرے خلاف شکوہ و شکایت کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ جب زبان تھک جاتی ہے تو قلم اُٹھا لیتی ہیں۔

داناؤں کا کہنا ہے کہ ہر ایک معاملے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ دُنیا شاید بیگم صاحبہ کے نقطۂ نظر سے تو واقف ہو چکی ہے۔ اب میرے لئے صرف یہی رہ گیا ہے کہ اپنے حالات سے بھی آپ کو مطلع کر دوں تاکہ آپ جانچ پرکھ کر خود ہی اندازہ لگا لیں کہ کیا میں ایک فرمانبردار میاں کے معیار سے گرا ہوا ہوں۔

میں صبح سویرے اُٹھتا ہوں اور رفع ضروریات سے فارغ ہو کر بیگم صاحبہ کے کہنے کے مطابق آدھ گھنٹے تک ورزش کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ سو پشت سے ہمارے خاندان کا پیشہ پہلوانی نہیں رہا اور نہ ہی میں پہلوان بننا چاہتا ہوں۔ درحقیقت میں تو یہ چاہتا ہوں صبح کا وہ آدھ گھنٹہ جو مگدر پھیرنے میں صرف کرتا ہوں بستر ہی میں گزار دوں۔ مگر حکم ہے بیگم صاحبہ کا کہ ورزش کرو نہیں تو موٹے ہو جاؤ گے۔ میں کہتا ہوں اوّل تو ہمارے خاندان میں موٹاپا ہے ہی نہیں اور اگر بفرضِ محال میں موٹا ہو بھی جاؤں تو کیا ہو جائے گا۔ کیا دُنیا میں موٹے آدمی نہیں ہوئے؟ بسمارک، ہنری ہشتم، مولانا محمد علی، ملکہ وکٹوریہ اور لالہ لاجپت رائے سب موٹے تھے۔ موجودہ زمانے پر غور فرمائیے۔ مسولینی، گورنگ، روزولٹ، ونسٹن چرچل۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور ہندوستانی اسکرین کے اکثر ہیرو موٹے ہیں اور اُن میں سے بعض تو اچھے خاصے موٹے ہیں پھر بھی یہ لوگ موجودہ اور آنے والی صدیوں کی تاریخ ڈھال رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ انکا موٹاپا ان کی کامیابیوں میں کیوں رُکاوٹ نہیں ڈالتا۔ حالانکہ بیگم کے خیال کے مطابق یہ سب لوگ حلوائی، پنساری یا زیادہ سے زیادہ لین دین کا بیوپار کرنے والے

مارواڑی ہونا چاہیئے تھے !!

یہ قدرت کا اصول ہے کہ جو شخص محنت کرتا ہے وہ تھک جاتا ہے اور اُس کے اعضا آرام چاہتے ہیں۔ اسی طرح اگر ورزش کرکے میں بھی تھک جاتا ہوں تو کونسی نرالی بات کرتا ہوں۔ صبح اُٹھتے ہی بیگم صاحبہ کا حکم بجالاتا ہوں یعنی ورزش کرتا ہوں مگر ورزش سے جو تکان میرے جسم میں پیدا ہوجاتی ہے اُس سے بیگم مطمئن نہیں۔ درحقیقت یہ ناممکن نہیں کہ میں صبح مگدر بھی پھیردں اور شام کو ٹینس بھی کھیلوں۔ مگر بیگم صاحبہ اُن آٹھ گھنٹوں کو بالکل نظرانداز کر دیتی ہیں جو میں دفتر میں گزارتا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہیں کہ جس طرح میرے دفتر جانے کے بعد وہ ریڈیو سے دل بہلاتی ہیں یا سوئی دھاگہ پکڑکر کوئی ڈیڑھ انچ کا رخنہ سی ڈالتی ہیں یا پھر گدے پر لیٹے ہوئے مرزا غالب کا دیوان پڑھ پڑھ کر لطف اُٹھاتی ہیں اسی طرح میں بھی دفتر میں بیٹھکر گپیں ہانکتا ہوں۔ حقیقت اس سے کہیں دُور ہے۔ میں ایک انجنیر ہوں اور انجنیر بھی ریلوے لائن کا۔ میرا کام دفتر میں بیٹھکر قلم چلانا نہیں ہے بلکہ صبح کی ورزش کے بعد تن خاکی کو خاکی نیکر اور قمیص سے ڈھانپ کر گشت لگانا ہے۔ صبح نو بجے سے لیکر ساڑھے تین تک یہ کارروائی جاری رہتی ہے۔ اس کے بعد دفتر میں بیٹھکر دفتری کاروبار کرنا ہے۔ یہ کرتے کرتے سوا پانچ بج جاتے ہیں۔ میں دفتر اور کام چھوڑکر گھر جانے کی فکر کرتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ گھر میں ریکٹ پکڑے بیگم میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ مگر کسی نے کیا خوب کہا ہے :-

ہائے ہائے نوکری بُری

تقریبًا ہر روز شام کے چار بجے میرے افسر کا حکم آجاتا ہے کہ آج فلاں کام ختم کرکے گھر جانا !!! — مجھے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ "صاحب میری بیوی بڑے شوق سے ٹینس کھیلنے کی تیاری مکمل کرکے میرا انتظار کر رہی ہونگی اس لئے مجھے جانے دو"۔ چنانچہ جب میں اپنے حاکم کو خوش رکھنے کی خاطر اپنے تھکے ماندے ورزشی جسم کو لیکر ریلوے لائن کے چکر کاٹ رہا ہوتا ہوں بیگم گھر میں ٹینس کھیلنے کیلئے بیقرار ہوتی جاتی ہیں۔ چار بجے کے بعد سے اُن کی پریشانی بڑھنی شروع ہوجاتی ہے۔ اگر یہ پریشانی پریشانی کی حد تک ہی رہے تو کوئی مضائقہ نہیں مگر ہوتا یہ ہے کہ بیگم اپنے خوبصورت ریکٹ کو لیکر یہ تصور کر لیتی ہیں کہ وہ ٹینس کورٹ میں نیٹ کے پاس کھڑی ہیں۔ اس تصور کے بعد وہ "سیش" کی پریکٹس شروع کر دیتی ہیں جس سے ڈرائینگ روم کے چینی کے مجسّے، قیمتی تصویریں، اُگالدان، پاندان، ریڈیو، بجلی کے پنکھے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا چیزوں کا حلیہ بگاڑ کر بیگم کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ رینگے بھی کیسے؟ کیونکہ اس دوران میں جبکہ یہ چیزیں اپنی اصلی ہیئت بدل رہی ہوتی ہیں میں اَدھ موئی حالت میں ریلوے لائن کے آس پاس اس غرض سے رینگ رہا ہوتا ہوں کہ دیکھ لوں کہیں گاڑی کہاں چیزوں کی جگہ نئی لادھروں۔ آخر جب میں گھر واپس پہونچتا ہوں تو موٹر کے ہارن کی آواز سُنکر بیگم ٹینس کھیلنا بند کر دیتی ہیں اور فورًا کمرے کو جھاڑنے کا حکم دیتی ہیں میں اس اثنا میں بیگم کے چہیتے کتے ریکس سے پیار کرتا ہوں حالانکہ میرا دل یہی چاہتا ہے کہ فورًا جاکر بیگم کو گلے سے لگا لوں — مگر ایسا کرنا مشرقی وضعداری کے خلاف ہے۔ نوکروں کی موجودگی میں ایسا فعل مجھ سے ہونا ممکن نہیں اگرچہ انگریز لوگ ان باتوں کی بالکل پروا نہیں کرتے اور خانساموں اور دیگر انسانوں کی موجودگی میں اپنی بیویوں کو بغل میں دبا لیتے ہیں۔

گھر آتے ہی میں دن بھر کی پڑی ہوئی دھول مٹی کو اپنے جسم سے علیحدہ کرتا ہوں۔ پھر کچھ شربت وغیرہ گلے میں اُنڈیل کر بیگم کو ٹینس کھیلانے لے جاتا ہوں۔ ہم واقعی کلب میں دیر سے پہونچتے ہیں۔ جلدی پہونچ ہی نہیں سکتے۔ آخر مجھے نوکری کے فرائض انجام دینے کے بعد ہی گھر واپس آنا ہوتا ہے اس لئے کھیلنے کو بہت کم وقت ملتا ہے۔ درحقیقت کام سے واپس آنے پر مجھے ٹینس کھیلنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ میں دل سے تو یہ چاہتا ہوں کہ بیگم کے پاس بیٹھکر کچھ دیر آرام کروں۔ سینما کے سین میرے دماغ میں چکر لگاتے ہیں — درختوں کی چھاؤں، ندی کے کنارے پتنی کی گود میں پتی کا سر۔ پتنی کا دامن سے ہوا کرنا۔ مگر یہ تو محض خیالی باتیں ہیں۔ بیگم ریکٹ گھما رہی ہوتی ہیں۔ مجبورًا لائن کے چکر لگانے کی طرح میں ٹینس کھیلنے میں بھی مستعدی ظاہر کرتا ہوں۔

ٹینس کے بعد میں کچھ دیر کے لئے برج کھیلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہوں۔ یار و احباب کا اصرار ہوتا ہے اور درحقیقت مجھے برج سے دلچسپی بھی ہے۔ مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ میں بیگم کی صحبت کو برج پر ترجیح دیتا ہوں۔ مگر کیا کروں ٹینس کھیل کر ایک دم گھر بھی واپس نہیں لوٹ سکتا۔ ایسا کروں تو لوگ پھبتیاں اُڑاتے ہیں۔ اگر کھیلنے بیٹھ جاتا ہوں تو ربر ختم کرکے ہی اُٹھنا پڑتا ہے۔ بعض دفعہ دیر بھی ہوجاتی ہے۔ دیر ہوجانے پر بیگم ناراض ہوجاتی ہیں، مُنہ پُھلا بیٹھتی ہیں۔ کہتی ہیں "کھانا نہیں کھاؤنگی — تم سے بولوں گی نہیں"۔ اب آپ ہی انصاف فرمایئے کہ برج کھیلنے کے لئے میں کس حد تک ذمہ دار ہوں۔ اگر شام کو ٹینس کھیلنے نہ جائیں — جیسا کہ میں دل سے چاہتا ہوں — تو برج کھیلنے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔

مگر بیگم کا شوق پورا کرنے کیلئے دفتر سے آتے ہی سیدھا کلب کا رُخ کرتا ہوں۔ وہاں برج کھیلنے سے پہلے بیگم کی اجازت لے لیتا ہوں۔ اس طرح کلب جاتا ہوں تو اُن کے اصرار پر، برج کھیلتا ہوں تو اُن کی رضامندی سے۔ اور آخر جب دن بھر کی مصروفیات ختم کر کے اس اُمید پر گھر کے نزدیک پہونچتا ہوں کہ اب میری زندگی میں نوکری کی ذمہ داریاں۔ دوست احباب کی موجودگی وغیرہ حائل نہ ہونگی اور ہم پریم کے سمندر میں ڈوب جائینگے تو بیگم اعلان جنگ کر دیتی ہیں۔ آخر میں کروں تو کیا کروں؟

پھر مجھ پر یہ الزام دھرا جاتا ہے کہ میں ہمیشہ برج میں ہارتا ہوں یہ سچ ہے کہ پچھلے چند دنوں سے میری تقدیر یاور نہیں ہے مگر بیگم اس بات کو بالکل بھول گئی ہیں کہ میں نے کئی مرتبہ بارہ بارہ، چودہ چودہ آنے اُنکے قدموں پر ایسے تقدس سے رکھ دئے تھے جیسے کسی ماں باپ کا فرمانبردار بیٹا اپنی کمائی کی پہلی تنخواہ اُن کے سامنے پیش کر دے۔ حالانکہ ہر ایک برج کھیلنے والا جانتا ہے کہ برج میں جیتے ہوئے پیسے ہر ایک کھلاڑی خود اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے۔ جیتے ہوئے مال کو کسی سے علیٰحدہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی سپاہی سے اس کی تلوار چھین لینا یا بیمہ کمپنی کے ایجنٹ سے اسکی سائیکل! مگر مجھے اس کا بھی کوئی گلہ نہیں۔ درحقیقت گلہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شادی ہو لینے کے بعد سے میں نے آج تک ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر صرف نہیں کیا۔ اسکی دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ بیگم آمدنی میں سے میری ذات کے لئے بجٹ میں ایک پائی بھی وقف نہیں کرتیں۔ دوسری یہ کہ ایک نیک اور راستباز میاں کی طرح میری ناچیز ہستی بیگم کی شخصیت میں ضم ہو چکی ہے۔

بعض مرتبہ بیگم یہ بھی شکایت کرتی ہیں کہ ایک زمانے سے انہوں نے کوئی نئی ساڑھی نہیں خریدی۔ یہ بھی سچ ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میرے برج کھیلنے کی وجہ سے گھر میں پائی نہیں بچتی۔ بلکہ دراصل بیگم پچھلے سال بمبئی تشریف لے گئی تھیں اور وہاں سے اس کثرت سے "الٹرا موڈرن" ساڑھیاں خرید کر لے آئی تھیں کہ ابھی تک اس شہر میں اس فیشن کی ساڑھیاں کسی صنفِ نازک کے جسم کے گرد نہیں دیکھی گئیں۔ اس شہر میں اسی قسم کی ساڑھیاں ۱۹۵۱ء میں رائج ہونگی اور تب تک (خدا مجھے سلامت رکھے!) بیگم ایک دو مرتبہ بمبئی کا چکر ضرور لگائیں گی اور دو سال تک کیلئے کپڑے خرید لائیں گی۔ اسکے برعکس میرے کپڑے بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ میں اپنے حلقہ میں بہترین کپڑے پہننے والا شخص متصور کیا جاتا تھا۔ مگر جب سے شادی ہوئی ہے میں نے مردانے پارچہ فروشوں اور درزیوں سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ جب کبھی میں ترکیب سے بیگم کے کانوں تک یہ پہونچاتا ہوں کہ "میرے پاجامے بہت خستہ ہو رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن مجھے بھرے مجمع میں شرمندگی اُٹھانی پڑے" تو بیگم جھٹ بول اُٹھتی ہیں: "لٹھا جتنا پرانا ہو اتنا ہی ملائم ہو جاتا ہے!" جب سے میں نے بیگم کا یہ رویہ دیکھا ہے اپنے کپڑے سلانے کا بالکل ذکر نہیں کرتا۔ مگر حتی المقدور کپڑوں کو بڑی احتیاط سے استعمال کرتا ہوں اور اپنے ملائم پاجاموں پر ہاتھ پھیر پھیر کر خوش ہوتا ہوں۔

دفتر جاتے وقت خاکی نیکر اور قمیص پہن لیتا ہوں۔ خاکی زین کی یہ صفت ہے کہ یہ پھٹتی کبھی نہیں۔ سارے محکمے میں صرف میں ہی ایک شخص ایسا ہوں جو جاڑے اور گرمی دونوں موسموں میں خاکی لباس میں ملبوس رہتا ہوں۔ بعض اوقات لوگ پوچھتے ہیں کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔ یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ بیگم کا حکم ہے۔ اسلئے مجبوراً جھوٹ بولنا پڑتا ہے کہ یہ لباس بہترین ہے اور اعلیٰ عہدے کے انگریزوں میں نہایت فیشن ایبل سمجھا جاتا ہے۔ میرے اس جواب سے بعض لوگ مجھے پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ اور درحقیقت جب میں اپنی زندگی پر خود غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے پاگل ہونے میں بعض اوقات شبہ نہیں رہتا۔ آخر میری زندگی کیا ہے؟ صبح سے شام تک بیگم اور محکمہ کے افسروں کے احکامات بجا لاتے گزرتی ہے۔ شام کو بلا ناغہ بیگم ناراض ہو جاتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً اپنی مایوسی کے اعلانات کرتی ہیں۔ مجھے نکاح کے معاہدہ کی یاد دلاتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ میں معاہدے کی برج کے شوق میں اُس معاہدے کے فرائض انجام نہیں دے رہا جو اُن سے کیا جا چکا ہے۔ اے دُنیا والو ذرا انصاف کرو کہ میں نے معاہدۂ نکاح کے کونسے شرائط پورے نہیں کئے۔ ذرا بیگم کو یہ بتاؤ کہ دُنیا میں کیسی کیسی مایوسیاں ہیں۔ درحقیقت بعض اوقات خود اجازت دیکر کچھ دیر تک مجھے برج کھیلتے دیکھتے رہنا مایوسی نہیں سمجھا جا سکتا۔ دُنیا میں بعض ایسی بھی بیگمیں ہیں جو اپنے خاوند کو محض پان، حکمہ، اینٹ اور چڑیا کی بیگموں سے کھیلتے دیکھکر مایوس نہیں ہوتیں بلکہ جیتی جاگتی سوکنوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے دیکھا کرتی ہیں اور زبان سے اُف تک نہیں کرتیں۔ بعض ایسی بھی ہیں جو خود برج کی دیوانی ہیں۔ برج سیکھ کر بیٹھی ہوتی ہیں مگر میاں ڈاڑھی بڑھا کر، پان سے دانت سُرخ کئے حقے کی نے سے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کارل مارکس، ٹراٹزکی اور لینن کی کتابوں میں غرق ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں بیگم کو مذکورہ بالا بیگم کی مایوسی دیکھکر عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور مذکورہ بالا بیگم کو چاہیئے کہ برج بھولکر میاں کے اشتراکی سمندر میں کود پڑیں اور اُنکے ساتھ ساتھ تیریں کیونکہ اشتراکیت کا چسکا ایسا ہے کہ ایک دفعہ لگ جانے کے بعد چھٹکارہ ناممکن ہے اور میں ایک ایسے جوڑے سے واقف ہوں جسکی بیوی اشتراکیت میں مبتلا تھیں۔ میاں ٹھیک نشان تھے۔ جاگیردار کے بیٹے ہیں مگر بیوی کو جاگیرداری بنانے بناتے ایسے پھسلے کہ اب اُن میں

تانگے والا

تانگے والا ہا۔ہا۔ پچ۔ پچ۔ کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بوڑھا اور کمزور گھوڑا مار دھاڑ سے بے خبر، ڈگمگاتا ہوا دوڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تانگے کی ہر چول ڈھیلی ہو چکی تھی۔ دونوں پہیے دو طرف ڈگ مار کر گھوم رہے تھے۔ داہنی اسپرنگ موٹی سواری کے بوجھ سے دب کر چر چرا رہی تھی۔ تانگے کے بم میں جوڑ لگا ہوا تھا اور دُھرا بیچ سے ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ گدیاں کبھی اچھی ہونگی مگر اب تو ہر جگہ سے اُن کے چیتھڑے نکل آتے تھے جو کثیف ہو کر گھناؤنے ہو گئے تھے۔ تانگے کا ٹپ چڑھا ہوا تھا جس کی کمانی ڈھیلی ہو کر چوں چوں چوں چوں کر رہی تھی۔ ٹپ پر چھوٹے بڑے ہزاروں طرح کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ تانگے کا پائدان بھی اُکھڑ چکا تھا جو اس وقت رسّی سے باندھ کر لٹکا دیا گیا تھا۔ ہر آنے والے ہچکولے میں یہ پائدان سڑک سے ٹکرا کر ڈھن ڈھن کا شور بلند کر رہا تھا۔ تانگے والا دُبلا پتلا چھوٹا سا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھا سوکھی گھانس پر پاؤں رکھے گھوڑے کو بھگانے کیلئے چابک مار رہا تھا اور ہا۔ہا۔ پچ۔ پچ کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ موٹا مسافر اپنے دونوں پاؤں نشست پر رکھے اُونگھ رہا تھا۔ وہ رات کے ایک بجے والی گاڑی سے اُترا تھا اور گھر جا رہا تھا۔ موٹے مسافر کا پھولا ہوا ہول ڈال اور وزنی سوٹ کیس نشست کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ صراحی کی گردن پیتل کے گلاس سے ڈھکی ہوئی تھی جو اگلی نشست پر رکھی ہوئی تھی۔ تانگے کے ہر ہچکولے میں گلاس چھن چھن کرنے لگتا اور صراحی سے پانی چھلک کر باہر آنے لگتا تھا۔

شہر میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ فٹ پاتھ پر دن بھر کے تھکے ماندے مزدور زمین پر پڑے سو رہے تھے۔ پہرے کا سپاہی ہاتھ میں ڈنڈا لئے کھڑا کھڑا سو رہا تھا۔ دو کتے آپس میں گتھے ہوئے خوب لڑ رہے تھے۔ اس میں سے ایک شکست کھا کر دُم دبائے ہوئے کاں کاں کرتا ہوا حلوائی کی دُکان کے نیچے والی نالی میں گھس گیا۔

تانگے والے کا نام جمراتی تھا۔ وہ چابک کو ہوا میں گھما رہا تھا اور سوچ رہا تھا: "اب اس گھوڑے سے کام نہ چلے گا" ہا۔ہا۔ پچ۔ پچ: "بیچارہ بوڑھا بھی تو ہو گیا۔ آج دس سال سے میں اسے جوت رہا ہوں۔ جب میں نے اسے لیا تھا تو یہ کیسا خوبصورت جانور تھا۔ سب کہتے تھے جمراتی کے گھوڑے کا شہر بھر میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور یہ سرپٹ جاتا بھی خوب تھا" ہا۔ہا۔

"نوچندی کے دن بیٹا کلّو مجھ سے مقابلہ کرنے آتے تھے، ذرا چابک چھو دیا تھا کہ میرا شیر فرّاٹے بھرتا ہوا ہوا سے باتیں کرنے لگا تھا۔ بیٹا کلّو میلوں پیچھے پڑے پھسپھساتے رہے" پچ۔ پچ۔ ہا۔ جمراتی نے لگام کو جھنجوڑتے ہوئے اپنے خیالات کا سلسلہ جاری رکھا: "اب گھوڑا بدلنا چاہیئے۔ یہ رات کو جوتتا ہوں تو کچھ سواریاں مل جاتی ہیں۔ دن کو بھلا کون اس تانگے پر آئیگا؟ .... یہ پولیس والے" ہا۔ہا۔ پچ۔ پچ: "اب تانگا بھی بیکار ہو گیا ہے۔ ٹپ بدلنا چاہیئے۔ دُھرا ٹیڑھا ہو گیا ہے، پہیے کمزور ہو گئے ہیں۔ ساز بدلنا چاہیئے .... مگر کہاں سے .... پیسے" ہا۔ہا۔ پچ پچ: "پیسے تو آج ابھی تک کچھ بھی نہیں ملے۔ یہ موٹے بابو کے چھ آنے اور پھر .... اللہ مالک ہے۔ مگر جلدی کرنا چاہیئے۔ اب پنجاب میل چھوٹ چکا ہوگا" ہا ہا ہا پچ۔ہا۔ پچ۔ہا۔ جمراتی اب خود جلدی کرنا چاہتا تھا مگر گھوڑا بدستور ڈگمگا رہا تھا اور جمراتی کے چیخنے چلّانے کی مطلق پروا نہیں کر رہا تھا۔ سڑک پر اندھیرا تھا۔ جمراتی نے دیکھا نہیں۔ پہیا ایک چھوٹے سے گڑھے میں چلا گیا۔ تانگہ میں زلزلہ آ گیا۔ بوڑھا گھوڑا اس جھنجوڑ کو سنبھال نہ سکا اور مُنہ کے بل آ رہا۔ جمراتی لڑھک کر بیٹھے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر آ گیا۔ صراحی لڑھکتی ہوئی سڑک پر گر کر پاش پاش ہو گئی۔ پیتل کا گلاس کھنکھناتا ہوا نالی میں جا گرا۔ موٹا مسافر نیند سے چونک کر تانگے کے ٹپ سے لپٹ گیا اور تانگے والے کو گالیاں دینے لگا: "حرامزادے، دیکھکر نہیں چلاتا!"

جمراتی نے بیٹھے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ سے اُترتے ہوئے کہا۔

"بابو صاحب! زبان سنبھال کر بات کیجئے نہیں تو اچھا نہ ہوگا!"

موٹے مسافر نے تانگے سے اُتر کر جمراتی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "کمینے، پاجی، گدھا جوت کر تانگہ چلانے نکلا ہے اور مجھ ہی پہ اُلٹی آنکھیں نکالتا ہے۔ دو گھنٹے میں آدھ میل آیا ہے۔ حرامزادے، اتنی مار مارونگا کہ ......!"

جمراتی نے آگے بڑھکر کہا: "بابو صاحب قصور سب سے ہوتا ہے۔ گھوڑا کمزور تھا، سنبھل نہ سکا۔ آپ گالیاں تو نہ دیجئے!"

موٹے آدمی نے جمراتی کو دبتے دیکھکر کہا: "اچھا پاجی، لینا تو مجھ سے پیسے!"

اتنے میں بابو صاحب کی نظر اپنی صراحی پر پڑی جو تانگے کی

ٹمٹاتی ہوتی روشنی میں چکنا چور پڑی فریاد کر رہی تھی۔ صراحی پر نظر پڑنا تھی کہ موٹا آدمی جامہ سے باہر ہو گیا۔ جمعراتی کی گردن پکڑ کر صراحی کی طرف جھکا دی اور کہنے لگا: "دیکھ، دیکھ حرامزادے تو نے میری مجھر کی صراحی توڑ ڈالی اور گلاس۔ گلاس کہاں گیا؟"

دونوں لڑنا جھگڑنا بھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ جمعراتی نے تانگے کی ٹوٹی ہوئی لالٹین، جس کے اندر چراغ سے دھواں نکل کر بھرا ہوا تھا، کھول لی اور گلاس کو ڈھونڈھ کر نالی سے نکالا۔ موٹا مسافر اپنے گلاس کی یہ گت بنتے دیکھکر غصہ سے بلبلا اٹھا اور پھر جمعراتی سے چمٹ پڑا۔ جمعراتی کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں گلاس تھا۔ وہ کھڑا مار کھا رہا تھا۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ رات کے سناٹے میں اُن کے چیخنے چلّانے کی آواز سُونی سڑک پر دُور تک گونجتی ہوئی چلی گئی۔ پہرے کے سپاہی کے بھاری بھاری بوٹوں کے چلنے کی آواز آئی۔ جمعراتی اس آواز کو سُنکر سہم گیا اور بابو صاحب نے بھی اپنے اُٹھتے ہوتے طمانچہ کو روک لیا۔ سپاہی نے پہونچکر پوچھا: "یہ کیا شور ہے؟"

دونوں بیک وقت اپنی اپنی کہنے لگے۔ جمعراتی نے اپنے بیٹھے ہوتے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا اور بابو نے اپنی ٹوٹی ہوئی صراحی دکھائی۔ سپاہی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ پھر دونوں بیک وقت اپنی اپنی دہائی دینے لگے۔ سپاہی نے ڈانٹ کر کہا: "چُپ رہو" دونوں چُپ ہو گئے۔

جمعراتی لالٹین نصب کرنے لگا اور موٹا مسافر گلاس تانگے میں رکھنے لگا۔ سپاہی نے جمعراتی کو ایک دھول رسید کر کے کہا: "اٹھا گھوڑے کو، جلد چلا جا نہیں تو چالان کر دونگا۔ یہ حرامزادے تانگے والے۔"

جمعراتی چپ چاپ بیٹھے ہوئے گھوڑے کی بغل میں آکر بچ بچ کرنے لگا اور چابک کی چھڑی سے گھوڑے کے پیٹ میں کچھ کے دینے لگا۔ گھوڑا زمین پر مُنہ رکھے اپنے کانوں کو نیچے لٹکائے ہوتے بیٹھا تھا۔ جمعراتی جب اُس کے پیٹ میں زور سے کچو کے لگاتا تو گھوڑے کی ناک سے ایک لمبی سی آہ خارج ہوتی اور اُس کا سر تھوڑی دیر کے لئے زمین سے کوئی ایک بالشت اُوپر اُٹھکر پھر زمین پر چلا آتا۔ جمعراتی گھوڑے کی دونوں بغلوں سے اپنی اس حرکت کو بے سُود پا کر خود بخود بول اُٹھا: "یہ اب ایسے نہ اُٹھے گا۔"

سپاہی اس حادثے سے بغیر کوئی دلچسپی لئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور رہ رہ کر جمائی لے رہا تھا اور اپنے کھلے ہوتے مُنہ کے آگے چٹکیاں بجا رہا تھا۔ موٹا مسافر کبھی اپنی ٹوٹی ہوئی صراحی کو حسرت سے دیکھ رہا تھا اور کبھی سپاہی پر فریادی کی سی نظر ڈال رہا تھا۔ جمعراتی نے بیٹھے ہوتے گھوڑے کے ساز کو کھول کر تانگے کو الگ کیا اور دوبارہ گھوڑے کو اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کبھی لگام کو پکڑ کر زور سے کھینچتا تھا۔ گھوڑے کی گردن لگام کے زور کے ساتھ کھنچ کر لانبی ہو جاتی تھی اور جب جمعراتی زور کرنا چھوڑ دیتا تھا تو یہ سکڑ کر اپنی جگہ پر آجاتی تھی۔ پھر جمعراتی نے گھوڑے کے پہلو میں جا کر زور لگایا اور دھکے دینے لگا۔ جمعراتی کے زور لگانے سے گھوڑا کروٹ سے لیٹنے کے قریب ہو جاتا تھا اور جب جمعراتی زور لگانا چھوڑ دیتا تو یہ خود بخود سیدھا ہو کر پھر بیٹھ جاتا۔ جمعراتی نے عاجز آکر چابک مارے، گھوڑے کی دُم اور کان کو توڑ مروڑ کر رکھدیا۔ اُسکے مُنہ پر چابک کی چھڑی ماری، اُس کی عیال کو پکڑ کر زور زور سے جھنجوڑا مگر گھوڑا بیٹھا کا بیٹھا ہی رہا۔ جمعراتی تھک کر پسینے پسینے ہو گیا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ اُس نے ایک عاجزانہ نگاہ پہلے سپاہی پر اور پھر موٹے مسافر پر ڈالی۔ سپاہی نے کہا: "یہ حرامزادے تانگے والے۔"

مسافر نے گلا صاف کرتے ہوتے کہا: "ان سے بھگوان بچاتے، ذرا تانگہ تو ملاحظ فرماتیے، یہ میونسپلٹی والے کیا کرتے ہیں؟"

جمعراتی تھک کر ہار چکا تھا۔ کہنے لگا: "صاحب گھوڑا انہیں اُٹھیگا۔"

موٹا مسافر گھبرا کر بیکسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُسے نیند آرہی تھی۔ وہ دو دن سے جاگ کر ریل کا سفر کر رہا تھا۔ اُسکے جلد گھر پہونچکر سونے کی اُمید خاک میں ملتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ سپاہی نے جماہی لیتے ہوتے کہا: "بابو صاحب، کہاں جانا ہے؟"

"یہی اُردو بازار تک۔"

سپاہی نے جمعراتی سے کہا: "حرامزادے، اُٹھا بابو صاحب کا سامان اور انکے گھر تک پہونچا آ۔"

جمعراتی احتجاجاً کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سپاہی نے بڑھ کر ایک طمانچہ رسید کیا اور کہا: "اُٹھاتا ہے یا پھر دوں؟"

جمعراتی موٹے مسافر کی مدد سے اپنے سر پر وزنی سوٹ کیس اور ہول ڈال اُٹھا کر آگے بڑھا۔ جاتے وقت اُس نے بوجھ کے نیچے تھرتھراتی ہوئی گردن کو موڑ کر بیٹھے ہوتے گھوڑے پر نگاہ ڈالی جو دُنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر زمین پر سر رکھے ہوتے بیٹھا تھا۔ جمعراتی اور اس کا ساتھ دس سال کا تھا۔ جمعراتی کا دل گھوڑے کی محبت سے بھر آیا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا: "بیچارہ بوڑھا ہو کر کمزور ہو گیا ہے۔"

سڑک سُونی پڑی ہوئی تھی۔ دُور کہیں کتے بھونک رہے تھے اور لڑ رہے تھے۔ ایک کوٹھے پر سفید چاند کی سی روشنی ہو رہی تھی۔ جہاں سے کسی عورت کے گانے کی تھکی ہوئی آواز آرہی تھی۔ طبلہ کھڑک رہا تھا اور

نشہ میں بھرائی ہوئی آوازیں ہوا ہا کر رہی تھیں۔ موٹا مسافر آگے آگے تھا اور اُسکے پیچھے جمعراتی بوجھ تلے دبا ہوا، اپنے بغل میں چابک دبائے چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "اب بابو شاید پیسے نہ دیگا۔ اُس کی صراحی بھی تو ٹوٹ گئی ہے..... اب گھوڑا بدلنا ہی پڑے گا۔ اس سے کام چلتا نظر نہیں آتا... مگر بدلوں کیسے.... پیسے کہاں سے آئیں؟.... اور تانگہ بھی تو بالکل ٹوٹ چکا ہے.... پیسے کہاں سے لاؤں.... ننھی کو کل سے بخار ہے.... دوا تک نہیں لا سکا.... اور ماں بھی تو بیمار ہے.... یہ بڑھیا مرتی کیوں نہیں؟ .... آج ابھی تک ایک پیسہ بھی نہیں ملا.... شاید بابو پیسے دیدے.... صراحی.... جھجھر کی"

دونوں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ موٹا مسافر ایک مکان پر پہونچ کر کنڈی کھٹکھٹانے لگا۔ جمعراتی بوجھ کے نیچے کھڑا تھر تھرا رہا تھا۔ بہت دیر بعد ایک عورت لالٹین لئے ہوئے آئی اور دروازہ کھول کر موٹے مسافر کو اندر بلا لیا۔ کچھ دیر بعد موٹے مسافر نے آواز دی: "تانگے والے، اُوپر چلے آؤ"

جمعراتی بوجھ لئے ہوئے اُوپر چڑھنے لگا۔ ہر سیڑھی پر پہونچکر جمعراتی کھڑا ہو جاتا تھا اور دوسری سیڑھی پر جانے کیلئے اپنی پوری قوت سے پہلے پاؤں اور بعد میں دُہرا ہو کر بوجھ سے دبے ہوئے جسم کو اُوپر لیجاتا تھا۔ وہ زینے کے وسط میں پہونچکر تھک گیا۔ اب اس کی ہمت اُوپر چڑھنے کی نہ تھی۔ وہ کہنے لگا "بابو صاحب، اب مجھ سے اُوپر نہیں آیا جاتا"

موٹے مسافر نے کڑک کر کہا "آتا ہے یا جوتے کھائیگا، پاجی نے میری صراحی توڑ ڈالی"

جمعراتی اب بوجھ اُٹھا کر کھڑا رہنے کے قابل بھی نہ تھا۔ اُس کی آنکھوں تلے رہ رہ کر اندھیرا چھا رہا تھا۔ اُس کا سر بھی چکر کھانے لگا تھا۔ اُس کی نظر تلے سیڑھیاں جھلمل جھلمل کرنے لگی تھیں۔ اور زینے کے دونوں طرف کی دیواریں سانپ کی طرح لہرانے لگی تھیں۔ جمعراتی چلا اٹھا "بابو صاحب لینا" دھم سے ہول ڈال اور سوٹ کیس نیچے گرے اور دھم دھم کرتے ہوتے زینے کے نیچے آرہے۔ موٹا بابو غصہ سے بے تاب ہو گیا۔ اور بڑھکر جھکے ہوئے جمعراتی کے ایک دھول رسید کیا۔ جمعراتی بھی ہول ڈال کی طرح دھم دھم کرتا ہوا زینہ کے نیچے آرہا۔ جمعراتی کے سر اور کہنی میں چوٹ آئی جہاں سے خون بہنے لگا۔ وہ بیہوش زینے کے نیچے پڑا تھا۔ موٹا مسافر اور اُس کی عورت گھبراہٹ میں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ جیسے دونوں نے بیک وقت کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ کچھ دیر بعد موٹا بابو ہانپتا کانپتا زینے کے نیچے پہونچا۔ اُس کو یہ دیکھکر ڈھارس بندھی کہ جمعراتی کا سانس چل رہا ہے۔ اُس نے عورت کو آواز دی "لوٹے میں پانی لانا" عورت بھاگتی ہوئی پانی لیکر آئی۔ دونوں مل کر جمعراتی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ کبھی اُس کے سر کو دھو رہے تھے اور کبھی اُس کے منہ پر پانی کی چھینٹیں مارنے لگتے تھے۔ کچھ دیر بعد جمعراتی نے آنکھیں کھول دیں۔ موٹے بابو نے ایک لمبا سانس لیا۔

عورت پیار سے کہنے لگی "تانگے والے کیسے ہو؟"

"بیوی اچھا ہوں" یہ کہکر جمعراتی اُٹھ بیٹھا اور اپنے سر اور پیشانی کو اپنی ہتھیلیوں سے دبانے لگا۔

موٹے بابو نے خفیف ہو کر کہا "تانگے والے تمہیں چوٹ تو نہیں لگی؟"

جمعراتی نے کہا "بابو صاحب، زیادہ نہیں لگی ہے"

موٹے بابو نے جلد اپنی نیکر کی جیب میں ہاتھ ڈال چمڑے کا بٹوہ نکالا اور بٹوے سے ایک روپیہ لیکر جمعراتی کی مٹھی میں بند کراتے ہوئے کہا "تانگے والے تم کو چوٹ آگئی ہے، یہ لو ایک روپیہ اور آج جاکر آرام کرو"

جمعراتی خلاف توقع ایک روپیہ پاکر دل ہی دل میں خوش ہوا اور اپنی چوٹ کو بھلا کر جانے لگا مگر اُس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا اور پیشانی میں نشتر چبھونے والی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ خوش تھا کہ ایک روپیہ مل گیا۔ وہ سوچنے لگا "ایک روپیہ... دو روپے.. اسی طرح اگر ساٹھ ہو جائیں.. نیا گھوڑا... بیچارہ بوڑھا.. ننھی کو بخار.. دوا... ماں.."

جمعراتی کے سر میں درد تھا۔ اُس کی آنکھوں تلے رہ رہ کر اندھیرا چھا رہا تھا۔ پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ اسکی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک رُک نہیں سکتا تھا سر پھٹنے لگتا تھا۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ کوٹھے سے اب بھی گانے کی تھکی ہوئی آواز آرہی تھی۔ جمعراتی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ کوٹھے کی روشنی مدھم معلوم ہو رہی تھی اور گانے کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ وہ بیٹھ جانا چاہتا تھا مگر تانگہ اور گھوڑا اب قریب ہی تھا۔ وہ انکے پاس جلد پہونچنے کیلئے چلتا ہی رہا۔ جمعراتی تانگے اور گھوڑے کو محبت سے دیکھنے لگا۔ جیسے یہ اس سے برسوں سے جدا ہو گئے تھے۔ تانگے کی لالٹین دھوئیں سے سیاہ ہو گئی تھی۔ گھوڑا اب بھی اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ جمعراتی نے گھوڑے کو تھپتھپا کر کہا "میرا شیر بوڑھا ہو گیا۔ دیکھو یہ روپیہ۔ میں گر پڑا ہوں میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ میں ذرا دیر شیر سے لگ کر آرام کر لوں تو ہم ساتھ چلینگے۔ دیکھو یہ روپیہ... سبز گھاس.. چنا" جمعراتی بیٹھے ہوئے گھوڑے کے پیٹ پر سر رکھکر لیٹ گیا۔ اسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا — صبح کو اس سڑک پر گذرنیوالے راہیوں نے دیکھا کہ بوڑھے گھوڑے کی لاش پر تانگے والا سر رکھے

ٹوٹے ہوئے کھنڈروں میں

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات انسان کے دل پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ بھلانے سے بھی نہیں مٹتی، کوشش کرنے سے بھی بھلائی نہیں جا سکتی۔ اور ایسی ہی باتوں میں سے ایک اس لڑکی کی آنکھیں تھیں۔ مگر میں نے انہیں بھلانے کی تو کبھی کوشش نہیں کی۔ اور اسکی ضرورت بھی کیا تھی، ایک نوجوان لڑکی کی آنکھیں ایک بے ضرر سی چیز ہیں۔ ممکن ہے آپ اس سے متفق نہ ہوں، میں بھی بعض حالتوں میں اس سے اتفاق نہیں کرتا، مگر اس لڑکی کی آنکھیں تو بالکل مضر نہیں، کم از کم مجھے تو انہوں نے کوئی نقصان پہونچایا نہیں اور نہ ہی مستقبل میں مجھے اس کی امید ہی ہے۔ اسکے خلاف اُن کی یاد آتے ہی میرے دماغ میں کئی تصویریں پھر جاتی ہیں اور اُن سب تصویروں میں سے جھانکتی ہوئی وہ آنکھیں ——— وہ شوخ اور شفاف آنکھیں جن میں زندگی تھی اور ایک عجیب سی چمک!

بات یوں ہوئی کہ اُن دنوں میں اشرف کے ہاں مہمان تھا۔ مہمان آپ جانتے ہیں کہ کُل تین دن کا ہوتا ہے اور چوتھے دن کا مہمان بے ایمان کہلاتا ہے اور ہم اگر زاہد و پاکباز نہ سہی تو بے ایمان بھی نہیں ہیں، اس لئے سمجھ لیجئے کہ وہ دن دہلی میں ہمارا آخری دن تھا۔ آخری دن، بہت خوشگوار اور تجربہ افروز!

وہ دن جمعرات کا تھا۔

آسمان پر خوب ابر چھایا تھا جیسے شروع اگست میں اکثر چھایا رہتا ہے۔ دُنیا میں ہر چیز کے لئے وقت مقرر ہے اور ابر کے لئے خاص طور سے برسات۔ برسات بھی عجب موسم ہے اور اگر اسکے غیر رومانوی پہلو سے قطع نظر کر لیا جائے تو نہایت ہی لطیف بھی۔ آسمان پر بادل گھر گھر کر نہ جانے کہاں سے آتے ہیں اور سر سنسار پر چھا جاتے ہیں۔ درختوں پر نئے پتے آتے ہیں، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ شاعروں کے جذبات اُبل پڑتے ہیں، مہجور عاشقوں کے دل سے آہیں اُٹھتی ہیں اور بادل بن کر آکاش پہ چھا جاتی ہیں۔ بجلیاں چمکتی ہیں جیسے زندگی اور موت کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو۔ لڑکیاں جھولا جھولتی ہیں اور قدرتی اور فطری طور پر موسم و فضا سے متاثر ہو کر میٹھے نغمے گاتی ہیں۔ سکھی ری یہ جیون پیا بِن نہ سوہے

رکھی ری یہ جیون

سکھی ری!

اور ہاں کبھی کبھی کوئی بات خوب موقع سے یاد آجاتی ہے، شادی شدہ لوگ اپنی بیوی کو اگر وہ بدقسمتی سے گھر پر نہ ہوں تو میکے سے بُلا لیتے ہیں ——— ساون کے دن ہیں، آسمان پر کالی بدلیاں ہیں، تمہاری یاد آتی ہے.....

تو وہ دن جمعرات کا تھا اور آسمان پر خوب ابر چھایا تھا، میں اور اشرف کوٹلہ فیروز شاہ دیکھنے گئے تھے، وہاں دہلی میں عام طور سے لوگ اسے صرف کوٹلہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

باؤلی کی متعفن فضا سے نکل کر میں نے سبزے پر قدم رکھا ہی تھا کہ بال بال اُس سے ٹکراتے ہوئے بچ گیا۔ اُس نے جھک کر برقعہ کی لٹ رکھی تھی اور لاابالیانہ انداز سے کائنات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتی ہوئی چلی جا رہی تھی، ایک لمحہ کے لئے اُس کی وہ شفاف آنکھیں میرے چہرے پر رُکیں اور وہ پھر آگے نکل گئی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی وہ خوبصورت آنکھیں میری آنکھوں کی راہ دل میں اُتر گئی ہوں۔ دس بارہ قدم آگے جا کر اُس نے پلٹ کر دیکھا ——— وہی شیشے کی طرح چمکتی ہوئی شفاف آنکھیں! کیوں دیکھا یہ وہی کچھ بہتر جانتی ہے، ممکن ہے صرف یہی جاننے کے لئے دیکھا ہو کہ اس طرح میری آنکھوں سے ٹکرا جانے والا کون ہو سکتا ہے... عورت کی فطرت میں سطحی تجسّس کا مادّہ کچھ زیادہ ہوتا ہے.... اور پھر وہ اُن میلے بُرقعوں میں مل گئی۔

اشرف بولا "تم نے دیکھا باؤلی کے پانی میں کتنی کثافت ہے، مگر پھر بھی بعض آدمی اس میں کُود پڑتے ہیں۔ گندے کہیں کے!"

مَیں، آگے جاتی ہوئی عورتوں کے اس غول کو دیکھ رہا تھا جس میں ہماری وہ چمکدار آنکھوں والی حسینہ گم ہو گئی تھی اور جو زندگی کی اُلجھنوں سے بے پروا فرش پر اپنی بھدّی جوتیوں کو پھٹپٹاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اُدھر ہی دیکھتے ہوئے میں نے کہا ——— "آخر ان عورتوں کو اتنے میلے بُرقعے پہننے کی ایسی کیا ضرورت ہے؟"

اشرف نے اپنی ہی دُھن میں جواب دیا "باؤلی میں ایک بار ایک لڑکا گر گیا تھا، تین دن بعد اس کی لاش سطح پر تیرتی ہوئی پائی گئی۔ لاش پھول گئی اور بدبو پیدا ہو گئی تھی، تب سے بچے تو اس میں جھانکتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔"

میں چُپ رہا، عورتیں ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے روپوش ہوگئی تھیں۔ آسمان پر بادل دوڑتے دوڑتے ٹھہر گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ ساری کائنات کو اپنے آنچل میں لپیٹ لیں گے، کبھی کبھی اُس سناٹے میں کسی درخت پر کوئی کوا چیخ اٹھتا تھا اور جواب میں کسی دُور اُفتادہ مقام پر کوئی دوسرا کوا تین چار بار کائیں کائیں کر کے خاموش ہو جاتا تھا، پھر ایک سناٹا چھا جاتا، جس میں انسان کو ایک عجیب قسم کا احساس تنہائی ہوتا ہے، دل میں ایک اجنبی سی خلا محسوس ہوتی ہے.....

ہم ٹوٹی ہوئی مسجد کے نیچے اُن تاریک بارہ دریوں میں سے گزرے جو صدیوں سے چمگادڑوں کا مسکن تھیں، جن کی دیواروں سے وقت پلاسٹر تک اکھاڑ کر لے گیا تھا، وہاں کی نمدار متعفن فضا سے بدبو کی لپٹیں آ رہی تھیں جو جلدی ہی انسان کو اس گندے ماحول سے نکل جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ فرش پر سانپوں کے رینگنے سے لہراتے ہوئے نشان پڑے تھے جو دل میں ایک مبہم سا خوف پیدا کر دیتے تھے، دیواروں میں جگہ جگہ سوراخ بنے ہوئے تھے جو دن کے وقت سانپوں کی جائے پناہ کا کام دیتے تھے، میں نے کہا: "ان بارہ دریوں میں کوئی قتل بھی کر دیا جائے تو پتہ نہ چلے، کتنی سنسان بھیانک جگہ ہے!"

اشرف بولا: "یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کتنے ہی آدمی یہاں مُردہ پائے گئے ہیں، اور ایک بار تو یہیں آس پاس کہیں ایک مقتول عورت ملی تھی، اُس کے گلے پر چھُری کا ایک گہرا زخم تھا!" اور کچھ ٹھہر کر وہ بولا: "جوان عورت تھی!"

میرے دل میں خوف کی ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی، قریب ہی کہیں فضا میں مجھے ایک خنجر چمکتا ہوا محسوس ہوا۔

اشرف کہتا گیا: "مگر یہاں صرف وہی لوگ آتے ہیں جن کا مقصد یا تو اِن کھنڈروں کو دراصل دیکھنا ہوتا ہے یا اُنہیں کسی ایسے ہی مجرمانہ کام کی تکمیل مقصود ہوتی ہے، عام لوگ تو اس طرف کا رُخ ہی نہیں کرتے!"

بارہ دریوں کے اندرونی حصے میں کہیں چمگادڑیں چیں چیں کر کے پھڑپھڑا اُٹھیں اور ہمارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ روسی ناولسٹ ترگینیو نے کہا ہے کہ انسان صرف اُس چیز سے ڈرتا ہے جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ موپساں کے الفاظ میں وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ مگر اس سنسنی کے کیا معنی؟... ممکن ہے خود نہ جانے ہوتے چمگادڑوں کی آواز میں کسی مقتول کی چیخیں معلوم ہوئی ہوں۔ خیر کچھ بھی ہو بارہ دریوں کے اُس کثیف و تاریک ماحول سے نکل کر میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور اس سانس کے ساتھ ہی پانی کی ایک ننھی سی بوند میرے ماتھے پر آ گری۔ کون جانے بارش کا یہ چھوٹا سا قطرہ کہاں کہاں سے ہوتا ہوا آیا ہوگا۔ کن نیلے پانیوں سے وہ اُٹھا ہوگا اور ہوا میں اُڑ گیا ہوگا اور اب میرے ماتھے پر آ گرا جہاں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ پانی کے اس چھوٹے سے قطرے کی تمام کوششیں فضول رہیں، اُسکی پیدائش، اُسکی زندگی سب فضول! دُنیا میں کسی کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں، کسی کی اُمیدیں بر نہیں آتیں.....

زندگی کے اِن ادھورے پہلوؤں پر میں غور کر ہی رہا تھا کہ بارہ دریوں سے ہٹ کر ٹوٹے زینے پر میں نے اُن بُرقعہ پوش عورتوں کی ایک جھلک دیکھی اور اپنے دل میں اُس سیاہ آنکھوں والی حسینہ کو دیکھنے کی ایک عجیب سی خواہش محسوس کی۔ اشرف کو میں زینے کی طرف لے چلا جو دوسری منزل کو جاتا تھا۔ زینہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور تین بل کھانے کے بعد چھت پر ختم ہو گیا تھا۔ چھت کے آخری کونے پر میں نے اُن عورتوں کو جھکے ہوئے دیکھا، نجانے فطرت انسانی میں یہ خاص بات کیوں ہے کہ جب وہ کسی اُونچے مقام پر پہونچ جاتا ہے تو ایک بار نیچے ضرور دیکھتا ہے۔ شاید نیچے کی طرف دیکھ کر وہ اپنی بلندی کا اندازہ لگاتا ہے، اس وقت اس کے دل میں ایک خاص قسم کا احساس برتری ہوتا ہے، نہیں جانتا کہ میں اس دُنیا کو حقیر سمجھ رہا ہوں مگر سمجھتا ہوں ... انسانی فطرت سے عجیب شاید دُنیا میں کوئی چیز نہیں۔

پاس ہی کھیتوں میں، جو جیل کی ملکیت ہے، قیدی کام کر رہے تھے مختلف جرائم میں سزا یافتہ اُن سب قیدیوں کی ایک سی وردی تھی جو شاید زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ جیل کی دُنیا میں سب قیدی یکساں ہیں اور اے بیرونی دُنیا کے نیم آزاد باشندو! تم بھی اپنے اندر سے یہ تفرقہ مٹا دو۔ کون جانے کسی ضرورت نے انہیں جُرم پر آمادہ کیا ہوگا، کس فاقہ کشی سے تنگ آ کر وہ چوری پر آمادہ ہو گئے ہونگے۔ قانون نے جُرم کی سزا دی، اُنکی قانون شکنی کی وجہ پر غور نہیں کیا۔ ایک طوفان کو روکنے کے لئے قانون نے ایک بند باندھا جس کے ٹوٹ جانے کے بعد پانی پھر اُسی طرح بہنا شروع کر دے گا.....

اچانک قیدیوں کے نگراں کی کرخت آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا، وہ زور سے چلایا — نمبر سات!

اُسکی آواز یکبارگی فضا میں گونجی اور ایک لمحے بعد ہی بادلوں میں گم ہو گئی جیسے جمنا کے مٹیالے پانی پر ایک بلبلہ اُٹھے اور دوسرے ہی لمحے غائب ہو جائے، پانی کی کسی لہر کے ساتھ بہہ جائے۔ کھیت میں بگلے پھر رہے تھے بے داغ سفید بگلے جو خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ مذہبی واقع ہوتے ہیں! کھیتوں میں دُور تک اروی کے چوڑے پتے کھلے ہوتے تھے، بادل زمین کے قریب آ گئے تھے اور پھر اچانک بارش!

بارش کی اچانک تڑاتڑ سے سامنے کے برقعہ پوش غول میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب کی سب محرابوں کی طرف بھاگیں۔ اُن کے بُرقعے ہوا سے بھر کر غبارے بن گئے، بڑی بی کی جوتی کائی پر پھسل گئی اور اُسے اٹھانے میں وہ آدھی بھیگ گئیں۔

بارش تیز ہوتی گئی۔ محرابوں میں آکر دیکھا، اچھا خاصہ کمرہ ہے۔ دیواروں پر سیاہی جمی ہوئی تھی اور فرش پر سُوکھے پتّوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا دیوار جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں اور ٹوٹے ہوئے طاق میں ایک چراغ رکھا تھا جس کا تیل پیندے میں آکر خشک ہوگیا تھا۔ نجانے کِسِس کس نے ایک کالی رات اس چراغ کے سہارے گزاری ہوگی۔ جب باہر درختوں پر اُلّو چیخ اُٹھتے ہونگے اور دُور کھیتوں کے پرے گیدڑوں کے بولنے کی مبہم آوازیں آتی ہونگی، ہوا درختوں کے درمیان سسکتی ہوئی گزرتی ہوگی یا پھر کبھی کبھی کائنات پر ایک تاریک خاموشی چھاجاتی ہوگی اور اُس خاموشی میں قلعہ کے یہ کھنڈر جو محکمۂ تحفظِ آثارِ قدیمہ کی وجہ سے ابتک قائم ہیں کتنے خوفناک معلوم ہوتے ہونگے.... یا اگر وہ دو ہوئے، ایک مرد اور غالباً ایک عورت ـــ عورت مَرد کے قریب ہوجاتی ہوگی اور سہم کر کہتی ہوگی :ـــ کتنی بھیانک اندھیری جگہ ہے ڈر لگتا ہے۔ اور جواب میں مرد اُسے اپنے اور قریب کرلیتا ہوگا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ چراغ کی لَو تھرتھراتی ہوگی اور تاریکی کے تصوّر سے وہ کانپ جاتے ہونگے۔ کتنا بھیانک وہاں ہوگا ـــ،

محراب کے دوسرے کونے میں ایک اور آدمی بیٹھا تھا، اُس کے چہرے پر افلاس تھا، اُس کی آنکھوں میں مری ہوئی زندگی تھی اور جسم پر میلے بوسیدہ کپڑے۔ اشرف کو سگریٹ جلاتے دیکھکر وہ بولا: "ذرا مجھے بھی ماچس دینا بابوجی"

اُسکی آواز میں انکساری تھی اور ایک بی ہوئی تکلیف۔

اشرف نے اُسے ماچس دیدی، بیڑی سلگا کر ماچس واپس کرتے ہوئے وہ بولا: "نجانے بارش کب تھمے!"

میں نے پوچھا: "تم کیا کرتے ہو، جانا ہے کہیں"

"بجلی گھر میں نوکر ہوں بابوجی، تار ٹھیک کرنا ہے، سوچا تھا ذرا آڑ میں ہوجاؤں، بارش تھمے تب تک ذرا دم لے لونگا، پر یہ بارش تو تھمتی دکھیتی نہیں، اب بھیگتے ہوئے ہی کرنا پڑے گا، اور نہ کریں بابوجی تو کھائیں کہاں سے"

"کیا ملتا ہے تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

اُس کے چہرے پر ایک جھجک سی آگئی۔ میں نے سوچا خودداری کا مادہ ابھی ان میں باقی ہے، پھر اُس نے جھجکتے ہوئے کہا: "اُنیس ملتے ہیں بابوجی! ڈیڑھ دھائی جمعدار کو بھی دینا پڑتے ہیں، بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے"

"جمعدار کو کیوں دیتے ہو؟"

"دینا پڑتے ہیں بابوجی، نہ دیں تو ترقی رُک جائے، آگے بھیجنا تو جمعدار کے ہاتھ میں ہے۔ نہ دیں تو شکایت ہی کردے"

میں نے سوچا انسان اپنے سے کمزور آدمی سے ہر طرح کا فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ جمعدار ان سے رشوت لیتا ہے اُسے اپنے افسر کو دینا پڑتا ہوگا۔ دُنیا میں ہر شخص کے اُوپر ایک افسر ہے، پھر اس رشوت ستانی کی منزل کہاں ہے، جو منزل ہے وہی منبع بھی ہے۔ اِس آدمی کو اُنیس روپے ملتے ہیں، اِسے جمعدار کو بھی دینا پڑتا ہے، بیوی بھی ہوگی، دو تین بچے بھی ہونگے ہی، اور میں نے پوچھا: "بال بچے ہیں؟"

"ہاں بابوجی بہو ہے، پانچ بچے ہیں۔ بڑی مشکل سے گزر ہوتی ہے"

پانچ بچّوں پر میں چونک پڑا۔ آخر یہ غریب آدمی اپنی بیویوں سے اتنی محبت ہی کیوں کرتے ہیں۔ پانچ بچے جن کی یہ پرورش بھی نہیں کرسکتے۔ ٹھیک طرح کھلا پلا بھی نہیں سکتے اور میرے دماغ میں ان پانچ رینگتے ہوئے بچّوں کی تصویر پھر گئی ـــ اُن کے جسم نیم برہنہ ہیں۔ سیاہ چمڑے کے پیچھے اُنکی پسلیاں جھانک رہی ہیں اور جیسے رو رو کر کہہ رہی ہیں، ہم نے کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا، ہم نے کبھی دودھ نہیں پیا، اس مکان کی تنگ متعفن فضا میں ہم سڑے جارہے ہیں....

بارش تیز ہوگئی تھی۔ پانی کی چھینٹیں اندر آآکر ہمارے اُوپر پڑ رہی تھیں۔ نہ جانے قدرت پانی چھڑک چھڑک کر ہمیں کس خواب سے بیدار کرنا چاہتی تھی،... میں نے کچھ سردی محسوس کی ـــ "بارش تیز ہوگئی اشرف"

اشرف بولا: "جی ہاں دیکھ رہا ہوں مگر تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"اب تو جانا ہی پڑیگا بابوجی"

اور تھوڑی دیر بعد اپنے سر پر ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال کر ٹوٹے ہوئے پتھروں پر پیر رکھتا ہوا وہ نیچے اُتر گیا۔ بارش کے بوجھ سے کھیتوں کے پودے جھکے جارہے تھے۔ دُور کھیتوں کے پرے جمنا لہراتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ ساری کائنات پر آنسو برس رہے تھے، چاندی کے خوبصورت تار سے جو دُور جاکر نیلے دُھندلکے میں گم ہوگئے تھے، کائنات پر ایک باریک جھلملاتا سا پردہ پڑا تھا، سامنے کی اُس محراب میں وہ عورتیں بیٹھی تھیں، عورتوں کے اُس سوفی صدی شہری غول میں مَیں نے اُس لڑکی کو ڈھونڈ لیا، اُس کا سر ساتھ والی عورت کے شانوں پر رکھا ہوا تھا اور وہ نیم باز آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی، مجھے اپنی طرف مُڑتا دیکھکر اُس نے

منہ پھیر لیا، شاید منہ پھیرنے سے پہلے وہ مسکرائی بھی تھی۔ مگر میں وثوق کیساتھ نہیں کہہ سکتا، ہاں مجھے ایسا معلوم ضرور ہوا تھا جیسے اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی ہو۔ میں نے بتوں کے قریب سرک کر آہستہ سے اشرف سے کہا: "یہ لڑکی جب سے ہماری طرف دیکھ رہی ہے، آنکھیں تو خوبصورت ہیں اس کی۔"

"ارے مارو گولی، یہاں سب ایسی ہی آتی ہیں" اشرف نے جواب دیا۔

"ایسی کیسی" میں نے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے عورت کی تخلیق کس طرح ہوئی؟"

"مگر ایسی کیسی؟" میں نے بےچینی سے پوچھا۔

"یہی بدکار قسم کی" اشرف نے کہا: "یہ ٹوٹے ہوئے کھنڈر بدکاری کے اڈے ہیں، بہت سے لوگوں کا تو خیال ہے کہ شریف عورتیں یہاں قدم ہی نہیں رکھتیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میری بےچینی بڑھتی جا رہی تھی۔

"یہ تو دنیا جانتی ہے، یہاں کا چوکیدار کہہ رہا تھا کہ ایک بار ایک عورت اِدھر پھول توڑ رہی تھی، وہ جو اُسے منع کرنے گیا تو وہ پھیل ہی گئی، کہنے لگی تمہیں شرم نہیں آتی، بےپردگی ہوتی ہے، ایسا ہی تھا تو وہیں سے منع کیا ہوتا اور پھر پھول توڑنے میں ہرج ہی کیا ہے، میں رپورٹ کر دونگی تمہاری۔ مالی بیچارہ سیدھا آدمی تھا ڈر گیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی کام سے جب وہ پچھلی روش کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہی محترمہ ایک ڈاڑھی والے سکھ کے ساتھ محوِ اختلاط ہیں۔ مالی کو غصہ آیا، کہہ رہا تھا، میں نے کہا رانڈ ہم سے تو کہتی ہو بےپردگی ہوتی ہے اور اب یہاں اپنے ڈاڑھی والے خصم کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔ بس اس نے ایک لات تو جمائی اُس عورت کے اور پھر اس سکھ کے پیچھے لٹھ لیکر بھاگا۔ اُس دن کے بعد وہ عورت اب بھی یہاں آتی ہے مگر مالی سے کترا کر نکل جاتی ہے۔"

اشرف چپ ہو گیا، پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ بولا: "تو دیکھا آپ نے یہ سب کچھ ہوتا ہے یہاں پر، اور صرف ایک ہی بات نہیں ہے اور سینکڑوں باتیں ہیں، اور ایسی ہی ہونگی یہ صاحبزادی بھی۔"

"نہیں بھئی، دیکھو تو اسکی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔"

"خوبصورت آنکھوں کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ بہت پارسا ہیں اور اگر یہی بات ہے جیسی کہ اُمید نہیں تو سنبھل جاؤ بھئی یہ ضرور تم پر عاشق ہو گئی ہیں جبھی اس طرح کنکھیوں سے دیکھ رہی ہیں۔"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھیں ہماری طرف سے ہٹ کر ساتھ والی عورت کے چہرے پر جم گئیں۔ وہ کہہ رہی تھی: "دیواروں پر کتنے آدمیوں کے نام لکھے ہیں، ہم بھی کیوں نہ اپنا نام لکھ دیں (ہماری طرف دیکھکر) کیوں خدیجہ تم بھی لکھ دو!"

اشرف کہنے لگے: "لتنے بارش تھمے لتنے اندر کی چیزیں دیکھ لو، اندر اور تو کچھ نہیں ہے بس ایک قبر ہے، چلو۔"

میں نے جواب نہیں دیا، لڑکی دیوار پر اپنا نام لکھ رہی تھی۔ لکھنے کے بعد اُس نے خدیجہ کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا اور اپنا مسکراتا ہوا چہرہ ہماری طرف پھیر دیا۔

"اب چلو بھی یا اسے آنکھوں ہی سے نگل جاؤ گے۔"

اندر جا کر دیکھا ایک چھوٹی سی اُداس قبر تھی جس پر ایک فقیر جھکا ہوا شاید کچھ دعا مانگ رہا تھا، اُس کے کندھوں پر ایک لبادہ پڑا تھا جو بیسیوں رنگ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا ــــ لال، کالے، پیلے، شربتی جو زندگی کے رنج و غم، خوشیوں اور مسکراہٹوں کی یاد دلاتے تھے۔ ایک فقیر اور دُنیا۔ کتنی متضاد چیزیں ہیں۔ مگر ایک فقیر کا لبادہ اور زندگی ــــ کتنی مشابہت پائی جاتی ہے۔ عجیب بات ہے، قدرت بھی کتنی عجیب ہے۔ زندگی بھی کس قدر عجیب ہے ــــ مگر نہیں، زندگی تو بالکل عجیب نہیں، ایک سیدھی سادی قوس و قزح کی مانند ہے، خوبصورت اور دلکش... گھناؤنی؟ اونہہ رہنے دو بھئی، آخر زندگی کی گہرائیوں کو سوچیں ہی کیوں۔ اگر اسی طرح زندگی کے بُرے پہلوؤں پر غور کرتے رہے تو جینا مشکل ہو جائیگا۔ انسان ہمیشہ اُس چیز سے اکتاتا ہے جو اُسے پسند نہیں آتی، نہ کبھی ہم زندگی کی گہرائیوں کو دیکھیں گے نہ اُس کی خوفناکیوں سے آگاہ ہو سکیں گے۔ اطمینان سے زندگی گزر جائیگی۔

قبر کے گرد دیوار میں کتنے ہی طاق بنے ہوئے تھے اور اُن میں چراغ رکھے تھے، چراغ جو بجھ گئے تھے۔ آخر نہ بجھیں تو یہاں آگ ہی نہ لگ جائے۔ سینکڑوں چراغ اپنی مختصر سی زندگی میں اس قبر پر اعلان کر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر جل کر اپنی بے ثباتی اور انسانی کے انجام کا احساس کرا جاتے ہیں۔ قبر کے سرہانے ایک شمع جل رہی تھی، رو رہی تھی اور اس کے آنسو قبر پر بہ رہے تھے۔ قبر پر ایک عجیب سی اُداسی چھائی تھی اور اگر اور لوبان کی اُداس خوشبو کمرے کی دیواروں میں بس گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اِن دیواروں میں اُداسی جذب ہو کر رہ گئی ہے۔ ماحول کی ایسی ہی رومانوی اُداسی انسان کو اِس محدود فضا سے نکالکر تصور کی دُھند لی وادیوں میں لے جاتی ہے۔ کتنی خاموش اُداسی تھی، کیسی اُداس خوشبو تھی۔

میں نے آہستہ سے اشرف سے کہا۔ (نجانے ایک قبر کے قریب کھڑے ہو کر آواز اتنی کمزور ـــــ کیوں ہو جاتی ہے) "کس کی قبر ہے یہ؟"

اشرف خاموش نجانے کیا سوچ رہا تھا۔

فقیر نے دُعا ختم کر کے اپنے سانولے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور اپنے دراز چکنے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا: "سید جلال الدین کا مزار ہے صاحب۔"

میں نے فقیر کو غور سے دیکھا، اس کی آنکھیں غیر معمولی طور سے بڑی تھیں اور اُن کے کونوں میں سے حسرت جھانک رہی تھی۔ اُسکے کپڑوں پر جابجا چکنے دھبے پڑے ہوئے تھے، ان دھبوں کو دیکھکر اُس فقیر کو میں نے ایک غیر معمولی سا انسان تصوّر کیا، دھبے معمولی بات ہیں، پھر بھی ..... نہ جانے کیوں!

قبر کے سرہانے کی شمع ایک بار بھڑکی اور بُجھ گئی۔ جیسے آسمان پر یکبارگی بجلی چمکے اور غائب ہو جائے۔ فقیر نے اپنا لبادہ سنبھالا، ایک بار قبر پر ہاتھ اٹھایا اور نہ جانے کیا سوچتا ہوا بائیں دروازے سے باہر نکل گیا، اُسکی لکڑی کی مسلسل کھٹ کھٹ دُور ہوتی گئی، مدھم ہوتی گئی اور پھر اُنہیں پیچدار راستوں میں گم ہو گئی۔ اور میں ایک لمحے کے لئے سوچتا رہ گیا..... ایک معمولی فقیر بھی کس قدر غیر معمولی ہے.... ہم ایک قبر کے قریب کھڑے ہیں .... جہاں زندگی اور موت مل کر ایک نئی چیز کی تخلیق کرتی ہیں .... نمدار ہوا کا ایک تیز جھونکا آ کر میرے چہرے سے ٹکرا گیا۔

اشرف بولا: "قبر بھی ایک اچھی یادگار ہے!"

اِس معمولی سی بات پر مجھے ہنسی آ گئی، قبر بھی ایک اچھی یادگار ہے! بیشک ایک اچھی یادگار ہے۔

اشرف بولا: "ارے تم ہنستے ہو، شیخ سعدی کا شعر ہے، اُنہوں نے کہا ہے کہ .... کہا ہے .... کہ .... کچھ یاد نہیں آتا۔ مگر تم ہنسے کیوں تھے بھئی؟ ...."

"چلو باہر چلو" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

باہر آ کر دیکھا بارش تھم چکی تھی۔ بہت ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں جیسے کسی یتیم لڑکے کے آنسو ٹپک رہے ہوں جو سڑک کے کنارے کھڑا ہوا اپنی ماں کی یاد میں رو رہا ہو۔ آسمان پر بادل جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے اور کہیں کہیں اس کے بیچ سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ جیسے نئی دُلہن آنچل اُٹھا کر مسکرا دے۔ سامنے کی محراب خالی پڑی تھی، اُن عورتوں کا وہاں نام بھی نہ تھا۔ محراب کے اُوپر بیٹھا ہوا ایک کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ اُسکی آواز میں موسیقی نام کو نہ تھی۔ نہ جانے یہ بدتہذیب کالے کالے کوّے اِس لمبی ٹھمری تان میں کیا الاپا کرتے ہیں۔ میں نے سوچا ہی تھا کہ ایک پتھر اُٹھا کر اِس کوّے کی چھوٹی سی کھوپڑی پر ماروں کہ وہ ایک لمبی لے "کائیں" کے ساتھ محراب سے اُڑ گیا۔ نہ جانے اِن کوّوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے مارنے کی اسکیمیں بن رہی ہیں۔ کیونکہ نہ صرف آج ہی بلکہ جب بھی میں نے کسی کوّے کو مارنے کا خیال کیا وہ اُڑ گیا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔

محراب میں آ کر دیکھا پیلی مٹی سے دیوار پر لکھا تھا: "تجھ گل قاسم جان"

"تجھ گل قاسم جان" اشرف نے بھی ایک بار دُہرایا۔

تجھ ... خوبصورت آنکھیں ... گل قاسم جان ... تجھ!

"آنکھیں تو بہت خوبصورت تھیں اسکی" میں نے کہا۔

"آنکھیں تو خوبصورت تھیں اُس کی" اشرف نے دُہرایا۔ "تو ایکبار اُسکے پھر درشن کر لو، ابھی تو وہ مزار پر ہی ہو گی۔"

"کون سے مزار پر؟"

"یہ ایک سید صاحب کا مزار، لوگ اپنی اپنی آرزوئیں لیکر آتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اُن کی اُمیدیں پوری ہو جائیں۔ تمہاری کوئی ایسی آرزو ہو تو بتا دو۔ اچھا چلو تمہیں اُن کے درشن تو کرا ہی دیں، چلو۔ اور ہاں یہاں قوالی خوب ہوتی ہے۔"

ہم ٹوٹی ہوئی دیواروں پر سے اُترنے لگے، باجے کی آواز آ رہی تھی مگر گیت سمجھ میں نہ آتا تھا، ہم اُترتے گئے آواز قریب آتی گئی۔

دھپ دھپ ـــ دھپ دھپ

.... تاراج کر دیا میرے .... ہاں تاراج کر دیا میرے! آگے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

صحن کے گرد دیواروں پر بیلیں لپٹی تھیں اور صحن کے بیچ میں قوال بیٹھے تھے، اُن کے آگے ساز تھے اور آواز میں ایک غیر معمولی تیزی!

بادِ خزاں نے لوٹا پھولے پھلے چمن کو ـــ پھولے پھلے چمن کو

بادِ خزاں نے لوٹا......

صحن کے ایک حصّے میں تماشائی بیٹھے تھے جو کبھی کبھی واہ واہ کا نعرہ لگا دیتے تھے، اُن میں سفید پوش شریف بھی تھے۔ تہمد پہنے ہوئے نچلے طبقے کے لوگ بھی تھے، شاید جوتے چور بھی تھے، مگر میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا مگر ایسی جگہ پر جوتے چور ہوتے ضرور ہیں۔ جوتوں کے قریب ہی پھولوں والا اپنا ٹوکرا لئے بیٹھا تھا۔ لوگ اُس سے پھول لیتے پھر اندر جا کر وہ پھول قبر کے سرہانے بیٹھے ہوئے ایک شخص کو دیدیتے، قبر پر ہاتھ رکھتے اور باہر آ جاتے۔ اندر جانے والوں میں زیادہ تر برقعہ پوش عورتیں ہی تھیں۔ آخر

ایسے مقاموں پر عورتیں ہی زیادہ کیوں نظر آتی ہیں، کیا عورتوں کی آرزوئیں مردوں سے کچھ نہیں بلکہ... عورت ہمیشہ ایک سہارے کی تلاش کرتی ہے، وہ جلدی ہی یقین کرتی ہے اور جلدی ہی اُس کا اعتقاد ختم ہو جاتا ہے۔

بادِ خزاں نے لوٹا، لے چی بادِ خزاں نے لوٹا پھولے پھلے چمن کو

پھولے پھلے چمن کو۔

اُس کی آواز میں رس تھا، جھنکار بھی تھی۔

دربار میں کھڑی تھی آنکھیں جھکائے زینب

ظالم دکھا رہے تھے بھائی کا سر بہن کو۔ بھائی کا سر بہن کو۔

ایسا معلوم ہوا جیسے سارنگی بھی کہہ رہی ہو۔ بھائی کا سر بہن کو، بھائی کا سر بہن کو۔

دھپ دھپ دھپ۔ دھپ دھپ دھپ

دروازے کے قریب سے گزرتی ہوئی عورتیں کہہ رہی تھیں: اللہ چاہیگا تو سب کچھ ہو جائے گا زندگی چاہیئے۔ ورنہ....! اور پھر وہ موڑ پر مڑ گئیں۔ میں سوچنے لگا۔ آخر دُنیا میں زندگی کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے، دُنیا میں ہر شخص کو ایک ابدی زندگی کی چاہ ہے، ہر شخص فانی زندگی کا متلاشی ہے۔ آخر کیوں؟ مگر جیسے پھر کوئی میرے کان میں کہہ گیا۔ — زندگی ہی تو دُنیا ہے!

قوال کا گیت ابھی ختم نہیں ہوا تھا، اب اُسکے دل میں ایک پیالہ پینے کی خواہش لہریں لے رہی تھی۔ وہ گا رہا تھا۔

ایک جام پلا خواجہ — اک جام پلا خواجہ۔

ایک خواجۂ حق کا ایک ایسا جام پلا جاکہ میں سب کچھ بھول کر ایک تجھے ہی یاد رکھوں۔

شام قریب آتی گئی، درختوں پر پرندوں نے ایک خوشگوار سا شور مچا دیا۔ سب طرف سے پرندے آکر ان درختوں پر جمع ہو گئے۔ جیسے رات کی تاریکی کا مقابلہ وہ اکیلے نہ کر سکتے ہوں۔ آسمان پر بگلوں کی ایک قطار اُڑی چلی جا رہی تھی اور وہ گہرے نیلے آسمان پر ایک سفید لکیر سی معلوم پڑتی تھی، دن بھر نہ جانے کہاں کہاں پھرنے کے بعد بڈھا اُداس اُس شکستہ طاق میں آ بیٹھا تھا۔

پھر روشنی کی آخری کرنیں بھی غائب ہو گئیں۔ شام کا اندھیرا بڑھتا گیا، چڑیوں کی آوازیں بند ہو گئیں اور ایک سناٹا چھا گیا۔

قدرت نے کائنات پر ایک باریک سا سیاہ پردہ ڈال دیا، سب طرف ایک اُداسی پھیل گئی۔ جیسے ایک حقیر سے دن کے گزر جانیکا بھی قدرت کو افسوس ہو۔ ہم دونوں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے، شام کی اُداسی نے دل کو خاموش کر دیا تھا۔ شام کے دُھندلکے میں وہ گیلے کھنڈر ایسے معلوم ہوتے تھے گویا اب گر پڑینگے۔

اندھیرا بڑھتا گیا، جھاڑیوں میں جھینگروں نے اپنا راگ چھیڑ دیا تھا، اُن کے راگ میں ایک بے پناہ یکسانیت تھی جیسے انکا یہ نغمہ ہمیشہ یونہی قائم رہیگا، اُنکے گیت کی یہ لَے کبھی نہ رُکیگی۔

زندگی کا ایک اور دن ختم ہو گیا — یہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈر.... خوبصورت آنکھیں.... بارش.... پانچ بچے.... قبر اور موت.... کتاب زندگی کا ایک ورق!

ایک گہرا اندھیرا سب طرف چھا گیا۔

تجمہ!

مدھوسودن!

سُورما

محکمۂ زراعت کے پروپگنڈوں میں آکر قصبۂ چتر پور کے زمیندار رحیم داد خاں صاحب اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اپنے گاؤں کے کاشتکاروں کو جدید طریقۂ کاشتکاری، نئے آلاتِ زراعت، اور ترقی یافتہ فصلوں کے بیج رائج کرنے پر راضی کریں۔ محکمۂ مذکور کے پمفلٹوں، ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر صاحبانِ زراعت کے مضامین، اور زراعتی کالجوں سے نکلے ہوئے گریجویٹوں کے گاؤں گاؤں کے دوروں اور تلقین سے خاں صاحب کو بڑے اور گہری جتائی کرنے والے بدیسی اور سودیشی ہلوں، کیمیاوی طریقے پر تیار کی ہوئی کھادوں، اور ہندوستانی ماہرینِ نباتات کی تحقیقات کردہ غلوں کی قسموں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا جاتا تھا۔ اور گو وہ اپنے یہاں کے مفلوک الحال کسانوں کے قطعی ہمدرد نہ تھے، تاہم وہ اپنے گاؤں کی زرعی حالت پہلے سے زیادہ سُدھری ہوئی دیکھنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ جو کچھ بھی ملک یا صوبہ کے اندر تعلیمیافتہ طبقہ زراعت کے متعلق نئی باتیں بتاتا ہے وہ لازمی طور پر ہندوستان کی یا کم از کم اُن کے گاؤں کی پیداوار کو پہلے سے بہتر بنا سکتی ہیں جس میں کہ خود خاں صاحب ہی کا فائدہ ہوگا، اور گاؤں کے اندر یہ زراعتی انقلاب اُن کی "جیبِ زر" پر کافی خوشگوار اثر ڈالے گا۔ اسی لئے خاں صاحب موصوف نے اپنے پٹواری، فصلعدار، (یا ذیلدار) اور تہنیت جیسے مصاحبین سے مشورہ لیکر (جنہوں نے ہمیشہ کی طرح "راضی برضائے خانصاحب" ہونے کا ثبوت دیا) محکمۂ زراعت کو لکھا کہ وہ ایک "تجربہ کار" آدمی کچھ عرصہ کے واسطے ان کے گاؤں میں بھیجدے جو مفید ہدایات اور قیمتی مشورے دینے کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سادہ لوح کسانوں کو بھی اپنی چرب زبانی سے اس بات پر آمادہ کرلے کہ وہ "انّا وَجَدْنَا عَلَیْہِ آبَاءَنَا"[1] والی ذہنیت کو چھوڑ کر اس کے بتائے ہوئے طریقے اختیار کریں، اور خاں صاحب کی دولت میں ترقی اور غلّے اوزان کے اضافے میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھیں، اور یہ اس خوبی سے ہو کہ بظاہر وہ اس کو اپنا ہی فائدہ سمجھکر کریں۔

کانگرس کی چندروزہ "سقّائی" حکومت کا دور ختم ہو چکا تھا لیکن اس آندھی کا گرد وغبار اتنا باقی تھا کہ اب تک دیہاتی خود کو "نیم سوراج یافتہ" سمجھے بیٹھے تھے، اور اس فرعونیت بے سامانی کی بناء پر مالگذاری بھی کافی ردّوکد بلکہ بعض اوقات سر پھٹول کے بعد دیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی پولیس کو بھی مداخلت کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ پھر بھلا اس قدر سرکش انسانوں سے یہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ وہ محض حکم زمیندار سمجھتے ہوئے خاں صاحب کی بات مان کر اپنے طریقۂ کاشتکاری میں کسی قسم کی تبدیلی گوارا کرلیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ خاں صاحب بھی زبردستی نہیں بلکہ خوشامد اور نرمی سے کام نکالنا چاہتے تھے جس کے لئے وہ خود کسی طرح موزوں نہ تھے۔ نہ اُن کے مصاحبین میں سے کوئی علم زراعت کے جدید انکشافات اور ایجادات سے واقف تھا، اس لئے ضرورت اس امر کی محسوس ہوئی کہ کوئی ماہر شخص بھی اس کمی کو پورا کرنے کیلئے آجائے۔ محکمۂ مذکور کو جو انہوں نے لکھا تو وہاں سے جواب ملا کہ چونکہ محکمہ کے اندر اس قسم کا کوئی آدمی خالی نہیں، اس لئے انہیں چاہئیے کہ کسی زراعتی گریجویٹ کی خدمات حاصل کریں، جو ہر سال اس قدر کافی تعداد میں نکلتے ہیں کہ خانصاحب کو زیادہ تلاش کی ضرورت نہ پڑی اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک عدد "بالوجی بہ متصف بجمیع اوصافِ زرعی، سر سے گھٹنوں یا زیادہ سے زیادہ پنڈلیوں تک کھدر میں ملبوس، ہندوستانی چپل پہنے ہوئے ان کے گاؤں میں آدھمکے، اور آتے ہی گاؤں والوں کو روشِ قدیم چھوڑ کر طرزِ جدید اختیار کرنے کی دعوت نہایت سرگرمی سے دینے لگے۔ انہوں نے دوسرے ملکوں سے ہندوستان کا مقابلہ کرتے ہوئے بتایا کہ انگلستان باوجود غیر زراعتی ملک ہونے کے ہندوستان کی فصلوں سے سینکڑوں گنا بہتر اور تناسب کے لحاظ سے زیادہ غلّہ پیدا کر رہا ہے۔ محض اس لئے کہ وہاں کے لوگ ہندوستانیوں کی مانند لکیر کے فقیر نہیں! انہوں نے مبالغہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا کہ آسٹریلیا کے غیر مہذب باشندوں نے اپنے متمدن آقاؤں کی پیروی کرکے سرزمین آسٹریلیا کو آج اس قدر زرخیز بنادیا ہے کہ وہاں کا غلّہ اپنے یہاں کی بلکہ دیگر ممالک کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اتنا بچ رہتا ہے کہ مشینوں کے انجنوں کیلئے ایندھن کی طرح استعمال ہوتا ہے، اور یہ نئے زراعتی آلات اور کھادوں وغیرہ کا طفیل ہے۔ لیکن اس تمام مغز زنی کا اثر گاؤں کے طفلانہ ذہنیتیں رکھنے والے افراد پر وہی ہوا جو کسی متعصب پیروِ مذہب پر کسی دوسرے مذہب کی

[1] یہ تو وہی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ (آیۂ کریمہ)

تلقین کرنے سے ہوسکتا ہے، وہ لوگ ہرگز اس بات کو گوارا نہ کرسکتے تھے کہ اُن کے موروثی کام میں ذرا بھی تبدیلی ہوسکے۔ کیونکہ وہ سامی کی طرح زراعت کو علم دریاؤ جانتے تھے اور خود کو اس کے قدیمی شناور، اُن کی سمجھ میں یہ بات قطعی نہ آسکتی تھی کہ اس کام کو وہ خود زیادہ بہتر جان اور سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں نہیں پشتیں اس میں صرف کر دی ہیں یا ان چند جنٹلمین بابو، جن کو بڑے بڑے شاندار مکانوں میں زندگی گزارنا، خوبصورت قیمتی موٹروں میں گھومنا، اور نرم نرم پوشاکیں استعمال کرنا ہی آتی ہیں۔ اگرچہ یہ "بابوجی" اس نمائش سے بظاہر قطعی مبرّا نظر آتے تھے، لیکن گاؤں کے لوگ ان کی تبلیغ سے متنفر ہو کر ان کو سمجھتے تھے کہ زمیندار صاحب کے خوشامدیوں میں سے یہ بھی ہیں، اور شاید زمیندار صاحب نے روپیہ اینٹھنے کی کوئی اور نئی چال چلی ہے، اس لئے کہ یہ بابو صاحب جن چیزوں کے خریدنے اور استعمال کرنے کو کہتے تھے، ان کے لئے تو کسی ایک جھونپڑے میں بھی روپیہ نہ نکل سکے گا۔ بھلا کہاں دیہات کے بڑھئی کا بنایا ڈھائی روپے کا دیسی ہل اور کہاں سینتالیس اڑتالیس روپے کا دکٹری[^1]۔ کہاں گاؤں کے کوڑے کرکٹ سے تیار کی ہوئی کھاد، جو ڈیڑھ ایک روپے میں گاڑی بھر سے زیادہ بیٹھے، اور کہاں کارخانوں کا تیار کردہ چار پانچ روپے من ہڈی کا چورا!

لاکھ "بابوجی" یقین دلائیں کہ جتنا لگاؤ گے اُس کا سو گنا حاصل بھی ہوگا۔ مگر وہ کیونکر ایک موہوم سی اُمید پر اتنا روپیہ بنئے سے قرض لیکر لگا دیں اور پھر جو کہیں گھاٹا بیٹھا تو اِن بابوجی کا تو کچھ نہ بگڑے گا، ان غریبوں کی گت بلکہ شامت آجائے گی۔ نالش، قرقی، بے دخلی — یہ خیالات تیزی کے ساتھ ہر بدھان کے دماغ میں دوڑ جاتے، اور وہ بابوجی کا پرچار بیدلی سے سُنتے ہوتے یا تو منہ پھیر کر اپنے حقہ کی طرف متوجہ ہو جاتے یا ایکدوسرے سے باتیں کرنے لگ جاتے۔ اور آخر میں بابو صاحب کے بار بار کہنے پر ایک دل ہونے کے سبب یک زبان ہو کر کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے۔ اور ایک شخص کے بولنے کے ساتھ ہی ساتھ اُسکے الفاظ دہراتے ہوئے بقیہ لوگ بھی صاف انکار کر جاتے۔

لیکن "بابوجی" کے کہنے سننے اور بار بار سمجھانے اور اطمینان دلانے سے پتھر میں جونک لگنی شروع ہوئی، آہستہ آہستہ گاؤں والے اس بات پر راضی ہو گئے کہ اگر وہ اپنی آنکھوں سے بابوجی کے طریقہ سے پیداوار بہتر ہوتی دیکھیں گے، تو وہ بھی سب کچھ کرنے لگیں گے جو بابوجی بتائیں۔ اور اس تجربہ کیلئے خاں صاحب کی خود کاشت زمین پیش کی، جس پر خاں صاحب تو مشوش ہوئے لیکن بابوجی نے، جن کی کارگزاری کا اب موقع آیا تھا انہیں سمجھایا بجھایا اور فائدے کا ذمہ لیتے ہوئے یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر کاشتکار بھی یہ کام کرنے لگے تو مزید فائدے کی توقع بھی ہے۔ خاں صاحب ہرگز بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح پر اُن کا ایک پیسہ بھی خرچ ہو۔ وہ گاؤں والوں سے زیادہ بودے ثابت ہوئے، لیکن بابوجی کے بار بار یقین دلانے سے کہ یہ بڑے نفع کی چیز ہے، راضی ہوئے اور اپنی خود کاشت زمین اُنکے اختیار میں دیتے ہوئے "حساب کم و بیش" پر بکار خویش ہشیار زمیندار نے اپنے پٹواری اور ضلعدار کو مسلط کر دیا کہ کہیں وہ چادر کو زیادہ وسیع دیکھکر پاؤں بھی پھیلانے پر نہ تل جائیں۔

اور اب بابوجی اپنی عملداری میں داخل ہوئے اور اپنے انتظامات شروع کر دئے۔ سب سے پہلے کھیتوں کی از سرِ نو پیمائش کرائی اور بجائے بیگھوں کے ایکڑوں کے حساب سے علیحدہ علیحدہ "پلاٹ" بنوائے۔ پھر ان کی حفاظت کیلئے تار کا جنگلا لگوایا، قریب ہی ٹین کا ایک بند شیڈ تعمیر کرایا جس میں سامانِ زراعت حفاظت سے رکھا جاسکے، اس کے بعد وکٹری اور مسٹن ہل اور دوسرے آلات زراعت یو۔پی کے زراعتی ورکشاپ سے منگوائے۔ مضبوط بیلوں کی جوڑیاں اور کھادیں بھی جب آگئیں تو بیجوں کا آرڈر دیکر زمینوں کی گوڑائی اور جتائی شروع کرادی۔

بیج آئے، ابھی چونکہ پہلا موقع تھا اس لئے تجربہ کے طور پر صرف دو قسم کے منگوائے گئے۔ ایک تو پی، بی ۱۸ ۵ قسم کے گیہوں، دوسرے پی، ۱۵ ۲ قسم کے چنے۔ چونکہ یہ دونوں اقسام ترقی یافتہ (improved) تھیں، اسی لئے معمولی دیسی قسموں سے نسبتاً گراں تھیں۔ بہرحال انکو اسی ٹین کے گودام میں رکھوا دیا گیا۔ کیونکہ ابھی ربیع کے لئے زیادہ تیاری نہیں ہوئی تھی، نہ ابھی موسم ہی آیا تھا۔ بیج رکھے گئے جو اپنی آس پاس کی چیزوں سے بے خبر حالت میں مُردوں کی طرح بوریوں کے اندر پڑے رہے۔ ان کو کسی شے نے اب تک ان کی موجودہ مدہوشی سے نہیں جگایا تھا اور نہ جگا سکتی تھی۔ ان کی نباتی رُوح کے لئے توپ کی وہ گھن گرج آواز جو بیہوش کو چونکا دے، طوفانی سمندر کا وہ شور جو جانوروں تک کو بہرا کر دے، اور زلزلوں کا وہ سامعہ خراش دھماکا جو مُردوں کو بھی ایک بار اُٹھا کر بٹھا دے — یہ سب اکٹھا ہو جانے پر بھی بے معنی تھے، لیکن زمین کی ملائم آغوش، بارش کا ایک ہلکا چھینٹا، اور سورج کی نرم گرم شعاعیں آج کے بیج کو کل کے پودے میں تبدیل کرنے کی طاقت رکھتی ہیں — بیشک دنیا میں کبھی طاقت سے دل فتح نہ ہوسکے، یہ کام تو محبت بھری باتوں، میٹھی گفتگو اور نرم

[^1]: Victory Plough ایک قسم کا بڑا ہل: [^2]: Meston Plough درمیانی ہلوں میں سے ایک ہل، جو دیسی ہل سے کچھ ہی بڑا ہوتا ہے۔

رکھ رکھاؤ سے ہی ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔

(۲)

جب کھیتوں کی اچھی طرح جتائی ہو چکی اور پانی بھی کافی پہونچ گیا تو اکتوبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی "بابوجی" نے بڑے ہَل چلوانے بند کرا دئے۔ اور اب دیسی کا دور دَورہ ہو گیا۔ کیونکہ بقول بابوجی کے "اب زمین کو زیادہ کھودنے کی ضرورت نہیں، ورنہ نمی خشک ہو جائے گی"۔ اب کھادیں ملائی جانے لگیں۔ یہاں تک کہ ۲۲ اکتوبر کو بیج گودام سے نکالے گئے اور دونوں فصلوں کو علیحدہ علیحدہ "پلاٹوں" (plots) میں دیسی ہَل کے پیچھے بویا گیا۔ کچھ پلاٹ خریف کیلئے چھوڑ دئے گئے۔

چنے کے بیجوں میں سے ایک بیج، جس کا یہ قصہ ہے، سب سے عمدہ اور تندرست بیجوں میں سے ایک تھا۔ یوں تو سب کے سب بیج اچھے تھے، لیکن چند تو خصوصیت کے ساتھ اعلیٰ درجے کے، خوب موٹے تازے، عمدہ مٹیالی رنگت کے، آگے کی نوک ذرا نیچے کی طرف مڑی ہوئی، پشت والی شکن نمایاں، جس کے آس پاس دو ایک شکنیں پڑی ہوئیں۔ یہ تھے وہ چند تندرست چنے، اپنی برادری میں رستم، لیکن انسان کے ہاتھ میں بیجان، اور اسقدر مجبور کہ جیسے کروڑوں بھی بھاڑ میں جھونک دئے جائیں تو چیخ کر ٹکڑے ہو جائیں اور بھاڑ پر آنچ بھی نہ آئے!

تو خیر، ان ہی گنے چُنے بیجوں میں وہ چنا بھی تھا جس کا بیان اب ہو رہا ہے، اور اگر اُردو کی ایک مشہور ضرب المثل کا خیال کر کے اُس کو شورہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہو۔ اپنی پیدائش سے کھیت میں ڈالے جانے تک بالکل بیہوش اور بظاہر مُردہ، لیکن اب جو ہَل کی کونڑ میں دو ایک اور چنوں کے ہمراہ تھوڑی سی نم جگہ میں ڈالا گیا تو ادھر پانی کی ٹھنڈک سے ہشیار ہونا شروع ہوا اُدھر اندھیرے اور ہوا کی کمی سے دل گھبرایا۔ فوراً (یعنی دو ایک روز بعد) آہستہ آہستہ ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے۔ سب سے پہلے اپنی نوک کے نیچے چھوٹے سے سوراخ کے ذریعہ اپنے زردی مائل سفید پاؤں کا سرا باہر نکالا، جس نے آہستہ آہستہ نیچے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہی وہ چیز ہے جو بعد میں چل کر جڑ بن جائے گی۔ اور پودے کو زمین سے خوراک حاصل کرنے میں مدد دے گی۔ لیکن فی الحال تو یہ ایک باریک سفید ڈورا سا ہے جو خاموشی اور سُستی سے زمین کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جا رہا ہے، اور جوں جوں یہ نیچے بڑھتا ہے اس کی لمبائی کے ساتھ ساتھ اس کے حجم میں بھی زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ زمین کے باریک نم آلود ذرّوں کے بیچ میں سے گذرتا ہوا ہندوستانیوں کی طرح مزید تاریکی کی طرف مائل ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سرے سے ذرا پیچھے تین چار باریک دھاگے اور نکلنے شروع ہو گئے اور اُنہوں نے اپنی اپنی سمت میں بڑھنا شروع کر دیا ۔۔۔ ابھی تک یہ سب خواہ مخواہ بڑھ رہے ہیں، جس طرح بچہ اپنی زندگی کے نصب العین سے بے خبر تیار شدہ غذا حاصل کر کر کے روز بروز توانا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ابھی انہیں تلاشِ غذا کی ضرورت پیش نہیں آئی ہے۔ کیونکہ اُن کے ماں باپ نے خوراک کا کافی ذخیرہ بیج کے اندر دو موٹے موٹے دالوں کی صورت میں چھوڑ دیا ہے جو اُن کی قوتِ نامیہ کا کفیل ہے۔

اِدھر جوں جوں "یہ" ہونے والی جڑ "نیچے کو بڑھتی جا رہی تھی، وہ دونوں دالے پھٹتے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جا رہے تھے تاکہ جڑ کو اور ایک اور حصۂ جسم کو بڑھنے میں رکاوٹ پیش نہ آئے۔ اور جب یہ "جڑ" کافی بڑھ چکی تو اس دوسرے حصہ نے سر نکالا۔ ذرا سا خم کھاتے ہوئے سیدھا ہوا، اور جڑ کی مخالف سمت میں بڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کلّہ تھا جو زمین کی اندھیری زندگی سے تنگ آ کر اُوپر کی طرف کو زمین پھاڑ کر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اس کا رنگ بھی زردی مائل تھا، اور حجم بھی زیادہ نہ تھا۔ دونوں، جڑ اور کلّہ ایک ہی رنگ کے تھے لیکن عادتیں مختلف، جس کا نتیجہ اختلافِ ہیئت کی صورت میں بعد میں ہوا۔

کھانے کا ذخیرہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ لیکن بیج کے پھول جانے کے سبب اُوپر کا خول پھٹتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ علیحدہ ہو کر گر پڑا اور کچھ عرصے بعد سڑ گل کر مٹی میں مل گیا۔

کلّہ لغیر رُکے اُوپر کی طرف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس نے زمین سے باہر سر نکالا۔ سُورج کی چمکتی ہوئی روشنی اس پر پڑی، اور اس کی جان میں جان آ گئی۔ اب جو سر اُٹھا کر دیکھتا ہے تو چاروں طرف کھیت کے اندر اُسی کے ہم جنس اُگتے ہوئے نظر پڑے، لیکن ہر ایک "پنج انگشت" کی طرح مختلف قد و قامت کا تھا۔ سورج کی صحت بخش روشنی سب کے اوپر نہایت عمدہ اثر کر رہی تھی۔ اور جس طرح رو بصحت مریض کے زرد کلّوں (گالوں) پر آہستہ آہستہ سُرخی آتی جاتی ہے، اسی طرح ان تمام بے رونق پودوں کے زرد کلّوں پر ہریالی نمودار ہونے لگی، جو شروع میں سب سے اوپر کے لپٹے ہوئے سرے پر جھلکی، اس کے بعد نیچے کی طرف کو بڑھنے لگی۔ یہ سبز رنگ ظاہر کر رہا تھا کہ پودوں کے اندر کلوروفِل (سبز مادّہ) پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے، جو خوراک حاصل کرنے میں پودوں کا سب سے بڑا مددگار ہے۔

تھوڑا ہی نکلنے کے بعد کلّے کے بڑھنے کی رفتار میں کمی آئی، اُس کا لپٹا ہوا سرا کھُلا اور اس میں سے شاخیں پھوٹنے لگیں۔ جو سب کی سب سبز تھیں۔ یہ شاخیں کچھ عرصے تک بڑھتی رہیں اور پھر اِن شاخوں میں، سے

چھوٹی چھوٹی پتیاں نکلیں۔ اِدھر ماں باپ کا اندوختہ ختم ہو چکا تھا۔ اَب اُسے اپنی جڑ پر صحیح معنوں میں کھڑا ہونا تھا۔ وہ اُس عیاش نوجوان کی طرح تو تھا نہیں جو باپ کی کمائی بیدردی سے پھونک دینے کے بعد در در اپنی "غیرت" اور "شرافت" کا واسطہ دلا کر بھیک مانگتا پھرے، اس کو تو ماں باپ نے خود ہی علیحدہ کر دیا تھا کہ اب یہ اپنی خوراک آپ پیدا کرے اور کھائے۔ نہ صرف نباتات بلکہ حیوانات میں بھی یہی اُصول ہے کہ بچے کو سنِ شعور تک پہونچنے کے بعد والدین نکال باہر کرتے ہیں۔ لیکن انسان کا باوا آدم ہی چونکہ نرالا ہے اِس لئے وہ اس اُصول پر کاربند ہو کر "زمرۂ حیوانات" میں، جس میں سے وہ ہزاروں برس جد و جہد کرنیکے بعد نکلا ہے، دوبارہ داخل ہونا پسند نہیں کرتا۔ اسکی اولاد تو پچیس تیس برس کی عمر تک بھی بچہ ہی ہوتی ہے جس کو "بھرنا" وہ اپنا فرض خیال کرتا ہے۔

بہرحال۔ اُسی سورما پودے نے اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے کوشش شروع کر دی۔ بدن کا ہر حصہ اس کوشش میں مصروف ہو گیا۔ تنے نے پتیوں پر پتیاں پیدا کرنی اور پھیلانی شروع کر دیں۔ اور پتیوں نے اپنی سطح والے باریک باریک سوراخ جو انسانی نگاہ سے نظر نہیں آسکتے، کھول دئے۔ تاکہ ہوا کا کارآمد جزو یعنی کاربن ڈائی آکسائڈ گیس زیادہ سے زیادہ مقدار میں اُن کے اندر آسکے۔ زمین کے اندر جڑ نے بھی اپنی شاخیں بڑھا کر مٹی کے ذروں سے چمٹنا شروع کر دیا۔ کچھ تو اس لئے کہ پودے کو گرنے سے روکیں اور کچھ اس لئے کہ خوراک حاصل کرنے میں یہ بھی مدد کریں۔ جڑ کی ہر ہر شاخ پر باریک باریک روئیں پیدا ہو گئے یہی وہ روئیں تھے جن کے ذریعے پودے کے جسم میں پانی اور پانی میں گھلے ہوئے زمین کے کارآمد معدنی اشیاء پہونچتے تھے۔ اور جب سارے اعضا اپنے اپنے استحکام سے فارغ ہو گئے تو کام شروع ہو گیا۔ پتیوں نے اپنی چھوٹے چھوٹے روزنوں کے ذریعے اپنے بدن میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس داخل کی جو کلوروفل کی موجودگی میں جڑوں کے روؤں کے ذریعے آئے ہوئے زمین کے پانی سے جا کر ملی۔ اُدھر سورج کی کرنوں سے حاصل کی ہوئی طاقت سے کلوروفل نے زور لگایا، اور پانی اور گیس مل کر ایک نئی چیز بن گئے، ایک ایسی چیز جو دنیا کے کسی سائنسداں سے آجتک لیبوریٹری (معمل) میں نہ بن سکی ـــــ پھر اس چیز نے مختلف شکلیں اختیار کیں، اور آخرکار پودے کی غذا بن گئی۔ دن بھر سورما اسی طرح غذا بھی تیار کرتا رہا، ان ہی روزنوں کے ذریعے سانس بھی لیتا رہا جس کی کہ ہم انسانوں کی طرح اُسے چوبیس گھنٹے ضرورت رہتی ہے۔ اور جڑوں کے ذریعے پانی سارے جسم میں پہونچا کر پتیوں کے ذریعے ہوا میں بھی اُڑاتا۔[۱] آخرکار سورج غروب ہو گیا۔ اور دن بھر کی تیار کی ہوئی غذا پودے کے پورے جسم میں تقسیم کر دی گئی۔ رات بھر پودے پر سکون کا عالم طاری رہا اور سوائے دو کاموں یعنی سانس لینے اور پانی کھینچنے اور ہوا میں اُڑا دینے کے سوا کوئی کام نہ ہوا۔

اب روزانہ کا یہی معمول ہو گیا۔ ایک جگہ سے پانی اور خوراک حاصل کر کے جہاں جڑوں نے کسی چیز کی قلت محسوس کی وہ فوراً اس جگہ کو چھوڑ کر اور آگے بڑھ گئیں۔ اور پودے کی حالت دن بدن بہتر ہوتی گئی۔ لیکن سورما کو قطعی معلوم نہ تھا کہ اُسکے اس تنازع للبقا سے قدرت کو کیا منظور ہے۔ وہ زندہ تھا اور زندہ رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور بس۔

جسم کی ظاہری ساخت جدا، رنگ مختلف، سفر کی سمتیں علیحدہ، کام ایک دوسرے کی ضد، لیکن جڑ اور تنے کا مقصد صرف ایک ـــــ اپنی نباتاتی رُوح کو زندہ رکھنا، اسکے لئے خوراک مہیا کرنا ـــــ کاش ہندوستانی بھی اس کو سمجھ سکتے!

(۳)

پانی وافر تھا اور غذا بھی کھادوں کی عنایت سے کافی۔ چند دنوں بعد تو سورما کی صورت ہی بدل گئی۔ کہاں وہ چھوٹا سا زمین سے چمٹا ہوا چھتری کی مانند ہلکے سبز رنگ کا مریل سا کلہ، اور کہاں اب گہرے سبز لباس میں ملبوس تندرست و توانا، دس بارہ تنے والا ہرا بھرا لہلہاتا گیارہ انچ اونچا پودا، دوسرے پودوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور اب زمیندار صاحب خوشی خوشی اور "بابوجی" فخریہ تاروں کے جنگلے سے گھرے ہوئے کھیتوں کو دیکھتے دکھاتے پھرتے، اور دونوں اپنے دل میں باغ باغ ہوتے۔ زمیندار صاحب اس لئے کہ اُنہوں نے کبھی ایسی گھنی اور عمدہ پیداوار نہیں دیکھی تھی اور اسکو دیکھکر کثیر منافع کی اُمید کے ساتھ ساتھ گاؤں والوں کا بھی خیال آتا تھا کہ وہ بھی اس کو دیکھکر اپنے یہاں اسی طرح کی کاشت کریں گے اور پھر اُن کی پیداوار بھی زمیندار صاحب کو نہال کر دیگی اور بابوجی اس لئے کہ محنت ٹھکانے لگی اور رضا الصاحب کے سامنے سرخروئی نصیب ہوئی اور اب، وہ خوش ہو کر ان کو اپنے ہاں کا مختار [illegible] بنا دیں گے، اور کیا عجب ہے بعد میں اپنا شریک بھی بنالیں۔ یا کم از کم بہترین سرٹیفکٹ عطا کر کے کسی دوسری جگہ ملازمت کے حصول میں آسانی پیدا ہونیکا سبب بنیں۔

اس عرصہ میں، جبکہ یہ پودے چھوٹے ہی تھے، اُنکے دو دشمنوں نے اُنہیں تھوڑی سی تکلیف پہونچائی تھی۔ ایک تو کھیت کے اندر گھاسوں نے اُگنا شروع کر دیا۔ اور اُن کی نشوونما میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش

[۱] اس کام کو Transpiration کہتے ہیں اس سے پودے کا درجہ حرارت حسب ضرورت گھٹ بڑھ سکتا ہے اور اسکے علاوہ اور بھی کئی فائدے ہیں۔

کرتے ہوئے اُن کے لئے وقف شدہ زمین کی خوراک بھی حاصل کرنے لگیں۔ لیکن زمیندار صاحب کے مزدوروں کی کھرپیوں نے اُن کا قلع قمع کرکے خود انہیں کو فصل کی خوراک بنا دیا وہ گل سڑ کر خاک میں مل گئیں اور جتنا کھایا تھا وہ سب کا سب پھر کھیت میں مل کر پودوں کے کام آگیا۔ اسکے بعد جب یہ پودے خوب بڑھ گئے تو پھر یہ گھاس نہ اُگ سکیں کیونکہ فصل اس قدر گنجان ہوگئی کہ اُنکے نیچے بلکہ کی قلت کے علاوہ اندھیرا ہو جانے کے سبب کسی پودے کی نشو و نما بھی، جو اُن کے نیچے اُگنے کی کوشش کرنے محال ہوگئی۔

دوسرا دشمن گاؤں کے بچے تھے جو رکھوالے کی آنکھ بچا کر، تار کو پھاند کر یا اُس کے نیچے سے بیٹھ کر کھیت میں گھس جاتے اور نئی کونپلیں توڑ کر کھانے لگتے، جس سے پودوں کو سخت تکلیف ہوتی، لیکن ان کی تکلیف کون محسوس کر سکتا، صبر کرکے خاموش کھڑے رہتے، اور جب حملہ ہو چکتا اور رکھوالے کے ڈنڈے کو قریب آتا دیکھکر بچے اِدھر اُدھر بھاگتے اور پلٹے جاتے تو یہ پودے تلافی مافات کے طور پر پہلے سے زیادہ کونپلیں نکالنے کی کوشش کرتے۔ اور اس طرح اُن کے نشو و نما کے حق میں یہ حملہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ عارضی تکلیف ہو چکنے کے بعد ایک کے بدلے دو دو، کلّے اور پھوٹنے لگتے۔ لیکن جب یہ پودے بڑھ گئے اور اُن میں پتیاں بھی کافی نکل آئیں تو اُن کی طرف نہ آیا۔ کیونکہ موجودہ حالت میں ان پر صرف مویشیوں اور جنگلی جانوروں کی رال ٹپک سکتی تھی، اور انکو روکنے کیلئے تار کا جنگلہ کافی مضبوط تھا۔

اب سخت جاڑے آپہونچے تھے۔ جس کے سبب پودوں کو رات کے وقت تکلیف بھی ہوتی تھی، اور پانی کی مقدار میں بھی کمی ہوتی جارہی تھی۔ پانی سب زمین کی نچلی تہوں میں تھا۔ جہاں تک جڑیں نہیں پہونچ سکتی تھیں۔ اُوپر کی تہ میں جو پانی تھا اُس کو فصل نہایت کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کر رہی تھی۔ پتیوں کے ذریعے پانی کو ہوا میں اُڑا دینا بھی کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اوّل تو اس لئے کہ پانی کم ہوتا جارہا تھا، دوسرے اس لئے کہ زیادہ پانی سے بدن میں ٹھنڈک محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اب گرمی کی ضرورت تھی۔ ادھر گنجان ہو جانے کے سبب وہ پتیاں اور تنے جو سُورج کی شعاعوں سے محروم ہو جاتے تھے، زرد پڑتے جارہے تھے۔ بہت سی پتیاں گر بھی پڑی تھیں۔ اور جو جو اُوپر کی طرف تعداد میں پتیاں بڑھتی جارہی تھیں، نیچے کی پتیاں آہستہ آہستہ زرد پڑتے پڑتے گر رہی تھیں۔ پودے بے حس و حرکت چُپ چاپ کھڑے خاموشی اور سستی سے تند میں بڑھ رہے تھے کہ ایک رات پالا گرا۔ جس سے ان کو بہت تکلیف ہوتی۔ لیکن چنا سخت جان ہوتا ہے، سردی جھیل جاتا ہے۔ اسلئے جب سورج نکلا تو سوائے کھیت کے وسط میں اُگے ہوئے چند پودوں کے جو زمین کی طرف جھک گئے تھے، کوئی خاص بات نہ دیکھی گئی۔ سُورما بھی بدستور اکڑا کھڑا رہا۔ گو سردی نے جان پر بنا دی تھی اور ٹھنڈا پانی اور بھی غضب ڈھاتا تھا لیکن سورج کی گرمی پہونچی کہ اس کی حالت دُرست ہوگئی اور رفتہ رفتہ طاقت عود کر آئی۔

سردیاں اس لئے اور بھی زیادہ اثر کرتی تھیں کہ پانی کی قلّت کے سبب زمین سے خوراک آنی کم ہوگئی تھی اور اس کی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی تھی۔ اور کمزور کو ستانا قدرت کی ہر چیز اور ہر قوت کا اُصول رہا ہے۔ لیکن اسی طرح کافی عرصہ گذر جانے کے بعد ایک صبح آسمان پر بادل اُمنڈ آئے اور تھوڑی دیر میں زبردست کڑک اور چمک کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ جو کافی دیر تک ہوتی رہی۔ انہیں جاوٹوں کے انتظار میں بابوجی نے اب تک کھیتوں کو پانی نہیں دلوایا تھا۔ پچھلے نومبر کی آخری تاریخوں میں ہلکی سی آبپاشی ہوئی تھی اور اب جو فروری کے زمانے میں دُھواں دھار بارش ہوئی تو اُس نے فصلوں کیلئے اکسیر کا کام کیا، اور سردی کا زور ٹوٹتا نظر آیا۔ ادھر جنوری کے گذر جانے سے جاڑے کم بھی ہو چلے تھے۔ خوراک کی فراوانی نے پودوں کو چونچال بنا دیا۔ دو ایک پانی اور برسے کہ فصلوں کے لئے عید ہوگئی۔ اور اب سردی گھٹی اور طاقت بڑھی تو دُور کی سُوجھی ـــ پودوں کو نہیں قدرت کو ـــ اور اب پودوں کے اصل مقصدِ زندگی کا وقت آگیا۔

اُوپر کی کونپلوں میں بجائے پتیوں کے کاسنی اور ہلکے گلابی مائل سفید پھول کھلنے شروع ہوئے، اور جب تناسل کے قابل ہوگئے تو چھوٹے چھوٹے پتنگوں کے ذریعے ایک پودا اپنا زرد زرد مادّۂ تولید دوسرے پودوں کو بھیجنے لگا۔ یہ خاک کی مانند زرد ذرّے پھولوں کے مادہ اعضا پر جا جا کر گرتے اور نشو و نما پانے لگے۔ بہت سے ذرّے ضائع بھی ہوئے تاہم ہر پھول کے اندر ایک دوسرے کا ذرہ پہونچ گیا۔ اور شکمِ مادر میں رکھے ہوئے ننھے منھے دانوں نے اِن ذرّوں سے اتّصال حاصل کرکے بڑھنا شروع کیا۔ یہی دانے بعد میں جا کر چنے کے بیج ہوگئے جو ایک ایک پودے کے اندر سینکڑوں کی تعداد میں قطار در قطار چھلکوں میں ملفوف لٹکتے دکھائی دینے لگے۔ ایک پودے کے اندر ہر پھول اپنا کام کرکے مُرجھا جاتا اور دوسرا اس کے بدلے نکل آتا ـــ ہندوستان کے باشندے ہوں یا امریکہ کے، نباتات میں عام قاعدہ ہے کہ اپنی ہی ذات میں بیاہ شادی نہیں کرتے، بلکہ "بین الاقوامی" قسم کا رشتہ حاصل

کرنے کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتے کہ ایک پودے کا زیرہ اُسی پودے کے کسی دوسرے ہی پھول کے مادہ زیرے سے تعلق پیدا کرے۔ ہمیشہ دُور کے پودے سے رشتہ کرتے ہیں۔ حیوانات کا بھی قریب قریب یہی حال ہے۔ لیکن انسان کی تہذیب اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے خاندان ہی سے باہر یہ تعلق پیدا کرکے "غیر مہذب" حیوانات میں شامل ہوجائے!

ابھی یہ بیج سبز ہی تھے کہ ان کے دُو دشمن پھر پیدا ہوگئے۔ ایک تو وہی دہقانی لونڈے، جو پہلے اگرہ ساگ" کھانے آتے تھے تو اب بونٹ چرنا اُن کا مشغلہ ہوگیا۔ دوسرا دُشمن وہ بھورے مٹیالے رنگ کا کیڑا جو زمین کے اندر سوراخوں میں رہ کر رات کے وقت چنے کے تنے کاٹ کاٹ کر لے جاتا ہے، اور دن بھر اپنے سُوراخ میں بیٹھکر کھاتا اور برباد کرتا ہے۔ اِن دونوں دُشمنوں سے پودوں کو سخت تکلیف پہونچی۔ خود سُورما بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ رات کے وقت سکون کے عالم میں جس وقت کیڑا اُس کا تنا کاٹنے لگا تو اُس کے تمام اعضا میں تشنج پیدا ہونے لگا۔ اور جسم کے ایک حصہ کے کٹ جانے پر جو اذیت اُسے پہونچی اس کو وہ چیخ کر یا رو کر ظاہر نہ کرسکا۔ بلکہ جس جگہ سے وہ تنا کٹ گیا تھا اُسی مقام پر اندر سے ایک رس نکلنے لگا۔ یہی تکلیف کا اظہار تھا۔ لیکن کسی نے اُسے نہ دیکھا اور دیکھتا بھی تو تکلیف کا اندازہ نہ لگا سکتا۔ اسی رس سے آہستہ آہستہ زخم مندمل ہونے لگا ہی لگا تھا کہ دوسرے دن دوسرے غنیم کا حملہ ہوا، جو بے تحاشہ پودوں کو روندتا کھیت میں گھس گیا۔ بچّوں نے ہولوں کو چٹکی سے ٹٹولا۔ جو ہولا "بیج" سے پھوٹ جاتا اُس کو چھوڑ دیتے اور جو سالم رہتا اس کو اندر کے موٹے موٹے دانوں کے لالچ میں بلاتکلّف کھسوٹ لیتے۔ دونوں باتوں سے پودوں کو بہت اذیت پہونچی۔ رات کے زخم ابھی نہ بھرے تھے کہ یہ چرکے اور لگنے لگے۔ لیکن مجبور تھے۔ نہ اپنی جگہ سے حرکت کرسکتے تھے نہ چیخ کر اُن کو باز رکھ سکتے تھے۔ خاموشی کے ساتھ جھٹکے اور جھنجوڑیاں کھاتے اور خُون (رس) بہاتے گئے۔ صرف وہ خوش قسمت پودے جو کھیت کے دوسرے کنارے پر درمیان میں تھے، اس "لوٹا کھسوٹی" سے محفوظ رہے۔ بہزار دقت جب رکھوالے کی نظر پڑی تو انکی جان چھوٹی۔ اب شبخون مارنے والے دُشمن کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لیکن کچھ اتفاق کی بات کہ بابوجی مغرب کے وقت ٹہلتے ہوئے کھیت کی طرف سے گزرے، اس وقت کیڑوں کے نکلنے کا وقت آگیا تھا بلکہ دُو ایک نکل بھی پڑے تھے۔ بابوجی نے جو موٹے موٹے ہولوں کے خوشے لٹکتے دیکھے تو اُن کا دل بھی للچانے لگا۔ اور کھیت کے اندر جاکر ہولے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

لیکن ایک پودے میں سے توڑ چکنے کے بعد اگلے کو جو سیدھا کیا تو زرد زرد شاخوں کے درمیان کیڑے کو شاخ سے چپٹا دیکھکر "ارے!" کہہ کر ٹھٹک سے گئے: "یہ تو کَٹ وَرم (Cut-worm) معلوم ہوتا ہے ــــ تو اس میں بھی کیڑا لگ گیا!" یہ کہکر وہ شاخ توڑ لی جس پر کیڑا بیٹھا ہوا تھا، کھیت کے باہر اُسے دیکھتے ہوئے نکلے، اور اطمینان کرتے ہوئے آپ ہی آپ کہنے لگے: "ہاں کَٹ وَرم ہی ہے... کٹ وَرم ہی ہے... مگر میں نے تو...." اور پھر وہ حیرت سے سوچنے لگے کہ یہ کیونکر لگ گیا جبکہ اُنہوں نے بونے سے پہلے ہی اس کا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کھیت کے تمام سُوراخ کھدوا ڈالے تھے۔ بہرحال معاملہ سنگین ہوگیا تھا فوراً سیدھے زمیندار صاحب کے پاس گئے اور صورتِ حالات سے اُنہیں مطلع کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے۔ سب معاملہ ٹھیک ہوجائے گا۔ کیڑوں کو زہر سے ہلاک کیا جائے گا! چنانچہ بابوجی کی ہدایتوں کے مطابق زہر تیار ہوا، اور پودوں پر اور اُن کے آس پاس چھڑکا گیا۔ اور اُس دن آخری مرتبہ کیڑے اور آئے۔ لیکن اسکے بعد پودوں نے محسوس کیا کہ اُن کا آنا بند ہوگیا۔ اور پھر وہ کبھی نہ آئے۔ اس طرح نقصانِ کثیر سے پودے اور خانصاحب دونوں بچ گئے۔

اُدھر گیہوں کی فصل بھی نہایت عمدہ ہو رہی تھی، جس سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن ان فصلوں کی روز افزوں ترقی کو دیکھکر گاؤں کے دیہاتی حیران ہو رہے تھے۔ وہ کبھی اتنی اچھی فصل کی اُمید نہیں رکھتے تھے۔ اور اب وہ روز بروز اس کے خواہشمند ہوتے جارہے تھے کہ کوئی ناگہانی حادثہ ایسا درپیش ہوجائے جس سے یہ فصلیں تباہ ہوجائیں تاکہ اُنہیں بابوجی کا مذاق اُڑانے کا موقع ملے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیڑوں سے کوئی خاص نقصان معلوم ہی نہیں ہوا۔ اور اب وہ بظاہر تاویلیں کرکرکے ایک دوسرے کو بہلانے لگے کہ یہ تو دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ پیداوار خاک بھی نہ ہوگی، یا ہوئی، تو جتنا خرچ ہوا ہے اس کا آدھا بھی نہ وصول ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دل میں وہ کچھ کچھ قائل ہوتے جارہے تھے۔ اور کبھی کبھی اُن کے دل میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر وہ بابوجی کے کہنے کے مطابق کاشت کرنے لگیں تو شاید بہتر ہی ہو۔

ــــــــ ٭٭٭ ــــــــ

مارچ کا قریباً وسط تھا اور خاں صاحب کی فصلوں کا شباب کہ ایک دن تیسرے پہر کے وقت خاں صاحب کے پیر و مرشد دورہ کرتے ہوئے چترپور بھی اُتر آئے۔ اُن کا دورہ اپنے زمیندار مُریدوں کے ہاں اپریل اور مئی کے درمیان ہوتا تھا۔ کیونکہ یہی وقت ربیع کی فصلوں کی کٹائی

اور مالگذاری کی وصولیابی کا ہوتا ہے۔ لیکن ایکی بار کچھ پہلے اس سے آگئے کہ خانصاحب کے ہاں خاص طور پر کچھ دن قیام کرنا تھا۔ بقول اُن کے "شہر کی کثیف فضا سے بچنے کے لئے کچھ دن دیہات میں بسر کرنے کا ارادہ" تھا۔ آپ کے مُریدوں کو ارمان تھا کہ کبھی ایک دو دن سے زائد کسی کے ہاں ٹھہر جائیں۔ لیکن آپ کے مُرید بہت سے تھے، اور ہر ایک کے یہاں نہیں تو زیادہ تر کے ہاں جانا ضروری تھا۔ لوگ زیادہ تھے اور وقت قلیل۔ لہذا یہ کبھی نہ ہو سکا کہ پیر صاحب کہیں جم کر ایک ہفتہ ہی گذار دیں۔ اب جو خاں صاحب کے ہاں کافی عرصہ کے قیام کے لئے آپ کا آنا ہوا تو خانصاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ سر آنکھوں پر شاہ صاحب کو جگہ دی۔ جلد جلد مکان کے مردانے میں صفائی ہونے لگی۔ فرش، قالین اور گاؤ تکیہ سے دیہات کی مَیلی "گَرد آلود" زمین کو سجایا گیا۔ چپکے سے تاشوں کی گڈی اور چوسر کی بساط باہر سے اٹھوا کر اندر پہنچوائی گئیں۔ سونے کا کمرہ الگ مخصوص کیا گیا۔ اجلا بستر نواڑ کی چارپائی پر (جو یہاں پر ایک ہی تھی۔ اور جس پر خود خاں صاحب سوتے تھے،) بچھا کر رکھا گیا۔ غرضکہ چاروں طرف ایک ہلچل مچی اور پھر سکون ہو گیا۔ چونکہ پیر صاحب زراہ لطف اطلاع کئے بغیر تشریف لائے تھے اس لئے تیاری پہلے سے نہ ہو سکی ورنہ اس سے قبل جب کبھی شاہ صاحب آئے، اسٹیشن پر اپنے استقبال کیلئے خانصاحب اور اُن کے متعلقین کو کھڑے پایا۔ گویا گھر کے انتظام کی طرف سے مطمئن ہو کر آئے ہیں۔

کھانے کے واسطے گاؤں میں مختلف آرڈر دئے گئے۔ مُرغی، انڈا، چاول، غرض بہت سے تکلفات منگائے گئے اور "باورچی" سے کہا گیا کہ کھیت میں سے تھوڑے سے بُونٹ تُڑوا کر بھیجدو۔ بونٹ پلاؤ کے واسطے منٹوں میں اس کی تعمیل ہوئی اور بیسیوں پودے جن میں ہمارا سُورما بھی تھا، چند بیدرد ہاتھوں کے ذریعے ایک بنڈل میں بندھے ہوئے باورچی خانہ میں پہونچ گئے۔ مارے تکلیف کے اُن کی جانیں نکل جارہی تھیں، وہ گہرا سبز رنگ اب ہلکا پڑتا جا رہا تھا۔ گو جڑوں میں تھوڑی سی مٹی اب بھی لگی ہوئی تھی لیکن اب وہ کیا کام دے سکتی تھی۔ بہت سی جڑوں کی شاخیں ٹوٹ کر کھیت ہی میں رہ گئی تھیں جہاں وہ کچھ ہی عرصے میں سوکھ کر خاک میں مل جائیں گی۔ اور کھیت کے باقی پودے اپریل تک وہیں چھوڑ دئے جائیں گے جبکہ اُن کے بیج پک جائیں گے۔ اس وقت نادر شاہی قتل عام ہوگا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی عمر ختم کر چکے ہوں گے، انہیں اتنی تکلیف ہرگز نہ ہوگی جتنی اِن چند سبز نوجوانوں کو ہو رہی ہے۔

کمزور اور لاغر باورچی نے، جس کی آنکھیں مسلسل خانصاحب کیلئے پانچ چھ سال تک کھانا پکاتے پکاتے چندھیا گئی تھیں اور چہرہ آگ کے سامنے بیٹھتے بیٹھتے جھلس گیا تھا، دو ایک اور بیگاریوں کی مدد سے چھلکے الگ کر کے ہرے ہرے چنے کے دانے ایک کونڈے میں جمع کئے۔ چھلکے اور ڈنٹھل باورچی خانہ سے کچھ فاصلے پر بندھی ہوئی گائے کے آگے ڈالدئے، جس نے پتیاں اور نرم شاخیں کھالیں، اور جڑیں اور سخت ڈنٹھل چھوڑ دئے۔ جو آپ سسک سسک کر یکے بعد دیگرے مرنے لگے۔

اور چیزوں کے ساتھ بونٹ پلاؤ بھی پکا۔ دانے ابھی زندہ تھے۔ چولھے کی تیز آنچ سے تلملا گئے۔ اپنے بدن سے برقی رو خارج کی[1]، تاکہ جلانے والا بھی ٹھنڈا نہ رہ سکے۔ یہ تھا نباتاتی ردِّ عمل کیونکہ ع۔

چوٹ کھا کر کوئی بےحِس بھی تو خاموش نہیں!

لیکن ان کا ردِّ عمل بےسُود ثابت ہوا۔ اگر وہ ایک قطار میں ہوتے تو ایک متحدہ کرنٹ باورچی کو ہلاک کر سکتا تھا۔ لیکن اس میں تو کوئی کہیں تھا کوئی کہیں۔

رات کو حضرت شاہ صاحب قبلہ کے ساتھ مؤدّب خانصاحب اور اُنکے بےفکر، بےروزگار، اکلوتے صاحبزادے جنہوں نے تین مرتبہ انٹرنس میں فیل ہو کر پڑھائی کو خیرباد کہہ دیا تھا، دسترخوان کے گرد بیٹھے۔

سُورما کے سینکڑوں مُردہ بچوں میں سے، جو کٹ وَرم یا دیہاتی بچوں کے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچے تھے، زیادہ تر شاہ صاحب کے شکم کے نذر ہوئے، کچھ خانصاحب کے پیٹ میں گئے اور چند کو اُن کے فیشن ایبل صاحبزادے نے ہضم کیا۔ باقی یا تو ضائع ہوئے، پاؤں تلے کچلے گئے یا نوکروں وغیرہ نے کھائے۔ اور جس مقصد کیلئے وجود میں آئے تھے وہ ہرگز پورا نہ کر سکے۔

شاہ صاحب نے بعد انفراغِ طعام ہاتھ دھو کر خلال کیا، خضاب سے رنگی ہوئی ڈاڑھی کو سنوارا، پٹھوں پر ہاتھ پھیرا، اور پھر نیم دراز ہو کر توند سہلاتے ہوئے ایک ڈکار لی "عوآم .... الحمدللہ" اور پھر دو تین منٹ بعد خلال کرتے ہوئے ایک اور "آعوآم .... الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وکفانا وجعلنا من المسلمین" کہنے کے بعد پُر تکلّف خاصدان میں سے پان لیکر چباتے ہوئے کھانوں کی عمدگی پر روشنی ڈالنے لگے "بھئی بُونٹ پلاؤ بڑے مزے کا تھا... چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا... اور چیزیں بھی بہت

[1] سر جے، سی، بوس کے تجربوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بیج گرم کئے جانے پر برقی کرنٹ خارج کرتا ہے، خاص طور پر مٹر کے بیج۔ اُنکا دعوی تھا کہ اگر پانسو مٹر کے دانے ایک قطار میں رکھکر گرم کئے جائیں تو اُن میں سے خارج شدہ کرنٹ ایک تندرست جوان آدمی کو ہلاک کر سکتا ہے۔

اچھی تھیں مگر پلاؤ بہت ہی اچھا تھا...؟ خانصاحب نے دانت نکال کر اپنی مسکینی ظاہر کی اور دل میں خوش ہوگئے۔

اور پھر اُسوقت جبکہ عبادت گذار مخدوم و مکرم جناب شاہ صاحب نمازِ عشا اور تسبیح سے فارغ ہوکر اطمینان سے مقوی اور لذیذ غذاؤں کے نشے میں خراٹے بلند کر رہے تھے، اور اُن کا معدہ اور آنتیں خدا کا شکر ادا کرتے ہوتے اس غذا کو ہضم کر رہے تھے، تو ٹھیک اسی وقت بہت دُور — سینکڑوں میل کے فاصلے پر، ایک بڑے بارونق کاروباری شہر میں، جہاں رات کے وقت بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے، اور چہل پہل برپا تھی، ایک کمزور، ضعیف العمر، نحیف و زار انسان دو وقت کے فاقے سے نڈھال پڑا اپنی خستہ حال گدڑی میں سُرسُر کرتا ہوا کراہ رہا تھا۔ اسکے اُلجھے اور ماتھے پر پڑے ہوئے گرد آلود کھچڑی بال، اس کے بڑھاپے کے مارے سیاہی مائل گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، اُسکے ناتواں ہاتھ پیر، اسکے بدن کی بے شمار نمایاں نیلی رگیں، اس کا اندر کو دھنسا ہوا پیٹ، اسکا فاقے سے نڈھال جسم چند چیتھڑوں میں لپٹا ہوا۔ یہ سب چیزیں اسکی انتہائی فلاکت زدہ حالت پر دلالت کر رہی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اگر کبھی فطرت کے خلاف مظلوموں اور غریبوں نے بغاوت کی، تو باغیوں کا سرگروہ یہی ہوگا۔ لیکن نہیں۔ یہ شخص اب بھی صابر و قانع ہے۔ موجودہ حالت کو اپنے ہی اعمالِ بد کا صلہ سمجھ رہا ہے۔ اُسے بھوک سے زیادہ یہ احساس ستا رہا ہے کہ اس نے بہت ہی گناہ کئے ہیں۔ وہ اپنی نجات پانے کے لئے دل سے اور کبھی کبھی زبان سے خداوند قدوس کا شکر بھی ادا کرتا جا رہا ہے۔ اور اس کے بے پایاں رحم و کرم کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی مغفرت کی دُعا مانگ رہا ہے۔

کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ گمنام انسان شاہ صاحب قبلہ کا وہ سگا بھائی ہے جس کو شاہ صاحب نے اب سے تیس سال قبل اِن حالوں کو پہونچایا، صرف تھوڑے سے دُنیاوی ترکہ کی خاطر، اور جو اب کمزور ہو جانے کے سبب مزدوری سے بھی معذور ہے!

جناب شاہ صاحب قبلہ کے حلق نے بے فکری کے خراٹوں کی صدا بلند کی: "خاں... خوں... خررر..."

اور ادھر اس غریب شخص کے خالی اور سکڑے ہوئے معدے نے گڑگڑا کر خداوند تعالیٰ کے حضور میں شکوہ کیا کہ:-

"دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دُشمناں نظر داری!!"

امان اللہ خاں

خُدا سے!

براتوں میں بجتے ہوئے ڈھول تاشے
جنازوں کے ہمراہ اقارب کے نالے
یہ کیا سُن رہا ہوں!

حسیں محفلوں میں سُریلی صدائیں
مُصیبت کے ماروں کی پُر درد آہیں
یہ کیا سُن رہا ہوں!

بھری توند میں سے نکلتی ڈکاریں
فلاکت زدہ، فاقہ کش کی کراہیں
یہ کیا سُن رہا ہوں!

فتح کی تکبّر سے لبریز باتیں
ہزیمت کے لب پر سسکتی دُعائیں
یہ کیا سُن رہا ہوں!

حسیں قہقہوں میں ترنّم کی موجیں
غم انگیز نالوں میں لرزاں اُمیدیں
یہ کیا سُن رہا ہوں!

جوانی کی شیریں، دل آویز باتیں
بڑھاپے کی مدقوق، لاچار سانسیں
یہ کیا سُن رہا ہوں!

عبدالجلیل دہلوی؛

پریتم، میری رُوح کی تسکین!

آج میرے گھر عید ہے۔ رسمی عید نہیں۔ وہ تو کل ہوگی، اور مجھے اس سے سروکار ہی کیا۔ میری عید تو آج ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے تمہارا پیارا خط ملا ہے۔ میں اسے پڑھکر فرطِ مسرّت سے بیتاب ہوگئی ہوں۔ یاس کے بھیانک اندھیرے میں یہ اُمید کی ایک دُھندلی سی کرن ہے۔ پھر بھی کتنی رُوح پرور ہے۔ نامراد زندگی کی تلخیاں سہنے کے لئے دل پھر ایک بار خوشی سے آمادہ ہوگیا ہے۔

پیارے، تمہارے اس خط کے انتظار نے مجھے بہت تکلیف دی۔ دو مہینے تک برابر راہ دیکھتی رہی۔ اب تو جی کچھ نراس ہو چلا تھا۔ ہر وقت تمہارا یہ شعر وردِ زبان تھا۔

نہ پوچھو زندگی کی تلخیاں، اب تو یہ حسرت ہے
مری آسانیاں کوئی بدل لے اپنی مشکل سے

تم کہتے ہو میں تمہارے اشعار اس لئے پسند کرتی ہوں کہ تم مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو اور محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے۔ مگر میں پوچھتی ہوں کہ اِن جواہر پاروں کو کون پسند نہ کرے گا۔ ذرا مجھے بتاؤ تو کوئی دوسرا بھی ایسے دل دوز اشعار کہتا ہے؟ کوئی اور بھی اس طرح کاغذ پر اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتا ہے؟ اور میں تو جس وقت تمہارے اشعار پڑھتی ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خود میری اپنی رُوح بول رہی ہے۔ مجھے تو اِن آئینوں میں اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔

میں اگر اپنے جذبات کی ترجمانی پر تمہاری طرح قادر ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ دُنیا میرے اور تمہارے اشعار میں کبھی امتیاز نہ کر سکتی۔ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ تم نے کہا تھا: "رضیہ، میری اور تمہاری تحریریں جب کوئی دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ دونوں ایک ہی قلم سے نکلی ہیں۔" پیارے، میری رُوح بلکہ میری کل ہستی کچھ اس طرح تمہارے اندر جذب ہوگئی ہے کہ اب میرا اور تمہارا احساس بالکل ایک ہے۔ درحقیقت یہی وجہ ہے کہ تمہارے اشعار سُنکر میں تڑپ اُٹھتی ہوں، جھُومنے لگتی ہوں، بیخود ہو جاتی ہوں اور تمہارے سوا دُنیا کی ہر چیز کو بھول جاتی ہوں حتیٰ کہ خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ آہ کس قیامت کا یہ شعر تم نے کہہ دیا ہے۔

یہ عالم ہے مری ہستی کا جیسے کوئی کشتی
کنارے تک اگر پہونچے تو ٹکرا کر کھائے ساحل کی

تم کہو گے یہ تمہاری آپ بیتی ہے اور میں کہتی ہوں یہ میری رُوداد زندگی ہے۔ کتنی بار آبِ حیات کا پیالہ میرے ہونٹوں تک آکر چھن گیا ہے۔ کتنی آرزوئیں، اُمیدیں بن بن کر یاس کی گود میں جا سوئی ہیں۔ ہائے اپنی کس کس نامرادی کو یاد کروں، کس کس ناکامی کا رونا روؤں۔ شکستوں کا ایک نامتناہی سلسلہ ہے جو خیال کی حدوں سے بھی باہر تک پھیلا ہوا ہے۔

کیوں پیارے کیا تمہارا خیال تھا کہ تم سے چھوٹ کر، تم سے دور رہ کر تمہاری یہ نامُراد کنیز تمہیں بھول جائے گی؟ ہاں، شاید دُنیا میں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جہاں انسان نظر سے دُور ہوا دل سے بھی دُور ہوگیا۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس غرض مندی کے دَور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف محبت ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ ایسی محبت جو نہ مستقل جدائی سے مٹتی ہے نہ ہزاروں کوس کی دُوری سے۔ نہ پیہم یاس اُسے فنا کر سکتی ہے نہ ابدی نامرادی۔

مجھ سا حرماں نصیب دُنیا میں کون ہوگا جس کی ساری زندگی آرزو ہی آرزو میں گذر گئی۔ جس طرح ماضی تاریک ہے۔ مگر اس کے باوجود جب میں یہ سوچتی ہوں کہ قدرت نے مجھے اُس دیوتا کا پرستار بنایا ہے جس کی محبت سمندروں کی طرح اتھاہ ہے۔ جو دُوری، جدائی اور مایوسی کے باوجود شدید تر ہوتی جاتی ہے، تو اپنے کو خوش قسمت سمجھنے لگتی ہوں۔ تم نے لکھا ہے۔

مٹا دیتی ہے دُوری نقشِ الفت کو مگر یہ کیا
کہ جب سے دُور ہو تم، اور بھی نزدیک ہو دل سے

مجھے یقین ہے، تم سچ کہتے ہو۔ کیا تم باور کروگے کہ تمہاری نامراد پرستار کا بھی یہی عالم ہے۔ دُوری نے شدّتِ احساس کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ تمہارا یہ شعر میرے جذبات کا صحیح ترجمان ہے۔ کل سے سینکڑوں دفعہ اُسے پڑھ چکی ہوں مگر کسی طرح سیری نہیں ہوتی۔

کبھی کبھی اپنے شہر کے ریڈیو اسٹیشن سے بولا کرتی ہوں مگر اتنا موقع نہیں ملتا کہ پہلے سے تمہیں اسکی اطلاع دیدیا کروں۔ اچھا پیارے اب اجازت دو۔ دو مہینے کیلئے تم سے رُخصت ہوتی ہوں مفصّل خط فروری سے پہلے نہیں لکھ سکتی۔ ہائے میری مجبوریاں ـــــ کامرانی کی ہزاروں دعائیں، ہزاروں تمنّائیں، اور اتنا پیار کہ تمہارے دل کی تمام گنجائشوں میں سما جائے۔ خدا حافظ۔

تمہاری، دُور اُفتادہ رضیہ

"تو کچھ ہو جائے سُننا ہو گا رازِ زندگی میرا"

(میری زندگی سے متعلق ایک واقعہ)

(سُورج کی سُنہری کرنوں کا بوسہ یا شباب آسا اُمنگوں کا اضطراب یکسر بے حجاب اور معصوم ہوتا ہے! مگر اِن کا کیف بالکل اتنا ہی ہوتا ہے جتنا شراب کے شبنمی قطروں کا خوشۂ انگور میں! لیکن انگور کی شراب کا کیف بالغ نظری اور بیداریِ احساس کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور یہی ساعت محبت کا رنگین ترین لمحہ ہوتی ہے، مگر یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جب سوسائٹی اور سماج کے مفلوج دماغ اور مبروص قلب محبت کی بارگاہ تک پہونچ جانے والے راستے میں خودغرضی اور انانیت کے کانٹے بچھا دیتے ہیں!

یہ زندگی کا وہ دور ہے جب محبت ہو تو غیر دانستہ طور پر کیجاتی ہے مگر مستقبل میں سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے، دل و دماغ برسرِ پیکار رہتے ہیں! سماج کی بنائی ہوئی آہنی زنجیریں دماغ کو پابہ جولاں لے جانا چاہتی ہیں اور محبت کی سرمستی دل کو ہر فطری اور غیر فطری قانون کے توڑ دینے پر مجبور کرتی ہے۔ محبت کا پیاسا وَلا تشرک کی گذرگاہوں پر ربِّ اَرِنی چلاتا پھرتا ہے اور سماج اپنے ماضیِ شباب سے بے نیاز ہو کر اُسے موردِ دار و رسن گردان دیتا ہے اور یہیں محبت کی یکسر قہقہہ مسرت تمثیل کو خوفناک المیہ بنا کر ختم کر دیا جاتا ہے!) فاعتبرو!

("ل، م" کے نام)

جھکی نظریں، پریشانی نمایاں، باادب ہو کر
تری عظمت سے تھرّایا ہوا تھا قلب شاعر کا
مگر تیری نگاہوں نے نہ جانے کیا کہا مجھ سے
خدا تھا میں سکھایا مجھ کو درسِ بندگی تو نے

میں آیا تھا تری دُنیا میں اپنی شاعری کھو کر
تری شوکت سے گھبرایا ہوا تھا قلب شاعر کا
میں جو بھی ساتھ لایا تھا وہ سب کچھ لے لیا مجھ سے
مری تاریک دُنیا کو عطا کی روشنی تو نے!

بڑی حسرت سے تُو نے میرے دل کا ساز چھیڑا تھا
جو نغمہ رُوحِ سازِ سرمدی میں بھی نہیں ملتا
جسے افلاک پر زہرا کبھی بھی گا نہیں سکتی
جسے سُنکر خدا کو دفعتاً کچھ رشک آیا تھا
وہ تیرا اشک میرا طالعِ تقدیر تھا گویا
اُسی تارے میں مَیں نے دیکھ لی تھی زندگی اپنی
تو خود شاہد ہے کتنی سادگی ہے میری حسرت میں!

بڑے ارمان سے میں نے تجھے نغمہ سُنایا تھا
جو نغمہ بارگاہِ ایزدی میں بھی نہیں ملتا
جسے حور و ملائک کی محبت پا نہیں سکتی
جسے سُنکر نگاہوں میں تری اک اشک آیا تھا
تمناؤں کی میری آپ ہی تصویر تھا گویا
اُسی تارے نے مجھکو بخشدی تھی روشنی اپنی
مجھے کیا کچھ نظر آنے لگا ہے تیری صورت میں!

پرستش نے مری تجھ کو بنایا ہے خدا میرا ۔۔۔ مری حسرت نے تجھ کو کر دیا ہے مدعا میرا
میں اپنی زندگی میں پا رہا ہوں سوزِ انسانی ۔۔۔ مرا ہر شعر گویا بن گیا الہامِ یزدانی

مگر اب تو مرے نغموں سے کچھ اکتائی جاتی ہے ۔۔۔ محبت کی فضاؤں تک سے بھی گھبرائی جاتی ہے
یہ کیا بیٹھے بٹھائے میرے ساحر ہو گیا تجھکو؟ ۔۔۔ مرا سازِ محبت بارِ خاطر ہو گیا تجھکو؟
تو کہتی ہے کہ دنیا کیا کہے گی میرے آنے کو ۔۔۔ زمانہ کس طرح سمجھے گا میرے گنگنانے کو
اگرچہ کر دیا تیرے تغافل نے مجھے بسمل ۔۔۔ سمجھتا ہے ترے احساسِ نسوانی کو میرا دل
میں تجھ سے دور رہنے کی کروں گا سعیِ لاحاصل ۔۔۔ میں طوفانوں میں ڈھونڈوں گا اب اپنی زیست کا ساحل
جو تو چاہے گی میں اک بار گویا سو سا جاؤں گا ۔۔۔ خود اپنے ہی جنوں کی وسعتوں میں کھو سا جاؤں گا

مگر تو نے بجایا ہے جو سازِ زندگی میرا
تو کچھ ہو جائے سُننا ہو گا رازِ زندگی میرا

میری اُمید کو بیگانۂ منزل بناتی جا ۔۔۔ مری مایوسیوں ہی کو مرا حاصل بناتی جا!
مجھے ایسا جنوں دیدے کہ جس پر ناز ہو تجھکو ۔۔۔ مجھے وہ بندگی دے جس کا خود انداز ہو تجھکو
مجھے وہ ساز دے جو گنگنائے تیرے رازوں کو ۔۔۔ مجھے وہ راز دے جو گدگدائے تیرے سازوں کو
مجھے دیوانگی دے کر عطا وہ دردِ سر مجھکو ۔۔۔ مسرت اور غم سے جو بنا دے بے خبر مجھکو
مرے انداز کو پھر والہانہ پن سکھا آکر ۔۔۔ حواس و ہوش سے پھر مجھ کو بیگانہ بنا آکر
جو تجھ سے ہو سکے مجھکو عطا کر جاوداں وحشت ۔۔۔ کبھی جو بر نہ آئے وہ محبت آفریں حسرت
مجھے اپنی محبت اپنا غم اپنی مسرت دے ۔۔۔ مجھے اپنی تمنا اپنے ارماں اپنی حسرت دے

جو تو چاہے تو ان میں سے نہ کر مجھکو عطا کچھ بھی ۔۔۔ مجھے ہرگز نہ ہوگا ذات سے تیری گلا کچھ بھی

مگر تو نے بجایا ہے جو سازِ زندگی میرا!
تو کچھ ہو جائے سُننا ہو گا رازِ زندگی میرا!

راحت سعید

ایسا کیوں...؟

"ہاں، کیا لیگا؟ ایک بستر اور یہ صندوق ہے۔"

"کہاں جانا ہے سیٹھ صاحب؟"

"عثمان پورہ، ڈاکٹر صاحب کے گھر کے قریب۔"

"بہت دور ہے سیٹھ جی! ڈیڑھ آنہ ہوگا۔"

"ڈیڑھ آنہ؟ جاگیر ہے کیا اپنی! ارے میل بھر تو ہے۔ پندرہ بیس منٹ کا راستہ اور اس کا ڈیڑھ آنہ گویا ایک گھنٹے کی چھ آنے مزدوری؟" سیٹھ جی نے کہا۔

"لالہ جی اگر وقت اور محنت کے لحاظ سے پیسہ کمانے کی آسانی ہوتی تو آج آپ کی کلائی پر سنہری گھڑی، انگلیوں میں قیمتی انگوٹھیاں اور تن پر ریشمی کپڑے نہ ہوتے اور مجھے محنت کرنے پر بھی بھوکا مرنے کی ضرورت نہ ہوتی!" سیٹھ جی کو ایسا جواب دینے کا خیال شرفو کے ذہن میں آیا ضرور لیکن اپنی مزدوری کے خیال نے اظہار سے باز رکھا۔

اس وقت کسی طرح سے اُسے آدھ آنہ بھی مل جاتا تو کافی تھا۔ اسی لئے سامان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اس نے کہا: "تو پھر کیا دیں گے صاحب۔۔۔؟"

"دو پیسے ملیں گے۔"

"دو پیسے؟ ایک آنہ تو دیجئے!"

"نہیں۔" کہہ کر سیٹھ جی نے درختوں کے سائے میں کھڑے ہوتے رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "اے میاں، تو چلے گا؟"

گردن ہلا کر شرفو کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے رحیم آگے بڑھا۔ وہ قریب آنے لگا تو ارنے بھینسے کی طرح آنکھیں نکال کر اس کی طرف .... دیکھتے ہوتے شرفو نے سیٹھ جی سے کہا: "میں چلتا ہوں صاحب۔ دو پیسہ میں!"

لیکن سیٹھ جی نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی اور جلدی جلدی سامان اُٹھا کر رحیم کے سر پر رکھ دیا۔ رحیم نے پھر ایک بار سہمی ہوئی نظروں سے شرفو کی طرف دیکھا اور چل پڑا۔۔۔

صبح آٹھ بجے سے وہ مزدوری کی آس میں وہاں کھڑا تھا لیکن ہر موٹر کی آمد کے ساتھ ہی وہاں قلیوں اور حمالوں کا ایک ہجوم ہو جاتا تھا۔ اکثر بچے اس بھیڑ میں گھس پڑ کے اپنے لئے کچھ پیدا ہی کر لیتے تھے۔ مگر رحیم سے یہ نہ ہو سکا کیونکہ اُس نے آج پہلی بار اس کام کی طرف قدم بڑھایا تھا اور دوسرے اُس کی عمر بھی کم تھی۔ وہ یہ خیال کر کے کہ سب لوگوں کو کام ملنے کے بعد جو کچھ بچ جائے گا تو وہ خود کرے گا جہاں کا تہاں کھڑا تھا۔ مگر اس ناکامی کہ ہر دفعہ بجائے کام کے کچھ بچے ہی بغیر کام کے بچ جاتے تھے۔ اسے اپنی اس ناکامی پر رونا آرہا تھا مگر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو وہ آج مزدوری کر کے پیسے کمائے گا ضرور۔ اُسے بھوک بھی بڑی شدت کی لگی تھی، صبح سے وہاں کھڑا تھا۔ وہ اس آس میں تھا کہ دوپہر کے کھانے کے وقت سب حمال چلے جائیں گے تو اسے کچھ کام مل ہی جائے گا۔ بارہ بجے کے قریب اُسے کچھ اُمید دکھائی دی کیونکہ ایک ایک کر کے سارے حمال اور قلی جا چکے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے جو موٹر آئی تو اس وقت وہاں دوسرے دو لڑکے اور شرفو اور رحیم، اس طرح چار ہی رہ گئے تھے۔ ان تینوں کو کام ملنے کے بعد خود جانے کے خیال سے وہ اپنی جگہ ہی کھڑا تھا۔ لیکن موٹر سے اُترنے والے بہت سے لوگ اپنا اپنا سامان لیکر چلے گئے۔ صرف تین مُسافر ایسے تھے جنہیں قلی کی ضرورت تھی۔ ان میں سے دو کا سامان تو ان دوسرے دو لڑکوں نے اٹھا لیا تھا۔ اب صرف اکیلے سیٹھ جی ہی باقی تھے۔ ان کیلئے شرفو تو تھا ہی۔ اسی لئے رحیم کی آس یاس سے بدل گئی۔ مگر آخر کار یکایک اُسے وہ کام مل گیا۔

موٹر اسٹانڈ سے عثمان پورہ تقریباً ایک میل ہے اور اس کے لئے اُسے صرف ایک آنہ مزدوری مل رہی تھی! علاوہ اس کے وزن بھی اس کی طاقت سے زیادہ تھا۔ لیکن اُس نے ان چیزوں کا خیال ہی نہیں کیا۔ پیسہ کے عوض وہ اس مُصیبت کے مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ عثمان پورہ کدھر ہے، اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر وہ اپنی اس کمزوری کو سیٹھ جی پر ظاہر نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ اور اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا گویا وہ اس کام میں کافی مشاق ہے۔

وہ راستے کی دونوں طرف کی اُونچی اُونچی عمارتیں، ہوٹلیں، اور بڑی بڑی دُکانوں کو پیچھے چھوڑتے ہوتے بے خبر جا رہا تھا۔ صرف ایک خیال اُس کے دل و دماغ میں جاگزیں تھا۔ اور وہ یہ کہ آج وہ اپنی محنت سے پیسہ کما کر اپنی دادی کو دکھائیگا تو وہ کتنی خوش ہوگی۔ لیکن یہ خیال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

کپڑے والوں کی دکانوں سے آگے بڑھتے ہی اُسے اپنے سر پر کے بوجھ کا احساس ہوا اور جوں جوں وہ آگے بڑھتا بوجھ زیادہ ہوتا معلوم ہو رہا تھا۔

نشاط سینما تک تو وہ پہونچ گیا لیکن اسکے آگے قدم بڑھانا اُس کیلئے کٹھن ہو گیا۔ اپنی کمزوری پر اُسے رونا آ رہا تھا۔ سیٹھ جی سے کہہ کر تھوڑا ستانے کا خیال اُسے ضرور ہوا لیکن اُسے اپنی مزدوری کے کھو جانے کا خوف بھی ہوا۔ بوجھ سے دبا ہوا بیچارہ غریب کچھ نہ کہہ کر تیز چلنے لگا۔ یہ تھا باعزت طریقہ روٹی کمانے کا ــــ!

لیکن اس کی اپنی خوش قسمتی سے سڑک کے دوسرے کنارے پر سیٹھ جی کا ایک دوست مل گیا اور وہ دونوں باتیں کرنے کھڑے ہو گئے۔ موقع غنیمت جان کر اُس نے ایک شخص سے استدعا کر کے اپنا بوجھ اتروایا اور بازو کی ایک دکان کے ورانڈے میں رکھ کر ستانے لگا۔

سیٹھ جی کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رحیم کو کافی آرام ملا۔ اور اُسے عثمان پورہ خواہ کتنی ہی دور ہو سامان پہونچانے کی توقع ہو گئی۔ اور اُس نے یہ بھی یقین کر لیا کہ اب مزدوری کے پیسے اُسے ضرور ملیں گے۔ ساتھ ہی اُس کی نظر سامنے والے سینما گھر پر پڑی۔ پھاٹک پر بجلی کے بڑے بڑے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اور اندرونی حصہ میں بڑے بڑے تختوں پر اداکاروں کی تصویریں عجب بہار دکھا رہی تھیں۔ وہ تلملا اُٹھا کہ وہ ایک مرتبہ بھی سینما نہیں دیکھ سکتا۔ مگر بہت جلد ہی یہ خیال غائب ہو گیا۔ کیونکہ اُسوقت اُس کے مدنظر صرف اس کی اپنی مزدوری تھی ــــ دو پیسے، ہر چیز حقیر اور بے قیمت دکھائی دے رہی تھی۔ سیٹھ جی کو باتیں ختم کر کے آگے بڑھتے دیکھکر وہ بھی کسی طرح سامان اُٹھا کر کھانے کے بعد گھر جانا چاہیئے؟ یا دونوں پیسوں کا کچھ لیکر کھا لینا؟ لیکن نہیں، پہلے دادی کو یہ پیسے بتا دینا چاہیئے اُسے کتنی خوشی ہو گی یہ دیکھ کر!

اس پاپ کی دنیا میں رحیم کا کوئی نہ تھا ــــ صرف ایک دادی! وہ بھی ضعیف ہو چکی تھی۔ پہلے کی طرح کام کرنے کی طاقت اس میں نہ تھی؛ بازو کے ایک دو گھروں کے برتن مانجھتی تھی ــــ اور بس! زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر میں آٹھ یا دس آنے مل جاتے، لیکن یہ بالکل ناکافی ہوتے، اِن دونوں کو مشکل ہی سے پیٹ بھر روٹی ملتی تھی۔ اس کے محلے کے چند لڑکے موٹر اسٹانڈ پر لوگوں کا سامان پہونچا کر آنہ دو آنے کما لیتے تھے، اُسے یہ معلوم تھا، اُسے اکثر یہ خیال ہوتا کہ اگر رحیم بھی اسی طرح مزدوری کرے تو کیا ہی اچھا ہو۔ لیکن رحیم کم عمر تھا اس لئے فوراً ہی وہ یہ کہکر اپنے دل کو تسلی دیتی کہ ابھی وہ اس قابل نہیں ہے ــــ آج تو رحیم نے خود ہی کہا تھا " دادی اماں! میں جاؤں کیا اسٹانڈ پر؟ آچن اور دگو اور رحمالی کر کے پیسے کماتے ہیں "

" مگر ابھی تو چھوٹا ہے نا۔ تجھ سے بوجھ نہ اُٹھ سکے گا " پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑھیا بولی۔

" میں ہلکا سا کام کرونگا۔ جاؤں پھر؟ "

" جاؤ۔ لیکن دیکھو بابا کہیں اناپ شناپ کرنے جائیگا تو گردن ہل جائیگی! ایسا نہ کرنا " اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑھیا نے کہا۔

بڑھیا کا چہرہ کسی اندرونی مسرت سے جگمگا اُٹھا۔

رحیم کے کرنے جیسا کوئی کام مل گیا اور آج اُس نے ایک آدھ آنہ کما لیا تو اُسے روز جانے کی ترغیب دینا۔ اور اگر اسی طرح اُسے روز مزدوری ملتی رہے تو کیا ہی اچھا ہو گا! ــــ اس قسم کا خیال بڑھیا کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا۔ گیارہ بجنے تک تو وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُس کی تشویش بھی بڑھتی گئی۔ بارہ بج گئے لیکن رحیم کا پتہ ہی نہ تھا۔ آخر کار وہ اٹھی اور اُسے ڈھونڈتی ہوئی موٹر اسٹانڈ پہونچی ــــ،

شرفو ابھی تک اسٹانڈ ہی پر بیٹھا تھا۔ صبح نو بجنے تک ہی اُسے دو پیسے کا کام مل گیا تھا۔ یہ پیسے ملتے ہی اُس نے سامنے والے ہوٹل سے ایک پیسے کی " سنگل چائے " اور ایک پیسے کا توس لے لیا تھا۔ اس کے بعد اب بارہ بجنے تک اُسے کوئی دوسرا کام نہیں ملا تھا۔ رات بھر سراؤں میں دکانوں کے تختوں پر یا در کہیں پڑ رہنا۔ دن بھر موٹر اسٹانڈ پہ بیٹھنا اور مزدوری کرنا ہی اس کا معمول تھا۔ شروع شروع میں اُسے کافی مزدوری ملتی تھی، لیکن پچھلے دو تین برس سے لڑکے، بوڑھے اور جوان ہر قسم کے لوگ حمالی کرنے لگے تھے۔ اس لئے اب اُسے دن بھر میں مشکل ہی سے آنہ دو آنے مل جاتے تھے، کسی دن تو کچھ بھی نہ ملتا اور اُسے چار و ناچار بھوکا ہی پڑا رہنا پڑتا۔ مستزاد یہ کہ چند دنوں سے اُسے گانجے کی بھی لت پڑ گئی تھی۔ گانجہ پینے والے پانچ چھ آدمیوں کی ایک پارٹی تھی جس میں یہ شریک تھا۔ وہ باری باری سے گانجہ لا کر ایک جگہ جمع ہو کر پیتے تھے، آج شرفو ہی کی باری تھی۔ بارہ بج چکے تھے مگر اُسکے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ وہ جھلا کر اپنے آپ سے کہہ رہا تھا " جہاں تہاں یہ لونڈے لارے موجود ہیں۔ مرتے بھی نہیں۔ کام ملنے دیتے ہی نہیں۔ دو آنے کے کام کو ایک پیسے میں کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ایک آنے کا کام مل رہا تھا کہ وہ ایک نیا لونڈا آ گیا آج! دو پیسے میں لے گیا بوجھ! ورنہ مجھے ایک آنہ مل ہی جاتا! اور پھر سارے کام بن جاتے۔ گانجہ کے سوا کچھ پیٹ کے لئے بھی مل جاتا۔

لیکن وہ لونڈا آگیا نا!"

اسی اثنا میں رحیم کی دادی اُسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی تھی۔ شرفو کے پاس آکر اُس نے پوچھا: "ایک نیا بچہ آیا تھا یہاں حمالی کرنے۔؟ گورا سا، اونچی ناک!"

شرفو تو پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا، اُس نے گرجکر کہا: "مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ جا دیکھ کہیں اور"

وہ وہاں سے اُٹھ گیا اور دوسرے اسٹانڈ پر کسی کام کی اُمید میں چل دیا۔ اسکے ساتھ ہی بڑھیا بھی بچے کو ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہونچی۔

عثمان پورہ میں سیٹھ جی کے مکان تک سامان پہونچانے تک رحیم کی گردن اکڑ گئی تھی۔ وہاں پہونچتے ہی سیٹھ جی نے سامان اُتار لیا اور پھر اپنی جیب سے دو پیسے نکال کر اُسے دیدئے۔ ان میں سے ایک پیسہ بہت زیادہ چکنا اور عجیب سا تھا۔ واپس دینے کیلئے پیسہ آگے بڑھاتے ہوئے رحیم نے کہا: "یہ پیسہ دوسرا دو مالک بہت گھسا ہوا ہے"

سیٹھ جی نے لاپرواہی سے کہا: "بڑا عقلمند ہے تو! جا! ہم نے گھر میں تو نہیں بنایا!"

رحیم کو سیٹھ جی سے تکرار کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بڑا ہی شکستہ دل ہوکر وہاں سے نکلا۔ ایک پیسہ تو اچھال گیا، اس خیال سے وہ بہت خوش تھا۔ راستہ سے اُچھلتا کودتا آرہا تھا، کبھی کبھی رُک کر وہ پیسہ ہتھیلی پر رکھ کر اُلٹتا پلٹتا بھی تھا۔ بھٹیار خانے کے پاس وہ تھوڑی دیر کھڑے ہوکر یہ سوچتا رہا ـــ کچھ لیکر کھالوں یا پیسے گھر لے جاؤں ـــ

اس وقت شرفو موٹر اسٹانڈ پر پہونچ گیا تھا۔ اسٹانڈ پر کامل سکوت تھا۔ شرفو نے دُور راستہ پر دیکھا۔ موٹر آتی دکھائی نہ دی۔ وہ بہت مایوس ہوا۔ اس کے لئے یہ خیال حد درجہ تکلیف دہ تھا کہ گیارہ بجے کا وقت ہوگیا اور ابھی تک اُس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ یکایک اُس کی نظر سڑک کی دوسری جانب پڑی۔ رحیم اپنا وہ کھوٹا پیسہ اُلٹ پلٹ کر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی رحیم بڑی تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور گرج کر بولا "کہاں ہیں وہ پیسے؟ لا ادھر!"

شرفو کو دیکھتے ہی رحیم کی حالت اس ہرنی کی سی ہوگئی تھی جو شکاری کے جال میں پھنس گئی ہو۔ وہ اپنی پیسے والی مٹھی بھینچ کر بولا۔ "کیوں؟ مزدوری تو میں نے کی ہے!"

"لا۔ پہلے ادھر دے! بکواس نہ کر! کاہے کو مرنے آیا تھا یہاں؟ پیسے لا ادھر۔ چل نکال!"

یہ کہکر شرفو نے زبردستی اسکی مٹھی سے پیسے نکال لئے اور ایک زوردار طمانچہ رسید کر کے چلتا بنا ـــ

رحیم رویا، چیخا لیکن بے سود! آس پاس لوگ تو تھے مگر انہوں نے سمجھا کہ لڑکے کا ہی قصور ہوگا۔ کسی نے بھی اُسے نہ سمجھایا۔ گھر جانے کے بجائے وہ بازو والی ندی پر چلا گیا۔

ندی کا پانی گھاٹ تک پہونچ گیا تھا۔ زائرین اس میں نہا رہے تھے، پجاری پھول چڑھا رہے تھے اور بعض معتقدین پیسے بھی ڈالتے جا رہے تھے۔ گھاٹ سے ذرا ہٹ کر بہت سے جوگی اور جنگم کھڑے تھے۔ ہر نہاکر نکلنے والے کو دُعا دیتے تھے۔ بہت سے بیراگی گاتے بجاتے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ہر واپس جانے والا انہیں ایک آدھ پیسہ دے دیتا تھا۔ رحیم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا ـــ یہ لوگ اول فول بکتے اِدھر اُدھر گھومتے پھر رہے ہیں اور لوگ کیوں خواہ مخواہ انہیں پیسے دیتے ہیں؟ ـــ پھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس سیٹھ جی نے ایک آنہ کا کام مجھ سے دو پیسے میں کرالیا۔ اور ایک پیسہ بھی کھوٹا دیا! یہاں ان لوگوں کو بغیر کسی محنت و مشقت کے پیسے ملتے ہیں۔ مگر مجھے تو خود اپنا پسینہ بہاکر کماتے ہوئے پیسے بھی راس نہ آتے! اس حمال کو کام کرنے کیلئے تیار ہوتے ہوتے بھی کام نہیں ملا اور اُس نے اپنا غصہ مجھ پر نکالا۔ تھپڑ بھی مارا اور پیسے بھی لے گیا! کیا بات ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور اگر ایسا ہو تو..... ایک کا نقصان کرکے دوسرا خود فائدہ نہ اُٹھا سکے اور کسی کو مفت پیسے بھی نہ ملیں! ہر ایک کو کام محنت اور کام ملے اور کام کی نسبت سے پیسے بھی ملیں! واقعی اگر ایسا ہو جائے تو..... پھر ایسا نہ ہوگا؟"

رحیم کی دادی اُسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہونچ گئی۔ وہ اُس کے قریب آکر کہنے لگی: "کوئی کام نہیں ملا؟ اب تو دوپہر ہوگئی! اس سے پہلے ہی گھر آجاتا؟ ـــ بھوک نہیں لگی؟۔ اُٹھ، گھر چل! ـــ ارے یہ کیا؟ تیرا گال لال کیوں ہے؟ ـــ اور یہ نشان کاہے کے ہیں ـــ؟"

دادی کو دیکھکر رحیم کی چھاتی بھر آئی۔ وہ اُٹھا اور دادی کی گردن میں باہیں ڈال کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مزدوری کی ہے!"

محمد عبدالقادر فاروقی

رتنی افسانہ

ریل گاڑی میں

بھالیہ کا تانگا اسٹیشن پر آکر رکا ہی تھا کہ گاڑی چھوٹنے کی گھنٹی بجی دل میں یہ خیال آتے ہی کہ منہ سے پھین نکلنے والے مردار گھوڑے کو اگر دھکا لگا تو وہ کسی طرح بچاتے رکھے اپنے پرانوں کو ہی چھوڑ دیگا، بھالیہ اپنا چھوٹا سا چمڑے کا بیگ اُٹھائے تانگے سے کود پڑا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آگے کھڑے ہو کر اُس نے پکارا "ٹکٹ دیدیجئے بابوجی جلدی سے لا" اور اُس نے پیسے سوراخ کے اندر کھسکا دئے۔ بابو نے تاریخ والے آلے کو کھٹکا کر ٹکٹ باہر پھینکا۔ جب وہ پلیٹ فارم پر پہونچا تو گاڑی چلدی تھی۔ اُس نے لپک کر کسی طرح ایک ڈبے کا ہنڈل پکڑا اور جیسے تیسے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ڈبے میں کتنی ہی بھیڑ کیوں نہ ہو، کچھ فکر نہیں، کھڑا رہنا پڑا تو کھڑا رہونگا، گاڑی پکڑ لی یہی کیا کم ہے، وغیرہ۔ یہی خیالات اُسکے دماغ میں چکر کاٹ رہے تھے۔

مگر پھر کر دیکھا تو اُسکے تعجب کی حد نہ رہی، سارا ڈبہ خالی تھا، صرف سامنے کی طرف ایک عورت بیٹھی تھی۔

ڈبے کو خالی دیکھکر اُسے بہت تعجب ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اُسے خیال آیا اور دروازے سے گردن نکال کر وہ باہر دیکھنے لگا۔ اُس کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ لال ہرے رنگ میں ایک عورت کی تصویر اُس ڈبے پر بنی ہوئی تھی۔ ارے باپ رے! وہ عورتوں کے ڈبے میں آگھسا! اور اگر کہیں اس عورت نے زنجیر کھینچدی تو؟ کیا ٹھیک کہ وہ جھوٹ موٹ ہی کہدے کہ اس آدمی نے میری توہین کرنے کی کوشش کی، آجکل عورتیں اس قسم کا ڈھونگ خوب کرنے لگی ہیں۔ ڈبے میں بیٹھی ہوئی اس عورت نے اگر ایسی ہی کوئی حرکت کی تو میری کتنی فضیحت ہوگی۔ "آج" "ہندوستان" وغیرہ سبھی روزانہ اخباروں میں موٹی موٹی سُرخیاں چھپیں گی، یونیورسل ریڈیو کے سیلزمین بھالچند بھاسکر بھاکرے پر مقدمہ، دن دہاڑے چلتی ٹرین میں ایک عورت کی توہین! ــــ ارے باپ رے! کیا گڑبڑ ہوگی کون جانے ــــ؟

آہستہ سے گردن گھما کر اُس نے عورت کی طرف چھپی نگاہ سے دیکھا۔ اُٹھکر زنجیر کھینچنے کے خیال میں وہ نہیں تھی۔ خوش قسمتی ہی ہے، یہ سوچکر بھالیہ دروازے کے پاس ہی کھڑا ہوا جھک کر باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

مگر کچھ وقت گزرتے ہی اس کا دل چنچل کرنے لگا۔ لازمی خطرے سے بچ کر اُس کا دل اَب اُسے باہر دیکھنے نہیں دے رہا تھا ــــ جیسے تیسے تو ڈبے میں گھس گیا، اور اب بے خطر بھی ہے، پھر اُس عورت کی طرف دیکھنے میں ڈر ہی کس بات کا ہے؟ وہ حسین ہے اور تو نے اگر اس کی طرف نہیں دیکھا تو یہ کیا اُسکی ایک طرح کی توہین نہیں ہے، کیا وہ اِسے اپنی ہتک نہیں سمجھے گی، انسان جیسا تو انسان، اور کیا! تیرا یہ برتاؤ بالکل مناسب رہے گا۔

بھالیہ اندر کی طرف مڑا اور سگرٹ سُلگانے کے بہانے اُسے اچھی طرح دیکھ لیا۔ دیکھ لیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کا دیکھنا ختم ہو گیا۔ وہ اُسے بار بار دیکھتا رہا، کیونکہ جتنی بار وہ اُس عورت کو دیکھتا تھا اُتنا ہی اُسکی نظروں میں اُس عورت کا حسن و شباب بڑھ جاتا تھا۔

وہ کوئی اٹھارہ انیس برس کی ہوگی، جتنی وہ خوبصورت تھی اتنی ہی سادہ بھی تھی۔ نہ اُس کے کپڑے قیمتی تھے نہ اُن میں کسی قسم کا خوبصورت ٹھاٹ باٹ ہی تھا۔ مگر اُس کے چہرے پر ایک انوکھا نور تھا اور بھالیہ کو محسوس ہوا کہ اگر کتاب پر جھکی ہوئی نمدار آنکھیں ایک بار بھی میری طرف اُٹھیں تو کسی لاثانی حسینہ کے تیر نظر کی جو جو قیاس آرائیاں آج تک پڑھی ہیں اُن کا سنسنی خیز تجربہ ہو جائیگا۔ اسکے دل میں یہ رومانوی خواہش پیدا ہوئی کہ ایکبار وہ کتاب چھوڑ کر میری جانب دیکھ لے۔

مگر کافی وقت گزر جانے پر بھی اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ اُس نے کسی کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ اگر کوئی اپنی طرف دیکھے تو دیکھے جانیوالے کا دل بھی اُسے اُس کی جانب دیکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اُس نے ایسا بھی کر دیکھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کتاب پر جمی ہوئی اُس کی آنکھیں اُٹھتی ہی نہ تھیں۔ یا تو اُسے اس بات کا خیال ہی نہیں تھا کہ بھالیہ ڈبے میں آچڑھا ہے یا پھر جان بوجھ کر وہ اُسے نظر انداز کر رہی تھی۔ دونوں میں سے ایک بات بھی اگر سچ ہے تو ..... بھالیہ کو محسوس ہوا کہ وہ اُس کی توہین کر رہی ہے۔

ایک لمحے کے لئے اُس کے دل میں خیال آیا کہ اگر کھانسوں تو وہ ضرور میری طرف دیکھے گی۔ مگر دوسرے ہی لمحے یہ خیال آتے ہی کہ کھانسنا توہین میں شریک ہونا ہے اُس نے یہ خیال ترک کر دیا۔

اتنے میں ہوا کے ایک جھونکے نے اُس کے ہاتھ کی کتاب کے

کئی صفحے فر فر کرکے اُلٹ پلٹ دئے۔ ساتھ ہی وہ چونکی اور جس طرف سے ہوا آرہی تھی اُدھر دیکھنے لگی۔

ایسا سُنہری موقع پاکر بھی بھاآلیہ چوکتا! وہ آگے بڑھا اور "خوب ہی ہوا آرہی ہے" یہ کہہ کر اس کی طرف دیکھ کر ہنستا ہوا کھڑکی بند کرنے لگا۔

اُسے دیکھتے ہی وہ بولی: "ارے، تم.....!"

بھاآلیہ کو محسوس ہوا کہ اَب وہ اُٹھکر زنجیر کھینچنے ہی والی ہے۔ وہ ایک دم بولا: "میں جلدی جلدی چلتی گاڑی میں سوار ہو گیا تھا، مگر تم زنجیر مت کھینچو نے۔"

اُس نے پوچھا: "کونسی، کیسی زنجیر؟"

• دھت تیرے کی! اُسے خبر بھی نہیں اور میں خود اُس کے من میں یہ بات جمائے دے رہا ہوں، بات چیت ایک دم بدلنی چاہیئے، اور وہ بولا "میں ہرگز اس ڈبے میں نہ آتا، مگر گاڑی پر چڑھنے کے بعد مجھے پتہ لگا کہ یہ زنانہ ڈبہ ہے، اُترنا چاہتا تھا کہ گاڑی چلدی۔ تب سوچا کہ چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"ہش، ہوگا کیا؟" وہ ہنسی۔

اپنے الفاظ کا دوسرا ہی مطلب ہوتے دیکھکر بھاآلیہ رُک گیا، گفتگو کا رُخ بدلنے کی دوسری باری آئی۔

وہ بولا: "اور تو کیا، گارڈ گھُورکے گا، چیخے گا، بس!.... آپ کیا پڑھ رہی تھیں، کتاب دیکھنے میں تو اچھی ہے۔"

"اچھی! گھر پڑے پاتی تو چھُوتی تک نہیں، مگر سفر میں دوسری بات ہوتی ہے۔ کچھ بھی چھپا ہوا ملنا چاہیئے، یہ ہے آدمی کی حالت اور اسی حالت کی بدولت تو کتنے ہی ہفتہ وار اور ماہوار رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ہے نا؟"

بھاآلیہ کے من میں آیا، اندھا مانگے ایک آنکھ اور خدا دے دو دو، صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ اجنبیوں سے بغیر خوف کے بولنے والی ہے یہ تو——!

پھر تو جناب بھاآلیہ صاحب کی قوتِ گویائی کیونکر خاموش رہتی، اُنہوں نے اتنی تیزی سے الفاظ کی گنگا بہائی کہ بس! اسدام مرہٹہ کمپنی کی وہ گاڑی سپاٹے سے اُڑی چلی جارہی تھی، مگر بھاآلیہ کی زبان کی تیزی بھی دیکھنے کے قابل تھی—— وہ کس ریڈیو کمپنی کا سیلزمین ہے، ریڈیو کس طرح بیچتا ہے، حقیقت میں تو وہ اسٹیشن پر گاڑی سے پہلے ہی آنے والا تھا مگر ایک گاہک پٹانے میں کیسے دیر ہو گئی، وغیرہ سبھی واقعات اُسنے مفصل طور پر نمک مرچ لگا کر سُنا دئے۔ پیدائشی سیلزمین نا جو ٹھہرا!

ہاں تو بھاآلیہ ٹھیرا پیدائشی سیلزمین، اُس کی حُسن شناس نظریں ہمراہ حُسن سے سیر ہونے کے ساتھ ساتھ بیوپارانہ طور سے اُس کے گلے میں ایک ریڈیو سٹ بھی باندھنا چاہتی تھیں۔ اور اسی لئے اُس نے کہا: "تم بھی خرید لونا ایک اچھا سا ریڈیو سٹ، آجکل کافی سستے ہو گئے ہیں۔"

"ایک اچھا سا ریڈیو سٹ کتنے میں مل جائیگا؟"

"کچھ بھی نہیں، سوا تین سو روپے خرچ کئے کہ....."

"ایں، یہی سستا ہے کیا؟" اور اُس نے اپنا ہاتھ چھاتی پر رکھ لیا۔

"کیوں، بہت دام معلوم ہوتے ہیں، مگر چیز ایک ہی ہے، تم اور تمہارے بیٹے پوتے تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ذرا یہ ہمارا ریڈیو کا "لٹریچر" تو دیکھ جاؤ۔" اتنا کہکر بھاآلیہ اپنا چمڑے کا بیگ کھولنے لگا۔

مگر اتنے میں گاڑی کی رفتار میں فرق ہوا: "اسٹیشن ہے کوئی" اُس لڑکی نے اتنا ہی کہا تھا کہ گاڑی پلیٹ فارم پر آرہی، اور "انجیر لو انجیر" "بامبیا چاے" کی آوازیں سُن پڑیں۔

بھاآلیہ نے جلدی سے دو چار رنگ برنگے کاغذ اُس لڑکی کی طرف پھینکے، بیگ بند کیا اور گاڑی رُکنے سے پہلے ہی دروازہ کھول کر کُود پڑا۔ دوڑتے ہوئے وہ دوسرے ڈبے میں سوار ہو گیا۔

حالانکہ وہ دوسرے ڈبے میں جا بیٹھا تھا، مگر اُس کا دل زنانے ڈبے میں ہی چکر کاٹ رہا تھا۔ گاڑی چلنے پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے پر لگنے سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں مگر اُن بند آنکھوں میں بھی اس خوبصورت لڑکی کی صورت ناچ رہی تھی۔ اگلے اسٹیشن پر اُس نے انجیر خریدے اور زنانے ڈبے کی طرف گیا۔

کھڑکی سے ہی انجیر کی پُڑیا بڑھاتے ہوئے بولا: "یہ لو، تازہ اور بڑھیا ہیں۔"

وہ اپنی جگہ ہی پر بیٹھے بیٹھے بولی: "نہیں، نہیں۔"

"اور ایسا بھی کیا، لونا!"

"نہیں، سچ مچ نہیں!"

"بہت ہو چکا، یہ لو—" اور اُس نے پُڑیا سیٹ پر رکھدی۔

وہ ہنسی، اُٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی۔ اپنا پرس کھولتے ہوئے بولی: "کتنے پیسے؟"

"اچھا! میں ریڈیو کا سیلزمین ہوں، انجیروں کا نہیں۔"

اتنا سنتے ہی وہ ہنس پڑی اور ایکدم سارا حجاب ہٹا کر اُس نے پُڑیا میں سے ایک انجیر اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لیا اور بولی: "کتنا میٹھا ہے!"

"ہاں، بہت میٹھا ہے۔"

کون سی چیز زیادہ میٹھی تھی یہ وہی جانے۔

وہ بولی: "مگر یہ کیا، تم بھی لونا!"

بھاٹیہ نے اُسکے دئے ہوتے چار انجیر لئے، اب وہ کُسے کتنے میٹھے لگے اس کا تصور کون کرسکتا ہے۔

اتنے میں گاڑی نے سیٹی دی، جلدی جلدی بھاٹیہ نے پوچھا۔

"تم پونہ جارہی ہو نا؟"

ہنس کر اُس نے گردن ہلائی۔ حالانکہ اُس نے پوچھا نہیں تھا مگر پھر بھی بھاٹیہ نے کہہ ہی دیا "اور میں بھی!" اور دوڑتا ہوا اپنے ڈبے میں گھس گیا۔

اگلے اسٹیشن پر وہ ڈبے سے اترا، مگر اُس اسٹیشن پر کچھ بھی نہیں بک رہا تھا۔ صرف ایک گندی تھالی میں کالے سیاہ پیڑے لئے ایک بوڑھا مارواڑی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ وہ عجیب مٹھائی بھلا اُس لڑکی کے کس کام آتی؟ اب دل میں دلیری سے یہ سوچتا ہوا کہ دینے کو کچھ نہ ہو تو صرف گفتگو کی خاطر اُس کے پاس جانے میں کیا ہرج ہے وہ زنانے ڈبے کی طرف چلا۔ مشکل سے آٹھ دس قدم چلا ہوگا کہ اُس نے دیکھا گارڈ صاحب زنانے ڈبے کے پاس ہی کھڑے ہیں۔ ایسے موقع پر بھاٹیہ وہاں جانے والا نہ تھا۔ اُس نے اس طرح ظاہر کیا گویا وہ نل پر ہاتھ دھونے کی خاطر ڈبے سے اترا ہے۔ ہاتھ دھوکر وہ پھر مردانے ڈبے میں جا بیٹھا۔

مگر ابھی تک اُسے اس کا نام بھی معلوم نہیں ہوا۔ یہ بات اس کے دل سے نہ گئی اور وہ دل میں سوچتا رہا کہ پونہ میں اپنے دس بیس دن کے قیام میں اس تعارف کو بڑھانا چاہیئے۔ مگر وہ لڑکی ہے کون؟ کہاں رہتی ہے، اس کا نام کیا ہے، وغیرہ۔ بغیر جانے واقفیت کیسے بڑھانا چاہیئے۔ پونہ کا اسٹیشن آنے سے پہلے پہلے اس بارے میں پوچھ گچھ کرنے کا اُس نے فیصلہ کرلیا۔

گھورپڑی اسٹیشن آتے ہی وہ گاڑی سے اترا۔ اُس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ گارڈ کیا گارڈ کا باپ بھی اگر زنانے ڈبے کے پاس کھڑا ہوگا تو بھی نہ رکونگا۔ وقت آنے پر کشتی لڑنے میں بھی اُس نے آگا پیچھا نہ سوچا ہوتا۔ اس کے مصمم ارادے کی بدولت یا کسی اور وجہ سے گارڈ آخری ڈبے کے پاس ایک پورٹر کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ چھپا کھڑا تھا یعنی بھاٹیہ کو نظر نہ آیا۔

ڈبے کے پاس جاکر کھڑکی میں گردن ڈال کر وہ بولا "پونہ اگلا اسٹیشن ہے!"

اپنے بالوں کو ذرا صاف کرنے کے لئے وہ اپنے سر پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "ہاں!"

"تمہیں اسٹیشن پر سے لے جانے والا کوئی آرہا ہے کہ نہیں۔ اگر نہیں تو......"

"آرہے ہیں"

"آرہے ہیں؟"

"یعنی .... ہو چکا! ارے گھے میں، اُسے کیا کہتے ہیں، وہ نہیں رکھا"

ہنستا ہوا بھاٹیہ بولا "ٹھیک ہے، جان پہچان یاد رکھنا، تمہارا گھر کہاں ہے؟ میں پونہ کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر تم پتہ بتادو تو میں آؤنگا ضرور ملنے"

ہنستے ہوئے وہ گھبراہٹ سے بولی "اوں، مجھ سے ملنے، نا بابا"

"کیوں؟"

کیا جواب دے، اسکی سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی بولی "میرے پتاجی کو یہ بالکل ناپسند ہے۔ وہ تحفظ تہذیب قدیم سبھا منڈل کے صدر ہیں۔ پرسوں "رادھا کرشن" اخبار کا کافی حصہ انہوں نے ایجی ٹیشن کرکے کٹوا ہی دیا۔ تم نے تو سب کچھ پڑھا ہی ہوگا"

"اچھا تو جنز بھاؤ جنیرے تمہارے پتا ہیں؟"

کونین کی گولی کھانے والے کی طرح اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بھاٹیہ بولا "مگر تم تو ویسی بالکل معلوم نہیں ہوتیں"

"اب اور کیا کہوں؟"

"اپنا نام بتاؤ"

اتنے میں گاڑی کی بڑی اور گارڈ کی چھوٹی سیٹی بجی۔ اور نام بتانے کے بجائے جلدی سے وہ بولی "ارے۔ رے رے، گاڑی چلدی۔ جلدی سے اپنے ڈبے میں جاکر بیٹھو"

بھاٹیہ دوڑا تو سہی، مگر بے پناہ مایوسی سے اُس کے پاؤں بیجان ہوگئے اور کسے معلوم اس کا دل بھی ٹھکانے سے تھا یا نہیں۔

پونہ اسٹیشن پر اُتر کر اُس نے اُسے دیکھنے کی کوشش کی مگر مسافروں کی بھیڑ میں وہ نظر نہ آئی۔

اُداس ہوکر وہ ایک تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے والے نے پوچھا "کہاں چلنا ہوگا رائے صاحب؟"

اُس نے جواب دیا: "اب اور کہاں جانا ہے، جہاں تیری مرضی ہو، ڈیکن جمخانہ کی طرف ہی لے چل۔"

بعد کے پانچ سات دنوں میں بھالیہ کی جو حالت ہوئی وہ کیا بیان کی جائے۔ پانی سے باہر نکلی ہوئی مچھلی کی طرح وہ تڑپتا تھا، کھانے پینے کی طرف بالکل دھیان نہیں تھا، صبح جلدی اُٹھکر کسی رستوران میں جاکر جو ٹوسٹ لے لیتا تو پھر گیارہ بجے تک کچھ نہیں کھاتا۔ دوپہر اور رات میں بھی دو چار لقمے مُنہ میں ٹھونس لینے کے سوا فاقہ ہی رہتا۔ اس کا دل ہی ٹھکانے پر نہ تھا اس کا کیا علاج! ریل گاڑی میں ہونے والی بڑی بڑی چوریوں کا حال وہ پڑھ چکا تھا۔ مگر دن دہاڑے ٹرین میں ایک لڑکی کے اپنے دل پر ڈاکہ ڈالنے کا اُس نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ پھر چوری کا مال بھی وہ اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ گھر میں گھُسکر سامان توڑ پھوڑ ڈالنے والے چور کی طرح اُس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چلدی تھی۔ اُن ٹکڑوں کو سینے میں دائیں اور بائیں طرف ہلتے ہوتے وہ پاتا تھا۔ خدا کے سوا اور کون جانتا تھا کہ اُنہیں کیسے جوڑا جاتے؟ سچ مچ ہی اُس کی طبیعت پریشان ہوگئی تھی جس کام کے لئے وہ پونہ میں دس بیس دن ٹھہرنا چاہتا تھا وہ سب چوپٹ ہوگیا۔ تھوڑی سی کھٹ پٹ سے آسے ریڈیو کے پانچ سات آڈر ملنے والے تھے مگر اب سب ناممکن ہوگئے۔ اُسے ایک ہی دھن تھی۔ ٹرین میں ملنے والی اس حسینہ سے پھر کیسے ملاقات کی جائے۔

چار پانچ دن اُس نے جوں توں کر کے گزارے اور آخر کار ایک رات بستر پر تڑپتے ہوتے اُس نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو صبح ہوتے ہی جنو بھائی جنیرے کے گھر جاکر اُن کی لڑکی سے ملنے کی جسارت کرنی چاہیئے۔

اس فیصلے کے مطابق واقعی دوسرے دن وہ جنیرے کے گھر کا پتہ لگا کر وہاں جا پہونچا۔ وہ گھر کے آنگن میں پہونچا تو دیکھا کہ باہر چبوترے پر کوئی بیس ایک برس کا ایک لڑکا بیٹھا ہوا جھونکے کھا رہا ہے۔ اُس نے بھالیہ سے پوچھا: "کس سے ملنا ہے؟"

یہاں اُس سے ملنا ہے، تھوڑے ہی کہا جا سکتا تھا، وہ بولا:

"جنیرے کا گھر یہی ہے؟"

"ہاں!"

"کیا گھر میں ہیں؟"

"کون، میرے پتاجی؟"

"ہاں!"

"نہیں ہیں،" "ڈیگر کھی،" اخبار کے دفتر میں گئے ہوتے ہیں۔ مگر آتے ہی ہونگے، تب تک بیٹھیے۔ یہاں بیٹھیے، یا میری کوٹھڑی میں چلیے چلیے؛ چلیے!—"

دل ہی دل میں یہ سوچتے ہوتے کہ چھوکرا بہت ہی تیز قسم کا ہے، بھالیہ اُس کے پیچھے ہولیا۔

کوٹھڑی میں پہونچتے ہی وہ لڑکا بولا: "بیٹھیے نا، تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بھاؤڈیا میرا نام ہے، میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ یہ لیجئے سگرٹ پیجئے۔"

بھالیہ کو شک ہوا کہ کہیں میں کسی دوسرے ہی گھر میں تو نہیں گھسا ہوں، کیونکہ وہ جس کمرے میں بیٹھا تھا، اُس کی دیواریں دیسی اور ولایتی ایکٹریسوں کی تصویروں سے اس قدر ڈھکی ہوتی تھیں کہ ایک انچ جگہ بھی نہ بچی تھی۔ ایک اونچی میز پر شیشے کے آگے پاؤڈر، کریم، سنو، لیونڈر وغیرہ کی شیشیاں سجی تھیں۔ کونے میں سات آٹھ جوتے رکھے تھے اور ایک بڑے سے کلنڈر پر ایک عورت کی تصویر تھی جو اپنے جسم کا آخری کپڑا اُتارتی ہوئی پانی میں اُتر رہی تھی۔ ایک دوسری میز پر پانچ سات انگریزی کتابیں ایک دوسرے کے سہارے کھڑی کی گئی تھیں۔ اُن میں مسٹریز آف لندن، لیڈی چیٹرلیز لور، وغیرہ صاف نظر آرہی تھیں۔

اِس سب شان بان کو دیکھکر بھالیہ کے دل میں جو خیالات آسکتے ہیں اُنہیں سمجھ کر بھاؤڈیا بولا: "بات یہ ہے مسٹر، کہ میرا اور پتاجی کا اُصول بالکل نہیں ملتا۔ شان کے ساتھ حاصل کی ہوئی جائداد کا کیا یہی مقصد ہے کہ اس سے جسم اور روح راکش خریدا جائے۔ مستقبل کے لئے قابلِ رشک آن بان سے رہنے اور مزا لوٹنے کا خیال اگر ہم نوجوان نہیں کرینگے تو اور کون کرے۔ مگر یہ اتنی سی بات تو ہمارے پتاجی کی سمجھ میں نہیں آتی اور چلے ہیں اُس مہامنڈل کو قائم کرنے۔ دیکھیے کل بچارے "رادھا کرشن" پر حملہ کیا اور گویا والا سب حصّہ سنسر کر ڈالا۔ اُس باتصویر اخبار کا اتنا ہی حصّہ تو مزیدار تھا، مگر اُنہوں نے اُسی کا ستیاناس کر ڈالا! ماں مرنے کی فکر نہیں، مگر سوتیلی ماں آنے کا رونا ہے۔ پرسوں ایک جیت کیا ہوگئی مہامنڈل کے ممبر کا دل اب کاٹ پھانس میں ہی لگا ہوا ہے۔ چھوٹے جارج واشنگٹن کے ہاتھ جب کلہاڑی لگی تو وہ خوش ہوا تھا، ٹھیک اسی طرح مہامنڈل کے رکن بھی آ خوش ہو رہے ہیں۔ اب تو جو اخبار بھی نکلے گا اُسی کی طرف قینچی لیکر پیچھے پڑنے کا ان لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ صرف گھر میں ہمارے پتاجی کی ہار نہیں چلتی ہے، چھوٹے تھے جب بہت سُن لی بھیس کی رگڑ پٹی اب کون سنتا ہے۔ پیجو...." سگرٹ کا دُھواں اُڑاتے ہوتے بھاؤڈیا نے

عجیب طرح کی حرکت کی۔

بھاگیہ اُس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک محافظِ تہذیب مہا منڈل کے آدھار۔ کے گھر کی یہ حالت دیکھکر اس کے تعجب کی حد نہ رہی۔ ساتھ ہی اُس کو یہ یقین بھی نہیں ہو رہا تھا کہ سامنے بیٹھا ہوا لڑکا بھی اُس کے دل کی ملکہ کا بھائی ہے۔

یہ اُس کا بھائی ہے؟ ....

کہاں اس کا جوہی جیسا سفید رنگ اور کہاں اس کا آنکھوں کو چکر میں ڈالنے والا نیلا کالا یا کالا نیلا نیلیا رنگ۔ کہاں اُس کی خوبصورت سڈول ناک اور کہاں اس کے یہ دو بھپن! جو ناک کی جگہ پر ہونے کی وجہ سے ناک کا نام پا گئے ہیں۔ کہاں اُس کے خوبصورت دانتوں کی قطار اور کہاں اس کے میان میں سے نکلتی ہوئی تلوار کی مانند ٹیڑھے ترچھے دانت، اُس کے نازک جسم کے مقابلے میں آبنوس کے درخت جیسی یہ جسامت!

وہ اس کی بہن ہے؟ ....

بھاؤ ڈیا نے اُس سے پوچھا: "آپ کو میرے کمرے کی سجاوٹ کیسی لگی؟ کمرے میں یہ گراموفون ہے، بہت بڑھیا میکر۔ اپنے پاس ریکارڈ کی بھی کمی نہیں؛ جنا بچے کسیلوں کھیل اکیلی رہتیں نے مجھ کو پریم سکھایا' ایک سے ایک بڑھیا۔ کیا سناؤں آپ کو؟"

بھاگیہ کی بیوپارانہ عقل بیدار ہوئی اور وہ ایک دم بولا: "مگر بھائی صاحب، گراموفون رکھنے کا فیشن پرانا ہوگیا۔ آپ کو تو ایک بڑھیا ریڈیو سیٹ ملنا چاہیئے۔ میں آپ کو ایک بہت ہی بڑھیا چیز سجسٹ کرونگا۔ میں یونیورسل ریڈیو کمپنی کا سیلز مین ہوں۔"

"اچھا، کیا پتاجی سے آپکو اسی سلسلے میں ملنا ہے؟"

"نہیں اُن سے تو مجھے دوسرا ہی کام ہے، اچانک آپ سے تعارف ہوگیا ــ یہ دیکھئے دو تین فہرستیں۔" یہ کہتے ہوئے بھاگیہ اپنا بیگ کھولنے لگا۔

مگر اتنے میں دالان کے فرش پر چھڑی کی آواز ہوئی جسے سنکر بھاؤ ڈیا بولا: "آگئے، آگئے۔"

بھاگیہ نے پوچھا: "کون؟"

"ہمارے پتاجی، چلئے میں آپ کو انکی بیٹھک میں پہونچا آؤں۔"

بھاگیہ اُٹھکر اسکے پیچھے پیچھے چل دیا۔

جنو بھاؤ کی بیٹھک میں گاؤ تکیوں کا پیشوائی ٹھاٹ تھا۔ اسلئے جب اُنہوں نے نمسکار کرکے اُسے بیٹھنے کے لئے کہا تو سوٹ بوٹ پہنے ہوئے بھاگیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں بیٹھا جائے۔ ایک چھوٹے سے سٹول پر پان تمباکو کی طشتری رکھی تھی اُسے ہٹا کر وہ جیسے تیسے بیٹھ گیا۔ جنو بھاؤ کے کمرے کی شان ہی نرالی تھی۔ عورتوں کے نام پر جھانسی کی رانی اور اہلیہ بائی کی تصویریں لٹک رہی تھیں۔ باقی سب تصویریں پیشوائی زمانے کے گھٹنا موڑے اور کوئی نہ کوئی پھول سونگھتے مردوں کی تھیں۔ ریک کی کتابوں میں دیدارتھ، ہیکا، چتر، سوتر پیاتر، شالکر بھاشیہ، بچتر جاجہات وغیرہ موٹی موٹی جلدیں تھیں۔

بھاگیہ نے کوٹھڑی کا جائزہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ جنو بھاؤ نے پوچھا: "ہاں تو کیا کام ہے آپ کو؟"

"ایسا کچھ خاص کام بھی نہیں۔"

"ارے کہیئے بھی، تکلف کس بات کا؟"

بھاگیہ نے تکلف تو نہیں کیا تھا مگر ماتھے اور سینے پر چندن لگانے والے، گہری مونچھوں اور گنیش جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے پیشوائی انگرکھا پہنے ہوئے اس کالے سیاہ مجسمے کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سن سا ہوگیا تھا۔ بار بار اُس کے دل میں یہی خیال آرہا تھا کہ بھاؤ ڈیا جیسا فرزند ارجمند اس انسانی دیوتا کے تخم سے پیدا ہو سکتا ہے، مگر وہ؟ اور پھر تسلی ہوجاتی، ہوسکتا ہے وہ ماں کی شکل پر ہوگی۔ جب تک اِس گھر کی مالکہ کو دیکھ نہیں لیتا، فضول فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ اسی قسم کے خیالات میں ڈوب سا گیا تھا کہ جنو بھاؤ نے اپنی موٹی آواز میں پوچھا: "کیا کام ہے آپ کو؟"

"ذاتی اور پوشیدہ کام ہے۔"

"تو کہئے نا، بھاؤ ڈیا تو پہلے ہی چلا گیا۔"

"ہاں مگر......"

"مگر کیا، کہئے نا جو کچھ کہنا ہو۔"

"ہاں، بات یہ ہے کہ پرسوں میں پونہ آرہا تھا کہ ٹرین میں.....؟"

"ہوں؟"

"آپ کی لڑکی سے میری واقفیت ہوگئی۔"

"میری لڑکی سے؟ ہاں ہاں، پرسوں ہی تو تھانیا سے آئی ہے۔"

"تھانیا سے؟" بھاگیہ چونکا، مگر اُس نے اپنے تعجب کو ظاہر نہ ہونے دیا اور بولا: "ہاں ہاں، گاڑی میں میری اُن سے ملاقات ہوگئی۔"

"اچھا؟ مجھے تو کچھ بتایا ہی نہیں، کتنی استاد ہے ٹلی۔"

ٹلی کا نام سنتے ہی بھاگیہ کا دل منجمد ہوگیا۔ اپنی دل کی ملکہ کا جو

نام اُس نے سوچ رکھا تھا وہ کتنا شیریں اور فنی تھا۔ کسم، وِمل، سونیترا، چارو لتا، مینکا، نیلا وغیرہ۔ اور ان سب کے بجائے کہاں کا گنوار نام سُننے میں آیا۔
—پلی—!

پھر اس نے سوچا گلاب کو خواہ کوئی نام دیا جائے وہ گلاب ہی ہیگا وہ بولا: "واقعی اُستاد ہے، اس سے ملکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے سوچا کار میں واقفیت ہو گئی ہے تو اُسے بڑھانا چاہیئے۔"

اتنے میں گھر کے اندرونی حصّے سے ہارمونیم اور گانے کی آواز آئی۔
سُنکر بھاٹیہ نے پوچھا: "کون، کیا...؟"

"وہ نہیں، اُس کی چھوٹی بہن ہے بنی!"

بنی! رام رام! نام بھی کیا ہے؟ اپنی سونے جیسی خوبصورت لڑکیوں کے ناموں کو بگاڑنے والے اس باپ کو کیا کہا جائے؟

مگر نام کا خیال دل سے نکال کر بھاٹیہ نے تعریف کی: "بنی بہت اچھا گاتی ہے!"

"ابھی تو نو ہی سال کی ہے!"

بھاٹیہ نے سوچا اگر نو برس کی بنی اتنا اچھا گاتی ہے تو اٹھارہ برس کی پلی ضرور اس سے دوگنا اچھا گاتی ہوگی۔ اُس کے پہلے ہی سے کمزور دل نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ پلی سے منگنی کرنے کی جرأت میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ بولا: "اب اِدھر اُدھر نہ کر کے اپنے من کی بات صاف صاف ہی کہتا ہوں، میں یونیورسل کمپنی کا سیلز مین ہوں۔ مہینے میں ڈیڑھ سو روپے تو میرے لئے معمولی بات ہے۔ کوئی مرض نہیں ہے۔ نکھ ناک سے بہت خوبصورت نہیں تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ بُرا بھی نہیں ہوں۔ اگلے مارچ سے ستائیسویں برس میں قدم رکھونگا۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں مگر......"

درمیان میں ہی جنو بھاؤ نے ٹوکا: "مگر یہ سب شجرہ نسب آپ مجھے کیوں سُنا رہے ہیں؟"

"میں اُسی طرف آ رہا ہوں، آپ کی لڑکی سے، جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں، پہلی نظر میں مجھے پیار ہو گیا ہے، آپ کی شوشل زندگی دیکھکر مجھے فکر ہوتا ہے کہ آپ کو لو میرج کہاں تک سچے گی۔ لیکن آپ ہی خیال فرمائیے کیا شنکر نے پاروتی سے لو میرج نہیں کی تھی، کیا سری کرشن نے لکمنی سے ارجن نے سبھدرا سے اور اتنا ہی نہیں برہم دیوتے....."

"ارے باپ رے، تم برہم دیو کی بھی شادی کروانے کی سوچ رہے ہو کیا، دیکھو انہوں نے کبھی کسی سے....."

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی؟ مگر اُنکے دوسرے گھوٹالے کیا کم تھے؟ تبھی سے تو برہم گھوٹالا، لفظ کی پیدائش ہوئی ہو۔ ہاں تو میں آپ سے کیا کہہ رہا تھا، کہہ نہیں رہا تھا، التجا کر رہا تھا کہ جیسے بھی ہو آپ اپنی لڑکی کی منگنی مجھ سے...."

"منظور کر لیجئے، یہی نا؟ ہا، ہا، ہا! اتنی سی بات کے لئے تم نے بھی کیا تمہید باندھی۔ مگر شوشل زندگی کا پرائیویٹ زندگی سے کیا تعلق؟ ہماری پلی کو اچھا گھر اور شوہر کیسے ملے میں اسی فکر میں تھا۔ تمہاری منگنی کی بات سُنکر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ ٹھہرو میں پلی ہی کو یہاں بُلا کر پوچھتا ہوں کہ کیوں ری شیطان، ہماری چِنتا تو اس طرح مٹانے والی تھی—سپلے او پلے—"

اس طرح آوازیں دیتے ہوتے جنو بھاؤ اندر کے زینے کے پاس گئے اور وہاں سے چلانے لگے— "اری او! ذرا پلی کو اوپر بھیجدینا، جلدی سے، پر دو پیالے چائے چاہیئے۔ پلی ہی کو لیکر آنیدو۔"

پانچ سات منٹ بعد ہی بھاٹیہ کو زینے پر چائے کے پیالوں کی آواز سُنی۔ جھپٹ کر اس نے اپنے کوٹ کی آستینیں دُرست کیں، نکٹائی کی گرہ ہلا کر ٹھیک کی۔ جیب سے کنگھا نکال کر وہ بال کاڑھنے کے خیال میں تھا مگر یہ سوچکر کہ جنو بھاؤ کے سامنے اس قدر تڑک بھڑک غیر مناسب ہوگی وہ رُک گیا۔

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ محبوبہ کے دروازے میں ظاہر ہوتے ہی کتنے سینکڑوں ہنسی چہرے پر نمودار ہونی چاہیئے۔ اس کا یہ حساب پورا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اُس کی نگاہ درمیانی دروازے پر پڑی اور پلی آتی دکھائی دی۔ اُس وقت وہ ایک منظر دیکھتے ہی چونک پڑا—
"یہ کون؟؟؟"

جنو بھاؤ نے جواب دیا: "ہماری پلی یہی تو ہے۔"
پلی! ہاتھی کا ایک چھوٹا سا پلہ ہی آ رہا تھا۔

بھاٹیہ پھر بولا: "شی شی، یہ وہ نہیں ہے، اِسے زنانے ڈبے میں کون بیٹھنے دیگا۔ یہ تو مال گاڑی کے ڈبے کی رونق بڑھانے والی ہے، اور اس کے بیٹھنے پر گاڑی چلے گی بھی؟ جنو بھاؤ میں چاروں ویدوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری متعارف یہ نہیں ہے۔ مجھے یہ چائے نہیں چاہیئے نمستے!—"

اور اپنا بیگ سنبھال کر بھاٹیہ ایک ہی چھلانگ میں سب سیڑھیاں پار کر آنگن میں آ رہا۔ اُوپر کی کھڑکی سے جھانک کر جنو بھاؤ بولے: "ارے ایسا بھی کیا بھاگنا؟ ارے ہادو، اُن سے کہہ....."

بھاؤ ڈیا بھی اپنی کوٹھڑی میں سے چلایا: "ارے مسٹر، آپ میرے

ہاتھ ایک ریڈیو سیٹ بیچنے والے تھے نا؟ پھر بھاگ کیوں رہے ہیں؟ آئیے آئیے، ارے مہادَو!"

بھالیہ نے گردن گھما کر دیکھا، کھڑکی سے جھانکتی ہوئی پلی بھی کہہ رہی ہے: "ارے مہادو، روک، روک انہیں!"

اورنگ زیب کے دربار سے پلاتن کرنے والے سیواجی کی طرح بھالیہ نے جنو بھاؤ کے دلّی دروازے سے ایک چھلانگ ماری اور سڑک پر آتے ہی وہ دوڑنے لگا۔ اس کا تصور اُسے پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ جنیرے خاندان کے دُودشتوں کی چیخ و پکار اُس کے کانوں میں پڑ رہی تھی ــــ ارے مہادو، روک اُنہیں! پکڑ اُنہیں! ـــ بیچ راستے میں ایک آدمی اُسے دیکھ کر چلّایا: "ارے بیگ چُرا کر بھاگ رہا ہے، اُچکا ہے اُچکا!" اور اُس کی آواز سُنکر سات آٹھ آدمی اُسکے پیچھے ہو لئے۔

بھالیہ مارے خوف کے بیہوش ہو ہی گیا۔ مرد، عورتیں، لڑکے، سائیکلیں، تانگے، کچھ بھی اُسے صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔ اُسے صرف یہی دھیاں تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے دوڑ لگائے۔ اور اسی بھاگ دوڑ میں وہ ایک موڑ پر اُدھر سے آنے والی ایک سائیکل سے ٹکرا گیا۔ لوگوں کا ایک جھنڈ اُسکے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ کوئی بولا: "اُچکا ہے اُچکا، پولیس میں دے دو۔" کوئی بولا: "نہیں جی نہیں بھلا آدمی نظر آتا ہے۔" کوئی بولا: "ارے دیکھتے کیا ہو، بچارے کے سر میں چوٹ لگی ہے، اُٹھاؤ اسے۔" ایک نے بتایا: "ارے اُسے اُدھر اس گھر میں لے چلو جہاں ڈاکٹر ککلکرنی رہتے ہیں۔ گھر یہ ہی مِل جائیں گے ــــ"

ہوش میں آتے ہی بھالیہ چلّایا: "ارے یہ وہ نہیں ہے، میں باز آیا تمہاری چائے سے، چھوڑ مجھے!"

وہ بستر سے اُٹھنے لگا، کسی نے اُسے روکا، اور آواز آئی: "تمہیں بالکل چپ چاپ لیٹے رہنا چاہیئے۔ کاکا جاتی بار کہہ گئے ہیں کہ....."

کاکا؟

یعنی وہ جنو بھاؤ کے گھر میں نہیں ہے تو پھر؟

اور یہ میٹھے الفاظ؟

بھالیہ نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں اور دیکھنے لگا کہ اُس کی چارپائی کے پاس کون ہے۔ اور اُس نے دیکھا کہ پچھلے پانچ دنوں سے وہ جس کے لئے تڑپ رہا تھا وہی!

وہ ہنسکر بولا: "تم یہاں کہاں؟"

ہنسکر ہی اُس نے جواب دیا: "اور کہاں، میں اپنے گھر میں ہوں۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ جنو بھاؤ جنیرے تمہارے پتا ہیں۔"

وہ زور سے ہنس پڑی: "تم نے اُسے سچ بھی مان لیا!"

"تم جھوٹ بولو گی، یہ تھوڑی سوچا تھا۔"

"تم روز روز ہی میرے گھر کے چکر کاٹنے لگو گے، اس لئے میں نے دھوکا دیا تھا!"

"بہت اچھا کیا، تمہارا دھوکا میری پیشانی پر کتنا صاف اُبھر آیا ہے۔ دیکھو ذرا....؟"

"ہائے ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ ایسا کہہ دینے کا یہ نتیجہ ہوگا۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے، مجھے معاف کر دو۔"

اتنا کہہ کر وہ نیچے جھکی اور اُس کی پیشانی پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔ اُسکی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر وہ بولا: "مگر دیکھو میں کتنی صفائی سے تمہارے گھر میں گھسا، اب کیسے مجھے نکالو گی؟"

شرما کر اُس نے مُنہ چھپانے کی کوشش کی اور بولی: "مگر نکالنے کو کہتا کون ہے۔"

اتنے ہی میں بھالیہ کو ایک بات یاد آ گئی۔ اُس نے کہا: "اب تو اپنا نام بتاؤ گی؟"

"نام کیا اس دن نہیں بتایا تھا؟"

"خوب، اگر اُس دن بتا دیا ہوتا تو میں اُس پلی جی راؤ کو لینے ہی کیوں مرتا؟ ـــ اچھا اپنا نام بتلاؤ۔"

"میرا نام.... لیلا ہے!"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا، بعد میں بھی یہی رکھونگا۔"

"بعد میں؟ یعنی؟"

"اوہو، جیسے جانتی ہی نہیں، پیشانی پر ہاتھ رکھنے کا کیا مطلب ہے ــــ؟"

"اب میں یہاں نہیں ٹھہرنے کی۔" کہتی ہوئی لیلا جھٹ پٹ اندر چلی گئی۔

بھالیہ بہت دیر تک جس دروازے سے وہ اندر گئی تھی اُدھر دیکھتا رہا۔ اُسکے دل کے سبھی ٹکڑے جُڑ گئے تھے۔ پھر اس یاد سے کہ اُسکے دل سے ایک دوسرا دل بھی وابستہ ہے، وہ خوشی سے کانپنے لگا۔

اندر کے کمرے میں لیلا ریڈیو سُن رہی تھی۔

ہرش میں اُمڈ کے ساگر نہیں جانتا دھیریہ

"ن۔ بس۔ پھڈکے"

راہی!

دیہاتی بولیاں

آئیے آپ کو پنجاب کے دیہاتوں کی سیر کرائیں۔ یہ ہندوستان کے وہ دیہات ہیں جہاں رومان تہذیب و تمدن کے بوجھ سے بالکل آزاد ہے۔ جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ یہاں کا عشق ایسا سونا ہے جس میں مٹی ملی ہوئی ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک ان دیہاتوں میں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ قدم قدم پر آپ کو شاعری نظر آئیگی جو اوزان کی قید اور لفظی بندشوں سے بالکل آزاد ہے۔

یہاں کی کھلی ہوا میں آپ چلیں پھریں گے تو آپ اپنے اندر ایک نئی زندگی پائیں گے۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ بھی عشق کر سکتے ہیں، آپ کے اندر بھی پھیل کر والہانہ وسعت اختیار کر لینے کی قوت موجود ہے، آپ بھی پرندوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں اور ہواؤں کی گنگناہٹ آپ کے لئے بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ جب ابابیلیں خاموش آسمان میں ڈبکیاں لگاتی ہیں اور شام کو چمگادڑیں قطار اندر قطار جنگلوں کی طرف تیرتی ہیں اور گاؤں واپس آنے والے ڈھور ڈنگروں کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو بجتے ہیں اور فضا پر ایک دلفریب ناچ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو آپ کا دل بھی کبھی پھیلے گا اور کبھی سکڑیگا۔

وہ دیکھئے، سامنے کچے کوٹھے زمین پر لیٹے ہوتے ہیں۔ دیوار دیوار پر بڑے بڑے اُپلوں کی قطار دُور تک چلی گئی ہے۔ مٹی کے یہ گھروندے بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں کیونکہ ان میں فاصلہ نہیں۔ ایک کوٹھا دوسرے کوٹھے سے ہمکنار ہے، اسی طرح اس کھلے میدان پر ایک اور کھلا میدان بن گیا ہے۔ اِن کوٹھوں پر چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں۔ گنے کے لمبے لمبے چھلکے جا بجا بکھرے ہوتے ہیں۔ دوپہر کا وقت ہے دھوپ اتنی تیز ہے کہ چیل بھی انڈا چھوڑ دے۔ فضا ایک خوابگوں اداسی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی کسی چیل کی باریک چیخ اُبھرتی ہے اور خاموشی پر ایک خراش سی پیدا کرتی ہوئی ڈوب جاتی ہے.... مگر اس تیز دھوپ میں یہ کوٹھے پر کون چڑھا ہے.... ارے، یہ تو کوئی اس گاؤں کی مٹیار (نوجوان لڑکی) ہے۔ دیکھو تو کس انداز سے تپے ہوئے کوٹھے پر ننگے پیر چل رہی ہے۔ یہ لو وہ کھڑی ہو گئی۔ اسے کس کا انتظار ہے۔ اُس کی آنکھیں کسے ڈھونڈ رہی ہیں۔ ببولوں کے جھنڈ میں یہ کیا دیکھ رہی ہے۔ کب تک یہ ایسے کھڑی رہے گی۔ کیا اس کے پیر نہیں جلتے۔ شاید اسی نے یہ کہا ہوگا:

کوٹھے اُپر کھڑیاں میری سڑگیاں پیر دیاں تلیاں

میرا یار نظر نہ آوے

(ترجمہ:۔ میں کوٹھے پر کھڑی ہوں اور یوں کھڑے کھڑے میرے پیر کے تلوے جل گئے ہیں — لیکن میرا عاشق نظر نہیں آتا۔)

نہیں اس نے تو گنّے کے سوکھے ہوئے چھلکے اکٹھے کرنے شروع کر دئے ہیں.... لیکن یہ پھر بار بار اُدھر کیوں دیکھتی ہے جدھر بوڑھے برگد کے سائے تلے ایک نوجوان ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لئے کھڑا ہے.... کیا یہ اِس کا "وہ" تو نہیں؟.... اس کی لاٹھی پر پیتل کے کوکے کتنے چمک رہے ہیں!

ہم اِدھر نوجوان کی طرف دیکھتے رہے اور اُدھر آخری کوٹھے پر جو کہ یہاں سے کافی دور ہے ایک اور نوجوان لڑکی نمودار ہو گئی۔ دُور سے کچھ دکھائی تو نہیں دیتا مگر اُسکی ناک کی لونگ کتنی چمک رہی ہے۔ کیا اسی لونگ کے بارے میں یہ کہا گیا تھا:

تیرے لونگ دا پیا لشکارا ہالیاں نے ہل ڈک لئے

(ترجمہ:۔ تیرے لونگ (ناک کی کیل) نے جب چمک پیدا کی تو ہل چلانے والوں نے اپنے ہل روک لئے۔ (اس خیال سے کہ بجلی چمکی ہے اور بارش آرہی ہے۔)

اجی نہیں یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہے.... یہ دیکھئے، اِدھر کی لڑکی اُس لڑکی کو اشارہ کر رہی ہے۔ شاید اُسے آنے کیلئے کہہ رہی ہو۔ پھر اُس طرف بھی جھک کر دیکھتی ہے جہاں گاؤں کا وہ نوجوان آدمی سائے تلے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ سے لاٹھی پکڑے ہے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑے ہوئے تعویذوں سے کھیل رہا ہے۔ اس منظر کو دیکھکر وہ "بولی" یاد آجاتی ہے جو اس گاؤں کے تمام لڑکوں کو یاد ہے۔ کیا ہے؟... ہاں...

منڈا موہ لیا تویتاں والا دمڑی دا سگ مل کے

(ترجمہ:۔ ایک تگڑے جوان کو جس نے آفات سے محفوظ رہنے کے لئے تعویذ پہن رکھے تھے ایک لڑکی نے دمڑی کا سگ (اخروٹ یا کسی اور درخت کی چھال جس سے ہونٹ رنگے جاتے ہیں۔) مل کر موہ لیا۔)

پھر اشارے ہو رہے ہیں۔ اِدھر کی لڑکی اُسے جلدی آنے

کے لئے اشارہ کر رہی ہے.... صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی۔

کوٹھے کوٹھے آ کچھیتے   تینوں بنتو کا یار وکھا واں

(ترجمہ:۔ کوٹھے کوٹھے چلی آ کچھی.... میں تجھے بنتو کا عاشق دکھاؤں)

کیا پتہ ہے کہ یہ نوجوان جو برگد کے سائے تلے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے بنتو ہی کا عاشق ہو۔ بنتو کا نہ ہوگا تو کسی اور کا ہوگا۔ کیونکہ بہرحال۔ اِسے کسی کا تو عاشق ہونا ہی چاہیئے۔ دیکھئے کس انداز سے کھڑا ہے۔ سر پر سفید کھادی کا صافہ باندھ رکھا ہے اور اپنے آپ کو کس قدر اہم سمجھ رہا ہے۔ اس کو دو جوان لڑکیوں نے اس حالت میں دیکھ لیا ہے، اب سارے گاؤں کی کنواریوں کو معلوم ہو جائے گا کہ سر پر سفید کھادی کا صافہ باندھ کر وہ برگد کے سائے تلے کھڑا تھا۔ کیا کیا باتیں نہ ہونگی۔ پھبتیاں اُڑائی جائیں گی اور کنوئیں پر دیر تک ہنسی اور قہقہوں کے چھینٹے اُڑتے رہیں گے۔ اور کیا پتہ ہے کہ کوئی شریر چھوکری اُونچے سُر میں یہ گانا شروع کر دے:۔

سر تَن کے کھدّر دا صافا   جیندرا شوقین ہو گیا

(ترجمہ:۔ سر پر کھادی کا صافہ باندھ کر بے چارہ شوقین ہو گیا ہے۔)

یہ چھوکری جب ہنسے گی تو اُس کے دانتوں میں ٹھکی ہوئی سونے کی کیلیں بھی ہنسیں گی اور کیا پتا ہے کہ وہاں پاس ہی کسی جھاڑی کے پیچھے کوئی شریر لونڈا چھپا بیٹھا ہو۔ وہ یہ ہنستی ہوئی کیلیں دیکھ لے اور اُٹھ کر جب کھیتوں کا رُخ کرے تو دفعتاً اُسکے ہونٹ وا ہوں اور یہ بولی پرندے کی طرح پھُر سے اُڑ جائے۔

موج سنیارا لے گیا   جنہیں لائیاں دنداں وچ میکھاں

(ترجمہ:۔ مزا تو وہ سنیارا لے گیا جس نے تمہارے دانتوں میں یہ کیلیں جڑیں۔)

یہ لڑکا جب کھیتوں سے لَوٹ کر گاؤں آئے گا اور شام کو چوپال پر حقّے کے دَور چلیں گے تو وہاں وہ سفید صافے والا بھی ہوگا۔ اس کو معلوم ہو جائے گا کہ کنوئیں پر پانی بھرنے کے دوران میں کس ظالمانہ طریق پر اُس کا مضحکہ اُڑایا گیا ہے تو وہ افسردہ اور مغموم ہو جائیگا۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اُس کو اپنی معشوقہ کی بے رُخی ستاتی رہے گی، ایک آہ کی صورت میں آخرکار اس کے سینے میں یہ الفاظ اُٹھیں گے:۔

کلا ملکریں تا حال سُناواں
دُکھاں وچ پے گئی جندڑی

(ترجمہ:۔ اس میں اپنے کسی دوست کو یا اپنے ہی آپ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اگر تم مجھے اکیلے میں ملو تو میں تمہیں سارا حال سُناؤں۔ میری زندگی دُکھوں سے گھِر گئی ہے۔)

بہت ممکن ہے وہ اپنے کسی دوست کو ہمدرد جان کر حالِ دل کہے اور یوں اپنے دل کا غبار ہلکا کرے مگر اتفاق ایسا ہو کہ اُن دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے اور جس کو اُس نے اپنا ہمدرد بنایا تھا اُسے سارے گاؤں میں نشر کر دے۔ اس پر یہ کوئی ضرور کہے گا:۔

یاری وچ نہ وکیل بنائیے   لڑکے دَس دیو گا

(ترجمہ:۔ عشق میں کسی کو وکیل نہ بنانا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اُس سے لڑائی ہو گئی تو وہ سارا بھید کھول دیگا۔)

پھر نامراد عاشق یہ سمجھ کر کہ اُس کا عشق ناکام رہا ہے ہل چلاتے ہوئے دوپہر کی اُداس دھوپ میں یکایک بول اُٹھے گا۔

میری لگدی کسے نہ ویکھی   تے ٹٹدی نوں جگ جان دا

(ترجمہ:۔ جب میری اور اُس کی محبت ہوئی تو کسی کو پتا تک نہ چلا مگر اب کہ یہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے ساری دُنیا کو معلوم ہو گیا ہے اور جگ ہنسائی کا باعث ہوا ہے۔)

لیکن کیا پتہ ہے کہ دوسری طرف اُس کی معشوقہ کو بھی کچھ کہنا ہو۔ کیا پتہ ہے کہ وہ اُس سے محبت کرتی ہو اور ظاہر نہ کر سکتی ہو، کیونکہ یہ بول اسکے مُنہ سے بغیر کسی وجہ کے تو نہیں نکلیں گے۔

یار سی سُرو دا بُوٹا   ویڑے وچ لا رکھدی

(ترجمہ:۔ میرا یار کیا تھا سرو کا درخت تھا۔ بس اُسے اپنے صحن میں لگا چھوڑتی)

اتنے میں فوج کی بھرتی شروع ہو جائے گی اور اُس کا یہ سرو قد یار لام پر چلا جائے گا۔ اُس کی دُنیا سُونی ہو جائے گی۔ جب برسات آئے گی، پیپل کے درختوں میں جھولے پڑیں گے، آم کے درختوں پر پپیہے پیہو پیہو پکاریں گے۔ کوئلیں کوکیں گی۔ سارا گاؤں خوش ہوگا تو وہ.... وہ اپنے گھر کی گیلی منڈیر کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھ کر پکارے گی۔

بول وے نمانیاں کاواں   کولاں کوک دیاں

(ترجمہ:۔ اے نمانے کوّے تو بھی بول، کوئلیں کوک رہی ہیں۔ کوّا اگر بولے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی عزیز آنے والا ہے۔)

میدان خالی ہونے پر اس کا گاؤں میں ایک اور عاشق بھی پیدا ہو جائے گا۔ وہ ہر روز اس اُمید پر اُس کے گھر کے پاس سے گذرا کرے گا کہ ایک روز وہ اُسے ضرور بُلائے گی اور اشاروں ہی اشاروں میں باتیں ہوں گی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ آخرکار وہ تنگ آ کر کہے گا:۔

کدی چندرے ہاک نہ ماری   چوڑے والی باں کڈ کے

(ترجمہ۔ لفظ چندری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اُردو میں اسکے لئے کوئی مترادف لفظ مجھے نہیں ملا۔ چندری پنجابی زبان میں مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے کبھی ہمدردی کے طور پر اسکو گفتگو میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں محبت اور شکایت دونوں اس میں حل ہیں۔ وہ اسکو چندری سے مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تو نے کبھی اپنے چوڑے (ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چوڑیوں کا ایک گروہ جو کلائی سے لیکر کہنی تک دیہات کی عورتیں پہنتی ہیں) والا بازو باہر نکال کر مجھے اشارہ نہیں کیا، مجھے اپنے پاس نہیں بلایا۔)

ایک زمانہ گذر جائیگا عشق کی داستان فسانہ بن جائیگی اور آخر ایک روز یہ دیہاتی حسینہ کسی کے ساتھ بیاہ دیجائیگی۔ اسکے بیاہ پر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونگی۔ لوگ اُس کا اور اُس کے خاوند کا مقابلہ کریں گے اور کوئی نوجوان چیخ اُٹھے گا۔

منڈا روہی دی ککر دا جاپتو   ویاہ کے لے گیا چندر ورگی

(ترجمہ۔ "روہی دی ککر" ایک خاص قسم کے ببول کو کہتے ہیں جسکی لکڑی بڑی کرخت اور کالی ہوتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرد جو کہ روہی کی ببول کی طرح کھردرا اور کالا تھا چاند جیسی دُلہن بیاہ کر لے گیا ہے!!)

پہلی رات آئے گی ہزاروں کپکپاہٹیں اپنے ساتھ لئے۔ ایک پلنگ پر دُلہن گٹھڑی بنی ہوئی اپنے حنا آلود ہاتھ جوڑے گی اور اپنے آمادہ ظلم خاوند سے منت بھرے لہجے میں کہے گی۔

میں نوں اَج دی رات نہ چھیڑیں   مہندی والے ہتھ جوڑ دی

(ترجمہ۔ مجھے صرف "آج" کی رات نہ چھیڑو۔ دیکھو میں اپنے حنا آلود ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔)

کیا وہ مان جائیگا؟ کیا جوڑے ہوئے حنا آلود ہاتھ اُس ظالم کے دل میں رحم پیدا کر دینگے؟ — خیر اس قصے کو چھوڑیئے۔ یہ مرحلہ کسی نہ کسی طرح طے ہو ہی جائیگا اور دُلہن پُرانی ہو جائیگی، پھر جھگڑے شروع ہونگے اور ایک روز اُس کا خاوند اُسکے پہلے عاشق کو بُرا بھلا کہیگا تو وہ اُسوقت سینے پر پتھر رکھکر خاموش تو ہو جائیگی مگر اکیلے میں اسکے منہ سے یہ بول نکلینگے۔

میرے یار نوں مندا نہ بولیں   میری بھانویں گت پٹ لئیں

(ترجمہ۔ میری تم چٹیا جڑ سے اُکھیڑ لو، مگر میرے یار کو بُرا بھلا نہ کہو۔)

اور.... اور پھر.... یونہی عمر بیت جائے گی اور یہ فسانہ اُس دیہات میں نئے فسانے پیدا کریگا۔

سعادت حسن منٹو

کھلی چٹھی بنام کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو

مکرمی۔ تسلیم۔

میں نے لاہور، لکھنؤ اور دہلی کے ریڈیو اسٹیشنوں کو کئی بار لکھا کہ آخر عورتوں کیلئے ایک علیحدہ پروگرام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟ لیکن صرف یہ جواب ملا کہ "خواتین کی زیادہ تعداد کی رائے میں ایک علیحدہ پروگرام ضروری اور مفید ہے"۔ کوئی معقول اور مدلل وجہ نہیں بتائی گئی۔ یہ میں نے مانا کہ بیشتر خواتین کی رائے ہے مگر کوئی وجہ بھی اس کی دی جاسکتی ہے؟۔ میں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ہمیں ایک علیحدہ ویٹنگ روم علیحدہ ریل کے کمپارٹمنٹ اور علیحدہ شعبۂ تعلیم کی ضرورت ہے کیونکہ دو اجناس کی جسمانی موجودگی ایسے مقامات پر معیوب ہے۔ اور تخلیہ کی ضرورت بھی ہے۔ لیکن باوجود غور کے میرے دماغ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ یہ "ہوا" میں ہمیں تخلیہ کی کیوں ضرورت ہے۔ وہاں تو جسمانی وجود کا خطرہ نہیں رہتا پھر آخر "عورتوں کا پروگرام" کس لئے ہے؟ وہی پرانی بات پھر پوچھتی ہوں کہ کیا عورتیں، بچوں اور دہاتی لوگوں کی طرح کچھ دماغی حالت میں کم ہیں کہ اُنہیں عام پروگرام کے علاوہ ایک جدا خوراک کی ضرورت بھی ہے۔ یا وُہ عام پروگرام سے لطف اندوز نہیں ہوسکتیں؟ اگر یہی ہے تو پھر آپ ایک جدا پروگرام "صرف پاگلوں کے لئے" بھی رکھئے۔ کیا وجہ کہ پاگلوں اور مخبوط الحواس لوگوں کے حقوق کو ریڈیو نہ تسلیم کرے؟ آپ کہیں گے کہ زیادہ تعداد پاگلوں کی اگر باقاعدہ عرضی دے تو آپ ضرور ایسا ایک پروگرام رکھیں۔ یا شاید "عورتوں کا پروگرام" رکھتے وقت آپ اِس فرض سے بھی سُبکدوش ہو چکے۔

آپ کو ضرور تعجب ہوگا کہ آخر مجھے "عورتوں کے پروگرام" سے کیوں دُشمنی ہے۔ شاید Inferiority complex ہے جس کا مرض تعلیم یافتہ عورتوں کے سر زبردستی تھوپ دیا گیا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ مجھے کمزور جنس ہوتے ہوئے اعتراف سے انکار ہے اور اُس جُدا اور ضروری دوا کی خوراک کو جو ہر ہفتے زبردستی گلوں سے اُتاری جاتی ہے نگلنے سے بچوں کی طرح اِنکار کر رہی ہوں۔ میں نے مانا کہ عورتیں دماغی، جسمانی اور بھی دوسری حالتوں میں کمتر اور ذلیل تر ہیں۔ مگر بندۂ ایزد کا اِس طرح اشتہار دیکر خواہ مخواہ ہم لوگوں کو چڑانے پر تو کمر نہ باندھیے۔ اگر واقعی آپ ہماری بھلائی کے لئے یہ علیحدہ ٹونک دیتے ہیں تو خدا شکر ہیں لپیٹ کر دیجئے تاکہ نگلا تو جاسکے! مردوں کے پروگرام میں ہی ہمارے کام کی باتیں بھی رکھ دیجئے۔ وہ اگر بہت زیادہ مردوں کے لئے خطرناک ہوں اور وہ کسی طرح بھی اُنہیں سُننے پر تیار نہ ہوں تو وہ بڑی خوشی سے سٹیشن بدل سکتے ہیں۔ پروگرام کے سب ہی عنوان ہر ایک کے لئے دلچسپ نہیں ہوتے۔

آپ کا یہ بھی خیال ہوگا کہ ہم نے تو اس قدر عنایت کی اور عورتوں کو بے مانگے حقوق دینے کو تیار ہیں کہ اُن کے لئے الگ پروگرام کا انتظام کیا تو جناب یہ سال میں اڑتالیس گھنٹے تو ہمارے پروگرام کے، اور باقی؟ باقی سب "مردانہ پروگرام" مگر آپ اس باقی کے پروگرام پر "مردوں کا پروگرام" کیوں نہیں لکھتے۔

جانے دیجئے اِن باتوں کو بھی چھوڑیئے، آپ، اِسے جذباتی ڈھکوسلہ کہیں گے۔ مجھے اصل اعتراض اس لئے ہے کہ آپ نے ایک خاص وقت مقرر کر لیا ہے کہ اسے کسی طرح عورتوں ہی کے لئے گنوانا ہے تو پھر کسی نہ کسی طرح اسے مرگر کر بِتا ہی دیتے ہیں۔ عورتیں خود تو اس میں دلچسپی لیتی نہیں تو پھر آپ کیوں اس میں سر ماریں۔ مگر سچ مانئے آپ کسی خاص گروہ کیلئے ایک علیحدہ پروگرام بنا کر اُن سے دلچسپی لینے کی درخواست کرینگے تو وہ یقیناً قاصر رہیں گے۔ میں شاید سمجھا نہیں سکتی کہ کیوں ایک بات اگر ہمیں "تمہیں اسکی الگ ضرورت ہے"، کہہ کر دی جائے تو ذرا بوجھ سا معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور ہم کسی طرح بھی اُس میں دلچسپی نہیں لے پاتے۔

ایک اور بھی بات ہے کہ (وہ چیز جو صرف عورتوں کے لئے ہے مرد کبھی سُننے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ کوئی لکچر جب تک مؤثر ثابت نہیں ہوسکتا جب تک کہ عورت اور مرد دونوں اُسے نہ سُنیں) صرف عورتوں کو لکچر دینے سے کیا فائدہ جبکہ مرد جو کہ اُن کی زندگی کے ہر شعبے کا رکھ رکھاؤ اور دیکھ بھال کرتے ہیں، وہ کبھی اُسے نہ سُنیں۔ فرض کیجئے ریڈیو پر بتایا جاتا ہے کہ بچوں کو شرارتوں پر اس طرح تنبیہہ کی جائے اور وہ اس پر عمل کرنے کو تیار ہیں مگر والد صاحب اُن بچوں کے وہ لکچر نہیں سُن پاتے اور وہ اُن پر غور نہیں کرتے، اور جب گھر کا اس قدر خاص فرد کسی بات پر عمل نہ کرے تو اکیلی عورت کیا کر سکتی ہے۔ اگر ریڈیو پر تقریر ہوتی ہے کہ عورتوں کو مصنوعات سے پرہیز کرنا چاہیئے

مگر شوہر صاحب چاہتے ہیں کہ اُن کی بیوی پھیکی پھیکی نہ لگے اور روز پاؤڈر اور لپ اسٹک لگائے۔ اب آپ کیا یہ اُمید رکھتے ہیں کہ عورتیں ریڈیو سُنکر فوراً شوہروں کو لکچر کا خلاصہ سُنائیں؟ یا کیا کریں؟ مفید تقاریر دونوں جنسوں کے لئے مفید ہیں۔ جب تک زندگی کے دونوں پہیوں میں برابر کا تیل نہ دیا جائے گاڑی نہیں چل سکتی۔

شاید آپ کا خیال ہے کہ مردوں کو تو کچھ سکھانے کی ضرورت ہی نہیں وہ تو ماں کے پیٹ سے سب ہی کچھ جانتے بوجھتے پیدا ہوتے ہیں۔ بھلا انہیں بچّوں کی دیکھ بھال کے متعلق کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہے تو خیر، ورنہ سب ہی مرد سائیکالوجی اور فزیالوجی نہیں پڑھتے اور بچوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرتے ہیں جو جنگلی سے جنگلی ماں بھی نہیں کرسکتی۔

ایک اور بات عرض کرنا ہے وہ یہ کہ عورتوں کے پروگرام میں الگ پھر سے گانا اور ریکارڈ کیوں ہوتے ہیں؟ سارے پروگرام کا گانا کیا کافی نہیں ہے جو یہ خاص طور پر پھر سُنایا جاتا ہے۔ دوسرے یہ اتوار ہی کو پروگرام کیوں ضروری ہے؟ عموماً عورتیں گھر پر رہتی ہیں اور سب دن اُن کے اتوار ہی ہیں۔ ہاں اتوار خاص طور پر چونکہ مردوں کو چھٹی ہوتی ہے بچے اسکول نہیں جاتے اس لئے عورتوں کی چھٹی کا دن اتوار نہیں ہے۔ ایسی عورتیں بہت کم ہیں جنہیں مردوں کی طرح اتوار کی چھٹی منانے کو ملتی ہے۔ بہتر ہے اگر عورتوں کو یہ ٹائم دوپہر کو ملے جبکہ وہ کام کاج سے فراغت پاکر چین سے بیٹھتی ہیں۔ اگر روزانہ چھوٹا سا پروگرام ہوگا تو بجائے دوپہر کو سستی میں سونے یا محلہ والیوں سے گپیں مارنے کے عورتیں جمع ہوکر کچھ سیکھیں گی۔ عورتوں کا ملاقات کا وقت عموماً دوپہر ہوتا ہے۔ مگر میری پہلی رائے تو یہی ہے کہ تقاریر تو ایسے موقع پر ہوں جبکہ مرد بھی سُن سکیں۔

رہا عورتوں کی زیادہ تعداد کی رائے کا سوال تو بیشک ذرا ٹیڑھا ہے۔ جب کبھی مردوں نے ہمیں کسی بات سے محروم کیا عورتوں کی زیادہ تعداد اُن کی طرفدار ہوگئی۔ جب مردوں نے عورتوں کو دُنیا سے الگ کرکے صرف گھروں کی چار دیواری میں قید کیا تو زیادہ تعداد عورتوں کی رائے ہوئی کہ "ہاں ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ ہم مردوں کے دوش بدوش جنگلوں میں ماری ماری نہیں پھر سکتیں"۔ جب مردوں نے کہا بیوہ ہونے کے بعد عورت کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے تو وہ فوراً جل مرنے کو تیار ہوگئیں اور بیشتر کی رائے ہوئی کہ "ضرور جل مرنا چاہیئے"۔ غرض جو کچھ آپ نے کہا عورتوں نے کثرت رائے سے مان لیا۔ اور اب جب آپ لوگ کہتے ہیں عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرسکتی ہیں اور اُن کو اس کی ضرورت ہے۔ عورتیں چلّانے لگیں "بیشک بیشک ہمیں آزادی کی سخت ضرورت ہے"۔ لہٰذا اب تو آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ عورتوں کی کثرت رائے کیا حیثیت رکھتی ہے۔ اب اس کثرت کی کثرت کا تو ذکر چھوڑیئے۔ اور reason کو لیجئے۔

وہ صاحبہ جو عورتوں کے پروگرام کے لئے خاص طور پر ذمہ دار ہیں اُن کو عام پروگرام ہی میں ایسی چیزیں مہیا کرنی چاہئیں جو عورتوں کے لئے خاص طور پر اور مردوں کے لئے عام طور پر مفید ہوں۔ وہ صرف پروگرام میں عورتوں کو ـــــ represent کریں۔ اُمید کہ آپ میری اس لمبی چوڑی خامہ فرسائی کو معاف فرمائیں گے۔ اور اگر میں مغالطہ میں ہوں تو اسے دُور کرکے احسان فرمائیں گے۔ آپ یہ خط یا اسے دفتر جھ لیجئے میری بہنوں کے سامنے پڑھکر اُن کی رائے لے لیجئے۔ اور اُن سے بھی میری طرف سے درخواست کر دیجئے کہ میری مدد فرمائیں اور مجھے اِس معاملے میں تشفّی بخش جواب عنایت فرمائیں۔

خاکسار

عِصمت چغتائی

نقد و تبصرہ

گلبانگِ حیات یہ اُردو کی ارتقائی شاعری کا ایک کامیاب مجموعہ ہے جس کے مصنّف کو اہلِ ادب حضرت امینِ حزیں اور عوام خان بہادر محمد مسیح پال کہتے ہیں. جیسا کہ خود ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے ؎

ادب نواز کہا کرتے ہیں امینِ حزیں
مگر عوام محمد مسیح پال مجھے

شکر ہے کہ اُردو کی اُس غزلگوئی کا دور جو فاحشانہ شاعری سے قریب تر ہو گیا تھا حکیمانہ شاعری سے مبدّل ہوتا جا رہا ہے. حضرت امینِ حزیں کی شاعری کو اسی نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے وہ بجا طور پر اقبال کی رُوح شاعری کے علمبردار اور اُن کے معنوی شاگرد ہیں۔ اس مجموعہ میں بالغ نظر شاعر نے اپنی قوم کے روبرو ایسا خوانِ سخن پیش کیا ہے جس میں بدرجۂ وافر ذہنی و دماغی لذت اندوزی کا سامان مہیا ہے۔ اور ابتدا میں سر عبدالقادر کا بصیرت افروز دیباچہ ہے۔

اس مجموعے کی نظمیں "دعا" "شعور و وجدان" "ستارۂ صبح" "آرزو" "خودی" "خدائے خودی کے حضور میں" "اقبال بارگاہِ باری تعالیٰ میں" "انسان" "شکوۂ شیطان" اچھی اور بہت اچھی ہیں. "طیارہ" جس میں ایک ہوائی پرواز کے مشاہدات قلمبند کئے ہیں، کیا خوب فرماتے ہیں ؎

مایا کے پھندوں میں جکڑے — دُنیا کے دھندوں میں جکڑے
رفعت کیا ہے ان کو خبر کیا — ہوتے ہیں یہ قلب و نظر کیا
کیچڑ کا کیڑا کیا جانے — دیوانے ہیں کیوں پروانے
رفعت کی کیوں رُوح کو دُھن ہے — کیوں پرواز کا اس میں گُن ہے
پستی سے ہے کیوں گھبراتی — کیوں رفعت ہے اس کو بھاتی
رفعت پریم ہے، پریم ہے رفعت — پستی ہے مایا کی اُلفت

غزلوں میں اقبال کے آخری دورِ تغزّل کی جھلک پائی جاتی ہے. یہ اگرچہ شاعر کے اس علوی تخیّل سے جو نظموں میں کارفرما ہے بیشتر حد تک معمور نہیں مگر پھر بھی بعض اشعار خوب ہیں. مثالاً اسی غزل کو پڑھیئے اور سر دُھنیئے ؎

نَے کا ہے نام رکھدیا کس نے — لَے میں پیغام رکھدیا کس نے
مختصر سی حیات میں جا سے — اس قدر کام رکھدیا کس نے
دل کی بیتابیوں کے عالم کا — زندگی نام رکھدیا کس نے
پی رہا ہوں کہ پڑ گیا پینا — سامنے جام رکھدیا کس نے
یہ حقیقت کا آئنہ ہے امیں — اس کا دل نام رکھدیا کس نے

معارف و نکات کے تحت میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس کو جناب امینِ حزیں کے حکیمانہ تخیّلات کا رس سمجھیے. مشتے از خروارے مندرجہ ذیل قطعات کو ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ تگ و دو پیٹ بھرنے کیلئے — کچھ نہیں کیا اور کرنے کے لئے
بڑھ گئی ہے حد سے جینے کی ہوس — کون آمادہ ہے مرنے کے لئے

جو ہر اُفتاد کو تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں
خود اپنی خود فریبی کی وہی تشہیر کرتے ہیں
یہ جبر و قدر کے مارے ہوئے نافہم کیا جانیں
ہمیں تخریب کرتے ہیں ہمیں تعمیر کرتے ہیں

حُسن بے عشوہ و انداز فضول — عشق بے جذبۂ جانباز فضول
تیغ بے بازوئے بیباک عبث — بازِ بے جوہرِ پرواز فضول

خودی کو بیچ کے صدق و صفا کو بیچ دیا
متاعِ خانۂ شرم و حیا کو بیچ دیا
حرام اُس پہ ہے جینے کی آرزو جس نے
بھرے سے جینے ہی کے مدعا کو بیچ دیا

حقائق کے تحت میں زندگی کی کتنی مختصر اور مکمّل تعریف فرمائی ہے ؎

غم سے آزاد بھی تو رہ نہ سکا — وقفِ فریاد بھی تو رہ نہ سکا
دُھوپ چھاؤں تھی اِک بجر اسکی — اور کچھ یاد بھی تو رہ نہ سکا

اُردو اکیڈمی پنجاب نے یہ کتاب نہایت دیدہ زیب شائع کی ہے۔ جلد کپڑے کی، سنہری ٹھپّہ۔ قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ: ساقی بُک ڈپو۔ دہلی، "ن۔ س"

سالنامہ ساقی جنوری سنہ ۴۱ء

مندرجہ ذیل حضرات کے مضامین موصول ہو چکے ہیں

علمی مضامین:۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی۔
پروفیسر سراج حسین نقوی
محمد احمد سبزواری
پروفیسر محمد مسلم
منظور حسین ماہر القادری
لطیف الدین احمد اکبرآبادی
سید بادشاہ حسین؛

ڈرامے:۔

انصار ناصری دھلوی
حفیظ جاوید
ناکارہ حیدرآبادی

منظومات:۔

آزاد انصاری۔ امین حزیں۔ سید علی منظور
کوکب شاہجہانپوری۔ ماہر القادری۔ شاد
عارفی۔ راحت سعید خان۔ جاں نثار اختر۔ بہزاد لکھنوی۔

افسانے:۔

ایم۔ عنایت اللہ دھلوی۔
ایم۔ اسلم
اعظم کریوی
صادق الخیری دھلوی
حجاب امتیاز علی
کرشن چندر
سعادت حسن منٹو
احمد ندیم قاسمی
ممتاز مفتی
اشرف صبوحی دہلوی
سید رفیق حسین
بھارت چند کھنہ
ڈاکٹر نصیر الدین
بلونت سنگھ
عظیم بیگ چغتائی
کرشن چندر سکسینہ
ریاض رونی
کملا دیوی چودھری
غلام عباس ہولوی
مدھو سودن
ساون مل ترکھا
ایس۔ ڈبلیو۔ حیدر
اسعد گیلانی

مزاحیہ مضامین اور طنزیہ افسانے:۔

سید امتیاز علی تاج
مرزا عظیم بیگ چغتائی
"ادارہ"
عصمت چغتائی
قیسی رامپوری

اِن کے علاوہ ایک درجن کے قریب اور مضامین بھی شائع ہونگے۔ اتنے عمدہ مضامین آپ کو کہیں بھی یکجا نہیں مل سکتے۔ سالنامے کی قیمت عہ ہوگی۔ لیکن مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا۔

جنوری کے پہلے ہفتے میں سالنامہ آپ کو مل جائے گا۔